عشق
کا
شین
علیم الحق حقی

پیش لفظ

ھذا من فضل ربی
الحمد للہ

بے شک، یہ میرے رب کا فضل ہے کہ ''عشق کا شین'' کا پہلا حصہ کتابی صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے جو کچھ اچھا لکھا، وہ اللہ کی توفیق سے ہے۔ اس کی عطا ہے۔ میں پوری سچائی کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ ایک عام انسان اور نفس کا غلام ہونے کے ناتے میں کبھی اللہ کی عطا کی ہوئی توفیق سے مکمل طور پر استفادہ نہیں کر پاتا۔ اس کے نتیجے میں کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں اور کام میں کمزوریاں اور خامیاں در آتی ہیں۔ آپ سب...... میرے قارئین ان خامیوں سے صرفِ نظر فرماتے ہوئے میرے کام کو والہانہ سراہتے ہیں اور مجھے اپنی بے پایاں محبتوں سے اور محبت بھری دعاؤں سے نوازتے ہیں۔ یہ آپ کا احسان ہے۔ میں بھی آپ سب اَن دیکھے، اَن جانے لوگوں سے ایسی ہی محبت کرتا ہوں۔ اس پر میرا اللہ گواہ ہے۔ جو کچھ میں لکھتا ہوں، وہ آپ سب کے لیے میری اُسی محبت کا سچا اظہار ہے۔

اس کہانی کو میں اب تک اپنے چار برس دے چکا ہوں اور ابھی یہ مکمل نہیں ہوئی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ آپ بھی اس کا انتظار کم از کم مہینوں سے کر رہے ہیں۔

میں انتظار کی لذت سے بھی واقف ہوں اور اس کے کرب سے بھی آگاہ ہوں۔ دل تو چاہتا تھا کہ کہانی مکمل ہونے کے بعد ہی شائع کراؤں لیکن پھر سوچا کہ آپ کو آپ کے انتظار کا کچھ صلہ تو ملے اور انتظار اتنا طویل بھی نہ ہو جائے کہ میرے لیے آپ کی محبت آزمائش میں پڑ جائے۔ اس لیے کہانی کا یہ پہلا حصہ جناب آفتاب ھاشمی کی محنت اور محبت سے مزین و آراستہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اللہ سے امید رکھتے ہوئے اور مدد چاہتے ہوئے، اس کے بھروسے پر آپ سے وعدہ کر رہا ہوں کہ آخری حصے کے لیے آپ کو بہت طویل انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ یہ بہت طویل کہانی ہے۔ ایسی کہانیاں لفظ لفظ ہی لکھی جاتی ہیں اور لفظ لفظ ہی پڑھی جاتی ہیں۔ شاید اسی لیے مسبب الاسباب نے اسے روزنامہ ''امت'' میں اشاعت نصیب فرمائی۔ روزنامہ امت شاید سندھ سے باہر کم ہی جاتا ہے۔ بہرحال امت کی ویب سائٹ پر آپ اس کہانی کو روز پڑھ سکتے ہیں......

www.ummat.com.pk.

میرا یہ منصب نہیں کہ میں کہانی کے بارے میں کچھ کہوں۔ کوئی بھی لکھنے والا نہیں کہہ سکتا کہ اس نے کیا لکھا ہے اور کیسا لکھا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اپنی یہ تحریر مجھے بہت پسند ہے۔ کہانی کو سندِ اعتبار تو آپ لوگ ہی دیتے ہیں اور کہانی کو قبولِ عام عطا کرنے والا تو صرف اور صرف اللہ ہے۔ میں تو بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنا کام محنت، جاں فشانی اور سچائی سے کرنے کی کوشش کی ہے۔ صلہ اور قبولیت اب اللہ کے اور آپ کے ہاتھ ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اب تک میں اپنی توقع سے بہت بڑھ کر نوازا گیا ہوں۔

آپ سب جانتے ہیں کہ بنیادی طور پر میں شاعر ہوں۔ شاؔم تخلص کرتا ہوں۔ کہانی کا میڈیم تو میں نے بہت بعد میں اپنایا۔ میری کچھ نظمیں اور اشعار میری کہانیوں میں آپ نے پڑھے۔ شعر کو میں کیونکہ اظہارِ ذات سمجھتا ہوں اور وہ مجھے بہت ذاتی لگتا ہے۔ اس لیے میں نے کبھی مجموعہ کلام کی اشاعت میں دلچسپی نہیں لی۔ لیکن اب بہت سے چاہنے والوں کے اصرار پر ارادہ کر لیا ہے کہ اللہ توفیق اور وسائل عطا فرمائے تو پہلا مجموعہ کلام بھی آپ تک پہنچا دیا جائے۔

آپ جانتے ہیں کہ آپ کی آراء کی میرے لیے کتنی اہمیت ہے۔ آپ کی تنقید کی مدد سے میں اپنی خامیاں دور کرتا ہوں۔ آپ کی حوصلہ افزائی مجھے اور اچھا لکھنے کی ترغیب دیتی ہے اور آپ غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہیں تو مجھے خوشی ہوتی ہے کہ آپ مجھے کتنی توجہ اور باریک بینی سے پڑھتے ہیں۔ آپ کی سہولت کے لیے اپنا ای میل ایڈریس بھی دے رہا ہوں۔ اس کے علاوہ آپ ایچ اینڈ ایچ پبلشرز کی معرفت بھی مجھے خط لکھ سکتے ہیں۔ میں عشق کا شین پر آپ کی آرا اور تبصروں کا بے چینی سے منتظر ہوں۔

مجھے درازیٔ عمرِ کارآمد بالخیر کی دعاؤں سے نوازتے رہیے۔ تاکہ میں آپ کے لیے اور اپنے لیے لکھتا رہوں۔

والسلام
آپ کا اپنا
علیم الحق حقی
aleem-haqqi@hotmail.com
ah-haqqi@yahoo.com

کتابِ اوّل

صبحِ کاذب

مجذوب یوں تیز قدم اٹھاتا چل رہا تھا، جیسے کہیں پہنچنے کی جلدی ہو۔ پھر وہ ایک دم سے بیٹھ گیا۔ بیٹھ کیا گیا، ساکت ہو گیا۔ اس کے جسم میں تو کیا، کپڑوں میں بھی جنبش نہیں تھی۔ حالانکہ خاصی تیز ہوا چل رہی تھی۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ تیزی سے آگے بڑھا۔ نجانے کیوں وہ پریشان ہو گیا تھا۔ مجذوب اس سے کوئی بیس قدم دور تھا۔ ٹھاکر اس کے پاس پہنچا اور اس کے آگے کی طرف پھیلے ہوئے ہاتھ کو چھو کر دیکھا۔ وہ حیران ہو گیا۔ مجذوب کا ہاتھ برف کی طرح سرد ہو رہا تھا۔

ٹھاکر سیدھا کھڑا ہوا اور اس نے مجذوب کو غور سے دیکھا۔ اس کا دل تاسف سے بھر گیا۔ مجذوب کے سینے میں سانسوں کا تموج بھی نہیں تھا۔ اس نے سوچا، یہ تو کوئی اچھا شگون نہیں۔ آج کے شبھ دن تو ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا اور ہونا تھا تو کم از کم یہاں نہ ہوتا۔

مجذوب کا چہرہ اور ہاتھ پیر دھول میں اَٹے تھے۔ اس کا کرتہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور پاجامے سے اگر پیوند نکال دیے جاتے تو شاید کچھ بھی نہ بچتا۔ اس کے سر کے بالوں اور بڑھی ہوئی بے ترتیب داڑھی میں نام کو بھی سیاہ بال نہیں تھا۔ لیکن اس کا چہرہ جوان تھا بلکہ اس پر بچوں کی سی معصومیت تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔

ٹھاکر بڑا دبدبے والا آدمی تھا۔ لیکن اس چہرے کو دیکھ کر مرعوب ہو گیا۔ وہاں مرنے کے بعد بھی عجیب طرح کا جاہ و جلال تھا۔ چہرے کا ایک ایک نقش ڈانٹتا گرجتا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر اسی لمحے ٹھاکر کے دماغ میں ایک شک نے سر ابھارا۔ آدمی یوں تو نہیں مرتا۔ اگر یہ مر گیا ہے تو اس کا جسم ڈھلکا کیوں نہیں۔ یہ خیال آتے ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر مجذوب کی پیشانی کو چھوا۔ لیکن وہ بھی برف کی طرح سرد تھی۔ پھر اگلے ہی پل اس سرد پیشانی میں جیسے بجلی کا بے حد طاقت ور کرنٹ دوڑ گیا۔ ٹھاکر کو بہت شدید جھٹکا لگا۔ وہ بے ساختہ، بلا ارادہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایسی سوزش ہو رہی تھی، جو جلنے پر ہوتی ہے۔ اس نے گھبرا کر اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ وہاں جلنے کا نشان ہوگا۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

چند لمحوں میں سوزش ختم ہو گئی اور اس کی گھبراہٹ بھی بتدریج دور ہو گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ مجذوب مرا نہیں ہے بلکہ زندہ ہے۔ مگر اب وہ مجذوب کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

طرف سے توجہ ہٹی تو اسے احساس ہوا کہ اندھیرا چھا رہا ہے۔ ابھی اس طرف آتے ہوئے اس نے دیکھا تھا کہ سورج دیوتا اپنی کرنوں کی فوجیں سمیٹ کر دوسری طرف چڑھائی کرنے کے لیے چلا جا رہا ہے اور اب اس کے تاراج کیے ہوئے آکاش پر اس کے قدموں سے سرخ نشان بھی مٹے جا رہے تھے۔ اندھیرا کسی بہت بڑے باز کی طرح پَر پھیلائے دھرتی پر اترا چلا آ رہا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی ٹھاکر کی نظر مجذوب کے چہرے کی طرف اٹھی اور اس نے سوچا کہ واپس لوٹ جائے۔ وہ جو سمجھ کر آیا تھا، یہ پُراسرار مجذوب وہ نہیں تھا مگر دوسری نظر میں اسے لگا کہ یہ وہی ہے یہ عجیب معما تھا۔

اب ٹھاکر کو خیال آیا کہ وہ اپنی حویلی سے نکل کر، کھیتوں سے گزر کر اس طرف آیا ہی کیوں تھا۔ اس کی کوئی تک ہی نہیں تھی۔ حویلی مہمانوں سے بھری تھی۔ باہر پکوان تیار ہو رہے تھے۔ گاؤں بھر میں میلے کا سماں تھا۔ اسے تو وہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔ مگر دل میں ایک لہر سی اٹھی تھی اور وہ بہتا ہوا حویلی سے نکلا تھا اور کھیتوں کی طرف چل دیا تھا اور اس کے قدم وہاں بھی نہیں رُکے تھے۔ وہ بے اختیار بڑھ رہے تھے۔ اس وقت بھی اس نے سوچا تھا کہ آخر وہ کہاں جا رہا ہے۔ اسے واپس جانا چاہیے لیکن خواہش اور کوشش کے باوجود وہ خود کو روک نہیں سکا تھا۔ قدم تھے کہ بہے جا رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔

اسے خوب یاد تھا۔ وہ سامنے غروب ہوتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اچانک اسے وہ مجذوب دکھائی دیا۔ وہ اچانک ہی نمودار ہوا اس لیے کہ سامنے حد نظر تک کہیں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ کوئی ایسی آڑ، ایسا موڑ نہیں تھا، جہاں سے وہ سامنے آتا۔ اس نے سوچا کہ اس کی کیفیت ہی کچھ عجیب تھی۔ ممکن ہے، اس نے مجذوب کو دیکھ کر بھی نہیں دیکھا ہو۔ کوئی جادو تو نہیں ہو سکتا اور مجذوب زمین سے تو اُگنے سے رہا۔

مجذوب بہت دور تھا...... اتنا دور کہ نہ اسے اس کے چہرے کے نقوش نظر آ رہے تھے، نہ اس کا کرتہ پھٹا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے میں وہ اسے مجذوب کیوں سمجھ رہا ہے۔ اسے تو اس کو کوئی جوگی سمجھنا چاہیے تھا۔ اس معترضانہ سوال نے اس کے ذہن میں سر اٹھایا۔ ہوتا تو نہیں چاہیے تھا سچ یہ تھا کہ مجذوب وہ سمجھتا تھا۔ بہت برس پہلے زمانہ تعلیم میں اس نے ایک ایسے شخص کو دیکھا تھا جو دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ تب اس کے ہم جماعت مسلمان دوست امان اللہ نے اسے بتایا تھا کہ ایسے لوگ صاحب حال ہوتے ہیں اور مجذوب کہلاتے ہیں۔ برسوں پرانا وہ حوالہ اس کے ذہن میں محفوظ نہ ہوتا تو شاید وہ اسے جوگی ہی سمجھتا۔ سو اس کے اندر موجود یقین نے اس سوال کو بہ جبر مٹا دیا۔

پھر اس یقین کے اندر سے ایک اور یقین نے سر ابھارا۔ اس نے سوچا، یہ وہی بزرگ ہستی ہے، جسے اس نے ٹھیک ایک سال پہلے خواب میں دیکھا تھا۔ اس یقین کے ساتھ ہی پچھلے

معترضانہ سوال نے پھر سر اٹھانے کی کوشش کی۔ یہ کیسے سوچا جا سکتا ہے کہ یہ وہی بزرگ ہے۔ جبکہ آنے والے کا چہرہ تک دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ اندر کے یقین نے پھر اس سوال کے سر پر دھپ سے ہاتھ مار دیا...... خاموش بے ادب، یہ وہی ہے۔

اس کے ساتھ ہی ٹھاکر کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔ آگے بڑھنے کی وہ لہر غائب ہو گئی جو اسے یہاں تک کھینچ لائی تھی۔ وہ مجذوب کو آگے بڑھتے دیکھتا رہا۔ مجذوب کے چہرے کے نقوش واضح ہوئے تو اس نے دل میں کہا...... نہیں، یہ وہ خواب والا بزرگ نہیں ہے۔

یہ ایک بات بھی عجیب تھی۔ ہر شخص بارہا کسی نہ کسی اجنبی کو خواب میں دیکھتا ہے۔ سو کر اٹھتا ہے تو وہ چہرہ اسے یاد نہیں ہوتا۔ یاد بھی ہو تو تھوڑی دیر میں محو ہو جاتا ہے لیکن ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے ایک سال پہلے جس بزرگ کو خواب میں دیکھا تھا، اسے اس کا چہرہ اب بھی یاد تھا۔ وہ جب تصور کرتا، اس کا جیتا جاگتا چہرہ اس کے سامنے آ جاتا...... چہرے کے ہر نقش اور تاثر سمیت۔ اس لیے تو اس نے جان لیا کہ یہ مجذوب وہ نہیں ہے۔

مگر مجذوب دو قدم آگے آیا تو ٹھاکر کو لگا کہ یہ وہی بزرگ ہے۔ اگلے لمحے نے اس کی نفی کر دی۔ شاید کسی خاص زاویے سے وہ اس بزرگ جیسا لگتا تھا۔ شاید کوئی مشابہت تھی ان دونوں میں...... مگر دور کی۔

اور پھر مجذوب اچانک بیٹھ گیا تھا...... مر گیا تھا......!

''ٹھاکر...... تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

یہ آواز سن کر ٹھاکر اچھل پڑا۔ سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ مجذوب اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ ''آپ کے سواگت کے لیے آیا ہوں'' ٹھاکر نے بے ساختہ کہا۔ کہنے کے فوراً بعد اس نے سوچا کہ یہ درست نہیں ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ اسے معلوم ہی نہیں کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ کوئی انجانی طاقت اسے کھینچ کر لے آئی ہے۔

''اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم تو خود خیر مقدم کے لیے یہاں آئے تھے۔ کچھ ضروری کام بھی تھے جو نمٹا لیے۔ اب ہمیں جانا ہے۔'' مجذوب کی آواز میں گہرائی تھی...... اور گونج تھی...... صحراؤں کی گونج!

''میں آپ کو ایسے نہیں جانے دوں گا۔'' ٹھاکر نے پھر بلا ارادہ کہا۔ اب اسے اپنی از خود رفتگی سے خوف آنے لگا تھا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' مجذوب نے پوچھا۔

''میں چاہتا ہوں مہاراج کہ آپ میری خوشیوں میں شریک ہوں۔ میرے بچے کی صورت دیکھیں اور اس کو دعا دیں۔''

''ہم تمھاری اور اپنی خوشی میں شریک ہو چکے ہیں۔ بچے کی صورت دیکھ لی اور دعا بھی

دے دی۔'' مجذوب نے بڑی تمکنت سے کہا۔''ہم وہیں سے آ رہے ہیں۔''

ٹھاکر حیران رہ گیا۔''مگر مہاراج، آپ تو ادھر سے آ رہے ہیں۔''

''ہر سمت اسی کی ہے۔'' مجذوب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔''باقی سب نظر کا دھوکہ ہے۔

ٹھاکر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ لیکن اس نے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔'' چل کے کچھ جل پان تو کر لیں مہاراج۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''نہیں ابھی نہیں۔ وہ بڑا ہوگا اور دعوت کرے گا تو ہم ضرور آئیں گے۔''

''تو مجھے کس لیے بلایا تھا مہاراج؟'' ٹھاکر کی زبان پھر پھسلی۔ اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔

''راجپوت میں ایسی عاجزی، سب اس کی شان ہے۔'' مجذوب نے انگلی آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر یوں بولا، جیسے سچ مچ ٹھاکر اسی کے بلاوے پر آیا ہو۔'' کچھ باتیں سمجھانی تھیں۔ پہلے یہ بتا، اس جگہ کا نام کیا ہے؟'' مجذوب نے ٹھاکر سے گاؤں کی طرف اشارہ کیا۔'' وہ جگہ جہاں وہ چراغ روشن ہے۔''

ٹھاکر نے اشارے کی سمت دیکھا اور بڑے فخر سے بولا۔''چراغ! وہاں تو چراغاں ہو رہا ہے مہاراج۔''

''نہیں۔ ابھی تو وہاں اندھیرا ہے۔ بس وہی ایک چراغ روشن ہے۔ چراغاں تو بعد میں ہوگا۔''

ٹھاکر نے حیرت سے اپنی حویلی کو دیکھا جو روشنی میں نہائی ہوئی تھی اور مجذوب کہہ رہا تھا کہ وہاں اندھیرا ہے۔ وہ احتجاج کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اندر سے کسی نے اسے روکا اور اسی نے ایک بار پھر خود کو محبت سے بچا لیا۔ برسوں پہلے امان اللہ نے نصیحت کی تھی کہ ایسے لوگوں سے الجھنا اچھا نہیں ہوتا۔ جو بھی کہیں چپ چاپ سن لو۔'' وہ میرا گاؤں ہے مہاراج۔ اس نے کہا۔''اس کا نام ٹھاکروں کی گڑھی ہے۔''

''نہیں رہے گا۔ نہ یہ گاؤں، نہ یہ نام، یہ اجڑ جائے گا۔ پھر دوبارہ آباد ہوگا اور اس کا نام حق نگر ہوگا۔ بڑی رونق ہوگی یہاں۔''

ٹھاکر کو برا تو بہت لگا۔ مگر وہ برداشت کر گیا۔

''دیکھ، میری باتیں غور سے سن اور بھولنا مت۔'' مجذوب نے ٹھاکر سے کہا۔''وہ چراغ جس نے روشن کیا ہے اس کی حفاظت بھی وہی کرے گا۔ لیکن تو اس کے سامنے ہوا کے لیے آڑ بن کر کھڑا ہوگا تو تیرا ہی بھلا ہوگا۔ چراغ کو تو روشن ہی رہنا ہے۔ اسے کوئی نہیں بجھا سکتا۔''

ٹھاکر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ مگر اس نے عاجزی سے کہا۔''میں سمجھ گیا مہاراج۔''

''اور سن۔ وہ تجھے ملا۔ یہ رب کا احسان ہے تجھ پر۔ تیری سمجھ میں اس کی باتیں نہیں آئیں گی۔ تو نہ اس سے بحث کرنا اور نہ سختی کرنا اس پر۔ اسے کسی بات سے مت روکنا۔ اس کی بات مان لیا کرنا۔ اس کا دل میلا نہ ہونے دینا۔ اس کا بن کر رہنا۔ تیرا ہی بھلا ہے اس میں۔ جان دے دینا اس کے لیے۔ پھر تیرا کھوٹا سکہ بھی اشرفی کے مول چل جائے گا۔''

اس بار ٹھاکر کی سمجھ میں بات پوری طرح آ گئی تھی۔''وہ تو میری جان ہے مہاراج۔''

''کچھ بھی ہو جائے، وہ کچھ بھی کرے، ہمیشہ اسے جان ہی سمجھنا۔'' مجذوب کا لہجہ سخت ہو گیا۔''بس اب چلا جا۔ وہاں حویلی میں تیری ضرورت ہے۔ وہاں ڈھونڈ پڑی ہے۔ تیرا بچہ کھو گیا ہے۔''

ٹھاکر کے ہوش اڑ گئے۔''میرا بچہ......''

''گھبرا مت۔'' مجذوب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔''تیرا بچہ محفوظ ہے۔ وہ اس کمرے میں ہے، جسے اس کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اب وہی اس کا کمرا ہے۔ جب تک وہ اس حویلی میں ہے، اس کمرے میں رہے گا۔''

ٹھاکر کا راجپوتی خون جوش کھا گیا۔ یہ کیسا مذاق ہے۔ بائیس سال بعد اسے بیٹا ملا ہے تو اس کے فیصلے دوسرے لوگ کر رہے ہیں۔ اسے بتایا جا رہا ہے کہ اس کی اپنی حویلی میں اس کے بیٹے کو کس کمرے میں رہنا ہے۔''شما کرنا مہاراج'' اس نے بڑے دبدبے سے کہا۔''ہم ٹھاکر لوگ اپنے معاملات میں دوسروں کی مداخلت قبول نہیں کرتے۔''

مجذوب کو جلال آ گیا۔''ادھر دیکھ میری طرف۔'' اس کے لہجے میں بجلی کی کڑک تھی۔

''اور میری بات غور سے سن۔ اپنی ٹھاکری کو بھول جا۔ یہ بچہ تجھے تیری ٹھاکری کی قیمت پر ملا ہے۔''

ٹھاکر نے سر اٹھایا۔ پہلی بار وہ براہ راست مجذوب کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا تو دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ ان آنکھوں کے سوا اسے کچھ یاد نہیں رہا۔ اور وہ آنکھیں عجیب تھیں۔ ان میں بلا کی چمک تھی، جو مجذوب کے جوان چہرے سے ہم آہنگ تھی۔ اور ان میں جہاں دیدگی تھی، دانش تھی، جو مجذوب کے سر اور داڑھی کے سفید بالوں سے میچ کر رہی تھی۔ وہ آنکھیں بوڑھی بھی تھیں اور جوان بھی......

''میری بات غور سے سُن۔ میں یہاں یونہی وقت ضائع کرنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔''

مجذوب کی آواز اسے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ وہ ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔

''حویلی میں سب پریشان ہیں۔ پاگلوں کی طرح بچے کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ لیکن وہ اسے نہیں ڈھونڈ سکتے۔ تجھے جا کر سب کو مطمئن کرنا ہے۔''

''وہ کمرا کون سا ہے مہاراج؟'' ٹھاکر اب بھی ان آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''پچھواڑے کی طرف جو کونے والا کمرا ہے......''

ٹھاکر کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ آنکھوں سے دہشت جھلکنے لگی۔ اس نے اس کمرے کا تصور کیا، جو ہر وقت مقفل رہتا تھا تو اس پر لرزہ چڑھ گیا۔ ''غضب ہوگیا مہاراج۔'' اس کی آواز بھی لرز رہی تھی۔ ''اس کمرے میں تو بھوت پریت......''

مجذوب آپے سے باہر ہوگیا۔ ''بکواس مت کر بدبخت، ملعون، گستاخ، زبان دراز۔ تو نہیں جانتا......'' وہ کہتے کہتے رکا۔ اور دوبارہ بولا تو اس کا لہجہ بے حد نرم تھا۔ ''وہاں ایسا کچھ نہیں ہے ٹھاکر۔ بس یہ یاد رکھ کہ اب وہ تیرے بیٹے کا کمرا ہے۔ تو اس کمرے کو کھول کر دیکھنا۔ بچہ جس رخ سے لیٹا ملے، اسے ہمیشہ اس رخ لٹانا۔ کبھی اس کے خلاف نہ کرنا۔ ورنہ بہت برا ہوگا اور اس کمرے میں پچھواڑے کے رخ پر چھوٹا سا دروازہ ہے نا، اسے کبھی نہ کھولنا۔ اور اس دروازے کے چاروں طرف دو دو فٹ کی جگہ چھوڑ دینا۔ اس طرف کوئی نہ جائے۔ باقی کمرا تمہارا ہے۔ کسی کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ سمجھ گیا؟''

اس کمرے کا تصور کر کے ٹھاکر کا دل لرزا جا رہا تھا۔ پھر بھی اس نے دل کڑا کر کے کہا۔

''میں سمجھ گیا مہاراج۔''

''اور سن۔ تیرا بیٹا ضدی نہیں ہوگا، لیکن کبھی ضد کرے تو اس کے خلاف نہ کرنا۔ اس کی ضد پوری کر دینا۔ نشانیاں نظر آتی رہیں گی۔ ان کو مانتے رہنا اور ہاں، وہاں شہد ملے گا، وہ بچے کو چٹاتے رہنا۔''

حواس باختہ ٹھاکر نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ذہن میں اٹھنے والا ایک سوال اس کی زبان پر آگیا۔ ''تم مس......'' وہ کہتے کہتے رکا۔ وہ مسلا کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے اندر کی کسی قوت نے اسے ٹوک دیا کہ یہ مناسب نہیں ہوگا۔ اس نے جلدی سے تصحیح کی۔ ''تم مسلمان ہو مہاراج؟''

مجذوب مسکرایا۔ ''ہم مسلم ہیں...... اللہ کے فرماں بردار۔''

''بچہ تو ہمارا ہی ہے نا مہاراج؟'' ٹھاکر کے لہجے میں اندیشے تھے۔

''وہ خوش نصیب ہے ٹھاکر پرتاپ سنگھ۔ وہ نہ تمہارا ہے نہ ہمارا ہے۔ وہ اس کا ہے، جس کا ہر بندے کو ہونا چاہیے لیکن بدنصیب اسی کو چھوڑ کر سب کے ہو جاتے ہیں۔ بس اس کے نہیں بنتے۔ اچھا اب تو جا۔''

ٹھاکر کو اب حویلی کی فکر تھی۔ وہاں کی پریشانی کا خیال تھا۔ وہ جانے کو بے تاب تھا۔ چنانچہ جانے کے لیے پلٹا۔ مگر مجذوب کی آواز نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

''ایک آخری بات، میرے متعلق کبھی کسی کو نہ بتانا۔ ہاں ضروری ہو تو بیوی کو بتا سکتا ہے۔''

''جو حکم مہاراج۔''

''بس اب چلا جا۔ اور میری ہر بات یاد رکھنا۔ بھولنا مت۔''

ٹھاکر پلٹ کر تیز قدموں سے گاؤں کی طرف چل دیا۔ اس کا بس چلتا تو وہ بھاگنے لگتا۔

کچھ دور جانے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا۔ مگر وہاں مجذوب کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ وہ کھلا میدان تھا اور ابھی اتنا اندھیرا بھی نہیں ہوا تھا کہ مجذوب نظر نہ آتا لیکن وہ جیسے نمودار ہوا تھا، ویسے ہی غائب بھی ہوگیا تھا۔ گاؤں کی طرف کچھ اور بڑھنے کے بعد ٹھاکر کو ایسا لگا کہ جو کچھ اس نے دیکھا، جاگتی آنکھوں کا خواب تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ مجذوب کو اس کا نام بھی معلوم تھا۔ چنانچہ اس کا یہ خیال اور بھی پختہ ہوگیا۔ اس کے قدم سست پڑ گئے۔ اس نے سوچا، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ یہ سب میرا وہم تھا۔ بچہ وہیں ٹھاکرانی کے پاس ہی لیٹا ہوگا۔

مگر وہ گاؤں میں داخل ہوا تو اسے دور ہی سے احساس ہوگیا کہ وہاں غیر معمولی صورت حال ہے۔ لوگ پریشانی میں اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے۔ حویلی میں بھی بھگدڑ کا سماں تھا۔ اس کے قدم پھر تیز ہوگئے......

❁......❁......❁

ٹھاکرانی رنجیتا کا عجیب حال تھا۔ مختلف اور متضاد کیفیات تھیں، جو اس کے اندر گھل مل گئی تھیں۔ وہ تھکن سے چور تھی، خوشی اور طمانیت سے سرشار تھی۔ ایسی طمانیت، جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اسے تکلیف بھی ہو رہی تھی۔ مگر اس کا احساس زیادہ نہیں تھا۔

ابھی ذرا دیر پہلے کمرا لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ دور دور سے ان کے رشتے دار یہاں آئے ہوئے تھے۔ دن سے مہمان داری چل رہی تھی اور جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور ابھی تھوڑی دیر پہلے سب بچے کو دیکھنے اور اسے بدھائی دینے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ وہ خوشی اور فخر میں تکلیف کو بھی بھول گئی تھی۔ وہ بدھائیاں لے رہی تھی۔ ٹھاکر کا چہرہ دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی تھی۔ وہ جیسے پھر سے جوان ہوگیا تھا۔

ٹھاکر اور سب مہمان کمرے سے نکلے تو دائی راجو نے اسے لٹا دیا۔ اسے اچھا لگا کیونکہ بیٹھے بیٹھے اسے تھکن ہوگئی تھی۔

''میں جا رہی ہوں مالکن'' دائی نے اس سے کہا۔ ''ذرا گھر کو بھی دیکھ لوں۔ بس ترنت آ جاؤں گی۔''

''چلی جا، پر شانتا کو ادھر بھیج دے۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔

دائی راجو کمرے سے نکلی۔ ٹھاکرانی کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ لیکن وہ غشی کی اس کیفیت سے لڑتی رہی جس میں اترنے کو اس کا جی بھی چاہ رہا تھا۔ مگر بچہ اکیلا ہو جاتا۔ شانتا آ جائے تو......

اور اگلے ہی لمحے شانتا کمرے میں آ گئی۔ وہ شاید کمرے کے باہر ہی تھی۔ دائی راجو کے نکلتے ہی آ گئی تھی۔ ٹھاکرانی نے اسے کونے میں فرش پر بیٹھتے دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اب وہ سکون سے سو سکتی تھی۔

ٹھاکرانی کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ غشی کی وہ کیفیت کتنی دیر رہی۔ اچانک اسے اپنے بچے کا خیال آیا۔ کوئی پریشانی کی بات تھی، جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ ''شانتا...... او شانتا'' اس نے پکارا۔

شانتا بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس آئی۔ ''جی مالکن؟''

''ذرا چھوٹے ٹھاکر کو میرے پاس لٹا دے۔''

ٹھاکرانی کی مسہری دیوار سے لگی تھی۔ بچے کا پنگھوڑا اس کے برابر تھا۔ درمیان میں اتنی جگہ چھوڑی گئی تھی کہ ٹھاکرانی کو اٹھنے کی ضرورت پڑے تو وہ مسہری سے اتر سکے۔ وہ چاہتی تو اٹھ کر بچے کو خود بھی اٹھا لیتی۔ لیکن ایک تو وہ نڈھال ہو رہی تھی دوسرے راجو نے اسے چھ دن احتیاط کرنے کو کہا تھا۔

''جی مالکن۔'' شانتا نے کہا۔

ٹھاکرانی کی آنکھیں پھر مند گئیں۔ لیکن شانتا کی چیخ سن کر وہ گھبرائی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ''کیا ہوا شانتا؟''

''جی...... مالکن...... وہ...... چھوٹے ٹھاکر......'' شانتا سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

ٹھاکرانی سب کچھ بھول کر ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''کیا...... کیا ہوا چھوٹے ٹھاکر کو؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔ اس کا ایک ہاتھ سینے پر تھا۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئی تھیں...... بلکہ پھٹ سی گئی تھیں۔

شانتا بت بنی کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ لیکن آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟ بولتی کیوں نہیں؟'' ٹھاکرانی نے اسے ڈانٹا۔

''وہ...... چھوٹے ٹھاکر...... چھوٹے ٹھاکر یہاں نہیں ہیں۔'' شانتا نے بڑی مشکل سے کہا۔

ٹھاکرانی کو لگا کہ اس کا دل بند ہو جائے گا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ ''کیا بکتی ہے۔ یہیں تو تھے چھوٹے ٹھاکر۔'' اس نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

''جھولا خالی پڑا ہے مالکن۔''

ٹھاکرانی نے بہت تیزی سے سوچنے کی کوشش کی۔ مگر بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ راجو گئی ہے تو بچہ یہیں تھا۔ ورنہ راجو ہی شور مچا دیتی اور راجو کے جانے کے ایک منٹ بعد شانتا کمرے میں آ گئی تھی اور اس دوران وہ خود آنکھیں کھولے لیٹی رہی تھی۔ اس ایک منٹ میں

بچہ کہاں جا سکتا ہے۔ ''کمرے میں دیکھو ادھر اُدھر۔'' اس نے شانتا سے کہا۔

لیکن کمرے میں ایسی کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ پھر بھی شانتا نے کمرا چھان مارا۔ اس دوران ٹھاکرانی سوچتی رہی۔ مگر اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

''جا...... جا کے ٹھاکر جی کو بلا کر لا۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔

چند منٹ بعد ٹھاکرانی کا کمرا بھر گیا۔ سب مہمانوں کو پتا چل گیا تھا۔ سب آ گئے تھے۔

لیکن ٹھاکر پرتاپ سنگھ کا کہیں پتا نہیں تھا۔ ٹھاکرانی کا برا حال تھا۔ مہمانوں میں ٹھاکر کے چچیرے بھائی بلبیر سنگھ بھی تھے۔ انھوں نے اسے دلاسہ دیا۔ ''بچہ کہاں جائے گا دیورانی جی، خود کو ہلکان مت کرو۔''

پوری حویلی چھان ماری گئی۔ بچے کا کہیں پتا نہیں چلا۔ ٹھاکر بھی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ٹھاکرانی پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ ایک اور مصیبت کھڑی ہو گئی۔ ٹھاکرانی کو سنبھالا جائے یا بچے کو تلاش کیا جائے۔ ایسے میں دلاسہ ہی دیا جا سکتا ہے۔

ٹھاکرانی کی بہن کو راجو کا خیال آیا۔ ''دائی کو بلاؤ۔ اس سے پوچھو۔''

شانتا راجو کو بلانے کے لیے دوڑ گئی۔ راستے میں اسے جو بھی ملا، اس نے اسے بچے کی گمشدگی کا بتا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پورے گاؤں کو پتا چل گیا۔ گاؤں والے ٹھاکر سے محبت کرتے تھے۔ وہ پریشان ہو گئے اور ادھر اُدھر بچے کو ڈھونڈنے لگے۔

اُدھر ٹھاکرانی کو ایک اور خیال سوجھا۔ ڈوبنے والا تنکے کا سہارا تلاش کر رہا تھا۔ ''ہو سکتا ہے، وہ بچے کو کہیں لے گئے ہوں۔'' وہ بولی۔ اس کا اشارہ ٹھاکر کی طرف تھا۔

اس پر سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ٹھاکر کو باہر جاتے ان میں سے کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ممکن ہے، ایسا ہی ہوا ہو۔

لیکن راجو نے آ کر وہ تنکا بھی توڑ دیا۔ ''میں گئی ہوں مالکن تو چھوٹے ٹھاکر پنگھوڑے میں تھے۔''

ٹھاکرانی جانتی تھی کہ ٹھاکر راجو کے جانے سے پہلے ہی کمرے سے چلے گئے تھے۔ تو پھر؟ راجو گئی اور ایک منٹ بعد شانتا کمرے میں آ گئی۔ اس ایک منٹ میں بچہ کیسے غائب ہو گیا! اس نے یہی بات بلند آواز میں کہہ بھی دی۔

اس پر سب لوگ دائی راجو کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ''تو جھوٹ بول رہی ہے۔'' بلبیر سنگھ نے راجو سے کہا۔

راجو بوکھلا گئی۔ ''مالکن سے پوچھ لیں۔ میں گئی ہوں تو میرے ہاتھ خالی تھے۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' ٹھاکرانی نے گواہی دی۔

اب سب شانتا کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ''تو پھر تو بتا۔'' ٹھاکر ارجن سنگھ نے اسے ڈپٹا۔

"مم...... میں...... میں کیا بتاؤں مالک۔"

"تو اور کون بتائے گا۔ راجو کے جانے کے بعد کمرے میں تیرے سوا کون تھا۔" ٹھاکر کی بہن کو بتا بولی۔

"بتا، کس نے دشمنی کی ہے ہم سے۔ کون تھا، جسے تو نے بچہ دے کر بھگا دیا۔ بتا، ورنہ میں تیری کھال کھینچ لوں گا۔" بلبیر سنگھ بولے۔

"رام جی کی سوگند۔ یہاں کوئی نہیں آیا ٹھاکر جی۔" شانتا گڑگڑائی۔ "اور میں نے دیکھا تو جھولا خالی تھا۔"

"بتا حرام......"

شانتا نے ہاتھ جوڑ لیے۔ "مالکن، مجھ پر شبہ کرنے کے بجائے آپ مجھے جان سے مار دیں۔" وہ رونے لگی۔ "میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں۔ ہم تو نسلوں سے ٹھاکروں کا نمک کھا رہے ہیں......"

"نمک حرامی میں دیر کتنی لگتی ہے۔" ارجن سنگھ نے کہا۔

ٹھاکرانی کو شانتا پر ترس آنے لگا۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ "اسے کچھ نہ کہیں۔ میرا دل نہیں مانتا کہ یہ میرے بچے کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔"

"خیر...... بعد میں دیکھیں گے۔ ان دونوں کو کہیں جانے نہ دینا۔" بلبیر سنگھ بولے۔ اشارہ شانتا اور راجو کی طرف تھا۔ "ہم ذرا باہر دیکھتے ہیں۔"

مرد باہر چلے گئے۔ کمرے میں عورتیں رہ گئیں۔ شانتا روئے جا رہی تھی۔ راجو سر جھکائے کھڑی تھی۔

اچانک باہر شور مچا۔ "ٹھاکر جی آ گئے۔ ٹھاکر جی آ گئے......"

ٹھاکرانی کے دل میں امید جاگ اٹھی......

❁......❁......❁

ٹھاکر پرتاپ سنگھ حویلی کی طرف بڑھتا رہا۔ اس نے کسی سے ہنگامے کا سبب نہیں پوچھا کیونکہ اسے معلوم تھا اور کسی کو اسے بتانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ سب اپنی اپنی جگہ ٹھہر گئے اور اسے جاتا دیکھتے رہے۔

حویلی میں داخل ہوتے ہی اس کا سامنا ارجن سنگھ اور بلبیر سنگھ سے ہوا۔ "کاکا...... تمہارا بالک غائب ہو گیا ہے۔" بلبیر سنگھ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"پریشان نہ ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔" پرتاپ سنگھ نے کہا۔ "آپ سب کو سمجھا دیں ویر جی کہ اس کی چنتا نہ کریں۔" یہ کہہ کر ٹھاکر آگے بڑھ گیا۔

بلبیر سنگھ اور ارجن سنگھ نے سب کو سمجھایا۔ سُتے ہوئے چہروں کی رونق واپس آنے لگی۔

اُدھر ٹھاکر پرتاپ سنگھ ٹھاکرانی کے کمرے میں داخل ہوئے۔ انھیں دیکھ کر ٹھاکرانی رونے لگی۔ شانتا اور دائی راجو کے چہروں پر زردی کھنڈ گئی۔ ٹھاکر نے پتنی سے کہا۔ "رنجیتا...... رونے کی ضرورت نہیں۔ چھوٹا ٹھاکر خیریت سے ہے۔ اس کی چنتا مت کرو۔"

"کہاں ہے میرا پتر؟"

"بتاتا ہوں۔ دھیرج رکھو۔" ٹھاکر نے کہا۔ پھر عورتوں کی طرف مڑے۔ "تم لوگ جا کر جشن کی فکر کرو۔"

سب سمجھ گئے کہ ٹھاکر جی کو ٹھاکرانی سے بات کرنی ہے۔ شانتا اور راجو کی بھی جان میں جان آ گئی۔

تخلیہ ہونے کے بعد ٹھاکر نے ٹھاکرانی سے کہا۔ "ہمارا پتر اس کمرے میں ہے، جہاں ہر وقت تالا لگا رہتا ہے...... وہی کونے والا کمرا۔"

"ہائے رام۔" ٹھاکرانی بوکھلا کر اٹھنے لگی۔ "یہ کیا غضب کیا آپ نے؟"

"بیٹھی رہو۔" ٹھاکر نے کہا۔ "اور اسے میں وہاں نہیں لے کر گیا۔ کسی نے اسے وہاں پہنچا دیا ہے۔ مگر تم ڈرو مت۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔"

"کیا بات کرتے ہیں آپ۔ وہاں تو آسیب......"

ٹھاکر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسا مت کہو۔ کبھی نہ کہنا۔ کسی کو کہنے بھی نہ دینا۔" اسے مجذوب کا ردعمل یاد آ گیا تھا۔ "اب وہی ہمارے پتر کا کمرا ہے۔"

"آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ اسے لائیں وہاں سے۔" ٹھاکرانی بپھر گئی۔

"رنجیتا...... میری بات سنو سکون سے۔" ٹھاکر کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "تمھیں وہ خواب یاد ہے؟"

❁......❁......❁

وہ خواب ٹھاکر نے ٹھیک ایک سال پہلے دیکھا تھا۔ یہی مہینہ تھا...... یہی تاریخ تھی......

اس صبح ٹھاکر نے ٹھاکرانی کو وہ خواب سنانے کا ارادہ کیا لیکن اس سے پہلے ہی ٹھاکرانی بول اٹھی۔ "ناتھ...... رات میں نے ایک سپنا دیکھا۔"

"میں نے بھی دیکھا۔ میرا من کہتا ہے کہ وہ بہت شبھ سپنا ہے۔ پہلے تم میرا سپنا سن لو۔" ٹھاکر نے کہا۔

"سپنا میرا بھی شبھ ہے۔ چلیں...... پہلے آپ سنا دیں۔"

"میں نے دیکھا کہ کونے والے بند کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور میں وہاں کھڑا ہوں......"

"وہ آسیب والا کمرا؟" ٹھاکرانی نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں وہی۔ اب ٹوکو مت۔ سنتی رہو۔'' ٹھاکر نے ناگواری سے کہا۔ ''اچانک کمرے میں ایک بزرگ آتے ہیں۔ ان کا سر بھی سفید ہے اور داڑھی بھی......''

''اور ماتھے پر مسلمانوں والا نماز کا ٹیکہ ہے۔'' ٹھاکرانی بولی۔

''ہاں'' ٹھاکر نے روانی میں کہا۔ پھر چونک کر اسے دیکھا اور اچنبھے سے بولا۔ ''تمھیں کیسے معلوم؟''

ٹھاکرانی کی نگاہوں میں بھی حیرت تھی۔ ''ایسے کہ میں نے بھی یہی دیکھا تھا۔''

ٹھاکر حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ، انھوں نے تم سے کیا کہا؟''

''وہ بولے...... تم اس برگد کے درخت سے بیٹا مانگ رہی تھیں نا؟ میں نے کہا...... ہمیں تو بیس سال ہوگئے مانگتے مانگتے۔ جو جہاں کا بتاتا ہے، ہم وہاں چلے جاتے ہیں۔ نگر نگر کی خاک چھان لی۔ پر منو کامنا پوری نہیں ہوتی......''

ٹھاکر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں نے بھی خواب میں یہی کہا تھا رنجو۔ اس پر وہ بولے، درخت کے مالک نے تمہاری سن لی ہے۔ تمھیں بیٹا ملے گا...... نصیبوں والا بیٹا......''

''مجھ سے بھی یہی کہا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ اس کی پرورش کرنا، اس سے محبت کرنا تمہارا کام ہے......''

''اور اس کی تعلیم و تربیت میں دخل نہ دینا۔ اس کی مرضی کے خلاف نہ کرنا۔ بس یہ یاد رکھنا، کسی بھی معاملے میں اس کے ساتھ زبردستی نہ کرنا...... کسی بھی معاملے میں۔'' ٹھاکر نے کہا۔

''جی ہاں۔ بالکل یہی...... اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔''

انھوں نے ٹکڑے لگا لگا کر خواب بیان کیا...... ایک دوسرے کی بات بڑھاتے ہوئے۔

پھر دونوں دیر تک بیٹھے سوچتے رہے...... خاموشی سے۔ دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ شاید ان کی آرزو پوری ہونے والی ہے۔ لیکن انھیں یقین کیسے آتا۔ بائیس سال کی محرومی ختم ہونے پر خود بھگوان آکر بدھائی دے تو بھی محروم کو تو اس وقت اعتبار آئے گا، جب جھولی سچ مچ بھر جائے گی۔ پھر بھی ان کے دل امید سے بھر گئے تھے۔ وہ تاریخ جب انھوں نے یہ خواب دیکھا تھا، ان کے دل پر نقش ہوگئی تھی۔ انھیں احساس تھا کہ ایک ہی وقت میں بالکل ایک سا خواب ان دونوں نے دیکھا تھا اور یہ غیر معمولی بات تھی۔

اب یہ روز کا معمول ہوگیا کہ ٹھاکر سوکر اٹھتا تو اس خیال کے ساتھ کہ شاید آج پتنی اسے کوئی اچھی خبر سنائے گی۔ وہ اپنے کاموں میں مصروف رہتا۔ مگر ٹھاکرانی کے سامنے آتا تو نظریں کیا، ایک زبان کو چھوڑ کر اس کے جسم کا ہر عضو سوال بن جاتا اور ٹھاکرانی خوب جانتی تھی کہ زبانِ خامشی سے وہ کیا پوچھ رہا ہے۔ وہ ایک آہ بھر کے نظریں جھکا لیتی یا وہاں سے ہٹ جاتی۔ اس صبح کے بعد ان کے درمیان اس سلسلے میں کبھی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ نہ بالواسطہ نہ بلاواسطہ۔

دونوں ڈرتے تھے کہ امید نہ ٹوٹ جائے۔ دل میں مایوسی جگہ نہ بنا لے۔ حالانکہ ہو یہی رہا تھا۔ ہر گزرتا دن امید کو کمزور کر رہا تھا اور مایوسی چپکے چپکے دل میں سرایت کر رہی تھی۔ ایک مہینہ ہوگیا اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ پھر ایک رات ٹھاکر آیا تو بجھا بجھا تھا...... خاموش، دل گرفتہ اور ملول۔ ٹھاکرانی نے کریدا تو وہ اسے ٹالنے لگا۔ ''نہیں رنجو۔ کوئی خاص بات نہیں۔ بس تھکن سی ہوگئی ہے۔''

''تھکن تو روز ہوتی ہے جی۔ پر ایسا تو نہیں ہوتا۔''

''اب بڑھاپے کا احساس بھی ستاتا ہے۔''

ٹھاکرانی سمجھ گئی کہ کوئی تازہ بات ہے۔ بڑھاپے کا تذکرہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ''ایسے نہ کہو ناتھ۔ بڑھاپا ابھی بہت دور ہے۔'' وہ سمجھ گئی کہ آج پھر محرومی نے ڈنک چبھویا ہے۔

ٹھاکر وہ بات اسے بتانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس سے یہ بوجھ اٹھایا بھی نہیں جا رہا تھا۔

''رنجو...... آج میں اس درخت کی طرف گیا تھا۔''

''کون سا درخت؟''

''وہی برگد کا درخت، جہاں ہم نے نذر چڑھائی تھی...... پرارتھنا کی تھی بچے کے لیے۔''

''اچھا'' ٹھاکرانی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''پتا ہے۔ وہ پیڑ سوکھ چکا ہے۔'' ٹھاکر نے دل گرفتگی سے کہا۔ ''بالکل سوکھ چکا ہے۔ بہار کے موسم میں جل گیا۔ ایک پتا بھی نہیں بچا۔''

ٹھاکرانی کے دل پر گھونسہ سا لگا۔ ''چلو...... جو بھگوان کی اچھا۔'' بظاہر تو اس نے یہ بات پیڑ کے سوکھنے پر کہی تھی۔ مگر اصل میں وہ اولاد کے امکان کو رو بیٹھی تھی۔

''اب کچھ نہیں ہوسکتا۔'' ٹھاکر بولا۔ ''جس سے ہم نے مانگا، وہ خود ہی لٹ گیا۔''

اس دن کے بعد وہ چپ چپ رہنے لگے۔ ٹھاکر تو بالکل ہی مایوس ہوگیا۔ امید کی شاخ اس بار یوں سوکھی تھی کہ اس کے ہرے ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں رہا تھا۔ خواب دیکھے تین مہینے ہوئے تھے کہ ٹھاکرانی نے اسے خوش خبری سنادی۔

اب وہ خوش تھے۔ لیکن ٹھاکر کو اندیشے بھی ستاتے تھے۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہوجائے۔ مگر چھ مہینے خیریت سے گزر گئے تو اسے اعتبار آنے لگا کہ خواب سچا تھا اور آج وہی تاریخ تھی، جس تاریخ کو ایک سال پہلے اس نے خواب دیکھا تھا اور اسے تعبیر مل گئی تھی......

❀......❀......❀

''یاد ہے مجھے۔ اس خواب کو بھلا بھول سکتی ہوں میں!'' ٹھاکرانی نے کہا۔

''شاید ابھی میں اس خواب والے سے مل کر آرہا ہوں۔''

''شاید کا مطلب؟''

''اس کی صورت الگ تھی۔ پر کبھی مجھے لگتا تھا، وہ وہی ہے جسے خواب میں دیکھا تھا۔''

''اسے چھوڑو۔ میرے پتر کو اس کمرے سے نکالو نا۔''

''وہی تو میں بتا رہا ہوں۔'' ٹھاکر نے کہا۔ مجذوب نے سختی سے کہا تھا کہ کسی کو کچھ نہ بتانا۔ ہاں ضروری ہو تو اپنی بیوی کو بتا دینا۔ تو ضروری تو تھا۔ وہ ٹھاکرانی کو نہ بتاتا تو وہ بچے کو اس کمرے میں کبھی نہ رہنے دیتی۔ جبکہ یہ مجذوب کا حکم تھا کہ بچہ اسی کمرے میں رہے گا۔

سو ٹھاکر نے ٹھاکرانی کو سب کچھ کہہ سنایا۔ ''اور یہ بات کسی کو بھی نہیں بتانی ہے۔'' اس نے آخر میں کہا۔

''لیکن وہ کمرا تو......''

''رنجو۔ یہ مت بھولو کہ بچے کی خبر بھی ہمیں اسی کمرے میں ملی تھی۔ مجھے وشواس ہے کہ کسی کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔'' ٹھاکر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں جا کر کمرا کھولتا ہوں۔ اسے ٹھیک کراتا ہوں۔ پھر تمھیں وہاں لے جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے ناتھ۔''

ٹھاکر اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔

وہ اس مقفل کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ بلبیر سنگھ اور ارجن سنگھ آ گئے۔ ''تمہارا پتر کہاں ہے کاکا؟'' بلبیر سنگھ نے پوچھا۔

''وہ کونے والے کمرے میں ہے۔''

''وہ دونوں ٹھاکر کے ساتھ چلتے رہے۔ انھیں اس کمرے کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا۔ یہ بات تو ٹھاکر نے اپنے کسی ملازم کو بھی پتا نہیں چلنے دی تھی۔ بس وہ اور ٹھاکرانی جانتے تھے اس بارے میں۔ وہ بند دروازے کے پاس رکا اور اس نے چابی نکالی۔

''پر کاکا، تم اسے یہاں لائے کیوں؟'' بلبیر سنگھ نے پوچھا۔

''وہ...... ویر جی...... بات یہ ہے کہ...... یہ کمرا الگ تھلگ ہے اور زیادہ آرام دہ بھی ہے۔'' ٹھاکر پرتاپ نے تیزی سے بات بنائی۔

اسی وقت ارجن سنگھ کی نظر دروازے کے تالے پر پڑی۔ ''اور تم نے تالا بھی ڈال دیا۔ ارے بچہ بند کمرے میں اکیلا ہے۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟'' اس نے کہا۔

''وہ...... مجھے تو......'' ٹھاکر گڑبڑا گیا۔ اس کے منہ سے سچ نکلنے ہی والا تھا کہ اس نے خود کو روک لیا۔ ''عادت ہے نا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تالا لگا رہا ہوں۔'' اس نے چابی تالے میں لگائی۔ پھر اسے خیال آیا کہ برسوں سے یہ کمرا نہیں کھلا ہے۔ اندر کا تو حال بہت برا ہوگا۔ دھول مٹی، مکڑی کے جالے، وہ اس سلسلے میں بھائیوں کو کیا جواب دے گا۔ پھر اس کا دل یہ سوچ کر کانپ گیا کہ، ہاں اس کا ننھا سا بچہ بھی ہے۔

لیکن اس نے دروازہ کھولا تو ہکا بکا رہ گیا۔ کمرا صاف ستھرا بھی تھا اور جگمگا بھی رہا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی کمرا ہے۔ وہ اتنا روشن اور ہوادار تو نہیں تھا۔ مگر اس وقت اس کمرے میں قدم رکھتے ہوئے تازگی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر خوبصورت پردے پڑے تھے۔ پچھواڑے کے رخ پر کھلنے والی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔

کمرے کا حلیہ اتنا بدلا ہوا تھا کہ اگر اس میں بچہ موجود نہ ہوتا تو ٹھاکر یہی سمجھتا کہ وہ کسی اور کمرے میں آ گیا ہے۔ وہ بے حد وسیع و عریض کمرا تھا۔ لیکن اس وقت اتنا بڑا نہیں لگ رہا تھا۔ وجہ شاید یہ تھی کہ پہلے اس میں ایک بڑی مسہری کے سوا کچھ نہیں تھا جبکہ اب وہاں بچے کا پنگھوڑا بھی تھا، کرسیاں بھی تھیں......اور ایک بڑا تخت بھی موجود تھا۔

ٹھاکر چند لمحے تو سکتے کی سی حالت میں دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا یہ سب دیکھتا رہا۔ پھر وہ تیزی سے اندر داخل ہوا اور پنگھوڑے کے پاس جا کر بچے کو دیکھا۔ وہ سو رہا تھا اور پنگھوڑے کے پاس ایک تپائی تھی، جس پر چاندی کی ایک کٹوری رکھی تھی۔ اس کٹوری میں شہد تھا۔

❁......❁......❁

ایک گھنٹے کے اندر کمرا رونقوں سے بھر گیا۔ ٹھاکرانی کو بھی وہاں منتقل کر دیا گیا۔ ادھر حویلی میں ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اس روز دعوتِ عام تھی حویلی میں۔ گاؤں کے کسی گھر میں چولہا نہیں جلا تھا۔ ٹھاکر نے سختی سے منع کیا تھا۔ پورا گاؤں حویلی میں جمع تھا۔

پھر راگ رنگ کی محفل جم گئی۔ بنارس سے ناچنے گانے والیاں آئی ہوئی تھیں۔ سب مہمان وہاں بیٹھے تھے۔ ٹھاکر میر محفل تھا۔ فن کاروں کو داد بھی مل رہی تھی اور پیسہ بھی۔ چنانچہ وہ جم کر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

وہیں جمال دین بھی تھا۔ وہ دوسرے درجے کے تماشائیوں میں تھا۔ وہاں تماشائیوں کے تین درجے تھے۔ ٹھاکر کے مہمان درجہ اول میں اس کے ساتھ تھے۔ دوسرا درجہ مزارعین کا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ٹھاکر کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ ان کے لیے سائیڈ میں بڑی سی دری بچھا دی گئی تھی۔ تیسرا درجہ حویلی میں کام کرنے والوں یا اوپر کے کام کرنے والوں کا تھا۔ وہ آزاد تھے۔ چاہیں تو کھڑے ہو کر ناچ گانا دیکھیں اور تھک جائیں تو بے شک زمین پر بیٹھ جائیں۔

جمال دین اس گاؤں میں واحد مسلمان تھا۔ شاید اس لیے وہ ٹھاکر کا منہ چڑھا بھی تھا۔ اس کی عمر تیس کے قریب تھی۔ جیسے وہ ٹھاکر کا منہ چڑھا تھا، ویسے ہی اس کی بیوی ٹھاکرانی کے بہت قریب تھی۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا، جو شادی کے چھ سال بعد پیدا ہوا تھا۔ اب وہ دس ماہ کا ہونے والا تھا۔

ٹھاکر نے برسوں پہلے جمال دین کے باپ مہر دین پر ایک احسان کیا تھا۔ مہر دین پڑوس کے گاؤں میں رہتا تھا۔ اوروں کی طرح وہ بھی مہاجن کا مقروض تھا۔ لیکن مہاجن خاص طور پر اسے بہت پریشان کرتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اس کی بیٹی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

ایک دن مہاجن سود کی رقم وصول کرنے آیا۔ مہر دین کے پاس اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔ مہاجن موقع پا کر دل کی بات زبان پر لے آیا۔ ''سن مہر دین۔ تو اپنی پتری کو کام کرنے کے لیے میرے ہاں بھیج دیا کر۔ تو میں سود معاف کر دوں گا۔ اصل رقم تو تھوڑی تھوڑی کر کے......''

مہر دین بیٹی کا نام سن کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے مہاجن کی مرمت لگا دی۔ ''اب تو اصل رقم اور سود تیار رکھ مہر دین۔'' مہاجن نے جاتے جاتے کہا۔ ''اب کے میں تیاری سے آؤں گا۔ پوری رقم نہ ملی تو تجھے گھر سے نکلوا دوں گا۔''

مہر دین اپنے زمین دار کے پاس گیا، جس کی زمین پر وہ کام کرتا تھا...... اور اس سے مدد چاہی۔

زمین دار نے بے مہری سے کہا۔ ''مہر دین، میں اس طرح کے معاملے میں نہیں پڑتا۔''

''راجا صاحب، آپ مجھے قرض دے دو۔ میں آپ کی پائی پائی اتار دوں گا۔'' مہر دین نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھئی مہر دین۔ یہ میرے لیے ممکن نہیں۔''

''مائی باپ، آپ میری مدد نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔'' مہر دین گھگھیانے لگا۔ ''آخر آپ کی زمینوں پر ہی کام کرتا ہوں میں۔''

''مفت تو نہیں کرتا۔ پورا محنتانہ دیتا ہوں میں۔'' راجا صاحب نے بگڑ کر کہا۔

''مگر میں تو قرض مانگ رہا ہوں۔''

''قرض دینا میرا نہیں، مہاجن کا کام ہے۔'' راجا صاحب نے بے رحمی سے کہا۔ ''مہاجن سے بگاڑی کیوں تھی۔''

''عزت کی بات تھی راجا جی......''

''تو اب بیوی بچوں کو گھر سے باہر آسمان کے نیچے رکھے گا تو وہی عزت دوسری طرح جائے گی۔ جانے والی چیز تو نہیں بچ سکتی عقل کے دشمن۔''

مہر دین لوٹ آیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ راجا صاحب اور مہاجن کی ملی بھگت ہے اور مہاجن اپنی نہیں، پردہ رکھتے ہوئے راجا صاحب کے دل کی بات کر رہا تھا۔ وہ ڈر گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر ہاتھ پھیلائے لیکن کہیں سے دھیلا بھی نہیں ملا۔

اور پھر ایک دن مہاجن ڈگری لے کر آ گیا۔ اس نے گھر کا سامان باہر پھنکوا دیا۔ عدالت کے اہل کار اس کے ساتھ تھے۔ خوش قسمتی سے عین وقت پر ٹھاکر پرتاپ سنگھ ادھر آ نکلا۔ وہ کسی کام سے آیا تھا۔ یہ ہنگامہ دیکھ کر رک گیا۔ پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کہ ظلم ہو رہا ہے۔ اس نے ہاتھ کے ہاتھ قرض مع سود کے چکا دیا۔ مہاجن اور اہل کار چلے گئے تو اس نے مہر دین سے کہا۔ ''اب تو یہاں آرام سے رہ......''

''پر ٹھاکر جی، اب میں یہاں رہنا نہیں چاہتا۔''

''کیوں؟''

مہر دین نے تفصیل سے اسے وجہ بتا دی۔

ٹھاکر چند لمحے سوچتا رہا۔ نجانے کیوں، مہر دین اسے پہلی نظر میں ہی اچھا لگا تھا...... بھلا مانس اور وفادار۔ پھر وہ بولا۔ ''تو چاہتا کیا ہے؟''

''آپ اپنی کوئی زمین مجھے کام کے لیے دے دیں۔ ایک احسان کیا ہے تو دوسرا بھی کر دیں۔ یہاں تو میں لٹ جاؤں گا۔''

یوں یہ گھرانا ٹھاکروں کی گڑھی میں آ کر آباد ہو گیا۔ یہیں مہر دین نے بیٹی کی اور پھر بیٹے کی شادی کی۔ دو سال پہلے وہ گزر گیا۔ اس کی موت کے بعد ٹھاکر نے جمال دین کو بلوایا۔

''اب تو نے کیا سوچا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں سمجھا نہیں ٹھاکر جی۔''

''دیکھو میں جانتا ہوں، تو نماز پڑھتا ہے۔ اپنے دھرم کا پکا ہے اور یہاں تیرے سوا کوئی تیرے دھرم کا نہیں۔ مسجد بھی نہیں ہے......''

جمال دین کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ سمجھا کہ نماز پڑھنا اس کا جرم بن گیا ہے۔ ''آپ مجھے نکال رہے ہیں ٹھاکر جی۔'' اس نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔

''یہ بات نہیں۔ میں تیرے بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں۔''

''میرا بھلا تو یہاں رہنے میں ہے۔'' جمال دین بولا۔ ''ابا نے کہا تھا، یہ در کبھی نہ چھوڑنا۔''

''میں تجھے کچھ رقم دوں گا۔ کسی ایسے گاؤں چلا جا، جہاں تیرے دھرم والے رہتے ہوں۔''

''آپ دھکے دے کر نکالیں تو مجبوری ہے ٹھاکر جی۔ ورنہ میں تو آپ کی رعیت بن کر رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہاں کوئی تکلیف، کوئی پریشانی نہیں۔ اللہ کا قبلہ ہر جگہ موجود ہے۔ مسجد نہ سہی۔ میں کہیں بھی کھڑا ہو کر اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لیتا ہوں۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''ابا کہتے تھے، احسان کرنے والے کو کبھی نہیں چھوڑتے۔''

اسی بات کا ٹھاکر کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ جمال دین جس زمین پر کام کرتا تھا، وہ اس نے اسی کے نام کر دی اور وضع دار آدمی تھا۔ اس کے بعد اس نے کبھی جمال دین کے ساتھ ملازموں اور مزارعوں والا سلوک نہیں کیا۔ وہ اسے ایک زمین دار کا مقام دیتا تھا لیکن جمال دین کو بھی وضع داری اپنے باپ سے ملی تھی۔ اس نے خود کو کبھی دوسرے درجے سے نہیں نکالا۔ بہرحال یہ بات گاؤں کے سب لوگوں نے جان لی۔ اب کسی کو ٹھاکر سے کچھ کہنا ہوتا اور ہمت نہ ہوتی، تو جمال

دین کی سیڑھی لگاتا۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ جمال دین کی بات کم ہی ٹالتا تھا۔

اس وقت بھی یہی کچھ ہوا؟

شانتا باہر آئی اور اس طرف گئی، جہاں ملازمین کھڑے تھے۔ اس نے ان میں سے ایک سے کہا۔ ''ٹھاکر جی کو بولو، مالکن انھیں بلاتی ہیں۔''

''پاگل ہوئی ہے۔'' ملازم نے اسے گھور کر دیکھا۔

''کہنا، کوئی بہت ضروری بات ہے۔''

اس بار ملازم نے اسے غور سے دیکھا۔ شانتا کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ لیکن ایسے میں ٹھاکر کے پاس جانا اور یہ پیغام پہنچانا رنگ میں بھنگ ڈالنے کے برابر تھا، یہ خطرناک کام وہ کیسے کرتا۔ ''نا بابا نا۔'' اس نے ہاتھ جوڑ لیے۔ ''اتنے مہمانوں کے بیچ میں یہ کام نہیں کرسکتا۔''

''مالکن کا حکم ٹالتا ہے۔'' شانتا نے جھنجھلا کر کہا۔ ''ٹھاکر جی کو پتا چلا تو......''

اب دوسرے بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ لیکن ٹھاکر کے لیے اس محفل سے اٹھنے کا پیغام لے کر جانے کی کسی میں ہمت نہیں تھی اور وہ اس سے بھی ڈر رہے تھے کہ پیغام نہ پہنچانے کی صورت میں ٹھاکرانی ٹھاکر جی سے شکایت کرے گی اور پھر ٹھاکر جی کا عتاب...... یعنی آگے کنواں پیچھے کھائی والا معاملہ تھا۔

ایسے میں گنگو کو جمال دین کا خیال آ گیا۔ ''آؤ جمال دین سے بات کرو نا۔''

جمال دین کو صورتِ حال بتائی گئی۔ وہ پہلے تو ہچکچایا لیکن پھر راضی ہو گیا۔

جمال دین ٹھاکر کی طرف گیا تو ٹھاکر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''تجھ سے کہا تھا جمال دین کہ تو ادھر کرسی پر بیٹھ۔ کہاں گرتا پھر رہا ہے۔''

''میں ٹھیک ہوں سرکار۔ بہت خوش ہوں۔'' جمال دین نے کہا۔ پھر سرگوشی میں بولا۔ ''ٹھاکرانی جی آپ کو بلا رہی ہیں۔''

ٹھاکر کچھ بدمزہ ہو گیا۔ ''اس وقت مہمانوں کو چھوڑ کر نہیں اٹھ سکتا میں۔ تھوڑی دیر میں آ جاؤں گا۔''

یہ وہ مرحلہ تھا، جس سے کوئی نوکر، کوئی مزارع نہیں گزر سکتا تھا۔ جمال دین صرف ایک لمحے کو ہچکچایا۔ پھر اس نے کہا۔ ''ٹھاکر جی۔ ضرور کوئی بڑی بات ہے۔ ورنہ وہ آپ کو نہیں بلاتیں۔ انھوں نے آپ کو فوراً بلایا ہے۔''

ایک لمحے کو ٹھاکر کے چہرے پر سختی ابھری۔ مگر فوراً ہی معدوم ہو گئی۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اچھا...... تو چل۔ میں آتا ہوں۔''

جمال دین فوراً ہی درجہ اوّل سے باہر آ گیا......

❁......❁......❁

ٹھاکرانی رنجیتا کو ایک پل کے لیے بھی یقین نہیں آیا کہ یہ وہی کمرا ہے۔ عجیب بات تھی کہ اپنے کمرے کے مقابلے میں یہاں اسے زیادہ سکون محسوس ہو رہا تھا۔ اور ایک احساس اس سے زیادہ گہرائی میں اور اس سے زیادہ طاقت ور تھا۔ وہ تحفظ کا احساس تھا۔ جیسے یہاں کوئی اسے اور اس کے بچے کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

بچے کے رونے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اچانک ہی بلک بلک کر رونے لگا تھا۔

دائی راجو نے کہا۔ ''مالکن، چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانے کی کوشش کریں۔''

یہ ایک عجیب بات تھی۔ ٹھاکرانی کی چھاتیوں میں ممتا کے سوتے پھوٹ چکے تھے۔ اب تک وہ کئی بار بچے کو دودھ پلانے کی کوشش کر چکی تھی لیکن بچے نے منہ بھی نہیں لگایا تھا۔ وہ پوری طاقت سے منہ موڑ لیتا تھا۔

عورت کہیں کی بھی ہو۔ کسی بھی مذہب، رنگ یا نسل سے تعلق رکھتی ہو، ماں کی حیثیت میں ایک جیسی ہوتی ہے۔ اپنے بچے کو دودھ پلانا اس کے لیے زندگی کا سب سے بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ ٹھاکرانی کے لیے تو اس کی اہمیت اور زیادہ تھی۔ بائیس سال کی محرومی کے بعد اسے یہ موقع ملا تھا۔ مگر بچہ تھا کہ اسے یہ اعزاز دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ٹھاکرانی کو اس پر رنج تھا۔ ادھر دودھ اب رک نہیں رہا تھا۔ بہنے لگا تھا۔ یہ اس کے لیے جسمانی اذیت کا سبب بھی تھا۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ جن ماؤں کے بچے مردہ پیدا ہوں یا شیر خواری میں مر جائیں، انھیں لازی یہ اذیت اٹھانی پڑتی ہے۔ دودھ کے جاری سوتے آسانی سے نہیں رکتے۔ پینے والا منہ موڑ جائے تو ماں کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ٹھاکرانی اسی تکلیف سے بھی دوچار تھی۔ ننھا دیوتا ماں کی پہلی بھینٹ سوئیکار کر لے، اس میں اس کی مکتی تھی۔

''ٹھیک ہے راجو۔ ادھر لے آ چھوٹے ٹھاکر کو۔'' اس نے پکارا۔

راجو نے بڑی نزاکت سے بچے کو لا کر ٹھاکرانی کو دیا۔ ٹھاکرانی نے بڑی چاہت سے بچے کو دودھ پلانے کی کوشش کی لیکن بچہ اب بھی انکاری تھا۔ ٹھاکرانی نے لاکھ کوشش کر لی۔ لیکن بچے نے ہر بار منہ موڑ لیا۔ گردن بھی اکڑا لی۔ ''کیا بات ہے؟ یہ میرا دودھ کیوں نہیں پیتا؟'' ٹھاکرانی نے افسردگی سے کہا۔

راجو بڑی تجربہ کار عورت تھی۔ ''آپ دل چھوٹا نہ کریں مالکن'' وہ بولی۔ ''کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دودھ کسی وجہ سے کڑوا ہوتا ہے۔ بچہ اسے قبول نہیں کرتا۔ پھر کڑواہٹ دور ہو جاتی ہے تو پینے لگتا ہے۔''

''تو کڑواہٹ کیسے دور ہو گی؟''

''کچھ جڑی بوٹیاں ہوتی ہیں۔ میں ان کی پھنکی بنا کر آپ کو دوں گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

بچہ ماں کے دودھ کو مسترد کرنے کے بعد چیخ چیخ کر روئے جا رہا تھا۔ ''مگر یہ بہت بھوکا ہے۔'' ٹھاکرانی نے تڑپ کر کہا۔

''تب تک کے لیے بکری کا دودھ دے دیں انھیں۔'' راجو نے تجویز پیش کی۔ ''میں دوا کوٹتی ہوں۔ پھر بھگوان نے چاہا تو یہ آپ کا دودھ پینے لگیں گے۔''

''ابھی تو تم انھیں انگلی سے شہد چٹا دو۔ یہ ٹھاکر جی کا حکم ہے۔''

''مالکن، برا نہ ماننا۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' راجو نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''عمر ہو گئی مجھے یہی کرتے۔ پر ایسا کبھی نہیں دیکھا۔ اپنے لوگوں میں بچے کو شہد نہیں چٹایا جاتا۔ یہ تو مسلوں میں ہوتا ہے۔''

بات سچی تھی مگر ٹھاکرانی کو بہت برا لگا۔ ''تجھ سے جو کہا جائے، وہ کر راجو۔ زیادہ بات کرنے والا بولنے کا ہی نہیں رہتا۔''

راجو ڈر گئی۔ اس نے خاموشی سے بچے کو اٹھایا اور لے جا کر پنگھوڑے میں لٹا دیا۔ پھر وہ انگلی سے بچے کو شہد چٹانے لگی۔ روتا ہوا بچہ ایک دم چپ ہو گیا۔ چند منٹ بعد وہ قلقاریاں مارنے لگا...... اور پھر سو گیا۔

تھوڑی دیر بعد بچہ پھر چنگھاڑنے لگا۔ ٹھاکرانی نے شانتا سے کہا۔ ''دیکھ تو۔ شاید چھوٹے ٹھاکر گیلے ہو گئے ہیں۔ کپڑے بدلا دے۔''

شانتا پنگھوڑے کی طرف بڑھی۔ ''مالکن، میں گھر جاؤں۔ آپ کے لیے دوا بناؤں گی۔'' دائی راجو نے ٹھاکرانی سے پوچھا۔ ''صبح سویرے آ جاؤں گی۔''

ٹھاکرانی جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ پنگھوڑے کے پاس سے شانتا کی چیخ سنائی دی۔ ''ہائے رام......''

''کیا ہوا؟'' ٹھاکرانی نے گھبرا کر پوچھا۔

مگر شانتا کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس کے ہونٹ البتہ لرز رہے تھے۔ ایک ہاتھ سینے پر رکھا تھا۔

ٹھاکرانی کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔ ''بچہ خیریت سے تو ہے نا؟'' اس کا دل اندیشوں کے بوجھ سے لرزنے لگا۔

''بچ...... جی...... چھ...... چھوٹے ٹھاکر ٹھیک ہیں۔ پر......''

راجو دوڑ کر اس طرف گئی اور پنگھوڑے میں پڑے بچے کو دیکھتی رہی، جس کا نچلا دھڑ برہنہ تھا۔ وہ بھی پریشان ہو گئی۔

''کیا ہوا؟ بولتی کیوں نہیں؟ کیا بات ہے شانتا؟'' ٹھاکرانی چلائی۔

شانتا اب بھی جواب نہ دے سکی۔ ٹھاکرانی نے راجو کو پکارا۔ ''راجو، تو بتا۔ کیا بات

ہے؟''

''وہ...... مالکن...... وہ...... آپ خود ہی دیکھ لیں۔'' راجو نے جواب دیا۔ وہ گڑبڑائی ہوئی تھی۔

ٹھاکرانی کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ ساری احتیاط بھول کر اٹھی اور پنگھوڑے کی طرف لپکی۔ بچے کو دیکھنے کے بعد اس کے منہ سے بھی بے ساختہ...... ''ہائے رام، یہ کیا......؟'' نکلا۔

تینوں دیر تک بچے کے جسم کے، ناف سے نیچے والے حصے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہیں۔ پھر راجو منمنائی۔ ''میں گھر جاؤں مالکن؟''

ٹھاکرانی نے چونک کر نظریں اٹھائیں اور اسے دیکھا۔ اچانک اس کی آنکھیں جیسے شعلے اگلنے لگیں۔ اس نے کہا۔ ''راجو، پہلے تجھے یہ بتانا ہوگا کہ یہ کیا ہے؟''

راجو نے اس کے تیور دیکھے تو تھر تھر کانپنے لگی۔ ''م...... میں...... میں کیا جانوں مالکن۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا ہے۔''

''تو پھر؟''

''مجھے...... مجھے کچھ پتا نہیں مالکن۔'' راجو کا چہرہ فق ہو گیا۔

ٹھاکرانی شانتا کی طرف مڑی۔ ''شانتا، تو جا کے ٹھاکر جی کو بلا کر لا۔''

''مالکن، باہر مجرا ہو رہا ہے۔ ٹھاکر جی مہمانوں کے ساتھ ہیں۔'' شانتا نے گھبرا کر کہا۔

ٹھاکرانی عام حالات میں نرم مزاج تھی لیکن اس وقت صورتِ حال ایسی تھی کہ اسے جلال آ گیا۔ اس نے درشت لہجے میں شانتا کو ڈپٹا۔ ''مجھے بھی معلوم ہے۔ تو مجھے مت پڑھا جا ان سے کہنا، بہت ضروری بات ہے۔ فوراً آ جائیں۔ تو خود جا کر ان سے کہنا۔''

اب کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ شانتا مرے مرے قدموں سے یوں چلی، جیسے مقتل کی طرف جا رہی ہو۔

ٹھاکرانی کو اس پر ترس آ گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس بے چاری پر بچے کے غائب ہونے کے سلسلے میں شبہ کیا جا رہا تھا۔ اس وقت خوف سے کیا حال ہوگا اس کا! اور اب یہ مصیبت۔ ''کسی نوکر سے کہہ دینا۔ وہ بلا دے گا۔ پر یہ بات منہ سے نہ نکلے۔ بس ان کو بلانا ہے۔ جلدی جا۔''

شانتا کے قدموں میں کچھ جان سی پڑ گئی......

❁......❁......❁

ٹھاکر مہمانوں سے معذرت کر کے حویلی کی طرف چلا تو جھنجھلایا ہوا تھا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ اس بات پر ٹھاکرانی کی اچھی طرح خبر لے گا۔ ایسے ذرا ذرا سی بات پر مہمانوں کے بیچ سے بلوا لینا۔ ٹھاکروں کے ہاں یہ سب چونچلے تو جوانی میں بھی نہیں ہوتے۔ جبکہ اب تو بڑھاپا

آن لگا ہے چوکھٹ پر۔

مگر فوراً ہی اس کے دل میں نرمی سی پھوٹ نکلی۔ بے چاری رنجیتا! بہت اچھی پتنی تھی وہ۔ چونچلوں کا عرصہ...... امنگوں بھری جوانی تو اس نے دبے دبے گزار دی تھی۔ صرف اس لیے کہ بھگوان نے اسے اولاد نہیں دی تھی اور وہ سمجھتی تھی کہ یہ اس کی اپنی نا اہلی ہے۔ اس لیے وہ کبھی کچھ مانگتی ہی نہیں تھی۔ کوئی مطالبہ نہیں کرتی تھی۔ کسی چیز پر حق نہیں جتاتی تھی۔ یہاں تک کہ اس پر بھی...... اپنے پتی پر بھی!

یہ سوچتے ہوئے ٹھاکر کو اپنا خیال آیا۔ اس کا بھی یہی حال تھا۔ اولاد سے محرومی کا ذمے دار وہ خود کو سمجھتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس میں یہ اہلیت ہی نہیں ہے اور وہ راجپوت تھا۔ آن بان والا۔ وہ یہ بات کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا...... پتنی سے بھی نہیں۔ اس نے کبھی اپنا معائنہ بھی نہیں کرایا۔ اگر رپورٹ صاف بتا دیتی کہ وہ اس جوہر سے محروم ہے تو اس کے سامنے مرجانے کے سوا کوئی راستہ نہ رہتا۔ چنانچہ وہ خاموش رہا اور اندر ہی اندر احساس کمتری پالتا رہا۔

شاید اس کا ایک فائدہ بھی ہوا۔ یہ کہ وہ ایک اچھا انسان بن گیا۔ وہ بہت بڑا زمین دار تھا۔ دور تک اس کی زمینیں تھیں۔ بیسیوں گاؤں تھے اس کے۔ بڑی رعیت تھی۔ پر اس نے کبھی زمین داروں کی روایتی عادتیں نہیں اپنائیں۔ وہ ظالم و جابر نہیں بنا۔ کبھی ناچ گانا دیکھ لینا الگ بات ہے۔ مگر اس نے کبھی کسی عورت پر بری نظر نہیں ڈالی۔ ہوس میں کبھی مبتلا نہیں ہوا۔ رعیت کی بہو بیٹیوں کو میلی نظر سے نہیں دیکھا جبکہ زمین دار تو پسند کی لڑکیوں کو گھر سے اٹھوا لیتے ہیں۔ اس نے تو کبھی کسی ناچنے والی کی خواہش بھی نہیں کی۔ کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا۔ اس کے مزارعے، ملازمین، گھر کے نوکر چاکر، سب ہمیشہ اس سے خوش رہے۔ اسے دعائیں دیتے رہے۔ وہ اس کی عزت کرتے تھے۔ اس سے ڈرتے بھی تھے۔ حالانکہ اس نے کبھی کسی کو سزا نہیں دی تھی۔ وہ تو ہر پریشانی میں ان کے کام آتا تھا۔ ان کی مدد کرتا تھا۔ فصل خراب ہوئی تو اس نے اپنا حصہ معاف کر دیا۔ الٹا مزارعوں کو کچھ پلے سے دے دیا۔ کسی کے گھر میں پریشانی ہوئی تو وہ اس کے کام آیا۔ شاید صرف اس لیے کہ وہ بائیس سال اولاد سے محروم رہا اور خود کو کمتر سمجھتا رہا۔ ورنہ شاید وہ بھی دوسرے زمین داروں کی طرح ہوتا۔

یہ بھی ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی اچھائی تھی کہ وہ اس انداز میں سوچتا تھا۔ اس کی طبیعت میں راجپوتوں کی ضد اور اکڑپن کے ساتھ ایسا انکسار، ایسی عاجزی تھی، جسے راجپوت توہین سمجھتے ہیں۔ جو راجپوتوں میں ہوتی ہی نہیں۔ ورنہ اگر وہ پیچھے کی طرف دیکھتا تو اکڑ جاتا۔ اس نے اپنے باپ ٹھاکر رندھیر سنگھ کو دیکھا تھا۔ وہ اولاد سے محروم نہ ہونے کے باوجود ایسے ہی تھے۔ رعایا کو اولاد کی طرح سمجھتے اور ان کا خیال رکھتے تھے۔ عیاش طبع بھی نہیں تھے۔ ان کی شرافت اور عزت کی مثالیں دی جاتی تھیں اور ٹھاکر پرتاپ سنگھ انہی کا بیٹا تھا۔

اور پھر ٹھاکر پرتاپ سنگھ اپنے ماضی کو دیکھتا تو بھی اس میں اکڑ پیدا ہو جاتی۔ اپنے بیاہ سے پہلے وہ جوانی کے نو سال گزار چکا تھا۔ بیاہ تو اس کا پچیس سال کی عمر میں ہوا تھا۔ زمین داروں کے جوان بیٹے تو طاقت کے نشے میں چور ہو کر اپنے گلشن عمل داری میں کسی کلی، کسی پھول کو شاخ پر نہیں رہنے دیتے۔

ٹھاکر پرتاپ چاہتا تو کیا نہیں کر سکتا تھا۔ بیاہ سے پہلے کتنی لڑکیاں اس کی نظر التفات کی آرزو کرتی تھیں۔ مگر اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر کسی کو نہیں دیکھا۔ اس لیے کہ یہ اس کی فطرت ہی نہیں تھی۔ محرومی تو بعد کی بات تھی۔

اور بیاہ کے پانچ سال بعد تو ٹھکرانی رنجیتا ہی دوسرے بیاہ کے لیے اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ مگر اس نے ہی ہمیشہ انکار کیا...... اور بہت درشتی سے انکار کیا۔ اسے رنجیتا سے بہت محبت تھی۔ وہ اسے سوکن کا دکھ کیسے دے سکتا تھا!

''مجھے بیٹا چاہیے ناتھ۔'' رنجیتا اکثر جھنجلا کر کہتی۔ ''تمہارا بیٹا۔ میری کوکھ سے نہ سہی، کسی اور کی کوکھ سے سہی۔ تمہارا بیٹا میرا بیٹا ہوگا۔''

''میں نے کہہ دیا نا۔ مجھے یہ سننا بھی برا لگتا ہے۔''

''مگر کیوں ناتھ؟''

''دیکھو رنجو، بیٹے کو میرا من بھی بہت چاہتا ہے۔ پر میں کہتا ہوں، بھگوان کو دینا ہی ہے تو تم سے دے۔ ورنہ مجھے نہیں چاہیے۔''

تو ٹھیک ہے۔ کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے ٹھاکر نے دل میں کہا۔ بائیس برس کی دبی ہوئی رنجیتا اب توجہ کی حق دار ہوئی ہے۔ وہ تمہیں محفل سے بھی بلائے تو ہنسی خوشی جاؤ۔ ماتھے پر بل نہیں ہونا چاہیے۔ یہ توجہ، یہ نخرے...... اب اسے ان کا ادھیکار ہے۔ وہ تمہاری پتنی ہی نہیں۔ تمہارے چھوٹے ٹھاکر کی ماں بھی ہے۔

اس نے دروازہ دھکیلا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ مسئلہ رنجیتا کے توجہ حاصل کرنے کا نہیں بلکہ سنگین ہے۔ رنجیتا بستر پر نہیں تھی بلکہ پنگھوڑے کے پاس کھڑی بچے کو دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر وحشت تھی۔ اس کے پاس ہی دائی راجو اور شانتا کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے ستے ہوئے تھے۔

ٹھاکر کا دل وسوسوں سے بھر گیا۔ بچے کو کچھ ہو گیا ہے؟ یہ سوچ کر ہی اسے لگا کہ اس کا دل بند ہو رہا ہے۔ سانسیں رکی جا رہی ہیں۔ مگر اسی لمحے اسے مجذوب کی بات یاد آ گئی۔ بچہ اسے جس طرح ملا ہے، دیا گیا ہے، بھگوان نے چاہا تو وہ لمبی عمر پائے گا۔

اس نے کھنکھار کر گویا اپنے آنے کا اعلان کیا۔ رنجیتا نے چونک کر اسے دیکھا اور شانتا

اور راجو سے کہا۔ ''تم باہر جاؤ۔ جب تک میں نہ بلاؤں، اندر نہ آنا۔''

راجو اور شانتا نظریں جھکائے ٹھاکر کے قریب سے گزر کر باہر چلی گئیں۔

''کیا بات ہے رنجو۔'' ٹھاکر نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔ اسے آگے جانے اور بچے کو دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ نجانے کیا دیکھنے کو ملے۔

''اِدھر آئیں ناتھ۔''

ٹھاکر دھڑکتے دل سے بڑھا اور پنگھوڑے کے پاس پہنچ گیا۔

''اِدھر دیکھیں بچے کو۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔

ٹھاکر نے بچے کو دیکھا۔ وہ ٹھیک ٹھاک تھا اور سو رہا تھا۔ اس نے سکون کی سانس لی۔

''ٹھیک تو ہے۔ سو رہا ہے۔ تم پریشان کیوں ہو؟'' اس نے کہا۔

''اِدھر دیکھیں...... نچلے دھڑ کو۔''

تب ٹھاکر نے دیکھا کہ بچہ نیچے سے کھلا ہوا ہے اور پھر اس نے دیکھا اور گڑبڑا گیا۔

''یہ...... یہ کیا؟''

''یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''بچہ ایسا پیدا تو نہیں ہوتا۔''

''ہاں۔ ایسا ہوتا نہیں۔ مگر مُسلوں کے ہاں بچے کو ایسا کر دیتے ہیں۔''

اس لمحے ایک عجیب بات ہوئی۔ اس پریشانی میں بھی ٹھاکر کو لفظ مسلا برا لگا۔ ''سنو رنجیتا، ہم لوگ نفرت سے، ان کی توہین کرنے کے لیے مسلمانوں کو ایسے پکارتے ہیں اب تم آئندہ کبھی یہ لفظ زبان پر نہ لانا۔''

ٹھاکرانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

''دیکھو نا، ہمیں خواب میں جنھوں نے بڑی خبر دی، وہ مسلمان بزرگ تھے۔ پھر آج جس مجذوب سے میں ملا، وہ بھی مسلمان تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ بھگوان کی اِچھا سے ہمارا اور ہمارے بیٹے کا مسلمانوں سے کوئی سمبندھ ہو گیا ہے۔ اب انھیں کبھی ایسے نہ پکارنا۔ کبھی برا نہ کہنا۔''

ٹھاکرانی نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ ٹھاکر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ''مگر یہ......؟'' اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے ہے؟''

دونوں چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر ٹھاکرانی نے کہا۔ ''بچے کو یہاں کون لایا تھا؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ مجھے تو مجذوب نے بتایا تھا کہ بچہ یہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ اور اب یہی اس کا کمرا ہے۔'' ٹھاکر نے کہا۔ پھر اسے یاد آیا کہ جب اس نے مجذوب سے پوچھا تھا

کہ وہ کہاں سے آ رہا ہے تو اس نے حویلی کی طرف اشارہ کیا تھا اور اس نے کہا تھا...... ہم تو خود خیر مقدم کے لیے یہاں آئے تھے۔ کچھ ضروری کام بھی تھے۔ نمٹا لیے۔ اب ہمیں جانا ہے۔ یہ تو ٹھاکر اب سوچ رہا تھا کہ وہ کون سے کام تھے جو مجذوب نے نمٹا لیے تھے۔ بچے کو اس کمرے میں پہنچانا...... شہد چٹانا...... اور...... اور...... ؟ اور پھر مجذوب نے یہ بھی کہا تھا...... بچے کی صورت دیکھ لی اور دعا بھی دے دی۔ ہم وہیں سے آ رہے ہیں...... تو یہ تو تھا کہ مجذوب یہاں آیا تھا۔ ''میرا خیال ہے رنجو کہ بچے کو مجذوب نے ہی یہاں پہنچایا تھا۔''

''تو ہو سکتا ہے، انھوں نے ہی......'' ٹھاکرانی نے جان بوجھ کر جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

''پاگل ہوئی ہو۔'' ٹھاکر نے بگڑ کر کہا۔ ''کوئی ایسا کرتا تو کوئی نشان ہوتا، کٹا ہوتا، زخم ہوتا، اتنی جلدی ٹھیک تو نہیں ہو سکتا۔''

''میں تو اب بھی یہی کہوں گی۔'' ٹھاکرانی بولی۔ ''آپ بتائیں، آپ جب اس کمرے میں آئے تھے تو دروازے پر تالا تھا۔''

''ہاں۔ میں نے چابی سے تالا کھولا تھا۔ مگر تم کہنا کیا چاہتی ہو۔''

''دیکھیں ناتھ۔ اگر وہ سب کی آنکھوں کے سامنے بچے کو اٹھا کر یہاں لا سکتے ہیں۔ تالا کھولے بغیر اسے اندر لا سکتے ہیں، تو یہ بھی کر سکتے ہیں، اچھا، ایک بات بتائیں۔ یہ کمرا تو برسوں سے بند تھا۔ یہاں تو گرد، مٹی ہوگی۔ مکڑی کے جالے ہوں گے۔ گھٹن ہوگی، اندھیرا ہوگا۔''

''ایسا کچھ نہیں تھا۔'' ٹھاکر نے کمرے کا نقشہ بیان کیا۔

''ہم اگر برسوں سے بند کسی کمرے کی صفائی کریں تو پورا دن لگ جائے۔ مگر یہ کمرا منٹوں میں صاف ہو گیا۔ تو کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ زخم منٹوں میں ٹھیک ہو جائے۔''

بات ٹھاکر کے دل کو لگی۔ لیکن پھر بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ''اچھا، تم راجو کو بلاؤ۔ میں اس سے بات کروں گا۔''

ٹھاکرانی نے آواز دی تو راجو اندر آ گئی۔ وہ سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ ''راجو، تو کیا کہتی ہے اس معاملے میں۔'' ٹھاکر نے پوچھا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں مالک۔'' راجو گڑگڑائی۔

''تو جانتی ہے، میں کیا پوچھ رہا ہوں۔'' ٹھاکر کا لہجہ سخت ہو گیا۔

''اس میں میرا کوئی قصور نہیں مالک۔''

''وہ تو میں جانتا ہوں۔ تیرا کسی طرح بھی کوئی قصور نہیں۔'' ٹھاکر نے لہجہ نرم کر لیا۔

''بس میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ پیدا ہی ایسا ہوا ہے۔ یا بعد میں ایسا ہوا؟''

''مم...... مجھے...... مجھے معلوم نہیں ٹھاکر جی۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تیرے ہاتھوں کی پیدائش ہے۔''

"وہ...... ٹھاکر جی...... میں نے تو اس بات پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔"

"جھوٹ بولتی ہے تو۔ یہ تو ممکن ہی نہیں۔" ٹھاکر کو غصہ آ گیا۔ "سچ بتا دے۔ نہیں تو میں تجھے شکاری کتوں کے آگے ڈلوا دوں گا۔"

راجو تھر تھر کانپنے لگی۔ لگتا تھا، بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ "سچ بتا دے۔ تجھے کچھ نہیں ہوگا راجو۔" ٹھاکرانی نے اسے دلاسہ دیا۔

"مالکن...... اگر آپ کو وشواس نہیں ہوا تو؟" راجو نے کہا۔

"کیوں نہیں ہوگا وشواس۔ سچ بولے گی تو ضرور ہوگا۔"

"وہ جی بات ہی ایسی ہے مالکن۔ جیون گزر گیا اس کام میں۔ پر پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

"صاف بات کر...... سیدھی بات۔" ٹھاکر نے ڈپٹ کر کہا۔

"سچ یہ ہے مالک کہ چھوٹے ٹھاکر ایسے ہی پیدا ہوئے تھے۔ میں نے ایسا پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

ٹھاکر نے سکون کی سانس لی۔ لیکن ٹھاکرانی کو غصہ آ گیا۔ "یہ تو پہلے بتانے والی بات تھی۔ تو نے چھپائی کیوں؟ ایسی بات چھپ سکتی ہے بھلا۔"

"ایک تو مجھے ڈر تھا کہ یہ بدشگونی ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ ٹھاکر جی ناراض ہو کر مجھے کتوں کے سامنے نہ ڈلوا دیں۔ اتنے برسوں کے بعد منتوں مرادوں کا بچہ ہے۔ پھر میں نے سوچا، مجھے انعام بھی نہیں ملے گا۔"

ٹھاکر مسکرایا۔ "تو تجھے انعام ملا یا نہیں؟"

"بہت ملا مالک۔ جھولی بھر کے ملا۔"

"نہیں۔ جھولی بھر کے تو اب ملے گا۔ کل تو آئے گی تو سچ مچ تیری جھولی بھر دوں گا۔" ٹھاکر نے کہا۔ پھر سخت لہجے میں بولا۔ "لیکن غور سے سن راجو۔ یہ بھگوان کی اچھا تھی۔ کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔ ورنہ تیری خیر نہیں۔"

"میری زبان نہیں کھلے گی مالک۔ پر شانتا......"

"تو اس کی فکر نہ کر۔ میں اسے سمجھا دوں گی۔" ٹھاکرانی نے کہا۔ "بس اب تو جا۔"

راجو چلی گئی۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ اپنی اپنی سوچوں میں گم۔ دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ لیکن ایک دوسرے سے کہنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے...... یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔ ایک دن میں کتنا کچھ ہو گیا۔ مگر خیر...... جیون اکارت تو نہیں گیا۔ من کی سب سے بڑی مراد تو پوری ہو گئی۔

یہ سچی بات تھی۔ وہ اولاد پانے کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے...... کچھ بھی!

چند منٹ بعد ٹھاکرانی نے آواز دے کر شانتا کو بلایا۔ "شانتا...... چھوٹے ٹھاکر کو کپڑے بدلا دے۔"

شانتا بچے کے پاس جا کر مصروف ہو گئی۔ ٹھاکرانی اور ٹھاکر مسہری پر آ بیٹھے۔ "سن شانتا، اس بات کا کبھی کسی سے نہ کہنا۔" ٹھاکرانی نے پکار کر کہا۔

شانتا نے سر جھکائے جھکائے کہا۔ "کون سی بات مالکن؟"

"یہی والی بات...... چھوٹے ٹھاکر والی۔"

"مجھے تو ایسی کسی بات کا خود بھی پتا نہیں مالکن۔ اور جو بات مجھے نہیں پتا، وہ میں کسی کو کیسے بتا سکتی ہوں۔" شانتا نے معصومیت سے کہا۔

"اور سن۔ چھوٹے ٹھاکر کا یہ کام اب صرف تیرے ذمے ہے۔ پھر کبھی کسی کے سامنے ان کا گیلا سوکھا نہ کرنا۔"

شانتا بچے کو کپڑے پہنا کر مڑی۔ "مالکن، وہ حمیدہ دیدی آئی ہوئی ہیں۔"

"تو جا کر اسے بھیج دے اور گھنٹا دو گھنٹا سو جا۔ تب تک حمیدہ میرے پاس رہ لے گی۔"

"حمیدہ کون؟ جمال دین کی گھر والی؟" ٹھاکر نے پوچھا۔

ٹھاکرانی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شانتا کے جانے کے بعد ٹھاکر نے کہا۔ "رنجو، اکیلی شانتا تو بچے کو نہیں سنبھال سکے گی اور کوئی اور بچے کا کام کرے گا تو راز راز نہیں رہے گا۔"

"آپ فکر نہ کریں ناتھ۔ تھوڑے دن کی تو بات ہے۔ راجو شانتا کا ہاتھ بٹا دے گی۔ ایک دن میں میرے پاس رہے گی تو دوسری رات میں۔ اور پھر بعد میں تو میں اپنے راج دلارے کا ہر کام خود ہی کروں گی۔ کسی کو چھونے بھی نہ دوں گی اسے۔"

ٹھاکر مطمئن ہو گیا۔ مگر پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ اس نے کہا۔ "اور کوئی بات تو نہیں رنجو...... پریشانی والی؟"

ٹھاکرانی ایک لمحے کو ہچکچائی۔ پھر بولی تو اس کے لہجے میں فخر تھا۔ "آپ کا بیٹا راج پوت ہے۔ بہت ضدی ہے۔ پتا ہے، اب تک میرا دودھ نہیں پیا ہے اس نے۔ بھوک سے تڑپ رہا ہوتا ہے۔ مگر دودھ کو منہ نہیں لگاتا۔ بس شہد پر گزارہ ہو رہا ہے۔"

"یہ تو پریشانی کی بات ہے۔ ایسا کب تک چلے گا۔ دودھ کے بغیر تو بچے کا گزارہ نہیں ہوتا۔" ٹھاکر پریشان ہو گیا۔

"بھگوان جانے......"

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ "آ جا حمیدہ۔" ٹھاکرانی نے پکارا۔

دروازہ کھلا اور حمیدہ اندر آئی۔ ٹھاکر کو دیکھ کر وہ جھجکی۔ پھر ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "مبارک

ہو ٹھاکر جی۔ بدھائی ہو مالکن۔''

ٹھاکر مسکرایا اور ٹھاکرانی نے شکریہ کہا۔ پھر پوچھا۔ ''تو اپنے بچے کو نہیں لائی؟''

''یہاں آتے ہوئے ان کے پاس چھوڑ آئی ہوں مالکن۔'' حمیدہ نے محجوب لہجے میں کہا۔

''لے آتی تو اچھا تھا۔ اب اگر میں تجھے کچھ دیر روک لوں تو؟''

''آپ حکم کریں تو میں پوری رات رکی رہوں۔'' حمیدہ نے بے ساختہ کہا۔

ٹھاکر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں جا رہا ہوں ٹھاکرانی۔ مہمان بیٹھے ہوئے ہیں۔ بری بات ہے۔''

''ٹھیک ہے ناتھ۔''

❁……❁……❁

حمیدہ کو بیٹھے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ بچہ بلک بلک کر رونے لگا۔ ''چھوٹے ٹھاکر اٹھ گئے۔'' حمیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دیکھوں…… گیلے تو نہیں ہو گئے۔'' وہ اٹھ کر پنگھوڑے کی طرف چلی۔

ٹھاکرانی بوکھلا گئی۔ ''حمیدہ…… گیلا ہو تو تم ہاتھ نہ لگانا۔ میں آپ ہی بدل دوں گی۔'' اس نے لہجے کو عام سا رکھنے کی کوشش کی تھی۔

حمیدہ کو اس کے لہجے کی وحشت نے حیران کر دیا۔ اس میں کیا حرج ہے کہ میں…… پھر اس نے سوچا۔ مالکوں کی باتیں مالک جانے۔ کیا پتا، کوئی دھرم کا معاملہ ہو۔ اس نے پنگھوڑے میں لیٹے بچے کو دیکھا اور دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ وہ بہت خوب صورت بچہ تھا۔ پیشانی بہت کشادہ تھی اس کی۔ نقوش کھڑے اور بہت پیارے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بلک بلک کر روئے جا رہا تھا۔ حمیدہ نے دیکھ لیا کہ وہ گیلا نہیں ہے۔

''چھوٹے ٹھاکر گیلے نہیں ہیں مالکن۔ بھوکے ہو رہے ہیں۔'' اس نے ٹھاکرانی کو بتایا۔

''اٹھا کر لے آؤ۔ پھر کوشش کرتی ہوں۔ اب تک انھوں نے دودھ نہیں پیا ہے۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔

''یہ تو اچھی بات نہیں۔'' حمیدہ نے بچے کو اٹھائے ہوئے کہا۔

بچے نے حمیدہ کی گود میں آتے ہی ہاتھ چلانے شروع کیے اور پھر اس کے ننھے ننھے ہاتھ حمیدہ کی چھاتیوں پر رک گئے۔ پھر جیسے وہ بار بار ہاتھ مار کر دودھ کا مطالبہ کرنے لگا ''یہ تو صاف صاف دودھ مانگ رہے ہیں۔'' حمیدہ نے ہنستے ہوئے کہا اور دل میں سوچا، کتنے عقل مند ہیں چھوٹے ٹھاکر۔ ابھی سے اتنی سمجھ ہے!

''اچھا شگون ہے۔ شاید اب دودھ پی ہی لیں۔'' ٹھاکرانی نے ہاتھ پھیلائے۔

لیکن ٹھاکرانی کے ساتھ بچے کا رویہ اب بھی پہلے جیسا تھا۔ ٹھاکرانی اسے زبردستی اپنی طرف کرتی اور وہ پوری طاقت سے منہ موڑ لیتا۔ یہی نہیں۔ وہ بار بار پاس کھڑی حمیدہ کی طرف

ہاتھ بڑھاتا تھا۔

ٹھاکرانی کا چہرہ خفت سے تمتما اٹھا۔ ''پتا نہیں، کیا بات ہے۔ کوئی خرابی ہے میرے دودھ میں۔''

''یہ بات نہیں مالکن۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔''

بچہ اب چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ ضد کر رہا ہے۔ اس نے تو آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ ''حمیدہ…… اسے لے جا کر لٹا دے اور شہد چٹا دے۔ اس پر گزارہ ہو رہا ہے میرے بچے کا۔''

مگر حمیدہ نے جیسے ہی بچے کو گود میں لیا، بچہ یک لخت چپ ہو گیا۔ اس کے ننھے منے ہاتھ پھر حمیدہ کی چھاتیوں کو ٹٹولنے لگے۔ حمیدہ کا اپنا دودھ پیتا بچہ تھا۔ وہ ممتا سے بھری تھی۔ اس کا دل پگھلنے لگا۔ لیکن کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ بچے کو گود میں لیے وہیں کھڑی رہی۔

ٹھاکرانی کوئی بچی نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئی۔ اس کا دل رنج اور حسد سے بھر گیا۔ میرا بچہ…… اور میرا دودھ ٹھکرا کر کسی اور کا دودھ مانگے۔ یہ کیسی توہین ہے ممتا کی۔ وہ سوچتی اور دانتوں سے اپنا نچلا ہونٹ چباتی رہی۔

ننھے منے ہاتھوں کی چھیڑ خانی نے ممتا سے لدی پھندی حمیدہ کو بے حال کر دیا۔ بچے پکاریں، دودھ مانگیں تو رکی ہوئی ممتا آتش فشاں کی طرح ہو جاتی ہے۔ اب مالکن کا رعب بھی حمیدہ کو باز نہ رکھ سکا۔ اس نے ملتجیانہ لہجے میں ٹھاکرانی سے کہا۔ ''چھوٹے ٹھاکر تو مجھ سے دودھ مانگ رہے ہیں۔''

ٹھاکرانی کا جواب بے حد مختصر اور فیصلہ کن تھا۔ ''اسے پنگھوڑے میں لٹا دے اور انگلی سے شہد چٹا۔''

حمیدہ کسی اور ہی کیفیت میں تھی۔ وہ بچے کو لپٹائے کھڑی رہی۔ پھر بولی۔ ''پلانے دیں نا مالکن۔''

''میں کہتی ہوں، لٹا دے اسے۔'' اس بار ٹھاکرانی نے گرج کر کہا۔

حمیدہ کی کیفیت ختم ہو گئی۔ اس نے بڑی نزاکت سے بچے کو خود سے دور کیا۔ پھر اسے پنگھوڑے میں لٹا دیا۔ بچے نے پھر رونا شروع کر دیا۔ ایک منٹ بعد تو یہ حال ہوا کہ اس کی چیخیں چھت پھاڑے ڈال رہی تھیں۔

''حمیدہ، اسے شہد چٹا۔'' ٹھاکرانی نے پکارا۔

لیکن اس بار بچہ شہد میں ڈوبی ہوئی انگلی سے بھی منہ موڑ رہا تھا۔ بلکہ اس نے ایک اور ادا سیکھ لی تھی۔ اب وہ ہونٹ سختی سے بھینچ لیتا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ آگے کی سمت مسلسل کچھ تلاش کر رہے تھے۔ وہ ننھے ننھے ہاتھ اپنی منزل کو نہیں چھو سکتے تھے۔ لیکن کوشش کیے جا رہے تھے اور

حمیدہ ان کے معصوم لمس کو، ان کے جان دار مطالبے کو صاف اپنی چھاتیوں پر محسوس کر رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا دل پھٹ جائے گا۔

بچہ اتنے زور سے رو رہا تھا کہ اتنے فاصلے سے بات کرنا ممکن نہیں تھا۔ حمیدہ ٹھاکرانی کے پاس چلی گئی۔ ''مالکن...... چھوٹے ٹھاکر شہد بھی نہیں لے رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

ٹھاکرانی نے ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھا اور جان لیا کہ وہ اس کے بچے کو دودھ پلانے کے لیے تڑپ رہی ہے۔ اسے یقین ہو گیا کہ حمیدہ نے بچے کو شہد چٹانے کی کوشش ہی نہیں کی ہے تاکہ وہ بچے کو اس سے دودھ پلوانے پر مجبور ہو جائے۔ راجپوت خون جوش مارنے لگا۔ پھر بھی اس نے تحمل سے کام لیا۔ معاملہ منتوں مرادوں والے بچے کا جی تھا۔

''مالکن مجھے دودھ پلانے دیں، نا۔'' حمیدہ نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''سن حمیدہ، یہ جو دودھ ہوتا ہے نا، یہ اصل میں خون ہوتا ہے۔'' ٹھاکرانی نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔ ''اور ہم راجپوت لوگ اپنے خون میں ملاوٹ کرنے سے اچھا مر جانے کو سمجھتے ہیں۔'' ٹھاکرانی کہہ تو گئی۔ لیکن اگلے ہی لمحے لرز گئی۔ یہ کیسی منحوس بات منہ سے نکالی ہے اس نے۔ اس بچے پر تو سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔

ادھر حمیدہ کچھ سننے اور سمجھنے کے قابل ہی نہیں تھی۔ وہ بولی۔ ''خدا کی قسم، میں کسی کو بھی نہیں بتاؤں گی مالکن۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ خون میں ملاوٹ تو ہو جائے گی نا۔''

اب کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ حمیدہ ٹھاکرانی کو ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہیں جیسے بھیک مانگ رہی تھیں۔

اُدھر بچے کی چیخیں، اِدھر حمیدہ کی نظریں...... ٹھاکرانی کا دل کٹنے لگا۔ بیک وقت دونوں چیزیں برداشت کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ اس نے حمیدہ سے کہا۔ ''تو اب گھر جا حمیدہ اور یہ بات کسی سے نہ کہنا۔''

''نہیں کہوں گی مالکن۔ مگر آپ ایک بار......'' بات پوری کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

''ٹھاکر کو پتا چل گیا کہ تو یہ چاہتی ہے تو وہ تیرا خون پی جائیں گے......اور میرا بھی۔'' ٹھاکرانی نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ یہ سن کر حمیدہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ ''بس اب تو جا اور جاتے ہوئے شانتا کو جگا دے۔ کہنا، میں بلا رہی ہوں۔''

حمیدہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ ٹھاکرانی نے اسے پکارا تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ''اور سن، جب تک میں خود نہ بلواؤں، حویلی میں قدم نہ رکھنا۔''

حمیدہ باہر نکل گئی۔ ٹھاکرانی نے سکون کی سانس لی۔ بچے کے رونے کی آواز سے اب

بھی اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ لیکن یہ اطمینان تھا کہ اب شانتا آ کر اسے شہد چٹائے گی اور وہ چپ ہو جائے گا۔ حمیدہ نے تو شہد چٹایا ہی نہیں۔

شانتا کمرے میں آئی تو ٹھاکرانی نے اس کی خوب خبر لی۔ ''کیسے سوتی ہے تو۔ برابر والے کمرے میں تھی اور چھوٹے ٹھاکر کے رونے کی آواز سے بھی تیری آنکھ نہیں کھلی۔''

''شما کر دیں مالکن۔'' شانتا نے ہاتھ جوڑ کر کہا اور پنگھوڑے کی طرف چلی گئی۔ اس نے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔ ''چھوٹے ٹھاکر بھوکے ہیں مالکن۔''

''پتا ہے مجھے۔ شہد چٹا دے۔''

لیکن بچہ چپ نہیں ہوا۔ ایک منٹ بعد شانتا نے کہا۔ ''مالکن، چھوٹے ٹھاکر کی طرف انگلی بڑھاؤں تو ہونٹ بھینچ لیتے ہیں۔ شہد نہیں لے رہے ہیں۔''

ٹھاکرانی کو افسوس ہوا کہ اس نے خوامخواہ حمیدہ پر شک کیا، اسے جھوٹا سمجھا۔ اب کیا کیا جائے۔ ''اچھا...... یہاں میرے پاس لے آ چھوٹے ٹھاکر کو۔''

❁......❁......❁

ٹھاکر پرتاپ سنگھ دیوان خانے میں تھا۔ پنڈت روپ سہائے اس کے سامنے، جنم کنڈلی پھیلائے، اس پر جھکا بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر الجھن تھی۔ ''پہلی بار ایسی جنم کنڈلی دیکھی ہے ٹھاکر جی۔ چھوٹے ٹھاکر بڑے بھاگوان ہیں۔'' اس نے ایسے موقعوں کے لیے رٹا رٹایا جملہ دہرایا۔ لیکن اس کا پہلا حصہ بالکل سچ تھا۔

''مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ پنڈت جی۔''

''زیادہ نہیں بتا سکتا ٹھاکر جی۔ میرا علم کم پڑ رہا ہے۔ یہ جنم کنڈلی تو میں اپنے گرو کو دکھاؤں گا۔ وہ زیادہ بتا سکیں گے۔'' پنڈت نے عاجزی سے کہا۔

''وہ تو جب بتائیں گے، تب بتائیں گے۔'' ٹھاکر نے خشک لہجے میں کہا۔ ''جو تم بتا سکتے ہو، وہ تو بتاؤ۔ رکاوٹ کیا ہے آخر۔''

پنڈت نے گہری سانس لی اور ٹھاکر کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''کبھی کوئی ایسی جنم کنڈلی بھی دکھائی دے جاتی ہے ٹھاکر جی، جس میں بڑے پیچ ہوتے ہیں۔ ستاروں کو کھوجنے نکلو تو اندھیرا نظر آنے لگتا ہے۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ یہاں معاملہ الٹ ہے۔ روشنی اتنی ہے کہ آنکھیں چندھیا جائیں اور کچھ دکھائی نہ دے۔''

''پھر وہی گھماؤ پھراؤ والی بات۔'' ٹھاکر جھنجھلا گیا۔

''جنم کنڈلی میں راج یوگ بھی ہے اور'' پنڈت کہتے کہتے رُک گیا۔ اب وہ یوگ بتائے گا تو ٹھاکر کچھ سمجھ نہیں پائے گا۔ لہٰذا سیدھی سیدھی بات کی جائے۔ بتانے کو تو کچھ زیادہ ہے بھی نہیں۔ ''جنم کنڈلی بتاتی ہے کہ چھوٹے ٹھاکر بھگوان نہیں، پر بھگوان جیسے ہیں۔ اوتار نہیں، پر اوتار

جیسے ہیں۔ وہ راجہ بھی ہوں گے اور فقیر بھی۔ وہ سب کچھ ہوگا ان کے پاس، جس کی انھیں پروا نہیں ہوگی اور جو وہ چاہیں گے، اس کے لیے انھیں بڑی تپسیا کرنی ہوگی۔ بڑا کشٹ اٹھانا ہوگا۔ کنڈلی بتاتی ہے کہ وہ کچھ کھوجتے، کچھ ڈھونڈتے پھریں گے۔ وہ جو ارادہ کرلیں گے، اس سے کبھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ ان کے جیون کی کہانی پریم کہانی ہوگی۔ اور......اور......'' پنڈت ہچکچانے لگا۔

''بتاؤ مجھے۔ بے فکر ہو کر بتاؤ۔''

''آپ کے جیون میں چھوٹے ٹھاکر کی وجہ سے بڑی کٹھنائیاں آئیں گی۔ اور...... اور......''

''اور کیا؟'' ٹھاکر نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

''اور آپ اپنا جیون ان کی بھینٹ کردیں گے۔''

ٹھاکر تو اب بھی بچے پر اپنا جیون بھینٹ کرنے کو تیار تھا۔ اس نے بغیر کسی تردد کے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔ پر بھاگیہ کا تو بتاؤ۔''

''بھگوان نے بڑی شکتی دی ہے چھوٹے ٹھاکر کو۔ ان کے بھاگیہ کا کوئی نہیں بتا سکتا۔ وہ اپنا بھاگیہ آپ لکھیں گے۔ جو چاہیں گے، لکھیں گے اور وہی کچھ ہوگا بھی۔''

''تم نے بتایا تو کچھ بھی نہیں۔'' ٹھاکر نے شکایتی لہجے میں کہا۔

پنڈت نے ہاتھ جوڑ لیے۔ ''اس سے زیادہ میں نہیں جانتا۔ گروجی کو لاؤں گا آپ کے پاس۔''

''اچھا کوئی شبھ نام تو نکال دو میرے پتر کا۔''

''ٹھاکر اوتار سنگھ سے شبھ نام کوئی نہیں۔ اگر چھوٹے ٹھاکر سویکار کرلیں تو......''

''اس کا کیا مطلب ہوا؟''

''ان کی مرضی کے آگے کسی کی نہیں چلے گی ٹھاکر جی۔''

ٹھاکر کو نام اچھا لگا تھا۔ اس نے مسخرے پن سے کہا۔ ''اچھا۔ میں ان سے پوچھ لوں گا۔ وہ مجھے انکار نہیں کریں گے۔''

ٹھاکر نے پنڈت کو اتنا دیا کہ وہ خوش ہوگیا۔ پنڈت کے جانے کے بعد ٹھاکر بیٹے کے پاس جانے کو بے تاب ہوگیا۔ رات وہ دیر سے سویا تھا۔ صبح اٹھتے ہی وہ اس کے درشن کرنا چاہتا تھا لیکن پنڈت کو آنا تھا۔ وہ یہ سوچ کر رک گیا کہ اب بچے کے پاس اس کا نام لے کر ہی جائیں گے۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس کا جسم اور دماغ شل ہو رہا تھا۔ اتنی بڑی خوشی نہ ہوتی تو اس وقت اس کے چڑچڑے پن سے حویلی کے نوکر لرزتے پھر رہے ہوتے۔

وہ دیوان خانے سے نکلا اور ٹھاکر اوتار سنگھ کے کمرے کی طرف چل دیا۔ دور سے ہی اسے اس کے رونے کی آواز سنائی دی۔ یہ کیا؟ ٹھاکر نے خود سے کہا۔ چھوٹے ٹھاکر اتنی بری طرح

کیوں رو رہے ہیں۔ کیا ابھی سے ضد شروع کردی ہے؟

❁......❁......❁
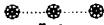
ٹھاکرانی اور شانتا ایک پل بھی نہیں سو سکی تھیں۔ رات بھر جاگتی رہی تھیں۔ اس لیے کہ بچہ رات بھر روتا رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی شہد قبول نہیں کیا تھا۔ ٹھاکرانی نے کئی بار اسے دودھ پلانے کی کوشش کی تھی۔ مگر ناکام رہی۔ آخر اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے سوچا، شاید بات بن جائے۔

اس نے اپنا چہرہ ساڑھی کے پلو میں چھپا لیا۔ پھر وہ نیچے قالین پر بیٹھ گئی...... وہیں جہاں حمیدہ بیٹھی تھی۔ پھر اس نے شانتا سے کہا کہ وہ بچے کو لا کر اس کی گود میں دے دے۔

اس کا خیال تھا کہ ناسمجھ بچہ دھوکہ کھا جائے گا۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ بچے نے دودھ کو منہ بھی نہیں لگایا۔

ننھے بچے میں جان ہی کتنی ہوتی ہے۔ پھر وہ بچہ جس نے بارہ گھنٹے سے کچھ کھایا ہی نہ ہو۔ مگر راجپوت بچہ تھا۔ اپنی طاقت سے بڑھ کر روتا رہا۔ کوئی اور بچہ ہوتا تو اب وہ بہت پہلے نڈھال ہو کر چپ ہو چکا ہوتا۔

ٹھاکرانی کے لیے وہ بڑی کشمکش کی رات تھی۔ بچے کے رونے سے اس کے دل پر چوٹ لگتی۔ کلیجے سے ہوک اٹھتی۔ بے بسی کے احساس نے اسے اور نڈھال کردیا تھا۔ دودھ کی کمی نہیں تھی۔ مگر ضدی بچہ دودھ قبول نہیں کررہا تھا۔ بھوک سے روئے جارہا تھا۔ اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہر پل وہ یہی سوچتی کہ بھوک سے بچے پر کیا گزر رہی ہوگی۔ کہتے ہیں کہ کوئی کسی سے کتنی ہی محبت کرتا ہو، اس کی تکلیف کا اندازہ نہیں کرسکتا کیونکہ اسے پتا ہی نہیں ہوتا کہ وہ کتنی تکلیف میں ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے لیکن ماں اس کلیے سے مستثنٰی ہے۔ بچے کو جتنی تکلیف ہوتی ہے، ماں اس سے بڑھ کر قیاس کرتی، اس سے بڑھ کر محسوس کرتی اور اس کے بارے میں سوچ کر اس سے زیادہ اذیت اٹھاتی ہے۔ اسی لیے تو اس کے پاؤں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔ صبح ہوتے ہوتے ٹھاکرانی بچے سے بڑھ کر نڈھال ہوگئی۔

روتے روتے بچے کا گلا بیٹھ گیا۔ اس میں رونے کی طاقت ہی نہیں رہی۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ ٹھاکرانی نے اس کی نیند گہری ہونے کا انتظار کیا۔ پھر خود جا کر اپنی انگلی شہد میں ڈبوئی اور اس سے ہونٹوں پر دباؤ ڈالا۔ ننھا سا منہ کھلا۔ بھوکا بچہ سوتے میں تو مزاحمت نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن شہد کا ذائقہ ہی دہن میں اترا، وہ جاگ گیا، اور لگا پھر چنگھاڑنے۔ ٹھاکرانی نے پھر شہد چٹانا چاہا۔ لیکن بچہ پھر اکڑ گیا تھا۔

اس ایک رات میں ٹھاکرانی ممتا کے ہر مرحلے سے گزر گئی۔ ابتداء میں وہ بائیس برس کے طویل انتظار کے بعد نوازی جانے والی وہ ماں تھی، جس میں عورت کی پوری تنگ نظری موجود تھی۔ جو اپنا اعزاز کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ محرومی کے احساس سے چور تھی کہ اس

کے بچے نے اس کی ممتا کا پہلا تحفہ ہی قبول نہیں کیا تھا۔ اور وہ ایک اور عورت سے دودھ مانگ رہا تھا اور وہ عورت نہ صرف غیر تھی بلکہ مسلمان تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اسے اپنے بچے کو دودھ پلانے دیتی۔ وہ تو کسی کو بھی یہ اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

سو پہلے مرحلے میں وہ اس بات کو قبول نہیں کر سکی تھی۔ مگر پھر اسے احساس ہوا کہ بچہ بھوکا ہے اور اگر یہ صورتِ حال جاری رہی تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اس احساس کے بعد پہلے تو وہ گھبرائی۔ یہ تصور اس کے لیے جان لیوا تھا کہ بچے کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ یہ بات سمجھ میں آئی کہ بات کو وہاں تک پہنچنے سے روکنا ہے۔ اس کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ وہ یہ توہین بھی گوارا کر سکتی ہے کہ اس کا بچہ اس کا دودھ ٹھکرا رہا ہے۔ کوئی بھی...... ہاں کوئی بھی اسے دودھ پلا دے۔ بس اس کا پیٹ بھر جائے اور وہ جیتا رہے۔ عورت اپنے شوہر کی سیج نہیں سجا سکتی۔ اپنے اوپر سوکن نہیں لا سکتی۔ لیکن وہ بچے کے لیے یہ سب کچھ کرنے کو تیار تھی...... بلکہ مصر تھی۔ تو اب اپنے بچے کی زندگی بچانے کے لیے اسے اس کی من پسند ماں نہیں دے سکتی! اسے دودھ نہیں دلا سکتی اس کا! کیوں نہیں۔ بس اس کا بچہ جیتا رہے۔ چاہے کسی اور کا بچہ بن کر جیے۔ چاہے اسے ماں بھی نہ کہے۔

مگر بچہ ایک مسلمان عورت کا دودھ مانگ رہا تھا۔ اس کا دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ یہ بھی سہی۔ بس وہ زندہ رہے۔ اس کے زندہ رہنے کی زیادہ اہمیت ہے۔ چاہے وہ اُدھرمی بن کر جیے۔ راجپوت کہتا ہے، جان چلی جائے پر آن نہ جائے اور راجپوت ماں ہو تو کہتی ہے کہ آن بے شک چلی جائے، بچے کی جان نہ جائے۔

اس کی سوچ پتا نہیں کب بدل گئی۔ اس کا ننھا سا بچہ ہندو بعد میں ہے، راجپوت بعد میں ہے۔ سب سے پہلے بس وہ اس کا بچہ ہے۔ یہ بنیادی بات ہے۔ اس کی زندگی پر، اس کی زندگی کے لیے سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔

اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ ابھی حمیدہ کو بلاتی اور بچے کو اس کی گود میں دے کر کہتی کہ اسے پیٹ بھر کر دودھ پلا دے۔ لیکن اس کے پاس یہ اختیار نہیں تھا۔ فیصلہ بچے کے باپ کو کرنا تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ کیا فیصلہ کرے گا۔ فیصلہ تو وہ بعد میں کرے گا۔ پہلے تو وہ یہ سوچنے پر اس کی گردن اُڑا دے گا۔ وہ آن والا راجپوت ہے اور ماں نہیں ہے۔

ابتداء میں وہ خوف زدہ تھی۔ اس میں ٹھاکر سے بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ پھر بچے کی چیخوں کی پے در پے...... نے اسے طاقت دے دی۔ اس نے سوچا، نتیجہ کچھ بھی ہو، وہ صبح ٹھاکر سے بات ضرور کرے گی اور اگر ٹھاکر نہ مانا تو بچے کی جان بچانے کے لیے چپکے سے وہ کچھ کر گزرے گی، جو اسے کرنا چاہیے۔

دروازہ کھلنے کی آواز سن کر وہ چونکی اور دروازے کی سمت دیکھا۔ ٹھاکر کمرے میں داخل

ہوا۔ اس نے نہ ٹھاکرانی کو دیکھا، نہ نمسکار کرتی ہوئی شانتا پر نظر ڈالی۔ وہ سیدھا پنگھوڑے کی طرف گیا۔ ٹھاکرانی نے شانتا کو آنکھ کا اشارہ کیا۔ شانتا کمرے میں چلی گئی۔

ٹھاکر نے ایک نظر روتے ہوئے بچے کو دیکھا۔ پھر ٹھاکرانی کی طرف مڑا۔ ''میں اسے گود میں لے سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

ٹھاکرانی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''ایسے کیوں کہہ رہے ہیں؟ آپ پتا ہیں اس کے۔''

ٹھاکر جھینپ سا گیا۔ ''اتنا چھوٹا سا ہے نا۔ لگتا ہے، میری گود میں دب نہ جائے، کوئی نقصان نہ ہو جائے اسے۔ ڈر لگتا ہے اس سے۔''

''جی نہیں۔ دیکھنے میں چھوٹا سہی۔ پر راج پوت بچہ ہے۔'' ٹھاکرانی کے لہجے میں فخر تھا۔ ''اور باپ کی گود کی سختی سے بھی بچوں کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔''

''رنجو...... تم اسے میری گود میں دے دو ذرا۔''

ٹھاکرانی اٹھ کر اس طرف گئی۔ اس نے بچے کو نزاکت سے اٹھا کر ٹھاکر کی گود میں دے دیا۔

ٹھاکر نے بچے کو غور سے دیکھا۔ ''کیا بات ہے ٹھاکر اوتار سنگھ جی۔ کیوں روئے جا رہے ہیں آپ؟ کوئی ضد کر لی ہے کیا؟'' ٹھاکر نے بچے سے کہا۔ تو یہ ہے میرے بچے کا نام...... اوتار سنگھ! پیارا نام ہے۔ ٹھاکرانی نے سوچا، دل میں عجیب سی خوشی جاگی۔ ''ہاں ناتھ۔ آپ کے ٹھاکر اوتار سنگھ ابھی دو دن کے ہوئے نہیں ہیں اور انھوں نے ضد بھی شروع کر دی ہے۔'' اس نے کہا۔

ٹھاکر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ خود تو جنم کنڈلی کے حوالے سے بات کر رہا تھا۔ مگر رنجو یہ بات کیوں کہہ رہی ہے۔ اتنا سا بچہ ضد کیسے کر سکتا ہے۔ یہ تو ان ہونی ہے۔ ''کیسی ضد؟'' اس نے پوچھا۔

''بیٹھ کر سکون سے سنیں تو بتاؤں۔'' ٹھاکرانی بولی۔

❁......❁......❁
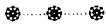
جمال دین نے عادت کے مطابق چنگیر پیچھے ہٹائی اور بیوی کو پکارا۔ ''حمیدہ...... برتن اٹھا لو۔''

روز حمیدہ اس کی ایک آواز پر برتن سمیٹنے کے لیے آ جاتی تھی لیکن اس روز ایسا نہیں ہوا۔ جمال دین چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ مگر کب تک؟ جھوٹے برتن پھیلے ہوئے اسے بہت برے لگتے تھے۔ وہ انھیں برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر اسے چلم کی طلب بھی ہو رہی تھی۔ جب تک دو کش نہ لے لیتا، اس کا ناشتہ مکمل ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس نے پھر آواز لگائی۔ ''حمیدہ، او بھئی حمیدہ، کہاں ہو۔ یہ برتن اٹھا لو نا۔''

حمیدہ تو اب بھی نہیں آئی لیکن کمرے کی طرف سے اس کی آواز آئی۔ ''آتی ہوں جی۔ ابھی آتی ہوں۔''

''ایسا کیا کر رہی ہو اس وقت؟'' جمال دین کو حیرت ہوئی۔ برسوں کا بنا معمول آج پہلی بار ٹوٹا تھا۔

ایک لمحے جھجکتی سی خاموشی رہی۔ پھر حمیدہ نے پکارا۔''وصال کو ناشتہ کرا رہی ہوں جی۔ ابھی آتی ہوں۔''

اس جواب نے جمال دین کی الجھن دور نہیں کی۔ بلکہ اس کی الجھن اور حیرت اور بڑھا دی۔ حمیدہ بہت اچھی عورت اور بہت اچھی بیوی تھی۔ عقل مند، محبت کرنے والی اور خیال رکھنے والی۔ چھ سال بعد اللہ نے انھیں اولاد سے نوازا تھا۔ اتنے عرصے کے بعد اولاد ہو تو عورتیں ان کے لیے پاگل ہو جاتی ہیں۔ مگر حمیدہ ایسی نہیں تھی۔ اس کا اصول تھا کہ بچہ شوہر سے ہے، نہ کہ شوہر بچے سے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ ہر معاملے میں شوہر کو بچے پر فوقیت دیتی تھی۔ پہلے اس کی ضرورت پوری کرتی، پھر بچے کی فکر کرتی۔ صبح بھی یہی ہوتا تھا۔ جمال دین اور بچہ، دونوں ایک ہی وقت اٹھتے تھے۔ حمیدہ ان دونوں سے پہلے اٹھتی تھی۔ سب سے پہلے وہ بچے کو صاف ستھرا کرتی، اس کے کپڑے بدلا دیتی۔ یہ اس لیے کہ وہ خود ہاتھ منہ نہیں دھو سکتا تھا۔ پھر وہ خود ہاتھ منہ دھوتی اور ناشتہ بنانے لگتی۔ اس دوران وہ دونوں اٹھ جاتے تھے۔ وہ جمال دین کو ناشتہ دیتی، اس کے لیے چلم تیار کرتی۔ وہ ناشتے سے فارغ ہوتا تو وہ برتن سمیٹتی اور اس کے سامنے چلم لا کر رکھ دیتی۔ اس کے بعد وہ بچے کی طرف توجہ دیتی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ جمال دین ناشتہ کر رہا ہے اور بچہ رونے لگا ہے۔ تو برتن سمیٹنے کے انتظار میں کھڑی حمیدہ لپک کر اندر جاتی اور بچے سے کہتی...... بے صبرا پن نہ کر وصال۔ ابھی تیرے ابا ناشتہ کر رہے ہیں۔ ان سے پہلے تجھے ناشتہ نہیں مل سکتا۔ چپ کر جا اور وہ فوراً باہر آ جاتی لیکن اس کے انگ انگ سے بے چینی اور اضطراب ٹپکتا۔ وہ ٹہل نہیں رہی ہوتی۔ بلکہ ساکت کھڑی ہوتی لیکن اس کا جسم پھڑکتا، جیسے وہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہل رہی ہو۔ جمال دین کہتا...... ''جاؤ حمیدہ، دودھ پلا دو وصال کو......، اور حمیدہ کہتی......، نا جی نا۔ آپ فارغ ہو جاؤ۔ بعد میں اسے ناشتہ ملے گا۔''

بچہ روتا رہتا اور جمال دین کا دل کٹنے لگتا۔''پلا دو نا۔ اتنا چھوٹا بچہ ہے۔ معصوم ہے ابھی۔''

''ابھی سے سکھانا پڑے گا۔ تبھی تو سمجھے گا کہ باپ بڑا ہوتا ہے۔ اللہ کی زمین پر اللہ کے بعد سب سے بڑے درجے والا۔''

جمال دین کو اپنی بیوی کی عقل پر فخر محسوس ہوتا۔ اسے یقین ہو جاتا کہ اس کے بیٹے کی تربیت بہت اچھی ہوگی۔ وہ سعادت مند اور فرماں بردار اٹھے گا۔ اندر بچہ روتا رہتا۔ باہر حمیدہ پہلو بدلتی، کسمساتی۔ لیکن اس کے قدم کبھی کمرے کی طرف نہ اٹھتے۔ جمال دین جلدی سے ناشتہ بھگتاتا۔ تاکہ حمیدہ فارغ ہو جائے۔ وہ چنگیر پرے ہٹا دیتا۔ حمیدہ برتن سمیٹتی، اسے چلم لا کر دیتی، پھر بے تابی سے کمرے کی طرف لپکتی۔ چند لمحے بعد کمرے کی طرف سے اس کی محبت میں لپٹی آواز سنائی دیتی۔ وہ دودھ پیتے ہوئے بچے کو ڈانٹ رہی ہوتی۔''وصال دین، آپ بہت برے بچے ہو۔ اپنے ابا کو ٹھیک سے ناشتہ بھی نہیں کرنے دیتے۔ بے صبرے کہیں کے۔ اگلی بار ایسا کرو گے تو آپ کی پٹائی ہوگی۔ اور دودھ بھی نہیں ملے گا آپ کو۔

جمال دین نے حیرت سے سامنے پڑے برتنوں کو دیکھا۔ آج اتنے دنوں کے بعد ایسا کیا ہو گیا کہ حمیدہ اس کے ناشتہ کرنے کے دوران وصال کو دودھ پلانے لگی ہے۔ یہ تبدیلی کیسی؟ کیا مطلب ہے اس کا؟ ضرور کوئی بڑی بات ہے اس کے پیچھے۔

اچانک جمال دین کو دھندلی دھندلی سی پچھلی رات یاد آنے لگی۔ دھندلی اس لیے کہ اس وقت وہ نیند میں تھا۔

اس لمحے خجل خجل سی حمیدہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس نے خاموشی سے برتن سمیٹے۔ پھر وہ بولی تو اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔''معاف کر دینا جی۔ وہ وصال بھوکا ہو رہا تھا نا، اس لیے......''

''میں نے تو اس کے رونے کی آواز نہیں سنی۔'' جمال دین بولا۔

''رونے سے پہلے بچوں کا پیٹ بھر دینا چاہیے۔''

''لیکن پہلے وہ روتا تھا، تب بھی تم اسے دودھ نہیں دیتی تھیں۔'' جمال دین نے اعتراض کیا۔

''غلطی کرتی تھی جی۔ اب نہیں کروں گی۔'' حمیدہ نے بڑے وثوق سے کہا۔ پھر وہ اس کے لیے چلم لے آئی۔''یہ لو جی۔''

جمال دین نے چلم سنبھالی اور ایک کش لیا۔ پھر کچھ سوچتے اور دھواں چھوڑتے ہوئے اس نے پوچھا۔''وصال دین کیا کر رہا ہے حمیدہ؟''

''سو رہا ہے جی۔''

''تو ٹھیک ہے۔ تم یہاں بیٹھو تھوڑی دیر۔''

حمیدہ پلنگ کے پائینتی والی پٹی پر ٹک گئی۔ جمال دین نے دوسرا کش لیا اور پچھلی رات کو یاد کیا۔ دھندلی دھندلی سی یاد پھر تازہ ہونے لگی۔ اس نے ایک اور کش لیا اور بولا۔''تم رات کو ٹھیک سے نہیں سوئی تھیں حمیدہ۔''

حمیدہ نے چونک کر اسے دیکھا۔''سوئی تو تھی۔ بس ذرا بے چینی سی تھی۔''

''تم بار بار اٹھ کیوں رہی تھیں؟''

''دودھ پلانے کے لیے۔''

جمال دین کی یاد کا دھندلا پن ذرا کم ہوا۔ ہاں واقعی...... حمیدہ بار بار بچے پر جھک رہی

تھی۔ تو وہ دودھ پلانے کے لیے تھا...... مگر بار بار؟ اس کی الجھن اور گہری ہوگئی۔ ’’بچے کو اتنی بار دودھ تو نہیں پلاتے۔‘‘

’’وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر مجھے بے چینی ہو رہی تھی۔ دور ہی نہیں ہوتی تھی کسی طرح۔‘‘

’’بے چینی! کس بات کی؟‘‘

’’مجھے لگتا تھا کہ میرا بچہ مجھ سے ناراض ہے۔ بہت بھوکا ہے اور رو رہا ہے۔‘‘

جمال دین کو ایک اور دھندلی سی بات یاد آئی۔ حمیدہ رات بچے سے کہہ رہی تھی...... وصال دین، میرے بچے، مجھ سے کبھی ناراض نہ ہونا۔ دودھ سے منہ نہ موڑنا کبھی۔ ’’لیکن حمیدہ، وصال رو تو نہیں رہا تھا۔ بھوکا تو نہیں تھا۔‘‘

’’وہ تو نہیں تھا جی۔ مگر مجھے تو ایسا ہی لگ رہا تھا نا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ بچہ بھوک سے تڑپے اور دودھ نہ پیے تو ماں کیسے سو سکتی ہے۔‘‘

’’مگر جب ایسا نہیں تھا تو پھر؟ تم پگلی ہو حمیدہ۔‘‘

جمال دین چلم ٹھنڈی کر کے اٹھا۔ اسے زمین پر جانا تھا۔ اس کے جانے کے بعد حمیدہ بیٹھی سوچتی رہی۔ چھوٹے ٹھاکر کی صورت اس کی نگاہوں میں پھر رہی تھی۔ کیسے وہ اس سے دودھ مانگ رہے تھے۔ کیسے چھو رہے تھے اسے۔ کیسی عجیب بات ہے۔ مجھی سے کیوں...... اپنی ماں سے کیوں نہیں۔ اور اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس لمحے میں میں جیسے سچ مچ ان کی ماں بن گئی اور وہ میری اولاد بن گئے۔ تبھی تو رات بھر بے چینی رہی۔

اور چھوٹے ٹھاکر نے اسے چھونے کے بعد شہد بھی نہیں لیا تھا۔ تو اب کیا ہوگا؟ کیا وہ بھوکے ہوں گے؟ رات بھر بھوکے رہے ہوں گے؟ مگر نہیں...... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ننھی سی جان اتنا تو برداشت نہیں کر سکتی۔ چھوٹا سا بچہ اتنی ضد نہیں کر سکتا۔ مگر اس کی بے چینی اسے کچھ اور ہی بتا رہی تھی۔

اور یہ کیسا تعلق تھا۔ ایک اجنبی نوزائیدہ بچہ اس کی گود میں آیا... ننھا بے زبان بچہ... اور اس سے دودھ مانگنے لگا اور وہ یوں تڑپ گئی، جیسے سچ مچ اس کی ماں ہو جبکہ یہ بے حد خطرناک تعلق تھا۔ کہاں ٹھاکر، گاؤں کا مالک، اور کہاں وہ، ان کی رعایا۔ یہ تو ان کی مہربانی تھی کہ انھوں نے زیر کاشت زمین ان کے نام کر دی تھی اور پھر سب سے بڑا فرق تو مذہب کا تھا۔ لیکن تعلق جڑتا ہے تو یہ سب سوچنے کی مہلت کہاں ملتی ہے۔

وصال جاگا تو وہ اس کے پاس گئی۔ اس کی ضرورتیں پوری کیں۔ پھر اسے گھر میں چلنے کے لیے چھوڑ دیا۔ ابھی وہ گھٹنوں چل رہا تھا۔ کھڑا ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر ابھی اس کے چلنے میں کچھ دیر تھی۔

وہ ٹہلتی اور سوچتی رہی کہ حویلی میں کیا ہو رہا ہوگا۔ ٹھاکرانی نے اسے وہاں آنے سے منع

کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر بچے نے دودھ نہ پیا تو اسے بلوا لیا جائے گا۔ اور بلوائے نہ جانے کا مطلب یہی ہوگا کہ بچے نے دودھ پی لیا ہے۔

جمال دین گھر واپس آیا تو حمیدہ کو احساس ہوا کہ بہت دیر ہوگئی ہے۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ دھوپ چڑھ آئی ہے۔ اس نے ابھی تک کھانے کی فکر بھی نہیں کی تھی۔ اس نے خود تو ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ بھوک ہی نہیں تھی۔ اسے تو بس چھوٹے ٹھاکر کی بھوک کا خیال ستا رہا تھا۔

وہ باورچی خانے میں گئی۔ تھالی میں دال اور چاول نکالے اور انھیں چننے بیٹھ گئی۔ دوپہر ہونے کو آئی تھی اور حویلی سے اس کا بلاوا نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا...... اپنی مایوسی نے اسے خود بھی حیران کر دیا۔ اسے احساس ہوا کہ اب زندگی کی سب سے بڑی خوشی اس کے لیے چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانا ہے۔

بظاہر وہ مایوس تھی۔ لیکن شاید اندر اسے کچھ اور یقین تھا۔ وہ دال چاول چنتے چنتے اٹھ کر دروازے پر جاتی کہ کہیں بلاوا تو نہیں آ گیا۔ ہر بار وہ تھکے قدموں سے باورچی خانے میں واپس آ جاتی۔ آخر اس نے دال چاول پکنے کے لیے چڑھا دیے۔

جمال دین کو اس کا بار بار دروازے پر جانا غیر معمولی لگا۔ اس نے پوچھا۔ ’’حمیدہ، کوئی آنے والا ہے کیا؟‘‘

’’نہیں جی۔ پر صبح سویرے منڈیر پر کاگا بولا تھا۔‘‘

تھوڑی دیر بعد جمال دین نے پکارا۔ ’’حمیدہ، وصال گندا ہو رہا ہے۔ اسے صاف کر دو۔‘‘

حمیدہ نے بچے کو دھلایا۔ کپڑے بدلوائے اور پھر باورچی خانے میں چلی گئی۔ کھانا تیار ہو گیا تھا۔ ’’سنیں جی، کھانا تیار ہے۔‘‘ اس نے پکارا۔

’’تھوڑی دیر بعد کھاؤں گا۔‘‘

اسی لمحے دروازے پر کھٹکا ہوا۔ جمال دین باہر گیا۔ حمیدہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ جلدی سے کمرے میں گئی اور کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ باہر آئی تو جمال دین اندر آ رہا تھا۔ ’’تمھیں ٹھاکرانی نے بلایا ہے حمیدہ۔‘‘ اس نے کہا۔

’’آپ کھانا کھا لینا جی۔ اور بچے کا خیال رکھنا۔ میں تھوڑی دیر میں آ جاؤں گی۔‘‘ اس نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

❀......❀......❀

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے بڑے تحمل سے پوری روداد سنی۔ پھر وہ بولا تو اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ ’’تمھارا مطلب ہے، ہمارا بچہ حمیدہ کا دودھ پینا چاہتا ہے؟‘‘

’’ہاں ناتھ۔ حمیدہ کی گود میں جانے کے بعد سے اس نے شہد بھی نہیں لیا ہے۔ رو رو کر

بے حال ہو گیا ہے۔"

ٹھاکر کے ماتھے پر ناگواری کی سلوٹیں ابھر آئیں۔ "ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ٹھاکرانی۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

ٹھاکرانی کا دل لرزنے لگا۔ وہ ٹھاکر کا مزاج پہچانتی تھی۔ اس کا اکیلے میں ٹھاکرانی کہہ کر پکارنا اس بات کی دلیل تھا کہ اس وقت وہ غصے میں ہے۔ اس نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔ "ناتھ، یہ بات آپ سے بڑھ کر میرے لیے تکلیف دہ ہے۔ آپ جس وجہ سے غصہ کر رہے ہیں، وہ میرے پاس بھی ہے اور میرے پاس غصے کی وہ وجہ بھی ہے، جو آپ کے پاس نہیں۔"

ٹھاکر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"دیکھیں، میں اوتار سنگھ کی ماں ہوں۔ بھگوان نے مجھے دودھ بھی دیا ہے، اور یہ میرا ارمان بھی ہے۔ لیکن چھوٹا وہ دودھ نہیں پی رہا ہے کچھ اور مانگ رہا ہے۔ یہ میری بے عزتی ہے۔ میری ماتا کی بے عزتی۔ مجھے اس کا دکھ بھی ہے اور سوچ کر غصہ بھی آتا ہے۔ پر......"

"پوری بات کرو۔"

"رات گزر گئی۔ چھوٹے کے پیٹ میں کچھ بھی نہیں گیا۔ ننھا بچہ ہے۔ ایسے تو نہیں چلے گا؟"

ٹھاکر نے اسی بات پر غور کیا۔ بچے کا چہرہ وہ دیکھ چکا تھا۔ اب پہلی بار اس نے بیوی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ بہت کمزور اور نڈھال لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے۔ ظاہر ہے، وہ رات بھر نہ صرف جاگی تھی۔ بلکہ پریشان بھی رہی تھی۔ چنانچہ اس نے لہجہ نرم رکھتے ہوئے کہا۔ "سنو رنجو، تم جلد بازی میں فیصلہ کر رہی ہو۔ ممکن ہے، تمہارے دودھ میں کڑواہٹ ہو، جو بعد میں دور ہو جائے۔ ایسے میں بچہ جس کی گود میں بھی جائے گا، اس سے دودھ تو مانگے گا نا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صرف حمیدہ کا دودھ چاہتا ہے۔"

ٹھاکرانی کو ٹھاکر کی بات معقول لگی۔ "پھر آپ کیا بولتے ہیں؟"

"دیکھو، بغیر بتائے اسے دوسری عورتوں کی گود میں دے کر دیکھو۔ ہم کسی راجپوت عورت سے اسے دودھ پلوا سکتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ دوسرے میں ابھی جا کر شہر سے ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔ یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں کہ حل نہ ہو سکے۔"

ٹھاکرانی کی ڈھارس بندھی۔ "کچھ بھی ہو۔ میرے بچے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔"

"بائیس سال بعد یہ پھول کھلا ہے۔ میں اسے مرجھانے تو نہیں دوں گا۔"

ٹھاکر شہر چلا گیا۔ اسی دوران ٹھاکرانی نے تمام تجربے کر لیے۔ دائی راجو کی بنائی ہوئی دوا وہ پہلے ہی لے چکی تھی۔ بچے کو بچوں والی بیسیوں عورتوں کی گود میں دے کر دیکھ لیا گیا۔ مگر اس نے کسی سے دودھ نہیں مانگا۔ وہ بس روئے جا رہا تھا۔ روتے روتے نڈھال ہو جاتا تو اس کی آواز بند ہو جاتی۔ اس دوران اس نے بس ایک بار ذرا سا شہد چاٹا تھا۔ ورنہ وہ بھوکا ہی تھا۔

ٹھاکر شہر سے آیا تو اس کے ساتھ ایک لیڈی ڈاکٹر تھی۔ ڈاکٹر جولیا نے بچے کا معائنہ کیا اور بولی۔ "یہ بہت کمزور ہو گیا ہے بھوک سے۔ آپ ایسا کریں کہ اسے بکری کا دودھ دیں۔ نہ لے تو گائے اور بھینس کا دودھ آزمائیں...... لیکن پانی ملا کر۔ آدھا دودھ آدھا پانی اور اس دوران میں ٹھاکرانی کا دودھ لے جا کر لیبارٹری میں ٹیسٹ کراؤں گی۔ آپ میرے ساتھ چلیے گا۔" یہ تخاطب ٹھاکر سے تھا۔

ٹھاکر ڈاکٹر کے ساتھ چلا گیا ادھر بچہ ہر ترکیب کو ناکام بنانے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے کسی دودھ کو بھی منہ نہیں لگایا۔ ہر بوتل کو پرے کر دیا اور جب تک اس میں رونے کی طاقت ہوتی تھی، وہ روتا رہتا تھا۔ ٹھاکرانی نے ایک نوکر کو شہر دوڑایا تا کہ وہ ٹھاکر کو صورتِ حال بتا سکے۔

آخر دوپہر کے قریب ٹھاکرانی نے حمیدہ کو بلوا لیا۔ اس کی آمد سے پہلے ٹھاکرانی نے حیلے بہانے سے سب لوگوں کو کمرے سے ہٹا دیا تھا۔

حمیدہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے چہرے سے، جسم کی ہر حرکت سے، ہر عضو سے ہیجان جھلک رہا تھا۔ اس نے ٹھاکرانی کو سلام کیا اور توقعات سے چھلکتے لہجے میں بولی۔ "کیا حکم ہے ٹھاکرانی جی؟"

"کل رات سے اب تک میرے بچے کے پیٹ میں کچھ نہیں گیا ہے حمیدہ۔" ٹھاکرانی نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ اس پر اسے خود بھی حیرت ہوئی۔ وہ بڑے ضبط کی، بڑے رکھ رکھاؤ والی عورت تھی لیکن حمیدہ کو دیکھتے ہی وہ ایسی دکھیاری بن گئی۔ جیسے دنیا میں اپنا اور غمگسار مل گیا ہو، جسے وہ اپنا ہر دکھڑا سنا سکتی ہے۔ ورنہ اب تک اس نے اپنی سگی بہن سے بھی ایسے ٹوٹے لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ "رو رو کر نڈھال ہو گیا ہے میرا بچہ اب تو رونے جتنی جان بھی نہیں ہے اس میں۔"

حمیدہ کے دل میں پھول سے کھل اٹھے۔ اسے یاد تھا کہ گزشتہ رات ٹھاکرانی نے کتنی بے رخی سے اسے دودھ پلانے سے روکا تھا۔ مگر کوئی بات نہیں۔ اب اس کی تلافی ہونے والی تھی۔ اب ٹھاکرانی خود ہی اسے دودھ پلانے کو کہے گی۔ اس کی خودداری کا سر اونچا رہے گا۔

"تو اپنے خدا سے دعا کر میرے بچے کے لیے۔" ٹھاکرانی نے کہا۔

حمیدہ کو مایوسی ہوئی۔ "چھوٹے ٹھاکر کے لیے میری جان بھی حاضر ہے ٹھاکرانی جی۔"

"بس تو دعا کر۔" ٹھاکرانی کا لہجہ پھر خشک سا ہو گیا...... موہوم سی بے رخی سے بھرپور۔

اب حمیدہ ضبط نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے خودداری کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ "میں دودھ پلا دوں چھوٹے ٹھاکر کو؟"

"نہیں حمیدہ۔ بس تو اسے گود میں لے لے میرے سامنے۔"

مایوسی اپنی جگہ تھی۔ مگر حمیدہ بچے کو دیکھنے کے لیے تیزی سے پنگھوڑے کی طرف بڑھی۔ اسے دیکھا تو کلیجے میں ہوک سی اٹھی۔ دل کٹنے لگا۔ ننھا ٹھاکر رو رہا تھا۔ مگر آواز نہیں نکل رہی

تھی۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھوں سے نقاہت جھلک رہی تھی۔ ''مالکن، یہ تو رو رہے ہیں۔ پر آواز نہیں نکل رہی ہے۔ اس نے ٹھاکرانی کو بتایا۔

روتے روتے گلا بیٹھ گیا ہے۔ ٹھاکرانی نے دل گرفتگی سے کہا۔ ''ہائے رام، کیا کروں؟''

حمیدہ نے بچے کو گود میں لے لیا اور ٹھاکرانی کے پاس چلی آئی۔ ٹھاکرانی بچے کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ حمیدہ کی گود میں آتے ہی وہ بے تابی سے اس کی چھاتیوں پر ہاتھ مار رہا تھا۔ اس کا ننھا سا دہن بار بار یوں کھلتا تھا، جیسے پانی سے نکلی ہوئی مچھلی ہو اور کل کے مقابلے میں آج اس کے ہاتھوں کی بے تابی بہت نمایاں اور رلا دینے والی تھی۔ ٹھاکرانی کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے جلدی سے منہ پھیر کر آنکھیں پونچھ لیں۔ حمیدہ کو اس کا خیال ہی نہیں تھا۔ وہ تو ننھے ٹھاکر میں گم تھی۔ وہ بچے کو والہانہ انداز سے تک رہی تھی۔

اس کی نظروں کو دیکھ کر ٹھاکرانی متضاد جذبوں میں گھر گئی۔ حمیدہ کی ممتا بھری نگاہ نے اسے حسد اور رقابت میں مبتلا کر دیا۔ وہ کون ہوتی ہے اس کے بچے کو اس طرح دیکھنے والی۔ پھر اسے حمیدہ پر پیار آنے لگا۔ کوئی کسی دوسرے کے بچے کو اتنی چاہت سے بھی دیکھ سکتا ہے۔ حمیدہ کا انداز ایسا تھا کہ اس کا بس چلے تو خود کو بچے پر قربان کر دے۔

مدعا پورا نہ ہوا تو بچے کے ہاتھوں کی بے تابی وحشت میں تبدیل ہونے لگی۔ اُدھر حمیدہ کے جسم کی اینٹھن بھی واضح ہو گئی تھی۔

پھر حمیدہ کا ضبط جواب دے گیا۔ ''مجھ پر رحم کریں مالکن۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ میں مر جاؤں گی۔'' وہ گڑگڑائی۔

''برداشت تو مجھ سے بھی نہیں ہوتا حمیدہ۔ پر یہ ہو نہیں سکتا۔'' ٹھاکرانی نے کمزور لہجے میں کہا۔ ٹھاکر کا ڈر نہ ہوتا تو وہ ابھی بچے کو دودھ پلوا دیتی۔

''تو پھر آپ ہی کوشش کریں ٹھاکرانی جی۔'' حمیدہ کے ہاتھ بری طرح لرز رہے تھے۔

''تو، بچے کو میرے پاس لٹا دے۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔ اب وہ حمیدہ کے سامنے اپنی ممتا کی توہین کرانا نہیں چاہتی تھی۔

حمیدہ نے کانپتے ہاتھوں سے بچے کو ٹھاکرانی کے پہلو میں لٹا دیا۔ بچے کو پھر آواز مل گئی۔ حمیدہ کی آغوش سے جدا ہوتے ہی وہ پھر رونے لگا۔ مگر آواز کمزور تھی۔

''ٹھاکرانی جی، مجھے چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانے دیں...... خدا کے لیے۔'' حمیدہ پھر گڑگڑائی۔

''دیکھ حمیدہ۔ تو ماں ہے۔ جانتی ہے کہ ماں کیا ہوتی ہے۔'' ٹھاکرانی نے بکھرتے لہجے کو ہموار کرنے کی کوشش کی۔ ''اور میں تو وہ ماں ہوں، جسے بائیس برس بعد بچہ ملا ہے۔ تیرا دودھ پلوانا تو بہت چھوٹی بات ہے۔ اس کے لیے تو میں اپنے ہاتھوں سے اپنے شریر کے ٹکڑے کر سکتی

ہوں۔ پر پتی کی بات ماننا میرا دھرم ہے۔''

حمیدہ اب رو رہی تھی۔

''میں ٹھاکر جی کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ وہ مان گئے تو تجھے بلوا لوں گی۔'' ٹھاکرانی صرف اسے نہیں، خود کو بھی دلاسہ دے رہی تھی۔ ''پر ایسا ہو بھی تو یاد رکھنا'' کسی کو کبھی پتا نہ چلے، بس اب تو جا۔''

حمیدہ کا دل نہیں مانتا تھا۔ مگر اب وہ رک نہیں سکتی تھی۔ دروازے تک اس قدم کے فاصلے میں اس نے دس بار، روتے ہوئے چھوٹے ٹھاکر کو پلٹ کر دیکھا تھا۔ مگر ٹھاکرانی نے منہ پھیر لیا تھا۔ کمرے سے نکل کر اس نے جلدی جلدی آنکھیں پونچھیں اور آگے بڑھ گئی۔

کمرے میں ٹھاکرانی نے بچے کو پھر دودھ پلانے کی کوشش کی لیکن بچہ اور زیادہ رونے لگا۔ ٹھاکرانی بے بسی سے اپنی انگلیاں چباتی رہی۔

❁......❁......❁

ٹھاکر پرتاپ سنگھ شہر میں تھا۔ رامو کے ذریعے اسے اطلاع مل چکی تھی کہ ننھے ٹھاکر نے کسی کا دودھ بھی قبول نہیں کیا ہے۔ اس نے اس سلسلے میں ڈاکٹر جولیا سے بات بھی کی۔

''میرا خیال ہے، بچہ ضد کر رہا ہے۔'' ڈاکٹر نے رائے دی۔ ''کوئی طبی وجہ تو نظر نہیں آتی۔ دودھ کی رپورٹ آ جائے تو بات واضح ہو جائے گی۔''

''اس صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''اس کی ضد کا پتا چلائیں اور اسے پورا کریں۔'' ڈاکٹر جولیا کے لہجے میں الجھن تھی۔

''مگر اتنے چھوٹے بچے ضد نہیں کرتے۔''

ٹھاکر جانتا تھا کہ بچہ ضد کر رہا ہے لیکن وہ ڈاکٹر کو نہیں بتا سکتا تھا۔ ''کوئی اور صورت نہیں ہو سکتی۔'' اس نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اتنے چھوٹے بچے کو ڈرپ بھی نہیں لگائی جا سکتی۔''

''کیوں؟''

''بچہ روئے گا۔ ہاتھ پاؤں چلائے گا۔ تو الٹا لینے کے دینے پڑ جائیں گے اور پھر غذا کا کوئی بدل نہیں۔ آپ صرف یہ کر سکتے ہیں کہ زبردستی چمچے سے اسے دودھ دیں۔''

ذرا دیر میں دودھ کی رپورٹ بھی آ گئی۔ رپورٹ کے مطابق دودھ میں کوئی کمی کوئی خرابی نہیں تھی۔ ''میں نے کہا تھا نا۔'' ڈاکٹر نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ''دیکھیں مسٹر ٹھاکر بچے کی کنڈیشن میں دیکھ چکی ہوں۔ اتنا سا بچہ اور پھر غذا نہ لینا اور رونا۔ یہ تو دُہرا نقصان ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہا تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔''

ٹھاکر کے تو ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ ''ڈاکٹر، آپ میرے ساتھ چل نہیں سکتیں؟''

"چل تو سکتی ہوں لیکن فائدہ کچھ نہیں۔ بچے کو کوئی بیماری نہیں۔ وہ پوری طرح صحت مند ہے۔ میں کوئی مدد نہیں کرسکوں گی۔ بس آپ زبردستی اسے دودھ اور گلوکوز پلانے کی کوشش کریں اور کوئی صورت نہیں۔"

ٹھاکر گاؤں کی طرف جاتے ہوئے مایوس تھا!

❀......❀......❀

شام ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن بچہ کلی کر کے سب کچھ نکال دیتا تھا۔ اس کا رونے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ بس گھنٹے دو گھنٹے میں وہ ذرا سا شہد قبول کر لیتا تھا۔

پھر ایک تجربہ کار عورت نے ایک ترکیب بتائی۔ "بچے کا منہ کھول کر زبردستی چمچے سے دودھ اس کے منہ میں ڈالو۔ پھر اس کے کھلے منہ میں پھونک مارو۔ دودھ اس کے حلق سے اتر جائے گا۔"

اس ترکیب سے ابتدا میں فائدہ ہوا۔ دو چمچے دودھ ننھے ٹھاکر کے حلق سے اتر گیا۔ مگر پھر اسے پھندا لگ گیا۔ اس پھندے نے اسے اور نڈھال کر دیا۔ اب اس پر ایسی نقاہت طاری تھی کہ اسے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اب وہ رونے سے بھی گیا۔ اس میں ہاتھ پاؤں ہلانے کی سکت بھی نہیں رہی۔ ایک خرابی اور تھی۔ وہ رات سے اب تک جاگ رہا تھا جبکہ اتنے چھوٹے بچے زیادہ وقت سوتے ہیں۔

رات ہونے کو تھی۔ ٹھاکر کمرے میں موجود تھا۔ بچہ ٹھاکرانی کے پہلو میں بے سدھ لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں لیکن ان میں دھندلاہٹ نظر آ رہی تھی۔ اب اس میں کسی طرح کی سکت نہیں تھی۔ کمرے میں ٹھاکر، ٹھاکرانی اور بچے کے سوا کوئی نہیں تھا۔

ٹھاکر نے اسے ایک نظر دیکھا اور اس کے بعد ٹھاکرانی سے نظریں چرانے لگا۔ "بائیس سال بعد بھگوان نے ہم پر دیا کی ہے ناتھ۔" ٹھاکرانی نے کہا۔ "پھر ایسا کیوں ہے کہ آپ کو اس سے محبت نہیں ہے۔"

ٹھاکر کو ان لفظوں نے تڑپا دیا۔ "راجپوتوں کی محبت کا کب کسی کو پتا چلتا ہے رنجو۔" اس نے شاکی لہجے میں کہا۔

"یہ محبت ہے کہ آپ کا بچہ بھوک سے مر جائے۔ آپ کے پاس دولت ہو۔ دنیا کی ہر چیز ہو اور آپ اسے دودھ بھی نہ دے سکیں۔"

ٹھاکر کو غصہ آ گیا۔ "ہوش میں رہو ٹھاکرانی۔ تم کس سے بات کر رہی ہو۔" اس نے پرجلال لہجے میں کہا۔ "اور تمہیں احساس بھی نہیں کہ تم غلط بات کر رہی ہو۔ سب کچھ موجود ہے۔ ہر طرح کا دودھ میسر ہے۔ بچہ دودھ نہیں پی رہا ہے تو اس میں میرا کیا دوش۔ اور یہ بیماری بھی نہیں۔

ورنہ میں اپنی جاگیر لٹا کر بھی اس کا علاج کراتا۔"

"دودھ میسر ہے۔ بچہ پینا بھی چاہتا ہے۔" ٹھاکرانی کی رگوں میں بھی راجپوتی خون دوڑ رہا تھا۔ "لیکن آپ اجازت نہیں دے رہے ہیں۔ سچ سننے اور برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کیجیے ناتھ۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں اپنے بچے کو اس حمیدہ کا دودھ پینے دوں!" ٹھاکر کا لہجہ زہریلا تھا۔

"آپ کا بچہ یہی چاہتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ اس کی پہلی ضد ہے۔"

"یہ ضد پوری نہیں کی جا سکتی۔ دودھ خون ہوتا ہے پاگل عورت اور تم خوب جانتی ہو کہ یہ دھرم کی بات بھی ہے۔"

"معصوم بچہ یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ وہ ضد کر رہا ہے۔ وہ اپنی ضد نہیں چھوڑے گا۔ آپ ہی کا بچہ ہے وہ...... راجپوت بچہ۔ میں اس پر حیران ہوں کہ آپ اتنے چھوٹے سے بچے سے ضد کر رہے ہیں۔ کیسے پتا ہیں آپ۔"

"راجپوت بچہ!" ٹھاکر نے غصے سے کہا۔ "جمال دین کی بیوی کا دودھ پینے کے بعد وہ راجپوت بچہ نہیں رہے گا۔ خون میں ملاوٹ ہو جائے گی...... اور وہ بھی دوسرے دھرم کی۔ پھر تو وہ ہمارا بچہ بھی نہیں رہے گا۔ حمیدہ کا ہو جائے گا۔"

ٹھاکرانی کو بھی طیش آ گیا۔ "آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ اس طرح تو بکری کا دودھ پینے سے وہ منش ہی نہیں رہے گا۔ کیا بکری کا بچہ ہو جائے گا وہ؟ ایسا ہے تو اسے بکری کا دودھ پلانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں۔ اس طرح تو وہ بکری اس کی ماں ہو جائے گی۔"

ٹھاکرانی کی دلیل ایسی تھی کہ ٹھاکر کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ مگر معاملہ سنگین تھا۔ اس نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا "دیکھو رنجو، جانور اور منش میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ منش کے دودھ میں تاثیر ہوتی ہے، جانور کے دودھ میں نہیں۔ جس عورت کا دودھ پیے گا بچہ، اسی کی فطرت اختیار کرے گا، اس کی عادتیں، اس کے طور طریقے، اس کا رنگ ڈھنگ اپنائے گا۔"

"بچے کا جیون زیادہ ضروری ہے یا ان باتوں کا دھیان رکھنا؟" ٹھاکرانی نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"جیون تو بھگوان کی دین ہے، وہ جانے۔" ٹھاکر نے ہٹیلے پن سے کہا۔ "ہمیں تو انہی باتوں کا دھیان رکھنا ہے۔"

"تو اس کے لیے ہر مندر، ہر استھان پر جا کر پرارتھنا کیوں کی تھی؟"

"پرکھوں کی آن، پرکھوں کا مان ختم کرنے کے لیے نہیں کی تھی۔"

"چاہے نسل ختم ہو جائے۔" ٹھاکرانی نے ترکی بہ ترکی کہا۔

ٹھاکر لاجواب ہو گیا اور اس کے نتیجے میں جھنجلا گیا۔ "کچھ بھی ہو ٹھاکرانی۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے چلا گیا۔

ٹھاکرانی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر وہ بچے پر جھک گئی۔ اس نے بچے کو دودھ پلانے کی کوشش کی لیکن بچے کی نقاہت اپنی جگہ، منہ پھیرنے کی طاقت اس میں اب بھی موجود تھی۔

"ضد چھوڑ دو میرے لال۔ برسوں کے بعد جنم جلی ماں کے بھاگ جاگے ہیں تو تم اسے دکھ دے رہے ہو۔"

ٹھاکرانی اس وقت بچے کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ بچے کی آنکھوں میں واضح طور پر ایک پل کے لیے ایک تاثر سا چمکا۔ وہ اسے کوئی مفہوم نہ پہنا سکی۔ اور اگلے ہی لمحے بچے کی آنکھوں میں نقاہت کے سوا کچھ نہیں رہا۔

ٹھاکرانی منہ چھپا کر رونے لگی۔

❀.......❀.......❀

ٹھاکر اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ یہ اس کی خواب گاہ تھی۔ آدھی رات ہو چکی تھی۔ کئی گھنٹوں سے وہ اس کمرے میں بیٹھا تھا۔ کبھی وہ اٹھتا اور ٹہلنے لگتا، کبھی بیٹھ جاتا اور کبھی لیٹ جاتا۔ وہ بہت پریشان اور مضطرب تھا۔ اس کے دل و دماغ میں ایسی کشمکش برپا تھی، جس کا اس نے پہلے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اس کمرے میں اس کا اتنی جلدی آنا ایک نئی بات تھی۔ یہاں وہ صرف سونے کے لیے آتا تھا۔ آتا، لیٹتا اور سو جاتا۔ کبھی ٹھاکرانی اس کی سیوا کے لیے آ جاتی۔ اس کے سر میں تیل لگاتی، سر تھپکتی، ٹانگیں اور جسم دباتی اور وہ سو جاتا تو کمرے سے چلی جاتی۔

یہ کمرا ٹھاکر کی ذاتی ملکیت تھا۔ خاص ملکیت۔ اس کے بلائے بغیر یہاں ٹھاکرانی کے سوا کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ کسی کو بلانا ہوتا تو وہ بٹن دبا کر گھنٹی بجاتا۔ لیکن ایسا کم ہی ہوتا تھا۔ جاگیر کے معاملات وہ اس کمرے سے باہر ہی نمٹاتا تھا۔ وہ عام طور پر اپنے سارے کام، معاملات اور مشاغل سے نمٹ کر رات گئے ہی یہاں آتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ سرِ شام ہی یہاں آ گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ بہت پریشان تھا اور اسے تنہائی کی ضرورت تھی۔

ٹھاکر کی کشمکش بہت بڑی تھی۔ وہ اپنے پرکھوں کے ورثے کا امین تھا بے شمار روایات تھیں۔ بہت بڑی جاگیر تھی۔ پرجا تھی۔ ٹھاکروں کی آن بان تھی۔

جب وہ ادھیڑ عمری کی سرحد میں داخل ہو گیا اور وارث نہ ملا تو اسے دنیا کے سب سے بڑے خوف۔ نے گھیر لیا۔ کیا اس کی نسل اسی پر ختم ہو جائے گی؟ اس کے خاتمے کے ساتھ ہی اس کا، اس کی نسل کا، اس کے پرکھوں کا نام و نشان مٹ جائے گا؟ یہ جاگیر مالک سے محروم ہو کر مزارعوں میں

بٹ جائے گی؟ رشتے دار تو بہت تھے لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر بھگوان نے اسے اولاد نہیں دی تو یہی ہوگا۔ وہ ساری کی ساری زمین مزارعوں میں تقسیم کر دے گا۔ جاگیر دار رشتے داروں کی جاگیر بڑھانے کا فائدہ؟ یوں کم از کم مزارعے ہی اسے یاد رکھیں گے۔ اس کا نام تو لیتے رہیں گے۔

شادی کے تین سال بعد سے اسے الجھن شروع ہو گئی تھی۔ پہلی بار اسے پتا چلا کہ جینے کی خواہش کے بعد انسان کے اندر سب سے توانا خواہش اولاد کی ہوتی ہے۔ شاید اس لیے کہ اولاد کے ذریعے وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ بہر حال اس خواہش میں وہ بے چین رہنے لگا۔ ادھر ٹھاکرانی بھی اپنے عورت پن کی تکمیل کے لیے تڑپ رہی تھی۔

اس کے بعد طلب اور خوف کے انیس سال ایسے گزرے کہ جس نے جہاں کا بتایا کہ وہاں من کی مراد ملتی ہے، وہ اور ٹھاکرانی وہاں گئے۔ کوئی مندر، کوئی استھان، حتیٰ کہ کوئی مزار نہیں چھوڑا انھوں نے۔ لیکن مراد پوری نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ ان دونوں نے ایک ہی رات، ایک ہی خواب دیکھ لیا اور خوش خبری دینے والے اس خواب میں حوالہ کسی بڑے استھان کا نہیں، برگد کے اس درخت کا تھا، جہاں انھوں نے چڑھاوا چڑھایا تھا۔ منت مانی تھی۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو احساس تھا کہ بھگوان نے اسے ایک غیر معمولی بچہ دیا ہے۔ شروع ہی سے واقعات اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ پہلی بات تو یہی تھی کہ جہاں انھوں نے اولاد کے لیے منت مانی تھی، وہ درخت ہی جل گیا تھا اور اس درخت کے جلنے کے بعد میں بچہ ٹھاکرانی کے پیٹ میں آیا تھا اور اس سے پہلے اس نے اور ٹھاکرانی نے بیک وقت خوش خبری والا وہ خواب دیکھا تھا۔ اس خواب میں خوش خبری کے ساتھ انھیں ہدایات بھی دی گئی تھیں۔ ان ہدایات کا خلاصہ یہ تھا کہ بچے کی پرورش کرنا اور اس سے محبت کرنا ان کا کام ہے۔ لیکن اس کی تعلیم و تربیت میں انھیں دخل نہیں دینا ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف نہیں کرنا ہے۔ پھر زور دے کر کہا گیا تھا کہ بچے کے ساتھ کسی بھی معاملے میں زبردستی نہ کی جائے۔

اب ٹھاکر ان ہدایات پر غور کر رہا تھا۔ بچے کی پرورش اور اس سے محبت کرنے کی ہدایت! لیکن کیوں؟ یہ دونوں کام تو ہر بچے کے ماں باپ کرتے ہیں۔ کون ہے جو اپنے بچے کی پرورش نہیں کرتا۔ کون ہے جو اپنے بچے سے محبت نہیں کرتا اور پھر وہ لوگ جو بائیس برس سے اولاد کے لیے ترس رہے ہیں۔ ان کی محبت کی تو کوئی حد ہی نہیں ہوگی۔ وہ تو اور کچھ کر ہی نہیں سکتے محبت کے سوا۔ پھر یہ ہدایت کیوں...... یہ تاکید کیوں؟ کوئی نکتہ ہے اس میں۔ بہت غور کرنے پر تعلیم یافتہ ٹھاکر کی سمجھ میں بس اتنا آیا کہ شاید یہ کوئی پیش گوئی ہے۔ پیش گوئی کہ یہ بچہ شاید ایسا ہو کہ ماں باپ اس کی پرورش سے گھبرا جائیں۔ بائیس برس بعد ملنے والی اولاد ایسی ہو کہ ان کے لیے اس سے محبت کرنا ممکن نہ رہے۔ اسی صورت میں انھیں اس بات کی تاکید کی جا سکتی ہے۔ مگر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ خود سے اس سے محبت، نہ کر پائیں۔ بلکہ تاکید کی وجہ سے محبت کریں۔

ٹھاکر نے خود کو ٹٹولا۔ ایک دن کے بیٹے پر اسے ایسی محبت آئی تھی کہ بیٹا اس محبت کے عملی اظہار کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور بچے کے لیے ٹھاکرانی کی محبت تو اس کے انگ انگ سے بول رہی تھی۔ وہ تو برستی محسوس ہو رہی تھی۔

تو اب...... کسی بھی معاملے میں زبردستی نہ کی جائے...... کا مطلب یہ ہے کہ بچے کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے جائیں؟ بچے کی زبردستی کے سامنے سر جھکا دیا جائے؟ اور پرکھوں کی آتماؤں کو ہمیشہ کے لیے دکھ میں مبتلا کر دیا جائے؟ اپنی آن...... اپنے خالص اور پوتر خون کا غرور خاک میں ملا دیا جائے؟ نہیں...... نہیں...... یہ تو ممکن ہی نہیں۔

پھر اسے مجذوب کی باتیں یاد آئیں۔ مجذوب نے کہا تھا...... وہ تجھے ملا، یہ رب کا احسان ہے تجھ پر۔ تیری سمجھ میں اس کی باتیں نہیں آئیں گی۔ بحث نہ کرنا۔ سختی نہ کرنا اس پر اس کو کسی بات سے مت روکنا۔ اس کی بات مان لیا کرنا۔ اس کا دل میلا نہ ہونے دینا۔ اس کا بن کر رہنا۔ تیرا ہی بھلا ہے اس میں۔

اب ٹھاکر ان باتوں پر غور کر رہا تھا۔ اتنے چھوٹے سے بچے سے نہ بحث کی جا سکتی ہے، نہ اس پر سختی کی جا سکتی ہے۔ مگر وہ ننھا نا سمجھ وہ مانگ رہا تھا جو اسے نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اور وہ چیز بھی کوئی معمولی چیز نہیں، جیون دھارا تھی وہ۔ جس کے بغیر جیا ہی نہیں جا سکتا۔ اب یہ کیسے مان لیا جائے۔ ٹھاکر کی سمجھ میں یہ نکتہ یوں آیا کہ بچے کو اس کی مرضی کا دودھ نہ دینا سختی ہی ہے اس کے لیے...... یہ وہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔

اور پھر ٹھاکر کو آج صبح کی بات یاد آئی...... پنڈت روپ سہائے کی بات! پنڈت نے جو آگے کی باتیں کی تھیں، وہ تو کہانی لگتی تھی۔ پر اس نے یہ بھی کہا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر اپنا بھاگیہ آپ لکھیں گے۔ جو چاہیں گے، لکھیں گے...... اور وہی کچھ ہوگا۔ بھگوان نے بڑی شکتی دی ہے انہیں۔

یہ سب باتیں پریشان کرنے والی تھیں۔ بچے کی زندگی خطرے میں تھی، اس بچے کی جو ٹھاکر کی زندگی کی اکلوتی کمائی تھا۔ ایسے میں اسے مجذوب کی ایک بات یاد آئی تو اس کی ڈھارس بندھی۔ مجذوب نے کہا تھا...... چراغ جس نے روشن کیا ہے، اس کی حفاظت بھی وہی کرے گا لیکن تو اس کے سامنے ہوا کے لیے آڑ بن کر کھڑا ہوگا تو تیرا ہی بھلا ہوگا۔ چراغ کو تو روشن ہی رہنا ہے اور کوئی نہیں بجھا سکتا۔

ٹھاکر کے ذہن میں ایک ہی جملہ گونجتا رہا۔ ''چراغ کو تو روشن ہی رہنا ہے۔'' باقی سب کچھ مٹ گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ بچے کو کچھ نہیں ہوگا۔ بس پھر ٹھیک ہے اور کیا چاہیے مجھے۔

اس جملے نے ٹھاکر کی پریشانی دور کی اور اسے تھپک تھپک کر سلا دیا۔ پھر اچانک ہی وہ خواب شروع ہو گیا مگر اس بار بشارت دینے والی کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ''کیوں رے ناشکرے۔'' اس نے گرج کر کہا۔ ''آ گیا نا اپنی اوقات پر......

احسان فراموش۔''

ٹھاکر سہم گیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ لیے۔ مجھ سے کیا بھول ہو گئی مہاراج۔''

''اکڑ کو بھول کہتا ہے۔ بچے کی جان پر بن گئی اور تو کہتا ہے کہ کیا بھول ہو گئی۔''

''میں کیا کروں مہاراج؟''

''دودھ پلوا بچے کو۔''

''وہ پیتا ہی نہیں۔''

''جو مانگتا ہے، وہ دے اسے۔''

''یہ نہیں ہو سکتا مہاراج۔'' ٹھاکر ہاتھ جوڑ کر گھگھیایا ''ٹھاکروں کے خون میں ملاوٹ کیسے کروں۔ پرکھوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔''

''اس وقت تیری ٹھاکری کہاں تھی، جب تو بچے کے لیے بے جان اور حقیر چیزوں کے سامنے ماتھا ٹیکتا تھا۔ منتیں مانتا تھا۔'' بزرگ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''وہ مل گیا تو تیری ٹھاکری جاگ اٹھی۔ احسان بھول گیا۔ کیا اب اسے مارنا چاہتا ہے۔''

ٹھاکر مسکرایا۔ ''میں جانتا ہوں مہاراج۔ وہ جیے گا۔ بھگوان اسے مرنے نہیں دے گا۔'' اس نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

''اوہ...... تو یہ اکڑ بھی ہے۔'' بزرگ نے پرجلال لہجے میں کہا۔ ''تو ٹھیک کہتا ہے۔ وہ جیے گا۔ لیکن تیرا نہیں رہے گا۔''

ٹھاکر لرز کر رہ گیا۔ ''کیا مطلب مہاراج؟''

''جیسے اس کا کمرا بدلا جا سکتا ہے، ویسے ہی گھر بھی بدلا جا سکتا ہے۔''

ٹھاکر گنگ ہو کر رہ گیا۔ یہ بات وہ کیسے بھول سکتا تھا۔

''اور ایک بات سن۔ تجھے بچہ برگد کے اس پیڑ نے نہیں دیا تھا، جہاں تو نے منت مانی تھی۔''

ٹھاکر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

''تجھے خوش خبری ملنے سے پہلے ہی وہ تو جل گیا تھا نا۔''

ٹھاکر کو یاد تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''جو اپنی زندگی کے لیے خود محتاج ہے، وہ کسی کو کچھ دے سکتا ہے۔ تجھے یہ بیٹا اس نے دیا ٹھاکر، جو سب کا مالک ہے۔ جو نہ سوتا ہے، نہ اونگھتا ہے۔ موت اس کے حکم کی محتاج ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں۔ یہ بچہ اس کی دین ہے۔ زندگی اس کے حکم سے ہے۔ وہ جو چاہتا ہے، وہی ہوتا ہے۔ تیرے بچے کے معاملے میں اسی کا فیصلہ چلے گا۔ جیسے کمرا بدلا تھا، گھر بھی بدل سکتا ہے۔ تیرے بچے کو اس کا من پسند دودھ پلوانے کے لیے لے جایا بھی جا سکتا ہے۔ کون روکے ٹھاکر اسے؟ تو روک سکتا ہے۔ زندگی تو جاری رہے گی۔ ماں باپ بدل جائیں گے۔ یہ بھی کوئی بڑی

بات نہیں۔''

''تجھ پر احسان کیا گیا تو احسان مان۔ تجھے امانت دی گئی تو اس کی قدر کر۔ اس کے سوا سب کچھ بھول جا۔ زندگی سنور جائے گی۔''

''ٹھیک ہے مہاراج۔ میں ایسا ہی کروں گا۔''

''اور خود سے سمجھنے کی عادت ڈال۔ کیا ہمیں ہی زحمت دیتا رہے گا؟''

''نہیں مہاراج۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔''

اور ٹھاکر کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ چند منٹ وہ اس خواب پر غور کرتا رہا...... اور پھر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ سچی بات تو یہی تھی کہ بچے کی زندگی سب سے اہم تھی۔ وہ اسے کیسے کھونے دیتا۔ اس کی زندگی بچانے کے لیے تو وہ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ وہ واقعی ناقدری کر رہا تھا۔ خوامخواہ بچے کو اتنی تکلیف دی اس نے۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا!

ٹھاکرانی رو رہی تھی۔ اسے ٹھاکر کے آنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ وہ مایوس تھی۔ ٹھاکر فیصلہ کر چکا تھا اور اب اس سے ہٹنے والا نہیں تھا اور ٹھاکرانی جانتی تھی کہ بچہ اب زیادہ دیر بھوک نہیں جھیل سکے گا۔ ایک ہی امید تھی...... اور وہ یہ کہ بچہ ضد چھوڑ دے...... اور یہ نہ پتا تو...... اس کے بعد کی بات ٹھاکرانی سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ بس رو سکتی تھی۔

ٹھاکر کمرے میں آیا تو وہ حیران ہوئی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ شانتا ایک کونے میں بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ ٹھاکر کے قدموں کی چاپ سن کر اس نے آنکھیں کھولیں اور گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پرنام مالک۔'' اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

ٹھاکر نے بچے کو دیکھا جو ٹھاکرانی کے پہلو میں لیٹا تھا۔ پھر اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''شانتا، جا...... تو جا کر سو جا آرام سے۔''

شانتا نے یوں دیکھا، جیسے اس کی سمجھ میں بات نہیں آئی ہو۔

''اب تیری ضرورت صبح کے وقت پڑے گی۔ رات کی تیری چھٹی۔''

شانتا کمرے سے چلی گئی تو ٹھاکر نے ٹھاکرانی سے وضاحت کی۔ ''اس کے سامنے بات نہیں کی جاسکتی تھی۔''

ٹھاکرانی نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ مگر سچ یہ ہے کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

ٹھاکر چند لمحے کھڑا بچے کو غور سے دیکھتا رہا۔ بچے کے چہرے سے نقاہت عیاں تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ٹھاکر نے بڑی محبت سے اسے پکارا۔ ''چھوٹے ٹھاکر، کیا بات ہے۔ آپ ایسے کیوں ہوگئے؟ ٹھاکر لوگ ایسے ہمت نہیں ہارتے۔''

یہ کہنا غضب ہوگیا۔ بچے نے آنکھیں کھولیں اور اگلے ہی لمحے چنگھاڑ چنگھاڑ کر رونے

لگا۔ یہ گویا باپ کی بات کا جواب تھا۔ ٹھاکر بچے نے نہ ہمت ہاری تھی اور نہ ہی اپنی ضد چھوڑی تھی۔

ٹھاکر کو حیرت ہوئی۔ بچے کی آنکھوں سے جھلکنے والی نقاہت بہت خوفناک تھی اور اس نقاہت میں وہ اپنی پوری طاقت سے رو رہا تھا۔ ٹھاکر کو خوف آنے لگا۔ کہیں بچے کو کچھ ہو نہ جائے۔ اس نے بچے کو گود میں اٹھا کر چمکارا۔ ''نا چھوٹے ٹھاکر، نا۔ آپ کو رونے کی ضرورت نہیں۔''

روتا ہوا بچہ ایک دم چپ ہوگیا۔

''میں نادان تھا چھوٹے ٹھاکر۔'' ٹھاکر پرتاپ سنگھ اب خود کلامی کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''مجھے سب کچھ بتا دیا گیا۔ لیکن میں سمجھا کچھ نہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ آپ سے ضد نہیں کرنی، بس آپ کی ماننی ہے۔ میں نے سوچا، آپ اتنے چھوٹے ہیں۔ ضد نہیں کرسکتے۔ مجھے بتایا گیا کہ آپ اپنا بھاگیہ خود لکھیں گے۔ میں نے سوچا، اس وقت تا جب لکھنا سیکھیں گے۔ میں نادان تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آپ نے اپنا بھاگیہ آپ لکھنا شروع کردیا ہے۔ اب میری سمجھ میں آرہا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ جو آپ مانگیں گے، ملے گا آپ کو۔ اب رویئے گا نہیں۔''

ٹھاکرانی یہ سب کچھ سن اور دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ مگر آخری بات اس کی سمجھ میں خوب آگئی۔ ''تو ٹھاکر جی، کیا حمیدہ......؟''

''ہاں رنجو۔ میں ابھی حمیدہ کو لینے جا رہا ہوں۔''

''آپ؟'' ٹھاکرانی کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں رنجو، میں خود جاؤں گا۔''

''شانتا کو بھیج دیں۔ کسی نوکر کو بھیج دیں۔''

''نہیں رنجو، غرض میری ہے۔ میں خود جاؤں گا۔ جب کسی سے کچھ مانگنا ہو...... اور وہ بھی جیون جیسی چیز، تو بھکاری بن کر مانگنا چاہیے۔ بادشاہ بن کر نہیں۔ میرا بس چلتا تو میں چھوٹے کو لے کر حمیدہ کے دروازے پر جاتا۔'' وہ کہتے کہتے رکا اور چند لمحے سوچ کر بولا۔ ''لیکن رنجو! ایک بات یاد رکھنا، یہ بات سب سے چھپانی ہے سب سے۔ کسی کو پتا نہ چلے کہ چھوٹا حمیدہ کا دودھ پیتا ہے۔ یہ تمہاری ذمے داری ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو چھوٹا خود جا کر حمیدہ سے دودھ مانگتا۔''

''آپ فکر نہ کریں ناتھ۔'' ٹھاکرانی نے سکون کی سانس لی۔

''میں چلتا ہوں'' ٹھاکر نے کہا۔ پھر اس نے جھک کر بچے کی پیشانی چوم لی۔ ''اب رونا مت چھوٹے'' اس نے کہا۔ ''میں تمہاری من پسند چیز لینے جا رہا ہوں۔''

ٹھاکر حویلی سے نکلا تو رات کے دس بجنے والے تھے۔ گاؤں میں یہ وقت آدھی رات کے برابر تھا۔

❀......❀......❀

ننھا وصال دودھ پی کر سو چکا تھا۔ حمیدہ اور جمال دین سونے کے لیے لیٹ چکے

تھے۔ لیکن نیند حمیدہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ بہت بے چین تھی۔ سینے میں جیسے لاوا سا دہک رہا تھا۔ سکون صرف ایک ہی صورت میں مل سکتا تھا اور وہ یہ کہ وہ دھماکے سے پھٹ جاتی اور اندر کھولنے والا لاوا باہر نکل آتا۔ وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ عجیب سی اذیت سے دوچار تھی وہ۔ دودھ پلانے کی ایسی طلب اسے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی کہ دودھ پلا کر بھی اسے چین نہیں آتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بستر پر لیٹنا بھی اس کے لیے اذیت ناک ہو گیا۔ لیکن وہ اٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جمال دین کی آنکھ کھلے اور اس کی نیند خراب ہو۔ مگر جب یہ اذیت اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی تو وہ بستر سے اٹھ گئی۔ ویسے بھی اس کا اندازہ تھا کہ جمال دین اب تک سو چکا ہو گا۔

وہ کمرے سے نکلی اور گھر کے صحن میں آ گئی۔

اُدھر جمال دین کو نیند تو آ رہی تھی۔ لیکن پلنگ پر زلزلہ سا آیا ہوا ہو تو آدمی کیسے سو سکتا ہے۔ حمیدہ بے چین تھی اور کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی۔ جمال دین کی نیند گہری ہونے سے پہلے ہی اُچٹ جاتی تھی۔ آخر میں اس کی نیند بالکل ہی اُڑ گئی۔ وہ حمیدہ کے بارے میں سوچنے لگا۔

ضرور کوئی خاص بات تھی۔ ورنہ حمیدہ تو بے سدھ ہو کر سونے والی تھی۔ جس کروٹ سے سوتی، جاگتی بھی اسی کروٹ سے تھی اور یہ تبدیلی گزشتہ رات سے آئی تھی۔ کل رات بھی وہ بے چین تھی۔ بار بار اٹھ کر وصال دین کو دودھ پلاتی تھی۔ پھر دن میں بھی اس کا حال عجیب رہا تھا۔ کئی غیر معمولی باتیں ہوئی تھیں دن میں۔ اور لگتا تھا کہ حمیدہ کو کسی کا انتظار ہے۔ پھر جب حویلی سے بلاوا آیا تھا تو دستک ہوتے ہی اس نے کپڑے بدلے تھے اور تیار ہو گئی تھی، جیسے وہ اس دستک ہی کی منتظر ہو اور وہ کیسی بے قرار ہو کر حویلی جانے کے لیے نکلی تھی۔

یہ سب یاد کر کے جمال دین کے دل میں ہول اٹھنے لگا۔ دماغ میں اندیشے سرسرانے لگے۔ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں...... کل رات حویلی سے واپسی پر ہی حمیدہ بے چین ہوئی تھی۔ وہاں کوئی بات......

اسی لمحے حمیدہ بڑی آہستگی سے بستر سے اٹھی اور صحن کی طرف چل دی۔

جمال دین کا دل عجیب انداز میں دھڑکا۔ اب وہ شک کی آگ میں جل رہا تھا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ وہ بھی بستر سے اٹھا اور دبے پاؤں صحن کی طرف چل دیا۔ کمرے کے دروازے کی چوکھٹ پر وہ ٹھٹھک گیا۔

اس کا خیال تھا کہ حمیدہ دروازہ کھول کر گھر سے باہر گئی ہو گی۔ لیکن وہ تو صحن میں ہی تھی۔

وہ پورے چاند کی رات تھی۔ صحن چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ سب کچھ بہت صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کھیت کرتی چاندنی میں جمال دین نے حمیدہ کو دیکھا اور دہل کر رہ گیا۔ وہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر یوں تیز قدموں سے ٹہل رہی تھی، جیسے اس کے پیروں کے نیچے

انگارے بچھے ہوں۔ اس کے چہرے پر ایسی وحشت تھی کہ جمال دین نے پہلے نہیں دیکھی تھی اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سینے کو نوچ رہی تھی۔

حمیدہ کی اس کیفیت نے جمال دین کو اور ہراساں کر دیا۔ ''حمیدہ...... او حمیدہ'' اس نے سرگوشی میں پکارا۔

اس کی آواز سنتے ہی حمیدہ جیسے بت بن گئی۔ اس کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے۔ ہاتھ سینے پر جمے رہے۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ جمال دین وہاں ہیولا سا نظر آ رہا تھا۔ ''آپ کیوں اٹھ گئے ہو جی؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

جمال دین نے قدم بڑھایا اور صحن میں آ گیا۔ ''بات کیا ہے حمیدہ؟ کل سے تمہارا یہی حال ہے۔''

''کوئی بات نہیں جی۔ بس نیند نہیں آ رہی ہے۔''

''بات تو ہے۔ کل رات تم حویلی سے آئی ہو تو اس حال میں ہو۔'' اب کے جمال دین کا لہجہ سخت تھا۔

حویلی کے حوالے پر حمیدہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ ''کک...... کچھ...... کچھ بھی تو نہیں۔'' وہ ہکلائی۔

جمال دین کا دل بیٹھنے لگا۔ ''حمیدہ...... کوئی روگ تو نہیں لگا لائی تو؟'' اس کے لہجے میں اندیشوں کی سرسراہٹ تھی۔

حمیدہ کو جھٹکا سا لگا۔ جیسے کسی نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا ہو۔ اس نے شکایتی نظروں سے شوہر کو دیکھا۔ ''آپ میرے بارے میں ایسا بھی سوچ سکتے ہو جی!''

''تو تیری حالت دیکھ کر اور کیا سوچوں۔''

''روگ تو لگا ہے جی۔ پر عزت کا، آبرو کا نہیں۔ ایسا ہونے سے پہلے تو میں مر جاؤں۔''

حمیدہ کے لہجے کی سچائی نے جمال دین کے دل کو چھو لیا۔ اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔ ''تو پھر کیسا روگ لگا ہے ری۔''

''یہ ماما کا روگ ہے وصال کے ابا۔''

یہ جواب جمال دین کے لیے اور معما تھا۔ وہ جھنجلا گیا۔ ''صاف بات کر حمیدہ۔''

''اتنا کافی نہیں کہ بات تمہاری عزت اور میری آبرو کی نہیں؟''

''نہیں۔ تو مجھے سب کچھ بتا دے۔''

حمیدہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر نظریں جھکا کر بولی۔ ''پر کسی کو بتانا نہیں۔''

حمیدہ بولتی رہی۔ جمال دین سنتا رہا۔ اس کا دل خوف سے بھرتا جا رہا تھا۔ سب کچھ سننے کے بعد اس نے کہا۔ ''تو آگ سے کھیل رہی ہے حمیدہ۔ دیکھ یہ دین دھرم کے گورکھ دھندے

ہیں۔ان میں خود کو الجھانا ٹھیک نہیں۔"

"میں بھی جانتی ہوں۔ پر کیا کروں۔ میں مجبور ہوں۔"

"یہ خیال دل سے نکال دے۔ یہ تیرا حق بھی نہیں ہے۔"

"میں یہی چاہتی ہوں۔مگر مجبور ہوں۔خود پر زور بھی تو نہیں چلتا۔" حمیدہ کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"کیسے نہیں چلتا۔ تجھے خود کو سنبھالنا ہوگا۔ میں کوئی مجبوری نہیں جانتا۔ پھر یہ تو سوچ کہ ٹھاکر جی کے کتنے احسان ہیں ہم پر۔"

"تم کیسے سمجھو گے۔ مرد ہو نا، تمھیں کیا معلوم۔ دودھ کا ابال کیا ہوتا ہے۔ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔"

"میں صرف یہ جانتا ہوں کہ ٹھاکر جی کو پتا چل گیا تو وہ ہمیں تباہ کر دیں گے۔"

"میں نہیں جانتی کہ میں ایسی بے بس کیوں ہو گئی ہوں......"

یہ وہ لمحہ تھا کہ جمال دین کا ہاتھ اٹھنے والا تھا۔ مگر اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ بے وقت کی دستک تھی۔ جمال دین گھبرا گیا۔ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ جیسے پتھر کا بن گیا۔ دستک دوبارہ ہوئی تو وہ چونکا۔"تو اندر جا حمیدہ میں دیکھتا ہوں۔ اتنی رات کو کسی کا آنا خیر تو نہیں۔"

حمیدہ کمرے میں چلی گئی۔ جمال دین دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے کنڈی کھولی۔مگر دروازہ کھلتے ہی وہ حیران رہ گیا۔ ایک بار پھر وہ بت بن کر رہ گیا......

❁......❁......❁

گاؤں میں سناٹا تھا۔ اِدھر اُدھر گھومنے والے آوارہ کتوں کے سوا کہیں کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ بھی اچھا تھا کہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو جمال دین کے دروازے پر جاتے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ اس وقت متضاد جذبوں کا اسیر تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی کچھ مانگنے کی، اسی لیے پہلی بار جب اولاد کے لیے منت ماننے وہ مندر گیا تو اسے عجیب سا لگا۔ اسے حیرت بھی ہوئی کہ اس سے پہلے اس نے بھی بھگوان سے بھی کچھ نہیں مانگا تھا۔ وہ راجپوت تھا اور اس کے پاس دو طرح کی طاقت تھی۔ ایک دولت کی، جس کے زور پر کچھ بھی خریدا جا سکتا تھا۔ اور دوسری طاقت اپنے بازوؤں کی تھی۔ لیکن ان دونوں کے استعمال کی بھی اسے کبھی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ طبعاً وہ نیک اور شریف النفس تھا۔ اس نے کبھی ایسی کوئی خواہش ہی نہیں کی۔ وہ تو ہمیشہ دوسروں کو دیتا ہی رہا تھا۔

تو جب پہلی بار مندر میں اس نے بھگوان کی مورتی کے سامنے ماتھا ٹیک کر اولاد کے لیے پرارتھنا کی تو وہ اپنے اندر بہت شرمندہ ہوا۔ شرمندگی اس بات کی بھی تھی کہ وہ کچھ مانگ رہا ہے اور

اس بات کی بھی کہ اس سے پہلے اس نے بھگوان سے کسی بھی طرح کا تعلق رکھا ہی نہیں تھا۔ اس نے کبھی پوجا بھی نہیں کی تھی اور اس وقت اپنی غرض سے اس کے سامنے سر جھکاتے ہوئے بھی اس کے دل میں کوئی جذبہ نہیں تھا۔ عبودیت کا احساس تک نہیں تھا اسے۔

پہلی بار اسے پتا چلا کہ منش کے پاس کتنی ہی طاقت ہو، وہ بہرحال غرض مند ہوتا ہے اور اس پر بے بسی پر طاری ہوتی ہے۔ اگلے اٹھارہ برسوں میں کون سی ایسی چوکھٹ تھی، جہاں اس نے سر نہ جھکایا ہو۔ اس نے سادھوؤں کے پیر چھوئے، درختوں کے سامنے ماتھا ٹیکا، اولاد کی طلب نے اسے بھکاری بنا دیا۔ کبھی کبھی راج پوت کی انا کے زخم سے ٹیسیں اٹھتیں تو وہ سوچتا...... کوئی بات نہیں۔ بھگوان کے سامنے ہی تو ہاتھ پھیلائے ہیں نا، جس سے راجے مہاراجے بھی بھیک مانگتے ہیں۔ یہی ایک مقام تو ہے، جہاں ہر منش جھکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

وہ بھکاری بن کر پھرتا رہا۔ آخر اسے بیٹا مل گیا اور اب وہ بیٹا اس سے ایک ایسی چیز مانگ رہا تھا، جو اس کے اور اس کی پتنی کے پاس نہیں تھی۔ وہ چیز بھگوان کے پاس بھی نہیں تھی۔ ہاں...... ایک منش کے پاس تھی۔ سو اس کے لیے اب اسے ایک منش کے سامنے ہاتھ پھیلانا تھا اور منش بھی وہ جس کا دھرم ہی دوسرا تھا اور وہ اس کا مزارعہ تھا، جسے اس نے زمین بخش دی تھی۔ وہ منش آج تک اس کا احساس مانتا تھا۔ مگر آج کے بعد صورت حال الٹ جائے گی۔ اب وہ اس کا احساس مانے گا...... مانتا رہے گا...... جیون بھر!

یہ سوچتے ہوئے ٹھاکر کا جی چاہا کہ پلٹ جائے۔ مگر کم وقت میں اتنا کچھ ہو چکا تھا، اس نے اتنا کچھ دیکھ لیا تھا کہ باتیں۔ مشکل باتیں بھی اس کی سمجھ میں آنے لگی تھیں...... بھگوان کی باتیں! اور وہ اتنی مشکل سے ہاتھ آنے والے بیٹے کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ یہ سچ سہی کہ جس نے چراغ جلایا ہے، وہ اسے بجھنے نہیں دے گا۔ لیکن وہ اسے ناقدرا سمجھ کر اسے اس سے چھین لے اور کسی قدر رواں کو دے دے تو اسے کون روک سکتا ہے اسے؟ پھر اس کی حویلی میں تو اندھیرا ہوگا، اور چراغ کسی اور کے گھر کو روشن کر دے گا۔ نہیں...... یہ تو وہ گوارا نہیں کر سکتا۔ اتنے برسوں کے بعد تو کہیں ہردے میں روشنی ہوئی ہے......

اور یہ کتنی عجیب بات تھی کہ اس کے گاؤں میں وہی ایک مسلمان پریوار تھا۔ وہ خود اس پریوار کو دوسرے گاؤں سے، ان پر مہربانی کر کے، انھیں بچا کے یہاں لایا تھا۔ اس دن کے لیے! یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ مگر بھگوان تو جانتا تھا۔ یہ تو وہ اب سمجھ رہا تھا کہ اس وقت اس نے ان پر نہیں، خود پر احسان کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کا احسان مانتے ہیں۔ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ شاید اگر وہ جمال دین سے جان بھی مانگ لے تو وہ انکار نہ کرے۔ لیکن وہ...... ٹھاکر پرتاپ سنگھ مانگنے والا تو نہیں تھا۔ یہ الگ بات کہ مانگنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ چھوٹے نے...... اس کے چھوٹے ٹھاکر نے اپنے دودھ کے لیے اسی گھر کی عورت کو پسند کیا تھا۔

تو اب وہ ان کے سامنے جھولی پھیلائے گا۔ ان سے بھیک مانگے گا!

یہ سوچ کر اس کے قدم پھر ٹھٹکے ۔ یہ ضروری تو نہیں کہ وہ خود جا کر سوال کرے، ضرورت کی جھولی پھیلائے۔ وہ ٹھاکرانی سے کہہ کر حمیدہ کو حویلی میں بلوا بھی سکتا ہے۔ کیوں نہیں۔ وہ یہاں کا مالک ہے۔ ٹھاکرانی نے بھی تو یہی کہا تھا لیکن اس نے خود ہی تو منع کر دیا تھا۔ مانگنا ہے تو آدمی مانگنے والوں کی طرح مانگے۔ مانگنے کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں۔

پھر ایک اور بات بھی تھی۔ اس طرح دوسروں کو شبہ ہو سکتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ منہ چھپانا بزدلی ہے جو راجپوتوں کے شایانِ شان نہیں اور وہ بازار میں ملنے والی کوئی عام چیز تو نہیں مانگ رہا ہے۔ ورنہ وہ اس چیز کو خرید ہی نہ لیتا۔ اس عورت حمیدہ کا اپنا ایک بچہ ہے، جس کا اس کے دودھ پر حق ہے اور اس کا پتی ہے، جس کی اجازت کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ اس سے اجازت لینا بھی ضروری ہے اور پھر اس کا صلہ دینا بھی ضروری ہے۔

ٹھاکروں کی گڑھی کے ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ مانگنے کے آداب خود بہ خود سیکھ رہا ہے۔

ٹھاکر چونک کر رکا۔ وہ منزل پر پہنچ چکا تھا۔ سامنے جمال دین کے گھر کا دروازہ تھا۔ ایک بار پھر اس کی راجپوتی آن نے اسے اکسایا کہ وہ پلٹ جائے لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور کنڈی ہلا دی......

❀......❀......❀

اتنی رات کو ٹھاکر کو اپنے دروازے پر کھڑا دیکھ کر جمال دین کے اوسان خطا ہو گئے۔ ابھی تو حمیدہ نے دھماکہ کیا تھا۔ وہ سمجھا کہ ٹھاکر کو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ ''ٹھاکر جی، آپ......؟ اور اس وقت؟'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ پھر اس نے جلدی سے اضافہ کیا۔ ''خیریت تو ہے ٹھاکر جی؟''

ٹھاکر نے جمال دین کو بہت غور سے دیکھا۔ دروازہ کھلنے میں دیر لگی تو اس نے سوچا کہ وہ لوگ یقیناً سو رہے ہوں گے۔ کام اتنا ضروری نہ ہوا تو وہ واپس چلا جاتا مگر اسے نہ چاہتے ہوئے بھی دوبارہ دستک دینی پڑی لیکن جمال دین کا چہرہ دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ سوتے سے اٹھا ہے۔ وہاں تو جگار ہی جگار تھی۔

ٹھاکر کو اس طرح گھورتے دیکھ کر جمال دین اور گڑبڑا گیا۔ اسے بس یہی خیال آیا کہ ٹھاکر کو حمیدہ کی خواہش اور ارادے کا پتا چل گیا ہے اور اب وہ انھیں سزا دینے کے لیے آیا ہے۔ ورنہ اتنی رات کو وہ یہاں کیوں آتا۔ ''حکم کریں ٹھاکر جی۔'' اس نے کہا۔ پھر فوراً ہی اسے اپنی بدتمیزی کا احساس ہوا۔ وہ بیچ دروازے میں کھڑا تھا اور اس نے ٹھاکر کو اندر آنے کے لیے بھی نہیں پوچھا تھا۔ اس نے جلدی سے دروازے سے ہٹ کر ٹھاکر کو راستہ دیا۔ ''اندر آئیں نا ٹھاکر جی۔''

ٹھاکر نے چوکھٹ پار کی اور صحن میں آیا۔ جمال دین نے صحن میں پڑی چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ ''بیٹھیں ٹھاکر جی۔''

ٹھاکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مگر وہ مضطرب تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کس طرح شروع کرے۔

جمال دین اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں کیا خدمت کروں آپ کی ٹھاکر جی۔''

''وہ...... میں...... تمہاری بیوی کہاں ہے جمال دین؟'' ٹھاکر کو کہتے کہتے خود بھی اپنی بات کے احمقانہ ہونے کا احساس ہونے لگا۔ ظاہر ہے، وہ سو رہی ہوگی۔

لیکن جمال دین بیوی کے حوالے پر اور بوکھلا گیا۔ اس کا خدشہ سچ ثابت ہو رہا تھا۔ ''اسے معاف کر دیں ٹھاکر جی۔ وہ نادان ہے...... دیوانی ہے۔ جو سوچنا بھی نہیں چاہیے، وہ، وہ کرنا چاہتی ہے۔ آپ معاف کر دیں اسے۔ میں اب اسے ایسا سوچنے بھی نہیں دوں گا۔''

ٹھاکر اچنبھے میں پڑ گیا۔ اس نے کہا۔ ''مجھے نہیں پتا جمال دین کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ پر میں تو حمیدہ سے ملنے آیا ہوں۔ مجھے ایک ضروری بات کرنی ہے، اس سے۔ ایک بنتی کرنی ہے۔ وہ سو رہی ہے کیا؟''

''جج...... ہاں...... جی...... نہیں۔ وہ سو رہی ہے۔'' جمال دین بوکھلا گیا۔

''میں اتنی تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ پر یہ ضروری ہے۔ تم جگا دو اسے۔''

ٹھاکر کے جملے کا پہلا حصہ تو جمال دین کے سر پر سے گزر گیا۔ اس نے آخری حصہ سنا اور دہل گیا۔ وہ جلدی سے لپکا اور ٹھاکر کے پاؤں پکڑ لیے۔ ''معاف کر دیں ٹھاکر جی۔ وہ تو پاگل ہے۔ آپ ہمیں معاف کر دیں۔''

ٹھاکر جھنجھلا گیا۔ یہ آدمی نہ سیدھی بات کرتا ہے، نہ اس کی سنتا ہے۔ مگر اس نے فوراً ہی خود کو یاد دلایا کہ غرض مند لوگ ان لوگوں پر غصہ نہیں کرتے، جن سے کوئی غرض ہو۔ ''تمھیں کیا ہو گیا ہے جمال دین۔'' اس نے لہجہ نرم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''چلو خیر۔ حمیدہ کو چھوڑو۔ اصل بات تو تم سے ہی کرنی ہے۔''

جمال دین پوری جان سے لرزنے لگا۔ ''رحم کر دیں ٹھاکر جی۔ ہم ہمیشہ سے آپ کے وفادار ہیں۔''

''اسی لیے تو تمھارے پاس آیا ہوں سوالی بن کر۔ مجھے تم سے کچھ مانگنا ہے۔''

جمال دین کو یوں لگا جیسے ٹھاکر کی پوری حویلی اس کے سر پر آ گری ہے۔ چند لمحے تو وہ گنگ رہا۔ پھر بولا۔ ''آپ کیسی بات کرتے ہیں ٹھاکر جی۔ میرے پاس ہے ہی کیا اور جو کچھ ہے، وہ آپ چھیننے کا اختیار رکھتے ہیں۔''

"لیکن میں مانگ رہا ہوں۔"

"شرمندہ نہ کریں ٹھاکر جی۔" جمال دین نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "حکم کریں۔"

"مجھے اپنے بچے کا جیون چاہیے۔"

"زندگی دینے والا تو رب ہے ٹھاکر جی......" جمال دین نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔

"میں دھرتی کی بات کرتا ہوں جمال دین۔ یہاں تم اور حمیدہ ہی اسے جیون دان کر سکتے ہو۔ حمیدہ اسے دودھ پلا کر اور تم حمیدہ کو دودھ پلانے کی اجازت دے کر۔"

جمال دین کا ذہن شکوک و شبہات سے بھر گیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ٹھاکر ان سے سچ اگلوانے کے لیے جال بچھا رہا ہو۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ "یہ کیسے ممکن ہے ٹھاکر جی؟ یہ تو دھرم کا معاملہ ہے۔"

"یہ نہ ہوا تو میرا بچہ بھوک سے مر جائے گا جمال دین۔ وہ کل سے بھوکا ہے اور وہ صرف حمیدہ کا دودھ مانگ رہا ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو میں بھی مر جاؤں گا جمال دین۔"

ٹھاکر کے لہجے کی تڑپ اور سچائی نے جمال دین کو ہلا کر رکھ دیا۔ پھر بھی وہ ہچکچا رہا تھا۔

"لیکن......لیکن ٹھاکر جی......"

ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے لیے وہ لمحہ بہت کڑا تھا۔ اس کے پرکھوں کی آن، راجپوتوں کی شان......اس نے سب کو جھٹک دیا اور جمال دین کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ "میں تم سے بنتی کرتا ہوں جمال دین۔ مجھے خالی ہاتھ مت......"

جمال دین نے جھپٹ کر اس کے دونوں ہاتھ کھولے اور انہیں بے تابانہ چومنے لگا۔

"ایسا نہ کریں ٹھاکر جی......ایسا نہ کہیں۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "چھوٹے ٹھاکر کے لیے ہم سب کی جان حاضر ہے۔ لیکن......"

اسی لمحے حمیدہ کمرے سے نکل آئی۔ "اب تو آپ اجازت دے دو نا جی۔ اب تو کوئی حرج، کوئی ڈر نہیں۔ مالک خود کہہ رہے ہیں۔" اس کے لہجے میں بے تابی تھی۔

"ٹھیک ہے حمیدہ۔"

ٹھاکر نے حمیدہ کے لہجے کی بے تابی محسوس کی۔ پھر اسے غور سے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ حمیدہ کی آنکھوں میں نیند کا نشان بھی نہیں تھا۔ یہ طے تھا کہ وہ بھی سوئی ہوئی نہیں تھی۔ اسے یہ بات عجیب لگی کہ وہ دونوں جاگ رہے تھے۔ "اجازت دے دو جمال دین۔" ٹھاکر نے کہا۔ "یہ مجھ پر اُپکار ہوگا تمہارا۔"

"مجھے گناہگار نہ کریں ٹھاکر جی۔ یہ تو ہمارا فرض ہے۔" جمال دین نے گڑگڑا کر کہا۔ پھر وہ بیوی سے مخاطب ہوا۔ "جاؤ حمیدہ۔ تم ٹھاکر جی کے ساتھ چلی جاؤ۔"

"نہیں جمال دین۔ مجھے اپنی آن کا خیال بھی رکھنا ہے اور تمہاری عزت کا بھی۔ تم بھی اپنے بچے کو ساتھ لے کر چلو۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی اکیلی حمیدہ کو میرے ساتھ دیکھے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ بات کسی کو پتا نہ چلے کہ حمیدہ اوتار سنگھ کو دودھ پلاتی ہے۔"

"کبھی کسی کو پتا نہیں چلے گا مالک۔" حمیدہ نے جلدی سے کہا۔

جمال دین کو ٹھاکر کا بڑا پن بہت اچھا لگا۔ وہ اپنی آن کی فکر کرتا تھا تو دوسروں کی عزت کا بھی اسے دھیان رہتا تھا۔ وہ کمرے میں گیا اور سوتے ہوئے وصال دین کو گود میں اٹھا لایا۔ پھر وہ گھر سے نکل آئے۔

"راستے میں ٹھاکر نے کہا۔ "آج جیسی بے وقت تکلیف تمہیں کبھی نہیں ہو گی۔"

"تکلیف کیسی ٹھاکر جی۔ یہ تو ہمارے لیے خوشی کی بات ہے۔" جمال دین نے کہا۔

ٹھاکر کو پھر اس بات کا خیال آ گیا، جو اسے رہ رہ کر چبھ رہی تھی۔ "ایک بات بتاؤ" اس نے کہا۔ "تم دونوں اتنی رات کو جاگ کیوں رہے تھے؟"

"حمیدہ تو کل سے بے کل ہے ٹھاکر جی۔" یہ چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانے کو تڑپ رہی تھی۔ اور......" جمال دین کہتے کہتے رک گیا۔

یہ ٹھاکر کے لیے انکشاف تھا۔ حمیدہ چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانے کے لیے......"اور کیا۔ بتاؤ مجھے۔"

لیکن جمال دین چپ رہا۔

"بتاؤ نا جمال دین۔" ٹھاکر نے اصرار کیا۔

"آپ خفا ہو جائیں گے ٹھاکر جی اور یہ میں نہیں چاہتا۔"

"تم بتاؤ۔ میں خفا نہیں ہوں گا۔"

جمال دین چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "یہ حمیدہ اس وقت غور کر رہی تھی......کہتی تھی، حویلی جاؤں گی۔"

ٹھاکر کی حیرت دو چند ہو گئی۔ "کیوں؟"

"کہتی تھی۔" اس وقت سب سو رہے ہوں گے۔ چپکے سے جا کر چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلا دوں گی۔ وہ بھوکے ہوں گے۔"

ٹھاکر کے دل کو اس لمحے کچھ ہو گیا۔ وہ پگھلنے لگا۔ یہ عورت جو اس کی کچھ نہیں لگتی، اس کے بچے کے لیے تڑپ رہی ہے۔ یہ جانتی ہے کہ اس کو کسی نے دیکھ لیا اس کا پورا پریوار ختم کر دیا جائے گا۔ پھر بھی......! یہ کونسا جذبہ ہے؟ اس نے بڑی ممنونیت سے حمیدہ کو دیکھا۔ اب اس کی سمجھ میں حمیدہ کی اس وقت کی پہلی بات بھی آ گئی جو اس نے کمرے سے باہر آ کر جمال دین سے کہی تھی......اب تو اجازت دے دو نا جی......مالک خود کہہ رہے ہیں۔ وہ سمجھ گیا کہ حمیدہ حویلی جانے اور

بچے کو چھپ کر دودھ پلانے پر اصرار کر رہی تھی اور جمال دین جو اس بات کے نتائج سمجھتا تھا، بجا طور پر اسے روک رہا تھا۔ ''لیکن کیا وہ......'' اسی لمحے جمال دین نے ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے من میں آئی ہوئی بات اپنے منہ سے کہہ دی۔ ''یہ تو پاگل ہو رہی تھی ٹھاکر جی۔ مجھے ڈر تھا کہ میری آنکھ لگ گئی تو یہ چپکے سے نکل جائے گی، اور اپنے دل کی کر کے رہے گی اور پھر......'' جمال دین نے جھرجھری لی اور جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ٹھاکر کو کوئی شبہ نہیں تھا کہ حمیدہ ایسا ہی کرتی۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ یہ بھگوان کے کھیل ہیں۔ بچے کے من میں جس کے دودھ کی طلب ڈالی، اس کے من میں بچے کو دودھ پلانے کی طلب بھی ڈال دی۔ اسے خوشی ہوئی کہ یہ عورت صرف اس کے حکم کی وجہ سے اس کے بچے کو دودھ نہیں پلائے گی۔ بلکہ محبت سے پلائے گی۔ ''دیکھو اس کا صلہ تو میں کیا، کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ مگر میں تم دونوں کا یہ اپکار ہمیشہ یاد رکھوں گا۔'' اس نے کہا۔

وہ حویلی کی طرف بڑھتے رہے۔

پورا گاؤں نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہاں وہ منظر دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ لیکن کوئی دیکھتا تو حیران ہوئے بغیر نہ رہتا۔ اور تجسس سے بھی نہ بچ پاتا۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ اکیلا آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے جمال دین اور حمیدہ قدم سے قدم ملائے چل رہے تھے اور جمال دین کی گود میں ننھا وصال دین تھا۔

وہ حویلی میں داخل ہوئے۔ وہاں بھی سناٹا تھا۔ در و دیوار بھی لگتا تھا کہ بے خبر سو رہے ہیں۔ راہداری میں ٹھاکر رکا۔ ''حمیدہ، وہ رہا میرے اوتار سنگھ کا کمرا۔'' اس نے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم جاؤ۔ جمال دین میرے ساتھ ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں تمہاری خبر لینے آؤں گا۔''

حمیدہ تیز قدموں سے کمرے کی طرف بڑھی۔ مگر تیزی کے باوجود اس کے قدموں میں ہچکچاہٹ تھی۔ ذرا آگے جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹھاکر وہیں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ بچے کو گود میں اٹھائے جمال دین اس کے پیچھے تھا۔ ٹھاکر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ حمیدہ۔ ڈرو مت۔ اندر تمہارا انتظار ہو رہا ہوگا۔''

حمیدہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھاکر پلٹا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ ''آؤ جمال دین۔ تم میرے ساتھ چلو۔''

❁......❁......❁

ٹھاکرانی کے کمرے میں جو کچھ ہوا، ٹھاکر پرتاپ سنگھ دیکھ لیتا تو راجپوتوں کی ایک روایت ٹوٹ جاتی۔ وہ یہ کہ راجپوت کبھی نہیں روتے۔

حمیدہ کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ ٹھاکرانی مسہری پر بیٹھی

پہلو میں لیٹے بچے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف جیسے جم کر رہ گیا تھا۔ اس کی محویت ایسی تھی کہ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سے بھی نہیں ٹوٹی۔ ''سلام مالکن۔'' حمیدہ نے کہا۔

اس پر ٹھاکرانی نے چونک کر سر گھمایا۔ حمیدہ کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ ''آ جا حمیدہ۔ ہم کب سے تیری راہ تک رہے ہیں...... میں اور میرا بچہ۔'' اس کے لہجے میں بے تابی تھی۔ ''مگر سن، دروازے کی چٹخنی لگا دے پہلے۔''

حمیدہ کچھ سمجھی نہیں۔ مگر حکم کی تعمیل کرنا اس کے خون میں شامل تھا۔ چٹخنی چڑھا کر وہ واپس آئی اور مسہری کے پاس کھڑے ہو کر ایک نظر بچے پر ڈالی۔ پھر اس نے ٹھاکرانی سے پوچھا۔ ''کیسے ہیں چھوٹے ٹھاکر۔''

''پوری رات، پورا دن گزر گیا۔ بھوکا ہے میرا بچہ۔ تو جلدی سے یہاں بیٹھ جا حمیدہ۔'' ٹھاکرانی نے مسہری کے پائنتی والے حصے کی طرف اشارہ کیا۔

حمیدہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''نہیں مالکن، یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔''

''جیسا میں کہتی ہوں، ویسا کر۔'' ٹھاکرانی نے درشت لہجے میں کہا۔ پھر لہجہ نرم رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو بھگوان کی دیا ہے تجھ پر۔ جب میرے حصے کا کام کرے گی تو میری جگہ پر ہی بیٹھے گی نا۔''

حمیدہ نے ٹھاکرانی کے تیور بھانپے اور سہمتے جھجکتے مسہری پر بیٹھ گئی۔ اس کے پاؤں نیچے لٹکے ہوئے تھے۔

''پاؤں اوپر کر کے آرام سے بیٹھ۔ لگتا ہے، تجھے تو دودھ پلانا بھی نہیں آتا۔''

حمیدہ کو یہ بات کوڑے کی طرح لگی۔ بات غلط اور توہین آمیز بھی تھی۔ وہ اپنے وصال کو دس ماہ سے دودھ پلا رہی تھی۔ اور ٹھاکرانی کہہ رہی تھی کہ اسے دودھ پلانا بھی نہیں آتا۔ مگر وہ عورت تھی۔ ٹھاکرانی کے اندر کا دکھ سمجھ گئی۔ وہ محروم عورت جو برسوں سے اپنے بچے کو دودھ پلانے کی آرزو کر رہی تھی۔ اب اسے بچہ بھی میسر تھا اور پلانے کے لیے دودھ بھی۔ لیکن اس کا بچہ اس کا دودھ پینے سے انکاری تھا۔ ایسے میں اسے حسد تو ہونا ہی تھا۔ یہ تو ممتا کی عظمت تھی کہ وہ اسے اپنے بچے کو دودھ پلانے کی اجازت دے کر اتنی بڑی شکست قبول کر رہی تھی۔ ورنہ عورت محبت کے معاملے میں ہمیشہ کی محرومی کو سانجھے پر ترجیح دیتی ہے۔

حمیدہ مسہری پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس نے بچے کو دیکھا۔ اس پر غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کی ادھ کھلی آنکھوں میں نقاہت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھ پا رہا ہے۔ اسے خوف آنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جلدی سے اسے گود میں لے اور دودھ پلانے لگے۔ لیکن اس نے یہ بات کہی بھی نہیں۔ بس وہ منتظر بیٹھی رہی۔

کچھ لمحے یونہی اس انتظار میں گزر گئے۔ اور وہ بہت طویل لمحے تھے۔ حمیدہ کو لگتا تھا کہ

کسی بھی لمحے ٹھاکرانی کا ارادہ بدل جائے گا اور وہ اسے رخصت کر دے گی۔ وہ اپنے حصے کا اعزاز اسے کبھی نہیں دے گی۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ نظریں اٹھا کر ٹھاکرانی کے چہرے کا تاثر ہی دیکھ لیتی۔

بالآخر ٹھاکرانی نے بڑی نرمی سے بچے کو اپنی گود میں اٹھایا اور جیسے خود سے بولی۔

''بہت مٹیلے بالک ہو راج کمار جی۔'' پھر اس نے بڑی نزاکت سے بچے کو حمیدہ کی گود میں لٹا دیا۔ پھر وہ عجیب سی نظروں سے بچے کو دیکھنے لگی۔

حمیدہ کی گود کالمس پاتے ہی بچے کے ننھے سے وجود میں جیسے کرنٹ سا دوڑ گیا۔ اس کی ادھ کھلی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ کمزوری کے ساتھ سہی، مگر اس کے ننھے منے ہاتھ مچلے اور حمیدہ کے سینے کو چھونے لگے۔

حمیدہ کا دل پھٹنے لگا۔ بچہ صاف صاف دودھ مانگ رہا تھا اس سے۔ مگر وہ حکم کی منتظر تھی۔ معاملے کی نزاکت اور راجپوتوں کی آن، دونوں کو سمجھتی تھی۔ بغیر حکم کے وہ دودھ کیسے پلاتی۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔

ٹھاکرانی نے بھی بچے کا کیمیاوی ردِعمل دیکھا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے سینے کی طرف لپکا۔ ہے بھگوان۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ میرا پوت تو سب کچھ جانتا ہے۔ پھر یہ اس طرح مجھے کیوں نہیں چھوتا اور یہ...... یہ انجان ناری! اس نے حقارت سے سوچا اور وہ بھی دوسرے دھرم کی۔ اس سے کیسے لپٹ رہا ہے۔

ایک دم سے رقابت کی آگ بھڑک اٹھی۔ آگ بھی ایسی کہ ٹھاکرانی کو کبھی اس سے واسطہ ہی نہیں پڑا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ بچے کو اپنی گود میں اٹھا لے اور حمیدہ کو دھکے دے کر کمرے سے نکال دے۔ مگر فوراً ہی یہ خیال بھی آ گیا کہ بچے کی زندگی خطرے میں ہے۔ مگر اس لمحے اسے حمیدہ سے نفرت...... شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی اور اس نفرت کو اظہار کی ضرورت بھی تھی۔ ورنہ ٹھاکرانی کو کچھ ہو جاتا۔ چنانچہ اس نے اس نفرت کو کسی اور طریقے سے نکالا۔ ''میں نے بچے کو تیری گود میں اس کا منہ دیکھنے کے لیے نہیں دیا ہے حمیدہ۔ دودھ کیوں نہیں پلاتی اسے۔'' اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

حمیدہ اس کی منتظر تھی۔ نفرت سے سہی، مگر حکم تو ہوا!

شاید کوئی بھی انسان دو متضاد کیفیات کے درمیان اس قدر برابر سے کبھی تقسیم نہیں ہوا ہوگا، جیسا اس وقت ٹھاکرانی ہوئی تھی۔ اس کے منقسم وجود کا ایک حصہ اس پر مصر تھا کہ وہ دودھ پیتے بچے کو چھوڑ کر کمرے سے نکل جائے کیونکہ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اسے دیکھنا...... بلکہ سننا بھی نہیں چاہتی تھی اور منقسم وجود کا دوسرا حصہ وہی سب کچھ دیکھنے اور سننے پر اصرار کر رہا تھا۔ پہلا حصہ اس کے اندر کی عورت کے قبضے میں تھا اور دوسرا اس کے اندر کی ماں کے تصرف میں تھا۔ رقابت کی

آگ میں جلتی ہوئی عورت کے لیے بچہ اس کا محبوب تھا، جو اس سے بے وفائی کر رہا تھا۔ وہ اس کی مسرت بھری چہکاریں سننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کی بے تابیاں دیکھنا نہیں چاہتی تھی جبکہ ماں اپنے بچے کی پہلی سچی خوشی کے اظہار کے ایک ایک لمحے کو اپنی یادداشت پر نقش کر لینا چاہتی تھی۔

اس جنگ میں ماں کو ہی جیتنا تھا...... اور وہ جیت گئی۔

ٹھاکرانی رنجیتا جو کر نہیں سکتی تھی، اسے محسوس تو کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس وقت وہ ٹھاکرانی نہ رہی، حمیدہ بن گئی۔ اب وہ اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اور وہ محبت ہی محبت تھی...... ماامتا ہی مامتا۔ رقابت کی آگ سرد پڑ گئی۔ خود سے بھی کوئی رقابت کرتا ہے۔

ننھا ٹھاکر بے سدھ ہو کر سو گیا۔ پیٹ بھرنے کی لذت اسے پہلی بار ملی تھی۔

سکون صرف ننھے بچے کو نہیں ہوا تھا۔ سکون تو شاید اس کمرے میں مینہ کی طرح برسا تھا۔ وہاں موجود دونوں عورتیں بھی شرابور ہو گئی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں۔ ان کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ ان کے مذہب جدا تھے۔ ان کی حیثیتیں جدا تھیں تو ان کا سکون بھی الگ الگ تھا۔ حمیدہ کا حال اس بستی کا سا تھا، جس کے پاس بہتا ہوا دریا چڑھ گیا ہو اور حفاظتی پشتے کو خطرہ ہو کہ کسی بھی لمحے پانی کا بہاؤ اسے توڑ دے گا۔ اور پھر چڑھا ہوا دریا پشتے کو توڑ کر بستی پر سے گزر گیا ہو...... لیکن معجزاتی طور پر بستی کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر۔ ایک فرض تھا، جو اسے پورا کرنا تھا...... اور وہ اس کے اختیار میں بھی نہیں تھا اور وہ اتنا سنگین تھا کہ اسے پورا کرنا آگ کے دریا کو پار کرنے کے برابر تھا۔ فرض پورا کر کے وہ صرف پُرسکون نہیں ہوئی، ڈھیر ہو گئی۔ دو دن کے تنے، چٹخے ہوئے اعصاب جیسے سو گئے۔ اس میں سکت ہی نہیں رہی۔ بھوکے ننھے بچے نے دودھ کیا، اسے نچوڑ ڈالا۔ اب وہ صرف سو جانا چاہتی تھی۔

اُدھر ٹھاکرانی کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ نیند اور آرام کجا، وہ تو سکون کو بھی ترستی رہی تھی۔ اتنے برسوں کے بعد خزاں میں کھلنے والا پھول کھلنے سے پہلے مرجھا جانے کے خطرے سے دوچار تھا۔ اس کا بچہ اب تک صحیح معنوں میں سویا بھی نہیں تھا۔ اس کی تو جان سولی پر ٹنگی ہوئی تھی۔

وہ دودھ پیتے بچے کو دیکھتی، اس کی مسرت بھری آوازیں سنتی رہی تھی۔ وہ دید اس کی آنکھوں میں، وہ آوازیں اس کی سماعت میں بس گئی تھیں۔ خاصی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ بچے کی آواز معدوم ہو گئی ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ بچہ دودھ پیتے پیتے سو گیا ہے۔ اس کے ہونٹ اب ہل نہیں رہے ہیں۔

اس نے بڑی نرمی، بڑی آہستگی سے بچے کو حمیدہ کی گود سے اٹھایا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بچہ اتنی گہری نیند میں تھا کہ کسمسایا تک نہیں۔ ٹھاکرانی نے اسے سینے سے بھینچ لیا۔ چھاتیوں میں ابلتا ہوا دودھ جو کہ آتش فشاں بن چکا تھا، ایک پل میں سرد ہو گیا اور [illegible]

نکلا۔ پہلی بار ٹھاکرانی نے سکون کی سانس لی۔ اس کا بچہ زندہ رہے گا۔ اس کا پیٹ بھر گیا ہے اور وہ سو رہا ہے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کی اپنی آنکھیں بھی مندنے لگیں۔ اُدھر حمیدہ کو ایسا لگ رہا تھا کہ جسم بے جان ہو گیا ہے۔ ہلنے کی سکت بھی نہیں تھی لیکن اسے احساس تھا کہ وہ ٹھاکرانی کی مسہری پر بیٹھی ہے...... اور یہ بے ادبی ہے۔ ٹھاکرانی کو جلال آ گیا تو خیر نہیں۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ٹھاکرانی کو اس کا احساس تک نہیں ہے۔

جیسے تیسے وہ مسہری سے اتری ''چٹخنی گرا دوں مالکن؟'' اس نے ٹھاکرانی سے پوچھا۔

ٹھاکرانی نے بڑی مشکل سے اثبات میں سر ہلایا...... اور نندا سی آواز میں بولی۔

''کھول دے حمیدہ۔'' اور یہ کہتے ہی وہ سو گئی۔

حمیدہ نے چٹخنی گرائی۔ پھر وہ آ کر فرش پر، دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

❀......❀......❀

جمال دین نے ٹھاکر کی خواب گاہ جیسی کوئی جگہ خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی اور وہ مسہری تو اتنی بڑی تھی کہ اس پر گاؤں کے آدھے لوگ سو سکتے تھے۔

''اپنے بیٹے کو یہاں لٹا دے جمال دین۔'' ٹھاکر نے مسہری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جمال دین کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ''یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے ٹھاکر جی؟''

''کیوں نہیں ہو سکتا؟''

''یہ سوتے میں پیشاب بھی کر سکتا ہے ٹھاکر جی۔''

ایک لمحے کو ٹھاکر کو اس خیال سے گھن آئی۔ مگر فوراً ہی اس کے اندر سے کسی نے للکار کر کہا...... اس بچے کے حصے کا دودھ جیون بن کر تیرے پتر کو مل سکتا ہے ٹھاکر۔ لیکن یہ تیرے بستر کو گندا کرنے کا حق نہیں رکھتا!

ٹھاکر نے جھرجھری سی لی اور تحکمانہ لہجے میں جمال دین سے کہا۔ ''جیسا میں کہتا ہوں، کر جمال دین۔ اسے یہاں لٹا دے۔''

جمال دین میں انکار کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے بیٹے کو لٹا دیا لیکن اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔

وہ نیچے بیٹھنے لگا تو ٹھاکر نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تو بھی یہاں پاؤں پھیلا کر لیٹ جا بچے کے ساتھ۔''

جمال دین کی تو جان پر بن آئی۔ ''مجھے اس پر مجبور نہ کریں ٹھاکر جی۔ میں اپنی جگہ پر ٹھیک ہوں۔''

''اب یہ نہیں ہو سکتا۔ تجھے میری بات ماننا ہو گی۔'' ٹھاکر کے لہجے میں قطعیت تھی۔

جمال دین نے تعمیل کی۔ لیکن اس کی کوشش تھی کہ اس کا جسم گدے سے نہ ٹکنے پائے۔

ٹھاکر نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ ''نیند آ رہی ہے جمال دین تو سو جا۔'' اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''نہیں ٹھاکر جی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔''

ٹھاکر کو اس پر ترس آنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ لحاظ میں جھوٹ بول رہا ہے۔ ''جھوٹ مت بول جمال دین۔ نیند تیری آنکھوں میں بھری ہوئی ہے۔'' ٹھاکر اس کے معمولات سے واقف تھا۔ صبح سویرے اٹھنے والے تو جلدی سوتے ہیں اور یہاں تو رات آدھی سے زیادہ ہو چکی تھی۔ ''سو جا۔ یہ میرا حکم ہے۔'' اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''کیسے سو جاؤں ٹھاکر جی۔ کوئی آ گیا تو؟''

ٹھاکر کو ہنسی آ گئی۔ ''یہ میرا خاص کمرا ہے۔ سوائے ٹھاکرانی کے یہاں کوئی نہیں آ سکتا۔ بس تو سو جا۔''

جمال دین نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔ ٹھاکر کو اندازہ ہو گیا۔ ''تو سوتا کیوں نہیں؟'' اس نے ڈپٹ کر کہا۔

''یہاں نیند نہیں آئے گی ٹھاکر جی۔'' جمال دین نے بے بسی سے کہا۔

''کیوں نہیں آئے گی؟''

''میں اپنی کھاٹ پر سونے کا عادی ہوں مالک۔ یہاں تو لگتا ہے کہ میں ڈوب رہا ہوں۔''

یہ بات ٹھاکر کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ آرام دہ بستر پر تو اور گہری نیند آنی چاہیے۔ تاہم اس نے اتمامِ حجت کے طور پر کہا۔ ''اچھا...... تو کہاں نیند آئے گی تجھ کو؟''

''نیچے شاید آ جائے۔'' جمال دین کے لہجے میں یقین نہیں تھا۔

''تو چل۔ نیچے آ جا۔''

جمال دین نیچے آ گیا۔ لیٹنے لگا تو ٹھاکر نے مسہری سے تکیہ اٹھا کر اسے دیا۔ اب جمال دین میں انکار کی جرأت نہیں تھی۔ اس نے تکیہ سر کے نیچے رکھا اور قالین پر لیٹ گیا۔ لیکن نیند آنے کے باوجود وہ سو نہیں سکا۔

ٹھاکر بھی نیچے بیٹھ گیا۔ جمال دین کی وجہ سے اسے اوپر بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد وہ اٹھا اور بچے کے کمرے کی طرف گیا۔ دروازے پر چند لمحے وہ ہچکچاتا رہا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ مداخلت بے جا کا مرتکب ہو رہا ہے۔ کہیں حمیدہ بچے کو دودھ نہ پلا رہی ہو۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس صورت میں دروازہ اندر سے بند ہو گا۔ ٹھاکرانی یہ خطرہ کبھی مول نہیں لے گی کہ کوئی اتفاقاً بھی حمیدہ کو چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلاتے دیکھ لے۔

اس نے ہلکے سے دھکیلا تو دروازہ کھل گیا۔ اور وہاں سچ مچ رات کا تیسرا پہر تھا۔ صرف

بچہ ہی نہیں، دونوں عورتیں بھی بے خبر سو رہی تھیں۔ حمیدہ تو دیوار سے ٹکے ٹکے ہی فرش پر نیم دراز ہو کر سو گئی تھی۔ اس نے اندر جا کر بچے کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا اور وہ بے خبر سو رہا تھا۔ ٹھاکر مطمئن ہو گیا۔

اس لمحے حمیدہ کو دیکھ کر ٹھاکر نے بہت کچھ سوچا۔ پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ راجا کون ہوتا ہے اور بھکاری کون۔ دینے والا ہاتھ راجا کا ہوتا ہے اور لینے والا ہاتھ بھکاری کا اور دینے والا ایسا کچھ دے کہ جو کہیں اور سے نہ مل سکتا ہو تو وہ تو مہاراجا ہوا۔ تو یہ حمیدہ مہارانی ہے..... اور بھکاریوں کی طرح فرش پر سو رہی ہے۔ اس کا دل کٹنے لگا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ پہلی فرصت میں اسی سلسلے میں کچھ کرے گا۔

اس وقت مخل ہونا مناسب نہیں تھا۔ وہ باہر نکلا، دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ وہاں جمال دین بھی سو چکا تھا۔ شاید ٹھاکر کی موجودگی ہی اس کی نیند میں حارج تھی۔ وہ کمرے سے گیا تو فوراً ہی اسے نیند آ گئی۔

ٹھاکر وہیں نیچے لیٹ گیا..... تکیے کے بغیر۔ وہ خود کو یاد دلا رہا تھا کہ اصل میں وہ بھکاری ہے۔ کبھی زندگی چپکے چپکے راستہ بدل لیتی ہے اور آدمی کو پتا بھی نہیں چلتا اور اس کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

❀.....❀.....❀

یہ دودھ کا مسئلہ ٹھاکر کے لیے بہت بڑی الجھن بن گیا!

زندگی میں پہلی بار اس نے کسی کا احسان لیا تھا..... اور اب وہ اس کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ اتنا تو اس کی سمجھ میں آتا تھا کہ احسان کا صلہ دینا ہے۔ مگر کتنا اور کیسے؟ یہ اندازہ وہ کیسے کرتا۔

راجپوتوں کے ہاں بچے کو کسی اور سے دودھ پلوانے کی کوئی روایت نہیں تھی بلکہ ان کے نزدیک تو یہ بہت بڑی برائی ہی ہوتی۔ یہ تو خون کی طاقت کو کم کرنے کی بات تھی۔ تاہم ٹھاکر یہ سمجھتا تھا کہ دودھ انمول شے ہے۔ اس کا کوئی مول نہیں۔ اس کی قیمت چکائی نہیں جا سکتی۔ مگر پھر بھی کچھ کرنا تو تھا۔ وہ اس معاملے کو روایت کی روشنی میں دیکھنا اور سمجھنا چاہتا تھا۔

اب وہ وہاں گاؤں میں، قریب کے لوگوں سے تو کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے اسے کسی مسلمان کی ضرورت تھی..... اور وہ بھی صاحب ثروت اور پڑھے لکھے مسلمان کی۔ وہ سوچتا رہا۔ آخر اسے امان اللہ کا خیال آیا۔ وہ دہلی کا رہنے والا تھا۔ کالج میں اس کے ساتھ پڑھا تھا اور اس کا گہرا دوست بھی تھا۔

چنانچہ ٹھاکر اس سے ملنے کے لیے دہلی چلا گیا۔

امان اللہ اس سے پہلے جیسی گرم جوشی سے ملا۔ لیکن وہ حیران بھی بہت تھا۔ ''اتنے

برسوں کے بعد میری یاد کیسے آ گئی پرتاپ سنگھ؟''

ٹھاکر تھوڑا سا کھسیایا۔ پھر بولا۔ ''یاد کی بات نہیں امان۔ یاد تو میں نے تمھیں ہمیشہ رکھا۔ بس یہ ہے کہ جاگیر کے معاملات میں الجھا رہا۔ کبھی نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بس ایک کام سے دہلی آنا ہو گیا۔ سوچا تم سے مل کر پرانی یادیں ہی تازہ کر لی جائیں۔''

''اچھا کیا۔'' امان اللہ نے بے حد خلوص سے کہا۔ ''پرانے دوستوں سے مل کر آدمی بڑھاپے میں بھی جوان ہو جاتا ہے۔''

''ہاں۔ بیس برس بعد مل رہے ہیں ہم۔ تمھیں تو میرا خیال کبھی نہیں آیا ہو گا۔'' ٹھاکر نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''خیر..... ایسی بات بھی نہیں۔ لیکن تم تو جانتے ہو کہ نوکری میں آدمی کو فرصت کم ہی ملتی ہے۔''

دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پرانی یادوں سے کھیلتے رہے۔ پھر ٹھاکر نے پوچھا۔ ''بچوں کا کیا حال ہے؟''

''سب مزے میں ہیں۔ تین بیٹوں اور ایک بیٹی کی شادی کر دی۔ چھوٹا بیٹا ابھی باقی ہے۔''

''واہ..... تم تو دادا بھی بن گئے اور نانا بھی۔'' ٹھاکر کے لہجے میں رشک تھا۔

''ہاں۔ اللہ کا شکر ہے۔ تم سناؤ پرتاپ سنگھ۔''

ٹھاکر مسکرایا۔ ''ابھی چند دن پہلے ہی تو بھگوان نے دَیا کی ہے مجھ پر۔'' اس نے کہا۔

''بیٹا ہوا ہے میرے ہاں۔''

امان اللہ حیران رہ گیا۔ ''پہلا بچہ! شادی کو تو تمھاری مجھے یاد پڑتا ہے، بائیس تئیس برس ہو گئے۔''

''ہاں امان۔ اب تو میں نراش ہی ہو گیا تھا۔ پر بھگوان نے دَیا کر دی۔''

''بہت بہت مبارک ہو میرے دوست۔'' امان اللہ نے گرم جوشی سے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم تو ابھی جوان ہوئے ہو۔''

''مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔''

پھر باتوں باتوں میں ٹھاکر نے دودھ کی بات چھیڑ دی۔ ''تم لوگوں میں تو دودھ باہر سے بھی پلوا دیتے ہیں بچے کو۔'' اس نے کہا۔

''کوئی مجبوری آن پڑے تو اور بات ہے۔'' امان نے کہا۔ ''ورنہ کون ماں اپنے بچے کو دودھ پلانا نہیں چاہے گی۔ میرے ہاں تو ایسا نہیں ہوا۔ اللہ کا شکر ہے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔ ''میرا مطلب ہے، تم لوگوں میں

ایسا ہوتا تو ہے نا۔''

''عرب میں یہ رواج عام ہے۔'' امان اللہ نے کہا۔ ''مگر ہمارے ہاں ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ لیکن تمھیں یہ خیال کیسے آیا ٹھاکر۔''

''ایسے ہی۔ میں اکثر سوچتا ہوں اس پر۔ مجھے عجیب سا لگتا ہے۔ یہ تو خون میں ملاوٹ کرنا ہوا۔''

ٹھاکر کی امید کے مطابق امان اللہ اپنے ہاں کے اس رواج کا دفاع کرنے پر اتر آیا۔

''ایسا نہیں ہے۔'' اس نے پرُ جوش لہجے میں کہا۔ ''عرب اس معاملے میں تم راجپوتوں سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ ایسے ہی کسی کے ہاں نہیں بھیج دیتے اپنے بچے کو۔ ان کی شرائط ہوتی ہیں۔ حسب نسب بھی دیکھتے ہیں۔ پھر عورت صحت مند ہو۔ یعنی اسے کوئی بیماری نہ ہو۔ اور وہ اعلیٰ کردار کی پاکیزہ عورت ہو۔''

''تو اس عورت کو کیا فائدہ؟'' ٹھاکر نے کہا اور دل میں سوچا، اسے تو بن مانگے ہی دودھ پلانے والی میں یہ خوبیاں مل گئیں۔

''بچے کا باپ اس عورت کو اپنی حیثیت کے مطابق طے شدہ محنتانہ دیتا ہے۔''

''نا بھئی۔ دودھ کا تو کوئی مول ہو ہی نہیں سکتا۔'' ٹھاکر نے حتمی لہجے میں کہا۔

''بے شک دودھ کا کوئی مول نہیں۔ ایسی عورتیں عام طور پر غریب ہوتی ہیں اور پرتاپ سنگھ، عورت اچھا کھائے پیے گی تو دودھ اترے گا نا۔ بھوکی عورت بچے کو کیا دودھ پلائے گی۔ جو کسی کے بچے کو دودھ پلائے گی تو اسے خرچا بھی ملے گا اور دودھ ہوگا تو اس کا اپنا بچہ بھی دودھ پیے گا۔ ہوا نا فائدہ۔''

ٹھاکر کی معلومات میں اب اضافہ ہونا شروع ہوا۔ مگر ابھی اسے اور کرید کرنی تھی۔

''مگر اس بے چاری کو کوئی حیثیت تو نہیں ملے گی۔'' اس نے کہا۔

''یہ کس نے کہہ دیا۔'' امان اللہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اس بچے کے لیے اس کا مرتبہ ماں کا ہوتا ہے۔ اور محنتانہ اپنی جگہ۔ دودھ پلانا اس کا ایسا احساس ہے، جس کا بدلہ چکایا نہیں جا سکتا۔''

تو حمیدہ ننھے ٹھاکر اوتار سنگھ کے لیے داتا سمان ہے۔ ٹھاکر نے سوچا۔ پھر بولا۔ ''تو وہ دوسرا بچہ...... دودھ پلانے والی کا بچہ......؟''

''ایسے بچے دودھ شریک بہن بھائی ہوتے ہیں...... سگوں کے جیسے۔''

تو وصال دین ٹھاکر اوتار سنگھ کا بھائی ہے...... دودھ شریک بھائی! ٹھاکر پر آگہی کے در کھل رہے تھے۔

''مگر پرتاپ سنگھ، تمھیں اس میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟'' امان اللہ کے لہجے میں تجسس

تھا۔ اس لمحے اسے خیال آیا کہ ابھی ذرا دیر پہلے خود ٹھاکر نے ہی بتایا تھا کہ چند روز پہلے اس کے ہاں بیٹا ہوا ہے...... پہلی اولاد۔ اور ٹھاکر کی عمر پچاس کے قریب تو ہے۔ تو ٹھاکرانی بھی 45 سے کم تو نہیں ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ دودھ نہیں اترا ہو۔ ''کہیں تمھارے ساتھ یہ مسئلہ تو نہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں امان۔ میری پتنی کو تو بھگوان نے اتنا دودھ دیا ہے کہ سات بچے ہوتے تو بھی کمی نہ ہوتی۔'' ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔ جو بات اسے سب سے چھپانی تھی، اس میں وہ کسی کو راز دار کیسے بنا سکتا تھا۔

امان اللہ کے اصرار پر وہ رات وہاں رکا اور اگلے روز واپس چلا آیا۔ معلومات تو اسے حاصل ہو چکی تھیں۔ اب ان کی روشنی میں عمل کرنا تھا اور سب سے اہم بات ٹھاکرانی کو سمجھانا تھا۔

❁......❁......❁

ٹھاکرانی پہلے ہی اپنے بچے کے معمولات طے کر چکی تھی۔ شروع میں تو وہ ڈر رہی تھی کہ شیر خوار بچے تو بار بار دودھ پیتے ہیں۔ یوں راز کو راز رکھنا ممکن نہ ہوتا۔ بہرحال اب وہ اٹھنے، چلنے پھرنے اور اپنے بچے کا خیال رکھنے کے قابل ہو گئی تھی۔ اور یہ تو اس کا جیون بھر کا ارمان بھی تھا۔ چنانچہ پہلے مرحلہ میں اس نے دائی راجو سے چھٹکارا حاصل کیا۔ اسے کہہ دیا کہ جب کوئی ضرورت ہوگی تو اسے بلا لیا جائے گا۔ دوسرے مرحلے میں اس نے شانتا کو دن کی ڈیوٹی سے آزاد کر دیا۔ وہ رات کو آتی اور صبح سویرے میں چلی جاتی۔ یوں حمیدہ کے لیے دن بھر کی گنجائش نکل آئی۔

ان معمولات کے ساتھ حمیدہ کے بھی نئے معمولات بن گئے۔ جمال دین کھیتوں پر جانے کے لیے نکلتا تو وہ وصال کو لے کر اس کے ساتھ حویلی آ جاتی۔ سات بجے وہ ننھے ٹھاکر کو دودھ پلاتی۔ ٹھاکرانی کے ساتھ رہتی اور ننھے ٹھاکر کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ دس بجے وہ پھر بچے کو دودھ پلاتی۔ اس کے بعد وہ گھر واپس جاتی۔ کھانا پکاتی۔ جمال دین آتا تو اسے کھانا دیتی۔ جمال دین ذرا دیر کے لیے کمر ٹکاتا۔ تب وہ پھر حویلی جاتی ایک بجے اور پھر چار بجے ٹھاکر بچے کو دودھ پلاتی۔ پھر گھر واپس آ کر رات کے کھانے کی فکر کرتی۔ شام سات بجے وہ ننھے ٹھاکر کو دن میں آخری بار دودھ پلانے کے لیے جاتی اور اس کے بعد گھر واپسی۔

پہلے دن ٹھاکرانی رنجیتا کو شام سات بجے سے صبح سات بجے تک کے وقفے سے بہت خوف آیا۔ رات کے وہ بارہ گھنٹے بڑی آزمائش کے تھے اگر ضدی بچہ بھوک سے جاگ اٹھا اور اس نے دودھ مانگا تو کیا ہوگا۔ اس کی ضد سے وہ خوب واقف تھی۔

اس خوف سے اس رات اسے نیند ہی نہیں آئی۔ نیند سے لڑتی ہوئی شانتا فرش پر پڑ کر سو گئی۔ مگر ٹھاکرانی جاگتی رہی۔ ادھر ننھا ٹھاکر بے سدھ سو رہا تھا۔ ٹھاکرانی کو بھی جھونک آ گئی۔

مگر وہ رات ٹھاکرانی کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی لانے والی رات تھی!

ٹھاکرانی کی آنکھ اس احساس سے کھلی کہ ننھے ننھے ہاتھ کسی جستجو میں اس کی چھاتیوں کو ٹٹول رہے ہیں۔ وہ گھبرا کر اٹھی۔ یہ طے تھا کہ بچے کو بھوک لگی ہے۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ اب حمیدہ کو اس وقت تو نہیں بلایا جا سکتا تھا۔ ٹھاکرانی کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ خود کوشش کرے۔

اس سے پہلے اس طرح کی کوششوں کے نتیجے میں ماما کی تذلیل کے سوا اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ وہ تماشہ بننے سے گھبراتی تھی۔ چنانچہ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ شانتا سو رہی تھی۔ کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

اس نے بچے کو گود میں لٹاتے ہوئے کہا۔ ''اب تو ماں کی بھینٹ سویکار کر لو میرے ضدی بچے۔''

اگلے ہی لمحے اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ ننھا ٹھاکر بڑی رغبت سے اس کا دودھ پی رہا تھا۔

وہ ٹھاکرانی کی زندگی میں آنے والی سب سے بڑی، سب سے سچی خوشی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ ساری دنیا کو وہ منظر دکھائے۔ ڈھنڈورا پٹوائے کہ اس کے بچے نے اس کا دودھ قبول کر لیا ہے۔

بچے کے ماں کے دودھ کو رد کرنے کے تو بہت سے گواہ تھے۔ مگر اس کی قبولیت دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ شانتا تھی۔ مگر وہ سو رہی تھی۔ ٹھاکرانی جھنجلا گئی۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ تو بہت اچھا موقع ہے۔ بچے کے دودھ کے معاملے میں تمام شکوک و شبہات ہمیشہ کے لیے دھل سکتے ہیں۔

اس نے کرخت آواز میں شانتا کو پکارا۔ ''مردار...... یہاں سونے کے لیے آئی ہے تو۔''

شانتا گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ ''آنکھ لگ گئی تھی مالکن۔ چھوٹے ٹھاکر بھی تو سو رہے تھے۔''

''روز پیتے ہیں۔ تبھی تو خوش رہتے ہیں۔'' ٹھاکرانی نے بڑے غصے سے کہا۔ ''اور اپنی ماں کا دودھ کونسا بچہ نہیں پیتا۔''

''پہلے تو نہیں پیتے تھے مالکن۔'' شانتا نے دبے لہجے میں کہا۔

''میرے دودھ میں کوئی خرابی تھی۔'' ٹھاکرانی بولی۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس وقت ہر بات نبھائی جا سکتی ہے۔ اس نے کہا۔ ''حمیدہ نے ایک بوٹی لا کر دی تھی مجھے، جس سے دودھ کی کڑواہٹ دور ہو گئی۔ اسی لیے تو میں نے حمیدہ کو قریب کر لیا ہے۔''

اچانک ٹھاکرانی کو احساس ہوا کہ ننھا ٹھاکر دودھ پیتے پیتے سو چکا ہے۔ اس نے شانتا کو پکارا۔ ''انھیں پنگھوڑے میں لٹا دے شانتا۔''

چند منٹ میں ٹھاکرانی بہت پُراعتماد ہو گئی تھی۔ اس نے بچے کو اپنے پاس سلایا تھا۔ تاکہ تماشہ نہ بنے۔ اب اسے یقین تھا کہ بچہ اس کا دودھ بھی پی لے گا۔ شانتا نے ٹھاکر کو پنگھوڑے میں لٹا دیا۔ ٹھاکرانی بھی بستر پر دراز ہو گئی۔

لیکن خاصی دیر وہ سو نہ سکی۔ خوشی اور فتح کا احساس اسے ہیجان میں مبتلا کر رہا تھا۔ اس دوران اس نے بہت کچھ سوچا بھی۔ اسے بہت سارے گواہ بنانے ہوں گے۔ پھر کوئی کبھی حمیدہ پر دودھ پلانے کا شبہ بھی نہیں کرے گا۔ اس نے کہا۔ ''کل سے تیرے ساتھ یہاں کوئی اور بھی ہوگا۔ ایک سوئے تو ایک جاگے۔''

شانتا گھبرا گئی۔ ''اب ایسا نہیں ہوگا مالکن۔''

''میں غصے سے نہیں کہہ رہی ہوں۔'' ٹھاکرانی نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تو ہر روز ہو گی۔ باقی نوکرانیاں روز بدلتی رہیں گی۔''

''ٹھیک ہے مالکن۔'' شانتا نے شکرگزاری سے کہا۔

اس لمحے ٹھاکرانی کو ایک خیال اور آیا۔ اب جبکہ بچے نے اس کا دودھ قبول کر لیا ہے تو ممکن ہے کہ اس کے دودھ میں ہی کوئی خرابی رہی ہو، جو اب دور ہو گئی ہو۔ ایسا ہے تو حمیدہ سے دودھ پلوانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

یہ سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی۔

وہ جانتی تھی کہ ننھا ٹھاکر ٹھیک چھ بجے اٹھ جاتا ہے۔ اس کی بھی آنکھ کھل گئی۔ شانتا بچے کے کپڑے بدل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''شانتا، چھوٹے ٹھاکر کو میرے پاس لٹا دے اور تو اب چلی جا۔''

شانتا کے جانے کے بعد ٹھاکرانی نے بچے کو دودھ پلانے کی کوشش کی۔ اسے خوشی تھی کہ اس نے شانتا کے جانے کے بعد وہ کوشش کی تھی۔ ورنہ بھرم ٹوٹ جاتا۔ اب ننھا ٹھاکر پھر اس کے دودھ سے انکاری تھا۔

اور سات بجے حمیدہ کے آتے ہی وہ مشینی انداز میں بہت تیز تیز ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ وہ اس سے دودھ مانگ رہا تھا۔ ٹھاکرانی نے سمجھ لیا کہ اس کے غیر معمولی طور پر سمجھدار بچے نے اسے صرف رات کا اعزاز دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ دن میں اس کی ضد برقرار ہے۔ مگر اسے رنج نہیں ہوا۔ یہ خوشی کم نہیں تھی کہ بچے نے اس کی ماما کو بے عزتی سے بچا لیا تھا اور پردہ بھی رکھ لیا تھا۔

اگلے چند روز میں سب کو معلوم ہو گیا کہ چھوٹے ٹھاکر نے ٹھاکرانی کا دودھ سویکار کر لیا ہے!

❁......❁......❁

ٹھاکر چند روز بہت مصروف رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ رنجیتا سے بات کرنے سے پہلے کچھ

ضروری کارروائیاں مکمل کر لے۔ کچہری کے کام لمبے ہوتے ہیں۔ ٹھاکر کی بڑی بات تھی۔ مگر رسمی کارروائی میں بھی وقت تو لگتا ہے۔

کاغذات مکمل ہو گئے تو اس رات اس نے ٹھاکرانی کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اب ایسا کم ہی ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ خود دن میں کئی بار ٹھاکرانی کے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ اس تبدیلی کی وجہ بیٹا تھا، جسے دیکھے بغیر اسے چین نہیں آتا تھا اور اب وہ بیٹے کو دیکھ کر خوش بھی بہت ہوتا تھا۔ دودھ کا مسئلہ حل ہو جانے کے بعد ننھا ٹھاکر اوتار سنگھ بہت مختلف، بہت پیارا اور من موہنا بچہ ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی ادائیں دل جیتنے والی تھیں۔ وہ ابھی بہت چھوٹا تھا...... بولنے کی منزل سے بہت دور۔ مگر اس میں اظہار کی غیر معمولی قدرت تھی۔ خوشی، غصہ، محبت، خفگی...... بچوں کے لیے یہی جذبے ہوتے ہیں۔ ننھا ٹھاکر ان کا بھرپور اظہار کرنا جانتا تھا۔

ٹھاکرانی خاص کمرے میں پہنچی تو ٹھاکر مسہری پر نیم دراز تھا۔ ٹھاکرانی اس کے پیروں کے پاس بیٹھ گئی اور پیر چھوتے ہوئے بولی۔ ''کیا سیوا کروں سوامی جی؟ پیر دبا دوں آپ کے؟''

''مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے رنجیتا۔''

''حکم کریں ناتھ۔'' ٹھاکرانی مسکرائی۔ ''ویسے مجھے وشواس ہے کہ بات آپ کے پوت سے متعلق ہی ہوگی۔''

ٹھاکر پرتاپ سنگھ بھی مسکرا دیا۔ ''اب اور کوئی بات تو جیسے ہم کر ہی نہیں سکتے۔''

''سو تو ہے۔ مگر مجھے اچھا لگتا ہے۔ آپ کمرے میں آتے ہیں تو اوتار سنگھ کے سوا کہیں نظر ہی نہیں پڑتی آپ کی۔''

''برسوں کی پیاس ہے نا۔'' ٹھاکر نے کہا۔ پھر بولا۔ ''جو میں کرنے والا ہوں، بات بہت بڑی ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرنا۔''

''سمجھ میں چاہے نہ آئے، پر آپ کی بات ماننا میرا دھرم ہے۔''

ٹھاکر چند لمحے سوچتا رہا کہ بات کہاں سے شروع کرے، کس طرح کرے۔ بالآخر اس نے کہا۔ ''یہ دودھ والا جو معاملہ ہے، ہمارے لیے تو بالکل نیا اور انوکھا ہے۔ ہمیں تو اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ مگر جاننا بھی ضروری ہے۔''

ٹھاکرانی منہ سے کچھ نہ بولی۔ بس مستفسرانہ نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

''تم جانتی ہو کہ راجپوتوں کو اپکار راس نہیں۔ سر کا جھکنا قبول نہیں ہوتا ہمیں۔ اور احسان سر جھکا دیتا ہے۔ راجپوت کے لیے سر جھکانا موت کے برابر ہے۔ پر جیون بھی عجیب چیز ہے۔ منش کتنا ہی طاقت ور ہو، بھگوان کی اچھا کے آگے بے بس ہوتا ہے۔ منش کا منش سے کام نکلتا ہے۔ پر راجپوت تو کسی سے کچھ نہیں لیتا۔ جیون بھی نہیں۔ لینا پڑ جائے تو اس کا بڑھ چڑھ کر بدلہ دیتا ہے تاکہ سر تھوڑا سا اٹھانے کی گنجائش نکل آئے۔ بس یہ راجپوت کی آن کی بات ہے۔ ورنہ سر کسی

کے آگے جھک جائے تو کبھی نہیں اٹھتا۔ تم سمجھ رہی ہو نا رنجیتا؟''

ٹھاکرانی رنجیتا خوب سمجھ رہی تھی۔ اس کی رگوں میں بھی تو راجپوت خون تھا۔ ''جی ناتھ۔''

''ہمارا یہی حال ہے۔ ہم پر کسی نے اپکار کیا ہے۔ چھوٹا موٹا نہیں، جیون جیسی چیز دان کرنے کا اپکار...... اور وہ بھی ہمارے اس پوت کے لیے جو برسوں سے ہمارا سپنا تھا اور لگتا تھا، پورا کبھی نہیں ہوگا۔ اب اوتار سنگھ کے لیے تو ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ہے نا رنجیتا۔''

''اَوَش کر سکتے ہیں ناتھ۔''

''میں اس پر سوچتا رہا ہوں ٹھاکرانی۔ میں نے اس کے لیے جان کاری بھی کی ہے۔ مسلمانوں میں ایسے دودھ پلوایا جاتا ہے۔ اس کی اجرت بھی دی جاتی ہے۔ ہر آدمی اپنی حیثیت کے مطابق اجرت دیتا ہے۔ مگر دودھ پلانے کا احساس اپنی جگہ رہتا ہے۔ تو رنجیتا، ہم جمال دین اور حمیدہ کے سامنے سر کبھی نہیں اٹھا سکتے۔ ہمیں ان کو اپنے برابر کا مقام دینا ہے۔''

ٹھاکرانی کچھ دیر سوچتی رہی۔ یہ خیال کئی دن سے اسے بھی ستا رہا تھا۔ اور جو کچھ ٹھاکر کہہ رہا تھا، وہی اس نے بھی سوچا تھا۔ وہ تو ماں تھی۔ یہ کام اس کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔ لیکن ٹھاکر کے لیے آسان نہیں تھا۔ اسے بس یہی فکر تھی۔ اب بھی وہ جو کچھ سوچ رہی تھی، ٹھاکر کے نکتہ نظر سے سوچ رہی تھی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''پر وہ تو ہماری رعیت ہیں ناناتھ۔ انھیں برابری کیسے دے سکتے ہیں۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔ یہی میں نے سوچا تھا۔'' ٹھاکر نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''میں نے اس کا اپائے بھی سوچ لیا ہے۔''

''وہ کیا ہے ناتھ؟''

''ہم انھیں دودھ کی اجرت دیں گے۔ اتنی کہ وہ ہماری رعیت نہیں رہیں گے۔ ہمارے برابر کے ہو جائیں گے۔''

ٹھاکرانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ بولی۔ ''میں مطلب نہیں سمجھی ناتھ۔''

''میں اپنی ساری زمین، جائیداد، نقدی، زیورات، سب آدھ سے کچھ زیادہ جمال دین کے نام کر رہا ہوں۔ یہ ان کا حق بھی ہے۔ پھر ان کے سامنے ہمیں کبھی بڑائی کا احساس بھی نہیں ہوگا۔''

ٹھاکرانی تو حمیدہ کے سامنے اپنے احساسِ برتری کو پہلے ہی ہار چکی تھی۔ اسے فکر تھی تو بس ٹھاکر کی۔ یہ سن کر اس نے سکون کی سانس لی۔ ٹھاکر بڑے خلوص سے سر جھکانے کا سامان کر رہا تھا۔ مسئلہ حل ہو گیا تھا۔

ٹھاکر بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں رنجیتا؟'' اس نے بہت نرم لہجے میں پوچھا۔

''یہ کیسی بات کی ہے ناتھ۔ میرے لیے تو آپ کے چرنوں کی دھول ہی بہت ہے۔ رہے چھوٹے ٹھاکر، تو ان کی فکر آپ کو مجھ سے زیادہ ہوگی اور یہ تو میں جانتی ہوں کہ بھگوان کا دیا اتنا ہے کہ میرے چھوٹے ٹھاکر کی نسلوں کے لیے کافی ہے۔''

ٹھاکر نے اسے گلے سے لگالیا۔ ''تم بہت اچھی پتنی ہو رنجو۔''

''یہ بتائیں، آپ نے کاغذات بنوالیے ہیں؟'' ٹھاکرانی نے اچانک کہا۔

''ہاں اور نقدی اور زیورات تو گھر کی بات ہے۔''

ٹھاکرانی سوچ میں پڑگئی۔ ٹھاکر اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے بعد ٹھاکرانی نے سر اٹھایا اور دبے لہجے میں بولی۔ ''ابھی آپ نے یہ سب کچھ انھیں دیا تو نہیں؟''

''نہیں۔'' ٹھاکر نے کہا۔ ''پر یہ تو بتاؤ، بات کیا ہے؟''

''دیکھیں۔ ابھی یہ سب کچھ کریں گے تو سب کو کھوج ہوگی کہ یہ کس بات کا انعام ہے۔ بہت لوگ سمجھ بھی جائیں گے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔''

ٹھاکر نے بھی ایک لمحے سوچا۔ ''تم عقل والی ہو رنجو۔ بات تو ٹھیک ہے۔ پر میں اب یہ کام کر کے رہوں گا۔''

''آپ کریں گے تو ٹھیک ہی ہوگا۔'' ٹھاکرانی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''تم فکر نہ کرو۔ میں جمال دین سے کہہ دوں گا کہ تین چار سال تک کسی کو پتا نہ چلے۔''

''اپنی بڑائی کوئی نہیں چھپاتا ناتھ۔''

''میں آدمی کو پہچانتا ہوں رنجو۔ جمال دین تو شاید یہ بات کبھی بھی کسی کو نہیں بتائے گا۔ وہ یہ سب کچھ آسانی سے لے گا بھی نہیں۔''

''ٹھیک ہے ناتھ۔ میرے لیے کوئی اور حکم؟''

''حکم نہیں، بنتی ہے۔ تم حمیدہ کو بھی خود سے کم نہ سمجھنا، ہمیشہ اس کی عزت کرنا اور اپنے بیٹے کو بھی یہی کچھ سکھانا۔ حمیدہ اس کے لیے ماتا سمان ہے اور وصال دین بھائی جیسا ہے۔''

''ایسا ہی ہوگا سوامی جی۔''

❁.....❁.....❁

ٹھاکر کا یہ دعویٰ غلط نہیں تھا کہ اسے آدمی کی پہچان ہے!

اسی رات جب پورا گاؤں سو رہا تھا تو ٹھاکر جمال دین کے گھر میں بیٹھا تھا۔ اس کے کہنے پر جمال دین نے حمیدہ کو بلایا۔ حمیدہ آئی تو ٹھاکر نے نقدی اور زیورات کی گٹھری اس کے قدموں میں ڈال دی۔

حمیدہ تو گنگ ہو کر رہ گئی۔ جمال دین نے گھبرا کر پوچھا۔ ''یہ کیا ہے ٹھاکر جی؟''

''کھول کر دیکھو۔ یہ سب حمیدہ کا ہے۔''

حمیدہ بت بنی بیٹھی تھی۔ جمال دین نیچے بیٹھا اور اس نے کانپتے ہاتھوں سے گٹھری کھولی۔ گٹھری کھلی تو ان دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''یہ...... یہ سب......؟'' جمال دین نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ حمیدہ اب بھی چپ تھی۔

''یہ اس دودھ کا حق ہے جو حمیدہ نے میرے بچے کو پلایا ہے۔'' ٹھاکر نے کہا۔

پھر حمیدہ پہلی بار بولی...... اور اس کے لہجے میں اذیت تھی۔ ''قیمت ادا کر رہے ہیں ٹھاکر جی؟''

ٹھاکر تڑپ گیا۔ ''نہیں۔ یہ تمھارے ہی ہاں کے رواج کے مطابق ہے۔'' اس نے مسلمان دوست سے جو کچھ سنا تھا، اسے استعمال کیا۔ ''قیمت تو ادا ہو ہی نہیں سکتی۔'' اس نے آخر میں کہا۔ ''یہ بات بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں میں۔''

''ٹھاکر جی، میں نے آپ کے کہنے پر نہیں، اپنے دل کے کہنے پر دودھ پلایا ہے چھوٹے ٹھاکر کو۔ میں تو تڑپ رہی تھی۔ مر رہی تھی اس کے لیے۔ آپ نے تو اجازت دے کر احسان کیا ہے مجھ پر۔ اور میں اس کا صلہ نہیں دے سکتی۔ اس لیے میں یہ سب کچھ نہیں لے سکتی۔'' حمیدہ نے کہا۔

''مگر اس کا صلہ تو تمھارے رواج کے مطابق تمہارا حق ہے۔''

''یہ ویسی بات نہیں مالک۔ میں سچ کہتی ہوں کہ اگر چھوٹے ٹھاکر کو دودھ نہ پلاتی تو مر جاتی شاید۔''

غیر عورت کی یہ اپنائیت...... بلکہ محبت بھری بات سن کر ٹھاکر کو کچھ ہوگیا۔ اس کے دل میں اس غیر عورت کے لیے عجیب طرح کی محبت پھوٹی۔ ''تو حمیدہ، میرے بچے سے کوئی ناتا تو ہے ناتمہارا۔ کوئی کسی کے لیے یوں نہیں تڑپتا، یوں نہیں مرتا۔ اب میں تم سے کہتا ہوں حمیدہ کہ آج سے تم میری بہن ہو۔ اور بہن ہونے کا حق تم پہلے ہی ادا کر چکی ہو۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں مالک؟''

''اب مجھے کبھی مالک نہ کہنا۔ میں بھائی ہوں تمہارا۔ ہم ٹھاکر کبھی کسی سے رشتہ نہیں جوڑتے۔ جوڑ لیں تو جیون بھر نبھاتے ہیں۔''

''ہم اس قابل نہیں مالک۔'' اب کے جمال دین ہاتھ جوڑ کے گڑگڑایا۔

''اب تم کیا چاہتے ہو۔ یہ کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹ لوں۔'' ٹھاکر غرایا۔

جمال دین تھر تھر کانپنے لگا۔ حمیدہ سر جھکا کر بولی۔ ''ٹھیک ہے ویر جی۔ پر یہ بوجھ ہم نہیں اٹھا سکتے۔'' اس نے گٹھری کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ تو اب تمہارا ہے۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی بہن کا حصہ۔ اور اس کے علاوہ بہت کچھ ہے۔'' ٹھاکر نے جیب سے کاغذات نکال کر [illegible] پر رکھ دیے۔ ''یہ زمین کے کاغذات ہیں۔''

حمیدہ رونے لگی۔ ''یہ میں کیسے مان لوں......''

''تو بھائی کی ارتھی اٹھنے پر مانو گی۔'' ٹھاکر نے کڑے لہجے میں کہا۔

جمال دین کا چہرہ فق ہو گیا۔ ''چلو حمیدہ...... اٹھاؤ اسے۔ اب کوئی بات نہ کرنا۔'' اس نے حمیدہ کو ڈانٹا۔ پھر وہ ٹھاکر کی طرف مڑا۔ ''اب کوئی بری بات منہ سے نہ نکالنا مالک۔ ہم جاں نثار لوگ ہیں۔ یہ سب نہیں سن سکتے۔''

''تم بھی آئندہ مجھے مالک نہ کہنا۔'' ٹھاکر نے جمال دین سے کہا۔

''تت...... تو...... کیا......؟''

''تم کون ہو میرے؟''

''میں آپ کا وفادار غلام ہوں۔''

''نہیں۔ حمیدہ بہن کے رشتے سے اب تم میرے جیجا ہو۔''

''تو میں کیا کہوں مالک؟''

ٹھاکر نے چند لمحے سوچا۔ پھر بولا۔ ''بس ٹھاکر جی کہہ لینا۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔''

''ٹھیک ہے ٹھاکر جی۔''

''اب میں چلتا ہوں۔'' ٹھاکر نے کہا۔ مگر دروازے پر پہنچ کر وہ مڑا۔ ''سنو...... اس رشتے سے میرے گھر، میرے پورے پریوار پر تمہارا ادھیکار ہے۔ یہ بات کبھی نہ بھولنا اور میرے گھر میں کوئی بھی اس سے انکار نہیں کرے گا۔ یہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی زبان ہے۔'' پھر وہ گھر سے نکل گیا۔

❁......❁......❁
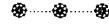
آنے والے وقت میں یہ ثابت ہوتا گیا کہ ننھے ٹھاکر اوتار سنگھ کو کسی کی تربیت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دودھ کے حق کو اور اس کے رشتوں کو خوب پہچانتا تھا۔ اس کی بے معنی غوں غاں بامعنی لفظوں سے قریب ہونے لگی تو کیا ٹھاکرانی اور کیا ملازم، سبھی اسے سکھانے پر تل گئے۔ ٹھاکر کے لیے پتاجی اور ٹھاکرانی کے لیے ماتاجی بس انہی دو لفظوں کی تلقین کی جا رہی تھی اسے۔ لیکن خود اس نے دودھ کا احترام ملحوظ رکھا۔ پہلا لفظ جو اس کی زبان سے ادا ہوا، وہ اماں تھا...... اور حمیدہ کے لیے تھا اور پہلا لفظ ادا کرنے کے بعد وہ دو ماہ تک اور کچھ نہیں بولا۔ سکھانے والوں کو لگتا تھا کہ وہ دیوار سے سر پھوڑ رہے ہیں اور حمیدہ کو اماں کہتے ہوئے اس کی آواز میں لپک، لہجے میں مٹھاس اور آنکھوں میں وارفتگی ہوتی تھی۔

پھر دو ماہ بعد وہ بولا تو خوب بولا۔ ابتداء میں ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ بلا کا ذہین ہے۔ ایک بار سننے کے بعد کوئی لفظ کبھی اس کے حافظے سے محو نہیں ہوا۔ اس کی سیکھنے کی رفتار بہت تیز تھی۔ بچے کی بڑھوتی کا عمل اتنا خوب صورت ہوتا ہے کہ مائیں اس کے سحر میں گرفتار رہتی

ہیں۔ اور ٹھاکرانی رنجیتا تو وہ ماں تھی، جسے ناامیدی کی انتہا پر پہنچ کر معجزانہ طور پر بیٹا ملا تھا۔ وہ تو زندگی کا سب سے خوب صورت وقت گزار رہی تھی۔ اسے ہوش ہی نہیں تھا۔ وہ تو جب چھوٹا ٹھاکر پٹ پٹ بولنے لگا اور بولتا چلا گیا تو اچانک ایک دن اسے خیال آیا کہ اب وہ کسی دن، کسی کے بھی سامنے حمیدہ سے دودھ مانگ سکتا ہے۔ تب اس نے پہلی بار اسے سمجھایا۔ ''پتر...... کبھی کسی کے سامنے اماں سے دودھ نہ مانگنا اور کبھی کسی کو بتانا بھی نہیں۔''

ننھا ٹھاکر ٹکر ٹکر ماں کو دیکھتا رہا۔ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ اس نے وجہ بھی نہیں پوچھی۔

وہ تو ٹھاکرانی کو بعد میں احساس ہوا کہ چھوٹے ٹھاکر کی زبان چلے چھ ماہ ہو چکے ہیں اور وہ اب اسے یہ بات سمجھا رہی ہے۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ ان چھ ماہ میں اب تک چھوٹے ٹھاکر نے ایسا نہیں کیا ہے۔ ورنہ تو اس کی بے خبری میں بھانڈا پھوٹ چکا ہوتا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔

چھوٹے ٹھاکر اوتار سنگھ کے دو سال کا ہوتے ہوتے بہت کچھ واضح ہو چکا تھا۔ وہ حمیدہ کو اپنی ماتاجی سے کم نہیں سمجھتا تھا بلکہ شاید ماتاجی کی نسبت اس سے زیادہ محبت کرتا تھا۔ دوسرے وہ وصال دین سے بہت قریب تھا۔ اتنا قریب کہ اس سے دوری اسے گوارا نہیں تھی۔ وہی ایک اس کا ہم جولی تھا۔ اپنی ہر چیز، ہر کھلونے میں وہ اسے شریک کرتا تھا۔ اس کے بغیر کھیلتا ہی نہیں تھا اور وہ اپنے سے دس ماہ بڑے وصال دین کو ویر جی کہتا تھا۔ لیکن حمیدہ اور وصال دین سے اس کے تعلق سے بڑھ کر غیر معمولی اس کا جمال دین سے تعلق تھا۔ جمال دین سے اس کا سامنا بہت کم ہوتا تھا لیکن جب بھی ہوتا، وہ جمال دین سے بڑے احترام اور ادب سے ملتا اور کسی کے سمجھائے بغیر وہ خود سے اسے چاچا جی کہتا تھا۔ ہاں، ٹھاکر پرتاپ سنگھ سے اسے بے حد محبت تھی۔ اور وہ جانتا تھا کہ ان سے ناز برداری کرانا اس کا حق ہے۔ اور لطف یہ کہ اس کے خیال میں ان پر ویر جی...... یعنی وصال دین کا بھی اتنا ہی حق تھا۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ ان دو برسوں میں بہت بدل گیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ حویلی سے باہر ہی نہ نکلتا۔ ہر وقت اپنے بیٹے کو دیکھتا رہتا۔ اپنے بچوں کو جسمانی محبت اور قربت دینا راجپوت کا مزاج نہیں۔ لیکن ٹھاکر مختلف تھا۔ وہ بیٹے کو گود میں اٹھاتا، زانو پر بٹھاتا، اسے چومتا، پیار کرتا اور ٹھاکرانی یہ دیکھ کر نہال ہوتی، یہ بیٹا اس کی زندگی میں بہار لایا تھا۔

ٹھاکر کی ایک بات عجیب تھی۔ وہ اپنے ننھے سے بیٹے سے بڑے احترام سے بات کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ اسے آپ کہتا۔ اس نے کبھی اسے تم کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔ سچ یہ ہے کہ اتنی عزت اس نے کبھی کسی کو نہیں دی تھی۔ شاید اس کا سبب وہ واقعات تھے، جو ننھے ٹھاکر کی پیدائش سے پہلے اور فوراً بعد پیش آئے تھے۔ ٹھاکر کے دل میں یہ خیال راسخ ہو گیا تھا کہ اس کا بیٹا بہت خاص ہے...... کوئی آسمانی چیز۔

ٹھاکر نے بیٹے کے لیے کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ کوئی کھلونا ایسا نہیں، جو وہ اس کے لیے نہیں لایا ہو۔ اور اسے خوشی تھی کہ اس کا بیٹا اپنے دودھ شریک بھائی کو اپنی چیز میں شریک کرتا ہے۔ وہ بہت خوش، مطمئن اور آسودہ تھا۔

ننھے ٹھاکر کو لکڑی کا گھوڑا بہت پسند تھا۔ وہ اس پر بیٹھ کر جھولتا رہتا۔ آگے پیچھے، آگے پیچھے۔ پھر ایک دن اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اس تحریک کے باوجود وہ اور اس کا گھوڑا وہیں کے وہیں رہتے ہیں، ذرا سا بھی آگے نہیں بڑھتے۔ شاید اس کا غیر شعوری احساس اسے ویر جی کو گھوڑے پر سواری کرتے دیکھ کر ہو گیا تھا لیکن شعوری طور پر اس نے یہ بات اپنے ہی حوالے سے سمجھی اور پھر اس نے اس گھوڑے کو چھوڑ دیا۔ وہ اس کے دل سے اتر گیا تھا۔

تب چھوٹے سے ٹھاکر اوتار سنگھ نے ایک بڑی بات سمجھی۔ لکڑی کا وہ گھوڑا اسے بہت محبوب تھا اور اب وہ دل سے اترا تو جیسے اس کے اندر کوئی کمی ہو گئی۔ کوئی خلا پیدا ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں بہت کچھ ہوا۔ وہ چڑچڑا اور اداس ہو گیا۔ اسے جھنجلاہٹ تھی کہ گھوڑا اس کی توقع پر پورا نہیں اترا۔ وہ بے کیف اور ناخوش ہو گیا۔

یہ بات ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے محسوس کر لی۔ ''کیا بات ہے پتر، آپ چپ چپ کیوں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''پتا نہیں پتا جی۔'' تین سالہ اوتار سنگھ نے جواب دیا۔

ٹھاکر نے متروک گھوڑے کو دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ پچھلے کافی دنوں سے اس کے بیٹے کا محبوب ترین مشغلہ اس پر سواری کرنا تھا۔ ''اور آج آپ اس گھوڑے پر بیٹھ کر سیر کو بھی نہیں گئے۔'' اس نے کہا۔

''یہ گھوڑا بہت خراب ہے پتا جی۔''

''کیوں بھئی؟ کیا خرابی ہے اس میں؟'' ٹھاکر نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''یہ ایک جگہ کھڑا رہتا ہے۔ اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھتا۔''

''تو پھر؟''

''میں اس پر بیٹھ کر سیر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ نہیں کرا سکتا۔ اب میں اس پر نہیں بیٹھوں گا۔''

''تو پتر، یہ اصلی گھوڑا تو نہیں ہے۔ یہ تو لکڑی کا گھوڑا ہے۔''

''آپ مجھے اصلی گھوڑا لا دیں۔ میں بیٹھوں گا۔''

''ابھی آپ بہت چھوٹے ہو پتر۔ اس پر نہیں بیٹھ سکتے۔ بڑے ہو گے تو میں خود آپ کو گھڑ سواری سکھاؤں گا۔''

''نہیں پتا جی۔ مجھے تو ابھی گھوڑے پر بیٹھنا ہے۔''

ٹھاکر پرتاپ سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے دیکھا تھا کہ اس کا بیٹا ضد کم کرتا ہے لیکن

ضد کرے تو پھر پیچھے نہیں ہٹتا۔ اب مزید سمجھانے کا مطلب یہ تھا کہ اس کی ضد بڑھے گی۔ چنانچہ اس سے بچنا ضروری ہے۔ پر اب اسے بہلایا کیسے جائے۔

اچانک وہ مسکرایا۔ وہ کسی بھی رنگ، نسل اور مذہب سے تعلق رکھتا ہو، ہر باپ کے اندر ایک گھوڑا چھپا ہوتا ہے۔ اس لمحے ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے اندر بھی ایک گھوڑا ہنہنایا۔ ''میں آپ کو ابھی ایک ایسا گھوڑا لا کر دیتا ہوں پتر۔'' اس نے کہا اور کمرے کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک لمبی ڈوری تھی۔ اس ڈوری کو اس نے درمیان میں سے اپنے دانتوں سے گزارا اور زمین پر گھٹنے ٹکا کر گھوڑا بن گیا۔ ''آؤ پتر، بیٹھ جاؤ اور یہ لگام تھام لو۔'' اس نے بیٹے سے کہا۔

ننھا ٹھاکر بڑے اشتیاق سے اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ وہ اصلی گھوڑے کے مسئلے کو بھول ہی گیا تھا۔ ''یہ لگام کس لیے ہیں پتا جی؟'' اس نے پوچھا۔

''انہیں سیدھے ہاتھ کی طرف جھٹکو گے تو گھوڑا داہنی جانب مڑے گا۔ الٹے ہاتھ کی طرف جھٹکو گے تو گھوڑا بائیں جانب مڑے گا اور لگام اپنی طرف کھینچو گے تو گھوڑا رک جائے گا۔'' ٹھاکر نے اسے سمجھایا۔

''ٹھیک ہے، گھوڑے میاں، اب چلو۔'' ننھے ٹھاکر نے ڈھیلی لگام کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

اور ٹھاکر نے اپنے لاڈلے بیٹے کو بٹھا کر گھوڑے کی طرح دوڑنا شروع کر دیا۔ بیٹا بھی اپنے اختیار کو چیک کرنے کے لیے کبھی لگام ایک طرف جھٹکتا، کبھی دوسری طرف جھٹکتا اور کبھی کھینچ لیتا۔ وہ بہت خوش تھا۔

وہ دونوں حویلی کے بہت بڑے دالان میں اس طرح دوڑ لگاتے رہے۔ ٹھاکر کو حیرت ہوئی کہ اسے تھکن کیوں نہیں ہوئی ہے۔ اسے احساس تھا کہ حویلی کے سارے نوکر یہ تماشہ دیکھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔ سب خوش ہیں۔ ٹھاکرانی کے چہرے سے تو روشنی پھوٹ رہی تھی۔

''چھوٹے ٹھاکر، اب گھوڑا تھک گیا ہوگا۔ اسے آرام کرنے دو۔'' ٹھاکرانی نے پکار کر کہا۔

ننھے ٹھاکر نے لگام کھینچی اور گھوڑا رک گیا۔ ننھے ٹھاکر نے اوپر بیٹھے بیٹھے پوچھا۔ ''پتا جی، گھوڑے تھک بھی جاتے ہیں؟''

''کیوں نہیں پتر۔ محنت کرنے سے ہر جاندار تھکتا ہے۔ گھوڑے بھی۔ اور بڈھے گھوڑے تو زیادہ جلدی تھک جاتے ہیں۔''

ننھا ٹھاکر باپ کی پیٹھ سے اتر آیا۔ ''آپ بڈھے ہیں پتا جی؟'' اس نے پوچھا۔

''میں بڈھا تھا پتر۔'' ٹھاکر نے بلاجھجک کہا۔ ''پر آپ کے آنے کے بعد میں جوان ہو

گیا ہوں۔"

ٹھاکرانی جلدی سے لسی کا بڑا پیالہ لے کر پہنچی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں تولیا تھا۔

"میرے چھوٹے ٹھاکر، تمھارے پتا جی تو تمھیں نہیں بتائیں گے۔ مجھے بتانا پڑے گا۔" اس نے بیٹے سے کہا۔ "گھوڑے کا کچھ حق بھی ہوتا ہے اپنے سوار پر۔ وہ ہمیشہ پورے کیا کرو۔"

ننھے ٹھاکر نے کچھ نہیں کہا۔ بس ماں کو استفسار طلب نظروں سے دیکھتا رہا۔

"گھوڑے کے رکتے ہی اس کا پسینہ خشک کرتے ہیں، اس کے جسم کی مالش کرتے ہیں اور اسے کھلاتے بھی ہیں۔" یہ کہہ کر ٹھاکرانی نے ٹھاکر کے پسینے میں نہائے ہوئے جسم کو تولیے سے پونچھا۔ پھر لسی کا پیالہ اس کی طرف بڑھایا۔ "لو ناتھ، یہ پی لو۔"

ٹھاکر نے ممنونیت سے پتنی کو دیکھا۔ وہ پیالہ منہ سے لگا ہی رہا تھا کہ ننھے ٹھاکر نے اسے ٹوک دیا۔ "پتا جی، گھوڑے تو گھاس کھاتے ہیں۔"

"یہ تو تمھارے پتا جی ہیں پتر۔" ٹھاکرانی نے جلدی سے کہا۔ "تمھاری محبت میں تھوڑی دیر کے لیے گھوڑا بن گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ماتا جی۔" ننھے ٹھاکر نے کہا اور دودھ کے پیالے کو بڑی محبت سے ہاتھ لگایا۔ "پی لیں پتا جی۔" اس کے لہجے میں بھی محبت تھی۔

ٹھاکر کے لیے وہ بڑی خوشی کا دن تھا۔ پہلی بار اس نے اپنے جسم و جاں سے بیٹے کے لیے کچھ کیا تھا۔

دوسرے دن بیٹے نے صبح سویرے ہی ٹھاکر سے گھوڑا بننے کی فرمائش کر دی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اس نے باگیں کھینچ لیں۔ "بس پتا جی۔" اس نے کہا اور اس کی پیٹھ سے اتر آیا۔

"کیوں پتر...... بس اتنی سی دیر؟ مجھے تو مزہ نہیں آیا۔" ٹھاکر نے شکایت کی۔

"پتا جی، میں آپ کو بہت تھکانا نہیں چاہتا۔" ننھے ٹھاکر نے کہا۔ "اور اب ویر جی کی باری ہے۔"

گھوڑے کی طرح بیٹھا ہوا ٹھاکر صرف چند لمحوں کے لیے ہچکچایا۔ کوئی دیکھتا تو اس ہچکچاہٹ کا سبب کبھی نہ سمجھ پاتا۔ یہی سمجھتا کہ اپنے سے نیچے کسی شخص کے بچے کو پیٹھ پر بٹھانے سے جھجک رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں تھی۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے ان چند لمحوں میں بہت کچھ سوچا۔ یہ تو اس نے پہلے ہی لمحے میں سمجھ لیا کہ یہ بھگوان نے اسے بہت اچھا موقع دیا ہے۔ پھر اس نے آگے غور کیا۔ جمال دین کے گھرانے پر اس کے پریوار کی عنایت پر سب لوگ سرگوشیوں میں بات کرتے ہوں گے۔ یہ اسے معاملات کو فطری رخ پر لے جانے کا موقع ملا تھا۔ اب وہ وصال دین کا گھوڑا بنے گا تو سب ملازم دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ ٹھاکر جی کو بیٹا ملا ہے تو وہ ایسے نرم ہو گئے ہیں کہ اپنے کارندوں کے بچوں کو بھی اپنا بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ تاثر ایک بار جم گیا تو آگے کے تمام

معاملات کو بھی اسی روشنی میں دیکھا جائے گا۔ پھر کسی کو کبھی کوئی شبہ نہیں ہو گا۔

چنانچہ ٹھاکر نے سر اٹھا کر بڑی محبت سے وصال دین کو دیکھا اور بولا۔ "آؤ وصال دین، گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔ گھوڑا چلانا آتا ہے تمھیں؟"

پونے چار سال کا وصال دین معصوم بچہ ہی تو تھا۔ اتنے چھوٹے بچوں کو کسی کے مقام اور مرتبے کا کہاں پتا ہوتا ہے اور پھر وہ اوتار سنگھ کے تمام کھلونوں سے کھیلتا رہا تھا۔ تو یہ کھلونا کیوں چھوڑتا۔ "آتا ہے ٹھاکر جی۔" اس نے گردن اکڑا کر بڑے فخر سے کہا اور ٹھاکر کی پیٹھ پر چڑھ گیا۔

"چلو...... گھوڑے میاں۔" اس نے اوتار سنگھ کی طرح آواز لگائی۔

ادھر ٹھاکر نے دوڑ لگائی، اُدھر پوری حویلی میں ہلچل مچ گئی۔ سب کو پتا چل گیا کہ ٹھاکر جی جمال دین کے بیٹے وصال دین کا گھوڑا بن گئے ہیں۔ سب سے پہلے تو ٹھاکرانی دوڑی آئی۔ وہ منظر دیکھ کر وہ بت بن کر رہ گئی۔ ٹھاکر جی سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بس ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

حمیدہ نے یہ سنا تو ننگے پاؤں دالان کی طرف لپکی۔ ٹھاکر سب سے بے نیاز گھوڑا بن کر دوڑ رہا تھا۔ حمیدہ ایسے بوکھلا کر آئی تھی کہ اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ ٹھاکر کے قریب پہنچ کر وہ وصال دین پر گرجی۔ "یہ کیا کر رہا ہے منحوس۔ تجھے تمیز نہیں۔ یہ ٹھاکر جی ہیں۔"

وصال دین سہم گیا۔ ماں ہمیشہ لاڈ پیار کرتی تھی۔ اس طرح پہلے کبھی نہیں ڈانٹا تھا اس نے۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے باگیں کھینچ لیں۔ ٹھاکر رک گیا۔ اس نے سر اٹھا کر حمیدہ کو دیکھا۔

"کیوں ڈانٹتی ہو اسے؟"

"میں تو اسے جان سے مار دوں گی۔" حمیدہ غرائی۔ پھر وصال دین کی طرف پلٹی۔ "اترتا ہے کہ نہیں۔"

وصال دین اترنے لگا تو ٹھاکر نے خود کو اونچا کر لیا۔ "نا وصال دین، ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ بیٹھا رہ۔ میں تیری ماں کو سمجھا لوں گا۔" اس نے کہا۔

حمیدہ کو بھی کچھ ہوش آیا۔ "اسے یوں سر نہ چڑھائیں ٹھاکر جی۔"

ٹھاکر نے تنبیہی لہجے میں دہرایا۔ "ٹھاکر جی! ایسے بات کرتے ہیں بھلا؟"

حمیدہ اس کی بات سمجھ گئی۔ سرگوشی میں بولی۔ "یہ کیا کرتے ہیں ویر جی۔"

ٹھاکر نے بلند آواز میں کہا تاکہ سب ملازم سن لیں۔ "سن حمیدہ، تیرا بیٹا میرے اوتار سنگھ کا دوست ہے۔ اس ناتے یہ اس کا حق ہے مجھ پر۔ اور میں اپنے اوتار سنگھ کی بات کیسے ٹال سکتا ہوں۔"

"مگر یہ گستاخی ہے مالک۔" حمیدہ نے بھی بلند آواز میں کہا۔

اس پر ٹھاکر نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ لفظ مالک سننا اسے گوارا نہیں تھا۔ "تو چنتا نہ کر حمیدہ۔ میں نے خود اسے اٹھایا ہے۔ یہ میرے حکم کی تعمیل کر رہا ہے اور گستاخی تو میرا حکم نہ

ماننے میں ہوتی۔ تو بھی مجھ سے بحث نہ کر۔ جا چلی جا۔'' یہ کہہ کر ٹھاکر اوپر بیٹھے وصال دین سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں بھئی، چلا گھوڑے کو۔''

مگر وصال دین اب چوکڑی بھول چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس نے ضرور کوئی غلطی کی ہے۔ وہ بیٹھا تو رہا۔ مگر اکھڑا اکھڑا تھا۔ دو چکروں کے بعد ٹھاکر نے اسے اتار دیا۔ ٹھاکرانی تولیا اور لسی لے کر آ گئی۔

یہ سچ ہے کہ اس روز ٹھاکر نے سب لوگوں کو بہت کچھ سمجھا دیا۔ مالک کے تیور پہچاننے والوں نے سمجھ لیا کہ جمال دین، حمیدہ اور وصال دین کی کوئی حیثیت ہے اور اب انھیں اس حیثیت کا خیال رکھنا ہے۔

❀......❀......❀
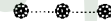
اس رات حمیدہ نے یہ روداد جمال دین کو سنا دی۔ جمال دین پریشان ہو گیا۔ ''یہ تو بہت خطرناک بات ہے حمیدہ۔'' اس نے متوحش ہو کر کہا۔ ''ہم لوگ برسوں سے آگ سے کھیل رہے ہیں۔ یہ تو اللہ کی مہربانی ہے کہ اب تک کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے اور یہ سب کچھ تم نے شروع کیا ہے۔''

''میں نے کیا کیا ہے؟'' حمیدہ نے بھڑک کر کہا۔

''چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانے کا شوق تمھیں ہوا تھا۔ یہ سب وہیں سے شروع ہوا ہے۔''

''تم مرد ہو۔ میری مجبوری کیا سمجھو گے۔'' حمیدہ بولی۔ ''لیکن یہ تو سوچو کہ صرف میرے چاہنے سے کیا ہوتا۔ چھوٹے ٹھاکر نے خود ضد باندھ لی تھی کہ دودھ میرا ہی پئیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں فخر تھا۔ ''اب یہ تو اللہ کی مرضی ہی تھی ورنہ اتنے چھوٹے بچے ایسی ضد نہیں کر سکتے۔''

''یہ بات تو ٹھیک ہے۔ مگر......''

''آپ پریشان کیوں ہو۔'' حمیدہ نے کہا۔ ''اب یہ بھی بڑے ٹھاکر خود ہی کر رہے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر ہمارے بیٹے کی تو عادتیں بگڑ جائیں گی اور کسی دن راجپوت کا خون جوش مار گیا تو کیا ہوگا۔ سوچو تو حمیدہ۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے مجھے اپنی فکر نہیں۔ لیکن میرا بیٹا......''

حمیدہ بھی پریشان ہو گئی۔ ''ڈر تو مجھے بھی لگتا ہے مگر ہم کر کیا سکتے ہیں۔''

''اپنے بیٹے کی تربیت تو کر سکتے ہیں۔ اسے سمجھا تو سکتے ہیں کہ اپنی حیثیت ہمیشہ یاد رکھے۔ وہ سر چڑھائیں تو بھی نہ چڑھے۔''

''کوئی کسی کو کچھ نہیں سکھا سکتا۔ وقت آپ ہی سکھا دیتا ہے۔ اوپر سے گرے گا تو خود

سمجھ جائے گا۔''

''سکھانا تو ہوتا ہے حمیدہ۔'' جمال دین نے آہ بھر کے کہا۔ ''ورنہ اللہ تربیت کا حکم کیوں دیتا۔ پھر آدمی بے خبری میں گرے تو چوٹ لگتی ہے۔ بہت تکلیف ہوتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بیٹے کو کوئی تکلیف ہو۔ اسے گرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا ہوگا۔''

''پر یہ سب کچھ اسے کیسے سمجھاؤ گے؟''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اب بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ میں دیکھ لوں گا۔'' جمال دین نے کہا اور کروٹ بدل لی۔

❀......❀......❀

جمال دین پر حویلی کے دروازے بہت پہلے کھل چکے تھے۔ وہ حویلی میں جب چاہے آ سکتا تھا اور جہاں چاہے جا سکتا تھا۔ اس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ٹھاکر کے خاص کمرے میں بھی وہ بغیر بتائے جا سکتا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر کا پہلا جنم دن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا تھا اور اس روز ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے اپنے تمام رشتے داروں پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اس مسلمان پریوار کو اپنے رشتے داروں سے کم نہیں سمجھتا۔

لیکن جمال دین نے اس رعایت سے کبھی استفادہ نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی کھال میں رہنے والا آدمی تھا۔ جانتا تھا کہ آسانی اپنے مقام پر رہنے میں ہے۔ انسان کی عنایت کا کچھ اعتبار نہیں۔ کون جانے کب عتاب میں تبدیل ہو جائے۔ چنانچہ وہ کبھی کبھار ہی حویلی میں جاتا تھا۔

مگر اس صبح وہ حمیدہ اور وصال دین کے ساتھ حویلی میں چلا گیا۔ وہ دونوں تو ہر روز حویلی میں جاتے تھے۔ چھوٹے ٹھاکر کا دودھ چھڑا دیا گیا تھا۔ مگر معمول پھر بھی نہیں بدلا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ دودھ چھڑانے پر چھوٹے ٹھاکر نے بالکل واویلا نہیں کیا تھا۔ کوئی ضد نہیں کی تھی۔ بس ایک صبح حمیدہ نے اس سے کہا تھا۔ ''چھوٹے ٹھاکر، اب آپ خیر سے بڑے ہو گئے ہیں۔ اب آپ کو ایسے دودھ نہیں پینا ہے۔''

اوتار سنگھ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بس وہ ٹکر ٹکر اماں کو دیکھتا رہا۔

وصال دین نے کہا۔ ''اور کیا چھوٹے ویر۔ دیکھو میں تو پہلے ہی ماں کا دودھ چھوڑ چکا ہوں۔ اب میں بڑا ہو گیا ہوں نا۔'' اس نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر قد اونچا کر کے دکھایا۔

اوتار سنگھ نے بھی اس کی نقل کی اور پھر طمانیت سے سر ہلایا، جیسے اپنے بڑے ہو جانے کا یقین آ گیا ہو۔ ''اب میں ایسے دودھ نہیں پیوں گا اماں۔'' اس نے کہا۔

انداز ایسا تھا کہ حمیدہ نے اس کی بلائیں لے لیں۔ پھر وہ بولی۔ ''آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی چھوٹے ٹھاکر۔ دودھ نہیں پئیں گے؟''

''نہیں اماں۔ بھوک تو لگ رہی ہے۔ پر میں دودھ نہیں پیوں گا۔''

''دودھ نہیں پئیں گے تو اور بڑے کیسے ہوں گے۔''

''پر آپ ہی تو کہہ رہی تھیں کہ......''

''ٹھہریں۔ بس آپ کو بتاتی ہوں کہ اب آپ کو دودھ کیسے پینا ہے۔'' یہ کہہ کر حمیدہ چلی گئی۔ ذرا دیر بعد وہ ٹھاکرانی کے ساتھ واپس آئی۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کا کٹورہ تھا، جس میں دودھ تھا۔ اس نے کٹورہ ٹھاکرانی کو دیا۔ ''لیں مالکن، چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلا دیں۔''

ٹھاکرانی دودھ پلانے لگی تو ننھے ٹھاکر نے ہاتھ سے کٹورے کو پرے کر دیا۔ بولا۔

''اماں کے ہاتھ سے پیوں گا۔''

ٹھاکرانی ہنسنے لگی۔ ''وقت کے بڑے پکے ہیں میرے چھوٹے ٹھاکر۔ لے حمیدہ، یہ وقت تو تیرا ہی ہے۔''

حمیدہ نے دودھ پلا دیا۔ یوں معمول وہی رہا، وقت وہی رہا، بس دودھ پینے کا انداز بدل گیا۔

سو اس صبح جمال دین بیوی اور بیٹے کے ساتھ حویلی میں چلا گیا۔ اس سے پہلے حویلی میں اتنی صبح وہ کبھی نہیں گیا تھا۔ اس نے ٹھاکرانی کو بڑے ادب سے سلام کیا۔ ٹھاکرانی بڑے تپاک سے مسکرائی۔ ''آؤ جمال دین، آج کیسے رستہ بھول پڑے۔ تم تو کبھی آتے ہی نہیں۔''

''بس مالکن، مصروفیت ہی اتنی ہے۔ زمین فرصت ہی نہیں دیتی۔''

''جل پان کرو گے۔ کچھ لاؤں؟''

''شکریہ مالکن، ابھی ناشتہ کر کے نکلا ہوں۔''

''ٹھاکر جی تو اپنے کمرے میں ہیں اور راستہ تمہیں معلوم ہی ہے۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔

اس نے یہ نہیں کہا کہ ٹھاکر جی سو رہے ہیں۔ جانتی تھی کہ ٹھاکر نے اپنے طور پر جمال دین کو یہ ادھیکار دے رکھا ہے کہ وہ جب چاہے، اس کے کمرے میں آئے اور وہ سو رہا ہو تو اسے جگا دے۔ یہ الگ بات کہ جمال دین نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔

جمال دین کا اب بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ''مالکن، اس وقت تو میں چھوٹے ٹھاکر کے دیدار، ان کی سیوا کے لیے آیا ہوں۔''

''ابھی بلاتی ہوں انہیں۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔

لیکن حمیدہ تڑپ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ ننھا ٹھاکر اس وقت بھوکا ہو گا اور اس کے ہاتھ سے ناشتے کا منتظر۔ اس نے شوہر سے کہا۔ ''سنو جی، ابھی چھوٹے ٹھاکر کو ناشتہ کرنا ہے۔ تم ذرا دیر انتظار کر لو۔''

جمال دین نے اسے نظر انداز کر دیا اور ٹھاکرانی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''مالکن، چھوٹا منہ بڑی بات ہو گی۔ پر مجھے ایک بات کہنی ہے۔''

''کہو جمال دین۔''

''ناشتہ کھیل کود کے، کسرت کے بعد اچھا ہوتا ہے۔ پورے کا پورا جسم کو لگ جاتا ہے۔ ناشتے کے بعد کھیل کود اور کسرت صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' ٹھاکرانی بولی۔

''میرا مطلب ہے، چھوٹے ٹھاکر پہلے مجھ سے مل لیں، کھیل کود لیں، پھر ناشتہ کریں گے تو اچھا ہو گا۔''

حمیدہ احتجاج کرنا چاہتی تھی۔ مگر اسی لمحے ٹھاکرانی نے اس سے کہا۔ ''جاؤ حمیدہ، چھوٹے ٹھاکر کو لے آؤ۔'' پھر وہ خود بھی حمیدہ کے ساتھ اندر چلی گئی۔

ننھا ٹھاکر وصال دین کے ساتھ دالان میں آیا تو جمال دین لکڑی کے گھوڑے کے پاس کھڑا اس کی پیٹھ سہلا رہا تھا۔ ننھا ٹھاکر دوڑ کر آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ ''آپ کب آئے چاچا جی؟ یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے چہک کر کہا۔

''یہ آپ کا گھوڑا رو رہا تھا۔ میں اس کے آنسو پونچھ رہا ہوں۔'' جمال دین بولا۔

''یہ رو رہا تھا!'' ننھے اوتار سنگھ نے حیرت سے کہا۔

''جی ہاں۔ آپ اس سے محبت کرتے تھے نا۔ روز اسے صاف کرتے تھے۔ اس پر بیٹھتے تھے۔ یہ خوش ہوتا تھا۔ اس کا عادی ہو گیا تھا۔ اب آپ نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ دیکھیں اس پر کتنی مٹی گرد جمی ہے۔'' جمال دین نے گھوڑے پر ہاتھ پھیرا اور اپنا گرد آلود ہاتھ اسے دکھایا۔ ''اس لیے یہ اداس رہنے لگا ہے۔''

''اداس رہنے لگا ہے۔'' ننھے ٹھاکر نے دہرایا۔ اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''آپ خود غور سے دیکھ لیں۔ آپ کو نظر آ جائے گا۔''

ننھے ٹھاکر نے غور سے دیکھا۔ اداسی کا مطلب تو اسے معلوم نہیں تھا۔ لیکن لکڑی کا وہ گھوڑا اجڑا اجڑا سا لگ رہا تھا۔ اسے افسوس ہونے لگا۔ ''لیکن چاچا جی، یہ میرے کام کا نہیں۔ یہ وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ مجھے کہیں لے جاتا نہیں۔''

''یہ سچ ہے میرے چھوٹے ٹھاکر۔ لیکن ہر چیز کی اپنی اوقات ہوتی ہے، اپنی طاقت ہوتی ہے۔ اس میں یہ طاقت نہیں۔ اس لیے اس سے ناراض ہونا ٹھیک نہیں۔ پہلے تو یہ آپ کا دل بہلاتا تھا نا۔ اب آپ بڑے ہو گئے لیکن اس کا تو قصور نہیں۔ اسے سزا نہیں ملنی چاہیے۔ محبت کرتے وقت دیکھ لینا چاہیے کہ کسی کی طاقت کتنی ہے۔ پھر محبت نہ رہے تو بھی ظاہر نہیں ہونے دینا چاہیے۔ دوسرے کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ کچھ چھن جانے کا دکھ بڑا ہوتا ہے۔'' جمال دین عدم تحفظ کے احساس کے تحت اپنے بیٹے کے حوالے سے بات کر رہا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ننھے بچے کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ ''ہاتھ تھام کر چھوڑتے نہیں چھوٹے ٹھاکر۔'' ننھا ٹھاکر کچھ سمجھا اور

بہت کچھ نہیں سمجھا۔ مگر اس نے جمال دین کی ہر بات پلے سے باندھ لی۔ رائیگاں تو کوئی بات نہیں جاتی۔ بہت سی باتیں بعد میں وقت سمجھاتا ہے۔ لیکن بہر حال وہ اداس ہو گیا۔ اسے لکڑی کے گھوڑے پر ترس آنے لگا۔ ''پھر میں کیا کروں چاچا جی؟'' اس نے پوچھا۔

''روز صبح سویرے اسے کپڑے سے صاف کریں اور اس پر بیٹھیں، چاہے تھوڑی دیر کے لیے بیٹھیں۔''

''پھر یہ اداس نہیں ہوگا۔ روئے گا تو نہیں۔''

''بالکل نہیں۔ پھر یہ اگلی صبح تک خوش رہے گا۔''

ننھے ٹھاکر نے جلدی سے کپڑا لا کر اپنے گھوڑے کو صاف کیا، اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور پھر اس پر بیٹھ کر جھولنے لگا۔ اسے مزہ تو نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس بات کی خوشی تھی کہ لکڑی کا گھوڑا خوش ہو رہا ہوگا...... اور اب اگلے دن تک خوش رہے گا۔

دو منٹ بعد وہ گھوڑے سے اتر گیا۔ ''اتنا ٹھیک ہے چاچا جی؟'' اس نے پوچھا۔

''جی میرے راج کمار۔ آیئے، اب اصل گھوڑا حاضر ہے۔'' جمال دین نے جواب دیا اور گھوڑا بن گیا۔

وہ چھوٹے ٹھاکر کو اٹھا کر دوڑتا رہا۔ اس دوران میں ٹھاکرانی اور حمیدہ بھی باہر دالان میں آ گئی تھیں اور یہ تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ کافی دیر بعد ننھے ٹھاکر کے اصرار پر جمال دین نے اسے اتارا۔

''اب میری باری ہے ابا۔'' وصال دین نے کہا۔

''نہیں بیٹے، میں تھک گیا ہوں۔ تجھے بعد میں سیر کرا دوں گا۔'' جمال دین نے اسے ٹالا۔ اس نے سوچا تھا کہ اسے بعد میں سمجھائے گا۔

ننھے ٹھاکر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر پہلے ٹھاکرانی کو اور پھر حمیدہ کو دیکھتے ہوئے تڑپ کر بولا۔ ''اماں...... جلدی سے تولیا لاؤ اور دودھ بھی۔''

جمال دین کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ لیکن دونوں عورتیں سمجھ گئیں۔ ٹھاکرانی نے حمیدہ کو آنکھ کا اشارہ کیا۔ حمیدہ چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ایک ہاتھ میں تولیا اور دوسرے میں دودھ کا پیالہ تھا۔

ننھے ٹھاکر نے چند لمحے ماتا جی اور اماں کو دیکھا۔ پھر تولیہ لیا اور ننھے ننھے ہاتھوں سے جمال دین کا چہرہ اور بازو خشک کرنے لگا۔ جمال دین بوکھلا گیا۔ ''یہ...... یہ آپ کیا کر رہے ہیں چھوٹے ٹھاکر۔''

ننھے ٹھاکر کے ہاتھ نہیں رکے۔ ''پتا جی کہتے ہیں، گھوڑے کا خیال رکھنا چاہیے۔''

اس دوران ٹھاکرانی مسکراتی رہی اور حمیدہ دودھ کا پیالہ لیے کھڑی رہیں۔ ننھے ٹھاکر

نے ہاتھ روکا اور حمیدہ سے بولا۔ ''اب اپنے ہاتھ سے چاچا جی کو دودھ پلاؤ اماں۔''

''وہ بھی پلا دوں گی۔ اب آپ ناشتہ کر لیں چھوٹے ٹھاکر۔''

ننھا ٹھاکر جمال دین کی طرف مڑا۔ ''میں جاؤں چاچا جی۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔''

''ضرور جائیں چھوٹے ٹھاکر۔ پر پہلے ایک بات کر لیں۔ آج سے میں آپ کا گھوڑا ہوں۔ مگر یہ بتائیں، جب میں بڈھا ہو جاؤں گا اور آپ بڑے ہو جائیں گے تو میں آپ کو پیٹھ پر بٹھا کر دوڑ نہیں سکوں گا۔ تب آپ مجھے لکڑی کے اس گھوڑے کی طرح چھوڑ تو نہیں دیں گے۔''

''نہیں چاچا جی۔ کبھی نہیں چاچا جی۔''

''شکریہ ٹھاکر۔ اب آپ جائیں۔ ناشتہ کر لیں۔''

❁......❁......❁

اس روز دوپہر کو جمال دین کھانے کے لیے گھر آیا تو اس نے وصال دین کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ ''بیٹا...... اب میں تجھے بتاؤں گا کہ میں نے حویلی میں تجھے اپنی پیٹھ پر کیوں نہیں بٹھایا تھا۔''

وصال دین استفہامیہ نظروں سے باپ کو دیکھتا رہا۔ ''دیکھ بیٹے، تو میرا بیٹا ہے۔ میرا سب کچھ ہے۔ میں اور تیری ماں تیرے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ہم تجھ سے محبت کرتے ہیں۔ تو ہمارے لیے شہزادہ ہے۔ ماں باپ کے لیے ان کی اولاد ایسی ہی ہوتی ہے لیکن ایک حقیقت اور ہوتی ہے۔ یہ کہ کوئی دنیا کے لیے کیا ہے۔ اس کی دنیا میں کیا حیثیت ہے۔ تیری سمجھ میں میری بات آسانی سے نہیں آئے گی۔ لیکن غور سے سننا اور ہر بات کو یاد رکھنا۔ آدمی کو اپنی حیثیت ہر جگہ اور ہر حال میں یاد رکھنی چاہیے۔ کوئی اس سے بڑھ کر سمجھے تو یہ اس کی مہربانی، اس کا احسان اور بندے کو احسان کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔ ''تو سمجھ رہا ہے میری بات؟''

چار سال کے وصال دین نے انکار میں سر ہلایا۔ ''نہیں ابا۔''

''کوئی بات نہیں۔ بس غور سے سن اور یاد رکھ۔'' جمال دین نے کہا۔ اسے بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔ چار سال کا بچہ تو لفظ حیثیت کا مطلب بھی نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن سمجھانا ضروری ہے۔ گستاخی تو گستاخی ہوتی ہے۔ چاہے چار سال کا بچہ کرے۔ بتانا تو پڑے گا۔ اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''تو بیٹے، تیری حیثیت کیا ہے۔ ابھی تو چھوٹا ہے۔ جب تو دنیا میں کچھ کرے گا تو تیری حیثیت بنے گی۔ اس وقت تک تیری حیثیت وہ ہے جو میری ہے اور میری حیثیت کیا ہے؟ میں کسان ہوں بیٹے۔ غریب کسان۔ مجھ پر ٹھاکر جی نے مہربانی کی کہ مجھے کچھ زمین دے دی۔ میں ویسے ہی ٹھاکر جی کا مزارعہ تھا۔ ان کی مہربانی کے بعد میں ان کا غلام ہو گیا۔ میں نے کہا نا، بندے کو احسان نہیں بھولنا چاہیے۔ تو ٹھاکر جی نے میرے ابا، تیرے دادا پر بھی احسان کیا تھا۔ میں اسے کبھی نہیں بھولتا۔ میں ٹھاکر جی کا کمی ہوں۔ وہ ایسا نہیں سمجھتے۔ مجھے برابری کا، زمین دار والا مقام

دیتے ہیں۔مگر اس سے میری حیثیت نہیں بدلتی۔تو بتایئے، میری حیثیت کیا ہے، میں کون ہوں؟''

چار سال کے لڑکے نے دماغ پر پورا زور دیا...... باپ کو خوش کرنے کے لیے۔ایسے میں قدرت راہ نمائی کرتی ہے۔ جواب اس کے اندر ابھرا۔اس نے کہا۔''آپ بڑے ٹھاکر جی کے کمی ہیں ابا۔آپ کسان ہیں۔''

جمال دین اس کے جواب سے بہت خوش ہوا۔''شاباش وصال دین شاباش۔''اس نے بیٹے کی پیٹھ تھپکی۔''اب یہ بتا کہ میری اپنی زمین نہیں ہے۔میں نے زمین کمائی نہیں ہے۔اب کوئی مجھے زمین دے دے تو کیا میں زمین دار ہو جاؤں گا؟''

''نہیں ابا۔''

''بالکل ٹھیک۔'' جمال دین نے پُر جوش لہجے میں کہا۔''ٹھاکر جی چاہے مجھے اپنے برابر میں جگہ دیں۔مگر میرا مقام تو ان کے قدموں میں ہے نا۔''

''جی ہاں ابا۔''

''اور جو میری حیثیت ہے، تیری بھی وہی ہے تو تو کون ہے؟''

وصال دین نے سینہ پھلا کر بڑے فخر سے کہا۔''ابا...... میں کمی ہوں...... کسان ہوں...... آپ کا بیٹا ہوں۔''

''شاباش۔میں چاہتا ہوں، تو یہ بات کبھی نہ بولنا۔اب تجھے ٹھاکر جی اور مالکن چھوٹے ٹھاکر کے برابر سمجھیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔تو کبھی خود کو چھوٹے ٹھاکر کے برابر نہ سمجھنا۔دیکھ تیرے دادا پر جو احسان تھا، وہ مجھ پر ہے کیونکہ میں ان کا بیٹا ہوں اور جو احسان مجھ پر ہے، وہ تجھ پر ہے۔کیونکہ تو میرا بیٹا ہے۔میں اس احسان کے بدلے کیا کرتا ہوں؟ ٹھاکر جی کی ہر بات مانتا ہوں۔خود کو ان کا غلام سمجھتا ہوں...... اور ہمیشہ سمجھوں گا۔

''اب حیثیت کی بات سمجھ۔وہاں حویلی میں تو اور میں دونوں غلام ہیں۔یہاں اس گھر میں ٹھاکر جی نہ ہوں تو میں بادشاہ ہوں اور تو شہزادہ ہے۔تجھ سے بڑھ کر دنیا میں میرے لیے کچھ بھی نہیں۔یہاں میں تیرا گھوڑا ہوں۔جب تو کہے میں تجھے سواری کراؤں گا۔لیکن حویلی میں میں صرف چھوٹے ٹھاکر کا گھوڑا ہوں۔وہاں تجھے سوار کروں تو تجھے چھوٹے ٹھاکر کے برابر سمجھوں گا اور یہ غلط ہے۔ٹھیک ہے نا۔''

''میں سمجھ گیا ابا۔''

''اب تیرا دل چاہے تو میں تیرا گھوڑا بن جاؤں؟'' جمال دین نے پوچھا۔

''نہیں ابا۔مجھے تو اس کا شوق ہی نہیں۔''

''یہ بھی اچھا ہے۔اب میری آخری بات غور سے سن۔چھوٹے ٹھاکر نے تیری ماں کا دودھ پیا ہے۔اس طرح وہ تیری ماں کا بیٹا ہے۔تیرا بھائی ہے۔لیکن تو اس کا بھائی نہیں۔تو غلام ہی

رہنا۔کبھی اس کی برابری نہ کرنا۔وہ تجھے اپنا بھائی سمجھے تو یہ اس کی بڑائی ہے۔پر تو کبھی خود کو اس کا بھائی نہ سمجھنا۔وہ تجھے کھیل میں، کسی بھی چیز میں شریک کرے، تجھے یہ خیال رکھنا ہے کہ تو زمین ہے اور وہ آسمان اور زمین اور آسمان کبھی نہیں ملتے۔''

چار سال کے بچے نے فوراً چیلنج کیا۔''ابا، آسمان اور زمین تو ملتے ہیں۔وہ دیکھیں۔''

جمال دین نے اس طرف دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی۔''اس جگہ کی کوئی نشانی مقرر کر لے بیٹے، جہاں زمین اور آسمان مل رہے ہیں۔''

وصال دین نے غور سے دیکھا اور بولا۔''وہ جو بڑا پیڑ ہے برگد کا، وہاں ابا۔''

جمال دین اٹھ کھڑا ہوا۔''چل بیٹے۔دیکھ کر آتے ہیں۔''

دونوں گھر سے نکل آئے۔وہ پیڑ کوئی میل سوا میل کے فاصلے پر تھا۔''تو بس پیڑ پر نظر رکھنا بیٹے۔''

دھوپ میں وہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ پسینے میں نہا گئے۔''اب دیکھ بیٹے، آسمان کہاں ہے اور زمین کہاں ہے۔'' جمال دین نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

وصال دین شرمندہ نظر آ رہا تھا۔اور وہ آگے کی طرف دیکھ رہا تھا۔''وہ دیکھو ابا۔کرتارے کے گھر کی چھت پر۔''

''چل، وہاں بھی دیکھ لیتے ہیں۔'' جمال دین نے نرمی سے کہا۔

ننھے بچے کے حصے میں وہاں پہنچ کر بھی شرمندگی ہی تھی۔مگر وہ اب بھی آگے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''دیکھ بیٹے، یہ نظر کا دھوکا ہے۔زمین آسمان کبھی نہیں ملتے۔دیکھنے والے کو ایسا لگتا ہے۔لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔بالکل ویسے ہی جیسے تو چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ کھیلے تو دیکھنے والوں کو لگے کہ تو اور وہ دوست ہیں لیکن اصل میں وہ مالک ہیں اور تو غلام۔تجھے یہ بات یاد رکھنی چاہیے بیٹے۔''

''ٹھیک ہے ابا۔'' وصال دین نے کہا۔اس نے زمین اور آسمان کا فلسفہ بہت اچھی طرح سمجھ لیا تھا...... اور ہمیشہ کے لیے سمجھ لیا تھا۔

کہتے ہیں کہ ہر بیٹا اپنے باپ پر جاتا ہے۔کچھ چیزیں تو پیدائش کے وقت ورثے میں خود بخود مل جاتی ہیں۔وصال دین بھی جمال دین کا بیٹا تھا۔جو باپ نے سمجھایا تھا، وہ اپنی جگہ۔لیکن کچھ تو اس کے اندر پہلے سے موجود تھا۔''ابا...... آپ بڑے ٹھاکر جی کی ہر بات مانتے ہو۔انکار نہیں کرتے؟'' اس نے پوچھا۔

''بالکل بیٹا۔میں انکار کر ہی نہیں سکتا۔''

''تو میں بھی کبھی انکار نہ کروں۔''

''یہی تو میں سمجھا رہا ہوں تجھے۔''

''وہ گھوڑا بنیں اور مجھ سے بیٹھنے کو کہیں تو۔''

جمال دین لاجواب ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے۔ پر اپنی حیثیت ہمیشہ یاد رکھنا۔'' اس نے بجھے دل سے کہا۔

❋……❋……❋
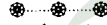
وہ تیسرا سال تھا کہ ٹھاکر فصلوں کی آمدنی میں جمال دین کا حصہ لے کر اس کے گھر آیا تھا۔ اس نے رقم کی پوٹلی جمال دین کو دیتے ہوئے کہا۔ ''تم کب تک اپنے حصے کا کام مجھ سے کراتے رہو گے جمال دین۔ اب مجھے ہلکا کر دو۔''

جمال دین کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ پوٹلی ہاتھ میں لیے نظر میں جھکائے بیٹھا رہا۔

''تم تو کچھ بولتے ہی نہیں۔ بھئی اپنی زمینوں کا انتظام آپ سنبھالو نا۔''

''مجھے یہ سب کچھ آتا ہی نہیں ٹھاکر جی۔'' جمال دین نے دبی آواز میں کہا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ مگر یہ تو بتاؤ، اس پیسے کا کیا کرتے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں۔ صندوق میں رکھ دیتا ہوں ٹھاکر جی۔''

''اب یہ نہ کہنا کہ تمھیں پیسہ خرچ کرنا بھی نہیں آتا۔''

''سچ ہے ٹھاکر جی۔ مجھے یہ بھی نہیں آتا۔''

''یہ کون سا مشکل کام ہے۔ اچھا سا مکان بنواؤ۔ مال مویشی خریدو۔ میری بہن کے لیے زیور گہنا بنواؤ۔ اب تمھارے پاس کمی تو نہیں ہے۔''

''نہیں ٹھاکر جی۔ اب تو زیادتی ہے جی۔ مکان کی ضرورت نہیں۔ یہ مکان کافی ہے ہمارے لیے۔ ابا کے ساتھ یہاں برسوں رہا ہوں میں۔ یہ ابا کی نشانی ہے۔''

''تو زمین کی کمی نہیں تمھارے پاس۔ کسی دوسری جگہ مکان بنوالو۔''

''ہم یہاں خوش ہیں ٹھاکر جی۔ تو دوسرا مکان کس کے لیے بنواؤں اور مال مویشی رکھوں تو اکیلی جان۔ کیسے دیکھ بھال کروں گا ان کی۔''

''نوکر ملازم رکھ لینا۔''

''نہیں ٹھاکر جی۔ میں تو خود نوکر ہوں۔ یہ کام میرے لیے اچھا نہیں اور حمیدہ کو زیور سے دلچسپی نہیں۔''

ٹھاکر کو حیرت ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ اب جمال دین کے پاس لاکھوں روپے ہیں، جائیداد ہے لیکن وہ وہیں کا وہیں ہے۔ اس میں اوپر جانے کی لگن تھی ہی نہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اب تک ٹھاکر کے مقابلے میں کھڑا ہو چکا ہوتا۔ اس نے یہ بات جمال دین سے کہہ دی۔

''میں آپ کے سائے میں رہنا چاہتا ہوں ٹھاکر جی۔ مجھے بڑا نہیں بننا۔ جیسا مجھے رب نے بنایا ہے، میں ویسا ہی اچھا ہوں۔'' جمال دین نے کہا۔ ''جو زمین آپ نے میرے ابا کو دی تھی، وہ ہماری ضرورت کے لیے بہت کافی ہے۔ باقی سب کچھ تو میں نے صرف آپ کی خوشی کے لیے رکھا ہے۔ ورنہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔''

''اتنا مانتا ہے مجھے۔'' ٹھاکر نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

''اتنا مانتا ہوں ٹھاکر جی کہ بتا نہیں سکتا۔'' جمال دین نے کہا۔ ''آپ کے حکم پر میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ جان بھی حاضر ہے۔''

ٹھاکر چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''اچھا۔ میں کہوں، نماز چھوڑ دے تو تو نماز چھوڑ دے گا۔''

''نہیں ٹھاکر جی۔ نہیں چھوڑوں گا۔''

''تو پھر کیا مانتا ہے مجھے۔''

''ہر ایک کا اپنا مقام ہے ٹھاکر جی۔ اللہ کا حکم سب سے بڑا ہے۔ اس کے حکم پر تو آدمی دوسروں کو مانتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا مقام سمجھتا ہے۔ جیسے آپ کے مقابلے میں کسی اور کی بات نہیں مانوں گا۔ ویسے ہی اللہ کے مقابلے میں آپ کی بات نہیں مانوں گا۔''

ٹھاکر کے تجسس کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس نے جمال دین کو ہمیشہ وفاداری، عاجزی اور فرماں برداری میں لپٹا دیکھا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہا تھا اور اس نے صاف انکار کیا تھا۔ ''یہ کیا بات ہوئی جمال دین۔''

''اللہ سب سے بڑا ہے ٹھاکر جی۔ سب کچھ اس کے حکم سے ہے۔''

''اور یہ اپنا حکم نہ ماننے کی سزا میں تجھے یہاں سے نکال دوں تو۔''

''میں یہاں سے چلا جاؤں گا ٹھاکر جی۔'' جمال دین نے ٹھاکر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔''

''اور جو تیرے اپنے گاؤں میں زمین تیرے باپ پر تنگ ہوئی تھی، تو کس نے اسے سہارا دیا تھا۔''

''آپ نے۔''

''تو تجھے اللہ کے مقابلے میں میرا حکم نہیں ماننا چاہیے؟'' ٹھاکر نے بے حد رسان سے کہا۔

''نہیں ٹھاکر جی۔ آپ کو اللہ نے ہمارا وسیلہ بنایا تھا۔ آپ کے دل میں ہماری مدد کا خیال اللہ نے ڈالا تھا۔ ہمیں تو پہلے اللہ کا حکم ماننا ہے۔''

''اور میں تجھے یہاں سے نکال دوں تو تم لوگ بھوکے نہیں مر جاؤ گے۔''

"نہیں سرکار۔ اللہ رزق دینے والا ہے۔"

"تجھے یہ یقین کیسے ہے؟"

"اللہ نے رزق کا وعدہ فرمایا ہے ٹھاکر جی۔ اور دیکھ لیں۔ کہیں کال پڑ جائے تو لوگ بھوک سے مرتے ہیں۔ یہ اللہ کا قہر ہے۔ ورنہ کہیں بھوک سے کوئی نہیں مرتا اور پھر ہم جانتے ہیں کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ ہے۔ مرنا ہے تو مرنا ہے۔" "یہ تو ایمان ہے ہمارا ٹھاکر جی۔"

ٹھاکر بہت حیران تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ راجپوت آن کی خاطر بھگوان سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ ذرا سے فائدے کے لیے بھگوان کے حکم کا انکار کر دیا جاتا ہے۔ پھر یہ جمال دین کس مٹی کا بنا ہے۔ پہلی بار اس کے دل کی گہرائیوں میں مسلمان کی عزت پیدا ہوئی۔ اس نے سوچا، ارے یہ تو ہم سے بڑھ کر اصول کے پکے ہیں۔ "چھوڑ ان باتوں کو جمال دین۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں یونہی تجھے آزما رہا تھا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تو اچھی طرح رہے۔ اب پیسے کی تو کمی نہیں ہے تجھے۔ تو بڑا زمین دار ہے۔ تجھے شان سے رہنا چاہیے۔"

"ساری شان اس رب کی ہے ٹھاکر جی۔" جمال دین نے آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میرے لیے تو اوپر وہ ہے اور نیچے آپ ہیں۔"

"اچھا۔ میں چلتا ہوں جمال دین۔" ٹھاکر اٹھ کھڑا ہوا۔

❀......❀......❀

جمال دین کی اس ملاقات اور گفتگو نے ٹھاکر پرتاپ سنگھ پر بہت گہرا اور ان مٹ نقش چھوڑا تھا۔ اس رات وہ دیر تک اس سلسلے میں سوچتا اور غور کرتا رہا۔ اسے یاد تھا کہ بچپن ہی سے اس نے مسلمانوں کے لیے لفظ ملیچھ سنا تھا۔ ہندو ان کا ذکر حقارت سے کرتے تھے۔ اب ملیچھ کا مطلب ہی گندا ہے۔ تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ اس سوچ کے ساتھ بڑا ہوا تھا۔ راجپوتوں میں تو ویسے ہی برتری کا احساس بہت ہوتا ہے۔ وہ اپنے سامنے کسی کو نہیں گردانتے۔ اور ایسے ہی نہیں۔ ان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ وہ بات کے سچے، کھرے اور صاف گو ہوتے ہیں۔ بہادر ہوتے ہیں۔ پیچھے سے وار نہیں کرتے اور کمزور پر ہاتھ اٹھانا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ آن کے مقابلے میں جان کی بھی انھیں پروا نہیں ہوتی۔ وعدہ وہ کبھی نہیں توڑتے اور دوستی ہر قیمت پر نبھاتے ہیں۔ اور انھیں اپنے ان اوصاف پر فخر ہوتا ہے۔ فخر انھیں اپنے نسب پر بھی ہوتا ہے۔ اور اسی لیے وہ اپنے خون میں ملاوٹ پسند نہیں کرتے۔ اسے خالص رکھنا چاہتے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ جب چھوٹے کے دودھ کا مسئلہ سامنے آیا تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ آگ بگولا ہو گیا۔ اس کا بیٹا ایک مسلمان عورت کا دودھ پی کر اس کے خالص خون میں ملاوٹ کرے، یہ وہ کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ مگر وہ بچہ اس کے لیے زندگی، آن، دھرم، ہر چیز سے بڑھ کر تھا۔ وہ اسے

بائیس برس کی منتوں مرادوں کے بعد ملا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس کے بعد وہ بھی صاحب اولاد نہیں ہو سکے گا۔ یہ بچہ نہ رہا تو اس کی نسل اسی پر ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ اسے بچے کی ضد کے آگے ہارنا پڑا۔

اوتار سنگھ کی پیدائش سے پہلے اسے اور ٹھاکرانی کو خواب میں بیک وقت بشارت دینے والا بھی مسلمان تھا اور انھوں نے دیکھ لیا کہ بشارت سچی تھی۔ پھر اس کی پیدائش والے دن جو مجذوب آیا، وہ بھی مسلمان تھا۔ پھر اس کے بعد اس نے خواب میں اسی مسلمان بزرگ کو دیکھا تھا۔ اسے ان کی ہر بات، ہر تنبیہ یاد تھی اور وہ بچہ نہیں تھا۔ چاہے وہ شعوری طور پر اعتراف کرنے سے بچے، لیکن اس نے جان لیا تھا کہ اس کے بچے کا مسلمانوں سے کوئی تعلق ہے اور اس کا جھکاؤ بھی مسلمانوں کی طرف ہے۔ یہی سمجھنے کے بعد تو اس نے مسلمانوں کے لیے اپنا رویہ تبدیل کیا تھا بلکہ ٹھاکرانی کو بھی تنبیہ کی تھی۔

بچے کی دودھ کی ضد کے سامنے ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے بری طرح شکست کھائی تھی۔ لیکن ایک سچے اور اچھے راجپوت کی طرح اس نے سر جھکایا تو پوری طرح جھکایا اس نے اس دن کے بعد حمیدہ کو اپنے من میں بہن کا درجہ دیا اور وہ سب کچھ کیا جو ایک احسان مند راجپوت کر سکتا تھا۔ لیکن برسوں کے نظریات جو اس کے باطن میں جڑ پکڑے ہوئے تھے، ایک دم سے نہیں مٹ سکتے تھے۔ چنانچہ یہ خلش اسے ہمیشہ ستاتی رہی کہ اس کا خالص خون خالص نہیں رہا۔ اس میں ملاوٹ ہو گئی ہے۔

قدرتی بات ہے کہ وہ اس پر غور کرتا تھا کہ اس کے خون میں ملاوٹ آخر کس قسم کی ہوئی ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کے بیٹے میں کیسی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس کے پاس مسلمانوں کے بس دو ہی حوالے تھے۔ ایک اپنے پرانے کلاس فیلو امان اللہ کا اور دوسرا مہر دین اور اسکے گھرانے کا۔ مگر پہلے اسے ان کے بارے میں غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ مگر اب یہ ضروری ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے وقت میں پیچھے جا کر یاد کرنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ اور اس نے امان اللہ کو نظر انداز کر دیا۔ ایک تو اس کا ساتھ بہت پرانی اور بھولی بسری بات تھی۔ دوسرے اس سے کوئی بالواسطہ تعلق بھی نہیں تھا۔ جبکہ مہر دین کے بیٹے جمال دین سے تھا۔ اس کا بیٹا اسی کی بیوی کا دودھ تو پی رہا تھا۔

سب سے پہلے تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ مسلمان گندے ہرگز نہیں ہوتے۔ اس لیے انھیں ملیچھ کہہ کر پکارنا غلط ہے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ ہندوؤں سے کہیں زیادہ صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ ہر نماز سے پہلے، یعنی دن میں کئی مرتبہ تو وہ آدھا اشنان کرتے ہیں۔ اس کے بغیر تو وہ نماز پڑھ ہی نہیں سکتے۔ پھر اپنی عادات میں بھی وہ پاکیزہ ہوتے ہیں۔ اور یہ کھلی ہوئی بات تھی۔

پھر ٹھاکر کو مہر دین سے ملاقات یاد آئی۔ وہ جب اس سے ملا تو مہاجن اس کے گھر پر قبضہ کر رہا تھا اور پوری بات ٹھاکر کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ گاؤں کا زمین دار مہر دین کی بیٹی کے چکر میں تھا اور اس سلسلے میں مہاجن کے قرضے کو استعمال کر رہا تھا۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے ایسے کھیل بہت دیکھے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ہندوستان کے گاؤں، دیہات تو بلکہ شہروں میں یہ کھیل کروڑوں بار کھیلا جا چکا ہے اور ہر بار غریب کسان نے شکست کھائی ہے اور ظالم زمین دار فتح یاب ہوا ہے۔ غریب نے ہمیشہ عزت اور آبرو کے بدلے اپنا گھر، اپنا معاش بچایا ہے۔ لیکن مہر دین اس پر آمادہ نہیں تھا۔ اس نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ ٹھاکر کو اس کی یہی ادا تو بھائی تھی۔ راجپوت اپنے کردار کے اوصاف پر فخر کرتا ہے۔ مگر اور کسی میں کردار دیکھے اور اوصاف نظر آئیں تو اسے بھی عزت دیتا ہے۔

پھر وہ گھرانہ اس کے گاؤں میں آباد ہو گیا تھا۔ تب اس نے ان کے اور اوصاف دیکھے۔ مگر ان پر غور اب کر رہا تھا۔ وہ وفادار تھے۔ بات کے پکے تھے۔ احسان ماننے والے تھے۔ مطلبی نہیں تھے۔ احسان کرنے والے کے لیے جان دینے میں بھی انھیں عار نہیں تھی۔ یہ چھوٹی خوبیاں نہیں ہوتیں۔

یہ سب پرانی باتیں تھیں۔ مگر اب ٹھاکر پرتاپ سنگھ جمال دین سے اپنی تازہ ترین گفتگو کے حوالے سے سوچ رہا تھا۔ وہ اپنا اور جمال دین کا موازنہ کر رہا تھا۔ اور موازنہ کرنے کے لیے آئینہ دیکھنا ضروری ہے۔ ٹھاکر کو خود کو بھی سمجھنا تھا۔ پہلے ہی مرحلے میں اسے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ مسلمانوں کے لیے اس کی ناپسندیدگی کی کوئی ٹھوس اور معقول وجہ نہیں تھی بلکہ اس کا سبب نسل در نسل ورثے میں ملنے والا تعصب تھا اور وہ خود کوئی اچھا ہندو نہیں تھا۔ اس کے خیال میں یہ دیوی دیوتا سب فرسودہ باتیں تھیں۔ اس نے زندگی میں کبھی پوجا نہیں کی تھی۔ مگر جب اسے بیٹے کی آرزو ہوئی اور وہ پوری ہوتی نظر نہیں آئی تو وہ مندروں میں گیا، پوجا کی، چڑھاوے دیے۔ درختوں تک سے اولاد مانگی۔ اس نے یہ سب کچھ کیا تو اپنی غرض، اپنے مطلب سے۔ اس وقت اگر کوئی اس سے کہہ دیتا کہ اپنے گاؤں میں مندر گرا دینے سے، کوئی مورتی توڑ دینے سے اس کی مراد پوری ہو سکتی ہے تو وہ یقیناً ایسا کر گزرتا۔

اور اصل راجپوت ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے برعکس ایک عام مسلمان جمال دین تھا، جس کی ذات کا، حسب نسب کا پتا نہیں تھا، بلکہ یقیناً وہ اونچی ذات کا نہیں تھا۔ لیکن وہ اس کے ہندو ہونے کے باوجود اس کے احسان کے حوالے سے اس کی ایسی عزت کرتا تھا کہ اس کے لیے جان دے سکتا تھا۔ اس نے خود کہا تھا کہ وہ اللہ کے بعد اسے سب سے بڑا مقام دیتا ہے...... اسے...... ایک ہندو کو! اس کی طاقت کی وجہ سے نہیں۔ صرف اس لیے کہ اس کے اللہ نے احسان ماننے کا حکم دیا ہے اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ چاہے اس سے روزگار چھن جائے، گھر بار چھن جائے، بیوی بچے حتیٰ کہ زندگی چھن جائے، پھر بھی وہ نماز چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ اگر وہ اس سے مورتی کی پوجا کرنے کو

کہتا، تب بھی وہ انکار کر دیتا اور وہ منافق بھی نہیں تھا کہ گھر بچانے کے لیے نماز چھوڑنے کی حامی بھر لیتا۔ بعد میں چاہے چھپ کر نماز پڑھتا رہتا۔ یعنی وہ بزدل نہیں تھا۔ بہادر تھا۔ کمزور ہونے کے باوجود طاقت ور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انکار کرتا تھا۔

اور ایک بہت بڑی خوبی جمال دین کا ایمان تھا۔ اللہ رزق دے گا۔ سب کچھ اسی کے حکم سے ہے۔ اس کا حکم ہو گا تو وہ مر جائے گا۔ زندگی بچاتے کے لیے اس کے حکم کے خلاف کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ ایمان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ مگر اسے ایمان میں بڑی کشش محسوس ہوئی۔ اسے جمال دین پر رشک آیا۔ یہ ایمان اس کے پاس ہوتا تو وہ کہتا...... میرے چھوٹے ٹھاکر بھگوان کی مرضی ہوئی تو جئیں گے۔ میں انھیں مسلمان عورت کا دودھ نہیں پینے دوں گا۔ ٹھاکر کو نامعلوم طور پر احساس ہو رہا تھا کہ ایمان والے کو کوئی نہیں ہرا سکتا۔ کیسے؟ یہ وہ نہیں جانتا تھا۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ اب جمال دین کے پاس ٹھاکر سے زیادہ زمین تھی، زیادہ پیسہ تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ٹھاکر کی نکالنے کی دھمکی سن کر کہتا، تم مجھے کیا نکالو گے۔ میں مالک ہوں اس زمین کا۔ میں تمھیں نکال دوں گا یہاں سے۔ لیکن جمال دین نے اس کے نکالنے کا حق تسلیم کیا تھا۔ اس نے اپنا ناتا اللہ سے ہی جوڑا۔ اور وہ کیسا آدمی ہے کہ اتنی زمین، اتنے پیسے کا مالک ہونے کے باوجود اپنے حال میں مست ہے۔ اس نے کسی سے نہیں کہا کہ اب میں بہت بڑا زمین دار ہوں۔ اس میں بڑائی نہیں۔ عاجزی ہی عاجزی ہے اور اس نے آخر میں کیسے کہا کہ میرے لیے تو اوپر اللہ ہے اور یہاں آپ ہیں ٹھاکر جی۔

اس عاجزی کے سامنے ٹھاکر کا سر جھک گیا۔ اس نے دل میں تسلیم کر لیا کہ جمال دین اس سے بڑا آدمی ہے۔ اس میں راج پوتوں سے زیادہ خوبیاں ہیں۔ پہلی بار اسے یہ اطمینان ہوا کہ حمیدہ کے دودھ نے اس کے بیٹے کو اور بہتر انسان بنایا ہو گا اور یہ کہ وصال دین کے ساتھ کھیل کر اسے خوبیاں ہی ملیں گی خرابیاں نہیں۔

اس رات ٹھاکر پرتاپ سنگھ سویا تو اس کی شخصیت میں ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہو چکا تھا۔

❀......❀......❀
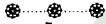
ٹھاکرائن رنجیتا ان دنوں بہت پریشان تھی۔ پریشان بھی اور خوف زدہ بھی۔ پریشان وہ اس لیے تھی کہ اس کا ننھا بیٹا حمیدہ اور وصال دین سے بہت قریب ہو گیا تھا بلکہ یوں کہیے کہ وہ انھیں دیکھ کر جیتا تھا۔ اس کی طبیعت ایسی تھی کہ وہ زیادہ لوگوں سے گھلتا ملتا نہیں تھا۔ اور جن لوگوں سے تعلق جڑا تو وہ بہت گہرائی تک جڑا تھا اس کی زندگی میں ماتا جی، پتا جی، اماں، ویر جی اور چاچا جی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ گھر میں اتنے ملازم، اتنی نوکرانیاں تھیں۔ مگر اسے کسی سے غرض نہیں تھی۔

اب جبکہ اس کا دودھ چھڑایا جا چکا تھا، تو ٹھاکرانی چاہتی تھی کہ اسے حمیدہ اور اس کے پریوار سے دور کر دے لیکن چھوٹا جس طرح ان کا دیوانہ تھا، اس میں یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا، اور یہ تعلق اسی طرح بڑھتا رہا تو ٹھاکرانی کو خوف تھا کہ کسی دن ٹھاکر بری طرح بھڑک جائے گا۔

ویسے ٹھاکرانی کو اپنے چھوٹے سے بچے پر ترس بھی آتا تھا۔ اپنے بھائی بہن ہوں تو بچہ اتنا تنہا نہیں ہوتا لیکن ننھا اوتار سنگھ تو بالکل اکیلا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ حمیدہ اور وصال دین نہ ہوتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔ ٹھاکرانی سوچتی تو اسے اس پر شرمندگی ہوتی کہ وہ انھیں بھی اس سے چھیننے کی کوشش کر رہی ہے۔

پھر اسے خوف تھا اوتار سنگھ ساڑھے تین سال کا ہو چکا تھا۔ ٹھاکر پڑھا لکھا آدمی تھا۔ یہ طے تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو تعلیم دلائے گا۔ اور گاؤں میں کوئی اسکول تھا بھی نہیں۔ تو تعلیم کے لیے چھوٹے کو گھر سے دور جانا ہوگا۔ ابھی تک تو ٹھاکر نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن ٹھاکرانی جانتی تھی کہ اس کے سر پر جدائی کی تلوار لٹک رہی ہے۔ یہ خیال ہی اس کے لیے تڑپا دینے والا تھا کہ ننھا راج کمار اس سے دور ہو جائے گا۔ برسوں کی تنہائی کے بعد وہ اسے ملا تھا۔ وہ تو اسے ایک لمحے کے لیے بھی خود سے دور کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ٹھاکرانی کو بیٹے سے اپنی جدائی کا خیال آتا تو وہ بے رحم ہو جاتی۔ وہ سوچتی کہ وہ عمر بھر کی ترسی ہوئی ماں ہو کر بھی اپنے بیٹے کی جدائی برداشت کر سکتی ہے تو اس کا بیٹا جو صرف ساڑھے تین سال کا ہے، حمیدہ اور وصال دین کی جدائی برداشت کیوں نہیں کر سکتا۔

یوں سوچتے سوچتے اسے ایک دن اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ مسئلے دو نہیں رہے، ایک ہو گیا۔ اس کے ایک مسئلے میں دوسرے مسئلے کا حل تھا۔ اوتار سنگھ پڑھنے کے لیے شہر جاتا تو وہ حمیدہ اور وصال دین سے بھی دور ہو جاتا لیکن اس سے ٹھاکرانی کی تسلی نہیں ہوئی۔ یوں وہ بھی تو محروم ہو جائے گی اپنے بیٹے سے، ایسا کیوں ہو۔ اس کا دودھ کا مطلب نکل چکا تو وہ پھر سے رقابت کی آگ میں جلنے لگی تھی۔

آدمی جس چیز سے ڈرتا ہے، ڈر بڑھ جائے تو خود اس کی طرف لپکتا ہے۔ ٹھاکرانی کی پریشانی اور خوف اتنا بڑھا کہ اس نے خود ہی آگ میں کودنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس رات ننھے ٹھاکر کو سلانے کے بعد وہ بڑے ٹھاکر کے کمرے کی طرف چل دی۔

اوتار سنگھ کی پیدائش کے بعد بڑے ٹھاکر میں بڑی تبدیلیاں آئی تھیں۔ اس کی باہری مصروفیات کم ہو گئی تھیں۔ شام ہوتے ہی وہ گھر میں آ جاتا اوتار سنگھ کے سونے تک وہ اس کے ساتھ وقت گزارتا۔ یہ اس کا ٹھاکرانی پر احسان تھا۔ کیونکہ ننھا اوتار سنگھ سوال بہت کرتا تھا۔ اور زیادہ تر سوال ایسے ہوتے تھے کہ ٹھاکرانی ان کا جواب نہیں دے سکتی تھی بلکہ وہ دیکھتی تھی کہ بعض اوقات تو ٹھاکر بھی پریشان ہو جاتا ہے کہ کیا جواب دے۔

ٹھاکرانی پورے یقین کے ساتھ ٹھاکر کے کمرے کی طرف گئی اور اس کا یقین غلط بھی نہیں تھا۔ ٹھاکر اپنی مسہری پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ ایسا منہمک تھا کہ اسے ٹھاکرانی کی آمد کا پتا بھی نہیں چلا۔ ٹھاکرانی کے پکارنے پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ''رنجو تم؟ کب آئیں؟''

''دیر ہو گئی ناتھ۔ پر آپ تو ایسے کھوئے ہوئے ہیں۔'' ٹھاکرانی نے شکایتاً کہا۔ اسے حیرت ہوتی تھی کہ پچھلے چند ماہ سے ٹھاکر کو کتابیں پڑھنے کا شوق ہو گیا تھا۔ ہر ہفتے پندرہ دن میں وہ شہر جاتا اور کتابیں خرید کر لاتا۔ اوتار سنگھ کے سونے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھتا رہتا تھا۔

ٹھاکر نے کتاب الٹ کر رکھ دی۔ ''ہاں، پڑھتے ہوئے کچھ ہوش ہی نہیں رہتا۔''

''یہ آپ کو اب پڑھنے کا شوق ہوا ہے۔''

''بڑھاپے میں۔'' ٹھاکر نے ہنستے ہوئے ٹکڑا لگایا۔ ''تمھیں حیرت ہوتی ہے؟''

''ہاں ناتھ۔ میری سمجھ میں اس کی ضرورت نہیں آتی۔ پڑھتے کیا ہیں آپ؟''

''کچھ نہیں زندگی کو، دنیا کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''مگر کس لیے؟''

''تمھارے بیٹے کے لیے رنجو۔'' ٹھاکر مسکرایا۔ ''دیکھتی نہیں، کیسے کیسے سوال کرتا ہے۔ میں جواب نہ دے پاؤں تو سمجھے گا کہ اس کا پتا جاہل ہے۔''

''بھگوان نہ کرے۔'' ٹھاکرانی نے جلدی سے کہا۔ ''ویسے وہ سوال بڑے عجیب کرتا ہے۔'' ٹھاکرانی کے لہجے میں فخر تھا۔

''تو ایسے بچے کے لیے تیاری کرنا ضروری ہے نا۔ ایسی تو میں نے کبھی اپنے امتحان کے لیے بھی تیاری نہیں کی تھی۔'' ٹھاکر ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ ''یہ بتاؤ، تم کیسے آئی ہو۔ ویسے تو کبھی خیال ہی نہیں آتا میرا۔ چھوٹے کے بعد تو بس تم اس کی ہو گئیں۔ مجھے تو چھوڑ ہی دیا تم نے۔''

''ایسی باتیں نہ کریں ناتھ۔'' ٹھاکرانی کھسیا گئی۔ ''پر اس وقت تو میں کام سے ہی آئی ہوں۔''

''تو کہہ دو جلدی سے۔''

''میں چاہتی ہوں کہ اپنے چھوٹے کو حمیدہ اور وصال دین سے دور کر دیا جائے۔''

''کیوں بھئی؟'' ٹھاکر حیران رہ گیا۔

''ناتھ، بچہ اب سیکھنے کی عمر میں ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ رہے گا تو انھی کی باتیں سیکھے گا۔''

''یہ تو پہلے سوچنے کی بات تھی ٹھاکرانی۔'' ٹھاکر نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اس نے تو دودھ ہی مسلمان عورت کا پیا ہے۔ اب اتنی فکر کاہے کی کرتی ہو۔''

''وہ تو مجبوری تھی ناتھ۔ بچے کی ضد کے آگے ہارنا پڑا۔ پر اب تو وہ دودھ چھوڑ چکا

ہے۔ اب تو اسے آسانی سے ان سے دور کیا جا سکتا ہے۔''

''تم بھول رہی ہو ٹھاکرانی کہ ہم راجپوت آن کے مقابلے میں کسی مجبوری کو نہیں مانتے۔'' ٹھاکر کے تیور بہت خراب تھے۔ ''اور احسان لینا ہمیں منظور نہیں ہوتا۔ لیکن احسان لے لیں تو جیون بھر یاد رکھتے ہیں۔ سر جھک جائے تو جیون بھر نہیں اٹھتا۔ کیا ہم راجپوت عام لوگوں کی طرح مطلبی ہو سکتے ہیں کہ مطلب نکل جانے کے بعد منہ پھیر لیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہم نے ایسا کیا تو ہم میں اور ایک نیچ منش میں کیا فرق رہ جائے گا۔''

ٹھاکرانی اس کے تیور دیکھ کر سہم گئی۔ ''شما کر دیں ناتھ۔ میں تو سب کا بھلا سوچ رہی تھی۔''

''اچھا...... یہ تو بتاؤ، تم اس سلسلے میں کیا کرنا چاہتی تھیں۔ تمھارے خیال میں چھوٹے ٹھاکر کو ان لوگوں سے کیسے دور کیا جا سکتا ہے؟''

''حمیدہ اور اس کے بیٹے کو حویلی آنے سے روک دیا جائے۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔ اس کے دل میں امید جاگ اٹھی تھی۔

''تم بڑی نادان ہو رنجو۔ اپنے بیٹے کو بھی نہیں جانتیں۔'' اس بار ٹھاکر کے لہجے میں پیار تھا۔ ''جب اسے بولنا نہیں آتا تھا، کچھ بھی نہیں آتا تھا، طاقت بھی نہیں تھی اس میں، تب بھی اس کی ضد نے ہمیں ہرا دیا تھا۔ اب کیا ہو سکتا ہے، یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔''

ٹھاکرانی کچھ نہ بولی۔ یہ بات اس کے دل کو لگی تھی۔ لیکن اس کے ترکش میں ایک تیر ابھی باقی تھا۔ ''اور ناتھ۔ دوسری فکر مجھے چھوٹے کی پڑھائی کی ہے۔ اب پڑھنے کی عمر میں آ رہا ہے وہ۔''

''ہاں...... بلکہ آ چکا ہے۔'' ٹھاکر نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ ''اس کے سوال، اس کی پوچھ تاچھ سے یہی پتا چلتا ہے۔ میرا خیال ہے، کچھ ہی دن بعد میں اس کے سوالوں کے جواب دینے سے ہار جاؤں گا۔ ہاں، اب اسے کسی گیانی استاد کی ضرورت ہے۔''

''لیکن یہاں قریب میں کوئی اچھا اسکول نہیں ہے۔''

''یہ درست ہے۔ تو پھر؟''

''اسے شہر بھیجنا پڑے گا۔''

ٹھاکر دل ہی دل میں پتنی کی عقل مندی پر مسکرایا۔ وہ ہر بات بہت اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ تم اس سے دوری سہہ سکتی ہو۔ اور تم چاہے سہہ لو، یہ میرے بس کی بات نہیں۔''

اب کے سوال اٹھانے کی باری ٹھاکرانی کی تھی۔ ''تو پھر؟ اسے پڑھانا تو ضروری ہے۔''

''ہاں۔ لیکن میں ابھی تو اسے خود سے دور نہیں کر سکتا۔ کچھ بڑا ہو جائے تو دیکھیں گے۔''

''تو پھر؟''

''تم یہ مجھ پر چھوڑ دو رنجو۔'' ٹھاکر نے بڑے پیار سے کہا۔ ''میں خود دہلی جاؤں گا۔ اس مسئلے کا کوئی حل نکل آئے گا۔''

اب ٹھاکرانی کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ ''جو آپ کی اچھا سوامی جی۔'' اس نے کمزور آواز میں کہا۔

❁......❁......❁

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے اپنے بچے کو ایک کڑی آزمائش سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ٹھاکرانی کو اس سے تسلی نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے ہمیشہ یہ خیال رہتا کہ اس سلسلے میں کوشش ہی نہیں کی گئی اور وہ ہمیشہ افسوس کرتی اور ہاتھ ملتی۔ لیکن قدرت نے اسے اس کشٹ سے بچا لیا۔

اس بات کو چند ہی روز ہوئے ہوں گے کہ پہلی بار معمول میں فرق آیا۔ حمیدہ اور وصال دین حویلی نہیں آئے۔ اس روز جمال دین اکیلا ہی آیا تھا۔

چھوٹے ٹھاکر اوتار سنگھ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''چاچا جی، اماں نہیں آئیں۔ ویر جی نہیں آئے؟''

''نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ وہ نہیں آ سکیں گے۔ وصال دین کو بخار ہے...... بہت تیز بخار۔''

ننھے ٹھاکر نے پہلے بخار کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ وہ اپنی اماں اور ویر جی کے نہ آنے کو بھی بھول گیا۔ فطری تجسس ہر بات پر حاوی آ گیا۔ ''یہ بخار کیا ہوتا ہے چاچا جی؟''

جمال دین گڑبڑا گیا۔ وہ اس طرح کے سوالات کا عادی نہیں تھا۔ اب بخار کے بارے میں کیا بتائے۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ''ایک بیماری ہوتی ہے۔''

''اور بیماری کیا ہوتی ہے؟''

جمال دین اور گڑبڑا گیا۔ اس دوران ٹھاکرانی بھی آ گئی تھی اور یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ وہ جمال دین کی مدد کو بڑھی۔ ''شریر میں جو خرابی ہوتی ہے، اسے بیماری کہتے ہیں۔'' اس نے ننھے بیٹے کو سمجھایا۔

''تو بیماری سے کیا ہوتا ہے؟'' ننھے ٹھاکر کے پاس سوالوں کی کمی نہیں تھی۔

''بیماری سے شریر کی شکتی کم ہو جاتی ہے۔''

''اور بخار کیا ہوتا ہے؟''

''اس میں شریر کی گرمی بہت بڑھ جاتی ہے۔ شریر دکھتا ہے اور منش چل پھر نہیں سکتا۔''

اس طرف سے تسلی ہوئی تو ننھے ٹھاکر کو اپنی محرومی کا خیال آیا۔ ''تو ویر جی کب آئیں گے؟''

''پتا نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ بہت تیز بخار ہے اسے۔ دعا کریں کہ شام تک اتر جائے۔''

''خود بخود اتر جائے گا؟''

''نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ ابھی میں وید جی کے پاس جا کر دوا لوں گا اس کے لیے۔''
جمال دین نے کہا۔ پھر زمین پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''آیئے چھوٹے ٹھاکر۔ گھوڑا حاضر ہے۔''

ننھے ٹھاکر نے سواری تو کی۔ لیکن انداز سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ خوش نہیں۔
اور ناشتے سے تو اس نے انکار ہی کر دیا۔ ٹھاکرانی کو تو پرانے دن یاد آ گئے، جب اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔

بہر حال بڑے ٹھاکر کے سمجھانے پر اس نے بڑی بے دلی سے ناشتہ کر لیا لیکن وہ دن اس نے جس طرح گزارا، اسے دیکھ کر ٹھاکر اور ٹھاکرانی دونوں کو ترس آنے لگا۔ وہ تو اس بچے کی طرح تھا، جو بارونق میلے میں اپنے لوگوں سے بچھڑ گیا ہو۔ پورا دن اس نے کسی کھلونے میں، کھیل کود میں دلچسپی نہیں لی۔ بس وہ بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہا۔ بیٹھے بیٹھے اکتا جاتا تو مشینی انداز میں اِدھر اُدھر چلنے پھرنے لگتا۔ وہ اتنا بیزار اور اکتایا ہوا تھا کہ ٹھاکرانی کا دل کٹنے لگا۔

''چلو...... بھگوان نے تمہاری منو کامنا پوری کر دی۔'' ٹھاکر نے رنجیتا سے کہا۔ ''ننھا بیٹا حمیدہ اور وصال دین سے دور ہو گیا۔''

''مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ حال ہو جائے گا میرے راج کمار کا۔'' ٹھاکرانی نے تاسف سے کہا۔

''مگر میں جانتا تھا۔ اس لیے منع کیا تھا۔''

ننھے ٹھاکر نے کھانا بھی برائے نام کھایا۔ ٹھاکرانی کے اصرار پر اس نے کہا۔ ''ماتا جی، کھایا نہیں جاتا۔ گلے میں کچھ پھنس رہا ہے۔''

اس کے لہجے میں ایسی بے چارگی اور دکھ تھا کہ ٹھاکرانی کے اپنے حلق میں کچھ پھنسنے لگا۔

اور سرِ شام ہی چھوٹا ٹھاکر منہ لپیٹ کر پڑ گیا۔ ورنہ اس وقت ہر روز وہ اپنے پتا جی سے کھیلتا، ان سے باتیں کرتا تھا۔ ٹھاکر نے اس سے پوچھا کہ وہ اتنی جلدی کیوں لیٹ گیا ہے تو اس نے کہا۔ ''میں سو جاؤں گا پتا جی۔ صبح اٹھوں گا تو اماں اور ویر جی آ جائیں گے۔''

یعنی وہ اپنے بچھڑے ہوؤں کا انتظار کر رہا تھا۔

ٹھاکرانی کو تو ہول اٹھنے لگا۔ ''ناتھ...... بھگوان نہ کرے، اس کی طبیعت خراب نہ ہو جائے۔'' اس نے گھبرا کر کہا۔

ٹھاکر خود بھی پریشان تھا۔ ''اگر وہ لوگ کل بھی نہیں آ سکے تو؟''

''بھگوان نہ کرے۔'' ٹھاکرانی نے بڑے خلوص سے کہا۔ یہ سوال خود اسے بھی پریشان کر رہا تھا۔ ''اور اگر ایسا ہوا تو؟''

''کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔''

''کسی بھی طرح ان کو آنا ہی ہوگا۔''

ٹھاکر کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ''کیسی بات کرتی ہو رنجیتا۔ وہ بھی منش ہیں۔''

وہ دونوں بار بار بیٹے کے پاس جاتے۔ وہ لیٹا ہوا تو تھا۔ لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔ انھوں نے کئی بار اسے پکارا۔ لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ ظاہر یہی کر رہا تھا کہ وہ سو رہا ہے۔ ٹھاکرانی بار بار اس کا ہاتھ تھام کر دیکھتی کہ کہیں اسے بخار تو نہیں ہے۔

دونوں کی وہ رات سوتے جاگتے گزری۔ کیونکہ ان کا بیٹا بھی اسی حال میں تھا۔ ایک جھپکی آتی اور پانچ منٹ بعد وہ چونک کر اٹھ جاتا۔ ''ماتا جی...... صبح ہو گئی؟''

''نہیں پتر۔ ابھی تو آدھی رات ہے۔ صبح تو بہت دور ہے۔''

''یہ صبح اتنی دیر میں کیوں ہوتی ہے۔'' ننھا بچہ جھنجھلا کر کہتا۔

ٹھاکرانی اسے کیا بتاتی کہ صبح تو اپنے وقت پر ہوتی ہے۔ لیکن انتظار ہو تو وقت جیسے ٹھہر جاتا ہے۔

ٹھاکر بھی رات بھر اس کمرے کے چکر لگاتا رہا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ سوچے جا رہا تھا کہ اس مسئلے کا کیا حل ہے۔

صبح کے قریب کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ نیند آ ہی جاتی ہے۔ اور گہری نیند آتی ہے۔ اس وقت ٹھاکرانی بھی سو گئی۔ ذرا ہی دیر ہوئی ہو گی کہ اوتار سنگھ نے اسے جھنجوڑ کر اٹھا دیا۔ ''اٹھیں ماتا جی، اٹھ جائیں۔ صبح ہو گئی ہے۔''

ٹھاکرانی گھبرا کر اٹھی۔ کھڑکی کے پاس گئی۔ پردہ ہٹا کر باہر جھانکا تو گہرا اندھیرا تھا۔

''نہیں پتر جی، ابھی تو رات ہے۔'' اس نے کہا۔

''نہیں ماتا جی۔ سنیں تو۔ چڑیاں بول رہی ہیں۔''

ٹھاکرانی نے کان لگا کر سنا۔ کہیں ایک آدھ چہکار سنائی دے رہی تھی۔ مگر ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ ''سو جاؤ پتر۔ ابھی تھوڑی دیر ہے صبح ہونے میں۔'' اس نے بیٹے کو سمجھایا۔

لیکن ننھے ٹھاکر کے لیے انتظار کی رات کی صبح ہو چکی تھی۔ یہ الگ بات کہ انتظار اب بھی کرنا تھا۔ وہ اس کے بعد نہ سویا، نہ ٹھاکرانی کو سونے دیا۔

وہ ایسی صبح تھی، جس میں سب کے لیے انتظار ہی انتظار تھا۔ ٹھاکر اور ٹھاکرانی بھی آنے والوں کے منتظر تھے۔ لیکن ان کے آنے کا وقت ابھی دور تھا۔

اور جب وہ وقت آیا تو مایوسی لے کر آیا۔ اس صبح بھی جمال دین اکیلا ہی آیا۔ ''وصال دین کا بخار کل سے اب تک نہیں اترا ہے۔'' اس نے بتایا۔

ننھے ٹھاکر کی مایوسی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس روز اس نے جمال دین پر سواری کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ اور ناشتے کو وہ ہاتھ لگانے کا روادار بھی نہیں تھا۔

ٹھاکر اور ٹھاکرانی پریشان تھے کہ اب کیا کریں۔

اچانک ننھے ٹھاکر نے کہا۔ ''پتا جی...... مجھے ویر جی کے پاس جانا ہے۔ مجھے لے کر چلیں۔''

ٹھاکر کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ اسے حیرت ہوئی اور خود پر غصہ بھی آیا۔ اتنے سامنے کی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس مسئلے کا واحد حل یہ تھا کہ ننھے ٹھاکر کو وصال دین کے پاس لے جایا جائے۔

لیکن ٹھاکر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ٹھاکرانی بول اٹھی۔ ''یہ نہیں ہو سکتا پتر۔''

''کیوں نہیں ہو سکتا ماتا جی؟''

''بس...... نہیں ہو سکتا۔''

''تم چپ رہو ٹھاکرانی۔'' ٹھاکر نے بے حد سخت لہجے میں کہا۔ پھر بیٹے کی طرف مڑا۔ ''یہ ٹھیک ہے پتر۔ ہم خود تمھارے ویر جی کے گھر چلیں گے۔''

ننھا ٹھاکر خوش ہو گیا۔ چوبیس گھنٹے میں پہلی بار اس کے چہرے پر خوشی نظر آئی تھی۔ اسے دیکھ کر ٹھاکرانی کا دل بھی موم ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے ناتھ۔''

''تم ناشتہ تیار کرو رنجو۔ ہم ناشتہ ساتھ لے کر جائیں گے اور تم جمال دین۔'' ٹھاکر جمال دین کی طرف مڑا۔ ''تم وید جی کو لے کر اپنے گھر پہنچو۔''

''وید جی سے تو مجھے دوا لینی ہے۔'' جمال دین نے حیرت سے کہا۔ ''وہ کب کہیں جاتے ہیں۔''

''ان سے کہنا، یہ میرا حکم ہے۔'' ٹھاکر نے سخت لہجے میں کہا۔

جمال دین چلا گیا۔ ٹھاکر گاڑی تیار کرانے لگا۔ جمال دین کا گھر گاؤں کے آخری سرے پر تھا۔ بچے کو اتنی دور پیدل تو نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔

ٹھاکر نے گاڑی تیار تو کرا لی۔ مگر اس کے بعد وہ دوسرے انداز میں سوچنے لگا۔ اسے یاد تھا کہ اپنی غرض کے لیے جب وہ پہلی بار جمال دین کے گھر گیا تھا تو اس نے یہ خیال رکھا تھا کہ غرض مندوں کی طرح جائے۔ سو وہ آدھی رات کو پیدل ہی اس کے گھر گیا تھا اور آج بھی بات غرض کی تھی۔ تو پھر یہ اہتمام اور کروفر کیسا۔ دوسری بات یہ کہ اوتار سنگھ کا حمیدہ سے دودھ کا تعلق جڑنے کے بعد اس نے اس کے گھرانے کو ہر اعتبار سے برابری کا درجہ دیا تھا۔ اب اسے خیال آ رہا تھا کہ یہ

برابری تو نہیں۔ وصال دین اپنی ماں کے ساتھ ہر روز پیدل چل کر حویلی آتا تھا۔ جبکہ اس کا بیٹا تو پہلی بار حمیدہ کے گھر جا رہا تھا۔ اسے بھی پیدل ہی جانا ہے۔

اور اس برابری کے خیال کے تحت ٹھاکر نے ایک فیصلہ اور کیا۔ یہ کیا کہ وصال دین اپنی ماں کے ساتھ ہر روز حویلی آئے۔ یہ بھی برابری تو نہیں۔ برابری تو یہ ہے کہ ایک دن وصال دین حویلی آئے اور دوسرے دن اوتار سنگھ اس کے گھر جائے اور وہاں وقت گزارے۔ یہ فیصلہ کر کے وہ پرسکون ہو گیا۔

ٹھاکرانی ناشتے کا سامان لے کر آئی تو ٹھاکر نے دونوں فیصلے اسے سنا دیے۔ ٹھاکرانی جز بز تو ہوئی۔ لیکن اختلاف کرنے کی جرأت نہ کر سکی۔ تاہم اس نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ ''میرا بچہ اتنا چھوٹا ہے۔ پیدل چلے گا تو تھک جائے گا۔''

''نہیں تھکوں گا ماتا جی۔ ویر جی سے ملنے تو میں خوشی خوشی جاؤں گا۔'' ننھے ٹھاکر نے کسی کے لیے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

وہ چلنے لگا تو ٹھاکرانی بھی ساتھ ہو لی۔ ''آج تو میں بھی چلوں گی۔''

ٹھاکر نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ ٹھاکرانی دیکھنا چاہتی ہے کہ اس کا بچہ کہاں جایا کرے گا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁
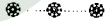
اس سے پہلے ننھے ٹھاکر کی دنیا صرف اس کی آبائی حویلی تھی۔ وہ کبھی باہر نکلا ہی نہیں تھا۔ سو اب وہ حیران بھی تھا اور خوش بھی۔ یہ باہر کی دنیا بہت بڑی تھی۔ تاحدِ نظر لہلہاتے ہوئے ہرے بھرے کھیت اور ان میں کام کرتے ہوئے کسان۔ یہ سب کچھ اسے بہت اچھا لگا۔ وہ ہر چیز کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور ہر سوال کے ساتھ وضاحتیں بھی تھیں ٹھاکر جواب دیتے دیتے تھک گیا۔ ''باقی باتیں پھر پوچھ لینا پتر۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

اسی لمحے اسے ایک درخت کے پاس وہی مجذوب کھڑا نظر آیا، جسے اس نے اوتار سنگھ کی پیدائش کے دن دیکھا تھا۔ اس نے ٹھاکرانی کا ہاتھ دباتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ''رنجو...... آج تمھیں بھی اس بابا کے درشن ہونے والے ہیں، جسے تم نے خواب میں دیکھا تھا۔''

ٹھاکرانی نے نظریں اٹھا کر اس طرف دیکھا۔ مجذوب ان سے کوئی بیس قدم کے فاصلے پر تھا۔ ٹھاکر نے اس کے تھامے ہوئے ہاتھ سے اس کے جسم کی تھرتھراہٹ محسوس کر لی۔ ''کیا بات ہے رنجو؟''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے ناتھ۔'' ٹھاکرانی کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

''دینے والوں سے ڈر کیسا؟'' ٹھاکر نے اسے تسلی دی۔

''دینے والے لے بھی تو سکتے ہیں۔''

وہ مجذوب کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ ٹھاکر اور ٹھاکرانی نے ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام کیا۔ ٹھاکرانی کا پورا جسم لرز رہا تھا۔

مجذوب ٹھاکرانی کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا، جو نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ ''نظریں تو اٹھا ٹھاکرانی'' مجذوب نے دھیمی آواز میں کہا۔

ٹھاکرانی نے ایک لمحے کو نظر اٹھائی اور فوراً ہی جھکا لی۔ ان آنکھوں میں دیکھنے کی تاب نہیں تھی اس میں۔

''دینے والے بہت سے نہیں ہوتے نا سمجھ۔ دینے والا ایک ہی ہوتا ہے۔'' مجذوب نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ ''اور دینے والا اتنا بڑا ہے کہ کسی بات پر خفا ہو کر دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتا۔''

ٹھاکرانی تو یہ سن کر دہل گئی۔ اتنے فاصلے سے اس کی سرگوشی میں کہی ہوئی بات مجذوب نے کیسے سن لی۔

''بھول ہو گئی مہاراج۔ میری پتنی نادان ہے۔ شما کر دیں اسے۔'' ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔

''بھول تو ہوتی ہے۔ معافی بھی مل جاتی ہے۔ لیکن نشانیاں دیکھ کر سمجھنا تو چاہیے۔ یہ بات تو بھی نہیں سمجھا کہ دینے والا صرف ایک ہے۔'' مجذوب کے لہجے میں ہلکی سی سرزنش تھی۔ ''تم کہاں کہاں مانگتے پھرے۔ مگر تمھیں کچھ نہیں ملا۔ پھر دینے والے نے تمھیں کچھ دینے سے پہلے برگد کے اس پیڑ کو جلا دیا، جس سے تم نے آخری بار اولاد مانگی تھی۔ اس میں نشانی تھی کہ برگد کا پیڑ تو خود اپنی مرضی سے رہ بھی نہیں سکتا۔ دینے والا کوئی اور ہے جو تمھیں نظر نہیں آتا۔ مگر تم بدنصیب سمجھتے ہی نہیں۔''

اس بار ٹھاکر پر بھی تھرتھری چڑھ گئی۔ اس پیڑ کا جلنا پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا تھا۔

''بھول ہو گئی مہاراج۔'' وہ گڑگڑایا۔

''کب تک بھولے رہو گے۔ کب تک بھول ہوتی رہے گی۔ خیر، بھول ہو گی تو معافی بھی ملے گی۔ وہ تو بہت معاف کرنے والا ہے مگر بھولے رہو گے تو وہ بھی تمھیں بھول جائے گا۔''

ان لفظوں میں جانے کیا تھا کہ ٹھاکر اور ٹھاکرانی اندر سے تھرا کر رہ گئے۔

''اور سنو۔ میں نے سب کچھ تو سمجھا دیا تھا۔'' مجذوب کا لہجہ اب بھی نرم تھا۔ ''ٹھاکرانی، تو سمجھتی کیوں نہیں۔ چھوٹے کی خوشی کے آڑے نہ آیا کر۔ تو اس کا راستہ کھوٹا نہیں کر سکتی۔ بس خود کو دکھی کر لے گی اس کوشش میں۔ محبت کی ہے تو محبت کرنا بھی سیکھ۔ دل بڑا رکھ۔ اس نے تجھے قیمتی چیز دی۔ تو اسے سب کے ساتھ بانٹے گی تو وہ تیرا ہو گا۔ ورنہ تیرا نہیں رہے گا۔ اور سن...... اسے اپنا راستہ معلوم ہے۔ اسے چلنے دے اس کے راستے پر۔ تب تیری تیڑھ بھی دور ہو

جائے گی۔''

اس بار مجذوب کی بات پوری طرح ٹھاکرانی کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے نظریں اٹھائیں اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ ''اب غلطی نہیں ہو گی مہاراج۔''

اتنی دیر تک ننھا ٹھاکر مجذوب کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا تھا۔ اچانک مجذوب گھٹنوں کے بل بیٹھا اور اس نے ننھے ٹھاکر کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ''آپ کیسے ہیں بیٹے۔'' اس نے کہا اس کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

''میں ٹھیک ہوں بابا۔ بس میرے ویر جی بیمار ہیں۔'' ننھے ٹھاکر نے کہا۔

''ٹھیک ہو جائے گا وہ۔ اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ بس آپ خوش رہیں خوش رہنے والی باتوں میں۔ اللہ آپ کے ساتھ ہے۔'' یہ کہہ کر مجذوب نے اس کے دونوں ہاتھوں کو محبت سے چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اب میں چلتا ہوں۔''

مجذوب دہلی کی سمت چل دیا۔ وہ تینوں کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ جمال دین کے گھر کی طرف چلے۔

راستے میں ننھے ٹھاکر نے باپ سے پوچھا۔ ''یہ کون تھے پتا جی؟'' اس کے لہجے میں احترام تھا۔

''یہ بہت بڑے گیانی ہیں پتر...... بڑی شکتی والے۔''

ننھے ٹھاکر نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ گیانی کیا ہوتا ہے اور شکتی کسے کہتے ہیں۔ جیسے وہ یہ بات پہلے سے جانتا ہو۔

چند منٹ بعد وہ جمال دین کے گھر پہنچ گئے۔

❀.....❀.....❀

وید جی وصال دین کو دوا دے کر جا چکے تھے۔ ننھا ٹھاکر جاتے ہی وصال سے لپٹ گیا۔

''اٹھو نا ویر جی۔ میرے ساتھ کون کھیلے گا۔''

وصال دین کراہ کر رہ گیا۔

''پتا جی، ویر جی کا شریر تو آگ ہو رہا ہے۔'' چھوٹے ٹھاکر نے باپ سے فریاد کی۔

''دوا پیے گا تو ٹھیک ہو جائے گا پتر۔'' ٹھاکر نے اسے دلاسہ دیا۔

''اب ناشتہ تو کر لو چھوٹے۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔

''ویر جی کے ساتھ کروں گا۔ اماں کے ہاتھ سے کروں گا۔''

دونوں شرطیں پوری کر دی گئیں۔ وصال دین سے کچھ کھایا تو نہیں گیا۔ اس نے دودھ پی لیا۔ ناشتے کے بعد چھوٹا ٹھاکر وصال دین سے لپٹ کر لیٹ گیا۔

ٹھاکرانی پریشان ہوئی۔ مگر ٹھاکر نے اسے بڑے یقین سے کہا۔ ''ڈرو مت ٹھاکرانی۔

تمھارے بیٹے کو کچھ نہیں ہوگا۔''

ٹھاکرانی کو مجذوب یاد آیا۔ وہ مطمئن ہوگئی۔

ایک گھنٹے بعد ٹھاکر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اب ہم جائیں گے جمال دین۔''

''آپ آئے سرکار۔ بڑی مہربانی آپ کی۔'' جمال دین نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں جاؤں گا پتا جی۔'' اوتار سنگھ بولا۔

ٹھاکر مسکرایا۔ ''تم سے کون کہہ رہا ہے جانے کو۔ تمھیں میں شام کو آ کر لے جاؤں گا۔''

یہ سن کر حمیدہ ہکا بکا رہ گئی۔ ٹھاکرانی نے اس کی کیفیت بھانپ کر جلدی سے نرم لہجے میں کہا۔ ''جب تک وصال دین ٹھیک نہیں ہو جاتا، چھوٹے ٹھاکر خود تمھارے گھر آیا کریں گے۔''

''اور ٹھیک ہو جانے کے بعد ایک دن وصال دین حویلی آئے گا تو دوسرے دن میرا پتر تمھارے گھر آئے گا۔'' ٹھاکر بولا۔ ''تمھیں بوجھ تو نہیں لگے گا حمیدہ؟''

''بوجھ کیسا ٹھاکر جی سرکار۔ ہماری تو کٹیا کے بھاگ جاگ گئے ہیں جی۔ سر آنکھوں پر۔''

ٹھاکر اور ٹھاکرانی اپنے بیٹے کو وصال دین سے لپٹا چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ راستے میں ٹھاکر نے پتنی سے کہا۔ ''تمہاری سمجھ میں آیا کہ تم آج یہاں کیوں آئیں۔''

ٹھاکرانی نے نفی میں سر ہلایا۔

''تمھیں آج مجذوب سے ملنا تھا۔''

ٹھاکرانی سوچ میں پڑ گئی۔ ''پرناتھ، اس کی بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔''

''نہ سہی۔ بس یاد رکھنا اور عمل کرنا۔ سمجھ میں خود آ جائیں گی۔''

''یہ کیسا بھید ہے ناتھ؟''

''بھید کے چکر میں نہ پڑ ناری۔ بھگوان کی باتیں بھگوان جانے۔''

''سچ کہتے ہو ناتھ۔''

❁ ..... ❁ ❁

پہلے تین دن تو چھوٹا ٹھاکر مسلسل حمیدہ کے گھر گیا۔ وصال دین کا بخار تو اتر گیا تھا۔ لیکن کمزوری بہت تھی۔ پھر بھی وہ صحن میں چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ کھیلتا رہا۔ تیسرے دن وہ گھر سے باہر نکل کر مٹی میں خوب کھیلے۔ چھوٹے ٹھاکر کو بہت مزہ آیا بلکہ یہ جان کر اسے افسوس ہوا کہ اگلے روز وصال دین حویلی آئے گا۔ اسے گھر سے باہر کھلی فضا میں کھیلنے کا چسکا لگ گیا تھا۔

پھر وہ دوسرا معمول شروع ہو گیا۔ ایک دن وصال دین حویلی آتا اور اگلے دن چھوٹا ٹھاکر [illegible] رہتا۔

ایک ہفتے بعد ٹھاکر پرتاپ سنگھ بیٹے کی تعلیم کی فکر میں دہلی چلا گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ بیٹے کی تعلیم شروع ہو چکی ہے۔

ننھا ٹھاکر بے حد متجسس فطرت کا مالک تھا۔ اس کا مشاہدہ بہت اچھا تھا..... اور چیزوں کو دیکھ کر وہ ان کے بارے میں غور و فکر بھی کرتا تھا۔ اب وہ باہر نکلا تو پتا چلا کہ دنیا بہت بڑی ہے..... اتنی بڑی کہ اس کی نظر اسے نہیں دیکھ سکتی۔

اب وہ سوال پہلے سے زیادہ کرتا تھا۔ لیکن اسے جواب بھی ملتے تھے۔ حمیدہ ٹھاکرانی اور جمال دین دونوں سے مختلف تھی۔ اس میں تعلیم کی تو کمی تھی لیکن گرد و پیش سے مکمل آگہی اسے حاصل تھی۔ اور اس کے پاس دانش بھی تھی۔ وہ مشین کی طرح لگی بندھی زندگی گزارتی تو تھی لیکن اس کے پاس سوچتا ہوا دماغ بھی تھا اور ننھے ٹھاکر کے لیے یہ بہت بڑی نعمت تھی۔

اس روز حمیدہ کو کھانا تیار کرنے میں دیر ہو گئی۔ چھوٹا ٹھاکر بھوک سے بے تاب ہو کر چلایا۔ ''اماں..... مجھے ابھی روٹی چاہیے۔ جلدی سے دو۔''

حمیدہ آٹا گوندھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''بس ذرا دیر رک جاؤ بیٹے۔ ابھی دیتی ہوں۔''

''مجھے ابھی چاہیے۔''

''اچھا..... یہاں آ جاؤ۔ دیکھو تو کہ روٹی کیسے بنتی ہے۔''

ننھا ٹھاکر اس کے پاس جا بیٹھا۔ حمیدہ اسے قصے سناتی، بہلاتی رہی۔ اس کے سوالوں کے جواب دیتی رہی۔ پھر اس نے پہلی گرم گرم روٹی اتاری، اس پر مکھن رکھا اور تھالی میں ساگ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ''تو چھوٹے ٹھاکر، اب کھاتے جاؤ۔ میں گرم گرم روٹی اتارتی رہوں گی۔''

ننھا ٹھاکر بہت بھوکا تھا۔ مگر اس عالم میں بھی وصال دین کو نہیں بھولا۔ ''آ ویر جی۔ کھانا کھائیں۔''

''ابھی نہیں..... دو روٹیاں اور اتر جائیں تو پھر وصال دین بھی بیٹھ جائے گا۔'' حمیدہ نے کہا۔

لیکن چھوٹا ٹھاکر نہیں مانا۔ اس نے وصال دین کے بغیر لقمہ نہیں توڑا۔ اتنی بحث میں حمیدہ کو مہلت مل گئی۔ روٹی کا تسلسل بھی نہیں ٹوٹا۔ دونوں بچے کھانا کھا کر نمٹے تو چھوٹے ٹھاکر نے حمیدہ کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ ''تم کتنی اچھی ہو اماں۔'' اس نے کہا اور وصال دین کو دیکھا جو ہاتھ پھیلا کر دعا کرنے کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ''یہ تم کھانے کے بعد کیا کرتے ہو ویر جی؟'' اس نے وصال دین سے پوچھا۔

وصال دین گھبرا گیا۔ اسے اپنے گھر میں ہمیشہ کھانے کے بعد ایسا کرنے کی عادت تھی۔ [illegible] اسے سکھایا تھا۔ [illegible] دل میں ہی

اللہ کا شکر ادا کر دینا۔'' ''کچھ نہیں چھوٹے ٹھاکر۔'' اس نے کہا۔

''نہیں ویر جی۔ مجھے بتاؤ نا۔''

وصال دین نے گھبرا کر ماں کو دیکھا۔ حمیدہ نے جلدی سے کہا۔ ''اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا بیٹے۔''

''کون اللہ؟''

اب حمیدہ بھی گڑبڑا گئی۔ ''وہ جسے تم بھگوان کہتے ہو۔''

''اچھا۔ اور شکر کیا ہوتا ہے؟''

''ابھی تم خوش ہو کر مجھ سے لپٹ گئے تھے نا...... اور کہا تھا...... تم کتنی اچھی ہو اماں۔ تو یہ شکر تھا۔''

''میں سمجھ گیا اماں۔ کوئی کسی کو کچھ دے، کسی کو کسی سے کچھ فائدہ ہو تو وہ اس کا شکر ادا کرتا ہے۔ ہے نا اماں۔''

حمیدہ اسے شکریہ اور شکر کا فرق بتانے کی ہمت نہیں کر سکی۔ ''ہاں چھوٹے ٹھاکر...... میرے بیٹے۔''

''تو ویر جی نے اللہ کا شکر کیوں ادا کیا۔ روٹی تو انھیں تم نے دی تھی اماں۔''

اب حمیدہ کو کون روک سکتا تھا۔ وہ چپ رہتی تو اس کا بیٹا خراب ہوتا..... ایمان سے دور ہوتا۔ ''اس کے لیے تمھیں یہ سمجھنا ہوگا بیٹے کہ روٹی کتنی مشکل سے بنتی ہے۔''

''مشکل سے بنتی ہے۔'' چھوٹے ٹھاکر نے حیرت سے دہرایا۔ ''آٹا گوندھا، چولہا جلایا، توا چڑھایا اور روٹی تیار۔''

''اور مکئی اور گیہوں کہاں سے آئے ہیں؟''

چھوٹے ٹھاکر کا تجسس بھڑک اٹھا۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ''تم بتاؤ اماں۔''

''کھیتوں سے۔'' حمیدہ نے کہا۔ ''کسان پہلے زمین میں ہل چلاتا ہے۔ پھر بیج بوتا ہے۔ چار پانچ مہینے اس کی دیکھ بھال، اس کی رکھوالی کرتا ہے۔ اللہ دھوپ سے گرمی دیتا ہے۔ وقت پر بارش برساتا ہے۔ تب فصل تیار ہوتی ہے۔ پھر بہت سے لوگ مل کر کٹائی کرتے ہیں۔ تب کہیں گندم یا مکئی ملتی ہے۔ اب سوچو، تمہاری ایک روٹی کے لیے کتنے لوگ مہینوں محنت کرتے ہیں۔ اور اللہ بارش روک دے تو فصل خراب ہو جاتی ہے۔ کبھی بہت دن سورج نہ نکلے تو بھی فصل خراب ہو جاتی ہے۔ اب سوچو، کتنا کچھ ہوتا ہے ایک روٹی کے لیے۔''

اس روز چھوٹے ٹھاکر کے لیے سوچ کے نئے دروازے کھل گئے۔ دنیا اس کے لیے کچھ اور بڑی، کچھ اور ناقابلِ فہم ہو گئی۔ جسے سمجھنے کی کوشش کرنی تھی۔

❁......❁......❁

ٹھاکر پرتاپ سنگھ دہلی سے کافی رات گئے واپس آیا۔ چھوٹا ٹھاکر اس وقت سو چکا تھا۔ ٹھاکرانی کھانا لے کر ٹھاکر کے کمرے میں گئی۔ ٹھاکر نے کھانا کھایا۔ پھر پتنی سے بولا۔ ''رنجو...... میں پورا بندوبست کر آیا ہوں۔ چھوٹے کی پڑھائی کا۔''

ٹھاکرانی کا تو دل دھک سے رہ گیا۔ اسے لگا کہ ٹھاکر نے بچے کو دہلی میں داخل کرانے کی بات کر لی ہے۔

ٹھاکر اس کے چہرے کے تاثر سے سمجھ گیا۔ ''نہیں ٹھاکرانی۔ چھوٹا گھر پر ہی پڑھے گا۔ میں نے اسکول والوں سے بات کر لی ہے۔ ہم چھوٹے کو گھر پر ہی تیاری کرائیں گے۔ آٹھویں جماعت سے اسے اسکول میں جانا ہوگا۔ پہلے وہ امتحان لیں گے۔ پھر داخلہ دیں گے۔ پھر اسے وہیں رہنا ہوگا۔ صرف چھٹیوں میں گھر آیا کرے گا۔''

ٹھاکرانی کو اس وقت سے خوف آنے لگا۔ ''اس وقت کتنا بڑا ہوگا ہمارا چھوٹا؟''

''بارہ تیرہ سال کا ہوگا۔''

ٹھاکرانی نے سکون کی سانس لی۔ ''تب تو ٹھیک ہے۔'' مگر فوراً ہی وہ پریشان ہو گئی۔ ''تو یہاں گھر پر اسے کون پڑھائے گا؟''

''اسی اسکول کے ایک ریٹائرڈ ماسٹر ہیں کانتی پرشاد۔ میں نے ان سے بات کی ہے۔ ہفتہ دس دن میں وہ یہاں آئیں گے۔ حویلی میں ہی رہیں گے۔ وہ اسکول کے نصاب سے واقف ہیں۔ صحیح تیاری کرائیں گے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہے۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔ اس کے دل سے بوجھ ہٹ گیا تھا۔

ٹھاکر نے اگلے روز اس سلسلے میں جمال دین سے بات کی۔ جمال دین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ٹھاکر اسے کیوں بتا رہا ہے۔ ''میرا اوتار سنگھ وصال دین کے بغیر نہیں پڑھے گا۔'' ٹھاکر نے وضاحت کی۔ ''وہ وصال دین کے بغیر کچھ نہیں کرتا۔''

''تو ٹھیک ہے ٹھاکر جی۔''

''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔''

''میں احسان فراموش نہیں ہوں سرکار۔'' جمال دین نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو آپ کا ایک اور احسان ہوگا مجھ پر..... اور وصال دین پر۔ ورنہ میں اسے کہاں پڑھاتا بھلا۔''

ٹھاکر کے لیے دل کی بات زبان پر لانا مشکل ہو رہا تھا۔ تاہم اس نے دل کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔ ''وہ ماسٹر کانتی پرشاد ہندو جاتی کا ہے جمال دین۔ تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں۔''

جمال دین نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''کیسی بات کرتے ہیں ٹھاکر جی۔ علم تو کوئی بھی کسی کو دے سکتا ہے۔ اس کا تو احسان ہوتا ہے جی۔''

ٹھاکر کو حیرت ہوئی۔ یہ وہی جمال دین تھا، جو مذہب کا پکا تھا۔ اس کے لیے کچھ بھی کھونے کو تیار تھا۔ کیا اسے ڈر نہیں لگتا کہ ہندو ماسٹر اس کے بچے کا دھرم خراب کر دے گا۔ جبکہ ٹھاکرانی تو صرف صحبت سے ڈر رہی تھی اور بچے کو اسی مسلمان پریوار سے دور کرنا چاہتی تھی۔

اس نے ٹھاکرانی کو یہ بات بتائی تو وہ بہت شرمندہ ہوئی۔

❁ .... ❁ .... ❁

دہلی سے ماسٹر کانتی پرشاد آ گئے۔ دونوں بچوں کی پڑھائی شروع ہو گئی۔

کانتی پرشاد پڑھے لکھے، لائق اور روشن خیال آدمی تھے۔ دھرم کو انھوں نے بہت پہلے فرسودہ پا کر طاقِ نسیاں پر رکھ دیا تھا۔ عمر ان کی تدریس میں گزری تھی۔ اب ریٹائر ہو چکے تھے۔ پریشانی کوئی نہیں تھی۔ گھر بچوں نے سنبھالا ہوا تھا۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی پیشکش انھیں بہت بڑی نعمت محسوس ہوئی۔ پتنی کے دیہانت کے بعد ان کا کہیں من نہیں لگتا تھا۔ بے کاری کا احساس ستاتا تھا۔ ٹھاکر کی مہربانی سے ان کا بے وقعتی کا احساس بھی دور ہو گیا، گرد و پیش بھی تبدیل ہو گیا اور مصروفیت بھی مل گئی۔ یہ طے تھا کہ انھیں پیسہ بھی بہت ملے گا۔ لیکن پیسے کی انھیں پروا نہیں تھی۔

انھیں دو شاگرد ملے۔ ابتداء میں ہی انھیں اندازہ ہو گیا کہ ٹھاکر کا بیٹا نہ صرف ذہین ہے۔ بلکہ اسے علم کی جستجو بھی ہے جبکہ دوسرا لڑکا بس ٹھاکر کے بیٹے کی محبت میں پڑھ رہا تھا۔ اسے جو پڑھایا جاتا طوطے کی طرح رٹ لیتا جبکہ ٹھاکر کا بیٹا بڑھ چڑھ کر سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ کانتی پرشاد کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا میلانِ طبع سائنس کی طرف ہے۔

پھر جیسے جیسے دن گزرتے گئے، کانتی پرشاد کی اوتار سنگھ میں دلچسپی بڑھتی گئی۔ وہ جتنا اسے پڑھانے کی کوشش کرتے تھے، اس سے زیادہ وہ پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ یعنی استاد اور شاگرد کے درمیان ایک دوڑ لگی تھی..... اور شاگرد ہمیشہ استاد پر فوقیت لے جاتا تھا۔ تجسس سے علم کی لگن بڑھتی ہے۔ اوتار سنگھ متجسس بھی تھا اور غور و فکر بھی کرتا تھا۔ چنانچہ وصال دین اس سے بہت پیچھے رہ گیا۔

دوسری طرف ٹھاکرانی رنجیتا نے بھی اپنے طور پر ایک ذمے داری سنبھال لی تھی۔ وہ اپنے بیٹے سے دھرم کی، دیوی دیوتاؤں کی باتیں کرتی تھی۔ اور تو اور اس نے حویلی میں ہی ایک چھوٹا سا مندر بنا لیا تھا۔ خود اسے دھرم کے بارے میں زیادہ جانکاری نہیں تھی۔ لیکن جتنا وہ جانتی تھی، اتنا بیٹے کو بتانا ضروری سمجھتی تھی۔ وہ اوتار سنگھ سے روز پوجا کراتی تھی۔

تیسری طرف حمیدہ تھی۔ اوتار سنگھ کے ذہن میں جو سوال ابھرتا، وہ اس کا جواب دینے کی کوشش کرتی۔ اس کے لہجے میں عجیب سی سچائی اور دل نشینی تھی۔ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی تھی۔ مگر اس [illegible] باتوں سے [illegible] ہوتی تھیں۔

آپس میں ایک [illegible] سے ملتے [illegible] یہ تینوں ضلع ایک مثلث بناتے تھے [illegible]

مثلث کے درمیان میں بیٹھا ہوا اوتار سنگھ یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا کہ سچائی کیا ہے۔ ساتھ ہی وہ گرد و پیش کی ہر چیز پر غور کرتا۔ سوچتا کہ وہ کیا ہے، کیوں ہے اور کیسے ہے۔ یہ سوال وہ تینوں سے کرتا اور تینوں کے جواب مختلف ہوتے۔ وہ حیران ہوتا کہ ایک ہی چیز کے بارے میں تین افراد کے تین نظریے ہیں۔ اس سے اس نے یہ سمجھ لیا کہ کثرت میں ابہام ہے، الجھاؤ ہے۔ اور یہ کہ نظریے ضروری نہیں کہ درست ہوں بلکہ ان کے غلط ہونے کا امکان زیادہ ہے۔

اوتار سنگھ اس پر غور کرتا کہ صبح کیا ہے۔ اپنے طور پر اس نے سمجھ لیا کہ سورج نکلتا ہے تو صبح ہوتی ہے اور جب تک سورج رہتا ہے، دن رہتا ہے۔ سورج غروب ہو تو رات ہو جاتی ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ سورج حرکت کرتا ہے۔ مشرق سے نکلتا ہے تو ہلکی ہلکی دھوپ پھیلتی ہے اور سورج اوپر آتا رہتا ہے تو دھوپ میں تیزی بڑھتی جاتی ہے اور ساتھ ہی گرمی بھی۔ پھر عین سر پر پہنچنے کے بعد سورج مغرب کی طرف جھکتا ہے تو دھوپ ہلکی ہونے لگتی ہے۔ روشنی کم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہوتا ہے اور رات ہو جاتی ہے۔

سوال یہ تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کی ضرورت کیا ہے۔ اس نے تینوں معلموں سے یہ بات پوچھی۔ ہمیشہ کی طرح جواب مختلف ملے۔ ماتا جی نے بتایا کہ سورج دیوتا کا کام ہی روشنی دینا ہے۔ دن بھر دھوپ بانٹنے کے بعد تھک جائیں تو آرام کرتے ہیں۔ ماسٹر جی نے بتایا کہ سورج نہیں چلتا۔ بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ جس حصے میں ہم موجود ہیں، وہ جب گھومتا ہوا سورج کے سامنے آتا ہے تو صبح ہوتی ہے۔ جب تک سامنے رہتا ہے، دن رہتا ہے اور جب گھومتا ہوا سورج سے اوجھل ہوتا ہے تو رات ہو جاتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ دراصل سورج غروب نہیں ہوتا۔ جس وقت ہمارے ہاں سورج غروب ہوتا دکھائی دیتا ہے تو وہ دوسری طرف طلوع ہوتا نظر آتا ہے اور وہاں صبح ہوتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ زمین پر زندگی سورج کے دم سے ہے۔ اسی کی وجہ سے حرارت ہے۔ حرارت نہ ہو تو زمین پر کوئی فصل نہ اُگے اور سردی ہی سردی ہو۔ اوتار سنگھ کو یاد تھا کہ یہ بات اماں نے بھی کہی تھی کہ دھوپ نہ نکلے تو فصلیں خراب ہو جائیں۔

اماں نے کہا کہ سورج اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے۔ اس سے زندگی ہے اور وہ اپنے وقت پر طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ یہ اللہ کا بنایا ہوا نظام ہے اور اماں نے ایک بات ایسی بتائی، جو اس کی سمجھ میں سب سے زیادہ آئی۔ اماں نے کہا کہ اللہ نے دن اور رات بنائے ہیں تاکہ انسان دن میں کام اور رات میں آرام کریں۔

''وہ کیسے اماں؟''

''چھوٹے ٹھاکر، یہ بتاؤ کہ تم دن میں کیوں نہیں سوتے؟'' اماں نے پوچھا۔

'' [illegible] روشنی ہو تو [illegible] نہیں

سکتا۔''

''تو سوچو، سورج ہر وقت نکلا رہتا تو تم کیسے سوتے اور نہیں سوتے تو تھکن بڑھتی رہتی۔ سوئے بغیر رہ سکتے ہو تم؟''

''نہیں اماں، کبھی میں زیادہ تھک جاؤں تو بستر پر لیٹتے ہی سو جاتا ہوں۔''

''اور سوچو کہ سورج نکلتا ہی نہیں اور ہر وقت اندھیرا رہتا تو لوگ کام کیسے کرتے۔ فصلیں کیسے ہوتیں۔ کھانا کیسے پکتا۔ زندگی تو ختم ہو جاتی نا۔''

اوتار سنگھ نے بڑے فخر سے سوچا کہ اماں کتنی عقل والی ہیں۔ یہ بات تو ماسٹر جی نے بھی نہیں بتائی تھی۔

اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ سورج دیوتا بہت شکتی مان ہے۔ زمین پر زندگی اسی کے دم سے ہے۔ جب وہ غصے میں ہوتا ہے تو گرمی بڑھ جاتی ہے۔ انسان اور جانور پسینے میں نہا جاتے ہیں، ہانپنے لگتے ہیں۔ لیکن پھر ایک دن سورج نہیں نکلا۔ آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اس نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ بات نہیں کہ صبح نہیں ہوئی۔ صبح تو ہوئی ہے۔ سورج بھی نکلا ہے۔ لیکن اس کی دھوپ، اس کی روشنی کا راستہ بادلوں نے روک رکھا ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ بادل تو معمولی چیز تھے اور وہ سورج جیسے شکتی مان کا راستہ روک سکتے تھے۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔

پھر اس نے موسموں کا مشاہدہ کیا۔ ماسٹر جی نے اس کی بڑی رہنمائی کی۔ ورنہ ماتا جی اور اماں تو ہر بات کے جواب میں۔ بھگوان کی اچھا...... اور اللہ کی مرضی کہہ دیتی تھی۔ سردی آتی ہے۔ بس آتی ہے۔ گرمی آئے گی۔ اسے آنا ہے۔ ماسٹر جی نے اسے بتایا کہ موسموں کے پیچھے بھی سورج کا دخل ہے۔ زمین سورج سے دور ہٹتی ہے تو سردی آتی ہے اور قریب ہوتی ہے تو گرمی آتی ہے۔ پھر اس نے بارش کو سمجھا۔ یہ بھی سمجھا کہ بارش کتنی اہم ہے۔ صرف دھوپ سے فصلوں کا تعلق نہیں تھا۔ بارش نہ ہو تو بھی فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

اگلے دو برس میں اس نے بہت کچھ سمجھ لیا۔ جس میں شکتی ہو اور جو سمجھ میں نہ آئے، وہ ماتا جی کے نزدیک دیوی تھی یا دیوتا۔ اور اماں ہر چیز کو اللہ سے جوڑ دیتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں، یہ سب اللہ کے کام ہیں۔ کچھ سمجھ میں آ جاتے ہیں، کچھ نہیں آتے۔ سب طاقت اللہ کی ہے۔

پہلے بچوں کو کھیل کود سے فرصت نہیں تھی۔ اب ان کے لیے دن چھوٹا پڑتا تھا۔ تین وقت تو ماسٹر جی پڑھاتے تھے۔ اس لیے معمولات کچھ بدل گئے تھے۔ اوتار سنگھ کے ایک دن چھوڑ کر حمیدہ کے ہاں جانے کا سلسلہ جاری تھا لیکن اب وہ کم وقت کے لیے جاتا تھا۔

چھوٹا ٹھاکر آٹھ سال کا ہوا تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے اسے سچ مچ کا گھوڑا دیا۔ گھوڑا وصال دین کو بھی ملا۔ کیونکہ ٹھاکر جانتا تھا کہ اس کا بیٹا اکیلا یہ تحفہ قبول نہیں کرے گا۔ پھر وہ ان دونوں کو گھڑ سواری سکھانے لگا۔ اور وہ بیٹے سے باتیں بھی کرتا تھا۔ وہ اسے راجپوتی آن کے بارے میں بتاتا۔

ان کے اوصاف سے متعارف کراتا۔ اسے پرکھوں کی بہادری کے قصے سناتا۔

باپ ہونے کے ناتے جمال دین بھی پیچھے نہیں تھا۔ وہ لٹھیا چلانے کا ہنر جانتا تھا۔ اس نے ان دونوں کو لٹھیا چلانا سکھانا شروع کر دیا۔ یوں وقت اور سمٹنے لگا۔ دونوں لڑکے ان نئی مصروفیات میں بہت خوش تھے۔ ان کے نزدیک وہ نئے کھیل تھے...... نئے بھی اور دلچسپ بھی۔

مگر پھر ایک دن یہ ہوا کہ چھوٹے ٹھاکر اوتار سنگھ پر معلومات کا ایک دروازہ بند ہو گیا۔ اب تک وہ یہ سمجھتا تھا کہ اللہ اور بھگوان ایک ہی ہیں۔ فرق صرف زبان کا ہے...... اور لفظوں کی طرح۔ جیسے ماتا جی شما کہتی ہیں اور اماں معافی۔ جیسے ماتا جی بنتی کہتی ہیں اور اماں التجا۔ اور اماں نے اسے تاثر بھی یہی دیا تھا۔

اس دن اس نے اماں سے کہا۔ ''اماں...... تم بھی اللہ کی پوجا کرتی ہو؟''

اماں نے جھرجھری سی لی۔ ایک لمحے ہچکچائیں اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مجھے بھی دکھاؤ اماں۔ میں بھی اس کی پوجا کروں گا۔''

اماں تو ہکا بکا رہ گئیں۔ ان سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔

''مجھے اللہ کی مورتی دکھاؤ نا اماں۔'' اس نے ضد کی۔

''وہ تو نہیں ہوتی چھوٹے ٹھاکر۔''

''کیوں اماں۔ بھگوان کی تو ہوتی ہے۔''

''اللہ کی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اسے کسی نے دیکھا نہیں ہے۔''

یہ چھوٹے ٹھاکر کو ہلا دینے والی بات تھی۔ ''تو اللہ اور بھگوان ایک نہیں ہیں؟''

اماں نے نفی میں سر ہلایا اور بولیں۔ ''دیکھ چھوٹے ٹھاکر، تم اب مجھ سے یہ نہ پوچھنا۔ ٹھاکر جی اور ٹھاکرانی کو پتا چل گیا کہ میں تم سے ایسی باتیں کرتی ہوں تو وہ ہم سب کو مروا دیں گے اور یہ نہ بھی ہوا تو تمھیں کبھی ہم سے ملنے نہیں دیں گے۔''

چھوٹا ٹھاکر ڈر گیا۔ اس کے لیے تو ان سے نہ ملنے کا تصور بھی ناقابل قبول تھا۔ کجا یہ کہ مر جانے کی بات۔ اس نے غور سے اماں کے چہرے کو دیکھا، جو پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ لگ رہی تھی۔ ''سچ اماں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں بیٹے۔ تم ہمیں زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو یہ بات کبھی نہ پوچھنا اور میری کہی ہوئی کوئی بات اپنے ماتا پتا کے سامنے نہ دہرانا۔ اللہ کا نام بھی نہ لینا ان کے سامنے۔ ورنہ وہ سمجھیں گے کہ ہم تمھیں خراب کر رہے ہیں۔ وہ ہمیں مروا دیں گے بیٹے۔''

''ٹھیک ہے اماں۔ میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔'' چھوٹے ٹھاکر نے بڑے خلوص سے وعدہ کیا۔ ''مگر آج جو میں پوچھوں، وہ بتا دو۔''

حمیدہ نے بادل نخواستہ ہامی بھرلی۔

تب حمیدہ نے اسے بتایا کہ اس کا اللہ ایک ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ کسی کو نظر نہیں آتا۔ مگر اس کی قدرت نظر آتی ہے۔ وہ زبردست ہے۔ سب کچھ اس نے بنایا، اسی نے پیدا کیا ہے۔

''تو ماتا جی اور پتا جی اسے کیوں نہیں مانتے؟''

''ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ سب کا اپنا اپنا عقیدہ ہوتا ہے۔''

اس لمحے نو سالہ ٹھاکر اوتار سنگھ کے نتائج اخذ کرنے والے ذہن نے ایک بڑی بات سمجھ لی۔ اس نے جان لیا کہ ماننے نہیں ماننے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ جو سچ ہے، وہ سچ ہے۔ نہ ماننے سے وہ تبدیل نہیں ہوگا اور جو نہیں ہے، اسے مان لینے سے وہ ہو نہیں جائے گا۔ ماننے میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ یہ سب کچھ اسے خود سمجھنا ہوگا۔

وہ اسی کی تلاش حق کا نکتہ آغاز تھا!

❁ ❁ ❁

کتابِ دوم

طلوعِ صبح

اس صبح پوجا کے بعد اوتار سنگھ نے ماں سے پوچھا۔ ''ماتا جی، آپ نے بھگوان کو دیکھا ہے؟''

''روز دیکھتی ہوں پتر۔ تم بھی دیکھتے ہو...... یہ بھگوان ہیں نا۔'' ٹھاکرانی نے مورتی کی طرف اشارہ کیا۔

''تو یہ سچ مچ کے بھگوان ہیں؟'' اوتار سنگھ کے لہجے میں حیرت تھی۔

ٹھاکرانی کو غلطی کا احساس ہوگیا۔ ''میرا مطلب ہے، یہ بھگوان کی مورت ہے۔ ہم روز اس کے درشن، اس کی پوجا کرتے ہیں۔''

''تو یہ سچ مچ کے بھگوان تو نہیں ہیں نا۔''

ٹھاکرانی چوکنا ہوگئی۔ ''بھگوان کی صورت بالکل ایسی ہے۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں ماتا جی۔ آپ نے بھگوان کو دیکھا ہے؟''

''نہیں۔ دیکھا تو نہیں۔ پر مجھے معلوم ہے، یہ بھگوان کی مورت ہے۔''

''تو ماتا جی۔ ہمیں بھگوان کی پوجا کرنی چاہیے۔ اس مورت کی نہیں۔''

ٹھاکرانی گھبرا گئی۔ ''دیکھو پتر...... ایسی باتیں نہیں کرتے۔ ہمارے باپ دادا صدیوں سے اس مورتی کی پوجا کرتے آئے ہیں۔ وہ غلط تو نہیں ہو سکتے۔''

چھوٹے ٹھاکر کی ذہانت پوری طرح کام کر رہی تھی۔ ''ماتا جی، آپ کے باپ دادا کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ان کا تو دیہانت ہوگیا۔''

''دیہانت کیا ہوتا ہے ماتا جی؟''

''منش ہے نا۔ وقت پورا کرتا ہے تو مر جاتا ہے۔''

''تو آپ کا وقت پورا ہوگا تو آپ کا دیہانت ہو جائے گا۔ اور اپنا وقت پورا کر کے میں بھی مر جاؤں......''

ٹھاکرانی نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتے پتر۔''

هم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

"منہ سے نہ نکالنے سے کچھ بدل جاتا ہے ماتا جی۔" اوتار سنگھ نے بے حد معصومیت سے پوچھا۔ "مجھے بتائیں نا۔ ایسا ہی ہوگا نا؟"

"ہاں۔" ٹھاکرانی نے بات مختصر کرنے کی کوشش کی۔

"تو پھر جو دوسرے لوگ ہوں گے، وہ بھی اپنے بچوں سے یہی کہیں گے کہ ہمارے باپ دادا اس مورتی کو پوجتے تھے۔ مگر ماتا جی، آپ کے باپ دادا بھی غلطی تو کر سکتے تھے نا۔ آپ کو کیسے پتا کہ وہ درست تھے۔ آنے والوں کو بھی یہ پتا نہیں ہوگا کہ آپ درست تھیں۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو پتر؟"

"یہی کہ ہمیں بھگوان کی پوجا کرنی چاہیے، اس کی مورتی کی نہیں۔"

ٹھاکرانی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ "سامنے مورتی ہے۔ مگر ہم پوجا تو بھگوان کی کرتے ہیں۔"

"تو ہم مورتی کے بغیر بھی پوجا کر سکتے ہیں ماتا جی۔ آپ کہتی ہیں، بھگوان سب جانتے ہیں۔"

"سو تو ہے پتر۔ مگر ہمارے باپ دادا......"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ غلطی کرتے رہے ہوں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ غلطی کرتے رہے ہوں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا اوتار سنگھ۔" ٹھاکرانی نے سخت لہجے میں کہا۔

"اچھا ماتا جی۔ میرے...... آپ کے جو پرکھ تھے، وہ منش تھے نا؟"

"اوش تھے۔"

"اور منش غلطی کرتا ہے۔ اس سے بھول بھی ہوتی ہے...... بلکہ جیون بھر ہوتی رہتی ہے۔"

ٹھاکرانی کو احساس ہوا کہ وہ بری طرح پھنس گئی ہے۔ انکار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ انکار کرتی تو ڈر تھا کہ آگے کہیں اس سے بری پھنس جائے گی۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "یہ باتیں چھوڑو نا چھوٹے۔"

"نہیں ماتا جی۔ بتائیں نا۔"

ٹھاکرانی بے بس ہو گئی۔ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ "ہاں پتر۔ منش غلطی کرتے ہیں۔"

"تو ہو سکتا ہے کہ ہمارے پرکھوں سے بھول ہوئی ہو۔" اوتار سنگھ نے کہا اور یہ سوال نہیں تھا۔ وہ ماں سے اس کی تصدیق بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ تو سیدھا سا بیان تھا۔ "تو اس کو ٹھیک کرنا ہماری ذمے داری ہے۔ اچھا تو ماتا جی، یہ تو بتاؤ کہ بھگوان کہاں رہتے ہیں؟"

"اوپر آکاش پر...... پرلوک میں۔"

"میں انھیں دیکھ سکتا ہوں...... ان سے مل سکتا ہوں ماتا جی؟"

"نا پتر۔ بھگوان کو کسی نے دیکھا ہے بھلا!"

اوتار سنگھ نے تیزی سے اس کی بات پکڑ لی۔ "کسی نے نہیں دیکھا؟"

"نا پتر۔"

"تو پھر یہ مورتی کیسے بنا لی۔" اوتار سنگھ نے نپا تلا اعتراض کیا۔ "اس کا مطلب ہے ماتا جی کہ یہ خیالی ہے۔ ضروری نہیں کہ بھگوان ایسے ہوں۔"

"دیکھ پتر۔ ہمیں تو اس مورتی کی ہی پوجا کرنی ہے۔ ہمارے پرکھوں سے یہ ریت چلی آ رہی ہے۔" ٹھاکرانی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"بھلے وہ غلطی پر ہی ہوں؟"

"بھلے وہ غلطی پر ہی ہوں۔" ٹھاکرانی کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"ماتا جی، اس نظر آنے والی خیالی مورتی کے مقابلے میں نظر نہ آنے والے سچے بھگوان کے سامنے سر جھکانا مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"ہوا کرے۔ پر تمھیں پوجا روز کرنی ہے۔"

اوتار سنگھ اٹھ کھڑا ہوا۔ سوچنے کو بہت سامان مل چکا تھا۔

❀......❀......❀
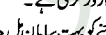
فطری بات تھی کہ اوتار سنگھ نے اس کے بعد ماتا جی اور اماں کے نظریات کا موازنہ کیا۔ اسے ایک بات مشترک نظر آئی۔ بھگوان بھی نظر نہیں آتا تھا اور اللہ بھی۔ اس کے آگے فرق ہی فرق تھا۔ ماتا جی کا کہنا تھا کہ بھگوان آکاش کے اوپر، پرلوک میں رہتا ہے۔ جبکہ اماں کہتی تھیں کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے۔ حتیٰ کہ انسان کے اندر بھی۔ پھر اماں کہتی تھیں کہ سب کچھ اللہ ہی کرتا ہے۔ اس کی قدرت ایسی ہے کہ وہ جو چاہتا ہے، ایک پل میں ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اماں بہت سے دیوی دیوتاؤں کو مانتی تھیں۔ بھگوان نے بہت سے دیوی دیوتاؤں کو کام سپرد کر رکھے تھے۔ انھیں اختیار دے رکھا تھا۔

اور ماسٹر جی بتاتے تھے کہ سب کچھ جو نظر آتا ہے، جسے آپ چھو سکتے ہیں، مادہ ہے اور مادہ کبھی فنا نہیں ہوتا۔ ہاں...... وہ شکل بدل لیتا ہے۔ پانی ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ اس کی مختلف شکلیں ہیں۔ سمندر، دریا، جھیل، ندی اور چشمے۔ پانی پر دھوپ پڑتی ہے تو عمل تبخیر ہوتا ہے۔ بادل بنتے ہیں۔ پھر جب بادل کسی پہاڑ سے، درختوں سے ٹکرائیں تو بارش ہوتی ہے۔ یہ بات اوتار سنگھ کی سمجھ میں آتی تھی۔ اس نے چولہے پر رکھی پانی سے بھری دیگچی میں بھاپ بنتے دیکھی تھی اور دیگچی کو ڈھکنے سے بند کر کے چولہا بجھانے کے کچھ دیر بعد ڈھکنا اٹھا کر دیکھا تھا تو ڈھکنے کے اندرونی حصے پر پانی کے بے شمار قطرے جمے ہوئے دیکھے تھے۔ وہ بھاپ سے پانی بنا تھا۔ اور غذا جو ہم کھاتے ہیں، اس کا ایک حصہ جسم میں شامل ہوتا ہے۔ باقی فضلہ ہوتا ہے۔ کھاد بن جاتا ہے۔

کھاد زمین میں ڈالی جاتی ہے تو فصل بہتر ہوتی ہے۔

اوتار سنگھ نے ندی تو دیکھی تھی۔ دریا اور سمندر نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ان کے بارے میں ماسٹر جی سے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''دریا بڑا بھی ہوتا ہے اور چھوٹا بھی۔ پر سمندر تو بہت ہی بڑا ہوتا ہے۔ اتنا بڑا کہ تم جہاں تک دیکھ سکو، پانی ہی پانی نظر آئے۔''

اوتار سنگھ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''اتنا پانی!''

''اور سمندر کا پانی اتنا کھاری، اتنا کڑوا ہوتا ہے کہ تم ایک گھونٹ بھی نہیں پی سکتے۔''

''کھاری کیا ماسٹر جی؟''

''کھاری کا مطلب نمک ملا ہوا۔''

''نمک ملا ہوا؟''

اس کی حیرت ایسی تھی کہ ماسٹر جی کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ اور وہ اسے پانچ سال سے پڑھا رہے تھے۔ اس کا مزاج جانتے تھے۔ وہ تو بہت بڑھے ہوئے تجسس والا بچہ تھا۔ ایسے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر زیادہ سیکھتے ہیں۔ ورنہ تو آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا معاملہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں ٹھاکر سے بات کی کہ بچوں کو سیر کرانا، دنیا دکھانا بھی ضروری ہے۔

''تو انھیں کہاں لے جانا ہے؟''

''میں چاہتا ہوں کہ یہ پہاڑ بھی دیکھ لیں اور سمندر بھی۔''

ٹھاکر کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے ٹھاکرانی کو بھی ساتھ لے لیا۔ ماسٹر جی کو تو ساتھ جانا ہی تھا۔

اس ایک ماہ میں اوتار سنگھ نے جو کچھ دیکھا، وہ اس کے لیے چشم کشا تھا۔ سمندر دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ماسٹر جی کے بتانے میں وہ بات نہیں تھی، جو اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں تھی۔ کنارے پر کھڑے ہو کر جو اس نے دیکھا تو جہاں تک نظر جاتی تھی، پانی ہی پانی تھا۔ اور سمندری آواز! اسے سن کر خوف آتا تھا۔ پتا چلتا تھا کہ وہ بہت طاقت ور ہے۔ مگر اس میں ٹھہراؤ تھا۔ اور اوتار سنگھ نے ایک بار ندی کی باڑھ دیکھی تھی۔ معمولی سی ندی چڑھی تو گاؤں کے گاؤں ڈبو گئی۔ اب سمندر کو دیکھ کر وہ سوچ رہا تھا کہ یہ چڑھ گیا تو کیا ہوگا۔ یہ تو اتنا پانی ہے کہ دنیا ڈبو دے گا۔ اور اس نے ایک گھونٹ حلق سے اتارنے کی کوشش کی تو دل بگڑ گیا۔ پھندا لگ گیا۔ وہ زہر جیسا پانی تھا..... کڑوا، کھاری۔

پھر اس نے پہاڑ دیکھے تو اسے خوف آیا۔ پہاڑ گر جائے، لڑھک جائے تو کتنی تباہی ہوگی۔ مگر اس نے یہ بھی دیکھا کہ دنیا کتنی خوبصورت ہے۔ اس نے چشمے دیکھے، آبشار دیکھے، پہاڑی ندیاں، جھیلیں اور دریا دیکھے۔ شور مچاتے تند خو دریا اور کیسے کیسے درخت، پھل پھول۔ اس

ایک ماہ میں اس نے ماسٹر جی سے ایک سوال بھی نہیں کیا..... ان کے اکسانے پر بھی نہیں۔ وہ تو سحر زدہ تھا۔ صرف دیکھ رہا تھا اور جذب کر رہا تھا۔

اس سفر میں بھی اسے ایک کمی محسوس ہوئی۔ بہت کچھ دیکھنے کے بعد اسے ہوش آیا کہ وہ بہت سی قیمتی چیزیں پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ ویر جی، اماں اور چاچا جی..... اور گاؤں۔ اسے گھر یاد آنے لگا۔ سب لوگ یاد آنے لگے۔ تب اسے واپسی کی لگ گئی۔

وہ واپس پہنچے تو اس کے سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ مشاہدے کی کوکھ سے سوال ہی سوال جنم لے رہے تھے۔ ''یہ دنیا تو بہت بڑی ہے ماسٹر جی۔'' اس نے کہا۔

''اتنی بڑی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔'' ماسٹر جی نے کہا۔ ''جو کچھ تم نے دیکھا، وہ تو ہمارے دیس کا ایک چھوٹا سا بہت چھوٹا سا حصہ ہے۔ صرف ہمارا دیس ہی اس سے سینکڑوں گنا بڑا ہے اور دنیا میں ایسے سینکڑوں دیس ہیں۔ آدمی پوری زندگی گھومتا پھرتا ہے تو بھی پوری دنیا نہیں دیکھ سکتا۔''

''ماسٹر جی، یہ زمین کیسے بنی؟''

''سائنس بتاتی ہے کہ زمین سورج کا حصہ تھی۔ پھر یہ ٹوٹ کر علیحدہ ہوئی۔ لاکھوں برس یہ کھولتا ہوا کرہ زندگی سے محروم رہا۔ بارشیں ہوتی رہیں۔ لاکھوں برس میں یہ ٹھنڈا ہوا۔ پھر اس میں زندگی کا آغاز ہوا۔ نباتات اور جاندار پیدا ہوئے۔''

''کیسے پیدا ہوئے؟'' اوتار سنگھ نے جھٹ پوچھا۔

''کھولتی ہوئی زمین پر ٹھنڈا پانی برستا رہا۔ یہ ایک بہت وسیع اور ہمہ پہلو کیمیاوی عمل تھا۔ اس کے نتیجے میں زندگی شروع ہوئی۔''

''آدمی بھی ایسے ہی پیدا ہوا؟''

کانتی پرشاد پریشان ہو گئے۔ انھوں نے کہا۔ ''سائنس بتاتی ہے کہ بندر ترقی کر کے انسان بنا۔ غور سے دیکھو تو بندر انسان سے مشابہ بھی ہے۔''

اوتار سنگھ کو ہنومان کا خیال آ گیا۔ ماتا جی کہتی تھیں، ہنومان دیوتا ہے۔ اسی لیے بندروں کو نہ مارنا چاہیے نہ ستانا چاہیے۔ لیکن اسے یہ خیال کچھ اچھا نہیں لگا کہ بندر اور انسان ایک جیسے ہوتے ہیں بلکہ ایک ہی ہیں۔ ''تو پھر باقی بندر ایسے کیوں رہ گئے۔ آدمی کیوں نہیں بنے؟''

''عمل میں کوئی کمی رہ گئی ہوگی۔ جو عمل سے گزر گئے، وہ آدمی بن گئے۔''

''مگر ماسٹر جی، اصل چیز تو دماغ ہے۔ بندر کا دماغ تو آدمی جیسا نہیں۔ آدمی بولتا ہے، سوچتا ہے، چیزیں بناتا ہے، کپڑے پہنتا ہے۔''

''کیمیاوی تبدیلی تو ایسی ہی ہوتی ہے کچھ پتا نہیں کہ کہاں کہاں کیا کچھ بدل جائے۔''

اوتار سنگھ کی تسلی تو نہیں ہوئی۔ لیکن اس نے اس بات کو یہیں چھوڑ دیا اور دوسرے

زاویے سے حملہ کیا۔ ''تو کیمیاوی عمل اب بھی ہوتا ہے؟''

''اب تو ویسا عمل نہیں ہوتا۔'' کانتی پرشاد نے کہا۔ ''زمین تو ٹھنڈی ہو چکی ہے نا۔''

''تو پھر اب درخت، پودے، انسان اور جانور کیسے پیدا ہوتے ہیں؟''

کانتی پرشاد کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ''وہ تو افزائش کا عمل چل رہا ہے۔''

''کیوں ماسٹر جی؟ آپ نے بتایا کہ تپتی ہوئی زمین پر ٹھنڈی بارش کے کیمیاوی عمل سے سب کچھ پیدا ہوا۔ تو اب اس عمل کے بغیر سب کچھ کیسے پیدا ہو رہا ہے؟ ہمارے پرکھے دادا پردادا مر گئے۔ ہم پیدا ہو گئے۔ یہ سب کیسے؟''

''یہ تولیدی نظام ہے۔ خودکار نظام۔ ایک سسٹم ہے، جس کے تحت تمام جانداروں اور نباتات کی افزائش ہوتی ہے۔''

''لیکن ماسٹر جی، پہلا درخت، پہلا جانور، پہلا انسان...... وہ تو اس سسٹم سے پیدا نہیں ہوئے ہوں گے نا؟'' اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

کانتی پرشاد بوکھلا گئے۔ ''دیکھو چھوٹے ٹھاکر، ابھی تم چھوٹے ہو۔ خود کو اتنا نہ الجھاؤ۔ بعد میں ان پر بات کریں گے۔'' انھوں نے ذہین شاگرد کو ٹالا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اب تو خود انھیں بہت کچھ پڑھنا ہوگا۔

❁......❁......❁

چھوٹے ٹھاکر نے ماں سے پوچھا۔ ''ماتا جی...... یہ سنسار کس نے بنایا ہے؟''

''بھگوان نے۔''

''کیسے؟''

''یہ تو بھگوان کو ہی معلوم ہوگا۔''

''اور یہ بھگوان کی مورتی کے تین سر کیوں ہیں؟''

''ایک بھگوان برہما ہے، دوسرا بھگوان وشنو اور تیسرا بھگوان شیو۔''

''تینوں کا جسم ایک کیوں ہے؟''

''تینوں مل کر بھگوان ہیں نا، اس لیے۔''

''بھگوان تین ہیں۔ میں تو ایک سمجھتا تھا۔''

''ایک ہی ہے۔ پرنتو روپ تین ہیں۔ برہما، وشنو اور شیو۔ تینوں کے کام الگ الگ ہیں۔ برہما نے سنسار بنایا۔ وشنو نرمی اور محبت کا بھگوان ہے اور شیو جی غضب، غصہ اور ہلاکت ہیں۔''

تب اوتار سنگھ کو پتا چلا کہ تمام دیوی دیوتا ان تینوں میں سے کسی نہ کسی کے ماتحت ہیں اور دیوی دیوتاؤں کی تعداد بہت بڑی تھی، جو سنسار کی مختلف ذمے داریاں سنبھالتے تھے۔ اور ماں کہتی تھی کہ کسی کی مورتی کے سامنے بھی پوجا کرو، پوجا بھگوان کی ہی ہوتی ہے۔ اوتار سنگھ کی سمجھ میں

نہیں آتا تھا کہ پوجا کرنے کے لیے کسی مورتی کی ضرورت ہی کیا ہے۔

اس نے ٹھاکرانی سے یہ بات کہی تو وہ بھڑک گئی۔ ''دیکھو پتر، یہ صرف مورتی نہیں۔ یہ خود بھگوان ہے۔''

''پر ماتا جی، آپ تو کہتی ہیں، وہ آکاش پر رہتے ہیں۔''

''رہتے ہیں۔ پر جہاں چاہے آ سکتے ہیں۔ ان کی شکتی مہان ہے۔ تم الٹا سیدھا بولو گے تو وہ تمھیں شراپ بھی دے سکتے ہیں۔''

اوتار سنگھ کو تھوڑا سا ڈر لگا۔ تین سر والی مورتی سے اسے ویسے بھی ڈر لگتا تھا۔ ''اور رام چندر جی اور کرشن جی کون تھے؟''

''رام چندر جی بھگوان وشنو کے اوتار تھے۔ ساتویں اوتار اور کرشن جی آٹھویں اوتار تھے۔''

''مطلب؟''

''ان کے اندر وشنو بھگوان کی آتما تھی۔ وہ منش کے روپ میں وشنو بھگوان تھے۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔ ''ویدوں میں لکھا ہے کہ دس اوتار آئیں گے۔ نو آ چکے ہیں اور ایک باقی ہے۔''

''ماتا جی، یہ کیسے پتا چلتا ہے کہ کسی منش میں بھگوان کی آتما موجود ہے۔''

''ان کی شکتی سے پتا چلتا ہے...... اور گیانیوں کو پتا چل جاتا ہے۔''

اوتار سنگھ اور الجھ گیا۔ یہ گورکھ دھندا کیا ہے، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

چند روز بعد اس نے ماسٹر جی کو گھیر لیا۔ ''ماسٹر جی، یہ دیوی دیوتا کیا سچ مچ ہوتے ہیں؟'' اس نے ریاضی پڑھتے پڑھتے اچانک پوچھ لیا۔

ماسٹر جی کا ذہن ریاضی میں تھا۔ انھوں نے بے دھیانی میں کہا۔ ''بھئی لوگ کہتے ہیں تو ہوتے ہی ہوں گے۔''

اس جملے سے اوتار سنگھ کی سمجھ میں آ گیا کہ ماسٹر جی دیوی دیوتاؤں پر اتنا یقین نہیں رکھتے۔ ''آپ کا اپنا خیال کیا ہے ماسٹر جی؟''

''بھئی میں تو سائنس کا آدمی ہوں اور سائنس ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔''

''تو پھر آپ کے خیال میں یہ دیوی دیوتا کہاں سے آئے؟ ان کی ضرورت کیا تھی؟''

''آنا تو ان کا ثابت ہی نہیں ہوتا یہاں میں اس سلسلے میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی ضرورت کیوں تھی۔''

''تو بتائیے نا۔''

''دیکھو، خوف انسان کی بنیادی جبلتوں میں سے ہے۔ ہے نا؟''

''شاید ہو۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔'' دس سالہ اوتار سنگھ نے ذہانت سے کام لیا۔

ورنہ وہ خوف کو سمجھتا تھا لیکن اس جواب سے وہ ماسٹر جی کو بھڑکانا چاہتا تھا۔ وہ بھڑکیں گے تو بھید کھولیں گے۔

اور کانتی پرشاد سچ مچ بھڑک گئے۔ ''یقین سے کیسے نہیں کہہ سکتے۔ ابھی اس کمرے میں کوئی اجنبی آواز تمھیں پکارے اور دیکھنے پر کوئی نظر نہ آئے، تو تم لازمی ڈرو گے۔''

''جی ہاں۔ مگر اس کا دیوی دیوتاؤں سے کیا تعلق؟'' اوتار سنگھ نے انھیں چیلنج کیا۔

''تعلق میں بتاتا ہوں۔'' کانتی پرشاد بڑے جوش سے بولے۔ ''اب تو منش نے بڑی ترقی کرلی ہے۔ ذرا بہت پرانے، ابتدائی دور کے منش کا سوچو۔ اس وقت کی بات سوچو، جب اس نے پتوں سے شریر ڈھانپنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ جب وہ ننگا رہتا تھا۔ جب اس نے سورج کو نکلتے دیکھا ہوگا تو ہلکی ہلکی دھوپ اسے نعمت لگی ہوگی۔ پھر سورج چڑھا ہوگا، دھوپ تیز ہوئی ہوگی اور اس نے اس کے جسم میں کانٹے چبھوئے ہوں گے تو اس نے سوچا ہوگا کہ اس میں تو قہر بھی ہے اور طاقت بھی۔ اس کی اطاعت کرنی ہوگی۔ ورنہ یہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور شروع ہی سے جھکنا اطاعت کی علامت رہا ہے۔ سو اس نے سورج کو سجدہ کیا ہوگا۔ پھر تیز دھوپ میں چلتے چلتے وہ کسی درخت کے ٹھنڈے سائے میں رکا ہوگا تو اس نے درخت کی طاقت کو تسلیم کیا ہوگا۔ ارے...... یہ تو سورج دیوتا کے قہر سے بچاتا ہے۔ پھر بارش ہوئی ہوگی اور اس کے ننگے جسم پر تیز بارش کے ٹھنڈے نیزے برسے ہوں گے۔ کہیں امان نہیں ملی ہوگی تو اس نے بارش کو اور بعد میں بادل کو دیوتا مانا ہوگا۔ ایک بار پھر درخت نے اسے تیز بارش سے بچایا ہوگا۔ تب اس کے ذہن میں آیا ہوگا کہ درخت کی طرح پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانپ کر وہ بھی بارش دھوپ اور ہوا سے بچ سکتا ہے۔ اور سوچو کہ ہوا سے وہ کتنا ڈرا ہوگا کیونکہ وہ تو نظر بھی نہیں آتی ہے اور جب پہلی بار بجلی کڑکی ہوگی اور اس نے چمک دیکھی ہوگی تو اس کے خوف کا کیا عالم ہوگا؟ وہ بس سجدے میں گر گیا ہوگا۔ اب تم سمجھ سکتے ہو کہ اس طرح دیوی دیوتا وجود میں آئے ہوں گے۔''

اوتار سنگھ سانس روکے ماسٹر جی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ ایک کیفیت میں تھے۔ ان کی گفتگو میں زور تھا، بہاؤ تھا، اوتار سنگھ نے زور سے سانس بھی نہیں لی کہ کہیں وہ کیفیت ختم نہ ہو جائے۔

''دراصل منش کے اندر، بہت گہرائی میں اوّل دن سے ایک احساسِ کمتری بیٹھا ہوا ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے کہ وہ اپنے سے بہت برتر کسی نامعلوم طاقت سے ڈرتا ہے۔ معلوم قوت سامنے آتی ہے تو وہ کسی نہ کسی طرح اسے تسخیر کرلیتا ہے اور جب بھی وہ خوف مٹ جائے، چاہے اوپری سطح پر مٹے تو وہ فرعون بن جاتا ہے۔''

''تو ماسٹر جی، اس خوف کا فائدہ تو ہے نا۔ اس سے انسان اچھا بنا رہتا ہے۔''

''[illegible] طور پر تو فائدہ [illegible]'' [illegible] پرشاد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے

کہا۔ ''میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ خوف بہت اہم ہے۔ انسان...... ہر انسان زندگی میں بارہا بے بسی محسوس کرتا ہے۔ جب اپنے مسائل اس سے حل نہیں ہوتے۔ جب اپنی ضرورتیں وہ پوری نہیں کر پاتا۔ ایسے میں اسے ایک برتر، ایک مشکل کشا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بیمار ہے اور شفا چاہیے، بے اولاد ہے اور اولاد کی ضرورت ہے اور دنیا میں ایسا کوئی نہیں، جس سے وہ یہ چیزیں مانگ سکے اور اسے مل بھی جائیں۔ تو اس کے لیے وہ ایک برتر نامعلوم تخلیق کرلیتا ہے۔ کہیں وہ بھگوان ہے تو کہیں خدا۔''

''کہتے ہیں کہ بھگوان آکاش پر رہتا ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''وہ کسی ایسی ہی جگہ رہ سکتا ہے، جو منش کی نظروں سے اوجھل ہو، اور آکاش سے اچھی ایسی جگہ اور کون سی ہوگی۔'' ماسٹر جی نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

''پر لوگوں نے بھگوان کو دیکھا ہوگا۔ تبھی تو مورتی بنائی ہے ان کی۔''

''نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ ایسے منش ہر دور میں رہے ہیں، جو بہت اچھے تھے۔ اخلاق میں اعلیٰ لوگوں کے کام آنے والے۔ ایسے کہ لوگ ان سے محبت کرنے لگیں۔ اب کوئی مجسمہ تراشنے والا کسی سے محبت کرے گا تو اس کی مورتی تو بنائے گا ہی۔ اور محبت کرے تو آدمی آدمی کو اوتار مان لیتا ہے۔ بلکہ بھگوان بھی بنا دیتا ہے اسے۔''

یہ بات معقول تھی۔ اوتار سنگھ نے بارہا ماتا جی کو پتا جی سے کہتے سنا تھا کہ آپ تو میرے بھگوان ہیں۔ اگر ماتا جی کو بت بنانا آتا تو وہ یقیناً پتا جی کا بت بناتیں۔ پھر ہزاروں برس بعد لوگ پتا جی کو بھگوان کہتے۔

''اور مسلمانوں اور انگریزوں کے بھارت میں آنے کے بعد ہندو دھرم کے بہت سے نظریات تبدیل ہوئے ہیں۔ تری مورتی کا تصور عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث سے لیا گیا ہے۔ اور مسلمانوں سے متاثر ہو کر بھگوان کے تصور کو مرکزیت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔''

''تو یہ دیوی دیوتا۔ یہ سب خوف کی پیداوار ہیں...... وہم ہے منش کا؟'' اوتار سنگھ نے پوچھا۔

ایک پل میں کانتی پرشاد کی کیفیت ختم ہوگئی۔ انھیں اچانک ہی احساس ہوا کہ وہ بہت خطرناک گفتگو کر رہے ہیں...... بلکہ کر چکے ہیں۔ اگر ٹھاکر جی کو پتا چل گیا کہ وہ ان کے بیٹے کو دھرم کے خلاف کر رہے ہیں تو وہ انھیں نکال باہر کریں گے اور کانتی پرشاد کا یہاں دل بھی لگ گیا تھا اور برسوں بعد ان کے جیون کو ایک مقصد مل گیا تھا۔ وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے گھبرا کر کہا۔ ''یہ میں نے کب کہا چھوٹے ٹھاکر۔''

''جو باتیں آپ نے کہیں، ان کا یہی مطلب نکلتا ہے۔''

اتنی دیر میں کانتی پرشاد نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ ''نہیں۔ وہ تو میں سائنس کے حوالے

سے بات کر رہا تھا۔ ورنہ میں کوئی ناستک تو ہوں نہیں۔''

''یہ ناستک کون ہوتا ہے؟''

''جو نہ بھگوان کو مانے نہ خدا کو، وہ ناستک ہوتا ہے۔'' کانتی پرشاد نے یوں بدمزہ ہو کر کہا جیسے ناستک کوئی گالی ہو۔ پھر پوچھا۔ ''چھوٹے ٹھاکر، تمھیں میں کیسا لگتا ہوں۔''

''اچھے لگتے ہیں۔''

''کیا تم یہ چاہو گے کہ میری جگہ کوئی اور ماسٹر تمھیں پڑھانے کے لیے آئے؟''

''نہیں۔ لیکن ایسا کیوں ہوگا؟''

''اگر ٹھاکر جی یا ٹھاکرائن کو پتا چل گیا کہ میں تمھیں ایسی باتیں بتا رہا ہوں تو وہ شاید مجھے مروا دیں۔ نہ بھی مروایا تو نکال ضرور دیں گے۔''

اوتار سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس سے پہلے اماں نے بھی یہی بات کہی تھی۔ اور وہ اماں سے کچھ پوچھنے سے محروم ہو گیا تھا۔ اب کیا ماسٹر جی بھی......؟ نہیں۔ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔

''میں پتا جی اور ماتا جی کو کبھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔ لیکن ایک شرط ہے ماسٹر جی۔''

کانتی پرشاد تو گویا سولی پر لٹک گئے۔ ''وہ کیا ہے اوتار سنگھ جی؟'' انھوں نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

''میں جب بھی کچھ پوچھوں گا، آپ مجھے بتائیں گے۔ وہ جو آپ کے خیال میں سچ ہے۔''

کانتی پرشاد مطمئن ہو گئے۔ وعدہ کرنے میں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے سوچا۔ لیکن دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ اب وہ محتاط رہیں گے۔ ''ضرور چھوٹے ٹھاکر'' انھوں نے اوتار سنگھ سے کہا۔ ''یہ تو میرا فرض ہے۔''

❀.....❀.....❀
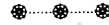
چھوٹے ٹھاکر اوتار سنگھ کے دماغ میں دو صندوق تھے۔ ایک میں معلومات جمع ہوتی رہتی تھیں...... دوسروں کے نظریات۔ وہ درست ہوں یا غلط۔ معقول ہوں یا احمقانہ۔ وہ اس صندوق میں جمع ہو جاتے تھے اور دوسرے صندوق میں اس کے مشاہدات۔ اور اب یہ ہوا کہ اسے تنہائی کی ضرورت محسوس ہونے لگی تا کہ وہ ان معلومات، نظریات اور مشاہدات کا تجزیہ کر کے ان سے نتائج اخذ کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تنہائی کے موقعے تلاش کرنے لگا۔ کھیل سے اس کا دل بالکل ہٹ گیا۔ جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ سب سے اچھی اور طویل تنہائی رات کو بستر پر میسر آتی ہے۔ سویرے سے سونا اس کا معمول بن گیا۔ وہ بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتا اور سوچتا رہتا۔ ماتا جی اور پتا جی سمجھتے کہ وہ سو رہا ہے۔

تنہائی کی ضرورت اس لیے اور بڑھ گئی تھی کہ ماسٹر جی نے اسے ایک بہت وسیع مشغلہ

دے دیا تھا۔ وہ تصور میں دیکھتا کہ وہ بہت پرانے...... ابتدائی زمانے کا انسان ہے۔ وہ یہ کیفیت خود پر طاری کرتا۔ اس کی مشکلات، اس کی پریشانیاں اور اس کی بے بسی محسوس کرنے کی کوشش کرتا۔ یوں وہ انسان کے ارتقا کو محسوس کر رہا تھا۔ سمجھ رہا تھا اور یہ میدان بہت بڑا تھا۔

اس وقت تک وہ مطالعہ بھی بہت کر چکا تھا۔ ماسٹر جی خود بہت لائق انسان تھے۔ ان کا شاگرد ہونے کی حیثیت سے وہ علم میں اپنی عمر کے مقابلے میں بہت آگے تھا۔ اس پر مستزاد اس کا فطری تجسس...... اس کے سوال۔ اسی حساب سے اس کا تصور بھی بہت زرخیز تھا۔

سو بیسویں صدی عیسوی کا اوتار سنگھ زمانہ ماقبل تاریخ کی وسیع و عریض دنیا میں آزادی سے گھومتا پھرا۔

بالکل ابتدا میں انسان کا معاش شکار تھا۔ اور زندگی صرف پیٹ بھرنا اور اپنی بقا کا خیال رکھنا۔ چنانچہ وہ کہیں نکلتا نہیں تھا۔ پانی میں ہاتھ سے مچھلی پکڑتا۔ پرندے اور زیادہ دشوار تھے۔ بکری اور ہرن وغیرہ کے لیے بہت مشقت کرنا پڑتی تھی۔ بڑے جانوروں سے تو وہ گھبراتا تھا۔

ایک بار دو دن ہو گئے اور کوئی شکار نہیں ملا۔ بھوک نے اسے نڈھال کر دیا۔ چلنے پھرنے کی طاقت بھی نہیں رہی۔ اب تو شکار کا کوئی امکان بھی نہیں رہا تھا۔ تب پہلی بار اس نے ڈرتے ڈرتے جنگلی بیریاں کھائیں۔ کچھ کڑوی کسیلی، کچھ میٹھی۔ ذائقہ اسے اچھا لگا۔ توانائی بھی ملی۔ یوں وہ پھلوں سے متعارف ہوا۔ اب کبھی شکار نہ ملتا تو وہ جنگلی پھل کھا لیتا۔ اس نے درختوں سے پھل توڑنا سیکھ لیا۔

پھر ایک دن بڑے نکیلے دانتوں والا گیدڑ اس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ بھاگا، گیدڑ اس کے پیچھے تھا۔ وہ بھاگتے بھاگتے تھک گیا اور ہانپنے لگا۔ گیدڑ اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور وہ بے بس تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک پتھر نظر آیا۔ اس نے پتھر اٹھایا اور کھینچ کر مارا۔ پتھر گیدڑ کے منہ پر لگا اور گیدڑ کے منہ سے خون نکلا۔ گیدڑ بھاگ گیا۔

اس اتفاق سے اس نے سمجھا کہ وہ پتھر سے کام لے سکتا ہے۔ اگلی بار گیدڑ چپکے سے اس کے قریب آیا اور اس پر حملہ کر دیا۔ پتھر اس کے پاس تھا اور کھینچ کر مارنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ ہاتھ میں پتھر تھام کر گیدڑ کو مارتا رہا۔ یہاں تک کہ گیدڑ ختم ہو گیا۔ اس دن اس نے پتھر کا فرق بھی سمجھ لیا۔ نکیلا پتھر زیادہ کام آتا ہے۔ اس نے پتھر کو پتلا اور نکیلا کر کے ہتھیار بنائے۔ تحفظ کا تحفظ...... اور شکار کرنا آسان ہو گیا۔

فاقے کا خطرہ دور ہوا تو دماغ زیادہ کام کرنے لگا۔ پیٹ کی طرف سے بے فکری ہوئی تو مشاہدہ شروع ہوا۔ اس نے مکئی دیکھی اور دیکھا کہ اسے پرندے شوق سے کھاتے ہیں۔ وہ خود بھی شوق سے کھاتا تھا۔ پھر وہ بیمار ہو گیا۔ مجبور ہو گیا کہ وہیں پڑا رہے۔ آگے جانے کی طاقت نہیں تھی۔ راستہ دشوار تھا اور سامنے پہاڑ تھا۔ اس کا جسم گرم ہو رہا تھا۔ اس نے مکئی کے دانے جہاں تک،

پھیلا سکتا تھا، پھیلا دیے کہ پرندے آئیں گے اور وہ پتھر سے ان کا شکار کر کے پیٹ بھرے گا اور طاقت بحال ہوگی تو آگے نکل جائے گا۔

تیس چالیس سورج نکلے اور ڈوبے تو اس نے دیکھا کہ جہاں اس نے مکئی کے دانے پھیلائے تھے، وہاں پودے نکل رہے ہیں۔ پھر اس نے ان پودوں کو بڑھتے دیکھا۔ ہر پودے میں مکئی کے بہت سارے پھل تھے۔ بہت سارے سورج نکلے اور ڈوبے تو مکئی تیار ہوگئی۔ اس نے سوچا تو ان دانوں سے پودے نکلتے ہیں۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔

وہ صحت یاب ہوگیا تھا۔ مگر وہ آگے نہیں گیا۔ اس نے پھر دانوں کو پھیلا کر تجربہ کیا۔ پھر فصل ہوئی۔ مگر اس نے سمجھ لیا کہ اس کے لیے یہاں رہنا ضروری ہے۔ سو اس نے گھومنے پھرنے کو خیرباد کہا۔ اور وہیں ایک غار میں رہنے لگا۔ پھر اس نے پرندوں کو گھونسلا بناتے دیکھا اور اپنے لیے گھر بنایا، جہاں وہ دھوپ اور بارش سے اور ہوا سے محفوظ تھا۔ وہ زراعت اور تمدن کا آغاز تھا۔

اہم ترین عناصر چار تھے مٹی، پانی، ہوا اور آگ۔ ان کے بغیر زندگی کا تصور نہیں تھا۔ ہوا اور مٹی ہر جگہ موجود تھی۔ پانی کا ایک سسٹم تھا اور آگ نہ ہوتی تو انسان جانوروں کی طرح کچا کھاتا رہتا۔ پہلی بار وہ کھانا پکا کر ہی جانوروں سے ممتاز ہوا تھا۔

ان سب باتوں پر غور کرتے ہوئے اوتار سنگھ کے ذہن میں دو باتوں نے جڑ پکڑی، جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ راسخ ہوتی گئیں۔ ایک یہ کہ دنیا میں کوئی کام خود بہ خود نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اتفاق کوئی چیز نہیں ہوتا اور اس کا سبب اس کا عمیق مشاہدہ تھا۔

وہ ہر چیز کو علم کی کسوٹی پر پرکھتا ضرور تھا لیکن اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ کہیں کہیں سائنس بھی بے بس ہو جاتی ہے۔ جیسے دنیا کی ابتداء کے بارے میں وہ یہ کہہ کر الگ ہو جاتا تھا کہ ایک کیمیاوی عمل کے نتیجے میں زمین بنی اور اس پر زندگی کا آغاز ہوا۔ اور وہ کہتا تھا کہ وہ عظیم کیمیاوی عمل خودکار تھا۔ یہ بات اس کے حلق سے نہیں اترتی تھی۔ یہ طے ہے کہ کیمیاوی عمل عناصر کے درمیان ہوتا ہے اور یہ بھی طے ہے کہ عناصر خود بہ خود پیدا نہیں ہوتے۔ ہر چیز کی، ہر عمل کی کوئی نہ کوئی علت ہے۔ جو آدمی کی سمجھ میں نہیں آتا، وہ اس پر اتفاق کا لیبل چپکا دیتا ہے۔ سو جہاں سائنس بے بس دکھائی دیتی تھی، وہ وہیں سے غور و فکر کرتا تھا۔

انسانی ارتقاء کی تاریخ سے اوتار سنگھ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ انسان کا علم بہت محدود اور ناقابل اعتبار ہے۔ ابتداء میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ پھر اسے اپنی عقلی صلاحیت کا ادراک ہوا۔ تب اس نے سمجھنا شروع کیا اور تب سے اب تک کتنے ہی نظریات ایسے ہیں، جن پر وہ مدتوں راسخ رہا۔ مگر بعد میں انھیں غلط ماننے پر مجبور ہوگیا۔ تو یہ طے ہے کہ جو بھی انسان کو معلوم ہے، جو کچھ بھی اس نے سمجھا ہے، اس کے درست ہونے کی کوئی ضمانت نہیں۔ کوئی بھی نظریہ کسی بھی وقت غلط ثابت ہوسکتا ہے۔

سائنس کی بنیاد انسان کی عقل اور اس کی جاننے کی خواہش ہے۔ اور اوتار سنگھ نے سمجھ لیا تھا کہ عقل خام ہے۔ بہت سی چیزیں ہیں، جنھیں عقل سمجھنے سے قاصر ہے تو اس وجہ سے ان کا انکار تو نہیں کیا جاسکتا جو کچھ انسان کو جب تک معلوم نہیں، تب تک وہ ناموجود ہے۔ لیکن اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔ وہ موجود تو ہوتی ہے۔ کسی کے وجود کا انکار کرنے سے وجود ختم تو نہیں ہو جاتا اور جب انسان اسے دریافت کرتا ہے، تب سے اسے ماننا شروع کرتا ہے۔ حالانکہ وہ بہت عرصے سے موجود ہوتی ہے۔ ابھی ماسٹر جی نے بتایا تھا کہ ایک اور ستارہ دریافت ہوا ہے، جس کا نام پلوٹو ہے۔ دریافت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اب انسان کو نظر آیا ہے۔ اس کی سمجھ میں اب آیا ہے۔

خود ماسٹر جی نے بتایا تھا کہ نظام شمسی بہت بڑا ہے اور ہوسکتا ہے کہ اس میں اور ستارے بھی ہوں، جو ابھی انسان کو نظر نہ آئے ہوں اور یہ بھی کہ کائنات میں اس سے کہیں بڑے ہزاروں...... بلکہ شاید لاکھوں نظام موجود ہوں۔ تو کائنات بہت بڑی ہے...... اتنی بڑی کہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ وہ تو ابھی تک اپنے نظام شمسی کو بھی پورے طور پر نہیں سمجھ پایا ہے۔ اور یہ جو کچھ انسان نے سمجھا ہے، ہزاروں برسوں میں سمجھا ہے اور جو سمجھا ہے، وہ بھی مکمل نہیں ہے۔ ہزاروں، لاکھوں سوال ایسے ہیں، جن کے وہ ابھی تک جواب نہیں دے پایا ہے۔

پھر عقل کے ساتھ حواس بھی ہیں۔ انسان دیکھتا ہے تو مانتا ہے۔ سب سے زیادہ وہ آنکھوں پر اعتبار کرتا ہے۔ مگر اور حسیں بھی ہیں۔ وہ سُن سکتا ہے۔ سونگھ سکتا ہے، چھو سکتا ہے، چکھ سکتا ہے۔ یہ تمام حسیں عقل کی مددگار ہیں۔ تبھی تو اس نے بہت سی ایسی چیزوں کا وجود تسلیم کیا، جنھیں وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ان میں ہوا بھی تھی اور خوشبو بھی۔

اوتار سنگھ دنیا کے نظام پر غور کرتا تھا۔ سورج ہر روز اپنے مقررہ وقت پر نکلتا اور غروب ہوتا تھا۔ چاند تھا۔ اس کی گردش کا دائرہ ایک خاص مدت میں مکمل ہوتا تھا۔ نیا چاند نکلتا، روز تھوڑا تھوڑا بڑھتا، مکمل ہوتا، پھر تھوڑا تھوڑا گھٹتا، دو دن غائب ہو جاتا اور پھر نیا چاند نکلتا۔ موسم تھے جو اپنے اپنے وقت پر آتے جاتے تھے۔ کچھ مہینے بارشوں کے تھے۔ گرمی سردی تھی۔ بہار خزاں تھی۔ تمام ستارے اپنی مخصوص رفتار سے آگے پیچھے گردش کرتے تھے۔ ایسے کہ اس میں کبھی ایک سیکنڈ کا فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔ تبھی تو جنتریوں سے پتا چلتا تھا کہ کب کون سا ستارہ کہاں ہے۔ زہرہ، مشتری، مریخ، عطارد اور زحل۔ یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ کب سے کب تک طلوع رہیں گے۔ یعنی زمین سے دیکھے جاسکیں گے۔ سب کچھ ایسے حساب کتاب سے تھا کہ نجومیوں کو پہلے سے معلوم ہوتا تھا کہ کس سال کس مہینے میں کتنے بج کر کتنے منٹ اور کتنے سیکنڈ پر سورج یا چاند گرہن ہوگا۔

سائنس بہت سی چیزوں کو نہیں مانتی تھی۔ ان میں آتما بھی تھی اور خدا بھی۔ اور بھی بہت کچھ تھا، جسے وہ توہمات قرار دے کر مسترد کر دیتی تھی۔ دراصل سائنس بہت مجبور تھی۔ اس کی کچھ حدود تھیں۔ وہ مختلف چیزوں پر، ان کی ماہیت، ان کے اجزائے ترکیبی کے حساب سے تجربے کر

کے نتائج اخذ کرتی تھی۔ اور ایسا صرف ان چیزوں پر ہو سکتا تھا جو اس کی دسترس میں ہوں۔ جو انسانی حسوں کی حدود میں ہوں۔ ایسی چیزیں بھی تھیں جو انسان دیکھ سکتا تھا، محسوس کر سکتا تھا۔ مگر وہ اس کی پہنچ سے دور تھیں۔ ان چیزوں کو وہ ریاضی کی مدد سے سمجھتا تھا۔ فلکیات کا پورا علم ایسا ہی تھا۔ اور اس کی براہِ راست تصدیق نہیں کی جا سکتی تھی۔ انسان نے بہت ترقی کر لی تھی۔ ثابت ہو چکا تھا کہ تمام جانداروں میں وہ سب سے برتر ہے۔ اس نے بہت کچھ تسخیر کر لیا تھا۔ بہت کچھ جان لیا تھا۔ بہت کچھ ایجاد کر لیا تھا۔ اس نے اپنے نظام شمسی کے سسٹم کو بھی بڑی حد تک سمجھ لیا تھا۔ لیکن اپنی قوتوں اور اختیارات کے باوجود بہت سے مقامات پر بے بس تھا۔ آسمانی بجلی، زلزلے، طوفان، ان کے سامنے اس کی نہیں چلتی تھی۔ اور وہ سسٹم میں تبدیلی کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ وہ سورج کو نہ پانچ منٹ پہلے نکال سکتا تھا نہ پانچ منٹ بعد۔ موسم بھی اس کے اختیار میں نہیں تھے۔

اور ایک اہم چیز وقت تھا۔ اس پر کسی چیز کا اثر و اختیار نہیں تھا اور اس کے اثرات سے کوئی چیز محفوظ نہیں تھی۔ اس کا تعلق سورج سے تھا اور وہ آگے ہی آگے بڑھتا تھا۔ کبھی رکتا نہیں تھا۔ اوتار سنگھ نے بیج سے پودے کو نکلتے اور پھر پودے کو بڑھتے دیکھا تھا۔ اس نے خود کو بھی بڑھتے دیکھا تھا۔ وہ لمبا بھی ہوا تھا اور بڑھا بھی تھا۔ اس نے چیزوں کو پرانی اور بوسیدہ ہوتے دیکھا تھا۔ اس نے ماتا جی کی آنکھوں کے نیچے چڑیوں کے پنجوں کے سے نشان آتے دیکھے تھے اور پتا جی کے چہرے پر جھریاں پڑتے بھی دیکھا تھا۔ وقت کے اثرات بے جان چیزوں پر اور طرح کے تھے۔ وہ بڑھتی نہیں تھیں۔ پرانی...... وقت کے ساتھ ساتھ بوسیدہ ہوتی چلی جاتی تھیں۔ لگتا تھا کہ گزرتا وقت ان میں توڑ پھوڑ کرتا ہے۔ انھیں کمزور کرتا ہے۔ جان دار چیزوں کے ساتھ معاملہ اور تھا۔ وہاں تعمیر بھی تھی۔ وقت پہلے جان دار چیزوں کو بڑھاتا تھا اور جان دار چیزوں کے بڑھنے کی ایک حد تھی۔ اس حد کو پہنچ کر بڑھوتی کا ہر عمل رک جاتا تھا اور ایک مدت کے ٹھہراؤ کے بعد زوال کا عمل شروع ہو جاتا تھا۔

وقت ایک ایسی طاقت تھی، جو نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن ہر چیز پر اس کے اثرات نظر آتے تھے۔ وہ ایک ایسا دھارا تھا، جو کبھی رک نہیں سکتا تھا۔ اوتار سنگھ نے غور کیا تو سمجھا کہ ہر جاندار چیز کے لیے ایک مہلت مقرر ہے اور وقت اس کا پیمانہ ہے۔ ہر چیز کو فنا ہے۔ جو جیتا ہے، وہ آخر کار مر جاتا ہے۔ اور اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ سب کی مہلت الگ الگ ہے۔ یہ نہیں کہ آدمی بوڑھا ہو کر مرے۔ گنگا رام کا بچہ دو سال کا مر گیا تھا۔ اور گنگا رام کا باپو 80 سال کا تھا، مگر زندہ تھا۔ یہی حال نباتات کا تھا۔ کوئی پودا بڑا ہوتے ہوتے اچانک سوکھ جاتا تھا اور کوئی درخت برسوں سے ہرا بھرا تھا۔

وہ بارہ سال کا ہونے والا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب اسے گھر سے دور جانا ہے۔ اسکول میں داخل ہونا ہے۔ اس خیال سے وہ گھبراتا نہیں تھا۔ بلکہ خوش ہوتا تھا۔ اس کے تجسس کو گاؤں کے

چھوٹے سے منظر نے مہمیز کر دیا تھا۔ وہ سوچتا کہ بڑے منظر میں جا کر وہ زیادہ دیکھے گا اور زیادہ سمجھے گا۔

پتا جی نے جب اسے اس بارے میں بتایا تو گویا دلاسہ دینے کے لیے کہا۔ ’’وصال دین بھی تمھارے ساتھ جائے گا......اور ماسٹر جی بھی۔‘‘

وہ خوش ہو گیا۔ ویر جی نے کبھی اس کے تجسس میں اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ خود کو ادھورا محسوس کرتا تھا۔

لیکن پتا جی اداس ہو گئے۔ ’’پتا نہیں، تمھارے بغیر ہم کیسے جئیں گے۔‘‘

’’کیوں پتا جی۔ اپنے بچوں کو تعلیم کے لیے سبھی لوگ دور بھیجتے ہوں گے۔‘‘

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے گہری سانس لی۔ ’’مگر تم تو میرے ایک بیٹے ہو......اور وہ بھی منتوں مرادوں والے......‘‘

’’یہ کیا ہوتا ہے پتا جی...... منتوں مرادوں والا؟‘‘ اوتار سنگھ نے اپنا پسندیدہ جملہ دہرایا۔

اس کے جواب میں ٹھاکر نے اسے سب کچھ بتایا۔ بلکہ اسے لے جا کر برگد کا وہ درخت بھی دکھایا، جو جل چکا تھا۔ مگر اب بھی کھڑا تھا۔ ’’یہاں ہم نے آخری بار تمھیں مانگا تھا۔ منت چڑھائی تھی۔‘‘

’’تو اس کے بعد ہی میں پیدا ہوا تھا؟‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’تو اس کا مطلب ہے کہ اس درخت نے آپ کو مراد دی۔‘‘ اوتار سنگھ نے کہا۔

ٹھاکر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بیٹے کو اس معاملے کی تفصیل نہیں بتانا چاہتا تھا۔ لیکن چند لمحے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے نکلا۔ ’’یہ درخت تو ہمارے منت ماننے کے کچھ دن بعد ہی سوکھ گیا تھا۔‘‘

’’میرے پیدا ہونے سے بھی پہلے۔‘‘

’’ہاں پتر۔ اس سے بہت پہلے۔‘‘

ماتا جی اکثر اسے بتاتی تھیں کہ انھوں نے کیسے طویل برس اولاد کی آرزو میں گزارے تھے۔ کیا گزرتی تھی ان پر۔ انھیں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہر چیز میسر تھی۔ لیکن انھیں کسی چیز سے غرض نہیں تھی۔ وہ بس ہر جگہ اولاد کی پرارتھنا کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ انھوں نے بائیس برس اولاد سے محرومی کا کشٹ اٹھایا ہے اور جب انھیں وہ مل گیا تو جیسے سب کچھ مل گیا۔

تو اوتار سنگھ نے سوچا کہ وہ ہستی جس نے مجھے پیدا کیا، یقیناً زبردست ہے اور وہ یہ درخت تو ہرگز نہیں ہو سکتا، جو خود ہی زندگی سے محروم ہو گیا ہے۔ میرے ماں باپ بائیس سال ہر کسی سے اولاد مانگتے رہے۔ لیکن اولاد نہیں ملی پھر اس نے مجھے پیدا کیا تو میرے ماں باپ پر بڑا احسان

کیا۔ مجھ پر بھی احسان کیا کہ مجھے ایسے محبت کرنے والے ماں باپ دیے، اور انھیں اتنا کچھ دیا کہ وہ میری ہر خواہش پوری کر سکتے ہیں۔ تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟

وہ اس سوال پر سوچتا رہا۔ اسے یاد آیا کہ ایک دن اس نے ماتا جی سے پوچھا تھا۔

''آپ میرا اتنا خیال رکھتی ہیں۔ ہر چیز دیتی ہیں مجھے۔ اور پتا جی بھی کیا کچھ کرتے ہیں میرے لیے۔ تو مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ابا جی۔ میں کیا کروں آپ کے لیے؟''

''کچھ بھی نہیں۔ بس تم اچھے رہو۔ خوش رہو۔ میرے لیے یہی سب کچھ ہے۔'' ماتا جی نے کہا تھا۔

''اچھے رہنے کا کیا مطلب ہے؟''

''اچھے پرش بنو۔ اچھے کام کرو۔ تاکہ تمھارے پتا جی کا نام روشن ہو۔ لوگ خوشی سے کہیں کہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کا پوت مہاپرش ہے۔''

''اور کیا کروں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اور کچھ بتائیے۔ کوئی مشکل سا کام۔''

ماتا جی چند لمحے سوچتی رہیں۔ اس دوران پتا جی بھی آ گئے تھے۔ ''بس تم ہمیشہ ہم سے محبت کرو۔'' انھوں نے کہا۔

اور اوتار سنگھ ماں سے لپٹا اور انھیں پیار کیا۔ پھر پتا جی سے لپٹ گیا اور انھیں چومنے لگا۔ ''وہ تو میں کرتا ہوں اور یہ بھی بہت آسان ہے میرے لیے۔''

''محبت کرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔'' پتا جی نے کہا۔ ''مگر یہ بات تم ابھی نہیں سمجھو گے۔''

تو اب اوتار سنگھ نے سوچا کہ اسے اپنے پیدا کرنے والے سے محبت کرنی چاہیے...... دنیا میں سب سے...... ماتا جی، پتا جی، اماں اور ویر جی سے بڑھ کر۔ کیونکہ اس نے اسے پیدا نہ کیا ہوتا تو نہ وہ ان سب کو ملتا اور نہ یہ سب اسے ملتے۔ اس نے سمجھ لیا کہ شکر ادا کرنا اور محبت کرنا سب سے زیادہ اس کے لیے ہونا چاہیے، جس نے اسے پیدا کیا ہے۔

مگر محبت کیسے کرے؟ وہ تو اسے جانتا بھی نہیں۔ تو پھر پہلے اسے جاننے کی کوشش کرے۔ اسے تلاش کرے۔ پھر اس سے دنیا کی ہر ہستی اور ہر چیز سے بڑھ کر محبت کرے۔

''اے تو کہ جو بھی ہے، میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں، اس سب پر جو تو نے مجھے اور میرے ماں باپ کو دیا۔'' اوتار سنگھ نے سرگوشی میں کہا۔ ''اب میں تجھے تلاش کروں گا۔ تجھے ڈھونڈوں گا اور پھر تجھ سے محبت کروں گا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ میں بس ارادہ کر سکتا ہوں، کوشش کر سکتا ہوں۔ مگر تو مجھے اسی وقت ملے گا، جب تو چاہے گا۔ جب تیری مرضی ہوگی۔ میں تجھ سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ میری مدد کر، اور مجھے مل جا۔''

یہ دعا کر کے اسے ایک پل کو سکون آیا۔ مگر وہ فوراً ہی مضطرب ہو گیا۔ اسے تو ڈھونڈنا ہے...... ان تھک کوشش کرنی ہے۔ سکون تو اس کے بعد کی چیز ہے۔ بعد میں ہی اچھا لگے گا۔

اب وہ سراپا عزم تھا!

''درخت کیسے سوکھ جاتے ہیں ماسٹر جی؟'' اوتار سنگھ نے ماسٹر جی سے پوچھا۔

''ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ ارد گرد کی زمین خشک ہو جائے۔ ایسی کہ درخت کی جڑیں درخت کے لیے غذا حاصل نہ کر سکیں۔ مگر بہت پرانے اور بہت بڑے درختوں کے ساتھ ایسا کم ہی ہوتا ہے کیونکہ ان کی جڑیں بہت دور تک...... بعض اوقات میلوں تک پھیلی ہوتی ہیں۔'' کانتی پرشاد نے کہا۔

''اور دوسری وجہ؟''

''تم جانتے ہو کہ جڑیں زمین سے غذا حاصل کر کے تنے کی طرف بڑھاتی ہیں۔ اس سے درخت ہرا رہتا ہے۔ نئی کونپلیں، نئے پتے نکلتے رہتے ہیں۔ غذا نہ ملے تو یہ عمل رک جاتا ہے اور دھیرے دھیرے سوکھ جاتا ہے۔ اب جڑوں میں کوئی بیماری پھیل جائے اور زمین سے غذا چوسنے اور آگے بڑھانے کا ان کا عمل معطل ہو جائے تو درخت ختم ہو جاتا ہے۔''

''تو سوکھنے کے بعد بھی درخت کھڑا رہتا ہے؟''

''کچھ عرصہ۔ اس وقت تک، جب تک جڑوں میں اس کا بوجھ اٹھانے کی طاقت ہو۔ اور پھر درخت اندر سے کھوکھلا ہونے لگتا ہے۔ پھر یا تو وہ کھڑے کھڑے ختم ہو جاتا ہے یا گر جاتا ہے۔ جڑیں زمین چھوڑ دیتی ہیں...... ٹوٹ جاتی ہیں۔''

''سوکھنے کے کتنے عرصے بعد درخت گر جاتا ہے؟''

''مہینہ...... دو مہینے...... چھ مہینے...... اور زیادہ سے زیادہ سال بھر بعد۔'' کانتی پرشاد نے کہا ''مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''یونہی۔ کوئی خاصی بات نہیں۔''

سہ پہر کو ان کا کھیلنے کا وقت تھا۔ وصال دین اور اوتار سنگھ حویلی سے نکل جاتے تھے اور کانتی پرشاد اپنے کمرے میں آرام کرتے تھے۔ اس سہ پہر اوتار سنگھ نے کانتی پرشاد سے کہا۔ ''آپ آج ہمارے ساتھ چلیں ماسٹر جی۔''

کانتی پرشاد کو معمول میں اس تبدیلی کا تصور خوش گوار لگا۔ انھوں نے ہامی بھر لی۔ وہ دونوں لڑکوں کے ساتھ حویلی سے نکل آئے۔ اوتار سنگھ آگے آگے چل رہا تھا۔

وہ بستی سے باہر نکل آئے۔ کچھ دور کانتی پرشاد کو وہ سوکھا ہوا برگد کا بہت بڑا درخت نظر آیا۔ انھیں اپنے شاگرد پر فخر ہونے لگا۔ وہ صحیح طالب علم تھا۔ سائنسی ذہن والا، تجسس سے بھرا ہوا اور تحقیق کے جذبے سے مالا مال۔

اوتار سنگھ نے انھیں لے جا کر وہاں کھڑا کر دیا۔ ''اس درخت کو دیکھیے ماسٹر جی۔''

کانتی پرشاد نے درخت کو دیکھا۔ پھر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ قریب ہی پانی کا ایک تالاب تھا۔ اور ہر طرف خودرو گھاس اور جنگلی پھولوں کے پودے موجود تھے۔ ''دیکھ رہا ہوں۔ یہ جڑوں کی بیماری والا معاملہ ہے کیونکہ اردگرد تو بہت ہریالی ہے۔''

''یہ درخت مر چکا ہے نا۔''

''بالکل۔'' کانتی پرشاد نے درخت کی زمین سے باہر نکلی ہوئی مردہ جڑوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایسا مر چکا ہے کہ اب کبھی ہرا نہیں ہوگا۔''

''مگر ماسٹر جی، یہ درخت تقریباً تیرہ برس سے اس حال میں ہے۔''

کانتی پرشاد کے چہرے پر بے یقینی کا تاثر ابھرا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا۔'' انھوں نے بے حد وثوق سے کہا۔

''آپ پتا جی سے پوچھ لیں۔''

ٹھاکر کے حوالے پر کانتی پرشاد کو سانپ سونگھ گیا۔ ''تو پھر یہ اتنے برسوں سے کھڑا کیسے ہے؟''

''یہی تو میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''میرے خیال میں تو اسے اب ایک انگلی کے دھکے سے بھی گر جانا چاہیے۔'' کانتی پرشاد نے کہا اور درخت کے تنے پر سچ مچ ایک انگلی سے ہی دباؤ ڈالا۔ پھر انھوں نے پہلے ایک ہاتھ سے اور پھر دوسرے ہاتھ سے درخت کو دھکیلا۔ وہ زور لگاتے رہے۔ دونوں لڑکے بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ مگر درخت اپنی جگہ کھڑا رہا۔

بالآخر کانتی پرشاد نے کوشش ترک کر دی۔ وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔ ''اس کی جڑیں یقیناً زندہ ہوں گی۔''

''تو پھر درخت کو غذا بھی ملنی چاہیے۔'' اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

''ہو سکتا ہے، درخت کا جڑوں سے رابطہ نہ رہا ہو۔''

''تو پھر درخت کو گر جانا چاہیے اور زندہ جڑوں سے دوبارہ درخت اگنا چاہیے۔ سائنس تو یہی بتاتی ہے نا۔''

''ممکن ہے، جڑ کے ایک مضبوط مگر چھوٹے حصے سے درخت کا رابطہ ہو۔''

''تو اسے تھوڑی بہت غذا تو مل رہی ہوگی۔ کہیں تو نمو کے آثار نظر آئیں۔''

کانتی پرشاد لاجواب ہو گئے۔ ''اس کی بھی کوئی وجہ ہوگی، جو ہمیں معلوم نہیں۔''

''سائنس کو بھی معلوم نہیں؟''

''سائنس کو معلوم ہوگا۔ ہمارا علم کم ہے۔'' کانتی پرشاد نے بات بنائی۔ لیکن ان کا لہجہ کمزور تھا۔ ''آؤ، اب چلیں۔'' انھوں نے کہا اور واپس چل دیے۔

دونوں لڑکے ان کے پیچھے تھے۔ ماسٹر جی کا جواب اوتار سنگھ کو مطمئن نہیں کر سکا تھا۔ مگر اسے خوشی تھی کہ ماسٹر جی نے اس معاملے کو توہم قرار نہیں دیا۔

❁......❁......❁
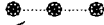
پھر ماتا جی بیمار ہو گئیں...... ایسی بیمار کہ دیکھتے ہی دیکھتے بستر سے لگ گئیں۔ چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں رہیں۔ پہلے تو وید جی آتے رہے۔ پھر شہر سے ڈاکٹر آنے لگے۔ ٹھاکر جی بھی بہت پریشان رہنے لگے تھے۔

بہت دن سے ماتا جی پوجا والے کمرے میں نہیں گئی تھیں۔ جب پہلی بار ایسا ہوا تو انھوں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''دیکھ پتر، آج میں اٹھ نہیں سکتی۔ لیکن تم روز کی طرح جاؤ گے اور پوجا کرو گے۔''

اوتار سنگھ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور جب تک میں نہ جا سکوں، تم ہر روز پوجا کرتے رہو گے۔''

''جی ماتا جی۔''

اوتار سنگھ اکیلا ہی پوجا کے کمرے میں جانے لگا۔ ایک دن اس نے بھگوان کے سامنے رکھے پرشاد پر ایک مکھی کو منڈلاتے دیکھا۔ وہ کبھی کسی پھل پر بیٹھتی تو کبھی مٹھائی پر۔ اوتار سنگھ کو گھن آنے لگی۔ اس نے ہاتھ ہلا کر مکھی کو اڑایا۔ مگر اگلے ہی پل وہ پھر وہاں آ بیٹھی۔ اوتار سنگھ نے پھر اسے اڑایا۔ مگر پھر وہی ہوا۔ ذرا دیر میں ہی وہ عاجز ہو گیا۔ بری طرح سے جھنجلانے لگا۔ ایک اتنی سی مکھی پر اس کا بس نہیں چل رہا اور ماسٹر جی کہتے ہیں کہ منش میں بڑی شکتی ہے۔ دنیا کی ہر مخلوق سے زیادہ۔

وہ عاجز آ گیا تو اس نے ہاتھ جوڑ کر بھگوان سے کہا۔ ''بھگوان، اس بدتمیز مکھی کو شراپ دیجیے۔ یہ آپ کے پرشاد کو گندا کر رہی ہے۔''

لیکن بھگوان کب جواب دیتا ہے۔

اوتار سنگھ نے اب مکھی کو مارنے کی کوشش کی۔ اس کی جھنجلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ ''کیسے بھگوان ہو۔ تم تو کچھ بولتے ہی نہیں۔ اس مکھی کو شراپ دو نا۔ ماتا جی کہتی ہیں، تم بدتمیزی کرنے والوں کو شراپ دیتے ہو۔ یہ مکھی تمہارا پرشاد گندا کر رہی ہے۔ ماتا جی کہتی ہیں، کوئی بدتمیزی کرے تو تم اسے بہت برا شراپ دیتے ہو۔''

اس نے ہاتھ روک لیا۔ اب وہ منتظر تھا کہ بھگوان مکھی کو شراپ دے گا۔ لیکن بدبخت مکھی اسی طرح پرشاد پر دندناتی رہی بلکہ وہ بار بار بھگوان کی مورتی پر بھی جگہ جگہ بیٹھ رہی تھی۔

''تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔'' اوتار سنگھ نے جھنجلا کر کہا۔ ''بولتے بھی نہیں۔ اپنے پرشاد

کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔ تو دنیا کا نظام کیسے چلاتے ہو؟"

اب کے اوتار سنگھ نے وہیں رکھی گیتا اٹھائی اور مکھی کے درپے ہو گیا۔ مگر مکھی بہت پھرتیلی، بہت شریر تھی۔ ایک بار جو وہ بھگوان کی مورتی پر بیٹھی تو اس نے گیتا سے اسے مارا۔ مکھی تو اڑ گئی۔ گیتا بھگوان کے منہ پر لگی۔ مورتی الٹ کر گر گئی۔

اوتار سنگھ پر تو لرزہ چڑھ گیا۔ اس کے ذہن میں بس ایک خوف تھا۔ اب بھگوان اسے شراپ دے گا۔ کئی منٹ گزر گئے اور کچھ نہیں ہوا، تو اس کا خوف کم ہونے لگا۔ اس نے سوچا کہ اس نے تو جان بوجھ کر بدتمیزی نہیں کی جبکہ مکھی تو دانستہ بدتمیزی کر رہی تھی اور بھگوان نے اسے شراپ نہیں دیا تو مجھے کیوں دے گا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ شاید کسی کو شراپ دے ہی نہیں سکتا۔

چند روز بعد ایک اور واقعہ ہوا۔ اس بار بدتمیزی کرنے والا ایک چوہا تھا۔ اوتار سنگھ نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ بس پوجا بھول کر چپ چاپ تماشہ دیکھتا رہا۔ چوہے نے پرشاد میں سے من پسند چیزیں اڑائیں اور اس کے بعد اس نے گستاخی کی حد کر دی۔ وہ براہ راست بھگوان سے بدتمیزی کرنے لگا۔ وہ اپنے نکیلے دانتوں سے شیو جی کی ناک کتر رہا تھا...... غیض و غضب والے، قہر کے دیوتا، تباہی کے دیوتا شیو جی کی ناک!

شیو جی کے بارے میں اس نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ وہ خوف سے شل ہو گیا۔ اب اس چوہے کی خیر نہیں۔ لیکن چوہے کو کچھ بھی نہیں ہوا۔ شیو کی ناک کترنے کے کھیل سے اس کا دل بھر گیا تو وہ مورتی سے اترا اور نہایت آسودگی کے ساتھ چلتے ہوئے ایک طرف چلا گیا۔

اس روز بھگوان سے تو نہیں، لیکن اس کی مورتی سے اوتار سنگھ کا دل برا ہو گیا۔ اس نے سوچا، اس کی پوجا کرنا، اس سے کچھ مانگنا، جو خود اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتا، پرلے درجے کی حماقت ہے۔ انسان کی توہین ہے۔ لیکن ماں باپ سے ملا ہوا نسلی ورثہ اور ان کی دی ہوئی تعلیم اتنی کمزور نہیں ہوتی کہ آسانی سے مٹ جائے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اگلے روز وہ پوجا کے لیے چلا آیا۔ اور ناگواری کے باوجود اس نے پوجا بھی کی۔

اسی شام ٹھاکر جی بہت پریشان تھے۔ اس نے پہلی بار ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ "کیا ہوا پتا جی؟ کیا بات ہے؟"

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ "کچھ نہیں پتر۔ بس ایسے ہی۔"

"کچھ تو ہے پتا جی۔ مجھے بتائیں نا۔"

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے چند لمحے سوچا اور فیصلہ کیا کہ بیٹے کو بتانا ضروری ہے۔ "پتر...... تمہاری ماں کی حالت اچھی نہیں۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔"

اوتار سنگھ گھبرا گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ماتا جی کی مہلت ختم ہونے والی ہے۔ ویسے جب سے وہ بیمار ہوئی تھیں، ہر گزرتے دن کے ساتھ اسے یہ احساس ستاتا رہا تھا کہ کہیں ایسا تو

نہیں کہ کبھی نہ رکنے والا وقت ان کے لیے ختم ہو رہا ہو۔ اسی لیے اس نے ان کے ساتھ بہت وقت گزارا تھا۔ پڑھائی میں تو اس کی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ لیکن کھیلنے کے وقت میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ وہ جلدی واپس آ جاتا اور بستر پر ماتا جی سے لپٹ جاتا اور انہیں پیار کرتا۔ وہ بھی جواب میں اسے پیار کرتیں۔ مگر پچھلے ایک ہفتے میں اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اب ان میں اسے پیار کرنے کی طاقت نہیں رہی ہے۔ وہ بس نگاہوں میں بے بسی اور حسرت لیے، پیاسی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہتی تھیں۔ اسے ڈر لگتا تھا...... مگر شعور کی سطح پر نہیں۔ وہ لاشعور میں تھا۔

"تو اب کیا ہوگا پتا جی؟" اس نے متوحش لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں ہو سکتا پتر۔ جو بھگوان کی اِچھا۔" ٹھاکر اوتار سنگھ نے اداسی سے کہا۔ پھر ذرا ٹھہر کر بولے۔ "تم تو روز پوجا کرتے ہو۔ بھگوان سے پرارتھنا کرو کہ تمہاری ماتا جی اچھی ہو جائیں۔"

اگلے روز اوتار سنگھ پوجا کے لیے گیا تو بھگوان کے لیے عقیدت سے بھرا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر بھگوان سے پرارتھنا کی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز لرز رہی تھی۔ "ہے بھگوان۔ میری ماتا جی کو اچھا کر دو۔ انہیں جیون دے دو۔ میں جیون بھر تمہاری پوجا کروں گا...... آرتی اتاروں گا۔ بس تم میری ماتا جی کو پہلے جیسا کر دو۔ ماتا جی کہتی تھیں کہ تمہاری شکتی مہان ہے۔ تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔ مجھے بھینٹ دے دو بھگوان۔ میری ماتا جی کا جیون مجھے بھینٹ دے دو۔ میں تمہارا یہ اپکار کبھی نہیں بھولوں گا۔"

وہ پوجا کے کمرے سے نکلا تو بہت پر یقین تھا۔ اسے اعتماد تھا کہ بھگوان نے اس کی سن بھی لی ہے اور مان بھی لی ہے۔ اس وقت تک ڈوبتے کو تنکے کا سہارا والا محاورہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ بحران میں آدمی کسی موہوم سہارے سے بھی آس لگا لیتا ہے۔ وہ اپنے تمام شکوک و شبہات بھول گیا تھا۔ اس نے بھگوان سے کمرے سے من کے ساتھ لو لگائی تھی۔

اس روز ماسٹر جی نے پڑھانے سے انکار کر دیا۔ "آج چھٹی ہے چھوٹے ٹھاکر۔ آپ اپنی ماتا جی کے پاس جائیں۔"

اوتار سنگھ کا دل ہولنے لگا۔ وہ اس کمرے میں چلا گیا، جو شروع ہی سے اس کا اور ماتا جی

روازے تک پہنچا ہی تھا کہ ٹھاکر جی باہر آئے۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے کہا۔ "میں تمہیں ہی بلانے کے لیے آ رہا تھا۔"

"پتا جی، خیر تو ہے؟" اوتار سنگھ نے گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں پتر۔ تمہاری ماتا جی کی حالت بہت خراب ہے۔ نہ کچھ بول رہی ہیں، نہ کسی کو پہچان رہی ہیں۔ چلو تم ان سے مل لو۔"

اوتار سنگھ ماں کے پاس چلا گیا۔ ایک پنڈت بیٹھا بلند آواز میں اشلوک پڑھ رہا تھا۔ ٹھاکرانی کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ لیکن بے نور لگ رہی تھیں۔ لگتا تھا، اسے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ اوتار سنگھ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ وہ برف کی طرح سرد تھا۔

''ماتا جی...... ماتا جی...... مجھے دیکھیں۔ یہ میں ہوں اوتار سنگھ۔'' اوتار سنگھ نے اسے پکارا۔

ٹھاکرانی نے جھرجھری سی لی۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے بمشکل بیٹے کو کھینچ کر لپٹا لیا۔ اس کا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔ اس کے ہونٹ تھرتھرائے۔ لیکن کوئی آواز نہ نکلی۔

''ماتا جی، مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔'' اوتار سنگھ گڑگڑایا۔ ''میں نے بھگوان سے بات کر لی ہے۔ وہ تمہارا جیون نہیں لیں گے۔ ماتا جی......'' بولتے بولتے اسے احساس ہوا کہ ماں کے جسم کی لرزش ختم ہو گئی ہے۔ وہ ساکت ہو گیا ہے۔ اس کا دل بری طرح گھبرانے لگا۔

اسی لمحے کسی نے اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ ''اٹھو چھوٹے ٹھاکر، تمہاری ماتا جی جا چکی ہیں۔'' یہ ٹھاکر جی کی آواز تھی۔

اوتار سنگھ ہٹا اور اس نے ماں کے چہرے کو دیکھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ پھر ٹھاکر نے اسے لپٹا لیا...... اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

❀......❀......❀
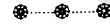
حویلی میں کہرام مچا تھا۔ سبھی رو رہے تھے۔ پھر مصروفیات بھی تھیں۔ ٹھاکرانی کی آخری رسومات کی تیاری ہو رہی تھی۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ سائے کی طرح بیٹے کے ساتھ لگا تھا۔ مگر پھر اسے اطمینان ہو گیا۔ اوتار سنگھ پہلے تو بہت رویا تھا۔ مگر اب پرسکون ہو گیا تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں میں عجیب سی ویرانی تھی۔ خالی پن تھا۔ ٹھاکر نے پرکھنے کی غرض سے اس سے کچھ باتیں پوچھیں۔ اس نے درست جواب دیے...... لیکن اس کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ ٹھاکر مطمئن ہو کر اس کے پاس سے ہٹ گیا۔ اسے بہت کچھ کرنا تھا۔ رشتے داروں کو اطلاع کرائی تھی اور بہت سے بندوبست کرنے تھے۔

مگر باہر جاتے ہوئے اس نے وصال دین سے کہا کہ وہ اس کا خیال رکھے۔

وصال دین اس کے قریب چلا گیا۔ ''چھوٹے ٹھاکر، کیا کر رہے ہو؟''

''کچھ نہیں ویر جی۔''

''تو کچھ سوچ رہے ہو؟''

اوتار سنگھ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر بولا۔ ''میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے یہ معلوم نہیں کہ کیا۔ اور میں سوچ بھی نہیں پا رہا ہوں۔''

''دماغ پر زیادہ زور نہ دو بھائی۔'' وصال دین نے بے ساختہ کہا۔

اوتار سنگھ نے چونک کر اسے دیکھا۔ وصال دین کی آنکھوں میں محبت تھی، دکھ تھا، آنسو تھے۔ اور اتنی خراب کیفیت میں بھی اوتار سنگھ کو ایک لمحے میں اس غیر معمولی بات کا احساس ہو گیا۔ ویر جی نے پہلی بار...... ہاں، پہلی بار اسے بھائی کہہ کر پکارا تھا۔ وہ اس سے لپٹ گیا۔ وہ اس سے لپٹ گیا۔ ''بس ویر جی، ایک وعدہ کرو۔'' اس نے کہا۔ ''اب مجھے ہمیشہ ایسے ہی پکارو گے۔''

وصال دین کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ''کیسے پکاروں گا!''

''ایسے ہی...... بھائی کہہ کر۔''

وصال دین نے اسے محبت سے دیکھا۔ ''میں تمہیں کچھ بھی کہوں، سمجھتا تو یہی ہوں۔''

''بس اب مجھے کچھ اور نہ کہنا۔''

جب آدمی کسی بہت بڑے غم سے شل ہوتا ہے تو اس کیفیت سے نکلنا اس کے لیے آسان نہیں ہوتا۔ بعض اوقات تو لوگ ہفتوں اس کیفیت میں الجھے رہتے ہیں۔ اوتار سنگھ کا بھی یہی حال تھا۔ لیکن وصال دین کا بھائی کہنا اسے ہوش میں لانے کا بہانہ بن گیا۔ اس کی غم کی کیفیت ختم ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ کیا سوچنا، کیا کرنا چاہ رہا تھا اور ایک لمحے میں غصہ اس کے اندر یوں امنڈا کہ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔

وصال دین اس کی یہ تبدیلی دیکھ کر گھبرا گیا۔ ''کیا ہوا بھائی؟''

''کچھ نہیں ویر جی۔ ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اوتار سنگھ کمرے سے نکل گیا۔

وصال دین کو یہ خیال تھا کہ بڑے ٹھاکر جی اس کا خیال رکھنے کو کہہ کر گئے ہیں۔ چنانچہ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ لیکن اسے پوجا کے کمرے میں جاتے دیکھ کر اس کے قدم رُک گئے۔ وہ اندر تو نہیں جا سکتا تھا۔

اوتار سنگھ اندر گیا اور بھگوان کی مورتی کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ ''او بے جان مورت، غلطی میری تھی۔ میں نے تجھ سے ماں کے جیون کی بھیک مانگی۔ میں جانتا تھا کہ تو تو اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتی۔ چوہا تو بڑی چیز ہے۔ تو مکھی سے بھی خود کو نہیں بچا سکتی۔ پھر تو میری ماں کو کیا جیون دے گی۔ میں نے تجھ سے مانگا تو اس لیے کہ میری ماں تجھ پر یقین رکھتی تھی...... اور ہم منش لوگ اپنے ماں باپ، دادا پردادا کے یقین پر یقین رکھتے ہیں، چاہے وہ غلط ہوں۔ مگر اب میں ایسا نہیں کروں گا۔ آج کے بعد میں تجھ سے واسطہ نہیں رکھوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹا۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے پلٹ کر آخری بار مورتی کو دیکھا۔ ''اگر تجھ سے بن پڑے تو مجھے شراپ ضرور دینا۔ میں انتظار کروں گا۔''

اور وہ باہر نکل آیا۔ اس کے بعد وہ کبھی اس کمرے میں نہیں گیا!

❀......❀......❀

ایک آدمی کی موت سے زندگی بدل سکتی ہے...... دنیا بھی بدل سکتی ہے۔ اوتار سنگھ کے لیے یہ ایک نیا اور بہت بڑا تجربہ تھا۔ اس کی مشاہدے کی قوت غیر معمولی تھی۔ لیکن یہ مشاہدہ بے حد غیر معمولی تھا کیونکہ اس کی دو جہتیں تھیں۔ وہ دیکھتا تو کچھ بھی پہلے جیسا نہیں لگتا تھا۔ حویلی کی چہل پہل ختم ہوگئی تھی۔ وہ رونق نہیں رہی تھی، جو پہلے ہوتی تھی۔ سب ملازم وہی تھے۔ گھر میں کام کرنے والی نوکرانیاں وہی تھیں۔ مگر اب خاموشی رہتی تھی۔ کوئی ہنستا بولتا نہیں تھا اور ماتا جی کے دیہانت کے بعد حویلی کا ایک کمرا بالکل اجڑ گیا تھا۔ وہ کمرا جو حویلی کا سب سے آراستہ و پیراستہ کمرا تھا، اب وہاں کوئی جاتا ہی نہیں تھا اور وہ ماتا جی کا کمرا نہیں تھا جو کہ اس کا بھی تھا۔ اجڑا تو پتا جی کا کمرا تھا۔ وہ اپنا کمرا چھوڑ کر اس کے پاس آگئے تھے اور ماتا جی کی جگہ سوتے تھے...... اس کے پاس۔

وہ باہر دیکھتا تو وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ سورج اسی طرح اپنے وقت پر طلوع و غروب ہوتا۔ پرندے اسی طرح چہچہاتے۔ ندی اس طرح بہتی۔ ہوا ویسے ہی چلتی۔ لیکن اسے لگتا کہ ہر شے اداس ہے۔ اس نے یہ بات وصال دین سے کہی تو وہ ہنس کر بولا ''نہیں بھائی، سب کچھ ویسا ہی ہے۔ تمہیں ایسا لگتا ہے۔''

تو اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ دنیا کا نظام کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔ کسی کے ہونے نہ ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بس اس سے تعلق رکھنے والوں پر اثر پڑتا ہے اور اس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ بنیادی طور پر آدمی بہت خود پسند ہے۔ وہ سب کچھ اپنے حوالے سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ وہ خوش ہے تو جھلسا دینے والی تیز دھوپ روح پرور ہے۔ تپتی ہوئی ریت سونا ہے۔ پتوں سے محروم خزاں رسیدہ درخت خوبصورت ہیں اور وہ ناخوش ہے تو چاندنی جھلساتی ہے۔ بہتے پانی کی آواز ڈراؤنی لگتی ہے۔ اور مہکتے ہوئے پھولوں کا نظارہ آنکھوں میں چبھتا ہے۔ خوشبو سے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔

ہے میرے دل سے تعلق تمام عالم کا
فضا اداس بہت چاندنی نراس بہت

پھر اس نے دیکھا کہ دھیرے دھیرے حویلی کی رونق بحال ہو رہی ہے۔ نوکروں اور داسیوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آنے لگی ہے۔ وہ ہنستے بولتے ہیں۔ لیکن وہ سامنے آجائے تو ایک دم چپ ہو جاتے ہیں۔ لگتا ہے خود کو مجرم سمجھ رہے ہیں۔ اسے عجیب سا لگا۔ مگر کچھ عرصے بعد خود اس میں بھی تبدیلی آ گئی۔ وہ ہنسنے بولنے مسکرانے لگا۔ تو یہ یوں ہے۔ اس نے سوچا۔ تعلق رکھنے والے بھی مرنے والے کو بھول جاتے ہیں۔ ابتداء میں یہ سوچنا اسے برا لگا۔ اس نے سوچا، آدمی کتنا بے وفا ہوتا ہے اور میں کتنا بے وفا ہوں کہ محبت کرنے والی خیال رکھنے والی ماں کو بھول رہا ہوں۔ لیکن احساس جرم کے تحت اس نے خود پر سوگواری طاری کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

اس نے پوجا تو چھوڑ دی تھی۔ لیکن آکاش پر بیٹھے بھگوان کو وہ پہلے سے زیادہ ماننے لگا تھا۔ ماتا جی کے دیہانت کے بعد اس نے اس پر بہت سوچا تھا اور بات سمجھ میں آتی تھی۔ وہ تو مہانوں کا مہان تھا، جو دنیا کا نظام چلا رہا تھا۔ تو وہ بے جان مورتی نہیں ہو سکتا، جو اپنے پرشاد پر بیٹھنے والی مکھی کو بھی نہ اڑا سکے۔ کسی گستاخ چوہے کو سزا بھی نہ دے سکے۔ بلکہ وہ مورتی بھی اس کی نہیں ہو سکتی۔ وہ اس طرح اپنی بے عزتی کیوں کرائے گا۔ جبکہ سب سے زیادہ عزت اسی کا حق ہے۔ اور یہ طے ہے کہ عبادت کی بنیاد خوف ہے۔ اور سب سے بڑا خوف ہمیشہ نامعلوم کا ہوتا ہے۔ جان لیا، سمجھ لیا تو رفتہ رفتہ خوف ختم۔ سامنے آگئے تو خوف ختم۔ تو وہ مہانوں کی مہان ہستی جس نے یہ سب کچھ بنایا ہے، یہ کیوں چاہے گی کہ کسی کے سامنے آئے اور اس کا خوف ختم ہو۔ وہ یہ کیوں چاہے گا کہ انسان اسے دیکھے، اس کی مورت بنائے اور حقیر جانور بھی اس کی توہین کریں۔ تو یہ مورتی انسان کی اختراع ہے اور وہ لوگ بے وقوف اور نہایت درجے کے جاہل ہی ہو سکتے ہیں، جو مکھی اور چوہے کے ہاتھوں اس مورت کا اپمان ہوتے دیکھیں اور پھر بھی اس کی پوجا کرتے رہیں۔ ان سے بہتر تو وہ جانور ہیں، جو مورت کا اپمان کرتے ہیں۔ چوہے کو دیکھو۔ کبھی جاگتے انسان پر چڑھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ مورت پر چڑھتا ہے تو اس سمجھ کے ساتھ کہ یہ بے جان ہے اور اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ تو جس سے جانور بھی نہ ڈریں، اس سے عقل مند انسان کیسے ڈر سکتا ہے۔ وہ تو کبھی ایسا نہیں کرے گا۔

تب سے اوتار سنگھ کا معمول ہو گیا کہ دن میں دو ایک بار وہ کھلے آسمان کے نیچے کھڑا ہوتا، احترام سے سر جھکاتا اور عقیدت اور احترام سے کہتا۔ ''اے سب کچھ بنانے والے، میں تیرے سامنے، تیری بڑائی کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔'' یہ اس کی پوجا تھی۔

ماسٹر جی تاریخ پڑھا رہے تھے...... ہندوستان کی تاریخ!

''یہ کیا بات ہے ماسٹر جی کہ پورے بھارت پر جب بھی کسی ایک راجا کی حکومت رہی تو پورے دیش میں خوش حالی تھی۔'' اوتار سنگھ نے ان سے پوچھا۔ ''اور جب بھی بہت سارے رجواڑے بنے، ریاستیں بنیں تو بدامنی اور بدحالی رہی۔''

''یہ تو اصول ہے۔ وحدت میں ارتکاز ہے، کثرت میں انتشار۔'' ماسٹر جی نے جواب دیا۔ ''کم و بیش ایک جیسی طاقت کے بہت سے حکمراں ہوں گے۔ تو وہ اپنی طاقت بڑھانے اور دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کریں گے یوں جنگیں ہوں گی۔ بدامنی ہوگی۔ پیسہ جنگوں پر خرچ ہوگا تو رعایا پر ٹیکس کا بوجھ پڑے گا اور غربت ہوگی۔''

''مگر جنگیں کیوں؟ سب اپنی اپنی جگہ حکومت کرتے رہیں۔''

''یہ انسان کی فطرت ہے۔ طاقت اور اقتدار ملتا ہے تو اس کی ہوس بڑھتی ہے۔ اس ہوس کی کوئی حد نہیں۔ تبھی تو کہتا ہوں کہ کثرت میں انتشار ہے۔ اب کسی کی پورے دیس پر حکومت

ہو تو بھی وہ اپنی راج دھانی میں بیٹھ کر حکومت کرتا ہے۔ ریاستوں میں وہ اپنے نائب مقرر کرتا ہے، جو اس کے ماتحت ہوتے ہیں۔ حکم اس کا ہوتا ہے، نافذ گورنر کرتے ہیں سکہ اس کے نام کا چلتا ہے۔ وصولی اور تقسیم کا کام گورنر کرتے ہیں۔ وحدت میں مرکزیت ہے۔ اس لیے خوش حالی ہے۔ معمولی سی شورش ہوئی جو فرو کر دی گئی۔ کوئی جنگ نہیں۔ کوئی چیلنج نہیں۔ رعایا سکون سے اپنا کام کرتی ہے۔ پیداوار زیادہ ہوتی ہے۔"

اوتار سنگھ پر سوچوں کے نئے دروازے کھل گئے۔ کثرت میں انتشار ہے، وحدت میں ارتکاز۔ یہ تو واقعی سامنے کی بات ہے۔ اگر بھارت میں یہ معاملہ ہے تو کائنات تو بہت بڑی ہے...... منش کے تصور سے بھی بڑی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس پر بے شمار دیوی دیوتاؤں کی حکمرانی ہو۔ ایسا ہوتا تو لڑائی جھگڑے ہوتے۔ انتشار ہوتا۔ بلکہ یہ نظام چلانے والے تین بھی نہیں ہو سکتے۔ ایک ہی ہو سکتا ہے۔ چندر گپت موریہ، اشوک، ہرش، اکبر اعظم، اورنگ زیب بڑے حکمران تھے، پورے بھارت کے مالک بہت طاقت ور۔ لیکن بغاوتیں تو ان میں سے ہر ایک کے خلاف ہوئیں۔ یعنی کیسی ہی مرکزیت ہو، اور کوئی کتنا ہی طاقت ور ہو، اس کے خلاف سر اٹھانے والے موجود ہوتے ہیں اور سر اٹھاتے بھی ہیں۔

اس کے برعکس کائنات کے نظام میں کبھی خلل نہیں پڑتا۔ سورج اپنے وقت پر نکلتا اور غروب ہوتا ہے۔ کوئی موسم وقت سے پہلے آتا ہے نہ بعد میں۔ اپنے وقت پر آتا ہے۔ سب کچھ ایک سسٹم کے تحت ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ جس نے یہ نظام قائم کیا اور چلا رہا ہے، نہ صرف واحد ہے۔ بلکہ مطلق العنان بھی ہے۔ اس کا اختیار و اقتدار ایسا ہے کہ کوئی اسے چیلنج نہیں کر سکتا۔ کوئی اس کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ اور اس کے پاس ایسی قوتیں ہیں کہ وہ دور بیٹھ کر بھی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

یہ سب کچھ سوچنے اور سمجھنے کے بعد اس پر ہیبت طاری ہو گئی۔ لرزہ چڑھ گیا۔ اس روز اس نے کھلے آسمان کے نیچے کمر کے بل جھک کر بہت عاجزی سے پکارا۔ "تو جو کوئی بھی ہے اے سب کچھ بنانے والے، میں تیرا اعتراف کرتا ہوں اور تیرے سامنے خود کو جھکاتا ہوں۔"

اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ رکوع کیا ہوتا ہے!

❁......❁......❁

کئی دن گزر گئے۔ اوتار سنگھ کو احساس بھی نہیں ہوا کہ اب وہ خود بھی ہنس بول رہا ہے۔ بلکہ ان کئی دنوں میں اس نے ماتا جی کو ایک بار بھی یاد نہیں کیا ہے اور جب اسے احساس ہوا تو پھر احساسِ جرم بھی ہوا۔ ارے...... وہ اتنی چاہنے والی ماں کو بھول گیا! احساسِ جرم ہو تو پھر آدمی تاویلیں بھی تلاش کرتا ہے۔ وہ تو واقعی بہت معروف ہو گیا تھا۔ اسکول میں داخلے کے دن قریب آ گئے تھے۔ ماسٹر جی نے پڑھائی کا وقت بڑھا دیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ بڑے ٹھاکر نے خود

ماسٹر جی سے فرمائش کی تھی کہ وہ اسے زیادہ مصروف کر دیں۔ تاکہ وہ ماں کا غم بھول سکے۔

مگر اوتار سنگھ کو یاد تھا کہ اسے پہلے بھی احساس ہوا تھا کہ وہ ماں کو بھول رہا ہے۔ اور اس نے خود پر سوگواری طاری کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ تو کیا وہ کوشش بھی ناکام ہو گئی...... اور وہ بھی ایسے کہ اسے پتا بھی نہیں چلا۔ اور اس کا مطلب ہے کہ اس کے اندر کوئی خودکار نظام حرکت میں آ گیا ہے جو اس کی کوشش پر حاوی ہے۔

اب کے ماتا جی کا خیال آیا تو اسے محرومی کا احساس اور دکھ تو ہوا۔ مگر اس بار وہ گہرائی میں نہیں تھا۔ بلکہ سطحی تھا۔ ایسا لگا کہ اندر کوئی زخم تھا...... گہرا زخم، جو چپکے چپکے بھر گیا تھا۔

یہ تو اوتار سنگھ نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا کہ دنیا میں کوئی کام خود بہ خود نہیں ہوتا۔ سائنس جس چیز، جس بات اور جس عمل کی توجیہہ نہیں کر پاتی، اسے یا تو ایک عظیم واقعہ قرار دے دیتی ہے یا اتفاق کہتی ہے یا پھر کہتی ہے کہ یہ ایک سسٹم ہے۔ اور اوتار سنگھ کا دل اور عقل اس بات پر متفق تھے کہ جہاں سسٹم نظر آتا ہے، وہیں سسٹم بنانے والی ایک عظیم اور سب سے طاقت ور ہستی کا وجود پکا ہو جاتا ہے۔

اب اوتار سنگھ نے اپنے وجود کے حوالے سے سمجھا کہ ہر جان دار شے کے وجود میں اس عظیم ہستی کی نشانیاں موجود ہیں۔ اور اسی حوالے سے اسے اس کی کچھ صفات بھی سمجھ میں آئیں۔ وہ یقیناً بہت مہربان ہے۔ بہت شفیق ہے۔ اپنی مخلوق کی فکر کرتا ہے۔ اس نے سب کو زندگی کے لیے وقت کی ایک خاص مقدار دی ہے۔ اس عرصے تک ہر ایک کو جینا ہے۔ اب کسی کو کوئی بہت بڑا دکھ یا غم لگ جائے تو وہ اپنا جیون تو جیے گا لیکن مردوں سے بدتر۔ اب یہ اس کی مہربانی ہے کہ وہ [illegible] گہرے زخم بغیر کسی دوا، کسی ظاہری مرہم کے بھر دیتا ہے۔ اب یہی دیکھو کہ ماں کے [illegible] روز اسے لگتا تھا کہ اس کی سانس غم کی شدت سے رک جائے گی۔ دل بند ہو جائے گا۔ جیسے وہ ماں [illegible] نہیں سکے گا۔ اگلے دن غم کچھ ہلکا ہوا۔ پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ اور [illegible] ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ [illegible] بے وفائی کے مجرمانہ احساس کے تحت اس غم کو زبردستی خود پر طاری [illegible] وہ زخم بھر چکا ہے۔ بس یاد کے ساتھ ہلکی سی ٹیس اٹھتی ہے اور بس۔

تو وہ مہربان ہے۔ اپنی مخلوق کا خیال رکھتا ہے۔ ان کے غم دور کرتا ہے۔ اس کا مطلب [illegible] اپنی مخلوق کی [illegible] ہر منش کی الگ الگ خبر رکھتا ہے۔ ان سے واقف ہے۔ کیوں نہ [illegible] اس نے انھیں بنایا ہے۔ اور اس کا مطلب ہے کامل علم کے ساتھ بنایا ہے۔ وہ ان کی ہر کمزوری، ان کی ہر خوبی سے آگاہ ہے۔

اس لمحے اوتار سنگھ کا احساسِ جرم مٹ گیا۔ اس نے اس اَن دیکھی مہربان ہستی کا شکر ادا کیا کہ اس نے اس کا غم دور کیا تاکہ وہ اپنا جیون جاری رکھ سکے۔ تو ضرور اس جیون کا کوئی مقصد بھی ہے۔ یقیناً ہے۔ لیکن یہ وہ مقام تھا، جہاں اوتار سنگھ ہار جاتا تھا۔

بہر حال اس نے اپنا جیون پھر سے جینا شروع کر دیا!

❁......❁......❁

چھ ماہ بعد اسکول میں داخلے کا مرحلہ آ گیا!

ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے لیے وہ مرحلہ بہت کڑا تھا۔ ابھی تو وہ بیوی کی دائمی جدائی کے صدمے سے بھی پوری طرح نہیں سنبھلا تھا۔ اس چہیتے بیٹے کے سوا اس کے پاس کچھ بھی تو نہیں تھا۔ وہ نہ ہوتا تو شاید جیون میں اس کی دلچسپی ہی نہ رہتی۔ اسے خود سے دور کرنے کا حوصلہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بری طرح ڈانواں ڈول ہو گیا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ اوتار سنگھ کو اسکول میں داخل کرنے کا خیال ہی دل سے نکال دے۔ لیکن وہ خود تعلیم یافتہ تھا۔ بیٹے کو تعلیم سے محروم رکھ کر وہ اس پر ظلم کیسے کر سکتا تھا۔ پھر اس کے ذہن میں ایک اور حل آیا۔ کیوں نہ وہ بھی بیٹے کے ساتھ دہلی چلا جائے۔ اب اس کا یہاں دل نہیں لگے گا۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اتنی بڑی جاگیر کے معاملات دیکھنا کوئی معمولی کام نہیں۔ یہ نہیں کہ اسے جاگیر سے کوئی دلچسپی رہ گئی ہو۔ مگر یہ سب کچھ اس کے چھوٹے ٹھاکر کا تھا۔ جب تک وہ تعلیم مکمل کر کے واپس آئے اور یہ سب کچھ سنبھالنے کے قابل ہو، تب تک اسے ہی یہ ذمے داری نبھانا تھی۔

پھر اسے ایک اور خیال آیا اور وہ جمال دین کے گھر چلا گیا۔ رنجیتا کی موت کے بعد وہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کے گھر گیا تھا۔ وقت ایسا تھا کہ اوتار سنگھ اور وصال دین ماسٹر جی سے پڑھ رہے تھے۔

حمیدہ نے جلدی جلدی چارپائی پر گدا بچھایا، چادر پھیلائی اور تکیہ لگایا۔ ''بیٹھیے ویر جی۔''

لیکن ٹھاکر اصرار کے باوجود چارپائی پر نیم دراز بھی نہیں ہوا۔ پاؤں لٹکا کر ہی بیٹھ گیا۔ جمال دین اور حمیدہ چارپائی کے پاس موڑھے رکھ کر ان پر بیٹھ گئے۔ ''آپ نے کیوں تکلیف کی ٹھاکر جی۔'' جمال دین نے عاجزی سے کہا۔ ''مجھے بلوالیا ہوتا۔''

''کام مجھے ہے تو میں ہی آؤں گا۔'' ٹھاکر نے کہا۔ ''کیسی عجیب بات ہے کہ مجھے تم سے کام پڑتا ہی رہتا ہے۔''

''کیا حکم ہے ٹھاکر جی۔ میں آپ کے کسی کام آ سکوں، اس سے بڑی خوشی میرے لیے کیا ہو گی۔'' جمال دین بولا۔

''حکم نہیں، درخواست ہے۔'' ٹھاکر کے لہجے میں عاجزی تھی۔ ''رنجیتا کے دیہانت کے بعد میرے پاس اوتار سنگھ کے سوا کچھ نہیں رہا ہے اور اب اوتار سنگھ کے اسکول میں داخلے کا وقت آ گیا ہے۔''

جمال دین اور حمیدہ پریشان ہو گئے۔ تو یہ بات ہے۔ ان کی بھی وصال دین سے جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ وہ پہلے بھی اس سلسلے میں آپس میں باتیں کرتے رہے تھے۔ لیکن ان میں اتنی

ہمت نہ تھی کہ وصال دین کو دہلی بھیجنے سے انکار کرتے۔ حمیدہ تو اب بھی کچھ نہ بولی۔ لیکن جمال دین نے بے حد خوش دلی سے کہا۔ ''میں نے تو پہلے بھی آپ سے کہا تھا ٹھاکر جی کہ یہ بھی آپ کا ہم پر احسان ہے۔ ورنہ ہم وصال دین کو کہاں پڑھوا سکتے تھے۔ وہ چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ دہلی ضرور جائے گا سرکار۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔''

''وہ تو جائے گا جمال دین۔ مگر میں تمھارے پاس ایک اور کام سے آیا ہوں۔''

اب تو جمال دین اور حمیدہ کی تشویش کی کوئی حد نہیں تھی۔ ''کیا حکم ہے سرکار۔ فرمائیں تو۔'' جمال دین نے مرے مرے لہجے میں پوچھا۔

''اب میں اوتار سنگھ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں بھی اس کے ساتھ دہلی جانا چاہتا ہوں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے ٹھاکر جی۔ جاگیر کا کیا ہو گا۔'' جمال دین نے اچنبھے سے کہا۔

''ہو سکتا ہے۔ اسی لیے تو میں تمھارے پاس آیا ہوں۔''

جمال دین کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ٹھاکر کو تکتا رہا۔

''اب یہ سب کچھ تم سنبھالو گے جمال دین۔''

یہ جمال دین کے لیے دھماکہ تھا۔ وہ اضطراری طور پر موڑھے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مم...... میں...... میں سنبھالوں گا!'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ آدھی زمین جائیداد تمہاری ہے اور میں برسوں سے تمھارے حصے کا کام بھی کر رہا ہوں۔ اب سمے آ گیا ہے کہ تم اپنا بوجھ اٹھاؤ۔ بلکہ میرے حصے کی ذمے داری بھی نبھاؤ۔''

جمال دین کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو جسم میں خون نہیں۔ ''ٹھاکر جی، آپ کے حکم پر میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن اس کام کی تو مجھ میں اہلیت ہی نہیں ہے۔ سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ ٹھاکر جی۔ یہ کام تو میرے بس کا نہیں۔'' وہ بری طرح گڑگڑا رہا تھا۔

''آدمی کوشش کرے تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

''ٹھاکر جی، اللہ نے ہر آدمی کو ہر کام کے لیے پیدا نہیں کیا۔'' جمال دین رونے لگا۔ ''میں کسان ہوں۔ زمین میں بس ہل چلا سکتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں، سب کچھ ہم نے صرف آپ کی خاطر لیا۔ آپ کا حکم نہیں ٹال سکتے تھے۔ آپ ہر سال ہمیں حصہ لا کر دیتے رہے۔ ہم سنبھال کر رکھتے رہے۔ ہم آپ کے کہنے پر بھی زمین دار نہیں بن سکے۔ صرف اس لیے کہ یہ ہمارے بس کا کام نہیں۔ پر حکم آپ کا تھا، اس لیے ٹال نہیں سکے۔ صرف آپ کی خوشی کی خاطر میں نے یہ سب قبول کیا۔ انکار کرتا تو گستاخی ہوتی۔ مگر کیا معلوم تھا کہ ایک دن آئے گا، جب مجھے آپ کو انکار کرنا پڑے گا۔ آج تو لگتا ہے، زندگی اکارت ہو گئی۔ کاش...... کاش ٹھاکر جی...... کاش میں آپ کے کام آ سکتا۔ پر مجھے تو کسی پر حکم چلانا آتا ہی نہیں۔ اور آپ کا کام تو بادشاہ کا کام ہے ٹھاکر جی۔''

جمال دین اب ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ ٹھاکر تڑپ کر اٹھا اور اسے گلے سے لگالیا۔ ''چلو جمال دین، تم چنتا نہ کرو۔'' اس نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''جب تک میں موجود ہوں، سنبھال لوں گا۔ لیکن میرے بعد کیا ہوگا۔''

''ایسی باتیں نہ کریں ویر جی۔'' حمیدہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اللہ آپ کو بہت عمر دے گا۔''

''پھر بھی، جانا تو ہر منش کو ہے۔ کون جانے، کب کس کا بلاوا آجائے۔''

''تب چھوٹے ٹھاکر ہوں گے نا۔''

''ٹھیک ہے بہنا۔ جو بھاگیہ میں ہے، سو تو ہوگا۔'' ٹھاکر نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

❁.....❁.....❁

اب ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو ایک ہی پریشانی تھی۔ اس کا بیٹا داخلے کا ٹیسٹ پاس کرے گا یا نہیں۔ اس کا داخلہ ہو بھی سکے گا۔ اس نے اس سلسلے میں کانتی پرشاد جی سے بات کی۔ ''ماسٹر جی۔ اوتار سنگھ ٹیسٹ پاس کرلے گا؟'' اس کے لہجے میں شک تھا۔

''کیسی بات کرتے ہیں ٹھاکر جی۔'' ماسٹر جی گویا برا مان کر بولے۔ ''چھوٹے ٹھاکر کو ابھی میٹرک کا امتحان دلوائیں تو وہ ٹاپ کریں گے۔ آپ اس ٹیسٹ کی بات کررہے ہیں۔ آپ نے اپنے بیٹے کی لیاقت دیکھی ہی نہیں۔''

ٹھاکر کو فخر کا احساس ہوا۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ ماسٹر جی مبالغے سے کام لے رہے ہوں۔ ''آپ کو پکا یقین ہے ماسٹر جی؟''

''اگر اس کے خلاف ہوا تو میں پڑھانا چھوڑ دوں گا۔''

اب ٹھاکر مطمئن ہوگیا۔ اسے بیٹے سے اپنی بے خبری پر افسوس ہونے لگا۔ وہ بس اتنا جانتا تھا کہ اس کا بیٹا سوال بہت کرتا ہے۔

''لیکن ایک مسئلہ ہے ٹھاکر جی۔'' کانتی پرشاد نے اچانک کہا۔

ٹھاکر کا دل بری طرح دھڑکا۔ اب وہ مطمئن ہوا ہے تو ماسٹر جی نے جانے کون سا مسئلہ کھڑا کردیا ہے۔ ''مجھے صرف اس بات کی فکر ہے کہ میرے بیٹے کو اسکول میں داخلہ مل جائے گا۔''

''اس طرف سے تو بے فکر رہیں۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ وصال دین وہ ٹیسٹ پاس کرسکتا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ٹھاکر جی، چھوٹے ٹھاکر کے برعکس وصال دین کو پڑھائی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ تو بس چھوٹے ٹھاکر کا سایہ ہے۔ ان کی محبت میں ان کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے اور مارے باندھے پڑھ بھی لیتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ اس ٹیسٹ میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔''

''یہ تو الجھن کی بات ہے۔'' ٹھاکر نے تفکر آمیز لہجے میں کہا۔ ''اوتار سنگھ بھی اس کے

بغیر نہیں رہ سکتا۔ اچھا ماسٹر جی، کچھ اُپائے ہے اس کا؟''

کانتی پرشاد کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر بولے۔ ''میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔''

''بہت بڑا فرق ہے دونوں کی قابلیت میں؟'' ٹھاکر نے پوچھا۔

''میں نے عرض کیا نا کہ چھوٹے ٹھاکر ابھی میٹرک کا امتحان دیں تو ٹاپ کرلیں جبکہ وصال دین کی قابلیت بمشکل پانچویں تک کی ہے۔''

ٹھاکر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''تب تو مسئلہ حل ہوسکتا ہے ماسٹر جی۔''

''جی...... میں سمجھا نہیں۔''

''آپ مجھے ایک بات بتائیں۔ وصال دین کو چھٹی جماعت کے ٹیسٹ میں بٹھایا جائے تو وہ کامیاب ہوسکتا ہے؟''

کانتی پرشاد نے پھر کچھ دیر سوچا۔ ''جی...... میرے خیال میں یہ ممکن ہے۔''

''بس تو ٹھیک ہے۔ ہم اوتار سنگھ کو آٹھویں میں اور وصال دین کو چھٹی میں داخلہ دلائیں گے۔'' ٹھاکر نے سکون کی سانس لی۔ ''ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔ آپ اتنے دن میں وصال دین کو کم از کم اس حد تک پکا کردیں۔''

''میں کوشش کروں گا ٹھاکر جی۔'' کانتی پرشاد نے کہا۔ مگر ان کے لہجے میں یقین کی کمی تھی۔

اسی شام کانتی پرشاد نے کہا۔ ''وصال دین، ایک ہفتہ ہے۔ اس میں تیاری کرلو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم پڑھنے میں پوری دلچسپی نہیں لیتے ہو۔ تمھیں پتا ہے، اگر تمھیں داخلہ نہیں ملا تو تمہارا ایک بہت بڑا نقصان ہوجائے گا۔''

وصال دین نے کچھ کہا نہیں۔ بس مستفسرانہ نظروں سے انھیں دیکھتا رہا۔

''تم گاؤں واپس آجاؤ گے اور پھر برسوں چھوٹے ٹھاکر سے نہیں مل سکو گے۔''

یہ سن کر صرف وصال دین ہی نہیں دہلا، اوتار سنگھ کا چہرہ بھی فق ہوگیا۔ اس نے وصال دین سے کہا۔ ''ویر جی، کچھ کرو۔ میں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

وصال دین خود بھی یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ خوف بہت بڑا محرک ہوتا ہے۔ اس دن سے وصال دین کی پڑھائی کو پر لگ گئے۔

❁.....❁.....❁

اس رات کسی کو نیند نہیں آرہی تھی۔ حویلی میں ٹھاکر اور اوتار سنگھ کروٹیں بدل رہے تھے تو گاؤں کے اس سرے پر جمال دین، حمیدہ اور وصال دین بھی نیند سے محروم تھے۔ سونے کا ڈھونگ نبھانا ناممکن ہوگیا تو جمال دین اٹھ بیٹھا۔ ''حمیدہ...... تم جاگ رہی ہو نا؟'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

"ہاں جی۔ اب تو بس اللہ کی مہربانی ہوگی، تبھی نیند آئے گی۔" حمیدہ بھی اٹھ بیٹھی۔

"ہاں۔ آج تو میں سو ہی نہیں سکتا۔"

"مجھے تو لگتا ہے، اب مجھے کبھی گہری نیند نہیں آئے گی۔" حمیدہ نے آہ بھر کے کہا۔ پھر رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "کیا ضروری تھا کہ ہمارا بیٹا بھی پڑھنے کے لیے اتنی دور جاتا؟"

"یہ تو نصیب کی بات ہے۔ جانا ہے تو جانا ہے۔ اللہ صبر دیتا ہے۔" جمال دین نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "میری نیند تو کسی اور ہی خیال سے اُڑی ہے۔"

حمیدہ چونکی۔ "کیا بات ہے؟"

"ہمارا گھر اس گاؤں میں اکیلا مسلمان گھر ہے۔" جمال دین کے لہجے میں فکر مندی تھی۔ "مجھے ہمیشہ ڈر لگتا تھا کہ میرا بیٹا اچھا مسلمان نہیں بنا تو میں قیامت کے دن اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اسی لیے میں نے خود اسے قرآن پڑھایا۔ کم عمری میں نماز سکھائی۔ ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ نماز میں کوتاہی نہیں کرتا۔ مگر اب وہ دور جا رہا ہے تو ڈر لگتا ہے۔ قیامت کے دن شرمندگی کا سامان نہ ہو جائے۔"

"کیوں پریشان ہوتے ہو جی۔ اب وہ بچہ تو نہیں ہے۔" حمیدہ نے اسے دلاسہ دیا۔ "ہم ابھی اسے تاکید کریں گے تو وہ انشاء اللہ نہ کبھی نماز چھوڑے گا، نہ قرآن پڑھنا۔"

"یہ بات اتنی سادہ نہیں ہے حمیدہ۔ چھوٹا ٹھاکر وصال دین کے بہت قریب ہے۔ وہ اسے نماز، قرآن پڑھتے دیکھے گا تو پوچھے گا۔ وہ سوالات بہت کرتا ہے نا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ وہ متاثر ہو۔ یوں مجھے ٹھاکر جی کے سامنے شرمندگی ہوگی۔ جان بھی جا سکتی ہے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں اسے سمجھا دوں گی۔ آؤ میرے ساتھ۔"

وصال دین صحن میں سو رہا تھا۔ وہ دونوں وہاں چلے آئے۔ حمیدہ نے نرمی سے اسے ہلایا۔ "اٹھ بیٹے۔ کچھ بات کرنی ہے تجھ سے۔"

وصال دین بھی سو نہیں رہا تھا۔ لیکن اس کی بے قراری ماں باپ جتنی نہیں تھی۔ اس کے لیے معاملہ انیس بیس کا تھا۔ ایک طرف ماں باپ تھے تو دوسری طرف اوتار سنگھ تھا، جس سے وہ سوائے سونے کے وقت کے کبھی دور نہیں ہوتا تھا۔ جو اس کا واحد ہم جولی، واحد دوست تھا۔ اور وہ ذہنی طور پر تیار بھی تھا کیونکہ اس پہلو پر غور کرتا رہا تھا۔ اگر اوتار سنگھ سے دور رہنا مشکل نہ ہوتا تو اس مسئلے کا حل اس کے لیے بہت آسان تھا۔ وہ پڑھائی میں دلچسپی ہی نہ لیتا۔ یوں اسے اسکول میں داخلہ بھی نہ ملتا اور وہ ماں باپ سے دور بھی نہ ہوتا۔ لیکن اس نے اس ایک ہفتے میں پڑھائی میں بہت زیادہ محنت کی تھی۔ صرف اوتار سنگھ کی محبت میں۔ اور یہی نہیں، اسے ابا کی سمجھائی ہوئی بات اچھی طرح یاد تھی۔ احسان کا رشتہ...... اسے تو چھوٹے ٹھاکر سے غلام جیسی محبت کرنی ہے۔ کبھی انکار نہیں کرنا کسی بات سے۔ تو وہ اسے اکیلا کیسے چھوڑ دے۔

مگر اس کے باوجود ماں باپ سے دور ہونا آسان نہیں تھا۔ اس کا دل بہت بوجھل تھا۔ وہ اداس تھا۔ اس جدائی کا خیال اسے سونے نہیں دے رہا تھا۔ ماں نے ہلایا تو وہ اٹھ بیٹھا۔ "کیا بات ہے اماں۔"

"کچھ ضروری باتیں سمجھانی ہیں تجھے۔"

"بولو اماں۔"

"دیکھ۔ اب تو جائے گا۔ ہم سے، گاؤں سے دور، چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ رہے گا۔ اب تیرے ابا پریشان ہو رہے ہیں کہ کہیں تو قرآن سے، نماز سے دور نہ ہو جائے۔" حمیدہ نے کہا۔

وصال دین نے جمال دین کو دیکھا۔ "نہیں ابا۔ انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔" اس نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "میں اس کا یہاں سے زیادہ خیال وہاں رکھوں گا۔"

تب جمال دین نے زبان کھولی۔ "تو نماز کہاں پڑھے گا۔ قرآن کہاں پڑھے گا؟"

وصال دین نے حیرت سے باپ کو دیکھا۔ "کیا مطلب ابا۔ جہاں رہوں گا، وہیں پڑھوں گا۔"

"چھوٹے ٹھاکر کے سامنے؟"

"تو اور کیا۔ اس میں کوئی حرج ہے ابا؟"

"ہاں، حرج ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تو چھوٹے ٹھاکر کے سامنے یہ سب کچھ کرے۔" جمال دین نے سخت لہجے میں کہا۔ "چھوٹا ٹھاکر سوال بہت کرتا ہے۔ تجھے نماز پڑھتے، تلاوت کرتے دیکھے گا تو تجھ سے بھی سوال کرے گا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تو اس سے اپنے دین کی کوئی بات کرے۔ اس لیے کہ یہ بات ٹھاکر جی کو اچھی نہیں لگے گی۔ ہمیں خیال رکھنا ہے کہ انھیں ہم سے کوئی شکایت نہ ہو۔ ان کے احسان ہیں ہم پر۔"

"تو کوئی بات نہیں ابا۔ میں اکیلے میں پڑھ لیا کروں گا۔" وصال دین نے سادگی سے کہا۔ "ٹھاکر جی نے ہمارے رہنے کے لیے بڑے مکان کا بندوبست کیا ہے۔ مجھے وہاں الگ کمرا ملے گا۔ چھوٹے ٹھاکر کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ اور میں نماز بھی پڑھ لیا کروں گا اور قرآن بھی۔"

"تب تو ٹھیک ہے۔" جمال دین نے پہلی بار سکون کی سانس لی۔ "لیکن وعدہ کر کہ تو نماز کبھی قضا نہیں کرے گا اور ہر روز قرآن بھی پڑھے گا۔"

"تم پریشان نہ ہو ابا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

جمال دین نے محبت سے اسے لپٹا لیا۔ "بس بیٹا، مجھے اللہ کے سامنے شرمندہ نہ کرانا۔" اس نے بیٹے کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

●....●....●

وہ دہلی گئے تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ اور جمال دین بھی ان کے ساتھ تھے۔ کانتی پرشاد کی توقع کے عین مطابق اوتار سنگھ نے داخلے کا ٹیسٹ بڑی شان سے پاس کیا۔ مگر اصل کارنامہ یہ تھا کہ وصال دین کو بھی چھٹی جماعت میں داخلہ مل گیا۔

ٹھاکر نے ان لوگوں کے لیے جامع مسجد کے علاقے میں مکان کا بندوبست کیا تھا۔ وہ اوپری منزل کا چھ کمروں کا مکان تھا۔ اوپر ایک کوٹھا تھا، جس کے ساتھ بڑی ساری چھت تھی۔ وہاں پھولوں کے پودے رکھے تھے۔ چنبیلی کی بیل دیوار پر چڑھی تھی۔ مکان صاف ستھرا اور بہت اچھا تھا۔

جمال دین کو اطمینان ہو گیا کہ اس کے بیٹے کو تنہائی میسر ہے۔ وہ ٹھاکر کے ساتھ گاؤں واپس گیا تو بہت مطمئن تھا۔

اس مکان میں کانتی پرشاد، اوتار سنگھ اور وصال دین کے علاوہ دو افراد اور تھے، جنھیں ٹھاکر پرتاپ سنگھ گاؤں سے لایا تھا۔ کھانا پکانے کے لیے رنجنا تھی اور باہر کے کام کرنے اور سودا سلف لانے کے لیے رگھو تھا۔

چند ہی دنوں میں زندگی کے نئے معمولات بن گئے۔

اوتار سنگھ اور وصال دین کے لیے تو دہلی ایک جہانِ حیرت تھا۔ وصال دین نے تو شہر ہی پہلی بار دیکھا تھا۔ جبکہ اوتار سنگھ تو ایک مہینے گھوما پھرا تھا۔ چند روز ممبئی میں بھی رہا تھا۔ لیکن بہرحال وہ گاؤں میں زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ اب دہلی شہر میں رہا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

دہلی بڑا بارونق شہر تھا...... خاص طور پر شام کے وقت۔ یہاں اوتار سنگھ کو گھومنے پھرنے کا شوق ہو گیا۔ اس نے ماسٹر جی سے بات کر کے ایسا معمول بنایا کہ شام کے وقت وہ آزاد ہوتا۔ اسکول سے واپسی پر وہ کھانا کھاتے، ایک گھنٹا آرام کرتے اور پھر ماسٹر جی سے پڑھنے بیٹھ جاتے۔ شام کو وہ سیر کے لیے نکلتے۔ واپس آ کر رات کا کھانا کھاتے اور سو جاتے۔ صبح وہ بہت سویرے اٹھتے اور ماسٹر جی سے پڑھتے۔ اس کے بعد اسکول جاتے۔

ایک سال میں وہ دہلی کے چپے چپے سے واقف ہو گئے۔ اوتار سنگھ نے آٹھویں پاس کر لی اور وصال دین نے چھٹی۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ گاؤں واپس گئے۔ اوتار سنگھ اب 14 سال کا ہو چکا تھا۔

شہر میں ایک سال گزارنے کے بعد گاؤں انھیں پہلے سے بھی اچھا لگا۔ وہاں شور و غل نہیں، سکون تھا۔ وہاں آ کر اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ دہلی نے اسے کتنا تبدیل کر دیا ہے۔ اس ایک سال میں اس کا تجسس صرف مادی اور ظاہری چیزوں تک محدود ہو گیا تھا۔ اس نے سوچنا اور غور کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس کے ذہن میں بہت سے سوال تھے، جن کے جواب اسے کھوجنے تھے۔ لیکن دہلی میں یہ عمل رک گیا تھا۔ اسے افسوس ہونے لگا۔ تنہائی...... اور تنہائی میں بیٹھ کر سوچنا

اسے کتنا اچھا لگتا تھا۔ دہلی میں اس تنہائی کو اس نے خود چھوڑ دیا تھا۔

گاؤں میں اس نے پھر سے سوچنا شروع کر دیا۔ تبھی اسے احساس ہوا کہ دہلی میں اس نے گھومنے پھرنے، سیر کرنے میں جو وقت صرف کیا، وہ ضائع نہیں ہوا۔ اس سے تو اس کے مشاہدات میں زبردست اضافہ ہوا تھا اور وہ ہمیشہ مشاہدات ہی کی بنیاد پر سوچتا آیا تھا۔ البتہ ایک کمی ضرور تھی۔ ماسٹر جی سے اس کا تعلق صرف پڑھائی تک محدود ہو گیا تھا۔ ورنہ پہلے وہ ان سے ہر طرح کی باتیں کرتا تھا۔

گاؤں میں اس کی چھٹیاں صرف اپنے نظریات کو تازہ کرنے میں گزر گئیں۔ بہرحال ایک سال کا ٹوٹا ہوا رابطہ پھر سے جڑ گیا۔

❁.....❁.....❁

دہلی میں ان کا دوسرا سال بالکل مختلف تھا!

شام کے وقت وہ گھومنے کے لیے ضرور نکلتے۔ کبھی چاندنی چوک کی طرف اور کبھی جمنا کے کنارے۔ مگر اوتار سنگھ اکھڑا اکھڑا رہتا تھا۔ اور ذرا ہی دیر کے بعد گھر واپس پہنچنے کی بات کرتا تھا۔ گھر پہنچنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتا تھا۔

وصال دین نے باپ کی بات کا پوری طرح خیال رکھا تھا۔ وہ تنہائی میں ہی نماز پڑھتا اور تنہائی میں ہی قرآن۔ اس کے نتیجے میں نماز میں بے قاعدگی بھی ہوتی تھی۔

اسکول کا چوکی دار مسلمان تھا۔ ایک دن اس نے اسے ٹوک دیا۔ ”تم تو مسلمان ہو۔ نماز کیوں نہیں پڑھتے؟“

وصال دین کے لیے تو وہ گالی تھی۔ اسے بہت برا لگا۔ تاہم اس نے تحمل سے کہا۔ ”نماز تو میں پڑھتا ہوں۔“

احمد علی نے کہا۔ ”میں نے تو تمھیں کبھی دیکھا نہیں نماز پڑھتے۔“

”تو نماز کیا دکھا کر پڑھتے ہیں؟“ وصال دین نے چڑ کر کہا۔

”دکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر سب کو پتا چل جاتا ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”بھئی تمہارا گھر بھی جامع مسجد کے قریب ہے۔ مسجد میں نماز پڑھو گے تو دوسروں سے ملو گے۔ انھیں پتا بھی چل جائے گا۔“ احمد علی بولا۔ ”لیکن میں نے تو تمھیں کبھی مسجد میں نہیں دیکھا۔“

اب وصال دین حیران تھا۔ ”میں مسجد کبھی گیا ہی نہیں۔“

”تو نماز کہاں پڑھتے ہو؟“ احمد علی نے حیرت سے پوچھا۔

”گھر میں پڑھتا ہوں۔“

"یہ تو بہت بری بات ہے۔ اتنے قریب مسجد ہے اور تم وہاں نہیں جاتے۔ پتا ہے، جماعت سے نماز پڑھنے کا اجر 27 گنا زیادہ ہے۔"

وصال دین کو یہ سب معلوم ہی نہیں تھا۔ باپ نے کبھی بتایا ہی نہیں۔ اس نے احمد علی کو یہ سب بتایا۔ احمد علی نے تاسف سے سر ہلایا۔ "وہ تو مجبوری تھی۔ تمہارا باپ بڑا آدمی ہے کہ اس نے اس حال میں بھی تم کو یہ سب کچھ سکھایا۔ مگر یہاں اور بات ہے۔ مسلمان بہت ہیں۔ مسجدیں بھی ہیں۔ اذان ہوتی ہے جو کہ بلاوا ہے۔ چلو، میں تمھیں سکھاؤں گا۔ آج ظہر کے وقت مجھے مسجد کے باہر ملنا۔"

اس روز وصال دین ظہر پڑھنے احمد علی کے ساتھ گیا۔ اس کا دل خوش ہو گیا۔ یہ تو بہت آسان تھا۔ مسجد گئے اور نماز پڑھ لی۔ مسجد میں قرآن بھی تھا۔ وہیں بیٹھ کر پڑھ لیا۔ گھر میں تو اوتار سنگھ کی وجہ سے نماز کبھی قضا بھی ہو جاتی تھی۔

اس کی مشکل آسان ہو گئی۔ بس اسے یہ فکر رہتی تھی کہ وہ چپکے سے نماز پڑھنے کے لیے نکلتا تھا۔ اگر اس دوران اوتار سنگھ اس کی غیر حاضری کو محسوس کر لے اور اس سے پوچھے کہ وہ کہاں تھا، تو اسے جھوٹ بولنا پڑے گا۔ لیکن اس کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ اوتار سنگھ تو خود میں گم رہنے لگا تھا۔

اوتار سنگھ نے سلسلہ وہیں سے جوڑا، جہاں چھوڑا تھا۔ یہ تو وہ سمجھ چکا تھا کہ کثرت میں انتشار ہے اور وحدت میں ارتکاز۔ اس نے بہت سارے دیوتاؤں کے وجود سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے نزدیک یہ یقین تھا کہ کائنات کا نظام ترتیب دے کر، اسے قائم کرنے والا کوئی ایک ہے...... صرف ایک۔ اس کی کچھ صفات بھی وہ جان چکا تھا۔ ورنہ یہ سب کچھ اتنا منظم نہ ہوتا۔

وہ ایک شہر کی، ایک ملک کی مثال پر غور کرتا۔ تاریخ کے اوراق گواہی دیتے تھے کہ بادشاہ قانون بناتا تھا۔ اس پر عمل درآمد کے لیے کارندے ہوتے تھے۔ قانون پر کبھی پوری طرح عمل درآمد نہیں ہوتا تھا۔ کارندے کبھی رشوت کی خاطر، کبھی کسی بڑے آدمی کی سفارش پر اور کبھی اپنے کسی عزیز رشتے دار کی خاطر لوگوں کو قانون سے مستثنیٰ کرتے رہتے تھے۔ اب ظاہر ہے، بادشاہ کیسا ہی عادل و منصف ہو، اُن کے پل پل کی اور اپنی مملکت کے چپے چپے کی خبر تو نہیں رکھ سکتا تھا۔ اور یہ خرابی طاقت کے ارتکاز اور وحدتِ اقتدار کے باوجود تھی۔

یہاں سے سوچ کے اور دروازے کھلے۔ کائنات بہت بڑی تھی۔ آدمی کو تو اس کے بہت چھوٹے سے حصے کا علم تھا۔ تو جو کائنات کا نظام چلا رہا تھا، اس کے تو کارندے اتنے ہوں گے کہ ان کا شمار ہی نہیں ہوگا۔ تو پھر کہیں کوئی بدنظمی کیوں نہیں ہوتی؟ کیوں؟

اس جواب کا سراغ اسے اپنے دکھ سے ملا۔ اسے یاد تھا۔ جب ماں کی موت کا غم وہ بھولا تھا، تب اس نے سمجھا تھا کہ اوپر والا اپنی مخلوق کی، ہر منش کی الگ الگ خبر رکھتا ہے۔ وہ ان سے واقف ہے۔ ان کی ہر کمزوری، ہر خوبی سے آگاہ ہے۔

تو اس کا مطلب تھا کہ وہ پوری کائنات پر، ہر چیز پر نظر رکھتا ہے۔ اپنے کارندوں پر بھی، جن کے سپرد کائنات کا نظام ہے اور اس کے کارندے یہ بات جانتے بھی ہیں۔ تبھی تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوتی۔

تو یہ طے ہو گیا کہ وہ ایسا دیکھنے والا ہے کہ ہر پل ہر جگہ کا علم رکھتا ہے۔ بیک وقت سب پر نظر رکھتا ہے۔ اس کے دیکھنے، اس کے سننے اور اس کے جاننے کی کوئی حد نہیں۔ اس سے کچھ چھپا نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اوتار سنگھ کو عجیب خیال آیا۔ اس کا مطلب ہے کہ اوپر والے کی کوئی ذاتی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ نہ کھانے پینے کی، نہ آرام کی، نہ سونے کی، اور اسے تھکن بھی نہیں ہوتی ہوگی۔ اور اس کا دیکھنا آنکھ کا، منش کا دیکھنا نہیں۔ منش کی نظر تو محدود ہے۔ ایک حد سے آگے نہیں جاتی۔ ایسے ہی اس کا سننا کان کا سننا نہیں۔ فاصلہ زیادہ ہو تو منش تک آواز نہیں پہنچتی۔ اس کا دیکھنا، اس کا سننا اور اس کا جاننا لامحدود ہے۔ آدمی صرف ایک طرف دیکھتا ہے جبکہ وہ ہر طرف دیکھتا ہے۔ وہ زمین کے اندر تک دیکھتا ہے۔ تبھی تو پوری کائنات سے باخبر رہتا ہے۔

چند روز بعد اوتار سنگھ نے ایک اور زاویے سے سوچنا شروع کیا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ سائنس اس اوپر والے کی سوچ ہو۔ وہی اصل سائنس دان ہو۔ اس صورت میں اسے بہت کارندوں کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ زمین پر چلنے والے سب جان دار، چاند ستارے، سورج...... یہ پورا نظام...... یہ سب اس کی ایجاد ہے۔ یہ سب کچھ جیسے چابی سے چل رہا ہے۔ سورج، چاند، ستارے سب اپنے وقت پر نکلتے ہیں۔ اپنے طے شدہ راستے پر چلتے ہیں۔ اپنے وقت پر غروب ہوتے ہیں۔ ایک سیکنڈ کا بھی فرق نہیں پڑتا۔ تو یہ کون سی بڑی بات ہے۔ منش نے کتنی چیزیں ایسی بنائی ہیں۔ چابی سے چلنے والے کھلونے، جب تک چابی ختم نہ ہو وہ چلتے رہتے ہیں۔ اور گھڑی...... جس وقت کا الارم لگا ہو، اس وقت گھنٹی بجنے لگتی ہے۔ اگر منش یہ سب کچھ بنا سکتا ہے تو وہ کیا کچھ بنائے گا، جس نے خود منش کو بنایا ہے۔

مہینوں وہ اس پر سوچتا رہا۔ اردگرد...... مظاہر فطرت کو دیکھتا تو وہ اس تھیوری کا اور قائل ہو جاتا۔ اسے اس بات پر یقین ہو گیا کہ انسان کی سائنس کا آغاز ہی مظاہر فطرت کے بارے میں سوچنے سے ہوا ہے۔ اور اشارے اسے اپنے وجود کے اندر سے ملے ہوں گے۔

اس آخری خیال کی اس کے پاس کوئی وضاحت نہیں تھی۔ مگر یہ خیال خود ایک وضاحت تھا۔ یہ خیال اسے کیوں آیا۔ سب کو تو یہ خیال نہیں آیا۔ ورنہ دنیا میں ماسٹر جی جیسے سائنس کے لوگ نہیں ہوتے۔ یہ خیال بھی اس کے وجود کے اندر سے ملنے والا اشارہ ہے۔ اسے سوچنے کی دعوت دے رہا ہے۔

وہ مظاہرِ فطرت پر سوچتا رہا۔ زندگی کی سب سے پہلی ضرورت...... بلکہ شرط ہوا تھی۔ اور وہ سب کے لیے تھی۔ اس پر کسی کی اجارہ داری نہیں تھی۔ اس پر کوئی قبضہ نہیں کر سکتا تھا۔

کوئی کسی کی ہوا نہیں روک سکتا تھا۔ کیوں؟ اس لیے کہ زندگی اوپر والے کا حکم تھا۔ اس نے اسے منقطع کرنے کا اختیار کسی کو نہیں دیا تھا۔

سائنس بتاتی ہے کہ انسان سانس کے ذریعے ہوا میں سے آکسیجن اندر لیتا ہے اور باہر کاربن ڈائی آکسائیڈ نکالتا ہے۔ ہوا ایک ایسا عنصر جو زمین کی فضا پر محیط ہے۔ ہوا مستقل طور پر گردش میں رہتی ہے۔ اس کے دباؤ میں کمی بیشی سے موسم پر اثر پڑتا ہے۔ اس کی ایک خاص مقدار ہے، جو گردش میں ہے۔

اب ایسے میں اربوں انسانوں کے سانس لینے کے نتیجے میں قدرتی طور پر ہوا کی ترکیب بری طرح بگڑتی۔ اربوں انسان ہر لمحے ہوا میں سے آکسیجن چوس کر کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں۔ اگر یہ معاملہ یونہی چلتا رہے تو آکسیجن ختم ہو جائے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ بہت بڑھ جائے۔ نتیجہ؟ انسانوں سمیت تمام جان دار ختم ہو جائیں۔

اس مقام پر پہنچ کر اوتار سنگھ اش اش کر اٹھا۔ اسے کہتے ہیں نظام...... ایک مکمل اور مربوط نظام۔ اس نظام کو قائم کرنے والا سب کچھ جانتا ہے۔ وہ وقت کے، صدیوں کے آر پار دیکھتا ہے۔ اسی لیے ہر مسئلے کا حل اس کے پاس ہوتا ہے۔ اس نے درخت، پودے، پھل پھول، ہر طرح کی نباتات سے دنیا کو آراستہ بھی کیا اور آکسیجن کا مسئلہ بھی حل کر دیا۔ کتنی سادہ اور آسان ترکیب تھی۔ مگر صرف ایک زبردست اور ہر علم پر حاوی ہستی کے لیے! نباتات کا سسٹم اس نے یہ رکھا کہ وہ جان داروں کے برعکس ہوا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کرتی ہیں اور آکسیجن خارج کرتی ہیں۔ لیجیے...... مسئلہ حل ہو گیا۔ ہوا میں آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کے تناسب میں معمولی سی...... بہت معمولی سی کمی بیشی تو ہو سکتی ہے۔ مگر ان کی مقدار میں بڑا فرق نہیں پڑ سکتا۔

اوتار سنگھ نے دیکھا کہ یہ سارا چکر کا معاملہ ہے۔ ایک چیز سے دوسری چیز بنتی ہے اور دوسری چیز سے پھر پہلی چیز۔ رات کے پیچھے دن لگا ہے اور دن کے پیچھے رات۔ اسے اماں کی بات یاد آئی۔ انھوں نے کہا تھا...... رات نہ ہوتی تو ہم آرام کیسے کرتے اور دن نہ ہوتا تو ہم کام کیسے کرتے۔ اماں پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ لیکن عقل مند تھیں۔ کیسی سادہ، مگر سچی بات کہی تھی انھوں نے۔

ہاں...... اب وہ اس بات سے اور باتیں سمجھ سکتا تھا۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ دن اور رات نہ ہوتے تو وقت کی پیمائش نہیں ہو سکتی تھی۔ دن رات نہ ہوتے تو کیلنڈر نہ ہوتا۔ یکسانیت ہوتی، پڑاؤ ہوتا، جو کہ زندگی کی نہیں، موت کی علامت ہے۔ زندگی کی رونق، اس کا لطف تو تغیر اور تبدل سے ہے۔

پھر موسم تھے۔ گرمی...... گرمی کے بعد سردی اور پھر گرمی۔ اور وہ بھی ایک دوسرے کے بعد ایک دم نہیں آتے تھے۔ ورنہ آدمی کے لیے ایک کے بعد دوسرے کو قبول کرنا آسان نہ ہوتا۔ گرمی کے بعد موسم میں ہلکی سی، بتدریج تبدیلی تاکہ آدمی کے لیے قبول کرنا آسان ہو جائے۔ وہ خزاں ہوتی تھی اور سردی کے بعد ہلکی سی بتدریج تبدیلی بہار تھی۔ یہ ایک سال میں وقت کے چار

ذائقے تھے۔ پھر اس میں بھی تنوع تھا۔ گرمی کی بارش اور سردی کی بارش۔ اوپر والا کتنا مہربان تھا۔ اس نے انسان کو اکتاہٹ کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے کتنا اہتمام کیا تھا۔ اوتار سنگھ نے باری باری تصور کیا کہ صرف ایک موسم میں جی رہا ہے۔ صرف تصور میں ہی اس پر مر جانے کی حد تک گھبراہٹ اور اکتاہٹ طاری ہو گئی۔

چکر کی...... سائیکل کی ایک اور بہت بڑی مثال پانی تھا۔ پانی کا سب سے بڑا ذخیرہ سمندر تھا۔ اتنا بڑا ذخیرہ کہ سمندر میں پانی کی مقدار کا اندازہ کرنا بھی ناممکن تھا۔ اس کی گہرائی بھی نامعلوم تھی۔ لیکن اس کا پانی بہت کھاری، بلکہ کڑوا تھا۔ کسی کام بھی نہیں آ سکتا تھا۔ نہ پینے کے، نہ گھریلو کام کاج کے اور نہ آب پاشی کے...... اس نے خود چکھ کر دیکھا تھا۔

کام کا پانی دریا، جھیل، ندی اور چشموں کی شکل میں تھا۔ یہ سب چیزیں آبادی کے، بستیوں کے درمیان بہتی تھیں۔ ان کے پانی سے انسانوں کی مختلف ضرورتیں پوری ہوتی تھیں۔ پانی ایک ایسی بنیادی ضرورت تھا، جس کے بغیر زندگی ناممکن تھی۔ مگر پانی کا استعمال بہت زیادہ تھا جبکہ ذرائع بہت محدود تھے۔ یہاں اوپر والے سائنس دان کا بنایا ہوا ایک اور عظیم نظام سامنے آتا تھا۔

سمندر پر دھوپ پڑتی تو عمل تبخیر ہوتا۔ پانی بخارات میں تبدیل ہوتا۔ ہلکے ہونے کی وجہ سے بخارات اوپر اٹھتے اور بادلوں کی شکل اختیار کرتے۔ پھر پانی کو اٹھائے ہوئے یہ بادل ہوا کے دوش پر سفر کرتے اور ان کے پاس میٹھا اور صاف پانی ہوتا کیونکہ نمک اور دیگر کثافتیں عمل تبخیر کے نتیجے میں ساحل پر ہی رہ گئی ہوتی تھیں۔ یوں بارش کے ذریعے یہ صاف ستھرا میٹھا پانی انسانوں تک پہنچتا۔ یہ گویا ایک عظیم فلٹر پلانٹ تھا۔ اور اتنا عظیم منصوبہ کوئی زبردست اور ذی علم ہستی ہی بنا سکتی تھی۔

پھر اوتار سنگھ نے ارتقائے انسان پر غور کرنا شروع کیا۔ یہ تو اس نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا کہ اتفاق کوئی چیز نہیں۔ جو آدمی کی سمجھ میں نہ آئے، جس کی کوئی ظاہری وجہ نظر نہ آئے، وہ اسے اتفاق قرار دیتا ہے...... صرف اپنی کم علمی چھپانے کے لیے۔ انسان کی ترقی ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ بہت محدود علم رکھتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ بے علم تھا۔ پھر بتدریج اسے علم حاصل ہوتا گیا۔ مگر اب اتنی ترقی کے باوجود وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ سب کچھ جان چکا ہے اور وہ یہ دعویٰ کبھی نہیں کر سکے گا۔

سوال یہ تھا کہ انسان نے علم کیسے حاصل کیا۔ انسانی ارتقاء کی تاریخ گواہی دیتی تھی کہ انسان کے کسب علم کی بنیاد مشاہدے اور اتفاق پر ہے۔ ہمیشہ انھی کی وجہ سے اسے کوئی خیال سوجھا۔ پھر اس نے اسے تجربات کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کی تصدیق کی اور اسے دوسروں کی طرف بڑھایا۔ اب ان میں سے اتفاق کو اوتار سنگھ مانتا ہی نہیں تھا۔ اس کے نزدیک اتفاق کائنات کا نظام قائم کرنے اور چلانے والے کی منصوبہ بندی تھی، جو نہ دکھائی دیتی تھی اور نہ ہی سمجھ میں آتی تھی۔

اتفاق کو نہ ماننے کی معقول وجہ تھی اس کے پاس۔ بچپن سے اس کے ساتھ ایسا ہوتا تھا...... اور اکثر ہوتا تھا۔ اس کے دل میں بیٹھے بیٹھے خیال آتا کہ راجو آئی ہے۔ راجو سے اسے بڑی اُنسیت تھی۔ اگلے ہی لمحے بند دروازہ کھلتا اور راجو نمودار ہوتی۔ ایسا بہت سے لوگوں کے معاملے میں ہوا۔ بارہا اس نے اعلان کر دیا۔ پھر کسی نے پوچھا...... تمھیں کیسے معلوم ہوا۔ ’’پتا نہیں۔ بس مجھے خیال آیا تھا۔‘‘ وہ جواب دیتا۔

پھر اس نے خود لوگوں سے پوچھنا شروع کیا کہ اسے کیسے معلوم ہو جاتا ہے۔ سب اس پر متفق تھے کہ یہ اتفاق ہے، جو اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ تقریباً سبھی کے ساتھ ہوتا تھا۔ کسی کے ساتھ کم اور کسی کے ساتھ زیادہ۔

اب اوتار سنگھ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی۔ اتفاق ایک بار ہو جائے، دو بار ہو جائے۔ بار بار ہو تو اسے اتفاق نہیں کہتے۔ اور پھر اس کا اندازہ ایک بار بھی غلط نہیں ہوا تھا۔ اس نے ماسٹر جی سے اس پر بحث کی تھی۔ مگر وہ بس اتفاق ہے، کہہ کر بات ختم کر دیتے تھے۔

پھر ایک دن وہ اماں اور ویر جی کے پاس ان کے گھر میں بیٹھا تھا۔ اچانک اس کے منہ سے نکلا۔ ’’اماں، چاچا جی آ رہے ہیں۔ ویر جی، دروازہ کھولو۔‘‘

حمیدہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ’’نہیں بیٹا، ابھی ان کے آنے کا وقت نہیں ہوا ہے۔‘‘

’’نہیں اماں، چاچا جی آ رہے ہیں۔‘‘

حمیدہ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ’’تمھارے کان بج رہے ہیں بیٹا۔‘‘

مگر اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ وصال دین نے دروازہ کھولا۔ جمال دین اندر آ گیا۔

حمیدہ اٹھ کر اس کی طرف لپکی۔ ’’کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟‘‘

’’کچھ نہیں۔‘‘ صبح ہلکا سا بخار تھا۔ اب تیز ہو گیا۔ میں وید جی سے دوا لیتا ہوا آیا ہوں۔ انھوں نے کہا ہے کہ آرام کروں۔‘‘

جمال دین اندر کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

حمیدہ اوتار سنگھ کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ ’’تمھیں کیسے پتا چل گیا تھا بیٹے؟‘‘ اس نے اس سے پوچھا۔

’’پتا نہیں اماں۔ بس مجھے معلوم ہو جاتا ہے خود بخود۔‘‘

’’قدموں کی چاپ سنائی دی تھی؟‘‘

’’نہیں اماں۔ بس میرے دل میں خیال آیا تھا اچانک۔‘‘ اوتار سنگھ نے کہا۔

’’پہلے بھی ایسا ہوا ہے کبھی؟‘‘ حمیدہ تفتیش کرتی رہی۔

’’ہوتا رہتا ہے اماں۔‘‘ اوتار سنگھ نے بے پروائی سے کہا۔ ’’کوئی نہیں بتاتا کہ ایسا کیوں

ہوتا ہے۔ سب کہتے ہیں، یہ اتفاق ہے۔‘‘

حمیدہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اسے کیا کیا کچھ یاد آ گیا۔ ننھا سا اوتار سنگھ، جو بھوکا تھا۔ مگر ماں کی چھاتیوں سے ابلتا ہوا دودھ قبول نہیں کر رہا تھا۔ اور اس نے حمیدہ کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ جیسے قسم کھائی ہوئی ہو کہ دودھ پیے گا تو بس اس کا پیے گا۔ اور اس نے اپنی ضد پوری کر کے چھوڑی۔ ہاں، اس کے بعد ماں کا دودھ بھی قبول کر لیا۔

تو وہ شروع ہی سے غیر معمولی بچہ تھا۔ ورنہ کون سوچ سکتا ہے کہ راجپوت کا بچہ مسلمان عورت کا دودھ پیے۔ اور اتنا سا نا سمجھ بچہ...... اور ضد ایسی سمجھ داری کی۔ اللہ کے بھید اللہ ہی جانے۔

’’تم ہی بتاؤ اماں، میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے؟‘‘ اوتار سنگھ نے کہا۔

’’اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں بیٹے۔‘‘ حمیدہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ’’جو لوگ صاف ستھرے ہوں، صاف ستھرے رہیں، اللہ ان سے خوش ہوتا ہے اور ان کے بہت قریب ہوتا ہے اور جس سے وہ خوش ہوتا ہے اسے اپنے علم میں سے جتنا چاہے دے دیتا ہے۔ تم خوش نصیب ہو بیٹے۔ اللہ نے تمھیں اپنے علم میں سے کچھ دے دیا ہے۔‘‘

اس بیان سے اوتار سنگھ کے ذہن میں کئی سوال اٹھے۔ وہ ذہنی طور پر بہت مرتب بچہ تھا۔ اس نے ان سوالوں کو ترتیب میں رکھ کر بات شروع کی۔ ’’ہاں اماں، صاف ستھرا تو میں رہتا ہوں۔ یہ اتنی بڑی بات ہے کیا؟‘‘

’’تم صاف ستھرا رہنا کسے سمجھتے ہو؟‘‘ حمیدہ نے اس سے الٹا سوال کیا۔

’’میں تین دن بعد نہاتا ہوں۔ کپڑے میلے ہونے سے پہلے بدل کر صاف ستھرے کپڑے پہنتا ہوں۔‘‘

’’یہ تو ایک حصہ ہے صاف ستھرے پن کا۔‘‘ حمیدہ بولی۔ ’’اپنے جسم کو پاک صاف رکھنا، روز نہانا اور صاف کپڑے پہننا۔ لیکن آدمی کو اندر سے بھی صاف ستھرا رہنا چاہیے۔‘‘

’’اندر سے؟‘‘ اوتار سنگھ نے حیرت سے کہا۔

’’ہاں بیٹے۔ خیال اندر ہی تو پیدا ہوتا ہے......‘‘

یہ بات اوتار سنگھ کی سمجھ میں آ گئی۔ یہ سچ تھا۔ خیال تو دل میں آتا تھا......

’’دل میں...... اور اس کے لیے خون کا صاف ستھرا ہونا بھی ضروری ہے۔‘‘ حمیدہ نے اپنی بات پوری کی۔

’’تو دل کو اور خون کو کیسے صاف کیا جا سکتا ہے۔ دھویا تو نہیں جا سکتا انھیں۔‘‘ اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

’’خون غذا سے بنتا ہے۔ خون کی صفائی اس میں ہے کہ آدمی حلال کھائے۔ حرام نہ کھائے۔‘‘

"یہ حلال حرام کیا ہوتا ہے اماں؟"

"اپنی محنت کی کمائی حلال ہے۔ کسی کی چیز بغیر اجازت لینا، چوری، بے ایمانی، کوئی بھی ناجائز کام۔ یہ سب حرام ہے۔" حمیدہ نے کہا۔ "پھر اندر روح بھی ہوتی ہے......" "آتما؟" اوتار سنگھ نے جلدی سے کہا۔

"ہاں۔ آتما کو پاک صاف رکھنے کے لیے اچھے کام، نیکیاں ہوتی ہیں۔ آدمی سچ بولے، لوگوں کے کام آئے...... اور برے کاموں سے بچے۔ جھوٹ نہ بولے۔ کسی انسان کو تکلیف نہ پہنچائے۔ یوں آدمی صاف ستھرا ہوتا ہے۔ تو پھر اللہ اس سے خوش ہوتا ہے۔ اس کے قریب ہوتا ہے۔ اس پر مہربان ہوتا ہے اور اسے کچھ بھی دے دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے علم میں سے بھی کچھ دے دیتا ہے۔"

"علم میں سے کچھ؟" اوتار سنگھ نے دوسرا نکتہ اٹھایا۔

"ہاں، کچھ۔ بہت تھوڑا۔"

"تو اللہ کے پاس بہت علم ہے؟"

"بہت نہیں، سارا علم۔" حمیدہ کے لہجے میں خفگی تھی۔ "علم سارے کا سارا اللہ کا ہے اور جو وہ بہت تھوڑا علم دیتا ہے تو وہ بھی بندے کے لیے بہت زیادہ ہوتا ہے۔"

"تو اللہ مجھ سے خوش ہے؟ میرے بہت قریب ہے؟"

"ہاں بیٹے۔ بس تم ہمیشہ اچھے رہنا۔"

وہ ساری باتیں اوتار سنگھ کے دل میں اتر گئی تھیں۔ اس دن کے بعد وہ صفائی پر اور توجہ دینے لگا۔ وہ دن میں دو بار نہاتا۔ سچ بولتا تا کہ اللہ اس سے خوش رہے۔ مگر پھر کچھ عرصے کے بعد اماں نے اس سے اللہ کی باتیں کرنا چھوڑ دیا۔ بہرکیف اس کے ساتھ جب بھی ایسی کوئی بات ہوتی، وہ خوش ہوتا کہ اللہ اب بھی اس سے خوش ہے...... اس کے قریب ہے۔ یہ نکتہ وہ کبھی نہیں بھولا۔

تو وہ اتفاق کو کیسے مان سکتا تھا۔ انسانی ارتقا کی تاریخ بتاتی تھی کہ اوپر والے نے دنیا بنائی، جاندار پیدا کیے، نباتات اگائی اور ایک مکمل سسٹم بنایا۔ اس نے انسان کو پیدا کر کے یونہی نہیں چھوڑ دیا۔ اس نے اسے سکھایا بھی۔ وہ قدرت والا، بہت زبردست اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اس لیے اسے آدمی کے سامنے آنے، اس سے اپنی آواز میں بات کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے مظاہرِ فطرت کے ذریعے اسے بہت کچھ سکھایا۔ اور اس کا تعلیم دینے کا سب سے بڑا ذریعہ خیال ہے، جو وہ جب چاہے، کسی کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ کم علم لوگ جو صرف اپنی حسوں پر یقین کرتے ہیں، اسے اتفاق کہتے ہیں۔

آدمی کو کششِ ثقل کا علم کیسے ہوا؟ نیوٹن کو کتاب پڑھنی تھی۔ وہ اتفاق سے ایک درخت

کے نیچے جا بیٹھا۔ اتفاق سے ایک سیب شاخ سے ٹوٹ کر اس کے سر پر گرا، تب نیوٹن نے غور کیا اور زمین کی کشش کو دریافت کیا۔ یہ بیان سائنس کا ہے۔ لیکن دوسرے زاویے سے دیکھیں تو اوپر والے کو یہ منظور تھا کہ آدمی کو زمین کی کشش کے بارے میں بتائے۔ وہ نیوٹن کو کتاب پڑھنے کے لیے درخت کے نیچے لے گیا۔ ورنہ نیوٹن اپنے کمرے میں بیٹھ کر بھی پڑھ سکتا تھا۔ پھر اس نے سیب گرایا۔ پھر نیوٹن کے دل میں خیال پیدا کیا۔ تب یہ دریافت ہوئی۔ اب اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی انسانوں کے سامنے درخت سے پھل گرتے رہے ہیں۔ کتنوں نے غور کیا کہ ایسا زمین کی کشش کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ تو اب بھی کوئی نہیں سوچتا۔

اور ایسے ہی اتفاق سے ارشمیدس نے کثافت کا اصول دریافت کیا۔ ورنہ آج بھی کتنے لوگ روز دریا میں، سمندر میں نہاتے ہیں۔ کسی کو یہ خیال نہیں آتا لیکن ارشمیدس کا دریافت کردہ کلیہ تمام انسانوں کے لیے کتابوں میں محفوظ ہو گیا۔

علم سے محروم انسان مشقت کی زندگی گزارتا تھا۔ اس نے پرندوں سے گھر بنانا سیکھا۔ درختوں سے اسے لباس کا خیال آیا۔ جھنجلاہٹ میں کسی جانور کو پتھر مارا اور اس کا نتیجہ دیکھ کر اس نے پتھر سے ہتھیار اور اوزار بنائے۔ پرندوں کو اڑتے دیکھ کر اسے اڑنے کا شوق ہوا۔ لکڑی کو پانی میں نہ ڈوبتے دیکھا تو کشتی کا خیال سوجھا۔ چیونٹی کو بوجھ اٹھا کر چلتے دیکھا تو جانوروں سے بار برداری کا کام لیا۔ غرض ہر دریافت، ہر ایجاد کے پیچھے صرف اور صرف مشاہدے اور خیال کی طاقت تھی۔ اور خیال بھی اجتماعی نہیں تھا۔ ہمیشہ کسی فرد کو خیال سوجھا اور اس نے کچھ دریافت یا ایجاد کیا اور پھر اپنی تعریف کے لیے، خود کو نمایاں کرنے کے لیے اس کے بارے میں دوسروں کو بتایا۔ اگر خیال کوئی عام چیز ہوتا تو بیک وقت بہت سارے لوگوں پر اترتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی قوت ہے، جو کسی منتخب شخص کو کوئی ایسا خیال سونپتی ہے۔ یہ علم کا ذریعہ ہے۔

اوتار سنگھ کی سمجھ میں اماں کی بات پوری طرح آ گئی کہ علم سارے کا سارا اللہ کا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے، اسے بہت...... بہت تھوڑا سا علم دیتا ہے۔ آدمی کو وہ بہت زیادہ لگتا ہے لیکن وہ علم کے سمندر کے ایک قطرے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ مگر بے خبر انسان کو بہت زیادہ لگتا ہے۔

خیال کی طاقت کے بارے میں سوچتے ہوئے اوتار سنگھ کے سامنے ایک اور رخ آیا۔ انسان کی ترقی، خیال کے دم سے تھی۔ تو دوسری طرف اس کے مصائب اور دنیا میں شر اور فساد کا ذمے دار بھی خیال ہی تھا...... خیالِ بد۔ اس کے تحت آدمی برے کام کرتا تھا۔ دوسروں سے ان کا حق چھیننے اور اپنی ہوس کی خاطر سازشیں سوچتا اور کرتا۔ دوسروں کو اپنا غلام بنانے کی کوشش میں ہی جنگیں ہوتی تھیں۔ چوری، ڈاکے، قتل، یہ سب برے خیال کی وجہ سے تھا۔

اس بارے میں سوچ کر وہ الجھنے لگا۔ کیا اوپر والے کے علاوہ کوئی اور طاقت بھی ہے۔ اس سے متصادم، اس کی مخالف، جو انسان کے دل میں برا خیال ڈالتی ہے؟ یہ تسلیم کرتا تو اس کے

اب تک کے اخذ کیے ہوئے نتیجے پر اثر پڑتا۔ کائنات کے منتظمِ اعلیٰ کی اپنی تلاش میں وہ یہاں تک پہنچا تھا کہ وہ ایک مطلق العنان ہستی ہے، جسے چیلنج کرنے والا کوئی نہیں۔ اب وہ اس میں ترامیم کرتا تو سب کچھ بکھر جاتا اور اس کا ذہن اس طرح کا تھا کہ وہ ہر چیز پر سوچتا تھا۔ نظریں کبھی نہیں چراتا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی اب تک کی تلاش رائیگاں ہونے والی ہے۔

وہ سوچتا رہا!

اچانک اسے ایک خیال آیا۔ اماں نے کہا تھا کہ آدمی صاف ستھرا رہے، اچھے کام کرے، برے کاموں سے بچے تو اللہ اس سے خوش ہوتا ہے، اس کے قریب ہوتا ہے اور اسے انعام دیتا ہے۔ تو اگر معاملہ برعکس ہو تو کیا ہوگا؟ یعنی آدمی گندا رہے، برے کام کرے اور اچھے کاموں سے بچے تو اللہ اس سے ناراض ہوگا، اس سے دور ہو جائے گا اور اسے سزا دے گا۔ تو یہ برا خیال سزا بھی ہو سکتا ہے۔

یہ دلیل معقول اور موثر تھی۔ اس سے اوپر والے کی اور صفتیں بھی سامنے آتی تھیں۔ وہ انتقام لینے والا بھی ہے۔ برے کو اور برا کر دیتا ہے وہ غصے والا بھی ہے۔ سزا بھی دیتا ہے۔ علم دیتا ہے۔ مگر گمراہ بھی کر دیتا ہے۔

وہ مطمئن تو ہوا، مگر پوری طرح نہیں۔ برائی کی قوت والا تصور وہ مسترد نہیں کر سکا تھا۔

پھر اس کی تلاشِ حق کی گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اس کا بنیادی سبب اردو شاعری بنی تھی...... اور اس کے بعد عشق!

❁......❁......❁

صحیح معنوں میں اردو شاعری سے اس کا واسطہ اب نویں جماعت میں پڑا تھا۔ میرؔ کو پڑھا تو پہلی بار اسے اندازہ ہوا کہ شاعری میں کتنی زیادہ قوت ہے اور وہ کیسا تحرک پیدا کرتی ہے۔ اور میرؔ کی شاعری تو عجیب تھی۔ سکوت بھی طاری کرتی اور اس کے ساتھ تحرک بھی دیتی۔ آدمی شعر پڑھتا اور بیٹھے کا بیٹھا رہ جاتا۔ وقت سمیت گرد و پیش کی ہر چیز جیسے ساکت ہو جاتی۔ پھر اندر ایک تحرک جاگتا۔ دل چاہتا کہ اداس ہو جائیں اور وہ اداس ہو جاتا...... بغیر کسی وجہ کے جیسے میرؔ کی شاعری اس کے اندر موجود اداس کر دینے والی کسی مشین میں چابی بھر دیتی۔

شاعری میں اس کے لیے کشش کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ شاعری کا بنیادی موضوع اور نفیس مضمون محبت تھی...... عشق تھا اور وہ محبت اور عشق کو سمجھنا چاہتا تھا۔ اس کی خاطر تو اس نے تلاشِ حق کا آغاز کیا تھا۔ کئی برس پہلے اس نے سوچا تھا کہ اوپر والے نے یہ دنیا بنائی، اسے وجود دیا، اس پر بڑی بڑی مہربانیاں کیں۔ تو اسے ماں باپ سے بڑھ کر اس سے محبت کرنی چاہیے۔ لیکن بغیر دیکھے، سمجھے اور جانے کوئی کسی سے اتنی محبت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس نے اوپر والے کو کھوجنا شروع کر دیا اور شاعری کے ذریعے اسے محبت کو سمجھنے کا موقع ملا تھا۔

پھر میرؔ کے بعد وہ غالبؔ تک پہنچا اور حیران رہ گیا۔ غالبؔ کا تجسس اس کی فکر...... وہ تو جیسے اس کا ہی عکس تھا۔ جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود۔ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟ سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں۔ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟ یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے؟

اور غالبؔ کا ایک شعر تو اس پر چھا گیا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

شاعری کے مطالعے کا شوق بڑھ گیا۔ وہ کتابیں خرید کر لانے لگا۔ نصاب کی شاعری بہت پیچھے رہ گئی۔

پھر شاعری کے حوالے سے اس نے محبت کو سمجھنے کی کوشش شروع کر دی۔ کیسا طاقت ور ہے یہ جذبہ جو آدمی کو تخلیق کے راستے پر لے جاتا ہے۔ کیسی کیسی کیفیتیں آتی ہوں گی، تب کہیں شاعر ایسے شعر کہتا ہوگا۔

یہ دروازہ کھلا تو اس کے آگے اور دروازے تھے۔ وہ نثر کی طرف چلا گیا۔ اس نے عشق کی داستانیں پڑھیں۔ شیریں فرہاد، قیس اور لیلیٰ، سسی پنوں، ہیر رانجھا، سمی مراد، سوہنی مہینوال اور انگریزی میں رومیو جولیٹ اور یہ سب پڑھ کر اسے محبت سے محبت ہو گئی...... عشق سے عشق ہو گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ سائنس میں اس کی دلچسپی صرف نصاب تک محدود ہو گئی۔ وہ فنون میں اور بالخصوص ادب میں دلچسپی لینے لگا۔ اوپر والے کی تلاش بھول کر وہ زمین پر کسی کی تلاش میں مصروف ہو گیا۔ کوئی ایسا ہو، جس سے اسے محبت ہو جائے۔ وہ بڑی حسرت سے سوچتا، کیا مجھے کبھی کسی سے محبت نہیں ہوگی۔ کیا مجھے کوئی ایسا نہیں ملے گا، جس کے لیے میں آہیں بھروں، شعر کہوں۔

وہ طبعاً شرمیلا تھا۔ لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے اس کی نظریں جھک جاتیں۔ لیکن اب تلاش کا مرحلہ تھا۔ چنانچہ اس کی نظریں اٹھنے لگیں۔ یہ الگ بات کہ بے خبر لڑکی نظریں اٹھاتی تو وہ نظریں نہ ملا پاتا۔ جھکا لیتا۔ لیکن بہرحال اب وہ دیکھتا تھا۔ تلاش جو تھی۔ وہ یہ سوچ کر بازار میں، جمنا کے کنارے، دیگر تفریحی مقامات پر لڑکیوں کو دیکھتا کہ شاید کسی کو دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوں گی۔ تب اسے پتا چل جائے گا کہ اسے اس لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔ لیکن ایسا کبھی ہوا نہیں۔

شاعری کے ذریعے اس نے بہت کچھ سمجھا اور سیکھا تھا۔ شاعری میں بوس و کنار بھی تھا اور جسمی اختلاط بھی۔ ایسے شعر پڑھ کر وہ ہیجان میں مبتلا ہوتا۔ جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگتی۔ اندر وحشت سی امنڈتی۔ وہ اس سے لطف اندوز ہوتا۔ لیکن پھر ایک جھٹکا لگتا۔ اسے احساس ہوتا کہ اس

وحشت میں خوب صورتی نہیں، اس میں لطافت نہیں کثافت ہے، جبکہ محبت کو تو بہت خوبصورت اور لطیف ہونا چاہیے۔ اس نے محبت کی تھی...... اپنے ماتا پتا سے، اماں سے، چاچا سے اور ویر جی سے۔ لیکن اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ محبت ناکافی ہے۔ اس میں کمی ہے۔ وہ مکمل محبت کرنا چاہتا تھا...... اپنے خالق سے۔ اس کا خیال تھا کہ محبت آدمی کو سکون دیتی ہے، خوشی دیتی ہے۔ مگر یہ وحشت...... یہ اندر جو کسی کو توڑ پھوڑ دینے کی خواہش اُبھرتی ہے...... یہ خوشی کیسے دے سکتی ہے۔

وہ اردو کے پیریڈ میں اردو کے استاد کو اپنے سوالات سے تنگ کرنے لگا۔ اس سے اسے فائدہ بھی ہوا۔ اسے پتا چلا کہ عشق بھی دو طرح کا ہے۔ عشق حقیقی اور عشق مجازی۔ عشق حقیقی وہ ہے جو بندہ اپنے معبود سے کرتا ہے اور عشق مجازی بندہ بندے سے۔

''لیکن سر، یہ محبت میں وحشت کیوں ہے؟ اسے تو لطیف ہونا چاہیے۔''

''محبت تو لطیف ہی ہوتی ہے۔'' سر نے کہا۔ ''محبت کی تعریف پر غور کرو۔''

''اور محبت کی تعریف کیا ہے سر؟''

''محبت کرنے والے کو اپنے محبوب سے کوئی غرض، کوئی طلب نہیں ہوتی۔ وہ اپنے محبوب سے بدلے میں کچھ بھی نہیں مانگتا۔ محبت بھی نہیں، التفات کی ایک نظر بھی نہیں۔ وہ تو بس محبت کیے جاتا ہے کیونکہ محبت ایک خودکار جذبہ ہے، جو دل میں خود بخود ابھرتا ہے۔ تو محبت کرنے والا تو محبت کرنے پر مجبور ہے۔ وہ کوئی شرط عائد نہیں کر سکتا۔ یہ محبت نہیں کہ محبوب جواب میں محبت نہ دے تو اسے چھوڑ کر کسی اور سے محبت کرلو۔ یہ تو پھر کاروبار ہوا۔''

اب اوتار سنگھ جو اتفاق کو نہیں مانتا تھا، خودکار جذبے کو کیسے مان لیتا۔ اس کا تو مطلب یہ ہے کہ اوپر والا خیال کی طرح کسی کو کسی کی محبت بھی سونپ دیتا ہے۔ لیکن تجربہ کرنا بھی ضروری تھا۔ اس نے کئی لڑکیوں سے بالارادہ محبت کرنی چاہی لیکن ناکام رہا۔ بات سمجھ میں آ رہی تھی۔

ایک اور موقعے پر سر نے اسے کہا کہ وہ چھٹی کے بعد ان سے ملے۔ وہ چھٹی کے بعد ان سے ملا۔ ''جی سر؟''

''بات یہ ہے اوتار سنگھ کہ تم ایسی باتیں جاننا چاہتے ہو، جو ابھی کلاس میں پڑھانا مناسب نہیں۔'' سر بولے۔ ''لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمھیں بتانا بھی ضروری ہے۔ ورنہ تم گمراہی میں پڑ سکتے ہو۔ اس لیے تم کلاس میں سوال کرنے کے بجائے مجھ سے اکیلے میں مل لیا کرو اور جو پوچھنا ہو پوچھ لیا کرو۔''

''شکریہ سر۔''

''میں دیکھ رہا ہوں کہ محبت میں تمھیں خاص دلچسپی ہے، اور تم شاعری کے حوالے سے اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہو۔''

''جی سر، یہ درست ہے۔''

''اس لیے غلط فہمی کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے۔ بہتر ہے کہ محبت کو سمجھ لو۔ محبت بہت پاک اور بلند جذبہ ہے۔ اور یہ محدود بھی نہیں۔ ماں بیٹے سے محبت کرتی ہے۔ بندہ معبود سے محبت کرتا ہے۔ محبت کسی کو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ کسی مرد کو عورت سے اور عورت کو مرد سے محبت ہو سکتی ہے۔ لیکن محبت کی بنیاد جسم کبھی نہیں ہوتا۔ اس کی بنیاد اچھے اوصاف بھی نہیں ہوتے۔ محبوب کا ظاہر بھی نہیں ہوتا کیونکہ محبت لافانی جذبہ ہے۔ آدمی بوڑھا ہو جائے تو جسم ڈھل جاتا ہے۔ اس جسم سے محبت ہو تو محبت ختم ہو جائے گی۔ محبوب کی کوئی بری عادت سامنے آئے تو محبت ختم ہو جائے گی......''

''جی سر۔''

''نہیں۔ محبت ہے تو کبھی ختم نہیں ہوگی۔''

اوتار سنگھ نے انھیں کئی اشعار کے حوالے دیے۔

سر مسکرائے۔ ''یہی تو میں تمھیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ محبت نہیں، ہوس ہے۔''

''لیکن سر......''

سر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''کوئی دن کو رات کہے تو وہ رات تو نہیں ہو جائے گا۔ بدی کو نیکی کہنے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ اسی طرح محبت کو اس کی تعریف پر، اس کی پاکی، اس کی بے غرضی اور بے طلبی پر تولو گے تو پتا چل جائے گا کہ وہ محبت ہے یا ہوس۔ چیزیں اپنے نام سے نہیں، خواص سے پہچانی جاتی ہیں۔ اور دعوے پڑتال کے بغیر بے معنی ہوتے ہیں۔''

بعد میں اوتار سنگھ ان باتوں پر غور کرتا رہا۔ سر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

پھر مومن کے ایک شعر نے اس پر محبت کی کیفیات کی خوبصورتی کسی حد تک واضح کر دی۔ شعر تھا......

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

پہلی بار یہ شعر پڑھنے کے بعد کئی دن تک اوتار سنگھ اس شعر کے طلسم کا اسیر رہا۔ اسے اس شعر میں ایک جہانِ معنی آباد نظر آتا تھا۔ یہ تھا محبت کا احترام اور اس کی پاکیزگی۔ خلوت...... ایسی تنہائی، جس میں کوئی بھی نہ ہو۔ تب محبوب آ جائے، جسمی طور پر نہیں، خیالوں میں۔ تنہائی میں محفل ہو جائے۔ اور آلودگی کا شائبہ بھی نہ ہو۔ وہ ایسی ہی محبت کا تو متمنی تھا۔

مجھے محبت...... سچی محبت کب ملے گی؟ اس نے خود کلامی کی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ محبت اسے ملنے ہی والی ہے!

⊛......⊛......⊛

امتحان ہونے والے تھے۔ اس شام وہ سکون سے پڑھائی کی غرض سے کوٹھے پر چلا گیا۔ اوپر جاتے ہی اسے افسوس ہونے لگا۔ اب تک یہاں نہ آکر اس نے بڑی ناقدری کی تھی۔ وہ تو بڑا خوبصورت ماحول تھا۔ فضا میں چنبیلی کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔

سورج غروب ہونے میں ابھی دیر تھی۔ کوٹھے پر بید کی بنی ہوئی کرسیاں پڑی تھیں۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کتاب کھولی اور پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔ سچ یہ ہے کہ وہاں پڑھنے میں اسے بہت لطف آرہا تھا۔

پھر ایک نسوانی آواز نے اس کی محویت کے حصار کو توڑ دیا!

اس نے کتاب سے نظریں ہٹائیں۔ چند لمحوں میں وہ یہ بھی بھول گیا کہ کتاب اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس آواز میں عجیب سا جادو تھا۔ وہ کانوں کی راہ سے اس کے جسم میں اتر کر جیسے خون کے ساتھ اس کی رگوں میں گردش کر رہی تھی۔ اتنی خوبصورت آواز! اس کے ذہن میں بس یہی خیال تھا۔

پہلے تو ذرا دیر وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکا۔ اس آواز کو سننے کے سوا وہ کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مگر پھر اس نے غور کیا۔ وہ آواز کسی سے گفتگو نہیں کر رہی تھی۔ ورنہ گفتگو میں تو وقفہ بھی ہوتا ہے۔ اس کی سمجھ میں آگیا کہ وہ لڑکی بلند آواز میں کچھ پڑھ رہی ہے۔ لڑکی اس لیے کہ اپنی آواز کی کھنک سے وہ بہت کم عمر لگ رہی تھی۔ اس نے سوچا، آواز اتنی خوبصورت ہے تو وہ خود کتنی خوبصورت ہوگی۔

پھر اسے الجھن ہونے لگی۔ یہ لڑکی کیا پڑھ رہی ہے؟ اس کی سمجھ میں کیوں نہیں آرہا ہے؟ اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ کچھ لفظ اس کی گرفت میں آئے مگر فوراً ہی محو بھی ہو گئے۔ وہ اس کے لیے اجنبی لفظ تھے۔ وہ کوئی اجنبی زبان تھی۔

اوتار سنگھ اردو، فارسی اور انگریزی پڑھتا تھا۔ چوتھی کوئی زبان اس کے علم میں نہیں تھی۔ وہ تجسس سے بے حال ہوگیا۔ اب یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ کون سی زبان ہے۔ ویرجی سے مدد لی جائے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ پڑھائی میں ویرجی اس سے پیچھے ہیں۔ تو ماسٹر جی...... لیکن نہیں۔ ان سے حجاب کا رشتہ تھا۔ وہ یقیناً بتا سکیں گے کہ یہ کون سی زبان ہے۔ لیکن ان سے پوچھا نہیں جاسکتا تھا۔

ابھی وہ اس الجھن میں تھا کہ آواز خاموش ہوگئی۔ ایسا لگا، جیسے پوری کائنات خاموش ہوگئی ہے۔ لیکن نہیں، ایسا نہیں تھا، پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے فضا گونج رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ جھٹ پٹے کا سماں تھا۔ پرندے بسیرے کے لیے واپس جارہے تھے۔

ذرا دیر میں وہ آواز ابھری، جو ہر روز اس کے جسم کی تمام طاقت کو ٹانگوں میں لے آتی تھی...... اذان کی آواز! یہ آواز سن کر اس کے قدم خود بخود اٹھتے تھے...... حرکت میں آتے تھے۔ اندر کوئی تلقین بھر کر اٹھتی تھی...... کوئی کہتا تھا...... تجھے بلایا جارہا ہے۔ تو جاتا کیوں نہیں۔ وہ خود

بخود چند قدم چلتا تھا اور پھر مضطربانہ انداز میں چھوٹے سے دائرے میں ٹہلتا رہتا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کون اسے بلا رہا ہے اور اسے کس طرف جانا ہے۔

مگر اس شام وہ تلقین بہت دھیمی، بہت کمزور تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کے مرتکز حواس پر وہ آواز چھائی ہوئی تھی، جو اس نے ذرا دیر پہلے سنی تھی۔ اجنبی الفاظ دوش پر اٹھائے ہوئے وہ آواز اب بھی اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔ اس کی موجودگی میں باہر کی آوازیں دھیمی پڑ گئی تھیں۔

وہ ہاتھ میں کتاب لیے دیر تک وہاں بیٹھا رہا...... منتظر کہ وہ آواز پھر سنائی دے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ ایسا گم تھا کہ اسے اندھیرے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ ورنہ وہ اٹھ کر لائٹ تو جلا لیتا اور تو اور اسے ویرجی کے آنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔

''بھائی...... تم یہاں بیٹھے ہو۔ اور میں تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔'' وصال دین کے لہجے میں شکایت تھی۔

''کیوں ڈھونڈ رہے ہو ویرجی۔'' اوتار سنگھ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

وصال دین نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''کھانے کے لیے بھائی۔''

''اچھا۔ کھانے کا وقت ہوگیا؟''

''کہاں کھوئے ہوئے ہو بھائی۔ اور یہاں بیٹھنا تھا تو لائٹ ہی جلالی ہوتی۔''

اب اوتار سنگھ اسے کیسے بتاتا کہ اسے کچھ ہوش ہی نہیں۔ اس نے بات بنائی۔ ''دل ہی نہیں چاہا۔ اندھیرا اچھا لگ رہا ہے۔''

''اچھا۔ اب نیچے چلو۔''

اوتار سنگھ کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر وہ خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

❁……❁……❁

اگلے روز شام کے وقت اس کے قدم خود بہ خود اٹھے اور وہ کوٹھے کی طرف چل دیا۔ کتابیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ بید کی کرسی پر بیٹھ کر اس نے کتاب کھولی اور پڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا دھیان تو کہیں اور تھا۔ اس کی تمام حسوں کی طاقت سماعت میں مجتمع ہوگئی تھی۔ اس کی نظریں کتاب کے کھلے صفحے پر تھیں۔ مگر اسے ایک حرف بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

لیکن وہاں ہر طرف خاموشی تھی...... ایک غیر معمولی خاموشی! وہ مضطرب ہوا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ کیا ہوا؟ کیا اب وہ آواز سنائی نہیں دے گی؟ وہ پریشانی سے سوچتا رہا۔ کیا وہ اتفاق تھا...... ؟ بس ایک دن کی بات تھی؟

ہاں...... بالکل ممکن ہے۔ اس کے اندر سے کسی نے جواب دیا۔ اب کیا ضروری ہے کہ روز اسی وقت وہ آواز سنائی دے۔

اس خیال سے وہ اتنی تیزی سے، اور اتنا زیادہ مایوس ہوا کہ اسے حیرت ہونے لگی۔ کیا صرف ایک بار سننے کے بعد وہ آواز اس کے لیے اتنی اہم ہوگئی کہ وہ اتنا مایوس ہوگیا۔ ایسا ہوتا تو نہیں۔

وہ یہ سب کچھ سوچتا رہا ٹہلتا رہا۔ اس کے اندر عجیب سی کشمکش تھی۔ دل کہتا تھا۔ ابھی وہ آواز سنائی دے گی۔ اور دماغ کہتا تھا... یہ ضروری نہیں۔ لمحے بہت سست رفتار سے گزر رہے تھے۔ اس کی بے چینی بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔

پھر وہ بے چینی وحشت میں تبدیل ہوگئی۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ پورا جسم اینٹھنے لگا۔ اس کے اندر ایک خواہش مچلی۔ جی چاہا کہ وہ پوری قوت سے چلائے... اے..... نیچے والی، تم چپ کیوں ہو؟ بولتی کیوں نہیں؟ اور اس خواہش کا گلا گھونٹنا بہت مشکل تھا۔ وجود کی پوری طاقت صرف کرنے کے باوجود اس کے ہونٹ بری طرح لرز رہے تھے۔ بے تاب زبان دہن میں اینٹھی جا رہی تھی۔

اوتار سنگھ نے گھبرا کر اپنا دھیان ہٹانے کی کوشش کی۔ اس نے پڑھائی کے بارے میں سوچا، ماسٹر جی اور ویر جی کے بارے میں سوچا، پتا جی اور اماں کے بارے میں سوچا۔ لیکن اس سے سوچا نہیں گیا۔ دماغ گراموفون کی سوئی کی طرح اسی آواز پر اٹکا ہوا تھا۔ اس نے ماتا جی کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی۔ اس سے پوری طرح سوچا تو نہیں گیا۔ البتہ وحشت قدرے کم ہو گئی۔ مگر اب بھی صورتِ حال تسلی بخش نہیں تھی۔

اچانک اسے خیال آیا کہ وہ کیوں نہ اس آواز والی کے بارے میں سوچے۔

یہ اس کے پاس آخری ترکیب تھی۔ خوش قسمتی سے وہ کارگر ثابت ہوئی۔ اس خیال سے ہی اس کا مضطرب وجود پُرسکون ہوگیا۔ چند لمحوں میں وہ سب کچھ بھول کر اسی کے بارے میں سوچنے لگا۔

نیچے والوں کے بارے میں اسے بتایا تو گیا تھا۔ لیکن اس نے کبھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ دھیان سے نہیں سنا تھا۔ رنجنا نیچے جاتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی وہ ان کی باتیں کیا کرتی تھی۔

اب تعلق جڑا تھا تو اوتار سنگھ رنجنا کی باتوں کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر دشواری ہو رہی تھی۔ کیونکہ وہ رنجنا کی باتیں دھیان سے سنتا ہی نہیں تھا۔ سو اب اسے اس چیونٹی کی سی مشقت کرنی پڑ رہی تھی، جو اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ اٹھا کر بل تک جاتی ہے۔ وہ بڑی مشکل سے رنجنا سے حاصل ہوئی معلومات کو یاد کرتا اور پھر ترتیب دیتا۔ یہ گھر ایک بہت بڑے سرکاری افسر کا تھا۔ خاندانی لوگ تھے۔ ان کے ہاں بیٹا کوئی نہیں تھا۔ بیٹیاں تین تھیں۔ ایک چودہ سال کی، دوسری بارہ اور تیسری دس سال کی۔ ان کے یہاں آنے سے ایک سال پہلے سرکاری افسر کا انتقال ہوگیا۔ اب گھر میں ان ماں بیٹیوں اور دو نوکروں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ چھمن بوا اور بہادر علی دونوں پشتینی

ملازم تھے اس گھر کے۔ مرنے والے کے واجبات میں بڑی رقم ملی تھی۔ باقاعدگی سے پنشن آتی تھی اور اب اوپر کے مکان کا کرایہ بھی تھا۔ چنانچہ تنگی کوئی نہیں تھی۔ وہ خوش حال لوگ تھے۔ ماں کو بس یہی فکر تھی کہ تینوں بیٹیوں کے ہاتھ پیلے ہو جائیں تو بوجھ ہلکا ہو۔

اوتار سنگھ کو خوشی ہوئی۔ دھیان سے نہ سننے کے باوجود اتنا کچھ اسے یاد تھا۔ ہاں وہ متاسف ضرور تھا کہ پتا نہیں کتنی اہم باتیں حافظے میں نہیں رہی ہوں گی۔ بہرحال اسے اتنا پتا چل گیا کہ وہ آواز ان تین لڑکیوں میں سے کسی کی ہے۔ کس کی؟ یہ فی الوقت اسے معلوم نہیں تھا۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اس کا دھیان پوری طرح بٹ چکا تھا اور وہ پُرسکون ہوگیا تھا۔ ایسا پُرسکون کہ نہ اسے اپنا اضطراب یاد تھا اور نہ ہی اس کا سبب۔ وہ ذہن پر زور دے رہا تھا..... نیچے والوں کے بارے میں سنی ہوئی اور باتیں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا.....

پھر اسے ایک اور اہم بات یاد آئی۔ نیچے رہنے والے سب لوگ مسلمان تھے..... ویر جی، اماں اور چاچا جی کی طرح!

اسی لمحے وہ آواز ابھری......اور اس کے ساتھ ہی وہ سب کچھ بھول گیا۔ وہ مترنم، دل نشیں آواز لمحہ بہ لمحہ بلند ہو رہی تھی۔ وہی اجنبی زبان، وہی مخصوص لحن۔ وہ نہیں سمجھ سکا کہ آواز بلند نہیں ہو رہی تھی۔ دراصل وہ اس کے پورے وجود میں دوڑ رہی تھی..... گونج رہی تھی۔ اس کے وجود میں اس آواز کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ جیسے کسی طلسم کا اسیر، ہاتھ میں کھلی کتاب لیے، سامنے کے صفحے پر نظریں جمائے ساکت وصامت بیٹھا تھا۔ لیکن وہ پڑھ نہیں رہا تھا۔ وہ صرف سن رہا تھا۔ ایسے کہ وہ اپنی مرضی سے ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔

پھر آواز کی وہ ڈور اچانک ہی ٹوٹ گئی۔ ہر طرف سکوت چھا گیا۔ اسے لگا کہ اس کا وجود بالکل خالی ہوگیا ہے۔ زندگی جیسے اس آواز سے لپٹ کر، اس آواز کے ساتھ رخصت ہوگئی ہے۔

وہ بیٹھا رہا۔ اسے امید تھی کہ وہ آواز پھر سنائی دے گی۔ لیکن چند لمحوں کے بعد از ان کی آواز سنائی دی۔ اندھیرا ہوگیا تھا۔ وہ اس آواز کا انتظار کیے جا رہا تھا۔

پھر اچانک اسے اندھیرے کا احساس ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی یاد آیا کہ گزشتہ روز ویر جی اوپر آئے تھے اور انھوں نے کہا تھا..... لائٹ ہی نہیں جلائی۔ تو لائٹ جلانا اب ضروری ہے۔ اس نے سوچا۔ یہ ضروری تھا۔ اب اس کے پاس ایک مقدس راز تھا، جسے افشا نہیں ہونے دینا تھا۔ سب کو یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ سکون سے پڑھنے کی غرض سے کوٹھے پر آتا ہے۔ انتظار کی اس کیفیت نے اس کے وجود کو شل کر دیا تھا۔ اس پر عجیب سی کسلمندی طاری تھی۔ اٹھنا اور کچھ کرنا تو بہت دور کی بات ہے، ایسے میں تو انگلی ہلانے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ لیکن بات اپنے مقدس و محترم راز کی پردہ

داری کی تھی۔ وہ یونہی بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ اٹھے، کتابیں لے اور نیچے چلا جائے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ کون جانے، وہ آواز پھر جادو جگائے..... اسی انتظار میں تو تھا۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ اٹھ کر لائٹ جلائے اور کتاب کھول کر پڑھنے کی اداکاری کرتا رہے۔

اس نے اٹھ کر لائٹ جلا دی۔ اب کتاب کے صفحے پر نظریں جمائے وہ اس آواز کا منتظر تھا۔

لیکن وہ آواز نہیں آئی!

❀.....❀.....❀

نجانے کتنے دن گزر گئے۔ اتنا ہوش کسے تھا کہ دنوں کی گنتی کرتا۔ ایک سحر تھا، جس میں اوتار سنگھ گرفتار تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی اس کا انتظار شروع ہوتا۔ وہ شام کے اس مخصوص وقت کے انتظار میں وقت گزارتا، جب وہ آواز ابھرتی تھی۔ حالانکہ وہ انتظار بے معنی تھا۔ وہ ذرا سا غور کر لیتا تو یہ بات خود اس کی سمجھ میں بھی آ جاتی۔ لیکن وہ تو خود فراموشی کی کیفیت میں تھا۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ اب وہ آواز تو ہر وقت، ہر پل اس کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ تو جیسے اس کی سماعت سے، اس کے وجود سے جڑ گئی ہے۔ وہ کلاس روم میں ہو یا گھر میں، کلاس میں لیکچر ہو یا گھر میں ماسٹر جی پڑھا رہے ہوں، وہ آواز اس کے کانوں میں بسی رہتی تھی، اس کے وجود میں گونجتی رہتی تھی۔

اور اتنے دنوں میں اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ آواز صرف اس مخصوص وقت میں آتی ہے۔ اس کے باوجود اس کا بس چلتا تو وہ چوبیس گھنٹے کوٹھے پر بیٹھا اس کا انتظار کرتا۔ اس انتظار میں ایسی انوکھی لذت تھی، جس سے وہ پہلی بار آشنا ہوا تھا۔

ابتداء میں وہ آواز سنتے ہوئے اسے جھنجلاہٹ ہوتی تھی..... اس بات پر کہ وہ زبان..... ادا کیے جانے والے الفاظ اس کے لیے اجنبی ہیں۔ کاش وہ ایک ایک لفظ سمجھتا۔ تب تو کچھ اور ہی بات ہوتی لیکن چند دنوں کے بعد یہ احساس خود بخود مٹ گیا۔ وہ آواز اس پر یوں حاوی ہوئی کہ اسے کچھ سوچنے کا خیال ہی نہ آتا۔ ہاں، اسے یہ احساس ہوتا کہ جو بات بھی کہی جا رہی ہے، وہ سمجھ میں نہ آنے کے باوجود اس کے اعصاب کو پُرسکون کر دیتی ہے۔ اس کے دل و دماغ کو طمانیت سے بھر دیتی ہے۔ اس کا پورا وجود جیسے ایک بہت خوبصورت کیفیت میں جھومنے لگتا ہے۔ اور یہ کیفیت صرف اس کی داخلی نہیں۔ باہر بھی ایسا ہی کچھ ہوتا ہے۔ بیلیں، پودے، پھول..... سب جھوم رہے ہوتے ہیں۔ ہر شے میں حتیٰ کہ بے جان دیواروں میں بھی ایک سپردگی آمیز ارتعاش محسوس ہوتا ہے۔

امتحان شروع ہوئے اور ختم بھی ہو گئے۔ اب نتیجہ آنے تک چھٹیاں تھیں۔ یہ دن اس کے

لیے آزمائش بن گئے۔ اس کا جی چاہتا کہ صبح ہی سے کوٹھے پر چلا جائے۔ رات تک کے لیے! لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی بات ہوگی، جس پر سب غور کریں گے اور بالآخر اس کا راز افشا ہو جائے گا اور یہ وہ گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے معمول سے ہٹ کر کچھ نہیں کیا۔ لیکن وقت گزارنا اس کے لیے دوبھر ہو گیا۔ وہ شام تک کا وقت گزارنے کے لیے باؤلوں کی طرح مضطرب اِدھر اُدھر پھرتا رہتا اور شام ہوتے ہی کتابیں اٹھا کر کوٹھے کا رخ کرتا.....

وصال دین چھوٹے ٹھاکر کے اس نئے معمول سے بے خبر نہیں تھا لیکن اس نے اس معاملے میں تجسس نہیں کیا۔ کچھ تو یہ کہ اس کی فطرت میں تجسس تھا ہی کم۔ دوسرے یہ کہ یہ معمول اس کے لیے بہت بہتر تھا۔ اسے اماں اور ابا کی نصیحت یاد تھی۔ جب اوتار سنگھ نیچے ہوتا تھا تو اسے عصر اور مغرب کی نماز کے لیے نظر بچا کر جانا ہوتا تھا۔ اور قرآن شریف کی تلاوت ایک الگ مسئلہ تھی۔ اب اوتار سنگھ کے اس نئے معمول نے اس کا مسئلہ حل کر دیا تھا۔

تجسس نہ کرنا اپنی جگہ، مگر وصال دین کا مشاہدہ بہرحال برا نہیں تھا۔ یہ تو اس سے نہیں چھپ سکا کہ اوتار سنگھ اب بہت مضطرب رہتا ہے۔ اس میں کچھ مشاہدے کا کمال بھی نہیں تھا۔ اوتار سنگھ کا اضطراب ایسا تھا کہ اس کے انگ انگ سے چھلکتا نظر آتا تھا۔ تاہم غیر متجسس وصال دین نے اس پر زیادہ غور نہیں کیا۔ یہ کیفیت گاؤں جانے کی خواہش کی وجہ سے بھی ہو سکتی تھی اور امتحان دینے کے بعد نتیجے کے انتظار میں بھی ایسا ہوتا ہے۔

کچھ بھی ہو، وصال دین کے لیے تو وہ معمول نعمت تھا۔ اوتار سنگھ اوپر ہوتا تو وہ بڑے سکون سے اپنے معمولات میں مگن رہتا۔ وہ اوپر جاتا تو صرف کھانے کے وقت کھانے پر اوتار سنگھ کو بلانے کے لیے۔ چنانچہ اوتار سنگھ سکون سے اپنے راستے پر چلتا رہا۔

مگر اس شام بڑے ٹھاکر کا ٹیلی گرام آ گیا۔ انھوں نے اطلاع دی تھی کہ اگلے روز وہ آ رہے ہیں۔

وصال دین نے ٹیلی گرام پڑھا۔ اس کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ خوشی کی یہ خبر سنانے کے لیے وہ آندھی طوفان کی طرح کوٹھے کی طرف دوڑا۔

اوتار سنگھ اپنی محبوب آواز میں اس طرح گم تھا کہ کوئی طوفان بھی اسے نہیں چونکا سکتا تھا۔ اسے وصال دین کی آمد کا پتا ہی نہیں چلا۔

وصال دین اوپر پہنچا تو اوتار سنگھ کتاب کھولے بیٹھا تھا۔ مگر اس کی نظریں کتاب پر نہیں تھیں۔ وہ سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مگر ایک لمحے میں وصال دین کو احساس ہو گیا کہ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ مگر وہ سامنے کی کوئی چیز بھی نہیں دیکھ رہا ہے۔ وہ ڈر گیا کہ کیا ہو گیا بھائی کو۔ لیکن چند لمحوں میں اس کا ڈر دور ہو گیا۔ اسے احساس ہو گیا کہ بھائی کہیں کھویا ہوا ہے..... دنیا و مافیہا سے بے خبر۔

وصال دین نے ادھر اُدھر دیکھا۔ کہیں کوئی نہیں تھا۔ وہاں بہت پُرسکون ماحول تھا۔ پھر اچانک اسے اس آواز کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ نسوانی آواز نیچے سے آ رہی تھی۔ مگر اس میں اسے کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں ہوئی۔

وہ اوتار سنگھ کی آنکھوں کے سامنے سے گزرا اور برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لیکن شاید اوتار سنگھ نے اسے نہیں دیکھا۔ یا دیکھا بھی تو بہر حال اس کی محویت نہیں ٹوٹی۔

اس نے اوتار سنگھ کو پکارنے کا ارادہ کیا۔ اسے خود بخود یہ احساس ہوا کہ اسے زور سے نہیں پکارنا چاہیے۔ جیسے یہ کوئی بے ادبی ہوگی۔ چنانچہ اس نے تین چار بار اسے دھیرے سے پکارا۔ ''بھائی...... بھائی...... ٹھاکر جی کا ٹیلی گرام آیا ہے۔''

لیکن اوتار سنگھ کی محویت نہیں ٹوٹی۔

پریشان ہو کر اس نے اوتار سنگھ کو نرمی سے ہلایا۔ ''بھائی...... کیا ہو گیا ہے تم کو؟ کہاں کھوئے ہوئے ہو؟''

پہلی بار اوتار سنگھ کی محویت ٹوٹی۔ اس نے وصال دین کو دیکھا۔ مگر اس کی نگاہوں میں بیگانگی تھی۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے درشت لہجے میں کہا۔

وصال دین کو جھٹکا لگا۔ اوتار سنگھ نے پہلے کبھی اس سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔ وہ سہم گیا۔ ''وہ...... وہ...... چھوٹے ٹھاکر......''

اوتار سنگھ نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ مت بولو۔ بس سنتے رہو۔''

اب وصال دین میں بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ نجانے اوتار سنگھ اسے کیا سننے کو کہہ رہا تھا۔ وہاں نیچے سے آنے والی اس نسوانی آواز کے سوا سننے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے سنتے سنتے وہ خود بھی اس آواز میں کھو گیا۔

نجانے کتنی دیر ہو گئی۔ پھر اوتار سنگھ نے ہی اسے چونکایا۔ ''سن رہے ہو نا ویر جی۔'' اس بار اس کے لہجے میں نرمی اور اپنائیت تھی۔

''جی چھوٹے ٹھاکر، سن رہا ہوں۔''

''کیا جادو ہے اس آواز میں۔''

''جی ہاں۔''

''پتا نہیں زبان کون سی ہے۔ ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ کاش......''

''یہ عربی زبان ہے۔'' وصال دین نے بے ساختہ کہا۔

اوتار سنگھ تو اچھل پڑا۔ ''عربی! سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں بھائی۔ یہ عربی ہے۔''

''تمہیں پکا معلوم ہے ویر جی۔'' اوتار سنگھ کی کیفیت ہیجانی تھی۔

''ہاں بھائی۔'' وصال دین نے کہا۔ اور فوراً ہی اسے ڈر لگنے لگا۔ وہ تو بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اوتار سنگھ اس سے پوچھے کہ اسے کیسے معلوم کہ یہ عربی ہے...... تو وہ کیا جواب دے گا۔

لیکن اوتار سنگھ ایسے عالم میں تھا کہ اور کچھ پوچھ ہی نہیں سکتا تھا۔

اُدھر اوتار سنگھ کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ مگن تھا۔ یہ تو بہت بڑی بات معلوم ہوگئی۔

چند لمحے اوتار سنگھ اس خوشی کی لذت میں گم رہا۔ مگر پھر سوچنے کا عمل شروع ہوا اور سوالات ابھرنے لگے۔ عربی تو عرب میں بولی جاتی ہے۔ تو کیا یہ نیچے رہنے والے لوگ عرب کے ہیں؟ نہیں...... ایسا تو نہیں؟ تو پھر؟ اس کا جی چاہا کہ یہ بات وصال دین سے پوچھے۔ لیکن فوراً ہی اس نے خود کو روک لیا۔ یہی کیا کم ہے کہ وصال دین کو اس کی محویت اور اس آواز کے درمیان رشتے کا احساس ہو گیا ہے۔ وہ زیادہ پوچھ گچھ کرے گا تو یہ راز کھل جائے گا۔ نہیں...... یہ نہیں ہونا چاہیے اور جو تھوڑی بہت بات کھلی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس کے بدلے یہ تو معلوم ہو گیا کہ یہ کون سی زبان ہے۔ اب وہ یہ زبان سیکھ سکتا ہے۔ یہ تو بہت بڑی بات معلوم ہوئی ہے۔ مگر اب اور کچھ نہیں پوچھنا۔

دراصل اوتار سنگھ کی سوچ کا محور صرف وہ آواز تھی...... اور صاحب آواز۔ ورنہ یہ سامنے کی بات وہ ضرور سوچتا کہ پڑھائی میں اس کے پیچھے چلنے والے وصال دین کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ زبان عربی ہے اور یہ سوچتا تو اس کا تجسس ضرور بھڑکتا۔ وہ وصال دین سے پوچھتا...... اور وصال دین کے لیے وہ بہت بڑی آزمائش ہوتی۔ لیکن اوتار سنگھ کے ارتکاز نے یہ نوبت ہی نہیں آنے دی۔

دوسری طرف وصال دین کو یہ شک تو ہوا کہ شاید اوتار سنگھ اوپر یہ آواز سننے کے لیے ہی آتا ہے۔ لیکن اس نے فوراً ہی اس خیال کو رد کر دیا کیونکہ اوتار سنگھ نے رات کے کھانے تک کوٹھے پر بیٹھا رہتا تھا۔ جبکہ یہ آواز تو تھوڑی دیر کی ہی ہے۔

اوتار سنگھ اس آواز کی اہمیت کے تاثر کو زائل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''یہاں پڑھائی کے لیے بہت اچھا ماحول ہے۔ بہت سکون ہے۔ آج اس آواز نے ڈسٹرب کر دیا۔ ورنہ یہاں پڑھائی میں ایک لمحے کو بھی خلل نہیں پڑتا۔'' یہ کہہ کر وہ ڈرا کہ وصال دین نے بھی پڑھائی کے لیے یہاں آنا شروع کر دیا تو کیا ہوگا۔

''ٹھیک کہتے ہو بھائی۔ لیکن میں یہاں نہیں پڑھ سکتا۔ میں تو یہاں کے ماحول میں کھو جاؤں گا۔'' وصال دین نے کہا۔

اوتار سنگھ نے خطرہ ٹل جانے پر سکون کی سانس لی۔ پھر بولا۔ ''ارے ہاں ویر جی، تم یہاں کیوں آئے تھے؟ کچھ کہہ رہے تھے؟''

''ہاں بھائی۔ کل ٹھاکر جی یہاں آ رہے ہیں۔''

❀......❀......❀
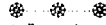
ٹھاکر پرتاپ سنگھ دوپہر کو وہاں پہنچ گیا۔ چنی کو کھونے کے بعد اس کے پاس اس بیٹے کے سوا بچا ہی کیا تھا۔ اس کے تو دل میں بار بار آتی تھی کہ اوتار سنگھ کو اسکول سے اٹھا لے۔ اچھی سے اچھی پڑھائی کا وہ گھر پر بھی بندوبست کر سکتا ہے۔ لیکن یہ سوچ کر رہ جاتا تھا کہ یہ تو انتہا درجے کی خودغرضی ہوگی۔ صرف علم سے کیا ہوتا ہے۔ اسکول کالج سے آدمی اور بھی بہت کچھ سیکھتا ہے۔ ٹھاکروں کی گڑھی میں بند رہے گا تو اس کا بیٹا علم حاصل کرنے کے باوجود کنویں کا مینڈک ہی رہے گا۔

اب مہینوں سے وہ بیٹے کی صورت دیکھنے کو ترس رہا تھا۔ جانتا تھا کہ اب گرمیوں کی چھٹیاں ہونے والی ہیں۔ اس کے باوجود اس سے رہا نہیں گیا۔ تین دن بیٹے کے ساتھ گزارنے کی نیت سے وہ دہلی چلا آیا۔

اور اب اس کا رویہ ایسا تھا کہ وہ بیٹے کو ایک پل کے لیے بھی نظروں سے دور نہ ہونے دیتا۔

شام کو اوتار سنگھ کتابیں لے کر اوپر جانے لگا تو ٹھاکر نے اسے ٹوکا۔ ''کہاں جا رہے ہو پتر؟''

اوتار سنگھ چور سا ہو گیا۔ ''اوپر کوٹھے پر پتا جی۔ وہاں پڑھائی اچھی ہوتی ہے۔''

''پر اب تو امتحان ہو چکے ہیں نا۔ پھر پڑھائی کیسی؟''

''اب بڑی کلاسیں ہیں پتا جی۔ اور میں کلاس کے مقابلے میں ایڈوانس رہنا چاہتا ہوں۔''

ٹھاکر کا سینہ فخر سے چوڑا ہو گیا۔ ''ابھی پڑھائی کو چھوڑو۔ تین دن تو میرے ساتھ گزارو۔''

''ٹھیک ہے پتا جی۔'' اوتار سنگھ نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

ٹھاکر کو فرض شناس اور ذمے دار بیٹے پر پیار آ گیا۔ ''اچھا چلو۔ میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ تم پڑھائی کرنا۔ میں تمھیں دیکھتا رہوں گا۔''

مایوس اوتار سنگھ کے لیے یہ بہت غنیمت تھا۔ دونوں اوپر چلے گئے۔

ابھی آواز کے طلوع ہونے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ اوتار سنگھ تڑپتے ہوئے باپ سے باتیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی اسے احساسِ جرم ہو رہا تھا۔ وہ کتنا خودغرض تھا۔ باپ اس کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے اتنی دور سے آیا تھا اور وہ اس آواز کی وجہ سے اسے ٹال رہا تھا۔

اس نے کتابیں بے پروائی سے رکھ دیں اور باپ کی طرف متوجہ ہوا۔ ''گاؤں کا کیا

حال ہے پتا جی؟''

''ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہے۔'' ٹھاکر نے کہا۔ ''لیکن تم پڑھتے کیوں نہیں؟''

''پڑھ لوں گا پتا جی۔ پہلے آپ سے باتیں تو کر لوں۔ میں بہت مس کر رہا تھا آپ کو۔''

ٹھاکر کا دل خوش ہو گیا۔ لیکن اسے بیٹے کی پڑھائی کا احساس بھی تھا۔ وہ بولا۔ تم پڑھتے رہو۔ میں بس تمھیں دیکھ کر ہی خوش ہو لوں گا۔''

''لیکن میں تو آپ کو نہیں دیکھ سکوں گا۔'' احساسِ جرم کے شکار بیٹے نے کہا۔ ''اور پڑھائی کی کوئی بات نہیں پتا جی۔ امتحان تو ہو چکے ہیں۔''

''ہاں۔ یہ تو ہے۔''

اچانک اوتار سنگھ کو بہت کچھ یاد آ گیا۔ اس کا احساسِ جرم اور بڑھ گیا۔ ارے۔۔۔۔ اس آواز کے چکر میں وہ سب کو۔۔۔ کیسے کیسے محبت کرنے والوں کو بھول گیا۔ اتنے دن اسے کسی کی یاد نہیں آئی، کسی کا خیال نہیں آیا۔ واقعی، یہ تو خودغرضی کی انتہا ہے۔ اسے اماں بھی یاد نہیں آئیں۔

''پتا جی۔۔۔۔ اماں کیسی ہیں۔۔۔۔ چاچا کا کیا حال ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''سب ٹھیک ہیں پتر۔ تمھیں بہت یاد کرتے ہیں۔'' ٹھاکر نے بتایا۔ ''اور تم سناؤ، یہاں کا کیا حال ہے؟''

''سب ٹھیک ہے پتا جی۔ بس مجھے ایک ٹیچر کی ضرورت ہے۔''

ٹھاکر چونکا۔ ''خیریت؟ کانتی پرشاد جی تو ہیں نا۔''

''مجھے عربی پڑھنی ہے پتا جی۔'' یہ کہتے ہوئے اوتار سنگھ اپنے آپ میں چور سا ہو گیا۔ ''اور کم وقت میں عبور حاصل کرنا ہے۔ اس لیے کسی کامل استاد کی ضرورت ہے۔''

ٹھاکر کچھ چونکنا سا ہو گیا۔ ''مگر عربی کیوں پتر؟''

''[illegible] چاہتا ہے میرا۔'' اوتار سنگھ نے سادگی سے کہا۔

ٹھاکر نے چند لمحے سوچا۔ پھر بولا۔ ''یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ میں جانے سے پہلے اس کا بندوبست کر دوں گا۔ مگر اب گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے والی ہیں۔ پھر تم گاؤں چلے آؤ گے۔ کیوں نہ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد کے لیے بات کی جائے۔''

اوتار سنگھ گڑبڑا گیا۔ اب تو وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور پتا جی تین ماہ کی بات کر رہے تھے۔ ''پتا جی، اس بار میں چھٹیاں یہیں گزاروں گا۔''

''کیوں پتر۔۔۔ ایسا کیوں؟'' ٹھاکر نے بوکھلا کر کہا۔

''پتا جی، مجھے عربی شروع سے پڑھنی ہے۔ یوں سمجھیں کہ عربی میں، میں دس سال پیچھے ہوں۔ بہت محنت کروں اور چھٹیوں میں بھی پڑھوں تو کچھ بات بنے گی۔''

ٹھاکر نے شکایتی نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ لیکن پھر اس کی علم کی تڑپ پر پیار آ گیا۔
''تم چھٹیوں میں بھی پڑھنا چاہتے ہو نا؟''
''جی پتا جی۔''
''ٹھیک ہے، یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔'' ٹھاکر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

❁……❁……❁

اوتار سنگھ کی چھٹیوں کے وہ دو مہینے ٹھاکر کے لیے اب بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ وہی ایک عرصہ تو تھا، جس میں اسے بیٹے کی قربت ملتی تھی۔ وہ راجپوت تھا۔ محبت میں بھی آن کا خیال رکھتا تھا۔ وہ خود کو بیٹے پر تھوپتا نہیں تھا۔ ہر وقت اس سے چپکے رہنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ بلکہ وہ تو اس کے اور اپنے درمیان فاصلہ رکھتا تھا۔ لیکن وہ اس کے ہر پل کی خبر رکھتا تھا۔ وہ اسے چپکے چپکے [illegible]۔ اس کے لیے یہ بہت بڑی خوشی تھی کہ اس عرصے میں اس کا بیٹا ہر وقت اس کی نگاہوں [illegible] سامنے رہتا ہے۔ ان دو مہینوں میں وہ رات کو کم..... بہت ہی کم سوتا تھا۔ بعض اوقات تو وہ رات بھر [illegible] سوتے ہوئے بیٹے کو دیکھتا رہتا تھا۔

تو اب وہ اس عرصے کو کھو دینا کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ مگر بیٹے کی بات ٹالنا بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ بیٹھ کر اسی مسئلے پر سوچتا رہا۔ بالآخر اسے اس کا حل مل گیا۔

اگلے روز وہ اسکول گیا اور اس نے پرنسپل کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔
''یہ کوئی بڑی بات نہیں۔'' پرنسپل نے سب کچھ سننے کے بعد مسکراتے ہوئے کہا۔
''مولوی برکت علی عربی میں استادِ کامل ہیں۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے بیٹے کو عربی کی کیا سوجھی۔''
''من موجی ہے سر وہ تو۔ اور علم کی بڑی لگن ہے اسے۔''
''چلیں، ٹھیک ہے۔ میں کل مولوی صاحب کو آپ کی طرف بھیج دوں گا۔''
''ایک مسئلہ اور ہے۔'' ٹھاکر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔
''فرمائیں ٹھاکر صاحب۔''
''اوتار سنگھ گرمی کی چھٹیوں میں بھی پڑھنا چاہتا ہے۔''
''آپ کا مطلب ہے، گاؤں میں .....''
''جی ہاں۔'' ٹھاکر نے کہا۔ پھر جلدی سے بولا۔ ''فیس کا کوئی مسئلہ نہیں۔ جو حکم کریں گے.....''
''میں بات کر لوں گا مولوی صاحب سے۔ میرا خیال ہے، یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں۔'' پرنسپل نے کہا۔

اور واقعی کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ مولوی برکت علی دو ماہ کی چھٹیاں ٹھاکروں کی گڑھی میں

گزارنے کے لیے بخوشی تیار ہو گئے۔

❁ ❁ ❁

مولوی برکت علی نہ صرف باشرع مسلمان تھے۔ بلکہ بہت بڑے عاشق رسولؐ بھی تھے۔ عربی اور فارسی ان کے لیے مادری زبان کی طرح تھیں۔ لیکن عربی سے تو انھیں عشق تھا۔ کیوں نہ ہوتا۔ وہ ان کے محبوبؐ کی زبان جو تھی اور پھر علوم دین کے تمام خزانے اسی زبان میں تھے۔ اللہ نے کیسی عزت، کیسا شرف عطا فرمایا ہے اس زبان کو کہ اپنا کلام پاک بھی اسی زبان میں عطا فرمایا ہے۔

مگر مولوی صاحب کے لیے وہ دور بڑا دکھ دینے والا تھا۔ قدریں بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی تھیں۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ تعلیم کا انداز بدل گیا تھا۔ جب سر سیّد احمد خان نے پہلی بار آواز اٹھائی تھی کہ مسلمانوں کے لیے انگریزی زبان سیکھنا بہت ضروری ہو گیا ہے تو مسلمانوں کا ردعمل بہت منفی تھا۔ سرسیّد کو کیسے کیسے خطابات دیے گئے۔ انگریزوں کا پٹھو، ٹوڈی کہا گیا انھیں۔ انھیں جوتوں کا ہار پہنایا گیا۔ لیکن وہ اپنی جگہ ڈٹے رہے۔ انھوں نے صرف زبان سے نہیں، عمل سے بھی ثابت کیا کہ ان کا موقف درست ہے اور مسلمانوں کی بقا اسی میں ہے۔

شروع میں مولوی برکت علی بھی سرسید کے مخالف تھے۔ مگر پھر بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ جیسے انگریز ہندوستان میں آئے تھے، ویسے ہی دنیا کے بہت سے ملکوں پر قابض ہوئے تھے۔ اس کے نتیجے میں انگریزی کو پوری دنیا میں فروغ حاصل ہوا تھا۔ اب اس زبان میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہریلا اور بے بنیاد پروپیگنڈا ہو رہا تھا..... اور وہ بہت موثر تھا کیونکہ یک طرفہ تھا۔ اس کی تردید کرنے والا، اس کا مدلل جواب دینے والا کوئی نہیں تھا کیونکہ مسلمان تو انگریزی سے ناواقف تھے۔ انھیں معلوم ہی نہیں تھا کہ حضورؐ کے اور اسلام کے خلاف کیسی کیسی ہرزہ سرائیاں ہو رہی ہیں اور تردید نہ ہونے کے نتیجے میں، جہاں انگریزی پڑھی نہ سمجھی جاتی تھی، وہاں اسلام کے متعلق لغو تصورات فروغ پا رہے تھے۔ اسلام کو ظالمانہ دین سمجھا جا رہا تھا۔

سرسیّد نے ایک طرف تو علی گڑھ یونیورسٹی قائم کی اور دوسری طرف انھوں نے اور ان کے رفقاء نے اس مذموم اور جھوٹے پروپیگنڈے کا جواب دینا شروع کیا..... اور وہ بھی منہ توڑ مدلل جواب۔

یہی فرماتے رہے، تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا، توپ سے کیا پھیلا ہے

تب مسلمانوں کو احساس ہوا کہ بے خبری میں ان کے اور ان کے دین کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ جہالت کی دھند چھٹنے لگی۔

پھر قرآن پاک کا انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں میں ترجمے کا سلسلہ شروع ہوا۔
جاہل مولویوں نے اس پر بڑا واویلا مچایا، فتوے لگائے۔ لیکن مولوی برکت علی کو ہوش آ گیا۔ وہ تو ہر چیز کو قرآن پاک کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے تھے اور قرآن میں اللہ نے جگہ جگہ فرمایا تھا کہ یہ قرآن سراسر ہدایت ہے تمام انسانوں کے لیے..... روشنی ہے پوری انسانیت کے لیے۔ تو پھر یہ مسلمانوں کا فرض نہیں کہ قرآن کو تمام انسانوں تک پہنچانے کا اہتمام کریں؟ اس زبان میں اللہ کے اس پیغام کو منتقل کر کے پہنچائیں، جو زبان لوگوں کی ہو۔ تو یہ دوسری زبانوں میں قرآن کا ترجمہ گناہ نہیں، فرض ہے اور فرض کو پورا نہ کرنا گناہ۔

دوسری بات مولوی برکت علی نے قرآن سے یہ سمجھی کہ کسی زبان سے نفرت کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ اللہ نے سورۃ الرحمٰن میں فرمایا ہے۔ ہم نے انھیں بولنا سکھایا۔ گویا دنیا میں جتنی بھی زبانیں بولی جاتی ہیں، سب اللہ نے ہی انسان کو سکھائی ہیں۔

سرسید کی تحریک کامیاب رہی۔ دشمنانِ اسلام کو پہلی بار احساس ہوا کہ ان کی لغو اور بے بنیاد باتوں کو بآسانی رد کیا جا سکتا ہے اور اتنی آسانی سے رد کیے جانے کے نتیجے میں ان کی پوزیشن خراب ہو رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ محتاط ہوئے اور ان کی ہرزہ سرائیاں محدود ہوئیں۔ ترجمے کے نتیجے میں قرآن پاک اور اسلامی لٹریچر دنیا بھر میں پہنچا اور ہزاروں انسانوں نے اللہ کی ہدایت سے استفادہ کیا۔ وہ صحیح معنوں میں احیائے اسلام کی تحریک تھی۔

خود مولوی برکت علی نے بڑے ذوق وشوق سے انگریزی سیکھی۔ تب ان کی آنکھیں کھلیں کہ دشمنانِ اسلام غیر جانب دار لوگوں کے سامنے اسلام کا کتنا خراب امیج بنا رہے تھے۔

لیکن مسلمانوں میں ایک خرابی ہے..... بھیڑ چال کی۔ وہ آنکھیں بند کر کے ایک راستے پر چلتے ہیں تو چلتے ہی جاتے ہیں۔ انھوں نے انگریزی کو قبول کیا تو اس کے ساتھ انگریزی کلچر کی تقلید اندھا دھند کرنے لگے۔ شعار میں انگریزوں کی نقالی ہونے لگی۔ عربی کو غیر ملکی زبان سمجھ لیا گیا۔ جو تعلیم ضروری سمجھی جاتی تھی، اسے غیر ضروری سمجھ لیا گیا۔ وہ انگریزی پڑھنے کا بنیادی مقصد اور غرض وغایت بھول گئے۔ اس کے نتیجے میں وہ خود دین سے دور ہونے لگے۔

مولوی برکت علی جلنے کڑھنے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔ ان کے اپنے لیے روزگار کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ چار ٹیوشن پکڑ لیتے تو کشادگی کے ساتھ گزر بسر ہو سکتی تھی۔ یہ اسکول بہت بڑا تھا۔ اس لیے یہاں پھر بھی عربی کے اسٹوڈنٹ موجود تھے۔ ورنہ عام اسکولوں میں تو عربی کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہی ہو چکا تھا۔

ایسے میں پرنسپل صاحب کی وساطت سے انھیں اس ٹیوشن کی آفر ہوئی تو وہ افسردہ بھی ہوئے، خوش بھی اور متجسس بھی۔ انھیں بتایا گیا کہ عربی پڑھنے کا یہ شوقین طالب علم راجپوت ہے۔ یہ ان کے لیے عبرت کی بات تھی۔ افسردگی کی بات تھی کہ کسی مسلمان بچے [illegible] تو یہ [illegible] نہیں ہوا۔

ایک ہندو عربی پڑھنا چاہتا ہے، اس پر انھیں خوشی بھی ہوئی۔ مگر ان کا تجسس بہت بڑا تھا۔ ایک ہندو کو عربی پڑھنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ بہرحال انھوں نے اس پیشکش کو قبول کر لیا۔

چھٹیاں شروع ہونے سے ایک دن پہلے وہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ اور اوتار سنگھ سے ملے۔ ٹھاکر نے ان سے فیس کے بارے میں استفسار کیا تو وہ بولے۔ ''فیس کی کوئی بات نہیں۔ جو آپ خوشی سے دیں گے، میرے لیے بہت کافی ہوگا۔''

ٹھاکران کے اس جواب سے بہت متاثر ہوا۔ ''تو آپ گرمی کی چھٹیاں ہمارے ساتھ گزاریں گے؟''

''جی ہاں۔ لیکن پہلے میں برخوردار سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور۔''

مولوی صاحب نے اوتار سنگھ کو بہت غور سے دیکھا۔ وہ انھیں بہت اچھا لگا۔ اس کی کشادہ پیشانی غیر معمولی طور پر روشن تھی۔ آنکھیں بے حد چمک دار اور متجسس اور اس کے چہرے پر عجیب سی پاکیزگی تھی۔ وہ انھیں متوقع نظروں سے دیکھ رہا تھا، جیسے ان کی پوچھ گچھ کا منتظر ہو اور لگتا تھا کہ وہ ڈر رہا ہے کہ کہیں وہ اسے منع نہ کر دیں۔

''بیٹا..... آپ کو اچانک یہ خیال کیوں آیا کہ آپ کو عربی پڑھنی چاہیے۔'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

وہ ٹپٹا گیا۔ ''جی..... وہ..... بس میرا دل چاہتا ہے عربی پڑھنے کو۔''

''بغیر کسی وجہ کے؟''

''جی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کو زیادہ سے زیادہ زبانیں سیکھنی چاہئیں۔'' اس بار اوتار سنگھ نے اعتماد سے کہا۔

مولوی صاحب کے لیے یہ جواب تسلی بخش تھا۔ لیکن ابھی ان کے پاس ایک اعتراض اور موجود تھا۔ ''تو یہ کام اسکول کھلنے کے بعد بھی ہو سکتا تھا۔ گرمی کی چھٹیوں میں ہی کیوں؟ اب تم دس ماہ بعد گھر جاؤ گے۔ وہاں لوگوں سے ملنے جلنے، کھیلنے کودنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے گا؟''

''جی میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں جلد سے جلد عربی پر دسترس حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''برخوردار، میں آپ کو بتا دوں کہ عربی جلد بازی میں سیکھی جانے والی زبان نہیں۔''

مولوی صاحب کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ''دنیا میں سب سے سخت اور منضبط قواعد اس زبان کی ہے۔ اسے سرسری طور پر نہیں پڑھا جا سکتا اور یہ دو ماہ کا کام نہیں۔ برسوں لگیں گے اس میں۔'' اور یہ بڑی محترم زبان ہے۔''

''میں شاید اپنی بات واضح نہیں کر سکا۔'' اوتار سنگھ نے بے حد عاجزی سے کہا۔ ''میں

بس بہت بے تاب ہوں۔ میرے اندر بڑی لگن ہے اس کے لیے۔''

مولوی صاحب کے چہرے پر نرمی چھا گئی۔ یہ بے تابی تو انھوں نے پہلے ہی دیکھ لی تھی۔ انھیں احساس ہو رہا تھا کہ انھیں ایک مثالی شاگرد مل رہا ہے۔ ''ٹھیک ہے اوتار سنگھ، ہم بھی آپ کو پوری لگن سے پڑھائیں گے۔''

''تو کل آپ ہمارے ساتھ چل رہے ہیں؟'' ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔

''جی ہاں انشاء اللہ۔ میں کل صبح اپنا ضروری سامان لے کر یہاں آ جاؤں گا۔'' مولوی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

ٹھاکر نے جیب سے کچھ رقم نکالی اور گن کر ان کی طرف بڑھائی۔

مولوی صاحب نے نوٹوں کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ ''یہ کیا؟'' انھوں نے پوچھا۔

''چار سو روپے آپ کی دو ماہ کی فیس اور یہ دو سو روپے ضروری کتابوں، لغات وغیرہ کی خریداری کے لیے۔''

مولوی صاحب مسکرائے۔ ''جو رقم میں نے ابھی کمائی نہیں، وہ کیسے لے لوں۔'' انھوں نے کہا۔ ''فیس تو میں مہینہ پورا ہونے کے بعد لوں گا۔ ہاں کتابوں کے پیسے دے دیجیے۔ وہ میں آج خرید لوں گا۔''

ٹھاکر مسکرا دیا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ میرے بیٹے کو آپ سا استاد ملا۔''

❁.......❁.......❁

پڑھائی شروع ہوئی تو مولوی برکت علی کو صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ انھیں کیسا شاگرد ملا ہے۔ ان کی زندگی درس و تدریس میں گزری تھی۔ انھیں بہت اچھے، علم کی لگن رکھنے والے، محنتی شاگرد بھی ملے تھے، جن پر وہ آج بھی فخر کرتے تھے۔ مگر وہ سب اس شاگرد کے سامنے ہیچ تھے۔ وہ حصول علم کے لیے پڑھتے تھے۔ لیکن یہ لڑکا تو جیسے پڑھتا نہیں تھا۔ یہ تو عربی سے عشق کرتا تھا۔ وہ پڑھاتے اور وہ والہانہ انداز میں سنتا۔ ذہن اس کا ایسا تھا، یا پھر یہ عشق کا کمال تھا کہ انھیں کبھی کوئی بات دہرانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ جو سنتا، اسے ذہن نشین کر لیتا۔

سو زبانِ رسولؐ سے عشق کرنے والے مولوی برکت علی کو اپنے اس شاگرد سے محبت ہو گئی۔ مگر وہ متجسس تھے۔ عربی زبان سے اس ہندو لڑکے کی محبت ان کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ یہ اسے کیسے ہو گئی، کہاں سے مل گئی؟ ان کے پاس اس سوال کا اس کے سوا کوئی جواب نہیں تھا کہ یہ بس اللہ کی عطا ہے۔ وہ جسے چاہے نواز دے۔ کبھی کبھی انھیں خیال آتا کہ یہ لڑکا مسلمان ہوتا تو یقیناً اسے بڑا مرتبہ ملتا۔

وہ شہر کے رہنے والے تھے۔ گڑھی کو دیکھ کر انھیں حیرت ہوئی۔ وہاں ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی حیثیت بادشاہ جیسی تھی اور اوتار سنگھ گویا کوئی شہزادہ تھا۔ لیکن ان دونوں کے ہی مزاج میں

حاکمیت نہیں تھی۔ ٹھاکر کا دبدبہ تھا۔ سب اس سے ڈرتے تھے۔ لیکن وہ کبھی کسی پر حکم نہیں چلاتا تھا۔ اور اوتار سنگھ کو تو پڑھنے کے سوا کسی چیز سے غرض نہیں تھی۔

مولوی صاحب کو عربی پڑھانے کا شوق تھا۔ لیکن اوتار سنگھ کا عربی پڑھنے کا شوق ان سے کہیں زیادہ تھا۔ ایک ہفتے میں یہ نوبت آ گئی کہ وہ پڑھانے سے تھکنے لگے۔ لیکن لڑکا کسی جن کی طرح آ دھمکتا۔ وہ تو جیسے تھکتا ہی نہیں تھا۔

ایک ہفتے میں مولوی صاحب نے اسے اتنا پڑھایا تھا کہ ذہین ترین شاگرد کو وہ پڑھنے میں ایک ماہ لگتا۔ انھیں اس کی رفتار غیر فطری لگی۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ایسا شوق تیزی سے ختم بھی ہو جاتا ہے اور یہ وہ نہیں چاہتے تھے۔ پھر یہ بھی ان کی ذمے داری تھی کہ دیکھیں کہ پڑھایا ہوا اسے ہضم بھی ہوا ہے یا نہیں اور وہ اس سرکش تیز رفتار دریا کے سامنے بند بھی باندھنا چاہتے تھے۔

چنانچہ دسویں دن انھوں نے اسے پڑھانے کے بجائے اس کا ٹیسٹ لینے کا فیصلہ کیا۔

''میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ جو کچھ پڑھا ہے، وہ تمھارے اندر اترا بھی ہے یا نہیں۔'' انھوں نے اس سے کہا۔ ''میں امتحانی پرچا بناتا ہوں۔ اسے حل کر کے دکھاؤ۔''

اوتار سنگھ اعتراض کرنا جانتا ہی نہیں تھا۔ وہ تو سراپا سپردگی تھا۔

مولوی صاحب نے بڑا طویل پرچا بنایا۔ جو کچھ پڑھایا تھا، وہ سب کچھ اس میں موجود تھا۔ اتنے طویل تو امتحانی پرچے بھی نہیں ہوتے۔

وہ پرچا اسے تھما کر وہ مطمئن ہو گئے اور اطمینان سے پاؤں پھیلا کر لیٹ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ اب اس دن کے لیے فرصت ہی فرصت ہے۔ دس دن میں پہلی بار انھوں نے سکون سے پاؤں پھیلائے تھے۔ ان پر غنودگی طاری ہو گئی۔

نجانے کتنی دیر ہوئی۔ غنودگی میں انھیں احساس ہوا کہ کوئی ان کے پاؤں دبا رہا ہے۔ ہاتھوں کا لمس جانا پہچانا تھا۔ ان کا یہ شاگرد ہر اعتبار سے عجیب تھا۔ پہلی رات سے اس نے معمول بنا لیا تھا کہ وہ سونے کے لیے لیٹتے تو وہ ان کے پاؤں دباتا۔ انھیں نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کب ان کے کمرے سے گیا کیونکہ اس وقت تک وہ سو چکے ہوتے۔

تو اس وقت غنودگی کے عالم میں انھیں یہی خیال ہوا کہ یہ رات کا وقت ہے۔ وہ سونے کے لیے لیٹے ہیں اور اوتار سنگھ ان کے پاؤں دبا رہا ہے۔ مگر کچھ دیر کے بعد انھیں یاد آیا کہ انھوں نے تو اسے پرچا بنا کر دیا تھا.... ایسا پرچا، جسے حل کرنے میں دو دن لگتے۔

شاید کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ اٹھ بیٹھے۔ ''کیا بات ہے اوتار سنگھ۔ کچھ مشکل ہو رہی ہے۔'' انھوں نے ننداسی آواز میں پوچھا۔

''نہیں مولوی صاحب۔''

''تو پھر کام کیوں نہیں کرتے؟''

"جی ... کام تو میں نے کرلیا ہے۔"

مولوی صاحب کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ غنودگی ہوا ہوگئی۔ "دکھاؤ مجھے۔" انھوں نے کہا۔

اوتار سنگھ نے کاپی ان کی طرف بڑھادی۔

مولوی صاحب نے کام چیک کرنا شروع کیا اور حیران رہ گئے۔ کہیں کوئی غلطی نہیں تھی اور اس نے پورا پرچا حل کرلیا تھا۔

مولوی صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ اس لڑکے میں کوئی بات ہے ... بھڑک کر تیز جلنے والے چراغ جیسی، جو جلدی بجھ بھی جاتا ہے۔ وہ تشویش میں پڑ گئے۔ ان کا باندھا ہوا بند بھی اسے روکنے میں ناکام رہا تھا۔ تو اب اور کیا کریں؟ پھر انھوں نے سوچا کہ یہی طریقہ کافی ہے۔ بس اس کی رفتار کم کرنی ہوگی۔

اس کی حوصلہ شکنی کرنا زیادتی ہوتی بلکہ اس کی تو حوصلہ افزائی ضروری تھی۔ چنانچہ انھوں نے کہا۔ "شاباش اوتار سنگھ۔ تم ہونہار اور قابلِ فخر شاگرد ثابت ہورہے ہو۔ لیکن ایک کمی ہے تمھارے اندر؟"

اوتار سنگھ نے کچھ نہیں کہا۔ بس انھیں مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

"رائٹنگ کی طرف توجہ دو۔ تحریر کی خوبصورتی بھی بہت اہم ہے۔" یہ کہتے ہوئے مولوی صاحب کو خود احساس ہوا کہ وہ زیادتی کررہے ہیں۔ مگر یہ ضروری تھا۔ "کام کرتے ہوئے کبھی جلدی نہ کرو۔ ہاتھ روک کر لکھو۔ خوب سوچ کر جواب دو۔ کام میں خوبصورتی ہونی چاہیے۔"

"جی مولوی صاحب۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔"

مولوی صاحب کو ادراک ہوگیا کہ اب وہ مزید پڑھانے کی فرمائش کرنے والا ہے۔ اس سے پہلے ہی انھوں نے کہا۔ "تم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ اب تم جاؤ۔ آج کی چھٹی۔ اب کل پڑھیں گے۔"

اوتار سنگھ ہچکچایا اور با دلِ نخواستہ اٹھ گیا۔

لیکن مولوی صاحب عصر پڑھ کر بیٹھے ہی تھے کہ وہ پھر آ گیا۔ یہ بھی ایک عجیب بات تھی۔ عصر اور مغرب کے درمیان اس کی عجیب کیفیت ہوتی تھی۔ اور وہ اس وقت میں لازمی طور پر ان کے پاس آتا تھا۔ اس وقت میں وہ کھویا کھویا رہتا تھا۔ لگتا تھا، ہمہ تن سماعت ہے۔ کہیں دور کی کوئی آواز سن رہا ہے۔

"کیسے آئے اوتار سنگھ؟" مولوی صاحب نے بڑی بے رخی سے کہا۔

"یونہی مولوی صاحب ..."

"میں نے کہا تھا ناکہ آج کی چھٹی۔"

"میں پڑھنے نہیں آیا۔ کچھ سنائیں مجھے عربی میں۔"

شام کے اس وقت میں وہ ہمیشہ یہی فرمائش کرتا تھا۔ مولوی صاحب کو پہلے دن اس کا اس وقت آنا بہت گراں گزر رہا تھا کیونکہ وہ ان کی تلاوتِ قرآن پاک کا وقت تھا۔ وہ بہت جھنجلائے۔ پھر انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ بلند آواز میں قرآن پڑھا جائے۔ اپنا معمول بھی پورا ہوجائے گا اور شاگرد کی فرمائش بھی۔ اس خیال پر پہلے تو وہ ڈرے۔ وہ ایک راجپوت کے گھر میں تھے۔ مگر پھر انھوں نے سوچا کہ یہ کیسے پتا چلے گا کہ وہ قرآن پڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ وہ قرآن سنانے بیٹھ گئے۔ پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔

اس وقت بھی انھوں نے قرآن پاک کی تلاوت شروع کردی۔

مولوی برکت علی حافظ قرآن بھی تھے۔ بڑی خوبصورت قرات کرتے تھے۔ قرات کرتے کرتے ان پر کیفیت طاری ہوجاتی۔ تاہم اس کیفیت سے پہلے وہ اوتار سنگھ کو بہت غور سے دیکھتے۔ اس کے چہرے پر انہماک ہوتا۔ آنکھیں کسی غیر مرئی شے پر جمی ہوتیں اور ان میں چمک ہوتی۔ مگر اسے دیکھ کر احساس ہوتا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ کہیں اور بیٹھا، کچھ اور سن رہا ہے۔

اس روز بھی اسے دیکھتے دیکھتے ان پر کیفیت طاری ہوگئی۔

❀ ... ❀ ... ❀

گرمی کی چھٹیوں کے لیے دہلی سے روانہ ہوتے وقت اوتار سنگھ کا عجیب حال تھا۔

آخری رات وہ بہت دیر تک کوٹھے پر بیٹھا۔ وہ پورے چاند کی رات تھی۔ ہر چیز چاندنی میں نہائی ہوئی اور روشن روشن تھی۔ وہ بہت اداس تھا۔ دو ماہ کی جدائی کا خیال روح فرسا تھا۔ اس شام اس نے وہ آواز سنی اور سوچا کہ اب وہ دو ماہ تک یہ آواز نہیں سن سکے گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اداسی اس کے وجود میں تیر گئی۔ دو ماہ ... ساٹھ دن! یہ تو بہت بڑا عرصہ ہے۔ کون جانے، اس عرصے میں کیا ہوجائے۔

پھر اسے خود بھی اس بات پر حیرت ہوئی کہ جس کے لیے وہ تڑپ رہا ہے، جس کی جدائی سے وہ ڈر رہا ہے، وہ اس سے کبھی نہیں ملا ہے۔ نہ کبھی اسے دیکھا ہے۔ اس رات اس نے پہلی بار یہ سوچا کہ اگر وہ بدصورت ہوئی تو کیا ہوگا۔

اس پر وہ دیر تک سوچتا رہا۔ بنیادی طور پر وہ حسن پرست تھا۔ خوبصورتی کسی بھی شکل، کسی بھی روپ میں ہو، اسے بہت زیادہ متاثر کرتی تھی۔ کوئی حسین منظر دیکھتا تو اس کی آنکھیں خود بخود بھیگ جاتیں۔ اندر عجیب سی کیفیت ہوجاتی۔ پھر وہ اندر سے بھی بھیگ جاتا۔ اس کے اندر ستائش، بے پایاں ستائش ابھرتی ... اس منظر کے خالق کے لیے، جس نے وہ خوبصورتی پیدا کی۔ پھر وہ شکر ادا کرتا۔ زندگی دینے والے کا۔ اگر اسے زندگی نہ ملی ہوتی تو وہ یہ خوبصورت کیفیت کا اسے کیسے تجربہ ہوتا۔ سب قیمتی زندگی کے ہی دم سے تو ہیں۔ زندگی نہیں تو کسی نعمت سے اس کا کیا

واسطہ۔

پہلے اس نے اس پر سوچا ..... اور ایک لمحے میں اپنے اس خیال کو پوری شدت سے مسترد کر دیا۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ جس کی آواز اتنی خوبصورت ہے، وہ بدصورت نہیں ہو سکتی۔ مگر پھر اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی اس محبت کی بنیاد اس امکان پر رکھ رہا ہے کہ وہ اپنی آواز کی ہی طرح خوبصورت ہوگی۔ جبکہ یہ امکان ہے، یقینی امر نہیں۔ اسے لگا کہ وہ کسی بہت بڑے محل کی بنیاد پانی پر رکھ رہا ہے۔

پہلے تو یہ سوچنا ضروری تھا کہ وہ محبت ہے بھی یا نہیں۔ پہلے تو یہ خیال اسے بے حد توہین آمیز لگا۔ مگر پھر اس کی اہمیت اس کی سمجھ میں آئی۔ اس نے شاعری کی مدد سے اور اپنے خیالات اور تصورات کی بنیاد پر جو محبت کا خاکہ بنایا تھا، یہ اس کا جذبہ اس پر پورا اترتا تھا۔ اس میں بے تابی تھی، تڑپ تھی، پاکیزگی تھی اور صورتِ حال کیسی ہی ہو..... اور چاہے تکلیف ہو، اس میں بھی خوبصورتی تھی۔ اب اس وقت کے جدائی کے دکھ ہی کو لے لو۔ یہ بھی خوبصورت ہے۔ اس سے دور جانے کے خیال سے جو اذیت ہوتی ہے، اس میں بھی خوبصورتی ہے۔ نہیں بھئی۔ یہ تو سراسر محبت ہے۔ اس نے طمانیت سے سوچا۔ میرا جی تو چاہتا ہے کہ اس آواز والی کو دیکھوں۔ مگر دیکھنے کی ایسی تڑپ نہیں کہ پاگل کر دے۔

سوال وہی تھا کہ اگر وہ بدصورت ہوئی تو کیا اس کے محسوسات، اس کے جذبات یہی رہیں گے اور یہ بڑا مشکل سوال تھا۔ ایک دلیل اس کے حق میں تھی۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے بھی تڑپا نہیں تھا۔ اس نے کبھی چھپ کر اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گویا اس کی صورت شکل کی اتنی اہمیت نہیں تھی۔

بہرحال بہت سوچنے پر بھی اسے اس کا حتمی جواب نہیں مل سکا۔ اس نے سوچا کہ یہ فکر بے کار ہے۔ اس کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کرے گا۔ جب وہ اسے دیکھے گا۔ اگر وہ بدصورت ہوئی اور اس کا جذبہ اسے دیکھنے کے بعد کمتر ہو گیا تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ محبت نہیں ہے اور ایسا ہوا تو اسے بہت دکھ ہوگا۔ وہ صدمہ ہوگا اس کے لیے۔

اس دوران اس کی حقیقت پسندی نے اسے یہ احساس بھی دلایا تھا کہ وہ ایک کم عمر لڑکا ہے، جو محبت کے بارے میں محض نظریات قائم کیے بیٹھا ہے۔ یہی نہیں، وہ محبت کا متمنی بھی ہے۔ گویا وہ ایک ایسا نوجوان ہے، جسے محبت سے محبت ہے۔ جو پہلا موقع ملنے پر ہی کسی سے بھی محبت کر سکتا ہے۔ یہ خیال بھی کچھ حوصلہ افزا نہیں تھا۔

بہر کیف دہلی میں اس آخری رات وہ ایک پل کے لیے بھی نہیں سویا۔ اسے ڈر تھا کہ صبح روانگی کے وقت وہ رو پڑے گا۔ اور یوں شاید اس کا بھید کھل جائے۔ لیکن روانگی کا وقت آیا تو اس کی کیفیت بالکل مختلف تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ خوش ہے اور اس خوشی کا سبب مولوی

برکت علی تھے۔ یہ خیال تھا کہ وہ دور جا رہا ہے۔ لیکن وہاں وہ اجنبی زبان سیکھ سکے گا، جو اس کی محبت کی زبان ہے۔ پھر ایک دن آئے گا کہ وہ اس کی بات سمجھ سکے گا۔ یہ کم خوشی کی بات نہیں۔ یہ تو مولوی صاحب نے اسے بتا دیا تھا کہ عربی بڑی مشکل زبان ہے۔ کوئی بات نہیں۔ میری محبت، میری لگن، میری تڑپ اس مشکل کو آسان کر دے گی۔

دہلی سے نکلتے ہی وہ گھر پہنچنے کے لیے تڑپنے لگا۔ پڑھائی جو شروع کرنی تھی۔

پڑھائی شروع ہوئی تو اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ اب جیسے عربی پڑھنے اور سیکھنے کے سوا دنیا میں اس کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہی اس کے لیے وصالِ یار تھا اور وہی عبادت۔ پہلی بار جب اس نے مولوی صاحب کو عربی بولتے سنا تو اسے ان سے محبت ہو گئی۔ اس نے سوچا، یہ اس کے لیے کتنا بڑا کام کر رہے ہیں۔ اسے محبوب کی بات سمجھنے کے قابل بنا رہے ہیں۔ اس خدمت کا تو کوئی صلہ ہو ہی نہیں سکتا۔

پھر گڑھی میں پہلی شام آئی ..... وہ وقت جب وہ کوٹھے پر جاتا تھا..... وہ آواز سنتا تھا۔ وہ وقت آیا تو وہ بے تاب ہو گیا۔ وہ اپنے کمرے سے نکلا۔ کوٹھے پر لے جانے والے زینے کی طرف بڑھنے کے لیے۔ لیکن وہ تو وہاں تھا ہی نہیں۔ وہ گڑھی میں تھا، دہلی میں نہیں۔ اس کی بے تابی وحشت میں بدل گئی۔ اس کا جی چاہا کہ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ دیوار سے سر ٹکرائے۔ بس ایسا ہو جائے کہ وہ آنکھیں بند کرے اور کھولے تو وہ دہلی میں ہو ..... اس کوٹھے پر۔ اور وہ آواز سورج کی طرح طلوع ہو..... پھر دھوپ کی طرح پھیلتی ..... چڑھتی جائے۔ یہاں تک کہ ہر چیز پر چھا جائے۔ دنیا میں کچھ بھی نہ رہے اس کے سوا۔

اس وحشت میں بھی اسے احساس تھا کہ یہ ان ہونی ہے۔ وحشت سے فاصلے نہیں مٹتے۔ وحشت تو حد درجہ بے بسی کا ردِ عمل ہے..... بے بسی کی آخری حد، جس کو پہنچ کر آدمی نقصان تو اٹھا سکتا ہے، دوسروں کو نقصان پہنچا بھی سکتا ہے۔ لیکن جو وہ چاہتا ہے، وہ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ مگر اس احساس میں بھی کوئی تسلی نہیں تھی۔ اس نے جان لیا کہ یہ وحشت دور کرنا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔

اسے احساس بھی نہیں ہوا اور وہ اس کمرے کی طرف چل دیا، جو مولوی صاحب کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ بس ایک اندھی، گونگی، بہری خواہش تھی جو طوفان کی طرح اس کے اندر امنڈ رہی تھی..... اسے دہلی جانا ہے، وہ آواز سننی ہے۔

مولوی صاحب اپنے کمرے میں کھڑے کسی کپڑے کو تہ کر رہے تھے (اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ جاء نماز ہے) انھوں نے چونک کر اسے دیکھا ..... اور دیکھتے رہ گئے شاید اس کے چہرے پر انھیں اس کے اندر امنڈنے والے طوفان کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔

”کیا بات ہے اوتار سنگھ؟“ انھوں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

اوتار سنگھ کے اندر بے تابی کی آگ بھڑک رہی تھی۔ لفظ اسے مل ہی نہیں سکتے تھے۔ ''وہ مولوی صاحب... عربی... ''اس نے بمشکل کہا۔

مولوی صاحب کے چہرے پر سرد مہری اور بے رخی کی سختی ابھر آئی۔ تاہم انھوں نے لہجے کو سخت نہیں ہونے دیا۔ ''میں نے تمھیں صبح ہی بتا دیا تھا بیٹے کہ پڑھائی ٹائم ٹیبل کے مطابق ہوگی اور یہ کہ پڑھانے والا میں ہوں۔ ہر فیصلہ میرا ہوگا۔''

لہجہ نرم تھا۔ لیکن لفظ بہت سخت تھے اور ان میں قطعیت تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اوتار سنگھ میں آگے بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ لیکن اس وقت تو وہ ایک ٹرانس میں تھا۔ یہی بہت بڑی بات تھی کہ اس وحشت میں بھی وہ حفظ مراتب کو نہیں بھولا۔ حد ادب اسے یاد رہی۔ ''جی مولوی صاحب، مجھے یاد ہے۔'' اس نے بھڑکتی آواز میں کہا۔ ''لیکن.....''

''لیکن کیا؟''

''میں پڑھنے نہیں آیا ہوں۔ آپ مجھے عربی میں کچھ سنا دیجیے..... شاعری... کوئی کہانی..... کچھ بھی۔''

مولوی صاحب کے لیے وہ فرمائش خلاف توقع تھی۔ ''لیکن ابھی تم اس قابل کہاں ہو کہ عربی میں کچھ سمجھ سکو۔ ابھی تو تم نے پورے حروف بھی نہیں پڑھے ہیں۔''

''بس آپ مجھے سنا دیجیے کچھ۔ آپ کی مہربانی ہوگی مجھ پر۔''

چند لمحے کے لیے مولوی صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ پھر انھوں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں سناتا ہوں۔ مگر ادب سے سننا۔ کوئی آواز نہ ہو۔''

''جی مولوی صاحب۔''

اور مولوی صاحب نے پڑھنا شروع کر دیا۔

جیسے ہی وہ اجنبی الفاظ اوتار سنگھ کے کان میں پڑے، اس کے اندر کا منظر دھیرے دھیرے بدلنے لگا۔ اندر بھڑکتی ہوئی وحشت کی آگ آہستہ آہستہ سرد ہونے لگی۔ بے تابی سکون میں بدلنے لگی۔ تڑپ ختم ہوتی گئی اور اس کی جگہ سپردگی نے لے لی۔ اندر کا ہی نہیں، باہر کا منظر بھی بدلنے لگا۔ وہ کمرا غائب ہو گیا۔ اب اس کی جگہ بے کراں صحرا تھا..... متحرک صحرا، جو آگے بڑھتا ہوا کہیں اور جا رہا تھا۔ پھر صحرا تھم گیا۔ اب وہ خود متحرک تھا۔ چند لمحے بعد اسے دہلی کی جامع مسجد کے مینار نظر آئے..... اور اگلے ہی لمحے وہ اس کوٹھے پر تھا، جو اس آواز سے معمور تھا اور اب وہ پوری طرح پرسکون تھا..... اور وہ آواز سن رہا تھا، جو لگتا تھا کہ پوری کائنات پر چھائی ہوئی ہے۔

اسے دبا دبا سا سہی، مگر یہ احساس تھا کہ وہ اپنی حویلی میں، مولوی صاحب کے کمرے میں ہے۔ اور جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے، حقیقت نہیں، تصور ہے۔ مگر وہ اتنا حقیقی لگ رہا تھا کہ اس نے زور زور سے آنکھیں مل کر دیکھا۔ اصولاً کوٹھے کے اس منظر کو ہٹ جانا تھا اور مولوی صاحب کے

کمرے کو نظر آنا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تو کیا میں سچ مچ اس کوٹھے پر ہوں۔ اس نے خود سے پوچھا۔ مولوی صاحب اور ان کا کمرا نظر نہیں آ رہا ہے اور تو اور مولوی صاحب کی آواز بھی نہیں ہے۔ یہ تو وہی آواز ہے۔ لیکن اس کے ذہن کا ایک چھوٹا سا حصہ اس کی تردید کر رہا تھا۔

چند لمحے اور گزرے تو اس نے خود کو اس رو کے سپرد کر دیا۔ اب کہیں کوئی خیال، کوئی احساس نہیں تھا۔ بس وہ کوٹھے پر بیٹھا وہ آواز سن رہا تھا۔

اس کیفیت میں جیسے زمانے گزر گئے۔ پھر اچانک ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ وہ آواز معدوم ہو گئی تھی۔ کائنات جیسے تھم گئی اور وہ بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔

پھر جیسے پرسکوت جھیل میں کوئی چھوٹا سا کنکر گر کر اسے متلاطم کر دیتا ہے، اس کی سماعت کو ایک آواز نے جھنجوڑ دیا۔ ''اوتار سنگھ۔''

اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ مولوی صاحب تھے۔ مگر وہ خود ابھی تک اس سحر انگیزی میں گرفتار تھا۔ مولوی صاحب کا کمرا نظر آیا تو اسے اچھا نہیں لگا۔ وہ خاموشی سے، کھوئی کھوئی آنکھوں سے انھیں تکتا رہا۔

''اب تم جاؤ۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔''

''اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بس وہ اٹھ کر کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل آیا۔

اس شام وہ مولوی صاحب کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے مولوی صاحب سے ایسی محبت محسوس ہو رہی تھی کہ اس نے آواز والی کے سوا کسی سے نہیں کی تھی۔ وہ بار بار سوچتا کہ آج مولوی صاحب نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ وہ تو اس کوٹھے پر پہنچنے کی لگن میں پاگل ہو جاتا۔

پھر وہ اپنی اس کیفیت کے بارے میں سوچنے لگا۔ مولوی صاحب جب پڑھ رہے تھے تو وہ کتنا پرسکون، کتنا شانت ہو گیا تھا۔ اور مولوی صاحب بالکل اس نیچے والی لڑکی کے انداز میں پڑھ رہے تھے۔ پھر کیا ہوا کہ آواز کا فرق مٹ گیا۔ وحشت ختم ہو گئی اور وہ پرسکون ہو گیا۔

تو کیا یوں ہے کہ اہمیت آواز کی نہیں۔ آواز تو محض ایک وسیلہ، ایک بہانہ ہے۔ تو کیا یوں ہے کہ اصل اہمیت الفاظ کی ہے، جنھیں وہ سمجھتا نہیں، نفس مضمون کی ہے، جس کا مفہوم وہ نہیں سمجھتا، پھر بھی وہ اس پراثر انداز ہوتے ہیں۔ تو وہ کیسے لفظ ہوں گے۔ وہ کیسا مضمون ہوگا، جو سمجھ میں نہ آنے پر بھی آدمی کی دنیا بدل دے!

بات بہت بڑی، مگر بہت آسان تھی۔ کم از کم اس کے لیے کیونکہ وہ بچپن ہی سے سوچنے اور تجزیہ کرنے کا عادی تھا۔ لیکن آنکھوں پر محبت کا رنگ چڑھ جائے تو سامنے کی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی۔ شاید ابھی وہ اس بڑی بات کے لیے بہت چھوٹا تھا۔

بلکہ اصل بات شاید یہ تھی کہ ابھی سمجھنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ سمجھنے کا بھی تو ایک وقت مقرر ہے۔

بہرحال اوتار سنگھ کی سمجھ میں یہ ضرور آ گیا کہ مولوی صاحب اسے وہ کچھ دے رہے ہیں اور دینے والے ہیں، جو بہت بڑا ہے، جو کوئی کسی کو نہیں دیتا اور اس کے صلے میں وہ جو کم سے کم انھیں دے سکتا ہے، محبت ہے اور محبت تو اسے ان سے خود بخود ہو گئی تھی۔

وہ آواز کو بھول کر مولوی صاحب کی محبت میں سرشار ہو گیا۔ رات کو وہ مولوی صاحب کے کمرے میں گیا۔ وہ سونے کے لیے لیٹے ہی تھے۔ مگر شاید اجنبی جگہ ہونے کی وجہ سے انھیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ پہلی بار وہ اپنی بیوی اور بچوں سے دور ہوئے تھے۔۔۔ اس کی وجہ سے۔ انھیں عجیب لگ رہا ہو گیا۔ اس کی محبت اور فزوں ہو گئی۔

وہ ان کے پاؤں دبانے لگا۔

مولوی صاحب کسمسائے۔ ''کیا کرتے ہو اوتار سنگھ۔ اس کی ضرورت نہیں۔''

''آپ کو ضرورت نہیں۔ مگر مجھے ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''آپ مجھے جو کچھ دے رہے ہیں، اس کے بدلے میں میں زندگی سمیت سب کچھ آپ کو دے دوں تو کم ہے۔ یہ تو بہت معمولی خدمت ہے۔''

مولوی صاحب حیران رہ گئے۔ کیا یہ غیر مسلم لڑکا اس کی اہمیت کو سمجھتا ہے؟ کیسے؟ یہ تو کچھ جانتا ہی نہیں۔ بہرحال اوتار سنگھ کے سچے جذبے نے ان کے دل کو چھو لیا تھا۔ ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''تم بہت اچھے ہو اوتار سنگھ۔'' انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اللہ تمھیں ہدایت سے نوازے اور اپنی راہ دکھائے۔''

اوتار سنگھ ان کی ٹانگیں دباتا رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ سو چکے ہیں تو وہ کمرے سے نکل آیا۔

اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے وہ ٹھٹھک گیا۔ اسے پتا جی کا خیال آ گیا۔ وہ بھی تو اپنے کمرے میں اکیلے ہوں گے اور جاگ رہے ہوں گے۔ ابھی وہ مولوی صاحب کی خدمت کر کے آیا ہے۔ لیکن اسے کبھی پتا جی کا خیال نہیں آیا۔ کتابیں بتاتی ہیں کہ ماں باپ اور استاد کا ایک ہی درجہ ہوتا ہے اور وہ دنیا میں سب سے زیادہ محترم ہوتے ہیں۔

اس خیال کے ساتھ ہی اس کے اندر ملامت ابھری۔ وہ فرض ادا کرنے میں، دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں کتنا پیچھے ہے۔ وہ بس خود میں ہمیشہ گم رہا۔ اس نے کبھی کسی کے بارے میں نہیں سوچا۔ ارے پتا جی نے تو برسوں پہلے اپنی پتنی، میری ماتا کو کھو دیا تھا اور ان کے پاس تو میرے سوا کوئی بھی نہیں اور میں دہلی چلا گیا۔ میرے اور ماتا جی کے بغیر ان پر کیا گزری ہو گی۔ مولوی صاحب کو آج بیوی بچوں سے جدا ہوئے پہلا دن ہے تو انھیں نیند نہیں آ رہی ہے۔ تو کیا میرے پتا جی برسوں سے نہیں سوئے ہوں گے اور میں نے کبھی سوچا بھی نہیں۔ بلکہ میں تو گرمی کی

یہ چھٹیاں دہلی میں گزارنا چاہتا تھا۔ صرف اس لیے کہ ہر روز وہ آواز سنتا رہوں۔ تو کیا محبت آدمی کو خودغرض اور بے پروا بنا دیتی ہے۔ نہیں محبت تو بہت عظیم جذبہ ہے۔

اوتار سنگھ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ محبت سچی ہو تو آدمی کو ہر شخص کے حقوق اور اپنے فرائض یاد دلاتی ہے۔ دل کو گداز اور عمل کو پھولوں کی سی نرمی بخشتی ہے۔ وہ لمحہ اوتار سنگھ کے لیے بہت بڑے انقلاب کا تھا۔

اس نے آنسو پونچھے اور ٹھاکر کے کمرے کی طرف چل دیا۔

ٹھاکر کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ بیٹھا ڈائری میں کچھ لکھ رہا تھا۔ اس نے بیٹے کو کمرے میں دیکھا تو اس کا چہرہ جگمگا اٹھا۔ اس نے ڈائری بند کی، قلم ایک طرف رکھا اور مسکرایا۔ ''کیسے ہو پتر؟''

''ٹھیک ہوں پتا جی۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ پھر پوچھا۔ ''آپ سوئے نہیں۔''

''نیند تو مجھے کم ہی آتی ہے پتر۔'' ٹھاکر نے سادگی سے کہا۔

اوتار سنگھ کا دل کٹنے لگا۔ اس چھوٹے سے جملے میں بہت کچھ تھا۔ ماں کی موت کے بعد کے، اس کے تعلیم کے سلسلے میں دہلی چلے جانے کے بعد کے، باپ کے شب و روز کی پوری داستان تھا وہ جملہ۔ اسے دکھ ہوا کہ اس نے کبھی باپ کے تنہائی کے دکھ اور کرب کو محسوس کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کبھی اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔

ٹھاکر اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ''کیا بات ہے پتر؟''

''کچھ نہیں پتا جی۔ آپ پاؤں پھیلا کر لیٹ جائیں۔ مجھے آپ کے پاؤں دبانے ہیں۔'' وہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''نہیں پتر، اس کی ضرورت نہیں۔ تم جا کر سو جاؤ۔''

''پتا جی، آپ مجھے معاف کر دیں۔'' اوتار سنگھ نے شرمندگی سے کہا۔ ''مجھے آپ کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے نہیں رکھا۔ مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی......''

ٹھاکر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''نا پتر...... ایسی کوئی بات نہیں۔ تمھاری پڑھائی میں میری بہت بڑی خوشی ہے۔''

''آپ لیٹیں تو۔ آپ کے پاؤں دبانے میں میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہو گی۔''

ٹھاکر چند لمحے ہچکچایا۔ پھر لیٹ گیا۔ اوتار سنگھ اس کے پاؤں دبانے لگا۔ اس سے پہلے اس نے روشنی گل کر دی تھی۔

بہت دیر ہو گئی۔ اوتار سنگھ پاؤں دباتا رہا۔ ٹھاکر کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند اسے آ ہی نہیں رہی تھی۔ یہ احساس الگ ستا رہا تھا کہ وہ بیٹے کو تکلیف دے رہا ہے۔ ذرا دیر بعد اس نے کسمساتے

ہوئے کہا۔ ''اب بس کرو پتر۔ تم تھک گئے ہو گے۔''

''اس کام میں تھکن نہیں ہو سکتی پتا جی۔'' اوتار سنگھ کے لہجے میں سچی خوشی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ ایسا سکون، ایسی خوشی، ایسی طمانیت اسے کبھی نہیں ملی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے بہت وقت ضائع کر دیا ہے۔ ''آپ سو جائیں۔ پھر میں چلا جاؤں گا۔''

''مجھے نیند کہاں آتی ہے پتر۔'' ٹھاکر نے بے بسی سے کہا۔ ''تم جا کر سو جاؤ۔''

''نہیں پتا جی۔ جب تک آپ سو نہیں جاتے، میں آپ کی ٹانگیں دباؤں گا۔''

کچھ دیر اور گزر گئی۔ پھر ٹھاکر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا پتر۔ میری ایک بہت بڑی خوشی ہے۔ وہ پوری کر دو۔''

''بولیں پتا جی۔''

''تم یہاں آ کر میرے ساتھ سو جاؤ۔''

اوتار سنگھ کو بہت حیرت ہوئی۔ لیکن اس نے جان لیا کہ ٹھاکر صرف اسے پاؤں دبانے سے روکنے کو، اسے ٹالنے کو یہ بات نہیں کر رہا ہے۔ اس کے لہجے میں سچائی تھی۔ جیسے وہ واقعی اس کے لیے بہت بڑی خوشی ہو۔ اس نے ہاتھ روک دیے اور بستر پر باپ کے ساتھ جا لیٹا۔

چند لمحے دونوں ذرا سے فاصلے پر لیٹے رہے۔ لیکن ان دونوں کے درمیان بہت بڑا فاصلہ تھا۔ اتنے قریب لیٹنے کے باوجود وہ اپنی اپنی جگہ تنہا تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف رخ کیے لیٹے تھے۔ ٹھاکر بیٹے کے چہرے کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

پھر ٹھاکر نے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو چھوا اور بولا۔ ''او یار اوتار سنگھ، ساتھ ایسے تو نہیں سوتے۔ مجھ سے لپٹ جا نا یار۔''

اوتار سنگھ کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ ٹھاکر کی ٹوٹتی بکھرتی آواز اور لہجے کی وہ تڑپ اس کے لیے بالکل نئی چیز تھی...... اس کی فرمائش کی طرح۔ باپ کی محبت کا اسے ہمیشہ احساس رہا تھا لیکن اس کا اظہار اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

وہ باپ سے لپٹ گیا...... چھوٹے سے بچے کی طرح!

''پتا جی کہتے تھے، ٹھاکر ہونا بڑا بھاری کام ہے۔'' اس نے باپ کی بھرائی ہوئی آواز سنی۔ ''ٹھاکر کو سخت ہونا چاہیے...... نرمی سے دور۔ ایک ٹھاکر کے لیے سب سے بڑی چیز آن ہے۔'' اس کی زبان ہے۔ محبت ٹھاکروں کے لیے نہیں بنی کیونکہ یہ کمزور کرنے والی شے ہے۔ محبت کرو تو اسے چھپا کر رکھو۔ اس کا اظہار مت کرو کبھی۔ پتر اوتار سنگھ پتا جی کی آگیہ کا پالن کرنا میرا دھرم تھا۔ میں نے ہمیشہ اچھا ٹھاکر بننے کی کوشش کی......''

اوتار سنگھ حیرت سے باپ کی باتیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ٹھاکر تو میں بھی ہوں۔ مگر مجھے محبت کتنی عزیز ہے۔ کیسے میں محبت پر جان [illegible] اور کس طرح کی محبت ہوتی ہے

مجھے۔ اگر پتا جی کو اس کا پتا چل جائے تو؟ وہ غصہ ہوں گے؟

ٹھاکر اپنی کہے جا رہا تھا۔ ''...... لیکن میں اچھا ٹھاکر تھا ہی نہیں۔ کوشش کے باوجود بن بھی نہیں سکا۔ شاید اگر تم مجھے شادی کے ایک دو سال بعد مل جاتے تو میں اچھا ٹھاکر بن جاتا۔ مگر تم تو برسوں کی منتوں مرادوں اور ماتھا رگڑنے کے بعد ملے۔ ایسے میں کہیں آن رہ پاتی ہے! پھر بھی میں اچھا ٹھاکر بننے کی کوشش کرتا رہا۔ پر ہوا یوں کہ نہ میں اِدھر رہا نہ اُدھر۔ ٹھاکروں کو دوستی بہت راس آتی ہے۔ بدقسمتی سے میرا کوئی میتر بھی نہیں تھا۔ جمال دین سے دوستی کو بہت من کرتا تھا۔ پر میں جانتا تھا کہ وہ اپنے حال میں مست ہے۔ سدا میراثی رہے گا۔ متر کبھی نہیں بنے گا۔ سو جیون اکیلے ہی بیت گیا۔ میں تمہاری ماتا جی سے بہت پریم کرتا تھا۔ پر کبھی اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا، یہاں تک کہ وہ چلی گئی۔

اور اوتار سنگھ، تم سے میں نے محبت نہیں کی۔ تم تو میری جان تھے۔ تم میں میری جان تھی۔ پر میں نے تمھیں کبھی بتایا نہیں۔ آج بھی نہیں بتا رہا ہوں کبھی بھی نہیں بتاؤں گا۔ ٹھاکر کبھی یہ بات بتایا نہیں کرتے۔

مگر میں تم سے یہ ضرور کہوں گا کہ تمھیں ٹھاکر بننے کی ضرورت نہیں۔ تم آزاد ہو۔ جو چاہو، کر سکتے ہو...... اور کرو۔''

ٹھاکر عجیب سے ڈوبتے لہجے میں بول رہا تھا اور اوتار سنگھ اس سے لپٹا ہوا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ حیران بھی تھا۔ لیکن پتا جی کی آخری بات سن کر اسے خوشی ہوئی تھی۔ انھوں نے اس کی ایک بڑی مشکل آسان کر دی تھی۔

وہ یہ سوچتا رہا۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ ٹھاکر کی آواز تھم گئی ہے۔ جب اسے احساس ہوا اور اس نے باپ کے سینے سے سر ہٹا کر دیکھا تو پتا چلا کہ ٹھاکر سو چکا ہے۔ اس نے سوچا، اب وہ جب بھی یہاں ہوگا، پتا جی کے ساتھ ہی سویا کرے گا۔

کیدار ناتھ کی ٹھاکر پرتاپ سنگھ سے دور پرے کی رشتے داری تھی۔ وہ ٹھاکر کے دیہانت کے بعد گدی میں وارد ہوا تھا۔ اسے زمین بھی دی گئی تھی رشتے داری کے ناتے اس کا شمار زمین داروں میں ہوتا تھا۔ مگر وہ زمین داری بہرحال ٹھاکر پرتاپ کی دی ہوئی تھی۔ ٹھاکر خون کے اعتبار سے اسے اپنا ہم رتبہ نہیں سمجھتا تھا۔ بس لحاظ کر لیتا تھا۔ کیدار ناتھ کو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ اس کا خواب تو بڑا تھا۔ ٹھاکر کے اولاد نہیں تھی۔ کیدار ناتھ کو یقین تھا کہ ایک دن وہی ٹھاکر کا وارث ہوگا۔ ٹھاکر کے قریب رشتے دار سب زمین جائیداد والے تھے۔ ان کو ٹھاکر کی زمینوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ٹھاکر کی موت کے بعد وہ اسی کے حصے میں آتی۔

لیکن اوتار سنگھ کی پیدائش نے اس کے سب سپنے بکھیر دیے۔ اوتار سنگھ سے اس کا الگ ہی تعلق بن گیا۔ نفرت کا تعلق۔ اوتار سنگھ کو پتا نہیں تھا کہ کیدار ناتھ نے اس کی پیدائش کے لیے

سے لے کر آج تک اس سے صرف نفرت کی ہے۔ خالص نفرت! وجہ یہ تھی کہ اوتار سنگھ اس کے راستے کی دیوار بن گیا تھا۔ کیدار ناتھ ہر وقت سوچتا رہتا تھا کہ اس دیوار کو کیسے گرائے۔ لیکن کوئی اپائے نہیں سوجھتا تھا۔ براہ راست وار کرنے سے وہ ڈرتا تھا۔ بات کھل جائے، یہ اسے کسی طور گوارا نہیں تھا لیکن اب ایسا لگتا تھا کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

اس روز کیدار حویلی چلا آیا۔ ٹھاکر پرتاپ تو موجود نہیں تھا، اوتار سنگھ سے ملاقات ہوگئی۔

''کہو چاچا جی، کیسے ہو؟'' اوتار سنگھ نے اس سے پوچھا۔

''بھگوان کی کرپا ہے۔ اچھا ہوں۔''

''ہماری یاد کیسے آ گئی؟''

کیدار ناتھ نے دل میں کہا۔ تم کو میں بھولتا ہی کب ہوں چھوٹے ٹھاکر کہ یاد آنے کا سوال ہو۔ پیدائش سے لے کر آج تک تم میرے دل و دماغ پر بوجھ بنے ہوئے ہو۔

لیکن اوپر سے وہ مسکرا دیا۔ ''تم تو ہمیشہ یاد رہتے ہو پتر۔'' وہ بولا۔ ''آج میں جے پور جا رہا ہوں.... میلے میں۔ سوچا تمھیں بھی پوچھ لوں۔''

''نہیں چاچا جی۔ میں تو نہیں جا سکتا۔'' اوتار سنگھ نے صاف انکار کر دیا۔

کیدار ناتھ کو بے حد مایوسی ہوئی۔ یہ ایک کوشش تو وہ برسوں سے کرتا رہا تھا۔ اس نے ہمیشہ چاہا کہ اوتار سنگھ سے قریب ہو جائے۔ وہ اس سے محبت اور شفقت جتاتا۔ تاکہ کبھی اسے اپنے ساتھ کہیں لے جائے۔ ایسے ہی کسی حادثے کا اہتمام کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ لیکن اوتار سنگھ کبھی اس سے بہت قریب نہیں ہوا۔ اس کی وجہ وہ مسلا بچہ وصال دین تھا۔ بلکہ اس کا پورا پریوار۔ اوتار سنگھ ان کی قربت میں ایسا مگن تھا کہ اسے کسی اور کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

اس وقت بھی کیدار ناتھ اوتار سنگھ کے انکار پر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ تاہم اس نے لہجے پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیوں نہیں جا سکتے پتر؟ اب تو چھٹیاں ہیں تمہاری۔''

گھر پر پڑھائی کر رہا ہوں چاچا۔ دیکھتے نہیں، مولوی صاحب کو ساتھ لایا ہوں۔''

''دیکھتا تو ہوں۔ پر سمجھ نہیں آتی۔'' کیدار ناتھ بولا۔ ''اس مسلے سے تم کیا پڑھتے ہو؟''

''عربی پڑھتا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے جلدی سے کہا۔ پھر ذرا سخت لہجے میں بولا۔ ''ان کے متعلق ایسی خراب بات مت کرو چاچا۔ وہ میرے استاد ہیں۔''

''تمھیں تو پتر مُسلوں سے شروع ہی سے محبت ہے۔'' کیدار ناتھ نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ ''یہ استاد ہے۔ وہ وصال دین تمہارا بھائی ہے۔ اور حمیدہ کو تم ماتا سمجھتے ہو۔ اور میں نے تو کوئی خراب بات نہیں کی۔ پر مُسلے کو تو مُسلا ہی کہیں گے اور پتر اوتار سنگھ، اس سے کوئی اچھی چیز تو تم پڑھ اور سیکھ نہیں سکتے۔'' کیدار ناتھ بہت ڈھٹائی سے بات کر رہا تھا۔

اوتار سنگھ کو غصہ آ گیا۔ ''یہ بات تو تم پتا جی سے کرنا چاچا۔ وہ تمھیں بہتر طور پر سمجھا سکیں

گے۔''

پرتاپ سنگھ کے نام پر کیدار ناتھ کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ ''اس کی ضرورت نہیں پتر۔ تم خفا نہ ہو۔ میں چلتا ہوں۔'' اس نے کہا اور وہاں سے نکل آیا۔

کیدار ناتھ بہت عیار اور شاطر آدمی تھا۔ اس وقت اسے احساس ہو رہا تھا کہ اوتار سنگھ کا مُسلوں کی طرف جو جھکاؤ ہے، وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مگر یہ بس موہوم سا احساس تھا.... جزئیات کے بغیر۔ کیسے؟ کیا کرے؟ ان سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ذہن پر زور دیتا رہا، لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

اب انگلیاں ٹیڑھی کرنی ہی پڑیں گی۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے بڑبڑایا۔

❁.....❁.....❁

گھٹا تو کئی دن سے چھائی ہوئی تھی۔ اور گرمی کے موسم میں گھٹا ہو اور نہ برسے تو حبس ہو جاتا ہے۔ حور بانو کو برسات جتنی اچھی لگتی تھی، حبس اتنا ہی برا لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کئی دن سے وہ بولائی بولائی پھر رہی تھی۔

اس صبح بوندا باندی شروع ہوئی تو سب سے خوش حور بانو ہی تھی۔ اس کے اندر جیسے بجلیاں چمکنے لگیں۔ ''امی جان.... پھوار پڑ رہی ہے۔'' اس نے ماں کو ہلا ڈالا۔

''ہاں.... نظر آ رہا ہے مجھے۔'' سرفراز بیگم نے کہا۔ ''جمعرات کی جھڑی ہے۔ ایک ہفتے سے پہلے نہیں ٹلے گی۔''

''اسے جھڑی تو نہ کہیں۔'' حور بانو نے اعتراض کیا۔ ''بوندا باندی ہے.... وہ بھی ہلکی سی۔''

''جھڑی تو کہلائے گی۔ چاہے روں روں برسے۔''

لیکن حور بانو کو تو موسلا دھار بارش پسند تھی۔ بہرحال حبس کے مقابلے میں تو یہ بوندا باندی بھی بہت بڑی نعمت تھی۔ وہ ماں کے پاس سے اٹھی تو بہنوں کی طرف لپکی۔ نور بانو حسب معمول اپنے مطالعے میں کھوئی ہوئی تھی۔ اور گلنار بیٹھی اپنی گڑیا کے کپڑے سی رہی تھی۔

''ارے تم لوگ یہاں بیٹھی ہو۔ پتا ہے، بوندا باندی ہو رہی ہے۔'' حور بانو نے انھیں ہلایا۔

دونوں بہنوں کا ردعمل مختلف تھا۔ ان کی طبیعتوں کے عین مطابق۔ نور بانو نے کتاب سے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور بڑی بے نیازی سے بولی۔ ''تو کیا ہوا یہ موسم ہی برسات کا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پھر کتاب پر جھک گئی۔

مگر گلنار نے گڑیا کے کپڑے ایک طرف پھینک دیے۔ ''سچ باجی۔ واہ اب مزہ آئے گا۔'' اس نے کہا۔ ''دل گھبرانے لگا تھا اس حبس سے۔'' اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''چلیں باجی، جھو

لگائیں گے۔"

حور بانو اور گلنار دالان کی طرف چلی گئیں۔ نور بانو بیٹھی پڑھتی رہی۔ حور بانو سب سے بڑی تھی اور گلنار سب سے چھوٹی۔ ان دونوں کے مزاج ایک سے تھے۔ شوخ و شنگ اور زندگی سے لبریز۔ حور بانو بے حد حسین تھی۔ گلنار ابھی کم عمر تھی لیکن ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ حور بانو سے کم ثابت نہیں ہوگی۔ بیچ کی نور بانو ہر اعتبار سے دونوں بہنوں سے مختلف تھی بلکہ ضد کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ شکل و صورت کے اعتبار سے وہ واجبی بھی نہیں تھی۔ اس کا رنگ سانولا بھی نہیں، پکا تھا۔ چہرے کے نقوش بھی موٹے تھے۔ آنکھیں بہت چھوٹی تھیں۔ مگر ان میں بلا کی چمک تھی۔ جسمانی اعتبار سے بھی وہ بہت کم تھی۔ بدن پر گوشت تھا ہی نہیں۔ لگتا تھا، ہڈیوں پر کھال منڈھ دی گئی ہے۔ دونوں بہنوں سے اس کا تضاد یہیں تک محدود نہیں تھا۔ طبیعت بھی اس کی بالکل الگ تھی۔ وہ بہت سنجیدہ، بردبار، کم گو اور کم آمیز تھی۔ ہنسنا تو جیسے اسے آتا ہی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مسکرا دیتی۔ بس اسے ایک ہی شوق تھا...... مطالعہ کرنا۔ لگتا تھا، اس کی دوستی صرف کتابوں سے ہے۔

حور بانو اور گلنار نے مل کر جھولا باندھا۔ پھر اس کی مضبوطی کو جانچا۔ دہری رسی کے اوپر انھوں نے ایک بڑے گدے کو باندھ دیا۔ اب وہ بہت آرام دہ جھولا تھا۔

"پہلی بار میری۔" گلنار نے چہک کر کہا۔

"واہ...... بڑی تو میں ہوں۔ پہلے تم مجھے جھولا جھلاؤ گی۔" حور بانو بولی۔

گلنار مان گئی۔ حور بانو جھولے پر بیٹھ گئی۔

دالان کی چھت کافی اونچی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جھولا وہاں باندھا جاتا تھا۔ دالان کے سامنے خاصا کشادہ صحن تھا۔ صحن کے اختتام پر غسل خانہ، بیت الخلا اور اسٹور تھے۔ اور ان کے اوپر کوٹھا تھا۔ وہ کوٹھا جو پچھلے کچھ عرصے سے حور بانو کو بہت محبوب ہو گیا تھا۔

گلنار نے پینگ دی۔ جھولا قوسی شکل میں اوپر اٹھا اور دالان سے ذرا باہر صحن تک گیا۔ اگلی پینگ اسے صحن کے وسط تک لے گئی۔ صحن میں پھوار حور بانو کے جسم اور رخساروں سے ٹکرائی تو حور بانو کے اندر کا سماں ایک دم تبدیل ہو گیا۔ وہ اداس ہو گئی۔

یہ اداس ہونا بھی اس نے حال ہی میں سیکھا تھا۔ ورنہ وہ تو بڑی معصوم، بے فکر اور شوخ لڑکی تھی۔ اداسی کا سبب وہ لڑکا تھا، جو ان کے مکان کے اوپری حصے میں کرائے دار کی حیثیت سے رہتا تھا۔ ویسے تو ان کرائے داروں کو ان کے ہاں دو سال ہو گئے تھے۔ لیکن اس نے ان میں سے کسی کو دیکھا نہیں تھا...... سوائے ان کی ملازمہ رنجنا کے کہ وہ اکثر نیچے آ جاتی تھی۔ وہ بس اتنا جانتی تھی کہ وہ لوگ ہندو ہیں اور بہت بڑے زمین دار ہیں۔

مگر چھ ماہ پہلے ایک اتفاق کے تحت اس نے لڑکے کو دیکھ لیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اس

نے آ کا میاں کو کوئی چیز لانے کے لیے بھیجا تھا۔ دیر ہو گئی تھی اور وہ واپس نہیں آئے تھے۔

نہ جانے کیا چیز تھی کہ وہ اس کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔ اسی بے تابی میں وہ چلمن تک پہنچ گئی۔

چلمن کی درزوں سے اس کی نظریں آ کا میاں کو تلاش کر رہی تھیں کہ اسے وہ دونوں لڑکے آتے نظر آئے۔ ایک بڑا تھا۔ وہ عام سا لڑکا تھا۔ مگر دوسرے لڑکے کو وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ پتا نہیں، کچھ عجیب سی بات تھی اس میں۔ کھڑا قد، بے حد متناسب جسم اور چہرہ ایسا خوبصورت کہ نظر ہی نہ ہٹے۔ ترشے ہوئے نقوش، متناسب کھڑی ناک، بڑی بڑی روشن آنکھیں، بہت کشادہ، دمکتی ہوئی پیشانی اور سرخ و سپید رنگت، چہرے پر روئیدگی تھی، جو جوانی کی آمد کا اعلان کر رہی تھی۔

پتا نہیں، وہ کیسا جادوئی لمحہ تھا۔ دونوں لڑکے زینے کی طرف چلے گئے۔ لیکن حور بانو وہیں کھڑی رہ گئی۔ چھوٹے لڑکے کا سراپا اب بھی اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اور اسے پلکیں جھپکانا بھی برا لگ رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ ایک پل کے لیے بھی سامنے سے ہٹے۔

کم عمر اور معصوم حور بانو نہیں جانتی تھی کہ یہ سب کیا ہے۔ جو بھی تعلیم اس نے حاصل کی تھی، گھر پر ہی کی تھی اور گھر میں اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ کون سی کتاب گھر میں رکھی جانی چاہیے اور کون سی نہیں۔ محبت کے بارے میں وہ کچھ جانتی ہی نہیں تھی۔

وہ وہیں کھڑی خلا میں اس حسین سراپا کو دیکھتی رہی۔ آ کا میاں نے آ کر اسے چونکایا تو وہ ہٹی۔

اسی لمحے سے ایک مستقل بے چینی، ایک عجیب سا اضطراب اس کے اندر رہنے لگا۔ یہ بے چینی بس اس بات کی تھی کہ وہ اس لڑکے کو بار بار دیکھنا چاہتی تھی۔ بلکہ درحقیقت وہ تو ہر وقت اسے دیکھنا چاہتی تھی اور یہ ممکن نہیں تھا۔

حور بانو بچپن ہی سے بہت ضدی تھی۔ جو مانگتی، وہ جب تک نہ ملتا، بے چین رہتی۔ جو کرنا چاہتی کر کے رہتی۔ اب اس معاملے میں بھی یہی کیفیت تھی۔ مگر ایک فرق بھی تھا۔ وہ جس چیز کی ضد کرتی، جب تک وہ نہ ملتی، اسے جھنجلاہٹ ہوتی رہتی۔ لیکن اس معاملے میں یہ بات نہیں تھی۔ وہ جھنجلا نہیں رہی تھی۔ اور اس اضطراب میں بھی عجیب سی لذت تھی۔ صرف اسے دیکھنے کی خواہش کرنا بھی بہت پُرلطف تھا۔ عجیب سا سرور تھا اس میں۔

چلمن کے قریب وہ کم...... بہت ہی کم جاتی تھی۔ مگر اب اس کا چلمن سے کوئی بہت گہرا تعلق قائم ہو گیا تھا۔ مضطرب تو وہ ہر وقت رہتی تھی۔ مگر جب بھی اضطراب کی کوئی اونچی لہر اٹھتی، اس کے قدم خود بہ خود چلمن کی طرف اٹھ جاتے۔ پھر وہ ناکام واپس آ جاتی۔

چند دن میں اس معاملے میں بھی ٹھہراؤ آ گیا۔ آدمی تجسس کرے تو اسے معلومات بھی

حاصل ہوتی ہیں۔ اسے پتا چل گیا کہ وہ صرف دو اوقات میں اس لڑکے کو یقینی طور پر دیکھ سکتی ہے۔ ایک صبح کے وقت جب وہ اسکول جاتا ہے اور پھر دوپہر کے وقت جب وہ اسکول سے آتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دوسرا لڑکا مسلمان ہے۔ وہ ایسے کہ وہ نماز کے وقت نکلتا تھا اور نماز پڑھ کر واپس آتا تھا۔ بظاہر تو گھر سے نکلتے وقت وہ کوئی ایسا اہتمام نہیں کرتا تھا کہ جس سے لگے، وہ نماز پڑھنے جا رہا ہے۔ سر پر ٹوپی بھی نہیں ہوتی تھی۔ شروع میں تو حور بانو یہی سمجھی کہ وہ کسی کام سے کچھ خریدنے کے لیے نکلا ہے۔ اذان کے بعد گھر سے نکلنا ایک اتفاق ہو سکتا ہے۔ لیکن دن میں پانچ بار اور ہفتے کے ساتوں دن یہ اتفاق نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک دن وہ نماز پڑھ کر واپس آیا تو اس کے پائنچے اوپر تھے۔ شاید ہر بار آتے ہوئے وہ انھیں نیچے کر لیتا تھا۔ مگر اس بار وہ ایسا کرنا بھول گیا تھا۔

حور بانو بہت ذہین لڑکی تھی اور جس طرح کا اسے تجسس تھا، ایسے میں ذہین لوگ معمولی سی بات سے بہت سارے نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ حور بانو کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ دوسرا لڑکا مسلمان ہے اور نماز کے لیے جاتا ہے..... مگر چوروں کی طرح، جیسے یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا ہو کہ وہ نماز پڑھنے جا رہا ہے۔ اس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ جن ہندوؤں کے ساتھ وہ رہ رہا ہے، ان کی طرف سے اسے یہ آزادی نہیں۔ اسی لیے وہ چھپ کر نماز پڑھتا ہے۔

اس احساس کے ساتھ اسے اس پر ترس آیا اور ان ہندوؤں پر غصہ، جنھوں نے اسے پابند کر رکھا تھا۔ لیکن ان ہندوؤں میں وہ لڑکا شامل نہیں تھا، جس کی دید کو وہ ترستی تھی۔ اس کے نزدیک اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

دونوں گھروں کے درمیان وہ تعلق تھا، جو پڑوسیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ کبھی اوپر سے رنجنا کھانے پینے کی کوئی چیز لاتی اور کبھی ان کے ہاں کوئی خاص چیز پکتی تو چھمن بوا اوپر لے جاتیں۔ چیزوں کے اس تبادلے میں معلومات کا تبادلہ بھی قدرتی طور پر ہوتا رہتا تھا۔ پہلے حور بانو اس میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ مگر اب وہ غور سے سننے لگی تھی۔ امی جان البتہ بڑے سوال جواب کرتی تھیں۔

رنجنا تھی بھی بڑی باتونی۔ کتنی باتیں تو وہ بغیر پوچھے ہی بتا دیتی تھی۔ حور بانو کو معلوم ہو گیا کہ چھوٹا لڑکا چھوٹا ٹھاکر کہلاتا ہے۔ رنجنا نے اس کا نام کبھی نہیں بتایا۔ کہتی تھی، بس وہ چھوٹے ٹھاکر ہیں۔ البتہ مسلمان لڑکے کا نام اس نے بتا دیا..... وصال دین!

''مگر یہ مسلمان لڑکا تمھارے ساتھ کیوں رہتا ہے؟'' امی جان نے ایک دن پوچھا۔

''وہ بھی اسکول میں پڑھتا ہے۔'' رنجنا نے بے حد سادگی سے جواب دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر تمھارے ٹھاکروں کے ساتھ اس کا کیا جوڑ؟''

رنجنا نے امی جان کو یوں دیکھا، جیسے ان کی سادگی اور کم علمی پر کڑھ رہی ہو۔ ''جوڑ تو کوئی نہیں بی بی۔ لیکن وہ چھوٹے ٹھاکر کا بچپن کا دوست ہے..... چھوٹے ٹھاکر اس کے بغیر رہ نہیں

سکتے۔ وہ نہیں آتا تو چھوٹے ٹھاکر یہاں بھی نہیں آتے۔''

''مگر تعلق کیا ہے ان سے؟'' امی جان بھی پیچھے ہی پڑ گئیں۔

''تعلق تو مجھے بھی نہیں پتا۔'' رنجنا نے بے بسی سے کہا۔ ''اس کا باپ جمال دین کمی ہے ہمارے بڑے ٹھاکر کا۔ مگر بڑے ٹھاکر اس پر بڑی دیا کرتے ہیں۔

ویسے اوپر والے روشن خیال ہندو تھے۔ گوشت کا پرہیز نہیں کرتے تھے۔ بس گائے کا گوشت کھانے سے بچتے تھے۔ بقول رنجنا کے ماسٹر جی تو گوشت کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے اور چھوٹے ٹھاکر کا بھی یہی حال تھا۔ رہ گئے رنجنا اور رگھو تو وہ ملازم تھے۔ اور ملازم آقاؤں کا عقیدہ اپناتے ہیں۔

حور بانو کو اچانک احساس ہوا کہ بارش تیز ہو گئی ہے۔ جس ثانیے میں جھولا صحن سے گزرا اور واپس آیا تھا، بارش کی بوچھاڑ نے اس کو بھگو ڈالا تھا وہ چونک کر خیالوں سے نکل آئی۔ ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ گلنار کچھ کہہ رہی ہے۔

''باجی..... بس اب اتریں بھی، اب میری باری ہے۔''

حور بانو نے پاؤں فرش سے ٹکائے۔ رکتے رکتے جھولا رک گیا اور وہ نیچے اتر آئی۔

گلنار نے حیرت سے اسے دیکھا۔ عام طور پر ایسا ہوتا نہیں تھا۔ حور بانو بڑی ہونے کا پورا فائدہ اٹھاتی تھی اور جب تک اپنا جی نہیں بھرتا تھا، اسے جھولنے کا موقع نہیں دیتی تھی۔

اس نے مشتبہ نظروں سے بہن کو دیکھا اور جلدی سے جھولے پر بیٹھ گئی۔ ''پینگ دیں باجی۔'' اس نے کہا۔

حور بانو نے جھولے کو دھکیلا۔ مگر دو تین پینگیں دینے کے بعد رک گئی۔ جھولے کا ردھم ٹوٹنے لگا۔ ''کیا کرتی ہیں باجی۔ پینگ دیں نا۔'' گلنار نے احتجاج کیا۔

''بھئی میرا دل نہیں چاہ رہا اس وقت۔''

''یہ تو بے ایمانی ہے باجی۔ آپ کی باری آئے گی تو میں بھی پینگ نہیں دوں گی۔''

''نہیں دینا۔ میرا دل بھی نہیں چاہ رہا ہے جھولنے کو۔''

تو یہ بات ہے۔ گلنار نے سوچا۔ اس لیے جھولا اتنی آسانی سے خالی ہو گیا۔ باجی کا بھی پتا نہیں چلتا۔ اب تو پل پل رنگ بدلتی ہیں۔ پہلے ایسا نہیں تھا۔ پھر اس نے خوشامدانہ لہجے میں پکارا۔ ''اچھی باجی، بس دو تین لمبی لمبی پینگیں دے دیں۔ پھر میں آپ سے نہیں کہوں گی۔''

حور بانو نے جھنجلا کر جھولے پر ہاتھ رکھا اور اسے دھکیلتی ہوئی صحن تک لے گئی۔ پھر وہ ایک طرف ہٹی اور دالان سے واپس صحن کی طرف آتے ہوئے جھولے کو اور زور سے دھکیلا۔ دو بار میں ہی گلنار کے پاؤں اسٹور کی دیوار سے جا لگے۔ اب وہ خود بھی پینگیں لے سکتی تھی۔

حور بانو تو اندر ماں کے پاس چلی گئی۔ ''امی جان..... بہت زور کی بارش ہو رہی ہے.....''

سرفراز بیگم نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں جانتی ہوں، تم کیا کہو گی۔'' انھوں نے کہا۔ ''میں بہادر علی کو پہلے ہی آلو لانے کے لیے بھیج چکی ہوں بیسن گھول کر رکھ دیا ہے۔ چھمن بوا ابھی گرم گرم پھلکیاں اتاریں گی۔ تم ذرا چٹنی پیس لو۔''

وہ چٹنی پیسنے بیٹھ گئی۔ مگر اس کا دھیان چھوٹے ٹھاکر کی طرف تھا۔ وہ گزرے ہوئے وقت میں کھو گئی۔

دن میں دوبارہ وہ چھوٹے ٹھاکر کو آتے جاتے دیکھتی تھی اور اس کے بعد وہ اُس کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ نیند بھی اس کی پہلے جیسی نہیں رہی، سوتی تو وہ خوابوں میں آ جاتا۔ نیند اچٹ جاتی۔ مگر نیند کا وہ اچٹنا بھی خوش گوار تھا کیونکہ وہ بہت سرشار اور خوش خوش اٹھتی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد دوبارہ نیند آ جاتی اور خوابوں کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا۔ اب اس کا جی چاہتا کہ ہر وقت وہ سوتی ہی رہے۔

پھر تین ماہ پہلے اس کی پیاسی نگاہوں کی مزید ضیافت کا سامان ہو گیا۔

اس کے حواس تو مکان کے اوپری حصے کی آوازوں پر ہی مرکوز رہتے تھے۔ اس روز اسے کوٹھے کی طرف جانے والے زینوں پر قدموں کی آہٹ سنائی دی تو وہ کوٹھے کی طرف لپکی۔ عام طور پر رنجنا کے سوا کوئی کوٹھے پر نہیں جاتا تھا۔ لیکن یہ رنجنا کے قدموں کی آہٹ نہیں تھی۔ حور بانو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اتنے زور سے کہ اسے لگا، اس کے دل کے دھڑکنے کی آواز امی جان تک بھی پہنچ جائے گی۔

کوٹھے کے چاروں طرف دیوار نہیں تھی۔ بلکہ منڈیروں پر جالیاں چن کر دیواریں بنا دی گئی تھیں۔ جالیوں کے درمیان سوراخ تھے، جن سے دونوں طرف کا منظر پوری طرح تو نہیں، کچھ کچھ نظر آتا تھا۔

چند لمحے بعد اس نے چھوٹے ٹھاکر کو دیکھا اس کے ہاتھ میں کتابیں تھیں۔ اوپر کرسیاں پڑی تھیں۔ وہ وہاں بیٹھ گیا اور کتابیں میز پر رکھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جالیوں کے سوراخوں سے بالکل صاف تو نہیں دکھائی دے رہا تھا لیکن انداز سے لگتا تھا کہ وہ وہاں پہلی بار آیا ہے اور جو کچھ اس نے دیکھا ہے اسے دیکھ کر وہ خوش ہوا ہے۔

وہ دالان میں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ اس وقت کی غیر متوقع دید اسے بہت بڑی نعمت محسوس ہوئی تھی۔ اس نے تصور میں کوٹھے کو دیکھا۔ کرائے پر اٹھنے سے پہلے تو وہ اکثر کوٹھے پر جاتی رہتی تھی۔ حور بانو کو پھولوں کا بہت شوق تھا۔ اس نے وہاں چنبیلی لگائی تھی جو خوب پھلی پھولی تھی۔ اس کے علاوہ موسمی پھولوں کے بھی کئی پودے تھے۔ اسے یاد تھا کہ اسے کوٹھا بہت اچھا لگتا تھا۔ شام کے وقت خاص طور پر وہ وہاں جایا کرتی تھی۔

اوپر کوٹھے پر چھوٹے ٹھاکر نے کتاب کھول لی تھی اور اس پر جھک گیا تھا۔

حور بانو بڑی محویت سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر امی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''حور بانو'' وہاں کیا کر رہی ہو۔ چلو عصر کی نماز پڑھو اور پھر قرآن پاک کی تلاوت کے لیے بیٹھو۔ عصر مغرب کے درمیان اعمال کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے۔''

''آئی امی جان...... وضو کرنے کے لیے ہی آئی ہوں یہاں۔'' حور بانو نے جواب دیا اور غسل خانے کی طرف چل دی۔ لیکن اس کا دل وہیں کوٹھے پر اٹکا رہا۔ وضو کر کے اس نے نماز پڑھی۔ پھر قرآن پاک کی تلاوت کی...... یہ روز کا معمول تھا اور اس کے معاملے میں امی جان بہت سخت تھیں۔ پھر عادت بھی تھی۔ سو وہ عصر سے مغرب تک کا یہ وقت بڑے شوق سے گزارتی تھی۔ قرآن شریف پڑھنے میں اسے بہت لطف آتا تھا بلکہ تلاوت کرتے ہوئے وہ کھو جاتی تھی۔ مگر اس شام وہ ارتکاز سے محروم تھی۔ وہ قرآن شریف پڑھ رہی تھی مگر اس کا دل کہیں اور تھا۔ وہ کوٹھے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ بلکہ تصور میں کوٹھے کو دیکھ رہی تھی، جہاں چھوٹا ٹھاکر بیٹھا پڑھائی کر رہا تھا۔ کئی بار اسے شرم آئی کہ یہ کتنی بری بات ہے۔ اس نے دل کو کوٹھے سے ہٹایا اور توجہ قرآن پر مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ مگر اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب بے ایمان دل چپکے سے پھر کوٹھے پر جا اٹکا ہے۔ وہ اندر سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ مگر بے بس تھی۔ یہ تو بہت بڑی بے ادبی ہے۔

یہ خیال دل میں آیا تو وہ اٹھ گئی۔

''کیا بات ہے۔ تلاوت میں دل نہیں لگتا۔'' امی جان نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔

''امی جان...... وضو کرنے جا رہی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔ دالان سے گزرتے ہوئے اس کی نظر کوٹھے کی طرف اٹھی۔ مغرب ہونے والی تھی۔ جھٹ پٹے کا سماں تھا۔ آسمان اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹنے والے پرندوں کے چہچہوں سے گونج رہا تھا۔ اتنا اجالا نہیں تھا کہ وہ اسے صاف دیکھ سکتی۔ مگر چھوٹا ٹھاکر اسے ہیولا سا نظر آ رہا تھا۔ پھر بھی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ پڑھ نہیں رہا ہے بلکہ بڑے ارتکاز کے ساتھ خلا میں گھور رہا ہے۔

وہ وضو کر کے آئی تو مغرب کی اذان شروع ہو چکی تھی۔ اس بار نماز میں بھی اس کا دل نہ لگا۔ جلدی جلدی نماز پڑھ کر وہ دالان میں تخت پر جا بیٹھی اب اندھیرا ہو چکا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر کا ہیولا اور گہرا ہو گیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ پڑھائی کے لیے اوپر آنے والے چھوٹے ٹھاکر نے روشنی کیوں نہیں کی۔ اور روشنی نہیں کی تو اندھیرے میں بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔

وہ بیٹھی رہی۔ اوپر چھوٹا ٹھاکر بھی بیٹھا رہا۔

کچھ دیر بعد اچانک اوپر روشنی ہو گئی۔ روشنی اسی دوسرے لڑکے وصال دین نے کی تھی۔

ذرا دیر دونوں باتیں کرتے رہے۔ پھر نیچے چلے گئے۔

اگلے روز شام کا وہ وقت ہوا تو حور بانو کا دل مچلنے لگا۔ کاش وہ آج بھی آ جائے۔ شاید

وہ وقت دعا کی قبولیت کا تھا۔ وہ آ گیا اور اس کے آنے کے ذرا دیر بعد ہی عصر کی اذان ہو گئی۔

پھر تو یہ روز کا معمول بن گیا۔ حور بانو بہت خوش تھی۔ رات کو وہ خواب میں اسے دیکھتی۔ پھر صبح وہ اسکول جاتا۔ صبح سے دوپہر اس کی واپسی کا انتظار رہتا۔ دوپہر کو وہ اسے دیکھتی اور پھر شام کا انتظار کرتی۔ شام کو وہ کوٹھے پر آتا...... کتابیں لے کر۔ لیکن کچھ پڑھے بغیر رات کو واپس جاتا۔ اور کوٹھے پر رہ کر پڑھائی وہ کبھی نہیں کرتا تھا۔

وہ عرصہ حور بانو کے لیے سرشاری کا تھا۔ وہ بے خود، کھوئی کھوئی، مگر بہت خوش رہتی۔ بات بات پر ہنستی۔ آپ ہی آپ مسکراتی۔ مگر کسی کی بات دھیان سے نہ سن پاتی۔

مگر ساتھ ہی ایک خلش اسے بار بار ستاتی۔ اس کے ضمیر پر بوجھ بڑھتا جاتا۔ قرآن پاک پر لاکھ کوشش کے باوجود وہ پوری توجہ مرکوز نہیں کر پاتی اسے تو بس انتظار رہتا تھا کہ کب مغرب ہو اور وہ نماز پڑھ کر دالان کا رخ کرے۔ اسے دیکھنے کے چکر میں وہ عصر کی نماز کے لیے کھڑے ہونے میں بھی تساہل کرنے لگی تھی۔

پھر ایک روز حور بانو نے تلاوت کرتے ہوئے قرآن پاک کی ایک آیت مبارکہ پڑھی، جس میں برتر مشرک مردوں پر کم تر مومن مردوں کی قوت اور برتری کو بیان کیا گیا تھا۔ وہ آیت سن کر وہ چور ہو گئی۔ مگر اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ وہ مشرک ہو سکتا ہے۔ بار بار اس کے ذہن میں ایک دلیل ابھرتی...... کسی مشرک کی پیشانی اتنی روشن کیسے ہو سکتی ہے!

اچانک سرشاری کی وہ کیفیت ایسے ختم ہو گئی، جیسے ٹھہرے ہوئے پانی میں کسی نے کنکر پھینک دیا ہو۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوئیں اور وہ لوگ چلے گئے۔ وہ پہلا موقع تھا کہ حور بانو اداسی سے آشنا ہوئی۔ یوں تو وہ اداس پہلے بھی ہوتی رہی تھی۔ کون ایسا ہے جو کبھی اداس نہ ہوتا ہو۔ اور اس نے بہت کم عمری میں شفیق باپ کی موت کا دکھ بھی جھیلا تھا۔ مگر یہ اداسی بہت مختلف تھی۔ بیٹھے بٹھائے کسی بھی لمحے اچانک اوپری سطح سے شروع ہوتی اور تیزی سے اس کے وجود کی نامعلوم گہرائی تک سرائیت کر جاتی۔

اور اس اداسی میں کوئی تکلیف، کوئی اذیت نہیں تھی۔ اس کے برعکس اس میں لذت تھی۔ یہ اداسی اسے سوچنے پر اکساتی...... ایسی ایسی باتیں جو پہلے اس کے گمان میں بھی نہیں تھیں۔ یہ اداسی تصور کو مہمیز کرتی...... اسے وہاں لیجاتی، جہاں چھوٹا ٹھاکر تھا۔ حالانکہ اس نے وہ جگہ دیکھی نہیں تھی بلکہ کبھی اس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔

کبھی وہ حیران ہو کر سوچتی کہ ایک اجنبی لڑکا، جس سے کبھی اس نے بات بھی نہیں کی، تھوڑے سے دنوں میں اتنا اہم کیسے ہو گیا کہ سامنے ہوتے ہوئے بھی اسے امی جان اور اپنی بہنوں کا خیال نہیں آتا جبکہ وہ اس کی یادوں، اس کے خیالوں میں کھوئی رہتی ہے۔ وہ اتنا اہم کیسے

ہو گیا کہ اس کے چلے جانے کے بعد زندگی بے کیف اور اپنا وجود نامکمل لگتا ہے۔

''اے ہے حور بانو...... یہ چٹنی پیس رہی ہو یا سفوف بنا رہی ہو؟''

امی جان کی آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ اس نے پہلے امی کو اور پھر سل کو دیکھا۔ پھر بڑی شرمندگی سے اس نے چٹنی پر پانی کے چھینٹے دیے اور وہ چار بار بٹا چلانے کے بعد چٹنی کو سمیٹ کر پیالے میں گرا دیا۔ وہ دالان میں چلی آئی۔ گلنار اب بھی جھولا جھول رہی تھی۔

''آئیں باجی...... جھولیں گی؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں...... دل نہیں چاہ رہا ہے۔''

گلنار نے حیرت سے اسے دیکھا۔ یہ جواب اس کے لیے بے حد خلاف توقع تھا۔ مگر آج کل باجی ایسی ہی ہو رہی تھیں۔

حور بانو تخت پر بیٹھ کر کوٹھے کو تکنے لگی، جہاں کوئی نہیں تھا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد بھی اس کا اپنا معمول وہی رہا تھا۔ عصر سے پہلے وہ یہاں آ کر ضرور بیٹھتی اور کوٹھے کو تکتی۔ پھر عصر کے بعد وہ قرآن پاک پڑھتی تو مغرب سے پہلے وضو کے بہانے اٹھ جاتی۔ وضو کے لیے جاتے وقت وہ پھر کوٹھے کی طرف دیکھتی اور مغرب کے بعد رات کے کھانے تک وہ پھر دالان میں تخت پر بیٹھی رہتی۔ اس دوران کبھی کبھی تو اسے چھوٹا ٹھاکر نظر آتا...... ایسا جیتا جاگتا کہ وہ خوش ہو جاتی...... ارے، یہ لوگ واپس آ گئے۔ مگر پلکیں جھپکتیں تو اندھیرا ویران کوٹھا سامنے ہوتا اور کبھی کبھی تو اسے سچ مچ ایسا لگتا کہ وہ لوگ کہیں نہیں گئے۔ یہیں موجود ہیں۔

اب زندگی کی مرکزی کیفیت انتظار کی تھی بلکہ یوں کہیے کہ زندگی نام ہی انتظار کا تھا۔ ویسے تو جب سے یہ دیکھنے کا کھیل شروع ہوا تھا، وہ حالت انتظار میں تھی۔ پہلے اس انتظار میں لمحے گنے جاتے تھے۔ مگر اب وہ دن گن رہی تھی...... دو مہینے کے ساٹھ دن۔ اور گرمیوں کے دن تو ویسے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ ایک ایک پل مشکل سے گزرتا ہے۔

''گلنار...... کہاں ہو؟ آ کر دسترخوان بچھاؤ۔'' امی جان نے پکارا۔ ''چلو حور بانو، نور بانو آ جاؤ بھئی۔ گرم گرم پراٹھے اترتے جائیں، کھاتی جاؤ۔''

دسترخوان بچھ گیا۔ چھمن بوا گرم پراٹھے اتار کر لا رہی تھیں۔ حور بانو نے پہلا لقمہ توڑا۔ مگر کچھ سوچ کر رک گئی۔ ''بوا...... پہلے چند پراٹھے اوپر دے آؤ نا۔'' اس نے پکارا۔

''اے بولا گئی ہو کیا۔'' امی جان نے اسے گھورا۔ ''پتا بھی ہے کہ وہ لوگ گئے ہوئے ہیں۔''

اب وہ کیا کہتی۔ کھسیائی اور دسترخوان پر جھک گئی۔

❁......❁......❁
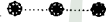
کیدار ناتھ جے پور کے میلے میں ہر سال جاتا تھا۔ مگر اس بار اس کے دماغ میں کھچڑی سی پک رہی تھی۔ اس بار اس نے اوتار سنگھ کو بہت بدلا بدلا پایا تھا۔ اس نے ایک دم سے قدم نکالا

تھا۔ وہ بہت بڑا بڑا اور بہت طاقت ور لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کیدار ناتھ کو نفرت تو ہمیشہ محسوس ہوتی تھی مگر اس بار وہ احساس کمتری میں بھی مبتلا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پرتاپ سنگھ سے بڑھ کر دبدبے والا نکلے گا۔

کیدار ناتھ نے سمجھ لیا کہ اب بھی اس نے کچھ نہ کیا تو اس کا سپنا سپنا ہی رہ جائے گا۔ وہ کبھی ٹھاکروں کی گڑھی کا بڑا ٹھاکر نہیں بن سکے گا۔ اب تو کوئی قدم اٹھانا ہی تھا۔

جے پور سے اس کا گہرا تعلق تھا۔ اس کے بیشتر رشتے دار جے پور میں ہی رہتے تھے۔ خود اس کی اپنی عمر کا بڑا حصہ بھی جے پور میں ہی بسر ہوا تھا ٹھاکروں کی گڑھی تو وہ صرف ٹھاکر بننے کے لالچ میں گیا تھا۔ جے پور ایک اعتبار سے اس کے لیے گھر کی طرح تھا۔ رشتے داروں کے علاوہ اس کے وہاں بہت تعلقات تھے۔ ہر طرح کے۔ اور اب اس نے ان تعلقات کو کام میں لانے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ میلے میں بھی شریک ہوا اور اپنے کام کے لوگوں سے بھی ملا۔ اس نے ان کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔

''او یار جی، یہ کون سی بڑی بات ہے۔'' اس کے بچپن کے دوست جسونت نے سنتے ہی کہا۔

''نہیں جسونت، بات تو بڑی ہے۔'' کیدار ناتھ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اس سلسلے میں مجھ پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔ اور شبہ کر لیا گیا تو سارا کھیل ختم سمجھو۔''

''تم پر کیوں شبہ کیا جائے گا؟''

''اس لیے کہ اس کی موت سے فائدہ صرف مجھ کو پہنچ سکتا ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ تب بھی کوئی بڑی بات نہیں۔'' جسونت نے کہا۔ ''اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔''

''مجھے پوری بات بغیر اطمینان نہیں ہوگا۔''

''یار جی...... ڈاکو تو ہر جگہ ہوتے ہیں نا۔''

''ہوتے ہیں۔ پر ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی حویلی میں گھسنے کی ہمت کسی میں نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ وہاں انھیں موت کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔''

''پر گاؤں میں تو ڈاکو کسی پر بھی حملے کر سکتے ہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' کیدار ناتھ نے پر خیال لہجے میں کہا۔ ''لیکن ایک بات کا خیال رکھنا ہوگا۔ چھوٹے ٹھاکر کو کچھ ہوا تو سب سے پہلے مجھ پر شبہ کیا جائے گا؟''

''وہ کیوں کید...؟''

''اس لیے کہ اس کی موت سے سب سے زیادہ فائدہ مجھے ہی پہنچے گا اور یہ بات نہ ہوتی

تو میں اس سلسلے میں کچھ کرتا ہی کیوں۔''

جسونت سوچ میں پڑ گیا۔ پھر سر ہلا کر بولا۔ ''تم چنتا مت کرو۔ میں ایسا بندوبست کروں گا کہ تم پر آنچ نہیں آئے گی۔''

''جو کچھ بھی کرو، میرے واپس جانے کے کچھ دن بعد کرنا۔'' کیدار ناتھ نے کہا۔ ''اور آدمی بھروسے کے ہونے چاہئیں۔ بات بگڑے تو بھی کسی قیمت نہ کھلے۔ ورنہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔''

''میں نے کہا نا، تم چنتا نہ کرو۔ یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔''

دو دن بعد کیدار ناتھ گاؤں واپس چلا آیا۔

❁ ❁ ❁

مہیش پور جمال دین کے باپ مہر دین کا وہ آبائی گاؤں تھا، جہاں سے ہجرت کر کے وہ ٹھاکروں کی گڑھی میں آیا تھا۔ ٹھاکروں کی گڑھی کی نسبت مہیش پور بڑا گاؤں تھا۔ اس کی آبادی بھی زیادہ تھی۔ وہاں چند گھر مسلمانوں کے بھی تھے۔

مہیش پور کے زمین دار ایشور لال کی ٹھاکروں سے بہت لگتی تھی۔ ایک تو مزاج کا فرق بھی تھا۔ دونوں زمین دار ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ٹھاکر پرتاپ اپنے کمیوں میں بہت پسند کیا جاتا تھا۔ بلکہ اس کی رعیت اس سے محبت کرتی تھی۔ اس کے برعکس ایشور لال روایتی زمین دار تھا۔ اس میں وہ سارے گن تھے، جن کا کسی زمین دار میں تصور بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ بہت شوقین مزاج آدمی تھا۔ ساتھ ہی ظالم بھی تھا۔ اس کے مزارعین میں اس سے کھل کر نفرت کرنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ اس سے بہت ڈرتے تھے۔

ٹھاکروں کی گڑھی مہیش پور سے چھوٹا گاؤں تھا۔ وہی نہیں، ارد گرد کے تمام گاؤں مہیش پور سے چھوٹے تھے۔ سال کے سال پھولوں کے موسم میں بہت بڑا میلہ لگتا تھا۔ اس میں مردانہ کھیلوں کے مقابلے ہوتے تھے۔ ایشور لال کی بڑی تمنا تھی کہ کسی بار اس کے گاؤں کے جوان جیت جائیں۔ لیکن جیت ہر بار ٹھاکروں کی گڑھی کے حصے میں آتی تھی۔ لٹھ بازی ہو، گھڑ سواری ہو، نیزے بازی ہو، دوڑ ہو یا کشتی، ٹھاکر کی گڑھی کے جوان ہر فن میں طاق تھے۔ یہ ایک اور وجہ تھی ایشور لال کے ٹھاکر پرتاپ سنگھ سے چڑنے کی۔

اور ایک بار ندی کے پانی پر دونوں گاؤں میں تنازعہ ہوا تھا۔ مسئلے کو بات چیت سے حل کرنے کے بجائے ایشور لال نے نفری کے زور پر طاقت کے استعمال پر بھروسہ کیا تھا اور بری طرح منہ کی کھائی تھی۔ ٹھاکر کے گاؤں کے لوگ فطری طور پر بہادر تھے...... ڈٹ جانے والے۔ اس دن کے بعد ایشور لال کی نفرت اور بڑھ گئی تھی۔ مگر وہ کر کچھ بھی نہیں سکا تھا۔

اس رات آدھی رات کے قریب آٹھ جوان ایشور لال کی حویلی پہنچے۔ جسونت نے خط

کے ذریعے پہلے ہی ایشور لال سے معاملات طے کر لیے تھے ان کے ٹھہرانے کا بندوبست حویلی کے تہہ خانے میں کر لیا گیا تھا۔ ایشور لال کے خاص معتمد جانکی داس کے سوا وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

جانکی داس انھیں تہہ خانے میں لے گیا، جہاں ضرورت کی ہر چیز پہلے سے ہی موجود تھی۔ ایشور لال نے جانکی داس کو پہلے ہی سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ ان آنے والوں کے بارے میں اپنے گاؤں میں بھی کسی کو پتا نہ چلے۔

ایشور لال نے جانکی داس کو بتا دیا تھا کہ وہ آٹھوں صرف رات کو یہاں آرام کریں گے اور ان کے بھوجن کا انتظام کرنا ہوگا۔ وہ رات کو گاؤں والوں کے سونے کے بعد آیا کریں گے اور پو پھٹے نکل جایا کریں گے۔ دن بھر وہ کیا کریں گے، کہاں رہیں گے، کس لیے آئے ہیں...... یہ سب اسے معلوم نہیں تھا۔ اور اسے معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ایشور لال کے پاس رہ کر اس نے اپنے کام سے کام رکھنا سیکھ لیا تھا۔

آنے والے خود بھی رازداری سے کام لے رہے تھے۔ انھوں نے اپنے چہرے بڑے سیاہ رومالوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ تہہ خانے میں پہنچنے کے بعد بھی انھوں نے چہرے نہیں کھولے۔ انھوں نے تنقیدی نظروں سے اس خفیہ اقامت گاہ کا جائزہ لیا اور جیسے مطمئن ہو گئے۔

''بھوجن کرنا ہے مہاراج؟'' جانکی داس نے پوچھا۔

انھوں نے اثبات میں سر ہلا دیے۔ کسی نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ جانکی داس ان کے لیے بھوجن لے کر آیا۔ وہ آٹھوں بھوجن کے لیے بیٹھے۔ تب ان میں سے ایک جانکی داس سے مخاطب ہوا۔ ''اب تم چلے جاؤ۔''

اس کی آواز کرخت تھی اور لہجے میں تحکم تھا۔ جانکی داس کو اچھا تو نہیں لگا۔ لیکن اسے زیادہ پروا بھی نہیں ہوئی۔ اسے تو بس اپنی ذمے داری پوری کرنی تھی۔ ''میں یہاں قریب ہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ گھنٹی بجا دینا۔''

''اب ہمیں ضرورت صبح نکلتے سمے ہی پڑے گی۔'' اسی شخص نے کہا۔ ''دھنے واد۔''

جانکی داس کمرے سے نکل آیا۔ وہ برابر والے چھوٹے کمروں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

※……※……※

اس شام گھٹا خوب گھر کر آئی۔ اوتار سنگھ کا دل جیسے کھل اٹھا۔ ساون کا وہ کب سے انتظار کر رہا تھا۔

صحرا میں بہار موسم [illegible] آتی ہے۔ [illegible] بہار کا آغاز ساون کی پہلی جھڑی سے ہوتا ہے۔ ساون کی محبت اوتار سنگھ کے لیے بچپن کی بات تھی۔ [illegible] کی بات ہے جب وہ ہر چیز پر غور کرتا تھا...... محسوس کرتا تھا۔

وہ باہر نکلا اور [illegible] دھان [illegible] ساتھ ہو [illegible]

جہاں گاؤں ختم ہوتا تھا، وہاں سے صحرا شروع ہوتا تھا۔ ریت ہی ریت...... لہریں لیتی ہوئی ریت۔ دھوپ ہوتی اور ہلکی سی بھی ہوا چلتی تو ریت کی جگہ پانی نظر آتا...... اور وہ پانی باقاعدہ لہریں لیتا، آگے بڑھتا نظر آتا۔ ریت تو صحرا کا خاص عنصر تھی۔ اس کے علاوہ وہاں ریت کے سینے پر خاردار جھاڑیوں اور کچھ سوکھے درختوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔

ریت کا عجیب مزاج تھا۔ وہ محض ایک لمحے کے لیے دباؤ قبول کرتی تھی۔ پھر پہلے جیسی ہو جاتی تھی۔ اس نے ریت پر چل کر دیکھا۔ پیر تھوڑے سے اندر دھنستے تھے۔ پیروں کے نشان بنتے۔ ذرا آگے جا کر وہ پلٹ کر دیکھتا تو پیچھے والے نشان معدوم ہو چکے ہوتے۔ جیسے اس نے وہاں پاؤں رکھا ہی نہ ہو۔ اور وہاں بھٹکنے کا امکان بہت زیادہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہاں سب کچھ ایک جیسا تھا۔ کہیں کوئی خاص نشانی نظر نہیں آتی تھی۔ اس کی وجہ سے سمتوں کا اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار وہ دونوں سورج غروب ہونے تک واپس نہیں ہوئے۔ اس کے بعد وہ راستہ بھٹک گئے۔ اور بڑی مشکل سے انھیں بستی کے نشان نظر آئے۔ ان کا اعتماد بحال ہوا۔ مگر وہ چند لمحوں کی بات تھی۔ بستی میں داخل ہونے سے پہلے ہی انھیں احساس ہو گیا کہ وہ ان کا گاؤں نہیں ہے۔ بعد میں انھیں پتا چلا کہ وہ شیو پور میں ہیں۔

زمین دار کی گاڑی میں انھیں ٹھاکروں کی گڑھی بھجوایا گیا، جہاں ان کی ڈھونڈ مچی تھی۔ لالٹینیں اٹھائے ہوئے گاؤں کے لوگ انھیں صحرا میں ڈھونڈ رہے تھے۔ پتا جی بہت پریشان تھے۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

اسے دیکھتے ہی انھوں نے اسے لپٹا لیا۔ ''کہاں چلے گئے تھے تم اوتار سنگھ؟''

''گھومنے گیا تھا پتا جی۔ پھر راستہ بھول گیا۔''

''صحرا میں راستہ بھولنا بہت آسان ہوتا ہے پتر۔ اور ایک بار راستہ بھول جائے تو صحرا منش کو نگل جاتا ہے۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔'' ٹھاکر نے کہا۔ ''پرنتو مجھے کچھ یاد آ گیا۔ پھر مجھے وشواس ہو گیا کہ تمھیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں شانت ہو گیا۔ پر من میں ہلکی سی چنتا لگی رہی۔''

''آپ کو کیا یاد آیا تھا پتا جی؟''

''کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔'' ٹھاکر نے تیزی سے کہا۔ پھر بات بدل دی۔ ''اور تم بھٹک کر بھیشم پور نکل جاتے تو اچھا نہ ہوتا۔ اب ایسے نہ نکلنا کبھی۔''

''واہ پتا جی...... بھٹکنے کے ڈر سے گھومنا چھوڑ دوں۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

ٹھاکر چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ جو من میں آئے کرو پتر۔ پر بھیشم پور کے معاملے میں احتیاط کرنا۔''

صحرا کے مشرق کی طرف شیو پور تھا اور جنوب کی طرف بھیشم پور۔ اوتار سنگھ نے گھومنا پھرنا تو نہیں چھوڑا۔ مگر جنوب کی سمت کا وہ خاص خیال رکھتا تھا۔ اس کی [illegible] کہ پتا جی کی

نافرمانی وہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

تب ایک دن اس نے وہ جادوئی منظر دیکھا، جس کے بعد اسے ساون سے محبت ہوگئی۔

وہ منظر اسے آج بھی یاد تھا۔ مگر اس منظر میں ایک جادو اور تھا۔ وہ یہ کہ اسے جب بھی دیکھو، لگتا تھا کہ پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ اس لیے آج ساون کی گھٹا گھر کر آئی تو اوتار سنگھ وصال دین کی طرف چل دیا۔

حمیدہ اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔ ''آ ؤ چھوٹے ٹھاکر، تم تو کبھی آتے ہی نہیں۔''

''پڑھائی میں لگا رہتا ہوں نا اماں۔'' اوتار نے کہا۔ پھر شکایتی لہجے میں بولا۔ ''تم ایسے پکارتی ہو اماں تو اچھا نہیں لگتا۔''

''کیسے پکارتی ہوں میں؟'' حمیدہ نے حیرت سے پوچھا۔

''میں تمھارے لیے ٹھاکر ہوں اماں۔'' اوتار کے لہجے کی شکایت اور بڑھ گئی۔

حمیدہ سمجھ گئی۔ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم تو بیٹے ہو میرے۔ اچھا لسی لاؤں تمھارے لیے؟''

''نہیں اماں۔ اس وقت تو میں بس ویر جی کو لینے آیا ہوں۔''

''تو جلدی کیا ہے؟ کہاں جا رہے ہو؟''

''بس اماں، سورج غروب ہونے سے پہلے کچھ دیکھنا ہے۔''

اتنے میں وصال دین کمرے سے نکل آیا تھا۔ ''بھائی...... تم کب آئے؟''

اوتار سنگھ نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما اور اسے دروازے کی طرف کھینچنے لگا۔ ''بس چلو نا ویر جی۔ دیر نہیں کرنی ہے۔''

وہ دونوں صحرا کی طرف چل دیے۔

گاؤں کے آخری سرے پر کھڑے ہو کر انھوں نے صحرا کی طرف دیکھا۔ ڈوبتے سورج کی دم توڑتی روشنی میں ریت لوہے کے ذرات جیسی لگ رہی تھی...... سیاہی مائل۔ لیکن چمک دار اور حد نظر تک صحرا ہی صحرا تھا۔ کہیں کسی آبادی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ بس ایک مقام تھا، جہاں آسمان ریت کو چومتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ نظروں کی آخری حد تھی۔ لیکن اوتار سنگھ جانتا تھا کہ کل نظر وہاں تک نہیں پہنچ سکے گی۔

اچانک ایک خیال نے اوتار سنگھ کو بری طرح چونکا دیا۔ اس کے وجود میں خود ملامتی کی ایک تند و اونچی لہر اٹھی اور اسے اندر سے بھگو گئی۔ ارے...... کیا میں آواز والی کو بھول گیا؟ اس کی آواز کو بھول گیا؟''

بس اس کے بعد ایک ہی خیال تھا، جو اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ اسے فوری طور پر مولوی صاحب کے پاس پہنچنا ہے...... سورج ڈوبنے سے پہلے!

''آؤ ویر جی چلیں۔'' اس نے وصال دین کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''ایسی جلدی کیا ہے بھائی۔'' وصال دین نے بے پروائی سے کہا۔

''جلدی ہے ویر جی۔ مجھے سورج ڈوبنے سے پہلے حویلی پہنچنا ہے...... مولوی صاحب کے پاس۔''

سورج ڈوبنے کے حوالے پر وصال دین کو مغرب کا خیال آیا اور وہ شرمندہ ہوگیا۔ اسے تو خیال ہی نہیں رہا تھا لیکن فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ ابھی مغرب میں کچھ وقت تھا۔

لیکن اوتار سنگھ کو بہت جلدی تھی۔ پہلے تو وہ تیز قدموں سے چلا۔ پھر باقاعدہ دوڑنے لگا۔ وصال دین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسی کیا افتاد آن پڑی ہے۔ پھر اسے احساس ہوا کہ اوتار سنگھ تو حویلی کی طرف جا رہا ہے جبکہ اسے ابھی مغرب کی نماز ادا کرنا تھی۔ وہ حویلی جاتا تو نماز قضا ہو جاتی۔

''بھائی...... میں گھر جاؤں؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ کیونکہ اوتار سنگھ اسے چلنے کو کہتا تو وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔

مگر خلاف توقع اوتار سنگھ نے اس سے کہا۔ ''ٹھیک ہے ویر جی۔ تم گھر جاؤ۔''

وصال دین نے سکون کی سانس لی اور اپنا رخ گھر کی طرف کر لیا۔ وہ کم سوچنے والا سادہ طبیعت کا لڑکا تھا۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ کچھ مخصوص اوقات میں اوتار سنگھ اسے ساتھ رکھنے سے گریز کرتا ہے۔

اوتار سنگھ پوری قوت سے حویلی کی طرف دوڑ رہا تھا۔ وہ اس وقت نیچے والی اور اس کی آواز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اس کا ایسا راز تھی، جس میں وہ کسی کو بھی شریک نہیں کر سکتا تھا...... ویر جی کو بھی نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہر معاملے میں وصال دین کو شریک کرنے کی خواہش کے باوجود اس نے اسے مولوی صاحب کی پڑھائی میں شریک نہیں کیا تھا اور اس وقت جبکہ اسے مولوی صاحب۔ سے عربی سننا تھی تو وہ وصال دین کو ساتھ لے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

حویلی میں داخل ہونے سے پہلے اس نے سورج کو دیکھا۔ سورج اب بھی ایک بڑے زرد گولے جیسا دکھائی دے رہا تھا...... یعنی وہ ابھی غروب ہونے کے عمل میں داخل نہیں ہوا تھا۔

اس نے سکون کی سانس لی اور مولوی صاحب کے کمرے کی طرف لپکا۔

مگر مولوی صاحب کا کمرا خالی تھا۔ وہ پریشان ہو ہی رہا تھا کہ مولوی صاحب غسل خانے کی طرف سے آتے نظر آئے۔ ان کا چہرہ اور ہاتھ پاؤں بھیگے ہوئے تھے۔ ''ارے اوتار سنگھ، خیریت تو ہے، ہانپ کیوں رہے ہو؟'' انھوں نے اس سے پوچھا۔

اوتار سنگھ کی سانس سینے میں نہیں سما رہی تھی۔ ''وہ...... مولوی صاحب...... مجھے۔ عربی میں...... کچھ سنا دیجیے۔''

مولوی صاحب کو روز کا معمول یاد آ گیا۔ ''آج وقت کچھ کم ہے......'' انھوں نے کہا۔

اوتار سنگھ نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ یہ احساس اس سے زیادہ کسی کو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے تو احساس جرم ہو رہا تھا ساون کی محبت میں گھٹا کو امنڈتے دیکھ کر وہ اپنی اصل محبت کو بھول گیا تھا۔

''مگر ٹھیک ہے۔'' مولوی صاحب نے مزید کہا۔ ''ادب سے بیٹھ جاؤ۔ میں تمھیں کچھ سناتا ہوں۔''

اوتار سنگھ بیٹھا اور ہمہ تن سماعت ہو گیا۔

مولوی صاحب نے قرأت شروع کی...... اور پھر وہی ہوا۔ احساس جرم معدوم ہو گیا۔ اس پر سپردگی اور خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔

اب وہ پھر دہلی میں اسی کوٹھے پر تھا!

❀......❀......❀

رات ہو گئی تھی۔ اوتار سنگھ مولوی صاحب کے پاؤں دبا رہا تھا۔ باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ سورج غروب ہونے کے ذرا دیر بعد ہی بارش شروع ہوئی تھی۔ تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ رکنا تو دور کی بات، بارش کے زور میں معمولی سی کمی تک نہیں ہوئی تھی اور اوتار سنگھ نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو آسمان بالکل سیاہ تھا۔ یعنی گھٹا اسی طرح چھائی ہوئی تھی۔

مولوی صاحب کسمسائے۔ اوتار سنگھ جانتا تھا کہ وہ کیا کہیں گے۔ وہ پاؤں دباتا رہا۔

''بس بیٹے، اب مجھے نیند آ رہی ہے۔'' مولوی صاحب نے کہا۔

''تھوڑی دیر اور مولوی صاحب'' اوتار سنگھ کے لہجے میں لجاجت تھی۔

''ٹھیک ہے بیٹے۔ مگر یہ یاد رکھنا کہ جب مجھے نیند آتی ہے تو جسم پر ہلکا سا دباؤ بھی نیند کو دور کر دیتا ہے۔''

اوتار سنگھ نے فوراً ہی ہاتھ روک لیے۔ کہیں مولوی صاحب کی نیند اڑ نہ جائے۔ وہ بہت آہستگی سے بستر سے اترا اور دبے پاؤں دروازے کی طرف چلا۔ روشنی گل کرنے کے بعد وہ کمرے سے نکل آیا۔ اس کا رخ پتاجی کے کمرے کی طرف تھا۔ جو اب اس کی خواب گاہ بھی تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو وہ معمول کے مطابق بیٹھے اپنی ڈائری میں کچھ لکھ رہے تھے۔ انھوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور دوبارہ لکھنے لگے۔ چند لمحے بعد انھوں نے ڈائری ایک طرف رکھی اور قلم بھی رکھ دیا۔ ''آؤ پتر، سناؤ کیسا دن گزرا؟''

''ہمیشہ کی طرح اچھا پتاجی۔'' اوتار سنگھ نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اور تمھاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟''

''بہت اچھی۔ مولوی صاحب بہت اچھے استاد ہیں۔''

''سو تو ہیں ہی۔ پر میرا پتر دنیا کا سب سے اچھا شاگرد ہے۔''

اوتار سنگھ شرمندہ ہو گیا۔ اپنی تعریف سننا اسے کبھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ یہ الفاظ پتاجی کے نہیں ہیں۔ ضرور انھوں نے مولوی صاحب سے بات کی ہو گی اور یہ مولوی صاحب نے کہا ہو گا۔ ''آپ نے مولوی صاحب سے بات کی تھی؟'' اس نے پوچھا۔

''اوش کی تھی۔'' ٹھاکر نے کہا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تمھاری پڑھائی کے لیے میں بہت چنتا کرتا ہوں۔ تمھاری طرف سے نہیں، بلکہ اس بات کی کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ گئی ہو۔''

اوتار سنگھ کو ان پر بڑی شدت سے پیار آیا۔ وہ ان کا بیٹا تھا۔ مگر وہ اس کی عزت بڑوں کی طرح سے کرتے تھے۔ کیوں؟ یہ بات وہ کبھی نہیں سمجھ سکا تھا۔ ''پتا آپ بہت اچھے ہیں۔ آپ نے مجھے ہمیشہ بہت اچھے استاد دیے ہیں۔''

''اس میں میرا کچھ نہیں پتر۔ یہ سب تو بھاگیا کی باتیں ہیں اور تم بھاگیاوان ہو'' ٹھاکر نے کہا۔ پھر اس کی آنکھوں سے تجسس جھلکنے لگا۔ ''مولوی صاحب سے تم کیا پڑھتے ہو پتر؟''

اوتار سنگھ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''عربی پڑھتا ہوں۔''

''سو تو میں بھی جانتا ہوں۔ پر تو عربی میں کیا پڑھتے ہو؟''

''عربی زبان...... اس کے قواعد۔ بس ابھی تو یہی پڑھ رہا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے جواب دیا۔ ''جو میں نے ابھی تک سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے قواعد بہت منظم اور ذخیرہ الفاظ بہت بڑا ہے۔ ایک چیز کے لیے اس زبان میں کئی کئی لفظ ہیں۔'' اوتار سنگھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس زبان کا ادب، اس کی شاعری پڑھنا چاہتا ہے، لیکن مولوی صاحب اسے صرف قواعد میں الجھائے ہوئے ہیں۔ مگر یہ شکایت ہوتی...... اور استاد کی شکایت گستاخی ہوتی ہے۔ پھر سچی بات یہ کہ مولوی صاحب ہی سمجھ سکتے تھے کہ کس چیز کی کیا اہمیت ہے۔ وہ تو نہیں جانتا تھا۔

''یہ بتاؤ پتر کہ تمھیں عربی پڑھنے کا خیال کیسے آیا؟''

[illegible] اوتار [illegible] پتاجی کے ساتھ کسی کو نہیں بتا سکتا تھا۔ ''بس پتاجی۔ ایک دن [illegible] یہ [illegible] تو من [illegible] چاہا کہ میں یہ زبان پڑھ لوں، ہندی، اردو، فارسی اور انگلش [illegible] پڑھتے ہی ہیں۔''

[illegible] ٹھاکر نے ہنکارا بھرا۔ پھر پرخیال لہجے میں بولا۔ ''[illegible] میں کوئی بات [illegible] نہیں آتی۔ کبھی کبھی نامعلوم شکتیاں منش کو کسی اور طرف لے جانا چاہتی ہیں تو من میں خود بخود خیال آتا ہے۔'' ''میں سمجھا نہیں پتاجی۔'' اوتار سنگھ [illegible] طرح چونکا۔

''[illegible] نہیں پتر۔ پوری طرح تو میں بھی نہیں سمجھا ہوں۔ بس من سے نکل گئی تھی یہ [illegible]'' [illegible] بھی نہیں جانتا تھا [illegible] وہ [illegible] جائے [illegible] اوتار سنگھ کو

وہ بات معنی خیز لگی تھی اور وہ اسی پر غور کر رہا تھا۔

''آج ساون کی جھڑی لگی ہے۔'' ٹھاکر نے بات بدلنے کی غرض سے کہا۔

''جی پتاجی۔ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔''

''ساگر بھی برس جائے تو صحرا کی پیاس نہیں بجھتی۔''

''اچھا اب آپ لیٹ جائیں...... میں آپ کے پیر دبا دوں۔''

''روز روز کیوں تکلیف کرتے ہو پتر۔''

''تکلیف نہیں پتاجی، یہ تو میرا دھرم ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

ٹھاکر شرمندہ ہو گیا۔ اس نے تو کبھی اپنے پتا کے پاؤں نہیں دبائے تھے۔ دبانے کی کوشش کرتا تو بھی وہ دبانے نہ دیتے۔ کہتے، یہ اتنے نوکر چاکر کس لیے ہیں۔ ''تم نے شاستروں میں پڑھی ہے یہ بات؟'' اس نے پوچھا۔

''شاستروں کا تو مجھے نہیں پتا۔ بس میرا من کہتا ہے۔'' اوتار سنگھ نے سادگی سے کہا۔

ٹھاکر لیٹ گیا اور اوتار سنگھ اس کی ٹانگیں دبانے لگا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ ٹھاکر کو اس سے بڑا سکون ملتا تھا۔ لیکن جب اوتار سنگھ اس کے ساتھ لیٹتا، اس سے لپٹتا تو وہ اس کے لیے دنیا کی سب سے بڑی راحت ہوتی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ نیند کو ترسے ہوئے ٹھاکر کو اب پُرسکون نیند آنے لگی تھی۔

''بس اب لیٹ جاؤ پتر۔'' تھوڑی دیر بعد ٹھاکر نے کہا۔ ''اب نیند آ رہی ہے۔''

اوتار سنگھ ٹھاکر سے لپٹ کر لیٹ گیا۔ چند منٹ بعد ہی اسے اندازہ ہوا کہ پتاجی سو چکے ہیں۔ وہ مسکرایا۔ کتنی اچھی بات ہے کہ وہ سونے لگے ہیں۔ اس نے اس عرصے میں ٹھاکر میں بہت بڑا فرق دیکھا تھا۔ اس کی صحت بہتر ہو گئی تھی۔ کاش...... یہ خیال مجھے پہلے ہی آ گیا ہوتا۔ پچھتاوے کا کانٹا اس کے دل میں چبھنے لگا۔

اس نے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی۔ لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وجہ اسے معلوم تھی۔ بارش! اس کا بس چلتا تو اسی وقت وہ صحرا کی طرف چل دیتا۔ اب وہ صبح کا منتظر تھا۔

اس نے پتاجی کے اچھی طرح سونے کا اطمینان کیا۔ پھر اٹھ کر روشنی گل کی اور کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے کھڑکی کے شیشے سے چہرہ لگایا۔ شیشہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ ٹھنڈا بھی اور دھندلا بھی۔ اس کے باوجود نظر آ رہا تھا کہ بارش بہت تیز ہو رہی ہے۔ ویسے تو یہ بتانے کے لیے بارش کا شور ہی بہت تھا۔

کچھ دیر وہ کھڑکی کے پاس کھڑا رہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ پتاجی اس سے لپٹ کر سونے کے عادی ہیں۔ کہیں اس کے نہ ہونے سے ان کی نیند نہ اچٹ جائے۔ دل نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مسہری کی طرف چل دیا۔

مولوی برکت علی بڑی الجھن میں تھے۔ کبھی تو وہ یہ تک سوچنے لگتے تھے کہ یہ ٹیوشن قبول کر کے انھوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ خود کو ایسی آزمائش میں ڈال دیا ہے، جس سے صحیح و سلامت نکلنا ممکن نہیں ہے۔ الجھن کی وجہ ان کا شاگرد تھا۔

وہ پورا معاملہ ہی پیچیدہ تھا۔ ابتداء میں انھیں اس کا احساس نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب ان کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ ان کے شاگرد کی اہلیت، لیاقت اور اس کی سیکھنے کی لگن کی شدت...... بلاشبہ یہ سب لائق تعریف عوامل تھے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ غیر مسلم تھا اور اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا سیکھ رہا ہے اس سے تو خود اس کے لیے بھی پیچیدگیاں پیدا ہوتیں۔ مگر وہ اس سے بے خبر تھا۔ جبکہ مولوی صاحب باخبر تھے۔ اس لیے پریشانی بھی ان کے لیے تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ عربی ایسی زبان نہیں کہ آدمی یونہی سیکھ لے اور وہ اسے آ بھی جائے۔ کوئی بھی زبان، جب تک اسے اندر نہ اتارا جائے، اس پر دسترس نہیں ہوتی۔ لیکن عربی زبان اس معاملے میں سب سے آگے ہے۔ برسوں کی ریاضت کے بعد ہی کوئی اس پر دسترس حاصل کر سکتا ہے۔

مگر اوتار سنگھ کا ذہن بہت تیز تھا اور سیکھنے کی خواہش بے حد توانا۔ فہم کے اعتبار سے وہ غیر معمولی لڑکا تھا۔ اگر وہ مسلمان ہوتا تو مولوی برکت علی خود کو بہت خوش نصیب سمجھتے کہ انھیں ایسا شاگرد ملا ہے۔ پھر اس کا خاندانی پس منظر الگ ایک مسئلہ تھا۔ وہ ایک متمول راج پوت گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ مولوی صاحب جانتے تھے کہ ذرا سی بھی چوک ہو گئی تو ان کے جینے کے لالے پڑ جائیں گے۔ وہ تو مصیبت میں پھنس گئے تھے۔

ابھی تو انھوں نے اسے حروف اور قواعد کے پھیر میں الجھایا ہوا تھا مگر وہ جانتے تھے کہ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ اوتار سنگھ کی رفتار کم کرنے کے لیے ان کے پاس ایک ہی ہتھیار تھا، جو اس نے خود انھیں دیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اسے اس زبان پر قدرت حاصل کرنی ہے۔ انھوں نے اس کی یہ بات پکڑ لی تھی۔ جب بھی وہ تیزی کی کوشش کرتا، وہ اسے ٹوک دیتے۔ ''بیٹے، عربی تو اس طرح تم سیکھ لوگے لیکن اس پر قدرت نہیں حاصل کر سکو گے۔ آہستہ چلو آہستہ۔''

اور شاید اوتار سنگھ کے لیے یہ بات بڑی اہم تھی۔ کیونکہ وہ فوراً ہی تیز رفتاری ختم کر دیتا۔

مولوی برکت علی کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ قواعد سے نمٹنے کے بعد اوتار سنگھ لازمی طور پر عربی لٹریچر پڑھنے کی خواہش کرتا۔ دورِ جاہلیت کا عربی ادب وہ اسے پڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ جدید عہد کا عربی لٹریچر ہندوستان میں دستیاب نہیں تھا۔ کچھ یوں بھی تھا کہ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ عربی میں دلچسپی صرف مسلمانوں کو تھی اور اس کا سبب، اس کا محرک صرف اور صرف دین تھا۔ لہٰذا صرف اپنی کتب مل سکتی تھیں۔ قرآن پاک، حدیث اور سنت پر کتابوں کی کمی نہیں تھی۔ لیکن

اوتار سنگھ کو وہ یہ سب کچھ پڑھا نہیں سکتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کسی کو پتا چل جاتا تو ان کی زندگی تک خطرے میں پڑ جاتی یہی کہا جاتا کہ وہ اس کا دھرم بھرشٹ کر رہے ہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ بہر حال مشرک تھا۔ جبکہ ان کتابوں کو تو وہ خود بھی وضو کیے بغیر نہیں چھوتے تھے۔ وہ انھیں ہاتھ لگائے، اس کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

تو سوال یہ تھا کہ یہ مرحلہ آنے پر وہ اسے پڑھنے کو کیا دیں اور ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

اس وقت خود کو سوتا ظاہر کر کے انھوں نے اسے رخصت کیا اور خود اس مسئلے پر سوچتے رہے۔ وہ بہت اچھا شاگرد تھا۔ صرف پڑھنے کے معاملے میں نہیں۔ شاگردی کے آداب بھی اسے خوب آتے تھے۔ وہ نہ صرف احترام کرنے والا تھا، بلکہ بے حد خدمت گزار بھی تھا۔ وہ احسان مانتا تھا کہ وہ اسے پڑھا رہے ہیں ایسی خدمت تو مولوی صاحب کی کسی نے کبھی نہیں کی تھی۔

مولوی صاحب نے ایک بات سمجھ لی تھی۔ درحقیقت انھوں نے بہت غلط عرصے میں یہ ٹیوشن قبول کی تھی۔ گرمی کی سالانہ چھٹیاں، یہی وجہ تھی کہ وہ جن کی طرح ان کے سر پر سوار رہتا تھا۔ اسکول کے دن ہوتے تو اوتار سنگھ کے پاس اتنی فرصت ہی نہ ہوتی۔ عربی کو وہ بہت کم وقت دیتا۔

اس خیال کے ساتھ ہی ایک ترکیب ان کی سمجھ میں آ گئی۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ کل اس پر عمل کریں گے۔ یوں اوتار سنگھ کی رفتار اور کم ہو جائے گی۔ وہ ایسے مطمئن ہوئے کہ انھیں نیند آ گئی!

صبح ہوتے ہوتے بارش تھم گئی تھی!

اوتار سنگھ ایسا بے تاب ہو رہا تھا کہ ناشتہ کیے بغیر ہی حویلی سے نکل آیا اور وصال دین کے گھر کی طرف چل دیا۔ گاؤں کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ کسی نے اسے دھو کر بالکل نیا کر دیا ہے..... نیا اور اجلا اجلا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آسمان پر اب بھی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ یہ طے تھا کہ ابھی بارش اور ہو گی۔

وصال دین بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔

اسے دیکھتے ہی بولا "مجھے معلوم تھا بھائی، آج تم ضرور آؤ گے۔"

"تم نے ناشتہ کیا ہے چھوٹے ٹھاکر؟" حمیدہ نے پوچھا۔

"نہیں اماں۔"

"تو وصال دین کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ میں گرم گرم روٹی ڈال رہی ہوں۔ مکھن موجود ہے۔"

اوتار سنگھ کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن حمیدہ کے کہنے پر بیٹھ گیا۔ وہ تو اس وقت بس یہ چاہتا تھا کہ اڑ کر صحرا میں پہنچ جائے۔ مگر اماں کی اتاری ہوئی گرم گرم روٹی، اماں کا بلویا ہوا مکھن اور لسی..... اس کی بھوک بھڑک اٹھی۔ وہ کھانے بیٹھا تو کھاتا ہی چلا گیا۔ عجیب سواد تھا اماں کے ہاتھ کے کھانے میں۔

وصال دین پہلے ہی اٹھ گیا تھا۔ اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ ہی کھا گیا ہے۔ اس نے لسی کا گلاس خالی کر کے رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو...... ویر جی اب چلنا ہے۔" اس نے وصال دین کو پکارا۔

"آتا ہوں بھائی۔" وصال دین نے کمرے سے جواب دیا۔

"ابھی ذرا دیر رکو۔" حمیدہ نے کہا۔

"کیوں اماں؟" اوتار سنگھ نے بے صبرے پن سے کہا۔

"بس کہہ جو دیا کہ رکو۔ ابھی تم لوگ نہیں جا سکتے۔ میں اجازت دوں گی تو جاؤ گے نا۔"

اوتار سنگھ بیٹھ گیا۔ مگر وہ اندر ہی اندر مچل رہا تھا۔ ایک ایک پل اسے گراں گزر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد حمیدہ ایک پوٹلیا لیے ہوئے آئی۔ "لو یہ رکھ لو۔" اس نے پوٹلیا وصال دین کی طرف بڑھائی۔

"یہ کیا ہے اماں؟" اوتار سنگھ نے پوچھا۔

روٹی مکھن اور ساگ ہے۔" حمیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس کے لیے روکا تھا تمھیں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے اماں؟"

"بچے ہو میرے۔ جانتی نہیں ہوں کیا تمھیں۔" حمیدہ نے بڑے مان سے کہا۔ "اب نکلو گے تو گھر کا ہوش تھوڑی رہے گا تمھیں۔ شام سے پہلے تو لوٹو گے نہیں۔ ساون میں بھوک بہت لگتی ہے۔"

اوتار سنگھ نے دل میں حمیدہ کو اس کی عقل مندی پر سراہا۔ واقعی وہ ان کا مزاج خوب سمجھتی تھی۔

وہ دونوں چلنے لگے۔ دروازے تک پہنچے تو حمیدہ نے پکارا۔ "سنو لاٹھیاں لیتے جاؤ۔ آج کل سانپ بہت نکل آتے ہیں بلوں سے۔"

وصال دین خاموشی سے جا کر کوٹھری سے دو لاٹھیاں نکال لایا۔ ایک لاٹھی اس نے اوتار سنگھ کی طرف بڑھا دی اور دوسری خود رکھ لی۔

"اور ہاں، خیال رکھنا کہ سورج ڈوبنے سے پہلے واپس آ جانا ورنہ ٹھاکر بھیا مجھ پر بہت خفا ہوں گے۔"

اوتار سنگھ مسکرایا۔ یہ اماں کا خاص ہتھیار تھا۔ اس سے کوئی ایسی بات منوانی ہوتی، جس کے بارے میں انھیں خدشہ ہوتا کہ وہ بھول جائے گا تو وہ یہ جملہ بڑے اہتمام سے کہتیں۔ حالانکہ اوتار سنگھ نے پتا جی کو کبھی اماں پر خفا ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے پتا جی کو غصہ کرتے ہی نہیں دیکھا تھا۔

"ٹھیک ہے اماں۔ ہم شام سے پہلے آ جائیں گے۔" اس نے کہا۔ وہ دونوں گھر سے

نکل آئے۔

❁......❁......❁

وہ گاؤں کی سرحد پر سحر زدہ سے کھڑے سامنے کا منظر دیکھے جا رہے تھے!

صحرا کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ وہاں تو اب ایک جنگل کھڑا تھا۔ رنگا رنگ پھولوں کے پودے، راتوں رات دھرتی سے نکل آئے تھے۔ ٹنڈ منڈ درخت ہرے بھرے ہو گئے تھے۔ ان پر نئی کونپلیں پھوٹی تھیں اور وہ نکھرے ہوئے پتوں سے سج گئے تھے۔ کیکٹس کے تمام پودوں پر پھول نکل آئے تھے...... نازک اور خوش رنگ پھول! اور تو اور خاردار جھاڑیاں بھی ریشم جیسی نرم لگ رہی تھیں، جیسے کسی نے ان پر مخمل کا غلاف چڑھا دیا ہو۔

یہ وہ منظر تھا کہ جب بھی دیکھو، نیا لگتا تھا۔ یہ منظر اس شعر کی تصویر تھا......

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا
کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا

اوتار سنگھ نے جب پہلی بار یہ شعر پڑھا تو حیران رہ گیا۔ جب اس نے پہلی بار صحرا کو لباس تبدیل کرتے دیکھا تھا تو اس کے ذہن میں یہی خیال آیا تھا۔ وہ شاعر نہیں تھا کہ اسے شعور میں ڈھال لیتا۔ یہ شعر پڑھ کر اس نے سوچا تھا کہ یہ شعر وہی کہہ سکتا ہے جس نے صحرا کو پل میں روپ بدلتے دیکھا ہو اور اسے سمجھ بھی وہی سکتا تھا، جس کی صحرا سے شناسائی ہو۔

وہ جادو لگتا تھا اور صحرا جادو نگری تھا۔ کسی نے جادو کی چھڑی گھمائی اور جادو کے زور سے سب کچھ بدل گیا۔ بدلنے کا اس سے تیز، اس سے بھرپور مفہوم کسی اور نظارے میں ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بارش سے پہلے کے ٹنڈ منڈ درخت تعداد میں بہت کم لگتے تھے۔ لیکن بارش کے بعد ان کی تعداد بہت زیادہ لگتی تھی۔ یا شاید زیادہ ہو ہی جاتی تھی۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی کیونکہ بارش کے نتیجے میں ایک دن میں یہ تو ممکن نہیں تھا کہ کچھ اگے بھی...... اور فوراً ہی درخت بھی بن جائے۔

وہ دونوں دیر تک سحر زدہ سے کھڑے وہ منظر دیکھتے رہے۔

اوتار سنگھ پیچھے...... بہت پیچھے پہنچ گیا تھا...... زندگی کے اس ابتدائی دور میں، جب اس نے غور وفکر...... تجسس کرنا سیکھا تھا۔

جب وہ ہر وقت سوالوں سے بھرا رہتا تھا اور ہر وقت جواب کھوجتا تھا۔ آج پھر اس کی وہی کیفیت ہو گئی۔ ایک اہم سوال کا جواب جو ملنا تھا۔

ایک بات اس نے سمجھ لی تھی۔ زندگی چار عناصر کی مرہون منت تھی۔ مٹی، پانی، آگ اور ہوا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی کم ہو جاتا تو زندگی ختم ہو جاتی۔ وہ ہمیشہ سوچتا تھا کہ چاروں میں اہم ترین عنصر کون سا ہے۔

اس نے یہ بات اپنے تینوں معلموں سے پوچھی تھی۔ ”دیکھ پتر، ہر دیوتا کو اپنا کام کرنا ہے۔ سو وہ کرتے ہیں۔“

ماتا جی نے کہا تھا۔ ”بات صرف اتنی ہے کہ جیون کو چلتے رہنا ہے۔“

”تو جیون کو کبھی رکنا بھی ہو گا۔“ اوتار سنگھ نے پوچھا۔

”نا پتر۔ جیون تو دھارا ہے۔ جنموں کا چکر ہے۔“

”جنموں کا چکر؟“

”ہاں پتر۔ جیون کا کوئی انت نہیں۔ سمے کی دھارا میں منش بار بار آتا ہے بھیس بدل کر۔“

”کیا مطلب ماتا جی؟“

”یہ سب کرموں کا کھیل ہے۔ کرم اچھے ہوں تو بہتر روپ ملتا ہے اگلے جیون میں۔ کرم برے ہوں تو برا روپ ملتا ہے۔ منش جانور بن کر بھی پیدا ہوتا ہے۔“

ماتا جی کے ساتھ یہ معاملہ تھا۔ سیدھی بات کو بھی الجھا دیتی تھیں۔ وہ عناصر پر تجسس کر رہا تھا اور انھوں نے اسے آواگون کا فلسفہ تھما دیا تھا۔ وہ کئی دن اس پر غور کرتا رہا۔ گائے کو دیکھتا تو سوچتا کہ کیا پچھلے جنم میں یہ عورت رہی ہو گی اور اس نے بہت اچھے کرم کیے ہوں گے تبھی تو یہ گئو ماتا بنی۔ ماتا جی کہتی تھیں کہ گائے سب سے اچھا روپ ہے اور وہ کتے کو دیکھتا تو اس کے پچھلے جنم کے کرموں کا سوچتا۔ یہ سزا اس کی سمجھ میں بھی نہیں آئی اور اچھی بھی نہیں لگی کہ کسی نے اچھے کرم نہیں کیے تو بھگوان نے اسے کتا بنا دیا۔ اور گئو ماتا کی پوترتا بھی اس کے حلق سے نہیں اترتی تھی۔ گائے جانور تھی، اور وہ بھی بے وقوف۔ جہاں چاہتی، گوبر کر دیتی۔ اسے ماتا کا درجہ کیسے دیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد اس نے ماسٹر جی سے رجوع کیا۔

”سب اپنی جگہ اہم ہیں۔“ ماسٹر جی نے کہا۔ ”کوئی ایک بھی کم ہو جائے تو زندگی ختم ہو جائے۔ سائنس بتاتی ہے کہ زمین جب سورج سے ٹوٹ کر علیحدہ ہوئی تو تپ رہی تھی۔ اس کی تپش سے بخارات بنے۔ بارش ہوئی...... اور لاکھوں سال برستی رہی۔ تب زمین ٹھنڈی ہوئی۔ پھر بارش کے نتیجے میں نباتات کی افزائش ہوئی۔ وہ زمین پر زندگی کا آغاز تھا۔ سورج نے توانائی دی۔ نباتات کی افزائش ہوئی۔ ہوا نے بیج اِدھر اُدھر بکھیرے۔ پھر بارش ہوئی تو بیجوں سے پودوں نے سر اٹھایا۔ اب کوئی بھی عنصر کم ہو جائے تو زندگی ختم۔“

”زندگی اس طرح شروع ہوئی تو ماسٹر جی، انسان کسی درخت پر اگا تھا؟“

ماسٹر جی بری طرح گڑبڑا گئے۔ ”منش کی نسل بڑھنے کا سسٹم الگ ہے۔“

”میں یہ پوچھ رہا ہوں ماسٹر جی کہ دنیا کا پہلا منش کیسے پیدا ہوا؟ وہ کسی درخت پر ہی اگا ہو گا نا۔“

ماسٹر جی کا چہرہ تمتما اٹھا۔ ''نہیں اوتار سنگھ، سائنس بتاتی ہے کہ منش بندر تھا۔ ہزار سال کے ارتقائی عمل کے بعد وہ بندر سے منش کے روپ میں آیا۔

''تو پھر لاکھوں کروڑوں بندر، بندر کیسے رہ گئے۔ ان پر ارتقا کا عمل کیوں ناکام ہو گیا۔'' اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔ ''اور اب تو میں آپ سے یہ پوچھوں گا کہ پہلا بندر، پہلا ہاتھی، پہلا کتا، ہر پہلا جاندار کیسے وجود میں آیا۔ مان لیا کہ بندر ترقی کر کے انسان بن گیا۔ مگر یہ تو بتائیں کہ بندر کہاں سے آیا؟''

ماسٹر جی تو ناچ کر رہ گئے۔ ''ہم بات عناصر کی کر رہے تھے۔'' انھوں نے جلدی سے کہا۔ پھر اس کا دھیان ہٹانے کی غرض سے عناصر کے بارے میں بے حد طویل تقریر کر ڈالی۔ آخر میں انھوں نے فیصلہ سنایا کہ چاروں عناصر یکساں طور پر اہم ہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔

اوتار سنگھ بے حد معاملہ فہم تھا اور اس میں خوبی تھی کہ وہ کسی بات کے پیچھے نہیں پڑتا تھا۔ اس کا مقصد کسی کو عاجز کرنا، بے بسی میں مبتلا کرنا نہیں تھا۔ وہ تو صرف جاننا اور سمجھنا چاہتا تھا۔ جب وہ سمجھ لیتا کہ اب یہاں سے معلومات حاصل نہیں ہو سکیں گی تو وہ بات ختم کر دیتا۔ اس وقت بھی اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس نے سمجھ لیا کہ اب ماسٹر جی کچھ بتا نہیں سکیں گے۔ چنانچہ اس نے بات آگے نہیں بڑھائی۔

مگر اس کے دماغ میں آواگون کی پھانس بھی چبھی ہوئی تھی۔ اس نے ماسٹر جی کو اس سلسلے میں اکسانے کی کوشش کی۔

''یہ سب بکواس ہے۔'' ماسٹر جی نے تند لہجے میں کہا۔ وہ بہت محتاط تھے یہ جواب ہرگز نہیں دیتے۔ مگر پچھلی گفتگو نے انھیں جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا اس جھنجلاہٹ میں انھوں نے یہ جواب دیا۔ ''منش مر گیا تو سب کچھ ختم۔''

اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ اب ماسٹر جی سے کچھ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ آخر میں وہ حمیدہ کے پاس گیا۔

''چھوٹے ٹھاکر، میرے بیٹے..... میں پڑھی لکھی نہیں ہوں۔'' حمیدہ کے لہجے میں معذرت تھی۔

''اس سے کیا ہوتا ہے اماں۔'' اوتار سنگھ بولا۔ ''میں پڑھتا ہوں، مگر تم مجھ سے زیادہ جانتی ہو۔ بتاؤ نا اماں۔''

حمیدہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ''مجھ جاہل کی سمجھ میں یہ تو آتا ہے کہ ترتیب بہر حال ہوتی ہے۔ مٹی کے پیٹ میں بیج پڑا ہوتا ہے۔ لیکن پانی کے بغیر بیج سے کلا نہیں پھوٹتا۔ زندگی پانی سے شروع ہوتی ہے۔ پھر مٹی کام آتی ہے۔ اس کے بعد سورج بڑھوتی کرتا ہے۔ بیج کی۔ اسے درخت بناتا ہے۔ ہوا بیج بکھیرتی ہے۔''

وہ جواب بھی تسلی بخش نہیں تھا۔ اوتار سنگھ دوسرے مرحلے کی طرف بڑھ گیا۔ ''یہ بتاؤ اماں، پہلا آدمی کیسے پیدا ہوا؟''

حمیدہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''اللہ نے پیدا کیا تھا۔''

اوتار سنگھ مایوس ہو گیا۔ اب اماں کہیں گی، خود بخود پیدا ہو گیا تھا۔ تاہم پوچھے بغیر وہ نہ مانا۔ ''کیسے؟''

''مٹی سے۔ اللہ نے مٹی سے اس کا پتلا بنایا۔''

''جیسے مورت ہوتی ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''مگر اس میں تو زندگی نہیں ہوتی۔''

''اس لیے کہ اسے اللہ نے نہیں بنایا، آدمی نے بنایا ہے۔ اللہ نے پہلے پتلا بنایا۔ پھر اس میں روح پھونک دی۔''

''اچھا اس کا کوئی نام بھی تو ہو گا۔''

''ہاں۔ وہ حضرت آدم تھے..... پہلے انسان۔''

''مگر اب جو اتنے سارے منش ہیں۔''

''حضرت آدم اکیلے تھے۔ ان کا ہم جنس، ان جیسا کوئی نہیں تھا، ان کی تنہائی دور کرنے کے لیے اللہ نے ان کی پسلی سے عورت کو پیدا فرمایا۔ وہ حضرت حوا تھیں۔ ان دونوں کی اولاد تمام انسان ہیں۔''

اوتار سنگھ کی دلچسپی کہیں کی کہیں پہنچ گئی۔ ''یعنی ان کے بعد تمام انسان ویسے پیدا ہوئے جیسے ہوتے ہیں۔ یہ بات تو دل کو لگتی ہے اماں۔''

مگر وہی لمحہ تھا کہ حمیدہ بھڑک گئی۔ ارے..... وہ ٹھاکر اوتار سنگھ کو دین پڑھا رہی ہے۔ یہ تو آگ سے کھیلنا ہوا۔ ''بس بیٹے، تم مجھ سے ایسی باتیں نہ پوچھا کرو۔''

''اچھا، اب نہیں پوچھوں گا۔'' اوتار سنگھ نے نہایت سعادت مندی سے کہا۔ ''بس ایک بات اور بتا دو۔ یہ تمہارا کون سا جنم ہے؟''

حمیدہ دونوں ہاتھوں سے رخسار پیٹنے لگی۔ ''توبہ توبہ۔ ہر آدمی کو زندگی بس دو بار ملتی ہے۔ ایک بار پیدا ہوتا ہے۔ اللہ نے جتنی عمر اسے دی ہوتی ہے، اتنا جیتا ہے۔ پھر وقت آنے پر مر جاتا ہے اور مٹی میں مل جاتا ہے۔''

اوتار سنگھ خوش ہو گیا۔ دو جنم کی بات تو اماں بھی کر رہی ہیں۔ اس نے سوچا۔ پھر بولا۔

''وہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں اماں۔ یہ تمہارا پہلا جنم ہے یا دوسرا؟''

''زندگی بس ایک ہی ہوتی ہے۔ دوسری زندگی تو قیامت کے دن سب کو ایک ساتھ ملے گی۔ اور قیامت ابھی نہیں آئی ہے۔ دوسری زندگی جب ملے گی تو اسے موت کبھی نہیں آئے گی۔ تب ہر آدمی ہمیشہ زندہ رہے گا۔''

اب اوتار سنگھ الجھ گیا۔ یہ معاملہ زیادہ پیچیدہ معلوم ہو رہا تھا۔ ''یہ قیامت کیا ہوتی ہے اماں؟''

''میں نہیں بتا سکتی چھوٹے ٹھاکر۔ اور جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ کبھی کسی سے نہ کہنا۔ ورنہ ٹھاکر بھیا ہم سب کو زندہ زمین میں گاڑ دیں گے۔'' حمیدہ کے لہجے میں خوف تھا۔

''میں کسی سے نہیں کہوں گا اماں۔ تم بتاؤ تو۔''

مگر حمیدہ نے چپ سادھ لی۔ ایسا ہمیشہ ہوتا تھا۔ اب وہ اس کی زبان نہیں کھلوا سکتا تھا۔

''کہاں کھوئے ہوئے ہو بھائی۔'' وصال دین کی آواز اوتار سنگھ کو حال کی دنیا میں کھینچ لائی۔ ''چلو نا...... بیر بہوٹیاں پکڑیں۔''

مگر وصال دین اس وقت ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک جسیم خیال کے خدوخال واضح ہو رہے تھے۔ اس نے بے دھیانی سے کہا۔ ''جلدی کیا ہے۔ ابھی چلتے ہیں۔''

وصال دین نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ پھر سر جھٹک دیا۔

اوتار سنگھ سامنے دیکھتا رہا۔ مگر درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ موہوم سے اس خیال کے خدوخال واضح ہوتے جا رہے تھے۔

اس نے صحرا کا تصور کرنے کی کوشش کی...... صحرا جو کل تھا۔ لیکن کھلی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہوئے یہ کام آسان نہیں تھا۔ ہرے بھرے جنگل کو دیکھتے ہوئے اس مردہ صحرا کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

اس بار مردہ صحرا کا منظر اس کے سامنے تھا۔ واقعی! وہ تو جیسے مردہ زمین تھی۔ اور اب...... بارش کے بعد اب وہ زندہ ہو گئی تھی۔ واضح طور پر وہ سانسیں لیتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے سینے پر سبزہ لہلہا رہا تھا۔ درخت تیز تیز سانسیں لے رہے تھے۔ پتے ہل رہے تھے۔ پھول جھوم رہے تھے۔ رنگ مسکرا رہے تھے۔ خوشبوئیں مل جل کر...... ایک دوسری کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر تالیاں بجاتی محسوس ہو رہی تھیں۔

اس لمحے اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ پانی بہت اہم ہے۔ زندگی پانی کے دم سے ہے۔ پانی سے ہی شروع ہوئی ہوگی۔ جب کچھ بھی نہیں رہا ہوگا، تب بھی سب پہلے پانی ہی رہا ہوگا۔

اس آواز اور اس آواز والی کی محبت میں گرفتار ہونے کے بعد وہ پہلا موقع تھا کہ وہ یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔ غور و فکر کر رہا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اس محبت نے اسے اپنی جستجو اور تلاش سے دور کر دیا تھا۔ اسے بہت اچھا لگا۔ لیکن چند ہی لمحے بعد وہ بلا ارادہ پھر اس آواز کے بارے میں سوچنے لگا۔ باقی سب اس کے ذہن سے نکل گیا۔

''آؤ دیر جی، چلیں۔'' اس نے وصال دین سے کہا۔

دونوں صحرا کی حدود میں داخل ہو گئے۔ وصال دین نے جلدی سے شیشی میں تھوڑی سی

ریت بھر لی۔ اوتار سنگھ نے بھی گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ریت کو چھوا اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ ریت بھیگی ہوئی تو نہیں تھی۔ لیکن ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ جبکہ عام دنوں میں اس پر ننگے پاؤں چلنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسے پتاجی کی کہی ہوئی، رات کی بات یاد آئی...... ساگر بھی برس جائے تو صحرا کی پیاس نہیں بجھتی۔

وہ بیر بہوٹیاں تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ چھوٹی بیر بہوٹیوں کو وہ نظر انداز کر رہے تھے۔ مگر انھیں دیکھنے کی خوشی بھی بہت بڑی تھی۔ سرخ...... خوبصورت سرخ رنگ کی یہ ننھی سی مخلوق جیسے نرم ملائم ریشم سے بنی تھی۔ ایسی کہ اسے دیکھ کر حیرت ہو کہ بھگوان نے کیا کیا بنایا ہے اور کیسا بنایا ہے۔ اپنی پتلی لمبی ٹانگوں پر چلتی وہ بہت عجیب لگتی تھی۔ عجیب اور خوبصورت۔ مگر جب وہ اپنے پنجے بند کر لیتی تو اسے دیکھ کر سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کوئی مخلوق ہے۔ ایسے میں اسے دیکھ کر اوتار سنگھ کو پتاجی کی انگوٹھی یاد آتی تھی، جس میں بہت خوبصورت سرخ پتھر جڑا تھا۔ اوتار سنگھ کو وہ بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ اکثر اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کرتا تھا۔

ایک دن ٹھاکر کو اس بات کا احساس ہو گیا۔ اس نے انگوٹھی اتار کر اس کی طرف بڑھائی۔ ''لو پتر...... اچھی طرح دیکھ لو اسے۔''

اوتار سنگھ نے پتھر کو بہت غور سے دیکھا۔ وہ بہت خوش رنگ اور بے داغ تھا۔

''یہ یاقوت ہے پتر۔ بہت اچھی کوالٹی کا پتھر بہت مہنگا اور بہت خوبصورت ہوتا ہے تم پہنو گے۔''

''نہیں پتاجی۔ دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ انگوٹھی پہننے کا مجھے شوق نہیں۔''

مگر پنجے سمیٹے ہوئے، ساکت بیر بہوٹی یاقوت سے ہزار گنا خوبصورت لگتی ہے اور دوسرے زاویے سے دیکھو تو یاقوت جتنا سخت ہوتا ہے، بیر بہوٹی اتنی ہی نازک ہوتی ہے۔ اسے بڑی نزاکت اور احتیاط سے پکڑا جاتا ہے۔ ایک بار انگلی اور انگوٹھے کا دباؤ ذرا سا بڑھ گیا تھا تو اس کے ہاتھ میں موجود بیر بہوٹی بیچ سے پچک گئی تھی، جیسے بہت پکا ہوا انگور ذرا سے دباؤ سے پھٹ جاتا ہے۔ اس کی انگلیوں پر سیال سا چپک گیا تھا۔ اس کا دل برا ہو گیا۔

انھوں نے آٹھ دس بڑی بڑی بیر بہوٹیاں پکڑ کر شیشی میں ڈال لیں۔ پھر وہ مزید رنگ جمع کرنے میں مصروف ہو گئے۔ وہ رنگ پھولوں کی شکل میں تھے جنھیں وہ شیشی میں اگا رہے تھے۔

وہ دن ہی رنگوں سے کھیلنے کا تھا۔ ان کے ہاتھ ایک مشغلہ اور آ گیا۔ وہ تتلیوں کے پیچھے بھاگتے پھرے۔ بڑی مشکل سے بھاگ دوڑ کر کے وہ کسی تتلی کو پکڑتے۔ مگر فوراً ہی چھوڑ دیتے۔ پھر وہ انگلی اور انگوٹھے کے پوروں پر موجود ریشمی لمس کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے محسوس کرتے۔ وہ عجیب جادوئی لمس تھا۔ دل میں پھول کھلتے محسوس ہوتے تھے۔

دوپہر ہوئی تو انھیں بھوک کا احساس ہوا۔ انھوں نے ندی کے کنارے بیٹھ کر کھانا

کھایا۔ پھر وہیں بیٹھ کر انھوں نے اپنا محبوب مشغلہ شروع کیا۔ انھوں نے شیشی میں سے اپنے لیے ایک ایک بیر بہوٹی منتخب کی۔ انھوں نے ریت پر ایک لکیر کھینچی اور دونوں بیر بہوٹیوں کو اس لکیر پر رکھ دیا۔ پھر انھوں نے کچھ فاصلے پر ایک اور لکیر کھینچ دی۔ وہ گویا وننگ پوسٹ تھی۔ جس کی بیر بہوٹی پہلے وہ لکیر پار کر جاتی وہ جیت جاتا۔

بیر بہوٹی کی عجیب فطرت ہے۔ ہاتھ میں لینا تو بڑی بات ہے، وہ کسی کی موجودگی بھی محسوس کرلے تو اپنے پنجے سمیٹ کر ایک خول کی صورت میں بند ہو جاتی ہے اس وقت بھی دونوں کی بیر بہوٹیوں کی یہی پوزیشن تھی۔ وہ ساکت تھیں۔

ان کے اندر جنبش تک نہیں تھی۔ اس کا منتر ان دونوں کے پاس تھا۔ دونوں اپنی اپنی بیر بہوٹی پر جھک کر وہ منتر گنگنانے لگے۔ ''بیر بہوٹی اپنے انجے پنجے کھول۔ تیرا اماموں لڈو پیڑے لایا۔ بیر بہوٹی اپنے انجے پنجے کھول......''

چند ہی لمحوں میں بیر بہوٹیوں نے اپنے پنجے کھول دیے۔ لیکن وصال دین کی بیر بہوٹی نے فوراً ہی اپنا رخ تبدیل کیا اور دوسری لکیر کی طرف بڑھنے کے بجائے اسی لکیر پر چلنے لگی۔

''ارے یہ کیا۔'' وصال دین چلایا۔ ''ادھر کہاں جا رہی ہو۔ ادھر چلو۔'' اس نے جلدی سے اپنی بیر بہوٹی کو پکڑ کر اس کی سمت درست کی۔ مگر بیر بہوٹی پھر اپنے پنجے بند کر کے بیٹھ گئی۔

دوسری طرف اوتار سنگھ کی بیر بہوٹی ذرا ٹیڑھی سمت سہی، بہر حال دوسری لکیر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ''شاباش...... تھوڑا تیز چلو...... کچھ اور تیز...... شاباش میری بیر بہوٹی......'' اوتار سنگھ اسے بڑھاوا دے رہا تھا، جیسے وہ سب کچھ سن اور سمجھ رہی ہو۔

ادھر وصال دین اپنی بیر بہوٹی کی سمت درست کرنے کے بعد التجائیہ لہجے میں منتر گنگنا رہا تھا۔ ''بیر بہوٹی اپنے انجے پنجے کھول......''

بالآخر وصال دین کی بیر بہوٹی نے اپنے پنجے کھولے اور چلنا شروع کیا۔ چلنا کیسا، وہ تو اب دوڑ رہی تھی، جیسے سچ مچ کسی دوڑ میں حصہ لے رہی ہو جبکہ اوتار سنگھ کی بیر بہوٹی خراماں خراماں چل رہی تھی اور اس نے ٹیڑھا چل کر اپنی مسافت اور بڑھا لی تھی۔

دونوں بیر بہوٹیوں کے درمیان فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ ادھر دوسری لکیر بھی زیادہ دور نہیں رہ گئی تھی۔ دونوں لڑکے چیخ چیخ کر اپنی اپنی بیر بہوٹی کو بڑھاوا دے رہے تھے۔ وہ اپنے اس کھیل میں اتنے منہمک تھے کہ انھوں نے بھاری قدموں کی قریب آتی ہوئی آہٹیں بھی نہیں سنیں۔

ہاں انھیں اس پر حیرت ضرور ہوئی کہ دونوں بیر بہوٹیوں نے اچانک ہی اپنے پنجے سمیٹ لیے۔

''یہ کیا؟'' وصال دین نے کہا۔ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ اب پھر منتر پڑھنا ہوگا اور

نجانے بیر بہوٹیاں پنجے کھولنے میں کتنی دیر لگائیں۔

❀......❀......❀
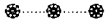
ان آٹھوں کو یہاں آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور اب وہ مایوس ہونے لگے تھے۔ ویسے تو وہ آئے ہی ناخوش تھے۔ جسونت کا لحاظ نہ ہوتا تو وہ آتے ہی نہیں۔ پندرہ سال کے ایک عام سے لڑکے کو ٹھکانے لگانے کے لیے آٹھ آدمی۔ ان کے خیال میں یہ بات ذلت آمیز تھی۔

''یارا...... یہ کام تو میں اکیلا ہی کر آؤں گا۔'' کرتارے نے جسونت سے کہا۔ ''کیوں ہم سب کو ذلیل کرتے ہو۔''

''دیکھو...... میں بہت سوچ سمجھ کر کام کر رہا ہوں۔'' جسونت نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اس میں احتیاط ضروری ہے صرف ٹھکانے لگانا کافی نہیں ہے۔ کام ایسے ہو کہ کوئی نشان بھی نہ چھوڑا جائے۔ کسی کو کچھ پتا نہ چلے۔ ورنہ ایک نشان ہی ٹھاکر پرتاپ کو اصل آدمی تک پہنچا دے گا۔''

''اور اصل آدمی کون ہے؟''

''یہ تمھیں پتا نہ ہو، اسی میں بھلائی ہے۔''

اس پر کرتار آپے سے باہر ہو گیا۔ ''او یار جسونت، صاف بول نا کہ ہم کو زنانی سمجھتا ہے۔ او کوئی ہم سے کچھ اگلوا سکتا ہے بھلا۔''

''کام میری مرضی کے مطابق کرنا ہے۔'' جسونت نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں نے کسی کو وچن دیا ہے کہ اونچ نیچ نہیں ہوگی۔ تو مجھے اس وچن کا پالن کرنا ہے۔''

''تو یارا، مکھی کو مارنے کے لیے توپ چلاؤ گے۔'' اس بار گوپال نے زبان کھولی۔

''تو تم لوگ رہنے دو۔ میں کسی اور سے بات کرلوں گا۔''

یہ سن کر کرتارا تیر کی طرح سیدھا ہو گیا۔ یہ تو بہت بڑی بے عزتی تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے اس کا یار کسی اور سے کام لے۔ ''پر یارا، سمجھا تو۔ یہ سب کیوں؟''

''بات یہ ہے کہ وہاں چھپنا آسان نہیں۔ وہ کوئی شہر تو ہے نہیں۔''

''یہی تو میں کہتا ہوں۔'' کرتارے نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ''یہ ایک آدمی کا کام ہے۔ ایک آدمی کا چھپنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ آٹھ آدمیوں کی کیا ضرورت ہے اور آٹھ آدمی کہاں چھپ سکتے ہیں۔''

''بدھی سے کام لے کرتارے۔ مجھ کو بتایا گیا ہے کہ لڑکا من موجی ہے۔ کسی بھی وقت کسی بھی طرف نکل کھڑا ہوتا ہے اور نہیں نکلتا تو کئی کئی دن حویلی سے باہر بھی نہیں آتا۔ ایک بار تو وہ راستہ بھول کر دوسرے گاؤں پہنچ گیا تھا۔ میں چاہتا ہوں، تم لوگ ڈاکو بن کر جاؤ۔ موقع ملے تو بے شک کسی کو لوٹ بھی لو اور تم لوگ الگ الگ رہو۔ یوں تم پورے علاقے پر نظر رکھ سکو گے۔ میں نے

کہا تا کہ وہ کسی بھی وقت کہیں بھی نکل سکتا ہے۔ ایک آدمی ہو تو وہ برسوں بھی کسی کو نہیں ملے گا۔"

بات کچھ کچھ سمجھ میں آتی تھی۔ پھر بھی دل نہیں مانتا تھا۔ یہ تو واقعی مکھی کو توپ کے گولے سے مارنے والی بات تھی۔ لیکن دوستی کا لحاظ تھا۔ کرتارے کو ماننا پڑا۔

یہاں آ کر وہ ایشور لال کی حویلی میں ٹھہرے۔ صبح سویرے جانکی داس انھیں کھانا دے کر رخصت کرتا اور وہ نکل کھڑے ہوتے۔ وہ اونٹوں پر سوار ہوتے اور صحرا میں پہنچ کر الگ ہو جاتے۔ دو وقت ان کی یکجائی کے ہوتے تھے۔ دوپہر میں کھانا کھانے کے لیے وہ ندی کے کنارے اکٹھا ہوتے اور رات کو واپس جاتے سے بھی وہ وہیں ملتے۔ وہاں سے وہ ساتھ ہی مہیش پور جاتے۔

اس ایک ہفتے میں انھوں نے چند افراد کو لوٹا تھا۔ مگر قسمت کی بات کہ وہ سب دور پرے کے گاؤں دیہاتوں کے لوگ تھے۔ جو یا تو شہر کی طرف جا رہے تھے یا شہر سے گاؤں واپس آ رہے تھے۔ یوں قریب کے دیہاتوں میں ڈاکوؤں کی آمد کا چرچا نہ ہو سکا، جو وہ چاہ رہے تھے۔

بہرحال اس ایک ہفتے میں ان کا دل اچاٹ ہو گیا۔ من موجی لڑکا جس کی وجہ سے وہ یہاں آئے تھے، اس کی تو ایک جھلک بھی انھیں دکھائی نہیں دی تھی بس دو دن پہلے تو وہ تہہ خانے میں بیٹھ کر اس پر گفتگو کر رہے تھے کہ کیا اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے انھیں ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی حویلی میں ہی گھسنا پڑے گا۔

"یہ تو بھول جاؤ۔" کرتارے نے کہا تھا۔ "دل تو میرا بھی یہی کرتا ہے۔ لیکن مجبوری ہے۔"

پھر کل شام موسلا دھار بارش شروع ہوئی۔ ان کے لیے تو وہ مسئلہ بن گئی۔ کہاں پناہ لیتے۔ مجبوراً ایک ایک کر کے وہ معمول سے پہلے مہیش پور چلے گئے تاہم کسی نے انھیں نہیں دیکھا۔ بارش کے نتیجے میں لوگ اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔

بارش ان کے لیے بڑی شبھ ثابت ہوئی تھی۔ صحرا ہرا بھرا ہونے کے بعد ایسا مقام نہیں رہا تھا کہ جہاں چھپنا کچھ مشکل ہو۔ بعض جگہوں پر تو وہ گھنا جنگل بن گیا تھا۔ ادھر موسم سے ان کی طبیعت بھی جولانی پر تھی۔

دوپہر کے وقت وہ یکجا ہوئے اور ندی کی طرف چل دیے۔ کرتارا آگے تھا۔ جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلتے ہی انھیں وہ دونوں نظر آئے۔ اوتار سنگھ کو اس نے پہلی نظر ہی میں پہچان لیا۔ وہ اپنی تصویر کے عین مطابق تھا۔

کرتارے نے جھٹکے سے اپنے اونٹ کو روکا اور ہاتھ اٹھا کر ساتھیوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔ پھر پلٹ کر سرگوشی میں بولا۔ "شکار بھٹ سے نکل آیا ہے۔"

ان سب کے چہرے کھل اٹھے۔

"اونٹ یہیں باندھ دو۔ میں اور راجو آگے جائیں گے۔ باقی یہیں رکیں گے۔"

"تم سردار ہو کرتارے۔ موقع ہمیں ملنا چاہیے۔" اس کے ایک ساتھی نے کہا۔

کرتارے نے چند لمحے سوچا۔ بحث کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ یہ کام راجو اور گوپال کریں گے۔"

راجو اور گوپال نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں نے اپنے ہتھیاروں کو چھوا اور آگے بڑھ گئے۔

❀❀❀

اوتار سنگھ نے آہٹیں سنی تو تھیں۔ مگر اس کا دھیان بیر بہوٹی کی طرف تھا۔ اس لیے اس کے دماغ نے ان پر توجہ نہیں دی۔

دونوں بیر بہوٹیوں کے پنجے بند کرنے کے بعد اس کی چھٹی حس نے اچانک ہی اسے نامعلوم خطرے کا احساس دلایا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ ڈھاٹے باندھے ہوئے دو افراد تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بڑا ابلم تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں خنجر تھا، جسے وہ بار بار دونوں ہاتھوں میں تول رہا تھا اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ وہ دشمن ہیں۔

وہ دونوں ابھی کوئی بیس قدم کے فاصلے پر تھے۔ اوتار سنگھ نے سرگوشی میں وصال دین کو پکارا۔ "ویر جی...... جلدی کرو۔ لٹھیا سنبھالو۔"

وصال دین نے چونک کر ایک نظر اسے اور پھر ان دونوں کو دیکھا۔ انداز ایسا تھا جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہو۔

ان کی لاٹھیاں کچھ دور پیچھے کی طرف پڑی تھیں۔ اوتار سنگھ تیزی سے جھپٹا اور لاٹھی اٹھا لی۔ اسی لمحے وصال دین بھی جیسے سب کچھ سمجھ گیا۔ وہ بھی لاٹھی کی طرف لپکا۔ دونوں دوست لاٹھیاں اٹھانے کے بعد ایک دوسرے سے خاصا دور چلے گئے۔

ڈھاٹا باندھے ہوئے دونوں افراد نپے تلے انداز میں آگے بڑھ رہے تھے لیکن ان دونوں نے جس انداز میں لاٹھیاں سنبھالی تھیں اس سے وہ کچھ جھجک گئے۔ انھوں نے پلٹ کر اس سمت دیکھا، جدھر سے وہ آئے تھے۔

ادھر کرتارے کی نگاہوں سے تشویش جھلکنے لگی تھی۔ لڑکوں نے جس انداز میں لاٹھیاں سنبھالی تھیں، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انھیں لٹھیا چلانی آتی ہے۔ اور یہ خطرناک بات تھی۔ اگر وہ اوسط درجے کے لٹھیا باز بھی تھے تو راجو اور گوپال ان کے لیے ناکافی تھے۔

"دو آدمی اور چلے جائیں۔" کرتارے نے اپنے ساتھیوں سے سرگوشی میں کہا۔

دو آدمی اور آگے بڑھ گئے۔

دونوں لڑکے لاٹھی سنبھالے کھڑے تھے۔ انھوں نے دو اور آدمیوں کو جھنڈ سے نکل کر

آتے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں بھی نیزے تھے۔ دونوں لڑکوں کی ملی جلی کیفیت تھی۔ وہ پُر اعتماد بھی تھے۔ انھیں جمال دین جیسے ماہرِ فن نے یہ فن سکھایا تھا۔ لیکن کچھ ڈر بھی تھا کیونکہ آپس میں مشق کرنا اور بات ہے اور مسلح دشمنوں کا سامنا کرنا اور بات ہے۔ وہ پہلا موقع تھا کہ ان کا واسطہ سچ مچ کے کسی دشمن سے پڑا تھا۔

نئے آنے والے دونوں آدمی اپنے پہلے ساتھیوں سے آ ملے۔ اب ان میں سے دو وصال دین کی طرف بڑھ رہے تھے اور دو اوتار سنگھ کی طرف۔

درمیانی فاصلہ کم ہوتے ہی دونوں لڑکے تیزی سے حرکت میں آئے۔ لاٹھیاں اتنی تیزی سے گردش کر رہی تھیں کہ نظر ہی نہیں آ رہی تھیں۔

پھر جو کچھ ہوا، وہ لمحوں میں ہوا۔ پہلے خنجر والا لپیٹ میں آیا۔ اس کا خنجر ہاتھ سے نکلا اور اڑتا ہوا دور جا گرا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر چیخ رہا تھا اور اس کا ہاتھ پہنچے کے پاس سے لٹک رہا تھا۔ دوسرا شکار کرپان والا تھا۔ اوتار سنگھ کی لاٹھی اس کی کنپٹی پر لگی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھیر ہو گیا۔

دونوں نیزے والے بھی گھبرا گئے تھے۔ وہ نیزے سے لاٹھی کا کام لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن لٹھیا بازی کے فن سے نابلد تھے۔ انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زیادہ دیر نہیں ٹک سکیں گے۔ دشواری یہ تھی کہ انھیں پلٹ کر بھاگنے کا موقع بھی نہیں مل رہا تھا۔

وصال دین کچھ نروس تھا۔ اس کا ارتکاز مکمل نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نیزہ اس کے بازو کو چھو کر گزرا۔ اس کی قمیص پھٹ گئی اور بازو پر ایک لکیر سی کھنچ گئی، جو دیکھتے ہی دیکھتے خون سے بھر گئی۔

''تم ہٹ جاؤ ویر جی۔'' اوتار سنگھ نے اسے پکارا۔ ''انھیں میں سنبھال لوں گا۔''

لیکن زندگی بھر وفاداری کا سبق پڑھنے والا اس آزمائش سے منہ نہیں پھیر سکتا تھا۔

اُدھر جھنڈ میں صورتِ حال اور خراب تھی۔ دو ساتھیوں کو گرتے دیکھ کر باقی لوگ میدان میں اترنا چاہتے تھے۔ جوش تو کرتارے کا خون بھی مار رہا تھا لیکن اسے اپنے وچن کی فکر بھی تھی۔ وہ بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ ''تم میں سے کوئی آگے نہیں بڑھے گا۔'' وہ سرگوشی میں پھنکارا۔

''تو اپنے ساتھیوں کو پٹتا دیکھتے رہیں۔'' رگھبیر نے غرا کر کہا۔

''اور کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا۔ لٹھیا چلانی آتی ہے تم میں سے کسی کو۔'' کرتارے نے چیلنج کیا۔

وہ تینوں خاموش رہے۔

''ہم بیس بھی ہوتے تو ان کے لیے کم تھے۔'' کرتارے نے کہا۔ ''اور سوچنے کی کوشش کرو۔ ہمیں اپنے کسی ساتھی کو یہاں چھوڑ کر نہیں جانا ہے...... زندہ نہ مردہ۔ اور میں اکیلا سات آدمیوں کو لے کر نہیں جا سکتا۔''

اتنی دیر میں لڑکوں سے لڑنے والے ان کے دوسرے دو ساتھی بھی ڈھیر ہو چکے تھے۔

''چلو ویر جی گاؤں کی طرف۔'' اوتار سنگھ نے وصال دین سے کہا۔ ''ہمیں وہاں سے لوگوں کو لے کر آنا ہے۔''

''میں یہیں رک جاتا ہوں۔'' وصال دین نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ان کی فکر نہ کرو ویر جی۔ یہ اٹھنے والے نہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔ ہمیں جانے اور واپس آنے میں بس دس منٹ لگیں گے۔''

بات ماننے والا وصال دین اوتار سنگھ کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

لڑکوں کے اوجھل ہوتے ہی کرتارا اور اس کے ساتھی اپنے گرے ہوئے ساتھیوں کی طرف لپکے۔ جس کی کنپٹی پر لٹھیا لگی تھی، وہ بے سدھ تھا۔ باقی تین ہوش میں تھے۔ مگر اٹھنے کے قابل نہیں تھے۔ ''جلدی کرو۔'' کرتارے نے کہا۔

انھوں نے چاروں ساتھیوں کو اونٹوں پر لادا۔ ''اب کرنا کیا ہے؟'' رگھبیر نے پوچھا۔

''نکلنا ہے یہاں سے۔''

''مہیش پور چلیں گے؟''

''بے وقوف نہ بنو۔ اب اس علاقے میں ہمیں ایک پل بھی نہیں رکنا ہے۔'' کرتارے نے جھنجلا کر کہا۔

❁……❁……❁

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے وید کو وصال دین کی مرہم پٹی کرنے کو کہا اور اپنے ساتھ کچھ آدمیوں کو لے کر اوتار سنگھ کے ساتھ چل پڑا۔ کیدار ناتھ بھی ان کے ساتھ تھا۔

اس کے علاوہ وہ وہاں کوئی ایسی نشانی نہیں تھی، جو اس واقعے کی گواہی دے۔

کیدار ناتھ نے اِدھر اُدھر دیکھا اور تمسخرانہ لہجے میں اوتار سنگھ سے بولا۔ ''پتر...... کہیں ایسا تو نہیں کہ تم دونوں نے خواب دیکھا ہو۔ یہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کا لہجہ فاتحانہ تھا۔

اوتار سنگھ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ٹھاکر پرتاپ نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''وصال دین کے بازو کا زخم تو اصلی ہے۔ یا وہ بھی خواب میں لگا ہے۔''

''کسی درخت کی شاخ سے خراش لگی ہو گی ٹھاکر ویر۔'' کیدار ناتھ نے بڑے ادب سے کہا۔ ''ورنہ سوچو تو۔ اتنی سی دیر میں چار زخمی آدمی کہاں جا سکتے ہیں۔ جبکہ پتر اوتار سنگھ کا کہنا ہے کہ وہ اٹھنے کے قابل نہیں تھے۔''

ٹھاکر پرتاپ کے ساتھ ایک کھوجی بھی تھا۔ ٹھاکر نے اس سے کہا۔ ''تو اِدھر اُدھر دیکھ۔ مجھے لگتا ہے، ان کے اور ساتھی بھی ہوں گے۔''

اس دوران اوتار سنگھ متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا تھا۔ ندی کے کنارے ایک

چمکتی ہوئی چیز نظر آئی تو وہ اس طرف لپکا۔ وہ ایک حملہ آور کا خنجر تھا۔ ”یہ دیکھیں پتا جی۔“ اس نے پکارا۔

ٹھاکر پرتاپ اس کی طرف بڑھا۔ کھوجی چند لمحے اِدھر اُدھر جائزہ لینے کے بعد جھنڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر نے وہاں پہنچ کر وہ خنجر اٹھایا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ”یہ لو کیدار ناتھ، خواب کا خنجر خواب سے باہر بھی آ گیا ہے۔“

”میں تو یوں ہی کہہ رہا تھا ٹھاکر ویر۔“ کیدار ناتھ نے کھسیا کر کہا۔ ”یہ نشانی تو نہیں دیکھی تھی نا میں نے۔“

ذرا ہی دیر میں کھوجی واپس آ گیا۔ ”وہ آٹھ اونٹوں پر سوار آٹھ منش تھے اَن داتا۔“ اس نے کہا۔

”چار نے حملہ کیا اور چار تماشا دیکھتے رہے۔“ ٹھاکر نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ ”انھیں وشواس ہوگا کہ دو لڑکوں کے لیے چار آدمی کافی ہیں۔ مگر جب انھوں نے چار ساتھیوں کو گرتے دیکھا تو حملہ کیوں نہیں کیا۔“ اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

”ڈاکوؤں کے دل بہت چھوٹے ہوتے ہیں ٹھاکر ویر۔“ کیدار ناتھ نے جلدی سے کہا۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ڈاکو تھے؟“ ٹھاکر نے تیکھے لہجے میں کہا۔

کیدار ناتھ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اوتار سنگھ بول اٹھا۔ ”ان کے چہروں پر ڈھاٹے تھے پتا جی۔“

”دیکھا ٹھاکر ویر، میں نے کہا تھا نا۔“

”میں نہیں مانتا کیدار ناتھ کہ وہ ڈاکو تھے۔“

”لیکن کیوں ٹھاکر ویر؟“

”پچھلے دنوں اِدھر اُدھر کے گاؤں دیہاتوں میں ایسا کچھ نہیں سنا گیا۔ ورنہ آٹھ ڈاکو آ جائیں تو شور مچ جاتا ہے علاقے میں۔ پھر وہ ڈاکو ہوتے تو میرے چھوٹے اور دو سال دین پر حملہ کیوں کرتے۔ ڈاکو تو مال دیکھ کر حملہ کرتے ہیں۔“ ٹھاکر نے دلیل دی۔

”تو ٹھاکر ویر، تمھارے خیال میں وہ کون تھے؟“

”وہ جو کوئی بھی تھے، میرے پتر کی جان لینا چاہتے تھے۔“ ٹھاکر نے کہا۔ ”صرف جان! مال سے انھیں کوئی غرض نہیں تھی۔“

”اگر وہ ڈاکو نہیں تھے تو انھوں نے ڈھاٹے کیوں باندھ رکھے تھے۔“ کیدار ناتھ نے اعتراض کیا۔

”خود کو چھپانے کے لیے۔ اور اسی لیے انھوں نے چار آدمی گرنے کے بعد مزید کوشش

نہیں کی۔ بلکہ ان چاروں کو اٹھا کر لے جانا زیادہ ضروری سمجھا۔ وہ جو بھی تھے، شناخت سے بچنا چاہتے تھے۔“

”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے ٹھاکر ویر۔“ کیدار ناتھ نے لہجے میں بے بسی سموتے ہوئے کہا۔

”مگر میری سمجھ میں بہت کچھ آ رہا ہے۔“ ٹھاکر بولا۔ ”خیر، اب اس پر حویلی میں بات ہوگی۔“

کیدار ناتھ کے من میں کھد بد ہو رہی تھی۔ وہ ٹھاکر کے ساتھ حویلی چلا آیا۔

وہ لوگ کچھ دیر ڈیوڑھی میں بیٹھے۔ ٹھاکر اپنے بیٹے کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”پتر اوتار سنگھ۔“ بالآخر اس نے کہا۔ اس کا لہجہ بھی محبت سے چھلک رہا تھا۔ ”مجھے تم پر فخر ہے پتر۔ تم نے ثابت کر دیا کہ تم ٹھاکر ہو...... اصلی ٹھاکر۔“

اوتار سنگھ نے کچھ نہیں کہا۔ بس باپ کو دیکھتا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ اب اس پر پابندیاں لگیں گی۔ وہ جانتا تھا کہ پتا جی اس سے کتنی محبت کرتے ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ اب وہ اسے اسکول نہ بھیجیں۔

”دیکھو پتر، جیون اوپر والے نے جتنا دیا ہے، منش اتنا ہی جیتا ہے۔ نہ ایک پل کم نہ ایک پل زیادہ۔“ ٹھاکر نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”راجپوت موت سے نہیں ڈرتے۔ ہاں جنگ وہ جان لینے کے لیے لڑتے ہیں، جان دینے کے لیے نہیں۔ پر جانتے ہیں کہ اس کھیل میں جان جا بھی سکتی ہے۔ سو وہ بہادروں کی طرح جیتے اور بہادروں کی طرح مرتے ہیں۔“

اوتار سنگھ اب بھی چپ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا ہے۔

”میں تم سے یہی کہوں گا پتر کہ جو ہوا، اسے بھول جاؤ۔ پر ہر بات کے لیے ہر وقت تیار رہو۔ جیسے چاہو جیو، جو چاہو کرو، جہاں چاہو جاؤ۔ بس یہ یاد رکھو کہ تم راجپوت ہو اور راجپوت دشمن پر دَیا کبھی نہیں کرتے۔“

”جی پتا جی۔“

ٹھاکر نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ ”کیا بات ہے؟ کچھ بے کل ہو پتر؟“

”جی پتا جی، وہ پڑھنے کے لیے جانا ہے۔“

ٹھاکر بے ساختہ مسکرایا۔ پھر ہنسنے لگا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ خوانخواہ بیٹے کو پڑھا رہا ہے جبکہ بیٹا اس سے بھی بڑھ کر پکا ہے۔ ابھی اس پر جان لیوا حملہ ہوا تھا اور وہ...... وہ پڑھائی کی فکر میں بے حال ہو رہا تھا۔ ”تو تم جاؤ...... پڑھو۔ شاباش پتر۔“ اس نے کہا۔

اوتار سنگھ چلا گیا۔

کیدار ناتھ کی بے چینی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اوتار سنگھ کے جاتے ہی اس نے ٹھاکر سے کہا۔ ''ٹھاکر ویر، تمھارے خیال میں چھوٹے ٹھاکر کے جیون کو کوئی خطرہ ہے؟''

''جیون کے ساتھ مرن کا دھڑکا تو لگا ہی رہتا ہے کیدار ناتھ۔ جیون کا انت تو مرن ہی ہے نا۔ پل میں ہو یا برسوں میں۔'' ٹھاکر نے فلسفیانہ انداز میں کہا ''پر مجھے خوشی ہے کہ میرا پتر جانتا ہے...... جانتا ہے کہ ٹھاکر موت سے نہیں ڈرتے۔''

''پر ٹھاکر ویر، دھڑکا ہے تو اس کا اُپائے تو سوچنا ہوگا۔'' کیدار ناتھ نے کہا۔ ''اور دشمنی ہے تو اس کا کارن بھی ہوگا۔''

''ہوگا...... اوش ہوگا۔'' ٹھاکر نے بے پروائی سے کہا۔

کیدار ناتھ کو اس کی بے پروائی بہت عجیب اور غیر فطری لگی۔ ''میں دیکھتا ہوں ٹھاکر ویر کہ تم کچھ بے پروائی کر رہے ہو۔ چھوٹا ٹھاکر تمہارا ایک ہی پتر ہے...... تمہاری نسل چلانے والا۔ اگر اسے خطرہ ہے تو تمھیں اس کی حفاظت کی فکر کرنی ہوگی۔ پر تم تو اسے اور آزادی دے رہے ہو۔ جیسے چاہو جیو، جو چاہو کرو جہاں چاہو جاؤ۔ یہ کیا بات ہوئی؟''

ٹھاکر مسکرایا۔ ''مجھے اس کی کوئی چنتا نہیں۔''

''پر کیوں؟''

''یوں کہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں ہوگا میرے پتر کو۔ وہ لمبا جیون جیے گا۔''

ٹھاکر کے لہجے کے یقین نے کیدار ناتھ کو ہلا کر رکھ دیا۔ ''اس کا اتنا وشواس کیوں ہے تمھیں؟''

''تم نہیں جانتے کیدار ناتھ کہ وہ مجھے کیسے ملا ہے۔'' ٹھاکر نے کہا۔ ''مجھے بتا دیا گیا تھا کہ کوئی اس کا بال بانکا نہیں کر سکے گا۔''

''پھر بھی ٹھاکر ویر......''

''چھوڑو اس بات کو کیدار ناتھ۔ یہاں ایک تم ہی تو ہو، جس سے من کی بات کر سکتا ہوں۔ جب تک اوتار سنگھ پیدا نہیں ہوا تھا، میں سوچتا تھا کہ ساری زمین اپنے کارندوں میں بانٹ دوں گا۔ لیکن جب وہ پیدا ہوا تو مجھے جیون اچھا لگنے لگا۔'' ٹھاکر کہتے کہتے رکا۔ چند لمحے وہ کیدار ناتھ کو غور سے دیکھتا رہا۔ ''میں اپنی وصیت تیار کر چکا ہوں۔ اگر میرے پتر کو کچھ ہو گیا تو میرا سب کچھ سرکار کے پاس چلا جائے گا۔ اوتار سنگھ کو کچھ نہ ملا تو کسی کو بھی کچھ نہیں ملے گا اور بھگوان نے اسے جیون دیا تو میں نے اپنی وصیت میں سب کا خیال رکھا ہے۔ کوئی محروم نہیں رہے گا۔''

کیدار ناتھ کو لگا کہ ٹھاکر جان بوجھ کر اسے یہ سنا رہا ہے...... جتا رہا ہے...... سمجھا رہا ہے کہ اوتار سنگھ کے جینے میں ہی اس کا فائدہ ہے۔ اوتار سنگھ کو راستے سے ہٹا کر اسے کچھ نہیں ملے گا۔

''ایسی باتیں نہ سوچو ٹھاکر ویر۔'' کیدار ناتھ نے بجھے دل سے کہا۔ من میں وہ سوچ رہا

تھا کہ اب اسے جے پور جا کر جسونت سے بات کرنی پڑے گی۔

❀......❀......❀

مولوی برکت علی اس کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا۔ ''اوتار سنگھ، استاد ہونے کے ناتے ایک بات کا مجھے شروع ہی میں خیال رکھنا چاہیے تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ تمھیں پڑھانے کی فکر میں اسے میں بھول ہی گیا۔''

''میں سمجھا نہیں مولوی صاحب۔''

''بھئی اسکول میں تمھیں ہوم ورک بھی تو ملا ہوگا نا۔''

''جی ہاں۔ ملا ہے۔''

''اور میں نے اس کی فکر بھی نہیں کی۔ بس اپنا مضمون پڑھانے میں لگا رہا۔ بڑی غیر ذمے داری ہوئی مجھ سے۔ مگر خیر۔ ابھی کچھ دن کی چھٹیاں باقی ہیں۔ اس کی تلافی اب کرنی ہوگی۔''

''آپ کیا کہہ رہے ہیں مولوی صاحب؟'' اوتار سنگھ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اب پہلے تم اپنا ہوم ورک مکمل کرو گے۔''

''وہ تو میں پہلے ہی مکمل کر چکا ہوں۔''

مولوی صاحب کو ایسا شاک لگا کہ وہ گنگ ہو کر رہ گئے۔ ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بڑی کوشش کے بعد انھوں نے خود کو سنبھالا۔ ''کک...... کیا...... کیا مطلب! تم ہوم ورک پہلے ہی کر چکے ہو؟''

''جی...... جی ہاں۔''

''ہر مضمون کا...... تمام مضامین کا۔''

''جی مولوی صاحب، تمام مضامین کا۔ لا کر دکھاؤں آپ کو۔''

''ہاں...... دکھاؤ تو۔''

''ابھی لاتا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے کہا اور کمرے سے چلا گیا۔

مولوی صاحب نے پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ ہوم ورک دیکھنے میں انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انھیں یقین تھا کہ اوتار سنگھ نے کہا ہے تو ٹھیک ہی کہا ہوگا۔ بس اس بہانے انھیں کچھ مہلت مل گئی۔ اب تو وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کہیں یہ لڑکا جن تو نہیں۔

کچھ دیر بعد اوتار سنگھ ہوم ورک کی کاپیاں لے آیا اور ہوم ورک چیک کرانے لگا۔ مولوی صاحب بے دلی سے دیکھتے رہے۔ پھر بولے۔ ''ٹھیک ہے۔ شکر ہے کہ میں شرمندگی سے بچ گیا۔''

''چلیں...... پڑھائی شروع کریں۔'' اوتار سنگھ نے خوش ہو کر کہا۔

اب مولوی صاحب اور کیا کر سکتے تھے۔ وہ اسے پڑھانے لگے۔

اس رات مولوی صاحب پھر الجھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے وہی مسئلہ تھا۔ اب اوتار سنگھ جب عربی میں کچھ پڑھنا چاہے گا تو وہ کیا کریں گے؟ اس سوال کا تو کوئی جواب انھیں نہیں سوجھ رہا تھا۔ البتہ یہ انھوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنے پڑھائے ہوئے کو بار بار ری وائز کراتے رہیں گے۔ اوتار سنگھ ایسا شاگرد تو ہے نہیں کہ کوئی اعتراض کرے۔ اس سے یہ ہوگا کہ اس کی بنیاد اور مضبوط ہو جائے گی۔

لیکن اصل مسئلے کا حل ابھی تلاش کرنا تھا۔ ری وائز کرانا اس مسئلے کا حل نہیں تھا۔ سوچتے سوچتے بالآخر ایک بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ ان کے سامنے ایک ہی راستہ تھا...... یہ کہ وہ اردو کی کہانیاں اور داستانیں خود عربی میں منتقل کریں۔

یہ سوچنے کے بعد وہ مطمئن ہو گئے۔ مگر ساتھ ہی انھیں احساس ہوا کہ ان کا یہ شاگرد ان کے لیے کتنا فائدہ مند ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ اپنی صلاحیتوں سے متعارف ہو رہے تھے۔ ورنہ شاید انھیں کبھی اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے کا خیال نہ آتا۔

اس رات وہ سوئے تو بے حد مطمئن تھے!

❁......❁......❁
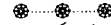
چھٹیاں اب ختم ہو رہی تھیں۔ اسکول کھلنے سے تین چار دن پہلے وہ دہلی کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔ تاکہ وہاں رہنے کھانے کا بندوبست کر لیا جائے۔ چنانچہ وہ گڑھی میں ان کی آخری رات تھی۔

اوتار سنگھ معمول کے مطابق پتاجی کے پاؤں دبا رہا تھا۔ لیکن ٹھاکر پرتاپ سنگھ بہت بے چین تھا۔ بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔

''کیا بات پتاجی؟ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟'' اوتار سنگھ نے پوچھا۔

''اب طبیعت کا کیا پوچھتے ہو پتر۔ اب سال بھر ایسے ہی رہنا ہے۔''

''ایسی باتیں نہ کریں پتاجی۔''

''چھوڑو پتر۔ تم بس مجھ سے لپٹ کر لیٹ جاؤ۔''

اوتار سنگھ ٹھاکر سے لپٹ گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اب پتاجی کو اس نئے معمول کی...... اس سے لپٹ کر سونے کی عادت ہو گئی ہے۔ یہ سال تو انھیں بہت ہی بھاری لگے گا۔ اسے یاد آیا کہ جب پہلی بار وہ ان سے لپٹ کر سویا تھا تو انھوں نے کہا تھا کہ مدت سے وہ نیند کو ترسے ہوئے ہیں۔ تو کیا اب وہ پھر رات بھر جاگا کریں گے۔

اس خیال سے وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اب وہ کیا کرے؟ کیا علاج ہے اس کا؟

''کیا یہ نہیں ہو سکتا پتر کہ تم دو دن اور رک جاؤ۔'' ٹھاکر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

ٹھیک ہے پتاجی۔ جو آپ کی اچھا۔'' اوتار سنگھ نے بلا جھجک کہا۔ ''اس بار تو میرا بالکل دل نہیں چاہتا ہے جانے کو۔''

ٹھاکر کو اس پر شدت سے پیار آیا۔ اس نے اسے بھینچ لیا۔ ''تم بہت اچھے ہو پتر۔ میں تو بچوں کی سی بات کر بیٹھا اس سے۔ ارے جانا ہے تو جانا ہے۔ دو دن سے کیا فرق پڑے گا۔ سال تو اکیلے ہی بتانا ہے نا۔''

اوتار سنگھ کا دل کٹنے لگا۔ ''پتاجی...... ایسا ہے کہ میں اسکول نہیں جاتا۔'' اوتار سنگھ نے بے حد خلوص سے کہا۔ کہنے کو تو وہ باپ کی محبت میں یہ بات کہہ گیا۔ لیکن فوراً ہی اس کی نگاہوں میں وہ کوٹھا پھر گیا...... ساعت میں وہ آواز گونجنے لگی......

لیکن وہ آزمائش بس ایک لمحے کی تھی۔ ٹھاکر نے کہا۔ ''ایسی بات نہ کرو پتر۔ تمہاری تعلیم میرا شوق ہے۔ اسکول تو تمھیں جانا ہے۔''

اوتار سنگھ اب شرمندہ تھا۔ اسکول جائے بغیر تو وہ خود بھی نہیں رہتا۔ یہ خیال اسے شرمندہ کر رہا تھا کہ اس آواز والی کی محبت باپ کی محبت کے منہ لگ رہی ہے۔

''تو پتاجی، آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ وہیں رہیں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں پتر...... یہ کہاں ممکن ہے۔ جیون کی بندشوں سے کہاں چھوٹتا ہے منش۔ چھوڑو اس بات کو۔''

مگر بات چھوڑ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آنکھیں بند کر لینے سے مسائل ختم نہیں ہو جاتے۔ یہ وہ رات تھی کہ وہ دونوں ہی نہیں سو سکتے تھے۔ یہ ان کے جاگنے کی رات تھی۔ دونوں کو معلوم تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ لیکن وہ سونے کی اداکاری کرتے رہے۔

وقت گزر ہی جاتا ہے۔ وہ رات بھی گزر گئی۔ صبح روانگی تھی۔ وہ دو راج پوتوں کے لیے سخت آزمائش کا وقت تھا۔ بہرحال وہ وقت بھی گزر ہی گیا۔

❁......❁......❁

دہلی میں سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا۔ بس ایک تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ سرفراز بیگم کو ایک دن بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ انھوں نے بچیوں کو قرآن کی تعلیم تو دلا دی تھی لیکن ان کی دینی تعلیم ابھی نامکمل ہے۔ حدیث شریف اور سیرت مبارکہ کے علم کے بغیر تو وہ مکمل نہیں ہو سکتی۔

محلے میں ایک خاتون تھیں...... مہرالنسا۔ سنا تھا کہ وہ ان علوم میں طاق ہیں۔ سرفراز بیگم نے ان سے رابطہ کیا۔ وہ اپنے گھر میں ہی بچیوں کو تعلیم دیتی تھیں۔ لیکن سرفراز بیگم نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی بچیاں گھر سے باہر قدم رکھیں۔

''آپ گھر پر آنے کی زحمت نہیں کر سکتیں؟'' سرفراز بیگم نے مہرالنسا سے کہا۔

مہر النسا کچھ ہچکچائیں۔ وہ جانتی تھیں کہ یہاں اس زحمت کی انھیں معقول فیس بھی ملے گی۔ ''آپ انھیں میرے گھر ہی بھیج دیں نا۔ اجتماعی تعلیم زیادہ موثر اور دل نشیں ہوتی ہے۔'' انھوں نے کہا۔

''آپ میری بچیوں کے لیے وقت نکالیں نا۔'' سرفراز بیگم نے اصرار کیا۔

مہر النسا سوچ میں پڑ گئیں۔ ''ان بہت ساری بچیوں کو میں نہیں چھوڑ سکتی جو میرے گھر پڑھنے کے لیے آتی ہیں۔'' انھوں نے کہا۔

''یہ تو میں چاہتی بھی نہیں۔ آپ الگ سے کوئی وقت دے دیں۔''

کچھ سوچ بچار کے بعد مہر النسا نے کہا۔ ''تو ٹھیک ہے۔ میں عصر اور مغرب کے درمیان انھیں پڑھا دیا کروں گی۔''

تینوں لڑکیاں اس نئی مصروفیت سے بہت خوش تھیں۔ ان کی روز و شب کی یکسانیت، یہ معمول انھیں بہت خوش گوار لگا تھا۔

دوسری طرف حور بانو اوپر والوں کی آمد کا ایک ایک دن گن رہی تھی۔ اسکول کھلنے میں ایک ہفتہ رہ گیا تو اس نے ان کا انتظار شروع کر دیا لیکن اس انتظار میں نہ کوفت تھی نہ اداسی کیونکہ یہ یقینی انتظار تھا۔ اسکول کھلنے سے پہلے انھیں بہرحال آنا تھا۔ سو اب حور بانو کے لیے ہر لمحہ ان کے انتظار کا تھا۔ وہ آپ ہی آپ مسکراتی رہتی۔ بار بار چلمن کی طرف جاتی۔ چند لمحے وہاں کھڑی رہتی اور پھر لوٹ آتی۔ وہ بہت کم گو لیکن بے حد خوش مزاج ہو گئی تھی۔

چار دن اس انتظار میں گزر گئے اور وہ نہیں آئے۔ لیکن حور بانو خوش تھی۔ آج نہیں تو کل...... وہ آ ہی جائیں گے۔

اور پانچویں دن وہ آ گئے!

ان کی آمد سے چند لمحے پہلے حور بانو کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکا اور اس کے قدم خود بہ خود چلمن کی جانب اٹھے۔ وہ وہاں جا کر کھڑی ہوئی ہی تھی کہ ایک بگھی اور تانگا سامنے آ کر رُکا۔

تب حور بانو نے دو ماہ کے بعد پہلی بار چھوٹے ٹھاکر کو دیکھا۔ ان دو مہینوں میں وہ پہلے سے اونچا ہو گیا تھا۔ یا شاید یہ اس کا گمان تھا!

❁......❁......❁

اوتار سنگھ کے دہلی جانے کے بعد وہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی پہلی رات تھی!

دن تو جیسے تیسے اِدھر اُدھر کی مصروفیت میں گزر گیا۔ مگر اب رات...... پہاڑ جیسی رات منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ یہ رات جس سے وہ بہت پہلے سے خوف زدہ تھا۔ سوچتا رہتا تھا کہ یہ رات آئے گی تو وہ کیا کرے گا...... کیا گزرے گی اس پر۔ اور اب یہ رات آ گئی تھی۔

سارے معاملات نمٹانے کے بعد وہ مجبوراً اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اپنا سیف کھول کر اس نے وہ کتابیں نکالیں، جو وہ چھپا کر رکھتا تھا۔ اس مطالعے میں اس کا خوب دل لگتا تھا۔ لیکن اس روز معاملہ مختلف تھا۔ وہ کتاب کھول کر پڑھ رہا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں پڑھ رہا تھا۔ اسے ایک لفظ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔ پھر وہ گہری سانس لے کر کچھ دیر سوچتا رہا۔ یہ تو پہلی رات ہے۔ اس نے سوچا۔ اور ایک سال میں 365 راتیں ہوتی ہیں۔ کیا بنے گا میرا؟

اس کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ بہت ناخوش تھا۔ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل بھی نہیں تھا وہ۔ حد یہ ہے کہ اس نے اوتار سنگھ کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی مگر اس سے اس کے بارے میں بھی نہیں سوچا گیا۔

اس نے اپنی ڈائری نکالی اور بڑی بے دلی سے قلم اٹھایا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ لکھنے میں محو ہو گیا۔

اس ڈائری لکھنے کے شغل کی کہانی بھی بڑی عجیب تھی۔ راجپوت ویسے بھی تلوار کے دھنی ہوتے ہیں، قلم کے نہیں۔ پھر زمین داری کا بکھیڑا الگ۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ڈائری لکھے گا۔

زمانہ تعلیم میں اس کا روم میٹ امان ڈائری لکھا کرتا تھا۔ ٹھاکر اسے ڈائری لکھتے دیکھ کر ہمیشہ الجھتا تھا۔ ''یہ تم کیا لکھتے رہتے ہو ڈائری میں؟'' اس نے امان سے پوچھا تھا۔

''بس یونہی۔'' امان نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''اچھا مجھے دکھاؤ۔''

''کیا کرو گے دیکھ کر؟''

''دیکھوں گا کہ تم اس میں کیا لکھتے ہو۔''

''یہ ڈائری ہے پرتاپ سنگھ۔ اور ڈائری بڑی ذاتی چیز ہوتی ہے۔ سوری...... یہ میں تمھیں نہیں دکھا سکتا۔''

''کیوں بھئی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ میں بس یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اس میں کیا لکھتے ہو۔''

''یہی تو میں تمھیں سمجھا رہا ہوں۔'' امان نے کہا۔ اس کی مسکراہٹ میں معذرت تھی۔ ''ڈائری میں آدمی وہ باتیں لکھتا ہے جو وہ کسی سے نہیں کر سکتا...... کسی سے بھی نہیں۔ تو جو باتیں وہ کسی سے کر نہیں سکتا، وہ کسی کو پڑھوا بھی نہیں سکتا۔ اسی لیے ڈائری بڑی ذاتی چیز ہوتی ہے۔''

ٹھاکر کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا۔ ''میں تو نہیں سمجھ پایا تمہاری بات۔''

''بھئی سیدھی سی بات ہے۔ ڈائری خود کلامی ہے...... ایک طرح سے خود سے گفتگو۔''

"تو کان گھما کر کیوں پکڑتے ہو؟ خود سے باتیں کر لیا کرو۔"

امان ہنسنے لگا۔ "یہ بتاؤ، تم مجھے خود سے باتیں کرتے دیکھو گے تو کیا سمجھو گے۔"

ٹھاکر نے چند لمحے غور کیا۔ پھر بولا۔ "پاگل ہی سمجھ سکتا ہوں۔"

"بس اس لیے میں خود سے باتیں نہیں کر سکتا۔ وہ باتیں میں ڈائری میں لکھ لیتا ہوں۔"

"میری سمجھ میں ایک بات اور نہیں آئی۔" ٹھاکر نے کہا۔ "ایسی کون سی باتیں ہو سکتی ہیں، جو منش کسی سے نہیں کر سکتا۔"

اس بار امان کو حیرت ہوئی۔ "کمال کرتے ہو۔ ارے آدمی سوچنے والا جانور ہے۔ دماغ ہر وقت کام کرتا رہتا ہے۔ اس میں کیسے کیسے خیال آتے ہیں۔ اگر وہ کسی سے کہے تو وہ اسے برا، بہت برا سمجھنے لگے۔ آدمی تمام باتیں کسی سے نہیں کر سکتا۔"

"اپنے سب سے اچھے دوست سے بھی نہیں؟"

امان نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں تمہارا بہت اچھا دوست ہوں۔ اور تم جانتے ہو کہ راز رکھنا بھی جانتا ہوں۔ تم مجھے کوئی ایسی بات بتاؤ گے تو مجھ سے آگے کبھی نہیں جائے گی۔"

"میں جانتا ہوں یہ بات۔" امان نے گہری سانس لے کر کہا۔ "مگر بھائی، بہت سی باتیں میں تم سے بھی نہیں کر سکتا۔"

"بھروسا نہیں ہے مجھ پر۔" ٹھاکر کے لہجے میں خفگی تھی۔

"یہ بات نہیں۔ بھروسا ہے۔ لیکن بہت سی باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جو آدمی خود سے بھی کرے تو شرمندہ ہو جاتا ہے۔ میں وہ باتیں خود سے نہیں کر سکتا۔ تم سے کروں گا تو پھر کبھی تم سے نظریں نہیں ملا سکوں گا۔ تمہارا سامنا کرنے سے گھبرانے لگوں گا۔ شاید تمہیں چھوڑ ہی بیٹھوں۔"

"تب تو مجھے بتانے کی ضرورت بھی نہیں۔" ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔ "میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔"

"چلو بات تمہاری سمجھ میں تو آئی۔" امان بولا۔ "اب یہ بتاؤ کہ ایسا تمہارے ساتھ بھی ہوتا ہوگا۔ تو تم کیا کرتے ہو؟"

"مجھے کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ ہم ٹھاکر لوگ تو ہر بات صاف کرنے کے قائل ہیں۔ میرے دل میں جو بھی آتی ہے، میں کسی سے بھی کہہ دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ مجھے کسی سے ڈر نہیں لگتا۔"

امان نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ "اتنا مت اکڑو۔ ابھی تم اس سے محفوظ ہو۔ لیکن یہ وقت ہر انسان پر آتا ہے۔"

"مجھ پر نہیں آئے گا۔" ٹھاکر نے بڑے یقین سے کہا۔

اس کے بعد بھی برسوں گزرے۔ ٹھاکر کا یقین سلامت رہا۔ اس کی زندگی میں کبھی کوئی پوشیدہ..... خفیہ موڑ نہیں آیا۔ دوسرے وہ صاحب اقتدار تھا۔ کسی سے کچھ بھی کہہ سکتا تھا۔

پھر جب ٹھاکرانی کا دیہانت ہوا اور اوتار سنگھ تعلیم کے سلسلے میں دہلی چلا گیا تو وہ اکیلا رہ گیا۔ وہ ایسی تنہائی تھی، جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ زندگی جیسے رینگ رینگ کر چلنے لگی اور وہ رینگنا بھی برائے نام تھا۔ وقت گزرتا ہی نہیں تھا۔ صبح سے شام کا انتظار رہتا۔ شام رات کے خوف میں گزرتی اور رات صبح کی آرزو میں کٹتی۔ چند ہی دنوں میں وہ اندر سے بیمار ہو گیا۔

گاؤں میں جمال دین کے علاوہ کوئی ایسا نہیں تھا، جس سے وہ قربت محسوس کرتا ہو۔ شام کے بعد جمال دین کا اس کے پاس آنا اور وقت گزارنا معمول بن گیا۔

اوتار سنگھ کی پیدائش سے پہلے کا ایک ہی خواب جو اس نے اور رنجیتا نے ایک ہی رات دیکھا تھا، درخت کا سوکھنا، مجذوب کی آمد اور اس کی باتیں اوتار سنگھ کا اس کے کمرے میں پہنچنا، پھر اوتار سنگھ جس خاص حال میں پیدا ہوا تھا، جس کی وجہ سے دائی راجو اور شانتا کی شامت آ گئی تھی، پھر اوتار سنگھ کا دودھ سے انکار اور حمیدہ کا دودھ پینا..... یہ سب ایسے معاملات تھے، جنہیں وہ برسوں سے سینے میں چھپائے بیٹھا تھا..... وہ ان پر کسی سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں بے شمار سوالات تھے۔ وہ بہت کچھ واضح طور پر جاننا..... سمجھنا چاہتا تھا۔

ایک اعتبار سے جمال دین اس کا ہم راز تھا۔ ان میں سے کم از کم ایک معاملے سے واقف تھا۔ پھر اپنی فطرت، اپنی عادات اور اپنے کردار سے اس نے ٹھاکر کا دل جیت لیا تھا۔ ٹھاکر تو اسے اپنا دوست ہی سمجھتا تھا۔ لیکن وہ خود اسے زمین دار کا اور خود کو رعیت کا درجہ دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے درمیان کبھی بے تکلفی کی فضا پیدا نہیں ہو سکی۔

ٹھاکر نے کئی بار جمال دین سے اس موضوع پر بات کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن ہمت نہ ہوئی۔ اسے امان کی بات یاد آئی اور تسلیم کرنا پڑا کہ وہ ٹھیک کہتا تھا۔ کچھ باتیں آدمی کسی سے نہیں کر سکتا..... خود سے بھی نہیں۔

یوں پہلی بار اس نے ڈائری لکھنی شروع کی۔

گاؤں میں رات جلدی ہو جاتی ہے۔ ٹھاکر کے حساب سے جمال دین جلدی گھر چلا جاتا تھا۔ وجہ یہ بھی تھی کہ ٹھاکر کو نیند آتی ہی نہیں تھی۔ یہ کمی اسے مطالعے کی طرف لے گئی۔ اور مطالعے نے ڈائری کی اہمیت اور بڑھا دی۔ اب تو تقریباً سبھی کچھ ایسا تھا، جس پر وہ کسی سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ ڈائری لکھنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

ڈائری لکھنے کی افادیت تو وہ پہلے ہی سمجھ چکا تھا۔ ڈائری لکھنے کے بعد وہ بوجھل نہیں رہتا تھا۔ ہلکا پھلکا ہو جاتا تھا۔ مگر آج اس پر ڈائری لکھنے کا ایک اور فائدہ کھلا۔ جس وقت وہ کمرے میں آ کر بیٹھا تھا تو سب سے پہلے اس نے مطالعے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ ارتکاز سے محروم تھا۔ پڑھنے

کے باوجود اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ دل لگ ہی نہیں رہا تھا۔ لیکن اب ڈائری لکھنے کے بعد وہ ہلکا ہوا تو اس نے کتاب اٹھائی اور سرسری طور پر اسے دیکھا۔ فوراً ہی اس کا دل کتاب میں لگ گیا۔ وہ مطالعے میں محو ہو گیا۔

جو کتابیں وہ پڑھتا تھا، اپنے نفس مضمون کے اعتبار سے بہت بھاری تھیں۔ شوق ہونے کے باوجود وہ ایک حد سے زیادہ مطالعہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس حد سے بڑھ کر مطالعہ کرتا تو سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ لگتا خالی لفظوں سے سر ٹکرا رہا ہے۔ ایسے میں وہ سمجھ جاتا کہ اب مطالعہ چھوڑنے کا وقت آ گیا ہے۔ اب اسے مطالعے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکے گا۔

اس وقت بھی یہی ہوا اور اس نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔

اس نے گہری سانس لے کر گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی رات آدھی سے زیادہ باقی تھی اور اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ وہی پرانا والا مسئلہ اس کے سامنے منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ اوتار سنگھ کے جانے کے بعد اسے نیند کم ہی آتی تھی۔

وہ کمرے میں بے چینی سے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہلتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے تھکن کا احساس ہونے لگا۔ دماغی طور پر تو وہ پہلے ہی تھک چکا تھا۔ ڈائری لکھنے اور مطالعے کے بعد دماغی تھکن تو ہونا ہی تھا۔ اور اب جسم بھی تھک گیا تھا۔

تھکن کا تقاضا تھا کہ وہ لیٹ جائے۔ سو وہ لیٹ گیا۔ اس کے بعد وہی کروٹیں بدلنے کا پرانا معمول۔ کچھ دیر وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اس وقت اوتار سنگھ اسے شدت سے یاد آ رہا تھا۔ کیسے وہ اس سے لپٹ کر لیٹتا تھا۔ اس نے ہاتھ پھیلائے اور جیسے اس کے ہاتھ نے اوتار سنگھ کو چھو لیا۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ اوتار سنگھ کا تکیہ تھا۔ مگر اس میں حرارت تھی...... اوتار سنگھ کے جسم کا لمس تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا ہاتھ تکیے پر نہیں، اوتار سنگھ کے دھڑکتے ہوئے سینے پر رکھا ہے۔

اس کا دل طمانیت سے بھر گیا۔ اس نے تکیے کو اپنی طرف کھینچا اور یوں سینے سے لگا لیا، جیسے وہ اوتار سنگھ ہے۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ سکون اس کے لیے ناقابل یقین تھا۔ اوتار سنگھ جاتے جاتے مجھے یہ تحفہ دے گیا ہے۔ اس نے سوچا۔ شاید اب اس کی جدائی کا سے اتنا سخت نہیں گزرے گا۔

اس کا خیال درست تھا۔ کچھ دیر وہ اس تکیے کو لپٹائے لیٹا رہا۔ پھر کب اسے نیند آئی، یہ اسے پتا ہی نہ چلا۔ اور وہ بہت گہری نیند تھی!

❀......❀......❀
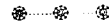
مولوی صاحب گھر ان سب [illegible] ساتھ آ [illegible] تھے۔ وہ کچھ دیر بیٹھے بھی۔ پھر انھوں نے کہا۔ ''اوتار سنگھ [illegible] میں چلتا ہوں۔''

''کہاں مولوی صاحب؟ کہاں جائیں گے آپ؟'' اوتار سنگھ نے حیرت سے کہا۔

مولوی صاحب کو اس کی حیرت پر حیرت ہوئی۔ ''ارے بھئی، اپنے گھر۔ اور کہاں جاؤں گا۔'' انھوں نے کہا۔

''گھر؟'' اوتار سنگھ نے حیرت سے دہرایا۔

''ہاں بھئی گھر، جہاں میں رہتا ہوں۔ میرے بچے رہتے ہیں۔''

اوتار سنگھ کو شاک لگا۔ اتنے دن مولوی صاحب اس کے ساتھ رہے تھے کہ وہ یہ سب بھول ہی گیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ مولوی صاحب دہلی میں رہتے ہیں۔ ان کا گھر ہے۔ بیوی بچے ہیں اور وہ اسی اسکول میں پڑھاتے بھی ہیں، جہاں وہ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اب وہ اپنے گھر تو جائیں گے۔ اور وہیں رہیں گے۔ وہ اداس ہو گیا۔ تو اب وہ ان کی خدمت سے...... ان کے پاؤں دبانے سے محروم ہو جائے گا!

''کچھ دیر اور رکیں نا مولوی صاحب۔'' اس نے کہا۔

مولوی صاحب نے جواب نہیں دیا۔ بس بیٹھ گئے۔ لیکن اضطراب ان کے صرف چہرے پر نہیں تھا۔ ان کا جسم تک مرتعش تھا۔ اوتار سنگھ نے انھیں غور سے دیکھا۔ اس بار بات ایک لمحے میں اس کی سمجھ میں آ گئی۔ گھر کو اور بیوی بچوں کو ترستے ہوئے مولوی صاحب کے لیے اس وقت ایک پل یہاں رکنا بھی دوبھر تھا۔ ان کا بس چلتا تو اڑ کر گھر پہنچ جاتے۔ اس کو احساس ہوا کہ اس وقت اس نے ان پر بڑا ظلم کیا تھا۔

''مجھے معاف کر دیجیے مولوی صاحب۔ آپ جائیے...... گھر جائیے آپ۔'' اس نے کہا۔

''چلا جاؤں گا۔ اب تین دن بعد اسکول کھل رہے ہیں۔ اس کے بعد یہ دیکھنا ہو گا کہ میں تمھیں کب وقت دے سکوں گا۔''

''جی...... جی ہاں۔''

''تو اب یہ سمجھ لو کہ ایک ہفتے کی چھٹی۔ اس کے بعد پڑھائی کا وقت طے کریں گے۔''

ایک ہفتے کے لیے عربی پڑھنے کی چھٹی! یہ اوتار سنگھ کے لیے تکلیف دہ بات تھی۔ لیکن اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ مولوی صاحب کو اپنے بچھڑے ہوئے بیوی بچوں کے لیے کچھ وقت تو ملنا چاہیے۔ پھر اسے کوٹھے کا خیال آ گیا۔ وہ بھی تو بے تاب ہو رہا تھا کہ شام ہو اور وہ کوٹھے پر جائے۔

''جی مولوی صاحب، جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں اتنے دن اپنا سبق دہراتا رہوں گا۔''

مولوی صاحب چلے گئے۔

اگلے چند گھنٹوں میں زندگی کے معمولات پھر سے جاری ہو گئے۔ رگھو بازار جا کر سودا لایا۔ اتنی دیر میں رنجنا نے گھر کی صفائی کر ڈالی۔ رگھو سودا لے کر آیا تو وہ رسوئی میں جا گھسی۔ تین گھنٹے بعد وہ دہلی میں پہلا کھانا کھا رہے تھے۔

اوتار سنگھ کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ بہت بے چین، بہت مضطرب تھا۔ اس وقت اسے نہ اسکول کا خیال تھا نہ اسکول کی پڑھائی کا۔ نہ ہی اسے عربی کی پڑھائی کی فکر تھی۔ اس کے دماغ پر تو صرف کوٹھا سوار تھا۔ وہ یونہی وقت گزاری کے لیے کانتی پرشاد جی سے اور کبھی وصال دین سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اس کی بے تابی ایسی تھی کہ وقت سے کچھ پہلے ہی وہ کوٹھے پر چلا گیا۔

رنجنا اوپر آ کر صفائی کر گئی تھی۔ کرسیاں اس نے جھاڑ پونچھ کر ترتیب سے رکھ دی تھیں۔ اس لیے کوٹھا ویسا ہی لگ رہا تھا، جیسا وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس بار اس نے کتابیں ساتھ لانے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔

وہ بیٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھتا...... جائزہ لیتا رہا۔ لیکن گرد و پیش سے درحقیقت اسے ایسی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ محض وقت گزاری تھی۔ چند منٹ میں ہی وہ اکتا گیا تو اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

دیر ہو گئی۔ مگر وہ آواز سنائی نہیں دی، جس کا انتظار وہ دو ماہ سے کر رہا تھا۔ پہلے تو وہ یہی سمجھتا رہا کہ وہ وقت سے کافی پہلے اوپر آ گیا ہے۔ مگر پھر اسے گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔ اس کا دل اندیشوں سے بھر گیا۔ ان دو مہینوں کی دوری میں ایسا کیا ہو گیا کہ آج وہ آواز سنائی نہیں دے رہی۔ کہیں وہ......! اس کہیں وہ کے آگے متعدد امکانات تھے، جن پر وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ اس کے ٹہلنے کی رفتار دوڑنے کے برابر ہو گئی ہے۔ اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ نیچے سے کوئی اسے دیکھ رہا ہے!

❀......❀......❀
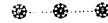
دو ماہ سے ترسی ہوئی حور بانو کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ چھوٹے ٹھاکر کی ایک جھلک دیکھ چکی تھی اور اس جھلک نے اسے اور بے تاب کر دیا تھا۔ وہ بار بار دالان کے چکر لگا رہی تھی۔

پھر اس نے اون کا گولا، اپنی سلائیاں اور ادھ بنا سویٹر اٹھایا اور دالان میں پڑے تخت پر آ بیٹھی۔ لیکن اس کی سلائیاں حرکت میں نہیں تھیں۔ اس کیفیت میں وہ بننے کی کوشش کرتی تو یقیناً غلط پھندے ہی ڈالتی۔

وہ وہاں بیٹھی رہی۔ اس کی نظریں نامکمل سویٹر پر تھیں۔ لیکن سماعت اوپر والے مکان کی آوازوں پر مرکوز تھی۔ عقل اسے کہتی تھی کہ وہ شام کو اسی مخصوص وقت میں کوٹھے پر جائے گا۔ مگر دل مُصر تھا کہ وہ یہاں بیٹھ کر انتظار کرے۔ کون جانے، آج وہ جلدی ہی آ جائے۔

زینے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ بغیر دیکھے وہ بتا سکتی تھی کہ وہ رنجنا ہے۔ لیکن پھر بھی

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ رنجنا ہی تھی، جو ہاتھ میں جھاڑو لیے کوٹھے پر جا رہی تھی۔

اس کا وہاں بیٹھنا فائدہ مند ثابت ہوا۔ اس بار قدموں کی آہٹ وہ تھی، جس کے ساتھ اس کا دل بے ترتیب ہو کر دھڑکتا تھا۔ اور وہ اس کی توقع سے خاصا پہلے اوپر جا رہا تھا۔ ورنہ اس کے اوپر جانے کا وقت مخصوص تھا۔

اس کی نظریں اوپر اٹھیں اور جم کر رہ گئیں۔ چند لمحے بعد چھوٹا ٹھاکر اس کے حیطہ نگاہ میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کتابیں نہیں تھیں۔ وہ اوپر پہنچا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا، جیسے گرد و پیش سے دو ماہ کا ٹوٹا ہوا تعلق پھر سے جوڑ رہا ہو۔

پھر وہ اٹھا اور ٹہلنے لگا!

حور بانو کی نگاہیں اس کی ایک ایک حرکت پر جمی تھیں۔ وہ والہانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

کچھ اور وقت گزر گیا۔ وہ اب بھی ٹہل رہا تھا۔ مگر اب حور بانو کو ایک غیر محسوس تبدیلی کا احساس ہو رہا تھا۔ اپنی وارفتگی کی وجہ سے وہ شعوری طور پر تو اسے محسوس نہیں کر سکی تھی۔ لیکن اس کے لاشعور نے اسے سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ اب وہ غور کر رہی تھی۔

پھر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ چھوٹے ٹھاکر کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ یہی نہیں، اس کے جسم کا ایک ایک عضو اس کے اندرونی اضطراب کا اظہار کر رہا تھا۔

حور بانو سوچ میں پڑ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے، محض چند لمحوں میں یہ تبدیلی کیسی؟ وہ آ کر بیٹھا تو پُرسکون تھا۔ پھر اس نے ٹہلنا شروع کیا، تب بھی وہ پُرسکون تھا۔ مگر اچانک ہی وہ مضطرب ہو گیا۔ کیوں؟

وہ اس پر سوچتی۔ مگر اسے موقع ہی نہیں ملا۔ ''حور بانو، عصر پڑھ لو۔ استانی جی آتی ہی ہوں گی۔'' امی نے اسے پکارا۔

''جی امی، وضو کر کے آتی ہوں۔''

اس نے اٹھ کر سلائیاں، اون کا گولا اور ادھ بنا سویٹر رکھا اور کاہلی سے غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ وضو کرتے ہوئے بھی وہ کوٹھے کی طرف دیکھتی رہی۔ چھوٹے ٹھاکر کی رفتار اور اس کا اضطراب اور بڑھ گیا تھا۔ وہ کسی عجیب ہی کیفیت میں تھا۔ اور حور بانو اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ یہ اچانک ہو کیا گیا ہے۔

وہ نماز پڑھ ہی چکی تھی کہ استانی جی آ گئیں۔ تینوں بہنیں ان سے پڑھنے بیٹھ گئیں۔ استانی جی بہت اچھا پڑھاتی تھیں۔ ان کا انداز بڑا دل نشیں تھا۔ وہ ایسی فضا بناتی تھیں کہ اس سے باہر نکلنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس دن حور بانو کا دل کوٹھے پر اٹکا ہوا تھا اور وہ چھوٹے ٹھاکر کے اچانک مضطرب ہونے پر غور کر رہی تھی۔

پڑھائی ختم ہوئی تو مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ انھوں نے مغرب کی نماز پڑھی۔ نماز پڑھتے ہی حور بانو دالان کی طرف لپکی۔ اس نے سلائیوں کو اٹھانے کا تکلف بھی نہیں کیا۔ تخت پر بیٹھتے ہی اس نے نظریں اٹھا کر کوٹھے کی طرف دیکھا۔

وہاں اندھیرا تھا۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ کچھ دیکھ نہ پاتی۔ چھوٹا ٹھا کر وہاں موجود تھا۔

❀.........❀.........❀

آس ایک بہت پتلے اور کمزور دھاگے کی طرح تھی۔ اور وہ کہتی تھی کہ کسی بھی لمحے وہ آواز ایک بار پھر فضا میں ابھرے گی۔ لیکن ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ کمزور دھاگا بھی اوتار سنگھ کے ہاتھ سے پھسلا جا رہا تھا۔

اور پھر مغرب کی اذان شروع ہوئی۔ اوتار سنگھ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ یہ کیسی آواز ہے اور اس کا کیا مطلب ہے۔ مگر وہ اتنا جانتا تھا کہ جس آواز سے اسے عشق ہوا تھا، وہ نسوانی آواز اس آواز سے پہلے خاموش ہو چکی ہوتی تھی۔

آس کا وہ کمزور دھاگا بھی ٹوٹ گیا!

اوتار سنگھ کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی بہت اہم چیز اس سے چھن گئی ہے۔ مایوسی ایسی تھی، جیسے دنیا میں کچھ بچا ہی نہ ہو۔ باہر جھٹ پٹے کا سماں تھا۔ لیکن اس کے اندر تو جیسے گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ ٹہلنا موقوف کر کے وہ بیٹھ گیا اور یوں بیٹھا، جیسے مر گیا ہو۔ خود اسے بھی اس بات کا احساس تھا۔ اس نے ہاتھ ہلانے کی کوشش کی۔ مگر ہاتھ تو کیا، اس سے ایک انگلی بھی نہیں ہلائی گئی۔

یہ کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟ یہ کیا ہو گیا ہے مجھے؟ اس نے گھبرا کر سوچا۔ یہ کیا ہو رہا ہے مجھے؟ وہ نہایت خوف زدہ تھا۔ کیا یہی موت ہے؟ کیا میں مر گیا ہوں؟ موت ساکت ہو جانے کا ہی تو نام ہے!

لیکن وہ سوچتے ہوئے ذہن کا آدمی تھا۔ بدترین صورتِ حال میں بھی اس کا ذہن تجزیہ کرنے کی راہیں نکال لیتا تھا۔ ماں کی موت جیسے صدمے پر بھی اس کا ذہن سوچ رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کا ذہن سوچ رہا تھا۔

چنانچہ اس کے اندر ایک تردید ابھری۔ نہیں، یہ موت نہیں۔ موت تو سب کچھ ختم کر دیتی ہے۔ ماسٹر جی کہتے تھے کہ موت مکتی ہے۔ زندگی کے تمام دکھوں، تمام پریشانیوں کو مٹا ڈالتی ہے۔ منش تمام بکھیڑوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ نجات پا لیتا ہے۔ جبکہ وہ تو اس وقت بہت زیادہ دکھی، بہت زیادہ مایوس ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ زندہ ہے۔

پھر جس طرح بالکل اچانک اس کے اندر گھپ اندھیرا ہوا تھا، ویسے ہی بالکل اچانک اس گھپ اندھیرے میں روشنی کی ایک ننھی سی کرن چمکی۔ وہ ننھا سا ایک روشن نقطہ تھا۔ اس کے دل

میں ایک امید جاگی۔ شاید ایسا ہے کہ نیچے والی لڑکی نے وقت تبدیل کر دیا ہے۔ ابھی کچھ دیر بعد...... یا زیادہ دیر بعد بہر حال وہ آواز ابھرے گی اور یہ اندھیرا روشنی سے تبدیل ہو جائے گا۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے دل اور دماغ دونوں اس پر متفق تھے کہ یہ بہت موہوم امید ہے...... بے حد دور از کار۔ اس کے باوجود اس کے اندر اس امید کے لیے قبولیت پیدا ہو گئی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے فضا بدلی اور دل نے بھی اس امید کے دھاگے کو تھام لیا۔

پڑوس کے گھروں میں، کوٹھوں پر روشنی ہوئی تو اس کا کوٹھا بھی کچھ روشن ہو گیا۔ ساتھ ہی اندر کے اندھیرے میں بھی کچھ کمی ہوئی۔ کچھ یوں بھی تھا کہ اس نے اپنا دھیان اصل مسئلے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

مگر وہ مایوس اب بھی تھا۔ دو ماہ وہ اس آواز سے محروم رہا تھا اور ان دو مہینوں کے ہر دن، اور ہر دن کے ہر لمحے اس نے یہی سوچا تھا کہ چھٹیاں ختم ہوں گی، وہ دہلی جائے گا اور وہ آواز سنے گا۔ لیکن آنے کے بعد پہلے ہی دن اسے مایوسی ہوئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہاں سب کچھ بدل گیا ہے۔ کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا ہے۔ اور زیادہ مایوسی کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سوچ رہا تھا...... شاید یہ تبدیلی مستقل ہے...... شاید اب وہ کبھی یہ آواز نہیں سن سکے گا اور اس کا یہ سوچنا فطری بھی تھا۔

اس موہوم امید کے تحت وہ اب بھی انتظار کر رہا تھا لیکن وہ نیم دلانہ انتظار تھا۔ اندر کی مایوسی کا عکس اس کے چہرے پر صاف نظر آ رہا تھا۔

پھر اس کی سوچ کا رخ بدلا۔ اسے ایک خیال آیا۔ یہ اس کے اندر گھپ اندھیرے میں امید کی وہ ایک کرن کہاں سے آئی؟ اسے ماں کی موت یاد آئی۔ کیسے اسے لگ رہا تھا کہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ وہ جی ضرور رہا ہے، سانس بھی لے رہا ہے۔ لیکن زندہ ہو کر بھی زندہ نہیں ہے۔ پھر چند ہی دنوں میں وہ اتنا بڑا غم خود بہ خود بھول گیا تھا۔ اس نے پھر سے ہنسنا بولنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ وہ مہانوں کا مہان جو دنیا کا نظام چلا رہا ہے، بہت مہربان ہے۔ وہ آتما کے گہرے زخم بغیر کسی دوا کے بھر دیتا ہے اور آج اس نے دیکھا تھا کہ وہ مہربان گہری مایوسی کے اندھیروں کو امید کی روشنی دیتا ہے۔ جیسے وہ کسی کو مایوس نہیں دیکھنا چاہتا۔

اس کے ساتھ ہی اوتار سنگھ کو خیال آیا کہ بہت دنوں سے اس نے اس انداز میں...... اس اوپر والے بھگوان کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ وہ تو اس کی جستجو کر رہا تھا۔ وہ اسے جاننا، اسے سمجھنا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ اس سے محبت کر سکے، کیونکہ سب سے زیادہ محبت تو صرف اسی کا حق ہے۔

آخر وہ اپنی اس جستجو سے دور کیسے ہوا...... کیوں ہوا؟ اس پر اس نے سوچا تو وہ حیران رہ گیا۔ یہ تبدیلی تو اسی دن سے آئی تھی، جب اس نے پہلی بار نیچے والی لڑکی کی آواز سنی تھی۔ یہ تو طے ہے کہ اسے نہ صرف اس آواز سے...... بلکہ آواز والی سے بھی محبت ہو گئی تھی۔ تو اس محبت نے اسے

بدل ڈالا تھا۔ اس کے مزاج، اس کے معمولات تک کو بدل دیا تھا۔ واقعی محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔

پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ اگر وہ اوپر والے بھگوان سے محبت کرنے کے قابل ہو جائے تو وہ محبت یقیناً دنیا کی سب سے بڑی محبت ہوگی۔ اس کے دل نے فوراً اس کی تائید کی۔ بے شک، وہ اس محبت سے بہت بڑی ہوگی، جو اسے اس آواز والی لڑکی سے ہے۔ اور اس لڑکی کی محبت میں وہ اتنا کچھ بھول گیا کہ اسے اپنی جستجو بھی یاد نہ رہی تو اس محبت میں اس کا کیا ہوگا۔ کیا وہ سب کچھ بھول جائے گا۔ حتیٰ کہ زندگی بھی اسے یاد نہیں......

''بھائی، کب سے یہاں بیٹھے ہوئے ہو۔ تمھیں ہوش ہی نہیں۔ کب سے تمھیں آواز دے رہا ہوں۔ تم ٹھیک تو ہو۔''

اس نے چونک کر وصال دین کو دیکھا، جو عین اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ''کیا...... کیا بات ہے ویر جی؟ کیا کہہ رہے ہو؟'' اس نے گڑبڑا کر کہا۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے بھائی۔'' وصال دین کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کیا ہوگیا۔''

''اتنی آوازیں دیں۔ تم نے سنی ہی نہیں۔ میں تمھارے سامنے کھڑا تھا اور تم مجھے دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔''

اب اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ یہ بات وصال دین نے شروع میں بھی کہی تھی۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اس کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اور بے شک، وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ لیکن نظر اٹھا کر دیکھنے سے پہلے اسے احساس بھی نہیں تھا۔

شاید وہ اپنے آپ میں بہت زیادہ کھویا ہوا تھا!

''اچھا اب چلو۔ کھانا کھالو۔'' وصال دین نے کہا۔

''ٹھیک ہے چلتا ہوں۔'' اوتار سنگھ اٹھ کھڑا ہوا۔

سچ یہ ہے کہ اسے بھوک بالکل نہیں تھی اور وہ یہاں سے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ کھانا نہیں کھاتا تو سب لوگ اور خاص طور پر ویر جی کو تشویش ہوتی اور تشویش ہوتی تو وہ اس کی وجوہات پر غور کرتے اور یہ اوتار سنگھ نہیں چاہتا تھا۔

وہ دونوں نیچے چلے آئے۔

❀......❀......❀

دہلی آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوگیا تھا!

اوتار سنگھ کے لیے وہ بدترین محرومی کے سات سخت ترین دن تھے۔ ان سات دنوں میں نہ صرف یہ کہ وہ اس آواز کو سننے کی ہر امید کھو بیٹھا تھا اور پوری طرح مایوس ہو چکا تھا۔ بلکہ ہر لمحے

اس کا دل بدترین اندیشوں سے لرزتا رہتا تھا۔ کہیں اسے کچھ ہو تو نہیں گیا۔

وہ اس راز کو راز رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے پوچھ گچھ کرنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن یہ معاملہ بہت سنگین اور اس کے لیے بہت اہم ہوگیا تھا۔ کہتے ہیں، جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔ پھر وہ تو تھا بھی بہت ذہین۔ اس نے ایک ترکیب سوچ ہی لی۔

اس شام وہ چاندنی چوک گیا اور وہاں سے رس ملائیاں لایا۔ پھر اس نے رنجنا سے کہا۔ ''نیچے بھی دے آؤ۔''

''جی چھوٹے ٹھاکر۔''

''سنو۔ ہر ایک کے لیے دو تو ہونی چاہئیں نا۔ تو تم ایسا کرو کہ دس رس ملائیاں قاب میں ڈال کر نیچے دے آؤ۔''

رنجنا نے چند لمحے سوچا، حساب لگایا، پھر بولی۔ ''دو کے حساب سے تو نیچے بارہ دینی ہوں گی چھوٹے ٹھاکر۔''

''وہ کیسے؟'' اوتار سنگھ نے معصومیت سے پوچھا۔

''وہ چھ ہیں سرکار۔ تین لڑکیاں، ایک ماں اور دو نوکر۔''

''اوہ...... میں سمجھا تھا کہ آج کل کوئی ایک ان میں سے گھر میں نہیں ہے۔ شاید کہیں گیا ہوا ہو۔''

''نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ سب لوگ موجود ہیں۔''

''چلو تو بارہ دے آؤ۔'' اوتار سنگھ کے لہجے میں اطمینان تھا۔ اس بات کی تصدیق ہوگئی تھی کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہے۔

رنجنا نیچے چلی گئی۔ اوتار سنگھ سوچتا رہا۔ اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ وہ بغیر کسی تردد کے کسی بھی طرح کی پوچھ گچھ کر سکتا ہے۔ آخر وہ لوگ اس کے ملازم ہیں اور اس کے سامنے چون و چرا نہیں کر سکتے۔ وہ تو اس سے ڈرتے ہیں۔ تو وہ ان سے کیوں ڈرے۔ بس اسے ذرا احتیاط سے کام لینا ہوگا۔

مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ پھر خوف زدہ ہوگیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو اس پر...... اس کی محبت کے بارے میں موہوم سا بھی شک ہو۔ ایسا ہوا تو ملازم جو اس سے ڈرتے ہیں، کہیں گے تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن دل میں تو سوچیں گے اور اسے یہ بھی گوارا نہیں تھا۔

اسے خیال آیا کہ پچھلے ایک ہفتے میں پریشان ہو کر وہ خاصی بے احتیاطی کر چکا ہے۔ اس کی وجہ اس کا یہ خیال تھا کہ ممکن ہے، نیچے والی نے وقت بدل لیا ہو۔ چنانچہ وہ کھانا کھانے کے بعد دوبارہ کوٹھے پر چلا جاتا تھا۔ وہ وہاں بیٹھا رہتا۔ یہاں تک کہ نیچے اندھیرا ہو جاتا اور رات کے سناٹے کے سوا کوئی آواز نہ رہتی۔ اسے یقین ہو جاتا کہ وہ سب سو چکے ہیں۔ تب وہ مایوس واپس آ

جاتا۔ وہ اس آواز کے لیے ترس رہا تھا۔ مگر اس سے زیادہ اب وہ آواز والی کے لیے پریشان تھا۔ اسے رہ رہ کر ہول اٹھتے تھے کہ کہیں اسے کچھ ہو تو نہیں گیا۔

اسی لیے آج اس نے یہ ہمت کر لی تھی اور اس کے نتیجے میں اسے معلوم ہو گیا تھا کہ لڑکی بہرحال اپنے گھر میں ہی ہے اور خیریت سے ہے۔

مگر اب وہ گومگو کی کیفیت میں تھا۔ کیا مزید پوچھ گچھ مناسب رہے گی۔ کچھ بھی ہو، بس اس کا راز افشا نہیں ہونا چاہیے۔

رنجنا واپس آئی تو اس سے رہا نہیں گیا۔ اس نے بڑے سرسری انداز میں کہا۔ ''رنجنا...... یہ نیچے والے شام کے وقت کیا کرتے ہیں؟ کیا مصروفیت ہوتی ہے ان لوگوں کی؟''

اس کی توقع کی خلاف رنجنا بالکل نہیں چونکی۔ ''بچیاں پہلے بھی پڑھتی تھیں شام کو۔ اور اب بھی پڑھتی ہیں۔ فرق یہ ہے چھوٹے مالک کہ پہلے خود پڑھتی تھیں، اب ایک ماسٹرنی آتی ہے پڑھانے۔ اور ان کی ماتا اور لچھمن بوا رسوئی میں ہوتی ہیں۔''

اوتار سنگھ ایک دم مطمئن ہو گیا۔ بلکہ وہ خوش ہو گیا۔ حالانکہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اب وہ آواز وہ شاید ہی کبھی سن سکے۔ لیکن خوشی اس بات کی تھی کہ وہ لڑکی خیریت سے ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ البتہ یہ بات اداس کن تھی کہ جب تک وہ ماسٹرنی سے پڑھیں گی، وہ اس آواز کو سننے سے محروم رہے گا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا کب تک ہوگا۔ مگر اس خوشی اور اطمینان کے سامنے کہ وہ لڑکی خیریت سے ہے، اس اداسی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

اس روز اوتار سنگھ پر محبت کی ایک اور عظمت عیاں ہوئی۔ محبت ہو تو آدمی کی سب سے بڑی خوشی اس میں ہوتی ہے کہ اس کا محبوب خوش و خرم ہو اور خیر و عافیت سے رہے۔ اپنی خوشی کہیں پیچھے چلی جاتی ہے اور اوتار سنگھ جانتا تھا کہ بے غرضی بہت بڑا انسانی وصف ہے۔

اگلے روز مولوی برکت علی نے اسکول میں اس سے رابطہ کیا۔ ''برخوردار اوتار سنگھ، اب پڑھائی کا ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑنا چاہیے۔'' انھوں نے کہا۔ ''جو آپ کا حکم مولوی صاحب۔''

''میں نے بہت سوچا۔ اسکول کی چھٹی کے فوراً بعد پڑھانا مناسب نہیں۔ ہم دونوں ہی تھکے ہوئے ہوں گے۔ اس لیے میرے خیال میں شام کا وقت مناسب رہے گا۔ یہ بتاؤ، اس وقت تمہاری کوئی مصروفیت تو نہیں؟''

اوتار سنگھ نے چھٹیوں سے پہلے کی شام کے بارے میں سوچا۔ وہ تو اس کے لیے مقدس ترین مصروفیت کا وقت ہوتا تھا۔ لیکن اب سب کچھ بدل چکا تھا۔ وہ دن ہوتے تو وہ مولوی صاحب کو انکار کر دیتا۔

مولوی صاحب اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ ''کیا بات ہے اوتار سنگھ۔ بتاؤ نا، شام کا وقت مناسب رہے گا نہیں تو کچھ اور سوچتے ہیں۔''

''جی نہیں مولوی صاحب۔ یہ وقت بہت مناسب ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ دل میں اس نے کہا...... اس سے مناسب وقت کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

''تو ٹھیک ہے۔ آج شام کو میں آؤں گا۔'' مولوی صاحب یہ کہہ کر چلے گئے۔

اوتار سنگھ گھر پر اس بارے میں سوچتا رہا۔ جتنا غور کرتا، یہ آنے والی مصروفیت اسے بہت بڑی نعمت معلوم ہوتی۔ آخر مولوی صاحب سے وہ عربی ہی تو سیکھ رہا تھا...... اور محض اس آواز کی وجہ سے سیکھ رہا تھا۔ اب وہ اس خاص وقت میں اس آواز کو سننے سے محروم ہو گیا تھا۔ تو اس وقت کا اس سے اچھا مصرف اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ اس میں مولوی صاحب سے پڑھے۔ اور آخر میں وہ ان سے کچھ سنا بھی کرے گا۔ واہ...... محروم ہوتے ہی محرومی کا مداوا بھی ہو گیا تھا۔

اُدھر مولوی صاحب کچھ سوچ کر جھجک رہے تھے۔ وہ اوتار سنگھ کو اس کی حویلی میں پڑھاتے رہے تھے، جہاں ان کا اپنا ایک کمرا تھا اور پڑھائی کے درمیان انھیں مکمل تنہائی میسر تھی۔ مگر یہاں معاملہ مختلف تھا۔ بہرحال پڑھانا تو تھا۔

شام کو مولوی صاحب آئے۔ وہ وہی خاص وقت تھا، جب چھٹیوں سے پہلے اوتار سنگھ کوٹھے پر جاتا تھا اور وہ آواز سنتا تھا۔ اب جبکہ آواز کا سلسلہ رک چکا تھا تو اب بھی یہ حال تھا کہ یہ وقت ہوتا تو اس کے قدم اوپر جانے کے لیے تھرکنے لگتے۔

''مولوی صاحب، میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کوٹھے پر مجھے پڑھائیں۔'' اس نے کہا۔

''جو تم مناسب سمجھو اوتار سنگھ۔''

''جی نہیں۔ فیصلہ تو آپ ہی کریں گے۔ چلیں...... میں آپ کو کوٹھا دکھا دوں۔''

اوتار سنگھ مولوی صاحب کو اوپر لے گیا۔ کوٹھا دیکھ کر مولوی صاحب کا دل خوش ہو گیا۔ انھوں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور طمانیت سے سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ''اس سے مناسب جگہ تو ہو ہی نہیں سکتی۔''

اوتار سنگھ بھی خوش ہو گیا۔ ایک خوشی سے...... بہت بڑی خوشی سے وہ محروم ہوا تھا۔ مگر اس کا جو بہترین مداوا ممکن تھا، وہ ہو گیا تھا۔ ''اور آخر میں آپ مجھے کچھ سنا دیا کریں گے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں التجا تھی۔

مولوی صاحب نے اسے تو نہیں بتایا۔ مگر انھوں نے سوچا تھا کہ عصر پڑھ کر یہاں آیا کریں گے اور یہاں سے جاتے ہوئے جامع مسجد میں مغرب پڑھ لیا کریں گے۔ یہ فرمائش انھیں اور اچھی لگی۔ انھوں نے سوچا کہ یوں وہ مغرب کی اذان تک تلاوت بھی کر لیا کریں گے۔

''کیوں نہیں اوتار سنگھ۔'' انھوں نے شفقت سے کہا۔ ''اب میں چلتا ہوں۔ کل سے اسی وقت آؤں گا۔''

''کل سے ہی کیوں مولوی صاحب؟ آج سے کیوں نہیں۔''

مولوی صاحب نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ اس کی بے تابی پر انھیں پیار آ گیا۔

''ٹھیک ہے اوتار سنگھ۔ آج ہی سے، سہی۔''

یوں ایک معمول دوسرے معمول میں ڈھل گیا!

❁......❁......❁
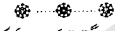
حور بانو بہت اداس تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی کوئی بے حد قیمتی چیز اس سے چھن گئی ہے۔ اوپر والے جب واپس آئے تھے تو وہ بہت خوش تھی لیکن اب وہ مایوس بھی تھی اور اسے محرومی کا احساس بھی ستا رہا تھا۔

بظاہر تو معمول میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ مغرب پڑھتے ہی دالان میں جاتی۔ چھوٹا ٹھاکر اسے کوٹھے پر بیٹھا نظر آتا۔ لیکن وہ بہت بجھا بجھا لگتا تھا۔ اسے دیکھ کر لگتا کہ جیسے اس کی کوئی بہت قیمتی چیز چھن گئی ہے۔ وہ بس اداس بیٹھا کچھ سوچتا رہتا۔ اور چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی خوش کن بات نہیں سوچ رہا ہے۔

اسے دیکھ کر حور بانو کو پہلے جیسی خوشی ہوتی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کی دید دوبارہ مل گئی ہے۔ لیکن اس کی اداسی دیکھ کر اس کا دل کٹنے لگتا تھا۔ وہ خود بھی اداس ہو جاتی تھی۔ وہ دعا کرتی کہ چھوٹے ٹھاکر کی اُداسی دور ہو جائے۔

ایک تبدیلی اور آئی تھی۔ چھوٹا ٹھاکر اب دیر تک کوٹھے پر بیٹھا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ مسلمان لڑکا اسے بلانے کے لیے آتا تھا اور پھر وہ نیچے چلے جاتے تھے۔ تیسرے چوتھے دن ایک ضرورت کے تحت حور بانو اٹھی اور بیت الخلا کی طرف گئی۔ اس وقت رات کافی ہو چکی تھی۔ اتفاقیہ طور پر ہی اس کی نظر اٹھی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ چھوٹا ٹھاکر کوٹھے پر بیٹھا ہے۔

وہ بیت الخلا سے آ کر کچھ دیر دالان میں بیٹھی اور چھوٹے ٹھاکر کو دیکھتی رہی۔ وہ اس وقت زیادہ ہی مضطرب تھا۔ بیٹھے ہوئے بھی اس کے چہرے کا تاثر پل پل بدلتا رہتا۔ اور ہر دو منٹ بعد وہ اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔

حور بانو کا بس چلتا تو وہ وہاں بیٹھی رہتی۔ لیکن وہ بے وقت تھا اور وہ ڈرتی تھی کہیں امی کی آنکھ کھل جائے اور وہ اسے یہاں بیٹھا دیکھ لیں تو وہ انھیں کیا جواب دے گی۔ وہ کیا سوچیں گی اس کے بارے میں۔ اس خوف نے دل چاہنے کے باوجود اسے ٹھہرنے نہیں دیا۔

یہ سلسلہ دو تین رات تک یونہی چلا، مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ اس کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔

ایک شام مغرب پڑھ کر وہ دالان میں گئی تو دیکھا کہ کوٹھا اجڑا ہوا ہے۔ چھوٹا ٹھاکر وہاں موجود نہیں تھا۔ اسے حیرت تو ہوئی۔ مگر کسی غیر معمولی پن کا احساس نہیں ہوا۔ وہ وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔

لیکن چھوٹا ٹھاکر نہیں آیا۔ کچھ دیر گزری تو وہ بے چین ہو گئی۔ اب ہر گزرتا لمحہ اسے مایوسی میں مبتلا کر رہا تھا۔ اگرچہ ہر لمحہ رک رک کر گزر رہا تھا۔ پھر بھی اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔

امی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''حور بانو عشاء کب پڑھو گی؟''

''اٹھتی ہوں امی۔''

اس نے اٹھ کر وضو کیا، نماز پڑھی۔ پھر خلاف معمول وہ دالان میں واپس آئی۔ لیکن چھوٹا ٹھاکر اب بھی کوٹھے پر نہیں تھا۔ بہرحال وہ بیٹھ گئی۔

''حور بانو۔ چلو اب سو جاؤ۔ پھر صبح اٹھنے میں پریشان کرتی ہو۔''

وہ بغیر ایک لفظ کے اٹھ گئی۔ لیکن بستر پر لیٹ کر وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ نیند آ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ انتظار کرتی رہی۔ پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ امی، بہنیں اور سب لوگ سو گئے ہیں تو وہ اٹھ کر دالان میں چلی آئی۔

مگر چھوٹا ٹھاکر اب بھی کوٹھے پر موجود نہیں تھا!

اس بار وہ زیادہ دیر نہیں رکی۔ ایک تو وہ اس بات سے ڈرتی تھی کہ امی اٹھیں، اسے یہاں دیکھیں اور انھیں اس پر کسی بھی طرح کا شک ہو۔ دوسرے نجانے کیسے اس نے یہ جان لیا تھا کہ اب وہ چھوٹے ٹھاکر کو کوٹھے پر کبھی نہیں دیکھ سکے گی۔ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر کی کیفیت میں جو فرق اس نے دیکھا تھا، اس کا کوئی بڑا سبب تھا۔ وہ سبب کوئی بھی رہا ہو، اس نے چھوٹے ٹھاکر کو اس کے کسی خاص معاملے میں مایوس کر دیا تھا...... بہت مایوس!

اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب چھوٹا ٹھاکر کوٹھے پر کبھی نہیں آئے گا۔ لیکن دل کہاں مانتا ہے۔ حور بانو اس کے بعد بھی تقریباً ایک ہفتہ اس کی جستجو کرتی رہی۔ اس نے آدھی رات کو وہاں آ کے دیکھا۔ لیکن چھوٹا ٹھاکر نہیں تھا۔

بالآخر وہ مایوس ہو گئی!

اب چھوٹے ٹھاکر کی دید کے وہی دو اوقات رہ گئے تھے۔ اسکول جاتے وقت اور اسکول سے آتے وقت اسے دیکھنا۔ حور بانو یہ موقعے کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ اس کے باوجود وہ ناخوش تھی۔ دن بھر ناخوش رہتی۔ وہ چڑچڑی ہو گئی۔ بات بات پر جھنجلاتی۔ نیند بھی اس کی کم ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ خوابوں سے بھی محروم ہو گئی تھی اور جب آدمی پر جھنجلاہٹ طاری رہنے لگے تو جاگتی آنکھوں تو وہ خواب دیکھ ہی نہیں سکتا۔

لیکن آدمی کے اندر امید کبھی ختم نہیں ہوتی۔ خراب صورت حال میں وہ اندر...... بہت نیچے، دبک کر، چھپ کر بیٹھ جاتی ہے۔ پھر اچانک کسی دن وہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ حور بانو کو بھی وہ امید اچانک کبھی دالان میں لے آتی کہ شاید چھوٹا ٹھاکر کوٹھے پر موجود ہوگا۔ کبھی

وہ رات کو بستر سے اٹھ کر دالان میں چلی آتی۔ مگر مایوس جاتی اور ہر بار موہوم سی وہ امید زیادہ دن کے لیے سر جھکا کر، منہ چھپا کر بیٹھ جاتی۔ مگر وہ ختم بہر حال کبھی نہیں ہوتی تھی۔ ہاں ہر بار اس کے سر اٹھانے کا دورانیہ بڑھ جاتا تھا۔

اسی طرح دو مہینے گزر گئے۔ پھر ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ استانی جی انھیں پڑھانے کے لیے نہیں آئیں۔ یوں کافی عرصے کے بعد حور بانو کو اس خاص وقت میں آزادی ملی۔ عصر پڑھنے کے بعد وہ بلاوجہ ہی دالان میں چلی آئی۔ وہاں بیٹھ کر وہ چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی۔

مگر وہاں تو اسے بن مانگے بہت بڑی خوشی مل گئی۔ چھوٹا ٹھاکر وہاں موجود تھا۔

خوشی ایسی تھی کہ کچھ دیر تو وہ کچھ سننے، سوچنے اور سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ چھوٹا ٹھاکر اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کوئی ہے اور یہ غیر معمولی بات تھی۔ ورنہ وہ تو اکیلا ہی وہاں آتا تھا۔

اس نے اچک اچک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن دوسرا شخص جو بھی تھا، اس کی پیٹھ اس طرف تھی۔ البتہ چھوٹا ٹھاکر اسی رخ پر بیٹھا تھا۔

اب حور بانو سماعت پر زور دے رہی تھی۔ اوپر سے آواز آتی تو تھی۔ لیکن بالکل صاف نہیں ہوتی تھی۔ بہرحال وہ سننے کی کوشش کرتی رہی۔ پہلے مرحلے میں اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ دوسرا شخص کوئی استاد ہے اور وہ چھوٹے ٹھاکر کو پڑھا رہا ہے۔

پھر اچانک اس کے کانوں میں کچھ لفظ پڑے اور اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ وہ تو عربی زبان کے الفاظ تھے۔ وہ سماعت پر اور زور دیتی رہی۔ ذرا دیر بعد اسے یقین ہو گیا کہ چھوٹا ٹھاکر عربی میں پڑھ رہا ہے۔

اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ چھوٹا ٹھاکر...... ہندو...... مشرک...... یہی اس کی شرمندگی تھی۔ مگر اب وہ مشرک، وہ ہندو عربی زبان پڑھ رہا ہے۔ کیوں؟ ایک ہندو کا عربی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ پتا نہیں کیوں، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ بہت اچھی علامت ہے۔ کیسے...... ؟ اس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

وہ بیٹھی اوپر کی آوازیں سنتی رہی۔ خوشی اس کے وجود میں موج در موج اٹھ رہی تھی۔ محبت تو اسے خود بہ خود، بغیر کسی ارادے کے ہو گئی تھی۔ یہ سوچ کر اسے شرمندگی ہوتی تھی کہ اس کا محبوب مشرک ہے۔ اب وہ عربی پڑھ رہا تھا تو اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ جیسے اس کے راستے کی کوئی رکاوٹ دور ہو رہی ہو۔

لیکن وہ کسی اور کو نہ بتاتی تو وہ خوشی ادھوری رہ جاتی۔ وہ اٹھ کر اندر گئی۔ نور بانو کچھ پڑھ رہی تھی۔ "نور...... نور...... اٹھو تو۔ کچھ دکھانا ہے تمھیں۔" اس کے لہجے میں بھی سنسنی تھی۔

نور بانو نے چونک کر، سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "کیا ہے باجی؟"

"میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟"

"دالان میں۔ اور کہاں لے جا سکتی ہوں میں تمھیں۔"

"میں پڑھ رہی ہوں باجی۔ یہیں بتا دو نا، کیا بات ہے۔"

"بہت عجیب بات ہے۔ بتانے میں مزہ نہیں آئے گا۔ آؤ نا۔" حور بانو اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔

"تم بہت اول جلول ہو باجی۔ پڑھنے بھی نہیں دیتیں چین سے۔"

نور بانو کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن بہن کے اصرار پر وہ اٹھ گئی۔

وہ دونوں دالان میں چلی آئیں۔ "آؤ یہاں بیٹھو۔" حور بانو نے تخت پر بیٹھتے ہوئے نور بانو سے کہا۔

نور بانو بیٹھ تو گئی۔ لیکن وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ "یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے باجی۔" بالآخر وہ مایوس لہجے میں بولی۔

"جو میں دکھانا چاہتی ہوں، وہ یہاں نہیں اوپر ہے...... کوٹھے پر۔"

"کوٹھے پر!" نور بانو نے حیرت سے دہرایا۔ پھر اس نے کوٹھے کی طرف دیکھا۔ "وہاں دو آدمی بیٹھے ہیں۔ مگر اس میں کیا خاص بات ہے؟"

"دیکھنا اتنا ضروری نہیں۔ تم ذرا کان لگا کر سنو۔"

نور بانو نے چند لمحے سماعت پر زور دیا۔ پھر بولی۔ "پڑھائی ہو رہی ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔ مگر یہ سنو کہ کیا پڑھایا جا رہا ہے۔"

اس بار چند لمحے گزرے تو نور بانو کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "ارے ہاں...... یہ تو عربی پڑھا رہے ہیں۔"

"ہاں۔" حور بانو نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ عربی کیوں پڑھ رہے ہیں۔"

"اس میں کیا خاص بات ہے باجی۔ لوگ عربی بھی پڑھتے ہیں اور فارسی بھی۔"

"لیکن ایک ہندو عربی کیوں پڑھنے لگا؟" حور بانو نے اعتراض کیا۔

"ہندو! یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو باجی۔" نور بانو نے کہا۔ "ایک مسلمان لڑکا بھی تو رہتا ہے وہاں۔"

"وہ تو ہے۔ لیکن اس وقت جو پڑھ رہا ہے، وہ مسلمان لڑکا نہیں، چھوٹا ٹھاکر ہے۔"

نور بانو نے انھیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ انھیں نہیں پہچانتی تھی۔ "یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو

باجی؟''

حور بانو چور سی ہوگئی۔ لیکن اب وہ پہلو نہیں بچا سکتی تھی۔ ''میں پہچانتی ہوں ان دونوں کو۔'' اس نے مجوب لہجے میں کہا۔ پھر جلدی سے صفائی پیش کی۔ ''کبھی کبھی اسکول جاتے آتے نظر آجاتے ہیں دونوں۔ یہ چھوٹا ٹھاکر ہے۔''

نور بانو چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ''واقعی یہ تو غیر معمولی بات ہے۔'' پھر وہ چند لمحے خاموش رہی۔ ''لیکن باجی، میں نے سنا ہے، ہندو بھی عربی فارسی پڑھتے ہیں۔ دیکھونا، علم تو کسی کی میراث نہیں۔''

حور بانو سوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اسے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ اصل میں وہ اسے غیر معمولی بات ثابت کرنا چاہتی تھی...... کسی اور کے لیے نہیں، اپنے لیے۔ اور اس کے لیے ضروری تھا کہ کوئی اور اس کی تائید کرے۔

لیکن اسی لمحے ایک عجیب بات ہوئی۔ اوپر موجود پڑھانے والے نے تلاوت شروع کر دی۔ اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی اور وہ بے حد خوبصورت قرأت کر رہا تھا اور وہ سورہ یٰسین کی تلاوت کر رہا تھا۔

لمحوں میں سماں بندھ گیا۔ اب جیسے اس آواز کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ دونوں بہنیں مبہوت ہو کر سن رہی تھیں۔

تلاوت کرنے والے نے صدق اللہ العظیم کہہ کر تلاوت ختم کی اور خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں خالی خالی نظروں سے سامنے کی طرف کسی غیر مرئی چیز کو تک رہی تھیں۔ پھر انھوں نے بیک وقت ایک دوسری کو دیکھا۔ حور بانو نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ''اب کیا کہتی ہو نور بانو۔ بات صرف عربی پڑھنے کی نہیں۔ یہ تو قرآن کی تلاوت تھی۔''

''یہ تو واقعی غیر معمولی بات ہے۔'' نور بانو نے کہا۔

حور بانو مسکرانے لگی۔ وہ کسی کو یہ بات بتا نہیں سکتی تھی۔ لیکن درحقیقت وہ بہت خوش تھی اور وہ خوشی اس کے لیے بہت غیر متوقع تھی۔ اس نے تو چھوٹے ٹھاکر کو عربی پڑھتے سنا تھا اور نور بانو کو گواہ بنانے کے لیے لے آئی تھی۔ لیکن یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بات قرآن پاک کی تلاوت تک پہنچے گی۔ یہ تو بہت بڑا معاملہ تھا۔ اب تو وہ آگے کے امکانات پر غور کر رہی تھی۔ کیا چھوٹا ٹھاکر مسلمان ہو گیا ہے؟ یہ سوچتے ہوئے اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔

اسی وقت مغرب کی اذان شروع ہوئی۔ کوٹھے پر پڑھنے والا اور پڑھانے والا دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ تب انھوں نے پہلی بار پڑھانے والے کو دیکھا۔ ان کی آدھی کالی، آدھی سفید لمبی داڑھی تھی۔ چہرہ نورانی تھا اور سر پر ٹوپی تھی۔

وہ دونوں بھی نیچے چلی آئیں۔ وضو کر کے نماز پڑھنی تھی۔

نماز کے بعد حور بانو پھر دالان میں گئی۔ لیکن کوٹھا سنسان پڑا تھا۔

مگر اس بار حور بانو کو کوئی مایوسی نہیں ہوئی بلکہ وہ تو خوش تھی۔ اس خوشی کے لیے تو وہ چھوٹے ٹھاکر کی دید بھی قربان کر سکتی تھی۔

اس دن کے بعد اس کے خواب خوبصورت ہوتے چلے گئے!

❀......❀......❀

ابتدا میں اوتار سنگھ کو اس آواز کی محرومی بہت بڑی لگی تھی۔ لیکن مداوا ہو گیا تو محرومی کا وہ زخم دھیرے دھیرے مندمل ہونے لگا۔ انھی اوقات میں مولوی صاحب کا عربی پڑھانا اس کے لیے بہت بڑی نعمت ثابت ہوا تھا۔ پھر آخر میں وہ مولوی صاحب سے کچھ سنانے کی فرمائش کرتا تھا اور مولوی صاحب سناتے تو ان کی آواز کہیں دور چلی جاتی اور وہی نسوانی آواز اس کی سماعت میں شہد انڈیلتی رہتی۔

پھر پڑھائی کا بوجھ بھی بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس سال اسے میٹرک کا امتحان دینا تھا۔ اس امتحان کی اہمیت بہت زیادہ تھی...... صرف طلباء کے نزدیک ہی نہیں، اساتذہ کے لیے بھی وہ بہت بڑا چیلنج تھا۔ اسکول کے میٹرک کے نتائج اس کی ساکھ سے کم نہیں ہونے چاہیے تھے۔ وہ ایک چیلنج تھا اساتذہ کے لیے۔ چنانچہ انھوں نے پڑھائی کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔

یہ اوتار سنگھ کے لیے کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اپنی جماعت کا ہونہار ترین طالب علم تھا۔

لیکن کانتی پرشاد جی اسکول کے اساتذہ سے بڑھ کر اس امتحان کو چیلنج بنائے ہوئے تھے۔ ایک بات ماننے والی تھی۔ پچھلے برسوں کی طرح وہ اس بار بھی اوتار سنگھ کو پڑھائی کے معاملے میں اسکول پر سبقت دلائے ہوئے تھے۔ لیکن اوتار سنگھ کے لیے وقت مسئلہ بن گیا تھا۔ اس کے پاس فرصت کے لمحے کم...... بہت ہی کم ہوتے تھے۔

ہر آدمی کے لیے ہر محرومی کا ایک مثبت نتیجہ بھی نکلتا ہے۔ بلکہ محرومی جتنی بڑی ہو، مثبت نتیجہ بھی اتنا ہی بڑا ہوتا ہے۔ اس آواز نے اوتار سنگھ کو اس کے طبعی تجسس سے اور اس کی زندگی کی ایک بہت بڑی جستجو سے محروم کر دیا تھا۔ اب وہ اس آواز سے محروم ہوا تو اس کی فطرت کے وہ دبے ہوئے عناصر پھر ابھر آئے۔ وہ پھر پہلے کی طرح تجسس، غور و فکر کرنے لگا...... وہ پھر سے سوچنے لگا۔

اسکول میں تفریحی پروگرام بھی ہوتے تھے۔ ایک اتوار کو اوتار سنگھ کی جماعت آم کے ایک باغ میں گئی۔ باغ شہر کے ایک بڑے رئیس کا تھا، جس کا بیٹا اسکول میں پڑھتا تھا۔ یہ دعوت اس کی طرف سے تھی۔

باغ دیکھ کر اوتار سنگھ کی آنکھیں کھل گئیں۔ زمین تو اس نے بہت دیکھی تھی۔ بڑے بڑے کھیت بھی دیکھے تھے اور صحرا بھی، جس کا کوئی انت نظر نہیں آتا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی، آسمان جھک کر ریت کو چومتا دکھائی دیتا لیکن پھلوں کا اتنا بڑا باغ اس نے نہیں دیکھا تھا۔

اس کے ہم جماعت تو آم کھانے میں مگن تھے۔ مگر وہ اِدھر اُدھر گھومتا پھر رہا تھا۔ کچھ لڑکے درختوں پر چڑھے ہوئے تھے اور آم توڑ توڑ کر نیچے کھڑے اپنے ساتھیوں کو دے رہے تھے۔ ایک ٹولی اس کام سے فارغ ہونے کے بعد آم کھانے میں مصروف تھی۔

باغ کے رکھوالے نے اسے الگ تھلگ دیکھا تو ہنس کر بولا۔ ''میاں، آم کھاؤ۔ پیڑ کیوں گنتے ہو۔''

اوتار سنگھ کر بھی یہی رہا تھا۔ اس نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک باغ کا جائزہ لیا تھا اور پیڑوں کو غور سے دیکھتا رہا تھا۔ ہر پیڑ دوسرے سے مختلف تھا۔ کچھ اونچے تھے، کچھ بہت چھوٹے تھے اور کچھ درمیانے۔ پھر یہی ایک فرق نہیں تھا۔ کچھ پیڑ زیادہ گھنے تھے، کچھ چھدرے تھے۔ کچھ پیڑ آموں سے لدے ہوئے تھے اور کچھ پر بہت کم آم تھے۔ یہی نہیں، ایک پیڑ کی مختلف شاخوں کا معاملہ تک مختلف تھا۔ کوئی ڈال آموں سے محروم تھی اور کوئی آموں کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھی۔ پھر گزرتے ہوئے اس نے آموں کے ڈھیر کو دیکھا، جو اس کے چند ساتھیوں نے جمع کیا تھا۔ ان میں ہر طرح کے آم تھے، چھوٹے، بڑے، پیلے، ہرے، ملی جلی رنگت والے۔

''گن نہیں رہا ہوں۔ دیکھ رہا ہوں۔'' اس نے رکھوالے کو جواب دیا۔

''کھانے کی چیز کھانے کے لیے ہوتی ہے میاں۔ دیکھنے کے لیے نہیں۔'' رکھوالے نے کہا۔ ''ویسے یہ بتاؤ کہ تم دیکھ کیا رہے ہو؟''

''دیکھ رہا ہوں کہ پیڑ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پھل بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔''

''وہ تو ہوتے ہی ہیں۔ کھا کر دیکھو میاں تو پتا چلے گا کہ ہر آم کا ذائقہ بھی جدا ہے اور خوشبو بھی۔''

''یقیناً ہوگی۔'' اوتار سنگھ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن ایسا کیوں ہے؟''

''اللہ کی شان ہے میاں۔ اللہ کی قدرت ہے۔ ہر آدمی دوسرے آدمی سے مختلف کیوں ہے۔ شکل وصورت الگ۔ کسی ایک آدمی کی آواز تک دوسرے کی آواز سے نہیں ملتی۔ پھر عادتیں، مزاج اور فطرت تو ہیں ہی الگ۔''

اوتار سنگھ نے سوچا، واقعی یہ تو سامنے کی بات ہے۔

''اور اللہ نے سب کو ایک سا بنایا ہوتا تو پہچان کیسے ہوتی۔ نام رکھنے کی ضرورت کیوں پیش آتی۔''

اس بار اوتار سنگھ نے باغ کے رکھوالے کو احترام کی نظر سے دیکھا۔ وہ بڑی عقل کی باتیں کر رہا تھا۔ ''لیکن جانور تو سب ایک جیسے ہیں۔'' اس نے وہ مخصوص انداز اختیار کیا، جو وہ ماسٹر جی سے باتیں اگلوانے کے لیے کرتا تھا۔

''نہیں میاں۔ ایسا نہیں ہے۔ جانور بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔ کسی بھی بندر کو دیکھ لو۔ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔''

''ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہمیں لگتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم ان میں دلچسپی نہیں لیتے۔ انھیں غور سے نہیں دیکھتے۔ ہاں جو جانور ہمارے ہوتے ہیں، انھیں تو ہم پہچانتے ہیں نا۔ اپنی بھینس کو ہر آدمی پہچانتا ہے۔ کوئی چوری کر لے، تب بھی شناخت کر لیتا ہے۔ ہزاروں گھوڑوں میں بھی آدمی اپنے گھوڑے کو پہچان لیتا ہے۔ ہے کہ نہیں؟''

اب اوتار سنگھ کو اس گفتگو میں لطف آ رہا تھا۔ وہ بات بڑھانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔

''ہاں، یہ تو ہے۔ لیکن......''

''جنگل کی بات لو۔'' رکھوالے نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''جانور ایک دوسرے کو الگ الگ پہچانتے ہیں...... بہت اچھی طرح۔ ان میں دوستیاں بھی ہوتی ہیں اور دشمنی بھی۔ ایک دوسرے کو شناخت نہ کر پائیں تو بھلا ایسا ہو سکتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ مگر یہ بے جان درخت......''

''درخت بے جان نہیں ہوتے۔ یہ جان دار ہیں۔ سانس لیتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں ہماری طرح۔ کسی درخت کو نظر انداز کریں تو وہ اداس ہو جاتا ہے۔ کسی کو غذا نہ ملے تو سوکھ جاتا ہے۔ غذا اچھی نہ ملے تو اس کے پھل کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔ میں اس باغ کے ایک ایک درخت کو جانتا ہوں...... پہچانتا ہوں۔''

اس بار اوتار سنگھ کو سچ مچ حیرت ہوئی۔ ''واقعی! کیسے؟''

''یہاں کا ایک ایک بوٹا میرے ہاتھوں لگا ہے۔ میرے ہاتھوں پروان چڑھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کس کے پھل کا ذائقہ کیسا ہے۔''

''تو مجھے بتائیں ان کے بارے میں۔ کچھ درخت چھوٹے کیوں رہ گئے۔ کسی میں پھل کم اور کسی میں زیادہ کیوں ہیں؟''

''یہاں دو طرح کے پیڑ ہیں میاں۔ ایک تخمی اور دوسرے قلمی۔ تخمی تو وہ ہیں، جو گٹھلی بوئی گئی اور اس سے کلا پھوٹا اور درخت بن گیا۔ اور قلمی وہ ہیں، جو ہم نے زمین میں قلم لگائی......''

''قلم کیا؟'' اوتار سنگھ نے پوچھا۔ وہ تو بس لکھنے والے قلم سے واقف تھا۔

''کسی درخت کی پتلی ٹہنی کو تراشا جاتا ہے، جیسے تم لکھنے والے قلم کو تراشتے ہو۔ اسی لیے اسے قلم کہتے ہیں۔ وہ قلم لگائی جاتی ہے۔ اس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ پھر وہ درخت بن جاتا ہے۔''

''مگر اس کی ضرورت کیا ہے؟ جبکہ گٹھلی سے بھی وہی کچھ حاصل ہوتا ہے؟'' اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

''قلمی آم تخمی آم سے کہیں زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ تخمی آم میں رس ہوتا ہے۔ اسے چوسا

جاتا ہے جبکہ قلمی آم میں آم تیار ہوتے ہوتے رس گودے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسے کھایا جاتا ہے۔ پھر اس میں تجربوں کی گنجائش بھی ہوتی ہے۔ دو آموں کو ملا کر ایک بنایا جاتا ہے۔ پیوند کاری کی جاتی ہے۔ میں ابھی تمھیں دکھاؤں گا۔''

اوتار سنگھ بہت حیران تھا۔ ''دو آموں کو ملانے کا..... پیوند کاری کا یہاں تک کیا مطلب ہے؟''

''دو مختلف قسم کے درختوں کی قلمیں بنائی جاتی ہیں اور انھیں ایک دوسرے سے ملا کر زمین میں لگایا جاتا ہے۔ یوں ایک نئی قسم وجود میں آتی ہے، جس کے پھل میں ان دونوں قسموں کی خاصیتیں اور ذائقے گھلے ملے ہوتے ہیں۔''

اوتار سنگھ کے ذہن میں شادی کا خیال آ گیا۔ انسانوں میں شادی اسی طرح تو ہوتی ہے۔

''آؤ میرے ساتھ۔ میں تمھیں آم بھی کھلاؤں گا اور کچھ دکھاؤں گا بھی۔''

اوتار سنگھ باغ کے رکھوالے کے ساتھ چل دیا۔

''یہ دیکھو۔ یہ سب تخمی آم کے درخت ہیں۔'' رکھوالے نے چلتے ہوئے کہا۔ ''آگے میں نے الگ الگ قلمیں لگائی ہیں۔ ابھی سب دکھاؤں گا۔''

وہ بڑھتے رہے۔ باغ کے آگے والے حصے میں جو درخت تھے، وہ دیکھنے میں ہی مختلف لگ رہے تھے۔ وہ زیادہ اونچے نہیں تھے۔ کچھ تو اتنے چھوٹے تھے کہ ہاتھ بڑھا کر ہی آم توڑے جا سکتے تھے۔ لیکن اونچے درختوں کے مقابلے میں لدے ہوئے تھے۔

اوتار سنگھ نے اس کی وجہ پوچھی۔

''دیکھو۔ درخت کو غذا تو اتنی ہی ملنی ہے۔ اب اگر درخت اونچا ہوگا تو وہ خوراک اس کے لیے نسبتاً کم ثابت ہوگی۔ جبکہ چھوٹے درخت کو اتنی ہی خوراک فراوانی کے ساتھ ملے گی۔ اس لیے اس پر پھل زیادہ ہوں گے۔''

اوتار سنگھ کچھ شرمندہ ہوا۔ اگر وہ سوچتا، غور کرتا تو یہ بات خود بھی سمجھ سکتا تھا۔

''دیکھو، یہ سرخاب ہے۔ اور وہ انور رٹول ہے۔'' رکھوالا درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتائے جا رہا تھا۔ ''اور وہ آگے میں نے ان دونوں کا ملاپ کیا ہے۔ ابھی ان میں پھل نہیں آئے ہیں۔''

رکھوالے نے آم توڑے، اپنے کندھے پر پڑا کپڑا زمین پر پھیلایا اور بیٹھ گیا۔ پھر اس نے جیب سے چھوٹا سا چاقو نکالا اور ایک قاش کاٹ کر اوتار سنگھ کی طرف بڑھائی۔

اوتار سنگھ نے کھایا اور اس کا دل خوش ہو گیا۔ وہ بہت میٹھا آم تھا۔ مگر اسی درخت کے دوسرے آم میں ہلکی سی کھٹاس تھی۔ ذرا دیر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ تمام آموں کا بنیادی ذائقہ ایک سا ہے۔ لیکن ہر آم د ے آم ۔ کچھ مختلف ہے۔

''یہ تو ہوتا ہے۔ کسی ڈال پر دھوپ کم پڑتی ہے تو اس سے فرق پڑتا ہے۔ نیچے کی ڈالیوں کے آم عام طور پر زیادہ میٹھے ہوتے ہیں۔ کیونکہ غذا ان تک پہلے پہنچتی ہے اور بھرپور بھی ملتی ہے۔ مگر ذائقے کا فرق تو ایک ڈال کے آم میں بھی ہوتا ہے۔ ایسے ہی جیسے ایک باپ کے بیٹے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ صورت میں بھی اور مزاج اور فطرت میں بھی۔''

اس روز اوتار سنگھ نے اپنے ہم جماعتوں سے زیادہ اور بہتر آم کھائے اور سوچنے کو جو کچھ ملا، وہ اضافی انعام تھا۔

اس رات اپنے بستر پر لیٹ کر وہ اسی حوالے سے سوچتا رہا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ دنیا کو دیکھو تو ایک حوالے سے دوسری اور تیسری...... بلکہ اَن گنت باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ بس آدمی غور تو کرے۔ دیکھے تو، سوچے تو۔ یہ فرق صرف آم کا نہیں۔ یہ تو ہر پھل میں ہوگا۔ جیسے ہر پھل اپنی جگہ ایک فرد ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ تو آ رہا تھا...... کوئی اس کے اندر بیٹھا کہہ رہا تھا...... یہ سب نشانیاں ہیں، اس ہستی کی جس نے یہ سب کچھ بنایا ہے۔ یہ مربوط نظام قائم کیا ہے۔ مگر اس سے آگے وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

پھر ایک دن اس نے کیلنڈر پر غور کیا۔ وہ تو بہت اہم چیز تھا۔ اسی سے آدمی وقت کا حساب رکھتا تھا۔ زندگی میں ترتیب اور تنظیم کیلنڈر کے دم سے تھی۔ اس پر اس نے کانتی پرشاد سے گفتگو بھی کی۔ ''جب کیلنڈر نہیں ہوگا تو کیسے کام چلتا ہوگا ماسٹر جی؟''

''کام تو چلتا تھا اوتار سنگھ۔ اس لیے کہ اس وقت زندگی بہت سست رفتار تھی۔ گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ پرانے زمانے کا آدمی نہیں جانتا تھا۔ اس کی اسے اتنی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اسے تو بس بنیادی ضروریات کی فکر کرنا اور زندہ رہنا تھا۔ تو سورج اور چاند تو موجود تھے نا۔ دن اور رات کا تو اسے معلوم تھا۔ پھر اس کے پاس اور پیمانے بھی تھے...... موسم کے پیمانے۔ سردی، گرمی، بہار اور خزاں۔ تب لوگ کہتے ہوں گے...... دو بہار پہلے میرا یہ بیٹا پیدا ہوا تھا۔ پھر آدمی نے مشاہدے سے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ کب بیج بونا فائدہ مند ہوتا ہے۔ کب فصل کٹنی چاہیے۔''

''کیلنڈر مختلف کیوں ہیں ماسٹر جی؟''

''ایک شمسی کیلنڈر ہے اور دوسرا قمری۔''

''فرق کیا ہے دونوں میں؟''

''زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے۔ 365 دن اور چند گھنٹوں میں زمین کا ایک چکر مکمل ہوتا ہے۔ اسی لیے شمسی سال 365 دن کا ہوتا ہے۔''

''تو چند گھنٹوں کے فرق کا کیا بنتا ہے؟''

ماسٹر جی مسکرائے۔ ''وہ اضافی گھنٹے تین سال میں ایک دن بن جاتے ہیں۔ اسی لیے تو ہر چوتھا سال لیپ ہوتا ہے...... 366 دن کا۔''

''اور قمری کیلنڈر؟''

''چاند زمین کے گرد چکر لگاتا ہے۔ وہ 28 دن اور چند گھنٹوں میں اپنا ایک چکر مکمل کرتا ہے۔ تو قمری مہینہ (29 یا 30) دن کا ہوتا ہے۔ اور سال وہی بارہ مہینوں کا۔''

''مگر یہ معلوم کیسے ہوا ماسٹر جی؟''

''گرنتھ سے...... جسے علم ریاضی کہا جاتا ہے۔ یہ بہت بڑا علم ہے...... دیوتاؤں کا علم۔ اسی سے آدمی نے زمین کا، سورج کا اور چاند کا قطر معلوم کیا۔ درمیانی فاصلہ بھی معلوم کیا۔ زمانہ قبل از مسیح میں یونانیوں نے چاند اور سورج گرہن کا حساب لگایا تھا۔ انھوں نے دو ہزار عیسوی تک کے تمام گرہنوں کا وقت لکھ دیا تھا۔ اور اس میں سیکنڈ کے دسویں حصے تک کا فرق نہیں ہے۔''

بعد میں اوتار سنگھ اس پر غور کرتا رہا۔ واقعی دنیا کا نظام اتنا مربوط تھا کہ لگتا تھا، حساب کتاب سے قائم کیا گیا ہے۔ لگتا تھا کہ ہر چیز علم ریاضی کے تحت ایک خاص رفتار سے حرکت کر رہی ہے۔ چاند، سورج، ستارے ایک سسٹم کے تحت چل رہے ہیں اور وہ سسٹم ایسا ہے کہ اس میں کبھی ایک سیکنڈ کا فرق بھی نہیں پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ علم رکھنے والے انسانوں کو معلوم ہوتا ہے کہ کب چاند کہاں ہے اور کوئی اور ستارہ کہاں ہے۔ اس کا ثبوت جنتریاں ہیں، جن میں چاند سورج اور تمام ستاروں کی آگے کے وقت تک کی ہر لمحے کی پوزیشن موجود ہے۔ یہ علم فلکیات ہے، جو علم نجوم میں بھی کام آتا ہے۔

وہ خیال اور راسخ ہو گیا کہ جس نے یہ پورا نظام قائم کیا ہے، وہ ہستی بہت مہان ہے۔ اس کی شکتی کی کوئی حد نہیں۔ اور منش جو کچھ بھی جانتا ہے، وہ اسی مہان ہستی نے اسے سکھایا ہے۔ مگر جو کچھ منش نہیں جانتا، وہ بہت زیادہ ہے۔

❁.....❁.....❁

اس شام ٹھاکر پرتاپ سنگھ بیٹھا اپنے کارندوں سے باتیں کر رہا تھا کہ پنڈت روپ سہائے آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک بہت بوڑھا آدمی تھا، جس کی بھویں تک سفید تھیں۔

ٹھاکر نے سر اٹھا کر ذرا خفگی سے اسے دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔ ''روپ سہائے، تم تو اس دن آنے کا وعدہ کر کے ایسے غائب ہوئے کہ میں تمہاری صورت بھی بھول گیا۔''

''شما کر دو ٹھاکر جی۔ پر میں نے وعدہ پورا کر دیا ہے۔''

''سو تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ پر بیچ میں سولہ سال ہیں...... پورے سولہ سال۔''

''میں نے کہا تھا نا ٹھاکر جی کہ میں اپنے گرو جی کو لے کر آؤں گا۔ تو میں انھیں تلاش کر رہا تھا۔ یہ ہیں میرے گرو جی۔'' روپ سہائے نے اپنے ساتھ آئے ہوئے بوڑھے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ ''بڑے گیانی ہیں۔ مگر سیلانی بھی ہیں۔ بڑی مشکل سے ہاتھ آئے ہیں۔''

ٹھاکر نے بوڑھے کو غور سے دیکھا۔ ''آپ کا شبھ نام؟''

بوڑھے نے ہاتھ جوڑ کر اسے نمسکار کیا۔ ''میں رام دیال ہوں ٹھاکر جی۔''

''آپ نے بڑی کرپا کی کہ ہمیں درشن دیے۔''

''نا ٹھاکر جی۔ یہ تو میرا بھاگیہ ہے کہ آپ کے درشن ہوئے۔ میں تو تڑپ رہا تھا یہاں آنے کے لیے۔''

ٹھاکر کی نگاہوں میں ایک لمحے کو حیرت جھلکی۔ پھر اس نے سوالیہ نظروں سے روپ سہائے کو دیکھا۔

''میں نے گرو دیو کو چھوٹے ٹھاکر کی جنم کنڈلی دکھائی۔ تب سے یہ بے چین ہیں انھیں دیکھنے کو۔'' روپ سہائے نے کہا۔ ''اب تو وہ جوان ہو گئے ہوں گے۔''

''مجھے راج کمار کے درشن تو کرا دیجیے ٹھاکر جی۔'' رام دیال کی آواز لرز رہی تھی۔

''اوتار سنگھ تو دہلی میں رہتا ہے۔ وہیں اسکول میں پڑھتا ہے۔'' ٹھاکر نے کہا۔ ''بس گرمی کی چھٹیوں میں گھر آتا ہے۔''

پنڈت رام دیال نراش نظر آنے لگا۔ ''میں سوچتا تھا کہ ان کی دید ہو گی تو بھاگ جاگ جائیں گے۔ پرنتو مجھے سمجھنا چاہیے تھا کہ میرے ایسے بھاگ کہاں۔ ٹھیک ہے ٹھاکر جی، چلتے ہیں۔''

وہ اٹھنے لگا تو ٹھاکر نے اس کا ہاتھ تھام کر بٹھا لیا۔ ''اب میں آپ کو ایسے تو نہیں جانے دوں گا۔'' اس نے کہا۔ ''یہ تو بتائیں، آپ کہاں سے آ رہے ہیں۔''

''بنارس سے۔''

''اتنی دور سے۔'' ٹھاکر کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''اتنا کشٹ اٹھا کر آپ یہاں آئے میرے پتر کو دیکھنے کو۔ اور میں نہ روکتا تو ایسے ہی واپس چلے جاتے!''

''ٹھاکر جی، میں اسی کی خاطر تو آیا ہوں اتنی دور سے۔'' پنڈت رام دیال بولا۔ ''جب چاند ہی نہیں نکلا تو رکنا کیسا؟''

''نہیں پنڈت جی۔ آپ دو چار دن یہاں رکیں۔ مجھے خدمت کا موقع دیں۔ آپ ایسے نہیں جا سکتے۔''

ٹھاکر کے بے حد اصرار پر پنڈت رام دیال نے ایک رات رکنے کی ہامی بھر لی۔ مگر اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ محض مروت میں آمادہ ہوا ہے۔ ورنہ وہ رکنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ پنڈت روپ سہائے رکنا چاہ رہا تھا۔ اور وہی اسے لے کر آیا تھا۔

ٹھاکر نے مہمان خانے میں ان کے ٹھہرنے کا بندوبست کر دیا۔ رات بھوجن بھی اس نے ان کے ساتھ کیا۔

بھوجن کے بعد اس نے کہا۔ ''آپ مجھے اوتار سنگھ کے بارے میں نہیں بتائیں گے؟''

"کیا بتاؤں؟ کیا بتا سکتا ہوں؟" پنڈت رام دیال کے لہجے میں بے بسی بھی تھی اور عاجزی بھی۔ "میں تو خود سمجھنا چاہتا ہوں۔"

"مگر مہاراج، اس کی کنڈلی دیکھ کر کچھ تو سمجھ میں آیا ہوگا۔" ٹھاکر نے کہا۔

"بہت مشکل ہے۔ ایسی ہی کنڈلیاں تو گیان دیتی ہیں۔ مگر جیون میں ایک ایسی کنڈلی بھی مل جائے تو بڑی بات ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے ایسی کنڈلی کبھی نہیں دیکھی۔" پنڈت رام دیال عجیب سی کیفیت میں بول رہا تھا۔ "میرے بے شمار چیلے ہیں۔ میں روپ سہائے کو اپنا اچھا چیلا مانتا ہوں۔ پرنتو یہ کنڈلی دیکھی تو مجھے اس پر شک ہونے لگا۔ مجھے لگا کہ اس سے کوئی غلطی ہوئی ہے کنڈلی بنانے میں۔ یا پھر جنم کا وقت اور تاریخ غلط ہے۔"

"دیکھیں مہاراج، اس کے جنم کی تاریخ اور وقت تو میں بھول ہی نہیں سکتا۔" ٹھاکر نے تیز لہجے میں کہا۔

"میری آپ سے ایک بنتی ہے ٹھاکر جی۔"

"آپ حکم کریں مہاراج۔"

"میں آپ کی اور چھوٹے ٹھاکر کی...... دونوں کی کنڈلی بنانا چاہتا ہوں۔" رام دیال نے کہا۔ "بلکہ آپ کی پتنی کی بھی......"

"ضرور بنائیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔" ٹھاکر نے کہا۔ پھر اپنی رنجیتا کی اور اوتار سنگھ کی تاریخ پیدائش اور وقت بتایا۔

پنڈت رام دیال کنڈلیاں بنانے میں مصروف ہوگیا۔ روپ سہائے پُرتشویش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

رام دیال نے پہلے اوتار سنگھ کی کنڈلی بنائی۔ پھر اس نے اپنے تھیلے سے ایک اور کنڈلی نکالی اور تازہ کنڈلی سے اس کا موازنہ کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔

پھر اس نے سر اٹھایا اور روپ سہائے کو ستائشی نظروں سے دیکھا۔ "تمہاری کنڈلی میں رتی بھر فرق نہیں ہے۔" اس نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

روپ سہائے پہلی بار مسکرایا۔ "جو بھی سیکھا ہے، آپ ہی سے سیکھا ہے مہاراج۔" وہ بولا۔

رام دیال دوسری اور تیسری کنڈلی میں مصروف ہوگیا۔ وہ کنڈلیاں بنانے کے بعد اس نے اوتار سنگھ کی کنڈلی سامنے رکھی اور اسے بہت غور سے دیکھنے لگا۔ لگتا تھا، اسے دنیا و مافیہا کی خبر نہیں۔

ٹھاکر اسے متوقع نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ لگتا تھا، کچھ بھید کھلنے والے ہیں۔ بڑے بھید!

پھر اچانک پنڈت رام دیال نے کئی بار سر جھٹکا اور بولنا شروع کیا۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔ اور وہ کسی کو سنا نہیں رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے۔ "عجیب...... بہت عجیب۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "اس جنم کنڈلی میں راج یوگ ہے...... اور بہت شکتی والا راج یوگ ہے۔ تو چھوٹے ٹھاکر۔ راج تو کریں گے۔ راجا تو بنیں گے۔ لیکن اس کنڈلی میں سنت یوگ بھی ہے...... اور وہ بھی بڑا شکتی والا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں کہ یہ کوئی اَنہونی ہو۔ میں نے سینکڑوں جنم کنڈلیاں دیکھی ہیں، جن میں یہ دونوں یوگ موجود تھے۔ پرنتو ہوتا یوں ہے کہ دونوں یوگ ایک دوسرے کو ناکارہ کر دیتے ہیں۔ منش نہ راجا رہتا ہے نہ بھکاری۔ بس عام سا منش بن کر رہ جاتا ہے۔ یا یوں ہوتا ہے کہ وہ من کا راجا ہوتا ہے اور بھاگیہ کا فقیر۔ یوں سمجھ لو کہ دونوں یوگ شکتی میں برابر ہوں تو ایک دوسرے کو صفر کر دیتے ہیں۔ اگر راج یوگ کی شکتی 4 ہو اور سنت یوگ کی 3 تو راج یوگ کا اثر ایک درجے کا رہ جاتا ہے۔"

"اوتار سنگھ کی کنڈلی میں راج یوگ کی شکتی کتنی ہے؟" ٹھاکر نے پوچھا۔

رام دیال نے اسے یوں چونک کر دیکھا، جیسے اب تک اس کی موجودگی سے بے خبر رہا ہو۔ "بہت ہے ٹھاکر جی، بہت ہے۔ مگر سنت یوگ کی شکتی بھی اتنی ہی ہے۔" اس نے کہا۔

"یعنی دونوں نے ایک دوسرے کو کاٹ دیا؟" ٹھاکر بولا۔

"نہیں ٹھاکر جی۔ ہونا تو یہی چاہیے تھا۔ لیکن کنڈلی میں کچھ اور یوگ بھی ہیں۔ سہارا دینے والے یوگ۔ جنھوں نے انھیں کٹنے نہیں دیا۔ سو میں کہتا ہوں کہ دونوں یوگ پورا اثر ڈال رہے ہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کام کر رہے ہیں۔ میرے لیے یہ عجیب بات ہے۔ میں نے ایسا کبھی نہیں دیکھا اور پھر یہی نہیں، اس کنڈلی میں ایسی بہت سی باتیں ہیں۔"

"مطلب کیا ہے۔ مجھے تو یہ بتائیں۔" ٹھاکر کے لہجے میں تشویش بھی تھی اور بے چینی بھی۔

"چھوٹے ٹھاکر راجا ہوں گے۔ لیکن جیون غلامی کا گزاریں گے۔ اور روپ سہائے سچ کہتا ہے۔ اس کنڈلی میں روشنی اتنی زیادہ ہے کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ کچھ نظر آنے لگتا ہے تو روشنی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ سب کچھ چھپ جاتا ہے۔"

"تو آپ اس سے زیادہ نہیں بتائیں گے جو روپ سہائے نے بتایا تھا۔" ٹھاکر کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"روپ سہائے میرا سب سے گیانی چیلا ہے ٹھاکر جی۔" رام دیال نے فخریہ لہجے میں کہا اور روپ سہائے کا سینہ چوڑا ہوگیا۔ "پرنتو میں آپ کو جو کچھ بتا سکتا ہوں، بتلاؤں گا۔ چھوٹے ٹھاکر کی زندگی کئی بار خطرے میں پڑے گی۔ مگر خطرے ہار جائیں گے اور چھوٹے ٹھاکر لمبا جیون پائیں گے اور چھوٹے ٹھاکر پریم کریں گے...... دو بار۔ اور وہ سچا پریم ہوگا۔ دونوں میں وہ سپھل ہوں گے۔

چھوٹے ٹھاکر کے بھاگیہ میں بدیشی سفر نہیں ہے۔ مگر ان کا دیہانت اپنے دیس میں نہیں ہوگا۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟'' ٹھاکر جھنجھلا گیا۔ ''جب بھاگیہ میں بدیشی سفر ہے ہی نہیں تو دیہانت بدیش میں کیسے ہوگا؟''

پنڈت رام دیال نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''شما چاہتا ہوں ٹھاکر جی۔ جو دیکھ رہا ہوں، سمجھ رہا ہوں، وہی بتا رہا ہوں۔ سمجھ میں تو میری بھی نہیں آتا۔ پرنتو کنڈلی یہی بتاتی ہے۔ اور ٹھاکر جی، چھوٹے ٹھاکر بڑے گیانی ہوں گے۔ ودیارتھی ہوں گے۔ پرنتو ان کا پریم زیادہ بڑا ہوگا۔'' وہ کہتے کہتے رکا۔ چند لمحے وہ جنم کنڈلی کو یوں دیکھتا رہا، جیسے اس میں اتر رہا ہو۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور بولا۔ ''ٹھاکر جی، ہوتا یوں ہے کہ منش جیون میں بہت کچھ کماتا ہے۔ دولت، عزت، شہرت۔ پر جب وہ مرتا ہے تو کیول راکھ رہ جاتا ہے۔ سب کچھ ختم۔ چھوٹے ٹھاکر کو جیون میں سب کچھ ملے گا، دولت بھی، عزت بھی اور شہرت بھی۔ پر وہ ہر چیز سے بھاگیں گے...... صرف پریم کی تلاش میں۔ وہ ہر چیز کو ٹھکرا دیں گے۔ اور جب ان کا سمے آئے گا تو موت ہی انھیں سب کچھ دے گی۔ وہ مرنے کے بعد بڑا مقام پائیں گے۔ ان کی بڑائی ان کے جینے سے بڑھ کر ان کے مرنے میں ہوگی۔''

ٹھاکر کو اکلوتے بیٹے کے مرنے کی باتیں بہت گراں گزر رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر درشتی ابھر آئی۔ مگر اسے یاد تھا۔ پنڈت رام دیال نے شروع میں ہی بتا دیا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر کو لمبا جیون ملے گا۔

''اب میں ذرا آپ کی اور سورگ باش ٹھاکرائن کی کنڈلی دیکھ لوں۔'' پنڈت نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''ہماری کنڈلیاں کیوں دیکھتے ہیں مہاراج۔ ٹھاکرائن تو جا چکی۔ اور میرا بھی کیا ہے......'' ٹھاکر نے اعتراض کیا۔

''بات یہ ہے ٹھاکر جی کہ جب کوئی کنڈلی سمجھ میں نہ آئے تو اس کے لیے ماتا پتا کی یا پتر کی کنڈلی دیکھی جاتی ہے۔'' پنڈت نے وضاحت کی۔ ''میں چھوٹے ٹھاکر کی کنڈلی کو ان دونوں کنڈلیوں سے سمجھوں گا تو زیادہ سمجھ سکوں گا۔''

ٹھاکر خاموش ہو گیا۔ پنڈت دونوں کنڈلیوں کو بہت غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر گہرے وچار کا تاثر تھا۔ مگر پھر اچانک اس نے جھرجھری لی اور بری طرح چونکا۔ اس کے چہرے پر بے یقینی تھی۔ اس نے سر اٹھایا۔ ایک لمحے کو نظریں اٹھائیں۔ مگر فوراً ہی جھکا لیں۔ ''شما چاہتا ہوں ٹھاکر جی۔ پرنتو میں اور کچھ نہیں بتا سکتا۔''

ٹھاکر اسے بغور دیکھتا رہا تھا۔ اس نے پنڈت کے چہرے کے تاثر کی تبدیلی دیکھی تھی۔ اس نے جان لیا کہ کوئی بہت بڑی بات سامنے آئی ہے اور وہ بات ایسی ہے کہ پنڈت بتانا نہیں

چاہتا جبکہ وہ جاننا چاہتا تھا۔ ''مہاراج، آپ کو بتانا ہوگا۔ میں بے خبر نہیں رہنا چاہتا۔''

پنڈت نے ہاتھ جوڑ لیے۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ٹھاکر جی جو بتانے کے قابل ہو۔''

''بتانے کے قابل نہیں، تب بھی بتائیں۔ میں اپنے پتر کے متعلق سب کچھ جاننا چاہتا ہوں۔''

''یہ بات چھوٹے ٹھاکر کے متعلق نہیں۔ میرا وشواس کریں ٹھاکر جی۔''

اس پر ٹھاکر کا تجسس اور بھڑک اٹھا۔ یعنی بات اس کے یا رنجو کے متعلق تھی۔ ''تب تو ضرور بتائیں مہاراج۔''

''میں شما چاہتا ہوں ٹھاکر جی۔'' پنڈت نے پھر ہاتھ جوڑ دیے۔

''آپ اتنا بچ کیوں رہے ہیں مہاراج؟''

پنڈت واضح طور پر ہچکچا رہا تھا۔ جیسے یہ سوچ کر الجھ رہا ہو کہ کچھ بولے یا نہیں۔ لیکن تجسس تو اسے بھی تھا۔ اور وہ تجسس اسے اکسا رہا تھا کہ جو دل میں ہے، کہہ دے۔ بالآخر تجسس جیت گیا۔ ''بات یہ ہے ٹھاکر جی کہ آپ کی اور ٹھاکرائن کی کنڈلی دیکھ کر میری ودیا نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے، جو سننا آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔ اور میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔''

ٹھاکر نے چند لمحے سوچا۔ پھر بولا۔ ''میں وچن دیتا ہوں کہ آپ سے ناراض نہیں ہوں گا۔ اور پھر یہ تو علم کی بات ہے۔ علم آپ کو کچھ بتاتا ہے تو وہ آپ کی ذاتی بات تو نہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے ٹھاکر جی۔ پر......'' پنڈت اب بھی ہچکچا رہا تھا۔ اور روپ سہائے پریشان نظر آ رہا تھا۔

''آپ چنتا نہ کریں مہاراج۔ آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں برا نہیں مانوں گا۔''

پنڈت ہچکچایا۔ مگر پھر اس کے چہرے پر استقلال نظر آنے لگا۔ ''میں آپ سے ایک بات پوچھوں ٹھاکر جی؟''

''ضرور پوچھیں مہاراج؟''

''چھوٹے ٹھاکر آپ کے اپنے پتر تو نہیں ہیں؟''

ٹھاکر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ لگا پنڈت نے اسے گالی دی ہے۔ شدتِ غیظ و غضب سے وہ اندر ہی اندر لرزنے لگا۔ لیکن ایسے میں بھی اسے یاد رہا کہ وہ ناراض نہ ہونے کا وچن دے چکا ہے۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''وہ لے پالک تو نہیں؟ آپ نے کسی کا بچہ لے کر پالا ہو۔ اسے اپنا بیٹا بنا لیا ہو۔''

ٹھاکر کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس کا پتر...... ٹھاکر اوتار سنگھ...... بھگوان کا اشیرباد...... بھگوان کا سب سے بڑا تحفہ۔ وہ یہ کیسے گوارا کرتا کہ دنیا میں کوئی ایک شخص بھی اس تحفے کو کچھ اور سمجھے...... اس کے بارے میں کچھ اور گمان کرے۔ مگر اسے اپنے وچن کا بھی احساس تھا۔ چنانچہ اسے اپنے لہجے پر

بھی قابو رکھنا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنی آواز اور لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم راجپوت اپنے خون پر بہت ناز کرتے ہیں مہاراج۔ ہم اپنے خون میں ملاوٹ گوارا نہیں کر سکتے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اداس ہو گیا۔ اسے یاد تھا کہ پتر تو اوتار سنگھ اس کا اور رنجو کا تھا۔ پر دودھ اس نے حمیدہ کا پیا تھا۔ خون میں ملاوٹ تو ہوئی تھی۔

''جانتا ہوں ٹھاکر جی۔ پر کوئی اصل راجپوت بچہ بھی مل سکتا ہے......''

''یہ خیال آپ کو کیسے آیا مہاراج۔''

''آپ کے اور سورگ باشی ٹھاکرائن کے بھاگیہ میں اولاد ہے ہی نہیں۔ جنم کنڈلیاں یہی بتاتی ہیں ٹھاکر جی۔''

ٹھاکر کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔ ''آپ سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی ہے مہاراج؟''

''میں نے بڑی احتیاط سے کام کیا ہے ٹھاکر جی۔''

ٹھاکر کا غصہ غائب ہو گیا۔ اس کی جگہ عاجزی نے لے لی۔ ''اوتار سنگھ میرا ہی پتر ہے مہاراج۔ اس کی پیدائش سے پہلے میں نے اور ٹھاکرائن نے ایک ہی رات ایک جیسا سپنا دیکھا تھا۔ اس سپنے میں ہمیں خوش خبری ملی تھی۔ اور وہ نو ماہ میری پتنی کی کوکھ میں رہا اور اس کی کوکھ سے جنم لیا۔ میرے پاس اس کا پورا ریکارڈ موجود ہے۔ پورا گاؤں گواہ ہے اس کا۔''

''میرے لیے آپ کا کہنا ہی کافی ہے ٹھاکر جی۔'' پنڈت رام دیال نے کہا۔ ''پرنتو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ جو بھاگیہ لکھتا ہے، وہ اسے کبھی بدل بھی دیتا ہے اور ہمیں پتا نہیں چلتا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ پرارتھنا میں بڑی شکتی ہے۔ اس سے بھاگیہ بھی بدل جاتا ہے۔ ٹھیک ہے ٹھاکر جی۔ میں اور دیکھتا ہوں۔''

ٹھاکر نے سکون کی سانس لی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پنڈت مزید کھوج کرے۔ مگر وہ اسے روک بھی نہیں سکتا تھا۔

پنڈت سر جھکائے کنڈلیوں میں الجھا رہا۔ پھر اچانک اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ''آپ کی پتنی کا دیہانت تین ورش پہلے...... ہوا تھا۔'' اس نے تاریخ تک بتاتے ہوئے کہا۔

ٹھاکر وہ دن کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ وہ تو اس کے دل پر لکھی تھی۔ اس نے اداسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پنڈت نے کنڈلیوں کو مزید چند لمحوں تک بغور دیکھا۔ پھر بولا۔ ''یہ سچ ہے کہ کنڈلی کے حساب سے آپ دونوں کے بھاگیہ میں اولاد نہیں۔ لیکن آپ کی کنڈلیوں میں چھوٹے ٹھاکر کی آمد کی گواہی ملتی ہے۔''

ٹھاکر نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''چھوٹے ٹھاکر کے جنم کے ساتھ آپ کا اور آپ کی پتنی کا نیا دور شروع ہوا۔ آپ کے جیون کی دِشا بدل گئی۔ آپ کا راستہ بدل گیا۔ آپ کی پتنی کے لیے تو یہ آسان نہیں تھا۔ لیکن آپ نے ہنسی خوشی اسے مان لیا۔ بلکہ آپ خود ہی نئے راستے پر چل پڑے۔''

ٹھاکر گھبرا گیا۔ پنڈت رام دیال خطرناک حد تک سچی بات بتا رہا تھا۔ ٹھاکر جانتا تھا کہ وہ تبدیل ہوا ہے۔ مگر پنڈت نہیں جانتا تھا کہ تبدیلی کا اصل عمل تو اب شروع ہو گا۔ اس نے بات ہی ایسی بتائی ہے۔ بچہ نہ اس کے بھاگیہ میں تھا نہ رنجو کے۔ پر دینے والے نے اسے اوتار سنگھ دیا۔ اس پر کتنی بڑی دَیا کی۔ اس نے اپنا لکھا ہوا اس کا بھاگیہ بدل دیا۔ تو کیا وہ نہ بدلے۔ اسے تو بدلنا ہے...... ہنسی خوشی!

''آپ لوگ اب آرام کریں۔'' ٹھاکر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''صبح آپ کے درشن ہوں گے۔''

ٹھاکر نے اگلے روز انھیں بہت کچھ دے کر رخصت کر دیا!

❁......❁......❁

مصروفیت بہت زیادہ ہو تو وقت کے پر لگ جاتے ہیں۔ اوتار سنگھ کو پتا ہی نہیں چلا کہ وہ سال کب اور کیسے بیت گیا۔ میٹرک کا آخری پرچا دے کر آیا تو اس نے بڑی بے یقینی سے سوچا...... ارے، امتحان ختم!

پھر ٹھاکر پرتاپ سنگھ خود دہلی آ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے بیٹے کی زندگی کا یہ اہم مرحلہ ہے۔ اب اس کے بیٹے کو کالج جانا تھا۔ وہ آیا تو اسے کالج میں داخلہ دلانے کے لیے تھا۔ لیکن انعام بہت بڑا تھا۔ بیٹے سے لپٹ کر سونے کے لیے اسے کئی راتیں مل گئیں۔ کیسی شانتی تھی اس کے ساتھ۔

امتحان کا نتیجہ نکلا۔ اوتار سنگھ نے امتیازی نمبروں کے ساتھ امتحان پاس کیا۔ اس دوران ٹھاکر پرتاپ سنگھ کالجوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے کوئین میری کالج کو اپنے بیٹے کے لیے چن لیا۔ داخلہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اوتار سنگھ کے نمبر ایسے تھے کہ اسے کہیں بھی داخلہ مل سکتا تھا۔

اوتار سنگھ کا کالج میں داخلہ ہوا۔ پھر وہ کالج جانے لگا۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کا دل تو نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اسے واپس تو جانا ہی تھا۔ فصلوں کا حساب کتاب، گاؤں کی دیکھ بھال کا کام وہ کیدار ناتھ پر چھوڑ کر آیا تھا۔ اور کیدار ناتھ پر اسے بھروسہ نہیں تھا۔

چنانچہ وہ واپس چلا گیا!

اوتار سنگھ کو اس نئی تبدیلی کو قبول کرنے میں کچھ دن لگے۔ وہ تبدیلی تھی بھی بہت بڑی۔ اب وہ کالج کا اسکول سے موازنہ کرتا تو ایسا لگتا کہ وہ ایک چھوٹے سے تالاب سے نکل کر ایک

بڑے دریا میں آ گیا ہے۔ اسکول میں رہ کر کالج کا جو تصور اس نے قائم کیا تھا، حقیقت میں کالج اس سے یکسر مختلف تھا۔ اسکول میں ہر پیریڈ لینا ضروری تھا۔ جبکہ کالج میں وہ آزاد تھا۔ یہاں خالی پیریڈ بھی ہوتے تھے، جنھیں طالب علم اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا تھا۔ چاہے وہ لائبریری میں جا بیٹھے اور مطالعہ کرے۔ چاہے وہ کامن روم میں چلا جائے اور کھیل لے۔ چاہے وہ لان میں جائے اور دوسرے طلبا کے ساتھ گپ شپ کرے۔ بلکہ کالج میں وہ تو اپنی مرضی سے کوئی پیریڈ چھوڑ بھی سکتا تھا۔ یعنی وہ آزاد تھا۔

ایک اور اعتبار سے بھی کالج بڑا دریا تھا۔ وہاں لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے۔ یہی نہیں، طلباء اور طالبات کی اس کمیونٹی میں تمام رنگ موجود تھے۔ مذہب کے اعتبار سے بھی اور زبان اور علاقے کے اعتبار سے بھی۔ انگریز، ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، پنجابی، گجراتی، بنگالی، مدراسی...... اور نجانے کیا کیا۔

ایک اور بات بھی تھی۔ اوتار سنگھ کو اسکول میں دوست بنانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ سنجیدہ طالب علم تھا۔ کلاس میں جان پہچان تو ہوئی۔ مگر باقاعدہ دوستی نہیں ہوئی۔ صرف ہاف ٹائم میں موقع ملتا تھا لیکن وہ وقت وہ وصال دین کے ساتھ گزارتا تھا۔

اب معاملہ مختلف تھا۔ کالج میں سوشل لائف ضروری تھی۔ اور وصال دین وہاں تھا نہیں۔ پھر اوتار سنگھ کی فطرت میں تجسس دوسروں سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ اب اسے مختلف لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے اور بہت کچھ جاننے کا موقع مل رہا تھا تو وہ اسے کیسے ضائع کرتا۔ اس کے لیے موقع اسے فوراً ہی مل گیا۔ کالج کی یونین کے الیکشن ہو رہے تھے۔ وہاں پہلی بار اسے پتا چلا کہ سیاست کیا ہوتی ہے...... نیچے سے اوپر تک۔ کالج میں ایک اور کام کا رویہ اسے ملا، جو اسکول میں نہیں تھا اور وہ تھا اختلاف رائے، ابتدا ہی میں اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اختلاف رائے سے معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا ہے۔

کالج لائف میں آتے ہی پہلے تو اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ لڑکیوں کے لیے ایک خاص کشش رکھتا ہے۔ ایف اے سالِ اول کی تمام لڑکیاں اس سے دوستی کی...... اس کی قربت کی متمنی تھیں۔ بلکہ سالِ دوم کی بھی کئی لڑکیوں نے اس سے دوستی کی کوشش کی۔ پھر اسے اندازہ ہوا کہ لڑکیوں کے اس کی طرف کھنچنے کی وجہ سے لڑکے بھی اس کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ یعنی لڑکے ان لڑکوں سے دوستی کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں، جن کی طرف لڑکیاں کھنچتی ہوں۔

بہت جلد اوتار سنگھ کو اندازہ ہو گیا کہ صحیح معنوں میں تعلیم اب شروع ہو رہی ہے۔ اس کے لیے جاننے اور سیکھنے کے مواقع بڑھ گئے ہیں۔ وہ سوالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور یہاں سب کے جواب موجود تھے۔

اوتار سنگھ بہت خوبصورت اور وجیہہ لڑکا تھا۔ وہ بے حد متناسب الاعضا تھا۔ ساکت رہتا،

تب بھی جسم توانائی کا پاور ہاؤس نظر آتا۔ پھر وہ خوش لباس بھی تھا...... اور اس کا لباس اس کے تموّل کا مظہر تھا۔ خود اعتمادی کی اس میں کمی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ساری زندگی اس نے کبھی ''نا'' نہیں سنی تھی۔ اس کی کوئی بات کبھی ٹالی نہیں گئی تھی...... رد نہیں کی گئی تھی۔ اس نے خود کو کبھی کسی سے کمتر نہیں جانا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کی فطرت میں عاجزی تھی، انکسار تھا...... لیکن بہت پُر اعتماد انکسار!

ابتدا میں ہی اس نے دیکھا کہ سب لوگ اس کی دوستی کے خواہاں ہیں...... کیا لڑکے، کیا لڑکیاں۔ یعنی اس کے پاس دوست منتخب کرنے کے لیے بڑی ورائٹی تھی۔ اور وہ کوئی سطحی انداز میں دیکھنے اور سوچنے والا لڑکا نہیں تھا۔ چنانچہ لپکنا تو درکنار، اس نے گرم جوشی تک نہیں دکھائی۔ وہ اپنے دوستوں میں کچھ خوبیاں ضروری سمجھتا تھا اور اس کے لیے پرکھنا ضروری تھا۔

دہلی میں تین سال گزارنے کے باوجود بنیادی طور پر وہ گاؤں کا لڑکا تھا۔ مطالعہ اس کا وسیع تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے۔ وہ ہندوستان کی تاریخ سے خوب واقف تھا۔ لیکن موجودہ سیاسی منظر سے وہ اتنا باخبر نہیں تھا۔ کالج میں اس کی سمجھ میں بہت کچھ آنے لگا۔

اسے معلوم تھا کہ ہندوستان پر انگریز حکومت کر رہے ہیں۔ مگر اس سے زیادہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ کیونکہ کورس کی کتابوں میں جنگ آزادی کا تذکرہ نہیں تھا۔ ان میں اسے غدر کہا جاتا تھا...... بغاوت! اور وہ جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا، وہاں انگریزوں کی مذمت نہیں کی جاتی تھی۔

تاہم وہ اپنے طور پر اس بات پر غور کرتا تھا کہ انگریز اتنی دور سے یہاں آئے اور اب اتنے بڑے ملک پر، اتنی بڑی آبادی پر حکومت کر رہے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ کہ اس ملک کے لوگ نااہل ہیں؟ ان میں اپنا ملک سنبھالنے کی، اسے چلانے کی اہلیت نہیں؟ اور ان میں غیرت بھی نہیں؟ وہ یہ نہیں سوچتے کہ دوسرے باہر سے...... اتنی دور سے آئے، ان کے ملک پر قابض ہوئے اور ان پر حکومت کر رہے ہیں۔ اس کے ذہن میں غدر کا تصور بھی مختلف تھا۔ بغاوت! کیسی بغاوت؟ بنیادی طور پر انگریزوں کو یہاں حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اگر کچھ لوگوں نے ان کا اقتدار ختم کرنے کی کوشش کی تو وہ بغاوت کیسے ہوئی۔ وہ تو اپنا حق چھیننے کی جائز کوشش تھی۔ اور جنھوں نے کوشش کی، وہ غیرت مند لوگ تھے۔ انھیں مجرم تو نہیں کہا جا سکتا۔

یہ سب کچھ وہ سوچتا رہا تھا۔ اب کالج میں یہ سب کچھ سمجھنے کے لیے فضا موجود تھی۔ چند دنوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ ملک میں آزادی کے لیے تحریک چل رہی ہے، یہی نہیں، انگریز بھی ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ یونین کے الیکشن میں مقابلہ دو پارٹیوں کے درمیان تھا۔ اور دونوں پارٹیوں کا اختلاف نظریاتی تھا در حقیقت وہ ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتوں کی ذیلی جماعتیں تھیں۔ ایک کانگریس تھی، جس میں سبھی مذاہب کے لوگ تھے۔ دوسری مسلم لیگ تھی، جو صرف مسلمانوں کی جماعت تھی۔ کانگریس ملک کی آزادی کا مطالبہ کر رہی تھی۔ جبکہ مسلم لیگ مسلمانوں کے لیے علیحدہ مسلمان مملکت چاہتی تھی۔

اوتار سنگھ کی سمجھ میں مسلمانوں کی منطق نہیں آئی۔ اگر مذہب کی بنیاد پر الگ الگ مملکتیں بنائی جاتیں تو ہندوستان میں سکھ بھی تھے، عیسائی بھی اور پارسی بھی۔ تاریخ بتاتی تھی کہ ملک پر سینکڑوں برس سے مسلمان حکومت کر رہے تھے۔ حالانکہ اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اس وقت ہندوستان ایک تھا تو اب وہ تقسیم کیوں ہو؟

دوستی اور تعلقات کے معاملے میں اوتار سنگھ کی کچھ ترجیحات تھیں۔ اسے ذہین، علم دوست اور متجسس لوگ اچھے لگتے تھے۔ اس اعتبار سے اس نے اپنے لیے دوستوں کا انتخاب کیا۔ اور اس کے دوستوں میں سبھی لوگ تھے...... انگریز، ہندو، مسلمان اور سکھ۔ ذہانت، علم کی لگن اور تجسس ان سب کے درمیان قدرِ مشترک تھا۔

ان سب کے درمیان بہت شدید نظریاتی اختلافات تھے اور ان کے درمیان تند و تیز بحثیں ہوتیں۔ کبھی تو ایسا لگتا کہ اب لڑائی ہو جائے گی۔ لیکن ذہین، علم دوست اور متجسس لوگوں میں یہ خوبی بھی ہوتی ہے کہ وہ روشن خیال ہوتے ہیں۔ اختلاف اپنی جگہ۔ لیکن وہ ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے۔

کالج یونین کا الیکشن ہوا اور کانگریس کی ذیلی جماعت جیت گئی۔ اوتار سنگھ نے انھی کو ووٹ دیا تھا۔

الیکشن کے بعد اس روز وہ لان میں بیٹھے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے دو پیریڈ خالی تھے۔ رام گوپال نے محمود کو چھیڑ دیا۔ ''دیکھا تم نے۔ اس الیکشن نے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا۔'' اس نے فاتحانہ لہجے میں محمود سے کہا۔ ''اس ملک میں اکثریت ہوش مندوں کی ہے، جو آزادی چاہتے ہیں۔ ملک کو تقسیم کرنا نہیں چاہتے۔''

''میں تم سے اتفاق نہیں کرتا۔'' محمود نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ کالج کی یونین کا الیکشن تھا اور بس۔''

''او یار، یہ تو وہی بات ہوئی نا کہ انگور کھٹے تھے۔'' فتح سنگھ بولا۔ ''یہ بات تھی تو الیکشن کیوں لڑا تم نے؟''

''یہ دیکھنے کے لیے کہ ہمارے لوگ ہمارے اس موقف کی تائید کرتے ہیں یا نہیں۔ دوسرے ہم رائے عامہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔''

''تو تمھیں پتا چل گیا کہ لوگ تمھارے ساتھ نہیں ہیں۔'' رام گوپال نے کہا۔ ''اس شکست نے تمہاری آنکھیں کھول دیں؟''

''ہاں ہمیں پتا چل گیا کہ قوم جاگ رہی ہے۔'' محمود کا لہجہ اب بھی نرم تھا۔ ''کالج میں 58 طلباء اور طالبات مسلمان ہیں اور ہمیں 56 ووٹ ملے۔''

رام گوپال کا منہ اتر گیا۔ ''یہ تو تنگ نظری ہے تمہاری۔ 56 ووٹوں نے تمھیں جتوا تو

نہیں دیا۔

''یہ تنگ نظری نہیں، حقیقت پسندی ہے۔ ہمیں اپنی طاقت کا اندازہ ہونا چاہیے۔''

تب اوتار سنگھ نے پہلی بار مداخلت کی۔ ''ویسے محمود، میری سمجھ میں تم لوگوں کی منطق نہیں آتی۔ اصل مسئلہ آزادی ہے۔ ملک کو تقسیم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''یہ فہم و فراست کی بات ہے۔ جب ایک جنگ سے کام چل سکتا ہے تو پے در پے دو جنگیں لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''کیا مطلب؟'' رچرڈ پارسن نے بھویں اچکائیں۔

''بھئی ابھی ہم آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں اور آزادی کے فوراً بعد ہمیں علیحدگی کے لیے لڑنا ہوگا۔ تو یہ کام ابھی کیوں نہ کر لیں۔''

''بنیادی سوال یہ ہے کہ علیحدگی کی ضرورت کیوں ہے۔'' رام گوپال بولا۔

''ضرورت اس لیے ہے کہ ہمیں اپنا دینی اور قومی تشخص برقرار رکھنا ہے۔'' محمود نے جواب دیا۔

''یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔'' رام گوپال نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ ''تمہارا قومی تشخص کیا ہے؟ یہی نا کہ تم ہندوستانی ہو۔''

''نہیں۔ ہم ہندوستانی مسلمان ہیں۔ ہمارا قومی تشخص دینی تشخص سے جڑا ہوا ہے۔'' محمود نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہم اگر صرف ہندوستانی رہ گئے تو گویا ہم نے اپنی شناخت کھو دی اور یہ ہم گوارا نہیں کر سکتے۔''

''تو بھائی، اتنی صدیوں سے جو تم اسی ہندوستان میں رہ رہے ہو، پہلے کبھی تمھیں یہ فکر نہیں ہوئی۔ نہ تم اپنی شناخت سے محروم ہوئے۔'' رام گوپال نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''قسم واہگورو کی رامو، تو تو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ اب اتنی صدیوں یہ صرف حکومت ہی تو کرتے رہے ہیں۔ یہ فکر کیوں ہوتی انھیں۔'' فتح سنگھ بولا۔

''یہ ہوئی نا بات۔'' رام گوپال کا لہجہ فاتحانہ تھا۔ ''جب تک حکومت کرتے رہے، یہ پریشانی نہیں رہی۔ اب ہماری باری آئی تو دم نکل رہا ہے ان کا۔''

''ہاں یہی بات ہے۔ اچھا ہوا کہ تم نے خود ہی کہہ دیا۔''

اوتار سنگھ کی توقع کے برعکس محمود کا لہجہ فاتحانہ تھا۔ ورنہ وہ تو سمجھا تھا کہ اس دلیل کے بعد محمود مدافعانہ انداز اختیار کرے گا۔ مگر وہ تو اس دلیل کی تائید کر رہا تھا۔

اب وہ سب محمود کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''اب ذرا اس کی وجہ بھی تو بتاؤ کہ تمہاری حکومت آنے سے پہلے ہی...... تجربہ ہونے سے پہلے ہی مسلمان عدم تحفظ کا شکار کیوں ہو گئے۔''

"اسے کہتے ہیں قبل از مرگ واویلا۔" فتح سنگھ نے چوٹ کی۔

"اور یہ ضروری ہے۔ ورنہ بعد میں کوئی ماتم کرنے والا بھی نہیں ملتا۔" محمود نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"بھیا ہم ٹھہرے جاہل اور ناسمجھ۔ وجہ بھی تم ہی بتا دو۔" رام گوپال نے جل کر کہا۔ "مسلمانوں نے صدیوں یہاں حکومت کی۔ مگر ہمارا قومی اور مذہبی تشخص تو خطرے میں نہیں پڑا۔"

"حکمرانوں کے معاملے میں ظرف، رواداری اور وسیع النظری کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ مسلمانوں میں تھا۔ اسی لیے مندر سلامت رہے۔ سب کو پوجا پاٹ کی آزادی تھی......"

"کیا بات کرتے ہو۔" رام گوپال تنک کر بولا۔ "رواداری، ظرف، وسیع النظری! سب کہنے کی باتیں ہیں۔ محمود غزنوی نے......"

"محمود غزنوی نے کبھی ہندوستان پر حکومت نہیں کی۔ وہ کبھی ہندوستان کا حکمراں نہیں رہا۔ اکبر کے عہد کی تاریخ بھی یاد ہے؟"

"ہاں یاد ہے۔ اور اورنگ زیب کے عہد کی تاریخ بھی یاد ہے ہمیں۔" رام گوپال اب تلخ ہو رہا تھا۔

"اورنگ زیب ویسا مسلمان تھا، جیسا مسلمان کو ہونا چاہیے۔ اس سے تو شکایتیں مسلمانوں کو بھی ہیں۔ بڑے بڑے بزرگوں کے مزار ڈھا دیے اس نے۔ وہ مزار پرستی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ بت پرستی تو بہت آگے کی بات ہے۔ اور میری بات کی سچائی اس سے ثابت ہے کہ کئی صدیوں تک مسلمان حکومت کرتے رہے۔ لیکن آج بھی ہندوستان میں ہندو بھاری اکثریت میں ہیں۔"

"کروڑوں ہندوؤں کو مسلمان کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ اس دیس میں کروڑوں مسلمان کہاں سے آئے؟"

"اسلام میں تو زبردستی ہے ہی نہیں۔" محمود پھر مسکرا دیا۔ "یہ سب حسنِ اخلاق کا، محبت کا، سلوک کا کمال ہے۔ محمد بن قاسم سندھ میں کتنا کم عرصہ رہا۔ لیکن لوگ اس کی پوجا کرنے لگے تھے۔ کیوں؟ ایک طاقت ور کا اتنے کم وقت میں دل جیت لینا سمجھ میں آتا ہے؟ جو مسلمان ہوا، اپنی خوشی سے ہوا۔ کردار اور اخلاق دیکھ کر ہوا۔ تم نے تو شودروں کو جانوروں سے بدتر بنا رکھا تھا۔ زندگی عذاب تھی ان کی۔ وہ مسلمان ہوئے تو انھیں عزت ملی۔ برابری کا درجہ ملا۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ برتری ہے تو صرف اعمال کی ہے۔ یہ اسلام کا کمال ہے۔ اسی لیے تو اسے پھیلنے سے نہیں روکا جا سکا۔ تو بھائی، میں ظرف، رواداری اور وسیع النظری کی بات یونہی نہیں کر رہا ہوں۔"

"تمھارے خیال میں ہندوؤں میں یہ خوبیاں نہیں ہیں؟ ان کی حکومت ہوئی تو تم اپنی پہچان کھو بیٹھو گے؟"

"ہاں۔ یہی بات ہے۔ اسی لیے پاکستان ضروری ہے۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ ایسی کوئی بات ہے۔ تم ثابت کر کے دکھاؤ۔" رام گوپال نے چیلنج کیا۔

"ثابت کرنا کیا مسئلہ ہے۔" محمود نے کہا۔ "یہ شدھی تحریک کون چلا رہا ہے؟ ہندو ہی چلا رہے ہیں نا......"

"وہ تو انتہا پسند ہندو ہیں۔" رام گوپال نے تلملا کر کہا۔

"ہیں تو ہندو نا۔ اور ابھی تو ان کے پاس اقتدار بھی نہیں ہے۔ اقتدار آئے گا تو کیا کچھ نہیں کریں گے وہ۔ مسلمان گائے ذبح کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے لیے گائے ماں کے برابر ہے۔ اب بتاؤ، جھگڑا ہوگا کہ نہیں۔ ارے خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ مسلمان اس خطے میں امن کی خاطر پاکستان کا مطالبہ کر رہے ہیں۔"

"بات تو سچ ہے۔" رچرڈ پارسن نے دھیرے سے کہا۔

"تم تو سچ ہی کہو گے۔" رام گوپال رچرڈ پر الٹ پڑا۔ "تم انگریزوں کو یہ اقتدار مسلمانوں سے ہی تو ملا ہے۔ ورنہ یہ سونے کی چڑیا تمھارے ہاتھ کہاں آتی۔"

"ہاں، یہ سچ ہے۔ میں مانتا ہوں کہ مسلمان حکمرانوں کی کمزوری کے نتیجے میں انگریز تجارت کے بہانے یہاں آئے اور پورے ہندوستان پر قابض ہو گئے۔" محمود نے کہا۔ "لیکن یہ تو بتاؤ کہ ان کمزور حکمرانوں کو ہٹا کر ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم نہ کرنا کس کی کمزوری تھی۔ جس میں جتنی طاقت تھی، اسی حساب سے وہ کوئی علاقہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مرکزیت کی کمی تو پورے ہندوستان کی تھی۔ صرف مسلمانوں کو قصوروار ٹھہرانا تو زیادتی ہے۔"

بات طول پکڑتی۔ لیکن ان کا پیریڈ شروع ہونے والا تھا۔ یہ بات فتح سنگھ نے یاد دلائی۔ وہ اٹھ گئے۔ محمود نے رام کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اچھا دوست، مائنڈ نہ کرنا۔ پھر کبھی بات ہو گی۔"

رام نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "نہیں کبھی نہیں ہو گی۔ میں تم سے بات کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

"ارے نہیں۔ دوستوں میں یہ جھگڑے اچھے نہیں ہوتے۔" اوتار سنگھ نے مداخلت کی۔ "دیکھو نا، یہ تو ایک علمی گفتگو تھی۔ نالج بڑھانے کے لیے، ذہن کو وسعت......"

"مجھے یہ پسند نہیں۔" رام نے تنک کر کہا۔

"او کم آن۔ تم میں اسپورٹس مین اسپرٹ نہیں ہے رام۔ اٹ واز آل ان گڈ

اسپرٹ۔‘‘ رچرڈ بولا۔ ’’اور بات شروع تو تم نے ہی کی تھی۔‘‘

’’اور کیا۔ یاروں کے بیچ کوئی بات فرق نہیں ڈال سکتی۔‘‘ فتح سنگھ سے بھی نہیں رہا گیا۔

لیکن رام گوپال بدستور اکڑا ہوا تھا۔ بالآخر محمود نے زبردستی اسے گلے لگالیا۔

’’اب مسکرا بھی دو۔‘‘ رچرڈ نے کہا۔

رام گوپال مسکرایا۔ لیکن اس کی آنکھوں سے کینہ توزی جھلک رہی تھی۔ اوتار سنگھ اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

❁........❁........❁

اوتار سنگھ کے دماغ میں نئے نئے دریچے کھل رہے تھے!

دوستوں کے اس گروپ میں لڑکیاں بھی تھیں۔ ریٹا پارسن رچرڈ کی بہن تھی۔ پشپا تھی، جو ایک دولت مند ہندو گھرانے سے تھی۔ نادرہ تھی، جو ایک پڑھے لکھے اور آزاد خیال مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔

تینوں لڑکیاں حسن و جمال میں ایک دوسری سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ پشپا اور نادرہ دوستوں کے اس گروپ میں اس لیے شامل ہو پائیں کہ ان کی ریٹا سے دوستی ہوگئی تھی...... اور ریٹا رچرڈ کی بہن تھی۔ تینوں بے حد حسین ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد ذہین بھی تھیں اور سوچنے والی بھی تھیں۔

دوستوں کے اس گروہ سے ملنے کے بعد اوتار سنگھ کی سوچ کا منظر بہت وسیع ہوگیا تھا۔ بہت کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا، اب اس کے علم میں آ رہا تھا۔ اس کے بعض نظریات کی تردید ہو رہی تھی اور بعض کی اصلاح۔ ان میں ایک نظریہ وہ تھا، جو اس نے مسلمانوں کے بارے میں قائم کر رکھا تھا۔

مسلمانوں کی اس کے لیے بڑی اہمیت تھی۔ ماتا جی اور پتا جی کو چھوڑ کر اس کے سب سے پسندیدہ انسان، سب کے سب مسلمان تھے۔ اماں، جو اس کے لیے ماتا جی سے کم نہیں تھیں۔ وصال دین جو اس کے لیے بھائی تھا اور چاچا جمال دین، جس کی وہ پتا جی جیسی عزت کرتا تھا۔ پھر بعد میں اس میں مولوی صاحب بھی شامل ہوگئے، جو اسے عربی پڑھا رہے تھے۔ کیسی عجیب بات تھی کہ ماسٹر کانتی پرشاد کو اس نے کبھی اس درجے میں شمار نہیں کیا۔

اماں، چاچا اور وصال دین کو وہ اس وقت سے دیکھ رہا تھا، جب اس نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا۔ اسی لیے وہ سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کو وہ بہت اچھی طرح سمجھتا ہے۔ ان کے مزاج سے خوب واقف ہے۔ اور ان تینوں کے حوالے سے اس نے مسلمانوں کے بارے میں ایک نظریہ قائم کیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مسلمان بہت صلح جو، بہت نرم خو اور بہت منکسر المزاج ہوتے ہیں۔ وہ کم سے کم اظہار کے قائل ہوتے ہیں۔ اپنی بات پر زور نہیں دیتے۔ اصرار نہیں کرتے۔ بحث سے گریز

کرتے ہیں۔ بے حد تابع دار اور ڈرپوک ہوتے ہیں۔

اس نے مسلمانوں کو ایسا ہی دیکھا تھا۔ اماں سب سے زیادہ کھل کر بات کرتی تھیں۔ مگر بات کرتے کرتے اچانک چپ ہو جاتیں...... گھبرا کر بات نامکمل چھوڑ دیتیں۔ اور پھر کہتیں کہ ٹھاکر جی کو پتا چل گیا تو وہ ان سب کو ختم کرا دیں گے۔ اس کے بعد وہ لاکھ کریدنے کی کوشش کرتا، ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا۔ اور چاچا جمال دین اور ویر جی دونوں ایک سے تھے۔ پتا جی چاچا کی کتنی عزت کرتے۔ لیکن چاچا کے انداز کی عاجزی وہی رہتی۔ چاچا اور ویر جی میں ایک بات مشترک تھی۔ دونوں اپنے خیالات کا اظہار کم ہی کرتے تھے۔ ان کا عمومی رویہ یہ تھا کہ جو کہا جاتا، اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے۔ حالانکہ چاچا جی کا کوئی بات سمجھانے کا طریقہ بے حد سادہ اور حد درجہ دل نشیں تھا۔ اوتار سنگھ کو آج بھی یاد تھا کہ انھوں نے لکڑی کے گھوڑے کو نظر انداز کرنے کے بارے میں اسے کیسے موثر انداز میں سمجھایا تھا اور پھر وہ اس کا گھوڑا بنے تھے۔ اسے پیٹھ پر بٹھا کر دالان میں دوڑتے رہے تھے۔ اس روز انھوں نے اسے وفاداری کا سبق ایسے دل نشیں انداز میں سکھایا تھا کہ وہ آج تک نہیں بھولا تھا۔ انھوں نے کہا تھا...... ہاتھ تھام کر چھوڑتے نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ کچھ چھن جانے کا دکھ بڑا ہوتا ہے۔

اوتار سنگھ کو اس دن کی ایک ایک بات آج بھی یاد تھی۔ چاچا جی نے کہا تھا کہ ہر چیز کی ایک اوقات ہوتی ہے۔ کسی سے محبت کرتے وقت اس کی اوقات ضرور دیکھنی چاہیے۔ اس کے باوجود بھی محبت ہو جائے تو محبت ضرور کرو۔ لیکن جب محبت نہ رہے، تب بھی یہ بات اس پر ظاہر نہ ہونے دو۔ کیونکہ کچھ چھن جانے کا دکھ بڑا ہوتا ہے۔

اس سے پتا چلتا تھا کہ چاچا جی عقل والے ہیں۔ لیکن وہ دبو بھی تھے۔ اپنی عقل کا اظہار کم ہی کرتے تھے۔ جمال دین اسی معاملے میں ان سے بھی آگے تھا۔ اس کے بارے میں تو اوتار سنگھ عقل مند ہی ہونے کا گمان کر ہی نہیں سکتا تھا۔ کبھی ایسی کوئی علامت ظاہر ہی نہیں ہوئی تھی۔

مگر اب کالج میں محمود کو دیکھنے کے بعد اوتار سنگھ کو مسلمانوں کے بارے میں اپنی رائے پر نظرِ ثانی کرنی پڑ رہی تھی۔ وہ جرأت مند بھی تھا اور سلجھے ہوئے ذہن کا مالک بھی۔ جس طرح ٹھنڈے دل و دماغ سے اس نے اپنے موقف کا دفاع کیا تھا، وہ قابلِ رشک تھا۔

لیکن اس بحث نے اوتار سنگھ کو الجھا بھی دیا تھا۔ اس کے ذہن میں کئی سوالات ابھرے تھے۔ یہ احساس بھی ہوا تھا کہ ملک کے سیاسی منظر نامے سے وہ نا واقف ہے۔ یہ تو پتا چل گیا تھا کہ مسلمان ہندوستان میں اپنے لیے الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ بھی طے تھا کہ انگریز ہندوستان سے رخصت ہونے والے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اقلیت میں ہونے کے باوجود مسلمانوں نے صدیوں ہندوستان پر حکومت کی ہے...... اور وہ بھی مرکزیت کے ساتھ...... پورے ہندوستان پر!

اوتار سنگھ نے اسی بات پر غور کیا تو وہ یہ ماننے پر مجبور ہو گیا کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اتنی بھاری اکثریت پر اقلیت کا حکومت کرنا ایک غیر معمولی بات تھی۔ یوں تو انگریز بھی اقلیت میں ہونے کے باوجود مدت سے ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ بتاتی تھی کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں امن و امان تھا، خوش حالی تھی۔ لوگوں کو انصاف ملتا تھا اور طوائف الملوکی پھیلنے سے پہلے رعایا مسلمان حکمرانوں سے محبت کرتی تھی۔ اس حکومت میں طاقت تو تھی لیکن جبر نہیں تھا۔ جبکہ انگریز بہ جبر حکومت کر رہے تھے۔ انھیں ایک بہت بڑی اور ملک گیر بغاوت کا سامنا کرنا پڑا تھا، جسے انھوں نے بڑی سختی اور بے رحمی سے کچل دیا تھا۔ اوتار سنگھ کے خیال میں اسے بغاوت کہنا زیادتی تھی۔ ہندوستانی لوگ...... کیا ہندو، کیا مسلمان...... بجا طور پر اسے تحریک آزادی کہتے تھے۔

اوتار سنگھ کے لیے مسلمانوں کی کشش اور بڑھ گئی۔ ان میں خوبیاں تو ہوں گی۔ تبھی تو انھوں نے اتنے طویل عرصے حکومت کی تھی۔ شیر شاہ سوری نے صرف پانچ سال میں اتنی اصلاحات کی تھیں...... اور اتنی بڑی اور اہم اصلاحات کہ اس کے مختصر دور کو بلاشبہ سنہرا دور کہا جا سکتا تھا۔

گزشتہ بحث کے بعد اوتار سنگھ کے اندر کا طالب علم بری طرح بھڑک چکا تھا۔ اب وہ جلد سے جلد سب کچھ جان لینا اور سمجھ لینا چاہتا تھا۔ گزشتہ بحث میں دو فریق تھے...... محمود اور رام گوپال۔ اس نے فیصلہ کیا کہ دونوں سے الگ الگ گفتگو کرے گا۔

پھر اسے رام گوپال سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ اسے کینٹین میں لے گیا۔ چند لمحے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے مطلب کی بات چھیڑی۔ ''اس روز تمھاری اور محمود کی جو بحث ہوئی، وہ مجھے بڑی دلچسپ لگی۔''

''کچھ بھی ہو، مُسلا تو مُسلا ہی رہے گا۔'' رام نے بے حد نفرت سے کہا۔ ''اور یہ مُسلے سالے ہوتے ہی مطلبی ہیں۔''

رام کے لہجے کی نفرت نے اوتار سنگھ کو ہلا کر رکھ دیا۔ بظاہر تو وہ معمولی سا اختلاف رائے تھا۔ لیکن یہ اتنی تند نفرت اس کے لیے ناقابلِ فہم تھی۔ ''ایسے تو نہ کہو رام۔ آخر وہ ہمارا دوست ہے۔'' وہ بولا۔

''ارے کاہے کا دوست۔'' رام نے بے زاری سے کہا۔ ''چھپا دشمن کہو اُسے۔''

''تم اوور ری ایکٹ کر رہے ہو رام۔ وہ محض ایک نظریاتی بحث تھی۔''

''نظریہ...... ہنہہ۔'' رام کے لہجے میں حقارت تھی۔ ''یہ ہندوستان جغرافیہ ہے، کوئی نظریہ نہیں۔ وہ نظریاتی بحث نہیں تھی، جغرافیائی بحث تھی۔ یہ ہماری دھرتی ہے، ہمارا دیش ہے۔ جو نظریہ اس کے ٹکڑے کرنے کی بات کرے، میں اسے نہیں مانتا۔ نظریے کو جغرافیہ تبدیل کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ذرا سوچو، اس دھرتی پر ان مُسلوں کا کیا حق ہے۔ یہ باہر سے آئے اور ہندوستان

پر قابض ہو گئے۔ اکثریت کو غلام بنا لیا...... انگریزوں کی طرح۔''

''میرے خیال میں تو فرق ہے دونوں میں۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''مسلمانوں نے حکومت کی، غلام نہیں بنایا۔ یہاں بہت کچھ کیا انھوں نے۔ اس ملک کو اپنا وطن بنایا۔ اس کی ترقی اور خوش حالی کے لیے کوشش کی۔ انگریزوں کا معاملہ اور ہے۔ وہ یہاں رہ کر بھی برطانیہ کی عظمت کے گن گاتے ہیں۔ وہ یہاں کی دولت برطانیہ منتقل کرتے ہیں۔ مسلمانوں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

''مسلمان بھی یہاں بیٹھ کر اسلام کی عظمت کے گن گاتے ہیں۔''

''تو یہ تو نظریاتی بات ہوئی، جغرافیائی نہیں۔'' اوتار سنگھ بولا۔ ''مسلمانوں نے ہندوستان کو انگریزوں کی طرح بدیش...... نو آبادی نہیں سمجھا۔ انھوں نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ وہ اسے اپنا دیش سمجھتے ہیں۔''

''سمجھنے سے یہ ان کا دیش ہوگا نہیں۔'' رام گوپال نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ''اب انگریز یہاں سے جانے والے ہیں۔ دیش آزاد ہوگا۔ اور یہاں وہ لوگ حکومت کریں گے، جن کا حق ہے۔ ان مُسلوں کی ہوا خراب ہو رہی ہے تو صرف اسی وجہ سے۔ یہ ہماری حکومت میں رعایا بن کر نہیں رہنا چاہتے۔''

اوتار سنگھ نے دل میں اس بات کی معقولیت کو تسلیم کیا۔ ''مگر وہ اپنے ڈر کی وجہ بھی تو بیان کرتے ہیں۔''

''ڈر ان کا سچا ہے۔'' رام گوپال مسکرایا۔ ''اب ہماری باری ہے اور ہم ان سے گن گن کر بدلے لیں گے۔ انھوں نے صدیوں ہم پر حکومت کی اور ہمیں دبا کر رکھا۔ اب ہماری باری ہے۔ یہ تو سمے کا چکر ہے۔ تو اب وہ ڈرتے کیوں ہیں۔ جو انھوں نے کیا، اب انھیں سہنا ہوگا۔''

''اور یہ شدھی تحریک کیا ہے؟''

''اس کی بنیاد اس پر ہے کہ ہندوستان میں صرف ہندوؤں کو رہنا ہے۔ یہ دھرتی ہندوؤں کی ہے۔ تو مسلمانوں کی بہتری کے لیے انھیں شدھی کیا جا رہا ہے۔ تاکہ وہ اس دھرتی پر رہ سکیں۔''

''شدھی کیا جا رہا ہے کا مطلب ہندو بنایا جا رہا ہے انھیں؟''

رام گوپال بڑی بے رحمی سے ہنسا۔ ''ہندو بنایا نہیں جاتا۔ ہم خالص لوگ ہیں۔ ماں کے پیٹ سے ہندو پیدا ہوتے ہیں۔ ان مسلمانوں میں یہ تصور نہیں۔ اسی لیے یہ شودروں کو بھی مسلمان بنا لیتے ہیں اور برابری کا درجہ دیتے ہیں۔''

اوتار سنگھ اس بات پر غور کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس وقت اتنی مہلت نہیں تھی۔ اس نے سوچا،

اس پر بعد میں غور کرے گا۔ ''تو ہندو نہیں بنایا جاسکتا انھیں۔ پھر شدھی کرنے کا کیا مطلب ہوا۔''

''یہ ایک مرحلہ ہے۔ وہ مسلمان نہیں رہتے اور شودر جیسے ہو جاتے ہیں۔ ہاں اگلے جنم میں وہ ہندو پیدا ہوں گے۔''

اوتار سنگھ کو اندازہ ہوگیا کہ خود رام گوپال کو بھی پوری معلومات نہیں ہیں۔ تاہم اس نے بات آگے بڑھائی۔ ''یہ تو ظلم ہے، زیادتی ہے۔''

''ہرگز نہیں۔ ذرا سوچو تو۔ ہم تو اپنے ہندوؤں کو دوبارہ ان کے دھرم میں واپس لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''مگر شدھی تو مسلمانوں کو کہا جارہا ہے۔'' اوتار سنگھ الجھنے لگا۔

''وہ مسلمان جو پہلے ہندو تھے۔ ارے مسلمان آئے تو ان کی تعداد ہی کیا تھی۔ انھوں نے زور زبردستی سے ہندوؤں کو مسلمان بنایا۔ ورنہ آج مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کیسے ہوتی۔''

اوتار سنگھ کے لیے یہ بات بھی قابلِ غور تھی۔ لیکن ابھی وقت نہیں تھا۔ ''تو تمھارے خیال میں شدھی تحریک جائز ہے؟'' اس نے رام گوپال سے پوچھا۔

''بالکل۔''

''مگر اس دن تم کہہ رہے تھے کہ وہ انتہا پسند ہندوؤں کی تحریک ہے۔ ایک طرح سے تم نے اس سے بے تعلقی ظاہر کی تھی۔''

''ارے یار، اسے ڈپلومیسی کہتے ہیں۔'' رام گوپال آنکھ مارتے ہوئے مسکرایا۔ ''ورنہ ہر ہندو انتہا پسند ہے۔'' پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ ''اس دھرتی پر بڑے پاپ کیے ہیں ان مُسلوں نے۔ اب یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔ ہم گئو ماتا کی رکھشا کریں گے۔''

بات ختم ہوگئی کیونکہ ان کا پیریڈ شروع ہونے والا تھا۔

اس گفتگو سے اوتار سنگھ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ رام گوپال تنگ نظر بھی ہے اور مکار بھی۔ لیکن بہرحال وہ فرد تھا۔ ضروری نہیں کہ ہندوؤں کی اکثریت ایسی ہی ہو۔ آخر وہ خود بھی تو ہندو ہی تھا۔ لیکن نہیں...... اس نے سوچا۔ میرا معاملہ مختلف ہے۔ میں بتوں کو نہیں پوجتا۔ میں انھیں مانتا بھی نہیں۔ میں تو اس مہان ہستی کی کھوج میں ہوں، جس نے یہ دنیا بنائی، اس کا مربوط نظام قائم کیا۔

اس کے بعد کافی دنوں تک اسے محمود سے تنہائی میں گفتگو کا موقع نہیں ملا۔ تاہم اس دوران اس نے متعدد ہندو طلبا سے بات کی۔ ان کا نکتہ نظر بالکل وہی تھا، جو رام گوپال کا تھا۔ اس بات نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

❀......❀......❀

پارسن فیملی طویل عرصے سے ہندوستان میں تھی۔ رچرڈ اور ریٹا یہیں پیدا ہوئے تھے۔ دونوں میں صرف ایک سال کا فرق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ زیادہ تر لوگ انھیں جڑواں بہن بھائی سمجھتے

تھے۔

جیمز پارسن دہلی کی انتظامیہ میں ایک کلیدی عہدے پر فائز تھے۔ دونوں بچوں کو تعلیم کے لیے انھوں نے نینی تال بھجوا دیا تھا۔ جہاں وہ پڑھتے تھے، وہ ایک بڑا کانونٹ اسکول تھا۔ وہاں اکثریت انگریزوں کی تھی۔ لیکن مسلمان اور ہندو بھی بہرحال موجود تھے۔

رچرڈ اور ریٹا دونوں کو ہندوستان بہت پُرکشش لگتا تھا۔ ہندوستان کی رنگا رنگ ثقافت ان کے لیے مسحور کن تھی۔ انھیں یہاں کی زبان میں بھی شروع ہی سے دلچسپی تھی۔ یہ دلچسپی ہی کی بات تھی کہ انھوں نے اِدھر اُدھر سے سیکھ سمجھ کر اردو میں اچھی خاصی استعداد بنالی تھی۔

اسکول میں عام طور پر انگریز بچوں کا رویہ ایسا تھا کہ وہ بس ایک دوسرے سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ ویسے بھی ان کی اکثریت تھی۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہندوستانی بچے سب سے الگ تھلگ، ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ مگر کچھ بچے ایسے بھی تھے جو فطرت کے اعتبار سے گھلنے ملنے والے تھے۔ وہ انگریز بچوں کی طرف بڑھتے تھے۔ مگر رچرڈ اور ریٹا کے سوا ان کی حوصلہ افزائی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ رچرڈ اور ریٹا کے لیے اپنے ہم نسلوں سے بڑھ کر ان میں کشش تھی۔ اور ان سے وہ بہت کچھ سیکھتے تھے۔ ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا تھا۔ پھر یہی نہیں، انھیں جب بھی موقع ملتا، وہ اسکول سے نکلتے اور مقامی لوگوں میں گھلتے ملتے۔ انھوں نے دیکھ لیا کہ مقامی لوگ بہت سادہ اور ملنسار ہیں۔

دونوں بہن بھائیوں کو ہندوستان سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بارے میں سوچتے تھے۔ ان کا مشاہدہ بھی بہت اچھا تھا۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ چند اکا دکا افراد کو چھوڑ کر ہندوستانیوں میں ایک اجتماعی احساسِ کمتری تھا۔ یہ فطری تھا۔ وہ باہر سے آنے والے اور خود سے ہر اعتبار سے مختلف انگریزوں کی رعایا تھے۔ کچھ انگریزوں کا حد سے بڑھا ہوا احساسِ برتری بھی ان کے احساسِ کمتری کو اور بڑھا دیتا تھا۔

بہرحال رچرڈ اور ریٹا نے اسکول میں بھی خود کو اپنے ہم نسلوں تک محدود نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے ہندوستانیوں سے بھی دوستی کی۔

اسکول کی تعلیم مکمل ہوئی تو جیمز پارسن نے انھیں دہلی واپس بلانے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ وہ نینی تال میں مزید پڑھ سکتے تھے۔ لیکن ایک تو وہ اور الزبتھ اپنے بچوں کو بہت زیادہ مس کرنے لگے تھے۔ اور دوسرے سیاسی صورتِ حال بہت تیزی سے بدل رہی تھی۔ انگریزوں کا ہندوستان سے رخصت ہونا اب نوشتہ دیوار تھا۔ جیمز پارسن کے بس میں ہوتا تو وہ ابھی انگلینڈ واپس چلا جاتا۔ ایسے میں وہ کم از کم یہ تو کرسکتا تھا کہ اپنے بچوں کو اپنے پاس واپس بلالے۔ تاکہ انگلینڈ واپسی کا فیصلہ ہو تو کوئی پیچیدگی نہ ہو۔

دہلی بڑا شہر تھا۔ وہاں انگریزوں کی اپنی سوشل لائف تھی۔ اب بچے جوانی کی سرحد میں

قدم رکھ چکے تھے۔ چنانچہ جیمز اور الزبتھ نے انھیں کلب لے جانا شروع کیا اور انھیں ان کے ہم نسلوں سے متعارف کرانے لگے۔ لیکن رچرڈ اور ریٹا کو کلب میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ریٹا بالخصوص پیدائشی رومینٹک تھی۔ اس کی جمالیاتی حس بڑی توانا تھی۔ وہ نازک طبع، نازک خیال اور آرٹسٹک تھی۔ وہ اتنی رومان پرست تھی کہ بچپن ہی سے اس نے اپنا ایک آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ اس کے خوابوں کا ایک شہزادہ تھا، جس کی وہ راہ تکتی تھی۔

کلب میں لوگوں نے جس طرح اس کی پذیرائی کی، وہ اسے اچھا نہیں لگا۔ جبلی طور پر ہر عورت بوالہوس نگاہوں کو پہچان لیتی ہے۔ وہ تو پھر ایسی لڑکی تھی، جسے مشرقیت اچھی لگتی تھی اور وہ رومان پسند بھی تھی۔ چنانچہ وہ کلب سے بےزار ہو گئی۔

کالج کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ خوش تھی۔ کالج میں نئے دوست ہوں گے۔ نئی دلچسپیاں ہوں گی۔ اچھا وقت گزرے گا اور کون جانے......

لیکن ابتدا میں اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ کالج میں ہندوستانیوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ نینی تال کے مقابلے میں یہاں ہندوستانیوں کا احساسِ کمتری بڑھا ہوا تھا اور جو لوگ اس سے محفوظ تھے، وہ انگریزوں کو غاصب سمجھتے تھے۔ یہاں دوست بنانا زیادہ دشوار ہو گیا۔ ریٹا حیرت سے سوچتی، جذباتی اعتبار سے یہ کتنے متوازن لوگ ہیں۔ یا تو احساسِ کمتری میں مبتلا ہوں گے۔ یا اپنے بدیسی حکمرانوں کے ہر ہم نسل سے نفرت کریں گے، جیسے وہ بھی اپنے ہم نسلوں کے ساتھ شریک استحصال ہو، جیسے وہ بھی ان کے جرمِ حکمرانی میں برابر کا شریک ہو۔

مگر پھر دھیرے دھیرے رچرڈ کے دوستوں کا ایک حلقہ بن گیا۔ اور اس حلقے میں ہر رنگ موجود تھا۔ قدرتی طور پر وہ ریٹا کا حلقہ بھی تھا۔ اس میں پشپا، نادرہ اور امرتا بھی تھیں اور محمود، رام گوپال، اوتار سنگھ اور فتح سنگھ بھی تھے۔ پہلی بار وہ خوش ہوئی۔

اور جب پہلی بار اس نے اوتار سنگھ کو دیکھا تو اسے ایسا لگا کہ اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کے سامنے کھڑا ہے۔ مگر اس نے پہلی نظر کے اس تاثر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے نزدیک آدمی کی ظاہری شخصیت سے زیادہ اہم اس کی باطنی شخصیت تھی اور باطنی شخصیت ذرا دیر میں ہی کھلتی ہے۔

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس کی شخصیت کے سحر میں الجھتی گئی۔ اوتار سنگھ ظاہری طور پر جتنا خوبصورت تھا، باطنی طور پر اس سے زیادہ خوبصورت تھا۔ اس کی شخصیت غیر معمولی طور پر متوازن تھی۔ وہ بنیادی طور پر طالب علم تھا...... زندگی کا طالب علم۔ کالج کا چپڑاسی ہو یا لیکچرار، اپنا کوئی ہم جماعت ہو یا دوست، وہ سب کی بات ایسی توجہ سے سنتا کہ لگتا عبادت کر رہا ہے۔ جیسے ہر اہم، غیر اہم بات سے وہ کچھ سیکھ رہا ہے۔ اس کے مزاج میں عجیب سا انکسار اور عاجزی تھی۔ لیکن وہ ڈرپوک نہیں تھا۔ جس بات کو درست سمجھتا، اس کا برملا اظہار وہ کسی کے بھی

سامنے کر سکتا تھا۔ خود اعتمادی کی اس میں کمی نہیں تھی۔ مگر وہ بات نظریں جھکا کر کرتا تھا۔ اس کی نگاہیں نہ چور کی نگاہیں تھیں اور نہ ہی کسی بوالہوس کی۔ ان میں عجیب سی پاکیزگی، معصومیت اور جستجو تھی۔ وہ ایک طالب علم کی متجسس نگاہیں تھیں۔ ایسا طالب علم جو سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔

مگر ایک بات تھی۔ دوستوں کے حلقے میں بھی وہ بہت ریزرو رہتا تھا۔ کبھی بہت زیادہ بے تکلف نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات نہیں کہ اس سے اس کے بارے میں بات کی جائے تو وہ اس سے بچے۔ نہیں...... اپنے بارے میں وہ کھل کر بات کرتا تھا۔ البتہ دوسروں کے معاملے میں وہ پرائیویسی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ کسی کی نجی زندگی کے بارے میں تجسس نہیں کرتا تھا۔ اس کا تجسس خالصتاً علمی تھا۔

ریٹا کو پتا بھی نہیں چلا کہ کب وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ کب وہ اسے مختلف نظر سے دیکھنے لگی۔ جب اسے اس بات کا احساس ہوا تو اسے کوئی پریشانی بھی نہیں ہوئی۔ وہ مغرب کی لڑکی تھی۔ اپنی زندگی کے فیصلے کرنا، اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنا اس کا حق تھا۔ بس اہمیت اس بات کی تھی کہ اوتار سنگھ کے نزدیک بھی اس کی کوئی اہمیت ہے یا نہیں۔

اس معاملے میں اسے مایوسی ہوئی۔ اوتار سنگھ سب سے ایک طرح سے ملتا تھا۔ بلکہ کبھی تو ایسا لگتا کہ دوستوں میں اس کے نزدیک جنس کی تفریق تھی ہی نہیں۔ وہ بہت خوش اخلاق تھا۔ مہذب تھا۔ اس کے اندر رکھ رکھاؤ تھا۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

وہ مایوسی وقتی تھی۔ ریٹا نے سمجھ لیا کہ اوتار سنگھ ایک ایسا لڑکا ہے، جس نے ابھی جوانی کی سرحد میں قدم رکھا ہے اور ابھی وہ جوانی کے تقاضوں سے ناآشنا ہے۔ وہ اسے اہمیت نہیں دیتا تو کوئی بات نہیں۔ اسے خود کوشش کرنی ہوگی کہ وہ اسے اہم سمجھنے لگے۔ وہ بہت خوبصورت اور شاداب لڑکی تھی۔ اسے خود پر بہت بھروسہ تھا۔ کلب میں وہ دیکھ چکی تھی کہ مرد کیسے دیوانہ وار اس کی طرف لپکتے ہیں۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب اس سلسلے میں اسے کچھ کرنا ہے لیکن اس سے پہلے ہی اس پر ایک دھاکہ خیز انکشاف ہو گیا۔ اس نے دیکھ لیا کہ وہ تو ایک انار سو بیمار والا معاملہ ہے۔ اس معاملے میں لڑکیوں کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اس نے دیکھ لیا کہ دوستوں کے اس حلقے میں تمام لڑکیاں صرف اور صرف اوتار سنگھ کی تمنائی ہیں۔ کیا پشپا، کیا امرتا اور کیا نادرہ۔ گویا مقابلہ بہت سخت تھا۔ مگر ریٹا کو یقین تھا کہ جیت اُسی کی ہوگی۔

❁......❁......❁

اوتار سنگھ کو اکیلے میں محمود سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن اس دوران ایک اور اہم واقعہ ہو گیا۔ ہفتے کے روز خالی پیریڈ میں وہ مل بیٹھے۔ چند لمحے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ پھر رچرڈ نے کہا۔ ”آج ریٹا کا برتھ ڈے ہے۔“

اس پر سب نے چونک کر ریٹا کو دیکھا۔ ریٹا مسکرائی۔ اسے سب کی توجہ کا مرکز بننا بہت اچھا لگتا تھا۔ سب نے اسے ہیپی برتھ ڈے کہا۔

''نہیں ...... مجھے یہ مبارک باد نہیں چاہیے۔'' ریٹا نے کہا۔ ''ہر چیز کا، ہر بات کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ یہ کیا کہ یہاں پتا چلا اور یہیں وش کر دیا۔''

''تو پھر؟'' محمود نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

ریٹا کو احساس تھا کہ محمود اسے خصوصی توجہ دیتا ہے۔ وہ پھر مسکرائی۔ ''اب یہ تم سوچو۔'' اس کے لہجے میں چیلنج تھا۔

''چلو...... میں تمہیں تحفہ دوں گا۔ تب وش کرلوں گا۔'' محمود بولا۔

''میں بتاتا ہوں۔'' رچرڈ نے مداخلت کی۔ ''آج ہمارے گھر پر ریٹا کی برتھ ڈے پارٹی ہے۔ تم سب کو آنا ہے۔''

''برتھ ڈے پارٹی!'' رام گوپال نے فکرمندی سے کہا۔

پھر وہی احساسِ کمتری! ریٹا نے سوچا۔

''اس پارٹی میں ہم دوستوں کے علاوہ کوئی نہیں ہوگا۔'' رچرڈ نے وضاحت کی۔

''اوہ...... وری گڈ۔'' پشپا نے چہک کر کہا۔

رام گوپال نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہاں بہت سارے لوگ ہوں گے...... بے شمار انگریز۔ ''کیوں نہیں۔ ہم ضرور آئیں گے۔''

''پارٹی کا وقت کیا ہے؟'' محمود نے پوچھا۔

''رات آٹھ بجے۔ ڈنر دس بجے۔ پھر ڈانس اینڈ میوزک۔'' ریٹا بولی۔

''یہ تو لمبا پروگرام ہے۔'' نادرہ کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

''تو کیا؟ آج سیٹرڈے ہے۔ کل کالج کی چھٹی ہوگی۔ رات اپنی ہی ہے۔'' رچرڈ نے کہا

''نا بابا...... میں رات بھر نہیں رک سکتی۔'' نادرہ بولی۔ ''مجھے تو پارٹی میں شرکت کی اجازت بھی آسانی سے نہیں ملے گی۔ ہم لوگ ایسے آزاد خیال نہیں ہیں۔''

''اوکم آن۔ ڈونٹ بی سو بیک ورڈ۔'' ریٹا نے کہا۔

''نادرہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' محمود نے تائید کی۔ ''میں بھی جلدی جانا چاہوں گا۔''

رچرڈ نے غور سے ان دونوں کو دیکھا۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ ان کے موقف میں لچک نہیں ہوگی۔ ''اوکے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ جب تم کہو گے، میں تم دونوں کو گاڑی میں تمہارے گھر ڈراپ کرادوں گا۔''

''تب تو ٹھیک ہے۔'' نادرہ نے کہا۔

ریٹا نے اوتار سنگھ کو دیکھا۔ ''تم نے کچھ نہیں کہا۔ کیا بات ہے، آؤ گے نا؟''

''ضرور آؤں گا۔ میں تو آزاد آدمی ہوں۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''اور اچھا لگا تو پوری رات بھی رک سکتا ہوں۔''

''میں بھی۔'' فتح سنگھ اور امرتا نے بیک آواز کہا۔

''میں بھی آؤں گی اور پوری رات رکوں گی۔''

''بس تو طے ہوگیا۔ آج رات آٹھ بجے۔''

❁......❁......❁

حور بانو ان دنوں بہت پریشان تھی!

پہلے تو استانی صاحبہ کی پڑھائی نے اس کا معمول تبدیل کیا۔ پھر اوپر چھوٹے ٹھاکر کا معمول بھی بدل گیا۔ اس نے مغرب کے بعد اوپر کوٹھے پر آنا اور دیر تک بیٹھنا چھوڑ دیا۔ کیوں؟ اس نے اس پر سوچا۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ پھر اتفاق سے استانی جی نے چھٹی کی تو اسے پتا چلا کہ چھوٹا ٹھاکر عربی پڑھ رہا ہے۔ یہی نہیں، وہ اپنے مولوی صاحب سے قرآن پاک کی تلاوت بھی سنتا ہے۔

اس انکشاف نے حور بانو کے سامنے امکانات کی ایک روشن دنیا لاکر رکھ دی۔ خوش فہمی کے سرسبز باغ اسے نظر آنے لگے۔ اسے لگا کہ نجانے کیسے...... مگر چھوٹا ٹھاکر بھی اسی سے محبت کرنے لگا ہے اور اسی کی خاطر وہ عربی سیکھ رہا ہے۔ اور تلاوت سننے کے بعد اگلا مرحلہ تو قبولِ اسلام ہی کا ہے۔

معصوم لڑکی اس معاملے میں نہ کسی کو راز دار بنا سکتی تھی، نہ کسی سے مشورہ لے سکتی تھی۔ آپ ہی آپ سوچتی، اندازے لگاتی اور خوش ہوتی اور عربی پڑھنے والی بات سے تو وہ اتنی خوش ہوئی تھی کہ اس نے چھوٹے ٹھاکر کی دید سے محرومی پر بھی صبر کرلیا تھا۔ بڑے کام کے لیے بڑی قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔ یہ دید سے محرومی تو بہت چھوٹی بات تھی۔

لیکن ایک صبح اسے بڑا دھچکا لگا۔ اس نے دیکھا کہ وصال دین اکیلا اسکول جارہا ہے۔ وہ پریشان ہوگئی۔ کہیں چھوٹے ٹھاکر کی طبیعت تو خراب نہیں ہوگئی؟ وہ بے چین رہی۔ مگر چھٹی کے وقت وہ پھر دروازے پر پہنچ گئی۔ وصال دین اسکول سے اکیلا ہی واپس آیا تھا۔

اس معمول کو ایک ہفتہ ہوگیا۔ حور بانو کی پریشانی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اسے یقین ہوگیا کہ چھوٹا ٹھاکر زیادہ ہی بیمار ہے۔ لیکن اوپر بظاہر سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ کافی دنوں سے رنجنا بھی نیچے نہیں آئی تھی۔

وہ پہلا موقع تھا کہ حور بانو نے ایک ہفتے تک چھوٹے ٹھاکر کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی۔ اس شام وہ پڑھائی کے دوران پانی پینے کے بہانے سے اٹھی اور برآمدے میں چلی آئی۔ اس

نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اوپر کوٹھے پر چھوٹا ٹھاکر اپنے مولوی صاحب سے عربی پڑھ رہا تھا۔

حور بانو کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہاں سے ہٹے۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو شبہ ہو۔ چنانچہ وہ پانی پی کر واپس چلی آئی۔ اسے یہ اطمینان تو ہو گیا کہ چھوٹا ٹھاکر بیمار نہیں ہے۔ لیکن یہ الجھن برقرار رہی کہ وہ اسکول کیوں نہیں جا رہا ہے۔

اس روز رنجنا نیچے آئی تو حور بانو ہر احتیاط بھول بیٹھی۔ ''اتنے دن بعد آئی ہو؟ کیا بات ہے؟'' اس نے رنجنا سے پوچھا۔

''بس موقع ہی نہیں ملا۔''

''سب خیریت ہے نا؟'' حور بانو نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں...... سب ٹھیک ہے۔''

اس سے زیادہ پوچھنے کا موقع نہیں تھا۔ رنجنا بیٹھ کر اماں سے بات کرتی رہی اور حور بانو بے تاب سی اِدھر سے اُدھر پھرتی رہی۔ رنجنا جانے لگی تو حور بانو اس کے پیچھے برآمدے تک چلی آئی۔ ''رنجنا...... تمہارے چھوٹے ٹھاکر نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے کیا؟'' اس نے بے حد سرسری انداز میں پوچھا۔ لیکن اسے احساس تھا کہ بات سرسری نہیں ہے۔

رنجنا بہت بری طرح چونکی۔ پھر بولی۔ ''لو...... انھیں تو پڑھنے کے سوا کچھ کام ہی نہیں ہے۔ ہر وقت پڑھتے ہی رہتے ہیں۔''

''تو گھر پر ہی پڑھتے ہیں؟ اسکول چھوڑ دیا کیا؟''

''نہیں تو۔ روز جاتے ہیں۔'' رنجنا نے کہا۔ پھر بہت غور سے اسے دیکھا۔ ''پر تم نے یہ کیسے سوچ لیا؟''

حور بانو چور سی ہو گئی۔ مگر اب پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتی تھی۔ ''آ کا میاں کہہ رہے تھے کہ اب وصال دین اسکول اکیلا جاتا ہے۔''

''ارے ہاں...... وہ چھوٹے ٹھاکر تو پاس ہو گئے نا۔'' اچانک رنجنا کو خیال آیا۔ ''اب وہ اسکول نہیں...... وہ کیا کہتے ہیں...... ماسٹر جی بتا رہے تھے...... ہاں کالج! اب چھوٹے ٹھاکر کالج جاتے ہیں۔''

''یہ کالج کیا ہوتا ہے؟'' حور بانو نے مزید ٹٹولا۔

''ماسٹر جی کہہ رہے تھے، بڑا اسکول ہوتا ہے...... بہت بڑا۔'' رنجنا نے دونوں ہاتھ آخری حد تک پھیلاتے ہوئے بتایا۔ ''اور ماسٹر جی یہ بھی بتا رہے تھے کہ وہاں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔''

''ہائے اللہ۔'' حور بانو نے بے ساختہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم تو آ کا میاں کے سوا کبھی کسی کے سامنے نہیں آئے۔''

''وہاں تو انگریز لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ پر میری سمجھ میں نہیں آتا۔ صبح چھوٹے ٹھاکر ذرا دیر سے جاتے ہیں اور واپسی کا کچھ پتا نہیں۔ کبھی جلدی میں آ جاتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر دیر ہی ہوتی ہے۔ کبھی تو شام بھی ہو جاتی ہے۔ پھر واپس آ کر بھی پڑھتے ہی رہتے ہیں۔ سوکھ کے کانٹا ہو گئے ہمارے چھوٹے ٹھاکر۔ ارے میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنی زمین داری ہی سنبھالنی ہے نا انھیں۔ اچھا...... اب میں چلتی ہوں۔''

رنجنا چلی گئی۔ حور بانو دیر تک بت بنی وہیں کھڑی رہی۔ ایک مسئلہ تو حل ہو گیا تھا۔ یعنی اب وہ چھوٹے ٹھاکر کو جاتے آتے دیکھنے کی کوشش تو کر سکتی تھی۔ لیکن دوسری پریشانی لاحق ہو گئی۔ کالج میں لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے!

یہ بات اس کے دل کا بوجھ بن گئی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس بوجھ کو کسی کے سامنے ہلکا کیسے کرے۔ خود ہی سوچتے رہنے سے تو الجھن اور بڑھ جاتی ہے۔

اگلے روز اسے موقع مل گیا۔ استانی جی پردے کی اہمیت کے متعلق ایک حدیث شریف پڑھا رہی تھیں۔ ''مگر استانی جی، میں نے تو سنا ہے کہ کالج میں لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔'' اس نے بات نکالی۔

''ہاں، یہ انگریزوں کی لائی ہوئی لعنت ہے۔'' استانی جی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اب ہندوؤں کے ہاں تو پردہ ہے نہیں۔ وہ بھی آنکھیں بند کر کے انگریزوں کے پیچھے چل پڑے ہیں۔ یہ تو بے حیائی ہے۔ میں نے تو سنا ہے کہ کالج میں لڑکیاں سرخی پوڈر لگا کر جاتی ہیں۔ بے حیائی کے کپڑے پہنتی ہیں اور لڑکوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گھومتی ہیں۔'' استانی جی نے تو گویا آگ پر تیل کا چھڑکاؤ کر دیا۔

''مگر استانی جی، سنا ہے کالجوں میں مسلمان لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں۔'' حور بانو نے کہا۔

''کچھ موئے مسلمان ہیں جو انگریزوں کے ٹوڈی بنے پھرتے ہیں۔'' استانی جی بھنّا کر بولیں۔ ''ان کی اولادیں ہی ایسے کالجوں میں پڑھتی ہوں گی۔ وہ کم بخت اپنی پہچان ہی کھو بیٹھے۔ بس کلمہ پڑھنے کے مسلمان رہ گئے ہیں وہ۔''

''پھر بھی استانی جی، ہیں تو وہ مسلمان ہی۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' استانی جی نے سرد آہ بھر کے کہا۔ پھر ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''صحبت کا اثر تو ہوتا ہے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اسی لیے تو مسلمان پاکستان بنا رہے ہیں۔ تاکہ وہاں پوری آزادی سے اپنے طریقے سے زندگی گزار سکیں۔ کسی کی نقالی نہ کریں۔ اچھے مسلمان بن کر رہیں۔''

استانی جی سے بات کر کے حور بانو اور پریشان ہو گئی۔ یہ کالج اس کے لیے تو سوہانِ روح بن گیا۔

اگلی صبح وہ وصال دین کے جانے کے بعد دروازے پر منڈلاتی رہی۔ بالآخر اس نے چھوٹے ٹھاکر کو جاتے دیکھ لیا۔ وہ انگریزوں کی طرح سوٹ پہنے ہوئے تھا اور بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یہ احساس بھی ہوا کہ وہ اور بڑا ہو گیا ہے۔

چند روز میں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اسے کالج سے آتے دیکھنا بہت مشکل ہے۔ اس کی واپسی کا کوئی وقت ہی نہیں تھا۔

اب رات کے وقت حور بانو سونے کے لیے لیٹتی تو تصور میں اسے کالج نظر آتا۔ حالانکہ کالج اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کالج میں بس وہ ایک ہی منظر دیکھتی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہاں چھوٹے ٹھاکر کے سوا کوئی لڑکا نہیں ہے اور وہ اسے بھانت بھانت کی لڑکیوں میں گھرا نظر آتا۔ لڑکیاں جو عجیب وغریب لباس پہنے ہوتیں اور چھوٹے ٹھاکر کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کرتیں۔ وہ بے چارہ انہیں جھٹکتا رہتا۔

لیکن تصور سے ہٹ کر جب وہ سوچتی تو خوف زدہ ہو جاتی۔ وہ سوچتی کہ چھوٹا ٹھاکر کتنا ہی اچھا سہی، ہے تو انسان۔ کب تک ان لڑکیوں سے بچے گا۔ جبکہ وہ لڑکیاں تو ہیں ہی بے حیا۔ اور چھوٹا ٹھاکر لاکھوں میں ایک ہے۔ کوئی نہ کوئی لڑکی اسے لبھا ہی لے گی۔ اور پھر ہو سکتا ہے کہ وہ خود بھی ایک کو چھوڑ کر دوسری اور دوسری کو چھوڑ کر تیسری کے چکر میں پڑ جائے۔ اور اسے بھول جائے تو کیا وہ اتنی آسانی سے اسے کھو بیٹھے گی۔

اس آخری بات پر اسے خود بھی ہنسی آ گئی۔ لو سوت نہ کپاس اور جلاہے سے لٹھم لٹھا۔ اسے بھولنے کا کیا سوال، جبکہ اسے تو معلوم ہی نہیں کہ کہیں کوئی حور بانو بھی ہے جو اس سے محبت کرتی ہے۔ اس نے تو اس کی ایک جھلک بھی کبھی نہیں دیکھی۔ وہ تو اسے جانتا بھی نہیں۔ اور کھونے کا کیا سوال، جبکہ وہ اس کا ہے ہی نہیں۔ اس مقابلے میں وہ تو کہیں ہے ہی نہیں۔

اس سوچ کے بعد بس وہ اس فکر میں لگ گئی کہ کس طرح چھوٹے ٹھاکر کے سامنے آ جائے...... وہ اسے دیکھ لے۔ تب شاید وہ ان بے حیا لڑکیوں سے محفوظ رہ سکے۔

براہ راست چھوٹے ٹھاکر کے سامنے جانے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہاں وہ چلمن کے پیچھے سے یا جالیوں کے عقب سے اسے اپنی جھلک دکھا سکتی تھی۔ سو اس نے اس کا اہتمام کر لیا۔

اس روز اس نے اپنا سرخ کامدانی کا جوڑا پہنا۔ چھوٹا ٹھاکر دو بجے سے پہلے کبھی کالج سے نہیں آتا تھا۔ چنانچہ وہ دو بجے تیار ہو کر ڈیوڑھی میں آ گئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے کتنا انتظار کرنا ہوگا۔ وہ تمام وقت کیا، زیادہ دیر بھی ڈیوڑھی میں کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ وہ بمشکل پانچ منٹ کھڑی ہوتی اور پھر ہٹ جاتی۔ پھر پانچ منٹ بعد وہ دوبارہ ڈیوڑھی میں چلی جاتی اور اس دوران اسے یہ الجھن ستاتی کہ شاید چھوٹا ٹھاکر آ کر اوپر جا بھی چکا ہے...... اس دوران جب وہ گھر

میں تھی۔

خوش قسمتی سے چھوٹا ٹھاکر اس روز کالج سے جلدی آ گیا۔ ورنہ حور بانو پر نہ جانے کیا بیتتی اور خوش قسمتی سے اس وقت وہ ڈیوڑھی میں آئی تھی...... یہی سوچتی ہوئی کہ شاید چھوٹا ٹھاکر اوپر جا چکا ہوگا۔

آتے ہوئے چھوٹے ٹھاکر کی پہلی جھلک دیکھی تو حور بانو کا دل سینے میں یوں دھڑ دھڑایا، جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اور سانسیں اتنی تیز ہوئیں کہ ان کے شور سے اسے خود بھی گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس کا جسم یوں سنسنا رہا تھا، جیسے رگ رگ میں کوئی برقی رو دوڑ رہی ہو۔ اس کے ہاتھ پاؤں کیا، پورا جسم کانپ رہا تھا۔

چھوٹے ٹھاکر کو آتے جاتے اس نے بارہا دیکھا تھا۔ مگر اس کا یہ حال پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ آج جو کرنے کا اس نے ارادہ کیا تھا، وہ پہلے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ آج وہ چاہتی تھی کہ چھوٹا ٹھاکر اسے دیکھے۔ وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی۔

مگر اب موقع ملا تو وہ پریشان کھڑی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے! ایسا کیا کرے وہ؟ کیسے کرے؟ اس کے ہاتھ پاؤں جواب دینے لگے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چلمن کی طرف بڑھی۔ لیکن ٹانگوں کی لرزش اتنی بڑھ گئی کہ اسے لگتا تھا، وہ گر جائے گی۔

اور وہ صرف چند لمحوں کا کھیل تھا۔ اس موقع کی طوالت نہ ہونے کے برابر تھی اور اختصار ایسا تھا کہ مشکل سے چار بار پلکیں جھپکی جا سکتی تھیں۔

چھوٹا ٹھاکر دور سے آتا دکھائی دے رہا تھا اور وہ بید مجنوں کی طرح لرزاں تھی۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اور اب ایک پل کی بات تھی۔ پل گزرتا اور وہ آگے نکل جاتا۔

حور بانو سوچ رہی تھی کہ کیا کرے۔ وہ گنگ تھی۔ ہونٹ سوکھ گئے تھے۔ اس نے آواز نکالنے کی کوشش کی۔ مگر آواز ندارد تھی۔ اور وہ پل نکلنے ہی والا تھا۔ اس نے پھر بولنے کی کوشش کی...... اور اسے پھندا لگ گیا!

چھوٹے ٹھاکر نے آواز سن کر نظر اٹھائی۔ لیکن پوری طرح اٹھنے سے پہلے ہی اس کی نظر جھک گئی۔ اور پھر وہ آگے نکل گیا۔

حور بانو کی مایوسی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر کی نظر اضطراری طور پر اٹھ رہی تھی۔ مگر درمیان میں ہی اس نے خود پر قابو پا لیا تھا اور نظر جھکا لی تھی۔ معصوم لڑکی نہیں جانتی تھی کہ وہ نظر بھر کر دیکھ لیتا تو بھی اسے نہ دیکھ پاتا۔ باہر دھوپ تھی اور اندر اندھیرا۔ پھر درمیان میں چلمن۔ ایسے میں چھوٹے ٹھاکر کو متحرک سرخ رنگ کے سوا کیا نظر آ سکتا تھا۔

اس رات وہ بستر پر لیٹی یہی کچھ سوچتی رہی۔ وہ منظر اس کے تصور میں بار بار آتا......

چھوٹے ٹھاکر کا اضطراری طور پر نظر اٹھانا...... اور فوراً ہی ٹھٹھک کر نظر جھکا لینا۔ اچانک اس کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ ارے...... یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں۔ یہ تو چھوٹے ٹھاکر کی شناخت کا ثبوت ہے۔ وہ تو نگاہ سنبھالنے والا آدمی ہے۔ اس رویے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کالج میں وہ کس طرح رہتا ہوگا۔ حور بانو کے دل کو ایک اطمینان سا ہو گیا۔

لیکن محبت میں خطرے کا احساس بہت توانا ہوتا ہے۔ اس کا سکون محض وقتی تھا۔ بعد میں اسنے مختلف انداز میں سوچا تو بے سکون ہو گئی۔ وہ تو چلمن کے پیچھے تھی۔ چھوٹے ٹھاکر نے اٹھتی نظر پر قابو پا لیا۔ لیکن کالج میں تو بے حجاب لڑکیاں دھڑ سے اس کے سامنے آ جاتی ہوں گی۔ تب تو نظر جھکتے جھکتے بھی پڑ ہی جاتی ہوگی۔ اور پھر یہ معمول ہو تو کیا کوئی ہر وقت...... بار بار نظریں جھکاتا رہے گا۔ نہیں...... یہ تو ممکن نہیں۔

کچھ بھی ہو، حور بانو نے یہ تسلیم کر لیا کہ اس کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں۔ وہ کچھ بھی کر لے، کبھی چھوٹے ٹھاکر کے سامنے نہیں آ سکے گی۔ اور اسے ایک اور خیال آیا۔ اس نے وجود کی پوری سچائی کے ساتھ اس پر سوچا۔ یہ حقیقت تھی۔ بہت بڑی سچائی تھی کہ اس محبت میں اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ یہ اس نے کی نہیں تھی، اسے خود یہ خود ہوئی تھی۔ اس میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ تو یہ محبت اللہ نے اس کے دل میں ڈالی تھی۔ تب اسے یہ سوچ کر شرمندگی ہوئی کہ چھوٹے ٹھاکر کے سامنے آنے کی، خود کو دکھانے کی کوشش اس کی اپنی تھی اور بالا رادہ تھی۔ یہی نہیں، اس کا ارادہ اور اس کی کوشش اللہ کے حکم سے متصادم تھی۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے اور وہ خود کو چھوٹے ٹھاکر کو دکھا دے۔ تب بھی اس بات کی ضمانت نہیں کہ چھوٹا ٹھاکر کالج میں بے پردہ لڑکیوں کے شر سے محفوظ رہے گا۔ یہ ضمانت تو وہی دے سکتا ہے، جس نے اس کے دل میں چھوٹے ٹھاکر کی محبت ڈالی ہے۔ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔

اس سوچ کے بعد بس یہ ہوا کہ وہ کئی دن تک اللہ سے توبہ کرتی رہی۔ پھر اس کے دل کو سکون ہو گیا۔ جس نے اس کے دل میں وہ محبت ڈالی ہے، وہی جانے۔ وہی فیصلہ کرنے والا ہے۔ اب اسے کچھ نہیں کرنا۔ جو ہو سو ہو۔

❁......❁......❁

پارٹی میں شریک ہونے کے لیے وہ سبھی ٹھیک وقت پر پہنچے۔ سب سے پہلے آنے والا محمود تھا اور امرتا سب سے آخر میں آئی تھی۔ اوتار سنگھ سب سے زیادہ پُر اعتماد تھا۔ ورنہ اس کے علاوہ سبھی کو یہ خیال تھا کہ وہاں بہت سے انگریز مہمان ہوں گے۔ بلکہ وہ تو ریٹا اور رچرڈ کے والدین کا سامنا کرتے ہوئے بھی احساسِ کمتری میں مبتلا ہو رہے تھے۔ جبکہ اوتار سنگھ کو اس سے غرض نہیں تھی کہ وہاں کون کون ہوگا۔

لیکن وہاں پہنچ کر ان سب کے دل خوش ہو گئے۔ اس پارٹی میں سوائے ان لوگوں کے

کوئی اور شریک نہیں ہو رہا تھا۔ رچرڈ کے ممی اور ڈیڈی بھی گھر میں موجود نہیں تھے۔ وہاں نوکروں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ان سب کی جھجک دور ہو گئی۔ وہ پُرسکون اور خوش نظر آنے لگے۔

پھر بھی ایک پھانس دلوں میں چبھ رہی تھی۔ مسٹر اور مسز پارسن نجانے کب آ جائیں۔

اوتار سنگھ ان سب کی اس کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ وہ ان کے اندر چھپے احساسِ کمتری سے تو پہلے ہی واقف تھا۔ اور وہ اس پر غور کرتا رہتا تھا۔

پھر وہ پھانس بھی نکل گئی!

''تمھارے ممی ڈیڈی کہاں گئے ہیں؟'' امرتا نے ریٹا سے پوچھا۔

''کلب گئے ہیں۔'' ریٹا نے جواب دیا۔

''واپس کب آئیں گے؟'' نادرہ نے سوال اٹھایا۔

''آج سیٹرڈے نائٹ ہے۔'' ریٹا مسکرائی۔ ''آدھی رات کے بعد ہی واپسی ہوگی۔''

اجتماعی طور پر سکون کی سانس لی گئی۔

''تو کیک کاٹنے کے لیے تم ان کا انتظار کرو گی؟'' فتح سنگھ نے پوچھا۔

''ارے نہیں یو سلی۔'' ریٹا نے آنکھیں نکالیں۔ ''میں نے انھیں بتا دیا تھا کہ یہ ایک پرائیویٹ پارٹی ہوگی۔ صرف ہمارے منتخب دوست اس میں شریک ہوں گے اور کیک تو ابھی ذرا دیر میں کاٹا جائے گا۔''

اس کے بعد ماحول ہلکا پھلکا ہو گیا۔ سب کے سب بے حد خوش مزاج ہو گئے۔ کالج کی، پڑھائی کی، کالج کے ساتھیوں کی باتیں ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد بٹلر کیک لے آیا۔ پارٹی کی فضا بن گئی۔ کیک کے گرد سولہ موم بتیاں روشن کر دی گئیں۔

ریٹا نے کیک کاٹا۔ سب نے اسے مبارک باد دی اور تحفے پیش کیے۔ کیک کاٹنے اور اس سے نمٹنے کے بعد تحفے کھولنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک دوسرے کے تحفوں پر فقرے چست کیے گئے۔

''ارے واہ...... رامو نے تاج محل کا ماڈل دیا ہے۔'' نادرہ بولی۔

رام گوپال کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''اوہ...... اِٹس بیوٹی فل۔'' ریٹا نے مسحور ہو کر کہا۔

''اینڈ اٹ از سمبل آف لَو۔'' امرتا نے وضاحت کی۔

رام گوپال بری طرح کھسیا رہا تھا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا دوں۔'' وہ بولا۔ ''اور یہ مجھے بہت خوبصورت لگا۔''

''ایسے صفائی کیوں پیش کر رہے ہو، جیسے تم نے کوئی جرم کیا ہے۔'' محمود نے کہا۔

''مجھے تو یہ بہت اچھا لگا ہے۔'' ریٹا بولی۔

رام گوپال کے چہرے پر رنگ دوڑ گیا۔ تحفہ کھلنے کے بعد پہلی بار اس نے سکون کی سانس لی تھی۔

اس کے بعد پارٹی اگلے دور میں داخل ہوگئی۔ بٹلر نے برف میں لگی شمپیئن کی بوتلیں اور جام لاکر میز پر رکھ دیے اور باہر چلا گیا۔ تب رچرڈ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ہاتھ میں شمپیئن کی بوتل لیے کھڑا ہوا اور اعلان کرنے والے انداز میں بولا۔ ''لیڈیز اینڈ جنٹلمین، آج کی یہ خوبصورت شام، میری سویٹ بہن ریٹا کے نام۔ اور اس شام کا آغاز ہم شمپیئن کی بوتل سے کریں گے۔ کہتے ہیں کہ شمپیئن کی بند بوتل جوانی کے جوش کی نمائندگی کرتی ہے۔ جیسے جوان آدمی زندگی کے جوش کو دبائے بیٹھا ہوتا ہے، ویسے ہی کارک ہونے تک شمپیئن کی بوتل بھی اپنا ابال چھپائے رہتی ہے اور کارک ہٹتے ہی......'' اس نے بوتل کا کارک کھول دیا۔ شراب یوں اچھل کر، مچل کر نکلی، جیسے اس کا ضبط جواب دے گیا ہو۔

وہ سب تالیاں بجانے لگے۔ وہ منظر انھیں خوبصورت لگا تھا۔

رچرڈ جام بھرنے میں مصروف ہوگیا۔ پھر اس نے پہلا جام ریٹا کو پیش کیا۔ ''ناؤ کم آن...... ایوری باڈی۔'' اس نے دعوت دی۔

جام اٹھانے کے لیے بڑھنے والوں میں نادرہ، محمود اور اوتار سنگھ نہیں تھے۔ پشپا، امرتا، رام گوپال اور فتح سنگھ نے جام اٹھا لیے۔

رچرڈ کی نظروں میں الجھن تھی۔ ''کیا ہوا؟ تم لوگ شامل نہیں ہوگے؟'' اس نے پوچھا۔

''تم جانتے ہو رچرڈ۔ ہم شراب نہیں پیتے۔'' محمود نے کہا۔

''اور تم اوتار سنگھ؟ تمھارا مذہب تو تمھیں منع نہیں کرتا۔'' رچرڈ نے اوتار سنگھ کو دیکھا۔

''ہاں۔ مگر مجھے یاد ہے۔ پتا جی نے ایک بار مجھے سمجھایا تھا اور میں کبھی نہیں بھولا۔'' اوتار سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پتا جی کہتے ہیں، دنیا میں سب سے قیمتی چیز آدمی کی عزت ہوتی ہے اور انھوں نے کہا تھا، آدمی نشے میں ہوش و حواس گنوا بیٹھتا ہے۔ نہ اسے اپنی عزت کا خیال رہتا ہے، نہ بے عزتی کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح اسے دوسروں کی عزت کی بھی پروا نہیں ہوتی۔ بس اسی لیے پتا جی نے کبھی شراب نہیں پی اور میں بھی کبھی نہیں پیوں گا۔''

اس دوران سب اسے غور سے دیکھتے رہے تھے۔ سب کے تاثرات مختلف تھے۔ پشپا، امرتا، رام گوپال اور فتح سنگھ کی نگاہوں میں استہزا تھا۔ نادرہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ محمود کی نگاہوں میں اس کے لیے عزت تھی۔ ریٹا سحر زدہ سی نظر آرہی تھی اور اس کی نگاہوں میں دلچسپی تھی۔ رچرڈ کا انداز ایسا تھا، جیسے اسے یقین نہیں آرہا ہو۔

''رَبِش...... بکواس۔'' رام گوپال بڑبڑایا۔

''یہ تو امرت رس ہے ٹھاکر جی۔'' فتح سنگھ نے چٹخارا لیتے ہوئے کہا۔

لڑکیوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بہرحال وہ سب اپنے اپنے جام ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔

رچرڈ نے ابھی تک جام نہیں اٹھایا تھا۔ ''بہرحال یہ تو مہمان نوازی کے اصول کے خلاف ہوگا کہ ہم پئیں اور تم دیکھتے رہو۔'' رچرڈ نے کہا۔

''تو ہم باہر چلے جاتے ہیں۔'' نادرہ بولی۔

''ارے نہیں...... تم غلط سمجھ رہی ہو۔'' رچرڈ بے ساختہ مسکرایا۔ ''میرا مطلب ہے، تم لوگوں کو تمھارے ذوق کے مطابق کچھ ملنا چاہیے۔'' یہ کہہ کر اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ چند لمحوں کے بعد بٹلر اندر آیا۔ ''کیا حکم ہے صاحب؟''

''اورنج جوس لے کر آؤ...... بڑے جگ میں۔''

اورنج جوس آیا تو رچرڈ نے ان تینوں کے لیے گلاسوں میں جوس انڈیلا اور انھیں دیا۔

''تھینک یو رچرڈ۔'' نادرہ نے کہا۔

اب رچرڈ نے اپنے لیے جام اٹھایا اور اسے فضا میں بلند کیا۔ ''لیٹ اس ٹوسٹ ناؤ...... ریٹا کی صحت اور خوشیوں کے نام۔''

سب نے گھونٹ لیے اور پارٹی شروع ہوگئی۔ جوس والے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہے تھے۔ جبکہ شراب والے کھل کر پی رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب تیسرے جام پر پہنچ گئے۔ چہرے تمتمانے لگے۔ آوازیں لڑکھڑانے لگیں۔

''اب یہ دیکھو رچرڈ......'' رام گوپال نے کہا۔ ''یہ میرا بے وقوف دوست ملک کا بٹوارا اس لیے چاہتا ہے تاکہ یہ آزادی کے ساتھ شراب نہ پیے۔'' اس کا اشارہ محمود کی طرف تھا۔ ''اب بتاؤ، کیا ہم نے اس کے ساتھ زبردستی کی؟ بھئی نہیں پیتا تو نہ پیے۔ کوئی پابندی نہیں ہے۔ اتنی سی بات کے لیے ملک کا بٹوارا...... یہ تو کوئی بات نہیں۔''

اس نے بات اس انداز میں کی تھی کہ سب ہنسنے لگے۔ لیکن محمود سنجیدہ تھا۔ ''تم غلط سمجھے ہو رام۔ ہم پاکستان اس لیے بنا رہے ہیں کہ وہاں اسلامی قانون ہو۔ نہ کوئی شراب پیے، نہ کسی دوسرے کو شراب کی ترغیب دے۔ ہم اس لیے پاکستان بنا رہے ہیں تاکہ تم ہندوستان میں آزادی سے شراب پیو اور ہم پاکستان میں شراب نہ پئیں۔''

''شراب پینے والے تو پھر بھی پئیں گے...... دیکھ لینا، پاکستان میں بھی پئیں گے۔'' فتح سنگھ نے انگلی نچاتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز میں چیلنج تھا۔

لیکن رام گوپال نے جیسے محمود کی بات سنی ہی نہیں۔ ''اب ہمارے ہندو بھائی اوتار سنگھ کو ہی دیکھ لو۔'' وہ بولا۔ ''اسے تو دھرم منع نہیں کرتا۔ مگر اس کے پتا جی منع کرتے ہیں۔ یہ نہیں پی رہا ہے۔ تو کیا ہم نے اسے مجبور کیا؟ نہیں کیا اور کیا ہم نے کسی کی بے عزتی کی یا اپنی عزت کا خیال

نہیں رکھا؟ نہیں...... ایسا کچھ بھی نہیں کیا ہم نے۔ اس لیے کہ اب ہمارا ہندوستان سیکولر ہوگا اور یہاں جمہوریت ہوگی۔''

اوتار سنگھ مسکراتا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تم خاموش ہو اوتار سنگھ۔ کچھ بولتے کیوں نہیں۔'' فتح سنگھ نے اسے اکسایا۔

''میں وقت آنے پر بولوں گا۔'' اوتار سنگھ نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اور مجھے لگتا ہے کہ آج میرے پتاجی کی بات درست ثابت ہو جائے گی۔''

''اب یہ سوچو دوست کہ میرا دھرم مجھے شراب پینے سے نہیں روکتا۔'' رام گوپال رچرڈ سے مخاطب تھا۔ ''اور تمہارا دھرم بھی تمہیں نہیں روکتا۔ مگر محمود کا دھرم کچھ عجیب ہے...... ہے نا۔ زندگی کو انجوائے کرنے سے روکتا ہے۔''

محمود نے کچھ کہا نہیں۔ لیکن رچرڈ پارسن کو ایسی چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ وہ شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ ''نہیں رامو، تمہارا خیال غلط ہے۔'' رچرڈ نے نظریں جھکاتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''شراب کی ممانعت تو ہمارے مذہب میں بھی ہے۔''

رام گوپال چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر شریری مسکراہٹ نظر آئی۔ ''تو یہ ثابت ہو گیا کہ ہمارا دھرم سب سے بہتر ہے۔'' اس نے کہا۔

اس کا لہجہ ایسا تھا کہ رچرڈ کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے محمود کو دیکھا۔ وہ بڑی بے نیازی سے مسکرا رہا تھا۔ اس کے انداز میں بے پروائی اور درگزر تھا۔

اوتار سنگھ اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ آج اسے بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اسے کئی مذاہب کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل ہوں گی۔ یہ موقع اس کے لیے خوش آئند تھا۔

رام گوپال نے بڑھ کر اپنے لیے ایک اور جام بنایا۔ ''تو آپ سب نے میری بات کی سچائی کو تسلیم کر لیا۔'' اس نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

رچرڈ نے محمود کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھا۔ محمود نے کندھے جھٹک دیے۔ ''میرا مذہب مجھے دوسروں کے مذہب پر تنقید کرنے سے بھی روکتا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں میزبان ہونے کے خیال سے خاموش تھا۔'' رچرڈ رام گوپال کی طرف متوجہ ہوا۔ ''لیکن اب بولنے پر مجبور ہوں۔ ورنہ تمہارا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ یہ مجھے گوارا نہیں۔''

''کیا مطلب؟ کس نقصان کی بات کر رہے ہو تم؟''

''تم اپنے دھرم کے بارے میں بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو جاؤ گے۔'' رچرڈ نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''تم جسے بڑے فخر سے اپنا دھرم کہتے ہو، وہ ہمیں عجیب و غریب اور

ناقابل فہم لگتا ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ اسے حماقتوں کا مجموعہ کہنا چاہیے۔ اس بیسویں صدی میں جبکہ دنیا ترقی کر رہی ہے، تم لوگ اپنی دیو مالا میں الجھے ہوئے ہو۔ جہالت پر فخر کرتے ہو تم لوگ......''

''پلیز رچرڈ...... اوتار سنگھ کا اور دوسروں کا تو خیال کرو۔'' ریٹا نے بھائی کو ٹوکا۔ وہ اوتار سنگھ کو معذرت طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''نو...... اٹس آل رائٹ۔ آئی ڈونٹ مائنڈ۔ بلکہ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔'' اوتار سنگھ نے جلدی سے کہا۔ ''علمی تبادلہ خیال بہت فائدہ مند ہوتا ہے اس سے نالج بڑھتا ہے۔ رچرڈ پلیز...... اپنی بات جاری رکھو۔''

رام گوپال سناٹے کی کیفیت میں تھا۔ اس کا نشہ کچھ کم ہو گیا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ نشے میں اس سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ اس نے آقاؤں کو چھیڑ دیا تھا۔

''تھینک یو اوتار سنگھ۔ بے شک یہ علمی تبادلہ خیال ہے۔'' رچرڈ نے کہا۔ پھر وہ رام گوپال کی طرف مڑا۔ ''رامو...... تم اپنے دیوی دیوتاؤں کی درست تعداد بتا سکتے ہو؟''

رام گوپال منہ کھولے کھڑا تھا۔ اسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ وہ تو محمود کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ لیکن رچرڈ سے الجھ بیٹھا تھا۔

''نہیں معلوم...... تمہیں بھی نہیں معلوم۔ میرا خیال ہے، ان کی تعداد ہزاروں میں تو ہوگی۔ بلکہ شاید لاکھ سے اوپر ہو۔ تو تمہارے دھرم میں کوئی اپنے دھرم پر پورا اتر ہی نہیں سکتا۔ تمام دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرنا تو دور کی بات ہے، کسی کو سب کے نام بھی معلوم نہیں ہوں گے۔ ہر جانور کو...... ہر چیز کو تو تم نے دیوتا بنا رکھا ہے۔ گائے، بندر، ہاتھی، سورج، چاند، درخت اور نجانے کیا کیا۔ اگر تم اپنے تمام دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرنے لگو تو زندگی میں پوجا کے سوا کچھ کر ہی نہ سکو۔ گندگی اور غلاظت کا یہ عالم ہے کہ گائے کے گوبر اور پیشاب کو تم مقدس کہتے ہو۔ میں نے تو سنا ہے کہ پی بھی لیتے ہو۔ شراب کی کیا بات کرتے ہو اور جہالت کا یہ عالم ہے کہ بیواؤں کو ان کے شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ جلا دیتے ہو۔ علم کے فروغ کی اس صدی میں تم اس جہالت کو دھرم کہتے ہو۔ اس دور میں بھی تم لوگ زندہ انسانوں کو دیوی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دیتے ہو۔ تم غار کے زمانے کی طرح جی رہے ہو اور تمہیں درست اور غلط کا احساس ہی نہیں۔''

رچرڈ خاموش ہو گیا۔ دیر تک خاموشی رہی۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔ اوتار سنگھ سوچ رہا تھا۔ جو کچھ رچرڈ نے کہا تھا، وہی سب کچھ وہ سوچتا رہا تھا۔ اب رچرڈ نے کہہ دیا تھا اور کسی کے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔

اور یہاں اس کے سامنے دو مذاہب آئے تھے...... دو مختلف طرز عمل۔ رچرڈ کرسچن تھا۔ اس نے اعتراف کیا کہ اس کا مذہب شراب کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ لیکن وہ شراب پیتا ہے۔

دوسری طرف محمود تھا...... مسلمان۔ اس کا مذہب بھی شراب کو منع کرتا ہے اور وہ اس کی پابندی بھی کرتا ہے۔ اور اس نے کہا کہ اس کا مذہب اسے دوسروں کے مذہب پر تنقید سے روکتا ہے۔ یہ ہوئی نارواداری۔ اور اس کے نتیجے میں انسان تحمل سیکھتا ہے۔

اس سے اوتار سنگھ اپنے دھرم سے پوری طرح بیزار ہو گیا۔ لیکن اب اسے دوسرے مذاہب کو سمجھنا تھا۔

"یہ کیا باتیں لے بیٹھے تم لوگ۔" اچانک ریٹا نے خاموشی کو توڑا۔ "تمھیں یہ احساس بھی نہیں کہ یہ میری برتھ ڈے پارٹی ہے۔"

"سوری ریٹا۔" رام گوپال نے جلدی سے کہا۔

"کسی کی دل آزاری ہوئی ہو تو میں اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔" رچرڈ نے نرم لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ سچ ہے کہ کسی پر اٹیک کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ اور مشتعل ہونے کے بعد تحمل برقرار رکھنا بہت مشکل۔ بہرحال جو ہوا اسے بھول جائیں۔ آفٹر آل، ہم سب دوست ہیں۔ چلیں...... اب پارٹی شروع کرتے ہیں۔" رچرڈ کونے میں رکھے گراموفون کی طرف گیا اور ایک ریکارڈ منتخب کر کے لگا دیا۔

کمرے میں مدھر موسیقی کی آواز بھر گئی۔ رچرڈ ریٹا کی طرف بڑھا اور ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔ "کم آن ڈیر، لیٹ اس ڈانس۔"

وہ دونوں ناچنے لگے۔ باقی سب لوگ انھیں دیکھ رہے تھے۔ لیکن ان میں لڑکیاں نہیں تھیں۔ وہ سب چوری چوری چپکے چپکے اوتار سنگھ کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اس کی قربت کے خواب تھے۔

ریکارڈ ختم ہوا تو رچرڈ اور ریٹا الگ ہو گئے۔ رچرڈ ریکارڈ تبدیل کرنے کے لیے گراموفون کی طرف بڑھ گیا۔ ریٹا اوتار سنگھ کی طرف چلی آئی۔ "آؤ میرے ساتھ رقص کرو۔" اس نے کہا۔

اوتار سنگھ گڑبڑا گیا۔ "لیکن مجھے تو رقص کرنا نہیں آتا۔"

"او کم آن۔ کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔ میں سکھا دوں گی۔"

اس دوران دوسرا ریکارڈ بجنے لگا تھا۔ ریٹا اوتار سنگھ کا ہاتھ تھام کر کھلی جگہ کی طرف چل دی۔ دوسری طرف رچرڈ پشپا سے رقص کی درخواست کر رہا تھا۔ "میں اور ریٹا آج تم سب کو ناچنا سکھا دیں گے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اب ایک کی جگہ دو جوڑے میدان میں تھے۔

ریٹا نے اوتار سنگھ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی کمر پر رکھا۔ "دوسرا ہاتھ بھی لاؤ اور مجھے اس طرح تھام لو۔" اس نے کہا۔ اوتار سنگھ نے جھجکتے جھجکتے اس کی ہدایت کی تعمیل کی۔ ریٹا نے اپنے دونوں ہاتھ اس

کے کندھوں پر رکھ دیے۔ "اب موو کرو...... ایسے۔" اس نے اسٹیپ لے کر دکھائے۔

اوتار سنگھ کو چند لمحوں میں اندازہ ہو گیا کہ ڈانس کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ یہ الگ بات کہ رقص کرنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بس مروتاً ریٹا کا ساتھ دے رہا تھا۔ کیونکہ وہ اس کی خوشی خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لیکن وہ لمحے بڑے بھرپور تھے۔ اس درجہ نسوانی قربت کا وہ تجربہ اس کے لیے نیا تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ بے حد مختلف اور متضاد کیفیات سے گزر گیا۔ بنیادی طور پر بہرحال وہ 17 سال کا جوان لڑکا تھا۔ نسوانی لمس کا وہ پہلا تجربہ اپنی ابتدا میں اس کے لیے بے حد سنسنی خیز تھا۔ اس کا پورا وجود مرتعش ہو گیا تھا۔ ریٹا بے حد حسین لڑکی تھی...... قد میں اس سے تھوڑی سی کم۔ ان کے چہروں کے درمیان بہت تھوڑا فاصلہ تھا اور ریٹا اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

قربت کے ابتدائی لمحوں میں وہ مسحور ہو گیا۔ اسے اچھا لگ رہا تھا۔ لیکن پھر اچانک اس کی سماعت میں وہ نسوانی آواز گونجی، جس کی وجہ سے اس نے عربی پڑھنی شروع کی تھی۔ وہ آواز، جسے سن کر اسے آواز والی سے محبت ہو گئی تھی۔ اس پر اسے محبت کا خیال آیا۔ محبت جس کی اسے کب سے جستجو تھی۔ پھر اسے محبت کے بارے میں اپنے اسکول کے اردو کے استاد کی گفتگو یاد آئی......

وہ ابتدائی سحر ایک سے زیادہ مرحلوں میں ٹوٹا تھا۔ سب سے پہلے تو اس لڑکی کی آواز نے اسے احساس دلایا کہ وہ اس کی پاکیزہ محبت ہے۔ اس لمحے اسے احساس ہوا کہ بہت عرصے سے اس نے وہ آواز بھی نہیں سنی اور آواز والی کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ اس کے باوجود وہ محبت ابھی تک ویسی ہی تازہ اور توانا ہے بلکہ سماعت میں وہ آواز ابھری تو اس کا دل ویسے ہی دھڑکا، جیسے اس آواز کو پہلی بار سن کر دھڑکا تھا۔ اور قربت کا وہ سحر ٹوٹ گیا، جس نے چند لمحوں میں اسے اسیر کر لیا تھا۔ اور اچانک اسے ریٹا پارسن بری لگنے لگی۔ اس کے لباس سے اسے کراہت آنے لگی۔

پھر اسے خوشی ہوئی کہ اس کی پہلی محبت سچی ثابت ہوئی ہے۔ آزمائش کے ان لمحوں میں سرخرو ہوئی ہے۔ جسمانی قربت اپنی جگہ ایک بڑی سچائی سہی، لیکن وہ پاکیزہ آواز، جس کے الفاظ تک کو وہ نہیں سمجھ سکتا، مفہوم تک سے ناواقف ہے، آج بھی اتنی اثر انگیز ہے کہ اس سچائی کی بدصورتی کا احساس دلا سکتی ہے، اسے رد اور بے معنی کر سکتی ہے۔ اس کی محبت اردو کے استاد کی بیان کردہ تعریف پر پوری اتری تھی۔ وہ محبت ہی تھی، ہوس نہیں۔ بلکہ اس نے تو ہوس کے امکان کو بھی باطل کر دیا تھا۔

اس کے ہاتھ وہیں رہے، جہاں تھے۔ لیکن اس کی نگاہوں کا تاثر بدل گیا۔ ریٹا نے بھی وہ تبدیلی دیکھ لی۔ لیکن وہ جس کیفیت میں تھی، اس میں اس تبدیلی کی معنویت کو وہ نہیں سمجھ سکی۔ اسے تو آج پہلی بار اظہار محبت کا موقع ملا تھا۔ وہ اسے گنوا نہیں سکتی تھی۔ "کیوں اوتار سنگھ، تمھیں یہ

اچانک کیا ہو گیا؟" اس نے سرگوشی میں اوتار سنگھ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ مجھے کیا ہو گا۔"

"نہیں۔ تم اچانک دور سے ہو گئے۔"

"وہ...... یہ...... دراصل تمہارا لباس اچھا نہیں لگا مجھے۔"

"اوہ...... مجھے تمہاری یہ بات اچھی لگی۔ آئندہ میں......" ریٹا کچھ اور بھی کہتی۔ مگر اسی لمحے ریکارڈ ختم ہو گیا۔ اچانک خاموشی کی وجہ سے وہ کہتے کہتے رک گئی۔

اوتار سنگھ نے اپنے ہاتھ اس کی کمر سے ہٹا لیے۔ لیکن ریٹا نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ "اتنی جلدی کیا ہے اوتار سنگھ۔ آج میرا برتھ ڈے ہے۔ ابھی تم میرے ساتھ رہو...... اور کچھ دیر۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

اسی لمحے رام گوپال ان کی طرف چلا آیا۔ "مے آئی ہیو دی آنر......"

ریٹا نے اوتار سنگھ کے ہاتھ اور مضبوطی سے پکڑ لیے۔ "یو ول ہیو ٹو ویٹ فور سم ٹائم۔" اس نے رام گوپال سے کہا۔ "پلیز...... ڈونٹ مائنڈ۔"

رام گوپال کا چہرہ کھسیاہٹ سے سیاہ ہو گیا۔ چند لمحے وہ وہیں ساکت کھڑا رہا۔ پھر پلٹ گیا۔

اسی وقت رچرڈ نے دوسرا ریکارڈ لگا دیا۔ وہ بہت رومان انگیز سلوٹیون تھی۔ رچرڈ کے ساتھ اب امرتا تھی۔ لیکن اس کی نظروں کا مرکز اوتار سنگھ اور ریٹا تھے۔ دوسری طرف رام گوپال کے پاس بیٹھی ہوئی پشپا بھی انہی دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"ریٹا ٹھاکر جی کو چھوڑ ہی نہیں رہی ہے۔" اس نے سرسری انداز میں کہا۔

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ رام گوپال بولا۔ "تم یہ بتاؤ تم کس میں انٹرسٹڈ ہو؟"

"میں صرف خود میں انٹرسٹڈ ہوں۔" پشپا نے نخوت سے کہا۔

"بہتری بھی اسی میں ہے۔ سراب کے پیچھے بھاگنے والوں کو پیاس کے سوا کچھ نہیں ملتا۔"

"تمہیں یہ بات ریٹا سے کہنی چاہیے۔ اوتار سنگھ کے تاثرات دیکھ رہے ہو۔ وہ بے چارہ بس مروت کر رہا ہے۔"

"اوتار سنگھ کو میں نے کبھی کسی لڑکی میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا۔" رام گوپال نے سرد لہجے میں کہا۔

"دیکھتے رہو۔ جونک پتھر میں بھی لگتی ہے۔"

"وہ مجھے پتھر نہیں لگتا اور تم بھی جونک نہیں لگتیں۔" رام گوپال نے سادگی سے کہا۔

"پلیز...... تم خاموش ہی رہو۔" پشپا نے بھنا کر کہا۔ "آج پہلے ہی تم بہت شرمندہ کرا

چکے ہو۔"

اُدھر ریٹا نے بھی اوتار سنگھ سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ "مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے اوتار سنگھ۔" اس نے مخمور آواز میں کہا۔ "مجھے کبھی کسی کے ساتھ رقص کرنا اتنا اچھا نہیں لگا۔ جانتے ہو، میں تمہیں بہت پسند کرتی ہوں۔"

"میں بھی تمہیں پسند کرتا ہوں۔ یو آر اے گڈ فرینڈ۔"

"مگر میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ وہ محبت جو ایک عورت ایک مرد سے کرتی ہے۔ وہ محبت میں نے پہلی بار تم سے کی اور اب کسی اور سے کبھی نہیں کر سکوں گی۔ میں تمھارے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں اوتار سنگھ۔ میں خود کو بدل بھی سکتی ہوں۔"

بات اس قدر اچانک اور اتنی صاف گوئی اور دوٹوک انداز میں کی گئی تھی کہ اوتار سنگھ ششدر رہ گیا۔ چند لمحے تو وہ کچھ سوچنے...... کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ پھر اس نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھالا۔ "سوری ریٹا وہ محبت تو مجھے بھی پہلے ہی ہو چکی ہے کسی سے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اب میں کبھی کسی سے اس طرح محبت نہیں کر سکوں گا۔" اس نے کہا۔

ریٹا کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ "مائی لک۔" اس نے آہ بھر کے کہا۔ پھر بولی۔

"کون ہے وہ خوش نصیب، بہت...... بہت خوبصورت ہو گی۔"

"پتا نہیں۔ میں نے کبھی اسے دیکھا نہیں۔"

"کیا مطلب؟" ریٹا کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیل گئیں۔ "دیکھا نہیں تو محبت کیسے ہو گئی؟"

"میں نے بس اس کی آواز سنی ہے۔"

ریٹا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "تب تو اس محبت کا کوئی اعتبار نہیں۔ کبھی تم اسے دیکھو اور وہ تمہیں اچھی نہیں لگے تو تمہاری محبت ختم ہو جائے گی۔"

"میں بھی یہی سوچتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔" اوتار سنگھ نے کہا۔

اسے دیکھے بغیر تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو۔"

"میں حسن پرست ہوں۔ خوبصورتی ہر روپ میں مجھے اچھی لگتی ہے۔ اسی لیے مجھے شبہ ہوتا تھا کہ اگر وہ خوبصورت نہ ہوئی تو میری محبت ختم ہو جائے گی۔ لیکن ریٹا، میں سچ کہہ رہا ہوں کہ تم بہت خوبصورت ہو۔ اس کے باوجود مجھے تم سے محبت نہیں ہوئی۔ تو میں نے سمجھ لیا کہ محبت میں کوئی شرط نہیں ہوتی۔ وہ تو بس ہو جاتی ہے...... اور ہو گئی۔ اب تو مجھے اس کی آواز سنے ہوئے بھی عرصہ ہو گیا۔ لیکن وہ آواز اب بھی میری سماعت میں گونجتی ہے اور اسے سن کر میری اب بھی وہی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو شاید آج میں تمہاری محبت کا جواب محبت سے دیتا۔"

"تم بہت عجیب، بہت انوکھے آدمی ہو اوتار سنگھ۔"

''اور ریٹا...... اصل میں تو محبت میں کسی اور سے کرنا چاہتا تھا۔'' اوتار سنگھ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''بہت برسوں سے! میں اس دنیا کے نظام پر غور کرتا رہا ہوں۔ میں نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا کہ کوئی کامل قوت ہے، جس نے یہ سب کچھ بنایا اور مکمل سسٹم کے ساتھ یہ نظام ترتیب دیا۔ وہ قوت والی ہستی واحد ہے...... مطلق العنان اور خود مختار۔ اس جیسا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ بہت مہربان ہے...... ماں سے زیادہ شفیق...... باپ سے زیادہ عنایت کرنے والی اور ضرورتیں پوری کرنے والی۔ میں نے بہت غور کیا اور سمجھا کہ میرے پاس جو کچھ بھی اچھا ہے...... میرے ماں باپ سمیت، وہ اس کا دیا ہوا ہے۔ میں والدین کی مہربانیوں کے جواب میں ان کا شکر گزار ہوتا ہوں اور اس کے اظہار کے لیے ان سے محبت کرتا ہوں، تو ان سے زیادہ...... سب سے زیادہ شکر گزاری اور محبت تو اس کا حق ہے۔ مگر سمجھے بغیر تو محبت نہیں ہوتی۔ یا مجھے نہیں ہو سکی۔ چنانچہ میں اسے سمجھنے کی جستجو میں لگ گیا۔ اب درمیان میں مجھے یہ محبت ہو گئی۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اس محبت کو ختم کر دیتا کیونکہ میری اصل منزل تو وہ بڑی محبت ہے۔''

ریٹا سحر زدہ سی ہو کر سن رہی تھی۔ ''مجھے یقین نہیں آتا۔'' اس نے کہا۔ ''تمھیں ہمارے مذہب کے بارے میں سمجھنا چاہیے۔ میں تمھیں بتاؤں گی۔''

اسی وقت ریکارڈ ختم ہو گیا۔ رچرڈ نے کہا۔ ''اب ذرا وقفہ کر لیں۔''

وہ چاروں واپس آ گئے۔

کچھ دیر ستانے کے بعد دوبارہ سلسلہ شروع ہوا تو اس بار میدان میں تین جوڑے تھے۔ اوتار سنگھ اور امرتا، رچرڈ اور پشپا، رام گوپال اور ریٹا۔ نادرہ اور محمود نے رقص میں دلچسپی ہی نہیں لی۔ اس پر رام گوپال زہریلے انداز میں مسکرایا تھا۔ انداز ایسا تھا، جیسے ان پر مذہب کے حوالے سے طنز کرنا چاہتا ہو۔ لیکن پچھلے تجربے کے پیش نظر اسے تبصرے کی ہمت نہیں ہوئی۔

رقص کا سلسلہ کافی دیر چلتا رہا۔ اوتار سنگھ نے محض مروتاً ایک ایک راؤنڈ امرتا اور پشپا کے ساتھ رقص کیا اور پھر اپنی جگہ فتح سنگھ کو دے دی۔ اس دوران محمود رچرڈ سے اجازت لے کر اس کی لائبریری میں چلا گیا تھا۔ نادرہ اکیلی بیٹھی تھی۔ اوتار سنگھ اس کے پاس چلا گیا۔ اسے وہ رات بہت طویل لگ رہی تھی۔ امرتا اور پشپا نے بھی رقص کے دوران اس سے اظہارِ محبت کیا تھا۔ نجانے کیوں اس نے ریٹا کی طرح ان سے تفصیل سے بات نہیں کی تھی۔ بس یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ وہ پہلے ہی کسی سے محبت کرتا ہے۔

''کیا بات ہے، تم نے رقص نہیں کیا؟'' اوتار سنگھ نے نادرہ سے پوچھا۔

''مجھے دلچسپی نہیں ہے۔'' نادرہ نے جواب دیا۔

''تمہارا مذہب تمھیں اس سے روکتا ہے؟''

''ہاں روکتا ہے۔ لیکن ہم بہت سے ایسے کام کرتے ہیں، جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ اس وقت میرے انکار کا اصل سبب یہ ہے کہ مجھے رقص میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''اللہ تمھیں کن کن باتوں سے روکتا ہے؟''

''اب تمھیں کیا بتاؤں۔ بہر حال سب سے بڑا گناہ شرک ہے...... اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا۔''

اوتار سنگھ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''مجھے کوئی ایسی بات بتاؤ، جو تم اللہ کے منع کرنے کے باوجود کرتی ہو۔'' اسے احساس ہوا کہ وہ بار بار اللہ کہہ رہا ہے۔ اور اللہ کہنا اسے اچھا بھی لگ رہا ہے۔

مگر اس سوال پر نادرہ کھسیا گئی۔ ''بہت ساری باتیں ہیں۔ ہم کوئی بہت اچھے مسلمان تو نہیں ہیں۔ ماحول ہم پر اثر انداز ہوتا ہے، ہمارے ایمان کی کمزوری کی وجہ سے۔ اب اسی وقت دیکھ لو۔ میں اس محفل میں شریک ہوں۔ حالانکہ اللہ نے مرد اور عورت کے اختلاط کو منع فرمایا ہے۔''

اس جواب سے اوتار سنگھ کو لمبی ڈور کا وہ سرا مل گیا، جسے تھام کر اس کے اندر کا متجسس انسان دور تک جا سکتا تھا۔ ''اس میں کیا برائی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''عورت اور مرد جتنا قریب ہوں گے، بے حیائی اور گناہ کا امکان یقین کی حد تک بڑھ جائے گا۔''

''مگر دونوں کے درمیان کشش تو قدرتی ہے، فطری ہے۔'' اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔ اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔

''اس کے لیے شادی ہے۔ شادی گناہ اور بے حیائی کا راستہ بند کر دیتی ہے۔''

''اور محبت کے بارے میں تمہارا مذہب کیا کہتا ہے؟''

''محبت پاکیزگی کے ساتھ ہو تو برائی نہیں۔ مگر حل شادی ہی ہے۔''

اوتار سنگھ کا دماغ روشن ہو گیا۔ اسی وقت اسے ایک بات یاد آ گئی۔ اس کا مشاہدہ شروع ہی سے غیر معمولی تھا۔ محسوس تو اس نے پہلے ہی کیا تھا۔ لیکن آج اسے پختہ یقین ہو گیا تھا۔ ''ایک بات بتاؤں تمھیں۔'' اس نے کہا ''رچرڈ تم میں غیر معمولی دلچسپی رکھتا ہے۔''

نادرہ کچھ محجوب ہو گئی۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔ ''میں جانتی ہوں۔ وہ مجھے بتا چکا ہے۔'' وہ بولی۔

''اب یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ میں تم سے کچھ پوچھ نہیں سکتا۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''مگر میں تمھیں بتا سکتی ہوں۔ مجھے اس سے کوئی لگاؤ نہیں۔'' نادرہ بولی۔ ''اور اگر ایسا کچھ ہوتا تو بھی میں اس کی حوصلہ افزائی نہ کرتی کیونکہ میں اس سے شادی نہیں کر سکتی۔''

''کیوں؟'' اوتار سنگھ نے پوچھا۔ ''مذہب کے فرق کی وجہ سے؟''

''ہاں۔ مشرکوں سے شادی کرنا ناجائز ہے۔ یہ لوگ اہل کتاب ہیں۔ لیکن شرک کرتے ہیں۔''

مشرک کے بارے میں نادرہ نے شروع میں بھی کہا تھا اور وضاحت بھی کی تھی۔ لیکن یہ اہل کتاب کی اصطلاح اوتار سنگھ کے لیے نئی تھی۔ ''اہل کتاب کا مطلب؟''

''وہ لوگ جن کے پاس اللہ کا کلام موجود ہے۔ ایسی تین ہی قومیں موجود ہیں۔ یہودی، عیسائی اور مسلمان۔''

''تینوں کے پاس اللہ کا کلام ہے تو وہ الگ الگ کیوں ہیں؟''

''یہ بہت لمبی بحث ہے۔ چھوڑو اسے۔ بہرحال میں کسی مشرک سے شادی نہیں کر سکتی۔''

''لیکن محبت تو ہو سکتی ہے تمہیں۔''

نادرہ یوں چونکی، جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔ پھر سنبھل کر بولی۔ ''ہاں...... ہو سکتا ہے۔ لیکن اس صورت میں میں اس محبت سے لڑوں گی۔ اسے دل سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کروں گی اور دعا کروں گی کہ وہ مسلمان ہو جائے۔''

''کوئی مسلمان کیسے ہو سکتا ہے؟''

''دو کلمے ہیں ہمارے ہاں۔ ایک ناپاکی کا دور کرنے والا کلمہ ہے...... **لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ** اور دوسرا گواہی دینے والا...... **اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد عبدہ ورسولہ**۔ آدمی دل کی گہرائیوں سے ایمان لائے، زبان سے یہ کلمے پڑھے تو مسلمان ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اسے اللہ کے احکامات پر عمل کرنا ہوتا ہے جو اللہ کی کتاب میں موجود ہیں۔''

اوتار سنگھ چونکا۔ ''یہ تو عربی زبان میں ہیں؟''

''ہاں۔ اللہ کا کلام بھی عربی زبان میں ہی نازل ہوا ہے۔''

اوتار سنگھ کا حافظہ بلا کا تھا۔ دونوں کلمے اسے یاد ہو گئے۔ اب وہ ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابھی اس کی استعداد اتنی نہیں تھی اور پھر مشق بھی نہیں تھی۔ اس نے اٹک اٹک کر ترجمہ کیا۔ ''اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں۔ اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اور دوسرا...... میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا......'' وہ اٹک گیا۔

نادرہ اسے بہت غور سے...... بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ''...... کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔'' اس نے جملہ پورا کیا۔ وہ اب بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ''تم غیر معمولی آدمی ہو اوتار سنگھ۔ کاش...... کاش تم......'' یہ کہتے ہوئے اس نے نظریں جھکا لیں۔

اوتار سنگھ اتنا ناسمجھ نہیں تھا کہ اس کا جملہ مکمل نہ کر پاتا۔ اس رات وہ چوتھا اظہارِ محبت تھا، جو اس سے کیا گیا۔ لیکن یہ آخری اظہار مشروط تھا۔

اسی وقت رقص کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ وہ سب یکجا ہو گئے۔ ''بس ذرا دیر ستا لیں۔

پھر کھانا کھائیں گے۔'' رچرڈ نے اعلان کیا۔

❀......❀......❀

وہ پارٹی اوتار سنگھ کو سوچنے کے لیے بہت کچھ دے گئی۔ یہی نہیں، اس نے اس آواز والی کی محبت کو پھر سے توانا کر دیا۔ یہ بات نہیں کہ وہ محبت کبھی ہلکی پڑی ہے۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ مصروفیات نے اسے دبا دیا تھا۔ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچتا تھا۔ دوسرے اب وہ اس آواز سے محروم بھی ہو چکا تھا۔

نادرہ کی بات سنتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا اور اب وہ اس پر سوچ رہا تھا۔

محبت ایک آفاقی جذبہ تھا۔ اس کے بے شمار روپ تھے۔ ایک انسان کی دوسرے انسان سے محبت، دوستوں کی محبت، بھائی بہن کی محبت، ماں باپ کی محبت، اولاد کی محبت اور سب سے بڑھ کر مخلوق کی اپنے خالق سے محبت۔ یہ سب محبتیں ہیں، جو انسان کرتا ہے...... کرتا رہے گا۔ غور کرو تو ان میں سے کوئی بھی محبت بے غرض نہیں ہے۔ انسان کتنا ہی بے غرض ہو، مگر کسی دوسرے انسان سے محبت کرتے ہوئے مکمل طور پر بے غرض نہیں ہو سکتا۔ کوئی غرض نہ ہو تو تنہائی دور کرنے کی غرض تو ہے۔ اکیلا تو کوئی نہیں رہ سکتا۔ انسان معاشرتی جانور ہے۔ تو تعلق رکھنے کی غرض تو ایک بڑی سچائی ہے۔ دوستی کا بھی یہی حال ہے۔ کوئی ہم خیال، جو اچھا بھی لگتا ہو۔ اس سے مل کر...... بات کر کے دل خوش ہوتا ہے۔ غرض تو ہوئی نا۔ اور اختلاف ہو جائے...... سنگین نوعیت کا اختلاف تو آدمی اس دوست کو چھوڑ دیتا ہے۔ کوئی اور دوست تلاش کر لیتا ہے۔ بھائی بہن کی محبت کا اسے تجربہ نہیں تھا۔ یہ نعمت اسے ملی ہی نہیں تھی۔ لیکن وصال دین کے حوالے سے وہ اسے سمجھ سکتا تھا۔ بھائی دوست سے بڑی ضرورت ہوتا ہے۔ ایک بہت اپنا، جو ہر کڑے وقت میں ساتھ رہے...... ہمارا دکھ بانٹے...... ہمیں تسلی دے۔ اب اولاد کی محبت کو لیں۔ تو ماں باپ سے تو اولاد کی غرض ہوتی ہی ہے۔ بلکہ اس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ آدمی کو اتنا کچھ ملتا ہے ماں باپ سے۔ وہ ان سے محبت نہ کرے تو کیا کرے اور خدا کی محبت! وہ تو ہے ہی محتاج کی محبت جو وہ اس سے کرتا ہے، جو اس کی ہر ضرورت پوری کرتا ہے۔ وہ ماں باپ سے بڑھ کر خیال رکھنے والا، ضرورتیں پوری کرنے والا ہے۔

بس ماں باپ کی اولاد سے محبت سب سے مختلف ہے۔ مگر نہایت بے غرض ہونے کے باوجود غرض سے بالکل پاک وہ بھی نہیں ہے۔ باپ کو اولاد سے ایک معصوم سی غرض ہوتی ہے کہ وہ اس کی نسل کو آگے بڑھائے، مرنے کے بعد بھی اس کے نام کو زندہ رکھے۔ ہاں ماں کی محبت شاید بالکل بے غرض ہوتی ہے۔ اسی کا بس چلے تو اولاد کا ہر دکھ خود لے لے اور اسے اس دکھ سے محفوظ کر دے۔

ماں باپ کی محبت پر اس نے سوچا تو اسے سب کچھ بنانے والے کی...... خالق کی اپنی مخلوق کے لیے محبت کا خیال آیا۔ وہی سب سے خالص، سب سے بے غرض اور پاک محبت ہے۔ کیونکہ اسے تو کسی سے کچھ نہیں چاہیے۔ وہ جو سب کچھ بنانے والا ہے، ہر چیز کا مالک ہے۔ کوئی

اسے کچھ دے نہیں سکتا اور اسے ضرورت بھی نہیں۔ اس پر سوچتے ہوئے اوتار سنگھ کو ماں باپ کی محبت میں اس عظیم ہستی کی محبت کی جھلک نظر آئی۔ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ غرض کا مارا، مطلبی انسان خود تو ایسی محبت کر ہی نہیں سکتا۔ تو کیا یہ محبت اسے اس طرح سونپی گئی ہوگی، جیسے اس خالق نے سائنسدانوں اور موجدوں کو خیال سونپا، جس کے نتیجے میں ایجادات ہوئیں۔ ضرور یہی بات ہے کیونکہ یہ تو طے ہے کہ وہ جو بھی ہے، اس کی ذات محبت کا سرچشمہ ہے۔ دوسری نعمتوں کی طرح وہ انسانوں کو ایک دوسرے کے لیے محبتیں بھی عطا کرتا ہے۔ اس نے ماں باپ کو اولاد کے لیے اپنے جیسی محبت عطا کی کیونکہ اس کا بنایا ہوا سسٹم ہے کہ بچہ بے بس لاچار اور کمزور ہوتا ہے۔ اپنے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ عاقل و بالغ ہونے تک برے بھلے میں تمیز نہیں کر سکتا۔ نہیں سمجھ سکتا کہ کون سی چیز سودمند ہے اور کون سی ضرر رساں۔ کہاں خطرہ ہے، اسے نہیں معلوم ہوتا۔ تو اگر اس نے ماں باپ کو وہ محبت نہ دی ہوتی تو انسانی نسل تو ختم ہو چکی ہوتی۔

اور پھر خدا کی محبت کیسی ہے۔ وہ سب کچھ ایسے دیتا ہے کہ مخلوق کو پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ اسے دے رہا ہے۔ وہ تو سوچتا ہے کہ فصل میں نے محنت کر کے اگائی۔ اماں نے کہا تھا نا کہ بارش نہ ہو تو محنت کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ گھٹا چھائی رہے، دھوپ نہ نکلے تو گندم پک نہیں سکتی۔ مگر اس بات پر غور کون کرتا ہے۔ اور اس مہان ہستی کو اس کی پروا بھی نہیں۔ شکر ادا نہ کرو، تب بھی وہ دیتا ہی رہتا ہے۔ وہ نہیں کہتا کہ میری بات نہیں مانو گے تو تمھیں کھانا نہیں ملے گا۔ وہ تو بس نوازتا ہی رہتا ہے۔

برسوں سے اوتار سنگھ یہ بات سوچتا رہا تھا کہ وہ اس مہان ہستی کو سمجھے گا...... اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانے گا۔ تاکہ دنیا میں ہر چیز سے بڑھ کر وہ اس مہان ہستی سے محبت کر سکے۔ مگر اب تک وہ کچھ بھی نہیں جان سکا تھا اور محبت کا وہ ارادہ تو رکھا رہ گیا۔ اسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی...... صرف اس کی آواز سن کر!

بہت پہلے وہ اس محبت کا تجزیہ بھی کر چکا تھا۔ اس نے خوب ٹٹول لیا تھا کہ اسے لڑکی سے کوئی غرض نہیں۔ یہ بھی طے تھا کہ وہ بدصورت ہو، تب بھی اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ البتہ وہ یہ ضرور سوچتا تھا کہ اس محبت کا انت کیا ہے...... یہ کہاں تک جائے گی؟

اب نادرہ کی گفتگو نے اس کے لیے اور دروازے کھول دیے تھے۔ مرد اور عورت کی اس محبت کا منطقی انجام شادی ہوتا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ، ایک دوسرے کے قریب رہیں اور مل کر اپنی نسل آگے بڑھائیں۔ اور اب وہ محبت اور ہوس کے فرق کو سمجھ سکتا تھا۔ اسکول میں اردو کے استاد نے شاعری کے حوالے سے محبت اور ہوس کا جو فرق سمجھایا تھا، وہ اتنی وضاحت سے اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن اب وہ سمجھ گیا تھا۔ قربت شادی کے بغیر ہو تو پاپ ہے۔ محبت اور ہوس میں وہی فرق ہے جو پاپ اور پن میں ہے۔

اور اوتار سنگھ نے یہ بھی سمجھ لیا کہ محبت آدمی اوپر والے سے کرے یا اس کی کسی مخلوق

سے، وہ عبادت ہوتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ پاک ہو اور محبت کرنے والا ہر پل یہ یاد رکھے کہ اسے اور اس کے محبوب کو اوپر والے نے بنایا...... احسان کیا۔ اور یہی نہیں، ان کے دلوں میں محبت بھی ڈالی، ورنہ وہ یک جا نہیں ہو سکتے تھے۔ تو یہ اوپر والے کا احسان ہے۔ اس خیال کے ساتھ محبت عبادت ہوگی۔ اور اس کے بغیر ہوس۔

پہلی بار وہ مطمئن ہوا کہ اس نے محبت اور ہوس میں فرق کرنا سیکھ لیا ہے...... اور اب اس سلسلے میں کبھی دھوکہ نہیں کھائے گا۔

اس نے پہلے کبھی اس آواز والی کے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچا تھا۔ لیکن اب سوچ رہا تھا۔ شادی کے بارے میں وہ کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اب اس کا جی چاہا کہ اس کی شادی اسی لڑکی سے ہو۔ مگر نادرہ کی طرح وہ لڑکی بھی مسلمان تھی۔ اور یقیناً وہ نادرہ سے اچھی مسلمان ہوگی اور مسلمان لڑکی کسی مشرک سے شادی نہیں کر سکتی۔ جبکہ ہندو مشرک ہوتے ہیں!

کیا میں مشرک ہوں؟ یہ سوال اس کے ذہن میں ابھرا۔

مشرک کون ہوتا ہے، یہ نادرہ نے اسے بتایا تھا۔ اس نے خود کو اس تعریف پر پرکھا۔ اس اعتبار سے وہ مشرک نہیں تھا کیونکہ اس نے از خود یہ نتیجہ نکالا تھا کہ کائنات کا یہ مربوط نظام قوت کے ارتکاز کے بل پر قائم ہے۔ اقتدار ایک سے زیادہ قوتوں کے پاس ہوتا تو اس میں خلل پڑتا۔ اس نے ہمیشہ اس مہان ہستی کو ایک مانا تھا۔ وہ بلاشرکت غیرے یہ نظام چلا رہا تھا۔ تو وہ مشرک تو نہیں۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اس نے تو ماں کی موت والے دن مورتی کو چیلنج کیا تھا۔ اسے بھگوان ماننے سے انکار کیا تھا۔ بلکہ وہ تو بتوں کی پوجا کے سلسلے میں بہت پہلے سے ماتا جی سے بحث کیا کرتا تھا۔

اب وہ پوری طرح سمجھ گیا کہ بتوں کی پوجا کرنا شرک ہے۔ تو وہ مشرک تو نہیں۔

لیکن یہ سچ ہے کہ وہ ہندو تھا...... اور ہندو مشرک ہوتے ہیں۔ پہلی بار اس نے سوچا کہ وہ بتوں کو نہیں مانتا، ان کی پوجا نہیں کرتا اور وہ ایک مہان ہستی پر یقین رکھتا ہے۔ تب تو اسے ہندو دھرم کو چھوڑ دینا چاہیے۔ مگر کیا دھرم یونہی چھوڑا جا سکتا ہے۔

اس لڑکی کو تو اب تک شاید اس کے وجود کا علم بھی نہیں ہوگا۔ اس کی محبت کا تو خیر گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر کسی طرح اسے معلوم ہو بھی جائے تو وہ اس سے محبت تو نہیں کر سکتی۔ وہ بھی نادرہ کی طرح یہی سوچے گی کہ میں کسی مشرک سے محبت کیسے کر سکتی ہوں۔ اور اگر اوپر والا اپنی عنایت سے اس کے دل میں اس کی محبت ڈال دے، تب بھی وہ یہ دعا کرے گی کہ میں مسلمان ہو جاؤں۔

تو میں مسلمان ہو سکتا ہوں! اس نے سوچا۔ بس وہ کلمہ ہی تو پڑھنا ہوگا۔ اس نے دل میں، ونوں کلمے دہرائے۔ وہ اسے پوری طرح یاد تھے پھر اس نے ان کے معنی دہرائے۔ اسے معنی

بھی یاد تھے۔

تو کیا میں مسلمان ہو گیا؟ یہ دونوں کلمے پڑھ لیے میں نے۔ کیا آدمی اتنی آسانی سے ایک دھرم چھوڑ کر دوسرا دھرم اپنا سکتا ہے۔ کیا مسلمان ہونا اتنا آسان ہے؟

مگر فوراً ہی اس کے اندر ایک بے چینی ابھری۔ میرا مقصد مسلمان ہونا تو نہیں۔ میں تو اس مہان مہربان ہستی کو کھوج رہا ہوں۔ میرا مقصد تو اس سے محبت کرنا ہے۔ دھرم میرا مسئلہ نہیں۔ میں اس لڑکی کی خاطر مسلمان ہو جاؤں تو یہ تو بے ایمانی ہو گی۔

وہ سوچتا اور الجھتا رہا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ مذاہب کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے گا۔ لفظ اللہ کے بارے میں اسے تجسس تھا۔ اسے زبان سے ادا کرنا اسے اچھا...... بہت اچھا لگتا تھا۔ بڑی اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔ اللہ سوچتا بھی تو اس کے اندر بڑے خوبصورت جذبے جاگتے تھے۔ یہ اللہ کیا ہے...... کون ہے...... کیسا ہے؟

وہ اٹھا اور کوٹھے پر چلا گیا۔ اس کے اندر ایک عجیب سا اضطراب مچل رہا تھا۔ کوٹھے پر آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے کمر کے بل جھکتے ہوئے، آسمان کا تصور کر کے بڑی عاجزی سے پکارا۔ ”تو جو کوئی بھی ہے اے سب کچھ بنانے والے، میں تیرا اعتراف کرتا ہوں اور تیرے سامنے خود کو جھکاتا ہوں۔ میں تیری جستجو کر رہا ہوں۔ تو مجھے مل جا۔ مجھے اپنا راستہ دکھا دے۔ مجھے اپنا بنا لے کہ میں تجھ سے محبت کرنا چاہتا ہوں۔“

یہ اس کی پوجا تھی...... اور ماتا جی کے دیہانت کے بعد سے اب تک اس کا معمول رہا تھا۔ اس روز یہ پوجا کر کے اس نے سر اٹھایا تو وہ مطمئن تھا۔ بے حد مطمئن! بھلے وہ ہندو ہو، لیکن وہ مشرک ہرگز نہیں ہے۔

❁......❁......❁
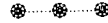
پڑھائی کا شیڈول بہت سخت تھا۔ اس پر مستزاد عربی کی پڑھائی، جسے اوتار سنگھ کورس سے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ پھر مولوی صاحب نے اسے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی پہلی کہانی لا کر دی جو عربی زبان میں تھی۔ اوتار سنگھ بہت خوش ہوا۔ مگر اسے پڑھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ ابھی وہ عربی کو پوری طرح سمجھنے کی اہلیت سے بہت دور ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی قواعد بڑی مضبوط تھی۔ لیکن اس کا ذخیرۂ الفاظ فی الحال بہت محدود تھا۔ لیکن اسے یہ یقین بھی ہو گیا کہ ذخیرۂ الفاظ ایسی کہانیاں پڑھنے سے بنے گا۔ اور جوں جوں ذخیرۂ الفاظ بڑھے گا، اس کی عربی کی استعداد بھی بڑھتی رہے گی۔

مذاہب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی اس کی خواہش شدید ہو گئی تھی۔ لیکن کسی سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ خالی پیریڈز میں سب اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے تھے۔ زیادہ ہوتا تو پڑھائی پر بات ہو جاتی۔ بہرحال اوتار سنگھ موقع نکالنے کی تلاش میں تھا۔

پہلا موقع اسے رچرڈ سے بات کرنے کا ملا۔ اس روز خالی پیریڈ میں وہ سب لائبریری میں تھے۔ وجہ یہ تھی کہ امتحان قریب آ رہے تھے اور سب بڑی سنجیدگی سے پڑھائی میں مصروف تھے۔

اچانک رچرڈ نے کہا۔ ”میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ کسی کا کافی پینے کا موڈ ہے؟“

سب نے انکار کر دیا۔ ”میں چلتا ہوں۔“ اوتار سنگھ نے کہا۔

”تو آؤ...... چلیں۔“

وہ دونوں لائبریری سے نکلے اور کینٹین کی طرف چل دیے۔

کینٹین میں رچرڈ نے کافی کا آرڈر دیا۔ اوتار سنگھ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کیسے شروع کرے۔ پھر اس نے بلاواسطہ بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ”رچرڈ...... مجھے اپنے مذہب کے بارے میں بتاؤ۔“

رچرڈ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”یہ خیال کیسے آ گیا تمھیں؟“

”اس روز پارٹی میں تم نے ہندو دھرم کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ میں بہت پہلے سے سوچ رہا ہوں۔“

”ہر معقول آدمی کو سوچنا چاہیے۔“ رچرڈ نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ”میں غور کرتا ہوں تو تم لوگوں کا دھرم مجھے مذہب کہیں سے نہیں لگتا۔ ہاں اسے ثقافت کہا جا سکتا ہے۔ بھلا بتاؤ تو، پتھر کے بتوں کی پوجا کرنا، انھیں بھینٹ دینا اس عہد کے شایانِ شان تو نہیں۔ تم لوگ اتنے وہمی اور ضعیف الاعتقاد ہو کہ درختوں تک سے اولاد مانگتے ہو۔“

اوتار سنگھ کو یاد آیا کہ اس کے ماتا اور پتا نے اس کے لیے برگد کے درخت پر منت مانی تھی اور وہ پیڑ ہی سوکھ گیا تھا۔ ”میں اس سلسلے میں بہت شروع سے سوچ رہا ہوں۔ میں نے کبھی دل سے پوجا نہیں کی اور چار سال سے تو میں نے مورتیوں کو ماننا ہی چھوڑ دیا۔“

”تم مجھے شروع ہی سے غیر معمولی لگے تھے۔“ رچرڈ کے لہجے میں ستائش تھی۔

”مگر رچرڈ، یہ کائنات کا نظام خود بخود تو نہیں چل رہا ہے۔ کوئی تو ہے جو اسے چلا رہا ہے۔“

”بے شک۔ اور وہ خدا ہے، جس نے چھ دن میں یہ نظام قائم کیا۔“

”تو تم اسے خدا کہتے ہو۔ کیوں؟“

”آسمانی کتاب میں یہی نام ہے اس کا...... گاڈ...... خدا۔ اس نے اپنے بیٹے مسیحؑ مصلوب کو دنیا میں اپنی کتاب دے کر بھیجا کہ انسانوں کو محبت کی تعلیم دے اور دکھوں سے نجات کا راستہ دکھائے۔“

اوتار سنگھ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”خدا کا بیٹا بھی ہے! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

''اسے مقدس کنواری ماں نے جنم دیا تھا..... پاک دامن مریم نے۔ چرچ کے باہر بڑی صلیب پر تم نے ان کا مجسمہ دیکھا ہوگا اور ورجن میری کی شبیہہ بھی دیکھی ہوگی..... کم سن مسیحؑ کو گود میں لیے ہوئے۔ چہرے کے گرد نور کا ہار۔''

اوتار سنگھ نے دونوں چیزیں دیکھی تھیں۔ ''میں نے دیکھا ہے۔'' وہ بولا۔ ''یہ بتاؤ کہ یہ کتنی پرانی بات ہے؟''

''ہمارا سن عیسوی مسیحؑ کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ یہ 19 صدی پہلے کی بات ہے۔''

''تو تمھیں کیسے معلوم کہ مقدس ماں اور مسیحؑ ایسے تھے؟'' اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

''اس کی کیا اہمیت ہے۔ اس زمانے میں کوئی مصور ہوگا، جس نے انھیں دیکھ کر ان کی تصویر بنالی ہوگی۔''

اوتار سنگھ کی تسلی نہیں ہوئی۔ ایک تو یہ خدا اس کے تصور کے خدا سے بہت مختلف تھا۔ اس پر یہ شبیہہ اور مورتی والی بات۔ ''تمہارا مذہب ہم سے کچھ زیادہ مختلف تو نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''بت تو تم بھی بناتے ہو۔''

''مگر ہم بت پرست نہیں ہیں۔'' رچرڈ نے سخت برا مان کر کہا۔

''پہلے بت بنتا ہے۔ پھر بت پرستی ہی ہوتی ہے۔''

''میں ایسی باتیں نہیں سن سکتا۔'' رچرڈ بدمزہ ہوگیا۔

''کیوں؟ میں نے جب پہلی بار بھگوان کی مورت دیکھی تھی تو اپنی ماتا جی سے یہی سوال کیا تھا۔ اور ان کے جواب سے مجھے تسلی نہیں ہوئی تھی۔ پھر میں نے کبھی بھگوان کو دل سے نہیں مانا۔ تم کیوں برا مانتے ہو۔ میں تو ایک معقول بات کر رہا ہوں۔''

''خیر..... چھوڑو اس بات کو۔''

''اور یہ تمھیں کیسے پتا چلا کہ مسیحؑ خدا کے بیٹے تھے؟''

''ہمارے پاس آسمانی کتاب بائبل ہے نا۔''

''اس میں یہ لکھا ہے؟''

رچرڈ گڑبڑا گیا۔ ''ظاہر ہے۔ اس میں لکھا ہوگا۔ تبھی تو ہم یہ بات مانتے ہیں۔''

''تم نے نہیں پڑھی بائبل؟''

''نہیں۔'' رچرڈ کچھ شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے کافی کی پیالی خالی کر کے ہٹا دی۔ ''آؤ..... اب چلیں۔ پیریڈ شروع ہونے والا ہے۔''

اوتار سنگھ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

اب اس کے پاس سوچنے کا کافی سامان تھا۔ کئی دن تک وہ سوچتا رہا۔ اس کا جو خدا کا

تصور تھا، وہ رچرڈ کے تصور سے بالکل مختلف تھا۔ اس کا خدا سب سے الگ، سب سے منفرد اور مختلف اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا تھا۔ یہ اولاد والا معاملہ تو اسے بہت برا لگا۔ کیا خدا نے شادی بھی کی ہوگی؟ اور اگر کی ہوگی تو کس سے.....؟ کسی عورت سے؟ اپنی مخلوق سے؟ یا اپنی ہی جیسی کسی ہستی سے؟

دونوں ہی امکان اس کے تصور سے متصادم تھے۔ اس کے نزدیک خدا جیسا تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ہوتا تو اس کی انفرادیت ختم ہو جاتی۔ اور اگر مسیحؑ خدا کے بیٹے تھے تو یہ تو طے ہے کہ وہ انسان تھے۔ ان کی ماں انسان ہی ہوگی۔ خدا تو انسان نہیں ہوسکتا۔

اسے ہندوؤں پر ترس آنے لگا۔ ہندو مشرک تھے۔ دیوی دیوتاؤں کی..... بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ اس لیے انھیں مشرک کہا جاتا ہے اور شرک کا جو مطلب نادرہ نے اسے بتایا تھا، اس کے مطابق تو عیسائی بھی مشرک تھے۔ انھوں نے خدا کی فیملی بنادی تھی۔ اور مورتیاں تو وہ بھی بناتے تھے۔ مگر نادرہ کا کہنا تھا کہ وہ اہل کتاب ہیں۔ تو کسی کے پاس آسمانی کتاب ہو تو شرک کرنا اس کے لیے جرم نہیں رہتا۔ یہ تو بے انصافی ہے۔

اور یہ آسمانی کتاب والا معاملہ بھی وہ پوری طرح نہیں سمجھ پایا تھا۔ کیا وہ کتاب خدا کی لکھی ہوئی تھی؟ خدا کی تحریر تھی؟ اور ایسی کتنی کتابیں ہیں دنیا میں؟ ہندوؤں کو کوئی کتاب کیوں نہیں ملی؟ سوچنا ختم ہوا تو اس کے پاس سوال ہی سوال تھے۔ جواب اسے تلاش کرنا تھے۔

❁.....❁.....❁
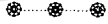
وصال دین کے امتحان بھی ہو چکے تھے اور نتیجہ بھی نکل آیا تھا۔ وہ پاس ہوگیا تھا۔

''مبارک ہو ویرجی۔ تمھیں تو آزادی مل گئی۔'' اوتار سنگھ نے اس سے کہا۔

''آزادی کیسی؟ میں تو تمہارے ساتھ ہی آزاد ہوں گا۔'' وصال دین نے کہا۔

''نہیں ویرجی۔ اب یہ ممکن نہیں۔'' اوتار سنگھ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''دیکھو نا..... اب تمہاری دو مہینے کی چھٹیاں شروع ہو رہی ہیں اور میرے امتحان میں ابھی بیس دن باقی ہیں۔ مجھے تو کوئی ڈیڑھ ماہ بعد آزادی ملے گی۔ اس کے بعد امتحان کا نتیجہ آنے تک چھٹیاں ہوں گی۔ لیکن میری آزادی کے چند دنوں کے بعد ہی تمہارا اسکول کھل جائے گا اور تمھیں واپس آنا پڑے گا۔''

وصال دین کی سمجھ میں یہ پیچیدہ حساب نہیں آیا۔ ''میں نہیں سمجھا بھائی۔ کیا اس بار ہم گاؤں صرف دس بارہ دن کے لیے جائیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''ارے نہیں۔ گھبراؤ نہیں ویرجی۔ تم ابھی گاؤں چلے جاؤ گے۔ میں ڈیڑھ ماہ بعد گاؤں آؤں گا۔ ہم دس بارہ دن ساتھ رہیں گے پھر تم دہلی واپس آ جاؤ گے اور میں وہیں رکوں گا رزلٹ آنے تک۔''

''تو ہم صرف دس بارہ دن ساتھ رہیں گے۔'' وصال دین نے تاسف سے کہا۔

”ڈیڑھ مہینے تم یہاں اکیلے رہو گے۔ نہیں بھائی، میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ میں تمھارے ساتھ ہی گاؤں چلوں گا۔“

اوتار سنگھ کو اس پر پیار آ گیا۔ ”نہیں ویر جی۔ یہ زیادتی ہوگی۔ وہاں اماں اور چاچا تمہارا انتظار کریں گے۔ ان کی خوشیوں کے یہ اتنے سارے دن میں تم سے نہیں چھین سکتا۔ تمھیں جانا ہوگا۔“

وصال دین نے اماں اور ابا کے بارے میں سوچا اور کشمکش میں پڑ گیا۔ وہ اوتار سنگھ کو اکیلا بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور اماں اور ابا کی یاد بھی ستانے لگی تھی۔ پھر اس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”نہیں بھائی، میں تمھارے ساتھ ہی رہوں گا۔“

اس لمحے وصال دین کی خالص محبت کو اوتار سنگھ نے اپنے دل میں اترتا محسوس کیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ”تم بہت اچھے ہو ویر جی...... اور مجھے بہت پیارے ہو۔ لیکن یہ میں نہیں ہونے دوں گا۔ تمھیں جانا ہی ہوگا۔“

اوتار سنگھ کا لہجہ فیصلہ کن تھا اور وصال دین نے کبھی اس کی بات نہیں ٹالی تھی۔

”بھائی...... صرف تمھاری خاطر میں نے پڑھائی میں دلچسپی لی۔ ورنہ میرا دل نہیں لگتا تھا پڑھنے میں۔“ اس نے اداس لہجے میں کہا۔ ”لیکن اب میں پچھتا رہا ہوں۔ کاش میں نے پڑھائی میں دلچسپی لی ہوتی تو آج یوں تمھیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاتا۔ یہ سزا ہے مجھے بے دلی کی۔“

”میں سمجھا نہیں ویر جی۔“

”میں دل لگا کر پڑھتا تو کالج میں تمھارے ساتھ ہوتا نا۔“

یہ بھی اس کی محبت تھی۔ اوتار سنگھ کا دل خوش ہو گیا۔ ”اب پچھتائے کیا ہووت ویر جی۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”لیکن بھائی، میں اکیلا تو گاؤں جا بھی نہیں سکتا۔“ وصال دین نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”مجھے تو راستے بھی نہیں معلوم۔“

”تو تم اکیلے تھوڑا ہی جاؤ گے۔ رگھو ساتھ جائے گا اور تمھیں گاؤں چھوڑ کر واپس آ جائے گا۔“

”مگر پھر یہاں رگھو کا کام کون کرے گا؟“ وصال دین پریشان ہو گیا۔

”تم فکر بہت کرتے ہو ویر جی۔ ارے ایک ہی دن کی تو بات ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

وصال دین نے ذہن تو بنا لیا۔ لیکن جاتے وقت وہ اوتار سنگھ سے لپٹ کر اتنا رویا کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ ”میں تمھارے بغیر کیسے رہوں گا بھائی۔ میرا وہاں دل نہیں لگے گا۔“ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

اوتار سنگھ کو بھی رونا آ رہا تھا۔ لیکن اس نے آنسو پی لیے۔ جانتا تھا کہ وہ رو دیا تو وصال دین کو گاؤں نہیں بھیج سکے گا۔ وہ جائے گا ہی نہیں۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ اس کا بھی برا حال تھا۔ آج تک وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے ہی نہیں تھے۔ ”تم اماں سے میری باتیں کیا کرنا ویر جی۔ اور ہاں، میرے پتا جی کا بہت خیال رکھنا۔ وہ بہت اکیلے ہیں۔ ان کے پاس روز جایا کرنا۔“ اوتار سنگھ نے اسے گاؤں جانے کا گویا ایک اور مقصد بھی دے دیا۔ ”پتا جی کو تمھاری صورت میں میری صورت نظر آیا کرے گی۔“

”یہ تو میں کروں گا ہی بھائی۔ یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں۔“

یوں وصال دین گاؤں چلا گیا۔ اگلے روز رگھو اسے چھوڑ کر واپس آیا تو ٹھاکر کے تحفوں سے لدا پھندا تھا، جو اس نے اوتار سنگھ کے لیے بھیجے تھے۔ مگر اوتار سنگھ کو سب سے قیمتی چیز وہ حلوہ لگا جو اماں نے اس کے لیے اپنے ہاتھوں سے بنا کر بھیجا تھا۔

جب سے اوتار سنگھ کالج میں گیا تھا، اس کا وصال دین سے ملنا بہت کم ہو گیا تھا۔ کالج کا طویل دورانیہ، پھر زیادہ پڑھائی کی وجہ سے مصروفیت۔ اتوار کو چھوڑ کر بس وہ کھانے پر ہی ساتھ ہوتے تھے۔ لیکن اب وہ چلا گیا تو اوتار سنگھ کو گھر سونا سونا لگنے لگا۔ امتحانوں کی وجہ سے پڑھائی کی بہت زیادہ مصروفیت نہ ہوتی تو شاید وہ بہت تڑپتا۔ جدائی کی پہلی رات وہ اپنے کمرے کی تنہائی میں جی بھر کے رویا۔ اس نے وہ آنسو بھی بہا دیے، جو وہ ویر جی کے سامنے نہیں بہا سکا تھا۔ پھر بہرحال پڑھائی نے جدائی کے اس احساس کو کم...... بہت ہی کم کر دیا۔

❀......❀......❀

وصال دین گاؤں پہنچا تو سب سے پہلے اس کی ملاقات ابا سے ہوئی جو کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ اس نے ابا کو سلام کیا۔ رگھو نے انھیں پرنام کیا۔

”کب آیا وصال دین؟“ جمال دین نے پوچھا۔

”ابھی آ رہا ہوں ابا۔“

جمال دین کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹکیں۔ پھر ان میں مایوسی اور حیرت کا تاثر ابھرا۔

”چھوٹے ٹھاکر کہاں ہیں؟“

”وہ تو نہیں آئے ابا۔ ابھی تو ان کے امتحان بھی نہیں ہوئے ہیں۔ مہینہ ڈیڑھ کے بعد آئیں گے وہ۔“

”تب تو تجھے بھی نہیں آنا چاہیے تھا وصال دین۔ تو چھوٹے ٹھاکر کو اکیلا چھوڑ آیا۔“ جمال دین نے سخت لہجے میں کہا۔

”میں نہیں آ رہا تھا ابا۔ چھوٹے ٹھاکر نے زبردستی بھیجا ہے مجھے۔“ وصال دین نے ندامت سے کہا۔ ”چاہے رگھو سے پوچھ لو ابا۔“

جمال دین نے سوالیہ نظروں سے رگھو کو دیکھا۔ ”وصال دین ٹھیک کہہ رہا ہے چاچا۔“ رگھو نے کہا۔

لیکن جمال دین کے رویے میں نرمی نہیں آئی۔ ”اور تو رگھو کو بھی لے آیا۔ انھیں بالکل اکیلا کر دیا تو نے۔“

”میں تو چاچا وصال دین کو چھوڑنے آیا ہوں۔ کل واپس چلا جاؤں گا۔“ رگھو نے کہا۔

”تجھے تو بالکل نہیں آنا چاہیے تھا رگھو۔“ جمال دین بیٹے کی طرف مڑا۔ ”اب پہلے گھر نہ جانا۔ ٹھاکر جی کے پاس جانا۔“

”میں وہیں جا رہا ہوں ابا۔“

جمال دین نے پہلی بار بیٹے کو نظر بھر کر دیکھا۔ وہ بڑا...... جوان ہو گیا تھا۔ قد بھی اونچا ہو گیا تھا اور جسم بھی بھر گیا تھا۔ اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ اس کے جسم کو چھو کر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا لرزتا ہوا ہاتھ سر سے اترا۔ لیکن کندھے تک آتے آتے ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ ”بس تو اب چلا جا۔ یہاں دیر نہ کر۔“ وہ سخت لہجے میں بولا۔

وصال دین سال بھر کے بچھڑے باپ سے لپٹ جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے خود کو روک لیا۔ باپ کا حکم ماننے کی عادت جو تھی۔ وہ رگھو کے ساتھ حویلی کی طرف چل دیا۔ جمال دین نہ کہتا تو بھی وہ پہلے حویلی ہی جاتا۔ اس کی تربیت ہی ایسی ہوئی تھی۔

جمال دین اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا...... شکر اور مسرت سے چھلکتی آنکھوں سے۔ اس کا وصال دین اب مرد بن چکا ہے۔ اے اللہ...... تیرا شکر ہے۔ اس نے زیرِ لب کہا۔ یہ سب تیرا ہی فضل ہے۔ تیری عنایت ہے۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ دیوان خانے میں تھا۔ منیم جی اسے کچھ حساب کتاب بتا رہے تھے۔ وصال دین کو دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ ”آؤ پتر وصال دین، کب آئے؟ کیسے ہو۔“ اس نے وصال دین کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہوں ٹھاکر جی۔“ وصال دین نے جواب دیا۔ اب وہ امید کر رہا تھا کہ ٹھاکر بھائی کے بارے میں حیرت سے پوچھے گا کہ وہ کیوں نہیں آیا۔

”اوتار سنگھ تو امتحان کی تیاری میں لگا ہوگا۔“ ٹھاکر نے اسے حیران کر دیا۔

وصال دین کو احساسِ جرم ہونے لگا۔ کاش وہ نہ آیا ہوتا۔ ”میں نہیں آ رہا تھا ٹھاکر جی۔ پر بھائی نے مجھے مجبور کر دیا۔ مجھے معاف ......“

”ارے کیسی بات کرتے ہو پتر۔“ ٹھاکر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یہ تو زیادتی ہوتی تمھارے ساتھ۔ دیکھو نا...... اوتار سنگھ دیر میں آئے گا تو دیر سے جائے گا بھی۔ یہاں اتنے ہی دن رکے گا وہ۔ جبکہ تمھیں جانا بھی اس سے پہلے ہی ہوگا۔ اس نے اچھا کیا کہ تمھیں بھیج دیا۔ یہ

بتاؤ...... وہ ٹھیک تو ہے نا؟“

”جی ٹھاکر جی۔ ٹھیک ہے۔ بس آج کل فرصت نہیں ہے انھیں۔“

”میں جانتا ہوں۔ پر اس کا پھل بھی اچھا ملے گا اسے۔ اچھا وصال دین، آؤ بیٹھو تو۔“

”جی...... میں...... میں یہیں ٹھیک ہوں ٹھاکر جی۔“

ٹھاکر نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ بیٹے کیسے باپ پر جاتے ہیں۔ جمال دین بھی بیٹھنے سے گھبراتا تھا۔ اس نے سوچا۔ پھر اچانک اسے ایک خیال آیا۔ ”ارے وصال دین، تم گھر بھی گئے ہو یا نہیں؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”سیدھا یہیں آیا ہوں ٹھاکر جی۔“

”حمیدہ بہن سے نہیں ملے۔ جمال دین سے نہیں......“

”ابا سے تو کھیت میں ملاقات ہو گئی تھی۔“

”اور...... پر پہلے ماں سے ملنا تھا نا۔“ ٹھاکر نے تڑپ کر کہا۔ ”بس تم فوراً گھر جاؤ اپنے۔“

”جاتا ہوں ٹھاکر جی۔ پر ایک بات کرنی ہے آپ سے۔“

”بولو...... کیا بات ہے۔“

”مجھے اجازت دے دیں کہ میں ہر روز کچھ دیر کے لیے آپ کے پاس آ جایا کروں۔“

ٹھاکر کھل اٹھا۔ ”اجازت کی کیا بات ہے پتر۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ جب چاہے، آ سکتے ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اچانک کسی خیال سے سنجیدہ ہو گیا۔ ”پر اپنے ماں باپ کا حق نہ مارنا۔ وہ کب سے ترس رہے ہیں تمھیں۔“

”جی ٹھاکر جی...... میں خیال رکھوں گا۔“

”بس اب جاؤ تم۔“ ٹھاکر نے شفقت سے کہا۔

وصال دین چلا گیا۔ مگر ٹھاکر دیر تک دروازے پر نظریں جمائے رہا۔ کیا میرا اوتار سنگھ بھی ایسا ہی بڑا ہو گیا ہوگا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ پچھلی بار جب وصال دین کو دیکھا تھا تو وہ اتنا بڑا نہیں تھا۔ اس کا دل مچلنے لگا اوتار سنگھ کو دیکھنے کے لیے۔ پھر اس نے سوچا...... تھوڑے ہی دن کی تو بات ہے۔ امتحان ختم ہوں گے اور وہ آ جائے گا۔

اس کا جی چاہا کہ دہلی چلا جائے اور اوتار سنگھ کو جی بھر کر دیکھے۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات بھی نہیں تھی۔ لیکن امتحان کے دنوں میں مناسب نہیں تھا۔ وہ بھی پیاسا رہ جاتا اور اوتار سنگھ کی پڑھائی میں بھی خلل پڑتا۔

اس نے چونک کر سر اٹھایا تو رگھو پر نظر پڑی۔ ”میرے لیے کیا حکم ہے مالک؟ چھوٹے ٹھاکر کا حکم تھا کہ وصال دین کو پہنچا کر آؤں۔ اب حکم ہو تو واپس چلا جاؤں۔“

”نہیں۔ تم کل صبح واپس جانا۔ اب جاؤ اور شانتا کو یہاں بھیج دو۔“ ٹھاکر نے کہا۔

رگھو نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''جو حکم ان داتا۔''

باہر وصال دین گھر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اُڑ کر ماں کے پاس پہنچ جائے۔

❀……❀……❀

امتحان شروع ہونے میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ گھر پر تیاری کا موقع دینے کے لیے کالج سے چھٹیاں مل گئی تھیں۔ محمود اپنی ریاضی کی تیاری سے مطمئن نہیں تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس مضمون میں اوتار سنگھ بہت اچھا ہے۔

کالج کے آخری دن اس نے اس سلسلے میں اوتار سنگھ سے بات کی۔ ''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے دوست۔''

''میں حاضر ہوں۔ بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''مجھے ریاضی کی تیاری کرا دو۔''

''بالکل کرا دوں گا۔ مگر تمھیں میرے گھر آنا ہوگا۔''

''جب کہو، آ جاؤں گا۔''

اوتار سنگھ نے چند لمحے سوچا۔ یوں اسے محمود سے بات کرنے کا موقع بھی مل جاتا۔ ''لیکن میں منہ مانگی فیس لوں گا۔'' وہ بولا۔

''فیس میں تو مجھے اعتراض نہیں۔ لیکن منہ مانگی فیس سے ڈر لگ رہا ہے۔ نجانے تم کیا مانگ بیٹھو۔'' محمود نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''خیر مجھے منظور ہے۔ بولو، کب آ جاؤں۔''

''کل صبح کالج کے وقت پر آ جاؤ۔ میں سمجھوں گا کہ کالج کی چھٹیاں پرسوں سے شروع ہو رہی ہیں۔''

''یہ ٹھیک ہے۔ پھر پرسوں سے پڑھائی کا اپنا اپنا شیڈول بنا لیں گے۔''

بات طے ہوگئی۔ دونوں آخری پیریڈ اٹینڈ کرنے کے لیے چل دیے۔

اگلے روز صبح نو بجے محمود اوتار سنگھ کے گھر پہنچ گیا۔

اوتار سنگھ کا پڑھائی کا کمرا گھر سے الگ تھلگ تھا۔ دونوں وہاں جا بیٹھے۔ اوتار سنگھ نے رنجنا سے کہہ دیا کہ ہر ایک گھنٹے کے بعد انھیں چائے کے لیے پوچھ لے۔

''اب بتاؤ، کہاں سے شروع کروں؟'' اوتار سنگھ نے محمود سے پوچھا۔

''تم استاد ہو۔ تم ہی فیصلہ کرو۔'' محمود نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ چند لمحے سوچتا رہا۔ ''ایسا کرو کہ جو تمھیں مشکل لگتا ہو، اس پر نشان لگا دو۔ وہ میں تمھیں سمجھا دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' محمود نے کتاب میں نشان لگا کر کتاب اوتار سنگھ کی طرف بڑھا دی۔

''میتھس میں یہ آسانی ہے کہ ایک سوال میں تمھیں اچھی طرح سمجھا دوں...... ایسے کہ تم میتھڈ اچھی طرح سمجھ جاؤ تو اس کے بعد تم ہر سوال حل کر سکتے ہو۔ بس میتھڈ سمجھتے وقت تکلف نہ کرنا۔ کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو بار بار پوچھو۔ یہاں تک کہ پوری طرح سمجھ جاؤ۔''

پڑھائی شروع ہوگئی۔ محمود دل میں سوچ رہا تھا کہ یہاں کتنا سکون ہے۔ اور وہ پڑھائی سے مطمئن بھی تھا۔ اوتار سنگھ کو ریاضی پر مکمل دسترس تھی اور اس کا سمجھانے کا طریقہ بھی بہت سادہ اور دل نشیں تھا۔

وہ منہمک تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ''آ جاؤ، رنجنا۔'' اوتار سنگھ نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

رنجنا ان کے لیے چائے لے آئی تھی۔

❀……❀……❀

اسی روز صبح ہی سے حور بانو باورچی خانے میں گھسی ہوئی تھی۔ عام حالات میں اس موسم میں باورچی خانے میں زیادہ دیر رکنا اسے گوارا نہیں تھا۔ گرمی اسے دوسروں سے کچھ زیادہ ہی لگتی تھی۔

اس روز بھی گرمی کافی تھی۔ وہ پسینے میں نہا رہی تھی۔ چہرہ تمتما رہا تھا۔ لیکن چولہے کے پاس سے ہٹنا اسے گوارا نہیں تھا۔ بوا نے کئی بار کہا..... تم جاؤ بیٹا، ہم سنبھال لیں گے۔ لیکن وہ نہ مانی۔

''نہیں بوا...... آج سبھی کچھ میں خود پکاؤں گی۔'' اس نے کہا۔

''ہمیں تو لگتا ہے، گرمی سے بولا گئی ہو۔'' بوا نے اسے ہمدردانہ نظروں سے دیکھا۔

بوا ہی نہیں، اماں بھی حیران تھیں۔ حور بانو نے کھانا پکانے میں ایسی دلچسپی کبھی نہیں لی تھی۔ بلکہ اماں تو یہ سوچ سوچ کر اکثر ہولتی رہتی تھیں کہ سسرال میں جا کر اس لڑکی کا کیا بنے گا۔ پکانا تو یہ سیکھنا ہی نہیں چاہتی۔

''پریشان نہ ہوں بڑی بیگم۔ وقت آئے گا تو سب کرنے لگیں گی بٹیا۔'' بوا اماں کو دلاسا دیتیں۔

مگر آج اماں اس پر پریشان تھیں کہ تین چار قسم کے کھانے...... اور یہ لڑکی مصر ہے کہ سب کچھ خود ہی پکائے گی۔ وجہ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

یہ سچ تھا کہ حور بانو کو کھانا پکانے میں دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن یہ تو چھوٹے ٹھاکر کے لیے

کھانا پکانے کا اعزاز تھا۔ اسے وہ کیسے کسی کے ساتھ بانٹ لیتی۔ یہ موقع تو قسمت نے اسے دیا تھا..... ایسا موقع جس کے بارے میں اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

اور وہ مطمئن تھی کہ اماں کو نہیں معلوم..... نہیں معلوم کہ اسے بھی معلوم ہے۔ اس نے تو بس اتفاقاً ہی اماں سے رنجنا کی گفتگو سن لی تھی۔

رنجنا پچھلی رات آئی تھی اور اماں کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ حور بانو اس وقت معمول کے مطابق برآمدے میں تھی۔

''بڑی بیگم..... میں اپنے چھوٹے ٹھاکر کی ایک بنتی لے کر آئی ہوں۔'' رنجنا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

چھوٹے ٹھاکر کا نام سن کر حور بانو کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ ہمہ تن سماعت ہو گئی۔ لفظ ''بنتی'' نے اس کے تجسس کو اور بھڑکا دیا تھا۔

''کیسی بنتی؟'' اماں نے کہا۔

''چھوٹے ٹھاکر کہتے ہیں کہ آپ ان پر اپکار کر دیں.....''

''ارے..... تم لوگ اتنا تکلف کیوں کرتے ہو ہم سے۔ کہو نا، کیا بات ہے۔ دیکھو نا، کرائے دار ہونے کے علاوہ تم لوگ پردیسی ہونے کے ناتے ہمارے مہمان بھی ہو اور پڑوسی بھی ہو۔ تمہارا تو بہت حق ہے ہم پر۔''

رنجنا اب بھی ہچکچا رہی تھی۔ کچھ اصرار کے بعد وہ بولی تو اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

''بڑی بیگم، کھانا تو میں اچھا بناتی ہوں۔ آپ نے بھی کھایا ہے نا میرے ہاتھ کا۔ آپ ہی بتائیں.....''

''بہت اچھا پکاتی ہو تم۔ پر بات کیا ہے؟''

''کل چھوٹے ٹھاکر کا کوئی دوست آ رہا ہے۔ لگتا ہے، چھوٹے ٹھاکر کو مجھ پر بھروسہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کل ان دونوں کے لیے کھانا بھجوا دیں۔''

''ارے تو اس میں اتنا جھجکنے کی کیا بات ہے۔''

''وہ دوست مسلمان ہے نا۔ تو آپ ایسا کھانا بھجوائیں جو آپ کے ہاں پکتا ہے۔ بے شک ماس ہو۔''

اماں کی سمجھ میں بات آ گئی۔ ''تمھارے چھوٹے ٹھاکر بہت اچھے ہیں۔'' انھوں نے کہا۔ ''تمھارے کھانے میں خرابی نہیں۔ مسلمان دوست کے لحاظ میں انھوں نے ہم سے فرمائش کی ہے کہ ممکن ہے، ان کا دوست تمھارے ہاتھ کا کھانا نہ کھائے۔''

''اوہو..... یہ بات ہے۔'' رنجنا نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''تو بڑی بیگم، آپ کر دیں گی نا یہ کام۔''

''سر آنکھوں پر۔ اور مجھے خوشی ہو گی۔ تم بے فکر ہو جاؤ اور چھوٹے ٹھاکر سے کہنا کہ پریشان نہ ہوں۔ انشاء اللہ انھیں شرمندگی نہیں ہو گی۔''

یہ سن کر حور بانو نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ سب کچھ وہ خود اپنے ہاتھوں سے بنائے گی۔ اس رات وہ سو ہی نہیں سکی۔ صبح نماز اور تلاوتِ قرآن کے بعد وہ معمول کے مطابق کچھ دیر لیٹنے کے بجائے باورچی خانے میں چلی آئی، جہاں اماں آ کا میاں کو سودے کی تفصیل بتا رہی تھیں، جو انھیں لانا تھا۔

''اماں..... آج کھانا میں پکاؤں گی۔'' اس نے اماں سے کہا۔

اماں خوش ہو گئیں۔ مگر ان کی نگاہوں میں حیرت تھی۔ ''یہ شوق تمھیں کب سے ہو گیا؟''

''بس اماں، آج جی چاہ رہا ہے۔''

''آج نہیں۔ یہ شوق پھر کبھی پورا کر لینا۔ آج زیادہ چیزیں پکانی ہیں نا۔''

''کیا کیا پکے گا؟''

''پلاؤ، کوفتے، شامی کباب اور میٹھے میں کھیر۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں ایک ہی دن میں اتنا کچھ سیکھ لوں گی۔'' حور بانو نے خوش ہو کر کہا۔

''نہیں بھئی۔ یہ تجرباتی کھانا نہیں ہے۔ کہیں بھیجنا ہے۔''

''آپ بس مجھے ترکیب بتا دیجیے گا۔ سارا کام میں ہی کروں گی۔''

اماں نہیں مان رہی تھیں۔ مگر اس نے انھیں منا کر ہی دم لیا۔ اماں نے بھی شاید یہ سوچ کر مان لیا کہ شوق کا بھوت گرمی میں ذرا دیر میں اتر جائے گا۔ لیکن حور بانو باورچی خانے میں ایسی ڈٹی کہ نکلنے پر آمادہ ہی نہیں ہوئی۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ کوفتے تیار ہو چکے تھے۔ کھیر برف میں لگا دی گئی تھی۔ پلاؤ دم پر تھا۔

''اچھا..... اب تم کچھ دیر ہوا میں جا بیٹھو بیٹا۔ صرف کباب رہ گئے ہیں۔ وہ میں تل لوں گی۔'' بوا نے پھر پیشکش کی۔

''واہ بوا..... سب کچھ کرنے کے بعد میں آخر میں کیوں ہٹوں۔ کباب بھی میں ہی تلوں گی۔'' اس نے جواب دیا۔

''اے دیکھو تو..... انگارہ ہو رہی ہو۔''

''ہونے دو بوا۔ بس اب کام ہی کتنا ہے۔''

آدھے گھنٹے کے بعد سب کچھ تیار ہوگیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے کھانا قابوں میں منتقل کیا۔ روٹیاں دسترخوان میں لپیٹیں اور سینی تیار کر دی۔ ''لو بوا..... اب یہ کھانا اوپر لے جاؤ۔'' اس نے سینی کو خوان سے ڈھانپتے ہوئے کہا۔

❁.....❁.....❁

محمود نے ہاتھ پھیلا کر انگڑائی لی اور اوتار سنگھ کو بڑی ممنونیت سے دیکھا۔ ''میں تمہارا شکر گزار ہوں اوتار سنگھ۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' اوتار سنگھ مسکرایا۔ ''یہ بتاؤ کہ اب تم مطمئن ہو۔''

''بالکل۔ مطمئن بھی اور پُراعتماد بھی۔ تم نے دیکھا نہیں کہ طریقہ میری سمجھ میں آ گیا ہے۔ تمھارے دیے ہوئے سوال میں نے تمہاری مدد کے بغیر حل کر لیے۔''

''ہاں۔ میں بھی مطمئن ہوں۔''

''بس اب میں چلوں گا۔''

''ایسے کیسے جا سکتے ہو۔ ابھی تو تمھیں میری فیس دینی ہے۔''

''کب لو گے؟''

''میں تو آج ہی لینا چاہتا ہوں۔''

''اچھا بتاؤ تو تمہاری فیس کیا ہے۔''

''ابھی نہیں۔ کھانے کے بعد بتاؤں گا۔''

''کھانا! سنو اوتار سنگھ اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ میں نے ناشتہ بہت اچھا کیا تھا۔ ابھی بھوک بھی نہیں ہے۔ کھانا گھر جا کر کھاؤں گا۔''

''تب تو میری فیس بھی نہیں دے سکو گے۔ مجھے تم سے جو کچھ لینا ہے، اس میں بھی وقت لگے گا۔''

''کوئی بات نہیں۔ تم بتاؤ تو۔ مگر کھانا میں نہیں کھاؤں گا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے۔ ہم راجپوتوں کی روایت ہے کہ مہمان کو کھانا کھلائے بغیر نہیں جانے دیتے۔''

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر رنجنا نے دروازہ کھول کر جھانکا۔ ''بھوجن لے آؤں چھوٹے ٹھاکر؟''

''ہاں ..... لے آؤ۔''

رنجنا دروازہ بند کر کے جانے کے بجائے اندر چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی چلمچی اور تولیا تھا۔

''لو..... ہاتھ دھولو محمود۔''

محمود ہچکچا رہا تھا۔ تاہم اس نے ہاتھ دھوئے اور تولیے سے خشک کیے۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں اوتار سنگھ، مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''چلو دو چار لقمے لے لینا۔'' اوتار سنگھ نے تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔ پھر رنجنا کی طرف مڑا۔ ''جاؤ..... کھانا لے آؤ۔''

رنجنا چلی گئی۔ محمود اب بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کشمکش تھی۔

''برا مت ماننا اوتار سنگھ۔ میں کھانا نہیں کھا سکتا۔''

اوتار سنگھ نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ ''دھرم کی وجہ سے؟'' اس نے پوچھا۔

محمود نے جواب نہیں دیا۔ بس اثبات میں سر ہلا دیا۔ اوتار سنگھ کی نظریں اسے اپنے وجود میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''تمھیں پتا ہے، میرے ساتھ ایک مسلمان رہتا ہے۔ بچپن سے ہم ساتھ رہے ہیں۔ کبھی جدا نہیں ہوئے۔ میں اسے ویر جی کہتا ہوں، اپنا بھائی مانتا ہوں اس کے امتحان ختم ہو چکے ہیں اور وہ گاؤں چلا گیا ہے۔ ورنہ میں اس سے تمھیں ملواتا۔''

''اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ کسی کا دل نہ مانے تو وہ کیا کرے۔'' محمود نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

اتنے میں رنجنا سینی لے آئی اور کھانا میز پر سلیقے سے رکھنے لگی۔ پھر وہ جا کر پانی لے آئی۔

''چلو محمود..... آ جاؤ۔'' رنجنا کے جانے کے بعد اوتار سنگھ نے کہا۔

''میں معذرت خواہ ہوں اوتار سنگھ۔''

''ہم راجپوت مہمان نوازی جانتے ہیں محمود۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''یہ کھانا میرے گھر میں نہیں پکا ہے۔ یہ کسی ہندو نے نہیں، مسلمان نے پکایا ہے۔ اب بس تمھیں میرے ساتھ بیٹھنے پر اعتراض ہوسکتا ہے۔ یہ بات ہے تو میں بعد میں کھا لوں گا۔ تم اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔''

محمود شرمندہ ہوگیا۔ ''اتنی زحمت کی تم نے.....''

''میں نے کی نہیں، زحمت دی۔ یہ جن کے مکان میں ہم رہ رہے ہیں، مسلمان ہیں۔ میں نے رات کو کہلوا دیا تھا۔ یہ سب کچھ انھوں نے ہی پکا کر بھیجا ہے اور کھانے بھی تم لوگوں کے ہی ہیں۔''

محمود کھانے کی میز پر جا بیٹھا تھا۔ ''آؤ نا اوتار سنگھ۔''

''تم کھاؤ۔ میں بعد میں کھا لوں گا۔''

''جو تم سمجھ رہے ہو، وہ بات نہیں ہے۔'' محمود نے کہا۔ ''آؤ۔ تمھارے بغیر میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔''

اوتار سنگھ بھی کھانے پر بیٹھ گیا۔

کھانا بہت لذیذ اور خوش ذائقہ تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ لاجواب تھی۔ ایسی کہ چھوڑنے کو دل ہی نہ چاہے۔ دونوں نے خوب ڈٹ کر کھایا۔

''پیٹ بھر گیا۔ نیت نہیں بھری۔'' محمود نے کہا۔

''ادھر بھی یہی حال ہے۔'' اوتار سنگھ بولا۔'' ویسے تم لوگوں کے کھانے بہت مزے دار ہوتے ہیں۔''

''اب تو نیند آنے لگی۔ کچھ کرنے کے قابل ہی نہیں رہا میں۔''

''تو چلو۔ پاؤں پھیلا کر لیٹ جاؤ ذرا دیر۔''

دونوں مسہری پر نیم دراز ہوگئے۔ ''ہاں...... اب اپنی فیس کی بات کرو۔'' محمود نے کہا۔

''میں تمھارے مذہب کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے سادگی سے کہا۔

محمود کے لیے اس کی بات یکسر خلاف توقع تھی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔'' کیوں جاننا چاہتے ہو؟''

''صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کے لیے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ پھر پوچھا۔'' تمھیں کوئی اعتراض ہے؟ تمھارا مذہب منع کرتا ہے تمھیں اس سے۔''

''نہیں، ہرگز نہیں۔ بلکہ اللہ کا حکم ہے کہ اس کے دین کو پھیلانے کے لیے کام کیا جائے۔ لوگوں کو بتایا جائے۔ تاکہ وہ سیدھی راہ اختیار کریں۔''

''تو مجھے بتاؤ۔''

محمود چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔''یوں بتانا تو بہت مشکل ہے۔ اور میں کوئی عالم بھی نہیں ہوں۔ ایسا کرو، تم مجھ سے پوچھتے رہو، جو مجھے معلوم ہوگا اور جتنا معلوم ہوگا، میں بتا دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ پہلے تم مجھے اللہ کے بارے میں بتاؤ۔ تم اپنے خدا کو اللہ کیوں کہتے ہو؟''

''یہ اللہ کا اسم ذات ہے اور خود اللہ نے ہمیں یہ بات بتائی ہے۔''

اوتار سنگھ پوچھتا رہا اور محمود بتاتا رہا۔ اس نے اللہ کی صفات اور اس کی کتابوں کے بارے میں بتایا۔ فرشتوں کے...... انبیاء کرام اور پیغمبروں کے بارے میں بتایا۔ اسلام کی تعلیم اور احکامات کے بارے میں بتایا۔ اوتار سنگھ جس دلچسپی سے سن رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا، وہ اس کے لیے حیران کن بھی تھا اور خوش کن بھی۔ محمود کو اندازہ ہوا کہ کچھ کچھ یہ سب اوتار سنگھ کے ذہن میں پہلے سے ہے۔

''اللہ کی کتاب تو عیسائیوں کے پاس بھی ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''اس وقت تین قومیں ایسی ہیں، جن کے پاس اللہ کا کلام موجود ہے۔ مسلمان، عیسائی اور یہودی۔'' محمود نے جواب دیا۔

''تو ان کو تو ایک ہونا چاہیے تھا۔'' اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کا ظاہری سبب قوموں کا تعصب اور ان کی اجتماعی فطرت کی کمزوریاں ہیں۔ اللہ کی کتاب بھی اس کے متعلق بتاتی ہے اور تاریخ بھی اس کی تائید کرتی ہے۔''

''لیکن اللہ نے تین کتابیں کیوں اتاریں۔ ایک کتاب ہوتی تو یہ تقسیم اور تفریق ہوتی ہی نہیں۔''

محمود گھبرایا...... لرز کر رہ گیا۔ اوتار سنگھ کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے اسے یہ احساس ہو گیا کہ یہ سوال بد نیتی سے نہیں، بلکہ خلوص سے کیا گیا ہے۔ لیکن اپنے عجز علم کی وجہ سے وہ اس کا جواب دینے سے معذور تھا۔

اچانک اس بے بسی کے عالم میں اسے اپنے اندر روشنی سی پھوٹتی محسوس ہوئی۔ اس نے بے ساختہ کہا۔''اوتار سنگھ، تم تو زمین دار گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ یہ بتاؤ، فصل کس چیز سے تیار ہوتی ہے۔''

''بیج سے۔'' اوتار سنگھ نے بلا جھجک کہا۔

''سخت پتھریلی زمین میں بیج ڈالا جائے تو فصل اترے گی؟''

''نہیں۔''

''تو اس کے لیے کیا کرنا ہوگا؟''

''پہلے اس زمین پر محنت کرنی ہوگی۔ پتھر نکالنے ہوں گے۔ زمین نرم ہوگی تو اس میں ہل چلائیں گے۔ اسے پانی دیں گے۔ تاکہ زمین بیج قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔''

''اور زمین تیار ہوتے ہی بوائی کر دیں گے؟''

اوتار سنگھ نے چند لمحے سوچا۔ پھر بولا۔''نہیں...... موسم کا انتظام کرنا ہوگا۔''

''یعنی مناسب وقت کا'' محمود نے وضاحت کی۔ پھر بولا۔''اب میں تمھیں سمجھا سکتا ہوں۔ اللہ نے حضرت آدمؑ اور بی بی حواؑ کو زمین پر اتارا اور ان کی نسل میں برکت عطا فرمائی۔ لیکن جلد ہی انسان گمراہی میں پڑنے لگا۔ اور اس کی گمراہی بہت تیزی سے بڑھتی گئی۔ تاریخ کا مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ معاشرے کس درجہ خراب ہو گئے تھے۔ ارباب اقتدار سفاک تھے۔ انسانوں کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ انسان کو انسان سے اور بھوکے درندوں سے لڑانا امرا کی تفریح تھی۔ اخلاقی انحطاط آخری حدوں کو پہنچ چکا تھا۔ مختصر یہ کہ معاشرے سنگلاخ زمین سے زیادہ بری حالت میں تھے۔ ایسے میں ہدایت کا بیج کیسے پنپتا۔ پھر اللہ کی صفات میں رحمت اور حد درجہ نرمی ہے۔ اللہ انسان کو آسانیاں عطا فرماتا ہے اور بتدریج بہتری اور اصلاح کی طرف لے جاتا ہے۔ یہاں یہ بھی بتا دوں کہ آسمانی کتابیں صرف چار ہیں۔ لیکن تقریباً ہر پیغمبر پر صحیفے اترتے۔ وہ مختصر

اور غیر جامع تھے اور محفوظ نہ رہ سکے۔ رہ گئیں آسمانی کتابیں تو تورات بار بار تلف بھی ہوئی اور یہودی علماء نے اس میں تحریف بھی کی۔ اسی طرح انجیل بھی اپنی اصل شکل میں موجود نہیں۔ البتہ قرآنِ پاک میں آج تک زبر زیر کا فرق نہیں ہوا۔ اس لیے کہ اللہ نے خود اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا تھا۔'' محمود نے گہری سانس لی۔ پھر کچھ سوچنے کے بعد گویا ہوا۔'' کہنے کا مطلب یہ کہ معاشروں کے حد سے بڑھتے ہوئے بگاڑ کی وجہ سے شاید اللہ نے اپنی شریعت بتدریج اور قسطوں میں اتاری۔ یہاں تک کہ ہمارے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو اللہ نے دین اور شریعت کو مکمل کر دیا۔ شریعت کے بتدریج مکمل ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ نزولِ اسلام کے ابتدائی عرصے میں شراب پی جاتی رہی۔ لیکن بعد میں قرآن پاک میں اسے حرام قرار دینے کا حکم آیا اور اس پر عمل درآمد ہوا۔''

''یہ بات اللہ نے بتائی ؟''

محمود ٹھٹھرا اٹھا۔'' یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ یہ میرا عقلی قیاس ہے اور اگر غلط ہے تو میں اس پر اللہ سے توبہ کرتا ہوں۔ وہ نیت کا حال جانتا ہے۔ میں نے صرف تمھیں سمجھانے کی غرض سے سوچا تو یہ بات میرے ذہن میں آئی۔ دیکھو نا..... اگر آدمی کو بہت ساری بری عادتیں ہوں تو انھیں ایک دم نہیں چھڑوایا جاتا کہ وہ گھبرا کر اصلاح قبول کرنے سے انکار کر دے گا۔ ایک ایک کر کے بری عادتیں چھڑا دیں تو اسی کے لیے آسانی ہو گی۔ اور ایک برائی چھوڑنے اور ایک اچھائی اپنانے کے نتیجے میں آدمی میں برائی کے لیے کراہت اور اچھائی کے لیے قبولیت پیدا ہوتی ہے۔ ہر مزید برائی چھوڑنے کے بعد وہ قبولیت بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آدمی کی مکمل اصلاح ہو جاتی ہے۔ میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے۔''

اوتار سنگھ نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔'' بات تو میری سمجھ میں بھی آگئی۔''

محمود نے اوتار سنگھ کو وحی کے بارے میں بتایا۔ اوتار سنگھ کے لیے وحی کو سمجھنا اور اس تصور کو قبول کرنا فطری طور پر آسان تھا۔ سائنسی ایجادات اور دریافتوں پر غور کرتے ہوئے برسوں پہلے اس نے سوچا تھا کہ اوپر والے نے ذہن میں خیال پیدا کر کے رہنمائی کی ہو گی۔ وحی کی وضاحت سے اس کے قیاس کی تائید ہوتی تھی۔

''اچھا..... ہم ہندو تو مشرک ہیں۔ بتوں کو پوجتے ہیں۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔'' لیکن عیسائی تو اہلِ کتاب ہیں۔ تم لوگ بھی یہ کہتے ہو۔ انھیں تو ایک خدا کو ماننا چاہیے۔ مگر وہ بھی بت بناتے ہیں۔ تصویروں کو پوجتے ہیں۔''

''اسی لیے تو اللہ نے تصویروں اور بتوں کو بنانے سے منع فرمایا ہے۔'' محمود نے کہا۔

''یہ مجسمے اور تصویریں فرضی ہوں گے۔ میں نے یہ بات رچرڈ پارسن سے بھی پوچھی تھی۔ وہ برا مان گیا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ یہ تصویریں اور مجسمے بعد میں بنائے گئے ہوں گے۔ ابتدائی

زمانے میں تو یہ فنون ڈیولپ ہی نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے یہ اصلی تو نہیں ہو سکتے۔''

''نہیں اوتار سنگھ، تاریخ بتاتی ہے کہ مصوری اور بت تراشی قدیم ترین فنون میں سے ہیں۔ انسان نے بولنا بعد میں سیکھا۔ تصویر اور بت بنانا پہلے شروع کیا تھا۔ اہمیت اس بات کی نہیں کہ وہ مجسمے اور تصویریں فرضی ہیں، اصلی نہیں۔ اللہ نے ان کی ممانعت اس لیے فرمائی ہے کہ شرک کا امکان پیدا ہوتا ہے اور شرک وہ گناہ ہے، جسے اللہ بھی معاف نہیں کرتا۔''

''کبھی بھی نہیں، کسی بھی صورت میں نہیں؟'' اوتار سنگھ کی آواز میں لرزش تھی۔

محمود نے چونک کر اسے دیکھا اور فوراً ہی بات سمجھ گیا۔'' مطلب یہ ہے کہ جو ایمان لے آیا، اس کو اللہ نے اس شرک پر معاف کر دیا جو وہ پہلے کرتا رہا۔ لیکن ایمان لانے کے بعد شرک کیا تو اس پر اسے معاف نہیں کیا جائے گا۔ اور جو مشرک جیا اور مشرک ہی مر گیا، وہ تو ہے ہی مجرم۔''

''اور یہ جو عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں.....''

''یہ تو بدترین شرک ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے کی میں ضرورت نہیں سمجھتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ اللہ نے بتایا ہے کہ وہ واحد ہے، احد ہے۔ اس کی کوئی مثال نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ نہ وہ کسی سے ہے اور نہ کوئی اس سے ہے۔ ہم اس کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں، جتنا اس نے ہمیں بتایا ہے۔ ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ ہاں اسے ہر جگہ، خود اپنے اندر محسوس کر سکتے ہیں۔''

اوتار سنگھ کو حیرت ہوئی۔ کم و بیش اس کا تصور بھی یہی تھا۔

''اب وقت کافی ہو گیا ہے اوتار سنگھ۔'' محمود نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔''اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ اس موضوع پر پھر بھی امتحانوں کے بعد بات کریں گے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر تم مذاہب کے بارے میں خاص طور پر اسلام کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو کسی عالم سے بات کرو۔ میری معلومات تو بہت محدود ہیں۔''

''تمہارا بہت شکریہ دوست۔ جو کچھ تم نے مجھے آج دیا، وہ میرے لیے بہت قیمتی ہے۔'' اوتار سنگھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔'' آؤ چلیں۔''

اوتار سنگھ محمود کو رخصت کر کے آیا تو اس کی سوچوں کو ایک نیا رخ مل چکا تھا۔

❁.....❁.....❁
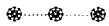
ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وصال دین نگاہیں نیچی کیے بیٹھا تھا۔ پچھلے ایک ہفتے میں ٹھاکر اس معمول کا عادی ہو چکا تھا۔ وصال دین پہلے دن دو بار اس کے پاس آیا تھا۔ ایک بار شام کے وقت اور دوسری بار رات کا کھانا کھانے کے بعد۔

پہلی بار وہ آیا تو زمین پر بیٹھ گیا۔'' اوپر بیٹھو پتر وصال دین۔'' ٹھاکر نے بڑی شفقت سے کہا۔

''نہیں ٹھاکر جی، میں یہیں ٹھیک ہوں۔'' وصال دین نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

''میں جو کہہ رہا ہوں''

''معاف کیجئے ٹھاکر جی، ابا نے مجھے یہی حکم دیا ہے۔''

ٹھاکر مسکرا دیا۔ بیٹا باپ سے آگے جا رہا تھا۔ اسے وہ رات یاد آ گئی، جب جمال دین پہلی بار اس کی خواب گاہ میں تھا۔ وصال دین اس وقت بہت چھوٹا تھا اور باپ کے ساتھ آیا تھا۔ یہ وہ رات تھی، جب ٹھاکر ان تینوں کو سوتے سے اٹھا کر اپنے ساتھ حویلی لایا تھا جب حمیدہ نے پہلی بار اوتار سنگھ کو دودھ پلایا تھا۔ جمال دین اوپر بستر پر لیٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بلکہ اس کا بس چلتا تو سوتے ہوئے وصال دین کو بھی بستر سے اٹھا کر نیچے فرش پر لٹا دیتا۔

''اور میں حکم دے رہا ہوں کہ تم اوپر بیٹھو۔'' ٹھاکر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وصال دین کشمکش میں پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ بالآخر اس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ''آج معاف کر دیجئے۔ کل میں ابا سے پوچھ کر آؤں گا۔''

ٹھاکر کو اس کی عقل مندی پر ہنسی آ گئی۔ تاہم اس نے خود کو بڑی مشکل سے روکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں ابھی جا کر جمال دین سے شکایت کرتا ہوں کہ وصال دین میرا حکم ماننے سے انکار کر رہا ہے۔''

''ایسا نہ کریں ٹھاکر جی۔'' وصال دین بھی گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھا جی، میں بیٹھ جاتا ہوں۔'' وہ کرسی پر بیٹھا کیا، بس ٹک گیا۔ انداز ایسا تھا کہ کسی بھی لمحے اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوگا۔ نگاہیں اس کی اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

ٹھاکر بھی بیٹھ گیا اور غور سے اسے دیکھتا رہا۔ ''دیکھ وصال دین، جیسے اوتار سنگھ میرا پتر ہے، ویسے ہی تو بھی ہے۔ میں تجھے اپنا بیٹا ہی سمجھتا ہوں۔''

''یہ تو آپ کی بڑائی ہے ٹھاکر جی۔''

''اچھا یہ بتا، تعلیم نے تجھے یہ نہیں سکھایا کہ سب انسان برابر ہوتے ہیں۔''

''تعلیم تو اچھی چیز ہے ٹھاکر جی۔ ادب لحاظ ختم نہیں کرتی۔ اور ٹھاکر جی، عزت سب کی ایک جیسی نہیں ہوتی۔ کسی کو اللہ نے زیادہ عزت دی ہے اور کسی کو کم۔ اور پھر ماں باپ کا حکم ماننا تو ضروری ہے۔ تعلیم بھی یہی سکھاتی ہے۔''

ٹھاکر کو اپنے بیٹے کا خیال آ گیا۔ کیا وہ بھی ایسا ہی ہے۔ باپ کا حکم ماننے والا۔ میرے اندر جو تبدیلی آئی ہے، کیا اوتار سنگھ اسے قبول کرے گا؟ کیا وہ خود بھی اپنے اندر وہ تبدیلی لائے گا؟ ان سوالوں کا جواب تو وقت ہی دے سکتا تھا۔ اور ٹھاکر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بیٹے کو اپنی تبدیلی کے بارے میں بتانے کو بے تاب تھا۔ مگر وہ بیٹے کے اختلاف کے امکان سے ڈر بھی رہا تھا۔ اگر اس نے اختلاف کیا تو کیا ہوگا؟ وہ تو بہت بڑی آزمائش ہوگی اس کے لیے۔

ٹھاکر نے اس سے پہلے نہ تو وصال دین کو کبھی بہت غور سے دیکھا تھا، نہ ہی اس کے ساتھ

کبھی اتنا وقت گزارنے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اسے بہت قریب سے دیکھ رہا تھا۔

پہلے دن ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ بیٹا باپ سے بہت آگے ہے۔ جمال دین بہت کم گو تھا۔ لیکن وصال دین سے موازنہ کرتے ہوئے اسے بڑی آسانی سے باتونی قرار دیا جا سکتا تھا۔ وہ تو بولتا ہی نہیں تھا۔ سوال کیا جاتا تو مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔ ایک فرق تھا۔ جمال دین کی نظریں اس کے سامنے ہمیشہ جھکی رہتی تھیں۔ جبکہ وصال دین کی موجودگی میں اسے دیکھے جانے کا احساس مسلسل ہو رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ نظریں اسے اپنے وجود میں چبھتی ہوئی محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔ بلکہ اسے سہلائے جانے کا۔ گدگدی کا احساس دلا رہی تھیں۔ وہ ناگوار ہرگز نہیں تھیں۔

کئی بار ٹھاکر نے اچانک نظریں اٹھا کر وصال دین کو دیکھا۔ مگر وصال دین کو بدستور فرش کی طرف دیکھتے پایا۔ اسے خود بھی شبہ ہونے لگا کہ دیکھے جانے کا احساس محض اس کا وہم تھا۔ لیکن نظریں ہٹانے کے بعد وہ احساس پہلے سے زیادہ توانا ہو جاتا تھا۔

دیر تک نظروں کی چوری کا معاملہ چلتا رہا۔ مگر بالآخر ایک موقعے پر نظروں کی وہ چوری پکڑی گئی۔ وصال دین کو نظریں جھکانے میں ایک ثانیے کی تاخیر ہو گئی تھی۔ ٹھاکر کو اپنی طرف متوجہ پایا تو اس نے گڑبڑا کر نظریں جھکا لیں۔

مگر ٹھاکر اسے دیکھ چکا تھا۔ اور ٹھاکر کو خوش گوار حیرت ہوئی تھی۔ اس ایک ثانیے میں اس نے وصال دین کی آنکھوں سے چھلکتی، برستی محبت دیکھ لی تھی۔ ایسی نظروں سے تو کوئی بیٹا اپنے باپ کو ہی دیکھ سکتا ہے۔

ٹھاکر کے اپنے احساسات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ اس ذرا سی دیر میں اس نے سمجھ لیا تھا کہ وصال دین کا پاس بیٹھنا اسے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اس پر اسے اوتار سنگھ جیسی ہی محبت آ رہی تھی اور اس کی موجودگی میں اوتار سنگھ کی یاد جدائی والی۔۔۔ تکلیف وہ یاد نہیں تھی۔

''پتر وصال دین، کچھ کھاؤ گے؟'' اس نے غیر معمولی شفقت سے پوچھا۔

''نہیں ٹھاکر جی، شکریہ۔'' وصال دین نے مختصر سا جواب دیا۔

''تم تکلف کرتے ہو پتر؟''

''نہیں ٹھاکر جی۔ میں گھر سے کھانا کھا کر آیا تھا۔''

اس پر ٹھاکر کو حمیدہ اور جمال دین کا خیال آ گیا۔ ایک سال بعد وہ گھر آیا تھا اور پہلے ہی دن ماں باپ کے ساتھ گزارنے کے بجائے اس کی دل جوئی کے لیے حویلی چلا آیا تھا۔ ٹھاکر جانتا تھا کہ وصال دین کے آنے میں اس کے ماں باپ کی مرضی بھی شامل ہوگی۔ وہ جانتا تھا کہ ان کی طبیعت میں کتنا ایثار ہے۔

ٹھاکر نے خود کو ان کی جگہ رکھ کر سوچا۔ اوتار سنگھ چھٹیوں میں گھر آتا تھا تو اس کا جی چاہتا

تھا کہ وہ ہر پل اس کی نظروں کے سامنے رہے اور اوتار سنگھ چھٹیوں میں گھر سے کم ہی نکلتا تھا۔ ہاں اس کی پڑھائی کی مصروفیات جاری رہتی تھیں۔ خود ٹھاکر بھی اپنے کاموں میں لگا رہتا تھا کہ زندگی یہی ہے۔ وہ اس میں خوش رہتا تھا کہ اس کا بیٹا گھر میں موجود ہے اور وہ جب چاہے، جا کر اسے دیکھ سکتا ہے۔

وہ جانتا تھا کہ حمیدہ نے اوتار سنگھ کو دودھ پلایا ہے اور وہ اس سے کتنی محبت کرتی ہے۔ لیکن اس نے کبھی اوتار سنگھ سے نہیں کہا کہ ہر روز جا کر حمیدہ سے ضرور مل آیا کرے۔

اسے شرمندگی ہونے لگی۔ جمال دین اور حمیدہ کے مقابلے میں وہ کتنا کم ظرف تھا!

''پتر وصال دین، تم حمیدہ اور جمال دین کے ساتھ وقت گزارنے کے بجائے میرے پاس چلے آئے۔ یہ تو زیادتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''نہیں ٹھاکر جی۔ پورا دن تو میں اماں اور ابا کے ساتھ رہا ہوں۔ ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا ہے۔''

''پھر بھی۔ ان کا دل تو نہیں بھرتا ہوگا تمھیں دیکھنے سے۔''

''اماں تو مجھ سے کہتی ہیں ٹھاکر جی کہ ہمارے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزارا کر۔ نہیں تو عادت ہو جائے گی۔ کہہ رہی تھیں، عادت ہو جائے تو شہر جانے کے بعد کے بہت سے دن بڑے سخت لگتے ہیں۔ بڑی مشکل سے عادت ہوتی ہے۔ وہ کہتی ہیں..... جا کہیں گھوم پھر آ وصال دین۔''

ٹھاکر اس دلیل کو جانتا تھا۔ جب اسکول جانے کے بعد اوتار سنگھ پہلی بار چھٹیوں میں گاؤں آیا تھا تو اس نے یہی سوچ کر اپنی مصروفیات اور بڑھالی تھیں کہ عادت نہ ڈالنا ہی اچھا ہے۔

تھوڑی دیر اور بیٹھنے کے بعد وصال دین پہلو بدلنے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ٹھاکر نے یہ بات بھانپ لی اور اس کی مشکل آسان کر دی۔ ''کیا بات ہے پتر وصال دین؟''

''مجھے اجازت دیں ٹھاکر جی۔ میں گھر جاؤں گا۔''

''اجازت کی کیا بات ہے پتر۔ چلے جاؤ۔''

وصال دین اٹھا۔ جاتے جاتے وہ پلٹا اور ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھاکر جی، رات کو میں آپ کے پاس آؤں تو آپ کو برا تو نہیں لگے گا؟''

''میں نے کہا نا پتر، یہ تمہارا گھر ہے۔ جب چاہو آؤ۔''

''میں رات کو کھانے کے بعد آؤں گا۔''

''کھانا یہیں کھا لینا پتر..... میرے ساتھ۔'' ٹھاکر نے بے ساختہ کہا۔ کہتے ہی اسے غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ فرماں برداری میں اگر وصال دین مان بھی گیا تو بھوکا ہی

اٹھے گا۔ وہ اس کی موجودگی میں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ کھانا کیا کھاتا۔

''وہ ٹھاکر جی جب سے آیا ہوں، ابا میرے بغیر کھانا نہیں کھاتے۔'' وصال دین کے لہجے میں معذرت تھی۔

''مجھے خیال نہیں رہا تھا پتر۔ ٹھیک ہے۔ تم کھانا کھا کر آنا۔''

وصال دین کے چہرے پر تشکر کا تاثر بے حد واضح تھا۔ پھر وہ پلٹا اور کمرے سے نکل گیا۔

رات کو وہ پھر آیا اور اسی طرح نظریں جھکا کر بیٹھ گیا۔ ٹھاکر کے لیے وہ مطالعے کا وقت تھا۔ وہ بیٹھا پڑھتا رہا۔ اسے بداخلاقی کا احساس ہو رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ وصال دین بات کرنے والا ہے ہی نہیں۔ وہ صرف اس کے سوالوں کا جواب دے گا۔ اور سوال وہ کتنے کر سکتا ہے۔ اصل میں ان کے درمیان مشترک کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ بات کیا کرتے۔

پھر بھی بداخلاقی کے احساس کو کم کرنے کے لیے ٹھاکر نے کئی بار اس سے چائے شربت کا پوچھا۔ مگر وصال دین نے ہر بار یہی کہا کہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ ضرورت ہوئی تو وہ خود مانگ لے گا۔

یوں وہ قربت ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو بوجھل لگنے لگی۔ اس حد تک کہ مطالعے میں بھی اس کا انہماک متاثر ہونے لگا۔ بلکہ ایسا ہوا کہ آخر میں جو وہ پڑھ رہا تھا، وہ اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا۔

بالآخر اس نے کتاب بند کر کے رکھ دی۔ بات کرنے کو اوتار سنگھ کے سوا کوئی موضوع نہیں تھا۔ چنانچہ وہ وصال دین سے اوتار سنگھ کے بارے میں پوچھنے لگا۔ وہ کیا کرتا ہے..... کیا مصروفیات ہیں..... صحت کیسی ہے..... کھانے پینے کا خیال رکھتا ہے یا نہیں۔

یہ ایک موضوع تھا، جس پر وصال دین اعتماد سے بات کر سکتا تھا۔ اوتار سنگھ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے لہجے سے محبت چھلک رہی تھی۔ اس کے انداز میں وہ اپنائیت تھی، جو کسی بہت محبوب ہستی کے لیے ہوتی ہے۔

کچھ دیر گزری اور پھر وہی خاموشی۔ لیکن اتنی سی گفتگو ٹھاکر کو بتا گئی کہ وصال دین اوتار سنگھ کو کتنا چاہتا ہے۔

مزید کچھ دیر گزری تو ٹھاکر کو خیال آیا کہ کہیں وصال دین گھر جانے کے لیے اس کے حکم کا انتظار تو نہیں کر رہا ہے۔ کیونکہ رات کافی ہو چکی تھی۔

بات بہت نازک تھی۔ ٹھاکر کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وصال دین کی دل آزاری ہو۔ اس نے لہجے میں دنیا جہان کی نرمی سموتے ہوئے کہا۔ ''پتر وصال دین، رات بہت ہو گئی ہے۔ حمیدہ اور جمال دین تمھارے انتظار میں جاگ رہے ہوں گے۔''

''جب تک آپ جاگ رہے ہیں، میں کیسے جا سکتا ہوں۔'' وصال دین نے جواب دیا۔

ٹھاکر کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ اس کے جاگنے اور وصال دین کے بیٹھے رہنے میں

اس کے نزدیک کوئی ربط نہیں تھا۔

''آپ کب سوتے ہیں ٹھاکر جی؟'' وصال دین نے اچانک پوچھا۔

''میرا کیا پتا ہے پتر۔ کوئی وقت نہیں ہے سونے کا۔ پر آج کل نیند آ جاتی ہے۔ پہلے تو رات رات بھر جاگتا تھا۔'' ٹھاکر نے جواب دیا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اسے وصال دین کو گھر بھیجنا ہے۔ ''پتر...... اب تم گھر جاؤ۔''

''آپ سوئیں گے تو میں گھر جاؤں گا ٹھاکر جی۔''

''کیوں پتر؟''

''مجھے آپ کے پاؤں دبانے ہیں۔''

ٹھاکر کا دماغ جیسے بھک سے اُڑ گیا۔ ''یہ اوتار سنگھ نے کہا ہے تم سے؟''

''جی ہاں۔'' وصال دین نے کہا۔ پھر جلدی سے وضاحت کی۔ ''بھائی نے ...... میرا مطلب ہے چھوٹے ٹھاکر نے چلتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ کا خیال رکھوں۔ لیکن میں اس سے بھی پہلے یہ سب سوچ چکا تھا۔ میری چھٹیاں پہلے ہو رہی تھیں اور چھوٹے ٹھاکر کی بعد میں۔ پہلے تو میں آنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر نے زبردستی مجھے بھیجا۔ ورنہ میں انھیں چھوڑ کر کبھی نہ آتا۔ پھر میں نے سوچا کہ چھوٹے ٹھاکر ہر رات آپ کے پاؤں دباتے تھے۔ اب میں دباؤں گا......''

ٹھاکر حیرت سے گنگ تھا۔ اس نے سب کچھ سنا تھا۔ وہ بھی جو کہا گیا اور وہ بھی جو نہیں کہا گیا۔ وصال دین اوتار سنگھ کو بھائی کہنے کا عادی تھا۔ یہ اس کے لیے انکشاف تھا۔ پھر وصال دین نے اس کے لحاظ میں جلدی سے بھائی کو چھوٹے ٹھاکر بنا دیا تھا اور وصال دین کا یہ کہنا کہ وہ اکیلا آنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ یعنی وہ اوتار سنگھ کو اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اوتار سنگھ نے زبردستی اسے بھیجا تھا اور کہا تھا کہ پتا جی کا خیال رکھنا۔ پھر وصال دین نے یہ بھی بتا دیا کہ اوتار سنگھ نے صرف اسے پتا جی کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ یہ خیال کس طرح رکھا جائے، یہ فیصلہ وصال دین کا اپنا تھا۔

اس وقت ٹھاکر تک وصال دین کی اپنے لیے اور اپنے بیٹے کے لیے بے پایاں محبت بہ کمال و تمام پہنچ گئی تھی۔ اور وہ ایسی محبت تھی کہ خود پر قابو رکھنے والے راجپوت کی آنکھیں تو نہیں بھیگیں۔ لیکن اسے اپنے سینے میں دل پگھل کر سیال بنتا ضرور محسوس ہوا۔

''تمھیں کیسے پتا کہ تمھارا بھائی اوتار سنگھ میرے پاؤں دباتا تھا؟'' اس نے لفظ بھائی پر خاص طور پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وصال دین نے بھی بے ساختہ جواب دیا۔ ''یہ بات تو بھائی نے خود مجھے بتائی تھی ...... بہت پہلے۔'' اور اس بار وصال دین کو احساس بھی نہیں ہوا کہ اس نے ٹھاکر جی کے سامنے ان کے بیٹے کو بھائی کہا ہے۔

''مگر بھائی نے تمھیں یہ تو نہیں کہا تھا کہ ہر رات میرے پاؤں دبانا۔''

''جی یہ تو نہیں کہا تھا۔ لیکن میں نے خود سوچ لیا تھا کہ یہ ضرور کروں گا۔''

اس لمحے ٹھاکر کو احساس ہوا کہ گاؤں کے اس مسلمان گھرانے نے راجپوت پتھر میں جونک لگا دی ہے۔ وہ بہت نرم دل ہو گیا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ابھی وہ منع کر دے کہ مجھے پاؤں نہیں دبوانے، تو وصال دین چوں بھی نہیں کرے گا۔ وہ اسے جانے کا حکم دے گا تو وہ فوراً واپس چلا جائے گا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وصال دین کا دل دکھے گا۔ وہ ایک بڑی خوشی سے محروم ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے کہا۔ ''چلو وصال دین۔''

وہ وصال دین کو اپنے ساتھ اپنے خاص کمرے میں لے گیا۔ وہاں پہنچ کر بلا ارادہ اس نے اپنی ڈائری نکالی اور قلم کھولا۔ اگلے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ وصال دین کی موجودگی میں ڈائری لکھنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اب وہ کیا کرے؟

آخر اس نے ڈائری کو واپس رکھ دیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ وصال دین اس کے پاؤں دبانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کسمسایا۔ ''وصال دین، اب تم جاؤ۔''

''آپ سو جائیں گے تو میں چلا جاؤں گا۔''

اب ٹھاکر کو سوچنا پڑا۔ وصال دین کی دل جوئی اپنی جگہ۔ لیکن اس مروت میں اس کا اور جمال دین کا...... دونوں کا نقصان تھا۔ آج وصال دین نے اس کے ساتھ کم از کم چار پانچ گھنٹے گزارے تھے۔ اس کا مطالعہ گیا، اس کا ڈائری لکھنا گیا۔ دوسری طرف وصال دین کو اس تمام وقت میں کوفت کے سوا کیا ملا ہوگا...... سوائے اس وقت کے۔ پاؤں دباتے ہوئے اسے کچھ کرنے کا احساس ہوا ہوگا۔ کچھ خوشی ملی ہوگی۔ ورنہ دو افراد خاموش بیٹھے رہیں۔ ان کے درمیان بات کرنے کو کچھ بھی نہ ہو تو ایسی قربت بوجھ ہی ہوتی ہے۔ یہ تو دونوں کا نقصان ہے۔

وہ سوچتا رہا کہ اس سے بچنے کے لیے کیا کرے۔ بالآخر اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وصال دین کے لیے صرف اتنا کافی تھا کہ اسے پاؤں دبانے کا موقع مل جائے۔ باقی قربت کا بوجھ اس پر سے اتار دیا جائے تو وہ زیادہ خوش رہے گا۔

''سنو وصال دین۔'' اس نے پکارا۔

وصال دین اس کے پاؤں دباتا رہا۔ ''جی ٹھاکر جی۔''

''دراصل میں بہت مصروف ہوتا ہوں۔ تم ایسا کرو، بس ایک وقت آیا کرو۔ رات کو نو بجے آیا کرو۔''

''جی...... بہت بہتر۔''

''تمھیں برا تو نہیں لگا وصال دین۔''

"نہیں ٹھاکر جی۔ آپ کا حکم ماننے میں تو خوشی ہے۔"

ٹھاکر مطمئن ہو گیا۔ اب اسے پاؤں دبانے کے اس دورانیے کو مختصر کرنا تھا۔ اس کی واحد صورت یہ تھی کہ وہ سوتا بن جائے کیونکہ نیند آنی تو آسان نہیں تھی۔ وصال دین کو یقین ہو گیا کہ وہ سو رہا ہے تو وہ چلا جائے گا۔ پھر وہ اٹھ کر ڈائری لکھے گا۔ اس نے اٹھ کر اوتار سنگھ کا تکیہ لیا اور اسے لپٹا کر لیٹ گیا۔

لیکن وصال دین اس کے پاؤں دباتا رہا۔ نجانے کیسے...... مگر اسے معلوم تھا کہ وہ سویا نہیں ہے۔

اب کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ٹھاکر نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ پھر پتا نہیں کیسے... بہرحال تھوڑی دیر میں وہ گہری نیند سو گیا۔

آنکھ کھلی تو صبح ہو رہی تھی۔ وصال دین کب گیا، اسے معلوم نہیں تھا۔ بس وہ یہ جانتا تھا کہ اس نے بہت اچھی نیند لی ہے اور تازہ دم بیدار ہوا ہے۔ اور یہ کہ رات اس نے ڈائری نہیں لکھی تھی۔

اس روز ٹھاکر نے اپنے کچھ معمولات بدلے۔ رات کا کھانا وہ سات بجے کھا لیتا تھا۔ اس معمول میں تبدیلی ممکن نہیں تھی۔ البتہ معمول کے مطالعے کے لیے وہ پانچ بجے بیٹھ گیا۔ کھانے کے بعد اس نے چہل قدمی کی۔ پھر اپنی خواب گاہ میں جا کر ڈائری لکھی اور واپس آ گیا۔

نو بجے وصال دین آیا تو وہ مطالعہ کر رہا تھا حالانکہ اصل مطالعہ تو وہ کر چکا تھا۔ اس نے پندرہ بیس منٹ وصال دین کو اپنے سامنے بیٹھنے کا موقع دیا۔ پھر وہ ایک جماہی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو وصال دین، اب میں سوؤں گا۔" اس نے کہا۔

اپنے کمرے میں وہ اوتار سنگھ کے تکیے کو سینے سے لگا کر لیٹ گیا۔ وصال دین اس کے پاؤں دبانے لگا۔ اس رات کیونکہ وہ ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس لیے ذرا ہی دیر میں اسے نیند آ گئی۔

سو اب یہی اس کا معمول تھا۔ اس نے کتاب بند کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو وصال دین، اب مجھے نیند آ رہی ہے۔"

❀.....❀.....❀

جس روز محمود ریاضی پڑھنے آیا تھا، اس دن کے بعد اوتار سنگھ کا دل پڑھائی میں نہیں لگا۔ اس روز اس کے اندر ایسی خوشی، ایسا دبا دبا ہیجان تھا، جیسے اسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ کسی چیز میں دل نہیں لگ رہا تھا۔

وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ کیفیت کیا ہے۔ اس کی سمجھ میں بس اتنا آیا کہ وہ جس مہان ہستی کی برسوں سے جستجو کر رہا تھا، اب اسے پانے کے بہت قریب پہنچ گیا ہے۔ یہ یقین اسے کیوں ہوا، یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ بس وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اب وہ اسے مل جائے گا اور پھر وہ اس سے وہ محبت کر سکے گا، جو کرنی چاہیے۔ جو وہ برسوں سے کرنی چاہتا ہے۔

اس شام مولوی صاحب نہیں آئے۔ انھوں نے کہہ دیا تھا کہ امتحان کے عرصے میں وہ اسے پڑھانے نہیں آئیں گے۔

"اور چھٹیاں ہوتے ہی میں گاؤں چلا جاؤں گا۔" اوتار سنگھ نے کہا۔

مولوی صاحب نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم اس بار بھی چھٹیوں میں مجھ سے پڑھنا چاہتے ہو؟"

"جی مولوی صاحب۔" وہ بولا۔ "تو آپ میرے ساتھ ہی گاؤں چلے چلیں۔"

مولوی صاحب اسکول میں پڑھاتے تھے اور اسکول میں چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ "تم گاؤں کب جاؤ گے؟" انھوں نے پوچھا۔

"18 تاریخ کو میرا آخری پرچا ہے۔ میں 19 تاریخ کو گاؤں چلا جاؤں گا۔"

"تو تم چلے جانا۔ مجھے 19 تاریخ کو اپنی بھتیجی کی شادی میں شرکت کرنی ہے۔ میں 20 تاریخ کو خود گاؤں پہنچ جاؤں گا۔"

یہ بات طے ہو چکی تھی۔ مگر اب شام ہوئی تو اوتار سنگھ مولوی صاحب کو مس کرنے لگا۔ وصال دین بھی نہیں تھا۔ اسے بڑی شدت سے تنہائی کا احساس ہو رہا تھا۔ آخر وہ اٹھا اور کوٹھے پر چلا گیا۔

وہاں بیٹھ کر وہ محمود سے حاصل ہونے والی معلومات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے لگ رہا تھا کہ کسی نادیدہ قوت نے اسے درست راستے کی طرف لگا دیا ہے۔ اس کا پہلا قدم صحیح راستے پر اٹھ گیا ہے۔

ایک تو یہ نام اللہ اسے بہت اچھا لگا تھا۔ وہ اسے نیا نہیں لگا۔ ایسا تھا جیسے وہ پہلے سے اس کے اندر موجود رہا ہو۔ بلکہ اب تو اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس مہان ہستی کو اسی نام سے پکارے گا، اسی نام سے سوچے گا۔

محمود سے گفتگو کر کے اس کی ایک بڑی خلش دور ہو گئی۔ شرک کے مفہوم کو بہت گہرائی میں تو نہیں، لیکن ایک اہم پہلو اور زاویے سے اس نے سمجھ لیا۔ وہ تو خود سوچتا تھا کہ اللہ کا کوئی بیٹا، کوئی رشتے دار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کے اندر موجود کوئی کہتا تھا کہ اس جیسا کوئی نہیں ہو سکتا۔ ورنہ بیٹا کسی حد تک تو باپ جیسا ہوتا ہے۔ محمود نے بتایا کہ اللہ واحد اور احد ہے۔ اب اتنی عربی تو وہ سمجھتا تھا کہ واحد ہونا اس بات کی ضمانت نہیں کہ جسے واحد کہا جا رہا ہے، اس جیسا کہیں کوئی اور نہیں ہے۔ لیکن احد ہونا اس بات کا ضامن ہے۔

دوسری بات جو اس کی سمجھ میں آئی، وہ پاکی اور ناپاکی کے حوالے سے تھی۔ محمود نے بتایا تھا کہ کلمۂ طیبہ ہر ناپاکی کو دور کرتا ہے، خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی۔ یہ بات بھی اوتار سنگھ کی سمجھ میں اپنے اندر سے آتی تھی۔ اپنے باطن میں وہ ایسے کسی کلمے کی ضرورت پہلے سے محسوس کرتا تھا۔ رفع حاجت کے بعد صابن سے خوب رگڑ رگڑ کر ہاتھ دھونے کے بعد بھی اس کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔

اسے گندگی کا احساس ستاتا رہتا تھا۔ یہ کلمہ اسے کیا ملا، بہت بڑا خزانہ مل گیا۔ اس نے سوچ لیا کہ اب اپنے ہاتھ کیا، پورے جسم کو اس کلمے کی برکت سے پاک کیا کرے گا۔ یہ سوچتے ہوئے اسے خیال آیا کہ آدمی کے اندر اس کی بے خبری میں بھی تو ناپاکی ہو سکتی ہے۔ یہ کلمہ تو اس ناپاکی کو بھی دور کر دے گا۔

البتہ آسمانی کتابوں کے بارے میں وہ الجھن میں تھا۔ وحی کا تصور تو اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ بلکہ وحی پر اسے سنتے ہی یقین آ گیا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ پہلے کون سی کتاب پڑھے۔ محمود نے قرآن کا تذکرہ کیا تھا۔ لیکن اس کے بارے میں زیادہ تفصیل سے بات نہیں کی تھی۔ ہاں اس نے ایک بہت اہم بات کہی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ پیغمبر حضرت محمد ﷺ روئے زمین پر آنے والے اللہ کے آخری پیغمبر ہیں اور قرآن اللہ کی آخری کتاب ہے۔ کیونکہ دین مکمل کر دیا گیا ہے۔ اس بات کی اہمیت وہ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ بہرحال اتنا وہ سمجھ گیا تھا کہ کسی بھی کتاب کا آخری ایڈیشن ہی مکمل ترین ہوتا ہے۔ جو کچھ پہلے ایڈیشنز میں رہ گیا ہوتا ہے، وہ آخری ایڈیشن میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اسے قرآن ہی پڑھنا چاہیے تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اسے ڈر لگنے لگا۔ جس نے زمین آسمان، چاند، سورج، ستارے بنائے ہیں۔ نباتات اگائی ہیں۔ پورا نظام قائم کیا ہے۔ اس کا کلام کیسا ہو گا! یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی کی رہنمائی کے بغیر اسے پڑھ سکے۔ اور اللہ پاک ہے تو اس کا کلام بھی پاک ہو گا۔ اسے پڑھنے کے لیے ناپاکی دور کرنے کے علاوہ بھی کچھ شرائط ہوں گی۔ کون جانے، وہ ان شرائط پر پورا اترتا بھی ہے یا نہیں۔ اس پر ایسا خوف طاری ہوا کہ اس کا جسم بری طرح لرزنے لگا۔ اور اس خوف سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ خوف بے سبب نہیں۔ یہ بھی اللہ کی طرف سے ہے اور تنبیہہ ہے کہ وہ بغیر اہلیت حاصل کیے اس کا کلام پڑھنے کی کوشش نہ کرے۔

اس لمحے اوتار سنگھ نے فیصلہ کر لیا کہ ابھی وہ قرآن نہیں پڑھے گا۔ حالانکہ یہ ناممکن نہیں تھا۔ وہ قرآن حاصل بھی کر سکتا تھا اور پڑھ بھی سکتا تھا۔ لیکن اس کے اندر سے اشارہ موصول ہو رہا تھا کہ ابھی اسے اس کی اجازت نہیں۔ ہاں ابھی وہ کلمۂ طیبہ سے استفادہ کر کے خود کو پاک کرنے کی پیہم کوشش کرتا رہے گا۔

ان فیصلوں کے بعد اس کے اندر ایسی طمانیت اُبھری، جو اس کے لیے بالکل نیا تجربہ تھی۔ اس کے نزدیک وہ بھی ایک اشارہ تھا۔ اللہ اس کے فیصلوں کی تائید کر رہا تھا۔۔۔۔ اسے بتا رہا تھا کہ اس نے درست فیصلے کیے ہیں۔

''مالک۔۔۔۔ چھوٹے ٹھاکر!'' رنجنا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ''کیا بات ہے رنجنا؟''

''رات ہو گئی ہے مالک۔ بھوجن کر لیں۔''

اس لمحے اوتار سنگھ کو شدت سے وصال دین یاد آیا۔ جس روز وہ نیچے والی کی آواز سن کر بے خود ہوا تھا، وصال دین نے ہی آ کر اسے چونکایا تھا۔ وہ اداس ہو گیا۔ آج وصال دین اس کے ساتھ نہیں ہے۔ ''چلو۔۔۔۔ میں آتا ہوں۔''

رنجنا چلی گئی۔ وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ زینے سے اترتے ہوئے اسے محمود کی ایک اور بات یاد آئی۔ محمود نے کہا تھا کہ اسلام کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو کسی عالم سے بات کرو۔ مولوی صاحب یقیناً عالم ہیں۔ اس نے سوچا۔ اب میں ان سے معلومات حاصل کروں گا۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ اوپر کچھ اور فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب وہ مولوی برکت علی کی آواز کبھی نہیں سن سکے گا!

❁....❁....❁

کانتی پرشاد جی کھانا کھا کر اُٹھ گئے۔ اوتار سنگھ نے رنجنا سے پوچھا۔ ''دوپہر والا کھانا بچا ہے؟''

''جی مالک۔۔۔۔ لاؤں؟''

''ہاں لاؤ۔''

رنجنا شامی کباب اور کوفتے لے آئی۔ ''میٹھا بعد میں دوں گی چھوٹے ٹھاکر۔''

اوتار سنگھ کو وہ کھانا اب بھی اچھا لگ رہا تھا۔ ''کیسا لگا چھوٹے ٹھاکر؟'' رنجنا نے اس سے پوچھا۔

''بہت اچھا۔۔۔۔ بہت مزے دار۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''ان کا میری طرف سے شکریہ ادا کر دینا۔''

''موسی بول رہی تھیں، یہ تو تم لوگوں کا حق ہے۔ تم ہمارے مہمان بھی ہو اور پڑوسی بھی۔''

''بڑی محنت کی ہو گی بوا نے۔''

''بوا نے؟ ہر چیز حور بانو نے اپنے ہاتھوں سے بنائی تھی چھوٹے ٹھاکر۔''

''حور بانو کون ہے؟''

''سب سے بڑی بہن۔''

اب اوتار سنگھ اس سے زیادہ کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ تین بہنیں ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جس آواز سے اسے محبت ہوئی ہے، وہ کس کی تھی۔

اور کچھ ہوا نہ ہوا، اسے سوچنے کے لیے بہت کچھ مل گیا۔۔۔۔ اور وہ بھی خوش امیدی ابھارنے والا۔ رنجنا اسے بتاتی تھی کہ نیچے کھانا پکانا بوا کی ذمے داری ہے یا گھر کی مالکن کی۔ لڑکیاں کھانا پکانے میں دلچسپی نہیں لیتیں۔ اس اعتبار سے یہ غیر معمولی بات تھی کہ اس کی طرف سے فرمائش ہونے پر ایک ایسی لڑکی، جسے کھانا پکانے میں کوئی دلچسپی نہ ہو، اکیلی اتنی محنت کرے اور کئی طرح کے کھانے تیار کرے۔ اس کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟ یہ کہ وہ اس میں دلچسپی لیتی ہو؟ اس سے

محبت کرنے لگی ہو؟

اوتار سنگھ نے خود کو ٹوکا۔ یہ خیال خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایسی کوئی وجہ سامنے نہیں ہے کہ نیچے رہنے والی کسی لڑکی کو اس سے محبت ہو جائے۔ نہ اس نے ان میں سے کسی کو دیکھا ہے۔ نہ ان میں سے کسی نے اسے دیکھا ہے۔

لیکن بنیادی طور پر اوتار سنگھ کا محبت کا تصور حقیقی بالکل نہیں تھا۔ بلکہ یکسر افسانوی تھا۔ خوش فہمی والی تنبیہہ اس کے حلق سے کیسے اُتر سکتی تھی۔ اسے خود بھی تو ایسے ہی...... ناقابل یقین انداز میں محبت ہوئی تھی...... صرف آواز سن کر۔ اسے جس سے محبت تھی، اس نے آج تک اسے دیکھا نہیں تھا۔ تو ایسی محبت کسی اور کو بھی اس سے ہو سکتی ہے۔

اور اوتار سنگھ محبت کو آسمانی جذبہ سمجھتا تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ اوپر والا خود کسی کے دل میں کسی کی محبت ڈالتا ہے۔ یہ ایسی دلیل تھی، جس کا خوش فہمی کی تنبیہہ کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

چنانچہ اوتار سنگھ نے اس گمان کو قبول کر لیا۔ اس کے نتیجے میں پہلی بار اسے ایسی سرشاری ملی، جس نے اسے بے خود کر دیا۔ سرشار تو وہ اپنی یک طرفہ محبت میں بھی تھا۔ مگر دو طرفہ محبت کے تصور کا تو لطف ہی اور تھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ امتحانوں کی فکر رہی نہ پڑھائی کی لگن۔ خوش قسمتی یہ تھی کہ وہ سارا سال پوری لگن کے ساتھ محنت کرنے والا تھا۔ اس لیے نقصان کا احتمال نہیں تھا۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ۔ مگر پاکی کا تصور اس کے ذہن پر چھا چکا تھا۔ رفع حاجت کا تو معاملہ ہی اور تھا۔ اس میں تو ہاتھ پاک کرنا لازم تھا۔ وہ تو عام حالات میں بھی ہاتھ دھوتا تو کلمہ طیبہ پڑھتا۔ منہ دھوتا تو بھی کلمہ پڑھتا۔ نہاتا تو بھی کلمہ پڑھتا اور کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے اسے خیال آتا کہ اسے تو معلوم ہی نہیں کہ اس کے وجود کی کون سی کوٹھری میں، کون سے گوشے میں ناپاکی گھسی ہوئی ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ دل کی گہرائیوں سے کلمۂ طیبہ مسلسل پڑھنا شروع کر دیتا۔ پڑھتا ہی چلا جاتا۔ یہاں تک کہ اسے احساس ہونے لگتا کہ وہ بہت ہلکا پھلکا اور اندر سے بہت صاف ستھرا ہو گیا ہے۔

اور دن میں کئی بار وہ آسمان کی طرف سر اٹھا کر پکارتا۔ ''اے اللہ، تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے اپنا راستہ دکھایا۔ اپنی طرف بلایا۔ اے اللہ، اب مجھے چھوڑ نہ دینا۔ مجھے سیدھا راستہ دکھاتے رہنا۔ گمراہ نہ ہونے دینا مجھے۔''

پہلے وہ ایک اَن دیکھی ہستی کو بغیر اس کا نام جانے پکارتا تھا۔ مگر اب یہ نام اللہ اس کے وجود کی، دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتر گیا تھا...... اسے بھا گیا تھا۔ اب وہ اسے اسی نام سے پکارتا تھا۔

❁......❁......❁

کتابِ سوم

نصف النہار
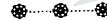
امتحان شروع ہو گئے۔ ایک دن پرچا ختم ہونے کے بعد اوتار سنگھ اور ارجن ایک ساتھ باہر آئے۔ ارجن اوتار سنگھ کا کلاس فیلو تھا اور جے پور میں رہتا تھا۔ اوتار سنگھ کی اس سے اچھی خاصی علیک سلیک تھی۔

''امتحان کے بعد کیا ارادہ ہے؟'' ارجن نے پوچھا۔

''گاؤں چلا جاؤں گا۔''

''تو میرے ساتھ جے پور ہوتے ہوئے جاؤ۔''

اوتار سنگھ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''کیوں..... کوئی خاص بات ہے؟''

''بڑا میلہ شروع ہونے والا ہے نا۔''

اوتار سنگھ کو یاد آیا۔ کیدو چاچا پچھلے سال اسے میلے میں لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے منع کر دیا تھا۔ اس وقت اس کا جی چاہنے لگا۔ کیوں نہ وہ میلہ دیکھ کر گاؤں جائے۔ ماسٹر جی کو رگھو اور رنجنا کے ساتھ گاؤں بھیج دیا جائے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اوتار سنگھ اب پوری آزادی اور خودمختاری کے ساتھ نقل و حرکت کرنا چاہتا تھا۔ یہ کیا کہ ویرجی کی طرح ہو کہ وہ اکیلے گاؤں بھی نہیں جا سکتے۔

پھر اسے ایک خیال اور آ گیا۔ تاج محل کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا اس نے اور اسے تاج محل دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ تاج محل، جسے دنیا میں محبت کی سب سے بڑی نشانی قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے سوچا، کالج میں پہنچنے کے بعد آدمی کی عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے ثبوت کے طور پر اور اپنا اعتماد بڑھانے کے لیے وہ اکیلا میلہ دیکھنے جے پور جا سکتا ہے۔ تو لگے ہاتھوں تاج محل کیوں نہ دیکھ لے۔

''تمھارے جے پور سے آگرہ کتنی دور ہے؟'' اس نے ارجن سے پوچھا۔

''تھوڑی ہی دور ہے۔ بلکہ بہت قریب کہو'' ارجن نے جواب دیا۔ پھر وہ مسکرایا۔

''تاج محل دیکھنے کا ارادہ ہے؟''

''ہاں۔''

''تو ٹھیک ہے۔ جے پور سے آگرہ چلے جانا۔''

اوتار سنگھ نے اپنے دل میں یہ پروگرام طے کر لیا۔

اترا نہ اے حباب تو اپنے عروج پر
سورج کی آب و تاب کبھی دوپہر کو دیکھ

لیکن آخری پرچے سے دو دن پہلے ماسٹر جی کی طبیعت بہت خراب ہوگئی۔ انھیں بہت تیز بخار تھا اور الٹیاں بھی لگ گئی تھیں۔ اوتار سنگھ انھیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

''بخار ایک دم نہیں اترے گا۔ وقت لگے گا۔'' ڈاکٹر نے ماسٹر جی کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ ''دوا میں دے رہا ہوں۔ کمزوری بہت ہو جائے گی۔ انھیں کم از کم دو ہفتے مکمل آرام کی ضرورت ہے۔''

اوتار سنگھ ماسٹر جی اور رگھو کو اپنے پروگرام کے متعلق پہلے ہی بتا چکا تھا۔ لیکن اب ماسٹر جی کو اس حال میں چھوڑ کر جانے کو اس کا دل نہیں مانتا تھا۔

''تم اپنا پروگرام خراب مت کرو۔'' ماسٹر جی نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔ ''کوئی بڑی پریشانی کی بات نہیں۔ طبیعت سنبھلے گی تو میں رگھو کے ساتھ گاؤں آ جاؤں گا۔ ویسے بھی تو مجھے ان کے ساتھ ہی آنا تھا۔''

''لیکن ماسٹر جی، آپ کو اس حال میں......''

ماسٹر جی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میرا خیال رکھنے کو رگھو اور رنجنا یہاں ہیں نا۔''

''ہاں چھوٹے مالک، آپ چنتا نہ کرو۔'' رگھو بولا۔

مگر استاد کا معاملہ تھا۔ اوتار سنگھ کا دل نہیں مانتا تھا۔ ماسٹر جی اور رگھو کے پیہم اصرار پر وہ جانے کے لیے راضی تو ہوگیا۔ لیکن اس سے پہلے اس نے ڈاکٹر سے تفصیلی بات کی۔ اس سے ماسٹر جی کے ٹھیک ہونے تک ہر روز گھر پر آ کر انھیں دیکھنے کا وعدہ لیا اور پیشگی فیس ادا کر دی۔ پھر اس نے ماسٹر جی کو بھی کچھ رقم دی اور رگھو کو بھی۔ اس کے باوجود اسے یہ احساس ستا رہا تھا کہ وہ کڑے وقت میں انھیں اکیلا چھوڑ کر جا رہا ہے۔

بہرحال اب وہ جے پور جانے کے لیے تیار تھا!

❁......❁......❁

سہ پہر کے وقت وہ جے پور پہنچ گئے۔ ارجن اوتار سنگھ سے اپنے گھر چلنے پر اصرار کر رہا تھا۔ لیکن اوتار سنگھ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔

''پھر کبھی کچھ دن کے لیے آؤں گا تو تمھارے ہاں رکوں گا۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''تو آج کہاں قیام کرو گے؟''

''کیوں، تمھارے شہر میں ہوٹل نہیں ہیں؟'' اوتار سنگھ نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔

''کیوں نہیں۔ ہر طرح کے ہوٹل ہیں۔ آؤ، تمھیں لے چلوں۔''

اوتار سنگھ کے لیے ہوٹل کی کوالٹی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اسے تو بس رات گزارنی تھی......اور رات کیا، رات کے بھی صرف چند گھنٹے۔ صبح ہی اس کا ارادہ آگرہ کے لیے نکلنے کا تھا۔

ارجن اسے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ وہاں اس نے کمرا لیا۔ ارجن دو گھنٹے بعد آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ اوتار سنگھ نہانے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ اس نے سامان رکھتے ہی کپڑے نکالے اور باتھ روم میں گھس گیا۔

نہاتے ہی اسے بھوک لگنے لگی۔ حالانکہ دوپہر کا کھانا وہ کھا چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ کمرے میں ہی چائے کے ساتھ بسکٹ منگوا لے۔ لیکن اس نے فوراً ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ ارجن کے آنے میں ابھی کافی وقت تھا۔ وہ اس وقت سے استفادہ کر سکتا تھا۔ اس نے سوچا، کچھ دیر اِدھر اُدھر گھومے پھرے گا۔ راستے میں ہی کہیں بھوک کا سامان بھی ہو جائے گا۔

یہ سوچ کر وہ ہوٹل سے نکل آیا۔

جے پور اسے پہلی ہی نظر میں اچھا لگا تھا...... بہت اپنا اپنا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ صحراؤں کا پروردہ تھا اور جے پور صحرائی شہر تھا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی وہاں کی گرمی نے اسے گاؤں کی یاد دلائی تھی۔ گلابی شہر (Pink City) کہلانے والے اس شہر کو ایک نظر دیکھ کر ہی اسے احساس ہوگیا تھا کہ یہ ثقافت سے چھلکتا ہوا شہر ہے......رنگین ثقافت کا نمائندہ شہر!

چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر اس نے چائے کے ساتھ بسکٹ کھائے۔ پھر سب سے پہلے اس نے پوچھ پوچھ کر بس کے اڈے کا رخ کیا۔ وہاں سے اسے پتا چلا کہ آگرہ جانے والی پہلی بس صبح چھ بجے روانہ ہوتی ہے۔ وہ اس کے لیے بہت مناسب تھی۔ آگرہ میں اسے کافی وقت گزارنے کا موقع مل جاتا۔

وہاں سے وہ بازار آیا اور وہاں گھومتا پھرا۔ بازار بارونق تھا۔ دکانیں آراستہ بھی تھیں اور ہر طرح کے مال سے بھری ہوئی بھی۔ کپڑے کی دکانیں دیکھ کر وہ ٹھٹھکا۔ دہلی سے تو وہ کچھ نہیں لے سکا تھا۔ لیکن یہاں اس نے سوچ لیا کہ وہ پتاجی، اماں، چاچا جی اور ویر جی کے لیے کچھ خریدے گا۔ مگر ابھی وہ کچھ خریدنے کے ارادے سے نہیں نکلا تھا۔ اس نے سوچا، خریداری رات کو کرے گا۔

وہاں مورتیوں کی ایک بہت بڑی دکان بھی تھی۔ بھگوان، ہنومان، کالی ماتا، سرسوتی......سبھی کی مورتیاں وہاں موجود تھیں......اور ہر سائز میں بعض بت تو بہت بڑے بڑے بھی تھے۔ وہ یونہی تفریحاً دکان میں چلا گیا۔ اس نے مختلف مورتیوں کی قیمت معلوم کی۔ خریدنا تو اسے کچھ تھا نہیں۔ وہ دل میں اس مضحکہ خیز تصور پر سوچ رہا تھا اور ہنس رہا تھا کہ بھگوان بھی بازار میں بکتا ہے اور دوسرے خدا بھی۔ جو چاہے خرید لے۔ وہ بھگوان، وہ دیوتا، جن سے جاہل لوگ پرارتھنا کرتے ہیں، اپنی منوکامنائیں جن سے مانگتے ہیں، وہ تو خود کو بکنے کی حقارت اور ذلت سے بھی نہیں بچا سکتے۔ کیا اس میں کوئی قدرت ہو سکتی ہے، جو خود کو بکنے سے بھی نہیں بچا سکے۔ یہ تو بھگوان کی توہین ہے کہ وہ چند سکوں میں بک جاتا ہے۔

دکان سے نکل کر اوتار سنگھ دل ہی دل میں کلمۂ طیبہ پڑھتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ مورتیوں کی دکان میں جا کر شاید وہ ناپاک ہو گیا ہو گا۔ اس لمحے اس کے دل میں عجب سا جذبہ پیدا ہوا...... اللہ کے لیے محبت کا جذبہ۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اللہ کے لیے کچھ ایسا کرے، جس سے اللہ خوش ہو...... بہت خوش۔ اس کے ذہن میں موہوم سا خیال تھا کہ وہ ایسا کچھ کر سکتا ہے۔ کیا؟ یہ وہ فی الحال نہیں جانتا تھا۔ لیکن اسے لگتا تھا کہ کوشش کرے گا تو وہ آسانی سے جان بھی جائے گا۔ وہ ہوٹل پہنچا تو ارجن اس کا انتظار کر رہا تھا!

❁......❁......❁
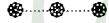
اس سے پہلے اوتار سنگھ نے صرف اپنے گاؤں کا میلہ دیکھا تھا۔ درحقیقت وہ ٹھاکروں کی گڑھی کا میلہ نہیں تھا۔ بلکہ اردگرد کے تین اور گاؤں بھی اس میں شریک ہوتے تھے۔ لیکن جے پور کا میلہ دیکھ کر اوتار سنگھ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اتنے بڑے میلے کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

وہاں ہر طرح کی تفریحات تھیں۔ کھیل تماشے تھے۔ سرکس بھی تھا۔ کرتب بھی دکھائے جا رہے تھے۔ جسمانی مقابلے بھی ہو رہے تھے۔ اونٹوں کی دوڑ ہونے والی تھی۔ کبڈی اور کشتی کے مقابلے دیکھنے والوں کا بڑا ہجوم تھا۔

دوسری طرف میلے میں بازار سے بھی بڑا بازار لگا تھا۔ وہاں بلاشبہ سینکڑوں اسٹال تھے۔ ہر چیز کا اسٹال تھا۔ کہیں کپڑا بک رہا تھا تو کہیں عورتیں چوڑیاں پہن رہی تھیں اور زیورات دیکھ رہی تھیں۔ وہاں کئی جوتشی بھی تھے۔ ایک بوڑھی عورت تھی، جو لوگوں کا ہاتھ دیکھ کر ان کی قسمت کا حال بتا رہی تھی۔

عورتوں کی دلچسپی یا تو خریداری میں تھی یا جھولوں میں۔ لیکن جھولوں کے پاس بچوں کا ہجوم سب سے زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کی چیزوں کے اسٹالز پر سب سے زیادہ رش تھا۔

اوتار سنگھ اس رونق میں ارجن کے ساتھ گھوم پھر رہا تھا۔ لیکن وہ بہت کھویا کھویا تھا۔ اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا، جو اسے ادھر اُدھر توجہ نہیں کرنے دے رہا تھا۔ یہ کہ اسے کچھ کرنا ہے...... اللہ کو خوش کرنے کے لیے...... اس سے اظہارِ محبت کے لیے! بس وہ یہ سوچے جا رہا تھا کہ کیا کرے۔

بس ایک چیز ایسی تھی، جس پر وہ توجہ دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اور وہ تھا لٹھیا بازی کا مقابلہ۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ لٹھیا بازی میں اسے خود کمال حاصل تھا۔ چاچا جمال دین نے یہ ہنر اسے اور ویرجی کو سکھایا تھا۔ وہ اس فن میں استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ اور ان کا کہنا تھا کہ وہ دونوں بہت اچھے شاگرد ہیں اور ان کے اندر اس فن کی قدرتی صلاحیت ہے۔ ان دونوں کو کارکردگی دکھانے کا ایک موقع مل چکا تھا، جب انھوں نے اپنے اوپر حملہ کرنے والوں کو نہ صرف مار بھگایا تھا۔ بلکہ انھیں زخمی کر کے اٹھنے کے قابل [illegible] چھوڑا تھا۔ اس موقعے پر ان [illegible] ثابت ہو گئی تھی۔

اس نے لٹھیا بازی کا مقابلہ ہوتے دیکھا تو مسحور ہو کر رہ گیا۔ وہ جس طرح داد دے رہا تھا اور تنقید کر رہا تھا، اس نے ارجن کو چونکا دیا۔ ''لگتا ہے، تم لٹھیا بازی جانتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''بس یونہی تھوڑی سی شدبد ہے۔'' اوتار سنگھ نے بے دھیانی میں کہا۔

''تمھارے تبصروں سے تو لگتا ہے کہ تم اس کی فنی باریکیوں سے بھی واقف ہو۔'' ارجن بولا۔

''میں نے کہا نا، تھوڑا بہت سیکھا ہے میں نے۔''

''کہاں...... کس سے سیکھا؟''

''گاؤں میں...... چاچا جمال دین سے۔''

''تو تم مقابلے میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟''

سچ تو یہ ہے کہ مقابلے میں حصہ لینے کے لیے اوتار سنگھ کا دل مچل رہا تھا۔ اب تک جو اس نے دیکھا تھا، وہ لٹھیا بازی کا کوئی اچھا معیار نہیں تھا۔ اپنی فطری انکساری کے باوجود وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہاں اس کے جوڑ کا کوئی نہیں ہے۔

لیکن دل کے مچلنے کے باوجود اس کا میدان میں اترنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ نمایاں ہونا اسے یوں بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ مگر یہاں جے پور میں اسے لگ رہا تھا کہ اس کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ نمایاں نہ ہو۔ وجہ اسے معلوم نہیں تھی۔

''نہیں...... میں اتنا اچھا بھی نہیں ہوں۔'' اس نے منکسرانہ لہجے میں کہا۔

ارجن کو مایوسی ہوئی۔

وہ میلے میں گھومتے پھرے۔ اوتار سنگھ نے خریداری وہیں سے کر لی۔ اس نے پتا جی اور چاچا جمال دین کے لیے پگڑی خریدی۔ ماں کے لیے چادر...... اور ویرجی کے لیے کپڑے اور ایک قلم۔

آخر اوتار سنگھ نے میلے سے واپسی کا ارادہ کیا۔ ارجن کو اس سے اختلاف تھا۔ ''ابھی تو بہت وقت ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ابھی تو رونق اور بڑھے گی۔''

''میں کل صبح چھ بجے والی گاڑی سے آگرہ جانا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے ساڑھے چار، پانچ بجے اٹھنا ہوگا۔'' اوتار سنگھ نے معذرت کی۔

اسی وقت ارجن کے چند دوست اسے مل گئے۔ ''تم واپس جا رہے ہو...... ابھی سے!'' ان میں سے ایک نے کہا۔

ارجن نے اوتار سنگھ کو ان سے متعارف کرایا۔ وہ لوگ ارجن کو روک رہے تھے۔ لیکن ارجن اوتار سنگھ کو اکیلا چھوڑنے کو بد اخلاقی سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ وہ انکار کر رہا تھا۔

’’تم رک جاؤ نا۔ میں تو ہوٹل جا کر سو جاؤں گا۔‘‘ اوتار سنگھ نے اسے سمجھایا۔ ’’تم اپنی تفریح کیوں خراب کرتے ہو۔‘‘

’’ایسی کوئی بات نہیں۔ میں بھی تھکا ہوا ہوں۔ جلدی سو جاؤں گا اور میلہ تو کل بھی رہے گا۔‘‘ ارجن نے کہا۔

لیکن اوتار سنگھ اصرار کرتا رہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ارجن مروت میں اس کی وجہ سے اپنی تفریح خراب کرے۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ ارجن کے دوستوں کو کئی مہینوں کے بعد اس سے ملاقات کا موقع ملا ہے اور وہ ان کے بیچ دیوار بن رہا ہے۔

آخر اوتار سنگھ نے ارجن کو قائل کر لیا۔ دونوں گلے ملے۔ ارجن نے وعدہ لیا کہ اگلی بار وہ چند روز کے لیے آئے گا اور اس کے گھر مہمان ہوگا۔ پھر اوتار سنگھ ارجن کو میلے میں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

اب اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا...... وہی اللہ کے لیے کچھ کرنے کا خیال۔
اور وہ خیال اس کے لیے بہت بے چین کر دینے والا تھا۔ کیونکہ اسے اس سلسلے میں کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

سڑک پر چلتے چلتے وہ ایک بڑے مندر کے سامنے رک گیا۔ چند لمحے کھڑا وہ دیکھتا رہا۔ پھر مندر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن مندر میں داخل ہوتے ہوئے اس کے قدم ہچکچا رہے تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ وہاں کیوں جا رہا ہے۔ پوجا کرنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اس کے اندر جانے کی وجہ عقیدت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس جذبے سے تو وہ برسوں پہلے جان چھڑا چکا تھا۔

اس نے بے اختیار زیرِ لب کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ مندر میں گھسنے کے بعد اسے باطنی طور پر ناپاکی کا احساس ہو رہا تھا۔ اور اسے دور کرنے کی ایک بے حد موثر ترکیب اس کے پاس تھی۔

اندر جا کر اس نے جائزہ لیا۔ مندر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ سامنے بھگوان کا ایک بہت بڑا بت تھا۔ سائیڈ والی دیوار کے ساتھ دیگر کئی دیوتاؤں کے نسبتاً چھوٹے بت رکھے تھے۔ بھگوان کے بڑے بت کے پہلو میں ایک دروازہ تھا، جو یقیناً مندر کے اندرونی حصے کی طرف کھلتا تھا۔ اس طرف پجاری اور اس کے چیلوں کے کمرے ہوں گے۔

بڑے بت کو دیکھتے ہوئے اس کے اندر شدید ناپسندیدگی اُبھری۔ ان چند لمحوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس کی بے چینی دور ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ اللہ سے اظہارِ محبت کے لیے، اسے خوش کرنے کے لیے وہ کیا کر سکتا ہے۔ محمود نے بتایا تھا کہ اللہ سب سے زیادہ شرک کو ناپسند کرتا ہے اور اس گناہ کو کبھی معاف نہیں کرتا اور مندر شرک کا اجتماعی مقام ہے اور بت شرک کا ذریعہ۔ تو اگر وہ یہاں شرک پر وار کرے گا تو اللہ اس عمل کو پسند کرے گا۔

ایک دم ہی وہ پُر جوش ہو گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ یہاں اکیلا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بڑے بت کا جائزہ لیا۔ اسے چھو کر دیکھا۔ اسے تھوڑی سی تشویش ہوئی۔ بت نہ صرف بھاری تھا بلکہ بہت سخت اور مضبوط بھی لگ رہا تھا۔

اب وہ صورتِ حال پر غور کر رہا تھا۔ فی الوقت تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پہلا قدم تو یہ تھا کہ وہ اپنی صبح کی روانگی منسوخ کرے۔ کل کا دن یہاں گزارے، تیاری کرے اور پھر یہاں واپس آئے۔ اپنا کام کرے اور نکل جائے۔

اسے اندازہ تھا کہ وقت بہت مناسب ہے۔ وہ ایسا مندر تھا، جو عام دنوں میں سونا نہیں رہتا ہوگا۔ اس کے سونے پن کا سبب میلہ تھا۔ اور میلہ کل بھی جاری رہے گا۔ مندر میں ہجوم ہوتا تو اس کا کام دشوار ہو جاتا۔

اب اسے بڑی احتیاط سے منصوبہ بنانا تھا۔

ضروریات کیا تھیں؟ کچھ چیزیں تو اسے کل بازار سے خریدنی تھیں۔ اصل چیز مندر میں اس کے لیے سازگار ماحول کا ہونا تھا۔ اس کے لیے اسے کچھ سوچنا اور کرنا تھا کہ مرنے میں اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہو اور وہ سکون سے اپنا کام کر سکے۔ اس کے لیے اس کے ذہن میں ایک منصوبے کے خدوخال واضح ہو رہے تھے۔

بت کے پہلو والا دروازہ کھلا اور پجاری اندر آیا۔ موٹے تازے بڑے پیٹ والے پجاری نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ ’’آؤ بالک...... پوجا کر لی؟‘‘

اوتار سنگھ نے اثبات میں سر ہلایا۔

پجاری نے تھالی اٹھائی، اس کے ماتھے پر تلک لگایا اور اسے پرشاد دیا۔

اوتار سنگھ کو کراہت کا احساس ہوا۔ تلک کا تو وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن پرشاد وہ ہرگز نہیں کھاتا اور وہ جلدی جلدی کلمہ پڑھنے لگا تھا۔ اس نے جیب سے کچھ بڑے نوٹ نکالے اور پجاری کی طرف بڑھا دیے۔

پجاری کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ تاہم اس نے بڑی بے نیازی سے پوچھا۔ ’’یہ کس لیے مالک؟‘‘

’’آپ کے لیے۔‘‘ اوتار سنگھ نے کہا۔ ’’میں بہت دور سے آیا ہوں۔ پنڈت جی۔ میں نے آپ کو سپنے میں دیکھا تھا۔‘‘

پنڈت کی باچھیں کھل گئیں۔ لڑکا اسے کوئی بڑی آسامی لگ رہا تھا۔ ’’کیا دیکھا تھا بالک؟‘‘ اس نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

’’میں نے سپنے میں اپنی سورگ باشی ماتا جی کو دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھیں...... جے پور جاؤ۔ وہاں کے بڑے مندر کے پجاری کو بھینٹ دو۔ اور اس سے گیتا کا پاٹھ سنو گر اکیلے

میں .....''

''تم نے کہا تھا بالک کہ تم نے مجھے سپنے میں دیکھا تھا؟''

''جی مہاراج۔ پھر میں نے دیکھا کہ میں مندر کے اندر کسی کمرے میں ہوں۔ شاید آپ کا کمرا ہے۔ وہاں میں آپ کے کچھ چیلوں کے ساتھ بیٹھا ہوا آپ سے گیتا کا پاٹھ سن رہا ہوں۔ اس کے بعد آپ اور آپ کے چیلے میری لائی ہوئی مٹھائی کھا رہے ہیں۔ پھر میں آپ کو ماتا جی کے کہنے کے مطابق پانچ سو روپے دے رہا ہوں۔ بس اتنا ہی دیکھا تھا میں نے۔''

پنڈت تو نہال ہو گیا۔ دو سو روپے اسے پہلے ہی مل چکے تھے اور پانچ سو روپے ملنے کا امکان سامنے تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم بہت بھاگیہ وان ہو بالک۔ تمہارا سپنا اوش سچا ہے۔ تم نے مجھے سپنے میں ایسا ہی دیکھا تھا۔''

''جی وہ آپ ہی تھے مہاراج۔ پرنتو آپ کا کمرا.....'' اوتار سنگھ کے لہجے میں ہلکا سا شک تھا۔

اب وہ شک دُور کرنا پجاری کی ذمے داری تھی۔ پانچ سو روپے کا سوال تھا۔ ''چلو..... میں تمھیں اپنا کمرا دکھاتا ہوں۔''

''یہ مندر کا دروازہ کھلا رہتا ہے؟''

''یہ بھگوان کا گھر ہے بالک۔ یہاں بری نیت سے کوئی نہیں آ سکتا۔'' پجاری نے بڑے یقین سے کہا۔

اوتار سنگھ دل ہی دل میں ہنسا۔ بھگوان اس کی نیت سے بے خبر تھا۔ دل کا حال تو صرف اللہ جانتا ہے۔

''دروازہ ہم رات گیارہ بجے بند کرتے ہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔''

پجاری اسے اندر لے گیا۔ وہاں ایک بڑا احاطہ تھا، جس کے دو اطراف کمرے بنے ہوئے تھے۔ تیسری سمت ایک اور دروازہ تھا۔ وہ شاید مندر میں رہنے والوں کے لیے باہر نکلنے کا راستہ تھا۔ اوتار سنگھ کو سارے کام آسان ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

پجاری کا کمرا دوسرے کمروں سے بہت بڑا تھا۔ اتنا بڑا کہ اس میں پچاس سے زیادہ افراد آسانی سے بیٹھ سکتے تھے۔

''تم نے سپنے میں یہی کمرا دیکھا تھا نا بالک؟'' پجاری کے لہجے میں اصرار تھا۔

''لگتا تو یہی ہے۔''

''اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔'' پنڈت نے زور دے کر کہا۔

''آپ کے چیلے کتنے ہیں؟''

''نو ہیں۔''

''مجھے لگتا ہے کہ میں نے چیلے زیادہ دیکھے تھے۔'' اوتار سنگھ کوئی کمی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

''لگتا ہے نا۔ پرنتو دیکھے نو ہی ہوں گے۔''

''ہو سکتا ہے۔'' اوتار سنگھ نے بے دلی سے کہا۔ پھر بولا۔ ''مگر یہاں کمرے تو زیادہ ہیں۔''

''تو چھ دیوداسیاں بھی ہیں نا بالک۔'' پجاری نے جلدی سے کہا۔

اوتار سنگھ کو غلطی کا احساس ہو گیا۔ اب اسے نبھانا تھا۔ ''ارے ہاں مہاراج، میں نے سپنے میں چھ دیوداسیاں بھی دیکھی تھیں۔ وہ بھی گیتا کا پاٹھ سن رہی تھیں اور انھوں نے بھی میرے ہاتھ سے پرشاد کھایا تھا۔''

''اوش دیکھا ہوگا۔ سچے سپنے میں بھول تو ہو سکتی ہے۔ پرنتو کوئی کمی نہیں رہتی۔'' پانچ سو روپے کے لیے پجاری سب کچھ قبول کر سکتا تھا۔

''جی مہاراج۔''

''میں اپنے چیلوں اور داسیوں کو بلاتا ہوں۔ پھر پاٹھ سناؤں گا۔''

اوتار سنگھ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ ابھی تو اسے بہت تیاری کرنا تھی۔ ''آج نہیں مہاراج، یہ کام کل کریں گے۔''

پنڈت بے صبرا ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''کیوں بالک۔ آج کا دن تو شبھ ہے۔''

''میں نے سپنے میں گروار کا دن دیکھا تھا اور رات گیارہ بجے کے بعد کا وقت۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''اور سپنا سچا ہے تو سب کچھ ویسے ہی ہوگا، جیسے میں نے سپنے میں دیکھا تھا۔ آپ، چیلے اور دیوداسیاں میرے ہاتھ سے مٹھائی بھی کھائیں گی۔ پھر میں آپ کو بھینٹ دوں گا۔''

''اوش ویسا ہی ہوگا بالک۔''

''اور میں نے سپنے میں مندر کا دروازہ بھی بند دیکھا تھا۔''

وہ تو گیارہ بجے کے بعد بند ہوتا ہی ہے۔''

''تو میں کل گیارہ بجے آؤں گا مہاراج۔''

''میں انتظار کروں گا بالک۔''

اوتار سنگھ مندر سے نکلا تو اس کے رگ و پے میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ اس کی بے چینی دور ہو چکی تھی اور وہ بہت خوش تھا۔ وہ ہوٹل گیا اور نہا دھو کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ لیکن سونے سے پہلے بہت دیر تک وہ اپنے منصوبے کی نوک پلک درست کرتا رہا۔ یہ سوچتا رہا کہ کل اسے کیا کیا کرنا ہے۔

سوتے وقت وہ مطمئن تھا کہ اس نے کبھی کوئی جھول نہیں چھوڑا ہے۔ البتہ اگلا دن بڑی مصروفیت کا تھا۔

❁......❁......❁
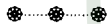
اگلی صبح سب سے پہلے اوتار سنگھ ایک مٹھائی کی دکان پر گیا۔ ''مجھے پانچ سیر لڈو بنوانے ہیں۔'' اس نے حلوائی سے کہا۔

''دو روپے سیر ہوں گے۔'' حلوائی نے کہا۔

''پیسوں کی مجھے کوئی پروا نہیں۔ لڈو ایسے ہوں کہ کوئی کھائے تو اس کا ہاتھ ہی نہ رکے۔''

حلوائی نے اسے غور سے دیکھا۔ ''پھر قیمت بڑھ جائے گی، تین روپے سیر دوں گا۔ لڈو ایسا ہوگا کہ آدمی کھائے تو کھاتا ہی چلا جائے۔''

''مجھے منظور ہے۔ مگر ایک بات اور ہے۔'' اوتار سنگھ نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

''بولو مہاراج۔''

''اصل میں ہم کچھ دوست ہیں کالج کے۔ ساتھ ہی یہاں آئے ہیں میلہ دیکھنے۔ میں ان کے ساتھ شرارت کرنا چاہتا ہوں...... یونہی مذاق میں۔''

''میں سمجھ گیا۔ لڈوؤں میں بھنگ ملا دوں؟'' حلوائی مسکرایا۔

''نہیں۔ یہ تو پرانا ہو چکا۔'' اوتار سنگھ بولا۔ ''میں تمھیں منہ مانگی قیمت دوں گا۔ لڈوؤں میں بے ہوشی کی دوا ملانی ہوگی۔ تیز اثر کرنے والی...... ایسی کہ رات کو آدمی کھائے تو پھر دوپہر کو ہی اٹھے۔''

حلوائی نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے بابو جی؟''

''ارے نہیں۔ بتایا نا، میرے کالج کے دوست ہیں۔ پچھلی بار میں ان کے مذاق کا نشانہ بنا تھا۔''

حلوائی چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ لیکن دس روپے سیر دوں گا۔''

''منظور ہے۔''

''کب چاہئیں لڈو؟''

''رات ساڑھے دس بجے۔''

''تیار ملیں گے۔ پرنتو پورے پچاس روپے پیشگی لوں گا۔''

''نہیں۔ آدھے ابھی اور آدھے لڈو لے جانے کے وقت۔''

''نہیں بابو جی۔ میں تو پورے پیسے پیشگی لوں گا۔ دیکھو نا، تمہارا ارادہ بدل گیا تو میرا تو نقصان ہوگا نا۔ وہ لڈو تو میں کسی کو بیچ بھی نہیں سکتا۔''

اوتار سنگھ نے کچھ دیر ہچکچانے کی اداکاری کی۔ حلوائی اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اتنا تگڑا گاہک ہاتھ سے نکلے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر لڑکا پھسلنے لگا تو آدھے پیسے ہی پکڑ لے گا۔ وہ نہیں آیا، تب بھی فائدہ ہی ہے۔ دس روپے کے لڈو ہوں گے اور پچیس پہلے

ہی مل رہے ہیں۔

بالآخر اوتار سنگھ نے جیب سے پچاس روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

''اچھا...... بے ہوشی کی دوا سے لڈو کے ذائقے میں تو فرق نہیں پڑے گا؟''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا بابو جی۔ تم بےفکر رہو۔ کھانے والے کو پتا بھی نہیں چلے گا۔''

''بس تو میں ساڑھے دس بجے آؤں گا۔ دکان بند تو نہیں کرتے تم؟''

''میلے کے دنوں میں تو آدھی رات تک دکان کھلی رہتی ہے بابو جی۔ تم بےفکر ہو کر جاؤ۔''

اگلا مرحلہ زیادہ مشکل تھا۔ اس کے لیے اوتار سنگھ کو بہت دوڑ دھوپ کرنا پڑی۔ اسے ایک کلہاڑی اور ایک ہتھوڑا خریدنا تھا۔ لیکن اس کے لیے اس کی کچھ شرائط تھیں۔ یہ ضروری تھا کہ دونوں چیزیں سائز میں چھوٹی ہوں۔ تاکہ وہ انھیں اپنے لباس میں باآسانی چھپا کر لے جا سکے۔ ہلکی ہوں تو اور بھی بہتر ہے۔ لیکن کلہاڑی بہت تیز ہو۔ کیونکہ بت بہت بھاری تھا...... اور سخت بھی معلوم ہوتا تھا۔

وہ درجنوں دکانوں میں گیا۔ لیکن موثر ترین کلہاڑی وہ تھی جو بڑی بھی تھی اور بھاری بھی۔ اور اسے تو اس پر بھی شبہ تھا کہ وہ بڑی اور بھاری کلہاڑی بھی اس بت کا کچھ بگاڑ سکے گی۔ دوسرے وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ زیادہ آواز ہو اور لوگ متوجہ ہوں۔ اسے تو بڑی خاموشی سے اپنا کام کر کے نکل آنا تھا۔

بالآخر ایک دکان پر اسے اپنے مطلب کی چیزیں مل گئیں۔ دونوں چیزیں باہر کی تھیں اور دیکھنے میں بےضرر لگتی تھیں۔ پہلی نظر میں تو وہ بھی دھوکہ کھا گیا۔ ''نہیں بھئی، اس کلہاڑی سے تو لکڑی بھی نہیں پھٹے گی۔'' اس نے دکان دار سے کہا۔

''بابو جی، غور سے دیکھو اس کی دھار۔'' دکان دار بولا۔ ''یہ تو لوہا بھی کاٹ دے گی۔''

اوتار سنگھ نے دھار پر انگلی رکھی ہی تھی کہ سرخ رنگ کی لکیر نمودار ہو گئی۔ کلہاڑی کی دھار بلاشبہ بہت تیز تھی۔ لیکن اہم سوال یہ تھا کہ اس بت کا بھی کچھ بگاڑ سکے گی یا نہیں۔ ''میں ذرا اور دیکھ لوں۔ شاید اس سے بہتر کچھ مل جائے۔'' اس نے کہا۔

''دیکھ لو بابو جی۔ بازار موجود ہے۔ پرنتو اس سے اچھی چیز ملے گی نہیں۔''

اوتار سنگھ نے پورا بازار چھان مارا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ دکان دار کا چیلنج بجا تھا۔ آخر اسے لوٹ کر وہیں جانا پڑا۔

کلہاڑی اور ہتھوڑا خریدنے کے بعد اس کی تیاری مکمل ہو گئی۔ وہ ہوٹل جا کر سکون سے سو گیا۔

شام کو وہ میلے کے لیے تیار ہو کر نکلا۔ اس کی مہم میں تو ابھی کافی وقت پڑا تھا۔

گزشتہ روز کے برعکس اس روز میلے میں اس کا دل لگا اور اس نے خوب تفریح کی۔ وجہ

یہ تھی کہ پچھلے روز وہ ایک الجھن میں تھا جبکہ آج نہ صرف وہ الجھن دور ہو چکی تھی۔ بلکہ وہ خوش تھا کہ آج کچھ کرنے والا ہے...... ایک ایسا کام جو شاید اللہ کو پسند آئے۔

وہ گھومتا پھرا۔ اس نے جسمانی مقابلے دیکھے۔ لیکن ان میں حصہ لینے کے خیال کو اس نے رد کر دیا۔ جو اصل کام وہ کرنے والا تھا، اس کے لیے اس کا یہاں نمایاں ہونا نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ یہاں کوئی اسے نہیں جانتا تھا۔ بعد میں بات کھلے گی تو ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ اسے کہاں ڈھونڈیں۔

اسے ڈر تھا کہ کہیں ارجن سے سامنا نہ ہو جائے۔ مگر خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔

نو بجے تو وہ میلے سے نکل آیا اور ہوٹل کی طرف چل دیا۔ اب اسے اصل کام کے لیے تیاری کرنی تھی۔

❀....❀....❀

اوتار سنگھ کو نہیں معلوم تھا کہ اس کا یہ سوچنا کہ اس شہر میں کوئی اسے جانتا پہچانتا نہیں، کتنا غلط ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ اس شہر میں پہلی بار آیا تھا۔ لیکن اس شہر میں آٹھ افراد ایسے تھے جو نہ صرف یہ کہ اسے جانتے تھے، پہچانتے تھے، بلکہ اس کے لیے جذبات بھی رکھتے تھے۔ یہ اس کے وہ کرم فرما تھے، جو اس کی خاطر گڑھی تک آئے تھے، بھیش پور میں رہے تھے، جنھوں نے اس پر حملہ کیا تھا۔ مگر اپنے زخمی ساتھیوں کو اٹھا کر فرار ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ان میں سے تین افراد اس وقت میلے میں موجود تھے۔ کرتارا، رگھبیر اور ہنس دھر۔ اوتار سنگھ کا ان سے سامنا نہیں ہوا تو محض اس لیے کہ یہ کاتب تقدیر کی اسکیم میں نہیں تھا۔ ورنہ ان تینوں کو بھی دارو کے بعد سب سے زیادہ جسمانی مقابلوں میں دلچسپی تھی۔ جو مقابلے اوتار سنگھ نے بڑی دلچسپی سے دیکھے، انھیں دیکھنے والے تماشائیوں میں وہ تینوں بھی شامل تھے۔ فرق یہ تھا کہ وہ دائرے کے ایک جانب تھے اور اوتار سنگھ دوسری جانب۔

دنیا کے بارے میں دو محاورے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دنیا اتنی بڑی ہے کہ کوئی بچھڑ جائے تو اس کے دوبارہ ملنے کی کوئی ضمانت نہیں۔ دوسرا یہ کہ دنیا اتنی چھوٹی ہے کہ لوگ بار بار ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں...... بغیر ارادے کے ملتے ہیں۔ اس معاملے میں دونوں محاوروں کو درست ثابت ہونا تھا...... مگر مختلف اوقات میں۔

نو بجے تو انھیں اپنا سب سے بڑا شوق یاد آیا...... دارو! میلے میں اس کا بندوبست بھی تھا۔ وہ تینوں اس طرف چل دیے۔

شراب کی ایک سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ تمام منفی چیزوں کو ابھارتی ہے۔ دماغ پر اثر انداز ہوتی ہے تو شعور کو بیکار کر کے لاشعور اور تحت الشعور کو جاگر کرتی ہے۔ یہ جن منفی جذبوں کو ابھارتی ہے، ان میں سب سے ہلکا اور شریفانہ جذبہ دکھ ہے۔ شرابیوں کو پینے کے بعد اپنے ایسے

ایسے دکھ یاد آتے ہیں، جن کا ان کی موجودہ زندگی سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا ہوتا۔ اور نشے میں وہ دکھ انھیں بہت اہم اور بہت بڑے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ نفرت، حسد، بغض، کینہ اور بڑی محرومیاں خواہ وہ ان کے لیے اچھی ہی ہوں، انھیں ستانے لگتی ہیں۔ شاید شراب کو حرام قرار دیے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو۔

پہلے جام کے بعد ان تینوں کو وہ عورتیں یاد آئیں، جو انھیں نہیں مل سکی تھیں۔ دوسرے جام نے انھیں باتونی کر دیا۔ وہ دنیا جہان کی بے سروپا باتیں کرنے لگے۔ کیونکہ شراب ان کے شعور کو معطل کر کے لاشعور کو کرید رہی تھی۔ تیسرے جام نے ان کی نفرتیں اور دشمنیاں ابھار دیں۔

ان کے درمیان ایک نفرت، ایک دشمنی قدر مشترک تھی...... اور وہ تھی اوتار سنگھ سے نفرت اور اس سے دشمنی۔ لیکن تینوں کے لیے اس کی شدت کے درجے الگ الگ تھے۔ کرتارے کے لیے اس کی اہمیت سب سے کم تھی۔ اس لیے کہ وہ اس کا ذاتی معاملہ نہیں تھا۔ وہ جسونت کا دوست تھا اور جسونت کی کیدار ناتھ سے دوستی تھی۔ اور کرتارا یاروں کا یار تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ کوئی اوتار سنگھ نامی لڑکا کیدار ناتھ کے راستے کی رکاوٹ ہے اور اسے دور کرنا ہے تو اس نے ہامی بھر لی۔ حالانکہ اس نے لڑکے کو دیکھا تک نہیں تھا۔ بات وہی تھی۔ وہ اس کا ذاتی معاملہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے دوستوں سے بات کی اور انھیں لے کر چل دیا۔ یہ الگ بات کہ وہ وہاں سے ناکام واپس آئے۔ کرتارے کو اس بے عزتی کی وجہ سے اوتار سنگھ سے نفرت تھی۔

رگھبیر کی نفرت اور دشمنی کرتارے سے زیادہ تھی۔ وہ کرتارے کی دوستی کی وجہ سے اس اسکیم میں شامل ہوا تھا۔ اس نے اپنے چار جواں مرد ساتھیوں کو دو عام سے کم عمر لڑکوں سے مار کھاتے دیکھا تھا۔ وہ میدان میں کودنا چاہتا تھا۔ لیکن کرتارے نے اسے روک دیا تھا۔ کرتارا اپنے دوست جسونت کی ہدایت پر محتاط تھا۔ اس لیے گرمی کے ان لمحوں میں بھی دماغ سے سوچ رہا تھا۔ تو وہ لڑکا اوتار سنگھ رگھبیر کی مردانگی کے جسم پر لگا ہوا وہ زخم تھا، جو کسی بھی مرہم سے ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔

لیکن سورج کو اوتار سنگھ سے کبھی نہ مٹنے والی دشمنی تھی۔ اسے اس سے ایسی شدید نفرت تھی کہ وہ اس کے چہرے کو بھی کبھی نہیں بھلا سکا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ان دو کم عمر اور بظاہر عام سے نظر آنے والے لڑکوں کو ختم کرنے کے ارادے سے حملہ آور ہونے والوں میں شامل تھا۔ اور اوتار سنگھ کی لاٹھی نے پہلا وار اسی پر کیا، اس کے بعد وہ لڑنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ ایسی ذلت تھی، جسے وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

ان سب کو وہ ذلت آمیز مہم یاد تھی۔ وہ آٹھ افراد اس مہم پر گئے تھے اور آٹھ ہی واپس بھی آئے تھے۔ مگر اس طرح کہ ان میں چار ناکارہ ہو چکے تھے اور دیگر چار انھیں اونٹوں پر لاد کر وہاں سے فرار ہوئے تھے۔

واپس آنے کے بعد ان کے درمیان تند و تیز بحثیں ہوئی تھیں۔ کیونکہ شریر کے گھاؤ تو

بھر گئے تھے۔ لیکن آتما کے گھاؤ بھرنے والے نہیں تھے۔ چاروں مقابلہ کرنے والے دوسرے چاروں پر برہم تھے کہ انھوں نے بزدلی دکھائی۔ ان چار میں سے تین کرتارے پر برہم تھے کہ کرتارے نے انھیں میدان میں اترنے نہیں دیا۔

لیکن کرتارا اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔ اصل میں ایک فرق تھا۔ اس نے اپنے یار جسونت کے کہنے پر اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ جبکہ اس کے دیگر ساتھیوں کے لیے انعام مقرر تھا۔ وہ کام پورا کر کے آتے تو مالا مال ہو جاتے۔ تو اوتارے کو تو جسونت کی ہدایت پر عمل کرنا تھا۔ کرتارے کی منطق اپنی جگہ پکی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ وہ آٹھوں بیک وقت بھی میدان میں اترتے تو دونوں لٹھیا باز لڑ کے انھیں لٹا دیتے۔ پھر وہ پکڑے جاتے۔ وہ ٹھاکر کے قہر کا شکار ہوتے اور ٹھاکر انھیں کبھی نہ بخشتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جسونت کے یار کیدار ناتھ کا پول کھل جاتا اور یہ کیدار ناتھ کو گوارا نہیں تھا۔

اس وقت چار جام حلق سے اترتے ہی سب سے پہلے سورج کو اوتار سنگھ کی یاد آئی۔ وہ بھاں بھاں کر کے رونے لگا۔

"او تجھے کیا ہو گیا یارا؟" رگھبیر نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

"مجھے کیا ہونا ہے۔ پہلے سے ہوا ہے...... مجھے اوتار سنگھ ہوا ہے۔ میں اس کا خون پینا چاہتا ہوں۔"

"اسے بھول جا سورج۔" رگھبیر نے اسے تھپکی دی۔ "سمجھ لے، ہم نے اسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔"

"کیسے بھول جاؤں؟ اس کا چہرہ تو ہمیشہ میری نظر میں رہتا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔" رگھبیر نے انگلی نچاتے ہوئے کہا۔ "چل...... ہم دونوں اس کے گاؤں چلتے ہیں۔ اب اسے ٹھکانے لگا کر ہی آئیں گے۔ اب تو ہم نے لٹھیا بازی بھی سیکھ لی ہے۔ دیکھ لیں گے اسے۔"

"ہاں...... چلو......" سورج اٹھنے لگا۔

کرتارے نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔ وہ جب بھی پینے کے لیے بیٹھتے تھے، یہی کچھ ہوتا تھا کرتارے کو یاد تھا کہ اسے کب کیا کرنا ہے۔ اسے یاد تھا کہ جب وہ ناکام ہو کر واپس آئے تھے تو انھوں نے فوراً ہی دوسرے حملے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ انھوں نے ایک ماہر لٹھیا باز کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔ لیکن تیاری مکمل ہونے سے پہلے ہی کیدار ناتھ جسونت سے بات کرنے جے پور آیا تھا اور اس کے بعد جسونت نے کرتارے سے کہا تھا...... "اب اس لڑکے کی طرف دیکھنا بھی نہیں...... بات الٹ گئی ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو میرے یار کا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔"

کرتارا جسونت کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس نے اپنے سب ساتھیوں سے وچن لے لیا تھا۔ لیکن وہ

جب بھی پی کر بہکتے تو اس وچن کو بھول جاتے اور اسے یاد دلانا پڑتا۔

اس وقت بھی اس نے یہی کہا۔ "مجھ سے کیا ہوا وچن یاد ہے؟" اس نے سورج کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "اس لڑکے کو چھونا بھی نہیں ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟ یہاں سینے میں ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے۔" سورج نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"جلنے دے۔ جلنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ پر جب تو دارو پیتا ہے تو یہ بھڑکتی ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"یا تو پیا نہ کر۔ یا اتنی پیا کر کہ یہ آگ اس سے بجھ جائے۔" کرتارے نے بے پروائی سے کہا۔ "یہ لے اور پی۔"

وہ پیتے رہے۔ کرتارے نے گفتگو کا رخ بدل دیا۔

کچھ دیر بعد سورج اٹھ کھڑا ہوا۔

"لو۔ کہاں چلا میرے یار؟" رگھبیر نے لہک کر پوچھا۔

"بس میں جاؤں گا۔ اسے ڈھونڈوں گا۔ کیا پتا، وہ مل ہی جائے۔" سورج نے کہا۔

کرتارا کچھ کہنا بھی چاہتا تھا کہ رگھبیر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے دبا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ سورج سے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ تو جا کر اسے ڈھونڈ۔ مل جائے تو مجھے بھی بتانا۔"

"ضرور بتاؤں گا۔" سورج نے کہا اور لڑکھڑاتے قدموں سے ایک طرف چل دیا۔

کرتارے نے سوالیہ نظروں سے رگھبیر کو دیکھا۔ "تم نے کیوں جانے دیا اسے؟"

"جانے دو یارا۔ ڈھونڈے گا تو کچھ دل ہی بہل جائے گا۔ آگ تو ٹھنڈی ہو گی۔ اب وہ یہاں اسے ملنے سے تو رہا۔"

اس پر دونوں ہنسنے لگے۔

❀......❀......❀

ٹھاکر پرتاپ سنگھ اب بڑی بے چینی سے بیٹے کا انتظار کر رہا تھا۔ اب وصال دین کو دیکھ کر اسے سکون کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ بڑی شدت سے اوتار سنگھ کی یاد آتی تھی۔ گزشتہ رات اس نے وصال دین سے پوچھا تھا۔ "میرے پتر کے امتحان کب ختم ہو رہے ہیں؟"

وصال دین نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ "آج ان کا آخری پرچا تھا۔"

یہ سن کر ٹھاکر بے چین ہو گیا۔ "تب تو اسے آ جانا تھا۔ وہ رکنے والا تو نہیں۔"

"کسی وجہ سے رک گئے ہوں گے ٹھاکر جی۔ کل آ جائیں گے۔"

سو آج صبح ہی سے ٹھاکر بیٹے کی راہ تک رہا تھا۔ دوپہر کو اس سے کھانا بھی نہیں کھایا

گیا۔ اب تو اوتار سنگھ کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔ اس نے سوچا۔

شام ہو گئی۔ وہ حویلی کے باہر چھڑکاؤ کرا کے، کرسیاں لگوا کے بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں آنے والے راستے پر جمی تھیں۔

پھر ٹھاکر نے مولوی برکت علی کو اکیلے آتے دیکھا تو اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ خود اٹھ کر ان کی طرف لپکا۔ ''کیا بات ہے مولوی صاحب؟ اور لوگ کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''وہ لوگ تو نہیں آ سکے ہیں۔''

''پر کیوں؟''

''کانتی پرشاد جی بیمار ہو گئے ہیں۔ وہ آ نہیں سکتے۔ اوتار سنگھ نے رگھو اور رنجنا کو ان کے پاس رکنے کو کہا ہے۔''

ٹھاکر اور پریشان ہو گیا۔ ''تو آپ اوتار سنگھ کو تو اپنے ساتھ لے آتے۔''

''میں گھر ہوتا ہوا آیا ہوں۔ اوتار سنگھ وہاں تھا ہی نہیں۔ وہ تو کل ہی روانہ ہو گیا تھا۔''

ٹھاکر کی پریشانی کی کوئی حد نہیں تھی۔ ''پر وہ یہاں نہیں آیا۔''

''اس نے کہا تھا کہ وہ جے پور جا رہا ہے۔ میلہ دیکھے گا۔ پھر آگرہ جائے گا۔ تاج محل دیکھنے۔'' مولوی صاحب نے وضاحت کی۔ ''میرا اندازہ ہے کہ وہ کل یا پرسوں یہاں پہنچے گا۔''

اس طرف سے اطمینان ہوا تو ٹھاکر کو دوسری فکر لگ گئی۔ ''پہلی بار وہ اکیلا نکلا ہے۔'' اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں ٹھاکر صاحب۔ وہ بہت عقل مند ہے۔ اب وہ کالج میں ہے۔ اسے پریکٹیکل لائف کے لیے تیار ہونا ہے۔ ساری عمر انگلی پکڑ کر تو نہیں چلے گا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ بہت سمجھدار اور اہل ہے۔''

ٹھاکر کو فخر کا احساس ہوا۔ واقعی...... اس کا بیٹا کالج میں پڑھتا ہے۔ جوان ہو چکا ہے۔

ٹھاکر نے مولوی صاحب کی خوب تواضع کی۔ اوتار سنگھ کی فکر کم ہوئی تو اسے خیال آیا کہ ابھی دو رات پہلے اس نے ایک بہت بڑا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس پر عمل پیرا کیسے ہو۔ اس سلسلے میں وہ کسی سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اب اس نے سوچا کہ وہ اس سلسلے میں مولوی صاحب سے مدد لے سکتا ہے۔ پہلے اسے ان کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس سال بھی آئیں گے۔

اپنی زندگی کے اہم ترین فیصلے کے بارے میں کسی سے بات کرنے کا تصور ہی اس کے لیے سنسنی خیز تھا۔ مولوی صاحب یقیناً اس کی مدد کر سکیں گے۔ اس نے سوچا، رات کو وہ ان سے بات کرے گا۔

اس رات وصال دین آیا تو ٹھاکر نے اس سے کہا۔ ''پتر وصال دین، آج مجھے ایک بہت ضروری کام کرنا ہے۔ آج تم چلے جاؤ۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' وصال دین نے کہا۔ پھر اسے اوتار سنگھ کا خیال آیا۔ ''بھائی...... میرا مطلب ہے، چھوٹے ٹھاکر نہیں آئے۔''

''نہیں پتر۔ وہ میلہ دیکھنے چلا گیا ہے۔ شاید کل آئے۔''

وصال دین چلا گیا۔

رات کے کھانے کے بعد ٹھاکر مولوی صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ''مولوی صاحب، مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے......''

مولوی صاحب نے اس کام کے بارے میں سنا تو پہلے تو ان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ پھر انھوں نے ہیجان سے لرزتی آواز میں کہا۔ ''کیا آپ کو پورا یقین ہے؟''

ٹھاکر نے اثبات میں سر ہلا دیا!

❁......❁......❁
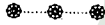
کلہاڑی بہت تیز تھی۔ اوتار سنگھ نے اس کے لیے چمڑے کا میان نما غلاف بھی خرید لیا تھا۔ اب وہ بے فکر ہو کر اسے اپنے لباس میں چھپا سکتا تھا۔ زخمی ہونے کا خطرہ بھی نہ رہتا۔ دوسری طرف اس نے ہتھوڑا بھی رکھ لیا تھا۔

پوری تیاری کے ساتھ وہ ٹھیک وقت پر ہوٹل سے نکل آیا۔

مٹھائی والے کے پاس وہ ٹھیک ساڑھے دس بجے پہنچا۔ مٹھائی والا اسے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ ''تمھارے لڈو تیار ہیں بابو جی۔'' اس نے مٹھائی کے ایک ٹوکرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ نے جیب سے پیسے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

''چکھ کر نہیں دیکھو گے بابو جی؟'' مٹھائی والے نے پوچھا۔

اوتار سنگھ کو لگا کہ وہ اس سے مذاق کر رہا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ یہ لڈو میں نے اپنے لیے نہیں، دوسروں کے لیے بنوائے ہیں۔''

''پرنتو تمھیں کیسے پتا چلے گا کہ لڈو کتنے عمدہ ہیں۔''

''مجھے تمہاری بات پر بھروسہ ہے۔''

''پر میں تعریف سننا چاہتا ہوں۔'' حلوائی نے ایک لڈو اس کی طرف بڑھایا۔

''میں نے کہا نا، مجھے نہیں چکھنا۔''

''گھبراؤ نہیں بابو جی۔ یہ لڈو بے ہوش کرنے والا نہیں ہے۔''

اوتار سنگھ نے اب بھی لڈو لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

"اصل میں آرڈر کی مٹھائی ہم کچھ زیادہ ہی بناتے ہیں۔" حلوائی نے وضاحت کی۔

"یہ لڈو بھی زیادہ بنے تھے۔ پانچ سیر تولنے کے بعد میں نے ان میں بے ہوشی کی دوا ملا دی اور انھیں ٹوکرے میں رکھ دیا۔ یہ لڈو صاف ہے۔ کھا کر دیکھو۔ تاکہ پتا چلے کہ میں نے قیمت غلط نہیں لی ہے۔ ایسا لڈو پورے جے پور میں کوئی نہیں بنا سکتا۔"

اوتار سنگھ ہچکچا رہا تھا۔ پہلی بار وہ اکیلا پردیس میں نکلا تھا۔ اور اس کی جیب میں خاصی رقم بھی تھی۔ اب وہ لڈو کھا لیتا اور اس میں بے ہوشی کی دوا ہوتی تو وہ لٹ بھی سکتا تھا۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ چلتا پھرتا بے ٹھکانہ آدمی تو ایسی حرکت کر سکتا ہے۔ لیکن مستقل دکان کرنے والا دکان دار ایسی حرکت کبھی نہیں کرے گا۔ البتہ وہ لڈو نہیں کھائے گا تو دکان دار اس پر شک بھی کر سکتا ہے۔"

ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد بالآخر اس نے لڈو لیا اور کھا کر دیکھا۔ لڈو واقعی بہت عمدہ تھا۔ "واقعی تم نے کمال کر دیا۔" اس نے دل کی گہرائی سے تعریف کی۔ "اتنا لذیذ لڈو تو میں نے دہلی میں نہیں کھایا۔"

دکان دار خوش ہو گیا۔ "تو تم دہلی سے آئے ہو بابو جی؟"

"ہاں۔"

اوتار سنگھ نے مٹھائی کا ٹوکرا لیا اور چل دیا۔ اب بس اسے مندر پہنچنا تھا۔

❁......❁......❁

سورج جھومتا جھامتا میلے سے باہر آیا اور سڑک پر چلنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا نے اس کے نشے کو اور تیز کر دیا۔ وہ اس وقت صرف اور صرف اس لڑکے اوتار سنگھ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بس ایک بار وہ مل جائے اور وہ اسے ٹھکانے لگا کر اپنا بدلہ لے لے تو اس کی آتما کو شانتی مل جائے۔ لڑکے کے مل جانے کے خیال پر وہ مٹھیاں بھینچتا، دانت پیستا اور ہاتھ کو یوں لہراتا، جیسے لاٹھی گھما رہا ہو۔

"مل جائے تو دیکھ لوں گا اسے۔" وہ بہ آواز بلند غرایا۔ "اب تو مجھے بھی لٹھیا چلانی آتی ہے۔"

قریب سے گزرتے ہوئے راہ گیروں نے اسے بلند آواز میں خود کلامی کرتے دیکھا تو مسکرا دیے۔ نشے میں آدمی کیا کچھ نہیں کرتا۔

سورج مندر کے سامنے سے گزرا اور بڑھتا چلا گیا۔ مندر سے کافی آگے جانے کے بعد اچانک اس نے نظر اٹھائی تو وہ لڑکا آتا دکھائی دیا، جس کی اسے تلاش تھی۔ اس کا نشہ جیسے ہرن ہو گیا۔ "یہ یہاں کہاں؟" وہ بڑبڑایا۔ نشے میں وہ اسے جے پور میں تلاش کر رہا تھا۔ لیکن ذرا سا ہوش آیا تو اسے یہ بات ناقابل یقین لگی۔ "کہیں مجھے چڑھ تو نہیں گئی؟"

وہ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ لڑکا ابھی خاصا دور تھا۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ٹوکرا تھا اور وہ اپنی دھن میں چلا آ رہا تھا۔

سورج نے کئی بار ہاتھوں سے آنکھوں کو مل ڈالا۔ مگر لڑکا سچ مچ وہی تھا۔ وہ وہیں کھڑا اس کے پاس سے گزرنے کا انتظار کرتا رہا۔ قریب سے دیکھوں گا تو پتا چلے گا۔ اس نے دل میں کہا۔

لڑکا ہر قدم اس سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اور ہر قدم پر سورج کو احساس ہو رہا تھا کہ یہ نشے کا دھوکہ نہیں۔ یہ سچ مچ وہی لڑکا ہے۔ نشہ ہوتا تو قریب آتے ہوئے لڑکے کی صورت بدلتی۔

اب لڑکا عین اس کے سامنے تھا...... اور وہ وہی تھا۔ اس کی صورت تو وہ آج تک نہیں بھول سکا تھا۔

وہ ایک پل کی بات تھی۔ وہ وہیں کھڑا رہ گیا اور لڑکا مٹھائی کا ٹوکرا لیے آگے نکل گیا۔

سورج بہت تیزی سے پلٹا اور اضطراری طور پر اس نے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن لڑکا اس کے ہاتھ کی پہنچ سے دور جا چکا تھا۔

سورج لڑکے کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ انتقام کا موقع ہے جو قسمت نے اسے دیا ہے۔ آج...... اسی وقت وہ اسے ختم کر سکتا ہے۔

لیکن کیسے؟ نشے سے نکلنے کی کوشش میں الجھتے ذہن نے سوال اٹھایا۔

واقعی! اس نے سوچا۔ اس وقت میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ لٹھیا نہ خنجر۔

کوئی بات نہیں۔ دل نے کہا۔ اس کے پاس بھی تو کچھ نہیں۔ وہ تو مٹھائی کا ٹوکرا اٹھائے ہوئے ہے۔ اسے جسمانی طور پر زیر کیا جا سکتا ہے۔

اس ایک پل میں سورج پر اپنے کتنے ہی بھید کھل گئے۔ اتنے عرصے سے وہ صرف اس لڑکے کی نفرت، انتقام کی آرزو میں اپنے اندر نہیں پال رہا تھا۔ اس کی بے خبری میں ایک اور چیز بھی اس کے اندر پل رہی تھی...... اور وہ تھا اس لڑکے کا خوف۔ پچھلے معرکے نے اسے اس لڑکے سے خوف زدہ کر دیا تھا۔ کیونکہ اس نے دیکھا تھا کہ اس لڑکے نے اس جیسے تین شہ زوروں کو اس دن زمین چٹا دی تھی۔ آٹھ افراد کو بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس نے پوری طرح سمجھ لیا۔ ہاں...... وہ اس سے خوف زدہ ہے۔ وہ اکیلا اس سے نہیں لڑ سکتا۔ لاٹھی ہوتی، خنجر ہوتا، تب بھی وہ اس سے نہ لڑ پاتا۔

لیکن ایک اچھی بات تھی۔ لڑکا اس کے شہر میں تھا اور اکیلا تھا۔ یہ اس سے نمٹنے کا بہت اچھا موقع تھا۔ سوال یہ تھا کہ اب وہ کیا کرے۔

وہ اس کے پیچھے چلتا رہا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اسے یہ معلوم کرنا ہے کہ لڑکا یہاں کہاں رہ رہا ہے۔ دوسرے مرحلے میں وہ اپنے ساتھیوں کو اس کے اور اس کے ٹھکانے کے بارے میں بتائے۔ لیکن کرتارا اس معاملے میں اعتبار کے قابل نہیں۔ جسونت نے اسے منع کر دیا ہے۔ کہا ہے کہ لڑکے کو بھول جائے اور یاروں کا یار کرتارا اپنے یار کی بات نہیں ٹالے گا۔ وہ انھیں کچھ نہیں

کرنے دے گا۔

ہاں رگھبیر کام کا آدمی ہے۔ وہ اس سے اتنی ہی نفرت کرتا ہے، جتنی وہ کرتا ہے اور راجو اور گوپال ہیں، جنھوں نے اس دن لڑکے سے زخم کھائے تھے۔ بس تو وہ جا کر رگھبیر کو بتائے گا۔ پھر وہ راجو اور گوپال سے بات کریں گے۔ اور اس کے بعد انتقام!

وہ چلتے چلتے ٹھٹک گیا۔ لڑکا بڑے مندر میں چلا گیا تھا اور پجاری سے بات کر رہا تھا۔

سورج وہیں کھڑا ہو گیا۔ اسے لڑکے کا پیچھا کر کے اس کا ٹھکانہ معلوم کرنا تھا۔

پانچ منٹ ہو گئے۔ لڑکا تو باہر نہیں آیا۔ البتہ مندر کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

سورج وہیں کھڑا رہا۔ اسے یقین تھا کہ لڑکا باہر آئے گا۔ تب وہ اس کا پیچھا کر کے اس کا ٹھکانہ معلوم کرے گا۔

دیر ہو گئی۔ آدھا گھنٹا گزرا...... پھر ایک گھنٹا ہو گیا۔ لڑکا باہر نہیں آیا۔ کھڑے کھڑے، پہلو بدلتے بدلتے اس کی ٹانگیں دکھ گئیں۔ مگر نہ دروازہ کھلا، نہ لڑکا باہر آیا۔ اب سورج اور امکانات پر غور کر رہا تھا۔ اس کے خیال میں لڑکے کا ٹھکانہ معلوم ہو گیا تھا۔ جس انداز میں وہ مندر میں گیا اور وہیں رک گیا، اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ مندر ہی میں ٹھہرا ہوا ہے۔

اب بس اسے جا کر رگھبیر سے بات کرنی تھی۔ رگھبیر بھی یقیناً خوش ہوگا۔ پھر وہ مل کر کچھ کریں گے۔

وہ میلے کی طرف جانے کے لیے چلا۔ لیکن اسے خیال آیا کہ اب تک تو میلہ اجڑ چکا ہوگا۔ یار لوگ گھر جا چکے ہوں گے۔ بہتر یہی ہے کہ وہ رگھبیر کے گھر جائے۔ وہ وہیں ملے گا۔ یہ سوچ کر وہ رگھبیر کے گھر کی طرف چل دیا۔

❀......❀......❀

بڑے پجاری نے بے حد پرتپاک انداز میں اوتار سنگھ کا خیر مقدم کیا۔ ''آؤ بالک، پدھارو۔''

اوتار سنگھ نے بہ اکراہ اسے نمسکار کیا۔ ''میں ٹھیک وقت پر آیا ہوں نا مہاراج۔''

''اوش بالک اوش۔''

چند لمحے گزر گئے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کھڑے تھے۔ اوتار سنگھ اس بات کا منتظر تھا کہ پجاری مندر کا دروازہ بند کرے اور اسے اندر لے کر چلے۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ پجاری کو بھی اس سے کوئی توقع ہے، جو پوری نہیں ہو رہی ہے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ بات کیا ہے۔

''اب دیر کس بات کی ہے مہاراج؟'' بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

''کچھ بھی نہیں بالک۔ تم بس پوجا کر لو، بھگوان کی آرتی اتار لو۔ پھر ہم اندر چل کر پاٹھ کریں گے۔''

اوتار سنگھ کو اب دکھاوے کے لیے بھی وہ شرک گوارا نہیں تھا۔ پوجا تو وہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن مصلحت ضروری تھی۔ ایسا نہ ہو کہ پنڈت اس کی طرف سے مشتبہ ہو جائے۔ ''پوجا بھی ضرور کروں گا مہاراج اور آرتی بھی اتاروں گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پرنتو پہلے مجھے اپنی سورگ باشی ماتا جی کی منوکامنا پوری کرنی ہے۔ تاکہ ان کی آتما کو شانتی ملے۔ پہلے مجھے اپنا سپنا پورا کرنا ہے۔ پوجا تو میں پاٹھ سننے کے بعد ہی کروں گا۔''

''جو اچھا تمہاری بالک۔ میں دروازہ بند کر لوں۔'' پجاری دروازے کی طرف بڑھا۔

مندر کا دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد پجاری نے بڑے بت کے ساتھ والا دروازہ کھولا۔ ''آؤ بالک۔''

اوتار سنگھ اس کے ساتھ اس کے کمرے میں چلا آیا۔ وہاں پجاری کے چیلے اور دیو داسیاں پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ پجاری ایک موٹے گدے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ ''آؤ بالک، تم یہاں میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔''

اوتار سنگھ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اب اسے یہ فکر تھی کہ اس وقت کمرے میں موجود لوگوں کے سوا اور کوئی مندر میں موجود تو نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کا کھیل خراب ہونے کا خطرہ تھا۔ اب یہ بات وہ پوچھے تو کیسے!

''مہاراج، اور کوئی موجود ہو تو اسے بھی بلا لیں۔'' بالآخر اس نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ مندر میں موجود بھی منش اس پاٹھ میں شریک ہوں۔''

پجاری مسکرایا۔ ''اس وقت ان لوگوں کے سوا مندر میں کوئی نہیں ہے بالک۔''

''تو ٹھیک ہے مہاراج۔''

پجاری نے گیتا کا پاٹھ شروع کیا اور ادھر اوتار سنگھ کو کراہت کا شدید احساس ہونے لگا، جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔ چند منٹ میں ہی اس کی یہ کیفیت ہوئی کہ اٹھ کر بھاگ جانے کو جی چاہنے لگا۔ اچانک ہی اسے خیال آیا اور وہ دل ہی دل میں کلمۂ طیبہ پڑھنے لگا۔ اس سے [illegible] آیا۔ لیکن گھبراہٹ اس کے باوجود رہی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ پاٹھ جلد از جلد ختم ہو اور اسے اس مصیبت سے نجات ملے۔

ادھر پجاری کے ذہن میں پانچ سو روپے کی خطیر رقم کا تصور تھا۔ چنانچہ وہ اس لڑکے کو خوش کر دینا چاہتا تھا۔ اس لیے رہ بہت جم کر گیتا پڑھ رہا تھا۔

لمحے گزرتے رہے۔ کلمہ پڑھتے پڑھتے اوتار سنگھ اونگھنے لگا۔ اب وہ سب کچھ اسے خواب جیسا لگ رہا تھا۔

❀......❀......❀

رگھبیر کو میلے سے واپس آئے۔ بہ مشکل آدھا گھنٹا ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

بے وقت کی اس دستک نے اسے حیران کر دیا۔ وہ اٹھ کر دروازے پر گیا۔

اس نے دروازہ کھولا تو سورج اس کے سامنے کھڑا تھا۔ سورج کے چہرے سے اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کے پاس کوئی سنسنی خیز خبر ہے۔ ''کیا بات ہے یارا۔ تو ابھی گھر نہیں گیا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''بات کیا ہے؟''

''اندر بیٹھ کر بتاؤں گا۔ بڑی خبر ہے۔'' رگھبیر نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ ''آ جا...... پر تو نے نیند خراب کر دی۔''

''خبر سنے گا تو تیری نیند اُڑ جائے گی۔''

''اب سنا بھی دے۔ آدھی رات ہو چکی ہے۔'' رگھبیر جھنجلا گیا۔

''خبر یہ ہے کہ وہ لڑکا اوتار سنگھ جے پور آیا ہوا ہے۔''

''کس نے بتایا تجھے؟ جسونت نے؟''

''ارے میں نے خود دیکھا ہے اسے...... اپنی آنکھوں سے۔''

''تب تو تو نے اسے ختم بھی کر دیا ہوگا۔'' رگھبیر نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ ''پر تیرے کپڑوں پر خون کے داغ واضح نظر نہیں آ رہے ہیں۔''

''تو مذاق سمجھ رہا ہے؟''

''تو اور کیا سمجھوں؟''

''میرے پاس خنجر نہیں تھا۔ ورنہ میں اسے مار کر ہی آتا اور کپڑوں پر خون کے داغ بھی ہوتے۔'' سورج نے غصے سے کہا۔

''دیکھ سورج، ہمیں پہلے ہی پتا تھا کہ تو آج اس چھوکرے کو ضرور دیکھے گا۔''

سورج بہت سوچ سمجھ کر رگھبیر کے پاس آیا تھا۔ لیکن وہ اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لے رہا تھا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

رگھبیر جانتا تھا کہ اس کے دوستوں میں شراب کی سب سے کم سہار سورج ہی کو ہے۔ وہ بہت جلدی بہک جاتا تھا اور وہ لڑکا تو مہینوں سے اس کے سر پر سوار تھا۔ ''سن سورج، گھر جا کر سو جا۔ صبح آ کے بتانا۔ تب میں ضرور مان جاؤں گا۔''

''میں نشے میں ضرور تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر میرا نشہ ختم ہو گیا تھا۔'' سورج نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں رگھبیر۔ میں نے اسے دیکھا ہے۔''

''اچھا...... ذرا جم کے بتا۔ اسے کہاں دیکھا تو نے؟''

سورج نے پوری تفصیل سنا دی۔

رگھبیر سوچ میں پڑ گیا۔ جو کچھ سورج نے بتایا تھا، وہ ناممکن نہیں تھا۔ یہ میلے کے دن تھے۔ عجب نہیں کہ اوتار سنگھ میلہ دیکھنے آیا ہو۔ لیکن یہ امکان اپنی جگہ تھا رگھبیر نشے میں کچھ بھی دیکھ سکتا تھا...... اور خاص طور پر اس لڑکے کو!

اس نے پوری تفصیل کئی بار سنی۔ کریدتے ہوئے سوالات کیے کہ کہیں بیان میں فرق ہو۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔

''اور تجھے یقین ہے کہ وہ مندر سے باہر نہیں آیا؟'' رگھبیر نے پوچھا۔

''میں پورا ایک گھنٹا مندر کے دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ دروازہ بند ہو گیا تھا۔''

''اگر وہ اوتار سنگھ ہی تھا تو یقیناً مندر میں ٹھہرا ہوا ہے۔ میں کرتارے سے بات کروں گا۔''

''کرتارے سے نہیں۔ وہ ہمیں کچھ کرنے نہیں دے گا۔ راجو اور گوپال کے پاس چل۔''

''اس وقت؟'' رگھبیر نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ''دیکھو یار، وہ مندر میں ہی ہے نا۔ ہم صبح مل کے طے کریں گے۔ پھر چل کر اسے دیکھیں گے۔ اگر وہ ہی ہے......''

''میں جو کہہ رہا ہوں کہ میں نے اسے دیکھا ہے۔'' سورج نے برا مان کر کہا۔

''تو ٹھیک ہے۔ کل کوئی ترکیب سوچ لیں گے۔ جا، گھر جا کر سو جا۔ صبح آنا۔ پھر راجو اور گوپال کے پاس چلیں گے۔''

سورج کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن رگھبیر کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

❀......❀......❀

پجاری بہت جم کے گیتا پڑھ رہا تھا!

اوتار سنگھ کے لیے ایک ایک پل بھاری تھا۔ وہ اس وقت عجیب کیفیت میں تھا۔ جو کچھ کرنے کا اس نے سوچا تھا، اس کا تصور ہی اس کے جسم میں سنسنی دوڑا رہا تھا۔ جسم میدانِ عمل میں اترنے اور عمل کرنے کو مچل رہا تھا۔ ایسے میں ساکت بیٹھنا اس کے لیے بے حد مشکل تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ اسے پاٹھ ختم ہونے کا انتظار کرنا تھا۔

دوسری طرف پجاری اوتار سنگھ کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی اصل خوشی کیا ہے۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ تو اسے کوفت میں مبتلا کر رہا ہے۔

اوتار سنگھ اس دوران کلمۂ طیبہ پڑھتا رہا تھا۔ ورنہ پاٹھ سن کر تو اس کا دل گھبرا رہا تھا۔

جیسے تیسے پاٹھ ختم ہوا اور اوتار سنگھ نے سکون کی سانس لی۔ ''لو بالک، تمہارا سپنا پورا ہوا۔'' پجاری نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

''ابھی کہاں مہاراج۔ ابھی تو مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔'' اوتار سنگھ معنی خیز لہجے میں بولا۔

پجاری مسکرا دیا۔ اسے پانچ سو روپے کا خیال آ گیا تھا۔ اس نے لڈو نکال کر تھالی پر رکھے اور ایک لڈو اوتار سنگھ کی طرف بڑھایا۔

''نہیں مہاراج۔ یہ کام تو میرا ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا اور تھالی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ ''یہ لیجیے۔'' اس نے لڈو پجاری کی طرف بڑھایا۔

پجاری نے لڈو کھایا اور چٹخارا لیتے ہوئے کہا۔ ''واہ بالک...... بہت مزے کا ہے۔''

''خاص طور پر بنوایا ہے مہاراج۔ ایک اور لیں۔''

پجاری نے ایک لڈو اور لے لیا۔ اوتار سنگھ نے وہاں بیٹھے پجاری کے چیلوں اور دیو داسیوں کو بڑے احترام سے لڈو پیش کیے۔ لڈو تھے ہی لذیذ۔ سبھی نے دوسرا لڈو بھی لیا۔ اب اسے لڈو کی تاثیر کا انتظار تھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر حلوائی نے صحیح کام نہیں دکھایا تو......

''تم بھی تو لو بالک۔'' پجاری نے اس سے کہا۔

''میں تو اپنے سپنے پر عمل کر رہا ہوں مہاراج۔'' اوتار سنگھ کا لہجہ مضحکہ اُڑانے والا تھا۔ ''اور میں نے سپنے میں خود لڈو نہیں کھایا تھا۔''

پجاری نے اسے یوں دیکھا، جیسے اس کی بات سمجھ نہیں پا رہا ہو۔ اس لمحے اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑھک گیا۔

''ارے...... یہ کیا ہو گیا مہاراج کو؟'' ایک چیلا گھبرا کر اٹھا۔

''کوئی خاص بات نہیں۔ نیند آ رہی ہو گی مہاراج کو۔'' اوتار سنگھ نے بے پروائی سے کہا۔

لیکن چیلے اور دیوداسیاں پجاری کو پر تشویش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کبھی وہ اوتار سنگھ کو بھی سوالیہ نظروں سے دیکھتے۔ پھر ان میں سے دو ڈھیر ہوئے تو باقی سراسیمہ ہو گئے۔ اب انھیں کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔

دیوداسیاں زیادہ گھبرائی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کچھ نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن گر پڑیں۔

دس منٹ کے اندر اندر وہ سب بے ہوش ہو چکے تھے۔ پھر بھی اوتار سنگھ نے اپنے اطمینان کے لیے ایک ایک کو ہلا جلا کر دیکھا۔ لیکن کسی کو ذرا بھی ہوش نہیں تھا۔

اوتار سنگھ کمرے سے نکل آیا۔ پجاری نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہاں موجود سب لوگ اس کے کمرے میں موجود ہیں۔ لیکن وہ بے احتیاطی کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے اندرونی حصے کو، اس کے ایک ایک کمرے کو دیکھا۔ تب کہیں وہ مطمئن ہوا۔ وہاں واقعی کوئی نہیں تھا۔ جو لوگ تھے، سب پجاری کے کمرے میں بے ہوش پڑے تھے۔ یعنی اب وہ بغیر کسی رکاوٹ کے اپنا کام کر سکتا تھا۔

اس نے مندر کے بیرونی ہال کی طرف کھلنے والا دروازہ کھولا اور ہال میں چلا آیا۔ چند لمحے وہ بھگوان کے بڑے بت کے سامنے کھڑا اسے گھورتا رہا۔ ''تو تم بھگوان ہو؟'' اس نے چیلنج

کرنے والے لہجے میں کہا۔ ''تم یہ پوری کائنات چلا رہے ہو۔ یہ نظام تم نے قائم کیا ہے۔ یہی بات ہے نا۔''

ہال میں خاموشی سنسنا رہی تھی۔ اوتار سنگھ کی سانسوں کے سوا وہاں کوئی آواز نہیں تھی۔

''تب تو تمہاری شکتیوں کی کوئی حد نہیں ہونی چاہیے۔ تم زندگی اور موت دیتے ہو۔ تو تم کسی کو بھی بچا سکتے ہو اور تمھیں تو دل کا حال بھی معلوم ہونا چاہیے۔ تمھیں علم ہونا چاہیے کہ میں یہاں کس نیت سے آیا ہوں۔'' اوتار سنگھ سرگوشی میں کہے جا رہا تھا۔

چند لمحے وہ بت کو یوں دیکھتا رہا، جیسے اس کے جواب کا انتظار کر رہا ہو۔ مگر بتوں میں جنبش کہاں ہوتی ہے۔

''بول نہیں سکتے تو کم از کم اشارہ ہی کر دو۔ تم پلکیں جھپکو گے تو میں سمجھوں گا کہ تم ہاں کہہ رہے ہو۔''

پتھر کا بت خاموش اور بے حس و حرکت تھا۔

''کیسے بھگوان ہو تم؟ تم میں تو اظہار کی قدرت بھی نہیں۔ تمھیں نہیں معلوم کہ میں یہاں کیوں...... کس لیے آیا ہوں۔ کیا سوچ کر آیا ہوں۔'' اوتار سنگھ کے لہجے میں ملامت تھی۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر اوتار سنگھ نے کہا۔ ''چلو...... میں خود ہی بتا دیتا ہوں۔ یہ جو تمھارے شریک ہیں......'' اس نے چھوٹے بتوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ تمھارے...... تمھارے ساتھی...... میں انھیں توڑنے کے لیے آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم انھیں بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرو گے۔ ہو سکتا ہے، تم مجھے موت دے دو۔''

اوتار سنگھ نے اپنے لباس میں سے کلہاڑی اور ہتھوڑا نکالا۔ ''یہ دیکھو...... میں یہ ہتھیار لایا ہوں۔ میں انھیں توڑ ڈالوں گا۔ روک سکتے ہو تو روک لو۔''

اوتار سنگھ کلہاڑی اور ہتھوڑا لے کر چھوٹے بتوں کی طرف بڑھا۔ سب سے پہلے اسے چھوٹے بت کو نشانہ بنانا تھا اور اس کے خیال میں اس کے لیے کلہاڑی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے کلہاڑی زمین پر رکھ دی اور ہتھوڑا سنبھال لیا۔

اس نے پلٹ کر بڑے بت کو دیکھا۔ ''تم تو کچھ بھی نہیں کر رہے ہو۔ آخر یہ تمہارا کارندہ ہے۔ اسے بچاؤ نا۔'' اس نے چیلنج کیا۔

پھر اس نے ہتھوڑے سے سب سے چھوٹی مورتی پر وار کیا۔ ایک ہی وار میں ٹوٹ گئی۔ اوتار سنگھ ٹھٹھکا۔ لیکن اگلے ہی لمحے مطمئن ہو گیا۔ آواز اتنی زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی اسے محتاط رہنا تھا۔ رات کے سناٹے میں آوازوں کا حجم بڑھ جاتا ہے اور وہ دور تک جاتی ہیں۔

اس کی اس احتیاط کا سبب خوف ہرگز نہیں تھا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ وہ مداخلت نہیں چاہتا تھا۔ کام ادھورا چھوڑنا اسے گوارا نہیں تھا۔ اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ اس کارروائی کے بعد وہ پکڑا

گیا تو لوگ اسے ختم کر ڈالیں گے۔ اس کی تو اسے پرواہی نہیں تھی۔ اسے تو بس یہ خیال تھا کہ نادان لوگ جن بتوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا کر شرک کر کے اللہ کو ناخوش کرتے ہیں، انھیں توڑ دے تا کہ اللہ خوش ہو کہ اس نے بساط بھر سامانِ شرک کا خاتمہ کیا ہے۔ اور اس کی ایک غرض اپنی بھی تھی جو پہلی مورتی کو توڑنے کے بعد اس کی سمجھ میں آئی۔ آدمی کے اندر بھی بت ہوتے ہیں۔ اس نے بچپن سے اب تک اپنے اندر کے بتوں کو توڑنے کی کوشش کی تھی۔ مگر آج وہ اپنے اندر کے بچے کھچے بت بھی توڑ دینا چاہتا تھا۔

اس نے ٹوٹی ہوئی مورتی پر مزید ضربیں لگائیں۔ ''دیکھو...... میں نہیں چاہتا کہ یہ قابل شناخت رہیں۔'' اس نے بڑے بت کی طرف رخ کر کے کہا۔ ''میں ان کو پہچانے جانے کے قابل ہی نہیں چھوڑوں گا۔''

پہلی مورتی کو چورا چورا کرنے کے بعد وہ دوسری مورتی کی طرف بڑھا۔ چند لمحوں میں وہ بھی چورا چورا ہو گئی۔

اب وہ ہنومان کی مورتی کے سامنے کھڑا تھا۔ ''تم اگر اللہ کے بنائے ہوئے بندر ہوتے تو بھی میرے ہاتھ نہ آتے۔ میں تمھیں پکڑ ہی نہیں سکتا تھا۔ کیوں...... غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟''

چند لمحے سناٹا رہا۔ اوتار سنگھ بت کو متوقع نظروں سے گھور رہا تھا۔

''جواب نہیں دے سکتے نا۔ بھاگو گے کیسے؟ تمھیں تو منش نے بنایا ہے نا۔ لو اب بچو۔''

اس نے وار کیا۔ مورتی ٹوٹ گئی۔ وہ اسے اور کوٹتا رہا۔

اب وہ گنیش کی مورتی کے سامنے تھا۔ ''تم اگر اللہ کے بنائے ہوئے ہاتھی ہوتے تو تمھارے سامنے ٹھہرنے کی مجھے مجال بھی نہ ہوتی۔ تم سامنے آتے تو میں جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑا ہوتا۔ لیکن تم منش کے بنائے ہوئے ہو اور منش تمھیں توڑ بھی سکتا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے گنیش کی مورتی بھی توڑ ڈالی۔

اب وہ کالی کے بت کے سامنے کھڑا تھا۔ ''اور تم؟ تمھارا شراپ تو مشہور ہے۔ تم تو جیون بھینٹ لیتی ہو۔ تم مجھے شراپ نہیں دو گی؟ میں تمھیں توڑنے والا ہوں۔''

وہ بت کافی بڑا تھا۔ ہتھوڑے کا وار ناکافی ثابت ہوا۔ تب اوتار سنگھ نے پہلی بار کلہاڑی اٹھائی۔ کلہاڑی کے ایک ہی وار نے بت کو زمیں بوس کر دیا۔ اس کے بعد اوتار سنگھ نے ہتھوڑا استعمال کیا۔ مورتی کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے وہ اس سے باتیں بھی کیے جا رہا تھا۔ ''سنو...... میں تمھارے شراپ کا انتظار کروں گا۔''

اس بت کے بعد اب وہاں بس ایک ہی بت سلامت رہ گیا تھا...... بھگوان کا بت۔

''اب میں ذرا اس بڑے کی خبر لے لوں۔'' اس نے کالی کے ملبے سے کہا۔

وہ بھگوان کے بت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ''یہ سب تو گئے۔'' اس نے حقارت سے

کہا۔ ''اور تم نے ان کی کوئی مدد نہیں کی۔ کیا اب یہ بھی تمھارا اعتبار کریں گے۔''

پتھر کا بت، جہالت کا خدا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔

''چلو، ان کی چھوڑو۔ دیکھیں، تم خود کو بچا سکتے ہو یا نہیں۔''

وہ بت بیٹھی ہوئی حالت میں بھی اس سے اونچا تھا۔ اوتار سنگھ نے کلہاڑی سے اس کی گردن پر وار کیا۔ اس کے ہاتھ کو زبردست جھٹکا لگا۔ ایسا لگا تھا کہ کلہاڑی کسی دھات سے ٹکرائی ہے۔ اوتار سنگھ نے دیکھا، بت کا کچھ بھی نہیں بگڑا تھا۔

اس نے دوبارہ وار کیا۔ مگر وہی کیفیت تھی۔ اس نے تیسری بار کوشش کی۔ پھر وہ دیوانہ وار کلہاڑی گھماتا گیا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ کافی آواز ہو رہی ہے۔ باہر کسی کو گڑبڑ کا احساس بھی ہو سکتا ہے۔ یہ اس کا آخری کام تھا اور اب اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ وہ تو بس اس بت کو زمیں بوس کرنا چاہتا تھا۔

وہ پوری قوت سے کلہاڑی گھما رہا تھا...... گھمائے جا رہا تھا۔ اس کا جسم پسینے میں نہا گیا۔ وہ ہانپنے لگا۔ اس کے بازو دکھ رہے تھے۔ اس نے ہاتھ روکا اور بت کو غور سے دیکھا۔ بت کی گردن پر، جہاں وہ وار کر رہا تھا، بس ہلکا سا نشان تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بت کسی چٹان سے تراشا گیا ہے اور بعد میں اس پر پینٹ کر دیا گیا ہے۔

اوتار سنگھ ہاتھ روک کر سوچنے لگا۔ جو کلہاڑی اس کے پاس تھی، اس کی دھار بہت تیز تھی اور پتھر بھی ایسے نہیں ہوتے کہ ٹوٹ ہی نہ سکیں۔ دھاتیں بھی کٹ جاتی ہیں۔ پتھر کی تو بساط ہی کیا ہے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ یہ بت نہیں ٹوٹ رہا ہے۔

اچانک اس کے دل میں خیال آیا کہ اسے اللہ سے مدد مانگنی چاہیے۔ اس نے دل میں اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ، میری مدد فرما۔ پھر اسے کچھ اور خیال آیا۔ اس نے کلہاڑی ہاتھ میں لی اور بلند آواز میں لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کہتے ہوئے کلہاڑی کا وار کیا۔

جو کچھ ہوا، اس کے نتیجے میں وہ خود کو سنبھال نہ سکا۔ اس کا جسم غیر متوازن ہوا اور وہ گر پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ کلہاڑی نے بت کی گردن کو ایسے کاٹ دیا تھا، جیسے چھری مکھن کو کاٹ ڈالتی ہے۔ بت کا سر بہت بھاری تھا۔ پرشور انداز میں دھڑ سے فرش پر گرا۔

اس آواز نے زمین پر گرے ہوئے اوتار سنگھ کو دہلا دیا۔ چند لمحے وہ ساکت و صامت زمین پر پڑا رہا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جو شور ہوا ہے، اس کا کوئی ردِعمل ظاہر ہوتا ہے یا نہیں۔

لیکن اندر باہر، ہر طرف سناٹا تھا۔ بت کا سر فرش پر گرنے کی بازگشت بھی دم توڑ چکی تھی۔

بالآخر وہ اٹھا اور اس نے سر کٹے بت کو دیکھا۔ اسے حیرت تھی کہ بت پر جو ناکام وار اس نے پہلے کیے تھے، وہ اس آخری وار سے زیادہ کاری اور طاقت ور تھے۔ اس بار تو اس کے بازوؤں میں پہلے جیسی طاقت بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس وار نے کام کر دکھایا۔ تو یہ اس کی دعا

کا نتیجہ تھا یا کلمۂ طیبہ کی طاقت!

اوتار سنگھ نے اِدھر اُدھر سے کچھ کچھ سن کر حاصل کیا تھا۔ مگر وہ یقینی طور پر کچھ نہیں جانتا تھا۔ اللہ پر وہ یقین رکھتا تھا۔ لیکن اس نے باقاعدہ اسلام تو قبول نہیں کیا تھا۔ کلمہ طیبہ کو وہ بجا طور پر پاکی کا ضامن سمجھتا تھا۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ وہ کلمہ حق ہے جو باطل کی بڑی سے بڑی قوت کو لمحوں میں پاش پاش کر دیتا ہے۔ اسے اس کلمے کی باطل شکنی کی قوت کا ادراک نہیں تھا۔

وہ کلمہ طیبہ پڑھ کر بڑے بت پر وار کرتا رہا اور بت کے ٹکڑے اُڑتے رہے۔ یہاں تک کہ بت زمیں بوس ہو گیا۔ وہ مزید وار کر کے اسے ناقابل شناخت بنانے کی کوشش کرتا رہا اور بالآخر کامیاب ہو گیا۔

اب مندر ایک ایسی تباہی کا منظر پیش کر رہا تھا، جو دیکھنے والوں کو ناقابل یقین لگتی۔

اوتار سنگھ کے بازو شل ہو چکے تھے۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ لیکن خوش اور مطمئن تھا۔ اس نے اللہ کو خوش کرنے کے لیے ایک کام کیا تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ اللہ اس سے خوش ہے۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ بڑا بت اس سے نہیں ٹوٹ رہا تھا۔ وہ اللہ کی تائید اور مدد ہی کے نتیجے میں ٹوٹا تھا۔

چند لمحے وہ وہاں بیٹھ کر سانسیں درست کر رہا تھا۔ دل تو چاہتا تھا کہ وہ وہیں لیٹ کر سو جائے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔ ہوٹل جا کر وہ آرام کر سکتا ہے۔ لیکن وہ بھی تھوڑی دیر۔ کیونکہ اسے صبح چھ بجے آگرہ جانے والی گاڑی پکڑنی ہے۔

اس نے کلہاڑی اور ہتھوڑا اپنے کپڑوں میں چھپایا اور مندر کے اندرونی حصے میں چلا آیا۔ وہاں بھی سناٹے کا راج تھا۔ وہ پجاری کے کمرے میں گیا۔ وہاں سب لوگ ویسے ہی پڑے تھے، جیسا وہ انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔

وہ گلی میں کھلنے والے دروازے کو کھول کر باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر اس نے دروازے کو بھیڑ دیا۔ پھر وہ گلی سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ انسان تو درکنار اسے راستے میں کوئی کتا بھی نظر نہیں آیا۔ وہ ہوٹل کی طرف بڑھتا رہا۔

ہوٹل پہنچ کر وہ نہایا۔ پھر اس نے پانچ بجے کا الارم لگایا اور سو گیا!

❀......❀......❀

وہ ایسی رات تھی کہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ مولوی صاحب کے کمرے سے آنے کے بعد اس نے ڈائری اٹھائی اور اس میں لکھنا شروع کر دیا۔

نیند نہ آنے کی وجہ کوئی پریشانی نہیں تھی۔ بلکہ آج تو وہ بہت خوش تھا...... اتنا خوش جتنا وہ صرف اوتار سنگھ کی پیدائش پر ہوا تھا۔ پہلی بار اسے معلوم ہوا تھا کہ خوشی نیند بھی اُڑا دیتی ہے۔

اس نے ڈائری بند کر کے رکھی، لائٹ آف کی اور بستر پر دراز ہو گیا۔ لیکن آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اس نے اوتار سنگھ کا تکیہ اٹھالیا اور اسے سینے سے لگا لیا۔

وہ تکیہ سینے سے لگتے ہی اسے نیند آ جاتی تھی۔ مگر اس رات ایسا نہیں ہوا۔ یہ الگ بات کہ وہ اوتار سنگھ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کا انتظار ختم ہونے والا تھا۔ اوتار سنگھ کو آج آنا تھا اور جب وہ آئے گا تو وہ اس سے وہ اہم بات کرے گا۔

اس خیال سے اس کا دل غیر معمولی رفتار سے دھڑکنے لگا۔ دماغ میں اندیشے سرسرانے لگے۔ وہ کسی بھی طرح یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کی بات سن کر اوتار سنگھ کا ردعمل کیا ہوگا۔ کیا وہ بغاوت پر آمادہ ہو جائے گا؟ کیا وہ اسے چھوڑ دے گا؟ کیا وہ اس بڑھاپے میں منتوں مرادوں والے اکلوتے بیٹے سے محروم ہو جائے گا؟ یہ سوالات اسے پریشان کر رہے تھے۔

لیکن ایک خیال بے حد خوش آئند تھا۔ اوتار سنگھ اسے ایک غیر معمولی نعمت کی طرح غیر معمولی حالات میں ملا تھا اور اس کے بعد جو واقعات پیش آئے، وہ بھی غیر معمولی تھے اور ٹھاکر پیچھے پلٹ کر دیکھتا تو یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ اس کا بیٹا بہت نیک، سعادت مند اور فرماں بردار تھا۔ یہی نہیں، وہ فیض رساں بھی تھا۔ آج ٹھاکر پرتاپ سنگھ جو کچھ بھی تھا، پہلے سے بہت اچھا تھا...... اور وہ بیٹے کے فیض ہی کی وجہ سے تھا۔ تو وہ اس بیٹے کو حقیقت بتائے گا تو امکان تو یہی ہے کہ وہ ناراض نہیں ہوگا بلکہ شاید وہ بھی......

لیکن اگر ایسا نہیں ہوا تو؟ ایک نکیلے سوال نے اس کے ذہن میں سر اٹھایا۔

بے ساختہ جواب بھی فوراً ہی ابھرا۔ تو کوئی بات نہیں۔ میں اس بیٹے کو خود چھوڑ دوں گا...... اس بیٹے کو جو میرے لیے وجہ زندگی ہے اور جب اس کو چھوڑوں گا تو سانس لینے کے سوا بھی کچھ چھوڑ دوں گا۔ میں نکل جاؤں گا کسی لمبے سفر پر...... اور کہیں نہیں رکوں گا۔ کبھی نہیں رکوں گا۔

پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس نے خود سے کہا۔ اللہ مالک ہے۔ جو وہ چاہے گا، وہی ہوگا۔ پھر پروا کیا کرنی۔

اور اس خیال سے اس کا دل مطمئن بھی ہو گیا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بج رہے تھے۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اب سونے کا وقت تو نہیں رہا۔ اب تو اسے اٹھنا تھا اور ایک بہت اہم کام کرنا تھا۔ اس کام کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔

وہ اٹھا اور کمرے سے نکل آیا!

❀......❀......❀

الارم کی آواز پہلے تو اسے خواب کا ہی حصہ لگی...... لیکن اَن مِل اور بے جوڑ حصہ! اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور اس وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔ چند لمحے تو اس کی سمجھ میں کچھ آیا ہی نہیں۔ خواب کا تاثر ایسا گہرا تھا کہ اسے نکلنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ الارم کی آواز نہ ہوتی تو شاید وہ اس سے نکل ہی نہ پاتا۔ اسی نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ ہوٹل کے کمرے میں تھا۔ الارم کی

آواز سرہانے کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر گھڑی کا الارم بند کر دیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھا۔ مگر اس کے دماغ پر وہ خواب طاری تھا۔ وہ اس کے بارے میں سوچنے لگا۔

خواب میں اس نے ایک بے حد روشن چہرے اور دمکتی پیشانی والے بزرگ کو دیکھا تھا۔ وہ ایک صحرا میں کھڑا تھا۔ تاحدِ نظر ریت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا...... نہ کوئی راستہ، نہ کسی راستے کا نشان۔ اور پیاس ایسی تھی کہ زبان میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ وہ پریشان اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ کچھ فاصلے پر وہ بزرگ اسے نظر آئے۔

اس نے ان کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس میں ایک قدم بڑھانے کی طاقت بھی نہیں تھی۔ نجانے کب سے وہ اس صحرا میں بھٹک رہا ہوگا۔ اور صحرا نے اس کی ساری طاقت نچوڑ لی تھی۔

وہ بے بسی محسوس کر رہا تھا کہ وہ بزرگ اس کی طرف بڑھنے لگے۔ چند لمحوں میں وہ اس کے قریب آ گئے۔ تب وہ گھٹنوں کے بل بیٹھے اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ''آپ کیسے ہیں بیٹے؟'' ان کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

اوتار سنگھ کو ایسا لگا کہ یہ سب کچھ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ ''میں ٹھیک ہوں بابا۔'' اس نے کہا اور پھر اسے یاد آ گیا۔ وہ بچپن میں ان سے ملا تھا۔ ''میں آپ سے پہلے بھی مل چکا ہوں نا بابا؟''

''ہاں۔ تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے۔''

اوتار سنگھ بھی ریت پر بیٹھ گیا۔ بزرگ نے اب بھی اس کے دونوں ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ ''تمہیں بہت پیاس لگ رہی ہے نا؟'' انھوں نے پوچھا۔

اوتار سنگھ نے انھیں اپنی زبان دکھائی۔ وہ موٹی بھی ہو رہی تھی اور اس پر کانٹے بھی ابھرے ہوئے تھے۔

''بہت مبارک ہے یہ پیاس۔'' بزرگ نے کہا۔

''مگر بہت ستا رہی ہے۔''

''بجھ جائے گی اور جتنی دیر میں بجھے گی، اتنا ہی نفع ہوگا تمہیں۔ بجھنے کو تو یہ ابھی بجھ جائے۔ اس ریت کو پانی بننے میں دیر نہیں لگے گی۔ لیکن ابھی مالک کی مرضی نہیں ہے۔ اس نے تو ہر کام کا مناسب ترین وقت مقرر کیا ہوا ہے۔ اس پیاس کو برداشت کرنے کا بہت بڑا صلہ ملے گا تمہیں۔ یہ تمہاری عبادت ہے، ریاضت ہے۔''

''میں کیا کروں بابا؟'' اوتار سنگھ نے بے بسی سے پوچھا۔

''چلتے رہو۔ منزل پر پہنچو گے تو پیاس بھی بجھ جائے گی۔''

''مگر مجھے تو راستہ بھی معلوم نہیں۔ مجھے صحیح اور غلط کی تمیز بھی نہیں۔''

''جس پر تم چل رہے ہو، وہی تمہارا راستہ ہے اور درست راستہ ہے۔''

''کتنی دیر لگے گی بابا؟''

''یہ تو وہی جانتا ہے۔ اس کی مرضی ہو تو برسوں کی مسافت پل بھر میں طے ہو جائے۔ تم پلک جھپکو تو منزل کے سامنے کھڑے ہو۔ یہ بھی اس کی نعمت ہے۔ اور مسافت کا طویل ہو جانا بھی اس کی نعمت ہے کیونکہ اس میں سختی اور ریاضت ہے۔ اب یہ اس کی مرضی کہ کسی کو وہ پہلی نعمت دیتا ہے اور کسی کو دوسری۔ دونوں صورتوں میں بندے کو بس شکر ادا کرنا چاہیے۔ یاد رکھو، پریشانی بھی نعمت ہے اور آسانی بھی۔ اور ہر نعمت اس کی آزمائش بھی ہے۔ ایک نعمت سے بندہ گھبرا کر شکایت پر آ جاتا ہے اور ناشکری کرتا ہے۔ دوسری نعمت میں تکبر کرتا ہے اور ناشکری اور اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ عافیت صرف شکر ادا کرتے رہنے میں ہے۔''

''مگر مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا بابا۔ مجھے تو کچھ علم ہی نہیں۔''

''علم تو تمہیں ہر قدم پر ملتا رہا ہے اور ملتا رہے گا۔''

''مگر میں کچھ بھی نہیں جانتا۔''

''وقت آنے پر سب کچھ جان جاؤ گے۔ بس چلتے رہو۔ اسی طرح قدم بڑھاتے رہو۔''

''ٹھیک ہے بابا۔ میں بس اللہ کو خوش کرنا چاہتا ہوں۔''

''وہی تو میں خوش خبری لایا ہوں تمھارے لیے۔ تم نے جو کچھ اللہ کے لیے کیا، اللہ اس سے خوش ہوا۔ اس نے قبول فرمایا۔''

اوتار سنگھ خوش ہو گیا۔ وہ اپنی پیاس اور زبان کے کانٹے بھول کر مسکرا دیا۔

''لیکن میں تمھیں خبردار کرنے بھی آیا ہوں۔ ایک لمحے میں آدمی اپنے کیے کرائے پر پانی بھی پھیر دیتا ہے۔'' بزرگ نے کہا۔

اوتار سنگھ گھبرا گیا۔ ''میں سمجھا نہیں بابا۔''

''بندے کو اپنے کسی عمل پر پھولنا نہیں چاہیے۔ اس لیے کہ وہ اس کے رب کی طرف سے ہوتا ہے۔ توفیق بھی وہی دیتا ہے، قوتِ عمل بھی اسی کی دی ہوئی ہے، راستہ بھی وہی بناتا ہے اور بندے کے اندر عمل کی تلقین بھی وہی ڈالتا ہے۔ بندے کا تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اچھا عمل کر کے خود پر فخر کر لیا تو سب کچھ تباہ کر لیا۔ دوسری بات یہ کہ اللہ کے لیے کچھ کرو تو اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ جتنی بھاری قیمت ادا کرو گے، عمل اتنا ہی مقبول ہوگا۔ مگر قیمت ادا کرنے کے بعد کے آداب بھی ہیں۔ قیمت ادا کر کے پچھتائے، غم کیا، افسوس تو سب کچھ ختم۔ جتنی بڑی قیمت ادا کرو، اتنی ہی خندہ پیشانی سے رہو۔ اللہ کے عام بندوں میں اور خاص بندوں میں یہی فرق ہوتا ہے۔''

''میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا بابا۔''

"ابھی کیسے سمجھ سکتے ہو۔ وقت آئے تو میری یہ بات یاد رکھنا۔ میں نے تمھیں بتایا ہے کہ تم نے جو کچھ کیا، وہ اللہ نے قبول فرمایا۔ اس کا بہت بڑا صلہ ملے گا۔ لیکن اس کی بہت بھاری قیمت بھی ادا کرنی ہوگی۔ وہی تمہاری آزمائش ہوگی اور اس میں اللہ ہی تمہاری مدد کرے گا۔"

یہ کہہ کر بزرگ نے اس کے دونوں ہاتھوں کو چھوا اور آنکھوں سے لگایا۔ وہی وہ وقت تھا، جب الارم کی آواز اس کی سماعت میں پڑی......

اوتار سنگھ خوش ہوگیا۔ اے اللہ، آپ کا شکر ہے۔ میں نے آپ کو خوش کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہا۔ آپ نے مجھے راستہ دکھایا اور کچھ کرنے کا موقع دیا۔ میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ بے شک سب کچھ آپ کی طرف سے ہے۔

وہ چونکا۔ اسے یاد آیا کہ اسے تو آگرہ جانا ہے۔ وہ تازہ دم اور خوش و خرم تھا۔ وہ اٹھا اور اس نے سفر کی تیاری شروع کردی۔

صبح چھ بجے وہ آگرہ جانے والی گاڑی میں بیٹھا تھا!

❁......❁......❁
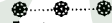
سورج سنگھ کے لیے وہ سونے کی رات نہیں تھی۔ یہ بات نہیں کہ اس نے سونے کی کوشش نہ کی ہو۔ کیونکہ جاگنے کا کچھ حاصل نہیں تھا۔ لیکن نیند آ ہی نہیں رہی تھی۔ چار بجے کے قریب اس نے سونے کا ارادہ ختم کردیا۔ اس نے سوچا تھا کہ صبح سات بجے وہ رگھبیر کے پاس جائے گا۔

لیکن پانچ بجے تو وہ سو گیا۔ آنکھ کھلی تو دس بجے تھے، دن چڑھ گیا تھا۔

اس نے منہ ہاتھ دھویا، دانت صاف کیے اور ناشتہ کیے بغیر ہی گھر سے نکل آیا۔

وہ رگھبیر کے گھر پہنچا تو رگھبیر نے اسے تمسخرانہ نگاہوں سے دیکھا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ تو سویرے ہی آ دھمکے گا۔ مگر تو نے اتنی دیر کردی۔ لگتا ہے، نشہ اتر گیا تیرا۔"

"مجھے نشہ تھا ہی نہیں...... بس صبح ہوتے ہوتے نیند آ گئی تھی۔"

"تجھے یاد ہے، رات تو میرے پاس آیا تھا؟"

"کہہ تو رہا ہوں کہ میں نشے میں نہیں تھا۔ مجھے سب یاد ہے۔" سورج نے جھنجلا کر کہا۔

"یہ بھی یاد ہے کہ تو نے مجھ سے کیا بات کی تھی۔"

"ہاں ہاں، یاد ہے۔ وہ لڑکا اوتار سنگھ یہاں آیا ہوا ہے۔"

"چل پھر راجو اور گوپال کے ساتھ چلتے ہیں۔"

وہ دونوں راجو کے گھر جانے کے ارادے سے نکل آئے۔ لیکن آدھے راستے میں ہی راجو انھیں مل گیا۔ اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ گوپال، کرتارا اور جسونت بھی تھے۔

"کہاں چل دیے تم دونوں؟" کرتارے نے ان سے پوچھا۔

"تم لوگوں سے ہی ملنے کے لیے نکلے تھے۔" رگھبیر نے کہا۔

کرتارے نے بہت غور سے انھیں دیکھا۔ "کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟"

"ایک بڑی بات ہے۔" رگھبیر جھجکنے لگا۔

"کچھ بول تو سہی۔"

مگر رگھبیر ہچکچا رہا تھا۔ کرتارے کے اصرار پر اس نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔ "یہ سورج کہتا ہے کہ اس نے رات اس لڑکے اوتار سنگھ کو دیکھا ہے۔"

"تو پھر؟"

"یہ رات نشے میں تھا۔ ہم سب ساتھ ہی بیٹھے پی رہے تھے۔ اسے چڑھنے لگی تو یہ یہ کہہ کر اٹھ گیا کہ اوتار سنگھ کو تلاش کرے گا۔ شراب چڑھتی ہے تو یہ ہمیشہ یہی کرتا ہے۔ پھر آدھی رات کو یہ میرے گھر آیا اور کہنے لگا کہ اس نے اسے بڑے مندر میں جاتے دیکھا ہے۔"

کرتارا ہنسنے لگا۔ مگر جسونت بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ "تو اب تو اتر گیا ہوگا نشہ؟" کرتارے نے پوچھا۔

"نہیں یارا۔ یہ کہتا ہے، وہ سچ مچ وہی تھا۔"

"تو پھر؟" اس بار کرتارے کا لہجہ کڑا تھا۔

رگھبیر کے بولنے سے پہلے ہی سورج بول اٹھا۔ "پھر یہ کہ ہمارے لیے یہ بدلہ لینے کا بہت اچھا موقع ہے۔"

"میں نے کہا تھا نا کہ اسے بھول جاؤ۔" کرتارا بولا۔

"راجپوت کے لیے بےعزتی بھولنے کی چیز نہیں ہوتی یارا۔"

"سورج ٹھیک کہہ رہا ہے کرتارے۔" راجو اور گوپال نے بہ یک آواز تائید کی۔

"کرتارے...... میں نے کہا تھا کہ اب اسے کوئی ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ ان سے کہو کہ اسے بھول جائیں۔" جسونت نے پہلی بار زبان کھولی۔ وہ بے حد سخت لہجے میں کرتارے سے مخاطب ہوا تھا۔

"ہمارے درمیان یہ فیصلہ ہو چکا تھا۔" کرتارے نے دوستوں سے کہا۔

رگھبیر نے کرتارے کا ہاتھ پکڑا اور بڑی لجاجت سے بولا۔ "میری ایک بات...... الگ چل کر۔"

کرتارا چند لمحے اسے گھورتا رہا۔ پھر جسونت کی طرف متوجہ ہوا۔ "چلو یارا، بات سننے میں کیا جاتا ہے اپنا۔"

کرتارا ان دونوں کو الگ لے گیا۔ "دیکھو مجھے یقین نہیں ہے کہ سورج کی بات پکی ہے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ نشے میں تھا اور نشے میں وہ اپنے باپ کو بھی اوتار سنگھ سمجھ سکتا

ہے۔''

''تو ہم کیا کریں؟'' جسونت نے بگڑ کر کہا۔

''عقل سے کام لو۔ اگر وہ اوتار سنگھ تھا اور مندر میں ٹھہرا ہوا تھا تو اب تک جا چکا ہوگا اور وہ اوتار سنگھ نہیں تھا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔'' رگھبیر نے انھیں سمجھایا۔ ''سورج کی تسلی کے لیے مندر تک جانے میں ہمارا کیا بگڑ جائے گا۔''

''اور اگر وہ اوتار سنگھ ہی ہے اور اس وقت بھی مندر میں موجود ہے تو۔'' جسونت نے سوال اٹھایا۔

''اس کا کوئی مکان نہیں۔ لیکن ایسا ہوا تو دیکھ لیں گے۔''

''جب امکان ہی نہیں ہے تو ضرورت کیا ہے۔''

''دوست کی تسلی تو ہو جائے گی۔ یاری میں فرق نہیں آنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے یارا۔'' کرتارے نے جسونت سے کہا۔ ''رگھبیر کی بات مان لینی چاہیے۔''

''تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔'' جسونت نے بے دلی سے کہا۔

❁......❁......❁

صبح سویرے پوجا کے لیے آنے والے آئے اور انھیں مندر کا دروازہ بند ملا تو وہ بہت حیران ہوئے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ مندر کا دروازہ تو صبح ہی کھل جاتا تھا۔ بہر حال انھوں نے سوچا کہ کسی وجہ سے دیر ہو گئی ہے۔ ابھی دروازہ کھل جائے گا۔ وہ بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔

ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ مشکل سے آٹھ دس افراد ہوں گے۔ ان میں بھی ایک کے سوا سب عورتیں تھیں۔ دروازے پر دستک دینے کی ان میں ہمت نہیں تھی کہ کہیں پجاری ناراض نہ ہو جائے۔

ایک گھنٹا انتظار کرنے کے بعد وہ لوگ واپس چلے گئے۔

کچھ دیر بعد پوجا کے لیے آنے والے آٹھ دس افراد پھر جمع ہو گئے۔ اب دن چڑھ آیا تھا۔ وہ لوگ بھی تبصرے کرتے رہے۔ لیکن دروازہ کھلوانے کی کوشش انھوں نے بھی نہیں کی۔

اسی طرح لوگ آتے اور جاتے رہے۔ مجمع لگنے کی نوبت بہر حال نہیں آئی۔

لیکن ساڑھے دس بجے جو لوگ مندر کے بند دروازے کے سامنے کھڑے تھے، وہ واضح طور پر تشویش میں مبتلا تھے۔ انھیں یہ بند دروازہ بہت غیر معمولی بات لگ رہا تھا اور وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اس بار ان میں مردوں کی تعداد تین تھی۔

وہ چھ دوست مندر کے پاس پہنچے تو انھوں نے لوگوں کو مندر کا دروازہ پیٹتے پایا۔ ''یہ کیا معاملہ ہے؟'' جسونت بڑبڑایا۔

''کوئی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔'' سورج نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔

''چل کر پوچھیں گے تو پتا چلے گا۔''

ویسے تو مندر کا بند دروازہ ہی صورتِ حال کی سنگینی کا احساس دلا رہا تھا۔ دروازہ پیٹنے والوں میں سے ایک نے کہا۔ ''ایسا آج تک نہیں ہوا کہ مندر کا دروازہ صبح سویرے ہی نہ کھل گیا ہو۔''

دروازہ پیٹا جاتا رہا۔ لیکن اندر نقل و حرکت تھی نہ کوئی آواز۔ وہاں تو موت کا سا سکوت طاری تھا۔

''گلی میں دروازہ ہے۔ اسے دیکھیں۔'' گوپال نے کہا۔

''ہاں...... ضرورت پڑی تو اسے توڑا بھی جا سکتا ہے۔'' راجو بولا۔

وہ گلی کی طرف چل دیے۔ ان کے ساتھ وہ تینوں مرد بھی تھے، جو مندر کا دروازہ پیٹ رہے تھے۔ عورتیں وہیں رہ گئیں۔

انھوں نے چھوٹے دروازے پر دستک دی۔ مگر وہ ہاتھ کا دباؤ پڑتے ہی کھل گیا۔

''ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔'' اس بار کرتارا بڑبڑایا۔

وہ سب چند لمحے ہچکچاتے رہے۔ مگر بالآخر اندر داخل ہو گئے۔

ایک ایک کر کے وہ کمروں میں جھانکتے پھرے۔ مگر وہ خالی تھے۔ آخر بڑے پجاری کے کمرے میں انھیں وہ سب لوگ نظر آئے۔

وہ بڑا عجیب منظر تھا۔ دیوداسیاں اور چیلے بے ترتیب بکھرے پڑے تھے۔ بڑا پجاری بھی بے ہوش تھا۔ مگر سانسوں کی وجہ سے اس کی موٹی توند اوپر نیچے نہ ہو رہی ہوتی تو وہ یہی سمجھتے کہ وہ مر گیا ہے۔

انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں لڈوؤں کا ایک ٹوکرا رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی سورج سنگھ نے ہیجانی لہجے میں کہا۔ ''یہ اسی کی حرکت ہے۔''

جسونت نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''دوسرے لوگوں کی موجودگی میں تم اس کی بات نہیں کرو گے۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

لیکن سورج نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ ''میں نے تمھیں بتایا تھا نا کہ وہ مٹھائی کا ٹوکرا لے کر مندر میں داخل ہوا تھا۔ یہ وہی ٹوکرا ہے۔'' وہ رگھبیر سے مخاطب تھا۔

دوسرے تین مرد اس کی بات بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے۔ ''پرنتو ہوا کیا ہے؟'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''اسے سمجھاؤ۔ ہم بعد میں اکیلے میں بات کریں گے۔'' کرتارے نے رگھبیر سے کہا۔

مگر اتنی دیر میں سورج پوچھنے والے کو جواب دے رہا تھا۔ ''جو ہوا ہے، نظر آ رہا ہے۔ وہ بھنگ کے لڈو لایا تھا۔ یہ سب لوگ اسی کے اثر میں ہیں۔''

''تم نے اسے دیکھا تھا؟'' دوسرے آدمی نے پوچھا۔

''ہاں، کہہ تو رہا ہوں۔ دیکھا تھا۔''

''تم اسے جانتے ہو؟'' یہ تیسرا تھا۔

رگھبیر نے سورج کا ہاتھ تھاما اور اسے تقریباً کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ ''سورج، جو بات ہمیں دوستوں کو اکیلے میں کرنی ہے، وہ سب کے سامنے نہ کر۔'' اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''ابھی تو ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کیا ہوا ہے۔''

''میں کیوں چپ رہوں؟''

''میں کہہ رہا ہوں نا۔'' رگھبیر کے لہجے میں سختی تھی۔

''ٹھیک ہے۔''

وہ دونوں اندر آئے۔ وہاں باہر کے تین آدمیوں میں سے ایک جسونت سے کہہ رہا تھا۔ ''تمھارے متر کی بات ٹھیک لگتی ہے۔ پرنتو اس نے ایسا کیوں کیا؟''

''ہمیں کچھ نہیں معلوم۔'' جسونت نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اب انھیں ہوش میں لایا جائے، تبھی کچھ پتا چلے گا۔''

ان میں سے وہ آدمی باہر نکل گئے۔ ایک وہیں رہ گیا۔ وہ بے ہوش لوگوں کو ہوش میں لانے کی کوشش میں ان لوگوں کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ راجو باہر سے پانی کی بالٹی لے کر آیا تھا اور وہ سب ان لوگوں پر پانی ڈالتے ہوئے انھیں ہلا رہے تھے۔

مگر بے ہوش لوگوں کی آنکھیں کسی طرح کھل ہی نہیں رہی تھیں۔ ادھر گلی کے دروازے سے اور لوگ بھی اندر آ گئے تھے اور مزید لوگ مسلسل آئے جا رہے تھے۔ سب اپنی اپنی کہے جا رہے تھے۔ مندر کا اندرونی حصہ آوازوں سے بھر گیا تھا۔

بالآخر سب سے پہلے پجاری ہی کو ہوش آیا۔ ہوش میں آتے ہی اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر چیخا۔ ''ارے...... میرے پانچ سو روپے!''

''ہوش میں آؤ پنڈت جی۔'' راجو نے اسے ہلا ڈالا۔ ''بتاؤ، یہ سب کیا ہے۔''

پجاری شروع ہو گیا۔ ''وہ ایک بالک تھا......''

''میں نے کہا نا، وہ وہی تھا۔'' سورج نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔

''چپ رہو، بات سننے اور سمجھنے دو۔'' کرتارے نے اسے ڈپٹا۔

پنڈت کا دماغ اب بھی چکرا رہا تھا۔ لیکن سنبھل سنبھل کر اس نے بتانا شروع کیا۔ دوسروں کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے والے بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ادھر ہجوم کافی بڑھ گیا تھا۔ جسونت کافی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بار بار کرتارے سے سرگوشی میں بات کرتا۔ کرتارا بھی متفکر تھا۔

پجاری نے اپنی پوری کتھا سنا ڈالی۔ ''لڈو کھانے کے بعد میں دیکھتے ہی دیکھتے بے

ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں۔''

''پرنتو اس کا کچھ مطلب تو ہے۔'' کسی نے کہا۔ ''میرا خیال ہے، یہ چوری کا معاملہ ہے۔ یہاں قیمتی چیزیں بھی تو ہوں گی۔''

''یہ بات نہیں۔ اسے پیسے کی ضرورت نہیں۔'' سورج نے جلدی سے کہا۔ ''وہ بڑے پیسے والے لوگ ہیں۔''

''تم اسے جانتے ہو؟''

''ہاں...... اچھی طرح۔ وہ ٹھاکروں کی گڑھی کے پرتاپ سنگھ کا بیٹا اوتار سنگھ تھا۔''

لیکن پنڈت کو چوری کی بات لگ گئی تھی۔ وہ جلدی سے کمرے میں رکھی تجوری کی طرف لپکا۔ اس نے چابی لگائی اور تجوری کھول کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے سر ہلایا اور آسودہ آواز میں بولا۔ ''بھگوان کی کرپا سے سب ٹھیک ہے۔''

''سب ٹھیک تو ہو نہیں سکتا۔'' کسی نے کہا۔ ''اس نے سب کو مذاق میں بے ہوش تو نہیں کیا ہوگا۔''

''تم اس کا حلیہ بتاؤ۔'' سورج نے پجاری سے فرمائش کی۔

پجاری اوتار سنگھ کا حلیہ بتا رہا تھا اور سورج اپنے ساتھیوں کو فاتحانہ نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ جسونت کے علاوہ وہ سبھی اثبات میں سر ہلا رہے تھے۔

''مان گئے نا کہ وہ اوتار سنگھ ہی تھا۔'' سورج نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

''یہ تو دیکھ لو کہ وہ کیا کر کے گیا ہے۔'' راجو بولا۔

اس پر پجاری کو کچھ خیال آیا۔ دراصل ابھی وہ دوا کے اثر سے پوری طرح آزاد نہیں ہوا تھا۔ اس کا دماغ دھندلایا ہوا سا تھا۔ بہرحال وہ کمرے سے نکلا اور مندر کے بیرونی حصے کی طرف کھلنے والے دروازے کی جانب بڑھا۔ سب لوگ اس کے پیچھے تھے۔

پجاری دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے ایک کریہہ چیخ نکلی اور وہ پاگلوں کی طرح اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔

دوسرے لوگ بھی اندر گھسے۔ اور ان سب کا بھی برا حال ہو گیا۔ اب لوگ اندر گھستے جا رہے تھے اور واویلا بڑھتا جا رہا تھا۔

مندر کا منظر بہت عجیب تھا۔ لگتا تھا کہ لوہے کے کسی ہاتھی نے اسے روند ڈالا ہے۔ بات صرف اتنی سی نہیں تھی کہ وہاں کوئی بت سلامت نہیں تھا۔ معاملہ یہ تھا کہ وہاں یہ بتانا بھی مشکل تھا کہ کہاں کون سا بت رہا ہوگا۔ وہاں تو صرف ملبہ تھا۔

ان سب کے لیے وہ گویا قیامت تھی۔ ردِعمل سب کا الگ الگ تھا۔ کوئی فرش سے سر ٹکرا رہا تھا تو کوئی دیوار سے۔ کوئی ماتھا ٹیکے بیٹھا تھا تو کوئی دہاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ پجاری پاگلوں کی طرح

اِدھر سے اُدھر بھاگتا پھر رہا تھا، جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو کہ وہ کیا کرے۔

جسونت نے کرتارے کو اشارہ کیا اور کرتارے نے دوسرے ساتھیوں کو۔ وہ سب خاموشی سے باہر نکل آئے۔ مندر میں آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ بتوں کو توڑے جانے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔

❁.........❁.........❁

دوستوں کی میٹنگ زیادہ دیر نہیں چلی۔ جسونت کے لیے اب بھی اس بات کی اہمیت تھی کہ کیدار ناتھ نے اسے منع کیا تھا...... بتایا تھا کہ اگر اوتار سنگھ کو کچھ ہو گیا تو اس کا معاملہ بننے کے بجائے بالکل ہی بگڑ جائے گا۔ وہ اب بھی یہی چاہتا تھا کہ اوتار سنگھ کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔

پہلے تو کرتارے نے معاملہ سنبھال لیا تھا۔ ورنہ جو لوگ وہاں سے زخمی ہو کر آئے تھے، وہ تو بدلہ لینے پر مصر تھے۔ مگر کرتارے نے انھیں سمجھایا کہ یاری دوستی ہی کی خاطر وہ اس کام کے لیے تیار ہوئے تھے اور اب یاری دوستی ہی کی خاطر اس سے بچنا ہے۔

لیکن اب خود کرتارے نے جسونت کو سمجھایا۔ ''دیکھو یارا، دھرم دوستی سے بڑا ہوتا ہے۔ اب میں کسی کو سمجھا نہیں سکتا۔''

''پھر بھی......''

''بات صرف ہم لوگوں کی نہیں، پورے شہر کی، اپنے دھرم کی عزت کی ہے۔'' گوپال نے جسونت کی بات کاٹ دی۔ ''اب اگر ہم چاہیں بھی تو اس معاملے سے الگ نہیں رہ سکتے۔''

''گوپال ٹھیک کہہ رہا ہے۔''

''یقین نہ آئے تو باہر چل کر دیکھ لو۔'' گوپال نے چیلنج کیا۔

وہ سب باہر آ گئے۔ باہر فضا ہی بدلی ہوئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں لوگ جمع تھے اور اس موضوع پر باتیں کر رہے تھے۔ وہ لوگ ان کے پاس سے گزرتے رہے اور ان کے کانوں میں باتیں پڑتی رہیں۔

''پر وہ تھا کون؟''

''وہ کوئی بھی تھا، ہمارے شہر کا ایک آدمی اسے جانتا ہے۔''

''اور وہ آدمی کون ہے؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ کوئی بتا رہا تھا کہ ایسا ایک آدمی ہے۔''

انھیں نہیں معلوم تھا کہ اس وقت وہ آدمی ان کے پاس سے گزر کر جا رہا ہے۔

''سورج کو بے سوچے سمجھے زبان نہیں کھولنی چاہیے تھی۔'' جسونت نے تاسف سے کہا۔

''وہ...... کوئی ہمارے دیوی دیوتاؤں کا اپمان کرے اور [illegible]

ہونٹ سی لوں۔'' سورج نے چیخ کر کہا۔

''سورج کا کوئی دوش نہیں۔'' کرتارا بولا۔

وہ کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ ایک شخص نے سورج کو پہچان لیا۔ وہ لپک کر اس کے پاس آیا۔ ''تم نے ہی کہا تھا نا کہ تم اس مورکھ کو جانتے ہو۔''

ان کے گرد لوگ جمع ہونے لگے۔ ''ہاں...... میں جانتا ہوں کہ وہ کون تھا'' سورج نے کہا۔

''وہ کوئی مُسلا ہے؟'' کسی نے پوچھا۔

''نہیں...... راجپوت ہے۔ اوتار سنگھ نام ہے اس کا۔ پتا کا نام ٹھاکر پرتاپ سنگھ ہے۔''

''چھی چھی چھی...... راجپوت ہو کر ایسی حرکت!''

''کل یُگ اسی کو کہتے ہیں بھائی۔'' کوئی بولا۔

''اچھا...... وہ رہتا کہاں ہے؟''

''ایک گاؤں ہے...... ٹھاکروں کی گڑھی۔'' سورج نے بتایا۔

لوگ پوچھے جا رہے تھے اور سورج جواب دے رہا تھا۔ اسی دوران جسونت اور کرتارا وہاں سے چلے گئے۔ اصل میں جسونت نے اسے اشارے سے وہاں سے ہٹنے کو کہا تھا۔

''کتنے گھر ہوں گے اس گاؤں میں؟'' کسی نے سورج سے پوچھا۔

''سو سے اوپر ہی ہوں گے۔ بڑا گاؤں ہے۔'' سورج نے کہا۔

''تم ہمیں راستہ دکھاؤ گے؟'' ایک جوشیلا جوان آگے بڑھا۔ ''ہم اس گاؤں کا نام و نشان مٹا ڈالیں گے۔''

اسے دیکھ کر چند اور جوان آگے بڑھ آئے۔ ''ہم بھی تمھارے ساتھ ہیں۔''

''کیوں نہیں۔ کوئی جائے نہ جائے، میں اور میرے متر وہاں جائیں گے اور اس لڑکے کو ختم کر کے ہی آئیں گے۔'' سورج نے اپنے دوستوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر اسے جسونت اور کرتارا کہیں وہاں نظر نہیں آ رہے تھے۔

''اوش جائیں گے۔'' راجو نے کہا۔ ''پرنتو پورا گاؤں پھونکنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں صرف دوشی کو سزا دینی ہے۔''

اب چاروں دوستوں کو خیال آ رہا تھا کہ انھیں جسونت اور کرتارے کی بات بھی رکھنی ہے۔ معاملہ کافی پیچیدہ ہو گیا تھا۔ ''بالکل ٹھیک۔ گاؤں کے نردوش لوگوں کو کیوں سزا دی جائے۔'' رگھبیر نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم ان سے کہیں گے کہ دوشی کو ہمارے حوالے کر دیں۔'' جوشیلے جوانوں میں سے ایک نے کہا۔

''اور ایسا نہ ہوا تو ہم پورا گاؤں [illegible] ڈالیں گے۔'' دوسرا بولا۔

"تو کب چلو گے؟" تیسرے نے سورج سے پوچھا۔

سورج نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ انھوں نے اثبات میں سر ہلا دیے۔ "ہم تو تیار ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "ابھی نکل کھڑے ہوں گے۔"

"ہمیں ایک گھنٹا دو۔ ہم تیار ہو کر آتے ہیں۔ چوک پر ملیں گے۔"

"خیال رکھنا۔ ٹھاکروں سے مقابلہ ہے۔" کسی نے چیلنج کیا۔

"دیکھ لیں گے۔" کئی غراہٹیں اُبھریں۔

مجمع چھٹنے لگا۔ چاروں دوست گوپال کے گھر کی طرف چل دیے۔ "یہ کرتارا کہاں گیا؟"

"جسونت کے ساتھ ہوگا۔ وہ اس معاملے میں ہمارا ساتھ نہیں دیں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہمیں تو موقع مل گیا ہے۔ آج وہ نہیں بچے گا۔"

❀......❀......❀
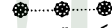
جسونت کرتارے کا ہاتھ پکڑ کر تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ "جلدی کیا ہے یارا؟" کرتارے نے احتجاج کیا۔

"جلدی تو ہے۔" جسونت نے کہا۔ "ہمیں ان لوگوں سے پہلے ٹھاکروں کی گڑھی پہنچنا ہے۔"

"کن لوگوں سے پہلے؟"

"تم نہیں سمجھ رہے، یہ لوگ وہاں حملہ کرنے جائیں گے۔"

"تو پھر؟"

"کیدو نے کہا تھا کہ اس لڑکے کو کچھ ہو گیا تو اس کا بڑا نقصان ہو جائے گا۔ اور اب اس لڑکے کی زندگی خطرے میں ہے۔ ہمیں جا کر کیدو کو خبردار کرنا ہے۔ تا کہ وہ لوگ اسے پہلے ہی اسے چھپا دیں یا اسے کہیں بھیج دیں۔" جسونت نے کہا۔

"یہ بڑا ٹیڑھا معاملہ ہے جسونت۔ اچھا یہی ہے کہ ہم اس معاملے سے الگ رہیں۔" کرتارے نے اسے سمجھایا۔

"تو بے شک نہ چل۔ میں تو جاؤں گا۔ تو جانتا ہے کہ میرے لیے یاری دھرم سے بڑھ کر ہے۔"

"تو مجھے کیوں گالی دیتا ہے۔ چل، میں ہر حال میں تیرے ساتھ ہوں۔" کرتارے نے بڑے پیار سے کہا۔ "بول کیا ارادہ ہے۔"

"بس سیدھے ٹھاکروں کی گڑھی چلیں گے۔"

"گھر پر تو کہہ دوں۔"

"اس وقت ہم ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس وقت نکلنا ہے۔ دیر ہو گئی تو ہم

کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے یارا۔" کرتارے نے سپر ڈال دی۔

❀......❀......❀

ایک گھنٹے بعد وہ چاروں چوک میں پہنچے تو وہاں تین جوان آدمی پہلے سے موجود تھے۔ انھیں کچھ مایوسی ہوئی۔ "صرف تین!" گوپال بولا۔

"انتظار کرو۔ ابھی اور آ جائیں گے۔" راجو نے کہا۔

گوپال ان تینوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ان میں سے ایک کے پاس تلوار نظر آ رہی تھی۔

"تم لوگ کیا لائے ہو؟" اس نے باقی دونوں سے پوچھا۔

"میرے پاس خنجر ہے۔"

"میرے پاس طمنچہ ہے۔" تیسرا بولا۔

"حملہ کرنے کے لیے کتنے آدمی ہونے چاہئیں تمھارے خیال میں؟" پہلے نے سورج سے پوچھا۔

سورج چند لمحے سوچتا رہا۔ اب اسے خیال آ رہا تھا کہ پچھلی بار وہ آٹھ کڑیل جوان گھات لگا کے اس لڑکے کو شکار کرنے گئے تھے اور وقت آیا تو چار زخمیوں کو لے کر واپس آئے تھے بلکہ کرتارے کا کہنا تھا کہ اگر وہ جذباتی ہو جاتا تو وہ آٹھوں وہیں شکار ہو جاتے اور پکڑے جاتے۔ تو چھپ کر وار کرنے میں یہ حال تھا۔ مگر اب تو وہ کھل کر حملہ کرنے جا رہے تھے۔ اس کے دل میں وسوسے آنے لگے۔ جانے والوں میں کون تھڑدلا ہے، کب بھاگ کھڑا ہوگا، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

مگر اب وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ بات غیرت کی...... اور اس سے بڑھ کر دھرم کی تھی۔ "سوڈیڑھ سو آدمی ہونے چاہئیں۔" اس نے کہا۔

"پر ہم تو صرف سات ہیں۔"

"آدھا گھنٹا اور دیکھ لیتے ہیں۔" سورج نے کہا۔

"اب تو چاہے اکیلے جانا پڑے، میں ضرور جاؤں گا۔" راجو تاؤ کھاتے ہوئے بولا۔

وقت گزرنے لگا۔ پھر لوگ ایک ایک دو دو کر کے آنے لگے۔ کسی کے ہاتھ میں لاٹھی تھی تو کسی کے پاس بلم تھا۔ سورج کو مایوسی ہونے لگی۔ اس نے تو سوچا تھا کہ تعداد میں کمی کا بہانہ بنا کر مہم کو منسوخ کر دے گا۔

آدھے گھنٹے بعد اس نے دیکھا۔ تعداد چالیس پر پہنچ چکی تھی۔ "یہ تو ناکافی ہیں۔" اس نے رگھبیر سے کہا۔

"تو پھر؟"

"میرا خیال ہے، آج رہنے دیں۔"

"چوٹ وقت پر ہی اچھی لگتی ہے۔" رگھبیر بولا۔ "ورنہ رات گئی تو بات گئی۔"
"لیکن کم تعداد میں ڈر ہے......"
"میں جانتا ہوں۔ ابھی اور انتظار کرتے ہیں۔"
ایک گھنٹے میں تعداد سو سے بڑھ گئی۔ اب ہتھیاروں کا جائزہ لیا گیا۔ حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ طمنچوں اور بندوقوں کی تعداد زیادہ تھی۔ سورج کو متفقہ طور پر سردار چن لیا گیا۔
اب سوال یہ تھا کہ سفر کیسے کیا جائے۔ کسی نے کہا کہ اس کے پاس دو ٹرک ہیں۔ یوں یہ بات بھی بن گئی۔
بالآخر انھوں نے سفر شروع کر دیا۔

❀....❀....❀

جسونت اور کرتارا کیدار ناتھ کے گھر پہنچے۔ پتا چلا کہ وہ کسی کام سے قریبی گاؤں گیا ہوا ہے۔ "وہ آتے ہی ہوں گے ویر جی۔" کیدار ناتھ کی بیوی نے کہا۔
دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اب بہتر یہی تھا کہ وہ براہِ راست ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو خبردار کریں۔
"آپ اندر آ جائیں نا۔" کیدار ناتھ کی بیوی نے کہا۔
"نہیں۔ ہم حویلی جا رہے ہیں۔ کیدو آ جائے تو اسے اُدھر ہی بھیج دینا۔"
وہ دونوں حویلی کی طرف چل دیے۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ وہاں موجود تھا۔ اسے پتا چلا کہ جے پور سے مہمان آئے ہیں تو اس نے انھیں بلوا لیا۔
وہ آئے تو وہ انھیں غور سے دیکھتا رہا۔ "میں نے آپ لوگوں کو پہچانا نہیں۔"
"ہم کیدار ناتھ جی کے دوست ہیں۔" جسونت نے کہا۔
تمہید کا موقع نہیں تھا۔ کرتارے نے کہا۔ "ہم خبردار کرنے آئے ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر کی جان خطرے میں ہے۔"
ٹھاکر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ چہرے پر سختی چھا گئی۔ "کیسے؟ اور کیوں؟"
جسونت نے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ اسی دوران ٹھاکر کو دیکھ کر انھیں بار بار ایسا لگا کہ وہ اپنی مسکراہٹ دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔
"تمھیں وشواس ہے کہ وہ اوتار سنگھ ہی تھا؟"
"پکا وشواس ٹھاکر جی۔ پر آپ چھوٹے ٹھاکر کو بلا کر پوچھ لیں۔"
"وہ تو ابھی تک واپس ہی نہیں آیا ہے۔" ٹھاکر نے اطمینان سے کہا۔
جسونت اور کرتارے کو یقین نہیں آیا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ ٹھاکر جھوٹا اور بزدل بھی نہیں ہو سکتا۔ پر اکلوتے بیٹے کی محبت بڑی چیز ہوتی ہے۔

"اب آپ کیا کریں گے؟" جسونت نے پوچھا۔
"تیاری کریں گے۔ اور حملہ آوروں کے دانت کھٹے کر دیں گے۔"
"وہ بڑی تعداد میں آئیں گے۔"
"ہم لڑائی کے دوران گنتی نہیں کرتے۔ ہاں لڑائی کے بعد کٹے ہوئے سر گنتے ہیں۔"
ٹھاکر حویلی کے باہر آ بیٹھا اور اس نے اپنے ملازم اِدھر اُدھر دوڑا دیے۔ تھوڑی ہی دیر میں گاؤں کے تمام مرد وہاں جمع ہو گئے۔ ان میں جمال دین اور وصال دین بھی تھے۔ مولوی صاحب بھی باہر نکل آئے تھے۔
"یہ لوگ جے پور سے خبر لائے ہیں کہ ہمارے گاؤں پر حملہ ہونے والا ہے۔" ٹھاکر نے کہا۔ اس نے ہاتھ سے جسونت اور کرتارے کی طرف اشارہ کیا۔
"تو مالک، ہم نے چوڑیاں تو نہیں پہن رکھی ہیں۔" ایک مزارعہ بولا۔
"ہم ان کا مقابلہ کریں گے۔" دوسرے نے کہا۔
"ہمیں ان کی تعداد کا اندازہ نہیں۔ وہ بہت زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔"
"ٹھاکر جی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمیں تو لڑنا ہے۔" جمال دین بولا۔
ٹھاکر نے ایک گہری سانس لی۔ "تم لوگوں نے یہ نہیں پوچھا کہ حملے کا کارن کیا ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن میں تمھیں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ میرے پتر اوتار سنگھ نے جے پور کے بڑے مندر میں تمام بت توڑ ڈالے ہیں۔ تم سب جانتے ہو کہ اوتار سنگھ واپس نہیں آیا ہے کہ میں اس سے پوچھوں کہ یہ آرودھ سچا ہے یا جھوٹا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر یہ سچ بھی ہے تو میں اوتار سنگھ کا بال بانکا نہیں ہونے دوں گا۔ میں لڑوں گا۔"
ٹھاکر کی بات سن کر سب سناٹے میں آ گئے تھے۔ کوئی کچھ بھی نہیں بولا۔
"اب میرا کہنا یہ ہے کہ تم میں سے جس کا جی چاہے، گاؤں چھوڑ دے۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہوگی اور جس کا جی نہ چاہے وہ لڑائی میں حصہ نہ لے۔ ہم ٹھاکر لوگ ویسے بھی اپنی جنگ آپ ہی لڑتے ہیں۔"
یہ سن کر جہاں کچھ لوگوں نے سکون کی سانس لی، وہاں کچھ لوگ تڑپ گئے۔ "ہم آپ کو چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں ان داتا۔" ان میں سے ایک نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "جیون بھر نمک کھایا ہے آپ کا۔"
"تو جو میرے ساتھ ہیں، وہ اس طرف آ جائیں۔" ٹھاکر نے کہا۔
کچھ لوگ اس طرف آ گئے۔ دوسرے لوگ نظریں چرا رہے تھے۔
ٹھاکر نے بنسی دھر کو حکم دیا کہ حویلی سے اسلحہ نکال کر لائے۔ اسلحہ ہر طرح کا تھا۔ اس میں پستول، بندوقیں اور کارتوس بھی تھے اور نیزے، تلواریں اور کلہاڑیاں بھی۔ "جس کا جو جی

چاہے، لے لے۔‘‘

لوگوں نے اپنی پسند کے ہتھیار اٹھا لیے۔

’’ہم گاؤں کے باہر ہی ان کا مقابلہ کریں گے۔‘‘ ٹھاکر نے اعلان کیا۔’’تم سب وہاں پہنچ جاؤ۔ میں آتا ہوں۔‘‘

’’لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ میں لڑائی میں آپ کا ساتھ نہ دوں۔‘‘ مولوی صاحب جوش سے کہا۔

’’آپ مہمان ہیں۔ مجھ پر کرپا کریں اور اندر چلے جائیں۔‘‘

مولوی صاحب اندر چلے تو گئے۔ لیکن ان کی کیفیت عجیب تھی۔ ان کے لیے تو یہ بہت بڑی خوش خبری تھی۔ اوتار سنگھ ان سے عربی پڑھتا رہا تھا۔ اور اب اس پر بت شکنی کا الزام تھا۔ انھیں تو ایسا لگ رہا تھا کہ اس گاؤں میں اللہ نے ان کے لیے سعادتیں ہی سعادتیں لکھ دی ہیں۔ انھوں نے سوچ لیا کہ بت شکنوں کی اس لڑائی میں وہ ہر حال میں بت شکنوں کا ساتھ دیں گے۔

ادھر ٹھاکر کی گاؤں والوں سے بات چیت کے دوران جسونت اور کرتار سنگھ نے مولوی صاحب کو دیکھا تو ان کے درمیان معنی خیز نظروں کا تبادلہ ہوا۔ دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ بیٹے نے بھگوان اور دیوتاؤں کا اپمان کیا اور باپ گھر میں ایک مُسلے کو لیے بیٹھا ہے۔ انھیں یقین ہوگیا کہ اوتار سنگھ پر جو آروپ لگایا گیا ہے، وہ سچا ہے۔

پھر جب ٹھاکر نے اعلان کیا کہ اگر اس کا بیٹا دھرم کا مجرم ہے، تب بھی وہ اس کے لیے لڑے گا، تو ان دونوں کا دل برا ہوگیا۔ ان کا بس چلتا تو وہ اسی وقت وہاں سے نکل جاتے اور حملہ آوروں سے جا ملتے۔ لیکن کرتارا جسونت کا لحاظ کر رہا تھا اور جسونت کیدار ناتھ کے مفاد میں چپ تھا۔

مولوی صاحب اندر گئے تو جسونت نے پوچھا۔’’یہ مُسلا کون ہے آپ کے ہاں؟‘‘

’’یہ میرے پتر کے استاد ہیں۔‘‘ ٹھاکر کے لہجے میں بدمزگی تھی۔

ان دونوں کو احساس ہوگیا کہ ٹھاکر کو ان کا مُسلا کہنا برا لگا ہے۔

اسی وقت کیدار ناتھ چلا آیا۔ وہ گھر گیا تھا، جہاں اس کی پتنی نے اسے دونوں دوستوں کے متعلق بتایا تھا۔ وہ فوراً ہی حویلی چلا آیا اور وہاں پہنچا تو خاصا پریشان اور وحشت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ باہر بھی اسے غیر معمولی سرگرمیاں دکھائی دی تھیں۔

اس نے جسونت اور کرتارے کو نظر انداز کر دیا۔’’کیا بات ہے ٹھاکر ویر، یہ لڑائی کی تیاری کیسی؟‘‘ اس نے ٹھاکر سے پوچھا۔

’’تمھارے متروں نے جو بتایا ہے، اس کے بعد ہم اور کیا کر سکتے ہیں۔‘‘ ٹھاکر نے جواب دیا۔

کیدار ناتھ نے جسونت کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ جسونت نے اسے سب ماجرا سنا

دیا۔’’ٹھیک ہے ٹھاکر ویر۔‘‘ کیدار ناتھ نے ٹھاکر سے کہا۔’’ہم لڑیں گے۔ پر اوتار سنگھ پتر کہاں ہے؟‘‘

’’وہ تو واپس ہی نہیں آیا ہے ابھی۔‘‘ ٹھاکر نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ حالانکہ وہ تشویش بس ظاہری تھی۔ اس کے لیے تو یہ مقامِ شکر تھا کہ اوتار سنگھ یہاں موجود نہیں ہے۔ لیکن اس نے کیدار ناتھ کی آنکھوں میں ابھرتی چمک دیکھ لی تھی۔ ویسے بھی وہ کیدو پر بھروسا نہیں کرتا تھا۔ اب اس صورتِ حال میں وہ اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اوتار سنگھ کہاں ہے۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ یہ بے حد نامناسب ہے۔

’’بھگوان چھوٹے ٹھاکر کی سہائتا کرے۔ میں چلتا ہوں ٹھاکر ویر۔ مجھے بھی تیاری کرنی ہے۔ ان دونوں کو ساتھ لے جاؤں۔‘‘

ٹھاکر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کیدار ناتھ ان دونوں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔

ٹھاکر تھوڑی دیر صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اسے دوستوں کی طرف سے بھی محتاط رہنا ہوگا۔

جو ہونا ہے، سو ہونا ہے۔ دیکھا جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ سر جھٹکتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اسے تیاری کرنی تھی۔

تہ خانے میں جا کر اس نے اپنے ہتھیار جسم پر سجائے اور باہر نکل آیا۔

❁……❁……❁
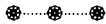
کیدار ناتھ کے گھر میں تینوں دوست سر جوڑے بیٹھے تھے۔ کیدار ناتھ بار بار ہاتھ ملتا تھا اور تاسف سے سر ہلاتا تھا۔’’کاش...... میں اس وقت موجود ہوتا۔ کاش میں تمھیں مل جاتا۔‘‘ وہ بار بار یہی کہے جا رہا تھا۔

’’تم نے تو مجھ سے یہی کہا تھا کہ اس معاملے سے ہاتھ اٹھا لیں۔ اس میں تمہارا نقصان ہے۔‘‘ جسونت نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

’’سمے سمے کی بات ہوتی ہے یارا۔‘‘ کیدو نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔’’مجھے کیا پتا تھا کہ بھگوان ایسا موقع دے گا۔‘‘

’’میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔‘‘

’’وقت نہیں ہے۔ ورنہ میں تمھیں سمجھا دیتا۔‘‘

’’پرنتو تم چاہتے کیا ہو؟‘‘

’’جو میں چاہتا ہوں، وہ تو اب ہو کر رہے گا۔ اور میں دونوں باپ بیٹوں کو جیتا نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس لڑائی میں دونوں مر جائیں گے تو یہاں سب کچھ میرا ہوگا۔‘‘

"پتا نہیں، کیا ہوگا۔ پر میں تو تمہاری خاطر یاروں کا بھی برا بن گیا اور دھرم کا بھی۔" جسونت نے افسوس سے کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہاری بگڑی بات بھی بن جائے گی۔ اب میری بات دھیان سے سنو۔ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ گاؤں سے دور رک کر تم آنے والوں کا انتظار کرو۔ وہ آئیں تو انھیں بتاؤ کہ تم یہاں ٹھاکر کی طاقت دیکھنے آئے تھے اور وہ تم نے دیکھ لی ہے۔ اب تم ان کے ساتھ ہو۔"

"اس سے تمھیں کیا فائدہ ہوگا۔"

"میں صرف ٹھاکر اور چھوٹے ٹھاکر کی موت چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ لوگ یہاں اور خاص طور پر حویلی میں لوٹ مار کریں۔ تمھیں ان کو اس سے روکنا ہوگا۔ انھیں سمجھانا کہ انھیں بس اس ایمان کا بدلہ لینا ہے۔ صرف ٹھاکر اور اس کے پتر کی جان لینی ہے۔"

"ضروری نہیں کہ وہ مان بھی لیں۔"

"تب تو کوشش اور ضروری ہے۔"

❁……❁……❁

ٹھاکر کی گفتگو سننے کے بعد گاؤں کی آبادی تین دھڑوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ گاؤں میں سوا سو کے قریب مرد تھے۔ ایک دھڑا یہ کہتا تھا کہ جے پور کے مندر میں جو کچھ ہوا، اگر وہ اوتار سنگھ نے کیا تو ٹھاکر پر اور گاؤں پر بھگوان کا شراپ آ کر رہے گا۔ وہ گاؤں چھوڑ دینا چاہتے تھے۔

دوسرا دھڑا اس پہلے گروہ کا ہم نوا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ گاؤں چھوڑنے کے حق میں نہیں تھے۔ وہ اس لڑائی میں غیر جانب دار رہنا چاہتے تھے۔

اور تیسرا دھڑا وہ تھا جو ٹھاکر پر جان قربان کرنے کے لیے تیار تھا۔

ان تینوں گروہوں کے درمیان بات ہوئی۔ ٹھاکر کے وفادار دوسرے لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس کڑے وقت میں ٹھاکر کا ساتھ نہ چھوڑیں۔

"بات دھرم کی ہے۔ چھوٹے ٹھاکر کا دھرم تو بھرشٹ ہوگیا۔" پہلے گروہ میں سے ایک شخص نے کہا۔ "اس کی کرنی ہم کیوں بھگتیں۔"

"دھرم کی بات نہ ہوتی تو ہم جان دے دیتے۔ پر ٹھاکر جی کا ساتھ نہ چھوڑتے۔" دوسرے نے کہا۔

"ہمارے لیے تو ٹھاکر کی سیوا ہی دھرم ہے۔" ٹھاکر کے وفاداروں میں سے ایک بولا۔

مفاہمت نہ ہوئی تو ٹھاکر کے ہتھیار بند وفادار ٹھاکر کی ہدایت پر گاؤں کی سرحد کی طرف چل دیے۔ جمال دین اور وصال دین ان کے ساتھ تھے۔

ان کے جانے کے بعد گاؤں میں رہنے کے حامی لوگوں میں سے ایک نے پہلے گروہ

سے پوچھا۔ "یہ بتاؤ، گاؤں چھوڑ کر جاؤ گے کہاں؟"

اس پر خاموشی چھا گئی۔ اس سوال کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں تھا۔

"یہاں تمھارے گھر بار ہیں، زمینیں ہیں۔" دوسرے نے کہا۔ "تم جانتے ہو، تمھیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ سوچو، بال بچوں کو لے کر کہاں جاؤ گے۔ کیا کرو گے۔ بھوکے مر جاؤ گے۔"

"سچ کہتے ہو۔ پر ہم کیا کریں۔"

"گاؤں مت چھوڑو۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے گھروں پر سفید جھنڈے لگا دیں گے۔"

"لڑائی ہوتی ہے تو سفید جھنڈا کسی کو نظر نہیں آتا۔ پھر یہ تو دھرم کی لڑائی ہے۔"

اس بات نے گاؤں میں رہنے والوں کو ہلا دیا۔ بات غلط نہیں تھی۔

کافی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ گھروں پر سفید جھنڈے لہرا دیے جائیں۔ لیکن لوگ اپنے بال بچوں کو لے کر گاؤں سے باہر نکل جائیں۔ لڑائی میں اگر نقصان ہوا تو صرف گھروں کا ہوگا۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد وہ واپس آ سکتے ہیں۔ آگے ان کے نصیب۔

اس پر عمل شروع ہوگیا!

❁……❁……❁

ہتھیار بند ٹھاکر گاؤں کی سرحد پر پہنچا تو لوگوں نے ...... ٹھاکر کی جے ...... کے نعرے لگا کر اس کا سواگت کیا۔ ٹھاکر نے جائزہ لیا۔ ان کی تعداد چالیس کے لگ بھگ ہوگی جبکہ کیدو کے متروں کا کہنا تھا کہ حملہ آور سو ڈیڑھ سو سے کم نہیں ہوں گے۔

ٹھاکر پریشان ہوگیا۔ حملہ آور شہر سے آ رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ ان میں سے بیشتر کے پاس آتشی اسلحہ ہوگا۔ اور یہاں بیشتر لوگ وہ تھے، جو طمنچہ یا بندوق چلانا بھی نہیں جانتے تھے۔ تو یہ تھوڑے سے لوگ ان لوگوں کے سامنے کتنی دیر ٹھہر سکیں گے۔

ٹھاکر موت سے نہیں ڈرتا تھا۔ لیکن یہ جو اس کے وفادار تھے، جو اس پر جان نچھاور کرنے چلے آئے تھے، ان کی یقینی موت کا خیال اسے پریشان کر رہا تھا۔ اس سے بہتر یہ تھا کہ وہ اکیلا لڑے اور اکیلا مرے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ انھیں نہیں سمجھا سکتا۔

پھر بھی کوشش تو کرنی ہی تھی۔ اس نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ ان میں سے کوئی پیچھے ہٹنے پر آمادہ نہیں تھا۔

اب ٹھاکر کو کچھ سوچنا تھا۔ یہاں کھلے میدان میں وہ چالیس افراد بڑی آسانی سے ختم ہو جاتے۔ تعداد کم ہو تو مدافعانہ جنگ لڑنی پڑتی ہے۔ ایسی جنگ کھلے میدان میں نہیں لڑی جا سکتی۔

ہاں جنگل میں کامیاب رہتی ہے۔اب یہاں جنگل تو تھا نہیں۔البتہ بستی تھی۔

''میں نہیں سمجھتا کہ یہاں ان سے الجھنا مناسب ہوگا۔حویلی کی طرف چلو۔'' ٹھاکر نے فیصلہ سنایا۔

حویلی پہنچ کر ٹھاکر کو جنگی حکمت عملی پر غور کرنا تھا۔لڑائی کس طرح لڑی جائے کہ جانی نقصان کم سے کم ہو۔

''حویلی کا پھاٹک بند کر دیا جائے۔'' سندر داس نے تجویز پیش کی۔

''نہیں۔ہم بزدل نہیں ہیں۔'' ٹھاکر نے فوراً ہی اسے رد کر دیا۔

اسی وقت کیدار ناتھ بھی آ گیا۔وہ بھی مشاورت میں شریک ہو گیا۔

ٹھاکر کو سب سے زیادہ فکر ان لوگوں کی تھی، جو روایتی ہتھیاروں سے لڑنے والے تھے۔ وہ ان کے بچاؤ کی ترکیب سوچ رہا تھا۔وہاں اسے اور کیدار ناتھ کو ملا کر سترہ آدمی ایسے تھے، جو آتشی اسلحہ استعمال کرنا جانتے تھے۔تو ایک صورت یہ تھی کہ وہ سترہ افراد حویلی میں بند ہو کر فائرنگ کر کے حملہ آوروں کا مقابلہ کریں۔یہ طے تھا کہ کھلے میدان میں ہونے کی وجہ سے حملہ آوروں کو بہت تیزی سے جانی نقصان اٹھانا ہوگا۔اور امکان تھا کہ لاشیں دیکھ کر وہ بھاگ کھڑے ہوں۔لیکن یہ انداز ٹھاکر کے مزاج کے خلاف تھا۔وہ کھل کر لڑنے والا آدمی تھا۔اس کے پاس راجپوت کا روایتی دماغ تھا۔مگر یہ بات بھی سمجھ میں آ رہی تھی کہ تلوار، لاٹھی اور نیزے والے 25 افراد کی جان اس طرح بچ سکتی ہے۔بشرطیکہ وہ انھیں لڑائی سے دست بردار ہونے پر آمادہ کر لے۔

اس نے یہ تجویز پیش کر دی۔''یہ لڑائی صرف ان لوگوں کو لڑنے دی جائے جو بندوق اور طمنچہ چلا سکتے ہیں۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا تھا اَن داتا۔'' وکرانت نے جلدی سے کہا۔

لیکن جن لوگوں کے تحفظ کی بات ہو رہی تھی، وہ دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے اور حویلی میں بند ہو کر وہ عضو معطل بن کر رہ جاتے۔''ایسا کرتے ہیں ٹھاکر جی کہ آپ بندوق والوں کو لے کر حویلی میں چلے جائیں۔پہلے ہمیں مقابلہ کرنے دیں۔'' جمال دین نے کہا۔''اللہ نے چاہا تو ہم انھیں بھگا دیں گے۔''

''وہ بہت زیادہ ہوں گے جمال دین۔''

''اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا ٹھاکر جی۔حوصلہ تعداد سے بڑا ہو تو جیت جاتا ہے۔''

''یہ ٹھیک ہے مالک۔'' سندر داس نے کہا۔''اور ہم ختم ہو جائیں تو آپ اندر بند ہو کر لڑتے رہیں۔''

یہ ٹھاکر کو گوارا نہیں تھا۔

مگر دور سے نعروں کی قریب آتی آواز سنائی دی تو انھوں نے سمجھ لیا کہ اب بحث کا

وقت نہیں رہا۔عمل کا وقت آ پہنچا ہے۔

اسی وقت مولوی برکت علی بھی باہر آ گئے!

❁......❁......❁

جسونت اور کرتار سنگھ گاؤں کے باہر جا کھڑے ہوئے تھے اور آنے والوں کا انتظار کر رہے تھے۔تھوڑی دیر بعد سامنے سے گرد اڑتی دکھائی دی۔پھر دو ٹرک نمودار ہوئے۔وہ قریب آئے تو جسونت نے ہاتھ اٹھا کر انھیں رکنے کا اشارہ کیا۔

دونوں ٹرک رک گئے۔اگلے ٹرک میں ڈرائیور کے ساتھ سورج بیٹھا تھا۔وہ دروازہ کھول کر نیچے اترا۔عقبی حصے سے رگھبیر اور گوپال کود کر آ گئے۔پچھلے ٹرک سے راجو بھی اتر آیا۔

''تم لوگ یہاں؟'' سورج نے حیرت سے کہا۔

''تمھیں دھرم کی لاج بھی نہیں رہی۔'' رگھبیر کے لہجے میں ملامت تھی۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو۔'' کرتارے نے نرم لہجے میں کہا۔''ہم نے یہاں آ کر تمھارا کام آسان کر دیا ہے۔''

''ذرا ہمیں بھی سمجھاؤ۔''

''دیکھو...... ہم نے کیدار ناتھ سے بات کی ہے۔اس کا کہنا ہے کہ اوتار سنگھ کو اس اپرادھ کی سزا ملنی ہی چاہیے۔''

''اس کے لیے ہمیں کیدار ناتھ کے آشیرباد کی ضرورت نہیں۔''

اس دوران اونٹوں پر سوار اور مسلح لوگ آئے اور وہاں رک کر ان کی باتیں سننے لگے۔

''ہم نے ٹھاکر پرتاپ سنگھ سے بات کی اور اس سے کہا کہ وہ اپنے اپرادھی بیٹے کو ہمارے حوالے کر دے۔پرنتو اس نے انکار کر دیا۔وہ لڑنے کی تیاری کر رہا ہے۔''

''تو ہم بھی یہاں اسی لیے آئے ہیں۔'' سورج نے کہا۔

''وہ تمھارا یار کیدار ناتھ۔یہاں نظر نہیں آ رہا ہے؟'' رگھبیر نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''وہ ٹھاکر کے ساتھ ہے۔لیکن اصل میں وہ ہماری طرف ہے۔وہ موقع پا کر ٹھاکر کو ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔''

''اور تم کہہ رہے تھے کہ تم نے یہاں آ کر ہمارا کام آسان کر دیا ہے؟''

''ہاں۔ہم کام کی جان کاری لے کر آئے ہیں۔ٹھاکر کے ساتھ مشکل سے پچاس آدمی ہوں گے۔لیکن ان کے پاس اسلحہ بہت ہے۔طمنچوں اور بندوقوں کی کمی نہیں۔''

''پچاس آدمی، بس!'' سورج نے حقارت سے کہا۔''اور ادھر دیکھو۔ہم دو سو سے اوپر ہے۔''

جسونت نے جائزہ لیا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں۔ دو سو تو نہیں لگتے۔''

''اور لوگ گاڑی سے آ رہے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ ہم اچھی طرح سے بدلہ لیں گے۔''

یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ گاڑی سے آنے والی ٹولیاں بھی آتی نظر آئیں۔

کرتارے نے کہا۔ ''ذرا الگ تو چلو۔ کچھ بات کرنی ہے۔''

چاروں دوست ان کے ساتھ اکیلے میں چل دیے۔ ''کہو، کیا بات ہے؟'' سورج نے کہا۔

''بات یہ ہے کہ کیدو کی جان خطرے میں نہیں پڑنی چاہیے۔'' جسونت کے لہجے میں تشویش تھی۔

''اسے وہاں رکنا ہی نہیں چاہیے تھا۔'' سورج بولا۔ ''اب یہ اتنے لوگ اسے پہچانتے تو نہیں ہیں نا۔''

''کیدو نے کہا ہے کہ ٹھاکر کو ختم کرتے ہی وہ جے بجرنگ بلی کا نعرہ لگائے گا۔ تب لڑائی ختم کر دی جائے۔''

رگھبیر نے جسونت کو غور سے دیکھا۔ ''صاف صاف کہو۔ کیا کہنا ہے۔''

جسونت ہچکچا رہا تھا۔ ''حویلی میں لوٹ مار نہیں ہونی چاہیے۔''

''اب اتنے لوگوں پر ہمارا زور تو نہیں چل سکتا ہے۔'' سورج نے بے بسی سے کہا۔ ''پھر بھی میں کوشش کروں گا۔ یہ بتاؤ، وہ لڑکا اوتار سنگھ کہاں ہے۔''

''ٹھاکر کہتا ہے کہ وہ ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔''

''تب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ اسے تلاش کرنے کے لیے حویلی میں ضرور گھسیں گے۔ انھیں نہیں روکا جا سکتا۔''

جسونت جانتا تھا کہ سورج ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس پہلو سے تو انھوں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ''حملہ کب کرو گے؟''

''ابھی آنے والوں کا انتظار کرنا ہے۔ میں پوری طاقت سے ایک بار حملہ کرنا چاہتا ہوں۔''

دور سے آنے والوں کی ایک اور ٹولی آتی نظر آ رہی تھی۔

❁......❁......❁

دیکھتے ہی دیکھتے پھاٹک کے باہر دو ٹرک آ کر رکے اور مسلح لوگ ٹرکوں سے کود کود کر اترنے لگے۔ ان میں وہ دونوں بھی تھے، جنھوں نے ٹھاکر کو آ کر خبردار کیا تھا۔

وہ آگے آئے اور انھوں نے پکار کر کہا۔ ''ٹھاکر پرتاپ سنگھ، ہم تم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اپنے اپرادھی پتر کو ہمارے حوالے کر دو۔ یہ جھگڑا یہیں ختم ہو جائے گا۔''

''میں تمھیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔'' ٹھاکر نے پرسکون لہجے [illegible] بلند آواز میں کہا۔

''[illegible]ت جان دے دیتے ہیں۔ پر آن کا سودا نہیں کرتے [illegible] کہا، وہ بپھر پڑ[illegible]

ہے۔''

''تو پھر تمھیں بھی کوئی نہیں بچا سکتا۔''

حویلی کے احاطے میں ٹھاکر کے جاں نثاروں نے دیکھا کہ اونٹوں پر سوار اور پیدل لوگ الگ آ رہے ہیں۔ وہ بہت بڑا مجمع تھا۔ ان کی تعداد دو سو سے اوپر ہی ہو گی۔

''مالک...... آپ بندوق والے لوگ اندر چلے جائیں۔'' سندر داس نے گڑگڑا کر کہا۔

''جس کو جانا ہو وہ چلا جائے۔ میں نہیں جاؤں گا۔'' ٹھاکر کے لہجے میں عجیب سا جاہ و جلال تھا۔

اسی وقت باہر حملہ آوروں نے جے بجرنگ بلی کا نعرہ لگایا اور دھاوا بول دیا۔

حویلی کے اندر سے سب سے پہلے لاٹھیاں سنبھالے ہوئے جمال دین اور وصال دین حملہ آوروں پر جھپٹے۔ ان کی رفتار اتنی تیز تھی اور وہ یوں پینترے بدل رہے تھے کہ ان پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ ایک بجلی سی کوند رہی تھی۔ ابھی وہ یہاں تھے اور اگلے پل وہاں۔ دوسری طرف حملہ آور تھے کہ پھاٹک سے احاطے میں گھسے چلے آ رہے تھے۔

لوگوں کے کسی بہت بڑے مجمعے میں لٹھیا باز کتنا کامیاب رہتا ہے، اس کا تصور کرنا ناممکن ہے۔ اسے وہی سمجھ سکتا ہے، جس نے کسی ماہرِ فن لٹھیا باز کو سینکڑوں کے درمیان لاٹھی چلاتے دیکھا ہو اور وہاں تو وہ دو تھے۔ لاٹھی اس طرح گھوم رہی تھی کہ ایک لکیر سی نظر آتی تھی۔ لیکن لاٹھی کو نہیں دیکھا جا سکتا تھا اور مجمع زیادہ ہونے کی وجہ سے لاٹھی خالی نہیں گھوم رہی تھی۔ لوگ اس کی ضرب کا نشانہ بن رہے تھے۔

دوسری طرف ٹھاکر بھی تلوار سونت کر میدان میں اتر گیا تھا۔ اس کے جاں نثار بھی اس کے ساتھ تھے۔

دوستوں کی ٹولی باہر ہی تھی۔ وہ ایک بار لٹھیا باز بچوں کو بھگت چکے تھے اور ویسے بھی وہ اندھا دھند میدان میں کود پڑنے کے قائل نہیں تھے۔ انھوں نے سوچ لیا تھا کہ پہلے باہر رہ کر جائزہ لیں گے۔ انھیں ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا تھا۔

اندر جو نقشہ بنا، اس نے ان پر ثابت کر دیا کہ ان کا فیصلہ درست تھا۔ پچھلی بار مار کھانے کے بعد انھوں نے خود بھی لٹھیا بازی سیکھی تھی۔ مگر اب جمال دین کو دیکھ کر انھیں احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس فن کی الف بے سے بھی واقف نہیں ہیں۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ اپنے زعم میں لاٹھیاں لے کر میدان میں نہیں اُترے۔

''اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ میں نے اس دن بزدلی کیوں دکھائی تھی؟'' کرتارے نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ''یاد ہے، میں نے کہا تھا کہ ہم بیس بھی ہوتے تو وہ ہمیں گرا دیتے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' [illegible]ھبیر [illegible] سے کہا کیونکہ [illegible] روز کرتا [illegible] سے بحث [illegible]

نے ہی کی تھی۔ ”مگر اسی وقت کچھ کرو۔ ورنہ یہ دونوں تو تباہی مچا دیں گے۔“

کرتارے کو اندازہ تھا کہ دونوں لٹھیا باز اب تک بیس سے زائد افراد کو ناکارہ کر چکے ہیں۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ”بس ایک ہی صورت ہے۔ بندوق سے انھیں نشانہ بنانے کی کوشش کرو۔“

ان میں صرف گوپال ہی ایسا تھا، جس کے پاس طپنچہ تھا۔ اس نے نشانہ لینے کی کوشش کی۔ لیکن وہ تو چھلاوا بنے ہوئے تھے۔ گولی ایسے متحرک ہدف کا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ الٹا ان کے تین افراد نشانہ بن گئے۔

”کیا کر رہے ہو؟ تم تو اپنوں ہی کی جان لے رہے ہو۔“ کرتارے نے جھنجلا کر کہا۔

”میں گولی چلاتا ہوں۔ مگر اس سے پہلے ہی وہ جگہ چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔“

”لڑکا اتنا تیز نہیں ہے۔ اس کا نشانہ لو۔“ جسونت نے مشورہ دیا۔

اس چکر میں ان کے دو اور آدمی کام آ گئے۔

”واپس بلا لو لوگوں کو۔“ کرتارے نے کہا۔ ”ہمیں خوب سوچ سمجھ کر اگلا قدم اٹھانا ہوگا۔“

سورج نے آسمان کی طرف دیکھا۔ تیزی سے اندھیرا ہو رہا تھا۔ اس نے حملہ آوروں کو پکارا۔ ”واپس آ جاؤ۔“

لیکن پسپا ہو کر باہر آتے آتے ان کے چھ سات آدمی اور کام آ گئے۔

❀....❀....❀
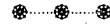
لڑائی رک گئی۔ ٹھاکر نے جائزہ لیا۔ احاطے میں انسانی جسموں کا ڈھیر تھا۔ ان میں اپنے پرائے کو تو پھر بھی شناخت کیا جا سکتا تھا۔ لیکن زندہ اور مردے کو پہچاننا بہت مشکل تھا۔

بہرحال اس کے لیے یہ مرحلہ اتنا مشکل نہیں تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو گنا اور اسے اندازہ ہو گیا۔ اس کے 14 ساتھی کم ہو چکے تھے۔ اب ان میں کتنے زندہ تھے، یہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے احاطے میں پڑے لوگوں کو ٹٹولنا پڑتا۔ فی الحال یہ ممکن نہیں تھا۔ دشمن پسپا ضرور ہو گیا تھا۔ لیکن پھاٹک کے باہر موجود تھا۔ اور اس کے پاس آتشیں ہتھیار بھی تھے۔

مگر ایک بات بے حد حوصلہ افزا تھی۔ احاطے میں پڑے لوگوں میں اگر 14 اس کے ساتھی تھے، تو دشمنوں کی تعداد 60 سے کم نہیں تھی۔ ٹھاکر نے دیکھا تھا اور جانتا تھا کہ جمال دین اور وصال دین نے دشمن کو بہت بھاری نقصان پہنچایا ہے۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا بہت تیزی سے پھیل رہا تھا۔

”مالک...... اب اندر بند ہو کر لڑنا ہمارے لیے بہتر رہے گا۔“ وکرانت نے ٹھاکر سے کہا۔

بات ٹھاکر کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اندھیرے میں فائرنگ ہوتی تو نقصان میں وہی لوگ

رہتے۔ لیکن ٹھاکر کا دل نہیں مان رہا تھا۔

ایسے میں جمال دین نے آہستہ سے کہا۔ ”ٹھاکر جی، ہمیں اپنے زخمیوں کی فکر کرنی چاہیے۔“

ٹھاکر نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ وہ کچھ مضطرب اور اداس نظر آ رہا تھا۔ ٹھاکر کو اچانک ہی وصال دین کا خیال آ گیا۔ ”وصال دین کہاں ہے؟“ اس نے تڑپ کر پوچھا۔

”وہ تو یہاں نہیں ہے ٹھاکر جی۔“

”تو کیا..... تو کیا؟“ ٹھاکر سے جملہ پورا نہیں کیا گیا۔

جمال دین نے کچھ نہیں کہا۔ صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تو چلو۔ دیکھتے ہیں۔ کوئی زخمی ملے تو اسے لے آئیں گے۔“

”نہیں ٹھاکر جی۔ ایسے میں تو وہ آسانی سے ہمیں نشانہ بنا لیں گے۔“ وکرانت بولا۔

”تو کیا اپنے زخمیوں کو ایسے ہی چھوڑ دیں۔“ ٹھاکر نے جھنجلا کر کہا۔

”وکرانت ٹھیک کہہ رہا ہے ٹھاکر جی۔“ جمال دین نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ اکیلے آدمی کا کام ہے۔ میں کالی چادر اوڑھ کر احتیاط سے جاؤں گا۔ انھیں اندھیرے میں پتا بھی نہیں چلے گا اور ٹھاکر جی، یہ بھی ٹھیک ہے کہ اب ہمیں بند ہو کر لڑنا پڑے گا۔ پر میں وہاں کسی کام نہیں آ سکوں گا۔ اس لیے مجھے اپنے حصے کا کام باہر ہی کرنے دیں۔“

وہ پہلا موقع تھا کہ ٹھاکر نے جمال دین کو اتنا بولتے سنا تھا اور وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ جمال دین بند ہو کر لڑنے سے پہلے ہی خود کو ٹھاکر پر قربان کر دینا چاہتا تھا۔ جمال دین باہر والوں پر ٹوٹ پڑنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ مر جائے گا۔ لیکن دس بیس آدمی ضرور گرائے گا۔

اس لمحے ٹھاکر کو پوری طرح اندازہ ہوا کہ وہ جمال دین سے کتنی محبت کرتا ہے۔ اس نے جمال دین کا ہاتھ تھام لیا۔ ”نہیں جمال دین، میں تمھیں اکیلے نہیں جانے دوں گا۔ ہم ساتھ لڑیں گے۔ ساتھ مریں گے۔“

”آج تو وفاداری کا حق ادا کرنے کا موقع ملا ہے، ٹھاکر جی۔ مجھے نہ روکیں۔“ جمال دین نے کہا۔ ”اس وقت اپنی لاشیں دیکھ کر ان کے حوصلے پست ہو رہے ہوں گے۔ انشاء اللہ میں انھیں بھاری نقصان پہنچاؤں گا۔ پھر ممکن ہے کہ وہ بھاگ کھڑے ہوں۔“

”جمال دین ٹھیک کہہ رہا ہے مالک۔“ سندر داس نے تائید کی۔ ”میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔ میں بھی حویلی میں بند ہو کر کسی کام کا نہیں رہوں گا۔“

جمال دین نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور ٹھاکر سے بولا۔ ”بس کالی چادریں منگوا دیں۔“

ٹھاکر ہچکچا رہا تھا۔ مگر وہ بہرحال اندر گیا اور دو کالی چادریں لے آیا۔ وہ جمال دین کو

اکیلے نہیں بھیجنا چاہتا تھا۔

جمال دین اور سندر داس نے چادروں میں خود کو لپیٹا اور ٹھاکر کے ہاتھ چومے۔

''ہمیں آشیر واد دیں ٹھاکر جی۔'' سندر داس نے کہا۔

''خدا حافظ جمال دین۔'' ٹھاکر نے زیر لب کہا۔

❀......❀......❀

اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ اماوس کی رات تھی...... روشنی سے محروم رات۔ حملہ آوروں کے حوصلے بہت پست تھے۔ اصل میں وہ کوئی منظم گروہ نہیں تھا۔ وہ محض افراد تھے، جو قیادت اور منصوبہ بندی سے محروم تھے۔ سورج کی پکار پر احاطے سے باہر آنے کے بعد انھوں نے اندر کا منظر دیکھا تو وہ ڈر گئے۔ احاطہ لاشوں سے پڑا ہوا تھا اور اب ایک گھنٹے بعد اندھیرے میں انھیں لاشیں اور زیادہ نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے بیشتر خوف زدہ تھے۔

''ہم نے اندھا دھند یلغار کر کے غلطی کی۔'' سورج کہہ رہا تھا۔

''تو یہ بات تمھیں پہلے کہنی چاہیے تھی۔'' ایک سورما نے جھلا کر کہا۔ ''دیکھ لو۔ ہمارے کتنے لوگ مارے گئے۔''

''اور تم لوگ خود تو اندر گئے ہی نہیں۔'' ایک اور نے للکارا۔

''اسی لیے زندہ ہیں۔'' جسونت نے کہا۔ ''لڑائی دماغ سے لڑی جاتی ہے۔''

''ایک دوسرے سے مت لڑو۔ یہ سوچو کہ اب کیا کرنا ہے۔'' کسی نے کہا۔

''ہمیں سب سے زیادہ نقصان لٹھیا بازوں سے پہنچا ہے۔'' سورج نے کہا۔ ''وہ سامنے آئے تو دور سے دور ہٹنے کی کوشش کرو۔ اس طرح بندوق یا غلیل والا کوئی انھیں آسانی سے نشانہ بنا سکے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس بندوقیں اور غلیلیں ہیں، وہ ایک جگہ ہو جائیں اور ایک جگہ رہیں۔ انھیں پھاٹک کے پاس رہنا چاہیے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد ہم اندر گھسیں گے۔ تو یہ لوگ سب سے آگے ہوں گے۔ اندر اب تھوڑے لوگ ہیں۔ انھیں ایک ایک کر کے نشانہ بنانا ہوگا۔ تب جیت ہماری ہوگی۔''

اس کا مثبت ردِعمل ہوا۔ بندوقوں اور غلیلوں والے لوگ آگے آئے اور پھاٹک کے پاس جمع ہو گئے۔ لیکن منفی ردِعمل بھی کم نہیں تھا۔ روایتی ہتھیاروں والے لوگ پہلے ہی لاٹھی چلانے والوں سے خوف زدہ تھے۔ انھوں نے اپنے بے شمار لوگوں کو گرتے دیکھا تھا۔ سورج کی بات سن کر ان کا خوف اور بڑھ گیا۔ وہ مارنے کے لیے آئے تھے۔ لیکن مرنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ان میں سے بیشتر جی چھوڑ بیٹھے تھے۔ اب انھیں پیچھے ہٹنے کا موقع ملا تو انھوں نے سمجھ لیا کہ وہ یہاں سے نکل سکتے ہیں۔ اندھیرا ان کے لیے پردے کا کام کر رہا تھا۔

وہ لوگ ایک ایک دو دو کر کے پیچھے کھسکتے رہے۔ ان کی تعداد کم ہوتی رہی۔ جو خود کو کا

کیے بیٹھے تھے، وہ انھیں بھاگتے دیکھ کر متزلزل ہو گئے اور خود بھی نکل بھاگنے کی سوچنے لگے۔

چھ دوستوں کی ٹولی اب پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ انھیں پتا بھی نہیں چلا کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے۔

❀......❀......❀
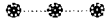
وہ دونوں متحرک سائے کی طرح نظر آ رہے تھے۔ پھر وہ اندھیرے میں مدغم ہو گئے۔ ٹھاکر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انھیں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ جھک کر بھاگتے ہوئے احاطے میں آگے بڑھے۔ پھر وہ کسی لاش سے ٹکرائے۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ اب انھیں سینے کے بل رینگنا ہوگا۔ سینے کے بل رینگتے ہوئے وہ آگے بڑھے۔ ابتدا میں جو لاشیں انھیں ملیں، وہ انھیں نہیں پہچان سکے۔ یہ اسی بات کا ثبوت تھا کہ وہ دشمنوں کی لاشیں ہیں۔ پھر جمال دین کو ایک شناسا چہرہ نظر آیا...... خون میں نہایا ہوا۔ وہ رندھیر تھا۔ جمال دین نے اسے ٹٹول کر دیکھا۔ وہ مر چکا تھا۔

جیسے جیسے وہ آگے بڑھے، جمال دین کا دل ڈوبنے لگا۔ بات پوری طرح سمجھ میں آ رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ احاطے میں کوئی زخمی نہیں ملے گا۔ وہ سب مر چکے ہیں۔ جو بھی زخم کھا کر ایک بار گرا، وہ اٹھ نہیں سکا ہوگا۔ دوسرے لوگ اسے روندتے ہوئے چلے گئے ہوں گے۔

جمال دین کا سینہ دکھ سے بھر گیا۔ تو میرا وصال دین اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ عمر بھر کی کمائی لٹ گئی۔ وہ بیٹا، جس کے بارے میں وہ سوچتا تھا وہ اس کی نسل کو آگے بڑھائے گا، وہ مر گیا۔ تو اب کیا بچا......؟ کچھ بھی نہیں!

پھر اس دکھ سے طمانیت کی ایک لہر اٹھی۔ اس کا دل شکر سے بھر گیا۔ اللہ نے عزت کی موت عطا کی ہے اس کے بیٹے کو۔ وہ ایک بت شکن کے دشمنوں، مشرکوں سے لڑتے ہوئے مرا ہے۔ اللہ کی مرضی ہوئی تو اسے شہید کا رتبہ ملے گا۔ اور یہی نہیں، اس نے جان دے کر حق نمک بھی ادا کر دیا۔

اچانک اسے وصال دین نظر آ گیا۔ اس کا چہرہ حیرت انگیز طور پر روشن لگ رہا تھا۔ اور اس کے سینے میں ایک نیزہ پیوست تھا۔ ایک لمحے کو اسے ایسا لگا کہ وصال دین سانس لے رہا ہے۔ اس نے اس کی نبض ٹٹولی، سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ مگر وہاں سناٹے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

جمال دین نے جھک کر بڑی محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔ ''مجھے تم پر فخر ہے میرے بیٹے۔'' وہ بڑبڑایا۔

اگلے ہی لمحے اس کے سینے میں آگ سی دہک اٹھی۔ ''اب میری باری ہے۔ میں بھی آ رہا ہوں بیٹے۔'' اس نے سرگوشی میں بیٹے سے کہا۔

جب وہ چلا تھا تو اسے افسوس تھا کہ وہ اپنی لاٹھی چھوڑ کے جا رہا ہے۔ لیکن مجبوری تھی۔

لاٹھی اس کی راہ کی رکاوٹ بن جاتی۔ اسے جس طرح بڑھنا تھا، وہ لاٹھی لے کر نہیں چل سکتا تھا۔ یہ بات نہیں کہ وہ موت سے ڈرتا ہو بلکہ وہ تو مرنے کا مصمم ارادہ لے کر چلا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ مشرکوں کو مار کر مرنا چاہتا تھا۔ اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ زخمیوں کی تلاش کے دوران کوئی گولی بغیر لڑے اسے زندگی سے محروم کر دے۔

مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ اللہ جو کرتا ہے، بہتر کرتا ہے۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ لاٹھی لے کر نہیں آیا۔ اب وہ زندہ بھی ہے اور اسے لاٹھی بھی مل گئی ہے۔ اس نیزے سے بہتر کون سا ہتھیار ہو سکتا ہے، جو اس کے بیٹے کے خون میں بھیگا ہوا ہے۔ وہ اسی نیزے سے دشمنوں کو مارے گا..... اپنے بیٹے کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لے گا۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ حویلی کے پھاٹک کے بہت قریب تھا۔ اب احتیاط کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سیدھا کھڑا ہوا اور وصال دین کے سینے سے نیزہ نکالنے لگا۔ کام اتنا مشکل نہیں تھا۔ لیکن جس نزاکت سے وہ یہ کام کرنا چاہتا تھا، اس نے اسے دشوار بنا دیا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ نیزہ اس کے اپنے سینے میں گڑا ہے۔ نکالتے ہوئے اسے یہ خیال ستا رہا تھا کہ اس کے بیٹے کو تکلیف نہ ہو۔ پہلی گولی چلی تو وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔ اور وہ گولی اس کے جسم کو تقریباً چھوتے ہوئے گزری تھی۔ وہ تیزی سے جھکا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس ایک ثانیے میں اس نے بہت کچھ سوچ لیا۔ اس کا بیٹا زندہ نہیں تھا، مر چکا تھا۔ اور اسے مرنے سے پہلے بہت کچھ کرنا تھا۔ حملہ آور بھلے نہ بھاگیں۔ لیکن وہ انھیں اتنا نقصان پہنچائے کہ ان کی کمر ٹوٹ جائے اور ٹھاکر کا بوجھ ہلکا اور کام آسان ہو جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مرے ہوئے بیٹے کے سینے سے نیزہ بھی نکالے اور دشمن کی گولی کا نشانہ بھی نہ بنے۔

بیٹھے بیٹھے اس نے اپنا پاؤں بیٹے کے سینے پر رکھا اور نیزے کو نیچے سے تھام کر پوری قوت سے اوپر کھینچا۔ نیزہ نکلا تو وہ خود کو سنبھال نہ سکا اور ایک طرف لڑھک گیا۔

اس لڑھکنے نے اسے بچا لیا۔ ورنہ وہ گولی اس کے ضرور لگتی۔ چند لمحے وہ ساکت پڑا رہا۔ پھر نیزے کو آگے کی طرف سرکاتے ہوئے وہ سینے کے بل آگے بڑھنے لگا۔ ساتھ ہی اس نے سمت بھی تبدیل کر لی تھی۔

کچھ آگے جا کر اس نے چادر کا بوجھ اتارا۔ اب اگلے مرحلے میں وہ اس کے لیے رکاوٹ ہی ثابت ہوتی۔ پھر وہ کھڑا ہوا۔ اس نے نیزے کو لاٹھی کے انداز میں پکڑا اور اسے گھما کر دیکھا۔

اس لمحے ایک گولی اور چلی۔ وہ بال بال بچا۔

اس نے بلند آواز میں نعرۂ تکبیر بلند کیا..... اللہ اکبر! پھر وہ نیزے کو لاٹھی کی طرح گھماتا، پینترے بدلتا پھاٹک کی طرف بڑھا۔ اب اس کی رفتار ایسی تھی کہ اس کے جسم کو دیکھا ہی

نہیں جا سکتا۔ اس رفتار سے تو وہ کبھی حرکت میں آیا ہی نہیں تھا۔

روشنی کی لکیر بنا وہ پھاٹک سے نکل آیا!

❀……❀……❀

گوپال پھاٹک پر جمع طمنچہ برداروں کی قیادت کر رہا تھا۔ وہ حملہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ طے یہ پایا تھا کہ وہ لوگ آگے ہوں گے اور روایتی ہتھیار والے پیچھے۔ اب وہ سورج کی آواز کے منتظر تھے۔

دوسری طرف سورج اور اس کے دوست عقب کی صورتِ حال دیکھ کر بھونچکا رہ گئے تھے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ ان کے ساتھیوں کی بڑی تعداد چپکے سے میدان چھوڑ گئی ہے۔

"ہمیں فوراً حملہ کرنا ہوگا۔" کرتارے نے کہا۔ "ورنہ یہاں صرف ہم ہی رہ جائیں گے۔"

"کائر کہیں کے۔" سورج کے لہجے میں حقارت تھی۔

یہ وہ وقت تھا کہ پھاٹک کے قریب کھڑے ایک بندوق بردار نے احاطے میں تحرک محسوس کیا۔ وہ تحرک بھی برائے نام تھا کیونکہ جس شخص کو وہ دیکھ رہے تھے، وہ تو جیسے اندھیرے میں لپٹا ہوا تھا۔

"وہ..... وہ دیکھو۔" بندوق بردار نے گوپال سے کہا۔

گوپال نے احاطے کی طرف دیکھا۔ اور اندازے سے گولی چلا دی۔

تحرک اس بار نیچے کی سمت تھا۔

گوپال نے دوسری گولی چلائی۔ بندوق بردار نے بھی گولی چلانے کو اپنا حق سمجھا۔ آخر تحرک کو پہلی بار اس نے ہی دیکھا تھا۔

اب اندر پھر سکوت اور اندھیرا تھا۔ "اسی جگہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے فائر کرتے رہو۔" گوپال نے ہدایت کی۔

انھوں نے چند فائر کیے۔ لیکن جواب میں کوئی چیخ نہیں سنائی دی۔ وہ رک گئے۔

پھر اچانک دلوں پر ہیبت طاری کرنے والا وہ نعرہ سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک سایہ پورے قد سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، جسے وہ گھما رہا تھا۔ پھر لاٹھی کی گردش کی رفتار بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ اب وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

نعرے کی ہیبت نے انھیں شل کر کے رکھ دیا تھا۔ اس میں ان کے وہ قیمتی سیکنڈ ضائع ہو گئے، جن میں وہ اسے نشانہ بنا سکتے تھے۔ پھر وہ سایہ حرکت میں آیا..... اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی حرکت بھی اتنی تیز ہو گئی کہ وہ ایک تاریک بگولہ بن کر رہ گیا، جو ان کی طرف لپک رہا تھا۔

"دور ہٹو..... تیزی سے ہٹو۔" گوپال چلایا۔

سب نے اس ہدایت پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جمال دین بہت تیزی سے ان کے سروں پر پہنچ چکا تھا۔ لاٹھی کے انداز میں گھمایا جانے والا وہ تیزہ بہت تباہ کن ثابت ہوا۔ جمال دین پھاٹک سے گزر کر پیچھے کی طرف پہنچا، جہاں وہ لوگ تھے، جو پہلے ہی متذبذب تھے۔ وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ جسے موقع ملا، اس نے راہِ فرار اختیار کی۔

ادھر گوپال نے احاطے میں داخل ہو کر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ''اندر گھس جاؤ اور فائرنگ کرتے رہو۔'' اس نے پھاٹک پار کرتے ہوئے کہا۔

یوں یہ لڑائی دو رخ میں تبدیل ہو گئی۔ یہ حملہ آوروں کے لیے نقصان دہ تھا کیونکہ وہ دو جگہ تقسیم ہو گئے تھے۔ جن لوگوں کے پاس آتشی اسلحہ تھا، وہ اب احاطے میں تھے اور فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

دوسری طرف روایتی ہتھیاروں والے لوگ تھے، جن پر جمال دین قہر بن کر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کے نتیجے میں کم وقت میں زیادہ لوگ ناکارہ ہو گئے اور اس سے بڑی بات یہ ہوئی کہ بڑی تعداد میں لوگ فرار ہو گئے۔

لیکن ابتدائی چند منٹ میں ٹھاکر کے ساتھیوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ وہ اچانک حملہ ان کے لیے خلافِ توقع تھا۔ وہ سب ایک جگہ تھے۔ اس لیے اندھا دھند فائرنگ ان کے لیے بے حد خطرناک ثابت ہوئی۔ ٹھاکر کو چیخوں سے اندازہ ہو گیا کہ وہ کئی ساتھیوں سے محروم ہو گیا ہے۔

''فائرنگ کرو...... مسلسل۔'' اس نے پکار کر کہا۔

احاطے میں داخل ہونے والے حملہ آوروں کو سب سے زیادہ نقصان احاطے میں پڑی لاشوں سے ہوا۔ وہ ان لاشوں سے الجھ کر گرے۔ دوسری طرف ٹھاکر کے ساتھی سنبھل گئے تھے اور جم کر فائرنگ کر رہے تھے۔ حملہ آوروں کا جانی نقصان بہت تیزی سے ہو رہا تھا۔

جمال دین کو احساس ہوا کہ پھاٹک کے قریب کھڑے حملہ آوروں نے حویلی پر دھاوا بول دیا ہے تو وہ پلٹا۔ ویسے بھی یہاں میدان صاف ہو چکا تھا۔ اسے صرف گنتی کے حملہ آور نظر آ رہے تھے۔

وہ پھاٹک کی طرف تیزی سے لپکا کہ ٹھاکر کی مدد کو پہنچے۔ اچانک وہ ایک لاش سے الجھ کر گرا۔ قریب ہی گرے ہوئے ایک زخمی حملہ آور نے ہاتھ میں تھاما ہوا خنجر بہت تیزی سے اس کے سینے میں گھونپ دیا۔

باہر اب کیدار ناتھ کے دوستوں کے سوا کوئی نہیں رہا تھا۔ باقی سب لوگ راہِ فرار اختیار کر چکے تھے۔ انھوں نے جمال دین کو گرتے دیکھا تو اس کی طرف جھپٹے۔ راجو نے تیزہ جمال دین کے سینے میں اتار دیا۔

مرتے وقت جمال دین کے دل میں سکون اور ہونٹوں پر کلمہ تھا۔

جمال دین کو دم توڑتے دیکھ کر انھوں نے سکون کا سانس لیا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں اب صرف وہ تین تھے...... راجو، کرتارا اور سورج۔ ''سب بھاگ گئے۔'' سورج نے نفرت میں بجھے لہجے میں کہا۔

''جسونت اور رگھبیر بھی نظر نہیں آ رہے ہیں۔'' راجو بولا۔

''وہ کائر نہیں ہیں۔ کام آ گئے ہوں گے۔'' کرتارا نے تڑپ کر کہا۔

''اب کرنا کیا ہے؟'' راجو سورج کی طرف مڑا۔

''اندر چلو...... اپنے ساتھیوں کے پاس۔''

وہ تینوں پھاٹک پر پہنچے اور اندر داخل ہوئے۔ دو طرفہ فائرنگ ہو رہی تھی۔ کبھی کوئی چیخ سنائی دیتی...... کبھی دور کی اور کبھی نزدیک کی۔ نزدیک کی چیخ بتاتی تھی کہ ان کا کوئی ساتھی کم ہوا ہے۔ جبکہ دور کی چیخ ان کے لیے ایک دشمن کے کم ہونے کی نوید تھی۔

وہ دس قدم ہی بڑھے ہوں گے کہ سورج چیخ مار کر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ بلند ہو رہا تھا۔

''لو...... سورج بھی گیا۔'' راجو نے اداس لہجے میں کہا۔

❀......❀......❀

''ٹھاکر جی میں فائرنگ کر رہا ہوں۔ آپ اندر چلے جائیں۔'' وکرانت نے کہا۔

''میں یہیں ٹھیک ہوں۔''

''مالک، اب ہم صرف تین رہ گئے ہیں۔ آپ، میں اور رنجیت۔''

ٹھاکر نے پہلی بار سر گھما کر دیکھا۔ وکرانت ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ لیکن دشمنوں کی فائرنگ میں بھی اب زور نہیں تھا۔ اس سے لگتا تھا کہ ان کی تعداد بھی بہت کم رہ گئی ہے۔

''ٹھیک ہے۔ تم لوگ بھی اندر چلو۔''

باہر اب سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ ان کے لیے باہر رہنا اب خطرناک ثابت ہوتا۔ دشمن بھی انھیں اب سائے کی طرح نظر آ رہے تھے۔ ان کی تعداد دس بارہ کے لگ بھگ ہو گی۔

پہلے ٹھاکر اندر گیا، پھر رنجیت اور آخر میں وکرانت۔

اندر روشنی ہو رہی تھی اور کیدار ناتھ اور مولوی برکت علی وہاں موجود تھے۔

''میں دروازہ سنبھالتا ہوں اَن داتا۔'' وکرانت نے کہا۔ ''آپ اور رنجیت کھڑکی کی اوٹ میں رہ کر فائر کریں۔ ہم انھیں ایک ایک کر کے مار گرائیں گے۔''

''ٹھاکر ویر...... باقی سب لوگ کہاں ہیں۔'' کیدار ناتھ نے پوچھا۔

''بس ہم ہی بچے ہیں۔'' ٹھاکر نے کہا۔ ''لیکن دشمن بھی زیادہ نہیں ہیں۔''

رنجیت نے ایک کھڑکی سنبھال لی تھی اور وکرانت دروازے سے فائر کر رہا تھا۔ ٹھاکر دوسری کھڑکی کی طرف چلا گیا۔

وہ ایک ایک کر کے حملہ آوروں کو شکار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اب باہر صرف چار سائے نظر آ رہے تھے۔ اجالا بھی اچھا خاصا ہو گیا تھا۔ اس صورتِ حال نے وکرانت کا اعتماد بڑھا دیا۔ وہ غیر محتاط ہو کر دروازے سے نکلا۔ اگلے ہی لمحے فائر کی آواز کے ساتھ وہ الٹ کر واپس آ گرا۔ حملہ آور دیوار سے چپکتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ وکرانت کے باہر نکلتے ہی اس نے فائر کیا۔ لیکن وکرانت کی گولی بھی کام کر گئی تھی۔

اسی وقت رنجیت کی توجہ وکرانت کی طرف تھی۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ گولی کب اس کے سر میں گھس گئی۔

یہ وہ موقع تھا، جس کا کیدار ناتھ کو انتظار تھا۔ اب ٹھاکر اکیلا رہ گیا تھا۔ اب صرف ایک لمحے کی بات تھی۔ اس کے بعد کیدار ناتھ کا برسوں کا خواب پورا ہو جاتا۔

اس نے جیب سے طمنچہ نکالا۔ ٹھاکر کھڑکی کی اوٹ میں باہر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک فائر کیا۔ باہر سے ایک کریہہ چیخ اور کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ اب صرف دو حملہ آور زندہ تھے۔

کیدار ناتھ نے طمنچہ سیدھا کیا اور ٹھاکر کے سر کا نشانہ لیا۔ یہ وہ لمحہ تھا، جب مولوی برکت علی نے اسے دیکھا۔ وہ کیدار ناتھ سے کافی دور تھے اور گولی چلنے سے پہلے اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ تاہم وہ اس طرف جھپٹے اور ساتھ ہی انھوں نے چیخ کر کہا۔ ''ٹھاکر جی...... عقب میں دوستوں سے ہشیار...... ٹھاکر جی۔''

ٹھاکر ان کی چیخ سن کر پلٹا۔ اس پلٹنے نے اسے بچا لیا۔ وہ سیدھا ہوا۔ گولی اس کے سر کے بجائے بائیں کندھے کے نیچے سینے کے اوپری حصے میں لگی۔ اس دوران مولوی صاحب کیدار ناتھ تک پہنچ چکے تھے۔ کیدار ناتھ نے تیزی سے رخ بدلتے ہوئے مولوی صاحب پر بہت قریب سے فائر کیا۔ اس دوران ٹھاکر کو کیدار ناتھ پر گولی چلانے کا موقع مل گیا۔

کیدار ناتھ گرنے سے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ مولوی صاحب قریب ہی گرے ہوئے تھے۔ ٹھاکر ان کی طرف بڑھا۔ ''مولوی صاحب، اتنے کم وقت میں آپ نے کتنے احسان کر دیے مجھ پر۔'' وہ ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

''احسان کیسا ٹھاکر جی۔'' مولوی صاحب نے اٹک اٹک کر کہا۔ ''میرے نصیب میں یہ سعادتیں لکھی تھیں مجھے تو افسوس ہے کہ آپ کو بچا نہ سکا۔''

دروازے پر آہٹ سی محسوس کر کے ٹھاکر تیزی سے گھوما اور اس نے فائر بھی کر دیا۔ اس بار گرنے والا کیدار ناتھ کے ان دو دوستوں میں سے ایک تھا، جنھوں نے آکرانت حملے سے خبر

دار کیا تھا۔

ٹھاکر نے پلٹ کر دیکھا تو مولوی صاحب دم توڑ چکے تھے۔ خود اس کا حال یہ تھا کہ اس کے زخم سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور دروازے کے عین سامنے دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے ذہن میں صرف دو باتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ باہر ایک حملہ آور ابھی موجود ہے اور اسے ٹھکانے لگانا ہے۔ دوسری ایک خواہش تھی۔ کم از کم اپنے بیٹے کے آنے تک وہ زندہ رہے اور اس کے لیے وہ دعا ہی کر سکتا تھا۔

طلوعِ آفتاب کا وقت تو ابھی دور تھا۔ لیکن صبح ہو رہی تھی۔ اور خون بہنے کی وجہ سے ٹھاکر کو شدید کمزوری ہو رہی تھی۔ اس پر غشی کی کیفیت طاری ہونے لگتی تو وہ ہاتھ سے اپنے سینے کے زخم کو دبوچ لیتا۔ تکلیف اسے ہوش میں لے آتی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ آخری حملہ آور آئے تو وہ غشی میں ہو اور حملہ آور کا نشانہ بن جائے۔ وہ طمنچہ تھامے اس آخری حملہ آور کا منتظر تھا۔

❁......❁......❁

دن چڑھ چکا تھا۔ گاؤں کے وہ لوگ، جنھوں نے لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا، صحرا میں فاتح حملہ آوروں کی واپسی کے منتظر تھے۔ انھیں واپس جاتا دیکھتے تو وہ گاؤں واپس جاتے۔

''بہت دیر ہو گئی۔ اب تک تو انھیں آ جانا چاہیے تھا۔'' رمیش نے کہا۔

''وہ لوگ لوٹ مار کر رہے ہوں گے۔'' ہردیال بولا۔

''ایسا تو نہیں کہ وہ سب ختم کر دیے گئے ہوں۔'' پوار نے کہا۔

''کیا بات کرتے ہو۔ وہ سینکڑوں تھے۔'' یشونت نے تڑپ کر کہا۔ وہ وہاں موجود لوگوں میں سب سے زیادہ بااثر تھا۔

''پر اپنے ٹھاکر جی تو شیر ہیں شیر۔'' پوار کے لہجے میں ستائش تھی۔

''کچھ بھی ہو۔'' اب ہمیں گاؤں جانا ہی ہوگا۔'' یشونت نے کہا۔

''ٹھاکر جی کو کیا منہ دکھائیں گے۔'' راجو بولا۔

بہت سے لوگ شرمندہ نظر آنے لگے۔ ''سچ ہے، ہم نے بہت برا کیا۔'' بہت سی آوازیں ابھریں۔

''برا ہم نے نہیں کیا، چھوٹے ٹھاکر نے کیا ہے۔ یشونت نے بھڑکتے لہجے میں کہا۔

''ٹھاکر اور چھوٹا ٹھاکر بھگوان کے دوشی ہیں۔ انھوں نے مندر کا اپمان کیا۔ شرم انھیں آنی چاہیے۔ اب ایک بات طے کر لو۔ اگر اپنے گاؤں کو بھگوان کے شراپ سے بچانا ہے تو ہمیں اپرادھیوں کو سزا دینی ہوگی۔ ٹھاکر اور چھوٹا ٹھاکر اگر زندہ ہیں تو ہم انھیں ختم کریں گے۔''

اس پر وہاں ہلچل مچ گئی۔ ٹھاکر کی سب عزت کرتے تھے۔ وہ تو ٹھاکر کا ساتھ نہ دینے پر شرمندہ ہو رہے تھے۔ اتنے بڑے اقدام کی...... ٹھاکر کے خلاف بغاوت کی تائید کیسے کر سکتے

تھے۔لیکن ان کے دلوں میں یہ خوف بہر حال تھا کہ اوتار سنگھ نے بہت برا کیا ہے اور ان پر بھگوان کا شراپ آ کر رہے گا۔وہ دودلی کا شکار ہو رہے تھے۔

یشونت نے ان کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھایا۔وہ دھرم کے حوالے سے انھیں اکساتا رہا۔پھر اس نے کہا۔''اور سوچو، ٹھاکروں کے ختم ہونے کے بعد جو زمین جس کے پاس ہے، وہ اس کی ہوگی۔وہ مالک ہوگا اس زمین کا۔''

زمین کا خواب بہت بڑا تھا۔سب کی وفاداری ڈول گئی۔

''اور ٹھاکر دھرم کا شروع ہی سے کچا تھا۔'' یشونت نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

''سوچو، ہم سب سے زیادہ وہ اس مُسلے جمال دین کی عزت کرتا تھا۔اسے برابری کا درجہ دیتا تھا۔ اس کے بیٹے کو یہ سب کچھ تو کرنا ہی تھا۔''

خاصی بحث وتمحیص کے بعد بالآخر سب قائل ہو ہی گئے۔یشونت جانتا تھا کہ ان میں سے بہت سے ٹھاکر کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھا سکیں گے۔لیکن کچھ لوگ تو اس کا ساتھ بہر حال دیں گے۔اسے یقین تھا کہ اول تو ٹھاکر زندہ ہی نہیں ہوگا اور ہوا بھی تو اس کے ساتھ دو چار لوگ ہی ہوں گے۔

وہ گاؤں کی طرف چلنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ رمیش نے کہا۔''میرا خیال ہے، سمے نکل چکا۔اب تو بھگوان کا شراپ ہی جھیلنا ہوگا۔''

''کیا مطلب؟'' یشونت نے پوچھا۔

''آسمان کو دیکھو۔''

انھوں نے دیکھا۔آسمان سرخ ہو رہا تھا اور ہوا ساکت تھی۔

''میرے پتا جی نے جو نشانیاں بتائی تھیں، ان کے مطابق یہ سرخ آندھی ہے۔اب کچھ بھی نہیں رہے گا۔سب ختم ہو جائے گا۔'' رمیش کی آواز لرز رہی تھی۔

''چلو......گاؤں کی طرف چلو۔اپنے گھروں تک تو پہنچو۔اور موقع ملے تو ٹھاکر کو ختم کر دو۔شراپ ٹل جائے گا۔''

وہ گاؤں کی طرف چل دیے۔

❁ ❁ ❁

اوتار سنگھ کندھے سے بیگ لٹکائے تیز قدموں سے بڑھ رہا تھا۔اسے پریشانی بھی تھی اور تشویش بھی کہ گاؤں کے باہر زمینوں پر کوئی کام کرتا نہیں دکھائی دے رہا تھا۔یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔

وہ گاؤں کی حد میں داخل ہوا تو اس کی تشویش اور بڑھ گئی۔وہاں ہر طرف سناٹا تھا۔ زندگی کے آثار ہی نہیں تھے۔پھر اس کی نظر فضا میں چکراتی ہوئی چیلوں پر پڑی۔اور وہ جگہ وہ تھی

جہاں اس کے اندازے کے مطابق حویلی تھی۔

اوتار سنگھ کا دل چاہ رہا تھا کہ پہلے اماں کے پاس جائے اور انھیں وہ چادر دے جو وہ ان کے لیے جے پور سے لایا تھا۔لیکن گاؤں میں قدم رکھتے ہی اس کا دل اندیشوں سے بوجھل ہو گیا تھا۔کوئی نامعلوم حس اسے بتا رہی تھی کہ گاؤں میں کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہوئی ہے۔

اس احساس کے ساتھ اس کے قدم تیز ہو گئے۔اس کا رخ حویلی کی طرف تھا۔

حویلی نظر آئی تو اس کا دل گویا اچھل کر حلق میں آ گیا۔پھاٹک کے سامنے لاشیں ہی لاشیں تھیں۔اب وہ تقریباً بھاگ رہا تھا۔لاشوں کو پھلانگتے ہوئے وہ انھیں دیکھ کر پہچاننے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔لیکن وہ سب اس کے لیے اجنبی تھے۔پھر اسے ان میں ایک جانی پہچانی لاش نظر آئی......سندر داس کی لاش!

وہ پھاٹک سے گزرا۔احاطہ بھی لاشوں سے اٹا پڑا تھا۔اب بھاگنا ممکن نہیں تھا۔لاشوں کے اس ڈھیر میں اسے شناسا چہرے بھی نظر آ رہے تھے۔پھر ایک لاش دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔اس کے حلق سے چیخ نکلی۔''ویرجی۔'' اور وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

''ویرجی......ویرجی۔'' وہ اسے ہلا رہا تھا۔

لیکن وصال دین کے سینے میں بہت گہرا زخم تھا۔خون اب جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔یہ جاننے کے لیے کہ وہ مر چکا ہے، اسے ٹٹولنے کی ضرورت نہیں تھی۔

لگتا تھا، وقت ٹھہر گیا ہے۔وہ وصال دین کا سر اپنے زانو پر رکھے بیٹھا تھا۔اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔''یہ کیا ہو گیا ویرجی، یہ کیا ہو گیا۔'' وہ بڑبڑا رہا تھا اور اسے اس کا احساس بھی نہیں تھا۔

پھر ایک چیل نیچے آ کر جھپٹی تو وہ چونکا۔اس نے بڑی نرمی اور آہستگی سے وصال دین کا سر زمین پر رکھ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ ویرجی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا اور اسے جلد سے جلد دوسروں کی خبر لینی ہے۔

سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے اسے کئی جانے پہچانے چہرے نظر آئے۔وہ سب مر چکے تھے اور ان میں چاچا جمال دین بھی تھا۔

وہ آگے بڑھ گیا۔وہ حویلی کے اندر کی صورتِ حال جاننے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔

حویلی کا صدر دروازہ کھلا تھا۔عین دروازے پر اندر کی جانب دو لاشیں پڑی تھیں۔وہ انھیں نہیں جانتا تھا۔لیکن اندر کے منظر نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔سامنے دیوار سے ٹک کر پتا جی بیٹھے تھے۔ان کے سامنے خون کا چھوٹا سا تالاب تھا۔ان کے قریب ہی مولوی برکت علی اور چاچا کیدار ناتھ تھے۔وہ دونوں مر چکے تھے۔

چند لمحے وہ ساکت کھڑا وہ منظر دیکھتا رہا۔ اس وقت بس ایک ہی بات اچھی لگ رہی تھی۔ پتا جی زندہ تھے۔ ان کے سینے کا زیروبم ان کی زندگی کا ثبوت تھا۔ ان کی آنکھیں مندی ہوئی تھیں اور وہ غشی کی حالت میں تھے۔

''پتا جی!'' اس نے انھیں پکارا۔ اپنی آواز خود بھی اسے اجنبی لگی۔

ٹھاکر نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ہونٹ لرزے۔ لیکن کوئی آواز نہ نکلی۔

اوتار سنگھ نے اپنا بیگ ایک طرف رکھا اور اس کی طرف لپکا۔

ٹھاکر بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے نیم جاں ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھائے، باہیں پھیلائیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کے دونوں ہاتھ بے جان ہو کر پہلو سے جا ملے۔

اوتار سنگھ نے اسے لپٹا لیا۔ ''یہ...... یہ سب کیا ہو گیا پتا جی؟''

ٹھاکر کے ہونٹ ہلے۔ کمزور سی آواز ابھری۔ لفظ بھی ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

''وہ...... جے پو...... جے پور...... والے......''

اوتار سنگھ کو بات سمجھنے کے لیے کسی دانش کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سب سمجھ گیا تھا۔

''آپ...... آپ ٹھیک ہو جائیں گے پتا جی۔''

ٹھاکر نے نقاہت سے سر ہلایا۔ سر کی وہ جنبش اس کی ناتوانی کی گواہ تھی۔ اس نے اشارے سے کان قریب لانے کو کہا۔ اوتار سنگھ کان اس کے ہونٹوں کے پاس لے گیا۔ ''میں بس...... تمھارے...... زندہ......'' ٹھاکر سے جملہ پورا نہیں کیا جا رہا تھا۔ ''مجھے...... بہت باتیں...... پرنتو...... سمے...... نہیں۔''

''بولیں...... بولیں پتا جی۔''

''تہ خانے...... سب تمھارا...... دہلی جا...... پڑھو...... یہاں...... نہیں۔''

ٹھاکر اٹک اٹک کر کہے جا رہا تھا۔ اوتار سنگھ کی سمجھ میں سب کچھ آ رہا تھا۔ ''سچ کہنا...... بت تم...... نے...... توڑے...... ؟''

اوتار سنگھ صرف ایک لمحے جھجکا۔ پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''جی پتا جی۔''

ٹھاکر کی آنکھیں چمکیں۔ پھر بڑی کوشش کر کے اس نے اوتار سنگھ کا ماتھا چوم لیا۔ ''اب میں...... سکون...... مر......''

ٹھاکر ہانپنے لگا۔ چند لمحے خاموش رہ کر وہ بولا۔ ''بڑی بات...... تم سے...... سے نہیں...... جلاتا نہیں...... دفن کرنا......''

اتنا تو اوتار سنگھ کی سمجھ میں آ گیا کہ پتا جی اسے کوئی بڑی اور اہم بات بتانا چاہتے تھے۔ لیکن ان سے بولا نہیں جا رہا ہے۔ بعد کی بات میں تھوڑی الجھن تھی۔ شاید وہ چاچا جمال دین اور ویر جی کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ شاید نہیں...... یقیناً یہی بات ہے۔

اسی لمحے ٹھاکر کی نظریں باہر آسمان پر پڑیں۔ اس کی نگاہوں میں چوکنا پن آ گیا۔

''اوتا...... لال آندھی...... سب ختم...... تم جاؤ...... میرا حکم...... جاؤ......'' لفظ اس کے ہونٹوں پر ٹوٹ گئے۔ ''تہ خانہ چھوڑ...... جاؤ...... میرا حکم......'' اب اس کے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بے تابی اور تحکم تھا۔ ''مت رکو...... جاؤ......''

''میں جاؤں گا۔ آپ ٹھیک ہو جائیں۔ میں آپ کا حکم مانوں گا۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

ٹھاکر زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ اس کے ہونٹ بے آواز ہل رہے تھے۔ پھر ایک جھٹکا لگا اور سب کچھ ساکت ہو گیا۔

اوتار سنگھ پتھرائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ ٹھاکر مر چکا تھا۔ اب اوتار سنگھ کو صرف اس کے حکم کی تعمیل کرنی تھی۔ اس نے باپ کے پاؤں چھوئے۔ پھر اٹھا اور مولوی صاحب کے پاؤں چھوئے۔ ''آپ سے تو مجھے بہت کچھ سیکھنا سمجھنا تھا۔'' وہ بڑبڑایا۔

جانے سے پہلے وہ ٹھاکر کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کلمہ پڑھتا رہا، جیسے اسے پاک کر رہا ہو۔

پر وہ نکل آیا۔ باہر ہوا بند تھی۔ ہر طرف خوف ناک سکوت تھا اور آسمان سرخ ہو رہا تھا۔

اسے یاد آیا۔ پتا جی نے کہا تھا...... لال آندھی۔ اور انھوں نے اسے چلے جانے کا حکم دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ تہ خانے جا کر کچھ رقم لے لے۔ لیکن پتا جی کا آخری حکم ماننا زیادہ ضروری تھا۔

وہ تیز قدموں سے چلنے لگا۔ اچانک اسے اماں کا خیال آیا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اماں سے ملے بغیر چلا جائے۔ بلکہ وہ اماں کو ساتھ لے کر جائے گا۔ اس نے اپنا رخ ویر جی کے گھر کی طرف کر لیا۔

یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ اماں ایک پوٹلی ہاتھ میں لیے دروازے پر کھڑی ہیں۔ وہ جا کر ان سے لپٹ گیا۔ ''اماں...... چاچا اور ویر جی......''

''مجھے پتا ہے۔ وہ شہید ہو گئے۔'' حمیدہ کے لہجے میں طمانیت اور ٹھہراؤ تھا۔ اس نے نرمی سے اوتار سنگھ کو خود سے علیحدہ کیا۔ ''وقت نہیں ہے بیٹے۔ تمھیں فوراً یہاں سے نکل جانا ہے۔''

اوتار سنگھ کو حیرت ہوئی۔ اماں بھی وہی کہہ رہی تھیں، جو پتا جی نے کہا تھا۔

''یہ پوٹلی لو اور فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ لال آندھی آ رہی ہے۔''

اوتار سنگھ نے پوٹلی لی۔ ''اس میں کیا ہے اماں؟''

''شہر پہنچ کر دیکھ لینا۔ وقت ضائع نہ کرو۔ جاؤ...... چلے جاؤ۔''

''اماں...... میں تو تمھیں لے کر جاؤں گا۔''

''میں نہیں جا سکتی بیٹے۔''

''تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔'' اوتار سنگھ بچوں کی طرح مچل گیا۔ ''اب تمھارے سوا کون بچا ہے میرا۔ میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔''

''دیکھ اوتار سنگھ، میری بات غور سے سن۔ تجھے شہر جانا ہے اور پڑھائی پوری کیے بغیر واپس نہ آنا۔'' وہ پہلا موقع تھا کہ حمیدہ کے لہجے میں اوتار سنگھ کے لیے سختی اور تحکم تھا۔

''میں تمھیں چھوڑ کر کیسے جاؤں اماں۔ میں تمھیں نہیں کھونا چاہتا۔''

''اللہ کی جو مرضی۔ بندے کا کام تو صرف قبول کرنا ہے۔'' حمیدہ کا لہجہ اور سخت تھا۔ ''اور تو تو سدا کا فرماں بردار ہے۔ میری بات کیوں نہیں مانتا۔ میں ماں ہوں تیری۔ اور پہلی بار تجھے حکم دے رہی ہوں۔''

حمیدہ کی یہ بات سن کر اوتار سنگھ مکھن کی طرح پگھل گیا۔ ''میں مانوں گا اماں۔ ضرور مانوں گا۔''

''وقت نہیں ہے۔ تجھے یہاں سے بھاگنا ہے۔ یہاں آفت آنے والی ہے......''

''تو اماں تم......''

''میں نہیں جا سکتی اوتار سنگھ۔ یہاں تیری کچھ امانتیں ہیں۔ ان کی رکھوالی کرنی ہے مجھے۔ یہ میرا وعدہ ہے تو جب بھی واپس آئے گا، میں انشاء اللہ تجھے یہاں ملوں گی۔ تیری امانتیں تجھے دوں گی۔ میرا رب مجھے امانت واپس دیے بغیر نہیں مرنے دے گا۔ اب تو جا۔''

اور اوتار سنگھ کے دل کو جیسے قرار آ گیا۔ وہ حمیدہ سے لپٹ گیا۔ ''ٹھیک ہے اماں۔ میں جا رہا ہوں۔''

حمیدہ نے اسے ذرا ہٹایا اور اس کی پیشانی چوم لی۔ ''جا بیٹا...... رب راکھا۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اب بھاگ کر جانا اور جب تک طاقت ہو، بھاگتے رہنا۔ رکنا نہیں۔''

اس کے لہجے میں کوئی بات تھی، جو اوتار سنگھ کو اس کے کہنے پر لفظ بہ لفظ عمل کرنے پر اکسا رہی تھی۔ اس نے پوٹلی سینے سے لگائی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ پوری طاقت سے بھاگ رہا تھا۔ لیکن پلٹ پلٹ کر اماں کو دیکھ رہا تھا، جو اب بھی وہیں کھڑی تھی۔

پھر وہ مڑا اور اماں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

وہ دوڑتا رہا...... دوڑتا رہا۔ اچانک اسے تبدیلی کا احساس ہوا۔ پہلے ہوا بالکل بند تھی اور فضا پر خوف ناک سکوت طاری تھا۔ مگر اب ہوا کی سنسناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ لگتا تھا کہ ہوا چل رہی ہے اور ہر لمحہ تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن ایسا بس لگتا تھا۔ ہوا چلتی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ اسے سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ بھاگنے کی وجہ سے وہ ہانپ رہا تھا۔ مگر اب بھاگنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ منہ کھول کر پھیپھڑوں میں ہوا کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہاں تو ہوا جیسے تھی ہی نہیں۔ سینے میں جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا اور سانس لینے کی

کوشش کرتا رہا۔

ہوا کی سنسناہٹ اب شور میں تبدیل ہو گئی تھی اور وہ شور بھی بڑھتا جا رہا تھا، اوتار سنگھ حیران تھا کہ اس سے تو سانس بھی نہیں لی جا رہی ہے۔ ہوا ہے کہاں؟ اور ہوا نہیں تو ہوا کا یہ شور کیسا ہے؟

بیٹھے بیٹھے اس نے پلٹ کر دیکھا اور دہل کر رہ گیا۔ وہ منظر ہی ایسا تھا۔ اس لمحے کے بعد وہ اس منظر کو کبھی بھول نہیں سکا۔

اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اتنا تیز دوڑا ہے...... اور اتنا دور نکل آیا ہے۔ گاؤں کے تو آثار بھی نہیں تھے۔ وہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اور اب وہ اندازہ ہی لگا سکتا تھا کہ گاؤں وہاں ہے۔

اور اوپر آسمان پر، جہاں اس کے اندازے کے مطابق اس کا گاؤں تھا، گاؤں سے بیس گنا بڑے حجم کا ایک سرخ بگولہ دھیرے دھیرے گھومتا ہوا نیچے اتر رہا تھا وہ زمین سے بس کچھ ہی فاصلے پر تھا۔

اسے اماں کی بات یاد آئی۔ اماں نے کہا تھا...... رکنا نہیں، چلتے رہنا۔ وہ اٹھا اور چلنے لگا۔ اگرچہ ایک قدم اٹھانا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ وہ اٹھا اور آگے بڑھتا رہا۔ ہوا کی سنسناہٹ اب مہیب شور میں تبدیل ہو گئی تھی۔

پھر اچانک وہ شور ایک دھماکے میں تبدیل ہو گیا۔ اس لمحے اس کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ گرا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر وہاں دیکھنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ آسمان سے جیسے خشک خون برس رہا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں بھر گیا۔ اس نے گھبرا کر سر جھکا لیا اور آنکھیں صاف کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن دیر تک وہ کچھ دیکھنے کے قابل نہیں ہوا۔

چند لمحوں میں اسے احساس ہوا کہ آسمان سے ریت برس رہی ہے اور وہ دب رہا ہے۔ وحشت اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اماں نے کہا تھا...... یہاں آفت آنے والی ہے...... اور اماں نے کہا تھا...... اب بھاگ کر جانا اور جب تک طاقت ہو، بھاگتے رہنا، رکنا نہیں۔

اب اس کی سمجھ میں اماں کی کہی ہوئی ہر بات کی اہمیت آ گئی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اگر وہ بیٹھا رہا تو زندہ ریت میں دفن ہو جائے گا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن لگتا تھا کہ ریت نے اسے جکڑ لیا ہے۔ اس سے ہلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ بے بسی کے احساس نے اسے شل کر کے رکھ دیا۔ وہ ہانپ رہا تھا اور سانس کے ساتھ ریت اندر جا رہی تھی۔ دم گھٹنے لگا تھا اور سانس لینا ناممکن ہوا جا رہا تھا۔

اس نے سمجھ لیا کہ اب وہ بچ نہیں سکتا۔ اچانک اس بے بسی میں بے ساختہ اس کے ہونٹوں پر کلمہ مچلا...... لا الہ الا اللہ...... اور جیسے ریت نے اسے اپنی آہنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سرخ ریت کے سمندر میں تیر رہا ہے۔ کچھ بھی دیکھنا ممکن

نہیں تھا اور ایسے میں سمت کا احساس بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بس اسے اتنا خیال تھا کہ اسے ہوا کی مخالف سمت میں چلنا ہے۔ ہوا کے ساتھ ہوا کے رخ پر جائے گا تو ریت میں دفن ہونا مقدر بن جائے گا۔

نجانے کتنی دیر وہ اندھا دھند ہوا سے لڑتا آگے بڑھتا رہا۔ کلمہ زبان سے ادا کرنے کی تو اس میں طاقت نہیں تھی۔ البتہ دل میں وہ اسے پڑھے جا رہا تھا۔ اور آگے بڑھتا ہوا ہر قدم اذیت ناک تھا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ شور اور ہوا کا دباؤ بتدریج کم ہو رہا ہے...... کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ مگر اب بھی وہ کچھ دیکھنے کے قابل نہیں تھا۔ پھر بھی وہ بڑھتا رہا۔ ہر قدم پر کم ہوتے شور اور ہوا کے دباؤ نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ وہ عافیت کی طرف بڑھ رہا ہے۔

پھر اچانک فضا پرسکون ہو گئی۔ اس کی ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ وہ بیٹھ گیا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ میں اماں کی دی ہوئی پوٹلی ہے۔ دوسرے ہاتھ سے وہ آنکھیں مسل رہا تھا۔ بالآخر دھندلا دھندلا سہی، اسے کچھ نظر آنے لگا۔

وہ سڑک کے قریب تھا اور دور سے ایک گاڑی آتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بڑھا۔ سڑک کے کنارے پہنچ کر اس نے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی......

❀......❀......❀
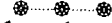
اسے یاد نہیں کہ وہ گھر کیسے پہنچا اور وہ گھر پہنچا تو رگھو اور رنجنا پریشان ہو گئے۔ اس کا جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔ اس کا سر اور تمام کپڑے سرخ ریت سے اَٹے ہوئے تھے اور وہ ایک پوٹلی کو سینے سے دبوچے ہوئے تھا۔

رنجنا نے نیچے جا کر بتایا تو بہادر علی اور چھمن بوا اوپر آ گئے۔ انھوں نے گیلے کپڑے سے اس کا سر اور چہرہ صاف کیا۔ بخار بہت تیز تھا۔ وہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتے بدلتے رہے۔ صبح کاذب کے وقت اس کا بخار اُتر گیا۔ پھر وہ بے خبر ہو گیا۔

دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی۔ رنجنا اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ مگر فوراً ہی اسے کمزوری کا احساس ہونے لگا۔ ''میں...... میں یہاں کیسے پہنچا؟''

رنجنا کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ''آپ کا بہت برا حال تھا مالک۔ ساری رات بخار رہا ہے۔''

اوتار سنگھ کو اچانک سب یاد آ گیا۔ وہ خواب تھا یا...... اس کا ذہن الجھنے لگا۔ اسی لمحے اسے اپنے کپڑوں پر اور بستر پر سرخ ریت نظر آئی۔ وہ گھبرا کر بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ تو وہ خواب نہیں تھا...... خوفناک حقیقت......! اس کے ساتھ ہی اسے سب کچھ یاد آنے لگا۔

''میرے پاس ایک پوٹلی تھی۔'' وہ بولا۔

''ہاں مالک۔ میں نے رکھ دی ہے سنبھال کر۔ ابھی لاتی ہوں۔''

رنجنا اٹھ ہی رہی تھی کہ باہر سے کسی نسوانی آواز نے پکارا۔ ''رنجنا...... او رنجنا......''

''ارے...... نیچے والی بیگم صاحبہ ہیں۔'' رنجنا باہر لپکی۔

اوتار سنگھ اب سوچ رہا تھا کہ پوچھنے والوں کو کیا بتائے گا...... اور کس حد تک بتانا مناسب ہو گا۔ یہ تو وہ سمجھ گیا تھا کہ پوری حقیقت بتانا بے حد خطرناک ہے۔ سوال یہ تھا کہ جو کچھ وہ چھپائے گا، وہ بتانے کے لیے اور بہت لوگ بھی تو موجود ہیں۔ تب کیا ہو گا۔

وہ ان سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ رنجنا پوٹلی لیے اندر آئی۔ ''یہ لیجیے چھوٹے ٹھاکر۔'' اس نے اماں کی دی ہوئی پوٹلی اس کی طرف بڑھائی۔ ''اور وہ نیچے والی بیگم صاحبہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔''

اوتار سنگھ گھبرا گیا۔ یہ بھی ایک غیر معمولی بات تھی۔ کہیں انھیں...... ''جی...... جی ماں جی؟''

''ہم تمھارے دکھ میں برابر کے شریک ہیں بیٹا۔'' دروازے کی اوٹ سے شفیق نسوانی آواز سنائی دی۔

اوتار سنگھ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس دکھ کی بات کر رہی ہیں۔

''ہم جانتے ہیں کہ تم اپنا سب کچھ کھو کر آئے ہو۔'' بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں۔ ''یہ دکھ بہت بڑا ہے۔ مگر بیٹے، اللہ صبر بھی دیتا ہے آدمی کو۔ تمھیں بھی صبر آ جائے گا۔ دیکھو بیٹے، اللہ کی مرضی کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ یہ اس کا کرم ہے کہ تم زندہ سلامت بچ کر نکل آئے۔ اب اسے اپنا ہی گھر سمجھو اور ہم سے کوئی تکلف نہ کرنا۔ سمجھ لینا کہ ان لوگوں کے بدلے میں ہم لوگ تمھیں مل گئے ہیں۔''

اوتار سنگھ حیران تھا۔ ''آ آپ کو یہ سب کیسے معلوم؟''

''اخبار میں چھپا ہے۔ ٹھاکروں کی گڑھی تھا نا تمھارے گاؤں کا نام؟''

''جی...... جی ہاں۔''

''وہ اور اس علاقے کے دس گاؤں سرخ آندھی نے تباہ کر ڈالے۔ لوگ زندہ دفن ہو گئے۔ کسی گاؤں کا نشان تک نہیں رہا۔''

اوتار سنگھ کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ وہ کیا چھپائے گا۔ سب کچھ ساری دنیا کو معلوم ہو گیا۔ ''اخبار ہو گا آپ کے پاس؟'' اس نے کہا۔

''جی۔ رنجنا، یہ اخبار چھوٹے ٹھاکر کو دے دو۔''

رنجنا گئی اور اسے اخبار لا کر اوتار سنگھ کو دیا۔

''اور بیٹے، جو کچھ میں نے کہا ہے، رسماً نہیں کہا ہے۔ یہ گھر تمہارا گھر ہے اور ہم سب

لوگ تمہارا خاندان۔ اب میں چلتی ہوں۔''

اوتار سنگھ کا دل تشکر سے بھر گیا۔ کتنی پیاری، نرم دل اور دردمند خاتون ہیں یہ نیچے والی۔ اس نے سوچا۔ پھر وہ اخبار کی طرف متوجہ ہو گیا۔

سرخ آندھی اور اس کی تباہی کی خبر اخبار کے پہلے صفحے پر چھپی تھی۔ اخبار کے مطابق گیارہ گاؤں ریت کے نیچے دفن ہو گئے تھے۔

لیکن پورا اخبار چھاننے پر بھی اسے جے پور کے بارے میں کوئی خبر نظر نہیں آئی۔ نہ ہی کوئی ایسی خبر تھی کہ جے پور سے لوگوں کی بھاری تعداد ٹھاکروں کی گڑھی پر حملہ کرنے گئی تھی۔ وہ معاملہ کیسے دبا ہوا ہے، یہ اوتار سنگھ کی سمجھ سے باہر تھا۔

بہرحال اس نے ایک بات سمجھ لی۔ قدرت اس معاملے کو راز رکھنا چاہتی ہے تو اسے بھی زبان کھولنے سے گریز کرنا ہوگا۔

اس نے اخبار ایک طرف رکھا اور اماں کی دی ہوئی پوٹلی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

پوٹلی کھول کر وہ حیران رہ گیا۔ اس میں بہت سارے۔۔۔ بہت سارے روپے تھے اور ان کے نیچے، بہت بھاری، سونے کے زیورات!

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ حویلی سے خالی ہاتھ نکلا تھا اور اماں گھر کے دروازے پر یہ سب کچھ لیے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ تاکہ پردیس میں وہ مفلسی سے ہمیشہ محفوظ رہے۔

اس نے ایک بار پھر رقم کو اور زیورات کو دیکھا۔ وہ اتنا کچھ تھا کہ ساری زندگی عیش سے گزاری جا سکتی تھی!

❁……❁……❁

سانحہ جتنا بڑا ہو، اس کا اثر اتنی دیر تک رہتا ہے۔ یہاں سانحہ بہت بڑا تھا۔ لیکن اس حد تک افسانوی تھا کہ ثبوت اور شواہد کی موجودگی کے باوجود بار بار محض ایک ڈراؤنا خواب لگنے لگتا تھا۔ مگر پھر ثبوت سامنے آتے اور وہ حقیقت نظر آنے لگتا۔

چند روز وقت کے ساتھ اس آنکھ مچولی میں گزرے تو اوتار سنگھ نے تسلیم کر لیا کہ وہ خواب نہیں تھا، حقیقت تھی۔ لیکن جو کچھ ہو چکا تھا، جو کچھ وہ کھو چکا تھا، اسے قبول کرنے کے لیے اور وقت درکار تھا۔ آدمی بڑے المیوں کو بتدریج قبول نہ کرے تو پاگل ہی ہو جائے۔

چوتھے دن اوتار سنگھ مولوی برکت علی کے گھر گیا۔ مولوی صاحب کا بڑا لڑکا اس کا ہم عمر ہی تھا۔ اوتار سنگھ چلا تو گیا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کہنا کیا ہے اور بات کہاں سے شروع کرنی ہے۔

''میرا نام اوتار سنگھ ہے۔'' اس نے کہا۔

''جی۔۔۔ بابا آپ کا بہت تذکرہ کرتے ہیں۔ بڑی تعریف کرتے ہیں آپ کی۔''

''بس اُن کی محبت ہے۔''

''لیکن بابا تو آپ کے گاؤں گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے، چھٹیوں میں آپ کو پڑھانا ہے۔'' لڑکے کے لہجے میں الجھن تھی۔ ''آپ گاؤں نہیں گئے؟''

''میں گیا تھا۔ تین دن پہلے واپس آیا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ پھر چند لمحے توقف کے بعد اٹک اٹک کر بولا۔ ''میں کوئی اچھی خبر نہیں لایا ہوں۔''

لڑکے کا چہرہ فق ہو گیا۔ تاہم اس نے کہا کچھ نہیں۔ سوالیہ نظروں سے اوتار سنگھ کو تکتا رہا۔

اوتار سنگھ اس مرحلے سے خوف زدہ تھا۔ یہ نئی ذمے داری اس کے لیے بالکل نئی۔۔۔۔۔ اور بہت بڑی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بڑا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ بہت بڑا۔ جبکہ وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ مگر یہ چیز اس کی فطرت میں تھی کہ وہ ذمے داری سے منہ موڑنے والا نہیں تھا۔

چند لمحے وہ کچھ کہنے کے لیے حوصلہ مجتمع کرتا رہا۔ لیکن ایک نوجوان لڑکے کو یہ بتانا کہ اس کا باپ مر چکا ہے، آسان کام نہیں تھا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ اسے لفظ نہیں مل رہے تھے۔

اس وقت کے لیے وہ اخبار ساتھ لایا تھا۔ اس نے لڑکے کی طرف اخبار بڑھا دیا۔

لڑکا اب بھی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اخبار کی طرف دیکھنے کا اسے حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔

''یہ خبر پڑھیں۔۔۔۔۔ سرخ آندھی والی۔'' اوتار سنگھ نے اشارہ کیا۔

لڑکے نے اخبار کھولا اور خبر پڑھنے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے سر اٹھا کر اوتار سنگھ کو دیکھا۔ ''کوئی بھی نہیں بچا؟''

''اخبار میں تو یہی لکھا ہے۔ گیارہ گاؤں یوں ختم ہو گئے، جیسے تھے ہی نہیں۔''

''لیکن۔۔۔۔۔ لیکن آپ۔۔۔۔۔؟''

اوتار سنگھ سمجھ گیا کہ لڑکا اس سے کیا پوچھنا چاہتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ تھا، جہاں اسے محتاط رہنا تھا۔ وہ پوری حقیقت نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ اسے یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ آندھی آنے سے پہلے وہ حویلی پہنچا تھا تو مولوی صاحب شہید ہو چکے تھے۔ اور انہیں گولی لگی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ وہاں گیا بھی تھا۔ ''میں تاج محل دیکھنے آگرہ چلا گیا تھا۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اوپر والے کو میری زندگی منظور تھی۔''

دیکھتے ہی دیکھتے لڑکے کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ لیکن اس کی آنکھیں چھلکی نہیں۔ وہ ضبط کر رہا تھا۔ اس نے نارمل سے بلند آواز میں کہا۔ ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔''

وہ جملہ عربی میں تھا۔ اوتار سنگھ کو مشق نہیں تھی۔ ورنہ وہ عربی اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ اس نے سنا، ذہن میں دہرایا اور ترجمہ کرنے لگا۔ بے شک ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اس طرف جانا

ہے۔ وہ مسحور ہو کر رہ گیا۔ یہ کیسا صبر دینے والا جملہ ہے!

لڑکے نے اسے چونکا دیا۔ ''میں امی کو یہ خبر کیسے سناؤں گا؟''

اوتار سنگھ کو جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ اس وقت اندر کی جانب کھلنے والے دروازے سے نسوانی آواز سنائی دی۔ ''صادق علی، ذرا یہاں آئیے۔''

''میں ابھی آتا ہوں۔'' لڑکے نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا اور دروازے سے اندر چلا گیا۔

ایک منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ ٹرے پر شربت کا ایک جگ اور دو گلاس تھے۔ اس نے ٹرے میز پر رکھی اور دونوں گلاسوں میں شربت انڈیلا۔ پھر اس نے ایک گلاس اوتار سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔

اوتار سنگھ بری طرح گڑبڑا گیا۔ وہ یہاں ایک بری خبر لے کر آیا تھا۔ بلکہ ایک طرح سے وہ مولوی صاحب کی موت کا ذمے دار تھا۔ اگر وہ مولوی صاحب کو ساتھ لے کر گیا ہوتا تو......

''یہ...... میں...... میں نہیں پی سکوں گا۔''

''دیکھیں...... آپ مہمان ہیں اور امی کو ابھی کچھ معلوم نہیں۔'' صادق علی کے لہجے میں التجا تھی۔

''میں...... میں کیسے پی سکتا ہوں۔'' اوتار سنگھ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''آپ دیکھیں۔ میں بھی تو پی رہا ہوں۔'' لڑکے نے گلاس اٹھایا اور شربت کا ایک گھونٹ لیا۔ ''بابا کہتے تھے...... موت اللہ کا حکم ہے۔ وہ تو مقررہ وقت پر، اللہ کے مقرر کردہ طریقے پر آتی ہے۔ آدمی نہ ایک پل زیادہ جی سکتا ہے نہ ایک پل کم۔''

اوتار سنگھ نے جیسے تیسے وہ شربت پی لیا۔

''اب مجھے امی کو بتانا ہے۔'' لڑکے نے کہا۔ ''آپ یہ اخبار مجھے دیں گے؟''

لڑکا بھی اسی کی طرح دشواری محسوس کر رہا تھا۔ اوتار سنگھ نے اخبار اسے دے دیا۔ وہ اندر چلا گیا۔

پھر لڑکا واپس آ گیا اور اس نے اخبار اسے دے دیا۔ اسی لمحے دروازے کے اس طرف سے نسوانی آواز میں کہا۔ ''بیٹے...... ہم تمھارے شکر گزار ہیں کہ تم نے یہ خبر ہم تک پہنچائی۔ ورنہ نجانے کب تک ہم بے خبر رہتے۔''

اوتار سنگھ کو حیرت ہوئی۔ ہندوؤں میں ہوتا تو اسے منحوس قرار دیا جاتا۔ یہاں شکریہ ادا کیا جا رہا تھا۔

''خالہ...... مولوی صاحب میرے لیے پتا سمان تھے۔ ان کا اس طرح سے جانا میرے لیے ذاتی نقصان ہے۔ لیکن آپ کا نقصان تو بہت بڑا ہے۔''

''اللہ جو کرتا ہے، بہتر ہوتا ہے اور اللہ کی مرضی کو خوش دلی سے مان لینے میں ہی عافیت ہے۔''

اوتار سنگھ نے جیب سے دو سو روپے نکالے اور صادق علی کی طرف بڑھائے۔ ''یہ کیا ہے؟'' صادق علی نے ہاتھ بڑھائے بغیر پوچھا۔

''یہ مولوی صاحب کی فیس ہے۔''

''اب اس پر ہمارا کوئی حق نہیں۔'' دروازے کے اس طرف سے مولوی صاحب کی بیوہ نے کہا۔

''ایسا نہ کہیں۔ میں ہر ماہ یہ رقم آپ کو دے کر جاؤں گا۔ یہ میرے پتا جی اور مولوی صاحب کے درمیان معاہدہ تھا۔ آپ یہ نہیں لیں گے تو میرے پتا جی کی آتما ہمیشہ بے چین رہے گی۔''

چند لمحوں کی ہچکچاہٹ آمیز خاموشی کے بعد خاتون نے بیٹے کو پکارا۔ ''صادق علی، رقم لے لو بیٹے اور بیٹے اوتار سنگھ، تمھارا شکریہ۔ میرے خاوند تمھارا تذکرہ ہمیشہ بہت اچھے الفاظ میں کرتے تھے۔ دعا بھی کرتے تھے تمھارے لیے۔ اب وہ نہیں تو ہم سب تمھارے لیے دعا کریں گے۔''

اوتار سنگھ وہاں سے نکلا تو اس کے سینے سے بہت بھاری بوجھ ہٹ چکا تھا۔

❁......❁......❁

بعد میں اوتار سنگھ ہمیشہ سوچتا رہا کہ مولوی صاحب کے گھر جانا اس کے لیے بہت زیادہ فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔ وہ وہاں سے بہت کچھ سیکھ کر آیا تھا۔ وہاں سے اسے زندگی اور موت کا واضح تصور ملا تھا اور صبر کا جو عملی مظاہرہ اس نے دیکھا تھا، وہ اس کے لیے مشعل راہ بن گیا تھا۔ ورنہ شاید وہ صبر نہ کر پاتا۔ امتحان کا نتیجہ آنے تک چھٹیاں تھیں۔ اس دوران وہ صرف سوچتا رہا...... سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ واقعات کس طرح پیش آئے ہوں گے۔ انھیں ترتیب دینے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ ٹھاکروں کی گڑھی میں اس نے بہت کم وقت میں بہت زیادہ دیکھا تھا۔ لیکن اسے سمجھنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ وہ اب وہ سب کچھ یاد کر کے سمجھنا چاہتا تھا۔

سب سے پہلے تو اس نے گاؤں کی ویرانی دیکھی تھی۔ دن کے وقت ٹھاکروں کی گڑھی میں کھیت سنسان تھے۔ ان میں کوئی کام کرنے والا نہیں تھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہاں غیر معمولی صورت حال ہے۔

پھر وہ بڑھا تو حویلی کے پھاٹک کے سامنے اسے لاشیں دکھائی دیں۔ ان میں صرف ایک لاش جانی پہچانی تھی...... سندر داس کی لاش! پھر وہ آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ احاطہ لاشوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہاں اسے ویرجی، چاچا جمال دین اور کئی شناساؤں کی لاشیں نظر آئیں۔

اسے حویلی کا منظر یاد آیا۔ صدر دروازے پر دو اجنبیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ انھیں

یقیناً پتاجی نے شوٹ کیا تھا اور پتاجی زخمی تھے۔ لیکن زندہ تھے۔ انھوں نے اس سے ٹوٹی پھوٹی گفتگو بھی کی تھی۔

اسے یاد آیا کہ پتاجی کی پشت پر بائیں کندھے کے نیچے گولی لگی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ان پر گولی پیچھے سے چلائی گئی تھی اور اس کا مطلب تھا کہ وہ گولی کسی دشمن کی طرف سے نہیں، بلکہ کسی دوست کی طرف سے آئی تھی۔ اور وہاں صرف دو افراد ایسے تھے، جو پتاجی پر گولی چلا سکتے تھے...... چاچا کیدار ناتھ اور مولوی صاحب۔ کیدار ناتھ کے ہاتھ میں طمنچہ تھا۔ جبکہ مولوی صاحب کے ہاتھ خالی تھے۔

اب اوتار سنگھ کے لیے اصل صورتِ حال کا تصور کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ کیدار ناتھ کو اس نے کبھی پسند نہیں کیا تھا۔ کبھی اسے دوستوں میں شمار نہیں کیا تھا۔ وہ اسے کبھی قابلِ اعتبار نہیں لگا تھا۔ اس نے پتاجی پر پیچھے سے وار کیا ہوگا۔ مولوی صاحب کی مداخلت کی وجہ سے اس کا نشانہ خطا ہوا ہوگا اور یوں مولوی صاحب پتاجی پر قربان ہوگئے ہوں گے اور پتاجی نے کیدار ناتھ کو شوٹ کیا ہوگا۔

اب وہ پتاجی کے ساتھ گزارے ہوئے آخری لمحوں کو پھر سے جی رہا تھا۔ انھوں نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بتا دیا تھا کہ جے پور والوں نے حملہ کیا تھا۔

اس سلسلے میں وہ صرف قیاس آرائی ہی کرسکتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جے پور والوں کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس کا تعلق ٹھاکروں کی گڑھی سے ہے۔ جبکہ جے پور میں کوئی اسے جانتا بھی نہیں تھا۔

وہ چونکا۔ نہیں...... جے پور میں کوئی مجھے جانتا تھا۔ اسی نے بتایا ہوگا۔ وہ ارجن تھا...... اس کا اسکول کا دوست۔

اب بھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ارجن کس طرح اس معاملے میں ملوث ہوا ہوگا اور کیسے اس نے ٹھاکروں کی گڑھی کا پتا چلایا ہوگا۔

بہر حال جس طرح بھی ہوا ہو، یہی ہوا ہوگا۔ جے پور سے مشتعل لوگوں کا لشکر گاؤں پر حملہ کرنے گیا ہوگا۔ اوتار سنگھ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ گاؤں کے تمام لوگوں نے لڑائی میں حصہ نہیں لیا اور وہ گاؤں میں بھی نہیں تھے۔ تو شاید وہ گاؤں چھوڑ گئے ہوں گے۔ البتہ پتاجی کے وفاداروں نے ان کا ساتھ دیا تھا اور ان پر قربان ہوگئے تھے۔ اور پتاجی......! وہ ایک اپنے ہی کی مکاری کا شکار ہوگئے تھے۔

ٹھاکر کے ساتھ گزرے ہوئے وہ آخری لمحے اوتار سنگھ کی یادداشت پر پوری ترتیب اور صحت کے ساتھ نقش ہوگئے تھے۔ وہ ان کی ٹوٹی ہوئی باتیں جوڑ کر پوری طرح سمجھ سکتا تھا۔ پتاجی نے اس سے کہا تھا کہ بس وہ اس سے ملنے، اسے دیکھنے کے لیے زندہ تھے۔ وہ جئیں گے نہیں۔ اور انھوں نے کہا تھا کہ انھیں اس سے بہت ساری باتیں کرنی تھیں۔ لیکن نہ ان کے پاس وقت ہے نہ

طاقت۔

پھر انھوں نے کہا کہ تہ خانے میں جو کچھ ہے، وہ اس کا ہے۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ وہ دہلی جا کر پڑھے۔ گاؤں میں نہ رکے۔ وہاں نہ رہے۔ یہ الگ بات کہ آسمان کی سرخی دیکھ کر انھوں نے اس سے اصرار کیا کہ وہ تہ خانے کے مال کو بھول جائے اور جان بچا کر نکل لے۔ وقت کم ہے۔ انھوں نے کہا...... رکو مت، چلے جاؤ۔ اور ان کی بات درست ثابت ہوئی تھی۔ وہ فوری طور پر نکلا، تب بھی بہ مشکل بچا تھا۔

پھر ٹھاکر نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا جے پور میں بت واقعی اس نے توڑے ہیں۔ اوتار سنگھ کو یاد تھا کہ وہ لمحہ اس کے لیے بڑی آزمائش کا تھا۔ وہ جھجکا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ سچ بولے گا تو مرتے ہوئے باپ کو تکلیف پہنچائے گا۔ پتاجی کو صدمہ ہوگا۔ لیکن آخر اس نے سچ بولنے کا فیصلہ کیا۔

لیکن اس کے اعتراف پر پتاجی کا ردِ عمل اس کی توقع کے بالکل برعکس تھا۔ وہ خوش ہوئے تھے اور انھوں نے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ ایسا کیوں ہوا۔ لیکن یہ بات صرف پتاجی ہی بتا سکتے تھے اور اب وہ اس دنیا میں نہیں۔ تو یہ بات اب اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکے گی۔ بہر حال یہ طے تھا کہ اس کے بت توڑنے پر پتاجی خفا نہیں تھے، بلکہ خوش تھے۔

اس کے بعد پتاجی نے کہا تھا کہ وہ اسے ایک بڑی بات بتانا چاہتے ہیں۔ لیکن وقت نہیں ہے۔ وہ بڑی بات بھی اب اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔

پھر پتاجی نے ایک مبہم بات کہی تھی...... جلانا نہیں۔ دفن کرنا۔ اب یہ بات وہ اپنے لیے تو نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس نے یہی نتیجہ نکالا تھا کہ وہ ویرجی اور چاچا جمال دین کے بارے میں کہہ رہے ہوں گے۔

پھر انھوں نے لال آندھی کے آثار دیکھ کر اسے فوراً جانے کا حکم دیا تھا۔ پھر مرنے سے پہلے آخری لمحے میں ان کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ لیکن کوئی آواز نہیں تھی۔ اس لمحے وہ پتاجی کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے ہونٹوں کی وہ جنبش اسے جانی پہچانی لگ رہی تھی، جیسے وہ جانتا ہو کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اور ہونٹوں کی وہ جنبش اسی کی یادداشت پر نقش ہوگئی تھی۔ اس وقت بھی وہ چشمِ تصور سے دیکھتا تو اسے ہلتے ہوئے وہ ہونٹ نظر آجاتے۔

اور پھر پتاجی کو ایک جھٹکا لگا تھا اور سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔ پتاجی مرگئے تھے۔

اور اماں! اماں اس کے ساتھ آنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ انھوں نے پہلی بار ماں بن کر اسے حکم دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا...... تجھے شہر جانا ہے اور پڑھائی پوری کیے بغیر واپس نہیں آنا ہے اور انھوں نے کہا تھا کہ وہ اس کی امانتوں کی رکھوالی کریں گی اور انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جب بھی واپس آئے گا، وہ اسے ملیں گی اور اس کی امانتیں اسے واپس دیں گی۔ انھوں نے کہا

تھا...... میرا رب امانت واپس کیے بغیر مجھے مرنے نہیں دے گا۔

اور اب خبر چھپی تھی کہ گیارہ گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ اماں کیسے بچی ہوں گی؟

اماں کیسے بچ سکتی ہیں! تو اماں کا وعدہ؟

کچھ بھی ہو، اس نے سوچا۔ مجھے اماں سے کیا ہوا وعدہ نبھانا ہوگا۔ پڑھائی مکمل کیے بغیر میں گاؤں واپس نہیں جاؤں گا۔ مگر گاؤں ہے کہاں؟ گاؤں نہ سہی، گھر میں جاؤں گا تو۔ دیکھنے اماں وعدہ پورا کرتی ہیں یا نہیں۔

ان لمحوں سے دوبارہ گزرنے کے بعد اوتار سنگھ کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کا سب کچھ کھو گیا ہے...... ایک ہی ہلے میں! محبت کرنے والا باپ، چاچا جمال دین، جس نے اسے محبت کا پہلا سبق سکھایا تھا...... چھوٹے ٹھاکر، جس سے محبت کریں، اس پر کبھی ظاہر نہ ہونے دیں کہ اب آپ کو اس سے محبت نہیں رہی ہے۔ کچھ چھن جانے کا دکھ برا ہوتا ہے...... وصال دین، دنیا کی وہ واحد ہستی جسے وہ بھائی سمجھتا تھا۔ اور مولوی صاحب، جن سے وہ عربی پڑھتا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ ان سے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرے گا۔ اور اماں، جنھوں نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ واپسی پر اسے ضرور ملیں گی۔ لیکن جہاں وہ تھیں، وہاں سے میلوں تک کوئی انسان زندہ نہیں بچا تھا۔

وہ سب لوگ اس کی زندگی کا محور و مرکز تھے...... زندگی کی رونق تھے۔ اور وہ سب کے سب بیک وقت اس سے چھن گئے تھے۔ یہ سوچ کر اس کے اندر غم کی ایسی مہیب موج اٹھی کہ اسے لگا کہ اس کا دل دھڑکنا چھوڑ دے گا۔ سینہ چٹخنے لگا تھا۔ اسے لگا تھا کہ وہ اندر سے پگھل رہا ہے...... سیال میں تبدیل ہو رہا ہے...... اور ذرا سی دیر میں اپنی آنکھوں سے بہہ کر ختم ہو جائے گا۔ بشرطیکہ اس سے پہلے ہی آنکھیں نہ بہہ گئی ہوں۔

اور ایسا ہو جاتا کیونکہ وہ پہاڑ جیسا غم تھا...... اس کے وجود، اس کی طاقت سے بہت بڑا۔ مگر اسی لمحے اس کی سماعت میں مولوی صاحب کے بیٹے کی آواز گونجی ''بابا کہتے تھے، موت اللہ کا حکم ہے۔ وہ تو مقررہ وقت پر، اللہ کے مقرر کردہ طریقے پر آتی ہے۔ آدمی نہ ایک پل زیادہ جی سکتا ہے نہ کم۔''

اور اس کے اندر پگھلنے کا وہ عمل رک گیا۔ ارے...... ہر کوئی اپنے مقررہ وقت پر گیا...... اللہ کے مقرر کردہ طریقے پر۔ اور یہ تو اس نے ماں کے دیہانت پر ہی سمجھ لیا تھا کہ اوپر والا صبر نہ دے تو آدمی کسی اپنے کے مرنے کا غم نہ جھیل سکے اور خود بھی مر جائے۔

اس کے بعد ایک بار اور اس پر کڑا وقت آیا۔ اس روز وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کتنا اکیلا رہ گیا ہے۔ اس کے پاس کچھ بھی تو نہیں بچا۔ اس کے سارے پسندیدہ لوگ ایک ساتھ ہی اس سے چھن گئے۔

یہ سوچتے ہوئے اسے غم کا شدید احساس ہوا اور دم گھٹنے لگا۔ پھر اچانک ہی اس کے

اندر ایک تلخی ابھری۔ یہ سب ہوا کیوں؟ اس نے سوچا۔ جے پور والوں نے اس کے گاؤں پر حملہ کیوں کیا؟ اگر اس نے اس روز جے پور کے اس مندر میں بتوں کو نہ توڑا ہوتا تو وہ حملہ نہ ہوتا اور وہ حملہ نہ ہوتا تو وہ سب لوگ...... اور ان کے علاوہ بہت سے لوگ مارے نہ جاتے۔

اس کے وجود میں خود ملامتی کی ایک تند لہر اٹھی۔ قریب تھا کہ وہ اس میں بہہ جاتا۔ مگر اسی لمحے اسے اس خواب کا خیال آ گیا، جو بتوں کو توڑنے والی رات اس نے جے پور کے ہوٹل میں دیکھا تھا۔

وہ خواب بھی اسے پوری جزئیات سمیت یاد تھا۔ بابا نے کہا تھا...... پریشانی بھی نعمت ہے اور آسانی بھی۔ اور ہر نعمت آزمائش بھی ہے۔ عافیت صرف شکر ادا کرتے رہنے میں ہے۔ اور انھوں نے خوش خبری سنائی تھی کہ اس نے جو کچھ اللہ کے لیے کیا، اللہ اس سے خوش ہوا۔ اس نے قبول فرما لیا۔ مگر انھوں نے خبردار کیا تھا کہ آدمی ایک لمحے میں اپنے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتا ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ اللہ کے لیے کچھ کرو تو اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ جتنی بھاری قیمت ادا کرو گے، عمل اتنا ہی مقبول ہوگا۔ مگر قیمت ادا کرنے کے بعد کے آداب بھی ہیں۔ قیمت ادا کر کے پچھتائے، غم کیا، افسوس کیا تو سب کچھ ختم۔ جتنی بڑی قیمت ادا کرو، اتنی ہی خندہ پیشانی سے رہو۔ انھوں نے کہا تھا، وقت آئے تو یہ بات یاد رکھنا۔ تم نے جو کچھ کیا، اللہ نے قبول فرمایا۔ لیکن اس کی بہت بھاری قیمت بھی ادا کرنی ہوگی۔ وہی تمہاری آزمائش ہوگی اور اس میں اللہ ہی تمہاری مدد کرے گا۔

ایک پل میں اوتار سنگھ کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کا خواب سچا تھا۔ اس نے اللہ کو خوش کرنے کے لیے کچھ کیا اور اللہ اس سے خوش ہوا۔ اس کی اسے بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ اور اب وہ افسوس کر رہا تھا...... پچھتا رہا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کے پیارے زندگی گنوا بیٹھے۔ تو اس کا وہ عمل تو ضائع ہونے والا تھا۔ وہ آزمائش میں ہارنے والا تھا۔ اور خواب ایسا سچا تھا کہ اس آزمائش میں اللہ نے ہی اس کی مدد کی تھی۔ اسے خواب یاد دلایا تھا۔

ایک پل میں اس کی سوچ بدل گئی۔ مولوی صاحب کے کہنے کے مطابق جو لوگ مرے تھے، انھیں اسی وقت، اسی طرح سے مرنا تھا۔ اگر وہ ان کی موت پر افسوس کرتا ہے، اس کا ذمے دار خود کو سمجھتا ہے تو وہ گویا اپنے اس عمل کی مذمت کر رہا ہے جو اس نے اللہ کو خوش کرنے کے لیے کیا۔

وہ پوری جان سے لرز کر رہ گیا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اللہ کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی اور کامیابی کے باوجود اپنی ناکامی کا سامان کر رہا تھا۔ وہ تو بس اللہ نے ہی اسے بچا لیا۔ وہ دل میں اللہ سے معافی مانگتا رہا اور شکر ادا کرتا رہا۔

عجیب بات ہوئی کہ اس کے بعد اس نے کبھی کسی مرنے والے کا غم نہیں کیا!

❀....❀....❀

نیچے والے اوتار سنگھ کے حق میں پوری طرح بدل گئے تھے۔ ان کے نزدیک وہ المیہ بہت بڑا تھا، جو رونما ہوا تھا۔ 18 سال کا نوجوان ایک ہی لمحے میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھا تھا۔ اس کا باپ ہی نہیں ختم ہوا، اس کا گاؤں ہی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ وہ بے چارہ تو گھر کا تصور بھی کھو بیٹھا۔

سرفراز بیگم بہت حساس خاتون تھیں۔ جوانی میں انھیں بیوگی کا دکھ ملا تھا۔ اور بیٹے سے وہ محروم تھیں۔ انھیں اوتار سنگھ کا غم بہت بڑا لگا۔ حور بانو کی بھی یہی کیفیت تھی۔ بلکہ وہ تو اخبار میں وہ خبر پڑھنے کے بعد گھنٹوں روتی رہی تھی۔ نور بانو اور گلنار بھی اس کی ہمدردی سے سرشار تھیں۔ اور چھمن بوا کا تو یہ حال تھا کہ بیٹھے بیٹھے خیال آتا تو ان کی آنکھیں چھلک جاتیں۔

نیچے سب لوگ اپنے اپنے طور پر چھوٹے ٹھاکر کے دکھ کا تصور کرتے اور کڑھتے۔ لیکن حور بانو تو اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ تو اب ہر وقت اسی کے بارے میں سوچتی رہتی۔ بار بار اسے اپنے آنسو پونچھنے پڑتے۔

اب ہر روز چھمن بوا نیچے سے چھوٹے ٹھاکر کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر جاتیں۔ سرفراز بیگم کو معلوم تھا کہ وہ ان کے ہاں کے کھانے پسند کرتا ہے۔ چند روز بعد رنجنا اس واقعے کے بعد پہلی بار نیچے آئی۔ سرفراز بیگم اس کے پاس بیٹھ گئیں۔ وہ بہت لٹی پٹی اور غم زدہ لگ رہی تھی۔

''یہ تم نے اپنا کیا حال بنالیا ہے رنجنا۔'' سرفراز بیگم نے کہا۔

''بس بڑی بیگم، من ہی نہیں لگتا کسی کام میں۔ مجھے تو وشواس ہی نہیں ہوتا کہ پورا گاؤں، سارے لوگ ختم ہو گئے۔ اور وشواس آئے تو دل پھٹنے لگتا ہے۔'' وہ بیٹھے بیٹھے رونے لگی۔

سرفراز بیگم نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''صبر کرو رنجنا۔ وہاں تمھارے رشتے دار بھی تھے؟''

''میرے ماتا پتا بھی تھے اور میرے رگھو کے گھر والے بھی تھے۔ کچھ بھی نہیں بچا۔'' رنجنا ہاتھ ملنے لگی۔

''دکھ تو بہت بڑا ہے۔ لیکن صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں رنجنا۔''

''پر صبر آتا ہی نہیں بڑی بیگم۔''

''شکر کرو۔ تمھارے پاس رگھو تو ہے۔ اپنے چھوٹے ٹھاکر کو دیکھو۔ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں بچا۔'' سرفراز بیگم نے دکھ سے کہا۔ پھر پوچھا۔ ''یہ بتاؤ، تمھارے چھوٹے ٹھاکر کا کیا حال ہے۔ وہ تو بہت غم کرتا ہوگا۔''

''وہ تو مہان ہیں بڑی بیگم۔'' رنجنا کے لہجے میں فخر تھا۔ ''میں نے انھیں دکھ کرتے نہیں دیکھا۔ الٹا مجھے اور رگھو کو دلاسہ دیتے ہیں، سمجھاتے ہیں۔ کہتے ہیں، جو ہونا تھا، وہ بھگوان کی اِچھا تھی سو ہو گیا۔ وہ تو کہتے ہیں، شکر ادا کرو کہ کسی کا ساتھ اتنے دنوں تک مل گیا۔''

سرفراز بیگم یہ سن کر بہت حیران ہوئیں۔ ہندوؤں میں یہ تصور اور شکر کی بات۔ وہ انھیں

ویسے بھی غیر معمولی لگا تھا۔

''کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے بڑی بیگم کہ ان کے شریر میں ہمارے ٹھاکر جی کی آتما آ گئی ہے۔'' رنجنا بولی۔ ''ہم سے اتنے چھوٹے ہیں۔ بچے تھے ہمارے سامنے۔ مگر بات کرتے ہیں تو ہم لوگ خود کو بچہ سمجھنے لگتے ہیں۔''

''پھر بھی غم تو ہوگا انھیں۔''

''بھگوان جانے۔ میرے پتا جی کہتے تھے کہ ٹھاکر لوگ اپنے اندر کا حال کسی کو معلوم نہیں ہونے دیتے۔ کمزوری دکھانے کو توہین سمجھتے ہیں۔ ویسے بڑی بیگم، آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ دکھ تو ہوگا انھیں۔''

''یقیناً ہوگا۔ اچھا یہ بتاؤ، وہ باتیں بہت کرتے ہیں۔''

''نہیں بڑی بیگم۔ بات تو وہ بہت ہی کم کرتے ہیں۔ ہاں سوچتے بہت ہیں۔ اب تو پھر بھی بات کرنے لگے ہیں...... شاید ہمیں دلاسہ دینے کے لیے۔ پہلے تو بغیر کام کے بات ہی نہیں کرتے تھے۔ ہاں پڑھنے بیٹھیں تو بہت بولتے ہیں...... بہت سوال کرتے ہیں۔''

قریب بیٹھی حور بانو بہت غور سے یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ اس روز اس کی محبت دوچند ہو گئی۔ چھوٹے ٹھاکر میں تمام خوبیاں بڑے لوگوں والی تھیں۔

اُدھر رنجنا کے جانے کے بعد سرفراز بیگم بھی چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں سوچتی رہیں۔ انھیں رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ کم از کم وہ اس لڑکے کی ایک محرومی تو کسی حد تک دور کر سکتی ہیں۔ وہ اسے ماں کی محبت دے سکتی ہیں۔

لیکن کیسے؟ انھوں نے سوچا۔ وہ اس کی ماں بن جائیں اور اسے کہیں کہ وہ اس گھر کو اپنا گھر اور گھر کے تمام لوگوں کو اپنا سمجھے۔ وہ اس کے لیے اپنا پردہ ختم کر سکتی ہیں۔ لیکن اس سے آگے..... ! وہ تین جوان بیٹیوں کی ماں تھیں۔ بن باپ کی بیٹیاں ویسے بھی بہت بڑا بوجھ ہوتی ہیں۔ پھر یہاں تو مذہب کا فرق تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی بچیاں بہت اچھی، بہت نیک ہیں۔ لیکن جوانی ناقابل اعتبار ہوتی ہے۔ کوئی معصوم سی بھول بھی ہو گئی تو وہ اللہ کے ہاں اپنے مرحوم شوہر کو کیا منہ دکھائیں گی۔ اللہ کو کیا منہ دکھائیں گی۔

بس اس ایک خیال سے وہ جھجکتی رہیں۔ ورنہ ان کا دل تو چاہتا تھا کہ وہ جائیں اور چھوٹے ٹھاکر سے یہ سب کچھ کہہ دیں۔ وہ اس پر حیران بھی تھیں کہ ان کے دل میں اس کے لیے یہ کیسی محبت پیدا ہو گئی ہے۔ پھر انھیں خیال آیا کہ شاید اس کا سبب ان کی محرومی ہے۔ انھیں بیٹے کی کیسی آرزو تھی۔ لیکن وہ ان کے نصیب میں تھا ہی نہیں۔ تو اب وہ محرومی ان کے لیے چھوٹے ٹھاکر کی محبت بن گئی ہے۔

وہ بیٹیوں کی خاطر اس محبت سے منہ موڑے بیٹھی رہیں۔ خود سے لڑتی رہیں۔ لیکن پھر

کچھ ایسا ہوا کہ ان کی ساری احتیاط دھری رہ گئی اور اس غیر مسلم کی محبت ایک منہ زور دھارے کی طرح انھیں بہا لے گئی۔

ہوا یہ کہ اس روز رنجنا ان کے پاس آئی اور انھیں کچھ نوٹ دیے۔

انھوں نے حیرت سے نوٹوں کو دیکھا اور پوچھا۔ ''یہ کس لیے رنجنا؟'' ان کی سمجھ میں واقعی کچھ بھی نہیں آیا تھا۔

اپنی حیرت کے جواب میں انھیں رنجنا کے چہرے پر بھی حیرت نظر آئی۔ ''بھول گئیں بڑی بیگم۔ یہ کرائے کے پیسے ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر نے بھجوائے ہیں۔''

''یہ..... اب میں یہ نہیں لے سکتی۔'' انھوں نے گھبرا کر کہا۔ ''میں نے کہا نا کہ یہ گھر اب تم لوگوں کا ہے۔ چھوٹے ٹھاکر کا ہے۔ لو یہ چھوٹے ٹھاکر کو واپس دے دو۔''

لیکن رنجنا کا ہاتھ مٹھی بن گیا۔ ''میں..... میں چھوٹے ٹھاکر کا حکم کیسے ٹال سکتی ہوں۔ ان کی بات ماننا تو میرا دھرم ہے بڑی بیگم۔''

''میں جو کہہ رہی ہوں۔'' سرفراز بیگم نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''مجھے شما کر دیں بڑی بیگم۔'' رنجنا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کا اور چھوٹے ٹھاکر کا معاملہ ہے۔ میں تو ان سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

بات سرفراز بیگم کی سمجھ میں آ گئی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں خود بات کروں گی تمھارے چھوٹے ٹھاکر سے۔'' انھوں نے کہا۔

رنجنا چلی گئی۔ سرفراز بیگم نے وہ روپے ایک طرف رکھ دیے۔ ہاتھوں میں وہ انھیں ڈنک مارتے لگ رہے تھے۔

ویسے انھیں حیرت ہو رہی تھی۔ ہر ماہ یہ روپے انھیں ملتے تھے اور وہ رکھ لیتی تھیں۔ لیکن اس بار انھیں یہ خیال تک نہیں آیا کہ یہ مکان کا کرایہ ہے۔ یعنی صرف چند روز میں انھوں نے دل کی گہرائیوں سے چھوٹے ٹھاکر کو اپنا بیٹا مان لیا تھا۔

انھوں نے سوچا، شام کو وہ خود جا کر چھوٹے ٹھاکر سے بات کریں گی۔

❁.....❁.....❁

اوتار سنگھ نے بھی نیچے والوں کی تبدیلی محسوس کر لی تھی۔ وہ بہت حساس اور سمجھ دار تھا۔ اس کا مشاہدہ بہت اچھا اور گہرا تھا۔ تبدیلیوں کو محسوس کر لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ان دنوں تقریباً ہر روز نیچے سے کچھ نہ کچھ بھیج دیا جاتا تھا اور وہ نیچے سے آئی ہوئی ہر چیز بہت شوق سے کھاتا تھا۔ دوسرے اب چھمن بوا اس سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ ورنہ پہلے کبھی وہ سامنے نہیں آئی تھیں۔

خود اس نے اپنی توجہ رنجنا اور رگھو پر مرکوز کر لی تھی۔ انھیں اس کی ضرورت بھی تھی۔ وہ ان کا دکھ سمجھ سکتا تھا۔ ان کا سب کچھ ٹھاکروں کی گڑھی کے ساتھ سرخ ریت کے نیچے دفن ہو چکا

تھا۔ رشتے دار، گھر والے، دوست، سہیلیاں، گھر بار..... کچھ بھی تو نہیں بچا تھا اور وہ پردیس میں تھے۔ اور ان کا اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔

اوتار سنگھ نے ایک بار..... صرف ایک بار ان کے دکھ سے اپنے دکھ کا موازنہ کیا تھا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ ہر اعتبار سے ان سے بہتر ہے۔ دیکھا جائے تو ان کی طرح اس کا بھی سب کچھ کھو گیا تھا۔ لیکن فرق تھا۔ اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے مٹتے دیکھا تھا۔ بلکہ وہ تو خود بھی زندہ دفن ہوتے ہوتے بچا تھا۔ آدمی اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لے تو بالآخر اسے صبر آ جاتا ہے۔ لیکن جس نے دیکھا نہ ہو، اسے صبر نہیں آتا۔ ایسے ہی جیسے کوئی کھو جائے اور یہ علم نہ ہو کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے، تو آدمی کو کبھی صبر نہیں آتا۔ مرے ہوئے کو تو وہ جلد یا بہ دیر بھول ہی جاتا ہے۔ سو رنجنا اور رگھو کو صبر نہیں آتا تھا اور یہ فطری بھی تھا۔

دوسرا فرق یہ تھا کہ ان دونوں کا کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ جبکہ اوتار سنگھ اماں کو جیتا چھوڑ کر نکلا تھا اور اماں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ جب وہ پڑھائی مکمل کر کے واپس آئے گا تو وہ اسے ملیں گی..... اس کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ اور اماں اس کے لیے بہت اہم تھیں۔ تو اس کے لیے ایک امید تھی کہ کوئی اس کا ہے..... اور اس کی راہ تک رہا ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ عقل سے سوچتا تو یہ اسے ممکن نہ لگتا۔ اماں کیسے بچی ہوں گی۔ جہاں گیارہ گاؤں ریت کے نیچے دفن ہو گئے ہوں، وہاں ان میں ایک گاؤں میں ایک عورت کیسے زندہ بچ سکتی ہے۔ تو وہ امید و بیم کی کیفیت تھی۔ لیکن امید تھی تو سہی۔

ہاں..... اسے پچھتاوا ہوتا تھا کہ کیوں اماں کی بات مان کر، وہ اکیلا وہاں سے نکل آیا۔ وہ اماں کو اپنے ساتھ لا سکتا تھا۔ وہ اماں کو زبردستی گود میں اٹھا کر لے آتا۔ کیسی عجیب بات تھی کہ وہ انھیں موت کے منہ میں اکیلا چھوڑ کر نکل آیا۔ اس کے پاس اس کوتاہی کے لیے بس ایک عذر تھا۔ اس نے حویلی کے باہر اور حویلی میں جو کچھ دیکھا تھا، وہ اس کے شاک میں تھا۔ اس کی سمجھ بوجھ متاثر ہو چکی تھی۔ ایسے میں آدمی نہ تو سوچ پاتا ہے، نہ درست فیصلہ کر سکتا ہے۔

اور ایک تیسرا فرق بھی تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے اللہ کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی۔ جو کچھ اس نے کھویا، وہ اس کوشش کی قبولیت کی نشانی تھی، قربانی تھی اور خواب میں اسے یہ بات سمجھا بھی دی گئی تھی کہ اسے دکھ نہیں کرنا ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ موت اپنے مقررہ وقت پر، طے شدہ طریقے سے آتی ہے اور اسے ٹالا نہیں جا سکتا۔ آدمی کو صبر کرنا پڑتا ہے اور صبر اسے اللہ دیتا ہے۔ جبکہ رنجنا اور رگھو کے پاس ایسا کوئی سہارا نہیں تھا۔ ان کے لیے تو وہ غیر فطری موت تھی۔ ایک ناگہانی مصیبت تھی، جس نے ان کا سب کچھ ختم کر دیا۔

چنانچہ وہ ان کی دل جوئی کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ سخت تو وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ لیکن اس سانحے کے بعد وہ ان کے لیے بہت نرم ہو گیا۔ وہ ان کی ذاتی ضرورتوں کا خیال کرتا۔ انھیں چیزیں

خرید کر لا دیتا۔ ان سے باتیں کرتا اور صبر کی تلقین کرتا۔ اب وہ کھانا ان کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھاتا۔ ویسے یہ مرحلہ اس کے لیے بڑا سخت ثابت ہوا تھا۔ کیونکہ کھانا تو دور کی بات، وہ تو اس کے ساتھ بیٹھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

''سنو......اب تم دونوں ہی میرا پریوار ہو۔'' اوتار سنگھ نے نرم لہجے میں کہا۔

رگھو دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگا۔ ''نہیں چھوٹے ٹھاکر......ہم تو آپ کے سیوک ہیں۔''

''سیوک تھے کہو۔ اب تو میرا تم دونوں کے سوا کوئی نہیں۔ میں نے کہا نا، تم میرا پریوار ہو۔''

''نا مالک...... یہ ہم سے نہیں ہوگا۔'' رنجنا گڑگڑانے لگی۔ ''ہماری جگہ تو آپ کے پیروں میں ہے۔''

اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ نرمی سے انھیں نہیں سمجھا سکتا۔ چنانچہ اس نے تیور بدل کر کہا۔

''تو تم میرے سیوک ہی رہنا چاہتے ہو نا۔ پر تم تو اچھے سیوک بھی نہیں ہو۔''

یہ سن کر وہ دونوں پوری جان سے لرز گئے۔ ''مالک...... حکم کرو تو جان بھی دے دوں۔'' رگھو بولا۔

''تو میرا حکم کیوں نہیں مانتے۔'' اوتار سنگھ نے کڑے لہجے میں کہا۔

چار و ناچار وہ دونوں اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ لیکن ان سے کھایا نہیں جا رہا تھا۔

اوتار سنگھ جانتا تھا کہ صدیوں پرانی نسلی عادت چھوٹنے میں وقت تو لگے گا۔ مگر اسے اس مشکل کام کو آسان کرنے کا طریقہ بھی آتا تھا۔ وہ انہی کے جیسے لقمے لے رہا تھا اور انہی کی رفتار سے کھا رہا تھا۔

وہ دونوں اس کے ساتھ بیٹھنے کی وجہ سے گھبرائے ہوئے تھے۔ پہلے تو انھیں پتا ہی نہیں چلا۔ لیکن آخر رنجنا کو اس کا احساس ہو گیا۔ ''مالک...... چھوٹے ٹھاکر، آپ نے ٹھیک سے بھوجن نہیں کیا ہے۔'' وہ بولی۔

''جتنا تم نے کھایا ہے، اتنا ہی میں نے کھایا ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''اور روز یہی ہوگا۔ مجھے کھلانے کے لیے تم دونوں کو ڈھنگ سے کھانا ہوگا۔''

''پر ٹھاکر جی، آپ کا بڑھتا ہوا شریر ہے۔ آپ کی اور ہماری ضرورت میں فرق ہے۔'' رگھو بولا۔

''وہ فرق میں جانتا ہوں۔ تم لوگ پیٹ بھر کر کھاؤ گے تو میں بھی پیٹ بھر کر کھاؤں گا۔''

یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ ان دونوں نے جلدی ہی سمجھوتہ کر لیا۔ اس کے باوجود رنجنا کو فکر لگی رہتی تھی کہ چھوٹا ٹھاکر کمزور ہو رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ٹھیک سے کھانا نہیں کھاتا ہے۔ چنانچہ وہ رگھو سے کھانے پر اصرار کرنے لگی۔

پھر اوتار سنگھ نے رگھو کو چاچا اور رنجنا کو موسی کہنا شروع کر دیا۔ وہ انھیں احساس دلا رہا تھا کہ اس کے لیے ان کے سوا کوئی نہیں ہے اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ لیکن نوکر اور مالک کے درمیان جو حجاب ہوتا ہے، وہ مٹنے والا نہیں تھا۔

اس رات وہ کھانے کے بعد معمول کے مطابق کچھ دیر کوٹھے پر چہل قدمی کرتا رہا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر پڑھنے لگا۔

کچھ دیر بعد رنجنا کمرے میں آئی۔ ''چھوٹے ٹھاکر، وہ بڑی بیگم آپ سے ملنے آئی ہیں۔''

اوتار سنگھ نے چونک کر دیکھا۔ اتنی دیر میں سرفراز بیگم اس کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ان کے اس طرح سامنے آنے کی اسے توقع نہیں تھی۔ ''ماں جی...... آپ......؟''

''کیوں؟ میں آ نہیں سکتی تمھارے پاس؟'' سرفراز بیگم کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

''کیوں نہیں ماں جی۔ گھر ہے آپ کا۔''

''مگر میں تو تمہارا گھر سمجھتی ہوں۔ یہی شکایت لے کر آئی ہوں۔''

شکایت کا سن کا اوتار سنگھ اور گھبرا گیا۔ ''مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ماں جی؟'' اس نے پوچھا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ کھڑی ہوئی ہیں۔ اس نے گھبرا کر کرسی اٹھائی اور ان کے پاس لے گیا۔ ''آپ بیٹھیں نا ماں جی۔''

سرفراز بیگم بیٹھ گئیں ''آپ بھی بیٹھیے نا۔''

''آپ کے سامنے بیٹھنا اچھا نہیں لگے گا۔''

''کیوں؟ بیٹے ماں کے سامنے نہیں بیٹھتے کیا؟'' سرفراز بیگم نے کہا۔

اوتار سنگھ جھجکتے جھجکتے بیٹھ ہی گیا۔ ''میں سوچ رہا ہوں ماں جی کہ مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے۔''

سرفراز بیگم نے بند مٹھی کھولی۔ مڑے ہوئے نوٹ ان کی ہتھیلی پر پھیل گئے۔ ''میں اس غلطی کی بات کر رہی ہوں۔'' انھوں نے کہا۔

''جی...... میں سمجھا نہیں۔ یہ کیا ہے؟''

''یہ تم نے مجھے بھجوائے تھے۔ رنجنا لائی تھی۔''

اوتار سنگھ کی سمجھ میں بات آ گئی۔ ''اوہ، یہ...... یہ تو مکان کا کرایہ ہے۔''

''مگر میں نے پچھلی بار تم سے کہا تھا کہ اب یہ تمہارا گھر ہے۔ میرا مکان نہیں۔''

اوتار سنگھ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ ''میرے دل میں بڑی قدر ہے اس بات کی۔'' وہ اٹک اٹک کر بولا۔ ''لیکن ماں جی، یہ لین دین کا معاملہ اس سے الگ ہے۔''

''لیکن اب میں تم سے یہ پیسے نہیں لے سکتی۔''

''آپ شاید غلط سمجھ رہی ہیں ماں جی۔ ہمارا سب کچھ ختم ہو گیا۔ لیکن ماں جی، میرے پاس اتنا ہے کہ زندگی بھر ختم نہیں ہوگا۔ اگر میں مفلس ہو گیا ہوتا تو آپ سے تکلف نہ کرتا۔ لیکن ہوتے ہوئے نہ دوں تو میرے پتا جی کی آتما اشانت رہے گی۔''

''غلط میں نہیں سمجھ رہی، تم سمجھ رہے ہو۔'' سرفراز بیگم کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''میں نے اس دن بھی کہا تھا کہ میں یہ سب رسماً نہیں کہہ رہی ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ اسے اپنا گھر ہی سمجھو اور ہم سے کوئی تکلف نہ کرنا۔ سمجھ لینا کہ ان لوگوں کے بدلے تمھیں ہم لوگ مل گئے ہیں۔ اب ہم سب لوگ تمہارا خاندان ہیں۔ آج میں پھر کہہ رہی ہوں کہ میں نے وہ رسماً نہیں کہا تھا......''

''میں نے ایسا سمجھا بھی نہیں ماں جی۔ آپ کی سچائی مجھ تک پہنچ گئی تھی۔''

''افسوس تو یہی ہے کہ نہیں پہنچی۔ کسی ماں کا بیٹا لکھ پتی ہو تو کیا ماں اس سے گھر میں رہنے کا کرایہ وصول کرتی ہے...... کر سکتی ہے؟ اور کوئی بیٹا لکھ پتی ہو تو کیا وہ گھر میں رہنے کے صلے میں ماں کو کرایہ ادا کرتا ہے؟ میں نے تمھیں مفلس نہیں سمجھا۔ بس بیٹا سمجھنے کے بعد میں تم سے کرایہ نہیں لے سکتی۔ ہاں میں نے تمھیں رسماً بیٹا کہا ہوتا تو لے لیتی۔ بلکہ مجھے تو خوشی تھی کہ تم نے پہلی بار مجھے پکارا تو ماں جی کہہ کر پکارا۔ لیکن آج تم نے میرا دل توڑ دیا......''

''یہ بات نہیں ماں جی۔'' اوتار سنگھ نے شرمندہ لہجے میں کہنے کی کوشش کی۔

''نہیں۔ مجھے بات پوری کرنے دو۔'' سرفراز بیگم نے اس کی بات کاٹ دی۔ 'آج تم نے رنجنا سے کرایہ بھجوایا تو میں نے سمجھ لیا کہ تم نے میری بات کو رسمی سمجھا تھا۔ اسی لیے میں ثابت کرنے چلی آئی۔ میں زندگی بھر بہادر علی کے سوا کسی نامحرم کے سامنے نہیں آئی۔ اور بہادر علی اماں جان کے زمانے کا ملازم ہے...... گھر کے فرد جیسا۔ مگر اپنے شوہر کے انتقال کے بعد میں نے بہادر علی سے بھی پردہ کیا۔ لیکن آج میں تمھارے سامنے ہوں کیونکہ تمھیں بیٹا سمجھتی ہوں۔'' یہ کہتے کہتے ان کی آواز رندھ گئی۔ ''اور میں آج تم سے کہہ رہی ہوں کہ تم جب چاہو، نیچے آؤ۔ میری بیٹیاں بھی تم سے پردہ نہیں کریں گی۔ تم ہمارے لیے گھر کا فرد ہو۔ تم میرے بیٹے ہو چھوٹے ٹھاکر۔''

اوتار سنگھ کو اپنے سینے میں دل پگھلتا محسوس ہوا۔ وہ اٹھا اور اس نے جھک کر سرفراز بیگم کے پاؤں چھو لیے۔ پھر وہ سیدھا ہوا اور اس نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''لائیے...... یہ پیسے مجھے دے دیجیے۔ مجھے شرمندگی ہے کہ میں نے یہ گستاخی کی۔ آپ کا دل دکھایا۔''

سرفراز بیگم آنسوؤں کے درمیان مسکرا دیں۔ انھوں نے نوٹ اوتار سنگھ کی طرف بڑھا دیے۔

''یہ بتائیں، آپ کیسی ماں ہیں کہ آپ کو اپنے بیٹے کا نام بھی نہیں معلوم؟'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''میں نے جاننا ہی نہیں چاہا بیٹے۔ مجھے تم کو چھوٹے ٹھاکر پکارنا ہی اچھا لگتا ہے۔

''دعا کیجیے گا کہ میں آپ کے لیے بیٹا ہی ثابت ہوں۔ یہ بڑی ذمے داری ہے۔''

''بیٹوں کو خود کو بیٹا ثابت کرنا نہیں ہوتا۔ بس وہ بیٹے ہوتے ہیں۔ اب میں چلتی ہوں اور چھوٹے ٹھاکر، جو میں نے کہا ہے، وہ یاد رکھنا۔ مجھے دہرانے پر مجبور کبھی نہ کرنا۔ سمجھ رہے ہو نا؟''

اوتار سنگھ سمجھ رہا تھا۔ وہ اسے کہہ رہی تھیں کہ وہ جب چاہے، نیچے آ سکتا ہے۔ اس سے کسی کا پردہ نہیں۔

❁......❁......❁

سرفراز بیگم کی وہ دعوت اوتار سنگھ کی محبت کے لیے کسوٹی بن گئی۔ بڑی بات یہ تھی کہ بالکل ابتدا ہی میں اسے اس بات کا احساس ہو گیا کہ یہ اس کی محبت کے لیے بہت بڑی آزمائش ہے۔ شاید ایسا اس لیے ہوا کہ وہ بنیادی طور پر سوچنے والا آدمی تھا۔ ہر بات پر سوچنا، غور کرنا، تجزیہ کرنا اور پھر فیصلہ کرنا اس کی فطرت میں تھا۔

اب تک اس کی محبت بے سمت اور نظریاتی تھی۔ اس کے عشق کا آغاز ایک آواز سے ہوا تھا اور ایک ہی پل میں وہ آواز اس کے حواس پر چھا گئی تھی۔ اس آواز نے اس کے پورے وجود پر سپردگی طاری کر دی تھی۔ وہ کیفیت اسے آج بھی یاد تھی۔ اردو کے کسی رومانوی شعر میں وہ کیفیت نہیں تھی، جو اس آواز نے اسے دی تھی۔ وہ ایسی کیفیت تھی، جسے وہ خود بھی لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے دل میں اس آواز والی کے لیے جو پہلا جذبہ ابھرا، وہ احترام کا تھا۔ پھر وہ عقیدت تک پہنچا۔ اسے لگا کہ وہ آواز اسے عبادت پر اکسا رہی ہے۔ اس کے بعد یہ خواہش ابھری کہ وہ اس آواز والی کے روبرو بیٹھا ہو اور وہ آواز سن رہا ہو، اور وقت ٹھہر جائے۔ یہاں تک کہ زندگی تمام ہو جائے۔ اس کے بعد ہی تو اسے یہ احساس ہوا کہ وہ اس اَن دیکھی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔

اسے آج بھی یاد تھا۔ وہ اس بات پر جھنجلایا تھا کہ وہ جو کچھ پڑھ رہی ہے، وہ اس کے لیے نامانوس ہے۔ اسے سمجھ نہیں سکتا۔ اور یہ بات تو اس نے فوراً ہی سمجھ لی تھی کہ وہ پڑھ رہی ہے کیونکہ وہ گفتگو کا انداز نہیں تھا۔

اس جھنجلاہٹ کے نتیجے میں اس کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش وہ الفاظ بھی سمجھ سکتا۔ وہ آواز بہت خوبصورت تھی۔ لیکن پڑھنے کا انداز اس سے بھی خوبصورت تھا...... یقین تھا کہ جو کچھ وہ پڑھ رہی ہے، وہ خوبصورت ترین ہے کیونکہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود آواز، لحن اور الفاظ کی وہ اکائی اس کے اندر خوبصورت ترین جذبے جگا رہی تھی۔ اسے سن کر اس کا جی چاہتا تھا کہ زمین پر ماتھا ٹیک دے اور ساکت ہو جائے۔ کس کے سامنے......؟ یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ تب اس نے سوچا تھا...... شاید اسی کو محبت کہتے ہیں۔

بچپن سے سوچنے والے اوتار سنگھ نے رومانوی شاعری سے، اپنے استاد کی تشریحات سے اور اپنے غور و فکر سے یہ بات سمجھ لی تھی کہ محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے اور ہو یوں جاتی ہے کہ اوپر والا کسی کے دل میں کسی کی بھی محبت ڈال دیتا ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ انسانی نسل کا ارتقا محبت کے دم سے ہے۔ دنیا میں سب سے سچی محبت ماں باپ کی محبت ہوتی ہے۔ اور وہ اوپر والے کی عطا ہے۔ محبت نہ ہوتی تو انسانی نسل ختم ہو چکی ہوتی۔ بچے کو کوئی خطرہ لاحق ہو تو کمزور عورت ماں بن کر بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرتی۔ انسان تو بڑی چیز ہے، اس نے ننھے چوزے کے لیے مرغی کو بلی کے سامنے ڈٹتے، لڑتے اور بھگاتے دیکھا تھا۔

تو اس کا نظریہ یہ تھا کہ محبت وہ ہوتی ہے، جو اوپر والا کسی بھی لمحے کسی کو کسی کے لیے دے دیتا ہے اور وہ بے لوث، بے غرض ہوتی ہے۔ وہ کچھ مانگتی ہے، نہ شرطیں عائد کرتی ہے۔ حد یہ ہے کہ وہ تو جواب میں محبت کجا، ذرا سی توجہ کا مطالبہ بھی نہیں کرتی۔

جب اوتار سنگھ کو یہ گمان ہوا کہ اسے اس آواز والی سے محبت ہو گئی ہے تو قدرتی طور پر اس نے یہی سمجھا کہ وہ محبت اس کے دل میں اوپر والے نے ڈالی ہے۔ لیکن اس بات کی تصدیق کی اس کے پاس کوئی سند نہیں تھی۔ وہ طبعاً حسن پرست تھا۔ ہر چیز میں خوبصورتی اور حسن دیکھنا چاہتا تھا اور خوبصورتی اسے اچھی بھی لگتی تھی۔ اس لڑکی کی اس نے آواز سنی تھی، اسے دیکھا نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آواز کی خوبصورتی اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ لڑکی حسین بھی ہوگی۔ چنانچہ اپنی محبت اس کی اپنی نظر میں مشتبہ ہو گئی۔ اگر وہ لڑکی کبھی سامنے آئی اور وہ بدصورت ہوئی تو کیا وہ اس کے لیے پہلے جیسی محبت محسوس کر سکے گا؟

الفاظ سمجھنے کی خواہش پیدا ہوئی تو یہ جاننا ضروری ہو گیا کہ وہ کون سی زبان ہے۔ لیکن وہ سمجھتا تھا کہ یہ بات شاید اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ وہ اس کا تذکرہ کسی سے نہیں کر سکتا تھا تو پوچھتا کیسے۔ وہ تو اتفاق سے اسے وصال دین سے معلوم ہو گیا کہ وہ عربی زبان ہے۔ تب اسے اپنی آرزو پوری کرنے کی کوشش کا موقع ملا اور وہ مولوی صاحب سے عربی سیکھنے لگا۔

اب اوتار سنگھ اتفاق کو نہیں مانتا تھا۔ برسوں پہلے اس نے سمجھ لیا تھا کہ جسے انسان اتفاق سمجھتا ہے، وہ اوپر والے کی منصوبہ بندی ہوتی ہے، جو انسان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بے بسی اور عاجزی میں وہ اسے اتفاق قرار دے دیتا ہے۔ تو گویا اس کے علم میں یہ بات آنا کہ آواز والی لڑکی عربی پڑھتی ہے، درحقیقت اوپر والے کی منصوبہ بندی تھی۔ اس کے نزدیک یہ اس کے اس اندازے کی تصدیق تھی کہ اس کے دل میں وہ محبت اوپر والے نے ڈالی ہے۔ اسے اپنی محبت پر اعتماد ہو گیا۔ تب اس نے یہ سمجھ لیا کہ وہ لڑکی کتنی ہی بدصورت کیوں نہ ہو، اس سے اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

اس نے بڑی لگن سے عربی پڑھی۔ مولوی صاحب بھی استادِ کامل ثابت ہوئے۔ لیکن مولوی صاحب اس کی رفتار پر حیران تھے۔ وہ اس کی رفتار کم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انھیں نہیں معلوم تھا کہ اس کی رفتار کے پیچھے محبت کی طاقت ہے۔ وہ جلد سے جلد عربی زبان پر قدرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔

پھر ایک دن اس کی سماعت اس آواز سے محروم ہو گئی۔ شروع میں تو وہ بہت پریشان ہوا۔ مگر پھر اسے پتا چلا کہ وہ آواز تو اس کے اندر موجود ہے۔ جب اس کا جی چاہے تو اس کے اندر کوئی خودکار بٹن دب جاتا ہے اور وہ آواز اپنی تمام تر خوبصورتی اور رعنائی سمیت اس کی سماعت میں رس گھولنے لگتی ہے۔ مگر وہ لفظوں سے محروم آواز تھی...... صرف آواز، لہجہ اور لحن!

اس محرومی سے اسے بس ایک نقصان ہوا۔ وہ اپنی عربی کی استعداد نہ جانچ سکا۔ وہ یہ نہ جان سکا کہ جو کچھ وہ لڑکی پڑھتی ہے، وہ اسے سمجھنے کے قابل ہوا ہے یا نہیں۔ کیونکہ اسی کے لیے تو وہ یہ سب جتن کر رہا تھا۔

اوتار سنگھ نے کبھی نہیں چاہا، کبھی نہیں سوچا کہ وہ آواز والی لڑکی کو دیکھے۔ اسے محبت ہو گئی تھی اور وہ بس محبت کیے جا رہا تھا۔ کالج میں اسے اس محبت کی سچائی کا یقین بھی مل گیا تھا۔ امرتا، ریٹا اور پشپا بے حد حسین لڑکیاں تھیں۔ اور وہ بچہ نہیں تھا، جانتا تھا کہ اس کے ایک اشارے پر وہ پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آ گریں گی۔ لیکن اس نے کبھی ایک پل کے لیے بھی ایسا نہیں سوچا بلکہ وہ جب بھی انھیں دیکھتا، اسے آواز والی لڑکی کا خیال آ جاتا اور اس کے اندر کا موسم ویسا ہی خوبصورت ہو جاتا، جیسا پہلی بار اس کی آواز سن کر ہوا تھا۔

سو وہ اپنی اس نظریاتی محبت کے سحر میں گم تھا۔ وہ محبت اس کے وجود میں ایک پُرسکون جھیل کی طرح تھی۔ لیکن اب سرفراز بیگم نے اس جھیل میں ایک کنکرا اچھال دیا تھا۔ جھیل کا سکون درہم برہم ہو گیا۔ جھیل کی سطح پر دائرے ہی دائرے نمودار ہوئے اور وہ بے چین ہو گیا۔

پہلی بار اس نے سوچا کہ وہ نیچے جا سکتا ہے۔ کوئی اس سے پردہ نہیں کرے گا، تو وہ پریشان ہو گیا۔ وہاں تین لڑکیاں تھیں۔ وہ اسے کیسے پہچانے گا۔ دل نے جھٹ کہا...... یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ اس کی آواز تو وہ لاکھوں میں پہچان سکتا ہے۔

وہ اسے دیکھ سکے گا۔ اس کی محبت مکمل ہو جائے گی۔ اس تصور نے ہی اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑا دی۔ اس کا جی چاہا کہ اسی وقت نیچے چلا جائے...... اسے دیکھ لے۔ وہ خوشی اس کے لیے بالکل نئی اور انوکھی تھی۔

لیکن وہ رکھ رکھاؤ والا آدمی تھا۔ یہ رات کا وقت تھا۔ اس وقت جانا مناسب نہیں۔ اس نے سوچا...... کل دیکھیں گے۔

سرخ آندھی والے واقعے کے بعد سونا اس کے لیے مسئلہ بن گیا تھا۔ قدرتی بات تھی

کہ پتا جی، ویر جی اور چاچا جی اسے یاد آتے تھے اور اسے یہ بھی خیال تھا کہ اسے ان کا دکھ نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ اس کی قربانی رائیگاں ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف دکھ ایک فطری چیز تھا۔ دکھ پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا...... کسی کا زور نہیں چلتا۔ وہ تو چپکے سے خیال کی طرح آتا ہے...... دبے پاؤں...... جیسے کوئی چور ہو۔ پھر پتا بھی نہیں چلتا کہ کب اور کیسے وہ دل، دماغ پر...... پورے وجود پر چھا گیا ہے۔ پتا چلتا ہے تو آنکھوں سے آنسو چھلک رہے ہوتے ہیں۔ اس کا تجربہ اسے ماتا جی کی موت پر ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ دکھ کی طرف سے چوکنا رہتا تھا۔ ایک بار تو بے خبری میں اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ وہ تو بروقت اسے خیال آ گیا اور اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس کے بعد سے وہ ان لوگوں کے بارے میں سوچنے سے بھی بچنے لگا تھا۔ وہ شعوری طور پر اس کوشش میں لگا رہتا تھا کہ ان لوگوں کو یاد نہ کرے۔

لیکن سوتے وقت بچھڑے ہوئے لوگ خاص طور پر یاد آتے تھے۔ یہ بات وہ کبھی نہیں سمجھ سکا کہ غم نہ کرنے کی جدوجہد میں اس نے غم کو خود پر طاری کر لیا ہے۔ اگر وہ ایک بار کھل کر غم کر لیتا...... رو لیتا، تو اس کے بعد دھیرے دھیرے، بہ تدریج وہ غم اس کے دل و دماغ سے محو ہو جاتا۔ لیکن اسے تو بس یہی فکر تھی کہ اس کی قربانی اکارت نہ ہو جائے۔ اللہ کو خوش کرنے کے بجائے وہ اسے خفا نہ کر بیٹھے۔

سو بستر پر لیٹنے سے پہلے وہ سر اٹھا کر پکارتا...... اے اوپر والے، تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے پیدا کیا...... وہ سب کچھ دیا جو میرے پاس ہے۔ مجھے راستہ دکھایا، جس کی وجہ سے میں نے تجھے خوش کرنے کی کوشش کی۔ اب اسے قبول بھی فرما لے اور مجھے ناشکرے پن سے بچائے رکھ۔

اس کے باوجود بستر پر لیٹتے ہی اس کی آنکھوں میں کسی نہ کسی مرنے والے کا چہرہ پھر جاتا...... کبھی وہ پتا جی ہوتے تو کبھی ویر جی۔ کبھی وہ مولوی صاحب ہوتے تو کبھی چاچا جی۔ اور وہ گھبرا کر، خوف زدہ ہو کر زور سے سر جھٹکتا۔ مجھے کسی کا دکھ نہیں کرنا ہے۔ وہ خود کو یاد دلاتا۔

ایسے میں کلمہ ہی اس کی ڈھال بن گیا تھا۔ وہ کلمہ پڑھنا شروع کرتا...... پورے دھیان سے...... ارتکاز کے ساتھ۔ مفہوم کے شعور کے ساتھ۔ اور کلمہ پڑھتے پڑھتے وہ سو جاتا۔

لیکن اس رات ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ آواز والی لڑکی کے تصور میں کھویا ہوا تھا۔ الفاظ کے بغیر اس کی آواز اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔ لیکن اس کا تصور بے چہرہ تھا۔ اس پردہ دار لڑکی کو اپنے تصور میں چہرہ دینے کی گستاخی وہ نہیں کر سکتا تھا۔

بالآخر اسی کیفیت میں وہ سو گیا۔ رات بھر بغیر خدوخال...... بغیر نین نقش کے وہ خواب میں اسی کو دیکھتا رہا!

❁......❁ ❁

اگلے روز اوتار سنگھ سو کر اٹھا تو وہ اسی کیفیت میں تھا، جس میں سویا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا

تھا کہ اڑ کر نیچے پہنچ جائے۔ ناشتے تک وہ اپنی اس خواہش کو دبائے بیٹھا رہا۔ مگر ناشتے کے بعد ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی بے چینی، اس کا اضطراب بڑھتا گیا بلکہ وہ ایک ایسی تڑپ میں تبدیل ہو گیا، جو اسے قدم اٹھانے پر اکسا رہی تھی۔

بالآخر اس کے قدم اٹھے اور وہ زینے پر آ گیا۔ اس کی چال میں عجیب سی بے تابی اور مستانہ پن تھا، جو کم از کم اس کے لیے نیا تھا۔ ان لمحوں میں اپنا آپ خود اسے بھی اجنبی لگ رہا تھا۔

مگر زینے پر اترتے اترتے اچانک وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ وہ کیا کر رہا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ اور کیوں جا رہا ہے؟ یہ وہ چبھتے ہوئے سوال تھے، جنھوں نے اچانک ہی اس کے قدموں سے تحرک چھین لیا تھا۔

چند لمحے وہ ساکت کھڑا رہا، جیسے وہ سوال اس کی سمجھ میں ہی نہ آئے ہوں۔ پھر اس کے اندر جواب ابھرا...... میں اسے دیکھنے جا رہا ہوں۔

اندر کی عدالت میں وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں ایک اور سوال کیا۔

''تمھیں یہ حق کس نے دیا؟''

''ماں جی نے۔''

''تو تم ماں جی کے بیٹے کی حیثیت سے ماں جی کی بیٹی کو دیکھنے جا رہے ہو؟''

اس ایک لمحے میں اوتار سنگھ کے ہر مسام سے پسینہ بہہ نکلا۔ اس کی شرمندگی نے اسے سمجھا دیا کہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں، جتنا نظر آتا ہے۔ اس معاملے میں کوئی بڑی گڑبڑ ہے اور یہ عدالت زینے پر نہیں لگائی جا سکتی۔

وہ پلٹا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اپنے کمرے میں، اپنی کرسی پر بیٹھ کر اس نے پہلی بار اس معاملے کو ہر رخ، ہر زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی۔

اب پہلی بار اسے احساس ہوا کہ ماں جی کے دل میں اس کے لیے کیسی سچی اور خالص محبت پیدا ہوئی ہے۔ اس کا ثبوت ان کی قربانی تھی۔ جو عورت پردہ کرنے والی ہو، جس نے شوہر کی موت کے بعد گھر کے آبائی ملازم سے بھی پردہ کیا ہو، وہ اس کے سامنے آ گئی۔ اس نے برسوں کی ریاضت ترک کر دی۔ یہ اتنا بڑا ایثار تھا، جو صرف سچی محبت کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ یہی نہیں، اس نے اپنے گھر کے تمام دروازے اس پر کھول دیے۔ اپنی بچیوں کا پردہ بھی اٹھا دیا۔ تو جواب میں اسے کیا کرنا چاہیے۔ اسے ایک اچھا اور سچا بیٹا بن کر دکھانا ہوگا۔

سوال یہ تھا کہ ماں جی کے رشتے سے ان کی بیٹیاں اس کے لیے کیا ہیں؟ بہن ہی نا! یہ الگ بات کہ ان میں سے ایک کی آواز سن کر وہ پہلے ہی اس کی محبت کا اسیر ہو چکا تھا۔ لیکن اس نے یہ بات کبھی کسی کو نہیں بتائی تھی...... کسی کو بھی نہیں! اور یہ راز داری اس نے صرف اپنی محبت کو رسوائی

سے بچانے کے لیے برتی تھی۔ تو کیا اب اسے اس رسوائی کی کوئی پروا نہیں رہی ہے؟

اسے احساس ہوا کہ اب تو اس کی ذمے داری اور بڑھ گئی ہے۔ ماں جی نے اتنے خلوص سے اسے بیٹا کہا ہے تو اسے بھی بیٹا بن کر دکھانا پڑے گا۔ اس لحاظ سے اس کا نیچے جانا تباہ کن ثابت ہوگا۔

یہ وہ موقع تھا کہ اس نے بہت عرصے کے بعد اپنی محبت پر غور کیا۔ اب تک اس کی محبت بے طلب تھی۔ وہ جس سے محبت کرتا تھا، اس کی اس نے صرف آواز سنی تھی اور اسے دیکھنے کی کبھی آرزو بھی نہیں کی تھی۔

لیکن اس وقت اس کے پاس ایسا کوئی موقع بھی نہیں تھا۔ جبکہ اب اسے موقع مل رہا ہے۔ تو اب اسے دیکھنے کی آرزو اس کے دل میں چٹکیاں لے رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ اسے دیکھ بھی لے تو اس کا حاصل کیا ہے؟

یہ تو اسے اب بھی یقین تھا کہ وہ دیکھنے میں کیسی ہی ہو، اسے اس سے کوئی غرض نہیں۔ کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس کے لیے نہیں۔ درمیان میں مذہب کی دیوار ہے۔ وہ مسلمان ہے...... اور مسلمان اس معاملے میں بہت پکے ہوتے ہیں۔ یہ بات اسے کالج کی ساتھی نادرہ نے سمجھا دی تھی۔ اس کا ہر انداز بتاتا تھا کہ وہ اسے پسند کرتی ہے۔ لیکن دوسری لڑکیوں کے برعکس اس نے کبھی بلاواسطہ اس کا اظہار کسی طرح بھی نہیں کیا تھا۔ وہ کالج میں لڑکوں کے ساتھ پڑھتی تھی۔ یہاں تو معاملہ ایک پردہ دار لڑکی کا تھا، جو گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالتی تھی۔ اور وہ دیوی دیوتاؤں کو نہیں مانتا تھا۔ اللہ کا نام لیتا تھا۔ لیکن تھا تو وہ ہندو ہی۔ مسلمان اور ان کے طور طریقے اسے اچھے لگتے تھے لیکن وہ مسلمان تو نہیں تھا۔ ہاں، ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک وہ کائنات کا نظام چلانے والی مہان ہستی کو کھوجتا آیا تھا۔ اس کی جستجو، اس کی تلاش اب بھی جاری تھی۔ ایک طرح سے یہ اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ لیکن وہ کسی لڑکی کی خاطر دھرم تبدیل نہیں کرسکتا تھا۔ خواہ وہ اس سے کتنی ہی محبت کرتا ہو۔ اس تلاش کے سامنے اس محبت کی حیثیت ثانوی تھی۔

اگر وہ نیچے جاتا ہے، اس لڑکی کو دیکھتا ہے تو اس سے اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ امکان یہ ہے کہ وہ ماں کے حوالے سے اسے بھائی کا مقام دے گی۔ اور وہ اسے محبت کی نظر سے دیکھے گا۔ محبت میں وارفتگی ہوتی ہے۔ کہیں اس کی نظروں نے بھید کھول دیا تو وہ اس کے سامنے...... اور سب سے بڑھ کر ماں جی کے سامنے کتنا شرمندہ ہوگا۔ کوئی نہیں مانے گا کہ وہ پہلے سے اس سے محبت کرتا ہے۔ ماں جی تو یہی سمجھیں گی کہ اس نے ان کی دی ہوئی رعایت کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ ان کی نظروں میں حقیر ہو جائے گا اور اس کی محبت رسوا ہو جائے گی۔ پھر کوئی عورت کسی محروم کو بیٹا نہیں بنائے گی۔

اور اگر بالفرضِ محال اوپر والے نے اس لڑکی کے دل میں بھی اس کی محبت ڈال دی تو......؟

یہ خیال بے حد خوش آئند تھا۔ اس کی دھڑکنوں کی لے بدلنے لگی۔

مگر اگلے ہی لمحے اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اس طرح پیچیدگی اور بڑھ جائے گی۔ اس میں تو ماں جی کے گھر کی بڑے پیمانے پر رسوائی کا خدشہ ہے۔ ان دنوں سیاسی صورتِ حال ویسے ہی خراب تھی۔ ہندوستان کی تقسیم کے معاملے پر اختلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی خلیج بڑھا رہا تھا۔

نہیں...... بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی محبت کو پہلے جیسا ہی رہنے دے۔ کسی کو چاند سے محبت ہو جائے تو وہ اس کی چاندنی میں نہا تو سکتا ہے، ہاتھ بڑھا کر اسے چھو تو نہیں سکتا۔ محبت سے جمالیاتی حس کی نمو ہے۔ بس اتنا کافی ہے۔

اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ کبھی نیچے نہیں جائے گا۔ وہ خطرناک رعاتیوں سے استفادہ نہیں کرے گا۔

اس نے فیصلہ کر تو لیا۔ لیکن جس بے چینی اور اضطراب سے وہ دوچار ہوا، وہ اس کے لیے نیا بھی تھا اور پریشان کن بھی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ اپنی بے طلبی کھو بیٹھا ہے اور طلب کے عذاب میں گرفتار ہو گیا ہے۔

وہ کوئی کمزور آدمی نہیں تھا۔ لیکن طلب طاقت ور لوگوں کو بھی کمزور کر دیتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے اس کے اندر اتنی شدت سے نیچے جانے کا خیال مچلتا کہ اس کے قدم خود بہ خود زینے کی طرف اٹھ جاتے۔ زینے پر ایک دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ جبکہ دوسرا اس کے پہلو میں تھا اور نیچے والے گھر میں کھلتا تھا۔ بے اختیار کئی بار وہ اس دروازے تک پہنچ بھی گیا، جو شاید دونوں طرف سے بند رہتا تھا۔ ہر بار وہ خود کو روک کر...... باندھ کر اوپر لے آیا۔

تین دن میں اوتار سنگھ کو تجربہ ہو گیا کہ طلب کتنی طاقت ور ہوتی ہے۔ وہ مولوی محمد حسین آزاد کو پڑھ چکا تھا۔ جانتا تھا کہ طلب کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اور انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔ ایک خواہش پوری ہو تو دو نئی خواہشیں سر اٹھاتی ہیں۔ اور دو پوری ہو جائیں تو چار۔ اس معاملے میں گربہ کشتن روزِ اوّل ضروری ہے۔ اگر وہ دل کے پہلے ہی مطالبے کے سامنے سپر ڈال دے گا تو ایک کے بعد ایک مطالبات اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جائیں گے۔ انسان طلب کا عادی ہو جائے تو کسی حال میں مطمئن اور خوش نہیں رہتا۔ آج وہ نیچے جانے کو مچل رہا ہے تو کل اسے دیکھنے کو بے تاب ہوگا۔ پھر اظہارِ محبت کی بے چینی ہوگی۔ اس کے بعد اسے چھونے کی...... اور نجانے یہ سلسلہ کہاں رُکے گا۔

وہ سمندر کی طرح بپھرتی بے چینی اور اضطراب سے لڑتا رہا۔ زینے پر جا کر واپس آتا

رہا۔لیکن اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ طالب کا گلا گھونٹ کر رہے گا!

❀......❀......❀

سرفراز بیگم چھوٹے ٹھاکر کو بیٹا بنا کر آئیں تو بہت ہلکی پھلکی تھیں۔ چھوٹے ٹھاکر کے لیے ان کی مامتا ایسے امڈی تھی کہ اتنا پیار انھیں اپنی کسی بیٹی پر بھی نہیں آیا تھا۔ان کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔لگتا تھا کہ ان کی برسوں پرانی بیٹے کی آرزو پوری ہوگئی ہے۔

لیکن اس رات وہ سونے کے لیے لیٹیں تو ان کا دل وسوسوں سے بھر گیا۔ بیٹا پانے کی خوشی میں انھیں احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کتنی بڑی بات کہہ آئی ہیں۔اسے نبھانا کتنا مشکل ہے، یہ وہ اب سوچ رہی تھیں۔

وہ چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں جو کچھ جانتی تھیں،اس کی روشنی میں سوچ رہی تھیں۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔وصال دین کو وہ بھائی کی طرح چاہتا تھا۔لیکن بہن کیا ہوتی ہے،یہ اسے نہیں معلوم تھا۔رنجنا بتاتی تھی کہ وہ کبھی لڑکیوں میں نہیں رہا۔اس کا بہن خانہ خالی ہی رہا تھا۔ماں سے بھی وہ کم عمری ہی میں محروم ہوگیا تھا۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ اسے لڑکیوں کا کوئی تجربہ نہیں۔وہ ایک ایسے کالج میں پڑھتا تھا، جہاں لڑکے اور لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے۔دوسرے انھوں نے تھوڑی دیر میں یہ بات سمجھ لی تھی کہ اس کی تربیت بہت اچھی ہوئی ہے۔وہ بہت شائستہ مزاج اور خوش اطوار لڑکا تھا۔

مگر وہ اس کا کیا کرتیں کہ آگ اور تیل کی قربت کو ہمیشہ منع کیا گیا ہے۔اور انھوں نے آگ اور تیل کو قریب کرنے کا سامان کر دیا تھا۔اب بہرحال وہ کچھ نہیں کرسکتی تھیں۔تیر کمان سے نکل چکا تھا۔واپس نہیں آسکتا تھا۔انھوں نے یہ کہہ کر خود کو تسلی دے لی کہ اسے بیٹا بنانے کے بعد انھیں یہی کہنا تھا۔ان کے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔بیٹا ہوگا تو گھر میں آئے گا بھی۔ان کی نیت اچھی ہے تو انشاءاللہ نقصان بھی نہیں ہوگا۔

اگلی صبح انھوں نے اس سلسلے میں بچیوں سے بات کی۔یہ بھی ضروری تھا کہ انھیں پہلے سے اس صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر تیار کیا جائے۔

انھوں نے تینوں بچیوں کو سامنے بٹھا کر کہا۔''میں نے چھوٹے ٹھاکر کو بیٹا بنا لیا ہے۔ اب وہ ہمارے گھر کا ایک فرد ہے۔اس رشتے سے وہ تمہارا بھائی ہوا۔'' ''اللہ، کتنا اچھا لگے گا اماں۔مجھے تو ہمیشہ یہ سوچ کر افسوس ہوتا تھا کہ اللہ نے ہمیں بھائی نہیں دیا۔'' گلنار نے چہک کر کہا۔وہ اس خبر سے کھل اٹھی تھی۔''وہ گھر میں آئے گا تو تم لوگ اس سے پردہ نہیں کروگی۔'' سرفراز بیگم نے مزید کہا۔اب وہ غور سے لڑکیوں کے چہرے دیکھ رہی تھیں۔گلنار تو خوش نظر آرہی تھی۔حور بانو کی آنکھوں میں ایک پل کو ایک تاثر سا چمکا تھا۔لیکن اگلے ہی پل وہ بے تاثر ہوگئیں۔اس تاثر کو سرفراز بیگم نے دیکھا تو لیکن سمجھ نہیں سکیں۔بہرحال یہ طے تھا کہ اس کا ردِعمل منفی نہیں تھا۔

لیکن نور بانو کی طرف دیکھ کر انھیں تشویش ہونے لگی۔اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کا تاثر بالکل واضح تھا۔''کیا بات ہے نور بانو۔تم اتنی چپ کیوں ہو؟'' انھوں نے اس سے پوچھا۔

''کچھ نہیں اماں۔''

''تمھیں کوئی اعتراض ہے؟''

''آپ ماں ہیں۔آپ کے فیصلے پر ہم اعتراض کیسے کرسکتے ہیں۔''

اس کا لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ اسے اعتراض ہے۔سرفراز بیگم عقل مند خاتون تھیں۔جانتی تھیں کہ اعتراض کا دبا رہنا اچھا نہیں۔اس کا اظہار ہونا چاہیے۔اظہار معاملات کی سنگینی کو کم کر دیتا ہے۔''نہیں نور بانو، ایسا نہیں۔تمھیں اعتراض کا حق ہے۔تم کھل کر اعتراض کرسکتی ہو۔کہو، کیا بات ہے؟''

نور بانو اب بھی ہچکچا رہی تھی۔''اماں...... یہ گستاخی ہوگی۔''

''میں اجازت دے رہی ہوں۔''

''اماں...... میں سمجھتی ہوں کہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔'' نور بانو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''یہ بات تم کیوں کہہ رہی ہو؟'' سرفراز بیگم نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''ان رشتوں کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہوتی جو انسان خود بنا لیتا ہے۔'' نور بانو بولی۔ ''کسی کو بیٹا بنا لیا جائے تو وہ حقیقی بیٹا نہیں بن جاتا۔اسے وہ حقوق حاصل نہیں ہوسکتے، جو حقیقی بیٹے کے ہوتے ہیں۔نہ بیٹا بنانے والے پر اس کے تمام فرائض واجب ہوتے ہیں۔یہ تو ایک جذباتی معاملہ ہے۔''

سرفراز بیگم سمجھ گئیں کہ وہ سورۂ احزاب کے حوالے سے بات کر رہی ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ بولے بیٹے زید بن حارث کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ سنایا ہے۔اب وہ اس سے اختلاف نہیں کرسکتی تھیں۔ چند لمحے سوچنے کے بعد انھوں نے کہا۔ ''لیکن بیٹا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یتیموں پر خاص طور پر شفقت فرماتے تھے اور یہ اللہ کا حکم بھی ہے۔''

''اماں، ہر معاملے میں اعتدال کا حکم بھی تو دیا گیا ہے۔آپ چھوٹے ٹھاکر پر بے شک شفقت کریں۔لیکن آپ کے بیٹا کہہ دینے سے وہ آپ کا بیٹا اور ہمارا بھائی نہیں بن جائے گا۔ ہمارے لیے اس کے سامنے آنا جائز نہیں۔''

''تم اماں سے بحث کر رہی ہو۔'' حور بانو نے اسے ٹوکا۔''ماں کی نافرمانی کو بھی تو منع کیا ہے اللہ نے۔''

''اماں نے مجھے اجازت دی ہے۔بلکہ اصرار کیا ہے۔'' نور بانو نے کہا۔''اور والدین کا حکم اگر اللہ کے حکم سے متصادم ہو تو والدین کی نافرمانی بری بات نہیں۔اللہ کے حکم کے سامنے تو

کسی کی کوئی حیثیت نہیں۔''

''تم بدتمیزی کر رہی ہو۔'' حور بانو نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ایک شخص پر جو کم عمر بھی ہے، اتنا بڑا سانحہ گزرا ہے کہ اس کا سب کچھ لٹ گیا۔ دکھ سے اس کا کیا حال ہوگا۔ ایسے میں اسے ہمدردی کی ضرورت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب ہمارے سوا اس کا کوئی نہیں۔ وہ کرائے دار کی حیثیت میں سہی، ہمارے ہی گھر میں رہتا ہے۔ ہم اس کے نزدیک ترین پڑوسی ہیں۔ اس کی دل جوئی ہماری انسانی ذمے داری ہے۔ اللہ اس سے منع نہیں فرماتا۔''

''میں اس کی دل جوئی کے خلاف نہیں ہوں۔ لیکن مجھے اس رشتے سے اختلاف ہے۔ ہر بات کی کوئی حد ہوتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ کسی کافر اور مشرک سے رشتہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ میں پردہ ختم کرنے کے خلاف ہوں۔'' نور بانو کے لہجے میں قطعیت تھی۔

حور بانو کا چہرہ تمتما اٹھا۔ کافر اور مشرک کے حوالے نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ نور بانو نے اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔ چھوٹے ٹھاکر کی محبت میں گرفتار ہونے کے بعد وہ خود بھی تو اسی پہلو سے سوچتی رہی تھی۔ لیکن جب اسے پتا چلا کہ وہ عربی پڑھتا ہے اور اپنے استاد سے قرآن سنتا تو اس کے دل نے کہا تھا کہ وہ مشرک نہیں ہے۔ بلکہ ممکن ہے کہ اسلام بھی قبول کر لے اور اس کے قرآن سننے کی گواہ تو خود نور بانو تھی۔

چنانچہ اس نے تڑپ کر کہا۔ ''تم تو ایسے بات کر رہی ہو، جیسے وہ انسان ہی نہیں ہے اور ذرا یہ تو بتاؤ، وہ کیسا کافر اور مشرک ہے جو قرآن کی تلاوت سنتا ہے اور عربی پڑھتا ہے۔''

یہ سن کر سرفراز بیگم چونکیں اور انھوں نے غور سے حور بانو کو دیکھا۔ ''کیا یہ سچ ہے؟''

''نور بانو سے پوچھ لیں۔''

سرفراز بیگم نور بانو کی طرف مڑیں۔ ان کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی نور بانو نے کہا۔ ''یہ سچ ہے۔ لیکن اماں، آپ ہی بتائیں، کیا اس بات سے اس کے کفر اور شرک میں کوئی فرق پڑتا ہے۔''

''فرق کیوں نہیں پڑتا۔'' حور بانو بولی۔ ''اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہے۔''

سرفراز بیگم اس اطلاع سے اچنبھے میں بھی تھیں اور خوش بھی ہوئی تھیں۔ مگر وہ جانتی تھیں کہ نور بانو کا موقف درست ہے۔ دین کے خلاف جانے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا اور انھیں نور بانو پر فخر ہو رہا تھا۔ پڑھائی رائیگاں نہیں تھی۔ اس نے بچیوں میں دین کی سمجھ پیدا کی تھی۔ بلکہ عملی زندگی میں اس کی افادیت بھی ثابت کر دی تھی۔

چند لمحے سوچنے کے بعد انھوں نے کہا۔ ''مجھے احساس ہو گیا ہے کہ جذباتیت میں میں حد سے گزر گئی تھی۔ اب بات میرے منہ سے نکل چکی ہے اور میں نے چھوٹے ٹھاکر سے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے رسماً یہ بات نہیں کہی ہے۔ لیکن میں تم لوگوں کو مجبور نہیں کروں گی۔ چھوٹے ٹھاکر کو

میں سمجھا کہ معذرت کر لوں گی۔''

''میں آپ کی بات رکھوں گی اماں۔'' حور بانو نے کہا۔

''اور میں تو انھیں بھائی ہی سمجھوں گی۔'' گلنار بولی۔

نور بانو خاموش رہی۔ اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر تھا۔

❀ ..... ❀ ..... ❀

ان کی سوچیں مختلف تھیں، محرکات جدا تھے۔ لیکن مشترک بات یہ تھی کہ وہ سب حالت انتظار میں تھے۔ انھیں اپنے گھر میں چھوٹے ٹھاکر کی آمد کا انتظار تھا۔

سرفراز بیگم ڈر رہی تھیں۔ ان کا ڈر دو دھاری تلوار کی طرح تھا۔ انھیں احساس تھا کہ انھوں نے گھر کی عزت کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ انھیں انگلیاں اٹھنے کا خوف بھی تھا اور یہ ڈر بھی تھا کہ انھیں چھوٹے ٹھاکر کے سامنے شرمندگی ہوگی کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ نور بانو اس کے سامنے ہرگز نہیں آئے گی۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ چھوٹے ٹھاکر کی آمد کی منتظر تھیں۔ ان کی کیفیت ایسی تھی، جیسے برسوں کے بعد ان کا بچھڑا ہوا بیٹا گھر آ رہا ہو۔

حور بانو کے لیے وہ بے حد ہیجانی خوشی میں لپٹا ہوا انتظار تھا۔ لیکن اسے اپنا ہیجان چھپائے رکھنا تھا۔ کیونکہ اس کے دل میں چور تھا۔ اس کے لیے یہ تصور ہی بے حد سنسنی خیز تھا کہ چھوٹا ٹھاکر نیچے آئے گا..... گھر کے فرد کی طرح۔ وہ اسے دیکھ سکے گی۔ اس کی باتیں سن سکے گی۔ اس سے باتیں کر سکے گی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے حجاب آئے گا۔ وہ اس کے سامنے شاید چند لمحوں سے زیادہ نہیں بیٹھ سکے گی اور شاید اس کے روبرو اس کی زبان بھی نہ کھلے۔ بہرحال وہ دور سے سہی، چپکے چپکے اسے دیکھتی تو رہے گی، اس کی باتیں سنتی تو رہے گی۔ اس کے لیے یہ چھوٹی سی معصوم سی خوشی بھی بہت بڑی تھی۔ اس سے آگے، اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے، یہ اسے معلوم ہی نہیں تھا۔

خوشی گلنار کو بھی اتنی ہی تھی۔ مگر اسے کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ اسے چھپائے۔ وہ کھل کر اس کا اظہار کر رہی تھی۔ بھائی اس کے لیے ایسی نعمت تھا، جس کی اسے بچپن سے آرزو تھی۔ لیکن پھر اس نے اس پر صبر کر لیا تھا۔ یہ تسلیم کر لیا تھا کہ یہ نعمت اس کے نصیب میں ہے ہی نہیں۔ اب اسے بیٹھے بٹھائے ایک بھائی مل رہا تھا تو اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ تو ہر لمحے اس کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ گھر میں وہ واحد ہستی تھی، جسے چھوٹے ٹھاکر کی آمد کے تصور سے کوئی خوف نہیں تھا۔ صرف خوشی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ خود اوپر جاتی اور چھوٹے ٹھاکر کا ہاتھ تھام کر کہتی..... ٹھاکر بھیا، آؤ میرے ساتھ گھر چلو۔

اور نور بانو تھی، جسے ماں پر افسوس ہو رہا تھا۔ وہ حیران تھی کہ اماں نے اتنی بڑی بات کہہ کیسے دی۔ اب وہ چھوٹا ٹھاکر نیچے آئے گا..... اور وہ اس کے سامنے نہیں آئے گی، تو اماں کی بات جائے گی۔ انھیں شرمندگی ہوگی اور وہ ٹھاکر اس کے بارے میں کیا سوچے گا..... یہ کہ وہ کتنی

نافرمان ہے۔ ماں کی بات نہیں مانتی۔ لیکن اللہ کے حکم کے سامنے وہ کسی سے کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتی تھی ..... کسی کا لحاظ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا فیصلہ اٹل تھا۔

اس روز ان سب کا عجیب حال تھا۔ ان کے کان زینے کے بغلی دروازے پر لگے تھے۔ شام کے وقت اس دروازے پر دستک ہوئی۔ سب کے دل دھڑک اٹھے۔ چھمن بوا دروازہ کھولنے چلی گئیں۔

مگر آنے والی رنجنا تھی!

رنجنا نے کچھ دیر ان لوگوں سے باتیں کیں۔ پھر وہ چلی گئی۔

رات ہوگئی۔ سرفراز بیگم کی اعصابی کشیدگی کا یہ حال تھا کہ اس روز انھیں چھوٹے ٹھاکر کے لیے آلو پالک میتھی کی بھجیا بھجوانے کا خیال بھی نہیں آیا، جس کے بارے میں وہ جانتی تھیں کہ وہ بہت شوق سے کھاتا ہے۔

اگلا دن پچھلے دن سے زیادہ سخت تھا۔ گھر کی فضا کشیدہ تھی۔ نور بانو نے خود کو بہنوں سے الگ تھلگ کر لیا تھا۔ زیادہ بات تو وہ ویسے بھی نہیں کرتی تھی۔ لیکن اس روز تو وہ ماں سے بھی ہم کلام نہیں ہوئی۔ انھوں نے کچھ پوچھا تو اس نے جواب دے دیا۔ اس کی ناراضی ایک کھلی ہوئی بات تھی۔

ویسے اس روز انھیں یقین تھا کہ چھوٹا ٹھاکر نیچے ضرور آئے گا۔ لیکن اس روز تو دروازے پر کوئی دستک ہی نہیں ہوئی۔

شام کو گلنار سرفراز بیگم کے پاس آ بیٹھی۔ ''اماں..... ٹھاکر بھیا آئے کیوں نہیں؟''

سرفراز بیگم کو اس پر پیار آ گیا۔ ان کے جوڑے ہوئے اس رشتے کے حوالے سے وہ بھائی کے لیے کیسے تڑپ رہی تھی۔ ''اب مجھے کیا پتا بیٹا۔ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔''

''کہیں انھوں نے ہماری بحث تو نہیں سن لی اماں؟''

سرفراز بیگم نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ تینوں بہنوں کے درمیان ڈیڑھ ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔ یعنی وہ حور بانو سے تین سال اور نور بانو سے ڈیڑھ سال چھوٹی تھی۔ مگر کہتے ہیں نا کہ گھر کا سب سے چھوٹا بچہ ہمیشہ چھوٹا ہی رہتا ہے۔ تو وہ اتنی بڑی ہو کر بھی چھوٹی سی بچی ہی تھی۔ ''اے ہے گلنار، کیا بولا گئی ہو۔ نیچے کمرے میں ہونے والی بات اوپر والے کیسے سن سکتے ہیں۔'' انھوں نے کہا۔

''تو پھر وہ کیوں نہیں آئے اماں؟''

''اب یہ تو مجھے نہیں معلوم۔''

''تو آپ خود انھیں بلا لیں نا۔''

''نہیں بیٹا۔ مجھے اس سے جو کہنا تھا، وہ میں کہہ چکی۔ اور اس پر شرمندہ بھی ہوں۔ اب

غلطی نہیں کروں گی۔''

''آپی بہت خراب ہیں اماں۔'' گلنار کے لہجے میں سختی تھی۔

''ایسا مت کہو گلنار۔ حور بانو نے جو کہا، وہ بالکل درست تھا۔''

تیسرے دن دوپہر کے وقت اچانک سرفراز بیگم کی شرمندگی اور ہر خوف مٹ گیا۔ مامتا کے سوا کچھ نہیں رہا۔ دو دن ہو گئے۔ میں نے بچے کی خبر تک نہیں لی۔ انھوں نے سوچا اور چھوٹے ٹھاکر سے ملنے کو بے تاب ہو گئیں۔

''میں ذرا اوپر جا رہی ہوں۔'' انھوں نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

❀......❀......❀
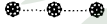
اوتار سنگھ خود پر جبر کیے بیٹھا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ بلانے پر بھی نیچے نہیں جائے گا۔ اس کے لیے دھیان بٹانا کچھ مشکل بھی نہیں تھا۔ ایک ایسا مسئلہ تھا، جس پر وہ اکثر سوچتا رہتا تھا۔

جے پور میں جو کچھ ہوا تھا، وہ اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ اخبار میں ٹھاکروں کی گڑھی کی لال آندھی میں تباہی کی خبر تو چھپی تھی۔ لیکن جے پور والوں کے حملے کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ البتہ اس نے اپنے گاؤں میں حویلی کے سامنے اور حویلی کے احاطے میں ان حملہ آوروں کی لاشیں دیکھی تھیں۔ اس کا اندازہ تھا کہ ان کی تعداد سو سے اوپر ہی ہوگی۔ اسے حیرت تھی کہ کسی شہر کے اتنے آدمی کہیں مارے جائیں اور ہلچل بھی نہ مچے، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بہرحال اس نے مناسب یہی سمجھا تھا کہ کسی سے ان واقعات کا تذکرہ نہ کرے۔

اب کچھ ہی دنوں میں امتحان کا رزلٹ آنے والا تھا۔ اس کے بعد کالج کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا۔ کالج جانے پر اس کی ملاقات ارجن سے ہونی تھی۔ وہ اس وقفے سے ڈر بھی رہا تھا اور اس کا سامنا بھی کرنا چاہتا تھا۔ ارجن سے ملاقات پر سب کچھ واضح ہو جاتا۔

اس وقت بھی وہ اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ نیچے سے بڑی بیگم آ گئیں۔ انھوں نے آ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور دعا دی۔

''ماں جی، کیسی ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں چھوٹے ٹھاکر۔ اللہ کا شکر ہے۔''

اوتار سنگھ کو ان کا جواب بہت اچھا لگا۔ لیکن چھوٹے ٹھاکر کہہ کر پکارا جانا اچھا نہیں لگا۔

''آپ مجھے بیٹا کہتی ہیں ماں جی اور چھوٹے ٹھاکر کہہ کر پکارتی ہیں۔'' اس نے بڑے ادب سے اعتراض کیا۔ ''مجھے اچھا نہیں لگتا ماں جی۔''

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے خیال نہیں کیا اور تمھیں یہ تکلیف پہنچی۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔'' سرفراز بیگم نے کہا۔ ''اچھا، یہ بتاؤ، تمھاری ماں تمھیں کیسے پکارتی تھی؟''

''ماتا جی!'' اوتار سنگھ نے کہا اور چند لمحوں کے لیے ماتا جی کی یاد میں کھو گیا۔ بہت

عرصے کے بعد اس نے انھیں اس طرح یاد کیا تھا۔ ان کی صورت اس کی نگاہوں میں پھر گئی۔ ''ماتا جی مجھے پتر کہہ کر بلاتی تھیں۔ کبھی میرے چھوٹے ٹھاکر بھی کہتی تھیں۔''

''تب تو تمھیں میرا چھوٹے ٹھاکر کہنا برا نہیں لگنا چاہیے تھا۔''

''دیکھیں ناماں جی، ایک فرق ہے۔ ماتا جی کی زبان، ان کی بولی اور تھی۔ وہ تو پتا جی کو بھی ٹھاکر جی کہہ کر پکارتی تھیں۔''

''میں سمجھ گئی۔ میں تمھیں چھوٹے ٹھاکر کہوں تو تمھیں اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔''

''جی ماں جی، یہی بات ہے۔''

''اچھا۔ مجھے بتاؤ تو، تمہاری ماتا جی کیسی تھیں؟''

''لفظ ماں تو اچھائی کی، بڑائی کی، محبت کی ضمانت ہے ماں جی۔'' اوتار سنگھ نے سادگی سے کہا۔

سرفراز بیگم اس کے جواب کی گہرائی سے حیران ہوگئیں۔ انھیں احساس ہوگیا کہ وہ بہت حساس، ذہین اور سوچنے والا لڑکا ہے۔

''ماتا جی مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ میں ان کے لیے بھگوان کا سب سے بڑا تحفہ ہوں۔'' اوتار سنگھ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ پھر اس نے بتایا کہ وہ کس طرح منتوں مرادوں کا بیٹا تھا۔ ماتا جی کے بیاہ کے برسوں بعد اس وقت پیدا ہوا تھا، جب ماتا جی اولاد کی طرف سے مایوس ہو بیٹھی تھیں۔ وہ خوب باتیں کرتا رہا۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ ماتا جی کے متعلق بات کرنے کو ترسا ہوا تھا۔ کبھی کسی نے اس موضوع پر بات ہی نہیں کی تھی کہ ایسا موقع ملتا۔ اب موقع ملا تھا تو اسے ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ ''ماتا جی میرے لیے اپنے ہاتھ سے کھانا بناتی تھیں۔ میرا ہر کام خود کرتی تھیں۔ کسی کو نہیں کرنے دیتی تھیں۔''

''تمھیں تو ان کے انتقال کا بہت دکھ ہوا ہوگا؟''

''بہت زیادہ ماں جی، بہت زیادہ۔ پہلے تو لگا کہ میں بھی مر جاؤں گا۔ پھر جیسے آہستہ آہستہ زخم ٹھیک ہوتا جاتا ہے، میں انھیں بھولنے لگا۔ مجھے اس پر افسوس ہوا کہ میں اتنی اچھی ماتا جی کو اتنی آسانی سے بھول گیا......''

''اللہ آدمی کو صبر دیتا ہے بیٹے۔ ورنہ آدمی کسی محبت کرنے والے کو کھو کر مر جائے۔'' سرفراز بیگم نے کہا۔

''تبھی تو پہلی بار میری سمجھ میں یہ بات آئی تھی۔'' اوتار سنگھ بولا۔

''کون سی بات؟'' سرفراز بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی کہ اوپر والا اپنی مخلوق سے بہت محبت کرتا ہے۔ آدمی کو زخم لگتا ہے تو زخم پر مرہم وہی رکھتا ہے۔''

سرفراز بیگم کی حیرت اور بڑھ گئی۔ ''تمہاری ماتا جی کا انتقال کب ہوا تھا؟'' انھوں نے پوچھا۔

''پانچ سال ہو چکے ہیں۔''

''اتنے عرصے سے تم ماں سے محروم ہو۔'' سرفراز بیگم نے تاسف سے کہا۔

''نہیں ماں جی۔ میں اس معاملے میں بہت خوش نصیب ہوں۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''میں پیدا ہوا تو میری ایک ماں تھی۔ لیکن تین دن بعد مجھے دوسری ماں بھی مل گئی۔''

''دوسری ماں! وہ کیسے؟''

''میرے ویر جی تھے نا، ان کی ماں میری دوسری ماں تھیں ... تھیں نہیں، ہیں۔''

''ویر جی تم وصال دین کو ہی کہتے تھے نا؟''

''جی ماں جی۔ وہ سچ مچ میرے بھائی تھے۔'' اوتار سنگھ وصال دین کے تذکرے پر اداس ہوگیا۔

''تو وہ تو مسلمان تھا۔'' سرفراز بیگم کے لہجے میں شاک تھا۔ ''تو کیا تمھارے پتا جی نے......''

ایک ثانیے میں اوتار سنگھ کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ کیا سمجھ رہی ہیں۔ اسے افسوس ہوا، اس نے بات ہی ایسے پیرائے میں کہی تھی۔ ''نہیں ماں جی...... ایسا سوچیے گا بھی نہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''ماں جی، سچی محبت کا رشتہ اوپر والا بناتا ہے۔ وہ دلوں میں محبت ڈالتا ہے۔ ایسے رشتے نہ کبھی ٹوٹتے ہیں، نہ خراب ہوتے ہیں۔ پتا جی نے مجھے بتایا تھا کہ میری زبان سے جو پہلا لفظ ادا ہوا، وہ اماں تھا۔ اماں کہہ کر ہی میں نے بولنا سیکھا تھا۔''

''حیرت کی بات ہے۔'' سرفراز بیگم کے لہجے میں بھی بے پناہ حیرت تھی۔

اوتار سنگھ بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ باتوں باتوں میں بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ ایک پل میں اس نے سمجھ لیا کہ ماں جی کیا سوچ رہی ہیں اور جو کچھ بھی سوچ رہی تھیں، وہ غیر فطری نہیں تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ اس کے پتا جی بڑے زمین دار تھے...... گاؤں کے مالک۔ اور جاگیردار کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ تو گویا انھوں نے...... اماں...... اس سے آگے اس سے سوچا بھی نہیں گیا۔ اس کے مرے ہوئے باپ کی کردار کشی ہو رہی تھی۔ یہی نہیں، اماں کی پاک دامنی پر حرف آ رہا تھا۔ اسے یہ سب نہیں ہونے دینا تھا۔ روکنا تھا۔

پچھلی بار گرمیوں کی چھٹیوں میں پتا جی نے اسے ایک راز کی بات بتائی تھی اور کہا تھا کہ وہ کبھی یہ بات کسی سے نہ کہے۔ ''میں تمھیں صرف اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم بے خبر نہ رہو۔ بے خبری میں کوئی گستاخی نہ کر بیٹھو۔ حمیدہ بہن تمہاری ماتا جی کی طرح ہے......''

لیکن اب اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ اسے وہ بات ماتا جی کو بتانا پڑے گی۔ ''ماں جی، میں

آپ کو ایک راز کی بات بتا رہا ہوں۔ کسی سے کہیے گا نہیں۔"

سرفراز بیگم سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ جیسے خود کو کسی بڑے دھماکے کے لیے تیار کر رہی ہوں۔

اوتار سنگھ نے جو کچھ پتا جی سے سنا تھا، وہ انھیں بتا دیا۔ وہ حیرت سے منہ کھولے سنتی رہیں۔

سب کچھ سننے کے بعد چند لمحے تو وہ سناٹے کی سی کیفیت میں بیٹھی رہیں۔ پھر انھوں نے کہا۔ "کیسی حیرت انگیز اور ناقابل یقین بات ہے۔ میں نے سنا ہے کہ راجپوت اپنے خون میں ملاوٹ کسی طرح گوارا نہیں کرتے۔"

"بالکل ٹھیک ہے ماں جی۔ لیکن میں کچھ بھی نہیں لے رہا تھا اور رو رو کر الگ توانائی ختم کر رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے اور اب میرے پیٹ میں کچھ نہیں گیا تو میں مر جاؤں گا۔ اور میں شاید بیس برس کی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا بچہ تھا۔ پتا جی کو ہار ماننا پڑی۔" اوتار سنگھ نے کچھ توقف کیا۔ پھر بولا۔ "اس بات کا علم میرے ماتا پتا اور ویر جی کے ماں باپ کے سوا کسی کو نہیں تھا اور پتا جی نے اس کے بعد اماں، چاچا جی اور ویر جی کو اتنی عزت دی کہ اپنے کسی رشتے دار کو بھی نہیں دی تھی۔ اماں کو وہ حمیدہ بہن کہتے تھے اور اس عزت کی خاطر ہی انھوں نے یہ راز مجھے بتایا۔ انھوں نے کہا تھا، حمیدہ بہن تمہاری ماں ہے۔ اسے ماتا سمان سمجھنا۔ کبھی گستاخی نہ کرنا۔"

سرفراز بیگم نے جو کچھ سنا تھا، اسے ہضم کرنے، ترتیب دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ چند لمحے بعد انھوں نے کہا۔ "تمھارے پتا جی بلاشبہ بڑے آدمی تھے۔ احسان ماننا بڑی بات ہے۔ اللہ کو بہت پسند ہے۔"

اوتار سنگھ نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے ایک غلط تاثر زائل کر دیا تھا۔

"تو اب تم دوسری ماں سے بھی محروم ہو گئے۔" سرفراز بیگم نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "لیکن اللہ نے تمھیں ایک اور ماں دے دی۔"

"نہیں ماں جی، اماں زندہ ہیں۔ اماں مجھے چھوڑ کر نہیں گئیں۔" اوتار سنگھ نے تڑپ کر کہا۔ "اب بھی میری دو مائیں ہیں۔"

سرفراز بیگم نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ "پورا گاؤں ختم ہو گیا۔ آس پاس کا کوئی گاؤں نہیں بچا۔ پھر تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو۔"

"مجھے معلوم ہے ماں جی۔ میں ان سے......" اوتار سنگھ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے بروقت احساس ہو گیا کہ وہ ایک اور راز فاش کرنے جا رہا تھا۔ "میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ ان کی موجودگی محسوس کر سکتا ہوں۔" اس نے جلدی سے بات بدل دی۔ پھر اس نے وہ سچی بات کہہ دی، جو وہ کہہ سکتا تھا۔ "اور اماں جب آخری بار مجھ سے ملی تھیں تو انھوں نے مجھ سے انشاء اللہ کہہ کر

وعدہ کیا تھا کہ میں تعلیم مکمل کر کے واپس آؤں گا تو وہ مجھے ملیں گی۔ وہ اللہ پر بہت بھروسہ کرتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ ان کے وعدے کی شرم رکھے گا۔"

سرفراز بیگم نے ہمدردانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ انھیں یقین ہو گیا کہ وہ اپنی اماں سے بے حد محبت کرتا ہے...... غیر معمولی محبت! اس کے پتا جی بھی اس گاؤں میں تھے اور اماں بھی۔ اس نے باپ کی موت کو تو تسلیم کر لیا۔ لیکن اماں کی موت کو تسلیم نہیں کرتا۔ حالانکہ دونوں کے امکانات ایک جیسے تھے۔ خیر...... ان کے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ اس کی یہ امید توڑ دیں۔ انھوں نے آہستہ سے کہا۔ "جو اللہ کرے گا، اسی میں تمہاری بہتری ہوگی بیٹے۔"

"جی ماں جی۔ مجھے بھی اس بات کا یقین ہے۔"

❁......❁......❁

سرفراز بیگم اس بار نیچے آئیں تو سوچنے کا بہت سامان لے کر آئی تھیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اوتار سنگھ ان کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔ انھوں نے بچیوں سے تو کچھ نہیں کہا۔ لیکن جب بھی وہ فرصت میں ہوتیں، اسی کے بارے میں سوچنے لگتیں۔

کیسی ناقابل یقین کہانی تھی...... پریوں کی کہانی! برسوں کی دعاؤں، منتوں اور مرادوں کے بعد ایک راجپوت جاگیردار کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ اس کی ماں کے دسترخوان پر دودھ کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن وہ ماں کا دودھ قبول نہیں کرتا۔ پھر وہ بے زبان بچہ دودھ مانگتا ہے تو ایک مسلمان عورت کا۔ اور ہندوؤں کے اس گاؤں میں وہ واحد مسلمان گھرانہ ہے۔ راجپوتوں کی آن یہ گوارا نہیں کرتی کہ بچہ ان کا ہو اور اسے دودھ کوئی اور پلائے۔ چلو وہ کسی عام ہندو عورت کا دودھ طلب کرتا تو بھی ماننے والی بات تھی۔ لیکن وہ تو ایک مسلمان عورت کا دودھ مانگ رہا ہے۔ مسلمان، جسے عام ہندو بھی ملچھ کہتے ہیں۔ راجپوت یہ کیسے گوارا کرے۔

لیکن وہ بچہ بھی تو راجپوت ہے۔ ننھا سا بچہ اور ایسی ضد کہ زبردستی بھی اس کے منہ میں کچھ نہیں ڈالا جا سکتا۔ وہ رو رو کر ہلکان ہوا جا رہا ہے، سست روی سے موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ تین دن ہو گئے ہیں اور اس کے منہ میں کھیل بھی اڑ کر نہیں گئی۔ اس ماں پر کیا گزر رہی ہوگی، جو بیس برس سے بچے کو ترس رہی تھی۔ اب اس کی آرزو پوری ہوئی ہے۔ اس کے پاس بچہ بھی ہے اور دودھ بھی۔ لیکن بچہ اس کا دودھ قبول نہیں کر رہا ہے۔ یہ کیسی توہین ہے مامتا کی کہ دودھ میں کوئی خرابی نہیں۔ لیکن بچہ کسی اور کا دودھ مانگ رہا ہے...... وہ بھی ایک مسلمان عورت کا۔

آخر مامتا جیت جاتی ہے۔ ماں کو اپنا بچہ چاہیے۔ چاہے وہ کسی کا دودھ پیے۔ چاہے وہ اس کی مامتا کی توہین کرے۔ بس وہ زندہ رہے۔ چاہے وہ اسے ماں بھی نہ کہے۔ یہ حوصلہ اور یہ ظرف اللہ نے صرف ماں کو دیا ہے۔

ماں بچے کی زندگی بچانے کے لیے اپنی مامتا میں شراکت برداشت کر لیتی ہے۔ اس کا

بچہ چاہے اس کا نہ رہے، لیکن زندہ رہے۔ لیکن راجپوت باپ مزاحمت کرتا ہے۔ مگر کب تک۔ بچے کی زندگی اور موت کا سوال سامنے ہو تو وہ کچھ نہیں کرسکتا۔

راجپوت اپنی جان دے سکتا ہے، آن نہیں گنوا سکتا۔ چنانچہ بچے کی ضد پوری کی گئی...... لیکن رازداری کے ساتھ۔ دونوں فریقوں کے سوا کسی کو کچھ پتا نہ چلے۔ اسے اور اس کے بچے کو کوئی طعنہ نہ سننا پڑے۔

وہ پریوں کی کہانی لگتی تھی۔ لیکن سرفراز بیگم جانتی تھیں کہ وہ حقیقت ہے اور اس کی مدد سے وہ بہت کچھ سمجھ رہی تھیں۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ چھوٹے ٹھاکر کا باپ بڑا انسان تھا۔ ویسے تو اسے رنجنا بھی بتاتی رہی تھی کہ بڑے ٹھاکر میں جاگیرداروں والی کوئی بات نہیں تھی۔ نہ وہ رعونت اور غرور نہ وہ جاگیرداروں والے شوق۔ لیکن اب جو بات سامنے آئی تھی، وہ بڑے لوگوں والی تھی۔ وہ یقیناً بہت اچھا انسان تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنا مطلب پورا کرانے کے بعد اس پورے گھرانے کو قتل کرا دیتا...... اپنا راز رکھنے کے لیے۔ لیکن نہیں۔ اس نے یہ سمجھا کہ دودھ پلوانا اس کی مجبوری ہے اور دودھ پلانے والی کا اس پر اور بچے پر احسان ہے۔ اس کے صلے میں اس نے عزت دی۔ بلکہ اسے دودھ پلانے والی کی عزت کا اتنا خیال تھا کہ اس کی وجہ سے اس نے اپنے بیٹے کو بھی اس راز سے آگاہ کر دیا اور اس عورت کی ماں جیسی عزت کرنے کی تلقین بھی کی۔

اور یہ چھوٹا ٹھاکر اسی باپ کا بیٹا تھا!

پھر سرفراز بیگم نے ایک اور زاویے سے سوچا۔ اللہ کے بھید اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن ایک نوزائیدہ بچے کا اس طرح کی ضد کرنا ایک بہت غیر معمولی بات ہے۔ اور یہی نہیں، اس بچے نے وہ ضد پوری بھی کرائی۔ اب نور بانو کے کہنے کے مطابق وہ عربی پڑھتا ہے، قرآن سنتا ہے تو اس میں حیرت کی بات نہیں۔ جس بچے نے مسلمان عورت کا دودھ پیا ہو، اٹھارہ سال اس عورت سے ماں جیسی محبت کی ہو، وہ ایسا کرسکتا ہے۔ کہتے ہیں، دودھ کی بڑی اہمیت ہے۔ شخصیت کی تعمیر دودھ کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ عربوں میں تو اس بات کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔

ان کے دل میں چھوٹے ٹھاکر کی محبت اور بڑھ گئی۔ ان کا جی چاہا کہ نور بانو سے سختی سے کہیں کہ اسے آئندہ کبھی مشرک نہ کہے کیونکہ ان کا دل کہتا ہے کہ ایک دن وہ اللہ پر ایمان لائے گا۔ لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتی تھیں۔ یہ دودھ والی دلیل کوئی سند نہیں تھی۔

❀......❀......❀
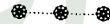
حور بانو کی ان دنوں عجیب کیفیت تھی۔ وہ ہر وقت غصے اور جھنجلاہٹ کا شکار رہتی۔ بلکہ اسے چڑچڑا پن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ کوئی بہت محبوب شے ملتے ملتے دور ہو جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ آدمی اس پر اپنا ردِعمل بھی ظاہر نہ کر پائے۔

اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب چھوٹا ٹھاکر نیچے آیا کرے گا۔ اس یقین نے اسے تصور کی

دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ وہ سوچتی رہی تھی کہ وہ نیچے آئے گا تو وہ کیا کیا کرے گی۔ وہ شرم و حیا والی باپردہ لڑکی تھی۔ اس کے دل میں معصوم سی خواہشیں تھیں۔ وہ اماں کی طرح بیٹھ کر اس سے بات تو نہیں کر سکتی تھی۔ دل چاہنے کے باوجود بھی نہیں کرسکتی تھی۔ پھر بھی چھوٹے ٹھاکر کا اپنے گھر کی طرح نیچے آنا جانا اس کے لیے ایک ایسی نعمت تھا، جسے مانگنے کا اس نے تصور تک نہیں کیا تھا اور وہ نعمت اسے بن مانگے مل رہی تھی۔

جس روز اماں نے انھیں یہ بات بتائی اور اس سے پردہ نہ کرنے کو کہا، وہ پورے دن تصور میں کھوئی رہی کہ وہ کیا کیا کرے گی۔ مگر ابتدا ہی میں اسے کئی بہت عجیب جھٹکے لگے۔ ایسی دشواریاں سامنے آئیں، جن کے بارے میں اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

چھوٹا ٹھاکر اماں کے پاس بیٹھا ان سے باتیں کر رہا ہے۔ وہ سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے اس کے پاس جاتی ہے۔ ''السلام علیکم......''

اسے پہلا جھٹکا لگا۔ ارے...... وہ تو ہندو ہے۔ وہ اسے سلام نہیں کرسکتیں۔ دور سے نور بانو کی مشتعل نگاہیں اس کے جسم میں چبھ رہی ہیں۔ اب وہ کیا کرے......؟

وہ تیزی سے کچھ سوچنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہاں...... یہ ٹھیک رہے گا۔ ''کیسے ہیں آپ......''

یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں اسے مخاطب کیسے کروں گی؟ امی نے اسے بیٹا بنایا ہے تو اس رشتے سے اسے بھائی کہنا چاہیے۔ لیکن صرف بھائی یا بھیا کہنے کا کوئی سوال نہیں۔ یہ وہ کیسے گوارا کرسکتی ہے اور اس کا نام اسے معلوم نہیں۔ ہاں...... وہ چھوٹے ٹھاکر کہلاتا ہے۔

''کیسے ہیں آپ چھوٹے ٹھاکر بھائی......؟'' وہ کہتی ہے۔

لیکن یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ طویل بھی ہے۔ اس سے اوپری پن جھلکتا ہے۔

''کیسے ہیں آپ چھوٹے ٹھاکر بھیا......؟'' وہ ترمیم کرتی ہے۔

یہ کچھ بہتر ہے۔ اس میں روانی ہے۔ لیکن اچھا اب بھی نہیں لگ رہا ہے۔ ایک لفظ کم ہونا چاہیے...... اس سرے سے یا اس سرے سے۔

''ٹھاکر بھیا......''

نہیں۔ یہ بھی نہیں۔

''آپ کیسے ہیں چھوٹے ٹھاکر؟''

یہ اسے اچھا لگا۔ بس یہ ٹھیک ہے۔ اس میں وہ بھی خوش ہے اور کسی کو کوئی اعتراض بھی نہیں ہوگا۔

چھوٹا ٹھاکر سر اٹھا کر اسے دیکھتا ہے...... آنکھوں میں سوال ہے۔ ''یہ میری بڑی بیٹی ہے...... حور بانو'' اماں جلدی سے تعارف کراتی ہیں۔

''جی..... میں ٹھیک ہوں۔'' چھوٹا ٹھاکر کہتا ہے۔

''چائے لاؤں آپ کے لیے؟'' وہ اس سے پوچھتی ہے۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ چائے تو تمھیں بغیر پوچھے لانی چاہیے تھی۔'' اماں بناوٹی خفگی سے کہتی ہیں۔

''میں نے سوچا، شاید یہ شربت پسند کریں۔''

''نہیں، چائے ہی ٹھیک ہے۔''

وہ باورچی خانے میں جاتی ہے، چائے بنا کر لاتی ہے اور اسے دیتی ہے۔ پھر وہ وہاں سے ہٹ جاتی ہے۔

اب وہ دور ایک کتاب لیے بیٹھی ہے اور چپکے چپکے اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے، وقت رک جائے، وہ یونہی سامنے بیٹھا رہے اور وہ چپکے چپکے اسے دیکھتی رہے۔

پھر اچانک وہ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کی چوری پکڑی جاتی ہے۔ وہ یوں گڑبڑاتی ہے کہ اسے نظریں جھکانے کا خیال بھی نہیں آتا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر وہ گھبرا کر کتاب پر جھک جاتی ہے۔

اس پورے دن وہ جاگتی آنکھوں اسی طرح کے خواب دیکھتی رہی۔ شام کو زینوں والے دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونکی۔ اس کا بس چلتا تو وہ دوڑ کر جاتی اور دروازہ کھول دیتی۔ بہرحال وہ خود کو سنبھالے بیٹھی رہی۔ لیکن اس کا دل سینے میں جیسے پھڑ پھڑا رہا تھا۔

مگر وہ چھوٹا ٹھاکر نہیں تھا۔ رنجنا تھی۔

رات ہوئی تو وہ مایوس ضرور تھی لیکن آس بہرحال نہیں ٹوٹی تھی۔

اگلے روز بھی وہی کچھ ہوا۔ مگر شدت پچھلے روز جیسی نہیں تھی۔ ہاں، رات ہونے پر مایوسی گزشتہ روز سے زیادہ تھی۔ اور آس کمزور ہو گئی تھی۔

تیسرے روز اسے نور بانو پر غصہ آنے لگا۔ نور بانو نے ہی ہنگامہ مچایا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر کو گھر میں نہیں آنا چاہیے......اور ان کا اس کے سامنے آنا کسی بھی طرح درست نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آواز اوپر گئی ہو اور چھوٹے ٹھاکر نے سن لیا ہو۔ اتنا کچھ سننے کے بعد وہ بھلا نیچے آ سکتا تھا اور کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

اس نے اماں سے بھی یہ بات کہی۔ لیکن اماں نے یہ ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ گفتگو اندر والے کمرے میں ہوئی تھی۔ اور وہاں کی آواز اوپر جانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بعد میں اس نے خود بھی غور کیا تو اسے تسلیم کرنا پڑا کہ اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔

کچھ بھی ہو، اس کے دل میں نور بانو کے لیے چڑ بیٹھ گئی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ نور بانو

نے غلط کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ اس نے جو کچھ کہا، ٹھیک کہا۔ لیکن دل کے معاملات تو خودکار ہوتے ہیں۔ وہ نور بانو سے کھنچ گئی۔ اس نے کچھ پوچھا تو مختصر سا جواب دے دیا۔

اس روز اماں خود اوپر گئیں اور جا کر بیٹھ ہی گئیں۔ دو گھنٹے بعد وہ واپس آئیں تو خوش نظر آ رہی تھیں۔ لیکن انھوں نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ کچھ بھی نہیں بتایا۔ حور بانو کو کچھ پوچھنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ دل میں چور جو تھا۔

لیکن اس بار وہ مایوس ہو گئی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ چھوٹا ٹھاکر کبھی نیچے نہیں آئے گا۔

❀......❀......❀

دو دن اور گزر گئے۔ سرفراز بیگم کو یقین ہو گیا کہ چھوٹا ٹھاکر نیچے نہیں آئے گا۔ وجہ انھیں نہیں معلوم تھی۔ انھیں تجسس بھی بہت تھا لیکن وجہ وہ اس سے پوچھنا نہیں چاہتی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے نیچے نہ آ کر ان کی غلطی کی تلافی کر دی تھی اور انھیں اللہ کے سامنے شرمندگی سے بچا لیا تھا۔ اب پوچھنے میں یہ ڈر بھی تھا کہ اس کے نیچے آنے کا راہ پھر نہ کھل جائے۔ یہ بات نہیں کہ وہ ایسا نہ چاہتی ہوں۔ دل تو ان کا اب بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ بیٹا بن کر نیچے آئے اور ان کے پاس بیٹھے اور باتیں کرے۔ لیکن ان کے منہ سے بچیوں کے پردہ نہ کرنے کی جو بات نکل گئی تھی، وہ اس پر پچھتا رہی تھیں۔

تیسرے دن انھوں نے بڑے اہتمام سے لوکی کا حلوہ بنایا اور چھمن بوا کے ہاتھ اوپر بھجوانے کے بجائے خود ہی لے گئیں۔ اس بار ان کے انداز میں حقیقی ماؤں والا اعتماد تھا۔ انھوں نے رنجنا سے پوچھا۔ ''چھوٹے ٹھاکر کہاں ہیں؟''

''اپنے کمرے میں ہیں بڑی بیگم۔'' رنجنا نے جواب دیا۔

وہ چھوٹے ٹھاکر کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ اسی لمحے وہ اپنے کمرے سے نکل آیا۔ اس نے ان کی آواز اور رنجنا کا جواب سن لیا تھا۔ ''آیئے ماں جی، کیسی ہیں آپ؟'' اس نے پوچھا اور دروازے سے ہٹ کر انھیں راستہ دیا۔

''ٹھیک ہوں بیٹے۔ تمھارے لیے لوکی کا حلوہ لائی ہوں۔'' انھوں نے اپنے ہاتھ سے چمچہ بھر حلوہ اسے کھلایا۔

''واہ ماں جی، بہت مزے کا ہے۔'' چھوٹے ٹھاکر نے چٹخارا لے کر کہا۔

''کیوں نہ ہو۔ تمھارے لیے بنایا ہے۔ اس میں محبت کا ذائقہ بھی ہے۔'' سرفراز بیگم بولیں۔ ''ہر روز تھوڑا سا کھایا کرو۔ یہ بہت فائدہ مند ہوتا ہے۔''

''شکریہ ماں جی۔ اچھا اب بیٹھیے تو۔ یہ بتائیں، کیا پئیں گی؟ چائے یا شربت؟''

سرفراز بیگم ایک لمحے کو ہچکچائیں۔ پھر انھوں نے کہا۔ ''چائے پی لوں گی۔''

چھوٹا ٹھاکر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ رنجنا حلوہ لے کر اندر چلی گئی۔ اسے چائے بھی بنانی

تھی۔

''اور سنائیں ماں جی، گھر میں سب ٹھیک ہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے بیٹے۔ سب ٹھیک ہیں۔''

چند لمحے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ مگر سرفراز بیگم کو اب بھی اس کے ماں باپ کے بارے میں تشنگی تھی۔ انھوں نے گفتگو کا رخ اسی طرف موڑ دیا۔ ''تم یہاں آئے تو تمہاری ماتا جی کا انتقال ہو چکا تھا؟''

''جی ماں جی۔ میں ماتا جی کے دیہانت کے چھ ماہ بعد یہاں آیا تھا۔''

''مجھے یہ بتاؤ، تمہاری ماتا جی کیسی تھیں؟''

''ماں کے بارے میں تو اتنا کہنا ہی کافی ہے ماں جی کہ وہ ماں ہے۔'' چھوٹے ٹھاکر نے سادگی سے کہا۔ ''اس کے بعد تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔''

کیسا خوبصورت اور سچا جواب ہے۔ سرفراز بیگم نے دل سے سوچا۔ پھر بولیں۔ ''تمہاری ماتا جی خوش نصیب تھیں کہ انھیں اتنے برسوں کے بعد ملا تو تم جیسا بیٹا ملا۔ کیسے خوش ہوتی ہوں گی وہ تمھیں دیکھ دیکھ کر۔''

''جی ماں جی۔ بہت خوش ہوتی تھیں۔ لیکن کبھی کبھی میں انھیں بہت پریشان کر دیتا تھا۔''

''یہ تو ذہانت کی دلیل ہے۔ اس میں پریشانی کیسی؟''

''ماتا جی سیدھی سادی دھرم کی پکی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں روزان کی طرح پوجا کیا کروں۔ میں یہ پوچھتا تھا کہ یہ پوجا کیوں کی جاتی ہے۔ بھگوان کون ہے؟ کیا سچ مچ ایسا ہے؟ کیا اسے دیکھا جا سکتا ہے...... وہ سامنے آتا ہے؟ اگر اسے کسی نے نہیں دیکھا تو اس کا بت کیسے بنا لیا؟ یہ بھگوان کیسا شکتی والا ہے کہ اپنے بت پر بیٹھی بدتمیز مکھی کو بھی نہیں اڑا سکتا...... سزا نہیں دے سکتا!''

سرفراز بیگم حیران تھیں۔ ان کے سامنے چھوٹے ٹھاکر کی شخصیت کا یہ نیا رخ آ رہا تھا۔ ایسا آدمی مشرک کیسے ہو سکتا ہے...... اور ہو بھی تو مشرک رہ تو نہیں سکتا۔ شاید اس لیے انھیں اس پر ایسا پیار آتا تھا۔

چھوٹا ٹھاکر ان کی کیفیات سے بے خبر اپنی دُھن میں بولے جا رہا تھا۔ ''ماتا جی کے پاس علم نہیں تھا۔ ان کے پاس میرے اعتراضات کے جواب نہیں تھے۔ وہ میرے سوالات پر جھنجلاتی تھیں۔ چڑتی تھیں...... کہتی تھیں، بس تم میری خوشی کے لیے پوجا کر لیا کرو۔ میں کہتا تھا، ماتا جی، میں آپ کو خوش کرنے کے لیے پوجا کروں گا تو وہ بھگوان کی پوجا تو نہیں ہوگی۔''

بات ٹھیک تھی۔ بندہ کسی انسان کو خوش کرنے کے لیے اللہ کی عبادت کرے تو اللہ اسے قبول نہیں کرتا۔ وہ اس سے خوش بھی نہیں ہوتا بلکہ ناراض ہوتا ہے۔ سرفراز بیگم نے سوچا۔ پھر بولیں۔ ''کچھ تو کہتی ہوں گی تمہاری ماتا جی؟''

''وہ کہتی تھیں، پرکھوں سے یہ پوجا چلی آ رہی ہے۔ ہمارے دادے پردادے اسی طرح پوجا کرتے رہے ہیں۔ تو ہم کیسے چھوڑ دیں؟''

سرفراز بیگم کو یاد آیا کہ قرآن پاک میں کئی جگہ اللہ نے لوگوں کے کفر کی یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ وہ لوگ دلیل میں اپنے آباو اجداد کے عمل کو پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، ہم ان دیوی دیوتاؤں کی پرستش کیسے چھوڑ دیں، جنھیں ہمارے آباو اجداد پوجتے آئے ہیں۔

''تو تمھیں اس میں کیا اعتراض تھا بیٹے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''دیکھیں ماں جی، انسان تو زندگی بھر غلطی کرتا رہتا ہے۔ ایک وقت میں وہ ایک نظریہ قائم کرتا ہے۔ آگے جا کر وہ غلط ثابت ہو جائے تو اس کی اصلاح کر لیتا ہے۔ جو غلط ثابت ہونے کے باوجود اس نظریے پر ڈٹا رہے، وہ جاہل ہوتا ہے۔ آدمی کے تسلیم نہ کرنے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔ اور آدمی کے تسلیم کرنے سے کوئی غلط بات درست نہیں ثابت ہوتی۔ میں ماتا جی سے کہتا تھا کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہمارے دادے پردادے غلطی پر ہوں۔ ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے۔ یہ سن کر ماتا جی کو غصہ آتا تھا۔ لیکن میری محبت میں وہ اسے پی جاتی تھیں۔ وہ مجھ سے خوشامد کرتی تھیں کہ بس میں ان کی خوشی کے لیے پوجا کر لیا کروں۔''

''تو پھر؟ تم کیا کرتے تھے؟''

''ماتا جی کی خاطر میں پوجا کر لیا کرتا تھا۔ جس روز ماتا جی کا دیہانت ہوا، پتا جی نے مجھے بلا کر کہا...... تمہاری ماتا جی کی حالت اچھی نہیں۔ بھگوان سے پرارتھنا کرو کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔ اس روز میں پہلی اور آخری بار اپنی مرضی سے ماتا جی کے کمرے میں گیا۔ میں نے پوجا کی اور بھگوان سے پرارتھنا کی کہ میری ماتا جی کو جیون دے دو۔ اسے مرنے نہ دو۔ میں پوجا کر کے نکلا تو پتا چلا کہ ماتا جی جا چکی ہیں۔ پھر میں آخری بار پوجا کے کمرے میں گیا۔ میں نے بھگوان سے کہا...... میں نے کبھی تجھے نہیں مانا۔ میں نہیں مانتا کہ تجھ میں کوئی شکتی ہے۔ تو تو خود کو بھی نہیں بچا سکتا۔ کسی اور کو کیا بچائے گا۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے تجھ سے کچھ مانگا۔ آج کے بعد تجھ سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ تجھ میں کوئی شکتی ہے تو مجھے شراپ ضرور دینا۔ میں تیرے شراپ کا انتظار کروں گا۔'' چھوٹے ٹھاکر نے گہری سانس لی۔ پھر دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا۔ ''اس دن کے بعد ماں جی میں نے کبھی پوجا نہیں کی۔''

وہ سب کچھ سننا اتنا غیر متوقع اور اثر انگیز تھا کہ سرفراز بیگم سن ہو کر رہ گئیں۔ چھوٹا ٹھاکر بھی خاموش ہو گیا تھا۔ سرفراز بیگم کچھ دیر اسی کیفیت میں بیٹھی رہیں۔ پھر انھوں نے کہا۔ ''تو تم اپنی ماتا جی کی موت کی وجہ سے بھگوان سے دور ہو گئے؟''

''نہیں ماں جی، یہ بات نہیں۔ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا، بھگوان دیوتاؤں کو کبھی مانا ہی نہیں۔ میری عقل نہیں مانتی تھی۔ وہ تو بس وقت پڑنے پر تنکے کے سہارے

والی بات تھی۔ ایسے میں آدمی کسی سے بھی امید لگا لیتا ہے۔'' چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ پھر انھیں غور سے دیکھا۔ ''ایسا تو آپ بھی کرتی ہوں گی۔''

''میں تو بھی سب کچھ اللہ سے مانگتی ہوں..... اور اس ایمان کے ساتھ مانگتی ہوں کہ وہ سب کچھ دے سکتا ہے۔ لیکن جانتی ہوں کہ اصل چیز اس کی مرضی ہے۔ وہ چاہے تو دے اور چاہے تو نہ دے۔ میں یہ بھی مانتی ہوں کہ وہ جو کچھ کرتا ہے، بہتر ہوتا ہے۔ میں مانگتی ہوں بھکاریوں کی طرح، غلاموں کی طرح..... عاجزی سے۔ میں اس سے شرطیں نہیں لگاتی۔''

چھوٹا ٹھاکر کچھ شرمندہ نظر آنے لگا۔ ''میں بھی اللہ سے شرطیں نہیں لگاتا ماں جی۔'' وہ بولا تو اس کے لہجے میں بھی شرمندگی تھی۔ ''وہ تو بھگوان کا معاملہ تھا۔ اس کے بارے میں جو کچھ بتایا جاتا ہے، میں نے اس پر کبھی یقین نہیں کیا۔ ویسے ماں جی، آپ نے بہت اچھی بات کہی۔ میں نے بھیک مانگنے والوں کو دیکھا ہے۔ اپنے جیسے انسانوں کے سامنے وہ ہاتھ پھیلاتے ہیں تو بھی عاجزی سے اور وہ بھیک نہ دے تو اس سے لڑتے نہیں۔ میری سمجھ میں ایک بات آ گئی ماں جی۔ اللہ سے مانگتے ہوئے تو ایسی عاجزی ہونی چاہیے، ایسی کہ.....'' اسے کوئی مثال نہیں سوجھ رہی تھی۔ ''بس میں سمجھ سکتا ہوں۔ بیان نہیں کر سکتا۔'' چند لمحے بعد اس نے بے بسی سے کہا۔ ''اور اکڑ تو ہونی ہی نہیں چاہیے۔''

''بالکل۔'' سرفراز بیگم نے جوش سے کہا۔ ''اور یاد رکھو۔ اللہ کو اپنے بندے کا کچھ مانگنا بہت اچھا لگتا ہے۔ بلکہ اللہ سے مانگنا ہی تو بندگی ہے۔ لہٰذا بندے کو چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ہر ضرورت کے لیے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلانا چاہیے۔ اللہ دعا ضرور قبول کرتا ہے۔ ہاں اس کی حیثیت نہ ہو تو دعا کا صلہ دنیا میں نہیں ملتا۔ لیکن دعا رائیگاں نہیں ہوتی۔ وہ یہاں نہ دے تو آخرت میں اور بڑھا کر دیتا ہے۔''

''آپ نے مجھے بہت بڑی، بہت کام کی بات بتائی ہے ماں جی۔ اب تو میں ہر چیز اللہ سے مانگوں گا۔ مگر یہ بتائیں کہ یہ آخرت کیا ہے۔''

یہ وہ لمحہ تھا کہ سرفراز بیگم کو جھٹکا لگا۔ اپنے جوش میں انھیں یہ خیال ہی نہیں رہا تھا کہ وہ یہ ساری باتیں ایک ہندو سے کر رہی ہیں اور لگتا بھی کیسے، وہ تو ایمان والوں کی طرح بول رہا تھا۔ اب انھیں اچانک احساس ہوا کہ وہ اللہ کا نام لے رہا ہے..... اور عقیدت اور احترام سے لے رہا ہے۔ وہ چند لمحے حیرت سے اسے دیکھتی رہیں۔ پھر بولیں۔ ''چھوٹے ٹھاکر، تم اللہ کو کیا جانو؟''

جواب میں چھوٹے ٹھاکر نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ''نہیں جانتا ماں جی۔ لیکن جب سے ہوش سنبھالا ہے، جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جستجو میں لگا ہوا ہوں۔ یہی تو مقصد ہے میری زندگی کا۔''

''لیکن اللہ! تمھیں تو بھگوان کہنا چاہیے تھا۔''

''نہیں ماں جی۔ میری عقل مجھے بتاتی ہے کہ یہ کائنات کا مربوط نظام ایک ہستی کا قائم کیا ہوا ہے۔ وہی اسے چلا رہا ہے۔ میں اسے کھوج رہا ہوں۔ مجھے اس کا نام بھی معلوم نہیں۔ لیکن یہ نام اللہ میرے دل کو اچھا لگا۔ اب میں اسے اللہ ہی کہتا ہوں۔'' چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس نے کچھ پوچھا تھا، جس کا جواب ماں جی نے اسے نہیں دیا ہے۔ ''ماں جی، یہ آخرت کیا ہے؟''

سرفراز بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔ بتائیں، نہ بتائیں۔ پھر انھوں نے سوچا کہ اس نے پوچھا ہے تو بتانا ان پر فرض ہے۔ ''یہ ہم مسلمانوں کے ایمان کا حصہ ہے۔ جسے اللہ نے پیدا کیا ہے، اسے مرنا بھی ہے۔ لیکن اللہ نے ایک دن مقرر کیا ہے، جس کا علم کسی کو نہیں۔ وہ دن آئے گا، جسے قیامت کہتے ہیں تو یہ دنیا ختم ہو جائے گی اور اللہ کے حکم سے تمام مردے جی اٹھیں گے۔ پھر ہر شخص کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ نیکیاں زیادہ ہوں گی تو جنت ملے گی۔ برے اعمال کے نتیجے میں دوزخ ملے گی۔ یہ آخرت ہے۔ اس کے بعد کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی ہے۔ اس میں جہنم نصیب ہو تو اللہ ہی اپنی رحمت سے نکالے تو نکالے۔''

خاموشی چھا گئی۔ چھوٹے ٹھاکر کے چہرے پر خوف تھا۔ اور وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ سرفراز بیگم اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

چند لمحوں کے بعد انھوں نے کہا۔ ''تم یہ سوچ رہے ہو نا کہ مرنے کے بعد اللہ آدمی کو کیسے زندہ کرے گا؟''

چھوٹا ٹھاکر بری طرح چونکا۔ ''نہیں ماں جی۔ یہ بات اللہ نے ہی بتائی ہے نا؟''

''ہاں۔ اللہ نے قرآن پاک میں خود یہ فرمایا ہے۔''

''تو پھر میں یہ کیسے سوچ سکتا ہوں۔'' چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ ''اللہ نے کہا ہے تو یہ ہو کر رہے گا۔ وہ تو مہان شکتی والا ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔''

سرفراز بیگم کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔ قرآن پاک میں اللہ نے بتایا ہے کہ اسی بات پر تو کافر سب سے زیادہ بحث کرتے تھے۔ ان کے خیال میں یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ اسی وجہ سے وہ اپنے کفر میں آگے بڑھتے گئے۔ وہ سوچ رہی تھیں، یہ کیسا مشرک ہے کہ اللہ کے کہنے پر ایسا یقین رکھتا ہے۔ یہ کیسی غیر معمولی بات ہے۔

''تو یہ بتاؤ کہ تم کس سوچ میں پڑ گئے ہو؟'' انھوں نے اس سے پوچھا۔

''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آخرت میں میرا کیا ہوگا؟ مجھے تو یہ معلوم ہی نہیں تھا۔ میں نے تو کچھ اچھا کام کیا ہی نہیں۔ اتنے برسوں سے تو میں بس کھوج میں لگا ہوا ہوں۔ کتنا وقت ضائع کر دیا میں نے۔'' چھوٹے ٹھاکر کے لہجے میں پریشانی تھی۔

سرفراز بیگم کو اس پر پیار آ گیا۔ ''حق کی تلاش میں صرف ہونے والا وقت ضائع نہیں

ہوتا۔ اسے تو اللہ کے ہاں عبادت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔'' انھوں نے اسے سمجھایا۔ ''اور ابھی تمہاری عمر کیا ہے۔ اچھے کام کرنے کو عمر پڑی ہے۔ اور برے تو تم ہو بھی نہیں۔''

''جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے ماں جی کہ ہر شخص کی موت کا وقت مقرر ہے اور صرف اللہ کو معلوم ہے۔ تب سے مجھے ہر وقت یہ خیال رہتا ہے۔ ایسا کوئی قانون نہیں کہ آدمی بوڑھا ہو کر ہی مرے۔ موت تو کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔ آدمی کو اپنا ہوم ورک ہر لمحے کرنا چاہیے۔''

سرفراز بیگم لرز کر رہ گئیں۔ ارے...... انھیں تو مسلمان ہو کر موت کا خیال بھی نہیں آتا۔ اور یہ مشرک جوان لڑکا آخرت کی فکر کر رہا ہے۔ نہیں، اسے تو مشرک کہا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ تو گناہ ہے۔ وہ دل میں توبہ کرنے لگیں۔

''اچھا بیٹے، میں چلتی ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

چھوٹا ٹھاکر بھی اٹھ گیا۔ اس نے سر جھکایا اور سرفراز بیگم نے بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

❁......❁......❁

اس روز ماں جی اسے سوچنے کے لیے بہت کچھ دے گئیں۔ آخرت! اب وہ اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔ ذہن کے وہ دریچے کھل رہے تھے، جن کی موجودگی کا اب تک اسے علم نہیں تھا۔

امتحان! امتحانوں کی وہ کیسی فکر کیا کرتا ہے! پاس ہونے کی کتنی اہمیت ہے اور فیل ہونے کا کتنا خوف ہے۔ مگر سب سے بڑے امتحان کی اسے کوئی فکر ہی نہیں تھی۔ اس میں فیل ہو گیا اور ہمیشہ کے لیے جہنم میں جا پڑا تو؟

مگر ابھی اسے جنت اور دوزخ کے بارے میں تفصیلی معلومات نہیں تھیں۔ اس لیے اس کا خوف بھی بڑا نہیں تھا۔

پھر بھی آخرت کی فکر اسے ستانے لگی۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ یہ جو اللہ نے دنیا بنائی ہے تو یہ کوئی کھیل تماشہ تو نہیں۔ ایسا نہیں کہ آدمی کو اللہ نے بے مقصد پیدا کیا ہو کہ وہ یہاں زندگی گزارے، کبھی روئے۔ کبھی خوشی سے سرشار ہو تو کبھی غم سے نڈھال۔ کبھی عیش میں گم ہو تو کبھی پریشان۔ اور وقت آنے پر مر جائے۔ کھیل ختم! اسے حیرت ہونے لگی کہ اس نے پہلے اس سلسلے میں کیوں نہیں سوچا۔ یہ تو بڑی اہم بات ہے۔ زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ہے نا۔ اور اب وہ مقصد سامنے آ گیا ہے۔ زندگی دراصل ایک امتحان ہے۔ اللہ نے انسان کو زندگی دی...... بے شمار نعمتوں کے ساتھ اور بتا دیا کہ یہ ایک امتحان ہے۔ پاس ہونے کا انعام ہے اور فیل ہونے کی سزا۔

اہم سوال یہ تھا کہ امتحان کیا ہے؟

جانوروں کو صرف جبلت دی گئی ہے، عقل نہیں۔ آدمی کو عقل دے کر تمام مخلوقات پر فوقیت دی گئی ہے۔ اسی عقل کی بنیاد پر امتحان ہے۔ اسی کی وجہ سے تو حساب لیا جائے گا۔ تبھی تو جزا اور سزا ہو گی۔

وہ مشاہدے کا آدمی تھا۔ اس نے دیکھا تھا، عام جانوروں کی جبلت میں احسان مندی تھی۔ کتے کو ایک بار روٹی کھلا دو۔ زندگی بھر تمھارے سامنے دم ہلاتا رہے گا۔ بلی کو ایک بار دودھ دے دو، بار بار تمہاری طرف آئے گی۔ یعنی ان کی احسان مندی شکر گزاری ہے۔ جس کتے کو آپ نے ایک بار کھانے کو کچھ دے دیا، وہ آپ کے ایک اشارے پر کچھ بھی کر دے گا۔ جان بھی دے دے گا۔

اور ایک آدمی ہے۔ جانتا ہے کہ اللہ نے اسے پیدا کیا۔ تمام جان داروں میں عزت عطا فرمائی۔ مرتبہ دیا۔ عقل جیسی نعمت دی۔ لیکن وہ اس کی وفاداری اور تابع داری نہیں کرتا۔ یعنی وہ ناشکرا اور احسان فراموش ہے۔ کیا یہ عقل کی وجہ سے ہے۔ اس لیے کہ جبلت اور فطرت تو احسان ماننا ہے۔ ہاں...... یہی بات ہے۔ عقل کی وجہ سے تو نہیں، ہاں عقل کو غلط استعمال کرنے کی وجہ سے ہے۔

تو امتحان تو سمجھ میں آ گیا۔ زندگی کا مقصد ہے پیدا کرنے والے کی بندگی۔ اس کا شکر ادا کرنا۔ اس کی اطاعت کرنا۔ اس کا حکم ماننا۔

اب سوال یہ تھا کہ وہ کیا کرتا رہا ہے۔ وہ جو اپنے پیدا کرنے والے سے سب سے بڑھ کر محبت کرنا چاہتا تھا، ابھی تک اس کے کھوج میں لگا تھا۔ اسے ڈھونڈ نہیں پایا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے احکامات کیا ہیں۔ وہ کن باتوں کا حکم دیتا ہے اور کن باتوں سے منع کرتا ہے۔ یہ سب اسے جاننا ہے۔ تبھی تو وہ امتحان دینے کے قابل ہو گا۔

اب وہ کیا کرے؟ اسے کیسے ڈھونڈے؟ اس کے بارے میں کیسے معلوم کرے؟ اب تک تو وہ اپنی عقل سے، اپنے اندر کی نشانیوں کی مدد سے اسے کھوجتا رہا ہے۔ لیکن ایسے تو کام نہیں چلے گا۔

اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اللہ کی کتابیں موجود ہیں۔ یہی سب سے اچھا اور معتبر ذریعہ ہے۔ لیکن قرآن کے بارے میں اسے خبردار کر دیا گیا تھا کہ اسے پاک ہوئے بغیر نہیں چھوا جا سکتا۔ البتہ بائبل کے بارے میں کسی نے ایسی کوئی شرط نہیں لگائی تھی۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بائبل پڑھے گا۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ بازار گیا اور کتابوں کی دکان سے ایک بائبل لے لی۔ پھر کچھ خیال آیا تو اس نے دکان دار سے کہا۔ ''مجھے جنت اور دوزخ کے موضوع پر کوئی اچھی اور جامع کتاب بھی چاہیے۔''

دکان دار نے کئی کتابیں نکال دیں۔ اس نے ان میں سے ایک کتاب منتخب کر لی۔ اب وہ مطالعے کے لیے تیار تھا!

❀.....❀.....❀

اس بار سرفراز بیگم ضبط نہیں کر سکیں۔ انھوں نے تینوں بچیوں کو اپنے پاس بٹھایا۔ ''میں تمھیں کسی بات پر مجبور نہیں کرنا چاہتی۔'' انھوں نے کہا۔ ''لیکن تمھیں بتانا ضروری سمجھتی ہوں۔''

وہ تینوں انھیں متوقع نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ نور بانو کے انداز میں چوکنا پن تھا۔

''میں تمھیں نصیحت کر رہی ہوں کہ چھوٹے ٹھاکر کو کبھی مشرک اور کافر نہ کہنا۔ بلکہ ایسا سوچنا بھی نہیں۔''

''ایسا تو صرف آپی ہی کہتی ہیں۔'' گلنار نے چیخ کر کہا۔

''آپ یہ نصیحت کس بنیاد پر کر رہی ہیں۔'' نور بانو نے معترضانہ لہجے میں پوچھا۔

سرفراز بیگم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی حور بانو بول اٹھی۔ ''صاف اور واضح حکم ہے کہ کافر کو بھی کافر نہ کہو۔ کسی بھی وقت اللہ کی ہدایت اسے نصیب ہو گئی تو وہ ایمان لے آئے گا۔ اور تمھیں شرمندگی ہو گی۔ تمھیں نہیں معلوم کہ کون ایمان پر مرے گا اور کون کفر پر۔''

''مجھے کسی کو کافر اور مشرک کہنے کا شوق نہیں ہے۔ نہ میں نے کبھی کہا تھا۔'' نور بانو نے نرم لہجے میں کہا۔ ''بات پردے کی تھی۔ نامحرم مومن ہو تو اس سے بھی پردے کا حکم ہے۔ جب چھوٹے ٹھاکر کو گھر میں بلانے اور اس سے پردہ ختم کرنے کی بات ہوئی تو مجھے مجبوراً اس انداز میں بات کرنی پڑی اور میں بھی اس پر قائم ہوں کہ جو میں نے کہا، درست تھا۔ اللہ کے حکم کے مطابق تھا۔''

''تم لوگوں نے آپس میں الجھنا شروع کر دیا۔'' سرفراز بیگم جھنجلا گئیں۔ ''میں نے تم لوگوں کی بھلائی کی خاطر تمھیں نصیحت کی تھی۔''

''میں پھر پوچھوں گی کہ آپ یہ نصیحت کس بنیاد پر کر رہی ہیں۔''

''جو کچھ میں نے چھوٹے ٹھاکر سے سنا ہے اور جتنا میں نے اسے سمجھا ہے، اس کی بنیاد پر تمھیں سمجھا رہی ہوں۔'' سرفراز بیگم بولیں۔ ''وہ تو حق کی جستجو کر رہا ہے۔ وہ اللہ کا نام لیتا ہے۔ اس نے کبھی بتوں کی پوجا نہیں کی۔''

''یہ تو وہ کہہ رہا ہے نا۔'' نور بانو نے حقارت سے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمھارا؟'' سرفراز بیگم نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

''میرا مطلب ہے کہ وہ آپ کے دل میں جگہ بنانے، آپ کے گھر میں گھسنے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ وہ پیدائشی ہندو ہے۔''

''تم نے حد کر دی ہے بدگمانی کی......'' حور بانو کو غصہ آ گیا۔

''تم لوگ آپس میں مت الجھو۔ مجھے بات کرنے دو۔'' سرفراز بیگم نے ہاتھ اٹھا کر حور

بانو کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''نور بانو، مجھے نہیں معلوم کہ تم یہ بدگمانی کس بنیاد پر کر رہی ہو۔ گھر میں گھسنا ہوتا تو وہ اب تک یہاں آ چکا ہوتا۔ خود میں نے اسے دعوت دی تھی۔ لیکن ایک ہفتہ ہو گیا اس بات کو اور وہ اب تک نہیں آیا۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ وہ آئے گا بھی نہیں......''

''یہ لوگ بڑے چالاک ہوتے ہیں اماں۔'' نور بانو اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی۔ ''وہ اپنا اچھا تاثر جمانا چاہتا ہے۔ وہ آپ سے اصرار کروانا چاہتا ہے......''

''اور میں اس سے اصرار کرتی۔ لیکن پچھلی بار تم لوگوں سے جو گفتگو ہوئی تو میں نے اس سے کہا بھی نہیں۔''

''اب دیکھ لیں۔'' نور بانو نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ''اسے تو نہیں معلوم کہ ہمارے درمیان کیا بات ہوئی ہے۔ اسے حیرت ہو گی کہ آپ نے دوبارہ اس سے آنے کو کیوں نہیں کہا اور وہ چاہتا ہے کہ آپ اس سے اصرار کریں۔''

نور بانو کی دلیل ایسی تھی کہ ایک لمحے کو تو سرفراز بیگم بھی ہل گئیں۔ پھر انھوں نے سنبھل کر کہا۔ ''میں اس سے ملی ہوں۔ میں نے گھنٹوں اس سے باتیں کی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ وہ نہ جھوٹا ہے نہ مکار۔ اور اس نے جو پوجا پاٹھ نہ کرنے کی بات کی ہے تو مجھے متاثر کرنے کی غرض سے نہیں کی۔ وہ تو ایک قدرتی عمل ہے۔ اللہ کی طرف سے ہے۔ جو تفصیل مجھے معلوم ہے، وہ تو میں نے تمھیں نہیں بتائی۔''

''مجھے سننی بھی نہیں ہے۔'' نور بانو نے بےزاری سے کہا۔

حور بانو اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ ''مجھے تو ایسا لگتا ہے نور کہ تمھیں چھوٹے ٹھاکر سے چڑ ہے۔'' وہ بولی۔ ''بتاؤ تو ایسا کیوں ہے؟''

''تمھارے دماغ کی خرابی ہے باجی۔'' نور بانو نے سرد لہجے میں کہا۔

''تم لوگ پھر الجھنے لگیں آپس میں۔'' سرفراز بیگم جھنجلا گئیں۔ ''سنو...... میرا کام سمجھانا تھا۔ میں نے تمھیں سمجھا دیا۔ اب کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو میں کیا کروں۔'' ان کے لہجے میں بےبسی تھی۔ ''اب تم جانو۔''

❀.....❀.....❀

اوتار سنگھ نے بائبل کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس مطالعے میں ارتکاز نہیں تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ اس دوران اسے مسلسل ابہام کا خیال ستاتا رہتا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ جم کر مطالعہ نہیں کر پاتا تھا۔ اس کا دھیان اچٹ جاتا تھا۔

ایسے ہی ایک موقعے پر اس نے دوسری کتاب کی ورق گردانی کی۔ اس میں اس کا دل لگ گیا۔ اس نے وہ کتاب شروع کی تو اس سے چھوڑی نہیں گئی۔ وہ کتاب ختم کر کے ہی رکا بلکہ رکا تو جب بھی نہیں۔ ایک ہفتے میں اس نے چار پانچ مرتبہ وہ کتاب شروع سے آخر تک پڑھ لی۔

اس کتاب نے اسے خوف زدہ کردیا۔ دوزخ کی تفصیلات نے اسے لرزا دیا..... دہشت زدہ کردیا۔ یہ تو اس نے سمجھ لیا تھا کہ زندگی ایک امتحان ہے۔ مگر یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنا بڑا امتحان ہے۔ فیل ہونے کی سزا اتنی ہولناک اور پاس ہونے کا انعام اتنا بڑا۔ جہنم کے فرشتوں کی جو اس نے تفصیل پڑھی تو کئی دن تک وہ اسے خواب میں ڈراتے رہے۔

نکیرین کے باب میں جو اس نے پڑھا، اس نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ قبر میں سوال جواب۔ وہ جانتا تھا کہ موت کسی کو بھی، کسی بھی لمحے دبوچ سکتی ہے۔ اگر وہ اسی وقت مرجائے تو قبر میں وہ کیا جواب دے گا۔ وہ کیا کہے گا؟ وہ تو نہ اِدھر ہے نہ اُدھر۔ وہ تو بھٹک رہا ہے۔ کیا وہ تفتیش کرنے والے فرشتوں سے یہ کہے گا کہ اسے مہلت نہیں ملی۔ ابھی تو وہ سمجھنے کی کوشش کررہا تھا کہ اسے موت آگئی۔ یہ جواب اسے بچا تو نہیں سکے گا۔

کتاب میں قیامت کا حال بھی تھا۔ وہ اس کی سمجھ میں زیادہ آسانی سے آگیا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ جس نے کامل حساب کتاب سے سب کچھ بنایا ہے، سیاروں کی باہمی کشش سے یہ نظام قائم کیا ہے، وہ بنانے کی نسبت کہیں زیادہ آسانی سے وہ سب کچھ تباہ کرسکتا ہے۔ نظام میں ایک معمولی سا خلل واقع ہوجائے تو لمحوں میں سب کچھ ختم ہوجائے گا۔

چند روز تو وہ خوف زدہ رہا۔ لیکن انسانی فطرت ہے کہ خوف انتہا کو پہنچ کر مٹ جاتا ہے۔ اور اوتار سنگھ تو ویسے بھی سوچنے والا آدمی تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ سب افسانے ہیں۔ اللہ نے انسان کو نیک بنانے کے لیے اسے ڈرانے کا سامان کیا ہے۔ ورنہ مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک مرتا ہے تو دو پیدا ہوتے ہیں۔ زندگی جاری و ساری رہتی ہے اور رہے گی۔ بس اس کے لیے اتنا کافی تھا کہ وہ نیک عمل کرتا رہے اور برائیوں سے بچے۔ لیکن جو کچھ اس نے پڑھا تھا، وہ اسے مکمل طور پر رد نہیں کرسکا۔ اسے یہ خیال رہتا تھا کہ اس کے دونوں کندھوں پر حساب لکھنے والے موجود ہیں اور اس کا ایک ایک عمل تحریر کیا جارہا ہے۔ اسے چوکنا رہنا چاہیے۔

دوسری طرف اسے خیال آیا کہ ماتا اور پتا جی سے فرشتوں نے سوال جواب کیے ہوں گے تو ان پر کیا گزری ہوگی۔ وہ لرز کر رہ گیا۔ وہ کم از کم حقیقت کو سمجھنے کی کوشش تو کررہا ہے..... جستجو تو کررہا ہے۔ وہ دونوں تو اس سے بھی محروم تھے۔ وہ تو بھگوان کو مانتے تھے..... برہما، وشنو اور شیو کو مانتے تھے۔ گویا شرک کرتے تھے۔ تب اسے ایک عجیب خیال آیا۔ ماتا جی تو بچ گئی ہوں گی۔ ان کی تو چتا جلائی گئی تھی۔ وہ دفن تھوڑا ہی کی گئی تھیں اور سوال جواب تو قبر میں مردے کو اٹھا کر کیے جاتے ہیں۔ جہاں مردہ راکھ میں تبدیل ہوگیا ہو، وہاں یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے۔ البتہ پتا جی کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ ان کی چتا کو آگ نہیں دکھا سکا تھا۔ وہ اس کے سامنے ہی ختم ہوئے تھے اور وہ ریت کے تلے دفن ہوئے تھے.....

اس پر اسے ایک بات یاد آئی۔ پتا جی نے اس سے کہا تھا..... جلانا نہیں، دفن کرنا.....

یہ بات پہلے بھی اس کے لیے الجھن کا باعث بنی تھی۔ یہ بات پتا جی اپنے لیے تو نہیں کہہ سکتے تھے۔ کیسے کہہ سکتے تھے! اس کا خیال تھا کہ انھوں نے یہ بات چاچا جی اور ویر جی کے لیے کہی ہوگی۔

بہرحال اس کے پتا جی قدرتی طور پر سہی، لیکن دفن ہوئے تھے اور وہ سوال جواب کے مرحلے سے گزرے ہوں گے۔ لیکن نہ وہ ان کے لیے کچھ کرسکا تھا، نہ اب کرسکتا ہے۔ ہاں وہ اپنی سمت درست کرلے تو ان کے لیے شاید کچھ کرسکے۔

ان دو کتابوں کے مطالعے نے (ایک کا جزوی اور دوسری کا تفصیلی مطالعہ) اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اب تک جو اپنے طور پر وہ جستجو کرتا رہا تھا۔ تو اس کے انداز میں یک سوئی اور سکون تھا۔ یہی حال اس کی سوچوں کا تھا۔ ان میں ٹھنڈک تھی، سکون تھا۔ لیکن اب ان میں جہنم کی گرمی، اضطراب اور خوف در آیا تھا۔ وہ وہی تھا..... پہلے جیسا۔ لیکن اس کی کیفیت بدل گئی تھی۔

اس نے سوچا، کیا مطالعہ آدمی کو مضطرب اور بے سکون کردیتا ہے؟ اس سوچ کے ساتھ دلیل بھی تھی۔ اس مطالعے نے اسے انتشار بھی دیا تھا اور مضطرب اور بے چین بھی کیا تھا بلکہ اسے لگ رہا تھا کہ اس کے اب تک کے کیے کرائے پر پانی بھی پھر گیا ہے۔

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس کا یہ سفر شروع کہاں سے ہوا تھا۔ اس وقت سے، جب اسے لکھنا پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔ اس کے سفر کا آغاز مشاہدے سے ہوا تھا۔ مشاہدے کے نتیجے میں اس کے ذہن میں سوالات ابھرے تھے۔ اس کے پاس جواب نہیں تھے۔ جواب اسے استادوں سے ملے تھے۔ ماسٹر جی اس کے پہلے استاد تھے۔ پھر ماتا جی اور اماں تھیں.....

ماسٹر جی کا خیال آیا تو وہ بری طرح چونکا۔ اسے شرمندگی ہونے لگی۔ کب سے اس نے ماسٹر جی کو نہیں دیکھا تھا..... اور اسے ان کا خیال، ان کی یاد بھی نہیں آئی تھی۔ وہ جب گاؤں جارہا تھا تو ماسٹر جی بیمار تھے۔ ان کی ہی وجہ سے رگھو اور رنجنا بھی گاؤں نہیں جاسکے تھے۔

اور جب وہ واپس آیا اور اس کی طبیعت ذرا سنبھلی تو اس نے رگھو سے ماسٹر جی کے بارے میں پوچھا۔

''ان کی طبیعت آپ کے جانے کے دوسرے روز سنبھل گئی تھی مالک۔'' رگھو نے بتایا۔ ''اس سے اگلے روز انھوں نے اپنے گھر جانے کو کہا۔ کہتے تھے، بچے بہت یاد آرہے ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر کی واپسی تک ان کے ساتھ وقت گزار آؤں۔ کہہ رہے تھے، فکر نہ کرنا..... میں آپ ہی واپس آجاؤں گا۔''

اب اتنے دن ہوگئے تھے اور وہ واپس نہیں آئے تھے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ میں نے ان کی فکر بھی نہیں کی۔ نجانے وہ کس حال میں ہوں۔ اوتار سنگھ کو افسوس ہونے لگا۔ اس نے سوچا، اب وہ پہلی فرصت میں ان کے بارے میں معلوم کرے گا۔

خیر، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ استاد کی رہنمائی کے بغیر مطالعہ نقصان دہ ثابت ہوسکتا

ہے۔ خاص طور پر دین کا مطالعہ!

یہ بات اس کے دل کو لگی۔ اس کا خوف اور اس کے اندر کی مایوسی اور پژمردگی ختم تو نہیں ہوئی۔ البتہ کم ضرور ہوگئی۔ وہ سوچ رہا تھا، مولوی صاحب زندہ ہوتے تو ان سے اسے مدد ملتی۔ اب وہ اپنے لیے استاد کہاں سے تلاش کرے۔ گرد و پیش میں اسے ایسا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔

پھر اس کا دھیان بٹ گیا۔ جس امتحان کا اسے خوف نہیں تھا، اس کا نتیجہ آ گیا تھا۔ وہ پاس ہوگیا تھا!

❁……❁……❁

سرفراز بیگم کرتے پر کڑھائی کر رہی تھیں۔ پائجامہ وہ پہلے ہی سی چکی تھیں۔ یہ کام کرتے ہوئے انھیں کیسی خوشی ہو رہی تھی، اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ بیٹے کے لیے کپڑے سینے کی خوشی ان کے لیے بالکل نئی تھی۔

کرتا مکمل کر کے انھوں نے استری کے لیے کوئلے دہکائے۔ بڑی محبت اور نفاست سے انھوں نے کپڑے استری کیے اور تہ کر کے رکھ دیے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد انھیں خیال آیا کہ اگر چھوٹے ٹھاکر کو یہ کپڑے اچھے نہیں لگے تو کیا ہوگا۔ ویسے تو وہ گھر پر قمیص پائجامہ ہی پہنتا تھا۔ کم از کم دھوتی میں تو انھوں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

انھوں نے اس خیال پر دل ہی دل میں خود کو جھڑک دیا۔ آدمی اپنی خوشی کے لیے کوئی کام کرے اور اس کے بعد اندیشے لے کر بیٹھ جائے، یہ بھی کوئی بات ہے۔ انھوں نے محبت سے لباس سیا ہے تو انشاء اللہ وہ اسے محبت ہی سے پہنے گا۔ محبت تو دل سے دل تک پہنچنے کا راستہ خود ہی بنا لیتی ہے۔

انھوں نے سوچا، شام کو یہ تحفہ لے کر جائیں گی۔ ویسے بھی اس کی صورت دیکھے کئی دن ہوگئے ہیں۔

لیکن شام کو رنجنا مٹھائی کا بڑا ڈبہ لے کر آ گئی۔ ''یہ لیجیے بڑی بیگم۔ چھوٹے ٹھاکر نے یہ مٹھائی بھجوائی ہے۔''

''اس کے ساتھ کوئی خوش خبری بھی تو ہوگی۔'' سرفراز بیگم نے ڈبہ لیتے ہوئے کہا۔

''جی بڑی بیگم۔ چھوٹے ٹھاکر امتحان میں پاس ہوگئے ہیں۔''

سرفراز بیگم کو خوشی تو بہت ہوئی۔ لیکن دھچکا بھی لگا۔ کیسا بے مروت لڑکا ہے یہ۔ کتنی غیریت برتتا ہے۔ کم از کم یہ خوش خبری تو خود آ کر سنا دیتا۔ اس بہانے تو وہ نیچے آ سکتا تھا۔

انھوں نے مٹھائی کھلاتے ہوئے بیٹیوں سے بھی یہ بات کہی۔ ''اور تم کہتی ہو کہ وہ نیچے آنے کے لیے ہم سے اصرار کروانا چاہتا ہے۔'' انھوں نے نور بانو سے کہا۔ ''اس نے تو اس جواز سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔''

''اس سے تو میری بات کی تائید ہی ہوتی ہے اماں۔'' نور بانو نے دھیرے سے کہا۔ ''دل میں کوئی بات ہو، تبھی آدمی اتنی احتیاط کرتا ہے۔''

''تم پھر شروع ہوگئیں۔'' حور بانو نے اسے ٹوک دیا۔ پھر ماں سے بولی۔ ''اب اس مسئلے پر بات ہی نہ کیا کریں اماں۔ نور بانو کا تو وہی حال ہے..... مرغے کی ایک ٹانگ۔ ویسے مجھے یقین ہو چکا ہے کہ چھوٹے ٹھاکر کو ہماری باتوں کی سن گن ضرور ہوگئی ہے۔''

''اللہ ہی جانے۔'' سرفراز بیگم نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اچھا..... میں ذرا اوپر جا رہی ہوں۔''

ان کے اٹھنے کے بعد نور بانو نے آہستہ سے کہا۔ ''اماں کو بھی عجیب محبت ہوئی ہے چھوٹے ٹھاکر سے۔ اس پر ممتا لٹانے کو بے قرار رہتی ہیں۔ دن رات ایک کر کے کرتا کاڑھا ہے۔ اب وہ دے کر آئیں گی۔''

''تم تو بس یونہی علامہ بنی پھرتی ہو۔ تم کہاں سمجھ سکتی ہو یہ بات۔ یہ محبت ہے...... محبت!'' حور بانو نے جل کر کہا۔

''میں تم سے زیادہ سمجھتی ہوں باجی۔''

حور بانو نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ ''کیا واقعی؟ یقین نہیں آتا۔'' اس کے لہجے میں تضحیک تھی۔

نور بانو اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ''تمھارے یقین کرنے نہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا باجی۔ یہ سچ ہے کہ میں تم سے زیادہ سمجھتی ہوں۔ لیکن اللہ کے حکم سے روگردانی کبھی نہیں کر سکتی۔''

''بس بڑے بڑے الفاظ بول سکتی ہو تم۔'' حور بانو نے اٹھتے ہوئے کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

اُدھر اوپر جاتے ہوئے سرفراز بیگم سوچ رہی تھیں کہ ان کی محبت یقیناً سچی ہے۔ وہ اس محبت کی وجہ سے چھوٹے ٹھاکر کے لیے کپڑے سی رہی تھیں۔ آج کرتا مکمل ہوا اور آج ہی اس کا نتیجہ نکلا۔ اب یہ امتحان میں پاس ہونے کا انعام کہلائے گا۔

❁……❁……❁

وہ اوتار سنگھ کے سامنے بیٹھی، اسے محبت سے تک رہی تھیں۔ پھر انھوں نے اس کی طرف وہ کپڑے بڑھائے۔ ''یہ میں نے تمھارے لیے کپڑے سیے ہیں۔ آج ہی کرتا مکمل ہوا اور آج ہی تم پاس ہوئے۔ اب اسے اپنا انعام سمجھ لو۔''

اوتار سنگھ نے کپڑے لے لیے اور شوخ لہجے میں بولا۔ ''انعام تو میں الگ سے لوں گا۔ یہ تو آپ ویسے ہی میرے لیے سی رہی تھیں۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ انعام الگ سے ملے گا۔'' سرفراز بیگم کو اس کے ردِعمل نے خوش کر دیا۔

اوتار سنگھ کرتے کو کھول کر اس کی کڑھائی کا جائزہ لے رہا تھا...... انگلی پھیر کر محسوس کر رہا تھا۔ سرفراز بیگم کا دل پھر اندیشوں سے بھر گیا۔ کیا پتا، یہ اسے پسند نہ آئے۔ انھیں گھبراہٹ ہونے لگی۔

''یہ آپ نے اپنے ہاتھوں سے سیا ہے......؟ یہ کڑھائی بھی؟'' اس نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں...... خود سیا ہے، خود کاڑھا ہے۔ لیکن......''

''معاف کیجیے گا ماں جی۔ میں ابھی آیا۔'' ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اوتار سنگھ اٹھا اور باہر چلا گیا۔ اس کے انداز میں عجلت تھی۔

سرفراز بیگم کو پھر اندیشے ستانے لگے۔ شاید اسے اچھا نہیں لگا......

لیکن وہ کمرے میں واپس آیا تو وہی کرتا اور پائجامہ پہنے ہوئے تھا۔ سرفراز بیگم اسے دیکھتی رہ گئیں۔ ویسے بھی وہ بہت خوبصورت اور وجیہہ لڑکا تھا۔ لیکن کرتے اور پائجامے میں تو وہ بہت ہی حسین لگ رہا تھا۔

''اب بتائیں، آپ کیا کہہ رہی تھیں؟'' اس نے انھیں چونکا دیا۔

وہ چونکیں تو لیکن اس کیفیت سے نہ نکل سکیں۔ وہ وارفتگی سے اسے دیکھے جا رہی تھیں۔ ''میں کہہ رہی تھی کہ یہ سیتے وقت میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ تمھیں یہ لباس اچھا بھی لگے گا یا نہیں۔'' انھوں نے اسی کیفیت میں دل کی بات کہہ دی۔ حالانکہ اب اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔

''اس کا جواب تو عملی طور پر میں دے چکا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے سادگی سے کہا۔ ''مگر یہ بتائیں کہ آپ نے یہ بات سوچی کیوں؟''

''میں نے تمھیں کبھی کرتا پہنے ہوئے نہیں دیکھا نا، اس لیے۔''

''ماں جی، یہ تو اتنا خوبصورت اور نفیس ہے اور پھر آپ نے اتنی محبت سے خود سیا ہے اور خود کڑھائی کی ہے کہ میں اسے ہمیشہ فخر اور محبت سے پہنوں گا مجھے تو اس میں ماتا کی نرمی اور ٹھنڈک بھی محسوس ہو رہی ہے۔''

سرفراز بیگم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

''اور میں ایک بات بتاؤں ماں جی۔ میں نے ہمیشہ اچھا لباس پہنا۔ مگر باہر کا سلا ہوا۔ ماتا جی کو سینا آتا ہی نہیں تھا۔ اماں کو بھی میں نے کبھی سلائی کرتے نہیں دیکھا۔ یہ پہلا لباس ہے جو کسی نے میرے لیے اپنے ہاتھوں سے سیا ہے اور یہ اتنی باریک اور نفیس کڑھائی ہے کہ میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ آپ نے اس پر کتنی محنت کی ہے۔ کتنا وقت لگایا ہے۔ یہ تو میری زندگی کا سب سے

قیمتی لباس ہے ماں جی۔''

سرفراز بیگم کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ اچھا قدر داں بھی تھا۔

''مگر یہ بتائیں ماں جی کہ آپ نے میرا ناپ لیے بغیر ٹھیک میرے ناپ کے کپڑے کیسے سی دیے۔ اس پر مجھے حیرت ہے۔''

سرفراز بیگم کا دل محبت اور مامتا سے لبالب بھر گیا۔ ''میں تمھیں سچ مچ اپنا بیٹا سمجھتی ہوں چھوٹے ٹھاکر اور کسی ماں کو اپنے بیٹے کا ناپ لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کی نگاہوں کی پیمائش سچی ہوتی ہے۔''

اوتار سنگھ نے اپنا جائزہ لیا۔ پھر پوچھا۔ ''میں کیسا لگ رہا ہوں ماں جی؟''

''بہت اچھے...... بالکل مغل شہزادوں کے جیسے۔''

اوتار سنگھ ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''مجھے انعام میں ایسا ہی جوڑا اور دیں گی نا؟''

''ایک نہیں، کئی جوڑے دوں گی انشاء اللہ۔'' سرفراز بیگم نے خوش ہو کر کہا۔ پھر بولیں۔ ''ارے...... میں نے تمھیں پاس ہونے کی مبارک باد تو دی ہی نہیں۔ بہت بہت مبارک ہو بیٹے۔ اللہ تمھیں ہر امتحان میں کامیابی عطا فرمائے۔''

اوتار سنگھ کے لیے وہ بہت بڑی دعا تھی۔ کیونکہ اس تذکرے پر اسے زندگی کے امتحان کا خیال آ گیا تھا۔

''لیکن بیٹے، مجھے تم سے ایک شکایت ہے۔'' سرفراز بیگم نے اچانک کہا۔

اوتار سنگھ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''مجھ سے ایسی کیا غلطی ہو گئی ماں جی؟''

''ہو سکتا ہے، تمھارے نزدیک بڑی بات نہ ہو۔ مگر مجھے تو بڑی بات ہی لگی۔ اسی لیے شکایت کر رہی ہوں۔''

''کچھ بتائیں تو ماں جی۔''

اس جذباتی لمحے میں سرفراز بیگم ہر احتیاط بھول گئیں۔ اس وقت وہ بس ایک ماں تھیں، جسے اپنے بیٹے سے بدلحاظی کی شکایت تھی۔ ''ادب کا تقاضہ تھا بیٹے کہ تم خود مٹھائی لے کر نیچے آتے، مجھے یہ خوش خبری سناتے اور اپنے ہاتھ سے میرا منہ میٹھا کراتے۔ تم نے تو غیروں کی طرح رنجنا کے ہاتھ مٹھائی اور حوش خبری بھیج دی۔ کیا بیٹے ماں کے ساتھ ایسا کرتے ہیں؟'' وہ جیسے پھٹ پڑیں۔

اوتار سنگھ کا چہرہ فق ہو گیا۔ ''آپ کا دل دُکھا ماں جی۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ لیکن میرے اس عمل میں گستاخی اور بے ادبی نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی بدنیتی تھی۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ لیکن مجبوری بھی ہوں ماں جی۔''

''تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم نیچے...... میرے گھر کبھی نہیں آ ؤ گے!''

''جی ماں جی۔''

’’تو مجھے اس کی وجہ بھی بتا دو۔‘‘
اوتار سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی ہچکچاہٹ واضح تھی۔ ’’یہ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟‘‘
’’میں جاننا چاہتی ہوں۔ یہ ضروری ہے میرے لیے۔‘‘
’’میں جھوٹ نہیں بولتا ماں جی۔ اور سچ بولوں گا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ مجھے برا سمجھنے لگیں گی۔‘‘

سرفراز بیگم کا دل دھڑک اٹھا۔ ایسی کیا بات ہو سکتی ہے؟ کہیں نور بانو کا خیال درست تو نہیں؟ وہ پریشان ہو گئیں۔ لیکن انھیں اس کی یہ ادا اچھی بھی لگی کہ اس نے جھوٹ نہیں بولا۔ ’’سچ بولنے سے کبھی نہیں ڈرو۔ اور ماں کا دل تو بہت بڑا ہوتا ہے۔ وجہ تو تمھیں بتانی ہوگی۔‘‘

’’بات یہ ہے ماں جی کہ میں اگر آپ کا بیٹا ہوں تو مجھے گھر کی عزت کا خیال بھی رکھنا ہے۔‘‘ اوتار سنگھ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ’’میں آپ کے گھر بیٹے کی طرح آؤں اور پاس پڑوس والوں کے علم میں یہ بات آئے تو باتیں بنیں گی۔ کوئی کسی کی زبان تو پکڑ نہیں سکتا۔ اپنی عزت کا خود خیال رکھنا ہوتا ہے اور اب آپ کے گھر کی عزت میری عزت ہے۔‘‘

اس کی بات کی سچائی نے سرفراز بیگم کے دل کو چھو لیا۔ لیکن انھیں احساس ہو رہا تھا کہ بات صرف اتنی نہیں ہے۔ ’’اس طرح سوچنا تو تمھاری بڑائی اور اچھائی کی دلیل ہے۔ اس پر میں تمھیں برا کیسے سمجھ سکتی ہوں۔‘‘ انھوں نے کہا۔ ’’بہتر یہ ہے کہ مجھے پوری بات بتاؤ۔‘‘

’’آپ مجھ سے وہ کیوں سننا چاہتی ہیں، جو میں کہنا نہیں چاہتا۔‘‘ اوتار سنگھ بے بسی سے بولا۔ ’’میں کہہ رہا ہوں نا کہ میرا آپ کے گھر آنا آپ کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں نیچے نہیں آؤں گا۔‘‘

’’نہیں۔ مجھے پوری بات بتاؤ۔ ورنہ میں سمجھوں گی کہ تم مجھے ماں نہیں سمجھتے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ تو سن لیجیے۔‘‘ اوتار سنگھ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ’’دیکھیے ماں جی۔ آدمی تو خطا کا پتلا ہوتا ہے۔ کچھ پتا نہیں، کب کہاں بہک جائے۔ میں بہن سے محروم رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ بھائی بہنوں کے ساتھ کیسے ہوتے ہیں۔ بہنوں کے ساتھ کیسا رویہ ہوتا ہے ان کا۔ اور میں بھی آدمی ہوں۔ کبھی میری نظر بھی بہک گئی، چاہے ایک لمحے کے لیے بہکے، تو میں تو ساری زندگی کے لیے اپنی نگاہوں میں گر جاؤں گا۔ مجھے ہمیشہ پچھتاوا رہے گا کہ ماں جی نے مجھ پر بیٹے کا سا اعتبار کیا اور میں نے اس اعتبار کو دھوکہ دیا اور اس شرمندگی میں میں آپ کو بھی کھو بیٹھوں گا۔ میں جانتا ہوں ماں جی کہ کوئی بھی انسان کسی بھی لمحے کسی کمزوری کا شکار ہو سکتا ہے۔ میں خود کو ایسی کسی آزمائش میں کیوں ڈالوں، جس میں ہار کر میں محبت کرنے والی ماں کو کھو بیٹھوں۔‘‘

سرفراز بیگم مبہوت ہو کر اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ کتنا اچھا تھا...... کتنا سمجھ دار...... کتنا حساس۔ اور اتنی سی عمر میں وہ دور اندیش بھی ہے۔ اتنے آگے تک کی کیسے سوچ لیتا ہے۔ اور وہ کیسا

سچ بولنے والا ہے کہ اس نے اتنا بڑا سچ بول دیا اور وہ کتنے لحاظ والا ہے۔ اس نے صرف اپنی کمزوری کی بات کی۔ یہ نہیں کہا کہ ان کی کسی بچی پر بھی کوئی کمزوری حاوی آ سکتی ہے...... اور اس کے نتیجے میں بھی شرمندہ وہی ہوگا۔ واقعی...... اس کے لیے تو ان کے گھر آنا جانا ہر طرح سے خسارے کا سودا تھا۔

خاموشی گہری اور طویل ہو گئی تھی۔ اوتار سنگھ مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ نظریں اٹھانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اور سرفراز بیگم کی خاموشی نے اسے چور بنا دیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیسا سوچ رہی ہیں...... ان کا کیا ردِعمل ہے۔ وہ ان کے کچھ کہنے کا منتظر تھا۔

اور سرفراز بیگم کو اس پر ایسی محبت آئی تھی کہ وہ گنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔

وہ کچھ نہ بولیں تو اوتار سنگھ نے نظریں اٹھائے بغیر ڈرتے ڈرتے کہا۔ ’’کیا میں نے یہ سچ بول کر آپ کو کھو دیا ماں جی؟‘‘

سرفراز بیگم نے حیرت سے اسے دیکھا۔ چند لمحے تو وہ اس کی بات سمجھیں ہی نہیں۔ بات سمجھ میں آئی تو وہ اٹھیں۔ انھوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں بھرا اور بے حد محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔ ’’نہیں بیٹے۔ تم تو مجھے پہلے سے بھی زیادہ عزیز ہو گئے ہو۔ تم جیسے بیٹے تو نصیب والوں کو ملتے ہیں۔ مجھے تو تم پر فخر ہے بیٹے۔ اب ذرا سر تو اٹھاؤ۔ اِدھر دیکھو تو۔‘‘

اوتار سنگھ نے نظریں اٹھائیں۔ اسے ان کی آنکھوں میں محبت اور ماما کا سمندر موج زن نظر آیا۔ ’’شکریہ ماں جی۔‘‘ اس نے دھیرے سے کہا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ وہ اب بھی کھسیایا ہوا تھا۔

’’ماں اور بیٹے کے درمیان شکریے کا لفظ کبھی نہیں آتا۔‘‘

اس لمحے سرفراز بیگم کے دل میں بے اختیار ایک تند...... بے حد منہ زور خواہش ابھری۔ کاش...... کاش یہ لڑکا مسلمان ہوتا۔ اور وہ اسے داماد بنا لیتیں۔ اس کی اخلاقی خوبیاں قابلِ رشک تھیں۔

اگلے ہی لمحے انھوں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

❁......❁......❁

اوتار سنگھ اپنے اندر کے مسائل میں اس طرح الجھا ہوا تھا کہ باہری دنیا کا اسے کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ اسے علم ہی نہیں تھا کہ باہر کی فضا کتنی بدل رہی ہے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے نعروں کی آوازیں سن کر وہ چونکا۔ اس نے سماعت پر زور دے کر سننے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

’’یہ کیا ہو رہا ہے رگھو؟‘‘ اس نے پوچھا۔
’’یہ تو ہر روز ہوتا ہے مالک۔‘‘ رگھو نے کہا۔ ’’مسلمان جلوس نکالتے ہیں۔ الگ ملک مانگ رہے ہیں نا۔‘‘

اوتار سنگھ کوٹھے پر گیا۔ وہ خاصا بڑا جلوس تھا۔ اس میں بچوں کی اکثریت تھی۔ لیکن بڑے بھی شامل تھے۔ آگے موجود شخص نے سبز رنگ کا ایک پرچم اٹھا رکھا تھا۔ وہ قیادت کر رہا تھا۔ وہ کہتا...... پاکستان کا مطلب کیا...... پیچھے والے ایک آواز ہو کر جواب دیتے ...... لا الہ الا اللہ۔

پاکستان! تو یہ ہے اس ملک کا نام جو یہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس نے سوچا۔ نام اسے اچھا لگا...... اپنا اپنا سا اور پاکستان کا مطلب ہے...... اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یعنی اس ملک میں صرف وہی لوگ ہوں گے، جو عبادت میں اللہ کا شریک کسی کو نہ بنائیں۔ لیکن نجانے کیوں اسے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ اس نعرے میں آدھا کلمہ تھا، پورا نہیں۔ اس نے دل ہی دل میں پورا کلمہ پڑھا۔

جلوس آگے نکل گیا۔ نعروں کی آوازیں دھیمی ہوتے ہوتے معدوم ہو گئیں۔ وہ وہیں کھڑا سوچتا رہا۔ اس روز پہلی بار اسے احساس ہوا کہ شہر کی فضا میں ایک ممکنہ تبدیلی سانس لے رہی ہے۔ وہ اچھی ہے یا بری، یہ اندازہ وہ نہیں لگا سکتا تھا۔

لیکن چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک اور جلوس نمودار ہوا۔ وہ جوابی جلوس تھا۔ باہر دیکھتے ہوئے اسے اندازہ ہوا کہ اس جلوس میں ہندو اور سکھ شریک ہیں۔ وہ قریب آئے تو اسے ان کے نعرے سنائی دیے۔ بٹ نہ سکے گا ہندوستان۔ بننے نہ دیں گے پاکستان۔ اس دھرتی سے نکلو مُسلو۔ ہندوستان ہمارا ہے۔ اپنا ترنگا اپنی آن، بھارت ماتا اپنے پران۔

دونوں جلوسوں کا تضاد بے حد واضح تھا۔ ایک طرف کے نعروں میں ایک وطن کے خواب کی محبت تھی تو دوسری طرف دہکتی ہوئی شدید نفرت تھی۔ ایک طرف جسمانی حرکات و سکنات کی زبان میں نرمی اور عزم تھا تو دوسری طرف سختی اور جارحیت۔ یہ دو گروہ تھے جو تصادم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اوتار سنگھ کو اندازہ ہو گیا کہ فضا میں جو ممکنہ تبدیلی اسے محسوس ہو رہی ہے، اس میں انسانی خون اور تشدد کی بو رچی ہوئی ہے۔

وہ نیچے چلا آیا۔ لیکن وہ نہایت فکرمندی سے اسی بارے میں سوچے جا رہا تھا۔

اس روز اس نے رگھو سے ماسٹر جی کے بارے میں پوچھا۔ ''ماسٹر جی جاتے وقت تمھیں اپنے گھر کا پتا تو دے کر گئے ہوں گے؟''

''نہیں مالک۔''

''تم نے پوچھا بھی نہیں۔''

''پوچھا تھا مالک۔ وہ بولے، پتے کا تمھیں کیا کرنا ہے۔ میں خود ہی دو چار دن میں واپس آ جاؤں گا۔''

اور اب اس بات کو تقریباً دو مہینے ہو گئے تھے اور وہ واپس نہیں آئے تھے۔ اوتار سنگھ کو تشویش ہونے لگی۔ کہیں ماسٹر جی زیادہ بیمار تو نہیں ہو گئے۔ ورنہ وہ آ جاتے۔ کہیں وہ......؟ اس سے آگے وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

ایک ہی جگہ ایسی تھی، جہاں سے اسے ماسٹر جی کا پتا معلوم ہو سکتا تھا۔ ماسٹر جی اسی اسکول میں پڑھاتے رہے تھے، جس میں وہ پڑھتا تھا۔ جب وہ پتا جی کے ساتھ گاؤں آئے تو ریٹائر ہو چکے تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے ہی ماسٹر جی کو پتا جی سے متعارف کرایا تھا اور ان کی سفارش کی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب سے ہی ماسٹر جی کا پتا معلوم ہو سکے گا۔ لیکن ان دنوں اسکول کی چھٹیاں تھیں۔ اسکول اب یکم اگست کو کھلے گا۔ تبھی کچھ معلومات ہو سکیں گی۔

❀......❀......❀

کالج کھل گئے۔ ابتدا میں تو پڑھائی ویسے بھی کم ہی ہوتی ہے۔ لیکن اوتار سنگھ کو اندازہ ہو گیا کہ اب پڑھائی کا ماحول ہے ہی نہیں۔ وہاں تو اب سیاسی گفتگو زیادہ ہوتی تھی۔ ٹیچرز کو بھی پڑھانے میں بہت زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ادھر دوستوں کے دلوں میں بھی دوری ہو گئی تھی۔ محمود اور رام گوپال اب بھی ساتھ بیٹھتے تھے۔ اختلاف رائے تو ان کے درمیان پہلے ہی تھا۔ لیکن اب ان کے درمیان نفرت اور شدید کھنچاؤ تھا۔ درحقیقت وہ دو ایسی قوموں کے نمائندے تھے، جو ایک بے حد دھماکہ خیز تصادم کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

اوتار سنگھ کو گرد و پیش سے ہمیشہ دلچسپی رہی تھی۔ وہ اندر کی دنیا میں دلچسپی لینے والا ایسا شخص تھا، جو اندر کی دنیا کو باہر کے حوالوں سے اور باہر کی دنیا کو اندر کے حوالوں سے سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسے افسوس ہوا کہ وہ حالاتِ حاضرہ سے اتنا بے خبر بیٹھا رہا۔ اپنے اندر کی دنیا میں مگن، اندر کی دنیا کے مسائل میں گم۔

یہ جولائی 46ء کا عرصہ تھا۔ اس عرصے میں وہ خود پسند (Introvert) نہیں رہا، Extrovert ہو گیا۔ اندرونی دنیا کے باطنی مسائل دب کر رہ گئے۔ اس لیے کہ اب اس کے پاس ان پر سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ اس کے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس وقت پورا ملک بارود کے سلگتے ہوئے ڈھیر پر بیٹھا تھا اور کسی بھی وقت پھٹ سکتا تھا۔ بڑے پیمانے پر خون ریزی کا خدشہ اسے حقیقت میں بدلتا نظر آ رہا تھا۔ وہ اس صورتِ حال سے بے تعلق نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے معاملات میں آدمی کنارہ کش ہو کے، غیر جانب دار ہو کے گزارہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ جہاں پوری قوم کا معاملہ ہو، وہاں آدمی چاہے تو بھی غیر جانب دار نہیں رہ سکتا۔ کبھی وہ خود بہ خود ملوث ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے، کبھی لوگ زبردستی اسے ملوث کر دیتے ہیں اور ایسی بے اختیاری میں اس بات کی بھی ضمانت نہیں ہوتی کہ وہ درستی پر ہے۔ اس لیے اوتار سنگھ صورتِ حال کو پوری طرح سمجھنا اور اس کے بارے میں درست فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ اگر کسی بھی مرحلے پر، کسی بھی حد تک اسے کسی فریق کا ساتھ دینا پڑے تو وہ غلطی نہ کرے۔ اس کا ساتھ دے، جس کا موقف درست اور جائز ہو۔

اس کے نتیجے میں وہ اخبارات میں دلچسپی لینے لگا۔ اور اخبارات بھی وہ دونوں جانب

کے پڑھتا تھا۔

اخبارات پڑھنے شروع کیے تو اسے حیرت بھی ہوئی اور خود پر افسوس بھی ہوا۔ اتنا کچھ ہو چکا تھا اور اسے کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ پاکستان کو وہ مسلمانوں کا خواب سمجھتا تھا۔ لیکن صورتِ حال بتاتی تھی کہ مسلمان تیزی سے تعبیر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ بات طے تھی کہ انگریز رخصت ہونے والے ہیں۔

16 مئی کو کیبنٹ پلان سامنے آیا۔ اس میں انگریزوں نے تقسیم ہند اور قیام پاکستان کو مسترد کر دیا تھا۔ لیکن مسلمانوں کے شدید ردِعمل نے انھیں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے ملک کو تین گروپس میں تقسیم کر دیا۔ پہلے گروپ میں مدراس، بمبئی، متحدہ صوبے، مرکزی صوبے، بہار اور اڑیسہ شامل تھے۔ یہ ہندوؤں کے اکثریتی علاقوں کا گروپ تھا۔ دوسرے گروپ میں پنجاب، اور صوبہ سرحد تھے۔ یہ مسلمانوں کے مغربی اکثریتی علاقوں کا گروپ تھا۔ تیسرے گروپ میں بنگال اور آسام تھے۔ یہ مسلمانوں کے مشرقی اکثریتی علاقوں کا گروپ تھا۔ انگریز چاہتے تھے کہ تینوں گروپ ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کے تحت چلیں۔ دفاع، خارجہ اور مواصلات، یہ تین شعبے مکمل طور پر اس وفاق کے اختیار میں ہوں۔ باقی اختیارات صوبوں کے پاس ہوں۔

کیبنٹ پلان کے دو حصے تھے۔ ایک دستور ساز اسمبلی سے متعلق تھا اور طویل المیعاد تھا۔ دوسرا عبوری حکومت سے تعلق رکھتا تھا اور مختصر المیعاد تھا۔ کیبنٹ مشن نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ اس پلان کو مسترد کیا جائے یا قبول کیا جائے تو مکمل طور پر۔ اور اگر بڑی سیاسی جماعتیں اس عبوری حکومت میں شامل ہونے سے انکار کریں گی تو وائسرائے کو اختیار ہوگا کہ اپنی مرضی کے کسی بھی گروپ کو حکومت بنانے کی دعوت دے۔

مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے یہ اسکیم قبول کر لی۔ وائسرائے نے محمد علی جناح کو یقین دہانی کرائی کہ عبوری حکومت 12 ارکان پر مشتمل ہوگی۔ ان میں 5 کانگریس کے 5 مسلم لیگ کے، ایک سکھوں کا اور ایک ہندوستانی عیسائیوں کا نمائندہ ہوگا۔ جبکہ کانگریس 5 کانگریسی اراکین (تمام ہندو) 4 مسلم لیگی اراکین، ایک غیر مسلم لیگی مسلمان رکن، ایک غیر کانگریسی ہندو رکن، ایک شودر، ایک انڈین عیسائی، ایک سکھ اور ایک کانگریسی عورت پر مشتمل 15 رکنی کابینہ کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اس ڈیڈ لاک کو ختم کرنے کے لیے وائسرائے نے 16 جون کو کچھ تجاویز پیش کیں۔ ان کی رو سے عبوری حکومت 14 اراکین پر مشتمل ہوگی۔ جن میں 6 کانگریسی، 5 مسلم لیگی، ایک سکھ، ایک انڈین عیسائی اور ایک پارسی شامل ہوگا۔ مسلم لیگ نے یہ تجویز قبول کر لی۔ لیکن کانگریس نے اس بنیاد پر اسے مسترد کر دیا کہ اس میں قوم پرست مسلمانوں کا کوئی نمائندہ نہیں ہے۔

وائسرائے نے کہہ دیا تھا کہ اگر کوئی بڑی پارٹی اس تجویز کو قبول نہیں کرتی تو بھی حکومت

تشکیل دیتے وقت کوشش کی جائے گی کہ وہ ممکنہ طور پر تمام سیاسی طبقوں کی نمائندہ حکومت ہو۔

کانگریس کے انکار کے بعد مسلم لیگ کو توقع تھی کہ وائسرائے کانگریس کے بغیر عبوری حکومت تشکیل دے گا۔ لیکن وائسرائے کے پیچھے ہٹنے سے یہ ثابت ہو گیا کہ اس کا جھکاؤ کانگریس کی طرف ہے۔ چنانچہ 27 جولائی کو مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن کی تجاویز قبول کرنے سے انکار کر دیا اور 16 اگست کو برطانوی حکومت کے خلاف راست اقدام کا دن منانے کا اعلان کر دیا۔ اس کے فوراً بعد کلکتہ میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ بڑی تعداد میں مسلمان مارے گئے۔

ان فسادات نے اوتار سنگھ کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرنے میں حق بہ جانب ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوا، تو ہندو اپنی اکثریت کی بنیاد پر مسلمانوں کو غلام بنا کر رکھیں گے اور انھیں کچل ڈالیں گے۔

❁......❁......❁

یکم اگست کو اسکول کھل گئے۔ اوتار سنگھ ہیڈ ماسٹر سے ملنے کے لیے گیا۔ ہیڈ ماسٹر نے اسے بڑی عزت سے بٹھایا۔ ''کیسے ہو اوتار سنگھ؟''

''جی ٹھیک ہوں۔''

''ہماری یاد کیسے آ گئی؟''

اوتار سنگھ شرمندہ ہو گیا۔ ''اس اسکول کو اور آپ سب اساتذہ کو تو میں بھول ہی نہیں سکتا۔ علم حاصل کرنا آپ ہی لوگوں سے سیکھا ہے میں نے۔''

''ہمیں تم پر فخر ہے اوتار سنگھ۔ تم بہت ہونہار شاگرد ہو۔'' ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ پھر پوچھا۔ ''تمھارے پتا جی کیسے ہیں؟''

''ان کا تو دیہانت ہو گیا سر۔'' اوتار سنگھ نے انھیں تفصیل بتائی۔

''مجھے بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔'' ہیڈ ماسٹر نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

''میں آپ کے پاس ایک کام سے آیا ہوں۔''

''کہو...... میں کیا کر سکتا ہوں تمھارے لیے۔''

''میرے استاد تھے، جن کی سفارش آپ نے کی تھی۔ وہ اس اسکول سے ہی ریٹائر ہوئے تھے...... کانتی پرشاد جی۔''

''ہاں...... ہاں، مجھے یاد ہے۔''

''مجھے ان کا پتا چاہیے۔''

''پتا؟ وہ تو شاید پرانے ریکارڈ میں ہی مل سکے گا۔ اچھا...... میں دیکھتا ہوں۔'' انھوں نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی آیا تو انھوں نے ایک پرچے پر کچھ لکھ کر اسے دیا۔ ''یہ بنسی دھر کے پاس

لے جاؤ۔اس سے کہو، یہ فوری طور پر چاہیے۔''

چپراسی چلا گیا۔

''آدھے گھنٹے کے بعد بنسی دھر خود آیا اور کانتی پرشاد جی کا پتا ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیا۔

اوتار سنگھ ہیڈ ماسٹر صاحب کا شکریہ ادا کر کے کمرے سے نکل آیا۔

❀......❀......❀
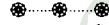
وہ اچھا خاصا مکان تھا۔اوتار سنگھ نے دروازے پر دستک دی تو سات آٹھ سال کا ایک لڑکا سامنے آیا۔

''کانتی پرشاد جی یہیں رہتے ہیں نا؟'' اوتار سنگھ نے اس سے پوچھا۔

''یہ نام تو میں نے کبھی نہیں سنا۔''

اوتار سنگھ گڑبڑا گیا۔''تمھارے پتاجی کا کیا نام ہے؟'' اسے یہ ڈر تھا کہ پرانا پتا ہے۔ نجانے اب ماسٹر جی وہاں رہتے بھی ہوں گے یا نہیں۔

''رام پرشاد۔''

اسی لمحے اندر سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔''گنگا......او گنگا۔کون آیا ہے رے؟''

پھر اس جوان عورت نے قریب آ کر باہر جھانکا۔''کون ہیں آپ؟ کس سے ملنا ہے؟'' اس نے اوتار سنگھ سے پوچھا۔

''کانتی پرشاد جی سے۔''

''کون کانتی پرشاد......ارے......تم کہیں باپو کو تو نہیں پوچھ رہے ہو؟''

''وہ اسکول میں پڑھاتے تھے۔''

عورت نے اسے غور سے دیکھا۔''تم انھیں کیسے جانتے ہو؟''

اوتار سنگھ کو یہ بات عجیب لگی کہ وہ دروازے پر کھڑی تفتیش کر رہی ہے۔ پہلے تو وہ کانتی پرشاد جی کو ان کے نام سے بھی نہیں پہچانتی تھی۔''میں ان کا شاگرد ہوں۔ کئی سال سے وہ میرے ساتھ رہے ہیں......''

''ارے......تو وہ تم ہو۔آؤ......اندر آؤ۔''

وہ اسے اندر لے گئی۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی خاصا بڑا صحن تھا۔صحن کے پار سامنے کے رخ پر کمرے بنے ہوئے تھے۔کونے والے کمرے کے پہلو میں زینہ تھا۔اوپر بھی دو کمرے بنے تھے۔

وہ اسے نیچے کے ایک کمرے میں لے گئی۔اب اس کا انداز بدل گیا تھا۔''آپ یہاں بیٹھیے۔'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''میں آپ کے لیے شربت لاتی ہوں۔''

اوتار سنگھ نے کھڑے کھڑے کمرے کا جائزہ لیا۔''سنیے......ماسٹر جی کہاں ہیں؟ مجھے

ان سے ملنا ہے۔'' اس نے کہا۔

وہ کمرے سے جاتے جاتے پلٹی۔''وہ......وہ تو......'' وہ کہتے کہتے رکی۔اوتار سنگھ کا دل گھبرانے لگا۔کہیں ماسٹر جی......؟

''وہ تو اپنے کمرے میں ہیں۔'' بالآخر اس نے جملہ پورا کیا۔

''مجھے ان سے ملوا دیجیے۔'' اوتار سنگھ نے لجاجت سے کہا۔''میں ان کے لیے ہی آیا ہوں۔''

''میں ابھی شربت لائی۔آپ پی لیں۔پھر ان سے مل لیجیے گا۔''

''شربت کی کچھ ایسی ضرورت نہیں اور وہ میں ان کے کمرے میں ہی پی لوں گا۔''

اس کا منہ کھل گیا۔نجانے وہ حیرت تھی یا خوف۔''آپ یہیں پی لیں۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ جھنجلا گیا۔''شربت کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں یہاں ماسٹر جی سے ملنے آیا ہوں۔آپ مجھے ان سے ملوا دیں۔''

''اچھا، آئیں میرے ساتھ۔'' عورت کے انداز سے لگا کہ وہ اپنی جھنجلاہٹ اور غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے۔

وہ صحن میں آئے۔عورت نے سامنے ایک چھوٹی سی کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔''وہ وہاں ہیں۔جاؤ ان سے مل لو۔''

اوتار سنگھ کو وہ کوٹھری دور سے ہی عجیب لگی۔اتنے کمروں کے ہوتے ہوئے ماسٹر جی اس تنگ کوٹھری میں کیوں رہ رہے ہیں۔ بہرحال وہ اس طرف بڑھنے لگا۔درمیان میں اس نے پلٹ کر کمرے کی طرف دیکھا۔وہ عورت اب بھی دروازے پر کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔اسے دیکھتے پایا تو اس نے منہ پھیر لیا، اور کمرے میں چلی گئی۔

اوتار سنگھ کوٹھری کے دروازے پر ٹھٹھکا۔اندر اندھیرا تھا۔بالآخر اس نے اندر قدم رکھا۔چند لمحے تو اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔مگر پھر چند لمحوں میں اس کی نظر اندر کے اندھیرے سے ہم آہنگ ہو گئی۔تب جو کچھ اس نے دیکھا، اس نے اسے دہلا دیا۔

کوٹھری اس کے اندازے سے بھی بڑھ کر تنگ تھی۔کونے میں دیوار سے ایک جھلنگا چارپائی تھی، جس پر ایک استخوانی وجود بکھرا ہوا تھا۔نقوش نظر آنے کے باوجود وہ ماسٹر جی کو پہچان نہیں سکا۔وہ تو جیسے چرمرا کر رہ گئے تھے۔ چہرے پر بھی ہڈیوں کے سوا کچھ نہیں تھا اور ان کی آنکھیں بند تھیں۔

وہ بے تابی سے ان کی طرف لپکا۔چارپائی کی پٹی پر ٹکتے ہوئے اس نے ان کے ہاتھ

تھام لیے۔ ”ماسٹر جی...... ماسٹر جی...... یہ کیا ہو گیا آپ کو؟“

ماسٹر جی نے آنکھیں کھولیں اور نحیف آواز میں بولے۔ ”کون ہے؟“

”میں ہوں ماسٹر جی اوتار سنگھ۔“

ماسٹر جی نے پہلو بدلنے کی ناکام کوشش کی اور اسے بہت غور سے دیکھا۔ ”تم...... تم یہاں کیوں آ گئے بیٹے۔“

باہر سے گنگا نامی بچے کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے پکار رہا تھا۔ ”بابو جی...... بابو جی...... یہ کرسی لے لو۔“

اوتار سنگھ نے دروازے کی طرف رخ کر کے جواب دیا۔ ”اندر لے آؤ۔“

”میں اندر نہیں آ سکتا بابو جی۔ آپ آ کر کرسی لے لو۔“

”اندر نہیں آ سکتے تو واپس لے جاؤ۔“ اوتار سنگھ نے جھنجلا کر کہا۔ پھر وہ ماسٹر جی کی طرف مڑا۔ ”یہ سب کیا ہے ماسٹر جی۔ اور آپ کا اتنا برا حال ہے......“

”مجھے...... مجھے...... ٹی بی...... ہو گئی ہے۔“ ماسٹر جی نے اٹک اٹک کر کہا۔

اوتار سنگھ کے لیے وہ ایسا دھماکہ تھا کہ چند لمحے کو اسے لگا کہ اس کے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ وہ رونے لگا۔ شاید اس وقت وہ نہ روتا تو اسے کچھ ہو جاتا۔ ”میں بہت برا ہوں...... بہت غیر ذمے دار ہوں ماسٹر جی۔“

”ایسا نہ کہو بیٹے......“

”دو مہینے ہو گئے اور میں نے آپ کی خبر تک نہیں لی۔ یہ غیر ذمے داری ہی تو ہے۔“ اوتار سنگھ نے کہا۔ ”لیکن آپ واپس کیوں نہیں آ گئے؟“

”اس بیماری کے ساتھ کیسے آتا۔“ ماسٹر جی کے لہجے میں بے بسی تھی۔ ”یہ تو لگنے والی بیماری ہے بیٹے۔“ اچانک وہ چونکے۔ ”یہاں سے اٹھ جاؤ بیٹے۔ تمھیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمھیں یہ بیماری لگے......“

”مجھے کچھ نہیں ہوگا ماسٹر جی۔“ اوتار سنگھ نے تڑپ کر کہا۔ ”اور ہو جائے تو بھی مجھے پروا نہیں۔ آپ نے مجھے علم جیسی دولت دی ہے۔ اگر مجھے آپ کی بیماری لگ جائے تو مجھے قبول ہے......“

”میرے اپنے بچے بھی میرے پاس نہیں آتے۔“ ماسٹر جی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور رونے لگے۔

اوتار سنگھ نے کوٹھری کا تفصیلی جائزہ لیا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ لوہے کے کچھ پرانے ٹرنک اوپر تلے رکھے تھے۔ ان کے پاس چند گٹھریاں تھیں۔ ایک ناکارہ سلائی کی مشین بھی پڑی تھی۔ گرد کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مدت سے وہاں جھاڑو نہیں دی گئی۔ کوٹھری میں کوئی کھڑکی،

کوئی روزن نہیں تھا۔ گھٹن بہت زیادہ تھی۔ ہوا کا کوئی گزر ہی نہیں تھا۔ دھوپ بھی صرف صبح کے وقت تھوڑی دیر کے لیے آتی ہوگی۔

پٹی پر بیٹھے بیٹھے اس کی کمر دکھ گئی تھی۔ اس نے پہلو بدلا تو اس کے پاؤں برتن سے ٹکرائے۔ اس نے نیچے دیکھا۔ وہ ایک پلیٹ تھی، جس میں تھوڑی سی دال بچی ہوئی تھی۔ قریب ہی ایک چنگیر تھی، جس میں موجود آدھی روٹی سوکھ کر لکڑی ہو چکی تھی۔ وہ برتنوں کو اٹھانے کے لیے جھکا تو اسے وہ بڑا تسلا نظر آیا، جو یقیناً تھوکنے کے کام آتا تھا۔ وہ بہت گندا ہو رہا تھا۔

اوتار سنگھ کی سمجھ میں لمحوں میں سب کچھ آ گیا۔ ماسٹر جی کا دکھ، ان کا رونا۔ انھوں نے اپنے بچوں سے بہت محبت کی تھی۔ ان کا بہت خیال رکھا تھا۔ کئی برس وہ اس کے ساتھ رہے۔ پتا جی انھیں معقول فیس دیتے تھے اور ماسٹر جی کے اپنے اخراجات نہیں تھے۔ وہ سب کچھ بچوں کو بھیج دیا کرتے تھے۔ مگر آج ان پر وقت پڑا تھا تو ان کے بچوں نے انھیں کاٹھ کباڑ کی طرح اس کوٹھری میں پھینک دیا تھا۔ اچھوت بنا کر رکھ دیا تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ ان کے بچوں کو نقصان کا احساس ہو رہا ہوگا۔ وہ ایک باقاعدہ آمدنی سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ الٹا ماسٹر جی ان پر بوجھ ہو گئے تھے۔

اچانک ماسٹر جی پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ ان سے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اوتار سنگھ نے سہارا دے کر انھیں اٹھایا۔ پھر اس نے تسلہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ کھانسی کے دورے کے باوجود ماسٹر جی نفی میں سر ہلائے جا رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اس تسلے کو چھوئے بھی۔

”آپ میری فکر نہ کریں ماسٹر جی۔ تھوک دیں۔“

مجبور ہو کر ماسٹر جی نے تسلے میں تھوکا۔ کھانسی کا دورہ رکا تو ماسٹر جی کا چہرہ تھوک سے لتھڑ چکا تھا۔ اوتار سنگھ نے رومال نکالا اور ان کا منہ پونچھ دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں ابھی آتا ہوں ماسٹر جی۔“

وہ کوٹھری سے نکلا۔ عورت اور بچہ کچھ دور کھڑے اسی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ ان سے کچھ کہے بغیر گھر سے نکل آیا۔

❁......❁......❁
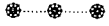
ڈاکٹر نے جتنی دیر ماسٹر جی کا معائنہ کیا، اس سے زیادہ دیر تک کوٹھری کا تفصیلی جائزہ لیا۔ پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ یہاں کب سے ہیں؟“

اوتار سنگھ نے ماسٹر جی کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ نہیں بولے۔ آخر اس نے جواب دیا۔

”ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا ہوگا۔“

”آپ کیسے بیٹے ہیں۔“ ڈاکٹر نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔ ”اس بیماری میں ایسے ماحول میں رہنا ان کے لیے مہلک ہے۔ کیا آپ یہ بات نہیں سمجھتے؟ یہ گرد، یہ گندگی ان کے مرض کو اور بڑھا دے گی۔ انھیں صاف ستھرے ماحول، روشنی، تازہ ہوا اور اچھی غذا کی ضرورت ہے۔ ان

کے لیے یہ چیزیں دوا سے بڑھ کر ہیں اور آپ نے انھیں اس کوٹھری میں مرنے کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔"

اوتار سنگھ نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ کانتی پرشاد جی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ مگر اسی لمحے کمرے میں ایک جوان آدمی داخل ہوا۔ اس میں ان کے پرانے دور کی شباہت تھی۔ اس نے منہ پر رومال رکھا ہوا تھا۔ "تم کون ہو؟" اس نے آتے ہی گھٹی گھٹی آواز میں اوتار سنگھ سے پوچھا۔

"میں اوتار سنگھ ہوں...... ماسٹر جی کا شاگرد۔" اوتار سنگھ نے نرم لہجے میں کہا۔ "آپ کے پاس آنے سے پہلے ماسٹر جی میرے ہی پاس رہتے تھے۔"

"میں بدری پرشاد ہوں...... ان کا بیٹا۔" جوان آدمی نے کانتی پرشاد جی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اوتار سنگھ کے ساتھ اس کا رویہ اب مودبانہ تھا۔

ڈاکٹر حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ "آئی ایم سوری مسٹر اوتار سنگھ۔ میں نے بلاوجہ آپ کو برا بھلا کہا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں واقعی اپنی غفلت اور بے خبری پر شرمندہ ہوں۔ دو مہینے میں ماسٹر جی کو بھولا رہا۔ میں قصوروار ہوں۔"

"بہرحال جو کچھ میں نے آپ سے کہا، اصولاً مجھے ان سے کہنا چاہیے تھا۔" ڈاکٹر نے بدری پرشاد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر حقارت بھرے لہجے میں بولا۔ "لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ان پر کچھ اثر ہوگا۔"

بدری پرشاد کھسیا گیا۔ "دیکھیے، ہم سے جو بن پڑا، ہم نے کیا۔ اپنی حیثیت کے مطابق ڈاکٹر کو دکھایا، دوا دی۔ لیکن کچھ فائدہ نہیں۔ یہ مرض ہی لاعلاج ہے۔"

"آپ کی حیثیت کا مجھے علم نہیں۔" ڈاکٹر نے تلخ لہجے میں کہا۔ "لیکن جو آپ نے کہا، وہ بھی دیکھ رہا ہوں۔ آپ کے منہ سے تو ابھی تک رومال بھی نہیں ہٹا۔ انھیں یہاں جس طرح کھانا دیا جا رہا ہے، اس کا آپ کی حیثیت سے کوئی تعلق نہیں اور آپ کے انداز سے مجھے پتا چل گیا کہ انھیں یہاں پھینکنے کے بعد آپ پہلی پہلی بار آئے ہیں۔ ذرا یہ تو بتائیں، انھیں کھانا دینے کون آتا ہے یہاں؟"

"گھر کی ملازمہ ہے......"

"وہ آپ کی حیثیت کا ثبوت ہے اور یہ جس حال میں ہیں، اس سے آپ کی سنگ دلی ظاہر ہوتی ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ پھر وہ اوتار سنگھ کی طرف مڑا۔ "باہر چلیں۔ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

وہ دونوں باہر نکل آئے۔ بدری پرشاد ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

دروازے پر پہنچ کر ڈاکٹر رکا۔ "ان کا مرض بہت بڑھ چکا ہے۔ اب آپ ان کے ساتھ ایک ہی بھلائی کر سکتے ہیں۔"

"بتائیے ڈاکٹر صاحب۔"

ڈاکٹر اب بدری پرشاد کو پوری طرح نظر انداز کر رہا تھا۔ "مجھے نہیں معلوم، آپ افورڈ کر سکیں گے یا نہیں۔"

"ماسٹر جی کے لیے میں سب کچھ افورڈ کر سکتا ہوں۔" اوتار سنگھ نے کہا۔ "آپ بتائیے تو۔"

"جتنی جلد ہو سکے، انھیں کسی پہاڑی مقام پر لے جائیں۔ کسی سینی ٹوریم میں داخل کرا دیں۔"

"یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ آپ کوئی مقام تجویز کریں۔"

"شملہ بہتر رہے گا۔ آپ کہیں تو میں وہاں کے ایک سینی ٹوریم کو لیٹر لکھ دوں گا۔"

"تو آپ لکھ دیں۔ میں ماسٹر جی کو کل ہی لے جاؤں گا۔"

بدری پرشاد کو توہین کا احساس ہونے لگا۔ "آپ لوگ یوں فیصلے کر رہے ہیں، جیسے پتا جی کا کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ ہماری مرضی کے بغیر......"

"میں ان کے پوچھنے والوں کو دیکھ چکا ہوں۔" ڈاکٹر نے بے حد خراب لہجے میں کہا۔ "برسوں بعد آپ اس حال کو پہنچیں اور آپ کی اولاد آپ کو اس طرح رکھے تو آپ کی سمجھ میں یہ سب کچھ زیادہ آسانی سے آ جائے گا۔"

"آپ کچھ بھی کہیں، ہماری مرضی کے بغیر آپ پتا جی کو کہیں نہیں لے جا سکتے۔"

"آپ ماسٹر جی کے بیٹے ہیں۔ ان کے حوالے سے میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔" اوتار سنگھ نے بدری پرشاد سے کہا۔ "آپ سے بعد میں بات ہو جائے گی۔" پھر وہ ڈاکٹر کی طرف مڑا۔ "ڈاکٹر صاحب کل مجھے سفارشی خط مل جائے گا؟"

"جی ہاں۔ میرے مطب سے لے لیجیے گا اور ہاں میں کچھ دوائیں لکھ رہا ہوں۔ وہ انھیں دیتے رہیے۔" ڈاکٹر نے دواؤں کا پرچا لکھا اور اوتار سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد اوتار سنگھ بدری پرشاد کی طرف مڑا۔ "اب فرمائیے۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں کہ پتا جی یہیں رہیں اور ان کا علاج بھی ہوتا رہے۔"

بات اوتار سنگھ کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ خود غرض بیٹا اب باپ کی بیماری سے منفعت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پیسہ اوتار سنگھ کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن وہ ماسٹر جی کی سنگ دل اولاد کو کچھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "[illegible] نے ڈاکٹر کی بات توجہ سے نہیں سنی۔ [illegible] اسے ماسٹر

جی کے ساتھ آخری بھلائی کہا ہے۔"

"ڈاکٹر تو کہتے ہی رہتے ہیں۔" بدری پرشاد نے بے پروائی سے کہا۔

اوتار سنگھ اسے باپ کی طرف سے بے پروائی اور بے حسی کا طعنہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "فیصلہ ماسٹر جی خود کرلیں گے۔"

وہ دونوں پھر کوٹھری میں چلے آئے۔ بدری پرشاد نے پھر منہ پر رومال رکھ لیا تھا۔ اوتار سنگھ نے کانتی پرشاد جی سے کہا۔ "ڈاکٹر کہتا ہے کہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ اس کے لیے آپ کو کسی پرفضا مقام پر جانا ہوگا۔"

کانتی پرشاد جی اسے دیکھتے رہے۔ بولے کچھ نہیں۔

"اب آپ کے سامنے تین راستے ہیں۔" اوتار سنگھ نے کہا۔ "شملہ چلے جائیں۔ وہاں ہر طرح سے آپ کا خیال رکھا جائے گا اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہر ہفتے آپ سے ملنے آیا کروں گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ میرے گھر چلیں اور مجھے خدمت کا موقع دیں۔ تیسری تجویز میری نہیں، آپ کے بیٹے کی ہے۔ آپ یہیں رہیں۔ میں آپ کا علاج کراؤں گا۔"

"جینا تو بہت دور کی بات ہے۔ میں ان مورکھوں کے پاس مرنا بھی نہیں چاہتا۔" کانتی پرشاد جی نے بیٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"پتا جی، ہمارے ہوتے ہوئے آپ......"

"رومال تو منہ سے ہٹا لے مورکھ۔ میرے اس شاگرد نے اپنے ہاتھ میں تسلہ اٹھا کر مجھے تھوکنے کا موقع دیا۔ اپنے رومال سے میرا لتھڑا ہوا منہ صاف کیا۔ اسے بیماری لگنے کا ڈر نہیں۔ اور تم لوگوں نے مجھے جانور سے بھی بدتر بنا دیا ہے۔" کانتی پرشاد جی نے اوتار سنگھ کا ہاتھ تھام لیا۔ "مجھے اپنے ساتھ لے چلو چھوٹے ٹھاکر۔ میں عزت سے سانس لینا بھی بھول چکا ہوں یہاں۔"

اوتار سنگھ نے بدری پرشاد کو دیکھا۔ "اب تو اجازت ہے۔"

بدری پرشاد کھسیا کر رہ گیا۔ اوتار سنگھ نے ماسٹر جی کو ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ اس کا دل دکھنے لگا۔ وہ پھول جیسے ہلکے تھے۔ انھیں ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے وہ کوٹھری سے نکل آیا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

❁......❁......❁

کالج کھلنے کے دن تک اوتار سنگھ کو ارجن کی فکر تھی۔ ارجن ہی جے پور والے راز سے پردہ اٹھا سکتا تھا۔ کالج کھلے۔ دو تین دن ہو گئے۔ لیکن ارجن کی صورت نظر نہیں آئی۔ ویسے وہ اس کے دوستوں کے حلقے میں تھا بھی نہیں۔

پھر اس نے ارجن کے متعلق معلوم کیا۔ پتا چلا کہ وہ اب تک آیا ہی نہیں ہے۔ کئی دن تک اسے ہر روز یہ دھڑکا رہتا کہ ابھی ارجن اسے نظر آئے گا اور اس پر جھپٹتے ہوئے کہے گا......

کتنے لوگوں کو ختم کرا دیا تم نے!

لیکن ایسا کبھی ہوا نہیں۔

انسانی فطرت ہے کہ کسی بات کا خوف ہو تو اس کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ لیکن وہ ٹلتی رہے تو دھیرے دھیرے خوف مٹ جاتا ہے۔ یہی اوتار سنگھ کے ساتھ ہوا۔ ویسے بھی اس کا معاملہ تھا بھی کچھ عجیب۔ ایسا کھلا معاملہ جس طرح سے پردے میں رہا تھا، اس سے اسے اس معاملے میں کسی بڑی طاقت کی کارفرمائی کا خیال آتا تھا۔

بہرحال چند ہی روز میں وہ ارجن کو بھول گیا۔ سامنے اور اہم معاملات بھی تھے۔

ماسٹر جی کو وہ شملہ کے سینی ٹوریم میں چھوڑ آیا تھا۔ صرف چھوڑ نہیں آیا تھا، اس نے وہاں دو روز رک کر اطمینان کیا تھا کہ وہاں ماسٹر جی کی بہت اچھی دیکھ بھال ہوگی۔

کالج میں پڑھائی کی صورتِ حال اب بھی ویسی ہی تھی۔ جہاں پورا ملک بے یقینی اور انتشار کی کیفیت میں ہو، وہاں زندگی بھی رک جاتی ہے۔ ان کے خالی پیریڈز کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ ان کے لائبریری میں جانے اور مطالعہ کرنے کا رجحان کم ہو گیا تھا۔ مطالعہ اخبارات تک محدود ہو گیا تھا۔ باہر لان پر اور کامن روم میں دوستوں کی نشستیں ہوتی تھیں۔ ان میں بھی صرف سیاست پر گرما گرم بحث ہوتی تھی۔

"جناح بے اصول آدمی ہیں۔" ایک دن ایسی ہی ایک نشست میں رام گوپال نے اعلان کیا۔

"تم اور کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔" محمود نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"میں نے یہ بات اس وقت کہی تھی، جب مسلم لیگ نے کانگریس کے بغیر عبوری حکومت میں شامل ہونا قبول کیا تھا۔" رام گوپال نے کہا۔ "اصل میں مسلم لیگ یہ چاہتی تھی کہ کانگریس عبوری حکومت میں شامل نہ ہو۔"

"یہ تجزیہ احمقانہ ہے۔ دراصل یہ سوچ کانگریس کی ہے کیونکہ اس نے ملک میں دو اکثریتی جماعتوں کے وجود جیسی حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔ مسلم لیگ کانگریس کے وجود سے انکار نہیں کرتی۔ اسی کی بنیاد پر دو قومی نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ مسلم لیگ ملک کی دوسری بڑی سیاسی جماعت ہے اور مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ اسے ملک کے 90 فیصد سے زیادہ مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے۔ اب ذرا یہ تو دیکھو کہ کانگریس نے وائسرائے کی تجاویز کو قبول کرنے سے انکار کس بنیاد پر کیا......؟ اس پر کہ اس میں قوم پرست مسلمانوں کا کوئی نمائندہ شامل نہیں ہے۔ حالانکہ ایسے نام نہاد قوم پرستوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور کانگریس کو ان کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تو موجود ہے نا۔"

"کانگریس کسی مذہب کو ماننے والوں کی جماعت نہیں۔" رام گوپال نے بڑے جوش

سے کہا۔ ”وہ تو پورے ملک کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ کانگریس ایک قومی سطح کی سیاسی جماعت ہے جبکہ مسلم لیگ مذہب کی بنیاد پر قائم ہونے والی غیر مذہبی سیاسی جماعت ہے۔“

”میں تھوڑی دیر کو تمہاری بات مان لوں، تب بھی یہ حقیقت تو نہیں بدلے گی کہ مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے تلے متحد ہیں۔ الیکشن میں مسلم لیگ کے امیدواروں کے سامنے بڑے بڑے لوگوں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں......“

”ایک تو تم لوگ بحث کرتے ہوئے موضوع سے ہٹ جاتے ہو۔“ فتح سنگھ نے اعتراض کیا۔

”میں موضوع سے نہیں ہٹ رہا ہوں۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ کانگریس کا یہ مطالبہ کہ عبوری حکومت میں قوم پرست مسلمانوں کا نمائندہ ہونا ضروری ہے، دراصل اپنی Strength بڑھانے کے لیے ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایک کانگریسی مسلمان کو مسلم لیگی کی جگہ دی جائے۔ یوں مسلمانوں کا ایک نمائندہ کم ہوگا اور دوسری طرف ان کی طاقت بڑھے گی۔ یہ کانگریس کی بدنیتی کا ثبوت ہے۔“

”اور یہ مسلم لیگ کی بدنیتی ہے کہ کانگریس کے انکار پر میدان خالی پا کر اس نے اس پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔“ رام گوپال بولا۔

”یہ تو سیاسی اور جمہوری عمل جاری رکھنے کی کوشش تھی۔ ورنہ انگریز تو یہاں رکنے کا بہانہ چاہتے ہیں۔“ محمود نے کہا۔

”تو اب مسلم لیگ پیچھے کیوں ہٹ گئی؟“ رام گوپال نے اعتراض کیا۔

”اصول کی بنیاد پر وائسرائے نے اپنے موقف سے پیچھے ہٹ کر یہ ثابت کر دیا کہ درپردہ وہ کانگریس سے ملے ہوئے ہیں۔ اس جانب داری کے ساتھ مسلم لیگ عبوری حکومت میں صرف استعمال ہوگی۔“

”اور اس جانب داری کے ساتھ تم ان سے پاکستان مانگ رہے ہو۔“ رام گوپال نے مضحکہ اڑایا۔

”پاکستان تو انھیں دینا پڑے گا۔ پاکستان تو ہم لے کر رہیں گے۔“ ٹھنڈے دل و دماغ سے بات کرنے والا محمود ایک دم جذباتی ہو گیا۔

”تم اصول کی بات کرتے ہو۔ مسلم لیگ نے عبوری حکومت سے منہ موڑ کر ثابت کر دیا کہ وہ کانگریس کے ساتھ کسی پلیٹ فارم پر بھی بیٹھنا نہیں چاہتی۔“

”اور میں کہتا ہوں کہ کانگریس کا اعتراض وائسرائے اور کانگریس کی ملی بھگت تھی...... ڈراما تھا۔ کانگریس نے یہ چاہتی ہے کہ مسلم لیگ مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے کہیں

نمایاں نہ ہونے پائے۔ اس سازش کے ذریعے انھوں نے مسلم لیگ کے لیے عبوری حکومت میں شامل ہونے کا راستہ ہی نہیں چھوڑا۔“

”تو یہ تدبر کی کمی ہے۔“ رچرڈ اچانک بول پڑا۔ ”مسلم لیگ کا ردِعمل وہی رہا جو کانگریس چاہتی تھی۔“

”مجھے یقین ہے کہ لیگی قیادت بالآخر درست فیصلہ کرے گی۔“ محمود نے کہا۔

”فیصلہ کر لیا ہے انھوں نے۔“ رام گوپال نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”16 اگست ڈائریکٹ ایکشن ڈے ہوگا۔“

”میں ایک بات بتاؤں۔“ رچرڈ پارسن بولا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ تم لوگ آزادی کے قابل نہیں ہو۔ تم میں اختلاف رائے کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ تمھارے اندر تشدد کا رجحان ہے۔ یہ بہت بڑی آبادی کا ملک ہے، جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں۔ کلکتہ میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے، وہ گواہی دیتا ہے کہ آزاد ہونے کے بعد تم ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہو گے۔ کہیں اختلاف رائے کو دبانے کے لیے تو کبھی مذہب کے نام پر۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کا پاکستان کا مطالبہ بالکل جائز اور فطری ہے۔ متحدہ ہندوستان میں تو ان کی نسل ہی مٹا دی جائے گی۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ سو سال تک تو اس خطے میں کوئی الیکشن خون ریزی کے بغیر نہیں ہوگا۔“

”تم پورے ہندوستان کی توہین کر رہے ہو۔“ رام گوپال نے مشتعل ہو کر کہا۔

”جو دیکھ رہا ہوں، اس کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ دلیل سے تردید کر سکتے ہو تو کرو۔“ رچرڈ نے چیلنج کیا۔

”تم لوگوں کو سیاست کا ہوکا ہو گیا ہے۔“ امرتا بلبلا کر بولی۔ ”کتنی تکلیف دہ گفتگو کرتے ہو۔ میرے تو سر میں درد ہو گیا۔“

”چلو...... اب چائے پلاؤ۔“ پشپا نے کہا۔

وہ سب کینٹین کی طرف چل دیے۔

❁......❁......❁

سرفراز بیگم کو اس بار ایسا سکون آیا تھا کہ کوئی خلش ہی نہیں رہی تھی۔ وہ پوری طرح سے مطمئن ہو گئی تھیں۔ اسی لیے انھوں نے بچیوں سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ حالانکہ بچیاں توقع کر رہی تھیں۔

وہ کچھ بدل گئی تھیں۔ چھوٹے ٹھاکر کا تذکرہ کرنا انھوں نے چھوڑ دیا تھا۔ بچیاں ان کی تبدیلی کو گہری نظر سے دیکھ رہی تھیں۔

ایک دن اس طرح گزر گیا۔ اگلے دن دوپہر کے کھانے کے بعد تینوں بہنیں ساتھ بیٹھی

تھیں۔سرفراز بیگم دوپہر کے کھانے کے بعد آدھے گھنٹے لیٹنے کی عادی تھیں۔وہ اپنے کمرے میں تھیں۔

''خلافِ معمول بات نور بانو نے چھیڑی۔''پرسوں اماں اوپر سے ہو کر آئی ہیں تو چپ چپ ہیں۔''

''ہاں آپی،انھوں نے کوئی بات ہی نہیں کی۔''

''مجھے لگتا ہے،غبارے سے ہوا نکل گئی ہے۔''نور بانو نے کہا۔

''کیا مطلب؟''حور بانو نے تنک کر پوچھا۔

''میری بات کی تصدیق ہوگئی ہوگی کسی طرح۔''نور بانو بولی۔''ورنہ اماں تو اوپر سے آتے ہی چھوٹے ٹھاکر کا قصیدہ پڑھتی تھیں۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ اماں اس معاملے میں ہم سے خفا ہیں......تمہاری وجہ سے۔''حور بانو نے اسے الزام دیا۔

''جی نہیں۔میرے کہنے سے کچھ فرق پڑتا تو وہ اوپر جانا ہی چھوڑ دیتیں۔''نور بانو نے تنک کر کہا۔

''دو دن ہو گئے۔وہ اوپر نہیں گئی ہیں۔''گلنار بولی۔

''اگر وہ اوپر نہیں جاتیں تو سمجھ لو کہ چھوٹے ٹھاکر کی اصلیت کھل گئی ہے۔میرا کوئی بیچ نہیں اس میں۔''

لیکن اسی شام سرفراز بیگم اوپر چلی گئیں۔

اس بار بھی ان کا رویہ پہلے والا تھا۔لڑکیاں پھر سر جوڑ کر بیٹھیں۔''مجھے نہیں لگتا کہ کوئی بڑی بات ہے۔''حور بانو نے کہا۔وہ نور بانو سے مخاطب تھی۔''اگر تمہارا اندازہ درست ہوتا تو اماں اوپر جاتی ہی نہیں۔''

''میں اماں کو سمجھتی ہوں۔''نور بانو کے لہجے میں فخر تھا۔''کوئی بڑی بات ... جائے تو بھی اوپر جانا نہیں چھوڑیں گی۔ان کی طبیعت میں وضع داری ہے۔اسے بیٹا کہا ہے تو عمر بھر نبھائیں گی۔ہاں یہ ضرور ہے کہ اسے نیچے نہیں آنے دیں گی۔''

''تم سے تو بس کوئی افسانہ نگاری کرا لے۔''حور بانو نے بھنا کر کہا۔''بے پر کے بھی کوا بنا ڈالتی ہو۔''

''میری سمجھ میں بات آ رہی ہے۔''اچانک گلنار نے کہا۔

''لو......بھائی کی آرزومند بہن بھی بولی۔''نور بانو نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''کیوں......یہ کیوں نہیں بول سکتی۔''حور بانو فوراً چھوٹی بہن کی حمایت میں ڈٹ گئی۔

''ہاں گلنار......بتاؤ،تمہاری سمجھ میں کیا آیا ہے؟''

''اس بار جو اماں اوپر گئی تھیں تو چھوٹے ٹھاکر کے لیے کرتا پائجامہ لے کر گئی تھیں۔''

''ہاں مجھے یاد ہے۔''حور بانو نے کہا۔

''وہ کرتا جو انھوں نے ایک مہینے کی مشقت کے بعد کاڑھا تھا......''نور بانو نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''جی......اور بہت خوبصورت کاڑھا تھا۔''گلنار نے جلدی سے وضاحت کی۔

''تم کچھ کہہ رہی تھیں۔''حور بانو نے گلنار کو آنکھیں دکھائیں۔

''میرا خیال ہے باجی کہ چھوٹے ٹھاکر کو امی کا وہ تحفہ اچھا لگا ہوگا......''

''اتنا خوبصورت لباس کیسے برا لگے گا۔''حور بانو نے بے یقینی سے کہا۔

''وہ ہندو ہیں نا......ہندو کرتا بھی اور طرح کا پہنتے ہیں اور ساتھ میں دھوتی ہوتی ہے۔''

''تو پھر؟''

چھوٹے ٹھاکر نے اس کا اظہار بھی کر دیا ہوگا اماں پر۔ظاہر ہے،اماں کو یہ بات اچھی نہیں لگی ہوگی۔''

''ہاں......یہ ممکن ہے۔''نور بانو نے کہا۔

''تو اب اماں جاتی تو ہیں۔لیکن ان کے متعلق بات نہیں کرتیں۔''

صورتِ حال ایسی تھی کہ اس سے بہتر کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

سرفراز بیگم کا معمول اب بھی وہی تھا۔ہر دوسرے تیسرے دن وہ چھوٹے ٹھاکر سے ملنے اوپر جاتی تھیں اور اس کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر جاتی تھیں۔لیکن بچیوں سے انھوں نے اس کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ایسا لگتا تھا کہ یہ باب مکمل ہو چکا ہے۔

لیکن ایک ماہ بعد یہ بات بھی غلط ثابت ہوگئی کہ فساد کرتے اور پائجامے کی وجہ سے تھا۔

اس روز اماں نے بہادر علی کو بلوایا۔''بہادر علی،دو تھان لانے ہیں کپڑے کے۔''انھوں نے دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر کہا۔''ایک تھان ڈھاکہ کی بہترین ململ کا اور ایک بہت اچھے لٹھے کا۔''

''لے آتا ہوں بیگم صاحبہ۔''

اماں نے چھمن بوا کو پیسے دیے جو انھوں نے بہادر علی کو دے دیے۔

تینوں لڑکیوں کا تجسس سے برا حال تھا۔''آپ بھی کمال کرتی ہیں اماں۔گرمیاں رخصت ہو رہی ہیں اور آپ ململ کا تھان منگوا رہی ہیں۔''حور بانو نے کہا۔

''اور پورے تھان کا کریں گی کیا؟''نور بانو نے اعتراض کیا۔

''کرتے ہی بناؤں گی۔ململ کا اور مصرف کیا ہے!''سرفراز بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اتنے کرتے!اور وہ بھی جاتی گرمیوں میں۔''حور بانو نے کہا۔

''کڑھائی میں مہینے سے کم نہیں لگتا۔اگلی گرمیاں آنے تک کرتے تیار ہو جائیں گے۔''

"اب اتنا وقت بھی نہیں لگتا اماں۔"

"مجھے تو لگتا ہے۔ بلکہ زیادہ ہی لگتا ہے۔ گھر کے اتنے کام ہوتے ہیں۔ تم لوگ تو ہاتھ بٹاتی نہیں ہو۔" سرفراز بیگم کے لہجے میں ملامت تھی۔ "میں رو پیٹ کر ایک کرتا کاڑھ لوں مہینے میں تو یہ بھی بڑی بات ہے۔ پھر اب نگاہ بھی تو پہلے جیسی نہیں رہی۔"

"اچھا ماں...... ایک کرتا مجھے بھی دیجیے گا۔ میں بھی کاڑھوں گی۔" نور بانو بولی۔

"یہ تو آپ نے بتایا نہیں کہ اس تھان میں سے کرتے کس کس کے نکلیں گے؟"

"صرف چھوٹے ٹھاکر کے۔ اور کسی کے بھی نہیں۔" سرفراز بیگم کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

ان تینوں کے منہ کھل گئے حیرت سے۔ "اتنے کرتے...... ! چھوٹے ٹھاکر کے لیے؟"

حور بانو نے بے ساختہ کہا۔ "اور ایک کرتا نور بانو بھی کاڑھے گی۔"

نور بانو جھینپی، کھسیائی، ایک لمحے کو ہچکچائی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ انکار کر دے گی۔ لیکن پھر شاید اسے اپنی آن کا خیال آ گیا۔ "لو...... اس میں ایسی کون سی بات ہے۔ کرتا کاڑھنے میں کیا برائی ہے۔ وہ تو میں ضرور کاڑھوں گی۔"

"ایک پر میں بھی کڑھائی کروں گی۔" حور بانو نے کہا۔

"چلو، کر لینا۔" سرفراز بیگم نے گہری سانس لے کر کہا۔ "لیکن سچ یہ ہے کہ میں اس کام میں کسی کا ساجھا نہیں چاہتی۔"

لڑکیوں نے ماں کو حیرت سے دیکھا۔ وہ کتنی محبت کرتی ہیں چھوٹے ٹھاکر سے۔ "تو انھیں وہ کپڑے پسند آئے؟" حور بانو نے پوچھا۔

"اتنے پسند آئے کہ اس نے اسی وقت پہن لیے اور کہنے لگا...... ایسے اور کپڑے سی کر دیں گی مجھے؟"

"اور آپ نے ایک درجن جوڑے دینے کا ارادہ کر لیا۔" نور بانو بولی۔

"تم نے دیکھا نہیں اسے اس لباس میں۔" سرفراز بیگم نے کہا۔ "سچ پوچھو تو مغل شہزادہ لگ رہا تھا وہ۔ اتنا خوبصورت کہ جی چاہے، دیکھتے ہی رہو۔"

یہ سن کر تینوں لڑکیوں کے دل میں کرتا پائجامہ پہنے ہوئے چھوٹے ٹھاکر کو دیکھنے کی خواہش مچلنے لگی!

❀......❀......❀
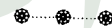
"دیکھ لیا۔ میں نے کہا تھا نا کہ یہ وائسرائے اور کانگریس کی ملی بھگت ہے۔" محمود جوشیلے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اس کا لہجہ فاتحانہ نہیں تھا۔ "اسے کہتے ہیں یوٹرن۔"

"اسے سیاست کہتے ہیں بچے۔" رام گوپال نے حقارت سے کہا۔ "اب مان لو کہ

مسلمان سیاست میں طفلِ مکتب ہیں۔ انھیں بہت کچھ سیکھنا ہے ہم سے۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ تم الگ ملک لے بھی لو گے تو چلا نہیں سکو گے۔ آخر ہم سے ہی ملنا پڑے گا۔"

"اگر سیاست جھوٹ، مکاری اور منافقت کا نام ہے تو ایسی سیاست کو سات سلام۔" محمود نے تند لہجے میں کہا۔ "پاکستان نام اس لیے تجویز کیا گیا ہے کہ وہ سرزمین انشاء اللہ ہر گندگی سے پاک ہو گی اور کانگریس کی گندی سیاست کا جہاں تک تعلق ہے تو اس کا توڑ بھی مسلم لیگ کر لے گی۔"

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ کانگریس اِن ہو گئی اور مسلم لیگ آؤٹ۔" رام گوپال نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کے نمائندے نامزد کیے جا چکے۔ وائسرائے نے اعلان کر دیا۔"

"دیکھ لینا۔ ہم یہ سازش بھی ناکام بنا دیں گے۔"

یہ گفتگو کالج کی کینٹین میں ہو رہی تھی۔ پڑھائی کسی حد تک شروع ہو گئی تھی۔ لیکن سیاسی ماحول کے درجۂ حرارت نے اب بھی اساتذہ اور طلباء کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ پڑھائی کا ماحول تھا ہی نہیں۔

ستمبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ سیاسی صورتِ حال ہر پل رنگ بدل رہی تھی۔ وائسرائے نے 16 مئی پلان سے پسپائی اختیار کی تو مسلم لیگ نے اس کی جانب داری محسوس کرتے ہوئے 27 جولائی کو پلان کی اپنی منظوری واپس لے لی۔ 8 اگست کو کانگریس نے اپنے موقف سے یوٹرن لیتے ہوئے 16 مئی پلان قبول کر لیا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ مسلم لیگ کو سیاسی منظر سے ہٹانے کی خواہاں ہے اور اس میں وائسرائے اس کا ساتھ دے رہا ہے۔ سیاسی صورتِ حال اس وقت اور گھمبیر ہو گئی، جب محمد علی جناح کو گرفتار کرنے کی افواہیں گردش کرنے لگیں۔ ردِ عمل میں محمد علی جناح نے اعلان کیا کہ وہ جیل جانے کو تیار ہیں۔

24 اگست کو وائسرائے نے اعلان کیا کہ تاجِ برطانیہ نے گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کے اراکین کے استعفے منظور کرتے ہوئے نہرو، پٹیل، راجندر پرشاد، آصف علی، راج گوپال اچاریہ، سرت چندر بوس، جون متھائی، سردار بلدیو سنگھ، شفاعت احمد خان، جگ جیون رام، سید علی ظہیر اور سی ایچ بھابھا کو ان کی جگہ ایگزیکٹو کونسل کے لیے نامزد کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ لارڈ ویول نے پانچ غیر مسلم لیگی اراکین کی نشستوں کی تقرری کا اختیار بھی کانگریس کو دے دیا۔ اسی شام وائسرائے نے ریڈیو پر عبوری حکومت کی تشکیل کا اعلان کر دیا۔ اس کے جواب میں محمد علی جناح نے تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان کا مسلم لیگ کا مطالبہ شد و مد سے دہرایا۔ تاہم 2 ستمبر کو مسلم لیگ کی نمائندگی کے بغیر عبوری حکومت قائم ہو گئی۔

اوتار سنگھ دوستوں کے سیاسی تبصرے بھی غور سے سنتا تھا اور خود بھی سوچتا تھا۔ اس کا

تجزیہ تھا کہ انگریزوں نے کانگریس کے ساتھ مل کر یہ بہت گہری چال چلی ہے۔ اس کے دو مقصد ہیں۔ ایک تو مسلمانوں کو مایوس کرنا، دوسرے مسلم لیگ پر ان کے اعتماد میں شگاف ڈالنا۔ یہ فطری امکان اپنی جگہ تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں مسلمانوں کی جانوں کے زیاں کے پیش نظر مسلمان بددل ہو کر مسلم لیگ کی حمایت سے ہاتھ اٹھالیں اور پاکستان کے مطالبے سے دست بردار ہو جائیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ آزمائش مسلم لیگ کی قیادت کی نہیں، عام مسلمانوں کی ہے۔ اگر اس وقت وہ ڈگمگا گئے تو مسلم لیگ کی قیادت کا تدبر، حوصلہ اور عزم بھی کچھ نہیں کر سکے گا۔ مسلمان خو... کی آزمائش اس اعتبار سے بھی سخت تھی کہ ہندو انھیں طعنے دیں گے کہ کتنی آسانی سے مسلم لیگ کو اقتدار سے باہر کر دیا گیا ہے اور یہ کہ یہ بہت بڑی ناکامی ہے۔

اب مسلمان اس آزمائش پر پورے اترتے ہیں یا نہیں، اس کا فیصلہ تو آنے والے وقت کو ہی کرنا تھا۔ اوتار سنگھ تو پہلی بار سیاست اور اقتدار کے کھیل کو عملی شکل میں اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ خود کو غیر جانب دار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اس غیر جانب داری کے نتیجے میں اس کی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ تھیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعے انھیں پاکستان بنانے سے روکنے کی کوشش کی جا رہی تھی، یہ سمجھے بغیر کہ اس طرح تو مسلمانوں کو عدم تحفظ میں مبتلا کیا جا رہا ہے۔ یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ ان کی بقا کی واحد صورت قیام پاکستان ہے۔ کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ مسلمانوں کو صرف محبت اور امن سے قائل کیا جا سکتا ہے۔ اوتار سنگھ کے نزدیک قیام پاکستان اب ناگزیر ہو چکا تھا۔

''تم کہاں کھوئے ہوئے ہو؟'' ریٹا پارسن نے اُسے چونکا دیا۔

''کہیں نہیں۔ میں تو یہیں ہوں۔''

''کل سنڈے ہے۔ ہمارے گھر پارٹی ہے۔ آؤ گے؟'' ریٹا کے لہجے میں لگاوٹ تھی۔

''سوری، میں تو نہیں آ سکتا۔''

''کیوں؟ ایسی کیا مصروفیت ہے؟''

''میں شہر سے باہر ہوں گا۔''

''پچھلے ہفتے بھی تم شہر سے باہر تھے؟''

''ہاں۔ ویک اینڈ پر میں شملہ جاتا ہوں۔''

''تفریح کے لیے؟''

''نہیں۔ وہاں سینی ٹوریم میں میرے استاد داخل ہیں۔ ویک اینڈ میں ان کے ساتھ گزارتا ہوں۔''

''تو آئندہ ہمیں پارٹی کے لیے کوئی اور دن رکھنا پڑے گا؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

ریٹا بجھ سی گئی۔ ''اس ہفتے مس کر دو نا...... میری خاطر۔''

''سوری۔ ماسٹر جی سے ملنے میرے سوا کوئی نہیں جاتا۔ وہ پورے ہفتے میری آمد کے دن گنتے ہیں۔''

''چلو، ٹھیک ہے۔ آئندہ میں پارٹی ارینج کرتے وقت اس کا خیال رکھوں گی۔''

❁......❁......❁

اوتار سنگھ ڈاکٹر چارلس کے سامنے بیٹھا تھا۔ ''مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے ڈاکٹر۔'' اس نے کہا۔ ''ماسٹر جی کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ صرف دو ماہ میں اتنا فرق پڑ گیا ہے۔''

''کیا واقعی؟'' ڈاکٹر نے بھویں اچکاتے ہوئے اسے دیکھا۔

''جی ہاں۔ جب میں انھیں یہاں لایا تھا تو چلنا در کنار، ان میں بولنے کی طاقت بھی نہیں تھی۔ اب وہ دس منٹ کی چہل قدمی کرتے ہیں۔ اپنی وہیل چیئر پر اِدھر سے اُدھر گھومتے ہیں اور ان کے چہرے پر زندگی کی چمک نظر آتی ہے۔''

''یہ صرف غذا کی وجہ سے ہے۔ غذا آدمی کے ظاہر پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جب وہ یہاں آئے تھے تو انھیں دیکھ کر لگتا تھا کہ ہفتوں سے انھوں نے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا ہے۔ بیماری سے جسم کمزور ہو جاتا ہے۔ لیکن غذا نہ ملنے سے تو بالکل تباہ ہو جاتا ہے۔ اب یہاں انھیں ہر وہ چیز مل رہی ہے، جس کی انھیں ضرورت ہے۔ دودھ، پھل، ہر چیز۔ اس لیے وہ دیکھنے میں بہتر ہو گئے ہیں۔''

''آپ کا مطلب ہے، ان کی صحت بہتر نہیں ہوئی ہے؟'' اوتار سنگھ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ایگزیکٹلی۔ دیکھو مسٹر اوتار سنگھ، میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''تم جب انھیں یہاں لائے تو ان کی بیماری بہت بڑھ چکی تھی۔ ان کے دونوں پھیپھڑے تقریباً ناکارہ ہو چکے ہیں۔ وہ بیماری کے اس اسٹیج پر ہیں، جہاں علاج ممکن نہیں رہتا۔ لیکن ہم ڈاکٹر لوگ ناممکن سے بھی لڑتے رہتے ہیں۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہم کسی کی زندگی بڑھا نہیں سکتے۔ ہاں زندگی کی کوالٹی بہتر کر سکتے ہیں۔ ان کی تکلیف کم کر سکتے ہیں۔ وہ ہم کر رہے ہیں۔''

اوتار سنگھ مایوس نظر آ رہا تھا۔ ''لیکن مجھے تو اب وہ صحت مند لگتے ہیں۔''

''دیکھو مسٹر اوتار سنگھ، یہ جو ٹی بی ہے نا، یہ بہت دھوکے باز اور پُرفریب مرض ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی اندر سے ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ لیکن بظاہر بہت صحت مند دکھائی دیتا ہے۔ ابھی تین دن پہلے مسٹر پرشاد پر شدید اٹیک [illegible] تا۔ مجھے امید نہیں رہی تھی۔ لیکن وہ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ قوتِ ارادی کے دم سے ہے۔ اور سنو، وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ تمہاری خاطر جینا چاہتے ہیں۔''

’’تھینک یو ڈاکٹر فار ایوری تھنگ۔ آپ ان کے گھر ہفتہ وار رپورٹ تو بھیج رہے ہیں نا؟‘‘

’’ہاں۔ یہ تو ہمارا فرض ہے۔‘‘

’’وہاں سے کوئی ان سے ملنے نہیں آیا۔‘‘

’’نہیں۔ شاید آئے گا بھی نہیں۔ یہاں جہالت بہت ہے۔ اپنے ڈر کی وجہ سے لوگ مریض کے جلد از جلد مرنے کا سامان کر دیتے ہیں۔‘‘ ڈاکٹر کے لہجے میں شکایت تھی۔

’’بہر حال آپ انھیں باخبر رکھیے گا۔‘‘

’’میں نے کہا نا۔ یہ میرا فرض ہے۔‘‘

اوتار سنگھ ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل آیا۔

وہ بہت بڑا سینی ٹوریم تھا۔ وسیع و عریض سرسبز لان تھا۔ کشادہ اور ہوادار کمرے تھے۔ صفائی ایسی تھی کہ دیکھ کر رشک آتا تھا۔ عام طور پر ایک کمرے میں چار مریض ہوتے تھے۔ لیکن اوتار سنگھ نے ماسٹر جی کو الگ کمرا دلایا تھا۔ ڈاکٹر نے پہلے ہی دن اسے بتا دیا تھا کہ یہاں جو مریض ہیں، ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ کسی بھی وقت، بالکل اچانک کسی کا وقت آ جاتا ہے۔ اور اکثر اس ایک موت کے نتیجے میں دوسری موت واقع ہو جاتی ہے۔ دوسرا مریض اپنے سے کہیں بہتر مریض کی موت پر حوصلہ ہار بیٹھتا ہے۔ "Death usually strikes twice in sueeesoion" ڈاکٹر نے کہا تھا۔ اور اوتار سنگھ نے سوچا تھا کہ ماسٹر جی کو اپنا کمرا ملنا چاہیے۔ وہ اپنے طور پر کہیں بھی آ جا سکتے ہیں۔ اس لیے انھیں تنہائی کا احساس بھی نہیں ہوگا۔ اور موت کے پلٹنے والے وار سے بھی بچے رہیں گے۔ ایک کمرے میں چوبیس گھنٹے ساتھ رہنے والے مریض کی موت زیادہ اثر انداز ہوتی ہوگی۔

وہ ماسٹر جی کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بستر پر لیٹے تھے۔ اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھے۔ ’’آؤ اوتار سنگھ، کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔‘‘ انھوں نے شکایت کی۔

’’سفر لمبا ہے ماسٹر جی۔ کبھی دیر بھی ہو جاتی ہے۔‘‘ اوتار سنگھ نے معذرت کی۔

’’میں بھی کیسا آدمی ہوں۔ تم اتنی دور سے آتے ہو اور میں شکایت کر بیٹھتا ہوں۔‘‘ ماسٹر جی نے شرمندگی سے کہا۔

اس شکایت میں جو محبت ہے، وہ مجھے بہت عزیز ہے ماسٹر جی۔‘‘ اوتار سنگھ نے کہا۔

’’ویسے میں ڈاکٹر سے ملتا ہوا آ رہا ہوں۔ وہ کہہ رہا تھا، آپ نے بہت تیزی سے Recover کیا ہے۔ کچھ ہی عرصے میں آپ یہاں سے جا سکیں گے۔‘‘

’’کہاں جا سکوں گا؟ کہاں جاؤں گا؟‘‘ ماسٹر جی نے گھبرا کر پوچھا۔

’’میرے ساتھ، میرے گھر۔‘‘

ماسٹر جی نے سکون کی سانس لی۔ ’’ارے ڈاکٹر تو بہلاتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ

جب تک زندہ ہوں، یہاں رہوں گا۔ یہاں سے مر کر ہی نکلوں گا۔‘‘

’’ایسی تو بات نہیں ماسٹر جی۔‘‘ اوتار سنگھ نے کہا۔ پھر تیزی سے موضوع بدلا۔ ’’یہ بتائیں، آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟‘‘

ماسٹر جی نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ’’ضرورتیں کہاں پیچھا چھوڑتی ہیں۔ مگر سب پوری بھی تو نہیں کی جا سکتیں۔‘‘

’’مجھے بتائیں نا، شاید میں کچھ کر سکوں۔‘‘

’’کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔‘‘

’’پھر بھی......‘‘

’’دل چاہتا ہے، کاش...... کبھی بچے مجھ سے ملنے آ جاتے۔ بچوں کے بچے بہت یاد آتے ہیں مجھے۔‘‘ ماسٹر جی کے لہجے میں تڑپتی ہوئی حسرت تھی۔

اوتار سنگھ کے دل پر گھونسہ لگا۔ ’’اس میں تو میرا قصور ہے ماسٹر جی۔‘‘ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ’’ان کو میں نے یہاں کا پتا ہی نہیں بتایا۔ اب کے واپس جاؤں گا تو انھیں بتا دوں گا۔‘‘

’’تم مہان ہو چھوٹے ٹھاکر۔ لیکن جھوٹ بولتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔‘‘ ماسٹر جی نے بہت پیار سے کہا۔ ’’مجھے معلوم ہے۔ تم ایسے نہیں ہو کہ انھیں بے خبر رکھو۔ مگر میں جانتا ہوں کہ وہ میرے مرنے پر بھی نہیں آئیں گے۔‘‘

’’آپ اتنی سخت بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟‘‘

’’میں ہی تو کہہ سکتا ہوں۔ انھیں پیدا کیا، پالا پوسا میں نے۔ ان کی رگ رگ سے واقف ہوں میں۔ ارے یہ شملہ تو بہت دور ہے...... اتنا دور جیسے دھرتی سے آکاش، انھوں نے تو وہاں مجھے اس کاٹھ کباڑی کوٹھری میں پھینک دیا تھا۔ میں ڈیڑھ مہینے وہاں پڑا رہا۔ وہ ایک گھر میں ہوتے ہوئے مجھ سے ملنے نہیں آئے۔ کسی پوتے پوتی کی شکل نہیں دیکھی میں نے۔ میں جانتا ہوں، جس روز ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ مجھے ٹی بی ہے، اسی روز میں ان سب کے لیے اور وہ میرے لیے مر گئے تھے۔ تم نہ آتے تو مری مٹی وہیں خراب ہونی تھی۔ آج میں یہاں عزت سے جی رہا ہوں...... تمہاری وجہ سے۔ ورنہ مجھے تو عزت کی موت بھی نصیب نہ ہوتی۔‘‘

’’اچھا چھوڑیے ان باتوں کو۔ آئیے...... لان پر چلیں۔‘‘

’’کیا کروں گا وہاں جا کے۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔‘‘ ماسٹر جی نے آزردگی سے کہا۔

’’کرنا کیا ہے، باتیں کریں گے خوب ساری۔ اور یہ نہ بھولیں کہ آپ میرے ماسٹر جی ہیں۔‘‘

’’یہ میں کیسے بھول سکتا ہوں۔‘‘

"میرے ذہن میں بے شمار سوال ہیں، جن کا جواب آپ کو دینا ہے اور اس کے لیے کھلی فضا ضروری ہے۔"

ماسٹر جی مسکرائے۔ ان کی آنکھیں چمکیں اور پورا چہرہ ایک دم روشن ہو گیا۔ "یہ تو ہے۔" انھوں نے چہک کر کہا۔ "جب سے تمھیں دیکھا ہے، ایسا ہی دیکھا ہے۔ ہمیشہ سوالات سے بھرے ہوئے ہوتے ہو تم۔ تجسس، جستجو اور تلاش...... یہی زندگی ہے تمہاری۔ سچ تو یہ ہے کہ میں تمھارے تمام سوالوں کے شافی جواب کبھی نہیں دے سکا۔ مگر خیر...... چلو، آج پھر کوشش کرتے ہیں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

اوتار سنگھ جلدی سے قریب رکھی وہیل چیئر ان کے پاس اٹھا لایا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں ویسے ہی چلوں گا۔" ماسٹر جی نے کہا۔

"ابھی اس پر بیٹھ جائیں۔ بعد میں لان پر چہل قدمی کریں گے۔"

ماسٹر جی وہیل چیئر پر بیٹھ گئے۔ اوتار سنگھ اسے دھکیلتا ہوا کمرے سے باہر لے آیا۔

اسے خوشی تھی کہ اس کی یہ پڑھنے اور سوال کرنے کی ترکیب اب بھی کارآمد ہے۔ اس سے ماسٹر جی کی مایوسی ہمیشہ دور ہو جاتی ہے اور وہ زندگی اوڑھ لیتے ہیں۔ انھیں اپنے کارآمد اور موثر ہونے کا احساس ہوتا ہے اور زندگی میں مقصدیت نظر آنے لگتی ہے۔

وہ لان کی طرف بڑھتے رہے!

❀......❀......❀

سرفراز بیگم چھوٹے ٹھاکر کے لیے کوفتے لے کر اوپر پہنچیں تو وہاں سناٹا تھا۔ "چھوٹے ٹھاکر...... چھوٹے ٹھاکر۔" انھوں نے پکارا۔

ایک کمرے سے رنجنا نکلی۔ "آیئے بڑی بیگم۔"

"چھوٹا ٹھاکر کہاں ہے؟ میں اس کے لیے کوفتے لائی ہوں۔"

"وہ تو گھر میں نہیں ہیں بڑی بیگم۔ ہفتے کو وہ شملہ چلے جاتے ہیں۔ اتوار کو واپس آتے ہیں۔"

سرفراز بیگم کو حیرت ہوئی کہ وہ بے خبر ہیں۔ اب اسے اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ ہفتے یا اتوار کو وہ کبھی اس سے ملنے نہیں آئیں۔ "کیوں...... خیریت تو ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"وہ ماسٹر جی وہاں اسپتال میں داخل ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر وہاں جا کر ایک دن ان کے ساتھ گزارتے ہیں۔"

"کون ماسٹر جی؟"

"ماسٹر جی کو نہیں جانتیں آپ۔ وہ ہمارے ساتھ ہی تو یہاں آئے تھے۔"

اچانک سرفراز بیگم کو ماسٹر جی یاد آ گئے۔ "اچھا وہ...... کیا ہوا انھیں؟ تمھارے گاؤں والا

واقعہ ہوا تو وہ یہیں تھے۔"

"جی بڑی بیگم۔ ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ انہی کی وجہ سے تو ہم بھی گاؤں نہیں جا سکے تھے۔"

"تو طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی ان کی؟"

"پتا نہیں۔ یہاں تو کچھ ٹھیک ہو گئے تھے۔ ہم سے کہنے لگے کہ گھر جاؤں گا۔ بچوں سے ملنا ہے۔ چلے گئے۔ پھر چھوٹے ٹھاکر واپس آئے تو اپنے دکھ میں ان کو بھولے رہے۔ یاد آیا تو ہم سے پوچھا۔ ہم نے بتایا کہ وہ تو اپنے گھر چلے گئے تھے۔ جب سے واپس نہیں آئے۔"

"پھر وہ تم پر ناراض ہوا ہوگا؟"

"ناراض کہاں ہوتے ہیں چھوٹے ٹھاکر۔ خود پر افسوس کرتے رہے۔ دیر تک دکھ کرتے رہے کہ اتنے دن وہ ماسٹر جی کو بھولے کیسے رہے۔"

"وہ ناراض نہیں ہوتا کبھی؟" سرفراز بیگم نے حیرت سے پوچھا۔ "میں نے تو سنا ہے کہ یہ زمین دار لوگ غصہ کے بہت تیز ہوتے ہیں۔"

"ہوتے تو ہیں بڑی بیگم۔ پر ہمارے چھوٹے ٹھاکر کو کبھی کسی نے غصہ کرتے نہیں دیکھا۔"

"چلو خیر...... پھر کیا ہوا؟"

"پھر چھوٹے ٹھاکر نے ہم سے پوچھا کہ ماسٹر جی اپنا پتا دے کر گئے ہیں۔ ہم نے کہا، نہیں۔"

"پھر ماسٹر جی ملے کیسے؟"

"چھوٹے ٹھاکر اسکول کھلنے کا انتظار کرتے رہے۔ اسکول کھلے تو وہاں سے ماسٹر جی کا پتا لیا اور ان سے ملنے چلے گئے۔ واپس آئے تو ماسٹر جی ان کے ساتھ تھے۔ اور ماسٹر جی کا اتنا برا حال تھا کہ ڈھانچہ بن کر رہ گئے تھے۔"

"ہوا کیا تھا انھیں؟"

"وہ ہوتی ہے نا تپ دق...... وہ بیماری ہو گئی تھی انھیں۔"

سرفراز بیگم کا ہاتھ بے اختیار اپنے منہ پر جا پہنچا۔ "ہائے میرے اللہ...... ٹی بی!"

"ہاں بڑی بیگم۔ اور ماسٹر جی نے بتایا کہ ان کے بچوں نے انھیں کوٹھری میں ڈال دیا تھا کباڑ کی طرح۔ کوئی اس کوٹھری میں نہیں جاتا تھا۔ ایک نوکرانی اپنے منہ پر کپڑا ڈال کر دور سے ان کے پاس کھانا رکھ جاتی تھی اور بعد میں برتن لے جاتی تھی۔"

"ٹی بی کے مریض کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ لگنے والی بیماری ہے نا۔"

"پر ہمارے چھوٹے ٹھاکر تو رات بھر ماسٹر جی کے پاس بیٹھے روتے رہے۔ کہتے تھے، ماسٹر جی، یہ حال میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں کیسے باپ جیسے استاد کو بھول کر بیٹھ گیا۔ ماسٹر جی میں تو

بولنے کی طاقت بھی نہیں تھی۔ بے چارے بار بار چھوٹے ٹھاکر کے سر پر ہاتھ رکھتے، کچھ بولنے کی کوشش کرتے اور پھر رونے لگتے۔ اس رات چھوٹے ٹھاکر ایک پل نہیں سوئے۔ اگلے روز کالج بھی نہیں گئے۔''

''ہئے ہئے...... یہ بیماری ہی ظالم ہے۔ اپنوں کو بھی دور کر دیتی ہے بیمار سے۔'' سرفراز بیگم نے تاسف سے کہا۔ ''بچوں کا بھی کیا قصور۔ اللہ ہر ایک کو محفوظ رکھے اس بیماری سے۔''

''پر ہمارے چھوٹے ٹھاکر تو ماسٹر جی کا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتے رہے۔ اپنے ہاتھ سے انھیں کھانا کھلاتے۔ ان کے برتن خود دھوتے۔ حد یہ کہ ان کا اگال دان بھی اپنے ہاتھوں سے دھویا چھوٹے ٹھاکر نے۔'' یہ کہتے کہتے رنجنا رونے لگی۔ ''میرا من کرتا تھا بڑی بیگم کہ میں مر جاؤں۔'' وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔ ''میں نے اور رگھو نے چھوٹے ٹھاکر کے پاؤں پکڑ لیے...... سر رکھ دیا ان کے پیروں میں کہ ماسٹر جی کی سیوا ہم کریں گے۔ پر چھوٹے ٹھاکر نے ڈانٹ دیا ہمیں۔ بولے ماسٹر جی کی سیوا میرا دھرم ہے، تمہارا نہیں۔ انھوں نے مجھے پڑھایا ہے، علم دیا ہے۔ وہ میرے لیے بھگوان ہیں۔ ان کی خدمت میرا فرض ہے۔''

سرفراز بیگم سناٹے کے عالم میں اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر انھوں نے پوچھا۔ ''ماسٹر جی یہاں کتنے دن رکے؟''

''دو دن بڑی بیگم۔ پھر چھوٹے ٹھاکر انھیں شملہ لے گئے...... بڑے اسپتال۔''

''اور اب وہ ہر ہفتے ان سے ملنے شملہ جاتا ہے؟''

''جی بڑی بیگم۔''

سرفراز بیگم کا دل بھر آیا۔ اسی وقت وہ ان کے سامنے ہوتا تو شاید وہ اسے سینے سے لگا لیتیں۔ انھوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تمہارا چھوٹا ٹھاکر بڑا آدمی ہے رنجنا۔ اللہ نے اسے بہت بڑائی دی ہے۔''

''ہمیں پتا ہے بڑی بیگم۔'' رنجنا پھر رونے لگی۔ ''بھگوان ہمیں سدا ان کے چرنوں میں رکھے۔ ایسا ہوا تو سمجھیں، جیون سپھل ہو گیا اپنا۔''

دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ وہ دونوں ہی اوتار سنگھ کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔

❁......❁......❁

دسمبر کا مہینہ آ گیا۔ سردیاں شروع ہو گئیں۔ مگر ہندوستان اپنے سیاسی ماحول کے اعتبار سے جون کے مہینے میں جی رہا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی خلیج بڑھتی جا رہی تھی۔ عقل والوں کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ بلوؤں کی وجہ سے قیام پاکستان ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔

2 ستمبر کو مسلم لیگ کے نمائندوں کے بغیر عبوری حکومت قائم ہو گئی۔ مسلم لیگ کے قائدین نے صورت حال کا جائزہ لیا۔ انھیں احساس ہو گیا کہ اگر مسلمانوں نے کانگریس کے لیے

میدان کھلا چھوڑ دیا تو یہ ان کے لیے تباہ کن ہو گا۔ ابھی تک تو عام مسلمانوں میں بددلی نہیں پیدا ہوئی تھی بلکہ ان کا جوش و خروش اور بڑھ گیا تھا۔ لیکن بددلی اور اس کے بعد مایوسی پھیلنے میں دیر نہیں لگتی۔

چنانچہ طویل اور مسلسل مذاکرات کے بعد مسلم لیگ بالآخر 25 اکتوبر کو کانگریس کی بالادستی قبول کیے بغیر عبوری حکومت میں شامل ہو گئی۔ اس کونسل کا نائب صدر نہرو کو مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن اس تقرری کا مقصد صرف اور صرف گورنر جنرل کی غیر موجودگی کی صورت میں کونسل کے اجلاس کی صدارت کرنا تھا۔ اس کے پاس کوئی خصوصی اختیار نہیں تھا۔ لیکن وہ ایسے اختیارات کا خواہاں تھا، جو پارلیمانی جمہوریت میں وزیراعظم کو حاصل ہوتے ہیں۔ مگر مسلم لیگ کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ لیگ دیکھ رہی تھی کہ پٹیل جو کہ ہوم ممبر تھا، گورنمنٹ کی پروپیگنڈا مشینری کو اپنی پارٹی کے مفاد کے سلسلے میں بے دریغ استعمال کر رہا تھا۔ اس صورتِ حال میں یہ اتحاد تناؤ سے بھرپور شراکت کے مترادف تھا اور اسے ایک طرح کی مسلح جانب داری کہا جا سکتا تھا۔

کالج کا ماحول بھی بے حد کشیدہ تھا۔ محمود اور رام گوپال کے درمیان نفرت اتنی بڑھ گئی کہ اب وہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار بھی نہیں تھے۔ رام گوپال نے دوستوں کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ سنا گیا تھا کہ وہ ان دنوں انتہا پسند ہندوؤں کے درمیان رہنے لگا ہے۔

❁......❁......❁

ماسٹر جی کو شملہ میں رہتے چار مہینے ہو گئے تھے۔ ان کی ظاہری حالت تو بہتر تھی۔ لیکن ڈاکٹر ان کے بارے میں پرامید نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مرض بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اور اس مرض میں ظاہری بہتری قابل اعتبار نہیں ہوتی۔

ماسٹر جی اس بات کو بہت محسوس کرتے تھے کہ ان سے ملنے کے لیے اوتار سنگھ کے سوا کوئی نہیں آتا۔ یہ بات نہیں کہ انھیں اپنے بیٹوں سے کوئی اس طرح کی امید ہو۔ لیکن اس کے باوجود ان کا جی چاہتا تھا کہ ان کا کوئی بیٹا کبھی ان سے ملنے کے لیے آئے۔

اوتار سنگھ کو اس کی فکر لگ گئی تھی۔ وہ ماسٹر جی کی یہ آرزو پوری کرنا چاہتا تھا۔ اسے کوئی امید تو نہیں تھی۔ لیکن اس نے ماسٹر جی کی خاطر کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس شام اس نے بازار سے پھل اور مٹھائیاں خریدیں۔ بچوں کے لیے کھلونے خریدے اور ماسٹر جی کے گھر کی طرف چل دیا۔

اس کی دستک پر دروازہ بدری پرشاد نے کھولا۔ اسے دیکھ کر وہ بڑے تپاک سے مسکرایا اور ہاتھ جوڑ کر نمسکار کہا۔

اوتار سنگھ کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس پرتپاک خیر مقدم کا تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کا تو خیال تھا کہ ان کا رویہ اس کے ساتھ معاندانہ ہو گا۔ اس نے بھی نمسکار کیا۔ ''کیسے ہیں بدری بھیا؟'' اس نے اپنائیت سے کہا۔

"آیئے نا، دروازے پر کیوں کھڑے ہیں۔"

اوتار سنگھ اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔ بدری پرشاد نے اسے کمرے میں بٹھایا۔ "آپ بیٹھیں۔ میں ابھی آیا۔" اس نے کہا۔ "اس وقت میرے دونوں بھائی بھی موجود ہیں۔ ان سے بھی آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔"

"بچوں کو بھی بلا لیجیے گا۔"

تھوڑی ہی دیر میں بدری پرشاد اپنے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ آیا۔ "یہ میرے بڑے بھائی ہیں رام پرشاد اور یہ سب سے چھوٹا ہے ہری۔"

ان دونوں نے بھی اوتار سنگھ کو بڑے تپاک سے نمسکار کیا۔ "پتا جی آپ کی بہت باتیں کرتے تھے۔" ہری پرشاد نے کہا۔ "بہت تعریف کرتے تھے آپ کی۔"

"آپ سب سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ بچے کہاں ہیں؟"

اسی لمحے دو عورتیں تین بچوں کے ساتھ کمرے میں آئیں۔ ان میں ایک عورت اور سب سے بڑے لڑکے سے وہ پچھلی بار مل چکا تھا۔

"یہ میری بھابھی ہیں رادھا...... یہ میری پتنی سادھنا۔" بدری پرشاد تعارف کرا رہا تھا۔

"یہ بھیا کا بیٹا گنگا، یہ بھیا کی بیٹی کانتا اور یہ میرا بیٹا مرلی۔"

اوتار سنگھ نے دونوں عورتوں کو نمسکار کیا۔ "آپ کیسی ہیں بھابھی۔" پھر پھل اور مٹھائی بڑی بھابھی کی طرف بڑھائی۔ "ماسٹر جی نے مجھ سے تاکید کر کے کہا تھا اور پیسے دیے تھے کہ آپ لوگوں کے لیے ان کی طرف سے مٹھائی اور پھل لے کر جاؤں۔"

رادھا نے دونوں چیزیں لیں اور سادھنا کے ساتھ کمرے سے چلی گئی۔

اوتار سنگھ نے بچوں کو بلایا اور انھیں کھلونے دیے۔ "یہ تمھارے دادا جی نے بھجوائے ہیں۔"

"دادو تاں ایں؟" سب سے چھوٹے مرلی نے تتلاتے ہوئے پوچھا۔

"تمھارے دادو اسپتال میں ہیں۔ تم سب کو بہت یاد کرتے ہیں۔" اوتار سنگھ نے کہا۔

"ماتا جی مجھے دادو کے پاس جانے ہی نہیں دیتیں۔"

"اچھا......اب تم لوگ جاؤ۔" رام پرشاد نے پہلی بار زبان کھولی تھی۔

بچوں کے جانے کے بعد رام پرشاد اوتار سنگھ سے مخاطب ہوا۔ "آپ نے بہت تکلف کیا اوتار سنگھ جی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ پتا جی یہ سب کچھ نہیں بھیج سکتے۔ ان کے پاس پیسے تھے ہی نہیں۔"

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ماسٹر جی کے پاس پیسے نہیں تھے۔ مگر اب

ہیں اور یہ سب کچھ انھوں نے ہی بھیجا ہے۔ میری طرف ان کی دو مہینے کی فیس تھی۔ وہ میں نے ادا کی اور اب ہر ماہ انھیں فیس دیتا ہوں۔"

رام پرشاد اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ "سینی ٹوریم کے اخراجات کم تو نہیں ہوں گے۔"

"وہ تو میری ذمے داری ہے۔ فرض ہے میرا۔ اور یقین کریں، مجھے ماسٹر جی کا نام لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں خود بھی لا سکتا تھا۔ یہ حق ہے میرا۔ ماسٹر جی کا پریوار میرا پریوار ہے۔ وہ میرے پتا سمان ہیں تو آپ میرے بھائی ہوئے نا۔"

"چلیں......ٹھیک ہے۔ یہ بتائیں، پتا جی کیسے ہیں؟"

"یہ تو آپ کو بھی معلوم ہوگا۔ میں نے آپ کا ایڈریس لکھوا دیا تھا۔ سینی ٹوریم والے ہر ہفتے رپورٹ بھیجتے ہوں گے۔"

رام پرشاد حیران نظر آنے لگا۔ ہری نے جلدی سے کہا۔ "ہاں بڑے بھیا، ہر ہفتے رپورٹ آتی ہے ڈاک سے۔"

"مجھے نہیں بتایا تم نے؟"

"میں نے سوچا، آپ خوامخواہ پریشان ہوں گے۔"

"کیوں کوئی بہتری نہیں ہوئی۔"

"مرض بہت بڑھ چکا ہے بڑے بھیا۔"

"وہ رپورٹ تو اندر کی بات ہے۔" اوتار سنگھ نے مداخلت کی۔ "آپ انھیں دیکھیں گے تو خوش ہوں گے۔ دیکھنے میں وہ صحت مند لگتے ہیں۔ چلتے پھرتے ہیں، چہل قدمی کرتے ہیں۔ اور وہ آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔"

"آپ ان سے ملنے جاتے ہیں؟"

"ہر ہفتے۔ ویک اینڈ میں ان کے ساتھ ہی گزارتا ہوں۔" اوتار سنگھ نے کہا۔ "کبھی آپ بھی چلیں نا۔"

"کون......؟ میں......!" رام پرشاد نے حیرت سے کہا۔ جیسے یہ تصور بھی اس کے لیے قابل قبول نہ ہو۔ "میں تو نہیں جا سکتا۔ میری تو ڈیوٹی ہی ایسی ہے۔ اور چھٹی مجھے مل نہیں سکتی۔ آج کل حالات ایسے ہیں......"

اوتار سنگھ نے بدری کی طرف دیکھا۔ "بھیا تو عام طور پر رات کو ہوتے نہیں ہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "گھر اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

"آپ میں سے کوئی ایک بار بھی چلے تو ماسٹر جی کو بہت فائدہ ہوگا۔ میں کچھ بھی کر لوں، حقیقی بیٹے کا بدل نہیں ہو سکتا۔"

وہ شرمندہ نظر آنے لگے۔ ''ہاں...... ہری جا سکتا ہے۔'' بدری نے کہا۔

''میں کیسے جا سکتا ہوں۔'' ہری ایک دم پریشان ہو گیا۔

''ہفتے کو اسکول سے چھٹی کر لو۔ اتوار کو تو چھٹی ہوتی ہی ہے۔''

''اور میری ٹیوشنز......''

''اس سے بھی ایک دن تو چھٹی کر سکتے ہو۔''

ہری کے چہرے پر چند لمحے کشمکش نظر آئی۔ پھر جیسے باپ کی محبت ہر رکاوٹ پر حاوی آ گئی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں چلوں گا۔'' اس نے کہا۔ ''آپ اب کب جائیں گے؟'' اس نے اوتار سنگھ سے پوچھا۔

''اب کرسمس کی چھٹیاں ہو رہی ہیں نا۔ اس بار پورا ہفتہ گزاروں گا ماسٹر جی کے ساتھ۔''

ہری گھبرا گیا۔ ''اسکول کی تو چھٹیاں ہوں گی۔ لیکن ٹیوشنز کی اتنی چھٹیاں میں نہیں کر سکتا۔ پھر امتحان سر پر آ جائے گا۔'' اس نے کہا۔ پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ''میں امتحان کے بعد آپ کے ساتھ چلوں گا...... مارچ یا اپریل میں۔''

اوتار سنگھ کا دل بہت دکھا، سب سے اچھا بیٹا موت کی دہلیز پر بیٹھے باپ سے ملاقات کے لیے چار ماہ بعد کا وعدہ کر رہا تھا۔ دوسرے تو اس کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ کاش ماسٹر صاحب اس وقت تک زندہ رہیں۔ یہ خوشی تو مل جائے انھیں۔ اس کے دل سے دعا نکلی۔

بہر حال ان لوگوں کی پچھلی بے حسی کے سامنے یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

اوتار سنگھ نے چلتے وقت چند نوٹ رام پرشاد کی طرف بڑھائے۔ ''یہ ماسٹر جی نے آپ لوگوں کے لیے بھجوائے ہیں۔''

دوسرے دو لڑکوں کے چہرے سُت گئے تھے!

❀......❀......❀

سردی بہت شدید تھی۔ موسم بدل گیا تھا۔ مگر زندگی کے معمولات نہیں بدلے تھے۔ سب کچھ پہلے جیسا تھا۔ گھر کے لوگوں کو اس بات کا تو احساس تھا کہ سیاسی موسم بدل گیا ہے۔ مگر وہ باہر کی بات تھی۔ گھر میں اتنی سنگینی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ گھر میں اخبار ہر روز آتا تھا۔ خون ریزی کی خبریں، مسلمانوں کا قتل روز کی بات تھی۔ اس سے گھر کے مکیں خوف زدہ تو تھے۔ لیکن وہ مطمئن بھی تھے کہ اپنے گھر کی چار دیواری میں وہ محفوظ ہیں۔

حور بانو اور نور بانو ابھی تک ایک کرتے کی کڑھائی مکمل نہیں کر سکی تھیں۔ جبکہ سرفراز بیگم تیسرے کرتے کی کڑھائی کر رہی تھیں۔ باریک کام کے لیے ان کی نگاہ پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ لیکن مشق بہر حال بڑی چیز ہوتی ہے۔ لڑکیوں نے کڑھائی سیکھی تو تھی۔ مگر ابھی نو آموز تھیں۔ بلکہ باقاعدہ کڑھائی کرنے کا تو وہ ان کے لیے پہلا موقع تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ خوبصورتی نے شوق میں

انھوں نے بہت باریک، نفیس اور مشکل ڈیزائن منتخب کیا تھا۔ ہر روز وہ تھوڑا سا کام کرتیں اور ماں کو دکھاتیں۔ بعض اوقات انھیں کام دوبارہ کرنا پڑتا۔

سرفراز بیگم کا معمول اب بھی وہی تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ اوپر جاتیں اور خالی ہاتھ کبھی نہ ہوتیں۔ اوپر وہ کم از کم دو تین گھنٹے گزارتیں۔ لیکن چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں ان لوگوں سے بات وہ اب بھی نہیں کرتی تھیں۔

لڑکیوں کو بہت تجسس تھا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اماں نے چھوٹے ٹھاکر کے متعلق بات کرنا کیوں چھوڑ دیا۔ جبکہ وہ اس سے خفا بھی نہیں ہیں بلکہ اس کے لیے ان کی محبت اور بڑھ گئی ہے۔

اس روز نور بانو نے اپنا کڑھائی والا گلا انھیں دکھایا۔ وہ جائزہ لینے کے بعد بولیں۔ ''یہ بوٹا دوبارہ بناؤ بیٹا۔ صفائی نہیں آئی ہے اس میں۔''

''ادھر وہ ہر روز دس بیس مسلمانوں کو مار رہے ہیں۔ اور یہاں ہم ان کے لیے کرتا کاڑھ رہے ہیں...... نفاست اور صفائی سے۔'' نور بانو نے تنک کر کہا۔

سرفراز بیگم نے چونک کر اسے غور سے دیکھا۔ اس کا یہ ردِعمل غیر معمولی تھا۔ وہ تو بڑے دھیمے، ٹھنڈے مزاج کی لڑکی تھی۔ وہ بات ہی کم کرتی تھی اور سخت بات تو اس کے مزاج میں تھی ہی نہیں۔ چھوٹے ٹھاکر کے معاملے میں البتہ وہ ترش رو ہو گئی تھی۔

سرفراز بیگم کو غصہ بالکل نہیں آیا۔ انھوں نے بڑی بے رخی سے سرد لہجے میں کہا۔ ''لاؤ بیٹا...... یہ مجھے دے دو۔ میں تو یہ کام تم میں سے کسی سے کروانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ تم لوگ خود ہی گھسیں تھیں اس میں۔''

''جو سچی بات آپ کے لیے نہیں، وہ بھی آپ کو کڑوی لگتی ہے اماں؟''

''یہ بات سچی ہے نہ کڑوی۔ یہ تو جہالت کی بات ہے۔'' سرفراز بیگم نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اول تو جو مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں، وہی اس کے ذمے دار ہیں نہ کہ تمام ہندو، اللہ کے ہاں ہر آدمی اپنے عمل کا جواب دہ ہوگا اور ہندو تو ایسے بھی ہیں کہ جو مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں اور دوسرے خیر جانے دو۔''

''بات پوری کریں نا اماں۔''

حور بانو اور گلنار بھی لپک کر آ گئیں۔ ''ہاں اماں، بتائیں نا۔ آپ نے تو ٹھاکر بھیا کے بارے میں بات کرنا ہی چھوڑ دیا۔'' گلنار بولی۔

''کیوں؟ یہ بھی کبھی سوچا تم نے۔''

''بہت سوچا ہے اماں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔'' حور بانو نے کہا۔

''میں نے دیکھا کہ جتنی میں اس کی تعریف کرتی ہوں، تم لوگ اتنا ہی اس سے چڑنے

ہو۔ حالانکہ خدا گواہ ہے، میں اس کی تعریف نہیں کرتی، حقیقت بیان کرتی ہوں۔ اس لیے میں نے اس کا نام لینا ہی چھوڑ دیا۔''

''صرف نور بانو چڑتی ہے اماں۔ میں اور گلنار تو نہیں چڑتیں۔'' حور بانو نے کہا۔

سرفراز بیگم نے سنی اَن سنی کر دی۔ ''میں جانتی ہوں کہ چھوٹا ٹھاکر کیسا ہے۔ اب تم لوگ میرے سمجھانے، منع کرنے کے باوجود اس کے متعلق بدگمانی کرو تو گناہ گار تو ہوگی نا۔ اور لطف یہ کہ اسے کارِ ثواب بھی سمجھو۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ تمہارا نقصان کیسے گوارا کر سکتی ہوں۔ اس لیے میں نے اس کا تذکرہ کرنا ہی چھوڑ دیا۔ کم از کم بدگمانی سے تو بچی رہو گی تم۔''

''اچھا اماں۔ آج آپ ہمیں بتائیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ بدگمانی نہیں کروں گی۔'' نور بانو نے کہا۔

''تو سن لو۔ سب سے پہلے تو میں نے یہ سمجھ لیا کہ چھوٹا ٹھاکر جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ اس کا کمال نہیں۔ اللہ کی رحمت ہے اس پر۔ وہ بچپن سے ہی ہر بات پر غور کرنے والا تھا۔ ماں کے کہنے پر وہ پوجا پاٹھ کرتا تھا۔ لیکن سوال بہت کرتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ جو بت اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا، وہ کسی اور کو کیا دے گا۔ ماں کی موت کے بعد اس نے پوجا بالکل چھوڑ دی۔ اس کا یقین ہے کہ کائنات کا نظام چلانے والی ہستی واحد ہے۔ وہ کہتا ہے، جہاں کئی حکمراں ہوں، وہاں فساد ہوتا ہے۔ نظام نہیں چلتا۔ وہ بڑے خلوص سے، محبت سے جستجو کر رہا ہے۔ میں پوری سچائی کے ساتھ کہتی ہوں کہ اسے مشرک یا کافر کہنا اس کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔

''اور سنو۔ بے شک مجھ سے پہلی بار جذبات میں بڑی غلطی ہوئی۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ گھر اس کا ہے۔ ہم سب اس کے گھر کے فرد ہیں اور ہمارے ہاں کوئی اس سے پردہ نہیں کرے گا۔ نور بانو نے احساس دلایا تو مجھے اپنی غلطی محسوس ہوئی۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں ڈرتی رہی کہ وہ آئے گا اور میں گناہگار ہوں گی۔ اب اسے منع بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن وہ نہیں آیا۔ میں ہی اوپر جاتی رہی اور میں نے اس سے نیچے آنے کو کہا بھی نہیں۔

''پھر جب وہ امتحان میں پاس ہوا اور اس نے مٹھائی نیچے بھجوائی، تب میں نے بے اختیار دوبارہ غلطی کی۔ میں نے اس سے شکایت کی کہ اسے مٹھائی لے کر خود آنا چاہیے تھا۔ تب اس نے کہا کہ وہ کبھی بھی نیچے نہیں آئے گا۔ وہ وجہ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ مگر میں نے اصرار کیا تو اس نے وجہ بتائی۔ اس کے بعد میری نظروں میں اس کا مقام اور بلند ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے تم لوگوں سے اس کے بارے میں بات کرنی چھوڑ دی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم لوگ اس کے متعلق بدگمانی کرو اور گناہگار بنو۔ اب وہ وجہ بھی سن لو، جس کے تحت وہ کبھی نیچے نہیں آئے گا۔''

انھوں نے سب کچھ بچیوں کو سنا دیا۔ پھر انھوں نے ماسٹر جی کی بیماری اور اس کے عمل کے بارے میں بتایا۔ بچیاں منہ کھولے سنتی رہیں۔ نور بانو کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ وہ خاص طور

پر بہت زیادہ حیران تھی۔

''تو یہ ہے چھوٹا ٹھاکر، اصل چھوٹا ٹھاکر۔'' سرفراز بیگم نے آخر میں کہا۔ ''میں تمہاری بھلائی اور بہتری کے لیے نہیں چاہتی کہ تم اس کے متعلق بدگمانی کرو۔ میں خود اس کے لیے دعا کرتی ہوں کہ اللہ اس کی کوشش قبول فرمائے، اسے اپنا راستہ دکھائے اور بھٹکنے سے بچائے رکھے۔ اور مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔''

''میں بہت شرمندہ ہوں اماں۔'' نور بانو نے کہا۔ ''اور میں اللہ سے سچے دل سے توبہ کروں گی۔''

''اور اب کبھی یہ فکر نہ کرنا کہ وہ نیچے آ جائے گا۔ کیونکہ وہ کبھی نیچے نہیں آئے گا۔''

یہ کہتے ہوئے سرفراز بیگم کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کی یہ بات درست نہیں۔ چھوٹا ٹھاکر ایک دن نیچے آئے گا۔

❁……❁……❁

کرسمس اور نیو ائیر کی چھٹیوں سے پہلے وہ کالج کا آخری دن تھا۔ اوتار سنگھ لائبریری میں چلا گیا۔ وہ کچھ کتابیں ایشو کرانا چاہتا تھا۔ اس کا پروگرام یہ تھا کہ وہ یہ چھٹیاں ماسٹر جی کے ساتھ گزارے گا۔ ماسٹر جی بھی خوش ہو جائیں گے۔

اس نے تین کتابیں منتخب کیں۔ کتابیں رجسٹر پر چڑھوانے کے لیے وہ لائبریرین کی طرف جا رہا تھا کہ ریٹا پارسن آ گئی۔ ''مجھے معلوم تھا کہ تم یہیں ملو گے۔'' اس نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔

''بات کیا ہے؟''

''سکون سے بیٹھو تو بات کروں۔''

وہ وہیں بیٹھ گئے۔ ''ہاں...... اب بولو۔''

''بات یہ ہے کہ تم میرے ہاں کی کئی پارٹیاں مس کر چکے ہو۔''

''میں نے تمھیں وجہ بھی بتائی تھی اور معذرت بھی کی تھی۔'' اوتار سنگھ بولا۔

''اور میں نے قبول بھی کر لی تھی۔'' ریٹا نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''لیکن اب معذرت نہیں چلے گی۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ تم اپنے ماسٹر جی سے ملنے ہر ویک اینڈ پر جاتے ہو؟''

''ہاں۔ میں نے یہی بتایا تھا تمھیں۔''

''ہمارے ہاں کرسمس پارٹی میں آنا ہے تمھیں اور میں انکار نہیں سنوں گی۔''

اوتار سنگھ مسکرا دیا۔ ''اب میں تمھیں ایک عجیب بات بتاؤں۔ میں نے یہ کتابیں ایشو

کرانے کے لیے نکالی ہیں۔ میں یہ ارادہ کر چکا تھا کہ یہ تمام چھٹیاں میں ماسٹر جی کے ساتھ گزاروں گا۔ وہاں ان کتابوں پر ڈسکشن بھی کرلوں گا ماسٹر جی سے۔"

ریٹا کا چہرہ پہلے تو بجھ گیا۔ پھر وہ بولی۔ "میں کچھ نہیں جانتی۔ تمھیں اس پارٹی میں ضرور آنا ہے۔"

"میں نے انکار تو نہیں کیا۔ میں تو تمھیں بتا رہا تھا کہ میرا یہ ارادہ تھا۔ اب یہ ہے کہ میں ماسٹر جی کے پاس 26 تاریخ کو چلا جاؤں گا۔"

ریٹا کھل اٹھی۔ "یہ ہوئی نا بات۔ تو تم آؤ گے نا؟"

"ہاں......ضرور آؤں گا۔"

"تو تم سات بجے آ جانا۔"

"شام سات بجے!" اوتار سنگھ کے لہجے میں حیرت تھی۔ "پارٹیاں تو رات کو دیر سے شروع ہوتی ہیں۔"

"پارٹی تو دس بجے ہی ہوگی۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ تم سات بجے آ جاؤ۔ مجھے تم کو کچھ دکھانا ہے۔"

"لیکن میں......" اوتار سنگھ ہچکچا رہا تھا۔

"اتنی پارٹیاں مِس کی ہیں تم نے۔ میری اتنی سی بات نہیں مانو گے۔" ریٹا کے لہجے میں لجاجت تھی۔

"چلو، ٹھیک ہے۔ میں آ جاؤں گا۔" اوتار سنگھ نے کہا۔

وہ یوں خوش ہوئی، جیسے کوئی بہت بڑی نعمت مل گئی ہو۔ "وعدہ؟"

"میں کچھ کہتا ہوں تو کرنے کا ارادہ بھی کرتا ہوں۔ اگر کوئی غیر معمولی رکاوٹ آ جائے تو الگ بات ہے۔ ورنہ میں وقت پر پہنچ جاؤں گا۔"

"تھینک یو اوتار سنگھ۔" وہ پلٹی۔ "میں تمھیں منتظر ملوں گی۔"

وہ چلی گئی اور اوتار سنگھ اٹھ کر لائبریرین کی طرف چل دیا......

❁......❁......❁

انگریزوں کے لیے وہ بڑا اداس کرسمس تھا۔ انھوں نے بھانپ لیا تھا کہ ہندوستان میں ان کے اقتدار کے دن گنے جا چکے ہیں۔ اور وہ اپنے وطن سے دور یہاں تھے تو صرف اقتدار کے لالچ میں ہی تھے۔ اب اقتدار جا رہا تھا تو ان میں بیشتر ایسے تھے، جو اس وقت سے پہلے ہی ہندوستان چھوڑ دینا چاہتے تھے۔

کرسمس کے دن پارسن فیملی کے درمیان موضوعِ گفتگو یہی تھا۔ "شاید ہمیں ایک اور کرسمس یہاں منانا پڑے۔" جیمز پارسن کہہ رہا تھا۔

"مگر اب مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔" الزبتھ بولی۔ "اب تو یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔"

"ابھی چند روز پہلے میری کچھ اہم لوگوں سے بات ہو رہی تھی۔" جیمز نے کہا، "وہ سب متفق تھے کہ اب انڈیا انگریزوں کے لیے محفوظ نہیں رہا ہے۔ ہندو جس طرح مسلمانوں پر حملہ کر رہے ہیں، کسی بھی وقت ان کا رخ انگریزوں کی طرف بدل سکتا ہے۔"

"میں تو اس پر حیران ہوں کہ ہم نے اب تک یہاں حکومت کیسے کرلی۔ یہ اتنا بڑا ملک ہے۔ کروڑوں کی آبادی ہے۔ ہماری تعداد تو کچھ بھی نہیں۔"

"برطانیہ عظمیٰ نے ہر جگہ غداروں کے زور پر حکومت کی ہے۔ بے شک یہاں آبادی بہت زیادہ ہے۔ لیکن غداروں کی کثرت بھی دوسری نو آبادیوں کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ ورنہ کسی اجنبی ملک میں، اجنبی ماحول، اجنبی موسم میں، جہاں کی زبان اور رسم و رواج بھی مختلف ہوں، چند لاکھ افراد چالیس کروڑ لوگوں پر حکومت نہیں کر سکتے۔"

"مگر اب یہ لوگ سیاسی طور پر بیدار ہو چکے ہیں۔"

"اس کے باوجود بنیادی طور پر یہ لوگ درندے ہیں۔" جیمز نے کہا۔

"سچ کہتے ہو، مجھے تو اب ڈر لگنے لگا ہے یہاں۔" الزبتھ نے جھرجھری لے کر کہا۔

"ایک چیز نے ہمیں بچایا ہوا ہے اور وہی ہمیں بچائے گی۔" جیمز بولا۔ "اور وہ ہے ہمارے مقابلے میں ان کا احساسِ کم تری۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ لوگ قومی سطح پر سو سال تک تو اس احساسِ کم تری سے نہیں نکل سکیں گے، جس میں ہم نے انھیں مبتلا کر دیا ہے۔ سو سال تک یہ ہماری برابری نہیں کر سکیں گے۔"

"لیکن جیمز، مجھے لگتا ہے کہ انتقالِ اقتدار کے موقعے پر یہاں خون ریزی ہو سکتی ہے۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ ایسا ہوگا۔ دیکھو، وہ ہم سے آزادی چھین نہیں رہے ہیں، مانگ رہے ہیں اور وہ بھی دب کر۔ انگریزوں کے خلاف کوئی گڑبڑ کرنے سے پہلے وہ دس بار سوچیں گے۔ وہ یہ بھی سمجھیں گے کہ آزادی ملنے سے پہلے ہی چھن بھی سکتی ہے۔ انگریزوں کی ہلاکت کے سلسلے میں برطانیہ ان پر فوج کشی بھی کر سکتا ہے۔"

"لیکن جیمز، Mob کی نفسیات میں سوچنے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔" الزبتھ نے کہا۔

"یہی وجہ ہے کہ بہت لوگ اپنی فیملیز کو واپس بھیج رہے ہیں۔ ابھی واکر فیملی انگلستان واپس گئی ہے۔"

"سنو الزبتھ، تم اور بچے چاہو تو انگلستان واپس جا سکتے ہو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو فی الحال یہ ممکن نہیں۔"

الزبتھ نے سوالیہ نظروں سے ریٹا کو دیکھا۔ ریٹا نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں ماما، میں تو واپس نہیں جانا چاہتی۔"

''حیرت ہے، تمھیں وطن کا خیال نہیں آتا۔''

جیمز ہنسنے لگا۔ ''ہمارے بچے تو یہاں پیدا ہوئے ہیں۔ کبھی گرمیوں کی چھٹیوں میں دو تین بار انگلستان چلے گئے۔ انھیں تو یہی اپنا وطن لگتا ہوگا۔''

''لیکن جیمز، کلچر کا فرق تو بہت بڑا ہے۔''

''ماما، مجھے تو یہاں کا کلچر بہت اچھا لگتا ہے...... سوکلرفل، سوامیزنگ۔ مجھے یہاں کا موسم بھی اچھا لگتا ہے۔ موسم گرما کو ہٹا دیں تو لندن میں بارشوں اور کہر کے سوا کیا رہ جاتا ہے۔ یہاں موسم سرما میں بھی دھوپ میسر ہوتی ہے۔''

''اور مجھے اس کے باوجود دنیا میں لندن سے پیاری کوئی اور جگہ نہیں۔'' الزبتھ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ پھر وہ رچرڈ کی طرف مڑی۔ ''اور تم کیا کہتے ہو ڈک؟''

''میں اپنی تعلیم نامکمل نہیں چھوڑنا چاہتا ماما۔''

''مگر بھئی میں تو واپس جانا چاہتی ہوں۔''

''چلو، اس پر بعد میں بات کریں گے۔'' جیمز نے کہا۔ ''فی الحال تو ہمیں وائسرائے کی پارٹی میں جانا ہے۔ تیاری کرو۔ چھ بجے تک پہنچنا ہے۔''

''ڈیڈی، میں تو آپ لوگوں کے ساتھ نہیں چل سکوں گی۔'' ریٹا نے معذرت کی۔

''تم یہ پارٹی مِس کروگی؟'' الزبتھ کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''جانتی ہو، وہاں کیسے کیسے لوگ ہوں گے...... کریم آف ایسٹ انڈیا کمپنی!''

''سوری ماما۔ میں نے کچھ دوستوں کو گھر پر مدعو کیا ہے۔''

''ان میں کوئی بہت خاص دوست بھی ہوگا؟'' رچرڈ نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

ریٹا کے رخسار دہک اٹھے۔ ''وہ جتنے بھی ہیں، سبھی بہت خاص دوست ہیں۔'' اس نے سچائی سے کہا۔

''آل رائٹ۔ کم آن لز۔ تم تیار ہو جاؤ...... اور ڈک تم بھی۔'' جیمز نے کہا۔

وہ لوگ تیار ہوئے اور ساڑھے پانچ بجے پارٹی کے لیے نکل گئے۔ ''تمام نوکر سرونٹ کوارٹرز میں موجود ہیں۔'' جیمز پارسن نے جاتے جاتے ریٹا سے کہا۔ ''تم انھیں طلب کرسکتی ہو۔ کک کو بلا کر سمجھا دو کہ تمھاری پارٹی کے لیے اسے کیا کرنا ہے۔''

''یس ڈیڈی۔''

ان کے جانے کے بعد وہ اپنے خاص مہمان کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ سب سے پہلے اس نے کک کو بلایا۔ ''دو افراد کے لیے ڈنر تیار کرنا ہے...... رات گیارہ بجے تک۔''

''دو افراد کے لیے!'' کک کی آنکھوں میں حیرت چمکی۔ لیکن اس کے لہجے میں صرف تعمیل تھی۔ ''یس میم صاب۔ ہو جائے گا۔''

ریٹا نے اسے مینو بتایا۔ کک چلا گیا۔

اب ریٹا کو مشروب کی فکر تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اوتار سنگھ شراب نہیں پیتا۔ چنانچہ اس نے اس کے لیے ایک خاص قسم کا شربت تیار کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے کئی مختلف ذائقوں کے ایسنس منگوائے تھے۔ عرقِ گلاب اس کے علاوہ تھا۔ عرقِ گلاب کے بارے میں اس نے کک سے معلومات حاصل کی تھیں۔

اس نے بڑے اہتمام سے اوتار سنگھ کے لیے وہ کاک ٹیل تیار کی اور اسے ایک بڑے جگ میں بھر کے ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیا۔

اب آخری مرحلے میں اسے خود تیار ہونا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اوتار سنگھ وقت کا پابند ہے۔ ٹھیک سات بجے آ جائے گا۔

اس موقعے کے لیے اس نے خاص طور پر سفید رنگ کا بہت خوبصورت ڈریس سلوایا تھا۔ ٹائٹ فٹنگ کا وہ ڈریس کچھ کچھ چھپانے اور بہت کچھ دکھانے والا تھا۔ اس ڈریس کو دیکھ کر ماما نے اسے چھیڑنے والے انداز میں کہا تھا۔ ''ارے ڈارلنگ، ایسا ڈریس تو میں نے تمھاری شادی پر سلوانے کا ارادہ کیا تھا۔''

اور وہ شرما گئی تھی۔

اس پر ماما نے کہا تھا۔ ''یہ تو یہاں کی لڑکیوں کی طرح شرماتی ہے۔''

اس وقت وہ ڈریس پہن کر ریٹا نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ بہت حسین لگ رہی ہے۔

اس نے بہت ہلکا میک اپ کیا۔ لیکن اس روز اسے خوشبو کا ہوکا ہو گیا تھا۔ خوشبو اس نے لگائی تھی اور پورا کمرا مہک رہا تھا۔

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ سات بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ کوئی طویل انتظار نہیں تھا۔

❀......❀......❀

اوتار سنگھ تھری پیس سوٹ میں تھا۔ اس نے بازار سے کچھ تحفے بھی خریدے تھے۔ تحفے صرف ریٹا اور رچرڈ کے لیے تھے۔ کیسی عجیب بات تھی کہ اپنے دوستوں کے والدین کو اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ اسے خیال آیا کہ آج شاید ان سے ملاقات ہو۔ لیکن بہرحال پہلی ملاقات میں انھیں دیکھے، سمجھے اور جانے بغیر ان کے لیے کوئی تحفہ لے کر جانا اس کے خیال میں ممکن نہیں تھا۔

ریٹا پورچ پر اس کی منتظر تھی۔ وہ فر کا لمبا کوٹ پہنے تھی۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ اس کے

رخسار تمتمارہے تھے اور وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ اس نے باہیں پھیلا کر اس کا خیر مقدم کیا۔

اوتار سنگھ کو اس طرح کے استقبال کی امید نہیں تھی۔ وہ گڑبڑا گیا۔ ایک لمحے کو بے اختیار وہ اس کی باہوں میں چلا گیا۔ پھر اس نے سنبھلتے ہوئے بڑی نرمی اور احتیاط سے اسے پیچھے ہٹا دیا اور اسے بہت غور سے دیکھتے ہوئے بولا ”میری کرسمس ریٹا۔“

”یو سلی...... تمھیں میرے رخسار پر بوسہ دینا چاہیے تھا۔“ ریٹا نے بناوٹی خفگی سے کہا۔

اوتار سنگھ مسکرایا۔ ”تم جانتی ہو کہ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ البتہ آج کرسمس ہے۔ اس خوشی میں تمھیں کچھ رعایت مل سکتی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ریٹا کا ہاتھ تھاما، اسے اٹھایا اور اس کے ہاتھ کی پشت کو چوم لیا...... صرف ایک ثانیے کے لیے!

ریٹا کو یوں لگا، جیسے کوئی تتلی اس کے ہاتھ کو چھو کر اڑ گئی ہو۔

وہ دونوں اندر ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔ وہاں آتش دان دہک رہا تھا۔ کمرا گرم ہو رہا تھا۔

اوتار سنگھ کو گھر پر چھایا ہوا سناٹا بہت غیر فطری لگا۔ گھر میں لوگ موجود ہوں۔ لیکن خاموشی ہو تو بھی گھر کی اپنی آوازیں ہوتی ہیں۔ وہ لفظ نہیں ہوتے۔ مگر وہ آوازیں گھر میں لوگوں کی موجودگی اور رونق کا اظہار کرتی ہیں۔ مگر یہاں تو گہرا سناٹا تھا۔ بس کبھی کبھی آتش دان میں کوئلوں کے چٹخنے کی آواز سناٹے کو تار تار کر دیتی تھی۔

”ارے...... کوٹ اتارنے میں میری مدد کرو نا۔“

ریٹا نے اسے چونکا دیا۔ اس نے بڑی نزاکت سے فر کا وہ کوٹ اتروایا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ سناٹے میں آ گیا۔ ریٹا اس سفید لباس میں آسمان سے اتری ہوئی کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ مگر وہ لباس ایسا تھا کہ نظر اٹھانا ناممکن ہو گیا تھا۔ اوتار سنگھ کی نظریں جھک گئیں۔

اوتار سنگھ کا ردِعمل بے حد واضح تھا۔ ریٹا نے دانستہ یہ ظاہر کیا، جیسے وہ اس سے بے خبر ہو۔ بے حد سرسری انداز میں اس نے اوتار سنگھ کا کوٹ اتروانے میں اس کی مدد کی۔ اس دوران غیر محسوس طور پر وہ اس کے اتنا قریب ہو گئی کہ ان کی سانسیں ایک دوسرے کو چھونے لگیں۔

اوتار سنگھ نے جلدی سے کوٹ سے جان چھڑائی اور گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

ریٹا کا جی چاہا کہ اس کے سامنے کھڑی ہو کر کہے...... مجھے غور سے دیکھو اوتار سنگھ۔ کیسی لگ رہی ہوں میں۔ لیکن نسوانی جبلت نے اسے خبردار کر دیا کہ اس طرح وہ ریلیکس نہیں ہو سکے گا۔ لوہے کو اس طرح گرم کرنا ہے کہ خود لوہے کو بھی پتا نہ چلے۔ وقت کی تو اس کے پاس کمی نہیں تھی۔

”بیٹھ جاؤ نا اوتار سنگھ۔“

اوتار سنگھ تھری سیٹر صوفے پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔

اس وقت ریٹا ایک ایسی عورت تھی، جو اپنے بے حد مشکل محبوب کو ہر قیمت پر تسخیر کرنا

چاہتی تھی۔ اور اس نے یہ نکتہ سمجھ لیا تھا کہ جلد بازی میں کھیل بگڑ جائے گا۔ بے صبرا پن اسے اس کی منزل سے دور کر دے گا۔ کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ وہ صبر و تحمل سے کام لے۔

وہ اوتار سنگھ کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ اس وقت یہ تاثر دے رہی تھی کہ وہ خود سے...... اپنی حشر سامانیوں سے یکسر بے خبر ہے۔ یوں وہ اپنے جلوؤں کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کر سکتی تھی۔

اوتار سنگھ کو نظریں اٹھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

ان دونوں کے درمیان میز حائل تھی۔ میز پر اوتار سنگھ کے لائے ہوئے تحفے رکھے تھے۔ ”میں اپنا تحفہ کھول کر دیکھ سکتی ہوں؟“ ریٹا نے کہا۔

اوتار سنگھ نے اپنی اعصابی کشیدگی کو اپنی حسِ مزاح سے کم کرنے کی کوشش کی۔ ”کیوں نہیں۔ میں تحفے لایا ہوں، خالی پیکنگ نہیں۔“ اس نے کہا۔

ریٹا کے لیے دو تحفے تھے۔ ریٹا نے پہلے چھوٹا پیکٹ کھولا۔ اس میں سے عطر کی ایک بے حد خوبصورت شیشی نکلی...... بلور کی بڑے خوبصورت ڈیزائن کی خاصی بڑی شیشی۔

”خوبصورت۔“ ریٹا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”مگر میں اسے کیسے اسپرے کروں؟“

”یہ عطر ہے، پرفیوم نہیں۔ اسے اسپرے نہیں کرتے۔ اس کا ڈھکنا کھولو اور دو تین جگہ ہلکا سا لگا لو۔“

ریٹا نے شیشی کھولی اور اسے سونگھا۔ ”یہ کچھ مختلف ہے۔ مگر خوشبو بہت اچھی ہے۔“

”یہ مشرقی خوشبو ہے۔ تیل میں بنائی جاتی ہے، الکحل میں نہیں۔“

ریٹا نے دوسرا پیکٹ کھولا۔ وہ بے حد نازک، خوبصورت اور نفیس نیکلس تھا۔ ”یہ بھی بہت خوبصورت ہے۔ شکریہ اوتار سنگھ۔ تمھارے ذوق کی داد دینی پڑے گی۔“

”داد عملی ہونی چاہیے۔“ اوتار سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پہن کر داد دو گی تو اچھا لگے گا۔“

ریٹا کہنا چاہتی تھی کہ اپنے ہاتھوں سے پہناؤ گے تو پہنوں گی۔ لیکن وہ ایک سوچی سمجھی حکمت عملی کے تحت چل رہی تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے قدرے بے نیازی سے کہا۔ ”مناسب وقت پر پہنوں گی۔“

اب اوتار سنگھ کو پھر گھر کا سناٹا چبھنے لگا تھا۔ اس نے رچرڈ کے تحفے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”رچرڈ کہاں ہے؟“

”گھر میں تو کوئی بھی نہیں ہے۔“ ریٹا نے بے پروائی سے کہا۔

اوتار سنگھ ایک دم چوکنا ہو گیا۔ ”تم تو کہہ رہی تھیں کہ تمھارے گھر پر پارٹی ہے۔“

”وہ تو ہے۔ تمھیں اسی لیے تو بلایا ہے۔“ ریٹا بلی اور چوہے کا کھیل کھیل رہی تھی۔ وہ

دیکھ رہی تھی کہ اس کی توقع کے عین مطابق اوتار سنگھ اعصابی تناؤ میں مبتلا ہو گیا۔ اب اس کا اگلا جواب اس تناؤ کو دور کرے گا تو وہ کافی دیر تک پُرسکون رہے گا۔ بلکہ شاید آخر تک پُرسکون ہی رہے۔

''تو پھر؟ گھر میں تو کوئی موجود نہیں ہے!''

''دراصل عین وقت پر وائسرائے کی پارٹی کی دعوت مل گئی۔ میں نے تمھیں سات بجے بلایا تھا۔ اس لیے میں اس پارٹی میں نہیں گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم یہاں اکیلے میرا انتظار کرو اور بور ہو۔''

اس کی توقع کے عین مطابق اوتار سنگھ نہ صرف ریلیکس ہو گیا۔ بلکہ وہ اس کے لیے زیادہ نرم ہو گیا۔ ''یہ تو زیادتی ہوئی تمھارے ساتھ۔''

اس نے کہا۔ ''وائسرائے کی پارٹی تو بہت اہم تھی۔''

''تمھارے اپائنٹ منٹ سے زیادہ اہم نہیں تھی۔'' ریٹا نے اسے لگاوٹ بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ کی ممنونیت بہت واضح تھی۔ ''تم مجھے پروگرام کی تبدیلی کی اطلاع دے دیتیں تو میں بھی گیارہ بجے آ جاتا۔''

''میں نے کہا نا، میرے لیے تمہاری ملاقات دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اہم تھی۔''

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر ریٹا نے کہا۔ ''سردی بہت زیادہ ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھی اور کونے میں رکھی ڈرنکس کی ٹرالی دھکیل کر لے آئی۔ ''یہ موسم برانڈی کا ہے۔'' اس نے ایسے کہا، جیسے موسم پر تبصرہ کر رہی ہو۔ ''تمھارے لیے ڈرنکس بناؤں؟''

''تم جانتی ہو، میں شراب نہیں پیتا۔'' اوتار سنگھ نے جلدی سے کہا۔

''جانتی ہوں اور اس پر تمہارا احترام بھی کرتی ہوں۔ مگر اس لیے پوچھ لیا کہ اس موسم میں برانڈی شراب نہیں، ضرورت ہے۔ برانڈی پیو گے تو جسم میں گرمی آئے گی۔''

''بے شک آئے گی۔ مگر نشہ بھی تو ہوگا۔ ویسے بھی میں موسموں سے لڑنے کا قائل نہیں۔ میں تو انھیں انجوائے کرتا ہوں۔''

''تم عجیب آدمی ہو...... سحر انگیز...... مشرق کے شہزادے۔'' ریٹا نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ ''مَیں جانتی تھی کہ تم برانڈی نہیں پیو گے۔ اس لیے میں نے تمہارے لیے خاص شربت تیار کرایا ہے۔ تاثیر میں یہ بھی برانڈی سے کم نہیں۔ اس میں مشک کا عرق اور دوسری گرم جڑی بوٹیاں ہیں۔'' اس نے شربت کے جگ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ایک گلاس میں انڈیل کر اوتار سنگھ کی طرف بڑھایا۔ ''اب یہ تو بری بات ہوتی نا کہ میں پیتی رہوں اور تم میرا ساتھ نہ دو۔ اب تمہارا اصول بھی نہیں ٹوٹے گا اور تم میرا ساتھ بھی دیتے رہو گے۔''

اوتار سنگھ نے مشروب لے لیا۔ ریٹا نے اپنے لیے برانڈی کا جام بنا لیا تھا۔ ''اتنا اہتمام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''ضرورت تو تھی۔ دیکھو نا، اب ہم دونوں انجوائے کریں گے۔''

اوتار سنگھ نے شربت کا گھونٹ لیا۔ شربت خوش ذائقہ اور فرحت بخش تھا۔ مگر اس میں ہلکی سی تلخی تھی جو بری بہرحال نہیں لگ رہی تھی۔ اور ایک بات یہ کہ وہ ہلکا نہیں، کافی بھاری تھا۔ اس نے یہ بات ریٹا سے بھی کہی۔

''کڑواہٹ مشک اور جڑی بوٹیوں کی وجہ سے ہے۔ یہ بتاؤ، تمھیں جسم میں گرمی کا احساس ہو رہا ہے یا نہیں۔''

اوتار سنگھ نے مزید چند گھونٹ لیے۔ ''ہاں...... یہ تو ہے۔'' اس نے کہا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اسے مشروب کی خوشبو بہت اچھی لگی تھی۔ سچ یہ ہے کہ ایسا شربت اس نے کبھی نہیں پیا تھا۔

ریٹا اپنے منصوبے کے پہلے مرحلے پر کامیابی سے عمل کر چکی تھی۔ اب دوسرا مرحلہ شروع ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اوتار سنگھ علم دوست ہے۔ علمی مباحثے اسے بہت پسند ہیں۔ اس کے لیے اس نے خاص طور پر تیاری کی تھی۔

اس نے پہلے ایک موضوع چھیڑا، پھر دوسرا۔ تھوڑی دیر میں اوتار سنگھ سب کچھ بھول کر گفتگو میں کھو گیا۔ پہلی بار وہ ریٹا کی قربت میں خوش تھا۔ وہ بڑے جوش و خروش سے اپنے موقف کے حق میں دلائل دے رہا تھا اور ریٹا بڑی معقولیت سے انھیں تسلیم کر رہی تھی۔ کتابوں کے، دانش وروں اور مفکرین کے حوالے دیے جا رہے تھے۔ اوتار سنگھ یہ بھی بھول گیا کہ سامنے ایک لڑکی...... بہت خوبصورت لڑکی ہے۔

ریٹا نے کہیں بھی معاملات کا ٹیمپو تیز نہیں ہونے دیا۔ اس نے شراب کے معاملے میں بھی احتیاط کی۔ اس نے جام پر جام نہیں لنڈھائے۔ مناسب وقفے کے بعد وہ اپنے لیے دوسرا جام بناتی اور ساتھ ہی اوتار سنگھ کا گلاس بھی شربت سے بھر دیتی۔ کک نے اسے بتایا تھا کہ شربت کا نشہ بہت آہستہ آہستہ، لیکن بہت گہرا ہوگا۔

اوتار سنگھ کی جھجک آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئی۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ شربت سے کچھ سرور آ رہا ہے۔ وہ کس قدر رنگ میں آ گیا ہے۔ ناپسندیدہ گفتگو ہو رہی ہوتی یا وہ تناؤ میں ہوتا تو اسے اس بات کا احساس ہو جاتا۔ لیکن وہاں تو اس کی من پسند گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ اپنے اندر کے ان سوالات پر گفتگو کر رہا تھا، جن کے جواب اسے ابھی تک نہیں ملے تھے۔ اور وہ بہت خوش تھا۔ پہلے وہ نظر اٹھاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ کیونکہ ایسا لگتا تھا کہ ریٹا کا لباس جسم چھپانے کے لیے نہیں، بلکہ جسم کے پُرکشش حصوں کی طرف دعوتی اشارے دینے کے لیے سیا گیا ہے۔ لیکن علمی گفتگو

شروع ہوئی تو اس کے نزدیک جنسی تفریق ختم ہوگئی۔ اب نہ وہ مرد تھا اور نہ ریٹا عورت۔ وہ تو دو دوست تھے، جو علمی موضوعات پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ اب وہ ریٹا کی آنکھوں میں دیکھ کر بات کر سکتا تھا اور کر رہا تھا۔ یوں اس کی نگاہ اور ریٹا کے لباس کے درمیان ایک خاموش مفاہمت ہو گئی۔ اب وہ لباس اسے اپنے لیے تباہ کن نہیں لگ رہا تھا۔

اوتار سنگھ نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے نو بجے تھے۔ وہ اور مطمئن ہوگیا۔ ابھی دس بجے دوسرے لوگ...... کالج کے ساتھی لڑکے اور لڑکیاں آ جائیں گے۔ ترغیب کے جس خطرے کے احساس نے ابتداء میں اسے چوکنا کر دیا تھا، وہ اب دور کی...... بہت دور کی بات لگنے لگا۔

یہ وہ وقت تھا کہ ریٹا نے ٹھیک حساب کتاب سے وہ حساس موضوع چھیڑ دیا...... محبت! محبت جو اوتار سنگھ کے لیے بے حد اہم تھی۔

''محبت کے بارے میں تم کیا سمجھتے ہو اوتار سنگھ۔''

اوتار سنگھ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''محبت میرے نزدیک دنیا کا سب سے طاقت ور جذبہ ہے۔ آفاقی جذبہ۔'' اس نے بلا جھجک کہا۔ ''دنیا کی تمام رونقیں اسی کے دم سے ہیں۔''

ریٹا کو پہلی بار اوتار سنگھ کی آواز میں لڑکھڑاہٹ محسوس ہوئی۔ ''اور سیکس کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟''

سوال اتنا اچانک تھا کہ اوتار سنگھ سناٹے میں آ گیا۔ چند لمحے تو اس کی سمجھ میں ہی کچھ نہیں آیا۔ احساس ہوا کہ اس کے دماغ پر بھی دھندلاہٹ سی طاری ہوگئی ہے۔ شاید کمرے کے گرم ماحول کا اثر تھا۔ چند لمحے بعد اس نے سنبھل کر کہا۔ ''میرا خیال ہے، ہمیں اس پر بات نہیں کرنی چاہیے۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ اس کی ضرورت نہیں۔''

''میں پہلی بار تمھیں کسی علمی موضوع سے فرار اختیار کرتے دیکھ رہی ہوں۔'' ریٹا کے لہجے میں چیلنج تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن میں نے کہا نا کہ اس کی ضرورت نہیں۔''

''تو تم اس سے انکار کرتے ہو کہ زندگی میں اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔''

''نہیں۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا۔ لیکن اس وقت ہم محبت کے موضوع پر بات کر رہے تھے۔''

''محبت اور سیکس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔''

''میں نہیں مانتا۔''

''مگر یہ حقیقت ہے۔ ماں کو بیٹے سے اور باپ کو بیٹی سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔''

''میں اس نظریے کو گمراہ کن سمجھتا ہوں اور یہ بات پوری سچائی سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اپنے پتا جی سے عشق تھا۔ میں نے کبھی ماتا جی سے اتنی محبت نہیں کی۔''

''میرے خیال میں تو یہ تمھارے ایب نارمل ہونے کا ثبوت ہے۔'' ریٹا نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

اوتار سنگھ کو طرارہ آ گیا...... ''یہ بتاؤ، محبت کی معراج کیا ہے؟''

''مجھے تو نہیں معلوم۔ تم ہی بتا دو۔'' ریٹا کا لہجہ اکسانے والا تھا۔

''خدا کی اپنے بندوں سے محبت میرے نزدیک محبت کی معراج ہے۔''

''خدا کی...... آل مائٹی کی محبت اور چیز ہے۔ اسے ہم کبھی پوری طرح سمجھ ہی نہیں سکتے۔ وہ بات کرو، جو میری سمجھ میں آئے'' ریٹا نے اسے چھیڑا۔

''انسانوں کی بات کرتی ہو تو بندے کی خدا سے محبت، محبت کی معراج ہے۔''

''چلو مان لیا۔ تو پھر؟''

''اور اس محبت میں سیکس کا کوئی دخل نہیں۔'' اوتار سنگھ نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

ریٹا گھوم گئی۔ اوتار سنگھ کی ذہانت میں کوئی شک نہیں تھا۔ اس نے بے ضرر سی بات میں اپنے موقف کے لیے ایک ایسی دلیل نکال لی تھی، جس کی کاٹ نہیں کی جا سکتی تھی۔ ''یہ بھی آسمانی محبت ہے۔'' وہ بولی۔ ''مجھ سے زمینی محبت...... حقیقی محبت کی بات کرو۔''

''چلو ماں کی اپنے بچے سے محبت کی بات کر لو۔''

''میں نے کہا نا کہ اس میں سیکس کا دخل ہوتا ہے۔ تمہارا تجربہ، تمہارا رویہ انفرادی ہے۔ جبکہ یہ ایک مسلمہ نظریہ ہے کہ ماں بیٹے سے زیادہ محبت کرتی ہے اور باپ بیٹی سے۔''

''اور میں کہہ چکا ہوں کہ یہ گمراہ کن نظریہ ہے...... پاکیزہ رشتوں کو داغ دار کرنے کی سازش۔ اس نظریے کو تسلیم کر لیا جائے تو کوئی معاشرہ اچھا معاشرہ نہیں رہے گا۔''

''میرا خیال ہے، یہ بات طے ہو چکی تھی کہ صرف مدلل گفتگو کی جائے گی۔''

''دلیل تو موجود ہے۔ ذرا تصور کرو کہ ایک بے بس نوزائیدہ بچہ جو اپنی کوئی ضرورت پوری نہیں کر سکتا، ماں اس کی ہر ضرورت پوری کرتی ہے۔ خود تکلیف اٹھاتی ہے۔ اسے آرام پہنچاتی ہے۔ خود گیلے میں سوتی ہے، اسے سوکھے میں سلاتی ہے۔ تو تمھارے خیال میں اس محبت بھری نگہداشت کے پیچھے سیکس کارفرما ہے۔ نہیں بھئی، مجھے تو یہ خیال ہی شرم ناک لگتا ہے......'' اوتار سنگھ اب جوش کے عالم میں بول رہا تھا۔

ریٹا بے حد مطمئن تھی۔ کچھ تو وہ نشے میں آ چکا تھا اور اب اس جوش کے عالم میں اسے

ہوش نہیں تھا کہ ریٹا نے اس کے سامنے برانڈی کا جام رکھ دیا ہے۔ اس نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔

......اگر میں اس نظریے کو درست مان لوں، تب تو ایک ماں کو اپنی بیٹی کی کوئی فکر نہیں کرنی چاہی۔ لیکن نہیں۔ وہ اپنی نوزائیدہ بیٹی کا بھی اسی طرح خیال رکھتی ہے، جیسے بیٹے کا۔ اگر مائیں اولاد سے محبت نہ کریں تو اولاد جی ہی نہیں سکتی۔'' اب اس کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ کسی دلیل کی ضرورت رہ جاتی ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم نے موثر دلیل سے اپنی بات ثابت کر دی۔'' ریٹا نے اس کے جام میں پھر برانڈی انڈیل دی۔ ''لیکن یہ تو کوئی معقول بات نہیں کہ تم مرد اور عورت کی عام محبت سے انکار کر دو۔''

''میں نے کب انکار کیا ہے۔ میں تو محبت کی عظمت کا قائل ہوں۔''

''تو مرد اور عورت کی محبت میں سیکس کا دخل تو ہوگا۔''

اب شراب اوتار سنگھ پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ وہ اپنے خیالات مجتمع نہیں کر پا رہا تھا۔ ''یہ میں نہیں مانتا۔ یہ تو پھر ہوس ہوئی نا۔''

ریٹا نے اس کی بے بسی محسوس کر لی ہے۔ لوہا گرم ہو رہا تھا۔ ''دلیل سے بات کرو اوتار سنگھ۔ مرد اور عورت میں محبت ہوگی تو سیکس کا عنصر بھی ہوگا۔ اب محبت اس حقیقت کو تو نہیں مٹا سکتی نا کہ دونوں کا تعلق مخالف جنس سے ہے اور ان کے درمیان جنسی کشش موجود ہے۔''

''مگر یہ تو دیکھو کہ دنیا کے ہر مذہب میں شادی کا تصور موجود ہے۔ کسی مذہب نے بھی اس معاملے میں انسان کو آزاد نہیں چھوڑا۔ ہر مذہب نے مرد اور عورت کو ایک خاص مرد اور عورت کا پابند کیا ہے۔ ورنہ انسان اور جانور میں کوئی فرق نہ رہتا۔''

ریٹا مسکرائی۔ اس نے نہیں کہا کہ وہ موضوع سے ہٹ رہا ہے۔ اوتار سنگھ کی زبان کی لڑکھڑاہٹ بڑھ گئی تھی۔

''اچھا چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتاؤ، تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔ میرے اور تمھارے درمیان کیا تعلق ہے؟''

اوتار سنگھ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''ہم دوست ہیں...... اچھے دوست۔''

''دیکھو میں تمہارا کتنا لحاظ کرتی ہوں۔ ایٹی کیٹس کے مطابق ہمیں ساتھ بیٹھنا چاہیے تھا۔ لیکن میں تم سے دور بیٹھی۔ اس لیے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ لیکن تم مجھے دوست سمجھتے ہونا۔ تو دوست سے دور بیٹھنے کا کوئی جواز نہیں۔ آؤ میرے پاس آ کر بیٹھو۔'' ''لیکن تم لڑکی ہو......''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ دوستی میں تو سیکس کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔'' ریٹا مسکرائی۔ ''ہمارے درمیان سیکس کا مسئلہ ہے ہی تو نہیں۔ یا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ مسئلہ موجود ہے۔''

اوتار سنگھ کے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا۔ شراب کے اثر کی وجہ سے اس کا دماغ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ بس اس کی سمجھ میں اتنا آیا کہ اس وقت وہ ہچکچایا تو ریٹا اس کی بات پکڑ لے گی۔ وہ اٹھا اور دوسرے صوفے کی طرف چلا۔ درمیان وہ میز سے الجھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کا دماغ جس دھندلاہٹ کا شکار ہو رہا ہے، اسے نشہ کہتے ہیں۔

ریٹا کے لیے اس کے قدموں کی وہ لڑکھڑاہٹ بہت خوش آئند تھی۔

اوتار سنگھ اس کے برابر آ بیٹھا۔ ''اتنی دور کیوں بیٹھے ہو۔'' ریٹا نے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہم تو دوست ہیں نا۔''

''ہاں...... ہم دوست ہیں۔''

ریٹا نے اس کے سامنے برانڈی کا جام رکھا۔ ''پیونا۔''

اس بار اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ وہ شربت نہیں، شراب ہے۔ ''یہ تو شراب ہے۔'' اس نے معترضانہ انداز میں کہا۔

''یہ بتاؤ، تمھیں نشہ تو نہیں ہوا۔ تم بہکے تو نہیں؟''

''نہیں۔ لیکن تم مجھے شراب کیوں دے رہی ہو۔''

''یو سلی۔ تمھیں پتا بھی نہیں اور تم چار جام پی چکے ہو۔ دیکھ لو۔ برانڈی سردی دور کر کے جسم کو چست اور توانا کرتی ہے۔ نشہ تھوڑا ہی ہوتا ہے اس سے'' اوتار سنگھ کو نشہ تو ہو رہا تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ نشہ اس پر اثر کر رہا ہے۔ اس نے دل میں سوچا، بات تو ٹھیک ہے۔ جسم میں گرمی آ گئی ہے اور مجھے نشہ بھی نہیں ہوا۔ نشے میں ہوتا تو بحث میں ریٹا کو کیسے قائل کرتا۔ جبکہ آج وہ خلاف توقع بہت اچھی دلیلیں دے رہی تھی۔

چنانچہ اس نے جام قبول کر لیا۔

تین چار جام کے بعد وہ کچھ سوچنے کے قابل نہیں رہا۔ اب اس کی آواز بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ ایسے میں اس کی نظر نیکلس کے مخملی باکس پر پڑ گئی۔ ''تم آ چھی ڈوست...... ہو...... ریٹا۔'' اس نے انگلی نچاتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... میں مانتی ہوں۔ میں اچھی دوست نہیں ہوں۔''

''کیوں...... کیوں نا ہیں ہو......؟''

''دراصل میں تمہاری دوست نہیں ہوں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں نا۔''

"محبت کرتی ہو۔تو میرا نیکلس کا تحفہ...... کیوں نہیں۔"

"تم اپنے ہاتھوں سے پہناؤ گے تو پہنوں گی۔"

"یہاں نہیں۔" ریتا اٹھ کھڑی ہوئی۔"میرے ساتھ چلو۔سنگھار میز کے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر دیکھوں گی۔"

"چلو...... چالو...... ابھی چالو......"

ریتا اسے اپنے بیڈروم میں لے گئی۔اوتار سنگھ نے بیڈروم کا جائزہ لیا اور ستائش لہجے میں بولا۔"بہوت...... بہوت خوبصورت......!"

بیڈ کے پہلو میں وہ بڑی خوبصورت ڈریسنگ ٹیبل تھی، جس میں بڑا آئینہ لگا تھا۔ریتا اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔اس نے بڑی ادا سے اپنے بال گردن سے ہٹائے اور بولی۔"لو...... اب اپنے ہاتھوں سے نیکلس مجھے پہنادو۔" یہ کہہ کر اس نے نیکلس باکس سے نکالا اور اوتار سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔

اوتار سنگھ نیکلس ہاتھ میں لیے اس کے پیچھے آیا۔اس کی نظر آئینے میں اپنے اور ریتا کے عکس پر پڑی۔وہ ایسا ہوش ربا منظر تھا کہ اس کی نظریں بے اختیار بہکنے لگیں۔اس کی انگلیوں میں لرزش تھی۔نیکلس کی ڈوری کسنے میں اسے خاصی دقت ہوئی۔

"اب دیکھو، کیسا لگ رہا ہے۔" ریتا نے اٹھلا کر کہا۔

لیکن اوتار سنگھ کی نظریں نیکلس پر ٹھہر نہیں رہی تھیں۔اس کے وجود میں بھونچال سا آیا ہوا تھا۔اسے اپنے جسم میں ایسی سرکش اور تند کیمیاوی تبدیلیوں کا ادراک ہو رہا تھا، جن سے وہ ناواقف تھا۔اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفلوج ہوگئی تھیں۔کچھ کرنے، کچھ کر گزرنے کی اندھی خواہش میں اس کا جسم پھنک رہا تھا اور اس کا وجود باہر سے ہی نہیں، اندر سے بھی بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا۔

ریتا نے آئینے میں اس کے چہرے پر اس کی اندرونی کیفیات کا عکس دیکھا اور مسکرا دی۔اس نے اپنے پتے بڑی احتیاط سے، بڑے ماہرانہ انداز میں کھیلے تھے۔اسے یقین تھا کہ اب اوتار سنگھ اس کے سحر سے نہیں نکل سکتا۔اس کے اندر کا طوفان اسے جلد بازی پر اکسا رہا تھا۔لیکن اس وقت وہ عورت نہیں، صرف ایک شکاری تھی، جو اپنے چالاک اور دشوار شکار کو بچ نکلنے کا کوئی موقع نہ دینا چاہے۔

اس نے اب بھی جلد بازی نہیں کی۔اس نے آئینے میں اوتار سنگھ کے عکس کو دیکھتے ہوئے اس سے کہا۔"میں تمھیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں اوتار سنگھ۔"

اوتار سنگھ اس وقت اپنے آپ میں نہیں تھا۔"ہم...... ہوں......" اس نے کہا۔

"یہ تصویر دیکھ رہے ہو۔" ریتا نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی اپنی بڑی، فریم میں لگی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہاری ہے...... خوبصورت ہے......" اوتار سنگھ کی آواز میں لرزش بھی تھی اور لڑکھڑاہٹ بھی۔

ریتا نے دو انگلیوں سے اپنی تصویر کھینچ کے باہر نکال لی۔"اب دیکھو......"

اوتار سنگھ نے ریتا کی تصویر کے نیچے سے برآمد ہونے والی تصویر کو دیکھا۔وہ تصویر کچھ کچھ اس کی لگ رہی تھی۔کچھ کچھ اس لیے کہ تصویر میں وہ کسی انگریز نائٹ کے گیٹ اپ میں تھا اور گھوڑے پر سوار تھا۔"یہ تو...... یہ مجھ سے...... ملتی جلتی ہے۔"

"سلی، یہ تمہاری ہی تصویر ہے۔میں نے ایک آرٹسٹ سے خاص طور پر بنوائی ہے۔" ریتا نے کہا۔پھر محبت بھرے لہجے میں بولی۔"یہ تصویر سامنے بھی رہے تو کوئی مجھے کچھ نہیں کہے گا۔لیکن میں نے محبت کو چھپانے کے آداب تم سے سیکھے ہیں۔" اس نے اپنی تصویر پھر اس کی تصویر پر لگا دی۔"یہ تصویر بتاتی ہے کہ میں تمھیں کیسا دیکھتی ہوں۔"

لیکن اوتار سنگھ کی نظریں اب تصویر پر نہیں تھیں۔وہ تو مبہوت ہو کر ریتا کے عکس کو دیکھے جا رہا تھا۔اس کے اندر اٹھنے والا طوفان اور تند ہوگیا تھا۔عین اس لمحے ریتا پلٹی۔اوتار سنگھ اس کے قریب ہی تھا۔پلٹتے ہوئے وہ اس سے ٹکرائی اور دانستہ لڑکھڑائی۔اوتار سنگھ نے بے ساختہ اسے سہارا دیا۔اور اگلے ہی لمحے وہ اس کی باہوں میں تھی۔

"چلو...... ڈانس کرو میرے ساتھ۔"

وہ رقص کرنے لگے۔لیکن وہ رقص نہیں تھا۔وہ قربت کا بے ربط اور غیر منظم بہانہ تھا۔اوتار سنگھ کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔اس کی سانسیں اور اس کے ہاتھ بہک رہے تھے۔دماغ کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھا۔"سوری ریتا...... میں...... نہیں کر سکتا۔" اس نے بہ مشکل کہا۔

"تمھارے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔آؤ، لیٹ جاؤ۔" ریتا نے اسے اس طرح کھینچا کہ وہ خود بیڈ پر گری اور اوتار سنگھ اس کے اوپر گرا۔

اوتار سنگھ کے لیے وہ بجلی کا وہ کڑاکا تھا، جو کب سے رکے ہوئے طوفان کے پھٹ پڑنے کا اعلان کر رہا تھا۔

اور پھر طوفان پوری شدت سے آگیا!

ریتا پوری طرح ہوش وحواس میں تھی اور اوتار سنگھ ہوش وحواس سے پوری طرح بیگانہ تھا۔ریتا چالاک شکاری تھی، جس نے بڑی مہارت اور چابک دستی سے جال پھیلایا تھا اور اوتار سنگھ شکار تھا، جو جال کے خلاف مزاحمت کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔لیکن شکار کا انداز شکاریوں کا

سا تھا، جیسے وہ شکار کھیل رہا ہو۔

نہایت قربت کے ان لمحوں میں احساسِ فتح سے معمور ریٹا اب تک احتیاطاً شکاری کا روپ دھارے ہوئے تھی۔ اب جبکہ وہ فتح یاب ہو چکی تھی تو اس کے خیال میں اس میں کوئی حرج نہیں تھا کہ وہ اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے۔ بنیادی طور پر وہ عورت تھی اور عورت بن کر ہی وہ ان لمحوں کو صحیح معنوں میں انجوائے کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے شکاری کا لبادہ اتار پھینکا اور عورت بن گئی۔

اور اس کی یہی غلطی اس کی شکست کا سبب بن گئی!

اوتار سنگھ بے خود تھا، اور تیزی سے وحشت کی سرحدوں میں داخل ہو رہا تھا۔

''آئی لو یو اوتار سنگھ۔'' ریٹا نے سرگوشی میں کہا۔ ''میں کب سے ان لمحوں کا خواب دیکھ رہی تھی۔ لیکن میں خواب دیکھنے والی لڑکی نہیں، عملی لڑکی ہوں۔ تعبیر کی فکر کرتی ہوں۔ یہ لمحے میں نے تخلیق کیے ہیں۔''

لیکن اوتار سنگھ کچھ سننے کے قابل نہیں تھا۔

''اب دیکھ لو۔'' ریٹا فاتحانہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''تم خدا کی بندے سے اور بندے کی خدا سے محبت کی بات کرتے تھے۔ لیکن وہ آسمان پر کی جانے والی محبت ہے، جو زمین پر نہیں پنپ سکتی۔ علمی بحث کرنا اور بات ہے۔ مگر زمینی حقائق کا سامنا کرنا دوسری بات ہے......''

خدا کا نام سنتے ہی اوتار سنگھ کو لگا کہ اس کے سر پر ٹھنڈے یخ پانی کی پوری بالٹی انڈیل دی گئی ہے۔ اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ اس نے ایک طویل جھرجھری لی اور پہلی بار ہوش میں اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا......

ریٹا پارسن بے خبر تھی کہ اس سے ناقابلِ تلافی غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ وہ اس وقت محض ایک عورت تھی، جو اس فتح کے احساس سے سرشار تھی، جس کی وہ طویل عرصے سے آرزومند تھی۔ وہ اس وقت اپنی اس مایوسی، جھنجلاہٹ اور بے بسی کا بدلہ لینا چاہتی تھی، جس میں اوتار سنگھ کی استقامت نے اسے مبتلا کیے رکھا تھا۔ وہ فاتحانہ لہجے میں کہے جا رہی تھی۔ ''اور وہ لڑکی، جس سے تم محبت کرتے ہو۔ جس کی تم نے صرف آواز سنی ہے۔ جسے تم نے کبھی دیکھا نہیں ہے۔ تم نے کہا تھا کہ میں بہت خوبصورت ہوں۔ لیکن حسن پرست ہونے کے باوجود تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ تم اس اَن دیکھی لڑکی سے محبت کرتے ہو۔ وہ بھی آسمانی محبت تھی اوتار سنگھ۔ اب دیکھ لو، تم میری خوبصورتی کو عملاً سراہ رہے ہو۔ اس لیے کہ وہ لڑکی محض خیال ہے اور میں گوشت پوست کی جیتی جاگتی حقیقت ہوں۔ خیال کتنا ہی توانا ہو، ایک کمزور حقیقت سے کبھی نہیں لڑ سکتا۔ آج میں تمہاری باہوں میں ہوں اور اس لڑکی کا خیال بھی تمہارے ذہن میں نہیں ہے......''

آواز والی لڑکی کا حوالہ ہوش میں آتے ہوئے اوتار سنگھ کو پوری طرح ہوش میں لے آیا تھا۔ اس حوالے نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اب معاملہ بالٹی کا نہیں تھا، اسے اپنے سر پر یخ پانی کی موٹی دھار مسلسل گرتی محسوس ہو رہی تھی۔ کھلی ہوش مند آنکھوں سے اس نے خود کو اور ریٹا کو جس حال میں دیکھا، اس نے اسے شرم سار کر دیا۔ ارے...... یہ کن پستیوں میں گر گیا ہے وہ۔ ایسا تو اس نے تصور میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ محبت کا، اس کی حرمت اور تقدس کا دعوے دار یہ کہاں آ پہنچا......

اور ریٹا، اس سے بے خبر، آنکھیں موندے اپنا اعلانِ فتح کیے جا رہی تھی۔ ''میں وہ خوبصورت حقیقت ہوں اوتار سنگھ، جس سے تم نظریں نہیں چرا سکتے۔ دیکھو...... مجھے چھو کر دیکھو، میں کتنی حسین ہوں۔ آؤ...... مجھے تسخیر کر لو اوتار سنگھ......'' یہ کہتے ہوئے اچانک اسے احساس ہوا کہ اوتار سنگھ کی پیش قدمی رک چکی ہے۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

اوتار سنگھ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا، پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہو گیا اوتار سنگھ، آؤ نا۔'' ریٹا نے اسے کھینچنے کی کوشش کی۔

اوتار سنگھ نے اسے جھٹک دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے قدموں میں اب لڑکھڑاہٹ بھی نہیں تھی۔ ''نہیں ریٹا...... مجھے تم کو چھونے کا کوئی حق نہیں۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اور تم جسے آسمانی محبت کہتی ہو، وہی زمین پر کی جائے تو محبت کی معراج ہوتی ہے میں تو محبت کا آدمی ہوں۔ جہاں تک آ چکا ہوں، اس پر ہی عمر بھر خود سے شرمندہ رہوں گا۔ آگے بڑھنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

ریٹا تیزی سے اٹھی اور پاگلوں کی طرح اس کی طرف جھپٹی۔ ''اب تم پیچھے نہیں ہٹ سکتے اوتار سنگھ۔ تم جانتے ہو کہ تم سرینڈر کر چکے ہو۔''

لیکن اتنی دیر میں اوتار سنگھ بیڈروم سے نکل چکا تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے لپکی۔

اوتار سنگھ ڈرائنگ روم میں کوٹ اسٹینڈ سے اپنا کوٹ اتار رہا تھا۔ ریٹا جا کر اس سے لپٹ گئی۔ ''تم مجھے ایسے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔''

اوتار سنگھ نے نرمی سے اسے ہٹانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ تو کسی ہشت پا کی طرح اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ ''پلیز ریٹا، ہٹ جاؤ۔ مجھے جانے دو۔''

''میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔'' ریٹا پر وحشت طاری تھی۔

''دیکھو ریٹا، میں عورت کی بہت عزت کرتا ہوں۔ مجھے جانے دو۔''

''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟ مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گے؟''

''نہیں۔ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔''

ریتا نے اسے اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس نے ریتا کے دونوں ہاتھ سختی سے تھامے اور اسے خود سے علیحدہ کر دیا۔ ریتا نے پھر اس سے لپٹنے کی کوشش کی۔ وہ اسے دھکیلتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

ریتا کوشش کے باوجود اس سے نہ لپٹ سکی۔ اور وہ چلا گیا۔ ریتا باہر تک اس کے پیچھے گئی۔ لیکن تماشہ بننے کے خیال سے وہ زبردستی نہیں کر سکی۔ وہ واپس آئی تو اس حال میں کہ اس کا وجود ناکامی اور توہین کے احساس سے پھنک رہا تھا۔

اس نے اپنے لیے جام بنایا اور پینے لگی۔ اس نے پے در پے کئی جام پیے۔ وہ اس توہین کو بھلا دینا چاہتی تھی۔ لیکن جیسے جیسے نشہ بڑھ رہا تھا، توہین کا احساس اور شدید ہو رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو اسے لگا کہ اوتار سنگھ لوٹ آیا ہے۔ ''کم ان۔'' اس نے تمکنت بھرے لہجے میں کہا۔

لیکن آنے والا کک تھا۔ ''کھانا تیار ہے مس ساب۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''ٹھنڈا ہو جائے گا تو وہ ذائقہ نہیں رہے گا مس ساب۔'' کک نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''گیٹ آؤٹ۔ لیو می الون۔'' وہ دہاڑی۔

کک سہم کر چلا گیا۔

وہ پیتی رہی۔ اس کے ہوش و حواس جواب دینے لگے۔ لیکن رد کیے جانے کی توہین کا احساس اب بھی ذہن سے چمٹا ہوا تھا۔ جب اسے احساس ہوا کہ وہ اب بیٹھ نہیں سکتی۔ تو وہ اپنے بیڈ روم میں جا کر بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔

❀......❀......❀
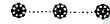
اوتار سنگھ بڑی عجیب ذہنی کیفیت میں باہر نکلا تھا۔ وہ نشے میں تھا، یہ ایک ایسی حقیقت تھی، جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن ہر آدمی کے اندر کچھ نظریات ہوتے ہیں، جو اس کے لیے بہت اہم ہوتے ہیں...... زندگی جیسے اہم! وہ زد پر آئیں تو نشے میں ہونے کے باوجود اس کے اندر مدافعت ابھرتی ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ وہ پوری طرح سوچنے سمجھنے کے قابل تو نہیں تھا۔ لیکن اس احساس نے کہ جس چیز کو وہ بے حد مقدس سمجھتا تھا، اس پر غلاظت کے چھینٹے آئے ہیں، اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ اس کا ذمے دار وہ خود ہے۔ اس لمحے اسے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ شرمندہ بھی تھا اور جھنجلایا ہوا بھی۔ وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا، اس لیے خود ملامتی کا شکار ہو گیا تھا۔ اس چیز نے ایک مہیب موج کی طرح اسے نشے کے سمندر سے اوپر

اچھال دیا تھا...... مگر صرف کچھ دیر کے لیے!

اس کے حواس اس وقت صرف ایک نکتے پر مرکوز تھے۔ اسے اس گندگی، اس غلاظت سے نکلنا تھا۔ یہ اس کا یک نکاتی ہنگامی ایجنڈا تھا اور جس طرح سے ریتا نے ہنگامہ کیا تھا، اس پر عمل درآمد آسان نہیں لگ رہا تھا۔

اب وہ باہر نکل آیا تو اسے کم از کم یہ سکون ہو گیا کہ محبت کا مقدس تصور اب غلاظت کے چھینٹوں سے محفوظ ہو گیا ہے۔ اس کی شرمندگی، جھنجلاہٹ اور خود ملامتی اب بھی اس کے اندر کہیں موجود تھی۔ لیکن اوپر کا سکون زیادہ اہم تھا۔ پھر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے چہرے سے ٹکرائے تو نشہ پھر گہرا ہونے لگا۔ اس کے قدم پھر لڑکھڑانے لگے۔

اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ سردی اپنے پورے شباب پر تھی۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ کہیں کوئی سائیکل رکشہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ پیدل ہی آگے بڑھنے لگا۔ یہ بڑی بات تھی کہ راستہ اسے معلوم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے، کہاں پہنچنا ہے۔

سامنے کچھ فاصلے پر اسے روشنی رقص کرتی نظر آئی۔ روشنی کیا، کبھی وہ آگ لگتی تھی...... اور وہ ایک دائرے کی شکل میں گھومتی ناچتی نظر آ رہی تھی۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ یہ اس کے نشہ کا کمال ہے۔

وہ دو پولیس والے تھے، جنھیں رات کے گشت پر مامور کیا گیا تھا۔ دو تین گھنٹے کے گشت نے ان کے جسم میں وقتی طور پر گرمی تو بھر دی تھی۔ لیکن انھیں تھکا بھی دیا تھا۔ ستانے کے لیے وہ ایک دکان کے سائبان کے نیچے بیٹھے تو سردی کا احساس زیادہ ہی ہونے لگا۔ انھوں نے اِدھر اُدھر سے لکڑیاں اور کاغذ جمع کیے، آگ جلائی اور ہاتھ تاپنے لگے۔

انھیں سوٹ پہنے ایک جوان لڑکا لڑکھڑاتا ہوا آتا دکھائی دیا تو وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے جسم اب تک کافی گرم ہو گئے تھے۔

اوتار سنگھ قریب آیا تو انھوں نے اسے للکارا۔ ''کون ہے؟ رک جاؤ۔''

اوتار سنگھ رک گیا اور انھیں غور سے دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟'' اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''اوہو...... نشے میں بھی ہے۔'' ایک پولیس والے نے کہا۔

''لگتا ہے، بڑا دن منا کے آ رہا ہے۔'' دوسرے نے تبصرہ کیا۔

''بڑی رات کہو۔'' پہلے نے ترمیم کی۔

اوتار سنگھ خاموش رہا۔ اسے وہ دونوں اِدھر اُدھر ڈولتے نظر آ رہے تھے۔

اچھا لباس قانون کے رکھوالوں کو ہر دور میں مرعوب کرتا رہا ہے۔ اوتار سنگھ آقاؤں کے لباس میں تھا۔ مگر اپنی سرخ و سپید رنگت کے باوجود وہ آقاؤں میں سے نہیں لگتا تھا۔ پھر بھی آقاؤں

کے لباس نے انھیں مرعوب کر دیا۔ ”کہاں سے آ رہے ہو راج کمار؟“ ایک نے پوچھا۔

”کرنل پارسن کے گھر سے۔“

”اوہو...... گورے راجا کے گھر گئے تھے۔ نام کیا ہے تمہارا؟“

”نام سے کیا...... ہوتا...... ہوتا ہے۔ نام تو...... اوتار سنگھ...... ہے۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ نام تو اوتار سنگھ ہے۔ پر ایک خدا کو...... مانتا ہوں۔“

”اور شراب گوروں کی پیتے ہو۔“ پولیس والے نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

”تم نے...... مو جھے روکا...... کیوں......؟“

”تمھارے بھلے کے لیے۔ تم مُسلے ہوتے تو سمجھاتے کہ اتنی رات کو اکیلے پھر رہے ہو۔ کوئی چھرا گھونپ دے گا۔ مگر تم تو اوتار سنگھ ہو۔ تمھیں کوئی خطرہ نہیں۔ جانا کہاں ہے تمھیں؟“

لیکن اوتار سنگھ کے دماغ میں مُسلے والی بات پھنس گئی تھی۔ ”چھرا گھونپنے سے پہلے نام بھی پوچھتے ہیں کیا؟“ اس نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

”ہاں...... اُوش پوچھتے ہیں کہ کہیں ہندو جانی کے ساتھ ظلم نہ ہو جائے۔“

”اور اوتار سنگھ کے اندر...... کوئی محمود ہو تو؟“

”جاؤ بھائی جاؤ۔ تمھیں چڑھ رہی ہے۔ پر نتو یہ بات کسی چھرے والے سے نہ کہنا۔“

”تم ہندو ہو؟“

”ہاں۔“

”تو مسلمان بھی تو ہوں گے پولیس میں۔“

”وہ کہاں نوکری کرتے ہیں۔ ان کو تو راج کرنے کی عادت ہے نا۔ پر اب وہ دن گئے۔ اب تو نوکری بھی نہیں ملے گی۔ غلامی کریں گے غلامی۔“

”جبھی تو وہ...... یہاں نہیں...... رہنا چاہتے۔“ اوتار سنگھ نے کہا۔

”چھوڑو مہاراج۔ تم جاؤ۔“

اوتار سنگھ چل دیا۔ وہ نشے میں تھا۔ لیکن کچھ باتیں اسے چبھ رہی تھیں۔ سڑکوں پر قتل کیے جانے کا خطرہ صرف مسلمانوں کے لیے تھا۔ ہندو اس سے محفوظ تھے۔ تو ایسے غیر محفوظ ملک میں وہ کیسے رہ سکتے ہیں۔ جبھی تو وہ الگ ملک مانگ رہے ہیں۔

دوسری بات یہ تھی کہ اگر سرسید احمد خان نے انگریزی تعلیم کے حق میں تحریک نہ چلائی ہوتی تو مسلمان بہت پیچھے رہ جاتے۔ بہر حال تعلیم کے میدان میں اب بھی وہ ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے اور یہ بھی حقیقت تھی کہ ان کا ملازمتوں کی طرف رجحان نہیں تھا۔ وہ سنگین حال میں جی

رہے تھے۔ لیکن درحقیقت وہ اب بھی اپنے عظیم الشان ماضی سے چمٹے ہوئے تھے۔ یہ نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ یہ خود فریبی انھیں کچھ نہیں دے گی۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے وہ جانے پہچانے راستوں پر بے اختیار چلتا رہا۔ نشے میں ہونے کے باوجود وہ راستہ نہیں بھٹکا۔ اس کے قدم خود کار انداز میں گھر کی طرف اٹھتے رہے۔

گھر پہنچ کر وہ بے سدھ ہو کر اپنے بستر پر گر گیا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ اس نے کھانا نہیں کھایا ہے۔

●......●......●

ناشتے کی میز پر سب کو احساس ہو گیا کہ ریٹا کا موڈ بہت خراب ہے۔ ایسے میں رچرڈ کی کوشش ہمیشہ یہی ہوتی تھی کہ اس سے کنارہ کش رہے۔ کچھ پوچھے تو جواب دے دے اور حتی الامکان اس سے الجھنے سے بچے۔

الزبتھ اور جیمز بھی اسے نظر انداز کر رہے تھے۔ لیکن ناشتے کی میز پر یہ کوئی آسان کام نہیں تھا...... خاص طور پر الزبتھ کے لیے۔

الزبتھ نے ٹوسٹ پر مکھن لگایا اور ریٹا کی پلیٹ میں رکھ دیا۔ جوس کا گلاس پہلے ہی اس کے سامنے رکھا تھا۔

ریٹا نے کوئی تعرض نہیں کیا اور ٹوسٹ اٹھا کر کھانے لگی۔ وہ اچھی علامت تھی۔

”تمھیں کافی دوں مائی ڈیر؟“ کچھ دیر بعد الزبتھ نے پوچھا۔

”جی ماما۔“

الزبتھ نے کافی کا مگ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”رات پارٹی میں بہت لوگ تمھیں پوچھ رہے تھے۔“ اس نے کہا۔

”ہوں ہم۔“

”مائیک اینڈرسن تمھیں بہت مس کر رہا تھا۔ بار بار تمہارا پوچھتا۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے مائی بے بی۔“

”یس ماما۔ میں نے کب کہا کہ وہ برا ہے۔“ ریٹا نے بے پروائی سے کہا۔

”اینڈرسنز بھی تو وطن واپس جا رہے ہیں۔“ جیمز پارسن نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

”نیو ائیر وہ وہیں منائیں گے۔ 28 تاریخ کو ان کی روانگی ہے۔“ الزبتھ بولی۔

”واہ...... کرسمس یہاں اور نیو ائیر وہاں۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ۔“ ریٹا نے تبصرہ کیا۔ لیکن اس کے لہجے میں پھیکا پن تھا۔

الزبتھ کو فضا قدرے سازگار محسوس ہوئی۔ ”رات تمہاری پارٹی بہت جلدی ختم ہو گئی

تھی؟'' اس نے بے حد سرسری طور پر پوچھا۔

''نہیں تو ماما۔'' ریٹا نے بے ساختہ کہا۔ پھر سنبھل کر پوچھا۔ ''آپ لوگ کس وقت واپس آئے تھے؟''

''ڈھائی بجے تھے۔'' الزبتھ نے جواب دیا اور تائید طلب نظروں سے شوہر کو دیکھا۔ جیمز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہماری پارٹی ڈیڑھ بجے ختم ہوئی تھی۔'' ریٹا نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

''تب بھی جلدی ہی ختم ہوئی نا۔'' الزبتھ نے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ ریٹا جھوٹ بول رہی ہے۔ رات وہ لوگ واپس آئے تو گھر کی ایسی صورت حال ہرگز نہیں تھی، جیسے وہاں پارٹی ہوئی ہو۔ اس پر الزبتھ پارسن کو تشویش ہوئی۔ ریٹا کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے کک سے پوچھ گچھ کی تو اسے سب معلوم ہوگیا۔ ریٹا نے کک کو صرف دو افراد کے ڈنر کے لیے کہا تھا...... اور اس کے پاس صرف ایک مہمان آیا تھا۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ وہ واپس گیا تھا اور اس عالم میں کہ ریٹا چیخ رہی تھی، چلا رہی تھی، زبردستی اسے روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن وہ نہیں رکا تھا، چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ریٹا اکیلی بیٹھی پیتی رہی تھی۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور کک کو ڈانٹ کر بھگا دیا تھا۔

الزبتھ پارسن کو یہ سب معلوم تھا لیکن اس نے ریٹا سے کچھ نہیں کہا۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ وہ لوگ پارٹی سے ڈھائی بجے نہیں، بلکہ ایک بجے واپس آئے تھے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی بیٹی محبت کی چوٹ کھائے بیٹھی ہے اور مایوسی سے دوچار ہے۔

اس نے ریٹا کی طرف دوسرا ٹوسٹ بڑھایا۔ ریٹا نے وہ بھی لے لیا۔ ظاہر ہے، وہ رات سے بھوکی تھی۔

''یہ بتاؤ، تمھارے دوستوں نے انجوائے تو خوب کیا نا؟'' الزبتھ نے اچانک پوچھا۔

ریٹا گڑبڑا گئی۔ ''یس ماما، بہت زیادہ۔'' اس نے جلدی سے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''اور تم نے؟'' الزبتھ نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

''میں نے بھی ماما۔'' ریٹا نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''مگر تم خوش تو نہیں لگ رہی ہو۔''

''وہ ماما نیند پوری نہیں ہو سکی ہے نا، اس لیے۔''

الزبتھ اب جو بات کر رہی تھی، وہ ایک منصوبے کے مطابق تھی۔ رات اس نے اس سلسلے میں جیمز سے بھی بات کی تھی۔ وہ دونوں جانتے تھے...... رچرڈ بھی انھیں اشارتاً بتا چکا تھا کہ ریٹا ایک ہندوستانی لڑکے سے محبت کرتی ہے، جو ہندو ہے بلکہ رچرڈ نے اس کی بہت...... بہت

زیادہ تعریف بھی کی تھی۔ رچرڈ نے انھیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کرسمس پر ریٹا نے صرف اوتار سنگھ کو بلایا ہے۔ الزبتھ اس بات سے خوش نہیں تھی۔ لیکن جیمز کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔

مگر رات جو کچھ انھوں نے دیکھا اور سنا، اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ لڑکا ریٹا میں انٹرسٹڈ نہیں ہے۔ الزبتھ کا کہنا تھا کہ یہ وقت برطانیہ واپس جانے کا تذکرہ کرنے کے لیے مناسب ہے۔ شکستہ دلی کی وجہ سے ریٹا اس وقت مان بھی سکتی ہے۔ لیکن جیمز کا کہنا تھا کہ وہ اس سلسلے میں براہ راست لڑکے سے بات ضرور کرے گا۔

اس وقت الزبتھ نے اس سلسلے میں پہل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ''میں تو بس اب تھوڑے ہی دن تمھارے ساتھ ہوں ریٹا۔'' اس نے کہا۔

''کیا مطلب ماما۔'' ریٹا بری طرح چونکی۔

''کرنل ولکسن سے بات ہوئی تھی۔ انھوں نے نیو ائیر کے بعد مجھے بلایا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ جیمز کے علاوہ ہم سب واپس جا سکتے ہیں۔ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ زیادہ سے زیادہ پندرہ دن لگیں گے۔''

''اوہ ماما۔''

''میں تمھیں بہت مس کروں گی ڈیئر۔''

وہ پہلا موقع تھا کہ ریٹا مسکرائی۔ ''نہیں ماما، آپ مجھے مس نہیں کریں گی۔''

''کیوں نہیں کروں گی۔ بہت کروں گی۔ تمھیں نہیں پتا، میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔''

''مجھے پتا ہے ماما۔ مگر آپ مجھے مس نہیں کریں گی۔ کیونکہ میں آپ کے ساتھ چل رہی ہوں۔''

وہ سب ہکا بکا رہ گئے۔ ''ابھی کل ہی کی بات ہے کہ تم نے منع کر دیا تھا۔'' جیمز نے کہا۔

''کل اور آج میں بڑا فرق ہوتا ہے ڈیڈی۔'' ریٹا نے جواب دیا۔

''تمھیں تو یہاں کا کلچر بھی پسند ہے اور موسم بھی۔''

''لیکن ڈیڈی، یہاں کے لوگ بہت بیک ورڈ ہیں۔'' ریٹا کے لہجے میں قطعیت تھی۔

''یہ کتنی ہی تعلیم حاصل کر لیں، روشن خیال کبھی نہیں ہوں گے ان کی قدامت پسندی کبھی ختم نہیں ہوگی۔''

رچرڈ مسکرا دیا۔ وہ بہن کی بات اور اس کے پس منظر کو پوری طرح سمجھ سکتا تھا۔

لیکن جیمز پارسن سوچ رہا تھا کہ وہ کم از کم ایک بار اس لڑکے اوتار سنگھ سے ضرور ملے گا...... کچھ نہیں تو صرف اپنے تجسس کی تسکین کے لیے۔

❀......❀......❀

اوتار سنگھ شروع ہی سے سحر خیز تھا۔ اوّل تو رات کو وہ جلدی سوتا تھا۔ لیکن دیر سے سوئے تو بھی اس کی آنکھ صبح پانچ بجے کھل جاتی تھی اور اسے صبح کا وقت اچھا بھی بہت لگتا تھا۔

اس صبح بھی وہ معمول کے مطابق اُٹھ گیا۔ لیکن اس کی طبیعت بہت عجیب سی ہو رہی تھی۔ سر ایسا بوجھل اور بند سا لگ رہا تھا، جیسے وہاں دماغ کی جگہ کوئی بھاری پتھر رکھا ہو۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ حالانکہ صبح اس کا دماغ ہمیشہ تر و تازہ اور روشن رہوتا تھا۔ وہ تو اسی وقت کو پڑھنے اور کچھ یاد کرنے کے لیے سب سے اچھا وقت قرار دیتا تھا۔

دوسرا احساس اسے یہ ہوا کہ اس کے منہ کا ذائقہ بہت کڑوا ہو رہا ہے۔ اس نے سوچا، شاید یہ لعاب کی وجہ سے ہے۔ لیکن باتھ روم میں جا کر تھوکنے، دانت صاف کرنے اور کلیاں کرنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ منہ میں تھوک بار بار آ رہا تھا اور وہ بے حد کڑوا بھی تھا۔

تیسرا احساس اسے یہ ہوا کہ اس کا جی متلا رہا ہے۔ وہ بار بار جھرجھری لیتا۔ ایسا لگتا کہ ابھی اسے قے ہو جائے گی۔ لیکن قے ہوئی نہیں بہرحال اسے بری طرح گھبراہٹ ہونے لگی۔

یہ صبح آخر اتنی مختلف کیوں ہے، اس نے گھبرا کر سوچا۔ کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے۔

اگلے ہی لمحے اسے بڑا شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ اسے رات کی باتیں دھندلی دھندلی یاد آئیں۔ ریٹا کے گھر جانا، شربت پینا، اس شربت کی کڑواہٹ اور اس کے سلسلے میں ریٹا کی وضاحت۔ وہ سب صوری یادیں تھیں، جیسے کوئی فلم بہت تیز چلائی جا رہی ہو...... اور وہ بھی ٹوٹ ٹوٹ کر...... مگر بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے گھبرا کر سر جھٹکا۔ آگے جو کچھ تھا، وہ فی الحال اسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جتنی بات سمجھ میں آ گئی تھی، فی الوقت اتنی ہی بہت تھی۔

اس کے منہ کی کڑواہٹ اور متلی کے احساس میں اور اضافہ ہو گیا۔ شاید اس لیے کہ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ رات وہ نشے میں تھا۔ ریٹا نے اسے جو شربت پلایا تھا، اس میں شاید شراب کی ملاوٹ تھی۔

منہ کی کڑواہٹ اور بڑھی تو وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے رنجنا کو پکارا جو باورچی خانے میں ناشتہ تیار کر رہی تھی۔

رنجنا دوڑی دوڑی آئی۔ ''کیا حکم ہے چھوٹے مالک؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے ایک پیالی میں بغیر دودھ اور چینی کی تیز چائے لا کر دو۔''

رنجنا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ لیکن کچھ کہنے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔ اس کا دیکھنے کا انداز ایسا تھا، جیسے اس سے سننے میں کچھ بھول ہو گئی ہو۔

اوتار سنگھ نے اس کی بے یقینی بھانپ لی۔ ''میری بات سمجھ گئی ہونا؟''

''دودھ اور چینی کے بغیر چائے کہاں ہوتی ہے چھوٹے مالک۔''

''بس ابلے ہوئے پانی میں زیادہ پتی ڈال کر پکاؤ اور وہ مجھے لادو۔''

رنجنا کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ لیکن وہ تعمیل کی عادی تھی۔ ''بہتر چھوٹے سرکار۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

اوتار سنگھ بے تابی سے ٹہلتا رہا۔ کڑواہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ نہ جانے کیسے اس کے دماغ میں یہ بات سما گئی تھی کہ اس کڑواہٹ کو کڑواہٹ ہی ختم کر سکتی ہے۔ ورنہ اسے تو یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ خمار کا توڑ بلیک کافی ہے...... وہ بھی بغیر شکر کی۔

چند منٹ بعد رنجنا چائے لے آئی۔ اس نے چائے کچھ زیادہ ہی تیز بنادی تھی۔ اوتار سنگھ نے چائے کا طویل گھونٹ لیا۔ چائے اسے زیادہ کڑوی نہیں لگی...... شاید اس لیے کہ اس کا منہ زیادہ ہی کڑوا ہو رہا تھا۔

چائے کے تین چار گھونٹ لینے کے بعد اچانک اسے احساس ہوا کہ سر اور دماغ کا بوجھل پن دور ہو گیا ہے...... یہی نہیں، دماغ پر جو دھندی چھائی ہوئی تھی، وہ بھی چھٹ گئی تھی۔ اب اس کا جی بھی نہیں متلا رہا تھا۔ بلکہ اسے بھوک لگ رہی تھی۔

تاہم اس نے ابھی ناشتہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ پہلے وہ رات کے واقعات کو یاد کرنا اور ان پر سوچنا چاہتا تھا۔

وہ ریٹا کے گھر گیا تھا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ ریٹا نے اس کی بہت معقول وضاحت پیش کی تھی۔ وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ پھر اس نے ریٹا کو کرسمس کے وہ تحفے دیے، جو وہ اس کے لیے لے کر گیا تھا۔

وہاں تک سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ گڑبڑ اس وقت شروع ہوئی ہوگی، جب ریٹا نے اپنے لیے برانڈی اور اس کے لیے شربت نکالا تھا۔ یہ بھی اس کا قیاس تھا۔ کیونکہ وہ سب کچھ اسے پوری طرح یاد تھا۔ اسے یاد تھا کہ شربت پینے کے کافی دیر بعد تک وہ نارمل رہا تھا۔

بس ایک بات عجیب تھی۔ شربت عام طور پر میٹھے ہوتے ہیں۔ وہ شربت بھی میٹھا تھا۔ لیکن اس میں کڑواہٹ بھی تھی اور اس نے اس سلسلے میں ریٹا سے پوچھا بھی تھا۔ لیکن اس بار بھی ریٹا نے معقول وضاحت پیش کی تھی۔ اور وہ مطمئن ہو گیا تھا کیونکہ تلخی کے باوجود وہ اسے شربت ہی لگا تھا۔

یہاں اوتار سنگھ ٹھٹکا۔ اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ شربت میں شراب کی آمیزش ہوتی ہے۔ اس نے تو شراب کبھی چکھی ہی نہیں۔ پھر وہ کیسے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ شراب نہیں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ لاشعوری طور پر وہ اس سب کی خواہش کر رہا ہو۔

اب اوتار سنگھ اپنی عدالت میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ اور اس کا ضمیر اس پر

الزام عائد کر رہا تھا۔

چند لمحوں کے لیے وہ گڑبڑا گیا۔ پھر اس نے سنبھل کر سوچا۔ کیا وہ اس سلسلے میں اپنی صفائی پیش کر سکتا ہے...... کچھ ہے اس کے پاس کہنے کو؟

''یہ سچ ہے کہ میں نے شراب کبھی نہیں چکھی۔ اس کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے، مجھے نہیں معلوم۔ لیکن میں شربت کا ذائقہ تو پہچانتا ہوں۔ وہ سو فی صد شربت ہی تھا۔'' وہ بڑبڑایا۔

''سو فیصد شربت!'' ضمیر کی آواز میں چیلنج تھا۔

''سو فیصد نہ سہی۔ ممکن ہے، اس میں کسی نشہ آور شے کی ملاوٹ ہو۔ لیکن اس میں شربت کا ذائقہ واضح اور غالب تھا۔''

''تمھیں اس کی کڑواہٹ پر بھی شبہ نہیں ہوا؟''

''نہیں...... شبہ نہیں ہوا۔ ورنہ میں محتاط ہو جاتا۔''

''حالانکہ ہونا چاہیے تھا۔ شربت ایسی چیز نہیں ہوتی کہ کوئی کسی کو گلاس بھر بھر کر پلاتا رہے۔''

''واقعی، یہ میری غلطی ہے۔ لیکن میں بلاوجہ کسی کے بارے میں بدگمانی کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہ میری فطرت ہے۔ اس لیے مجھے شک نہیں ہوا۔''

''بلاوجہ! بدگمانی!'' ضمیر نے حقارت سے کہا۔ ''وہ تمھیں بتا چکی تھی کہ تم سے محبت کرتی ہے اور تم جانتے تھے کہ وہ آزاد معاشرے کی پروردہ ہے۔''

''مگر جب میں نے اسے بتا دیا کہ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں تو اس نے افسردگی سے مائی لک کہہ کر بات ختم کر دی تھی۔''

''نہیں۔ تم جانتے تھے کہ تمھاری محبت کو اس نے مشرق کی حماقت سمجھا ہے۔ اس کے نزدیک تم اب بھی قابل حصول تھے۔ اس نے تمھیں پارٹی میں بلایا اور وہاں کوئی نہیں تھا۔ سوائے اس کے اور تمھارے۔ تمھیں سمجھ لینا چاہیے کہ وہ تمھاری خیالی محبت کو اپنی بے باک محبت سے شکست دینے کی کوشش کرے گی۔''

''میں نے کہا نا کہ میں بدگمانی نہیں کرتا۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''اور پھر وہ دور بیٹھ کر مجھ سے علمی گفتگو کر رہی تھی۔ شبہ کرنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا میرے پاس۔''

''کارروائی آگے بڑھائی جائے۔'' دماغ جج کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے رولنگ دی۔

اوتار سنگھ کو یاد تھا کہ وہ بہت معقولیت کے ساتھ علمی گفتگو کر رہی تھی۔ پھر اس نے گفتگو کا رخ محبت کی طرف پھیر دیا تھا۔ مگر تھی وہ بھی علمی گفتگو۔

اب وہ سب کچھ یاد کرتے ہوئے اسے دھندلا سا خیال آ رہا تھا کہ محبت سے جسمانی

ربط تک بات گئی تھی تو وہ بہت پُرجوش ہو گیا تھا اور اس دوران ریٹا نے اسے جو مشروب دیا تھا، وہ شربت نہیں تھا۔ شاید خالص شراب تھا کیونکہ یہی وہ وقت تھا کہ اسے دماغ پر دھند سی چھاتی محسوس ہوئی تھی۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ پھر صوری یادیں تھیں۔ لیکن اس باران میں ریل ٹوٹ جانے کی سی کیفیت نہیں تھی۔ بلکہ تسلسل تھا۔

اس نے ریٹا سے اپنے تعلق کو دوستی کہا تھا اور ریٹا نے چیلنج کیا تھا کہ اگر وہ دوست ہیں تو انھیں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنا چاہیے۔ اب وہ اس سے انکار کرتا تو ریٹا کہتی کہ درحقیقت وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ مگر اس سے بے خبر ہے۔ چنانچہ وہ اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھنے کے لیے بڑھا تھا۔ اس وقت اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی اور وہ یقیناً نشے میں تھا۔ اس لیے کہ اس نے جانتے بوجھتے شراب کے کئی جام قبول کر لیے تھے......

اس کے بعد مسلسل ایسے مناظر تھے، جنھیں وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر فلم بند آنکھوں کے سامنے بھی چلتی رہی۔ شرمندگی اور ندامت بوند بوند اس کے وجود میں ٹپکتی رہی اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں تبدیل ہو گئی۔

اب وہ شرمندگی سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ یہ میں کہاں پہنچ گیا تھا...... کتنی پستی میں گر گیا تھا میں اور میں بچ نہیں سکتا تھا۔ میں تباہ ہو جاتا، اگر خدا نے مجھے بچا نہ لیا ہوتا۔ ہاں...... اس نے مجھے بچا لیا۔ ورنہ میں محبت کا نام زبان پر لانے تک کے قابل نہ رہتا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

''محبت کا نام زبان پر لانے کے قابل تو تم اب بھی نہیں رہے ہو۔'' ضمیر نے تلخ تبصرہ کیا۔

جو منظر اس کی نگاہوں کے سامنے پھر رہے تھے، انھیں دیکھ کر اس نے سر جھکا لیا۔ بات درست تھی۔

مگر وہ کیسا لمحہ تھا۔ خدا کے حوالے میں کیسی تاثیر تھی کہ اس کا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا تھا۔ اگر ریٹا نے اس لمحے بندے کی خدا سے محبت کا مضحکہ نہ اڑایا ہوتا تو وہ یقیناً ایسے گرتا کہ اٹھنا تو در کنار، کبھی نظر بھی نہ اٹھا پاتا۔ خدا کا نام سنتے ہی اسے ایسا لگا تھا کہ کسی نے اس پر ٹھنڈے پانی کی بالٹی انڈیل دی ہے۔ کیسا خوف طاری ہوا تھا اس پر خود کو ریٹا کے ساتھ اس حال میں دیکھ کر۔

وہ ریٹا کے سحر سے باہر آ گیا تھا...... خدا کے حوالے کی وجہ سے۔ مگر ریٹا کو خبر نہیں تھی۔ اس نے اس پر اکتفا نہیں کیا۔ اس نے اَن دیکھی نشے کی محبت کا بھی مذاق اڑایا تھا۔ اسے کمزور اور بودا قرار دیا تھا۔ اس لیے کہ وہ خود کو فاتح سمجھ رہی تھی اور یہ بات اسے پوری طرح ہوش میں لے

آئی اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ ریٹا اپنی فتح پر اترائی نہ ہوتی تو محبت کو اور اوتار سنگھ کو شکست ہو چکی ہوتی۔

وہ سب کچھ یاد کرنے اور سمجھنے کے بعد اوتار سنگھ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ وہ رونے والا آدمی نہیں تھا۔ لیکن وہ ندامت کے آنسو تھے اسے خود پر شرم آ رہی تھی۔ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ بس اس کا جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

دیر تک وہ روتا رہا...... دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ پھر جیسے اندر کے سوتے خشک ہو گئے۔ آنسو بھی رک گئے۔ شاید اب اس کے اندر کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ سینہ اسے خالی خالی لگ رہا تھا، جیسے کوئی عمارت کھنڈر میں تبدیل ہو گئی ہو۔

پھر اچانک ایک تبدیلی آئی۔ اللہ کا نام اس کے کھنڈر وجود میں گونجا اور اس کی زبان پر آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دماغ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اللہ نے اسے اور اس کی محبت کے تصور کو بچایا ہے۔ اسے اس پر اللہ سے معافی مانگنی چاہیے اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے اسے بچا لیا۔

یہاں پہنچ کر وہ الجھ گیا کہ معافی مانگنا زیادہ اہم ہے یا شکر ادا کرنا۔ کیونکہ اس کے لیے تو دونوں ہی باتیں اہم تھیں۔ اسے توبہ کرنا نہیں آتا تھا۔ البتہ شکر وہ زبان سے ادا کر سکتا تھا۔ وہ دیر تک شکر ادا کرتا رہا۔ معافی مانگنے کے خیال سے وہ پھر الجھنے لگا۔ بس وہ زبان سے ہی تو کہہ سکتا تھا کہ اے اللہ، مجھے معاف کر دے۔

مگر یہ کہتے کہتے اسے لگا کہ اس کے سینے میں پھر سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا ہے۔ آنسو اتنی تیزی سے امنڈ کر آئے کہ وہ خود کو سنبھال بھی نہ سکا۔ اب وہ پھر ننھے بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ ناپاک ہو گیا ہے۔ روتے روتے بھی وہ کلمہ پڑھنے لگا...... یہ سوچ کر کہ یہ کلمہ اس کی ناپاکی کو دور کر کے اسے پاک کر دے گا۔

پھر اسے احساس ہوا کہ جیسے جیسے آنسو بہہ رہے ہیں، اس کے سینے میں کوئی پتھر ہے جو ہلکا ہوتا جا رہا ہے۔ جیسے وہ اندر سے ڈھل رہا ہے اور جب اس کے آنسو تھمے تو اسے یہ خوش گوار احساس ہوا کہ وہ اب ہلکا پھلکا ہو چکا ہے۔ اس نے تصور میں ان مناظر کو دیکھنا چاہا، جن پر وہ شرمندہ تھا۔ مگر اب وہ بہت دھندلے تھے۔ نہ وہ خود کو واضح طور پر دیکھ پا رہا تھا۔ نہ ریٹا کو۔ وہ تو بس دو ہیولے تھے۔

اس وقت نہ تو وہ توبہ کو سمجھتا تھا اور نہ توبہ قبول ہونے کی علامات کو۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اللہ توبہ قبول کرے تو اپنی رحمت اور مغفرت سے بندے کے دل و دماغ سے اس گناہ کی یاد بھی مٹا دیتا ہے، جس پر اس نے توبہ کی ہو۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اللہ نے اس کی توبہ قبول فرما لی ہے۔

ہلکا ہونے کے بعد وہ ذہنی طور پر اس قابل ہو گیا کہ اس پورے معاملے کو عقل کی کسوٹی پر

پرکھ کر تجزیہ کر سکے۔ اس نے سوچنا شروع کیا تو یہ بات سمجھنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی کہ ریٹا نے کچھ بھی اضطراری طور پر نہیں کیا تھا۔ اس نے پوری منصوبہ بندی کی تھی۔ اس نے بڑی احتیاط سے، خوب سوچ سمجھ کر اس کے لیے جال بچھایا تھا اور اس نے کہیں بھی جلد بازی سے کام نہیں لیا تھا۔

قدرتی بات تھی کہ اس کے بعد اسے ریٹا پر غصہ آیا۔ اسے ریٹا سے یہ امید نہیں تھی۔ مگر اگلے ہی لمحے یہ سوچنے کے بعد اس کا غصہ سرد ہو گیا کہ اسے اللہ نے بچا لیا تو شکایت کیسی۔ اور اس کی اپنی غلطیاں بھی تو تھیں، جن سے وہ انکار نہیں کر سکتا۔

اس نے چند باتیں زندگی بھر کے لیے سمجھ لیں اور ذہن نشین کر لیں۔ عورت اور مرد کے درمیان دوستی نہیں ہو سکتی اور عورت سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیے۔ عورت مکر سے کام لینے پر آئے تو اس سے بچنا ممکن نہیں ہوتا۔ اللہ ہی بچائے تو بچائے۔

بہر حال اس کے دل میں ریٹا کے لیے جو برائی آئی تھی، اس نے اسے جھٹک دیا۔ ریٹا نے جو کچھ کیا، وہ اپنی بے لگام خواہشات سے مجبور ہو کر کیا۔ اس کے ہاتھ تو کچھ بھی نہیں آیا۔ بلکہ اب شاید وہ ہمیشہ اس سے شرمندہ ہی رہے گی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے مزید شرمندہ نہیں کرے گا۔

''چھوٹے مالک، ناشتہ لاؤں؟'' رنجنا نے اسے چونکا دیا۔

''ہاں، جلدی سے لے آؤ'' اوتار سنگھ نے کہا۔ اسے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ ''اور ہاں، میں آج شملہ جا رہا ہوں...... ماسٹر جی کے پاس۔ چار پانچ دن بعد واپس آؤں گا۔''

رنجنا خاموشی سے ناشتہ لانے کے لیے چلی گئی۔

❁....❁....❁

وہ پہلا موقع تھا کہ اوتار سنگھ نے ماسٹر جی کے ساتھ سینی ٹوریم میں مسلسل پانچ روز گزارے...... پہلا اور آخری موقع!

اس نے ایک قریبی ہوٹل میں اپنے لیے ایک کمرا لے لیا تھا۔ کمرا تو وہ پہلے بھی لیتا تھا، مگر صرف ایک رات کے لیے۔ ہوٹل کے سبھی لوگ اسے پہچانتے تھے حالانکہ ہوٹل میں صرف نہانے دھونے، کھانا کھانے اور ناشتہ کرنے اور رات کو سونے کے سوا وہ رکا بالکل نہیں تھا۔

''اس بار مجھے 31 تاریخ تک کمرا چاہیے ہوگا۔'' اس نے استقبالیہ کلرک سے کہا۔

''جب تک دل چاہے رہیں صاحب۔ آج کل سیزن تو ہے نہیں۔ کمرا بھی آپ کو اچھا والا دوں گا۔''

ماسٹر جی کو پتا چلا کہ وہ پانچ دن رکنے کے ارادے سے آیا ہے تو ان کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ انھوں نے بڑی ممنونیت سے اسے دیکھا۔ ''تم میرے کسی اچھے کرم کا پھل ہو اوتار سنگھ۔

حالانکہ میں نے زندگی میں شاید ہی کوئی اچھا کام کیا ہو۔''

''یہ تو اچھے لوگوں کی پہچان ہوتی ہے ماسٹر جی کہ انھیں اپنا کوئی اچھا کام یاد ہی نہیں ہوتا۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''اچھے تو تم ہو اوتار سنگھ۔''

''اگر میں اچھا ہوں تو صرف اس لیے کہ آپ میرے استاد ہیں۔''

ماسٹر جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''میری اپنی اولاد نے مجھے چھوڑ دیا۔ تم نہ ہوتے تو میں اس گندی کوٹھری میں کب کا مر کھپ چکا ہوتا۔'' انھوں نے رقت بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ ایسے نہ سوچا کریں ماسٹر جی۔''

''کیسے نہ سوچوں۔ چار مہینے سے یہاں پڑا ہوں۔ کسی نے نہیں پوچھا مجھے۔ کوئی ایک بار بھی نہیں آیا یہاں؟''

''ارے میں تو آپ کو بتانا بھول ہی گیا۔ میں آپ کے گھر گیا تھا۔ گنگا، کانتا اور مرلی آپ کو بہت یاد کر رہے تھے۔'' اوتار سنگھ نے اسے خوش کرنے کی کوشش کی۔

''بچے تو من کے سچے ہوتے ہیں نا۔ وہ تو وہاں بھی میری کوٹھری میں آنے کو تڑپتے تھے۔ پر ان کی کٹھور مائیں انھیں آنے ہی نہیں دیتی تھیں۔''

''وہاں سب آپ کو یاد کرتے ہیں ماسٹر جی۔ آپ کے بیٹے برے نہیں ہیں، مجبور ہیں۔''

''ہاں، مجھے کوٹھری میں اکیلا چھوڑ دینا مجبوری ہی تو تھی۔'' ماسٹر جی نے تلخ لہجے میں کہا۔ کوٹھری کی خوف ناک یادیں ان کے اندر کہیں بہت گہرائی میں شکایت بن کر اتر گئی تھیں۔

''رام بھیا کی تو رات کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ بدری بھیا کی بھی ڈیوٹی بہت سخت ہوتی ہے۔ ہری بھیا نے میرے ساتھ آنے کا وعدہ کیا ہے۔''

''کب.....؟ اگلی بار؟'' ماسٹر جی نے زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ کھسیا گیا۔ ''اب تو اسکول کے امتحان سر پر ہیں۔ ٹیوشنز سے بھی چھٹی نہیں کر سکتے وہ۔'' اس نے کہا۔ کہہ رہے تھے کہ مارچ یا اپریل میں میرے ساتھ آئیں گے۔''

''مارچ اپریل کا کس کو پتا۔ میں ہوں نہ ہوں۔'' ماسٹر جی نے سرد آہ بھر کے کہا۔

''آپ ایسی باتیں نہ کریں ماسٹر جی۔ ایک دن آپ صحت یاب ہوں گے اور میں آپ کو گھر لے کر جاؤں گا۔''

ماسٹر جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر وہ خاموشی بھی جواب تھی..... یہ جواب کہ انھیں ایسی کوئی امید نہیں۔

اوتار سنگھ نے جلدی سے ایک کتاب ماسٹر جی کی طرف بڑھا دی۔ ''آپ موقع نکال

کر اسے پڑھیے گا۔ پھر ہم اس پر بات کریں گے۔''

ماسٹر جی نے کتاب کا سرسری سا جائزہ لیا۔ ''اس پر تو ہم اب بھی بات کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ تم اس کا مطالعہ کر چکے ہو۔''

ان کے درمیان علمی گفتگو شروع ہوئی تو ماسٹر جی اپنا دکھ، اپنی شکایتیں بھول گئے۔ اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ ماسٹر جی کا ذہن اور حافظہ اب بھی پہلے جیسا ہی ہے۔ وہ اس کتاب پر سیر حاصل گفتگو کر رہے تھے۔

رات کو وہ ہوٹل جانے کے لیے اٹھا تو ماسٹر جی بچوں کی طرح ضد کرنے لگے۔ ''جانے کی کیا ضرورت ہے یہیں رک جاؤ نا۔'' انھوں نے کہا۔

''میں صبح سویرے ہی آ جاؤں گا ماسٹر جی۔''

''میں میڈن سے بات کروں گا۔ یہیں تمھارے لیے پلنگ ڈال دیا جائے گا۔'' ماسٹر جی بچوں کی طرح ایکسائیٹڈ تھے۔ مگر اس کی ہچکچاہٹ دیکھ کر اچانک ان کا لہجہ بدل گیا۔ ''مگر تم میرے ساتھ کیسے سو سکتے ہو۔ یہ چھوت کا مرض ہے۔ تمھیں لگ گیا تو'' اس کے چہرے پر نظر پڑی تو وہ کہتے کہتے رک گئے انھیں احساس ہو گیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

اوتار سنگھ کو ان کی بات سے دلی صدمہ ہوا تھا۔ وہ اسے ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بے اختیار دل کی کیفیت کا عکس اس کے چہرے پر آ گیا تھا اور عین اسی لمحے ماسٹر جی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

''یہ بات نہیں ماسٹر جی.....'' اس نے کہنا چاہا۔

مگر دیکھتے ہی دیکھتے ماسٹر جی کا چہرہ یوں چٹخا، جیسے ساکت پانی میں عکس ایک کنکر پھینکے جانے پر چٹخ جاتا ہے۔ اگلے ہی لمحے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

''ماسٹر جی، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ کاش آپ نے مجھے وضاحت کا موقع دیا ہوتا۔ مگر خیر، اب تو میں یہیں رکوں گا۔''

ماسٹر جی نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کرنا چاہا۔ لیکن وہ کچھ کہنے کے قابل نہیں تھے۔ مدت سے جمع ہونے والا غبار آنسوؤں کی شکل میں نکل رہا تھا۔

اوتار سنگھ لپک کر بڑھا اور ان کی پیٹھ تھپتھپانے لگا۔ ''ماسٹر جی، آپ نے ایسا کیسے سوچ لیا۔ میں تو آپ کو پتا سمان سمجھتا ہوں۔ دل چھوٹا نہ کریں ماسٹر جی، میں نے تو شروع میں ہی کہا تھا کہ آپ کی صحت یابی تک میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔''

''اسی لیے تو..... رو رہا..... ہوں۔'' ماسٹر جی نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

اوتار سنگھ اس جملے کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ ماسٹر جی کے جملے کا رخ اس کے بیان سے

پہلے حصے کی طرف تھا۔ لیکن اس نے سمجھا کہ وہ اس کے آخری جملوں کے حوالے سے جواب دے رہے ہیں۔ ''اب میں کہیں نہیں جاؤں گا ماسٹر جی۔ آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ میں آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔''

ماسٹر جی کا گریہ اور بڑھ گیا۔ ساتھ ہی وہ زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگے۔

کچھ دیر میں غبار چھٹا تو ماسٹر جی نے اوتار سنگھ کے سامنے ہاتھ جوڑ لیے۔ مگر بولنا اب بھی ان کے بس میں نہیں تھا۔ چند لمحے بعد انھوں نے کہا۔ ''میں ہاتھ جوڑ کر تم سے بنتی کرتا ہوں بیٹے کہ مجھے معاف کر دو۔''

اوتار سنگھ نے بے تابی سے ان کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو علیحدہ کیا اور انھیں چومنے لگا۔ ''یہ کیا کر رہے ہیں ماسٹر جی...... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ مجھے گناہ گار کر رہے ہیں آپ؟''

''گناہ گار تو میں ہوں بیٹے۔ تم تو میرے اپنے بیٹوں سے بڑھ کر میرے بیٹے ثابت ہوئے اور میں نے تمھارے متعلق ایسے سوچا۔ میں اتنا کڑوا، اتنا زہریلا ہو گیا ہوں، مجھے اندازہ ہی نہیں تھا۔ میں نے امرت رس کی ندی میں اپنا زہر گھول دیا۔ اب سمجھ میں آیا ہے کہ امرت رس سچا ہو تو اس میں گرنے والا زہر بھی امرت ہی بن جاتا ہے۔ مجھے شما کر دو بیٹے۔''

''ارے ماسٹر جی، ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے تو برا بھی نہیں لگا۔ آپ کی بات فطری تھی۔ لیکن میں......''

''تم نے کبھی مجھ سے چھوت چھات نہیں کی۔ پھر بھی میں نے تمھیں طعنہ دیا۔ بس تم مجھے شما کر دو۔''

''آپ مجھے گناہ گار نہ کریں ماسٹر جی۔ آپ کی کسی بات سے مجھے تکلیف نہیں ہوئی۔ مگر اس بات سے ہو رہی ہے۔''

''تم سچے بیٹے ہو۔ تم نے مجھے پاسان ہی سمجھا ہے۔ مجھے تم پر مان ہے بیٹے۔ اب میں یہ بات نہیں کروں گا۔ مگر اب تم یہاں نہیں رکو گے۔''

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر ماسٹر جی۔ مگر پہلے میں آپ کے پہلے حکم کی تعمیل کروں گا۔ آج رات تو میں یہیں رکوں گا۔''

اوتار سنگھ نے اتنی قطعیت کے ساتھ بات کی تھی کہ ماسٹر جی کچھ کہہ نہ سکے۔ ویسے بھی وہ شرمندہ تھے۔

❁......❁......❁

اگلی صبح اوتار سنگھ کا دماغ نیند سے بوجھل تھا۔ جسم بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔ دراصل وہ معمولات کا آدمی تھا، اچھی اور طویل نیند اس کے لیے بہت ضروری تھی اور رات کو کسی بھی وقت

سوئے، صبح پانچ بجے اس کی آنکھ بہر حال کھل جاتی تھی۔ اس کے بعد دن بھر وہ سو بھی نہیں سکتا تھا۔ نیند پوری نہ ہونے کی صورت میں اس کا یہی حال ہوتا تھا۔

رات شروع میں تو ماسٹر جی کو یہ ملال تھا کہ انھوں نے زبردستی اسے روکا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر فرائیڈ اور ڈارون کے نظریات پر گفتگو چھڑی تو وہ سب کچھ بھول گئے۔ ایسے میں تو انھیں اپنی بیماری بھی یاد نہیں رہتی تھی۔ وہ پہلے جیسے ہو جاتے تھے۔ وہ اتنے خوش نظر آ رہے تھے کہ مدت سے اوتار سنگھ نے انھیں ایسا خوش نہیں دیکھا تھا۔ خود وہ انھیں خوش دیکھ کر بہت خوش تھا۔

نفسیات کا موضوع خود اوتار سنگھ نے نکالا تھا اور اسے فرائیڈ تک لے گیا تھا۔ ماسٹر جی تو حیران تھے کہ وہ فرائیڈ کے نظریات پر گفتگو کر رہا ہے۔

''دیکھو بیٹے...... مرد اور عورت کے درمیان جنسی کشش ایک کائناتی حقیقت ہے۔'' ماسٹر جی نے کہا تھا۔ ''انسان کا نسلی ارتقا اس حقیقت پر ہی قائم ہے۔ انسان کی جبلت میں جو طاقت ور ترین محرکات ہیں، ان میں بقا اور بھوک کے ساتھ جنس بھی شامل ہے۔''

''میرے خیال میں جنس کو بقا اور بھوک جیسے محرکات کے ساتھ رکھنا زیادتی ہے ماسٹر جی۔'' اوتار سنگھ نے ان سے اختلاف کیا۔ ''بقا خطرے میں ہو یا بھوک حد سے گزر جائے تو آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے...... اپنی فطرت اور مزاج کے برعکس۔''

''جنسی خواہش بھی درحقیقت بھوک ہی ہوتی ہے۔ ان محرکات کو طاقت ور ترین اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے زیر اثر انسان جانور بن جاتا ہے۔ درندگی پر اتر آتا ہے۔ کسی کی پروا نہیں کرتا۔ کچھ نہیں دیکھتا۔''

''جنس کا معاملہ مختلف ہوتا ہے ماسٹر جی۔ اگر آدمی میں تہذیب ہو تو وہ اس معاملے میں خود کو مذہبی اور معاشرتی اقدار کا پابند رکھتا ہے۔''

''تہذیب کو یہیں تک محدود کیوں کرتے ہو بیٹے۔ یہ طاقت ور ترین محرکات اصل میں انسان کی روحانی آزمائش ہوتے ہیں۔ انسان اخلاقی اور روحانی بلندی پر فائز ہو تو ان محرکات کو زیر کر لیتا ہے۔ اسی میں تو انسان کی عظمت ہے۔ بھوک سے تڑپتی ہوئی ماں روٹی کا ایک ٹکڑا مل جانے پر اسے خود نہیں کھاتی، اپنے کم بھوکے بچے کو کھلا دیتی ہے۔ یہ تو چھوٹی بات ہے۔ لوگ اپنے حصے کی روٹی کسی اور بھوکے کو بھی دے دیتے ہیں۔ بقا کا معاملہ اور سخت ہے۔ لیکن ایسی مثالیں موجود ہیں کہ انسان نے مارنے پر مرنے کو ترجیح دی۔ خود کسی کا خون بہانے کے بجائے قتل ہو جانا گوارا کر لیا۔ انسان میں بڑا تنوع ہے۔ ایک طرف وہ آکاش سے بلند ہے تو دوسری طرف پاتال سے بھی پست۔ فیصلہ اس پر ہوتا ہے کہ کس نے اپنے نفس کو کس حد تک فتح کیا ہے۔''

ماسٹر جی کی بات معقول تھی۔ لیکن اوتار سنگھ کا دماغ جنسی خواہش کو اتنا طاقت ور محرک

ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ”لیکن ماسٹر جی، جنسی خواہش پر قابو پانا اتنا مشکل نہیں۔“

”تمھیں اس کا تجربہ بھی تو نہیں ہے بیٹے۔“

اب اوتار سنگھ ماسٹر جی کو کیسے بتاتا کہ وہ قدم اکھاڑ دینے والے منہ زور طوفان کا سامنا کر کے آ رہا ہے۔ ”تجربہ تو مجھے بقا اور بھوک کا بھی نہیں ہے ماسٹر جی۔ لیکن عقل تو بتاتی ہے۔ میں بقا، بھوک اور جنسی خواہش کے بحران کا تصور تو کر سکتا ہوں۔ اسی بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ جنسی خواہش کو قابو میں رکھنا آسان ہے۔“

”اس لیے تو میں نے اسے بقا اور بھوک کے بعد رکھا ہے ترتیب میں۔“ ماسٹر جی نے ڈپلومیسی سے کام لیا۔ ”مگر بیٹے۔ بحران کا تصور کرنا اور بات ہے اور اس کا سامنا کرنا اور۔ برسوں نفس کشی اور ریاضت کرنے والے بقا اور بھوک کے محرکات پر قابو پا لیتے ہیں۔ مگر جنسی خواہش ایسا پُرفریب چھپا رستم ہے کہ اس کے سامنے ایک کمزور لمحے میں ان کی ساری تپسیا نشٹ ہو جاتی ہے۔“

اوتار سنگھ کے سامنے اپنا تجربہ تھا۔ اسے دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ اگر خدا کا اور اس کے بعد ان دیکھے محبوب کا طعنہ اسے نہ ہلا دیتا تو وہ بھی ہار جاتا۔ لیکن بہرحال اس نے کوئی نفس کشی اور ریاضت بھی نہیں کی تھی۔

مگر اب وہ پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے گفتگو کا رخ بدلا۔ ”لیکن ماسٹر جی، فرائیڈ کا نظریہ تو احمقانہ، مضحکہ خیز اور گمراہ کن ہے۔ میں اس بات کو کیسے مان لوں کہ ہر رشتے کے پیچھے جنس کارفرما ہے۔“

”یہ تو میں بھی کہتا ہوں۔“ ماسٹر جی نے کہا۔ ”میں نے کبھی اس کی حمایت نہیں کی۔“

انھی باتوں میں چار بج گئے۔ ماسٹر جی کی آنکھیں مندنے لگیں، جماہیاں آنے لگیں۔ لیکن مدت سے کسی اپنے کی قربت کو ترسا ہوا وہ بوڑھا اور بیمار شخص اب بھی سونا نہیں چاہتا تھا۔ اور موضوعات کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ وہ صاحب علم آدمی تھا اور اپنے ہونہار ترین شاگرد سے باتیں کر رہا تھا۔

آخر اوتار سنگھ کو اسے ٹوکنا پڑا۔ ”ماسٹر جی، اب آپ سو جائیں۔“

”ٹھیک ہے۔ روشنی گل کر دو۔“

اوتار سنگھ بھی ماسٹر جی کے ساتھ ہی سویا۔ لیکن اسے سونا تو نہیں کہیں گے۔ کیونکہ اس کی آنکھ سوا پانچ بجے کھل گئی۔ اس نے مزید سونے کی کوشش کی۔ لیکن اس سے سویا ہی نہیں گیا۔ ماسٹر جی البتہ بے سدھ سو رہے تھے۔

اوتار سنگھ نے چیسٹر پہنا، مفلر لپیٹا اور باہر نکل آیا۔ سردی ایسی تھی کہ اس کے دانت بج رہے تھے۔ مگر ایسے میں بھی وہ چہل قدمی اس کی روح کو شاداب کر گئی۔ صبح کے حسن کا تو وہ ہمیشہ

سے قائل تھا۔

چہل قدمی کے نتیجے میں جسم میں گرمی آئی اور سردی کا احساس کم ہو گیا۔ باہر ایک ہوٹل میں اس نے ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ واپس آیا تو ماسٹر جی اب بھی سو رہے تھے۔ وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور وہ کتاب اٹھا لی جو اس نے کالج کی لائبریری سے اِشو کرائی تھی۔

لیکن مطالعہ اس وقت اس کے بس میں نہیں تھا۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے جسم اور ذہن کی عجیب کیفیت تھی۔ جسم ایسے ٹوٹ رہا تھا، جیسے وہ رات بھر دوڑتا رہا ہو اور ذہن کا یہ حال تھا کہ نہ وہ سو رہا تھا، نہ جاگ رہا تھا۔

وہ اسی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ گیارہ بجے کے بعد ماسٹر جی کی آنکھ کھلی۔ لیکن ان کے چہرے پر بھی پژمردگی اور اضمحلال تھا۔ انھوں نے حیرت سے اوتار سنگھ کو دیکھا۔ ”تم سوئے نہیں اوتار سنگھ؟“

”میں تو اپنے وقت پر اٹھ گیا تھا ماسٹر جی اور دن میں مجھے نیند ہی نہیں آتی۔“ اوتار سنگھ کے لہجے میں بے بسی تھی۔

”میں نے تم پر ظلم کیا اوتار سنگھ......“

”ایسی کوئی بات نہیں ماسٹر جی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ آپ سے باتیں کرنے کو اور سچ یہ ہے کہ رات میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا......“

”لیکن تمھارا بہت برا حال ہو رہا ہے۔“

”مگر میں بہت خوش ہوں ماسٹر جی۔ اور ایسی خوشی کے لیے ہزار راتیں جاگ سکتا ہوں میں۔“

لیکن خود ماسٹر جی کے معمولات بگڑ گئے تھے۔ سینی ٹوریم میں وہ بڑی منضبط زندگی گزار رہے تھے اور اس کا اثر ان کی صحت پر بہت مثبت پڑا تھا۔ ایک دن کی بے اعتدالی نے ان پر بڑا منفی اثر ڈالا تھا۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ ان کے لیے اچھا نہیں۔ انھوں نے ناشتہ دیر سے کیا۔ پھر دوپہر کا کھانا بھی دیر سے کھایا۔ اس کے نتیجے میں رات کو انھیں بھوک ہی نہیں لگی۔ اور دن الگ بے کیف گزرا۔

رات کو انھوں نے خود ہی اوتار سنگھ سے کہا۔ ”تم اب چلے جاؤ بیٹے۔“

”میں رکنا چاہتا ہوں ماسٹر جی۔ لیکن یقین کریں، میں اس لیے نہیں رکتا کہ آپ کی صحت کے لیے دیر تک جاگنا اچھا نہیں ہے۔“ اوتار سنگھ نے بے حد خلوص سے کہا۔ ”میں رکوں گا تو آپ سے باتیں کروں گا۔ آپ کو جگاؤں گا۔ بس یہ بات ہے۔“

”میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا ہے بیٹے۔ بس اب تم جاؤ اور آرام کرو۔ تمھارا بھی برا

حال ہو رہا ہے۔''

❀......❀......❀

اوتار سنگھ کے شملہ میں قیام کے وہ دن کانتی پرشاد کے لیے بے حد خوش گوار تھے۔ دن بھر وہ اوتار سنگھ سے باتیں کرتے۔ رات کو وہ اسے جلدی ہی ہوٹل بھیج دیتے۔ سردی کی راتیں ویسے بھی جلدی آجاتی ہیں اور دیر تک رہتی ہیں۔

اوتار سنگھ سے باتیں کرتے ہوئے خوشی ان کے چہرے سے پھوٹی پڑتی۔ مگر اچانک، ایک لمحے کے لیے ان کے چہرے پر دکھ کا سایہ سا لہرا جاتا۔ دراصل اپنے بچوں کی بے نیازی اور بے پروائی ان کے لیے بے حد اندوہناک تھی۔

اچھے دن ہوا کے جھونکے کی طرح جلدی سے گزر جاتے ہیں۔ پل بھر میں جیسے اوتار سنگھ کے قیام کا آخری دن آ گیا۔

''تم کل چلے جاؤ گے اوتار سنگھ۔'' اس شام انھوں نے اداس لہجے میں کہا۔

''ضروری نہیں ہے ماسٹر جی۔'' اوتار سنگھ نے انھیں بہت غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ان کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔

''کل نہیں تو پرسوں جاؤ گے۔ جانا تو ہے۔''

''میں یہی تو کہہ رہا ہوں ماسٹر جی کہ ضروری نہیں ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہا ہوں۔ میں آپ کے پاس ہی رہوں گا...... آپ کی صحت یابی تک۔ اور پھر آپ کو لے کر ہی گھر جاؤں گا۔''

ماسٹر جی تڑپ کر اٹھ بیٹھے۔ ''یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔''

''کیوں نہیں ہو سکتا ماسٹر جی؟''

''میں جانتا ہوں کہ میں یہاں سے زندہ واپس نہیں جاؤں گا۔''

''آپ ایسی باتیں نہ کریں ماسٹر جی۔ امید سے ہی سب کچھ ہوتا ہے۔'' اوتار سنگھ کے لہجے میں خفگی تھی۔

''تمھاری خاطر منہ سے نہ کہوں۔ مگر اپنے اندر کا حال تو مجھے معلوم ہے نا۔ اپنی موت کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن یہ مجھے معلوم ہے کہ اب میں یہاں سے کہیں نہیں جا سکتا۔''

''اب یہ بات سننے کے بعد تو میں یہاں سے جاؤں گا ہی نہیں۔''

''تمھیں جانا پڑے گا اوتار سنگھ۔ میں ہر ہفتے تمھارے انتظار میں ہی تو جیتا ہوں۔''

''مگر آپ مجھے یہاں رہنے کیوں نہیں دیتے؟''

''میں تمھارا تعلیمی سال خراب کیوں کروں۔ ایسا ہو گیا تو میں ٹھاکر جی کو کیا منہ دکھاؤں

گا۔ ٹھاکر جی کے اور تمھارے کتنے احسان ہیں مجھ پر۔ کیا میں اس کا یہ صلہ دوں گا۔'' ماسٹر جی کی آواز بھرا گئی۔

یہ کہنے کے بعد جو انھوں نے اوتار سنگھ کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں انھیں عجیب سا تاثر نظر آیا۔ اسے دیکھ کر انھیں ایک پل میں اپنی بہت بڑی غلطی کا احساس ہو گیا۔ انھیں شرمندگی بھی ہوئی۔ بیماری کے بعد سے انھوں نے ایک بار بھی بڑے ٹھاکر کی خیریت دریافت نہیں کی تھی۔ گاؤں کے بارے میں بھی کچھ نہیں پوچھا تھا۔

ان کی شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔ ان کی نظریں جھک گئیں۔ ''میں بہت کٹھور اور خود غرض ہوں اوتار سنگھ۔ مجھے معاف کر دو۔'' ان کی آواز لرز رہی تھی۔

اوتار سنگھ نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ''اب ایسا کیا ہو گیا ماسٹر جی۔ آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔''

''شرمندہ کرتا نہیں، ہو گیا ہوں۔ میں اپنی نظروں میں گر گیا ہوں۔ اپنی بیماری، اپنی پریشانی میں ایسا الجھا کہ مجھے کسی اور کی پروا ہی نہیں رہی۔ میں نے ایک بار بھی ٹھاکر جی کی خیریت نہیں پوچھی۔''

اوتار سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب وہ ان کے دونوں ہاتھ سہلا رہا تھا۔

''کیسے ہیں ٹھاکر جی؟''

''اب تو بس میرے پاس آپ ہی ہیں ماسٹر جی۔''

ماسٹر جی بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔ ان کا سر یوں جھکا ہوا تھا کہ ٹھوڑی سینے سے لگ گئی تھی۔ اور وہ چپکے چپکے رو رہے تھے۔ ان کے آنسو بہے جا رہے تھے۔ ان کے جسم میں لرزش نہ ہوتی تو اوتار سنگھ کو پتا بھی نہ چلتا کہ وہ رو رہے ہیں۔

اس نے ماسٹر جی کو لپٹا لیا اور ان کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ ''آپ نہ روئیں ماسٹر جی۔ ہر زندگی کا انجام تو یہی ہے۔''

لیکن ماسٹر جی نے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ کچھ سننے کے قابل ہی نہیں تھے۔ وہ تو اس وقت سوچ رہے تھے۔ ان کے دل میں بار ہا یہ خیال آیا تھا کہ اوتار سنگھ نے دو مہینے تک ان کو پلٹ کر پوچھا بھی نہیں۔ ان کی خبر ہی نہیں لی۔ اس خیال سے ان کے اندر اس کے لیے شکایت ابھرتی تھی۔ لیکن دو سبب ایسے تھے کہ وہ اپنی شکایت کو رد کر دیتے تھے۔ ایک تو یہ کہ دو ماہ کی غفلت اپنی جگہ، لیکن دو ماہ بعد اسی اوتار سنگھ نے ان کی ذلت بھری زندگی اور درماندگی کا مداوا کیا تھا۔ ان پر اتنی عنایتیں کی تھیں کہ اپنی غفلت کی تلافی کر دی تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ اس غفلت کے باوجود ان کی اپنی اولاد سے کروڑ درجہ بہتر تھا۔

لیکن ان کی شکایت ایسی تھی کہ ختم نہیں ہوتی تھی، اندر دب جاتی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ بار بار کیوں ابھرتی اور اس شکایت کا تعلق اس مان سے تھا، جو انھیں اوتار سنگھ پر تھا۔ وہ اس پر بیٹوں سے بڑھ کر مان کرتے تھے۔ بیٹوں نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا، اس پر انھیں اتنی شکایت نہیں تھی، جتنی اوتار سنگھ کی دو ماہ کی غفلت پر تھی۔

مگر اب وہ شرمندہ تھے۔ انھوں نے ایک لمحے کو بھی نہ یہ سوچا، نہ اس سے پوچھا کہ وہ دو مہینے ان کی طرف سے بے پروا کیوں رہا۔ ایسی کیا گزری اس پر ان دو ماہ میں۔ اپنے باپ جیسا ان کا ادب کرنے والا، ان سے اولاد جیسی محبت کرنے والا وہ شاگرد ایسا تو نہیں تھا کہ عام حالات میں ان کی طرف سے ایسی بے پروائی کرتا۔

اب انھیں معلوم ہو گیا تھا اور وہ محسوس کر سکتے تھے کہ اس پر کیا گزری ہوگی۔ وہ جو سال بھر کے بچھڑے باپ سے، اپنے محبوب لوگوں سے ملنے کے لیے گیا تھا۔ اپنے گاؤں میں، اپنے گھر میں کچھ وقت گزارنے گیا تھا، وہاں اپنی آنکھوں سے سب کچھ...... پورا گاؤں، اپنا باپ، اپنے لوگ ٹنوں ریت کے نیچے دب کر دفن ہوتے دیکھ کر آیا تھا، اس پر ان دو ماہ میں کیا گزری ہوگی۔

وہ شرمندہ تھے...... اس کے اور اپنے ظرف کے فرق پر۔ وہ کتنا بڑا دکھ سینے میں چھپائے ان کی دل جوئی کرتا رہا۔ اور وہ اتنا کچھ ملنے کے باوجود کتنی حقیر سی شکایت دل میں چھپائے بیٹھے رہے۔ اب وہ شرمندہ نہ ہوتے تو کیا کرتے۔

وہ اس سے کہنا چاہتے تھے کہ مجھے معاف کر دو۔ لیکن بات ان کے ہونٹوں پر رک گئی۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ اس پر وہ کیسا شرمسار ہوتا ہے، کھسیاتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے بلند آواز میں...... رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بھگوان مجھے معاف کرے۔ میں بہت کم ظرف اور خود غرض آدمی ہوں۔''

وہ بوجھ ہٹنے کے بعد وہ کھل کر روئے...... اتنا روئے کہ نڈھال ہو گئے۔ اب وہ بڑے ٹھاکر کو یاد کر کے رو رہے تھے۔

اگلی صبح اوتار سنگھ ان سے رخصت ہونے کے لیے آیا تو اس نے ہنس کر کہا۔ ''اس بار تو میں صرف تین دن بعد واپس آ جاؤں گا۔''

''ہوں......'' ماسٹر جی نے بے دھیانی سے کہا۔ وہ کسی اور سوچ میں تھے۔ ''اوتار سنگھ، بیٹے...... میں تم پر ایک بہت بڑا بوجھ ڈالنا چاہتا ہوں۔''

اوتار سنگھ ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔ ''حکم کریں ماسٹر جی۔''

''تم نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے...... بلکہ سب کچھ کیا ہے...... ایک بیٹے کی طرح! تو بیٹے کی طرح میرا ایک آخری کام بھی کر دینا۔''

''آپ حکم تو کریں ماسٹر جی۔''

''میں مر جاؤں تو میری چتا یہیں جلانا اور میری چتا کو آگ تمھی دینا۔''

''لیکن ماسٹر جی......''

''یہ میری وصیت ہے اوتار سنگھ۔'' ماسٹر جی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں یہاں سب ڈاکٹروں سے بات کر چکا ہوں۔ میری چتا میرا کوئی بیٹا نہیں جلائے گا۔ تم جلاؤ گے۔ یہ تمھارے لیے میرا حکم ہے۔''

''مگر ماسٹر جی، وہ لوگ آپ سے ملنے آنا چاہتے ہیں...... اور آئیں گے بھی۔'' اوتار سنگھ کے لہجے میں احتجاج تھا۔

''آئیں گے تو ان کا احسان ہوگا مجھ پر۔ نہیں آئیں گے تو شکایت نہیں کروں گا۔ مگر میرا یہ فیصلہ آخری ہے۔''

اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی!

❀......❀......❀

جنوری کا مہینہ گزر رہا تھا۔ کالج دوبارہ کھلا تو اوتار سنگھ یہ سوچ کر گھبرا رہا تھا کہ ریٹا کا سامنا کیسے کرے گا۔ یہ بات نہیں کہ وہ کسی بھی اعتبار سے اس کا مجرم ہو۔ وہ تو اس کے لیے شرمندگی کا نشان تھی۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ رچرڈ اور ریٹا دونوں غائب تھے۔ کالج کھلے ہوئے پندرہ دن ہو گئے اور وہ نہیں آئے۔ اب اوتار سنگھ اس طرف سے پریشان تھا کہ ان کی غیر حاضری کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اس کا دل وسوسوں میں گھر گیا۔ اسے رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ کہیں ریٹا نے اس کے نکل جانے کے بعد کوئی الٹی سیدھی حرکت تو نہیں کر لی۔ کہیں اسے کچھ ہو تو نہیں گیا۔ رچرڈ ہی آ جاتا تو اس سے حقیقت حال معلوم ہو جاتی۔

وہ اس معاملے کی حقیقت جاننے کو بے تاب تھا۔ صرف اسی طرح اس کی پریشانی دور ہو سکتی تھی۔ مگر اس کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ بس ایک ہی حل تھا۔ وہ ان کے گھر جا کر معلوم کرے۔ لیکن اس کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اور پھر کون جانے کہ وہاں جانے پر کیا صورتِ حال سامنے آئے اور اس پر اس کی ذمے داری عائد کر دی جائے۔

پھر سیاسی ماحول میں بھونچال آ گیا۔ پورا ہندوستان جیسے کسی آتش فشاں کے دہانے پر تھا۔ وائسرائے نے دستور ساز اسمبلی کا اجلاس 9 دسمبر 46ء کو طلب کیا تھا۔ اس پر محمد علی جناح نے تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ وائسرائے نے موجودہ صورتِ حال کی سنگینی اور زمینی حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور وہ پوری طرح کانگریس کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ انھیں مسلم

لیگ اور ہندوستان کی دیگر سیاسی تنظیموں کی کوئی پروا نہیں۔

دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شیڈول کے مطابق ہوا۔ لیگ کے تمام نمائندے اجلاس میں شریک نہیں ہوئے۔ اجلاس میں چیئرمین کا انتخاب ہوا اور ایک ضابطہ کمیٹی تشکیل دی گئی۔ ایک قراداد منظور کی گئی، جس کے تحت ہندوستان کو وفاقی جمہوریہ قرار دے دیا گیا جبکہ پلان میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ علاقائی آئین کی تشکیل تک وفاقی آئین پر غور نہیں کیا جائے گا۔

دوسری طرف کانگریس پنجاب میں خضر حیات ٹوانہ کی نام نہاد مخلوط پٹھو حکومت کی کھل کر حوصلہ افزائی کر رہی تھی، جو یکے بعد دیگرے شہری حقوق کو غصب کرتی جا رہی تھی۔ پٹھو حکومت نے 24 جنوری 47ء کو مسلم لیگ نیشنل گارڈز کی تنظیم کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ پولیس نے گارڈز کے ہیڈ کوارٹر پر چھاپہ مارا، جس میں انہیں کافی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ پنجاب کے بیشتر بڑے مسلم لیگی رہنما گرفتار کر لیے گئے۔ اس کے خلاف تحریک شروع ہوئی، جو اتنی پھیلی کہ خضر حیات حکومت کے بس سے باہر ہو گئی۔ نتیجہ یہ کہ حکومت کو مستعفی ہونا پڑا۔

اسی دوران بمبئی، احمد آباد اور کئی شہروں میں اور متحدہ اور وسطی صوبوں اور مدراس کے گاؤں و یہاتوں میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ الہ آباد اور کانپور میں تشدد کی وارداتیں معمول بن گئیں۔ کلکتہ میں چھرا گھونپنے کے واقعات جاری رہے۔ ڈھاکہ اور نواکھلی بھی فسادات کی لپیٹ میں آ گئے۔ میرٹھ میں ڈھ مکھتیشر اور بہار میں سرن، پٹنہ، گیا، مونگیر اور بھاگلپور میں ہندو مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہزاروں مسلمان مارے گئے، ان کی جائیدادیں لٹیں اور ان کی عورتوں کو اغوا کر لیا گیا۔ برصغیر پوری طرح یک طرفہ خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔

ان حالات میں برطانیہ کے وزیراعظم اٹیلی نے 20 فروری کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کا اقتدار جون 48ء سے پہلے ذمے دار ہندوستانیوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ضروری اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

اوتار سنگھ بہت دکھی تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ انگریز کیا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اگر درست فیصلے کرتے اور کانگریس سے جانب داری نہ برتتے تو اتنی خون ریزی نہ ہوتی۔ وہ حکمراں تھے۔ انہیں فیصلے کرنے کا اختیار تھا اور کانگریس اور مسلم لیگ، دونوں ان سے تعاون کرنے پر مجبور تھیں آزادی کی خاطر! اسے لگتا تھا کہ انگریز یہ سب دیدہ و دانستہ کر رہے تھے۔ ہندوؤں کا چیلنج تھا کہ پاکستان بن بھی جائے تو قائم نہیں رہ سکے گا۔ اوتار سنگھ کے خیال میں وہ بے بنیاد چیلنج نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ انگریز کانگریس سے ملے ہوئے ہیں اور تقسیم اس غیر منصفانہ انداز میں کی جائے گی کہ پاکستان بن بھی جائے تو تھوڑے ہی عرصے میں ٹوٹ پھوٹ جائے۔

اوتار سنگھ ذہین اور حساس تھا۔ غیر جانب دار بھی تھا۔ لیکن مسلمانوں کے مسلسل جانی نقصان نے اس کی غیر جانب داری ختم کر دی۔ اس پر واضح ہو گیا کہ مسلمان مظلوم ہیں۔ قیام پاکستان کے حق میں تو وہ پہلے ہی تھا۔

فروری کے آخر میں رچرڈ اچانک کالج چلا آیا۔ کلاس میں وہ اوتار سنگھ کے برابر ہی بیٹھا۔ ''کیا بات ہے؟ تم لوگ اتنے دن کالج نہیں آئے۔'' اوتار سنگھ نے اس سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔ ''خیریت تو ہے نا؟''

''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔'' رچرڈ نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''بس ایک اہم کام میں الجھے ہوئے تھے۔''

''ریٹا نہیں آئی؟''

رچرڈ نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کیا تم اسے مِس کرتے رہے ہو؟'' اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''مِس تو خیر نہیں کر رہا تھا۔ مگر مجھے تشویش تھی تم لوگوں کی طرف سے۔''

''اور پھر بھی گھر آ کر خیریت دریافت نہیں کی؟''

اوتار سنگھ کھسیا گیا۔ ''بس مصروفیات ہی ایسی ہیں۔'' وہ بولا۔ ''مگر تم نے بتایا نہیں کہ ریٹا کیوں نہیں آئی۔''

''وہ نہیں آ سکتی۔ مگر اس نے تمہارے لیے یہ بھجوایا ہے۔'' رچرڈ نے فائل میں سے ایک لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

اوتار سنگھ نے لفافے کا جائزہ لیا۔ لفافے پر صاف ستھری تحریر میں اس کا نام لکھا تھا۔ اس نے لفافہ جلدی سے اپنی فائل میں رکھ لیا۔ پھر وہ رچرڈ کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم نے اب بھی نہیں بتایا کہ ریٹا کیوں نہیں آئی۔ وہ خیریت سے تو ہے نا؟''

رچرڈ مسکرایا۔ ''یہ لفافہ کھول کیوں نہیں لیتے۔ میرا خیال ہے، اس میں تمہارے ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ ویسے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ وہ خیریت سے ہے۔''

اس روز پڑھائی میں اوتار سنگھ کا دل نہیں لگا۔ وہ اس لفافے کو اپنے کمرے کی تنہائی میں کھولنا چاہتا تھا۔ کون جانے، اس میں کیا ہو۔ اندازہ تو یہی ہو رہا تھا کہ اس میں خط ہے۔ اور وہ یہ اندازہ بھی لگا سکتا تھا کہ خط میں کرسمس کی اس رات کا تذکرہ ہو گا۔ بلکہ خط اسی کے بارے میں ہو گا۔ اب انداز کیا ہو گا، اس واقعے کے بارے میں ریٹا کا نکتہ نظر کیا ہو گا، اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ البتہ وہ متجسس بہت زیادہ تھا اور وہ تجسس لفافہ کھلنے پر ہی دور ہوتا۔

یہ بڑی بات تھی کہ اس نے جیسے تیسے پورے پیریڈ اٹینڈ کر ہی لیے!

❀......❀......❀

اپنے کمرے میں اوتار سنگھ لفافے کو دونوں ہاتھوں میں یوں تول رہا تھا، جیسے اس کے وزن کا اندازہ لگا رہا ہو۔ اب وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ لفافے میں بس ایک خط ہے۔ تجسس اسے خط کھولنے پر مجبور کر رہا تھا اور خط کھولتے ہوئے وہ ڈر بھی رہا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اس میں الزام تراشیاں ہوں گی، شکایتیں ہوں گی اور ایسی کہ وہ ان کا جواب بھی نہیں دے سکے گا۔

مگر خط تو بہر حال اسے کھولنا تھا۔ دل کڑا کر کے اس نے لفافہ چاک کیا اور خط نکال لیا۔ دھڑکتے دل سے اس نے خط کی تہیں کھولیں اور اسے پڑھنے لگا۔

پیارے دوست!

صدا خوش رہو!

جس وقت تم یہ خط پڑھ رہے ہوگے، میں یہاں سے بہت دور جا چکی ہوں گی۔ دراصل جو کچھ ہوا...... بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ میں نے جو کچھ کیا، اس کے بعد مجھ میں تمہارا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ سامنا کرنا تو بہت دور کی بات ہے، میں اس پر معذرت بھی نہیں کر سکتی۔ شرمندگی کا اظہار بھی نہیں کر سکتی۔ یہ خط بھی صرف اس لیے لکھ رہی ہوں کہ تمھیں اپنے بارے میں سب کچھ پوری سچائی کے ساتھ بتا دوں۔ شاید اس کے بعد تم مجھے معاف کر سکو۔

میں ہندوستان میں ہی پیدا ہوئی اور پلی بڑھی۔ بہت چھوٹی سی تھی، تبھی سے ہندوستانی لوگوں میں، ان کے کلچر میں، ان کی زبان میں دلچسپی لیتی تھی۔ یہاں کے ڈریس مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ یہاں رنگ ہی رنگ تھے۔ میں یہاں کے رنگ میں رنگنا چاہتی تھی۔ میں نے تعلیم کے لیے انگلینڈ جانے سے انکار کر دیا۔ میں تو یہاں کی زبان سیکھنا چاہتی تھی۔ مجھے کانونٹ بھیج دیا گیا۔

اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں کہیں کی نہ رہی۔ سچ پوچھو تو میرا اپنا کوئی کلچر نہیں۔ نہ میں انگریز ہوں نہ ہندوستانی۔ آدھی اِدھر آدھی اُدھر۔ کانونٹ میں ہندوستانی لڑکیاں بھی تھیں۔ میں نے انگریز لڑکیوں کے مقابلے میں دوستی کے لیے انھیں ترجیح دی۔ تب میری سمجھ میں پہلی بار آیا کہ ہندوستانی لوگ بہت رومینٹک ہوتے ہیں۔ بے حد تخیلاتی، ہندوستانی لڑکیاں [illegible]

خوابوں کے شہزادے کا انتظار کرتی ہیں۔ ان کی محبت کی بنیاد پاکیزگی پر ہوتی ہے۔ ان کا انداز ایسا ہوتا ہے، جیسے محبت بھی کوئی مذہب ہے۔ کانونٹ میں پڑھنے والی بے حد ماڈرن لڑکیوں کو بھی میں نے محبت کے معاملے میں قدامت پرست ہی پایا۔ مجھے یہ سب بہت اچھا لگا۔ میں شاید پیدائشی طور پر رومان پسند تھی اور تخیلاتی بھی۔ میں نے مشرق کے اس فلسفہ محبت کو اپنا لیا۔ میرے خیالوں میں بھی خوابوں کا ایک شہزادہ بس گیا۔ کانونٹ میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا، جو میرے خوابوں کا وہ شہزادہ ہو۔ میں اس کا انتظار کرتی رہی۔

جب تمھیں دیکھا تو میں نے پہلی نظر میں جان لیا کہ وہ تم ہو۔ میں جواب تک محبت کے بارے میں صرف سوچتی رہی تھی، محبت میں گرفتار ہوئی تو مجھے پتا چلا کہ یہ کیسی سحر انگیز کیفیت کا نام ہے۔ اب میرے اندر اور باہر...... میرے گرد و پیش میں ہر طرف خوبصورتی ہی خوبصورتی تھی۔ میری ہم نسل سہیلیوں نے جو محبت میں جسمانی اختلاط کو ضروری سمجھتی تھیں، اپنی جو کیفیات بتائی تھیں، میری کیفیت ان سے بہت مختلف تھی۔ تب میں نے سمجھ لیا کہ جسمانی اختلاط انتشار، ٹوٹ پھوٹ اور محبت کے زوال کے سوا کچھ نہیں دیتا۔ محبت تو اصل میں پاکیزگی، ایثار اور قربانی کا نام ہے۔ محبت کچھ لینے کا نہیں، سب کچھ دے دینے کا نام ہے۔

پھر میں نے پہلی بار تم سے اظہارِ محبت کیا۔ اس وقت میں بہت پُر اعتماد تھی۔ میرے خیال میں مجھ میں کوئی کمی نہیں تھی۔ میں خوبصورت تھی۔ نسلی اعتبار سے برتر تھی۔ لیکن تم نے بتایا کہ تم پہلے ہی کسی سے محبت کرتے ہو۔ ایک ایسی لڑکی سے، جس کی تم نے صرف آواز سنی ہے۔ کبھی دیکھا تک نہیں ہے۔

میرا پہلا ردِعمل بے حد معذبانہ تھا۔ میں نے سوچا...... میرا نصیب۔ محبت میں زبردستی نہیں ہوتی۔ وہ تو خود بہ خود ہو جاتی ہے۔ لیکن بعد میں گڑبڑ ہو گئی۔ شاید مشرقی انداز میں سوچنے کے باوجود میں اپنی بنیاد میں مغرب کی لڑکی تھی۔ مجھے اپنے حسن پر بہت غرور تھا۔ شاید محبت کی عظمت کو سمجھنے کے [illegible] کی عظمت پر، اس کے بنیادی فلسفے پر یقین نہیں رکھتی تھی۔ تمھارے انکار [illegible] میری انا کو ٹھیس پہنچائی اور اس کے زیر اثر میں نے

تمھارے حصول کو ایک آسان چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا۔ بس یہ بھول گئی کہ انا سر اٹھائے تو محبت کہیں پیچھے رہ جاتی ہے۔ محبت میں تو انا کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔

تو میری انا نے مجھے یہ سمجھایا کہ جسم ایک ناقابل تردید حقیقت ہے جبکہ آواز محض ایک گمان ہے۔ اس آواز والی کو تم دیکھو اور وہ کوئی بدصورت لڑکی ہو تو تمھاری محبت پانی کے بلبلے کی طرح ختم ہو جائے گی اور اگر وہ خوبصورت بھی ہو تو مجھ سے زیادہ خوبصورت تو نہیں ہوگی اور ہو بھی تو وہ تو اوجھل ہے جبکہ میں تمھارے سامنے، تمھارے قریب ہوں۔ میں اگر منصوبہ بندی کر کے کوشش کروں تو تم میرے سحر سے نہیں نکل سکتے۔

مجھے اعتراف ہے کہ میری انا نے مجھے بہت پست کر دیا، گھٹیا بنا دیا اور میں بن گئی۔ میں نے وہ گھٹیا منصوبہ بنایا۔ میں نے تمھارے لیے وہ ملاوٹ شدہ مشروب تیار کرایا۔ پھر میں نے تمھیں بے خیالی میں شراب بھی پلا دی۔ اس سے اندازہ لگا لو کہ تمھیں کردار کے اعتبار سے میں کتنا بڑا آدمی سمجھتی ہوں...... بڑا اور ناقابل تسخیر اور آج میں اپنے اس عمل پر، اس سازش پر اتنی شرمندہ ہوں کہ خود کو معافی کے قابل بھی نہیں سمجھتی۔ تم میرے چاند تھے۔ میں نے تمھیں داغ دار کرنے کی کوشش کی۔ خدا کا شکر ہے کہ تم داغ سے محفوظ رہے۔ اب تم چاہے مجھے معاف کر دو۔ مگر میں اپنے اس گھٹیا پن پر خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

اوتار سنگھ، یہ پورا خط سچا ہے۔ اس میں کہیں کوئی جھوٹ نہیں۔ میں تم سے محبت کرتی تھی۔ تمھیں حاصل کرنا چاہتی تھی۔ تم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ مگر میں جسمانی اختلاط کی قائل نہیں تھی۔ جو کچھ ہوا، صرف تمھیں پانے کی اندھی خواہش میں ہوا۔ میں نے سوچا کہ تم ایسے ہو کہ اگر تم سے لغزش ہوئی تو تم اسے نباہنے کے لیے مجھ سے شادی کر لو گے اور پھر میں تمھاری محبت جیت لوں گی۔

میں اپنی سازش میں کامیاب ہو جاتی۔ مگر میں نے پہلے خدا کی محبت اور اس کے بعد آواز والی اَن دیکھی لڑکی کی محبت کا طعنہ دے کر اپنا کھیل خراب کر لیا۔ میں اس پر خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کیونکہ اسی وجہ سے تم اپنی نظروں میں گرنے سے بچ گئے۔ ورنہ میں زندگی بھر اس پر ملول رہتی۔

دوسری بات یہ کہ اس طعنے ہی کی وجہ سے مجھ پر حقیقی محبت کی عظمت کھلی۔ تم نشے میں دھت تھے۔ لیکن میرے وہ دونوں طعنے تمھیں ہوش میں لے آئے۔ تم سنبھل گئے۔ پستی میں گرنے سے بچ گئے۔ میرا کیا ہے، میں تو تھی ہی پست۔ تمہاری وجہ سے میں بھی بچ گئی۔ میں تمہاری شکر گزار ہوں۔

یہ اعتراف نامہ میں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے پوری سچائی سے لکھا ہے۔ یہ میرا تم سے آخری رابطہ ہے۔ ایک بات اب تک کسی کو نہیں بتائی ہے۔ صرف تمھیں بتا رہی ہوں۔ میرے اس گناہ نے میری روح کو بہت بوجھل کر دیا ہے۔ میں اس کا کفارہ ادا کروں گی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ زندگی کی تمام خوشیوں اور لذتوں سے ناتا توڑ کر لوگوں کے دکھوں اور ان کی پریشانیوں کو اپناؤں گی۔ میں چرچ جوائن کر کے راہبہ بن جاؤں گی۔ زندگی بھر خدا سے اپنے لیے معافی اور تمھارے لیے سچی خوشیاں، بلند مقام اور بلند مرتبہ مانگتی رہوں گی۔

آخر میں ایک التجا کرتی ہوں۔ جو کچھ اس رات ہوا، اس میں تمہارا ذرہ برابر قصور نہیں تھا۔ تم کبھی اس کے بارے میں شرمندہ ہو یا خود کو مجرم سمجھو تو اس سے میرے گناہوں کے بوجھ میں اضافہ ہوگا۔ کیونکہ سازش میں نے کی تھی۔ قصوروار میں تھی۔ اگر ایک دوست کی حیثیت سے تمھیں میرا ذرا بھی خیال ہے تو خود کو مجرم کبھی نہ سمجھنا بلکہ تم خدا سے میرے لیے دعا کرنا کہ وہ مجھے معاف کر دے اور کاش تم بھی مجھے معاف کر دو۔

خدا ہمیشہ تم پر کرم فرمائے۔ خدا حافظ

تمہاری گناہ گار دوست

ریٹا پارسن

اوتار سنگھ نے خط تہ کر کے دوبارہ لفافے میں رکھ دیا۔ اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ ریٹا کے بارے میں اس کا جو تصور تھا، ریٹا اپنے خط میں اس سے بہت مختلف ثابت ہوئی تھی۔ کیسی عاجزی، کیسی نرمی، کیسا گداز اور کیسی سچائی تھی اس کے خط میں۔ وہ دل کو چھو لینے والی تحریر تھی۔

اوتار سنگھ نے دیکھا تھا کہ عام طور پر غلطی کر کے لوگ اس پر اصرار کرتے ہیں۔ بلکہ جتنی بڑی غلطی ہو، اتنا ہی اصرار کرتے ہیں۔ غلطی تسلیم کرنا، معذرت کرنا آسان کام نہیں۔ اس کے لیے بڑا ظرف درکار ہوتا ہے اور ریٹا نے خود کو صاحب ظرف ثابت کر دیا تھا۔

پھر اس نے ریٹا کے فیصلے کے بارے میں سوچا۔ چرچ کی ننوں کے بارے میں وہ تھوڑا بہت جانتا تھا۔ ریٹا نے دنیا ترک کر کے نن بننے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر اس کے خیال میں یہ غلط تھا۔ بلکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ خدا کی اسکیم کے خلاف ہے..... ایک طرح کی بغاوت ہے۔ رومن کیتھولک عقیدے کے پادری اور راہبائیں جو زندگی گزارتے تھے، وہ یکسر غیر فطری تھی۔ اگر دنیا کے تمام لوگ یہ نظریہ اپنا لیتے اور اس طرح کی زندگی گزارتے تو نسلِ انسانی کا وجود ہی مٹ چکا ہوتا۔ اس اعتبار سے یہ خدا سے بغاوت تھی۔ دوسری طرف وہ غیر فطری زندگی گناہ کے امکان کو بہت زیادہ قوی کر دیتی تھی۔ فطری تقاضوں کے سامنے ان میں سے کوئی بھی سرنگوں ہوتا تو گناہ کی دلدل میں دھنس کر رہ جاتا۔ اس کے نزدیک اس میں خسارہ ہی خسارہ تھا۔

لیکن وہ یہ بات ریٹا کو سمجھا نہیں سکتا تھا۔ سمجھانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ سمجھانے میں اس تعلق کا اظہار ہوتا جو اس کے اور ریٹا کے درمیان تھا ہی نہیں۔ اور وہ پھر سے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے سمجھ لیا کہ وہ اس کی کتابِ زندگی کا ایک چھوٹا سا اور غیر اہم باب تھا، جو ختم ہو گیا ہے۔

❁.....❁.....❁
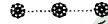
حور بانو اور نور بانو کے کرتے مکمل ہو گئے تھے۔ سرفراز بیگم ان کا کام دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ خاص طور پر نور بانو کی کڑھائی نے تو انھیں حیران کر دیا۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ کام اس نے بس مروت میں کیا۔ ورنہ اوتار سنگھ سے تو وہ چڑتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس کے ٹالنے والے کام میں اتنی خوبصورتی ہے تو محبت سے کام کرے گی تو غضب ہی ڈھائے گی۔

انھوں نے یہ بات نور بانو سے کہہ بھی دی۔

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں اماں۔'' نور بانو نے کہا۔ ''کام تو میں نے محبت سے ہی کیا ہے۔ کام محبت سے کیا جائے تو عبادت ہی ہوتا ہے نا اماں۔''

سرفراز بیگم نے اسے حیرت سے دیکھا۔ وہ عجیب لڑکی تھی۔ بپھرتی تو آتش فشاں بن جاتی اور نرم ہوتی تو دور سے ہی احساس ہوتا کہ مخمل سے بنی ہے۔ اے اللہ..... اس کے نصیب بہت اچھے کرنا۔ انھوں نے دل میں اس کے لیے دعا کی۔

یہ حقیقت تھی کہ وہ اس کے لیے فکر مند رہتی تھیں۔ وہ بڑی خوبیوں، بڑے ہنر والی تھی۔ لیکن شکل و صورت کے اعتبار سے بہ مشکل اسے گوارا ہی کہا جا سکتا تھا۔ اب انھیں لڑکیوں کی شادی کی فکر بھی تھی۔ ملک کے حالات ایسے تھے کہ آنے والی کل کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ شہر میں کشیدگی تھی۔ مسلمانوں کے چھرا گھونپنے کی وارداتیں عام ہو گئی تھیں۔ ایسے میں بیوہ عورت، عزت اور آبرو

کی طرف سے نہ ڈرے تو کیا کرے۔

ایسا نہیں تھا کہ لڑکیوں کے رشتے آئے ہی نہ ہوں۔ حور بانو کے لیے تو اب تک چار پیغام آ چکے تھے۔ وہ خاندانی اعتبار سے کم تر تھے۔ اور وہ معاشی مضبوطی سے محروم تھے۔ چنانچہ انھوں نے انکار کر دیا تھا۔ گلنار کے بھی دو رشتے آئے تھے۔ وہ دونوں ہی اچھے تھے۔ لیکن سرفراز بیگم نور بانو کے بیٹھے ہوئے اس کی شادی کیسے کر سکتی تھیں۔ انھیں تو سب سے بڑھ کر نور بانو کے لیے رشتے کا انتظار تھا۔ مگر اس کا کوئی رشتہ نہیں آیا تھا۔

مگر اب جو حالات تھے، ان کے بارے میں سوچ کر وہ پچھتا رہی تھیں۔ انھیں احساس ہو رہا تھا کہ انھوں نے انکار کر کے غلطی کی ہے۔ کچھ نہیں، دو بیٹیاں تو عزت کے ساتھ اپنے گھر کی ہو جاتیں۔ ایک نور بانو ہی تو رہ جاتی۔ اب تو وہ تین گنا بوجھ سر پر لیے بیٹھی تھیں۔

باہر کے حالات ایسے تھے کہ وہ مستقل طور پر پریشان رہنے لگی تھیں۔ بس اوتار سنگھ کی محبت ان کے لیے بڑا سہارا تھی۔ ان کا دل گھبرا جاتا تو وہ اوپر چلی جاتیں۔ اس سے بات کرتے ہوئے وہ سب کچھ بھول جاتیں۔ بس ایسا لگتا کہ برسوں کا بچھڑا بیٹا انھیں مل گیا ہے۔ ان کا سینہ خوشی سے پوری طرح بھر جاتا۔ سچ یہ تھا کہ وہ اس کی قربت میں بہت محظوظ ہوتی تھیں۔

انھیں خوشی اس بات کی تھی کہ اوتار سنگھ بھی ان سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ ان کا ویسے ہی ادب اور احترام کرتا تھا، جیسے کوئی اچھا بیٹا اپنی ماں کا کرتا ہے۔ وہ ان کی [illegible] سنتا۔ اور اس دوران اس کی نگاہوں میں محبت ہوتی۔

گھر میں صرف سرفراز بیگم ہی ایسی نہیں تھیں، جو پریشان ہوں۔ بہادر علی ان سے کہیں زیادہ پریشان تھا۔ اس کی وجہ بھی تھی۔ اس کا تو باہر آنا جانا رہتا تھا۔ صورتِ حال کی سنگینی کا اسے سب سے بڑھ کر احساس تھا۔ اس کی پریشانی کا سرفراز بیگم کو علم نہیں تھا کیونکہ وہ اس کے سامنے نہیں آتی تھیں۔ لیکن چھمن بوا کو علم تھا کہ وہ بہت پریشان ہے۔ بلکہ وہ تو اس کی پریشانی کا سبب بھی جانتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود بھی پریشان رہنے لگی تھیں۔ اکیلی بیٹھی ہوتیں تو تشویش بھرے انداز میں بڑبڑاتیں..... اے اللہ، آبرو رکھ لیجیو۔ بس تیرا ہی آسرا ہے۔

بہادر علی نے از خود انھیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ مگر وہ جہاں دیدہ تھیں۔ بے خبر رہ بھی نہیں سکتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ بہادر علی حکم کا بندہ ہے۔ ہر حکم پر بلا چون و چرا عمل کرتا ہے۔ مگر ایک دن انھیں احساس ہوا کہ نجانے کب اس میں تبدیلی آ گئی ہے۔

ہوا یوں کہ اس رات انھوں نے بہادر علی سے کہا۔ ''آدھا سیر دہی لے آؤ۔''

''ابھی شام کو ہی تو میں دہی لایا تھا۔'' بہادر علی نے معترضانہ لہجے میں کہا۔

یہ غیر معمولی بات تھی۔ بہادر علی کبھی کسی کام میں ہیر پھیر نہیں کرتا تھا۔ ''تمھیں اس سے

کیا۔ ''چھمن بوا نے تنگ کر کہا۔ ''تم سے جو کہا جائے، وہ کرو۔ بہادر علی زیر لب کچھ بدبدایا۔
چھمن بوا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ''کچھ کہا تم نے؟'' انھوں نے تیز لہجے میں کہا۔

''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تم آ کر دروازہ بند کرلو۔''

''پانچ منٹ تو لگیں گے تم کو دہی لانے میں۔''

''دیر بھی لگ سکتی ہے۔ تم میرے ساتھ چلو اور دروازہ بند کرلو۔'' بہادر علی کے لہجے میں قطعیت تھی۔

چھمن بوا سمجھ گئیں کہ بہادر علی کی بات نہ مانی تو وہ نہیں ہلے گا۔ ''اچھا چلو۔'' انھوں نے غصے سے کہا۔

وہ گئیں اور دروازہ بند کر کے آئیں۔ انھیں اس وقت سچ مچ بہت غصہ آیا، جب دو تین منٹ بعد انھیں اس کی دستک پر دروازہ کھولنے کے لیے جانا پڑا۔ دروازہ کھولنے کے بعد وہ اس پر برسنے ہی والی تھیں کہ اس نے الٹا ان سے باز پرس شروع کر دی۔ ''تم نے دروازہ کھولنے سے پہلے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ کون ہے؟''

چھمن بوا نے اسے یوں دیکھا، جیسے ان کے خیال میں وہ پاگل ہو گیا ہو۔'' کیوں پوچھتی۔ دہی لینے تم ہی گئے تھے نا۔ تو واپس بھی تم ہی آئے ہو گے۔''

''دیکھو...... یہ وقت ایسا نہیں۔'' بہادر علی کا لہجہ نرم ہو گیا۔ ''وقت بہت خراب آ لگا ہے۔ کبھی پوچھے بغیر دروازہ نہ کھولنا۔''

''کیوں بھئی؟''

بہادر علی ایک لمحے کو ہچکچایا۔ پھر بولا۔ ''آج کل چوری کی وارداتیں بہت ہو رہی ہیں۔''

چھمن بوا اس کی لمحاتی ہچکچاہٹ دیکھ چکی تھیں۔ انھیں یقین نہیں آیا۔ مگر انھوں نے جرح نہیں کی۔ اس وقت تو انھیں بس دہی کی ضرورت تھی۔

پھر ایک دن ایک بہت غیر معمولی بات ان کے سامنے آئی۔ بہادر علی ڈیوڑھی میں سوتا تھا۔ اس رات چھمن بوا نجانے کس کام سے ڈیوڑھی میں گئیں۔ بہادر علی بے خبر سو رہا تھا۔ اچانک ان کی نظر بہادر علی کی چارپائی پر پڑی۔ سرہانے کی طرف تکیے کے نیچے لوہے کا ایک بڑا اور بھاری سریا رکھا تھا۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ چارپائی کے دونوں طرف نکلا ہوا تھا۔ اس کی کیا ضرورت پڑ گئی بہادر علی کو۔ انھوں نے سوچا۔ اور وہ بھی سوتے وقت۔ جبکہ یہ گھوڑے بیچ کر سوتا ہے۔

چند لمحے وہ اچنبھے میں رہیں۔ مگر پھر ان کے دل نے کہا کہ یہ بات بے سبب تو نہیں ہو سکتی۔

وہ جس چیز کی تلاش میں آئی تھیں، اندھیرے کی وجہ سے اس کا ملنا آسان نہیں تھا۔

روشنی وہ کرنا نہیں چاہتی تھیں کہ بہادر علی کی نیند خراب نہ ہو۔ حالانکہ انھیں پورا یقین تھا کہ روشنی سے بہادر علی کی آنکھ نہیں کھلے گی۔ وہ ایسا ہی بے خبر سوتا تھا۔

ذرا دیر میں ان کی نگاہ اندھیرے سے ہم آہنگ ہو گئی۔ وہ ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھیں۔ بہادر علی کی چارپائی کے پاس سے گزرتے ہوئے ان کا پاؤں کسی چیز میں الجھا اور وہ لڑکھڑا گئیں۔ وہ بہادر علی کا سلیپر تھا۔ ان کی چپل سلیپر میں پھنس گئی تھی۔ سلیپر گھسٹنے کی ہلکی سی آواز ہوئی۔ انھوں نے بڑی مشکل سے اپنے آگے کی طرف گرتے ہوئے جسم کو روکا اور سنبھلنے کی کوشش کی۔

وہ سنبھل تو گئیں۔ مگر اگلے ہی لمحے انھیں جو جھٹکا لگا، وہ ذہنی تھا۔ گہری بے ہوشی جیسی نیند سونے والا بہادر علی سلیپر گھسٹنے کی ہلکی سی آواز سے ہڑبڑا کر اٹھا، اس نے جھپٹ کر سرہانے رکھا سریا اٹھایا اور للکار کر بولا۔ ''کون ہے؟ جہاں ہو، وہیں رک جاؤ۔''

چھمن بوا اپنی جگہ بت بن کر رہ گئیں۔ انھوں نے دیکھا کہ بہادر علی کی آنکھیں ٹھیک سے کھلی بھی نہیں ہیں۔ مگر اس نے سریا اٹھالیا ہے اور اسے سر سے اوپر بلند کر رہا ہے۔

''بہادر علی...... یہ کیا کر رہے ہو بہادر علی۔'' انھوں نے گھبرا کر کہا۔ انھیں ڈر تھا کہ وہ اپنی بات پوری نہیں کر سکیں گی اور سریا ان کے سر سے ٹکرا چکا ہو گا۔

مگر ان کی آواز سے بہادر علی کو جھٹکا لگا۔ پہلے تو کسی اضطراری عمل کے تحت اس کے سریے والے ہاتھ ساکت ہو گئے۔ پھر اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ اس نے چھمن بوا کو حیرت سے دیکھا۔ پھر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ''ارے چھمن بوا...... تم یہاں کیا کر رہی ہو اس وقت۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

چھمن بوا کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ انھیں احساس تھا کہ وہ بال بال بچی ہیں۔ غنیمت ہے کہ ان کی زبان کھل گئی۔ ورنہ اگلے ہی لمحے سر کھل جاتا اور زبان ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتی۔ ان سے بولا تو کچھ نہیں گیا۔ بس وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتی رہیں۔

''میں نے پوچھا، تم یہاں کیا کر رہی ہو اس وقت؟''

''کچھ ڈھونڈنے آئی تھی۔ کیا ڈھونڈنے آئی تھی، یہ اب یاد نہیں۔ مگر یہ کیا حرکت ہے۔ تم نے تو مجھے مار ہی دیا ہوتا۔''

''کون سی حرکت؟ کیا کہہ رہی ہو؟'' بہادر علی نے حیرت سے پوچھا۔

''تمھیں نہیں معلوم۔ حالانکہ اب بھی سریا سر سے اوپر اٹھائے کھڑے ہو۔''

بہادر علی کو بات کا احساس ہوا تو وہ کھسیا گیا۔

''اب تو خدا کے لیے اسے رکھ دو۔ میں تو ہول رہی ہوں۔''

بہادر علی کے سریا اٹھائے ہوئے ہاتھ نیچے آئے۔ اس نے سریا دوبارہ سرہانے رکھ

دیا۔ ”بس اب تم جاؤ۔ مجھے سونا ہے۔“ اس نے چھمن بوا سے کہا۔

”ایسے کیسے سونا ہے۔ میری تو نیند اڑا دی تم نے۔“ چھمن بوا نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر چیلنج کرنے والے انداز میں کہا۔

”کیا کہہ رہی ہو؟“

”مجھے بتاؤ، بات کیا ہے۔ تمھیں ہو کیا گیا ہے۔“

”مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔“

”یہ سریا سرہانے رکھ کر کیوں سونے لگے ہو تم اور یہ معمولی سی آہٹ پر چونک کر اٹھتے ہو اور حملہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہو۔ ایسا کون سا خوف لاحق ہو گیا ہے تمھیں؟“

بہادر علی گڑبڑا گیا۔ ”خوف؟ کیسا خوف! ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”تو پھر یہ سریا سرہانے کیوں؟ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔“

”ارے وہ...... وہ میں نے بتایا تھا نا کہ آج کل چوریاں بہت ہو رہی ہیں۔ بہادر علی کے لہجے میں بے پروائی در آئی۔

چھمن بوا نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔ ”تم جھوٹ بولتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔ بس سچ اگل دو۔“

”سچ وہی ہے، جو میں نے بتایا۔“

”تم مجھے جانتے ہو۔ اب تمہاری جان نہیں چھوٹے گی۔“

بہادر علی کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ کندھے جھک گئے۔ وہ جانتا تھا کہ اب جان واقعی نہیں چھوٹے گی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ بتاتا ہوں۔ مگر گھر میں کسی کو پتا نہ چلے۔“

”اے ہے، ایسی کیا بات ہے۔ تم تو ہولائے دے رہے ہو مجھے۔“

”بات یہ ہے چھمن کہ ہندو مسلم فساد کا خطرہ ہے۔ رات کے وقت مسلمان راہ گیر نظر آ جائے تو ہندو چھرا گھونپ دیتے ہیں......“

”تو اس لیے تم اس دن دہی لانے سے گھبرا رہے تھے۔“ چھمن بوا نے طنز کیا۔

”بکومت۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں۔ موت جب آنی ہے تو آئے گی۔“ بہادر علی نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم میری بات سن لو۔ میں باہر آتا جاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ شہر میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ ابھی تک تو ایسا نہیں ہوا ہے۔ لیکن ہندوؤں کے عزائم ہیں کہ مسلمانوں کے گھروں پر منظم حملے کیے جائیں۔ ان کے گھر لوٹے جائیں اور انھیں ختم کر دیا جائے۔ اسی لیے میں محتاط رہتا ہوں۔ بہت بھاری ذمے داری ہے مجھ پر۔ دیکھو نا، جوان بچیوں کا ساتھ ہے۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔“ چھمن بوا نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔ ”مگر گھر کے لوگوں کو بے خبر تو نہیں ہونا چاہیے۔“

”بتانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ اس کے سوا کیا ہوگا کہ سب پریشان ہو جائیں گے۔ رہی بات بڑی بیگم کی تو وہ بے خبر نہیں ہوں گی۔“

”ہاں۔ پریشان تو وہ رہتی ہیں آج کل۔ لیکن کبھی کوئی بات نہیں کی۔“

”بس اب تم جاؤ۔ مجھے سونے دو۔“

بس اسی دن سے چھمن بوا کو بھی فکر رہنے لگی۔ بیٹھے بیٹھے وہ ہولنے لگتیں۔ گلی میں پتنگ لوٹنے والوں کا شور ہوتا تو وہ ڈر جاتیں۔ معمول کے مطابق گزرنے والے روز و شب ان کے لیے سخت ہو گئے۔

❁......❁......❁

اوتار سنگھ کے لیے کاڑھا جانے والا کرتا مکمل کر کے حور بانو کو جو خوشی ہوئی تھی، وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ خود اوپر جاتی اور اوتار سنگھ کو وہ کرتا دے دیتی۔ لیکن یہ تو کسی بھی طرح اور کبھی بھی ممکن نہیں تھا۔

چھوٹے ٹھاکر کے معاملے میں تو شروع ہی سے یہ ہو رہا تھا کہ وہ جو چاہتی، اسے معلوم ہوتا کہ وہ ناممکن ہے۔ محبت تو اسے بے اختیار اور بے ارادہ ہوئی تھی بلکہ اس نے اس کے خلاف بساط بھر مزاحمت بھی کی تھی۔ اور اس محبت کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بعد اس کے اندر دو عادتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ایک تو وہ تاویلیں تلاش کرنے لگی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مشرک سے محبت وہ گوارا نہیں کر سکتی تھی اور ترکِ محبت بھی اس کے بس میں نہیں تھی۔ خوش قسمتی سے اس کی تاویلوں کو جواز بھی میسر آ گیا تھا۔ ایسی باتیں سامنے آئیں کہ صاف لگتا تھا کہ چھوٹا ٹھاکر مشرک نہیں ہے۔ پھر یہ ہوا کہ اسے اپنی تاویلوں پر پختہ یقین ہو گیا۔ دوسری عادت یہ تھی کہ جو اس کا دل چاہتا اور وہ ممکن نہ ہوتا تو وہ اس کا تصور کر لیتی اور وہ تصور اتنا جاندار اور حقیقت سے اتنا قریب ہوتا تھا کہ اس سے اسے حقیقی تسکین حاصل ہوتی تھی۔

وہ دن بہت خوبصورت تھے اور اسے بہت یاد آتے تھے، جب چھوٹا ٹھاکر شام کو کوٹھے پر بیٹھتا تھا اور وہ بہانوں سے جا جا کر چپکے چپکے اسے دیکھ لیا کرتی تھی۔ مگر پھر استانی جی آنے لگیں تو وہ سلسلہ رک گیا۔ اور ایک دن استانی جی نے چھٹی کی تو اسے پتا چلا کہ چھوٹا ٹھاکر اپنا وہ معمول ترک کر چکا ہے۔ اس کے بعد بھی اس نے کئی بار موقع نکال کر دیکھا۔ لیکن ثابت ہو گیا کہ چھوٹا ٹھاکر اب کوٹھے پر نہیں آتا ہے۔ وہ اس کے لیے بہت بڑی محرومی تھی۔ اسے پھر تصور کا سہارا لینا پڑا۔ ابتداء میں تو بڑی بے کیفی ہوئی کیونکہ وہ اس دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی۔ مگر چند روز بعد رنگ دوبارہ

جم گیا۔ بلکہ اسے احساس ہوا کہ براہِ راست دیکھنے کے مقابلے میں تصور میں زیادہ گنجائش ہے۔ تصور حقیقت کی طرح محدود جو نہیں ہوتا۔

تو اب کرتے کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ اس کے تصور کو موقع مل گیا۔ اس کے تصور کو گویا ایک کھلونا ہاتھ آ گیا۔ اور اس کے لیے عرصہ بھی کافی تھا۔ اماں ابھی کڑھائی کر رہی تھیں۔ گرمیوں کی آمد میں بھی ابھی کافی دن تھے۔

حور بانو کی محبت تمام نشیب و فراز دیکھ چکی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ ہر روز چھوٹے ٹھاکر کو دیکھا کرتی تھی۔ مگر اب بہت عرصے سے یہ سلسلہ موقوف تھا۔ محبت کمزور ہو یا سطحی ہو تو ایسے عرصے میں ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن حور بانو کی محبت کم نہیں ہوئی۔ بلکہ اور بڑھ گئی۔ دوسری طرف بغیر کسی وجہ کے اسے یہ یقین بھی تھا کہ قرآن سنتے سنتے چھوٹا ٹھاکر کسی دن اچانک ایمان لے آئے گا...... مسلمان ہو جائے گا۔

یہ سب کچھ وہ سوچتی رہتی تھی۔ کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ اس بات نے اسے اور تصوراتی بنا دیا تھا۔ ہر بات...... ہر کام وہ تصور میں کر لیتی تھی۔

اس کرتے کو کاڑھنے میں اسے بہت زیادہ وقت لگا تھا۔ اس کی وجہ بھی تھی۔ ورنہ کرتا اس سے آدھے وقت میں مکمل ہو گیا ہوتا۔ ایک تو یہ تھا کہ کرتا وہ اکیلے میں لے کر بیٹھتی تھی۔ ایسا کم ہی ہوا تھا کہ کسی کے سامنے اس نے کڑھائی کی ہو۔ کرتا کاڑھنا اس کے لیے چھوٹے ٹھاکر سے ملاقات کے مترادف تھا۔ وہ اکیلے میں بیٹھتی۔ ایک ٹانکا لگاتی، پھر بیٹھ کر اسے انگلی سے سہلاتی، اسے تنقیدی کی نظروں سے دیکھتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ اسے ادھیڑ کر دوبارہ سے لگاتی۔ اور کڑھائی کے دوران وہ کرتے کے کپڑے کو کئی کئی بار نرم ہاتھ سے محبت بھرے انداز میں سہلاتی۔ زیادہ تر یہ عمل غیر شعوری ہوتا تھا۔ لیکن کبھی کیا۔ اس کے شعور میں یہ خیال آتا کہ وہ کپڑا نہیں، چھوٹے ٹھاکر کا وجود ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ شرم سے دُہری ہو جاتی۔ چور نگاہوں سے وہ ادھر اُدھر دیکھتی کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا ہے اور وہ کپڑے سے یوں ہاتھ ہٹاتی، جیسے دہکتے ہوئے انگاروں پر ہاتھ پڑ گیا ہو۔

کئی بار اس نے یہ بھی سوچا کہ چھوٹا ٹھاکر تو اس کی محبت سے بے خبر ہے۔ اگر اسے اس کی محبت کا پتا چل جائے تو کیا ہوگا۔ اس خیال کے آگے امکانات کا بہت بڑا میدان تھا۔ اسی میدان میں وہ کئی زاویوں سے یہ کھیل کھیلتی۔ کسی Version میں چھوٹا ٹھاکر یہ جان کر خوش ہوتا تو کسی میں اس پر برہمی کا اظہار کرتا۔ کسی میں وہ پریشان ہو کر کہتا...... یہ کیسے ممکن ہے۔ تمھارے اور میرے درمیان مذہب کی اتنی بڑی خلیج ہے کہ جسے پاٹا نہیں جا سکتا۔ اور کبھی وہ اعلان کرتا...... اس وقت میں مسلمان نہیں ہوں تو ہندو بھی نہیں ہوں۔ اور میں اسلام کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

چھوٹے ٹھاکر کے ردِّ عمل کے مطابق اس کی کیفیات ہوتیں۔ کبھی وہ خوش ہوتی، کبھی اداس ہو جاتی اور کبھی پریشان۔ لیکن ہر حال میں اسے لطف آتا تھا کیونکہ وہ ایک رکی ہوئی کہانی کو آگے بڑھا رہی ہوتی تھی۔

اسے ایک بات پر بڑی حیرت تھی۔ اس نے کرتا مکمل کرنے میں بڑی دیر لگائی تھی۔ لیکن نور بانو کے کرتے کی کڑھائی بھی اس کے ساتھ ہی مکمل ہوئی تھی۔ کیوں؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس کے حساب سے تو نور بانو کو اتنے عرصے میں دو کرتے مکمل کرنا چاہیے تھے۔ اس نے اتنا سا کام کیوں کیا، اس کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اس نے سوچا، بیگار سمجھ کر رہی تھی نا، اس لیے دیر لگی ہوگی۔ مگر اسی لمحے اس کے کانوں میں نور بانو کے الفاظ گونجے...... کام تو میں نے محبت سے ہی کیا ہے۔ کام محبت سے کیا جائے تو عبادت ہی ہوتا ہے نا اماں۔

حور بانو نے سر جھٹک دیا۔ یہ معما اس کی سمجھ میں آنے والا نہیں تھا۔

❁......❁......❁

"تمھارے ماسٹر جی کا کیا حال ہے بیٹے؟" سرفراز بیگم نے پوچھا۔

"بس ٹھیک ہیں ماں جی۔ پہلے سے تو بہت بہتر ہیں۔" اوتار سنگھ نے جواب دیا۔

"تمھاری بات سے تو لگتا ہے کہ ان کی حالت اچھی نہیں ہے۔"

اوتار سنگھ نے نظریں جھکا لیں۔ چند لمحے وہ خاموش رہا۔ پھر بولا تو اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ "ڈاکٹروں کا کہنا ہے ماں جی کہ مرض بہت بڑھ چکا ہے۔ یہ بھی میری کوتاہی ہے۔ مجھے پہلے خیال آ جاتا تو شاید یہ صورتِ حال نہ ہوتی۔"

سرفراز بیگم نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھا اور بناوٹی خفگی سے بولیں۔ "تم ہر الزام اپنے سر لینے کی کوشش کیوں کرتے ہو۔ تمھارے ماسٹر جی تم سے زیادہ اپنے بیٹوں کی ذمے داری تھے۔"

"اپنی ذمے داری وہ جانیں ماں جی۔ مجھے تو اپنی فکر کرنی چاہیے نا۔ کوتاہی تو مجھ سے ہوئی۔ مجھے فوراً ان کا خیال آ جاتا تو مرض اتنا بڑھنے سے پہلے میں انھیں سینی ٹوریم لے جا سکتا تھا۔"

"یہ بھی تو سوچو کہ اگر تمھیں مزید کچھ دن ان کا خیال نہ آتا تو کیا ہوتا؟"

اوتار سنگھ نے انھیں زخمی نگاہوں سے دیکھا۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔

"زندگی اور موت صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔" سرفراز بیگم نے وضاحت کی۔ پھر انھوں نے موضوع بدلا۔ "ابھی بڑے دن کے موقعے پر تم کئی دن ان کے پاس رہ کر آئے ہو نا۔"

اوتار سنگھ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''جی ماں جی۔ اور ماسٹر جی بہت خوش ہوئے۔''

''یہ بتاؤ، ان کے بیٹے بھی کبھی ان سے ملنے جاتے ہیں؟''

''اپنے اپنے روزگار میں الجھے ہوئے ہیں..... مصروف ہیں وہ۔'' اوتار سنگھ نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن شاید اگلے مہینے ان کا چھوٹا بیٹا میرے ساتھ جائے۔''

''زندگی کی مصروفیات تو چلتی رہتی ہیں بیٹے۔ لیکن بیمار باپ کی خدمت اور عیادت کے لیے کوئی عذر نہیں چلتا اور جب انھوں نے بیمار باپ کو اچھوت بنا کر کوٹھری میں ڈال رکھا تھا، تب کون سی مجبوری تھی انھیں۔ وہ ان کے مرنے کا ہی انتظار تو کر رہے تھے۔''

اوتار سنگھ نے حیرت سے انھیں دیکھا۔ ''آپ..... آپ کو یہ سب کچھ کیسے معلوم ہے؟''

''رنجنا نے بتایا تھا مجھے۔''

''مگر میں پھر کہوں گا ماں جی کہ ان کے بیٹوں کی غیر ذمے داری میری کوتاہی کا جواز نہیں ہے۔ مجھے ان سے کیا۔ میں تو اپنی کوتاہی پر کڑھتا ہوں۔''

''اور میں تمھیں یہ سمجھا رہی ہوں کہ اپنے ضمیر پر بلاوجہ بوجھ لینا اچھا نہیں ہوتا۔ اس سے آدمی کمزور ہو جاتا ہے۔ اللہ کی مرضی کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔''

اوتار سنگھ کو مسلمانوں کی یہ بات بہت اچھی لگتی تھی۔ اسے مولوی صاحب کی موت پر ان کے بیٹے اور بیوی کا ردِعمل بھی یاد تھا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ماں جی۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''زندگی اللہ کی امانت ہوتی ہے، وہ جب چاہے واپس لے لے۔ اس میں شکایت کیسی۔'' سرفراز بیگم نے سرد آہ بھر کے کہا۔ ''حالانکہ کسی آدمی کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ کوئی آدمی سائبان کی طرح ہوتا ہے۔ چلا جائے تو غیر محفوظ ہو جانے کا احساس پیچھے رہنے والوں کو ہمیشہ ستاتا ہے۔''

ان کے لہجے میں عجیب سا دکھ تھا۔ اوتار سنگھ پچھلے کچھ دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ وہ پریشان رہنے لگی ہیں۔ یہ بات نہیں کہ وہ پریشانی ظاہر کرتی ہوں۔ بلکہ وہ آتیں تو ہمیشہ اس کی دل جوئی کرتیں، اس کی فکر کرتیں۔ لیکن اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اندر ہی اندر پریشان ہیں۔ کوئی فکر انھیں ستا رہی ہے۔

اس وقت اسے موقع مل گیا۔ ''ماں جی..... آپ پریشان کیوں رہتی ہیں آج کل؟'' اس نے پوچھا۔

''کون، میں؟ نہیں تو۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' سرفراز بیگم نے جلدی سے کہا۔

''میں تو کئی دن سے یہ بات محسوس کر رہا ہوں۔ آپ کو خود ہی بتا دینا چاہیے تھا۔ لیکن

شاید آپ بس زبان سے مجھے بیٹا کہتی ہیں، سمجھتی نہیں۔''

''ایسی کوئی پریشانی تو نہیں۔''

''مطلب یہ کہ کچھ تو ہے۔ تو کیا چھوٹی پریشانی بیٹوں کو نہیں بتائی جاتی؟'' اوتار سنگھ کے لہجے میں شکایت تھی۔

''ایسا کچھ ہے ہی نہیں۔'' سرفراز بیگم نے کہا۔ ''تم تو بات پکڑ رہے ہو۔''

''نہیں ماں جی۔ سچ یہ ہے کہ آپ مجھے بتانا نہیں چاہتیں۔ ورنہ پریشان تو آپ ہیں۔ اس سے میں یہی سمجھوں گا کہ آپ مجھے بیٹا نہیں سمجھتیں۔''

سرفراز بیگم کے سینے میں کچھ پگھلنے لگا۔ ''پریشان تو میں ہوں۔ مگر تمھیں پریشان کرنے کا کیا فائدہ۔ جو مدد کرنے والا ہے، اس سے چپکے چپکے مدد مانگ لیتی ہوں۔''

اوتار سنگھ سمجھ گیا کہ ان کا اشارہ اللہ کی طرف ہے۔ ''لیکن ماں جی، جوان بیٹے اس لیے تو ہوتے ہیں کہ اپنی پریشانی انھیں سونپ دی جائے اور وہ اسے دور کرنے کی کوشش کریں۔ مسئلے کا کوئی حل نکالیں۔''

''اب اتنے بڑے بھی نہیں ہو تم۔'' سرفراز بیگم نے معاملے کی سنگینی کم کرنے کے لیے ذرا شگفتگی سے کہا۔

''عمر سے کچھ نہیں ہوتا ماں جی۔ میں تو ماں، باپ..... بہت کچھ کھو چکا ہوں۔ میں چھوٹا نہیں ہوں ماں جی۔ آپ بتائیں، کیا پریشانی ہے آپ کو؟''

''کیا کہوں بیٹا۔ بس یہ خیال آتا ہے کہ گلنار کے ابا ہوتے تو ڈھارس رہتی۔'' سرفراز بیگم کی آواز بھرا گئی۔

''آپ خود ہی کہتی ہیں کہ زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے اور پھر جوان بیٹا تو ہے نا۔ آپ بات تو بتائیں۔''

''بس بیٹا، یہ ملکی حالات سے ڈر لگنے لگا ہے۔ شہر کے حالات بھی اچھے نہیں ہیں اور یہ موئی دلی تو ہر دور میں اجڑتی رہی ہے۔ اب دیکھو، ہر روز چار چھ مسلمانوں کے چھرا گھونپ دیا جاتا ہے۔ اب تو اخبار پڑھنا بھی چھوڑ دیا میں نے۔ بہت گھبراہٹ ہوتی تھی۔''

''آپ پریشان نہ ہوں ماں جی۔ آپ تو گھر میں محفوظ ہیں نا۔''

''نہیں بیٹے۔ میں جانتی ہوں۔ یہ آگ ابھی اور بھڑکے گی۔ اللہ محفوظ رکھے۔ نجانے کتنے گھر جلیں گے اس آگ میں۔ میں نے سنا ہے..... منظم حملوں کا ارادہ بھی ہے متعصب ہندوؤں کا۔ میرے ساتھ جوان بیٹیاں ہیں۔ ہر وقت ڈرتی رہتی ہوں میں۔'' ان کی آنکھیں بھیگ آئیں اور آواز لرزنے لگی۔

اوتار سنگھ دہل کر رہ گیا۔ وہ تو باہر جاتا تھا۔ حالات سے بہت زیادہ واقف تھا۔ اس کے باوجود اس نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ ماں جی نجانے کب سے عدم تحفظ کے احساس میں، اس خوف میں گرفتار تھیں۔ اس نے کبھی ان کی ڈھارس نہیں بندھائی، ان کی دل جوئی نہیں کی۔ اس نے بیٹا ہونے کا حق بالکل ادا نہیں کیا۔ وہ کتنا غیر ذمے دار ہو گیا ہے۔ اپنے سوا کسی کا ہوش نہیں ہے اسے۔ کیا وہ خود غرض ہو گیا ہے۔ وہ ایسا شرمندہ ہوا کہ جی چاہتا تھا، زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

وہ اٹھا اور سرفراز بیگم کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس نے ان کے دونوں ہاتھ محبت سے تھام لیے۔ ''میں بہت شرمندہ ہوں ماں جی۔ میں الٹا آپ سے شکایت کر رہا تھا کہ آپ مجھے بیٹا نہیں سمجھتیں۔ مجھے اپنی پریشانی نہیں بتاتیں۔ حالانکہ اس پر تو مجھے خود سوچنا چاہیے تھا۔ مجھے خود آپ سے بات کرنی چاہیے تھی۔ میں بہت شرمندہ ہوں ماں جی۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔''

سرفراز بیگم تو ہکا بکا رہ گئیں۔ ''ارے نہیں بیٹے...... اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔'' وہ دل میں سوچ رہی تھیں کہ یہ کیسا لڑکا ہے۔ ہر بات کو اپنی ذمے داری سمجھتا ہے اور پھر خود کو غیر ذمے دار سمجھ کر خود ملامتی میں مبتلا ہوتا ہے۔ شرمندہ ہوتا ہے اور تلافی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

پھر اوتار سنگھ نے ایسی بات کہی کہ سرفراز بیگم ہل کر رہ گئیں۔ ''دیکھیں ماں جی، بظاہر تو میں ہندو ہوں اور آپ کا بیٹا بھی ہوں۔ اب یہ تو مجھے معلوم ہے کہ میں ہندو نہیں۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو منزل کی تلاش میں بھٹکتا ہوا ایک راہی ہوں۔ مگر میرا بظاہر ہندو ہونا یہاں فائدہ مند ہے۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی آپ کے گھر کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ آپ آج کے بعد اس طرف سے بالکل پریشان نہ ہوں۔''

''مگر بیٹا، تم خود اکیلے......''

''آپ مجھے نہیں جانتیں ماں جی۔ چاچا جمال دین نے مجھے لٹھیا چلانا سکھایا تھا۔ بیس تیس کے لیے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں۔'' اوتار سنگھ نے کہا اور پھر عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ ''اور ویسے بھی ہندو کسی ہندو پر تو ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔''

''ٹھیک ہے بیٹا۔ تم واقعی سچے بیٹے ہو۔''

اوتار سنگھ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کے چہرے پر اسے مکمل اطمینان نظر نہیں آیا۔ ''آپ مطمئن نہیں ہوئیں ماں جی۔ مگر یقین کریں، میرے جیتے جی کوئی آپ کی دہلیز نہیں پھلانگ سکتا۔ کوئی آپ کی عزت کو میلی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھ پر بھروسہ کریں ماں جی۔ میں ہوں نا۔''

سرفراز بیگم نے اس کے دونوں ہاتھ اٹھائے اور انہیں لبوں سے لگا لیا۔ ''میں مطمئن ہو گئی بیٹا۔ جوان بیٹے کے ہوتے ہوئے ماں پریشان کیسے ہو سکتی ہے۔''

اوتار سنگھ مسکرایا۔ ''اور آپ نے مجھے معاف بھی کر دیا نا؟''

''کس بات پر؟''

''میری بے خبری پر...... میری غیر ذمے داری پر۔''

سرفراز بیگم ہنس دیں۔ ''اگر تم غیر ذمے دار ہو تو سب کو ایسا ہی غیر ذمے دار ہونا چاہیے۔''

''نہیں ماں جی۔ آپ معاف نہیں کریں گی تو میری تسلی نہیں ہو گی۔''

''اچھا بیٹے...... معاف کیا۔''

اوتار سنگھ کی کہی ہوئی وہ بات سرفراز بیگم کبھی نہیں بھولیں کہ وہ ہندو نہیں ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ منزل کی تلاش میں بھٹکتا ہوا راہی ہے۔ اس دن کے بعد مرتے دم تک وہ اس کے لیے ہر نماز میں دعا کرتی رہیں۔ اے اللہ، اپنے اس بندے کو صراط مستقیم پر لے جائیے۔ اے اللہ اسے اپنا راستہ دکھا دیجیے۔ اے اللہ، اس میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو اہل ایمان میں ہوتی ہیں۔ اسے ایمان سے نواز دیجیے اے اللہ......

❁......❁......❁
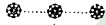
اس دن کے بعد اوتار سنگھ کو بے کلی لگ گئی۔ اس نے سرفراز بیگم سے جو کچھ کہا تھا، صرف زبانی نہیں تھا۔ وہ اس نے پوری سچائی سے کہا تھا اور اس پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس دن سے اس نے وہ ذمے داری قبول کر لی۔

اس کے نتیجے میں اس کے معمولات بدل گئے۔ وہ جلدی سونے کا عادی تھا لیکن پہلی ہی رات کھانا کھانے کے بعد وہ کوٹھے پر چلا گیا۔ کتاب لے جانے کا اس نے تکلف نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ پڑھ نہیں سکے گا۔

رات دس بجے کے بعد سناٹا ہو جاتا تھا۔ وہ دس بجے سو جاتا تھا۔ مگر اس رات وہ جاگ رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھا وہ آسمان کو تکتا رہا۔ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو ٹہلنے لگا۔ بار بار جا کر وہ گلی میں جھانکتا، مکان کے صدر دروازے کو دیکھتا۔ کوٹھے پر اس نے دانستہ روشنی کی تھی۔ تاکہ کوئی حملہ آور اس طرف آئے تو سمجھ لے کہ وہاں لوگ جاگ رہے ہیں۔

دو بجتے بجتے وہاں کافی سردی ہو گئی۔ وہ کوئی چادر یا شال بھی نہیں لایا تھا۔ سردی سے اس پر کپکپی چڑھنے لگی۔ ڈھائی بجے کے قریب وہ نیچے آ گیا۔ اس کے خیال میں اب خطرے کا وقت نہیں تھا۔

وہ بستر پر لیٹا اور رضائی اوڑھ لی۔ جسم کو گرمی ملی تو اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔ اصولاً اسے گہری نیند سو جانا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ نیند کے عالم میں اسے خیال آیا کہ اگر اس وقت حملہ ہو جائے تو اسے تو پتا بھی نہیں چلے گا۔ اس کی نیند اچٹ گئی۔ اس سے اٹھا بھی نہیں گیا اور

وہ ٹھیک سے سو بھی نہیں سکا۔ اس کے بعد تو یہ معمول ہو گیا۔ رنجنا پہلی رات تو بے خبر رہی۔ لیکن دوسری رات اسے پتا چل گیا۔ وہ اور رگھو اسے بلانے کے لیے اوپر آئے۔ لیکن اس نے سختی سے انہیں منع کر دیا۔ وہ دونوں اس کی بے چینی اور اضطراب دیکھتے رہے۔ رنجنا کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ لیکن رگھو سمجھ گیا تھا۔

''تم لوگ سو جاؤ جا کر۔'' اوتار سنگھ نے ان سے کہا۔

''لیکن مالک آپ......؟''

''مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔''

''تو آپ نیچے چلیں۔ میں سر میں تیل لگا دوں گی۔ نیند آ جائے گی۔''

''مگر مجھے سونا نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اوتار سنگھ کو خیال آیا کہ کتاب اوپر لانا ضروری ہے۔ ''مجھے پڑھائی کرنی ہے چلو...... کتابیں تو لے آؤں۔''

وہ نیچے آیا اور اپنی کتابیں اٹھائیں۔ پھر ان لوگوں کو سو جانے کی تاکید کر کے وہ اوپر چلا گیا۔

رنجنا نے رگھو کو مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھا۔ ''کیا ہو گیا ہے چھوٹے ٹھاکر کو؟''

''وہ پریشان ہیں۔'' رگھو نے کہا۔

''یہ کیسی پریشانی ہے کہ رات بھر چھت پر ٹہلتے رہیں۔''

''فسادات کا خطرہ ہے نا۔ وہ نیچے والوں کی حفاظت کے خیال سے جاگتے ہیں۔''

''ہائے رام۔'' رنجنا کا ہاتھ سینے پر پہنچ گیا۔ ''تو کیا گھر پر بھی حملہ ہو سکتا ہے۔''

''ہاں۔ ابھی تو منصوبے بن رہے ہیں۔ پرنتو یہ ہو کر رہے گا۔''

رنجنا پریشان ہو گئی۔ ''تو چھوٹے ٹھاکر کیا کر سکتے ہیں؟''

''جو کر سکتے ہیں، اوش کریں گے۔ راجپوت ہیں وہ۔ جان پر کھیل جائیں گے ان کی حفاظت کے لیے۔''

''تو چنتا نہ کر۔ جا کے سو جا۔''

''اور تم؟''

''میں تو جاگوں گا۔ مالک جاگے اور میں سوؤں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''تو میں بھی کیسے سو سکتی ہوں۔''

وہ دونوں بھی جاگتے رہے۔ اوتار سنگھ نیچے آ کر سونے کے لیے لیٹا تو وہ دونوں بھی سوئے۔

ایک ہفتہ گزرا تو وہ معمول اوتار سنگھ کی صحت پر اثر انداز ہونے لگا۔ اس کی آنکھوں سے

نیچے گہرے سیاہ حلقے پڑ گئے۔ آنکھیں ہر وقت متورم رہنے لگیں۔ رنگت بھی سنولانے لگی۔ اسے یہ احساس بھی ستا رہا تھا کہ اس کی ذہنی صلاحیتیں ماند پڑنے لگی ہیں۔

ایسے میں ایک دن سرفراز بیگم نے اسے دیکھا تو دھک سے رہ گئیں۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے بیٹے؟''

''جی ماں جی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''مگر تمہاری حالت تو کچھ اور بتا رہی ہے۔ آنکھوں کے نیچے حلقے...... جھلسی ہوئی رنگت......''

''کچھ نہیں ماں جی۔ نیند پوری نہیں ہو رہی ہے نا۔ آج کل پڑھائی کا زور ہے۔''

''مگر اتنا نہ کرو کہ صحت متاثر ہونے لگے۔''

رنجنا پہلے سے اس کی یہ حالت دیکھ کر کڑھ رہی تھی۔ لیکن کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ سرفراز بیگم کی بات سننے کے بعد اس سے رہا نہیں گیا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے اوتار سنگھ سے کہا۔ ''ایک بنتی کروں مالک؟''

''ہاں رنجنا، کہو۔''

''جب تک پڑھائی کا زور ہے، آپ دن میں دو گھنٹے سو لیا کریں۔''

اوتار سنگھ کے دل کو یہ بات لگی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اسے دن میں نیند نہیں آتی تھی۔ مگر اس نے سوچا، کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ اگلے دن کالج سے واپس آ کر اس نے کھانا کھایا۔ نیند پوری نہ ہونے کے نتیجے میں اس کی بھوک بھی کم ہو گئی تھی۔

کھانا کھا کر وہ لیٹا تو اسے لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ اور وہ دو گھنٹے کا ارادہ کر کے لیٹا تھا۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد آپ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔

یوں یہ دوپہر کی نیند بھی اس کے معمولات میں شامل ہو گئی۔

ایک رات وہ کوٹھے پر ٹہلتے ٹہلتے تھک کر کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ نیچے سے دروازے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ وہ لپک کر اٹھا، اپنی لاٹھی اٹھائی اور تیزی سے لپکا۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ صدر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لیکن کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ''کون ہے؟'' اس نے للکار کر کہا۔

جواب نہیں ملا تو وہ پھر چلایا۔ رات کے سناٹے میں اپنی آواز اسے بہت بلند آہنگ لگی۔ وہ نیچے اترنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ جواب مل گیا۔

''میں ہوں بہادر علی چھوٹے ٹھاکر۔'' اس کے ساتھ ہی بہادر علی کی صورت نظر آئی۔

''اتنی رات کو ایسے دروازہ نہ کھولا کریں آپ۔'' اوتار سنگھ نے سخت لہجے میں کہا۔

بہادر علی نے اس کے لہجے پر چونک کر اوپر دیکھا تو اس کے ہاتھ

"اتفاق سے کھولنا پڑ گیا۔ ورنہ میں خود بڑی احتیاط کرتا ہوں۔" انھوں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "لیکن تم اوپر کیا کر رہے ہو چھوٹے ٹھاکر۔"

"میں پڑھ رہا ہوں۔" اوتار سنگھ نے کہا اور پیچھے ہٹ آیا۔

نیچے بہادر علی نے دروازہ بند کیا۔ اسے بڑی آسودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اکیلا نہیں۔ ان کا ہندو کرائے دار بھی ان کے تحفظ کی فکر کرتا ہے...... راتوں کو جاگتا ہے۔ اس کا بوجھل پن کافی حد تک کم ہو گیا۔

دو بجے کے بعد اوتار سنگھ نیچے چلا آیا۔ صبح اسے ماسٹر جی سے ملنے کے لیے جانا تھا۔

یہ ماسٹر جی والا معمول اب اس کے لیے کشمکش کا باعث ہو گیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ماسٹر جی بھی اس کی ذمے داری تھے اور دوسری طرف اس گھر کا تحفظ بھی اس کی ذمے داری تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ماسٹر جی کے پاس نہ جائے۔ اور وہ وہاں جانے کے لیے نکلتا تو اسے یہ فکر رہتی کہ گھر کو بے آسرا چھوڑ کر جا رہا ہے۔ وہاں وہ ایک رات ہوٹل میں گزارتا۔ مگر اس کا دل گھر میں اٹکا رہتا۔ اس سے سویا ہی نہ جاتا۔ ہر پل وہ وسوسوں میں گھرا رہتا۔ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔

ویسے اپنی وہاں کی ذمے داری وہ رگھو پر چھوڑ کر آتا تھا۔ اپنی دانست میں اس نے بڑی راز داری سے رگھو کو سب کچھ سمجھا دیا تھا اور اسے کہہ دیا تھا کہ اس معاملے میں اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرنی ہے۔ مشکل یہ تھی کہ وہ اس طرح مطمئن ہونے والا نہیں تھا۔ لہٰذا ہفتے میں ایک بار یہ اذیت اس کے لیے لازمی ہو گئی تھی۔

اسکولوں کے امتحانات ہو چکے تھے۔ وہ ماسٹر جی کے گھر گیا تھا...... اس امید پر کہ شاید اس بار ان کا کوئی بیٹا اس کے ساتھ چلا جائے۔ لیکن ہری پرشاد نے اس بار بھی مصروفیت کا عذر پیش کر دیا۔ دوسرے دونوں تو پہلے ہی اس عذر کے تحت انکار کر چکے تھے۔

اس بار اوتار سنگھ ان کی بے حسی پر بہت جھنجلایا تھا۔ اس نے عہد کر لیا کہ اب ان لوگوں سے کبھی نہ امید رکھے گا، نہ چلنے کو کہے گا۔

❁......❁......❁
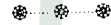
سرفراز بیگم چھوٹے ٹھاکر کی طرف سے فکر مند تھیں۔ اس کی صحت میں انھیں بہت بڑا فرق نظر آیا تھا۔ انھوں نے اسے ٹوکا بھی تھا اور اس نے وجہ بھی بتائی تھی کہ وہ رات کو بہت دیر تک جاگ کر پڑھائی کر رہا ہے۔ لیکن وہ مطمئن نہیں ہوئی تھیں۔ ان کے خیال میں یہ امتحانوں کا عرصہ تو تھا نہیں کہ وہ پڑھائی میں اتنی محنت کرتا۔ بہرحال اس معاملے میں وہ مزید جرح تو نہیں کر سکتی تھیں۔

اگلی بار وہ گئیں تو وہ سو رہا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی کیونکہ دن میں انھوں نے اسے

کبھی سوتے نہیں دیکھا تھا۔ انھیں ڈر لگا کہ کہیں اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی۔ "کیا ہوا رنجنا۔ خیریت تو ہے؟" انھوں نے گھبرا کر پوچھا۔

"جی بڑی بیگم۔" رنجنا ان کا مطلب نہیں سمجھی۔ "خیریت ہے۔"

"یہ چھوٹا ٹھاکر کیوں سو رہا ہے اس وقت۔ پہلے تو کبھی دن میں سوتے نہیں دیکھا۔"

"وہ...... رات کو بہت دیر تک جاگتے ہیں نا بڑی بیگم۔ میں نے کہا، دن میں گھنٹے دو گھنٹے سو لیا کریں۔"

"اتنی رات تک کیوں جاگنے لگا ہے یہ؟"

رنجنا ایک لمحے کو ہچکچائی۔ پھر اس نے جلدی سے کہا۔ "پڑھائی کرتے ہیں نا بڑی بیگم۔"

سرفراز بیگم نے اس کی وہ ہچکچاہٹ دیکھ لی تھی۔ معاملہ ان کے نزدیک اور پُر اسرار ہو گیا تھا۔ عجیب معما تھا۔ بہرحال انھوں نے اس خلش کو ذہن سے جھٹکا اور غور سے سوتے ہوئے چھوٹے ٹھاکر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے جو حلقے تھے، وہ اس وقت اتنے گہرے نہیں لگ رہے تھے۔ انھیں اطمینان ہوا کہ نیند سے بہرحال فرق پڑا ہے۔ یعنی صحت میں کوئی بڑی خرابی نہیں ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا تو اسے دیکھ کر وہ اس کی صحت کی طرف سے اور مطمئن ہو گئیں۔ اس کی رنگت بھی بحال ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ نیچے چلی آئیں۔

جو معما ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ گزشتہ رات خود بخود حل ہو گیا۔ عشاء کے آدھے پونے گھنٹے بعد سو جانا ان کا معمول تھا۔ مگر رات اچانک گلا خشک ہونے کے احساس کے ساتھ ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھیں، تو گھبرائی ہوئی تھیں۔ جاگنے کے ذرا دیر بعد انھیں احساس ہوا کہ وہ گھبراہٹ پیاس کی تھی۔

وہ اٹھیں اور انھوں نے پانی پیا۔ آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ انھیں خیال آیا کہ اب جاگ گئی ہیں تو وضو ہی تازہ کر لیں۔ اس ارادے سے وہ غسل خانے جانے کے لیے دالان میں نکلیں۔ اوپر کوٹھے پر روشنی دیکھ کر وہ چونکیں۔ مگر وہ چونکنا بس ایک لمحے کا تھا کیونکہ اگلے ہی لمحے انھیں خیال آ گیا کہ آج کل اوتار [illegible] کو دیر تک پڑھائی کر رہا ہے۔

انھوں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہاں روشنی ہو رہی تھی۔ جالیوں کی درزوں سے اوپر کا منظر بالکل صاف تو نہیں، البتہ ٹکڑے ٹکڑے نظر آ رہا تھا۔ چھوٹا ٹھاکر کرسی پر بیٹھا تھا۔ انھوں نے بہت غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن انھیں اس کے ہاتھ میں کتاب نظر نہیں آئی۔

وہ وضو کرنے کے لیے غسل خانے میں گئیں۔ واپس آئیں تو ان کی نیند اچٹ گئی تھی۔ وہ دالان میں بچھے تخت پر دراز ہو گئیں۔ اوپر چھوٹا ٹھاکر بدستور کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کتاب اب بھی نہیں تھی۔

ذرا دیر بعد چھوٹا ٹھاکر اٹھا۔ اس کے ہاتھ میں کتاب اب بھی نہیں تھی۔ وہ کوٹھے پر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہلنے لگا۔ ہر چند منٹ بعد وہ ٹہلتے ٹہلتے بیرونی دیوار کے پاس رکتا اور باہر گلی میں جھانکنے لگتا۔ چند لمحے وہاں رکنے کے بعد وہ پھر چہل قدمی شروع کر دیتا۔

ایک گھنٹا ہو گیا اور وہ ٹہلتا رہا۔ سرفراز بیگم کو ایسا لگا کہ وہ خود ٹہلتے ٹہلتے تھک گئی ہیں۔ ان کی ٹانگیں دُکھنے لگی ہیں۔ یا اللہ، یہ لڑکا پڑھتا ہے یا رات بھر ٹہلتا رہتا ہے۔ ابھی تک تو اس کے ہاتھ میں کتاب دیکھی نہیں۔ وہ بڑبڑائیں۔ اور کتنا ٹہلتا ہے یہ۔ ٹانگیں نہیں دکھ جاتی ہوں گی۔ صحت تو خراب ہونی ہی ہے۔ اوپر کوٹھے پر چھوٹا ٹھاکر ان کی موجودگی سے بے خبر ٹہلے جا رہا تھا۔ اب اس کی رفتار کچھ کم ہو گئی تھی۔ شاید تھکن کی وجہ سے!

یا اللہ...... یہ لڑکا کس لیے جاگے جا رہا ہے؟ کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ؟ وہ پھر بڑبڑائیں۔ اس بار ان کے لہجے میں بے زاری تھی۔ وہ جو بیرونی دیوار کے پاس کچھ دیر رکتا تھا اور پھر باہر گلی میں جھانکنے لگتا تھا، اس کا یہ انداز انھیں کچھ مشتبہ سا لگنے لگا۔ کہیں کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں۔ انھوں نے سوچا۔ لیکن اگلے ہی لمحے انھیں اپنی سوچ پر افسوس ہونے لگا۔ وہ چھوٹے ٹھاکر کو بہت مضبوط کردار کا لڑکا سمجھتی تھیں۔ انھوں نے اس کے بارے میں ایسی بات سوچی ہی کیوں۔ وہ دل ہی دل میں خود کو ملامت کرتی رہیں۔

کچھ دیر بعد چھوٹا ٹھاکر دوبارہ کرسی پر جا بیٹھا۔ شاید ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تھا۔

لیکن اگلے ہی لمحے ایک عجیب بات ہوئی۔ چھوٹا ٹھاکر کرسی سے یوں جھٹکے سے اٹھا، جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ اور وہ اٹھا تو سرفراز بیگم کو اس کے ہاتھ میں لاٹھی نظر آئی۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے بیرونی دیوار کی طرف لپکا۔ اس نے گلی میں جھانکا اور للکار کے کہا۔ ''کون ہے؟''

سرفراز بیگم اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ چھوٹے ٹھاکر کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ کوئی خطرہ محسوس کر رہا ہو۔

وہ چھوٹے ٹھاکر کو صاف دیکھ رہی تھیں۔ ایک لحہ گلی میں جھانکنے کے بعد چھوٹا ٹھاکر پلٹ ہی رہا تھا کہ دوبارہ گلی کی طرف مڑا اور جھانکنے لگا۔ سرفراز بیگم کو کوئی آواز تو سنائی نہیں دی تھی۔ لیکن چھوٹے ٹھاکر کا ردِعمل بتاتا تھا کہ اسے نیچے سے جواب ملا ہے۔

ایک لمحے بعد اوتار سنگھ نے سخت لہجے میں کہا۔ اتنی رات کو ایسے دروازہ نہ کھولا کریں آپ۔''

سرفراز بیگم کو لگا کہ وہ ان کے دروازے کی بات کر رہا ہے۔ اور اس کے لہجے میں سختی کے ساتھ احترام بھی تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کسی اجنبی سے نہیں، بلکہ کسی شناسا سے بات کر رہا ہے۔

ایک لمحے کو خاموشی رہی۔ سرفراز بیگم کو اب بھی دوسری کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی۔

لیکن چھوٹے ٹھاکر کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ کسی کی بات سن رہا ہو۔

پھر چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ ''میں پڑھ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹ آیا۔ اس نے لاٹھی دیوار سے ٹکا کر کھڑی کی اور پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

سرفراز بیگم کو یقین ہو گیا کہ چھوٹے ٹھاکر کی بہادر علی سے بات ہوئی ہے۔ اب انھیں اس کی تصدیق کرنی تھی۔ عام حالات میں وہ اتنی رات کو کبھی ڈیوڑھی کی طرف نہ جاتیں۔ مگر یہ ان کے گھر اور بچیوں کے تحفظ کا معاملہ تھا۔

بہادر علی ڈیوڑھی میں سوتا تھا۔ دروازہ وہ بند رکھتا تھا۔ سرفراز بیگم نے دروازے پر رک کر اسے پکارا۔ ''بہادر علی ......تم جاگ رہے ہو؟''

بہادر علی کے لیے وہ غیر معمولی بات تھی۔ اتنی رات کو بڑی بیگم پکار رہی تھیں۔ ''جی بڑی بیگم، میں جاگ رہا ہوں۔ خیریت تو ہے نا۔'' اس نے دروازہ کھولے بغیر دروازے کے قریب آ کر کہا۔

''چھوٹا ٹھاکر تم سے بات کر رہا تھا؟'' سرفراز بیگم نے پوچھا۔

''جی بڑی بیگم۔'' بہادر علی کے لہجے میں شرمندگی تھی۔ ''میں نے مجبوری میں بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا تھا۔ پھر بھی اسے پتا چل گیا۔''

''تم حالات سے بے خبر تو نہیں ہو بہادر علی۔'' سرفراز بیگم کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

''ساری زندگی اس گھر کا نمک کھایا ہے بڑی بیگم۔ آپ جانتی ہیں کہ غیر ذمے دار نہیں ہوں۔ میرے جیتے جی اس گھر کی دہلیز کوئی نہیں پھلانگ سکے گا۔ ہر صورت حال کے لیے تیار رہتا ہوں۔ لیکن بڑی بیگم، آج مجھے طاقت کا احساس ہو رہا ہے۔ میں اکیلا نہیں۔ اس گھر کی حفاظت کی فکر کرنے والے اور لوگ بھی ہیں اور وہ چوکنا بھی رہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے بہادر علی۔ تم آرام کرو۔''

سرفراز بیگم دوبارہ تخت پر آ بیٹھیں۔ چھوٹا ٹھاکر اب بھی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اور اب بھی اس کے ہاتھ میں کتاب نہیں تھی۔

اس وقت ان کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ دل کو کچھ ہو گیا تھا۔ وہ چھوٹے ٹھاکر کو بہت اچھا سمجھتی تھیں۔ لیکن ہر بار، ہر نئے موڑ پر انھیں پتا چلتا تھا کہ وہ ان کے تصور سے بڑھ کر اچھا ہے۔ وہ کتنا سچا ہے۔ جو کہتا ہے، دل سے کہتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ اس کا ثبوت اس وقت ان کے سامنے تھا۔ انھیں یاد آیا، ابھی کچھ دن پہلے ہی تو اس نے ان کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے، ان کے دونوں ہاتھ بڑی محبت سے تھام کر اپنی شرمندگی کا اظہار کیا تھا، ان سے معافی مانگی تھی...... اپنی بے خبری اور غیر ذمے داری پر! اور اس نے ان سے کہا تھا کہ اب وہ پریشان نہ ہوں۔ اس کے ہوتے

ہوئے کوئی ان کے گھر کی دہلیز نہیں پھلانگ سکتا۔ انھوں نے اس کی بات سنی تھی اور مطمئن نہیں ہوئی تھیں۔ انھیں نہیں معلوم تھا کہ وہ کسی پختہ ارادے کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہے۔ یہ تو انھیں گمان بھی نہیں تھا کہ اس بات کے بعد وہ ہر رات پہرہ دے کر وہ ذمے داری نبھائے گا۔ اور نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے پڑ جائیں گے۔ اس کی رنگت پھیکی پڑ جائے گی۔ اس کی صحت خراب ہو جائے گی۔ اس کی یہ حالت تو انھوں نے خود دیکھی تھی۔ اور پھر جب وہ رات میں تھوڑی دیر پہلے، جب وہ بار بار دیوار کے پاس رک کر گلی میں جھانک رہا تھا تو انھیں مشتبہ لگا تھا۔ انھوں نے سوچا تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں۔ یہ خیال آیا تو وہ شرمندگی سے نڈھال ہو گئیں۔ ارے...... انھوں نے ایسے بے غرض اور جاں نثار لڑکے پر اس طرح کا شک کیا، جو اپنی نیند صرف اس لیے قربان کر رہا ہے کہ وہ سکون سے سو سکیں۔

اس لمحے ان کے دل سے ہر خوف، ہر پریشانی مٹ گئی۔ موت جس وقت آنی ہے سو آئے گی۔ جو کچھ ہونا ہے، وہ ہوگا۔ مشیت کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ اللہ کو جو منظور ہو، وہ ہو کر رہتا ہے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ اللہ کی مہربانی سے کوئی ہے، جو ان کے، ان کے گھر کے اور ان کی بچیوں کے تحفظ کے لیے جاگتا ہے۔ تو وہ ڈر کس بات سے رہی ہیں...... اور کیوں ڈر رہی ہیں۔

انھوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ چھوٹا ٹھاکر اب بھی وہیں بیٹھا تھا۔ وہ اٹھیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اب وہ پوری طرح بے فکر تھیں۔

❀......❀......❀
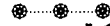
کالج کی فضا بے حد خراب ہو گئی تھی!

جس روز محمود کی موت کی خبر آئی، پورا کالج جیسے سہم گیا۔ محمود بہت زندہ دل اور خوش مزاج لڑکا تھا۔ اس کے مزاج میں دردمندی بھی بہت تھی۔ وہ اپنے نظریات میں بے حد اٹل اور ان کے اظہار میں بے حد پرجوش بھی تھا لیکن اس کے باوجود وہ کالج کے ہر دل عزیز طلبا میں سے تھا۔ جن لوگوں کو اس سے نظریاتی اختلاف تھا، وہ بھی اس کی عزت کرتے تھے۔ اس لیے کہ نظریاتی اختلاف کو وہ ذاتی نہیں بننے دیتا تھا۔ جن سے اختلافات تھے، وہ ان کے بھی کھلے دل سے کام آتا تھا۔

محمود کی موت کا علم انھیں اخبار سے ہوا تھا۔ رات کو دس بجے کے قریب وہ چاندنی چوک کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ اس کے ساتھ مسلم لیگ کے تین کارکن بھی تھے۔ ایک سنسان سڑک پر متعصب ہندوؤں کا ایک گروہ ان پر حملہ آور ہوا۔ حملہ آور چاقوؤں، برچھیوں اور بلموں سے مسلح تھے۔ چاروں افراد کو ختم کرنے کے بعد وہ فرار ہو گئے۔

یہ تمام خبریں مصدقہ نہیں تھیں۔ یہ محض اندازے اور قیاس آرائیاں تھیں کیونکہ اس واقعے کا کوئی عینی گواہ نہیں تھا اور اگر تھا تو سامنے بہرحال نہیں آیا تھا۔ تمام اخبارات نے ظاہری

شواہد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی اپنی پالیسی کے مطابق خبر بتائی تھی۔

بہرحال اس روز کالج میں پڑھائی بالکل نہیں ہوئی۔ پورا کالج تو محمود کے گھر پہنچا ہوا تھا۔ جنازے میں اتنے افراد تھے کہ شاید ہی کسی کو دوسری بار کندھا دینے کا موقع ملا ہوگا۔ محمود کے والد کے حوصلے اور استقامت نے سب کو متاثر کیا۔ غم اور صدمے کے باوجود انھوں نے خود کو سنبھالا ہوا تھا۔ وہ بار بار یہی کہتے کہ یہ تو ایک بیٹا تھا۔ پاکستان پر تو وہ ایسے سو بیٹے بھی قربان کر سکتے ہیں۔ کالج کی لڑکیوں نے بتایا کہ گھر میں محمود کی ماں اور بہنوں کا بھی یہی رویہ تھا۔ ان لوگوں کو پہلی بار پتا چلا کہ محمود اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا اور بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔

اگلے روز کالج کے آڈیٹوریم میں تعزیتی جلسہ ہوا۔ اس جلسے نے کالج کی فضا کو نہایت مکدر اور کشیدہ کر دیا۔ وہ تعزیتی جلسہ کالج کے ایک ہونہار اور ہر دل عزیز طالب علم کی یاد میں ہوا تھا۔ مسلمانوں کی تو بات ہی اور تھی۔ محمود کے قتل کی مذمت تو کالج کے طلبا کی بھاری اکثریت نے کی تھی۔ ان میں ہندو بھی تھے، سکھ بھی اور انگریز بھی۔ اس قتل کی مذمت میں طلبہ یونین بھی پیش پیش تھی۔

یونین کے صدر نے اپنی تقریر میں کہا کہ محمود سیاست کے تشدد بھرے ماحول میں شائستگی، نرمی اور رواداری کا علم بردار تھا۔ اس کی زندگی بھی اس بات کا ثبوت تھی اور موت نے بھی یہ بات ثابت کر دی ہے۔

یہ وہ موقع تھا کہ رام گوپال اور اس کے چند ساتھیوں نے ماحول خراب کر دیا۔ حالانکہ تقریر کے دوران مداخلت کا کوئی جواز نہیں تھا۔ مگر ایک ایک متعصب ہندو لڑکے نے نہایت بدتمیزی کے ساتھ یونین کے صدر کو چیلنج کیا۔ ”یہ بات تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”اگر محمود اور اس کے ساتھی بھی مسلح ہوتے تو دو ایک لاشیں حملہ آوروں کی بھی ملتیں۔“ یونین کے صدر نے کہا۔

”میرے خیال میں تو یہ حملہ آوروں کی جاں بازی کا ثبوت ہے۔“

”جاں بازی! چار نہتے افراد پر دس بارہ مسلح افراد کے حملہ کرنے کو جاں بازی کیسے کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو بہادری کے اصولوں کے خلاف ہے۔“

”یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ حملہ کرنے والے دس بارہ تھے؟“ معترض نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ عین ممکن ہے کہ ان کی تعداد پچاس ہو یا اس سے بھی زیادہ۔“ یونین کے صدر نے بھی تمسخرانہ انداز اختیار کر لیا۔

”یہ سب اخبار والوں کے بنائے ہوئے افسانے ہیں۔ محمود اور اس کے ساتھی ان

حالات میں اتنی رات کو نکلے تھے تو وہ مسلح بھی رہے ہوں گے......"

"اور ان کی آتمائیں پرلوک سدھارتے وقت ان کے ہتھیار بھی ساتھ لے گئی ہوں گی۔" یونین کے صدر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اور اب تم یہ بھی کہو گے کہ اصل میں حملہ آور محمود اور اس کے ساتھی تھے۔ اور دوسرے فریق کی لاشیں اخبار والوں نے غائب کر دی ہوں گی......"

"پولیس بھی مُسلوں سے ملی ہوئی ہے۔" کسی نے پکار کر کہا۔ "اور گورے بھی اس میں شامل ہیں۔"

اس کے بعد وہ ہلڑ بازی ہوئی کہ تعزیتی جلسہ ختم ہو گیا۔

ایک گھنٹے بعد اوتار سنگھ رچرڈ پارسن کے ساتھ کینٹین میں بیٹھا تھا کہ رام گوپال بھی آ گیا۔ وہ بے تکلفی سے ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "اور سناؤ دوستو، کیا حال ہے؟"

"یہ ہنگامہ آرائی غیر ضروری تھی۔" اوتار سنگھ نے اس سے کہا۔

"میں تم سے متفق ہوں۔ یہ جذباتی لوگ گڑبڑ کر دیتے ہیں۔ ان کی وجہ سے میرا منصوبہ دھرا رہ گیا۔"

"اور تمہارا منصوبہ کیا تھا؟" رچرڈ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"مجھے تقریر کرنی تھی اور میں اس میں لوگوں کو بتاتا کہ بھارت ایک ہے اور ایک رہے گا۔ ہم بٹوارا نہیں ہونے دیں گے۔"

"حالانکہ ہندوؤں کی اس پالیسی کی وجہ سے بٹوارا لازمی ہو گیا ہے۔" رچرڈ نے کہا۔ "مسلمانوں کو محبت سے سمجھایا...... قائل کیا جاتا۔ انھیں اچھے مستقبل اور تحفظ کا یقین دلایا جاتا تو شاید بٹوارا رک جاتا۔"

"نہیں رکتا رچرڈ۔ تم ہماری قوم کے مزاج سے ناواقف ہو۔ مسلمان جذباتی طور پر فیصلہ کر چکے ہیں۔ وہ پاکستان بنا کر رہیں گے۔"

"تو پھر اتنے خون خرابے کی کیا ضرورت ہے۔ جب یہ ہونا ہے تو اسے تسلیم کر لو۔" اوتار سنگھ بولا۔

"پاکستان بنے گا۔ لیکن زیادہ دن نہیں چلے گا اور پاکستان بننے تک ہم مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلتے رہیں گے۔ اس سے ان کی طاقت بھی کم ہو گی اور حوصلہ بھی پست ہو گا۔ اب تمام مسلمان تو یہاں سے نہیں جا سکتے نا۔ ہم یہاں سے بھاگنے والے مسلمانوں کو بھی کاٹتے رہیں گے اور یہاں رہ جانے والوں کو بھی مارتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ بچے کھچے مُسلوں کی سمجھ میں آ جائے گا کہ ان کی بقا صرف بھارت میں ہے۔ ہمارا خواب اکھنڈ بھارت ہے۔ میں آج یہی بتانا چاہتا تھا کہ مُسلے پاکستان کا خیال دل سے نکال دیں۔ ورنہ انھیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ میں انھیں

بتانا چاہتا تھا کہ اصل پاکستان وہ ہے، جہاں محمود اور اس کے ساتھی گئے ہیں..... پرلوک میں! وہ نہیں مانیں گے تو جیسے ہم نے محمود اور ان کے ساتھیوں کو پاکستان بھیجا ہے، ویسے ہی دو دو چار چار کر کے ہم ان سب کو پاکستان بھیجتے رہیں گے......"

اوتار سنگھ بہت متحمل مزاج تھا۔ لیکن اس کا تحمل جواب دینے لگا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"رچرڈ، تم اگر بیٹھنا چاہو تو بیٹھو۔ لیکن میں یہ بدبودار گفتگو مزید برداشت نہیں کر سکتا۔"

جواب میں رچرڈ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں بھی چل رہا ہوں۔"

وہ دونوں جا رہے تھے کہ عقب سے رام گوپال چلایا۔ "تم کالی بھیڑ ہو اوتار سنگھ اور میں جانتا ہوں کہ ہمارے درمیان کالی بھیڑیں موجود ہیں۔"

اوتار سنگھ پلٹا اور اس کی طرف واپس آیا۔ اس کے بہت قریب آ کر وہ رکا۔ "کالی بھیڑ میں نہیں ہوں، تم ہو رام گوپال۔ کیونکہ کالی بھیڑیں اکثریت میں کبھی نہیں ہوتیں۔ تم جیسے لوگ اپنے عمل سے امن پسند اکثریت کو رسوا کر رہے ہیں۔ ملک کا ماحول خراب کر رہے ہیں۔"

"امن پسندی...... ہنہہ!" رام گوپال نے حقارت سے کہا۔ "یہ بزدلی کو چھپانے والا لفظ ہے۔"

"بزدلی اور بہادری تم کیا جانو۔" اوتار سنگھ نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ ساتھ ہی اس کا ہاتھ رام گوپال کے گلے کی طرف لپکا۔

رام گوپال کو شاید پہلے سے اندازہ تھا۔ وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ "یہ کیا طریقہ ہے اوتار سنگھ......؟"

"تمھیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں رام گوپال۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم نہیں سمجھو گے۔ یہ امن پسندی ہے۔ میں یہیں، اسی وقت صرف اپنے ہاتھوں سے تمھیں ختم کر سکتا ہوں۔ یہ بہادری بھی ہے اور امن پسندی بھی۔ بہادری ایسے کہ میں یہ کر سکتا ہوں اور امن پسندی ایسے کہ میں یہ نہیں کروں گا اور تم جس طرح گھبرا کر پیچھے ہٹے ہو، یہ بزدلی ہے۔ اس وقت تمھارے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ لیکن ابھی تمھارے ساتھ چند کالی بھیڑیں اور ہوتیں اور تمھارے پاس ہتھیار بھی ہوتے تو تم مجھے کاٹ کر پھینک دیتے۔ یہ بزدلی ہے رام گوپال۔ اور مجھے فخر ہے کہ محمود جیسا بہادر آدمی میرا دوست تھا۔ آئندہ میرے سامنے اس انداز میں کبھی نہ بولنا رام گوپال۔ میں تم جیسے تیس چالیس مسلح افراد سے اکیلا ہی نمٹ سکتا ہوں۔ یاد رکھنا رام گوپال، میں راجپوت ہوں اور بزدلوں سے دوستی نہیں رکھتا۔" یہ کہہ کر اوتار سنگھ پلٹا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا کینٹین سے نکل گیا۔ رچرڈ پارسن اس کے پیچھے تھا۔

رام گوپال بت بنا کھڑا تھا۔ وہ شاک میں تھا۔ نرم خو، نرم گفتار اوتار سنگھ کا یہ روپ اسی

نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اوتار سنگھ کا لہجہ تو اب بھی سخت نہیں تھا۔ بلکہ پہلے سے زیادہ نرم تھا۔ لیکن جو کچھ اس نے کہا تھا، اس نے رام گوپال کو دہلا دیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ رام گوپال کو اس کے کہے ہوئے ہر لفظ پر یقین تھا۔ اس نے جو کہا تھا، وہ کر کے بھی دکھا سکتا تھا۔

رام گوپال صرف متعصب ہی نہیں، بے حد کینہ پرور بھی تھا۔ ٹھیک ہے اوتار سنگھ۔ میں تمہاری ہر بات یاد رکھوں گا۔ میں وہ موقع نہیں دوں گا تمہیں کہ تم اپنی بات سچ ثابت کر سکو میں تمہیں ایسی سزا دوں گا کہ تم تڑپتے رہو گے اور کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔

❀……❀……❀

تین دن بعد کالج میں امتحان کی تیاری کے سلسلے میں دی جانے والی چھٹیوں کا اعلان ہو گیا۔ نام تو امتحان کی تیاری کا تھا۔ لیکن در حقیقت کالج کے سخت کشیدہ ماحول کی وجہ سے چھٹیاں ایک ہفتہ پہلے ہی شروع کر دی گئی تھیں۔

اوتار سنگھ کے لیے وہ اچھی خبر تھی۔ کالج میں ویسے بھی پڑھائی بالکل نہیں ہو رہی تھی۔ وہاں وقت ہی ضائع ہوتا تھا۔ رات کو کوٹھے پر پہرہ دینے کے دوران وہ بالکل نہیں پڑھتا تھا۔ کیونکہ جانتا تھا کہ وہ کتاب میں ایسا محو ہو جائے گا کہ اسے گرد و پیش کی خبر نہیں رہے گی۔ دن میں دو گھنٹے سونے کے معمول کی وجہ سے پڑھائی کا وقت بہت کم رہ گیا تھا۔

اب کالج کی چھٹیاں ہوئیں تو اسے پڑھائی کا موقع مل گیا۔ اس نے اپنے معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ وہ کالج جانے کے حساب سے ہی اٹھتا تھا۔ فرق یہ تھا کہ کالج جانے کے بجائے وہ گھر پر ہی پڑھائی کر رہا تھا۔ جو وقت اس کا کالج سے واپسی کا تھا، اس وقت تک وہ پڑھائی کرتا تھا۔ پھر وہ کھانا کھاتا اور دو گھنٹے کے لیے سو جاتا۔ اٹھنے کے بعد پھر پڑھائی شروع۔ یہاں تک کہ رات کے پہرے کا وقت آ جاتا۔

شہر کی فضا میں کشیدگی اور بڑھ گئی تھی۔ مسلمانوں کے چھرا گھونپنے کے واقعات میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ گلی سے گزرنے والے جلوسوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ان میں پاکستان مخالف ہندوؤں کے جلوس بھی ہوتے تھے، جن میں سکھ بھی خاصی تعداد میں شامل ہوتے تھے۔ مسلمانوں کے جلوس البتہ ان کے مقابلے میں زیادہ ہوتے تھے۔ لیکن ان جلوسوں میں بڑی تعداد بچوں کی ہوتی تھی۔

تین چار مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک ہی وقت میں دونوں متحارب جلوس گلی میں داخل ہوئے۔ ایک ایک طرف سے اور دوسرا دوسری طرف سے۔ اسی کے نتیجے میں تصادم ہوا۔ ڈنڈے چلے۔ کچھ افراد زخمی ہوئے۔ مگر ہلاکت کی نوبت نہیں آئی۔ اوتار سنگھ اور رگھو ہر بار پہنچے گئے اور بیچ بچاؤ کرایا۔ ورنہ بات بہت آگے بڑھ جاتی۔

ایسے موقعوں پر اوتار سنگھ کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنی لٹھیا اٹھائے اور زیادتی کرنے والے ہندوؤں پر پل پڑے۔ لیکن مصلحت اور حکمت نے اسے روک دیا۔ اگر وہ کھلے عام مسلمانوں کی حمایت کرتا تو وہ اس کی ماں جی کے گھرانے کے لیے نقصان دہ ہوتا۔ ان کے تحفظ کے لیے اس کا خود کو غیر جانب دار ظاہر کرنا ضروری تھا۔

امتحان شروع ہوئے اور ختم بھی ہو گئے۔ اوتار سنگھ کے سر سے جیسے کوئی بوجھ اتر گیا۔ نجانے کیا بات تھی کہ اس بار امتحان اسے بہت بے معنی اور بوجھ لگ رہے تھے۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ ان امتحانوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ دے یا نہ دے، کامیاب ہو یا ناکام، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ امتحان کے بعد جو آزادی کا احساس ہوتا تھا، وہ پہلے سے بھی بڑھ کر تھا۔

امتحانوں کے دوران بھی اس کا معمول نہیں بدلا تھا۔ ہفتے میں ایک بار وہ ماسٹر جی کے پاس جاتا اور ان کے ساتھ دن گزارتا۔ ان کی ظاہری حالت تو اب بھی پہلے جیسی ہی تھی۔ لیکن ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ اب ماسٹر جی پر کثرت سے کھانسی کے دورے پڑنے لگے ہیں۔ ان کا دورانیہ بھی زیادہ ہو گیا ہے اور شدت بھی بڑھ گئی ہے۔ اس کے علاوہ منہ سے خون آنا بھی بڑھ گیا ہے۔ مجموعی طور پر صورتِ حال اچھی نہیں تھی۔ ڈاکٹر عام طور پر مکمل طور پر مایوس تو نہیں ہوئے۔ لیکن ڈاکٹر نے کھل کر کہا کہ صورتِ حال امید افزا ہرگز نہیں ہے۔ علاج کے باوجود مرض بہت بڑھ گیا ہے۔

ایک بار تو اوتار سنگھ کی موجودگی میں ماسٹر جی پر دورہ پڑا۔ اوتار سنگھ سے ان کی تکلیف، ان کی وہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اس دوران ماسٹر جی کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا تھا کہ سانس ٹوٹ ہی جائے گی۔ وہ دُہرے ہو ہو جاتے تھے۔ جسمانی طور پر وہ اتنے کمزور ہو چکے تھے کہ وہ تکلیف ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ ان کا پورا جسم تشنجی کیفیت میں تھا۔ آخر میں ان کے منہ سے جیتا جاگتا خون باہر آیا تھا۔

دورہ تقریباً 25 منٹ جاری رہا۔ اس کے نتیجے میں ماسٹر جی بے جان ہو کر رہ گئے۔ جس وقت انھیں اس سے نجات ملی تو ان میں آنکھیں کھلی رکھنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد تین گھنٹے تو ان پر غشی طاری رہی۔ پھر جب وہ اس غشی سے نکلے تو انھیں تھوڑا سا دلیہ دیا گیا۔ تب کہیں وہ بات کرنے کے قابل ہوئے مگر ان کی آواز تک سے کمزوری عیاں تھی۔

''تم نے دیکھا بیٹے۔'' انھوں نے اوتار سنگھ سے کہا۔ ''یہ حال ہوتا ہے میرا۔ جب بھی دورہ پڑتا ہے تو میں بھگوان سے موت کی پرارتھنا کرنے لگتا ہوں۔''

''آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ حوصلہ رکھیں ماسٹر جی۔''

''صرف تمہاری خاطر میں لڑ رہا ہوں۔ ورنہ تکلیف سے جی چاہتا ہے کہ حوصلہ چھوڑ دوں۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ موت میں بڑی راحت ہے۔''

ماسٹر جی کی اذیت اور بے بسی نے اوتار سنگھ کو دہلا دیا تھا۔ وہ بھی یہی بات سوچ رہا تھا کہ جب زندگی پوری ہو جائے تو موت راحت ہے۔ موت نجات ہے۔ لیکن وہ یہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ بے بسی یہ تھی کہ وہ سوچ خودکار تھی۔ اس پر اس کا اختیار نہیں تھا۔

ماسٹر جی نے اسے چونکا دیا۔ ''اوتار سنگھ، تمھیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟'' انھوں نے نحیف آواز میں پوچھا۔

اوتار سنگھ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس کا ذہن ویسے ہی الجھا ہوا تھا۔ ''کون سا وعدہ ماسٹر جی؟''

''میں نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ میری چتا کو آگ تم ہی دو گے۔''

اس یاددہانی کے جواب میں کچھ کہنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

ماسٹر جی کی حالت نے اسے دکھی کر دیا۔ وہ کچھ عرصہ اس نے بڑی ذہنی اذیت میں گزارا۔ وہ دہلی میں ہوتا تو اسی کا دل ماسٹر جی میں اٹکا رہتا۔ اور وہ ماسٹر جی کے پاس ہوتا تو گھر کی فکر لگی رہتی۔ یہی نہیں، اس کے ضمیر پر ایک اور بوجھ آ گیا تھا۔ اب جبکہ وہ کالج نہیں جا رہا تھا تو اسے ماسٹر جی کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا چاہیے تھا۔ بلکہ اصولاً تو اسے کچھ دن ماسٹر جی کے ساتھ گزارنے چاہیے تھے۔ لیکن یہاں تو ایک دن بھی اس کے لیے بھاری ہو جاتا تھا۔ ایسے میں وہ اپنی بے بسی اور تقسیم پر کڑھنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس کا پہرہ دینے کا معمول اب بھی جاری تھا۔ بلکہ اب تو وہ رات بھر کوٹھے پر رہتا تھا۔ صبح ہوتی تو نیچے آتا۔ اب صبح ناشتے کے بعد وہ دوپہر تک سو لیتا تھا۔

❀......❀......❀
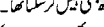
چھمن بوا کو اچانک چھوٹا ٹھاکر بہت برا لگنے لگا تھا!

بہادر علی سے اس رات کی گفتگو کے بعد وہ مسلسل تشویش زدہ اور پریشان رہنے لگی تھیں۔ گلی میں پتنگ لوٹنے والے بچوں کا شور بھی ہوتا تو وہ دہل جاتیں اور دروازے پر جا کر باہر کی سن گن لیتیں کہ کہیں حملہ تو نہیں ہو گیا ہے۔ پاکستان کے حق میں نعرے لگاتا کوئی جلوس گلی میں داخل ہوتا تو بھی ان کی حالت غیر ہو جاتی اور اکھنڈ بھارت والوں کا جلوس آتا تو وہ گویا سولی پر ہی لٹک جاتیں۔

ایک دن تو ان کا بہت برا حال ہوا۔ دروازے سے ٹکے ٹکے انھیں یوں لگا کہ وہ اب گریں اور جب گریں۔ ہوا یہ کہ ایک طرف سے مسلمانوں کا جلوس گلی میں داخل ہوا اور دوسری طرف سے ہندوؤں کا جلوس آ گیا۔ دونوں طرف کے نعرے گھل مل گئے۔ آوازوں کا حجم اور لہجوں کی تندی بڑھتی گئی۔ اس سے چیخ پکار اور آہ و زاری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ

دونوں جلوسوں میں ٹکراؤ ہو گیا ہے۔ اب چھمن بوا میں دروازہ کھولنے کی ہمت تو نہیں تھی۔ بلکہ وہ تو وہاں سے بھاگ کر ہٹ جانا چاہتی تھیں۔ لیکن ان کے پاؤں تو جیسے من من بھر کے ہو گئے تھے۔

اچانک اوپر والے زینوں کی طرف سے لپکتے ہوئے قدموں کی چاپ اُبھری۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ قدموں کی چاپ بتاتی تھی کہ اترنے والے دو افراد ہیں۔ اور وہ چھوٹا ٹھاکر اور رگھو ہی ہو سکتے تھے۔

پھر گلی میں چھوٹے ٹھاکر کی آواز ابھری۔ ''ارے ہٹو...... چھوڑو۔ یہ کیا وحشت ہے۔''

چھمن بوا کو اندازہ ہو گیا کہ چھوٹا ٹھاکر بیچ بچاؤ کرا رہا ہے۔ چند منٹ میں تصادم تو موقوف ہو گیا۔ لیکن دونوں طرف کی تند و تیز گفتگو اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ آوازوں میں وحشت تھی اور لہجوں میں تیزی اور نفرت۔ شاید اسی لیے چھمن بوا کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہیں آ رہا تھا۔

مگر پھر چھوٹے ٹھاکر کی شائستہ آواز ابھری۔ لہجے میں نرمی اور تحمل تھا۔ اس کا کہا ہوا ایک ایک لفظ ان کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

''یہ کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو۔ ہمیشہ سے ساتھ رہنے والے، رشتے داروں سے بڑھ کر ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے والے، بے لوث ایک دوسرے کے کام آنے والے.... آج تم ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو رہے ہو۔ جانوروں کی طرح لڑ رہے ہو......''

لہجے میں ملامت اور شکایت۔

کچھ ملی جلی آوازیں......

''جلوس نکالنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ صرف نفرتیں بڑھیں گی۔ دلوں کے فاصلے بڑھیں گے۔ جو ہونا ہے، وہ تو ہو کر رہے گا۔''

مزید آوازیں......

''تم تو اکثریت میں ہو۔ تمہارا رویہ بڑے بھائی جیسا ہونا چاہیے۔''

''یہ لوگ 'بن کے رہے گا پاکستان'...... 'بٹ کے رہے گا ہندوستان' کا نعرہ کیوں لگاتے ہیں۔ ہمیں چڑانے کے لیے؟ تو ہم انھیں سبق بھی نہ سکھائیں۔'' ایک تند آواز ابھری۔

''تم اپنی کہو۔ تم کون ہو؟ ان کی طرف داری کیوں کر رہے ہو؟'' ایک اور تند آواز......

ایک لمحہ ایسی خاموشی رہی، جیسے جواب دینے والا لاجواب ہو گیا ہو۔ پھر چھوٹے ٹھاکر کی آواز ابھری۔ ''میں ہندو ہوں...... راجپوت۔'' اس کی آواز میں جھجک تھی اور لہجے میں فخر۔

''اور میں کسی کی طرف داری نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو دلوں کی نفرت مٹانے کی، آگ بجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' ایک لمحے کا موقف۔ پھر چھوٹا ٹھاکر شاید دوسرے گروہ سے مخاطب ہوا۔ ''یہ بات تو واقعی غلط ہے۔ جب تمھارے کسی نعرے سے کسی بھائی کی دل آزاری ہوتی ہے تو وہ نعرہ

کیوں لگاتے ہو؟''

''یہ ہمارا عزم ہے۔ پاکستان بن کر رہے گا۔ ہندوستان تقسیم ضرور ہوگا۔'' ایک کم عمر جذباتی آواز......

''یہ نہیں ہوگا۔ اس سے پہلے ہم تمھیں مٹا دیں گے۔''

''ہمیں جان کی پروا نہیں۔ پاکستان پر ایسی سو جانیں قربان...... ''

چھوٹے ٹھاکر نے پھر مداخلت کی۔ ''عزم دل میں ہوتا ہے۔ آدمی کے اندر رہتا ہے۔ نعرہ تو یقین کی کمزوری کی دلیل ہے۔ اگر تمھارا یقین سچا ہے تو اعلان مت کرو...... چیلنج مت کرو۔ تمھارا یقین سچا ہے تو تمھارا خیال حقیقت میں بدل جائے گا۔ نعرے سے فساد ہوتا ہے تو نعرہ مت لگاؤ۔''

''انھیں نعرے لگانے دو۔ ہم انھیں ٹھکانے لگا دیں گے۔''

''ہم تم سے ڈرتے نہیں ہیں۔ ہم تو شہادت کی آرزو کرتے ہیں۔''

''اور ہم تمھاری آرزو پوری کرنا چاہتے ہیں۔''

''تو آجاؤ......''

''بس!'' اچانک چھوٹے ٹھاکر نے گرج کر کہا۔ اس کا لہجہ اچانک بدل گیا تھا۔ ''میں تمھیں بتا دوں کہ ہم ہندو بہت روادار ہیں...... اہنسا کے پجاری ہیں۔ تمھیں سمجھ لینا چاہیے کہ ہمیں اشتعال دلاؤ گے تو وہ پاکستان کم از کم تمھیں کبھی نہیں ملے گا، جس کے تم خواب دیکھ رہے ہو۔ اس لیے کہ تم مارے جاؤ گے۔ کان کھول کر سن لو۔ اب اس گلی میں کوئی جلوس نہیں آئے گا۔ کوئی نعرہ نہیں لگے گا۔ یہاں ہندو مسلمان صدیوں سے بھائیوں کی طرح رہ رہے ہیں۔ میں یہاں کی فضا خراب نہیں ہونے دوں گا۔'' اس نے لاٹھی زور سے زمین پر ماری۔ ''اور یہ بات میں کہہ رہا ہوں۔ جسے اختلاف ہو، وہ مقابلے پر آجائے۔ تم سب کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ میں اس گلی میں صرف امن اور محبت دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وہاں سناٹا چھا گیا۔ پھر آوازوں سے لگا کہ دونوں گروہ منتشر ہو گئے ہیں۔ گلی میں خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد زینے پر اوپر جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ چھمن بوا بھی لرزتی ٹانگوں کے ساتھ دروازے سے ہٹ آئیں۔ اس لمحے سے چھوٹا ٹھاکر انھیں برا لگنے لگا۔ آخر میں اس نے مسلمانوں کو کتنی نفرت اور حقارت سے مخاطب کیا تھا اور اس نے کتنے فخر سے خود کو ہندو اور راجپوت کہتے ہوئے ہندوؤں کی رواداری اور امن پسندی کی تعریف کی تھی۔ اس نے کھلم کھلا اپنے متعصب ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ اس نے واضح طور پر جانب داری برتی تھی۔ اور اندرون خانہ وہ بڑی بیگم کا بیٹا بنا بیٹھا ہے۔ اسے کہتے ہیں بغل میں چھری اور منہ پر رام رام۔

پریشان اور خوف زدہ تو وہ تھیں ہی۔ اس صدمے کے نتیجے میں انھیں بیٹھے بیٹھے بڑبڑانے، خود کلامی کرنے کی عادت ہوگئی۔ وجہ یہ بھی تھی کہ اب وہ چھوٹے ٹھاکر سے خوف زدہ تھیں اور اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ خوف سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کا اعتبار اس پر سے اٹھ گیا تھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ کسی دن وہ خود ہی بغلی دروازے سے گھر میں گھس آئے گا اور سب کو کاٹ کر رکھ دے گا۔ اس وہم سے دن بھر وہ اس دروازے کو دیکھتیں کہ اپنی طرف سے بند ہے یا نہیں۔ رات کو سونے سے پہلے وہ خاص طور پر اس دروازے کو دیکھتیں۔

بڑبڑانے کا معمول ایسا تھا کہ وہ کوئی بھی کام کرتے ہوئے بڑبڑانا شروع کر دیتیں اور انھیں خود بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ بڑبڑا رہی ہیں۔

اس روز بھی وہ بڑبڑا رہی تھیں۔ ''موئے کافر تو ہوتے ہی منافق ہیں......''

یہ بات قریب بیٹھی ہوئی نور بانو نے سن لی۔ ''یہ آپ کس کے بارے میں بات کر رہی ہیں بوا؟''

چھمن بوا نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''میں کب بات کر رہی ہوں۔'' انھوں نے کہا ''میں تو چپ بیٹھی ہوں۔''

''کمال ہے بوا۔ آپ بول رہی ہیں اور بولنے سے انکاری بھی ہیں۔ بتائیے نا'' کس کے بارے میں کہہ رہی تھیں آپ۔''

چھمن بوا نے غور سے اسے دیکھا کہ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہی ہے۔ لیکن اس کے چہرے پر تو گہری سنجیدگی تھی۔ ویسے بھی نور بانو نہ مذاق کرتی تھی اور نہ ہی کبھی جھوٹ بولتی تھی۔ وہ پریشان ہو گئیں۔ کیا سچ مچ وہ ایسے بول رہی تھیں کہ انھیں خود بھی علم نہیں تھا۔ یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔ کیا دماغ چل گیا ہے میرا؟ ارے...... ابھی تو میں ساٹھ کی ہوئی بھی نہیں۔

''اچھا یہ بتاؤ، میں کیا کہہ رہی تھی؟''

''آپ کو نہیں معلوم کہ مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔''

''مجھے واقعی نہیں معلوم۔''

نور بانو نے چند لمحے انھیں تولنے والی نگاہوں سے دیکھا۔ پھر ان کی بات دہرا دی۔

چھمن بوا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''یہ کہہ رہی تھی میں؟'' انھیں یقین ہونے لگا کہ وہ سٹھیا رہی ہیں۔

''جی ہاں، یہی کہہ رہی تھیں آپ۔ اب یہ بتائیں، کس کے بارے میں کہہ رہی تھیں؟''

چھمن بوا صرف ایک لمحے کو ٹھٹکی تھیں۔ ''ارے وہی چھوٹا ٹھاکر۔ اور کس کے بارے

میں کہوں گی۔'' انھوں نے جھنجلا کر کہا۔

''چھوٹے ٹھاکر نے ایسا کیا کر دیا؟'' نور بانو کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔

چھمن بوا نے سب کچھ اسے بتا دیا۔

''میں تو پہلے ہی سے کہتی ہوں یہ بات۔'' نور بانو نے کہا۔ ''لیکن اماں تو سچ مچ اسے اپنا بیٹا سمجھتی ہیں۔''

نور بانو سے وہ بات حور بانو اور گلنار تک پہنچی۔ حور بانو یہ سن کر بہت تلملائی۔ لیکن چھمن بوا نے جو بات اپنے کانوں سے سنی تھی، اس کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں تھا۔

اس طرح یہ بات سرفراز بیگم تک بھی پہنچ گئی۔ کئی دن سے وہ دیکھ رہی تھیں کہ لڑکیاں سر جوڑے بیٹھی سرگوشیوں میں گفتگو کرتی رہتی ہیں۔ ان کے انداز سے لگتا تھا کہ بحث کر رہی ہیں۔ کوئی ایسا متنازعہ معاملہ تھا، جس پر وہ متفق نہیں تھیں۔ ان کے استفسار پر نور بانو نے انھیں وہ بات بتا دی۔ سرفراز بیگم تو دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

''اماں...... دل چھوٹا نہ کریں۔ اللہ حفاظت کرنے والا ہے۔'' نور بانو نے بڑے خلوص سے انھیں دلاسہ دیا۔ ''بس اندر کے دشمن سے ہوشیار رہنا ضروری ہے۔ یہ تو اللہ کی رحمت ہے کہ اندر کے دشمن کا پتا چل گیا......''

''بس چپ رہو تم۔'' سرفراز بیگم نے اسے اس طرح ڈانٹا کہ وہ دہل کر رہ گئی۔ اس سے پہلے اماں نے کبھی ایسے درشت لہجے میں بات نہیں کی تھی۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ تینوں لڑکیاں سہمی ہوئی بیٹھی تھیں۔ اماں کی برہمی ان کی سمجھ سے باہر تھی۔

سرفراز بیگم سوچ رہی تھیں کہ انھیں کیا بتائیں، کس طرح سے سمجھائیں۔ وہ جانتی تھیں کہ نور بانو شروع ہی سے چھوٹے ٹھاکر سے چڑتی ہے۔ وہ اسے ضد بھی نہیں دلانا چاہتی تھی۔ مگر سمجھانا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ انھوں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''دیکھو...... تم لوگ ابھی چھوٹی ہو۔ دنیا کا تمھیں کچھ پتا نہیں اور میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ میں آدمی کو پہچانتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس وقت جو کچھ میں تم سے کہوں، وہ تمھیں ہمیشہ یاد رہے۔ اسے کبھی نہ بھولنا تمھیں میری قسم...... تمھارے مرے ہوئے باپ کی قسم......''

تینوں لڑکیاں اور دہل گئیں۔ اماں نے پہلے کبھی انھیں قسم نہیں دی تھی۔ وہ تو اس کے سخت خلاف تھیں۔ ''آپ کہیں اماں، ہم یاد رکھیں گی۔'' حور بانو بولی۔

''چھوٹے ٹھاکر سے تمھیں اللہ واسطے کا بیر ہے۔ میں جب بھی تمھیں سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں تو یہ نور بانو تاویلیں لانے لگتی ہے۔ اس کی اچھائی کو برائی میں بدل دیتی ہے۔ تم

مجھے بے وقوف سمجھتی ہو۔ مگر تم خود بے وقوف ہو۔ آج میں تمھیں وہ کچھ نہیں بتاؤں گی، جو میں جانتی ہوں۔ تم اس میں بھی بدنیتی تلاش کر لو گی۔ اس لیے میں تمھیں حکم دے رہی ہوں۔ اسے میری وصیت سمجھ لو......''

ان الفاظ پر تینوں لڑکیاں تھرا کر رہ گئیں۔ لیکن کسی میں کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔

''چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں جس کا جو گمان ہے، بے شک وہ اس پر قائم رہے۔ لیکن میں تمھیں حکم دے رہی ہوں کہ ہمیشہ اس پر ویسا ہی اعتبار کرنا، جیسا مجھ پر کرتی ہو۔ اور اسے اپنا ویسا ہی بہی خواہ سمجھنا، جیسا بہادر علی کو سمجھتی ہو۔ چھوٹے ٹھاکر سے تمھیں کبھی دھوکہ نہیں ملے گا۔ وہ تمہاری ویسی ہی حفاظت کرے گا۔ جیسے بہنوں کے بھائی کرتے ہیں۔ اس سے کبھی نہ ڈرنا اور اس سے بڑھ کر اعتبار کسی پر نہ کرنا۔ سمجھ گئیں۔''

''مگر اماں......'' نور بانو نے کچھ کہنا چاہا۔

''اگر مگر نہیں۔ میں نے تمھیں بہت بڑی قسم دی ہے۔ آگے تم جانو۔'' یہ کہہ کر سرفراز بیگم اٹھ گئیں۔

اس کے بعد انھوں نے چھمن بوا کی خبر لی۔ ''بوا...... تم نے تو حد ہی کر دی۔ ایسے حالات میں تم بچیوں کو ان کے ہمدرد سے برگشتہ کر رہی ہو۔ انھیں بدگمانی میں مبتلا کر رہی ہو۔ ارے بچیوں کو تو ان حالات کا پتا ہی نہیں چلنا چاہیے تھا۔ اور تم نے تو انھیں گھر کے آدمی سے خوف زدہ کر دیا۔''

چھمن بوا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ''آپ کس کی بات کر رہی ہیں بڑی بیگم؟'' انھوں نے سہم کر پوچھا۔

''میں چھوٹے ٹھاکر کی بات کر رہی ہوں بوا۔''

''میں نے تو بچیوں کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ وہ تو انھوں نے مجھے بڑبڑاتے ہوئے سن لیا۔ پھر مجھے کھولنا پڑا۔''

''جو ہوا سو ہوا۔ اب آئندہ تم چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں بچیوں سے کبھی بات نہ کرنا۔ یہ میرا حکم ہے۔''

چھمن بوا ان کے سامنے دم نہیں مار سکیں۔ پہلی بار بڑی بیگم نے ان سے اس طرح بات کی تھی۔ لیکن چھوٹے ٹھاکر کی یہ حمایت ان کے حلق سے نہیں اُتری۔ موقع پاتے ہی انھوں نے اس سلسلے میں بہادر علی سے بات کی۔ انھوں نے بہادر علی کو سب کچھ بتایا اور پھر بولیں۔ ''مجھے تو لگتا ہے، چھوٹے ٹھاکر نے بڑی بیگم پر کوئی جادو کر دیا ہے۔''

''جہالت کی باتیں مت کرو۔'' بہادر علی نے الٹا انھیں ڈانٹ دیا۔ ''جانتی بھی ہو، چھوٹا

ٹھاکر اس گھر اور گھر والوں کی حفاظت کے لیے رات بھر پہرہ دیتا ہے۔''

چھمن بوا کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ''یہ کیسے کہہ رہے ہو تم؟''

''آنکھوں دیکھی کہہ رہا ہوں۔ اور بڑی بیگم کو بھی یہ بات معلوم ہے۔''

''تو پھر وہ اس دن گلی میں ایسی باتیں کیوں کر رہا تھا؟'' چھمن بوا نے اچنبھے سے کہا۔

''یہ تو میں نہیں جانتا۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ اسے ہم سب کی حفاظت کی فکر ہے۔'' بہادر علی نے بے حد یقین سے کہا۔ پھر چند لمحے سوچنے کے بعد وہ بولا۔ ''ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ ہماری خاطر ہندوؤں میں اپنا اعتبار قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ ہندو اسے ہمارا ہم نوا اور محافظ سمجھیں۔ ایسا ہوا تو اس کا کام اور مشکل ہو جائے گا۔''

''تو یہ منافقت تو ہوئی نا۔'' چھمن بوا نے تنک کر کہا۔

''یہ منافقت نہیں۔ اسے مصلحت کہتے ہیں۔ آج کے دور میں یہ سیاست کہلاتی ہے۔ اور یاد کرو، اس دن کے بعد سے ہندوؤں کے جلوس تو رک گئے نا۔ اور مسلمانوں کے جلوس اب بھی نکلتے ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر نے انھیں تو کبھی نہیں ٹوکا۔ گلی کا فساد تو بہرحال رک گیا نا۔''

چھمن بوا نے ذہن پر زور دیا۔ بہادر علی کی بات واقعی ٹھیک تھی۔ جس روز چھوٹے ٹھاکر نے دونوں جلوسوں کے شرکا کو سختی سے ڈانٹا تھا اور ہندوؤں کی خاص طور پر حمایت کی تھی، اس دن کے بعد سے ہندوؤں کا کوئی جلوس گلی میں داخل نہیں ہوا تھا۔ مگر مسلمان نہیں رکے تھے اور چھوٹا ٹھاکر بھی اس دن سے جلوس کو روکنے کے لیے نیچے نہیں اترا تھا۔

اس رات چھمن بوا نہیں سوئیں۔ آدھی رات کو وہ دبے پاؤں باہر آئیں۔ انھوں نے دیکھا کہ چھوٹا ٹھاکر کوٹھے پر ٹہل رہا ہے۔ وہ مطمئن ہو گئیں۔ ساتھ ہی انھیں افسوس ہوا کہ اس کے بارے میں اس طرح کی بات کر کے وہ گنہگار ہوئیں۔ اب وہ اسی طرح اس کا کفارہ ادا کر سکتی تھیں کہ لڑکیوں کو حقیقت بتا دیں۔ لیکن اس کی انھیں ہمت نہیں ہوئی۔ بڑی بیگم نے سختی سے انھیں حکم دیا تھا کہ اب وہ لڑکیوں سے چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں کوئی بات نہ کریں۔

وہ دل پر بوجھ لیے پھرتی رہیں!

❁ .... ❁ .... ❁
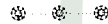
اوتار سنگھ مطالعہ کرنے کا عادی تھا۔ لیکن ان دنوں اس کے لیے کچھ پڑھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ ایسے میں اچانک اسے عربی کا خیال آ گیا۔ اس نے پرانی کاپیاں اٹھائیں اور عربی کو تازہ کرنے لگا۔ آخری دنوں میں مولوی صاحب نے اسے عربی میں کئی کہانیاں لکھ کر دی تھیں۔ وہ انھیں بھی پڑھنے لگا۔ پھر اس نے ان کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے کیے ہوئے اردو ترجمے کو عربی میں منتقل کیا اور اس کا موازنہ مولوی صاحب کی لکھی ہوئی کہانیوں سے

کیا۔ اس مشق سے اسے بہت فائدہ ہوا۔ اس کی عربی کی استعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور اس معاملے میں اس کی خود اعتمادی بھی بڑھ گئی۔

اس معمول سے اسے بہت فائدہ ہوا۔ اس میں اس کا دل لگتا تھا، اس لیے اسے خوشی بھی ہوئی۔ ورنہ مطالعے میں دل نہ لگنے کے نتیجے میں اس کے لیے وقت گزارنا بھی مسئلہ ہو گیا تھا اور وہ مسلسل اعصابی تناؤ کا شکار رہنے لگا تھا۔ اس خوشی نے اس تناؤ کو کم کر دیا۔

ماسٹر جی کی حالت اور خراب ہو گئی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بار پھر ان کے گھر گیا اور ان کے بیٹوں سے بات کی۔ اس نے انھیں یہاں تک بتا دیا کہ کسی بھی وقت انھیں ماسٹر جی کی طرف سے کوئی بری خبر مل سکتی ہے۔ لیکن یہ سن کر بھی ان کے دل نہیں پسیجے۔ انھوں نے پہلے کی طرح اسے ٹرخا دیا۔ ان کی اس بے حسی نے اسے بہت دکھی کر دیا۔

ملکی صورتِ حال بھی اور ابتر ہو گئی تھی۔ مارچ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو انڈیا کا وائسرائے مقرر کر دیا گیا۔ اس تقرری پر کانگریس میں خوشی کے شادیانے بجے۔ وجہ یہ تھی کہ پنڈت جواہر لال نہرو سے ماؤنٹ بیٹن کے قریبی تعلقات تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعد میں وہ تعلقات کانگریس کے کام آئے۔ ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کی تشکیل کے معاملے میں جانب داری سے کام لے کر مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ بہت سے ایسے علاقے جنھیں اصولاً پاکستان میں شامل ہونا تھا، پاکستان میں شامل نہ ہو سکے۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو جانی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔

بہرحال جس وقت ماؤنٹ بیٹن نے چارج سنبھالا، پورا ہندوستان یک طرفہ فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں خانہ جنگی میں مبتلا تھا۔ اس صورتِ حال میں مسئلے کا واحد حل تقسیم ہند تھا۔ یعنی ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کا قیام ناگزیر ہو چکا تھا۔ 3 جون کو ماؤنٹ بیٹن نے اپنا منصوبہ پیش کیا، جسے ماؤنٹ بیٹن پلان کا نام دیا گیا۔ اس پلان میں 15 اگست 47ء کو اقتدار کی منتقلی کا دن قرار دیا گیا تھا۔

ایک رات اوتار سنگھ کوٹھے پر پہرہ دے رہا تھا۔ آدھی رات کے قریب کا وقت تھا اور وہ [illegible] ٹہل رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ دیوار کے پاس رکا اور گلی میں جھانکنے لگا۔ وہ پورے چاند کی رات تھی اور پوری گلی چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔

اچانک اس نے دو افراد کو گلی میں داخل ہوتے دیکھا۔ دونوں جوان لڑکے تھے۔ ان میں سے ایک اسے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ وہ انھیں بہت غور سے دیکھتا رہا۔ وہ قریب آئے تو اس نے اسے پہچان لیا۔ جو اسے جانا پہچانا لگ رہا تھا، وہ اس کا کلاس فیلو رام گوپال تھا۔

''ارے رام گوپال...... تم یہاں؟'' اس نے بے ساختہ اسے پکارا۔

دونوں لڑکوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اس وقت عین کوٹھے کے نیچے سے گزر

رہے تھے۔ رام گوپال نے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی نظر آئی۔ ''وہ اوتار سنگھ۔ نمسکار۔'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ نے جواب میں اسے نمسکار نہیں کہا۔ ''کیسے ہو رام؟''

''ٹھیک ہوں...... ہمیشہ کی طرح۔'' رام گوپال بولا۔ ''تو تم یہاں رہتے ہو؟''

''ہاں۔''

''اتنی رات کو کوٹھے پر کیا کر رہے ہو؟''

''پڑھ رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے ٹانگیں اینٹھ گئیں تو سوچا ٹہل لوں۔''

''پڑھائی؟ اور امتحان سے فارغ ہونے کے فوراً بعد۔'' رام کے لہجے میں مسرت تھی۔ پھر وہ مسکرایا۔ ''ہاں بھئی، میں بھول گیا تھا کہ تم تو پورا سال پڑھنے والوں میں سے ہو۔'' مگر پھر اس کے تیور بدلے۔ ''چوکی داری تو نہیں کر رہے ہو؟'' اس کے لہجے میں اشتباہ تھا۔

''چوکی داری...... کیسی اور کس کی؟'' اوتار سنگھ نے بے پروائی سے کہا۔ ''کوئی خطرہ ہو تو چوکی داری بھی کی جائے۔''

رام گوپال شیطنت بھرے انداز میں ہنسا۔ ''ٹھیک کہتے ہو۔ تمھیں تو کوئی خطرہ نہیں۔''

''میری چھوڑو۔ اپنی کہو۔ تم اتنی رات کو کہاں جا رہے ہو؟''

''گھر جا رہا ہوں۔ یہاں ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔''

''اتنی رات کو تمھیں اس طرح نہیں گھومنا چاہیے۔''

رام گوپال پھر شیطنت سے ہنسا۔ ''میں کوئی مُسلا تو ہوں نہیں کہ مجھے کوئی خطرہ لاحق ہو۔'' اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک کہتے ہو۔ ان بے چاروں نے تو کبھی کسی ہندو پر حملہ نہیں کیا۔''

''یہ کام بزدلوں کے بس کا نہیں اوتار سنگھ۔ یہ تو ہم جیسے بہادر ہی کر سکتے ہیں۔''

''اکیلے اور نہتے آدمی کو گھیر کر دس آدمی ماریں تو یہ تمھارے نزدیک بہادری ہے۔ میں تو اسے بزدلی کہتا ہوں۔''

''وقت قریب آ رہا ہے اوتار سنگھ۔ عنقریب تم ہماری بہادری بھی دیکھ لو گے۔''

''بہادروں کی خاطر مدارات کے لیے میں ہر وقت تیار رہتا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن کچھ مناسب نہیں لگتا۔ خوامخواہ کسی کی نیند خراب کریں۔ کبھی مناسب وقت میں آنا۔ ٹھاکروں کی تواضع بھی دیکھ لینا۔'' اس کا لہجہ ذومعنی تھا۔

''ضرور۔ اب تو میں نے گھر دیکھ لیا ہے تمہارا۔'' رام گوپال نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''کسی رن آؤں گا۔ چلتا ہوں۔''

وہ چلے گئے۔ اوتار سنگھ انھیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ گلی سے نکل گئے۔

اوتار سنگھ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ رام گوپال کا یہاں نظر آنا خالی از علت نہیں تھا۔ یہ ناممکن نہیں تھا کہ وہ یہاں اپنے کسی دوست سے ملنے آیا ہو۔ لیکن یہ بات بھی کم خطرناک نہیں تھی کہ اس کا کوئی دوست یہاں رہتا ہے۔

❀......❀......❀

اس روز اوتار سنگھ سو رہا تھا کہ رگھو نے اسے اٹھا دیا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اوتار سنگھ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ''کیا بات ہے رگھو؟ خیریت تو ہے نا؟''

رگھو ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ ''شما کر دینا مالک۔ مجبوری تھی۔ ورنہ آپ کو کبھی نہ جگاتا۔''

''میں پوچھ رہا ہوں، بات کیا ہے؟'' رات بھر کا جاگا ہوا اوتار سنگھ جھنجلا گیا۔

رگھو اور گھبرا گیا۔ ''وہ...... مالک...... وہ...... ڈاکیا آیا ہے۔''

''تو خط لایا ہوگا نا۔''

''کھت نہیں مالک، تار ہے۔ وہ کہتا ہے، دس کھت بھی کرنے ہیں۔''

اوتار سنگھ کی نیند ہوا ہو گئی۔ وہ اٹھا اور زینے کی طرف لپکا۔ اسے تو اب کوئی خط لکھنے والا تھا ہی نہیں۔ تار تو ویسے بھی خطرناک ہے۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ اچھی خبر نہیں ہے۔ اور وہ جانتا تھا کہ تار شملے سے آیا ہے۔

ڈاکیے نے اس سے دستخط لیے اور لفافہ اسے دیا۔ اس نے وہیں کھڑے ہو کر لفافہ چاک کیا اور تار نکال کر پڑھا۔ وہ ذہنی طور پر اس کے لیے پہلے ہی تیار ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود اسے شاک لگا۔ رات ماسٹر جی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسے فوری طور پر شملہ جانا تھا۔

اوتار سنگھ کا ذہن سنسنا رہا تھا۔ زندگی کی اذیت کو موت کے سکون نے نگل لیا تھا۔ اذیت اٹھانے والے ماسٹر جی کو شانتی مل گئی تھی۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اوپر آیا۔ رنجنا اسے دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ ''کیا ہوا مالک؟''

''ماسٹر جی......'' اپنی آواز اسے خود بھی اجنبی لگی۔ ''ماسٹر جی کا دیہانت ہو گیا۔''

''ہائے رام۔''

اوتار سنگھ کے سنسناتے ذہن میں کوئی خیال نہیں تھا۔ وہ کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھا۔ اچانک اسے ماسٹر جی کی خواہش یاد آ گئی۔ ماسٹر جی بار بار اس سے کہتے تھے...... بار بار وعدہ لیتے تھے۔ اوتار سنگھ میری چتا کو آگ تم دکھانا۔ اسے ماسٹر جی کی آواز سنائی دی۔ وہ اس سے یہی کہہ رہے تھے۔

وہ خیال اسے یک لخت شاک سے باہر لے آیا۔ ارے...... اسے تو بہت کچھ کرنا ہے۔

کئی ذمے داریاں نبھانی ہیں اسے...... اپنی بھی اور دوسروں کی بھی۔ اس پر اسے ماسٹر جی کے وارث...... ان کے بچوں کا خیال آیا۔ ان لوگوں نے کبھی اپنی ذمے داری کو نہیں سمجھا تھا۔ وہ بار بار ان کے پاس جا کر ان کی خوشامد کرتا تھا کہ کم از کم ایک بار ان میں سے کوئی ماسٹر جی کے پاس چلا چلے...... صرف ماسٹر جی کی خوشی کے لیے۔ ان کا یہ کرب تو کم ہو جائے کہ ان کے اپنے بیٹوں نے انھیں چھوڑ دیا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ اسے ٹالتے رہے۔ وہ ان سے اتنا نالاں ہوا کہ اس نے آئندہ ان کے پاس نہ جانے کا عہد کر لیا۔

لیکن اب صورتِ حال اور تھی۔ وہ کتنے ہی بُرے سہی، بہر حال وہ یتیم ہوئے تھے۔ ان کا باپ مرا تھا۔ تو اب اسے ان کو اطلاع بھی دینی تھی۔

تار تنہا مجھے نہیں، انھیں بھی بھیجا گیا ہوگا۔ اس نے سوچا۔ میں نے سینی ٹوریم والوں کو تاکید کی تھی کہ جو اطلاع مجھے دیں، مجھ سے پہلے ان کے گھر والوں کو دیں۔ تو یہ ممکن نہیں کہ انھیں اطلاع نہ ہو۔

کچھ بھی ہو۔ یہ اس کا فرض ہے۔ ذمے داری ہے۔ ضمیر نے اسے ملامت کی۔ ماسٹر جی کے بیٹے اس کے روحانی بھائی ہیں۔ کیا وہ ان کے دکھ میں شریک نہیں ہوگا۔ انھیں سینے سے لگا کر دلاسہ نہیں دے گا۔

ایک نئے عزم سے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور جانے کی تیاری کرنے لگا۔

''رگھو...... رات کو میں نہیں آسکوں گا۔'' اس نے رگھو سے کہا۔ ''لیکن جلد سے جلد آنے کی کوشش کروں گا......''

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں مالک؟'' رگھو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے۔'' اوتار سنگھ نے تڑپ کر کہا۔ ''تم میرے ساتھ چلے گئے تو گھر کا خیال کون رکھے گا۔''

رگھو کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ''لیکن مالک......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ رات کو سیری جگہ تمھیں پہرا دینا ہوگا۔ چوکس رہنا۔ جان چلی جائے پر پیچھے والوں پر آنچ نہ آئے۔''

اب بات رگھو کی سمجھ میں آئی۔ ''آپ کے حکم پر سب قربان ہے مالک۔ آپ چنتا نہ کریں۔''

''میں چلتا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے بیگ کندھے پر لٹکاتے ہوئے کہا۔

پہلے وہ ماسٹر جی کے گھر گیا۔ دروازہ ماسٹر جی کی بڑی بہو نے کھولا۔ اوتار سنگھ کو دیکھ کر اسے

لمحے کو وہ جھجکی۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے نمسکار کیا۔ ''آپ...... آپ کو پتا ہے؟''

''جی...... ابھی کچھ دیر پہلے تار آیا تھا۔ مجھے بہت......''

''تار یہاں بھی آیا تھا۔ بھگوان نے بڑی دیا کی بابو جی پر۔''

ابھی تک اوتار سنگھ کو اندر آنے کو نہیں کہا گیا تھا۔ ''وہ تو دیا کرتا ہے۔ پر بندے تو اپنا فرض بھی پورا نہیں کرتے۔'' اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ پھر بولا۔ ''کسی کو بلا دیں نا۔ میں شملہ جانے کے لیے آیا ہوں۔''

''گھر میں تو کوئی بھی نہیں ہے بچوں کے سوا۔''

''کیوں؟ ہری بھیا کی تو اسکول کی چھٹیاں ہوں گی۔''

''وہ تو بھیا شہر سے باہر گیا ہے۔ ایک ہفتہ ہو گیا۔''

''تو بدری بھیا رات کی ڈیوٹی کر کے آئے ہوں گے۔ انھیں جگا دیں۔''

''کل سے ان کی دن کی ڈیوٹی لگی ہے۔''

اوتار سنگھ نے ایسی بے حسی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اسے بڑی شدت سے غصہ آیا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے تو تار کس نے پڑھا۔ اسے ماسٹر جی کی موت کا پتا کیسے چلا۔ اور وہ اسے اندر کیوں نہیں بلا رہی ہے۔ اسی لیے تا کہ وہ اندر جائے گا تو اسے مردوں کی موجودگی کا پتا چل جائے گا۔ ''اچھا بھابھی، میں چلتا ہوں۔'' اس نے کہا اور جانے کے لیے مڑا۔

''جل پان تو کرتے جاؤ بھیا۔''

اس نے پلٹ کر غصے سے اس عورت کو دیکھا۔ ''جہاں کریا کرم کا معاملہ ہو، وہاں جل پان کسے یاد رہتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹا اور واپس چل دیا۔

❁......❁......❁

گھر میں عید کا سا سماں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ پچھلے روز چھوٹے ٹھاکر کے لیے سیا جانے والا آخری کرتا بھی مکمل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد استری کا سلسلہ شروع ہوا۔ اب ایک درجن جوڑوں پر استری کوئی آسان کام تو نہیں ہوتا۔ کوئلوں کی استری تھی اور استری کرنے والی سرفراز بیگم، جو یہ اہتمام چھوٹے ٹھاکر کے لیے کر رہی تھیں۔ ایک ایک سلوٹ دور کی جا رہی تھی۔

سرفراز بیگم خوش بھی تھیں اور بے تاب بھی۔ ان کا حال بچوں جیسا تھا۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اوپر چلی جائیں اور چھوٹے ٹھاکر کو یہ جوڑے دیں۔ اس کے بعد اس کے چہرے پر غیر معمولی خوشی دیکھنا ان کی خواہش تھی۔

اس روز سرفراز بیگم نے کھانے میں بالکل دلچسپی نہیں لی۔ یہ کام انھوں نے چھمن بوا کے سپرد کر دیا اور خود استری کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ ایک کرتا استری کرتیں تو اس کے بعد وہ

اسے خس کے عطر میں بساتیں اور پھر تہ کر کے رکھ دیتیں۔

لڑکیوں میں نور بانو تو ان کی اس کیفیت پر جل کڑھ رہی تھی۔ حور بانو اور گلنار بار بار ماں کو تعاون کی پیشکش کرتیں۔ ''اماں...... آپ تھک گئی ہوں گی۔ لائیں، ایک کرتا میں استری کر دوں۔''

''لو...... اس میں تھکن کیسی! میرے لیے تو یہ خوش کرنے والا کام ہے۔ اور ایک جوڑا استری کرنے میں لگتا ہی کیا ہے۔'' سرفراز بیگم کہتیں۔

لیکن یہ بس کہنے کی بات تھی۔ کلف لگے کپڑے پر استری کرنے میں وقت لگتا ہے۔ بہر حال سرفراز بیگم نے دو بیٹیوں کو ایک ایک کرتا کاڑھنے کی اجازت تو دے دی تھی۔ لیکن وہ کسی کو استری کرنے کی سعادت دینے کے موڈ میں نہیں تھیں۔

یہ سلسلہ چلتا رہا۔ دوپہر ہوگئی۔ ''اماں...... چلیں کھانا تو کھالیں۔'' نور بانو نے کہا۔

''تم لوگ کھالو۔ میں تو کام ختم کر کے ہی کھاؤں گی۔''

''ارے اماں...... ایسا بھی کیا۔ اور کام تو بہت باقی ہے۔'' نور بانو تنک کر بولی۔

''بہت کہاں۔ بس دو جوڑے ہی تو رہ گئے ہیں۔''

''جس طرح سے آپ کر رہی ہیں تو ان دو جوڑوں میں دو گھنٹے تو لگیں گے ہی۔''

گھر کا اصول تھا کہ دسترخوان پر سب لوگ ساتھ ہی بیٹھتے تھے۔ سرفراز بیگم کہتی تھیں کہ جو دسترخوان پر نہیں بیٹھے گا، اسے بعد میں کھانا نہیں ملے گا۔

انھیں خیال آیا کہ خود اپنا اصول توڑ کر وہ کوئی اچھی مثال قائم نہیں کر رہی ہیں۔ انھیں خود بھی اپنے اصول پر عمل کرنا ہوگا۔ اور اس کے باوجود یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ آئندہ کبھی بچیاں بھی یہی کر سکتی ہیں۔

چنانچہ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''چلو بھئی، دسترخوان لگاؤ۔ پہلے کھانا کھالیں۔''

مگر کھانا بھی انھوں نے بے دلی سے کھایا۔ دل تو ان کا استری میں اٹکا ہوا تھا۔ بچیوں نے یہ بات محسوس کرلی۔ ''اماں...... ٹھیک سے کھانا کھائیں۔'' نور بانو نے انھیں ٹوک دیا۔

''کھا تو رہی ہوں۔''

کھانے کے بعد وہ دوبارہ استری کرنے میں مصروف ہوگئیں۔

وہ آخری جوڑا استری کر رہی تھیں کہ اوپر سے رنجنا آگئی۔ ''یہ کیا کر رہی ہیں بڑی بیگم؟''

''چھوٹے ٹھاکر کے لیے کپڑے سیے ہیں۔ اب استری کر رہی ہوں۔ چھوٹا ٹھاکر تو گھر میں ہی ہے نا؟''

''نہیں بڑی بیگم۔ وہ تو شملہ گئے ہیں۔''

سرفراز بیگم کا ماتھا ٹھنکا۔ یہ ہفتے کا دن تو نہیں۔ چھوٹا ٹھاکر تو ہفتے کے دن وہاں جاتا ہے۔ پھر آج کیوں؟ ''خیریت تو ہے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''ماسٹر جی کا دیہانت ہوگیا بڑی بیگم۔''

''اوہ......'' سرفراز بیگم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''تو وہ واپس کب آئے گا؟'' ان کا استری کرنا اب بھی نہیں رکا تھا۔

''کہہ رہے تھے، کل صبح تک آجائیں گے...... ماسٹر جی کا انتم سمسکار کر کے۔''

''کریا کرم تو یہاں دلی میں ہی ہوگا نا؟''

''نہیں بڑی بیگم۔ وہیں ہوگا...... شملے میں۔''

''ارے...... کیوں؟'' سرفراز بیگم کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''ان کے بچے تو یہاں ہیں...... دلی میں۔ وہ جائیں گے وہاں؟ زندگی میں تو کبھی گئے نہیں۔''

''وہ کہاں جانے والے ہیں بڑی بیگم۔ ماسٹر جی نے چھوٹے ٹھاکر سے وچن لیا تھا کہ ان کی چتا کو آگ وہی دیں گے......''

''ہائے اللہ۔ بیٹوں کے ہوتے ہوئے!''

''جی بڑی بیگم۔ ماسٹر جی نے کہا تھا کہ ان کے بیٹے آئیں اور موجود ہوں تو بھی ان کی چتا کو آگ چھوٹے ٹھاکر ہی دیں گے۔'' رنجنا بولی۔ ''مگر بڑی بیگم ان کے بچے تو اتنے مورکھ ہیں کہ مجھے نہیں لگتا، وہ جائیں گے۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔ ایسے ناخلف بچوں سے کوئی امید نہیں رکھی جاسکتی۔'' بڑی بیگم نے کہا۔ پھر آخری کرتے پر عطر لگایا اور اسے تہ کرنے لگیں۔ ''صبح تو آجائے گا نا چھوٹا ٹھاکر۔'' ان کے لہجے میں بچوں کی سی بے تابی تھی۔

''کہا تو یہی ہے بڑی بیگم۔ اور اب وہ وہاں رکیں گے کیوں؟'' رنجنا نے کہا۔ پھر حیرت سے تمام جوڑوں کو دیکھا۔ ''یہ اتنے سارے کپڑے! یہ سب آپ نے چھوٹے ٹھاکر کے لیے سیے ہیں؟''

''اتنے سارے کہاں، صرف بارہ جوڑے ہیں۔'' سرفراز بیگم نے سادگی سے کہا۔ ''اتنوں ہی کی فرمائش کی تھی اس نے۔''

''چھوٹے ٹھاکر نے خود کہا تھا!'' رنجنا حیران تھی۔

''ہاں، اسے بہت اچھا لگا تھا یہ لباس۔'' سرفراز بیگم نے کہا۔ ''اب یہ کپڑے میں ٹرنک میں رکھ دوں۔ کل وہ آئے گا تو اسے دوں گی۔''

❀......❀......❀

اوتار سنگھ ماسٹر جی کے چہرے کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ مرنے کے بعد ان کے چہرے پر بے پناہ سکون تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور انھیں دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ مرے نہیں، بس گہری نیند سو گئے ہیں۔

تو یہ ہوتی ہے موت! اوتار سنگھ نے سوچا اور زندگی کے ساتھ کتنے بکھیڑے ہوتے ہیں۔ غم روزگار، غم جاناں، گزرے ہوئے کے پچھتاوے، آج کی مصروفیت اور آنے والے کل کی فکر، نہ ملنے والی محبتوں کا دکھ، لوگوں سے شکایتیں، کتنی بھاری چیز ہے زندگی، پھر بھی آدمی موت سے ڈرتا ہے...... گھبراتا ہے۔ زندگی سے چمٹے رہنا چاہتا ہے۔ بیماری کی بدترین اذیت اٹھا کر بھی جینا چاہتا ہے۔ نہیں سمجھتا کہ موت میں ہی مکتی ہے...... نجات ہے۔

لیکن نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ شاید موت کے پہلے مرحلے میں اس کی سمجھ میں یہ بات آ جاتی ہے کہ موت ہر دکھ سے نجات کا نام ہے۔ تبھی تو مرنے کے بعد آدمی کے چہرے پر اتنا سکون ہوتا ہے۔ ماسٹر جی کے چہرے پر کوئی تاسف نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ انھوں نے بانہیں پھیلا کر موت کا استقبال کیا ہوگا۔

''ان کے بچے نہیں آئے؟'' ڈاکٹر براؤن کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

اوتار سنگھ نے سر اٹھا کر خالی خالی نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ وہ اپنے خیالوں میں ایسا گم تھا کہ اس نے ڈاکٹر کی بات نہیں سنی تھی۔ ''کیا کہا آپ نے؟''

''ان کے بچے آج بھی نہیں آئے؟'' ڈاکٹر نے دہرایا۔

''سب مصروف ہیں۔ گھر پر کوئی نہیں تھا چھوٹے بچوں اور عورتوں کے سوا۔''

''ان کا انتظار کرو گے؟''

اوتار سنگھ کے نزدیک وہ بڑی ذمے داری تھی۔ وہ کوئی فیصلہ کن جواب نہیں دے سکتا تھا۔ ''آپ کی کیا رائے ہے ڈاکٹر؟''

ڈاکٹر نے کندھے جھٹک دیے۔ ''مردہ خانے میں لاش دس دن بھی محفوظ رہ سکتی ہے۔'' وہ بولا۔ ''لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ان کے گھر سے کوئی آئے گا۔ وہ آنے والے ہوتے تو آپ سے پہلے آ چکے ہوتے۔ دوسری بات اُن کی وصیت ہے۔ یہاں انھوں نے ہر ڈاکٹر، ہر نرس، ہر وارڈ بوائے سے یہی کہا کہ ان کی آخری رسومات یہیں ہوں گی۔ اور یہ کہ ان کے بیٹے موجود ہوں یا نہ ہوں، ان کی چتا کو آگ آپ دیں گے۔''

اوتار سنگھ کے دل سے ایک بوجھ سا ہٹ گیا۔ ''تو ٹھیک ہے۔ میں تیاری کراتا ہوں۔ اس کام میں دیر کرنا مناسب نہیں۔''

وہ باہر چلا آیا۔ اس وقت اس کے دل میں ایک خیال آیا۔ اوپر والا جو کچھ کرتا ہے، اس

میں بہتری ہوتی ہے۔ وہ چاہتا تو ان کے بیٹوں کے دل میں یہاں آنے کا خیال ڈال دیتا اور وہ آ جاتے۔ لیکن کیا ان کی موجودگی میں وہ ماسٹر جی کی وصیت پر عمل کر پاتا۔ وہ یہی سوچتا کہ ماسٹر جی کی چتا کو آگ دکھانے کا اصل حق ان کے بیٹوں کا ہے۔ وہ تو بہت بڑی آزمائش میں پڑ جاتا۔ اس کے لیے اس وقت حتمی طور پر یہ سوچنا مشکل تھا کہ اس صورت حال میں وہ کیا کرتا۔ بہرحال وہ جو بھی کرتا، اس کے نتیجے میں عمر بھر کے لیے اس کے ضمیر پر بوجھ آ جاتا۔ اگر ماسٹر جی کی چتا ان کے بیٹے جلاتے تو وہ عمر بھر یہ سوچ کر کڑھتا کہ اس نے ماسٹر جی کی آخری خواہش پوری نہیں کی۔ ان کے آخری حکم کی تعمیل نہیں کی۔ اور اگر چتا وہ جلاتا تو اسے عمر بھر یہ پھانس چبھتی رہتی کہ اس نے ماسٹر جی کے بیٹوں سے ان کا حق چھینا ہے۔ انھیں ان کے حق سے محروم کیا ہے۔ واقعی...... اوپر والے کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے کیونکہ وہ سب جانتا ہے۔

اس وقت شام ہو چکی تھی۔ اس کا اندازہ تھا کہ ماسٹر جی کی آخری رسومات ادا ہوتے ہوتے دس بج جائیں گے۔ سوال یہ تھا کہ وہ رات کو ہی واپسی کے لیے نکل سکے گا یا نہیں۔ اس نے اِدھر اُدھر معلومات کیں تو پتا چلا کہ آخری گاڑی بارہ بجے روانہ ہوتی ہے۔

اس کے بعد وہ اس کوشش میں لگ گیا کہ ہر کام وقت پر ہو جائے اور وہ رات کو ہی دہلی کے لیے روانہ ہو جائے۔ اسے گھر کی فکر بھی ستا رہی تھی۔

تمام کام آسانی سے ہو گئے۔ سوا نو بجے ماسٹر جی کی ارتھی شمشان گھاٹ لے جانے کے لیے اٹھائی گئی۔ اپنے کندھے پر ارتھی اٹھاتے ہوئے اوتار سنگھ کو یاد آیا کہ وہ ماسٹر جی کو ان کے گھر سے اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر ہی اپنے گھر لایا تھا اور آج وہ اور لوگوں کے ساتھ مل کر انھیں ان کے آخری سفر پر لے جا رہا ہے۔ شمشان گھاٹ تک کے سفر میں وہ ماسٹر جی کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کو دہراتا رہا۔ کیسے وہ اسے پڑھاتے تھے۔ کیسے وہ ان سے سوال کرتا تھا۔ ٹیڑھے سوالوں پر کیسے وہ گھبراتے تھے۔ ڈرتے تھے کہ کہیں بڑے ٹھاکر ان سے باز پرس نہ کریں۔ کیسے وہ اس طرح کے سوالوں سے بچتے تھے اور کیسے اس کے اصرار پر اس سے وعدہ لیتے تھے کہ وہ یہ بات کسی سے نہیں کہے گا۔ تب وہ اپنی رائے دیتے تھے۔ پھر ان کی بیماری کا عرصہ...... ان کا سینی ٹوریم آنا۔ یہاں اس کا آنا...... ان سے باتیں کرنا۔ ایک ایک لمحہ اسے یاد آتا رہا۔ اس کی آنکھیں خشک رہیں۔ لیکن سینے پر جیسے کوئی بہت بڑا اور بھاری پتھر آ گرا۔ اس بوجھ سے اسے سانس لینا دشوار محسوس ہونے لگا۔

پھر آخری مرحلہ آ گیا۔ ماسٹر جی کی چتا تیار کر دی گئی۔ آگ دکھانے کے لیے جلتی ہوئی لکڑی اس کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ اس لمحے اسے خیال آیا کہ اس نے اتنی موتیں دیکھیں۔ لیکن اس مرحلے سے وہ پہلی بار گزر رہا ہے۔ یہ کام تو وہ اپنے پتا جی کے لیے بھی نہ کر سکا۔ موقع ہی نہیں

ملا اسے۔ وہ تو اپنے باپ کو بے گور و کفن چھوڑ کر آنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ تو خود ہی ریت میں دفن ہو گئے ہوں گے۔ وہ بھی اور چاچا جمال دین بھی اور ویر جی بھی اور مولوی صاحب بھی۔ وہ کسی کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ اپنی جان بچا کر بھاگ آیا۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اسے ایسا لگا کہ اس کے سینے پر رکھا ہوا پتھر پگھل رہا ہے۔ کوئی چیز وہاں سے حرکت کر کے اس کے حلق کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں جلنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔

وہ لرزتے قدموں سے آگے بڑھا اور اس نے ماسٹر جی کی چتا کو آگ دکھا دی۔ اس نے سوچا، چلو کوئی ایک ذمے داری پوری کرنے کا تو موقع ملا مجھے۔

اس وقت رات کے ٹھیک دس بجے تھے!

❀......❀......❀
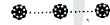
عین اس وقت دہلی میں لوگوں کے سونے کا وقت تھا!

رگھو نے چھوٹے ٹھاکر کی لاٹھی کو یوں چھوا، جیسے وہ کوئی بہت مقدس چیز ہو۔ پھر اس نے لاٹھی کو اوپری حصے سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کو چھونے سے اسے ایسا لگا، جیسے اس کے جسم میں طاقت کی لہر دوڑ گئی ہو۔

عام حالات میں وہ اس لاٹھی کو چھونے کی جرأت بھی نہ کرتا۔ لیکن یہ عام حالات نہیں تھے۔ چھوٹا ٹھاکر اس پر بہت بھاری ذمے داری ڈال کر گیا تھا۔ اور اسے وہ نبھانی تھی۔ چھوٹے ٹھاکر کی موجودگی میں وہ خود کو بہت چھوٹا اور کمزور محسوس کر رہا تھا۔ لاٹھی میں اس کی دلچسپی کی یہ وجہ نہیں تھی کہ وہ اسے استعمال کرنا جانتا تھا۔ لٹھیا بازی کے فن سے تو وہ بالکل ناواقف تھا۔ بس اس وقت وہ لاٹھی اس کے لیے چھوٹے ٹھاکر کی حیثیت رکھتی تھی۔ لاٹھی ہاتھ میں تھی تو اسے لگ رہا تھا کہ وہ اکیلا نہیں ہے بلکہ چھوٹے ٹھاکر اس کے ساتھ ہیں۔

اسے لاٹھی لے کر جاتے ہوئے دیکھا تو رنجنا نے پوچھا۔ ''تم کہاں چلے؟''

''اوپر جا رہا ہوں...... پہرہ دینے۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''مالک کا حکم ہے تو ضرورت بھی ہوگی۔''

چھوٹے ٹھاکر کے حوالے پر رنجنا چپ ہو گئی۔ مگر ایک لمحے کے بعد بولی۔ ''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔''

''تو کیا کرے گی چل کر؟''

''تمہارا ساتھ دوں گی اور کچھ تو میرے بس میں نہیں ہے۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔ تو سو جا۔''

لیکن رنجنا مصر رہی۔ رگھو نے بھی سوچا، کوئی حرج نہیں ہے۔

اوپر پہنچ کر رگھو ٹہلنے لگا۔ وہ اس وقت پوری طرح اوتار سنگھ کے انداز کی نقل کر رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے اچانک وہ بیرونی دیوار کے پاس رکتا، چند لمحے نیچے گلی میں جھانکتا رہتا اور پھر ٹہلنا شروع کر دیتا۔

رنجنا بھی اس کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ تھک گئی۔ اس کی ٹانگیں دُکھنے لگیں۔ ''اب بس بھی کرو۔'' اس نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔ ''یوں ٹہلتے رہنا ضروری ہے کیا؟''

''ہاں۔ مالک روز یہی کرتے ہیں۔''

''میں تو تھک گئی۔ رنجنا نے کہا اور کرسی پر جا بیٹھی۔

کچھ دیر بعد رگھو بھی اس کے پاس آ بیٹھا۔ ''اتنا چلتے ہیں چھوٹے ٹھاکر!'' رنجنا نے حیرت سے کہا۔

''نہیں پگلی۔ میں تو جلدی تھک گیا ہوں۔ وہ اتنی جلدی نہیں بیٹھتے۔'' رگھو نے کہا۔

''میری ان کی عمر میں بھی تو فرق ہے۔''

''مالک سے تمہارا کیا مقابلہ۔'' وہ تنبیہی لہجے میں بولی۔

''توبہ توبہ۔ میں چھوٹے ٹھاکر سے کیوں مقابلہ کروں گا۔ میں دھرتی ہوں تو وہ آکاش ہیں۔'' رگھو نے دونوں کان پکڑے اور پھر دونوں ہاتھوں سے رخسار پیٹنے لگا۔ ''میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ وہ بہت دیر تک چلتے رہتے ہیں۔ اتنی جلدی نہیں بیٹھتے وہ۔''

''اور رات بھر ٹہلتے ہیں۔ کتنا تھک جاتے ہوں گے۔''

''یہی تو میں بھی سوچتا ہوں۔''

''ہائے رام۔'' اچانک رنجنا نے کہا اور آنکھ پر ہاتھ رکھ لیا۔

رگھو نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''کیا ہوا؟''

''میری الٹی آنکھ پھڑک رہی ہے۔'' رنجنا کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''تو کیا ہوا؟ تو اس طرح سے کیوں چیخی؟''

''تم بھی نرے بدھو ہو۔ پتا نہیں، الٹی آنکھ پھڑکنا اشبھ ہوتا ہے۔ کوئی مصیبت آنے والی ہو تو الٹی آنکھ پھڑکتی ہے۔''

رگھو چند لمحے سوچتا رہا۔ کچھ ایسا ہی ماں بھی کہتی تھی۔ پرنتو...... اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ''عورت کی الٹی آنکھ پھڑکنا شبھ ہوتا ہے۔ ہاں عورت کی سیدھی آنکھ پھڑکنا اشبھ ہوتا

ہے۔"

"تم الٹا بول رہے ہو۔ یہ تو مرد ذات کے لیے ہے۔"

"تم الٹا سمجھ رہی ہو۔"

دونوں میں بحث ہونے لگی۔ "میری الٹی آنکھ پھڑکنا اشبھ ہے۔" رنجنا نے زور دے کر کہا۔

"مردوں کی الٹی آنکھ پھڑکنا اشبھ ہوتا ہے مورکھ۔ عورت کی الٹی آنکھ پھڑکنا اشبھ ہے۔"

"ہے بھگوان۔" اچانک رنجنا نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ "میں کہہ رہی تھی نا کہ اشبھ ہوتا ہے۔ سو ہے۔" یہ کہہ کر وہ زینے کی طرف لپکی۔

"کچھ بتاؤ تو۔ ہوا کیا؟" رگھو نے پریشان ہو کر پوچھا۔

رنجنا جاتے جاتے پلٹی۔ "دودھ کی دیگچی چولہے پر رکھ کر آئی تھی میں۔ اب تک یا تو سارا ابل چکا ہوگا۔ یا جل چکا ہوگا، جبھی تو میں کہوں کہ میری الٹی آنکھ کیوں پھڑک رہی ہے۔ ہوا نا اشبھ انجام۔"

وہ نیچے چلی گئی۔ رگھو پھر اٹھا اور ٹہلنے لگا۔

❀......❀......❀

جس وقت اوتار سنگھ نے شملہ میں ماسٹر کانتی پرشاد جی کی چتا کو آگ دی، اس وقت دہلی میں سرفراز بیگم کے گھر میں سب لوگ سونے کے لیے لیٹ چکے تھے۔ سرفراز بیگم بہت تھکی ہوئی تھیں۔ درجن بھر جوڑوں پر استری کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ جبکہ کپڑوں پر کلف بھی ہو۔ سہ پہر کو وہ اس کام سے نمٹی تھیں اور انھوں نے کپڑے ایک ٹرنک میں رکھ دیے تھے۔

وہ بچوں کی طرح پُر جوش تھیں۔ بس کسی طرح وہ سو جائیں اور اٹھیں تو صبح ہو چکی ہو۔ چھوٹا ٹھاکر واپس آ چکا ہو۔ وہ جائیں اور کپڑے اسے دے دیں۔ وہ کتنا خوش ہوگا۔ اس کی وہ خوشی دیکھنے کے لیے وہ تڑپ رہی تھیں۔

وہ بستر پر لیٹیں اور لیٹتے ہی بے خبر سو گئیں۔

چھمن بوا تو سب سے پہلے سونے اور سب سے پہلے اٹھنے کی عادی تھیں۔ وہ سرفراز بیگم سے پہلے ہی سو چکی تھیں۔ تینوں لڑکیاں بھی سونے کے لیے لیٹ چکی تھیں۔ نور بانو سب سے آخر میں سوتی تھی۔ اسے سونے سے پہلے مطالعہ کرنے کی عادت تھی۔ مطالعہ کرتے کرتے جب آنکھیں بند ہونے لگتیں تو وہ لائٹ بند کر کے لیٹتی اور لیٹتے ہی سو جاتی۔

نور بانو کو جماہیاں آنے لگیں۔ اس نے کتاب بند کی اور اٹھ کر ایک انگڑائی لی۔ کتاب کو اس کی جگہ پر رکھ کر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ دونوں بہنیں بستر پر تھیں اور سو چکی تھیں۔ اس

نے روشنی گل کی اور خود بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ حور بانو ابھی تک نہیں سوئی ہے۔

حور بانو جاگ رہی تھی۔ لیکن یہ بات وہ کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے نہ سونے کی ایک خاص وجہ تھی۔ ایک کام تھا، جو اسے سب کے سونے کے بعد کرنا تھا۔

نور بانو پڑھ رہی تھی اور حور بانو چڑ رہی تھی۔ یہ سوتی کیوں نہیں۔ اس نے جھنجلا کر سوچا۔ وہ جانتی تھی کہ نور بانو کے سوا باقی سب لوگ سو چکے ہیں۔ اس وقت جاگتی ہوئی نور بانو ہی اس کی راہ کی واحد رکاوٹ تھی۔

نور بانو نے روشنی گل کی اور سونے کے لیے لیٹی تو حور بانو نے سکون کی سانس لی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل تیز دھڑکنے لگا۔ آنے والے لمحوں کا تصور ہی اس کے لیے ہیجان انگیز تھا۔

وہ جانتی تھی کہ نور بانو لیٹتے ہی سو جاتی ہے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسی لمحے وہ اٹھ کھڑی ہو۔ لیکن وہ مکمل احتیاط سے کام کرنا چاہتی تھی۔ کوئی غیر ضروری خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔

ایسے میں ایک ایک پل ساعت بن کر گزرتا ہے۔ وقت کی رفتار بھی کم ہو جاتی ہے۔ نجانے کیسے وہ ضبط کر رہی تھی۔

بالآخر اس کے اندازے کے مطابق نور بانو کو لیٹے ہوئے آدھا گھنٹا ہو گیا تو وہ اٹھی اور دبے پاؤں کمرے سے نکل آئی۔ اس کا رخ اس کوٹھری کی طرف تھا، جہاں صندوق رکھے تھے۔ کمرے کے دروازے پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دونوں بہنیں ساکت تھیں اور سو رہی تھیں۔

کوٹھری کے قریب وہ کمرا تھا، جہاں اماں سوتی تھیں۔ کوٹھری میں داخل ہونے سے پہلے اس نے اماں کے کمرے میں جھانکا۔ ظاہری آثار بتاتے تھے کہ اماں بھی بے خبر سو رہی ہیں۔ لیکن اسے سب سے زیادہ ڈر اماں سے ہی تھا۔ اماں کی نیند بہت کچی تھی۔ ذرا سے کھٹکے پر اٹھ جاتی تھیں۔

بہرحال وہ پلٹی اور کوٹھری میں داخل ہوئی۔ گھر کا تمام فاضل سامان کوٹھری میں ہی رکھا جاتا تھا۔ وہ اس طرف بڑھی، جہاں صندوق رکھے تھے۔ اچانک اسے خیال آیا کہ روشنی کی ضرورت ہے۔ وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں گئی اور لیمپ اٹھا لائی۔ کوٹھری میں اس نے لیمپ روشن کیا۔ روشنی کوٹھری سے باہر جا رہی تھی۔ اس لیے اس نے کوٹھری کا دروازہ بھیڑ دیا۔

وہ اوپر تلے تین ٹرنک تھے۔ سب سے نیچے سب سے بڑا اور سب سے چھوٹا اوپر۔ اسکا اندازہ تھا کہ اس کی مطلوبہ چیز اوپر والے ٹرنک میں ہی مل جائے گی۔ اس نے لیمپ ایک اونچی جگہ پر رکھ دیا اور اوپر والا ٹرنک کھولا۔

ٹرنک کھولتے ہی اس کا دل خوش ہوگیا۔ اس کی مطلوبہ چیز اوپر ہی موجود تھی۔

اماں نے وہ درجن بھر جوڑے ترتیب اور سلیقے سے رکھے تھے۔ اوپر صرف کرتے تھے اور کرتوں کے نیچے پائجامے۔ اس نے اوپر والے کرتے کو غور سے دیکھا اور چھوا۔ وہ اس کے ہاتھ کا کاڑھا ہوا نہیں تھا۔ اماں نے شاید کرتے اس طرح سے رکھے تھے کہ جس کرتے پر سب سے آخر میں استری کی تھی، وہ سب سے اوپر تھا۔ اور اسے یاد تھا کہ اماں نے سب سے پہلے اس کا کاڑھا ہوا کرتا استری کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کرتا سب سے نیچے ہوگا۔

اس نے بڑی آہستگی اور احتیاط سے ایک ایک کرتا اٹھایا اور دیکھا۔ اپنی کڑھائی کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اس کا کاڑھا ہوا کرتا سب سے نیچے تھا۔ اس نے وہ کرتا نکال لیا اور باقی کرتوں کو دوبارہ سلیقے سے ٹرنک میں رکھ دیا۔ ایسے کہ وہ ذرا بھی نہ مسکیں۔

اپنا کاڑھا ہوا کرتا اپنے کندھے پر ڈال کر اس نے آہستگی سے ٹرنک بند کیا، لیمپ بجھایا اور کوٹھری سے نکل آئی۔ اس نے اماں کے کمرے میں جھانکا۔ وہ بدستور بے خبر، اسی کروٹ سو رہی تھیں۔ اس نے اطمینان کی سانس لی اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

اپنے بستر پر لیٹ کر اس نے اس کرتے کو کھولا اور اپنے اوپر چادر کی طرح پھیلا لیا۔ یہ کرتا میں نے کتنی محبت سے کاڑھا ہے چھوٹے ٹھاکر کے لیے۔ اس نے سوچا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ محبت اس تک پہنچ جائے گی۔ لیکن اب رات بھر یہ کرتا میرے ساتھ رہے گا تو میری محبت کی خوشبو اس میں اس طرح بس جائے گی کہ کبھی بھی نہیں مٹے گی۔ وہ وارفتگی سے سوچ رہی تھی۔ اس کرتے میں اب میرے جسم کی خوشبو بھی ہوگی۔ اس خیال سے وہ شرما گئی۔

وہ کرتا اس کے پاس رات بھر کا مہمان تھا۔ کل اماں اسے دوسرے کرتوں کے ساتھ چھوٹے ٹھاکر کو دے آئیں گی اور کون جانے کہ اس کی محبت کی سچائی کی وجہ سے، اس کی خوشبو کی وجہ سے چھوٹا ٹھاکر سب سے پہلے اسے ہی پہنے۔ کیا پتا، وہ یہ کرتا کل ہی پہنے اور کسی طرح اسے دیکھنے کا موقع بھی مل جائے۔ کیسا لگے گا وہ اس کرتے میں...... جیسے مغل شہزادہ! اس کے کانوں میں اماں کے الفاظ گونجے۔

اس خیال نے اسے تصور کی دنیا میں پہنچا دیا، جہاں وہ چھوٹے ٹھاکر کو یہ کرتا پہنے دیکھ سکتی تھی اور دیکھ رہی تھی۔

اس تصور سے کھیلتے کھیلتے نجانے کتنا وقت گزر گیا۔ اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔ نیند پلکوں پر بوجھ بن گئی تھی۔ اچانک اس خیال نے اسے چونکا دیا کہ لیمپ تو وہ کوٹھری میں ہی بھول آئی ہے۔

اس نے سوچا کہ کوٹھری میں جائے اور لیمپ اٹھا لائے۔ لیکن نیند کا غلبہ اس قدر تھا کہ اس میں ہلنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ اس نے بے پروائی سے سوچا۔ چھوڑو...... صبح دیکھا جائے گا۔ ویسے بھی مجھے تو صبح سب سے پہلے اٹھنا ہے۔ اگر کسی نے مجھے یہ کرتا اوڑھے ہوئے دیکھ لیا تو......؟ نہیں...... مجھے سب سے پہلے جاگنا ہے اور جا کر اس کرتے کو ٹرنک میں رکھنا ہے۔ تب لیمپ بھی لا کر یہاں رکھ دوں گی۔

اے اللہ...... صبح سب سے پہلے مجھے جگا دیجیے گا۔ اس نے بڑے خشوع وخضوع سے اللہ سے دعا کی۔ میری محبت کا پردہ رکھ لیجیے گا۔

اسے پتا نہیں تھا کہ اس کی دعا اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوگئی ہے!

❁.....❁.....❁

بہادر علی نے دیوار کے ساتھ کھڑی چارپائی سیدھی کر کے بچھائی اور ملحقہ کوٹھری میں چلا گیا۔ وہاں اس کا بستر تھا۔ اس کا صندوق تھا، جس میں اس کے کپڑے اور دوسری چیزیں ہوتی تھیں۔ وہ گدا اور چادر لے کر آیا اور چارپائی پر بستر بچھایا۔ پھر وہ تکیہ لے کر آیا۔ اس کے بعد اس نے سریے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ رات کو سونے سے پہلے سریا سرہانے رکھنا وہ کبھی نہیں بھولتا تھا۔ نجانے کب ضرورت پڑ جائے۔

مگر سریا ڈیوڑھی میں نہیں تھا۔ صبح سویرے اٹھنے والا بہادر علی نیند سے بے حال ہو رہا تھا۔ لیکن سریا سرہانے رکھے بغیر تو اسے نیند بھی نہ آتی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ بس اب بستر پر گر جائے۔ لیکن وہ اٹھ کر کوٹھری میں گیا۔ سریا وہاں موجود تھا۔ وہ اسے لایا اور تکیے کے نیچے رکھ کر بستر پر دراز ہوگیا۔

چند لمحوں میں اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔ مگر اسے خیال آیا کہ اس نے دعا نہیں مانگی۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا دامن پھیلایا اور دعا کرنے لگا۔

''اے اللہ...... عمر بھر اس ڈیوڑھی کا نمک کھایا ہے۔ نمک حرامی سے بچا لینا اے مالک۔ اے اللہ، تو ہی حفاظت کرنے والا ہے کمزوروں کی۔ اور موت کا وقت بھی تو ہی مقرر کرتا ہے۔ میری دعا ہے اے رب کہ میرے جیتے جی کوئی بری نیت سے اس ڈیوڑھی کو نہ پھلانگ پائے۔''

یہ دعا وہ ہر رات کرتا تھا۔ وہ ان وفادار ملازموں میں سے تھا، جو جان کو مالک کا قرض سمجھتے ہیں اور یہاں تو گھر کا مالک مر چکا تھا۔ اب اس کی بیوہ اور بچیوں کی حفاظت اس کی ذمے داری تھی۔ اسے احساس تھا کہ وہ اکیلا ہے۔ کوئی حملہ ہوا تو وہ جان دینے کے سوا کچھ نہیں کر سکے گا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا رب اس کے ساتھ ہے اور وہ سب سے بڑھ کر حفاظت کرنے والا ہے۔ اور جب اس نے [illegible] چھوٹے ٹھاکر کو پہرہ دیتے دیکھا تھا تو اس کا دل اور مطمئن ہوگیا

تھا۔ اللہ نے اسے زمین پر بھی اکیلا نہیں رہنے دیا تھا۔ اس گھر کا ایک اور محافظ بنا دیا تھا۔

دعا کرتے کرتے اسے نیند آ گئی!

❀ ❀ ❀

اوتار سنگھ چتا کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا!

اس کے ذہن میں سوچوں کا اژدہام تھا۔ چند گھنٹے پہلے ایک زندگی اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی۔ اور اس وقت وہ وجود جل رہا تھا، مٹ رہا تھا، جو نصف صدی سے زائد عرصے تک ایک حقیقت رہا تھا۔ آج کے بعد وہ ایک گزری ہوئی داستان ہوگا۔ ماسٹر جی کا وجود، ان کا سراپا صرف پیچھے رہ جانے والوں کے تصور میں رہے گا...... ان کی یادوں میں رہے گا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ ماسٹر جی کا عرصہ امتحان پورا ہو چکا ہے۔ اب امتحانی پرچا ان کے ہاتھ سے لیا جا چکا ہے۔ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ بہت عرصے کے بعد اسے وہ کتابیں یاد آئیں، جن میں اس نے جنت دوزخ کا احوال پڑھا تھا۔ اس کتاب میں قبر کا حال بھی دیا گیا تھا۔ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ اس کی ماتا کی تو چتا جلائی گئی تھی۔ چنانچہ وہ اس تفتیش سے بچ نکلی ہوں گی۔ مگر اس وقت ماسٹر جی کو راکھ میں تبدیل ہونے کے عمل سے گزرتا دیکھ کر اسے خیال آیا کہ اس کی وہ سوچ بے حد احمقانہ تھی۔ حساب کتاب ہونا ہے تو حساب کتاب ہوگا۔

اس نے سوچا کہ جو ہستی ایسی قدرت والی ہے کہ مرنے کے بعد بھی ہر انسان کو...... زمانہ آغاز سے لے کر لمحۂ آخر تک روئے زمین پر پیدا ہونے اور مرنے والے ہر انسان کو دوبارہ زندہ کر دے، اس سے کون بچ سکتا ہے۔ اس کا بنایا ہوا ہر قانون اٹل، اس کا قائم کیا ہوا ہر نظام مسلسل۔ اس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ موت بھی تو اس کے حکم سے آتی ہے۔ اب کوئی شخص ریل کے نیچے کٹ کر مر جاتا ہے...... ایسے کہ اس کا جسم بوٹی بوٹی ہو جاتا ہے تو وہ اس کے نظام سے بچ تو نہیں سکتا۔ جواب دہی تو سبھی کو کرنی ہے نا۔

مگر کیسے؟ اس نے سوچا۔

اگلے ہی لمحے جواب اس کے ذہن میں اُبھرا۔ جو قیامت کے دن مردوں کو، جن کے وجود کا کچھ بھی نہیں بچا ہوگا...... ہڈیاں بھی خاک ہو چکی ہوں گی، دوبارہ زندہ کر سکتا ہے تو وہ مرنے کے فوراً بعد بھی آدمی کو یکجا کر دیتا ہوگا...... سوال جواب کے لیے۔ یہ تو زیادہ آسان ہے بہ نسبت ہزار سال بعد اسے زندہ کرنے کے۔

بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ بلکہ قیاس کے زور پر وہ اپنے تئیں بہت کچھ سمجھ گیا۔ مرتے وقت چاہے آدمی کا پورا وجود مٹ گیا ہو، اللہ اسے یکجا کرتا ہے اور کسی مقام پر اس کا حساب کرتا ہے۔

وہ جانتا تھا کہ موت آتما کے شریر سے چلے جانے کا نام ہے۔ لیکن سوال جواب کے اس مرحلے سے گزارنے کے لیے اللہ آتما کو دوبارہ شریر میں لے آتا ہوگا اور تفتیش مکمل ہونے کے بعد آتما پھر چلی جاتی ہوگی۔ اور آتما شریر میں دوبارہ اس وقت آتی ہوگی، جب شریر دنیا والوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہوگا۔ وہ چاہے جلانے کے نتیجے میں ہو یا تدفین کے نتیجے میں۔

پھر اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ ممکن ہے، اللہ نے ہر آدمی کی ایک قبر بھی مقرر کی ہو۔ آدمی کسی طرح بھی مرے اور مرنے کے بعد اسے جلائیں یا دفن کریں، وہ اپنی اس قبر میں کچھ دیر سوال جواب کے مرحلوں سے ضرور گزرتا ہوگا۔ ورنہ جو آدمی سمندر میں ڈوب کر مر جائے اور اس کی لاش بھی نہ ملے، ظاہر دار لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ وہ سوال جواب کے مرحلوں سے بچ گیا۔ لیکن اللہ کا فرمان ہے کہ یہ مرحلہ ہر آدمی کے لیے ہے تو یہ اٹل ہے۔

وہ یہ سوچتا رہا۔ لیکن پنڈت نے اسے چونکا دیا۔ ”یہ لو بالک۔“

اس نے چونک کر پنڈت کو دیکھا۔ وہ ایک ہانڈی اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ ”یہ کیا ہے مہاراج؟“ اس نے پوچھا۔

پنڈت کی نگاہوں میں ایک لمحے کو ملامت ابھری۔ مگر فوراً ہی معدوم ہو گئی۔ ”یہ راکھ ہے تمھارے پتا کی۔“

ہانڈی کے منہ پر لال کپڑا بندھا تھا۔ اوتار سنگھ نے وہ ہانڈی لے لی۔ پنڈت نے کپڑے کا ایک خاصا بڑا تھیلا بھی اسے دیا۔ اس میں ارتھی کے پھول اور کچھ دوسری چیزیں بھی تھیں۔ اس نے وہ تھیلا بھی لے لیا۔

اسپتال کا حساب اس نے پہلے ہی صاف کر دیا تھا۔ نچلے اسٹاف میں جتنے لوگوں کا بھی ماسٹر جی سے تعلق رہا تھا اور جنھوں نے ماسٹر جی کی خدمت کی تھی، ان سب کو وہ انعام دے کر آیا تھا۔ اب تو بس دلی کا مرحلہ تھا۔

اس نے تھیلے اور ہانڈی کو اپنے بیگ میں رکھا اور لاری اڈے کی طرف چل دیا۔ خوش قسمتی اس کے ساتھ تھی۔ دلی کی روانگی میں تو ابھی وقت تھا۔ لیکن اسے ایک پرائیویٹ کار نظر آ گئی۔

”کہاں جاتا ہے بابو جی؟“ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے اس سے پوچھا۔

وہ یقیناً کسی کی ذاتی گاڑی چلانے والا تھا۔ اور اس وقت گاڑی اس کے پاس تھی۔ وہ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر کچھ کما لینا چاہتا تھا۔

”مجھے دہلی جانا ہے۔“

”تو میرے ساتھ چلیں۔ آپ کو گاڑی کے مقابلے میں مہنگا تو پڑے گا۔ لیکن میں آپ کو اس کے مقابلے میں بہت جلدی پہنچا دوں گا۔“

اوتار سنگھ کے لیے وہ پیشکش بہت بڑی نعمت تھی۔ وہ تو اس وقت اڑ کر دہلی پہنچ جانا چاہتا تھا۔ پیسے کی اسے کوئی پروا نہیں تھی۔

ڈرائیور نے باہر نکل کر اس کے لیے عقبی نشست کا دروازہ کھولا۔ اس نے اپنا بیگ رکھا اور پھر خود اندر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور نے اپنی سیٹ سنبھالی۔ ''آپ نے یہ نہیں پوچھا صاحب کہ میں کیا لوں گا؟''

''اس کی مجھے پروا نہیں۔ تم مجھے جلد سے جلد دہلی پہنچا دو۔ جو تم مانگو گے، میں اس سے زیادہ ہی دوں گا۔''

ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی!

❀....❀....❀
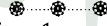
یہی وہ وقت تھا کہ اٹھارہ بیس افراد کا وہ گروہ اس گلی میں داخل ہوا، جہاں سرفراز بیگم کا مکان تھا۔ جو شخص سب سے آگے تھا، اس نے گلی میں داخل ہوتے ہی منہ پر ڈھاٹا باندھ لیا۔ وہ اس گروہ کا سرغنہ تھا۔

''یہ کیا؟'' اس کے ایک ساتھی نے اعتراض کیا۔ ''کیا تمہیں ڈر ہے کہ کوئی تمہیں پہچان لے گا؟''

سرغنے کے انداز سے لگتا تھا کہ اسے یہ سوال پسند نہیں آیا ہے۔ ''یہی سمجھ لو۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ لہجے میں بے پروائی تھی۔

''کوئی زندہ بچے گا تو پہچانے گا نا'' اس کے ایک اور ساتھی نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

سرغنے نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا تو وہ سب گلی کے سرے پر ہی رک گئے۔ ''میری بات غور سے سن لو۔'' سرغنے نے کہا۔ ''اب کوئی زور سے نہیں بولے گا۔ بات کرنے کی تو ضرورت نہیں۔ ضروری ہو تو آہستہ بولو۔''

''تو کیا ہم ڈرتے ہیں؟'' کسی نے اعتراض کیا۔

سرغنے کی آنکھوں میں مسکراہٹ کی چمک نظر آئی۔ ''یہ سیاست ہے۔ وقت آنے والا ہے کہ ہم کھل کر بھی کام کریں گے۔'' وہ کہتے کہتے رکا اور چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ ''اب پہلا کام یہ ہے کہ گلی میں جتنے بھی دروازے ہیں، سب کو باہر سے بند کر دو۔''

اس کی ہدایت پر عمل کیا جانے لگا۔ گلی میں کھلنے والے تمام دروازوں کی کنڈیاں باہر سے بند کر دی گئیں۔

وہ تمام افراد مسلح تھے۔ کچھ کے ہاتھوں میں بلم تھے۔ جو خالی ہاتھ نظر آ رہے تھے، وہ بھی مسلح تھے۔ ان کے پاس خنجر اور کرپانیں تھیں۔

تمام دروازے بند کر دیے گئے۔

اب وہ لوگ سرفراز بیگم کے مکان کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ''یہی گھر ہے نا؟'' کسی نے پوچھا۔

''سرغنے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہاں لڑکیاں بھی ہیں نا؟'' کسی نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔''

''مزہ آ جائے گا'' ایک اور چٹخارہ لیتے ہوئے بولا۔

سرغنہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس نے برابر والے دروازے کو غور سے دیکھا۔ وہ اسی مکان کے اوپری زینے کا دروازہ تھا۔ اس دروازے کو بند نہیں کیا گیا تھا۔ ''یہ دروازہ بھی بند کر دو۔'' اس نے کہا۔

''اسے بند کرنے کی کیا ضرورت ہے گرو۔ یہاں تو ہم دھاوا بولنے والے ہیں۔''

''جیسا میں کہتا ہوں، ویسا ہی کرو بے وقوف۔'' سرغنے نے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ اوپر والوں کا دروازہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس طرف سے کوئی مداخلت ہو۔ وہ ہیں تو ہندو۔ مگر مُسلوں کے ہمدرد ہیں۔''

وہ دروازہ بھی بند کر دیا گیا۔

''دروازہ کھٹکھٹائیں؟'' کسی نے پوچھا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے بے وقوف۔'' سرغنے نے جھنجلا کر کہا۔ ''بلّم استعمال کرو اور دروازہ توڑ دو۔''

دو بلم والے آگے بڑھ آئے۔ باقی سب لوگ دروازے سے ہٹ گئے۔

❀....❀....❀

رنجنا چائے لے کر کوٹھے پر پہنچی تو رگھو کوٹھے پر ٹہل رہا تھا۔ ''ارے...... تم ٹہلے جا رہے ہو۔ تھکے نہیں؟'' رنجنا نے کہا۔

حقیقت یہ تھی کہ رگھو تھک گیا تھا۔ مگر وہ سوچ رہا تھا کہ مالک بھی تو ٹہلتے رہتے ہیں۔

''تھک تو گیا ہوں۔''

''تو بیٹھ جاؤ۔ چائے پی لو۔''

رگھو بیٹھ گیا اور چائے کی پیالی لے لی۔

''یہ بتاؤ۔ ٹہلنے سے کیا فائدہ؟'' رنجنا نے کہا۔

''مجھے کیا پتا۔ پر چھوٹے ٹھاکر ٹہلتے ہیں تو کچھ فائدہ ہوگا ہی۔'' رگھو نے چائے کا

گھونٹ لیتے ہوئے جواب دیا۔

''میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔''

''میں اور تو مالک کی طرح بدھی مان تو نہیں ہیں نا۔''

''ہاں۔یہ تو ہے۔''

دونوں بیٹھے کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ رگھو چائے کے گھونٹ لیتا رہا۔ پھر اس نے خالی پیالی نیچے رکھ دی۔

وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ رنجنا نے کہا۔''اب پھر کھڑے ہو رہے ہو؟''

''ہاں۔''

''بیٹھو کچھ دیر۔ تھوڑی دیر سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔''

رگھو بیٹھ گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا، جب نیچے بند دروازے پر بلموں کی پہلی ضرب پڑی۔

وہ آواز سن کر رگھو تڑپ کر اٹھا۔''کون ہے نیچے؟'' وہ چلایا اور ساتھ ہی وہ دیوار کی طرف لپکا۔ اس نے باہر جھانکا۔ وہاں اسے بڑی تعداد میں لوگ نظر آئے۔ وہ بلموں سے دروازے پر ضربیں لگا رہے تھے۔

''کون ہو تم لوگ؟ کیا کر رہے ہو؟'' رگھو نے انہیں للکارا۔

ان میں سے ایک نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ اس کے چہرے پر ڈھاٹا بندھا تھا۔''ڈاکو ہیں ....اور دروازہ توڑ رہے ہیں۔'' اس نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

رنجنا بھی رگھو کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی اور نیچے دیکھ رہی تھی۔''ہائے رام.....'' وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

رگھو اس طرف لپکا، جہاں چھوٹے ٹھاکر کی لاٹھی تھی۔ اس نے لاٹھی اٹھائی اور رنجنا کی طرف دیکھا۔''تم نیچے نہیں آنا۔''

رنجنا نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے روکنے کی کوشش کی۔''وہ اتنے لوگ ہیں۔ تم اکیلے کیا کرو گے۔ مت جاؤ رگھو۔''

''ہٹ جا۔'' رگھو نے اسے جھٹک دیا۔''میں وہی کروں گا جو چھوٹے ٹھاکر ہوتے تو کرتے۔''

لیکن رنجنا نے پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔''تم انہیں نہیں بچا سکتے۔''

''دو چار کو مار کے مر تو سکتا ہوں۔ مالک کو وچن دیا تھا میں نے۔ کیا اب بزدلوں کی طرح منہ کالا کر کے بیٹھ جاؤں۔ کیا منہ دکھاؤں گا مالک کو۔ مجھے جانے دے۔''

وچن کا سنتے ہی رنجنا نے جھرجھری لی اور اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔''تو میں بھی چلوں گی

تمھارے ساتھ۔''

رگھو نے بحث نہیں کی۔ وہ زینے کی طرف لپکا۔ رنجنا اس کے پیچھے تھی۔

رگھو نے نیچے اتر کر باہر کھلنے والے دروازے کی چٹخنی کھولی اور دروازے کو کھینچا۔ مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس نے نیچے کے گھر میں کھلنے والے بغلی دروازے کو آزمایا۔ مگر وہ بھی دوسری طرف سے بند تھا۔

باہر سے سنائی دینے والی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ گھر کا دروازہ توڑ دیا گیا ہے اور حملہ آور اندر گھس گئے ہیں۔

رگھو لاٹھی سے کبھی ایک دروازے پر ضرب لگاتا اور کبھی دوسرے دروازے پر۔ لیکن وہ ایسے کھلنے والے نہیں تھے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ اوپر لپکا۔''کہاں جا رہے ہو؟'' رنجنا نے پکارا۔

''دروازے کو توڑنے کے لیے کچھ لاتا ہے۔'' رگھو نے پلٹ کر دیکھے بغیر جواب دیا۔

❀....❀....❀
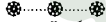
بہادر علی کی آنکھ اس احساس سے کھلی تھی کہ باہر سے آوازیں آ رہی ہیں۔ وہ گہری نیند سے اٹھا تھا۔ چند لمحے تو وہ بستر پر لیٹا رہا۔ آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ باہر کئی افراد تھے اور وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

پہلے تو بہادر علی نے اسے اپنا وہم سمجھا۔ لیکن پھر خطرے کے احساس نے اسے اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

وہ اٹھ کر بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر باہر سے ایسی ضرب لگائی گئی کہ دروازہ ہل کر رہ گیا۔

اضطراری طور پر بہادر علی کو پوچھنا چاہیے تھا..... للکارنا چاہیے تھا..... کون ہے۔ لیکن خطرے کے احساس نے اس کی تمام حسوں کو مہمیز کر دیا تھا۔ اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ یہ سوال بے معنی تھا..... مہمل تھا۔ یہاں تو دروازہ توڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اگر دروازے پر دستک دی گئی ہوتی تب بھی وہ اس سوال کو بے معنی اور مہمل ہی سمجھتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ کون ہیں اور کس نیت سے آئے ہیں۔

بہادر علی کو کافی دن سے یہ خوف تھا..... یہ خدشہ اسے ستا رہا تھا۔ وہ سوچتا کہ جب ایسا ہوگا تو اس کا کیا حال ہوگا۔ وہ گھبرائے گا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جائے گی۔ لیکن خدشہ حقیقت بن کر سامنے آیا تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بلکہ وہ اتنا پرسکون تھا کہ اسے خود بھی اپنے آپ پر حیرت ہونے لگی۔

دروازے پر دوسری ضرب لگی تو وہ تکیے کے نیچے سے سریا نکال چکا تھا۔ سریا اٹھا کر وہ

خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھا اور دروازے کی ایک جانب دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ سریا اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام کر سر سے اوپر اٹھا رکھا تھا۔ چل بہادر علی......حق نمک ادا کرنے کا وقت آ گیا۔ اس نے خود سے کہا۔

وہ جانتا تھا کہ حملہ آور تعداد میں زیادہ ہوں گے۔ ایسے ہی للکارنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے لیے تو بہتر یہی ہے کہ حملہ آوروں کو اس کی موجودگی کا احساس بھی نہ ہو۔ ان پر اچانک حملہ کر کے وہ ان میں ابتری پھیلا سکتا ہے۔ ان میں سے کچھ کو ٹھکانے لگا سکتا ہے۔ ورنہ للکارنے میں تو اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا......سوائے موت کے! وہ بہت حقیقت پسند بن کر سوچ رہا تھا۔ اللہ کی مشیت اس کے حق میں ہو اور اللہ کی خاص مدد آ جائے تو اور بات ہے۔ ورنہ اس کے سامنے تو بس یہی راستہ تھا کہ ان پر حملہ کرے اور انہیں بساط بھر نقصان پہنچا کر انہیں اندر گھسنے سے روکے۔ یہ وہ اللہ سے دعا ہی کر سکتا تھا کہ ان کے اندر گھسنے سے پہلے اسے موت آ جائے۔ جو کچھ ہونا ہے، اس کے جیتے جی نہ ہو۔

چوتھی پانچویں ضرب میں بلم دروازے کی لکڑی کو چیرتے ہوئے اندر آ گئے۔ وہ دیوار سے چپکا سانس روکے کھڑا رہا۔ مزید ضربوں کے نتیجے میں دروازے میں خاصا بڑا موکھا سا بن گیا۔ اس میں سے ایک ہاتھ اندر آیا، جس نے ٹٹول کر چٹخنی ہٹا دی۔

دروازہ کھلا اور جیسے ہی پہلا آدمی اندر آیا، بہادر علی نے پوری قوت سے سریا اس کے سر پر دے مارا۔ وہ آدمی گرا۔ لیکن اس کے پیچھے دو آدمی اور اندر آئے تھے۔ پہلے آدمی کا حشر دیکھ کر وہ بڑی پھرتی سے دائیں بائیں ہو کر اندر لپکے۔ جو بہادر علی کے قریب تھا، بہادر علی نے اس کی کمر پر سریے کا وار کیا اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

بہادر علی دوسرے آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔ مگر وہ اس سے بہت دور تھا۔ اور اتنی دیر میں اور حملہ آور بھی اندر آ گئے تھے۔

اب وہ کھلی جنگ تھی۔ بہادر علی نے فلک شگاف آواز میں نعرۂ تکبیر بلند کیا اور سریے کو اندھا دھند گھمانا شروع کیا۔ لیکن بلموں کی وجہ سے اسے پسپا ہونا پڑ رہا تھا۔ وہ دیوار سے جا لگا۔ اب سریا گھمانے کے لیے اس کے پاس زیادہ جگہ نہیں تھی اور وہ سب ایک ساتھ اس پر یلغار کر رہے تھے۔ اس کے باوجود وہ ان میں سے دو اور کافروں کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ تو نہیں معلوم کہ یہ جئیں گے یا مریں گے۔ بہرحال میں چار کو ضرب لگا چکا ہوں۔ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

اسی وقت اس کے پیٹ میں ایک بلم لگا۔ اس نے سریے کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا اور گھماتا رہا۔ دوسرا بلم اس کے سینے سے ٹکرایا تو سریا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ دیوار سے ٹک کر بیٹھتا گیا۔ حیرت ہے، مجھے تکلیف نہیں ہو رہی ہے۔ اس نے سوچا۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ چار افراد اسے گھیرے کھڑے تھے۔ دوسرے اندر کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''میری عزت رکھ لے میرے معبود۔'' اس نے زیر لب اپنے رب کو پکارا۔ ''میں نے ہمیشہ یہی دعا کی ہے کہ میرے جیتے جی کوئی بدنیت اس ڈیوڑھی کو نہ پھلانگے۔''

''ہاں بھئی مُسلے...... پاکستان جائے گا؟'' کوئی اس سے پوچھ رہا تھا۔

دوسری طرف گھر میں کھلنے والے دروازے پر ضربیں پڑ رہی تھیں۔ اندر سے چھمن بوا اور بڑی بیگم کے چیخنے......مدد کے لیے پکارنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

بہادر علی نے بولنے کی کوشش کی تو اس کے منہ سے خون ابل پڑا۔ تکلیف اسے اب بھی نہیں ہو رہی تھی۔ ''پاکستان زندہ باد......'' اس نے ٹوٹتی نحیف آواز میں کہا۔

''جے واہ گرو کی۔'' سکھ نے نعرہ لگایا اور اس کی کرپان حرکت میں آئی۔

بہادر علی کی گردن سے خون کا فوارہ بلند ہوا۔ اے اللہ......کلمہ نصیب فرما دے۔ اس نے دل میں دعا کی۔ اس کے لب ہلے......لا الہ......الا اللہ......خون کے بلبلے اس کے لبوں پر بن رہے تھے، پھوٹ رہے تھے۔ ایک لمحے ہونٹ بے آواز ہلے......پھر صاف اور واضح آواز......محمد الرسول اللہ اور خون کا ایک بڑا بلبلہ اس کے ہونٹوں پر ساکت ہو گیا۔

اندر گھر میں کھلنے والا دروازہ ٹوٹا تو بہادر علی اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر چکا تھا۔ اللہ نے اس کی عزت رکھ لی تھی!

❀......❀......❀

رگھو بولایا بولایا پورے گھر میں پھر رہا تھا۔ اسے ایسی کوئی چیز نہیں مل رہی تھی، جو دروازہ توڑنے میں مدد کرتی۔

رنجنا خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

رگھو دوبارہ رسوئی میں چلا آیا۔ ''کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں۔''

''کچھ بتاؤ تو۔ کس طرح کی چیز۔''

''کلہاڑی ہو، کدال ہو، کوئی آری ہو۔''

''ایسی تو کوئی چیز گھر میں ہے نہیں۔''

رگھو جھنجلا گیا۔ وہ بار بار ہاتھ مل رہا تھا۔ ''کیا کروں میں؟'' پھر اس نے لپک کر بڑی، لمبی چھری اٹھائی، جو سبزی کاٹنے کے کام آتی تھی۔

''اس کا کیا کرو گے؟'' رنجنا نے گھبرا کر پوچھا۔

''دروازہ کاٹنے کی کوشش کروں گا۔''

''اس سے کچھ نہیں ہوگا۔''

رگھو نے سل کے پاس رکھا ہوا بٹا اٹھالیا۔''کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے۔''

دونوں چیزیں لے کر وہ پھر زینے پر لپکا۔ رنجنا اس کے پیچھے تھی۔ رگھو کی لاٹھی وہیں دروازے کے پاس پڑی تھی۔

رگھو نے باہر والے دروازے پر مناسب جگہ تلاش کر کے وہاں چھری رکھی اور بٹے سے اس کے دستے پر ضربیں لگا کر اسے دروازے میں پیوست کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن ذرا دیر میں ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ اس دروازے کی لکڑی بہت مضبوط ہے۔ ایک طرف تو چھری کی نوک کند ہونے لگی۔ دوسری طرف چھری کا دستہ ٹوٹ گیا اور دھات نمودار ہوگئی۔

مزید کچھ کوشش کے نتیجے میں دروازے سے لکڑی کی کچھ کھپچیاں ٹوٹ کر اُڑیں۔

رگھو نے ہاتھ روک لیا۔ وہ مایوس ہوگیا تھا۔ اس نے نیچے کے گھر میں کھلنے والے دروازے کو دیکھا۔ باہر کے دروازے کی نسبت وہ آسان ہدف معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اس دروازے پر کوشش شروع کردی۔

اس کوشش میں اس کے ہاتھ زخمی ہوگئے۔ کئی بار چھری پھسل کر اس کے ہاتھ پر لگی۔

''ہے بھگوان۔ تمہارا ہاتھ گھائل ہوگیا ہے۔'' رنجنا نے پریشان ہو کر کہا۔ ''چھوڑو نا۔ اس طرح دروازہ نہیں کھلے گا۔''

رگھو نے اپنے زخمی ہاتھ سے بہتا ہوا خون اپنی قمیص پر پونچھا اور جھنجلا کر بولا۔ ''تو کیا کروں؟''

''کچھ اور سوچو۔''

اسی وقت دروازے کی دوسری طرف سے ایک دل دوز نسوانی چیخ سنائی دی۔ رگھو پھر چھری لے کر دروازے پر پل پڑا۔

❁......❁......❁

نیچے سب سے پہلے چھمن بوا کی آنکھ کھلی تھی اور اس کا سبب دروازے پر پڑنے والی ضربیں تھیں۔ وہ چونک کر اٹھیں۔ ان کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ اٹھنے سے پہلے ہی ان کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ بات کیا ہے کیونکہ وہ خوف تو انھیں ہر روز ستاتا تھا۔ آج وہ خوف حقیقت میں بدل گیا تھا۔

جاگتے ہی وہ تیزی سے بڑی بیگم کو جگانے کے لیے لپکیں۔

لیکن سرفراز بیگم پہلے ہی جاگ چکی تھیں۔ فرق یہ تھا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ یہی بات انھوں نے چھمن بوا سے پوچھی۔

''ہہ......ہہ......حملہ......بب......بڑی بیگم۔'' چھمن بوا کی آواز بری طرح لرز رہی تھیں۔

سرفراز بیگم یوں بستر سے اٹھیں، جیسے کرنٹ لگا ہو۔ ''بچیاں! بچیوں کو کہیں چھپانا ہے۔'' وہ بولیں۔

دونوں اندر کی طرف بھاگیں۔ دونوں پوری جان سے کانپ رہی تھیں۔ چھمن بوا باورچی خانے میں گھس گئیں اور سرفراز بیگم بچیوں کے کمرے کی طرف چل دیں۔

کمرے میں نور بانو جاگ چکی تھی۔ مگر نیند میں تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے، یہ آواز کیسی ہے اور وہ کیوں جاگی ہے؟

سرفراز بیگم کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ''جلدی سے اٹھو اور کہیں چھپ جاؤ۔'' سرفراز بیگم نے اس سے کہا۔

''کیا ہوا ہے اماں؟''

''یہ سب بتانے کا وقت نہیں ہے۔'' سرفراز بیگم نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''بہنوں کو اٹھاؤ اور کہیں ایسی جگہ چھپ جاؤ، جہاں ظالم تمھیں نہ دیکھ سکیں۔ جلدی کرو میری بچی۔'' وہ رونے لگیں۔ ''اے اللہ... تو ہی حفاظت کرنے والا ہے۔''

نور بانو اپنے برابر لیٹی ہوئی گلنار کو جھنجوڑنے لگی۔ ''اٹھ جاؤ گلنار۔ جلدی کرو۔''

سرفراز بیگم نے حور بانو کو جھنجوڑ ڈالا۔

آخر تمام بچیاں اٹھ گئیں۔ حور بانو خود کو رضائی میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیونکہ اس کے جسم پر چھوٹے ٹھاکر کا کرتا تھا۔ عجیب بات تھی کہ وہ زندگی اور موت کے اس کھیل میں زندگی بچانے کی فکر کرنے کے بجائے اس فکر میں تھی کہ اس کی خاموش محبت کا راز نہ کھل جائے۔

اس نے سوتے وقت اللہ سے پردہ رکھنے کی دعا کی تھی اور وہ دعا قبول ہوگئی تھی۔ وہ سب سے پہلے تو نہیں اٹھ سکی تھی۔ لیکن وہ لوگ جس صورتِ حال میں جاگے تھے، اس میں کس کو یہ دیکھنے کی فرصت نہیں تھی کہ کون کس حال میں ہے۔ کسی نے نہیں دیکھا کہ اس کے جسم پر چھوٹے ٹھاکر کا ایک کرتا چادر کی طرح پڑا ہے۔

''اٹھو تم لوگ جلدی جلدی کہیں چھپ جاؤ۔'' سرفراز بیگم کے لہجے میں وحشت تھی۔

''کہاں چھپیں اماں؟''

''جہاں تمہارا دل گواہی دے کہ تم محفوظ ہو۔ لیکن الگ الگ چھپنا۔'' سرفراز بیگم نے کہا اور باہر کی طرف لپکیں۔ بچیوں کو اس حال میں چھوڑ کر باہر جانے کو ان کا دل تو نہیں مان رہا تھا۔ لیکن وہ بچیوں کے پاس رہتیں تو ان کے لیے نقصان کا باعث ہی بنتیں۔ اگر وہ اپنی آنکھوں سے بچیوں کو کسی محفوظ جگہ پر چھپا ہوا دیکھ لیتیں تو ان کے دل کو سکون ہو جاتا۔ لیکن اتنی مہلت ان کے پاس نہیں تھی۔ باہر دروازے پر پڑنے والی ضربوں سے اب اندازہ ہو رہا تھا کہ دروازہ کسی بھی لمحے

ٹوٹ جائے گا۔ اور یہ ضروری تھا کہ دروازہ ٹوٹے تو وہ وہاں موجود ہوں۔ اس طرح وہ اپنی بچیوں کے لیے تھوڑی سی مہلت کما سکتی تھیں۔

''جلدی کرو تم لوگ۔ فوراً چھپ جاؤ۔ اللہ تمہاری حفاظت فرمائے۔'' سرفراز بیگم نے کہا اور دل میں کلمہ طیبہ کا ورد کرتی ہوئی باہر نکلیں۔

بچیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کوٹھری کی طرف بڑھیں۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ یہی سوچ رہی تھیں کہ کاش اماں انھیں چھپنے کی جگہ بھی بتا دیتیں۔ ان کی ٹانگیں ان کے جسم کا بوجھ نہیں اٹھا پا رہی تھیں۔ ان کے جسم سوکھے پتوں کی طرح لرز رہے تھے۔

جس خوف سے وہ نڈھال تھیں، اس کی نوعیت کا انھیں ذرا بھی اندازہ نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ انھیں کس طرح کا خطرہ لاحق ہے!

❁......❁......❁
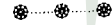
حملہ آور دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے تو سب سے پہلے انھیں چھمن بوا نظر آئیں۔ ان کے ہاتھ میں چھری تھی۔ لیکن جسم پر لرزہ طاری تھا۔

سرغنہ سب سے آگے تھا۔ چھمن بوا کو دیکھ کر وہ زہریلے انداز میں ہنسا۔ ''تم لوگ بھی وہی دیکھ رہے ہو جو مجھے نظر آ رہا ہے۔'' اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔

اس کے ساتھی بھی قہقہے لگانے لگے۔ ''ہاں گرو۔ اب اس بڑھیا سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔''

چھمن بوا کے ہاتھ سے چھری چھوٹ گئی۔ اسی لمحے ایک بلم ان کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

یہ وہ لمحہ تھا، جب سرفراز بیگم صحن میں نکل کر آئیں۔ ''کیا چاہتے ہو تم لوگ؟'' انھوں نے باوقار لہجے میں کہا۔ لیکن ان کی آواز لرز رہی تھی۔

''بتانے سے کیا ہوگا؟'' سرغنے نے جواب میں سوال کیا۔

''تم جو چاہو گے مل جائے گا۔ بس جان اور عزت کی امان دے دو ہمیں۔''

''تمھارے احسان کی ضرورت نہیں۔ وہ تو ہمیں یوں بھی مل جائے گا۔'' سرغنہ زہریلے انداز میں ہنسا۔ ''کون روک سکتا ہے ہمیں۔''

''میں نے کہا نا کہ جان اور عزت کی امان دے دو ہمیں۔''

''اور اگر میں یہ کہوں کہ یہ دونوں چیزیں تمھیں نہیں مل سکتیں تو؟''

''تو میں یہ کہوں گی کہ صرف عزت کی امان دے دو۔ بے شک مجھ سے زندگی چھین لو۔''

سرغنہ پھر ہنسنے لگا۔ ''ہاں جیون تو تمہارا پاکستان کے لیے ہے۔ وہ تو تم خوشی سے دے دو گی۔ ہم لے بھی لیں گے۔ مگر عزت تو تمہاری ہندوستان میں ہے۔ ہندوستان کے لیے ہے اور تم

تو اتنی قیمتی بھی نہیں ہو۔ ہمیں تو لڑکیاں چاہئیں تمہاری۔''

''وہ...... وہ تو گھر میں نہیں ہیں۔''

''اوہ...... ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا۔ ورنہ ہم آتے ہی کیوں یہاں۔'' سرغنے نے کہا۔ ''ویسے یہ تو بتا دو، وہ ہیں کہاں؟''

''وہ آگرہ گئی ہیں...... اپنے چچا کے ہاں۔''

''ہمیں پتا ہے۔ بے خبر نہیں ہیں۔ ہم۔ یہاں سے کوئی اب تک کہیں نہیں گیا۔ ہاں اب جائے گا...... اور جو بھی جائے گا، پاکستان جائے گا۔''

''دیکھو ہم پر رحم کرو۔ ہمارے ہاں کوئی مرد نہیں جو ہمارا تحفظ......''

''تھوڑی دیر پہلے تک ایک تھا۔ اسے ہم نے پاکستان بھیج دیا ہے۔'' سرغنے نے کہا۔ پھر اس کے لہجے میں نفرت اور سفاکی در آئی۔ ''اس نے ہمیں جو نقصان پہنچایا ہے، اس کا حساب بھی تم سے لینا ہے۔''

''جے ہند۔'' اس کے ساتھیوں نے نعرہ لگایا۔

سرفراز بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تو وفادار، نمک خوار بہادر علی اپنے آقا کے گھر کی چوکھٹ پر قربان ہو گیا۔ ان کے سینے میں جیسے کچھ ٹوٹ گیا۔ چھمن بوا بھی گئیں اور اب ان کی باری ہے۔ کوئی بات نہیں۔ موت تو اپنے وقت پر آنی ہے۔ انھیں اپنی موت کی فکر نہیں تھی۔ انھیں تو یہ پریشانی تھی کہ بچیوں کا کیا ہوگا انھیں فکر تھی تو عزت کی۔ انھوں نے دل ہی دل میں اللہ کو پکارا۔

''گرو...... آگے بھی بڑھنا ہے۔'' کسی چیلے نے سرغنے کو چونکا دیا۔

سرغنہ سرفراز بیگم کو گھورنے لگا۔ وہ نگاہیں بے حد گندی...... غلیظ تھیں۔ سرفراز بیگم کے رخسار تمتما اٹھے۔ وہ نظریں جھکانے پر مجبور ہو گئیں۔

''سنو...... عمر تو زیادہ ہے۔ لیکن ہڈیوں میں رس اب بھی ہے۔'' سرغنے نے سرفراز بیگم کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اب جو زیادہ بھوکا ہو، وہ کھانا کھا لے۔''

سرفراز بیگم کا چہرہ فق ہو گیا۔ اپنی عمر کے پیش نظر یہ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کی عزت کو بھی خطرہ لاحق ہے۔ مرنے کے لیے تو وہ تیار تھیں۔ لیکن عزت ہی سے تو وہ سب سے زیادہ ڈرتی تھیں۔ ''خدا کے لیے، ہم پر رحم کرو۔'' وہ گڑگڑائیں۔

''بھگوان کے لیے کہو تو میں کچھ سوچوں۔'' سرغنے نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''لیکن وہ تم کہو گی نہیں۔''

سرفراز بیگم کے ہونٹ بھنچ گئے۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹیں۔ اپنی عزت پر بات آئی تو وہ بچیوں کو بھی بھول گئیں۔

اسی وقت تین چار افراد ان پر ٹوٹ پڑے۔

''چلو......لڑکیوں کو تلاش کریں۔'' سرغنے نے باقی لوگوں سے کہا۔

وہ لمحے ایسے تھے کہ شیطان ننگا ہو کر ناچ رہا تھا۔ انسانیت کی تذلیل ہو رہی تھی۔ مسلمانوں کو مسلمان ہونے اور اپنے لیے الگ وطن مانگنے کی سزا دینے والے اپنی دانست میں تقسیم ہند کے عمل کو روک رہے تھے۔ ان کے سڑے ہوئے بدبودار دماغوں میں یہ بات نہیں آئی کہ اپنے اس عمل سے وہ پاکستان کی ضرورت ثابت کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو جتا رہے ہیں کہ ان کی بقا اس میں ہے کہ پاکستان قائم ہو اور ہمیشہ قائم رہے۔

اس گھر سے پہلی بلند ہونے والی چیخ سرفراز بیگم کی تھی۔ اس کے بعد تو ان کی چیخیں آسمان کو چھونے لگیں۔ وہ جس درندگی کا سامنا کر رہی تھیں، اس کا انھوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

باقی لوگ گھر میں دندنا رہے تھے۔ انھیں لڑکیوں کی تلاش تھی۔

''یہیں کہیں چھپی ہوں گی۔ ڈھونڈو انھیں۔'' سرغنے نے کہا۔

تین چار آدمی کوٹھری میں گھس گئے۔ ''اس صندوق کو کھول کر دیکھو۔'' کسی نے کہا۔

صندوق کھولا گیا۔ اس میں استری کیے ہوئے کپڑے تہ کیے ہوئے رکھے تھے۔ ''اس میں کپڑے ہیں۔'' کھولنے والے نے جواب دیا۔

''لاٹھی سے ٹٹول کر دیکھ۔ کیا پتا، نیچے کوئی ہیرا ہو۔''

مگر اس وقت کوئی چلایا۔ ''وہ رہی۔''

صندوق کھولنے والے نے بے ساختہ صندوق بند کر دیا اور اس طرف دیکھا۔ وہاں اس کا ایک ساتھی گلنار کو دبوچے کھڑا تھا۔ ''باہر لے چل اسے...... گروجی کے پاس۔'' وہ فاتحانہ لہجے میں چلایا۔

اس لمحے حور بانو بھی پکڑی گئی۔

دونوں لڑکیوں کو کمرے میں لے جایا گیا، جہاں سرغنہ موجود تھا۔ ''یہ مل گئیں گرو۔'' لانے والے نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

''تیسری نہیں ملی؟''

''تلاش کر رہے ہیں گرو۔ مل جائے گی۔ جائے گی کہاں؟''

''ڈھونڈو اسے۔''

''کوٹھری میں تو نہیں ہے۔ باہر دیکھتے ہیں۔''

باہر سے سرفراز بیگم کی فلک شگاف دردناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ کمرے میں دونوں لڑکیاں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں تھیں۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

بالآخر وہ ڈھے گئیں۔

سرغنہ انھیں ناقدانہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ ''پہلے چھوٹی کا اگھاٹن کرتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

درندگی کا کھیل شروع ہو گیا۔ باہر اور اندر کی چیخیں گھل مل گئیں۔ تھوڑی دیر بعد باہر کی چیخیں دم توڑ گئیں۔ مگر اندر ایک چیخنے والی کا اضافہ ہو گیا۔ روئے زمین پر کوئی سننے والا نہیں تھا...... سوائے اس ایک کے جو بے بس تھا!

❁......❁......❁

رگھو کی چھری جواب دے گئی تھی اور دونوں ہاتھ لہولہان تھے۔ دروازے کے پار صحن کی طرف سے دردناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر اندر سے بھی چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی۔

''میں کیا کروں مالک۔ میں ہار گیا۔'' رگھو نے دروازے سے سر ٹکرایا۔ ''میں کیا منہ دکھاؤں گا تمھیں مالک۔''

رنجنا دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ ''ہے بھگوان، یہ کیسا انیائے ہے؟''

رگھو دروازے سے سر ٹکراتا رہا۔ اس کے سوا وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت وہ تکلیف کے ہر احساس سے بے نیاز تھا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ اس کا ماتھا زخمی ہو گیا ہے اور خون بہہ کر اس کے چہرے پر آ رہا ہے۔

رنجنا بہ دستور روئے جا رہی تھی۔ اب اس نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

گزرتا ہوا ہر لمحہ اذیتوں کی طرح طویل تھا۔ دردناک چیخوں کو سنتے ہوئے لگتا تھا کہ دل پھٹ جائے گا۔ پھر اچانک ہی صحن کی طرف سے سنائی دینے والی چیخیں دم توڑنے لگیں اور آہستہ آہستہ معدوم ہوتی گئیں، جیسے کسی نے زندگی کو اذیت سے چھٹکارا دلا دیا ہو۔

لیکن اندر سے سنائی دینے والی چیخوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

رگھو دروازے سے سر ٹکراتا رہا۔ رنجنا روتی رہی۔ سسکتے ہوئے لمحے اٹک اٹک کر، ٹھہر ٹھہر کر گزرتے رہے۔ کتنا وقت گزر گیا تھا، اس کا کوئی پیمانہ نہیں تھا...... نہ اذیت دینے والوں کے پاس، نہ اذیت سے گزرنے والوں کے پاس اور نہ ناکام چارہ گروں کے پاس۔

پھر اچانک ہر طرف موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ بس رات کا سکوت نوحہ گری کر رہا تھا۔

''سب کچھ نشٹ ہو گیا...... سب کچھ۔'' رگھو نے دروازے سے زخمی پیشانی ٹکا دی اور رونے لگا۔ رنجنا بھی رو رہی تھی۔

پھر دروازے کے دوسری طرف بھاری قدموں کی چاپیں ابھریں...... پھر اوباش قہقہے،

فحش تبصرے اور گندے جملے۔ یہ سب دور ہوتا گیا۔ پھر گلی کی جانب سے وہی سب کچھ سنائی دیا اور دور ہوتا گیا۔

اب رات کے سناٹے میں رگھو کی سسکیوں اور رنجنا کے گریے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ قیامت صرف ڈیڑھ گھنٹے کے لیے آئی تھی اور سب کچھ تہس نہس کر کے چلی گئی تھی۔

❁....❁....❁
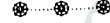
گلی میں گھستے ہی اوتار سنگھ کو یہ احساس ستانے لگا کہ کہیں کوئی بڑی گڑبڑ ہے۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس کا احساس غیر شعوری تھا۔ بہرحال وہ چوکنا ہو گیا، جیسے کوئی نامعلوم خطرہ اس کا منتظر ہو۔

پھر اچانک بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ ایک گھر کے دروازے کو اس نے باہر سے بند دیکھا۔ پھر دوسرے کو بھی بند پایا۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔ کوئی بات ضرور تھی۔ اس نے پلٹ کر پیچھے رہ جانے والے دروازوں کو دیکھا۔ وہ سارے بھی بند تھے۔ شاید انہی دروازوں کو اس نے غیر شعوری طور پر دیکھا تھا اور انہی کی وجہ سے اسے گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔

اس کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔ لیکن وہ دونوں طرف کے دروازوں کو بھی دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ اب تک گلی میں اسے ایک دروازہ بھی ایسا نظر نہیں آیا تھا، جو بند نہ ہو۔ البتہ ہر گھر میں سناٹا تھا۔ کہیں کوئی آہٹ، کوئی آواز نہیں تھی۔

اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا تو اس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔ نیچے والے گھر کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ کھلا ہوا نہیں تھا۔ بلکہ اسے توڑا گیا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ گلی کے بند دروازوں کو یکسر بھول گیا۔ اس نے بڑھ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ ٹوٹے ہوئے دروازے سے دو قدم آگے اس کے گھر کا دروازہ ہے اور وہ بھی باہر سے بند ہے۔ وہ تو ٹوٹے ہوئے دروازے پر ٹھٹھک کر رہ گیا تھا۔ اس کے قدم جیسے زمین نے پکڑ لیے تھے۔

چند لمحے تو وہ ساکت وصامت کھڑا رہا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر اندر جھانکا۔ اندر اندھیرا تھا۔ ابتداء میں تو اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ لیکن پھر نظر اندھیرے سے ہم آہنگ ہوئی تو اسے فرش پر ایک جسم پڑا نظر آیا۔ اور وہ جسم بے حس وحرکت تھا۔

اوتار سنگھ نے وہ چوکھٹ کبھی نہیں پھلانگی تھی۔ وہ ہچکچا رہا تھا۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ یہ تو ڈیوڑھی ہے..... زنان خانے سے بہت دور۔ اور صورت حال ایسی ہے کہ اس کا اندر جا کر دیکھنا ضروری ہو گیا ہے۔

وہ اندر گیا اور اس جسم کے پاس جا کر جھکا۔ وہ خون میں لت پت بہادر علی کی لاش تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کارنس پر لالٹین رکھی تھی۔ مگر وہ روشن نہیں تھی۔ وہ کارنس کی طرف بڑھا۔

مگر اس سے پہلے ہی کسی چیز سے الجھ کر گر پڑا۔

وہ ایک اور لاش تھی!

اب اوتار سنگھ کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر کارنس کی طرف بڑھا۔ وہاں لالٹین کے برابر دیا سلائی بھی موجود تھی۔ اس نے لالٹین روشن کر دی اور جائزہ لیا۔ دوسری لاش کسی اجنبی کی تھی اور وہاں جا بجا خون بکھرا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ میدانِ جنگ ہے۔ بہادر علی کے ہاتھ میں اب بھی لوہے کا سریا تھا۔

اندر کی جانب کھلنے والا دروازہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ اوتار سنگھ چند لمحے یہ سوچ کر الجھتا رہا کہ اندر جائے یا نہ جائے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اندر بھی سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ کون جانے، وہاں کیا دیکھنے کو ملے۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ اندر ممکن ہے، کسی کو اب بھی مدد کی ضرورت ہو۔ وہ وقت بہرحال پردے کا خیال کرنے کا نہیں تھا۔

اس نے ایک ہاتھ میں لالٹین اٹھائی اور دوسرے میں اجنبی لاش کے قریب پڑا ہوا خنجر اٹھایا اور گھر میں داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی دل ہلا دینے والا ایک منظر اس کے سامنے تھا۔ وہ چھمن بوا تھیں۔ وہ بھی مر چکی تھیں۔

مگر اس کے بعد اس نے جو کچھ دیکھا، اس سے اس کا دل پھٹنے لگا۔ ماں جی کو وہ صرف ایک نظر دیکھ سکا...... اور وہ نظر بھی غیر ارادی تھی۔ ارادے سے نظر بھر کر تو وہ انہیں اس حال میں دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اور جو کچھ اس پھسلتی ہوئی غیر ارادی نظر میں اس نے دیکھا، وہ بھی اس کے حافظے سے محو نہیں ہوا۔ حالانکہ وہ ان یادوں کو مٹا دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ اس کے دل کا...... ضمیر کا بوجھ تھیں۔

وہ ماں جی، جو اسے بیٹا کہتی تھیں، اس کے سامنے ایسی ڈھکی چھپی آتی تھیں کہ چہرے کے نقوش بھی کسی غیر مرئی نقاب میں چھپ جاتے تھے۔ وہ ماں جی آج مرنے کے بعد اس حال میں تھیں کہ ان کے بدن پر کپڑے برائے نام تھے اور اس پھسلتی ہوئی پہلی نظر میں اس نے دیکھ لیا تھا کہ انہیں بری طرح نوچا کھسوٹا، کاٹا اور بھنبھوڑا گیا ہے۔ ان کے جسم سے جا بجا خون رس رہا تھا اور ان کے چہرے پر خوف اور اذیت کا ملا جلا تاثر جیسے منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔

اوتار سنگھ نے ان کی لاش سے نظریں چرائیں اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ قریب ہی اسے ماں جی کی اوڑھنے والی چادر نظر آئی۔ وہ اس چادر کو اٹھا کر منہ پھیرے پھیرے آگے بڑھا اور اسے ماں جی کے جسم پر ڈال دیا۔

اوتار سنگھ کا دل پھٹ رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دل میں ایک ملال

تھا...... پچھتاوا جو کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ ضمیر پر ایک بوجھ تھا۔ شاید اس لیے کہ جو کچھ اس نے دیکھا تھا، اس نے اسے ہوش مندوں کے سے انداز میں سوچنے اور سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا، اس نے ماں جی سے اس گھر کی، اس گھر کے لوگوں کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا اور وہ یہ وعدہ پورا نہیں کر سکا تھا۔ اس کی ذرا سی غیر ذمے داری کے نتیجے میں ان سب پر قیامت گزر گئی تھی۔

وہ ماں جی کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اور شرمندگی سے روتا رہا۔ میں اپنی ذمے داری پوری نہ کر سکا ماں جی۔ میں اپنا وعدہ نبھا نہ سکا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ میں آپ سب کو تحفظ......

سب کے خیال نے اسے چونکا دیا۔ ارے گھر میں اور لوگ بھی تو ہوں گے۔ کیا پتا، ان میں سے کوئی محفوظ ہو۔ عقل کہتی تھی کہ کوئی نہیں بچا ہوگا۔ ماں جی کو نہیں چھوڑا ظالموں نے تو لڑکیوں کو کہاں چھوڑیں گے۔ لیکن دل کہتا تھا کہ موت تو خدا کے حکم سے ہے۔ اگر کسی کے لیے حکم نہیں ہوا تو وہ تو بچ گیا ہوگا نا۔ اور کون جانے، وہ آواز والی لڑکی بچ گئی ہو......

کوئی ظاہری امکان نہیں تھا۔ لیکن اس کے دل نے امکان کا وہ تنکا بڑی مضبوطی کے ساتھ تھام لیا۔ وہ تڑپ کر اٹھا۔ اس نے لالٹین اٹھائی اور اندر کی طرف چلا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو اب بھی بہہ رہے تھے۔

اندر، پہلا کمرا اسے خالی ملا۔ وہ آگے بڑھا۔ اس نے اسٹور روم میں جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کے برابر والا کمرا بھی خالی تھا۔ ”کوئی ہے...... کوئی ہے۔“ اس نے پکارا۔ مگر کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔

وہ سامنے والے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ اس کے دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ گھٹی گھٹی سی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ وہ ایسی آواز تھی، جیسے کوئی اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ آواز اتنی موہوم تھی کہ اسے اپنے اندر موجود امید کی تخلیق لگی۔ اور اس کے پلٹتے پلٹتے وہ موہوم آواز بھی معدوم ہو گئی۔ اس نے سر جھٹکا اور پلٹا۔

وہ اس آخری کمرے میں داخل ہوا۔ اندر کا وہ منظر اتنا روح فرسا تھا کہ اس پر لرزہ چڑھ گیا۔

وہاں دو بستر تھے، جن پر دو لڑکیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ان کے جسم جس طرح مڑے تڑے تھے، اس کو دیکھ کر یقین ہو جاتا تھا کہ وہ مر چکی ہیں۔ وہ دونوں بے لباس تھیں اور ان کے جسم لہولہان تھے۔ ان کے جسموں پر کھرونچے بھی تھے اور دانتوں کے نشان بھی۔ لیکن کوئی زخم نہیں تھا۔ اوتار سنگھ تھرا کر رہ گیا۔ پہلی بار وہ دیکھ رہا تھا کہ انسان درندگی پر اتر آئے تو درندے بھی شرما جاتے ہیں۔

اس نے ایک نظر میں وہ سب کچھ دیکھا اور اضطراری طور پر نظر ہٹا لی۔ اب وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ جو بستر اس کے قریب تھا، اس پر کوئی چادر، کوئی چیز ایسی نہیں تھی، جو پردے کا کام کرتی۔ پھر اسے وہ سفید کرتا نظر آ گیا۔

وہ بکھرے ہوئے وجود سے نظریں چراتے ہوئے اس طرف بڑھا۔ اس نے وہ کرتا اٹھایا اور بے کسی کی موت مرنے والی کے بدن پر ڈال دیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ لڑکی ماں جی کی سب سے بڑی بیٹی حور بانو ہے۔ اور جس کرتے سے اس نے اس کی برہنگی کو ڈھانپا ہے، وہ کرتا اس لڑکی نے اس کے لیے اپنے ہاتھوں سے کاڑھا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ لڑکی رات کو اس کرتے کو چادر کی طرح اپنے جسم پر ڈال کر سوئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ لڑکی اس سے محبت کرتی تھی...... اتنی محبت کہ لوگ کسی سے کم ہی کرتے ہیں۔ وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

اسے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس نے اس کے جسم پر کرتا ڈالا تھا۔ اسے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ کرتا اس کے جسم کو پوری طرح سے ڈھانپ سکا ہے یا نہیں۔ اس لیے اسے اس طرف دیکھنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

وہ دوسرے پلنگ کی طرف بڑھا۔ وہاں چادر موجود تھی۔ اس نے چادر کو اچھی طرح پھیلا کر اس مڑے تڑے وجود پر ڈال دیا۔ اس نے دوسری لڑکی کے چہرے کو دیکھا۔ وہ بہت کم سن تھی۔ یقینی طور پر وہ سب سے چھوٹی بہن ہوگی۔ اس کے معصوم چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔ لیکن کھلی آنکھوں میں منجمد اذیت گواہی دے رہی تھی کہ زندگی کی موت سے ہم آغوشی کے لمحے اس کے لیے بہت بھیانک رہے ہوں گے۔

اوتار سنگھ نے بڑی نرمی اور نزاکت سے اس کی آنکھوں کو بند کر دیا۔ اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ لڑکی اسے ٹھا کر بھیا کہہ کر پکارنا چاہتی تھی۔ بھیا کہہ کر اس سے لپٹ جانا، اس سے لاڈ کرنا چاہتی تھی۔ بھائی سے محروم وہ لڑکی اسے بھائی سمجھتی تھی اور اس سے بہت محبت کرتی تھی۔

اوتار سنگھ نے دوسری چادر یا کسی اور چیز کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ پھر اسے پلنگ کے پہلو میں فرش پر گری ہوئی وہ چادر نظر آئی۔ اس نے اسے اٹھایا، جھاڑا اور اسے لے کر پہلی لڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ منہ پھیرے پھیرے اس نے لڑکی پر وہ چادر پھیلا کر ڈالی۔ پھر اس نے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ بے حد حسین لڑکی رہی ہوگی۔ لیکن اس کا چہرہ اذیت سے چٹخا ہوا تھا۔ جو چیز چھوٹی لڑکی کی طرف آنکھوں میں تھی، وہ اس لڑکی کے پورے چہرے پر تھی۔ اس چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ چہرہ نہیں، عکس ہے...... اور وہ بھی چور چور آئینے میں نظر آنے والا

عکس، اس کی آنکھیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔

اس لڑکی کی آنکھیں بند کرتے ہوئے اوتار سنگھ سوچ رہا تھا کہ دونوں لڑکیوں میں یہ تضاد کیسا ہے۔ ایک کے چہرے پر سکون اور دوسری کے چہرے پر اذیت۔ پھر اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ چھوٹی لڑکی نے موت سے کچھ دیر پہلے خود کو موت کے سپرد کر دیا ہوگا۔ اسے بھیانک حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا ہوگا۔ جبکہ بڑی لڑکی آخری لمحے تک موت اور ذلت...... دونوں سے لڑتی رہی ہوگی۔

اچانک اوتار سنگھ کو خیال آیا کہ وہ تین بہنیں تھیں۔ تیسری کہاں ہے؟

یہی وہ وقت تھا کہ گھٹی گھٹی سسکیوں کی وہ آواز پھر ابھری...... اور بہ تدریج بلند آہنگ ہوتی گئی۔ گھٹی گھٹی سسکیاں تو وہ اب بھی تھیں۔ لیکن اتنی گھٹی ہوئی بھی نہیں تھیں۔ آواز سے پتا چل رہا تھا کہ سسکیوں کو گھونٹنے والی اب اپنی قوت سے محروم ہو رہی ہے۔ سسکیاں اس کے ضبط سے باہر ہوئی جا رہی تھیں۔

اوتار سنگھ آواز کی سمت لپکا۔ ساتھ ہی اس نے پھر پکارا۔ ''کون......؟ کہاں ہو تم؟''

اس کی آواز پر ردِعمل یہ ہوا کہ سسکنے والے نے شاید اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر سسکیاں بھینچنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں آواز ہلکی ہو گئی۔

اتنی دیر میں اوتار سنگھ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ آواز کوٹھری کے اندر سے آ رہی ہے۔ وہ لالٹین اٹھائے کوٹھری میں داخل ہوا۔ خنجر نجانے کب وہ پچھلے کمرے میں ہی چھوڑ آیا تھا۔ ویسے بھی اس کی اب ضرورت نہیں تھی۔ گھر میں کوئی حملہ آور موجود نہیں تھا۔

وہ کوٹھری میں داخل ہوا تو وہ آواز بے حد موہوم ہو چکی تھی۔ اس کی وجہ سے سمت کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ بلکہ دھیمی...... بہت دھیمی سی وہ آواز، اسے تو لگتا تھا کہ ہر طرف سے آ رہی ہے۔

اس نے کوٹھری کا جائزہ لیا۔ وہ ویسی ہی کوٹھری تھی، جیسی عام طور پر گھروں میں ہوتی ہیں۔ وہاں گھر کا فاضل سامان رکھا تھا...... مگر بکھرا ہوا نہیں۔ اسے سلیقے سے رکھا گیا تھا۔ سامنے ہی اسے اوپر تلے تین ٹرنک رکھے نظر آئے۔ اس کے برابر ایک بہت بڑا صندوق رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ اس میں بستر رکھے جاتے ہوں گے۔ پہلو والی دیوار کے ساتھ ایک بڑی الماری رکھی تھی اور جو اِدھر اُدھر دوسرا سامان تھا، اس میں ایسا کچھ نہیں تھا کہ کسی کے چھپنے کی جگہ ہو۔

اس کی نگاہیں اوپر تلے رکھے صندوقوں پر جم گئیں۔ اوپر والا صندوق بھی اتنا بڑا تھا کہ اس میں ایک لڑکی بہ آسانی سما سکتی تھی۔ سسکیوں کی موہوم، گھٹی گھٹی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ اسے لگا کہ آواز اسی صندوق سے آ رہی ہے۔

وہ اس طرف بڑھا۔ ''ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میں ہوں اوتار سنگھ۔''

اس کے یہ کہتے ہی سسکیاں ہذیانی چیخوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ''نہیں...... نہیں...... میرے پاس نہ آنا...... خدا کے لیے...... مجھے چھوڑ دو...... رحم کرو مجھ پر......''

آواز سے اوتار سنگھ کو اندازہ ہوا کہ آواز والی پوری طرح ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ خوف اتنا بڑھا ہوا ہے کہ دہشت کی حد کو پہنچ گیا ہے۔ ''ڈرو نہیں، یہ میں ہوں چھوٹا ٹھاکر۔''

آواز پھر گھٹنے لگی۔ اوتار سنگھ نے صندوق کھولا۔ اس میں کرتے رکھے تھے۔ صندوق وہ کافی بڑا تھا۔ اس نے کرتے ہٹائے۔ لیکن لمحوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ لڑکی وہاں نہیں ہے۔ ساتھ ہی اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ کہاں ہے۔

اس نے بستروں کے بہت بڑے صندوق کو کھولا۔ اوپر دو تین لحاف مڑے تڑے، بے ترتیب رکھے تھے۔ صندوق کی مجموعی حالت بھی ابتری کی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی تلاشی لی گئی ہے۔

اس نے اوپر کے لحاف گدے اٹھائے تو اسے لڑکی نظر آ گئی۔ اس کا ہاتھ سختی سے اپنے منہ پر جما تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ لیکن کھل جانے کا احساس ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور اس کا ہاتھ منہ پر سے ہٹ گیا۔ ''ہٹ جاؤ...... مجھے چھوڑ دو...... رحم کرو مجھ پر......'' وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔

اوتار سنگھ نے وہ آنکھیں دیکھیں۔ وہ کیفیت وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ ان آنکھوں میں گہری دہشت تھی اور اس کے علاوہ عجیب سا خالی خالی پن تھا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی...... لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی اور وہ پوری جان سے کانپ رہی تھی...... کسی سوکھے پتے کی طرح!

او ر دیکھتے ہی دیکھتے لڑکی کے دانت بھنچ گئے۔ آنکھیں مندنے لگیں۔ اس کے لرزتے بدن نے ایک طویل جھٹکا لیا اور اگلے ہی لمحے وہ کسی بے جان گڑیا کی طرح ڈھے گئی۔

اوتار سنگھ صرف ایک لمحے کے لیے جھجکا۔ پھر اس نے اس لڑکی کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ اس کا دل سینے میں دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ کم از کم کوئی ایک تو زندہ مل گیا۔ وہ لڑکی کو ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے کوٹھری سے نکلا اور صحن کی طرف چل دیا۔

❀......❀......❀
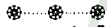
نور بانو ٹھیک سے جاگی نہیں تھی۔ لیکن اماں کے لہجے اور انداز سے اسے سنگینی کا احساس ضرور ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے چھپنے کے لیے کپڑوں کا ٹرنک منتخب کیا تھا۔ کرتوں کو اپنے اوپر پھیلاتے ہوئے اس نے ٹرنک کو بند کر لیا تھا۔

اندر گھسنے کے بعد ا[illegible] احساس ہوا کہ وہ کتنی بی [illegible]بلی پتلی [illegible] ٹرنک اس کے لیے

بہت تنگ ہے۔ وہ مڑی تڑی حالت میں دبکی ہوئی تھی۔ دم بھی گھٹ رہا تھا۔ لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ بستروں والا بڑا صندوق چھپنے کے لیے بہترین جگہ تھی۔ لیکن وہاں گلنار چھپ گئی تھی۔ اسکا جی چاہا کہ وہ اس تنگ صندوق سے نکل کر کوئی اور جگہ تلاش کرے۔ لیکن اسے ہمت نہیں ہوئی۔

اسے اتنا تو معلوم تھا کہ گھر پر حملہ ہوا ہے۔ لیکن خطرے کی نوعیت کے بارے میں وہ اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔ وہ دبکی بیٹھی کلمے کا ورد کرتی رہی۔ خوف ایسا تھا کہ آیۃ الکرسی اسے یاد نہیں آ رہی تھی۔

ٹرنک میں آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی۔ وہاں اندھیرا اور سناٹا تھا۔ پھر بھی اسے کوٹھری میں لوگوں کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ کچھ لوگ تھے، جو انھیں ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ اور سمٹ گئی۔ خطرہ سر پر آ پہنچا تھا۔

پھر کسی نے ٹرنک کھولا۔ ''اس میں کپڑے ہیں۔'' ٹرنک کھولنے والے نے کہا۔

''لاٹھی سے ٹٹول کر دیکھ۔ کیا پتا نیچے کوئی ہیرا ہو۔'' دوسری آواز نے کہا۔

نور بانو نے ایک آنکھ کی جگہ بنالی تھی اور وہ دم سادھے ہوئے تھی۔ ٹرنک کے پاس کھڑا آدمی اسے بہت بڑے ہیولے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا کہ ایک اور شخص بستروں والا ٹرنک کھول رہا ہے۔ ادھر اسے اپنا ڈر تھا کہ ابھی کپڑے ہٹا کر دیکھیں گے تو وہ پکڑی جائے گی۔ اُدھر اسے چھوٹی بہن کی فکر تھی۔

پھر بستروں والے صندوق کو کھولنے والا چلایا۔ ''وہ رہی۔''

یہ آواز سنتے ہی ٹرنک کھولنے والے نے بے ساختہ ٹرنک بند کر دیا۔ نور بانو نے سکون کی گہری سانس لی۔ مگر پھر اسے یہ فکر ستانے لگی کہ گلنار کا کیا ہوگا۔ اس پریشانی میں اس نے ٹرنک کو تھوڑا سا کھول لیا۔ تاکہ باہر کی سن گن مل سکے۔

باہر کی آوازوں سے پتا چل گیا کہ حور بانو بھی پکڑی گئی ہے۔ عجیب بات یہ تھی کہ دونوں بہنوں کے چوں کرنے کی آواز بھی اس نے نہیں سنی تھی۔ شاید وہ فرطِ خوف سے گنگ ہو گئی تھیں۔ البتہ کسی نے کہا...... انھیں گروجی کے پاس لے چلو۔

قدموں کی چاپوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ سب ان کے کمرے کی طرف جا رہے ہیں۔ نور بانو نے ٹرنک تھوڑا سا اور کھولا۔ چند لمحوں میں اسے یقین ہو گیا کہ کوٹھری میں اب کوئی نہیں ہے۔

نور بانو چند لمحے جھجکتی رہی۔ پھر نجانے کہاں سے اس میں اتنی ہمت آ گئی کہ وہ ٹرنک سے نکل آئی۔ اس نے کپڑے سلیقے اور ترتیب سے رکھنے کے بعد ٹرنک بند کر دیا۔ پھر وہ لرزتے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی۔

کوٹھری کے دروازے پر رک کر اس نے سر ذرا سا باہر نکالا۔ کمرے کا منظر تو وہ باہر نکلے بغیر نہیں دیکھ سکتی تھی اور باہر نکلنے کی بہرحال اس میں ہمت نہیں تھی۔ کمرے کی آوازیں اسے صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''تیسری نہیں ملی؟'' کمرے میں کوئی پوچھ رہا تھا۔

''تلاش کر رہے ہیں گرو۔ مل جائے گی۔ جائے گی کہاں؟'' کسی نے جواب دیا۔

''ڈھونڈو اسے۔''

''کوٹھری میں تو نہیں ہے۔ باہر دیکھتے ہیں۔''

باہر...... دوسری طرف سے اسے ماں کی دردناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان چیخوں میں ایسی اذیت تھی کہ اس پر تھرتھری چڑھ گئی۔ حملہ آوروں کی آخری بات سے اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ کم از کم فوری طور پر وہ کوٹھری کا رخ نہیں کریں گے۔ لیکن یہ تشویش بھی ہوئی کہ انھیں اس کے وجود کا علم ہے اور وہ اسے تلاش کر رہے ہیں۔

وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹ آئی اور دروازے کے ایک پٹ کو آہستگی سے بھیڑ دیا۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ کوئی اسے دیکھ لے گا۔

لالٹین ہاتھ میں لیے کچھ لوگ اسے باہر جاتے دکھائی دیے۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ اس کی تلاش کے لیے نکلے ہیں۔ باہر سے اماں کی چیخیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں لیکن اندر کمرے میں جہاں اس کی دونوں بہنیں موجود تھیں، خاموشی تھی۔

مگر اس لمحے اسے گلنار کی لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر گلنار کی نہ رکنے والی چیخوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان چیخوں میں اتنی اذیت تھی کہ انھیں سن کر کوٹھری میں کھڑی نور بانو کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔ کھڑا رہنا اس کے لیے ممکن نہیں رہا۔ وہ بیٹھ گئی۔

باہر سے اماں کی چیخیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ نور بانو نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے تھے۔ ورنہ وہ پاگل ہو جاتی۔ کیونکہ اس کے وجود میں بہن کو بچانے کے لیے لپک کر جانے کی دیوانی خواہش مچل رہی تھی۔ اور یہ پاگل پن ہی ہوتا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ بہن کو تو نہیں بچا سکے گی۔ البتہ خود بھی اسی اذیت سے دوچار ہو جائے گی۔

پھر باہر کی جانب سے اماں کی آخری چیخ سنائی دی۔ وہ دم توڑتی ہوئی چیخ تھی۔ اس کے بعد باہر سناٹا چھا گیا۔ اندر گلنار کی چیخوں میں شدت اور اذیت اور بڑھ گئی تھی۔ پھر اندر سے ایک اور چیخ بلند ہوئی۔ وہ آپی کی چیخ تھی...... حور بانو کی چیخ!

اب کانوں پر ہاتھ رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ بہنوں کی وہ چیخیں اس کے وجود میں اتر کر بازگشت کی طرح گونج رہی تھیں...... وجود کی دیواروں سے سر ٹکرا رہی تھیں، ایسے

پرندوں کی طرح، جو کسی تنگ جگہ میں بند کر دیے گئے ہوں اور انھیں باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا ہو۔ وہ اِدھر اُدھر دیوانہ وار اڑ رہے ہوں کہ شاید کہیں وزن ہو، جس سے باہر نکلنے کا انھیں موقع مل جائے۔

نور بانو نے غیر ارادی طور پر کانوں پر سے ہاتھ ہٹا لیے اور کوٹھری سے نکل آئی۔ اب وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ اسے یہ خیال بھی نہیں تھا کہ وہ کمزور ہے۔ کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ البتہ خود کو بھی مصیبت میں پھنسا لے گی۔ وہ تو اس وقت جیسے کسی ٹرانس میں تھی۔

وہ اس کمرے کی طرف بڑھی، جو تینوں بہنوں کی خواب گاہ تھا۔ اس کا انداز اس مکھی کا سا تھا جو چھپکلی کی آنکھوں سے مسحور ہو کر بے اختیار چھپکلی کے کھلے منہ کی طرف بڑھتی ہے۔

اس کے تصور کے کسی تاریک ترین گوشے میں بھی یہ خیال نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ تو نہایت معصوم اور بے خبر لڑکی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ انسان اس طرح درندہ بھی بن سکتا ہے۔

اس کی دونوں بہنوں کے بدن پر کپڑے کا تار بھی نہیں تھا اور ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، اسے دیکھتے ہوئے اس کے شل دماغ میں ایک بے بس سوچ سر اٹھا کر اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کر رہی تھی...... کہ اسے یہ سب کچھ نہیں دیکھنا چاہیے۔ لیکن ماؤف دماغ اس سوچ کو سننے سے قاصر تھا۔

وہ دیکھتی رہی اور پوری جان سے لرزتی رہی۔ درندے اس کی بہنوں کو نوچ رہے تھے...... کاٹ رہے تھے...... بھنبھوڑ رہے تھے۔ وہ بہنیں جن کے سینوں سے دوپٹہ کبھی اماں اور چھمن بوا کے سامنے بھی نہیں ڈھلکتا تھا، آج نامحرموں کے سامنے بے لباس تھیں۔ وہ چاند تھے، جن پر گہن لگ رہا تھا۔

وہ دیکھتی رہی۔ سن دماغ کا کوئی حصہ اسے کچھ بتانے کی کوشش کر رہا تھا...... یہ کہ اگر وہ پکڑی گئی تو یہی سب کچھ اس کے ساتھ بھی ہو گا۔ لیکن وہ ایسی کیفیت میں تھی کہ اس پیغام کو سمجھنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ خوف ایسا تھا کہ اس نے ہر ممکنہ خوف کو مٹا ڈالا تھا۔

اس کی دونوں بہنوں کی چیخیں اب آسمان کو چھو رہی تھیں۔

وہ یونہی کھڑی رہتی اور پکڑی جاتی۔ لیکن اس لمحے ایک معجزہ ہو گیا۔ کمرے کی دیوار پر لرزتی ہوئی روشنی پڑی...... اور وہ روشنی جیسے اس کے دماغ میں اتر گئی۔ اس کا دماغ ایک دم روشن ہو گیا۔ ایک پل میں وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گئی۔

کمرے میں جو لوگ درندگی کا کھیل کھیل رہے تھے، انھیں نظر اٹھانے کی فرصت نہیں

تھی کہ وہ اسے دیکھ پاتے۔ لیکن دیوار پر تھرکتی لالٹین کی روشنی بتا رہی تھی کہ جو لوگ اسے ڈھونڈنے کے لیے گئے تھے، وہ ناکام واپس آ رہے ہیں۔ انھوں نے اسے دیکھ لیا تو پکڑ لیں گے۔ اور انھوں نے پکڑ لیا تو اس پر بھی وہی گزرے گی، جو بہنوں پر گزر رہی ہے۔

حد سے بڑھا ہوا خوف بھی عجیب چیز ہے۔ کبھی تو آدمی کو ہلنے کے قابل نہیں رہنے دیتا اور کبھی اس کو پر لگا دیتا ہے۔

نور بانو کا ٹرانس تو اس روشنی کو دیکھتے ہی ختم ہو گیا تھا۔ مگر ایک پل میں وہ کوٹھری کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ کہاں تو چند لمحے پہلے تک اس کا دماغ مفلوج تھا اور کہاں یہ کہ اب اس کا دماغ بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔

کوٹھری کے علاوہ اس کے لیے کہیں پناہ نہیں تھی۔ کوٹھری میں گھس کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وقت بہت کم تھا۔ وہ بہت تیزی سے سوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی نظر میں بستر والے صندوق پر جم گئیں۔

ہاں...... یہ ٹھیک ہے۔ اس نے سوچا۔ انھوں نے گلنار کو اس صندوق میں سے نکالا تھا۔ اب انشاءاللہ کم از کم وہ اس صندوق کو کھول کر نہیں دیکھیں گے۔ یہ سوچ کر وہ اس صندوق کی طرف مڑی۔ مگر لڑکھڑا گئی۔

دراصل بچنے کے خیال نے اس کے جسم میں بجلی ضرور بھر دی تھی۔ لیکن اس کی تھرتھری کا وہی عالم تھا۔ خوف نے رخ ضرور بدل لیا تھا۔ لیکن اصل خوف ذہن کے کسی گوشے میں اب بھی موجود تھا۔

اس نے خود کو سنبھالا اور صندوق میں اتر گئی۔ گلنار کو نکالتے ہوئے ان لوگوں نے بستر بے ترتیب چھوڑ دیے تھے۔ لہٰذا انھیں ترتیب دینے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس نے ایک لحاف اور گدا اپنے اوپر گھسیٹ لیا اور صندوق کو بند کر دیا۔

صندوق بند ہوتے ہی اسے ایسا لگا کہ وہ کسی پناہ گاہ میں آ گئی ہے۔ باہر کی تمام آوازیں باہر ہی رہ گئی تھیں۔

محفوظ ہونے کا احساس ہوا تو اس کی نظروں میں بہنوں پر گزرنے والی قیامت کے منظر پھرنے لگے۔ وہ رونے لگی۔ سسکیوں کی آواز بلند ہونے لگی تو اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ کہیں یہ سسکیاں ان درندوں کو اس تک نہ لے آئیں۔ عافیت اس میں تھی کہ فی الوقت وہ بہنوں کے بارے میں نہ سوچے۔ یہ کام تھا تو بہت مشکل۔ مگر عزت آبرو اور زندگی داؤ پر لگی تھی۔ اس لیے قدرے آسان ہو گیا۔

اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ اور یہ اس کے حق میں بہتر ہی تھا۔ ورنہ ممکن

تھا کہ ڈر کر وہ کوئی آواز نکال دیتی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ اسے تلاش کرنے کے لیے کوٹھری میں آئے تھے۔ جس صندوق میں وہ پہلے چھپی تھی، انھوں نے اسے کھول کر دیکھا تھا۔ پھر ان میں سے ایک بستروں والے صندوق کی طرف بڑھا، جہاں وہ چھپی ہوئی تھی تو دوسرے نے اسے ٹوک دیا۔ ''اسے دیکھا جا چکا ہے۔ چھوٹی اسی میں سے نکلی تھی۔''

پھر وہ ناکام ہو کر چلے گئے۔ نور بانو کا پتا بھی نہیں چلا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ بھینچے صندوق میں دبکی رہی۔

نجانے کتنی دیر ہوگئی۔ اسے باہر کا کچھ پتا نہیں تھا اور اندر سوچنے کے لیے اس کے پاس بہنوں کی ابتلا کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ رہ رہ کر وہ منظر اس کی آنکھوں میں پھر رہے تھے اور باہر نکلنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس میں تو اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ صندوق کا پٹ ہی تھوڑا سا اٹھا دیتی۔

اب اس کے لیے اپنی سسکیوں کو روکنا مشکل ہوگیا۔ اس کی سسکیاں بلند ہونے لگیں۔ وقت کتنا گزر گیا ہے، اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ تو بس بے بسی سے رو رہی تھی...... سسک رہی تھی۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔ اب اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ رونے کی وجہ سے سانس لینا اور دشوار ہوگیا تھا۔ اب یہ ضروری ہوگیا تھا کہ وہ صندوق کا ڈھکنا تھوڑا سا اٹھائے۔ تاکہ تازہ ہوا اندر آئے۔

روتے اور سسکتے ہوئے اس نے صندوق کا ڈھکنا تھوڑا سا اوپر اٹھایا۔ یہ وہ وقت تھا، جب اوتار سنگھ کوٹھری کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس نے اس کی سسکیوں کی آواز سنی۔ لیکن کوٹھری کا رخ کرنے کے بجائے کمرے میں چلا گیا۔

نور بانو میں باہر نکلنے کی ہمت اب بھی نہیں تھی۔ اس نے صندوق کا ڈھکنا مزید اوپر اٹھایا۔ وہ اپنی سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن بہنوں پر گزرنے والی قیامت کے منظر نگاہوں میں پھرتے تو اس کی سسکیاں گھٹی گھٹی چیخوں میں تبدیل ہونے لگتیں۔ وہ انھیں روک نہیں سکتی تھی۔

پھر ایک نئی بات ہوئی۔ بہنوں کا خیال آیا تو اسے احساسِ جرم ہونے لگا۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگا۔ اس کی بہنوں پر کیسی قیامت گزری تھی اور وہ بے حسی سے تماشہ دیکھتی رہی تھی۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ کچھ کر تو نہیں سکتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ وہ خود بھی اس درندگی کی بھینٹ چڑھ جاتی۔ اس پر اس نے سوچا کہ ایسا ہوا ہوتا تو اچھا ہی ہوتا۔ کم از کم ضمیر پر بوجھ تو نہ ہوتا۔ اور ابھی تو اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ دونوں بہنوں پر کیا گزری ہے۔ وہ زندہ بھی ہیں یا......

اس سے آگے اس سے سوچا بھی نہیں گیا۔ اس کے اندر متضاد اور ایک دوسرے سے متصادم سوچوں نے اسے اور کمزور کر دیا۔ اس کی سسکیاں اور بلند ہوگئیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ

وہ دھاڑیں مار کر...... چیخ چیخ کر روئے اور خود پر قابو پانا اس کے لیے ناممکن ہوا جا رہا تھا۔ کوشش کے باوجود اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلنے لگیں۔

یہ وہ وقت تھا کہ اس نے کوٹھری کی طرف آتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی۔ پھر کسی نے پکارا۔ ''کون...... کہاں ہو تم؟''

اس نے اپنا ہاتھ منہ میں لیا اور چبا ڈالا۔ اس کی گھٹی ہوئی چیخیں معدوم ہوگئیں اور سسکیاں رہ گئیں۔ اسی لمحے صندوق کی جھری سے اس نے کسی کو لالٹین اٹھائے کوٹھری میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے گھبرا کر صندوق کو ڈھکن نیچے کر لیا۔ لیکن اسے پتا نہیں چلا کہ صندوق پوری طرح بند نہیں ہوا ہے۔ بہت چھوٹی سی ایک جھری رہ گئی ہے۔

وہ دہشت سے بے حال ہوگئی تھی۔ اس پر لرزہ چڑھا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ اپنے منہ پر بہت سختی سے جما تھا۔ لیکن وہ اپنی ڈری ڈری آوازوں کا پوری طرح گلا نہیں گھونٹ پا رہی تھی۔ اسے بس ایک خیال ستا رہا تھا...... اب اس کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوگا، جو اس کی بہنوں کے ساتھ ہو چکا ہے اور یہ خیال بے حد روح فرسا تھا۔ اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہونے لگی۔ ہوش و حواس اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

قدموں کی چاپ اسے اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ مگر وہ بہت ہلکی تھی۔ حالانکہ اندر آنے والا اب کوٹھری میں آ چکا ہوگا۔ اس سے اس کی سمجھ میں آ گیا کہ صندوق پوری طرح بند نہیں ہوا ہے اور جیسے اسے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے، اسی طرح کوٹھری میں آنے والے کو اس کی سسکیاں سنائی دے رہی ہوں گی۔ مگر اب اس میں ہلنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ لرزتے ہوئے ہاتھ اس کے قابو میں نہیں تھے۔ وہ صندوق کو پوری طرح بند کرنے کی کوشش کرتی تو زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ اپنی موجودگی کا راز افشا کر دیتی۔

اور تو کچھ نہیں ہوا، اس پر وحشت اور گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ خوف اتنا بڑھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سلب ہوگئی۔ اب وہ تصور میں اپنے ساتھ وہی کچھ ہوتے دیکھ رہی تھی، جو اس کی بہنوں کے ساتھ ہوا تھا۔

باہر کسی نے کچھ کہا۔ اس نے آواز سنی۔ لیکن ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکی۔ بس اسے یہ خیال آیا کہ آنے والے کے اور ساتھی بھی آ گئے ہیں اور وہ ان سے کچھ کہہ رہا ہے۔ اس کا خوف اور بڑھ گیا۔ اب اسے کوئی نہیں بچا سکتا......

پھر کسی نے صندوق کھول دیا۔ نور بانو کو ایسا لگا کہ اس کا دل بند ہو جائے گا۔ اپنا ہاتھ سختی سے منہ پر جمائے جمائے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دل میں دعا کرنے لگی کہ صندوق کھولنے والا لحاف نہ ہٹائے۔

مگر آنکھیں بند ہونے کے باوجود اسے احساس ہو گیا کہ لحاف ہٹا دیے گئے ہیں۔
اب اسے چیخنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اب تو چیخیں روکنے کا کوئی جواز ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور منہ پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے چلائی۔ ''ہٹ جاؤ۔ مجھے چھوڑ دو۔ رحم کرو مجھ پر۔''

اس نے کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ سامنے کوئی تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ اسے نہیں دیکھ سکی۔ وہ بری طرح لرز رہی تھی اور پھر اس کے ہوش و حواس پوری طرح اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ وہ ایک طرف گرتی چلی گئی۔

❀....❀....❀

رگھو اور رنجنا اوپر چلے آئے تھے۔ اور دونوں روئے چلے جا رہے تھے۔ رنجنا کو یہ خیال بھی نہیں تھا کہ رگھو کے زخمی ہاتھوں اور ماتھے کی فکر کرنی ہے۔ بس وہ تو یہ سوچ کر روئے جا رہی تھی کہ نیچے اتنے پیارے پیارے لوگوں میں سے کوئی بھی نہیں بچا۔ اور رگھو اس خیال سے رو رہا تھا کہ مالک کو کیا منہ دکھائے گا۔

کچھ دیر گزری تو انھیں ایسا لگا کہ زینے پر کوئی چڑھ رہا ہے۔ رگھو ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے لاٹھی اٹھالی۔

مگر اگلے ہی لمحے لاٹھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اوپر آنے والا چھوٹا ٹھاکر تھا اور اس نے ہاتھوں پر ایک لڑکی کو اٹھا رکھا تھا۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا، رگھو تیزی سے اس کے قدموں میں سر رکھ کر بیٹھ گیا۔ ''مجھے شما کر دو مالک۔ میں کچھ نہیں کر سکا۔ مجھے شما کر دو مالک۔''

''رگھو..... ہوش میں آ۔ مجھے راستہ دے۔'' اوتار سنگھ نے اسے ڈانٹا۔

لیکن رگھو نے تو جیسے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ ''میں مجبور تھا مالک۔ انھوں نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔'' وہ اپنی کہے جا رہا تھا۔

''مجھے معلوم ہے رگھو۔ انھوں نے گلی کے ہر گھر کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ تو اٹھ جا رگھو۔ مجھے راستہ دے۔''

رگھو اٹھ کھڑا ہوا۔ اوتار سنگھ تیزی سے اس کمرے کی طرف بڑھ گیا، جو کبھی اس کے ویر جی..... وصال دین کے استعمال میں رہتا تھا۔ وہاں اس نے لڑکی کو بستر پر لٹایا اور پھر کمرے سے باہر آ گیا۔

رگھو اور رنجنا سر جھکائے کھڑے تھے۔ ''رگھو..... تم جاؤ اور گلی کے تمام گھروں کے دروازے کھول کر آ جاؤ'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''لیکن مالک اپنا دروازہ بھی تو بند ہے۔ کھلا ہوتا تو.....''

''میں اڑ کر تو نہیں آیا ہوں رگھو۔ بیچ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور ماں جی کے.....'' ماں جی کا نام لیتے ہوئے اوتار سنگھ کی آواز بھرا گئی..... ''گھر کا دروازہ ٹوٹا ہوا ہے۔ میری بات دھیان سے سن رگھو۔ ماں جی کے گھر میں جاتے ہی بیچ کا دروازہ اس طرف سے بند کر دینا۔ پھر گلی کے تمام دروازے کھول کر آؤ تو اپنا دروازہ بھی کھول لینا اور اسی سے اندر آنا۔''

بات تو رگھو کی سمجھ میں آ گئی۔ لیکن وہ الجھ گیا۔ لیکن وجہ پوچھنا اس کے مزاج میں ہی نہیں تھا۔ ''جو حکم مالک۔'' اس نے کہا اور جانے کے لیے پلٹا۔

''اور ہاں، ایک بات اور۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''کسی کو نہیں بتانا کہ وہ لڑکی ہمارے گھر میں ہے۔''

رگھو پلٹ کر اس کی بات سن رہا تھا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ لیکن بولا کچھ نہیں۔

رگھو کے جانے کے بعد اوتار سنگھ رنجنا کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم بھی دھیان سے سنو رنجنا۔ اندر جاؤ اور اس لڑکی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔ مگر پہلے دروازہ اندر سے بند کر لینا۔ اسے سمجھانا کہ وہ محفوظ ہے۔ کہنا کہ وہ چیخے چلائے نہیں۔ زور سے بولے بھی نہیں۔ کسی کو اس کی یہاں موجودگی کا پتا نہ چلے، اسی میں اس کی بہتری ہے۔ جن لوگوں نے حملہ کیا تھا، ممکن ہے ان میں کوئی جان پہچان والا بھی ہو۔ ایسا ہے تو انھیں علم ہو گا کہ تیسری لڑکی موجود نہیں تھی۔ تو وہ اس کے چکر میں رہیں گے۔''

''مگر پڑوسیوں کو تو معلوم ہونا چاہیے چھوٹے ٹھاکر.....''

''یہی تو میں نہیں چاہتا۔'' اوتار سنگھ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''دیکھو، پڑوسیوں کو پتا چلے گا تو وہ لڑکی کو یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ کوئی مسلمان گھرانہ اسے پناہ دے گا۔ مگر مسلمان گھر سب خطرے میں ہیں۔ جبکہ ہمارا گھر محفوظ ہے۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکا اور ماں جی کا پورا گھر ختم ہو گیا'' اوتار سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''اب میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ لڑکی بچ جائے۔ اسے کچھ نہ ہو۔ میری شرمندگی کچھ تو کم ہو۔''

رنجنا کا دل کٹنے لگا۔ ''آپ فکر نہ کریں مالک۔ وہ مجھے جانتی ہے۔''

''بس تم اس کے پاس جاؤ اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔''

رنجنا کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ اوتار سنگھ اکیلا رہ گیا۔ واپسی کے بعد سے یہ پہلا موقع تھا کہ جو کچھ ہو چکا تھا، اس پر سوچنے کی اسے مہلت ملی تھی۔ اور لڑکی کے بارے میں بغیر سوچے سمجھے اس نے جو فیصلہ کیا تھا، اس پر اسے حیرت ہوئی تھی۔ اس بحران میں اس نے کب

اور کیسے یہ سب کچھ سوچ لیا۔ ویسے یہ حقیقت تھی کہ مسلمانوں کے پاس وہ لڑکی غیر محفوظ رہتی اور اب اس لڑکی کی حفاظت اس کا مشن تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے سات پردوں میں چھپا کر رکھے گا اور اسے کوئی ضرر نہیں پہنچنے دے گا۔

اسے اندازہ ہو گیا کہ اس نے بہت بڑا بحران دیکھا ہے۔ اور ابھی وہ اس پر سوچ نہیں سکتا کیونکہ اس نے سوچنے کی کوشش کی تو اس کی نگاہوں میں ماں جی کی بے یار و مددگار لاش بھر گئی۔ پھر وہ دونوں لڑکیاں...... کیا وہ یہ مناظر کبھی بھول سکے گا؟ کیا اس احساسِ جرم سے کبھی اسے نجات مل سکے گی......؟

رگھو آیا تو اسے ان سوچوں سے نجات مل گئی۔ مگر رگھو کو دیکھ کر اسے جھٹکا لگا۔ اس کی پیشانی زخمی اور چہرہ لہولہان تھا۔ ہاتھ بھی لہولہان ہو رہے تھے۔ ''ارے...... یہ تمھیں کیا ہوا ہے رگھو؟'' اس نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

رگھو پھر اس کے پیروں میں گر گیا۔ ''مجھے شما کر دو مالک، مجھے شما کر دو۔''

اوتار سنگھ جھنجلا گیا۔ ''میں پوچھ رہا ہوں، ہوا کیا ہے؟''

''آپ کے حکم پر ان کو بچانے کے لیے میں جان بھی دے دیتا مالک۔'' رگھو اب رو رہا تھا۔ ''مگر موقع ہی نہیں ملا۔ بس یہی کچھ کر سکا میں۔''

''میں پھر پوچھ رہا ہوں کہ ہوا کیا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم مالک۔ بس میں چھری سے بیچ کا دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''اچھا...... اب چلو میرے ساتھ۔'' اوتار سنگھ نے جھٹکے سے اسے کھڑا کیا۔ اس کے زخم دھلا کر اس کی مرہم پٹی کرنی تھی۔

❀......❀......❀
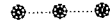
اس واقعے کو ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ مارے جانے والوں کی تدفین پہلے ہی دن ہو گئی تھی۔ متاثرہ گھر میں سب سے پہلے محلے کی خواتین داخل ہوئی تھیں۔ ان میں مسلمان بھی تھیں اور ہندو بھی۔ اندر جو کچھ انھوں نے دیکھا تھا، اس نے ان کی روحوں تک کو لرزا دیا تھا۔ پردہ دار عورتوں کی بے لباسی اور ان کے جسموں پر درندگی کے نشانات کوئی کبھی نہیں بھول سکا۔

اس واقعے کے نتیجے میں مسلمان بری طرح سہم گئے تھے۔

نور بانو کو پہلے دن ہوش آیا تو اس کے سامنے ایک جانا پہچانا چہرہ تھا۔ رنجنا اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دے رہی تھی۔ نور بانو کے اندر بے شمار چیخیں گھٹی ہوئی تھیں، جنھیں وہ دباتی رہی تھی۔ جانا پہچانا چہرہ دیکھتے ہی اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا......

رنجنا نے گھبرا کر بے ساختہ کہا۔ ''چیخنا مت منجھلی بی بی۔ وہ لوگ تمھیں ڈھونڈتے پھر

رہے ہیں۔''

یہ سنتے ہی نور بانو کے دانت بھنچ گئے۔ آنکھوں سے خالی پن جھانکنے لگا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

رنجنا کو نہیں پتا تھا کہ اس نے بے خبری میں ایک مسئلے کو ہمیشہ کے لیے حل کر دیا ہے۔ یہ جملہ نہ ہوتا تو نور بانو اس طرح چیختی کہ پورا محلہ اکٹھا ہو جاتا۔ اس جملے نے نور بانو کو سمجھا دیا...... یاد دلا دیا کہ وہ چیخے گی...... آواز بھی نکالے گی تو گویا ظالموں کو اپنا پتا دے رہی ہو گی۔

بے چاری رنجنا تو پریشان ہو گئی کہ منجھلی بی بی پھر بے ہوش ہو گئی ہے۔

اس شام کو نور بانو کو دوبارہ ہوش آیا تو اس کے تمام لوگوں کی تدفین ہو چکی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر رنجنا کو دیکھا اور بولی۔ ''تم رنجنا ہی ہو نا۔''

''ہاں منجھلی بی بی۔'' رنجنا کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ''مجھے بھول گئیں؟''

''بھول گئی!'' نور بانو جیسے ذہن پر زور دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''نہیں...... بھولی تو نہیں۔ مگر لگتا ہے، کچھ کچھ بھول گئی ہوں۔'' پھر اچانک اس نے پوچھا۔ ''میں کہاں ہوں؟''

''ہمارے گھر میں۔ اپنے مکان کے اوپری حصے میں۔''

''میں یہاں کیوں آئی ہوں؟ کون لایا ہے مجھے یہاں؟''

رنجنا نے اسے غور سے دیکھا۔ ''آپ کو یاد نہیں۔''

نور بانو نے پھر ذہن پر زور دیا اور اچانک تھر تھر کانپنے لگی۔ ''کچھ کچھ یاد آتا ہے۔ لیکن زیادہ یاد کروں تو ڈر لگتا ہے...... بہت ڈر لگتا ہے...... اتنا کہ لگتا ہے کہ میں خوف سے مر جاؤں گی۔''

رنجنا پڑھی لکھی نہیں تھی۔ لیکن عقل مند تھی۔ اس نے سمجھ لیا کہ خود سے سب کچھ بتانا ٹھیک نہیں۔ اگر وہ نور بانو کے سوالوں کے جواب دے گی تو ممکن ہے، وہ بھڑک جائے یا پھر سے دورہ پڑ جائے۔ اور خاص طور پر یہ بات کہ اسے چھوٹے ٹھاکر اوپر لائے ہیں۔ ''آپ کو یاد نہیں کہ آپ خود یہاں آئی ہیں۔'' اس نے گول مول بات کی۔

''میں یہاں کیوں آئی؟ پہلے تو کبھی میں یہاں نہیں آئی۔''

''اب یہ تو آپ خود ہی یاد کریں۔''

نور بانو نے پھر ذہن پر زور دیا...... اور اس پر پھر لرزہ چڑھ گیا۔ ''یاد نہیں آتا۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔ پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''مگر میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ میں اپنے گھر جاؤں گی۔''

وہ بہت تیزی سے اٹھی تھی۔ رنجنا گھبرا گئی کہ اب اسے کیسے روکے۔ مگر اسی لمحے نور بانو چکرائی اور گر گئی ہے۔ اچھا یہ ہوا کہ وہ پلنگ پر گری تھی۔ اسے چوٹ تو نہیں لگی۔ لیکن جیسے اسے چکر

آیا تھا، اس سے وہ خوف زدہ ہو گئی۔ ''یہ کیا ہوا ہے مجھے؟'' اس نے گھبرا کر کہا۔ ''مجھ سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا ہے۔''

رنجنا نے اس موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ ''آپ یہاں اس لیے ہیں منجھلی بی بی کہ آپ کی طبیعت خراب ہے۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے تو چلی جایئے گا۔'' رنجنا جانتی تھی کہ اسے کمزوری ہے۔ رات سے اب تک اس نے کچھ کھایا بھی تو نہیں تھا۔ بے ہوشی کے دوران اس نے اسے دلیہ کھلانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن دانت پر دانت سختی سے جمے ہونے کی وجہ سے اس کے حلق میں کچھ بھی نہیں گیا تھا۔

''طبیعت خراب ہو تو آدمی اپنے گھر میں رہتا ہے۔'' نور بانو کے لہجے میں الجھن تھی۔

''اچھا...... اماں کو بلا دو۔''

''بڑی بیگم تو نہیں ہیں۔'' رنجنا نے بے ساختہ کہا۔

''کیوں......؟ وہ کہاں ہیں؟''

رنجنا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ کاش وہ چھوٹے ٹھاکر سے پوچھ سکتی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ بڑی بیگم آگرہ میں اپنے رشتہ داروں کا ذکر کرتی تھیں۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''وہ تو آگرہ گئی ہیں...... آپ کے ماموں کے ہاں۔''

''تو آپی کو بلا دو۔''

''گھر میں کوئی نہیں ہے منجھلی بی بی۔ سب لوگ بڑی بیگم کے ساتھ گئے ہیں۔''

''عجیب بات ہے۔''

''آپ کو بیماری کی وجہ سے یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ اچھا...... میں آپ کے لیے دلیہ لاتی ہوں منجھلی بی بی۔''

رنجنا نے بڑی مشکل سے بہلا پھسلا کر اسے دلیہ کھلایا۔ کھانے کے ذرا دیر بعد نور بانو سو گئی۔ سونا کیسا، وہ تو پیٹ بھرنے کے بعد کی غشی تھی۔

رنجنا نے وہ سب کچھ اوتار سنگھ کو سنایا۔ اوتار سنگھ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''یہ تو قدرت کی مدد ہے۔ ورنہ بڑا مسئلہ ہو جاتا۔ لیکن رنجنا، ہم اسے ڈاکٹر کو بھی نہیں دکھا سکتے۔ تمھیں ہی اسے سنبھالنا ہو گا۔''

''میں کیسے سنبھالوں گی مالک۔ ان کے تو دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔''

''یہ کوئی اثر وثر نہیں ہے۔'' اوتار سنگھ نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اس نے جو کچھ دیکھا ہے، اسے بھول جانا چاہتی ہے۔ تم اس سے اصرار بھی نہ کرنا۔ بس اسے دھیرے دھیرے یاد کرنے کا کہتی رہنا۔ تھوڑا تھوڑا یاد آئے گا تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ ایک دم یاد آئے گا تو اس کے لیے بڑا صدمہ ہو گا۔''

''اور ایک دم سب یاد آ گیا تو؟''

''جیسے ہی کچھ یاد آئے تو بات بدل دینا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بات آگے بڑھانا۔''

رنجنا اب بھی گھبرا رہی تھی۔ مگر چھوٹے ٹھاکر کے سامنے دم نہیں مار سکتی تھی۔

اوتار سنگھ کی بات ٹھیک تھی۔ نور بانو نے جو کچھ دیکھا تھا، اس نے اس کو ذہنی طور پر تقسیم کر دیا تھا۔ ذہن کا ایک حصہ وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔ جبکہ دوسرا حصہ اسے یاد رکھنے پر مصر تھا۔ یوں وہ ایک عارضی دماغی اختلال میں مبتلا ہو گئی تھی۔

تین دن گزرے تو نور بانو کی کمزوری دور ہو گئی۔ رنجنا نے اس کے کھانے پینے کا بہت خیال رکھا تھا۔

چوتھے دن بیٹھے بیٹھے نور بانو نے کہا۔ ''تمھیں پتا ہے، رات کو ہمارے گھر میں کچھ لوگ گھس آئے تھے۔''

رنجنا کو چھوٹے ٹھاکر کی ہدایت یاد تھی۔ وہ بولی۔ ''ہاں...... مجھے معلوم ہے۔''

''تمھیں معلوم ہے، اس کے بعد کیا ہوا؟'' نور بانو نے الجھن بھرے لہجے میں کہا۔

''نہیں...... یہ تو مجھے نہیں معلوم۔'' رنجنا نے کہا۔ ''تمھیں یاد نہیں؟''

نور بانو ذہن پر زور دے رہی تھی۔ ''کچھ کچھ یاد آ رہا ہے۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ''اماں گھبرائی ہوئی آئی تھیں اور ہمیں سوتے سے اٹھایا تھا۔ کہنے لگیں...... تم لوگ کہیں چھپ جاؤ۔ جلدی کرو۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''ہم تینوں اٹھ کر کوٹھری کی طرف بھاگیں......'' یہ کہتے کہتے نور بانو پر لرزہ طاری ہو گیا۔

رنجنا نے جلدی سے بات بدلی۔ ''منجھلی بی بی...... تمھیں اپنے پتا جی یاد ہیں۔''

''ابا!'' نور بانو نے برا مانتے ہوئے تصحیح کی۔ ''ہاں...... مجھے ابا یاد ہیں۔ ابا بہت اچھے تھے۔'' اتنی دیر میں وہ نارمل ہو گئی۔ اب وہ جیسے دور کہیں دیکھ رہی تھی۔ ''ابا ہمیں بازار لے کر جاتے تھے۔ عید کے کپڑے ابا خود دلاتے تھے......''

''میرے پتا جی بھی بہت اچھے تھے۔'' رنجنا نے کہا۔ ''ماں باپ سب کے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مجھے اس بات کا بڑا دکھ ہے کہ پتا جی کے مرتے سمے میں ان کے پاس نہیں تھی۔ میں انھیں دیکھ بھی نہیں سکی آخری بار۔''

''تمھارے پتا جی کو کیا ہوا تھا رنجنا؟''

''آپ کو یاد نہیں منجھلی بی بی؟''

''ہاں...... یاد آ گیا۔ تمہارا تو پورا گاؤں ختم ہو گیا تھا لال آندھی میں۔'' نور بانو کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

''ہاں منجھلی بی بی۔ ہمارا تو سب کچھ ختم ہو گیا۔ ماں باپ، بہن بھائی، سب رشتے دار ریت کے تلے دب کر ختم ہو گئے۔ کریا کرم بھی نصیب نہیں ہوا کسی کو۔'' رنجنا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ اس لڑکی کو بہلانے کی کوشش میں اپنے زخم ہرے کر بیٹھی تھی۔

نور بانو ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھنے لگی۔ ''ایسے نہ رو رنجنا۔ پتا ہے، موت تو اللہ کا حکم ہوتی ہے۔ آنی ہے تو کوئی روک نہیں سکتا۔ بہانہ چاہے کوئی ہو۔ زندہ رہنے والوں کو تو بس صبر کرنا ہوتا ہے...... اور اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے آپ کو زندگی دی...... مہلت دی۔''

''جس کا بھرا پُرا پریوار ختم ہو گیا ہو...... کوئی بھی نہ بچا ہو، اسے صبر کیسے آ سکتا ہے منجھلی بی بی۔''

''صبر تو کرنا پڑتا ہے۔ اللہ کی مرضی کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔'' نور بانو نے رنجنا کا ہاتھ تھام لیا اور اسے سہلانے لگی۔

اگلے روز رنجنا نے پھر بات چھیڑی۔ ''جب لوگ گھر میں گھس آئے اور بڑی بیگم نے آپ لوگوں سے چھپنے کو کہا تو آپ کہاں چھپی تھیں منجھلی بی بی؟''

نور بانو نے ذہن پر زور دیا...... اور اگلے ہی لمحے جیسے وہ ٹرانس میں آ گئی۔ اس کا جسم لرزنے لگا، آنکھیں پھیل گئیں۔ جو کچھ اس پر گزری تھی، جو کچھ اس نے دیکھا تھا، وہ سنانے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

رنجنا اس کا ہاتھ تھام کر اسے سہلا رہی تھی۔ ''بس...... اب بس کرو منجھلی بی بی۔ بھول جاؤ وہ سب۔''

''بھولی ہوئی تو تھی۔ اب تک بھولی رہتی۔ اب سب یاد آ رہا ہے۔'' نور بانو نے سسکیوں کے درمیان کہا۔ پھر وہ چونکی۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ میں بیمار ہوں۔ اس لیے یہاں ہوں اور اماں...... اور سب لوگ آگرہ گئے ہیں۔''

''بیمار تو آپ تھیں منجھلی بی بی۔ اور اب بھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہیں۔''

''اماں کہاں ہیں؟ میری بہنیں کس حال میں ہیں؟'' نور بانو کا لہجہ ہذیانی ہو گیا۔ ''میں یہاں نہیں رکنا چاہتی۔ میں نیچے جاؤں گی...... اپنے گھر۔''

رنجنا گھبرا گئی۔ سخت مرحلہ آ گیا تھا۔ اس نے چھوٹے ٹھاکر کا انداز اختیار کیا۔ ''میری بات دھیان سے سنو منجھلی بی بی۔ ہم تم ایک ہی حال میں ہیں۔ ہمارے دکھ ایک جیسے ہیں۔''

''مطلب کیا ہے تمہارا؟''

''تمہارا بھی سب کچھ ختم ہو گیا۔ کچھ بھی نہیں بچا منجھلی بی بی۔''

نور بانو یوں بلک کر روئی کہ رنجنا کا دل پھٹنے لگا۔ اس نے نور بانو کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔ اچھا ہے، رو لے۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ اس نے دل میں سوچا۔ لیکن نور بانو کی آواز بلند ہونے لگی تو اسے ٹوکنا پڑا۔ ''منجھلی بی بی...... خود پر قابو رکھو۔ تمہاری آواز گھر سے باہر نہیں جانی چاہیے۔''

نور بانو نے جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا اور عجیب سی نظروں سے رنجنا کو دیکھا۔ ''کیوں؟ تم نے مجھے یہاں قید کر رکھا ہے؟'' یہ کہتے کہتے وہ سہم گئی۔

''نہیں۔ پرنتو تم کو چھپا رکھا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ تم یہاں ہو۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ جنھوں نے تمہارا گھر اجاڑا ہے، ہو سکتا ہے، وہ تمہاری تلاش میں ہوں۔''

نور بانو اور سہم گئی۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ لوگ تیسری لڑکی کو تلاش کر رہے تھے۔ ''مگر تم لوگ بھی تو ہندو ہو۔ میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتی۔ محلے میں مسلمان گھر بھی تو ہیں۔ مجھے ان میں سے کسی کے ہاں بھیج دو۔''

رنجنا کے دل پر چوٹ لگی۔ ''کیسی باتیں کرتی ہو منجھلی بی بی۔ ہم تمہارے گھر میں رہتے ہیں۔ برسوں کا ساتھ ہے ہمارا۔ میں تمہارے گھر میں آتی تھی۔ گھنٹوں بیٹھتی تھی...... میرے مالک کو بڑی بیگم نے بیٹا بنایا تھا۔ اور تم کہتی ہو کہ ہم پر اعتبار نہیں کر سکتیں۔ اپمان کر رہی ہو ہمارا، رنجنا کے لہجے میں شکایت تھی۔

''ہاں...... اب میں کسی ہندو پر اعتبار نہیں کر سکتی۔ میں نے درندگی دیکھی ہے۔ تم مجھے کسی مسلمان گھر میں پہنچا دو۔''

رنجنا کو غصہ بھی آیا اور جھنجلاہٹ بھی ہوئی۔ لیکن چھوٹے ٹھاکر کے خیال سے وہ اسے پی گئی۔ ''سنو منجھلی بی بی، یہاں سے زیادہ محفوظ تم کہیں بھی نہیں ہو۔ مسلمانوں کے تمام گھر خطرے میں ہیں۔ کسی بھی دن کسی بھی گھر میں وہی کچھ ہو سکتا ہے، جو تمھارے گھر میں ہوا تھا۔ تمھیں اپنی بہنیں یاد نہیں ہیں۔''

اس حوالے نے نور بانو کو ہلا کر رکھ دیا۔ بہنوں پر جو اس نے گزرتے دیکھی تھی، وہ اس کی نگاہوں میں پھر گئی۔ وہ پوری جان سے کانپنے لگی۔ کیا اس کے ساتھ بھی وہی سب ہوگا۔ یہ تصور بھی اس کے لیے روح فرسا تھا اور یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ کوئی مسلمان گھر بھی محفوظ نہیں ہے۔ البتہ یہ گھر محفوظ ہے۔ مگر سوال یہ تھا کہ کیا یہاں وہ محفوظ ہے۔

اسے یاد تھا۔ اس نے چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں کبھی اچھا گمان نہیں رکھا تھا۔ اس

کے معاملے میں وہ اماں سے ہمیشہ اختلاف اور بحث کرتی رہی تھی۔ اسے ہمیشہ چھوٹے ٹھاکر کی نیت پر شبہ رہا تھا۔ اور اب تو ہندوؤں کے بارے میں اس کی رائے بہت ہی خراب ہوگئی تھی۔

تو کیا یہ ممکن نہیں کہ یہاں بھی وہ لٹ جائے۔ اس نے سوچا۔

وہ بہت کم عمر تھی۔ لیکن بہت بڑے سانحے کم عمروں کو بھی جہاں دیدہ بنا دیتے ہیں۔ وہ بڑے لوگوں کے انداز میں سوچنے لگی۔ خطرہ یہاں بھی تھا۔ مگر یہاں سے باہر بہت بڑا خطرہ تھا۔ وہ یہاں بھی لٹ سکتی تھی۔ لیکن کم از کم یہاں اس کے ساتھ وہ کچھ نہیں ہوگا، جو اس کی بہنوں کے ساتھ ہوا تھا اور یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بچاؤ کے لیے بھی کچھ کر سکتی ہے۔ اور بچاؤ ممکن نہ ہو تو وہ جان بھی دے سکتی ہے۔

اس نے گہری سانس لی۔ وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئی تھی۔ ''تم جانتی ہو، رنجنا دیدی کہ میں پردہ کرتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ہم سب کو پتا ہے۔ خود دیکھ لو کہ چھوٹے ٹھاکر اس کمرے کے پاس سے بھی نہیں گزرے ہیں۔''

اچانک نور بانو کو ایک خیال آیا۔ ''یہ بتاؤ، مجھے یہاں کون لایا تھا؟''

''چھوٹے ٹھاکر لائے تھے۔'' رنجنا کی نظریں جھک گئیں۔ ''مگر وہ تو مجبوری تھی۔ ان کلمونہوں نے تمہارا دروازہ توڑنے سے پہلے گلی کے تمام گھروں کے دروازے بند کر دیے تھے۔ کوئی اپنے گھر سے نہیں نکل سکتا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر شملہ سے آئے تو انھوں نے تمہارے گھر کا دروازہ ٹوٹا دیکھا۔ اندر گئے تو سب ختم ہو چکے تھے۔ تم بے ہوش تھیں۔ وہ اور کیا کرتے۔''

نور بانو کو شرم بھی آئی اور کراہت بھی۔ لیکن اب وہ سمجھوتہ کرنا سیکھ رہی تھی۔ جو کچھ اس کی بہنوں کے ساتھ ہوا تھا، اس کے مقابلے میں تو چھوٹے ٹھاکر کا آنا اور اسے یہاں لانا بہت بڑی نعمت ہی تھا۔

''اچھا رنجنا دیدی، اب مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

رنجنا وہاں سے ہٹ آئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ نور بانو اکیلے میں اپنے بچھڑے ہوؤں کا غم کرنا چاہتی ہے۔

مگر نور بانو کو چپ لگ گئی تھی۔ اور کھانے پینے میں وہ دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ یہ بات نہیں کہ اس نے کھانے سے انکار کیا ہو۔ بس اتنا تھا کہ وہ کم...... بہت ہی کم کھا رہی تھی۔ اور وہ دو ہی کیفیات میں نظر آتی تھی۔ یا تو وہ رو رہی ہوتی یا پھر کسی گہری سوچ میں مستغرق ہوتی۔ رنجنا یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھی کہ نور بانو کیا سوچ رہی ہے۔ کیونکہ سوچنے کے دوران اس کا چہرہ بے تاثر ہوتا تھا۔

جو کچھ نور بانو پر گزری تھی اور جو کچھ اس نے دیکھا تھا، اس نے اس کی پوری شخصیت کو تبدیل کر ڈالا تھا۔ بڑے المیے آدمی کے لیے ہمیشہ انقلابی ثابت ہوتے ہیں۔ اہم بات یہ ہوتی ہے کہ تبدیلی مثبت ہے یا منفی۔ اس میں آدمی کی عمر اور المیے سے پہلے جو اس کی شخصیت تھی، اس کا بڑا دخل ہوتا ہے۔

نور بانو کم عمر تھی اور اس کی شخصیت بھی پختہ نہیں تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کی شخصیت زیر تعمیر تھی۔ جس سانحے کی وہ عینی شاید تھی، وہ بہت بڑا اور بہت الم ناک تھا۔ ایسے سانحے بہت گہرا، بہت دیرپا اثر چھوڑتے ہیں۔ بلکہ ان کے اثرات سے آدمی بعض اوقات برسوں بعد بھی متعارف ہوتا ہے۔ وہ زلزلے کی طرح ہوتے ہیں۔ زلزلے کی شدت زیادہ ہو تو ایک طرف تو دیواریں گر جاتی ہیں۔ دوسری طرف ایسا بھی ہوتا ہے کہ زلزلے سے متاثرہ کھڑی دیوار کو کافی عرصے بعد چھو کر دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ اسے تو زلزلے نے ہلا دیا تھا۔ وہ تو بس ایک ہلکے سے دھکے کی محتاج ہے۔

دو دن نور بانو سوچتی رہی۔ اس حقیقت کو اس نے قبول کر لیا تھا کہ جانے والے تو چلے گئے۔ جیسے بھی گئے، ان کا نصیب۔ جو کچھ ہوا، اسے تو بھول جانا ہی بہتر ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ بچ گئی۔ وہ زندہ ہے۔ اب اسے ایسے رہنا ہے کہ جو کچھ بہنوں کے ساتھ ہوا، وہ اس کے ساتھ نہ ہو۔ کیونکہ خطرات تو اتنے ہی ہیں۔

اپنی بقا کا مسئلہ سامنے آیا تو الم ناک سانحہ کہیں بہت پیچھے، بہت اندر گہرائی میں چلا گیا۔ شعور میں صرف اپنے تحفظ کا خیال رہ گیا۔ اس کے لیے اسے سمجھوتے کرنے تھے۔ پہلے بھی رنجنا کھانے کی کوئی چیز نیچے لاتی تھی تو وہ نہیں کھاتی تھی۔ مگر اب وہ کھانا پڑ رہا تھا۔ نہ کھاتی تو کیا کرتی۔ سو اس نے اتنا سمجھوتہ کر لیا کہ جینے کے لیے کھا لیتی تھی۔ پیٹ بھر کھانا وہ بھول گئی۔

ان دو دنوں میں اس نے سوچا اور کچھ فیصلے کر لیے۔

اس روز اس نے رنجنا سے کہا۔ ''میں چھوٹے ٹھاکر سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''میں ابھی بلا لاتی ہوں انھیں۔''

تھوڑی دیر بعد چھوٹا ٹھاکر دروازے کے پاس آ کھڑا ہوا۔

''میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے گلی میں کسی بھی مسلمان کے گھر بھیج دیں۔'' نور بانو نے نرم لہجے میں کہا۔

''کیا آپ یہاں خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہیں؟''

نور بانو ہر مصلحت، ہر سمجھوتا، ہر احتیاط بھول گئی۔ ''جی ہاں۔ یہاں کئی اعتبار سے میں غیر محفوظ ہوں۔''

"کوئی اعتبار سے؟" چھوٹے ٹھاکر کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی ہاں۔ آپ کے ہاں کھانے کو میرا دل نہیں چاہتا۔ آپ نہیں سمجھیں گے۔ یہ ایمان کا معاملہ ہے اور کتنے دن سے میں نے نماز بھی نہیں پڑھی۔"

"نماز تو آپ پڑھ سکتی ہیں۔ یہ آپ کا کمرا بالکل الگ تھلگ ہے۔"

"نماز کے لیے...... قرآن کی تلاوت کے لیے وضو کرنا ہوتا ہے اور مجھے تو لگتا ہے کہ میں اس کمرے میں قید ہوں۔"

"میں سمجھ گیا۔ دیکھیں...... میں نیچے چلا جاتا ہوں۔ وہیں آپ کی ڈیوڑھی میں رہ لوں گا۔ آپ پورے گھر میں گھوم پھر سکیں گی۔ اور میں نیچے سے آپ کے برتن لا دوں گا۔ آپ اپنا کھانا خود پکا لیں۔ تب تو آپ کا ایمان محفوظ رہے گا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں آپ کو آپ کے گھر سے نکالوں، یہ اچھا تو نہیں لگے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ میں کسی مسلمان کے گھر چلی جاؤں۔"

"دیکھیے...... آپ بھی سمجھتی ہیں کہ مسلمانوں کے گھر غیر محفوظ ہیں۔ کسی بھی وقت کسی کے گھر پر بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ ویسے تو آپ کہیں بھی رہیں، میں آپ کی حفاظت کروں گا۔ میرے جیتے جی آپ پر آنچ نہیں آئے گی۔ لیکن ایک بات اور ہے۔ آپ ایک ہفتہ میرے گھر میں رہنے کے بعد کہیں اور جائیں گی تو لوگ آپ کو اچھا نہیں سمجھیں گے۔ وہ آپ کے بارے میں میری بات ہی سوچیں گے۔"

اس کی شائستگی اور سوچ کی گہرائی نے نور بانو کو متاثر کیا۔ لیکن ہندوؤں سے نفرت اس کے وجود کی گہرائی میں اتر چکی تھی۔ اس نے بے حد کڑوے لہجے میں کہا۔ "آپ کو میری حفاظت کی اتنی فکر کیوں ہے؟"

"اس لیے کہ میں نے ماں جی سے آپ سب کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا......"

"اور وہ آپ پورا نہیں کر سکے۔" نور بانو نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس کے لہجے میں الزام تھا...... شکایت تھی۔

"میں مجبور تھا۔ مجھے جانا پڑا۔ اسے قسمت ہی کہیں گے۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ مگر اب کوتاہی نہیں کروں گا۔ آپ شاید نہیں جانتیں، ماں جی نے مجھے بیٹا بنایا تھا۔ اور میں سچ مچ انھیں ماں سمجھتا تھا۔ جو کچھ ہوا، وہ میرے ضمیر پر بوجھ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔"

"مگر میں نہ آپ پر بوجھ بننا چاہتی ہوں نہ آپ کے ضمیر پر۔"

"جو آپ چاہتی ہیں، اس میں آپ کا نقصان ہے۔"

"تو پھر میرا مستقبل کیا ہے؟ آپ ساری عمر میری حفاظت تو نہیں کر سکتے۔"

"میں تو کر سکتا ہوں۔ لیکن آپ یہ پسند نہیں کریں گی۔" چھوٹے ٹھاکر نے سادگی سے کہا۔ "آپ کی نظر میں کوئی قابل قبول حل ہو تو بتائیں۔"

نور بانو نے چند لمحے سوچا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کا کوئی مستقبل تھا ہی نہیں۔ اس کے پاس بچا ہی کیا تھا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں روشنی سی ہوگئی۔ "آگرہ میں میرے چچا رہتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"آپ ان کا پتا لکھ دیں۔ میں رگھو کو بھیج کر معلومات کرا لوں گا۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے۔ آپ مجھے آگرہ بھجوا دیں۔"

"مسلمان گھرانے تیزی سے ہجرت کر رہے ہیں۔ اس بات کی تصدیق تو ہو جائے کہ وہ لوگ آگرہ میں ہی ہیں۔ پھر میں خود آپ کو وہاں چھوڑ آؤں گا۔"

نور بانو کو اس کی ذمے داری بہت اچھی لگی۔ "چلیں...... ٹھیک ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن اس کام میں دیر نہ کریں۔"

اوتار سنگھ وہاں سے چلا آیا۔

نور بانو کو سکون ہو گیا۔ بس چند ہی دنوں کی بات ہے۔ پھر وہ چچا کے ہاں چلی جائے گی۔

❀......❀......❀

اوتار سنگھ اسی روز نیچے منتقل ہو گیا!
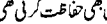
نیچے کے گھر میں جس روز جنازے اٹھے تھے، دروازہ اس نے اسی دن لگوا لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اب وہاں لوٹ مار ہو۔ ایک لڑکی زندہ تھی، اور نیچے جو کچھ تھا، اب اسی کا تھا۔ اسے لڑکی ہی کی نہیں، اس کے مال و متاع کی بھی حفاظت کرنی تھی۔

بیچ کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اوتار سنگھ نے ڈیوڑھی میں اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔

اگلے روز اس نے نور بانو کے چچا کا پتا دے کر رگھو کو آگرہ بھیج دیا۔

نور بانو قدرے پرسکون ہو گئی۔ اب گھر میں وہ آزادانہ گھوم پھر سکتی تھی۔ اس کی نماز کا سلسلہ بھی بحال ہو گیا۔ لیکن رات کی نیند اس کا مسئلہ بن گئی۔ وہ بستر پر لیٹی کروٹیں بدلتی رہتی تھی۔ نگاہوں میں بہنوں کی بے آبروئی کے اذیت ناک مناظر پھرتے رہتے تھے۔ وہ بہت دیر سے سوتی اور وہ کوئی پرسکون نیند نہیں ہوتی تھی۔ وہ ڈراؤنے خواب دیکھتی۔ آنکھ کھلتی تو اس کا پورا جسم پسینے میں نہا رہا ہوتا۔

پھر آس کی وہ ڈوری بھی ٹوٹ گئی۔ رگھو نے آ کر بتایا کہ اس کے چچا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پاکستان چلے گئے ہیں۔

اس روز اوتار سنگھ اس سے بات کرنے کے لیے آیا۔ "اب میرا کیا ہوگا؟" نور بانو کے

لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

''ہم پاکستان چلیں گے اور انھیں تلاش کریں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو ان تک پہنچا دوں گا۔'' اوتار سنگھ نے بے حد اعتماد سے کہا۔

''پتا معلوم نہ ہو تو چھوٹے سے شہر میں کسی کو تلاش کرنا ممکن نہیں ہوتا اتنے بڑے ملک میں انھیں کیسے تلاش کریں۔''

''سب ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔''

نور بانو کا دن بہر حال اچھا گزرتا تھا۔ یہ احساس کہ وہ اپنے ہی گھر میں ہے اور آزادی سے چل پھر رہی ہے، بہت خوش کن تھا۔ البتہ نیچے جانے کے خیال سے اس پر لرزہ چڑھ جاتا تھا۔

پھر ایک دن رنجنا نے اسے کچھ نوٹ دیے۔

''یہ کیا ہے؟'' نور بانو نے ہاتھ بڑھائے بغیر کہا۔

''یہ مکان کا کرایہ ہے اس مہینے کا۔''

''میں...... میں کیا کروں گی ان کا۔''

''رکھیں اپنے پاس۔ اور ہاں، مالک کہہ رہے تھے کہ آپ نیچے سے اپنی تمام قیمتی چیزیں اور نقدی اوپر لے آئیں اور اپنے پاس رکھیں۔''

یہ سب کچھ تو نور بانو نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ''رہنے دو۔ مجھے کیا کرنا ہے کسی چیز کا۔''

''پھر بھی منجھلی بی بی......''

''نہیں۔ مجھ میں نیچے جانے کی ہمت نہیں ہے۔'' نور بانو کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔

رنجنا اس کے دل کا حال سمجھ سکتی تھی۔ ''اب کوئی فکر نہ کریں منجھلی بی بی۔ آپ محفوظ ہیں۔''

''میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ میرا دنیا میں کوئی ٹھکانا نہیں اور کوئی میرا اپنا نہیں۔''

''ہم ہیں نا منجھلی بی بی۔''

نور بانو نے کچھ نہیں کہا۔ مگر اس کی وہ خاموشی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ اور رنجنا وہ سب سمجھ رہی تھی۔ اس کے دل پر گھونسہ سا لگا۔ ہے بھگوان۔ اس نے دل میں سوچا۔ آدمی کا آدمی پر سے اعتبار اٹھ جائے تو کیسا لگتا ہوگا۔

اس رات نور بانو نے پھر ڈراؤنا خواب دیکھا۔ اس کے بعد اس کی نیند اُڑ گئی۔ وہ اٹھ کر باہر نکل آئی۔ رگھو بھی چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ نیچے ہی رہتا تھا۔ یوں اسے کوٹھا بھی مل گیا تھا۔ دل گھبراتا تو وہ اوپر ہی چلی جاتی۔

وہ کوٹھے پر چلی گئی۔ وہ اندھیری رات تھی...... اماوس کی رات۔ عجیب بات تھی کہ

کوٹھے پر اسے ڈر نہیں لگتا تھا۔ وہاں کرسی پڑی تھی۔ وہ اس پر بیٹھ گئی۔ تازہ ہوا میں اس نے گہری گہری سانسیں لیں تو اس کی طبیعت بحال ہو گئی۔

سوچتے سوچتے اسے خیال آیا کہ یہ اتنی اندھیری رات کیوں ہے۔ اس پر سوچتے ہوئے اسے یاد آیا کہ رمضان کا چاند ہونے والا ہے۔ جس روز وہ خوف ناک واقعہ ہوا تو شب برات میں دو ہی دن رہ گئے تھے۔ اسی شام تو اماں نے آکا میاں سے کہا تھا کہ کل جا کر شب برات کے لیے سامان لے آنا۔

تو کل پرسوں چاند ہو جائے گا۔ رمضان آ گیا۔ اللہ...... میں کتنی اکیلی ہو گئی۔ رمضان میں کتنی رونق ہوتی تھی گھر میں۔ اب میں اکیلی روزے رکھوں گی! یہ خیال ہی رلا دینے والا تھا۔ وہ روتی رہی...... دیر تک روتی رہی۔

پھر اس نے ایک دم سے آنسو پونچھ دیے۔ اب تو روزوں کی فکر کرتی ہے۔ وہ اٹھ کر منڈھیر کی طرف گئی۔ اس نے باہر جھانکا۔

وہ لمحہ حیرت کا تھا!

نیچے دروازے پر ایک لالٹین رکھی تھی۔ اور لاٹھی اٹھائے ہوئے دو آدمی گلی میں گشت کر رہے تھے۔ پہلے تو وہ ڈر گئی۔ مگر چھوٹا ٹھاکر دروازے کے پاس آیا اور نور بانو نے لالٹین کی روشنی میں اسے دیکھا تو پہچان گئی۔ اس سے پہلے اس نے چھوٹے ٹھاکر کو بس ایک ہی بار دیکھا تھا۔ مگر اس کی وہ جھلک وہ کبھی نہیں بھولی تھی۔

یہ کیا کر رہے ہیں؟ نور بانو نے حیرت سے سوچا۔ آدھی سے زیادہ رات ہو چکی۔ یہ ابھی تک سوئے کیوں نہیں۔

چھوٹا ٹھاکر اور رگھو اب دروازے پر بیٹھ گئے تھے اور سستا رہے تھے۔

نور بانو کچھ دیر وہاں کھڑی رہی۔ پھر پیچھے ہٹ آئی۔ اس کا رخ زینے کی طرف تھا۔

اس بار باورچی خانے میں بھی روشنی تھی اور برتنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ ''اس وقت کیا کر رہی ہو رنجنا؟''

''چائے بنا رہی ہوں چھوٹے ٹھاکر کے لیے۔''

''اس وقت؟''

''ہاں۔ اس وقت انھیں ضرورت ہوتی ہے نا۔ رات بھر ٹہلتے رہتے ہیں گلی میں۔''

''ہر روز؟''

''جی چھوٹی بی بی، ہر روز۔''

''لیکن کیوں؟''

''پہرہ دیتے ہیں نا۔'' رنجنا نے کہا۔ ''گلی میں مسلمانوں کے گھر ہیں نا۔ ان پر کہیں حملہ نہ ہو۔''

''ہمارا گھر تو لٹ گیا نا۔'' نور بانو نے دکھے دل سے کہا۔

رنجنا نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور محبت سے اسے سہلانے لگی۔ ''بس قسمت کی بات ہے منجھلی بی بی۔ مالک گھر میں نہیں تھے۔ وہ ہوتے تو یہ سب کچھ کبھی نہیں ہوتا۔''

نور بانو کو یاد آیا۔ چھوٹے ٹھاکر نے بھی یہی کچھ کہا تھا۔ مگر وضاحت نہیں کی تھی۔ ''تو کیا انھیں پتا تھا کہ یہ سب ہونے والا ہے۔''

''بڑی بیگم نے ان سے کہا تھا کہ انھیں ڈر لگتا ہے۔ مالک نے ان سے وعدہ کیا کہ ان کے جیتے جی کچھ نہیں ہوسکتا۔ اس دن سے وہ رات بھر کوٹھے پر ٹہل کر پہرہ دیتے تھے۔ وہ تو ایک مہینے سے پہرہ دے رہے تھے۔''

''تو اس روز کون سی مجبوری آپڑی تھی کہ وہ گھر میں نہیں تھے۔'' نور بانو کے لہجے میں شکایت تھی۔

''بڑی مجبوری تھی منجھلی بی بی۔ ماسٹر جی کے دیہانت کا تار آیا تھا۔ ماسٹر جی کے بچے تو ان کے پاس جاتے نہیں تھے۔ ماسٹر جی نے مالک سے وچن لیا تھا کہ ان کی چتا کو آگ وہی دیں گے۔ مالک جانا نہیں چاہتے تھے۔ مگر مجبور تھے۔ وہ رگھو سے کہہ کر گئے تھے کہ بس ایک رات کی بات ہے۔ خیال رکھنا۔''

''لیکن رگھو نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔''

''ان راکھشسوں نے سب گھروں کے دروازے باہر سے بند کر دیے تھے۔ کوئی بھی گھر سے نہیں نکل سکتا تھا۔''

''تو تمھارے چھوٹے ٹھاکر ہوتے تو کیا کر لیتے۔ وہ بھی باہر نہیں نکل سکتے تھے۔'' نور بانو نے اعتراض کیا۔

''آپ مالک کو نہیں جانتیں منجھلی بی بی۔ وہ کوٹھے پر ہوتے تو نیچے کود جاتے اپنی لاٹھی لے کر۔''

''رگھو کو یہ خیال نہیں آیا؟''

''میں بھی کوٹھے پر تھی رگھو کے ساتھ۔ ہم نے ان راکھشسوں کو آتے دیکھا۔ ہم دونوں نیچے آئے۔ دروازہ بند تھا۔ رگھو پہلے تو باہر کا دروازہ توڑنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر بیچ کا دروازہ توڑنے کی کوشش کی۔ یہ تو خیال ہی نہیں آیا کہ کوٹھے سے کود کر نیچے پہنچا جا سکتا ہے۔'' رنجنا کہتے کہتے رکی اور چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔ ''رگھو تو شاید کود بھی نہ پاتا۔ چھوٹے ٹھاکر کی بات

اور ہے۔ وہ بڑی آن والے ہیں۔ جان جائے پر وچن نہ جائے۔ اور وہ صرف لاٹھی سے سب کو ختم کر دیتے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے۔ ان لوگوں کے پاس تو ہتھیار تھے۔''

''چھوٹے ٹھاکر کو لٹھیا بازی آتی ہے۔ گاؤں میں ایک بار چھ سات ڈاکوؤں نے انھیں گھیر لیا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر نے لٹھیا سے انھیں مار بھگایا۔ اور اس وقت تو وہ چھوٹے ہی تھے۔''

''موت تو اللہ کے حکم سے ہوتی ہے۔ موت سے کوئی کسی کو نہیں بچا سکتا۔'' نور بانو کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

یہ جملہ اس نے بے سوچے سمجھے کہا تھا۔ لیکن کہتے ہی اس کی معنویت اس پر پوری طرح روشن ہوگئی۔ ارے...... ایسے تو اس نے سوچا ہی نہیں۔ مگر حقیقت تو یہی ہے اور اس کے لیے اللہ کا حکم نہیں تھا۔ اس لیے وہ بچ گئی۔

پہلی بار اسے صبر آیا۔ اس نے سوچا کہ اسے تو زندگی اور آبرو کے بچنے پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اور پہلی بار اس نے چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں مثبت انداز میں سوچا۔ اماں چھوٹے ٹھاکر پر جان چھڑکتی تھیں، بڑا مان کرتی تھیں تو کوئی بات تو ہوگی۔ وہ خوامخواہ اسے برا سمجھتی رہی۔ حالانکہ کمزوری اس کی اپنی تھی۔ لیکن اپنی کمزوری کو اس نے اس کی نفرت کا جواز بنا لیا۔

پہلی بار اسے یقین ہوا کہ اب وہ محفوظ ہے!

''میں چائے دے آؤں منجھلی بی بی۔'' رنجنا نے اسے چونکا دیا۔

❀......❀......❀
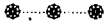
اب نیچے جانا نور بانو کے لیے ضروری ہوگیا تھا!

نزول قرآن کا مبارک مہینہ آپہنچا تھا۔ اور وہ پہلا موقع تھا کہ دو ہفتے سے اس نے قرآن پاک نہیں پڑھا تھا۔ یہ درست کہ وہ بڑی آفت اور ابتلا میں تھی اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا ہے۔ لیکن اب قرآن سے دوری کا احساس اسے بہت گراں گزر رہا تھا۔

دشواری یہ تھی کہ وہ ان میں سے کسی سے قرآن پاک نہیں منگوا سکتی تھی۔ اس کے لیے اسے خود ہی نیچے جانا تھا۔ اور نیچے جانے کے تصور سے ہی اس پر لرزہ چڑھ جاتا تھا۔ لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ رمضان المبارک کا مہینہ آئے اور وہ قرآن کی تلاوت سے محروم رہے اور اب تو اس کے سارے لوگ تازہ تازہ بچھڑے تھے۔ ان کے ایصال ثواب کے لیے بھی کچھ کرنا تھا۔

اگلی صبح اس نے رنجنا سے کہا۔ ''میں نیچے جاؤں گی۔''

رنجنا نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کچھ ضروری چیزیں لانی ہیں۔'' اس نے وضاحت کی۔

مگر رنجنا کی حیرت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ نیچے جانے کو کہہ رہی تھی۔ وہ تو ایک قدرتی بات تھی۔ اسے حیرت اس پر تھی کہ یہ کہتے ہوئے اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ بری طرح لرز رہی تھی۔ رنجنا یہ سوچ رہی تھی کہ ابھی سے یہ حال ہے تو نیچے جا کر کیا ہوگا۔ وہاں تو منجھلی بی بی کی طبیعت بھی خراب ہو سکتی ہے۔ ''ٹھیک ہے منجھلی بی بی۔'' اس نے کہا۔ ''میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔''

نور بانو نے تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔ ''تم چھوٹے ٹھاکر سے بات کرلو۔''

''ان سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ گھر آپ کا ہے۔''

''تم سمجھی نہیں۔ ان سے کہنا، وہاں سے ہٹ جائیں۔''

''وہ تو اس وقت سو رہے ہیں۔ آپ ابھی چلی چلیں۔''

''کیا پتا'' آنکھ کھل جائے۔ انھیں تو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ میں نیچے ہوں۔ نہیں...... پہلے تم انھیں بتا دینا۔''

''تو چھوٹے ٹھاکر کے اٹھنے کا انتظار کرلیں۔ شام کو چلیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔''

اس دوران نور بانو رمضان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ رمضان آتے تھے تو اماں سحری اور افطار کے لیے کیسا اہتمام کرتی تھیں۔ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ کھانے میں اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ تو اب بس زندہ رہنے کے لیے کھاتی تھی۔ اب اہتمام کیسا، اس نے سوچا۔ بس روزے ہی تو رکھنے ہیں۔

اس لمحے اس کے کانوں میں اماں کی آواز گونجی۔ ''سحری اور افطاری، دونوں کا اپنی حیثیت کے مطابق اہتمام کرنا چاہیے۔ اس سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ اور اس مہینے دوسروں کا بھی خاص خیال رکھنا چاہیے...... خاص طور پر ناداروں کا......''

نور بانو کو یاد تھا کہ افطار سے پہلے اماں افطاری کا سامان سینی پر سجا کر آکا میاں کے ہاتھ مسجد بھجواتی تھیں۔ پڑوسیوں کے ہاں بھیجنے کا سلسلہ الگ تھا۔

مگر میں یہ سب کیسے کروں گی؟ نور بانو نے سوچا۔ میرے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں۔

اسی وقت اسے یاد آیا کہ رنجنا نے اسے مکان کا کرایہ دیا تھا۔ پیسے تو ہیں اس کے پاس!

مگر میں افطاری مسجد یا کہیں اور کیسے بھجوا سکتی ہوں۔ کون ہے لے کر جانے والا؟ اور اب اس گھر سے کہیں افطاری بھیجی جائے تو...... یہ تو کسی کو بھی نہیں معلوم کہ میں یہاں رہ رہی ہوں۔ اس نے سرد آہ بھر کے سوچا...... کاش، یہ لوگ مسلمان ہوتے۔

پھر بھی اس نے فیصلہ کرلیا کہ تھوڑا بہت اہتمام ضرور کرے گی۔ اس طرح اللہ بھی خوش ہوگا اور اماں کی روح کو بھی سکون ملے گا۔ پھر اس کے دل میں ایک عجیب خیال آیا۔ وہ ان لوگوں کو

بھی کھلائے گی۔ آخر یہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے بغیر کسی لالچ کے اس کی زندگی اور آبرو بچائی ہے اور اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔

اور وہ انکار کردیں تو؟ آخر وہ بھی تو ان کے گھر کا پکا ہوا نہیں کھاتی۔ تو وہ اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کیوں کھائیں گے؟ جیسے وہ انھیں ناپاک سمجھتی ہے، وہ بھی مسلمانوں کو ملیچھ کہتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ وہ حق پر ہے اور وہ واقعی ناپاک ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ کا انکار کرتے ہیں۔

تو بھلے ہی وہ انکار کردیں، پوچھنا تو اس کا فرض ہے۔

وہ آپ ہی آپ یہ سب کچھ سوچتی رہی اور فیصلے بھی کرتی رہی۔ پھر اس نے ایک فہرست بنائی اور کچھ رقم کے ساتھ رنجنا کو دے دی۔ ''رگھو سو کر اٹھ جائے تو اسے یہ پرچا دے دینا۔ بازار سے یہ سودا لانا ہے۔''

''تو پیسوں کی کیا ضرورت ہے منجھلی بی بی۔''

''اس لیے کہ پیسوں کے بغیر کچھ نہیں آتا۔'' نور بانو نے خشک لہجے میں کہا۔ ''اور یہ سودا میں منگوا رہی ہوں...... رمضان کے لیے۔''

''ارے...... روزوں کا مہینہ آگیا۔'' رنجنا نے چہک کر کہا۔ وہ رمضان کی رونق دیکھتی رہی تھی۔ اسے روزے بہت اچھے لگتے تھے۔

''ہاں...... شاید آج چاند ہو جائے۔''

''مجھے یہ مہینہ بہت اچھا لگتا ہے۔'' رنجنا نے بے ساختہ کہا۔

نور بانو نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''اچھا...... چھوٹے ٹھاکر سے وہ بات بھی کرلینا۔''

''کرلوں گی منجھلی بی بی۔ آپ فکر نہ کریں۔''

❁......❁......❁
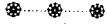
رنجنا اوتار سنگھ کے لیے ناشتہ لے کر گئی تو اس نے نور بانو کی وہ بات کی۔ ''مالک...... منجھلی بی بی کچھ چیزیں لینے کے لیے نیچے آنا چاہتی ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے۔ میں تو پہلے ہی سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔''

''پر مالک، یہ بات کہتے ہوئے وہ تھر تھر کانپ رہی تھیں۔''

''یہ بھی قدرتی بات ہے۔ وہ نیچے آئیں گی تو انھیں اس رات کا ایک ایک پل یاد آئے گا۔'' اوتار سنگھ نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ ''وہ جب تک نیچے رہیں، تم ان کے ساتھ ہی رہنا۔''

''جی مالک۔ پر ایک بات اور کہی ہے انھوں نے۔'' رنجنا ہچکچا رہی تھی۔

''تو بتاؤ نا۔''

''وہ...... مالک...... مجھے اچھی نہیں لگی وہ بات۔''

''تم بتاؤ تو۔''

''وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ اتنی دیر کے لیے یہاں سے ہٹ جائیں۔''

''تو اس میں کون سی بری بات ہے۔ میں باہر چلا جاؤں گا۔ جب تم انھیں واپس چھوڑ آؤ تو مجھے بتا دینا۔''

''مالک...... مجھے لگتا ہے، ان کی طبیعت بھی خراب ہو سکتی ہے یہاں۔''

''تو میں باہر رہوں گا۔ مجھے بلا لینا۔''

''اور مالک، کل سے شاید روزے شروع ہو رہے ہیں۔''

''اوہ۔ روزوں کا تو بڑا اہتمام ہوتا ہے۔''

''انھوں نے ایک پرچا اور پیسے دیے ہیں۔ رگھو سے سودا منگوانے کو کہا ہے۔ میں نے پیسوں کے لیے منع بھی کیا۔ مگر وہ نہیں مانیں۔''

''یہ تو اچھا ہے۔ اس طرح ان کی خود اعتمادی بڑھے گی۔'' اوتار سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پچھلی باتیں بھولنے میں بھی مدد ملے گی۔ ویسے بھی یہ گھر تو انہی کا ہے۔''

''جی مالک۔''

اوتار سنگھ کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر وہ بولا۔ ''ستور رنجنا، تمھیں معلوم ہے نا کہ روزوں میں مسلمان دن میں کھانا نہیں کھاتے۔''

''معلوم ہے مالک۔''

''بس تو خیال رکھنا۔ دن میں کھانا نہیں کھانا۔ ہم لوگ بھی نہیں کھائیں گے۔''

''ٹھیک ہے مالک۔''

''اور رگھو ناشتہ کر لے تو اس کو سودا لانے کے لیے بھیج دینا۔''

❀......❀......❀

نور بانو نے نیچے جانے کے لیے زینے پر پہلا قدم رکھا تو اس کا یہ حال تھا کہ دل سینے میں دھڑ دھڑ کر رہا تھا اور ٹانگیں یوں لرز رہی تھیں، جیسے اس کے وجود کا بوجھ ان کے لیے بہت زیادہ ہو گیا ہو۔ اسکا جی چاہا کہ وہ پلٹ جائے اور اپنے اس نئے کمرے میں جا کر چھپ جائے، جہاں اسے پناہ ملی ہے۔ لیکن اس نے خود کو یاد دلایا کہ اس مرحلے سے تو گزرنا ہی ہے۔ ورنہ وہ ساری عمر اسی طرح خوف میں مبتلا رہے گی۔

اگر اسے ہر قیمت پر قرآن پاک نہ لانا ہوتا تو شاید وہ واپس ہی چلی جاتی۔

اس نے کوشش کی تھی کہ رنجنا پر اس کا حال نہ کھلے۔ لیکن رنجنا تو پہلے ہی سے اس کی

کیفیت سمجھ رہی تھی۔ بہر حال اس نے نور بانو پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح نور بانو خود کو مضبوط بنانے کی کوشش کرے گی۔

بیچ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ابھی اس نے چوکھٹ پھلانگ کر صحن میں قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ وہ جیسے ماضی میں پہنچ گئی۔ بھولی بسری یادیں آواز کا روپ دھار کر اس کی سماعت میں گونجنے لگیں۔

وہ بت بن کر رہ گئی۔ وہ دہلیز پار کرنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔

''رات کو سونے سے پہلے میں دس بار دیکھتی ہوں کہ بیچ کا دروازہ بند ہے نا۔'' وہ چھمن بوا کی آواز تھی۔

''کیوں بوا؟'' وہ حور بانو تھی۔

''ارے...... وہ موا چھوٹا ٹھاکر! کسی دن دروازہ کھلا ہوا مل گیا تو گھر میں گھس آئے گا۔''

نور بانو کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ اب بیچ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ روکنے والا بھی کوئی نہیں۔ اور وہی چھوٹا ٹھاکر اپنے گھر میں اس لیے قدم نہیں رکھتا کہ اس نے.......... نور بانو نے اسے منع کر دیا ہے۔

''...... میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ میں آدمی کو پہچانتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس وقت جو کچھ میں تم سے کہوں، وہ تمھیں ہمیشہ یاد رہے۔ اسے کبھی نہ بھولنا۔ تمھیں میری قسم...... تمھارے مرے ہوئے باپ کی قسم......'' وہ اماں کی آواز تھی۔

نور بانو چونکی۔ حیرت ہے...... یہ اتنی بڑی بات مجھے یاد ہی نہیں رہی۔ یاد ہی نہیں آئی۔

''آپ کہیں اماں۔ ہم یاد رکھیں گے۔'' وہ حور بانو تھی۔

''چھوٹے ٹھاکر سے تمھیں اللہ واسطے کا بیر ہے۔'' اماں کہہ رہی تھیں۔ ''میں جب بھی تمھیں سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں تو یہ نور بانو تاویلیں لانے لگتی ہے۔ اس کی اچھائی کو برائی میں بدل دیتی ہے۔ تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو۔ مگر خود بے وقوف ہو۔ آج میں تمھیں وہ کچھ نہیں بتاؤں گی جو میں جانتی ہوں۔ تم اس میں بھی بد نیتی تلاش کر لو گی۔ اس لیے میں تمھیں حکم دے رہی ہوں۔ اسے میری وصیت سمجھ لو...... چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں جس کا جو گمان ہے، بے شک وہ اس پر قائم رہے۔ لیکن میں تمھیں حکم دے رہی ہوں کہ اس پر ہمیشہ ویسا ہی اعتبار کرنا، جیسا مجھ پر کرتی ہو۔ اور اسے اپنا ویسا ہی بہی خواہ سمجھنا، جیسا بہادر علی کو سمجھتی ہو۔ چھوٹے ٹھاکر سے تمھیں کبھی دھوکہ نہیں ملے گا۔ وہ تمھاری ویسی ہی حفاظت کرے گا، جیسی بہنوں کے بھائی کرتے ہیں۔ اس سے کبھی نہ ڈرنا۔ اس سے بڑھ کر اعتبار کسی پر نہ کرنا۔

کیا مجھے چھوٹے ٹھاکر سے اللہ واسطے کا بیر تھا؟ نور بانو نے دل میں سوچا۔ نہیں...... ایسا

تو نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کمزوری میری اپنی تھی اور میں اس پر اس سے چڑتی تھی۔ اور اماں کی بات تو سچ ثابت ہوئی ہے۔ حرف بہ حرف۔ چھوٹا ٹھاکر اس کی حفاظت کر رہا ہے۔

''کیا ہو گیا منجھلی بی بی، رک کیوں گئیں؟ آئیں نا۔'' رنجنا نے اسے چونکا دیا۔

''آ رہی ہوں۔'' نور بانو نے کہا۔

وہ صحن میں داخل ہو گئی۔ ماضی سے رابطے کے نتیجے میں اس کی دہشت کم ہو گئی تھی۔ اس کے جسم میں لرزش تو اب بھی تھی۔ لیکن پہلے جیسا حال نہیں تھا۔ اب اس کے پاؤں اپنے قابو میں تھے۔

صحن میں اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ جائزہ لے رہی تھی۔ جانا پہچانا گھر نجانے کیوں اسے اجنبی لگ رہا تھا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ قرآن پاک لیتی اور اوپر کا رخ کرتی۔ لیکن اس نے سوچا، کون جانے پھر یہاں آنے کا موقع ہی نہ ملے۔ میں پورے گھر کو آخری بار دیکھ لوں۔

اس کے قدم ڈیوڑھی کی طرف اٹھ گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور باہر کا دروازہ بند تھا۔ لیکن اب اس پر پہلے کی طرح چلمن نہیں تھی۔ وہ چلمن جس کے توسط سے اس نے چھوٹے ٹھاکر کو پہلی بار دیکھا تھا۔ دروازے کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ دوبارہ لگایا گیا ہے۔

وہ ڈیوڑھی میں داخل ہوئی۔ وہاں دو پلنگ بچھے تھے...... آمنے سامنے، دو دیواروں کے ساتھ۔ ایک پلنگ تو وہاں پہلے بھی بچھتا تھا۔ اس پر آکا میاں سوتے تھے۔ باقی سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہاں کاٹھ کباڑ، کئی طرح کے اوزار بکھرے ہوئے تھے۔

اچانک نور بانو کو جھٹکا لگا۔ وہ خیال ہی ایسا تھا۔ ''چھوٹے ٹھاکر یہاں سوتے ہیں؟'' اس نے رنجنا سے پوچھا۔

''جی منجھلی بی بی۔''

نور بانو اوپر والے گھر میں آزادانہ پھرتی رہی تھی۔ اس نے چھوٹے ٹھاکر کا کمرا دیکھا تھا۔ وہ بہت نفیس کمرا تھا۔ وہاں مسہری تھی۔ نرم دبیز بستر تھا۔ کتابوں کا ایک شیلف تھا، جس میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک رائٹنگ ٹیبل تھی۔ ایک طرف ایک آرام کرسی تھی، جس پر آدمی آرام سے نیم دراز ہو جائے اور جی چاہے تو جھولتا رہے۔

نور بانو کو حیرت بھی ہوئی اور شرمندگی بھی۔ چھوٹے ٹھاکر کے کمرے کے مقابلے میں ڈیوڑھی تو اصطبل لگ رہی تھی۔ اسے یہ احساس تو تھا کہ اس نے چھوٹے ٹھاکر کو اس کے کمرے کی آسائش سے محروم کر دیا ہے۔ مگر وہ نیچے اس حال میں رہ رہا ہوگا، یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

''یہاں کیوں سوتے ہیں تمھارے چھوٹے ٹھاکر۔'' اس نے رنجنا سے کہا۔ ''اندر کسی

کمرے میں آرام سے سو جاتے۔''

''اب میں تو ان سے نہیں پوچھ سکتی منجھلی بی بی۔''

نور بانو ڈیوڑھی سے نکل آئی۔ صحن صاف ستھرا تھا۔ لگتا تھا کہ وہاں صفائی کی جاتی رہی ہے۔ لیکن اندر گھستے ہی اسے لگا کہ جیسے گھر برسوں سے غیر آباد اور اجڑا ہوا ہے۔ ہر چیز ویسی ہی تھی، جیسی اس رات چھوڑی گئی تھی۔ بلکہ ہر چیز پر منوں گرد جم گئی تھی۔ اِدھر اُدھر مکڑیوں نے بے شمار جالے بُن دیے تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ بیس دن پہلے یہ گھر آباد تھا۔ اس میں چہل پہل تھی۔

اپنے کمرے میں گھستے ہوئے نور بانو کی حالت پھر غیر ہو گئی۔ ہاتھ پاؤں بری طرح کانپنے لگے۔ اس نے بستر کو دیکھا۔ یہی تو وہ جگہ تھی جہاں اس نے درندگی کا وہ کھیل دیکھا تھا۔ جہاں اس کی بہنیں آبرو اور زندگی دونوں سے محروم ہوئی تھیں۔

اسے سردی لگنے لگی۔ دانت بجنے لگے۔

''کیا ہو رہا ہے منجھلی بی بی؟'' رنجنا نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''مم...... میری...... طط...... طبیعت خراب ہو رہی ہے۔''

''جو کچھ ہوا، اسے بھول جائیں۔ وہ ہو چکا۔ اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

نور بانو کو یاد آیا۔ اماں نے یہی بات اور انداز میں کہی تھی۔ اوتار سنگھ بھائیوں کی طرح تمہاری حفاظت کرے گا۔ اس پر اعتبار کرنا ہے۔ یہ میرا حکم ہے...... وصیت ہے۔ اور نور بانو کی طبیعت ایک دم سنبھل گئی۔ ہاں...... اب انشاء اللہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔

اس کے جسم کی تھرتھری رک گئی۔ اب اس نے بستر کو دیکھا۔ وہ اسی طرح مسکا ہوا تھا۔ مگر دونوں بستروں پر چادر نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئی۔ چادریں خون آلود ہوں گی۔ ہٹا دی گئی ہوں گی۔

اس کی نگاہوں میں پھر وہ مناظر پھرنے لگے۔ وہ جلدی سے کمرے سے نکل آئی۔

اماں کے کمرے میں کوئی بے ترتیبی نہیں تھی۔ چھمن بوا بھی اسی کمرے میں سوتی تھیں۔ دونوں بستروں کی چادروں پر شکنیں تھیں۔ لگتا تھا، اماں اور چھمن بوا ابھی ابھی سوتے سے اٹھ کر کہیں گئی ہیں اور ابھی واپس آ جائیں گی۔ بس اتنا تھا کہ ہر چیز پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔

نور بانو کمرے سے نکل کر کوٹھری کی طرف بڑھی۔ وہاں سے اسے قرآن پاک لینا تھا اور اپنے لیے کچھ کپڑے بھی۔

کوٹھری بھی اسی حال میں تھی، جس میں اسے چھوڑا گیا تھا۔ بستروں والا بکس کھلا ہوا تھا۔ چند لحاف اور گدے نیچے فرش پر گرے ہوئے تھے۔ اسے یاد تھا، اس نے اس بکس میں انہی لحاف گدوں کے نیچے خود کو چھپایا تھا اور جب وہ بکس کھولا جا رہا تھا تو وہ دہل رہی تھی کہ اس کا انجام بھی اپنی بہنوں جیسا ہوگا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آنے والا چھوٹا ٹھاکر ہے۔ اور معلوم بھی ہوتا، تب

بھی اس کے خوف میں کمی نہ ہوتی۔ آخر چھوٹا ٹھاکر بھی تو ہندو ہی تھانا۔

اور جب وہ بکس کھولا گیا تھا تو وہ دہشت سے بے ہوش ہوگئی تھی۔ رنجنا نے بتایا تھا کہ چھوٹا ٹھاکر اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر اوپر لے گیا تھا۔ اس خیال سے اس وقت بھی اس کے رخسار حیا سے دہک اٹھے۔ اس کا پردہ ختم ہوگیا۔ چھوٹے ٹھاکر نے اسے دیکھا...... بلکہ چھوا بھی۔

اس کے اندر جھنجلاہٹ بھر گئی۔ ایک بار پھر چھوٹا ٹھاکر اسے برا لگنے لگا۔ مگر اماں کی وصیت پھر اس کے کانوں میں گونجی۔ وہ متضاد جذبوں میں گھر گئی۔ چھوٹے ٹھاکر سے اسے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ مگر اس میں چھوٹے ٹھاکر کی کسی خرابی کا دخل تھا، نہ اس کے ہندو ہونے کا۔ کیونکہ کسی ہندو سے اسے ایسا بیر نہیں ہوا تھا۔ یہ بیر اس کی اپنی کمزوری کی وجہ سے تھا اور اس کمزوری کے بارے میں کسی سے بات کرنا تو درکنار، وہ تنہائی میں بھی اس پر سوچنے سے گریز کرتی تھی۔ بس چھوٹے ٹھاکر پر اسے غصہ آتا رہتا تھا۔

اس نے جزدان میں لپٹا ہوا قرآن پاک اٹھالیا۔ اپنے لیے کپڑے اس نے رنجنا سے نکلوائے۔ پھر وہ رنجنا کے ساتھ اوپر چلی آئی۔

اگلی شام رمضان کا چاند نظر آ گیا!

نور بانو چاند دیکھنے کے لیے کوٹھے پر جا رہی تھی کہ رنجنا نے اسے روک دیا۔ ''آپ کا اوپر جانا مناسب نہیں ہے منجھلی بی بی۔''

''کیوں؟'' نور بانو نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''سب لوگ چاند دیکھنے کے لیے اپنے اپنے کوٹھے پر چڑھے ہوئے ہیں۔ آپ اوپر جائیں گی تو سب کو پتا چل جائے گا۔''

بات نور بانو کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

کچھ دیر بعد نقاروں کی آواز سنائی دی۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ چاند نظر آ گیا ہے۔

تب نور بانو اپنے سب لوگوں کو یاد کر کے روئی...... اور خوب روئی۔ رنجنا اسے لپٹا کر تھپکیاں دیتی رہی۔ مگر نور بانو کے آنسو کسی طرح تھم ہی نہیں رہے تھے۔

روئی تو وہ پہلے بھی تھی۔ مگر وہ رونا بچھڑنے والوں سے زیادہ اپنے لیے تھا۔ وہ اپنی بے کسی پر بہائے جانے والے آنسو تھے۔ ان آنسوؤں کا اصل محرک خوف اور دہشت تھا۔ جو بہنوں پر گزری تھی، اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اور اسے ڈر تھا کہ اس کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسے رونا آیا تھا۔ لیکن آج اس کے دل سے ہر خوف دور ہوگیا تھا۔ دہشت مٹ گئی تھی۔ پہلی بار وہ ان کی موت پر روئی تھی۔

اس کے آنسو تھمے تو اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ اسے خیال آیا کہ اس نے ان کے ایصالِ ثواب کے لیے اب تک کچھ نہیں کیا ہے۔ چلو اچھا ہوا...... رمضان کا بابرکت مہینہ آ گیا۔ وہ کثرت سے سورۂ ملک پڑھے گی۔

اس رات عشاء کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گئی کہ سحری کے لیے بہت سویرے اٹھنا ہوگا۔ لیکن اسے نیند نہیں آئی۔ وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اندوہناک واقعہ، جس میں اس نے تمام اپنوں کو کھو دیا، آج ہی کی بات ہے۔ ایک اعتبار سے یہ سچ بھی تھا۔ شعوری طور پر تو آج اس نے پہلی بار ہی ان لوگوں کا غم کیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے روتی رہی۔

آدھی رات کے قریب وہ گھبرا کر اٹھ گئی۔ اب اس سے لیٹا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر نکل آئی۔ اس کے قدم چھوٹے ٹھاکر کے کمرے کی طرف اٹھ رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر اس کمرے کو دیکھ کر نیچے والی ڈیوڑھی سے اس کا موازنہ کرنا چاہتی تھی۔

اس نے کمرے میں روشنی کی اور کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر یونہی وہ کتابوں کے شیلف کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ شیلف میں ادبی کتابیں زیادہ تھیں۔ سائنس پر بھی کافی کتابیں تھیں اور کچھ علمی کتابیں بھی تھیں۔

مگر وہاں دو کتابوں کو دیکھ کر وہ چونک گئی۔ ان میں سے ایک تو بائبل تھی اور دوسری دوزخ اور آخرت کے موضوع پر اسلامی کتاب تھی۔ یہ کتابیں یہاں کیوں ہیں؟ اس نے حیرت سے سوچا۔

اس لمحے اسے کچھ یاد آ گیا۔ ایک بار باجی نے اسے دکھایا تھا۔ کوٹھے پر چھوٹا ٹھاکر کسی مسلمان استاد سے عربی سیکھ رہا تھا۔ یہی نہیں، اس کے بعد استاد نے قرآن پاک کی قرات کی تھی اور چھوٹا ٹھاکر احترام سے سر جھکائے سن رہا تھا۔ بلکہ اس پر تو باجی بھی حیران ہوئی تھیں کہ وہ ہندو ہو کر قرآن کی تلاوت سنتا ہے۔

اسے یاد آیا کہ اماں نے کہا تھا کہ چھوٹا ٹھاکر حق کی جستجو کر رہا ہے۔ وہ اللہ کا نام لیتا ہے۔ اس نے کبھی بتوں کی پوجا نہیں کی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے گھر میں کوئی اسے کافر اور مشرک کہے یا سمجھے۔ لیکن وہ [illegible] پر مصر رہی تھی۔ اس نے ہمیشہ چھوٹے ٹھاکر کو کافر اور مشرک کہا تھا۔ صرف اپنی کمزوری کی وجہ سے...... وہ کمزوری جس پر وہ شعوری طور پر سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

تو چھوٹا ٹھاکر سچ مچ حق کی جستجو کرتا رہا ہے! نور بانو نے سوچا۔ دوزخ کے موضوع پر اس کتاب [illegible] اور بائبل کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ وہ شیلف میں عربی کی بھی کئی کتابیں موجود تھیں۔ نور بانو کو اس پر حیرت ہوئی کہ وہاں قرآن کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔ اس کے بغیر تلاشِ حق کیسے مکمل ہو سکتی ہے۔ اور چھوٹا ٹھاکر تو قرآن سنتا رہا ہے۔ پھر یہاں قرآن کیوں موجود نہیں۔

وہ کمرے سے نکل آئی۔ اسے ایسی بے چینی ہو رہی تھی، جیسے وہ کچھ کرنا چاہ رہی ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ کیا کرے۔ اپنے کمرے میں جا کر وہ بستر پر لیٹی۔ مگر فوراً ہی اٹھ گئی۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ کیا چاہ رہی ہے۔ آج رمضان کی پہلی شب تھی۔ اسے کم از کم سات بار سورۂ ملک پڑھنی چاہیے تھی۔

اس نے وضو کیا، قرآن شریف لیا اور کوٹھے کی طرف چل دی۔ وہاں بیٹھ کر وہ سکون سے تلاوت کرے گی۔

اوپر پہنچ کر اس نے روشنی کی، کرسی پر بیٹھ کر قرآن پاک کو گود میں رکھا اور تلاوت شروع کی۔

چند لمحے بعد اس پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی، جس کا اسے پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اسے دنیا و مافیہا کا ہوش نہیں رہا۔ اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

❀……❀……❀

اوتار سنگھ لاٹھی لیے گلی میں گشت کر رہا تھا!

گلی کے اس سرے سے چلتا ہوا وہ اپنے گھر کے دروازے تک پہنچا تو اسے وہ آواز سنائی دی۔ اس کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔

وہ بلا شک و شبہ وہی آواز تھی……وہ آواز جو اس نے پہلی بار سنی تو اسے محبت ہو گئی۔ وہ آواز جسے سنے ہوئے اسے جیسے صدیاں ہو گئی تھیں۔ وہ آواز جسے وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولا تھا۔ وہ آواز جو آج بھی اس کی سماعت میں گونجتی تھی۔

پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ آواز سچ مچ کی ہے۔ اس نے یہی سوچا کہ شاید یہ اس کی سماعت کی خواہش اور طلب کا ثمر ہے۔ مگر آواز کے تسلسل نے اسے مزید سوچنے کے قابل نہیں چھوڑا۔

اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ از خود رفتگی کے عالم میں اس کے قدم خود بہ خود اٹھ رہے تھے۔ وہ گھر کے کھلے دروازے سے ڈیوڑھی میں داخل ہوا اور صحن میں نکلا۔ یہاں اس کے قدم ایک لمحے کو رُکے۔

اب آواز بالکل صاف اور واضح تھی۔ وہ اوپر سے آ رہی تھی۔ اس کے قدم جیسے اس آواز کی ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ بیچ کے دروازے کی طرف بڑھا اور زینے پر چڑھنے لگا۔ اسے بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے، کہاں ہے اور کدھر جا رہا ہے۔ بس وہ آواز مقناطیس کی طرح اسے کھینچ رہی تھی۔

باہر گھو حیران تھا کہ یہ مالک کو اچانک کیا ہو گیا۔ مگر پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اسے اپنا کام کرتے رہنا چاہیے۔

اوپر والے گھر کے دروازے پر اوتار سنگھ کے قدم ایک لمحے کو رکے۔ پھر وہ مڑا اور کوٹھے کی طرف جانے والے زینے پر چل دیا۔

اوپر پہنچتے ہی وہ ٹھٹھک گیا۔ اس کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔ وہ منظر اسے اس دنیا کا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ لڑکی بڑے سلیقے سے چادر میں لپٹی دوپٹہ سر پر رکھے، گود میں کتاب رکھے پڑھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اتنا روشن تھا کہ اس کی روشنی سیاہ دوپٹے کے پار بھی نظر آ رہی تھی۔

ایک لمحے میں اوتار سنگھ نے یہ سب کچھ دیکھا۔ پھر اس کے بعد جیسے اس کی بینائی چلی گئی۔ جیسے بہت گھپ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیتا، ویسے ہی بہت زیادہ روشنی میں بھی نظر بے کار ہو جاتی ہے اور وہاں تو اتنی روشنی تھی کہ آسمان بھی غائب ہو گیا تھا۔ اب کہیں کچھ بھی نہیں تھا……سوائے اس آواز کے۔ اوتار سنگھ نے آنکھیں بند کر لیں۔ لگتا تھا کہ آنکھیں کھلی رہیں تو وہ ہمیشہ کے لیے اندھا ہو جائے گا۔

لگتا تھا کہ اس کے تمام حواس سماعت میں مرتکز ہو گئے ہیں۔ ایک ایک لفظ یوں صاف سنائی دے رہا تھا، جیسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھا جا رہا ہو۔ اور سماعت کا جیسے فہم سے گہرا رابطہ تھا۔ وہ ہر لفظ کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔ عربی اس نے بڑی لگن اور شوق سے پڑھی تھی۔ اس کی غیر معمولی استعداد کے مولوی صاحب بھی معترف رہے تھے۔ لیکن بہر حال وہ اہل زبان تو نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ایک ایک لفظ کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔

نور بانو اپنی کیفیت میں مستغرق پڑھے جا رہی تھی۔ آخری آیت پڑھنے کے بعد اس نے سورۂ ملک دوبارہ شروع کی۔ ”تبارک الذی بیدہ الملک……“ وہ…… خاسئا و ھو حسیر……تک پہنچی تھی کہ اس آواز نے اسے چونکا دیا۔

”شروع سے پڑھو……اور ذرا ٹھہر ٹھہر کر۔“

نور بانو بری طرح چونکی۔ بلکہ ڈر گئی۔ اس نے سر اٹھایا تو اسے احساس ہوا کہ روشنی زیادہ……بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ اور اس نے سر گھما کر دیکھا تو اسے وہ روشن ہیولیٰ نظر آیا۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ وہ اوتار سنگھ ہے۔ وہ روشنی کا کمال تھا یا اس کی کیفیت کا، بہر حال اسے ایسا لگا کہ وہ آسمان سے اترا ہوا کوئی فرشتہ ہے، جو اس کے بچھڑے ہوؤں کی خیر خبر لایا ہے اور سورۂ ملک سننے کے لیے آیا ہے۔

”رک کیوں گئیں۔ شروع سے پڑھو……اور ذرا ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔“ اوتار سنگھ نے آنکھیں بند کیے کیے دھیمی آواز میں کہا۔

نور بانو نے سر جھکایا اور دوبارہ پڑھنے لگی۔ ''تبرک الذی بیدہ الملک وھو علی کل شیء قدیر o''

''بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہے بادشاہی۔'' اوتار سنگھ کے لہجے میں عجیب سا جاہ و جلال تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ ''اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔''

''الذی خلق الموت والحیوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاط وھو العزیز الغفور o''

''وہ ذات جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تا کہ آزمائش کرے تمہاری کہ کون تم میں سے زیادہ اچھا ہے عمل میں۔ اور وہ ہے زبردست، بے انتہا معاف فرمانے والا۔''

نور بانو اب گویا اشارے پر پڑھ رہی تھی۔ ''الذی خلق سبع سموت طباقاط''

''وہ ذات جس نے بنائے سات آسمان تہ بہ تہ۔'' اور اوتار سنگھ نے بے ساختہ آنکھیں کھول دیں۔ روشنی تو اب بھی ویسی ہی تھی۔ لیکن نگاہ کام کر رہی تھی۔ وہ دیکھ سکتا تھا۔

اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ ذہن میں ایک خیال تھا...... آسمان تو ایک ہی نظر آتا ہے۔ پھر سات آسمان......!

مگر وہ عجیب منظر تھا۔ اوپر نیلے آسمان کی روشن چھت تھی۔ پھر وہ جیسے شفاف ہو گیا اور اس کے پار رنگ برنگے کئی آسمان...... شفاف آسمان نظر آنے لگے۔ وہ بس ایک لمحے کی بات تھی۔ اگلے ہی لمحے اس کے سامنے وہی نیلا آسمان تھا، جو وہ ہر روز دیکھتا تھا۔ اس نے گنے نہیں تھے، رنگوں کی ترتیب بھی وہ نہیں بتا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ بس ایک ثانیے کا نظارہ تھا اور ایسا محیر العقول نظارہ کہ وہ ششدر رہ گیا تھا۔ لیکن اتنا وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس نے روز نظر آنے والے نیلے آسمان کے اوپر چھ مختلف رنگوں کے چھ اور آسمان دیکھے ہیں۔

نور بانو خاموش تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ مگر نجانے کیسے اسے یہ احساس تھا کہ ابھی آگے پڑھنا مناسب نہیں ہے۔ وہ خاموشی اسے بتا رہی تھی، سمجھا رہی تھی کہ فرمائش کرنے والا اپنے مکمل ارتکاز کے ساتھ کسی جستجو میں مصروف ہے۔ وہ خاموشی جیسے ایک بلیغ حکم تھا...... آگے نہ پڑھنے کا۔ اور اس کی حیثیت محض ایک معمول کی سی تھی۔

''بے شک اے اللہ۔ میں نے دیکھ لیا۔ میں گواہی دیتا ہوں۔'' اوتار سنگھ کو احساس بھی نہیں تھا کہ یہ اس کی آواز ہے۔

یہ اشارہ تھا آگے پڑھنے کا۔ نور بانو نے اگلی آیت مبارکہ پڑھی۔ ''ماتری فی خلق الرحمٰن من تفوت ط''

اب اوتار سنگھ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ ''نہیں دیکھو گے تم

رحمان کی تخلیق میں کوئی بے ربطی۔'' اوتار سنگھ نے اسی کیفیت میں کہا۔ آسمان کے سوا گردوپیش کی کسی چیز کا اسے احساس نہیں تھا۔

ایک بار پھر اس خاموشی کے تحکم کو اپنے وجود میں گونجتا محسوس کر کے نور بانو خاموش تھی۔ ابھی آگے پڑھنے کا حکم نہیں تھا۔ اس کی نگاہیں قرآن پاک پر جمی تھیں۔

اوتار سنگھ آگے بڑھ کر منڈیر تک گیا۔ اس کی نگاہیں آسمان کو ٹٹول رہی تھیں، کھوج رہی تھیں...... ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔

ارے...... یہ کیا؟ اس نے حیرت سے سوچا۔ زندگی کے ہر روز آسمان کو میں کئی بار دیکھتا رہا ہوں۔ میں نے پہلے کبھی یہ محسوس نہیں کیا۔ ارے واقعی...... یہ بیکراں لامتناہی آسمان جو وہاں تک نظر آتا ہے، جہاں تک نظر جاتی ہے۔ جس کی وسعت کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ ارے...... اتنے بڑے آسمان میں کہیں کوئی بے ربطی نہیں ہے۔ ہر طرف سے ایک سا خم، ایک سی ہمواری۔ انسان چھوٹا سا گنبد بھی بنائے تو خفیف سی اونچ نیچ ضرور ہوتی ہے۔ کوئی مینار بنائے تو کہیں نہ کہیں فرق ضرور پڑ جاتا ہے۔ کچھ نہیں تو وقت گزرنے کے ساتھ کسی طرف سے جھک جاتا ہے اور بوسیدہ بھی ہو جاتا ہے۔ مگر یہ آسمان جو زمین بننے کے بعد سے اب تک قائم ہے، اس کا رنگ بھی پھیکا نہیں پڑا۔ ہر طرف سے ایک سا خم، ایک سی ہمواری۔ کہیں کوئی اونچ نیچ نہیں۔ کہیں کوئی فرق نہیں۔

''وہ ورطۂ حیرت میں تھا۔ اس نے پکار کر کہا۔ ''بے شک اے اللہ۔ میں نے دیکھا اور میں گواہی دیتا ہوں۔ آپ کے آسمان میں کہیں کوئی بے ربطی نہیں۔''

وہ حکم تھا آگے پڑھنے کا۔ نور بانو نے آیت مبارکہ کا اگلا حصہ پڑھا۔ ''فارجع البصر ھل تری من فطور o''

''ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھو۔ بھلا نظر آتا ہے تم کو کوئی خلل؟''

چند لمحے خاموشی رہی...... وہی خاموش رہنے کا حکم دیتی ہوئی خاموشی۔ نور بانو منتظر تھی......

پھر اوتار سنگھ کی آواز دوبارہ ابھری۔ ''دیکھ لیا اے اللہ۔ کہیں کوئی خلل نہیں، کوئی بے ربطی نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں اے اللہ۔''

نور بانو نے اگلی آیت پڑھی۔ ''ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئا و ھو حسیر o''

''پھر دوڑاؤ نظر۔ بار بار پلٹ آئے گی تمہاری طرف نگاہ تھک کر۔ اور وہ نامراد ہو گی اپنی تلاش میں۔''

نور بانو قرآن پاک پر نظریں جمائے خاموش بیٹھی تھی۔

چند لمحے بعد اوتار سنگھ اپنی اسی گونج دار آواز میں بولا۔ ''اس کی ضرورت نہیں اے اللہ۔ میں نے جان لیا۔ میں نے سمجھ لیا۔ آپ کی ہر بات حق۔ لیکن آپ کے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ اس لیے دوبارہ نظر دوڑا رہا ہوں۔''

یہ کہہ کر اوتار سنگھ منڈیر کی طرف بڑھا۔ اس کی نظریں آسمان کو کھوج رہی تھیں...... روشن نیلے آسمان کو۔ منڈیر کے پاس پہنچ کر وہ چند لمحے آسمان کو متلاشی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ ان نگاہوں میں سچی تلاش تھی۔

پھر وہ بولا تو اس کے لہجے میں بلا کی عاجزی تھی۔ ''بے شک اے اللہ۔ میری نگاہ اپنی تلاش میں نامراد ہو کر لوٹ آئی ہے۔''

اب ہر طرف خاموشی تھی۔ رات کا گہرا سکوت تھا۔ نور بانو یوں دم بہ خود بیٹھی تھی، جیسے یقین ہو کہ ابھی کچھ غیر معمولی...... بہت غیر معمولی ہونے والا ہے۔

اوتار سنگھ اب نظریں جھکائے کھڑا تھا...... کسی گناہ گار کی طرح۔ گرد و پیش میں اب بھی وہی روشنی تھی۔ اور اب تو اسے اپنے اندر...... اپنے وجود میں بھی نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی نظر آ رہی تھی۔

پھر جیسے اس کے اندر روشنی کی ایک بہت بڑی موج اٹھی اور اس کے دل سے ٹکرائی۔ اسے لگا کہ اس کا دل نرم ہو رہا ہے۔ پھر اس کا دل جیسے پگھلنے لگا اور پگھلا ہوا وہ سیال اوپر کی طرف اٹھنے لگا۔ وہ گلے تک پہنچا...... اور اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں تک آ پہنچا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ساتھ ہی اس کا وجود ہلکا ہونے لگا...... ہلکا ہوتا گیا۔ اور جیسے جیسے ہلکا ہوتا گیا، وہ اوپر اٹھتا گیا۔ اب آسمان ایسا تھا کہ جیسے وہ ہاتھ بڑھائے تو اسے چھو سکتا ہے۔ پھر اچانک آسمان شفاف ہونے لگا اور کسی باریک دوپٹے کی طرح ہو گیا۔ اس کے پار اسے دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا...... اسے مختلف رنگوں کے آسمان ہی آسمان دکھائی دینے لگے اور وہ اب بھی اڑ رہا تھا۔ ہلکا ہو کر اوپر اٹھ رہا تھا......

اچانک اس کے اندر کسی نے ڈپٹ کر کہا۔ ''کیا اس کے بعد بھی تو کلمہ نہیں پڑھے گا۔''

اوتار سنگھ کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ ''کلمہ؟'' اس نے زیر لب حیرت سے کہا۔ ''یہ کلمہ ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اس کی بے وزنی کی کیفیت ختم ہو گئی۔ اس کے جسم کو ایسا جھٹکا لگا، جیسے وہ واقعی آسمان سے زمین پر آ گرا ہو۔

''ہاں...... کلمہ تو مجھے یاد ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''مجھے کلمہ پڑھنا چاہیے۔''

''کون سا کلمہ؟'' اس کے اندر کسی نے سوال اٹھایا۔

''مجھے گواہی دینی ہے۔ میں سمجھ گیا، جان گیا۔ اب گواہی دینی ہے۔''

''تو دیر کس بات کی؟''

اوتار سنگھ کے ہونٹ ہلے۔ پہلے تو کوئی آواز نہیں نکلی۔ پھر آواز نکلی تو بلند ہوتی گئی...... ایسی بلند کہ اس آواز کے سوا کہیں کچھ نہیں رہا۔ ایسے جیسے وہ آواز آسمان کے پار...... آسمانوں کے پار جا رہی ہو۔

''**اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا عبده ورسوله.** میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اللہ کے رسول ہیں۔''

اس بار آواز سن کر نور بانو چونکی۔ وہ تو چھوٹے ٹھاکر کی آواز تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ واقعی چھوٹا ٹھاکر ہی تھا اور منڈیر کے پاس کھڑا تھا۔ اور کلمہ بھی وہی پڑھ رہا تھا۔ اور اس کا بدن یوں کانپ رہا تھا، جیسے اس کے اندر بجلی کا کوئی بہت طاقت ور کرنٹ دوڑ رہا ہو۔

''اب پاک بھی ہو جا۔'' اوتار سنگھ کے اندر کسی نے تلقین کی۔

نور بانو کو بہت غصہ آیا۔ اسے جرات کیسے ہوئی اوپر آنے کی۔ کیا یہ نہیں جانتا کہ میں پردہ کرتی ہوں۔ وہ اس پر برسنے ہی والی تھی۔ مگر وہ لمحہ ایسا تھا کہ وہ بھی اس کی اسیر ہو گئی۔ وہ حیرت سے اوتار سنگھ کو دیکھتی رہی۔

اوتار سنگھ کی کپکپی بڑھ گئی۔ مگر اس کی آواز بہت صاف اور گونج دار تھی۔ وہ کلمہ پڑھ رہا تھا...... **لا اله الا الله محمد الرسول الله......**

عشق کا شین
علیم الحق حقی
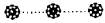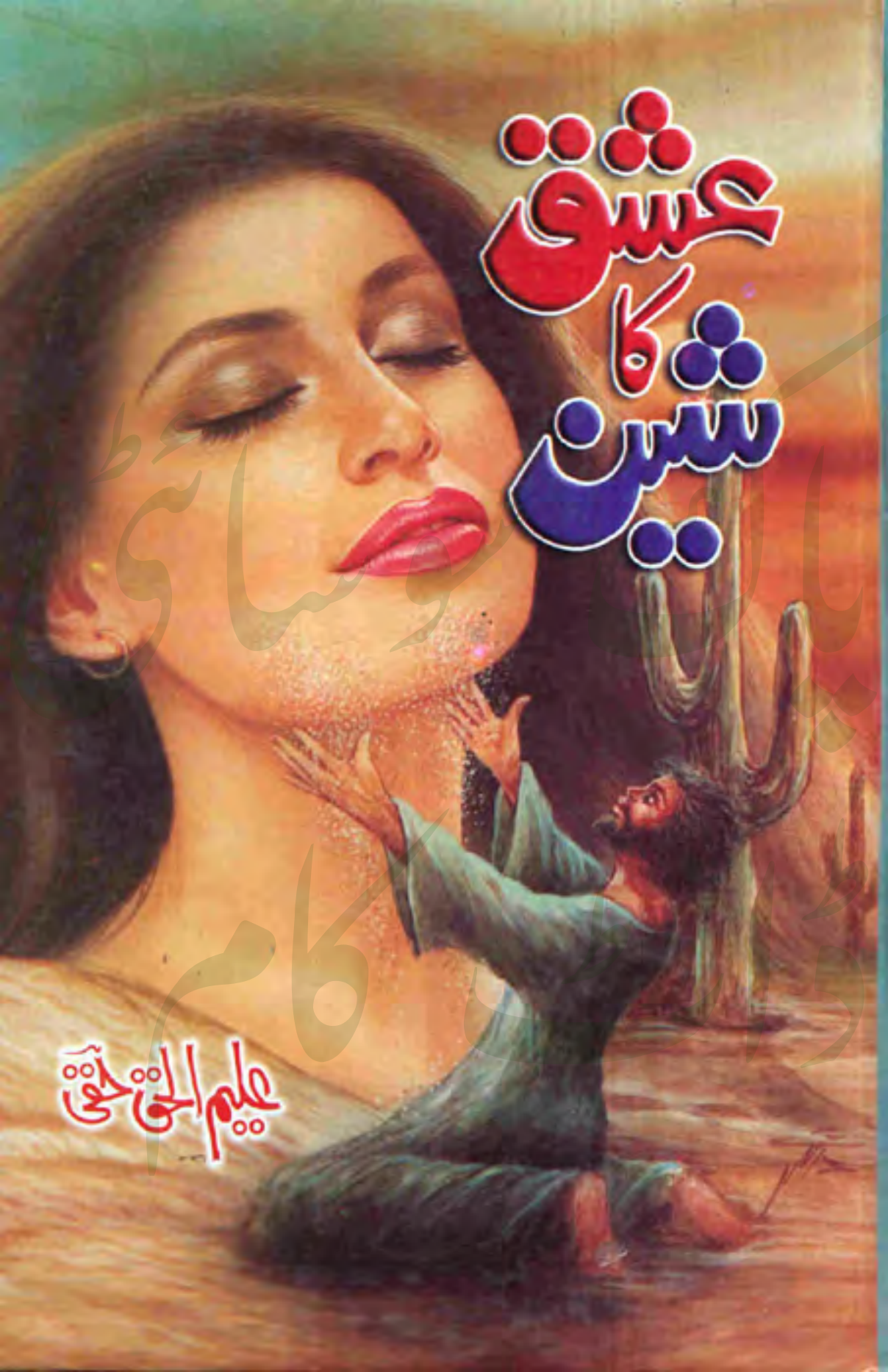
مجذوب یوں تیز قدم اٹھاتا چل رہا تھا' جیسے کہیں پہنچنے کی جلدی ہو!
اندھیرے میں دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے چار جوان لڑکوں نے اُسے دور سے آتے دیکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''لو بھئی...... شکار آ گیا۔'' اُن میں سے ایک نے کہا۔
''اور کوئی ہندو ہوا تو۔'' دوسرا بولا۔
''تو بھی بے وقوف ہے شمو۔ اس وقت کوئی ہندو گھر سے نہیں نکلتا۔ نکلتا ہے تو ہماری طرح گھات لگا کر بیٹھتا ہے۔'' تیسرے نے کہا۔
''مگر بڈھا لگتا ہے۔'' چھوٹے نے تبصرہ کیا۔
''بس مُسلا ہو۔ ہمیں بڈھے جوان سے کیا لینا دینا۔'' پہلا بولا۔
''نہیں جوان ہو تو شکار کا مزہ ہی اور ہے۔''
اتنی دیر میں مجذوب ان کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ وہ چاروں اپنے ہتھیار سنبھالتے اُس کی طرف بڑھے۔ ''کہاں جا رہے ہو مہاراج؟'' پہلے جوان نے مسخرانہ لہجے میں پوچھا۔
''ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔'' مجذوب نے رکے بغیر کہا۔
''مگر اب تو تم بس قبرستان جاؤ گے۔'' دوسرا بولا۔
مجذوب اب ان کے بہت قریب آ چکا تھا۔ وہ اسے اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔ اُس کے سر کے بالوں اور بڑھی ہوئی بے ترتیب داڑھی میں نام کو بھی سیاہ بال نہیں تھا۔ لیکن اُس کا سلوٹوں سے پاک چہرہ جوان تھا۔ بلکہ اس پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔ اُس کا کرتہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اور پاجامے سے اگر پیوند نکال دیے جاتے تو شاید کچھ بھی نہ بچتا۔
مگر اُس کی شخصیت میں سب سے نمایاں چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ ایک طرف تو ان بڑی بڑی آنکھوں سے روشنی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی اور دوسری طرف ان میں دل دہلا دینے والی سرخی تھی۔ ''تم قبرستان کا نام کیوں لیتے ہو۔ تمہارا مرگھٹ تو شمشان گھاٹ کہلاتا ہے۔'' اُس کی آواز میں گہرائی تھی اور گونج تھی۔ صحراؤں کی گونج!
چاروں جوان الجھ گئے۔ ''تو تم مسلمان نہیں ہو؟''
''کیوں نہیں۔ الحمدللہ میں مسلمان ہوں۔''

"تو پھر تم نے شمشان گھاٹ کیوں کہا؟"

"وہ تو تمہارے لیے کہا تھا۔ تمہیں جانا ہوگا وہاں۔ اور ابھی میرا قبرستان جانے کا وقت نہیں آیا ہے۔ ابھی تو مجھے ایک اہم کام کرنا ہے۔"

پاگل معلوم ہوتا ہے۔" اُن میں سے ایک بولا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مار دو سالے کو۔"

ان میں دو کے ہاتھ میں خنجر تھے۔ ایک کے پاس بلم تھا اور چوتھا لاٹھی اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ چاروں بیک وقت حرکت میں آئے۔

"تم میرا راستہ کھوٹا نہیں کر سکتے۔" مجذوب نے کہا اور ایک نظر اُن چاروں پر ڈالی۔

اُن چاروں کو ایسا لگا کہ اُن کے جسم پتھر کے ہو گئے ہیں۔ جو جہاں جس حال میں تھا' ویسا ہی رہ گیا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ تمہیں شمشان گھاٹ جانا ہے۔" مجذوب نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "دوسروں کو مارتے...... لوگوں کا گھر جلاتے پھرتے ہو نا۔ آج تمہارے گھر میں آگ لگی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے انگلی سے ایک خنجر بردار کی طرف اشارہ کیا۔ "تمہارے گھر میں۔ یہاں وقت برباد نہ کرتے تو شاید کچھ لوگوں کو بچا لیتے۔ مگر اب تو کسی کو نہیں بچا سکو گے۔ تمہارا تو گھر ہی شمشان گھاٹ بن گیا۔ افسوس...... صد افسوس۔"

وہ اپنی جگہ بے بس کھڑے اسے جاتے دیکھتے رہے۔ وہ اپنی انگلی تک ہلانے کے قابل نہیں تھے البتہ وہ بول سکتے تھے۔ "یہ مُسلا کیا کر گیا ہے ہمیں؟"

"کوئی جادوگر تھا شاید۔"

"اب ہم ٹھیک کیسے ہوں گے؟"

اسی لمحے مجذوب اِن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور اُس کے ساتھ ہی جیسے اُن کے جسموں کی بندش کھل گئی۔ "چلو! دوڑ کر پکڑتے ہیں سالے کو۔" بلم بردار نے کہا۔ "نہیں۔ میرے گھر کی چتا کرو۔ میرے گھر چلو۔" وہ بولا جس کی طرف مجذوب نے اشارہ کیا تھا۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے' ہے بھگوان...... میرے گھر والوں کی سہائتا کرنا۔"

وہ چاروں مخالف سمت میں چل دیے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ جس گھر کی بات ہو رہی ہے' وہ جل کر خاک ہو چکا ہے۔ کچھ بھی نہیں بچا۔ کوئی بھی نہیں بچا!

❀......❀......❀

نور بانو سن ہو کر رہ گئی۔ کیا یہ قبولِ اسلام ہے؟ وہ سب کچھ اتنا اچانک اور بغیر متوقع تھا کہ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

کلمہ پڑھتے ہوئے اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ باہر کی تمام روشنی اس کے جسم میں اتر رہی

ہے۔ آسمان اب بھی پہلے کی طرح سیاہ نظر آ رہا تھا۔ لیکن اُس کے اندر روشنی اتنی بڑھ گئی ہے کہ اُس کی نگاہیں چندھیا رہی ہیں۔ وہ روشنی اسے اچھی بھی لگ رہی تھی۔ وہ ایسا ناقابلِ بیان سکون محسوس کر رہا تھا' جس کا پہلے کبھی اس نے تصور ہی نہیں کیا تھا۔ وہ ایسا سکون تھا کہ اسے نیند آنے لگی...... مکمل نیند! وہ اس کی آنکھوں میں بھی تھی اور دماغ پر بھی قبضہ جما رہی تھی۔ اُس کے جسم کے تمام عضلات ڈھیلے ہوتے جا رہے تھے۔ پھر اُسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ گر رہا ہے۔

نور بانو نے اُسے گرتے دیکھا تو اُس کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکلی۔ اُس نے قرآن پاک کرسی پر رکھا اور اُس کی طرف لپکی۔ اوتار سنگھ اس طرح گرا تھا کہ اُس کے سر پر یقیناً شدید چوٹ آئی ہوگی۔

اُس کے پاس پہنچ کر وہ ٹھٹک گئی۔ وہ کیا کر سکتی ہے اُس کے لئے؟ کچھ بھی نہیں۔ اُسے رگھو کو اور رنجنا کو بلانا ہے۔ لیکن اسے اس حال میں کوٹھے پر اکیلا چھوڑ کر نیچے جانے کو اُس کا دل نہیں مانا۔ وہ ہر احتیاط بھول کر منڈیر کی طرف لپکی۔ رگھو دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھا تھا۔ ایک لمحے کے لئے نور بانو کو حیرت ہوئی۔ اتنی تیز آواز نیچے نہیں پہنچی۔ رگھو نے کچھ نہیں سنا؟

"رگھو چاچا...... رگھو چاچا......" اُس نے پکارا۔

رگھو نے حیرت سے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس طرح کون پکار سکتا ہے اسے...... منجھلی بی بی کے سوا مگر وہ تو پردہ کرتی ہیں۔ اُس نے اُوپر دیکھتے ہوئے سوچا...... یہ منجھلی بی بی کے سوا کون ہو سکتا ہے؟

"کیا بات ہے منجھلی بی بی؟"

"جلدی سے اوپر آؤ۔ چھوٹے ٹھاکر کو کچھ ہو گیا ہے۔"

یہ سنتے ہی رگھو کو تو جیسے پر لگ گئے۔ مگر اس عالم میں بھی وہ دروازہ بند کرنا نہیں بھولا۔

وہ اوپر آیا تو نور بانو نے کہا: "تم انہیں سنبھالو چاچا۔ میں رنجنا دیدی کو جگاتی ہوں۔"

وہ رنجنا کو لے کر اوپر آئی تو رگھو چھوٹے ٹھاکر کا سر اپنی گود میں رکھے بیٹھا تھا۔ وہ رو رہا تھا اور بار بار بڑی محبت بھری نرمی سے چھوٹے ٹھاکر کے رخسار تھپ تھپا رہا تھا۔ "کیا ہو گیا مالک؟ آنکھیں کھولو نا مالک......"

رنجنا کے ہاتھ میں پانی کی لٹیا تھی۔ اُس نے چھوٹے ٹھاکر پر پانی کے چھینٹے دیے۔

"انہیں ہوا کیا ہے منجھلی بی بی؟" رگھو نے نور بانو سے پوچھا۔

نور بانو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا بتائے۔ "معلوم نہیں۔ میں یہاں قرآن شریف پڑھ رہی تھی کہ یہ اوپر آ گئے۔ کچھ دیر سنتے رہے۔ پھر......" نور بانو کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ جو کچھ ہوا' وہ سب بتانا مناسب بھی ہے یا نہیں۔

یہ تو رگھو کو بھی یاد تھا کہ چھوٹے ٹھاکر اچانک گھر میں چلے گئے تھے۔ "پھر کیا ہوا منجھلی بی بی؟" رنجنا نے پوچھا۔

''چھوٹے ٹھاکر کو ہوش آئے گا تو وہی بتا سکیں گے۔'' نور بانو نے پہلو تہی کی۔

رنجنا چھوٹے ٹھاکر کے چہرے پر چھینٹے مارے جا رہی تھی۔ بالآخر وہ کسمسانے لگا...... اور پھر اٹھ بیٹھا۔ ''کیا ہوا؟ یہ میرا چہرہ کیوں بھگو دیا تم نے؟''

''آپ...... آپ بے ہوش ہو گئے تھے مالک!'' رگھو نے کہا۔

''نہیں...... ایسا سکون ملا تھا کہ میں بے خبر سو گیا۔'' اوتار سنگھ بولا۔

''آپ کا سر تو نہیں دُکھ رہا ہے۔ بہت زور سے گرے تھے آپ' چوٹ یقیناً لگی ہو گی؟'' نور بانو نے کہا۔ وہ اپنا پردہ بھول ہی گئی تھی۔

اوتار سنگھ نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''نہیں کوئی چوٹ نہیں لگی' کوئی تکلیف نہیں' ایسا آرام اور سکون تو مجھے کبھی ملا ہی نہیں تھا۔''

''جو کچھ ہوا تھا' وہ آپ کو یاد ہے؟'' نور بانو کو شبہ ہو رہا تھا کہ یہ دماغی چوٹ کا معاملہ ہے۔

''وہ سب کچھ تو میں مرتے دم تک نہیں بھولوں گا۔'' اوتار سنگھ نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ ''آپ جو کچھ پڑھ رہی تھیں' میں وہ پوری طرح سمجھ رہا تھا' پھر میں نے اُس کی تصدیق کے لئے آسمان کو دیکھا۔ اور میں نے ایک نہیں' سات آسمان دیکھے' ہر آسمان الگ رنگ کا تھا' اور کسی میں کوئی بے ربطی نہیں تھی' کہیں کوئی خلل نہیں تھا۔ ہر طرف سے ایک سا ختم' ایک سی ہمواری۔ پھر مجھ سے کسی نے کہا...... کیا اس کے بعد بھی تُو کلمہ نہیں پڑھے گا۔ پھر میں نے کلمہ پڑھا اور مجھے لگا کہ میرا وجود بہت روشن' بہت ہی زیادہ روشن ہو گیا ہے۔ مجھے ناقابلِ بیان سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ مجھے نیند آنے لگی اور میں سو گیا۔''

سات آسمانوں کے نظارے کا تذکرہ سنتے ہوئے نور بانو کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ ارے...... میں اس شخص کو کتنا حقیر سمجھتی تھی' کافر اور مشرک کہتی تھی اسے' اور اللہ نے اسے کیسا اعزاز عطا فرمایا ہے۔ میں ایمان پر پیدا ہوئی۔ اب تک بلاشبہ ہزاروں بار میں نے یہ آیات پڑھیں۔ ان کا مطلب بھی سمجھتی ہوں اور آسمان کو کبھی میں نے یہ سوچ کر نہیں دیکھا کہ یہ اللہ کی کیسی بے مثال تخلیق ہے۔ بے مثال اور بے عیب اور یہ شخص جو مشرک گھرانے میں پیدا ہوا' آج اس نے پہلی بار یہ آیات سنیں' سمجھیں اور آسمان کو اس خیال سے دیکھا تو اللہ نے اسے یہ نظارہ نصیب فرمایا۔

نور بانو کی شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔ ''کلمہ پڑھتے ہوئے آپ اپنے ہوش و حواس میں تھے؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں اتنے ہوش و حواس میں اس سے پہلے میں کبھی نہیں رہا۔'' اوتار سنگھ نے سادگی سے کہا۔

''کلمہ پڑھنے کا مطلب بھی سمجھتے ہیں آپ؟''

اوتار سنگھ کو ریتا پارسن کی پارٹی میں اپنی کلاس فیلو نادرہ سے اپنی گفتگو یاد آ گئی۔ اُس نے نادرہ سے پوچھا تھا...... کوئی مسلمان کیسے ہو سکتا ہے؟ تو نادرہ نے اسے بتایا تھا کہ آدمی دل کی گہرائیوں

سے ایمان لائے اور کلمہ پڑھے تو وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔

اوتار سنگھ کا دل خوشی سے بھر گیا۔ ''ہاں...... میں جانتا ہوں۔ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔''

اُس کی خوشی نے نور بانو کو حیران کر دیا۔ وہ بڑی سچی خوشی تھی۔

اوتار سنگھ رگھو کی طرف مڑا۔ ''اب تم اور رنجنا آزاد ہو رگھو۔ میرے اور تم لوگوں کے راستے آج الگ ہو گئے۔''

رگھو رونے لگا اور ان کے پیروں پر گر پڑا۔ ''یہ ناممکن ہے مالک......''

''میں تم لوگوں کو بہت کچھ دوں گا۔ تم جہاں جی چاہے' چلے جاؤ۔ میں نے وہ دھرم چھوڑ دیا جو تمہارا ہے۔''

رنجنا بھی رونے لگی۔ وہ بھی اوتار سنگھ کے پیروں میں گر پڑی۔ ''ہمارا دھرم تو جیون بھر تمہاری سیوا کرنا ہے مالک۔ اور ہمارا کوئی دھرم نہیں۔''

''ہمیں بھی مسلمان کر لو مالک!'' رگھو گڑگڑانے لگا۔

اوتار سنگھ نے سوالیہ نظروں سے نور بانو کو دیکھا۔

''اللہ کی محبت میں' دل کی گہرائیوں سے کوئی ایمان لائے تو مسلمان ہوتا ہے۔ یہ تو صرف آپ کی خوشی کے لئے مسلمان ہو رہے ہیں۔'' نور بانو نے افسردگی سے کہا۔

''مالک کی محبت بھی تو اوپر والے نے دی ہے۔'' رگھو نے تڑپ کر کہا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ سچا مسلمان بنوں گا۔''

نور بانو کا دل کٹنے لگا۔ ''یوں تو آپ کے لئے بھی ضروری ہے کہ کسی دین دار امام کے سامنے کلمہ پڑھیں۔ پھر وہ آپ کا اسلامی نام رکھے۔''

''تو میں ابھی جامع مسجد چلا جاتا ہوں......'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''میں بھی......'' رگھو بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اور رنجنا بھی۔

''اس وقت تو مسجد میں کوئی نہیں ہو گا۔''

''تو سحری کے وقت چلے جائیں گے۔''

''آپ نے اعلان کر دیا تو میری حفاظت کیا کریں گے؟ آپ تو خود خطرے میں پڑ جائیں گے۔'' نور بانو کے لہجے میں خدشات تڑپ رہے تھے۔

''ارے حفاظت کرنے والا اللہ ہے۔ اُس کی مرضی ہو تو کوئی بچا نہیں سکتا۔ اور وہ نہ چاہے تو موت آ نہیں سکتی۔'' یہ بات ایک نو مسلم اُس لڑکی سے کہہ رہا تھا' جو مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی تھی اور دینی تعلیم بھی حاصل کرتی رہی تھی۔

نور بانو کیلئے وہ شرمندگی کی رات تھی۔ وہ اس پر غور کر رہی تھی کہ وہ کیسی مسلمان ہے۔

وہ سب اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔انہیں سحری کے وقت کا انتظار تھا۔

اچانک نیچے دروازے پر ہونے والی دستک نے انہیں چونکا دیا۔

رگھو منڈیر کی طرف گیا اور باہر جھانکا۔گلی میں اندھیرا تھا لیکن دروازے پر کوئی کھڑا تھا۔

''کون ہو تم؟ کیا بات ہے؟'' رگھو نے پکارا۔

نیچے کھڑے شخص نے سر اٹھایا۔''دروازہ کھول۔ میں تیرے مالک سے ملنے آیا ہوں بہت دور سے۔جلدی کر۔''

❁....❁....❁
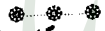
بابا کو اپنے ساتھ اوپر لے کر آتے ہوئے رگھو کو یاد آ گیا کہ اُس نے اسے پہلے کہاں دیکھا ہے۔ہاں...... یہ وہی ہے اُس نے دل میں کہا۔جس روز چھوٹے ٹھاکر کا جنم ہوا تھا' اُس روز یہ بابا ٹھاکروں کی گڑھی آیا تھا۔

اُس نے بات کر کے بابا سے یہ بات پوچھ بھی لی۔

''ہاں...... میں وہی ہوں۔''

اوپر پہنچ کر مجذوب نے اوتار سنگھ سے ہاتھ ملایا۔اوتار سنگھ بھی اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ کوئی بھولی بسری یاد اُس کے ذہن میں کلبلا رہی تھی لیکن گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔''کیسے ہو بیٹے؟'' مجذوب نے پوچھا۔

اوتار سنگھ کو یقین تھا کہ اسی آواز اور لہجے میں لفظ بہ لفظ یہی جملہ وہ پہلے بھی کہیں سن چکا ہے۔

''جی...... میں ٹھیک ہوں۔آپ سنائیں' کیسے تشریف لائے؟''

''آج تو آنا ہی تھا بیٹے۔آج تو آپ کو میری ضرورت تھی۔میں بھی بہت خوش ہوں کہ آج آپ خوش ہیں...... خوش رہنے والی باتوں میں۔''

اور اوتار سنگھ کو یاد آ گیا۔اُس نے اس بابا کو پہلے بھی ایک بار دیکھا تھا۔اس وقت وہ بہت چھوٹا تھا۔اور یہ اس دن کی بات ہے' جب وہ پہلی بار ویر جی کے گھر جانے کے لئے ماتا اور پتا جی کے ساتھ نکلا تھا۔''آپ وہی ہیں نا بابا......؟''

''ہاں۔میں وہی ہوں۔تمہیں مبارک باد دینے کے لیے آیا ہوں۔''

نور بانو تجسسانہ انداز میں اُن کی گفتگو سن رہی تھی۔یہ تو اُسے ایک نظر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ آنے والا کوئی بڑا بزرگ ہے۔حیرت اُسے اس پر ہو رہی تھی کہ وہ چھوٹے ٹھاکر سے اتنے احترام سے بات کر رہا ہے۔اور پھر مبارک باد کی بات......

''کس بات کی مبارک باد؟'' اوتار سنگھ نے مجذوب سے پوچھا۔

''آج آپ نے خوش رہنے والی سب سے بڑی بات ڈھونڈ لی ہے۔مبارک ہو۔''

''شکریہ بابا۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔''لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''اللہ جب کرم فرمائے تو آدمی کے حواسوں پر پڑے پردے ہٹا دیتا ہے۔پھر آدمی سب کچھ دیکھ لیتا ہے' سن لیتا ہے' محسوس کر لیتا ہے اور جان جاتا ہے۔'' مجذوب کے لہجے میں عاجزی تھی۔''آپ بھی تو یہ بات سمجھ سکتے ہیں۔آج کیا کچھ دکھا دیا آپ کو اللہ نے۔کیا کچھ سمجھا دیا۔یہ سب اللہ کا کرم ہے۔''

نور بانو کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔مجذوب جو کچھ کہہ رہا تھا' وہ اُسے معلوم ہونا ہی نہیں چاہئے تھا۔وہ تو اسے بھی صرف اس لیے معلوم ہو سکا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر نے اُسے بتا دیا تھا۔حالانکہ سب کچھ اس کے سامنے ہی ہوا تھا۔مگر چھوٹے ٹھاکر نے کیا دیکھا ہے' یہ تو وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

''میری بچی نے ٹھیک کہا۔'' مجذوب نے نور بانو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''آپ کو باقاعدہ اسلام قبول کرنا ہوگا۔اس کے لئے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔میں خود یہاں چلا آیا ہوں۔یہ سعادت اللہ نے مجھے نصیب فرمائی ہے۔''

اوتار سنگھ نے کلمہ پڑھا۔

''مبارک ہو۔اللہ آپ کو ایمان پر زندہ رکھے اور ایمان پر اٹھائے۔'' مجذوب نے کہا۔اور چند لمحوں کے توقف کے بعد بولا۔''میں آپ کا نام عبدالحق تجویز کرتا ہوں۔اچھا نہ لگے تو بتا دیجئے۔''

اوتار سنگھ کی آنکھیں خواب ناک ہو گئیں۔''یہ...... یہ میرا نام ہے...... اتنا سادہ' زبان پر اتنا رواں...... اتنا خوب صورت نام! بابا...... یہ تو نام بہت اپنا لگ رہا ہے۔جیسے شروع ہی سے میرا یہ نام ہو۔''

''بس تو آج...... اس لمحے سے آپ عبدالحق ہیں۔''

''شکریہ بابا۔''

''پہلے اللہ کا شکر ادا کیجئے۔پھر بندے کو شکریہ کہیے۔یہی بندگی ہے۔اس میں کوتاہی شرک ہے۔اور یاد رکھیے' اللہ شرک پر کبھی معاف نہیں کرتا۔''

اوتار سنگھ نے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا۔''اے اللہ۔آپ کا شکر ہے۔''

رگھو آگے بڑھا اور مجذوب کے قدموں میں بیٹھ گیا۔''مجھے بھی مسلمان کر لیجئے بابا...... اور میری پتنی کو بھی۔''

وہ دونوں خود سے کلمہ نہیں پڑھ سکتے تھے۔مجذوب نے انہیں کلمہ پڑھایا۔اُس نے ان کے نام محمد زبیر اور رابعہ تجویز کیے۔

اب مجذوب نور بانو کی طرف متوجہ ہوا۔''ادھر آؤ بیٹی۔''

نور بانو جھجکتی ہوئی اُس کی طرف بڑھی۔''تم اللہ کا شکر ادا کرو کہ اُس نے تمہاری آرزو پوری کر دی۔'' مجذوب نے کہا۔

نور بانو کے رخسار دہک اٹھے۔''آپ کس آرزو کی بات کر رہے ہیں۔''

''تم چاہتی تھیں کہ تمہارا رمضان مسلمانوں کے درمیان گزرے۔ دیکھ لو اب تم مسلمانوں کے درمیان ہو۔''

نور بانو نے اطمینان کی سانس لی۔ ''جی...... بے شک' میں نے یہ آرزو کی تھی۔ اللہ کا شکر کہ اُس نے پوری فرمائی۔''

اسی وقت نقاروں کی آواز سنائی دی۔ سحری کا وقت ہو گیا تھا۔ ''اب ہم نیچے چلیں گے۔'' مجذوب نے کہا۔ ''تم سحری کی تیاری کرو۔''

❁ ❁ ❁

سحری نور بانو بنا رہی تھی۔ باقی لوگ اوتار سنگھ کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ مجذوب انہیں دین کی باتیں سمجھا رہا تھا۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے انہیں کیا کیا کرنا چاہئے اور کیا کیا نہیں کرنا چاہئے۔

سحری کے بعد مجذوب نے انہیں وضو کرنا سکھایا۔ پھر روزہ رکھنے اور افطار کرنے کی نیت یاد کرائی۔ پھر انہیں نماز سکھائی۔ عبدالحق کو تو دشواری نہیں ہوئی لیکن زبیر اور رابعہ کو چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کرانا بھی آسان نہیں تھا۔ اُن کے لئے تو وہ بالکل اجنبی زبان تھی۔

مجذوب نے رابعہ کو ہدایت کی کہ وہ نور بانو کے ساتھ نماز پڑھے اور جو نور بانو پڑھے' اُسے دہراتی رہے۔ انہوں نے نور بانو سے کہا کہ رابعہ کی خاطر اُسے بہ آواز بلند نماز پڑھنی ہو گی۔

اُن دونوں کے جانے کے بعد مجذوب نے عبدالحق سے دو رکعت نماز سنت پڑھنے کو کہا اور زبیر کو اُس کی تقلید کرنا تھی۔

عبدالحق کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ اُس کے لئے جیسے اہم ترین امتحان تھا۔ اُس کا جسم پسینے میں نہا رہا تھا اور دل جیسے حلق میں دھڑک رہا تھا۔

''نیت کرتا ہوں دو رکعت نماز سنت......''

نیت کرتے ہی اسے ناقابلِ بیان سکون کا احساس ہوا۔ وہ سب کچھ بھول گیا اور نماز پڑھنے لگا۔ زبیر اُس کا پڑھا ہوا دہرا رہا تھا اور اُس کی تقلید کر رہا تھا۔ عبدالحق نے سلام پھیرا تو مجذوب نے خوش ہو کر کہا: ''سبحان اللہ۔ تم نے پہلی نماز ہی کتنی اچھی طرح پڑھی ہے۔''

''یہ سب اللہ کا کرم ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اب میں سنتیں ادا کر لوں پھر فرض نماز تم میرے پیچھے پڑھنا۔''

وہ بڑی مختصر جماعت تھی۔ ایک امام' ایک اقامت پڑھنے والا اور ایک مقتدی۔ لیکن نماز پڑھتے ہوئے عبدالحق کو احساس ہو رہا تھا کہ کمرے میں بے شمار لوگ ہیں۔ کمرے کی فضا میں حدت تھی' جیسے وہاں بہت سے لوگ سانس لے رہے ہوں۔

مجذوب نے بہت اچھی دعا کرائی۔ دعا کے بعد عبدالحق کو لگا کہ کمرا بالکل خالی ہو گیا ہے۔ اُس نے یہ بات مجذوب سے کہہ بھی دی۔

''اللہ کے بھید بے شمار ہیں۔ اللہ ہی جانے۔''

مجذوب نے نور بانو اور رابعہ کو اس کمرے میں بلا لیا۔

''وقت بہت کم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس میں تمہاری زیادہ سے زیادہ رہنمائی کردوں۔ یاد رکھو' اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے اللہ نے قرآن نازل فرمایا۔ تم لوگ بہت خوش نصیب ہو کہ اللہ نے نزولِ قرآن کے مہینے کی پہلی شب ہدایت سے سرفراز فرمایا۔ یوں تمہیں قرآن سے خاص نسبت عطا کی گئی ہے۔ قرآنِ حکیم کی ایک ایک آیت میں ہزار ہزار حکمتیں ہیں۔ اللہ ہی چاہے تو بندہ سمجھے ورنہ یہ ناممکن ہے۔ سو قرآن کو ہدایت کی نیت سے پڑھو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ اُس کے لئے ضروری ہے کہ پڑھنے سے پہلے اللہ سے رہنمائی کی التجا کرو۔ ایک بندے کے شایانِ شان عاجزی کے ساتھ دوسرا ذریعہ ہے حضور ﷺ کی سیرتِ پاک۔ حضور ﷺ نے پوری زندگی قرآن کے احکام کے تحت گزاری۔ سیرتِ پاک کو پڑھتے رہو اور پیروی کرتے' رہو تو سمجھ لو کہ تم قرآن پر عمل کر رہے ہو۔'' مجذوب نور بانو کی طرف مڑا۔ ''تم پر بڑی ذمے داری ہے بیٹی۔ تم پیدائشی مسلمان ہو۔ انہیں مسلمانوں کے طور طریقوں سے متعارف کراتی رہو۔ اچھا مسلمان بننے میں ان کی مدد کرو۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔ اللہ کے ہاں تمہیں اس کا بہت بڑا اجر ملے گا۔ اور ہاں' انہیں قرآن پاک بھی تمہیں پڑھانا ہے۔''

''لیکن بابا' میرا پردہ......''

''تم نیت اور ارادہ تو کرو۔ راستہ اللہ بنائے گا۔'' مجذوب نے چند لمحے توقف کیا۔ ''تم رابعہ کو پڑھاؤ۔ وہ اپنے شوہر کو پڑھائے گی۔ اور ہاں پردے پر مجھے یاد آیا کہ ابھی ایک دن تمہارے درمیان پردہ نہیں رہے گا۔''

وہ سوالیہ نظروں سے مجذوب کو دیکھ رہے تھے۔

''اللہ کو یہ منظور ہے کہ تم یہ مبارک مہینہ پوری آزادی کے ساتھ پاکستان میں گزارو۔''

''لیکن بابا، پاکستان تو ابھی بنا نہیں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''پاکستان بن گیا ہے۔ یوں کہو' ابھی دنیاوی اعلان نہیں ہوا ہے۔ بہر حال تمہیں پاکستان جانا ہے۔ پرسوں صبح تم لوگ روانہ ہو گے۔ سفر کے دوران تم لوگ خود کو ہندو ظاہر کرو گے۔ اس لیے تمہارے درمیان پردہ نہیں ہو گا۔ نور بانو بھی ہندوانہ لباس میں ہو گی۔''

''ہمیں پاکستان میں کہاں جانا ہے؟''

''جہاں کوئی تمہاری راہ تک رہا ہے۔''

''پاکستان میں؟ وہاں میرا انتظار کون کر سکتا ہے؟''

''بھول گئے اپنی اماں کو۔''

عبدالحق تڑپ گیا۔ ''اماں! اماں میرا انتظار کر رہی ہیں! اماں موجود ہیں! اللہ کا شکر ہے۔ مگر

وہ ہیں کہاں؟"

"وہیں...... تمہارے گاؤں میں۔"

"لیکن ہمارا گاؤں تو ختم ہو گیا تھا بابا جی۔"

"ٹھاکروں کی گڑھی ریت کے نیچے دفن ہو گئی۔ لیکن اب وہ پھر سے آباد ہو گا...... نئے نام کے ساتھ۔ حمیدہ اُس مدفون گاؤں کی سرحد پر تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

عبدالحق کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ "تو بابا جی! میرا گاؤں پاکستان میں ہے؟"

"تمہارا گاؤں پاکستان میں ہی ہو سکتا تھا۔"

عبدالحق کو اللہ نے ایمان عطا فرمایا تھا۔ وہ الجھ رہا تھا۔ "مگر بابا، ہم ہندو بن کر کیوں سفر کریں؟"

"اللہ کا حکم ہے۔ اپنی مصلحت وہ جانے۔ کیا پتا، اس میں تمہارے لئے آزمائش ہو۔"

"آپ ہمارے ساتھ ہوں گے؟"

"نہیں۔ میں تو ابھی واپس جا رہا ہوں۔"

"کہاں۔"

"یہ میں نہیں بتاؤں گا۔ تمہارے پاس بھی کام کے سلسلے میں آیا تھا۔ اب آگے ایک اور کام کرنا ہے۔"

وہ سب افسردہ ہو گئے۔ اتنی سی دیر میں بابا انہیں اپنے گھر کا فرد لگنے لگے تھے۔

❀......❀......❀
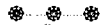
تو انقلاب ایسے آتا ہے! نور بانو سوچ رہی تھی۔ ایسے کہ ایک لمحے پہلے تک کسی کو علم نہیں ہو پاتا۔ اگر کسی اور نے یہ سب کچھ اسے سنایا ہوتا تو وہ اُسے گھڑی ہوئی کہانی...... کوئی افسانہ قرار دیتی لیکن وہ تو اس انقلاب کی عینی شاہد تھی۔

یہ بات ہی کیسی ناقابلِ یقین تھی کہ وہ کوٹھے پر تلاوت کر رہی تھی اور چھوٹا ٹھاکر اوپر چلا آیا تھا۔ وہ جو اُس سے ڈرتی رہی تھی، وہ تو اسے دھتکار کر بھگا دیتی۔ اور وہ نہ جاتا تو وہ کوٹھے سے کود جاتی لیکن اُس کے آنے کے بعد وہ جیسے اُس کے حکم کی پابند ہو گئی تھی۔ وہ اُس کے حکم پر پڑھ رہی تھی، اُس کے حکم پر توقف کر رہی تھی۔ صرف اس لیے کہ وہ اسے چھوٹا ٹھاکر نہیں لگ رہا تھا۔ وہ تو اُس کے نزدیک آسمان سے اترا ہوا کوئی فرشتہ تھا، جو اُس کی قرأت سننے کے لئے چلا آیا تھا۔

آدمی بھولنا چاہے تو بڑی سے بڑی بات نہایت آسانی سے بھول جاتا ہے۔ بس جتنی بڑی بات ہو، اسے بھولنے کے لیے اتنا ہی طاقت ور جواز ہونا چاہیے۔ نور بانو کے پاس تو طاقت ور ترین جواز تھا۔ وہ اس کے ایمان کا معاملہ تھا۔

مگر اب وہ جواز ختم ہو گیا تھا۔ ایک چھوٹے سے لمحے نے کتنی آسانی سے چھوٹے ٹھاکر کو

اوتار سنگھ سے عبدالحق بنا دیا تھا۔ اب وہ بھولی ہوئی ہر بات یاد کر سکتی تھی۔ چاہے اس کے نتیجے میں اسے کتنی ہی شرمندگی ہو۔ وہ تو آخرت کی شرمندگی سے ڈرتی تھی۔ دنیا کی شرمندگی تو کوئی بڑی بات نہیں۔ وہ تو غلطی کی سزا ہے۔ اور اس پر وہ توبہ اور استغفار بھی کر سکتی ہے۔

چنانچہ نور بانو سوچ رہی تھی...... یاد کر رہی تھی۔ حالانکہ یاد کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ تو وہ سب کچھ زبردستی بھولے بیٹھی تھی۔ وہ سب اسے یاد تھا۔ مگر اس نے اسے لاشعور کے نہاں خانے میں دھکیل دیا تھا۔

سوال یہ تھا کہ...... شروع کہاں سے کرے......؟

اسے اماں کی بات یاد آئی۔ اماں نے کہا تھا۔ تم لوگ میرے سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود چھوٹے ٹھاکر کے متعلق بدگمانی کرو تو گناہ گار تو ہو گی نا۔ اور سمجھو گی کہ وہ کارِ ثواب ہے۔ ہوا نا دہرا نقصان۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ تمہارا نقصان کیسے گوارا کر سکتی ہوں۔ اس لیے میں نے اس کا تذکرہ کرنا ہی چھوڑ دیا کہ کم از کم بدگمانی سے تو بچی رہو گی تم۔

اسے یاد آیا...... اس نے اماں سے بدگمانی نہ کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے اصرار کیا تھا کہ وہ چھوٹے ٹھاکر کے متعلق انہیں بتائیں۔

اب اسے اماں کی کہی ہوئی ہر بات یاد آ رہی تھی۔ اماں نے کہا تھا۔ چھوٹا ٹھاکر جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ اس پر اللہ کی رحمت ہے۔ وہ بچپن ہی سے ہر بات پر غور کرنے والا تھا۔ سوال بہت کرتا تھا۔ ماں کی موت کے بعد اس نے پوجا چھوڑ دی۔ اس کا یقین ہے کہ کائنات کا نظام چلانے والی ہستی واحد ہے، وہ کہتا ہے، جہاں کئی حکمراں ہوں، وہاں فساد ہوتا ہے۔ نظام نہیں چلتا۔ وہ بڑے خلوص سے، محبت سے اس واحد ہستی کی جستجو کر رہا ہے وہ اس واحد ہستی سے محبت کرنا چاہتا ہے میں سچ کہہ رہی ہوں، اسے کافر سمجھنا بھی بڑی زیادتی ہے۔

آج اماں کی بات سچ ثابت ہو گئی تھی۔ وہ اس کی تلاوت سن کر ہی تو اوپر آیا تھا۔ اور جو آیات اس نے سنیں، ان کا ترجمہ بھی سنایا۔ پھر اس نے کلمے سے اللہ کے کلام کی سچائی کی گواہی دی۔ اماں نے ٹھیک کہا تھا۔ وہی بدگمانی کرتی تھی۔

اور اس روز اماں نے یہ وجہ بھی بتائی تھی کہ ان کے اصرار کے باوجود وہ کبھی نیچے ان کے گھر کیوں نہیں آیا۔ اماں کا بیٹا بننے کے بعد ان کے گھر کی عزت اس کے گھر کی عزت تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ نیچے آئے جائے اور لوگ باتیں بنائیں۔ دوسرے وہ خود کو انسان سمجھتا تھا...... خطا کا پتلا۔ وہ نظر کے بہکنے سے بھی ڈرتا تھا۔ اس نے خود کو آزمائش سے دور رکھا۔ وہ اماں کی اعتباری قائم رکھنا چاہتا تھا۔

اور اب نور بانو اس کا احسان سمجھ سکتی تھی۔ اس نے نیچے نہ آ کر دوسروں پر احسان کیا تھا۔ کون کون آزمائش میں پڑ جاتا۔ نیچے بھی تو خطا کے پتلے ہی رہتے تھے۔ وہاں بھی تو بہکنے والی نظریں تھیں۔

تو یہ ہے وہ شخص جسے اپنی کمزوری کی وجہ سے وہ کافر اور مشرک کہتی رہی۔ جبکہ اس میں

دو اوصاف تھے' جو بہت اچھے مسلمانوں میں ہوتے ہیں۔ اس نے بڑا ظلم کیا...... اس پر بھی اور خود پر بھی۔ اپنی کمزوری کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے کہ وہ اس سے لڑ نہیں سکتی تھی...... اسے دور نہیں کر سکتی تھی۔ سو وہ شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپا کر بیٹھ گئی۔ اور وہ اسے کافر اور مشرک کہتی رہی۔ اس کی ہر بات' ہر عمل پر شک کرتی رہی۔ اسے مکار اور سازشی سمجھتی رہی۔

مگر اب وہ اپنی کمزوری کے بارے میں سوچ سکتی تھی...... اس سے آنکھیں چار کر سکتی تھی۔ اس کمزوری کے نتیجے میں اس نے چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ جو زیادتی کی تھی' اس پر وہ توبہ کر سکتی تھی۔ بس ضروری یہ تھا کہ وہ اس بارے میں سوچے۔

اس کی کمزوری تھا چھوٹا ٹھاکر...... ٹھاکر اوتار سنگھ!

وہ اس لمحے کو منحوس کہتی تھی' جب اس نے چھوٹے ٹھاکر کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اس وقت تو وہ محبت کو جانتی بھی نہیں تھی۔ بس چھوٹے ٹھاکر کو جب اس نے دیکھا تو واضح طور پر اسے ایسا لگا کہ وہ اس کی آنکھوں کے راستے دل میں اتر گیا ہے۔ اگلے ہی لمحے اس نے خود کو یاد دلایا کہ وہ ہندو ہے۔

شروع میں اس نے اس دید کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ پریشانی اس وقت شروع ہوئی' جب اسے احساس ہوا کہ چھوٹے ٹھاکر کا سراپا اس کی آنکھوں میں نقش ہو گیا ہے۔ وہ کسی وقت بھی اسے دیکھ سکتی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی دیکھ سکتی تھی۔ تب اپنے اوپر یہ بے اختیاری اسے بری لگنے لگی۔ ایک کافر کو اس طرح دیکھنا...... یہ تو ایمان خراب کرنا ہے۔ اس نے بہت کوشش کی۔ لیکن اسے نگاہوں سے اور دل سے وہ دور نہ کر سکی۔

دل بڑی ظالم بلا کا نام ہے۔ دل چاہتا ہے کہ وہ اسے بار بار دیکھے۔ اور قدم ڈیوڑھی کی طرف اٹھنے لگتے۔ مگر دل سے تو آدمی لڑ سکتا ہے۔ نور بانو نے اپنے قدموں کو ہر بار ڈیوڑھی میں پہنچنے سے روک لیا۔ لیکن نگاہوں کا وہ کچھ نہ کر سکی' جن میں چھوٹا ٹھاکر بس گیا تھا۔ وہ کہیں بھی بیٹھی ہوتی' کچھ بھی کر رہی ہوتی' اچانک اسے چھوٹے ٹھاکر کا خیال آتا اور اس کے ساتھ ہی وہ اسے اپنے رُوبرو نظر آنے لگتا۔ اور اسے ہٹانے کا اختیار نہیں تھا۔

اسے احساس ہو گیا کہ یہ محبت ہے۔ اسے چھوٹے ٹھاکر سے محبت ہو گئی ہے۔ لیکن اس کے نزدیک یہ ناپاک محبت تھی۔ وہ اس محبت کو ختم کرنے کا اختیار نہیں رکھتی تھی۔ اسی جھنجلاہٹ میں وہ اس محبت پر لعنت بھیجنے لگی۔ اس نے اس پر سوچنا بھی کبھی گوارا نہیں کیا۔ محبت کے لطیف پہلوؤں سے وہ ہمیشہ کے لیے دور ہو گئی۔ یوں محبت نفرت کا روپ دھارنے لگی اور نفرت دن بہ دن بڑھنے لگی۔

بس ایک ہی عمل ایسا تھا' جس کے دوران اوتار سنگھ کی شبیہہ مداخلت نہیں کر سکتی تھی۔ اور وہ تھا قرآن پاک کی تلاوت۔ یہ احساس ہوا تو وہ کثرت سے قرآن پڑھنے لگی۔ قرآن پڑھتے ہوئے اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہوتی تھی اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی تھی۔ سو اس نے تلاوت قرآن پاک کو اپنا قلعہ بنا لیا اور اس میں محصور ہو گئی۔

لیکن وہ ہر وقت تو قرآن نہیں پڑھ سکتی تھی۔ خالی وقت میں اسے اوتار سنگھ کی شبیہہ سے لڑنا پڑتا تھا۔ اور رات کو بستر پر لیٹے ہوئے تو اس کا تصور جیسے مہمیز ہو جاتا تھا۔ بہرحال وہ پوری شدت سے اس سے لڑتی تھی۔

اپنی اس الجھن میں وہ اس طرح گم تھی کہ اسے گردوپیش پر دھیان کی فرصت ہی نہیں رہی تھی۔ پھر بھی اس نے کئی بار دیکھا کہ دو خاص اوقات میں...... صبح کے وقت اور دوپہر کے وقت...... باجی کے قدم خود بخود ڈیوڑھی کی طرف اٹھتے ہیں۔ یہی نہیں' ڈیوڑھی کی طرف جاتے ہوئے ان کے قدموں میں جھجک...... اور لڑکھڑاہٹ ہوتی ہے۔ ویسی ہی جیسے اس کے قدموں کی ہوتی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ خود کو روک لیتی تھی۔ جبکہ باجی کھنچی چلی جاتی ہیں۔ اور ایسے میں اس کے چہرے پر قوس وقزح کے رنگ بکھرے ہوتے ہیں۔

یہ اس کے لیے دلچسپی کا معاملہ تھا۔ کہیں باجی کے ساتھ بھی وہی تو نہیں ہو رہا ہے' جو میرے ساتھ ہو چکا ہے۔ یوں اسے ایک ایسا مشغلہ مل گیا' جس میں اس کا دھیان بٹنے گا۔ وہ باجی کو بہت غور سے دیکھنے لگی۔

چند ہی روز میں اسے احساس ہو گیا کہ باجی میں بڑی تبدیلی آ رہی ہے۔ عصر سے پہلے وہ دالان میں تخت پر جا بیٹھتی تھیں۔ پھر عصر کی اذان ہو جاتی' تب بھی وہ وہیں بیٹھی رہتیں۔ یہاں تک کہ اماں انہیں آواز دیتیں...... حور بانو' عصر نہیں پڑھو گی۔ تب وہ اٹھتیں اور عصر پڑھتیں۔

عصر سے مغرب تک تینوں بہنوں کا لگا بندھا معمول تھا۔ عصر کی نماز کے بعد مغرب تک وہ قرآن پاک کی تلاوت کرتی تھیں۔ مگر وہ اب دیکھ رہی تھی کہ تلاوت میں باجی کا دل پہلے کی طرح نہیں لگتا ہے۔ وہ وضو پر زیادہ دھیان دے رہی تھیں۔

پھر اسکول کی گرمی کی چھٹیاں ہوئیں۔ اوپر والے گاؤں چلے گئے۔ اس نے سکون کی سانس لی۔ کم از کم وہ قدموں کو روکنے باندھنے کی مشقت سے تو بچ گئی لیکن اس نے دیکھا کہ باجی بہت بدل گئی ہیں۔ وہ کھوئی کھوئی سی رہتیں۔ اکثر بیٹھے بیٹھے اداس ہو جاتیں۔

اوپر والے ابھی نہیں آئے تھے کہ اماں نے استانی جی کو ان کی دینی تعلیم پر مامور کر دیا۔ استانی جی نے اپنے لیے عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت منتخب کیا تھا۔ یوں ان کا یہ نیا معمول شروع ہو گیا۔

پھر اوپر والے لوٹ آئے۔ اس دن باجی بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ عصر سے پہلے انہوں نے سلائیاں اور اون کا گولا لیا اور دلان میں بڑے تخت پر جا بیٹھیں۔

نور بانو وضو کرنے کے لیے نکلی تو پہلی بار اس نے تفصیلی جائزہ لیا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی باجی کے معاملے میں تجسس نہیں کیا تھا۔ وہ دبے قدموں دلان کی طرف بڑھی اور ذرا پیچھے ہی رک گئی۔ وہ باجی کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

باجی کے ہاتھوں میں سلائیاں تھیں' مگر ساکت۔ بلکہ وہ تو سلائیوں کو دیکھ ہی نہیں رہی تھیں۔ ان کی نظریں تو سامنے کوٹھے پر تھیں۔ نور بانو نے ان نظروں کی سمت دیکھا۔ کوٹھے پر جالیوں کے اس پار چھوٹا ٹھاکر بیٹھا ہوا نظر آیا۔

باجی اس کو دیکھ رہی تھیں...... اور ان کی نگاہوں میں عجیب سا والہانہ پن تھا۔

نور بانو کا پہلا تاثر یہ تھا کہ چھوٹا ٹھاکر بھی باجی کو دیکھ رہا ہوگا لیکن چند ہی لمحوں میں اسے احساس ہو گیا کہ اس کا اندازہ غلط ہے۔ چھوٹا ٹھاکر تو کوٹھے پر اِدھر سے اُدھر ٹہلے جا رہا تھا۔ اور اس نے ایک بار بھی دالان کی طرف رخ نہیں کیا تھا۔ ویسے اگر وہ اس طرف دیکھتا تو باجی کو بھی دیکھ سکتا تھا۔ اور اسے بھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے وہ دونوں اسے دیکھ رہی تھیں۔

پھر نور بانو کو ایک تبدیلی کا احساس ہوا۔ چھوٹے ٹھاکر کے ٹہلنے کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ یہی نہیں' اس کے جسم کا ایک ایک عضو اس کے اندرونی اضطراب کا اظہار کر رہا تھا اور باجی گردوپیش سے بے خبر' والہانہ نظروں سے اسے تکے جا رہی تھیں۔

نور بانو کی سمجھ میں چھوٹے ٹھاکر کا اضطراب نہیں آیا۔ وہ کوٹھے پر کیوں ٹہل رہا تھا۔ اگر باجی کی وجہ سے ٹہل رہا تھا تو اس نے ان کی طرف دیکھا کیوں نہیں۔ بہرحال یہ تھا کہ باجی اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس بات کی بھی تصدیق ہو گئی کہ باجی کے ساتھ بھی وہی ہوا ہے' جو اس کے ساتھ ہوا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ باجی خود سے لڑ نہیں رہی تھیں۔ بلکہ وہ اس میں خوش تھیں۔

وہ وہیں کھڑی رہتی لیکن اماں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''حور بانو' عصر پڑھ لو۔ استانی جی آتی ہوں گی۔''

حور بانو تو بعد میں گئی۔ پہلے نور بانو دالان سے گزر کر غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔

استانی جی کے جانے کے بعد اس نے مغرب پڑھی۔ سلام پھیرا تو پتا چلا کہ باجی پہلے ہی اٹھ چکی ہیں۔ وہ پھر دالان کی طرف گئی۔ باجی وہاں موجود تھیں وہ تخت پر بیٹھی اسی سمت گھور رہی تھیں۔ اس بار انہوں نے سلائیوں اور اون کے گولے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔

نور بانو نے جالیوں کے اس پار دیکھا۔ اوپر اندھیرا ہونے لگا تھا لیکن چھوٹا ٹھاکر ایک ہیولے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اور اب اس کا رخ جالیوں والی دیوار کی طرف نہیں تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ دالان سے اسے دیکھا جا رہا ہے۔

اس سے نور بانو کو ایک فائدہ ضرور ہوا۔ اس کے اندر کی خود ملامتی کم ہو گئی۔ ملامت کا رخ اب باجی کی طرف ہو گیا تھا۔ کیا باجی نہیں جانتیں کہ وہ کافر ہے' مشرک ہے۔ پھر وہ اس کی طرح خود کو روکنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ وہ تو بڑی ہیں۔ زیادہ سمجھ دار ہیں۔

اور کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ چھوٹا ٹھاکر بھی ضرور باجی کو دیکھتا ہوگا۔ یہ خیال آتا تو اسے باجی سے رقابت ہونے لگتی۔ مگر وہ تھوڑی دیر کی بات ہوتی پھر وہ سوچتی' چلو اچھا ہے' میری جان تو

چھوٹی۔ باجی اپنی جانیں۔ اللہ کے آگے جواب بھی خود ہی دیں گی۔

کبھی وہ سوچتی کہ اگر چھوٹا ٹھاکر مسلمان ہوتا...... اور وہ دونوں بہنوں کو دیکھتا تو اس کی طرف بھی متوجہ نہ ہوتا۔ وہ باجی سے ہی محبت کرتا۔ باجی ہیں ہی اتنی خوبصورت۔ اور وہ خود اتنی معمولی سی لڑکی ہے۔ اسے تو کوئی دوسری نظر دیکھنا بھی گوارا نہ کرے۔

یہ احساسِ کم تری شروع ہی سے اس کے ساتھ تھا۔ اسے شدت سے احساس تھا کہ باجی اور گلنار کے سامنے وہ نوکرانی لگتی ہے۔ احساسِ کمتری نے اسے کم آمیز بنا دیا تھا۔ وہ بہنوں میں گھلتی ملتی نہیں تھی۔ زیادہ وقت کتابوں کے ساتھ ہی گزارتی تھی۔

احساسِ کم تری تو الگ رہا' اسے تو اللہ سے بھی شکایت تھی۔ اماں اور ابا' دونوں ہی بہت خوش شکل اور خوب صورت تھے۔ پھر اللہ نے اسے ایسا کیوں بنایا۔ ایک بار چچا نے ہنس کر کہا تھا۔ ''مجھے تو لگتا ہے بھابی کہ آپ کی یہ بیٹی بدل گئی ہے کہیں۔ یہ آپ کی اور بھائی کی بیٹی تو لگتی ہی نہیں۔''

چند روز بعد ایک عجیب بات ہوئی۔ وہ بیٹھی مطالعہ کر رہی تھی کہ باجی کمرے میں آ گئیں۔

''نور۔ نور اٹھو تو...... کچھ دکھانا ہے تمہیں۔'' ان کے لہجے میں سنسنی آمیز مسرت تھی۔

''کیا ہے باجی؟'' وہ جھنجلا گئی۔

''تم میرے ساتھ چلو۔''

''کہاں؟''

''دالان میں۔ اور کہاں لے جا سکتی ہوں میں تمہیں۔''

''میں پڑھ رہی ہوں باجی۔ یہیں بتا دو نا' کیا بات ہے۔''

''بہت عجیب بات ہے بتانے میں مزہ نہیں آئے گا۔ آؤ نا۔'' باجی اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگیں۔

وہ بہت جھنجلائی لیکن بہرحال وہ باجی کا بہت لحاظ کرتی تھی' اٹھ گئی۔ باجی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دالان میں لے گئیں۔ ''آؤ...... یہاں بیٹھو۔'' باجی نے اسے تخت پر بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گئیں۔

نور بانو سمجھ تو گئی تھی لیکن ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ لیکن اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کیا آج باجی ہر لحاظ' ہر حجاب ختم کرائیں گی۔ وہ تاسف سے سوچ رہی تھی۔ ''یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے باجی۔'' اس نے لہجے میں مایوسی سموتے ہوئے کہا۔

''جو میں دکھانا چاہتی ہوں' وہ یہاں نہیں' اوپر ہے...... کوٹھے پر......''

یہ سن کر نور بانو کا دل حلق میں آ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ آج باجی کو خوب سنائے گی۔

''کوٹھے پر؟'' اس نے حیرت سے کہا اور کوٹھے کی سمت دیکھا۔ ''وہاں دو آدمی بیٹھے ہیں۔ مگر اس میں کیا خاص بات ہے؟''

''دیکھنا اتنا ضروری نہیں۔ تم ذرا کان لگا کر سنو۔''

نور بانو نے چند لمحے سماعت پر زور دیا۔ ''ہاں...... پڑھائی ہو رہی ہے۔''

"بالکل ٹھیک۔ مگر یہ سنو کہ کیا پڑھایا جا رہا ہے۔"

نور بانو کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "ارے ہاں...... یہ تو عربی پڑھ رہے ہیں۔"

"ہاں"۔ باجی نے کہا۔

مگر ان کا فاتحانہ لہجہ نور بانو کو بہت برا لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں باجی کی خوشی کی کیا بات ہے۔

"مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ عربی کیوں پڑھ رہے ہیں۔" باجی کے لہجے میں بناوٹی حیرت تھی۔

"اس میں کیا خاص بات ہے باجی۔ لوگ عربی بھی پڑھتے ہیں اور فارسی بھی۔"

"لیکن ایک ہندو عربی کیوں پڑھنے لگا۔" باجی نے اعتراض کیا۔

نور بانو کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ یہ وہ لمحہ ہے' جب باجی کھل کر سامنے آسکتی ہیں۔ اس نے چھوٹے ٹھاکر کو پہچان لیا تھا۔ مگر اس نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "ہندو! یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو باجی۔ ایک مسلمان لڑکا بھی تو رہتا ہے وہاں......"

"وہ تو ہے لیکن اس وقت جو پڑھ رہا ہے' وہ مسلمان لڑکا نہیں' چھوٹا ٹھاکر ہے۔"

نور بانو نے بہت غور سے باجی کو دیکھا۔ "یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو باجی۔"

باجی چور سی ہو گئیں لیکن اب وہ پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتی تھیں۔ اور انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ بھی چھوٹے ٹھاکر کو پہچانتی ہے۔ "میں پہچانتی ہوں ان دونوں کو۔" ان کے لہجے میں حجاب تھا۔ "کبھی کبھی اسکول جاتے آتے نظر آتے ہیں دونوں۔ یہ چھوٹا ٹھاکر ہے۔"

اب کے نور بانو کے دل میں رقابت کی جو لہر اٹھی' وہ بے حد تند تھی۔ اس وقت وہ ہر قیمت پر باجی کو تکلیف پہنچانا چاہتی تھی...... انہیں مایوس کرنا چاہتی تھی۔ "لیکن باجی' میں نے سنا ہے کہ ہندو بھی عربی فارسی پڑھتے ہیں۔ دیکھو نا علم تو کسی کی بھی میراث نہیں۔"

اور اسے خوشی ہوئی کہ باجی کو مایوسی ہوئی۔ وہ خاموش ہو کر سوچنے لگیں۔ ان کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اس بات کو غیر معمولی ثابت کرنا چاہتی ہیں اور اس کے حق میں کوئی دلیل ڈھونڈ رہی ہیں لیکن انہیں کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

اس لمحے ایک عجیب بات ہوئی۔ اوپر موجود پڑھانے والے نے اچانک تلاوت شروع کر دی۔ ان کی آواز بھی بہت اچھی تھی اور وہ بڑی خوب صورت قرات کر رہے تھے۔ اور وہ سورہ یٰسین کی تلاوت کر رہے تھے۔

دونوں بہنیں مبہوت ہو کر سن رہی تھیں۔ تلاوت ختم ہو گئی۔ پھر بھی چند لمحے انہیں اِدھر اُدھر کا ہوش نہیں تھا۔

پھر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور باجی نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "اب کیا کہتی ہو

نور بانو بات صرف عربی پڑھنے کی نہیں یہ تو قرآن کی تلاوت تھی۔"

نور بانو کو اس کا فاتحانہ لہجہ بہت برا لگا۔ باجی یوں خوش ہو رہی تھیں' جیسے اس میں ان کا کمال ہو لیکن اسے بہرحال اعتراف کرنا پڑا کہ واقعی یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔

اس وقت مغرب کی اذان شروع ہوئی۔ اور کوٹھے پر دونوں افراد اٹھ کھڑے ہوئے۔ پڑھانے والا نورانی چہرے والا باریش ادھیڑ عمر آدمی تھا۔

وہ دونوں بھی وضو کے لیے چل دیں۔

اس روز نور بانو باجی کے بارے میں سوچتی رہی۔ یہ بات طے تھی کہ باجی کو چھوٹے ٹھاکر سے محبت ہو گئی ہے۔ یوں چھوٹے ٹھاکر سے محبت اسے بھی تھی لیکن فرق بہت بڑا تھا۔ وہ اس محبت پر نادم تھی۔ وہ اس محبت سے نفرت کرتی تھی۔ جبکہ باجی اس محبت میں سرشار تھیں' خوش تھیں۔ وہ اس فرق کے اسباب پر غور کرنے لگی۔ اسے خوشی ہوئی کہ وہ باجی سے بہتر ہے۔ وہ ایک مشرک اور کافر سے محبت پر مجبور ہو گئی ہے تو کم از کم اپنی اس مجبوری سے نفرت تو کرتی ہے۔ وہ اپنے محبوب سے نفرت کرنے کی کوشش تو کرتی ہے...... وہ بھی اللہ کی خاطر۔ باجی نے تو خود کو اس محبت کے سپرد کر دیا ہے۔ انہوں نے تو سپردگی اوڑھ لی ہے۔ وہ تاویلیں گھڑتی ہیں۔ جواز ڈھونڈتی ہیں۔ یہ نہیں سوچتیں کہ عربی پڑھنے سے انسان مسلمان نہیں ہو جاتا۔ مشرک اور کافر تو عربوں میں بھی تھے۔ اور عربی ان کی مادری زبان تھی۔ اور قرآن کی تلاوت سننے سے بھی کوئی مسلمان نہیں ہو جاتا۔

یوں اپنے موقف پر اس کا یقین اور بڑھ گیا۔

مگر آج ثابت ہو گیا کہ باجی درست تھیں اور وہ غلطی پر تھی۔ لیکن باجی یہ دن دیکھنے کے لیے موجود نہیں تھیں۔ وہ ہوتیں تو کتنی خوش ہوتیں۔ اسے اپنا بہت اچھا گمان رکھنے والی' محبت کرنے والی سیدھی بچی بہن پر اس کو بہت پیار آیا جواب اس دنیا میں نہیں تھی۔ اسے رونا آ گیا۔

پھر اسے خیال آیا کہ وہ جسمانی طور پر ہی نہیں' صورت شکل میں ہی نہیں' باطنی طور پر بھی باجی کی ضد تھی۔ اس نے گمان اچھا نہیں رکھا۔ اس نے محبت جیسی خوب صورت چیز کو بھی بدصورت بنا دیا۔ وہ کھل کر اسے برا کہتی رہی۔ اس سے پہلے نہ اس کے بعد' اس نے کبھی کسی ہندو کو برا نہیں کہا تھا۔ مشرک اور کافر تضحیک کرنے کے انداز میں نہیں کہا تھا۔ بری بات یہ تھی کہ وہ اپنی مذمت کرنے سے بچنے کے لیے اسے برا کہتی تھی' اس کی توہین کرتی تھی۔ اللہ اسے معاف کرے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ کافر کو بھی کافر نہ کہو۔ اس لیے کہ نہیں معلوم' کب اللہ کی ہدایت اسے نصیب ہو جائے۔

اس کی نگاہوں میں پھر وہ منظر پھر گیا۔ سماعت میں پھر وہ آوازیں گونجنے لگیں۔ وہ اور شرمندہ ہو گئی۔ چھوٹا ٹھاکر ایمان پر پیدا نہیں ہوا تھا۔ مگر وہ اللہ کی روشن دلیل پر ایمان لایا تھا۔ وہ اس کے مقابلے میں کتنی چھوٹی اور حقیر ہے اور الٹا اسے حقیر سمجھتی رہی۔ اس نے اللہ کی مبین اور روشن دلیلیں ہزاروں بار پڑھی تھیں۔ مگر انہیں نہ کبھی اس طرح سمجھا تھا اور نہ ان سے اپنے ایمان کو تازہ

اور مستحکم کیا تھا۔

پھر اچانک اس کے وجود میں اطمینان اور خوشی کی ایک لہر اٹھی۔ اس نے سوچا' اب تو مجھے اس محبت پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب تو میں اسے محترم سمجھ کر بھی محبت کر سکتی ہوں۔ اب تو سلیقے سے...... محبت کی طرح محبت کی جا سکتی ہے۔

اندر سے کسی حریص جذبے نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں...... اب کوئی رکاوٹ بھی نہیں۔ اب وہ تمہیں مل سکتا ہے۔''

اور نور بانو تڑپ گئی۔ وہ پھر رونے لگی۔ یہیں رکاوٹ نہیں ہوتیں۔ وہ بڑبڑائی۔ بہنوں کو تو اپنے حصے کی بڑی سے بڑی خوشی دی جا سکتی ہے۔ اور میں تو خود اپنی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میں کیا ہوں...... کیسی ہوں...... میں تو چاند کی بس آرزو کر سکتی ہوں......

اسی وقت رابعہ اس کے پاس آ گئی۔ اس نے نماز کے لیے چند چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر وہ زبیر کو یاد کراتی۔ بے چین' مضطرب اور شرمندہ نور بانو کے لیے اس وقت صرف اس کام میں سچی خوشی اور روحانی سکون تھا۔ وہ رابعہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

❁......❁......❁

عبدالحق نے بہت اہتمام سے وضو کیا۔

اسے یاد تھا' جن دنوں وہ حق کی جستجو کر رہا تھا' اسے قرآن پاک کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ لیکن ہر ایک نے یہ بھی کہا تھا کہ پاک ہوئے بغیر اس کتاب مقدس کو چھونا بھی بہت بڑا جرم ہے۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ قرآن پڑھے لیکن دل مسوس کر رہ جاتا تھا۔ مگر آج وہ مبارک دن تھا کہ اس کی یہ آرزو پوری ہونے والی تھی۔

وضو کر کے وہ اٹھا تو اسے خیال آیا کہ اس کے پاس قرآن پاک تو ہے ہی نہیں۔ وہ ابھی بازار چلا جاتا لیکن اس میں دیر لگتی۔ اور یہ اسے گوارا نہیں تھا۔ وہ بہت بے قرار اور بے تاب ہو رہا تھا۔

اس نے رابعہ کو آواز دی۔ ساتھ ہی اسے حیرت ہوئی...... کیسی عجیب بات ہے کہ وہ زبان پر چڑھا ہوا اس کا پرانا نام بھول چکا ہے۔ اور اس نئے نام سے اسے پکار رہا ہے۔ یہ یقیناً اللہ کی مہربانی ہے اس نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔

رابعہ آئی تو اس نے کہا۔ ''منجھلی بی بی سے کہو کہ مجھے قرآن پاک چاہیے۔''

رابعہ نور بانو کے پاس چلی گئی۔

نور بانو جواب میں بے ساختہ کہنے والی تھی کہ نیچے اسٹور روم میں موجود ہیں۔ وہاں سے لے لیں لیکن وہ ایک لمحہ اس کے لیے طویل ہو گیا۔ اس نے اپنا قرآن پاک جو وہ گزشتہ روز ہی نیچے سے لائی تھی' رابعہ کو دے دیا۔ ''لو...... انہیں دے آؤ۔''

اس ایک لمحے میں نور بانو نے کتنا کچھ سوچ لیا۔ اس کا جی چاہا کہ چھوٹے ٹھاکر کو باجی

کا قرآن پاک دیا جائے۔ مگر اس نے فوراً ہی اس سوچ سے نظریں چرا لیں۔ ہونا تو یہی چاہیے تھا۔ کیونکہ اوپر اس کے اپنے پاس قرآن پاک ایک ہی تھا۔ مگر اس نے وہی دے دیا۔

''ایسا کیوں کیا۔'' اس کے اندر کسی نے پوچھا۔

''وہ پڑھیں گے تو مجھے بھی ثواب ملے گا۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ بات صرف اتنی سی نہیں۔ لیکن وہ اس پر گہرائی میں جا کر سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سوچا میں نیچے سامان لینے جاؤں گی تو اور قرآن پاک بھی لے آؤں گی۔

ادھر قرآن پاک کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے عبدالحق کا دل اس عاشق کی طرح دھڑک رہا تھا' جو پہلی بار اپنے محبوب سے ملنے والا ہو۔

اس نے قرآن پاک لیا' اسے چوما' آنکھوں سے لگایا اور کھولا۔

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ واہ...... اس نے سوچا۔ ہر کام کرنے سے پہلے یہ پڑھ لینا چاہیے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

اب اس کے سامنے سورۂ فاتحہ تھی۔ بابا نے کہا تھا کہ اس کی تلاوت کے بغیر کوئی رکعت مکمل نہیں ہو سکتی۔ اور ہر رکعت میں اس کے بعد چھوٹی سورت کی تلاوت کرنی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مجھے پندرہ چھوٹی سورتیں یاد ہونی چاہئیں۔ لیکن یہ تو بہت مشکل کام ہے۔

اللہ چاہے تو کوئی کام مشکل نہیں۔ اندر سے ایک آواز ابھری۔ دیکھو! اس نے تمہیں' زبیر اور رابعہ کو ایمان عطا فرما دیا۔ یہ کوئی آسان کام تھا۔

بے شک' یہ سچ ہے۔ عبدالحق نے کہا اور دل میں اللہ کو پکارا۔ ''میری مدد کیجیے اے اللہ۔ میرا کام آسان کر دیجیے۔ اپنا کلام میرے حافظے پر نقش کر دیجیے۔''

اس نے دوبارہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا اور پہلی آیت کی طرف بڑھا۔ نجانے کیوں اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس پر کائنات کے' زندگی کے تمام راز اور علوم کھلنے والے ہیں۔

اس کا دل دھڑک رہا تھا اور پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔

تعریف اللہ کے لیے جو رب ہے تمام جہانوں کا......

پہلی ہی آیت نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ ارے...... میں کہتا تھا کہ یہ مربوط نظام کسی ایک ہستی نے قائم کیا ہے' جو بہت زبردست ہے۔ میں تو ایک عالم کی بات کرتا تھا۔ صرف اس دنیا کی۔ وہ تو پہلی ہی آیت میں بتا رہا ہے کہ یہ کائنات بے شمار جہانوں پر مشتمل ہے' جن کا تمہیں علم ہی نہیں ہے۔

اسے اقبال کا مصرعہ یاد آیا......

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اور تعریف اللہ کے لیے ہے!......صرف اللہ کے لیے! کسی اور کے لیے نہیں!......اور ہم جو کسی کی تعریف کرتے ہیں......وہ بہت اچھا انسان ہے......تو یہ نہیں کہنا چاہیے؟

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے دماغ میں بے شمار مشینیں ہیں......گراریاں ہیں جو حرکت کر رہی ہیں۔ کوئی بہت بڑا بھید' بہت بڑا راز عیاں ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ تعریف صرف اللہ کے لیے ہے......!

اگلے ہی لمحے وہ تھرا کر رہ گیا......اس پر کپکپی چڑھ گئی۔ یہ اللہ کا کلام ہے۔ ایک دن میں کیا' ایک برس میں' ایک عمر میں بھی نہیں سمجھ آئے گا۔ بابا نے کہا تھا' عاجزی سے پڑھنا' ایک ایک لفظ پر غور کرنا اور اللہ سے رہنمائی طلب کرنا۔ تو یہ عمر بھر کا کام ہے۔ پہلے پڑھنا تو سیکھ لے۔ پھر غور کرنا۔

اسے خیال آیا کہ ابھی تو اسے کم از کم پندرہ سورتیں یاد کرنی ہیں۔ پہلے سورۂ فاتحہ یاد کر لے۔ پھر بابا نے کہا تھا......آخری پارے میں چھوٹی سورتیں ملیں گی۔ وہ پڑھنے لگا۔ ہر آیت پر اس کا دل اٹکتا تھا۔ وہ غور کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ خود کو دھکیل کر آگے بڑھا دیتا تھا۔

بہت مہربان' نہایت رحم والا۔ مالک روز جزا کا۔ تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ دکھا ہمیں راستہ سیدھا۔ راستہ ان کا کہ جن پر تُو نے انعام کیا۔ نہ کہ ان کا جو بھٹکنے والے اور گمراہ ہیں۔

اب وہ یاد کرنے کی غرض سے بار بار پڑھ رہا تھا۔ ایک بات اس نے بہت اچھی طرح سمجھ لی تھی۔ اسے قرآن پاک سے محبت ہو گئی ہے۔

دہراتے ہوئے اس نے دیکھے بغیر اگلی آیت پڑھی تو اس کے جسم میں خوش گوار سی سنسنی دوڑ گئی......ارے کیا مجھے یاد ہو گیا۔ اس نے جانچنے کے لیے قرآن پاک سے نظریں ہٹائیں اور آگے پڑھنے کی کوشش کی۔ روانی کے ساتھ نہ سہی' مگر اگلی آیت بھی اسے یاد ہو گئی تھی۔ شاید کمی صرف زبان پر رواں ہونے کی تھی۔

چھ سات بار دہرانے کے بعد اس نے خود کو پھر آزمایا۔ اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اسے سورۂ فاتحہ روانی کے ساتھ یاد ہو چکی تھی۔ یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ عاجزی سے زیر لب بولا۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے۔

اگلے صفحے پر سورۂ بقرہ اسے پکار رہی تھی۔ اس کا دل مچل اٹھا لیکن اس نے خود کو روکا۔ پہلے نماز کے اسباب مکمل کر لوں۔ پھر پڑھوں گا......اور اللہ نے جتنی زندگی دی' اتنا ہی پڑھوں گا۔ اس نے کہا۔ مگر بے صبرا پن ٹھیک نہیں۔

اس نے تیسواں پارہ کھولا۔ شروع میں تو بڑی سورتیں تھیں۔ (اس وقت اس نے بڑی سورتیں دیکھی ہی نہیں تھیں وہ تو بس سورہ فاتحہ سے موازنہ کر رہا تھا) اس نے دیکھا کہ سورتیں

بتدریج چھوٹی ہو رہی تھیں۔ آخر اس نے پیچھے سے یاد کرنے کا فیصلہ کیا۔

ایک گھنٹے بعد اس نے پھر اللہ کا شکر ادا کیا۔ وہ دن ہی شاید مبارک دن تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اسے سولہ سورتیں یاد ہو گئیں۔ وہ روانی سے یاد ہوئی تھیں۔ مگر پڑھتے ہوئے وہ کبھی کبھی اٹکتا تھا۔ اس نے سوچا' کوئی بات نہیں۔ میں پڑھتا رہوں گا تو روانی سے یاد ہو جائیں گی۔ اور جب نماز میں پڑھوں گا تو اعتماد بھی بڑھ جائے گا۔

اس نے رابعہ کو بلایا۔ ”منجھلی بی بی کے ساتھ نیچے جاؤ۔ ان سے کہنا' بہت ضروری اور قیمتی سامان الگ باندھ لیں۔ کل صبح سویرے ہم روانہ ہوں گے۔“

❁ ❁ ❁

اس بار نور بانو نیچے گئی تو جیسے سب کچھ بدل چکا تھا!

اب وہ پچھلی بار والا خوف نہیں تھا۔ نگاہوں میں اس رات کے وہ خوف ناک مناظر نہیں پھر رہے تھے۔ ہاں' ان کی یاد تھی' جو دھیمے انداز میں دکھی کر رہی تھی۔ مگر وہ دکھ نارمل تھا۔ آدمی لوگوں کو کھوتا ہے تو اسے دکھ ہوتا ہے۔ پچھلی بار دکھ تو کم تھا' دہشت زیادہ تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنی بقا کی طرف سے خوفزدہ اور عدم تحفظ کا شکار تھی۔

صرف دو دن میں یہ تبدیلی آئی تھی۔

اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اسے بہت زیادہ سامان نہیں لینا ہے۔ صرف بہت ضروری چیزیں اور ایسی قیمتی چیزیں لینی ہیں' جو بہت زیادہ جگہ نہ گھیرتی ہوں۔ بنیادی ضرورت کی چیز تو کپڑے تھے......اور اس کی کتابیں۔

اس نے کپڑوں کا صندوق کھولا تو سب سے پہلے اسے وہ کرُتے نظر آئے جو اماں نے' باجی نے اور خود اس نے اوتار سنگھ کے لیے کاڑھے تھے۔ پہلی بار وہ انہیں دیکھ کر خوش ہوئی۔ عبدالحق اب ان تحفوں کا......اور اس کی محبت کا جوان کرُتوں میں چھپی ہوئی تھی' پوری طرح مستحق تھا۔

اس نے کرُتوں کو گنا تو حیران ہوئی۔ وہ نو کرُتے تھے' ایک کرُتا کہاں گیا؟ اس نے پورا صندوق الٹ پلٹ کر دیا۔ مگر دسواں کرُتا موجود ہی نہیں تھا۔ پاجامے البتہ دس تھے۔

اس نے ایک ایک کر کے جائزہ لیا اپنا کرُتا تو وہ بہت اچھی طرح پہچانتی تھی۔ بھول نہیں سکتی تھی اس نے جس کیفیت میں اس کی ترپائی اور کڑھائی کی تھی' وہ بھولنے والی بات ہی نہیں تھی۔ اور وہ کرُتا موجود تھا۔

ذرا دیر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ باجی کا کاڑھا کرُتا کم ہے۔ سوال یہ تھا کہ وہ کہاں گیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا جواب اسے کبھی معلوم نہیں ہو گا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ بے کسی کی موت کے بعد وہ کرُتا ہی باجی کی آبرو کا پردہ دار بنا تھا۔ اور وہ کرُتا خود اس نے منہ پھیرتے ہوئے باجی کے

جسم پر ڈالا تھا' جس کے لیے بڑی چاہت سے باجی نے اسے کاڑھا تھا۔

اس نے وہ کپڑے اسی صندوق میں رکھ دیئے' جس میں لے جانے والا سامان رکھنا تھا۔ اس کا کاڑھا ہوا کرتا سب سے اوپر تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ رابعہ دالان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ محض دوسراہٹ کے لیے آئی تھی۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ کیا رکھ رہی ہے۔ اور کیا جوڑ رہی ہے۔

اسے خوشی تھی کہ اسے تنہائی میسر ہے۔ اس نے اس کرتے کو بڑی محبت سے چھوا۔ اس وقت اس کے چہرے پر جو رنگ تھے' وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی انہیں دیکھے۔ اور وہ اس وقت کو یاد کرنا چاہتی تھی' جب اس نے وہ کرتا کاڑھا تھا۔ مگر اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس وقت تو اسے جلد از جلد سامان پیک کرنا تھا اس کے بعد افطاری کی تیاری کرنی تھی۔

وہ کپڑوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ پہلے اس نے اپنے عام استعمال کے کپڑے نکالے۔ پھر اچھے کپڑوں کا خیال آیا۔ اماں تھوڑا تھوڑا کر کے تینوں بیٹیوں کی شادی کی تیاری کر رہی تھیں۔ جب جب موقع ہوتا' وہ ایک ایک جوڑا بنا کر اس صندوق میں ڈال دیتیں۔ ہر بیٹی کا انہوں نے الگ صندوق بنا رکھا تھا۔ اس نے اپنا صندوق کھولا اور اس میں سے تمام چیزیں نکال لیں۔ اس کا ارادہ تھا کہ دونوں بہنوں کی کسی چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگائے گی۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ ان کے زیورات نکال لینے چاہئیں۔ پاکستان جا کر وہ کسی ضرورت مند کو دے دے گی۔ اللہ بہنوں کو اجر دے گا۔

اس نے گلنار کے صندوق سے زیورات نکال لیے۔ پھر وہ باجی کے صندوق کی طرف متوجہ ہوئی۔ زیورات نکالتے ہوئے باجی کے ایک کامدانی کے جوڑے پر اس کی نظر جم گئیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جوڑا نکال کر اپنے سامان میں رکھ لے لیکن وہ ہچکچا رہی تھی۔ مری ہوئی بہن کی کوئی ذاتی چیز لینا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مگر دل اسے چھوڑنے پر مان ہی نہیں رہا تھا۔ نجانے کیوں وہ جوڑا اسے بہت اہم لگ رہا تھا۔ یہ الگ کہ اس کی اہمیت وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

وہ ہچکچاتی رہی لیکن نہ وہ صندوق کے پاس سے ہٹی' نہ ہی اس نے صندوق بند کیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ سب چیزیں جو وہاں چھوڑ جائے گی' نجانے کس کو ملیں گی۔ ضروری تو نہیں کہ کوئی مستحق ہی ہو۔ پھر یہ ایک جوڑا لینے میں حرج ہی کیا ہے۔

خاصی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے جوڑا اپنے سامان میں رکھ لیا۔

اماں کی تجوری میں اماں کے زیورات کے علاوہ نقد رقم بھی تھی۔ اس نے وہ تمام چیزیں بھی سامان میں رکھ لیں۔ اب صرف کتابوں کا مرحلہ رہ گیا تھا کتابیں دینی اور علمی تھیں۔ یہ حقیقت اس پر پوری طرح روشن تھی کہ کتابیں وہ عبدالحق کی وجہ سے لے جانا چاہتی ہے۔ اس سے زیادہ عبدالحق کو ان کتابوں کی ضرورت تھی۔

ہر طرف سے مطمئن ہو کر اس نے رابعہ کو آواز دے لی۔

❁ ❁ ❁

عشاء کے بعد وہ سب سونے کے لیے لیٹ گئے۔ دن بھر ان میں سے کسی نے ایک جھپکی بھی نہیں لی تھی اور صبح انہیں سفر کے لیے نکلنا تھا۔

مگر عبدالحق کی آنکھوں میں اب بھی نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس نے ایک ایسا دن گزارا تھا' جس میں اسے نہ اپنی خبر تھی' نہ گرد و پیش کا احساس تھا۔ بلکہ گزشتہ رات ہی سے اس کی یہ کیفیت تھی۔ اسے سوچنے کی تو فرصت ہی نہیں ملی تھی۔

جو کچھ ہوا تھا' بہت تیزی سے ہوا تھا اور ایک دن میں اتنا کچھ ہو گیا تھا کہ جو برسوں میں بھی نہیں ہوتا۔ برسوں سے جو کچھ سمجھنے اور جاننے کی کوشش کر رہا تھا' وہ اس نے صرف ایک لمحے میں سمجھ لیا تھا اور جان لیا تھا۔ برسوں سے جس چیز کی وہ جستجو کر رہا تھا' وہ صرف ایک لمحہ میں اسے مل گئی تھی۔ اور کیسی نچی چیز تھی وہ کہ اس کا سینہ اس نے روشن کر دیا تھا۔

اسے ایسی خوشی کا احساس ہوا' جو بہت بڑی تھی۔ ایسی خوشی جس کا اسے پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس کا پورا وجود اس خوشی سے بھر گیا...... چھلکنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھے اور باہر نکل جائے اور چیخ چیخ کر سب کو...... ہر شخص کو وہ شناسا ہو یا اجنبی' اپنی اس خوشی کے بارے میں بتائے...... ارشمیدس کی طرح' جس نے پانی میں غوطہ لگاتے ہوئے کثافت کا راز سمجھا تو اتنا خوش ہوا کہ میں نے جان لیا...... میں نے سمجھ لیا...... میں نے پا لیا کے نعرے لگاتا ہوا پانی سے نکل آیا تھا اور اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ بے لباس ہے۔

لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ وہ اپنی خوشی سے محظوظ ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے اندر ہی اندر اس خوشی سے کھیل سکتا تھا۔

اچانک اسے خیال آیا۔ بابا نے کہا تھا۔ پہلے اللہ کا شکر ادا کیجئے پھر بندے کو شکریہ کہیے۔ اس میں کوتاہی شرک ہے۔ اور اللہ شرک پر کبھی معاف نہیں کرتا۔ وہ اس پر غور کرنے لگا۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ اللہ نے اسے بڑی نعمت عطا فرمائی ہے۔ بہت بڑا کرم ہوا ہے اس پر۔ یہ کسی کے بتانے کی بات نہیں تھی۔ یہ احساس تو ان کے وجود کے اندر پہلے ہی موجود تھا۔ مگر اسے لگ رہا تھا کہ بابا کی بات میں سمندر کی سی گہرائی ہے۔ بڑے معنی چھپے ہیں اس میں......

لیکن اس وقت وہ ارتکاز سے محروم تھا۔ غور نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے اس خیال سے دامن چھڑا لیا۔

اللہ کا شکر تو اسے ادا کرنا تھا...... اور ساری زندگی ادا کرنا تھا۔ وہ دل میں اللہ کا شکر ادا کرتا رہا۔ پھر اچانک اسے اپنی ایک پرانی...... دیرینہ آرزو یاد آئی۔ برسوں سے وہ سوچتا تھا...... وہ اوپر

والا ہی تو ہے، جس نے زندگی سمیت بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں۔ وہی سب سے زیادہ محبت کا حق دار ہے۔ انسان کو سب سے بڑھ کر اس سے محبت کرنی چاہیے۔ اور وہ چاہتا تھا کہ اس سے محبت کرے۔ اسی لیے تو وہ اس کی جستجو کر رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ وہ اسے سمجھے گا نہیں، جانے گا نہیں تو محبت کیسے کرے گا۔

اور اب اس نے رحمت فرمائی تھی۔ اس نے اسے اپنا راستہ دکھا دیا تھا۔ اسے خود سے متعارف کرا دیا تھا۔ اب تو وہ اس سے محبت کر سکتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اسے بے بسی کا نہایت شدید احساس ہوا۔ اس بے بسی کے دو رخ تھے۔ ایک تو یہ تھا کہ تعارف تو ہو گیا لیکن وہ ابھی اسے کتنا جانتا ہے...... کچھ بھی نہیں! کچھ بھی نہیں! ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہوا کہ اس کی عظمت تو ایسی ہے کہ جاننے والے بھی شاید یہ دعویٰ نہ کر سکیں کہ اسے جانتے ہیں۔ پھر یہ تسلی بھی ہوئی کہ اب اسے راستہ تو دکھا دیا گیا ہے۔ اب وہ جاننے کی کوشش کر سکتا ہے اور وہ بھی درست سمت میں اور محبت تو اسے اپنے پیدا کرنے والے سے ہے اور وہ کرتا رہے گا۔

بے بسی کا دوسرا رخ یہ تھا کہ وہ اس سے محبت کیسے کرے۔ محبت کوئی اظہار کرنے کا...... زبان سے یہ کہتے رہنے کا نام تو ہے نہیں کہ مجھے تم سے محبت ہے یہ سچ ہے کہ محبت کرنے والوں کو دنیا میں بے عمل اور ناکارہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر درحقیقت محبت عملی چیز ہے۔ اس کا اظہار زبان کی بجائے عمل سے ہی اچھا لگتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ اللہ سے کیسے محبت کرے۔

بے بسی کے عالم میں اس نے سوچا کہ آدمی اپنے جیسے کسی آدمی سے محبت کرے تو کیا کرتا ہے۔ کوشش کرتا ہے کہ جو کچھ اسے اچھا لگتا ہو وہ اسے دے۔ وہ کام کرے جو اسے پسند ہوں۔ وہ کام نہ کرے جو اسے ناپسند ہوں۔ اس کی خوشی میں خوش ہو اس کی ہر مرضی پوری کرے۔

پھر اس نے سوچا کہ اللہ کو کچھ دینے کا تو سوال ہی نہیں۔ سب کچھ اللہ کا ہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ دینے والا ہے۔ ہر ضرورت سے پاک اور بے نیاز۔ ہاں وہ کام کیے جائیں، جو اللہ کو پسند ہیں۔ اور وہ کام نہ کیے جائیں جو اسے ناپسند ہوں۔ اللہ کے ہر حکم کی تعمیل کی جائے۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ بہت تیز دوڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ابھی تو اسے ہدایت پائے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے۔ اتنا تیز دوڑنے میں کوئی لغزش نہ ہو جائے...... کوئی گمراہی مسلط نہ ہو جائے۔ ابھی تو اسے قرآن پڑھنا ہے...... پڑھتے رہنا ہے اور سمجھنا ہے پھر اس کی سمجھ میں آنے لگے گا۔

بابا نے کہا تھا...... یاد رکھنا، قرآن اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، جو انسان کو عطا کی گئی ہے۔ اور انسان پر قرآن کے چار حقوق ہیں۔ اسے پڑھو اور سمجھو۔ اور اس پر عمل کرو اور اسے دوسروں تک

پہنچاؤ۔ یہ سفر بہت طویل ہے اور زندگی اسی لیے دی گئی ہے۔

اس نے سوچا، وہ خواہ مخواہ جلد بازی کر رہا ہے۔ برسوں وہ جستجو کرتا رہا ہے...... بھٹکتا رہا ہے۔ اس کی کوشش سے کچھ نہ ہوا۔ اور اللہ نے عنایت کی تو لمحے میں اتنا کچھ ہو گیا۔ اسے بس ترتیب سے قرآن پاک کے چاروں حقوق ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اللہ کو جب منظور ہو گا تو وہ اسے محبت کے آداب سکھا دے گا۔

لیکن اس کے جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ اس کی کیفیت ہیجانی تھی۔ ایسے میں خود کو سوچنے سے روکنا آسان نہیں تھا۔ اس وقت تو نیند ہی اس کا مسئلہ حل کر سکتی تھی۔ اور نیند اسے آ نہیں رہی تھی۔

ہیجان اس بات کا تھا کہ اس دن کے ایک ایک لمحے میں اس کے لیے ایسی لذت اور سرشاری تھی، جس سے وہ اس سے پہلے ناواقف تھا۔ اور اس لمحے کی لذت تو وہ بھول ہی نہیں سکتا تھا، جب اس نے کلمہ پڑھا تھا۔ اس وقت گرد و پیش ایسی روشنی تھی، جس کا حسن وہ بیان ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ ایسی روشنی اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ ارضی روشنی تو تھی ہی نہیں۔ وہ تو کوئی آسمانی چیز تھی۔ اور اس میں کیسی ٹھنڈک اور کیسا سکون تھا۔

وہ روشنی اپنی ٹھنڈک اور سکون سمیت اس کے جسم میں اترنے لگی تھی۔ اور نجانے کیسے اسے یہ قدرت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ اپنے جسم کے اندر جھانک سکتا تھا اور اس نے حیرت سے دیکھا تھا کہ اس کا وجود ویسا ہی روشن ہو گیا تھا، جیسا گرد و پیش تھا۔ بلکہ باہر اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اور اندر روشنی اتنی بڑھتی جا رہی تھی کہ نگاہیں چندھیانے لگی تھیں۔ وہی لمحہ تھا، جب اس کا وجود سکون اور طمانیت سے بھر گیا تھا۔ دماغ سے ہر خیال، ہر سوچ مٹ گئی تھی۔ سکون اور طمانیت کے سوا کوئی احساس باقی نہیں رہا تھا۔ اسے نیند آنے لگی تھی۔ اور اس نیند میں انوکھی ناقابل بیان لذت تھی، جسے وہ اب بھی محسوس کر سکتا تھا۔ لیکن بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یاد تھا کہ ان لمحوں میں جب اس پر نیند طاری ہو رہی تھی، اس نے اپنے اندر جھانکتے ہوئے اپنے دل کو دیکھا تھا۔ وہ اتنا روشن لگ رہا تھا کہ اس کی طرف دیکھنا محال تھا اور اس روشنی کا کم از کم کوئی زمینی رنگ نہیں تھا۔ وہ رنگ لگ تو رہا تھا لیکن ویسا رنگ [illegible] نے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ اور اس کے دل سے رنگ برنگی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ پھر اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا تھا اور وہ سو گیا تھا۔

اور جب وہ جاگا تو...... وہ یاد کر رہا تھا۔ اور اسے یاد آ رہا تھا۔ وہ جاگا تو اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بہت طویل، بہت اچھی اور پرلذت نیند کے بعد بیدار ہوا ہے۔ اس کا دماغ تر و تازہ اور روشن تھا۔ اس کی جسمانی کیفیت بھی یہی تھی۔ یہ بات اس کے لیے بھی ناقابل یقین تھی کہ وہ محض چند لمحے سویا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ یہ حقیقت ہے۔ تو وہ کیسی نیند تھی؟ اور اب اسے نیند نہیں آ رہی تو کیا اس لیے کہ ان لمحوں میں وہ کئی راتوں کی نیند پوری کر چکا ہے؟

وہ وقت یاد کرتے ہوئے اس وقت بھی اس کے رگ وپے میں کیف وانبساط دوڑ رہا تھا۔ بڑی لذت تھی اس یاد میں بھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ شروع سے وہ سب یاد کروں۔

اس نے یاد کرنا شروع کیا......

وہ اپنی لاٹھی اٹھائے گلی میں ٹہل کر پہرہ دے رہا تھا کہ اس نے وہ آواز سنی......

اس سے آگے وہ کچھ نہیں سوچ سکا۔ وہ بری طرح چونکا تھا۔ پھر وہ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ارے...... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں!

❁ ❁ ❁

اپنے کمرے میں نور بانو جاگ رہی تھی!

جو کرتا اس نے اس وقت کے چھوٹے ٹھاکر کے لیے اپنے ہاتھوں سے کاڑھا تھا اور سیا تھا، اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس کے ایک ایک ٹانکے کو کڑھائی کیے ہوئے ایک ایک پھول کو بڑی محبت سے سہلا رہی تھی۔ کرتا کیا تھا، وہ تو اس کے لیے یادوں کا خزانہ تھا...... ایسی یادوں کا خزانہ جو کبھی اس کے لیے ناخوشگوار تھیں۔ مگر اب خوش گوار ہو گئی تھیں۔ اب وہ یاد کر سکتی تھی۔

اس نے جس وقت اماں سے کہا کہ ایک کرتا وہ کاڑھے گی تو اسے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ کرتے چھوٹے ٹھاکر کے لیے کاڑھے جا رہے ہیں۔ وہ تو یہ سمجھی تھی کہ اماں ابھی سے گھر کے لوگوں کے لیے گرمی کا سامان کر رہی ہے۔

اسے یاد تھا کہ جب اماں نے بتایا کہ وہ تمام کرتے چھوٹے ٹھاکر کے لیے کاڑھے جا رہے ہیں تو وہ کیسے کھسیائی تھی۔ اور باجی نے کیسے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اور انہوں نے کہا تھا۔ اتنے کرتے...... چھوٹے ٹھاکر کے لیے! اور ایک کرتا نور بانو بھی کاڑھے گی۔

وہ اس سے انکار کرنے والی تھی۔ لیکن جانتی تھی کہ اس صورت میں بہنیں اس کا مذاق اڑائیں گی۔ سو اس نے دل پکا کر کے بظاہر بے پروائی سے کہا تھا۔ "کرتا کاڑھنے میں کیا برائی ہے۔ وہ تو میں ضرور کاڑھوں گی۔"

باجی نے جھٹ سے کہا تھا...... "اماں، ایک کرتا میں بھی کاڑھوں گی۔"

اور اماں نے بس ان کی محبت میں اجازت دے دی تھی۔ ورنہ وہ اس کام میں کسی کا ساجھا نہیں چاہتی تھیں۔

اس نے کہہ تو دیا تھا۔ مگر شروع میں اس کا دل ہی نہیں چاہا۔ اس نے سوچا تھا، وہ کرتا کاڑھے گی ہی نہیں۔ اور آخر میں اماں تنگ آ کر اس سے کرتا واپس لے لیں گی۔

لیکن پھر اس نے باجی کو کرتا کاڑھتے دیکھا تو اسے کچھ ہونے لگا۔

اس نے دیکھا تھا کہ باجی کرتے پر کڑھائی کرتی ہیں تو بالکل اکیلے میں...... تنہائی میں۔ اس

وقت جب گھر کے سب لوگ مصروف ہوتے ہیں۔ وہ خود بھی کسی کتاب کے مطالعے میں کھوئی ہوتی تھی۔ وہ تو اس روز وہ پانی پینے کے لیے نہ اٹھی ہوتی تو اسے بھی پتا نہیں چلتا۔

اٹھی تو وہ پانی پینے کے لیے تھی۔ مگر نجانے کیوں وہ دالان میں چلی گئی۔ وہاں باجی تخت پر بیٹھی کرتے پر کڑھائی کر رہی تھی اور ان کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ وہ کھڑی انہیں دیکھتی رہی اور انہیں اُس کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوا۔

اور وہ منظر بہت عجیب تھا، خوب صورت تھا۔ باجی کے چہرے پر جیسے دھنک کے تمام رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ ایک بار انہوں نے آنکھیں اٹھا کر بھی دیکھا تو ان کی آنکھوں میں وہی رنگ نظر آئے لیکن یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ کچھ دیکھ نہیں رہی تھیں۔ کیونکہ انہوں نے اُسے بھی نہیں دیکھا جو اُن کی نگاہوں کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ تو جیسے کچھ اور ہی دیکھ رہی تھیں۔ اور ان کی آنکھوں کی کیفیت، اُن کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ کوئی بہت حسین منظر دیکھ رہی ہیں۔ پھر انہوں نے نظریں جھکائیں اور دوبارہ کرتے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

نور بانو مبہوت ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ باجی نے اُسے دیکھ کر بھی نہیں دیکھا۔ دیکھ لیا ہوتا تو وہ وہ کچھ نہیں کرتیں، جو انہوں نے بعد میں کیا۔ نور بانو تو بس سحر زدہ سی انہیں دیکھتی رہی باجی ویسے ہی بہت خوب صورت تھیں۔ مگر اس وقت تو آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور لگ رہی تھیں۔ اور ان کے چہرے پر ایسی پاکیزگی تھی کہ اُس کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔

وہ باجی کو دیکھتی رہی۔ باجی نے کپڑے کو بڑی محبت اور نرمی سے چھوا...... سہلایا۔ پھر ان کے ہونٹ ہلے۔ لیکن آواز سنائی نہیں دی۔ پھر انہوں نے ایک ٹانکا لگایا۔ پھر اُس ٹانکے کو سہلایا۔ اور ان کے ہونٹ دوبارہ ہلے۔

وہ حیرت سے دیکھتی رہی۔ چند لمحوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ سب باجی کا معمول ہے، جسے وہ دہراتی ہیں۔ وہ کپڑے کو سہلاتیں، دھاگے کو سہلاتیں، سوئی کو چومتیں، ٹانکا لگاتیں اور پھر ٹانکے کو سہلاتیں۔

اچانک نور بانو کے اندر شدید غصہ ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ باجی اُس کرتے کی ہر چیز کو اپنی محبت سونپ رہی تھیں اور ان کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ عبادت کر رہی ہوں۔

اُس کا جی چاہا کہ وہ باجی کو جھنجھوڑ کر رکھ دے لیکن وہ ان سے بدتمیزی نہیں کرنا چاہتی تھی، وہ وہاں سے ہٹ آئی۔

لیکن اب کتاب میں اُس کا دل نہیں لگا۔ اسے رہ رہ کر وہ منظر یاد آ رہا تھا جو اُس نے دالان میں دیکھا تھا۔ اور غصے کے باوجود وہ یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی کہ وہ بے حد خوب صورت منظر تھا...... خوب صورت اور پاکیزہ۔ اور اس میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ اس زمین کا کوئی منظر نہیں

لگ رہا تھا۔ اُس میں کوئی غیر ارضی بات تھی۔

اُس نے سوال کیا محبت اتنی پاکیزہ اور اتنی خوب صورت ہوتی ہے۔ صرف محبت کی بات ہوتی تو اسے اتنی حیرت نہ ہوتی۔ مگر یہ تو ایک کافر' ایک مشرک کی محبت تھی' اور وہ محبت اُس کے پاس بھی تھی۔ مگر وہ اُس پر شرمندہ رہتی تھی...... اور اسے یقین تھا کہ اُس کی شرمندگی بجا ہے۔ بلکہ کم ہے۔ تو باجی کو شرمندگی کا احساس کیوں نہیں ہوتا؟

وہ اپنی اس شرمندگی پر فخر کرتی رہی تھی...... اور باجی کی ڈھٹائی پر انہیں برا سمجھتی رہی تھی۔ مگر وہ منظر دیکھنے کے بعد وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ خوب صورتی اللہ کی عطا ہے...... ہر اچھی چیز کی طرح اللہ نے باجی کو حسین...... بہت حسین بنایا۔ یہی تو اسے شکایت تھی اللہ سے کہ اسے نظر انداز کر دیا۔ مگر اس کرُتے پر کڑھائی کرتے ہوئے باجی جتنی خوب صورت تھیں' اُس سے ہزار گنا خوب صورت لگ رہی تھیں۔ تو یہ بات واضح تھی کہ خوب صورتی میں وہ اضافہ اس محبت کی وجہ سے تھا' جو وہ اس وقت چھوٹے ٹھاکر کے لئے محسوس کر رہی تھیں اور جس کے زیرِ اثر وہ اس وقت چھوٹے ٹھاکر کے کرُتے پر کڑھائی کر رہی تھیں اور وہ اضافی خوب صورتی بھی اللہ کی عطا تھی۔ وہ شیطان کی دین تو نہیں کہہ سکتی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے بھی اس پر لرزہ چڑھنے لگا۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ کو باجی کی چھوٹے ٹھاکر سے محبت پر کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ وہ اللہ کے ہاں مقبول ہے۔ اس لئے تو انعام کے طور پر باجی کی خوب صورتی بڑھ گئی۔

اس بات نے اسے الجھا دیا۔ اللہ بہت غفور الرحیم ہے' لیکن مشرک کو وہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ پھر یہ عنایت کیسی؟ تو کیا یوں ہے کہ محبت پاکیزہ ہو تو اللہ کے ہاں مقبول ہوتی ہے۔ خواہ کسی مشرک سے کی جائے۔ مگر اس خیال سے وہ لرز کر رہ گئی۔ یہ تو یقینی طور پر فاسد خیال ہے۔ مگر باجی کی ان لمحوں کی خوب صورتی کی وہ چشم دید گواہ ہے۔

اسے ڈر لگنے لگا۔ اُس کی سوچیں گمراہی کی طرف جا رہی تھیں' اُس نے انہیں ذہن سے جھٹک دیا۔ کیسی عجیب بات ہے۔ وہ اللہ کی خاطر اپنی محبت سے منہ موڑ رہی ہے اور پھر بھی عذاب میں ہے۔ اور باجی اللہ کے لئے بھی اپنی محبت نہیں چھوڑتیں اور پُر سکون اور خوش ہیں۔ یہ کیسا انصاف ہے۔ بس یہ ہے کہ اللہ نے باجی کو ہر معاملے میں نوازا ہے اور اسے نظر انداز کیا ہے۔ باجی کو گناہ پر بھی انعام ملتا ہے۔ اُس نے جل کر سوچا۔

مگر وہ فوراً ہی ڈر گئی۔ یہ اللہ کے بارے میں وہ کیسے سوچ رہی ہے۔ اُس نے دل میں توبہ کی اور سوچا' بس یہ محبت کا کمال ہے۔ ثابت ہو گیا کہ محبت بہت خوب صورت اور طاقت ور جذبہ ہے۔

اس کے بعد اُسے باجی سے شدید رقابت محسوس ہونے لگی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی باجی کا رویہ اپنائے گی۔ چھوٹے ٹھاکر کے معاملے میں اپنی محبت کا گلا نہیں گھونٹے گی۔ چپکے چپکے اُس

سے محبت کرے گی اور اُس کی محبت سے نہیں لڑے گی۔

لیکن عملی طور پر یہ ناممکن ثابت ہوا۔ وہ چھوٹے ٹھاکر سے محبت تو کرتی تھی۔ مگر اس محبت کو قبول کر لینا' خود کو اُس کے سپرد کر دینا اُس کے لئے ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ کافر تھا۔ مشرک تھا۔ اُس نے باجی کی دلیلوں کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔ مگر بات نہیں بنی۔ کیا ہوا جو وہ عربی سیکھتا ہے۔ کیا ہوا' جو وہ قرآن پاک کی تلاوت سنتا ہے اس کے باوجود ہے تو وہ مشرک ہی۔

بس اُس نے باجی کی ضد میں ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ چھوٹے ٹھاکر کے لئے کرُتا کاڑھے گی اور اس میں اپنی پوری محبت سمو دے گی۔ اس میں کوئی برائی نہیں۔ ہاں! وہ ترکِ محبت کی کوشش بھی کرتی رہے گی اور اس میں ناکامی پر شرمندہ بھی ہوتی رہے گی۔

تب اُس نے کرُتے پر کڑھائی شروع کی اور بڑی محبت سے کی۔ کرُتے کا ایک ایک ٹانکا' ایک ایک پھول اُس کی محبت کا گواہ تھا۔ پہلی بار اُس نے اپنی دبی ہوئی' کچلی ہوئی محبت کو ابھرنے کا موقع دیا تھا تو وہ پوری شدت سے ابھری تھی۔ اُس محبت کی گرمی' گداز' نزاکت اور سچائی سب اُس کرُتے میں منتقل ہو گئی تھی۔

اماں نے کرُتا دیکھا تھا تو بہت خوش ہوئی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اُس نے محض مروت میں' بے دلی کے ساتھ کام کیا ہے تو اتنا خوبصورت کام کیا ہے۔ طبیعت سے کرے گی تو کتنا اچھا کرے گی۔ اور اس نے کہا۔ ”آپ غلط سمجھ رہی ہیں اماں۔ یہ کام تو میں نے محبت سے ہی کیا ہے اور کام محبت سے کیا جائے تو عبادت ہوتا ہے۔“ یہ آخری جملہ کہتے وقت اُس کے تصور میں کرُتا کاڑھتی ہوئی باجی کا سراپا لہرا گیا تھا۔

کرُتا مکمل کرنے کے بعد وہ پھر پہلے جیسی ہو گئی تھی۔ وہ اکثر سوچتی اور کڑھتی کہ اُس کا اتنی محبت سے کڑھا ہوا کرُتا ایک مشرک پہنے گا۔ یہ تو بڑی زیادتی ہو گی۔

اور اب اس وقت وہ اسی کرُتے کو بڑی محبت اور فخر سے سہلا رہی تھی۔ اُس کے پاس چھوٹے ٹھاکر کے لئے ایک یہی کرتا تو تھا جو اچھا تھا۔ باقی تو سب کچھ برا ہی تھا۔ بہت برا۔ وہ تو کبھی وقت پڑنے پر اُس کے سامنے محبت کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اُسے کیسے بتاتی کہ وہ اسے کیا سمجھتی رہی ہے...... اور وہ بھی اس سے محبت کرنے کے باوجود!

اُس نے کرُتے کو محبت سے چوم لیا۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ کرُتا ایک مومن پہنے گا۔ وہ بڑبڑائی۔

اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ اماں ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ کافر کو کافر اور مشرک کو مشرک نہ کہو۔ اُس کے لئے اللہ سے ایمان کی دعا کرو۔ کون جانے' اللہ کب اسے ہدایت سے نواز دے اور اسے تم سے زیادہ ہدایت یافتہ بنا دے۔

یہ سوچتے ہوئے اُس کا احساسِ کم تری اور بڑھ گیا۔ وہ جسے کافر اور مشرک کہتی تھی' اسے اللہ

نے ایمان عطا فرمایا اور کیسے مبارک وقت میں عطا فرمایا۔ رمضان المبارک کی پہلی شب! اور جس انداز میں ایمان عطا فرمایا' وہ اُس کی عینی شاہد تھی۔ چھوٹے ٹھاکر نے عربی پڑھی تھی اور سمجھتا تھا۔ اُس نے اللہ کی روشن آیات سنیں' سمجھیں' سر اٹھا کر تصدیق کی اور ان کی سند پر ایمان لایا۔ خالص ایمان...... بغیر کسی لالچ کے...... صرف اللہ کے لئے! اور کیسے وہ بزرگ اُس کی مدد کے لئے آیا۔ یقیناً اللہ اُس پر بہت مہربان ہے۔

اور وہ اُس کے سامنے کتنی حقیر' کتنی چھوٹی ہو گئی ہے!

اچانک اسے خیال آیا' اس وقت اماں موجود ہوتیں تو کتنی خوش ہوتیں' اور باجی ہوتیں تو......؟ اُس کا دل کٹنے لگا' ارے...... یہ تو باجی کا حق تھا انہیں کیسا یقین تھا کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہے۔ اسی لئے تو وہ اپنی محبت پر بھی شرمندہ نہیں ہوئیں۔ انہوں نے اپنی محبت کو بڑے فخر سے سنبھال کر رکھا۔ لیکن باجی ہوتیں تو میں......؟

اس سے آگے اُس نے خود کو سوچنے سے روک دیا۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ بڑبڑائی۔ اب باجی نہیں ہیں تو بھی میرے لئے کوئی امکان نہیں ہے۔ میں اس قابل ہوں ہی کہاں۔ صورت شکل بھی اچھی نہیں اور اُس کی تحقیر بھی کرتی رہی ہوں میں۔ بس میں تو یہ کرتا اسے دے سکتی ہوں۔

اب اسے نیند آنے لگی تھی۔

اُس نے سوچا' مجھے باجی کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ محبت کرنا انہی سے تو سیکھ سکتی ہوں میں۔ کچھ ملنے کا امکان ہو نہ ہو' مجھے اب محبت کرنے کا سلیقہ تو سیکھنا چاہئے اور یہ محبت میں نے ارادے سے کب کی ہے یہ تو مجھے زبردستی سونپی گئی ہے۔ مجھے اس سے کیا غرض کہ عبدالحق مجھے کبھی نہیں مل سکیں گے۔ مجھے تو اس توہین کا ازالہ کرنا ہے جو میں محبت کی اور اپنے محبوب کی کرتی رہی ہوں۔ اور باجی کو بھی کوئی ملنے کی امید تو نہیں تھی۔ بس محبت انہیں سونپ دی گئی اور وہ اسے بڑے سلیقے سے' بڑی محبت سے کرتی رہیں۔ باجی یقیناً اندر سے بھی بہت روشن رہی ہوں گی۔ آدمی کے لئے تو بس یہی بہتر ہے کہ جو کچھ بھی اسے دیا جائے' اُس سے بہترین طور پر استفادہ کرنے کی کوشش کرے۔

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے وہ سو گئی!

❀ ❀ ❀

ہیجان سے تو وہ گزشتہ رات سے ہی دو چار تھا۔ پورے دن جسم میں خوش گوار اور کیف آمیز سنسنی دوڑتی رہی تھی۔ مگر اس وقت وہ ہیجان اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اُسے خیال ہی ایسا آیا تھا!

وہ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا!

ارے...... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ یہی ایک خیال اُس کے ذہن میں اس پرندے کی

طرح چکرا رہا تھا' جو کسی کمرے میں بند ہو گیا ہو اور گھبرا کر پر پھڑپھڑاتا ہوا اڑ رہا ہو۔ لیکن اسے نکلنے کا موقع نہیں مل رہا ہو۔

وہ آواز...... وہ آواز! وہ تو وہی آواز تھی' جو اُس نے پہلی بار سنی تھی تو اسے آواز والی سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ آواز' جو بعد میں اُس سے چھن گئی تھی لیکن اُس کی سماعت میں گونجتی رہتی تھی۔ وہ آواز جس نے اُسے دنیا کے حسن سے اور ریٹا پارسن کی خوف ناک ترین ترغیبات سے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہی آواز تو تھی' جس کی ڈور سے بندھا گزشتہ رات وہ بے اختیار کوٹھے پر کھنچا چلا گیا تھا۔

ہاں...... وہ وہی آواز تھی۔ اور بے اختیاری کے ابتدائی لمحوں میں اسے اس کا احساس بھی ہوا تھا لیکن اس کے بعد وہ اب اس بات کو بھولا رہا تھا۔

وہ بے قرار ہو گیا۔ اُس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ تو وہ لڑکی زندہ ہے...... وہ منجھلی بی بی ہے۔ وہ اُس کا نام نہیں جانتا۔ لیکن وہ زندہ ہے۔

اسے یاد تھا۔ دو لڑکیوں کی تدفین کے موقعے پر اُس نے سوچا تھا کہ شاید وہ آواز والی ان دونوں ہی میں سے کوئی ایک ہے۔ اور اس خیال سے اُس کے دل میں ایسا غم ابھرا تھا کہ زندگی اسے بے معنی لگنے لگی تھی۔

مگر اس وقت......! اس وقت شاید اسے زندگی کی سب سے بڑی خوشی ملی تھی۔

اس خوشی کے سحر سے نکلنے میں اسے کچھ دیر لگی۔ جب وہ سوچنے کے قابل ہوا تو اسے خیال آیا کہ یہ کتنی غیر معمولی بات ہے کہ تقریباً چوبیس گھنٹے بعد اسے یہ احساس ہوا۔ اُسے اس آواز کے بارے میں یاد ہی نہیں آیا۔ یہ کیسی محبت ہے؟ کیا یہ محبت میں کمی کی' اُس کی اہمیت کم ہونے کی یا اہمیت بالکل ختم ہونے کی دلیل ہے؟

آخری بات تو غلط ثابت ہو گئی۔ اندر ابھرنے والی خوشی اتنی بڑی تھی کہ وہ خود اس محبت کی زندگی اور اہمیت کی دلیل تھی۔

عبدالحق تو شروع ہی سے غور کرنے والا' تجزیہ کرنے والا ذہن رکھتا تھا۔ وہ اتنی بڑی بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ آواز کو سننے کے لمحے سے لے کر آخر تک دہرانے لگا۔

آواز سنتے ہی وہ آواز کی سمت لپکا تھا۔ اُس لمحے اسے احساس تھا کہ یہ وہی آواز ہے' جس کی خاطر اُس نے عربی سیکھی تھی۔ جس نے اسے محبت کرنا سکھایا تھا۔ مگر اُس کے بعد وہ آواز کہیں پیچھے چلی گئی تھی اور اس پر از خود رفتگی کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی اور اوپر پہنچتے پہنچتے وہ ایک خاص کیفیت میں آ گیا تھا' جس میں اسے نہ اُس آواز کا خیال تھا اور نہ گرد و پیش تھا۔ اور وہ از خود رفتگی ایسی مکمل تھی کہ وہ اوپر کوٹھے پر پہنچ کر ہی رکا تھا۔ اگر وہ ذرا بھی ہوش میں ہوتا تو پردہ دار لڑکی کو اوپر دیکھ کر ایک لمحہ بھی وہاں نہ رکتا۔ خاموشی سے نیچے چلا آتا۔ لیکن اُسے تو کسی بات کا احساس ہی نہیں تھا۔

اور اُسے یاد تھا۔ آواز کہیں پیچھے...... بہت پیچھے چلی گئی تھی۔ وہ صرف الفاظ سن رہا تھا۔ اُس وقت وہ ایسی حالتِ ارتکاز میں تھا کہ اُس کے لئے کائنات میں ان لفظوں کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ اور وہ ایک ایک لفظ کا مطلب صاف اور واضح طور پر سمجھ رہا تھا۔

وہ آیات اسے اب بھی مفہوم سمیت یاد تھیں۔ وہ تو جیسے اُس کے دل پر کندہ ہو گئی تھیں۔ آج ہی جب وہ کوٹھے پر گیا تو اُس نے آسمان کو دیکھا۔ وہ آیات پڑھیں اور آسمان کی طرف انگشتِ شہادت اٹھاتے ہوئے گواہی دی۔ اَشْہَدُ اَنْ لَّا......

اسے یقین تھا کہ اب زندگی بھر وہ جب بھی آسمان کو دیکھے گا تو یہی کرے گا لیکن شاید اب وہ سات آسمان کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ وہ تو اللہ نے اُس پر رحمت فرمائی تھی...... اسے ایمان عطا فرمانے کے لئے!

تو اُس وقت وہ بس وہ الفاظ سن رہا تھا...... سمجھ رہا تھا اور ان کی تصدیق کر رہا تھا۔ پھر اُس کے اندر کسی نے اسے ڈانٹا تھا...... کیا تو اب بھی کلمہ نہ پڑھے گا۔ تب وہ جھٹکے سے ہوش میں آیا تھا۔ ورنہ تو اسے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ کلمہ کیا ہوتا ہے...... اور یہ کہ اُسے کلمہ یاد ہے۔

یہ سب کچھ یاد کرتے ہوئے اچانک عبدالحق کی آنکھیں پھیل گئیں۔ بالکل ہی اچانک اسے ادراک ہوا تھا کہ اللہ نے اُس رات اس پر صرف یہی عنایت نہیں کی کہ اسے ایمان سے نوازا۔ اللہ نے اس پر ایک اور بڑی رحمت فرمائی۔ ورنہ وہ ساری زندگی ایک بہت بڑی خلش میں مبتلا رہتا۔ اللہ نے عنایت فرمائی کہ ہدایت کے ان لمحوں میں اس آواز کو بیچ سے ہٹا دیا۔

اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ محبت کی کمی نہیں تھی۔ بلکہ اللہ کی رحمت تھی۔ اور اب وہ اُس کی حکمت کو بھی سمجھ سکتا تھا۔

اچھا ہوا کہ آواز درمیان سے ہٹ گئی۔ رابطہ الفاظ بنے...... اللہ کے الفاظ۔ ورنہ وہ اس آواز سے...... آواز والی سے کیسی محبت کرتا تھا۔ اسے ہمیشہ یہ خلش ستاتی کہ اُس نے اس آواز کی وجہ سے...... آواز والی کی محبت میں ایمان قبول کیا۔ ارے وہ تو اس احساس کبھی مٹا ہی نہیں سکتا تھا۔ اور اس بات کی بڑی اہمیت تھی۔ جب زبیر نے اسلام قبول کرنے کا کہا تو اُسی منجھلی بی بی نے کہا تھا......

یہ تو آپ کی محبت میں ایمان لا رہے ہیں۔ اللہ کی محبت میں دل کی گہرائیوں سے کوئی ایمان لائے تو مسلمان ہوتا ہے۔ تو یہ بات اسے بھی سنی پڑتی۔ اور سنی نہ بھی پڑتی تو اس کا ضمیر تو اسے ہمیشہ ملامت کرتا۔ اپنا ایمان اُس کی نظر میں ہمیشہ مشتبہ رہتا۔ اللہ نے اسے کتنی بڑی خرابی سے بچا لیا۔

اور بات اتنی بچی تھی کہ چوبیس گھنٹے بعد اسے پہلی بار اس آواز کا...... اور آواز والی کا خیال آیا تھا۔

وہ دل ہی دل میں شکر ادا کرنے لگا۔

لیکن چند لمحے بعد سنسنی اُس کے وجود میں موج در موج اٹھی۔ پہلی بار شعوری طور پر اسے

پوری طرح اس بات کا ادراک ہوا اس بات کی اہمیت اُس پر اجاگر ہوئی کہ وہ جس سے محبت کرتا ہے نہ صرف اُس کی آواز موجود ہے۔ بلکہ وہ زندہ ہے۔

سینے میں اُس کا دل خوشی سے ناچنے لگا۔ وہ زندہ ہے۔ اُس کے پاس ہے۔ بلکہ وہ اُس کے ساتھ اُس کے گاؤں جا رہی ہے۔ اور اب اُس کے اور اُس کی محبت کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں۔ اب اللہ نے اُسے ایمان دے دیا ہے۔ اب وہ ہر طرح سے اُس کے قابل ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں۔

لیکن ہو سکتا ہے وہ مجھے پسند نہ کرے۔ دل میں اچانک ایک وسوسے نے سر اٹھایا۔ یہ محبت تو دل کا سودا ہوتا ہے۔ اچھا ہونا ایک بات ہے اور دوسروں کو اچھا لگنا دوسری بات۔

تو کیا ہوا۔ اُس نے بے پروائی سے سوچا۔ مجھے اس سے کیا۔ محبت کوئی تجارت تو ہے نہیں کہ اُس کی قیمت بھی وصول کی جائے۔ میں کب کہتا ہوں کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرے۔ میرے لئے تو یہ خوشی بہت ہے کہ وہ زندہ سلامت رہے اور خوش رہے۔

باقی رات اس میں گزر گئی۔ وہ پہلی بار آزادانہ اپنی محبت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اور اس میں بڑی لذت تھی!

❁ ❁ ❁

نور بانو خواب دیکھ رہی تھی!

یہی گھر تھا۔ مگر بڑی گہما گہمی تھی۔ اماں بھی موجود تھیں، دونوں بہنیں بھی اور چھمن بوا بھی اور گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ یقیناً کوئی تقریب تھی...... بڑی تقریب! مگر اُس کی سمجھ میں تقریب کی نوعیت نہیں آ رہی تھی۔

چھمن بوا ادھر سے اُدھر بھاگتی پھر رہی تھیں۔ کام بہت تھے اور سب انہی کو نمٹانے تھے۔ نور بانو مہمانوں کو دیکھ رہی تھی۔ مگر ان میں اسے ایک بھی جانا پہچانا چہرہ نظر نہیں آیا۔ ہاں...... یہ ضرور تھا کہ تمام مہمانوں کے چہرے غیر معمولی طور پر روشن تھے۔

چھمن بوا اُس کے پاس سے گزریں تو اُس نے اُن کا ہاتھ تھام لیا۔ ”چھمن بوا...... میری بات تو سنیں۔“

”کیا ہے بیٹا۔ جلدی سے کہو۔ دیکھتی نہیں ہو کتنا کام ہے۔“

”مجھے یہ تو بتا دیں کہ یہ تقریب کیسی ہے؟“

چھمن بوا نے اسے شکایتی نظروں سے دیکھا۔ ”اتنی مصروفیت میں مذاق اچھا نہیں لگتا بیٹا۔ تم ہم سے پوچھ رہی ہو کہ یہ تقریب کیسی ہے؟“

”مذاق نہیں کر رہی ہوں مجھے سچ مچ پتا نہیں ہے۔“

”بس بنو مت۔“ یہ کہہ کر بوا نے ہاتھ چھڑایا اور آگے بڑھ گئیں۔

نور بانو حیرت سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ یہ کیسی بات کر رہی ہیں بوا۔ ان کا انداز تو ایسا ہے جیسے مجھے معلوم ہونا چاہیے۔

اتنے میں اماں اُس کی طرف چلی آئیں۔ ”ارے نور بانو...... تو یونہی بیٹھی ہو۔ تیار ہو جاؤ نا۔“

”مگر یہ تو بتائیں اماں کہ یہ کیسی تقریب ہے؟“

اماں نے بھی اسے شکایتی نظروں سے دیکھا۔ ”لو...... ہم اتنی دور سے تمہاری تقریب میں شرکت کے لئے آئے ہیں اور تم ہم سے تقریب کے متعلق پوچھ رہی ہو۔“

نور بانو تقریب کو بھول گئی اور اتنی دور سے آنے کے بیان میں الجھ گئی۔ ”کتنی دور سے آئی ہیں آپ؟“ اُس نے معترضانہ لہجے میں کہا۔ ”آپ تو یہیں رہتی ہیں اماں۔“

”تم بھول گئیں۔ ہم اب یہاں نہیں رہتے۔ ہم سب تو یہاں سے چلے گئے تھے۔“

خواب میں نور بانو کو اُس سانحے کی یاد آئی اور اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ”مجھے یاد آ گیا اماں۔ ظالموں نے آپ سب کو مار دیا تھا۔“

”نہیں...... مارا نہیں تھا۔“ اماں مسکرا دیں۔ ”ہم مرے تھوڑا ہی ہیں۔ ہم تو زندہ ہیں۔ شہید کبھی نہیں مرتے۔“

”شہید!“ نور بانو نے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں...... ہم نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اللہ اپنی رحمت سے ہمیں یہ مرتبہ عطا فرمائیں گے۔ ہم اس قابل کہاں تھے۔ بس اللہ نے ہم سب کو نواز دیا۔“ اماں نے کہا۔ ”اسی لئے تو ہم سب تمہیں اتنے خوش نظر آ رہے ہیں۔ یہ تو ہم تمہاری محبت میں یہاں آ گئے۔ ورنہ ہم تو اتنی خوب صورت جگہ رہتے ہیں کہ اُسے چھوڑنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ اتنی نعمتیں ہیں وہاں اللہ کی۔ اور ایسی عزت اور ایسا سکون ہے کہ ہم نے کبھی تصور میں بھی نہیں سوچا تھا۔“

”لیکن اماں، میں تو یہاں اکیلی رہ گئی۔“ نور بانو نے اداس ہو کر کہا۔ ”مجھے بھی ساتھ لے چلیں نا۔“

”بھئی اللہ کی مشیت یہی ہے۔ اس میں بندے کی مرضی تو نہیں چلتی۔“

”آپ وہاں خوش ہیں۔ اور میں یہاں ناخوش بھی ہوں اور اکیلی بھی۔“ نور بانو کے لہجے میں شکایت در آئی۔

”تم یہ ناشکرا پن چھوڑ دو...... یہ ہر وقت ہر بات پر شکایت۔“ اماں کے لہجے میں فہمائش تھی۔ ”اللہ اتنا مہربان ہے تم پر۔ رحمت فرماتا ہے، نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ اور اب تم نہ اکیلی رہو گی نہ ناخوش۔ ہم اسی لئے تو آئے ہیں یہاں۔“

نور بانو کا ذہن پھر اُلجھنے لگا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ ”کس لئے؟“

”ارے اس تقریب کے لئے...... اور کس لئے۔“ اماں نے جھنجھلا کر کہا۔

بات پھر وہیں آ کر رک گئی۔ ”اور یہ تقریب کیسی ہے؟ یہ آپ بتا نہیں رہیں۔“ نور بانو بھی جھنجھلا گئی۔

”ارے تمہیں یہ بھی نہیں معلوم۔ آج تمہاری شادی ہو رہی ہے۔“ اماں نے کہا۔ پھر دوسری طرف رخ کر کے پکارا۔ ”اے حور بانو...... گلناز کہاں ہو بھئی۔ کیا کر رہی ہو؟ جلدی سے آؤ نا۔“ وہ پھر نور بانو کی طرف مڑیں۔ ”بس یہ غیر ذمے داری اور سستی ان کی مجھے بہت بری لگتی ہے۔“

نور بانو نے ان کی بات نہیں سنی۔ اُس کا دماغ جیسے سن ہو گیا تھا۔ اُس کی شادی ہو رہی ہے! مگر کس سے؟

اتنی دیر میں دونوں بہنیں بھی اُس کے پاس آ کھڑی ہوئیں۔ ”جی اماں؟“

”کتنی غیر ذمے داری کی بات ہے۔“ اماں نے انہیں ڈانٹا۔ ”اب یہ کیا خود دلہن بنے گی؟ تم لوگوں کی کوئی ذمے داری نہیں ہے؟“

”تو اماں، اسی کی تو خاطر کر رہے تھے ہم۔“ حور بانو نے کہا۔ ”یہ جوڑا مل ہی نہیں رہا تھا۔ بڑی مشکل سے ملا ہے...... انہی محترمہ کے صندوق میں سے۔“

نور بانو شرمندہ ہوئی، کھسیا گئی۔ ”مجھے اچھا لگا تھا باجی۔ میں نے سوچا، اب تم تو پہنو گی نہیں۔ اس لئے میں نے رکھ لیا۔“

”اچھا کیا نور۔ یہی تمہارا شادی کا جوڑا ہے۔ چلو اب تمہیں تیار کرا دیں۔“ حور بانو نے خوش دلی سے کہا۔

”تم لوگ جلدی کرو۔ میں ذرا مہمانوں کو دیکھ لوں۔“ اماں نے کہا اور کمرے سے چلی گئیں۔

اسی لمحے باہر کسی نے کہا: ”ارے...... برات نہیں آئی اب تک؟“

”آ گئی ہے۔ دولہا میاں مسجد گئے ہیں...... شکر کے نفل ادا کرنے۔“

نور بانو اداس ہو گئی۔ تو آج چھوٹے ٹھاکر کا کانٹا ہمیشہ کے لئے نکل رہا ہے۔ اُس نے سوچا۔ پھر حیرت سے سوچا، کانٹا نکلنے میں اداسی کیسی۔ مگر اُسے رونا آنے لگا۔

”چلو نور، اب کپڑے بدل لو۔“ حور بانو نے اُس سے کہا۔ ”پھر ہم تمہیں تیار کر دیں تمہارے دولہا کے لئے۔“

”مجھے یہ تو بتا دو کہ میری شادی کس سے ہو رہی ہے؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے لہجے میں فریاد تھی۔

”ارے...... تمہیں نہیں معلوم۔ تمہاری شادی عبدالحق سے ہو رہی ہے۔“

”کون عبدالحق؟“

"وہی عبدالحق جنہیں ہم پہلے چھوٹا ٹھا کر کہتے تھے۔"

نور بانو حیران رہ گئی۔ مگر وہ بے حد خوش گوار حیرت تھی۔ پھر اچانک اسے باجی پر ترس آنے لگا۔ "لیکن باجی...... تم تو ان سے......"

حور بانو نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُسے جملہ پورا نہیں کرنے دیا۔ "کچھ بھی نہیں کہنا۔ ہم جہاں ہیں' وہاں ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسی لئے تو ہم یہاں تمہیں وداع کرنے آئے ہیں۔"

"لیکن باجی' تمہیں افسوس......"

"بالکل نہیں ہوگا۔" حور بانو نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "ہم جہاں ہیں' وہاں ایسی نعمتیں ہیں' ایسی خوشیاں ہیں' جن کا یہاں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے کہا نا کہ اب میرے لئے ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔"

"اور یہ تمہارا جوڑا......"

"یہ ہم نے تمہیں سونپ دیا۔ یہ بھی اور اپنی محبت بھی۔" حور بانو مسکرائی۔ وہ بہت خوب صورت مسکراہٹ تھی۔ اُس میں سچی خوشی تھی۔ "اب یہ تمہارا نکاح کا جوڑا ہے...... عروسی جوڑا۔"

"کیا میرے لیے نیا عروسی جوڑا نہیں بن سکتا تھا؟" نور بانو کے لہجے میں شکایت تھی۔

"دیکھو...... ایک تو بالکل اچانک ہو رہی ہے تمہاری شادی۔ تیاری کا کوئی موقع ہی نہیں ملا۔ دوسرے تمہیں یہ جوڑا پسند ہے۔ تیسرے تمہیں معلوم نہیں کہ تم اس جوڑے میں کتنی حسین لگو گی۔"

"میں اور حسین!" نور بانو نے حقارت سے کہا۔

"خود دیکھ لینا۔ بس اب کپڑے بدل لو۔"

نور بانو نے کپڑے بدلے۔ باجی اور گلنار اسے تیار کرنے لگیں۔ پھر حور بانو نے اسے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ "لو...... خود دیکھ لو۔" نور بانو نے نظریں اٹھا کر آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہ ہے۔ اُسے تو جیسے جادو کے زور سے کسی نے پتھر کا بنا دیا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ جا لگی۔ اُس نے پیچھے کھڑی دونوں بہنوں کے عکس کو بھی دیکھا' ان دونوں کے سامنے تو وہ ہمیشہ نوکرانی لگتی تھی۔ لیکن آج وہ دونوں ہی اُس کے سامنے پھیکی لگ رہی تھیں۔

"دیکھا۔ آج تو ہم دونوں بھی تمہاری کنیز لگ رہی ہیں۔" حور بانو نے ہنس کر کہا۔

اسی وقت باہر کسی نے خوشی سے پکار کر کہا۔ "برات آ گئی۔"

اماں کمرے میں آئیں۔ انہوں نے اسے دیکھا تو خوش ہو کر بلائیں لینے لگیں۔ "میں ہمیشہ فکر کرتی تھی کہ میری یہ بیٹی بہت معمولی شکل و صورت کی ہے۔ اس کا کیا ہوگا۔ میں بہت دعائیں

کرتی تھی تمہارے لئے۔ اللہ نے میری ہر دعا قبول کر لی۔ تم تو ان دونوں سے بڑھ کر حسین لگ رہی ہو۔ اور اللہ نے نصیب بھی اچھے کر دیے۔"

اُس نے شرما کر سر جھکا لیا۔

اماں نے اُس کی پیشانی چوم لی۔ "دیکھو نور بانو' میرے عبدالحق کا دل بھی کبھی میلا نہ ہونے دینا۔ اللہ نے تمہیں بڑی نعمت عطا فرمائی ہے۔ اس کی ہمیشہ قدر کرنا۔ اسے خوش رکھنا۔ اسے کبھی کسی شکایت کا موقع نہ دینا۔"

اُسی وقت اسے نقاروں کی آواز سنائی دی اور اُس کی آنکھ کھل گئی۔

خواب ایسا تھا کہ اُس کا ٹوٹنا اسے برا لگا۔ وہ چاہتی تھی کہ خواب کا سلسلہ وہیں سے جڑ جائے' جہاں سے ٹوٹا تھا۔ اُس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ مگر اُس سے سویا نہیں گیا۔

وہ لیٹی خواب کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے اپنا سراپا یاد آیا۔ مگر اُس کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کے بجائے اُس نے اُس کا احساسِ کم تری اور بڑھا دیا۔ اُس نے سوچا' خواب میں تو کچھ بھی ہو جاتا ہے۔ اس کا حقیقت سے تو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ خواب میں تو میری اُس سے شادی بھی ہو گئی' جس سے میں محبت کرتی ہوں جبکہ حقیقت میں یہ ناممکن ہے۔ مجھ جیسی لڑکیوں کے لئے تو خواب ہی ہوتے ہیں۔

لیکن اس خیال سے اسے خوشی ہو رہی تھی کہ خواب میں باجی نے اپنے اس جوڑے کو اُس کا عروسی جوڑا قرار دیا اور اپنی محبت بھی اُسے سونپ دی۔

چند لمحے بعد وہ سحری بنانے کے لئے کھڑی ہوئی۔ یہ خیال آیا تو اُس کا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا کہ آج وہ یہ گھر چھوڑ کر کسی اجنبی جگہ کے لئے روانہ ہو رہی ہے...... اور اسے ہندو عورت کے بھیس میں بے پردہ سفر کرنا ہے۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق نے اس سفر کے بارے میں بہت سوچا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ آسان سفر نہیں ہے۔ متعصب ہندو اور سکھ سفر کرنے والوں پر خاص طور پر گھات لگاتے تھے۔ ان کے پاس اس کی معقول وجہ بھی تھی۔ جو علاقے ہندوستان میں تھے' وہاں سے ہجرت کرنے والے صرف مسلمان ہی تھے۔ اور وہ ان علاقوں کی طرف جا رہے تھے جو پاکستان میں شامل ہوئے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ اپنے گاؤں کا نام نہیں لے سکتا تھا۔ اس صورت میں وہ مشتبہ قرار پاتا۔ کیونکہ جس گاؤں کا نام و نشان مٹ چکا ہو' وہاں کوئی کیوں جانا چاہے گا۔

رکاوٹیں اپنی جگہ' بہر حال انہیں تو وہاں جانا تھا۔ بابا نے کہا تھا کہ یہ حکم ہے۔ اب حکم ہے تو اسے تعمیل کرنی ہے۔

اُس نے فیصلہ کیا کہ پہلے وہ جے پور جائیں گے۔ وہاں سے وہ اونٹ خرید کر ان کے ذریعے سفر کریں گے۔ اسے احساس تھا کہ اپنا گاؤں ڈھونڈنا بھی آسان نہیں ہوگا۔

سفر کی صبح ساتھ لے جانے والے سامان پر بھی بحث ہوئی۔ نور بانو کتابیں نکال کر الگ رکھ رہی تھی۔ وہ اس وقت ہندوانہ لباس میں تھی اور اس کی وجہ سے خاصی چڑچڑی ہو رہی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" عبدالحق نے پوچھا۔

"قرآن پاک کے نسخے ہیں اور دینی کتابیں ہیں۔" نور بانو نے جواب دیا۔

"تو یہ آپ الگ کیوں کر رہی ہیں؟"

"ہم ہندوؤں کے بھیس میں سفر کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اپنے سامان میں کیسے رکھ سکتے ہیں؟"

"میں ان کا جائزہ لے سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں؟"

عبدالحق نے کتابوں کا جائزہ لیا اور خوش ہو گیا۔ "یہ نعمت تو ہم نہیں چھوڑ سکتے۔ مجھے تو ان کی بہت ضرورت ہے۔"

"میں نے بھی سوچ کر نکالی تھیں لیکن انہیں ساتھ رکھنا خطرناک ہوگا۔" نور بانو نے کچھ جھجکتے، کچھ شرماتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی ہو۔ میں یہ سب کتابیں ضرور لے کر جاؤں گا۔"

"مجھلی بی بی ٹھیک کہہ رہی ہیں مالک۔" زبیر بولا۔

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ "انہیں کپڑوں میں لپیٹ کر رکھ لیں۔ میں انہیں نہیں چھوڑ سکتا۔"

نور بانو نے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھا۔ "جیسی آپ کی مرضی۔"

"ایک ذاتی بات پوچھ سکتا ہوں آپ سے؟" عبدالحق نے اس سے کہا۔

نور بانو پھر جھجکی۔ "جی ضرور۔"

"آپ کا نام کیا ہے؟"

نور بانو کا چہرہ تمتما اٹھا۔ چند لمحے جھجکنے کے بعد اُس نے کہا۔ "نور بانو۔"

اوتار سنگھ نے اپنی خوشی چھپانے کے لئے سر جھکا لیا۔ کیسا خوب صورت نام ہے۔ اُس نے دل میں سوچا۔

جے پور جانے کے لئے وہ گاڑی میں بیٹھے۔ سفر شروع ہو گیا۔

مگر دہلی شہر سے نکلتے ہی مسلح ہندوؤں اور سکھوں کے ایک جتھے نے گاڑی رکوا دی۔ انہوں نے تمام مسافروں کو نیچے اترنے کا حکم دیا۔ اور لوگ بھی گاڑی سے اُتر آئے۔

سوال جواب ہونے لگے۔ کہاں جا رہے ہو؟ کیوں جا رہے ہو؟ کون ہو؟ نام کیا ہے؟ وہ

پوچھتے اور جس سے مطمئن ہوتے اُسے گاڑی میں بھیج دیتے۔ نور بانو نے گھونگھٹ کاڑھ رکھا تھا۔ لباس بھی ایسا تھا جیسے نئی نئی شادی ہوئی ہو۔

"میرا نام ٹھاکر اوتار سنگھ ہے۔"

"میں رگھوٹوں...... رگھبیر...... چھوٹے ٹھاکر کا سیوک۔ اور یہ میری پتنی ہے...... رنجنا۔"

"اور یہ کون ہے؟"

سوال نور بانو کے بارے میں تھا۔ اور عبدالحق جانتا تھا کہ ایک لمحے کی ہچکچاہٹ بھی نقصان دہ ثابت ہوگی۔ چنانچہ اس نے سوچے سمجھے بغیر بے ساختہ جواب دیا۔ "یہ میری پتنی ہے...... لاجونتی۔"

گھونگھٹ کے اندر نور بانو کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ دل یوں دھڑکا، جیسے سینے سے نکل آئے گا۔

"اس کا گھونگھٹ تو اٹھاؤ مہاراج۔"

عبدالحق کے تیور بدلنے لگے۔ لاٹھی کی مٹھ پر اُس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ گھونگھٹ کی آڑ میں اُس کی طرف دیکھتی ہوئی نور بانو نے بھانپ لیا کہ معاملہ بگڑنے والا ہے۔ اُس نے جلدی سے گھونگھٹ اٹھا دیا۔

عبدالحق سخت جواب دینے ہی والا تھا کہ نور بانو نے اسے حیران کر دیا۔ وہ نور بانو کو دیکھتا رہ گیا۔

نور بانو نے گھونگھٹ تو اٹھا دیا تھا لیکن اتنے سارے مردوں کے سامنے پہلی بار بے حجاب ہوئی تھی۔ اُس کی نظریں جھک گئیں۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔

"سچ مچ لاج والی ہے متروّ۔" روکنے والوں میں سے ایک نے دوسروں سے کہا۔

اب عبدالحق برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ "اپنی حد میں رہو۔" اُس نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہم ٹھاکر لوگ جان لیتے زیادہ ہیں، دیتے کم ہیں۔" بولنے والا کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن دوسرے نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ "ہم اپنے لوگوں کو ستانے کے لئے نہیں نکلے ہیں۔" وہ بولا۔ "ضروری نہیں کہ یہ اپنے ہی لوگ ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مسلمان بچ نکلنے کے لئے ہندوؤں کا روپ بھی دھار لیتے ہیں۔"

"تو اب یہ کیسے پتا چلے گا؟"

"یہ کون سی مشکل بات ہے۔ الگ لے چل کر دیکھ لیتے ہیں۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔" اُس نے شیطنت بھرے لہجے میں کہا۔

بات عبدالحق کی سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن زبیر سمجھ گیا۔ تاہم عبدالحق کو یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی

ایسی بری بات ہے‘ جسے قبول کرنے پر وہ مرجانے کو ترجیح دے گا۔ لاٹھی کی مٹھ پر اُس کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔

زبیر نے دوسرے شخص سے کہا۔ ”مہاشے...... آپ ذرا الگ چل کر میری ایک بات سن لیں۔“

”سننا سنانا کیا ہے۔ ہمیں تو دیکھنا ہے۔ کہو تو یہیں دیکھ لیں...... سب کے سامنے۔“ پہلے والے نے پھر مداخلت کی۔

زبیر نے اُسے نظر انداز کردیا۔ ”میں دھرم کے نام پر بنتی کررہا ہوں مہاشے۔“

دوسرے شخص نے زبیر کا ہاتھ تھاما اور اُسے ایک طرف لے گیا۔ ”اب بولو‘ کیا بات ہے؟“

”میرا مالک راج پوت ہے‘ آن کے لیے جان لینا بھی جانتا ہے اور جان دینا بھی۔ آپ کا متر ان کا اپمان کیے جارہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہاں خون خرابہ ہو جائے گا۔“

”خون خرابہ!“ وہ مضحکانہ لہجے میں بولا۔ ”تمہارے پاس ہے کیا؟ خون بھی تمہارا ہوگا اور خرابہ بھی۔“

”تم غلط سمجھ رہے ہو مہاشے۔ چھوٹے ٹھاکر کو لٹھیا کا ہنر آتا ہے۔ چالیس پچاس آدمی تو ان کے سامنے ٹھہر بھی نہیں سکتے۔“

اُس کو یقین تو نہیں آیا۔ لیکن بہرحال وہ متاثر ہوا۔ ”تو تم کیا چاہتے ہو؟“

”مجھے جس طرح چاہو دیکھ لو لیکن چھوٹے ٹھاکر یہ اپمان برداشت نہیں کریں گے۔“

”چلو...... ٹھیک ہے۔“

اسی دوران وہ شرپسند بھی ان کے پاس آ گیا تھا‘ جس کی وہ تجویز تھی۔ اُس کے ساتھی نے کہا۔ ”لالو...... تو اسے دیکھ لے۔“

لالو زبیر کی طرف مڑا۔ ”چل...... دھوتی اوپر اٹھا۔“

چند لمحے بعد لالو نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”یہ ہندو ہی ہے۔“

”جاؤ مہاشے‘ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔“

یوں یہ مشکل مرحلہ آسان ہوگیا۔ زبیر کو پتا ہی نہیں تھا کہ اُس نے اپنے مالک کو بہت بڑی مشکل سے بچالیا ہے۔ خود عبدالحق کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ مرحلہ کتنا دشوار تھا۔

❁ ❁ ❁

جے پور سے ان کے اصل سفر کا آغاز ہوا۔ انہوں نے چار اونٹ لئے تھے۔ ایک پر سامان تھا۔ دوسرے پر رابعہ اور نور بانو تھیں۔ عبدالحق اور زبیر باقی دونوں اونٹوں پر تھے۔ عبدالحق کو احساس تھا کہ نور بانو کے لئے وہ بہت تکلیف دہ سفر ہے۔ اُس نے حتی الامکان اُسے آسان کرنے کی کوشش کی تھی۔ رابعہ کو اونٹ کا تجربہ تھا۔ اس لئے نور بانو اُس کے ساتھ تھی۔

صحرا کا سفر اور وہ بھی دن میں...... بہت ہی دشوار ہوتا ہے۔ دھوپ ایسی ہوتی ہے کہ جسم کا پانی ختم ہو جاتا ہے۔ اور وہ سب تو روزے سے تھے۔ ریت دیکھ دیکھ کر ان کے جی اُوب گئے۔

وہ سمت پوچھ کر چلے تھے۔ عبدالحق اپنے گاؤں کا حوالہ تو نہیں دے سکتا تھا۔ تاہم اُس نے سندر پور کے حوالے سے راستہ پوچھا تھا۔ یہ قریب کا وہ گاؤں تھا‘ جو اُس کی معلومات کے مطابق تباہی سے بچ گیا تھا۔

اب دھوپ کی تیزی ختم ہو رہی تھی اور وہ بتدریج پھیکی ہوتی جارہی تھی۔ عبدالحق کو تشویش ہونے لگی۔ مسافت کا اسے خوب اندازہ تھا۔ اُس کے خیال میں اب تک انہیں گاؤں پہنچ جانا چاہئے تھا لیکن وہاں تو کوئی آثار نہیں تھے۔

صحرا میں سورج بہت تیزی سے غروب ہوتا ہے۔ ابھی نظر آرہا ہے اور ابھی غائب اور ان کی تو زندگی ہی اس صحرا میں گزری تھی۔ زبیر نے عبدالحق سے کہا۔ ”مالک سانجھ ہوگئی ہے۔ ہمیں روزہ بھی کھولنا ہے۔“

”ابھی کچھ وقت ہے۔“ عبدالحق نے کہا۔ ”دیکھو...... شاید کوئی مناسب جگہ نظر آجائے۔“

وہ چلتے رہے۔ کوئی پندرہ منٹ بعد انہیں کچھ فاصلے پر کھجوروں کے درختوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ نظر آیا۔ ”چلو...... یہاں افطار کریں گے۔“ عبدالحق نے خوش ہو کر کہا۔

سب سے زیادہ خوشی نور بانو کو ہوئی تھی۔ اس سفر نے اُس کا برا حال کردیا تھا۔ اُس کے انجر پنجر ڈھیلے ہوگئے تھے۔ جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اُسے یقین نہیں تھا کہ اُترنے کے بعد وہ اپنے پیروں پر بھی کھڑی ہوسکے گی۔

وہ درختوں کے قریب پہنچے تو انہیں درختوں کے درمیان ایک جھونپڑی نظر آئی۔ ”لگتا ہے‘ ہم یہاں رات بھی گزار سکیں گے۔“ عبدالحق نے کہا۔

انہوں نے وہاں پڑاؤ ڈالا۔ اونٹوں کو درختوں سے باندھ دیا گیا۔ نور بانو ریت پر بیٹھ گئی تھی۔ رابعہ سامان اتروانے میں زبیر کی مدد کررہی تھی۔ عبدالحق یہ دیکھنے کی غرض سے جھونپڑی کی طرف بڑھا کہ وہ آباد ہے یا نہیں۔

اسی وقت جھونپڑی کے اندر سے ایک لرزتی تڑپتی ہوئی آواز ابھری۔ ”ارے...... یہ تو میرے چھوٹے ٹھاکر کے قدموں کی چاپ ہے۔ ارے...... کیا میرا چھوٹا ٹھاکر آگیا...... میرا چھوٹا ٹھاکر...... اے اللہ......“

عبدالحق کے پاؤں جیسے زمین نے پکڑ لئے۔ وہ قدم اٹھانا بھول گیا۔ اُس کی نظریں جھونپڑی کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ آواز سب نے سنی تھی۔ نور بانو اپنی بے آرامی اور تھکن بھول گئی۔ وہ بھی اٹھ کر جھونپڑی کی

سمت چلی۔

اسی لمحے دروازے سے ایک بوڑھی عورت تیز مگر لڑکھڑاتے قدموں سے نکلی۔ اُس کے استخوانی وجود میں ہڈیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ”اے اللہ! تیرا شکر ہے۔ میرا چھوٹا ٹھاکر آ گیا۔ کہاں ہو تم چھوٹے ٹھاکر۔“

عبدالحق اپنی جگہ بت بنا کھڑا تھا۔ وہ سب اُس کے لئے اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ سانس لینا بھی بھول گیا تھا۔ اُس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ مگر کوئی آواز نہیں تھی۔

بوڑھی عورت ہاتھوں سے اِدھر اُدھر ٹٹول رہی تھی۔ ”نہیں...... مجھے دھوکہ نہیں ہو سکتا۔ میرا چھوٹا ٹھاکر یہیں کہیں ہے۔ چھوٹے ٹھاکر‘ تم بولتے کیوں نہیں۔“

عبدالحق کے ہونٹ پھر لرزے...... مگر بے آواز۔ نور بانو بھی وہیں کھڑی تھی۔

بوڑھی عورت ایک طرف لپکی اور کھجور کے ایک درخت سے ٹکرا کر گر گئی۔ یہ وہ لمحہ تھا کہ زمین نے جیسے عبدالحق کے پیروں کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ وہ بوڑھی عورت کی طرف جھپٹا جو کھڑی ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس نے اسے اٹھایا اور لپٹا لیا۔ پھر وہ دیوانہ وار اُس کی پیشانی چومنے لگا۔ ”ہاں اماں‘ یہ میں ہی ہوں۔ اماں...... چوٹ تو نہیں لگی تمہیں؟“

بوڑھی عورت بڑی بے یقینی سے اُس کے چہرے کو اپنی کانپتی انگلیوں سے چھو رہی تھی۔ ”چوٹ...... کون سی چوٹ؟ میں تو ہر دکھ بھول گئی اپنا‘ چھوٹے ٹھاکر تم آ گئے تو سب کچھ ڈھل گیا میرے چھوٹے ٹھاکر۔“

”اب تو مجھے ایسے نہ پکارو اماں۔ اب میں عبدالحق ہوں۔“ عبدالحق نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اور حمیدہ ایک دم ساکت ہو گئی۔ عبدالحق کے چہرے پر اُس کا ہاتھ جہاں تھا‘ وہیں رہ گیا۔ اُس نے یوں سر اٹھایا‘ جیسے اُس کا چہرہ تک رہی ہو...... یا جیسے اُس کے کہے ہوئے لفظوں کی بازگشت سننے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر اُس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ”کیا کہا تم نے؟ ذرا پھر سے کہنا پتر۔“

”اماں‘ اب مجھے کبھی ٹھاکر نہ کہنا۔ اب میرا نام عبدالحق ہے۔“

”تم...... تم مسلمان ہو گئے......؟“

”ہاں اماں۔ الحمدللہ۔ اللہ کا کرم ہے۔“

حمیدہ نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھایا اور آنچل پھیلا کر بکھرتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اے اللہ شکر ہے تیرا۔ اے اللہ تو نے میرے دودھ کی لاج رکھ لی۔“ پھر وہ عبدالحق سے لپٹ گئی‘ اور ایسے رونے لگی جیسے اب کبھی چپ نہیں ہو گی۔

نور بانو بوڑھی عورت کی بات سن کر حیرت سے سن ہو کر رہ گئی تھی۔ حالانکہ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ بوڑھی عورت نے وہ الفاظ کہے ہیں۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اُس کی سماعت کا واہمہ ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح ایک بات سوچے جا رہی تھی...... کیا چھوٹے ٹھاکر نے اس مسلمان عورت کا دودھ پیا تھا۔

زبیر کی پکار نے اُس منظر کو تبدیل کر دیا۔ ”مالک...... سورج ڈوب گیا ہے۔“

حمیدہ چونکی۔ ”ارے...... یہ تو رگھو کی آواز ہے۔“

”رگھو نہیں اماں‘ اب وہ زبیر ہے۔ اور رنجنا کا نام اب رابعہ ہے۔“ عبدالحق نے کہا اور نرمی سے حمیدہ کو خود سے الگ کیا۔ ”تم سے بہت باتیں کرنی ہیں اماں۔ مگر افطار کا وقت ہو گیا ہے۔ اور مجھے اذان بھی دینی ہے۔“

چند لمحے بعد اُس مردہ گاؤں کی فضا میں اذان کی آواز گونج رہی تھی‘ جہاں پہلے کبھی مسجد بھی نہیں تھی۔ جہاں صرف تین مسلمان رہتے تھے۔ اور وہاں اذان دینے کا اعزاز ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے بیٹے عبدالحق کو حاصل ہو رہا تھا۔ جبکہ اسے اسلام قبول کیے صرف تین دن ہوئے تھے۔

❁ ❁ ❁
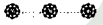
باتیں کرنے کا موقع ملنا آسان نہیں تھا۔ وہ ایسا بے سروسامانی کا عالم تھا کہ انہیں پہلے اس کی فکر کرنی تھی۔ جھونپڑی میں ایک چارپائی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر فی الوقت کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

مغرب اور عشاء کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ عبدالحق نے عشا کی اذان دی۔ نماز کے بعد انہیں سونے کی فکر ہوئی۔ سفر کی تھکان نے نور بانو کو ایسا نڈھال کر دیا تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے جھوم رہی تھی۔

”مجھلی بی بی چارپائی پر سو جائیں گی۔“ رابعہ بولی۔

”ہاں‘ یہ ٹھیک ہے۔“ عبدالحق نے کہا۔

”نہیں‘ یہ ناممکن ہے۔“ نور بانو نے کہا۔ ”ہم اندر سونے والے تو فرش پر بھی سو جائیں گے۔ چارپائی باہر والوں کو ملنی چاہئے۔“

ان کی خوش قسمتی تھی کہ رابعہ نے سامان میں بستر بھی رکھ لیا تھا۔ ان کے پاس ایک بڑا بستر بند تھا‘ جس میں گھر کے لحاف‘ چادریں اور تکیے تھے۔ یوں ان کا بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ چارپائی باہر لا کر بچھا دی گئی۔ اندر حمیدہ‘ نور بانو اور رابعہ کے بستر بچھ گئے۔ زبیر نے اپنا بستر کھجور کے درخت کے پاس بچھا لیا۔

تھوڑی ہی دیر میں عبدالحق اور حمیدہ کے سوا سب لوگ سو گئے۔

عبدالحق حمیدہ کو باہر لے آیا اور چارپائی پر بٹھا دیا۔ وہ خود اُس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"اب ہم خوب باتیں کریں گے اماں۔"

لیکن حمیدہ دہل گئی۔ "تم نیچے کیوں بیٹھے ہو چھوٹے......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"اچھا ہوا اماں کہ تم نے جملہ پورا نہیں کیا۔" عبدالحق نے کہا۔ "اللہ کا شکر ہے اماں کہ ٹھاکری ختم ہوگئی۔ اب میں تمہارا بیٹا ہوں اور تم میری ماں ہو۔ اور جہاں میں بیٹھا ہوں' وہی میرا مقام ہے۔"

دونوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں سے شروع کریں۔ ان کی گفتگو ترتیب سے محروم تھی۔ البتہ دونوں کے لئے نقطۂ آغاز ایک ہی تھا۔ وہ لمحہ جب وہ آخری بار ملے تھے...... بچھڑنے کے لئے۔ جب پہلی بار حمیدہ نے ماں بن کر اسے وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا تھا۔ اور اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ پڑھائی مکمل کر کے واپس آئے گا تو وہ اسے ملے گی۔ کس یقین سے کہا تھا اُس نے......اور اس وقت کے اوتار سنگھ نے اس پر ویسا ہی یقین کیا تھا۔

"تم پر کیا گزری اماں؟" عبدالحق نے پوچھا۔

"مجھ پر کیا گزری؟ کچھ بھی نہیں۔ اللہ کی رحمت تھی۔ گاؤں کے گاؤں مٹ گئے۔ مگر اللہ نے مجھے بچالیا۔ اور تمہارے جانے کے بعد ذرا دیر بعد ہی آندھی آئی تھی۔ میں تمہاری طرف سے ڈرتی رہی۔ مگر نجانے کیسے دل کو اطمینان ہو گیا کہ تم خیریت سے ہو۔"

"مجھے بھی بس اللہ نے بچالیا اماں۔ ورنہ میں ریت میں دب رہا تھا۔ سانس بھی نہیں لی جا رہی تھی مجھ سے۔" عبدالحق کو اب بھی وہ منظر یاد آیا تو اس کے جسم میں تھرتھری دوڑ گئی۔ "پر اماں' تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا؟"

"رب کی امانت تھی پتر۔ جب تک رہی' اُس کی مہربانی۔ جب اس کی مرضی ہوئی' واپس لے لی۔ مگر جان بخش دی اس نے...... تمہارے لئے۔ اور اُس کا شکر ہے کہ آج اُس نے یہ دن دکھایا۔ تمہیں مجھ سے ملایا۔"

"پر آنکھوں کو ہوا کیا اماں؟"

"پتر ہونا کیا تھا۔ رب نے کرم کیا۔ جس ریت میں گاؤں کے گاؤں دب گئے' اُس کے سامنے میری کیا بساط تھی۔ بس جیسے وہ ساری کی ساری میری آنکھوں میں بھر گئی۔ نظر تو کچھ نہیں آتا۔ پر اب بھی کبھی کبھی آنکھوں میں کھٹک ہوتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے پتر۔"

عبدالحق کو اُس پر پیار آگیا۔ اُس نے اُس کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگالیا۔ کیسی شکر گزار تھیں اماں۔

"تم نے یہاں اکیلے اتنے برس کیسے گزار دیے اماں؟"

"میں کہاں گزار سکتی تھی۔ رب نے گزار دیے۔" حمیدہ نے شکر گزاری سے کہا۔ "میں تو پریشان تھی۔ آنکھوں سے بھی محروم ہو گئی تھی۔ وقت کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ پھر ایک اللہ کا بندہ

میرے پاس آیا۔ بولا...... یہاں کیسے جیو گی۔ چلو تمہیں اللہ کی رحمت کے سائے میں لے چلوں۔ میں نے کہا...... مجھے کسی کا انتظار ہے...... اور اس کی امانتیں بھی سنبھالے بیٹھی ہوں۔ وہ بولا...... امانتیں بھی محفوظ ہیں۔ بس تم چلو۔ بہت اصرار سے وہ مجھے یہاں لے آیا۔ کہنے لگا...... سر چھپانے کو یہ چھت ہے۔ سونے کے لئے چارپائی۔ کھانے کے لئے کھجوریں۔ اور یہ پانی کا گھڑا بھی رکھا ہے۔ اور کیا چاہئے تمہیں۔ میں نے کہا...... پانی ختم ہو جائے گا تو میں اندھی کہاں پانی ڈھونڈتی پھروں گی۔ وہ ہنس کر بولا...... پانی کبھی ختم نہیں ہوگا۔ بس...... اس دن سے میں یہاں ہوں۔ بھوک لگتی ہے تو درختوں کے نیچے ٹپکی ہوئی کھجوریں کھاتی ہوں۔ گھڑے میں پانی کبھی کم نہیں ہوتا۔ اللہ کی مہربانی ہے۔ تمہارا انتظار تھا۔ تم بھی آگئے۔ اللہ کا شکر ہے۔"

"اور وہ آدمی کہاں گیا؟"

"اس دن کے بعد میں نے کبھی اُس کی آواز بھی نہیں سنی۔"

"تم نے کتنی تکلیف اٹھائی ہے اماں۔"

"کوئی تکلیف نہیں تھی پتر۔ بس وقت کا پتا نہیں چلتا تھا۔ پرندوں کے شور سے صبح اور شام کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ اندازے سے نماز پڑھتی تھی۔ پتا نہیں' کتنی غلط نمازیں پڑھی ہوں گی میں نے۔ اللہ معاف کرے۔ اور مہینوں کا تو پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ اب یہی دیکھ لو' مجھے نہیں معلوم تھا کہ رمضان آگئے ہیں۔ نجانے کتنے روزوں سے محروم رہی میں۔" وہ رونے لگی۔ "اور وقت کتنا ہی نہیں تھا۔"

عبدالحق کا دل کٹنے لگا۔ واقعی' وہ کیسی روح فرسا تنہائی ہوگی' جس سے اماں گزری تھیں۔

"مجھے بتاؤ تو' تمہیں گئے کتنے برس ہو گئے؟"

"دو سال ہو گئے اماں۔"

"صرف دو سال۔" حمیدہ کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور اذیت بھی۔ "مجھے تو وہ دس بیس سال پرانی بات لگتی ہے۔"

عبدالحق اس بات کو سمجھ سکتا تھا۔

"اچھا پتر' اب تم سو جاؤ۔" حمیدہ نے کہا اور اندر چلی گئی۔

عبدالحق لیٹ گیا۔ تھکن بہت زیادہ تھی۔ جسم کو آرام ملا۔ مگر نیند نہیں آئی۔ اس رات کلمہ پڑھنے کے بعد جو اسے نیند آئی تھی تو اُس کے بعد اب تک وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سو سکا تھا۔ اور یہ بھی نہیں کہ اسے نیند کی کمی کا احساس ستاتا ہو۔ وہ تازہ دم ہی رہتا تھا۔

گھڑی اُس کے پاس تھی۔ سحری کے وقت اُس نے سب کو جگا دیا۔

❁ ❁ ❁

پہلا مرحلہ اس جگہ کو زندگی گزارنے کے قابل بنانا تھا۔ ضروری تھا کہ رہنے کے لئے ایک گھر

بنایا جائے۔ مگر اس سے زیادہ ضروری اس بات کا خیال رکھنا تھا کہ وہ گھر اپنے گاؤں کی ...... اپنی زمین پر بنایا جائے۔

فجر کے بعد عبدالحق زبیر کے ساتھ اس جستجو میں نکلا۔ بظاہر تو وہاں کہیں کوئی نشانی نظر نہیں آ رہی تھی۔ مگر تلاش کرنے پر ایک اونچے ٹیلے کے نیچے حویلی کے آثار نظر آ گئے۔ آثار کیا' وہ ایک منڈیر سی تھی لیکن ان کی پہچان کے لئے کافی تھی۔ اور وہ آثار بھی اُس ٹیلے کی وجہ سے نمایاں ہوئے تھے۔ وہاں سے ریت نے اُڑ اُڑ کر ٹیلے کی شکل اختیار کی تھی اور جہاں سے ریت اڑی تھی' وہاں چھت کی منڈیر نمایاں ہو گئی تھی۔

اسے دیکھ کر عبدالحق کو ایسی بے قراری ہوئی کہ وہ خود بھی حیران رہ گیا۔ جی چاہتا تھا کہ ہاتھوں سے زمین کھود کر نیچے اُتر جائے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس طرح یہ ممکن نہیں۔

بہر حال حویلی کے حوالے سے پورے گاؤں کا نقشہ ان دونوں کو یاد تھا۔ وہاں کھڑے ہو کر انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ دونوں حیران رہ گئے۔ اماں کی جھونپڑی عین اس جگہ تھی' جہاں ان کی یادداشت کے مطابق گاؤں کا مرکز تھا۔

عبدالحق نے یہ بات زبیر سے کہی۔ زبیر نے اس کی تائید کی۔ حیرت اس بات کی تھی کہ کھجوروں کا وہ جھنڈ اچانک کہاں سے آ گیا۔ "زبیر...... یہ اللہ کی قدرت ہے۔ اُس کی رحمت ہے۔ ورنہ تو اماں کے بچنے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں مالک۔"

"بس...... اب ہمیں شہر چلنا ہے۔"

اس بار وہ جے پور کی مخالف سمت میں گئے۔ راستے میں انہیں کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں ملے۔ وہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ہندو بڑی تعداد میں اپنے گھر چھوڑ گئے تھے اور جو موجود تھے' وہ عافیت میں رہ رہے تھے۔

انہوں نے پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کہ اُن کی ضرورت شہر میں ہی پوری ہو سکتی ہے۔ اور شہر زیادہ دور بھی نہیں ہے۔

اور وہ قریب ترین شہر صادق آباد تھا۔

❁......❁......❁

پہلا دن تو جھونپڑیاں کھڑی کرنے میں گزر گیا۔ وہ جھونپڑیاں ان کے اپنے لئے تھیں اور دو راج مزدوروں کے لئے۔ عبدالحق نے حمیدہ سے اُس کی جھونپڑی خالی کرنے کی اجازت لے لی تھی۔

اگلے روز عبدالحق نے راج کو تفصیل سے بتایا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ مسجد کے لئے اُس نے اماں کی جھونپڑی والا مقام منتخب کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اُس کے اندازے کے مطابق وہ

گاؤں کا وسطی مقام تھا لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ اللہ نے ایک بہت بڑی آفت کے دوران اس مقام پر اماں کے لئے اپنی رحمت کا دامن پھیلایا تھا۔

"صاحب...... یہاں مسجد کی ضرورت کہاں ہے؟" راج نے اعتراض کیا۔

عبدالحق نے اسے یوں دیکھا' جیسے اُس کی نا سمجھی پر حیران ہو رہا ہو۔ "کیوں؟ یہاں مسلمان نہیں رہتے؟"

"آپ دو ہی تو آدمی ہیں یہاں۔"

"مگر نماز تو پڑھیں گے۔"

راج شرمندہ ہو گیا۔ "مگر اتنی بڑی مسجد!"

"دیکھو...... انشاء اللہ یہ گاؤں آباد ہو گا۔ میں چاہتا ہوں' یہاں پہلی بنیاد ایک مسجد کی رکھی جائے۔ اور میں بڑی مسجد کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں اس لئے اتنی جگہ چھوڑنا چاہتا ہوں کہ بعد میں ضرورت پڑنے پر توسیع کی جا سکے۔"

"ٹھیک ہے صاحب۔ مگر مال دور سے آئے گا۔ خرچا بہت ہو گا۔"

"خرچے کی تم پروا مت کرو۔ بس عید سے پہلے کام مکمل ہو جائے۔" عبدالحق نے کہا۔ "اب مکان کے لئے جگہ دیکھ لو۔"

راج پیمائش میں مصروف ہو گیا۔ کچھ مزدوروں کو مال کے لئے شہر بھیج دیا گیا۔

اذان کی آواز تو ان کی آمد کے ساتھ ہی گونج چکی تھی۔ اب وہاں باجماعت نماز ہونے لگی۔

اگلے روز سے تعمیر کا کام بھی شروع ہو گیا۔

❁......❁......❁

نور بانو کے لئے وہ بالکل نئی اور مختلف زندگی تھی۔ اس نے خواب میں بھی اس زندگی کا تصور نہیں کیا تھا۔ وہ ایک عجیب عالمِ حیرت میں جی رہی تھی۔ پہلی رات تو اسے لگتا تھا کہ وہ سو ہی نہیں سکے گی۔ نیچے فرش پر وہ کبھی سوئی ہی نہیں تھی۔ اب سونا تھا اور وہ بھی اونٹ پر طویل اور تکلیف دہ سفر کے بعد' تھکن اور درد اُس کی ہڈیوں میں سرایت کر گیا تھا۔ اور اسے لگتا تھا کہ اُس کے جسم کا ایک ایک جوڑ الگ ہو گیا ہے۔

لیکن سونے کے لیے لیٹنا تو تھا۔ اور عجیب بات یہ ہوئی کہ لیٹتے ہی وہ سو گئی۔ اور وہ ایسی بے خبر نیند تھی...... ایسی لذت والی نیند کے رابعہ کے جھنجوڑنے پر بھی سحری میں اُس کی آنکھ نہیں کھل رہی تھی۔

اُس کے لئے وہ تبدیلی بہت بڑی' بالکل مکمل اور یکسر تھی۔ اُس نے آنکھ کھولنے کے بعد بس گھر کی چار دیواری دیکھی تھی۔ گھر سے باہر کی دنیا کا اُس کے پاس بے حد محدود سا تصور تھا۔ پہلے تو اُس سفر نے ہی اُس کی آنکھیں کھول دیں۔ یہ احساس الگ تھا کہ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک

میں چلی آئی ہے۔ اللہ کی زمین اتنی بڑی ہے۔ اتنی وسیع' یہ تو اُس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

اگلے روز سویرے ہی عبدالحق اور زبیر کہیں چلے گئے۔ وہ رابعہ کو قرآن پڑھانے بیٹھ گئی۔ اماں بھی اس کے پاس بیٹھی سن رہی تھیں۔

قرآن پڑھنے کے بعد رابعہ نے کہا۔ "آؤ منجھلی بی بی' ذرا باہر چل کر دیکھیں۔"

نور بانو ہچکچا رہی تھی۔ دل تو چاہ رہا تھا باہر جانے کو۔

"یہاں تو کوئی ہے ہی نہیں دیکھنے والا۔ چلیں چادر لپیٹ لیں اچھی طرح۔"

وہ رابعہ کے ساتھ باہر نکل آئی۔

باہر آ کر پہلا ردعمل یہ ہوا کہ اُس کا دل گھبرانے لگا۔ اپنا وجود اسے بہت چھوٹا' بہت حقیر لگنے لگا۔ کھجور کے درختوں کے جھنڈ سے باہر حدِ نظر تک ریت اور آسمان کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اور وہ منظر اتنا بڑا' اتنا وسیع تھا کہ انسان کی بے بضاعتی کا احساس دلاتا تھا۔

پھر اسے ڈر لگنے لگا...... وہاں وہ بس تین عورتیں ہی تو ہیں۔ کوئی آ جائے تو۔ اُس نے یہ بات رابعہ سے کہہ دی۔

"کوئی نہیں آتا منجھلی بی بی۔ آئیں......"

نور بانو کو ایسا لگ رہا تھا کہ اب اسے ازسرِنو زندگی گزارنا سیکھنا ہوگا۔ وہ دیکھتی رہی۔ رابعہ نے درختوں کے جھنڈ میں ہوا کے رخ سے ہٹ کر مٹی کا بہت خوب صورت چولہا بنایا۔ اسے بہت اچھا لگا۔

عبدالحق اور زبیر واپس آئے تو ان کے ساتھ راج مزدور تھے۔ اُس کے علاوہ وہ کھانے پینے کا سامان اور جلانے کیلئے لکڑی بھی لائے تھے۔ اُن کے آتے ہی نور بانو جھونپڑی میں جا گھسی۔ رابعہ باہر کام میں مصروف رہی۔

ذرا دیر بعد حمیدہ نے پکارا۔ "نور بانو...... وچھیے...... ذرا عبدالحق کو تو بلا لا۔"

"میں کیسے جاؤں اماں۔ باہر مرد ہیں۔" نور بانو نے کہا۔

"سن وچھیے' میں کوئی پڑھی لکھی نہیں ہوں۔ دین کا بھی کچھ علم نہیں ہے مجھے۔ پر زندگی کی سمجھ ہے مجھے۔ دین پردے کے نام پر عورت کو قید نہیں کرتا۔ دین میں آسانی ہے' مشکل نہیں' عورت کے باہر نکلنے پر پابندی نہیں۔ پابندی ہے تو بس نفس کے لئے۔ عورت کے لئے باہر نکلنے کی پابندی نہیں۔ بس وہ اپنی نمائش نہ کرے۔"

نور بانو یہ سب کچھ جانتی تھی۔ مگر وہ جس ماحول میں رہی تھی' اُس میں یہ پابندیاں تھیں۔ وہ دین کا علم حاصل کرتی رہی تھی۔ اس کو علم تھا کہ اسلام کے ابتدائی دور کی عورتیں علمِ حدیث حاصل بھی کرتی تھیں اور اُس کی تعلیم بھی دیتی تھیں...... اور وہ بھی صرف عورتوں کو نہیں مرد بھی ان سے علم

حاصل کرنے آتے تھے اور اُن سے سند لے کر جاتے تھے۔ لیکن وہ جس معاشرے میں رہی تھی' اُس کے یہی تقاضے تھے اور وہ اُس کی عادت بن چکے تھے۔ اُس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "لیکن اماں' مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"دیکھ بیٹی۔ تو شہر میں رہتی تھی نا۔ یہاں گاؤں کی زندگی کا تجھے کچھ پتا نہیں۔ یہاں عورت کی ذمے داری صرف گھر سنبھالنا نہیں۔ یہاں کبھی اُسے کھیتوں میں بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ ڈنگر بھی چرانے پڑتے ہیں۔ اب مجھے نہیں معلوم' تجھے یہاں رہنا ہے یا نہیں لیکن آدمی پر خدانخواستہ وقت تو کہیں بھی پڑ سکتا ہے...... گاؤں میں بھی اور شہر میں بھی۔ میں چاہتی ہوں' تو اُس کے لئے خود کو بدل لے۔ بس چادر میں خود کو اچھی طرح چھپا لے۔ پھر بھی دل نہ مانے تو اسی چادر سے آدھے چہرے کو بھی چھپا لے۔ جا...... جا کر عبدالحق کو بلا لا۔"

نور بانو نے خود کو چادر میں پہلے ہی لپیٹا ہوا تھا۔ اسی چادر کا نقاب بنا کر وہ باہر نکلی۔ مگر اُس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ وہ تو دہلی سے یہاں تک کے سفر نے اُس کی جھجک قدرے کم کر دی تھی۔ ورنہ شاید وہ بے ہوش ہی ہو جاتی۔

خوش قسمتی سے مرد خاصے فاصلے پر زمین کا جائزہ لے رہے تھے۔ رابعہ ایک اور چولہا بنانے میں مصروف تھی۔ نور بانو نے اُس سے کہا۔ "سنو...... عبدالحق سے کہو کہ اماں انہیں بلا رہی ہیں۔"

رابعہ اٹھ کر اُس طرف چل دی۔

نور بانو سوچنے لگی۔ زندگی اس سے تبدیلیوں کا تقاضہ کر رہی ہے۔ اور بنیادی چیز زندگی ہی ہے۔ مزاج اور معاشرت کی تبدیلی آسان نہیں ہوتی۔ لیکن ناگزیر ہو تو زندگی کی خاطر کرنی پڑتی ہے۔ پھر یہاں تو تبدیلی اُسے اچھی لگ رہی تھی۔ چند گھنٹوں میں ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ کھلی فضا میں سانس لینا کتنا خوب صورت ہے۔ ہر سانس کے ساتھ وجود جیسے روشن ہوا جا رہا تھا۔

اُس نے خود کو سمجھایا کہ حیا آنکھ میں ہوتی ہے' نیت میں ہوتی ہے اور دل کی بے غرضی میں ہوتی ہے اور مستور ہونے میں ہوتی ہے۔ حیا خود کو غائب کر لینے میں نہیں ہوتی۔ مستور ہونا دنیا سے کٹ جانا نہیں ہوتا۔ پردہ ایسا ہو کہ کسی کے لئے ترغیب کا سامان نہ ہو۔

مگر عبدالحق کے معاملہ میں یہ ممکن نہیں تھا۔ وہاں اُس کا دل بے غرض نہیں تھا۔ وہ اُس سے محبت کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ وہ بھی اُس سے محبت کرے۔ لہٰذا اُس کے سامنے جانے کے خیال سے اسے گھبراہٹ ہوتی تھی۔

شام سے پہلے وہ دوسری جھونپڑی میں منتقل ہو گئے۔ جہاں اماں کی جھونپڑی تھی' وہاں عبدالحق نے مسجد بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ نور بانو نے یہ سوچ کر سکون کی سانس لی کہ اب عبدالحق کو کھلے آسمان کے نیچے نہیں سونا پڑے گا۔

مزدوروں کو کام مکمل ہونے تک وہیں رہنا تھا۔ چنانچہ وہاں کھلے آسمان کے نیچے باجماعت نماز ہونے لگی۔ مزدوروں میں دو ایسے تھے جن کی داڑھی تھی۔ ان میں سے ایک امامت کراتا تھا۔

حمیدہ کے لئے وہ بہت بڑی خوشی تھی۔ ساری عمر وہ اذان کی آواز سننے کو ترستی رہی تھی۔ اُس نے ہمیشہ اندازے سے نماز پڑھی تھی۔ اب پانچوں وقت اذان کی آواز سننا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ اُس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ اور وہ اذان کے فوراً بعد نماز کے لئے کھڑی ہو جاتی۔ نمازیں اُس کی طویل ہو گئی تھیں۔ سچ یہ تھا کہ پہلے ایسی نماز اُس نے کبھی نہیں پڑھی تھی۔ پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ آزادی کے ساتھ نماز پڑھنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔

حمیدہ کو نور بانو کے بارے میں اندازہ ہوا کہ وہ باقاعدہ علم دین حاصل کرتی رہی ہے تو اُس نے اسے اپنے قریب کر لیا۔ ویسے بھی اسے یہ لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔ اسے احساس ہوتا تھا کہ عبد الحق اس لڑکی کو پسند کرتا ہے۔ اگرچہ بہ ظاہر کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن اس معاملے میں عورتوں کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔

❁ ❁ ❁

اس روز حمیدہ نے عبدالحق کو اپنے پاس بلا لیا۔ ”پتر...... میں چاہتی ہوں کہ عید سے پہلے تمہاری امانتیں تمہارے سپرد کر دوں۔“

عبدالحق متجسس ہو گیا۔ اسے یاد تھا' لال آندھی والے دن بھی اماں نے یہی کہا تھا کہ انہیں اس کی امانتوں کی فکر ہے۔ ”اب جلدی کیا ہے اماں۔“ اس نے کہا ”میں آ گیا ہوں نا۔“

”جلدی تو ہے پتر۔ کیا پتا' اب ضرورت پڑ جائے۔“

عبدالحق کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

”تم مجھے کھجور کے اس درخت کے پاس لے چلو' جو سب سے اونچا ہے۔“

ذرا دیر بعد وہ اس درخت کے پاس کھڑے تھے۔ حمیدہ نے جھک کر درخت کے تنے کو نیچے سے چھوا۔ چند لمحے وہ ٹٹولتی رہی۔ پھر ذرا سا ہٹ کر اُس نے زمین پر نشان لگایا۔ ”یہاں کھودنا ہو گا پتر۔ تمہاری امانت یہیں ہے۔“

”میں مزدور کو بلاتا ہوں۔“

”نا پتر...... کسی کو پتا نہ چلے۔ یہ کام تم لوگ...... زبیر سے لے سکتے ہو' پر خود ہی کرو تو اچھا ہے۔“

عبدالحق بحث کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ خود ہی اس کام میں لگ گیا۔ اور اسے زیادہ کھودنا نہیں پڑا۔ تھوڑی سی کھدائی کے بعد کدال کسی دھات کی چیز سے ٹکرایا۔ اُس نے مٹی ہٹا کر دیکھا۔ وہ کافی بڑا ایک دیگچہ تھا' جس کے اوپر ڈھکن بھی تھا۔

وہ آواز سنتے ہی حمیدہ کے چہرے پر خوشی دوڑ گئی۔ اس سے پہلے اس کے جسم میں تناؤ تھا وہ سوچ رہی تھی کہ وہ چیز یہاں موجود بھی ہو گی یا نہیں۔ ”ہاں...... یہی ہے پتر نکال لو اسے۔“ اس نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔

دیگچہ نکالنے کے لیے اور اِدھر اُدھر کی مٹی ہٹانی پڑی۔ بالآخر اس نے دیگچہ نکال لیا۔ ”اب کیا کروں اماں“

”اسے کھول کر دیکھو۔ یہ سب تمہارا ہے۔“

عبدالحق نے دھڑکتے دل کے ساتھ ڈھکنا ہٹایا۔ دیگچے میں ایک بڑی گٹھری تھی۔ ”اس میں گٹھری ہے اماں۔“

”ہاں۔ یہ تمہاری امانت ہے۔“ حمیدہ نے کہا اور آسمان کی طرف سر اٹھاتے ہوئے بولی۔

”تیرا شکر ہے ربا۔ تو نے میرا بوجھ اتار دیا۔“

عبدالحق نے گٹھری کو کھولا۔ گٹھری میں کچھ کاغذات تھے اور دو بڑی بڑی پوٹلیاں تھیں۔ اس نے کاغذات اٹھائے اور ان کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ عدالتی کاغذات تھے ان کی رُو سے جمال دین نے اپنی تمام زمین' اپنا مکان' سب کچھ کرتار سنگھ کے نام کر دیا تھا۔

چند لمحے تو وہ ان کاغذات کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر کچھ خیال آیا تو اس نے تاریخ دیکھی۔ وہ اس کے لیے ایک اور مقام حیرت تھا۔ وہ دستاویزات 1932ء کی تھیں۔ یعنی بات یہ نہیں تھی کہ جمال دین نے اپنی موت سے کچھ پہلے وہ کچھ اس کے نام کیا تھا۔ یہ اس سے بہت پہلے کی بات تھی۔ ”یہ سب کیا ہے اماں۔“ بڑی مشکل سے وہ بولا۔

”سب بتا دوں گی۔ پہلے سب چیزیں دیکھ لو اور بتا دو۔ مجھے تسلی ہو جائے کہ امانت پوری ہے اور تمہیں مل گئی ہے۔“

عبدالحق نے پوٹلیاں کھولیں۔ مگر اس کا دماغ اب بھی کاغذات میں الجھا ہوا تھا۔ چاچا جمال دین نے یہ سب کچھ اس کے نام کیوں کیا۔ انہیں تو یہ سب کچھ ویر جی کے نام کرنا چاہیے تھا۔

اس نے پوٹلیاں کھول کر دیکھا۔ ایک میں نقدی تھی اور دوسری میں سونا اور زیورات۔ رقم بھی بھاری تھی اور سونا بھی کم نہیں تھا۔ وہ تو اچھا خاصا خزانہ تھا۔

اماں...... اس میں نقدی اور زیورات بھی ہیں...... بہت سارے۔“

”یہ سب تمہارا ہے پتر۔ تمہاری امانت تھی میرے پاس۔ رب سے دعا کرتی تھی کہ امانت لوٹائے بغیر مجھے مرنے نہ دینا۔“

عبدالحق نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ”ایسی باتیں نہ کرو اماں۔ اب تمہارے سوا میرا کون

ہے۔" پھر وہ بولا۔ "لیکن اماں' چاچا نے یہ سب میرے نام کیوں کیا ہے انھیں تو ویرجی کے نام کرنا چاہیے تھا۔"

"اس لیے کہ یہ سب کچھ تمہارا ہی تھا۔ ہمارا اس پر کوئی حق نہیں تھا۔"

"کیسے اماں۔ سمجھاؤ تو۔"

تب حمیدہ نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ کیسے بڑے ٹھاکر نے دودھ کے صلے میں اپنی زمین اور ہر چیز کا نصف انھیں دیا تھا۔ "ہم ٹھاکر جی کو انکار تو نہیں کر سکتے تھے نا۔ وصال دین کے ابا نے کہا...... یہ سب کچھ چھوٹے ٹھاکر کا ہے حمیدہ...... ہم سب کچھ چپکے سے اس کے نام کر دیں گے۔ یاد رکھنا حمیدہ...... یہ سب کچھ چھوٹے ٹھاکر کی امانت ہے ہمارے پاس۔"

عبدالحق کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "لیکن بتاجی نے سب کچھ خوشی سے دیا تھا...... آپ کے احسان کے صلے میں۔"

"ہم نے کوئی احسان نہیں کیا تھا پتر۔ تمہیں پہلی بار دیکھا تو دل میں تمہیں دودھ پلانے کی آرزو پیدا ہوئی تھی۔ اس میں تو میری خوشی تھی۔ اور اسے بھی بھول جاؤ تو بھی وہ بڑے ٹھاکر کے احسان کا صلہ تھا' احسان نہیں۔"

"آپ کس احسان کی بات کر رہی ہیں اماں؟"

"مجھے تو نہیں معلوم۔ وصال دین کے ابا نے بتایا تھا۔" حمیدہ نے کہا اور پھر اسے بتایا کہ کیسے وہ لوگ دوسرے گاؤں میں رہتے تھے اور زمین دار کی نظر جمال دین کی بہن پر تھی۔ اس نے مہاجن کے ذریعے چکر چلایا۔ اور کیسے بڑے ٹھاکر نے وہ قرضہ چکا کر ان کی جان چھڑائی، عزت بچائی۔ پھر اپنے گاؤں میں انھیں زمین دی' عزت دی اور مرتبہ دیا۔

یہ کیسے احسان ماننے والے لوگ ہیں۔ عبدالحق نے سوچا۔ "مگر اماں' مجھے یہ سب لینا اچھا نہیں لگے گا۔"

"کیوں اچھا نہیں لگے گا؟" حمیدہ نے خفگی سے کہا۔

"بتاجی کی دی ہوئی چیز میں واپس لے رہا ہوں۔ یہ کوئی اچھی بات ہے۔"

"تم واپس کہاں لے رہے ہو۔ یہ تو وصال دین کے ابا نے تمہیں دیا ہے۔ اور وہ اپنے بیٹے سے زیادہ تمہیں چاہتے تھے۔ تم انکار کیسے کر سکتے ہو۔"

عبدالحق کی کیفیت عجیب تھی۔ اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔

"پھر مان لو کہ یہ سب میرا ہے۔ اب یہ بتاؤ تمہارے سوا میرا کون ہے۔ تم نہ ہوتے تو میں تو موت کی دعا مانگتی۔ اور پتر' موت تو یہاں بن مانگے مل رہی تھی۔ اللہ نے مجھے بچایا۔ صرف تمہارے لیے۔"

عبدالحق کو دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ یہ سب سچ ہے۔ اماں کا بچ جانا معجزے سے کم نہیں۔ جہاں گاؤں کے گاؤں مٹ گئے' اماں کیسے بچیں۔ اور پھر آنکھوں سے محروم ہونے کے بعد اتنے برسوں کیسے جیتی رہیں۔ یہ کھجور کے درخت کہاں سے آئے۔ گھڑے میں پانی کبھی ختم نہیں ہوتا تھا۔ کیوں؟ اور اسے یاد تھا' آنے کے بعد تین دن تک اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ گھڑا بھرا ہی رہتا تھا۔ پھر گھڑا خالی ہونے لگا۔ اور اب پانی مسئلہ بن گیا تھا۔

"ٹھیک کہتی ہو اماں۔ میرا بھی تمہارے سوا کون ہے۔"

"بس...... اب تم شادی کر لو۔"

"ارے اماں......"

"سچ کہتی ہوں پتر۔ یہ نور بانو بہت پیاری لڑکی ہے......"

"تم نے تو اماں اسے دیکھا بھی نہیں......"

"کیوں نہیں دیکھا من کی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیتی ہوں۔ اور وہ تجھ سے پیار بھی کرتی ہے۔"

ایک لمحے کو عبدالحق کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ پھر اس نے افسردگی سے سوچا' اماں تو میری محبت میں کہہ رہی ہیں۔ ورنہ یہ کہاں ممکن ہے......

اسی وقت باہر سے زبیر کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "مالک...... جلدی آئیں۔ پانی نکل آیا۔ مالک پانی......"

عبدالحق نے وہ سب کچھ حمیدہ کے پاس چھوڑا اور باہر لپکا......

❁ ❁ ❁

عبدالحق نے جب پہلی بار کنویں کی بات کی تو راج نے کہا۔ "صاحب...... یہاں پانی کہاں سے آیا۔ یہاں تو ریت ہی ریت ہے۔"

مگر عبدالحق کو گاؤں کی ندی یاد تھی۔ اس نے کہا "جہاں میں کہوں' وہاں کھدائی کر کے دیکھو۔"

ہر پرانی جگہ کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے پاس ایک ہی حوالہ تھا...... حویلی۔ وہ حویلی کے آثار کے پاس کھڑا ہو کر اندازہ کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ اس کی مطلوبہ جگہ کہاں ہوگی۔ اسی طرح اس نے اماں کے گھر کا اندازہ لگایا تھا۔ وہ اپنے لیے مکان وہیں بنانا چاہتا تھا' جہاں کبھی اماں کا گھر تھا۔ جہاں اس نے چاچا جمال دین اور اس کے ویرجی رہتے تھے۔ اس کے اندر اس بات پر اصرار تھا کہ مکان وہیں بنے۔

لیکن وہیں کیوں؟ اس نے خود حیرت سے سوچا۔ اصولاً تو اسے ریت میں دفن حویلی پر اپنے

نئے گھر کی بنیاد رکھنی چاہیے تھی۔

مگر جواب بھی اُسے اپنے اندر سے فوراً ملا تھا۔ اس لیے کہ گاؤں میں وہی ایک جگہ تو تھی جہاں نماز پڑھی جاتی تھی' قرآن پڑھا جاتا تھا۔ اللہ کا ذکر کیا جاتا تھا۔ اور اس کا دل مطمئن ہو گیا تھا۔

اسی طرح اس نے کنویں کی جگہ کا تعین کیا تھا۔ اور اب وہاں سے پانی نکل آیا تھا۔

جہاں کنواں کھودا گیا تھا' وہاں جشن کا سماں تھا۔ تمام مزدور خوشی سے ناچ رہے تھے۔ پانی نکلنے کی خوشی کو صحرا کے باشندوں سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے۔

''آپ نے ٹھیک کہا تھا صاحب۔'' راج نے اس سے کہا۔ ''پانی نکلا ہے...... اور وہ بھی میٹھا پانی۔''

عبدالحق نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھایا اور بولا۔ ''اللہ کا شکر ہے۔''

''بہت مبارک ہو صاحب۔''

''تمہیں بھی مبارک ہو۔ محنت تو تم لوگوں کی ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔ ''اب یہاں چرخی بھی لگا دینا۔''

❁ ❁ ❁

راج اور مزدور کام مکمل کر کے رخصت ہونے لگے۔ عبدالحق نے انہیں طے شدہ اجرت سے زیادہ دیا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ابھی تم لوگ یہاں اور رکو۔ کام بہت ہے یہاں۔''

راج نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''کام کہاں ہے صاحب؟''

''مجھے یہاں پر مکان بنوانے ہیں۔''

''لوگ تو ہیں ہی نہیں۔ مکان کس کے لیے بنوائیں گے؟''

''لوگ آئیں گے۔ یہ گاؤں آباد ہوگا۔ تھوڑے ہی دن کی بات ہے۔''

راج اس کی فیاضی اور حسن اخلاق سے بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ بولا ''جب ضرورت ہو صاحب' بلوا لیجیے گا۔''

''اچھا ہے' ابھی کام کر جاؤ۔''

''اب تو عید سر پر ہے صاحب۔ سب لوگ عید گھر کرنا چاہیں گے۔ میری مانو صاحب' آپ لوگ بھی شہر چلو عید کر کے آ جانا۔''

عبدالحق نے ایک لمحے کو سوچا۔ پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ ''تم نے خود ہی تو کہا ہے کہ لوگ عید گھر میں کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ ہمارا گھر ہے۔''

''پر صاحب عید کی نماز کے لیے تو آپ کو شہر ہی آنا ہوگا۔ یہاں تو نہیں ہو سکتی نا۔''

ان کے جانے کے بعد عبدالحق حمیدہ کے پاس گیا۔ اتفاق سے حمیدہ نے بھی وہی بات کہی۔ ''آج کون سا روزہ ہے پتر۔''

''چھبیسواں اماں۔''

''اللہ کا شکر ہے۔ اس نے تمہیں عید سے پہلے رہنے کو گھر بھی دے دیا۔ اب کچھ عید کی فکر بھی کرو۔''

''مجھے بتائیں اماں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

''اللہ دے تو عید کے دن بندہ نئے کپڑے پہنے' اچھا کھائے پیے۔ اللہ کا شکر ادا کرے۔''

''ٹھیک ہے اماں۔ وہ میں کرلوں گا۔'' عبدالحق نے کہا۔ پھر اس نے عید کی نماز کے بارے میں پوچھا۔

اماں نے بھی وہی کہا جو راج نے کہا تھا۔

اگلا دن یہ حساب لگاتے گزرا کہ انہیں گھر کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ تیسرے دن عبدالحق شہر گیا۔ وہاں ہر زبان پر ایک ہی بات تھی۔ پاکستان بن گیا ہے۔ گزشتہ رات ریڈیو پر اناؤنس ہوا تھا...... اور وہ ریڈیو پاکستان تھا۔

عبدالحق کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ پاکستان ایک خواب تھا' جو جہدِ مسلسل کے نتیجے میں حقیقت میں تبدیل ہو گیا تھا۔

❁ ❁ ❁

حمیدہ ایک ایک چیز کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھی۔ وہ حیران تھی کہ عبدالحق نے ہر چیز کا خیال رکھا ہے۔ کپڑے تو سامنے کی بات تھے۔ وہ چوڑیاں' مہندی' رابعہ کے لیے پائل' اور سب کے لیے زیور بھی لایا تھا۔

''تمہیں ان سب چیزوں کا کیسے خیال آیا پتر؟'' اس نے پوچھا۔

عبدالحق نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو کچھ بھی نہیں پتا تھا اماں۔ دکان دار سے پوچھا تھا۔'' پھر بولا۔ ''پر تمہارے لیے چوڑیاں نہیں لایا اماں۔''

''اب اس عمر میں سب کچھ کھو کر چوڑیاں میں کیا پہنوں گی۔''

''ایک بیٹا تو تمہارا زندہ ہے اماں۔''

''اللہ بڑی عمر دے۔ تیرے ہی لیے تو جی رہی ہوں پتر۔''

''تو اماں' تمہارے لیے میں کڑے لایا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں......''

عبدالحق نے اپنے ہاتھ سے سونے کے وہ کڑے اسے پہنا دیے۔ ''اب اماں' سب لوگوں کو ان کی چیزیں تم دے دینا۔''

اچانک حمیدہ کو خیال آیا۔ ''پتر اپنے کپڑے اور جوتے تو تم نے دکھائے نہیں۔''

عبدالحق نے چپ سادھ لی۔

"بولتے کیوں نہیں۔" حمیدہ نے ذرا خفگی سے کہا۔

"وہ...... یاد ہی نہیں رہا اماں۔"

"یاد نہیں رہا یا جان بوجھ کر......"

عبدالحق نے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "نہیں اماں! سچ یاد نہیں رہا۔"

"تجھے یاد نہیں رہا...... زبیر کے لیے لیتے ہوئے......"

"سب سے پہلے تو اسی کی چیزیں خریدی تھیں اماں۔ میں نے سوچا' سب کے بعد اپنے لیے لوں گا۔ پھر پاکستان بننے کی خوشی میں سب کچھ بھول گیا۔"

"کل جا کر لانا......"

"اب تو جانا مشکل ہے اماں......"

"تو پھر کوئی نئے کپڑے نہیں پہنے گا۔"

"اچھا اماں' دیکھوں گا۔"

مگر اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ حمیدہ نور بانو اور رابعہ کو ان کی چیزیں دے رہی تھی۔ دبی دبی سسکیوں کی آواز سے وہ چونکی۔ "ارے یہ کون رو رہا ہے؟"

"مجھلی بی بی۔" رابعہ نے جواب دیا۔

"کیوں' کیا بات ہے؟" حمیدہ نے نور بانو کا ہاتھ تھاما اور اسے محبت سے سہلانے لگی۔

محبت کا لمس پا کر نور بانو پھٹ پڑی۔ وہ اس طرح روئی کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ حمیدہ اور رابعہ اسے چمکارتی' دلاسے دیتی رہیں۔ "نہ رو' کچھ تو بولو...... کیا بات ہے؟"

ذرا دیر میں نور بانو کا بوجھ ہلکا ہوا۔ "اماں...... باجی...... سب لوگ یاد آ گئے تھے اماں۔" اس نے کہا۔ "اماں ہمیشہ عید کا اہتمام کرتی تھیں۔ میں نئے کپڑے کیسے پہنوں گی اماں......"

"یہ سوچ کر کہ یہ تمہارے لیے وہ لایا ہے' جو تم سے پہلے ماں باپ سے محروم ہو چکا ہے۔ اس میں اس کی خوشی ہے۔"

نور بانو کی کیفیت ایک دم بدل گئی۔ حیا سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ کچھ دیر تو اس سے بولا نہیں گیا۔ "یہ...... یہ...... یہ وہ لائے ہیں۔"

"ہاں۔ اور ہر چیز کا خیال رکھا اس نے۔ بس اپنے لیے کچھ نہیں لایا۔ کہتا ہے' بھول گیا۔ پر میں سمجھتی ہوں۔ اس کا دل چاہتا ہوگا کہ کوئی اور محبت سے اس کی فکر کرے۔ خود اپنے لیے کچھ کرنے میں اتنا مزہ کہاں۔"

نور بانو کو اچانک اس کے وہ کپڑے یاد آ گئے جو اماں نے بڑے اہتمام سے تیار کیے تھے۔

اللہ...... یہ کیسی بات ہے۔ وہ انہیں عید کے موقعے پر ملنے تھے۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "آپ ان کی فکر نہ کریں اماں۔ میں ابھی آئی۔"

نور بانو نے بکس کھولا اور وہ کرتے پاجامے نکالے۔ وہ گیارہ جوڑے تھے۔ باجی کا کاڑھا ہوا کرتا کم تھا۔ اس نے اپنا کاڑھا ہوا کرتا صندوق میں ہی رہنے دیا اور اماں کے تیار کیے ہوئے دس جوڑے نکال کر حمیدہ کے پاس لے گئی۔

حمیدہ نے ٹٹول کر کپڑوں کو دیکھا اور بولی "اتنے کپڑے؟"

"یہ...... یہ اماں نے ان کے لیے بڑی محبت سے تیار کیے تھے۔ اسی لیے میں انہیں چھوڑ نہ سکی۔"

"چلو...... وہ خوش ہو جائے گا۔ اسے بن مانگے مل گیا۔ اللہ کا شکر ہے۔"

تھوڑی دیر بعد حمیدہ نے عبدالحق کو بلا کر وہ کپڑے اسے دیے تو وہ حیران ہو گیا۔ "یہ ماں جی نے سیے...... میرے لیے" اس نے بے ساختہ کہا اور کپڑوں کو چومنے لگا۔

"ماں جی!" حمیدہ نے حسرت سے دہرایا۔

عبدالحق اسے ماں جی کے بارے میں بتانے لگا۔ اس وقت وہ بہت خوش تھا' جیسے کوئی بہت بڑی نعمت مل گئی ہو۔

❁ ❁ ❁

اگلی صبح فجر کے بعد عبدالحق زبیر کے ساتھ مدفون حویلی کی منڈیر پر کھڑا تھا کہ دور سے اسے غبار سا اٹھتا دکھائی دیا۔ دیکھتے رہنے پر احساس ہوا کہ غبار آگے کی سمت متحرک ہے۔

وہ پاکستان بننے کے بعد کی پہلی صبح تھی۔ انہیں ٹھیک طرح سے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی زمین پاکستان میں شامل ہے بھی یا نہیں۔ بس وہ یہ جانتے تھے کہ بابا نے بتایا تھا کہ وہ پاکستان میں ہے۔

اور اب وہ غبار گواہی دیتا تھا کہ اونٹ پر سوار کچھ لوگ اس طرف آ رہے ہیں۔ اتنے فاصلے سے یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ان کی تعداد کیا ہے۔

عبدالحق نے زبیر سے کہا۔ "لاٹھیاں لے آؤ۔"

زبیر لپکتے قدموں سے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دو لاٹھیاں تھیں۔ اس نے ایک لاٹھی عبدالحق کی طرف بڑھا دی۔ جو اب بھی غبار پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ "یہ جو لوگ بھی ہیں' تین اونٹوں پر سوار ہیں۔" عبدالحق نے تبصرہ کرنے والے انداز میں کہا۔

زبیر نے غبار کی سمت دیکھا۔ اسے تو ایسا کچھ دکھائی نہیں دیا۔

لیکن چند منٹ بعد عبدالحق کی بات کی تصدیق ہو گئی۔

آنے والوں نے انہیں دیکھا تو ان کے چہروں سے خوف جھلکنے لگا۔ تاہم وہ وہاں رکے بغیر نہ رہ سکے۔ عبدالحق اس کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔ ان لوگوں کے چہرے ریت سے اٹے تھے۔ اور وہ نڈھال لگ رہے تھے۔ یہ بات طے تھی کہ انہوں نے رات بھر سفر کیا تھا۔ رات کے وقت صحرا کا سفر بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ وہاں سمتوں کا پتا تو دن میں نہیں چلتا۔ رات میں تو یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ آدمی چھوٹے سے دائرے میں سفر کر رہا ہے۔ اور درحقیقت جہاں تھا۔ وہی ہے۔

اب رات بھر سفر کرنے والوں نے صبح ہونے پر دیکھا ہوگا تو چاروں طرف بے نشاں ریت کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا ہوگا۔ اور بھوک پیاس سے ان کا برا حال ہوگا۔ ایسے میں انہیں وہ مکان اور جھونپڑیاں نظر آئی ہوں گی تو ان کے دل میں امید جاگی ہوگی۔ لیکن انہیں ڈر بھی ہوگا۔ بہرحال صحرا میں امید خوف سے بڑی ہوتی ہے۔ کیونکہ صحرا میں بھٹکنے کا مطلب یقینی موت ہوتا ہے۔

وہ لوگ رک تو گئے تھے لیکن انداز ایسا تھا کہ کسی بھی لمحے بھاگ کھڑے ہوں گے۔

''السلام علیکم۔'' عبدالحق نے پرتپاک لہجے میں کہا۔

یہ سنتے ہی ان کے چہروں پر جو سکون نظر آیا' وہ حیران کن بالکل نہیں تھا۔ ''وعلیکم السلام۔'' انہوں نے کہا۔ ''یہ جگہ پاکستان میں ہے نا۔''

''الحمدللہ۔''

''اللہ کا شکر ہے۔'' سب سے بڑے نے کہا۔ ''ہم لوگ یہاں کچھ دیر رک سکتے ہیں؟''

''کچھ دیر کیا' آپ جب تک چاہیں' یہاں رک سکتے ہیں۔''

''چلو نواز...... اترو۔''

وہ تین مرد تھے اور ان کے ساتھ پانچ عورتیں تھیں۔ جس نے بات کی تھی' اس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی' جو یقیناً اس کی ماں تھی۔ دوسرے دو مردوں کے ساتھ دو دو عورتیں تھیں۔ ان میں ایک جوان لڑکی تھی...... سولہ سترہ سال کی۔

بات کرنے والے نے اپنی گود میں اٹھا کر بوڑھی عورت کو اتارا لیکن بوڑھی عورت کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ وہ ریت پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کا حال بہت برا تھا۔ بیٹے نے ریت پر بیٹھتے ہوئے ماں کو سہارا دیا۔ دوسرے لوگ بھی اتر آئے تھے۔

''زبیر...... پانی لاؤ ان لوگوں کے لیے۔'' عبدالحق نے زبیر سے کہا۔ زبیر کے جانے کے بعد وہ بڑے لڑکے کی طرف مڑا۔ ''خواتین کو وہاں بھیج دیں۔ وہاں میری اماں اور بھابی موجود ہیں۔'' اس نے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے تشکر آمیز نظروں سے عبدالحق کو دیکھا' پھر عورتوں سے بولا۔ ''جاؤ...... تم لوگ وہاں چلی جاؤ۔''

عورتیں چلی گئیں۔ زبیر پانی لے آیا تھا۔ بوڑھی عورت کو دو گھونٹ پانی دیا گیا۔ اس کے چہرے پر بحالی نظر آنے لگی۔

❁ ❁ ❁

ایک گھنٹے بعد عبدالحق ان کے بارے میں سب جان چکا تھا۔ وہ تینوں بھائی تھے۔ سب سے بڑا نیاز تھا۔ اس کے ساتھ اس کی ماں تھی۔ پھر نواز تھا اور سب سے چھوٹا ریاض۔ تینوں شادی شدہ تھے اور ان کی بیویاں بھی ساتھ تھیں...... سب سے کم عمر لڑکی ان کی بہن تھی۔

ان لوگوں کا تعلق اودے پورے تھا۔ وہ وہاں کے خوش حال لوگوں میں سے تھے لیکن پاکستان کی خاطر اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ آئے تھے۔ اپنے بھرے پرے گھر سے پاکستان کے لیے نکلتے ہوئے انہوں نے صرف تن کے کپڑے لیے تھے۔

''شہر یہاں سے کتنا دور ہے؟'' نیاز نے پوچھا۔

''بارہ پندرہ میل ہوگا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''یعنی زیادہ وقت نہیں لگے گا۔''

''تو آپ لوگ ابھی جانا چاہتے ہیں۔''

''جی ہاں۔ جانا تو ہے۔''

عبدالحق سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ''کوئی ضروری تو نہیں۔ آپ لوگ یہاں رک سکتے ہیں۔''

''آپ پر بوجھ نہیں بنیں گے۔''

''بھائی بھائی کے لیے بوجھ نہیں ہوتا۔'' عبدالحق نے سادگی سے کہا۔ ''آپ چاہیں تو یہاں زندگی بھر رہیں۔''

نیاز نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ پھر اس کی نگاہوں سے تشکر جھلکنے لگا۔ ''آپ کے خلوص اور محبت نے مجھے خرید لیا ہے لیکن یہاں ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ہم لوگ نہ کاشتکار ہیں' نہ گلہ بان۔ ہم تاجر ہیں۔ ہمارے لیے شہر ہی مناسب رہے گا۔''

''لیکن ابھی شہر میں آپ کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ عورتوں کو لے کر کہاں پھرتے رہیں گے۔ میری مانیں تو عید یہیں کر لیں۔ پھر آپ شہر جا کر حالات دیکھیں۔ بات بن جائے تو آ کر سب کو لے جائیں۔''

''بات تو ٹھیک ہے لیکن......''

''دیکھیں' یہاں جگہ کی کمی نہیں۔ اللہ کے فضل سے ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ دو مکان ہیں۔ دو جھونپڑیاں بھی ہیں۔ ایک مکان میں آپ لوگ رہ سکتے ہیں۔''

"ہم آپ کا یہ احسان......"

"اس میں احسان کی کوئی بات ہی نہیں۔" عبدالحق نے اس کی بات کاٹ دی۔

اس کی ضرورت تو نہیں تھی۔ مگر عبدالحق نے دو مکان یہ سوچ کر بنوائے تھے کہ ایک زہیر اور رابعہ کے لیے ہے۔

شام تک انہیں پوری طرح احساس ہو گیا کہ پاکستان بن چکا ہے۔ شام تک تین اور مہاجر گھرانے وہاں پہنچ گئے۔ وہ سب بہت زیادہ تباہ حال تھے کیونکہ وہ سب پیدل چل کر آئے تھے۔ اور صحرا میں تو سفر ہی آسان نہیں ہوتا۔ کجا یہ کہ پیدل سفر۔

عبدالحق نے انہیں بھی ٹھہرا لیا۔

وہاں اسلامی یگانگت اور ایثار کا جو مظاہرہ دیکھنے میں آیا، وہ اس اعتبار سے غیر معمولی نہیں تھا کہ وہ پورے پاکستان کا منظر تھا۔ ہر جگہ یہی کچھ ہو رہا تھا۔ لوگ کھلی باہوں کے ساتھ ہندوستان سے لٹ پٹ کر ہجرت کر کے آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ چودہ سو سال پہلے انصار مدینہ نے جو روایت قائم کی تھی، وہ آج بھی زندہ تھی۔ بلکہ اب اس کا احیا ہو رہا تھا۔

پہلے آنے والوں نے خود ہی فیصلہ کر لیا کہ بدلی ہوئی صورت حال میں ان کے لیے الگ مکان میں رہنا مناسب نہیں۔ طے یہ پایا کہ دن میں عورتیں ایک گھر میں رہیں گی، کھانا پکانا کریں گی۔ رات کو شادی شدہ لوگ ایک گھر میں رہیں گے۔ غیر شادی شدہ عورتیں دوسرے گھر میں رہیں گی اور غیر شادی شدہ مرد جھونپڑیوں میں شب بسر کریں گے۔

انہوں نے عبدالحق کو مستثنیٰ کرنا چاہا۔ لیکن وہ نہ مانا۔

اگلے روز وہ مردوں کے ساتھ شہر گیا اس نے زبردستی ان کے اور گھر والوں کے لیے عید کی خریداری کی۔ ضرورت کی چیزیں خریدیں۔ پھر انہوں نے اپنی مسجد کے لیے بات کی۔ بالآخر انہیں ایک پیش امام مل گیا۔

اب وہ عید کی نماز اپنی مسجد میں پڑھ سکتے تھے۔

❁ ❁ ❁

عید کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں تیزی سے آباد ہونے لگا عبدالحق نے شہر جا کر پٹواری سے بات کی۔ کاغذات دکھائے۔ لیکن وہ آدھی زمین کے کاغذات تھے...... اس زمین کے جو اس کے بابا جی نے چاچا جمال دین کے نام کی تھی۔ باقی کاغذات حویلی میں ہوں گے، جو ریت کے تلے دفن تھی۔

"بابا...... اس وقت کاغذات کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک زمین پر کسی کا دعویٰ نہیں، آپ قبضہ کر سکتے ہو۔" پٹواری نے کہا۔

"لیکن میں قبضہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں صرف اپنا حق لینا چاہتا ہوں۔"

"تم عجیب آدمی ہو۔ میں بولتا ہوں، جہاں تک چاہو زمین لے لو۔ تم حساب کتاب میں پڑ رہے ہو۔"

عبدالحق کے اصرار پر پٹواری گاؤں آیا۔ گاؤں میں وہ لوگوں سے ملا تو اور متاثر ہوا۔ لوگ تو اس نوجوان کی پرستش کرتے تھے۔ اس نے ان لوگوں کو گھر بنوا دیے تھے۔ غیر مشروط طور پر انہیں زمین دی تھی اور ہر طرح سے ان کی مدد کی تھی۔

"تم بابا اپنے لیے تو زمین لے نہیں رہے ہو۔ پھر میری بات کیوں نہیں مانتے" پٹواری نے عبدالحق سے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ حد بندی کر دیں۔ اور پہلے ہمارے گاؤں کو نہری پانی بھی ملتا تھا۔ لال آندھی کے بعد وہ رک گیا۔"

"حد بندی میں کر دیتا ہوں پر پانی کے لیے بابا تم کو محکمہ زراعت والوں سے بات کرنی ہوگی۔"

پٹواری نے بہت کھلے دل سے حد بندی کی۔ اس نے وہ زمین بھی شامل کر دی، جس کے کاغذات حویلی میں دفن تھے۔ اس کے علاوہ اس نے اِدھر اُدھر کی اور زمینیں بھی اس گاؤں میں شامل کر دیں، جن کا کوئی دعوے دار نہیں تھا۔

"اب بابا اس گاؤں کا کوئی نام بھی رکھ دو۔"

"نام؟" عبدالحق نے حیرت سے کہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ پرانا نام تو اب مناسب نہیں۔

"نام کی کیا ضرورت ہے؟" اس نے کہا۔

نیاز آگے بڑھ آیا وہاں اس وقت گاؤں کے سبھی لوگ موجود تھے۔ "نام میں بتاتا ہوں۔"

"بولو بابا۔"

"اس گاؤں کا نام ہے حق نگر۔"

عبدالحق کو احتجاج کا موقع بھی نہیں ملا۔ سب لوگ اس نام کی تائید میں بولنے لگے۔

"ٹھیک ہے بابا۔ آج سے یہ حق نگر ہے۔" پٹواری بولا۔ پھر وہ عبدالحق کی طرف مڑا۔ "تم بابا کسی دن میرے پاس آ جاؤ میں تمہیں محکمہ زراعت کے ایک افسر سے ملوا دوں گا۔ پانی کی بات کر لینا۔"

"میں آ جاؤں گا۔" عبدالحق نے کہا۔

❁ ❁ ❁

نیاز عید کے تیسرے دن اپنے بھائی نواز کے ساتھ شہر گیا تھا۔ وہاں جا کر جو انہوں نے جائزہ لیا تو صورت حال کو خاصا مایوس کن پایا۔ ان کے پاس تھوڑی بہت رقم تھی۔ باقی تو سب کچھ وہ پیچھے

ہی چھوڑ آئے تھے۔ انہیں پتا چلا تھا کہ ہندوان کے گھر پر حملے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ عورتیں بھی تھیں۔ عزت کا معاملہ تھا۔ وہ راتوں رات چپکے سے نکل آئے عزت سے بڑھ کر تو کوئی چیز نہیں ہوتی۔

دونوں بھائی منہ لٹکائے واپس آ گئے تو عبدالحق سے بات ہوئی۔ ''آپ لوگ کام کیا کرتے ہیں؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''میری تو دکان تھی ریاض میرے پاس ہوتا تھا۔ اور یہ نواز مکان بناتا تھا۔''

عبدالحق کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''تب تو بات بن سکتی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''میرا مشورہ مانیں گے آپ؟''

''مشورہ کیسا، آپ حکم کریں۔''

''یہ گاؤں آباد ہوتا ہے تو یہاں مکان بھی بنیں گے نواز بھائی کا تو کام ہو گیا۔ اور آپ لوگوں کے لیے میرا مشورہ ہے کہ مویشی پالیں۔''

''مگر ہمیں اس کا کوئی تجربہ ہی نہیں ہے۔''

''زبیر تجربہ کار ہے۔ آپ اس کے ساتھ مل کر کام کریں۔ تجربہ آپ ہی ہو جائے گا۔''

''ہمارے پاس زیادہ رقم نہیں ہے۔''

''اس کی فکر نہ کریں سرمایہ زبیر کا ہوگا۔''

نیاز ہچکچا رہا تھا۔

''شہر میں جگہ بنانے کی نسبت یہ زیادہ آسان ہے۔'' عبدالحق نے اسے سمجھایا۔ ''بکریوں میں برکت بھی ہے۔''

یوں وہ لوگ وہیں رک گئے اور انہوں نے زبیر کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ نواز بھی مصروف ہو گیا تھا۔ وہ لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں رکے تو شاید اس لیے کہ نیاز کو گاؤں کا نام تجویز کرنا تھا۔

❁ ❁ ❁

عید سے پہلے جو اور گھرانے آئے تھے وہ کاشت کار تھے۔ عبدالحق نے انہیں وہاں رکنے کو کہا تو وہ ہچکچائے۔ ''یہاں پانی تو ہے نہیں۔''

''ہمارے گاؤں میں پانی تھا۔'' عبدالحق نے کہا۔ ''یہاں فصلیں ہوتی تھیں۔ انشاءاللہ اب بھی ہوں گی۔ انشاءاللہ ہمیں پانی ملے گا۔''

اس کے لہجے میں ایسا یقین تھا کہ وہ لوگ ماننے پر مجبور ہو گئے۔ ویسے بھی وہ انہیں تمام سہولتیں

فراہم کر رہا تھا اور وہ بھی بغیر کسی لالچ کے۔ سر چھپانے کو ٹھکانہ اور پیٹ بھرنے کو کھانا۔ اس ابتری کے عرصے میں یہ بہت بڑی نعمت تھی۔ وہ جانتے تھے کہ دردر بھٹکنے میں بڑی کٹھنائیاں ہیں۔

عبدالحق شہر گیا اور پٹواری کی وساطت سے محکمہ زراعت و آب پاشی کے افسر سے ملا۔ افسر نے اس کی بات بڑی توجہ اور ہمدردی سے سنی۔ وہ اس سے متاثر بھی نظر آ رہا تھا۔ ''آپ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں عبدالحق صاحب۔''

''جی...... میں گریجویشن نہیں کر سکا۔ ایف اے پاس ہوں۔'' عبدالحق نے بڑی عاجزی سے کہا۔

''آپ جیسے لوگوں کی تو سرکاری محکمے میں ضرورت ہے۔''

''فی الحال تو مجھے اپنے گاؤں کی فکر ہے جناب۔''

''بات یہ ہے عبدالحق صاحب کہ اس وقت ہمارے پاس وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایسے میں ہجرت کر کے آنے والوں کے بوجھ نے مسائل میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔ آپ کا کیس میں سمجھ گیا ہوں۔ لال آندھی نے نہ صرف نہری رابطہ منقطع کر دیا۔ بلکہ زرعی اراضی کو صحرا میں تبدیل کر دیا ہے۔''

''نہری رابطہ بحال کیسے ہوگا؟''

''موجودہ صورت حال میں تو یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ پانی بلندی سے نشیب کی طرف جاتا ہے نشیب سے بلندی کی طرف نہیں۔ اور آپ کا گاؤں پورے علاقے سے کم از کم بارہ پندرہ فٹ بلند ہو گیا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہیں نا آپ؟''

عبدالحق کی سمجھ میں بات آ رہی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اب ہمارے پاس ایسے وسائل نہیں کہ ہم ریت میں دبے ہوئے گاؤں کو نکال سکیں۔ اور اس کے بغیر کچھ ہو نہیں سکتا۔''

''اگر میں یہ کام کر لوں تو؟''

''پھر کوئی مسئلہ نہیں۔ لیکن یہ آپ کریں گے کیسے؟''

''کوشش کروں گا۔ اللہ سے امید ہے کہ کامیابی ہوگی۔''

وہ رخصت ہونے لگا تو افسر نے کہا۔ ''میری بات پر غور کیجیے گا۔ ہمارا ملک جس مرحلے سے گزر رہا ہے اسے آپ جیسے پڑھے لکھے جوانوں کی ضرورت ہے۔ ملک کے لیے کچھ کرنے کا ارادہ ہو تو مجھ سے مل لیجیے گا۔''

عبدالحق وہاں سے چلا آیا۔

❁ ❁ ❁

وہ اس پر سوچتا رہا۔ بظاہر یہ کام ناممکن تھا۔ ہزاروں ایکڑ زمین پر سے پندرہ فٹ ریت ہٹانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ اس کے لیے مشینوں اور آلات کی ضرورت تھی۔ اور اس پر بھی اس میں وقت لگتا۔ اور مشینوں اور آلات کی اس میں استطاعت نہیں تھی۔

رقم تو وہ حویلی سے بھی خاصی لایا تھا۔ پھر اماں نے بھی دیے تھے لیکن وہ خرچ بھی تو کھلے دل سے کرتا رہا تھا۔ گاؤں کو آباد کرنے کے لیے اس نے بہت خرچ کیا تھا۔ اب بھی اس کے پاس اچھی خاصی رقم تھی لیکن جو مہم درپیش تھی اُس کے لیے تو وہ بہت ہی کم تھی۔ پھر یہ سوچ کر اس کا دل دکھ رہا تھا کہ اب تک کے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ ریت کے نیچے سے گاؤں کو نکالنے کا مطلب تھا کہ جو مکان اس نے بنوائے ہیں وہ ختم ہو جائیں گے۔ اور گاؤں کے نکلنے کے بعد نئے سرے سے تعمیر ہوگی۔

وہ سوچتا رہا لیکن کوئی حل سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

اول تو وہ پریشان ہوتا ہی نہیں تھا۔ فکرمند ہوتا تو وہ قرآن پڑھنے بیٹھ جاتا۔ قرآن میں اس کے لیے یہ عجیب تاثیر تھی کہ وہ ہر پریشانی بھول جاتا تھا۔ ایک اور نعمت مسجد کے امام مہر علی تھے۔ وہ ان کے پاس جا بیٹھتا۔

مہر علی بہت سادہ طبع اور دین سے بہت محبت کرنے والے تھے۔ ان کی طبیعت میں بہت نرمی اور حلیمی تھی۔

عبدالحق مہر علی کے پاس چلا گیا۔

''کیا بات ہے پتر۔ کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' مہر علی نے پوچھا۔

عبدالحق نے انہیں پوری روداد سنائی۔ ''اور میں نے پانی کا وعدہ کر کے لوگوں کو روکا تھا۔'' اس نے آخر میں کہا۔

مہر علی چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر بولے۔ ''دیکھو پتر! اللہ کے ہاں نیتیں چلتی ہیں۔ تمہاری نیت اچھی ہے تم نے جو کچھ کیا اور کر رہے ہو بےلوثی کے ساتھ کر رہے ہو۔ اس میں تمہاری کوئی غرض نہیں ہے۔ تو اللہ تمہاری مدد ضرور کرے گا۔''

''مگر کیسے؟ مجھے کوئی امکان نظر نہیں آ رہا ہے۔''

''یہ امکاں تو ہم عقل والوں کی بات ہے۔ اللہ کے ہاں تو ہونی ہوتی ہے اور ہو جاتی ہے۔ چاہے بعد میں بھی بندوں کی سمجھ میں نہ آئے۔''

عبدالحق شرمندہ ہو گیا۔ عمر اس کی کم تھی لیکن کتنا کچھ وہ دیکھ چکا تھا۔ اماں اس کی مثال تھیں۔ جہاں گاؤں کے گاؤں دفن ہو گئے وہاں اماں زندہ رہیں۔ اور وہ کیسے زندہ رہیں۔ کھجور کے وہ درخت اب بھی موجود ہیں۔ جن کے ذریعے سے اللہ نے اماں کو غذا فراہم کی۔ عبدالحق جانتا تھا

کہ وہ درخت اللہ کی قدرت کی نشانی ہیں۔ اس علاقے میں کھجور کم ہی ہوتا ہے۔ آگے سندھ کی طرف بہت ہے اور پھر کھجور کا درخت راتوں رات بڑا نہیں ہوتا۔ مگر اماں کو تو سب کچھ جیسے تیار ملا۔ پینے کے لیے پانی۔ وہ گھڑا جس میں پانی کم نہیں ہوتا تھا۔ تین دن تک تو اللہ کی اس قدرت کا ان سب نے مشاہدہ کیا تھا۔ اب سوچو اماں کے بچنے کا کوئی امکان تھا نہیں۔ ہرگز نہیں۔ مگر اماں بچ گئیں اور موجود ہیں۔ یہ اللہ کی قدرت ہے۔ واقعی اللہ کے ہاں امکان نہیں ہوتا۔ ہونی ہوتی ہے اور ہو کر رہتی ہے۔

اور وہ خود کیسے بچا تھا۔ لال آندھی آئی تو وہ خود بھی تو اس کی حدوں میں تھا۔ ایک وقت ایسا لگتا تھا کہ وہ بھی ریت میں زندہ دفن ہو جائے گا۔ اس کے جسم میں ہلنے کی بھی طاقت نہیں تھی۔ ریت اس پر برس رہی تھی۔ اور اب بھی وہ زندہ تھا۔

اتنا کچھ دیکھنے کے بعد بھی وہ امکان کی بات کرتا ہے! سچ ہے انسان پر جب کوئی بحران آتا ہے تو وہ اللہ کی پچھلی مہربانیاں اور نشانیاں بھول جاتا ہے۔ وہ مایوس ہو جاتا ہے اور اللہ کو پکارنے کی بجائے امکان کی جستجو میں اِدھر اُدھر سر ٹکراتا رہتا ہے۔

عبدالحق پہلے تو شرمندہ ہوا۔ پھر اس کے اندر ایک یقین ابھرا۔ اللہ کے حکم سے گاؤں ریت میں دفن ہوا تو اللہ کی مرضی ہے تو وہ ریت سے نکلے گا بھی۔ آباد بھی ہوگا۔ اور اگر اللہ کی یہ مرضی نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔

اس رات عشا کے بعد وہ ٹہلتا ہوا حویلی کی طرف چلا گیا۔ وہاں وہ اس منڈیر پر بیٹھ گیا۔ دعا میں اس نے اللہ سے گاؤں کے لیے مدد مانگی تھی اور اس کا دل مطمئن ہو گیا تھا۔ جیسے اب یہ معاملہ اس کا نہیں رہا ہے۔

حویلی کی چھت کی اس منڈیر پر بیٹھے بیٹھے وہ حویلی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کبھی وہاں کیسی رونق ہوتی تھی۔ اس کی نگاہوں میں بچپن کے منظر پھرنے لگے۔ بابا جی گھوڑا بنے ہوئے ہیں اور وہ ان کی پیٹھ پر سواری کر رہا ہے۔ ماتا جی بابا جی کا پسینے میں نہایا ہوا جسم تولیے سے خشک کر رہی ہیں اماں اسے دودھ کا پیالہ دے رہی ہیں۔

پھر اس نے جمال دین کو دیکھا۔ اسے یاد آیا کہ گھوڑا بننے کی ذمہ داری چاچا جمال دین نے سنبھال لی تھی۔ اسے اپنا لکڑی کا گھوڑا یاد آیا۔ چاچا جمال دین نے کیسے اسے سجایا تھا۔

اور اسے اپنا کمرا یاد آیا۔ حویلی کا سب سے روشن اور ہوادار کمرا! سچ یہ ہے کہ وہ کمرا اسے بہت عزیز تھا۔ رہنے کی کوئی جگہ کبھی اسے اتنی اچھی نہیں لگی جتنا وہ کمرا لگتا تھا۔ اس کمرے میں کوئی بات تھی۔ اس میں عجیب سا سکون تھا۔ اور وہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ کسی محبت کرنے والی مہربان ہستی کی موجودگی کا احساس!

اسے حیرت ہوئی کہ اس کمرے کو وہ کیسے بھولا ہوا تھا۔ اس نے کبھی اسے یاد ہی نہیں کیا۔ اس وقت وہ کمرا یاد آیا تو اس کا دل اس کمرے کے لیے مچلنے لگا۔ اس کا بس چلتا تو ریت ہٹا کر اس کمرے میں پہنچ جاتا۔

وہ خواہش بچکانہ حد تک شدید تھی۔ اس کے زیر اثر اس کا جسم کانپنے لگا۔ اس نے دھیان بٹانے کی کوشش کی۔

اسے حویلی کا آخری حوالہ یاد آیا۔

حویلی کا احاطہ لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ اکثریت اجنبی لاشوں کی تھی۔ پھر اس میں اسے ویرجی کی لاش نظر آئی تھی اور پھر چاچا جمال دین اور کئی جاننے والوں کی لاشیں ملی تھیں۔

اس آخری روز وہ حویلی کے ہال سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ حویلی کے صدر دروازے پر دو لاشیں پڑی تھیں۔ اندر دیوار سے ٹک کر پتا جی بیٹھے تھے۔ وہ زندہ تھے ان کے قریب ہی مولوی برکت علی اور کیدار ناتھ کی لاشیں پڑی تھیں۔

وہ اس منظر کو تازہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یادوں میں وہ سب کچھ دہرانا نہیں چاہتا تھا لیکن ان یادوں سے دامن چھڑانا اس کے بس میں نہیں تھا وہ تو جیسے کسی ٹرانس میں تھا۔

اور اب تو وہ جیسے جیتا جاگتا منظر تھا!

وہ پتا جی کو لپٹائے بیٹھا تھا۔ ان سے بولا نہیں جا رہا تھا لیکن انہیں بہت باتیں کرنی تھیں۔ وقت بہت کم تھا۔ لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے تھے۔ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا اور بہت کچھ مبہم تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ اس وقت اس کا ذہن ٹھیک سے سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ مگر اب بھی اسے پتا جی کا کہا ہوا ایک ایک لفظ یاد تھا ایک بات طے تھی گاؤں پر بے پور والوں نے حملہ کیا تھا۔

اچانک اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ پتا جی کی بات اسے یاد بھی آئی اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں نے جڑ کر جیسے مفہوم بھی پا لیا۔

پتا جی نے کہا تھا...... تہ خانے میں جو کچھ ہے' سب تمہارا ہے۔ تم دلی جا کر پڑھو۔ یہاں نہیں رکنا۔

تہ خانہ! سب کچھ!!

اچانک اس کا ذہن جیسے روشن ہو گیا۔ سب کچھ' اس کی سمجھ میں آنے لگا۔ تہ خانے میں تجوری تھی۔ زمین کے کاغذات کے علاوہ وہاں بھاری نقد رقم بھی ہوگی اور شاید سونا بھی۔ اور وہ سب کچھ اس کا تھا۔

یادوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس کا ذہن بہت تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ اس کے پاس کھدائی کرا کے گاؤں کو برآمد کرانے کے وسائل نہیں تھے لیکن وہ وسائل حاصل ہو سکتے تھے۔ وہ

وسائل موجود تھے۔ بس انہیں پانے کی کوشش کرنی تھی۔

بس! حویلی کے تہ خانے تک رسائی حاصل کرنی تھی۔ اور اس کے لیے اس کے پاس وسائل موجود تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر وہ حویلی کو برآمد کرانے میں کامیاب ہو گیا تو گاؤں بھی برآمد ہو جائے گا۔

❁ ❁ ❁
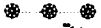
نور بانو اب پہلے کے مقابلے میں خوش تھی۔ اب اسے یہاں آئے ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا تھا کہ وہ وہاں اور یہاں کی زندگی کا موازنہ کر سکتی تھی...... تقابلی جائزہ لے سکتی تھی۔ اور خوش وہ یوں تھی کہ اسے یہاں کی زندگی واضح طور پر اچھی لگی تھی۔

یہ ضرور تھا کہ وہاں کی زندگی آسان تھی اور یہاں کی سخت۔ لیکن وہ زندگی بے رنگ بھی تو تھی۔ جبکہ یہاں زندگی میں تمام کے تمام رنگ موجود تھے۔ وہاں ہر چیز میسر تھی۔ یہاں پانی بھی بہت بڑی نعمت تھا۔ وہاں موسم کی سختیاں نہیں تھیں۔ گرمی آئی تو ہلکے کپڑے پہن لیے۔ سردی آئی تو گرم کپڑے پہن لیے۔ یہاں موسم بے رحمی کی حد تک سخت تھا وہاں موسموں سے لطف لیا جاتا تھا۔ یہاں موسم آزمائش تھا۔

نور بانو نے بہت کم وقت میں سمجھ لیا کہ یہ کنوئیں کا فرق ہے۔ وہاں زندگی کا منظر بہت محدود تھا۔ وہاں دنیا چار دیواروں کے درمیان تھی۔ آسمان بے کراں نہیں تھا۔ صحن سے جو آسمان کا چھوٹا سا ٹکڑا نظر آتا تھا' وہی آسمان تھا۔ ہاں کبھی چھت پر چلے گئے تو آسمان دیکھ لیا۔ مگر یہاں کے آسمان کے مقابلے میں تو وہ بھی بہت چھوٹا تھا۔

نور بانو نے سمجھ لیا کہ وہ پنجرے میں قید پرندوں جیسی زندگی تھی۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز میسر تھی۔ کھانا' پینا' کپڑے' کتابیں سب کچھ تھا۔ وہ پڑھتی تھی' سمجھتی تھی۔ اس کے مطابق عمل بھی کرتی تھی لیکن وہ کچھ مشکل نہیں تھا۔ اللہ کے کسی حکم پر عمل کرنا اسے مشکل نہیں لگتا تھا۔ کم از کم اوتار سنگھ سے بلا ارادہ محبت سے پہلے تو صورت حال یہی تھی۔ وہ محبت ہوئی تو پہلی بار اسے احساس ہوا کہ یہ کام آسان نہیں۔ ورنہ وہ سمجھتی تھی کہ اللہ کے احکامات مانتے ہوئے بڑی آسانی سے زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ اور جب اوتار سنگھ کی محبت سے...... اپنے آپ سے لڑنا پڑا' تب بھی وہ صحیح معنوں میں نہیں سمجھ پائی۔ بلکہ وہ اور مغرور ہو گئی۔ وہ باجی کو حقیر سمجھنے لگی جو اپنی خواہش نفس سے لڑنے کی بجائے اس کے سامنے سپر ڈال بیٹھی تھیں۔ اس نے نہیں سمجھا کہ ملامت کرنا دنیا کا آسان ترین کام ہے۔ اور نفس سے لڑنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ زندگی کی ترغیبات سامنے موجود نہ ہوں تو نفس بے معنی ہے۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ جنت کا حصول نہایت آسان ہے۔

اب پردے ہی کو لو۔ وہاں پردے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ چھوٹے ٹھاکر سے پہلے تو وہاں کوئی ایسا تھا ہی نہیں' جس سے پردہ کیا جائے۔ باہر وہ نکلتی نہیں تھیں۔ آغا میاں موجود تھے۔

باہر کے تمام معاملات وہ دیکھتے۔ ضرورت کی ہر چیز پیسوں سے مل جاتی تھی۔ اس وقت تو اس نے کبھی ایسے نہیں سوچا۔ لیکن وہ سوچتی تھی کہ اگر آ کا میاں نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ بھائی نہ ہوتیں تو سودا سلف لانے کے لیے اماں کو بازار جانا پڑتا۔ تب پردہ ان کے لیے آزمائش ہوتا۔ اور اگر اماں بیمار ہو جاتیں تو اسے بازار جانا پڑتا۔ تب اس کی آزمائش ہوتی۔ وہ کیا کرتی۔ مردوں کے سامنے اس کے منہ سے آواز بھی نہ نکلتی۔ مگر دو چار بار جاتی تو اسے سمجھوتہ کرنا آ جاتا۔

یہاں کھلی فضا میں اسے آزادی کا احساس ہو رہا تھا۔ پہلی بار وہ یہ سوچ رہی تھی کہ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ کوئی اسے نہیں روکے گا۔ اب اسے اللہ کی پابندیوں کا خیال رکھنا ہے۔ اب یہ اس کے لیے آزمائش ہے۔ عبدالحق اس کے سامنے چلتا پھرتا ہے۔ وہ اسے کھل کر نظر بھر کر نہیں دیکھتی لیکن چوری چوری دیکھتی ہے۔ اسے نہیں یاد رہتا کہ اللہ نگاہوں کی چوری سے بھی باخبر ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ سب کچھ دیکھتا ہے۔ اب ہوئی نا مشکل۔

پردہ تو یہاں بھی ہوتا تھا۔ اسی کو دیکھ کر اس کی سمجھ میں آیا کہ اصل میں پردہ کیا ہے۔ یہاں زندگی ایسی تھی کہ عورتوں کو مردوں کے ساتھ کام کرنا پڑتا تھا۔ ان کا ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ گھر کے باہر بہت سے کام عورتوں کو کرنے پڑتے تھے۔ وہ پردہ کرتی تھیں۔ پردے کا اہتمام نہیں کرتی تھیں۔ وہ گھونگھٹ اس طرح نکالتیں کہ ان کا چہرہ چھپ جاتا۔ پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ پردہ برقع پہننے کا نام نہیں ہے۔ برقع پہنے بغیر بھی پردہ کیا جا سکتا ہے۔ پردہ خود کو اس طرح رکھنے اور چلنے پھرنے کا نام ہے کہ کم از کم آپ کے جسم کے حوالے سے کسی شخص کے ذہن میں کوئی سفلہ خیال نہ پیدا ہو۔ کم از کم آپ کی کسی کوتاہی اور بے پروائی کی وجہ سے ایسا نہ ہو۔ سچ یہ ہے کہ اسے چادر برقعے کے مقابلے میں زیادہ اچھی لگی۔

پھر پہلی بار اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ ہر چیز کے دو رخ ہیں...... ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ ظاہری رخ سے آپ دنیا دکھاوا تو کر سکتے ہیں۔ لوگوں کی نظر میں اچھے تو بن سکتے ہیں۔ لیکن اللہ تو سب کچھ جانتا ہے۔ اس کے سامنے سرخرو ہونے کے لیے باطن کو صاف کرنا ضروری ہے۔ اس اعتبار سے ظاہری پردے کی کوئی اہمیت نہیں۔ اہمیت باطنی پردے کی ہے۔ اگر وہ عبدالحق کے سامنے نہیں آتی لیکن چھپ چھپ کر اسے دیکھتی ہے تو پردہ بے کار ہے۔ اگر وہ برقع اوڑھ کر خود کو نمایاں کرتی ہے تو وہ سزا کی مستحق ہے۔

ان سوچوں کے نتیجے میں اس کے اندر تبدیلیاں آئیں۔ ویسے بھی وہ ایک بالکل مختلف معاشرت میں چلی آئی تھی۔ ایسے میں یا تو آدمی اس نئی معاشرت کو یکسر مسترد کر دیتا ہے۔ یا پھر خود کو اس میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اس کے ذہن میں تو ایک لمحے کے لیے بھی اس معاشرت کو مسترد کرنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ چنانچہ اسے مطابقت تو پیدا کرنی تھی۔ اسے پتا چل رہا

تھا کہ اس کے ذہن میں دین کی تفہیم پیدا ہو رہی ہے۔

وہ یہاں چولی اور گھا گھرے میں آتی تھی' جو یہاں کا خاص لباس تھا۔ اسے حجاب تو آیا تھا لیکن اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ پہلی بار بے پردہ باہر نکلی تھی۔ بعد میں اسے اندازہ ہوا کہ اسے وہ لباس برا نہیں لگا تھا۔ بلکہ اچھا لگا تھا۔ پھر یہاں اس نے حمیدہ کو اسی لباس میں دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ یہ لباس غیر اسلامی نہیں ہے۔ اور حمیدہ خود کو چادر میں اس طرح لپیٹتی تھی کہ اس کے سامنے برقع بے حیثیت لگتا تھا۔

چنانچہ اس کے بعد اس نے چولی اور گھا گھرا شوق سے پہنا۔ عبدالحق اس کے لیے عید کے کپڑے شہر سے لایا تھا لیکن ساتھ چادر بھی تھی۔ اس نے حمیدہ کی باقاعدہ تقلید شروع کر دی۔

وہ رابعہ کو روز قرآن پڑھاتی تھی اسے اسلامی معاشرت کے بارے میں بتاتی تھی۔ مگر ساتھ ہی وہ باہر کے کاموں میں دلچسپی لینے لگی۔ اس کے علاوہ وہ کھانا بہت شوق سے پکاتی تھی۔ وہ سب اس کے ہاتھ کے کھانے کے عادی ہو گئے۔ خاص طور پر حمیدہ۔ اس نے دہلی کے کھانے بھلا کب کھائے تھے۔

ابتدا میں تو اسے عبدالحق سے بہت حجاب آتا تھا۔ پھر چادر لے کر' گھونگٹ نکال کر وہ بلا جھجک اس کے سامنے سے گزرنے لگی۔ ہاں اس کی موجودگی میں چلتے پھرتے اس کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں۔ ان کی لے ہی بدل جاتی تھی...... اور قدموں میں تیزی کے ساتھ لڑکھڑاہٹ بھی آ جاتی تھی۔ مگر وہ سب کچھ بے حد خوش گوار ہوتا تھا۔

پھر اور لوگ آئے اور عبدالحق نے انہیں روک لیا۔ عید بہت اچھی ہو گئی۔ شروع میں تو ایک فیملی کی طرح رہے۔ بعد میں عبدالحق نے ان کے لیے الگ کچے مکان بنوا دیے۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں اور سب کی سب بہت خوب صورت تھیں۔

عورتوں میں ایک جبلی حس ہوتی ہے۔ بہت سی باتیں وہ بغیر کہے جان لیتی ہیں۔ نور بانو بھی جان گئی کہ ان میں سے ہر لڑکی عبدالحق میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اس میں ان کا قصور بھی نہیں تھا۔ عبدالحق تھا ہی ایسا۔ لیکن نور بانو بھڑک گئی۔ اب تک وہ مسابقت سے محفوظ تھی لیکن اب مسابقت درپیش تھی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ پہلی کمزوری تو یہ تھی کہ عبدالحق پر اس کا کوئی حق نہیں تھا۔ وہ تو یہی جانتی تھی کہ عبدالحق کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں مگر اسے اپنی محبت کی خاطر اسے ان لڑکیوں سے محفوظ رکھنا تھا۔

چادر اوڑھنے کا سلیقہ اس نے حمیدہ سے سیکھ لیا تھا۔ وہ باہر نکلنے لگی۔ چند ہی دنوں میں اس کی جھجک ختم ہو گئی...... وہ چادر کو چہرے پر اس طرح لیتی کہ اس کا چہرہ چھپ جاتا لیکن عبدالحق قریب ہوتا تو جیسے اس کا پلو خود بہ خود سرک جاتا۔ کبھی کوئی لڑکی عبدالحق کے آس پاس ہوتی اور اسے اپنے

وجود کا احساس ولانے کی کوشش کررہی ہوتی تو وہ اسے پکارتی اور کسی کام کا کہہ کر وہاں سے ہٹا دیتی۔ وہاں وہ سب کے لیے بڑی محترم تھی۔ وہ سب اسے ملکہ سمجھتے تھے۔ اس کی بات کی تعمیل کرنا ان پر فرض تھا۔ بلکہ وہ اس پر حیران ہوتیں کہ نور بانو پانی بھرنے کے لیے کنویں پر کیوں جارہی ہے۔ جبکہ وہ اس کام کے لیے حاضر ہیں۔

اس دوران اسے ایک اطمینان ہوگیا۔ عبدالحق خواتین کی موجودگی میں نظریں اٹھانے کا قائل ہی نہیں تھا۔ اور ایک اس میں بڑی بات یہ تھی کہ وہ دیکھتا تو کھل کر دیکھتا۔ کن انکھیوں سے چپکے چپکے اسے دیکھنا آتا ہی نہیں تھا۔

کبھی وہ سوچتی کہ یہ سب کچھ وہ کیوں کررہی ہے۔ جبکہ اس کا کوئی امکان بھی نہیں کہ عبدالحق اس کی طرف ملتفت ہوگا۔ لیکن مذہب کی دیوار گر جانے کے بعد اس کے پاس اپنی محبت سے لڑنے کا کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ اب وہ اس محبت میں بہنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ بلکہ اب تو اس کی سمجھ میں یہ بھی آگیا کہ معاشرت کی یہ تبدیلی بھی اس نے عبدالحق کی محبت میں قبول کی ہے...... یہ سوچ کر وہ اس کے محبوب کی معاشرت ہے۔

پھر اس کے لیے مسابقت کا مسئلہ بھی نہیں رہا۔ عبدالحق گاؤں کی بہتری کی فکر میں ایسا مصروف ہوا کہ اس کی ایک جھلک دیکھنا بھی مسئلہ بن گیا۔ بس دو وقت وہ حمیدہ سے ملنے ضرور آتا تھا۔ صبح سویرے اور رات کو سونے سے پہلے۔

ادھر زبیر نے نیاز کے ساتھ مل کر بکریاں پالیں تو اسے ایک مشغلہ مل گیا۔ رابعہ بکریوں کا خیال رکھتی تھی۔ نور بانو اس کام میں اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ بکریاں اسے بہت اچھی لگتی تھیں۔ وہ ان کے چارہ بناتی' پانی بھرتی۔ پہلی بار اس نے جانور دیکھتے تھے۔ گائیں تو خیر اسے گندی لگتی تھیں اور وہ ان سے گھبراتی تھی لیکن بکریوں کی طرف اس کا دل کھنچتا تھا۔

پھر پہلی بکری نے بچے دیے تو وہ اس کے لیے بہت خوب صورت دن تھا۔ دو اتنے خوب صورت' اتنے نرم بچے۔ ان سے تو اسے پہلی نظر میں محبت ہوگئی۔ وہ انہیں اچنبھے سے دیکھتی اور سوچتی...... زندگی ایسی ہوتی ہے' ایسے شروع ہوتی ہے اور اتنی خوبصورت ہوتی ہے۔ بکری کے وہ دونوں بچے اس کے کھلونے بن گئے۔

ان کی رفتار دیکھ دیکھ کر وہ حیران ہوتی۔

"یہ دونوں بچے مجھے چاہئیں آپا۔" اس نے رابعہ سے کہا۔

"تو آپ رکھ لیں منجھلی بی بی۔"

"ایسے نہیں بلکہ باقاعدہ میرے۔ تم زبیر بھائی سے بات کرو میں ان کی قیمت ادا کروں گی۔"

"وہ آپ سے پیسے لیں گے! نہیں منجھلی بی بی وہ مجھ پر خفا ہوں گے۔"

لیکن نور بانو نہ مانی۔ پہلی بار اس نے اپنی رقم میں سے کچھ نکالا اور ان بچوں کی قیمت ادا کردی۔

اب وہ بچے اس کے تھے۔

اسے پتا ہی نہیں تھا کہ کھلی آب و ہوا کی یہ صحرائی زندگی اس پر کیا اثرات مرتب کررہی ہے۔ مگر اس دن آئینہ دیکھتے ہوئے اسے تبدیلی کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے عکس کو غور سے دیکھا اور حیران رہ گئی۔

اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہ ہے۔ اس نے غور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ اتنی تبدیل ہوچکی ہے۔ وہ سحرزدہ سی اپنے عکس کو دیکھتی رہی۔

اس کی رنگت تو شروع ہی سے سانولی تھی۔ مگر اب اس کی جلد چمک دار اور چکنی ہوگئی تھی۔ اور آنکھیں تو اس کی اپنی لگ ہی نہیں رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں اب صحراؤں کی وسعت اور پنہائیاں تھیں۔ ان میں نجانے کہاں سے گہرائی آگئی تھی۔ اور اس کا استخوانی چہرہ بھر گیا تھا۔ اور خوب صورت لگ رہا تھا۔

آئینے سے نظریں ہٹانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن اب وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ یہ تبدیلی چہرے تک محدود ہے' یا وہ جسمانی طور پر بھی تبدیل ہوئی ہے۔ ہاتھوں پر ایک نظر ڈالتے ہی اسے اندازہ ہوگیا تھا۔ ہڈیوں پر گوشت چڑھ گیا تھا لیکن وہ موٹی ہرگز نہیں ہوئی تھی۔

پہلی بار اسے اپنا آپ بہت اچھا لگا۔ پہلی بار وہ بہت گہرائی میں اترے ہوئے اپنے احساسِ کم تری کی قید سے آزاد ہوئی' اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ ہے مگر اب جو کچھ وہ تھی' وہ یہاں آکر بنی تھی۔ یہ یہاں کی آزاد فضاؤں' وسیع زمین اور کھلے آسمان کا کرشمہ تھا۔ یہ باہر نکل کر باہر کے کام کرنے کی وجہ سے تھا کہ اس کے جسم کو صحت مندی اور مضبوطی ملی تھی۔

پہلی بار اس کے دل نے خلوص اور سچائی سے نعرہ لگایا...... پاکستان زندہ باد!

اس روز وہ باہر نکلی تو اس کی چال بدلی ہوئی تھی۔

❁......❁......❁

عبدالحق کے پاس جو کچھ بھی تھا' اس نے وہ سب حویلی میں جھونکنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کا مقصد کم سے کم وقت میں حویلی کے تہ خانے تک پہنچنا تھا۔ اس کے لیے وہ شہر سے مزدور لایا اور دو ٹریکٹر بھی۔

گاؤں کے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی عظمتِ رفتہ کو بحال کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ گاؤں میں جو کاشت کار گھرانے تھے' وہ پانی کے امکان کی طرف سے مایوس ہوچکے تھے۔ انہیں عبدالحق سے موہوم سی امید تھی کہ وہ ریت ہٹوائے گا تو نہری نظام بحال ہوگا۔ حالانکہ یہ بہت

مشکل کام تھا لیکن انسان جبلی طور پر پُر امید ہوتا ہے۔ انہیں یقین تھا کہ یہ معجزہ رُونما ہوگا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وہ صرف حویلی کو برآمد کرانے کے لیے کھدائی کر رہا ہے تو وہ مایوس ہو گئے۔

وہ سب عبدالحق کے احسان مند تھے۔ بے سروسامانی اور غریب الوطنی کے عالم میں اس نے انہیں وہ سب کچھ دیا تھا' جو کوئی انہیں نہیں دے سکتا تھا۔ جبکہ اسے ان سے کوئی لالچ' کوئی غرض نہیں تھی۔

تو اب وہ اس سے شکایت نہیں کر سکتے تھے وہ اس سے منہ پھیر کر تو نہیں جا سکتے تھے۔ لیکن ان کے لیے نئی مملکت میں اپنے مستقبل کو تلاش کرنا بہت ضروری تھا۔ کیونکہ گاؤں میں پانی نہیں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اور پانی کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔

چنانچہ اپنے گھر والوں کو گاؤں میں چھوڑ کر وہ نئے امکانات کی تلاش میں شہر کی طرف چل دیے۔

گاؤں میں مٹی ہٹانے کا کام بہت تیزی سے شروع ہوا۔ عبدالحق نے بڑے پیمانے پر کام شروع کرایا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے بھی لوگوں کی مایوسی محسوس کر لی تھی اور وہ جلد از جلد گاؤں کے لیے پانی کی فراہمی شروع کرانا چاہتا تھا۔

کام شروع ہوا تو عبدالحق کو ایک اور اہم کام کے لیے فرصت مل گئی۔ وہ اہم کام تھا اماں کی آنکھوں کا علاج۔ شہر میں ایک بڑے ڈاکٹر سے اس نے بات کی تھی۔ بس اسے اب اماں کو وہاں لے جانا تھا۔

حویلی برآمد کرانے کے کام کی دیکھ بھال زبیر بخوبی کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ حویلی کے چپے چپے سے واقف تھا۔ عبدالحق نے اس عرصے میں اماں کو لے کر شہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ڈاکٹر نے حمیدہ کی آنکھوں کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس کا تجزیہ بے حد حوصلہ افزا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب' اماں کی آنکھیں ٹھیک ہو سکتی ہیں نا۔'' عبدالحق نے پوچھا۔ وہ نروس ہو رہا تھا۔ اس کے لیے اماں کی آنکھوں کی بڑی اہمیت تھی۔

''انشاءاللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔'' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دراصل ابتدا میں کوتاہی نہ ہوتی تو یہ مسئلہ ہی نہ ہوتا۔ انہیں آنکھوں کو خوب اچھی طرح دھوتے رہنا چاہیے تھا۔ آنکھیں آپ ہی دھل کر صاف ہو جاتیں۔''

''تو اب آپ کیا تجویز کریں گے؟''

میں ایک دوا لکھ رہا ہوں۔ تین دن تک یہ آنکھوں میں ڈالیں۔ اس کے بعد معائنہ کر کے ہی میں کچھ کہہ سکوں گا۔''

عبدالحق نے اماں کو گاؤں واپس لے جانا مناسب نہ سمجھا۔ ایک تو وہ انہیں بار بار سفر کی تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ دوسرے وہ اس مسئلے کو حل کر کے ہی واپس جانا چاہتا تھا۔ وہ وہیں مقیم ہو گیا۔

ڈاکٹر نے دن میں تین بار آنکھوں میں دوا ڈالنے کی ہدایت کی تھی۔ لیکن عبدالحق نے پہلی بار ہی دوا ڈالی تو حمیدہ تڑپ کر رہ گئی۔ صابر عورت تھی۔ اس لیے شکایت تو نہیں کی۔ بس اتنا ہی۔ ''پتر..... تم مل گئے ہو تو مجھے آنکھوں کی کیا ضرورت ہے۔ اور بینائی چلی جائے تو واپس نہیں آتی۔''

''ایسی بات نہیں ہے اماں۔'' عبدالحق بولا۔ ''ڈاکٹر نے کہا ہے تو انشاءاللہ تم دیکھ سکو گی۔ بس تین دن برداشت کر لو۔''

مگر حمیدہ کی آنکھوں میں تو جیسے آگ لگ گئی تھی۔ آنکھوں کے ڈھیلوں میں درد بھی بہت شدید ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا' جیسے انہیں کھرچا جا رہا ہو۔ لیکن عبدالحق کی محبت میں وہ برداشت کر رہی تھی۔ پھر بھی وہ آنکھوں کو ملے بغیر نہ رہ سکی۔

اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ عبدالحق نے رومال سے اس کی آنکھیں پونچھیں۔ وہ ٹیالے رنگ کا پانی تھا۔

تیسری صبح ایک عجیب بات ہوئی۔ عبدالحق حمیدہ کی طرف پانی کا گلاس بڑھا رہا تھا کہ حمیدہ نے ہاتھ بڑھا کر گلاس سے ذرا پیچھے روکا اور لرزتی ہوئی ہیجانی آواز میں بولی۔ ''پتر..... یہ گلاس ہے نا۔''

''ہاں اماں۔''

حمیدہ نے گلاس کو چھوا۔ اس کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔ گلاس تھامنے کی بجائے اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اس کے چہرے کی طرف بڑھایا اور بولی۔ ''..... یہ تمہاری ناک..... یہ ہونٹ..... یہ آنکھیں ہیں۔''

عبدالحق کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ ''تم دیکھ رہی ہو اماں۔ تمہیں نظر آ رہا ہے نا؟'' اس کے لہجے میں یقین اور بے یقینی کا امتزاج تھا۔

''ہاں پتر۔ دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا ہے مجھے۔''

اب تو یہ کھیل ہو گیا۔ حمیدہ کسی چیز کو چھوتی' اس کا نام بتاتی پھر وہ دونوں خوش ہوتے۔ پھر حمیدہ نے آنکھوں پر زور دیتے ہوئے عبدالحق کو بہت غور سے دیکھا۔ ''ارے پتر..... تو کتنا بڑا ہو گیا۔ کتنا خوبصورت نکلا ہے تو۔ ارے تو تو پورا مرد بن گیا ہے۔'' اور اس نے عبدالحق کو لپٹا لیا۔

وہ پہلا دن تھا کہ حمیدہ نے شوق سے آنکھوں میں دوا ڈلوائی۔ ویسے تو اب تکلیف پہلے جیسی تھی بھی نہیں۔ لیکن اب اسے یقین تھا کہ اللہ اسے اس کی بینائی واپس دے رہا ہے۔

تین دن پورے ہونے پر عبدالحق اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر بہت خوش ہوا۔ ''مجھے

یقین تھا کہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے' آپریشن کی نوبت نہیں آئے گی۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"شروع میں بہت تکلیف ہوئی تھی ڈاکٹر صاحب۔"

"وہ تو ہونی ہی تھی۔ دراصل آپ کی اماں کی آنکھوں میں جو ریت بھر گئی تھی' وہ صاف نہ ہونے کی وجہ سے جم کر سخت ہو گئی۔ ابتدا میں دوا نے اسے نرم کرنے کا کام کیا تو تکلیف ہوئی۔ نرم ہونے کے بعد وہ ریت اکھڑ کر بہنے لگی۔ ہر بار دوا ڈالنے پر مرحلہ آسان ہوا ہوگا۔"

"جی ہاں۔"

"مگر مجھے بس دھندلا دھندلا سا دکھائی دیتا ہے' صاف نہیں۔" حمیدہ نے کہا۔

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔ "برسوں کی جمی ہوئی ریت ہے اماں۔ آنکھ صاف ہونے میں وقت لگے گا۔ بس دوا ڈالتی رہیں۔ اور ہاں عرق گلاب بھی ڈالتے رہیں۔ اس سے دکھن کم ہوگی اور آنکھوں کو آرام ملے گا۔"

"آپ معائنہ تو کرلیں ڈاکٹر صاحب۔" عبدالحق نے کہا۔ "دیکھ لیں۔ کیا پتا، آپریشن کی ضرورت ہو۔"

ڈاکٹر نے حمیدہ کی آنکھوں کا تفصیلی معائنہ کیا۔ "نہیں...... آپریشن کی ضرورت نہیں۔ سیدھا سا معاملہ ہے۔ بس یہ دوا اور عرق گلاب ڈالتے رہیں۔"

"ہمیں یہیں رکنا ہوگا۔" عبدالحق نے پوچھا۔

"نہیں...... اس کی ضرورت نہیں اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کو بھی یہاں آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ البتہ احتیاط کرنا ہوگی۔ ایک تو یاد رکھیں کہ دوا مسلسل سات دن سے زیادہ نہ ڈالیں۔ سات دن ہو جائیں تو تین چار دن کا وقفہ کر دیں۔ عرق گلاب مگر باقاعدہ ڈالتے رہیں۔ اس کے علاوہ آنکھوں کو تیز چمک سے بچانا ہوگا۔ اس کے لیے رنگین شیشوں کا چشمہ لگائیں۔ ورنہ آنکھوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

عبدالحق اور حمیدہ گاؤں واپس آئے تو بہت خوش تھے۔

❁ ❁ ❁
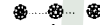
حمیدہ کو سب سے زیادہ اشتیاق نور بانو کو دیکھنے کا تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ اسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔ جیسا اس نے سوچا تھا' وہ اس سے بڑھ کر ہی تھی۔

حمیدہ نے عبدالحق کو منع کر دیا تھا کہ وہ گاؤں میں کسی کو بھی اس کی بینائی کی جزوی بحالی کے بارے میں نہ بتائے۔ لہٰذا نور بانو کو معلوم بھی نہیں تھا کہ حمیدہ اسے دیکھ رہی ہے۔

حمیدہ کو چشمے سے بہت الجھن ہو رہی تھی۔ ایک تو وہ چشمہ لگانے کی عادی نہیں تھی۔ چشمہ اسے بوجھ لگتا تھا۔ دوسرے چشمہ لگا کر اسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ لیکن جب اس

نے دن کی روشنی میں چشمہ اتارا تو گھبرا گئی۔ دن کی روشنی اور وہ بھی صحرائی علاقے میں...... وہ تو صحت مند آنکھوں کے لیے بھی آزمائش بن جاتی ہے۔ وہ تو ایک طرح سے چھلی ہوئی آنکھیں تھیں۔ روشنی اس کی آنکھوں میں بری طرح چبھی اور ایک لمحے کے بعد اسے گھپ اندھیرا نظر آنے لگا۔ وہ ڈر گئی کہ شاید بینائی بحال ہونے سے پہلے وہ پوری طرح اندھی ہو گئی ہے۔ اس نے گھبرا کر دوبارہ چشمہ لگا لیا۔ مگر آنکھوں کی وہی کیفیت تھی۔ اور وہ اپنی حماقت پر پچھتانے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس بار چشمہ لگانے پر چشمے کی ایک افادیت اس کی سمجھ میں آئی۔ چشمہ لگانے پر ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہوگا۔ مگر کیونکہ وہ چشمے کو بوجھ سمجھتی تھی' اس لیے یہ احساس اس کے شعور تک نہیں پہنچا تھا لیکن اس بار اس کی سمجھ میں آ گیا۔

چند لمحے بعد اُس کا خوف دور ہو گیا۔ کیونکہ اسے پہلے جیسا ہی نظر آ رہا تھا۔ جیسے وہ رات میں سب کچھ دیکھ رہی ہو۔ اس نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا اور چشمے پر قانع ہو گئی۔

وہ اس کے لیے بڑا دلچسپ عرصہ تھا۔ اسے ہر طرح کے مشاہدے کا موقع مل رہا تھا۔ خاص طور پر نور بانو کو بہت قریب بٹھا کر وہ اس سے خوب باتیں کرتی اور بڑے غور سے دیکھتی۔ وہ اس سے اس کی دہلی کی زندگی کے بارے میں پوچھتی۔ نور بانو کو ماضی میں جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ ماضی میں وہ اذیتیں تھیں' وہ دکھ تھے' جنہیں وہ بھول جانا چاہتی تھی۔ اُس نے حمیدہ کو اپنے گھر اور گھر والوں پر گزرنے والے سانحے کے بارے میں بتایا تو مگر بہنوں کی آبرو ریزی والی تفصیل گول کر گئی۔

حمیدہ کو بھی اندازہ ہو گیا کہ نور بانو اپنے دکھ بھول جانا چاہتی ہے۔ اس نے اس کے ماضی کو کریدنا چھوڑ دیا۔ نور بانو نے جو کچھ اسے بتایا تھا' اُس سے وہ اس کے پچھلے رہن سہن کے بارے میں جان گئی تھی۔ اسے احساس تھا کہ یہ لڑکی بہت بڑی تبدیلی سے گزری ہے۔

وہاں اور لڑکیاں بھی تھیں اور وہ سب بنیادی طور پر اسی ماحول کی تھیں لیکن حمیدہ کو عبدالحق کے لیے یہ شہری لڑکی ہی بھائی تھی۔ نجانے اُس میں ایسی کیا بات تھی۔

ایک دن حمیدہ نے نور بانو سے پوچھا۔ "یہاں کی زندگی تو تمہیں بہت سخت لگتی ہوگی؟"

"سخت تو ہے اماں' لیکن اتنی سخت بھی نہیں۔ بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ آدمی کو یہ سب کچھ آنا چاہیے۔" نور بانو نے جواب دیا۔

"پھر بھی تمہارا من تو شہر میں زندگی گزارنے کو چاہتا ہوگا۔"

"نہیں اماں۔ یہاں مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ یہاں آ کر مجھے لگا ہے کہ میں نے خود کو اب جانا ہے۔ میں تو خود کو جانتی ہی نہیں تھی۔ یہاں کی مصروفیت مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ وہاں خالی پن کا احساس ہوتا تھا۔"

”عبدالحق کو کب سے جانتی ہو؟“

”جی...... وہ...... جی نہیں...... میں کہاں......“ نور بانو بری طرح گڑبڑا گئی۔

”تو تم نے اسے پہلے دیکھا ہی نہیں تھا!“

”نن...... نہیں...... ایک بار دیکھا تھا۔ وہ ہمارے ہاں تو پردہ تھا نا...... بہت سخت پردہ۔“

حمیدہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن اُس کے چہرے کے تاثرات وہ نہیں دیکھ سکی۔ کاش...... وہ پہلے کی طرح دیکھ سکتی ہوتی۔ اسے محرومی کا احساس ہونے لگا۔ پھر بھی زبان کی لڑکھڑاہٹ بھی بہت کچھ بتا رہی تھی۔ حمیدہ نے سمجھ لیا کہ یہ لڑکی عبدالحق کو بہت پہلے سے پسند کرتی ہے۔

حمیدہ نے اسے مزید چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا کہ حیا کی وجہ سے کہیں اُس لڑکی کے منہ سے ایسی بات نہ نکل جائے جو اِن دونوں کی شادی کے راستے کی رکاوٹ بن جائے۔ اس کے بجائے وہ عبدالحق کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔

نور بانو کے لیے وہ من پسند موضوع تھا۔ وہ عبدالحق کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتی تھی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق حویلی کے کام کی نگرانی میں بری طرح مصروف ہو گیا تھا۔ اسے کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ بس ایک بات وہ پوری ذمے داری کے ساتھ یاد رکھتا تھا۔ حمیدہ کی آنکھوں میں دوا ڈالنا۔

اس شام وہ تھکا ہارا حمیدہ کے پاس پہنچا۔ دوا کی طرف ہاتھ بڑھایا تو حمیدہ نے کہا۔ ”دوا تو میں ڈال چکی ہوں۔“

”خود ڈال لی دوا؟“ عبدالحق کے لہجے میں حیرت تھی۔

”میرے بس کا یہ کہاں ہے۔ نور بانو نے ڈال دی تھی۔ وہ بہت خیال رکھتی ہے میرا۔“

عبدالحق کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ ”چلو ٹھیک ہے اماں۔ میں آج کل بہت مصروف ہوتا ہوں۔ تم ان سے ہی دوا ڈلوا لیا کرو۔“

حمیدہ نے اس وقت چشمہ اتارا ہوا تھا۔ ”یہ تم نے اپنا حال کیا کر لیا ہے پتر۔“

”بس اماں، دو چار دن کی بات ہے۔ پھر فرصت مل جائے گی۔“

”تم نے تو خود کو بہت مصروف کر لیا ہے پتر اور میں کہتی ہوں کہ حویلی کو نکالنا اچھا نہیں ہے۔“

عبدالحق بری طرح چونکا۔ ”کیوں اماں؟“

”وہ آندھی اللہ کا قہر تھی۔ اور جہاں اللہ کا قہر آئے، اُس جگہ سے دور رہنا اچھا ہوتا ہے۔ میں تو

کہتی ہوں، دبا رہنے دے وہ سب کچھ۔“

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ مگر اُس کا دل نہیں مانا۔ ”دیکھو اماں، اب یہ جگہ پاکستان میں ہے اور جب تک ریت نہیں ہٹتی، بے کار ہے۔ جبکہ ہندوستان سے لوگ پاکستان اور اسلام کی محبت میں اپنے گھر، زمین جائیداد چھوڑ کر بے سروسامان چلے آ رہے ہیں۔ تو میں سوچتا ہوں کہ اس پر ان کا حق ہے۔ وہ یہاں آباد ہوں، انہیں زمین ملے، وہ کاشت کاری کریں۔ اچھی زندگی گزاریں۔ میں یہ سب ان لوگوں کے لیے کر رہا ہوں۔“

”تو اس کے لیے تو دبے ہوئے گاؤں نکالنے ہوں گے۔“

”ہاں اماں۔ اور اُس کے لیے بہت پیسہ چاہیے۔ اسی لیے تو میں پہلے حویلی نکال رہا ہوں۔ وہاں سے مجھے پیسہ بھی ملے گا اور زمین کے کاغذات بھی۔ پھر میں یہ دوسرا کام شروع کراؤں گا۔“

”بات تو اچھی ہے پتر۔ پر کام بہت بڑا اور مشکل ہے۔“

”اللہ سے دعا کرتی رہو اماں۔ انشاء اللہ ہو جائے گا۔“

”مجھے تو اب بس تیری شادی کی فکر ہے پتر۔ تو اتنے لمبے بکھیڑوں میں نہ پڑ۔“

”اماں، میں تو بس اللہ کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ شادی کا کیا ہے۔ وہ بھی ہو جائے گی۔“

”کوئی لڑکی پسند ہے تجھے؟“

عبدالحق گڑبڑا گیا۔ ”ارے نہیں اماں۔ وقت آنے پر تم ہی دیکھ لینا کوئی لڑکی۔“

”میں نے تو پہلے ہی دیکھی ہوئی ہے۔ بس یہ نور بانو مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ تجھے کیسی لگتی ہے؟“

”اچھا برا لگنے کی بات نہیں اماں۔ وہ تو ہیں ہی اچھی۔“ عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”لیکن اماں، تم ان کے بارے میں ایسے نہ سوچا کرو۔ میں انہیں اس وعدے پر ساتھ لایا ہوں کہ ان کے رشتے داروں کو تلاش کروں گا اور انہیں ان تک پہنچاؤں گا۔ وہ بس ہمارے ہاں مہمان ہیں اماں۔“

یہ کہتے ہوئے اُس کے لہجے میں ایسی اداسی تھی کہ حمیدہ کا دل کٹنے لگا۔ بات اُس کی سمجھ میں آ گئی۔ یہ دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن اپنی اپنی محبت میں گم ہیں...... دوسرے کے دل سے بے خبر۔ دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دوسرے کی محبت کے قابل نہیں۔ اس نے سوچ لیا کہ انہیں ملانا اُس کا کام ہے۔

❁ ❁ ❁

بالآخر حویلی یوں نمودار ہوئی، جیسے چند برس پہلے وہ سطحِ زمین پر تھی۔

عبدالحق کو پہلی بار مٹی کی طاقت کا اندازہ ہوا۔ پہلے وہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ مٹی پتھر کو بھی چاٹ جاتی ہے۔ وسیع و عریض حویلی کی تعمیر بڑی مضبوط تھی۔ اپنے زمانے میں اسے دیکھ کر اُس کے ناقابلِ تسخیر ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ مگر اب وہ ایک کھنڈر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ چھتیں تو تمام بیٹھ چکی تھیں۔ بیشتر دیواروں کا یہ حال تھا کہ ہاتھ سے دھکیلو تو ڈھے جائیں۔ یہ بڑی بات تھی کہ چند کمرے اچھی حالت میں تھے۔ ان میں ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی خواب گاہ اور عبدالحق کا کمرا شامل تھا جو اسے بہت پسند تھا لیکن چھتوں سے وہ بھی محروم ہو گئے تھے۔

وہاں پہلا سب سے بڑا کام ان سینکڑوں ڈھانچوں سے نمٹنا تھا' جو ریت کے نیچے سے برآمد ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر عبدالحق تھرا گیا۔ یہ ہے زندگی اور یہ ہے زندگی کا انجام۔ اُس نے سوچا۔ ان ڈھانچوں کی کوئی شناخت نہیں تھی۔ وہ خود اپنے باپ کو نہیں پہچان سکتا تھا۔

ان ڈھانچوں کو اجتماعی طور پر زمین میں دبا دیا گیا۔

عبدالحق نے مزدوروں اور ٹریکٹروں کو واپس نہیں جانے دیا۔ بلکہ انہیں آگے کے کام پر لگا دیا۔ اب تو اسے مزدوروں اور ٹریکٹروں کی تعداد میں اور اضافہ کرنا تھا۔ اپنے گاؤں کو دوبارہ آباد کرنا اُس کا خواب بن گیا تھا۔

اس شام کو وہ بہت خوش خوش حمیدہ کے پاس پہنچا۔ ''اماں...... حویلی پوری طرح نکل آئی ہے۔''

''مبارک ہو پتر۔ اور مجھے لگ رہا ہے کہ اب میں سب کچھ پوری طرح دیکھ سکتی ہوں۔'' حمیدہ نے کہا۔

''اماں...... دیکھنے نہیں چلو گی؟'' اُس کے لہجے میں دبا دبا ہیجان تھا۔

نور بانو کچھ فاصلے پر بیٹھی یہ گفتگو سن رہی تھی۔

حمیدہ اللہ کے قہر کے حوالے سے خوف زدہ تھی لیکن بیٹا خوش تھا تو وہ انکار کیسے کر سکتی تھی۔ بس اسے ڈھارس یہ تھی کہ عبدالحق نے یہ سب کچھ ایک بہت بڑے اور نیک مقصد کے لیے کیا ہے۔

''کیوں نہیں پتر۔ ضرور چلوں گی۔''

''تو آؤ نا اماں۔''

حمیدہ اٹھ کر اُس کے ساتھ چلی۔ نور بانو پر نظر پڑی تو اُس نے کہا۔ ''چل دھیے' تو بھی آجا۔''

نور بانو کچھ جھجکی' کچھ شرمائی۔ مگر حویلی دیکھنے کی اسے آرزو تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ حویلی کو دیکھ کر عبدالحق کے بارے میں کچھ اور جاننے کا موقع ملے گا۔ اس نے حمیدہ کا ہاتھ تھام لیا۔

''رابعہ کہاں ہے؟'' باہر نکل کر عبدالحق نے کہا۔

''یہیں کہیں ہوگی۔ پر زبیر کہاں ہے......؟'' حمیدہ نے پوچھا۔

''زبیر کو تو میں وہاں چھوڑ کر آیا ہوں۔ رابعہ کو لینا ہے۔''

رابعہ جانوروں کے باڑے سے نکلتی دکھائی دی۔ عبدالحق نے اُسے بھی ساتھ لے لیا۔

وہ سب حویلی کے کھنڈر کی طرف بڑھ گئے۔

* * *

حویلی کی حدود میں وہ چار افراد افراد نہیں رہے' کردار بن گئے۔ انہیں وہاں گزرے ہوئے لمحے اور واقعات یاد آ رہے تھے۔ وہ ایسی تنویمی کیفیت میں تھے کہ بلند آواز میں واقعات کو دہراتے اور انہیں خیال بھی نہ ہوتا کہ ان کی آواز بلند ہے۔ حال سے ان کا رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ سب اپنے اپنے ماضی میں تھے۔

اور ان میں ایک فرد تماشائی تھا...... جیسے کوئی مبصر ہو۔ اور وہ نور بانو تھی۔ کبھی تو اسے شرمندگی ہوتی کہ وہ مخل ہو رہی ہے لیکن وہاں تو کسی کو اس کی موجودگی کا احساس ہی نہیں تھا۔

احاطے کی طرف بڑھتے ہوئے زبیر نے کہا۔ ''یہیں باہر چھوٹے ٹھاکر کی پیدائش کا جشن منایا جا رہا تھا۔''

''شہر سے ناچنے گانے والیاں آئی ہوئی تھیں۔'' رابعہ بولی۔ ''وصال دین کے ابا نے مجھے بتایا تھا کہ ٹھاکرانی نے بڑے ٹھاکر کو بلایا تھا اور کسی کی ہمت نہیں تھی ان سے کہنے کی۔ تو ان لوگوں نے وصال دین کے ابا سے کہا تھا......''

نور بانو حیرت سے انہیں دیکھ اور سن رہی تھی۔ ان سبھوں کے لہجے خواب ناک تھے۔ لگتا تھا کہ حال سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جیسے وہ ابھی آیا ہی نہیں ہے۔ وہ عبدالحق کو چھوٹے ٹھاکر کہہ رہے تھے اور عبدالحق کو کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ اس نے عبدالحق کو دیکھا۔ مگر وہ جیسے اپنے آپ میں نہیں تھا۔

نور بانو نے حیرت اور مسرت سے سوچا' اس وقت یہاں ایسی تنہائی ہے کہ وہ اسے جی بھر کر دیکھ سکتی ہے۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ خود عبدالحق کو بھی نہیں۔

''اور وہ بوڑھا بابا اُدھر سے آیا تھا۔'' زبیر اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''وہی بابا' جس نے دہلی میں ہمارے گھر آ کر ہمیں مسلمان کیا۔''

اس بار جیسے نور بانو بھی سحر زدہ ہو گئی۔ اسے دہلی والا بابا لمبے ڈگ بھرتا' آتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

پیٹرومیکس اٹھائے ہوئے زبیر آگے آگے چل رہا تھا۔ وہ احاطے میں داخل ہوئے تو اس نے کہا۔ ''یہاں بڑے ٹھاکر پنچایت لگاتے تھے۔''

عبدالحق کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے پاس حوالہ ہی ایسا تھا۔ یہی تو وہ جگہ تھی' جہاں اس نے ویر جی کی اور چاچا جمال دین کی لاشیں دیکھی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا دل

پلپل رہا ہے۔ سینہ خالی ہوا جا رہا ہے۔

وہ صدر دروازے سے گزر کر اندر داخل ہوئے تو عبدالحق کا گریہ اور بڑھ گیا۔ یہاں اُس نے مولوی صاحب کی لاش دیکھی تھی اور مرتے ہوئے باپ سے آخری بار بات کی تھی۔ وہ سب کچھ اسے لفظ بہ لفظ یاد تھا اور اس کی سماعت میں گونج رہا تھا' سچ تو یہ ہے کہ حویلی کو برآمد کرانے کا خیال اسے بپاجی کی آخری گفتگو یاد کرتے ہوئے ہی آیا تھا۔

وہ آگے بڑھتے ہی رہے۔ ''یہ بڑے ٹھاکر کی بیٹھک ہے۔'' زبیر کہہ رہا تھا۔ ''دن میں وہ یہیں لوگوں سے ملتے تھے۔''

اب وہ بڑے ٹھاکر کی خواب گاہ کے دروازے پر تھے۔ زبیر سب سے آگے تھا اور نور بانو سب سے پیچھے۔ نور بانو نے عبدالحق کے قدموں کو ٹھٹکتے دیکھا۔ زبیر بھی ایک لمحے کو رکا تھا۔ لیکن حمیدہ نے ہیجانی لہجے میں کہا۔ ''آگے چلو......''

زبیر نے پلٹ کر عبدالحق کو دیکھا۔ عبدالحق نے اثبات میں سر ہلایا۔ زبیر آگے بڑھ گیا۔

نور بانو نے سوچا' یہ کمرا یقیناً عبدالحق کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ تبھی تو اُس کے قدم رکے تھے۔

حمیدہ ایک بے چوکھٹ کے دروازے کے پاس رک گئی۔ ''یہ ہے میرے پتر...... میرے چھوٹے ٹھاکر کا کمرا۔'' اُس نے چھلکتی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ سب اس کشادہ کمرے میں داخل ہوئے۔ ''یہاں...... کھڑکی کے پاس بستر تھا۔ بستر کے ساتھ پنگھوڑا۔ اس میں چھوٹے ٹھاکر لیٹے تھے۔ یہیں میں نے پہلی بار چھوٹے ٹھاکر کو دیکھا۔ اور میں نے پہلی بار اسے گود میں لیا تو وہ دودھ مانگنے لگا......'' یہ کہتے ہوئے بوڑھی حمیدہ کے رخسار بھی دہک اٹھے۔ ''ٹھاکرانی نے بتایا کہ اُس نے ابھی تک دودھ نہیں پیا ہے۔ وہ مجھ سے دودھ مانگ رہا تھا اور ماں کا دودھ نہیں پی رہا تھا......''

سب اپنے اپنے ماضی کے سحر سے نکل آئے تھے۔ ان کے سامنے ماضی کا ایک ایسا باب کھل رہا تھا' جس سے وہ بے خبر تھے۔

''ایسی ضد کبھی کسی بچے نے نہیں کی ہوگی۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ ڈاکٹر بھی ناکام ہو گئے......''

وہ سب سحر زدہ سے حمیدہ کو تک رہے تھے......

''ایک طرف راجپوتی آن تھی' دوسری طرف بیاہ کے بائیس برس بعد پیدا ہونے والے منتوں مرادوں کے بچے کی جان......''

بائیس برس! نور بانو نے سوچا۔ کتنا چاہتے ہوں گے ان کے ماں باپ انہیں......

''پتا نہیں کیا بات تھی۔ کچھ اللہ کی طرف سے ہی تھا۔ میں چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانے کے

لیے ایسی تڑپی کہ اپنے وصال دین کو دودھ پلانے سے چڑنے لگی۔ وصال دین کے ابا ڈرتے تھے کہ ٹھاکر جی کو اس تڑپ کا پتا چل گیا تو وہ ہم سب کو مروا دیں گے......''

کیسی پریوں والی کہانی ہے!

''مگر ٹھاکر جی بڑے آدمی تھے۔ جب ان کی سمجھ میں آ گیا تو وہ آدھی رات کو خود چل کر ہمارے گھر آئے۔ حالانکہ وہ کسی کو بھیج کر بلواتے تو میں سر کے بل جاتی میری تو اپنی غرض تھی۔ لیکن وہ خود چل کر آئے...... سوالی بن کر......''

نور بانو کے ذہن میں بڑے ٹھاکر کا خاکہ بن رہا تھا...... بارعب...... آن والے......

''بیٹے کی خاطر انہوں نے پرکھوں کی آن اور اپنے دھرم کو ایک طرف رکھ دیا......''

نور بانو اس باپ کی محبت کا اندازہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی......

''یہاں مسہری تھی۔ یہاں بیٹھ کر میں نے چھوٹے ٹھاکر کو گود میں لیا۔ وہ بہت کمزور ہو رہا تھا۔ پھر میں نے پہلی بار اسے دودھ پلایا۔ پھر میں یہاں لیٹ کر سو گئی۔ اُس دن سے ٹھاکر جی نے ہمیشہ ہمارا احسان مانا۔ حالانکہ وہ احسان نہیں تھا' محبت تھی۔ ماتا کا احسان سے کیا واسطہ۔ مگر ٹھاکر جی نے ہمیں برابر کا رتبہ دیا۔ اپنا سب کچھ آدھا ہمیں دے دیا۔ وہ مجھے بہن کہتے تھے۔ بہت بڑے آدمی تھے وہ......''

عبدالحق کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''میں یہیں چھوٹے ٹھاکر کو ہر روز دودھ پلاتی تھی۔ ٹھاکرانی پریشان تھیں کہ رات کو میرے گھر جانے کے بعد کیا ہوگا۔ مگر میرا چھوٹا ٹھاکر عقل مند بچہ تھا۔ اس نے رات کو میری ضد کبھی نہیں کی۔ رات کو وہ اپنی ماتا جی کا دودھ پی لیا کرتا تھا۔ یوں کبھی کسی کو پتا نہ چلا......''

وہ اس کمرے سے نکلے۔ باہر ایک دروازہ تھا۔ اس دروازے کے باہر پچھواڑا تھا...... بے حد وسیع و عریض۔ سامنے کہیں کہیں شکستہ دیوار نظر آ رہی تھی۔

''یہاں ٹھاکر جی پہلی بار اپنے بیٹے کے لیے گھوڑا بنے تھے۔'' حمیدہ نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ ''اور جب چھوٹے ٹھاکر نے کہا کہ اب ویر جی کی باری ہے تو ٹھاکر جی نے وصال دین کو پیٹھ پر بٹھا لیا اور اسے لے کر دوڑنے لگے۔ میں وصال دین پر بہت چیخی۔ پر ٹھاکر جی نے مجھے روک دیا۔ بولے۔ ''یہ وصال دین میرے بیٹے اوتار سنگھ کا دوست ہے۔ اس ناتے یہ اس کا حق ہے مجھ پر......''

نور بانو نے تصور میں وہ منظر بھی دیکھا...... کیسے محبت کرنے والے وضع دار لوگ تھے وہ......

''اُس کے بعد وصال دین کے ابا نے ٹھاکر جی کو کبھی چھوٹے ٹھاکر کا گھوڑا بھی نہیں بننے دیا۔''

''کیسے اماں؟'' وہ عبدالحق کی آواز تھی۔

حمیدہ نے نظریں اٹھا کر اسے نہیں دیکھا۔ وہ بدستور نگاہوں کے سامنے جیسے کسی غیر مرئی شے کو دیکھ رہی تھی۔ ''وہ ہر صبح حویلی آجاتے تھے...... چھوٹے ٹھاکر کو گھوڑا بن کر سیر کراتے......''

عبدالحق کو دھندلا دھندلا سا یاد آ رہا تھا...... بہت کچھ...... ایک لکڑی کا گھوڑا...... اور چاچا جی کی باتیں...... وہ کچھ محبت کے بارے میں سمجھا رہے تھے...... طاقت اوقات کی بات کر رہے تھے۔

وہ دوبارہ اندر آئے۔ اب وہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی خواب گاہ میں تھے۔

یہ کمرا سب سے بہتر حالت میں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی چھت نہیں گری تھی۔ یہ بات عبدالحق کے لیے حیرت انگیز تھی اور ہر حیرت انگیز بات کو وہ اللہ کا اشارہ کہتا تھا۔ چاہے وہ اشارہ اس کی سمجھ میں نہ آئے۔

وہاں مسہری تھی۔ مسہری پر دو تکیے تھے۔ ہر چیز مٹی میں نہائی ہوئی تھی۔ مگر عبدالحق کی نگاہوں میں پتا جی کی خواب گاہ بھر گئی۔

اور ایک رات یاد آ گئی۔ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں گیا تھا۔ مولوی صاحب اُس کے ساتھ تھے اور وہ اپنی نئی نویلی محبت میں سرشار تھا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ ہر وقت مولوی صاحب سے عربی پڑھتا رہتا۔ وہ پتا جی کو بھول ہی بیٹھا تھا۔

اُس رات اس نے سوچا تو اسے شرمندگی ہوئی۔ وہ پتا جی کے کمرے میں چلا گیا۔ پتا جی بیٹھے ڈائری میں کچھ لکھ رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر انہوں نے ڈائری ایک طرف رکھ دی۔ اُس نے پوچھا...... ''آپ سوئے نہیں پتا جی؟......'' انہوں نے کہا...... ''نیند تو مجھے کم ہی آتی ہے پتر؟'' اور وہ کیسا شرمندہ ہوا تھا۔ اسے احساس ہوا تھا کہ ماں کی موت کے بعد وہ کتنے اکیلے ہو گئے ہیں۔ اور وہ بھی دلی چلا گیا ہے۔ اُس نے کبھی پتا جی کی تنہائی کے بارے میں' ان کے کرب کے بارے میں نہیں سوچا۔

تب اُس نے پہلی بار پتا جی کے پاؤں دبائے تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ سو جائیں گے۔ لیکن وہ پاؤں دباتا رہا اور وہ کروٹیں بدلتے رہے۔

پھر اس رات پہلی بار ٹھاکر ایک عام آدمی بن گیا تھا۔ اُس کے پتا جی نے کہا...... میری ایک خوشی پوری کر دو۔ یہاں میرے ساتھ لیٹ کر سو جاؤ۔

عبدالحق کو اس رات کا ایک ایک لمحہ' ایک ایک بات یاد تھی۔ وہ دونوں کچھ فاصلے پر لیٹ گئے۔ چند لمحے گزرے تو پتا جی نے کہا...... ''اویار اوتار سنگھ' ساتھ ایسے تو نہیں سوتے۔ مجھ سے لپٹ جانا یار!'' اور وہ کسی چھوٹے سے بچے کی طرح حیران' باپ سے لپٹ گیا تھا۔

تب پتا جی نے اس سے اندر کی باتیں کی تھیں۔ ان کے پتا...... اُس کے دادا نے انہیں اچھا ٹھاکر بننے کی تلقین کی تھی۔ ٹھاکر کو سخت' مضبوط اور آن والا ہونا چاہیے...... اور محبت سے دور' کیونکہ

محبت آدمی کو کمزور کر دیتی ہے۔ محبت ہو جائے تو اسے چھپا کر رکھو۔ اس کا اظہار مت کرو۔ پتا جی نے کہا تھا...... میں پتا جی کی آگیا کا پالن کرتا رہا۔ لیکن میں اچھا ٹھاکر تھا ہی نہیں۔ میں تمہاری ماتا جی سے بہت پریم کرتا تھا۔ لیکن کبھی اُس پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ یہاں تک کہ وہ چلی گئی۔ اور اوتار سنگھ' تم سے میں نے محبت نہیں کی۔ تم تو میری جان تھے۔ تم میں میری جان تھی۔ پر میں نے تمہیں کبھی بتایا نہیں۔ آج بھی نہیں بتا رہا ہوں۔ ٹھاکر کبھی یہ بات بتایا نہیں کرتے۔

پھر پتا جی نے کہا تھا...... میں تم سے یہ ضرور کہوں گا کہ تمہیں ٹھاکر بننے کی ضرورت نہیں۔ تم آزاد ہو۔ جو چاہو' کر سکتے ہو...... اور کرو۔ یہ کہتے کہتے وہ سو گئے تھے۔

وہ جب تک گاؤں میں رہا' اسی طرح لپٹ کر پتا جی کے ساتھ سوتا رہا۔

نور بانو اس دوران عبدالحق کو بہت غور سے دیکھتی رہی تھی۔ وہ حمیدہ کی طرح از خود رفتہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے اندر گہرائی تھی۔ وہ خاموش رہا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بہت کچھ کہہ رہے تھے...... بہت کچھ بتا رہے تھے۔

پھر عبدالحق چونکا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کی نظریں مسہری کے سرہانے رکھے سیف پر جم گئیں۔ وہ سیف کی طرف بڑھا اور اُس نے ہینڈل گھمایا لیکن سیف لاک تھا۔

چند لمحے سوچنے کے بعد عبدالحق پلٹا۔ اُس نے تکیہ اٹھا کر دیکھا۔ اُس کے نیچے چابی موجود تھی۔ اس نے چابی اٹھالی۔

چابی کے باوجود سیف آسانی سے نہیں کھلا۔ شاید زنگ کا مسئلہ تھا۔

سیف کھلا تو عبدالحق نے زبیر سے پیٹرومیکس لے کر سیف کا جائزہ لیا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سیف میں کتابیں تھیں۔ اس نے کتابوں کو باہر نکالا اور مسہری پر رکھنے لگا۔

کتابوں کے ہٹنے کے بعد اُسے نوٹ نظر آئے۔ اس نے نوٹ نکالے۔ خاصی موٹی گڈی تھی۔ ساتھ ہی چابیوں کا ایک گچھا بھی تھا۔ عبدالحق سمجھ گیا کہ یہ چابیاں تہ خانے میں کام آئیں گی۔

وہ نوٹ اور چابیاں نکال ہی رہا تھا کہ نور بانو کی استعجابیہ آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

''یہ...... یہ تو سب دینی کتابیں ہیں...... اسلامی کتابیں!'' نور بانو نے کہا۔

اس کی بات نے سب کو چونکا دیا۔ عبدالحق نے مسہری پر بکھری ہوئی کتابوں کو دیکھا۔ اُس نے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ سب سے اوپر سیرت پر ایک کتاب تھی۔ قرآن پاک کا ایک مترجم نسخہ بھی اسے نظر آ رہا تھا۔

''کیا...... کیا آپ کے والد مسلمان تھے؟'' نور بانو نے سنسنی آمیز لہجے میں پوچھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ وہ اپنا حجاب بھی بھول گئی تھی۔

"م...... مجھے پتا نہیں۔" عبدالحق نے گڑبڑا کر کہا۔ ان کتابوں کو دیکھ کر اسے حیرت بھی ہو رہی تھی اور خوشی بھی۔

"میں نے تو اُن میں بہت ساری باتیں بہت اچھے مسلمانوں والی دیکھی تھیں۔" حمیدہ خوش ہو کر بولی۔

عبدالحق کو بہت خوشی ہوئی۔ کاش ایسا ہی ہو۔ اس نے دل میں سوچا۔ پھر وہ بولا۔ "اب تہ خانہ اور دیکھنا ہے۔"

وہ دیوار کی طرف بڑھا اور دیوار کو ٹٹولنے لگا۔ اس کا ہاتھ دیوار سے تھوڑا سا باہر نکلے ہوئے ایک ہینڈل سے ٹکرایا۔ اس نے اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ کھڑکھڑاہٹ سی ہوئی اور دیوار میں ایک خلا سا نمودار ہوا۔ اُس خلا میں نیچے اترتی ہوئی سیڑھیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

عبدالحق نے خلا کی طرف قدم اٹھایا۔ مگر اسی لمحے زبیر چلایا۔ "نہیں مالک۔ رک جائیں۔" ساتھ ہی وہ اس طرف لپکا۔

عبدالحق پلٹ کر سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ زبیر اُس کے پاس چلا آیا۔ "کیا بات ہے زبیر؟"

"پہلے میں جاؤں گا مالک۔" زبیر نے کہا۔

"لیکن کیوں؟"

"برسوں سے بند پڑا تہ خانہ ہے۔ حویلی تک ریت کے نیچے دفن تھی۔ اندر کی فضا زہریلی ہوگی۔"

"میرے لیے زہریلی ہے تو تمہارے لیے بھی ہوگی۔"

"تو میں فوراً تھوڑا ہی اتروں گا مالک۔ گھٹن کم ہونے کا انتظار کروں گا۔"

عبدالحق کو وہ تاخیر بری لگ رہی تھی۔ مگر زبیر کی بات بھی معقول تھی۔

وہ کچھ دیر انتظار کرتے رہے۔ پھر زبیر پیٹرومیکس ہاتھ میں لیے خلا کی طرف بڑھا۔ عبدالحق نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔ "نہیں زبیر...... پہلے میں ہی اتروں گا۔"

"میرے پاس روشنی ہے مالک۔ آگے تو مجھے ہی رہنا ہے۔" زبیر نے دلیل دی۔

"تم ہنڈا مجھے دے دو۔"

حکم ماننے کا عادی زبیر جھجک رہا تھا۔ "یہ مناسب نہیں مالک......" اُس کے لہجے میں احتجاج تھا۔

"خطرہ سب کے لیے برابر ہے......"

"نہیں مالک۔ زبیر کو آگے جانے دیں...... خدا کے لیے۔" عقب سے رابعہ نے مداخلت کی۔

عبدالحق اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ اتنی دیر میں زبیر اُس خلا میں اُتر گیا۔

لیکن زبیر عقلمند تھا۔ وہ ایک دم سے نیچے نہیں اُترا اور اُس نے ایک دم سے گہری سانس بھی نہیں لی۔ چند لمحوں میں اسے احساس ہو گیا کہ فضا میں گھٹن ضرور ہے۔ لیکن زہریلا پن نہیں ہے۔ پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ اُس نے منہ اوپر کر کے پکارا۔ "جب تک میں آواز نہ دوں' آپ نیچے نہیں آئیے گا مالک۔"

نور بانو نے جاں نثاری کا ایسا مظاہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آ کا میاں کی وفاداری اور ایثار سے وہ بے خبر تھی۔ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ انہوں نے کیسے جان دی۔

"نیچے سب ٹھیک ہے نا؟" عبدالحق نے پکارا۔

"جی مالک۔ میں نیچے اتر کر آپ کو آواز دوں گا۔"

عبدالحق خواتین کی طرف مڑا۔ "آپ لوگوں کو نیچے آنے کی ضرورت نہیں۔"

دوسری طرف زبیر نیچے اتر گیا۔ پوری طرح اطمینان کرنے کے بعد اُس نے عبدالحق کو آواز دی اور خود پیٹرومیکس لے کر سیڑھیوں کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں میں عبدالحق بھی تہ خانے میں اتر آیا۔

تہ خانہ بہت بڑا نہیں تھا۔ وہ ٹھاکر کی خواب گاہ سے کچھ چھوٹا ہی تھا۔ وہاں دو بڑی الماریاں تھیں اور ایک بہت بڑی تجوری تھی۔ چابیوں کا گچھا عبدالحق کے پاس تھا۔

سب سے پہلے اُس نے تجوری کو کھولا۔ تجوری میں موجود رقم دیکھ کر اُس کا دل خوش ہو گیا۔ اُس کو ایک نظر میں اندازہ ہو گیا کہ تجوری میں اس کی توقع سے کہیں بڑھ کر نقد رقم موجود ہے۔ اُس نے نوٹوں کی گڈیاں باہر نکال کر ڈھیر کر دیں۔

تجوری میں کاغذات بھی تھے۔ اُس نے کاغذات بھی نکال لیے۔ کاغذات کا جائزہ لینے کا موقع نہیں تھا۔ اُس نے انہیں بھی نوٹوں کے ساتھ رکھ دیا۔

اب وہ چھوٹی الماری کی طرف متوجہ ہوا۔ اس الماری میں سونے' زیورات اور ملبوسات کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس الماری کو بھی اُس نے خالی کر دیا۔ سونے اور زیورات کو کپڑوں میں لپیٹ کر زبیر نے گٹھڑیاں بنا دیں۔ "میں یہ اوپر پہنچاتا ہوں مالک۔" وہ بولا۔

عبدالحق نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور دوسری الماری کی طرف متوجہ ہوا۔

وہ بہت بڑی الماری تھی۔ عبدالحق جانتا تھا کہ اس میں کیا ہے۔ بہ ظاہر تو اب وہ چیزیں کسی کام کی نہیں تھیں لیکن وہ یہاں کچھ بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ہر چیز اُس کے باپ دادا' بلکہ پرکھوں کی امانت تھی۔

اُس نے الماری کھولی۔ الماری کیسی' وہ تو پورا اسلحہ خانہ تھا۔ ہر طرح کے ہتھیار وہاں موجود تھے۔ تلواریں' نیزے' بھالے' تیر کمان اور ڈھالیں بھی۔ اور ہر سائز کے طمنچے اور بندوقیں بھی۔ پھر

کارتوس کا ڈھیر بھی تھا۔

ایک لمحے کو عبدالحق نے سوچا کہ یہ سب کچھ اس الماری میں ہی چھوڑ دیا جائے لیکن اُس کا دل نہیں مانا۔ اُس نے ان سب چیزوں کو بھی کپڑوں میں لپیٹنا شروع کر دیا۔

❁ ❁ ❁

سامان اتنا تھا کہ اسے گھر تک پہنچانے میں مزدوروں کی مدد لینی پڑی۔ عبدالحق نے سوچا تھا کہ مزدوروں کی مدد سے تہہ خانے کی چھت تڑوا کر الماریاں اور تجوری بھی اٹھوا لے گا۔ لیکن رات میں کسی وقت ٹھاکر کی خواب گاہ کی چھت بھی بیٹھ گئی۔ جیسے امانت کے وصول کیے جانے کی منتظر تھی۔

نقد رقم، سونا اور زیورات عبدالحق نے حمیدہ کو سونپ دیے۔ زیورات کا جائزہ لیتے ہوئے حمیدہ نے اس پر احتجاج کیا۔ ''پتر...... تو مجھ اندھی پر یہ بوجھ کیوں ڈالتا ہے......'' یہ کہتے کہتے اُس کی نظر اس جڑاؤ ہار پر پڑی۔ اس کے ہیرے آنکھوں کو چکا چوند کیے دے رہے تھے۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ ''یہ ہار تو میں بہو کو دوں گی پتر۔''

''اللہ کا شکر ادا کرو اماں۔ اب تم اندھی کہاں ہو۔ بہو کے لیے ہار پسند کر رہی ہو۔'' عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔

حمیدہ کھسیا گئی۔ ''ہاں پتر، اللہ کا شکر ہے۔ واقعی اب تو سب دکھائی دیتا ہے مجھے۔'' پھر وہ بولی۔ ''اب تو تُو خوش ہے نا پتر؟''

''ہاں اماں۔ اب میں انشاء اللہ گاؤں کو آباد کر سکوں گا۔ اور اللہ نے چاہا تو یہاں پہلے سے زیادہ خوش حالی ہوگی۔ اب تو یہ پاک سرزمین پر ہے نا۔''

''بس تو خوش رہ۔''

عبدالحق نکلنے ہی والا تھا کہ نور بانو آ گئی۔ اُس کے ہاتھ میں ٹھاکر کی کتابیں تھیں۔ ''یہ کتابیں لے لیں آپ۔''

''آپ اپنے پاس رکھیں۔ فرصت سے دیکھوں گا انہیں۔'' عبدالحق نے جاتے ہوئے کہا۔

نور بانو نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ اسے تھوڑا سا افسوس ہوا۔ عبدالحق کو صرف نقدی اور زیورات کی فکر تھی۔ باپ کے سیف سے نکلی ہوئی کتابوں کو اُس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

''تو غلط سمجھ رہی ہے دھیئے۔'' حمیدہ نے اُسے چونکا دیا۔

اُس نے چونک کر حمیدہ کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

''اسے پیسے کی فکر تھی۔ صرف اس لیے کہ وہ ہندوستان میں سب کچھ چھوڑ کر آنے والوں کو اس گاؤں میں آباد کرنا چاہتا ہے۔ انھیں خوش حالی دینا چاہتا ہے۔ اسے اپنے لیے کچھ نہیں

چاہیے۔ وہ تو بس دوسروں کے لیے دیوانہ ہو رہا ہے۔ اس کے سوا اس وقت اسے کچھ سجھائی نہیں دے گا۔''

نور بانو شرمندہ ہو گئی۔

حمیدہ نے ہیروں کا ہار اس کی طرف بڑھایا۔ ''دھیئے...... ذرا یہ پہن کر تو دکھا مجھے۔''

''آپ کو کیا پتا چلے گا اماں؟''

''ارے...... میری آنکھیں ٹھیک ہو گئی ہیں۔ سب دکھائی دینے لگا ہے مجھے۔ تو پہن تو سہی۔''

نور بانو نے ہار لے کر دیکھا۔ وہ بہت خوبصورت، بے حد جگمگاتا ہوا ہار تھا۔ مگر بھاری بہت تھا۔ اس نے سوچا، یہ پہن کر تو میری گردن ہی لٹک جائے گی۔ اُس نے یہ بات حمیدہ سے بھی کہہ دی۔

''کچھ نہیں ہوتا دھیئے۔ تو پہن تو سہی۔''

نور بانو نے بڑے اشتیاق سے ہار پہنا۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ وہ پہلے جیسی مرگھلی نہیں رہی ہے۔

حمیدہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ ''خوب سجا ہے یہ تیرے گلے میں۔ پتا ہے، ٹھاکرانی نے بہت پہلے یہ مجھے دکھایا تھا۔ کہتی تھی، اپنی بہو کے گلے میں ڈالوں گی یہ ہار۔ میں نے بھی سوچ لیا ہے۔ یہ ہار عبدالحق کی بیوی کے لیے ہے......''

نور بانو کا ہاتھ ہار اتارنے کے لیے حرکت میں آیا تھا۔ مگر حمیدہ کی بات سن کر اُس کے ہاتھ نے ہار کو یوں گلے سے چپکا لیا، جیسے اب اُسے اترنے نہیں دے گا۔ ساتھ ہی اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

وہ بس ایک لمحے کی بات تھی۔ لیکن حمیدہ نے دیکھ لیا تھا۔ نور بانو ہار اتارنے لگی تو وہ جلدی سے بولی۔ ''رہنے دے دھیئے۔ پہن لے دو چار دن۔ اچھا لگتا ہے تیرے گلے میں۔''

مگر نور بانو نے جلدی سے ہار اتار کر حمیدہ کو دے دیا۔ ''نہیں اماں۔ مجھے پتا ہوتا تو پہنتی ہی نہیں۔ کسی کی چیز جھوٹی کرنے سے کیا فائدہ۔''

''اب یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ کس کے نصیب میں ہے۔ مجھے تو تُو ہی اچھی لگتی ہے۔ پر عبدالحق کو بھی......''

مگر نور بانو اُس کا پورا جملہ نہ سن سکی۔ وہ اس سے پہلے ہی اٹھ کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

❁ ❁ ❁

صبح عبدالحق حمیدہ کے پاس آیا تو اس کے چہرے سے دبا دبا ہیجان جھلک رہا تھا۔ نور بانو بھی وہاں بیٹھی تھی۔

''میں شہر جا رہا ہوں اماں۔ کچھ منگوانا ہے؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''نا پتر۔ مجھے کیا منگوانا ہوگا۔''

''مجھے کچھ منگوانا ہے۔'' اچانک نور بانو بولی۔

''جی فرمائیے؟'' عبدالحق نے نگاہیں جھکائے جھکائے پوچھا۔

''اون لے آئیے گا میرے لیے۔ سردیاں آرہی ہیں۔ سویٹر بننے ہیں۔''

''جی لے آؤں گا۔''

''یہ پیسے لے لیں۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے۔''

''یہ ضروری ہے۔''

عبدالحق نے نوٹ لے لیے۔ نور بانو وہاں سے چلی گئی۔ عبدالحق چند لمحے ہچکچاتا رہا۔ پھر بولا۔ ''اماں......ایک بات پوچھنی ہے تم سے۔''

''پوچھو پتر۔''

''وہ اماں...... جب سے میں نے اپنا کمرا دیکھا ہے' بے تاب ہوگیا ہوں۔'' عبدالحق اب بھی جھجک رہا تھا۔ ''پر اماں' سوچتا ہوں۔ خودغرضی کی بات ہے۔ اللہ کو بری لگے گی۔''

''بات تو بتا پتر۔''

''کل سے میرا دل چاہ رہا ہے اماں کہ اسی جگہ مکان بنواؤں۔ حویلی تو بہت بڑی تھی۔ میں وہاں اپنی ضرورت کے مطابق مکان بنوانا چاہتا ہوں۔ جہاں میرا کمرا تھا' وہیں میرا کمرا ہو۔ ویسا سکون اماں مجھے کبھی کہیں اور نہیں ملا۔''

''نہ تو یہ بری بات ہے پتر اور نہ اس میں خودغرضی ہے۔''

''نہیں اماں۔ میری گاؤں کو آباد کرنے کی جو خواہش تھی' یہ اس سے بھی بڑی خواہش ہے۔ جی چاہتا ہے' پہلے اس پر کام شروع کرادوں۔ بلکہ میں نے سوچا ہے اماں کہ جہاں حویلی تھی' وہاں ہمارے گھر کے ساتھ اور گاؤں والوں کے بھی گھر ہوں۔''

''اس میں کوئی برائی نہیں پتر۔ بندے پر سب سے پہلا حق تو اس کا اپنا ہوتا ہے۔ تو بے فکر ہو کے یہ کام کر پتر۔ اور اب تو تیرے پاس پیسے کی کمی نہیں۔ دونوں کام ایک ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔''

عبدالحق نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اٹھائے اور انہیں چوم لیا۔ ''تم نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا اماں۔ واقعی دونوں کام ایک ساتھ ہو سکتے ہیں۔''

حمیدہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ ''تو اللہ سے کتنا ڈرتا ہے پتر۔''

''کہاں [illegible] اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ ہاں کوشش ضرور

کرتا ہوں۔ یہ تو بنیاد ہے اماں۔ ہدایت ہی ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں' بن دیکھے ایمان لاتے ہیں' آخرت پر یقین رکھتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں اور اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

''یہ تجھے کس نے بتایا پتر؟''

''قرآن نے۔ یہ سورۂ بقرہ کے پہلے رکوع کی آیات ہیں اماں۔''

حمیدہ تھرا کر رہ گئی۔ زندگی بھر وہ قرآن پڑھتی رہی تھی۔ مگر یہ تو اسے معلوم ہی نہیں تھا۔ پھر اسے عبدالحق پر فخر بھی ہوا اور پیار بھی آیا۔ وہ تو مسلم تھا۔ مگر قرآن سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ''تو قرآن کو سمجھ کر پڑھتا ہے پتر۔''

''تو اماں' قرآن صرف پڑھنے کے لیے تو نہیں ہے۔ پڑھ کر سمجھنا اور عمل کرنا ضروری ہے۔''

''تو کیسے سمجھ لیتا ہے؟''

''ترجمے والے قرآن بھی ہوتے ہیں اماں۔ اور اللہ کی مہربانی سے میں نے عربی بھی پڑھی ہے۔'' عبدالحق کی نگاہوں میں نور بانو کا سراپا لہرا گیا۔ یہ اس پر اس کی محبت کا احسان تھا۔

''تو پتر' خرچ تو سبھی کرتے ہیں۔''

''ایسے نہیں اماں' اللہ نے بتایا ہے کہ مال کہاں کہاں خرچ کرنا چاہیے۔ مختصر سی بات یہ ہے اماں کہ مال اللہ کو خوش کرنے کے لیے خرچ کیا جائے۔ اسی لیے تو میں ڈر رہا تھا۔ اچھا اماں' اب میں چلتا ہوں۔''

وہ کمرے سے نکلا۔ باہر نور بانو کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹھاکر کے سیف سے نکلی ہوئی کتابیں تھیں۔ ''سنیے...... مجھے آپ سے اجازت چاہیے۔''

''جی؟'' عبدالحق ایک دم مؤدب ہوگیا۔

''یہ آپ کے والد کی کتابیں میں لے لوں؟''

عبدالحق کے چہرے کی رنگت متغیر ہوگئی۔

اس کی کیفیت دیکھ کر نور بانو نے جلدی سے وضاحت کی۔ ''میں ٹھیک سے اپنی بات نہیں کہہ سکی شاید۔ میں آپ سے انہیں پڑھنے کی اجازت مانگ رہی ہوں۔ یہ آپ کی امانت ہوگی میرے پاس۔ جب کہیں گے' واپس دے دوں گی۔''

عبدالحق مسکرایا۔ ''جی ضرور۔ کیوں نہیں۔ مجھے تو اپنے کام نمٹانے کے بعد ہی ان کی ضرورت پڑے گی۔ اور میرے کام دیر طلب ہیں۔''

نور بانو نے دل میں سوچا......لیعنی آنکھیں آپ کو دیکھنے کو ترس جائیں گی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''شکریہ۔''

عبدالحق سر جھکائے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

❁ ❁ ❁

محکمہ زراعت کا ڈپٹی ڈائریکٹر عبدالحق سے ملاقات کا کب سے مشتاق تھا۔ پٹواری حسن دین نے جس انداز میں اُس کا غائبانہ تعارف کرایا تھا' وہ غیر معمولی تھا۔ ڈپٹی ڈائریکٹر عرفان احمد جانتا تھا کہ حسن دین بہت اصول پرست اور سخت آدمی ہے۔ اگر وہ کسی شخص کی اتنی تعریف کرے تو اس شخص کے بہت اچھے ہونے میں شک ہی نہیں کیا جاسکتا۔

مگر وہ عبدالحق سے ملا تو حیران ہوا۔ اس کی توقع کے برعکس وہ بہت کم عمر تھا۔ اس کی عمر بیس اکیس سے زیادہ ہرگز نہیں تھی لیکن اُس میں بڑوں جیسی متانت اور بردباری تھی۔

''حسن دین نے مجھے بتایا کہ آپ اپنے خرچ پر ریت ہٹوانے کا کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔'' عرفان احمد نے کہا۔

''جی ہاں۔ الحمدللہ...... اللہ نے مجھے اس قابل بنادیا ہے۔'' عبدالحق نے منکسرانہ انداز میں کہا۔

''ہم نے طے کرلیا ہے کہ جتنی زمین بھی آپ برآمد کرائیں گے' وہ آپ کی ہوگی۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ زمین تو اللہ کی ہے اور ضرورت مندوں کے لیے ہے۔''

''وہ آپ جانیں۔ ہماری طرف سے تو وہ تمام زمین آپ کی ہوگی۔ یہ ایک طرح سے میری...... ہم سب کی طرف سے...... اس نوزائیدہ ملک کی طرف سے اظہارِ تشکر ہے۔ آپ جو چاہیں کریں' ہمیں اس میں کوئی تعرض نہیں ہوگا۔''

''تشکر کیسا؟ میرے پاس اللہ کے دیے ہوئے وسائل ہیں۔ اور میں وہ کچھ کر رہا ہوں جو مجھے کرنا چاہیے۔''

''دراصل آپ صورتِ حال کو سمجھے بغیر ہمارے اس تشکر کو سمجھ نہیں سکتے۔'' عرفان احمد نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''ہم ہندوؤں کی منافقت اور مکاری اور انگریزوں کی عیاری کا شکار ہوئے ہیں۔ ہمارے ساتھ تقسیم میں بھی دھاندلی کی گئی اور اب وسائل کی تقسیم کے معاملے میں بھی زیادتی کی جارہی ہے۔ ایک تو ہمارا حق ہمیں دیا ہی نہیں جارہا۔ دوسری طرف جو نام نہاد وسائل ہمیں ملتے ہیں' ان میں بھی لیت ولعل سے کام لیا جارہا ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے دفتروں میں لکھنے کے لیے کاغذ اور پنسل تک کی قلت ہے۔''

''لیکن اس سے انہیں کیا فائدہ ہوگا؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''انگریز اور ہندو' دونوں ہی تقسیم کے مخالف تھے۔ لیکن مسلم لیگ کی تحریک کے پیچھے عوامی طاقت ایسی تھی کہ انہیں ماننا پڑا۔ مگر ہندوؤں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ پاکستان زیادہ دن نہیں چلے گا۔ آخر وہ خود آکر ہندوستان سے ملے گا۔ تو یہ اس ایجنڈے پر کام ہو رہا ہے۔ تقسیم میں دھاندلی

کی وجہ سے مسلمانوں کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ فارمولا یہ تھا کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں' وہ علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے۔ تو اکثریتی علاقوں والے مسلمان مطمئن تھے۔ عین وقت پر انھیں پتا چلا کہ وہ تو ہندوستان میں بیٹھے ہیں۔ تب وہاں ان کا قتلِ عام ہوا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے ہجرت کر کے پاکستان آنے والوں کی ٹرینوں کی ٹرینیں کاٹ ڈالیں۔ ابھی تو گرد بیٹھی نہیں ہے۔ پھر بھی یہ یقینی ہے کہ شہید ہونے والے مسلمانوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ اور جو پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوگئے' انھیں یہاں آباد کرنے اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کا مسئلہ ہے۔ جبکہ وسائل ہیں ہی نہیں۔ یہ ایک بہت بڑا انسانی المیہ ہے۔ ہجرت کر کے آنے والوں میں کتنی کے خوش نصیب ہی ایسے ہوں گے' جنھوں نے اپنے کسی پیارے کو نہ کھویا ہو۔ بچے ماں باپ سے محروم ہو کر یہاں پہنچے ہیں۔ جو وہاں صاحب ثروت تھے' ان کے پاس یہاں سر چھپانے کا ٹھکانہ نہیں۔ یہ انسانی ایثار اور قربانی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ سرکاری مشینری کے سامنے مسئلہ صرف وسائل سے محروم اس ملک کو چلانے کا نہیں۔ ان لوگوں کی آباد کاری کا بھی ہے اور انھیں روزگار فراہم کرنے کا بھی ہے۔''

''واقعی...... یہ تو بہت مشکل صورتِ حال ہے۔''

''جی ہاں۔ لیکن ہمارے ساتھ اللہ کی رحمت ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ پاکستان اللہ کے حکم سے قائم رہنے کے لیے بنا ہے۔ ہندوؤں کا یہ خواب کہ پاکستان دوبارہ اُن سے جا ملے گا' کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔ ہم اس مشکل وقت سے گزر کر جب ابھریں گے تو انشاءاللہ بہت مضبوط ہوں گے۔''

''انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔'' عبدالحق نے بے حد خلوص سے کہا۔

''انشاءاللہ' آپ جیسے لوگ جو موجود ہیں۔ اب آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم کیوں آپ کے احسان مند ہیں۔ آپ ناقابلِ کاشت اراضی کو قابلِ کاشت بنا کر اپنے وطن کو اضافی وسائل مہیا کر رہے ہیں۔ یہ آپ کا احسان ہے۔ اسی لیے یہ فیصلہ کرلیا گیا ہے کہ وہ تمام اراضی آپ کی ہوگی۔''

عبدالحق عرفان احمد سے بہت متاثر ہوا۔ اس میں افسرانہ شان نہیں تھی۔ وہ ملک کی محبت سے سرشار تھا۔ ملک پر کوئی احسان کرے تو وہ اسے خود پر احسان سمجھتا تھا۔ وہ منکسر المزاج تھا اور خدمت کے جذبے سے معمور اور عبدالحق نے اب تک تمام افسر ایسے ہی دیکھے تھے۔ انہیں دیکھ کر یقین ہوتا تھا کہ یہ ملک بہت ترقی کرے گا۔ کسی بھی ملک کے لیے یہ بہت بڑی نعمت ہوتی ہے کہ اس کی بیوروکریسی امین اور دیانت دار بھی ہو اور اس سے محبت بھی کرتی ہو۔

''اور ہاں' میں نے آپ کے وسائل میں اضافے کا سامان بھی کیا ہے۔'' عرفان احمد نے

اُسے چونکا دیا۔

"جی...... میں سمجھا نہیں۔"

"میں نے ایک کنٹریکٹر سے بات کر لی ہے۔ جو ریت آپ ہٹوا رہے ہیں' وہ بہت کام آئے گی' آپ کو اس کا معقول پےمنٹ بھی ملے گا۔ اگر آپ کو قبول ہو تو یہاں دستخط کر دیں۔" عرفان احمد نے ایک کاغذ اُس کی طرف بڑھایا۔ "وہ ریت کنٹریکٹر اٹھواتا رہے گا۔"

عبدالحق نے کاغذ پر دستخط کر دیے اور ممنونیت سے اُسے دیکھا۔ "میں آپ کے تعاون پر آپ کا شکرگزار ہوں۔"

"یہ تو ہمارا فرض ہے۔ اور ہاں' کرنسی تبدیل کرانے کے لیے بھی تیار رہیے گا۔ پاکستانی کرنسی آنے ہی والی ہے۔"

عبدالحق اس کا شکریہ ادا کر کے کمرے سے نکل آیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ بظاہر ناممکن نظر آنے والا کام ہر مرحلے میں آسان تر ہوتا جا رہا تھا۔ حسن دین کی طرف جاتے ہوئے وہ بہت مطمئن تھا۔

❁ ❁ ❁

نور بانو ان کتابوں کا جائزہ لے رہی تھی' جو ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے سیف سے نکلی تھیں۔ ان میں سے ایک کتاب تو سیرت النبی ﷺ پر تھی' دوسرا قرآن پاک کا ترجمہ تھا' پھر ایک اور کتاب تھی...... احکاماتِ الٰہی۔

کتابوں کو سرسری طور پر دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ پڑھنے والے نے انہیں بڑی دیدہ ریزی سے پڑھا ہے۔ اہم عبارت کو پنسل سے خط کشیدہ کیا گیا تھا۔ جابجا حاشیے میں تبصرے لکھے تھے اور تبصروں سے پڑھنے والے کی فہم کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔

نور بانو کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ عبدالحق کے والد کا کام تھا۔ کیونکہ جب اُس نے عبدالحق سے ان کے مسلمان ہونے کے بارے میں پوچھا تھا تو اس کے جواب سے اُس کی الجھن ظاہر ہو رہی تھی۔ یعنی اُسے اپنے باپ کے مسلمان ہونے کا علم نہیں تھا۔ اور بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ باپ مذہب تبدیل کر لے اور بیٹا اس تبدیلی سے بے خبر رہے۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت تھی کہ کتابوں کا مطالعہ تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔ اُس نے سنا تھا کہ دوسرے مذاہب کے لوگ قرآن تک کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ بات تو گاندھی کے بارے میں بھی کہی جاتی تھی۔ لیکن جس طرح عبارات کو خط کشیدہ کیا گیا تھا اور جس طرح حواشی میں تبصرے تحریر کیے گئے تھے' اُس سے ثابت ہوتا تھا کہ قاری اور مبصر مسلمان نہیں بھی تھا تو لازمی طور پر مسلمان ہو گیا ہوگا۔

معاملہ عبدالحق سے متعلق نہ ہوتا' تب بھی اُس کے لیے دلچسپ ہی ہوتا لیکن عبدالحق کے تعلق کی وجہ سے وہ نور بانو کے لیے ایک ایسی گتھی بن گیا' جسے وہ ہر حال میں سلجھانا چاہتی تھی۔

قرآن پاک میں ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی توجہ کا مرکز وہ روشن آیات تھیں' جو اللہ کے قادرِ مطلق' واحد اور احد ہونے کی دلیل تھیں۔ نور بانو کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان میں سورۂ ملک کی وہ آیات بھی تھیں' جنہیں سن کر عبدالحق ایمان لایا تھا۔ وہاں حاشیے میں ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے لکھا تھا......

میں نے اس کا مشاہدہ کیا۔ یہ بالکل سچ ہے۔ اس پر میں اپنی ڈائری میں تفصیل سے لکھوں گا۔

یہ پڑھ کر نور بانو کو اُس کی ڈائری کے بارے میں تجسس ہوا۔ تب اسے پہلی بار پتا چلا کہ ان کتابوں میں ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی دو ڈائریاں بھی ہیں۔

اُس نے دونوں ڈائریوں کا سرسری جائزہ لیا۔ ایک تو واقعتاً ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے روز و شب کی ڈائری تھی۔ جبکہ دوسری ڈائری مختلف تھی۔ اس میں ٹھاکر نے اپنے تجربات و مشاہدات تحریر کیے تھے اور جو کچھ اُس نے پڑھا تھا' اُس پر تبصرے لکھے تھے۔

نور بانو نے پہلی ڈائری کو تو ذاتی قرار دے کر چھوڑ دیا۔ اصولاً تو دوسری ڈائری بھی ذاتی تھی اور اُسے بلا اجازت اسے پڑھنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ مگر اُس نے سوچا کہ وہ صرف ان آیات پر ٹھاکر کا تبصرہ پڑھنا چاہتی ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔

بالآخر اس نے وہ صفحہ نکال لیا' جہاں ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے سورۂ ملک کی ان آیات پر تبصرہ لکھا تھا۔ وہ اسے پڑھنے لگی......

یہ نشانی پڑھ کر میں آسمان کا مشاہدہ کرنے کے لیے نکلا۔ میرا خیال تھا کہ یہ دو منٹ کا کام ہے۔ میں باہر نکلا اور میں نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں آسمان کو دن میں دسیوں بار دیکھتا رہا ہوں۔ مگر غیر شعوری طور پر۔ میں نے کبھی شعوری طور پر آسمان کو نہیں دیکھا۔ مشاہدہ کبھی نہیں کیا۔ اس پر غور کبھی نہیں کیا۔ اس اتنی بڑی چیز کو میں کیسے نظرانداز کرتا رہا۔ ہم بھی ایسا کرتے ہیں۔ اس لیے تو حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں۔ اس کتاب میں بالکل سچ لکھا ہے کہ چیزوں کو دیکھو' ان پر سوچو اور غور کرو۔ ان میں نشانیاں ہیں۔

تو جب میں نے پہلی بار آسمان کو سمجھنے کے خیال سے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ صحرا کے آسمان کو منٹ غور سے دیکھیے تو ہیبت طاری ہو جائے۔ اس کا کوئی انت نہیں۔ اپنے سر کے عین اوپر دیکھو تو وہ گنبد کا مرکزی نقطہ لگتا ہے...... آسمان کا بلند ترین مقام۔ اور وہاں سے ہر سمت میں وہ ایک جیسا ستواں ہے۔ ہلکا سا ہموار جھکاؤ ہر سمت میں دور تک...... حدِ نظر تک چلا جاتا ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ اس میں ذرا سی بھی ناہمواری نہیں۔ کہیں ذرا سا بھی فرق دکھائی نہیں دیتا اور صحرا کی وسعت میں بھی آسمان' صحرا سے بڑا...... بہت بڑا دکھائی دیتا ہے۔

میں بہت اچھی طرح مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک سمت نظر جما کر دیکھا۔ ایک جگہ دھرتی اور آکاش ملتے دکھائی دے رہے تھے۔ آکاش کا نیلا پن صحرا کی ریت سے گھلتا ملتا نظر آ رہا تھا۔

میں آگے اُس طرف بڑھنے لگا۔ کچھ آگے جا کر میں رکا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اب بھی آسمان کا مرکزی نکتہ..... بلند ترین مقام عین میرے سر کے اوپر تھا۔ حالانکہ میں کوئی پچاس قدم آگے چلا آیا تھا۔ اور میں نے سامنے دیکھا تو وہی منظر تھا۔ دھرتی اور آکاش آپس میں گھل مل رہے تھے۔

میں آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ بار بار میں رک کر اوپر دیکھتا۔ لگتا تھا کہ آسمان کا مرکز میرے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ اور سامنے آخری منظر وہی تھا۔ دھرتی اور آکاش کے گلے ملنے کا!

میں بھی ایک دھن میں تھا۔ بڑھتا رہا۔ بڑھتا رہا۔ مگر آسمان کے مرکز کی حد سے نہیں نکل پایا۔ ہاں' سامنے کا منظر ضرور بدل گیا۔ اب آسمان جھاڑیوں کو چوم رہا تھا۔

میں اور آگے بڑھا تو آسمان ان جھاڑیوں کی حد سے بھی دور نکل گیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے گاؤں کے آثار تک دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں اپنی دھن میں بہت دور نکل آیا تھا۔ مگر آسمان کے مرکز کی حد سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔ مجھ پر ہیبت طاری ہوگئی۔ میرے پاؤں شل ہوگئے۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ دیر تک مجھ سے اٹھا ہی نہیں گیا۔ اب مجھے اتنی ہی دور پیچھے بھی جانا تھا۔

میں نے بہت غور کیا اور کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ میں دنیا کے کسی ملک میں چلا جاؤں' آسمان کا مرکز میرے سر کے عین اوپر ہی رہے گا۔ اس کا مطلب؟ آسمان کی وسعت نامعلوم ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آسمان کے مرکز کی وسعت اتنی ہے کہ پوری زمین بس اسی کے نیچے ہے۔ میں کہیں بھی کھڑا ہو کر دیکھوں' خود کو اسی مرکز کے عین نیچے پاؤں گا۔

میں آسمان کی ناہمواری کھوجنے نکلا تھا۔ کئی گھنٹوں میں میلوں کی مسافت طے کر کے نامراد لوٹا۔ لیکن نہیں۔ میں نامراد نہیں تھا۔ میں تو ایک بہت بڑا بھید سمجھ آیا تھا۔

سائنسداں کہتے ہیں کہ آسمان فریب نظر ہے۔ مجھ سے کہیں تو میں ان سے فرمائش کروں کہ اس طرح کا ایک چھوٹا سا..... بہت ہی چھوٹا سا..... بہت ننھا منا فریب نظر تخلیق کر کے بتاؤ تو مانوں۔ فریب سب کے لیے نہیں ہوتا۔ کسی کو فریب لگتا ہے' کسی کو نہیں لگتا۔ یہ کیسا فریب نظر ہے کہ دنیا کے ہر انسان کو ہوتا ہے۔ تمام انسانوں کے پُرکھوں کو بھی ہوتا رہا اور آنے والی نسلوں کو بھی ہوتا رہے گا۔ ہاں..... فریب نظر ہوتا ہے۔ آدمی جب آسمان اور زمین کو ملتے دیکھتا ہے وہ فریب نظر ہوتا ہے۔ مگر سب کو الگ الگ..... اپنی اپنی نظر کے مطابق ایک ہی جگہ کھڑے ہر آدمی کو زمین آسمان ملتے دکھائی دیں گے۔ مگر کسی کو کہیں اور کسی کو کہیں۔ کسی کو آگے' کسی کو درمیان میں اور کسی کو پیچھے۔ اپنی اپنی نظر کی بساط کے مطابق۔

مجھے افسوس ہوا کہ یہ نشانی میرے مذہب کی کتابوں میں کیوں موجود نہیں۔ میں شروع سے سمجھتا تھا کہ بھگوان' خدا اور اللہ ایک ہی ہستی کے نام ہیں۔ فرق صرف زبانوں کا اور تہذیب و ثقافت کا ہے' لیکن یہاں میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ بنیادی فرق تو تعلیمات کا ہے اور مذہبی عقائد کا ہے۔ عمل کا ہے۔ اب میں اس پر غور کرنا اور سمجھنا چاہتا ہوں۔

میں نے یہ نشانی اتفاقاً پڑھی تھی۔ میں تو بس قرآن کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ نامانوسیت کی وجہ سے میں جم کر پڑھ نہیں پا رہا تھا۔ یونہی میری نظر اس عبارت پر پڑی اور جم گئی۔

اب سوچتا ہوں کہ جس کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایسی دلیل نظر آئے' اس میں اور کتنا کچھ ہوگا۔ اب میں اس کتاب کو باقاعدہ پڑھوں گا۔ مجھے لگتا ہے' کوئی بہت بڑی طاقت میرے اندر سے میری رہنمائی کر رہی ہے......

نور بانو سوچ میں پڑ گئی۔ کیسی عجیب بات تھی کہ باپ کی نظر انہی آیات پر پڑی......اور بعد میں بیٹے نے انہی آیات کو سن کر اسلام قبول کیا۔ یقیناً اللہ نے دونوں کی رہنمائی کی۔

وہ اس ڈائری کو پڑھنا چاہتی تھی لیکن بغیر اجازت کے پڑھنا اخلاقی اعتبار سے بری بات ہوتی۔ اُس نے سوچا کہ وہ اس کے لیے عبدالحق سے اجازت لے لے گی۔

❁ ❁ ❁

گاؤں میں زراعت کے مستقبل سے مایوس ہو کر کام اور ٹھکانے کی تلاش میں جانے والے شہر کی خاک چھان کر مایوس ہو کر لوٹے تو حیران رہ گئے۔ گاؤں میں مصروفیت' اور گہما گہمی کا عجیب عالم تھا۔ کئی جہتوں میں کام ہو رہا تھا اور بہت تیز رفتاری سے ہو رہا تھا۔

وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ حویلی برآمد ہو چکی ہے۔ بلکہ اب تو حویلی کی جگہ مکانات تعمیر کیے جا رہے تھے۔ دوسری طرف ٹریکٹر اور مزدور اب حویلی کے اطراف سے ریت ہٹانے میں مصروف تھے اور اچھا خاصا علاقہ صاف ہو چکا تھا۔ تیسری طرف شہر سے ٹرک اور اونٹ گاڑیاں ریت لینے کے لیے مسلسل آ رہی تھیں۔ ریت کے پہاڑ سمٹ رہے تھے۔ منظر صاف ستھرا اور خوب صورت لگ رہا تھا۔

وہ عبدالحق کے پاس پہنچے۔ عبدالحق نے پُرتپاک لہجے میں ان سے حال احوال پوچھا۔ پھر بولا۔ ''کوئی بات بنی؟''

وہ سب شرمندہ ہو گئے۔ ''نہیں بھائی' کوئی امکان نظر نہیں آتا۔''

''مایوس کیوں ہوتے ہو۔'' عبدالحق نے انہیں دلاسہ دیا۔

''ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی املاک اور اراضی اُن لوگوں کو دی جا رہی ہے' جن کے پاس ہندوستان میں اس اراضی اور املاک کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں۔ جو وہ ہندوستان میں چھوڑ کر

آئے ہیں۔ ہمارا تو صرف زبانی دعویٰ ہے۔ ہم ایسی افراتفری میں جان بچا کر نکلے کہ ہمیں کاغذات کا خیال بھی نہیں آیا۔"

"کوئی بات نہیں۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔"

ان لوگوں کو اندازہ تھا کہ عبدالحق کے خواب کو تعبیر ملنے میں وقت لگے گا۔ مگر یہ طے تھا کہ اب یہ گاؤں خوشحال ہو کر رہے گا۔ وہ انتظار کر سکتے تھے' لیکن وہ کھسیا رہے تھے۔ انہیں شرمندگی تھی کہ وہ اپنا گاؤں چھوڑنے کا ارادہ ظاہر کر چکے تھے' اب کس منہ سے وہاں رہنے کی بات کرتے۔

عبدالحق نے اُن کی شرمندگی محسوس کر لی۔ "تو اب فکر کی کیا بات ہے۔" اس نے بے حد اپنائیت سے کہا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ انشاءاللہ یہ گاؤں آباد بھی ہو گا اور خوشحال بھی۔ دیکھ لیں' آپ سب کے لیے مکان بھی بن رہے ہیں اور انشاءاللہ زمین کی بھی کمی نہیں ہوگی۔"

"اصل میں ہم تو یہ سمجھے تھے کہ آپ گاؤں کی طرف سے مایوس ہو کر حویلی کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔" عمر نے کہا۔

"حویلی برآمد کرائے بغیر ہم یہ بڑا کام کر ہی نہیں سکتے تھے۔" عبدالحق نے وضاحت کی۔

"تو اب ہم یہاں رہ سکتے ہیں؟" اصغر نے پوچھا۔

"مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں آپ۔ فیصلہ تو آپ کو خود کرنا ہے۔"

وہ سب خوش ہو گئے۔

اب یہ صورت حال بھی نہیں تھی کہ گاؤں میں کام نہ ہو۔ بے کاری ہو تو کام کرنے کے عادی لوگوں کا جی اُوب جاتا ہے۔ مگر یہاں تو کام کی کمی نہیں تھی۔ ایک طرف جو ریت ٹرکوں اور گاڑیوں میں بھر کر شہر لے جائی جا رہی تھی' اُس کا حساب رکھنا تھا۔ دوسری طرف ریت ہٹائی جا رہی تھی۔ تیسری طرف مکانات تعمیر ہو رہے تھے۔ وہ سب شریک ہو گئے تو عبدالحق کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اب ہر کام کی نگرانی کے لیے لوگ موجود تھے۔ لیکن عبدالحق کا مزاج ایسا تھا کہ وہ ہر کام اپنی نگرانی میں کرانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسے فرصت تو نہیں ملی لیکن سب لوگ مصروف ہو گئے۔

نیاز اور اُس کے بھائی بہت خوش تھے۔ یہ نیا کام انہیں راس آ گیا تھا۔ دودھ کی بہتات تھی۔ رابعہ نے ان کی عورتوں کو گھی مکھن بنانا سکھا دیا تھا۔ چنانچہ آمدنی شروع ہو گئی تھی۔ اس کام کی وجہ سے شہر میں تعلقات الگ بن رہے تھے۔

پہلی بار نفع تقسیم ہوا تو زبیر اپنا حصہ لے کر عبدالحق کے پاس پہنچا۔ اُس نے نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ لو مالک۔"

عبدالحق نے ہاتھ بڑھانے کے بجائے پوچھا۔ "یہ کیا ہے زبیر؟"

"یہ آپ کے حصے کا منافع ہے مالک۔"

"میرا حصہ کیسے' یہ تو تمہارا ہے۔" عبدالحق نے کہا۔ "اس کاروبار میں تم اور نیاز کے بھائی برابر کے شریک ہو۔ میرا تو کوئی بیچ نہیں۔"

زبیر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "کیسی غیریت کی بات کر دی مالک۔ کیا آپ نے مجھے اپنی زندگی سے نکال دیا ہے؟"

"دیکھو زبیر' تم بات سمجھ نہیں رہے ہو۔ پرانی باتیں بھول جاؤ۔ وہ تمہارے دھرم کے ساتھ گئیں۔ یہ مت بھولا کرو کہ اب ہم مسلمان ہیں۔"

"تو مالک' اس سے پرانے رشتے تو نہیں ٹوٹ گئے......"

"تم اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرو زبیر۔ اسلام نے غلامی ختم کی ہے۔ مسلمان سب برابر ہیں اور ایک دوسرے کے لیے بھائی ہیں۔ اب نہ میں تم سے برتر ہوں اور نہ تم مجھ سے کم تر۔"

"ایسا نہ کہو مالک۔ ہمارا کون ہے تمہارے سوا۔"

"تو میں تم سے تعلق تو نہیں توڑ رہا ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اب تم میرے بڑے بھائی جیسے ہو۔"

زبیر باقاعدہ رونے لگا۔ "میں پرانا تعلق نہیں بھول سکتا مالک۔"

عبدالحق بے بسی بھی محسوس کر رہا تھا اور اسے جھنجھلاہٹ بھی ہو رہی تھی لیکن اس وقت اس کا اظہار اور مخدوش تھا۔ زبیر تو پہلے ہی دل شکستہ ہو رہا تھا۔ "زبیر بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اب ہمیں اچھا مسلمان بننا ہے۔ یہ جو تم مجھے مالک کہہ کر پکارتے ہو' مجھے اچھا نہیں لگتا۔ مجھے اس میں تماشہ بننے کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے خیال رہتا ہے کہ دوسرے ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے۔ یہی کہ ہم اپنے پرانے طور طریقے نہیں چھوڑ سکے۔ میری خوشی اس میں ہے کہ اب ہمارے درمیان برابری ہو......"

"یہ تو ہو ہی نہیں سکتا مالک۔ ہماری تو سب سے بڑی خوشی چھن جائے گی۔"

"اب میں اوتار سنگھ نہیں ہوں کہ تم میرا نام نہ لے سکو۔ میں عبدالحق ہوں۔ تم بڑے ہو۔ تمہیں تو میرا نام لے کر مجھے پکارنا چاہیے۔"

"اس سے تو اچھا ہے مالک کہ تم ہمیں دھکے دے کر یہاں سے نکال دو......"

"میں جو اجنبی لوگوں کو گلے لگا رہا ہوں' تمہارے ساتھ ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔" عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔ "تم تو میرے گھر کا فرد ہو۔ مگر اب مجھے تم سے شکایت ہے......"

یہ سن کر تو زبیر لرز گیا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو مالک؟"

"ایک طرف تم مجھے مالک کہتے ہو۔ دوسری طرف میرا حکم بھی نہیں مانتے......"

"جس دن آپ کا حکم نہ مانوں مالک تو مر ہی نہ جاؤں۔"

"تو میں کہتا ہوں کہ میرا نام لو۔ مجھے چھوٹا بھائی سمجھو۔"

زبیر کو چپ لگ گئی۔ "آپ خود سوچو مالک کہ کیا یہ ہو سکتا ہے۔"

عبدالحق کو اس پر ترس آنے لگا۔ "چلو، تم مجھے مالک کہتے رہو۔ مگر دل میں مجھے چھوٹا بھائی سمجھ لو۔ اور میں کہتا ہوں کہ تم سب کچھ چھوڑ کر پہلے دین کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تبھی بات تمہاری سمجھ میں آئے گی۔ میں مولوی صاحب سے بات کروں گا۔ تم روز ان کے پاس پڑھنے کے لیے جایا کرو......"

"جو حکم مالک۔ میں جاؤں گا۔ پر یہ پیسے رکھ لو۔"

"نہیں زبیر۔ یہ تمہارے ہیں۔ اب تم اپنی مرضی سے خرچ کرنا سیکھو۔ تم اگر شہر جاؤ اور میرے لیے کوئی چیز خرید کر لاؤ تو مجھے اس سے بہت خوشی ہوگی۔ تمہارے علاوہ کون ہے مجھے تحفہ دینے والا۔"

یہ بات زبیر پر اثر کر گئی۔ "ٹھیک ہے مالک۔ میں وہ سب کچھ کرنے کی کوشش کروں گا جو آپ چاہتے ہیں لیکن مجھ سے مالک کہنے کا حق چھینا تو میں مر جاؤں گا مالک۔"

"کوشش تو کرو گے؟"

"جی مالک۔" زبیر نے مرے ہوئے لہجے میں کہا۔

اگلے روز زبیر شہر گیا اور عبدالحق کے لیے ایک بہت شاندار گھوڑا خرید لایا۔ عبدالحق نے اسے بے حد تشکر کے ساتھ قبول کیا۔ اسے امید تھی کہ زبیر پیسہ خرچ کرے گا تو اس کا شوق بڑھے گا اور وہ پیسہ رکھنے لگے گا۔ لیکن اسے یقین ہو گیا کہ وہ لفظ مالک کو اور اپنے لیے اُس کی خدمت گزاری کو کبھی اس کے سسٹم سے نہیں نکال سکے گا۔

❁ ❁ ❁

دو دن ہو گئے۔ نور بانو کا عبدالحق سے سامنا ہی نہیں ہوا کہ وہ اس سے ڈائری پڑھنے کی اجازت مانگتی۔ یوں وہ ڈائری اس کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش بن گئی۔ وہ دن میں کئی بار اسے لے کر بیٹھتی اور خود سے بحث کرتی۔

اُس کے پاس ایک دلیل تھی۔ اس نے عبدالحق سے ان کتابوں کو پڑھنے کی اجازت مانگی تھی اور عبدالحق نے اجازت دی تھی۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ انہیں نہ پڑھے۔

مگر رکاوٹ تھا تو اس کا ضمیر...... اس کا ضابطۂ اخلاق۔ وہ جانتی تھی کہ جب وہ اجازت مانگ رہی تھی تو اسے نہیں معلوم تھا کہ ان کتابوں میں دو ذاتی ڈائریاں بھی ہیں۔ اور یہ بات عبدالحق کو بھی معلوم نہیں تھی۔ تو اس نے کتابیں پڑھنے کی اجازت مانگی تھی اور عبدالحق نے اسے کتابیں پڑھنے کی ہی اجازت دی تھی۔ وہ اجازت ڈائری کے لیے نہیں تھی۔ ڈائری تو بہت ذاتی

چیز ہوتی ہے۔

دونوں دن وہ عبدالحق کے لیے باہر بھی نکلی لیکن اسے اس کی مصروفیت کا بخوبی اندازہ ہو گیا۔ وہ ایک جگہ ٹھہر ہی نہیں رہا تھا۔ ابھی یہاں ہے تو ابھی وہاں ہے۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اس نے خود کو کام میں اس طرح الجھا لیا ہے کہ اسے سانس لینے کی بھی فرصت نہیں۔ اور تیسرے دن وہ نظر ہی نہیں آیا۔ کسی ضروری کام سے اسے شہر جانا پڑ گیا تھا۔

اس روز وہ گھر میں واپس آئی تو دونوں ڈائریاں سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔ وہ بڑی کشمکش میں تھی۔ دل چاہتا تھا کہ پہلی ڈائری کھولے اور پڑھنا شروع کر دے لیکن یہ بھی جانتی تھی کہ اخلاقاً یہ غلط بات ہے۔

پھر اچانک ایک دلیل نے اس کے ذہن کو چھو لیا۔ عبدالحق کے والد کے سیف سے جتنی بھی کتابیں نکلی تھیں، اس نے ان کو پڑھنے کی اجازت اس سے لے لی تھی۔ اور ان کتابوں میں یہ ڈائریاں بھی شامل تھیں۔

وہ مسکرائی۔ دلیل اس کے دل کو مؤثر لگی تھی۔

لیکن ضمیر ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے گرج کر کہا۔ اس وقت نہ تمہیں معلوم تھا کہ ان کتابوں میں کوئی ڈائری ہے۔ نہ ہی یہ بات عبدالحق کے علم میں تھی۔ تو وہ اجازت کتابوں کے لیے تھی، ڈائری کے لیے نہیں۔

ضروری نہیں کہ عبدالحق کو ڈائریوں کی موجودگی کا علم نہ ہو۔ نور بانو نے ایک اور دلیل نکالی۔

علم ہوتا تو کتابوں کے برآمد ہونے پر وہ حیران نہ ہوتا۔ ضمیر نے دلیل رد کر دی۔

اس کی حیرت کا سبب کتابوں کے موضوعات تھے۔ ورنہ ایک بیٹے کو تو یہ علم ہوتا ہے کہ اس کا باپ ڈائری لکھتا ہے۔

مگر اس نے تمہیں کتابیں پڑھنے کی اجازت دی تھی، ڈائری پڑھنے کی نہیں۔ اور ڈائری پڑھنے کی اجازت تو تم نے مانگی بھی نہیں تھی۔

نور بانو اخلاقی اعتبار سے کوئی کمزور لڑکی نہیں تھی۔ وہ ضمیر کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

کچھ دیر وہ یونہی ڈائری ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔ پھر بے دھیانی میں اس نے ڈائری کا پہلا صفحہ کھول لیا۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بے دھیانی اس کی لاشعوری خواہش کی پیدا کردہ تھی یا نہیں۔

بہرحال صفحہ کھولتے ہیں جو الفاظ اسے نظر آئے، انہوں نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ ڈائری پڑھ رہی ہے۔ وہ الفاظ تھے ہی ایسے......! لکھا کرنے لکھا تھا......

"میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی ڈائری لکھنے پر مجبور ہوں گا۔ میرے دوست امان اللہ

نے مجھے بتایا تھا کہ ڈائری لکھنا ایسا ہے جیسے تنہائی میں خود سے باتیں کرنا۔ جو بات آدمی کسی کے ساتھ بھی نہ کر سکے' وہ اس کے لیے بوجھ بن جاتی ہے۔ اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے وہ بات خود سے کر لی جائے...... ڈائری لکھ کر یوں دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔

اس پر میں نے اکڑ کر کہا تھا...... اسی لیے تو ہم ٹھاکر لوگ ڈائری کبھی نہیں لکھتے۔ ہمیں خود سے بات کرنے کی ضرورت کبھی نہیں پڑتی۔ ہم ٹھاکر لوگ تو ہر بات صاف کرنے کے قائل ہیں۔ میرے دل میں جو بھی آتی ہے، کسی سے بھی کہہ دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ مجھے کسی سے ڈر نہیں لگتا۔

اس پر اماں نے کہا تھا...... اکڑو مت! یہ وقت ہر انسان پر آتا ہے۔ میں نے کہا تھا...... مجھ پر کبھی نہیں آئے گا۔

''مگر اوتار سنگھ کی پیدائش سے پہلے ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا' جس پر میں رنجیتا کے سوا کسی سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ جب تک رنجیتا رہی' وہ بوجھ ہونے کے باوجود میرے لیے بوجھ نہیں بنا۔ لیکن رنجیتا کے دیہانت کے بعد اوتار سنگھ تعلیم کے لیے دہلی چلا گیا۔ اور میں اکیلا رہ گیا۔ تب مجھے ڈائری کا سہارا لینا پڑا۔

اوتار سنگھ کا جنم ایسا پُراسرار معاملہ ہے کہ اگر میرے ساتھ نہ پیش آیا ہوتا اور کسی نے مجھے سنایا ہوتا تو میں مذاق اڑاتا اور کہتا کہ اچھی کہانی ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ حقیقت ہے' چاہے سمجھ میں نہ آئے۔

میں نے کبھی نہیں سنا کہ دو آدمیوں نے ایک ہی وقت میں ایک ہی خواب دیکھا ہو...... لفظ بہ لفظ' ہو بہو ایک ہی خواب۔ مگر اوتار سنگھ کی پیدائش سے پہلے میں نے اور رنجیتا نے ایک ہی رات ایسا خواب دیکھا تھا......

''نور بانو...... وہیئے' کہاں ہے؟'' حمیدہ کی پکار نے نور بانو کو چونکا دیا۔ چونکی تو اسے احساس ہوا کہ وہ تو ڈائری کے چار صفحے پڑھ چکی ہے۔ شرمندگی سے اس کا برا حال ہو گیا۔

''نور بانو......''

دوسری پکار پر اسے خیال آیا کہ اس نے حمیدہ کو جواب بھی نہیں دیا ہے۔ ''ابھی آئی اماں۔'' اس نے کہا اور ڈائری کو تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ پھر وہ کمرے سے نکل گئی۔

وہ حمیدہ کے کمرے میں پہنچی۔ ''کیا بات ہے اماں؟''

''میری آنکھوں میں دوا ڈال دے بیٹی۔ عبدالحق کو تو اب فرصت ہی نہیں ہے۔ پتا نہیں' ٹھیک سے کھاتا بھی ہے یا نہیں۔''

نور بانو نے دوا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ لیٹ جائیں اماں۔ میں دوا ڈال دوں۔''

وہ اس کی دوسری شرمندگی تھی۔ اماں کو پکارنے کی ضرورت پڑ گئی۔ صرف اس لیے کہ ڈائری کے چکر میں اسے وقت کا احساس نہیں رہا۔ ورنہ وہ خود ہی اماں کو یاد دلاتی تھی کہ دوا ڈالنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اور بلا اجازت وہ ڈائری پڑھنا پہلی شرمندگی تھی۔

❁......❁......❁

اب ڈائری پڑھنے سے تو وہ رک نہیں سکتی تھی۔ جو کچھ اس نے پڑھا تھا' اس سے آتشِ شوق بھڑک گئی تھی۔ اور اب اس کے پاس ایک دلیل بھی تھی۔ غلطی وہ کر چکی تھی۔ تو اب مکمل غلطی ہی سہی۔

عبدالحق کے باپ نے جس انداز میں لکھا تھا' اس سے پتہ چلتا تھا کہ عبدالحق کی ولادت ایک بڑا واقعہ تھی۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ وہ والدین کی شادی کے بیس سال بعد پیدا ہوا تھا۔ مگر اب یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی ولادت سے پہلے اور بعد پُراسرار واقعات پیش آئے تھے۔ پہلا واقعہ وہ خواب تھا' جو اس کے ماں اور باپ نے بیک وقت دیکھا تھا۔ وہ اس خواب کی تمہید ہی پڑھ رہی تھی کہ حمیدہ نے اسے آواز دے دی تھی اب وہ آگے پڑھنے کو بے تاب تھی۔

اس نے آگے پڑھنا شروع کیا تو ڈائری میں کھو ہی گئی۔

وہ تو نا قابلِ فہم واقعات تھے۔ وہ حقیقت نہیں' افسانہ لگتا تھا اور افسانہ بھی ایسا' جس کا حقیقت سے دور کا تعلق بھی نہ ہو...... ایک دیومالائی افسانہ!

جیسے جیسے وہ پڑھتی گئی' اس کی سمجھ میں آ گیا کہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے لیے وہ ڈائری لکھنا کتنا ضروری ہو گیا تھا۔ ابتدا میں جو اس نے ڈائری لکھنے کی وجہ بیان کی تھی' نور بانو نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی لیکن ڈائری پڑھتے ہوئے وہ یہ ماننے پر مجبور ہو گئی کہ ٹھاکر کیونکہ فنکار نہیں تھا' اس لیے اپنی مجبوری کو پوری طرح سے بیان نہیں کر سکا تھا۔

جو کچھ اس ڈائری میں تھا' اسے وہ جھوٹ یا افسانہ بھی قرار نہیں دے سکتی تھی۔ اور وہ ایسا بھی نہیں تھا کہ اس پر آسانی سے یقین کیا جا سکتا لیکن اس کا دل اس پر یقین کر رہا تھا۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے واقعات کو ترتیب کے ساتھ' بے حد سادگی سے لکھا تھا۔ اس کے نتیجے میں کڑی سے کڑی ملتی گئی تھی اور کہیں کوئی ابہام نہیں رہا تھا۔

مگر واقعات نا قابلِ یقین تھے۔ میاں بیوی کا ایک ہی رات ایک جیسا خواب دیکھنا بھی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پھر اس خواب کے بعد اس درخت کا سوکھ جانا' جس پر انہوں نے آخری بار اولاد کے لیے چڑھاوا دیا تھا۔ اس پر دونوں میاں بیوی کی مایوسی بھی بالکل فطری تھی۔ جس درخت سے وہ بیٹا مانگ رہے تھے' جس سے انہیں خوش خبری ملی تھی' وہ عین بہار کے موسم میں اس طرح جل گیا تھا کہ اس پر ایک پتا بھی نہیں بچا تھا۔ لیکن پھر اچانک ہی ٹھاکرانی کی گود بھر گئی تھی۔

مجذوب کے بارے میں پڑھ کر نور بانو کو وہ بابا یاد آیا' جو دہلی میں اس کے گھر عین ضرورت کے وقت آیا تھا۔ جب عبداللہ نے اسلام قبول کیا تھا' جب وہ کہہ رہی تھی کہ انہیں اسلام قبول کرنے کے لیے مسجد جانا ہوگا۔ تو وہ کیا وہی مجذوب تھا؟ اسے تو عبدالحق بھی جانتا تھا اور زبیر بھی۔ بلکہ زبیر نے تو کہا تھا کہ وہ عبدالحق کی پیدائش والے دن گاؤں آیا تھا اور یہی بات ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے بھی لکھی تھی۔ تو اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ وہی تھا۔ اور وہ وہی تھا تو ٹھاکر کی ڈائری میں لکھی ہر بات کے سچ ہونے کی سند تھا۔ وہ سب ایک دوسرے کی تصدیق کر رہے تھے۔

پھر چھوٹے ٹھاکر کا ماں کا دودھ نہ پینا اور حمیدہ کے دودھ پر اصرار کرنا۔ یہ بھی افسانہ لگتا تھا، لیکن یہاں دودھ پلانے والی حمیدہ زندہ تھی اور وہ تفصیل بھی بیان کرتی تھی' جو ٹھاکر کی ڈائری میں نہیں تھی۔ کیونکہ ٹھاکر کو اس کا علم نہیں تھا۔

آگے ایک ایسی بات تھی...... اہم بات' جو اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ آ بھی نہیں سکتی تھی۔ بات الجھی ہوئی تھی اور ٹھاکر نے کھل کر بھی نہیں لکھی تھی۔ بس وہ یہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ کوئی معاملہ ہے' جس میں تمام انسان ایک طرح سے پیدا ہوتے ہیں۔ تاہم مسلمان' بچے کو اس حالت کو تبدیل کر کے دوسری حالت پر لایا جاتا ہے۔ یہاں چھوٹا ٹھاکر پیدا ہوا تو اسی دوسری حالت میں تھا۔ اور ٹھاکر نے پوری طرح چھان بین کی تھی اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس کا بیٹا اسی حال میں پیدا ہوا ہے۔ اسے اس پر لایا نہیں گیا ہے۔

نور بانو نے اس پر بہت غور کیا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

ٹھاکر نے آگے اپنی ڈائری میں لکھا تھا......

''رنجو کے علم میں یہ بات آئی تو وہ پریشان ہوگئی۔ اس وقت تک رنجو کے علاوہ دائی راجو اور شانتا کو بھی یہ بات معلوم تھی۔ وہ دونوں بہت خوف زدہ تھیں۔ کچھ ہی پہلے تو چھوٹے ٹھاکر کے غائب ہو جانے کا معاملہ ہوا تھا اور اس سلسلے میں شانتا پر شک بھی کیا گیا تھا اور اسے دھمکیاں بھی دی گئی تھیں۔ بہرحال رنجو نے مجھے بلوالیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں اس وقت چھوٹے ٹھاکر کے جشن میں شریک تھا اور مہمانوں میں گھرا ہوا تھا۔ جمال دین نے مجھ سے اصرار نہ کیا ہوتا تو میں اس محفل سے کبھی نہ اٹھتا۔ میں نے جا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ یہ اس مجذوب کی حرکت ہے۔ کمرا تبدیل کرتے وقت اس نے میرے پتر کے ساتھ یہ کارروائی کر دی ہوگی لیکن پھر میں نے سمجھ لیا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ ایک تو وہاں کوئی نشان نہیں تھا۔ دوسرے وہ چیز تین دن سے پہلے ٹھیک بھی نہیں ہوتی۔ اور میرے پتر کی تو پیدائش کو ہی ابھی تین دن نہیں ہوئے تھے۔ یہ میں جانتا تھا کہ دائی راجو اور شانتا ایسی جرأت نہیں کر سکتیں۔ اور وہ کرتی بھی تو کیوں۔ میں نے ان دونوں سے اس راز کو ہمیشہ راز رکھنے کا وعدہ لیا۔ مگر اس دن میں نے پہلی بار یہ ضرور سوچا کہ میرے

پتر کا مسلمانوں سے کوئی بہت گہرا تعلق ہے۔ بلکہ مجھے تو ایسا لگا کہ اسے کسی مسلمان گھرانے میں پیدا ہونا تھا۔ مگر بھگوان نے میری اور رنجو کی محرومی دیکھ کر اسے ہمارے گھر پیدا کر دیا۔ تب میں نے سوچا کہ مجھے مسلمانوں کے بارے میں سوچنے اور جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ورنہ شاید میں مجذوب کی ہدایات پر عمل بھی نہیں کر سکوں گا۔ مجذوب نے کہا تھا کہ مجھے بیٹے کی ہر بات ماننا ہوگی۔ وہ جو چاہے کرے۔ اور معنی خیز بات یہ ہے کہ میرے بیٹے نے ماں کا دودھ ہوتے ہوئے گاؤں میں موجود واحد مسلمان عورت کے دودھ کی ضد کی اور اس کے لیے جان پر کھیل گیا۔ وہ صرف چند روز کا تھا اور اس نے مجھے شکست دے دی......''

ڈائری پڑھتے ہوئے نور بانو کو یہ احساس ہو گیا کہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ بہرحال بہت اچھا انسان تھا۔ ورنہ راجاؤں کو اپنی رعایا سے کسی چیز کی ضرورت پڑے تو وہ اسے چھین لیتے ہیں۔ مگر ٹھاکر نے وہ چیز عزت اور عاجزی سے مانگی تھی...... ضرورت مند بن کر مانگی اور اس کا احسان مانا۔ پھر اس احسان کا صلہ دینے کی بھی کوشش کی۔

نور بانو نے وصال دین کو صرف ایک بار دیکھا تھا۔ اور جمال دین کو تو وہ جانتی ہی نہیں تھی۔ حمیدہ کے ساتھ اب وہ وقت گزار رہی تھی۔ ٹھاکر کی ڈائری پڑھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ غیر معمولی انسان تھے۔ ٹھاکر کو انہوں نے بہت متاثر کیا تھا۔ بلکہ یوں کہیں کہ ٹھاکر کے ذہن پر انہوں نے اَن مٹ نقش چھوڑے تھے۔ ٹھاکر کو اپنے بیٹے کی وجہ سے مسلمانوں کو سمجھنے کی' ان کے بارے میں جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ مگر مسلمانوں کے بارے میں اچھا تاثر اس پر اس گھرانے نے قائم کیا تھا۔ ٹھاکر کی ڈائری سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ غیر معمولی طور پر وفادار' احسان شناس' منکسر المزاج' عالی ظرف اور نیک تھے۔ ٹھاکر نے دودھ کے صلے میں اپنی زمین جائیداد آدھی ان کے نام کر دی تھی۔ مگر وہ اسی طرح رہتے رہے۔ اور ٹھاکر کو اسی طرح مانتے رہے۔ اور اب یہ تو نور بانو بھی جانتی تھی کہ انہوں نے چپکے سے وہ سب کچھ چھوٹے ٹھاکر کے نام کر دیا تھا۔

جیسے جیسے نور بانو وہ ڈائری پڑھتی گئی' اس کی شرمندگی بھی بڑھتی رہی اور پچھتاوے کا احساس بھی۔ اور دونوں چیزوں کا تعلق عبدالحق سے تھا۔ وہ شرمندہ تھی تو اپنے گمان پر۔ وہ محبت کے باوجود ہمیشہ اسے کافر کہہ کر رد کرتی رہی۔ اس کے بارے میں اماں نے جب بھی کوئی اچھی بات کی تو اس نے اسے مکاری اور منافقت قرار دیا۔ اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ وہ ان کے گھر میں گھسنے کے لیے خود کو اچھا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور پچھتاوا اسے اس بات پر تھا کہ جو محبت اس کے لیے خوشی کا باعث ہو سکتی تھی' اس نے اسے اپنے لیے ذہنی اور روحانی اذیت کا سامان بنا لیا تھا۔ وہ اس محبت رد کرتی رہی۔ اس کے نتیجے میں ناخوش رہی اور جلتی کڑھتی رہی۔ اس بات کا احساس اسے باجی کو یاد کر کے ہوتا تھا۔ باجی کتنی خوش رہتی تھیں۔ باجی ایسی از خود رفتگی کی کیفیت میں رہتی تھیں کہ

اس وقت تو انہیں دیکھ کر اسے غصہ آتا تھا اور لگتا تھا کہ وہ اللہ سے بغاوت کر رہی ہیں۔ مگر اب اس پر رشک آتا تھا۔

وہ ڈائری بند کر کے اس پر سوچتی رہی کہ اس کی اور باجی کی محبت میں اتنا فرق کیوں تھا۔ ایک جواب تو بالکل سامنے تھا۔ وہ اس محبت پر شرمندہ تھی' جبکہ باجی اس محبت پر نازاں تھیں۔ فرق دونوں کے گمان کا تھا۔ اس کا گمان برا اور غیر لچک دار تھا...... ضد اور ہٹ دھرمی پر مبنی...... جبکہ باجی اپنے محبوب کے بارے میں اچھا گمان رکھتی تھی۔ انہیں پتا چلا کہ وہ عربی پڑھتا ہے اور قرآن کی تلاوت سنتا ہے تو انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کا رجحان اسلام کی طرف ہے۔ جبکہ اس نے اتنی بڑی بات کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی اور بدگمانی کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور بعد میں ثابت ہوا کہ باجی کی سوچ درست تھی۔

مگر یہ تو سامنے کی بات تھی۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ اصل بات تو اندر کی ہے۔ پہلی بار اس نے خود کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہاں آنے کے بعد جو اس میں خود اعتمادی پیدا ہوئی تھی' یہ اس کی بدولت تھا۔ ورنہ تو کبھی وہ ایسا سوچتی بھی نہیں۔ اس کی سمجھ میں ایک بات آ گئی۔ اس کے اور باجی کے درمیان مزاج اور طبیعت کا بہت فرق تھا۔ باجی نرم خو اور درگزر کرنے والی تھیں۔ جبکہ وہ تند مزاج اور دوسروں کی غلطیاں پکڑ کر خوش ہونے والی تھی۔ باجی خوش مزاج تھیں۔ بات بات پر ہنسنے والی۔ اور مسکراہٹ تو کبھی ان کے ہونٹوں سے جدا ہی نہیں ہوتی تھی۔ اور وہ بدمزاج اور اپنے آپ میں گم رہنے والی تھی۔ مسکراتی بھی وہ کبھی کبھار تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ محبت سے اس کا کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ اور باجی کو تو لگتا تھا کہ بنایا ہی محبت کے لیے گیا تھا۔

اب اس نے سوچا کہ ایسا کیوں تھا۔ کوئی سبب بھی تو ہوگا۔ اس نے حوصلہ کر کے اس پر سوچا تو اسے اس کا بھی جواب مل گیا۔ وہ اپنی صورت شکل اور رنگ و روپ کے حوالے سے احساسِ کمتری کا شکار تھی۔ اسے اللہ سے شکایت تھی کہ اس نے اسے دونوں بہنوں سے مختلف بنایا۔ وہ اپنی بہنوں سے اپنا موازنہ کرتی اور اس کے نتیجے میں ناخوش رہتی۔

تو اب اس کی سمجھ میں آیا کہ مذہب کا فرق اور خوف خدا اپنی جگہ' لیکن اسے مسترد کیے جانے کا خوف بھی تھا۔ اس کے اندر گہرائی میں یہ خوف بیٹھا ہوا تھا کہ اسے کبھی محبت نہیں ملے گی۔ وہ اس قابل ہے ہی نہیں کہ کوئی اس سے محبت کرے۔ اس کے باوجود شاید وہ محبت اس کے لیے کوئی خوب صورت اور نازک خواب بن جاتی اور وہ چپکے چپکے' نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے لطف اٹھاتی۔ مگر جب اسے یہ احساس ہوا کہ باجی کی محبت کا مرکز بھی چھوٹا ٹھاکر ہی ہے' تو اس نے سمجھ لیا کہ اس کے لیے اب کوئی امکان نہیں ہے۔ حالانکہ امکان تو کبھی چھوٹے ٹھاکر سے سامنا ہونے کا بھی نہیں تھا لیکن اب تو اسے خواب و خیال میں بھی چھوٹے ٹھاکر کی محبت نہیں مل سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اور

کڑوی ہوگئی۔

یہ تو وہ جانتی تھی کہ عملی طور پر چھوٹے ٹھاکر کے باجی سے یا اس سے ربط ضبط کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کے لیے تو وہ بس خواب و خیال کا معاملہ تھا...... اور پھر وہ بھی نہیں رہا۔

لیکن اب وہ سوچ رہی تھی کہ ہونے کو تو دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ وہ جب کے چھوٹے ٹھاکر اور حال کے عبدالحق کے اتنا قریب رہ سکے گی۔ لیکن یہ ہو گیا تھا۔

اس نے سوچا' میرے لیے تو یہ بھی بہت بڑی بات ہے۔ محبت نہیں مل سکتی تو کیا ہوا، اسے اپنے محبوب کی قربت تو مل گئی۔ اس نے عہد کیا اب پہلے کی طرح ناشکرا پن کبھی نہیں کرے گی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ابھی اسے پچھلے ناشکرے پن کی سزا ملنی ہے۔

❁ ❁ ❁

جہاں کبھی حویلی تھی' وہاں عبدالحق کی مرضی کے مطابق مکانات تعمیر ہو گئے تھے۔ عبدالحق نے اپنے لیے وہی کمرا مخصوص کیا تھا' جو پہلے حویلی میں اس کا کمرا تھا۔ اس نے اپنے لیے جو مکان بنوایا' اس میں چھ کمرے تھے۔ ایک کمرا اماں کا' ایک نور بانو کا' دو زبیر کے اور ایک اس کا اپنا تھا چھٹا کمرا مردانہ تھا۔ اور بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

یوں وہ جگہ' جہاں کبھی حویلی تھی' اب گاؤں کا رہائشی علاقہ بن گیا۔ جہاں ایک گھر تھا' وہاں دس گھر بن گئے۔ عبدالحق نے یہ کام بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اس کے پیش نظر اس کی افادیت تھی۔ ایک تو وہ زمین کو کفایت کے ساتھ استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں ہندوستان سے آنے والوں کی نو آبادکاری کا اہم کام تھا۔ بڑی حویلی اور بڑے مکانوں کی ایسی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس طرح سے زمین بچا کر اسے زراعت کے کام میں لایا جاتا تو کسی ایک گھرانے کا تو بھلا ہوتا۔ دوسرے اس کے نتیجے میں گاؤں میں مرکزیت کا تصور بھی قائم ہوا تھا۔ وہاں رہنے والوں میں قربت اور یگانگت پیدا ہوتی۔

سب لوگ بہت خوش تھے۔ وہ عبدالحق کی طرف ایسے دیکھتے تھے' جیسے وہ اس دنیا کا آدمی ہی نہ ہو۔ وہ نوجوان تھا لیکن وہ اس کی ایسی عزت کرتے' جیسے وہ ان سب سے بڑا ہو۔ انہوں نے اس کے دل کی بڑائی دیکھی تھی' اس کا ایثار دیکھا تھا۔ وہ کبھی صرف اپنے لیے نہیں سوچتا تھا۔ اس کی سوچ اجتماعی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اسے ان سے کوئی غرض نہیں ہے۔ وہ ان کی بہتری کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ وہ ان کی تکالیف' ان کے مصائب دور کرنا چاہتا تھا۔ اس کا مقصد ان کے لیے آرام اور خوش حالی کا حصول تھا۔ ورنہ وہ اس علاقے کا سب سے بڑا زمین دار بن سکتا تھا۔

سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں منتقل ہو گئے۔ زندگی اپنے نئے راستے پر قدم بڑھانے

لگی۔ اب سب لوگوں کو صرف پانی کا انتظار تھا۔ پانی آجاتا وہ زمین سے رزق حاصل کرنے کی کوشش شروع کرتے۔ اور وہ دیکھ رہے تھے کہ اس سلسلے میں بھی بہت تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ وہ سب سوچتے تھے کہ عبدالحق نے اپنا سب کچھ اس کام میں جھونک دیا ہے۔ اور جواب میں ان سے کچھ طے بھی نہیں کیا ہے۔

نئے گھر میں منتقل ہونے کے بعد نور بانو کو عبدالحق سے دوری کا احساس ہونے لگا۔ سب کے کمرے الگ ہو گئے تھے۔ عبدالحق کا زیادہ وقت باہر ہی گزرتا۔ پھر وہ دن بھر کا تھکا ہارا آتا تو کبھی بیٹھک میں ہی لیٹ کر سو جاتا۔ کئی کئی دن وہ اس کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ پاتی وہ اس سے ڈائری کے سلسلے میں بھی بات نہیں کر پا رہی تھی۔

دوسری طرف وہ خود بھی بہت مصروف ہو گئی تھی۔ وہ بیک وقت دو سویٹر بن رہی تھی۔ اور وہ چاہتی تھی کہ سردی کا موسم آنے سے پہلے چار سویٹر مکمل کر لے۔

حمیدہ کی آنکھیں تقریباً پوری طرح ٹھیک ہو چکی تھیں۔ عبدالحق اسے ہر ہفتے شہر لے جاتا تھا...... ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے۔

''اب آپ چشمہ لگانا کم کر دیں۔'' ڈاکٹر نے حمیدہ کو کہا تھا۔

''میں تو لگانا ہی نہیں چاہتی۔''

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔ ''نہیں' ایسا نہ کریں۔ ابھی آپ کو اس کی ضرورت ہے۔''

''تو پھر کم کرنے کا مطلب؟''

''صبح کے وقت' اور شام کے وقت' جب دھوپ ہلکی ہو جاتی ہے' آپ چشمہ اتار کر دیکھیں۔'' ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔ ''لیکن نظروں میں چبھن ہو تو فوراً چشمہ لگا لیں۔''

''اور دوپہر میں۔''

''تیز دھوپ میں چشمہ لگانا ضروری ہے۔ ابھی یہ احتیاط کریں گی تو کچھ عرصے کے بعد چشمہ لگانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔''

حمیدہ کو وہ رعایت بھی بڑی نعمت لگی۔ پہلی بار دن کے اجالے میں اس نے چشمے کے بغیر دنیا کو دیکھا تو اسے بڑی خوشی ہوئی۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے عبدالحق کے لیے دعا نکلی۔ پھر وہ شوہر اور بیٹے کو یاد کر کے رونے لگی۔ آج وہ دونوں موجود ہوتے تو عبدالحق کو عبدالحق دیکھ کر کتنے خوش ہوتے۔ اور اپنے گاؤں میں اذان کی آواز سن کر انہیں کتنی خوشی ہوتی۔

❁ ❁ ❁

گاؤں میں ریت ہٹانے کا کام بہت تیز رفتاری سے ہو رہا تھا۔ مگر کام بہت بڑا تھا۔ عبدالحق کا اندازہ تھا کہ اس تیز رفتاری کے باوجود اس کام کو مکمل ہونے میں کم از کم چار مہینے تو لگیں گے۔

وہ بہت مصروف ہو گیا تھا۔ اسے ریت ہٹانے کے کام کی نگرانی خود کرنا تھی۔ اگر وہ اس کام پر توجہ نہ دیتا تو کام کی یہ رفتار ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ سب کے پیچھے پڑا رہتا۔ پھر شہر آنا جانا بھی لگا رہتا تھا۔ ان تمام مصروفیات میں وہ تھک کر چُور ہو جاتا تھا۔ مگر اسے کوئی ملال نہیں تھا۔ یہ کام تو اسے کرنا ہی تھا۔

ایک اس پر اللہ کی رحمت تھی۔ وہ رات میں مشکل سے دو تین گھنٹے سوتا تھا لیکن وہ ایسی بھرپور نیند ہوتی تھی کہ وہ ایسا تازہ دم اٹھتا تھا' جیسے اس نے آٹھ گھنٹے کی نیند لی ہو۔ اور یہ اس رات کا تحفہ تھا' جب اس نے اسلام قبول کیا تھا...... رمضان المبارک کی پہلی رات!

ابتدا میں تو وہ اس تبدیلی سے بہت ڈرا تھا۔ اس لیے کہ وہ اسے غیر فطری لگتی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ تقریباً دو مہینے تک تو وہ بالکل سو ہی نہیں سکا تھا۔ نیند آتی ہی نہیں تھی۔ مگر کوئی تکلیف بھی نہیں تھی۔ نیند کی کمی کا احساس ہوتا تھا' نہ ہی کوئی تھکن ہوتی تھی۔ بس وہ سارا دن' ساری رات جاگتا رہتا تھا۔ اس سے اسے جسمانی طور پر تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ البتہ ذہنی طور پر وہ خود کو بیمار اور ایب نارمل سمجھنے لگا تھا۔ تکلیف یہ بھی تھی کہ رات کو نیند نہ آئے تو وہ کیا کرے۔ کروٹیں بدلنے کے سوا کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ سوچتا کہ اللہ نے دن کام کرنے کے لیے بنایا ہے اور رات آرام کرنے کے لیے اب وہ رات کی نیند سے محروم ہے تو کہیں اس کا سبب یہ تو نہیں کہ اللہ اس سے ناراض ہے۔ اس خیال سے وہ بہت بے چین رہتا تھا۔

وہ سوچتا تھا کہ اس پر کسی سے بات کرے۔ لیکن ہمت نہیں ہوتی تھی۔ پھر جب مہر علی مسجد امام کی حیثیت سے آئے تو اس نے یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا۔

مہر علی چند لمحے اسے بہ غور دیکھتے رہے۔ پھر بولے۔ ''یہ تو تم پر اللہ کی رحمت ہوئی ہے عبدالحق۔''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔''

''یہ سچ ہے کہ اللہ نے رات آرام کرنے کے لیے بنائی ہے۔ مگر اللہ کو یہ بہت پسند ہے کہ اس کا بندہ اپنے آرام کے وقت میں سے اس کے لیے وقت نکالے۔ آدھی رات کے بعد کی عبادت اللہ کو بہت پسند ہے۔ کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ جس دعا کی قبولیت کا امکان ہوتا ہے' وہ دعائے نیم شب ہے۔''

عبدالحق اب بھی انہیں ایسے دیکھ رہا تھا' جیسے ان کی بات سمجھ نہیں پا رہا ہو۔

''دیکھو...... دن اللہ نے کام کے لیے بنایا ہے۔ اس لیے بنایا ہے کہ تم اس میں اللہ کا فضل تلاش کرو یعنی دن میں تمہیں بندوں کے حقوق ادا کرنے ہیں۔ اس میں فرض نمازیں بھی پڑھنی ہیں۔ سورہ مزمل میں اللہ نے فرمایا ہے کہ قرآن رات کے وقت پڑھو اور ٹھہر ٹھہر کر...... سمجھنے کی نیت

سے پڑھو۔ وجہ؟" اتنا کہہ کر مہر علی نے توقف کیا اور چند لمحے یوں خاموش رہے جیسے اپنے ہی اٹھائے ہوئے سوال کا جواب سوچ رہے ہیں۔ پھر انہوں نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "دن کام کے لیے ہے۔ کام آدمی اپنے لیے بھی کرتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی۔ یعنی وہ وقت خالص تمہارا نہیں ہوتا۔ اب تم دن میں قرآن پڑھو تو دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ دھیان کسی ایسے کام کی طرف لگا ہوگا' جو تمہیں کرنا ہے تو یکسوئی نہیں ہوگی۔ یکسوئی نہیں ہوگی تو سمجھ میں کیا آئے گا۔ پھر وہ اللہ کا کلام ہے۔ یک سوئی کے بغیر اسے پڑھنا احترام کے منافی ہے..... گستاخی ہے۔ تو تمہیں قرآن پڑھنے سے وہ کچھ حاصل نہیں ہوگا' جو ہونا چاہیے۔ الا یہ کہ اللہ چاہے اور پھر تم ایسے وقت میں قرآن پڑھ رہے ہو گے' جس پر دوسروں کا حق ہے۔ یا پھر اللہ کے فضل کی تلاش میں کوتاہی کر رہے ہو گے۔ اور رات کا وقت خالص تمہارا اپنا ہے' تمہارے آرام کے لیے ہے۔ اپنے آرام کو نظر انداز کر کے اللہ کے لیے وقت نکالو تو اللہ خوش ہوگا۔ تمہاری عبادت قبول ہوگی۔ اس لیے نفلی عبادت کے لیے رات ہی ہے۔ اللہ نے رات آرام کے لیے بنائی ہے۔ تم آرام کی بجائے عبادت کرو' قرآن پڑھو' ذکر کرو تو اس کے اجر کا تم اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔"

عبدالحق کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کے دل سے مہر علی کے لیے دعا نکلی۔ رات کے وقت کے زیاں نے اسے بہت بے چین کر رکھا تھا۔

مہر علی نے اسے تہجد کی نماز کے بارے میں بتایا۔

اس کے بعد پہلی بار وہ سویا۔ شاید اس لیے کہ تہجد کے لیے سو کر اٹھنا ضروری تھا۔ دو گھنٹے کے بعد وہ اٹھا تو پوری طرح تازہ دم تھا۔

یوں اس کا ایک نیا معمول قائم ہو گیا' ایسا معمول' جس میں اس کے لیے روحانی خوشی تھی۔ قرآن پاک سے تو اسے عشق تھا۔ قرآن پڑھنے سے تو اس کا دل ہی نہیں بھرتا تھا۔

یہاں بھی مہر علی نے اس کی رہنمائی کی۔ "قرآن صرف اس وقت تک پڑھا کرو' جب تک طبیعت میں شگفتگی رہے۔ یہ بہت بھاری کلام ہے۔ دل و دماغ بوجھل محسوس ہونے لگیں تو طبیعت کی شگفتگی واپس آنے تک وقفہ کرو۔"

اب اس مصروفیت میں یہ نیا معمول اور بڑی نعمت بن گیا۔ دن میں قرآن پڑھنے کا وقت ملتا ہی نہیں تھا۔ وہ رات کو سونے سے پہلے اور پھر تہجد اور فجر کے درمیان پڑھتا تھا۔

شب بیداری میں اسے لذت ملنے لگی!

❁ ❁ ❁

نور بانو نے ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی پہلی ڈائری پڑھ لی جس میں واقعات تھے۔ اس کے بعد دوسری ڈائری بھی پڑھنے لگی۔ دوسری ڈائری تاریخ وار لکھی گئی تھی۔ اس میں ٹھاکر کے شب و روز

بھی تھے' واقعات بھی اور اس کے بدلتے ہوئے رجحانات کا عکس بھی۔

وہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی ایک بات سے پوری طرح متفق تھی۔ عبدالحق کی ٹھاکر پرتاپ کے ہاں پیدائش میں اللہ کی کوئی مصلحت تھی' اللہ کا کوئی بھید تھا' جو وہی جانتا تھا۔ ورنہ عبدالحق کو تو واقعی مسلمان گھرانے میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔

اب وہ سوچتی تھی کہ اماں پہلی بار اور پر گئیں تو چھوٹے ٹھاکر کو پُرسہ دینے گئی تھیں۔ مگر وہ اتنا اچھا لگا کہ اسے بیٹا بنا لیا۔ وہ تو اسے اپنے گھر بلانے پر تلی ہوئی تھیں۔ اگر خود اس نے مزاحمت نہ کی ہوتی تو وہ اسے ہر حال میں اپنے گھر لے آتیں۔ اماں کہتی تھیں...... اس میں کافروں اور مشرکوں والی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ بتوں کی پوجا نہیں کرتا۔ وہ حق کی جستجو میں ہے۔ اور اماں کہتی تھیں کہ میں ہر نماز میں اللہ سے اس کی ہدایت کے لیے دعا کرتی ہوں۔

اماں تو خیر اس سے ملتی رہی تھیں۔ باتیں کرتی رہی تھیں۔ لیکن باجی نے تو اس سے کبھی بات نہیں کی تھی۔ وہ تو بس اس سے محبت کرتی تھیں اور ان کا یقین تھا کہ وہ ایک دن مسلمان ہو جائے گا۔ کیسے؟ صرف محبت کی وجہ سے! وہ اسے اتنا یقینی طور پر سمجھتی تھیں۔ تو اس کی اپنی محبت میں کوئی کمی تھی کہ وہ اسے کافر اور مشرک سمجھتی اور کہتی رہی۔

بہر حال اب ڈائری پڑھ کر وہ سمجھ گئی تھی کہ اماں اور باجی دونوں درست تھیں اور وہ غلطی پر تھی۔ اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ اس وقت کے چھوٹے ٹھاکر کے لیے اس کی اور باجی کی محبت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اور وہ اس پر شرمندہ ہونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری ڈائری پڑھتے ہوئے ایک مقام ایسا آیا کہ وہ ہل کر رہ گئی۔ ٹھاکر نے لکھا تھا......

"مجھے اپنے پتر کی صورت دیکھے کئی مہینے ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی تو دل میں آتا تھا کہ اسے اسکول سے اٹھا لوں۔ اسکول سے اچھی پڑھائی کا تو میں گھر پر بھی بندوبست کر سکتا تھا لیکن ہر بار میں نے خود کو سمجھایا کہ گاؤں میں میرا بیٹا کتنا ہی علم حاصل کر لے' کنویں کا مینڈک رہے گا۔ شہر میں' اسکول میں وہ بہت کچھ سیکھے گا۔ میں اپنی خود غرضی پر کڑھتا تھا۔ مگر میں کیا کرتا' رنجو کے بعد میرے پاس اوتار سنگھ کے سوا تھا ہی کیا۔

پھر اس دن میری برداشت جواب دے گئی۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اب اوتار سنگھ گھر آئے گا۔ مگر اس میں ابھی دس پندرہ دن باقی تھے۔ اور میں اسے دیکھے بنا نہ رہ سکتا تھا۔ میں اس کے ساتھ تین دن گزارنے کی غرض سے دہلی چلا گیا۔

میں ان تین دنوں میں اس کو ہر پل اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔ اسکول جانا تو مجبوری تھی۔ مگر شام کو وہ کتابیں لے کر کوٹھے پر جانے لگا۔ مجھے فخر ہوا کہ اسے پڑھائی کی کتنی فکر ہے۔ میں اس کے ساتھ اوپر چلا گیا کہ وہ پڑھے' تب بھی میں اسے دیکھتا رہوں۔

مگر اوپر پہنچ کر وہ پڑھنے کی بجائے مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ میرے ٹوکنے پر اس نے کہا کہ امتحان ہو چکے ہیں۔ اب میں آ گیا ہوں تو وہ مجھے دیکھنا بھی چاہتا ہے اور مجھ سے باتیں کرنا بھی چاہتا ہے۔

مجھے احساس ہوا کہ بات کچھ اور ہے۔ بلکہ مجھے ایسا لگا کہ وہ پڑھائی کے لیے کوٹھے پر نہیں آیا' کسی اور وجہ سے آیا ہے۔ بیٹا کتنا ہی ذہین ہو' باپ کا تجربہ تو اس کے پاس نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ باپ بیٹوں کے بہت سے راز بغیر کہے سمجھ جاتے ہیں۔ میں اسے غور سے دیکھتا رہا۔ وہ ہو رہا تھا...... جوانی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ اور میں نے دیکھا کہ وہ بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ میں نے دل میں کہا' ہو نہ ہو' یہ کوئی لڑکی کا چکر ہے۔ میرا پتر محبت کرنے کی عمر میں داخل ہو گیا ہے۔

میں نظریں جھکا کر بیٹھ گیا۔ میں اسے موقع دے رہا تھا کہ وہ جس مقصد کے تحت اوپر آیا ہے' وہ پورا کرے۔ اور میں چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ اس کی نظریں مجھ پر جمی تھیں وہ اِدھر اُدھر نہیں بھٹک رہی تھیں۔ وہ پورے دھیان کے ساتھ مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے اپنی بدگمانی پر شرمندگی ہونے لگی۔ وہاں اردگرد اور کوٹھے بھی تھے۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھتا رہا مگر مجھے کسی کوٹھے پر کوئی لڑکی نظر نہیں آئی۔ پھر بھی میرے دل کو یقین تھا کہ کوئی بات ضرور ہے اور سامنے بھی آئے گی۔"

یہ عبارت پڑھتے ہوئے خنک موسم میں بھی نور بانو کی پیشانی عرق آلود ہو گئی اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے لگ رہا تھا کہ کسی بہت بڑے راز سے پردہ اٹھنے والا ہے۔ ایک لمحے کو اس نے سوچا' کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی کوٹھے پر کوئی لڑکی آتی ہو اور چھوٹے ٹھاکر کو اس سے محبت ہو گئی ہو۔ مگر پھر اسے باجی کا خیال آیا' جو عصر کی نماز میں بھی سستی کرتی تھیں اور قرآن پڑھتے ہوئے وضو کے بہانے اٹھ جاتی تھیں اور چھوٹے ٹھاکر کو دیکھتی تھیں۔ تو کیا چھوٹا ٹھاکر بھی انہیں دیکھتا تھا۔ اس کے دل میں کانٹا سا چبھ گیا۔ یہی بات ہو گی۔

پھر اسے شرمندگی ہوئی۔ اب تو وہ بہن دنیا میں بھی نہیں تھی۔ اور وہ اس سے رقابت محسوس کر رہی تھی۔

اس نے سر جھکایا اور دوبارہ ڈائری پڑھنے لگی......

"پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ اوتار سنگھ نے مجھ سے کہا کہ اسے ٹیچر کی ضرورت ہے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے کہا' کانتی پرشاد جی ہیں نا۔ اس پر وہ بولا...... نہیں پتا جی۔ مجھے عربی پڑھنی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ مگر میں نے کہا کہ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد اس کا بندوبست بھی کر دوں گا۔ وہ کچھ شرمندہ نظر آنے لگا اور بولا کہ وہ اس بار گرمی کی چھٹیاں دہلی میں گزارنا چاہتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ جلد سے جلد عربی پڑھ لینا چاہتا ہے۔ کیونکہ عربی میں وہ دس سال پیچھے ہے اور چاہتا ہے کہ ان چھٹیوں میں یہ فرق پورا کر لے۔

میرے لیے تو وہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ میں تو پورا سال ان چھٹیوں کی راہ دیکھتا تھا کہ میرا پتر میرے ساتھ وقت گزار سکے گا۔ میں اس سے کیسے دست کش ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ تم فکر نہ کرو۔ تم چھٹیاں گاؤں میں بھی گزار سکو گے اور عربی بھی پڑھ لو گے۔

اس رات میں سوچتا رہا۔ اوتار سنگھ کو عربی پڑھنے کا خیال کیسے آیا؟ اور وہ بھی اتنا اچانک؟ اسکول اور کالج کے دونوں میں میرا سب سے قریبی دوست مسلمان تھا۔ میں جانتا تھا کہ عربی مسلمانوں کی زبان ہے۔ ان کی مقدس کتاب اس زبان میں ہے۔ تو کیا یوں ہے کہ اسے کسی مسلمان لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔ لیکن یہ تو کوئی معترضانہ خیال نہیں تھا۔ مجھے تو بالکل ابتدا ہی میں واضح طور پر بتا اور سمجھا دیا گیا تھا۔ مجذوب نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے اپنے بیٹے کی ہر بات ماننی ہو گی۔ میں اسے کسی بات سے نہیں روکوں گا۔ وہ جس طرف جانا چاہے گا' میں اسے اسی طرف جانے دوں گا۔ اور جوتشی نے مجھ سے کہا تھا...... چھوٹے ٹھاکر اپنا بھاگ آپ لکھیں گے۔ اور بالکل ابتدا میں میرے شیر خوار بچے نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ مجھے مجذوب اور جوتشی کی باتیں ہمیشہ یاد رکھنی ہوں گی۔ شاید میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار بھی تھا۔ اگر اوتار سنگھ نے مسلمان عورت کا دودھ پینے کی ضد کی تھی اور اس کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی تو یہ امکان بھی توی تھا کہ وہ اپنے لیے مسلمان پتنی چنے گا۔ تو مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن میرا جی چاہا کہ اس لڑکی سے ملوں' اس کے سر پر ہاتھ رکھوں۔ بیٹے کا رجحان دیکھ کر ہی تو میں نے مسلمانوں کو اور ان کے دھرم کو سمجھنے کے لیے مطالعہ شروع کیا تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ جو کچھ میں نے پڑھا اور جانا تھا' اس نے مجھے متاثر کیا تھا۔ میرے مطالعے کا شوق اور بڑھ گیا تھا۔

اگلے روز میں اس کے اسکول جا کر ہیڈ ماسٹر سے ملا۔ ان کی مدد سے مجھے اوتار سنگھ کے لیے عربی کا استاد مل گیا۔ مولوی برکت علی ہمارے ساتھ گاؤں میں چھٹیاں گزارنے پر بھی رضا مند ہو گئے۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ کم از کم چھٹیوں میں تو وہ مجھ سے دور نہیں ہو گا۔

مگر مجھے اس معاملے کی کھوج تھی۔ اگلے دن شام کو وہ اچانک بے چین نظر آنے لگا۔ وہ مجھ سے بات کر رہا تھا لیکن اس کا دھیان کہیں اور تھا مجھے اس پر محبت آ گئی۔ میں نے خود اس سے کہا...... تم پڑھنے کے لیے اوپر نہیں جاؤ گے پتر؟...... اس نے بے پروائی سے کہا...... نہیں پتا جی' آپ کے ساتھ وقت گزارنے کا یہ موقع میں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے کہا...... دو گھنٹے کی تو بات ہے پتر۔ جاؤ' تم پڑھ لو۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی میں بازار جاؤں۔

میرے کہنے پر وہ اوپر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی دبے پاؤں زینے کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس کے سامنے نہیں گیا۔ بلکہ چھپ کر اسے دیکھتا رہا۔ اس نے کتاب نہیں کھولی تھی۔ مگر وہ اِدھر

اُدھر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ تو بس سر جھکائے بیٹھا تھا خاصی دیر ہوگئی۔ اس نے سر اٹھا کر ایک بار بھی کسی کی جستجو میں نظر نہیں دوڑائی۔ مجھے شرمندگی ہونے لگی کہ میں نے اس پر شک کیا...... اسے غلط سمجھا۔ لیکن پھر مجھے یہ خیال بھی آیا کہ بظاہر وہ پڑھنے کے لیے کوٹھے پر آیا ہے۔ جبکہ اب تک اس نے ایک بار بھی کتاب کھول کر نہیں دیکھی' کوئی بات تو ہے۔

میں وہاں سے ہٹنے ہی والا تھا کہ اچانک نیچے سے کسی لڑکی کی آواز آئی۔ وہ کچھ پڑھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا۔ وہ آواز سنتے ہی میرے اوتار سنگھ کے جسم میں جیسے کوئی برقی رو دوڑ گئی۔ اس نے سر اٹھایا اور اپنے سامنے دیکھنے لگا۔ لیکن اگلے ہی پل مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ اس وقت کچھ بھی نہیں دیکھ رہا ہے وہ تو صرف سن رہا تھا...... اور اس میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ میں اس کے سامنے بھی چلا جاتا تو وہ مجھے نہ دیکھ پاتا۔

میں نے اوتار سنگھ سے دھیان ہٹا کر لڑکی کی آواز پر توجہ کی۔ چند ہی لمحوں میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ لڑکی قرآن پڑھ رہی ہے۔ میرا زمانہ تعلیم کا ساتھی امان اللہ اکثر میرے سامنے قرآن پڑھا کرتا تھا۔ اس لیے مجھے یہ بات معلوم تھی۔ مگر میرے خیال میں میرے بیٹے کو اس بات کا علم نہیں ہوگا بلکہ اسے تو یہ بھی مشکل سے ہی معلوم ہوا ہوگا کہ وہ عربی زبان ہے۔

بہر حال میری سمجھ میں بات آگئی کہ وہ عربی کیوں سیکھنا چاہتا ہے۔

میں نے اگلے دن بھی مشاہدہ کیا۔ بات میری سمجھ میں آگئی۔ اوتار سنگھ صرف وہ آواز سننے کے لیے کوٹھے پر جاتا تھا۔ وہ آواز رکتی تو وہ مشکل سے دو تین منٹ وہاں ٹھہرتا۔ آواز رکتے ہی اس کی محویت ٹوٹتی۔ وہ اس بچے کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتا جس سے اس کا من پسند کھلونہ چھین لیا گیا ہو۔ پھر وہ نیچے کا رخ کرتا۔

اتنی بات تو سمجھ میں آگئی۔ مگر اس کے ساتھ الجھنیں بھی بڑھ گئیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسی دلچسپی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اوتار سنگھ کھڑا ہوتا اور جالیوں کے پاس جا کر اس لڑکی کو دیکھتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو بس مبہوت ہو کر اس آواز کو سنتا تھا۔ میں نے ایک بار بھی اسے اپنی جگہ سے اٹھتے نہیں دیکھا تھا۔ اب اسے محبت تو نہیں کہا جا سکتا۔

تین دن دہلی میں گزار کر میں گاؤں چلا آیا۔ ایک ہفتے بعد اوتار سنگھ کو بھی آنا تھا۔ میں اس معاملے پر سوچتا رہا۔ اگر اوتار سنگھ اس لڑکی کی خاطر عربی سیکھ رہا ہے تو پھر یہ تو محبت ہی ہوئی۔ لیکن وہ اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ غیر معمولی بات ہے۔

گرمی کی چھٹیاں شروع ہوئیں اور وہ سب گاؤں آگئے۔ ان کے ساتھ اوتار سنگھ کے نئے استاد مولوی صاحب بھی تھے۔ میں نے رگھو اور رنجنا سے الگ الگ بات کی۔ رنجنا سے باتوں ہی باتوں میں نیچے والوں کے بارے میں پوچھا۔ وہاں تین لڑکیاں تھیں۔ یہ پتا چلانا مشکل تھا کہ

اوتار سنگھ ان میں سے کس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ نیچے والوں کے ہاں پردہ بہت سخت ہے۔

پندرہ دن بعد میں نے مولوی صاحب سے اوتار سنگھ کی پروگریس پوچھی۔ وہ خود حیران تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہیں زندگی میں ایسا لائق اور محنتی شاگرد کبھی نہیں ملا۔ وہ اتنا تیز چلتا ہے کہ وہ بھی تھک جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کی علم کی لگن غیر معمولی تھی۔

میں نے یہ بات بہت پہلے سمجھ لی تھی کہ اوتار سنگھ کو کبھی کسی بات سے روکنا نہیں ہے۔ مجھے اس کی محبت پر کوئی اعتراض نہیں تھا اس کی خوشی کے لیے میں کوئی بھی قربانی دے سکتا تھا۔ مجھے پریشانی بس اس بات کی تھی کہ دھرم کے فرق نے اس معاملے کو پیچیدہ بنا دیا تھا۔ مگر مجھے یہ بھی یقین تھا کہ اس کا خود بہ خود کوئی حل نکل آئے گا۔ ویسے یہ بات تو میرے لاشعور میں کہیں پہلے سے موجود تھی کہ مسلمان عورت کے دودھ کی ضد کرنے والے اوتار سنگھ کو محبت بھی کسی مسلمان لڑکی سے ہی ہوگی......"

نور بانو نے ڈائری بند کر دی اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ یہ اسے وہ بات معلوم ہوئی تھی' جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی وہ سمجھ گئی تھی کی باجی کی محبت یک طرفہ نہیں تھی۔ چھوٹا ٹھاکر بھی ان سے محبت کرتا تھا۔ آج باجی زندہ ہوتیں اور یہ بات انہیں معلوم ہوتی تو وہ کیسی خوش ہوتیں۔

اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا تھا۔ اسے اپنے گھر کا پرانا معمول یاد تھا۔ عصر کی نماز کے بعد تینوں بہنیں قرآن پاک کی تلاوت کرتی تھیں...... مغرب کی اذان تک۔ اور پھر مغرب کی نماز پڑھتی تھیں۔ اور اسے یاد تھا کہ ابتدائی دنوں میں اس کی نگاہوں میں ہر وقت چھوٹے ٹھاکر کی صورت پھرتی تھی۔ اور اس بات پر وہ خود سے چڑنے لگی تھی۔ بس قرآن پڑھتے ہوئے اسے چھوٹے ٹھاکر کے تصور سے چھٹکارا ملتا تھا۔ تو ان دنوں وہ اس ضرورت کے تحت بھی قرآن کی تلاوت کرتی تھی...... اور تلاوت کے دوران اس کی کیفیت عجیب ہوتی تھی۔ اسے گرد و پیش کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ اور ایک تبدیلی یہ آئی تھی کہ وہ بلند آواز میں تلاوت کرنے لگی تھی۔ دو ایک بار اماں نے اسے اس پر ٹوکا بھی تھا۔ حالانکہ پہلے صرف باجی ہی بلند آواز میں قرأت کرتی تھیں۔

اسے یاد تھا کہ جس عرصے میں اس کا تلاوت کا رجحان بڑھا تھا' اس عرصے میں باجی تلاوت سے دور ہوگئی تھیں۔ وجہ تو وہ نہیں سمجھ سکتی تھی' مگر یہ حقیقت تھی وہ قرآن پڑھنے سے جی چرانے لگی تھیں۔ عصر اور مغرب کے درمیان وہ وضو کا حیلہ کر کے دالان میں وقت گزارنے کی کوشش کرتی تھیں۔ اسے حساس ہو رہا تھا کہ اس معاملے میں اس نکتے کی کوئی خاص اہمیت ہے' جیسے وہ سمجھ نہیں پا رہی ہے۔ کوئی اہم بات ہے' جو اس کے شعور کی گرفت میں آتے آتے پھسل جاتی ہے۔

بہر حال ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی وہ ڈائری اس کے لیے چشم کشا ثابت ہوئی تھی۔ اس کے ذریعے کئی حیرت انگیز انکشافات ہوئے تھے۔ یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ ٹھاکر کو باجی کے لیے اپنے بیٹے کی محبت کا ادراک ہو گیا تھا اور وہ اسے قبول کرنے کے لیے تیار بھی تھا۔ اب وہ بس یہی سوچ سکتی تھی کہ کاش اللہ نے اس کے حصے کی زندگی باجی کو اور باجی کے حصے کی موت اسے دے دی ہوتی تو آج محبت کی اس عجیب کہانی کو ایک خوش گوار انجام مل چکا ہوتا۔

وہ اس ڈائری کو پڑھتی گئی۔ وہ حیران تھی۔ اس ڈائری میں انکشافات ہی انکشافات تھے۔ وہ ڈائری ایک انسان کی عظیم باطنی تبدیلی کی گواہ تھی۔ یقینی طور پر وہ بہت ذاتی دستاویز تھی۔ اسے شرمندگی تھی کہ اس نے اسے بلا اجازت پڑھا۔ مگر اب کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔ یہ بات بھی اس نے سمجھ لی کہ درحقیقت وہ ڈائری عبدالحق کی امانت تھی...... اس کے باپ کا ترکہ تھی۔ اور اسے پڑھ کر عبدالحق کو ایک بہت بڑی بات معلوم ہوتی اور ایک بہت بڑی خوشی حاصل ہوتی۔ اب اسے یہ بات عبدالحق کو بتانی تھی۔

ڈائری کے آخری چند اندراجات بے حد سنسنی خیز تھے۔ اور عبدالحق سے ان کا بہت گہرا تعلق تھا۔ وہ اسی یقینی تبدیلی کا اعلان کر رہے تھے، جو آ چکی تھی۔ لیکن آخری اندراج نامکمل تھا اور اس کا براہ راست عبدالحق سے تعلق تھا۔

اس آخری اندراج میں ٹھاکر نے لکھا تھا......

''آج میں وقت سے پہلے ڈائری لکھ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے پتر پر قربان ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اس کے بعد میں کبھی ڈائری نہیں لکھ سکوں گا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے کیدار ناتھ کے دو متر مجھ سے ملنے آئے۔ وہ جے پور سے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ چھوٹے ٹھاکر کی جان کو خطرہ ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو انہوں نے وجہ بتائی۔ اور وہ وجہ سن کر میرا دل خوش ہو گیا۔ انہوں نے بتایا کہ اوتار سنگھ نے جے پور کے بڑے مندر کے تمام بت توڑ ڈالے ہیں۔ پہلے تو مجھے یقین نہیں آیا۔ لیکن ان کا کہنا تھا کہ اس میں کسی قسم کے شک و شبے کی گنجائش نہیں۔ تب میرا جی چاہا کہ میں ہنسوں۔ بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ دباتا رہا۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ہم دونوں کو منزل ملنے والی ہے......

میں نے انہیں بتایا کہ اوتار سنگھ تو ابھی واپس نہیں آیا ہے۔ میں نے دیکھا، انہیں میری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جے پور سے مشتعل لوگ بڑی تعداد میں ٹھاکروں کی گڑھی پر حملہ کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہم ان سے مقابلے کی تیاری کریں گے اور لڑیں گے۔

میں نے گاؤں کے تمام لوگوں کو بلوا بھیجا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہ میری آخری آزمائش ہے۔

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ گاؤں والوں سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ انہیں بتا دوں گا کہ اوتار سنگھ پر کیا الزام ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے بعد بڑی تعداد میں لوگ میرا ساتھ چھوڑ دیں گے لیکن ضرورت پڑی تو میں تنہا لڑوں گا اور آخری سانس تک لڑوں گا۔

مجھے ایک بات کا افسوس ہے۔ میں نے اپنے بارے میں جو سوچا تھا اور فیصلہ کیا تھا، اب مجھے اس پر عمل کرنے کی مہلت نہیں مل سکے گی۔ صرف اس لیے کہ اوتار سنگھ واپس نہیں آ سکا۔ مگر ساتھ ہی مجھے اس بات کی خوشی بھی ہے کہ اوتار سنگھ واپس نہیں آیا۔ اب میری نسل آگے بڑھ سکے گی۔

جس دن اوتار سنگھ پیدا ہوا تھا، مجذوب نے مجھ سے ایک بات کہی تھی آج وہ بات مجھے رہ رہ کر یاد آ رہی ہے۔ مجذوب نے کہا تھا......''جان دے دینا اس کے لیے۔ پھر تیرا کھوٹا سکہ بھی اشرفی کے مول چل جائے گا۔'' آج مجھے لگ رہا ہے کہ وہ بات پوری ہو گی۔ اور یہ تو میں جانتا ہوں کہ میرا کھوٹا سکہ اشرفی کے مول چل چکا ہے۔

اب گاؤں کے لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ میں ڈائری بند کرتا ہوں۔''

اس کے بعد ڈائری کے تمام ورق سادہ تھے!

وہ آخری اندراج پڑھتے ہوئے نور بانو کو کچھ ہونے لگا۔ چھوٹے ٹھاکر نے جے پور کے بڑے مندر میں بت توڑے تھے۔ اس کے نتیجے میں اس کے گاؤں پر حملہ ہوا تھا لیکن اس کا گاؤں تو سرخ آندھی کی لپیٹ میں آ کر صفحۂ ہستی سے مٹ گیا تھا۔ کچھ بھی ہو اور کچھ بھی ہوا ہو، یہ ایک ناقابل تردید حقیقت تھی کہ چھوٹے ٹھاکر نے سنت ابراہیم علیہ السلام کو تازہ کیا تھا۔ اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اس پر شروع ہی سے اللہ کی رحمت ہے۔ اس کے بغیر وہ یہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اس بار وہ اس سے پوری طرح مرعوب ہو گئی۔

اب اسے بے تابی ہو رہی تھی کہ وہ عبدالحق کو ڈائری دے اور پڑھنے کے لیے اصرار کرے۔ عبدالحق کو تو اندازہ بھی نہیں ہو گا کہ اس ڈائری کے صفحات میں اس کے لیے کتنی خوشی چھپی ہے۔ وہ اسے وہ خوشی دینا چاہتی تھی۔

❀ ❀ ❀

عبدالحق کے دن اتنی مصروفیت میں گزر رہے تھے کہ اس کے پاس سوچنے کی مہلت ہی نہیں تھی۔ رہ گئیں راتیں تو رات کو وہ قرآن پاک پڑھنے میں مصروف رہتا۔ اس معاملے میں اسے احساس ہوتا کہ وہ دس سال پیچھے ہے اور اسے اس زیاں کی تلافی کرنی ہے۔

قرآن پاک وہ ترجمے کے ساتھ پڑھتا تھا......اور ٹھہر ٹھہر کے، خوب غور کر کے پڑھتا تھا۔

قرآن میں اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں پڑھا تو اس کے لیے سوچ کے نئے دروازے کھل گئے۔ [illegible] یسے تو اس میں عاجزی بہت [illegible] ی لیکن [illegible] آ [illegible] ھنے کے بعد اسے یہ احساس

ہونے لگا کہ اس میں عاجزی کم...... بہت کم ہے۔

پہلی بار اس نے حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں پڑھا تو حیران رہ گیا۔ اس نے بھی تو اسی انداز میں سوچا تھا۔ اس کے بعد ہی تو اس کی تلاشِ حق کا آغاز ہوا تھا۔ ورنہ وہ اسی گم راہی میں پڑا رہتا' جس میں وہ پیدا ہوا تھا۔ اس نے بھی بے جان بتوں کو اس دلیل سے مسترد کیا تھا کہ وہ نہ کسی کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور نہ ہی ضرر پہنچانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ بلکہ وہ تو اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پھر ان کی پرستش کیوں کی جائے۔ پھر جب اس نے قرآن پاک میں وہ واقعہ پڑھا' جہاں ابراہیمؑ نے بت توڑے تھے' تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ فوراً ہی چوکنا ہو گیا۔ حالانکہ اس کی سمجھ میں وجہ نہیں آئی تھی۔ مگر اسے احساس ہو گیا تھا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں ایک لمحے میں وہ سب کچھ کھو سکتا ہے...... جہاں اس کے گم راہ ہو جانے کا قوی امکان ہے۔

وہاں رک کر اس نے غور کیا۔ وہ واقعہ پڑھتے ہوئے ایک ثانیے کو اسے ابراہیمؑ سے اپنی مماثلت پر فخر کا احساس ہوا تھا۔ مگر اس کے چوکنے پن نے فوراً ہی اسے دبا دیا۔ چند لمحے غور کرنے کے بعد بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس مماثلت میں فخر کوئی گنجائش نہیں تھی۔ بلکہ مزید غور کرنے پر اسے منزل مل گئی۔ اس نے سمجھ لیا کہ یہ خیال' اس کی یہ سوچ ہی گم راہ کن ہے۔ اللہ کے بندے' اللہ سے ڈرنے والے اس انداز میں نہیں سوچا کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مشرک گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ وہ صرف اللہ کی ہدایت ہے کہ اس کے دل میں یہ سوچ پیدا ہوئی اور اللہ کی رحمت ہے کہ اسے منزل ملی۔ ورنہ وہ عمر بھی تلاش حق میں بھٹکتا رہتا اور ناکام ہی رہتا۔ اور اگلے ہی لمحے جو اس کے ذہن میں خیال ابھرا' اس نے اسے لرزا دیا۔ صحرا کی سرد رات میں بھی اس کے جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ اس پر تھرتھری چڑھ گئی۔ یہ میں نے سوچا بھی کیسے؟ وہ بڑبڑایا۔ اس کے لہجے میں پچھتاوا تھا...... ملامت تھی۔ کسی پیغمبر سے اپنی مماثلت کا تو خیال بھی بہت بڑی گستاخی ہے۔ اپنے بارے میں اتنا بڑا گمان! پستی کی انتہا اور اتنی بلندی کی خوش فہمی!!

اس نے عاجزی کے ساتھ موازنہ کیا تو پیغمبر کے عمل کی عظمت اس کی سمجھ میں آ گئی۔ پیغمبر نے بت توڑے تو اس لیے کہ وہ اپنی قوم کو گم راہی سے بچانا چاہتے تھے۔ وہ انہیں ان کے عقائد کی کمزوری سے آگاہ کر رہے تھے کہ وہ ان سے مدد اور عافیت کے طلب گار ہیں' جو آپ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے۔ ان کا عمل اجتماعی فلاح کے لیے تھا۔ جبکہ اس کا عمل انفرادی تھا۔ وہ بس اللہ کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے دوسروں کی گمراہی اور ہدایت سے کوئی غرض نہیں تھی۔ پھر پیغمبر کے عمل میں کوئی خوف نہیں تھا۔ بلکہ ان گمراہوں کا سامنا کرنا پیغمبر کی اسکیم کا حصہ تھا۔ جبکہ اس نے کوشش کی تھی کہ اس کا عمل پوشیدہ رہے۔ وہ پکڑا نہ جائے۔ پیغمبر نے اپنی مغضوب الغضب قوم کا سامنا کیا اور ان کے سامنے نظریۂ وحدانیت رکھا' کلمۂ حق بلند کیا۔ اپنے عمل کے نتائج کا سامنا

تن تنہا کیا۔ آگ میں جلائے جانے کی سزا بھی قبول کی۔ فرشتے کی امداد بھی گوارا نہیں کی اور صرف اللہ سے لو لگائی۔ اس کے نتیجے میں آگ بھی گلزار بن گئی۔ جبکہ اس کے عمل کے نتیجے میں اس کے گاؤں کے لوگ آزمائش میں پڑے۔ اس کے باپ اور اس کے چاہنے والوں کو زندگی کا نذرانہ دینا پڑا۔

حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں جتنا اس نے پڑھا' اتنا ہی وہ ان کی شخصیت کا اسیر ہوتا گیا۔ ان کی شخصیت کا جزوِ اعظم اللہ کی محبت تھی۔ اور عبدالحق کا اپنا بھی ابتداء ہی سے مقصد یہی تھا۔ وہ اللہ سے ایسی محبت کرنا چاہتا تھا' جیسی کہ کرنی چاہیے۔ مگر اب حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں پڑھنے اور جاننے کے بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ یہ کہنا کہ آپ اپنے ماں باپ' اپنی اولاد اور دنیا کی ہر محبت اور ہر چیز سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں' بہت آسان ہے۔ مگر عملاً ایسا کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ سوچنا کہ آپ اپنا سب کچھ اللہ کے نام پر قربان کر سکتے ہیں' بہت آسان ہے مگر قربان کرنا پڑے تو پتا چلتا ہے۔

سچ تو یہ تھا کہ اللہ پر ایمان' اللہ کی فرماں برداری اور اللہ سے محبت کے بارے میں عبدالحق سب کچھ ابراہیم خلیل اللہ کے حوالے سے سمجھ رہا تھا۔ محض ایک خواب دیکھ کر اللہ کی خاطر بیٹے کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو جانا محبت کی مثال تھا۔ صرف ایک زندگی میں اللہ سے محبت کے متعدد روشن ثبوت چھوڑنا ابراہیمؑ کا ایسا کارنامہ تھا' جس پر انسانیت فخر کر سکتی تھی۔ فرمانبرداری اور اللہ پر بھروسہ ہی تو تھا کہ ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی اور بیٹے کو لق و دق صحرا میں بہ ظاہر وسائل سے محروم بے سروسامانی کے عالم میں چھوڑ گئے تھے۔

عید قرباں گزر چکی تھی۔ عبدالحق نے اللہ کی راہ میں ایک جانور کی قربانی پیش کی تھی۔ مگر اب وہ سوچتا تھا کہ اس کی قربانی اس عظیم قربانی کے شایانِ شان تھی' جس کی یاد میں یہ دن منایا جاتا تھا۔ اس جانور کو قربان کرتے ہوئے اس کے دل میں کسی دکھ' کسی ملال کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ کیا قربانی ایسی ہوتی ہے؟

اس نے اس سلسلے میں مہر علی سے بات کی۔

”تو پتر' آپ ایسا کرو کہ ابھی ایک بچہ جانور کا لو اور اسے پالو“۔ مہر علی نے کہا۔

”اس سے کیا ہو گا مولانا؟“

”پالو گے تو پتا چلے گا۔“

”پھر بھی' کچھ بتائیں تو۔“

”پالو گے تو آپ کو اس سے محبت ہو جائے گی۔ وقت آئے گا تو قربان کرنے کو دل نہیں چاہے گا۔“

"کیا واقعی؟"

"پالنے کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے پتر جی۔ تب سمجھ میں آئے گی۔ پھر سوچنا کہ اصل پروردگار تو اپنا رب ہے۔ اور وہ اپنی مخلوق سے جو محبت کرتا ہے' وہ اولاد کے لیے ماں کی محبت سے کم از کم ستر گناہ زیادہ ہوتی ہے۔ جب خود محبت کرو گے تو پتا چلے گا۔"

عبدالحق کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ "یہ تو آپ نے بہت کام کی بات بتائی ہے۔ اس پر میں ضرور عمل کروں گا۔"

اگلی بار وہ شہر گیا تو وہاں سے اپنے لیے چھوٹا سا ایک مینڈھا بھی لے آیا۔ اسے اس نے پورے بازار میں گھوم پھر کر منتخب کیا تھا۔ یہ وہ سوچ کر نکلا تھا کہ جانور جب تک دل سے پسند نہیں ہوگا' نہیں خریدے گا۔

زبیر اسے دیکھ کر خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔ "مالک...... یہ تم لائے ہو...... اپنے لیے۔"

"ہاں۔"

"بے فکر رہنا مالک۔ میں اس کا ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ اس کا ہر کام میں خود کروں گا۔"

زبیر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ مالک کے پاس فرصت تو تھی نہیں۔ اور بات ہو رہی تھی جانور پالنے کی۔ مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ دل میں یہ ضرور سوچا کہ چار دن کا شوق ہے۔ اور کوئی مسئلہ بھی نہیں۔ جانور تو پہلے ہی پل رہے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ عبدالحق کی مصروفیت بہت تھی لیکن اس نے بچے مینڈھے کے لیے خاص طور پر وقت نکالا۔ وہ اسے خود ہی کھلاتا پلاتا۔ لیکن چار ہی دن میں اس کو فکر لاحق ہوگئی کہ وہ بڑا نہیں ہو رہا ہے۔ اس نے زبیر سے اس تشویش کا اظہار کیا۔

"ارے مالک...... چار دن میں جانور کتنا بڑا ہو سکتا ہے۔" زبیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بڑا تو ہونا چاہیے نا۔"

"اب ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ اس کے بڑے ہونے کا تو پتا بھی نہیں چلے گا آپ کو۔"

"مگر مجھے معلوم ہے کہ یہ بڑا ہوا ہی نہیں ہے۔" عبدالحق بدستور فکر مند تھا۔ "مجھے لگتا ہے کہ کچھ خاص کھلانے کی ضرورت ہے اسے۔"

"ارے مالک' سب بڑھتے ہیں اپنی رفتار سے۔ ایک جیسا کھاتے ہیں سب۔"

"نہیں۔ یہ خاص ہے۔ بتاؤ تو' مجھے کیا کھلانا ہوگا اسے۔"

زبیر چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "شوقین لوگ تو خشک میوہ بھی کھلاتے ہیں۔"

اس دن سے عبدالحق نے بچے مینڈھے کے لیے خشک میوے کا اہتمام کر دیا۔ دراصل اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد بڑا ہو جائے۔ اور اس کے خیال میں یہ جبھی ممکن تھا کہ اسے زیادہ سے زیادہ کھلایا جائے۔

اس کی توجہ اور محبت کا نتیجہ یہ نکلا کہ تیسرے دن بچے مینڈھے کو دست لگ گئے۔ زیادہ کھلانا اور وہ بھی خشک میوہ' اس کا یہ نتیجہ تو نکلنا ہی تھا۔ عبدالحق کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

زبیر نے اس کے لیے دوا بنا کر دی۔ "لیکن مالک' دوا سے زیادہ ضروری یہ سمجھنا ہے کہ زیادہ کھلانے سے یہ بڑا نہیں ہوگا۔ بلکہ پیٹ خراب ہو جائے گا اس کا۔ بڑا تو یہ اپنے وقت پر ہی ہوگا۔"

"تو میں زیادہ کب کھلاتا ہوں اسے۔" عبدالحق نے احتجاج کیا۔

اسی وقت مہر علی بھی آگئے۔ "کیا ہو رہا ہے پتر؟"

"اب مالک' پاؤ بھر بادام کو آپ زیادہ ہی نہیں سمجھتے۔ میں کیسے سمجھاؤں۔" زبیر نے بے بسی سے کہا۔

بات مہر علی کی سمجھ میں آئی تو انہوں نے عبدالحق کو سمجھانے کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ "دیکھ پتر' اللہ نے مینڈھوں کے لیے بادام پستے اور اخروٹ نہیں بنائے تھے۔ اب یہ تو تم محبت میں کھلاتے ہو۔ یہ سچ ہے کہ خشک میوہ کھانے سے اس میں طاقت آئے گی لیکن اعتدال ضروری ہے۔ صبح و شام دو دو چار چار دانے کھلا دیا کرو بس۔"

عبدالحق کا دل تو نہیں مانتا تھا لیکن مہر علی سے وہ بحث نہیں کرتا تھا۔ اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے مولانا۔"

"اور تم اسے باندھ کر رکھتے ہو پتر۔"

"جی مولانا"۔ عبدالحق نے سادگی سے کہا۔

"تو اس کا پیٹ تو خراب ہونا ہی ہے۔ یہ تو بھاگنے والا جانور ہے پتر۔ یہ تو اس پر دو ظلم ہو گئے۔"

"لیکن ابھی تو یہ بہت چھوٹا ہے مولانا۔ کھول دوں گا تو اِدھر اُدھر بھاگتا پھرے گا۔ مجھے ڈر لگتا ہے یہ بڑے بڑے بلڈوزر چلتے ہیں یہاں۔ میں اسے خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔"

مہر علی مسکرائے۔ "اب سمجھ میں آ رہا ہے پتر کہ پالنا کیا ہوتا ہے۔" وہ بولے۔ "بظاہر تو ماں باپ بچے کو پالتے ہیں لیکن پروردگار صرف رب ہوتا ہے۔ وجہ؟ انسان کسی کی خبر گیری نہیں کر سکتا۔ جو اس کی آنکھوں کے سامنے نہیں' اس سے وہ بے خبر ہوتا ہے۔ جو اس کی عقل اور اس کے حواس سے باہر ہوا سے اس کا علم نہیں ہوتا۔ اسی لیے تو ماں چاہتی ہے کہ اس کا بچہ ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے رہے۔ اور پروردگار سب جانتا ہے۔ علم سارے کا سارا اسی کا ہے۔ اس نے

پیدا کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی مخلوق کی کیا ضرورتیں ہیں۔ وہ ہر پل اپنی ہر مخلوق سے باخبر رہتا ہے۔ اور ہر پل اس کی تمام ضرورتیں پوری کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اسی لیے تو اس کے سوا کوئی پروردگار نہیں ہے۔ اسی لیے تو ماں کی محبت میں پریشانی اور تفکرات ہیں۔ اور اللہ کی محبت میں جو ماں کی محبت سے ستر گنا سے بھی زیادہ ہے' تحفظ اور حاجت روائی ہے۔ پریشان اور فکر مند تو وہ ہوتا ہے نا' جو بے بس ہو۔ تو پتر عبدالحق' یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھا کرو کہ پروردگار وہ ہے۔ تم کسی کو موت سے نہیں بچا سکتے۔ اور اگر تم کسی کو کچھ دیتے ہو' کسی کے لیے کچھ کرتے ہو تو وہ بس ایک اعزاز ہے جو اللہ نے تم کو عطا کیا ہے۔''

عبدالحق بڑی توجہ سے مہر علی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ ان کی دانش کا قائل تھا۔ وہ بڑی مشکل باتیں بڑی آسانی سے سمجھا دیتے تھے۔

''تو پتر عبدالحق' تم اپنے جانور کو اس کی ضرورت سے زیادہ نہ کھلاؤ۔ اور اسے کھلا رکھو۔ اس کی حفاظت اللہ کا کام ہے۔''

عبدالحق نے اس نصیحت پر عمل شروع کر دیا۔

پندرہ دن بعد اسے اندازہ ہوا کہ محبت کا جذبہ جانوروں میں بھی ہوتا ہے۔ ان کا ننھا مینڈھا سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ وہ کہیں بھی ہوتا۔ مینڈھا دوڑ کر اس کی طرف چلا آتا۔ اور وہ پھرتیلا بہت تھا۔ گاڑیوں سے ایسے بچتا کہ وہ دیکھتا رہ جاتا۔ کبھی وہ جانوروں کے باڑے میں بھی چلا جاتا۔ لیکن عجیب بات تھی کہ وہ کہیں منہ نہیں مارتا تھا۔ بلکہ جو کچھ بھی کھاتا تھا' صرف عبدالحق کے ہاتھ سے کھاتا تھا۔ اس کا علم بھی عبدالحق کو اتفاق سے ہی ہوا تھا۔

وہ جب بھی شہر جاتا تھا' زبیر سے اپنے مینڈھے کا خیال رکھنے کو کہہ کر جاتا تھا لیکن کبھی یہ نوبت نہیں آئی کہ زبیر کو اسے کھلانا پڑے عبدالحق شام سے پہلے واپس آجاتا تھا۔

مگر اس روز اسے واپسی میں دیر ہوگئی۔ وہ گھر پہنچا تو رات ہوگئی تھی۔ کھانا کھانے کے لیے بیٹھا تو مینڈھا یاد آیا۔

''میرا مینڈھا کہاں ہے؟ ٹھیک تو ہے؟'' اس نے زبیر سے پوچھا۔

''وہ اپنے شیڈ میں ہے مالک۔ پر اس نے کچھ کھایا نہیں ہے۔''

''کھایا نہیں ہے کا مطلب؟''

عبدالحق کا نوالہ منہ میں لے جاتا ہوا ہاتھ رک گیا۔

''میں نے بہت کوشش کی۔ لیکن اس نے کھایا ہی کچھ نہیں مالک۔''

عبدالحق نے نوالہ پلیٹ میں رکھ دیا۔ ''بیمار تو نہیں ہے وہ؟''

''نہیں مالک۔''

''تو پھر اس نے کچھ کھایا کیوں نہیں؟''

''وہ آپ کے ہاتھ سے کھانے کا عادی ہوگیا ہے مالک۔ اس نے رابعہ کے ہاتھ سے بھی نہیں کھایا۔''

عبدالحق اٹھا اور شیڈ کی طرف چل دیا۔ زبیر لالٹین لیے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ عبدالحق کو زبیر کی اس بات پر یقین نہیں آرہا تھا کہ مینڈھا اس کے علاوہ کسی کے ہاتھ کا نہیں کھاتا۔ اسے ڈر تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ پریشان ہوگیا تھا۔

مینڈھا اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا تھا اور جاگ رہا تھا۔ عبدالحق کے پاؤں کی چاپ سن کر وہ اٹھا اور ممیانے لگا۔ عبدالحق شیڈ میں داخل ہو کر اس طرف بڑھا تو مینڈھا بھی اس کی طرف لپکا لیکن رسی نے اسے روک دیا

عبدالحق نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کا سر تھپتھپایا۔ ''کیا بات ہے مینو۔ کچھ کھاتا کیوں نہیں؟''

مینڈھا اس کے جسم سے اپنا سر رگڑتے ہوئے لاڈ بھری آواز میں ممیاتا رہا۔ عبدالحق نے اپنے ہاتھ سے گھاس اس کی طرف بڑھائی تو وہ بڑے بے صبرے پن سے کھانے لگا۔ پھر عبدالحق نے اپنے ہاتھ پر چارہ رکھ کر اسے کھلایا اور اس نے معمول کے مطابق کھایا۔ کھاتے ہوئے اس کی کھردری زبان اس کی ہتھیلی سے ٹکراتی تھی تو اسے بہت اچھا لگتا تھا۔

''تو میرے مینو کی عادتیں بگڑ گئی ہیں۔'' عبدالحق کھلاتے ہوئے کہتا رہا۔ ''اب نخرے ہوگئے ہیں اس کے۔ میرے علاوہ کسی کے ہاتھ سے نہیں کھائے گا۔'' اس کے لفظوں میں شکایت تھی لیکن اس کے برعکس لہجے میں فخر اور مسرت تھی۔

چارے کے بعد اس نے بادام پستے اور اخروٹ کی چند گریاں ہتھیلی پر رکھیں۔ مینو بڑی رغبت سے مزے لے لے کر کھاتا رہا۔

''دیکھ لیا مالک!'' زبیر نے کہا۔ ''آپ نے سچ مچ اسے بگاڑ دیا ہے۔''

مینو کھانے کے بعد عبدالحق کی ہتھیلی کو ممنونیت سے چاٹ رہا تھا۔ اس رات عبدالحق کو ایسا لگا کہ اسے مینو سے محبت ہوگئی ہے۔

❁ ❁ ❁

پاکستان بننے کے چند ماہ بعد ہی ہندوؤں اور انگریزوں کی ملی بھگت اور منافقت واضح ہو گئی۔ مطالبہ پاکستان کو تو وہ نظر انداز نہیں کر سکتے تھے کیونکہ مسلمانوں کی بہت بھاری اور قطعی اکثریت اس کے پیچھے تھی۔ لیکن ملک کی تقسیم تو ان کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے اپنے اس اختیار کو اس طرح استعمال کیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں مسلمان اپنے مطالبے پر پچھتائیں اور پاکستان کو دوبارہ بھارت میں ضم کرنے کی پیشکش خود ہی کر دیں۔

کسی بھی ملک کی تقسیم آسان نہیں ہوتی۔ اس میں بڑی پیچیدگیاں، بڑے الجھاؤ ہوتے ہیں۔ یہ تقسیم صرف جغرافیائی نہیں ہوتی کہ بس ایک لکیر کھینچ کر سرحد بنادی۔ اس میں وسائل بھی تقسیم ہوتے ہیں۔ فوج کی تقسیم کے ساتھ اسلحہ بھی تقسیم ہوتا ہے...... اور کرنسی بھی۔ پھر قدرتی وسائل کا معاملہ بھی ہوتا ہے، جو بہت اہم ہوتا ہے۔ یہاں قدرتی وسائل میں پانی کی بہت اہمیت تھی۔ اور دریا اگرچہ پاکستان میں تھے لیکن تمام آبی ذخائر ہندوستان میں تھے۔ اس پر مستزاد ہندوستان سے بھاری تعداد میں ہجرت کر کے آنے والوں کی نوآبادکاری کا مسئلہ تھا۔ اور ہجرت کے دوران ہندوؤں کی مکاری اور سکھوں کی سفاکی نے جو منظر ابھارا تھا، وہ ایک بہت بڑا انسانی المیہ تھا۔

چنانچہ آثار یہی بتاتے تھے کہ پاکستان قائم تو ہو گیا ہے لیکن زیادہ عرصہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکے گا۔ اسے بالآخر بھارت کا دست نگر بن کر رہنا پڑے گا۔

عبدالحق کی لگن اور محنت رنگ لائی۔ ریت کے نیچے دبے ہوئے تمام گاؤں برآمد ہوئے اور حق نگر کے نام سے ایک ہو گئے۔ لیکن خوش حالی اب بھی ایسا خواب تھا، جس کی تعبیر محال تھی۔ وجہ تھی پانی کی کمی۔ پانی ہی موجود نہیں تھا۔ تو نہری نظام کی بحالی سے کیا ہو سکتا تھا۔ دریاؤں میں پانی بہت کم تھا اور آبی ذخائر موجود نہیں تھے۔

گاؤں میں جو کاشت کار آبسے تھے، وہ اس صورت حال سے مایوس تھے لیکن ان کے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا۔ جو صورت حال گاؤں کی تھی، کم وبیش وہی پورے ملک کی تھی۔ اور ان سب کا تو زمین پر کوئی کلیم بھی نہیں تھا۔ کلیم والوں کو بھی زیادہ تر بارانی زمینیں ہی مل رہی تھیں۔ یہاں کم از کم انہیں زمین تو مل گئی تھی چنانچہ وہ تن بہ تقدیر ہو گئے۔

پریشانی کے ساتھ ہی سہی، بہرحال عبدالحق کو فرصت ملی تو اسے اس کے بارے میں سوچنے کا موقع ملا، جس کے بارے میں وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اور وہ تھی نور بانو۔ اسے نور بانو کی بے چینی کی فکر تھی۔ اسے یاد تھا کہ اس نے دہلی میں نور بانو سے کوئی وعدہ کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ پاکستان میں اس کے چچا کو تلاش کرے گا اور اسے ان تک پہنچائے گا۔

اب اسے اس خیال سے گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ کیا وہ خود نور بانو کو خود سے دور کرنے کا سامان کرے گا۔ کم از کم اس وقت وہ اس کی قربت تو محسوس کر سکتا ہے۔ چاہے کئی دن اس کی ایک جھلک بھی نہ دیکھے۔ یہ خیال تو رہتا ہے کہ وہ اس کے قریب موجود ہے۔

لیکن وعدے کی پاس داری اُس کے خون میں شامل تھی۔ کتنا ہی بڑا نقصان ہو، وہ وعدے سے رُوگردانی نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ مصروفیت کی بات اور تھی۔ پچھلے دنوں وہ گاؤں کے معاملات میں اس طرح الجھا رہا تھا کہ اماں کو بھی بھول گیا تھا۔ اماں کی ایک جھلک دیکھے بھی کئی کئی دن ہو جاتے تھے۔ مگر اب وہ آزاد تھا۔

اُس رات وہ نور بانو کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دہلی میں اوپر والے مکان میں رہنے کے دوران نور بانو کا رویہ اُسے یاد تھا۔ وہ اُن لوگوں سے ڈرتی تھی۔ اور اسے وہ گفتگو بھی یاد تھی جو اُس سے ہوئی تھی۔ وہ اپنے چچا کے ہاں آگرہ جانا چاہتی تھی۔ پھر پتا چلا کہ وہ لوگ پہلے ہی پاکستان جا چکے ہیں۔ تب انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان میں انہیں ڈھونڈ نکالے گا اور اُسے ان تک پہنچا دے گا۔

اب اسے شرمندگی ہو رہی تھی۔ یہاں آ کر وہ اپنا وعدہ بھول گیا۔ اپنے ضمیر کی حد تک تو وہ مطمئن تھا۔ اُس نے دانستہ کوتاہی نہیں کی تھی۔ وہ زیادہ بڑے معاملات میں الجھ گیا تھا۔ ایک آدمی کے مستقبل پر بہت سارے لوگوں کے مستقبل کو بہرحال فوقیت دینی پڑتی ہے۔ اتنے دن اُس نے اس بارے میں سوچا بھی نہیں لیکن اب اسے فکر ہو رہی تھی کہ نور بانو اُس کے بارے میں کس انداز میں سوچتی ہوگی۔ کون جانے، وہ اُس کی نیت پر بھی شبہ کرتی ہو۔

وہ یہ سوچتے سوچتے سو گیا کہ نور بانو کا سامنا وہ کیسے کر سکے گا!

❁ ❁ ❁

نور بانو کو وہ دن بہت مبارک لگا۔ بہت دن کے بعد اسے عبدالحق کی جھلک نظر آئی تھی۔ اُس نے سوچا، آج وہ اُس سے بات کرے گی اور اُس کے باپ کی ڈائری اور کتابیں اُسے سونپ دے گی۔

وہ ایک طرف کھڑی رہی۔ عبدالحق حمیدہ کے کمرے سے نکلا۔ توقع کے عین مطابق وہ اُسے نہ دیکھ سکا۔ وہ سر جھکائے آگے بڑھتا رہا۔

”سنیے......“ نور بانو نے اُسے پکارا۔

وہ یوں رُکا، جیسے اُس زمین نے اُس کے قدموں کو پکڑ لیا ہو۔ پھر وہ آہستہ سے پلٹا۔

”جی...... فرمایئے۔“ اُس نے سر جھکائے جھکائے کہا۔

نور بانو اپنی جگہ کھڑی تھی۔ عبدالحق کا سر جھکا کر بات کرنا اُس کے لئے غیر معمولی نہیں تھا لیکن اُس کے لہجے نے اسے عجیب سا احساس دلایا۔ وہ جیسے احساسِ جرم کا شکار ہو رہا تھا۔ مگر کیوں؟ ایک لمحے کو وہ الجھ کر رہ گئی۔

چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ عبدالحق بدستور مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

”ایک بہت ضروری اور اہم بات کرنی تھی آپ سے۔“ نور بانو نے کہا۔

سر جھکا کر کھڑے عبدالحق نے سوچا، شرمندگی کا وہ لمحہ آ گیا، جس سے وہ ڈر رہا تھا۔ اُس کے بس میں ہوتا تو وہ وہاں سے بھاگ جاتا۔ کہنے کو تو اُس کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔

اُس کی کیفیت سے بے خبر نور بانو نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ اتنے دن گزر گئے۔ یہ بات تو مجھے بہت دن پہلے کر لینی چاہئے تھی لیکن موقع ہی نہیں ملا۔ آپ کی

مصروفیت......"

عبدالحق نے سوچا' وہ اخلاق اور مروت کی وجہ سے شکایت کے بجائے افسوس کا اظہار کر رہی ہے' جیسے کوتاہی اس بے چاری کی ہو۔ اب ایسے میں چپ رہنا ٹھیک نہیں۔ وہ ایسے جتنے لفظ کہے گی' اتنی ہی اُس کی شرمندگی بڑھے گی۔ چنانچہ اُس نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں بہت شرمندہ ہوں نور بی بی۔ مجھے اپنی ذمے داری یاد ہے۔ اتنے دن گاؤں کی الجھنوں میں مجھے خیال نہیں رہا لیکن اب میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کروں گا۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ اب میں آپ کا کام کر کے واپس آؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

نور بانو اتنی حیران تھی کہ کچھ کہہ بھی نہ سکی۔ خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ وہ اُس کے کس کام کی اور اپنی کس ذمے داری کی بات کر رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا کہ وہ چور سا کیوں ہو رہا تھا۔

اُس نے سر جھٹکا اور حمیدہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

❀ ❀ ❀

زبیر بے حد پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ "مالک...... اتنے بڑے ملک میں تم انہیں کہاں ڈھونڈو گے؟"

"اللہ مدد کرنے والا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے وعدے کی عزت ضرور رکھے گا۔" عبدالحق کے لہجے میں یقین تھا۔

"لیکن یہ اتنا بڑا ملک......"

عبدالحق نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "سب سے بڑا کیمپ تو لاہور میں ہے مہاجروں کا۔" اُس نے کہا۔ "پھر سب سے زیادہ مہاجر کراچی میں جا کر آباد ہوئے ہیں۔ لاہور میں پتا نہ چلا تو میں کراچی چلا جاؤں گا۔"

"مگر مالک' آپ ایک بات بھول رہے ہو۔"

عبدالحق نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ لیکن بولا کچھ نہیں۔

"وہ لوگ کافی پہلے پاکستان چلے آئے تھے۔"

عبدالحق چونکا۔ زبیر ٹھیک کہہ رہا تھا۔ نور بانو کے چچا اپنی فیملی سمیت پاکستان بننے سے کم از کم ایک ماہ پہلے پاکستان چلے آئے تھے۔ اُس وقت تو مہاجروں کے کسی کیمپ کا کوئی تصور بھی نہیں تھا۔ تو وہاں سے ان کے بارے میں کچھ معلوم ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

مگر بات تو وعدہ نبھانے کی تھی۔ کام مشکل ہو یا ناممکن' عبدالحق جانتا تھا کہ اُسے کرنا ہی ہے۔ اب وہ اللہ سے مدد کی دعا ہی کر سکتا ہے۔ اُس نے بہرحال یہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ان کے

بارے میں معلوم کر کے ہی واپس آئے گا۔

"ٹھیک ہے زبیر۔ لیکن ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔" اُس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "مجھے جانا ہے۔ کوشش کرنی ہے۔ تم مجھے ان کے بارے میں پوری معلومات دے دو۔"

زبیر ہچکچا رہا تھا۔ "مالک...... ایک صورت اور ہے۔"

عبدالحق نے پھر اسے مستفسرانہ نظروں سے دیکھا۔

"میں چلا جاتا ہوں۔ جو کچھ آپ کر سکتے ہیں' وہ میں بھی کر سکتا ہوں۔"

"نہیں۔" عبدالحق نے بلاجھجک کہا۔ "انہیں ڈھونڈنے کی اہلیت مجھ میں تم سے زیادہ ہے۔ دوسرے وعدہ میں نے کیا تھا۔ ذمے داری بھی میری ہے۔ خدانخواستہ میں ناکام ہو جاؤں تو کم از کم میرا ضمیر تو مطمئن رہے گا کہ میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔ تم ناکام ہوئے تو میں بدگمانی ہی کرتا رہوں گا کہ تم نے کوتاہی کی ہے......"

"مالک...... آپ جانتے ہو کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔" زبیر نے احتجاج کیا۔

"جانتا ہوں' لیکن ایسی صورتِ حال میں بدگمانی فطری ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ تم چلے جاؤ گے تو رابعہ کی حق تلفی ہو گی۔ میں جاؤں گا تو کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

یہ سن کر تو زبیر جیسے تڑپ گیا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو مالک۔ تمہارے نہ ہونے سے تو پورے گاؤں کو فرق پڑے گا......"

"اچھا بس۔" عبدالحق نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "مجھ سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو میں کہتا ہوں' وہ کرو۔ تم مجھے وہ کاغذ لا کر دو' جس پر ان لوگوں کے متعلق معلومات لکھی ہیں۔"

اُس کے لہجے نے زبیر کو سہما دیا۔ اُس نے کبھی زبیر سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ "جو حکم مالک۔" زبیر نے کہا اور گھر کی طرف چلا گیا۔

عبدالحق کو افسوس ہوا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ ضروری ہے۔ وہ اس لہجے میں بات نہ کرتا تو زبیر اس کے بجائے خود جانے پر اصرار کرتا رہتا۔ وہ اُسے کبھی نہ جانے دیتا۔

عبدالحق دل میں اللہ سے مدد کی دعا کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ کام بہت مشکل ہے۔

اگلی صبح نور بانو ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی کتابیں اور ڈائریاں لئے اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اُس نے رات کو بھی کافی دیر تک عبدالحق کا انتظار کیا تھا۔ صبح وہ اُس کی پوری بات سنے بغیر ہی چلا گیا تھا اور وہ اُس کی بات سمجھ بھی نہیں پائی تھی۔ مگر اب اُس نے سوچا تھا' پہلے اس کی امانتیں اُسے سونپے گی اور وضاحت بعد میں کرے گی۔

لیکن وہ رات کو آیا ہی نہیں۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ پچھلے دنوں وہ اتنا مصروف رہا

تھا کہ رات کو اماں کے پاس کم ہی آپاتا تھا۔ صبح کو بھی وہ بہت سویرے ہی ہو کر چلا جاتا تھا۔ ہاں باہر اُس کی جھلک ضرور نظر آجایا کرتی تھی۔

خاصی دیر ہوگئی اور وہ نہیں آیا۔ نور بانو کتابیں اور ڈائریاں لے کر حمیدہ کے کمرے میں چلی گئی۔ حمیدہ کی آنکھیں اب بالکل ٹھیک ہو چکی تھیں۔ البتہ وہ نظر کا چشمہ لگانے لگی تھی۔ دوا سے تو اسے نجات مل چکی تھی۔ البتہ عرقِ گلاب کا معمول اب بھی جاری تھا۔

نور بانو نے حمیدہ کو سلام کیا۔ پھر اُس کی آنکھوں میں عرقِ گلاب ڈالا۔ حمیدہ نے آنکھیں موندلیں۔

نور بانو بیٹھی انگلیاں مروڑتی رہی۔ ہر آہٹ پر ایسے لگتا تھا کہ عبدالحق آرہا ہے لیکن وہ نہیں آیا۔ حمیدہ سے پوچھتے ہوئے وہ جھجک رہی تھی لیکن کب تک۔ آخر اُس سے رہا نہیں گیا۔

''اماں...... وہ نہیں آئے اب تک؟''

حمیدہ نے آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کس کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔ مگر وہ غیر معمولی بات تھی۔ نور بانو نے خود سے عبدالحق کے بارے میں بات کبھی نہیں کی تھی۔ چنانچہ حمیدہ نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا۔ ''کون؟ کس کی بات کر رہی ہے بیٹی؟''

''وہ...... وہ...... عبدالحق......'' سردی کے موسم میں بھی نور بانو کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلا۔

''وہ کہاں سے آئے گا۔ وہ تو چلا گیا۔''

نور بانو کا دل دھک سے رہ گیا۔ ''چلے گئے؟ کہاں چلے گئے؟''

''وہ تو لہور گیا۔ ہوسکتا ہے' اور آگے بھی جائے۔''

''لاہور! لیکن کیوں اماں؟''

اُس کے لہجے میں ایسی پریشانی' ایسا صدمہ تھا کہ حمیدہ کو پہلی بار مکمل یقین ہوا کہ وہ عبدالحق سے محبت کرتی ہے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس پر خوش ہوتی۔ مگر اس وقت تو اُسے اُس پر غصہ آرہا تھا۔ ''تیرے ہی لئے تو گیا ہے۔ تُو نے ہی تو بھیجا ہے اسے۔'' حمیدہ کے لہجے میں شکایت بھی تھی اور ملامت بھی۔

نور بانو کے لئے وہ لفظ' وہ لہجہ...... سبھی کچھ خلافِ توقع تھا۔ وہ تو ہکا بکا رہ گئی۔ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

حمیدہ نے بھی کچھ نہیں کہا...... اُس نے آنکھیں صاف کر کے چشمہ لگایا اور نور بانو کو غور سے دیکھتی رہی۔ اُس کا ردِعمل اُسے بے ساختہ لگا۔ اُس میں بناوٹ تو کہیں سے نہیں تھی۔

نور بانو کو سمجھنے میں چند منٹ لگے۔ پھر اُس نے حیرت سے کہا۔ ''میرے لئے گئے ہیں وہ! میں نے بھیجا ہے انہیں؟ نہیں اماں...... ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ یہ کس نے کہا آپ سے؟''

حمیدہ سوچ میں پڑگئی۔ گزشتہ روز عبدالحق دوپہر کو اُس کے پاس آیا تھا اور اسے بتا کر اُس سے اجازت لی تھی۔ وہ تو ہچکچا رہی تھی۔ مگر اُس نے کہا تھا...... اماں' اس کام سے مجھے نہ روکنا۔ مجھے وعدہ پورا کرنا ہے۔

''خود اُس نے بتایا ہے مجھے۔'' حمیدہ نے کہا۔ پھر نرم لہجے میں پوچھا۔ ''تُو نے کل صبح اُس سے کیا بات کی تھی دھیے؟''

نور بانو جانتی تھی کہ اُس نے عبدالحق سے کہیں جانے کو نہیں کہا۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ عبدالحق جھوٹ نہیں بولتا۔ تو پھر یہ معاملہ کیا ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ''میں نے...... میں نے تو کوئی بات نہیں کی ایسی۔'' وہ بولی۔

''تیری کل اُس سے کوئی بات نہیں ہوئی دھیے؟'' حمیدہ کے لہجے میں اصرار تھا۔

اچانک نور بانو کو گزشتہ صبح یاد آئی۔ ''بات! بات تو انہوں نے مجھے کرنے ہی نہیں دی تھی۔ وہ خود پتا نہیں کس ذمے داری کی...... اپنی کس شرمندگی کی بات کرنے لگے۔ پھر بولے کہ اب میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کروں گا اور آپ کا کام کر کے ہی واپس آؤں گا۔ میری تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ اور میری تو انہوں نے سنی ہی نہیں۔''

اب حمیدہ الجھ گئی۔ یہ کیا معما ہے؟ ''تو اُس سے کیا کہنا چاہتی تھی دھیے؟''

نور بانو نے یہ تو نہیں بتایا کہ بڑے ٹھاکر کی ڈائری میں کیا لکھا تھا۔ وہ تو خود بھی پڑھ کر پچھتا رہی تھی۔ وہ سب کچھ جاننے کا پہلا حق تو عبدالحق کا تھا۔ تاہم اُس نے حمیدہ کو یہ بتا دیا کہ وہ ڈائری عبدالحق کے لئے بہت اہم ہے۔ اور وہ اسے اُس کے باپ کی کتابیں اور ڈائری دینا چاہتی تھی۔

حمیدہ نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ''وہ تو اور ہی کچھ سمجھا تھا۔ پگلا کہیں کا۔''

نور بانو کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا تھا۔ ''اب مجھے یہ تو بتا دیجئے اماں کہ وہ لاہور کیوں گئے ہیں......؟ اور وہ بھی میرے لئے!'' اُس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''تُو نے کبھی اُس سے کوئی وعدہ لیا تھا بیٹی؟'' حمیدہ نے الٹا اُس سے سوال کیا۔

نور بانو کا تو دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ وہ تو اپنی دانست میں محروم تھی اور یہاں اُس پر یہ الزام لگایا جا رہا تھا کہ وہ جس پر کبھی اپنی دلچسپی کا اظہار بھی نہ کر سکی' اُس سے مطالبے کرتی رہی ہے۔ بلکہ اُس کے لئے تو یہ تہمت کے مترادف تھا۔ ''اماں...... میں تو کبھی چھوٹے......'' اُسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ وہ ذہنی طور پر اُس زمانے میں پہنچ گئی ہے' جب عبدالحق چھوٹا ٹھاکر ہوا کرتا تھا۔ مگر اب اسے اُس کو اس طرح پکارنے کا کوئی حق نہیں۔ اُس نے جلدی سے تصحیح کر لی۔ ''...... میرا مطلب ہے اماں کہ میں تو کبھی ان کے سامنے ہی نہیں آئی۔ میں نے تو کبھی اُن سے بات بھی نہیں

کی۔ پھر میں ان سے کوئی وعدہ کیسے لے سکتی تھی؟''

حمیدہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی نظریں اسے اپنے وجود کے آر پار دیکھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ''تُو یاد تو کر دھیے۔ عبدالحق میرے سامنے چھوٹے سے بڑا ہوا ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا۔''

مگر نور بانو کا حیا اور شرمندگی سے برا حال تھا۔ اُس کا چہرہ تپ رہا تھا۔ ایسی کوئی بات اسے یاد آ ہی نہیں سکتی تھی۔ دوسری طرف حمیدہ کے لہجے میں بڑا دعویٰ تھا...... چیلنج تھا۔ اور یہی بات کبھی اُس کی شہید اماں نے بھی کہی تھی کہ چھوٹا ٹھاکر کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ وہ انہیں جھٹلا بھی نہیں سکتی تھی۔
''میں بھی جانتی ہوں اماں کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے۔'' اُس نے بے بسی سے کہا۔ ''مگر اماں، میں بھی سچ کہہ رہی ہوں کہ مجھے ایسی کوئی بات یاد نہیں۔ میں نے تو کبھی ان سے بات بھی نہیں کی۔''

حمیدہ چند لمحے کچھ سوچتی رہی۔ اُس کے چہرے پر اُلجھن تھی۔ پھر وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی۔ اُس نے پوچھا۔ ''تیرے کوئی رشتے دار بھی ہیں بیٹی......؟''

''ہاں اماں۔ ایک چچا تھے میرے آگرے میں......'' اور یہ کہتے کہتے اُسے سب کچھ یاد آ گیا۔ ''ارے ہاں اماں...... وہ......! مگر وہ تو اُس وقت کی بات ہے اماں جب میرے گھر پر قیامت ٹوٹی تھی۔ جب مجھے کسی پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ اس وقت میں بس کسی اپنے کے پاس پہنچ جانا چاہتی تھی۔ مجھے ہر جگہ ڈر لگتا تھا......'' اُسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ صفائی پیش کرنے والے ملزم کے انداز میں بات کر رہی ہے۔ وہ حمیدہ کو بہت تفصیل سے بتا رہی تھی کہ اُس کی ماں، بہنوں، بوا اور آکا پر کیا گزری تھی۔

حمیدہ دیکھ، سُن اور سمجھ رہی تھی۔ ایک بات پوری طرح واضح تھی۔ نور بانو اب یہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی۔ اُس کے لہجے میں عبدالحق کے جانے کا دکھ تھا۔ مگر اُس دکھ سے زیادہ اُس کے لہجے میں اسی بات کا خوف تھا کہ کہیں عبدالحق اُس کے چچا کو تلاش نہ کر لے اور اسے اپنے چچا کے پاس جانا نہ پڑ جائے۔ اُس لمحے حمیدہ کو یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ نور بانو عبدالحق سے محبت کرتی ہے۔

اُس نے بڑی محبت سے نور بانو کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اسے قریب کر کے لپٹا لیا۔ ''تُو فکر نہ کر دھیے۔ رب کی مہربانی سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اُس نے اُسے تھپکتے ہوئے دلاسہ دیا۔

نور بانو کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح اُس سے چپکی رہی۔ ''نہیں اماں! وہ وعدے کے پکے ہیں۔'' اُس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اور وہ کہہ کر گئے ہیں کہ اب میرا کام کر کے ہی واپس آئیں گے۔''

''میں نے کہا نا دھیے، تُو فکر نہ کر۔ اتنے بڑے ملک میں کسی کو صرف اُس کے نام سے ڈھونڈنا کوئی آسان کام نہیں۔''

''مجھے اس کا ہی تو ڈر ہے اماں تو کیا وہ واپس ہی نہیں آئیں گے۔''

اس بار حمیدہ کو اس محبت کی گہرائی کا بھی پتا چل گیا۔ نور بانو کا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔
اُدھر نور بانو کو بھی احساس ہوا کہ اس بحران میں وہ اپنے دل کا بھید کھول بیٹھی ہے۔ وہ حمیدہ سے الگ ہوئی۔ اُس نے حمیدہ کے چہرے کو غور سے دیکھا اور وہاں تفہیم کا رنگ دیکھ کر نظریں جھکا لیں۔
اُس لمحے میں، جب وہ بھاگ ہی نہیں سکتی تھی اور حیا کی وجہ سے وہ حمیدہ کا سامنا بھی نہیں کر پا رہی تھی، باہر سے قدرتی مدد میسر آ گئی۔ اُسے رابعہ کی پکار سنائی دی۔ وہ بے حد پریشان لہجے میں اُسے پکار رہی تھی۔ ''منجھلی بی بی...... نور بی بی...... کہاں ہو؟''

''خیر تو ہے۔'' حمیدہ نے پریشان ہو کر کہا۔

''میں دیکھتی ہوں اماں۔'' نور بانو بولی اور اٹھ کر باہر کی طرف لپکی۔ کتابیں اور ڈائریاں حمیدہ کی چارپائی پر ہی رہ گئی تھیں۔

❋ ❋ ❋

باہر رابعہ پریشان کھڑی تھی۔ نور بانو باہر نکلی۔ ''کیا بات ہے آپا؟'' اُس نے رابعہ سے پوچھا۔

''وہ منجھلی بی بی، مینو کچھ کھا ہی نہیں رہا ہے۔'' رابعہ کے لہجے میں سراسیمگی تھی۔
نور بانو جانتی تھی کہ مینو عبدالحق کے مینڈھے کا نام ہے۔ اور بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ مینو عبدالحق کے ہاتھ سے کھانے کا عادی تھا۔ ایک بار پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔ مگر جب عبدالحق واپس آ گیا تھا اور اُس نے آدھی رات کو مینو کو اپنے ہاتھ سے کھلایا تھا۔
لیکن اب اور بات تھی۔ نور بانو کو لگتا تھا کہ عبدالحق خدانخواستہ بہت دنوں کے لئے چلا گیا ہے۔ تو اب مینو کا کیا بنے گا؟ وہ بھی پریشان ہو گئی۔ ''اب کیا ہو گا آپا؟''
''کچھ سمجھ نہیں آتا۔ میں نے اور زبیر نے تو بہت کوشش کر لی۔ پر وہ کچھ کھاتا ہی نہیں۔ کل دوپہر سے کچھ نہیں کھایا ہے اُس نے۔''

''کچھ تو کرنا ہو گا۔ وہ تو جلدی آنے والے نہیں۔''

''آپ چلو نا منجھلی دیدی۔ آپ کوشش کرو۔ شاید کچھ کھا لے۔''

''میں؟'' نور بانو نے حیرت سے کہا۔ ''مجھ سے تو وہ بالکل بھی مانوس نہیں ہے۔''

''آپ جانوروں سے محبت کرتی ہیں۔ اور جانور محبت کو سمجھتے ہیں منجھلی بی بی۔''
نور بانو کو اپنے والے بکری بچوں کا خیال آ گیا۔ یہ جانوروں سے محبت اُس نے یہاں آ کر ہی تو سیکھی تھی۔ اور اب تو وہ بچے بھی نہیں رہے تھے۔ بڑے ہو رہے تھے۔ ان میں ایک بکرا تھا اور ایک بکری۔ چھوٹے تھے تو وہ بھی بہت نخرے کرتے تھے۔ مگر اب کھلے پھرتے تھے۔ نور بانو کی

دلچسپی بھی اب کم ہو گئی تھی۔ وہ بچے تھے تو وہ ان میں بہت کشش محسوس کرتی تھی۔

مینو بہت خوب صورت تھا۔ اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ لیکن وہ کبھی اُس کے قریب نہیں آتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ عبدالحق گاؤں میں ہوتا تو مینو ہر وقت اُس کے ساتھ ہی لگا رہتا تھا۔

''چلو نا مجھلی دیدی۔'' رابعہ نے اسے چونکا دیا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ کچھ فائدہ ہوگا۔''

''کوشش تو کرو مجھلی دیدی۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ مینو کو کچھ ہو نہ جائے۔''

اُس لمحے نور بانو کو مینو پر ایسا پیار آیا کہ وہ خود بھی حیران ہو گئی۔ ''اللہ نہ کرے۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا مینو کو۔ چلو آپا۔'' دونوں باہر نکل آئیں۔ ''مینو ہے کہاں؟'' نور بانو نے پوچھا۔

''اپنے شیڈ میں ہے۔''

''یہ غلطی ہوئی ہے نا۔ اسے کھول دینا چاہئے تھا۔ خود ہی کھا لیتا کہیں نہ کہیں۔''

''کھولا تھا مجھلی بی بی۔ کھایا تو اُس نے کچھ نہیں۔ پاگلوں کی طرح پورے گاؤں میں مَیں مَیں کرتا پھرا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ مالک کو ڈھونڈ رہا ہے۔ سچ مجھلی بی بی' مجھے تو رونا آنے لگا۔ تبھی تو شیڈ میں لا کر باندھا ہے اُسے۔''

نور بانو نے سوچا' واقعی یہ تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ یوں تو اسے کھولنا بھی ممکن نہیں رہے گا۔ کھولیں گے تو وہ ہر طرف عبدالحق کو ہی تلاش کرتا پھرے گا۔ مسئلہ کافی ٹیڑھا تھا۔

وہ دونوں شیڈ میں پہنچ گئیں۔ مینو سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اُسے دیکھ کر نور بانو کو کچھ ہونے لگا۔ اس کا پیٹ بالکل پچک گیا تھا اور ابھی سے وہ بہت کمزور لگ رہا تھا۔

مینو نے ایک بار بڑی بے زاری میں نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ مگر فوراً ہی سر جھکا لیا۔ اُس نے منہ سے کوئی آواز نہیں نکالی۔

نور بانو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کر سکتی ہے۔ زبیر اور رابعہ تو شروع ہی سے مویشی پالنے والے تھے۔ مگر وہ مینو کو کچھ نہیں کھلا سکے تو وہ کیسے کھلا سکتی ہے۔ وہ سوچتی رہی۔ مگر اس مسئلے کا کوئی حل اُسے سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

''کچھ کرو نا مجھلی بی بی۔'' رابعہ نے اُسے ٹہوکا دیا۔

''سوچنے تو دو آپا۔''

نور بانو نے شیڈ کا جائزہ لیا۔ وہ صرف مینو کے لئے بنایا گیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے شیڈ میں صرف مینو بندھا ہے۔ لیکن پھر اسے اندازہ ہوا کہ ایسا نہیں ہے۔ شید کا ایک اور مقصد بھی تھا۔ وہاں بھوسے اور کھل کی بوریاں بھی موجود تھیں۔ یعنی اسے گودام کے طور پر بھی استعمال کیا

جاتا تھا۔ اُس کے علاوہ وہاں چارہ کاٹنے کی مشین بھی لگی تھی۔ ایک طرف گھاس کا ڈھیر تھا۔ یہ سردی کا موسم تھا۔ اس لئے وہاں سوکھی گھاس تھی۔ سردیوں میں ہری گھاس نہیں ہوتی تھی۔

''آپ کچھ کرو مجھلی بی بی۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' رابعہ نے کہا اور شیڈ سے چلی گئی۔

نور بانو نے سوچا کہ رابعہ اور زبیر اگر مینو کو کھلانے میں ناکام ہو گئے ہیں تو وہ آسانی سے تو کچھ کھائے گا نہیں۔ اور ابھی وہ اُس سے مانوس بھی نہیں ہے۔ اس لئے پہلے کچھ کھلانے کی کوشش کرنے کی بجائے دوستی کی جائے...... اسے خود سے مانوس کیا جائے۔

چنانچہ وہ مینو کے پاس بیٹھ گئی اور اُس کا سر سہلانے لگی۔ بکروں اور مینڈھوں کا معاملہ عجیب ہوتا ہے۔ ان کے سر کے اگلے حصے میں کوئی میکنزم ہوتا ہے۔ وہاں ہاتھ لگاؤ تو وہ پُرجوش ہو جاتے ہیں...... ہیجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بلکہ ان میں جارحیت بھی جاگ اٹھتی ہے۔

نور بانو کو اپنی دو بکریوں کا تجربہ تھا۔ اُس نے جلدی سے ہاتھ اٹھا لیا اور مینو کی کمر سہلانے لگی۔

شروع میں تو مینو کے انداز میں بے نیازی تھی۔ اُس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ مگر چند منٹ بعد نور بانو کو اپنے ہاتھ پر اُس کی گرم گرم سانسیں محسوس ہونے لگیں۔ شاید وہ سونگھ رہا تھا۔

نور بانو کو تجربہ ہو گیا تھا کہ جانوروں کو بھی باتیں سننا بہت اچھا لگتا ہے۔ اور وہ خود بھی بہت بوجھل ہو رہی تھی۔ دل پر ایسا بوجھ تھا' جو وہ کسی کے سامنے بھی ہلکا نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ بے زبان مینو کی بات اور تھی۔ وہ نہ کچھ سمجھتا اور نہ نور بانو کو حیا آتی۔

لیکن ایسے میں اسے رابعہ کی بات یاد آئی۔ ایک بار رابعہ نے کہا تھا...... جانور ہر بات سمجھتے ہیں۔ بس بول نہیں سکتے۔

''چلو ایسا ہی سہی۔'' نور بانو نے مینو کی کمر سہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم سن لو' سمجھ بھی لو۔ مگر کسی سے کچھ کہو گے تو نہیں۔''

مینو ویسے ہی بیٹھا رہا۔ اُس کی گرم سانسیں نور بانو کے ہاتھ کو چھوتی رہیں۔

''تمہاری قصوروار میں ہوں۔'' نور بانو کہتی رہی۔ ''لیکن سچ پوچھو تو میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے تو ان سے کچھ بھی نہیں کہا۔ انہوں نے خود ہی ایک مطلب نکالا اور چل دیے۔ اب بتاؤ' میں نے تو کچھ نہیں کہا نا۔ لیکن سب یہی سمجھ رہے ہیں کہ ان کے جانے کی ذمے دار میں ہوں۔''

نور بانو کا ہاتھ اب مینو کی گردن کو سہلا رہا تھا۔ اب لگتا تھا کہ اس لمحہ میں مینو کو کوئی کرنٹ محسوس ہو رہا ہے۔ کیونکہ وہ کچھ سنبھل کر بیٹھ گیا اور سر اٹھا کر نور بانو کو دیکھ رہا تھا۔

''تم پر جو گزر رہی ہے مینو' میں اسے سمجھ سکتی ہوں۔ میں تم سے کم تکلیف میں نہیں ہوں۔ لیکن تم اظہار تو کر سکتے ہو۔ کھانا پینا چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ مجھے بتاؤ' میں کیا کروں؟ میں تو کچھ بھی نہیں کر

سکتی۔'' اُس کے لہجے میں شکایت بھی تھی اور بے بسی بھی۔ ''میں تو کسی سے کچھ کہہ ہی نہیں سکتی۔ اب تم ہی کہو' میرا دکھ بڑا ہے نا؟ مگر میں تمہاری دل جوئی کر رہی ہوں۔ اور تم ہو کہ نخرے کیے جا رہے ہو۔ حالانکہ تمہیں میری دل جوئی کرنی چاہیے۔''

مینو اب بھی سر اٹھا کر معصومیت سے اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

نور بانو نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ شیڈ میں کوئی نہیں تھا۔ رابعہ ابھی واپس نہیں آئی تھی۔ ''دیکھو نا مینو' تم تو بہت خوش نصیب ہو۔ ہر وقت ان کے ساتھ لگے پھرتے ہو۔ تمہارے سب کام وہی کرتے ہیں۔ تمہارے لاڈ کرتے ہیں' ناز اٹھاتے ہیں تمہاری سیری نہیں ہوتی؟'' اُس نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا' جیسے سچ مچ جواب کی توقع کر رہی ہو۔ ''اور ایک میں ہوں۔ کبھی چلتے پھرتے اُن کی ایک جھلک دیکھ لی تو دیکھ لی۔ اب میں اُس سے بھی گئی۔''

مینو نے ہلکی سی آواز نکالی' جیسے تائید کر رہا ہو۔

وہ مینو کا پہلا مثبت ردِعمل تھا۔ یعنی مانوس ہونے کا عمل شروع ہو رہا تھا۔ لیکن نور بانو کو پتا نہیں چلا۔ برسوں میں پہلی بار وہ اندر کی بات کسی سے کہہ رہی تھی اور اُسے ڈر بھی نہیں تھا۔

''بہ ظاہر تو تمہاری محرومی بڑی ہے۔ کیونکہ میرے پاس تو کبھی کچھ تھا ہی نہیں۔ اور تمہارے پاس سب کچھ تھا۔'' وہ کہتی رہی۔ ''لیکن غور کیا جائے تو میری محرومی تم سے بہت بڑی ہے۔ یہ تو برسوں کی محرومی ہے۔ اور پھر تم تو اس کا اظہار بھی کرتے ہو۔ میں تو نہیں کر سکتی۔ اور تم تو کچھ بھی نہیں جانتے جبکہ میں جانتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اُن کی واپسی آسان نہیں۔ نجانے کتنا وقت لگے انہیں واپس آنے میں اور کون جانے......'' اُس نے گہری سرد آہ بھری۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ''میں بس دعا ہی کر سکتی ہوں۔ اور اب تو مجھے تمہاری بھی فکر ہے۔ تمہیں کچھ ہو نہ جائے......''

اس بار مینو کی مَیں مَیں زیادہ طویل تھی۔

''سنو سنو' تم کچھ کھاؤ گے نہیں تو خدانخواستہ مر جاؤ گے۔ اور ایسا ہو گیا تو یہ میرے لئے ایک اور شرمندگی ہو گی۔'' اُس نے سر جھکا کر مینو کی چھوٹی سی تھوتھنی پر اپنا رخسار رکھ دیا۔ ''مجھ پر مہربانی کرو مینو' کچھ کھا لو۔ مجھے شرمندگی سے بچا لو۔'' آنسو اب اُس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

اچانک مینو کی کھردری زبان اُس کے رخسار کو چاٹنے لگی۔ اسے ناگواری نہیں ہوئی۔ بلکہ اچھا لگا۔ چند لمحے بعد اسے احساس ہوا کہ مینو اُس کے آنسو چاٹ رہا ہے۔

''مینو' میں تمہاری نسبت زیادہ محبت کرتی ہوں اُن سے....''

اسی لمحے باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

''تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں اُن سے کتنی محبت کرتی ہوں۔'' نور بانو نے جلدی سے کہا۔ ''لیکن دیکھ لو۔ میں نے کھانا نہیں چھوڑا۔ یہ تو حماقت ہے۔ تم ایسا کیسے کر سکتے ہو...''

رابعہ شیڈ میں داخل ہوئی۔ وہ منظر دیکھ کر وہ بولی۔ ''اوہو...... باتیں ہو رہی ہیں مینو سے۔ لگتا ہے' دوستی ہو گئی۔''

نور بانو اب محتاط ہو گئی تھی لیکن اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''تمہیں کھانا پڑے گا مینو...... میری خاطر......''

مینو نے مَیں مَیں کر کے کچھ کہا۔

نور بانو وہاں سے ہٹی۔ اُس نے دانے کے ڈھیر سے مٹھی بھر دانہ اٹھایا۔ اور مینو کے سامنے دانے والا ہاتھ پھیلا دیا۔

مینو نے گہری سانس لی۔ وہ ایسا تھا' جیسے اُس نے زور سے پھونک ماری ہو۔ سارا دانہ اُڑ گیا۔ چند دانے نور بانو کی ہتھیلی پر رہ گئے۔

''چلو دانے کو دل نہیں چاہتا تو نہ سہی۔ گھاس کھا لو۔'' نور بانو نے اُس کی طرف سوکھی گھاس بڑھائی۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اُس کی گردن سہلا رہی تھی۔ ''چلو جلدی سے کھا لو ننھے بچے...... شاباش۔ ضد نہیں کرتے۔''

لیکن مینو نے منہ پھیر لیا۔ وہ گھاس کو منہ لگانے کو تیار نہیں تھا۔

''اچھا چلو۔ میں تمہارے نخرے اٹھاتی ہوں۔ گھاس کاٹتی ہوں تمہارے لئے۔''

نور بانو نے چارہ کاٹنے کی مشین میں تھوڑی سی سوکھی گھاس کاٹی اور ہتھیلی پر رکھ کر مینو کی طرف بڑھا دی۔ ''لو...... اب تو کھا لو۔ دیکھو میں نے یہ گھاس صرف تمہارے لئے کاٹی ہے۔''

مینو چند لمحے سر اٹھا کر اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے سر جھکایا اور بے دلی سے سہی' مگر کٹی ہوئی گھاس کھانے لگا۔ لیکن اس نے زیادہ نہیں کھایا۔ لگتا تھا کہ معصوم جانور زندہ رہنے کے لئے کھانا سیکھ رہا ہے۔

''آپ نے تو کمال کر دیا منجھلی بی بی۔'' رابعہ نے خوش ہو کر کہا۔

میرا نہیں' یہ محبت کا کمال ہے۔ نور بانو نے دل میں سوچا۔

۞ ۞ ۞

پناہ گزینوں کا کیمپ ایسا تھا کہ عبدالحق نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہاں اُس نے وہ مناظر دیکھے' جن کا اُس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اور جو کچھ اُس نے وہاں سنا اور جانا وہ اس سے بھی سوا تھا۔ اُسے تو ایسا لگا کہ وہ زندگی کی تعلیم حاصل کرنے یہاں آیا ہے۔

وہ رحیم یار خاں سے عرفان احمد کا تعارفی سفارشی خط اپنے ساتھ لایا تھا۔ کیمپ کے انچارج مسعود احمد خان عرفان احمد کے کلاس فیلو تھے اور دونوں میں بہت اچھی دوستی رہی تھی۔ ''مسعود تمہاری ہر ممکن مدد کرے گا۔'' عرفان احمد نے کہا تھا۔

عبدالحق کیمپ پہنچ کر مسعود صاحب سے ملا اور انہیں عرفان احمد کا خط دیا۔ مسعود صاحب نے وہ خط پڑھا' سرسری انداز میں عبدالحق کو دیکھا اور بولے۔ ''اندر بلاؤ نا انہیں۔''

عبدالحق نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ''کسے بلاؤں جناب؟''

''ارے بھئی اُسی کو جس کے بارے میں عفی نے یہ خط لکھا ہے۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ پھر دوبارہ خط کا جائزہ لیا اور نام پڑھنے کے بعد بولے۔ ''عبدالحق صاحب کو۔''

''عبدالحق میرا ہی نام ہے جناب۔''

مسعود صاحب نے اُسے یوں دیکھا' جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔ ''جس عبدالحق کے بارے میں عفی نے خط میں لکھا ہے' وہ تم ہو!''

''جی صاحب۔''

مسعود صاحب چند لمحے خاموش ہو کر سوچتے رہے۔ ''عفی کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' انہوں نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''اگر آپ محکمۂ زراعت کے سیکشن آفیسر عرفان احمد صاحب کے بارے میں پوچھ رہے ہیں تو الحمدللہ وہ خیریت سے ہیں۔''

مسعود صاحب ہنسنے لگے۔ ''میں اُسی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ ہم اسے پیار سے عفی کہتے تھے اور وہ مجھے مچھو کہتا تھا۔'' وہ ہنستے ہنستے اچانک سنجیدہ ہو گئے۔ ''وہ اپنی ڈیوٹی تو کر رہا ہے نا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی باقاعدہ سے۔ مگر آپ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں ان کے لئے؟''

''تمہاری وجہ سے پریشان ہو رہا ہوں برخوردار۔ اچھا یہ بتاؤ' تمہاری عمر کیا ہے؟''

''جی...... میں 22 سال کا ہوں۔'' خلاف عادت عبدالحق نے عمر بڑھا کر بتائی۔

''لگتی تو نہیں اتنی۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ ''مگر خیر' عفی نے خط میں جو کچھ لکھا ہے' اُس کے مطابق تو تمہیں بہت بڑا ہونا چاہئے۔ اتنی سی عمر میں کوئی اتنا کچھ کیسے کر سکتا ہے۔''

عبدالحق شرمندہ ہو گیا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ عرفان صاحب نے محبت میں میرے بارے میں کیا کچھ لکھ دیا ہے۔ لیکن......''

''میں عفی کو بچپن سے جانتا ہوں۔ وہ بلاوجہ کسی کی تعریف نہیں کرتا۔ ارے...... میں نے تمہیں بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔ بیٹھو نا۔''

عبدالحق نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں بیٹھنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ پہلی بار اُس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اسے دیکھ کر اسے اپنے مینو کا شیڈ یاد آ گیا۔ جس میز کے پیچھے مسعود صاحب بیٹھے تھے' اُس کا بھی ایک پایا ندارد تھا۔ پائے کی کمی پوری کرنے کے لئے میز کے نیچے اوپر تلے چند اینٹیں رکھ دی

گئی تھیں۔ کمرے میں موجود واحد کرسی پر مسعود صاحب بیٹھے تھے۔ ان کے دائیں بائیں سبزی اور فروٹ کی متعدد پیٹیاں اور ٹوکرے رکھے تھے۔ ان میں سے کچھ تو بھرے ہوئے لگ رہے تھے۔ بلکہ ٹٹولے بغیر تو یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ ان میں سے کون سا خالی ہے۔ ''جی...... میں یہیں ٹھیک ہوں'' اُس نے گڑبڑا کر کہا۔

''ارے نہیں بھئی' یہاں تکلف کی کوئی گنجائش نہیں۔'' مسعود صاحب اُس کی کیفیت بھانپ کر مسکراتے ہوئے بولے۔ ''یہاں خالی پیٹیاں رکھی ہیں۔ یہ لے لو بیٹھنے کے لئے۔'' انہوں نے اپنے بائیں جانب اشارہ کیا۔

عبدالحق اُس طرف بڑھا۔ تب اُس کی نظر مسعود صاحب کی کرسی پر پڑی۔ وہ ان کی میز سے بھی آگے کی چیز تھی۔ وہ دو پایوں سے محروم تھی اور اینٹوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ عبدالحق پیٹی اٹھا کر لایا اور میز کے سامنے رکھی۔

''اس سے کام نہیں چلے گا میاں۔ میں تم سے غائبانہ گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔'' مسعود صاحب نے کہا۔

عبدالحق کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے انہیں تکتا رہا۔

''نہیں سمجھے۔ چلو بیٹھ کر دیکھو سمجھ جاؤ گے۔''

وہ پیٹی پر بیٹھا اور بات فوراً ہی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ پیٹی پر بیٹھ کر نہ تو وہ مسعود صاحب کو دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی وہ انہیں نظر آ سکتا تھا۔ غائبانہ گفتگو کے تصور پر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ ایک اور پیٹی اٹھا لایا۔ دو پیٹیاں اوپر تلے رکھ کر وہ بیٹھ گیا۔

''ہاں بھئی عبدالحق میاں' اب ہوگی بات۔ یہ تو میں سمجھ گیا ہوں کہ تم بھی کسی کی تلاش میں آئے ہو۔''

عبدالحق نے تمام کوائف بیان کر دیے۔

''یہ کام تو مشکل معلوم ہوتا ہے۔'' مسعود صاحب نے تفصیل سن کر کہا۔ ''وہ لوگ پاکستان بننے سے ایک ماہ پہلے ہی یہاں آ گئے۔ اُس وقت تو یہاں کوئی کیمپ تھا نہیں۔ اور جو لوگ پہلے آئے عام طور پر یہاں ان کی پہلے سے کوئی سیٹنگ تھی۔ کوئی دوست' کوئی رشتے دار' جس نے انہیں یہاں بلایا۔ ان کے لئے کچھ بندوبست کیا۔ اب ایسے لوگوں کا کیمپ سے تو پتا چلنا میرے خیال میں ممکن نہیں۔''

عبدالحق مایوس نظر آنے لگا۔ مسعود صاحب کی بات معقول تھی۔

''مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔'' مسعود صاحب نے جلدی سے کہا۔ ''یہ وقت ہی معجزوں کا ہے۔ میں نے تو یہاں ایسے ایسے لوگوں کو ملتے دیکھا ہے کہ جو ایک دوسرے کو رو بیٹھے تھے۔ تم فکر نہ کرو۔ انشاءاللہ وہ لوگ تمہیں مل جائیں گے۔''

اُسی وقت ایک ادھیڑ عمر شخص کمرے میں آیا۔ اُس نے ایک کاغذ کا ٹکڑا مسعود صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ مسعود صاحب نے غور سے اُس کا جائزہ لیا اور پھر اُس پر دستخط کر دیے۔ ''لو بھئی جمیل میاں۔ اب سامان نکال دو۔'' انہوں نے کاغذ کا ٹکڑا میز کی دراز میں رکھ لیا۔

جمیل باہر چلا گیا۔ چند منٹ بعد اُس کے ساتھ تین آدمی آئے جو حلیے سے مزدور لگتے تھے۔ وہ چاروں مسعود صاحب کی میز کے پیچھے گئے۔ وہاں عقبی دیوار میں ایک دروازہ تھا۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور اندر چلے گئے۔

''میں معذرت چاہتا ہوں۔ بس ایک منٹ میں آیا۔'' مسعود صاحب بھی اٹھ کر اندر چلے گئے۔ عبدالحق اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

تب پتا چلا کہ وہ عقبی کمرا اجناس کا گودام تھا۔ اس وقت کیمپ میں دوپہر کے کھانے کا سامان ہو رہا تھا۔ ایک مزدور آٹے کی ایک بڑی بوری لے کر نکلا۔ دوسرے دو مزدوروں نے بھی سامان اٹھایا ہوا تھا۔ اور جمیل کے ہاتھوں میں دو کنستر تھے۔

وہ لوگ چلے گئے اور مسعود صاحب اپنی کرسی پر آ بیٹھے۔ ''ہاں بھئی عبدالحق' کیا کہہ رہے تھے ہم؟''

''آپ کہہ رہے تھے کہ رضوان صاحب کو تلاش کرنا آسان نہیں لیکن انشاء اللہ وہ مل جائیں گے۔''

''ہاں۔ میں احتیاطاً ریکارڈز میں ان کی فیملی کو چیک کروں گا۔ اور میں تمہیں افضال صاحب سے ملواؤں گا۔ ان سے بڑھ کر کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔''

''یہ افضال صاحب کوئی افسر ہیں؟''

مسعود صاحب ہنسنے لگے۔ ''افسر سے بھی بڑے ہیں وہ۔ وہ اس کیمپ کے سب سے سینئر اور مستقل باسی ہیں۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھا۔''

''جیسے اسکولوں میں کوئی کریکٹر ہوتا ہے نا۔ وہ لڑکا جو کئی برس سے ایک کلاس میں فیل ہوتا آ رہا ہو۔ یہ افضال صاحب بھی ویسا ہی کیریکٹر ہیں۔ اس کیمپ کو' اُس کی تاریخ اور جغرافیے کو' یہاں رہنے والوں کو' یہاں سے رخصت ہو جانے والوں کو افضال صاحب سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ مگر تم اس وقت اُن سے نہیں مل سکو گے۔ وہ شام کو گھر واپس آتے ہیں۔''

''گھر؟''

''ہاں۔ کیمپ ان کا گھر ہی تو ہے۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ ''اچھا چلو' میں تمہیں اسٹاف سے ملوا دوں۔۔ پھر میں ریکارڈز میں تمہارے رضوان صاحب کو چیک کروں گا۔'' وہ اُٹھ کھڑے

ہوئے۔

❁ ❁ ❁

کیمپ اپنی جگہ ایک بڑی دنیا تھی۔ ایسی دنیا جس کا رقبہ تو بہت زیادہ نہیں تھا' لیکن آبادی بہت زیادہ تھی۔ اور اس دنیا میں ہر طرف کہانیاں ہی کہانیاں بکھری ہوئی تھیں۔

کیمپ کے پناہ گزینوں کو جس زاویے سے بھی دیکھا جاتا' کئی کیٹیگریز میں تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ البتہ ایک قدر ان میں مشترک تھی۔ وہ سب پاکستان کی محبت میں مبتلا تھے۔ اور پاکستان کے لئے اپنے پُرکھوں کی زمین چھوڑ آئے تھے۔

عبدالحق پہلے تو اسٹاف سے ملا۔ ان میں جمیل تھا...... مسعود صاحب کا اسسٹنٹ۔ پھر باورچی شمشاد تھا اور اُس کے بے شمار معاونین تھے۔ ڈسپنسری تھی۔ وہاں ڈاکٹرز اور دیگر اسٹاف تھا۔

بنیادی طور پر کیمپ خیموں کی چھوٹی سی بستی تھی۔ کیمپ میں داخل ہوتے ہی خیمے ہی خیمے نظر آتے تھے۔ لیکن صاف پتا چلتا تھا کہ کیمپ قائم کرنے والوں کا اندازہ بری طرح پٹ گیا ہے۔ پناہ گزینوں کی تعداد ان کے اندازے اور توقع سے کہیں بڑھ کر تھی۔ اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کیمپ کو جس حد تک بھی بڑھایا جا سکتا تھا' بڑھا دیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ خیموں کے آگے کیمپ کے کئی رنگ تھے۔ کہیں چٹائیوں کی جھونپڑی تھی تو کہیں چادروں کی مدد سے چار دیواری بنالی گئی تھی اور چھت بھی چادر ہی کی ڈال لی گئی تھی۔ درمیان میں ایسے لوگ بھی تھے' جو محض ایک دری بچھائے بیٹھے تھے۔ وہ اکیلے مرد تھے' جن کے ساتھ عورتیں نہیں تھیں۔ لہٰذا انہیں نہ چھت کی ضرورت تھی نہ دیواروں کی۔

مجموعی طور پر وہ کیمپ ایک بہت بڑا گھر تھا اور وہاں رہنے والے ایک بہت بڑا کنبہ۔ ایسا کنبہ جس میں بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ عبدالحق ایسا مسحور ہوا کہ کچھ دیر کے لئے تو یہ بھی بھول گیا کہ وہ وہاں کیوں آیا ہے۔ یہ تو اسے وہاں کچھ عرصہ گزارنے پر پتا چلا کہ اس کیمپ کو دیکھ کر وہ پاکستان کو سمجھ سکتا ہے۔

وہ دوبارہ مسعود صاحب کے پاس پہنچا تو مسعود صاحب اسے اپنے کمرے کے برابر ایک بڑے خیمے میں لے گئے۔ وہ کیمپ کا ریکارڈ آفس تھا۔ وہاں پھلوں کی خالی پیٹیاں ہی میز کے طور پر استعمال ہو رہی تھیں اور وہی کرسی بھی تھیں۔ ''یہ ہے ہمارا ریکارڈ آفس۔''

عبدالحق کو ریکارڈ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ وہ ایسے کاغذوں پر مشتمل تھا' جو تقسیم سے پہلے ایک طرف سے استعمال کر لئے گئے تھے۔ یہاں ان کے پیچھے کا حصہ استعمال کیا گیا تھا۔ کیمپ میں جو بھی' کبھی آیا تھا' خواہ چند گھنٹوں کے لئے آیا ہو' اُس کے کوائف وہاں درج تھے۔ اُس کا نام' کہاں سے آیا' ساتھ میں کون کون ہے' عمر کتنی ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر اگر وہ رخصت ہوا تو اس کی تفصیل بھی تھی۔ کس تاریخ کو گیا' کہاں گیا' نیا پتا کیا ہے۔ کیا کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

عبدالحق بہت متاثر ہوا۔ ''یہ بہت بڑا کام کیا ہے آپ لوگوں نے۔'' اس نے ہیڈ کلرک اخلاق سے کہا۔

اخلاق ایسا سنجیدہ طبع جوان تھا' جس کی آنکھوں سے گہری اداسی نظر آتی تھی۔ ''بڑا کام تو نہیں کہا جاسکتا اسے۔'' اُس نے عاجزی سے کہا۔ ''ہاں...... ایک مخلصانہ کوشش کہہ لو۔''

''کیا مطلب؟''

''میں چاہتا تھا کہ یہ ریکارڈ ہر اعتبار سے مکمل ہو۔''

''مجھے تو یہ مکمل ہی لگتا ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''لیکن ہے نہیں۔ ہو بھی نہیں سکتا۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''جو لوگ اکیلے ہیں' ان کا ریکارڈ مرتب کرنا آسان نہیں۔'' اخلاق نے وضاحت کی۔ ''ان میں سے کوئی کیمپ سے باہر گیا۔ وہاں اسے کوئی موقع ملا اور وہ کہیں سیٹ ہو کر بیٹھ گیا۔ اب اُس نے یہاں آکر بتانے کی زحمت نہیں کی تو ہم تو بے خبر ہی رہیں گے نا۔ یہاں ہزاروں افراد ہیں۔ ہم اسکول کی طرح حاضری تو نہیں لے سکتے۔ اب مجھے کیسے پتا چلے گا کہ کوئی یہاں سے چلا گیا۔ پھر بھی میں باخبر رہنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں اپنے طور پر۔''

عبدالحق کو سوچ کر چکر آ گیا۔ واقعی' یہ تو بڑا پیچیدہ معاملہ تھا۔ اس نے تو اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ اب غور کیا تو اسے اخلاق کا باخبر رہنا بھی ممکن نہیں لگا۔ ''آپ کو کیسے پتا چل سکتا ہے؟'' اُس نے حیرت سے کہا۔

اخلاق مسکرایا۔ اس مسکراہٹ سے اُس کا چہرہ دو متضاد کیفیات میں تقسیم ہوگیا۔ کیونکہ آنکھوں کی اداسی اور گہری ہوگئی تھی۔ ''اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔'' اُس کے لہجے میں عاجزی اور بڑھ گئی۔ ''افضال صاحب اور ان جیسے کچھ اور لوگ ہیں۔ وہ یہاں گھل مل کر رہتے ہیں اور سب سے باخبر رہتے ہیں۔ میں اُن سے رابطہ رکھتا ہوں۔''

''گھل مل کر تو سبھی رہتے ہیں یہاں۔'' عبدالحق نے اعتراض کیا۔ ''افضال صاحب میں ایسی کیا خاص بات ہے۔''

''آپ یہاں رہیں تو سمجھیں۔ ساتھ رہنے کا مطلب گھل مل کر رہنا نہیں ہوتا۔ یہاں بیشتر لوگ خود میں گم رہتے ہیں۔ کسی کو کسی کا پتا نہیں چلتا۔'' کہتے کہتے اخلاق کا لہجہ بدلا اور وہ صفائی پیش کرنے لگا۔ ''ان کا بھی کوئی قصور نہیں اس میں۔ یہ سبھی لوگ بہت کچھ قیمتی کھو کر آئے ہیں۔ وہ لوگ بہت خوش قسمت ہیں' جو بغیر کسی جانی قربانی کے یہاں تک پہنچ گئے۔ اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ اور وہ بھی اپنا گھر! اپنا جائیداد اور کچھ نہیں تو اپنے اجداد کی قبریں پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ ایسے

لوگوں کا ماضی میں گم رہنا فطری ہے۔ پھر یہاں بھی وہ عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ مستقبل میں روشنی کی ایک کرن بھی نظر نہیں آتی۔ ایسے میں آدمی کسی دوسرے کے بارے میں سوچ سکتا ہے بھلا؟''

''تو افضال صاحب اور وہ دوسرے لوگ تو عظیم انسان......''

''ان کی عظمت سے تو میں انکار نہیں کروں گا لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو خود میں گم ہو ہی نہیں سکتے۔''

''کیوں بھئی؟''

''اس لیے کہ یہ وہ لوگ ہیں' جن کا پورا خاندان ہجرت کے دوران ختم ہوگیا۔ کوئی بھی نہیں بچا۔ کچھ بھی نہیں بچا۔''

''ایسے لوگوں کو تو دوسروں سے زیادہ خود میں گم ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ ان کے پاس اپنے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ مگر پھر ایسے لوگ پاگل ہو جاتے ہیں۔ وہی ٹھیک رہتے ہیں' جو اپنے دکھ بھول کر دوسروں کو توجہ دیتے ہیں۔'' اخلاق نے سادگی سے کہا۔ ''تو مجھے ان لوگوں سے دوسروں کے بارے میں پتا چلتا رہتا ہے۔ پھر بھی ہمارے ریکارڈ کو مکمل نہیں کہا جاسکتا۔''

بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ لیکن ابھی عبدالحق کو اس کی گہرائی اور سنگینی کا اندازہ نہیں تھا۔ ابھی اُس نے کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔ ''تو ذرا ہمارے رضوان صاحب کو بھی اپنے ریکارڈ میں چیک کرلیں۔'' وہ بولا۔

تھوڑی دیر بعد اخلاق نے نفی میں سر ہلایا تو عبدالحق کو کوئی مایوسی نہیں ہوئی۔ مسعود صاحب نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہاں رضوان صاحب کے آنے کا کوئی امکان نہیں۔ کیونکہ وہ کیمپ قائم ہونے سے کافی پہلے پاکستان آ چکے تھے۔

لیکن نجانے کیوں اسے ایسا لگتا تھا کہ رضوان صاحب کے بارے میں معلومات اسے یہیں سے حاصل ہوں گی۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر مسعود صاحب کے سامنے بیٹھا تھا۔ ''میں نے پہلے ہی کہا تھا۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ ''لیکن کوئی بات نہیں۔ بس ڈٹے رہو۔ وقت تو لگتا ہی ہے۔ اب یہ بتاؤ' آگے کا کیا پروگرام ہے؟''

''میں رضوان صاحب کے بارے میں معلومات کیے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''تو تم پہلے سے ہی ڈٹے ہوئے ہو۔'' مسعود صاحب مسکرائے۔ ''اچھا...... لاہور میں کوئی

ٹھکانہ ہے تمہارا؟"

"آدمی جاتا ہی وہیں ہے' جہاں اُس کا ٹھکانا بھی ہوتا ہے اور آب و دانہ بھی۔"

"سچ کہا تم نے۔ مگر میرا مطلب اور تھا۔ دیکھو عبدالحق! میرا غریب خانہ حاضر ہے تمہارے لیے۔"

"شکریہ سر۔ لیکن کیا میں یہاں کیمپ میں نہیں رہ سکتا؟"

"ایسا مذاق مت کرو میاں کہ میں گر پڑوں۔" مسعود صاحب نے کہا۔ پھر عبدالحق کے چہرے کا تاثر دیکھ کر جلدی سے وضاحت کی۔ "میں یہاں جس پوزیشن میں بیٹھتا ہوں' اس میں پہلو بدلنے کی بھی گنجائش نہیں۔ میں جذباتیت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

"میں سمجھا نہیں جناب۔"

"نہیں سمجھے تو ایک بار پھر میری کرسی کو غور سے دیکھو۔ میں تو یہاں پہلو بھی بدلوں گا تو لڑھک جاؤں گا۔"

عبدالحق کو ہنسی آ گئی۔ "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ میں یہاں کیمپ میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے؟"

"اب میں اس کا کیا جواب دوں۔ یہاں ابھی دو ہزار مہاجرین کا قافلہ آ جائے تو نہ وہ یہ سوال کریں گے اور نہ ہی میں ایک لمحے کے لیے سوچوں گا۔ بس وہ آئیں گے اور یہاں رہنے لگیں گے۔ تم تو بس ایک فرد ہو...... اکیلے آدمی۔"

"تو میں یہاں رہ سکتا ہوں نا؟"

"میرا خیال ہے' میں اس کا جواب دے چکا ہوں۔"

"میرا مطلب ہے' مجھے اس کے لیے کیا کرنا ہو گا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ کرنا چاہو تو اپنے لیے ایک بستر' ایک تکیے اور ایک چادر کا بندوبست کر لو۔ ورنہ ضرورت تو اس کی بھی نہیں۔ کسی کے ساتھ بھی سو جانا۔ اپنے افضال صاحب ہی تمہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔ میں یہیں رہوں گا۔"

"بالکل رہو۔ لیکن جب بھی دل گھبرائے' مجھے بتا دینا۔ میں اپنے گھر لے چلوں گا تمہیں۔"

❁ ❁ ❁

مینو اب نور بانو کا سایہ بن گیا تھا!

نور بانو کو اکثر وہ پہلا دن یاد آتا' جب عبدالحق کے جانے کے بعد اُس نے پہلی بار مینو کو کچھ کھلانے کی کوشش کی تھی۔ اس کا پیٹ پچکا ہوا تھا۔ زبیر اور رابعہ نے کیسے جتن کیے تھے لیکن اس نے

بھوسے کا ایک تنکا بھی قبول نہیں کیا تھا۔ خود نور بانو نے کوشش کی تو اس نے برائے نام کچھ کھا لیا تھا۔ ایسے جیسے بس اس کا دل رکھ رہا ہو۔

نور بانو نے اس وقت یہ سوچا تھا کہ میرے ساتھ یہ رعایت کیوں؟ اور وہ اب بھی اکثر یہ سوچتی تھی۔ اس وقت اس کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ شاید بے زبان مینو عبدالحق سے اس کے تعلق کو سمجھتا ہے۔ لیکن عبدالحق سے تو زبیر اور رابعہ کا بھی تعلق ہے۔ بلکہ زیادہ پرانا اور شاید زیادہ گہرا تعلق ہے۔ پھر اس نے ان کے ہاتھ سے کچھ کیوں نہیں کھایا۔ اور اس سوال کا اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اُس پہلے دن' اُس پہلی کوشش میں مینو نے کچھ زیادہ نہیں کھایا تھا۔ بلکہ اتنا کم کھایا تھا کہ اسے زندہ رہنے کے لیے کھانا بھی نہیں کہا جا سکتا۔ نور بانو ناکامی کے احساس کے ساتھ وہاں سے چلی آئی تھی۔ مگر وہ اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اور اُس نے سوچا تھا کہ تھوڑی دیر بعد پھر کوشش کرے گی۔ اسے فکر تھی...... مینو کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ مینو کو زندہ رہنا ہے۔

اسے عبدالحق پر غصہ آنے لگا...... شدید غصہ۔ ایسا بھی کیا آدمی دوسرے کو سمجھنے کی کوشش بھی نہ کرے...... بلکہ اس کی بات بھی نہ سنے۔ اپنے طور پر سوچے...... اپنی طرف سے بھی اور دوسرے کی طرف سے بھی۔ پھر فیصلہ کرے اور چل دے۔ اب یہاں سب یہی سمجھ رہے ہیں کہ وہ اس کی وجہ سے گیا ہے۔ حالانکہ وہ نہیں چاہتی تھی۔ اُس نے تو ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ بلکہ وہ تو اداس ہو گئی ہے اس کے جانے سے

مگر پھر سوچتے سوچتے اُس کے غصے کا رخ خود اُس کی طرف ہو گیا۔ یہ سب اُس کی حماقت کی وجہ سے ہوا ہے۔ کیا وہ سیدھی سی بات نہیں کر سکتی تھی۔ اور بات کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ڈائری اور کتابیں اسے دیتی اور ہر بات کرتی۔ ایسا کیا ہوتا تو وہ بے چارہ یہ تو نہ سمجھتا کہ وہ اسے اس کی غیر ذمے داری پر ملامت کر رہی ہے۔ اور اُس نے سمجھا تو اس کے لہجے میں ملامت' شکایت...... کوئی تو ایسی بات ہو گی نا۔

اسے خود پر اور غصہ آیا۔ وہ خود کو نجانے کیا سمجھتی ہے۔ کچھ زیادہ ہی...... یا بہت ہی کم! ارے لڑکیاں حیا کرتی ہیں۔ شرمیلی ہوتی ہیں۔ ان کی زبان پر حیا کے تالے ہوتے ہیں۔ محبت کرتی ہیں لیکن اس کا اظہار نہیں کر پاتیں۔ یہ سب کچھ فطری ہے۔ مگر یہ بھی تو فطری ہے کہ محبت ہوا کی طرح ہوتی ہے۔ ہوا جو ہر وقت' ہر جگہ موجود ہے۔ جس کے دم سے زندگی ہے۔ لیکن زندہ لوگوں کو کیونکر وہ نظر نہیں آتی' اس لیے ہر وقت اُس کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ مگر ہوا جب چاہتی ہے' اپنی موجودگی کا احساس دلا دیتی ہے۔ اس کی چال میں تنوع ہے۔ اس کے لہجے ہزاروں ہیں۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولتی۔ مگر سب کچھ کہہ دیتی ہے۔ ایسے ہی قدرت نے عورت کو حیا دی ہے تو اس

کے ساتھ ہی اسے محبت کے اظہار کے اَن گنت پیرائے بھی دیے ہیں۔ اس کی نگاہ کے نہ اٹھنے میں اس کے ہونٹوں سے لفظ نہ نکلنے میں اس کے ہونٹوں کی بے بس تھرتھراہٹ میں اس کی خاموشی تک میں ایسا بھرپور اظہار ہے کہ شاعر کے اشعار اور نثر نگار کی طویل تحریریں بھی اُس کے سامنے عاجز نظر آتی ہیں۔ پھر وہ کون سی انوکھی ہے کہ آج تک اُس کی محبت اپنے محبوب پر ظاہر نہیں ہوئی۔

چلو...... پہلے تو اس کے پاس معقول وجہ تھی۔ مگر اب کیا ہے......؟ اُس کا احساسِ کم تری! تو اس میں ہونا یہ چاہیے کہ آدمی محبت کرے۔ اظہار تو خود بہ خود ہو جاتا ہے۔ ہاں، دوسرے سے اس کی طلب نہ کرے۔ شاید یہی اُس کا مسئلہ ہے۔ اُس کا مسئلہ ہے انا...... وہ نہیں چاہتی کہ اسے ٹھکرا جائے۔ لیکن اس کی وجہ سے تو اس کی محبت ہی کھوٹی ثابت ہوتی ہے۔

اس خود ملامتی سے بچنے کے لیے وہ پھر مینو کے شیڈ کی طرف چلی گئی۔ اس نے پھر مینو کو پیار کیا اس سے باتیں کیں، اسے کچھ کھلانے کی کوشش کی۔ مگر اس نے پھر جیسے مرد تا بہت تھوڑا سا کھایا۔ یہ ثابت ہو گیا کہ معصوم مینو ناز برداری کرانا چاہتا ہے۔ اس نے دانے اور بھوسے کو منہ بھی نہیں لگایا۔ ہاں جو گھاس اُس نے کاٹ کر دی، اس میں سے تھوڑا سا کھا لیا۔ مگر اس نے پانی بھی نہیں پیا۔

اس بار وہ واپس آئی تو عبدالحق کے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے سوچا، اب وہ ہر روز اُس کے کمرے کی صفائی کیا کرے گی۔

عبدالحق کے کمرے کی صفائی ہر روز ہوتی تھی...... رابعہ کرتی تھی۔ مگر اس وقت خود ملامتی کی شکار نور بانو بہت دلیر ہو گئی تھی۔ درحقیقت وہ خود پر غصہ اتار رہی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ رابعہ سے کہہ دے گی کہ اب عبدالحق کے کمرے کی صفائی وہ کیا کرے گی۔

اُس نے جھاڑن سے ہر چیز کی گرد جھاڑی، پھر جھاڑو دی۔ بستر کو درست کرتے ہوئے اس کی نظر عبدالحق کی چادر پر پڑی۔ رضائی تہ کر کے پائینتی پر رکھنے کے بعد وہ چادر کو تہ کرنے لگی۔ مگر اچانک ٹھٹک گئی۔

یہ وہ چادر تھی جو عبدالحق تقریباً ہر وقت کندھے پر ڈالے رکھتا تھا۔ حیرت انگیز بات تھی کہ وہ چادر اپنے ساتھ لے کر نہیں گیا تھا۔ نور بانو چادر کو تہ کرتے کرتے ٹھٹکی اور اسے چھو کر دیکھا۔ اسے نرمی اور حدت کا احساس ہونے لگا۔ اس نے چادر اٹھائی اور اپنے جسم پر ڈال لی۔

ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنا عکس دیکھا۔ چادر اوڑھے ہوئے وہ خود کو بہت خوبصورت لگی۔ اس نے چادر کا کنارہ تھام کر اسے سونگھا۔ اس میں سے خوشبو آ رہی تھی۔ کیا یہ خوشبو عبدالحق کی ہے؟ اس نے سوچا۔ اس خیال سے ہی اس کا چہرہ تمتما اٹھا اور جب اسے چادر میں عبدالحق کے لمس کا احساس ہوا تو وہ حیا سے دہری ہو گئی۔

لیکن وہ بس ایک لمحے کی بات تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ اس چادر میں لپٹی باہر نکل آئی۔ ابتدا میں تو اس کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ سب کو للکار رہی ہو...... جسے جو کرنا ہو کر لے۔ میں عبدالحق سے محبت کرتی ہوں۔ مگر پھر ایک ایسے احساس نے اسے آ لیا کہ دوسرا ہر احساس مٹ گیا۔ اور وہ احساس تھا تحفظ کا۔ وہ چادر اُسے ایسے تحفظ کا احساس دلا رہی تھی جو اسے کبھی ملا ہی نہیں تھا۔ جیسے اس چادر میں لپٹ کر وہ دنیا کی ہر پریشانی، ہر بلا سے محفوظ ہو گئی ہے۔

ابتدا میں وہ اس کے لیے چیلنج تھا۔ چنانچہ وہ چادر میں لپٹی ہر جگہ گئی۔ اس کا خیال تھا، لوگ اسے دیکھیں گے...... گھوریں گے...... اور ان کی نظریں خاموشی کی زبان میں اس سے کہہ رہی ہوں گی کہ وہ کیسی بے شرم ہے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کہیں کسی نے اس پر دوسری نظر نہیں ڈالی۔ لگتا تھا کہ کسی کو پتا ہی نہیں چلا ہے کہ وہ عبدالحق کی چادر اوڑھے ہوئے ہے۔

اس سے اسے اعتماد ہوا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ یہ چادر اب وہ ہمیشہ اوڑھے گی۔ اب وہ یہ چادر عبدالحق کو بھی نہیں دے گی۔

مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ اس چادر کو پہچاننے والا کوئی موجود ہے اور وہ شور بھی مچا دے گا!

وہ شیڈ میں داخل ہوئی اور مینو کی طرف بڑھی۔ اچانک مینو تڑپ کر اٹھا اور اس نے مَیں مَیں کر کے شیڈ سر پر اٹھا دیا۔ وہ اس کی طرف لپک رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اپنی زنجیر توڑ ڈالتا۔

نور بانو گھبرا گئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس لمحے وہ یہ بھول گئی کہ اسے تو کسی کی پروا تھی ہی نہیں۔

وہ آگے بڑھی، مینو کے پاس پہنچی جو زنجیر کی پوری حد تک آگے آیا ہوا تھا۔ مینو نے چادر کو سونگھا اور پھر بے تابی سے اسے چاٹنے لگا۔ نور بانو اس کی گردن سہلانے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس چادر میں عبدالحق کی خوشبو ہے، جسے بے زبان مینو پہچانتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ میرے ہاتھ سے کھائے گا بھی۔ اس کا دل امید سے بھر گیا۔

یہ سوچ کر وہ دانے کی طرف چلی۔ اسے جاتے دیکھ کر مینو نے اودھم مچا دیا اور زنجیر تڑانے کے لیے زور لگانے لگا۔

''بے صبرے مت بنو۔ تمہارے لیے دانہ لینے جا رہی ہوں۔'' نور بانو نے پلٹ کر کہا۔

لیکن مینو کی اچھل کود جاری رہی۔

نور بانو دانہ لے کر آئی اور اُس نے مینو کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ مینو بے قراری سے کھانے لگا۔ اگلے ہی لمحے وہ نور بانو کی ہتھیلی چاٹ رہا تھا۔

نور بانو نے اس کی طرف گھاس بڑھائی اور وہ بڑی رغبت سے گھاس کھانے لگا۔

نور بانو نے مینو کو کھول دیا۔ مینو نے پیٹ بھر کر کھانے کے بعد پانی پیا۔ پھر چادر سے اپنا سر

رگڑنے لگا۔ چند لمحے بعد نور بانو کو چادر سے نکلے ہوئے اپنے ہاتھ پر اُس کی گرم گرم سانسیں محسوس ہوئیں۔ اُس نے سر جھکا کر دیکھا۔ مینو اُس کی کلائی کو سونگھ رہا تھا' جیسے اس بار چادر سے آنے والی خوشبو اور اس کی خوشبو میں فرق کر رہا ہو...... اور جیسے اُس کی خوشبو کو یادداشت میں محفوظ کر رہا ہو۔

نور بانو نے پیار سے اُس کے سر کو سہلایا اور پھر اسے اپنی گود میں بھر لیا۔ چند لمحے بعد اُس نے سر جھکا کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ مینو اس کی گود میں دبک کر سو گیا۔

اُس دن سے مینو نور بانو کا سایہ بن گیا...... اور عبدالحق کی اس چادر کو نور بانو نے جیسے جزو بدن بنا لیا۔ رات کو سونا اُس کے لیے آسان نہیں رہا تھا۔ اپنے بستر پر لیٹ کر وہ سوچتی کہ عبدالحق نجانے کہاں' کس حال میں سو رہا ہوگا۔ کتنا بے آرام ہوگا وہ...... اور پردیس میں اکیلا۔ جانے بستر بھی میسر ہوگا اسے یا نہیں۔ اور یہ سب کچھ وہ صرف اس کے لیے کر رہا ہے۔ یہ جانے' سمجھے بغیر کہ وہ یہ نہیں چاہتی۔ اس میں اس کی خوشی بھی نہیں ہے۔ مگر وہ بے خبر یہ اُس کی خوشی کے لیے کر رہا ہے۔

ایسے میں نیند نہیں آتی اور وہ بہت بے چین ہوتی تو اٹھ کر وضو کرتی اور نفل ادا کرتی۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی تو اس کے ذہن کا صفحہ جیسے سادہ ہو جاتا۔ وہ عبدالحق کی جلد سے جلد واپسی کی دعا کرتی۔ مگر پھر ٹھٹک جاتی۔ اسے خیال آتا کہ عبدالحق کیا کہہ کر گیا ہے...... یہ کہ وہ چچا جان کا پتا معلوم کیے بغیر واپس نہیں آئے گا۔ اب یہ دعا وہ کیسے کر سکتی تھی کہ عبدالحق کو چچا جان مل جائیں۔ یہ دعا تو وہ عبدالحق کی واپسی کی خاطر بھی نہیں مانگ سکتی تھی۔

بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے وہ تھک جاتی تو چادر میں منہ چھپا لیتی۔ اسے ایسا لگتا کہ عبدالحق کی خوشبو اس سے لپٹ گئی ہے۔ اس کے چند لمحے بعد وہ سو جاتی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق کھلے آسمان کے نیچے لیٹا تھا!

وہ ایک بڑی اور موٹی دری تھی' جس پر وہ مرد سوتے تھے' جو اکیلے تھے۔ مسعود صاحب کے اصرار کے باوجود عبدالحق نے ان کے گھر قیام کی پیشکش قبول نہیں کی تھی۔ ویسے وہ اپنا بندوبست کہیں اور بھی کر سکتا تھا۔ لاہور میں ہوٹلوں کی کمی نہیں تھی لیکن وہ کیمپ میں اصل پاکستانیوں کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ اُس کے نزدیک پاکستان کے اصل شہری یہی لوگ تھے' جو پاکستان کے نام پر اپنے گھربار' اپنی زمین جائیداد' اپنے کاروبار چھوڑ کر خالی ہاتھ چلے آئے تھے اور سفر میں ان پر جو گزری تھی' وہ قیامت سے کم نہیں تھی۔ ان کے قافلوں پر' ان کی ٹرینوں اور ان کے ٹرکوں پر ہندوؤں اور سکھوں نے حملے کیے تھے۔ اس دوران بہت بھاری جانی نقصان ہوا تھا۔ شاید ہی ان میں کوئی ایسا خوش نصیب ہو جس نے اپنے کسی پیارے کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے نہ دیکھا

ہو۔

عبدالحق کو ان بے خانماں لوگوں سے خصوصی دلچسپی تھی۔ وہ انہیں سمجھنا چاہتا تھا۔ وہ سننا اور جاننا چاہتا تھا کہ ان پر کیا گزری ہے۔ اس حوالے سے وہ پاکستان کی قدر و قیمت کا یقین کرنا چاہتا تھا۔

پہلی رات شمشاد نے اسے افضال صاحب سے ملوایا۔ ان کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ ان کی شخصیت میں اسے تضاد نظر آیا۔ ان کا چہرہ استخوانی تھا اور دیکھنے میں وہ پریشان حال لگتے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں زندہ دلی کی چمک تھی اور گفتگو میں رجائیت تھی۔

انھوں نے متعارف ہوتے ہی کہا۔ "تم اکیلے نہیں ہو میاں عبدالحق۔ یہاں ہر شخص کسی نہ کسی کو تلاش کر رہا ہے۔"

"آپ بھی؟" عبدالحق نے پوچھا۔

اُن کی آنکھیں اچانک ہی دھندلا گئیں۔ "نہیں۔ میرا تو کوئی نہیں کھویا۔ لیکن کچھ تلاش تو میں بھی کر رہا ہوں۔"

عبدالحق کو ان کے جواب پر حیرت ہوئی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں' جن کے بھرے پرے خاندان میں کوئی بھی نہیں بچا...... سوائے ان کے۔ "آپ کا کوئی بھی نہیں کھویا' اس کا مطلب ہے کہ آپ کے سب لوگ موجود ہیں۔"

"ہاں میاں' اللہ کا شکر ہے کہ میرا کوئی نہیں مرا۔ سب کے سب موجود ہیں۔" وہ بولے۔

"تو آپ تلاش کسے کر رہے ہیں؟"

"خود کو۔"

"خود کو!" عبدالحق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں میاں۔ خود کو تلاش کر رہا ہوں۔ ایک بحران آیا تھا میری زندگی میں۔ وہاں میں کھو گیا۔"

عبدالحق کو ان کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا۔ "اور آپ کے لوگ کہاں ہیں؟"

"وہ...... وہ سب زندہ جاوید ہو گئے۔ شہید ہو گئے۔ اور تم تو جانتے ہی ہو میاں کہ شہید کبھی نہیں مرتے۔ اور موت سے وہ ڈرتے ہیں' جن کا ایمان کمزور ہوتا ہے۔ اس لیے انہیں خوف خدا بھی نہیں ہوتا۔ اور جو موت سے ڈرتے ہیں' وہ راہِ حق میں جیتے جی مر جاتے ہیں۔"

عبدالحق کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس کی سمجھ میں کچھ کچھ آ رہا تھا...... وہ بھی لاشعوری طور پر۔ وہ سب کچھ سمجھنا چاہتا تھا لیکن اسے احساس ہو رہا تھا کہ افضال صاحب سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں۔ وہ ان کے لیے دماغی طور پر نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

مگراس سے رہا بھی نہیں گیا۔" آپ دن بھر غائب رہتے ہیں۔ کیوں؟"

"اپنے سب لوگوں کو تلاش کرتا ہوں۔" افضال صاحب نے کہا اور پھر اُس کے اعتراض کرنے سے پہلے ہی وضاحت کرنے لگے۔ "دیکھو نا میاں' شہید تو نہیں مرتے۔ وہ زندہ ہوتے ہیں۔ بس نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ تو ہو سکتا ہے کہ وہ یہیں کہیں ہوں...... اسی شہر میں۔ کسی اور روپ میں' کچھ اور ناموں سے۔ تو میں انہیں ڈھونڈتا ہوں۔ مجھے یقین ہے' کہیں نہ کہیں وہ مل جائیں گے۔"

عبدالحق نے گھبرا کر سوچا کہ گفتگو کا رخ بدلا جائے۔ خوش قسمتی سے اسے سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دانت بجنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جس طرف سے آواز آرہی تھی' وہاں کمبل کے نیچے جیسے زلزلہ آیا ہوا تھا۔

افضال صاحب تڑپ کر اٹھے اور اس طرف لپکے۔ انھوں نے کمبل ہٹا کر دیکھا۔ "ارے...... یہ تو حمید ہے۔ کیا ہوا؟"

حمید کے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔

افضال صاحب نے اُس کی پیشانی کو چھوا۔ "اسے تو بہت تیز بخار ہے۔" وہ بولے۔ "اور سردی بھی چڑھ رہی ہے۔" انھوں نے اپنا کمبل اس پر ڈال دیا۔ عبدالحق نے بھی ان کی تقلید کی' مگر حمید کی تھرتھری نہیں رکی۔

"ڈسپنسری جا کر کمپاؤنڈر کو لانا ہوگا۔" افضال صاحب اٹھے۔

کمپاؤنڈر کو بلایا گیا۔ اُس نے دوا دی۔ تھوڑی دیر بعد حمید کی حالت قدرے بہتر ہوگئی۔

وہ دونوں اپنی جگہ آ بیٹھے۔ مگر دونوں کا سردی سے برا حال تھا۔ باقی لوگ بے خبر سو رہے تھے۔ "تم ایسا کرو میاں کہ اپنا کمبل اٹھالو۔" افضال صاحب نے عبدالحق سے کہا۔ "کہیں تم بھی بیمار نہ پڑ جاؤ۔"

عبدالحق نے تین کمبلوں کے نیچے حمید کو ٹٹولا۔ اب وہ پُرسکون تھا۔ اس کے جسم میں خفیف سی تھرتھری بھی نہیں تھی اور پسینہ بھی آرہا تھا۔ "آپ کا کمبل بھی اٹھالوں؟ میرے خیال میں اب انہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے افضال صاحب سے پوچھا۔

"پسینہ آرہا ہے اسے؟"

"جی ہاں۔"

"تو میرا کمبل رہنے دو۔ پسینے کے بعد خدانخواستہ ٹھنڈ لگ گئی تو بہت خطرناک ہوگا۔"

عبدالحق نے زبردستی افضال صاحب کو اپنے کمبل میں شریک کیا۔

❁ ❁ ❁
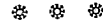
وہاں کیمپ میں اور کیمپ سے باہر کہانیاں ہی کہانیاں بکھری ہوئی تھیں...... اور کردار ہی کردار تھے۔ ہر رنگ کے کردار! وہ زندگی کی ایک مکمل تصویر تھی۔ اس میں ہیرو بھی تھے' ولن بھی اور عام لوگ بھی۔

کیمپ میں پہلے ہفتے نے ہی اسے سب کچھ بھلا دیا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے۔

کیمپ ایک بہت بڑے گھر کی طرح تھا۔ وہاں زندگی کے لگے بندھے معمول تھے۔ صبح سویرے چائے بنتی۔ وہ سرکاری چائے ہوتی تھی۔ لیکن ساتھ ہی باہر سے کیمپ والوں کے لیے ناشتے کا سامان آتا تھا۔ اس میں پاپے' ڈبل روٹی' بسکٹ' حلوہ پوری اور جانے کیا کیا ہوتا تھا۔ وہ شہر کے دولت مند اور مخیر لوگوں کی طرف سے ہوتا تھا۔

ناشتے کے فوراً بعد کھانے کی تیاری شروع ہو جاتی۔ شمشاد اور اس کی ٹیم اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتی۔

پہلے دن عبدالحق نے کھانا پکتے دیکھا تو وہ بہت حیران ہوا۔ کیمپ میں موجود لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اس لحاظ سے کھانا بہت کم پک رہا تھا۔ یہ طے تھا کہ کھانا کم پڑ جائے گا اور لوگ بھوکے رہ جائیں گے۔

اس نے اس سلسلے میں انتظامیہ کے لوگوں سے بات کی۔ مختلف لوگوں نے مختلف جواب دیے۔

شمشاد نے کہا۔ "جتنا دیا جائے گا' ہم اتنا ہی پکائیں گے صاحب۔"

پیاز کاٹنے والا بولا۔ "اللہ کی رحمت ہے صاب۔ برکت بڑی چیز ہوتی ہے۔ نیت ٹھیک ہونی چاہیے بندے کی۔"

اُس نے جمیل سے بات کی تو جمیل کا موڈ بگڑ گیا "بڑے صاحب کا دل بہت چھوٹا ہے دوسروں کے لیے۔" اُس نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"ارے...... وہ سوچتے ہی نہیں کہ اتنے سارے لوگ ہیں۔ انہیں تو راشن بچانے میں دلچسپی ہے۔"

"راشن بچانے میں! مگر کیوں؟"

جمیل نے معنی خیز انداز میں ایک آنکھ بھینچتے ہوئے کہا۔ "یہ کہنے والی بات نہیں ہے بابو جی۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔"

پہلی بار ایک منفی تصویر سامنے آرہی تھی۔ "میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔" عبدالحق نے

کہا۔

جمیل نے رازدارانہ سرگوشی میں کہا۔ ''اپنے لیے بابوجی' اپنے لیے۔ بڑے صاحب اپنے لیے راشن بچاتے ہیں۔''

''کیوں..... وہ کیا کرتے ہیں راشن کا۔ اپنے گھر لے جاتے ہیں؟''

''اتنے بے وقوف نہیں ہیں وہ۔ ہاں' مارکیٹ میں بیچ دیتے ہیں۔''

عبدالحق یہ سن کر دہل گیا۔ مسعود صاحب کا اس پر بہت اچھا تاثر تھا۔ وہ ان کے بارے میں اس انداز میں نہیں سوچ سکتا تھا۔ ''میں نہیں مانتا۔'' اس نے تند لہجے میں کہا۔

''نہ مانو بابوجی۔ پر یہ تو مانو گے کہ وہ بہت بڑے افسر ہیں..... یہاں کے سب سے بڑے افسر۔'' جمیل نے کہا۔

''ہاں..... وہ تو ہیں۔''

''تو پھر یہ بتاؤ کہ اتنے بڑے افسر کے شایانِ شان ہے کہ وہ اسٹور کیپر بن کر بیٹھے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''ارے بھئی' تم نے دیکھا تو ہے۔ ان کے کمرے کے پیچھے اسٹور روم ہے۔ وہ اس کے دروازے پر یوں بیٹھے رہتے ہیں' جیسے مایا پر سانپ۔ شمشاد پرچا تیار کر کے مجھے دیتا ہے۔ اب اصولاً مجھے سامان نکال کر دینا چاہیے۔ لیکن نہیں۔ مسعود صاحب خود ناپ تول کر دیتے ہیں۔ اب سمجھ میں کچھ آیا بابوجی۔''

بات عبدالحق کی سمجھ میں تو آ گئی تھی لیکن حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔ مسعود صاحب ایسے نہیں لگتے تھے۔ لیکن جمیل نے جو کچھ کہا تھا' وہ اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھ چکا تھا۔

''اب بولو بابوجی۔ جو ایسے مظلوموں کے حصے کا مال ہڑپ کرے' اُسے کیا کہا جائے۔'' جمیل نے زہریلے لہجے میں کہا۔

عبدالحق کے دل میں پھانس سی چبھی اور اٹک کر رہ گئی۔

مگر دوپہر کے کھانے میں کوئی کمی' کوئی تنگی نہیں ہوئی' اور اس میں حیرت کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ باہر سے ناشتے کی طرح کھانے کی دیگیں بھی آئی تھیں..... اور اتنی آئی تھیں کہ گنتی بھی ممکن نہیں تھی۔ وہاں زردہ اور بریانی بھی تھی اور سالن اور روٹی بھی۔ یہ ثابت ہو گیا کہ وہاں کھانے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ بلکہ اس کے برعکس افراط تھی۔

دوپہر کو کھانے کے بعد کیمپ میں زندگی گویا اونگھنے لگی۔ عورتیں اور بچے اپنے خیموں میں دراز ہو گئے۔ مردوں کی تعداد ویسے بھی کم تھی۔ کھانے کے بعد ان میں سے کچھ باہر چلے گئے اور کچھ خیموں میں آرام کرنے لگے۔

جمیل البتہ بہت مصروف تھا' وہ کچھ دیگیں اٹھوا کر کیمپ سے باہر بھجوا رہا تھا۔ ''خالی دیگیں واپس بھجوا رہے ہو؟'' عبدالحق نے کہا۔

''آں..... ہاں..... بھجوانی تو ہیں۔''

لیکن اتنی دیر میں عبدالحق کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ دیگیں خالی نہیں ہو سکتیں۔ اٹھانے والوں کے انداز سے پتا چل رہا تھا۔

''کھانا خراب نہیں ہونا چاہیے۔ کسی کے بھی پیٹ میں پڑ جائے۔'' جمیل نے کہا۔ ''کبھی ہمارے ہاں کھانا بچتا ہے تو ہم دوسرے کیمپ بھجوا دیتے ہیں۔''

''میں تو سمجھ رہا تھا کہ کھانا کم پڑے گا۔ یہاں تو صورتِ حال الٹ گئی۔'' عبدالحق بولا۔ ''کیا روز یہی ہوتا ہے؟''

جمیل جواب دیتے ہوئے ہچکچایا۔ ''اگر ایسا ہوتا بھی ہے تو بھی خیال رکھنا چاہیے۔ باہر سے آنے والے کھانے کا کوئی اعتبار تو نہیں ہے نا۔ کسی دن کم آیا تو کمی پڑ جائے گی۔''

''کبھی ایسا ہوا بھی ہے؟''

''ہوا تو نہیں لیکن کسی بھی دن ہو سکتا ہے۔''

عبدالحق ابتدا ہی سے سوچنے' غور و فکر کرنے اور تجزیہ کرنے والا تھا۔ وہ اس بات پر بھی غور کرتا رہا۔ پہلا افسر جس سے اُس کا واسطہ پڑا' وہ حسن دین تھا۔ حسن دین جس نے بغیر کاغذات کے نہ صرف اس کا پورا گاؤں' بلکہ اردگرد کی زمینیں بھی اُس کے نام کر دی تھیں' اور صلے میں اُس سے کچھ بھی نہیں مانگا تھا۔ صرف اس لیے کہ وہ اس کے جذبے سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس بات سے کہ وہ اپنی زمینوں پر ہندوستان سے لٹ پٹ کر آنے والوں کو بے غرض پناہ دے رہا تھا۔ پھر اُس نے پانی کے سلسلے میں اسے محکمۂ زراعت کے دوسرے افسر عرفان احمد سے ملوایا تھا۔ وہ بھی بے غرض' دردمند اور پاکستان سے محبت کرنے والے افسر تھے۔ یعنی یہاں کند ہم جنس با ہم جنس پرواز والا معاملہ کام کر رہا تھا۔ اور عرفان احمد نے اسے مسعود احمد خان کے پاس بھیجا تھا۔ اس لحاظ سے مسعود صاحب کے بارے میں بدگمانی کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

اُس نے اس بات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ چند روز بعد بات خود ہی کھل گئی۔

مسعود صاحب کے لگے بندھے معمولات تھے۔ شام پانچ بجے وہ اپنے گھر چلے جاتے۔ جانے سے پہلے وہ رات کے کھانے کا راشن جمیل کو دے جاتے۔ پھر وہ رات آٹھ بجے دوبارہ کیمپ آتے اور رات کے کھانے کے معاملات دیکھتے۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ہی وہ گھر واپس جاتے۔

یہ جمیل کی عبدالحق سے گفتگو کے دو دن بعد کی بات ہے کہ رات کو کھانا کم پڑ گیا۔

مسعود صاحب کو پتا چلا تو تڑپ کر اپنے دفتر سے نکل آئے۔ کُلی صورتِ حال سمجھنے میں انہیں ذرا دیر نہیں لگی۔ اس وقت تک کھانا ختم ہو چکا تھا اور چوتھائی کیمپ کھانے سے محروم تھا۔

انہوں نے جمیل اور شمشاد کو طلب کر لیا۔ "یہ کیسے ہوا؟" انہوں نے کڑے لہجے میں ان دونوں سے پوچھا۔

عبدالحق نے پہلی بار انہیں اس لہجے میں گفتگو کرتے دیکھا تھا۔ ورنہ وہ تو ظرافت کی چاشنی کے بغیر بات کرنے کے قائل ہی نہیں تھے۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب۔" شمشاد نے بڑی عاجزی سے کہا۔ "میں نے تو ہمیشہ کی طرح پرچا بنایا اور جمیل صاحب کو دے دیا۔ سامان مجھے ملا اور میں نے کھانا تیار کر دیا۔ اس کے آگے تو مجھے کچھ معلوم نہیں جناب۔"

"اور تم کیا کہتے ہو؟" مسعود صاحب جمیل کی طرف مڑے۔

"مجھ سے کیا پوچھتے ہیں سر، ذمے داری تو آپ کی ہے۔" جمیل نے بے حد بے خوفی سے کہا۔

"کیمپ کے انچارج تم ہو۔ جواب دہی بھی تمہیں کرنی ہے۔" مسعود صاحب کے لہجے میں غصہ تھا۔

"میں تو نام کا انچارج ہوں۔ آپ کسی کی سنتے ہی کب ہیں۔"

مسعود صاحب کا لہجہ اچانک نرم ہو گیا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ یہ میری ذمہ داری ہے؟"

"جی سر۔" جمیل اب بھی اُن کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

مسعود صاحب مسکرائے۔ "تمہاری بات وضاحت طلب ہے جمیل۔" وہ بے حد نرم لہجے میں بولے۔ "لیکن پہلے ہمیں اصل مسئلے سے نمٹنا ہے۔ تم سے بات میں ذرا دیر بعد کروں گا۔" وہ شمشاد کی طرف مڑے۔ "شمشاد فوری طور پر کھانے کا بندوبست کرنا ہے۔"

"جو حکم جناب۔ آپ سامان نکلوا دیں۔ میں تیاری کرتا ہوں۔"

"نہیں شمشاد، اس میں دیر لگے گی۔ کھانا باہر سے منگوانا ہوگا۔"

"ایک گھنٹے میں تیار ہو جائے گا جناب....."

مسعود صاحب نے جیب سے چند نوٹ نکال کر شمشاد کی طرف بڑھائے۔ "فوری طور پر باہر سے کھانا منگوا کر لوگوں کو کھلاؤ۔"

شمشاد ایک لمحے کو ہچکچایا۔ مگر پھر اس نے نوٹ لے لیے اور کچن کی طرف چلا گیا۔

اب مسعود صاحب جمیل کی طرف مڑے۔ "ہاں اب ذرا اپنی بات کی وضاحت بھی کر دو۔"

"دیکھیں نا سر، میں ہمیشہ آپ سے کہتا ہوں کہ کھانا ذرا زیادہ پکوایا کریں۔ کم پڑنے کا احتمال

نہ رہے۔"

"شمشاد جو پرچا بناتا ہے اس کے مطابق اسٹور سے سامان تم خود نکالتے ہو۔"

"مگر آپ کی نگرانی میں۔" جمیل نے بے ساختہ کہا۔

"اوہ..... تو تمہیں اس پر اعتراض ہے۔" مسعود صاحب کا لہجہ اور نرم ہو گیا۔

"جی نہیں۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔" جمیل گڑبڑا گیا۔ "میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اس صورت میں کمی کا ذمہ دار شمشاد ہے۔ میں یہاں اسسٹنٹ انچارج ہوں۔ مگر میری سنتا کون ہے۔"

"یعنی تم یہاں وزیرِ بے قلم دان ہو۔" مسعود صاحب کی روایتی ظرافت اور شگفتگی لوٹ آئی۔ مگر عبدالحق کو نجانے کیوں اس کی تہ میں سنگینی چھپی نظر آ رہی تھی۔

اس شگفتگی نے جمیل کو اور شیر کر دیا۔ "آپ خود ہی دیکھ لیں سر۔ پرچا تو شمشاد بناتا ہے نا۔"

"ہاں...... لیکن باہر سے آنے والے کھانے کو ذہن میں رکھ کر۔"

"اس میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" مسعود صاحب نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ پھر جمیل کو بہت غور سے دیکھا۔ "تو یہاں کھانے کے سلسلے میں ذمہ دار دو افراد ہیں، ایک میں اور دوسرا شمشاد۔" ان کے لہجے میں تاسف تھا۔

"جی ہاں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہاں اسسٹنٹ انچارج کی ضرورت ہی نہیں۔ یعنی تم غیر ضروری ہو۔"

"بہ ظاہر تو یہی لگتا ہے جناب۔ لیکن بہرحال میں سرکاری ملازم ہوں۔"

"ارے ہاں، یاد آیا۔" مسعود صاحب کو اچانک جیسے کچھ یاد آ گیا۔ "ایسے بے کار بھی نہیں ہو تم۔ کام تو بہت کرتے ہو تم۔"

"آپ ہی جانیں سر۔" جمیل نے بے پروائی سے کہا۔

"باہر سے آنے والا کھانا تو تمہاری ہی ذمہ داری ہے۔" مسعود صاحب نے بے حد سرسری انداز میں کہا۔

اچانک جمیل بہت چوکنا نظر آنے لگا۔ "جی..... جی ہاں۔"

"اس میں تو میں دخل بھی نہیں دیتا۔ وہ تو مکمل طور پر تمہاری ذمہ داری ہے۔ اس معاملے میں تم پوری طرح بااختیار ہو۔ یعنی تم کیمپ کے انچارج ہو۔ نام کے نہیں، سچ مچ کے۔"

"جی ہاں۔ لیکن میں باہر جا کر مخیر لوگوں سے اپیل تو نہیں کرتا۔"

"تھوڑی دیر پہلے تم نے معترضانہ انداز میں کہا تھا کہ پرچا شمشاد بناتا ہے۔ اس پرچے کے

مطابق سامان تم نکالتے ہو۔ لیکن میری نگرانی میں۔ گویا میری نگرانی کے بغیر تم آزادانہ سامان نکالو تو کمی نہیں پڑے گی۔ شاید میری نگرانی بے برکتی کا سبب ہے۔''

''یہ تو نہیں کہا میں نے۔'' جمیل نے جلدی سے کہا۔

''مگر مطلب تو یہی تھا۔ خیر...... ایک بات ذہن میں آتی ہے۔ ممکن ہے' آج باہر سے کھانا کم آیا ہو۔''

''جی...... جی ہاں' ممکن ہے۔'' اب جمیل پریشان نظر آ رہا تھا۔

مسعود صاحب نے اِدھر اُدھر دیکھا' پھر آواز لگائی۔ ''عابد...... نسیم...... ذرا یہاں آؤ۔''

کچن میں کام کرنے والوں میں سے دو افراد ان کی طرف چلے آئے۔ ''کیا حکم ہے صاحب جی؟''

''نسیم' تم ذرا باہر سے آنے والی دیگیں گن کر مجھے بتاؤ۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ ''اور عابد' تم ذرا اخلاق صاحب کو بلا لاؤ۔''

عبدالحق نے دیکھا کہ جمیل بری طرح مضطرب ہو گیا ہے۔ وہ بار بار پہلو بدلتا تھا' کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتا تھا' مگر فوراً ہی سختی سے ہونٹ بھینچ لیتا تھا۔ مگر مسعود صاحب جیسے اس سے بے تعلق ہو گئے تھے۔

''آپ نے مجھے یاد فرمایا سر؟''

اخلاق کی آواز سن کر مسعود صاحب چونکے اور انہوں نے سر اٹھایا۔ ''ہاں اخلاق' اپنے رجسٹر میں چیک کر کے مجھے بتاؤ کہ آج باہر سے کتنا کھانا آیا تھا۔''

''میں رجسٹر چیک کیے بغیر بھی بتا سکتا ہوں سر۔ چاول کی 25 دیگیں......''

مسعود صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''مجھے یقین ہے کہ تمہارا زبانی حساب بھی درست ہو گا۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ تم رجسٹر سے چیک کر کے تحریری طور پر مجھے بتاؤ۔''

''جی بہت بہتر۔'' اخلاق نے جمیل کو ایک نظر دیکھا اور پلٹ کر چلا گیا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ اخلاق یہ کام بھی کرتا ہے۔'' جمیل نے کہا۔ اُس کے لہجے میں احتجاج تھا۔ ''اس کی ذمہ داری تو صرف کیمپ میں آنے اور رخصت ہونے والوں کا ریکارڈ مرتب کرنا ہے۔''

''جی نہیں۔ کیمپ میں آنے والی اور کیمپ سے باہر جانے والی ہر چیز کا ریکارڈ وہ مرتب کرتا ہے......''

''لیکن سر......''

''میں اس کیمپ کا انچارج ہوں اسسٹنٹ انچارج صاحب۔ یہاں کی ہر بات سے باخبر

رہنا چاہتا ہوں میں۔ تمہاری طرح نام کا انچارج بننا مجھے گوارا نہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں......''

''بات اعتماد کی نہیں' اپنی ذمہ داری کی ہے جمیل۔'' مسعود صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''امانت بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے' اور اس معاملے میں مَیں اپنا بار دوسروں پر ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ ورنہ پرچون فروش بنیوں کی طرح خود اپنے سامنے راشن نہ تلواتا۔ یہی شکایت ہے نا تمہیں۔''

''نہیں سر' یہ بات نہیں......''

اتنی دیر میں نسیم آ گیا۔ ''سر جی' یہاں سولہ خالی دیگیں موجود ہیں...... بارہ چاول کی اور چار سالن کی۔''

''دیکھا آپ نے۔ آج باہر سے کھانا آیا ہی کم تھا۔'' جمیل نے کہا۔

''اچھا...... ذرا اخلاق آ جائے' پھر دیکھتے ہیں۔'' مسعود صاحب نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔

اخلاق اس بار پتلے سے ایک رجسٹر کے ساتھ آیا۔ ''جی سر' چاول کی 25 دیگیں' سالن کی پندرہ دیگیں آئی تھیں آج۔''

''کچھ خالی دیگیں میں نے پہلے ہی واپس بھجوا دی تھیں۔'' جمیل نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

''ابھی دو منٹ پہلے تو تم کہہ رہے تھے کہ کھانا ہی کم آیا تھا۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ ''تمہیں یاد ہے کہ کتنی دیگیں آئی تھیں اور کتنی خالی دیگیں تم نے واپس بھجوائیں۔''

''اب میں گنتا تو نہیں ہوں۔''

''حالانکہ حساب رکھنا چاہیے تمہیں......'' مسعود صاحب نے کہا۔ پھر اضافہ کیا۔ ''میری طرح۔ آخر یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔'' پھر وہ اخلاق کی طرف مڑے۔ ''تم کیا کہتے ہو اس سلسلے میں؟''

''جی سر۔ 40 دیگیں آئی تھیں۔ ان میں سے 24 دیگیں واپس بھجوائی جا چکی ہیں لیکن وہ خالی نہیں تھیں۔ جیسی بھری ہوئی آئی تھیں' ویسی ہی بھری ہوئی گئیں۔'' اخلاق نے کہا۔ ''اور یہ تو ہر روز ہوتا ہے۔ بس آج تعداد بڑھ گئی تھی۔''

''یہ بات تمہارے علم میں تھی؟'' مسعود صاحب نے جمیل سے پوچھا۔

''نہیں جناب۔''

''اخلاق تو کہتا ہے کہ یہ روز کا معمول ہے۔''

''جی' وہ کھانا زیادہ ہوتا ہے تو میں دربار بھجوا دیتا ہوں' یہ سوچ کر کہ کھانا ضائع نہ ہو۔''

''بہت اچھی سوچ ہے تمہاری۔'' مسعود صاحب بولے۔ ''لیکن میں نے کہا نہ کہ میرے

کیمپ کے بارے میں بے خبر رہنا پسند نہیں کرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ دیگیں دربار کی لنگر کی دکانوں پر سجادی جاتی ہیں اور تم ان کے پیسے وصول کرتے ہو۔ میں جانتا تھا' لیکن چشم پوشی کرتا رہا۔ مگر آج تم حد سے گزر گئے۔ کیمپ میں کھانا کم پڑ گیا۔ اس کے لیے میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔''

''جانے دیجیے سر۔'' جمیل نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ ''پہلی بار یہ غلطی ہوئی کہ کیمپ کو نمٹانے سے پہلے دیگیں دربار بھجوا دیں۔ اب آدمی سے غلطی تو ہو جاتی ہے سر۔''

''یہ غلطی نہیں' بددیانتی ہے۔ اب میں تمہیں برداشت نہیں کر سکتا......''

''مگر آپ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں سرکاری ملازم ہوں۔''

''میں اپنے اختیارات سے واقف ہوں جمیل۔ فی الحال تمہیں معطل کر رہا ہوں۔ انکوائری ہونے پر تم یقیناً ڈسمس ہو جاؤ گے۔''

''دیکھ لیں گے سر۔''

''تم یہاں حاضر رہو گے۔ لیکن کسی کام میں دخل نہیں دو گے۔''

جمیل پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔ مسعود صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے۔

❁......❁......❁

عبدالحق دنیا کی نیرنگی اور بوالعجبی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے خوشی تھی کہ مسعود صاحب کھرے آدمی ثابت ہوئے۔ لیکن اسے افسوس تھا کہ جمیل جو خود اتنا خراب آدمی تھا' کیسے ان کی کردار کشی کرتا رہا۔ جو کچھ اس نے مسعود صاحب کے بارے میں اُس سے کہا تھا' نجانے کس کس سے کہتا رہا ہوگا۔ اسے جمیل کے کردار پر افسوس تھا۔

رات تک کیمپ میں سب کو معلوم ہو گیا کہ جمیل کو معطل کر دیا گیا ہے۔ لیکن جمیل کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ وہ لوگوں سے یوں مذاق کرتا پھر رہا تھا' جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ بہرحال اس رات کیمپ میں اسی موضوع پر بات ہوتی رہی۔ لیکن جمیل کے سامنے کسی نے کچھ نہیں کہا۔

اس رات افضال صاحب جلدی سو گئے۔ نجانے کیوں وہ بہت اداس اور دل گرفتہ نظر آ رہے تھے۔ سونے سے پہلے دیر تک وہ اکیلا ایک گوشے میں دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے بیٹھے رہے تھے۔ رہ رہ کر وہ کچھ بڑبڑاتے اور اپنے سر پر زور سے ہاتھ مارتے' کوئی اندرونی اضطراب تھا' جو انہیں بے چین کیے ہوئے تھے۔

عبدالحق نے حمید سے کہا۔ ''افضال صاحب کی آج کچھ طبیعت خراب ہے۔''

''ہاں...... ایسا ہوتا رہتا ہے۔''

عبدالحق کا جی چاہ رہا تھا کہ جا کر ان کے پاس بیٹھے' ان کی دل جوئی کرے لیکن کوئی غیر شعوری احساس اسے ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس وقت افضال

صاحب کو تنہائی کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کی اپنی فطرت ایسی تھی کہ وہ کسی کو پریشانی میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ سو فطرت اسے بار بار اکساتی تھی کہ وہ ان کی طرف بڑھے۔ اسے اس پر بھی حیرت تھی کہ کسی اور کو افضال صاحب کی فکر نہیں ہوئی۔ حالانکہ وہ خود بھی کی فکر کرتے تھے۔

عبدالحق کو افضال صاحب کی طرف بڑھنے کے لیے ایک بہانہ...... کسی کی تائید درکار تھی۔

اُس نے حمید سے کہا۔ ''چلو...... کچھ دیر چل کر افضال صاحب کے پاس بیٹھیں۔''

''ایسا غضب نہ کرنا۔'' حمید نے جلدی سے کہا۔ ''اس وقت انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینے ہی میں بہتری ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''دیکھو' مہینے میں کم از کم ایک بار ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ اس وقت وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہوتے۔''

''لیکن......''

''ایسے میں کوئی قریب جائے تو وہ جنونی ہو جاتے ہیں۔ کسی کو کوئی بھی نقصان پہنچ سکتا ہے ان سے۔''

''تو پھر یہ ایسے ہی رہیں گے؟''

''کچھ دیر ایسے ہی رہیں گے۔ پھر سو جائیں گے...... بے خبر' گہری نیند۔ اور ہو سکتا ہے کہ کل دوپہر کو بلکہ شام کو سو کر اٹھیں۔''

عبدالحق بہت ملول ہوا۔ اُس سے ان کا حال دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

''تم بے کار کڑھ رہے ہو۔'' حمید نے اسے تسلی دی۔ ''یہ کیفیت ان کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ کی رحمت ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''اس کیفیت کے بعد وہ گہری طویل نیند سو جاتے ہیں۔ نیند ان کے لیے نعمت ہے۔ جانتے ہو کیوں؟''

عبدالحق نے نفی میں سر ہلایا۔

''اس لیے کہ وہ کبھی سوتے ہی نہیں ہیں۔''

''مگر میں نے تو ہر رات انہیں سوتے ہوئے دیکھا ہے۔'' عبدالحق نے اعتراض کیا۔

''سوتے نہیں ہیں' بس آنکھیں بند کیے پڑے رہتے ہیں۔ تاکہ دوسروں کی نیند خراب نہ ہو۔ شروع میں یہ سوتے تھے۔ مگر ذرا دیر میں ہی چیختے ہوئے اٹھ جاتے تھے۔ شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھتے تھے اور اٹھتے تو زور زور سے چیختے تھے...... مجھ پر لعنت ہو...... لعنت ہو مجھ پر۔ موت

نے بھی مجھ پر لعنت بھیج دی ہے۔"

عبدالحق سوچ میں پڑ گیا۔ یہ تو نفسیاتی معاملہ ہوا۔ کچھ ایسی گزری ہے ان پر' جو ان کے ضمیر کے لیے بوجھ ہے۔ "کبھی ان سے پوچھا کہ پاکستان آتے ہوئے ان پر کیا گزری تھی۔"

"وہ بس اتنا کہتے ہیں کہ کچھ نہیں بچا...... کچھ نہیں بچا...... اور جو بچا' وہ زمین کا بوجھ ہے۔"

"اپنے بیوی بچوں' اپنے رشتہ داروں کے بارے میں نہیں بتاتے۔"

"بس اتنا کہتے ہیں کہ سب شہید ہو گئے۔ اور ساتھ ہی کہتے ہیں کہ میں کہیں کھو گیا' ضائع ہو گیا۔"

عبدالحق کو افضال صاحب سے اپنی گفتگو یاد آ گئی۔ اُس سے بھی انہوں نے یہی کہا تھا۔ اب وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ افضال صاحب کا نہ سونا بھی فطری تھا۔ یہ نہیں کہ انہیں نیند نہیں آتی ہوگی۔ بات یہ ہے کہ وہ نیند سے لڑتے تھے' سونا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ وہ اپنے ڈراؤنے خواب سے گھبراتے تھے۔ ڈراؤنے خواب دیکھنے والے بھی نیند سے نہیں لڑتے۔ نیند بہت بڑی آسائش ہے' اللہ کی بہت بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے' تھکن اور اضمحلال کو زائل کر کے آدمی کو تازہ دم کرنے کا قدرتی عمل۔ کوئی شخص اگر دو رات نہ سوئے تو اس کی تھکن اور اضمحلال کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ نڈھال ہو جاتا ہے آدمی۔ اس لیے ڈراؤنے خواب کا خوف بھی اسے نیند سے دور نہیں رکھ سکتا۔ افضال صاحب دوسروں کا خیال رکھنے والے آدمی تھے۔ وہ کسی کو تکلیف نہیں پہنچا سکتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھ لیا کہ سونے کے بعد وہ چیختے ہوئے اٹھتے ہیں اور دوسروں کی نیند خراب ہوتی ہے تو انھوں نے ارادہ کر لیا کہ وہ سوئیں گے ہی نہیں۔ اپنے خوابوں پر تو ان کا قابو نہیں تھا' اپنی نیند سے تو وہ لڑ سکتے تھے۔

اب عبدالحق سمجھ سکتا تھا کہ افضال صاحب کی یہ کیفیت اللہ کی طرف سے بہت بڑی رحمت ہے۔ اس طرح اللہ انہیں ایک طویل نیند عطا فرما کے تازہ دم کر دیتا ہے۔ ورنہ جاگنے کی وہ تھکن اور بے آرامی ان کے وجود کو دیمک کی طرح چاٹ جائے۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے عبدالحق کو افضال صاحب پر ترس آنے لگا۔ ایک ایسا شخص جو زندہ رہنے کا ہر جواز کھو چکا ہو' مگر اللہ کا حکم آنے تک اسے جینا ہو' کیسا قابلِ رحم ہوتا ہے۔ افضال صاحب نے بہ ظاہر جینے کے کئی جواز بنا لیے تھے لیکن اندر سے وہ موت کے آرزومند تھے' ورنہ وہ چیخ کر یہ کیوں کہتے کہ موت نے بھی ان پر لعنت بھیج دی ہے۔

افضال صاحب کے بارے میں عبدالحق کا تجسس اور بڑھ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ پس منظر میں کوئی بڑی کہانی ہے۔ اسے شرمندگی بھی ہوئی۔ عام حالات میں وہ غیر ضروری تجسس سے بچتا تھا کہ اللہ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

"وہ دیکھو' وہ سو گئے۔"

حمید کی آواز نے عبدالحق کو چونکا دیا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ افضال صاحب جہاں بیٹھے ہوئے تھے' وہیں ڈھے گئے تھے۔ ان کا جسم بے ترتیب اور نہایت بے آرامی کی حالت میں تھا۔ ایسی بے آرامی میں کوئی سو نہیں سکتا۔ لیکن افضل صاحب گہری نیند سو رہے تھے اور ان کے چہرے پر ایسا سکون تھا کہ وہ کسی معصوم بچے کا چہرہ لگ رہا تھا۔

کچھ دیر تو عبدالحق یہ سوچ کر بیٹھا رہا کہ کہیں ان کی نیند خراب نہ ہو جائے۔ پھر وہ اٹھا اور اس نے انہیں سیدھا کر کے لٹایا اور کمبل اڑھا دیا۔ افضال صاحب اتنی گہری نیند میں تھے کہ اس دوران کسمسائے بھی نہیں۔

عبدالحق کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا۔ اس دوران نذیر' نعمان اور مجید بھی سونے کے لیے وہاں آ گئے تھے۔ ان کے درمیان گفتگو ہونے لگی۔ جمیل کا نام سن کر عبدالحق چونکا' اور ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"اب جمیل کا کیا بنے گا؟" مجید نے پوچھا۔ اُس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"بڑے صاحب اصول کے پکے ہیں۔ اسے چھوڑیں گے نہیں۔" نعمان نے کہا۔ "لیکن تجھے اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے جمیل صاحب کی۔"

"یہ مجید کسی کی فکر نہیں کرتا۔ یہ صرف اپنی فکر کرتا ہے۔" نذیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیوں نہ کروں۔ میری فکر کرنے والا کوئی ہے ہی نہیں۔ میں بھی اپنی فکر نہ کروں تو کیا بنے گا میرا۔" مجید نے جھنجھلا کر کہا۔

"ارے' تین وقت کی روٹی کے سوا فکر کی بات کیا ہے۔ اور وہ بھی فکر کے بغیر مل جاتی ہے۔" نذیر نے کہا۔

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔" نعمان چھیڑنے والے انداز میں گنگنانے لگا۔

"تو اور کیا..... آگے پوری زندگی پڑی ہے۔ اس کیمپ میں تو نہیں گزرے گی نا۔" مجید بولا۔

"ابھی تو شادی کرنی ہے' گھر بسانا ہے۔ بچے ہوں گے' ان کے مستقبل کا سوچنا ہے۔" نذیر نے ٹکڑا لگایا۔

حمید ابھی تک اس گفتگو میں شامل نہیں ہوا تھا اور عبدالحق اس رمزیہ گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ تینوں جوان تھے۔ تیس سے کچھ کم ہی عمر ہوگی اُن کی لیکن جو کچھ وہ دیکھ کر آئے تھے' اس کے نتیجے میں اپنی عمر سے بڑے لگتے تھے۔

"ہاں' جو ہونا تھا' وہ تو ہو چکا۔" مجید نے آہ بھر کے کہا۔ "مستقبل کی تو فکر کرنی ہوگی۔"

"کوئی بات نہیں۔ اگر چھن گیا اک نشیمن تو کیا غم۔ مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں۔" نعمان

پھر گنگنایا۔
’’لیکن ایک بات بتاؤں‘ جمیل صاحب کا کچھ نہیں بگڑے گا۔‘‘ مجید نے جیسے چڑ کر کہا۔
’’تیل دیکھو اور تیل کی دھار دیکھو۔‘‘ نذیر کے انداز میں چیلنج تھا۔
’’دیکھ لینا۔‘‘
’’مجید ٹھیک کہتا ہے۔‘‘ نعمان نے پہلی بار سنجیدگی سے کہا۔ اس کے لہجے میں تاسف تھا۔
’’بڑے صاحب جمیل کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔‘‘

عبدالحق عام طور پر خاموشی سے سنتا تھا‘ دوسروں کی گفتگو میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔ مگر اس وقت اُس سے رہا نہیں گیا۔ اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ’’میں سمجھتا ہوں کہ جمیل کو سزا ملنی چاہیے‘ اور ملے گی بھی۔ مسعود صاحب نے اسے معطل تو کر ہی دیا ہے۔ اس کے خلاف تمام ثبوت موجود ہیں۔ انکوائری کے نتیجے میں وہ برطرف بھی ہوگا۔‘‘

’’بابو صاحب‘ آپ کچھ بھی نہیں جانتے۔‘‘ نذیر نے کہا۔ ’’جمیل صاحب بڑی چیز ہیں......‘‘
’’لیکن مسعود صاحب......‘‘ عبدالحق نے کچھ کہنا چاہا۔
’’بڑے صاحب سے بھی بڑی چیز۔‘‘ نذیر نے ان کی سنی اَن سنی کرتے ہوئے اپنی بات پوری کی۔

’’اور جمیل صاحب زیادہ دیر معطل بھی نہیں رہیں گے۔‘‘ مجید نے فخریہ لہجے میں کہا۔
’’مگر کیوں۔ یہاں تو اللہ کا قانون ہے۔ مجرم کو سزا تو ملے گی۔‘‘ عبدالحق کا لہجہ تلخ ہوگیا۔
’’ابھی تو یہاں انگریز کا قانون ہے اور نجانے کب تک چلے گا۔‘‘ نعمان کے لہجے میں بھی تلخی تھی۔

’’میری سمجھ میں تو نہیں آتا......‘‘
’’آپ نہیں سمجھ سکتے۔ جمیل صاحب کے بڑے صاحب سے بھی بڑے افسروں سے تعلقات ہیں۔‘‘

’’تو تعلقات سے کیا ہوتا ہے۔ تعلقات سے جرم کرنے کا لائسنس مل جاتا ہے کیا؟‘‘
’’جی ہاں بابو صاحب‘ اب تک یہاں ہم نے یہی دیکھا ہے۔‘‘ حمید نے پہلی بار زبان کھولی۔

’’میری سمجھ میں نہیں آتا‘ جمیل میں ایسی کیا خصوصیت ہے کہ مسعود صاحب سے بڑے افسروں سے اس کے تعلقات ہیں۔ جبکہ وہ تو مسعود صاحب کی نظروں میں بھی عزت حاصل نہیں کر سکا۔‘‘

’’آدمی آدمی کا فرق ہوتا ہے بابو صاحب۔‘‘ نعمان نے کہا۔ ’’یہاں بنیادی رشتہ غرض کا

ہے۔ غرض سے دوستی ہے‘ غرض سے تعلق ہے۔ جو غرض نہیں رکھتا۔ اسے جیتا بھی نہیں جا سکتا‘ جیسے اپنے بڑے صاحب۔‘‘

عبدالحق کی نظر حمید پر پڑی۔ اسے محسوس ہوا کہ حمید کی نگاہوں میں تنبیہہ ہے‘ جیسے وہ اسے موضوع پر گفتگو سے منع کر رہا ہو۔ وہ خاموش ہوگیا‘ ویسے بھی اس گفتگو نے اس کے ذہن میں کئی سوالوں کو جنم دیا تھا‘ جن پر اسے سوچنا تھا۔

سب سونے کے لیے لیٹ گئے اور سو بھی گئے۔ مگر عبدالحق دیر تک جاگتا رہا اور ان سوالات پر سوچتا رہا۔ بڑے افسروں کو جمیل سے کیا غرض ہو سکتی ہے؟ کیا دے سکتا ہے وہ اُنہیں‘ بڑے افسروں کو کھانے کی ضرورت تو نہیں ہو سکتی۔ مگر اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ شاید حمید اس سوال کا جواب دے سکے۔ تبھی تو اس نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

پھر وہ ان گروہ بندیوں پر غور کرنے لگا‘ جو اسے وہاں نظر آئی تھیں۔ نذیر‘ مجید اور نعمان ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ لیکن جمیل کے مسئلے پر ان کا ردِعمل مختلف تھا۔ مجید جمیل کا حامی معلوم ہوتا تھا اور نعمان مخالف۔ جبکہ نذیر غیر جانبدار تھا۔ یہاں بھی غرض کی...... ضرورتوں کی کارفرمائی ہوگی۔ مگر یہاں وہ سمجھ سکتا تھا۔ ہاں...... یہاں تو غرض موجود تھی۔

وہ پھر سوچنے لگا کہ جمیل جیسے عام آدمی سے بہت بڑے افسروں کو کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ اس کے مشاہدے کے مطابق جمیل کی اہلیت بس اتنی تھی کہ وہ کسی بھوکے کو کھانا کھلا سکتا تھا لیکن بڑے سرکاری افسروں کو یہ حاجت تو نہیں ہو سکتی۔

یہ سب کچھ سوچتے سوچتے نجانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی۔

❁ ❁ ❁

حمیدہ عبدالحق کے لیے بہت پریشان‘ بہت فکرمند تھی۔ عبدالحق سے وہ اس کے زمانۂ شیر خواری سے واقف تھی۔ نور بانو نے اسے بتایا تھا کہ وہ کیا کہہ کر گیا ہے...... یہ کہ وہ اس کا کام کر کے ہی آئے گا۔ اور کام ناممکن تھا۔ ایک ایسے شخص کو انسانوں کے جنگل میں تلاش کرنا‘ جسے آپ نے دیکھا بھی نہ ہو‘ جسے آپ صرف نام سے جانتے ہوں‘ ناممکن ہی کہلائے گا۔ ارے بڑے شہر میں تو ایک نام کے دسیوں آدمی ہو سکتے ہیں۔ اور پھر سوال یہ تھا کہ وہ انہیں ڈھونڈے گا کہاں۔ کوئی پتا‘ کوئی نشان‘ کوئی سراغ نہیں اس کے پاس۔ تو کیا نور بانو کا خدشہ درست ہے۔ اس ضدی لڑکے کو نور بانو کا چچا نہیں ملے گا...... اور وہ اپنے عہد کے مطابق یہ کام کیے بغیر واپس نہیں آئے گا۔ یہ تو وہ جانتی تھی کہ عبدالحق وعدے کا پکا ہے۔

مگر حمیدہ زیادہ دیر مایوس رہنے والی نہیں تھی۔ اس نے زندگی ہی ایسی گزاری تھی۔ اتنا کچھ دیکھ چکی تھی وہ کہ مایوسی سے اس کا تعلق زیادہ دیر کا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے تو اللہ کی رحمت کے عقل

کو عاجز کر دینے والے مظاہرے دیکھے تھے۔ اللہ نے اس لال آندھی سے اُس کو بچا لیا تھا' جس نے اردگرد کے کئی گاؤں نگل لیے تھے اور ان میں کوئی متنفس بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ اور وہ بچی بھی کیسے کہ آنکھوں سے محروم ہو گئی۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ دنیا میں اکیلی ہے۔ تب اللہ کی رحمت نے اسے سہارا دیا' سر چھپانے کا ٹھکانہ فراہم کیا' کھانے کو کھجوریں اور پینے کو پانی عطا فرمایا۔ اس رزاق نے جو پتھر میں بھی کیڑے کو رزق عطا کرتا ہے۔ وہ اگر ایسی بھیانک تنہائی میں زندہ رہی تو صرف اللہ کے فضل و کرم سے۔ اس نے کبھی انسانی آواز تو کجا' کسی جان دار کے قدموں کی چاپ بھی نہیں سنی' یہاں تک کہ چھوٹا ٹھاکر عبدالحق بن کر چلا آیا۔ وہ تو معجزہ تھا۔ ورنہ اُس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اسے کبھی مل سکے گا۔ وہ تو اپنی دانست میں زندگی کے باقی دن پورے کر رہی تھی۔ مگر اللہ نے اسے کتنا کچھ دے دیا۔ عبدالحق مل گیا' آنکھوں کی کھوئی ہوئی روشنی مل گئی اور وہ اب بھی زندہ ہے...... زندہ اور صحت مند!

حمیدہ کبھی اس پر غور کرتی تو سوچتی کہ اس نے تین زندگیاں گزاری ہیں۔ ایک زندگی تو جمال دین کی بیوی' وصال دین کی ماں اور اوتار سنگھ کی اماں کی حیثیت سے۔ دوسری وہ تنہا زندگی' جہاں نہ کوئی آدم تھا نہ آدم زاد اور جہاں دنوں کا شمار بھی ممکن نہیں تھا' اور تیسری یہ جو وہ اب گزار رہی ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھتی تو وہ پہلی زندگی اسے اپنی نہیں لگتی تھی۔ وہ جمال دین کی بیوی اور وصال دین کی ماں حمیدہ کوئی اور عورت تھی۔ بس وہ اُس کی زندگی کی عینی شاہد تھی' وہ وہ نہیں تھی۔ اور دوسری زندگی اب محض ایک ڈراؤنا خواب لگتی تھی۔ جیسے خواب دیکھا اور آنکھ کھل گئی۔ ہاں' اب جو وہ زندگی گزار رہی تھی' وہ حقیقی لگتی تھی۔

تو حمیدہ نے خود کو جھڑکا اور مایوسی اور پریشانی کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ رب جس نے عبدالحق کو اُس تک پہنچا دیا' وہ انشاء اللہ عبدالحق کو نور بانو کے چچا تک پہنچا دے گا۔ پھر عبدالحق سرخرو واپس آئے گا۔

مگر اس خیال سے حمیدہ کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ اگر نور بانو کے چچا مل گئے تو نور بانو ان کے پاس چلی جائے گی۔ اس کے بعد ضروری نہیں کہ وہ ان سے عبدالحق کے لیے نور بانو کا رشتہ مانگیں اور وہ ہاں کر دیں۔ کیا پتا' ان کا اپنا کوئی بیٹا ہو اور وہ اس سے نور بانو کی شادی کرنا چاہیں۔ اس صورت میں عبدالحق تو رہ جائے گا۔

لیکن اُس نے فوراً ہی لاحول پڑھی اور اس خیال کو بھی ذہن سے جھٹک دیا۔ آدمی اندیشے پالنا شروع کر دے تو ان کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ آدمی کر ہی کیا سکتا ہے۔ اس نے سوچا کہ اللہ کا اتنا فضل و کرم دیکھنے کے بعد اُس کے خوف کا یہ حال ہے۔ یہ تو اللہ کو ناراض کرنے والی بات ہے۔ اس طرح سے سوچے گی تو وہ تو دعا بھی نہیں کر سکے گی۔ اگر نور بانو

کے چچا کے مل جانے کی دعا کرتی ہے تو نور بانو کے ہاتھ سے نکلنے کا ڈر ہے۔ اور اگر ان کے نہ ملنے کی دعا کرتی ہے تو وعدے کا سچا عبدالحق واپس ہی نہیں آئے گا۔ یہ تو بند گلی ہے۔

اُس نے دل میں اللہ سے توبہ کی۔ جن لوگوں کو اللہ کی طرف سے معجزے جیسی عطا نصیب ہو' ان کا تو ایمان پختہ ہونا چاہیے۔ انہیں تو کبھی کسی خوف اور اندیشے کا شکار ہونا ہی نہیں چاہیے۔

اس نے اللہ سے دعا کی کہ ایسا کچھ کر دیں' جس میں سب کے لیے بہتری ہو۔

پھر اس نے کچھ اچھا' کچھ ایسا سوچنے کی کوشش کی' جو مایوسی اور خوف سے پاک ہو' اور جس میں دل خوش ہو۔ اور ایسا سوچنے کے لیے اس کے پاس عبدالحق اور نور بانو کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

کبھی وہ اپنے بیٹے وصال دین کے بارے میں سوچنے کی کوشش کرتی تو وہ اسے بھولی بسری بات لگتی۔ بلکہ کبھی تو اسے لگتا کہ وہ کسی اور حمیدہ کا بیٹا تھا' اُس کا اپنا نہیں۔ ایسے میں ایک لمحے کے لیے احساسِ جرم ہوتا...... ارے' وہ کیسی ماں ہے کہ اپنے بیٹے کو ایسے بھول گئی ہے کہ اب اُس کی صورت اسے یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آتی۔ مگر فوراً ہی اسے لال آندھی کا سماں یاد آ جاتا۔ اُس کی خوف ناکی کا یہ حال تھا کہ اُس کا تصور کرنے پر بھی اُس کے جسم میں تھرتھری دوڑنے لگتی۔

وہ دن اسے اچھی طرح یاد تھا۔ وہ اسے کبھی بھول ہی نہیں سکتی تھی۔ اُس دن ٹھاکر جی نے گاؤں کے تمام لوگوں کو طلب کیا تھا' جو ایک غیر معمولی بات تھی۔ جمال دین اور وصال دین بھی گئے تھے۔ تب اُس نے اُن دونوں کو آخری بار دیکھا تھا۔ پھر وہ پلٹ کر نہیں آئے۔ وہ اپنے دروازے پر کھڑی رہی۔ پھر اچانک گاؤں میں بھگدڑ مچ گئی۔ لوگوں نے اپنے گھروں پر سفید جھنڈے لہرا دیے لیکن ساتھ ہی وہ گھر چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ سب لوگ گاؤں سے باہر جا رہے تھے۔

حمیدہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ اُس نے گاؤں کی عورتوں کو روک کر ان سے پوچھنے کی کوشش کی لیکن پوری بات کسی نے بھی نہیں بتائی۔ وجہ یہ تھی کہ کوئی رک کر بات کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ دوسری بات یہ کہ بیشتر کا رویہ اُس کے ساتھ معاندانہ تھا۔ گزرتی ہوئی عورتوں سے ایک ایک جملے کی معلومات حاصل ہو سکیں۔

''ہُوا کیا ہے؟'' اُس نے ایک عورت سے پوچھا۔

''کل جگ ہے کل جگ۔'' عورت نے جواب دیا۔

دوسری عورت نے کہا۔ ''جے پور والے حملہ کرنے آ رہے ہیں۔''

''کیوں؟'' حمیدہ نے پوچھا تھا۔

مگر اُس کے سوال کرنے سے پہلے ہی وہ عورت آگے جا چکی تھی۔

پھر ایک اور عورت نے کہا۔ ''یہ سب کچھ اُس اپرادھی چھوٹے ٹھاکر کی وجہ سے ہو رہا ہے۔''

حمیدہ کو الجھن ہونے لگی۔ چھوٹا ٹھاکر تو دہلی میں ہے۔ اُس نے ایسا کیا کر دیا کہ جے پور والے ٹھاکروں کی گڑھی پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔

''دیکھ لینا' اب تو یہ گاؤں مٹ کر رہے گا۔'' ایک عورت دوسری عورت سے کہتے ہوئے گزری۔

ایک گھنٹے میں اُس نے دیکھ لیا کہ گاؤں پوری طرح خالی ہو گیا ہے۔ عورتوں اور بچوں میں سے تو کوئی بھی نہیں رہا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ مردوں کی بھاری اکثریت بھی گاؤں خالی کر گئی تھی۔ حمیدہ کا اندازہ تھا کہ بہت تھوڑے مرد گاؤں میں رہ گئے ہیں۔

حمیدہ کو الجھن بھی تھی اور پریشانی بھی۔ ٹھاکر اتنا اچھا انسان تھا کہ گاؤں کے تمام لوگ اُس سے محبت کرتے تھے' پوجا کرتے تھے اُس کی۔ تو چھوٹے ٹھاکر نے ایسا کیا کر دیا کہ وہ بڑے ٹھاکر کو اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ لیکن اُس کے سوال کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔

شام ہو گئی۔ حمیدہ وہیں کھڑی رہی۔ جمال دین اور وصال دین میں سے کوئی واپس نہیں آیا۔ پھر گاؤں کی طرف سے ایسی دھول اُٹھی کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ساتھ ہی نعرے بھی سنائی دینے لگے۔ لگتا تھا کہ حملہ ہو گیا ہے۔ حمیدہ اُس طرف جانا چاہتی تھی۔ لیکن ایک خیال اسے روک رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ چھوٹے ٹھاکر کو واپس آنا تھا لیکن ابھی وہ واپس نہیں آیا ہے۔ واپس آتا تو وہ سب سے پہلے اسے ملنے آتا تھا۔ اور اسے یہ خیال تھا کہ یہ سب کچھ چھوٹے ٹھاکر کی وجہ سے ہوا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ چھوٹے ٹھاکر کی جان کو خطرہ ہے۔ کاش' وہ اِس راستے سے آئے تو وہ اسے گاؤں جانے ہی نہیں دے گی۔ وہ اسے یہیں سے بھگا دے گی۔ مگر اس کے لئے کچھ کرنا بھی چاہیے۔

سورج غروب ہوا تو اس نے نماز پڑھی اور سب کے لیے...... خاص طور پر چھوٹے ٹھاکر کے لیے دعا کی۔ اس سے فارغ ہوئی تو وہ ٹھاکر جی کی امانتوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس میں زر و جواہر اور نقد رقم کے علاوہ زمینوں کے کاغذات بھی تھے۔ اسے خیال تھا کہ یہاں گاؤں میں بہت کچھ ختم ہونے والا ہے...... بلکہ شاید سب کچھ تب چھوٹے ٹھاکر کو شہر میں زندگی گزارنی ہوگی۔ اسے یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جانا چاہئے۔ اُس نے خاصے زیورات اور رقم ایک طرف کر کے اس کو ایک پوٹلی میں باندھ دیا۔ اور باقی رقم اور زیورات اور زمین کے کاغذات کی ایک اور پوٹلی بنا دی۔ پھر وہ دوبارہ دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔

گاؤں کی طرف سے چیخ و پکار اور فائرنگ کی آوازوں میں شدت آ گئی تھی۔ حمیدہ کا دل چاہتا تھا کہ وہاں جائے مگر وہ جانتی تھی کہ چھوٹے ٹھاکر کے لئے اُس کی ذمہ داری زیادہ اہم ہے۔ کبھی کبھی اسے یہ خیال ستاتا کہ کہیں چھوٹا ٹھاکر حویلی ہی میں نہ ہو۔ لیکن مطمئن دل ہر بار تردید کر

دیتا تھا۔ اور وہ جانتی تھی کہ اُس کا دل سچا ہے۔

صبح کی نماز پڑھ کر اُس نے پھر دعا کی۔ اس بار وہ باہر آئی تو گاؤں میں سکوت تھا۔ کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ سورج طلوع ہوا تو پوٹلی کو گھر میں رکھ کر وہ گاؤں کی طرف چل دی۔ راستے میں جگہ جگہ لاشیں پڑی تھیں۔ حویلی کے پھاٹک کے باہر لاشوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہیں اسے جمال الدین کی لاش نظر آ گئی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر چند لمحے وہ اُس کے چہرے کو دیکھتی رہی' جس پر ابدی سکون تھا۔ ''رب راکھا۔ اللہ تمہیں اپنے بہت قریب جگہ عطا فرمائے۔'' اُس نے زیرِ لب کہا اور آگے بڑھ گئی۔

پھاٹک سے گزر کر وہ احاطے میں داخل ہوئی۔ احاطہ لاشوں سے اس طرح پٹا ہوا تھا کہ آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ اُس کا دل گھبرانے لگا۔ اتنا خون' اتنی لاشیں اُس نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ لیکن کچھ فاصلے پر اُس کی نظر ایک جانی پہچانی قمیص پر پڑی۔ وہ گرتی پڑتی اُس کی طرف بڑھی۔ وہ وصال دین تھا۔ اُس کے سینے میں بہت بڑا گھاؤ تھا۔ خون جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔ لیکن چہرے پر نور اور سکون تھا۔ حمیدہ نے اُس کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا' پھر جھک کر اُس کی پیشانی چوم لی۔ ''اللہ تمہیں قبول فرمائے پتر۔'' وہ اٹھی اور پلٹ کر دیکھے بغیر پھاٹک کی طرف چل دی۔ اور آگے جانے کی اُس میں ہمت نہیں تھی۔ ویسے بھی وہاں لاشوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

وہ واپس اپنے دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ لیکن اب اُس کا یقین متزلزل ہو چکا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی' کون جانے چھوٹا ٹھاکر بھی......؟ اب اپنے دل کی بات پر بھی اسے یقین نہیں رہا تھا۔ وہ تو بس ایک موہوم آس کی ڈور تھامے کھڑی تھی۔

پھر ایک دم ہوا جیسے بند ہو گئی اور فضا پہ ایک گہرا' غیر فطری سا سکوت طاری ہو گیا۔ سکوت تو پہلے بھی تھا لیکن یہ سکوت تو ایسا تھا کہ اسے اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اُس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا' جو گہرا سرخ ہو رہا تھا۔ لال آندھی! اُس کے اندر سے کوئی سہمی ہوئی آواز ابھری۔ اب سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ کچھ بھی نہیں بچے گا!

مگر وہ چھوٹے ٹھاکر کا انتظار کرنے پر مجبور تھی۔ وہ پوٹلی ہاتھ میں لئے دروازے پر کھڑی رہی۔ وہ انتظار امید سے ایسا محروم تھا کہ جب اُس نے چھوٹے ٹھاکر کو آتے دیکھا تو لگا کہ وہ اُس کا فریبِ نظر ہے۔

مگر جب وہ آ کر اُس سے لپٹا تو ثابت ہو گیا کہ وہ حقیقت ہے۔

حمیدہ جانتی تھی کہ وقت بہت کم ہے۔ اوتار سنگھ ضد کر رہا تھا کہ اسے ساتھ لے کر جائے گا۔ زندگی میں پہلی بار حمیدہ نے ماں بن کر اسے حکم دیا اور اسے جانے پر مجبور کر دیا۔ شاید وہ دن تھا' جب اُس کی پچھلی زندگی ختم ہو گئی۔ کیونکہ اس آندھی میں اُس کا بچ جانا بس معجزہ ہی تھا۔ اور صرف

بچ جانا ہی نہیں، جس طرح رب نے اُس کے زندہ رہنے کا اہتمام فرمایا' وہ بھی معجزہ تھا۔ اب اُس نے سوچا تو اسے لگا کہ جیسے وہ برزخ کی زندگی تھی۔ وہ اکیلی' اندھی عورت اس مقام پر جہاں کئی گاؤں ریت کے نیچے دب کر فنا ہو گئے' اس کے لئے سر چھپانے کا ٹھکانہ ایک جھونپڑی' رزق کا سامان کھجور کا درخت اور پیاس کے لئے نہ ختم ہونے والا پانی! بے شک اللہ اسے زندہ رکھنا چاہتا تھا' اور اس کا کوئی مقصد بھی تھا۔

پھر اُس کی زندگی چھوٹے ٹھاکر کی آمد سے شروع ہوئی۔ اور چھوٹا ٹھاکر عبدالحق بن کر آیا تھا۔ اُس نے سمجھ لیا کہ اللہ نے اسے عبدالحق کیلئے ہی زندہ رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے اپنے بیٹے وصال دین کی یاد بھی نہیں آتی تھی۔ وہ زندگی تو اُس کی ختم ہو چکی تھی۔

جو عرصہ اُس نے تنہائی میں گزارا تھا' اُس کے بارے میں اسے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ اسے تو یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ کس وقت دن ہے اور کس وقت رات۔ عرصے کا شمار وہ کیا کرتی۔ اسے تو لگتا تھا کہ دسیوں برس گزر گئے اور اس عرصے میں وہ ہر سوچ سے مبرا رہی تھی۔ بس وہ تھی' اندازے سے پڑھی جانے والی نماز اور یا اللہ کا ورد۔ شاید سوچتی تو وہ پاگل ہی ہو جاتی۔ ہاں' ایک یقین اُس کے اندر موجود تھا' اور وہ یہ کہ اُس کا چھوٹا ٹھاکر ضرور واپس آئے گا۔

اور وہ واپس آیا تھا۔ اور اُس کی ٹوٹی ہوئی زندگی کی ڈور پھر سے جڑ گئی تھی۔ اور اب تو اسے آنکھیں بھی مل گئی تھیں۔ کبھی کبھی تو اسے یہ سب اتنا غیر حقیقی لگتا تھا کہ وہ سوچتی تھی' کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ ایسے میں وہ اپنے بازو میں چٹکی بھرتی۔ منہ سے سسکی کی آواز نکلتی تو اسے یقین ہوتا کہ یہ خواب نہیں' حقیقت ہے۔

یہ سب کچھ سوچتے سوچتے وہ چونکی۔ اسے احساس ہوا...... اور پھر حیرت ہوئی۔ یہ سب کچھ اُس نے پہلی بار سوچا تھا' اس سے پہلے اُس نے زندگی کے ان غیر معمولی ادوار پر غور بھی نہیں کیا تھا۔ اب بھی شاید وہ سب کچھ اس لئے یاد آیا' تاکہ ایمان تازہ ہو جائے اور اُس کے اندر کے خوف اور وسوسے ڈھل جائیں۔

اور خوف اور وسوسے واقعی ڈھل گئے تھے۔ اب اُس کے اندر ایک خوشی تھی...... اور بے پایاں طمانیت!

وہ نور بانو کے بارے میں سوچنے لگی۔ نجانے کیسے' مگر اسے شروع ہی میں احساس ہو گیا تھا کہ عبدالحق اور یہ لڑکی ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں۔ اُس نے بھی بغیر دیکھے ہی اس لڑکی کو عبدالحق کے لئے پسند کر لیا تھا۔ پھر جب اُس کی آنکھوں کی بینائی واپس آنی شروع ہوئی تو اس نے چپکے چپکے اسے جانچنا شروع کیا۔ نور بانو کو تو نہیں معلوم تھا کہ اس کی بینائی کس حد تک بحال ہو چکی ہے۔ سو وہ اس کے سامنے عبدالحق کا تذکرہ کرتی اور اس کا ردِعمل دیکھتی۔ اسے اعتراف کرنا پڑا کہ

لڑکی کے پاس وہ گہرائی ہے' جو باکردار لوگوں میں ہوتی ہے۔ اس کے باوجود محبت تو چھپائے نہیں چھپتی لیکن یہ طے تھا کہ وہ لڑکی اظہارِ محبت کی قائل نہیں ہے۔

البتہ عبدالحق کا معاملہ اُس کی گہرائی کے باوجود کھلا تھا۔ وہ یقیناً نور بانو سے محبت کرتا تھا۔ لیکن اُس نے اسے ایسا بلند مقام' ایسا مرتبہ دے رکھا تھا کہ وہ اس کے لئے عزت اور احترام سے بڑھ کر کچھ سوچتا ہی نہیں تھا۔ حمیدہ نے جب پوری طرح نور بانو کو دیکھا تو وہ قائل ہو گئی کہ نور بانو اس رویے کی حق دار ہے۔ اتنی پاکیزہ اور اتنی نیک لڑکی اُس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے بعد تو اس کی یہ خواہش اور شدید ہو گئی کہ عبدالحق کی شادی اس سے ہو۔

حمیدہ نے سمجھ لیا کہ وہ دونوں اپنی اپنی محبت میں مدہوش اور دوسرے کی محبت سے بے خبر ہیں۔ عبدالحق سے تو اُس نے جب بھی بات کی' اُس نے یہی کہا کہ اماں' ایسا سوچنا بھی مت۔ منجھلی بی بی ہمارے پاس مہمان ہیں...... امانت ہیں۔ اور منجھلی بی بی کہتے ہوئے اُس کے لہجے میں کیسا احترام ہوتا تھا۔

مگر عبدالحق کے لاہور جانے پر بات پوری طرح کھل گئی۔ نور بانو کو جب اُس نے بتایا کہ عبدالحق اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے اس کے چچا کی تلاش میں لاہور گیا ہے تو اس کا خوف بالکل واضح تھا۔ اور حمیدہ نے اس خوف کو پوری طرح سمجھ لیا۔ کیونکہ وہ ہر زاویے سے اُس کے خوف سے مماثل تھا۔ نور بانو کو ڈر تھا کہ عبدالحق نے جو کہا ہے' وہی کرے گا۔ جب تک وہ اس کے چچا کو ڈھونڈ نہیں لیتا۔ واپس نہیں آئے گا۔ یعنی واپس آئے گا تو جدائی کی خبر لائے گا۔ نور بانو کو اُس کے چچا کے سپرد کر دے گا۔ یہ تو آگے کنواں پیچھے کھائی والا معاملہ تھا۔

اب سے کچھ دیر پہلے حمیدہ بھی اسی بات سے ڈر رہی تھی۔ مگر اب اسے خیال آیا کہ نور بانو کے چچا کا مل جانا ہی بہتر ہے۔ یہ تو بڑی آسان سی بات ہے۔ نور بانو کو اُسی کے چچا کے سپرد کر دینے کے بعد ان سے عبدالحق کے لئے نور بانو کا ہاتھ بھی تو مانگا جا سکتا ہے۔

اس خیال نے حمیدہ کو یک سو اور پوری طرح سے مطمئن کر دیا۔ اب تو اُس کی یہی دعا تھی کہ عبدالحق کو جلد از جلد نور بانو کے چچا مل جائیں اور یہاں ایک کام اور کرنا تھا۔ اسے نور بانو سے کھل کر بات کرنی تھی۔ لیکن یہ مرحلہ بہت نازک اور دشوار تھا۔ حمیدہ سمجھ گئی تھی کہ نور بانو ایسی لڑکی ہے جو اپنی محبت کو خود سے بھی چھپا کر رکھتی ہے۔

اُس کے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ اسے نور بانو کو بچھڑنے کے خوف میں مبتلا کرنا تھا۔

❊ ❊ ❊

نور بانو کے دل پر بہت بوجھ تھا۔ وہ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ اماں نے سچ کہا تھا۔ کسی اَن دیکھے آدمی کو صرف اس کے نام کے حوالے سے تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔ مشکل نہیں'

ناممکن۔ اگر اسے عبدالحق کے مزاج کا پتا نہ ہوتا تو یہ بات اُس کے لئے بہت خوش کن ہوتی کہ نہ عبد
الحق اُس کے چچا جان تک پہنچ سکے گا اور نہ ہی اس سے جدائی کی نوبت آئے گی۔ لیکن جب عبدالحق
کی کہی ہوئی آخری بات اس کی سماعت میں گونجتی تو خون اس کی رگوں میں جیسے جمنے لگتا۔ عبدالحق
نے کہا تھا...... اب میں آپ کا کام کر کے ہی واپس آؤں گا۔ اور وہ جانتی تھی کہ عبدالحق وعدے کا پکا
ہے۔

نور بانو بہت بدل گئی تھی۔ اسے تو بدلنا ہی تھا۔ کوئی کسی سے اتنی گہری محبت کرے اور برسوں
اس محبت سے لڑتا رہے، اسے دبانے کی کوشش کرتا رہے اور محبت میں کوئی کمی تک نہ ہو، تو ایسا آدمی
جب خود کو اس محبت کے سپرد کر دے تو وہ تو مکمل سپردگی ہوتی ہے۔ ساری مزاحمت اور مدافعت تو
اُس کی ختم ہو چکی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اُس نے خود کو اس بے حد مختلف معاشرت میں ایسے ڈھال لیا
تھا کہ وہ پرانی نور بانو نہیں رہی تھی۔ اور یہ سب کچھ اُس نے دل سے قبول کیا تھا۔ اب وہ یہاں
سے جانا ہی نہیں چاہتی تھی...... عبدالحق سے دور ہونے کا تصور بھی اسے گوارا نہیں تھا۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ اُس کا دل کسی کام میں نہیں لگتا تھا۔ ہر وقت دھیان اُڑا اُڑا رہتا
تھا۔ نہ بھوک نہ پیاس۔ بس ایک کام اسے بہت عزیز تھا...... سویٹر بننا۔ وہ مضطرب ہوتی تو اس کا
سارا اضطراب جیسے ہاتھوں کی انگلیوں میں کھنچ آتا۔ سلائیاں اس کے ہاتھوں میں بہت تیزی سے
گردش کرنے لگتیں۔ یہ کام وہ دیوانہ وار کرتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پانچوں سویٹر مکمل ہو گئے۔ سردی بھی
شباب پر تھی۔ اُس نے اماں، زبیر بھائی اور رابعہ آپا کے سویٹر انہیں دے دیے۔ وہ تینوں بہت خوش
ہوئے۔ اماں نے تو اسے ڈھیر ساری دعائیں دیتے ہوئے کہا تھا...... ''کیسا نرم اور گرم ہے یہ۔''

اپنا اور عبدالحق کا سویٹر اس نے ٹرنک میں چھپا دیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں سویٹر ایک ہی رنگ
اور ایک ہی ڈیزائن کے تھے۔ یہ کام غیر ارادی طور پر ہوا تھا۔ اور جب اسے احساس ہوا تو وہ حیا
سے دہری ہو گئی۔ ''انہیں تو سویٹر دے دوں گی۔'' اُس نے دونوں سویٹروں کو سامنے رکھ کر غور سے
دیکھتے ہوئے زیرِ لب خود سے کہا۔ ''لیکن میں یہ سویٹر کیسے پہنوں گی۔ سب لوگ کیا سمجھیں
گے...... کیا کہیں گے۔''

سویٹر بننے کے دوران اسے خوش قسمتی سے ایک اور مصروفیت مل گئی۔ اور وہ تھا مینو۔ مینو جو
عبدالحق کی چادر کی وجہ سے اُس کا بن گیا تھا۔ مینو نے اسے پوری طرح اپنا لیا تھا اور اسے وہی مقام
دے دیا تھا، جو عبدالحق کا تھا۔ یہ اُس کے لئے بہت بڑی خوشی تھی۔ اب تو مینو پورے دن اُس کے
ساتھ لگا رہتا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ مینو نہ ہوتا تو اسے کچھ ہو جاتا۔ بے زبان مینو کی شکل میں اسے ایک راز داں
میسر آ گیا تھا...... ایسا راز داں جو راز کو کبھی افشا نہیں کرتا۔ وہ دل پر بوجھ محسوس کرتی تو شیڈ میں چلی

جاتی اور اسے اپنی گود میں بھر کر اُس سے دل کی ہر بات سرگوشی میں کہہ دیتی۔ اور بات کرتے
ہوئے وہ چوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتی رہتی کہ وہاں کوئی موجود تو نہیں ہے۔ کوئی اُس کی باتیں
سن تو نہیں رہا ہے۔ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کیا کچھ کہتی رہی ہے۔ اُس سے باتیں کرتے
ہوئے وہ از خود رفتگی کی کیفیت میں ہوتی تھی۔ بس اتنا خیال ضرور رہتا تھا کہ کوئی اُس کی باتیں
سن نہ لے۔

''مینو، تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ جب میں نے پہلی بار انہیں دیکھا تو مجھے کیسا لگا۔'' وہ کہتی۔
''میں انہیں دیکھتی رہ گئی اور سینے سے دل جیسے اُڑ کر نکل گیا۔ تم نے تو دیکھا ہے انہیں۔ کوئی شہزادہ
بھی کیا ہو گا ان کے سامنے۔ تو اسی لمحے مجھے کچھ ہو گیا، اور میری سمجھ میں آ گیا کہ اب میں کبھی بھی
پہلے جیسی نہیں ہو سکوں گی۔ یہ محبت کبھی میرے دل سے نہیں نکلے گی۔''

مینو سر جھٹک کر ہلکی سی مَیں مَیں کرتا، جیسے کہہ رہا ہو۔ ہاں، میں سمجھتا ہوں۔

''مگر وہ پہلی محبت ساتھ ہی مجھے نفرت بھی دے گئی۔ اُس سے پہلے نہ میں محبت سے واقف
تھی نہ نفرت سے۔ اور بدقسمتی کہو یا میرے اندر کی خرابی، میری نفرت محبت سے زیادہ شدید تھی۔
اے مینو...... بدتمیز، تم میری بات دھیان سے نہیں سن رہے ہو۔''

ایک لمبی سی مَیں، جیسے مینو پوچھ رہا ہو، یہ کیسے کہہ سکتی ہو تم؟

''اب کہ تم نے پوچھا ہی نہیں کہ محبت کے ساتھ نفرت کیسے ہو گئی اور پھر نفرت محبت سے کیسے
بڑھ گئی، خیر میں تمہیں سمجھاتی ہوں، دیکھو نا، محبت کی اس پہلی نظر کے ساتھ ہی مجھے یہ احساس ہو گیا
کہ وہ تو ہندو ہیں...... مشرک اور کافر اور ایک مسلمان لڑکی کے لئے کسی ہندو سے محبت کرنا بالکل
ناجائز ہے۔ اوہو...... مَیں مَیں مت کرو۔ میں سمجھ رہی ہوں تمہاری بات۔ بھئی تم کیسے سمجھ سکتے
ہو۔ تم تو مینڈھے ہو...... جانور ہو۔ تمہارے ہاں یہ جھنجٹ کہاں ہوتے ہیں۔ تم نہ ہندو ہو نہ
مسلمان۔ یہ تو ہمارا مسئلہ ہے۔ تو جیسے ہی مجھے محبت ہوئی، وہ نفرت میں بدل بھی گئی۔ اس کے بعد
سے کوئی لمحہ اس محبت کے بغیر نہیں گزرا مگر ہر روز میں اُس پر نفرت کی ایک تہ چڑھا لیتی تھی۔ ہوتے
ہوتے یہ ہوا کہ نفرت ہی نفرت رہ گئی اور اصل چیز محبت کہیں بہت نیچے رہ گئی۔ اور میں اس محبت کے
بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ میں بس تمہارے مالک سے اندھی نفرت کرتی رہی۔''

مینو سے اس طرح باتیں کرتے کرتے نور بانو اچانک سوچنے لگتی، یاد کرنے لگتی۔ بہت سی
باتیں تھیں، جو وہ پہلے سمجھ نہیں سکتی تھی۔ وہ اب غور کرنے پر سمجھ میں آتی تھیں۔ بہت سی باتیں،
جنہیں اُس نے یادداشت کے نچلے تہ خانے میں بند کر دیا تھا۔ وہ نہ انہیں یاد کرنا چاہتی تھی، نہ تصور
میں انہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر محبت شاید ایسی طاقت ور چیز ہے، جو آدمی کو طاقت ور اور جرأت مند بنا
دیتی ہے۔ اب وہ سب کچھ دیکھ اور سمجھ سکتی تھی اور وہ سب کچھ دیکھنا اور سمجھنا چاہتی تھی۔

نور بانو ابھی تک اپنے ماضی کے حصار سے نہیں نکل سکی تھی۔ وہ حال میں جی رہی تھی، مگر سانس ماضی میں لیتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اُس نے ماضی کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کبھی نہیں دیکھا تھا، آدمی جب تک حقائق کو پوری طرح قبول نہ کرے، ماضی میں ہی کھڑا رہتا ہے۔ لیکن بعض اوقات ماضی ایسا ہوتا ہے کہ اُس سے آنکھیں چرانی پڑتی ہیں۔

''اور مینو، جانتے ہو آگے کیا ہوا۔'' اُس نے مینو کا کان پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ایک دن مجھے صاف صاف پتا چل گیا کہ میری باجی بھی ان سے محبت کرتی ہیں۔ اوہو...... باجی کے متعلق تو میں نے تمہیں بتایا ہی نہیں۔ حور بانو نام تھا میری باجی کا۔ ایسا اسمِ با مسمّٰی تو میں نے کسی کو دیکھا ہی نہیں۔ وہ تو سچ مچ جنت کی حور تھیں...... اور بہت سچی، بہت کھری۔ وہ میری طرح نہیں تھیں۔ انہیں چھوٹے ٹھاکر سے محبت ہوئی تو وہ اس محبت میں، اُس کے بہاؤ پر بہنے لگیں۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ ایک ہندو سے محبت کر رہی ہیں۔ میں ان سے چڑنے لگی۔ مگر اب میری سمجھ میں آتا ہے کہ اصل وجہ رقابت تھی۔ مل تو وہ ہم میں سے کسی کو بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کا تو امکان ہی نہیں تھا۔ مگر باجی یہ سوچے سمجھے بغیر اس محبت کی لذت میں گم تھیں۔ جبکہ میں نے اسے انگاروں کا راستہ بنا لیا تھا۔ وجہ بتاؤں؟''

مینو سر اٹھا کر اسے دیکھتا رہا۔

''باجی اور گلنار جس قدر خوب صورت تھیں، میں اتنی ہی بدصورت تھی۔ اکثر میں بڑے وثوق سے سوچا کرتی کہ میں امی کی سگی بیٹی ہو ہی نہیں سکتی۔ ضرور امی مجھے کہیں سے اٹھا لائی ہیں۔ اب میں وہ سب کچھ سمجھ سکتی ہوں۔ کم عمری کی محبت میں کوئی ممکن اور ناممکن نہیں دیکھتا۔ وہ تو بس تصورات میں گم رہتا ہے۔ موقع ملتا تو میں بھی ایسی ہی محبت کرتی۔ فطری بات تو یہ تھی کہ میں تصور میں دیکھتی کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں لیکن جب مجھے چھوٹے ٹھاکر کے لئے باجی کی محبت کا پتا چلا تو سب کچھ بدل گیا۔ میں نے جان لیا کہ میں ہار گئی۔ میں تو خواب و خیال میں، تصور میں بھی باجی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ تو پھر میں نفرت کے سوا کیا کرتی۔ میں کوئی امکان نہیں تراش سکتی تھی۔ کسی تصورِ امکان میں مَیں ان کے سامنے کھڑی ہوتی تو باجی آ جاتیں، اور میں کسی واہمے کی طرح ہوا میں تحلیل ہو جاتی۔ جانتے ہو مینو، یہ باتیں میں نے کبھی خود سے بھی نہیں کہیں جو تم سے کہہ رہی ہوں۔ تم بہت اچھے ہو مینو۔'' اور وہ مینو کو لپٹا لیتی۔

مینو کے ساتھ تحلیلِ نفسی کے اس سیشن میں اسے اچانک احساس ہوا کہ اس کے لئے ایک بات کی بڑی اہمیت ہے، جس کو شاید وہ کبھی نہیں جان سکے گی۔ وہ بات بھی کہیں اُس کے لاشعور میں دبی ہوئی تھی، اور اب اچانک ابھر آئی تھی۔

چھوٹے ٹھاکر نے...... آج کے عبدالحق نے باجی کو کبھی دیکھا تھا یا نہیں؟

اس کا حتمی جواب تو صرف عبدالحق دے سکتا تھا، اور اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ کبھی اُس سے یہ بات پوچھ سکے گی۔ البتہ اس کا جواب بڑے ٹھاکر کی ڈائری دیتی تھی۔ اس میں بڑے ٹھاکر نے حیرت ظاہر کی تھی کہ اس کے بیٹے کو یہ کیسی محبت ہے کہ وہ اس لڑکی کو دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ صرف اس کی آواز سننے کے لئے تڑپتا ہے۔ دوسری طرف وہ خود بھی گواہ تھی۔ اُس نے بارہا جالیوں کے پیچھے عبدالحق کو مضطربانہ انداز میں ٹہلتے دیکھا تھا۔ اُس کا رخ کسی طرف بھی نہیں ہوتا تھا۔ اُس کی نگاہوں میں خالی پن ہوتا تھا نہ کہ کوئی تلاش۔ اور یہ اس بات کی دلیل تھی کہ اُس نے باجی کو کبھی نہیں دیکھا۔ دیکھا ہوتا تو بار بار دیکھنا چاہتا۔ اُس کی نظریں ان کی جستجو میں بھٹکتی ہی رہتیں۔ وہ تھیں ہی ایسی۔

پھر اسے ایک اور بات یاد آئی۔ امی نے اُس سے کہا تھا کہ وہ جب اور جس وقت چاہے، نیچے آ سکتا ہے...... اپنے گھر کی طرح۔ اس بات پر اُس نے بہت ہنگامہ کیا تھا...... شاید اس لئے کہ وہ دوسری نظر کے قابل بھی نہیں تھی اور باجی کی جیت یقینی تھی۔ بہر حال چھوٹا ٹھاکر کبھی نیچے نہیں آیا۔ اس سے بھی ثابت ہوتا تھا کہ وہ کسی کو دیکھنے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ باجی کو دیکھ لیا ہوتا تو وہ سر کے بل نیچے آتا اور بار بار آتا۔

اس کے باوجود نور بانو یہ تو دعوے سے کہہ سکتی تھی کہ عبدالحق کی محبت کی ابتدا آواز سے ہوئی تھی...... باجی کے قرآن پڑھنے کی آواز سے۔ اُس نے اگر انہیں دیکھا بھی ہوگا تو بہت بعد میں۔ اور اس دیکھنے کی بھی حتمی تصدیق ممکن نہیں ہے۔

یہاں ایک اور سوال نے سر اٹھایا۔ بہت اہم اور چبھتا ہوا سوال یہ تھا کہ کیا عبدالحق کو واقعی باجی سے محبت تھی۔ اس بات کے حق میں صرف ایک دلیل تھی...... بڑے ٹھاکر کی ڈائری۔ بڑے ٹھاکر نے اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ اُس کے بیٹے کو نیچے رہنے والی کسی مسلمان لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔ لیکن وہ ڈائری ہی ثابت کرتی تھی کہ بڑا ٹھاکر ذہنی طور پر غیر جانب دار نہیں تھا۔ ماضی میں ہونے والے غیر معمولی واقعات کی روشنی میں وہ پہلے ہی یہ فیصلہ کیے بیٹھا تھا کہ اس کا بیٹا کسی مسلمان لڑکی سے شادی کرے گا۔ اور وہ اس پر کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔

اور اس بات کے خلاف بہت زوردار دلیل موجود تھی کہ عبدالحق کو باجی سے محبت تھی۔ محبت کرنے والے تو اپنے محبوب کی موت کے غم میں زندگی کی رغبت اور محبت سے محروم ہو جاتے ہیں، پاگل دیوانے ہو جاتے ہیں، مر جاتے ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر کو بس یہ ملال تھا، پچھتاوا تھا کہ اس واقعے کے وقت وہ وہاں موجود نہیں تھا، کچھ کر نہیں سکا۔ اسے دل چیر دینے والا کوئی غم نہیں تھا۔ بلکہ اُس رات اُس کی سورۃ الملک کی تلاوت سن کر وہ جس از خود رفتگی کی کیفیت میں اوپر آیا تھا، اس سے تو یہ ثابت ہوتا تھا کہ اسے محبت آواز سے بھی نہیں تھی، بلکہ کلامِ الٰہی سے تھی۔ وہ سامنے تھی، مگر وہ اپنے

نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سن رہا تھا، مگر اُس کی سماعت کا مرکز و محور اُس کی آواز نہیں تھی، اللہ کا کلام تھا اور کیسی کیفیت میں اُس نے کلمہ پڑھا تھا۔ اس میں کسی لڑکی کے عشق کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا تھا۔

اُس کے دل کو اطمینان سا ہوا۔ یہ تو طے تھا کہ باجی ٹھاکر اوتار سنگھ سے محبت کرتی تھی۔ مگر اس بات کے شواہد نہیں ملتے تھے کہ وہ بھی باجی سے محبت کرتا تھا۔ اور یہ اس بات کی دلیل تھی کہ اُس نے باجی کو نہیں دیکھا تھا۔ دیکھا ہوتا تو وہ ان سے محبت کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اور پھر باجی اللہ میاں کے ہاں چلی گئیں......

اچانک نور بانو کی آنکھوں کے سامنے ایک منظر آ گیا...... دل خراش، روح فرسا منظر۔ وہ منظر، وہ صورتِ حال وہ زندگی میں کبھی یاد کرنا، دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ منظر جس لمحے اُس نے دیکھا تھا، اسی لمحے اسے بھلا دیا تھا۔ اُس نے ایک گہری سسکی لی اور دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے لیکن وہ منظر محو نہیں ہوا۔ وہ تو جیسے اُس کی نگاہ کے کینوس پر چپک گیا تھا۔ دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے رکھے اُس نے کئی بار سر جھٹکا لیکن وہ منظر نہیں ہٹا۔

نور بانو کا جسم سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ منہ سے ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس وقت وہ دہلی میں اپنے گھر میں تھی اور اس خوف اور دہشت کو دوبارہ جی رہی تھی، جس سے وہ اُس رات دوچار ہوئی تھی۔ وہ اس منظر سے نہیں بچ سکتی تھی، جو آنکھیں بند کرنے پر بھی اسے صاف نظر آ رہا تھا۔

جس وقت کا وہ منظر تھا، اس وقت وہ اپنی زندگی کے سب سے خوف ناک بحران سے دوچار تھی۔ ایسے میں آدمی کسی بھی چیز کی اہمیت کو پوری طرح نہیں سمجھ پاتا۔ لیکن اُسے یاد تھا کہ وہ لرزہ خیز منظر تھا۔ شاید اس کے اندر اللہ کے قائم کردہ مدافعتی نظام کا کمال تھا کہ اس دن کے بعد اُس کی نگاہوں میں وہ منظر کبھی نہیں لہرایا۔ اُس نے کبھی سوچا بھی تو بس اتنا کہ اس دن اُس کے گھر والوں پر کیا قیامت گزری۔ اور صرف اتنا سوچنے پر سوچوں کا وہ سلسلہ منقطع ہو جاتا تھا...... خود بہ خود۔ تصور تک پہنچنے کی تو نوبت ہی نہیں آتی تھی۔

ایک بار حقیقت میں وہ منظر دیکھنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ منظر اسے یاد آیا۔ اور اگلے ہی لمحے اس کی طبیعت بگڑنے لگی۔ اس کے جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا اور وہ جیسے بے جان ہو گیا۔ قریب تھا کہ وہ ڈھے جاتی۔ مگر اس لمحے وہ خیال اُس کے جسم میں کرنٹ کی طرح دوڑ گیا۔ اسے ایک جھٹکا لگا اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

کیا اس روز عبدالحق نے باجی کو دیکھا تھا؟ یہ ایک سوال اُس کے ذہن میں اس چڑیا کی طرح چکرا رہا تھا، جو ایک بند کمرے میں آ پھنسی ہو اور اسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا ہو۔

وہ اُس کی زندگی کے لئے بہت خطرناک وقت تھا۔ وہ متضاد کیفیات سے دوچار تھی اور اصل

مسئلے کو بھول گئی تھی، جو اسے یہاں تک لے آیا تھا۔ یہ خیال بھی اُس کے لئے روح فرسا تھا کہ اُس وقت کے اوتار سنگھ اور حال کے عبدالحق نے امی اور اُس کی بہنوں کو اس حال میں دیکھا ہوگا، جو اُس نے دیکھا تھا...... جسموں پر کھرونچے، لہولہان، درندگی کے نشان لئے، ایسے کہ جسموں پر لباس کے نام پر ایک تار بھی نہ ہو۔ اسے یہ سوچتے ہوئے بھی حیا آ رہی تھی اور ساتھ ہی جھنجھلاہٹ بھی تھی اور عبدالحق پر غصہ بھی۔ کیوں دیکھا اُس نے انہیں ایسے؟ اس حال میں؟ ذہن میں دبی دبی کچھ آوازیں بھی تھیں...... ضروری تو نہیں کہ دیکھا ہو۔ اور اس صورتِ حال میں اور نجانے کس کس نے دیکھا ہوگا۔ مگر اس کے اندر جو وحشت امنڈ رہی تھی، کسی طغیانی کی طرح بڑھ رہی تھی، اُس کے سامنے ان آوازوں کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اسے موہوم سا احساس ہو رہا تھا کہ یہ وحشت اسی طرح بڑھتی رہی تو اسے کچھ ہو جائے گا۔ وہ پھٹ جائے گی...... ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گی۔

ایسے میں مینو نے اسے بچا لیا!

دہشت کے اس عالم میں تشنجی کیفیت میں گود میں لیٹے ہوئے مینو کو اُس نے بھینچا تو وہ گھبرا کر اٹھ گیا اور فریاد کرنے والے انداز میں مَیں مَیں کرنے لگا۔ اُس کی آواز نور بانو کو ہوش کی دنیا میں کھینچ لائی۔

اس منظر سے، اس خیال سے، اس تصور سے پیچھا چھڑانا تو اب اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ تحت الشعور کی تاریک کوٹھری کا دروازہ کھل گیا تھا، اور وہاں چھپی ہوئی بلائیں لاشعور کے نیم تاریک کمرے میں رکے بغیر شعور کے جگمگاتے ایوان میں چلی آئی تھیں۔ اب ان سے نظریں چرانا، صرفِ نظر کرنا ناممکن تھا۔

آدمی اللہ کی رحمتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اللہ نے کیسے کیسے اہتمام کیے ہیں آدمی کی بہتری کے لئے۔ جب وہ کچھ ایسا دیکھتا یا جھیلتا ہے، جو اُس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو، مار دینے والا ہو تو وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ کبھی اُس کی یادداشت جزوی طور پر معطل ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس واقعے سے بے خبر اور یوں محفوظ ہو جاتا ہے۔

اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ وہ کسی پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ تو اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی پر کوئی افتاد پڑنے والی ہو تو اللہ اُس سے پہلے ہی اس کے اندر ظرف، برداشت اور سکت بڑھا دیتا ہے۔ ورنہ تو آدمی صدمے سے مر جائے۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی وقتی طور پر اس افتاد کو بھول جاتا ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ ہر پریشانی کی اپنے لمحے پر بڑی اہمیت ہوتی ہے، جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بتدریج کم ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ کچھ وقت گزرنے پر وہ غیر اہم ہو جاتی ہے۔

آدمی صرف اپنے وجود، اپنے جسم کو سمجھ لے تو اللہ کی رحمت پر شکرگزاری سے شل ہو جائے۔

جسم کے اندر ایسا مکمل نظام قائم ہے' جسے طبی سائنس بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتی۔ ورنہ صرف ایک مکمل نظام کار ہے۔ بلکہ اُس میں ہر موقع اور ہر صورت حال کے لئے مدافعتی نظام بھی موجود ہے' جو خود کار انداز میں کام کرتا ہے۔ جیسے ناقابلِ برداشت صدمے سے دوچار ہونے پر آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے' اور ہوش میں آنے پر بعض اوقات اسے یاد بھی نہیں ہوتا کہ ہوا کیا تھا۔

درحقیقت آدمی بھولتا کچھ نہیں ہے۔ انسانی دماغ اللہ کی وہ عظیم تخلیق ہے' جسے نہ تو دماغ کے ڈاکٹر پوری طرح سمجھ سکیں گے' نہ ہی ماہرین نفسیات۔ یہ وہ مشین ہے جو پورے جسم پر نگراں ہے' بلکہ حکمراں ہے۔ تمام اعضا اسی کے تابع ہیں۔ وہ ضرورت پڑنے پر کسی بھی عضو کو معطل کر دیتا ہے' اور کسی بھی عضو کی کارکردگی کو بہت زیادہ بڑھا دینے کی قدرت بھی اسے حاصل ہے۔ دوسری طرف یہ صرف جسم کی کارکردگی پر حکمران نہیں ہے۔ بلکہ مختلف ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کو جمع کرنا' ان کا تجزیہ کرنا اور ترجیحی بنیاد پر ان کے لئے ردِعمل متعین کرنا بھی اسی کی ذمہ داری ہے۔

تو جہاں اللہ نے پورے جسم کے لئے ہر ہر عضو کے لیے دفاعی میکنزم تیار کیا ہے' وہاں دماغ جیسا اہم حکمراں کیسے محروم رہ جاتا۔ تو دماغ کے لئے بھی مکمل مدافعتی نظام موجود ہے۔ اور وہ خود کار انداز میں کام کرتا ہے۔ دماغ کے معلومات جمع کرنے اور تجزیہ کر کے نتائج اخذ کرنے والے حصے کو ہم شعور کہتے ہیں۔ وہ ایک بہت بڑے اور بہت روشن ہال کی طرح ہے' جہاں کچھ بھی نہیں چھپتا۔ وہاں ہونے والے تجزیوں اور اخذ ہونے والے نتائج آدمی کی فکری اور نظریاتی شخصیت کا تعین کرتے ہیں۔

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ...... اللہ قرآن میں فرماتا ہے' وہی نہ جانے' جس نے پیدا کیا ہے۔ بے شک وہ سب کچھ جانتا ہے' اس لئے اُس نے ہماری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہم بھلائی سے زیادہ برائی میں کشش اور خوب صورتی محسوس کرنے والے ہیں' ہم گناہ کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔ ہمارا نفس ہم پر ہمیشہ غالب رہے گا۔ چنانچہ ہمیں پوری طرح بے لگام ہونے سے بچانے کے لئے اس نے نفس کے ساتھ ہمیں ضمیر بھی عطا فرمایا...... ایک محتسب' جس کے پاس روکنے کی قوت تو نہیں' لیکن وہ ہمیں ٹوکتا رہتا ہے کہ کہاں ہم کیا غلط کر رہے ہیں۔ پھر ہمارا پیدا کرنے والا جانتا تھا کہ ہمارے لیے اپنے اچھے ہونے کی بڑی اہمیت ہے۔ جبکہ ہم ہمیشہ اچھے کم اور برے زیادہ ہوں گے۔ لیکن اس بات کی اہمیت بہت زیادہ ہے کہ ہم خود کو اچھا سمجھیں۔ جو خود کو برا سمجھنے لگے' وہ تو پھر بہت تیزی سے بدترین ہونے کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ آدمی خود کو اچھا سمجھے گا' تبھی تو اور اچھا ہونے کی خواہش کرے گا۔ تو اللہ نے اپنے بندوں کی یہ ضرورت پوری کرنے کے لئے بھی اہتمام فرمایا۔ اسے توبہ جیسی نعمت عطا فرمائی۔ شرک کے سوا ہر گناہ معاف کرنے کا وعدہ فرمایا۔ دل کی گہرائیوں سے اپنے گناہ پر نادم ہو اور اس عہد کے ساتھ اللہ سے توبہ کرو کہ اس

گناہ کا اعادہ نہیں کرو گے تو وہ تمہیں دھو کر پاک کر دے گا۔ اس گناہ کو تمہارے نامۂ اعمال سے مٹا دے گا اور تم ستر مرتبہ بھی وہ گناہ کر کے دل کی سچائی کے ساتھ توبہ کرو گے تو وہ بخش دے گا۔ سچائی شرط ہے' اور اللہ سے کچھ بھی چھپا نہیں ہے۔ تبھی تو مایوسی کو کفر قرار دیا ہے۔ گناہ سمندروں کے جھاگوں جتنے بھی ہوں تو اُس کی بے پایاں رحمت اور وسیع مغفرت کے سامنے بے حقیقت ہیں۔ توبہ کا دروازہ نہ کھلا ہوتا تو آدمی اپنے بے حد و بے حساب گناہوں کی وجہ سے مایوس ہوتا۔ مایوس ہوتا' اور بخشش کی امید نہ ہوتی تو سوائے اس کے کیا کرتا کہ نڈر ہو کر...... بلکہ خوف زدہ ہو کر پیٹ بھر کے گناہ کرتا کہ اب تو جہنم ہی مقدر ہے' اس دنیا میں جو جی چاہے' کر لو۔ اور اللہ کا انکار کر دو کہ اسی میں عافیت ہے۔ کفر اور کیا ہے؟ یہی تو ہے!

مگر یہ بچت تو ان کے لئے ہے' جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں' اُس سے رجوع کرنے والے ہیں۔ اللہ کی رحمت تو تمام عالموں کے لئے ہے۔ اُس نے تو انکار کرنے والوں کا بھی خیال رکھا۔ وہ جو نہ اللہ کو جانتے اور مانتے ہیں اور نہ انہیں توبہ کا پتہ ہے۔ ان کے لئے اس نے دماغ کے تین حصے کر دیے۔ اوپر جگمگاتا ہوا روشن ایوان' جسے شعور کہا جاتا ہے۔ اُس کے نیچے ایک نیم تاریک تہ خانہ' جو لاشعور کہلاتا ہے۔ اور اُس کے نیچے نہایت تنگ و تاریک کوٹھری' جسے تحت الشعور کہتے ہیں۔ انسان کچھ بھی کر لے' کتنی ہی آگہی حاصل کر لے' اس کوٹھری سے بے خبر ہی رہتا ہے۔ اللہ' جو علیمٌ بذات الصدور ہے' وہی جانتا ہے کہ کس کی کوٹھری میں کیا ہے۔ اپنے اعمال میں سے' رُونما ہونے والے واقعات میں سے' سنی جانے والی باتوں' نظر آنے والے مناظر میں سے' جو کچھ بھی آدمی کو ناپسند ہو' جس سے وہ نظریں چرانا چاہے' جسے وہ تجزیہ کر کے شعوری طور پر نہ سمجھنا چاہے' اس سب کو وہ روشن ایوان کے نیچے نیم تاریک تہ خانے میں دھکیل کر بھول جاتا ہے...... یا یوں نہیں کہ گمان کرتا ہے کہ بھول گیا۔

انسان کے لاشعور میں جو کچھ جاتا ہے' وہ دو طرح سے جاتا ہے۔ کبھی تو وہ خود کسی بات کو اس نہاں خانے میں دھکیل دیتا ہے۔ اور کبھی اللہ کے قائم کردہ خود کار نظام کے تحت ایسا ہوتا ہے۔ بہر کیف اس تہ خانے پر آدمی کا اپنا کوئی اختیار نہیں۔ وہ وہاں سے خود کچھ نکال نہیں سکتا۔ وقت آنے پر جب بھی ایسا ہوتا ہے تو وہ بھی قدرت کے خود کار نظام کے تحت ہوتا ہے۔ البتہ آدمی کے اپنے حیران کن اور ناقابلِ فہم اقوال و افعال کا محرک ہمیشہ اس کے لاشعور میں چھپی کوئی بات ہوتی ہے۔ اسی لئے تو وہ اس کے لئے حیران کن اور ناقابلِ فہم ہوتی ہے۔

تحت الشعور کی تاریک کوٹھری پر آدمی کا ذرا بھی اختیار نہیں۔ نہ وہ وہاں کچھ داخل کر سکتا ہے اور نہ ہی وہاں سے کچھ نکال سکتا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ تو اس کی موجودگی سے بھی بے خبر ہے۔ اس حجرۂ ہفت بلا کو تو بس ہمارا خالق جانتا ہے۔ اور اس کے لئے اُس نے خود کار نظام متعین کر دیا ہے۔

خود آدمی کو بھی علم ہے کہ وہ کتنا نازک ہے۔ تبھی تو میر نے کہا تھا......

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

......تو یہ دیکھیں کہ کوئی بہت بڑی یا بہت بری خبر کسی کو سنانی ہو تو اس کے محبت کرنے والے‘ اس کے خیر خواہ اس تک وہ خبر مرحلہ وار‘ کئی قسطوں میں پہنچاتے ہیں‘ ایک دم سے نہیں‘ اس ڈر سے کہ وہ سن کر اسے کچھ ہو نہ جائے...... پہلے اُس نے مُس کہا‘ پھر تق کہا‘ پھر بل کہا‘ کے مصداق۔ اور ان کا یہ عمل درحقیقت قدرت کی پیروی ہی ہے۔

تحت الشعور بلاؤں کا گھر ہے...... بڑی بلاؤں کا۔ وہ ایسی بلائیں ہوتی ہیں جن سے آدمی بے خبر ہوتا ہے۔ کسی بھی مصلحت یا ضرورت کے تحت قدرت جب آدمی کو اُس کی آگہی عطا کرنا چاہے تو وہ بھی یہ اہتمام کرتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ اس بات کو ایک دم تحت الشعور سے شعور میں منتقل کیا جائے۔ وجود کے پاتال کی اس کوٹھری کا آہنی دروازہ کھلتا ہے اور وہ بلا نکلتی ہے اور اُس کی منزل لاشعور کا تہہ خانہ ہوتا ہے۔ اور جب وہ لاشعور میں آ جائے تو آدمی کسمساتا ہے‘ اسے احساس ہوتا ہے کہ کوئی اہم بات ہے‘ جو اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ وہ ذہن پر زور دیتا رہتا ہے‘ اور یوں اس کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ پھر جب وہ شعور میں آ جائے‘ تب بھی وہ اسے فوری طور پر قبول نہیں کرتا۔ روشنی میں اُس کی چھان پھٹک کرتا ہے۔ یوں اس بات کی شدت بھی کم ہوتی ہے اور وہ اُس کے لئے بہتر طور پر تیار بھی ہو جاتا ہے۔ پھر ضروری نہیں کہ وہ بات براہِ راست اس کے شعور تک پہنچے۔ نفسیات بتاتی ہے کہ عام طور پر یہ عمل خوابوں کے ذریعے ہوتا ہے۔

نور بانو کا یہ عمل بھی مہینوں سے چل رہا تھا۔ کچھ تو ایسا تھا‘ جس سے وہ نظریں چراتی تھی‘ جو وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد یہ ہوا کہ اُس نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور اُس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی‘ جو اس سے بہت مختلف تھی‘ جسے وہ حقیقت سمجھتی تھی‘ اسے احساس ہوا کہ اس آگہی میں اُس کے لئے بہتری تھی۔ چناں چہ اُس کا حوصلہ بڑھا۔

مگر اس وقت جو کچھ اُس کے سامنے آیا‘ وہ بہت خوف ناک تھا۔ وہ منظر...... اسے دیکھنا تو دور کی بات‘ وہ اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی لیکن اب وہ اس سے بچ بھی نہیں سکتی۔ اب تو وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کتنی خود غرض ہے۔ اس کی اماں‘ بہنیں‘ چھمن بوا اور آپا پر جو گزری تھی‘ اللہ نے اسے اس سے بچا لیا تھا۔ اور وہ ان محبت کرنے والوں کی یادوں سے منہ موڑے بیٹھی تھی‘ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ چند لمحے ان لوگوں کی اذیت کو محسوس کرنے کی کوشش تو کرتی۔ مگر وہ اس سے ڈرتی تھی‘ اور اب بھی ڈرتی ہے۔ جبکہ وہ محض تصور میں اس اذیت کو محسوس کرے گی‘ جو ان لوگوں نے حقیقت میں اٹھائی تھی اور اس اذیت سے گزر کر موت کی سرحد میں چلے گئے تھے۔

یہ تو اُس نے پہلے بھی مان لیا تھا کہ وہ بہت خود غرض ہے مگر اس بار تو اُس نے سوچا کہ واقعی اُس نے حد کر دی۔ اُس نے اس موضوع پر کسی سے بات نہیں کی۔ چلو عبدالحق اور زبیر بھائی سے تو ممکن نہیں تھا لیکن وہ رابعہ آپا سے تو بات کر سکتی تھی۔ کیا ان جانے والوں کا اُس پر یہ حق نہیں تھا کہ وہ ان کے بارے میں بات کرتی‘ معلوم کرتی۔ اسے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کی تدفین کیسے ہوئی؟ وہ کہاں دفن ہوئے؟

وہ لرز کر رہ گئی۔ یہ تو خود غرضی کی آخری حد تھی کہ آج چھ ماہ سے زیادہ گزر جانے کے بعد بھی اسے اس منظر کا خیال آیا تو وہ بھی اس لئے کہ وہ رقابت کے زیر اثر یہ جاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ عبدالحق نے باجی کو کبھی دیکھا تھا یا نہیں۔ اور کتنی تن دہی سے وہ اس بات کو کھوج رہی تھی‘ جیسے اس کی بہت بڑی اہمیت ہو۔ حالانکہ اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کیا مری ہوئی مظلوم بہن اب بھی اُس کے لئے رقیب ہے۔

اس کی شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ اپنے چھپے ہوئے ماضی کے بارے میں رابعہ آپا سے تفصیل سنے گی...... کسی گھٹیا تجسس کی خاطر نہیں‘ بلکہ اپنے مظلوم شہید لوگوں کی محبت کا قرض اتارنے کے لئے!

اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں...... ان میں کچھ دکھ کے تھے اور کچھ شرمندگی کے!

❁ ❁ ❁

زبیر نے جب مالک کی تقلید میں اسلام قبول کیا تو اس کے خیال میں وہ محض نام کی تبدیلی تھی۔ پہلے وہ رگھو تھا‘ اب زبیر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک مصروفیت اتنی تھی کہ جو کچھ اُس نے دیکھا تھا‘ اس پر سوچنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ دہلی سے یہاں آنا‘ آباد ہونا‘ پھر ہندوستان سے مہاجروں کی آمد‘ حویلی کو برآمد کرانے کا مرحلہ اور اُس کے بعد ریت میں دبے ہوئے گیارہ گاؤں برآمد کرانا۔

مگر اب وہ سب کچھ ہو چکا تھا۔ گیارہ گاؤں برآمد ہو چکے تھے۔ پٹواری حسن دین آیا تو اور زمین کے کاغذات اسے دے گیا تھا۔

”صاحب تو شہر گئے ہیں۔“ زبیر نے اسے بتایا۔ بڑی مشکل سے اس نے مالک کو صاحب سے تبدیل کیا تھا۔

”مجھے معلوم ہے۔“ حسن دین نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ”اس موقع ہی سے تو فائدہ اٹھایا ہے میں نے۔“

”کیا مطلب؟“

”یہ گیارہ گاؤں ہیں نا‘ ان میں سے سات گاؤں کی مثل میں نے عبدالحق کے نام بنا دی

ہے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے اس سے' وہ آئیں گے تو یہ زمین تقسیم کر دیں گے۔"

حسن دین مسکرایا۔ "میں تمہارے اس صاحب کا مزاج سمجھ گیا ہوں۔ اس سلسلے میں مَیں نے گاؤں والوں سے بھی بات کی ہے اور انہیں سمجھایا ہے۔ اُس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ عبد الحق صاحب اپنے دل کی ہی کریں گے۔ مگر اُس کا بھی توڑ کر لیا ہے میں نے۔"

"وہ کیا؟"

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ گیارہ میں سے چار گاؤں کا میں نے کیا کیا؟"

"کسی دعوے دار کو دے دیے ہوں گے۔" زبیر نے بے پروائی سے کہا۔

"دعوے داروں کی تو پوچھو ہی مت۔ یہ گناہ گار آنکھیں کیا کچھ دیکھ چکی ہیں۔ بڑے بڑے کھیلے ہو رہے ہیں۔ جو وہاں غلامی کرتے تھے' وہ یہاں زمین دار اور آقا بن گئے ہیں' اور حق دار خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔ کوئی حقیقی دعوے دار ثبوت کے ساتھ آتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ کوئی جعلی کاغذات کی مدد سے پہلے ہی ہاتھ صاف کر چکا ہے۔ خیر...... دو چار گاؤں میں نے تمہارے نام کر دیے ہیں۔ یہ رہی ان کی مثل۔"

زبیر ہکا بکا رہ گیا۔ "لیکن میرا نہ کوئی دعویٰ ہے نہ حق۔ یہ تو زیادتی ہے حق داروں کے ساتھ۔"

"یہ سب کچھ مجھے مت پڑھاؤ۔" حسن دین نے ترشی سے کہا۔ "اس تھوڑے سے عرصے میں مَیں اتنا کچھ دیکھ اور سیکھ چکا ہوں' جو ساری عمر نہیں سیکھ سکا تھا۔ جو وہاں حویلیوں میں رہتے تھے' انہیں کیمپ میں کس مپرسی کی زندگی گزارتے دیکھ رہا ہوں۔"

"مگر یہ سب تم نے کیا کیسے؟"

"یہاں بہت ایمان دار اور دردمند اعلیٰ افسر بھی ہیں۔ جن سے میرا رابطہ ہے' میں نے ان کو عبدالحق کے بارے میں بتایا ہے۔ یوں کلیم آفس کے ایک بڑے افسر سے بات ہوئی اور کام ہو گیا۔ اپنے میدان میں میرے اپنے اختیارات بھی کم نہیں ہیں۔"

"لیکن میں کیوں؟ میرے پاس تو بس اپنا کچا گھر تھا اسی گاؤں میں۔ اور اب اُس سے اچھے گھر میں رہتا ہوں۔" زبیر نے کہا۔ "اور جانتے ہو' صاحب کو پتا چلے گا تو وہ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ کیا پتا' مجھے چھوڑ ہی دیں۔" یہ کہتے ہوئے اُس کی آواز لرزنے لگی۔

"اُنہیں بتانے کی غلطی بھی نہ کرنا۔" حسن دین نے جلدی سے کہا۔ "ورنہ یہ زمین بھی وہ تقسیم کر دیں گے۔ اصل میں تو یہ زمین انہی کے لیے ہے۔ دیکھو نا' ان کی شادی ہوگی' بچے ہوں گے۔ وہ خود تو دوسروں کی فکر کرتے رہیں گے اور ان کے بچے محروم رہ جائیں گے۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔" زبیر نے فکرمندی سے کہا۔ وہ خود بھی اسی انداز میں سوچتا تھا۔

"تو یہ زمین دراصل انہی کے لئے ہے۔ تمہارے پاس امانت رہے گی۔ آدھی بے شک تم اپنے لئے رکھ سکتے ہو۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" زبیر نے کہا۔ "مگر یہ تو بُری بات ہے کہ یہ زمین غیر آباد پڑی رہے۔"

"غیر آباد کیوں ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ ایک ماہ میں یہاں پانی آجائے گا۔ میں مناسب آدمی دیکھ کر یہ زمین کاشت کے لیے دے دوں گا۔ کاغذات تمہارے پاس' اور تمہارے نام ہیں۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ جو کچھ ملے' وہ آدھا تمہارا' اور آدھا اپنے صاحب کے لئے جمع کرتے رہنا۔"

"دل تو میرا بھی چاہتا ہے کاشت کاری کو۔"

"تو زمین تو تمہاری ہی ہے۔ جتنی چاہو' زیرِ کاشت لے آؤ۔"

"اور صاحب کو کیا جواب دوں گا؟"

حسن دین جیسے ہر بات سوچ سمجھ کر آیا تھا۔ "کہہ دینا کہ میں نے کسی سے زمین دلوائی ہے تمہیں۔" اُس نے جھٹ سے کہا۔

زبیر مطمئن ہو گیا۔ "اور یہ تو بتاؤ' میرے صاحب کا کیا حال ہے؟"

حسن دین ہنسنے لگا۔ "عیش کر رہے ہیں۔ پناہ گزینوں کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں' ان کے ساتھ سوتے ہیں اور کسی رضوان کو تلاش کرتے ہیں۔ فکر نہ کرو' کیمپ کے انچارج عرفان صاحب ان کا خیال رکھتے ہیں۔"

"صاحب واپس کب آئیں گے؟"

"اس کے بارے میں تو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

سونہری پانی کے آنے تک زبیر کے لئے فرصت ہی فرصت تھی۔ نیاز اور اس کے بھائی مویشیوں کے کام کو پوری طرح سمجھ چکے تھے' اور اس میں ان کا دل بھی لگ گیا تھا۔ زبیر کو اب ان کے ساتھ آگے آگے رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ چند روز آرام کرے گا اور پھر نیاز سے کہے گا کہ اب وہ اپنا کام خود سنبھالیں۔ اسے کاشت کاری کرنی ہے۔

یوں پہلی بار اسے سوچنے کا وقت ملا۔ اور سوچا تو اس پر حیرت کے دروازے کھلتے گئے۔ اُس نے تو یہ سوچ کر دھرم بدلا تھا کہ جو مالک کا دھرم' وہ اُس کا دھرم۔ مگر اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بہت زیادہ بدل گیا ہے۔ اور تبدیلی کا عمل اتنا سُست رفتار اور تدریجا تھا کہ اسے پتا ہی نہیں چلا۔

قرآن وہ اور رابعہ اب بھی پڑھتے تھے ابتدا میں تو وہ بہت مشکل؛ بلکہ ناممکن لگتا تھا۔ مگر پھر ان کی زبان حروف وصوت کو قبول کرنے لگی۔ ابھی ان کا تیسواں پارہ ختم نہیں ہوا تھا لیکن انہیں قرآن پڑھنا بہت اچھا لگنے لگا تھا۔ بلکہ قرآن پڑھنے کے وقت میں انہیں بے تابی ہوتی تھی۔ اور اذان کی آواز سن کر تو وہ بے چین ہو جاتا تھا۔ کوئی معروفیت ہوتی تو اُس میں بھی اس کا دل نہیں لگتا تھا۔

البتہ ایک موقع پر وہ بری طرح گھبرا گیا تھا۔ مالک کا خیال نہ ہوتا تو وہ بھاگ کھڑا ہوتا۔

مسجد کے امام مہر علی صاحب کو جب پتا چلا کہ وہ ہندو تھے اور مسلمان ہوئے ہیں تو انہوں نے پوچھا۔ ''مسلمانی ہوئی ہے تم لوگوں کی؟''

''وہ کیا ہوتی ہے؟'' عبدالحق نے سوال کیا۔

''ایک طرح کی جراحت ہوتی ہے۔'' مہر علی نے کہا اور پھر وضاحت کی۔ وہ وضاحت سن کر زبیر کے تو چھکے چھوٹ گئے۔ گھبراہٹ عبدالحق کے چہرے پر بھی تھی۔ ''کیا یہ ضروری ہے مولانا؟''

''بالکل ضروری ہے۔ بچہ بہت چھوٹا ہوتا ہے تو اُس کی مسلمانی کرا دی جاتی ہے۔ اسے پتا بھی نہیں چلتا لیکن بڑے ہونے پر ہو تو تکلیف بھی ہوتی ہے اور ٹھیک ہونے میں بھی زیادہ وقت لگتا ہے۔''

''ضروری ہے تو تکلیف کی مجھے پروا نہیں۔ لیکن مجھے جراح کے سامنے......'' عبدالحق سے جملہ پورا نہیں کیا گیا' اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''مجبوری ہے اب دیکھو' ڈاکٹر سے تو پردہ نہیں ہوتا نا۔''

مہر علی صاحب نے بڑی رازداری سے جراح کا بندوبست کیا۔ یہ طے تھا کہ عبدالحق' زبیر' مہر علی اور جراح کے سوا کسی کو اس بات کی ہوا بھی نہیں لگے گی۔ مسجد سے متصل مہر علی کا چھوٹا سا گھر تھا' جہاں وہ اکیلے رہتے تھے۔ وہاں کسی کا آنا جانا بھی نہیں تھا۔ ٹھیک ہونے تک وہ دونوں وہیں رہتے۔

گاؤں والوں کو بتا دیا جاتا کہ وہ کسی کام سے شہر گئے ہیں۔ اِس کام کے لئے وقت عشا کے ایک گھنٹے بعد کا طے پایا کہ اس وقت تک گاؤں میں سناٹا ہو جاتا تھا۔ سب لوگ سو جاتے تھے۔

وہ پہلا موقع تھا کہ مالک کی وفاداری خون میں رچی بسی نہ ہوتی تو زبیر بھاگ جاتا...... گاؤں سے بھی اور اپنے اس مذہب سے بھی۔ وہ سوچتا اور دہلتا رہا' ارے انگلی میں پھانس چبھ جائے تو اسے نکالنے میں کتنی تکلیف ہوتی ہے' جبکہ یہ تو بات بہت آگے کی تھی۔

عبدالحق نے اُن کی کیفیت بھانپ لی تھی۔ اُس نے زبیر سے کہا۔ ''بھائی! اللہ کی خاطر میں سر بھی کٹا سکتا ہوں۔ تکلیف سے ڈر نہیں لگتا۔ بس بے پردگی کے خیال سے شرم آتی ہے۔ مگر مجبوری ہے۔''

اس لمحے زبیر کو کچھ یاد آ گیا۔ ڈر اور خوف تو اس کے ذہن سے نکل گیا۔ جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ ''دہلی سے یہاں آنے والا سفر یاد ہے مالک؟ وہ جو راستے میں ہمیں روکا گیا تھا۔ حیرت ہے' مجھے پہلے خیال نہیں آیا۔ وہ لوگ یہی تو دیکھتے تھے۔ اس سے انہیں پتا چل جاتا تھا کہ مسافر مسلمان ہے یا نہیں۔''

عبدالحق کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''تو وہ تمہیں اس لئے الگ لے گئے تھے؟''

''تو اور کیا۔ آپ کے لئے میں نے کہہ دیا تھا کہ راج پوت ہیں......''

''واقعی...... میں تو جان لے لیتا یا جان دے دیتا۔'' عبدالحق نے جھرجھری لے کر کہا۔

''لیکن یہاں تو مجبوری ہے۔''

جراح آ گیا۔ عبدالحق نے زبیر سے کہا۔ ''بھائی' پہلے میں جاؤں گا۔ اور دیکھو' تم بلاوجہ ڈر رہے ہو۔ بس یہ تصور کر لینا کہ اس میں اللہ کی خوشی ہے' تو پھر تکلیف ہوگی ہی نہیں۔ اور ہوگی تو بڑی اور بری نہیں لگے گی۔''

لیکن جراح کے سامنے بے پردہ ہوتے ہوئے اسے خود کو یاد دلانا پڑا کہ اگر یہ اللہ کا حکم نہ ہوتا تو بے پردہ ہونے سے پہلے وہ شرم سے مر جاتا۔ اور اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''اے...... تمہاری تو ختنہ پہلے ہی ہو چکی ہے۔''

جراح کی آواز نے اسے چونکا دیا اور اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ سمجھ میں اُس کی کچھ بھی نہیں آیا تھا۔

''یہ تم نے کوئی مذاق کیا ہے میرے ساتھ؟'' جراح اب خشمگیں نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔ ''سمجھ رہے ہو نا۔ تمہاری تو ختنہ ہو چکی ہے۔''

''کک...... کب...... کک...... کیسے۔'' عبدالحق بری طرح بوکھلا گیا تھا۔

''اب یہ تو تمہیں ہی معلوم ہوگا۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ میں پیسے پورے لوں گا۔''

''پیسوں کی آپ فکر نہ کریں۔ میں زیادہ ہی دوں گا۔''

''وہ دوسرا بھی تم جیسا تو نہیں؟''

''پپ...... پتا نہیں۔ آپ خود دیکھ لیں۔''

''بلاؤ اسے۔''

یہ سب کچھ عبدالحق نے اسے بتایا تھا۔ مگر اس وقت وہ کچھ سوچ سمجھ نہیں سکا تھا۔ اُس وقت تو صحن میں جراح کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ کاش اُس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو۔ مگر پھر اسے یاد آیا۔ دہلی سے آتے ہوئے جب اس بلوائی نے اسے چیک کیا تھا تو مطمئن ہو کر سر ہلاتے ہوئے کہا تھا...... ہاں' یہ ہندو ہی ہیں۔

جراح نے اسے دیکھا تو خوش ہو کر بولا۔ ''شکر ہے۔ تم تو کام کے نکلے۔''

یہ سن کر زبیر کا تو دم ہی نکل گیا۔ ''کیا بہت تکلیف ہوگی؟''

''میں استاد عبدالقادر ہوں...... اپنے فن میں ماہر۔'' جراح نے برا مانتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''یوں ایک سیکنڈ میں چڑیا اُڑ جائے گی پھر سے۔'' اُس نے چٹکی بجائی۔ ''اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔''

استرے کا چمکتا ہوا پھل دیکھ کر زبیر کے اوسان خطا ہو گئے۔ ''اور میں کتنے عرصے میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' اس نے مہلت حاصل کرنے کے لئے کہا۔

''زیادہ سے زیادہ تین دن۔''

''بس۔'' زبیر کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''ہاں...... استاد عبدالقادر کے ہاتھ کا کام اس سے زیادہ وقت نہیں مانگتا۔'' جراح زبیر کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر اچانک اُس نے کہا۔ ''یہ اوپر جو اُڑی ہے' چڑیا تو نہیں ہو سکتی۔ چمگادڑ ہو گی۔''

زبیر نے بے ساختہ سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ''کہاں؟'' اسی لمحے اسے ہلکی سی چبھن کا احساس ہوا۔

''اُڑ بھی گئی۔'' جراح نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ تب زبیر کو پتا چلا کہ اُس کا کام ہو گیا تھا۔

اور جراح کی بات سچی ثابت ہوئی۔ تین دن میں وہ بھلا چنگا ہو گیا۔ لیکن ان تین دنوں میں عبدالحق نے اسے ایک لمحے کے لئے بھی اکیلا نہیں چھوڑا۔

طبیعت ذرا سنبھلی اور زبیر کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو اس کی سمجھ میں وہ بات آئی۔ دہلی سے نکلتے ہوئے اگر ہندو انتہا پسندوں نے اگر اُس کی بات نہ مانی ہوتی اور مالک کو چیک کیا ہوتا تو کیا ہوتا۔ چیک کرنے والا نعرہ لگاتا...... ہے پربھو' یہ تو مُسلا ہے مُسلا۔ جے بجرنگ بلی۔ لیکن پھر اُسے خیال آیا کہ مالک کے جیتے جی تو یہ ہو نہیں سکتا تھا۔

وہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے اِس مذہب کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا۔ یہ تو واقعی اللہ کی رحمت تھی۔ تو چھوٹے ٹھاکر اسی حال میں پیدا ہوئے تھے۔ اُس نے دیکھا تھا کہ وہ شروع ہی سے مختون تھے۔ لال آندھی کے بعد وہ جس حال میں آئے تھے' وہ بھی اسے یاد تھا۔ وہ کئی دن تک سوچتا رہا کہ جس آندھی میں گیارہ گاؤں ریت میں دفن ہو گئے' چھوٹے ٹھاکر وہاں سے کیسے بچ آئے۔ ویسے ہی جیسے بعد میں وہ دہلی سے نکل آئے۔ جبکہ ان کے سامان میں قرآن پاک کے کئی نسخے بھی موجود تھے۔ اور چھوٹے ٹھاکر کی جانچ ہو جاتی تو وہ سب مارے جاتے۔

اُس کی سمجھ میں آنے لگا کہ وہ سب سے مہان شکتی ہے۔ ہوتا وہی ہے' جو وہ چاہتا ہے۔ کتنا

کچھ دیکھ لیا تھا اُس نے۔ پورے گیارہ گاؤں اُس نے ریت میں سے برآمد ہوتے دیکھے تھے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

اُس رات وہ سونے کے لئے لیٹا۔ زمینوں کے کاغذات اُس نے رابعہ کو احتیاط سے رکھنے کے لئے دے دیے تھے۔ اپنے کاغذات کو اُس نے علیحدہ رکھوایا تھا۔ وہ اُس کے پاس عبدالحق کی امانت تھے۔

اسے احساس ہوا کہ رابعہ اسے بار بار دیکھتی ہے اور نظریں جھکا لیتی ہے۔ جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ایک بڑی خبر ہے جی' میں ماں بننے والی ہوں۔''

زبیر ایک دم سے اٹھ بیٹھا۔ ''کیا کہتی ہو؟ یہ کیسے......؟''

''میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ دو مہینے ہو گئے ہیں۔ میں نے سوچا' ایسا ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری گود بھر سکتی ہے۔ لیکن آج نیاز بھائی کی اماں نے مجھے ٹوک دیا۔ کہنے لگیں' تمہیں پتا بھی ہے یا نہیں' اب سنبھل کر قدم اٹھایا کرو۔ میں تو کچھ سمجھی ہی نہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا' یہ تمہارا پہلا بچہ ہے؟ تب مجھے سمجھ آئی۔''

''بوڑھی عورت ہے' اسے کیا پتا۔'' زبیر پھر دراز ہو گیا۔

''نہیں جی۔ انہوں نے دیکھا کہ مجھے یقین نہیں آیا ہے تو انھوں نے شاداں کو بلوا لیا......''

''کون شاداں؟''

''دائی ہے۔ اور وہ آئی تو اُس نے بھی یہی بات کہی۔ اُس نے کہا' یہ تیسرا مہینہ ہے۔''

زبیر پھر اٹھ بیٹھا۔ ''مجھے تو یقین نہیں آتا۔''

''مجھے بھی' لیکن من میں کچھ کچھ ہوتا ہے۔ اور مجھے بھاری بھاری سا بھی لگتا ہے۔''

''اللہ کرے' یہ سچ ہو۔'' زبیر نے بڑے خلوص سے کہا اور رابعہ کو لپٹا لیا۔

''پر مجھے تو یقین اُس وقت آئے گا' جب ہو گا۔''

''اللہ پر یقین رکھ پگلی۔ سب کچھ اسی کے حکم سے ہے۔''

اس لمحے نے زبیر کو پوری طرح بدل دیا۔ اُس نے بڑے فخر سے سوچا' ہمارا بچہ خالص مسلمان ہو گا۔ یہی تو کہا تھا' مولوی مہر علی نے۔ مسلمانی کے بعد انہوں نے کہا تھا' اب تمہارا اور رابعہ کا نکاح بھی ضروری ہے۔ اُس نے اعتراض کیا کہ وہ تو پہلے ہی سے شادی شدہ ہیں۔ تب مولوی مہر علی نے کہا تھا کہ نکاح حرام کو حلال کر دیتا ہے۔ اس نکاح کے بعد جو اللہ تمہیں اولاد دے گا' وہ انشاء اللہ نیک اور صالح ہو گی۔ زبیر نہ چاہتے ہوئے بھی مان گیا تھا۔ اعتراض تو اسے کوئی نہیں تھا لیکن لگتا تھا کہ وہ اور رابعہ تماشا بن رہے ہیں۔

مگر سچی بات یہ تھی کہ اس نکاح کے بعد رابعہ اسے نئی نئی لگی تھی۔ بعد میں رابعہ نے بھی یہی بات کہی۔

ان دونوں کی شادی کو بارہ سال ہو چکے تھے۔ عمریں ان کی زیادہ نہیں تھیں۔ زبیر اب بہ مشکل بتیس کا ہوگا۔ اور اولاد کی آرزو تو سبھی کو ہوتی ہے۔ زبیر کے ماں باپ کو اُس سے بھی زیادہ خواہش تھی پوتے کی۔ انہوں نے کوئی در نہیں چھوڑا تھا۔ منتیں مان مان کر ہار گئے تھے۔ کوئی وید طبیب نہیں چھوڑا تھا۔ مگر جواب یہی ملا تھا کہ ان کے نصیب میں اولاد ہے ہی نہیں۔

اور اب زبیر سوچ رہا تھا کہ نکاح کی برکت سے یہ اَن ہونی بھی ہوگئی۔ ان کے نکاح کو ابھی چار مہینے ہی تو ہوئے تھے۔

اُسی وقت عبدالحق اسے بڑی شدت سے یاد آیا۔ مالک یہاں ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔ اور وہ اسی سے وہی بات کہتے، جو ہر خوشی کے موقع پر کہا کرتے تھے...... اللہ کا شکر ادا کرو زبیر۔ سب کچھ اسی کی طرف سے ہے۔

زبیر نے سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا اور زیرِ لب بولا...... اللہ تیرا شکر ہے۔ پھر اُس نے رابعہ سے کہا۔ ”اللہ کا شکر ادا کر رابعہ۔“

”وہ تو میں نے کیا تھا۔“

”مالک کہتے ہیں، شکر کا اچھا اور آسان طریقہ دو نفل ہیں۔ چل اٹھ۔ وضو کریں اور شکر ادا کریں۔“

❁ ❁ ❁
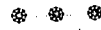
انکوائری کا فیصلہ آ گیا تھا۔ انکوائری آفیسر نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ جمیل کو بدعنوانی کا مرتکب پایا گیا لیکن کیونکہ یہ اُس کی پہلی غلطی تھی اور بدعنوانی سنگین نوعیت کی نہیں تھی۔ پھر جمیل نے تحریری طور پر معافی بھی مانگ لی تھی۔ اس لئے اسے بحال کر دیا گیا تھا۔

بحال ہونے کے بعد جمیل پورے کیمپ میں دندناتا پھرا تھا۔ وہ مسعود صاحب کا مذاق اڑا رہا تھا۔ ”بڑے افسر بنے پھرتے ہیں۔ ارے افسروں والے اعمال بھی تو ہوں۔ راشن تولتے ہیں تو یہ نہیں سوچتے کہ یہ چپراسی کا کام ہے۔ ایسے افسروں کو کون پوچھتا ہے۔“

”لیکن یہ ہوا کیسے؟“ عبدالحق نے اُس سے پوچھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس فیصلے سے اسے شاک پہنچا تھا۔ ”تمہارے خلاف ثبوت تو سارے پکے تھے۔“

”ثبوتوں سے کیا ہوتا ہے۔ جس کے پاس پوا ہو، اُس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

”اور یہ پوا کیا ہوتا ہے؟“

”تعلقات کو کہتے ہیں۔“ جمیل نے اسے بچوں کی طرح سمجھایا۔ ”میرا پوا بہت بھاری ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”جن افسروں سے میرے تعلقات ہیں، وہ مسعود صاحب جیسوں کو اپنی جیب میں ڈالے پھرتے ہیں۔“

”اتنے بڑے افسروں سے تمہارا کیا تعلق؟“

جمیل نے بائیں آنکھ دباتے ہوئے لچر پن سے کہا۔ ”اب گھر کی باتیں تو نہیں بتائی جا سکتیں۔ بس اتنا سمجھ لو کہ یہ دنیا ضرورت کی ہے۔ تم میری ضرورت پوری کرو گے تو میں تمہارا خیال تو رکھوں گا نا۔ یہ دنیا مطلب کی ہے۔“

عبدالحق کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ مگر وہ اندر سے بہت زخمی ہوا۔ یہ کیسا اسلامی ملک ہے اور یہ کیسے مسلمان ہیں۔ کیا اسلام یہ سکھاتا ہے۔ کیا اس ملک میں باطل حق پر غالب آ سکتا ہے؟ اسے کالج میں ہونے والی بحثیں یاد آ گئیں۔ وہاں تو کچھ اور ہی باتیں ہوتی تھیں۔

پھر اسے پتا چلا کہ اسی سلسلے میں مسعود صاحب کی انکوائری افسر صدیق صاحب سے خاصی تلخی ہوئی ہے۔ ان کا مؤقف تھا کہ جمیل کا جرم معمولی نہیں، بلکہ سنگین تھا، اور بے شک پکڑا وہ پہلی بار گیا تھا لیکن یہ اُس کی پہلی غلطی بہرحال نہیں تھی۔ انداز سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ عادی مجرم ہے۔ اور اسے ڈسمس ہونا چاہئے تھا۔ اس پر صدیق صاحب نے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ وہ مجبور تھے۔ جمیل کے لئے سفارش بہت اوپر سے آئی تھی۔

عبدالحق اسی روز مسعود صاحب سے ملنے گیا۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح اُس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ ”آؤ میاں عبدالحق، کیسے ہو؟“

”جی، اللہ کا شکر ہے۔“

”او تمہارا کام بھی کچھ بنا؟“

”ابھی تک تو ناکام ہی ہوں۔“

”چند روز افضال صاحب کے ساتھ باہر جا کر دیکھو۔ اللہ مسبب الاسباب ہے اور حرکت میں برکت ہے۔“

عبدالحق کو وہ تجویز اچھی لگی۔ ”واقعی، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ کل سے یہی کروں گا۔“

”اور ملازمت کے بارے میں بھی کچھ سوچا تم نے؟“

”جی نہیں، اور اب تو سوچنے کی گنجائش بھی نہیں۔“ عبدالحق کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”میں نے یہاں بے ایمانی کو ایمان داری پر غالب ہوتے دیکھا ہے۔“

”ارے وہ...... ان باتوں کو اتنی اہمیت نہ دو۔“ مسعود صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بلکہ اس صورت حال میں تو تم جیسے لوگوں کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اور ایک بات یاد رکھو۔ یہ حق و باطل کی جنگ تو ازل سے جاری ہے۔ اس میں دل چھوٹا کرنے کی گنجائش نہیں۔ ہم دست بردار ہو گئے تو باطل جیت جائے گا۔ یہ تو ہر مسلمان پر اُس کی حیثیت اور استطاعت کے مطابق فرض ہے۔''

''لیکن جو کچھ ہوا' اُس میں آپ کی بے عزتی ہوئی ہے۔''

''ایک بات اور یاد رکھو۔ عزت ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم خاک کے پتلے عزت کے مستحق تو نہیں۔ یہ تو اللہ کا کرم ہے۔ اپنا تو موٹو ہے کہ سیدھی راہ پر چلو اور بے عزتی سے مت ڈرو۔ اب میں اس دکھ کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں' جو تمہیں میری بے عزتی سے ہوا ہے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا اور لفظ بے عزتی پر خاص طور پر زور دیا۔ ''تو یہاں' میں نے اوپر والوں کو لکھ بھیجا ہے کہ یہ ملازمت میں ملک و قوم کی خدمت کے لئے کر رہا ہوں۔ ورنہ اللہ کے فضل و کرم سے مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے کیمپ میں کسی کرپٹ آدمی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر جمیل بحال ہوتا ہے تو میں احتجاجاً استعفیٰ دینے پر مجبور ہوں گا۔''

''یعنی آپ ہار مان لیں گے؟'' عبدالحق نے کہا۔ ''اور آپ مجھے سرکاری ملازمت کا مشورہ دے رہے ہیں۔''

''ابھی بچے ہو نا میاں۔'' مسعود صاحب ہنسنے لگے۔ ''سول سروس کے بھی کچھ گہرے رموز ہوتے ہیں۔ احتجاج کے تحت دیئے جانے والا استعفا کوئی قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ اس طرح وجہ احتجاج ریکارڈ کا حصہ بن جاتی ہے۔ آدمی کو سروس رولز میں پکا ہونا چاہئے بس۔ اور دوسری مضبوطی یہ ہو کہ آدمی کو اس ملازمت کی ضرورت نہ ہو تو یہ سونے پر سہاگہ ہے۔ خوش قسمتی سے یہ مضبوطی مجھے بھی حاصل ہے اور تمہیں بھی۔''

''آپ مجھے بار بار کیوں گھسیٹتے ہیں اس میں۔''

''ملک و قوم کی ضرورت کی خاطر۔ اور سنو عبدالحق' میں اپنے تو کل کی بھی فکر نہیں کرتا۔ لیکن ملک اور قوم کی خاطر بہت دور تک دیکھتا ہوں۔ آج بہت سوچ سمجھ کر تمہیں مشورہ دے رہا ہوں۔ تم نے ایف اے کیا ہے نا؟''

''جی ہاں۔''

''تم بی اے کرو اور سروس جوائن کر لو۔ میں تمہیں کتابیں دوں گا۔ تم سول سروس کے مسابقتی امتحان کی تیاری کرتے رہو۔ یہاں اس سلسلے میں کام ہو رہا ہے۔ جیسے ہی پہلے امتحان کا اعلان ہو' اُس میں شریک ہو جاؤ۔ سی ایس پی افسر کی حیثیت سے بہت کچھ کر سکو گے۔''

''اس کی اتنی اہمیت کیا ہے جناب؟''

''یہی تو رونا ہے۔ کسی چیز کی اہمیت کو سمجھنے میں ہماری قوم بہت دیر کر دیتی ہے۔'' مسعود صاحب نے افسردگی سے کہا۔ ''سرسیّد کی بات بھی لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ ہندوؤں نے بہ کثرت آئی سی ایس کا امتحان پاس کیا۔ ان کے پاس قابل افسروں کی کمی نہیں۔ اور یہاں نرے اندھوں میں لاٹھی والے اندھے راجا بنے ہوئے ہیں۔ اسی لئے تو جمیل جیسوں کی اتنی اہمیت ہے۔''

''میں آپ سے سی ایس پی آفیسر کی اہمیت کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔'' عبدالحق نے انہیں ٹوکا۔

''دیکھو' میں اللہ کی دی ہوئی عقل کی روشنی میں دور تک دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' مسعود صاحب نے پُر خیال لہجے میں کہا۔ ''اس خطے پر انگریزوں کے چھوڑے ہوئے اثرات شاید پوری طرح کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ میرا دعویٰ ہے کہ کم از کم سو سال تک تو اس انتظامی ڈھانچے میں اور انگریزوں کے بنائے ہوئے قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی۔''

''کیوں نہیں ہو گی۔ کم از کم پاکستان میں تو اسلامی نظام قائم ہو گا۔''

''نعروں پر مت جاؤ۔ نعرے محض کوئی مقصد حاصل کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ اب میں وجہ بھی بتا دوں۔ اب اس ملک میں وکیلوں کی تعداد کتنی ہو گی۔ اور وہ سب تعزیرات ہند کے تحت تعلیم حاصل کر کے وکیل بنے ہیں۔ یہ قانون نہ رہا تو وہ وکیل بھی نہیں رہیں گے۔ اور یہ مسئلہ اور بھی بہت سارے پیشوں کے ساتھ ہے۔ تو یہ تبدیلی آئی بھی تو صدیوں میں آئے گی۔ اب میں تمہیں بتاؤں کہ انگریز Direct governance کی بجائے Indirect governance کے قائل تھے۔ ان کے انتظامی ڈھانچے میں بیوروکریسی کی بڑی اہمیت تھی' اور میں اس کا حصہ رہا ہوں۔ پاکستان ہمیں جس پوزیشن میں ملا ہے' اس میں اس کا جیسے تیسے چلنا بھی آسان نہیں۔ اس وقت افراتفری کا یہ حال ہے کہ سمت کا نہ کسی کو خیال ہے' نہ ہوش۔ پہلی ترجیح ملک کے نظم و نسق کو نارمل انداز میں چلانا ہے۔ ہم اس وقت ایک نوزائیدہ قوم ہیں۔ شیر خوار بچے کی طرح۔ سب سے پہلے تو ہمیں Survive کرنا ہے۔ اور یہ بہت بڑی کامیابی ہو گی۔ انگریز اور ہندو' دونوں یہی سمجھتے ہیں کہ پاکستان بہت جلد ایک ناکام ریاست ثابت ہو جائے گا۔ لیکن مجھ جیسے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ملک اللہ کے حکم سے بنا ہے۔ اس کا قیام کسی بڑے مقصد کے تحت ہے' اس لئے یہ قائم رہے گا۔ ہمیں یہ یقین ہے کہ یہاں سو سال تک حکمران بیوروکریسی کے محتاج ہوں گے۔ اصل حکومت بیوروکریسی کی ہو گی۔ میری یہ بات آج لکھ لو کہ بیوروکریسی پاکستان سے مخلص اور ایماندار ہوئی تو یہ ملک بہت ترقی کرے گا۔ دوسری صورت میں تم سمجھ سکتے ہو۔'' انہوں نے گہری سانس لی۔ ''اور میں یہاں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے ہم خیال افسران کا ایک چھوٹا سا گروپ

ہے۔ ہم ہندوستان سے آنے والوں کو بہت غور سے دیکھ رہے ہیں' اور ان میں سے اہل لوگوں کو چن رہے ہیں۔ اس ملک کو ایسے افسروں کی ضرورت ہے' جو یہاں تنظیم نو کا کام کر سکیں۔ ہم بے ایمان' خود غرض اور مفاد پرست لوگوں سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف وہ بھی ہم سے چھٹکارا چاہتے ہیں۔ یہ ہمارے لئے ایک جہاد ہے۔ ورنہ میں واقعی استعفا دے دیتا۔ میں نے کہا نا کہ یہ ملازمت میری معاشی ضرورت نہیں لیکن اگر میں ہٹ جاؤں اور میری جگہ کوئی کرپٹ آدمی آجائے تو یہ بڑا نقصان ہوگا۔ اور میں اپنی انا کی خاطر یہ حماقت کروں تو مجھ سے بڑا خود غرض کوئی نہیں ہوگا۔"

عبدالحق کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ حسن دین' عرفان احمد اور مسعود احمد خان بہت اچھے انسان ہیں لیکن اب اسے ان کی عظمت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے' جنہوں نے اپنے قد سے بہت بڑے کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ وہ ایک ملک کی تعمیر نو کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اور اس میں ان کا اپنا کوئی مفاد نہیں تھا۔

"آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"صاف لفظوں میں تو کہہ چکا ہوں۔ تم یہاں آجاؤ۔ تعلیم مکمل کرو۔ سرکاری ملازمت کرو۔ پھر مقابلے کے امتحان میں بیٹھو' اور افسر بن کر ہمارے اس مشن پر کام کرو۔"

"اور واضح لفظوں میں بتایئے کہ آپ کا مشن کیا ہے؟"

"بے ایمانی' رشوت ستانی اور ہر طرح کے کرپشن کو روکنا اور ختم کرنا' اس ٹوٹے پھوٹے ملک کو مستحکم کرنا اور زخموں سے چُور' لٹی پٹی قوم کے زخموں پر مرہم رکھنا اور مظلوموں کی دادرسی کرنا۔"

"یہ کام تو میں ویسے بھی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مگر وہ بہت چھوٹا کینوس ہے۔ میں تمہیں ایک بہت بڑے منظر کی طرف بلا رہا ہوں۔"

"لیکن میں اپنے گاؤں کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں......"

"کہاں کچھ کر رہے ہو تم؟ یہاں اس کیمپ میں بے کار زندگی گزار رہے ہو' جہاں سے فرسٹریشن کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ مایوسی اور تھکن کا شکار ہو جاؤ گے۔"

"کچھ ذاتی قرض بھی تو ادا کرنے ہوتے ہیں۔" عبدالحق نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"قومی فرض کے سامنے ذاتی قرض کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ خیر...... کچھ دن بعد تمہیں ایک بہت بڑی خوش خبری سناؤں گا۔ پھر بات کریں گے۔"

عبدالحق وہاں سے اُٹھ آیا۔ اس رات وہ دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا۔ تعلیم تو اسے ویسے

بھی مکمل کرنا تھی۔ اور مسعود صاحب کی باتیں بھی ایسی نہیں تھیں کہ انہیں نظر انداز کیا جاتا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ نور بانو کو کیا منہ دکھائے گا۔ کیا جواب دے گا۔ اتنی بڑی شرمندگی تو وہ نہیں اٹھا سکتا۔

❀ ❀ ❀

دو دن بعد مسعود صاحب کی ہر بات ثابت ہو گئی۔ جمیل کا ٹرانسفر ہو گیا۔ مسعود صاحب کی کامیابی گو مکمل نہیں تھی لیکن ان کی اہمیت بہر حال ثابت ہو گئی۔ وہ جمیل کو نکلوا نہیں سکے۔ لیکن اس تبادلے میں جمیل کی بڑی خفت ہوئی۔ دو دن سے وہ مسعود صاحب کے خلاف ڈینگیں مارتا پھر رہا تھا لیکن بالآخر اسے کیمپ سے رخصت ہونا پڑا۔

عبدالحق کی سمجھ میں اب مسعود صاحب کی ہر بات آگئی تھی۔ کرپٹ لوگوں کی تعداد بہر حال زیادہ تھی' اور جمیل والے معاملے سے ثابت ہوتا تھا کہ ایمان دار افسران پر ان کا پلہ کچھ بھاری ہے۔ اس کے باوجود مسعود صاحب کا دم غنیمت تھا۔ ورنہ جمیل نے کہا تھا کہ اس کے اتنے بڑے افسروں سے تعلقات ہیں' جن کے سامنے مسعود صاحب کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے باوجود مسعود صاحب نے جمیل کو اپنے کیمپ میں نہیں رہنے دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ مسعود صاحب اپنے بڑوں سے ٹکرا سکتے ہیں۔ ان کے پاس بے غرضی اور ایمان داری کی قوت تھی۔

رات کو وہ حمید کے پاس بیٹھا تھا۔ افضال صاحب کیمپ میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ حمید نے کہا۔ "بڑے صاحب نے تو کمال کر دیا۔"

عبدالحق جانتا تھا کہ مسعود صاحب کو بڑے صاحب کہا جاتا ہے۔ "کیا کمال کر دیا انہوں نے؟" اس نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا۔

"ارے...... تمہیں نہیں پتا؟ جمیل کا تبادلہ ہو گیا!"

"تو اس میں کمال کی کیا بات ہے۔ اصولاً تو اسے برخواست ہونا چاہیے تھا۔"

"اس کا تبادلہ بھی معمولی بات نہیں۔ اب دیکھو بابو جی' بحال تو وہ ہو گیا تھا نا۔ اس کے تعلقات ہی ایسے ہیں لیکن بڑے صاحب نے پھر بھی اسے اس کی اوقات یاد دلا دی۔"

عبدالحق کو مجید' نعمان اور نذیر کی گفتگو یاد تھی۔ بلکہ وہ ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ جمیل کے اتنے بڑے افسروں سے تعلقات کیوں اور کیسے ہیں' لیکن حمید نے ہی آنکھ کے اشارے سے اسے روک دیا تھا۔ اس نے حمید کو یاد دلاتے ہوئے کہا۔ "اس رات تم نے مجھے پوچھنے سے کیوں روکا تھا؟"

"وہ مجید ہے نا' وہ جمیل کا ہی آدمی ہے۔"

"تو پھر؟"

"اس وقت مناسب نہیں تھا۔" حمید نے اسے ایسے سمجھایا' جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہو۔ "اس وقت جمیل یہاں موجود تھا۔ میں تمہارا مزاج سمجھتا ہوں بابو صاحب۔ تم ضرور اس کے راستے میں

رکاوٹ بنتے' اور نقصان تمہارا ہی ہوتا۔"

"تو تمہیں معلوم ہے کہ جمیل کے اتنے بڑے افسروں کے ساتھ تعلقات کس بنیاد پر تھے؟"

"ہاں۔ مگر عافیت اسی میں تھی کہ انجان بنا رہوں۔"

"تو اب تو مجھے بتا دو۔"

حمید اس کے بہت قریب ہو گیا' پھر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ "جمیل بڑے بڑے افسروں کو لڑکیاں سپلائی کرتا تھا۔"

عبدالحق کا تو دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ لڑکیاں سپلائی! اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ کالج کے ہوسٹل میں رہنے والے لڑکے بھی اسی طرح کی بات کرتے تھے...... یار' آج وہ انڈے سپلائی کرنے والا نہیں آیا۔ ناشتہ بھی ڈھنگ کا نصیب نہیں ہوا۔ مگر لڑکیاں...... لڑکیاں بھی سپلائی کی جاسکتی ہیں؟ کیا وہ کوئی جنس ہیں' جو دکانوں سے ملتی ہو' یا بیکری میں بنتی ہو۔ یہ بات اس نے حمید سے بھی کہہ دی۔

"ابھی بچے ہو بابو صاحب۔ ارے لڑکیوں کی یہاں کیا کمی۔ ہر طرف کٹی پتنگوں کی طرح اُڑتی ہوئی مل جاتی ہیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں تو اپنے اسی کیمپ میں ہی ہیں۔"

"لیکن بھائی' لڑکیوں کی سپلائی۔" عبدالحق کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ "کیا اچار ڈالا جاتا ہے لڑکیوں کا۔" اچانک اسے خیال آیا کہ ممکن ہے' گھروں میں کام کرنے کے لیے لڑکیوں کی ضرورت پڑتی ہو۔ یہاں لڑکیوں کی کمی نہیں۔ بڑے افسر جمیل سے کہتے ہوں گے اپنی ضرورت' اور جمیل یہاں سے ان کو لڑکیاں فراہم کر دیتا ہو گا۔ اب وہ احسان مند تو ہوتے ہوں گے جمیل کے۔

مگر پھر ایک اور الجھن سامنے آئی۔ حمید تو ایسے بات کر رہا تھا جیسے گالی دے رہا ہو...... جیسے لڑکیاں سپلائی کرنا بری بات ہو۔ اور اگر یہ بری بات ہے تو اخلاق جو ہر چیز پر نظر رکھتا ہے' اس نے مسعود صاحب کو یہ اطلاع کیوں نہ دی۔

حمید اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ "کہاں پہنچ گئے بابو صاحب؟"

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ مسعود صاحب نے اس کی روک تھام کیوں نہیں کی؟"

"انہیں پتا ہی کب ہے اس بات کا۔ کیسے پتا چلتا انہیں؟"

"اخلاق سے۔ اخلاق کو تو سب معلوم ہوتا ہے۔"

"لیکن اخلاق آدمی کا بچہ ہے۔ یہ رات کو سوتا بھی ہے۔"

"تو جمیل یہ کام رات کو کرتا تھا۔"

"تو اور کیا دن میں کرے گا۔ تم بھی کمال کرتے ہو بابو صاحب۔"

"لیکن رات کو تو گھروں میں کام نہیں ہوتے۔ رات کو لڑکیاں کیا کرتی ہوں گی۔"

اب حمید کی الجھنے کی باری تھی۔ "تم کس کام کی بات کر رہے ہو بابو جی؟"

"یہی گھر کے اوپر کے کام...... جھاڑو دے دی' برتن دھو دیے......"

حمید نے بہت زور سے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔ "اب بابو صاحب' تم بے وقوف ہو یا مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔ جوان آدمی ہو۔ ارے' یہ جو پاکستان بنا ہے تو وہاں سے تو آنے والے بچے بھی بالغ ہو گئے ہیں۔ کیا کیا کچھ دیکھا ہے معصوم آنکھوں نے تمہیں کچھ بھی نہیں پتا۔ تمہیں نہیں معلوم کہ رات کے اندھیرے میں لڑکیاں کس لیے سپلائی کی جاتی ہیں۔" اب حمید کو غصہ آ رہا تھا۔

"ارے تم نے کچھ نہیں دیکھا کیا۔ کیا ماں کے پیٹ سے سیدھے یہاں چلے آئے ہو۔ ارے یہاں تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والا بچہ بھی اس دکھ کو سمجھتا ہے۔" بالکل اچانک ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

عبدالحق بوکھلا گیا اور اسے سینے سے لپٹا کر چپ کرانے لگا۔ "مجھ سے خفا کیوں ہوتے ہو حمید بھائی۔ میں واقعی بے وقوف ہوں۔"

"تم سے کہاں خفا ہوں۔ خود سے خفا ہوں۔ زندگی سے خفا ہوں۔ ساری دنیا سے خفا ہوں" حمید روئے جا رہا تھا۔ "میری بہن تھی...... بہت پیاری تھی مجھے۔ پاکستان آتے ہوئے ٹرین پر حملہ ہوا۔ ظالموں نے میری آنکھوں کے سامنے......" اس سے جملہ پورا نہیں کیا گیا۔ "بہنیں تو غیرت ہوتی ہیں بھائیوں کی۔ میں نہتا ہی ان سے بھڑ گیا۔ کسی نے میرے پیٹ کو چیر دیا۔ میں گر گیا' اور میری آنکھوں کے سامنے میری بہن لٹ گئی۔ میں لاشوں میں دبنے کی وجہ سے بچ گیا۔ اسپتال میں انہیں میرے ہاتھ باندھنے پڑے۔ کیونکہ میں اپنے زخم کو نوچ کر خراب کر لیتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ زخم ٹھیک ہو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں زندہ رہوں۔ آج بھی بہن یاد آتی ہے تو میں اس زخم کو نوچتا ہوں...... یہ دیکھو۔" اس نے پیٹ پر سے قمیص اٹھائی۔ وہ کوئی دس گیارہ انچ لمبا زخم کا نشان تھا۔ زخم مندمل ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے ارد گرد کئی کھرنڈ تھے...... کچھ کچے' کچھ پکے۔ "تم نہیں جانتے بابو صاحب کہ لڑکیاں کیا ہوتی ہیں۔ تمہاری کوئی بہن ہے؟"

"نہیں۔" عبدالحق کی آواز رندھ گئی۔

"تو پھر تم کیسے سمجھ سکتے ہو۔ میں سمجھاتا ہوں۔ یہ معصوم چڑیاں ہوتی ہیں...... ایک آنگن میں رہنے والی...... بہت نازک...... ننھے ننھے سے دل' جو ذرا سی بات پر بری طرح دھڑکنے لگتے ہیں۔ باپ کے پاؤں دبانے والی' ماں کا ہاتھ بٹانے والی' بھائی کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھنے والی۔ جن کے ماں باپ اور بہن بھائی ان کے لیے اچھے گھر میں وداع ہونے کی دعا کرتے ہیں...... یہ آنگن میں پھدکتی' چہچہاتی چڑیاں' یہ معصوم بہنیں' جنہیں باپ اور بھائی کے سوا کچھ معلوم

نہیں ہوتا۔ وہ نہیں جانتیں کہ باہر کی دنیا کیسی ہے۔ دو ٹانگوں پر چلنے والے درندے کیسے ہوتے ہیں۔ پاکستان بنا تو ہماری بہنوں نے وہ وحشی درندے بھی دیکھ لیے' جنہیں انسان نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے اپنی بہن کو جس طرح لٹتے اور مرتے دیکھا' وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مجھے بہت غم تھا' بہت دکھ تھا اس کا۔ مگر میں دوسروں کی بہنوں کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا کہ چلو ہم تو لٹ گئے' لیکن یہ تو خیریت سے پاکستان آ گئیں...... درندوں اور درندگی سے دور۔ میں سوچتا' میری بہن معصوم تھی' معصوم ہی مری۔ اچھا ہوا' مر گئی۔ انشا اللہ شہید کا مرتبہ پائے گی اللہ کے ہاں۔ اس کا جسم توڑ پھوڑ دیا...... کاٹ پیٹ دیا ظالموں نے لیکن اس کی معصومیت تو سلامت رہی۔ مگر پھر میں نے یہاں جو کچھ دیکھا تو اپنی بہن کا غم بھول گیا۔ یہاں جو ہو رہا ہے' وہ اس سے بہت برا ہے۔ یہاں تو اپنے مسلمان بھائی ہیں۔ لیکن نہیں' بھڑوے مسلمان کیسے ہو سکتے ہیں۔ صرف کلمہ پڑھنے سے کوئی مسلمان نہیں ہو جاتا۔ بابو صاحب' تم یہ بھی نہیں جانتے ہو گے کہ بھڑوا کیا ہوتا ہے۔ میں بتاتا ہوں' جو اپنے کسی بھی فائدے کی خاطر کسی کی بیٹی' کسی کی بہن' کسی کی بہو کو لے جا کر کسی درندے کے سامنے ڈال دے' وہ بھڑوا ہوتا ہے۔ اور یقین کرو بابو صاحب' بھڑوے سے بری کوئی مخلوق روئے زمین پر نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ان مشرک درندوں سے بھی برا ہے' جنہوں نے مسلمان عورتوں کی عزتیں لوٹیں۔ کیونکہ وہ مسلمان عورتوں کی معصومیت نہیں لوٹ سکے' انہیں گناہ گار نہیں کر سکے۔ جبکہ یہ بھڑوے یہ کام بھی کرتے ہیں۔ جمیل یہاں سے معصوم لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر' کوئی فریب دے کر' کوئی لالچ دے کر رات کو کسی افسر کی خواب گاہ میں پہنچا دیتا تھا۔ پھر میں صبح کو دن میں' ان لڑکیوں کو روتے دیکھتا تو بہت خوش ہوتا تھا کہ معصومیت محفوظ ہے۔ مگر وہ دوبارہ بھی چلی جاتی تھیں۔ پھر واپس آتی تھیں تو نہ آنسو ہوتے تھے' نہ افسردگی۔ اور بعد میں تو وہ جمیل کی خوشامد کرنے لگتی تھیں۔ تو صاحب' آنگن کی بھولی بھالی چڑیوں کو میں نے لہولہان بھی دیکھا اور پھر انڈے ڈبل روٹی کی طرح ان کی سپلائی ہوتے بھی دیکھی تھی...... یہاں' اسی پاکستان میں۔"

عبدالحق اس کی آواز بھی سنتا رہا تھا۔ لیکن وہ دہلی والے گھر میں تھا' جہاں اس نے ماں جی کی' بوا کی' اور دو معصوم لڑکیوں کی برہنہ خون میں نہائی ہوئی لاشیں دیکھی تھیں۔ اور اس کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا تھا۔ اسے بہت بڑا دھچکا لگا تھا۔ یہ پاکستان ہے...... اور یہ مسلمان ہیں۔ واقعی حمید نے سچ کہا' یہ تو مشرکوں سے بھی بدتر ہیں۔ جمیل جیسے بھی اور ان افسروں جیسے بھی' جو معصوم اور بے سہارا لڑکیوں کو اپنی ہوس کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ لفظ بھڑوا اس نے دہلی میں بہت سنا تھا۔ وہ بس یہ جانتا تھا کہ یہ ایک بری گالی ہے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں' اور یہ لفظ ان کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر عبدالحق نے کہا۔ "یہ بات تمہیں مسعود صاحب کو بتا دینی چاہیے

تھی۔"

"مجھے ابھی چند روز پہلے ہی تو معلوم ہوا ہے۔ پھر میں سوچتا رہا کہ بتاؤں یا نہ بتاؤں۔ اپنے بڑے صاحب جیسے لوگ اس پاکستان میں بڑی نعمت ہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے شکایت کی تو ہم اس سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ یہ جمیل جیسے لوگ بہت گھٹیا' بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ اور پھر اس کے تعلقات بھی بہت بڑے لوگوں سے ہیں۔ اب دیکھ لو کہ بڑے صاحب اسے برخواست نہیں کرا سکے۔ بس تبادلے پر بات ٹلی اور پھر یہاں ایک جمیل ہی تو نہیں' اور بھی بہت ہوں گے اس جیسے۔"

"لیکن ایسے لوگوں کو کم نہیں کیا گیا تو یہ بڑھتے رہیں گے۔"

"میرے خیال میں اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ اچھے لوگوں کی طاقت کم نہ ہو۔"

اسی وقت افضال صاحب آ گئے۔ ان کی گفتگو رک گئی۔

"افضال صاحب' کل سے میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔" عبدالحق نے افضال صاحب سے کہا۔

"کیوں بھئی؟"

"مجھے بھی کسی کی تلاش ہے۔"

"ضرور چلنا۔ مگر ٹانگوں کی تھکن کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ کھوئے ہوئے تو بس اللہ کے حکم سے ملتے ہیں۔"

"آپ کو بھی تو آپ کے بچھڑے ہوؤں میں سے کوئی نہیں ملا۔ پھر بھی آپ ہر روز کوشش کرتے ہیں۔"

"کوشش کرنا تو ہمارا کام ہے نا۔ آگے اللہ کی مرضی۔"

❁ ❁ ❁

نور بانو نے رابعہ سے اس خونی رات کی پوری کہانی' پوری تفصیل کے ساتھ سن لی تھی۔ سنتے ہوئے چند ایک باتیں تو اسے دھندلی دھندلی سی یاد آئیں' جیسے وہ پہلے بھی سن چکی ہو۔ پھر رابعہ کو یہ باتیں تو وہ پہلے ہی بتا چکی ہے۔ اس سے نور بانو کی سمجھ میں آیا کہ وہ اس وقت کس کیفیت میں ہو گی۔ صورت حال ہی ایسی تھی کہ وہ بری طرح ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔

بہرحال اب سب کچھ شعور میں آ گیا تھا۔ اب کوئی بات خود سے چھپی نہیں تھی۔ اس سے پہلے اسے آخری بات جو یاد تھی' وہ اپنی بہنوں کی خون میں نہائی ہوئی بے لباس لاش دیکھنا تھا۔ اس کے بعد گھبرا کر بستروں کے بکس میں جا گھسی تھی۔ پھر کوئی آواز سنائی دی تھی اور بکس کھولا گیا تھا۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں تھا۔

رابعہ سے سن کر اس نے کڑیاں ملائیں اور واقعات کو مربوط کر لیا۔ تصویر کچھ اس طرح بنی۔
حملہ آوروں نے گلی کے تمام گھروں کے دروازے باہر سے بند کر دیے تھے۔ زبیر بھائی بھی بے بس تھے۔ ان کی اور رابعہ کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ گھر کے اندر سے ایسی دردناک اور فلک شگاف چیخیں سنائی دے رہی تھیں کہ یقیناً پورا محلہ جاگ اٹھا ہوگا لیکن کسی کو باہر نکل کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی ہوگی۔ کسی نے کوشش بھی کی ہوگی تو بند دروازوں کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکا ہوگا۔

پھر جب نیچے سکوت طاری ہوئے کچھ دیر ہوگئی تو عبدالحق کی واپسی ہوئی۔ گھروں کے بند دروازے دیکھ کر اسے گڑبڑ کا احساس ہوا ہوگا اپنے گھر کے بالائی حصے کا دروازہ بھی اسے باہر بند ملا۔ البتہ نچلے حصے کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔

یہ طے تھا کہ تباہی کے بعد اس گھر میں سب سے پہلے گھسنے والا شخص عبدالحق تھا۔ اندر اسے صرف لاشیں ملیں۔ اور بھنچی بھنچی سسکیوں کی آواز اسے صندوق تک لے گئی۔ پھر وہ وہاں سے نور بانو کو اٹھا کر اوپر لے گیا۔

عبدالحق نے سختی سے کہہ دیا تھا کہ اس لڑکی کی موجودگی کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کے گھر میں یہ لڑکی غیر محفوظ ہوگی۔ اور اگر مسلمانوں کو یہ معلوم ہوگیا کہ یہ ہمارے ہاں ہے تو وہ یہاں رہنے نہیں دیں گے۔ وہ بہت شرمندہ تھا۔ اس نے ماں جی سے وعدہ کیا تھا کہ جان دے کر بھی ان سب کی حفاظت کرے گا اور وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا۔ اب نور بانو اس کے لیے بہت قیمتی تھی وہ محفوظ رہتی تو اس کی شرمندگی کسی حد تک کم ہوتی۔

''یہ ہے میری اہمیت۔ چلو، کچھ تو ہے۔'' نور بانو نے حسرت سے سوچا۔ پھر اس نے رابعہ سے کہا۔ ''آپا، وہاں سب لوگ میرے بارے میں جانتے تھے۔ انہوں نے سوچا تو ہوگا کہ میں کہاں گئی۔''

''ہاں...... عورتوں میں یہ باتیں ہوئی تھیں۔'' رابعہ نے بتایا۔ ''ایک عورت بولی، اٹھا کر لے گئے ہوں گے موئے اس کو۔ اور یہ بات سب کی سمجھ میں آگئی۔'' یہ سب کچھ سننے کے بعد نور بانو بہت روئی...... دو دن تک روتی رہی۔ وہ تو جانے والوں کا ماتم بھی نہیں کر سکی تھی۔ سو اب کر رہی تھی۔

مگر تیسرے دن اسے احساس ہوا کہ اس کے سینے پر سے کوئی چٹان سا بوجھ ہٹ گیا ہے۔ کبھی اس نے خود کو اتنا ہلکا پھلکا محسوس نہیں کیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اب باجی کے بارے میں اس کا سوچنے کا انداز مختلف تھا۔ وہ اس کی مظلوم شہید بہن تھی، رقیب نہیں۔ پہلی بار ایسا ہوا کہ اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہی کہ عبدالحق نے باجی کو دیکھا تھا یا نہیں۔ اور پہلی بار اس نے بغیر کسی اندرونی مزاحمت کے تسلیم کیا کہ عبدالحق کے اس پر بڑے احسانات ہیں۔

وہ دو دن اس کے ایسے گزرے تھے کہ وہ ماضی میں زندہ رہی تھی۔ سچ پوچھو تو اسے اپنا خیال بھی نہیں تھا۔ ایسے میں بس ایک مینو تھا، جو وقتاً فوقتاً اسے ماضی سے حال میں کھینچ لاتا تھا۔ وہ باہر نہیں نکلی تو وہ اس کے کمرے میں چلا آیا اور اس کے پیروں پر سر رگڑنے لگا۔ اس نے چونک کر دیکھا تو اسے بے زبان جانور پر بڑا ترس آیا۔ ارے...... یہ تو بھوکا ہوگا۔ اس نے سوچا۔ اور کسی کے ہاتھ سے تو یہ کچھ کھائے گا بھی نہیں۔ تب وہ اٹھی اور اس نے مینو کو کھلایا۔ مگر پھر مینو اس سے چپک ہی گیا۔ شاید وہ بے زبان جانور کا خوف تھا۔ ایک مالک کو تو وہ کھو چکا تھا۔ اب دوسرے مالک کو نہیں کھونا چاہتا تھا۔ اس لیے اسے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

نور بانو نے جو یہ صورت حال دیکھی تو محبت بھرے لہجے میں اسے ڈپٹا۔ ''اے مینو...... یہاں گندگی نہ کرنا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

جواب میں مینو نے مئیں مئیں کر کے گویا اسے یقین دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اور واقعی ایسا ہوا بھی نہیں۔

اب اسے احساس ہوا کہ پچھلے دو دن سے اس نے اماں کی خبر بھی نہیں لی انہیں پوچھا بھی نہیں۔ اس نے چادر اوڑھی اور اماں کے کمرے کی طرف چل دی۔ مینو بھی اس کے پیچھے لگ لیا۔

''اب تم کیا میرے پیچھے ہی لگے رہو گے؟'' اس نے کہا۔

مینو نے ہلکی سی مئیں مئیں کر دی۔ جیسے شرمندہ ہو رہا ہو۔

❁ ❁ ❁

حمیدہ بہت بے چین اور مضطرب تھی۔ اب تو وہ بس ایک ہی بات سوچتی تھی۔ کسی طرح عبدالحق کی نور بانو سے شادی ہو جائے۔ وہ دونوں ہی اپنے دل کی بات اس پر کھول چکے تھے۔ یہ الگ بات کہ ایسا انجانے میں ہوا تھا۔ حمیدہ نے اپنا لائحہ عمل بھی طے کر لیا تھا۔ ایک طرف وہ عبدالحق کے جلد از جلد لوٹ کر آنے کی دعا کرتی تھی تو دوسری طرف اسے یہ فکر بھی تھی کہ اس کی آمد سے پہلے نور بانو کو ہموار کر لے۔

آنکھیں تو اس کی بالکل ٹھیک ہوگئی تھیں۔ بس کبھی کبھی کھٹک سی ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ عرق گلاب باقاعدگی سے ڈالتی رہیں تو کچھ دن بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔

نور بانو باقاعدگی سے اس کے پاس آتی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں عرق گلاب ڈالتی اور پھر دیر تک اس کے پاس بیٹھ کر اس کی باتیں سنتی۔ خود وہ بہت کم بولتی تھی۔ البتہ عبدالحق کا تذکرہ نکلتا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگتیں۔

ادھر حمیدہ نے نور بانو سے بات چھیڑنے کا فیصلہ کیا اور ادھر وہ غائب ہوگئی پورا دن ہوگیا،

اور وہ نہیں آئی۔ دوسری صبح بھی دن چڑھے تک اس کی صورت نظر نہیں آئی تو وہ پریشان ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ رابعہ کو آواز دے کر بلائے اور اس سے کہہ کر نور بانو کو بلوائے۔ مگر یہ سوچ کر رہ گئی کہ نجانے کیا بات ہو...... بلوانا مناسب بھی ہو یا نہ ہو۔

دوپہر کو رابعہ خود اس کے پاس چلی آئی۔ ''کیسی ہو اماں؟''

''بس اب دل نہیں لگتا عبدالحق کے بنا۔'' حمیدہ نے کہا۔ ''خیر تُو سنا کیسی ہے تُو؟''

''اچھی ہوں اماں۔ اللہ کا شکر ہے۔'' رابعہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ پھر وہ جھجکتے جھجکتے بولی۔ ''اماں' ایک خوش خبری ہے۔''

''تو سنا دے نا۔ خوش خبری سنانے میں کنجوسی نہیں کرتے۔ میں تو کب سے انتظار کر رہی ہوں۔''

رابعہ نے چونک کر سر اٹھایا اور اسے دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور وہ مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی۔ رابعہ نے پھر نظریں جھکا لیں۔ ''اماں...... میں ماں بننے والی ہوں۔''

''اللہ مبارک کرے...... نیک اور نصیب والی اولاد عطا فرمائے۔'' حمیدہ نے کہا۔ ''دیکھ تو میں بھی رہی تھی۔ اب اندھی تو نہیں ہوں میں۔'' پھر اس کے لہجے میں شکایت در آئی۔ ''میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ کوئی اپنا سمجھے تو بتائے گا نا۔''

رابعہ تڑپ گئی۔ ''ایسا نہ کہو اماں۔ اب تمہارے اور مالک کے سوا ہمارا ہے کون۔''

''تو پھر خوش خبری سنانے میں اتنی دیر کیوں؟''

''بس اماں' شرم آتی تھی مجھے۔'' رابعہ نے نظریں جھکائے کہا۔

اس لمحے حمیدہ ایک بیٹی کی تجربہ کار ماں بن گئی۔ حالانکہ وہ سمجھتی تھی کہ اسے وہ سب کچھ یاد ہی نہیں ہے' جو وصال دین کی دادی نے اسے سمجھایا تھا۔ مگر وہ تو کہیں گہرائی میں محفوظ تھا۔ وہ رابعہ کو سمجھانے لگی کہ اسے کیا کرنا چاہیے' کیسے کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ کون کون سا وقت زیادہ نازک ہوتا ہے۔ کن کن معاملات میں احتیاط کرنی ہے۔

رابعہ بڑی توجہ سے سنتی رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''یہ آنسو کیسے؟'' حمیدہ نے پوچھا۔

''کچھ نہیں اماں' ماتا جی یاد آ گئی تھیں۔ وہ ہوتیں تو ایسے ہی سمجھاتیں مجھے۔''

''تو میں بھی تو تیری ماں ہوں پگلی!'' حمیدہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

چند لمحوں کے بعد حمیدہ کو خیال آیا کہ رابعہ سے نور بانو کے بارے میں پوچھنا ہے۔ ''یہ نور بانو کہاں ہے۔ پرسوں سے میرے پاس نہیں آئی ہے وہ۔''

رابعہ نے اسے نور بانو کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ ''اسی دن سے بس رو رہی ہیں۔

اپنے کمرے سے بھی نہیں نکلیں۔'' وہ بولی۔ ''کھانا بھی میں کمرے میں لے جاتی ہوں۔ بس تھوڑا سا کھا لیتی ہیں۔ کہتی ہیں' دل ہی نہیں چاہتا۔''

''قدرتی بات ہے۔'' حمیدہ نے کہا۔ ''مرنے والوں کو جب تک رو نہ لے آدمی' قرار نہیں آتا۔ غم دل پر بیٹھ جائے تو برا ہوتا ہے۔ آنسوؤں میں بہہ جائے تو شفا ہو جاتی ہے۔''

''پر ایسا کب تک چلے گا اماں۔''

''دیکھ لینا' وہ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی۔'' حمیدہ نے بڑے یقین سے کہا۔ ''اور یہ بھی دیکھ لینا کہ پہلے سے اچھی ہو جائے گی ان شاء اللہ۔ خوش مزاج ہو جائے گی۔ پہلے چپ چپ رہتی تھی نا۔ اب ہنسے بولے گی بھی۔''

''مجھے تو ایسا نہیں لگتا اماں۔ رو رو کے آنکھیں سجا لی ہیں۔''

''قدرتی بات ہے۔ بس تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دے۔''

اور ہوا بھی یہی۔ دو دن نور بانو نے باورچی خانے کا رخ بھی نہیں کیا تھا۔ حالانکہ کھانا پکانے میں وہ بہت دلچسپی لیتی تھی لیکن تیسرے دن وہ خود ہی باورچی خانے میں چلی آئی۔ ''کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے رابعہ سے پوچھا۔

''کھانا پکا رہی ہوں۔''

''آپ چھوڑ دیں۔ میں پکا لوں گی۔''

''ٹھیک ہے منجھلی بی بی۔''

نور بانو کو احساس تھا کہ دو دن سے وہ اماں سے دور ہے۔ اب اس کی تلافی کرنا تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اماں کو سرسوں کا ساگ بہت پسند ہے۔ وہ اس نے رابعہ سے پکانا سیکھا تھا۔ لیکن پھر اس میں کچھ جدت اور مسالوں میں دہلی والوں کے کچھ اضافے بھی شامل کر دیے تھے۔ اور جب اماں نے پہلی بار اس کا پکایا ہوا ساگ کھایا تو حیران رہ گئی تھیں۔ اتنے مزے کا ساگ تو پہلے کبھی نہیں کھایا میں نے' سو نور بانو نے وہی ساگ پکا لیا۔ مکئی کی روٹی البتہ وہ کبھی نہیں پکا سکی تھی۔ وہ رابعہ ہی کی ذمہ داری تھی۔

کھانا لے کر وہ حمیدہ کے کمرے میں چلی گئی۔ ''لیجیے اماں...... کھانا لیجیے۔''

حمیدہ نے بہت غور سے اسے دیکھا اس کا اندازہ درست تھا۔ غم بالآخر ڈھل گیا تھا۔ نور بانو کی آنکھیں تو ضرور متورم تھیں لیکن وہ پہلے کے مقابلے میں بہت نکھری نکھری لگ رہی تھیں۔ ''آ بیٹی تو بھی میرے ساتھ بیٹھ جا۔''

''آپ کھائیں اماں۔ میں بعد میں کھا لوں گی۔''

مگر حمیدہ اپنے سوچے سمجھے لائحہ عمل پر چل پڑی تھی۔ اس نے آہ بھر کے کہا۔ ''اب تو میرے

ساتھ ہی کھایا کر بیٹی۔ کچھ ہی دن کی تو بات ہے۔''

نور بانو اس بات کا مطلب پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر اسی لمحے دروازے کی طرف سے قریب آتی مَیں مَیں کی آواز سنائی دی اور اگلے ہی لمحے مینو کمرے میں آ گیا۔ وہ نور بانو کے پاس آ کر اس کے گھٹنے پر دھیرے دھیرے ٹکریں مارنے لگا۔ پھر اس نے نور بانو کی چادر کو سونگھا اور اس سے سر رگڑنے لگا۔

حمیدہ یہ سب کچھ بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ یہ تو اسے معلوم تھا کہ عبدالحق کے جانے کے بعد مینو نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ مگر پھر نجانے کیسے نور بانو نے اسے بہلا لیا۔ یہ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ایسا کیوں کر ہو گیا۔

مگر اسی وقت حمیدہ کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا اور اسے اپنی ناسمجھی پر بہت غصہ آیا۔

اچھے خاصے عرصے سے وہ نور بانو کو یہ چادر اوڑھے دیکھ رہی تھی۔ دو ایک بار اسے خیال آیا کہ یہ مردانہ چادر ہے۔ مگر اس نے سوچا کہ نور بانو کو پردے کا بہت خیال رہتا ہے' اس لیے بڑی ہونے کی وجہ سے وہ یہ چادر اوڑھتی ہے۔ اسے کبھی یاد نہیں آیا کہ یہ تو عبدالحق کی چادر ہے' جو وہ ہر وقت اوڑھتا تھا۔ لیکن اس وقت مینو کو اس چادر سے سر رگڑتے اور سونگھتے دیکھ کر اسے یہ بات یاد آ گئی۔ یہ اس بات کا ایک اور ثبوت تھا کہ نور بانو عبدالحق سے محبت کرتی ہے۔ مینو ہی کے حوالے سے اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ جو کپڑا آدمی کے جسم سے لگا رہے' اس میں آدمی کے جسم کی خوشبو رچ جاتی ہے۔ عبدالحق کی یاد سے اور اس کی جدائی سے بے حال نور بانو نے بھی عبدالحق کی خوشبو کو اوڑھ لیا تھا۔ اور اس خوشبو نے ہی مینو کو رام کیا ہو گا۔

نور بانو اس کی نظروں اور سوچوں سے بے خبر اپنی ہتھیلی پر ساگ رکھ کر مینو کو کھلا رہی تھی' اور وہ بڑی رغبت سے کھا رہا تھا۔ بلکہ ہر بار اور مانگتا تھا۔ ''تو تم مجھے نہیں کھانے دو گے؟'' نور بانو نے بڑے لاڈ سے کہا۔

''تُو نے اس کی عادتیں بہت بگاڑ دی ہیں بیٹی۔''

''نہیں اماں' اس کی عادتیں تو پہلے ہی سے بگڑی ہوئی تھیں۔''

''پر تُو نے اس کا دل کیسے جیت لیا؟''

نور بانو کے چہرے پر رنگ سا دوڑ گیا۔ ''پتا نہیں اماں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ حمیدہ چادر کو بہت غور سے دیکھ رہی ہے۔ اگر یہ پول کھل گئی تو کیا ہو گا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ وہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''آپ کھانا کھائیں نا اماں۔''

''کھانا' تیرے ساتھ ہی کھاؤں گی۔''

''یہ مینو مجھے کہاں کھانے دے گا۔''

مگر مینو نے جیسے بات سمجھ لی۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹا اور نیچے بیٹھ گیا۔ ''چلیں اب کھائیں اماں۔''

دونوں کھانا کھانے لگیں۔ اچانک حمیدہ نے کہا۔ ''تُو روز میرے ساتھ کھانا کھایا کر دھی میری۔ دیکھو نا' کچھ ہی دن کی تو بات ہے۔ پھر تُو کہاں' میں کہاں۔''

''یہ..... کیوں کہہ رہی ہیں آپ۔'' نور بانو نے دل گرفتگی سے کہا۔

''سچ سے آنکھیں چرانے سے سچ تو نہیں بدل جاتا۔''

''کس سچ کی بات کر رہی ہیں آپ؟''

''اس سچ کی کہ تُو پرائی ہے۔ اب دیکھو نا' عبدالحق کسی بھی طرح تیرے چچا کو ڈھونڈ نکالے گا۔ پھر تُو اپنے چچا کے ساتھ چلی جائے گی۔ پھر تُو کہاں اور ہم کہاں۔'' حمیدہ نے ایک گہری سرد آہ بھری۔ ''میں تو کہتی ہوں' اب تُو کھانا پکانا بھی چھوڑ دے۔ ہماری تو عادتیں خراب ہو گئی ہیں۔ ابھی سے اس سواد کو بھلانے کی کوشش کریں۔ تیرے بعد کون کھلائے گا ایسا کھانا۔''

نور بانو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تاہم وہ ضبط کی کوشش کرتی رہی۔

''تُو دل چھوٹا کیوں کرتی ہے پگلی۔'' حمیدہ نے اسے بہت غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تُو تو اپنوں میں چلی جائے گی۔ کچھ دن ہم یاد رہیں گے۔ پھر بھول جائے گی۔''

نور بانو ابھی دو دن پرانے زخموں کی تکلیف جھیل کر بہ مشکل سنبھلی تھی کہ ایک نئے مہیب دکھ کا امکان نظر آنے لگا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ حمیدہ اس کی پیٹھ تھپکنے لگی۔ ''لے..... تجھے کیا ہو گیا ہے۔ روئیں گے تو ہم تجھے کھو کر۔ تُو تو اپنوں میں ہو گی۔''

''آپ کیسی باتیں کرتی ہیں اماں۔'' نور بانو نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔ ''آپ لوگوں سے بڑھ کر اب میرا اپنا کون ہے۔''

''دیکھ' وہ تو تیرے سگے چچا ہیں...... تیرے باپ کی جگہ۔''

اچانک نور بانو کے دل میں ایک ایسی طاقت ور شکایت ابھر آئی۔ جس سے وہ اس لمحے سے پہلے بے خبر تھی۔ وہ رونا بھول گئی اور تلخ لہجے میں بولی۔ ''باپ کی جگہ! خوب حق ادا کیا انہوں نے اس رشتے کا۔ کبھی ہمیں پوچھا بھی نہیں کہ کس حال میں ہیں۔ ہندوستان چھوڑتے ہوئے۔ یہ خیال بھی نہیں آیا کہ ہمیں بھی ساتھ لے لیں۔ حالات خراب ہونے سے پہلے وہ یہاں آ گئے تھے۔ ہمیں انہوں نے پوچھا بھی نہیں۔ اگر انہیں ہمارا خیال آ گیا ہوتا تو میری امی اور بہنوں پر' آکا میاں اور بوا پر وہ قیامت کبھی نہ ٹوٹتی۔'' وہ پھر رونے لگی۔

''ہوتا وہی ہے دھیے جو رب کو منظور ہو۔ جو ہوا' وہ ایسے ہی ہونا تھا۔'' اب حمیدہ سچ مچ اسے تسلی دے رہی تھی۔ ''لیکن خون کے رشتے بڑی سے بڑی شکایت سے بھی نہیں ٹوٹتے۔ آخر وہ

تیرے سگے چچا ہیں۔"

"انہیں تو اس وقت ہم میں سے کوئی یاد بھی نہیں ہوگا۔ انہیں کیا معلوم کہ ہم پر کیا گزری۔ کون جیتا ہے اور کون مر گیا۔"

"پھر بھی وہ تیرے وارث ہیں۔ اور تُو نے خود ہی تو عبدالحق سے وعدہ لیا تھا......"

"مجھ پر تو قیامت گزری تھی اور میں اس وقت اس سے سنبھلی بھی نہیں تھی۔ میں تو اس وقت کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل بھی نہیں تھی۔ اور انہوں نے تو اسی وقت زبیر بھائی کو آگرے بھیج دیا تھا۔ مگر چچا جان پاکستان جا چکے تھے۔ وہ وعدہ تو انہوں نے اسی وقت پورا کر دیا تھا۔"

"پر اسے تو تُو نے نہیں بتائی تھی یہ بات۔"

نور بانو جھجک گئی' شرما گئی۔ "تو میں ان سے بات کب کرتی ہوں۔"

"اب یہ بھی غلط ہے کہ ایک گھر میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے سے بات بھی نہ کریں۔"

"میں...... میں کیا کروں اماں...... شرم آتی ہے مجھے۔ اور اگر انہوں نے مجھے بتایا ہوتا کہ وہ اس کام سے لاہور جا رہے ہیں تو میں انہیں منع کر دیتی۔ مگر دیکھیں نا' وہ بھی تو بات نہیں کرتے مجھ سے"۔ اس کے لہجے میں شکایت اتر آئی۔

حمیدہ اندر ہی اندر خوش ہوئی یہ سن کر۔ "اب تم دونوں بے وقوف ہو تو کوئی کیا کرے۔ چل اب کھانا تو کھا۔"

"آپ کھائیں اماں۔ میری تو بھوک ہی اُڑ گئی ہے۔"

"نا میری دھی' تیرے بغیر تو میں نہیں کھاؤں گی۔"

"ضد نہ کریں اماں۔ مجھ سے کھایا ہی نہیں جائے گا۔"

"دیکھ بیٹی' کوئی مشکل ہوتی ہے تو اس کا حل بھی ہوتا ہے۔" حمیدہ نے بڑی محبت سے کہا۔ "بس ذرا سوچنا پڑتا ہے۔ کھانا پینا چھوڑنے سے کام نہیں چلتا۔ الٹا کمزور ہو جاتا ہے آدمی۔ میں بھی نہیں چاہتی کہ تُو یہاں سے جائے۔ میری تو کوئی دھی تھی ہی نہیں۔ تُو ملی تو سوچا' خدا نے مجھے بیٹی دے دی ہے۔ پھر جب تیرے چچا کا پتا چلا تو میں نے سوچا کہ تُو پرائی ہے۔ تجھے تو جانا ہوگا۔ پر دل نہیں چاہتا کہ تُو جائے۔ میں سوچتی ہوں کہ یہ تو خود غرضی ہے۔ میں اپنی خوشی کے لیے تیری خوشی خراب کر رہی ہوں۔ اچھا' کھانا تو کھا' دیکھ اللہ پر یقین رکھ۔ میں سوچتی ہوں۔ کوئی صورت نکل آئے گی۔"

نور بانو بے دلی سے کھانے لگی۔ حمیدہ بھی اب کھا رہی تھی۔

اچانک حمیدہ نے کہا۔ "ایک بات سچی سچی بتا۔ تُو یہاں سے جانا تو نہیں چاہتی نا؟"

نور بانو کے جواب دینے سے پہلے نیچے بیٹھے مینو نے بے قراری سے مَیں مَیں کی آواز نکالی۔ "تُو چپ بیٹھا رہ۔" حمیدہ نے اسے ڈپٹا۔ "بڑوں کی باتوں میں دخل نہیں دیتے۔ ہاں بیٹی تُو بتا۔"

"میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی اماں۔"

"لیکن تیرے چاچا آئیں تو ہم انہیں منع بھی نہیں کر سکتے......"

"کیوں منع نہیں کر سکتے۔ انہیں ہماری کون سی پروا......"

حمیدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ تُو میرے سامنے تو کہہ سکتی ہے' ان کے سامنے زبان نہیں کھلے گی تیری۔ میں نے کہا نا تُو کھانا کھا۔ یہ سوچنے کا کام مجھ پر چھوڑ دے۔"

نور بانو نے ایک لقمہ لیا اور دھیرے دھیرے چبانے لگی۔

حمیدہ کھا تو رہی تھی لیکن کسی گہری سوچ میں تھی۔ پھر اچانک اس نے کہا۔ "ایک ترکیب ہے تو سہی۔"

نور بانو نے پُر امید نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"یہ تو لازم ہے کہ ہم تجھے تیرے چاچا کے سپرد کر دیں۔ اور پھر اس سے تجھے مانگ لیں۔"

"کیسے مانگ لیں گی؟" نور بانو کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"تُو تو بالکل ہی ناسمجھ ہے۔ میرا مطلب ہے' تیرا رشتہ مانگ لیں گے ان سے۔"

"میرا رشتہ! مگر کس کے لیے؟"

حمیدہ نے ماتھے پر بہت زور سے ہاتھ مارا۔ "ارے یہاں ہے کون تیرے قابل...... عبدالحق کے سوا۔"

عبدالحق کا نام سن کر نور بانو جیسے سن ہو گئی۔ پھر سنبھل کر بولی

"کوئی زبردستی ہے۔ یہ تو زیادتی ہوگی۔"

لیکن حمیدہ اس بار کام مکمل کیے بغیر پیچھے ہٹنے والی نہیں تھی۔ "اب تجھے اس پر اعتراض ہے تو کچھ نہیں کیا جا سکتا۔"

"م م...... مم...... مجھے کوئی اعتراض نہیں......" نور بانو گڑبڑا گئی۔

"زیادتی بھی کہہ رہی ہے اور کہتی ہے' اعتراض بھی نہیں ہے۔" حمیدہ نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"یہ زیادتی میرے ساتھ تھوڑی ہے......" نور بانو نے معصومیت سے کہا۔

"تو پھر؟"

"یہ تو ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔"

''تیرا مطلب ہے' عبدالحق کے ساتھ؟''

نور بانو نے نگاہیں جھکائیں اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہ تُو کیسے کہہ سکتی ہے۔''

''مجھے معلوم ہے کہ میں ان کے قابل نہیں ہوں۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ کسی اور سے محبت کرتے ہیں۔''

اس بار حمیدہ کو جھٹکا لگا...... ایک نئی پیچیدگی۔ اور نور بانو اتنے یقین سے کہہ رہی تھی۔ ''کس سے محبت کرتا ہے وہ؟''

''میری باجی سے۔''

''لیکن وہ تو......''

''جی اماں۔ وہ دہلی میں شہید ہوگئی تھیں۔'' نور بانو نے اداسی سے کہا۔

حمیدہ نے سکون کا سانس لیا۔ ''تُو یہ بتا' تجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔''

نور بانو نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''لیکن اماں' یہ ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ میں کسی طرح بھی ان کے قابل نہیں۔''

''پاگل ہے تُو تو۔ بلکہ دونوں ہی پاگل ہو۔ پتا ہے' یہ بات اس سے بھی پوچھی تھی میں نے۔ اور اس نے بھی یہی جواب دیا تھا۔ خیر اب مجھے اطمینان ہوگیا۔ نہ تجھے کوئی اعتراض ہے نہ اسے۔ اور تم دونوں بے وقوف ہو۔''

نور بانو ہکا بکا رہ گئی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ عبدالحق نے بھی یہی کہا...... وہ خود کو میرے قابل نہیں سمجھتے۔ حالانکہ میں سچ مچ ان کے قابل نہیں ہوں۔ انہوں نے ایسا کیوں سمجھا؟ اور وہ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟ ارے...... میں کیا' میرے خیال میں تو دنیا کی کوئی لڑکی بھی ان کے قابل نہیں۔ ایسے لوگ تو نصیب سے ہی ملتے ہیں۔ وہ حیران ہو کر سوچتی رہی۔

''اب تجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' حمیدہ نے اسے ٹوکا۔ ''سب مجھ پر چھوڑ دے۔ تُو یہاں سے کہیں نہیں جائے گی۔''

نور بانو نے ایک نظر احسان مندی سے اسے دیکھا' اور فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔

''بس اب تُو کھانا کھالے سکون سے۔ اور مجھے بھی کھانے دے۔''

اس لمحے نور بانو کو احساس ہوا کہ اسے تو بہت شدید بھوک لگی ہے!

❁ ❁ ❁ ❁

دنیا ایسی رنگین ہوگی' یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اس نے افضال صاحب سے جب ان کے ساتھ چلنے کو کہا تو وہ بڑے حیران ہوئے۔ ''تھکن

چاہتے ہو؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا مطلب؟''

''میں تو یہاں چلتا رہتا ہوں بس۔ چلے جاتا ہوں' چلے جاتا ہوں۔''

''تو آپ بھی تو تھک جاتے ہوں گے؟''

''یہ تو کبھی خیال ہی نہیں آیا۔'' انہوں نے بے حد سادگی سے کہا۔ پھر اچانک پوچھا۔ ''کیا تمہیں بھی کسی کی تلاش ہے؟'' لہجے میں تجسس تھا۔

''جی ہاں۔ مجھے بھی کسی کو ڈھونڈنا ہے۔''

''اللہ تمہیں کامیاب کرے۔'' افضال صاحب نے خلوص سے کہا۔

افضال صاحب تیز نہیں چلتے تھے۔ شاید اس لیے کہ ان کی کوئی منزل نہیں تھی۔ وہ بہت آہستہ چلتے تھے' اور ان کی نظریں گرد و پیش کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیتی تھیں۔ یہ تو عبدالحق کو بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ صرف لوگوں کو' چہروں کو غور سے دیکھتے تھے۔

عبدالحق کو ذرا دیر میں ہی اندازہ ہوگیا کہ لاہور بہت بارونق شہر ہے۔ وہ زندہ دلوں کا شہر تھا۔ لوگوں کا ایک مخصوص لہجہ تھا...... چہکار سے بھرا' آواز میں بے تکلفانہ پکار۔ ہر شخص زور سے بولتا تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ لاہور والوں کا اپنا مخصوص لہجہ ہے۔ اور رونق دیکھ کر اسے دہلی کا خیال آ رہا تھا۔

وہاں کی رونق میں بہت بڑا دخل ٹھیلے والوں کا تھا۔ لگتا تھا کہ دنیا کی ہر چیز ٹھیلوں پر ملتی ہے۔ موسم کا ہر پھل وہاں موجود تھا۔ انواع و اقسام کے شربت تھے۔ پھر نان چھولے' دال چاول اور کھانے کی ایسی ہی اور چیزیں تھیں۔ اور ہر چیز پر چھائی ہوئی آوازیں تھیں۔ ہر شخص اپنے مال کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ اور تعریف کے انداز بھی بے حد متنوع اور دلچسپ تھے۔ وہ تمام ملی جلی آوازیں ایک دوسرے میں گھل مل کر زندگی کے متحرک احساس کو اجاگر کر رہی تھیں۔

دوپہر کے قریب لوگوں کا ہجوم کافی کم ہوگیا۔ عبدالحق کو تھکن کا احساس ہونے لگا تھا۔ ''اب کہیں بیٹھ نہ جائیں۔'' اس نے افضال صاحب سے کہا۔ افضال صاحب مسکرائے۔

''آپ تھک گئے نا؟''

''تھکن تو ہے۔ اچھا یہ بتائیں' شربت پئیں گے؟''

افضال صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''شربت! پیسے ہیں تمہارے پاس؟'' ان کے انداز میں عجیب سی معصومیت تھی۔

عبدالحق نے جیب تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔ ''پیسے بہت' اس کی آپ فکر نہ کریں۔''

''تم بہت امیر آدمی ہو؟''

"یہ تو مجھے پتہ نہیں۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ اللہ کا دیا سبھی کچھ ہے میرے پاس۔"

"تو چلو سکنجبین پلا دو۔"

وہ ایک ٹھیلے کی طرف بڑھ گئے۔ "آؤ باؤ جی آؤ بزرگو!" ٹھیلے والے نے انہیں سکنجبین کے دو گلاس تھما دیے۔ دونوں وہیں فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر پینے لگے۔ عبدالحق افضال صاحب کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ انہیں ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ شربت انہیں بہت اچھا لگا ہے۔ وہ بہت چھوٹے چھوٹے گھونٹ' مگر بہت جلدی جلدی لے رہے تھے۔ جیسے صبر سے پینا چاہتے ہوں' لیکن اندر بے صبری ہو۔

عبدالحق نے آدھا گلاس پیا ہو گا کہ افضال صاحب نے اپنا گلاس خالی کر کے شربت والے کی طرف بڑھا دیا۔

"اور دوں بزرگو؟" شربت والے نے پوچھا۔

افضال صاحب ایک پل ہچکچائے۔ پھر بڑی بے نیازی سے بولے۔ "ارے نہیں میاں' شربت کوئی پیٹ بھرنے کی چیز تھوڑا ہی ہے۔"

"لیکن دل چاہے تو زیادہ پینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔" عبدالحق نے کہا۔

"اب میاں تم اصرار کرتے ہو تو ایک گلاس اور سہی۔"

عبدالحق کو ان کا رکھ رکھاؤ بہت اچھا لگا۔ وہ یقیناً کسی بہت اچھے گھرانے کے تھے اور خوش حالی دیکھے ہوئے تھے۔ تبھی تو یہ وضع داری تھی ان کے پاس۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ شربت انہیں اچھا لگا ہے۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیے تھے۔ حالانکہ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر دیں۔ پھر دل نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے دوسرے گلاس سے انکار کر دیا۔

عبدالحق نے اپنا گلاس افضال صاحب کے دوسرے گلاس کے ساتھ خالی کیا۔ اس دوران وہ انہیں بہت غور سے دیکھتا رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ ابھی وہ سیر نہیں ہوئے ہیں۔

عبدالحق نے گلاس شربت والے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "دو گلاس اور دو۔"

"ارے میاں' اب کیا حلق تک بھروا دو گے۔" افضال صاحب نے احتجاج کیا۔

"میری خاطر۔" عبدالحق نے التجائیہ لہجے میں کہا۔ "دیکھیں نا' میرا دل چاہ رہا ہے اور شربت پینے کو۔"

"تو تم پی لو۔"

"اکیلے پینا تو اچھا نہیں لگے گا۔ آپ کا احسان ہو گا مجھ پر۔"

"ارے میاں اس میں احسان کیسا۔" افضال صاحب نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر بے

ساختہ ان کے منہ سے نکلا۔ "احسان تو تم نے کیا ہے ہم پر۔"

عبدالحق کو اس لمحے ان پر بہت شدت سے پیار آیا۔ وہ ہر روز ان سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہوں گے لیکن ان کی جیب میں پیسے نہیں ہوتے ہوں گے۔ شربت پینے کو...... اور نجانے کس کس کو ان کا دل چاہتا ہو گا۔ اور وہ اپنی محرومی کا بوجھ ہر قدم پر بڑھاتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہوں گے۔ کیسے کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں۔ یہ سوچتے ہوئے اسے احساس بھی نہیں تھا کہ ابھی اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا ہے۔ کیسے کیسے لوگ دیکھنے ہیں اسے...... بھانت بھانت کے۔

شربت پینے کے بعد اس نے شربت والے سے پوچھا۔ "کتنے پیسے ہوئے؟"

"ڈھائی آنے بنتے ہیں باؤ جی' پر تسی دوانی دو۔"

"دوّنی کیوں پورے پیسے لو نا۔" عبدالحق نے جیب سے چونی نکال کر اسے دی۔

شربت والے نے دوّنی اس کی طرف بڑھائی۔ "اپنی خوشی سے چھوڑ رہا ہوں باؤ جی۔"

عبدالحق کو اچھا نہیں لگا۔ "میں کوئی ضرورت مند نہیں ہوں۔ پیسے ہیں میرے پاس۔" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تم پورے پیسے کاٹو۔"

"برا مان گئے باؤ جی۔" شربت والے نے دل گرفتگی سے کہا۔ "میں تو بہت غریب آدمی ہوں جی۔ ادھر سے جو لوگ لٹ کٹ کے آئے ہیں' ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ پر دل تو تڑپتا ہے نا کچھ کرنے کو۔ تو بس ایسے ہی کر لیتا ہوں۔ دل خوش ہو جاتا ہے تھوڑا سا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

عبدالحق کے دل پر اثر ہوا تھا۔ پھر افضال صاحب نے اس کا ہاتھ تھام کر دبایا' جیسے کہہ رہے ہوں' اس سے بحث نہ کرو۔ اس نے شربت والے سے کہا۔ "شکریہ بھائی' بہت شکریہ۔"

وہ دونوں کچھ دور نکل آئے تو افضال صاحب نے کہا۔ "دلوں کو پہچاننا سیکھ بیٹے۔ یہ بڑے مخلص' بڑے درد مند لوگ ہیں۔ حیثیت کے چھوٹے' دل بہت بڑے۔ یہ جو دو پیسے اس نے چھوڑے' تمہارے لیے ان کی کوئی وقعت نہیں لیکن اس کے نزدیک ہے۔ یہ اس کا ایثار ہے...... پاکستان کے لیے۔ وہ تمہاری بے عزتی نہیں کر رہا تھا۔ اپنی نظر میں اپنی عزت بحال کر رہا تھا۔"

عبدالحق دہل کر رہ گیا۔ افضال صاحب کا کہا ہوا ایک ایک لفظ سچا بھی تھا اور اہم بھی۔ نوکروں کی رعیت کی وفاداری تو اس کے لیے جانی پہچانی تھی لیکن عام آزاد لوگوں کا یہ جذبۂ ایثار اس کے لیے بالکل نیا تھا۔

"مجھے معاف کر دیجیے۔ میں اسے سمجھ ہی نہیں سکا تھا۔"

"دیکھو گے تو سمجھو گے نا۔ ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ میرے ساتھ چلتے رہو اور دیکھتے رہو۔"

"فی الحال تو بیٹھنے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"تو یہ کون سا مسئلہ ہے۔ چلو میرے ساتھ۔"

وہ افضال صاحب کے ساتھ چلتا رہا۔ آگے ایک پارک تھا۔ وہ پارک میں داخل ہوئے اور ایک بینچ پر جا بیٹھے۔ پارک میں اچھے خاصے لوگ تھے۔ زیادہ تر گھاس پر پاؤں پھیلائے نیم دراز تھے۔ کچھ ان کی طرح بینچوں پر بیٹھے تھے۔ کچھ درختوں کے سائے میں گھاس پر لیٹے بے سدھ سو رہے تھے۔

"یہ بھی ایک بڑا غیر سرکاری کیمپ ہے۔" افضال صاحب نے کہا۔

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ رات کو یہاں لوگ بہت بڑی تعداد میں سوتے ہیں۔"

عبدالحق نے سوچا، گھر سے...... چھت سے محرومی کتنی بڑی ہوتی ہے۔ اور یہ پاکستان بنا ہے تو اس اعتبار سے یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ اس کے نتیجے میں لاکھوں افراد بے گھری میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اب یہ اسی نومولود ریاست کی ذمہ داری ہے کہ ان افراد کی نوآبادکاری کا اہتمام کرے، انہیں گھر فراہم کرے۔

مگر وہ کوئی یک جہتی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کی تو کئی جہتیں تھیں۔ وہ تو بہت بڑا انسانی المیہ تھا۔ لاکھوں افراد زندگی سے محروم ہو گئے تھے۔ لاکھوں افراد کا مرجانا چھوٹی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ لاکھوں انسان قتل ہوئے تھے، انھی جیسے لوگوں نے انھیں قتل کیا تھا۔ یہ بہت بڑے پیمانے پر خون ریزی تھی اور دونوں طرف سے ہوئی تھی۔ ایک طرف سے زیادہ اور دوسری طرف سے کم سہی، دوسری طرف والے چاہے اسے ردعمل کہیں، لیکن خوں ریزی دونوں طرف سے ہوئی تھی۔ اور جب کسی خطے میں اتنے بڑے پیمانے پر قتل عام ہو، لوگ بغیر ذاتی عناد کے، بغیر کسی پہچان کے لوگوں کو قتل کرنے لگیں تو یہ بہرحال مقام فکر ہوتا ہے۔ اس کے کھلے نتائج تو سامنے ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس خطے میں لوگ بڑی تعداد میں وحشت کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ نارمل نہیں رہے۔ تب ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ ان نفسیاتی عوامل اور بیماریوں کو کھوجا جائے، جس میں لوگ مبتلا ہو گئے ہیں۔ تاکہ ان کا علاج، ان کا مداوا کیا جاسکے۔

یہ سب کچھ سوچ کر عبدالحق کو پاکستان پر ترس آنے لگا۔ ہندوستان تو اپنی جگہ جما ہوا، مستحکم اور بہت بڑا ملک تھا۔ وہاں نہ وسائل کی کمی تھی، نہ سسٹم کی۔ ادارے بھی وہاں قائم اور مستحکم تھے۔ ذرائع اور وسائل تمام انہی کے کنٹرول میں تھے۔ بلکہ ان کے وسائل اور بڑھ گئے تھے۔ نقل مکانی تو ادھر بھی ہوئی تھی۔ مگر اس کی نوعیت مختلف تھی...... سود مند تھی...... جو علاقے پاکستان میں تھے، وہاں سے نقل مکانی کرنے والے ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد وہاں سے ہجرت کرنے والوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ اور وہ جو زمینیں اور وسائل پاکستان میں چھوڑ گئے تھے، اس سے کہیں

زیادہ، بہت زیادہ زمینیں اور وسائل مسلمان ہندوستان میں چھوڑ کر گئے تھے۔ لہٰذا ان کی نوآبادکاری کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ جبکہ پاکستان میں صورت حال بالکل برعکس تھی۔ وہاں ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی زمینیں، املاک اور وسائل آنے والے مسلمانوں کے لحاظ سے کم، بہت ہی کم تھے۔

وہ موازنہ بہت عجیب، بہت تکلیف دہ تھا۔ ہندوستان ایک ملک تھا، جسے آزادی ملی تھی۔ وہ ہر اعتبار سے ایک Established ملک تھا۔ اس میں بڑے بڑے شہر تھے، بندرگاہیں تھیں۔ ضرورت کی ہر چیز ان کے پاس تھی...... نہ صرف اپنے لئے، بلکہ پاکستان کے لیے بھی۔ جبکہ پاکستان میں لے دے کر ایک بڑا شہر تھا...... لاہور! پاکستان کے پاس تو اس وقت اپنے لوگوں کے لیے بھی وسائل موجود نہیں تھے۔ اس پر مستزاد لاکھوں کی تعداد میں ہندوستان سے لٹے پٹے تباہ حال مہاجرین کی آمد، اور ان کی نوآبادکاری کے مسائل۔ نوآبادکاری تو بعد کا مسئلہ تھی، پہلے تو انہیں رکھنا اور بنیادی ضرورت یعنی ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرنا ہی بہت بڑا مسئلہ تھا۔

اور وسائل تمام ہندوستان کے قبضے میں تھے۔ پہلے تو وسائل کی تقسیم میں بے انصافی کی گئی۔ پھر جو نام نہاد حصہ طے پایا، اسے پاکستان کے حوالے کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا گیا۔ انگریزوں اور ہندوؤں نے مل کر پاکستان کو محتاج اور معذور بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان جو اپنی جگہ جما کھڑا تھا، تیزی سے مستحکم ہونے لگا...... اپنے پیروں پر کھڑا ہونے لگا۔ وہاں استحکام تھا۔ جبکہ پاکستان میں انتشار تھا، افراتفری تھی۔ انگریزوں اور ہندوؤں کو بجا طور پر امید تھی کہ پاکستان چند ماہ سے زیادہ نہیں جی سکے گا اور آخر میں ہاتھ جوڑ کر ہندوستان میں شامل ہونے کی استدعا کرے گا۔

لیکن عبدالحق نے پاکستان میں ٹوٹے پھوٹے بدحال لوگوں کو کہتے سنا تھا کہ پاکستان اللہ نے بنایا ہے...... اور بنایا ہے تو قائم رہنے کے لیے بنایا ہے۔ اللہ ہی اسے قائم رکھے گا۔ اور یہ کہتے ہوئے ان کے لہجے میں بڑا یقین ہوتا تھا۔

تو یہ ہے صورتِ حال عبدالحق نے سوچا۔ ایک طرف اَن دیکھا اللہ ہے اور دوسری طرف انگریز اور ہندوستان۔ اس میں شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ کون جیتے گا۔

"میاں، کہاں کھو جاتے ہو تم۔"

افضال صاحب نے اسے چونکا دیا۔

"اب چلیں؟"

"جی...... ضرور۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

❁ ❁ ❁

چلتے چلتے عبدالحق نے افضال صاحب سے کہا۔ "آپ کو بھوک نہیں لگتی؟ آپ کھانا نہیں

کھاتے؟"

"بھوک بھی لگتی ہے' مگر کم کم۔ اور کھانا بھی کھاتا ہوں مگر اس لیے کہ یہ جینے کے لیے ضروری ہے۔" افضال صاحب نے کہا۔ پھر چونک کر بولے۔ "کیوں...... تمہیں بھوک لگی ہے؟"

"جی ہاں۔ مگر اس کی برداشت مجھ میں ہے۔" عبدالحق نے کہا۔ "دراصل میں آپ کے خیال سے کہہ رہا تھا۔"

"ابھی چل کر کھانا کھائیں گے لیکن اس سے پہلے میں ایک کام کرتا ہوں۔"

کچھ آگے جا کر سامنے عبدالحق کو ایک عمارت نظر آئی' جس کا گنبد سبز رنگ کا تھا۔ وہاں لوگوں کا ہجوم بہت زیادہ تھا۔ "یہ کون سی جگہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ داتا دربار ہے۔" افضال صاحب نے کہا۔ پھر یہ دیکھ کر کہ اسے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں' وضاحت کی۔ "یہ مزار ہے حضرت سید علی ہجویریؒ کا یہ بہت بڑے بزرگ اور اللہ کے ولی تھے۔"

عبدالحق نے صوفیائے کرام کے بارے میں خاصا پڑھا تھا۔ گو کہ داتا دربار اس کی سمجھ میں نہیں آیا' لیکن سید علی ہجویریؒ کا حوالہ اسے یاد آ گیا۔ "یہاں اتنا ہجوم کیوں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہاں ہر وقت ہجوم رہتا ہے۔ اس ہجوم میں سائل بھی ہیں اور زائرین بھی۔"

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔"

"میں تو ہر روز یہاں آتا ہوں۔ دل کو بڑا سکون ملتا ہے یہاں۔" افضال صاحب نے کہا۔

وہ آگے بڑھے تو انہیں نیچے زمین پر بیٹھے سائل نظر آئے۔ مزار کی دیوار سے لے کر تا حدِ نظر تک سائل ہی سائل تھے' جو آوازیں بھی لگا رہے تھے۔ افضال صاحب ایک سائل کی طرف بڑھے۔ "کھلا ہے تمہارے پاس؟" انہوں نے پوچھا۔

"آہو جی...... اک رپئے داتے ہوسی۔"

افضال صاحب نے جیب سے ایک روپے کا سکہ نکال کر اسے دے دیا۔ اس نے گن کر 64 پیسے ان کے حوالے کر دیے۔

عبدالحق کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس کا تو خیال تھا کہ افضال صاحب کے پاس پیسے ہوتے ہی نہیں ورنہ وہ شربت کو ایسے کیوں ترستے۔ ایک روپیہ کوئی چھوٹی رقم تو نہیں ہوتی۔

اب وہ افضال صاحب کے ساتھ مزار کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ افضال صاحب کہیں رکتے اور کسی سائل کو ایک پیسہ دے دیتے' عبدالحق نے غور سے دیکھا۔ سائلوں میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ مرد' عورتیں' بوڑھے' جوان اور بچے۔ ان میں محتاج اور معذور بھی تھے۔ کوئی اندھا تھا' کوئی ہاتھوں سے' کوئی ٹانگوں سے محتاج۔ عبدالحق نے محسوس کیا کہ افضال صاحب بچوں اور معذور

افراد کو خاص طور پر نواز رہے ہیں۔ اور ایک بات طے تھی جوان اور خاص طور پر خوش شکل جوان لڑکیوں کو وہ نظر انداز کر رہے تھے۔

پھر ایک بار انہوں نے سر گھما کر عبدالحق کو دیکھا۔ "کھانے کے پیسے تو ہیں نا تمہارے پاس؟"

"پیسوں کی آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں نے کہا نا' پیسوں کی کوئی کمی نہیں" عبدالحق نے انہیں یقین دلایا۔

افضال صاحب پھر مصروف ہو گئے۔ عبدالحق گردوپیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں چند دکانیں تھیں' جن کے باہر دیگیں رکھی تھیں۔ عبدالحق کو جمیل کا خیال آ گیا۔ "تو جمیل کھانے کی دیگیں ان لوگوں کو بیچتا تھا؟" اس نے افضال صاحب سے پوچھا۔

"ہاں یہاں۔"

"آؤ باؤ جی آؤ۔ لنگر کرو گے؟"

عبدالحق کی سمجھ میں بات تو نہیں آئی۔ تاہم وہ اس کی طرف بڑھ گیا۔ "کیا ریٹ ہے تمہارا؟"

"او جی بریانی کی دیگ پانچ روپے کی ہے' زردے کی چھ روپے کی ہے اور سو روٹیاں دال کے ساتھ تین روپے کی۔"

"کوئی سالن نہیں ہے گوشت کا؟"

"نہیں باؤ جی۔"

"ابھی کچھ دن پہلے تو میں نے کھایا تھا یہاں سے۔"

"او مجیں باؤ جی۔" دکان دار نظریں چرانے لگا۔ "کوئی بھول ہوئی ہے تم کو۔"

عبدالحق کی سمجھ میں بات آ گئی۔ وہ سپلائی تو منقطع ہو گئی تھی۔ اتنے میں افضال صاحب نے اسے آواز دی۔ "ارے میاں' کہاں پھنس گئے۔ آؤ نا۔"

وہ افضال صاحب کی طرف بڑھا۔ "دیکھو نا' ہم تو خالی ہو گئے۔" افضال صاحب نے کہا۔

"تو اب؟"

"اب دربار چلیں گے۔ فاتحہ پڑھیں گے۔"

"مجھے تو فاتحہ پڑھنی آتی بھی نہیں۔"

"یہ کون سا مشکل ہے۔ الحمد شریف پڑھو اور تین بار قل ھو اللہ پڑھ لو' بس......"

واہ...... یہ تو بڑا آسان ہے۔ عبدالحق نے دل میں سوچا۔

وہ دربار میں داخل ہوئے۔ مزار تک تو جانا ممکن نہیں تھا۔ بہت بڑا ہجوم تھا وہاں...... وہ

دونوں پیچھے ہی کھڑے ہو گئے اور فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد عبدالحق نے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ کچھ لوگ مزار پر سجدہ بھی کر رہے تھے۔

اس کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ ''یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے افضال صاحب سے پوچھا۔

''ماتھا ٹیک رہے ہیں۔'' انہوں نے سادگی سے کہا۔

''ماتھا ٹیکنے کو سجدہ کہا جاتا ہے۔'' عبدالحق کے لہجے میں تلخی تھی۔

''سنو میاں' یہ عقیدت سے بھرے لوگ ہیں' اور یہ ان کا اظہارِ عقیدت ہے۔''

''سجدہ عقیدت کا نہیں' بندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور بندگی صرف اللہ کے لیے ہوتی ہے۔''

''اس الجھن میں کیوں پڑتے ہو میاں۔ اب چلو۔''

''لیکن افضال صاحب' یہ شرک ہے۔ اور مجھے بتایا گیا ہے کہ شرک اللہ کبھی معاف نہیں کرتا۔''

''تو تم کہاں کر رہے ہو۔ دیکھو نا' بس میں بھی نہیں کر رہا ہوں۔'' افضال صاحب نے بڑی معصومیت سے کہا۔ آؤ اب چلیں۔''

وہ مزار سے نکلے۔ عبدالحق کے ذہن میں بڑی الجھنیں تھیں۔ وہ انہی پر غور کرتا رہا۔ افضال صاحب نے یہ بات بھانپ لی تھی۔ وہ بھی خاموشی سے چلتے رہے۔ پھر اچانک انہوں نے نعرہ لگایا۔ ''لو ہم پہنچ گئے۔ اب کھانا کھائیں گے۔''

عبدالحق نے چونک کر دیکھا۔ وہ ایک ٹھیلا تھا۔ چاروں طرف کچھ بنچیں تھیں۔ جن پر لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

''بھئی ہم تو سمجھتے تھے کہ چھولے بس چاٹ کے لیے ہوتے ہیں۔'' افضال صاحب نے کہا۔ ''لیکن یہاں تو اس کا سالن بھی بنایا جاتا ہے۔ اور یہ پہلوان صاحب تو ایسے مزے کا سالن بناتے ہیں کہ بس انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ۔''

ٹھیلے پر ایک بہت بڑا دیگچا رکھا تھا۔ ساتھ ہی تین چار چھوٹی دیگچیاں بھی تھیں۔ بھاری جسم کا ایک شخص بڑی پھرتی سے بڑے دیگچے میں سے پلیٹ میں سالن نکالتا' پھر کسی جادوگر کی طرح چھوٹی دیگچیوں میں سے کچھ نکال کر اس پلیٹ میں شامل کرتا اور پکارتا...... یہ لو جی' کوفتہ چھولے۔ اور نان چاہیے جناب؟ پانی ادھر گھڑے میں سے لے لیں۔ وہ ایک مشین کی طرح سے ہاتھ چلا رہا تھا۔ اور یہی صورتِ حال زبان کی بھی تھی۔

اور اسے دیکھ کر ذہن میں لفظ پہلوان ہی گونجتا تھا۔

پہلوان کی نظر افضال صاحب پر پڑی تو اس نے آواز لگائی۔ ''آ گئے ہو بزرگو...... بھاگاں والیو آج کچھ دیر نہیں کر دی۔'' پھر اسے اندازہ ہوا کہ ان کے ساتھ عبدالحق بھی ہے تو وہ کام چھوڑ لپک کر ان کی طرف آیا۔ عبدالحق کا ہاتھ تھام کر اس نے بڑے زور سے مصافحہ کیا۔ ''تسی کدوں

آئے او جی؟ جم جم آؤ جی' جم جم آؤ۔ اللہ کی رحمت ہو جی آپ تو۔ میرے نصیب......''

عبدالحق اُس کے تپاک پر حیران ہو رہا تھا۔ اُس کا انداز ایسا تھا' جیسے برسوں سے اسے جانتا ہو۔

''او پولے' کپڑا مار اس بنچ تے' اور پانی کا جگ لا کر رکھ۔'' پہلوان نے ایک دس بارہ سال کے لڑکے کو پکارا' جو وہاں ویٹر کا کام کر رہا تھا۔

''ہو جی تسی آرام نال۔'' یہ کہہ کر پہلوان واپس چلا گیا۔

وہ دونوں بنچ پر بیٹھ گئے۔ عبدالحق نے سوالیہ نظروں سے افضال صاحب کو دیکھا...... مگر وہ وضاحت کے موڈ میں نہیں تھے۔

''آہو جی بزرگو' کی دیواں توانوں۔ اج پائے چھولے وڈے چنگے نیں۔ کھاؤ گے تو سواد آ جائے گا۔''

''نہیں پہلوان جی۔ آپ ہمیں سادہ چھولے ہی دے دیں۔'' افضال صاحب نے کہا۔

پہلوان نے شک آمیز نظروں سے انہیں دیکھا۔ ''او جی تسی تکلف شکلف تو نہیں کر رہے او میرے نال۔ میں تو جی پتر ہوں تواڈا۔''

''آپ جانتے ہو پہلوان کہ مجھے کیا اچھا لگتا ہے۔ تکلف کروں تو پھر یہاں آؤں ہی کیوں۔''

''اے گل تو اڈی سولہ آنے سچی ہے۔'' پہلوان نے کہا اور جلدی جلدی پلیٹوں میں چھولے نکال کر لڑکے کو پکارا۔ ''او پولے...... انہیں گرم نان دینا۔ لے...... یہ لے جا جھیتی نال۔''

وہ کھانا عبدالحق کے لیے بڑی نعمت تھا۔ ایک تو بھوک بہت زور کی لگ رہی تھی۔ اس پر چھولے اتنے مزے دار تھے کہ لطف آ گیا۔ مگر یہ وی آئی پی ٹریٹ منٹ اُس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ سب لوگ خود اٹھ کر مٹکے سے پانی نکال کر پیتے ہیں۔ مگر ان کے بنچ پر جگ اور گلاس رکھے تھے۔ نان انہیں صرف دو دیے گئے تھے۔ وہ ختم ہوئے تو لڑکا بڑی مستعدی سے دو اور گرم نان ان کے لیے لے آیا۔

وہ کھانا کھا کر اٹھ رہے تھے کہ پہلوان نے ہانک لگائی۔ ''او پولے' ہاتھ دھلا اناں دے۔'' پولا اُس سے پہلے ہی حرکت میں آ چکا تھا۔ اُس نے ان کے ہاتھ دھلوائے' پھر انہیں ہاتھ خشک کرنے کے لیے تولیا پیش کیا' جو ذرا میلا تو تھا' لیکن ان کے سوا کسی کو پیش نہیں کیا گیا تھا۔ یعنی وہ ایک اعزاز تھا' جو خاص گاہکوں کے لیے مخصوص تھا۔

یہ بات طے تھی کہ افضال صاحب پہلوان کے خاص گاہک ہیں۔

افضال صاحب نے سرگوشی میں عبدالحق سے کہا۔ ''اب میاں یہ تمہارا امتحان ہے۔ کوشش

کرو پیسے دینے کی۔ ورنہ تمہیں سکون نہیں ملے گا۔"
"کیا مطلب؟" عبدالحق نے حیرت سے دیکھا۔
"زیادہ بحث نہ کرنا۔ دلوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہ بڑے نازک ہوتے ہیں۔ لفظوں کو سننے سے زیادہ ان کی روح کو محسوس کرنا۔ ورنہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکو گے۔"
عبدالحق دل ہی دل میں الجھتا پہلوان کی طرف بڑھ گیا۔ "کتنے پیسے ہوئے پہلوان جی۔"
پہلوان کے چہرے پر صدمے کا حقیقی تاثر ابھرا۔ "نا باؤ جی نا۔ تسی تے ساڈے مہمان ہو...... اللہ دی رحمت ہو۔"

"دیکھو پہلوان جی' یہ تمہارا روزگار ہے۔"
پہلوان ایک دم سے جیسے چمرا کر رہ گیا۔ چہرے پر خفت برسنے لگی۔ وہ ٹھیٹھ پنجابی بولنے والا تھا۔ مگر اردو پر آ گیا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہو باؤ جی۔ یہ میرا ٹھیا ہے روزی کا۔ پر جی مہمانوں کے لیے یہ گھر ہے میرا۔ گھر آئے مہمان سے میں پیسے لوں گا۔" اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے۔
عبدالحق نے شرمساری سے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن ان کی طرف کوئی متوجہ نہیں تھا۔ "لیکن پہلوان......"

"جانتا ہوں باؤ جی' جانتا ہوں۔" پہلوان کو اردو بولنے میں خاصی دشواری ہو رہی تھی۔
"تیس سال سے اوپر ہو گئے بیچ بجار میں اس ٹھیلے پر بیٹھے۔ آدمی کی پہچان ہے مجھے۔ جانتا ہوں' آپ بڑے آدمی ہو' حاکم ہو۔ مجھے بھی خرید سکتے ہو۔ پر بڑا آدمی ہی تو چھوٹے کی عزت رکھتا ہے نا۔ دیکھو باؤ جی' اس میں تمہاری بے عزتی نہیں' پر میری عزت ہے۔ آپ عزت نہیں دو گے مجھے؟"

"کیا مطلب؟ تمہاری عزت کیسے ہے اس میں۔"
"میں اَن پڑھ جاہل ہوں باؤ جی' پر سمجھتا سب کچھ ہوں۔ صبح سویرے جب میں اٹھتا ہوں تو خود سے کہتا ہوں' اوئے ماجھے! اب تُو ہندوؤں کا غلام نہیں' آزاد ہے۔ اپنے سوہنے پاکستان میں ہے۔ پر تُو نے کچھ نہیں کیا پاکستان کے لیے۔ اوئے تُو تو سویا تھا ہندوستان میں اور جاگا پاکستان میں۔ تُو اپنے گھر میں تھا' اپنے گھر میں ہے۔ تیرے بچے خیر سے ہیں۔ تیرے کسی پتر کو سکھوں نے نہیں مارا۔ تیری کسی دھی کو ہندو نہیں اٹھا کے لے گئے۔" یہ کہتے کہتے پہلوان کی آواز رندھ گئی۔ "جو وہاں سے آئے ہیں' انہیں دیکھ کر میرا دل روتا ہے۔ سوہنے رب دی سوں' میرا دل کرتا ہے کہ اپنا گھر اُدھر سے آنے والے کسی کنبے کو دے دوں اور اپنے بچوں کو لے کر کیمپ میں چلا جاؤں۔ پر جانتا ہوں' بچے کہیں گے' پیو پاگل ہو گیا ہے۔" اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "جو میں آپ لوگوں کی مہمانی کر لوں تو آپ بے عزتی سمجھتے ہو۔" اُس نے پھر ہاتھ جوڑ لیے۔ "میں تو اور کچھ کر بھی نہیں

سکتا۔"
عبدالحق تو سن ہو کر رہ گیا تھا۔ پہلے شربت والا اور اب یہ پہلوان۔ اور وہ دونوں کو سمجھنے میں ناکام رہا تھا۔ وہ جذبے اس کے لیے بے حد انوکھے' طاقت ور اور پاکیزہ تھے۔ اس کے دل میں کسی نے کہا...... پاکستان انشاء اللہ قائم رہے گا۔ جہاں لوگوں میں ایسا ایثار' ایسی محبتیں ہیں' ان زمینوں پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔
"کچھ بولو نا باؤ جی۔" پہلوان نے اسے چونکا دیا۔
"کیا بولوں۔ میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دیں۔"
"نا جی' ایسے نہیں کہتے باؤ جی۔" پہلوان نے اُس کا ہاتھ چوم لیا۔ "بس ایک وعدہ کرو۔ اس طرف جب بھی آؤ گے تو میرے پاس ضرور آؤ گے۔ آپ آؤ گے تو میرے لیے مبارک ہو گا۔ رب سوہنا میرے رزق میں برکت دے گا۔"
وہ وہاں سے چل دیے۔ "اب میاں' میں تو کھانے کے بعد قیلولہ کرتا ہوں۔" افضال صاحب نے کہا۔
"میں تو بس آپ کے ساتھ ہوں۔ جہاں چاہیں' لے چلیں۔"
وہ چلتے رہے۔ عبدالحق کسی گہری سوچ میں غلطاں تھا۔ افضال صاحب نے بھی اسے نہیں چھیڑا۔ عبدالحق کو پتا بھی نہیں چلا کہ وہ ایک باغ میں داخل ہو گئے ہیں۔ "چلو...... یہاں گھاس پر بیٹھتے ہیں۔" افضال صاحب نے کہا۔
عبدالحق نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ بہت بڑا باغ تھا۔ لہلہاتی ہوئی گھاس' جھومتے ہوئے درخت' پھولوں کی روشیں' جا بہ جا سلیقے اور ترتیب سے بچھی ہوئی بینچیں۔ اس کا دل خوش ہو گیا۔ اتنا بڑا باغ اور سلیقے کا یہ حال۔ پھر اسے خیال آیا کہ ابھی تو اس نے اس باغ کو صرف ایک نظر دیکھا ہے۔ اسے پوری طرح دیکھنے میں تو اسے کئی گھنٹے لگیں گے۔
افضال صاحب گھاس پر نیم دراز ہو گئے تھے۔ "آؤ میاں' بیٹھ جاؤ۔"
عبدالحق ان کے پاس بیٹھ گیا۔ "یہ کون سی جگہ ہے؟" اس نے پوچھا۔
"یہ لارنس گارڈن ہے۔"
"لارنس گارڈن؟"
"ہاں میاں۔ انگریزوں نے یہاں جو کچھ بھی بنایا' اسے اپنے کسی نام کی یادگار بنا دیا۔ لیکن ایک بات ہے۔ یہ انگریز لوگ ہر کام بڑی سچائی' لگن اور سلیقے کے ساتھ کرتے ہیں۔"
"میں بھی یہی بات کہنے والا تھا۔"
"لیکن مغلوں کو باغوں سے بڑی محبت تھی' اور ان کا ذوق بھی بہت اعلیٰ تھا۔ یہ باغ مغلوں

کی روایت سے ہٹ کر ہے۔ اس میں انگریزوں کا مزاج جھلکتا ہے۔'' افضال صاحب کسی محقق کی طرح بول رہے تھے۔

''وہ کیسے؟''

''میں نے اس باغ کو پوری طرح دیکھا ہے۔ اس میں گوشہ ہائے خلوت بڑی کثرت سے ہیں۔ شاید اسی لیے اسے بڑے رقبے پر بنایا گیا ہے۔''

عبدالحق نے باغ کو دیکھا نہیں تھا۔ اس لیے وہ اس پر تبصرہ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اس کی ذہنی رَو ان معاملات کی طرف مڑ گئی' جو اس کے ذہن میں سراسرار ہے تھے۔ اس نے افضال صاحب سے کہا۔ ''آپ برا نہ مانیں تو آپ سے ایک بات پوچھوں؟''

ایک لمحے میں افضال صاحب کا چہرہ بدل گیا۔ وہ وحشت زدہ نظر آنے لگے۔ ''ہندوستان سے یہاں آنے کے دوران جو گزری ہے' اس پر میں کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا۔'' انہوں نے درشت لہجے میں کہا۔

بات عبدالحق کی سمجھ میں آ گئی۔ افضال صاحب اس سلسلے میں بس اتنا بتاتے تھے کہ سب شہید ہو گئے۔ انھوں نے یہ کبھی نہیں بتایا کہ ان کے ساتھ کون کون تھا' کتنے لوگ تھے۔ اور کس پر کیا گزری' یہ تفصیل بھی انھوں نے کبھی نہیں بتائی تھی۔ شاید وہ تفصیل ہی تھی' جس کی وجہ سے وہ نیند سے محروم ہو گئے تھے۔ اور شاید اسی کی وجہ سے وہ کسی کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ جبکہ خود ان کے بہ قول ان کا کوئی بچا ہی نہیں تھا۔

''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں پوچھ رہا ہوں۔'' عبدالحق نے کہا۔

افضال صاحب کے چہرے کی وحشت دور ہو گئی اور اس کی جگہ نرمی نے لے لی۔ ''تو پوچھو نا؟''

''آپ ہندوستان سے کچھ لے کر آئے تھے؟''

''صرف ایک بے قیمت' بے وقعت چیز بچا کر لا سکا تھا'' افضال صاحب نے کہا۔ ''اور وہ ہے یہ جسم' مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو میاں؟''

''آپ کے پاس پیسے نہیں ہوتے......''

''یہ تم نے کیسے سمجھا؟''

''شربت پینے کو دل چاہ رہا تھا آپ کا۔ اور پتا نہیں' کب سے چاہ رہا ہوگا۔''

''تو پیسے تو تھے میرے پاس۔''

''ہاں' آج تو تھے۔''

''آج نہیں' ہر روز ہوتے ہیں۔''

''جب آپ ساتھ کچھ لائے نہیں تو پھر یہ پیسے کہاں سے آتے ہیں؟''

افضال صاحب کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''پہلے کبھی کسی نے پوچھا نہیں۔ میں نے بتایا بھی نہیں۔ تم نے پوچھا ہے تو بتا دیتا ہوں۔'' وہ رازدارانہ انداز میں اس کے قریب ہو گئے اور سرگوشی میں بولے۔ ''ہر صبح بڑے صاحب مجھے ایک روپیہ دیتے ہیں۔ کبھی دو روپے بھی دے دیتے ہیں۔'' پھر اچانک ان کے لہجے میں بے نیازی آ گئی۔ ''سچ تو یہ ہے کہ مجھے ضرورت بھی نہیں لیکن میں لے لیتا ہوں۔''

''اس پر بھی ایک سوال ہے میرے ذہن میں۔ لیکن وہ میں بعد میں پوچھوں گا۔ پہلے یہ بتائیں کہ جب آپ کے پاس پیسے بھی ہوتے ہیں تو پھر آپ کھانے کے لیے پہلوان کے پاس ہی کیوں آتے ہیں۔ جبکہ آپ کو معلوم ہے کہ وہ پیسے نہیں لے گا۔''

افضال صاحب نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا اور دیر تک دیکھتے رہے۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ''میاں' میں تمہاری بات پوری طرح سمجھ گیا ہوں۔ تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں خوددار اور عزت والا نہیں ہوں......''

''یقین کریں' ایسی کوئی بات میں نے نہیں سوچی۔'' عبدالحق نے جلدی سے کہا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے صدمہ بھی ہوا تھا اور شرمندگی بھی۔ صدمہ اس لیے کہ اُس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ اُس نے خود دیکھا تھا کہ افضال صاحب نے اس روپے کا ایک ایک پیسہ بھکاریوں کو دے دیا تھا اور شرمندگی اس لیے کہ جس انداز میں اس نے پوچھا تھا' اس کا یہی مطلب نکالا جا سکتا تھا۔

''میں نے برا نہیں مانا میاں۔ نجانے کیوں' تم مجھے اپنے بیٹے کی طرح لگتے ہو۔ اب میں تمہیں جو کچھ بتاؤں گا' اس میں تمہارے ہر سوال کا جواب موجود ہے' غور سے سننا۔'' وہ چند لمحوں کے لیے رکے' پھر ایک گہری سانس لے کر گویا ہوئے۔ ''ہندوستان میں بہت زمین تھی ہماری۔ بہت بڑی جاگیر تھی۔ بلا مبالغہ بیسیوں مزارعے کام کرتے تھے ہماری زمین پر۔ اور ہم بڑے مغرور تھے میاں۔ اللہ کی دی ہوئی عزت' دولت اور حاکمیت پر جی بھر کر اکڑتے تھے۔ بہت برس پہلے جب میرا بیٹا چھوٹا تھا تو ایک مزارعے کے بیٹے نے کھیل کھیل میں اسے مارا۔ مجھے پتا چلا تو میں نے اس لڑکے کے کپڑے اتروا کر' اسے درخت سے لٹکوا کر اتنے بید لگوائے کہ اس کا جسم سوج گیا۔ ہفتوں اس کا ہلدی چونا ہوتا رہا۔ اور جس دوران اس بچے کی مرمت ہو رہی تھی' اس کا باپ میرے پاؤں پکڑے زار و قطار رو رہا تھا۔ معافی مانگ رہا تھا۔ مگر میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر وہ ہماری عزت اور آن کا مسئلہ تھا۔ یہ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے عہد کے فرعون تھے۔

''تو جب پاکستان بنا تو ہم پاکستان کے لیے روانہ ہوئے۔ میں نے کچھ بھی نہیں لیا تھا...... سوائے زمینوں کے کاغذات کے۔ مگر ہوا یہ کہ میں اکیلا ہی پاکستان پہنچا۔ میرے چاروں بیٹے

میری آنکھوں کے سامنے قتل کر دیے گئے۔ کچھ بھی نہیں بچا' میری دنیا اندھیر ہو گئی۔ میں زندہ تھا' مگر زندہ نہیں تھا۔

"پھر ایک دن اس کیمپ میں ایک شناسا سے ملاقات ہو گئی۔ جانتے ہو وہ کون تھا؟ اس مزارعے کا بیٹا' جسے میں نے ننگا کر کے پٹوایا تھا۔ میرا بس چلتا تو اسے پہچاننے سے انکار کر دیتا۔ مگر وہ تو میرے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گیا...... سرکار' آپ یہاں...... اس حال میں؟ قصہ مختصر اس نے بڑے صاحب کو میرے بارے میں بتا دیا۔ بڑے صاحب نے مجھے بلوا لیا۔ بس اُس دن سے میں مجبور ہو گیا۔ ان سے وعدے کے مطابق ہر صبح میں ان کے پاس جاتا ہوں' اور وہ مجھے کبھی ایک اور کبھی دو روپے دے دیتے ہیں۔

"اب تم سوچو گے کہ میں مجبور کیسے ہو گیا۔ ایک تو بڑے صاحب نے مجھے میرے شہیدوں کی قسم دی تھی۔ مگر اندر کی وجہ اور تھی۔ میں شریف سے ملا تو مجھے احساس ہوا کہ میں کیسا آدمی تھا۔ میں نے اپنی حاکمیت کے ذعم میں لڑکپن میں شریف کے ساتھ کیسا غیر انسانی سلوک کیا تھا۔ اب وہی شریف مجھے کیمپ میں ملا تو میں اور وہ برابر تھے۔ بلکہ اسے مجھ پر فوقیت حاصل تھی۔ پناہ گزین اور مہاجر تو ہم دونوں ہی تھے۔ لیکن اب میں بوڑھا تھا اور وہ جوان۔ میں کمزور تھا اور وہ طاقتور۔ وہ مجھ سے بدلہ لے سکتا تھا۔ لیکن اُس نے مجھے وہی پرانا والا مرتبہ اور مقام دیا۔ میری سمجھ میں آیا کہ بحیثیت انسان وہ کتنا بلند ہے اور میں کتنا پست ہوں۔ میں نے سمجھ لیا کہ میں جس غرور میں مبتلا تھا' وہ بے جا تھا۔ میری آن جھوٹی تھی۔ مجھے اس کا حق نہیں تھا' کیونکہ وہ سب کچھ تو اللہ کا دیا ہوا تھا۔ اللہ نے واپس لے لیا تو سب کچھ ختم ہو گیا نا۔ گھر بار' مال جائیداد' اولاد...... کچھ بھی تو نہیں رہا۔

تو میں نے اپنی انا کو ذلیل کرنے کے لیے بڑے صاحب سے پیسے لینا گوارا کر لیا۔ گو کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر میں خود کو اپنی اوقات یاد دلانا چاہتا تھا اور پچھلے غرور کی سزا دینا چاہتا تھا۔

پھر ایک دن پہلوان سے واسطہ پڑ گیا۔ اس کا رویہ تو تم نے بھی دیکھ لیا ہے۔ اس کے سچے خلوص کے سامنے مزاحمت ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کے باوجود خودداری کا تقاضا تھا کہ آئندہ میں وہاں کھانا ہی نہیں کھاؤں لیکن اُس نے بھی مجھے میرے شہیدوں کی قسم دے دی۔ پھر بھی میں اس کے پاس آتا ہوں تو خالی ہاتھ نہیں آتا' اور ہر بار پیسے دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اسی لیے تو آج فقیروں کو تمام پیسے دینے سے پہلے میں نے تم سے پوچھ لیا تھا کہ تمہارے پاس پیسے ہیں نا۔ بس یہ ہے ساری بات۔"

عبدالحق کی عجیب کیفیت ہو گئی۔ کیسے کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں۔ اُسے اَن دیکھے شریف پر بہت پیار آیا۔ ویسے انسانوں کی اس قسم سے تو وہ پہلے ہی خوب واقف تھا۔ اسے اس وقت زبیر بڑی شدت سے یاد آیا۔ اور زبیر کے ساتھ دوسرے تمام لوگ...... اور نور بانو بھی۔ اُس نے جلدی سے

اپنی سوچ کا رخ بدلا۔

افضال صاحب کا معاملہ وہ پوری طرح سمجھ گیا تھا' اور ان کے بارے میں اپنی بدگمانی پر شرمندہ تھا۔ وہ خود کو سزا دے رہے تھے۔ حالانکہ اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ تلافی تو وہ کر چکے تھے۔

"آپ بے کار کے احساسِ جرم میں مبتلا ہیں۔" اس نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ اپنی دولت' جائیداد' گھر بار اور اپنی حاکمیت چھوڑ کر پاکستان کی محبت میں چلے آئے اور اس کوشش میں آپ کے تمام لوگ شہید ہو گئے۔ اللہ قبول کرنے والا ہے......"

"تم کچھ بھی نہیں جانتے میاں عبدالحق۔ کچھ جان بھی نہیں سکتے۔" افضال صاحب نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "کوئی انسان کبھی نہیں سمجھ سکتا کہ کسی کی گٹھڑی میں گناہوں کا کتنا بوجھ ہے' صرف اللہ جانتا ہے یا پھر کسی حد تک خود وہ آدمی۔"

عبدالحق نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ لیکن بولا کچھ نہیں۔

"نجانے کیوں' تمہیں اتنا کچھ بتا دیا۔ جو میں کسی کو بھی نہیں بتانا چاہتا۔ سب کچھ تو تمہیں بھی نہیں بتا سکتا۔ میاں' میں بہت گھٹیا' بہت برا آدمی ہوں۔ دل میں ہر وقت توبہ کرتا رہتا ہوں۔ مگر میرا دل کہتا ہے' صرف توبہ سے کچھ نہیں ہوگا۔ تلافی بہت ضروری ہے۔ سو میں ہر وقت تلافی کے موقع کی تلاش میں پھرتا ہوں۔ مگر مجھے نہیں لگتا کہ کبھی کامیاب ہو سکوں گا۔ اور میاں' اگر تلافی کی شدید آرزو نہ ہوتی تو شاید میں خودکشی کر لیتا۔ خود سے اتنی شدید نفرت ہے مجھے۔"

"لیکن کیوں؟"

"اب میں تمہیں سب کچھ تو نہیں بتا سکتا۔" افضال صاحب نے بے بسی سے کہا۔ "میں بہت خود غرض' موقع پرست اور خود پسند آدمی ہوں۔ سنو میاں' مجھے پاکستان سے کوئی محبت نہیں تھی۔ پاکستان آنے کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا میں نے۔ میں جانتا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد ہندوستان میں ہندوؤں کا رویہ کیسا ہوگا۔ وہاں میری حاکمیت' میرا اقتدار قائم رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ سب کچھ چھن جاتا۔ اور میں نے غلط کہا کہ میں زمینوں کے کاغذات کے سوا کچھ نہیں لایا۔ میرے پاس بہت بھاری نقد رقم بھی تھی اور کثیر قیمتی زیورات بھی۔ میں نے سوچا تھا کہ پاکستان میں ہم ہندوستان سے بھی زیادہ طاقتور ہوں گے لیکن راستے میں سب کچھ لٹ گیا' ختم ہو گیا۔ کاغذات بھی صرف اس لیے محفوظ رہے کہ میرے سینے پر بندھے ہوئے تھے۔"

عبدالحق کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اب وہ افضال صاحب کے نفسیاتی مسائل کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ آدمی کتنے بڑے بڑے بوجھ اٹھائے پھرتا ہے...... ایسے بوجھ جن کے بارے میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتا۔

"تو آپ کو زمین کا کلیم تو بھرنا چاہیے تھا۔ وہ سب کچھ تو آپ کو اب بھی مل سکتا ہے۔"

"جوان اولاد آنکھوں کے سامنے ختم ہوگئی تو سمجھ میں آیا کہ کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہم بلاوجہ اہمیت دے کر ان کی قدر و قیمت بڑھا دیتے ہیں۔"

"تو پھر آپ نے ان کاغذات کا کیا کیا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں تو انہیں بھول ہی گیا تھا۔ مجھے تو صرف تلافی کی فکر تھی۔ کیمپ میں شریف مجھے ملا تو کاغذات یاد آئے۔ میں نے سوچا' کم از کم شریف کے ساتھ زیادتی کی تلافی تو کر دوں۔ میں نے کاغذات بڑے صاحب کو دیے اور کہہ دیا کہ اب شریف میرا وارث ہے۔ وہ نہیں مان رہے تھے لیکن میں نے انہیں مجبور کر دیا۔ اس معاملے کو میں نے تحریری اور قانونی شکل دے دی۔"

"تو تلافی تو ہوگئی۔ اب آپ کیوں پریشان ہیں؟"

"تم نہیں سمجھ سکتے میاں۔ میں نے کہا نا کہ تلافی تو صرف شریف کے ساتھ زیادتی کی ہوئی ہے۔ میرے گناہوں کی فہرست تو بہت طویل ہے اور گناہ بھی بہت بڑے ہیں۔ میں تو بس موقع ڈھونڈتا پھرتا ہوں تلافی کا۔ خیر' چھوڑو اب اس بات کو۔"

دونوں دیر تک اپنی اپنی سوچوں میں گم بیٹھے رہے۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ باغ میں قمقمے روشن ہونے لگے۔

"آؤ' اب چلیں۔" افضال صاحب نے کہا۔

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور باغ سے نکل آئے۔

❀ ❀ ❀

سیکرٹری وزارت داخلہ شفاعت بھٹی ڈرائنگ روم میں اکیلا بیٹھا تھا۔ وہ کوٹھی اس کی ملکیت نہیں تھی' اور وہ وہاں رہتا بھی نہیں تھا۔ وہ ایک ہندو بنیے کی کوٹھی تھی' جو اسے جوں کا توں چھوڑ بھاگا تھا۔ ڈرائنگ روم کے فرنیچر ہی کی بات نہیں' جس وقت اس ہندو فیملی نے ہندوستان کے لیے رختِ سفر باندھا تھا تو ساتھ کچھ بھی نہیں لے کر گیا تھا...... سوائے نقدی کے۔ حد یہ ہے کہ بجھے ہوئے چولہے پر دودھ کی دیگچی بھی رکھی رہ گئی تھی' اور کھانا بھی تیار تھا۔ بس کھایا نہیں جا سکا تھا۔ اور یہ کہانی صرف اس کوٹھی کی نہیں تھی۔ بے شمار گھر ایسے ہی تھے' جہاں گھر چھوڑ کر بھاگنے والوں کا پورا سامان یونہی رکھا تھا' جیسے وہاں گھر کے لوگ موجود ہوں۔ صندوقوں اور الماریوں میں زیورات تک موجود تھے۔ لوٹ مار کرنے والوں کے گھر بھر گئے تھے۔ کچھ لوگ تو ایسے مکانات پر قابض بھی ہو گئے تھے۔

لیکن شفاعت بھٹی کا یہ معاملہ نہیں تھا۔ ہندو بنیے نے وہ کوٹھی خود اسے سونپی تھی اور ہاتھ جوڑ

کر بنتی کی تھی کہ اسے اور اس کے بچوں کو بہ حفاظت سرحد پار کرا دے۔ وزارت داخلہ کا سیکرٹری ہونے کے ناتے یہ شفاعت بھٹی کے لیے بڑی بات نہیں تھی۔ اُس نے اس کا بندوبست کر دیا تھا۔ کسی کی مجال تھی کہ اس کے حکم سے انکار کرتا۔

ہندو بنیا رام داس خوش تھا کہ جان بچ رہی ہے۔ بھٹی کے اصرار کے باوجود اس نے تجوری میں رکھے زیورات کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ "اُن داتا' ان کی وجہ سے جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔" اُس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تھا۔ لیکن اس وقت رام داس کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ ایک ہار...... انسانی ہار جو وہ ساتھ لیے جا رہا ہے' وہ بھی اسے چھوڑنا پڑے گا...... اور وہ انسانی ہار تھا' اس کی بے حد حسین بیٹی شوبھا' جو شفاعت بھٹی کو اتنا پسند آ گیا تھا کہ اسے اپنے گلے میں ڈالنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔

بھٹی نے ایک چھوٹے افسر کو رام داس کے سامنے حکم دیا تھا کہ وہ سرکاری جیپ میں خود اس فیملی کو سرحد پار کرا کے آئے لیکن ایک حکم ایسا تھا' جو اس نے اس افسر کو تنہائی میں دیا تھا۔

اس حکم کے نتیجے میں شوبھا واپس آ گئی اور روتا پیٹتا رام داس سرحد پار کر گیا۔

شفاعت بھٹی نے انگریزوں کے ساتھ بہت وقت گزارا تھا اور ان سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ حکومت کرنے والوں کو کبھی انکار نہ کیا جائے تو پھر آپ خود حکمران بن جاتے ہیں' یہ وہ دیکھ چکا تھا۔ اصل حکمران محض چند سو یا ہزار دو ہزار افسروں پر حکومت کرتے ہیں۔ اور ان افسروں میں سے جو عقل مند ہوتے ہیں' وہ لاکھوں پر حکمران ہوتے ہیں۔ سو وہ لاکھوں پر حکومت کرنے والا تھا۔ اسے دو ہی شوق تھے...... ایک ولایتی شراب اور دوسرا دیسی شباب۔

اور شفاعت بھٹی دوست بھی سوچ سمجھ کر بناتا تھا۔ دو دوست تو اس کے ہم پلہ افسر تھے۔ پھر ایک بہت بڑے زمین دار تھے' جن کے پاس دولت کی فراوانی تھی۔ بھٹی دولت کی اہمیت کو بھی خوب سمجھتا تھا۔ اُس کے علاوہ کچھ چھوٹے افسروں کے ساتھ بھی وہ بالادستی کے ساتھ شفقت اور مروت کا تعلق رکھتا تھا۔ وہ سب ایسے ہوتے تھے کہ کسی نہ کسی معاملے میں اس کے کام آ سکتے تھے۔

کچھ دن تو شوبھا اُس کی ذاتی خوشی بنی رہی۔ پھر اس نے اس خوشی میں دوستوں کو بھی شریک کر لیا۔ لیکن کھیلنے والوں کے دل کھلونوں سے بہت جلدی بھر جاتے ہیں۔ شوبھا بھی ان کے دل سے اتر گئی۔

ایسے میں ایک چھوٹے افسر نے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اسے ایک راستہ دکھا دیا۔ "سر...... اس وقت تو کیمپوں میں بہار آئی ہوئی ہے۔" اس چھوٹے افسر نے کہا۔ "اور سیکرٹری داخلہ ہونے کی حیثیت سے آپ ان کیمپوں کے بادشاہ ہیں۔"

اس کے نتیجے میں جمیل کی کیمپ میں تعیناتی ہوگئی اور یوں یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ بہت تھوڑے

وقت میں جمیل، بھٹی کے لیے ناک کا بال بن گیا۔ اس سے پہلے بھٹی نے اس لیول کے کسی آدمی کو منہ نہیں لگایا تھا لیکن جمیل کی بات اور تھی۔ وہ بہت تیز وطرار تھا' اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی ضرورت بخوبی پوری کر رہا تھا۔

شوبھا کی اہمیت اب محض ایک ساقی کی سی رہ گئی تھی۔ پھر ایک دن جمیل نے بھٹی سے شوبھا کو مانگ لیا۔

بھٹی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ "تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی؟"

"آپ کے در کا کتا ہوں سرکار۔" جمیل نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ "گوشت نہیں مانگتا۔ چھوڑی ہوئی ہڈی کی اوقات ہے میری۔ اسی لیے اسے مانگ رہا ہوں۔ اب یہ تو آپ کو شراب پلانے کے لائق بھی نہیں رہی۔ میں تو کہتا ہوں سرکار' ساقی بھی بدلتے رہا کیجیے۔ نشہ اور بڑھ جاتا ہے۔"

بھٹی کو اس کی بات بھا گئی اور اس نے شوبھا کو جمیل کے حوالے کر دیا......

قدموں کی آہٹ سن کر بھٹی نے چونک کر دیکھا۔ چوہدری صاحب اپنے تین ملازموں کے ساتھ آئے تھے۔ ان کے ساتھ سامانِ ناؤ نوش بھی تھا۔ "لو جی بھٹی صاحب' ہم تو آ گئے۔ تم سناؤ کیا حال ہے؟"

ملازمین شراب کی بوتلوں کو برف میں لگانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ "سب ٹھیک ہے جی چوہدری صاحب۔" بھٹی نے کہا۔

تھوڑی دیر میں اکبر صاحب اور چیمہ صاحب بھی آ گئے۔ محفل جم گئی۔ شراب کا دور شروع ہو گیا۔ ان دنوں زرینہ نام کی ایک لڑکی ان کی خدمت کرتی تھی۔

"اس زرینہ سے کب تک کام چلے گا بھٹی صاحب۔" چوہدری نے کہا۔ "لگتا ہے' مجھے پنڈی جانا پڑے گا۔ تمہاری تو بادشاہت ختم ہو گئی۔"

"میں نے جمیل کو بڑی سختی سے کہلوایا ہے چوہدری صاحب۔ آپ فکر نہ کریں۔" بھٹی نے قدرے کھسیا کر کہا۔ اسے جمیل پر بڑی شدت سے غصہ آیا تھا۔

کچھ دیر بعد جمیل بھی آ گیا۔ وہ اکیلا تھا۔

"اتنی دیر میں آئے اور وہ بھی اکیلے۔" بھٹی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"کیا کروں سرکار۔ ہاتھ پاؤں تو آپ نے ہی کٹوا دیے ہیں۔" جمیل نے جواب دیا۔ اس کے انداز میں بے خوفی تھی۔

"اس سے تو اچھا تھا' میں تمہیں ڈسمس ہی کرا دیتا۔" بھٹی نے بہت غصے سے کہا۔

جمیل ہر کام سوچ سمجھ کر کرتا تھا' بولنے سے پہلے ہر لفظ کو تولتا تھا۔ "واقعی سرکار' یہی اچھا

ہوتا۔" اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "نوکری کی تو مجھے ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ اس سے زیادہ تو گھوم پھر کر کما لیتا ہوں۔ یہ تو بس آپ جیسوں کی خدمت کے لیے نوکری کر رہا ہوں۔"

"تو پھر خدمت تو کرو نا۔" بھٹی نے نرم لہجے میں کہا۔

"وہی تو کہہ رہا ہوں سرکار کہ اس تبادلے سے ہاتھ پاؤں کٹ گئے میرے۔ خزانہ تو اس کیمپ میں ہی تھا سرکار۔"

"تمہارا تبادلہ دفتر میں نہیں کیا گیا جمیل۔" بھٹی کا لہجہ سرد ہو گیا۔ "تمہیں دوسرے کیمپ میں بھیج دیا گیا ہے۔"

"اب وہاں جمنے میں وقت تو لگے گا صاب جی۔ اور پھر اس کیمپ جیسی بات کہاں۔" جمیل نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "پھر سرکار' آپ کی خدمت کر کے ہم نے عزت کے سوا کیا کمایا تھا۔ وہ بھی آپ کے ہوتے ہوئے لٹ گئی مسعود صاب کے ہاتھوں۔ سچ تو یہ ہے سرکار کہ اب تو میں ڈر گیا ہوں۔"

"میری بات غور سے سن جمیل۔ تیرے پاس دو گھنٹے ہیں۔ خالی ہاتھ آیا یا نہیں آیا' دونوں صورتوں میں تیری خیر نہیں۔ ہماری محفل خراب مت کر۔ جا جلدی سے آ۔" بھٹی کا لہجہ نرم تھا۔ لیکن تیور بہت کڑے تھے۔

"آپ کا نمک خوار ہوں سرکار۔ آپ کے لیے کیا کچھ کیا ہے میں نے۔ اور آپ مجھے دھمکا رہے ہیں۔"

"تو کیا احسان مانوں تیرا۔ اور میرے لیے کچھ نہیں کیا ہے تو نے' اپنے ہی لیے کیا ہے۔"

"اب تو کچھ بھی نہیں رہ گیا جناب آپ نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ میں استعفیٰ ہی دے دیتا ہوں۔"

بھٹی پہلی بار مسکرایا۔ لیکن وہ مضحکہ اڑانے والی مسکراہٹ تھی۔ "ضرور دے دینا۔ مگر اس سے پہلے ہمارے لیے آج کا بندوبست کرنا ہو گا۔"

"میں کیسے کروں۔ بے بس ہوں سرکار۔ میں یہ نوکری ہی چھوڑ رہا ہوں۔" جمیل کے لہجے میں بے رخی آ گئی۔

"تو ایک اور کام کر۔ شوبھا کو واپس لا دے......"

"شوبھا؟" جمیل کا انداز ایسا تھا' جیسے کچھ سمجھ ہی نہ پایا ہو۔

"ہاں شوبھا...... وہ ہڈی جو تو میرے دسترخوان سے مانگ کر لے گیا تھا۔"

"وہ...... وہ ہندو لڑکی؟ وہ تو اب میرے پاس نہیں ہے سرکار۔"

"کہاں گئی؟" بھٹی کا انداز مضحکہ اڑانے والا تھا۔

"کچھ دن میرے پاس رہی۔ پھر بھاگ گئی جناب۔"

"بھاگ گئی یا تُو نے بازار میں لے جا کر بیچ دیا اسے۔"

جمیل کا تو چہرہ فق ہو گیا۔ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہیں سکا' پھر اُس نے بڑی مشکل سے کہا۔ "کک...... کیا...... کک...... کہہ رہے ہیں سرکار۔"

"مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کس کوٹھے پر بیٹھی ہے۔" بھٹی نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "میں ایسے ہی اتنی بڑی کرسی پر نہیں بیٹھا ہوں۔ رعایا سے باخبر رہتا ہوں تو حکمرانی کرتا ہوں۔ اب تو سمجھا جمیل۔ مجھے آنکھیں کبھی نہیں دکھانا۔ ورنہ نوکری تو بہت چھوٹی چیز ہے۔ عمر بھر کے لیے جیل میں سڑوا دوں گا تجھے۔ وہ شوبھا خود تیرے کالے کرتوت بیان کرے گی۔ اور یہ بھی یاد رکھنا' میری طرف کوئی انگلی نہیں اٹھے گی۔ جا...... بس اب دفع ہو جا۔ دو گھنٹے ہیں تیرے پاس۔"

جمیل وہاں سے نکلا تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

اس کے جانے کے بعد چیمہ نے بھٹی سے کہا۔ "مان گئے یار' استاد ہو۔ مگر تمہیں پتا کیسے چلا؟"

"ادھر کیمپ میں ایک جاسوس ہے میرا۔ یہ جمیل اسے اپنا بندہ سمجھتا ہے۔ اب یار' خبر تو رکھنی پڑتی ہے۔"

"مگر اس کے تبادلے کا کیا چکر ہے۔ تم اپنے محکمے میں بھی بے بس ہو گئے۔" اکبر نے حیرت سے کہا۔

"مجبوری تھی۔ جانتے ہو اس کیمپ کا انچارج کون ہے؟ مسعود احمد خان!"

"وہ؟ وہ وہاں کہاں جھک مار رہا ہے۔ وہ تو آئی سی ایس ہے۔" چیمہ نے بے ساختہ کہا۔

"وہاں جھک نہیں مار رہا ہوتا تو شاید تمہاری جگہ بیٹھا ہوتا۔" بھٹی نے چڑ کر کہا۔

"کیا پتہ تمہاری جگہ ہوتا۔" چیمہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"ہاں' کیوں نہیں' بہرحال وہ وہاں خدمتِ خلق کر رہا ہے۔ وہ تو اس جمیل کو معطل کرانے پر تلا بیٹھا تھا۔ بڑی مشکل سے تبادلے پر بات ٹلی۔"

"لیکن یار وہ تمہیں ڈکٹیٹ تو نہیں کرا سکتا۔" اکبر بولا۔

"کرا سکتا ہے اور کرایا ہے۔ وہ استعفا دینے جا رہا تھا۔"

"تو جانے دیتے۔ خس کم جہاں پاک۔"

"اس کا استعفا قبول ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت تو کمی ہے افسروں کی۔ اور پھر احتجاجی استعفا۔"

"اوہ۔ ہاں یہ تو ہے۔"

"اویار چھوڑو ان باتوں کو۔ جام بنواؤ۔" چوہدری نے کہا۔ "اور سنو' یہ تمہارا جمیل اب آئے گا بھی یا نہیں۔"

"آئے گا چوہدری صاحب...... جم جم آئے گا۔" بھٹی نے ہنستے ہوئے کہا۔

❁ ❁ ❁

شاہی قلعہ اور بادشاہی مسجد دیکھ کر عبدالحق کو دہلی یاد آ گیا۔ مغل دور کا طرزِ تعمیر کس قدر منفرد ہے۔ اس نے سوچا' ایک نظر ڈالو تو پتا چل جائے کہ یہ مغل دور کی عمارت ہے۔

اس کا جی چاہا کہ اندر جا کر دیکھے لیکن افضال صاحب کے انہماک کو توڑنا اچھا نہیں لگا۔ اس نے سوچا' بعد میں کبھی اکیلا آئے گا۔

افضال صاحب کا انہماک بھی عجیب تھا۔ وہ گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے چلتے تھے۔ بلکہ ان کے انہماک کا مرکز چہرے تھے۔ وہ ہر شخص کو یوں دیکھتے' جیسے وہ ان کا شناسا ہے' اور وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

وہ خاموشی سے ان کے ساتھ چلتا رہا۔ اتنے ہی غور سے وہ انہیں دیکھ رہا تھا۔

اچانک...... بالکل ہی اچانک جیسے دنیا بدل گئی۔ موڑ مڑتے ہی وہ ایک بارونق علاقے میں داخل ہو گئے۔ وہاں راہ گیروں کی تعداد بھی زیادہ تھی' اور آوازیں ہی آوازیں تھیں۔ بھانت بھانت کی آوازیں۔ سڑک کے دونوں طرف کئی منزلہ پرانے مگر پختہ مکانات کا سلسلہ تھا۔ نچلی منزل پر دکانیں ہی دکانیں تھیں' جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ بازار ہے۔ وہاں ہر طرح کی دکانیں تھیں۔ چائے خانے بھی تھے اور کھانوں کے ریستوران بھی۔ مگر وہاں ہار پھول بیچنے والوں اور پان بیڑی والوں کی دکانیں بڑی کثرت سے تھیں۔

ہار پھول والوں کی دکانیں دیکھ کر عبدالحق کو داتا دربار کا خیال آ گیا۔ اُس نے سوچا' یہاں بھی قریب ہی کوئی مزار ہو گا۔ مگر ایک فرق تھا۔ وہاں لوگ ہار' پھول اور چادریں لے کر مزار کا رخ کرتے تھے۔ جبکہ یہاں لوگ ہار خرید کر خود اپنے ہی گلے میں ڈالتے اور مستانہ چال چلتے آگے بڑھ جاتے یا کسی نیم تاریک زینے میں گھس جاتے۔

"یہاں کوئی مزار ہے؟" اُس نے افضال صاحب سے پوچھا۔

"نہیں میاں' یہ قبرستان ہے...... زندہ روحوں کا قبرستان۔" انھوں نے افسردگی سے کہا۔

عبدالحق نے مزید کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ جواب سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی ذہنی رو بہک گئی ہے۔

وہ آگے بڑھتے رہے۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے عبدالحق کو گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ آگے چند شراب خانے بھی تھے۔ پھر مکانوں کے بالا خانوں پر اسے جا بہ جا عورتیں بیٹھی نظر آئیں۔ یہ

ظاہر تو وہ بنی سنوری بیٹھی تھیں۔ ہونٹوں پہ سرخی' چہرے پر غازہ' آنکھوں میں کاجل اور کلائیوں میں گجرے لیکن اس بناؤ سنگھار کے باوجود نجانے کیوں وہ اسے اجڑی اجڑی لگ رہی تھیں۔ اور ان سے کچھ اشارے کر رہی تھیں۔ کچھ کی نگاہوں میں بلاوے تھے۔ کچھ ساکت بیٹھی تھیں۔ مگر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ یہ الگ بات کہ عبدالحق کو لگ رہا تھا کہ وہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر چپکا دی گئی ہے۔

عبدالحق نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ اس وقت کوئی لڑکھڑاتا ہوا شرابی اُس سے ٹکرا گیا۔

"ایں...... دیکھ کیں چل۔" شرابی لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں منمنایا اور اِدھر اُدھر ڈولتا آگے بڑھ گیا۔

"یہ کون سی جگہ ہے افضال صاحب؟"

لیکن افضال صاحب بالا خانوں پر عورتوں کو دیکھنے میں ایسے منہمک تھے کہ انھوں نے اُس کی آواز سنی ہی نہیں۔

چند لمحوں میں عبدالحق کو احساس ہو گیا کہ اس سڑک پر بعض راہگیر مستقل ہیں۔ بلکہ انہیں راہگیر نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ راہگیر تو راستے سے گزر کر کسی منزل کی طرف جاتے ہیں۔ جبکہ یہ لوگ اسی سڑک پر مستقل اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر چل رہے تھے۔

عبدالحق نے اُن میں سے ایک کو غور سے دیکھا تو اسے کوّے کا خیال آیا۔ وہ اپنے چہرے اور وضع قطع سے کوئی لفنگا لگ رہا تھا۔ انگلیوں میں دبی ہوئی بیڑی' جس کا کش لیتے وقت وہ مٹھی بنا لیتا تھا۔ اور اُس کی آنکھیں ایسی متحرک تھیں' جیسے ٹھہرنا ہی نہیں جانتی ہوں۔ اور وہ کسی چیز یا کسی شخص کو براہ راست نہیں دیکھتا تھا۔ اسی صفت پر عبدالحق کو کوّے کا خیال آیا تھا کہ کوا اپنی پسندیدہ کسی چیز کو نظر بھر کر نہیں دیکھتا' چپکے چپکے کن انکھیوں سے دیکھتا ہے' اور آہستہ آہستہ اُس کی طرف کھسکتا ہے۔ ذرا سی آہٹ ہو تو بھڑک کر اُڑ جاتا ہے' ورنہ اُس چیز کو چپکے سے چونچ میں دبا کر اُڑ جاتا ہے' اور کہیں دور جا کر اسے کھاتا ہے۔

اُس شخص کو عبدالحق کی نگاہوں کا احساس ہوا تو وہ مسکرایا۔ اس کے پیلے پیلے دانت نمایاں ہو گئے۔ اس لمحے اسے دیکھ کر عبدالحق کو کراہت کا شدید احساس ہوا اور وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

اسے پتا بھی نہ چلا کہ وہ شخص اُس کے پاس آ گیا ہے اور اُس کے ساتھ چل رہا ہے۔ "مال چاہیے باؤ صیب؟"

"مال' کیسا مال؟" عبدالحق نے گھبرا کر پوچھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہ کوئی بہت بری بات کی جا رہی ہے۔ اس نے امداد طلب نظروں سے افضال صاحب کو دیکھا لیکن وہ بدستور حالتِ استغراق میں تھے۔

وہ شخص ہنسا...... اور اس کی ہنسی بھی بڑی مکروہ تھی۔ پیلے دانت پھر نمایاں ہو گئے۔ "مال کا پوچھتے ہو۔ باؤجی ہیرا منڈی میں کیا لینے آئے ہو۔ یہاں تو ہیرے ملیں گے نا۔ کہو تو نیلم دلوا دوں' کہو تو یاقوت۔ چکنے نگ ہیں...... بے داغ بھی ہیں۔ میرے جیسا مال یہاں کوئی نہیں دلوائے گا......"

اچانک افضال صاحب چونکے۔ انھوں نے خشمگیں نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا اور مضبوطی سے عبدالحق کا ہاتھ تھام لیا۔ "ہمیں تم سے کچھ نہیں چاہیے۔" وہ تند لہجے میں بولے۔

کوّے جیسی فطرت کا شخص اسی لمحے پلٹ گیا۔

"یہ کون سی جگہ ہے افضال صاحب؟"

"اسے شاہی محلہ بھی کہتے ہیں۔ حالانکہ یہاں نہ بکنے والا شاہ ہے' نہ خریدنے والا۔ اور اسے ہیرا منڈی بھی کہتے ہیں۔ یہ نام ٹھیک ہے اس کا۔"

"کیا یہاں واقعی ہیرے ملتے ہیں؟"

"منڈی تو یہ کنکروں کی ہے۔ مگر یہاں بدنصیب ہیرے بھی پہنچ جاتے ہیں۔ انھی کو تو ڈھونڈتا ہوں میں۔"

عبدالحق کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ "کبھی کبھی آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔"

"ارے میاں' یہ بازارِ حسن ہے۔" افضال صاحب کے لہجے میں غصہ بھی تھا اور جھنجلاہٹ بھی۔ "اب یہ نہ کہنا کہ تم بازارِ حسن کا مطلب بھی نہیں سمجھتے۔"

"جی...... میں واقعی نہیں سمجھتا۔" عبدالحق نے شرمندگی اور عاجزی سے کہا۔

"میاں' تم ہندوستان سے آئے ہوئے تو نہیں لگتے۔ لگتا ہے' ماں کے پیٹ سے سیدھے یہاں چلے آئے ہو۔" افضال صاحب نے غصے سے کہا۔ پھر اچانک ان کا لہجہ نرم ہو گیا۔

"یہاں عورت کو سب سے برے روپ میں بٹھا کر اس کا کاروبار کیا جاتا ہے۔ یہ عورتیں دیکھ رہے ہو نا۔" انھوں نے بالا خانوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بکنے کے لیے بیٹھی ہیں۔ گاہکوں کو بلا رہی ہیں۔"

اگر حمید سے بات نہ ہوئی ہوتی تو شاید عبدالحق یہ بات بھی نہ سمجھتا۔ اور جب اُس کی سمجھ میں آئی تو اس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ "تو آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"میں ہر شام یہاں آتا ہوں...... اس یقین کے ساتھ کہ ان کنکروں پتھروں میں رُلتا ہوا کوئی ہیرا مجھے ضرور ملے گا۔ بس یہی تلاش ہے میری۔"

اسی لمحے ایک نسوانی آواز نے جیسے ان کے قدم تھام لیے۔ کوئی عورت بڑے دلنشیں انداز میں گا رہی تھی۔

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر آتا ہے پروانہ

آواز میں بلا کا لوچ تھا...... اور لہجے میں وہ غرور و تمکنت جو اس شعر کے شایانِ شان تھی۔ ساتھ ہی ڈھولک کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی جھنکار بھی تھی۔ پھر گانے والی نے دوسرے مصرع کی تکرار شروع کر دی، جیسے شمع کو چیلنج کر رہی ہو اور پروانے کو لبھا رہی ہو۔

افضال صاحب نظریں اُٹھائے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ عبدالحق کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا۔ سب کچھ جاننے کے بعد عبدالحق میں تو اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہاں سر اٹھاتا۔ مگر چند لمحے بعد جب افضال صاحب کی گرفت اچانک سخت ہوگئی تو اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کے چہرے پر اضطراب تھا، اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ان کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ مگر آواز واضح نہیں تھی۔

"کیا ہوا افضال صاحب؟ کیا بات ہے؟"

"زرینہ...... زرینہ......" ان کے لہجے میں بھی اضطراب تھا۔

"کون زرینہ...... کہاں؟"

"چپ۔" انھوں نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے اشارہ کیا۔ پھر دھیمی آواز میں بولے۔ "وہ سامنے کوٹھے پر دیکھو وہ زرینہ ہے۔"

عبدالحق نے اس طرف دیکھا۔ وہاں کئی لڑکیاں بیٹھی تھیں۔

"آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"وہ...... وہ ہرے دوپٹے والی۔" افضال صاحب نے ہیجانی آواز میں کہا۔ "اسے غور سے دیکھ لو اور یاد رکھو۔"

"کیوں؟"

"تاکہ پہچان سکو۔"

"مگر کیوں؟"

"اب یہاں سے چلو۔ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔" وہ عبدالحق کا ہاتھ تھام کر چل پڑے۔

"اب چلنا کہاں ہے؟" عبدالحق نے پوچھا۔

"کیمپ جائیں گے میاں۔"

عبدالحق نے تانگہ روک لیا۔ افضال صاحب نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ عبدالحق کا تجسس سے برا حال تھا۔ وہ زرینہ کون تھی؟ جسے وہاں دیکھ کر افضال صاحب مضطرب ہو گئے تھے۔ کیا وہ اسے ہی ڈھونڈنے کے لیے ہر روز نکلتے تھے؟ کون تھی وہ ان کی؟ اور وہاں کیسے پہنچ گئی؟

کیمپ میں افضال صاحب نے عبدالحق کو زرینہ کے بارے میں بتایا۔ اس بدنصیب لڑکی کے

گھر کے تمام لوگ امرتسر میں شہید کر دیے گئے تھے۔ وہ اکیلی نجانے کیسے پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

"تو وہ وہاں کیسے پہنچ گئی؟"

"یہ تو وہی بتا سکتی ہے۔"

"تو ہمیں اس سے ملنا چاہیے تھا۔"

"ایسے نہیں میاں۔ اسے وہاں سے نکال کر لانا ہے۔"

"یہ بات وہاں کہتے تو وہ اس وقت ہمارے ساتھ ہوتی۔"

"دیکھو میاں، تم کم عمر اور ناسمجھ ہو۔ کوٹھوں کے ماحول سے ناواقف ہو۔" افضال صاحب اسے بچوں کی طرح سمجھانے لگے۔ "کوٹھے پر بیٹھی عورت کو نکال لانا آسان ہوتا تو ایسے تمام بازار کب سے اجڑ چکے ہوتے۔ جبکہ تمہیں سب سے زیادہ رونق انہی بازاروں میں نظر آئے گی۔ کوئی لڑکی ایک بار اس ماحول میں پہنچ جائے تو اس سے نکل نہیں سکتی۔ کوئی لاکھوں میں ایک بچ نکلتی ہے۔ مگر انجام اس کا بھی اچھا نہیں ہوتا۔"

عبدالحق حیران تھا۔ اسے تو لگ رہا تھا کہ اس نے دنیا کو دیکھا اور سمجھا ہی نہیں۔ اب اُس کی سمجھ میں بات پوری طرح نہیں آئی تھی۔ "اسے وہاں سے نکال لانے میں دشواری کیا تھی۔"

"کوٹھوں پر ہر طرح کے لوگ آتے ہیں میاں۔ شریف بھی اور بدمعاش بھی۔ دکان جو ٹھہری۔ اب دکان دار کی گاہک منتخب کرنے کی حیثیت تو نہیں ہوتی نا۔ ایسے لوگ بھی کوٹھوں پر جاتے ہیں، جنھیں کوئی لڑکی زیادہ پسند آ جائے تو وہ اسے جبراً یا اس کی مرضی سے اٹھا کر لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو ایسے لوگوں سے نمٹنے کے لیے بازار میں بدمعاشوں کو ملازم رکھا جاتا ہے۔ بعض کوٹھوں پر اپنے پہرے دار بھی ہوتے ہیں۔ اور ان کے پاس ہتھیار بھی ہوتے ہیں۔ چاقو تو سبھی کے پاس ہوتے ہیں۔ وہ جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتے میاں۔"

عبدالحق نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ "بس اتنی سی بات ہے۔ آپ ابھی کہیں تو میں اس لڑکی کو اکیلا جا کر لے آؤں۔ نہ اُس کے خراش آئے نہ میرے۔"

افضال صاحب نے سر اٹھا کر بڑی بے بسی سے اُسے دیکھا۔ "یہ سب کچھ تمہاری سمجھ میں اتنی آسانی سے کیسے آئے گا میاں۔ میں نے کہا نا کہ وہاں غنڈے......"

عبدالحق نے ان کی بات کاٹ دی۔ "مجھے لٹھیا چلانی آتی ہے افضال صاحب۔ دس بیس کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں اللہ کے فضل و کرم سے۔"

"دیکھو میاں، ایک وعدہ کرو مجھ سے۔ اس معاملے میں تم بس اتنا ہی کرو گے، جتنا میں کہوں۔ یہ طاقت سے حل کرنے والا مسئلہ نہیں ہے۔"

عبدالحق کو ان کا لحاظ نہ ہوتا تو وہ اسی وقت جا کر اس زرینہ کو اپنے ساتھ لے آتا لیکن ایک دشواری اور بھی تھی۔ اُس نے زرینہ کو دیکھا ضرور تھا۔ لیکن یقینی طور پر اسے پہچان نہیں سکتا تھا۔ وہاں کوٹھے پر اتنی روشنی بھی نہیں تھی کہ وہ اس کی صورت دیکھ کر پوری طرح ذہن نشین کر سکتا۔ البتہ افضال صاحب اسے پہلے سے جانتے...... پہچانتے تھے۔ ''تو ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ ''آپ حکم کیجیے کہ کیا کرنا ہے۔''

افضال صاحب نے کچھ نہیں کہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھے۔ چہرے کی لکیروں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

چند لمحے بعد انھوں نے سر اٹھایا اور عبدالحق کو بہت غور سے دیکھا۔ ''اپنی مالی حیثیت کے بارے میں بتاؤ ذرا۔''

''جی...... اللہ کا بڑا فضل ہے۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''پاکستان آنے کے بعد پہلی بار مجھے افسوس ہو رہا ہے اپنی تہی دامنی کا۔ میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ کبھی مجھے روپے پیسے کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔''

''ارے...... آپ بتائیں تو۔'' عبدالحق نے تڑپ کر کہا۔ ''کیا ضرورت ہے آپ کی؟''

''میری ضرورت تو بس زرینہ ہے۔''

''کہیں تو اسے میں ابھی لے آؤں۔ چلیں میرے ساتھ۔''

''تم نے وعدہ کیا ہے کہ میرے کہنے پر عمل کرو گے۔''

''جی ہاں۔ اور میں وعدہ کبھی نہیں توڑتا' آپ بتائیں تو' کرنا کیا ہے۔''

''ہمیں زرینہ کو خرید کر واپس لانا ہوگا۔ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ تمہاری مالی حیثیت کیا ہے۔''

عبدالحق پھر بحث کرنا چاہتا تھا لیکن اسے یہ مناسب نہیں لگا۔ ''آپ یہ بتائیں کہ آپ کی زرینہ کتنے میں ملے گی؟'' اُس نے پوچھا۔

''کون جانے' سو روپے میں...... اور کیا پتا' پانچ سو میں۔'' افضال صاحب کے لہجے میں تشویش تھی۔

''بس تو بے فکر ہو جائیں۔'' عبدالحق نے بے پروائی سے کہا۔ ''اگر وہ کوئی اچھی جگہ ہوتی تو میں آپ کی خاطر وہ پورا کوٹھا خرید لیتا۔''

پہلی بار افضال صاحب کے چہرے پر طمانیت نظر آئی۔ ''اللہ کا شکر ہے۔'' انھوں نے آہستہ سے کہا۔

''لیکن آپ مجھے یہ ضرور بتائیں کہ جب ہم زرینہ کو ویسے بھی لا سکتے ہیں تو اس خرید و

فروخت کی کیا ضرورت ہے۔'' عبدالحق کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''کیونکہ مجھے تو کسی لڑکی کو خرید کر لانا نہایت شرم ناک لگتا ہے۔''

''میں تمھیں بتاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم سمجھ جاؤ گے۔'' افضال صاحب نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''دیکھو...... اپنی عزت اور آبرو کی وجہ سے لڑکیاں کانچ سے زیادہ نازک ہوتی ہیں۔ زرینہ نوجوان ہے۔ اُس کے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ اب یہ تو ممکن نہیں کہ ہم جانتے بوجھتے اسے اس جہنم میں جلنے کے لیے چھوڑ دیں۔ اور بہ زور اسے لے کر آئیں تو ہنگامہ تو ہو گا نا۔ اور سب کو پتا چل جائے گا کہ زرینہ اتنے دن کوٹھے پر رہی ہے۔ پھر کون اس سے شادی کرے گا۔ تم کرو گے؟''

عبدالحق بہت غور سے سن رہا تھا۔ آخری بات سن کر اُس نے سر ہلایا۔ ''اگر میرے ساتھ ایک اور معاملہ نہ ہوتا تو بالکل کر لیتا۔ اس لیے کہ میرے نزدیک وہ گناہگار نہیں' معصوم ہے۔ وہ تو مظلوم ہے۔ اس پر جبر ہوا ہے۔''

''ایسی منطق زیادہ دن نہیں چلتی۔'' افضال صاحب نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ ''اول تو تمہارے انداز میں سوچنے والا کروڑوں میں ایک ہوتا ہے۔ کہاں ڈھونڈتے پھریں گے ہم۔ پھر فرض کر لو کہ کوئی تم جیسا مل گیا اور اُس کی شادی ہو بھی گئی تو جب بھی کسی بات پر غصہ آیا تو شوہر اسے یہ طعنہ دے گا۔ کبھی اس پر شک بھی کرے گا۔ اس کا کسی بھی وقت خراب نتیجہ نکل سکتا ہے۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ''نہیں...... یہ بات تو چھپانی ہی ہو گی۔ بس جیسا میں کہتا ہوں' تم ویسا ہی کرو۔''

''تو بتائیں مجھے' کیا کرنا ہے۔''

افضال صاحب اسے سمجھانے لگے۔ ان کی باتیں سن کر اُس کی آنکھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ تاہم اُس نے مداخلت نہیں کی۔

افضال صاحب کی بات پوری ہو گئی تو اس نے کہا۔ ''افضال صاحب' یہ سب تو بہت مشکل ہے میرے لیے۔ میں کیسے کر سکوں گا۔''

''ایک معصوم لڑکی کی زندگی تباہ ہونے سے بچانے کے لیے کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔''

''لیکن میں...... میں گاہک کی حیثیت سے...... میرے انداز سے سب کو......''

''سنو میاں' اس کوچے میں گاہکوں کے چہرے اور انداز نہیں دیکھے جاتے' صرف ان کی جیب پر نظر رکھی جاتی ہے۔ اور پھر وہاں جانے والوں میں سے ہر شخص کی زندگی میں یہ دن ضرور آتا ہے جب وہ پہلی بار اس کوچے میں قدم رکھتا ہے۔ سبھی گھبرائے ہوئے ہوتے ہیں پہلی بار۔''

عبدالحق پر اسی لمحے سے گھبراہٹ سوار ہو گئی۔ جبکہ وہاں جانے کا مرحلہ 24 گھنٹے دور تھا۔

❀ ❀ ❀

اُس روز حمیدہ سے گفتگو کے نتیجے میں نور بانو میں ایک بڑی تبدیلی آئی۔ بنیادی تبدیلی یہ تھی

کہ عبدالحق کے بارے میں اس کے سوچنے کا انداز مثبت ہو گیا تھا۔ یہ احساس کہ عبدالحق خود کو اُس کے قابل نہیں سمجھتا' پہلے تو ناقابلِ یقین لگا۔ مگر پھر ذہن بتدریج اسے تسلیم کرنے لگا۔ پھر اس خیال سے اسے خوشی ملی' اور اس کے نتیجے میں وہ خوش بھی رہنے لگی اور خوش مزاج بھی ہو گئی۔

دن تو کاموں میں گزر جاتا تھا۔ کام میں بھی اب اُس کا دل زیادہ لگتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے پتا چلا تھا کہ خوش رہنے کی کتنی اہمیت ہے۔ آدمی خوش ہو تو کام بھی اچھی طرح کرتا ہے' اور کام کرنے سے بھی خوشی ملتی ہے۔

یہ احساس بھی اسے پہلی بار ہوا کہ زندگی میں پہلی بار وہ صحیح معنوں میں خوش ہوئی ہے۔ دہلی میں گزری ہوئی زندگی پر وہ نظر ڈالتی تو سمجھ میں آتا کہ وہ خوش کبھی نہیں رہی تھی۔ اس کے پاس تو شکایتوں کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ اور شاکی لوگ کبھی خوش نہیں ہوتے۔ اور شکایت اسے سبھی سے تھی' خود سے بھی اور اللہ میاں سے بھی۔ اللہ میاں سے تو بہت بڑی شکایت تھی۔ اُس کے ماں باپ خوبصورت تھے' دونوں بہنیں خوبصورت تھیں' تو پھر وہ اتنی بدصورت کیوں تھی۔ وہ بری طرح احساسِ کمتری میں مبتلا تھی۔ اور اپنے اندر کی جھنجلاہٹ وہ دوسروں پر اتارتی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ زندگی میں محبت کی کتنی اہمیت ہے۔ بلکہ اصل میں محبت سے زیادہ محبت کو تسلیم کرنے اور اس کے اظہار کی اہمیت ہے۔ اور وہ اپنے اندر موجود محبتوں کو تسلیم ہی نہیں کرتی تھی۔ اظہار تو بہت دور کی بات ہے۔

کوئی انسان ایسا نہیں ہو سکتا' جو محبت نہ کرتا ہو۔ وہ بھی محبت کرتی تھی...... امی سے' باجی سے' گلنار سے' بوا سے اور آ کا میاں سے' لیکن اپنے احساسِ کمتری کی وجہ سے وہ ان میں سے کسی سے بھی قریب نہیں تھی۔ بہنوں کی باہمی محبت تو قدرتی ہوتی ہے۔ باجی اور گلنار میں کیسی محبت تھی۔ وہ انہیں دیکھتی اور کڑھتی تھی کہ وہ ان جیسی نہیں ہے۔ اس احساس نے اسے تنہا رہنے کا عادی بنا دیا۔ سب کچھ چھوڑ کر اُس نے کتابوں سے دوستی کر لی۔ اب جو آدمی اپنے اندر کی محبتوں سے منہ موڑے گا' وہ جھنجلائے گا بھی اور جو جھنجلائے گا' وہ ناخوش بھی رہے گا۔

اب اُس کی سمجھ میں آیا تھا کہ محبت کو تسلیم کرنے اور اُس کا اظہار کرنے میں بہت بڑی خوشی ہے۔ عبدالحق کے آنے کے بعد سے باجی کو اُس نے ایسی خوشی' ایسی سرشاری میں دیکھا تھا کہ وہ حیران ہوتی تھی۔ ان کی وہ کیفیت اس لیے تھی کہ انھوں نے اپنے دل میں موجود ٹھاکر ادتار سنگھ کی محبت کو تسلیم بھی کیا تھا' اور وہ اپنے تئیں اس کے اظہار کی کوشش بھی کرتی تھیں...... کبھی کُرتے کاڑھ کر اور کبھی اس کے لیے کچھ پکا کر۔

اور اب زندگی میں پہلی بار وہ خوش تھی۔ اس لیے کہ اُس نے عبدالحق کی محبت کو تسلیم کر لیا تھا۔ بلکہ اس نے اماں کے سامنے اس محبت کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ اس نے اماں سے کہا تھا کہ اسے

عبدالحق سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن وہ عبدالحق کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ کیونکہ وہ اس کے قابل نہیں ہے۔ یہ کہتے وقت اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ اس کا اظہارِ محبت ہے۔ مگر اب وہ سمجھ سکتی تھی۔ اور اس کے بعد وہ ایسی ہلکی پھلکی ہو گئی تھی' جیسے دل پر رکھا ہوا کوئی بھاری پتھر ہٹ گیا ہو۔

تو اب وہ سرشاری کی اس کیفیت میں تھی' جس میں باجی کو دیکھ کر وہ حسد کرتی تھی۔ کوئی کام کرتی تو لگتا کہ کسی خوبصورت دھن کی لے پر حرکت کر رہی ہے۔ چلتی تو لگتا کہ بادلوں پر اُڑ رہی ہے۔

مصروفیت کم نہیں تھی۔ دو بکری کے بچے اُس نے خود لیے تھے۔ اب وہ خاصے بڑے ہو گئے تھے۔ اُدھر مینو تھا' جو اس کے لیے بہت اہم ہو گیا تھا۔ بلکہ وہ ہر وقت اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اس کے علاوہ گھر کے کام الگ تھے۔

پھر اس کا جی یہ چاہتا کہ وہ اماں کے پاس جا کر بیٹھے۔ صرف اس لیے کہ وہ عبدالحق کے بارے میں باتیں کریں گی' اور اسے اچھا لگے گا۔ وہ نہ بولتیں تو وہ خود کسی بہانے سے اُس کا تذکرہ نکال لیتی۔

اور رات...... رات کا تو وہ بے صبری سے انتظار کرتی تھی۔ رات اسے اتنی اچھی کبھی نہیں لگی تھی۔ رات کی تنہائی اور اندھیرے میں عبدالحق کی چادر جسم پر لپیٹ کر وہ جاگتی آنکھوں اُس کے سپنے دیکھتی۔ اُس سے باتیں کرتی' وہ سب کچھ کہہ دیتی' جو شاید اس کی موجودگی میں وہ کبھی نہیں کہہ سکے گی۔ اور وہ اس کی زبان سے وہ سب کچھ سنتی' جو شاید وہ اس سے کبھی نہیں کہے گا۔ اور اس دوران وہ از خود رفتہ ہوتی۔ وہ شبنم جیسی خوشی تھی' جس میں وہ بھیگ جاتی تھی۔

اور پھر اسی کیفیت میں وہ سو جاتی...... گہری خوب صورت نیند۔ اور پھر وہ عبدالحق کو خواب میں دیکھتی۔ صبح اٹھتی تو وہ پھول کی طرح تر و تازہ اور خوش ہوتی۔ اور جس رات وہ عبدالحق کو خواب میں نہ دیکھتی' اس صبح اسے دن بھر کسی کمی کا اک احساس ستاتا رہتا۔ مگر ناخوش وہ تب بھی نہ ہوتی۔ کیونکہ وہ اس کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔

اس روز وہ اماں کے پاس گئی تو اماں نے اسے ایک نئی بات بتائی' بات کیا' وہ تو خوشخبری تھی۔

''سن نور بانو' اب تو رابعہ کا بہت خیال رکھنا۔'' حمیدہ نے کہا۔

''جی اماں' کوشش تو میں کرتی ہوں۔'' نور بانو نے جواب دیا۔ گو کہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

''دھی میری' اب اسے بوجھ بالکل نہ اٹھانے دینا۔''

''اس معاملے میں تو الٹا وہ میرا خیال رکھتی ہیں۔'' نور بانو نے شرمندگی سے کہا۔ ''وہ مجھے بہت کمزور اور نازک سمجھتی ہیں۔''

"تب تو تجھے اس کا زیادہ خیال رکھنا ہوگا دھیے۔" حمیدہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "کسی قیمت پر بھی اسے زیادہ وزن نہ اٹھانے دینا۔ پہلی بار کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے۔ خدا نہ کرے کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو نقصان بھی ہوسکتا ہے۔"

نور بانو کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ مگر وہ ڈر گئی تھی۔ "کیسی اونچ نیچ اماں؟" اُس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

حمیدہ نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ پہلی بار اسے خیال آیا کہ معصوم نور بانو یہ بات کیسے سمجھ سکتی ہے۔ وہ اسے بتانا بھی نہیں چاہتی تھی لیکن مجبوری تھی۔ گھر میں اور تھا ہی کون۔ "وہ ماں بننے والی ہے میری بیٹی۔" اُس نے بہت نرم لہجے میں کہا۔

نور بانو کی نگاہیں جھک گئیں۔ "جی اماں۔"

"تو سمجھ گئی ہے نا؟" حمیدہ نے زور دے کر پوچھا۔ "زیادہ وزن نہ اٹھانے دینا اسے۔"

"میں سمجھ گئی اماں۔ آپ اب فکر نہ کریں۔ میں خیال رکھوں گی۔"

"اور یہ بتا تو عبدالحق کے لیے دعا بھی کرتی ہے کہ وہ کامیاب واپس آئے۔"

"جی اماں، ہر وقت کرتی ہوں یہ دعا۔" نور بانو کی نظریں اور جھک گئیں۔

"اب ڈر تو نہیں لگتا اس دعا سے؟" حمیدہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ پھر دلاسہ دینے والے انداز میں بولی۔ "تو فکر نہ کر۔ اب میں تجھے جانے نہیں دوں گی یہاں سے۔"

نور بانو نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر جلدی سے سر کو تفہیمی جنبش دی اور وہاں سے اٹھ گئی۔

اس دن نور بانو بہت خوش تھی۔ شاید وقت کا مزاج بدل رہا ہے۔ اس نے سوچا۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہیں۔ زندگی کی ہری بھری شاخ پر ایک اور شگوفہ پھوٹنے والا ہے۔ خوشی کو ترسی ہوئی، اپنے اندر گھٹ گھٹ کر جینے والی لڑکی کے لیے وہ بہت بڑی خوشی تھی۔ اس نے تو کبھی کسی چھوٹے بچے کو گود میں لیا ہی نہیں تھا۔ بلکہ دیکھا بھی نہیں تھا۔ ارے...... کتنا اچھا لگے گا۔ وہ نہال ہو گئی۔

یوں اس کی مصروفیت اور بڑھ گئی۔

مگر رابعہ سے نمٹنا آسان نہیں تھا۔ کیونکہ معاملہ الٹا تھا۔ رابعہ اس کا خیال رکھتی تھی۔ وہ تو اسے بہت نازک۔ بہت بلند سمجھتی تھی۔ چنانچہ اسے مزاحمت تو کرنا تھی۔ اگلے روز رابعہ پانی گرم کرنے کے لیے بڑی دیگچی اٹھانے کے لیے بڑھی تو نور بانو نے اسے روک دیا۔ "نہیں آپا، یہ میں اٹھاؤں گی۔"

"ارے نہیں منجھلی بی بی......"

"مجھے اماں نے بتا دیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے نور بانو کی نگاہیں جھک گئیں۔ "اب آپ بوجھ

ذرا سا بھی نہیں اٹھائیں گی۔"

"کچھ فرق نہیں پڑتا ہم گاؤں کے لوگوں کو۔ آپ چنتا نہ کرو منجھلی بی بی۔"

بے بس ہوتی ہوئی نور بانو کو اچانک ایک نکتہ سوجھ گیا۔ ان لوگوں کی عبدالحق کے ساتھ وفاداری اور فرمانبرداری وہ دیکھ چکی تھی۔ اس وقت اس کمزوری ہی سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ "تو آپ میری بات نہیں مانیں گی آپا؟" اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"یہ کیسے مان لوں منجھلی بی بی۔ خدمت کرنا تو میرا کام ہے۔ مالک کو کیا جواب دوں گی۔"

"یہ میرا حکم ہے۔" نور بانو نے لہجہ اور سخت کر لیا۔

رابعہ ہچکچانے لگی لیکن ابھی اُس نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔

"نہیں مانو گی تو آپ کی شکایت کردوں گی ان سے۔"

"نا منجھلی بی بی...... ایسا نہ کرنا۔" رابعہ گھگھیانے لگی۔

"تو پھر آپ کو میرا ہر حکم ماننا ہوگا۔"

"ہم تو ہیں ہی حکم ماننے والے جی۔"

"مانو گی نا۔"

رابعہ نے مرے مرے انداز میں اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر غور سے سنو۔ تم کبھی کوئی بوجھ نہیں اٹھاؤ گی۔ ایسے موقع پر مجھے آواز دو گی۔"

"ٹھیک ہے منجھلی بی بی۔"

لیکن جب نور بانو نے دیگچی اٹھائی تو رابعہ نے نظریں جھکا لیں۔ چہرے سے لگتا تھا کہ وہ شرم سے پانی پانی ہو رہی ہے۔ نور بانو کو اندازہ ہوگیا کہ ہر روز یہ سب کچھ برداشت کرنا رابعہ آپا کے لیے آسان نہیں ہوگا۔

اور ہوا بھی یہی۔ اگلے روز صبح سویرے ہی ایک عورت کام کرنے کے لیے گھر آگئی۔

"یہ کیا......؟" نور بانو نے رابعہ سے پوچھا۔

"زبیر صاحب نے بندوبست کیا ہے۔ اب یہ ہر روز آکر کام کرے گی۔" رابعہ نے شرماتے ہوئے کہا۔ "لیکن منجھلی بی بی، کھانا آپ ہی پکایئے گا۔ آپ کے ہاتھ کے کھانے کے بنا اب اپنا گزارا نہیں۔"

نور بانو کو اس پر...... ان لوگوں پر بہت پیار آیا۔ کیسے عزت کرنے والے اور دھن کے پکے تھے یہ لوگ۔ یہ گوارا کر ہی نہیں سکتے تھے کہ کوئی ان کی معمولی سی خدمت بھی کرے۔ خدمت جیسے صرف انھی پر فرض تھی۔

❁ ❁ ❁

گاؤں میں پانی آ گیا۔ ہر طرف جیسے زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر چہرے پر مسکراہٹ تھی اور ہر دل میں خوشی، لیکن زبیر پریشان ہو گیا تھا۔ عبدالحق ابھی تک واپس نہیں آیا تھا، اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہاں کے معاملات کس طرح سنبھالے۔

اس شام چوپال میں تقریباً قصبے کے تمام مرد جمع تھے۔ کچھ بڑے بوڑھے بھی تھے، جو چارپائیوں پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ یہ چوپال کا بندوبست خود عبدالحق کر کے گیا تھا۔

''اللہ کی مہربانی سے آج حق نگر میں ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔'' ایک بوڑھے شخص نے کہا۔

''اور اس کے ساتھ ہی ذمہ داریاں بھی بڑھ رہی ہیں۔'' دوسرے نے کہا۔ ''اب پنچایت بنانا ضروری ہو گیا ہے۔''

''بالکل۔ پانی کی تقسیم کے معاملات طے ہو جانے چاہئیں۔ تاکہ بعد میں جھگڑا اور نا اتفاقی نہ ہو۔''

''ویسے یہاں یہ سب کچھ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ یہ حق نگر ہے۔ ہم سب پر احسان عبدالحق صاحب نے کیا ہے، جس کا صلہ ہم مر کر بھی نہیں چکا سکتے۔ تو کم از کم یہ تو کریں کہ امن، سکون اور محبت سے رہیں۔''

''یہ تو انشاء اللہ ہو گا۔ لیکن چھوٹے موٹے اختلافات تو گھر میں بھی ہوتے ہیں۔ ان کے تصفیے کے لیے پنچایت ضروری ہے۔''

''جی ہاں، یہ تو برسوں کی ریت ہے۔''

''اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ لوگ تھانے کچہری سے دور رہتے ہیں۔''

''معاملات تھانے کچہری میں جائیں تو دشمنی پیدا ہوتی ہے، نفرتیں بڑھتی ہیں۔''

سب لوگ اپنے اپنے طور پر اظہارِ خیال کرتے رہے۔ بالآخر پنچ منتخب کر لیے گئے۔

''اور سرپنچ کون ہو گا؟'' ایک جوان نے سوال اٹھایا۔

''سرپنچ اپنے عبدالحق کے سوا کون ہو سکتا ہے۔'' نیاز نے جلدی سے کہا۔

''مگر سرپنچ تو کسی بوڑھے، تجربہ کار اور عقل مند آدمی کو بنایا جاتا ہے۔'' ایک جوان نے اعتراض کیا۔

''دیکھو...... یہ گیارہ گاؤں تھے۔ مگر اب ایک قصبہ ہے۔'' بوڑھے اللہ یار نے کہا۔ ''اور اس قصبے کا نام ہے حق نگر۔ تو یہاں تو وہی ہو گا، جس کا حکم عبدالحق دیں گے۔ یہاں سرپنچ کی ضرورت نہیں۔''

اب زبیر سے چپ نہیں رہا گیا۔ ''میں ما......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔ عبدالحق نے اسے

سمجھایا تھا کہ مالک تو صرف اللہ ہے، تو پھر وہ اسے کیا کہے۔ عمر بھر اسے چھوٹے ٹھاکر یا مالک کہہ کر پکارتا رہا تھا۔ پھر اسے ان لوگوں کے تخاطب سے ایک مناسب لفظ مل گیا۔ وہ اسے صاحب کہہ سکتا ہے۔ وہ مسکرایا اور بات پھر سے شروع کی۔ ''میں صاحب کا مزاج سمجھتا ہوں۔ وہ بڑوں کی عزت کرنے والے ہیں۔ سرپنچ بننا کبھی پسند نہیں کریں گے۔''

''تو پھر۔''

''میں کہہ تو رہا ہوں کہ یہاں سرپنچ کی ضرورت نہیں۔'' اللہ یار نے زور دے کر کہا۔

''لیکن سرپنچ تو ضروری ہے۔''

''میں ایک بات کہوں۔'' زبیر بولا۔ ''آپ سرپنچ منتخب کر لیں۔ کبھی کوئی مسئلہ ہو، کسی کو پنچایت کا فیصلہ زیادتی لگے یا پنچایت کوئی فیصلہ نہ کر پائے تو صاحب سے فیصلہ کرا لیں۔ لیکن انھیں سرپنچ بنائے بغیر۔''

یہ بات سب کے دل کو لگی۔ بابا رحیم بخش کو سرپنچ بنا دیا گیا۔

''اب دیکھیں اس کا فائدہ۔'' زبیر نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''اب آپ لوگ پانی کی باریاں مقرر کر سکتے ہیں۔ پانی کی تقسیم کے معاملات طے کر سکتے ہیں۔ دیکھیں صاحب تو اس وقت بھی موجود نہیں۔''

اس کی بات پر اللہ یار کو ایک اور خیال آ گیا۔ ''اور ہاں، صاحب کی غیر موجودگی میں ان کی حیثیت زبیر صاحب کے پاس ہو گی۔''

زبیر نے بہت احتجاج کیا۔ مگر یہ فیصلہ بھی متفقہ طور پر قبول کر لیا گیا۔

''اب زمین کی لکھا پڑھی بھی ضروری ہے۔''

زبیر کو حسن دین کی بات یاد آ گئی۔ ''یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ پٹواری حسن دین کے پاس چلے جائیں۔ وہ کاغذات تیار کرا دیں گے اور حد بندی بھی کر دیں گے۔''

وہاں ایسے لوگ بھی تھے، جنہیں عبدالحق پہلے ہی زمین دے چکا تھا، اور اب وہ ان کے نام تھی۔ ان کا یہ مسئلہ تھا ہی نہیں۔

سو زبیر اب بہت ہراساں تھا۔ وہ حکم ماننے والا، کام کرنے والا آدمی تھا۔ یہ حاکم کا کردار اس کے بس کا نہیں تھا۔ اسے ایک ہی راہ سجھائی دی۔ یہ کہ وہ لاہور جائے اور صاحب کو ساتھ لے آئے۔ لیکن اس کے لیے اماں کی اجازت ضروری تھی۔

چوپال سے اٹھ کر وہ سیدھا حمیدہ کے پاس گیا اور اسے سارا احوال سنا کر لاہور جانے کی اجازت مانگی۔

''تو اب تُو لہور جا کر اسے کہاں ڈھونڈتا پھرے گا۔''

"وہ کوئی مسئلہ نہیں اماں۔ حسن دین سے پتا لے کر جاؤں گا۔"

"لیکن میں جانتی ہوں، وہ کام پورا کیے بغیر آنے والا نہیں۔"

"پھر بھی اماں، کوشش تو کر لوں۔ یہاں کے معاملات میرے بس کے نہیں۔"

"اچھا، چلا جا۔ اللہ تیری مدد کرے۔"

"تو پھر اماں، میں صبح نکل جاؤں گا...... حسن دین کی طرف ہوتا ہوا۔"

حمیدہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

❁ ❁ ❁

اگلے روز عبدالحق نے افضال صاحب سے پوچھا۔ "آج کہیں جا نہیں رہے ہیں آپ؟"

"نہیں میاں، بس رات کو چلیں گے۔ اپنے اس کام کے لیے۔"

عبدالحق دیکھ رہا تھا کہ وہ کتنے مضطرب ہیں۔ اور ہر پل ان کا اضطراب بڑھ رہا ہے۔ بس وہ چاہتے تھے کہ جلدی سے رات ہو جائے اور وہ کسی طرح زرینہ کو واپس لے آئیں۔

لیکن آنے والے وقت کے بارے میں سوچ سوچ کر عبدالحق بری طرح ہول رہا تھا۔ وہ ہمیشہ سے صاف اور کھرا آدمی رہا تھا۔ زندگی میں کبھی اُس کو اداکاری کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ مگر اب اسے ایک ایسا کردار ادا کرنا تھا، جو اسے پسند بھی نہیں تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اسے جو کردار ادا کرنا تھا، وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ کوئی اور صورت حال ہوتی تو وہ صاف انکار کر دیتا لیکن یہاں ایک معصوم لڑکی کی زندگی اور عزت بچانے کا معاملہ تھا۔

وہ افضال صاحب کو دیکھتا رہا، جنھیں کسی کل چین نہیں تھا۔ انھوں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ لیکن عبدالحق انہیں ایسے تو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اُس نے کہا۔ "افضال صاحب، کھانا تو آپ کو کھانا ہوگا۔"

"بالکل بھوک نہیں ہے میاں۔"

"آپ شاید بھول گئے۔ کھانا آپ بھوک لگنے کی وجہ سے نہیں، زندہ رہنے کے لیے کھاتے ہیں۔"

افضال صاحب کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ "بالکل دل نہیں چاہ رہا ہے میاں۔"

"دیکھیں...... پروگرام کے مطابق ہمیں وہاں پیٹ بھرے تماش بینوں کی حیثیت سے جانا ہے۔ جبکہ آپ کو اس وقت دیکھ کر بھی لگ رہا ہے کہ تین دن کے فاقے سے ہیں۔ تو پھر اپنا پروگرام کینسل کرنا پڑے گا۔"

اس دھمکی کے نتیجے میں افضال صاحب نے تھوڑا بہت زہر مار کر لیا۔

شام ہوئی تو افضال صاحب نے عبدالحق سے کہا۔ "میاں، اب تیاری کے لیے نکلیں۔"

"جی، ٹھیک ہے۔"

افضال صاحب اپنے اس صندوق کی طرف بڑھ گئے، جسے شاید انھوں نے کیمپ میں آنے کے بعد کبھی کھولا بھی نہیں تھا۔ اس میں سے انھوں نے اپنے لیے ایک شیروانی، کرتا اور پاجامہ نکالا۔ پھر سلیم شاہی جوتے بھی برآمد کیے۔ پھر وہ پُرتشویش نظروں سے ان چیزوں کو دیکھنے لگے۔

عبدالحق نے دیکھا اور سمجھ گیا۔ کپڑے بری طرح مسکے ہوئے تھے۔ "فکر نہ کریں۔ استری ہو جائیں گے۔"

عبدالحق کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ کیمپ سے ہی تیار ہو کر نکلا۔ البتہ افضال صاحب کو تیار کرانا تھا۔ باہر نکلتے ہی سب سے پہلے تو اُس نے بگھی کی فکر کی۔ تانگوں کی تو وہاں کثرت تھی۔ مگر بگھیاں ذرا کم تھیں۔ اور وہ بہت اچھی بگھی منتخب کرنا چاہتا تھا۔

بالآخر ایک بگھی اسے پسند آ گئی۔ گھوڑا بھی بہت شاندار تھا۔ "ہمیں یہ بگھی صبح تک کے لیے چاہیے۔"

"جی ضرور باؤ جی۔" بگھی والا بھی خوش ہو گیا۔

"کیا لو گے؟"

بگھی والے نے اسے تولنے والی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ "پانچ روپے لوں گا باؤ جی۔"

اُس نے سوچا جیسے ہی انکار ہوگا، جھٹ پیسے کم کر دے گا۔ اب رات بھر کے گاہک کو تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔

"میں دس دوں گا۔" عبدالحق نے کہا۔ "لیکن تمہیں اس بگھی کو ایسا سجانا ہوگا کہ لگے، کسی شوقین کی بگھی ہے۔"

"میں سمجھ گیا باؤ جی۔ ہو جائے گا۔" کوچ بان نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

عبدالحق نے جیب سے پانچ روپے نکال کر اسے دیئے اور افضال صاحب سے کہا۔ "چلیے...... بیٹھ جائیے۔"

"بولو باؤ جی، کہاں چلنا ہے۔"

"پہلے تو تم ہمیں کسی حمام کی طرف لے چلو۔"

مگر راستے میں عبدالحق نے اسکیم بدل دی۔ سبب افضال صاحب کا لباس تھا۔ "سنو...... تم ہمیں کسی ہوٹل لے چلو۔"

کوچ بان نے پلٹ کر معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔ "ٹھیک ہے باؤ جی۔ جو حکم آپ کا۔"

ہوٹل میں کمرہ لینے کے بعد عبدالحق نے کوچ بان سے کہا۔ "جاؤ، اب بگھی سجا کر لے آؤ۔ کتنی

دیر لگے گی؟"

"بس ایک گھنٹا باؤ جی۔"

"آؤ تو یہیں کھڑے ہو جاتا۔"

واپس کمرے میں جا کر اُس نے ویٹر کو بلایا۔ جسے ٹپ [illegible] دے کر وہ پہلے ہی رام کر چکا تھا۔ "کپڑے استری ہو سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں باؤ جی۔ سب کچھ ہوگا' جو آپ کہو۔"

عبدالحق نے اسے افضال صاحب کے کپڑے دے دیے۔

افضال صاحب بگھی میں بیٹھنے کے بعد سے اب تک ایک [illegible] نہیں بولے تھے۔ "آپ کو کیوں چپ لگ گئی؟" عبدالحق نے انہیں چھیڑا۔

"کچھ نہیں میاں' تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"میرے بارے میں!" عبدالحق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں میاں' آج تمہیں دیکھ کر اپنی جوانی یاد آ گئی۔" افضال صاحب نے آہ بھر کے کہا۔ "خاندانی لگتے ہو۔ ضرور کسی بڑے گھر کے ہو۔"

"پیسے کی افراط دیکھ کر کہہ رہے ہیں؟" عبدالحق نے آزردگی سے پوچھا۔

"نہیں میاں' پیسہ تو اب یہاں' ان لوگوں کے پاس بھی ہے' جنہیں بات کرنے کی تمیز نہیں۔" افضال صاحب نے جلدی سے کہا۔ "میں تو تمہارا [illegible] اطوار طریقے دیکھ کر رشک کر رہا تھا۔ میں نے تم سے جو کردار ادا کرنے کو کہا' وہ تو تم [illegible] تمہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم نواب زادے نہیں ہو۔ وہی سخاوت اور دریا دلی' وہی وقار۔"

"لیکن اس کے باوجود جو کچھ آگے مجھے کرنا ہے' وہ میرے [illegible] مشکل ہے۔"

"یہ اضافی خوبیاں ہیں۔ یعنی نیک اور شریف بھی ہو۔"

ویٹر استری کیے ہوئے کپڑے لے آیا۔ "آپ اب نہا دھو [illegible] جائیں۔" عبدالحق نے افضال صاحب سے کہا۔ پھر وہ کھڑکی کے پاس گیا اور باہر جھانکا۔ [illegible] ہوئی بگھی ان کے لیے تیار تھی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق افضال صاحب کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ شیروانی [illegible] وہ بہت وجیہہ لگ رہے تھے۔ ایسی شخصیت تھی ان کی کہ آدمی کی بات کرنے کی بھی ہمت [illegible] سوچنے لگا کہ لباس سے آدمی کی شخصیت پر کتنا اثر پڑتا ہے۔ اس نے نوٹوں کی خاصی موٹی [illegible] ان کے حوالے کر دی۔ افضال صاحب وہ لیتے ہوئے ایک لمحے کو جھجکے۔

وہ باہر نکلے اور بگھی میں جا بیٹھے۔ کوچ بان اب بہت زیادہ مؤدب ہو گیا تھا۔ یقیناً وہ افضال صاحب سے مرعوب ہوا تھا۔ "اب بتاؤ باؤ جی' کہاں جانا ہے؟" اُس نے عبدالحق سے پوچھا۔

لیکن جواب افضال صاحب نے دیا۔ اب مرکزی کردار انہیں ادا کرنا تھا۔ "شاہی بازار چلو میاں۔"

کوچ بان کو یہ اندازہ پہلے ہی سے تھا۔

افضال صاحب نے بگھی عین اس کوٹھے کے سامنے رکوائی' جہاں زرینہ کو دیکھا تھا۔ "اب بس تمہیں میرے اشاروں پر چلنا ہوگا۔" انہوں نے سرگوشی میں عبدالحق سے کہا۔ "تم یہیں بیٹھے رہو۔" یہ کہہ کر وہ بگھی سے اترے اور پان کی دکان کی طرف چل دیے۔

عبدالحق غور سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار ان کی چال ڈھال سے یہ اعتماد جھلکتا نظر آیا تھا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ بازار میں تقریباً سبھی لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ ایک تو وہ سجی ہوئی خوب صورت بگھی' اس پر افضال صاحب کا لباس اور ان کی شخصیت۔ یہ سب کچھ ان کے منصوبے کے عین مطابق ہو رہا تھا۔

اگلے چند منٹوں میں کئی لوگ اس کی طرف آئے۔ "آؤ باؤ جی۔ تمہیں پرستان لے چلوں۔ باؤ جی نئی نئی کلیاں بھی ہیں۔" وہ سب اپنی اپنی ہانک رہے تھے' اور اس چکر میں تھے کہ اسے گھیر کر لے جائیں۔ عبدالحق نے جواب کسی کو نہیں دیا۔ بس منہ پھیر لیا۔ یہ اس منظر نامے کا وہ حصہ تھا' جس میں اسے اداکاری کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا ردِ عمل قدرتی تھا۔

اُس کی طرف سے مایوس ہو کر وہ لوگ افضال صاحب کو تاکنے لگے۔

افضال صاحب کا پان کی اُس دکان پر جانا بھی بے سبب نہیں تھا۔ پان کی یہ دکان اس بالا خانے پر جانے والے زینے کے ساتھ تھی' جس پر انہوں نے زرینہ کو دیکھا تھا۔ اور بگھی رکوانے کے بعد بھی وہ چند منٹ بگھی میں ہی بیٹھے رہے تھے۔ انداز ایسا تھا' جیسے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے ہوں' اور ہچکچا رہے ہوں کہ وہاں اتریں یا نہ اتریں۔ مگر در حقیقت وہ کن انکھیوں سے اس کوٹھے کو دیکھ رہے تھے۔ اس وقت زرینہ تو وہاں موجود نہیں تھی۔ مگر دوسری لڑکیاں بگھی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ پھر انہوں نے ایک لڑکی کو اندر جاتے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ ایک ادھیڑ عمر عورت کو ساتھ لے کر آئی۔ ادھیڑ عمر عورت نے ایک نظر انہیں اور بگھی کو دیکھا اور پلٹ کر چلی گئی۔ افضال صاحب سمجھ گئے کہ تیر کارگر ہوا ہے۔ تب وہ بگھی سے اترے۔

اس وقت بھی وہ پان بنانے کا کہنے کے بعد کن انکھیوں سے اس زینے کو دیکھ رہے تھے۔ اِدھر اُدھر سے آنے والے دلالوں کو وہ جھڑک رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ زرینہ کے کوٹھے سے کوئی ان کے پاس ضرور آئے گا۔

ان کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اس زینے سے ایک شخص اترا۔ نگران سے رابطہ کرنے کے بجائے وہ ذرا فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ افضال صاحب نے دیکھا، وہ روایتی دلال نہیں لگ رہا تھا۔ گو انہیں توقع کے مطابق خصوصی اہمیت دی جا رہی تھی۔ کوٹھے سے خاصے نستعلیق آدمی کو بھیجا گیا تھا۔

وہ پان لے کر پلٹے اور بگھی کی طرف بڑھے۔ اسی وقت کوٹھے سے اترنے والے شخص نے دھیمی آواز میں انہیں پکارا۔ ”حضرت، ذرا سنیے۔“

افضال صاحب رکے اور اسے دیکھتے ہوئے بولے۔ ”جی...... فرمایئے۔“

”اوپر، بائی جی آپ کو بلا رہی ہیں۔“ اس نے آنکھ سے کوٹھے کی طرف اشارہ کیا۔

”ضروری تو نہیں کہ ہم جائیں بھی۔“ افضال صاحب نے ذرا تیکھے لہجے میں کہا۔

”ان کی التجا ہے لیکن مرضی تو آپ کی ہی چلے گی۔ ویسے میں یہ عرض ضرور کروں گا کہ پورے بازار میں آپ کو بائی جی کے بالاخانے جیسا ماحول کہیں نہیں ملے گا۔“

”اچھا۔“ افضال صاحب نے لفظ کو ذرا کھینچتے ہوئے کہا۔ ”مگر ہم ایک بات بتا دیں۔ ہم یہاں صرف اپنے سب سے چھوٹے بھائی کی خاطر آئے ہیں۔“ انہوں نے بگھی میں بیٹھے عبدالحق کی طرف اشارہ کیا۔ ”ورنہ ہم بازار آنا پسند نہیں کرتے۔ یہ لڑکا بہت شرمیلا ہے اور ہم اس کے شرمیلے پن سے عاجز آ چکے ہیں۔ اس کی جھجک دور کرنے کی یہی ایک صورت سمجھائی دی تھی۔ ورنہ تو میاں، ہم وہ پیاسے ہیں، جس کے پاس ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے خود چل کر آتے ہیں۔“

”ہماری بائی جی نے یہ بات سمجھ کر ہی مجھے بھیجا ہے آپ کی پیشوائی کے لئے۔“

”اور ہمیں عزت بہت عزیز ہے۔ اور انکار سننے کے بھی ہم عادی نہیں۔ اپنی بائی جی سے ایک بار جا کر پوچھ آؤ۔“

”جو حکم سرکار کا۔“ اس شخص نے کہا اور الٹے پاؤں کوٹھے کی طرف چلا گیا۔

افضال صاحب وہیں کھڑے رہے۔ دو منٹ بعد ہی وہ شخص واپس آ گیا۔ ”بائی جی کہتی ہیں کہ آپ کی عزت و تکریم میں کوئی کمی نہیں ہو گی، اور وہ کہتی ہیں کہ کنیزوں کو انکار کرنا زیب نہیں دیتا۔“

افضال صاحب نے عبدالحق کو آنے کا اشارہ کیا......

❀ ❀ ❀

سب کچھ منصوبے کے عین مطابق ہو رہا تھا۔ بائی جی تو ان لوگوں کے آگے بچھی جا رہی تھیں۔ ان کی تواضع تو افضال صاحب نے رد کر دی تھی۔ ”ہمارے پاس پان موجود ہیں۔“ انہوں نے بڑی بے نیازی سے کہا تھا۔

”تو لڑکیوں کو بلواؤں۔“

”ایسے نہیں۔ ہمارے نزدیک ان لڑکیوں کی بھی عزت ہے۔“ افضال صاحب نے قدرت سخت لہجے میں کہا۔ ”انہیں بکاؤ مال سمجھ کر ہم ان کی عزت کم کریں گے تو ان سے خوشی بھی نہیں پا سکیں گے، اور ہم یہاں خوشی کے لئے آئے ہیں۔“

”سبحان اللہ۔“ بائی جی نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”ایک عمر ہو گئی کوٹھے پر۔ آپ جیسا وضع دار آدمی آج تک نہیں دیکھا۔ تو پھر آپ ہی بتایئے۔“

”آپ یہی لڑکیاں ایسے دکھائیں کہ لڑکیوں کو پتا نہ چلے۔ پھر منتخب ہم کر لیں گے۔“ افضال صاحب نے کہا۔ اب وہ نروس ہو رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ زرینہ نے انہیں دیکھا اور پہچان لیا تو ان سے لپٹ جائے گی اور معاملہ خراب ہو جائے گا۔ حالانکہ موجودہ وضع قطع میں اس بات کا امکان بہت کم تھا۔ وہ تو آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر خود کو بھی نہیں پہچان سکے تھے۔ مگر وہ ذرا سا خطرہ بھی مول لینا نہیں چاہتے تھے۔

بائی جی نے اس کا اہتمام بھی کر دیا۔ افضال صاحب اور عبدالحق نے بغیر کسی دشواری کے زرینہ کو منتخب کر لیا۔

”اب آپ ان لڑکیوں کو واپس بھیج دیجئے۔“ افضال صاحب نے کہا۔ پھر بائی جی کو ایک الگ گوشے میں لے گئے اور سرگوشیوں میں اسے سمجھایا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

”یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ اہتمام صرف لڑکیوں کی خواب گاہوں میں ہی ممکن ہے اور ویسے بھی آپ لوگوں کے شایانِ شان وہی کمرے ہیں۔ لیکن نواب صاحب، آپ نے اپنے لیے کچھ پسند نہیں فرمایا۔“

”ہم تو یہاں صرف بھائی کی خاطر آئے ہیں۔ ورنہ ہم تو اپنا شوق اپنے گھر میں ہی پورا کرنے کے قائل ہیں۔“

”تو کبھی دل چاہے تو ہمیں پکار لیجئے گا۔“ بائی جی نے بڑی لگاوٹ سے کہا۔

”ضرور۔ ہم آپ سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ آپ پنجاب میں بیٹھ کے لکھنؤ کے انداز میں کام کر رہی ہیں۔“

”بازار نہ علاقوں کا پابند ہوتا ہے نواب صاحب، نہ علاقوں تک محدود ہوتا ہے۔ اچھا، اب میں آپ کی خوشنودی کا بندوبست کرتی ہوں۔“

❀ ❀ ❀

عبدالحق بہت خوش تھا۔ اب تک اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ سب کچھ افضال صاحب نے سنبھالے رکھا تھا، اور سچ یہ ہے کہ انہوں نے کمال کر دیا تھا۔ وہ ان کی پلاننگ پر حیران تھا۔ کیسی مکمل اور بے داغ پلاننگ کی تھی انہوں نے۔

اب بائی جی نے اسے اس کمرے میں بھیج دیا تھا۔ اُس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ ایک آراستہ کمرا تھا۔ بڑی سی مسہری، اُس کے سامنے سنگھار میز، پتا چلتا تھا کہ وہ ایک آباد کمرا ہے۔ پہلو والی دیوار میں شاید ایک دروازہ ہوگا، جس پر بھاری پردہ پڑا تھا۔

قدموں کی چاپ سن کر اُس نے سر گھمایا اور دروازے کی طرف دیکھا۔ زرینہ کمرے میں داخل ہوئی۔ عبدالحق نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ بلاشبہ وہ بہت حسین لڑکی تھی لیکن ناخوش ہونے کی وجہ سے اس کا حسن ماند پڑ گیا تھا۔ اُس کے بجھے بجھے چہرے پر اداسی کی گہری تہ تھی۔

وہ آئی اور اُس کے سامنے سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔

عبدالحق دروازے کی طرف گیا اور اسے بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ پھر وہ واپس آیا، اور مسہری پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ زرینہ اب بھی اسی طرح کھڑی تھی۔ ''آؤ زرینہ، یہاں آ کر بیٹھو۔'' اُس نے نرم لہجے میں کہا۔

''جی......'' زرینہ نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ پھر اچانک سے احساس ہوا کہ گاہک نے اسے اُس کے اصل نام سے پکارا ہے۔ ورنہ بائی جی نے تو اس کا نام زہرہ رکھ دیا تھا۔ اور وہ اس میں خوش تھی کہ کم از کم اُس کے اصل نام کی آبرو تو بچ گئی۔

وہ تیزی سے اُس کے قریب آئی۔ مگر مسہری پر بیٹھی نہیں۔ ''آپ کون ہیں؟ آپ کو میرا نام کیسے معلوم؟ میں نے تو آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''ہاں۔ میں بھی تمہیں نہیں جانتا تھا لیکن افضال صاحب تو جانتے ہیں۔''

''کون افضال صاحب......''

''وہ مہاجروں کے کیمپ والے......''

''ارے چچا صاحب...... کہاں ہیں وہ۔'' وہ ایک دم پُرجوش ہوگئی۔

''اتنے زور سے مت بولئے۔'' عبدالحق نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ابھی تم ان سے ملوگی۔''

زرینہ کے چہرے پر بے یقینی تھی اور آنکھوں میں خوشی......

❀ ❀ ❀

ملحقہ کمرے میں افضال صاحب چند منٹ تو مسہری پر بیٹھے رہے۔ پھر وہ اٹھے اور انہوں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ وہاں سے پلٹ کر وہ اس دروازے کی طرف گئے، جس پر پردہ پڑا تھا۔ انہوں نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ دروازہ بند تھا لیکن چٹخنی گری ہوئی تھی۔ انہوں نے دروازے کو اپنی طرف کھینچا۔ دروازہ کھل گیا۔ وہ اس دوسرے کمرے میں داخل ہوگئے۔

زرینہ اور عبدالحق کی نظریں اسی دروازے پر جمی تھیں۔ زرینہ نے افضال صاحب کو دیکھا۔

چند لمحے تو وہ انہیں پہچان ہی نہیں سکی۔ پھر جب پہچان لیا تو سکتے کی سی کیفیت میں انہیں دیکھتی رہی۔

افضال صاحب آگے آئے اور اُس کے سامنے آ کر رک گئے۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھے جا رہے تھے۔ ان کی نگاہوں سے دلی اذیت جھلک رہی تھی۔

بالآخر زرینہ کا سکوت ٹوٹا۔ ''چچا صاحب، یہ سچ مچ آپ ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔''

''یہ میں ہی ہوں میری بچی۔''

''آ...... آپ...... آپ یہاں کیسے؟''

''حالانکہ یہ سوال مجھے تم سے پوچھنا چاہئے۔'' افضال صاحب کے لہجے میں سنگینی در آئی۔

اتنا سننا تھا کہ زرینہ پھٹ پڑی۔ وہ اتنا روئی اور ایسے روئی کہ لگتا تھا، اب چپ نہیں ہوگی۔ اس گریے کو روکنا جیسے اُس کے اختیار میں نہیں تھا اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

عبدالحق تو اُس کے رونے سے بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ افضال صاحب نے بڑھ کر زرینہ کو لپٹا لیا تھا اور اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے اسے خود پر قابو رکھنے کی تلقین کر رہے تھے۔ ''خود کو سنبھالو زرینہ۔ تمہارے رونے کی آواز باہر نہیں جانی چاہئے۔'' انہوں نے اسے سمجھایا اور پھر نرمی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

زرینہ کو سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔ اور طبیعت جیسے ہی سنبھلی تو اُس نے پھر وہی سوال کیا۔ ''چچا صاحب، آپ یہاں کیسے؟''

''ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔''

زرینہ کو پھر رونا آنے لگا۔ ''یہ ناممکن ہے چچا صاحب۔ میں نے یہاں سے بھاگنے کی بہت کوشش کی اور ناکام ہونے پر بہت پٹی۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں آنے کے سو دروازے ہیں، اور باہر جانے کا ایک بھی نہیں۔''

''تم فکر نہ کرو میری بچی۔ ہم تمہیں اسی دروازے سے باہر لے کر جائیں گے، جس سے تم اندر آئی ہو۔'' افضال صاحب نے کہا۔ ''مگر تم یہ تو بتاؤ کہ تم یہاں پہنچیں کیسے؟''

زرینہ پھر رونے لگی۔ افضال صاحب نے سہارا دے کر اسے مسہری پر بٹھا دیا۔ وہ دیر تک تکیے میں منہ چھپائے روتی رہی۔

جب دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تو اس نے سر اٹھایا۔ افضال صاحب پاس بیٹھے اسے متوقع نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اُس نے سر گھما کر دیکھا۔ عبدالحق ایک طرف کھڑا تھا۔ ایسا لگا کہ عبدالحق کی وہاں موجودگی کا اسے پہلی بار احساس ہوا ہے۔ ''یہ...... یہ کون ہیں چچا صاحب۔''

''سمجھ لو، میرا بیٹا ہے یہ...... تمہارا بھائی۔''

اس لمحے عبدالحق کے اندر جیسے کوئی کیمیاوی تبدیلی رُونما ہوئی۔ وہ اکیلا تھا...... والدین کی واحد اولاد۔ نہ کوئی بھائی نہ بہن۔ اس بات کا اسے بڑی شدت سے احساس ہوتا تھا۔ محرومی سی محسوس ہوتی تھی۔ بھائی کے لئے نہیں، البتہ بہن کے معاملے میں اسے بہت تجسس ہوتا تھا۔ کیسی ہوتی ہوگی بہن کی محبت؟ اور اکثر وہ سوچتا، کاش میری کوئی بہن ہوتی۔

اور اب افضال صاحب نے کسی ارادے کے بغیر اُس کے اور اس اجنبی لڑکی کے درمیان وہی رشتہ ٹانک دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ افضال صاحب نے یہ بات محض اُس بے بس اور مظلوم لڑکی کی دل جوئی کے لئے کی لیکن وہ الفاظ سنتے ہی اُس کے دل میں جیسے محبت کا کوئی چشمہ سا پھوٹ نکلا۔ اُس نے اس لڑکی کو غور سے دیکھا اور اس کے دل نے ایک پل میں اعلان کر دیا کہ وہ اُس کی بہن ہے۔

اسے یاد تھا، افضال صاحب نے بتایا تھا کہ اپنے گھر والوں میں یہ واحد لڑکی ہے، جو پاکستان پہنچ پائی ہے۔ اس کے تمام گھر والے شہید ہو گئے تھے۔ اب اُس کا کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔ اور اب بدقسمتی سے وہ اس دلدل میں آ پھنسی تھی۔ اگر ایسے میں اسے ایک بھائی مل جائے تو......

اسے احساس ہوا کہ زرینہ اسے دیکھ رہی ہے۔ ''جو کچھ افضال صاحب نے کہا، وہ میرے نزدیک رسمی بات نہیں۔'' اُس نے جلدی سے کہا۔ ''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم مجھے ہمیشہ بھائی جیسا ہی پاؤ گی۔ میری کوئی بہن تھی ہی نہیں۔ آج اللہ کی رحمت سے وہ بھی مل گئی۔''

زرینہ کی آنکھیں ایک دم ڈبڈبا گئیں۔ ''ایسا نہ کہیں بھائی۔ میں اس قابل نہیں رہی۔ میرا سگا بھائی بھی زندہ ہوتا تو مجھے بہن کی حیثیت میں قبول نہ کرتا۔ آپ ایسا نہ کہیں بھائی۔''

''میں نے سوچ سمجھ کر کہی ہے یہ بات۔ میں ہر قیمت پر تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔ اور میرا وعدہ ہے کہ آج کے بعد تم ایک باعزت زندگی گزارو گی۔''

زرینہ پھر رونے لگی۔

وہ چپ ہوئی تو افضال صاحب نے کہا۔ ''اب یہ تو بتاؤ کہ تم یہاں کیسے پہنچیں۔''

زرینہ نے ایک پل عبدالحق کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

عبدالحق سمجھ گیا کہ وہ حجاب کی وجہ سے اُس کی موجودگی میں کچھ نہیں بتا سکے گی۔ ''میں دوسرے کمرے میں جا رہا ہوں۔ آپ اطمینان سے بات کریں۔'' یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

وہاں مسہری پر بیٹھ کر وہ زرینہ کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ اور اسے حیرت ہوئی۔ کیا جوان بہن کا بھائی بن کر آدمی اتنا سمجھ دار اور عقل مند ہو جاتا ہے۔ وہ اُس کے مستقبل کے بارے میں

باقاعدہ منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

وہ اُس وقت چونکا، جب افضال صاحب کمرے میں آئے اور اُس کے پاس بیٹھ گئے۔ اُس نے دیکھا، ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ بار بار مٹھیاں بھینچ رہے تھے۔

''کیا معلوم ہوا؟'' اُس نے ان سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ کوئی اسے دھوکہ دے کر یہاں لایا تھا اور نائیکہ کے ہاتھوں بیچ کر چلا گیا۔''

عبدالحق کو لگا کہ افضال صاحب اپنی آواز پر قابو رکھنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ ''میں سمجھا نہیں۔''

''کسی نے اس سے کہا کہ ایک گھر ایسا ہے، جہاں اسے کام مل سکتا ہے۔ یہ اس آسرے میں آئی اور یہاں پھنس گئی۔''

''وہ تھا کون؟''

افضال صاحب نے ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد کہا۔ ''یہ تو اسے بھی معلوم نہیں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' عبدالحق نے اعتراض کیا۔ ''وہ کوئی جاننے والا ہی ہوگا۔ کسی اجنبی کے ساتھ تو وہ نکلنے سے رہی۔''

''میں نے کہا نا کہ اسے معلوم نہیں۔'' افضال صاحب نے جھنجلا کر کہا۔ پھر کچھ احساس ہوا تو لہجہ نرم کرتے ہوئے بولے۔ ''ممکن ہے، وہ بتانا نہیں چاہتی ہو۔ میں نے بھی زیادہ زور نہیں دیا۔ تم بھی اس سے کچھ مت پوچھنا۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میری کوئی بہن نہیں تھی۔ پھر بھی میں اتنا جانتا ہوں کہ کوئی بھائی اپنی بہن سے اس طرح کی بات نہیں پوچھتا۔'' عبدالحق نے کہا۔ ''اب یہ بتایئے؟ کرنا کیا ہے؟''

''کرنا کیا ہے؟ بس اسے یہاں سے لے کر نکلتے ہیں۔''

''اور کہاں جائیں گے؟''

''کیمپ جائیں گے، اور کہاں۔''

''تو کیمپ میں زرینہ اپنے اتنے دن غائب رہنے کے بارے میں کیا بتائے گی۔ دیکھیں نا، لوگ تو پوچھیں گے۔''

''ہاں، یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں۔ یہاں سے نکلنے کے بعد بھی یہ بچی رسوا ہو، یہ تو میں نہیں چاہوں گا۔''

''اور ویسے بھی میں اپنی بہن کو کیمپ میں تو نہیں رکھوں گا۔'' عبدالحق کے لہجے میں قطعیت تھی۔

افضال صاحب نے اسے بہت غور سے دیکھا، جیسے اسے تول رہے ہوں۔

"جی ہاں، اب وہ میری بہن ہے۔ میں نسلاً راج پوت ہوں، جو کہتا ہوں، وہ کرتا بھی ہوں۔ اور غیرت کی ہمارے نزدیک بڑی اہمیت ہے۔"

افضال صاحب اب بھی اسے گھور رہے تھے۔

بات عبدالحق کی سمجھ میں آ گئی۔ جہاں دیدہ افضال صاحب اس پر شک کر رہے تھے کہ کہیں وہ بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا تو نہیں۔ توہین کے احساس سے اُس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہ کوئی سخت بات کہنا چاہتا تھا لیکن اُس نے خود کو روک لیا۔ افضال صاحب اس پر بھی شک کر رہے تھے تو یہ ان کے خلوص اور دردمندی کا ثبوت تھا۔ بس اس نے اتنا کیا کہ ان کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتا رہا۔

چند لمحے اسی طرح گزرے۔ پھر اچانک افضال صاحب کی آنکھوں سے جیسے شک کا غبار دھل گیا۔ وہ خفت آمیز انداز میں مسکرائے۔ "مجھے معاف کر دینا میاں، میں تم پر شک کر رہا تھا۔ مگر اب مجھے اطمینان ہو گیا۔ یہ لڑکی خوش قسمت ہے کہ اسے تم مل گئے۔ اب یہ انشاء اللہ محفوظ رہے گی۔"

عبدالحق نے ان کی معذرت کو نظر انداز کر دیا۔ "تو پھر اسے لے کر کہاں جائیں گے؟"

"اب تو ہوٹل ہی رہ جاتا ہے۔"

"تو ہوٹل کے لوگ بھی کچھ اچھا تو نہیں سوچیں گے...... نہ اس کے بارے میں، نہ ہمارے بارے میں۔"

"واقعی، یہ تو بڑا مسئلہ ہے۔"

"جب آپ زرینہ سے بات کر رہے تھے تو میں اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر میں کوئی عہد کر کے گھر سے نہ نکلا ہوتا تو میں اسی وقت اسے اپنے گھر لے جاتا۔ وہاں کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اب ایک ہی صورت ہے۔ جب تک میں گاؤں واپس نہیں جاتا، یہ ہماری امانت کے طور پر مسعود صاحب کے پاس، ان کے گھر میں رہے گی۔"

"بڑے صاحب کے گھر؟"

"جی ہاں...... وہ وہاں ہر طرح سے محفوظ رہے گی...... چبھتے ہوئے سوالوں سے بھی۔ اور جب میں گاؤں جاؤں گا تو اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

افضال صاحب نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔ "اس عمر میں تم مجھ سے زیادہ عقلمند ہو میاں۔"

"یہ بات نہیں۔ اصل میں آپ تو صرف ایک نکتے پر مرتکز تھے، اور اس میں خوش تھے...... کہ زرینہ کو یہاں سے نکالنا ہے۔ آگے کے بارے میں خیال ہی نہیں آیا آپ کو۔ اچھا...... اب یہ بتائیں کہ اگر آج ہم زرینہ کو یہاں چھوڑ دیں تو کوئی حرج تو نہیں؟"

افضال صاحب نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیوں...... ایسی کیا بات ہے؟"

"رات ہو گئی ہے۔ مجھے مسعود صاحب کے گھر کا پتا بھی نہیں معلوم۔ وہ کیمپ جا کر اخلاق سے معلوم کرنا ہو گا۔ اس میں بھی وقت لگے گا۔ تو اتنا بے وقت مسعود صاحب کے ہاں جانا اچھا نہیں لگے گا۔ ہمیں ان کو سوتے سے اٹھانا ہو گا۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔" افضال صاحب نے کہا اور کچھ سوچنے لگے۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا اور بولے "لیکن میاں، زرینہ کو مزید یہاں چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔ یہ بازار حسن ہے۔ یہاں جو پل آپ کے پاس ہے، بس وہی آپ کا ہے۔ کون جانے، کل ہم یہاں آئیں تو زرینہ یہاں موجود ہی نہ ہو۔ اور میاں، ابھی تو بڑے سخت مرحلے سے گزرنا ہے۔ یہ لوگ ہر روز سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو بیچنا خسارے کا سودا سمجھتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" عبدالحق نے کہا۔ "تو آپ اسی مرحلے کی فکر کریں۔ میں آگے کی سوچتا ہوں۔"

"بس تم اس کمرے میں چلے جاؤ۔" افضال صاحب بولے۔

عبدالحق دوسرے کمرے میں چلا گیا اور پردہ برابر کر دیا۔ افضال صاحب نے بڑھ کر اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

❁ ❁ ❁

مشتری بیگم بہت خوش تھی۔ دھندا اچھا چل رہا تھا۔ مگر ایسا گاہک مدت کے بعد نصیب ہوا تھا۔ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے تھی۔ آدمی کو ایک نظر میں تول لیتی تھی۔ کوٹھے پر سے نواب صاحب کو ایک نظر دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ تگڑی اسامی ہے۔ مستقل ہو جائے تو کیا ہی بات ہے۔ یہی سوچ کر اُس نے بشارت کو نیچے بھیج دیا تھا۔

اور نواب صاحب اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ اوپر آئے تو اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ دونوں بھائیوں میں عمر کا فرق بہت زیادہ تھا۔ چھوٹے کو ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ نیا پنچھی ہے۔ بہت شرمیلا تھا۔ نظر ہی نہیں اٹھ رہی تھی اس کی۔

اور نواب صاحب واقعی بڑے وضع دار آدمی تھے۔ مشتری بیگم کو ان کا لڑکی منتخب کرنے کا انوکھا انداز بہت بھلا لگا۔ ورنہ زندہ گوشت کے اس بازار میں تو بس بھیڑیے ہی آتے ہیں۔ اور بھیڑیوں کی بھوک کا تہذیب سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔

لیکن ایک بات اسے عجیب لگی۔ انہوں نے الگ لے جا کر جو اُس سے فرمائش کی، اُس نے اسے چونکا دیا۔ ایسا کمرا، جس کا دروازہ دوسرے کمرے میں بھی کھلتا ہو۔ تا کہ وہ اپنے بھائی کو دیکھ سکیں۔ اس کی وضاحت کے طور پر انہوں نے اپنے بھائی کے شرمیلے پن کو پیش کیا لیکن تجربہ کار

مشتری بیگم سمجھ سکتی تھی۔ کہ پس پردہ اور بھی کچھ ہے، اور وہی اصل بات ہے۔

پھر ایک بات مشتری بیگم کو اور کھٹکی وہ یہ کہ نواب صاحب نے اپنے لئے کوئی لڑکی منتخب نہیں کی۔ ایک لمحے میں مشتری بیگم نے یہ بات سمجھ لی کہ دونوں باتوں کا آپس میں کچھ تعلق ہے۔ اور پھر وہ تعلق بھی اُس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہاں دو امکانات تھے، اور دونوں ہی اتنے قوی تھے کہ وہ ان میں سے ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دے سکتی تھی۔

مرد کی نفسیات کو طوائف سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ مشتری بیگم نے سمجھ لیا کہ پسِ پردہ وہ میں سے ایک بات ضرور ہے۔ یا تو دونوں بھائی ایک ہی کشتی میں سفر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ایک ٹکٹ میں دو مزے والی بات نہیں۔ نواب صاحب پیسے نہیں بچا رہے تھے، بلکہ لطف دوبالا کر رہے تھے۔ اور یہ بات ایک طوائف ہی سمجھ سکتی تھی۔ عیش کی کثرت اور تواتر مرد کو تنوع پر اکساتا ہے، اور وہیں سے بے راہ روی کا آغاز ہوتا ہے۔ ایسے میں آدمی بھائی کیا، اپنے بیٹے کے ساتھ بھی شاملِ تفریح ہو جاتا ہے۔ دونوں بھائی ایک ساتھ دادِ عیش دیں، ایک ہی لڑکی کے ساتھ، تو بڑے بھائی کے لے وہ سنسنی خیز تجربہ ہوگا۔ البتہ چھوٹے بھائی کو خفت اور کوفت ہوگی۔ اور کیا پتا، یہی چھوٹے بھائی کے شرمیلے پن کا سبب ہو۔

لیکن مشتری بیگم کو دوسرا امکان زیادہ قوی لگا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ نواب صاحب کثرتِ عیش کی وجہ سے ناکارہ ہو چکے ہیں۔ ایسے میں آدمی اس حال کو بھی پہنچ جاتا ہے کہ کسی دوسرے کو مشغول دیکھ کر اُس کی تسکین ہو جائے۔ اور پھر وہ دوسرا اپنا ہی بھائی ہو تو سونے پر سہاگہ۔

دوسری طرف مشتری بیگم اس میں بھی خوش تھی کہ نواب صاحب نے زرینہ کو منتخب کیا۔ زرینہ بلاشبہ بہت حسین تھی لیکن بازار میں روتا بسورتا حسن نہیں چلتا۔ اُس نے زرینہ کو بہت سمجھایا، سختی بھی کی لیکن بات نہیں بنی۔ جس عمر میں لڑکیاں جوالامکھی ہوتی ہیں، زرینہ برف کی مورت تھی۔ ہر گاہک خوش خوش اس کے ساتھ جاتا، مگر مشتعل واپس آتا۔ پروانہ تو جلنا پسند کرتا ہے۔ برفستان میں وہ کب پہنچتا ہے۔ ایک گاہک نے تو جھنجلا کر یہ بھی کہہ دیا تھا کہ بائی، مجھے تو لگ رہا تھا، میں اپنے ساتھ ہی زیادتی کر رہا ہوں۔ نتیجہ یہ کہ پرانے گاہک تو اب زرینہ کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ وہ زیادہ تر فارغ بیٹھی رہتی۔ کبھی کوئی نیا گاہک آتا تو پہلی اور آخری بار اسے ساتھ لے جاتا۔ اب تو مشتری کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ جمیل سے 50 روپے میں اس لڑکی کو خرید کر اُس نے خسارے کا سودا کیا تھا۔

''بائی جی......''

اُس نے چونک کر دیکھا۔ دروازے میں بشارت کھڑا تھا۔ ''کیا بات ہے بشارت؟''

''وہ بائی جی، نواب صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔''

مشتری بیگم پریشان ہو گئی کہ کہیں زرینہ نے کوئی گڑبڑ تو نہیں کر دی۔ اُس نے دل میں سوچ لیا کہ اگر ایسا ہوا تو وہ اسے صحیح معنوں میں اس بازار کے کسی قسائی کے ہاتھ بیچ دے گی۔ جان تو چھوٹے۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو نواب صاحب گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے مسہری پر نیم دراز تھے۔ وہ ان کے سامنے دست بستہ کھڑی ہو گئی۔ ''کیا حکم ہے نواب صاحب۔''

''بیٹھ جاؤ تو سکون سے بات کریں۔''

مشتری بیگم کا دل اور زور سے دھڑکا۔ تاہم اُس نے کرسی کھینچی اور بیٹھ گئی۔ ''جی فرمایئے۔''

''بھئی...... اس لڑکے نے ہمیں پریشان کر دیا ہے۔''

مشتری بیگم کو پہلے تو لگا کہ نواب صاحب نے لڑکی کہا ہے، گویا زرینہ کی شکایت ہے۔ ''کیا ہوا؟ کچھ فرمایئے تو۔''

''اس کا شرمیلا پن ختم ہی نہیں ہوتا کسی طرح۔ ویسے اتنا تو ہوا کہ اس لڑکی سے مانوس ہو گیا ہے وہ۔''

اب مشتری بیگم کی سمجھ میں آیا کہ وہ اپنے بھائی کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ اُس نے سکون کی سانس لی۔ ''چلیں، اتنا تو ہوا۔'' اُس نے دلاسہ دینے والے انداز میں کہا۔ ''آتے رہیں گے یہاں تو کھل ہی جائیں گے۔''

''یہی تو مسئلہ ہے۔ لڑکی سے تو وہ کھل گیا ہے لیکن یہ جگہ اسے قبول نہیں۔''

''اوہ......'' بات کچھ کچھ مشتری بیگم کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ ''تو میرے لئے کیا حکم ہے۔''

''حکم کا تو یہاں موقع نہیں۔ ایک استدعا ہے۔''

''میرے لئے تو وہ بھی حکم کا درجہ رکھتی ہے۔''

''آپ اس لڑکی کو ہمیں دے دیں۔''

مشتری بیگم کا دماغ سرپٹ دوڑنے لگا۔ یہ تو وہ سمجھ چکی تھی کہ زرینہ اس کے مطلب کی نہیں۔ یہ بات تو اسے پہلی نظر میں ہی سمجھ لینی چاہئے تھی لیکن وہ اُس کے حسن پر ریجھ گئی تھی۔ اب یہ جان چھڑانے کا موقع مل رہا تھا لیکن بہرحال کاروبار کی وہ پکی تھی۔ اس نے منہ پکا کر کے کہا۔ ''آپ تو جانتے ہی ہیں نواب صاحب کہ ہم اپنا مال کرائے پر دیتے ہیں۔ ایسے بیچنے لگیں تو پھر خالی دکان میں بیٹھ کر مکھیاں ہی ماریں گے۔''

''تو یہاں خریدنے کے لئے آتا ہی کون ہے۔'' نواب صاحب نے بھی بے رخی سے کہا۔

''مجبوری نہ ہوتی تو ہم بھی یہ بات نہ کرتے۔ خیر...... یہ تو معلوم ہو گیا کہ صاحب زادے کا شرمیلا پن کیسے ختم ہوگا۔ لڑکیاں تو بازار میں بہت۔ اس سے بھی اچھی مل جائیں گی۔'' وہ اٹھ کر بیٹھے۔

جیسے جانے کے لئے تیار ہو رہے ہوں۔

مشتری بیگم گڑبڑا گئی۔ "آپ خفا کیوں ہوتے ہیں نواب صاحب......"

"ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہم انکار سننے کے عادی نہیں۔"

"تو میں نے انکار کب کیا ہے۔"

"تو پھر بتاؤ، کیا پیش کریں۔"

"کوئی اور ہوتا تو میں اس لڑکی کو ایک لاکھ میں بھی نہ دیتی۔ پر معاملہ آپ کا ہے۔ میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی۔ چاہتی ہوں کہ آپ سے تعلق ہمیشہ بنا رہے۔ آپ جیسے قدردان تو قسمت سے ملتے ہیں۔"

نواب صاحب کچھ مضطرب نظر آنے لگے۔ "میری بات کا جواب دو بائی جی۔"

"آپ ایک ہزار دے دیجئے۔"

نواب صاحب کا ہاتھ بے ساختہ شیروانی کی اندروالی جیب کی طرف لپکا لیکن پھر رک گیا، اور وہ شیروانی کے بٹن کو انگلی سے تھپ تھپانے لگے۔ "ایک ہزار روپے کا مطلب بھی سمجھتی ہو بائی جی؟" انہوں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

مشتری بیگم نے ہاتھ کی وہ حرکت دیکھ لی تھی۔ چنانچہ وہ ڈٹ گئی۔ "عزت کے علاوہ سب کچھ دے رکھا ہے حضور اللہ نے...... عزت ہوتی تو ہم بھی نواب ہوتے نواب صاحب۔"

"بہت گستاخانہ جواب دیا ہے تم نے۔" نواب صاحب نے بہت نرم لہجے میں کہا۔ "لیکن ہم تمہیں بتا دیں، ایک چیز اور ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے...... عزت کے علاوہ۔ اور وہ ہے طاقت۔ طاقت سمجھتی ہو تم؟ اس کوٹھے کو اجڑنے میں ایک گھنٹا بھی نہیں لگے گا لیکن ہم خریدنے کی چیز کو خریدنے کے قائل ہیں، چھیننے کے نہیں۔"

لفظ منہ سے نکلتے ہی مشتری بیگم کو غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ نواب صاحب کی بات سن کر تو وہ دہل گئی۔ اُس نے جلدی سے نواب صاحب کے پاؤں پکڑ لئے۔ "مجھ سے بے دھیانی میں بہت بڑی بھول ہو گئی نواب صاحب۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔"

"معاف تو جب کریں کہ سزا دینے کا کوئی ارادہ ہو۔ ہمارا مقام یہ نہیں کہ تم جیسوں سے الجھیں۔"

"آپ کا ناراض ہونا ہی میری سزا ہے۔ جب تک آپ معاف نہیں کریں گے، میں آپ کے پاؤں نہیں چھوڑوں گی۔"

"جاؤ، معاف کیا۔ اس لئے کہ غلطی ہماری بھی ہے۔ کچھ خریدتے ہوئے مول تول ہم کبھی نہیں کرتے۔ بس، یہ لڑکی ہمیں کچھ اتنی زیادہ پسند نہیں، اس لئے اتنی بات بھی ہو گئی۔"

"مگر میں اب آپ سے دھیلا بھی نہیں لوں گی۔ اور لڑکی آپ کی ہوئی۔"

"تم پھر گستاخی کر رہی ہو۔ اب تو ہم تمہیں ایک ہزار ہی دیں گے۔" نواب صاحب نے شیروانی کی اندر کی جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور ایک ہزار گن کر اس کے سامنے ڈال دیے۔

مشتری بیگم نے دکھاوے کی خاطر خاصی بحث کی اور بالآخر نواب صاحب کے احترام میں رقم قبول کر لی۔ "اس سے بہتر ہوتا نواب صاحب کہ آپ اسے میری طرف سے تحفہ سمجھ کر لے جاتے۔ دل بھر جاتا تو مجھے ہی واپس دے جاتے۔ آخر ایک دن اس سے دل تو بھر ہی جائے گا نا چھوٹے سرکار کا۔"

"تم نے پھر گستاخی کی بائی جی۔ دل بھر جانے پر بھی ہم کوئی چیز نہ پھینکتے ہیں، نہ دکان دار کو واپس دیتے ہیں۔ دل بھر جائے گا اس سے تو یہ ہمارے گھر میں کام کاج کرے گی۔ ویسے بھی کھوٹا سکہ بھی کام آ ہی جاتا ہے۔ اب تم ایسا کرو، ایک بڑی چادر لا دو ہمیں۔"

مشتری بیگم نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ اب کچھ پوچھنے کی ہمت تو اُس میں نہیں رہی تھی۔

"دیکھو نا، ابھی تو رات شروع ہوئی ہے۔ یہاں رونقیں شباب پر ہوں گی۔ ہم اس لڑکی کی نمائش تو نہیں کریں گے۔ ہم تو یہ بھی نہیں چاہیں گے کہ اب اس پر کسی کی بری نظر بھی پڑے۔"

"سوائے ہمارے"۔ مشتری نے دل ہی دل میں گویا ان کی بات مکمل کی۔ "جی...... بہت بہتر۔" اُس نے کہا اور کمرے سے چلی گئی۔ اس نے ایک بار بھی درمیانی دروازے پر پڑے پردے کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ دیکھتی تو شاید اسے وہ دو بڑی بڑی آنکھیں نظر آ جاتیں، جو پردے کی جھری سے جھانک رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں حیرت تیر رہی تھی۔ اور تیر اس لیے رہی تھی کہ ان میں آنسو بھرے تھے۔

❁......❁......❁

بگھی والے کے اندازے کے مطابق اسے وہاں کھڑے تین گھنٹے ہو گئے تھے۔ اس دوران وہ بس ایک بار بگھی سے اترا تھا، جب اسے بھوک لگی تھی۔ مدت سے اسے دودھ جلیبی کی آرزو تھی۔ آج پیسوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اُس نے سامنے دودھ کی دکان پر دودھ جلیبی کا آرڈر دیا۔ پھر سیر ہو کر کھایا پیا۔ اُس کی روح تک خوش ہو گئی تھی۔

پھر اُس نے اپنی سواریوں کو زینے سے نکلتے دیکھا تو نیچے اتر آیا۔ ان کے ساتھ ایک عورت بھی تھی...... بڑی سی چادر میں لپٹی۔ اور اسی چادر کا گھونگھٹ سا نکالے۔ بڑے میاں نے اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔

وہ تینوں بگھی میں بیٹھے تو کوچ بان نے جلدی سے پردے کھینچ دیے۔ عبدالحق نے اسے

کیمپ کا پتا بتایا۔ بگھی چل دی۔

عبدالحق نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے نو بجے تھے۔ اُس نے سوچا، مسعود صاحب کے گھر پہنچتے پہنچتے گیارہ بج جائیں گے۔

بازار میں تو رونق پہلے سے بھی زیادہ تھی۔ لیکن رات ہونے کا احساس بازار سے نکلنے کے بعد ہوا۔ ہر طرف سکوت تھا۔ کبھی کوئی اکا دکا راہ گیر یا تانگہ نظر آ جاتا تھا۔

عبدالحق نے کیمپ کے باہر بگھی رکوائی اور کیمپ کے دفتر کی طرف لپکا، جو رات کے وقت اخلاق کی خواب گاہ میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ اخلاق جاگ رہا ہے۔

''ارے..... تم ابھی سوئے نہیں؟''

''ہاں..... کام میں لگا ہوا تھا۔'' اخلاق نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ''بس اب سونے جا رہا ہوں۔''

''مجھے مسعود صاحب کا پتا چاہئے۔''

''بڑے صاحب کا پتا؟ اتنی رات کو! خیر تو ہے؟''

''سب خیریت ہے۔ بس مجھے اسی وقت ان سے ملنا ہے۔''

''ایسی کیا بات ہے۔ صبح مل لینا۔''

''نہیں اخلاق بھائی، بہت ضروری بات کرنی ہے ان سے۔'' عبدالحق نے کہا۔ پھر اسے پریشان دیکھ کر تسلی دی۔ ''یقین کرو، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بلکہ خوش خبری ہی ہے۔''

اخلاق سے مسعود صاحب کا پتا اچھی طرح سمجھنے کے بعد وہ واپس آیا اور کوچ بان سے کہا۔ ''اب مغل پورے چلنا ہے۔''

مسعود صاحب کے مکان تک پہنچنے میں انہیں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ مکان کیا، وہ وسیع و عریض کوٹھی تھی۔ گیٹ بند تھا لیکن اندر چوکی دار موجود تھا۔ عبدالحق نے اُس سے کہا۔ ''ہم مسعود صاحب کے مہمان ہیں.....''

''صاحب تو سو چکے ہوں گے۔'' چوکی دار نے کہا۔

عبدالحق ایک لمحے کو ہچکچایا۔ اخلاقی طور پر یہ زیادتی تھی۔ مگر وہ جس طرح کی صورت حال میں تھے، اس میں یہ جائز لگ رہی تھی۔ اُس نے چوکی دار سے بارعب لہجے میں کہا۔ ''ہم بہت دور سے آئے ہیں۔ تم صاحب کو جگا دو۔ میرا وعدہ ہے کہ صاحب ناراض نہیں ہوں گے۔''

''آپ کا نام؟''

''کہنا کہ عبدالحق آیا ہے۔''

چوکی دار اندر چلا گیا۔ عبدالحق کو ایک بات کا خیال آیا تو اُس نے بگھی میں بیٹھے افضال

صاحب سے پوچھا۔ ''بڑے صاحب زرینہ کو پہچانتے تو نہیں ہیں؟''

افضال صاحب نے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ وہ اسے پہچان سکیں گے۔ کیمپ میں ہزاروں افراد ہوتے ہیں..... اور پھر لڑکی.....'' تاہم اتنا کہہ کر انہوں نے سوالیہ نظروں سے زرینہ کو دیکھا۔

''میرا اور ان کا سامنا دو ایک بار ہی ہوا ہوگا۔ وہ مجھے کیسے پہچان سکتے ہیں۔''

چوکی دار کوئی پانچ منٹ بعد واپس آیا اور اُس نے گیٹ کھول دیا۔ اُس کے ساتھ مسعود صاحب بھی تھے۔ عبدالحق نے انہیں سلام کیا۔ جواب دیتے ہوئے انہوں نے اسے لپٹا لیا۔

''مجھے شرمندگی اور افسوس ہے کہ ناوقت آپ کو زحمت دی۔'' عبدالحق نے معذرت کی۔

''ارے نہیں۔ میں نے کہا تھا نا کہ یہ تمہارا ہی گھر ہے۔ تو اپنے گھر تو آدمی جب چاہے آ سکتا ہے۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ ''یہ بتاؤ، خیریت ہے نا؟''

''جی الحمدللہ۔ بلکہ میں تو اچھی خبر کے ساتھ آیا ہوں مگر اسی سلسلے میں آپ کی فوری مدد کی ضرورت ہے۔''

''میں حاضر ہوں۔''

''مجھے میری بچھڑی ہوئی بہن مل گئی ہے مسعود صاحب۔ میں کچھ دن کے لئے اسے آپ کے پاس چھوڑنا چاہتا ہوں۔ گاؤں جاتے ہوئے ساتھ لے جاؤں گا۔''

''یہ تو میرے لئے اعزاز ہوگا کہ میں تمہارے کسی کام آیا۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ پھر غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''لیکن تم تو یہاں کسی رضوان صاحب کی تلاش میں آئے تھے۔''

''جی ہاں، ان کی بھی تلاش ہے مجھے لیکن بہن کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ اُس کا اعلان بھی نہیں کیا جا سکتا۔''

مسعود صاحب مطمئن نظر آنے لگے۔ ''ہاں۔ یہ تو ہے۔ خیر..... تم بہن کو لے کر آؤ۔ میں بچوں کو جگاتا ہوں۔''

یوں عبدالحق کے لئے اور آسانی ہو گئی۔ پروگرام کے مطابق افضال صاحب بگھی میں ہی بیٹھے رہے۔ زرینہ اتر کر عبدالحق کے ساتھ کوٹھی میں چلی گئی۔

❁.....❁.....❁

''اب ہمیں ہوٹل لے چلو۔'' عبدالحق نے باہر آ کر بگھی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہوٹل کیوں.....'' افضال صاحب نے معترضانہ انداز میں کہنا چاہا۔

عبدالحق نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

افضال صاحب زرینہ کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتے تھے لیکن خاموش رہے۔

بگھی ہوٹل کے سامنے رکی۔ وہ دونوں نیچے اترے۔ عبدالحق نے کوچ بان کو دس روپے

دیے۔ ''یہ کیا باؤجی، پانچ روپے تو آپ نے پہلے ہی دے دیے تھے۔'' کوچ بان نے کہا۔

''رکھ لو۔ خوشی سے دے رہا ہوں۔ تم نے ہمارا ساتھ بھی تو دیا ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔ پھر بولا۔ ''ایک بات مانو گے میری؟''

''بولا باؤجی۔''

''آج جو کچھ بھی دیکھا ہے، سنا ہے اور سمجھا ہے، اسے بھول جانا، کبھی زبان پر نہ لانا۔''

''آپ لوگوں کو تو میں کبھی نہیں بھول سکوں گا باؤجی۔'' کوچ بان آب دیدہ ہو گیا۔ ''اور یہ وعدہ کہ کبھی کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ میں کچھ بھی نہیں جانتا باؤجی، پر اتنا سمجھتا ہوں کہ آپ نے آج مجھے ایک نیکی میں شریک کر لیا ہے۔''

''بس اب تم جاؤ۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔''

وہ دونوں اپنے کمرے میں چلے آئے۔ وہاں عبدالحق نے افضال صاحب کو سمجھایا کہ نواب کی حیثیت میں وہ کیمپ میں جاتے تو چہ میگوئیاں ہوتیں۔ اور یہ کہ اسی لئے اس نے مسعود صاحب سے ان کا سامنا نہیں ہونے دیا۔

افضال صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''تم بہت عقل مند ہو میاں۔ اور تم نے ہر لمحہ زرینہ کی عزت کا خیال رکھا ہے۔''

''بھائیوں کو بہنوں کی عزت کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ اب آپ سو جائیے۔''

عبدالحق بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔ صبح چار بجے وہ تہجد کے لئے اٹھا تو افضال صاحب جاگ رہے تھے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ کیمپ میں بھی کہاں سوتے تھے۔

صبح انہوں نے ہوٹل میں ہی ناشتہ کیا۔ پھر عبدالحق نے کہا۔ ''اب کیمپ چلیں گے۔ مسعود صاحب سے زرینہ کی خیریت بھی پوچھنی ہے۔''

افضال صاحب نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ''تو اب میں زرینہ کی طرف سے بے فکر ہو جاؤں؟''

''بالکل۔ اب وہ میری بہن ہے، اور زندگی کی آخری سانس تک میری ذمہ داری ہے۔''

باہر آ کر عبدالحق نے کیمپ کے لئے تانگہ کیا۔ مگر افضال صاحب نے کیمپ جانے سے انکار کر دیا۔ ''میں تو اپنی روز کی آوارہ گردی پر نکلوں گا میاں، یہ میرے کپڑے میرے ٹرنک میں رکھ دینا۔ بلکہ اب یہ سب کچھ تمہارا ہے۔''

عبدالحق نے زبردستی ان کی جیب میں دس روپے ڈال دیے۔ ''تو پھر شام کو ملاقات ہو گی؟''

''دیکھو میاں، کیا ہوتا ہے۔ آدمی کو تو آنے والے پل کا علم بھی نہیں ہوتا۔''

ان کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔ عبدالحق نے غور سے انہیں دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں کہیں گہرائی میں اسے وحشت سی مچلتی نظر آئی۔ یا پھر وہ اُس کا وہم تھا۔ اگلے ہی لمحے افضال صاحب پلٹے اور مخالف سمت میں چل دیے۔ ان کی چال میں تیزی تھی۔

عبدالحق چند لمحے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر تانگے میں بیٹھ گیا۔ ''چلو بھائی۔''

❀ ❀ ❀

زبیر کو حسن دین سے معلومات حاصل کر کے نکلنے میں دیر ہو گئی۔ اس کے نتیجے میں لاہور پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ اس وقت کیمپ جانا مناسب نہیں تھا۔ اسٹیشن کے باہر اُس نے چارپائی، تکیہ اور چادر لے کر رات گزاری، اور صبح ہوتے ہی کیمپ کا رخ کیا۔

کیمپ میں عبدالحق موجود نہیں تھا، وہ سیدھا مسعود صاحب کے پاس چلا گیا۔

''رات عبدالحق کافی دیر سے میرے پاس آئے تھے۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ پھر زبیر کے چہرے کو بہت غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''ان کی کھوئی ہوئی بہن مل گئی ہے۔''

زبیر اپنی حیرت نہ چھپا سکا۔ مگر اگلے ہی لمحے اُس نے خود پر قابو پا لیا۔ وہ بہت تیزی سے سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر صاحب نے کسی کو اپنی بہن کے بارے میں بتایا ہے، جبکہ ان کی کوئی بہن ہی نہیں، تو یہ ضروری ہی ہو گا۔ اسے کوئی بات بنانی ہو گی۔

''تم تو ایسے چونکے، جیسے اس بات سے بھی بے خبر ہو کہ ان کی کوئی بہن بھی ہے۔'' مسعود صاحب نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ رات سے ہی بے چین تھے۔ یہ بات نہیں کہ انہیں عبدالحق پر اعتبار نہیں تھا۔ لیکن وہ اتنا کچھ دیکھ چکے تھے کہ ہر بات پر شبہ کرنا ان کی عادت بن گیا تھا۔ عبدالحق بہر حال جوان آدمی ہے، اور اس دور میں بدنصیب لڑکیاں کٹی ہوئی پتنگوں کی طرح ڈولتی پھر رہی ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ عبدالحق پوری طرح خود مختار آدمی ہے۔ کون جانے، وہ اس لڑکی کو...... بہر حال وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی انہیں کسی ایسے ویسے معاملے میں استعمال کرے۔

''میں اس پر حیران ہوں کہ انہوں نے آپ کو یہ بات کیسے بتا دی۔ یہ بات تو وہ کسی کو بھی نہیں بتا سکتے تھے۔'' زبیر کو بھی نکتہ سوجھ ہی گیا۔

مسعود صاحب ایک دم مطمئن نظر آنے لگے۔ ''ارے...... وہ میرا بڑا احترام کرتے ہیں۔ اور مجھے بھی وہ بہت عزیز ہیں۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اب دیکھو نا، انہوں نے صرف مجھے بتایا ہی نہیں، بلکہ زرینہ کو میرے گھر پر چھوڑ گیا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ ابھی گاؤں واپس نہیں جا سکتے۔ اب زرینہ کو وہ کیمپ میں تو نہیں رکھ سکتے تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے مجھے اپنا سمجھا۔''

زبیر کے لئے وہ انکشاف پر انکشاف تھا۔ مگر اب وہ پوری طرح سنبھل چکا تھا۔ ''تب تو ٹھیک ہے۔ انہیں آپ کو بتانا ہی تھا۔''

''اور سناؤ..... تمہارے گاؤں میں پانی پہنچ گیا؟''

''جی ہاں جناب۔''

''اب اسے گاؤں نہیں، قصبہ کہنا چاہئے۔ آنے والے وقتوں میں وہ اچھا خاصا شہر ہوگا۔''

''جی..... جی ہاں۔''

وہ دونوں حق نگر کی صورتِ حال کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ عبدالحق آ گیا۔ زبیر کو دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔ ''ارے زبیر..... تم کب آئے۔'' پھر وہ پریشان ہو گیا۔ ''گھر میں سب خیریت ہے نا؟''

''سب ٹھیک ہے صاحب۔ بس مجھے اماں نے بھیجا ہے۔'' زبیر نے معذرت طلب نگاہوں سے مسعود صاحب کو دیکھا۔ ''آپ اجازت دیں تو......''

مسعود صاحب مسکرائے۔ ''تم ان سے بات کر لو۔ میرے پاس فرصت سے آنا۔''

وہ دونوں باہر نکل آئے۔ زبیر نے سکون کی سانس لی۔ وہ صحیح معنوں میں بڑی مشکل میں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مسعود صاحب اس کی موجودگی میں اس کے صاحب سے اُس کی بہن کے بارے میں بات کریں، اور صاحب کو شرمندگی ہو۔ دوسری طرف وہ صاحب سے بھی اس سلسلے میں کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ وہ خود ہی بتائیں تو بتائیں۔

وہ ایک تنہا گوشے میں جا بیٹھے۔ عبدالحق کو اس پر حیرت تھی کہ زبیر بہت بدلا بدلا لگ رہا ہے۔ جس انداز میں اُس نے مسعود صاحب سے معذرت کی تھی، وہ اُس کی پرانی شخصیت سے متصادم تھا۔

''صاحب، اماں نے کہا ہے کہ آپ اب گھر واپس آ جائیں۔'' زبیر نے کہا۔

عبدالحق کو دوسری حیرت ہوئی..... صاحب! اُس نے بات جیسے سنی ہی نہیں۔ ''میں دیکھ رہا ہوں زبیر کہ آپ بہت بدل گئے ہیں۔ جس طرح آپ نے میرے ساتھ علاحدگی میں بات کرنے کے لئے مسعود صاحب سے بات کی اور اب آپ مجھے صاحب کہہ رہے ہیں۔''

''بس سیکھ رہا ہوں صاحب۔ اب دیکھیں نا، مالک تو بس اللہ کی ذات ہے۔ میری عادت تھی آپ کو مالک کہنے کی۔ کسی سے میں نے یہ لفظ سنا اور آپ کے لئے پسند کر لیا۔ آپ کو برا تو نہیں لگا۔''

''مجھے تو یہی اچھا لگے گا کہ آپ میرا نام لیں۔''

''یہ تو میرے لئے ممکن نہیں صاحب۔'' زبیر گڑگڑانے لگا۔ ''اور صاحب، اب آپ رابعہ کو سنیں گے تو بھی حیرت ہوگی۔ ہم لوگوں نے منجھلی بی بی سے بہت کچھ سیکھا ہے اور سیکھ رہے ہیں۔''

نور بانو کے تذکرے پر عبدالحق کے چہرے پر رنگ سا دوڑ گیا۔ ''کیسی ہیں وہ؟'' اس نے

بے ساختہ پوچھا۔

''جی ٹھیک ہیں۔''

''اور سب لوگ؟'' عبدالحق نے جلدی سے اپنے پچھلے سوال کی اہمیت زائل کرنے کی کوشش کی۔

زبیر اسے گاؤں کی خبریں سنانے لگا۔ اُس نے پانی کے...... پنچایت کے قیام کے اور نئے آنے والوں کے بارے میں بتایا۔ پھر جھجکتے ہوئے بولا۔ ''صاحب، ایک بڑی خوش خبری بھی ہے۔'' پھر اُس نے اٹک اٹک کر بتایا کہ رابعہ ماں بننے والی ہے۔

عبدالحق نے گرم جوشی سے اسے لپٹا لیا۔ ''اللہ کا شکر ہے۔ یہ پاکستان کی برکت ہے۔ انشاء اللہ ہمارے علاقے میں پیدا ہونے والا پہلا خالص پاکستانی تمہارا بچہ ہوگا۔'' اُس نے کہا پھر اسے خیال آیا تو اُس نے پوچھا۔ ''میرے مینو کا کیا حال ہے؟''

''ارے صاحب، وہ تو بس بچ ہی گیا اللہ کی رحمت سے۔ ورنہ تو وہ مر ہی جاتا۔''

عبدالحق گھبرا گیا۔ ''ہوا کیا تھا؟''

''ارے صاحب، آپ نے اُس کی عادتیں بگاڑ دی تھیں۔ وہ چارہ آپ کے ہاتھ سے کھانے کا عادی تھا۔ پھر ہر وقت آپ کے آگے پیچھے گھومتا رہتا تھا۔ آپ چلے آئے تو اُس نے کھانا پینا، دوڑنا کھیلنا چھوڑ دیا۔ پیٹ پیٹھ سے لگ گیا۔ میں تو پریشان تھا کہ آپ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ پھر پتا نہیں کیسے، منجھلی بی بی نے اسے رام کر لیا۔ اب وہ سارے لاڈ ان سے کرتا ہے۔ وہ پہلے جیسا ہو گیا ہے صاحب۔''

عبدالحق کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ خود پر افسوس بھی ہوا کہ اسے بے سوچے سمجھے اس طرح چھوڑ آیا۔ اگر وہ مر جاتا تو......؟

اس کے بعد زبیر نے مطلب کی بات چھیڑی۔

''زبیر بھائی، آپ جانتے ہیں کہ میں ابھی واپس نہیں آ سکتا۔ میں یہاں ایک کام سے آیا ہوں اور وہ کر کے ہی جاؤں گا۔''

''مگر وہاں آپ کی ضرورت ہے صاحب۔''

''وہاں آپ موجود ہیں زبیر بھائی، اب آپ کو ہی سب کچھ سنبھالنا ہوگا۔''

''لیکن صاحب، یہ میرے بس کا نہیں۔ میں تو نوکر آدمی......''

''یہ ذہن سے نکال دیجئے زبیر بھائی۔ آپ اب کسی کے نوکر نہیں، آزاد اور خود مختار آدمی ہیں، فیصلے کر سکتے ہیں۔''

''فیصلے کرنے مجھے کہاں آتے ہیں۔'' زبیر نے بے بسی سے کہا۔

"کریں گے تو آ جائیں گے۔ دیکھیں زبیر بھائی، اس وقت سب کو پاکستان کے استحکا[م]
کے لئے بڑھ چڑھ کر کام کرنا ہے۔ یہ بات عرفان صاحب اور مسعود صاحب جیسے لوگ مجھ سے
کہتے ہیں، اور بات میرے دل کو لگتی بھی ہے۔ اب آپ کو میں ترکیب بتاتا ہوں۔ میرے پتا جی یا[د]
ہیں نا آپ کو۔"

"ان کو کیسے بھول سکتا ہوں صاحب۔"

"انہیں، بہت زیادہ دیکھا تھا آپ نے، اور بہت غور سے دیکھا تھا؟"

"جی ہاں صاحب۔"

"بس تو زمین کے معاملات میں آپ اسی طرح بات کریں، عمل کریں، فیصلے کریں، جیسے وہ
کرتے تھے۔"

زبیر دونوں رخسار ہاتھوں سے پیٹنے لگا۔ "میں کہاں صاحب......"

عبدالحق نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "مجھلی بی بی سے اتنا اچھا بولنا سیکھ لیا آپ نے۔
حالانکہ اُنہیں اتنا دیکھا بھی نہیں۔ پتاجی کے ساتھ اور قریب تو آپ نے برسوں گزارے تھے۔
آپ کو نہیں پتا، لیکن آپ وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اور سن لیں، یہ میرا حکم ہے۔"

"جی...... جی صاحب۔" زبیر نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"ابھی میرے ساتھ کچہری چلیں، میں آپ کے نام مختار نامہ بنوا دیتا ہوں۔ پھر میرے تمام
اختیارات قانونی طور پر آپ کے ہوں گے۔"

"مجھے لگتا ہے کہ آپ یہاں رکنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ تو کیا آپ......"

"نہیں، نہیں۔ میں واپس آؤں گا یہ کام کر کے۔" عبدالحق نے جلدی سے کہا۔ اس نے سمجھ
لیا کہ زبیر کو اس وقت ٹھکانے کی ضرورت ہے۔ کچھ عرصہ وہ معاملات سنبھالے گا تو اس میں اعتماد
آ جائے گا لیکن ابھی ڈر گیا تو کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ اس لئے اُس نے اسے یہ نہیں بتایا کہ مسعود
صاحب کی بات اُس کے ذہن نے قبول کی ہے۔ اور کچھ نہیں تو اُس نے تعلیم مکمل کرنے کا مصمم
ارادہ کر لیا ہے۔ "بس آپ اس وقت تک میرے حکم کی تعمیل کریں۔"

"ٹھیک ہے صاحب۔" زبیر نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

وہ دونوں کچہری جانے کے لئے کیمپ سے نکل آئے۔

❁ ❁ ❁

کچہری سے مختار نامہ بنوا کر انہوں نے باہر ہی کھانا کھایا، اور پھر کیمپ واپس آئے۔ انہیں
وہاں بیٹھے ذرا دیر ہی ہوئی ہوگی کہ مجید ہانپتا کانپتا کیمپ میں داخل ہوا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں
اُڑ رہی تھیں۔ اُسے دیکھ کر عبدالحق کو کسی سنگین گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔ اس نے متلاشی نظروں

سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر وہ اپنے دوستوں نذیر اور نعمان کو دیکھ کر ان کی طرف لپکا۔

درمیانی فاصلہ خاصا تھا۔ عبدالحق کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا لیکن اتنا اُس نے دیکھا کہ مجید
ہیجانی انداز میں اپنے دوستوں کو کچھ بتا رہا ہے۔ ہیجان اُس کے ایک ایک عضو کی حرکت سے جھلک
رہا تھا۔ نذیر اور نعمان کا ردعمل اتنی دور سے بھی واضح تھا۔ ان کے منہ کھلے ہوئے تھے اور چہروں پر
بے یقینی کا تاثر تھا۔ پھر وہ کچھ بولے بھی......

ذرا سی دیر میں وہ خبر پورے کیمپ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ عبدالحق کو اپنی
سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ افضال صاحب...... افضال صاحب جیسا آدمی...... یہ...... یہ کیسے
ممکن ہے۔

وہ خود مجید کے پاس گیا۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

"میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے سب۔ افضال چچا نے جمیل بھائی کو قتل کر دیا۔" اُس
کی آواز میں اب بھی ہیجان تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں وہاں موجود تھا، اور جمیل بھائی سے بات کر رہا تھا کہ اچانک افضال چچا آئے۔ جمیل
بھائی نے انہیں اپنی طرف آتے دیکھا تو بولے، آپ یہاں کیسے؟ افضال چچا نے کہا...... میں
تیرے لیے ہی آیا ہوں کمینے افضال، آج میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ کام تو مجھے پاکستان
آنے سے پہلے ہی کر دینا چاہئے تھا۔ بس پھر انہوں نے ایک ہاتھ نکالا جیب سے اور جمیل بھائی پر
وار کرنے شروع کر دیے......"

عبدالحق کو کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ پھر بات اُس کی سمجھ میں آ گئی۔ "افضال صاحب
نے جمیل کو افضال تو نہیں کہا ہوگا۔"

"ارے...... وہ تو اب بھی انہیں افضال کہہ رہے ہیں، اور گالیاں بھی دے رہے ہیں۔
مارتے وقت بھی وہ انہیں افضال کہہ رہے تھے۔"

بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ "جمیل اسپتال میں ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"میں بتا رہا ہوں، وہ مر چکے ہیں۔ اسپتال لے جانے کی تو نوبت ہی نہیں آئی۔ افضال چچا
نے انہیں بُری طرح کاٹ ڈالا تھا۔ اور آخر میں تو ذبح ہی کر دیا انہیں۔"

عبدالحق جھرجھری لے کر رہ گیا۔ اس کے لئے یہ تصور بھی محال تھا...... اور وہ بھی افضال
صاحب کے لئے۔

مسعود صاحب کو اس واقعے کا علم ہوا تو وہ بھی باہر آ گئے۔ مجید کہانی پھر دہرانے لگا۔

"میرے حلق سے نہیں اتر رہی ہے یہ بات۔" مسعود صاحب نے کہا۔ "وہ عبدالحق سے

مخاطب تھے۔ ''چلو...... تھانے چل کر معلوم کرتے ہیں۔''

عبدالحق نے زبیر کو وہیں رکنے کو کہا اور مسعود صاحب کے ساتھ کیمپ سے نکل آیا۔ مسعود صاحب کی فیاٹ میں وہ تھانے پہنچے تو تھانے دار مسعود صاحب کے آگے بچھ گیا۔ وہ انہیں جانتا تھا۔

''ہم کیمپ میں ہونے والے قتل کے سلسلے میں آئے ہیں۔'' مسعود صاحب نے اُس سے کہا۔

وہاں مجید کی ہر بات کی تصدیق ہوگئی۔ افضال صاحب نے جمیل کو بڑی بے رحمی سے قتل کیا تھا۔

''ہم افضال صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔'' مسعود صاحب نے کہا۔

''ضرور سر۔ پر پہلے چائے پی لیں۔''

مسعود صاحب کچھ ہچکچائے۔ مگر پھر شاید افضال صاحب کی بہتری کی خاطر چائے پینے پر آمادہ ہوگئے۔

عبدالحق اس دوران بہت تیزی سے سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ افضال صاحب جیسا آدمی اور ایسا بے رحمانہ قتل! پھر سوال یہ تھا کہ انہوں نے اس دوسرے کیمپ جا کر بالارادہ جمیل کو قتل کیوں کیا۔ اور وہ بالارادہ قتل تھا، کیونکہ چاقو وہ اپنے ساتھ لے کر گئے تھے۔

جمیل کے بارے میں عبدالحق کو ایک بات یاد آئی...... وہ بڑے بڑے افسران کو لڑکیاں سپلائی کرتا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی کڑیاں ملنے لگیں۔ اگر جمیل کا یہ دھندا تھا تو وہ کسی لڑکی کو ہیرا منڈی لے جا کر بھی بیچ سکتا تھا۔ تو ممکن ہے، زرینہ کو بھی اُس نے ہی بیچا ہو۔

اب عبدالحق نے کوٹھے پر زرینہ سے ہونے والی ملاقات کو ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے وہاں افضال صاحب سے پوچھا تھا کہ زرینہ کو کون دھوکا دے کر لایا اور بیچ گیا تو وہ جھنجلا گئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ زرینہ نے انہیں نہیں بتایا، اور یہ کہ اس سے پوچھنا بھی نہیں چاہئے۔ عبدالحق نے دلیل بھی دی تھی کہ آدمی دھوکہ کسی پہچان والے سے ہی کھاتا ہے۔

اب کہانی عبدالحق کی سمجھ میں آنے لگی۔ زرینہ نے افضال صاحب کو یقیناً بتایا ہوگا کہ جمیل اسے دھوکہ دے کر وہاں لے آیا تھا۔ اور وہ کیوں نہ بتاتی۔ یہ کوئی چھپانے والی بات تھی ہی نہیں۔ تو افضال صاحب نے اسی وقت جمیل کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے موذی کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے۔ اس لیے صبح افضال صاحب اُس کے ساتھ کیمپ نہیں آئے۔ اُس نے انہیں دس روپے دیے تھے۔ لہٰذا چاقو خریدنے میں انہیں کوئی دشواری نہیں ہوئی ہوگی۔ پھر وہ دوسرے کیمپ گئے اور انہوں نے جمیل کو ختم کر دیا۔

اب سوال یہ تھا کہ وہ جمیل کو افضال کیوں کہہ رہے تھے۔ عبدالحق کی سمجھ میں ایک ہی بات آتی تھی۔ افضال صاحب اس معاملے میں زرینہ کا نام آنے سے بچانے کے لئے، اسے رسوائی سے بچانے کے لیے ایسا کر رہے ہیں۔ وہ پاگل بن رہے ہیں۔ تا کہ ان سے تفتیش ہی نہ کی جائے۔ یقیناً یہی بات ہے۔

مگر اس کے ساتھ ہی وہ تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ یہ صورت حال زرینہ کے لئے بہت خطرناک تھی۔ مشتری بائی کو بھی کسی طرح اس واقعے کا علم ہو سکتا تھا۔ پھر وہ افضال صاحب کو پہچان لیتی۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ کسی وقت افضال صاحب کی زبان سے زرینہ کا نام پھسل جاتا۔ اس لحاظ سے زرینہ کو فوری طور پر گاؤں بھجوانا بہت ضروری ہوگیا تھا۔ افضال صاحب کب تک پاگل بنے رہ سکتے تھے اور زرینہ اب اُس کی بہن تھی...... اُس کی عزت......

''چائے پی لو برخوردار۔''

مسعود صاحب نے اسے چونکا دیا۔ اُس نے جلدی سے چائے پی لی۔

تھانے دار انہیں اس حوالات تک لے گیا، جہاں افضال صاحب بند تھے۔ انہوں نے سلاخوں والے دروازے کے پار دیکھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے کپڑوں پر خون کے دھبے تھے اور آنکھیں مندی ہوئی تھیں۔ وہ وہاں اکیلے تھے۔

''دروازہ کھول دو۔ ہم ان سے اندر جا کر ملیں گے۔'' مسعود صاحب نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''یہ مناسب نہیں سر۔ ملزم پر وحشت طاری ہے۔ وہ کسی پر بھی حملہ کر سکتا ہے۔'' تھانے دار نے معذرت طلب لہجے میں انہیں سمجھایا۔

''ارے...... وہ ہمیں جانتے ہیں۔ وہ میرے ہی کیمپ میں رہتے ہیں۔''

''سر، میرا تو خیال ہے، وہ اس وقت خود کو بھی نہیں پہچانتے۔ ایسا کریں، آپ پہلے دور سے بات کر لیں۔ پھر آپ حکم کریں گے تو میں دروازہ بھی کھول دوں گا۔''

''افضال صاحب...... افضال صاحب۔'' مسعود صاحب نے انہیں پکارا۔

''افضال صاحب بدستور اونگھتے رہے، جیسے انہوں نے سنا ہی نہ ہو۔''

''زحمت نہ ہو تو ذرا یہاں آیئے۔''

افضال صاحب اٹھے اور دروازے تک آئے۔ وہ انہیں بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن نگاہیں اب بھی شناسائی سے محروم تھیں۔

''افضال صاحب، یہ کیا ہوگیا۔ یہ کیا کر دیا آپ نے؟'' مسعود صاحب نے دردمندی سے کہا۔

افضال صاحب نے حیرت اور تشویش سے اِدھر اُدھر دیکھا، جیسے افضال صاحب کو تلاش کر

رہے ہوں پھر وہ مطمئن نظر آنے لگے۔

''میں آپ سے بات کر رہا ہوں افضال صاحب۔'' مسعود صاحب نے اُن سے کہا۔

افضال صاحب اچانک غضبناک ہو گئے۔ ان کا ہاتھ جارحانہ انداز میں سلاخوں سے باہر آیا۔ مسعود صاحب گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ ''تم نے مجھے گالی دی۔ تم نے مجھے اتنی بری گالی دی۔'' افضال صاحب نے کف اُڑاتے ہوئے کہا۔

''میں نے آپ کو گالی نہیں دی افضال صاحب۔'' مسعود صاحب نے ان کی پہنچ سے دور ہوتے ہوئے مدافعانہ انداز میں کہا۔

''میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔ مجھے افضال کے نام سے پکارتے ہو۔ یہ تو بدترین گالی ہے۔ ارے میں نے زمین کا سب سے بڑا اور سب سے ذلیل بوجھ کم کر دیا۔ میں نے اس حرام زادے افضال کو قتل کر دیا۔ ٹکڑے کر دیے میں نے اُس کے اور تم مجھے افضال کہتے ہو۔''

مسعود صاحب دم بہ خود تھے۔ عبدالحق نے افضال صاحب سے پوچھا۔ ''تو آپ کا کیا نام ہے جناب؟''

''میں...... میرا نام؟'' افضال صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ جیسے ذہن پر زور دے رہے ہو۔ پھر وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیوں کو زور زور سے مسلنے لگے۔

''اچھا، مجھے تو جانتے ہیں نا آپ۔ اور یہ بڑے صاحب ہیں۔''

''میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا...... اور نہ ان بڑے صاحب کو۔ مجھے...... مجھے اپنا نام کیوں یاد نہیں آتا۔'' ان کی آنکھوں میں وحشت ناچنے لگی۔

''چلیں چھوڑیں۔ آپ آرام کریں۔'' عبدالحق نے کہا۔ افضال صاحب دوبارہ اپنی جگہ جا بیٹھے۔

وہ لوگ دوبارہ تھانے دار کے کمرے میں آ گئے۔ ''آپ نے مار پیٹ تو نہیں کی ان کے ساتھ؟'' عبدالحق نے تھانے دار سے پوچھا۔

''او تو بہ کریں جی۔ اپنے بندے تو الٹا ڈرتے ہیں اس سے۔''

''سنو...... میں ان کے لئے کپڑے بھجواؤں گا اور وکیل کا بندوبست بھی کروں گا۔ اس سے تعاون کرنا۔''

''لیکن سر، یہ 302 کا کیس ہے......''

''میں نے تمہیں انہیں رہا کرنے کو تو نہیں کہا۔'' مسعود صاحب نے سخت لہجے میں کہا۔ ''جو کچھ میں کر رہا ہوں، یہ ان کا حق ہے۔ اور تمہیں ان کا خیال رکھنا ہو گا۔ یہ کوئی عادی مجرم نہیں۔ لگتا ہے، کسی دماغی عارضے میں مبتلا ہیں۔ اور ہاں، ان کے کھانے پینے کا خیال رکھنا۔''

''جو حکم آپ کا سر۔''

مسعود صاحب نے کھانے کی مد میں تھانے دار کو پانچ روپے دینے چاہے لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ ''یہ تو ان کا سرکاری حق ہے جناب...... اور آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں ہر طرح سے ان کا خیال رکھوں گا۔''

مسعود صاحب اور عبدالحق تھانے سے نکل آئے۔

❀ ❀ ❀

عبدالحق صرف پریشان ہی نہیں متوحش بھی تھا۔ یہ جمیل کے قتل کا معاملہ اسے بہت خطرناک لگ رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ خدانخواستہ کسی بھی وقت زرینہ اس معاملے میں ملوث ہو جائے گی۔ اور یہ اسے کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔ جس لڑکی کو اُس نے بہن کہا اور اسے بازار سے نکالا، وہ اب اس کی رسوائی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس نے تو یہ فیصلہ کیا تھا کہ اب اس کے لیے سب سے اہم کام زرینہ کی شادی کرانا ہے۔

زبیر نے یہ بات محسوس کر لی کہ عبدالحق بہت پریشان ہے۔ اس سے کچھ پوچھنا تو اُس کے نزدیک گستاخی تھی۔ بس وہ اس کے لئے دعا ہی کر سکتا تھا۔ اسے اس حال میں چھوڑ کر جانے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر وہ خود فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔

فجر کی نماز کے بعد اس نے عبدالحق سے کہا۔ ''میرے لئے کیا حکم ہے صاحب؟''

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا، اور اس لمحے اسے اپنے دل کا بوجھ ہٹتا محسوس ہوا۔ ارے...... یہ معاملہ تو آسان ہے۔ زرینہ کو منظر سے ہٹا دیا جائے۔ فوری طور پر اسے گاؤں بھجوا دیا جائے۔

پریشان ہونے کی وجہ سے اسے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا۔ ورنہ تو یہ اس کا طے شدہ لائحہ عمل تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ جب تک اس کے گاؤں واپس جانے کا وقت نہیں ہوتا، زرینہ مسعود صاحب کے ہاں رہ لے گی۔ پھر وہ اسے اپنے ساتھ گاؤں لے جائے گا۔ اب وہ غور کر رہا تھا کہ یہ تو تائید غیبی ہے...... اللہ کا فضل ہے کہ زبیر یہاں چلا آیا۔ بس زرینہ کو زبیر کے ساتھ بھیج دینا ہے۔

سوال یہ تھا کہ زبیر کو اس سلسلے میں کس طرح بتایا جائے۔ اس کی ذہنی کیفیت عجیب سی تھی۔ ایک تو وہ افضال صاحب کی طرف سے پریشان تھا۔ پہلے تو اس نے یہی سوچا تھا کہ افضال صاحب جان بوجھ کر پاگل بن رہے ہیں، تاکہ زرینہ کا راز چھپا سکیں لیکن حوالات میں ان کی حالت دیکھنے کے بعد اسے اس پر یقین نہیں رہا تھا۔ ان کی دماغی حالت تو سچ مچ خراب لگ رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر اسے دو طرح کی پریشانیاں لاحق ہو گئیں۔ ایک تو خود ان کے بارے میں تھی۔ وہ دعا کرتا کہ اللہ کرے، وہ ٹھیک ہو جائیں۔ مگر دوسری پریشانی یہ تھی کہ اگر یہ واقعی پاگل پن ہے،

اور آگے کسی مرحلے پر دور ہو جاتا ہے تو عین ممکن ہے کہ افضال صاحب جمیل کے قتل کا محرک بیا[ن] کرتے ہوئے زرینہ کا نام بھی لے دیں۔ تو صورت حال یہ ہوئی کہ وہ ان کے لئے دعا کرنا چا[ہتا] تھا لیکن نہیں کر سکتا تھا۔

مگر اب اتنا آسان حل نظر آ گیا تھا۔ اس سے ایک پریشانی تو کم ہو جائے گی۔ البتہ دوسر[ی] باقی رہے گی۔ اگر افضال صاحب ہوش و حواس میں آ کر زرینہ کے بارے میں بیان دیں گے تو [وہ] اسے سنبھال لے گا۔ سب سے بڑی بات کہ زرینہ کی رسوائی اگر ہوئی تو یہاں ہو گی۔ وہاں گاؤں میں وہ خود تو رسوائی سے محفوظ ہو گی۔ اور وہ کسی نہ کسی طرح اس معاملے کو سنبھال ہی لے گا۔

اسے اچانک احساس ہوا کہ اُس کی اپنی ذہنی کیفیت بھی ٹھیک نہیں۔ وہ ایک ہی بات بار بار سوچ رہا ہے...... نئی بات سمجھ کر......

"صاحب...... آپ نے بتایا نہیں۔"

زبیر نے اسے چونکا دیا۔ "ارے ہاں...... بس وہاں کے معاملات تمہیں سنبھالنے ہیں میرے آنے تک۔ مختار نامے کی رُو سے تم میرے قائم مقام ہو۔ آج ہی تم گاؤں واپس چلے جاؤ۔"

"جو آپ کا حکم صاحب۔"

عبدالحق نے سوچا کہ زرینہ کو زبیر کے ساتھ بھجوانا ہے تو زبیر کا اب کیمپ میں ایک لمحے رکنا بھی ٹھیک نہیں۔ "تم ایسا کرو کہ لاری اڈے چلے جاؤ۔ میں وہاں آ کر تم سے ملوں گا۔ تمہارے ساتھ کسی کو بھیجنا بھی ہے۔"

زبیر کو یاد آ گیا، مسعود صاحب نے بتایا تھا کہ صاحب کو ان کی بہن مل گئی ہے۔

اب زبیر کو زرینہ کے بارے میں کیا بتائے، عبدالحق نے سوچا۔ ایک تو اس ذہنی کیفیت میں بات ہی نہیں کی جا رہی ہے...... اور پھر یہ بات...... وہ جھنجھلا گیا۔ زرینہ کے بارے میں سب کچھ تو وہ کسی کو بھی نہیں بتا سکتا۔ اس نے سوچا، زبیر نے پوچھا بھی تو وہ اسے ٹال دے گا۔ اس کی ذہنی کیفیت اتنی خراب تھی کہ اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ زبیر حکم کا بندہ ہے۔ کچھ پوچھنے کا تو قائل ہی نہیں۔

"ٹھیک ہے صاحب، تو میں جاؤں؟"

"ہاں، تم جاؤ۔ اڈے پر میرا انتظار کرنا۔"

اُس کے جانے کے بعد عبدالحق مسعود صاحب کے کمرے کی طرف لپکا۔ وہ سویرے ہی آ جاتے تھے، تا کہ کیمپ والوں کا ناشتہ ان کے سامنے ہو۔

"سر...... آپ کو ایک زحمت دینی ہے۔" اُس نے مسعود صاحب سے کہا۔

"بھئی تم تکلف بہت کرتے ہو۔"

"وہ گاؤں سے زبیر آیا ہوا ہے نا۔ آج واپس جا رہا ہے۔ میں زرینہ کو اس کے ساتھ گاؤں بھجوانا چاہتا ہوں۔"

"ابھی سے! ارے کچھ دن ہمارے ساتھ گزارنے دو اسے۔ میری بچیاں بہت مانوس ہو گئی ہیں اس سے۔"

عبدالحق کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے جواب میں کوئی مؤثر دلیل کہاں سے لائے۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے سوجھ گئی۔ "میں آپ کی بات ٹال نہیں سکتا سر لیکن وہاں اماں اس سے ملنے کے لیے تڑپ رہی ہوں گی۔"

"اماں......؟ ہاں، ٹھیک کہتے ہو۔ یہ تو ہے۔" مسعود صاحب کی سمجھ میں اس بات کی اہمیت آ گئی۔ واقعی جو ماں مہینوں سے بیٹی سے ملنے کی امید آس لگائے بیٹھی ہو، جو کبھی ٹوٹے اور کبھی جڑے، جسے یہ بھی نہیں معلوم ہو کہ اُس کی بیٹی زندہ بھی ہے یا نہیں، اس کے لیے بیٹی کا اچانک آ جانا کتنی بڑی خوشی کا سبب ہو گا۔ "تو برخوردار، زحمت کیسی۔ زبیر کب جا رہا ہے واپس۔"

"ابھی...... ذرا دیر میں۔"

"تو چلو۔"

وہ باہر آئے۔ عبدالحق مسعود صاحب کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی ایک اور خیال اسے ستانے لگا۔ یہ تو وہ جانتا ہے کہ اُس نے زرینہ کو زبان سے کہا ہی نہیں، دل سے بھی اپنی بہن سمجھتا ہے۔ تو کیا اب وہ اپنی بہن کو خالی ہاتھ، تین کپڑوں میں گھر بھیجے گا۔ مگر وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ اب تو کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

مسعود صاحب نے گاڑی پورچ میں روکی، اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود اندر چلے گئے۔ دو منٹ بعد ایک ملازم اس کے لئے لسی لے آیا۔ وہ اس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا، لیکن وہ بہت مضطرب تھا۔ جب تک زرینہ گاؤں کے لئے روانہ نہ ہو جاتی، اسے سکون نہیں آ سکتا تھا۔ اُس کے پاس سلیمانی ٹوپی ہوتی تو وہ اس کی مدد سے زرینہ کو پوری دنیا کی نظروں سے اوجھل کر دیتا۔

مسعود صاحب کوئی آدھے گھنٹے کے بعد واپس آئے تو زرینہ ان کے ساتھ تھی۔ "معاف کرنا برخوردار، بچیاں اسے چھوڑ ہی نہیں رہی تھیں۔ بلکہ اب بھی روئے جا رہی ہیں۔ اس لئے اتنی دیر ہو گئی۔"

"کوئی بات نہیں جناب۔"

وہ باہر آئے۔ عبدالحق اگلی سیٹ پر بیٹھا اور زرینہ پچھلی سیٹ پر۔ پھر ملازم نے ایک سوٹ

کیس لا کر پچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔ گاڑی چل دی۔

"کہاں جانا ہے؟" مسعود صاحب نے پوچھا۔

"لاری اڈے چھوڑ دیجئے ہمیں۔"

"تو تم میرے ساتھ واپس نہیں چلو گے؟"

"مجھے کچھ دیر لگے گی۔ میں خود ہی آ جاؤں گا۔"

مسعود صاحب نے انہیں لاری اڈے پر اتار دیا۔ پھر انہوں نے پچھلی سیٹ سے سوٹ کیس اتارا اور زرینہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "خدا حافظ بیٹی۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ یہ تمہارا بھائی عبدالحق ہمیں بہت عزیز ہے۔ اب اسے ہم چھوڑیں گے تو کبھی نہیں۔ اپنی اماں سے میرا اسلام کہنا۔"

عبدالحق نے سوٹ کیس کو حیرت سے دیکھا۔ "یہ کیا ہے سر؟"

"ارے کچھ نہیں۔ کل بچیاں زرینہ کو بازار لے گئی تھیں۔ وہاں ان لوگوں نے خریداری کی تھی اپنے لئے۔ یہ زرینہ کی چیزیں ہیں۔"

عبدالحق کے دل سے ایک ملال ڈھل گیا۔ کیا ہوا کہ وہ اپنی بہن کو کچھ نہیں دلا سکا۔ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے اہتمام فرما دیا۔

وہ زرینہ کی کیفیت سے بے خبر تھا، جو خوف زدہ ہو رہی تھی۔ زندگی نے اسے کہاں سے کہاں لا پھینکا تھا۔ پچھلا دن اس کی زندگی کا سب سے خوش گوار دن تھا۔ مسعود صاحب کے گھر میں اسے بڑی عزت، بہت محبت ملی تھی۔ مگر آج پھر زندگی اس کے لئے ایک تبدیلی لئے کھڑی تھی۔ اسے خیال آ رہا تھا کہ کچھ پتا نہیں، وہ ایک بار پھر بیچی جا رہی ہو۔ یہ ایک اور دھوکہ ہو۔ مگر اسے یاد تھا کہ افضال چچا نے بڑے یقین سے عبدالحق کو اُس کا بھائی کہا تھا۔ اور گھر بار والے، بیٹیوں والے، مسعود صاحب عبدالحق کی کتنی عزت کرتے تھے۔ وہ برا آدمی کیسے ہو سکتا ہے۔

پھر اُس نے جھنجھلا کر سوچا، جہنم میں تو میں رہ آئی ہوں۔ اب ہر جگہ اس سے بہتر ہی ہو گی۔ اس سے بری جگہ تو کوئی نہیں ہو سکتی۔

عبدالحق نے ادھر اُدھر دیکھا۔ زبیر کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے سوچا، جلدی سے کچھ باتیں کر لے۔ "سنو زرینہ، میرا ارادہ تو یہی تھا کہ میں خود اپنے ساتھ تمہیں گھر لے کر جاؤں گا لیکن صورت حال ایسی ہو گئی ہے کہ تمہیں فوری طور پر بھجوانا ہے......"

دور کھڑے زبیر نے انہیں دیکھا اور سمجھ لیا کہ مداخلت مناسب نہیں۔

"... خوش قسمتی سے زبیر بھائی آ گئے۔ اللہ نے مشکل آسان کر دی۔ اب تم ان کے ساتھ گاؤں چلی جاؤ۔ میں اپنا کام نمٹا کر ہی گھر واپس آؤں گا۔"

یہ سنتے ہی زرینہ کا رنگ فق ہو گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ ایک بار پھر بیچی جا رہی ہے۔

عبدالحق نے اُس کی کیفیت بھانپ لی۔ "ڈرو مت۔ اب تم میری بہن ہو۔ تمہیں ایک باعزت زندگی اور ہر وہ نعمت ملے گی، جس کی تمہیں آرزو ہے۔ اور سنو زبیر بھائی کو میں اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہوں، لیکن وہ خود کو میرا جاں نثار سمجھتے ہیں۔ میری ناکارہ ترین چیز کی حفاظت کے لئے وہ اپنی جان بھی قربان کر سکتے ہیں۔ تم تو میری بہن ہو...... سگی بہن۔"

زرینہ کچھ بول نہ سکی۔ اس کے چہرے پر اب بھی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ پھر بڑی مشکل سے اُس نے پوچھا۔ "ایسی کیا بات ہو گئی بھائی کہ میں آپ کے ساتھ جانے سے محروم ہو گئی؟"

عبدالحق نے ایک گہری سانس لی، چند لمحے سوچا، پھر اسے افضال صاحب کے ہاتھوں جمیل کے قتل کے بارے میں بتا دیا۔

زرینہ کی آنکھوں میں نفرت دہک اٹھی۔ "بہت اچھا کیا چچا نے۔ وہ منحوس اسی قابل تھا۔" اُس کا لہجہ بے حد تند تھا۔

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا۔ "یہ بات کیوں کہی تم نے؟ جمیل بھی انسان تھا۔"

"میں اسے انسان نہیں سمجھتی۔ پتا ہے آپ کو، وہی تو مجھے وہاں دھوکے سے لے گیا تھا...... اور مجھے بیچ آیا تھا۔"

چلو...... یہ بات بھی کھل گئی۔ عبدالحق نے گہری سانس لی۔ پھر اُس نے زرینہ سے کہا۔ "اب تم یہ سب کچھ بھول جاؤ۔ میرے گھر میں میری اماں تمہیں اتنی محبت دیں گی کہ تم ہر دکھ بھول جاؤ گی۔" اُسی وقت عبدالحق کی نظر زبیر پر پڑ گئی۔ زبیر بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ان کی طرف بڑھنے لگا۔

"مگر بھائی، میں انہیں اپنے بارے میں بتاؤں گی کیا؟" بے خبر زرینہ نے پوچھا۔

اب زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں تھا۔ "تمہیں کسی کو بھی اس سے زیادہ نہیں بتانا ہے کہ تمہارے گھر والوں میں سے کوئی نہیں بچا۔ اور تم مجھے کیمپ میں ملی تھیں۔ باقی سب کچھ مجھ پر چھوڑ دینا۔ کچھ بھی نہ بتانا کسی کو۔"

اتنی دیر میں زبیر قریب آ گیا تھا۔ "صاحب...... یہ لاری بس جانے ہی والی ہے۔ دو سیٹیں میں نے روک رکھی ہیں۔" پھر اُس کی نظر سوٹ کیس پر پڑی۔ اس نے سوٹ کیس اٹھا لیا۔

لاری واقعی روانگی کے لئے تیار تھی۔ زبیر نے سوٹ کیس اندر رکھا اور زرینہ کو اپنی روکی ہوئی سیٹ پر بٹھا دیا۔ پھر وہ عبدالحق کے پاس آیا۔ "اور کوئی حکم صاحب؟"

عبدالحق کچھ کہنے ہی والا تھا کہ کنڈکٹر نے چیخ کر کہا۔ "او بس جا چا جی...... گڈی پئی جا رئی اے۔ لیتی اے کہ نئیں۔"

زیادہ کچھ کہنے کا موقع نہیں تھا۔عبدالحق نے جلدی سے کہا۔''بس زبیر بھائی، زرینہ کا خیال ایسے رکھنا، جیسے میرا رکھتے ہو۔ سمجھنا کہ یہ یہ نہیں، میں ہوں اور سب لوگوں کو یہ بات بتا دینا۔''
لاری چل پڑی تھی۔زبیر کو بھاگ کر اسی میں سوار ہونا پڑا۔عبدالحق جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھتا رہا۔

❁ ❁ ❁

مسعود صاحب نے افضال صاحب کے لئے وکیل کا بندوبست کر دیا تھا۔وہ ان کے ایک جاننے والے تھے۔

افتخار صاحب تھانے جا کر افضال صاحب سے ملے۔پھر انہوں نے تھانے دار سے بھی بات کی اور ایف آئی آر بھی دیکھی۔وہاں سے وہ سیدھے مسعود صاحب کے پاس کیمپ چلے آئے۔

''آپ کا کیا خیال ہے افتخار صاحب؟''مسعود صاحب نے ان سے پوچھا۔

''ایک بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔افضال صاحب کو سزا نہیں ہو سکتی لیکن ان کی ضمانت بھی نہیں ہو سکتی۔''

''وہ کیوں؟''

''جس بنیاد پر سزا نہیں ہو سکتی، وہی ان کی ضمانت کی راہ میں مانع ہے۔اور وہ ہے ان کا پاگل پن۔''

''ذرا وضاحت تو کریں۔''

''دیکھیں نا، مقتول کا نام ایک بار بھی ان کی زبان پر نہیں آیا۔مقتول کی جگہ وہ اپنا نام لیتے ہیں، اور اپنا نام لیتے ہوئے ان کے لہجے میں شدید نفرت ہوتی ہے۔وہ کہتے ہیں، ہاں میں نے افضال کو قتل کیا۔وہ تھا ہی اسی قابل۔اگر مجھے سو بار موقع ملے اور وہ سو بار زندہ ہو جائے تو میں سو بار اسے قتل کروں گا۔''

''جی ہاں، یہ تو میں نے بھی دیکھا تھا۔مگر بات سمجھ میں نہیں آتی۔''مسعود صاحب نے سوچ میں ڈوبی آواز میں کہا۔

''یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں۔یہ کوئی نفسیاتی مرض بھی ہو سکتا ہے۔اور ہم اسی بنیاد پر کیس لڑیں گے۔دماغی خلل ثابت ہو گیا تو عدالت انہیں سزا ہرگز نہیں دے گی۔''

''مگر ان کی ضمانت کیوں نہیں ہو سکتی۔''

''بہ ظاہر ان کی ذہنی کیفیت ایسی ہے کہ کوئی انہیں افضال کہہ کر پکارے تو وہ اسے قتل کر دیں۔وہ اپنے لئے یہ نام سن کر بپھر جاتے ہیں، متشدد ہو جاتے ہیں تو اس اعتبار سے وہ خطرناک پاگل ہوئے۔اس کے علاوہ وہ نارمل لگتے ہیں۔لیکن ان سے ان کا نام پوچھا جائے تو گم صم ہو جاتے ہیں، بے بسی سے کہتے ہیں مجھے یاد نہیں۔اسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں کہ یہ نفسیاتی مرض ہے یا

کسی نوع کا پاگل پن۔یا پھر......''افتخار صاحب کہتے کہتے رک گئے۔

''یا پھر؟''مسعود صاحب نے انہیں بغور دیکھا۔

''یا پھر وہ بن رہے ہیں......خود کو سزا سے بچانے کے لئے۔''

''نہیں......وہ ایسے آدمی نہیں ہیں۔''مسعود صاحب تڑپ گئے۔''وہ خاندانی آدمی ہیں۔نعمتوں میں زندگی گزری ہے ان کی۔اپنے علاقے میں حکم چلتا تھا ان کا۔میں نے ہمیشہ انہیں دو ٹوک بات کرتے دیکھا ہے۔پھر دکھوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ان پر۔وہ پاگل تو ہو سکتے ہیں، مگر مکار نہیں ہو سکتے۔''

''معاف کیجئے گا مسعود صاحب، آپ انسان کو سمجھنے کا دعوا نہیں کر سکتے۔کوئی بھی آدمی بہ وقتِ ضرورت کوئی روپ بھی دھار سکتا ہے۔اور وہ روپ اور اُس کی آگہی پہلے سے اُس کے اندر موجود ہوتی ہے۔''

''اس کیمپ میں مَیں نے بھی انسانوں کی بے شمار قسمیں دیکھی ہیں افتخار صاحب۔اور بات یہ ہے کہ آپ کے پیشے کا تقاضا ہے کہ آپ ہر شخص کو شبہے کی نظر سے دیکھیں۔''

''جی ہاں، یہ تو ضروری ہوتا ہے وکیل کے لئے۔''

''تو آپ کہتے ہیں کہ انہیں سزا نہیں ہو سکتی۔سزا نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بری ہو جائیں گے۔تو جب ضمانت نہیں ہو سکتی تو عدالت انہیں رہا کیسے کرے گی؟''

''رہائی کا میں نے کب کہا۔اگر وہ پاگل ثابت ہو گئے تو انہیں سزا نہیں ہو گی۔عدالت انہیں دماغی امراض کے کسی ہسپتال میں بھیجنے کا حکم دے گی' اور وہ وہاں رہیں گے۔''

''اور وہ وہاں کب تک رہیں گے۔''

''ممکن ہے' تمام عمر۔''

''اور اگر وہ ٹھیک ہو گئے......''

''دیکھیے' اسی بنا پر تو میں شک کر رہا تھا۔''افتخار صاحب نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔''کچھ مجرم جو خود کو اس طرح سزا سے بچا لیتے ہیں' سال دو سال پاگل بن کر گزارتے ہیں' بتدریج پاگل پن کم کرتے جاتے ہیں۔یہاں تک کہ ڈاکٹرز انہیں سرٹیفکیٹ دے دیتا ہے کہ اب وہ نارمل ہیں۔پھر انہیں رہائی مل جاتی ہے۔''

''اس جرم کی سزا نہیں ملتی ہے۔''

''کسی سے پاگل پن کی حالت میں جو جرم سرزد ہو اس کی دنیا کے کسی قانون میں سزا کی گنجائش نہیں۔''افتخار صاحب نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

''اب مجھے اجازت دیجئے۔''

"افضال صاحب کا خیال رکھیے گا۔"
"ان کی طرف سے بےفکر رہیں۔"

❁ ❁ ❁

عبدالحق کا ذہن بری طرح منتشر تھا۔ وہ سکون سے بیٹھ کر سوچنا چاہتا تھا۔ گزشتہ 36 گھنٹوں کے دوران اتنا کچھ ہوا تھا' اور اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ اسے سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

ایسے میں اسے لارنس گارڈن کا خیال آ گیا۔ وہاں تنہائی اور سکون کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

وہ لارنس گارڈن میں داخل ہوا۔ صبح کا وقت تھا۔ پارک میں بہت تھوڑے لوگ تھے۔ وہ ایک سنسان گوشے کی طرف چلا گیا اور وہاں گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

لیکن وہاں بھی ابتدا میں وہ ارتکاز سے محروم ہی رہا۔ وجہ یہ تھی کہ اسے افضال صاحب بری طرح یاد آئے۔ ابھی پرسوں ہی کی تو بات ہے کہ وہ ان کے ساتھ سڑکوں پر پھر رہا تھا...... دنیا' اور طرح طرح کے لوگ دیکھ رہا تھا۔ اور وہ یہاں بھی آتے تھے۔

کچھ دیر وہ انہی سوچوں میں غلطاں رہا۔ پھر بالآخر وہ سوچنے کے قابل ہو گیا۔ ذہن میں بے شمار سوال تھے' جن کے جواب انہیں تلاش کرنے تھے' اور پھر کڑیاں ملانی تھیں۔

پہلا سوال یہ تھا کہ افضال صاحب جیسے آدمی نے جمیل کو اس بے رحمی سے کیوں قتل کیا۔ وہ تو دردمند آدمی تھے۔ کسی کی ذرا سی تکلیف پر بھی تڑپ جانے والے۔

اسی لمحے اسے یاد آیا کہ جمیل کے قتل کی خبر پر زرینہ کا کیا ردعمل تھا۔ اس نے اس فعل پر افضال صاحب کی تحسین کی تھی۔ اس نے بتا دیا تھا کہ جمیل ہی اسے دھوکہ دے کر کوٹھے پر لے گیا تھا اور اسے بیچ ڈالا تھا۔

پھر اسے یاد آیا کہ کوٹھے پر اس نے افضال صاحب سے یہ سوال کیا تھا کہ زرینہ کو اس حال پر پہنچانے والا کون تھا تو وہ جھنجلا گئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ زرینہ نے انہیں نہیں بتایا۔ انہوں نے اسے منع بھی کیا تھا کہ وہ زرینہ سے اس سلسلے میں کچھ نہ پوچھے۔ اور اس نے پوچھا بھی نہیں تھا۔ اس نے تو زرینہ کو جمیل کے قتل کی اطلاع دی تھی' اور بات کھل گئی تھی۔ اور زرینہ کے لہجے میں کیسی نفرت تھی جمیل کے لیے۔

تو یہ تو طے تھا کہ زرینہ نے اس رات کوٹھے پر افضال صاحب کو جمیل کے متعلق بتا دیا تھا۔ اور افضال صاحب نے دانستہ طور پر اسے بے خبر رکھا تھا۔ وہ یقیناً اسی وقت جمیل کو قتل کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ لیکن افضال صاحب جیسا آدمی اور ایسا بے رحمانہ قتل! گو کہ عبدالحق کے خیال میں جمیل اس کا مستحق تھا۔ مگر افضال صاحب......

اس لمحے اسے ایک اور بات یاد آئی۔ اسی باغ کے ایک گوشے میں بیٹھ کر باتوں ہی باتوں میں افضال صاحب نے اسے اپنی ماضی کی کتاب سے چند اوراق پڑھ کر سنائے تھے۔ وہ ایسی باتیں تھیں' جو ان کے ضمیر پر بوجھ تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ بہت برے آدمی رہے ہیں۔ وہ زندہ تھے تو صرف اپنے اعمال کی تلافی کے کسی موقع کی تلاش میں' ورنہ وہ خودکشی کر لیتے۔

تو جمیل کو قتل کر کے اپنی دانست میں انہوں نے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کیا تھا۔ جبکہ جمیل کے بارے میں انھیں اس کے سوا کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس نے زرینہ کو دھوکہ دیا تھا نوکری دلانے کا' اور اسے کوٹھے پر لے جا کر فروخت کر دیا تھا۔ شریف گھر کی ایک لڑکی کو بازار میں بٹھا دیا تھا......

ایسی مظلوم لڑکی کو' جو ہجرت کے دوران اپنے ہر محافظ رشتے سے محروم ہو گئی تھی۔ بس اتنا ہی جانتے تھے وہ جمیل کے بارے میں۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ جمیل اب تک ایسی نجانے کتنی مظلوم لڑکیوں کی زندگی تباہ کر چکا ہے۔ جمیل تو نہایت مکروہ اور قابل نفرت انسان تھا۔ اگر وہ سب کچھ افضال صاحب کو بتا دے تو شاید افضال صاحب کو زیادہ خوشی ہو اور شاید ان کا زیادہ بوجھ کم ہو جائے۔

ایک سوال یہ تھا کہ افضال صاحب یہ کیوں کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے افضال کو مارا ہے۔ ایک تو اس کے ذہن میں یہی بات آتی تھی کہ وہ زرینہ کو رسوائی سے بچانے کے لیے پاگل پن کی اداکاری کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ انہوں نے جمیل کو کیوں قتل کیا۔ وجہ بتائیں گے تو زرینہ کا نام لینا پڑے گا۔ اس لیے انہوں نے پاگل بن جانے ہی میں عافیت سمجھی۔

لیکن نجانے کیوں' عبدالحق کو لگتا تھا کہ افضال صاحب اداکاری نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے انداز میں ذرا بھی تو بناوٹ نہیں تھی۔ انہیں اگر افضال صاحب کہہ کر پکارا جاتا تو وہ مرنے مارنے پر تل جاتے۔ اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے افضال کو مارا ہے' اور ان سے ان کا نام پوچھا جاتا تو وہ کھو سے جاتے۔ گو وہ خود کو بھول چکے تھے۔

اب یہ بات عبدالحق کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ افضال صاحب کی اس ذہنی کیفیت کا جواز موجود ہے۔ اسی پارک میں بیٹھ کر تو انہوں نے اس سے کہا تھا کہ وہ بہت گھٹیا اور برے آدمی ہیں' انہیں خود سے شدید نفرت ہے۔ تلافی کی آرزو نہ ہوتی تو وہ خودکشی کر لیتے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے بارے میں کچھ بتا بھی نہیں سکتے۔ اسے نجانے کیوں اتنا بتا دیا۔ اور انہوں نے کہا تھا...... سب کچھ تو میں تمہیں بھی نہیں بتا سکتا۔

خودکشی خود کو قتل کرنا ہی تو ہے۔ افضال صاحب نے خودکشی کا کہا اور اب وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے افضال کو قتل کر دیا۔ اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے لاشعور میں دبی ہوئی خواہش پوری کر لی۔ کم از کم وہ یہی سمجھتے ہیں۔ اور اگر یہ درست ہے تو وہ دیوانگی حقیقی ہے۔

افضال صاحب نے کہا تھا' کوئی نہیں جانتا کہ کس کی گٹھڑی میں گناہوں کا کتنا بوجھ ہے۔

عبدالحق یہ بات سمجھ سکتا تھا۔ جو بوجھ کسی کے ساتھ شیئر نہ کیے جائیں' وہ نفسیاتی مسائل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ افضال صاحب کے اندر یقیناً کوئی بہت بڑی کہانی چھپی ہوئی ہے۔

اسے زرینہ کا خیال آیا تو اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اللہ نے کیسی آسانی پیدا فرمائی کہ زبیر بھائی کو بھیج دیا اور زرینہ ان کے ساتھ گھر چلی گئی۔ وہ یہاں ہوتی تو نہ جانے کتنی پیچیدگیاں پیدا ہوتیں۔

مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس سے گھر میں کتنی پیچیدگیاں جنم لیں گی!

❁ ❁ ❁

اس روز صبح ہی سے نور بانو کا دل اڑا اڑا سا تھا۔ بار بار اسے عبدالحق کا خیال آ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ زبیر بھائی عبدالحق کے پاس لاہور گئے ہوئے تھے۔ اور اماں نے زبیر بھائی سے تاکید کی تھی کہ ان کی طرف سے عبدالحق کو خود واپسی کا حکم دیں۔

اب زبیر بھائی کو گئے تیسرا دن تھا۔ نجانے کیوں اس کے دل کو یقین تھا کہ آج وہ واپس آئیں گے۔ اور کون جانے' ان کے ساتھ عبدالحق بھی ہوں۔ وعدہ پورا کرنے کا عبدالحق کا مزاج اپنی جگہ' لیکن وہ اماں کا فرماں بردار بھی تو تھا۔

یہ تاویلیں اپنی جگہ' مگر در حقیقت یہ اس کے اندر کی خواہش تھی کہ وہ واپس آ جائے۔

دوپہر کو اس نے کھانا پکایا اور اماں کے ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ لیکن کھانا کیا تھا' وہ بس ٹونگتی رہی۔ جب اندر ہیجان مچل رہا ہو تو کھانا کس سے کھایا جاتا ہے۔ اماں کے پاس تو وہ اس لیے آتی تھی کہ وہ عبدالحق کی باتیں ضرور کرتی تھیں۔ اور یہ اسے اچھا لگتا تھا۔

''زبیر ابھی تک واپس نہیں آیا۔'' کھانے کے دوران حمیدہ نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

''آج شاید آ جائیں۔ پرسوں ہی تو گئے ہیں۔''

''دیکھو کیا ہوتا ہے۔ عبدالحق بھی آتا ہے یا نہیں۔''

اس روز حمیدہ زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد نور بانو وہاں سے اٹھ آئی۔

کچھ دیر کے لیے وہ مینو کے شیڈ میں چلی گئی۔ وہاں اس کی بکریاں بھی تھیں۔ جب سے زبیر بھائی نے سامنے چھوٹے سے قطعہ زمین میں ترکاریاں کاشت کی تھیں' مینو اور بکریوں کا کھلنا موقوف ہو گیا تھا۔ انہیں کچھ دیر کے لیے باہر نکالا جاتا۔ لیکن بالکل کھلا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ ان کی رسّی کسی نہ کسی کے ہاتھ میں ہوتی۔ حالانکہ قطعے کے چاروں طرف زبیر بھائی نے کانٹوں کی باڑھ بھی لگا دی تھی۔ لیکن بکریاں اسے بھی پھلانگ جاتی تھیں۔ البتہ مینو کی بات اور تھی۔ وہ تو بس نور بانو کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ اور وہ ہاتھ سے کھانے کا عادی ہونے کی وجہ سے سیر چشم بھی تھا۔ ہر جگہ منہ

مارنے کا قائل نہیں تھا۔

اس نے اپنی بکریوں کے آگے چارہ ڈالا پھر مینو کی طرف چلی گئی۔ اسے ہتھیلی پر رکھ کر چارہ کھلاتے ہوئے وہ اس سے باتیں کرتی رہی۔ ''ایک بات بتاؤ مینو' وہ آ جائیں گے تو تم مجھے چھوڑ دو گے؟''

مینو نے کھاتے کھاتے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ لیکن خاموش رہا۔ جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

''مصلحت سے کام لے رہے ہو۔ اس لیے جواب نہیں دے رہے ہو۔ یہی بات ہے نا؟''

مینو سر جھکائے کھاتا رہا۔

''لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ آخر تم ہو تو انہی کے۔'' نور بانو نے کہا۔ پھر ادھر اُدھر دیکھا کہ کوئی اس کی بات سن تو نہیں رہا ہے۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر اس نے کہا۔ ''اور جو اماں سوچتی ہیں' وہ ہو گیا تو پھر وہ...... میرا مطلب ہے تم میرے بھی ہو جاؤ گے۔'' یہ کہتے کہتے اس کے چہرے پر رنگ سا دوڑ گیا۔ وہ جو کہنا چاہتی تھی' مینو کے سامنے کہتے ہوئے بھی حیا آتی تھی کہ جب وہ میرے ہو جائیں گے تو تم بھی میرے ہو جاؤ گے۔

شام کو وہ ترکاریوں والے قطعے میں چلی گئی۔ وہاں اس نے کچھ دیر وقت گزارا لیکن اس کی نظروں کا مرکز راستہ ہی تھا۔

رات ہوئی تو اسے صبر آ گیا۔ اب آج کچھ نہیں ہونے والا۔ رات کو نیند نہیں آئی تو وہ قرآن پڑھنے بیٹھ گئی۔ درمیان میں اسے احساس ہوا کہ گھر میں ہل چل سی مچی ہے۔

پھر دروازے سے رابعہ نے جھانکا اور بولی۔ ''منجھلی بی بی' اماں آپ کو بلا رہی ہیں۔''

❁ ❁ ❁

زبیر زرینہ کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تو رابعہ حیران رہ گئی۔ ''یہ کون ہے؟''

''آتے ہی سوال جواب شروع کر دیے۔'' زبیر کچھ جھنجلا گیا۔ دن بھر کے سفر کی تھکن اور گھر میں گھستے ہی یہ استقبال۔ یہ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔

''اماں سو تو نہیں گئیں؟''

''تسبیح پڑھ رہی ہوں گی۔'' رابعہ نے کھسیا کر کہا۔ اسے غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ ''آؤ بی بی!'' اس نے زرینہ کا ہاتھ تھام لیا۔

حمیدہ اپنے بستر پر دراز تسبیح پڑھ رہی تھی۔ زبیر کو دیکھا تو جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ اس کی نظریں زبیر کے عقب میں دیکھ رہی تھیں۔ مگر وہاں اسے رابعہ کے ساتھ چادر میں خوب اچھی طرح لپٹی ایک لڑکی نظر آئی۔ ''آؤ...... آ جاؤ۔'' اس نے پکارا۔

وہ تینوں اندر چلے گئے اور حمیدہ کے سامنے تخت پر بیٹھ گئے۔ زبیر اور زرینہ نے سلام کیا

حمیدہ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”عبدالحق کا کیا حال ہے؟“

”صاحب بالکل ٹھیک ہیں اماں۔“

”وہ آیا کیوں نہیں۔“

”جب تک ان کا کام نہیں ہوگا‘ وہ نہیں آئیں گے اماں۔“

”ضدی کہیں کا۔“ حمیدہ نے بڑے لاڈ سے کہا۔ ”اور یہ لڑکی کون ہے۔“

”صاحب نے کہا ہے کہ ان کا ایسے خیال رکھنا‘ جیسے میں ہوں۔“ زبیر نے کہا اور عبدالحق کی بات لفظ بہ لفظ دہرا دی۔

حمیدہ نے زرینہ کو بہت غور سے دیکھا۔ چادر میں لپٹی ہوئی لڑکی کا چہرہ پوری طرح کھلا ہوا نہیں تھا۔ مگر اس کے باوجود حمیدہ کو اس کی خوب صورتی کا احساس ہو گیا۔ ”ماشاء اللہ“۔ اس نے کہا۔ ”لگتا ہے کہ ہمارے گھر میں چاند اتر آیا ہے۔“ پھر وہ رابعہ کی طرف مڑی۔ ”زبیر تھکا ہوا بھی ہوگا اور بھوکا بھی۔ جاؤ اسے کھانا کھلاؤ۔ اور سنو نور بانو کو بھیج دینا۔“

وہ لوگ کمرے سے گئے تو حمیدہ نے زرینہ سے کہا۔ ”چادر اتار دو اور یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو اطمینان سے۔“

زرینہ بری طرح خوف زدہ تھی۔ اسے اپنا پچھلا تجربہ یاد آ رہا تھا۔ وہاں بھی پہلے دن ایسے ہی آؤ بھگت ہوئی تھی‘ اور اسے نگاہوں ہی نگاہوں میں تولا گیا تھا۔ اس نے چادر تو نہیں اتاری‘ لیکن حمیدہ کے پاس جا بیٹھی۔

حمیدہ چند لمحے تو اسے بڑے غور سے دیکھتی رہی‘ پھر اسے خود سے لپٹا لیا۔

زرینہ نے الگ ہونے کے بعد حیرت اور خوف کے ملے جلے اثرات سے حمیدہ کو دیکھا۔ مگر اس چہرے پر محبت ہی محبت تھی۔ وہ قدرے پُرسکون ہو گئی۔ حمیدہ نے اس کی حیرت بھانپتے ہوئے کہا۔ ”حیران کیوں ہو۔ میرے بیٹے نے کہلوایا ہے کہ تم عبدالحق ہو۔ تو وہ آتا تو میں ایسے ہی اسے لپٹاتی نا۔ تو اب تم اس کی جگہ آئی ہو.....“

اسی لمحے نور بانو کمرے میں آئی اور زرینہ کو دیکھ کر ہکا بکا ہو گئی۔ اتنی خوبصورت لڑکی! اس کا دل غیر معمولی رفتار سے دھڑکا۔ ”جی اماں۔“

”دھی میری‘ اس بچی کے لیے کھانا لاؤ۔“ حمیدہ نے نور بانو سے کہا۔

نور بانو الٹے قدموں کمرے میں سے نکل آئی۔ وہ متوحش ہو گئی۔ وہ تو دن بھر عبدالحق کے آنے کی آس میں تھی‘ اور آئی تو یہ لڑکی۔ اسے اس لڑکی کی آمد خالی از علت نہیں لگ رہی تھی۔

اندر حمیدہ نے زرینہ سے پوچھا۔ ”بیٹی نام کیا ہے تیرا۔“

”زرینہ۔“

”اچھا تو جا کر ہاتھ منہ دھو آ‘ کھانا کھا لے پھر بات کریں گے۔“

زرینہ کمرے سے نکل آئی۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس نے جائزہ لیا تھا۔ بہت بڑے صحن کے ایک طرف باورچی خانہ تھا۔ اور اس کے برابر غسل خانہ۔ اسی طرف جاتے ہوئے اس نے دوسری لڑکی کو دیکھا‘ جو باورچی خانے میں کام کر رہی تھی۔

نور بانو نے بھی اسے دیکھا۔ وہ جلدی سے ٹرے پر کھانا رکھ کر باہر آئی اور کمرے کی طرف چل دی۔ لڑکی کی غیر موجودگی میں وہ حمیدہ سے اس کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔

کمرے میں اس نے ٹرے اماں کے سامنے والے تخت پر رکھی اور دھیمی آواز میں بولی۔

”اماں‘ یہ لڑکی کون ہے؟“

”آ یہاں بیٹھ میرے پاس۔“ حمیدہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ ”ابھی تو بس اتنا معلوم ہے کہ اسے عبدالحق نے یہاں بھیجا ہے یہ کہہ کر کہ اس کا ایسے ہی خیال رکھا جائے‘ جیسے اس کا رکھا جاتا ہے۔“

نور بانو کا تو دل جیسے بیٹھ گیا۔ ایک تو لڑکی کا حسن‘ اس پر اماں کا تپاک۔ اس نے اسے اماں سے لپٹے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ”پر اماں‘ یہ ہے کون؟“

”اب وہ تھکی ہوئی آئی ہے۔ اتنی دور سے۔ کھانا کھا کر کچھ دم لے تو پوچھیں گے اس سے۔ تُو بیٹھی رہ۔ نیند تو نہیں آ رہی ہے تجھے؟“

نور بانو کہنا چاہتی تھی کہ نیند تو اب اُڑ گئی ہے۔ اسے ان پر..... ان کی تو تا چشمی پر شدت سے غصہ آ رہا تھا۔ وہ اجنبی لڑکی...... کیسے اس کی تھکن کی فکر ہو رہی ہے۔

”زرینہ نام ہے اس کا۔ ہے کتنی خوبصورت۔ لگتا ہے چاند اتر آیا ہے گھر میں۔“ حمیدہ نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

نور بانو کے وجود میں غصے کی تند لہر اٹھی۔ چاند اتر آیا ہے گھر میں‘ تو اب اسے بہو بھی بنا لیں اس نے جل کر سوچا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے نکل جائے لیکن لڑکی کے بارے میں جاننے کا تجسس بھی تھا۔ اس لیے بیٹھی رہی۔

”وہ خود اب بھی نہیں آیا۔“ حمیدہ نے افسردگی سے کہا۔

اچھا ہی ہوا۔ نور بانو کو اپنی سوچوں پر اختیار نہیں رہا تھا۔ اندر آگ سی دہک اٹھی تھی‘ اس نے سوچا‘ اچھا ہی ہوا‘ وہ نہیں آئے۔ ورنہ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہو جاتا۔ لیکن منہ سے اس نے کچھ نہیں کہا۔

زرینہ ہاتھ منہ دھو کر آئی تو اور نکھر گئی تھی۔ کچھ یہ بھی تھا کہ اس کا خوف بھی دور ہو گیا تھا۔ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ محبت کرنے والے محفوظ ہاتھوں میں ہے۔

"چل...... پہلے تو بیٹھ کر کھانا کھالے۔ پھر بات کریں گے۔"

"آپ لوگ کھانا نہیں کھائیں گے؟" زرینہ نے کہا اور خاص طور سے نور بانو کی طرف دیکھا۔

نور بانو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حمیدہ نے کہا۔ "ہمیں تو دیر ہوگئی کھانا کھائے۔"

زرینہ چند لمحے جھجکی لیکن بھوک بہت تھی۔ کھانا کھانے لگی۔

کھانا کھانے کے بعد نور بانو برتن سمیٹ کر لے گئی۔ واپس آئی تو دیکھا کہ نئی لڑکی حمیدہ کے پاس لحاف میں پاؤں ڈالے بیٹھی ہے۔ اسے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ اس نے سوچا' اماں نے اس کے آتے ہی کتنی آسانی سے اسے میری جگہ دے دی ہے۔

"آ دھیئے تُو بھی آجا لحاف میں۔" حمیدہ نے بڑی محبت سے اس سے کہا۔

"میں یہیں ٹھیک ہوں اماں۔" اس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ اور تخت پر بیٹھ گئی۔

"اس کا نام زرینہ ہے...... ہے نا پیارا نام۔" حمیدہ نے کہا۔ پھر وہ زرینہ کی طرف مڑی۔

"ہاں دھیے...... اب اپنے بارے میں بتا۔ تُو عبدالحق کو کہاں ملی؟"

"جی...... وہ میں انہیں کیمپ میں ملی تھی...... وہ لاہور میں کیمپ ہے نا مہاجروں کا...... وہاں۔"

حمیدہ کو معلوم تھا کہ عبدالحق کس کیمپ میں رہ رہا ہے۔ "تیرے ماں باپ' بہن بھائی؟"

زرینہ کا دل ایک دم بھر آیا۔ "سب تھے اماں۔ بھرا گھر تھا ہمارا۔ مگر پاکستان آتے ہوئے گاڑی پر حملہ ہوا۔ سب میری آنکھوں کے سامنے ختم ہوگئے کوئی بھی نہیں بچا...... سوائے مجھ بدنصیب کے۔" وہ رونے لگی۔

"نا دھیئے ایسے نہیں کہتے۔" حمیدہ نے شفقت سے اسے سمجھایا۔ "اللہ تیرے نصیب اچھے کرے۔ موت تو اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ اور پتا ہے' شہید کا رتبہ کتنا بڑا ہوتا ہے۔ ان کا غم نہیں کرتے۔ ادھر نور بانو کو دیکھ۔ یہ میری بچی تو اپنے سب لوگوں کو اپنے گھر میں ہی کھو کر آئی ہے۔ مگر پھر اللہ نے اسے کتنے لوگ دے دیے۔ اب یہ گھر اس کا ہے۔ ایسے ہی اب تم بھی اکیلی نہیں ہو۔"

نور بانو کے دل کا غبار کسی حد تک دھل گیا۔ اماں نے اس گھر کو اس کا قرار دیا تھا اور زرینہ کو دلاسہ دے رہی تھیں۔

"یہاں اپنے گھر کی طرح رہ دھیے۔" حمیدہ زرینہ سے کہہ رہی تھی۔ "یہ نور بانو اور رابعہ تیری بہنیں ہیں' زبیر تیرا بڑا بھائی ہے...... باپ کی جگہ اور مجھے تو تُو اپنی ماں ہی سمجھ۔ اللہ نے مجھے بیٹی نہیں دی تھی۔ پھر یہ نور بانو ملی تو مجھے لگا کہ میری کمی پوری ہوگئی۔ اور اب تُو بھی میری بیٹی ہے۔"

حمیدہ کے لہجے میں ایسی محبت اور خلوص تھا کہ زرینہ پھر رونے لگی۔ حمیدہ نے اس کے آنسو

پونچھ دیے۔ "سفر میں تھکن ہوگئی ہوگی۔ چل اب جا کر سو جا۔" حمیدہ نے کہا۔ پھر نور بانو کی طرف دیکھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ نور بانو نجانے کیوں بجھی سی گئی ہے اور چپ چپ ہے۔ "ایسا کر نور بانو کہ جب تک عبدالحق واپس نہیں آتا' اس کا کمرہ زرینہ کو دے دے۔" حمیدہ نے کہا۔

نور بانو کیسے گوارا کر سکتی تھی۔ "اس کی ضرورت نہیں اماں۔ میرے کمرے میں ایک اور پلنگ ہے نا۔ ہم دونوں ساتھ ہی رہیں گی۔"

"یہ اور بھی اچھا ہے۔ اسے تنہائی کا احساس بھی نہیں ہوگا۔" حمیدہ نے کہا۔ پھر جلدی سے وضاحت کی۔ "میں نے تو عبدالحق کے کمرے کا اس لیے کہا تھا کہ تجھے کوئی تکلیف نہ ہو۔"

تکلیف تو ان کے کمرے میں اس کے رہنے پر تھی۔ نور بانو نے دل میں سوچا۔ پھر وہ زبردستی مسکرائی۔ "تکلیف کیسی اماں۔ تنہائی تو مجھے بھی اچھی نہیں لگتی۔ پھر میرے اور زرینہ کے دکھ بھی ایک جیسے ہیں۔" اور شاید طلب بھی ایک ہی ہے۔ اس کے دل نے ٹکڑا لگایا۔ "پھر ہم دونوں بہنیں ہی ہوئیں نا بس ہم ساتھ ہی رہیں گی۔"

"جاؤ پھر' آرام کرو۔"

اپنے کمرے میں آ کر نور بانو نے زرینہ کو اپنے بستر پر بٹھایا اور خود دوسرے پلنگ پر اس کے لیے بستر بچھانے لگی۔ "لو اب آرام سے لیٹ جاؤ۔" زرینہ بستر پر دراز ہوگئی۔ نور بانو بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ لڑکی تو باجی سے بھی خوبصورت ہے۔ اس نے سوچا۔

چند لمحے خاموش رہی۔ پھر نور بانو نے پوچھا۔ "وہ کیسے ہیں؟"

"کون؟" زرینہ کسی سوچ سے چونکی۔

نور بانو کو بہت غصہ آیا۔ ارے...... وہ اس سے کس کے بارے میں پوچھے گی۔ کیا اس کے رشتہ دار موجود ہیں اس کیمپ میں۔ "میں عبدالحق صاحب کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔" یہ کہہ کر اسے حیرت ہوئی' کیونکہ اس نے کبھی عبدالحق کا نام نہیں لیا تھا۔

زرینہ گڑبڑا گئی۔ "جی...... وہ بالکل ٹھیک ہیں۔"

"کیمپ میں ان سے کیسے جان پہچان ہوئی تمہاری؟"

"جی میں...... میں تو انہیں نہیں جانتی۔ افضال چچا کے ساتھ تھے وہ۔"

"افضال چچا کون؟"

"وہ بہت اچھے ہیں۔ ان کے گھر میں بھی کوئی نہیں بچا۔ اکیلے ہیں وہ۔ سب کا خیال رکھتے ہیں۔"

"عبدالحق صاحب کیسے لگے تمہیں؟"

"میں انہیں کہاں جانتی ہوں۔ میں تو یہاں آتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی۔ یہ تو آپ لوگوں کو

دیکھ کر ڈر دور ہوا ہے میرا۔"

"حیرت ہے' ان سے بھی کوئی ڈر سکتا ہے۔" نور بانو نے سخت معترضانہ لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا نا کہ میں انہیں ٹھیک سے جانتی نہیں ہوں۔"

"بھئی کیمپ میں انہیں دیکھتی تو رہی ہو گی نا؟"

"نہیں...... ابھی دو دن پہلے ہی تو میں نے پہلی بار دیکھا تھا انہیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔ ایک ہی کیمپ میں رہتے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے تو رہے ہوں گے۔ دور سے دیکھ کر بھی آدمی سمجھ جاتا ہے۔"

عبدالحق نے زرینہ سے کہا تھا کہ گھر میں کسی کو اپنے بارے میں کچھ نہ بتانا۔ اس وقت یہ کام اسے بہت آسان لگا تھا۔ مگر اب اس لڑکی کے سامنے جو ایسے جرح کر رہی تھی' جیسے کوئی وکیل ہو' تو زرینہ کو اندازہ ہوا کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ اب ایک بچی بات تو اس کی زبان سے پھسل گئی تھی کہ اس نے عبدالحق کو دو دن پہلے ہی پہلی بار دیکھا تھا۔ اور اب اس کی سمجھ میں یہ بات بھی آ گئی تھی کہ جو کچھ اس پر گزری ہے' وہ کسی کو نہیں بتا سکتی۔ عبدالحق منع نہ بھی کرتا تو بھی وہ اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتاتی۔

"اور وہ تو ایسے ہیں کہ ماشاء اللہ ہزاروں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم نے دو دن پہلے انہیں دیکھا۔"

"اب میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ وہ کیمپ تو ایک پورا شہر ہے۔"

"کتنے لوگ ہوں گے اس کیمپ میں۔"

"ہزاروں لوگ ہوں گے۔"

"اور تم جیسی لڑکیاں کتنی ہوں گی؟"

"سینکڑوں؟"

نور بانو ٹھوڑی کو ہاتھوں کے پیالے میں رکھ کر کچھ دیر سوچتی رہی' پھر بولی۔ "اتنی لڑکیوں میں انھوں نے تمہیں ہی کیوں منتخب کیا۔ جبکہ صرف دو دن پہلے ہی دیکھا تھا تمہیں؟"

زرینہ پریشان ہو گئی۔ سوالوں کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہونے والا لگتا تھا۔ اب وہ دو دن کی بات منہ سے نکال کر پھنس گئی تھی۔ باتیں بنانے کے لیے وقت بہت مختصر رہ گیا تھا۔ ادھر عبدالحق نے بڑے یقین سے اسے اپنے گھر بھیجا تھا کہ وہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ زبیر کے ساتھ تو وہ یہاں تک آئی تھی۔ اماں کا رویہ اس نے دیکھ لیا تھا۔ مگر یہ لڑکی مختلف تھی۔ یہ تو پولیس والوں کی طرح تفتیش کر رہی تھی۔ "بات یہ ہے کہ وہاں میری عزت خطرے میں تھی۔" اس نے کہا۔

"تو کیمپ میں تحفظ کا بندوبست ہو گا۔"

اس بار زرینہ جھنجلا گئی۔ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "کیمپ دیکھا بھی ہے آپ نے۔ اللہ نہ دکھائے آپ کو۔ وہاں لاوارث رہتے ہیں' جن کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ وہاں آپ تحفظ کی بات کرتی ہیں۔ وہ گھر نہیں ہے میری بہن اور لاوارث لوگ تو اپنے گھر میں بھی محفوظ نہیں ہوتے۔"

چند لمحوں کے لیے نور بانو تھرا گئی۔ اللہ نے اس پر کرم کیا تھا' ورنہ وہ خدا جانے کہاں ہوتی۔ لیکن پھر غور کرنے پر زرینہ کا جواب اسے تسلی بخش نہیں لگا۔ "میں تو کہہ رہی ہوں کہ تمہارے تحفظ کا بندوبست وہاں بھی تو کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے یہاں کیوں بھیجا تمہیں؟"

"کیا یہ مناسب نہیں ہو گا کہ یہ بات آپ ان سے پوچھیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی زرینہ کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "اور یہ بھی سن لیں کہ میں نے ان سے تحفظ نہیں مانگا تھا۔ انہوں نے خود پیش کش کی تھی بلکہ اصرار کیا تھا۔"

اس سخت جواب سے نور بانو کو شاک لگا۔ اسے یہ احساس بھی ہوا کہ وہ اس لڑکی سے ایسے بات نہیں کر رہی تھی' جیسے دو اجنبی' جنہیں ساتھ وقت گزارنا ہو' ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کے لیے کرتے ہیں۔ اس کا انداز تفتیشی تھا۔ اگر وہ اس لڑکی کی جگہ ہوتی تو اسے بھی برا لگتا۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ اگر یہ لڑکی اس کی جگہ ہوتی تو شاید یہ بھی اس کی اسی طرح تفتیش کرتی۔

چند لمحے بعد زرینہ نے بہت شکستہ لہجے میں پوچھا۔ "کیا میں آپ کو بوجھ لگ رہی ہوں؟ میرا آنا برا لگا ہے آپ کو؟"

"ارے نہیں...... ہرگز نہیں۔" نور بانو نے بڑی سچائی سے اس کے پہلے سوال کا جواب دیا۔ دوسرے سوال کا جواب البتہ اثبات میں تھا...... اسے وہ پی گئی۔ "معاف کرنا' شاید میرا لہجہ تمہیں برا لگا ہو۔ دراصل نیند کی وجہ سے میں چڑچڑی ہو جاتی ہوں۔ تم بھی تھکی ہوئی ہو۔ سو جاؤ صبح بات کریں گے۔"

زرینہ نے سکون کی سانس لی اور لحاف میں منہ چھپا لیا لیکن تھکن کے باوجود اس کی نیند اُڑ گئی تھی۔ اگر اسے یہاں رہنا ہے تو اس لڑکی کا سامنا ہر روز کرنا ہو گا۔ اور یہ آسان نہیں۔ وہ سوچ رہی تھی۔

اس گفتگو پر غور کرتے ہوئے ایک بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ یہ لڑکی عبدالحق سے محبت کرتی ہے' اور یہ اس کے اور عبدالحق کے بارے میں غلط نظریے سے سوچ رہی ہے۔ اسے اپنی بے پروائی پر افسوس ہونے لگا۔ اسے خیال ہی نہیں آیا کہ عبدالحق کا تذکرہ کرتے وقت اسے بھائی کہنا چاہیے۔ اور یہ نور بانو کتنی عقل مند ہے۔ اس نے تو انہیں عبدالحق صاحب کہہ کر اپنا تعلق واضح کر دیا تھا۔

خیر...... جو ہوا' اچھا ہوا۔ آئندہ کے لیے بات سمجھ میں آ گئی۔ اب وہ عبدالحق کو بھائی ہی کہے

گی۔اور یہ سچ بھی ہے۔عبدالحق نے اسے بہن ہی کہا تھا۔اور وہ سچا آدمی ہے۔سچا اور اچھا نہ ہوتا تو بازار میں بیٹھی ہوئی لڑکی کو بہن کیوں بناتا۔اس کی عزت بچانے کے لیے اسے گاؤں کیوں بھیجتا۔اسے ڈر تھا کہ جمیل کے قتل کے معاملے میں اس کا نام نہ آجائے۔جبھی تو اس نے زبیر بھائی کے ساتھ اسے گاؤں بھیجا۔ورنہ وہ خود اسے لے کر یہاں آتا۔ایک بات اور اس کی سمجھ میں آگئی۔ یہ لڑکی بھائی سے یک طرفہ محبت کرتی ہے۔جبھی تو ایسی بے یقینی کا شکار ہے۔

ادھر نور بانو کی نیند بھی اُڑ گئی تھی۔وہ بھی زرینہ اور عبدالحق کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کا لہجہ بے شک خراب تھا' لفظ بھی بے شک بھونڈے تھے۔لیکن اس کی کہی ہوئی ہر بات سچی تھی۔کیمپ میں سینکڑوں لڑکیاں تھیں۔کیمپ میں ان میں سے بیشتر کی عزت کو خطرہ لاحق ہوگا۔مگر اس مسئلے کا حل وہیں تو تلاش کیا جائے گا۔ان سب کو یہاں تو نہیں بھیجا جائے گا۔سیدھی سی بات بھی ہو سکتی ہے کہ عبدالحق کو بے حد حسین لڑکی بھا گئی ہو اسے اس نے اپنے لیے منتخب کر لیا ہو۔تبھی تو اسے یہاں بھیجا ہے۔

ایک اور بات یہ تھی کہ اسے یقین تھا کہ اس لڑکی نے کئی جھوٹ بولے ہیں۔اور وہ عادی جھوٹی بھی نہیں ہے۔ورنہ جھوٹ بولتے ہوئے نہ ایسے گڑبڑاتی' نہ پکڑی جاتی۔یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک کیمپ میں رہتے ہوئے عبدالحق اور اس لڑکی کی ملاقات صرف دو دن پہلے ہوئی ہو' اور یہ لڑکی اس سے پہلے عبدالحق کو جانتی ہی نہ ہو۔ارے اس کیمپ میں تو عبدالحق ایسا نمایاں نظر آتا ہوگا' جیسے آسمان پر ستاروں کے درمیان چاند......

اس رات نور بانو نے دو خواب دیکھے۔ایک خواب میں تو اس نے عبدالحق کی شادی زرینہ سے ہوتے ہوئے دیکھی۔اور دوسرے خواب میں دیکھا کہ چچا اسے اپنے ساتھ لے جانے آئے ہیں۔دونوں بار اس کی آنکھ کھلی تو سردی کے باوجود پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

❁ ❁ ❁

پولیس نے افضال صاحب کو عدالت میں پیش کر دیا تھا اور عدالت نے انہیں پانچ دن کے ریمانڈ پر پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔عبدالحق مسعود صاحب کے دفتر میں ان کے وکیل افتخار صاحب سے ملا تھا اور ان سے اس کیس کے بارے میں بات کی تھی۔

''میری رائے میں عدالت زیادہ سے زیادہ تین پیشیوں میں اس کیس کا فیصلہ کر دے گی۔'' افتخار صاحب نے کہا۔''وہ جس حال میں ہیں' انہیں سزا دی ہی نہیں جا سکتی۔انہیں دماغی امراض کے کسی اسپتال میں بھیج دیا جائے گا۔''

یہ سن کر عبدالحق کو کچھ اطمینان ہوا۔

افتخار صاحب کے جانے کے بعد مسعود صاحب دیر تک کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔

پھر بولے۔''میں ایسا سوچنا تو نہیں چاہتا لیکن مجھے لگتا ہے کہ افضال صاحب پاگل بن رہے ہیں۔''

''نہیں جناب' یہ ممکن نہیں ہے۔'' عبدالحق نے جلدی سے کہا۔''ان کے ساتھ نفسیاتی مسائل تو پہلے سے تھے۔مگر اب تو ان کی یادداشت ہی ختم ہو گئی ہے' دیکھیں نا' وہ آپ کو اور مجھے بھی نہیں پہچانتے۔''

''ان کے نفسیاتی مسائل اپنی جگہ۔لیکن یادداشت ایسی چیز نہیں کہ یونہی بیٹھے بٹھائے زائل ہو جائے۔کسی بہت بڑے سانحے کے بغیر یہ ممکن نہیں۔''

''تو کیا پتا' ایسا کوئی واقعہ......کوئی سانحہ انہیں پیش آیا ہو۔'' عبدالحق نے دھیرے سے کہا۔

مسعود صاحب نے ایک دم موضوع بدل دیا۔''جس دن جمیل کا قتل ہوا' مجھے یقین ہے کہ اس رات افضال صاحب کیمپ واپس نہیں آئے تھے' اور نہ ہی وہ اس صبح کیمپ سے گئے تھے۔''

''یہ آپ کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں؟'' عبدالحق بری طرح چونکا۔

''وہ صبح کیمپ سے نکلنے سے پہلے میرے پاس آتے تھے۔'' مسعود صاحب نے کہا۔''میں نے بڑی مشکل سے ان سے یہ وعدہ لیا تھا۔اور وعدہ کرنے کے بعد سے اس صبح کو چھوڑ کر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ مجھ سے ملے بغیر کیمپ سے باہر گئے ہوں۔''

یہ بات عبدالحق کو بھی معلوم تھی۔خود افضال صاحب نے بھی اسے بتائی تھی۔

''اور جس رات تم اپنی بہن کو لے کر میرے گھر آئے تھے' وہ اسی رات کی صبح تھی۔یعنی وہ اس رات کیمپ میں نہیں تھے' اور یہ غیر معمولی بات ہے۔افضال صاحب کبھی کیمپ سے دور نہیں رہے...... کم از کم رات میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔اب تم بتاؤ برخوردار کہ اس رات وہ کہاں تھے۔''

''یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔'' عبدالحق گڑبڑا گیا۔

''کیونکہ وہ تمہارے ساتھ تھے۔اگلی صبح تمہارا ملازم۔کیا نام ہے اس کا...... ہاں زبیر وہ کیمپ آیا تو تم موجود نہیں تھے۔اسی لیے تو وہ میرے پاس چلا آیا تھا۔''

یہ ایسا ثبوت تھا' جو ناقابلِ تردید تھا۔عبدالحق نے گہری سانس لی۔اسے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ مسعود صاحب نے اسے اسی روز کیوں نہیں پکڑا۔اس سے رہا نہیں گیا' اس نے یہ بات مسعود صاحب سے پوچھ لی۔

''تم پر بہت بھروسہ کرتا ہوں۔تم جھوٹ بولنے والے نہیں ہو۔اگر جھوٹ بولا تو کوئی بہت بڑی بات ہوگی۔اب جبکہ تمہاری الجھن دور ہو چکی ہے تو مجھے سب کچھ بتا دو۔ویسے مجھے یقین ہے کہ زرینہ تمہاری بہن نہیں ہے۔''

عبدالحق نے احترام آمیز نظروں سے انہیں دیکھا۔واقعی' وہ اس کی عزت بھی کرتے تھے

اور اس پر اعتبار بھی اس نے اس دن کی پوری کہانی تفصیل کے ساتھ انہیں سنادی۔

مسعود صاحب بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ اس کی بات مکمل ہونے کے بعد وہ چند
خاموش بیٹھے رہے جیسے ذہن میں سب کچھ ترتیب دے رہے ہوں۔ پھر وہ بولے۔ ''تو یہ وجہ
زرینہ کو فوری طور پر گاؤں بھیجنے کی۔ تمہیں ڈر تھا کہ افضال صاحب زبان کھول دیں گے تو زرینہ
معاملہ کھل جائے گا؟''

''جی ہاں سر میں نے زرینہ کو بہن کہا ہے تو اب اس کی عزت میری عزت ہے۔ میں اس
رسوائی برداشت نہیں کر سکتا اور اس لیے بھی کہ وہ مظلوم ہے۔ اور اس کے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ وہ
رسوائی کی نہیں ایک اچھی زندگی کی مستحق ہے۔''

''ہاں...... تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''اور سر اب میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ اس وقت تو مجھے مدد کی ضرورت تھی۔ میں خ
غرض ہو گیا تھا۔ میں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں میں بہ
شرمندہ ہوں آپ سے۔''

''کس بات پر؟''

''اس بات پر کہ میں بازار سے ایک لڑکی لے کر آیا اور دھوکے سے اسے آپ کے ہاں
مہمان ٹھہرایا۔ آپ کی بچیاں بھی تو میری بہنیں ہیں۔ اگر میں آپ کو سچ بتا دیتا......''

''واقعی یہ تو تم نے بہت بُری حرکت کی۔'' مسعود صاحب نے اس کی بات کاٹ دی ''مگر
معافی سے کیا ہوتا ہے برخوردار۔ بس زبان سے کہہ دیا اور قصہ ختم۔ تلافی کرو تو بات ہے۔''

''آپ حکم کریں میں انشااللہ تلافی کروں گا۔''

''سوچ لو۔''

''وعدہ کر رہا ہوں۔''

''تو اس زیادتی کی تلافی یہ ہوگی کہ تم میری بات مان لو اور لاہور آ کر سول سروس کی تیاری
کرو بولو تیار ہو۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں لیکن......''

''بس باقی معاملات مجھ پر چھوڑ دو۔ میں نے سب سوچ رکھا ہے۔ اس پر بعد میں بات
کریں گے۔'' مسعود صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ ''ویسے یہ
بتا دوں کہ زرینہ کے معاملے میں تم سے مجھے شکایت نہیں بلکہ میں تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے
مجھے تلافی کا موقع دیا۔'' عبدالحق کی نگاہوں میں الجھن دیکھ کر انہوں نے وضاحت کی۔ ''دیکھو
میرے کیمپ میں ہی اس کے ساتھ یہ دھوکہ ہوا۔ اور نجانے کتنی لڑکیوں کے ساتھ ہوا ہوگا۔ تو کیمپ کا

انچارج ہونے کی حیثیت سے اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں کیوں بے خبر رہا۔ میں رات کو اپنے گھر
میں سکون سے سوتا رہا اور یہاں جمیل یہ سیاہ کارنامے انجام دیتا رہا۔'' اتنا کہتے کہتے وہ چونکے۔
''لیکن جمیل اکیلا تو نہیں ہوگا۔''

''جی...... کیمپ میں ایک شخص ہے مجید...... وہ اس کا ساتھی تھا۔''

''اسے فوری طور پر کیمپ سے نکالنا ہوگا بلکہ بلیک لسٹ کرنا ہوگا اسے۔ اور ہاں اب مجھے
یقین ہو گیا کہ افضال صاحب بن رہے ہیں۔ وہ بھی تمہاری طرح زرینہ کو رسوائی سے بچانے کی
کوشش کر رہے ہوں گے۔''

''نہیں سر مجھے یقین ہے کہ یہ بات نہیں ہے۔''

''خیر...... یہ بات تو کھل جائے گی۔ پولیس کی مار کے سامنے تو گونگے بھی بول پڑتے
ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' عبدالحق بری طرح بھڑکا۔ ''کیا تھانے میں ان پر تشدد کیا جائے گا۔''

''تو اور کیا۔ ریمانڈ کا یہی تو مطلب ہوتا ہے برخوردار۔ مگر ہمیں ان کے نیچے کچھ...'' وہ
بات پوری نہیں کر پائے۔ کیونکہ اسی لمحے ان کا ڈرائیور اندر آیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی
تھیں۔

''کیا ہوا...... خیریت تو ہے؟''

''صاحب جی بیگم صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی۔ میں انہیں اسپتال چھوڑ کر آ رہا ہوں۔''

''وہاں ان کے ساتھ کون ہے۔''

''بڑی بی بی ہیں صاحب جی۔''

مسعود صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''میں چلتا ہوں برخوردار تم دعا کرنا ہماری اہلیہ کے لیے۔''

عبدالحق ان کے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے ایک اور اہم کام کرنا ہے۔ وہ
افضال صاحب کی طرف سے پریشان تھا۔

❀......❀......❀

اس بار تھانے دار کا رویہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ اس کی رعونت دیکھ کو عبدالحق حیران رہ گیا۔ وہ
کچھ کہنے ہی والا تھا کہ تھانے دار نے اسے بری طرح جھڑکتے ہوئے کہا۔ ''اوئے یہاں کیا منہ
اٹھائے چلے آ رہے ہو۔ اُدھر جاؤ۔ ہیڈ محرر سے بات کرو۔'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

عبدالحق کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ خاموشی سے اس طرف چلا گیا۔

ہیڈ محرر سر جھکائے رجسٹر میں کچھ اندراج کر رہا تھا۔ عبدالحق نے کہا۔ ''سنیے...''

''ذرا صبر کرو دیکھتے نہیں کام کر رہا ہوں۔''

عبدالحق کو چند منٹ انتظار کرنا پڑا پھر ہیڈ محرر نے سر اٹھایا اور پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔ ”کیا ہے؟“ مگر پھر اس نے عبدالحق کو غور سے دیکھا۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ تگڑی اسامی ہے۔ ”کوئی رپٹ لکھوانی ہے؟“ اس نے نسبتاً نرم لہجے میں پوچھا۔

”نہیں...... مجھے افضال صاحب سے ملنا ہے۔“

”کون افضال صاحب؟ اس تھانے میں تو اس نام کا کوئی افسر نہیں۔“

”وہ افسر نہیں ہیں۔ قتل کے الزام میں حوالات میں ہیں۔“

”تو ملزم کو صاحب بولتے ہو“...... ہیڈ محرر برا مان گیا۔ ”اور وہ بھی قاتل۔ تمہیں کیوں ما ہے اس سے۔ رشتہ دار ہے تمہارا۔“

”یہی سمجھ لیں۔ اور ان کی دماغی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ کسی کو بھی نہیں پہچانتے۔ انہیں اپنا نا بھی نہیں معلوم۔“

”ہیڈ محرر نے سامنے بیٹھے کانسٹیبل سے پوچھا۔ ”وہ بڈھا کہاں ہے...... قتل کے کیس والا؟“

”وہ تو جی تفتیش والے کمرے میں ہے۔“

ہیڈ محرر نے قہقہہ لگایا۔ ”اب اسے سب یاد آ جائے گا۔ سب کو پہچاننے لگے گا۔“

عبدالحق کا دل ڈوبنے لگا۔ ”تفتیش والے کمرے میں کیا ہوتا ہے؟“

”تفتیش کی جاتی ہے۔ سچ اگلوایا جاتا ہے۔“

”مار پیٹ ہوتی ہے؟“

”اوئے بھولے بادشاہ! چھتر ول کے بغیر کوئی سچ بولتا ہے۔“ ہیڈ محرر نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

”یہ تو غلط ہے۔“ عبدالحق تڑپ گیا۔ ”وہ تو ویسے ہی دماغی خلل میں مبتلا ہیں۔“

”تم ان کے رشتہ دار تو نہیں ہو سکتے۔“

”یہ کیسے کہہ رہے ہیں آپ۔“

”میں نے پہلے بھی پوچھی تھی یہ بات۔ تم نے بولا، یہی سمجھ لو۔ اس کا مطلب ہے، رشتہ دار نہیں ہو۔ اور رشتہ دار ہوتے تو ان کی بھلائی کی فکر کرتے۔“

”کس طرح؟“

”اوئے کوئی چائے پانی کا خرچہ دیتے۔ کچھ اس کی فکر کرتے۔ تم نے تو اس کے کھانے کی فکر بھی نہیں کی۔“

”کی تھی۔ بڑے صاحب تھانے دار صاحب کو پیسے دے رہے تھے۔ انہوں نے منع کر دیا۔“

”کون بڑے صاحب؟“ ہیڈ محرر کچھ محتاط نظر آنے لگا۔

”مسعود احمد خان صاحب۔ رفیوجی کیمپ کے انچارج ہیں۔ بڑے افسر ہیں وہ۔“

اچانک تھانے دار اٹھا اور باہر چلا گیا۔ عبدالحق کو لگا کہ وہ مسعود صاحب کا نام سن کر دانستہ ادھر گیا ہے۔

ادھر ہیڈ محرر مزید محتاط ہو گیا۔ لہجے میں بھی کچھ شائستگی آ گئی۔ ”دیکھو جی، ہمیں تفتیش تو کرنی ہے نہیں تو کیس کیسے چلے گا عدالت میں اور پھر معاملہ قتل کا ہے۔“

”مگر وہ تو تقریباً پاگل ہیں۔“ عبدالحق نے احتجاج کیا۔

”ایسے کیسوں میں لوگ پاگل بھی بن جاتے ہیں۔ اب سچ اگلوانے کے لیے چھتر ول نہ کریں تو کیا کریں۔ کسی سے ہاتھ باندھ کر پوچھیں کہ بابا سچ بول، تو سچ پاگل ہے یا بن رہا ہے تو وہ سچ بول دے گا کیا۔“

عبدالحق کو اس کی بات معقول لگی۔ اس سے انکار تو ممکن نہیں تھا۔

اتنے میں ایک تحیم شحیم پولیس والا ہانپتا ہوا اندر سے آیا۔ ”صاحب کہاں ہیں؟“ اس نے ہیڈ محرر سے پوچھا۔

”باہر گئے ہیں۔ کیا بات ہے؟“

”بڈھا بڑا پکا ہے۔ میں نے سارے حربے آزما لیے۔ کچھ نہیں اگلا۔ بولتا ہے، میں نے افضال کو قتل کیا ہے۔ اور سالے کا اپنا نام پوچھو تو بولتا ہے، معلوم نہیں۔“

عبدالحق کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ تو یقیناً افضال صاحب کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ ”اب تو آپ اس سلسلے کو روکیں......“

”آپ کو تھانے کے آداب نہیں آتے باؤ جی۔ یہاں مال ڈھیلا کرو تو سب ہو جاتا ہے۔ تمہارا بندہ دو دن سے بھوکا ہے۔ تمہیں اس کی فکر نہیں۔“

”تھانے دار صاحب نے کہا تھا کہ یہ سرکاری ذمہ داری ہے۔ انہوں نے پیسے لینے سے انکار کر دیا تھا۔“

”آپ بھی بھولے بادشاہ ہو۔ اب ایک بڑا افسر اپنے سے بڑے افسر سے پیسے تو نہیں لے سکتا۔ اور تھانے دار صاحب خود بھی کسی سے کچھ نہیں لیتے۔ یہ کام تو ہم جیسے نیچے کے لوگوں کا ہے۔“

”مگر یہ تو رشوت ہوئی......“

”اوئے ہمیں نہیں پڑھاؤ باؤ صاحب۔ پتا ہے، تنخواہ کتنی کم ہے ہم لوگوں کی۔ گھر کی دال روٹی بھی نہیں چلتی اس میں۔“

عبدالحق کو افضال صاحب کی فکر تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ بحث کا فائدہ نہیں، بلکہ نقصان

ہوگا..... وہ بھی افضال صاحب کو۔"اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ مجھ سے کیا چاہتے ہو تم۔"

"اب مجھے تمہاری حیثیت کا کیا پتا۔"

"میری حیثیت کو چھوڑو۔ اپنی ضرورت کی بات کرو۔"

"پہلے آپ بتاؤ' آپ ہم سے کیا چاہتے ہو۔"

"میں چاہتا ہوں کہ افضال صاحب پر تشدد بالکل نہ ہو' کوئی انہیں ہاتھ بھی نہ لگائے۔ ان کی ہر ضرورت اچھی طرح پوری کی جائے۔"

"آخری بات تو آسان ہے۔" ہیڈ محرر نے پُرخیال لہجے میں کہا۔"پر پہلی دو باتیں مش ہیں۔ اب دیکھو نا' تفتیش تو ہمیں کرنی ہے نا۔"

"تو تفتیش کرو' تشدد کے بغیر۔"

"یہ تو کیس ہی ٹھپ کرانے والی بات ہے باؤ جی۔" اب ہیڈ محرر کا لہجہ بالکل تبدیل ہو تھا۔"اس کام میں بڑا خرچہ ہوگا۔ آپ نہیں کر سکتے۔"

"تم بولو تو۔"

ہیڈ محرر چند لمحے سوچتا رہا' پھر بولا"پانچ نوٹ دے سکو گے۔"

"یہ بہت زیادہ ہیں۔"

"کیس قتل کا ہے باؤ صاحب۔ اور اس میں پورے تھانے کا حصہ ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" عبدالحق نے جیب سے تین سو روپے نکال کر اسے دیے۔"دو سو ر پورا ہونے پر دوں گا۔ شرط یہ ہے کہ افضال صاحب کو کوئی انگلی بھی نہ لگائے۔ اور انہیں تم کھانا اچھا دو۔"

"آپ بے فکر ہو جاؤ صاحب۔" ہیڈ محرر کی باچھیں کھل گئیں۔"سمجھ لو اب وہ ہمارا وی آ پی ہے۔ پر ایک بات ہے باؤ صاحب۔ اس بات کا نہ آپ کے بڑے صاحب کو پتہ چلے اور ہمارے بڑے صاحب کو۔"

"ٹھیک ہے۔ اب مجھ افضال صاحب سے ملا دو۔"

"ابھی یہ مناسب نہیں۔ آپ شام کو آنا باؤ جی۔ ابھی تو اس کا حال اچھا نہیں۔ شام تک اسے سجا سنوار دیں گے تمہارے لیے' پیٹ میں کچھ پڑے گا تو چہرے پر رونق آئے گی۔" عبدالحق کا د کٹنے لگا لیکن وہ افضال صاحب کو ابتر حال میں دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

❀ ❀ ❀
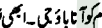
مسعود صاحب شام تک بھی واپس نہیں آئے۔ ان سے رابطے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ عبدالحق ان کی طرف سے بھی پریشان تھا کہ نجانے ان کی اہلیہ اب کس حال میں ہوں۔ ویسے اگر

کو بہتر ہوگئی ہوتیں تو مسعود صاحب کیمپ ضرور آتے۔

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو وہ کیمپ سے نکلا اور تھانے کی طرف چل دیا۔

وہاں تھانے دار صاحب موجود تھے۔ اس بار ان کا انداز مختلف تھا۔ انہوں نے خود ہی اپنی طرف لیا۔"ارے..... تم وہی ہو نا' جو اس دن خان صاحب کے ساتھ آئے تھے؟"

عبدالحق ان کے تجاہل عارفانہ کو سمجھ گیا۔ ابھی دوپہر کو ہی اس نے اسے بری طرح جھڑک دیا تھا' جیسے اسے پہچانتا ہی نہ ہو۔"جی ہاں' میں وہی ہوں۔" اس نے کہا۔"میں دوپہر کو بھی آیا تھا۔ مگر....."

"اوہ تو وہ تم تھے۔ معاف کرنا' میرا ذہن اس وقت الجھا ہوا تھا' تمہیں پہچان نہیں سکا۔" تھانے دار نے کہا۔"آؤ بیٹھو' میں نے اپنے اسٹاف سے افضال کا خاص طور پر خیال رکھنے کو کہہ دیا ہے۔"

عبدالحق کہنا چاہتا تھا کہ دوپہر کو اسے بتا دیا گیا تھا کہ کس طرح ان کا خیال رکھا جا رہا ہے۔ مگر اسے خیال آیا کہ شاید یہ مناسب نہیں ہوگا۔"جی..... ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔"

"ایسے نہ کریں۔ یہ تو ہمارا فرض ہے۔ مگر دیکھیں نا' یہ قتل کا کیس ہے۔ اور سنائیں' خان صاحب کیسے ہیں؟ وہ تشریف نہیں لائے۔"

"ان کی اہلیہ بیمار ہیں اور اسپتال میں ہیں۔ اسی لیے وہ نہیں آسکے۔ شاید کل آئیں۔"

"تم انہیں بتا دینا کہ افضال صاحب خیریت سے ہیں۔" تھانے دار نے کہا اور پھر آواز لگائی"نبی داد..... او نبی داد' ادھر آ۔"

ایک کانسٹیبل لپکا ہوا ان کی طرف چلا آیا۔"ان صاحب کو لے جا کر افضال صاحب سے ملا دے۔ اور ہاں' وقت کی کوئی قید نہیں ہے ان کے لیے۔ ان کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرنا۔ یہ خان صاحب کے آدمی ہیں۔ اور اب میں گھر جا رہا ہوں۔" تھانے دار نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہوا۔

نبی داد بھی تھانے دار کے ساتھ باہر چلا گیا۔ عبدالحق تھانے کے معاملات پر غور کر رہا تھا۔ اسے پولیس والوں کی ڈھٹائی پر حیرت ہو رہی تھی۔ خان صاحب بڑے افسر تھے۔ تھانہ دار ان سے ڈرتا تھا، ان کا لحاظ بھی کرتا تھا، مگر اس کے باوجود اس نے دوپہر کو اسے جھڑک دیا تھا..... پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔ اور سوچی سمجھی سکیم کے تحت اس سے رشوت وصول کی گئی یہ سب کچھ تھانے دار کے حکم کے مطابق ہوا ہوگا' اور اب وہ خود کو اس سے بے تعلق ظاہر کر رہا تھا۔ انہیں یہ ڈر بھی نہیں تھا کہ بات مسعود صاحب تک پہنچ سکتی ہے۔

"ارے صاحب' ادھر آئیں نا۔" کسی نے اسے پکارا۔

وہ ہیڈ محرر تھا' جو اس وقت اپنی جگہ پر آ کر بیٹھا تھا۔ عبدالحق اٹھ کر اس کے پاس چلا گیا۔

"آپ کا مہمان سو رہا ہے اس وقت۔ کھانا کھا کر جیسے نشہ ہو گیا اسے۔"
عبدالحق نے کچھ نہیں کہا اس کا موڈ خراب تھا۔
"ہمارے بیچ جو کچھ ہوا' اس کے بارے میں مسعود خان صاحب کو نہیں بتایئے گا۔"
"کیوں؟ اس میں کیا حرج ہے؟" عبدالحق کے لہجے میں چیلنج تھا۔
ہیڈ محرر کے تیور اچانک بدل گئے۔ "کوئی حرج نہیں۔ بس لحاظ کی بات ہے۔ ورنہ ہمارا ا
سے کیا تعلق۔"
"ایک بات بتائیں۔ کیا انگریز کے دور میں بھی یہ سب ہوتا تھا۔"
"دیکھو برخوردار' میں بیس سال سے اس محکمہ میں ہوں۔ اور پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ تر
صرف اس لیے نہیں ہو سکی کہ میں نے انگریزی نہیں پڑھی۔ اب میں آپ کو بتاؤں' تاریخ گواہ ہ
کہ جن لوگوں کے پاس اختیارات ہوتے ہیں' انہیں نذرانے بھی ملتے ہیں۔ بادشاہوں کے دو
میں بھی یہ ہوتا آیا ہے لیکن بڑے پیمانے پر ایسا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ انہیں سرکار بہت کچھ دیتی تھی،
ضرورت کے تحت کوئی رشوت نہیں لیتا تھا۔ صرف جمع کرنے کی حرص میں مبتلا لوگ رشوت لیتے او
پکڑے جاتے تو سزا بھی بہت ملتی تھی۔ اس لیے یہ عام نہیں رہی۔ پر یہ انگریز بڑا چالاک ہے۔ و
جانتا ہے کہ یہ سدا یہاں حکومت نہیں کر سکتا۔ ایک نہ ایک دن اسے رخصت ہونا ہوگا۔ اور یہ بہت
دور تک کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ اس نے بہت پہلے سے اس سلسلے میں کام شروع کر دیا۔ وہ
جانتا تھا کہ رشوت ہمارے ہاں حرام ہے' اور بہت بڑی خرابیوں کا سبب بنتی ہے۔ اس نے تمام
محکموں میں جہاں رشوت کی گنجائش تھی' ملازمین کی کم تنخواہیں مقرر کیں...... رشوت کے فروغ کے
لیے۔ تو برخوردار' رشوت تو انگریز نے ہی عام کی۔ ہمیں بس اتنا خیال رکھنا ہوتا تھا کہ انگریزوں
اور ان کے حواریوں کے خلاف نہ جائیں۔ باقی ہم آزاد تھے۔ لیکن بڑے آدمی کی سفارش پر عمل
کرنا ضروری تھا۔ اور بڑا آدمی وہ تھا' جو انگریزوں کا منظور نظر ہو۔"
عبدالحق حیران تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس شخص میں اتنی گہرائی ہوگی۔ وہ ہیڈ محرر تو
خالص علمی گفتگو کر رہا تھا۔ "آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" اس نے کہا۔ اس بار اس
کے لہجے میں اس کے لیے احترام تھا۔
"میں جواب دے رہا ہوں۔ میں نے تمہیں غلامی کے دور کی رکاوٹوں کے بارے میں
بتایا۔ لیکن یہ طے ہے کہ حرام خوری ہمارے مزاج میں رچ گئی ہے۔ اور اب ہم آزاد ہیں۔ آزادی
کا مطلب ہم سے پوچھو' اب کسی بڑے آدمی کے کہنے پر تمہیں نکالا نہیں جا سکتا۔ یہاں کمی ہے
پولیس کی' زیادتی نہیں ہے۔ اب تم مجھے نکلوا دو تو مجھ جیسے تربیت یافتہ پولیس والے کا متبادل کہاں
سے لاؤ گے۔ یہاں تو اضافے کی فکر کرنی ہوگی۔ تو اب ہم تمہارے خان صاحب سے کیوں

ڈریں۔"
"لیکن رشوت تو حرام ہے۔"
"انسان بن کر سوچو برخوردار۔ جانتے ہو' میری تنخواہ سات روپے ہے۔ بچے ہیں میرے۔
بیٹے ابھی چھوٹے ہیں میرے دو بیٹیاں جوان ہو چکی ہیں۔ دو جوانی کی سرحد پر کھڑی ہیں۔ خیر' یہ تو
بعد کی فکر ہے۔ یہ سوچو' تیرہ پیٹ ہیں میرے ساتھ۔ کیا میرا گزارا ہو سکتا ہے۔ اس تنخواہ میں؟"
عبدالحق ہکا بکا رہ گیا۔ واقعی...... یہ ممکن ہی نہیں تھا۔
اسی لمحے نبی داد آ گیا۔ ہیڈ محرر نے اس سے کہا۔ "ذرا ان کے بندے کو جا کر دیکھو۔ اٹھ
گیا ہے یا نہیں۔"
نبی داد گیا' اور واپس آ کر اسے بتایا کہ افضال صاحب ابھی سو رہے ہیں۔
"بولو تو جگا دیا جائے اسے۔ ویسے ہم کسی کو حوالات میں ایسے آرام سے سونے نہیں دیتے۔"
عبدالحق کو خیال آیا کہ افضال صاحب تو کبھی آسانی سے سوتے ہی نہیں تھے۔ ان کی نیند
خراب کرنا ٹھیک نہیں۔ "نہیں...... میں صبح آؤں گا۔" اس نے کہا۔
"چاہو تو انہیں دیکھ لو۔ ہم نے انہیں چادر اور تکیہ تک دیا ہے۔"
عبدالحق نے دیکھا اور مطمئن ہو گیا۔ "ایک بات پوچھوں آپ سے؟" اس نے ہیڈ محرر سے
کہا۔ "آپ تجربہ کار پولیس افسر ہیں۔ یہ بتائیں' آپ کے خیال میں افضال صاحب بن رہے
ہیں یا وہ سچ مچ ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں۔"
"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت ان کی یادداشت مٹ چکی ہے۔ چاہے یہ وقتی
طور پر ہو۔ جتنا کچھ آج ان کے ساتھ ہوا ہے' اس کے بعد تو مُردے بھی بول اٹھتے ہیں۔"
عبدالحق تھانے سے نکل آیا۔

❁ ❁ ❁

زرینہ بہت خوش تھی۔ اس نے بھرا پُرا گھر کھویا تھا۔ مگر یہاں اللہ نے اسے بھرا پُرا گھر دے
دیا تھا۔ سب لوگ بہت محبت کرنے والے تھے۔ اماں تو بہت ہی اچھی تھیں۔ محبت کے سوا کچھ
جانتی ہی نہیں تھیں۔
زرینہ نے جب سے ہجرت کے وقت اپنا گھر چھوڑا تھا' تب سے دکھوں کے سوا کچھ
دیکھا ہی نہیں تھا۔ آنکھوں کے سامنے گھر کے تمام لوگ ختم کر دیے گئے پاکستان پہنچی تو گھر سے
محروم ہو چکی تھی۔ کیمپ ہی اس کا گھر تھا' جو کہ گھر ہرگز نہیں تھا لیکن ایک لحاظ سے کیمپ میں رہنے
کا بہت فائدہ ہوا۔ آدمی جب کسی کو اپنے جیسے دکھ میں مبتلا دیکھتا ہے تو اس کا دکھ ہلکا ہو جاتا ہے۔
جبکہ اس نے تو وہاں کیمپ میں اپنے جیسے بے شمار لوگ دیکھے' جو پاکستان آتے ہوئے اپنا سب کچھ

لٹا آئے تھے ان میں بعض تو ایسے تھے کہ ان کے دکھوں کے سامنے اس کا اپنا دکھ بھی ہیچ تھا۔ چنانچہ وہ بہت آسانی سے اپنے دکھ بھول گئی۔ اور زندگی کی تازہ حقیقتوں کو اس نے قبول کرلیا۔

بس ایک پریشانی اسے تھی...... مستقبل کی فکر یہ تو ممکن ہی نہیں کہ آدمی زندہ ہو اور مستقبل کے بارے میں نہ سوچے۔ مگر وہاں کیمپ میں مستقبل کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ بس ایک ہی زندگی ایک سے صبح و شام۔ لگتا تھا زندگی اس کیمپ میں ہی ختم ہو جائے گی۔ لگتا تھا کہ دنیا ختم ہو گئی ہے۔ بس ایک کیمپ ہی بچا ہے۔ جیسے کیمپ سے باہر کچھ بھی نہیں۔

وہ بار بار سر اٹھا کر آسمان کو دیکھتیں۔ دن ہو یا رات' آسمان بھی اسے آسمان نہیں' محض بڑا سا ایک شامیانہ لگتا تھا۔ جس میں رات کو ستاروں کے قمقمے روشن ہو جاتے تھے۔

لوگ باہر جاتے تھے۔ اس کا بھی دل چاہتا کہ باہر جائے لیکن وہ نہیں جا سکتی تھی۔ پھر جمیل نے اسے لالچ دیا کہ وہ ایک اچھے گھر میں اسے ملازمت دلا دے گا' جہاں اسے پیسے بھی ملیں گے اور ضرورت کی ہر چیز بھی۔ وہ ہر قیمت پر کیمپ سے نکلنا چاہتی تھی' اس لیے اس جھانسے میں آ گئی۔

باہر نکل کر وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ یہ دنیا بہت بڑی تھی۔ آسمان اتھاہ تھا اور ہر طرف گھما گھمی تھی' اس کا اعتماد بحال ہونے لگا مگر وہ بس تھوڑی دیر کی بات تھی۔ اس کے بعد اسے پتا چلا کہ اب وہ جہاں قید ہے' کیمپ کے مقابلے میں تو اسے بہت چھوٹا سا پنجرہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

مگر یہاں وہ پوری طرح آزاد تھی۔ زمین بھی اپنی' چلتے چلتے تھک جاؤ تو بھی زمین ختم نہ ہو۔ اور پھر اپنائیت ایسی' اور ایسی عزت کہ اتنی تو اسے ہندوستان میں اپنے پہلے گھر میں بھی نہیں ملی تھی۔ بس ایک نور بانو اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ ابھی اپنائیت اور محبت سے بات کر رہی ہے' اور ابھی ایک دم سے بے مہر ہو جائے گی۔ اس کے نتیجے میں زرینہ اس سے دور ہو گئی۔ اور یوں وہ رابعہ سے قریب ہو گئی۔

گھر میں کام کرنے والی موجود تھی۔ اس کے باوجود چھوٹے چھوٹے کام کم تو نہیں ہوتے۔ زرینہ نے وہ سب سنبھال لیے۔ رابعہ کو تو وہ ہلنے ہی نہیں دیتی تھی۔ رابعہ نے ابتدا میں بڑی مزاحمت کی۔ اماں کا کہنا تھا کہ صاحب نے اس کا خیال رکھنے کو کہا ہے۔ ایسے جیسے وہ صاحب ہو۔ زرینہ نے نتیجہ لیا کہ اس حوالے سے وہ یہاں بالادست ہے۔ اس نے رابعہ کو بتا دیا کہ وہ جو چاہے کرے گی' اور وہ اسے روک نہیں سکتی۔

کیمپ میں بے کار ساکت و جامد زندگی گزارنے والی زرینہ کو زندگی گزارنے کا موقع ملا تو وہ اس میں کھو گئی۔ اس نے خود کو مصروف کر لیا۔ گھر سے باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ لوگ عبدالحق کی کتنی عزت کرتے ہیں۔ اس کا رہا سہا خوف بھی دور ہو گیا۔

لیکن سوتی تو وہ نور بانو کے کمرے میں تھی۔ اور نور بانو ہمیشہ اسے عبدالحق کے سلسلے میں

ٹٹولنے کی کوشش کرتی' معلومات حاصل کرنا چاہتی۔ جبکہ زرینہ عبدالحق کے بارے میں کچھ جانتی ہی نہیں تھی۔ تنگ آ کر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ عبدالحق کے بارے میں بلا جھجک بات کیا کرے گی۔

❁......❁......❁

نور بانو کے لیے سب کچھ بدل کر رہ گیا تھا...... مینو کے سوا۔ عبدالحق کی چادر اور مینو کے سوا اس کا کوئی مونس و دمساز نہیں تھا۔ زرینہ کے آنے کے بعد وہ پہلے کی طرح خود اعتمادی سے محروم ہو گئی تھی۔ وہی پہلے جیسے خدشے اور وسوسے اسے ستانے لگے تھے۔ اب تو نیند میں بھی وہ لذت نہیں رہی تھی۔ کیونکہ وہ عبدالحق کے خوابوں سے بھی محروم ہو گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں چڑچڑاپن اور بد مزاجی تو آنی ہی تھی۔

زرینہ کو وہ مکار سمجھتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اگلے دن اس نے عبدالحق کو بھائی کہنا شروع کر دیا تھا۔ نور بانو کا خیال تھا کہ زرینہ نے اپنے ساتھ اس کے تفتیشی رویے کا سبب جان لیا تھا۔ اور اطمینان دلانے کے لیے اسے بھائی کہنے لگی تھی۔ ویسے وہ کوشش کرتی تھی کہ اس کا رویہ زرینہ کے ساتھ خراب نہ ہو۔ کچھ بھی ہو' وجہ کوئی بھی ہو' عبدالحق نے بہر حال واضح ہدایت کے ساتھ اسے یہاں بھیجا تھا۔ تو عبدالحق کی بات کا بھرم رکھنا تو ضروری تھا۔

دوپہر کا کھانا وہ دونوں حمیدہ کے ساتھ کھاتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ رات کو لازمی طور پر یکجا ہوتی تھیں۔ کھانے کے وقت نور بانو حمیدہ کے حجاب کی وجہ سے عبدالحق کا تذکرہ کبھی نہیں چھیڑتی تھی۔

اس روز کھانے پر حمیدہ نے زرینہ سے پوچھا۔ ”عبدالحق تو بہت کمزور ہو گیا ہو گا؟“

زرینہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ”میں یہ کیسے کہہ سکتی ہوں اماں میں نے تو بھائی کو پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں۔“

”اور کیمپ میں بھی زیادہ کہاں دیکھا ہے۔ بس دو ہی دن تو دیکھا تھا۔“ نور بانو نے موقع پا کر جلدی سے ٹکڑا لگایا۔

حمیدہ نے چونک کر زرینہ کو دیکھا۔ ”دو دن کیوں؟ وہ کیمپ میں ہی تو رہتا ہے نا۔ اور تُو بھی وہیں تھی۔“

زرینہ جھنجلا گئی۔ یہ دو دن کا حوالہ تو اس کے لیے عذاب بن چکا تھا۔ جھنجلاہٹ میں اس نے سوچا کہ عبدالحق تو نجانے کب واپس آئے گا۔ اس کے آنے تک نجانے اسے کتنے جھوٹ بولنے پڑیں گے۔ البتہ ایک سچ اسے ہر جھوٹ سے بچا سکتا ہے۔ یوں اسے نور بانو کی ہر وقت کی تفتیش سے بھی نجات مل جائے گی۔ چنانچہ اس نے کہا۔ ”اماں...... کیمپ میں ہزاروں لوگ ہوتے ہیں یہ سچ ہے کہ بھائی سے صرف دو دن پہلے ملی تھی۔ پھر انہوں نے مجھے یہاں بھیج دیا۔ اور ہاں اماں چلتے

ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے بارے میں آپ لوگوں کو وہ خود یہاں آ کر بتائیں گے۔"

یہ سنتے ہی نور بانو کا چہرہ فق ہو گیا۔ یہ بات تو بڑی معنی خیز تھی۔ زرینہ کبھی عبدالحق کے بارے میں لگاوٹ سے گفتگو نہیں کرتی تھی جیسے اسے اس کی پروا ہی نہ ہو لیکن عبدالحق کا اس سے یہ کہلوانا...... اور کون جانے' یہ بھی زرینہ نے خود ہی گھڑ لیا ہو۔ "یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی؟" اس نے اعتراض کیا۔

"یہ کہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔"

حمیدہ بچی نہیں تھی۔ یہ تو پہلے ہی دیکھ چکی تھی کہ ان دونوں کے درمیان یک طرفہ کشیدگی ہے...... صرف نور بانو کی طرف سے۔ اور اس کا مطلب عبدالحق ہے لیکن اس وقت تو یہ بات کھل کر واضح ہو گئی تھی۔ خود اسے اس بارے میں ذرا بھی تردد نہیں تھا لیکن اس وقت کی بات نے اسے بھی چونکا دیا کہ کوئی خلاف توقع بات بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے زرینہ کے چہرے پر ردعمل دیکھنے کے لیے نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "اچھا! جیسے یہ بتا کہ تیرے بھائی نے واپسی کے بارے میں کچھ کہا تھا۔" تیرے بھائی کہتے ہوئے اس نے خاص طور پر دیکھا لیکن زرینہ کا چہرہ بے تاثر رہا۔

"بس اماں' بھائی نے اتنا کہا کہ وہ اپنا کام کر کے ہی آئیں گے۔" اس جانچ پڑتال سے بے خبر زرینہ نے سادگی سے کہا۔

حمیدہ پوری طرح مطمئن ہو گئی۔ لیکن نور بانو پوری طرح بھڑک چکی تھی۔

زرینہ نے برتن سمیٹے اور باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ اماں...... میں ذرا آپا کو دیکھ لوں' اس نے جاتے جاتے کہا۔

نور بانو اٹھنے لگی تو حمیدہ نے ہاتھ تھام لیا۔ "تُو کہاں چلی۔ یہاں بیٹھ نا میرے پاس۔"

نور بانو بیٹھ گئی لیکن وہ حمیدہ سے نظریں چرا رہی تھی۔

"تُو تو اب میرے پاس بیٹھتی ہی نہیں۔ کچھ ناراض ہے مجھ سے۔"

"ارے نہیں اماں۔ آپ سے میں کیسے ناراض ہو سکتی ہوں" نور بانو نے جلدی سے کہا۔

"تو پھر اتنی دور دور کیوں رہتی ہے؟"

"یہ بات نہیں اماں۔ دور تو آپ ہوئی ہیں۔" نور بانو کو دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا موقع مل گیا۔ "نئی اور خوبصورت بیٹی جو مل گئی ہے آپ کو۔"

"لے...... وہ کب آتی ہے میرے پاس وہ تو ہر وقت رابعہ کی فکر میں لگی رہتی ہے بے چاری۔ اور رہی بات خوبصورتی کی تو مجھے تو تُو زیادہ خوبصورت لگتی ہے۔"

"میں ہر روز آئینہ دیکھتی ہوں اماں۔ مجھے حقیقت معلوم ہے۔ آپ میرا دل رکھنے کے لیے

کہہ رہی ہیں نا۔" نور بانو کا دل بھر آیا۔

حمیدہ کو اس پر پیار بھی آیا اور غصہ بھی۔ "سن میری دمی' آج میں تجھے وہ بات سمجھاؤں گی' جو شاید تجھے تیری ماں بھی کبھی نہ سمجھاتی۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "اس لیے کہ تیری ماں نے بھی تجھے اتنا نہیں سمجھا ہو گا' جتنا میں سمجھ گئی ہوں۔ تُو دیے کی طرح ہے' جو روشن اسی وقت ہوتا ہے' جب جلتا ہے۔ اس کی زندگی ہی جلنا ہے' اس کا کام بھی یہی ہے۔ نہ جلے تو اسے چین نہیں آئے۔ تُو اس بچے کی طرح ہے' جسے ہر وقت سردی لگتی ہے۔ اور وہ ہاتھ تاپنے کے لیے آگ جلاتا ہو' اور پھر تاپتے تاپتے اپنے ہاتھ جلا بیٹھتا ہو۔ ظاہر میں تو جلنے سے ڈرتی ہے' پر اندر ہی اندر تجھے جلنے کا شوق ہے......"

نور بانو سن ہو کر رہ گئی۔ غور کیے بغیر بھی وہ جان گئی تھی کہ اماں سچ کہہ رہی ہے۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اماں کتنی عقل مند ہیں۔

"اب تجھے ایک کام کی بات بتاؤں۔ جیسے یقین میں بڑی طاقت ہوتی ہے' ویسے ہی شک میں بھی ہوتی ہے۔ بلکہ شک چاہے طاقت میں یقین سے کم ہو' اثر میں اس سے تیز ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یقین نیکی ہے اور شک بدی۔ اور بدی نیکی سے آسان ہوتی' ہے۔ تو دمی میری' تُو یقین تو کرتی نہیں' پر گمان کرتی ہے۔ اور گمان کا یہ ہے کہ کیے جاؤ تو پھر پورا ہو کر رہتا ہے۔ آدمی کو بڑی طاقت دی ہے اللہ نے۔ پر وہ اس طاقت کے ساتھ الٹے راستے پر چل پڑے تو یہ اس کا نصیب۔"

نور بانو اندر ہی اندر لرز گئی۔ اماں تو جیسے اسے اندر سے دیکھ رہی تھی...... آر پار۔ واقعی امی نے بھی اسے نہ اس طرح محسوس کیا تھا' نہ اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ سوچنے کا تو ابھی اسے موقع نہیں ملا تھا۔ لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے ذہن کی گرہیں کھل رہی ہیں۔

"میری بات تیری سمجھ میں آ رہی ہے؟" حمیدہ نے پوچھا۔

"جی اماں لیکن میں کیا کروں' میں شاید ایسی ہی ہوں"

"ایسا کوئی ہوتا نہیں۔ ہاں خود کو بنا لیتا ہے ایسا۔ میں نے دیکھا ہے' تُو اپنی صورت شکل کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ مجھے یہ تو پتا ہے کہ تیری بہنیں تھیں۔ تُو مجھے یہ بتا کہ کیا وہ بہت...... بہت زیادہ خوبصورت تھیں؟"

"ہاں اماں......" نور بانو نے فوراً کہا۔

"جبھی تو۔ اب تجھے ایک بات بتاؤں۔ یہ سچ ہے کہ کچھ لوگ بہت خوب صورت ہوتے ہیں اور کچھ بدصورت۔ ان کے علاوہ لوگ عام سے ہوتے ہیں۔ پر خوب صورتی دو طرح کی ہوتی ہے بچی۔ ایک باہر کی' اور ایک اندر کی۔ باہر کی خوبصورتی وقتی ہوتی ہے' جیسے پھول مرجھا جاتا ہے۔ اور اندر کی خوب صورتی دیرپا ہوتی ہے۔ اندر کی خوبصورتی نظر نہیں آتی لیکن محسوس

کی جاتی ہے۔ اور محسوس کرنے پر باہر کی خوبصورتی سے زیادہ صاف نظر آتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ خوبصورتی دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ بہت خوبصورت لڑکی بھی سب کو اچھی نہیں لگتی۔ اور بہت بدصورت لڑکی بھی بہت سوں کو اچھی لگتی ہے۔ دنیا میں آج تک کوئی لڑکی اس لیے شادی سے محروم نہیں رہی کہ وہ بدصورت ہے۔ اللہ نے کسی کو بھی محبت سے محروم نہیں رکھا۔ اور میاں بیوی کے رشتے کا تو یہ حال ہے کہ میاں کو اپنی بیوی سے خوبصورت کوئی نہیں لگتا اور بیوی کو اپنے میاں سے زیادہ کوئی نہیں بھاتا۔ یہ اللہ کی رحمت ہے اس رشتے پر۔ ہاں جن کے دل خراب ہوتے ہوں' ان کی بات اور ہوتی ہے۔"

نور بانو کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور وہ حمیدہ کی باتیں بہت غور سے سن رہی تھی۔

"تُو نے یہی سمجھا ہے نا کہ میرے پتر نے اس زرینہ کو اپنے لیے پسند کر کے یہاں بھیجا ہے؟" حمیدہ کا لہجہ کچھ سخت ہو گیا۔ "اور تُو نے یہ بھی سمجھا ہے کہ مجھے بھی زرینہ تجھ سے زیادہ اچھی لگی ہے۔ اس لیے کہ وہ تجھ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اور آگے جا کر تُو رابعہ اور زبیر کے بارے میں بھی یہی سوچے گی۔ اب یہ دیکھ کہ زرینہ اتنی دور سے زبیر کے ساتھ اکیلی آئی ہے۔ ہے نا؟ اب جا کر رابعہ سے پوچھ کہ اس کے دل میں ان دونوں کے لیے کوئی برا خیال بھی آیا۔ بھروسہ اور یقین بڑی چیز ہوتا ہے دھی میری۔ یہی تو رشتوں کو پکا کرتا ہے۔ نہیں تو رشتے کچے دھاگوں کی طرح ہوتے ہیں۔ میں تجھے عبدالحق کی ماں بن کر نہیں' تیری ماں بن کر سمجھا رہی ہوں۔"

نور بانو کے منہ میں آواز نہیں تھی' بولتی کیا۔ ایسی شرمندگی اسے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

"اب تجھے بتاؤں' میں عبدالحق کو ایسے جانتی ہوں' جیسے اپنے اس ہاتھ کو۔" حمیدہ نے اپنا ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ "دودھ پلایا ہے اسے' میری گود میں پلا ہے وہ۔ اس نے اس زرینہ کو نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ اسے مصیبت میں دیکھا ہوگا' تو اس کے کام آنے کا سوچا ہوگا۔ اور رہی میں' تو میں زرینہ کے دکھوں کی وجہ سے اس سے ہمدردی کرتی ہوں۔ اور اس لیے کہ میرے بیٹے نے اسے اپنا مقام دے کر یہاں بھیجا ہے۔ مجھے اس کی خوبصورتی سے غرض نہیں۔ میں نے تجھے بہو بنانے کا کہا تو تیری صورت شکل نہیں دیکھی۔ تیرے اندر کی خوب صورتی دیکھی اور یہ دیکھا کہ عبدالحق تجھے پسند کرتا ہے' تجھے بہت بلند سمجھتا ہے۔ پر مجھے پتا نہیں تھا کہ تیرے اندر یہ بد صورتی موجود ہے۔ تُو اس سے پیچھا چھڑا لے بیٹی ورنہ اس کے ساتھ شادی کے بعد تیری زندگی بھی جہنم بن جائے گی اور میرے پتر کی بھی۔ جو تُو برا سوچے گی تو وہ تیرے سوچنے ہی کی وجہ سے آخر سچ ہو جائے گا۔ تُو اپنے شک اور گمان کی وجہ سے چڑچڑی اور کھنچی کھنچی سی رہے گی تو ایک دن زبیر اور رابعہ بھی اکتا جائیں گے' اور میں بھی۔ پھر وہی سچ ہو جائے گا نا جو تُو نے سوچا تھا۔ تو نقصان کس کا ہوگا؟ تیرا اپنا! بیٹی یاد رکھ برا گمان رکھنے والے کے ہاتھوں میں بس شرمندگی ہی آتی ہے...... اور

کبھی کبھی وہ بھی وقت نکل جانے کے بعد۔"

نور بانو سر جھکائے بیٹھی رہی۔ حمیدہ کی ہر بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ کبھی کسی نے اسے ایسے سمجھایا ہی نہیں تھا۔ اور امی کیسے سمجھا سکتی تھیں اسے۔ وہ اسے سمجھتیں تو اسے سمجھاتیں نا۔ یہ بات بھی اس کی سمجھ میں ابھی آئی تھی کہ کسی کو کچھ سمجھانے کے لیے اس کو سمجھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ تو وہ سمجھ گئی جس نقصان کی طرف اماں اشارہ کر رہی ہیں۔ وہ اس کے بہت قریب پہنچ چکی ہے۔ اسے خود کو سنبھالنا ہوگا' بدلنا ہوگا۔ "اماں...... میں بہت شرمندہ ہوں......" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"میں یہ نہیں چاہتی دھیے۔ میں تو تجھے خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"آپ میری ماں ہیں نا اماں۔"

"ہاں' اور اس میں کبھی شک نہ کرنا۔"

نور بانو نے اب تک بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔ اپنی کمزوریاں بھی وہ جان گئی تھی۔ اور اظہار کی اہمیت سے بھی وہ واقف ہو چکی تھی۔ پھر اسے حمیدہ جیسی شفیق اور عقل مند عورت بھی مل گئی تھی۔ "تو اماں بیٹیاں ماں سے دل کی ہر بات کہہ سکتی ہیں نا؟"

"ہاں...... اور اس سے دل بھی ہلکا ہو جاتا ہے۔"

"تو اماں' آج میں آپ کو دل کی بات بتاتی ہوں۔ میں ان سے بہت محبت کرتی ہوں اماں۔" یہ کہتے ہی اسے احساس ہوا کہ دل پر رکھی کوئی بھاری چٹان ہٹ گئی ہے۔

حمیدہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ حیرت اس کی بات پر نہیں تھی' کیونکہ یہ تو وہ جبلی طور پر جان چکی تھی کہ نور بانو کو عبدالحق سے محبت ہے' حیرت اسے اس بات پر تھی کہ نور بانو اپنی زبان سے کہہ رہی ہے۔

"اور اماں' میرے اندر کی ساری خرابیاں میری بے اعتمادی' اور بے یقینی کی وجہ سے ہیں۔ اور بے اعتمادی اور بے یقینی کا سبب یہ ڈر ہے کہ وہ مجھے کبھی نہیں ملیں گے۔ اس لیے کہ وہ بہت اچھے ہیں اور میں اتنی ہی بری ہوں۔ میں ان کے قابل ہوں ہی نہیں' لیکن اماں' اگر اللہ کی مہربانی سے وہ مجھے مل گئے تو میں بالکل بدل جاؤں گی۔ انہی سے میرا اعتماد ہے' اور انہی سے میرا یقین۔"

حمیدہ نے محبت سے اسے لپٹا لیا۔ "تو سمجھ لے کہ وہ تجھے مل گیا۔ بس تُو اس کے آنے کی دعا کر۔ باقی سب کچھ مجھ پر چھوڑ دے۔ تُو تو میری دولت ہے۔ تُو میری بیٹی ہے اور بہو بھی۔ اور تیری وجہ سے عبدالحق میرا جوائی ہوگا۔"

نور بانو کمرے سے نکلی تو اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ گویا ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔

❁ ❁ ❁

افضال صاحب کی حالت ویسی ہی تھی۔ ان کا کیس عدالت میں گیا۔ عدالت نے دماغی امراض کے کسی ڈاکٹر سے ان کے معائنے کا حکم دیا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ ان کی یادداشت کھو چکی ہے۔ ہجرت کے عرصے میں اس طرح کے کیس بہت عام ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے اتنا کچھ دیکھا ہے' اور ایسا کہ وہ کچھ یاد رکھنا ہی نہیں چاہتے۔ اس کا کہنا تھا کہ کسی بھی وقت' کسی بھی واقعے کے نتیجے میں اس کی یادداشت واپس آسکتی ہے۔ لیکن یہ بات یقینی نہیں۔ ممکن ہے کہ چند دن میں ایسا ہو جائے' اور ممکن ہے' پوری زندگی اسی حال میں گزر جائے۔

اس کے بعد عدالت نے کیس کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ افضال صاحب نے جس ذہنی کیفیت میں قتل کیا تھا' اس میں انہیں ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا اس لیے انہیں دماغی امراض کے اسپتال میں بھیج دیا گیا۔

عبدالحق ہفتے میں کم از کم ایک بار ان سے ملنے ضرور جاتا تھا۔ ایک بات اس نے سمجھ لی تھی۔ وہ انہیں ان کے نام سے کبھی نہیں پکارتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس بات پر وہ بری طرح بھڑ کتے تھے لیکن اس کا تجسس بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ ان کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اب وہ انہیں چچا کہہ کر پکارتا تھا اور ان کے سامنے افضال صاحب کو برا بھلا کہتا تھا۔ اس بات سے وہ بہت خوش ہوتے تھے۔

ایک عجیب بات تھی۔ وہ تازہ باتیں بھی فوراً ہی بھول جاتے تھے۔ موجودہ ملاقات میں انہیں پچھلی ملاقات کے بارے میں کچھ یاد نہیں ہوتا تھا۔ اور ہر بار وہ ان سے پوچھتا کہ ان کا نام کیا ہے۔

اور وہ کھو سے جاتے۔ ''یہی تو یاد نہیں آتا۔'' وہ بے بسی سے کہتے۔

''یاد کرنے کی کوشش تو کریں۔''

''کرتا ہوں...... بہت یاد کرتا ہوں۔ ارے آدمی کے لیے اس کا نام بہت اہم ہوتا ہے۔ پر ذہن پر زیادہ زور دوں تو جی متلانے لگتا ہے' اور چکر آنے لگتے ہیں۔ میں گھبرا جاتا ہوں۔''

''پھر آپ یہ کوشش نہ کیا کریں۔''

''مگر میاں' یہ بہت ضروری ہے دیکھونا' کوئی نام تو ہو گا میرا۔ نام تو آدمی کی پہچان ہوتی ہے۔'' وہ بولے۔ پھر بہت اداس ہو کر کہا۔ ''میری کوئی بھی پہچان نہیں میاں۔''

''صرف نام سے کیا ہوتا ہے۔ آپ کے اپنے بھی تو ہوں گے۔ بچے بھی آدمی کی پہچان ہوتے ہیں۔''

وہ کچھ دیر سوچتے رہے جیسے ذہن پر زور دے رہے ہوں پھر انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بہت یقین سے کہا۔ ''نہیں میاں' میرے بچے نہیں ہیں۔ میرا تو کوئی بھی نہیں۔ میری کوئی

پہچان نہیں۔''

عبدالحق کو ان پر بہت ترس آیا۔ ''میں ہوں نا آپ کی پہچان۔ آپ میرے چچا ہیں۔ میں بھتیجا ہوں آپ کا۔''

وہ ایک دم خوش ہو گئے۔ ''ہاں...... تم میری پہچان ہو۔ اچھا یہ تو بتاؤ' تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام عبدالحق ہے۔''

''اب کوئی پوچھے گا کہ میں کون ہوں تو میں کہہ دوں گا کہ میں عبدالحق کا چچا ہوں۔'' انہوں نے خوش ہو کر بہت معصومیت سے کہا۔

مگر اگلی ملاقات پر انہوں نے پھر اس کا نام پوچھا۔ ''آپ کو بتایا تو تھا پچھلی بار۔''

''ہاں...... بتایا تو تھا یہ میں ہر بات بھول کیوں جاتا ہوں۔'' وہ ہتھیلی سے پیشانی کو بری طرح مسلنے لگے۔

عبدالحق نے جلدی سے انہیں دوسری باتوں میں لگا لیا۔

مگر اس بار جو وہ آیا تو ایک اور ہی بات ہوئی۔ ''میاں' تم میرے بھتیجے ہو نا؟''

''جی ہاں۔''

''تو تمہیں میرا نام بھی معلوم ہو گا آخر میں تمہارا چچا ہوں۔''

عبدالحق گڑبڑا گیا۔ ''ج...... جی ہاں...... مجھے معلوم ہے۔''

''تو مجھے بتاؤ نا' میرا نام کیا ہے۔''

عبدالحق نے جلدی سے کوئی نام گھڑنے کی کوشش کی۔ ''آپ کا...... آپ کا نام جمال ہے۔''

افضال صاحب بچوں کی طرح خوش ہو گئے۔ ''واہ...... بہت اچھا نام ہے۔'' انہوں نے کہا۔ مگر پھر سے گئے۔ ''اچھا ہے...... مگر اس منحوس افضال کے نام سے ملتا جلتا ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' عبدالحق نے انہیں تسلی دی۔

''اچھا میرے بھائی کا کیا نام ہے؟''

''آپ کے بھائی کا نام......'' عبدالحق بوکھلا گیا۔ ''م...... مجھے کیا معلوم؟''

''ارے بھئی' میرا بھائی تمہارا باپ ہی تو ہوا۔ تمہیں اپنے باپ کا نام نہیں معلوم!''

عبدالحق کی زبان پر بے ساختہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کا نام آیا تھا' مگر اس نے بروقت خود کو روک لیا۔ یہ تو سب گڑبڑ ہو جاتا۔ اپنے بھائی کا ہندوانہ نام سن کر افضال صاحب بھڑک سکتے تھے۔

اگلے ہی لمحے وہ اداس ہو گیا۔ کاش...... کاش پتا جی کا کچھ اور نام ہوتا۔ کاش وہ مسلمان ہو گئے ہوتے۔ پھر اسے شرمندگی ہونے لگی۔ ایسے محبت کرنے والے عظیم انسان تھے اس کے پتا جی اور آج وہ ان سے تعلق پر شرمندہ ہو رہا ہے۔

"بتاؤ نا' میرے بھائی کا کیا نام تھا؟" افضال صاحب نے اسے چونکا دیا۔

"جی...... وہ تو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔" عبدالحق نے ان کا دھیان بٹانے کی کوشش کی۔

"اوہ...... مگر ان کا نام کیا تھا۔"

اب عبدالحق پتاجی کا نام تو نہیں بتا سکتا تھا لیکن راج پوت بچہ اپنی ولدیت مصلحتاً بھی نہیں تبدیل کر سکتا تھا۔ "مجھے یاد نہیں ہے چچا۔"

وہ ڈر رہا تھا کہ یہ مرحلہ بہت دشوار ہو جائے گا لیکن معاملہ برعکس ہوا۔ افضال صاحب بچوں کی طرح تالیاں بجانے لگے۔ "دیکھا تم بھی بھول گئے۔ ارے نام تو کوئی بھی بھول سکتا ہے۔ میں یونہی پریشان ہوتا تھا۔"

عبدالحق نے سکون کی سانس لی۔

"چچا...... یہ بتائیں' آپ اس افضال کو کیسے جانتے ہیں؟" عبدالحق نے پوچھا۔ وہ عزت سے نام لیتا تو افضال صاحب بھڑک اٹھتے۔

افضال صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ "تعلق کی نوعیت یاد نہیں آتی۔" چند لمحے بعد انہوں نے کہا۔ "لیکن یہ جانتا ہوں کہ تعلق بہت گہرا تھا۔ اس لیے تو اس تعلق پر شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔"

"بہت گہرا تعلق تھا آپ کا اس سے؟"

"گہرا ہی ہوگا...... بہت گہرا۔ کیونکہ اس کی زندگی کا ہر لمحہ مجھے یاد ہے۔ میں اس میں شریک تھا۔"

"آپ پاکستان اس کے ساتھ ہی آئے تھے؟"

"ہاں۔ اور اسی دوران تو میں نے اس کا اصل چہرہ دیکھا۔ اسی دوران تو مجھے اس سے شدید نفرت ہوئی۔" افضال صاحب کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"ایسی کیا بات ہوگئی اس سفر میں۔"

"بتانے والی بات نہیں ہے میاں۔" افضال صاحب نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی نہیں بتائیں گے چچا۔ میں تو بھتیجا ہوں آپ کا۔" عبدالحق نے انہیں اکسایا۔ "اور آپ بتائیں گے نہیں تو میں یہ کیسے مانوں گا کہ وہ بہت برا آدمی تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ آپ بلاوجہ اس سے نفرت کرتے ہیں......"

"بلاوجہ؟" افضال صاحب بھڑک گئے۔ "تم تو یہ سوچ سکتے ہو۔ مگر حقیقت میں جانتا ہوں۔ میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور کانوں سے سنا ہے۔ اس کمینے کو تو سو بار قتل کر دیا جائے تو بھی کم ہے۔"

"تو پھر مجھے بتائیں نا۔ ورنہ میں تو آپ کو ہی غلط سمجھتا رہوں گا۔"

افضال صاحب نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ "میں کسی کو کچھ بتاؤں تو اس میں افضال کی ذلت اور رسوائی ہے۔ مگر نجانے کیا بات ہے کہ اتنی شدید نفرت کے باوجود اس کی ذلت اور رسوائی مجھے گوارا نہیں۔" ان کے لہجے میں اذیت تھی۔ "اب اسے تو اس کے کیے کی سزا مل گئی نا۔ تو پھر مزید ذلت اور رسوائی کیوں۔ وہ آخر میرا اپنا ہے۔ کوئی بہت قریبی تعلق ہے میرا اس سے۔"

عبدالحق کا دل بھر آیا لیکن اسے لگ رہا تھا کہ اس وقت لوہا گرم ہے۔ اس نے کہا۔ "لیکن چچا' میں بھی تو آپ کا اپنا ہوں۔ مجھ سے کیا پردہ۔ اور میرا سینہ بہت گہرا ہے۔ ان کی ذلت اور رسوائی تو نہیں ہوگی۔ جیسے وہ آپ کا اپنا ہے' ویسے ہی میرا بھی ہے۔"

افضال صاحب نے سر اٹھا کر شکرگزاری سے دیکھا۔ پھر بولے۔ "نجانے کیا بات ہے میاں تم میں کہ تمہیں تو میں سب کچھ بتا سکتا ہوں۔ تو سنو وہ افضال پشتینی رئیس تھا۔ اس کے علاقے میں اس کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ علاقے میں رہنے والے اس کی رعایا تھے۔ وہ مغرور اور متکبر تھا...... اپنے نام و نسب پر بھی' اپنی دولت پر بھی' اپنی زمین جائیداد پر بھی اور اپنی اولاد پر بھی۔ حالانکہ خطاب اور زمین انگریزوں کی غلامی کے صلے میں ملے تھے۔

"جب یہ پاکستان کا سلسلہ شروع ہوا تو اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ ہندوستان میں ہو یا پاکستان میں' اسے تو رعایا پر راج ہی کرنا تھا۔ اور اس کی رعیت میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ مگر جب اس کی رعایا میں ہندوؤں کے تیور بگڑنے لگے تو بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اب مزید وہاں رہنا اپنے غلاموں کی غلامی قبول کرنے کے برابر تھا۔ چنانچہ اس نے ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"اب ہجرت کے وقت وہ کچھ بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی یہی حکومت پاکستان میں قائم کرنا چاہتا تھا اس کا بس چلتا تو اپنی ساری زمین بھی اٹھا کر لے جاتا۔ بہر حال زمین نہ سہی' اس کے کاغذات اس نے رکھ لیے۔ زیورات اور نقدی الگ تھی۔ آگے کی اسکیم اس کے ذہن میں تھی۔ چار بیٹے تھے اس کے' اور اس دولت کے زور پر تو وہ پاکستان میں بھی وہی سب کچھ بنا سکتے تھے۔

"لیکن جب انہوں نے جانے کا ارادہ کیا تو پتا چلا کہ یہ اتنا آسان نہیں رہا ہے۔ اپنی حویلی میں بیٹھے اسے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ باہر کی فضا کتنی تبدیل ہو چکی ہے۔ وہ تو اپنے زعم میں پہلے کی طرح حاکم بنا بیٹھا تھا۔ وہ تو اسے اس کے ایک وفادار نے بتایا کہ ہندوؤں نے آہستہ آہستہ کارروائیاں شروع کر دی ہیں۔ اور اب وہاں سے نکلنا بھی مخدوش ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ہندوؤں کی نظریں اس کی حویلی پر ہیں۔

"اب میں تمہیں تفصیل کیا بتاؤں۔ مختصر بتا دیتا ہوں۔ شہر میں فسادات شروع ہوئے اور افضال کی بادشاہت ختم ہوگئی۔ ایک دن اسے حویلی بھی چھوڑنی پڑی۔ فوجیوں نے اسے اس کی فیملی کے ساتھ کالج میں قائم کیمپ میں پہنچا دیا۔ راستے میں اس نے جو کچھ دیکھا' اس نے پہلی با

اسے لرزا دیا۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ فرعونوں پر لرزہ چڑھے تو وہ بودے ہو جاتے ہیں۔ اندر سے کھوکھلے لیکن جسم پر رعونت کا لبادہ۔ کیمپ تک پہنچنے سے پہلے اس نے راستے میں تین لڑکیوں کی خون میں نہائی ہوئی بے لباس لاشیں دیکھیں...... تین مختلف مقامات پر...... درختوں سے لٹکی ہوئی۔ اور ان کے جسموں کے نازک حصوں پر پینٹ سے...... پاکستان کے لیے تحفہ...... لکھا ہوا تھا۔ ان مناظر نے اسے لرزا دیا۔ لاشیں زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں کہ ان پر کیا گزری ہے۔ اس نے گھبرا کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا جو سر جھکائے بیٹھی تھی۔"

عبدالحق سحرزدہ سا سن رہا تھا۔ افضال صاحب جو کچھ بیان کر رہے تھے' ظاہر ہے کہ وہ ان کا آنکھوں دیکھا تھا۔ وہ سب کچھ ان پر بیتی تھی لیکن اس بارے میں وہ ایسے بتا رہے تھے' جیسے وہ کوئی اور ہوں' اور افضال صاحب کو دیکھتے رہے ہوں۔ اس نے درمیان میں ہوں ہاں بھی نہیں کی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بیان کا وہ طلسم ٹوٹے......

"......افضال کے چار بیٹے تھے۔ بیٹی ایک ہی تھی۔ وہی تو ایک تھی' جس کے لیے اس نے گڑگڑا کر برسوں دعائیں کی تھیں۔ اس کے علاوہ اس نے کبھی کوئی دعا نہیں کی تھی۔ دعا کے بغیر ہی سب کچھ میسر تھا۔ تو چار بیٹوں کے بعد کئی برس کے انتظار کے بعد پیدا ہونے والی اس بیٹی سے اسے بہت محبت تھی۔ مگر اس وقت وہ پریشان ہو گیا۔ اسے خیال آیا کہ یہ سب کچھ اس کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے...... اس کی بیٹی کے ساتھ۔

"اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اسے طمانیت ہوئی کہ اس کے پاس اسلحہ بھی ہے۔ چاروں بیٹوں کے پاس بھی برچھیاں تھیں اس کے علاوہ سامان میں بندوقیں بھی تھیں اور میگزین بھی۔

"کیمپ اس کی شخصیت کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ وہاں تو محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہاں موجود لوگ اپنے مقام' مرتبے اور اپنی حیثیتیں باہر ہی چھوڑ آئے ہیں۔ وہاں نفسانفسی کا عالم تھا۔ اس کا مزارع بھی اسے نہیں پہچانتا تھا' اور برا یہ ہوا کہ وہ وہاں بہت دیر میں پہنچا۔ جو پہلے سے آئے ہوئے تھے' وہ نسبتاً بہتر حال میں تھے۔

"اب مزاج کی رعونت ایسے تو نہیں جاتی۔ دولت کا گھمنڈ اتنا ہی دیرپا ہوتا ہے' جتنی دولت۔ جب تک دولت' تب تک گھمنڈ۔ کیمپ میں غذا کی بہت شدید قلت تھی۔ کبھی اشیائے خورد و نوش کا ایک ٹرک آ جاتا۔ لیکن وہ اتنے لوگوں کے لیے کافی نہیں ہوتا تھا۔ پھر وہاں ڈسپلن نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہاں وہ لوگ فائدے میں تھے' جو ہاتھ پھیلانے کے عادی تھے۔ جنہیں مانگتے ہوئے شرم آتی تھی' وہ خالی ہاتھ ہی رہ جاتے تھے۔ بس یوں کہو کہ چھٹ بھئیوں کی بن آئی تھی۔ بسکٹ کے پیکٹ پچاس پیکٹ لے لیتے۔ پھر ضرورت مندوں کو دس دس روپے کا بیچتے تھے۔ افضال کے لیے تو خیر یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن میں نے وہاں بھوک سے بلکتے بچوں کی ماؤں کو اپنے کانوں

کے بُندوں کے بدلے بسکٹ کے وہ پیکٹ خریدتے دیکھا تھا۔

"وہ کیمپ افضال کے لیے ایک بھیانک خواب کی حیثیت رکھتا تھا۔ تکلیفیں تو وہاں ہر نوع کی تھیں لیکن سب سے بڑی تکلیف یہ تھی کہ وہاں کوئی اسے پہچانتا نہیں تھا۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ غیر محفوظ ہونے کا یہ عالم تھا کہ فوج کی حفاظت میں ہونے کے باوجود کیمپ پر تقریباً ہر روز حملہ ہوتا تھا۔ اس کے نتیجے میں کیمپ میں خوف و ہراس مستقل تھا۔

"ایک دن افضال نے ایک فوجی سے پوچھا۔ "کیا اب ہماری زندگی یہیں گزرے گی؟"

فوجی نے غیر معمولی تحمل کا مظاہرہ کیا۔ "بڑے صاحب' گاڑی آئے گی تبھی تو آپ سب کو اسٹیشن پہنچائیں گے۔ ابھی سے لے جا کر وہاں ڈال دیں آپ لوگوں کو تو فسادیوں کے ایک ہی حملے میں سب ختم ہو جائیں گے۔"

"تو گاڑی کب آئے گی؟"

"کچھ نہیں کہا جاسکتا بڑے صاحب۔"

"وہ بے بسی اور جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو گیا۔ اب تو اقتدار بس اسے پاکستان میں ہی مل سکتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اُڑ کر پاکستان پہنچ جاتا۔ لیکن پاکستان جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

"خیر' بالآخر ایک دن ٹرک آ گئے۔ اس وقت تک افضال کا دماغ درست ہو چکا تھا۔ وہ اپنی نوابی بھول گیا۔ ورنہ وہ لوگ پیچھے ہی رہ جاتے کیونکہ ٹرکوں کی تعداد پناہ گزینوں کی ضرورت سے بہت کم تھی۔ ٹرکوں کی روانگی کے بعد آدھے سے زیادہ لوگ کیمپ میں رہ گئے تھے۔

"راستے میں ٹرکوں کے اس قافلے پر بھی سکھوں نے حملہ کر دیا۔ دونوں طرف سے فائرنگ ہونے لگی۔ ٹرک روک دیے گئے۔ اس دوران لاڈلی بیٹی نے افضال سے کہا۔ "ابا میاں، آپ کے پاس طمنچہ تو ہے نا؟"

"ہاں بیٹی!" افضال نے جیب تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔ "کیوں پوچھ رہی ہو تم؟"

"میں آپ سے کچھ مانگنا چاہتی ہوں ابا میاں۔"

"مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔"

""وعدہ کریں کہ آپ مجھے ان لڑکیوں کی طرح مرنے نہیں دیں گے' جن کی لاشیں ہم نے کیمپ آتے ہوئے دیکھی تھیں۔"

"افضال تھرا گیا۔ گویا سر جھکا کر بیٹھی ہوئی بیٹی نے وہ منظر دیکھ لیا تھا۔ "تم پریشان نہ ہو جانِ پدر۔ ایسی نوبت نہیں آئے گی۔" اس نے کہا۔

"جانتی ہوں ابا میاں۔ آپ بہت بہادر ہیں۔ مگر جب کچھ بھی بس میں نہ رہے تو ایک گولی میرے دل میں اتار دیجیے گا۔"

"ایسی باتیں نہ کرو......"

"نہیں ابا میاں' آپ مجھ سے وعدہ کریں۔"

"اچانک افضال کی غیرت جوش میں آ گئی۔ اس کام کے لیے وعدے کی ضرورت نہیں جانِ پدر ایک گولی تمہارے لیے ہو گی اور آخری گولی میرے لیے۔ ہم عزت سے جیتے آئے ہیں' مریں گے بھی عزت سے۔"

"ٹرکوں کی حفاظت کے لیے آنے والے فوجی تعداد میں کم تھے۔ کیمپ کی حفاظت کے لیے بھی وہ خاصی نفری چھوڑ آئے تھے۔ کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ طاقت تقسیم ہو جانے پر بلوائی کیمپ پر حملہ کر سکتے ہیں۔ پھر بھی وہ بڑی بے جگری سے لڑے اور بلوائیوں کو مار بھگا دیا۔ دو فوجی البتہ شہید ہو گئے۔

"اسٹیشن پر سکھ فوجی بھی موجود تھے۔ ان کی نگاہوں میں عناد تھا۔ تاہم انہوں نے تعرض نہیں کیا۔ ہزاروں کا مجمع پلیٹ فارم پر ٹرین کا منتظر تھا۔ بالآخر ٹرین آئی اور بھگدڑ مچ گئی۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا نہ صرف وہ اور اس کے اہل خانہ سب سے پہلے ڈبے میں گھس جائیں' بلکہ اپنا سامان بھی چڑھا دیں۔ افضال کو اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ پھر چار جوان بیٹے اس کی طاقت تھے۔ وہ لوگ ایک ڈبے میں سوار ہو گئے۔

"وہاں صورت حال یہ تھی کہ ڈبے میں 32 افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور سو سے زیادہ افراد سوار ہو چکے تھے۔ دونوں پیروں پر کھڑے ہونے کی جگہ ملنا بھی آسان نہیں تھا۔ تاہم افضال اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

"گاڑی روانہ ہوئی لیکن اس کی رفتار اتنی کم تھی کہ کوئی بھی بہ آسانی ایک ڈبے سے اتر کر آگے والے ڈبے میں سوار ہو سکتا تھا۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ ڈرائیور سکھ ہے اور جان بوجھ کر گاڑی آہستہ چلا رہا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ گاڑی پر اس کی بساط سے زیادہ وزن ہے۔ اس لیے انجن پوری رفتار سے چلنے سے قاصر ہے۔

"چند گھنٹے گزرے تو خوشی اور عافیت کا وہ احساس ہوا ہو گا' جو ٹرین پر سوار ہونے کے بعد انہیں ملا تھا۔ اس وقت تو لوگوں کو یہی لگا تھا کہ بس اب خیریت ہی خیریت ہے' بس سمجھو اب پاکستان پہنچ گئے لیکن چند گھنٹوں میں جو مسائل سامنے آئے' انہوں نے مسافروں کے ہوش اُڑا دیے۔ ڈبے میں چھوٹے بچے بھی تھے اور کسی کے پہلو بدلنے کی گنجائش تک نہیں تھی۔ ایسے میں پیشاب پاخانہ کا کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس پر ستم ٹرین کی رفتار' لگتا تھا کہ حشر کے روز ہی پاکستان پہنچے گی۔ بدبو سے دماغ پھٹنے لگا۔ تدارک کی بھی کوئی صورت نہیں تھی۔ لیکن اللہ نے انسان میں سمجھوتا کرنے کی زبردست صلاحیت رکھی ہے۔ مزید چند گھنٹوں میں لوگ اس کے عادی ہو گئے۔ لیکن وہ سلسلہ رکنے والا نہیں' مسلسل بڑھنے والا تھا۔ مسائل کی وہاں کوئی حد نہیں تھی۔ نکلتے

وقت تو صرف جان بچانے کی فکر تھی۔ مگر اب بھوک اور پیاس کا سامنا بھی تھا۔ بچے بھوک سے بلکنے لگے۔ مائیں چمکارتیں اور جھنجلائے ہوئے بے بس باپ بچوں کی پٹائی کر دیتے' اور پھر اس پر دل گرفتہ ہو کر ایک طرف بیٹھ جاتے۔

"رات کے اندھیرے میں ٹرین رک گئی۔ سب سہم گئے کہ شاید حملہ ہونے والا ہے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ جھانکنے پر پتا چلا کہ گاڑی ایک ویرانے میں کھڑی ہے۔ گاڑی وہاں کئی گھنٹے رکی رہی۔

"اس وقت سب کو یقین تھا کہ گاڑی رکی ہے تو حملہ بھی ہو گا۔ بیٹی نے افضال کو ان کا وعدہ یاد دلایا۔ افضال کے ہاتھ میں اس وقت طمنچہ تیار تھا۔ اس نے کہا...... میں نے کہا تا جانِ پدر کہ اس کام کے لیے وعدہ لینے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو میں فرض کے طور پر خود ادا کروں گا۔

"سفر تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ٹرین درمیان میں کسی اسٹیشن پر رکتی تو مسافر سرکاری نلکوں سے پانی بھر لاتے۔ کھانے کی البتہ کوئی سبیل نہیں تھی۔ اس کا کچھ فائدہ بھی نہیں تھا۔ ڈبے کا ماحول اس قدر بدبودار تھا کہ کچھ کھا لینا اور عذاب ہو جاتا۔ بہت لوگوں کو الٹیاں ہو رہی تھیں۔ یوں ڈبے کی گندگی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ چوتھے دن تک سب نڈھال ہو گئے۔ کسی میں جان باقی نہیں رہی تھی۔ کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ یہ سفر بھی ختم ہو گا۔ اور وہ پاکستان کی زمین پر قدم رکھ سکیں گے۔

"چوتھی رات قیامت کی رات تھی۔ ٹرین حسب معمول رکی۔ تین راتیں اسی معمول میں مگر خیر و عافیت سے گزری تھیں۔ اس لیے مسافر مطمئن تھے۔ ادھر ڈرائیور کا کہنا تھا کہ اگلے روز دوپہر تک وہ پاکستان پہنچ جائیں گے۔ ایسے میں اچانک گاڑی پر حملہ ہو گیا۔

"حملہ آور بہت بڑی تعداد میں تھے' اور ان کے پاس ہر طرح کا اسلحہ تھا۔ اس ڈبے میں افضال اور اس کے بیٹوں کے سوا کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ افضال تو اپنی سیٹ پر یوں بیٹھا تھا' جیسے اس کے جسم میں جان ہی نہ رہی ہو۔ اس کے چاروں بیٹے البتہ بے جگری سے لڑ رہے تھے۔ حملہ آوروں کو صرف اسی ڈبے میں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بلکہ ان کا جانی نقصان بھی ہوا تھا۔ انہوں نے پوری طاقت وہیں لگا دی۔

"گھپ اندھیرے میں فائروں کی روشنی کے سوا کوئی روشنی نہیں تھی۔ افضال کو احساس تھا کہ بیٹی ملتجیانہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی ہے۔ مگر اسے اپنا طمنچے والا ہاتھ بے جان محسوس ہو رہا تھا۔

"پھر صبح کا اجالا پھیلنے لگا۔ تب افضال نے دیکھا کہ مزاحمت کرنے والا بس اس کا منجھلا بیٹا بچا ہے۔ اس کے علاوہ تینوں بیٹے شہید ہو چکے تھے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن جسم بے جان ہو رہا تھا' اس سے اٹھا نہیں گیا۔ اسی لمحے اپنے اس بیٹے کو بھی گرتے دیکھا اور ٹوٹتے لفظوں میں اس

کے کلمہ پڑھنے کی آواز سنی۔ پھر اوپر چڑھتے ہوئے ڈبے میں داخل ہوتے ہوئے بلوائیوں کے ست سری اکال کے نعرے گونجے۔

''باباجان......'' بیٹی نے سہمی ہوئی آواز میں بہ مشکل پکارا۔

''اسی لمحے ڈبے پر سکھوں کی یلغار ہوگئی......اوئے بھون ڈالو سب کو......کوئی چلایا۔ ایک گولی چلی......اور اس ڈبے میں افضال کے بیٹوں کے بعد سب سے پہلے شہید ہونے والی اس کی بیوی تھی۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح اس پر گری اور وہ نیچے دب گیا۔ چند ہی ثانیوں میں اس کا لباس ہی نہیں' اس کا چہرہ بھی بیوی کے خون سے نہا گیا۔ طمنچہ اب اس کے بے جان ہاتھ میں لٹک رہا تھا۔

''چند فائر اور ہوئے' چند چیخیں اور ابھریں۔ پھر ایک سکھ چلایا۔ اوئے بے وقوفو' فائر مت کرو۔ اوئے زنانیاں نوں تے چکنا اے۔' اور فائرنگ رک گئی اب حملہ آور کرپانیں اور بلم استعمال کررہے تھے۔ مزاحمت کرنے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ قتل عام ہو رہا تھا۔

''افضال کے لیے اس وقت بیوی کا موٹا پا ڈھال بن گیا۔ وہ بیوی کے نیچے دبا' خون میں نہایا ہوا زندہ ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں اور ان میں دہشت جیسے منجمد ہوگئی تھی۔

''مردوں کو ختم کرنے کے بعد سکھ عورتوں کی طرف متوجہ ہوئے' اور بربریت کا وہ کھیل شروع ہوا' جس پر انسانیت ہمیشہ شرمندہ رہے گی۔ بیوی کے نیچے دبے ہوئے افضال نے دو سکھوں کو اپنی بیٹی کی طرف جھپٹتے ہوئے دیکھا۔ بیٹی نے درد بھری فریاد میں اسے پکارا......
باباجان' ہمیں بچا لیجیے......اپنے ہاتھوں سے ختم کردیجیے۔ آپ نے وعدہ کیا تھا......''

''افضال کے جسم کا ایک ہی حصہ بیوی کی لاش کے بوجھ سے آزاد تھا......اور وہ تھا اس کا طمنچے والا ہاتھ۔ اور اسے یاد تھا کہ اس نے بیٹی سے کیا کہا تھا۔ ایک گولی تمہارے لیے جانِ پدر' اور آخری گولی اپنے لیے۔ مگر وہ اچھے وقت کی بات تھی۔ اب صورتِ حال کچھ اور تھی۔ اس کا دماغ بھی جسم کی طرح شل ہو رہا تھا۔ جسم کے شل ہونے کا سبب تو یہ تھا کہ وہ بیوی کی لاش تلے دبا ہوا تھا۔ مگر دماغ خوف اور محبت کی وجہ سے شل ہو رہا تھا۔ خوف تھا محبت کا......اور محبت زندگی کی۔ بدقسمتی یہ تھی کہ یادداشت نے ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ بیٹی نے جو وعدہ اس سے لیا تھا' وہ بھی اسے یاد تھا اور اس نے خود سے جو عہد کیا تھا وہ بھی نہیں بھولا تھا۔

''خوف سے شل دماغ نے کمزور سی آواز میں ہاتھ کو حکم دیا......فائر کر......لبلبی دبا۔ لیکن وہ آزاد ہاتھ تو دبے ہوئے جسم سے کہیں زیادہ شل تھا۔ اس میں تو جنبش ہی نہیں تھی۔

''بے لباس ہوتی ہوئی بیٹی نے اسے پکارا......باباجان' وعدہ پورا کریں......''

''اس کی بیٹی سے الجھے ہوئے سکھوں میں سے ایک نے اپنے ایک ساتھی سے کہا......
اوئے دیکھ تو' یہ کس بابے کو پکار رہی ہے؟''

''دوسرے سکھ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کی نظر افضال پر جم گئی۔ خون میں نہائے ہوئے افضال کی آنکھوں میں زندگی کی چمک سی محسوس ہوئی۔ خطرناک بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں طمنچہ نظر آرہا تھا۔' اوئے سکھ ویر' ادھر ہے تو ایک بندہ' اس نے اپنے ساتھی کو اطلاع دی۔' لگتا تو مرا ہوا ہے۔ ہاتھ میں پستول بھی ہے۔ پر آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔' پھر وہ محتاط انداز میں افضال کی طرف بڑھا۔

''اس کے ساتھی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ مرتے وقت آنکھیں بند کرنے کی مہلت نہیں ملی ہوگی۔ چل اچھا ہے' یہی بابا ہے تو اپنی بیٹی کا خال مرنے کے بعد بھی دیکھ سکے گا۔'

''افضال نے یہ باتیں سنیں تو اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اس پر غشی سی طاری ہوگئی۔ سکھ اس کے پاس آکر رکا اور اس کی آنکھوں میں بہت غور سے دیکھنے لگا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ اس وقت طمنچے کی رینج میں ہے۔

''مگر افضال تو ان لمحوں میں دہشت سے ساکت ہوگیا تھا' جیسے سانس بھی لینا بھول گیا تھا۔ اس وقت اگر اس کی انگلی لبلبی پر دباؤ ڈال دیتی تو کم از کم وہ سکھ تو جہنم رسید ہو جاتا۔ مگر وہ تو موت کے خوف سے جیسے پتھر ہوگیا تھا۔ جسم میں سانس تک کی جنبش نہیں تھی۔

''اس کا معائنہ کرنے والے سکھ نے پلٹ کر اپنے ساتھی سے کہا۔' اوئے سکھ ویر' یہ تو مر چکا ہے۔ پر ایک بات ہے۔ پکی بات......آدمی تھا نامرد' پستول ہاتھ میں لیے بیٹھے بیٹھے مر گیا۔ اوئے ایک فیر بھی تو نہیں کیا نامرد نے۔' پھر وہ افضال کی طرف مڑا۔' اب اس پستول کا کیا کرنا ہے تُو نے۔ لا یہ مجھے دے دے۔ تیرے بھائیوں کے ہی کام آئے گا۔ یہ کہہ کر اس نے افضال سے پستول لینے کی کوشش کی۔

''افضال کے بس میں ہوتا تو وہ فوراً ہی طمنچہ چھوڑ دیتا لیکن خوف کی شدت سے اس کا جسم سچ مچ کسی مردے کی طرح اکڑ گیا تھا۔ گرفت کم کرنا بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ وہ تو سچ مچ کسی مردے کی گرفت تھی۔

''سکھ نے تھوڑی دیر زور لگایا' پھر پیچھے ہٹ گیا۔

''ادھر بربریت کا وہ کھیل شروع ہوگیا۔ افضال کی معصوم اور اچھوتی بیٹی اس کی آنکھوں کے سامنے پامال کی جا رہی تھی' اور وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے وہ منظر دیکھنے پر مجبور تھا۔ وہ نگاہیں ہٹانے پر بھی قادر نہیں تھا۔ اندر' کہیں بہت گہرائی میں زندگی کی محبت نے بزدلی کا روپ دھار کر اسے پتھر کا بت بنا دیا تھا......پتھر کا بت' جو نہ جنبش کرتا ہے اور نہ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آتے

ہیں۔

"اس کے اندر کوئی جذبہ، کوئی احساس نہیں بچا تھا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ پامال ہونے والی اس کی بیٹی اس کی آبرو ہے۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ اس کی بیٹی اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں شکایت لیے اسی کو تک رہی ہے۔ جیسے اسے اپنے اوپر گزرنے والی قیامت کا ادراک ہی نہ ہو۔ بس یہ طے تھا کہ بری طرح روندے جانے کے باوجود وہ زندہ ہے لیکن پتھر بنے افضال کو اس بات پر حیرت بھی نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ ایک سانس لیتا ہوا مردہ تھا، جو نہ سوچ سکتا تھا، نہ کچھ محسوس کر سکتا تھا۔

"اس کے نزدیک وہ چند منٹ قیامت کے دن کی طرح تھے، جس کی طوالت سے اللہ کے پسندیدہ بندے بھی پناہ مانگتے ہیں۔ اس کے لیے وہ یوم حساب تھا۔ اس کی روح میں بڑے بڑے گھاؤ پڑ رہے تھے۔

"بالآخر کھیلنے والوں کا کھلونے سے دل بھر گیا۔ چلو...... اب اسے چھوڑو اور باہر نکلو۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ لیکن دوسرا اب بھی بے لباس بکھری ہوئی افشاں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ یہ کوئی چھوڑنے والی چیز ہے۔ اسے تو ساتھ لے کر چلیں گے یارا۔ اس کے ایک ساتھی نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔ گھر میں ڈالے گا کیا؟ اس پر وہ برا مان گیا۔ او نہیں یارا...... کچھ دن عیش کریں گے سب یار۔ پھر بیچ دیں گے سالی کو۔

"افشاں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ خدا کے لیے...... مجھے مار دو۔"

"اس کو پسند کرنے والے سکھ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ 'ہم خدا کے لیے نہیں مارتے' واہگورو کے لیے مارتے ہیں۔ خدا کے لیے مارنے کو اپنے بابا سے کہنا تھا۔ پر وہ تو آپ ہی مر گیا خدا کے لیے۔" پھر اس نے بے لباس افشاں کو کھلونے کی طرح اٹھایا اور کندھے پر ڈال کر ڈبے سے نکل گیا۔

"افضال اسی طرح پتھر بنا پڑا رہا۔ اسے نہیں پتا کہ کب ٹرین پاکستان پہنچی۔ لاہور کے اسٹیشن پر رضاکاروں نے اس کی بیوی کی لاش ہٹائی تب بھی وہ اسی طرح پڑا رہا۔ کیمپ میں دو دن بعد اسے ہوش آیا۔ اور ہوش آیا تو اسے پتا چلا کہ کوئی انسان پتھر نہیں بن سکتا۔ اسے تو سب کچھ یاد تھا۔ اور وہ منظر تو اس کے حافظے پر پوری جزئیات سمیت نقش تھا۔ یہ کہانی ہے اس بے غیرت افضال کی۔" یہ کہہ کر افضال صاحب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

❀......❀......❀

افضال صاحب کی کہانی نے عبدالحق کو اداس کر دیا تھا۔ آدمی غلطیاں کرتا ہے، پھر اپنے باطن میں کیسے کیسے عذاب جھیلتا ہے۔ اب وہ افضال صاحب کے کرب کو سمجھ سکتا تھا۔ ساری گرہیں کھل

گئی تھیں۔ افضال صاحب کا دنیا میں کوئی بھی تو نہیں بچا تھا۔ پھر بھی وہ ہر روز کسی جستجو میں مارے مارے پھرتے تھے۔ وہ کہتے تھے ان کے لوگ کھو گئے ہیں۔ وہ کہتے تھے، شہید کبھی نہیں مرتے، کون جانے کہاں، کس روپ میں مل جائیں۔ اسی لیے وہ انہیں ڈھونڈتے ہیں۔

اب عبدالحق سمجھ سکتا تھا کہ افضال صاحب کی اپنے بارے میں یادداشت پوری طرح تو اب کھوئی ہے۔ لیکن نارمل تو وہ پہلے بھی نہیں تھے۔

جو کچھ ان پر گزری تھی، اس کے بعد وہ نارمل تو رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ شعوری طور پر ان واقعات کو انہوں نے بھلا دیا تھا۔ مگر وہ انہیں یاد رکھتے تو یقیناً خودکشی کر لیتے یا پاگل ہو جاتے۔ اور انہوں نے ایسا کیا تو صرف اس لیے کہ وہ اپنے کیے کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جن واقعات کو اپنی دانست میں انہوں نے بھلا دیا تھا، وہ درحقیقت ان کے لاشعور میں محفوظ تھے۔

افضال صاحب کے لیے ان کا اپنا وجود بے غیرتی کی علامت تھا۔ صرف تلافی ہی ان کے داغ کو کسی حد تک دھو سکتی تھی۔ مگر پوری طرح تو وہ داغ مٹنے والا نہیں تھا

عبدالحق کو اس روز بڑی حیرانی ہوئی تھی کہ افضال صاحب ہیرا منڈی کیوں گئے تھے۔ اور انہوں نے بتایا تھا کہ وہ وہاں آتے رہتے ہیں۔ اب عبدالحق اس کا سبب سمجھ سکتا تھا افضال صاحب کو تلافی کا موقع ملا تو خوش قسمتی سے وہ ان کے ساتھ تھا۔ بلکہ اس نے ان کے کام کو بھی آسان کر دیا تھا ورنہ نجانے کیا کرتے۔ بہرحال اس روز ان کی جستجو بارآور ثابت ہوئی۔

تو وہ بازار حسن میں اپنی بیٹی کی تلاش میں آتے تھے۔ وہ سب سے کہتے تھے کہ ان کے گھر میں کوئی زندہ نہیں بچا۔ سب شہید ہو گئے۔ حالانکہ یہ حقیقت نہیں تھی۔ مگر وہ کسی کو اپنی بیٹی کے بارے میں کیسے بتا سکتے تھے۔ وہ تو ان کی روح کا ناسور تھا۔ انہوں نے وہ منظر دیکھا تھا جو کسی بیٹی کا باپ نہیں دیکھ سکتا۔ مگر انہوں نے دیکھا تھا۔ وہ بڑی آن بان والے تھے۔ لیکن آزمائش کے ایک کمزور لمحے میں ان پر زندگی سے بے غیرتی کی حد تک محبت کا اور موت کے خوف کا عذاب اترا تھا۔

پھر اگر وہ بیٹی ان کی آنکھوں کے سامنے مر جاتی، تب بھی شاید انہیں کسی حد تک قرار آ جاتا۔ لیکن ظالم سکھ نہ صرف ان کی زندہ بیٹی کو اٹھا کر لے گئے تھے، بلکہ یہ اعلان بھی کر گئے تھے کہ وہ اسے بازار کی جنس بنا دیں گے۔

عبدالحق حساس اور دردمند تھا۔ وہ سوچ سکتا تھا کہ افضال صاحب کس کس طرح سوچتے ہوں گے، کیسے بے یقینی میں مبتلا رہتے ہوں گے۔

وہ یہ یقین کرنا چاہتے ہوں گے کہ ان کی بیٹی مر گئی ہوگی۔ لیکن یہ امکان انہیں ڈستا ہوگا کہ وہ زندہ ہوگی اور کسی بازار میں کسی کوٹھے پر بے غیرتی کی زندگی گزار رہی ہوگی...... صرف ان کی بزدلی اور بے غیرتی کی وجہ سے۔ ان کا جی چاہتا ہوگا...... بلکہ ان کی زندگی کا یہی واحد مقصد ہوگا اور یہی

واحد آرزو کہ کسی طرح وہ انہیں مل جائے اور وہ اسے ذلت کی اس دلدل سے نکال لائیں۔

انہیں یہ خیال بھی ستاتا ہوگا کہ قوی امکان یہی ہے کہ وہ ہندوستان میں ہی کہیں ہوگی۔ کہا پتا' انہوں نے سوچا ہو کہ افشاں تو اب انہیں نہیں مل سکتی۔ وہ کسی لڑکی کو اس طرح کی زندگی سے نجات دلا سکیں تو شاید ضمیر کا بوجھ کچھ کم ہو۔ شاید اسی لیے وہ ہر شام بازارِ حسن جاتے ہوں گے اور کوٹھے پر بیٹھی بجی سنوری لڑکیوں میں کوئی شناسا سا چہرہ تلاش کرتے ہوں گے۔

اور بالآخر وہ کامیاب ہو گئے۔ انہیں زرینہ مل گئی' اور اسے بازار سے نکال بھی لائے۔

اس تلافی سے افضال صاحب کا بوجھ ہلکا ہوتا لیکن زرینہ کو بازار تک پہنچانے میں جمیل کا کردار آڑے آ گیا۔ تلافی کی خوشی دھری رہ گئی۔ جمیل کے کردار نے انہیں ان کا ماضی یاد دلا دیا۔ لاشعور میں دبی ہوئی یادیں ابھر آئی ہوں گی۔ اپنی ذلت کا زخم ہرا ہو گیا ہوگا۔ اسی لیے تو جمیل انہیں جمیل نہیں' افضال لگا۔ افضال جوان کے نزدیک اس دنیا میں بے غیرتی کی علامت تھا۔ اور انہوں نے افضال کو قتل کر کے جیسے دنیا کو پاک کر دیا اور خود کو بری کرا لیا۔

عبدالحق کا جی چاہا کہ افضال صاحب کو یاد دلائے کہ انہوں نے ایک نیکی کی ہے' تلافی کی ہے۔ یوں وہ انہیں واپس لانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں فوراً ہی یہ بات آ گئی کہ یہ اور زیادہ مخدوش ثابت ہو سکتا ہے۔ امکان یہی تھا کہ اگر افضال صاحب نے خود کو افضال مان لیا تو وہ خودکشی کر لیں گے۔ ان کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ کسی شناخت کے بغیر' دماغی امراض کے اس اسپتال میں اپنی باقی ماندہ زندگی بے نام گزار دیں۔ کم از کم اذیت سے تو بچے رہیں گے۔ یہ سوچتے ہوئے اس کا دل بہت دکھا لیکن زندگی کے حقائق کو سمجھنا اور قبول کرنا وہ سیکھ چکا تھا۔

بہرحال افضال صاحب کے اس راز کو اس نے اپنے سینے میں دفن کر لیا۔ اس سلسلے میں اس نے مسعود صاحب کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ ''میں نہیں سمجھتا سر کہ ان کی یادداشت کبھی بحال ہوگی۔'' اس نے اداس لہجے میں ان سے کہا۔

''میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ انہوں نے جمیل پر خود کو قیاس کیوں کیا۔'' مسعود صاحب نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ ''ان کے اور جمیل کے درمیان کوئی قدر مشترک ہی نہیں۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔'' عبدالحق نے گڑگڑا کر کہا۔ مسعود صاحب جس نہج پر سوچ رہے تھے' وہ انہیں درست نتیجے تک پہنچا سکتی تھی۔ ''لیکن سر' انسانی دماغ عجیب بھول بھلیاں ہے......''

''پھر بھی' اگر وہ جمیل کو افضال سمجھے اور افضال سمجھ کر ہی انہوں نے اسے قتل کیا تو ان کے اور جمیل کے درمیان کوئی مماثلت ہوگی ہی۔''

''نہیں سر' آپ خود سوچیں۔ کہاں افضال صاحب کہاں جمیل۔ نہ تو ان کی ذہنی سطح ایک ہے

اور نہ ہی اسٹیٹس' دونوں کا پس منظر بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔'' عبدالحق نے جلدی سے تردید کی۔

''میں کسی باطنی مماثلت کے امکان پر غور کر رہا ہوں۔''

''انہیں موضوع سے ہٹانے کے لیے عبدالحق کو ان کے پسندیدہ موضوع پر بات چھیڑنا پڑی۔ ''اور سر آپ کے سول سروس کے اسٹرکچر کا کیا حال ہے؟ کچھ بہتری نظر آئی؟'' اس نے کہا۔

''فی الحال تو نہیں لیکن بہتری تو انشاء اللہ آئے گی۔'' مسعود صاحب ایک دم پُرجوش ہو گئے۔ ''ارے ہاں' میرا ابھی تبادلہ ہونے والا ہے۔''

''کہاں؟''

''اکنامک پلاننگ ڈویژن میں۔''

''اور آپ خوش ہیں اس میں؟''

''ہاں میاں' میرا اصل شعبہ تو وہی ہے۔ اور اس وقت تو بڑی اہمیت ہے اس کی۔ یہاں تو میں اپنی مرضی سے بیٹھا تھا۔ مقصد خدمتِ خلق بھی تھا اور آنے والوں کی تعداد' ان کے دکھوں اور ان کے مسائل کو سمجھنا بھی۔ مگر اب پاکستان کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ یہ طے ہے کہ پاکستان کی بقا کے لیے اس کا معاشی استحکام بہت ضروری ہے۔ معیشت کے لیے طویل پلاننگ کرنی ہوگی۔'' وہ کہتے کہتے رکے۔ ''ارے ہاں' تم سے بھی تو میں نے اس سلسلے میں بات کی تھی۔ اور تم نے وعدہ بھی کر لیا تھا۔''

''جی ہاں۔ لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' انہوں نے کہا اور ہنسنے لگے۔ ''وہ تو تم نے میرے ایک احسان کے صلے میں وعدہ کیا تھا۔ پورا تو کرنا پڑے گا۔''

عبدالحق جانتا تھا کہ وہ زرینہ کا حوالہ دے رہے ہیں...... اور وہ بھی سنجیدگی سے نہیں۔ ''وعدہ کر کے میں کبھی پیچھے نہیں ہٹتا سر' لیکن میرا ایک بار گاؤں واپس جانا ضروری ہے۔ اور گاؤں میں اس وقت تک نہیں جا سکتا' جب تک یہاں آنے کا مقصد پورا نہ ہو جائے۔''

''مجھے یاد ہے' تمہیں کسی کی تلاش ہے۔ مگر میاں' صرف ایک نام کے حوالے سے کسی کو تلاش کرنا آسان نہیں۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ ''ویسے لاہور میں سیٹل ہو گئے تو شاید یہ کام آسان ہو جائے گا۔''

''آپ کا میرے سلسلے میں ارادہ کیا ہے۔''

''میں جانتا ہوں کہ کم از کم فی الحال پیسہ تمہارا مسئلہ نہیں۔ یہاں میں نے ایک کوٹھی تمہارے لیے پسند کر لی ہے۔ وہ خرید و اور گھر والوں کو یہاں لے آؤ۔ تعلیم مکمل کرو' مقابلے کا امتحان پاس کرو'

اوراس ملک کی خدمت کرو۔‘‘

’’کوٹھی بھی پسند کر چکے ہیں آپ؟‘‘ عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

’’ہاں میاں۔ وہ کلیم ڈیپارٹمنٹ میں میرا ایک دوست ہے اچھے عہدے پر۔ اس سے بات کی تھی۔ وہ کوٹھی مشتاق نے ہندوستان سے آئے ہوئے ایک مہاجر کو الاٹ کی تھی‘ جو وہاں صاحب حیثیت ہوتے تھے۔ اب وہ صاحب چاہتے ہیں کہ اس کوٹھی کو بیچ کر کوئی چھوٹا سا مکان لیں اور باقی رقم سے کوئی کاروبار شروع کریں‘ تاکہ آمدنی کا سلسلہ شروع ہو۔ کوٹھی بہت شان دار تھی۔ دیکھو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔‘‘

مگر عبدالحق کوٹھی سے آگے کچھ دیکھ رہا تھا۔ ’’آپ کے دوست تو میرے کام بھی آسکتے ہیں۔‘‘

’’کیسے؟ کیا مطلب؟‘‘

’’دیکھیں نا‘ میں رضوان صاحب کی تلاش میں ہوں۔ رضوان صاحب بھی آگرہ میں صاحب حیثیت تھے اور وہ پاکستان بننے سے پہلے یہاں آگئے تھے انہوں نے بھی تو اپنی وہاں کی املاک کے بدلے یہاں کچھ لیا ہوگا...... اور کلیم ڈیپارٹمنٹ سے ہی لیا ہوگا۔ تو وہاں ریکارڈ میں ان کا نام یقیناً ہوگا...... ان کا موجودہ پتا بھی۔‘‘ یہ کہتے کہتے اس کا لہجہ ہیجانی ہو گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ جو بات اس نے ایک موہوم سے امکان کے خیال سے شروع کی تھی‘ وہ درحقیقت ایک فیصلہ کن پیش رفت ثابت ہو سکتی ہے۔

ادھر مسعود صاحب بھی سنبھل کر بیٹھ گئے...... بیٹھ کیا گئے‘ گرتے گرتے بچے۔ ’’کمال ہے۔ مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔‘‘ انہوں نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ ’’حالانکہ یہ تو سامنے کی بات تھی۔‘‘

’’بعض اوقات سامنے کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔‘‘ عبدالحق نے کہا۔ ’’بس اب آپ مجھے مشتاق صاحب سے ملوا دیجیے۔‘‘

❁ ❁ ❁

زرینہ حیران تھی۔ نور بانو اس کے لیے یکسر بدل گئی تھی۔ اب نہ تو وہ اس سے تفتیش کرتی تھی اور نہ ہی اس کا انداز طنزیہ ہوتا تھا۔ عبدالحق سے دوروزہ شناسائی کا جو طعنہ اس کے لیے وبالِ جان بن گیا تھا‘ اب وہ بھی نور بانو کی زبان پر نہیں آتا تھا۔ پہلے دو دن تو وہ یہ سوچ کر محتاط ہو گئی کہ کہیں یہ بھی کسی نئی حکمت عملی کا حصہ نہ ہو۔ لیکن پھر اسے نور بانو کے خلوص کا اندازہ ہو گیا۔ وہ تو سچ مچ اس کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آنے لگی تھی۔ البتہ انداز اُس کا مربیانہ تھا۔ مگر زرینہ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بلکہ اس سے تو اسے مزید تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ پھر زرینہ کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ نور بانو کے خدشات دور ہو گئے ہیں اور اب وہ عبدالحق کے معاملے میں اسے اپنا حریف نہیں سمجھتی۔ یہ کیسے ہوا‘ اس کا اسے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ اور اس بات کی کوئی اہمیت بھی نہیں تھی۔

اس رات وہ سونے کے لیے لیٹیں تو نور بانو نے بالکل اچانک اُسے کہا۔ ’’سنو زرینہ‘ تم مجھے میرے پچھلے رویے پر معاف کر دو۔‘‘

زرینہ کو بہت حیرت ہوئی۔ ’’مگر مجھے تو آپ سے کوئی شکایت نہیں۔‘‘ اُس نے دھیرے سے کہا۔

’’لیکن تمہیں تکلیف تو پہنچی ہوگی میرے رویے سے۔ میں سچ مچ بہت شرمندہ ہوں۔‘‘

’’آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ اس کا سبب ایک غلط فہمی تھی۔‘‘

’’نہیں...... وہ میرا چھوٹا پن تھا۔ اس کا سبب میرے دل کی تنگی تھی۔‘‘ نور بانو کے لہجے میں شرمندگی تھی۔ ’’مگر بعد میں مَیں نے غور کیا تو میری سمجھ میں آیا کہ تم اور میں تو دو سگی بہنوں کی طرح ہیں‘ جن کے دکھ درد مشترک ہیں۔ تم بھی اپنا سب کچھ کھو کر آئی ہو اور میرے پاس بھی کچھ نہیں بچا۔ ہم دونوں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ لٹتے دیکھا ہے۔ مجھے تو تم سے صرف محبت کرنی چاہیے۔‘‘

اُس کے لہجے کی سچائی نے زرینہ کے دل کو چھو لیا۔ ’’میرے دل میں تو آپ کے لیے عزت اور محبت کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔‘‘ وہ بولی۔

مگر نور بانو اس وقت کسی رو میں بہہ رہی تھی۔ اس نے جس طرح اپنی بہنوں کو پامال ہوتے دیکھا تھا‘ اور اُس کی اپنی جو کیفیت تھی‘ وہ سب زرینہ کو سنا ڈالی۔ پہلی بار اسے ایسا لگا‘ جیسے قلب اور روح پر سے ہر بوجھ پوری طرح ہٹ گیا ہے۔ ’’میں خوش نصیب تھی کہ ان لوگوں کی پناہ میں آ گئی۔‘‘ عبدالحق کا نام لیتے لیتے رک گئی۔ ’’اور ان لوگوں کے روپ میں مجھے سب کچھ مل گیا۔ ہر رشتہ مل گیا۔ ورنہ میرا کیا حشر ہوتا۔‘‘ اس خیال سے ہی اسے جھرجھری آ گئی۔

لیکن مجھ پر جو گزری ہے‘ وہ تو میں تمہیں بتا بھی نہیں سکتی۔ زرینہ نے دل میں سوچا۔ پھر بڑے خلوص سے نور بانو سے بولی۔ ’’چلیں...... اب میری صورت میں آپ کو بہن بھی مل گئی۔ اور میری اپنی محرومی بھی دور ہو گئی۔‘‘

اس رات کے بعد وہ دونوں بہت قریب ہو گئیں۔ دن میں بھی ان کا وقت ساتھ گزرنے لگا۔

زرینہ نے مینو کو نور بانو کے آگے پیچھے پھرتے دیکھا تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔ یہ بات اسے اور عجیب لگی کہ نور بانو اسے اپنے ہاتھ سے کھلاتی ہے۔ ویسے تو نور بانو کے پاس بکروں کی ایک جوڑی بھی تھی‘ اور وہ ان کا بھی خیال رکھتی تھی۔

’’حیرت ہے‘ آپ کو جانور پالنے کا شوق ہے۔‘‘ ایک دن زرینہ نے اُس سے کہا۔ ’’آپ تو بول چال سے مجھے شہری لگتی ہیں۔‘‘

’’ہاں، میں دہلی کی ہوں۔‘‘ نور بانو نے کہا۔ ’’اور شاید اسی لیے مجھے جانور پالنے کا شوق ہوا۔ کیونکہ اپنے گھر میں تو میں نے ایسا دیکھا ہی نہیں تھا۔ زبیر بھائی ان دنوں بکریوں کی فارمنگ کر

رہے تھے۔ ایک بکری نے یہ دو بچے دیے...... ''نور بانو نے اپنی جوڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ''...... تو میں نے ان سے مانگ لیے۔ یہ چھوٹے تھے تو اتنے خوب صورت تھے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔''

''میں سوچ سکتی ہوں۔'' زرینہ نے آہستہ سے کہا۔ ''ہمارے گھر میں بھی بکریاں پالی جاتی تھیں۔'' ایک لمحے کو وہ اداس ہو گئی۔ پھر سنبھل کر بولی۔ ''لیکن آپ ان سے زیادہ توجہ اس مینڈھے کو دیتی ہیں۔''

نور بانو کی نگاہیں جھک گئیں۔ ''یہ مجبوری ہے۔ اس کے نخرے بہت ہیں۔''

زرینہ نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر اچانک چھانے والی سرخی اس نے دیکھ لی تھی۔ ''کیا مطلب؟''

''ایسے نہیں سمجھو گی تم۔ اچھا اسے کچھ کھلا کر دکھاؤ۔''

زرینہ نے کوشش کی لیکن مینو نے اس طرف دیکھا بھی نہیں۔ زرینہ نے اسے بادام کا لالچ بھی دیا لیکن ناکام رہی۔ ''واقعی...... یہ تو بڑے نخرے والا ہے۔ لگتا ہے' صرف آپ کے ہاتھ سے کھاتا ہے۔ آپ نے اس کی عادتیں بگاڑ دی ہیں۔''

''نہیں...... یہ میرا نہیں ہے' اور اس کی عادتیں بھی میں نے نہیں بگاڑی ہیں۔''

''تو پھر؟''

''اسے عبدالحق صاحب لائے تھے۔'' نور بانو کی نگاہیں پھر جھک گئیں۔ ''وہ اس کا ہر کام خود کرتے تھے۔ اور یہ ہر وقت ان کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ پھر وہ اچانک لاہور چلے گئے۔ انہیں تو پتا بھی نہیں ہوگا کہ اس بے چارے پر کیا گزری۔''

زرینہ کی دلچسپی بڑھ گئی۔ مینو بڑی محبت سے نور بانو کے گھٹنے سے سر رگڑ رہا تھا۔ ''مجھے بتائیں نا۔'' زرینہ نے کہا۔

''ان کے جانے کے بعد اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ پاگلوں کی طرح انہیں ڈھونڈتا پھرتا تھا' اس لیے باندھنا پڑ گیا۔ جان کے لالے پڑ گئے۔''

''تو پھر آپ سے یہ کیسے رام ہو گیا؟''

''مجھ سے نہیں' اس چادر سے۔'' نور بانو نے اپنی چادر کی طرف اشارہ کیا۔

''میں سمجھی نہیں۔''

نور بانو چند لمحے جھجکتی رہی۔ پھر سر جھکا کر بولی۔ ''یہ چادر اس کے مالک کی ہے۔ اس میں ان کی خوشبو ہے۔ اس کی وجہ سے اس نے مجھے ان کا مقام دے دیا۔''

''اللہ...... اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ بھوکا مر جاتا۔'' زرینہ نے کہا۔

''اللہ نہ کرے۔ یہ تو ان کی امانت ہے۔'' نور بانو نے بے ساختہ کہا۔

اس لمحے زرینہ پر نور بانو کی محبت پوری طرح واضح ہو گئی۔ یہ لڑکی عبدالحق کو دیوانہ وار چاہتی ہے۔ اس نے سوچا۔ ''یہ تو بتائیں کہ بھائی لاہور کیوں گئے ہیں؟''

''ایک کام سے گئے ہیں' اور جب تک کام نہ ہو جائے' واپس نہیں آئیں گے۔'' نور بانو نے اداسی سے کہا۔

''ایسا کیا کام ہے وہاں۔''

''وہ میرے چچا کو تلاش کرنے گئے ہیں' تاکہ مجھے ان کے سپرد کر کے سرخرو ہو جائیں۔''

''اللہ نہ کرے کہ وہ کامیاب ہوں۔''

نور بانو نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''یہ کیوں کہا تم نے؟''

''کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ آپ یہاں سے جائیں۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ آپ یہاں سے نہیں جانا چاہتیں۔'' زرینہ نے کہا۔ ''سنیں نور بانو' بھائی آپ کو اچھے لگتے ہیں نا۔''

نور بانو چند لمحے خاموش رہی۔ پھر بولی۔ ''چاند کسے اچھا نہیں لگتا۔ وہ تو ساری دنیا کو اچھا لگتا ہے۔''

''بے شک' لیکن ویسے نہیں' جیسے چکور کو اچھا لگتا ہے۔''

''لیکن ملتا تو چکور کو بھی نہیں۔'' نور بانو نے اداسی سے کہا۔

''یہ تو قصے کہانیوں والی بات ہے۔ ورنہ وہ بھی انسان ہیں اور آپ بھی انسان ہیں۔'' زرینہ نے بے پروائی سے کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے نور بانو کہ آپ جان بوجھ کر اداس رہنا چاہتی ہیں۔ اچھی باتیں سوچا کیجیے۔ دیکھیں نا' میں اور آپ...... ہم لوگ اتنا کچھ دیکھ چکے ہیں کہ مایوس تو ہمیں ہونا ہی نہیں چاہیے۔''

''مگر جب صورت حال ہی مایوس کن ہو تو......''

زرینہ نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''ویسی مایوس کن تو نہیں ہو سکتی' جس سے آپ ہندوستان میں گزری ہوں گی۔''

''ہاں...... یہ تو ہے۔'' نور بانو نے اعتراف کیا۔

''اور اللہ آپ کو عزت کے ساتھ وہاں سے نکال لایا نا...... اور اب آپ عافیت میں ہیں۔''

اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں تھا۔ نور بانو نے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

''تو اب ہم مایوس ہوں تو یہ ناشکرا پن ہی ہوا نا۔ اور ناشکرا پن تو خود مایوسی کا سبب ہوتا

ہے۔"

اس لمحے نور بانو کو اس پر بہت پیار آیا۔ اس نے لفظ ہم استعمال کر کے اس کی شرمندگی کم کر دی تھی۔ بلکہ خود کو بھی اس کے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ اور یہ احساس تو اسے پہلے ہی سے تھا کہ اس کا مسئلہ ہی ناشکرا پن ہے۔

"دیکھیں نور بانو' آپ نے تو اپنی کہانی مجھے سنا دی لیکن میں تو آپ کو بتا بھی نہیں سکتی کہ مجھ پر کیا گزری۔ بس یہ سمجھ لیں کہ آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ اب میں یہاں ہوں تو بہت خوش ہوں۔ میں سوچتی ہوں کہ اللہ نے مجھے جہنم سے نکالا اور جنت میں پہنچا دیا۔ اُنہوں نے میری بہتری کی فکر کی' جبکہ میری فکر کرنے والا کوئی نہیں بچا تھا۔ ہاں کبھی مجھے مستقبل کی فکر ہوتی ہے۔ یہ تو فطرت ہے۔ مگر میں چند لمحوں میں اسے جھٹک دیتی ہوں۔ جو اللہ مجھے کیمپ کی بے گھری سے نکال کر ایک گھر میں لایا' اس نے میرے مستقبل کا معاملہ بھی طے کر دیا ہوگا۔ اتنا کچھ دیکھنے کے بعد میرا کام اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا نہیں۔ مجھے تو صرف اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے' بلکہ اس سے بھی پہلے مجھے ناشکرے پن سے بچنا چاہیے۔ آگے جو ہوگا' انشاء اللہ اچھا ہی ہوگا۔ کیونکہ اس سے برا تو نہیں ہو سکتا' جو پہلے ہو چکا ہے۔"

نور بانو چند لمحے اُس کے چہرے کو بہت غور سے دیکھتی رہی۔ اُس کی نگاہوں میں زرینہ کے لیے محبت تھی۔ پھر اُس نے زرینہ کا ہاتھ تھام لیا۔ "تم بہت اچھی ہو زرینہ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں غلط سمجھا تھا۔ میں شرمندہ ہوں۔"

"اس میں آپ کی غلطی نہیں تھی۔ صورتِ حال ہی ایسی تھی۔" زرینہ نے بے حد خلوص سے کہا۔

❁ ❁ ❁

ڈاکٹر محمود واسطی حق نگر میں آباد وہ واحد آدمی تھے' جو وہاں مہاجر کی حیثیت سے نہیں آئے تھے۔ وہ حیثیت میں بھی کم نہیں تھے۔ ہجرت سے پہلے الہ آباد میں ان کی بڑی کامیاب پریکٹس تھی اور ان کا شمار وہاں کے خوشحال لوگوں میں ہوتا تھا۔ ہجرت کر کے وہ لاہور پہنچے تو ان کے پاس کثیر نقد رقم بھی تھی اور زیورات بھی۔ بیوی کے علاوہ ان کے بس دو بیٹے تھے' اور دونوں جوان تھے۔ اس کے باوجود وہ لاہور میں مہاجر کیمپ میں رہے۔ وہ اپنے بچوں کو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ ہجرت کے دوران اور ہجرت کے بعد لوگوں پر کیا کیا گزری ہے۔ کیمپ کے انچارج مسعود صاحب ان کے گرویدہ ہو گئے۔ مسعود صاحب کے توسط سے وہ عرفان صاحب سے ملے۔

پاکستان میں اپنی پریکٹس کا آغاز انہوں نے مہاجر کیمپ سے کیا تھا۔ ان کے نظریات کچھ عجیب تھے۔ ان کا سوچنا یہ تھا کہ پیسے مقصد نہیں۔ دونوں بیٹے اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں

گے۔ چنانچہ اب انہیں پیسہ کمانے سے زیادہ اپنے مقدس پیشے کے ذریعے خدمت کرنے کی فکر تھی۔ اور وہ سوچتے تھے کہ کسی بڑے شہر کی بجائے دیہی علاقے میں پریکٹس کریں۔

محکمۂ زراعت کے افسر عرفان احمد کے دفتر میں پٹواری حسن دین سے اتفاقاً ان کی ملاقات ہوئی۔ حسن دین سے انہوں نے عبدالحق کا تذکرہ سنا۔ انہوں نے حسن دین سے کہا کہ وہ اس گاؤں کو دیکھنا اور عبدالحق سے ملنا چاہتے ہیں۔

یوں وہ حق نگر آئے اور عبدالحق سے ملے۔ ان دنوں ریت ہٹانے کا کام اپنے آخری مرحلے میں تھا۔

عبدالحق سے مل کر انہیں حیرانی ہوئی۔ جو کچھ انہوں نے اس کے بارے میں سنا تھا' اس کی روشنی میں انہوں نے اس کی عمر کا جو اندازہ لگایا تھا وہ اس سے بہت چھوٹا تھا۔ وہ تقریباً ان کے چھوٹے بیٹے کی عمر کا تھا۔ وہ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں لگا کہ وہ اس نوجوان کے روپ میں مستقبل کے ایک بہت بڑے آدمی کو دیکھ رہے ہیں۔

انہوں نے عبدالحق سے بات کی کہ وہ یہاں آباد ہونا چاہتے ہیں۔ عبدالحق تو نہال ہو گیا۔ گاؤں والوں کی ایک بہت بڑی ضرورت پوری ہو رہی تھی۔ گاؤں کو ایک اچھا اور مستند ڈاکٹر میسر آ رہا تھا۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ جہاں' جتنی زمین چاہیں' انہیں مل جائے گی۔

"دیکھیے عبدالحق صاحب' ہم زمین دار تو ہیں نہیں۔ زرعی زمین کی تو ہمیں ضرورت نہیں۔ اور ایک بات یہ کہ میں زمین کی قیمت ادا کروں گا' ایسے نہیں لوں گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ صاحبِ حیثیت ہیں۔" عبدالحق نے قدرے حیرت سے کہا۔

"الحمدللہ' اللہ کے فضل و کرم سے کسی چیز کی کمی نہیں ہے میرے پاس۔"

"تو پھر آپ لاہور میں آباد ہونے کے بجائے یہاں کیوں آ رہے ہیں۔"

"ایک وجہ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر کی ضرورت یہاں زیادہ ہے۔ لاہور میں تو ڈاکٹروں کی کمی نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میری نگاہیں مستقبل میں آگے تک دیکھ رہی ہیں۔ میں کسی بڑے آدمی سے جڑنا...... اس کے سائے میں رہنا چاہتا ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"میں آپ کو سمجھاؤں گا بھی نہیں۔ بس میں پاکستان میں مختلف زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔"

"تو بسم اللہ ڈاکٹر صاحب' حق نگر آپ کے لیے حاضر ہے۔"

"آپ نے یہاں رہائشی علاقے کے لیے تو جگہ مختص کی ہوگی۔" ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

"دیکھیں...... یہاں اس وقت دو ہی پیشے ہیں۔ زراعت اور فارمنگ۔ دونوں میں آدمی اپنی زمین کے پاس ہی گھر چاہتا ہے۔"

"مگر میں کچھ اور دیکھ رہا ہوں عبدالحق صاحب۔" ڈاکٹر محمود نے کہا۔ "آپ اسے گاؤں دیکھتے ہیں۔ جبکہ مجھے یہ کچھ اور نظر آ رہا ہے...... چھوٹا شہر کہہ لیجئے یا بڑا قصبہ۔ اس لئے یہاں رہائشی اور تجارتی علاقے کے لئے کافی زمین مختص کی جانی چاہئے۔"

عبدالحق سوچ میں پڑ گیا۔ بات اُس کے دل کو لگی تھی۔

"اب سوچیں' آبادی بڑھنے کے بعد کیا یہاں کے لوگ' اپنی ضرورت کی خریداری کے لئے قریبی شہر جایا کریں گے۔ سب کچھ یہیں ہونا چاہئے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ رہنمائی کا شکریہ۔"

ان کی اس بات نے عبدالحق کو ایک نیا وژن دیا تھا۔ اس کے بعد اُس نے ان کے ہی نظریے کے تحت پلاننگ کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے لئے ایک مکان کی زمین کے علاوہ عبدالحق سے دس ایکڑ زمین معقول قیمت پر خریدی تھی۔ عبدالحق کو حیرت تھی کہ وہ اتنی زمین کا کیا کریں گے۔ اس نے ان سے پوچھ ہی لیا تھا۔

"یہ آپ کے مستقبل کے حق نگر کا تجارتی علاقہ ہوگا۔" ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ "اور زندگی رہی تو میں یہاں ایک بہت اچھا ہسپتال بھی قائم کروں گا۔ دیکھیں نا عبدالحق صاحب' یہ ضروری ہے۔"

اور عبدالحق ان کی فراست اور دور اندیشی کا قائل ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے بڑے بیٹے کا رجحان تجارت کی طرف تھا۔ اس دس ایکڑ زمین پر انہوں نے اپنے لئے ایک مطب بنا لیا تھا۔ مطب کے ساتھ چھوٹا سا اسپتال تھا' جس میں فی الحال صرف دس بیڈ تھے۔ وہ بھی خالی ہی رہتے تھے۔ اسی لئے علاقے کے لوگ انہیں سنکی سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک دکان بنائی تھی...... کریانے کی دکان۔ وہ ان کا بڑا بیٹا اکبر چلاتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک اچھے جنرل اسٹور کا روپ دھار گیا۔ اُس کی افادیت ابتدا ہی میں ثابت ہو گئی تھی۔ وہ علاقے کے لوگوں کے لئے بڑی نعمت تھا۔

چھوٹے بیٹے کا رجحان ڈاکٹری کی طرف تھا۔ اسے ڈاکٹر صاحب نے تعلیم کے لئے لاہور چھوڑ دیا تھا۔

اپنے مطب سے اٹھ کر ڈاکٹر صاحب اکبر کی دکان پر ضرور جا کر بیٹھتے تھے۔ وہاں بیٹھ کر وہ بڑی باریک بینی سے جائزہ لیتے۔ اکبر کی طرف سے وہ مطمئن تھے۔ وہ محنتی بھی تھا اور عقل مند بھی۔ یہی وجہ تھی کہ دکان مال کے اعتبار سے پھیل رہی تھی۔ کسی نئی چیز کی ڈیمانڈ آتی تو وہ فوراً وہ چیز لے آتا۔ ابھی تو اس دکان سے زیادہ آمدنی نہیں تھی۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ مستقبل بہت روشن

ہے۔

اس روز وہ دکان پر پہنچے تو وہاں رابعہ موجود تھی۔ اور اس کے ساتھ ایک بہت حسین لڑکی بھی تھی۔ وہ بڑے سلیقے سے چادر لئے ہوئے تھی اُس کے چہرے کی پاکیزگی اور معصومیت نے انہیں بہت متاثر کیا۔

مگر انہیں دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اکبر بہت نروس نظر آ رہا تھا۔ پھر اس کی وجہ بھی ان کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ بار بار کن انکھیوں سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا اور اس کی بے دھیانی کا یہ عالم تھا کہ وہ حساب بھی ٹھیک سے نہیں کر پا رہا تھا۔

"ارے...... آپ دکان لٹانے کے لئے بیٹھے ہیں۔" لڑکی نے اکبر کو ٹوکا۔ "دو روپے دس آنے بنتے ہیں اور آپ کہہ رہے ہیں ایک روپیہ دس آنے' اتنا تو شاید آپ کا منافع بھی نہیں ہوگا۔"

اکبر نے باپ کو دیکھا تو اور نروس ہو گیا۔ "جی...... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میرے سر میں درد ہے نا' اس وجہ سے......"

رابعہ نے ڈاکٹر صاحب کو سلام کیا۔ لڑکی نے بھی اُس کی تقلید کی۔

"کیسی ہو رابعہ؟ اماں کا کیا حال ہے؟ اور عبدالحق واپس آئے یا نہیں۔" ڈاکٹر صاحب نے سوالات کی بوچھار کر دی۔

رابعہ نے ترتیب سے جواب دیے۔ "صاحب تو ابھی نہیں آئے۔" اُس نے آخر میں کہا۔

"اور یہ بچی کون ہے؟"

"بہن ہے ہماری۔ اماں کی بیٹی جو ہوئی۔" رابعہ نے بڑے فخر سے کہا۔

"بہت اچھی ہے ماشاء اللہ۔"

ان کے جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب سوچتے رہے۔ وہ یہاں بے مقصد نہیں آتے تھے۔ اکبر شادی کے قابل تھا' جوان تھا۔ اور دکان پر لڑکیاں بھی آتی تھیں وہ بیٹے سے بے خبر نہیں رہنا چاہتے تھے۔ لیکن اس سے پہلے انہوں نے اکبر کو کسی لڑکی کو اس طرح دیکھتے نہیں دیکھا تھا۔ اور سچی بات یہ تھی کہ لڑکی انہیں بھی بہت اچھی لگی تھی۔ یہ وہ جانتے تھے کہ وہ اماں کی بیٹی نہیں ہو سکتی لیکن یہ حوالہ کافی تھا کہ اماں اسے بیٹی سمجھتی ہیں۔

اُس روز وہ دکان سے اٹھے تو فیصلہ کر چکے تھے۔ گھر پہنچتے ہی انہوں نے بیوی سے کہا۔

"صفیہ...... آج میں نے ایک بہت پیاری لڑکی دیکھی۔"

"اب تو باز آ جائیں ڈاکٹر صاحب۔" ان کی بیگم نے شوخی سے کہا۔ "آنکھیں بند کر کے نبض دیکھا کیجئے۔"

"ارے نہیں بھئی' مریضہ تھوڑا ہی تھی وہ۔"

"لو......تو اب راستہ چلتے بھی دیکھنے لگے۔ مطلب ہی کیا کم تھا آپ کا۔"

"تم تو ہر بات مذاق میں اُڑا دیتی ہو۔ میں بہت سنجیدہ ہوں۔ مجھے وہ لڑکی اکبر کے لئے اچھی لگی ہے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"وہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔" ڈاکٹر صاحب نے بے حد معصومیت سے کہا۔

"لو تو اب اسے کہاں ڈھونڈتے پھریں گے۔"

"ارے وہ رابعہ کے ساتھ تھی۔"

"اوہ......زرینہ ہوگی۔ سچ کہتی ہوں' وہ تو میرے دل میں بھی اتر گئی تھی۔ مجھے بھی اکبر کا خیال آیا تھا اسے دیکھ کر۔"

"بس تو جا کر اماں سے بات کرو رشتے کی۔"

"جی تو میرا بھی چاہا تھا۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ شاید وہ صاحب کے لئے......" زبیر کی دیکھا دیکھی اب پورا گاؤں عبدالحق کو صاحب کہنے لگا تھا۔

"ارے نہیں بیگم' یہ نہیں ہو سکتا۔" ڈاکٹر صاحب نے ان کی بات کاٹ دی۔

"کیوں؟"

"عبدالحق کی شادی تو بس نور بانو سے ہوگی۔ دیکھ لینا۔" ڈاکٹر صاحب نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "تم کل ہی جا کر اماں سے بات کر لو۔"

"ٹھیک ہے۔ چلی جاؤں گی۔ اب آپ کھانا تو کھا لیں۔"

"ہاں' لے آؤ۔"

"اور ہاں۔ اکبر سے تو پوچھ لیں۔"

"بھئی بیٹا ہے ہمارا۔ اس کی شادی تو ہماری پسند سے ہی ہوگی۔ آپ فکر نہ کریں اس کی۔"

"آپ جانیں۔" صفیہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ویسے وہ بھی بہت خوش تھیں۔

❁ ❁ ❁
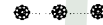
مشتاق صاحب عمر میں مسعود صاحب سے بڑے تھے۔ انہوں نے مسعود صاحب کا دیا ہوا تعارفی خط پڑھا' اسے تہ کر کے ایک طرف رکھا اور عبدالحق کی طرف متوجہ ہوئے۔ "یہ بتاؤ بیٹے کہ میں تمہارے کس کام آ سکتا ہوں؟" ان کے لہجے میں شفقت تھی۔

"مجھے کسی کی تلاش ہے۔ شاید اس سلسلے میں آپ میری مدد کر سکیں۔"

"میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔ تم مجھے ان کے بارے میں بتاؤ۔"

"جی ان کا نام رضوان ہے......رضوان احمد۔"

مشتاق صاحب ہکا بکا رہ گئے۔ "صرف نام! اس نام کے تو درجنوں افراد سے واسطہ پڑا ہے ہمارا۔" انہوں نے کہا۔ "ان کی ولدیت تو بتاؤ۔ یہ بتاؤ کہ وہ ہندوستان میں کہاں رہتے تھے۔ اور کیا کرتے تھے۔"

عبدالحق کو شرمندگی ہونے لگی۔ "جی......نام کے علاوہ میں بس یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ آگرہ میں رہتے تھے۔"

"اپنے کسی ایسے رشتہ دار کے بارے میں اتنی محدود معلومات حیران کن ہیں بیٹے۔ جبکہ وہ تمہیں بہت عزیز بھی ہوں گے۔ ورنہ تم انہیں یوں تلاش کیوں کرتے۔"

"دراصل میں انہیں کسی اور کے لئے تلاش کر رہا ہوں۔"

"اوہ......تو ان کے بارے میں اور کچھ نہیں بتا سکتے تم؟"

عبدالحق نے ذہن پر زور دیا۔ "جی ایک بات اور ہے۔ اللہ کرے کہ وہ اہم ثابت ہو۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان بننے سے شاید ڈیڑھ دو ماہ پہلے ہی پاکستان آ گئے تھے۔"

"ہاں......یہ ہے کام کی بات۔" مشتاق صاحب نے کہا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ "ایک رضوان احمد جون میں یہاں پہلی بار آئے تھے میرے پاس......کلیم کے سلسلے میں۔ مجھے بہت اچھے لگے تھے۔ بہت شائستہ انسان تھے۔ اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی ان سے۔ پھر میرے پاس ان کا آنا جانا رہا۔ یہاں تک کہ اگست میں ان کا کلیم منظور ہو گیا۔"

عبدالحق کی آنکھوں میں امید چمکنے لگی۔ اس تلاش میں وہ صرف اللہ کے بھروسے پر نکلا تھا۔ اور اللہ اس کی مدد کر رہا تھا۔

"......مگر مجھے یہ یاد نہیں کہ ان کا تعلق ہندوستان میں کہاں سے تھا۔"

عبدالحق کا دل ایک دم جیسے بجھ سا گیا۔

"لیکن یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ ان کی فائل نکلواتے ہیں۔ ابھی پتا چل جائے گا۔"

امید کا دیا پھر سے جل اُٹھا۔

مشتاق صاحب نے گھنٹی بجائی تو چپراسی اندر آ گیا۔ "وہ رضوان صاحب آتے تھے نا میرے پاس' ذرا ان کی فائل نکلوا کر لاؤ۔"

"یس سر۔" چپراسی نے کہا اور باہر چلا گیا۔

عبدالحق کے دل میں ایک بے یقینی نے سر اٹھایا۔ "اگر یہ وہ رضوان صاحب نہیں ہوئے تو؟" اُس نے مشتاق صاحب سے پوچھا۔

"تب تو ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔" مشتاق صاحب نے کہا۔ "ہم پورا ریکارڈ چیک

کریں گے۔ ہر رضوان کو دیکھیں گے۔ اگر تمہارے مطلوبہ رضوان صاحب نے کلیم کیا ہوگا تو ان کا پتا چل جائے گا۔ اور اگر انہوں نے یہاں کلیم کیا ہی نہیں تو پھر بات ختم اور بیٹے' اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو تمہارے ان کو تلاش کرنے میں کامیابی کا امکان نہ ہونے کے برابر رہ جائے گا۔"

عبدالحق کے لئے ایک ایک لمحہ بھاری تھا۔ وہ امید و بیم کے درمیان معلق تھا۔

بالآخر چپراسی فائل لے آیا۔ مشتاق صاحب نے فائل کھولی اور نظر ڈالتے ہی مسکرائے۔ انہیں مسکراتے دیکھ کر عبدالحق کی جان میں جان آئی۔ "لگتا ہے بیٹے' تمہارا کام ہو گیا۔ ان کا تعلق آگرہ ہی سے ہے۔"

عبدالحق پر پھر بے یقینی کا حملہ ہوا۔ "کیا پتا' آگرہ سے بھی اس نام کے کئی لوگ آئے ہوں۔ اور یہ رضوان صاحب وہ نہ ہوں جنہیں میں تلاش کر رہا ہوں۔"

"بہر حال تم ان سے مل لو۔ پتا چل جائے گا۔" مشتاق صاحب نے ایک کاغذ پر رضوان صاحب کا پتا لکھ کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔

"بہت شکریہ جناب۔" عبدالحق اٹھ کھڑا ہوا۔

"شکریے کی کوئی بات نہیں۔ مسعود صاحب کو میرا اسلام کہہ دینا۔"

عبدالحق باہر نکل آیا۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

عبدالحق اللہ کی قدرت پر غور کر رہا تھا۔ رضوان صاحب کو تلاش کرنے کے لئے وہ لاہور آیا تھا۔ مگر اتنے عرصے قیام کرنے کے باوجود اسے اپنے مقصد میں موہوم سی کامیابی ہی نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ کھلی بات سامنے آگئی تھی کہ صرف نام سے کسی کو تلاش کرنا ناممکن ہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی امکان نظر ہی نہیں آیا تھا۔ اور وہ ناکام واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔

اور اب...... بالکل اچانک...... محض چند لمحوں میں ناکامی کی دیوار میں اللہ نے اپنی قدرت سے ایک امکان کا دروازہ کھول دیا تھا...... ایسا دروازہ جو ابتدا ہی سے مسعود صاحب کی نگاہوں کے سامنے تھا' لیکن انہیں نظر نہیں آیا۔ اور نظر بھی وہ اسی کو آیا تھا۔ مسعود صاحب تو آخر تک اسے نہیں دیکھ سکے تھے۔

ایک دن میں جیسے دنیا بدل گئی تھی۔ ایک دن پہلے وہ مایوس تھا' اور آج ایک دن بعد اس کی جیب میں رضوان صاحب کا پتا موجود تھا اور اُس کی اپنی کیفیت عجیب تھی۔ نجانے کیسے' مگر اس کے دل کو یقین تھا کہ یہ رضوان صاحب نور بانو کے چچا ہی ہیں لیکن وہ اس پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا۔

مشتاق صاحب کے دفتر سے نکلتے ہی اُس نے سوچا تھا کہ ابھی اس پتے پر جا کر چیک کرے گا لیکن اس کے بجائے وہ اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ بالآخر وہ لارنس گارڈن میں جا کر بیٹھ گیا۔

وہاں بیٹھ کر وہ سوچتا رہا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ لارنس گارڈن آئے اور اسے افضال صاحب یاد نہ آئیں۔ افضال صاحب اور ان جیسے لوگوں کے حوالے سے اُس نے پاکستان کو سمجھا تھا۔ اور یہ صرف اس لئے ممکن ہوا کہ وہ لاہور آیا اور کیمپ میں رہا۔ اور لاہور وہ صرف رضوان صاحب کی تلاش میں آیا تھا۔ گویا وہ تلاش بہانہ تھی۔ اصل میں اسے وسعتِ نظر عطا کی جا رہی تھی۔

دہلی میں' اپنے کالج میں وہ تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں نظریات سے آگاہ ہوا تھا۔ لیکن یہاں لاہور میں اُس نے انسانوں کے رنگا رنگ روپ دیکھے تھے...... عملی پیکر۔ اور وہ اتنے مختلف اور اتنے متنوع تھے کہ دیکھ کر عقل حیران ہوتی تھی۔ خود افضال صاحب ہی ایک چیستان تھے۔ ان کی کہانی سن کر پتا چلتا تھا کہ انسان کی حقیقت کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں! وہ کھلونا ہے مشیت کے ہاتھوں میں۔ اللہ نے اسے طاقت دی تو وہ اپنی طاقت کے خیال سے پھول گیا۔ اور جب وہ طاقت واپس لے لی تو وہ اتنا کمزور اور بے بس ہو گیا کہ حد نہیں۔ تو شاید یہ آزمائش ہے' طاقت بھی آزمائش ہے اور کمزوری بھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ کون کس حال میں اللہ کو یاد رکھتا ہے۔ اسے ظفر کا شعر یاد آیا......

ظفر آدمی اُس کو نہ جانیے گا' ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی' جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

تحریکِ پاکستان سے اُس کے باطن کا گہرا تعلق تھا۔ وہ جو بچپن سے ہی سوچتا رہا تھا' ذہن بھی ابھرنے والے سوالات پر غور کرتا تھا' وہ جو خدائے واحد کی جستجو میں تھا' اسے روشنی ملی تو اس عرصے میں' جب پاکستان بن رہا تھا۔ وہ قرآن کی تین آیات سن کر اور سمجھ کر مسلمان ہوا۔ یہ سچائی اُس کے دل میں پوری طرح اتر گئی تھی کہ اسلام دینِ کامل ہے۔

ایک عجیب بات یہ تھی کہ زندگی میں اس کا واسطہ جتنے بھی مسلمانوں سے پڑا تھا' وہ سب کے سب بہت اچھے مسلمان تھے۔ سب سے پہلے حمیدہ' چاچا جمال دین اور وصال دین۔ سادہ محبت کرنے والے سچے لوگ۔ پھر مولوی صاحب' ماں جی' کاکا' بوا' محمود اور نادرہ سب کے سب اہلِ ایمان تھے...... شک سے دور اور یقین سے آراستہ۔ سبھی سے اُس نے کچھ نہ کچھ سیکھا تھا' اور بہت اہم سیکھا تھا۔ مولوی صاحب سے اُس نے عربی سیکھی تھی۔ اور عربی قرآن کی زبان تھی۔ وہ زبان نہ سیکھی ہوتی تو اُس رات وہ آیات اُس کی سمجھ میں نہ آئی ہوتیں۔ وہ آیات سن کر ہی تو وہ ایمان لایا تھا۔ اور کلمہ...... وہ اس پر اُس کی کلاس فیلو نادرہ کا احسان تھا۔ اس رات پارٹی میں اُس نے سمجھ لیا تھا کہ اگر وہ مسلمان ہوتا تو نادرہ نے اس سے اظہارِ محبت کر دیا ہوتا۔ لیکن وہ کسی مشرک سے محبت کے باوجود جڑ نہیں سکتی تھی۔ یعنی اُس کے لئے اللہ کے حکم کے سامنے اپنی خوشی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اور محمود' جس نے اس پر وحدانیت کا تصور بالکل واضح کر دیا تھا۔ اسے بتا دیا تھا کہ عقیدۂ تثلیث بدترین شرک ہے۔ اور ماں جی اور آکا میاں اور چھمن بوا' جن میں اُس نے اعلیٰ انسانی

اوصاف دیکھے تھے۔

تو جس وقت اُس نے اسلام قبول کیا' وہ جانتا تھا کہ اسلام دینِ کامل ہے۔اور مسلمان کامل انسان۔اسے پاکستان بننے کی بہت زیادہ خوشی تھی۔اُس کے نزدیک وہ خدا کی سرزمین تھی...... کامل انسانوں کی سرزمین۔یہ سن کر اسے بہت خوشی ہوئی تھی کہ اُس کا آبائی گاؤں پاکستان میں ہے۔اس تصور کے ساتھ وہ پاکستان آیا تھا۔اپنے گاؤں اور اردگرد کے گاؤں دیکھ کر اُس کے ذہن میں ایک ہی لفظ گونجا تھا...... مردہ زمین۔پھر اُس نے اپنی آنکھوں سے اس مردہ زمین کو زندہ ہوتے دیکھا تھا...... اللہ کی قدرت!

لیکن رضوان صاحب کی تلاش میں لاہور آنے کے بعد اُس نے جو کچھ دیکھا' اُس نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔اندر مسلسل ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہی تھی' جس کا اندازہ اسے اب ہوا تھا۔یہاں اُس نے جمیل کو دیکھا' جو پناہ گزینوں کے حصے کا کھانا بیچ کر اپنی جیب گرم کرتا تھا' جو معصوم لڑکیوں کو بازار میں جسم فروشی کے لئے بیچ دیتا تھا۔اور تو اور اللہ کی اس پاک سرزمین پر ہیرا منڈی بھی تھی' جہاں بکنے والے جسم تھے۔اور صرف اس لئے تھے کہ ان کے خریدار بھی موجود تھے۔اور اس کاروبار کو چلانے والی عورتیں ہی تھیں۔اور گھیر کر لانے والے دلال تھے۔وہاں جمیل کی پشت پناہی کرنے والے بڑے افسر بھی تھے' جنہوں نے مجرم ہونے کے باوجود اسے معطل نہیں ہونے دیا تھا۔صرف اس لئے کہ وہ انہیں لڑکیاں سپلائی کرتا تھا...... لڑکیاں...... ہندوستان سے لٹ پٹ کر آنے والے مہاجروں کی مظلوم اور معصوم بچیاں۔اسی پاک زمین پر وہ لوگ بھی تھے' جو ایک ولی کے مزار کے زیرِ سایہ بیٹھے لنگر کی دیگوں کا کاروبار کر رہے تھے' جو جمیل سے سستے میں کیمپ والوں کے حصے کا کھانا خرید کر زائرین کو بیچ دیتے تھے۔

اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔لیکن اس وقت تنہائی اور فرصت میں سوچنے کا موقع ملا تو اسے اندازہ ہوا کہ مایوسی قطرہ قطرہ اس کے اندر گرتی رہی ہے' اور اچھا خاصا ایک تالاب سا بن گیا ہے۔

اللہ کو واحد ماننے والے' اس پر ایمان رکھنے والے' شرک سے بچنے والے ایسے کیسے ہو سکتے ہیں۔اس نے سوچا۔

اندر کا موسم بہت خراب ہو رہا تھا۔اس نے سوچا' مجھے اچھی باتیں سوچنی چاہئیں۔اسے نور بانو کا خیال آیا۔نور بانو جو اس کے لئے محض آواز تھی۔وہ آواز سنتے ہی اسے اس آواز والی سے محبت ہو گئی تھی۔وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے۔لیکن اب وہ اس کی اہمیت سمجھ سکتا تھا۔اللہ نے اسے اس کے لئے نشانِ راہ بنایا تھا۔وہ آواز سن کر اس نے عربی سیکھی۔عربی نہ سیکھتا تو قرآن سن کر وہ اس کا مطلب کیسے سمجھتا۔اور مطلب نہ سمجھتا تو اسلام کیسے قبول کرتا۔

تو اس کے لئے تو نور بانو بہت مبارک تھی۔اور وہ ملی بھی کیسے۔اس کی دونوں بہنیں ظالموں

کی درندگی کی بھینٹ چڑھ گئیں لیکن اللہ نے اسے بچا لیا۔یہ تو اُس نے لڑکپن میں ہی سمجھ لیا تھا کہ اللہ مسبب الاسباب ہے۔اُس نے دیکھا تھا کہ کسی چھوٹے سے کام کے لئے بھی اسباب کا سلسلہ بہت دور سے...... بہت پیچھے سے جاری ہوتا ہے۔کوئی سمجھ بھی نہیں پاتا کہ یہ کس لئے ہو رہا ہے۔اور شاید اس کے معاملے میں تو یہ سلسلہ اور دور سے چل رہا تھا۔بلکہ اس کے لئے اس کا سرا پکڑنا ممکن ہی نہیں تھا۔

اُس نے نور بانو کا تصور کرنے کی کوشش کی۔اُس کی نگاہوں میں تو کوئی سراپا نہیں ابھرا...... کوئی پرچھائیں بھی نہیں ابھری' ہاں سماعت میں مترنم آواز اور آنکھیں کھول دینے والے اللہ کے الفاظ ضرور گونجے...... فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرىٰ مِنْ فُطُور۔اس کے جسم میں ہلکی سی کپکپی دوڑ گئی۔نور بانو کئی بار اُس کے سامنے آئی تھی۔لیکن اُس نے کبھی اسے نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔وہ تو اس کی غیر مشروط اور حتمی محبت تھی۔جیسے محبت کے لئے وجود کی ضرورت ہی نہ ہو۔آواز ہی کافی ہو۔

اور یہ سچ تھا...... بہت بڑا سچ۔اس کی محبت میں نہ کوئی شک تھا' نہ شرط۔وہ حتمی اور غیر متزلزل محبت تھی۔اور اس کی بنیاد صرف آواز تھی...... اور آواز بھی قرآن پڑھنے والی آواز۔اگر کوئی اس سے پوچھتا کہ خوب صورتی کا معیار کیا ہے' تو وہ کہتا۔جس کے پاس ایسی آواز ہو' وہ خوب صورتی کی دنیاوی حد ہے۔کبھی وہ سوچتا کہ نور بانو سے اُس کی شادی ہو جائے تو بس وہ اُس سے قرأت ہی سنتا رہے گا۔

کسی پھیری والے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔اسے احساس ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔چند لمحے تو اُس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا کہ وہ یہاں کیوں بیٹھا ہے۔

پھر اسے یاد آ گیا!

وہ گھر سے...... سب لوگوں سے دور' یہاں ایک کام سے آیا تھا۔اور اب وہ کام ہو گیا تھا تو وہ اداس تھا۔نور بانو کے چچا کا پتا اُس کی جیب میں تھا۔فطری طور پر تو اسے پتا ملتے ہی اُس طرف لپکنا چاہئے تھا۔لیکن اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ شام کو وہاں جائے گا۔

کیوں؟

اس کیوں کا جواب نوکِ زباں پر موجود تھا۔لوگ اپنے کاموں کے سلسلے میں گھر سے نکلتے ہیں اور شام کو گھر لوٹتے ہیں لیکن بجھا بجھا دل گواہی دے رہا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔

آدمی جھوٹ بولتا ہے۔مگر اس کا دل کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔عبدالحق نے دل کی آواز کی طرف سے کان بند کر لئے تھے۔مگر اس وقت دل کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔وعدے کا پاس نہ ہوتا تو وہ کاغذ کے اس ٹکڑے کو چاک کرتا اور گاؤں واپس چلا جاتا۔

پہلی بار اُس نے شعور کے ساتھ اس صورتِ حال کے بارے میں سوچا۔ تو اب نور بانو اپنے چچا کے پاس چلی آئے گی۔ اور اُس کا گھر سُونا ہو جائے گا۔ اُس کا دل بوجھل ہو گیا۔ پھر اُس نے خود سے کہا..... یہ تو ہونا ہی تھا۔ کہاں میں کہاں وہ' کہاں زمین کہاں آسمان۔ ہم دونوں کا کیا میل' کیا جوڑ۔ مگر یہ کیا کم ہے کہ وہ آواز سماعت میں محفوظ ہے۔

تو پھر اُداسی کیسی؟ اندر سے کسی نے کہا۔ تیرا تعلق صرف آواز سے ہی تو تھا۔ سو وہ تیرے پاس ہے اور رہے گی۔

لیکن اداسی پھر بھی نہیں چھٹی۔

❀......❀......❀

دستک کے جواب میں دروازہ کھلا اور دس بارہ سال کے ایک لڑکے نے باہر جھانکا۔

"جی..... فرمایئے؟"

"رضوان صاحب یہیں رہتے ہیں؟" عبدالحق نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ وہ سوچ رہا تھا' کاش انکار میں جواب ملے۔

"جی ہاں۔"

مایوسی کی وجہ سے چند لمحے وہ کچھ بول ہی نہیں سکا۔ پھر اُس نے سنبھل کر پوچھا۔ "وہ موجود ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"مجھے ان سے ملنا ہے۔"

"آپ کا نام؟"

"عبدالحق۔"

"آپ یہاں رکیں۔ میں ابا جان کو بلاتا ہوں۔"

لڑکا اندر چلا گیا۔ عبدالحق وہیں کھڑا رہا۔ ذرا دیر بعد ایک ادھیڑ عمر شخص باہر آیا۔ اُس کے چہرے سے شرافت اور متانت عیاں تھی لیکن مزاج کا سخت لگتا تھا۔

عبدالحق نے اسے سلام کیا۔ "جی..... فرمایئے۔" اُس نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔

"میرا خیال ہے' میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"جی ہاں۔ میں آپ کے لئے اجنبی ہوں لیکن آپ میرے لئے اجنبی نہیں ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

وہ خشک لہجہ' وہ بے مہری عبدالحق کے لئے بہت دل شکن تھی..... اور وہ بھی ٹوٹے ہوئے دل کے لئے۔ "آپ کا تعلق آگرہ سے ہی ہے نا؟"

"آپ کا اس سے کیا تعلق؟" رضوان صاحب نے مشتبہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"دیکھیے..... میں بہت دنوں سے آپ کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔ مگر سب سے پہلے مجھے تصدیق کرنی ہے کہ آپ وہی رضوان صاحب ہیں یا نہیں۔"

"بات کیا ہے؟"

"آپ کی ایک امانت ہے میرے پاس۔"

"حیرت ہے' جبکہ آپ مجھے جانتے ہیں' نہ میں آپ کو جانتا ہوں۔"

"آپ میرے سوال کا جواب تو دیجئے۔ آپ ہندوستان میں آگرہ میں ہی رہتے تھے نا؟"

رضوان صاحب کچھ ہچکچائے۔ پھر انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آپ کے ایک بھائی دہلی میں رہتے تھے۔"

اچانک رضوان صاحب کا انداز بدل گیا۔ "آپ اندر آیئے....." انہوں نے کہا۔

وہ عبدالحق کو بیٹھک میں لے گئے۔ "بیٹھیے۔" انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ چائے پئیں گے یا شربت؟"

"جی کچھ نہیں۔" عبدالحق نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

رضوان صاحب نے اصرار بھی نہیں کیا۔ "یہ باتیں باہر کرنا مناسب نہیں تھا۔" وہ بولے۔ "دہلی میں میرے بڑے بھائی رہتے تھے لیکن ان کا تو ہندوستان بننے سے دس سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔"

"آپ کی بھابی اور ان کی تین بیٹیاں....."

"جی ہاں۔ جی ہاں۔"

عبدالحق کا دل ڈوبنے لگا۔ آس کا کچا دھاگا بھی ٹوٹ رہا تھا۔

"آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کے پاس میری ایک امانت ہے۔"

"جی ہاں۔ دیکھیے' میں نے اپنے ملازم کو آپ کی تلاش میں آگرے بھیجا تھا۔ مگر آپ ہجرت کر چکے تھے۔"

"ہاں..... ہم جون میں ہی یہاں آ گئے تھے....."

"اب میں کئی ماہ سے آپ کو یہاں تلاش کر رہا ہوں۔ بڑی مشکل سے آپ کا پتا ملا ہے۔"

"آپ مجھے بھابی جان اور بچیوں کے متعلق بتایئے نا۔" رضوان صاحب کے لہجے میں بے تابی تھی۔

"مجھے افسوس ہے۔ کوئی اچھی خبر نہیں ہے آپ کے لئے۔ ان کے گھر پر شرپسندوں نے حملہ کیا تھا۔ آ کا میاں' چھمن بوا' ماں جی اور ان کی دو بیٹیوں کو شہید کر دیا گیا۔ ان کی ایک بیٹی نور بانو

البتہ بچ گئی۔ وہی آپ کی امانت ہے میرے پاس۔"

"نور بانو...... وہ بچ کی لڑکی۔" رضوان صاحب نے بے ساختہ کہا۔ پھر چونکے۔ "آ کا میاں اور چھمن بوا کا جس طرح آپ نے تذکرہ کیا ہے' اُس سے لگتا ہے کہ آپ ان لوگوں کے بہت قریب تھے۔"

"جی...... ہم لوگ انہی کے مکان میں اوپر والے حصے میں کرائے دار تھے۔"

رضوان صاحب کی رنگت متغیر ہوگئی۔ "میرے بچے نے تو......" وہ کہتے کہتے رک گئے۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام عبدالحق ہے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ بھائی جان کے کرایہ دار تو ہندو تھے۔ اور میں نے بھائی جان کو خط لکھا تھا کہ حالات اچھے نہیں ہیں۔ آپ ان لوگوں سے چھٹکارا پالیجئے۔" رضوان نے تلخی سے کہا۔ "مگر وہ کہاں سنتی تھیں کسی کی۔"

"میں انہی میں سے ہوں۔ ہم سب پاکستان بننے سے پہلے ہی مسلمان ہوگئے تھے۔" عبدالحق نے بے حد تحمل سے کہا۔

"نور بانو کیسے بچ گئی؟" رضوان صاحب نے شک آمیز لہجے میں کہا۔ "جبکہ گھر کے تمام لوگ ختم ہوگئے۔"

"زندگی اور موت تو اللہ کے اختیار میں ہے۔"

"ابھی تمہیں مسلمان ہوئے چند ماہ ہوئے ہیں اور تم مجھے دین پڑھا رہے ہو۔ بہت خوب...... ماشاء اللہ۔ چلو زندہ تو بچ گئی۔ مگر ویسے تو نہیں بچی ہوگی...... ایک بات بتاؤ' جب کی یہ بات ہے' تم مسلمان ہوچکے تھے؟"

"جی نہیں۔"

"تو ہندوؤں نے اُس کی جان اور آبرو کی حفاظت کی۔ یہی باور کرانا چاہ رہے ہو تم۔" رضوان صاحب نے زہریلے لہجے میں کہا۔

عبدالحق کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "اللہ ہی سب کا محافظ ہے۔ جان و مال کا بھی اور عزت آبرو کا بھی۔" اُس نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ "اور میں آپ کو کچھ باور نہیں کرا رہا ہوں۔ میں تو آپ کو آپ کی امانت لوٹانے کے لئے آیا ہوں۔"

"میری کوئی امانت تمہارے پاس نہیں تھی۔ وہ میری امانت نہیں۔" رضوان صاحب کا لہجہ بہت سخت ہوگیا۔

"وہ آپ کا خون ہے۔ آپ کی بھتیجی ہے۔ آپ سے ملنے کو' آپ کے سائے میں آنے کو

کب سے ترس رہی ہے۔"

"وہ میرے لیے مرگئی ہے...... اپنی ماں اور بہنوں کی طرح۔"

"جسے اللہ نے بچالیا' وہ کیسے مرسکتا ہے...... محض آپ کے کہنے پر۔"

"تم مجھ سے بے کار بحث مت کرو۔" رضوان صاحب اب واضح طور پر مشتعل ہوگئے تھے۔ "ہمارے لئے ہر چیز سے زیادہ اہم عزت ہے۔"

"اور عزت ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

"یہ تم بار بار اللہ کو بیچ میں لاکر کیا جتارہے ہو مجھے۔"

"میں کچھ جتا نہیں رہا ہوں۔ اللہ کے الفاظ دہرا رہا ہوں۔ اور یہ بھی بتادوں کہ آپ کے خدشے بے بنیاد ہیں۔ نور بانو پہلے جیسی معصوم اور پاکیزہ ہیں۔ ان پر تو کسی کی میلی نگاہ بھی نہیں پڑی۔"

"تمہیں پارسائی کی سند جاری کرنے کا اختیار کس نے دیا ہے۔"

"میں تو صرف حقیقت بتارہا ہوں۔"

"میری بات سنو۔ میرے گھر میں بھی بیٹیاں ہیں۔ میں ان پر ایسی کسی لڑکی کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا۔"

"یہ بتائیں' میں ان سے جاکر کیا کہوں؟"

"یہی کہ وہ ہمارے لئے مرچکی ہے۔"

"تاکہ وہ جیتے جی مرجائیں۔"

"جیتے جی تو وہ پہلے ہی مرچکی ہے۔" رضوان صاحب نے بے مہری سے کہا۔ "سنو میاں' مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارا ہی بوجھ ہے۔ تمہیں ہی اٹھانا چاہئے اپنا بوجھ۔ تو ایسا کرلو کہ اُس سے شادی کرلو۔"

عبدالحق کا چہرہ لال بھبھوکا ہوگیا' مٹھیاں بھنچ گئیں لیکن اُس نے تحمل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ "یہ کام آپ کے گھر سے ہوتو میں آپ کا بہت شکر گزار رہوں گا۔" اُس نے نرم لہجے میں کہا۔

"مجھے جو کہنا تھا' کہہ چکا۔ اب تم جاسکتے ہو۔"

عبدالحق اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اللہ نے آپ کی بچیوں کی حفاظت فرمائی۔ آپ وہ کچھ دیکھنے سے بچ گئے' جو ہزاروں لوگوں کا مقدر بنا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ آپ شکر گزار ہوتے لیکن آپ تو اپنے خون سے بھی منہ پھیر لینے والے بن گئے۔ آپ اپنی بن ماں باپ کی بھتیجی کے لئے باپ بننے کے بجائے بے رحم ہوگئے۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے......"

"بس اب یہ بکواس بند کرو اور یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ......" رضوان صاحب کہتے کہتے

رک گئے۔

عبدالحق یوں کھڑا رہا' جیسے ان کا جملہ پورا ہونے کا انتظار کر رہا ہو۔ چند لمحے وہ اُن کی آنکھوں میں دیکھتا رہا' پھر بولا۔ ''اس 'ورنہ' کے بعد آپ کے پاس نہ کہنے کے لئے کچھ ہے اور نہ کرنے کے لئے۔ آپ مجھے یہاں سے نہ نکال سکتے ہیں' نہ نکلوا سکتے ہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ لیکن جانے سے پہلے آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ نے مجھ پر جو تہمت لگائی' اُس کی تو مجھے پروا نہیں' البتہ آپ نے اپنی بیٹی پر جو تہمت لگائی' وہ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھی' کیونکہ میرے نزدیک وہ بہت عظیم اور بہت محترم ہے۔ میں نے صرف اس لئے اسے برداشت کر لیا کہ آپ اس کے باپ ہیں۔'' اُس نے اپنے دونوں ہاتھ ان کی طرف بڑھائے۔ ''......ورنہ میں اپنے ان ہاتھوں سے آپ کو ختم کر دیتا۔''

رضوان صاحب کے چہرے سے رعونت ہوا ہو گئی۔ وہ ایک دم سے سہم گئے۔ ان کی نگاہوں میں خوف تھا۔

عبدالحق پلٹا' بیٹھک سے نکلا اور گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اُس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔

❀ ❀ ❀

رابعہ حمیدہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ''اماں......وہ صفیہ باجی آئی ہیں۔''

حمیدہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ یہ نام ان کے لئے اجنبی تھا۔

''ارے اماں......ڈاکٹر صاحب کی بیوی۔'' رابعہ نے وضاحت کی۔

''انہیں بٹھایا تو نے؟'' حمیدہ نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب کو کون نہیں جانتا تھا۔ وہ علاقے کے سب سے پڑھے لکھے آدمی تھے' انہیں بہت بڑی نعمت سمجھا جاتا تھا۔

''جی اماں۔ وہ آپ کے پاس آئی ہیں۔''

''چل......میں آتی ہوں۔ اور ہاں' زرینہ یا نور بانو سے کہنا کہ چائے بنا لائے ان کے لئے' وہ تو شہری لوگ ہیں نا۔''

رابعہ چلی گئی۔ حمیدہ اٹھی اور بیٹھک کی طرف چل دی۔ ایسا بہت ہی کم ہوتا تھا کہ کوئی عورت مہمان آئے اور اسے بیٹھک میں بٹھایا جائے۔ لیکن رابعہ نے بھی مہمان کے شہری مزاج کا خیال رکھتے ہوئے انہیں وہاں بٹھایا تھا۔ بیٹھک کی آرائش عبدالحق نے شہری انداز میں ہی کی تھی۔

حمیدہ بیٹھک میں داخل ہوئی تو صفیہ بیگم اٹھ کھڑی ہو گئیں۔ ''ارے اماں......آپ نے کیوں تکلیف کی۔ میں خود آپ کے کمرے میں آ جاتی۔''

''تکلیف کیسی بیٹی۔ تم یہاں تک آئی ہو۔ تکلیف تو تم نے کی ہے۔ بیٹھ جاؤ آرام سے۔''

حمیدہ نے بے حد شفقت سے کہا۔

صفیہ بیٹھ گئی۔ ''اور اماں' طبیعت کیسی ہے آپ کی؟'' اماں تو اس پورے علاقے کی اماں تھیں۔

''اللہ کا شکر ہے بیٹی۔ تمہارے میاں کے ہاتھ میں اللہ نے شفا دی ہے۔ جب سے وہ آئے ہیں' میرے تو سارے مسئلے حل ہو گئے۔ ایک خوراک میں فائدہ ہوتا ہے اللہ کے حکم سے۔''

''اللہ کا شکر ہے۔ اور اماں' صاحب ابھی واپس نہیں آئے لاہور سے؟''

حمیدہ مسکرائی۔ زبیر کی دیکھا دیکھی سب لوگ عبدالحق کو صاحب کہنے لگے تھے' کیا چھوٹے کیا بڑے' کیا مرد کیا عورت۔ ''نہیں بیٹی' وہ بہت ضدی ہے۔ کسی کام کا سوچ لے تو ادھورا کبھی نہیں چھوڑتا۔''

''وہ تو ہم نے دیکھا ہے۔ ریت میں دبے ہوئے اس علاقے کو سنوارنا آسان کام نہیں تھا۔''

اتنی دیر میں نور بانو چائے اور بسکٹ لے آئی۔ ٹرے اُس نے ان کے سامنے میز پر رکھ دی۔

''لو بیٹی' تم نے تو اہتمام کر ڈالا۔''

''کوئی اہتمام نہیں خالہ۔'' نور بانو نے کہا اور چلی گئی۔

حمیدہ صفیہ کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس کی آمد کی کوئی وجہ تو ہو گی۔

صفیہ نے دو ایک بسکٹ لیے' پھر چائے کے دو گھونٹ۔ ''اماں' اس وقت تو میں اپنی ایک غرض سے آئی ہوں۔''

''کہو نا......کیا بات ہے۔''

''انہیں اب اکبر کی شادی کی فکر لگ گئی ہے۔'' صفیہ نے کہا۔ ''مگر سچ پوچھو تو اماں' بہو کی اصل ضرورت تو مجھے ہے۔ اصغر لاہور میں ہے۔ یہ اپنے مطلب چلے جاتے ہیں۔ اور اکبر دن بھر دکان میں لگا رہتا ہے۔ میں اکیلی دن بھر کیا دیواروں سے بات کروں۔''

حمیدہ کی سمجھ میں کچھ کچھ بات آ رہی تھی۔ ''تو کوئی لڑکی دیکھی اس کے لئے۔''

''جی دیکھی۔ اسی لئے تو آپ کے پاس آئی ہوں۔''

''مگر بیٹی' نور بانو کو تو میں عبدالحق کے لئے پسند کر چکی ہوں۔'' حمیدہ نے کہا۔

''میں نور بانو کی بات نہیں کر رہی ہوں اماں۔''

''تو پھر؟'' حمیدہ نے حیرت سے کہا۔ اسی لمحے اُس کے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔ اسے افسوس بھی ہوا کہ اسے زرینہ کا خیال ہی نہیں آیا۔ اور ادھر اس پگلی نور بانو کا یہ حال ہے کہ زرینہ سے جلتی رہی......یہ سوچ کر کہ زرینہ کی خوب صورتی کے آگے میں اسے بھول گئی ہوں۔

''میں تو زرینہ کے لئے آئی ہوں اماں۔'' صفیہ نے اسے چونکا دیا۔ ''وہ آپ کے لئے بیٹی

ہی کی طرح تو ہے۔"

"ہاں بھئی! عبدالحق کی بہن میری بیٹی ہی تو ہوئی۔" حمیدہ نے کہا۔ وہ تیزی سے سوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عبدالحق نے اسے بھیجا تھا اور کہا تھا کہ اس کے بارے میں خود آ کر بتائے گا۔ وہ اس کے بارے میں کچھ جانتی ہی نہیں تھی۔

"ڈاکٹر صاحب کو بھی وہ بہت اچھی لگی ہے اکبر کے لئے۔" صفیہ نے کہا۔

"دیکھو بیٹی! اس کا فیصلہ تو عبدالحق ہی کرے گا آ کر۔ اس کی بہن ہے۔ فیصلہ بھی اسی کو کرنا ہے۔"

"مگر اماں! صاحب آپ سے پوچھے بغیر تو کچھ بھی نہیں کریں گے۔"

"یہ تو اُس کی لیاقت ہے۔ ورنہ فیصلہ تو اسی کو کرنا ہے۔"

"تو اماں! آپ تو ہمارے حق میں ہی رائے دیں گی نا۔"

"او دھی میری! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" حمیدہ نے بہت جوش سے کہا۔ "تیرے گھر سے اچھا کوئی گھر ہے اس علاقے میں۔ وہ تو نصیبوں والی ہوگی جو تیرے گھر میں بسے گی۔"

"بس تو اماں! میں مطمئن ہوں۔ ہم صاحب کے آنے کا انتظار کریں گے۔"

دروازے کی اوٹ میں کھڑی نور بانو تیزی سے وہاں سے ہٹ گئی۔ وہاں سے گزرتے ہوئے اُس نے اپنا نام سنا تو ٹھٹک گئی تھی۔ مگر اماں کی بات سن کر اس کے تمام اندیشے ڈھل گئے تھے۔

پہلی بار اسے یقین آیا کہ اماں سچ مچ اُس کے حق میں فیصلہ کیے بیٹھی ہیں۔

❀ ❀ ❀

نور بانو نے حیرت سے زرینہ کو دیکھا۔ "تم خوش نہیں ہوئیں یہ سن کر؟"

"میرے لئے خوش ہونا بہت آسان ہے لیکن خوشی پر یقین کرنا مشکل ہے۔" زرینہ نے جواب دیا۔

"کہیں تم پہلے سے کسی کو پسند تو نہیں کرتیں؟"

"میں اور پسند۔" زرینہ نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "مجھے تو یہ حق حاصل ہی نہیں۔ اور مجھے کوئی بھی پسند کرے، وہ کیسا ہی ہو، تو یہ اُس کا مجھ پر احسان ہوگا۔"

"ایسی کیا بات ہے۔"

"ایسی بات ہے کہ میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتی۔"

"مجھے بھی نہیں۔"

"آپ کو کیا، میں تو خود کو بھی نہیں بتانا چاہتی لیکن مجبور ہوں۔ کیونکہ گزری تو مجھ پر ہی ہے۔"

"مجھے بتاؤ، کیا بات ہے۔" نور بانو نے اصرار کیا۔

"نہیں بتا سکتی۔ آپ خدا کے لئے مجھ سے اصرار مت کیجئے۔"

"اچھا...... نہیں کرتی اصرار۔ مگر تم یہ مجھ سے آپ آپ کیوں کرتی ہو۔ میں تم سے اتنی بڑی تو نہیں ہوں۔"

"وہ تو میں بھائی کے رشتے سے آپ کا ادب کرتی ہوں۔ یہی بہت ہے کہ میں آپ کا نام لیتی ہوں۔ بھابی نہیں کہتی آپ کو۔"

نور بانو کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اُس نے جلدی سے موضوع بدلا۔ "یہ اکبر بھائی بہت اچھے ہیں...... بہت نیک ہیں۔"

"جانتی ہوں۔ دیکھ چکی ہوں انہیں۔"

"وہ تمہیں اچھے نہیں لگے۔"

"وہ تو ہیں ہی اچھے لیکن سچ یہ ہے کہ میں ان کے قابل نہیں ہوں۔" زرینہ نے افسردگی سے کہا۔

"لیکن خالہ کے انداز سے تو لگتا ہے کہ وہ تمہیں بہو بنا کر ہی چھوڑیں گی۔"

اچانک زرینہ کا انداز بدل گیا اور وہ مسکرانے لگی۔ "اتنی خرابیوں کے باوجود اب تک سب ٹھیک ہی ہوتا رہا ہے۔ تو اللہ نے چاہا تو آگے بھی اچھا ہی ہوگا۔" اُس نے اپنی کہی ہوئی بات دہرا دی۔ "تو میں ناشکرا پن کیوں کروں۔ نہیں نور بانو! اللہ جو کچھ بھی مجھے دے گا، وہ مجھے قبول ہوگا...... اور میرے لئے اچھا بھی ہوگا۔"

نور بانو نے حیرت سے اسے دیکھا اور سوچا...... یہ کتنی اچھی ہے...... کاش میں بھی ایسی ہی ہوتی۔

❀ ❀ ❀

عبدالحق کی ذہنی کیفیت اس وقت بڑی عجیب تھی۔ وہ اس حال میں کیمپ نہیں جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں چلا گیا۔ وہاں اُس نے رہنے کے لیے ایک کمرہ لیا۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ کلرک اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

"آپ رات بھر رکو گے یا تھوڑی دیر؟" کلرک نے اُس سے پوچھا۔

"تھوڑی دیر کا کیا مطلب ہے۔ مجھے رات گزارنی ہے۔"

"وہ جی آپ کے پاس سامان نہیں تھا نا، اس لیے......"

"سونے کے لیے آدمی کو سامان کی ضرورت بھی پڑتی ہے؟" عبدالحق نے چڑچڑے پن سے کہا۔ "کمرے میں بستر نہیں ہوگا کیا؟"

کلرک نے اُس کا نام پوچھ کر رجسٹر میں اندراج کیا اور چابی اسے دے دی۔ ''کمرہ نمبر 101 ہے صاحب جی۔ زینے سے اوپر جائیں گے تو بتے ہاتھ والا پہلا کمرہ ہے۔''

''شکریہ۔'' عبدالحق نے کہا اور زینے کی طرف بڑھ گیا۔

اپنے کمرے میں وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ تھکن کا احساس بہت شدید تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ درحقیقت تھکن نہیں ہے۔ رضوان صاحب سے ملاقات کا نتیجہ ہے۔ ان سے مل کر اسے بہت مایوسی ہوئی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ کوئی اتنا بے حس بھی ہو سکتا ہے۔ سگے بھائی کی بیٹی اپنی ہی بیٹی ہوتی ہے...... خاص طور پر جبکہ بھائی مر چکا ہو۔ لیکن انہوں نے کس طرح نور بانو کو رد کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا...... مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارا ہی بوجھ ہے...... اور تمہیں ہی اٹھانا چاہیے۔ اور وہ لفظ بوجھ انہوں نے گالی کی طرح استعمال کیا تھا۔ وہ لفظ درحقیقت مہذب آدمی کی گالی تھا۔ اور وہ عزت کی بات کر رہے تھے۔ اور اپنے خون کو گالی دے رہے تھے۔ یہ عزت کا کون سا معیار تھا!

اس لمحے عبدالحق کی سمجھ میں اپنے اضمحلال کی وجہ آ گئی۔ درحقیقت اسے بہت شدت سے غصہ آیا تھا۔ ایسا شدید غصہ کہ اسے ضبط کرنے میں اُس پر قیامت گزر گئی تھی۔ بلکہ اسے تو اس پر حیرت تھی کہ اُس نے برداشت کیسے کر لیا۔ نور بانو کو تو وہ اپنی عزت سمجھتا تھا۔ وہ اس کے لیے گالی سن کر کیسے برداشت کر سکتا تھا لیکن برداشت کرنا پڑا۔ کیونکہ گالی دینے والا نور بانو کا چچا تھا' جس کا حق نور بانو پر سچا تھا' اس کے حق کی طرح خود ساختہ نہیں۔

یہ عزت کیا چیز ہے' جسے یہ لوگ اتنی اہمیت دیتے ہیں۔ اس نے سوچا۔ یہ جو اتنے بڑے پیمانے پر ہجرت ہوئی' اور اس کے دوران بہیمیت اور درندگی کے جو اجتماعی مظاہرے دیکھنے میں آئے' وہ تو شاید انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ انسان نے مذہب کے نام پر جس طرح اپنے جیسے انسانوں کو کاٹا اور روندا اور معصومیت کو پامال کیا' وہ تو پوری انسانیت کے لیے شرم ناک ہے۔ تو اس پُر آشوب عہد میں جن ہزاروں معصوم لڑکیوں کی عصمت دری ہوئی' کیا وہ اس بات کی حق دار نہیں کہ ان کے لوگ انہیں زیادہ عزت دیں' ان کے زخموں پر مرہم رکھیں' انہیں جینے کا حوصلہ دیں' انہیں عزت کے ساتھ بسائیں' آباد کریں۔ یہ کیسے عزت دار لوگ ہیں' جو اپنی ہی مجبور اور مظلوم بچیوں کو آبرو باختہ قرار دے کر دھتکارتے ہیں۔ جو انہیں ایسی مکروہ اور متعدی بیماری میں مبتلا حقیر مخلوق سمجھتے ہیں' جو ان کی اچھوتی بچیوں کو بھی اس بیماری میں مبتلا کر دیں۔ یہ کیسے عزت دار لوگ ہیں' اپنی عزت پر گھمنڈ کرنے والے' جو عزت کو اپنی کمائی سمجھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ یہ مسلمان ہو کر بھی قرآن میں اللہ کے اس فرمان کو بھول جاتے ہیں کہ عزت ساری کی ساری اللہ کی ہے' اور عزت اور ذلت اللہ ہی کی طرف سے ہے' اور اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ نہیں جانتے کہ زندگی کی محبت کے ایک کمزور لمحے میں آدمی اپنی اس نام نہاد عزت اور غیرت سے کتنی آسانی سے

دست بردار ہو جاتا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے میں بے عزتی اور بے غیرتی کا طوق پہن لیتا ہے۔ افضال صاحب کی مثال اس کے سامنے تھی۔ وہ بلاشبہ مضبوط آدمی تھے لیکن زندگی کی محبت ان پر حملہ آور ہوئی تو ان میں ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ڈالنے کی سکت بھی نہیں رہی۔ وہ مسلح بھی تھے' انہوں نے صرف بیٹی سے ہی نہیں' خود سے بھی وعدہ کیا تھا' مگر زندگی کی محبت نے ان سے جسم کی جنبش چھین لی' اور وہ کھلی آنکھوں سے اپنی غیرت کی دھجیاں اُڑتے دیکھتے رہے۔ اس کے نتیجے میں وہ ذہنی توازن کھو بیٹھے' اپنا نام بھی ان کے لیے نفرت کا نشان بن گیا۔ اور جس زندگی کی محبت میں یہ سب کچھ ہوا' وہ زندگی بھی ان کے لیے قابل نفرت بن گئی۔

افضال صاحب کے برعکس یہ رضوان صاحب اسے بہت کمزور آدمی لگے۔ افضال صاحب پر جو گزری' وہ ان پر گزرتی تو شاید وہ جھیل بھی نہ پاتے۔ اور ان کی رعونت کا یہ حال تھا کہ انہوں نے اپنے خون کو ہی حقیر کر دیا۔ اپنی معصوم اور پاکیزہ بھتیجی کو بھی مسترد کر دیا۔ صرف اپنے گمان کی بنیاد پر اسے اپنے لیے باعثِ ننگ قرار دے دیا۔ وہ افضال صاحب کے مقابلے میں بہت ہی چھوٹے' بہت حقیر آدمی تھے۔ افضال صاحب نے اپنی بزدلی کی تلافی تو بڑی شان سے کی۔ اپنی بیٹی' اپنی آبرو گنوانے کے بعد انہوں نے عملی کوشش تو کی کہ جس صورت حال میں ان کی بیٹی پھنسی' اس سے کسی اور کی بیٹی کو بچا لائیں لیکن یہ رضوان صاحب! اسے یقین تھا کہ ان میں تو اخلاقی جرأت ہے ہی نہیں۔ دوسروں کو زبان کے زور پر مطعون کرنے والے عملاً کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

کیا مسلمان بھی موت سے ڈرتے ہیں...... یہ جاننے کے باوجود کہ موت اللہ کا حکم ہے' اور مقررہ وقت پر آتی ہے۔ اس نے سوچا۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ اس نے جمیل کو بھی دیکھا ہے۔ وہ بھی تو مسلمان تھا۔ کیا اسے رزقِ حلال اور رزق حرام کی تمیز نہیں تھی اور وہ لوگ' جنہیں وہ نہیں جانتا' جن کے دم سے ہیرا منڈی کی رونق ہے' کیا وہ مسلمان ہو کر بھی نہیں جانتے کہ زنا گناہِ کبیرہ ہے۔ اللہ کو بہت ناپسند ہے۔ مگر یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ مسلمان ہونا صالح اعمال کی ضمانت نہیں......

دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ ''آ جاؤ۔'' اس نے پکارا۔

دروازہ کھلا اور ویٹر اندر آ گیا۔ ''صاحب...... کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں۔''

''ابھی تو مجھے بھوک نہیں ہے۔ ضرورت ہو گی تو بلاؤں گا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''مجھے بلانا ہو تو یہ بٹن دبا دیجیے گا۔'' ویٹر نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔ چند لمحے بعد اسے احساس ہوا کہ ویٹر اب بھی کھڑا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''میں آپ کی ہر ضرورت پوری کر سکتا ہوں صاحب۔''

''کیا مطلب؟''

''پینا چاہیں تو دیسی بھی مل سکتی ہے اور ولایتی بھی۔''

عبدالحق کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ نگاہوں میں الجھن لیے ویٹر کو دیکھ رہا تھا۔

''اور صاحب' تنہائی بھی دور ہو جائے گی۔ بس آپ حکم کریں۔ جیسی آپ چاہیں گے' مل جائے گی۔ آج کل تازہ مال بہت آیا ہوا ہے۔''

اس بار عبدالحق کی سمجھ میں پوری بات آگئی۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور بڑی شدت سے غصہ آیا تھا۔ لیکن اس نے خود کو روک لیا۔ ایک وہ ویٹر ہی تو نہیں تھا۔ یہاں کا پورا سسٹم تھا۔ ''مجھے ایسی کوئی ضرورت نہیں۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''کھانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو تمہیں بلا لوں گا۔''

ویٹر نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا اور کمرے سے چلا گیا۔

عبدالحق 'تازہ مال' کی اصطلاح پر سوچنے اور کڑھنے لگا۔ مال! یعنی عورتیں کاروباری جنس ہیں...... جیسے پھل' سبزی' ترکاری اور تازہ مال! گویا ہجرت کا انسانی المیہ کاروبار چمکانے کا سبب بنا ہے۔ جسموں کے بیوپاریوں سے پوچھا جائے تو وہ یہی کہیں گے کہ بازار میں اتنی ورائٹی پہلے کبھی نہیں آئی۔ واقعی...... اس نئے مال میں وہ ہندو اور سکھ لڑکیاں بھی ہوں گی' جو ہندوستان جانے کی کوشش میں پکڑ لی گئی ہوں گی۔ اور وہ مسلمان لڑکیاں بھی ہوں گی' جو اپنے گھر والوں کو کھو کر' یا ان سے بچھڑ کر پاکستان پہنچی ہوں گی۔ اور کسی جمیل کے ہتھے چڑھ گئی ہوں گی۔ جسموں کے ان بیوپاریوں کے نزدیک ان کے ہندو' سکھ یا مسلمان ہونے کی کوئی اہمیت نہیں۔ ان کے نزدیک تو وہ محض ورائٹی ہوگی۔

عبدالحق کو افسوس ہونے لگا۔ وہ نور بانو کی خاطر رضوان صاحب کی تلاش میں یہاں آیا تو اس نے پایا تو کچھ نہیں' البتہ کھو بہت کچھ گیا۔ اس کے آئیڈیل ٹوٹ پھوٹ گئے۔ یہ بہت بڑا نقصان تھا اس کا۔

یہ وہ پاکستان تو نہیں' جو میرے تصور میں تھا۔ اس نے سوچا۔ مایوسی کی ایک تند لہر اٹھی اور اس کے وجود پر چھانے لگی۔ یہاں جسم فروشی بھی ہو رہی ہے' بے ایمانی بھی ہے' رشوت ستانی بھی ہے اور ظلم بھی۔

مگر پھر اچانک دل میں روشنی کی ایک ننھی سی کرن پھوٹی اور پھیلنے لگی۔ اسے ہیڈ محرر کی گفتگو یاد آگئی۔ وہ رشوت لیتا تھا' لیکن جانتا تھا کہ یہ بڑا گناہ ہے اور اس نے جو کچھ بتایا تھا' وہ دل کو لگتا تھا۔ انگریز بلاشبہ سازشی ذہن کے لوگ تھے۔ اور ہندوؤں کے ساتھ ان کی ملی بھگت تھی۔ وہ اس ریاست کو ناکام دیکھنا چاہتے تھے۔ اور اس کے لیے انہوں نے اہتمام بھی کیا تھا۔ اس ننھے

منے نوزائیدہ پاکستان کو انہوں نے معاشی کمزوری بھی دی تھی اور اخلاقی خرابیاں بھی مروج کی تھیں۔ جو کسی بھی معاشرے کے لیے تباہ کن ہوتی ہیں۔ جو لوگ ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ وہ سب اندر سے زخمی اور غم زدہ بھی تھے اور بے سروساماں بھی۔ ایسے میں مایوس ہونا کتنا آسان ہے۔ اور مایوسی کے نتائج تو اچھے ہوتے ہی نہیں۔

اس نے اپنی مایوسی کو ذہن سے جھٹکا۔ وہ جمیل اور رضوان صاحب جیسے لوگوں کو دیکھ کر مایوس ہو رہا تھا۔ مگر وہاں حسن دین' عرفان صاحب اور مسعود صاحب جیسے لوگ بھی تو تھے' جو پاکستان کے مستقبل کے لیے سوچ ہی نہیں رہے تھے' عمل بھی کر رہے تھے۔ اور تھانے کا وہ معمولی سا ہیڈ محرر بھی تو تھا' جو سب کچھ سمجھتا تھا۔ اور وہاں عام لوگوں میں چھولے والے پہلوان جیسے لوگ بھی تھے۔ برائی اور خرابی بہت بڑی تھی' اور جتنی بڑی تھی' اس سے بہت زیادہ بڑی نظر آتی تھی۔ اور نیکی تو بہت خاموش طبع ہوتی ہے۔ اس لیے نظر کم آتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس ملک کا قیام اللہ کی طرف سے تھا' اور ایک معجزہ تھا۔ تو اگر اللہ کی مرضی ہے کہ یہ قائم رہے تو تمام سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے باوجود' اور تمام تر خرابیوں کے باوجود قائم رہے گا۔ مایوسی تو صرف کمزور ہی کرے گی۔ مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

اس لمحے مسعود صاحب کی بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آگئی۔ اسے بھی اس ملک کی بہتری کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔ اسے سول سروس کی طرف آنا ہوگا۔ یہ اس کی ضرورت نہیں لیکن ملک و قوم کی ضرورت تو ہے۔ ویسے بھی وہ ان سے وعدہ کر چکا ہے۔

لاہور وہ جس مقصد کے تحت آیا تھا' وہ پورا ہو چکا تھا۔ اگرچہ وہ ناکام رہا تھا۔ تاہم فی الحال یہاں قیام کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے اب گاؤں واپس جانا تھا۔ اماں اسے یاد آ رہی تھیں' اور اماں بھی اس کے لیے تڑپ رہی ہوں گی۔ اور نور بانو......!

نور بانو کا خیال آتے ہی وہ پھر فکر مند ہو گیا۔ وہ نور بانو کو کیا جواب دے گا؟ اور کیا بتائے گا اسے؟ اگر وہ سچ بولتا ہے تو نور بانو کو کتنا دکھ ہوگا اور وہ شرمندہ بھی ہوگی۔ یہ تو کچھ ٹھیک نہیں، پھر وہ کیا کرے۔ جھوٹ تو بہت بری چیز ہے۔

وہ سوچنے اور الجھنے لگا۔ پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ اسے یاد تھا کہ نور بانو ابتدا ہی سے اپنے چچا کے پاس جانے کے لیے بے تاب تھی۔ اس کے خیال میں وہ صرف وہیں محفوظ ہو سکتی تھی۔ اور ان لوگوں کے بارے میں تو وہ تھی ہی بدگمان۔ اسے یاد تھا' یہاں آنے سے پہلے وہ خود اس کے پاس آئی تھی...... یہ یاد دلانے کے لیے کہ اس نے اس کے چچا کو تلاش کرنے کا وعدہ ابھی تک پورا نہیں کیا ہے۔ یعنی اس کا دل اب بھی اپنے چچا کے گھر میں اٹکا ہوا تھا۔

تو اب اگر وہ اسے سچ بتاتا ہے تو بہت ممکن ہے کہ وہ اس پر یقین نہ کرے...... بدگمانی کرے

کہ وہ...... اس بدگمانی کے بارے میں سوچنا بھی اسے اچھا نہیں لگا۔ وہ جانتی اور سمجھتی بھی ہی نہیں کہ وہ اس کے لیے کتنی محترم ہے۔ وہ اسے نجانے کیا سمجھتی ہے۔

خیر...... اس کا آسان حل یہ تھا کہ وہ اسے رضوان صاحب کے گھر لے جائے اور اسے ان سے ملوا دے لیکن وہ جانتا تھا کہ رضوان صاحب کا ردعمل کتنا شدید ہوگا۔ نور بانو کو صرف شرمندگی نہیں ہوگی بلکہ سخت ذلت بھی اٹھانی ہوگی۔ وہ تو کبھی خود سے نظر ملانے کے قابل بھی نہیں رہے گی۔ نہیں...... وہ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے نور بانو کو جیتے جی نہیں مار سکتا۔

اس کا مطلب تھا کہ اسے جھوٹ بولنا ہوگا۔ اور جھوٹ بولنے کے لیے اس کا دل آمادہ نہیں تھا۔

بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ کر مطمئن ہوگیا۔ سچ اسے اماں کو بتانا تھا۔ اور نور بانو سے وہ بس اتنا ہی کہتا کہ رضوان صاحب کو وہ تلاش نہیں کرسکا۔ اس کے بعد وہ اسے جو چاہے سمجھے لیکن وہ بہت بڑی اذیت سے بچ جائے گی۔

دل مطمئن ہوا تو بھوک جاگ اٹھی۔ اس نے ویٹر کو بلانے کے لیے گھنٹی کا بٹن دبا دیا......

❁ ❁ ❁

"تو تمہارا کام نہیں ہوا؟" مسعود صاحب نے پوچھا۔

"مجھے یقین تھا سر کہ وہ میرے مطلوبہ رضوان صاحب ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔" عبدالحق نے جواب دیا۔

"یعنی تمہاری تلاش جاری رہے گی؟"

"نہیں سر!" عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔ "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں برسوں مارا مارا پھرتا رہا ہوں، تب بھی انہیں تلاش نہیں کرسکوں گا۔ تو بے سود جستجو کا کیا فائدہ۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ اب کیا ارادہ ہے۔"

"گاؤں واپس جاؤں گا۔"

"لیکن واپس آنے کے لیے۔"

"جی ہاں۔"

"تو چلو...... میں تمہیں کوٹھی دکھا دوں۔"

"جلدی کیا ہے سر۔ واپس آؤں گا تب دیکھ لوں گا۔"

"نہیں میں چاہتا ہوں کہ تم آؤ تو سیدھے اپنی کوٹھی میں قیام کرو۔"

مسعود صاحب کے انکار کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ مسعود صاحب اپنی گاڑی میں اسے کوٹھی دکھانے لے گئے۔

"یہ تو وہی علاقہ معلوم ہوتا ہے، جہاں آپ کا گھر ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"ہاں...... یہ کوٹھی بھی مغل پورے میں ہی ہے۔" مسعود صاحب نے کہا۔ "پیدل تمہارے گھر آنا چاہو تو زیادہ سے زیادہ سات منٹ کا راستہ ہے۔"

میرے گھر! عبدالحق نے حیرت سے سوچا۔ یہ ابھی سے اسے میرا گھر کہہ رہے ہیں۔ ایسا خلوص بھی کہیں ملتا ہے! مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ ابھی اسے اس خلوص کا اور بڑا مظاہرہ دیکھنا ہے۔

مسعود صاحب نے گاڑی جس بنگلے کے سامنے رکوائی، اسے دیکھ کر عبدالحق کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ مسعود صاحب کی کوٹھی سے کافی مختلف تھا۔ مسعود صاحب کی پرانی طرز کی کوٹھی تھی جبکہ یہ جدید طرز کا بنگلہ تھا۔ پھر باہر سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ رقبے میں بھی مسعود صاحب کی کوٹھی سے کافی بڑا ہے۔

ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور دونوں نیچے اترے۔ مسعود صاحب نے گیٹ کے پہلو میں لگا اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ چند ہی لمحے بعد ادھیڑ عمر چوکی دار لپکتا ہوا گیٹ کی طرف آیا۔ مسعود صاحب کو دیکھ کر اس نے فرشی سلام کیا اور پھرتی سے گیٹ کھول دیا۔

"آؤ عبدالحق۔" مسعود صاحب نے عبدالحق کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

وہ اندر داخل ہوئے۔ سامنے ہی بہت بڑا، بہت وسیع و عریض لان تھا۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ پچھلے کچھ عرصے سے وہ نگہداشت سے محروم ہے۔ تاہم وہ بے ترتیب ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ اسے دیکھ کر سلیقے کا احساس ہوتا تھا۔

مسعود صاحب نے پلٹ کر چوکی دار کو دیکھا۔ "صادق...... یہ ہیں اس بنگلے کے اصل مالک۔" انہوں نے کہا۔ "ان کا نام عبدالحق ہے۔"

"سلام صاحب!" صادق نے عبدالحق کو یوں سلام کیا جیسے پہلی بار اس کی موجودگی کا احساس ہوا ہو۔

"صادق ڈرائیور سے کہو کہ گاڑی اندر لے آئے۔" مسعود صاحب نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

صادق پلٹا اور گیٹ کی طرف واپس چلا گیا۔

"مبین صاحب کے لیے یہ بنگلہ مصیبت بن گیا تھا۔" مسعود صاحب نے کہا۔ "اس کی مینٹیننس بھی ان کے لیے ممکن نہیں تھی۔ بنگلہ ان کے پاس تھا، مگر پیسہ نہیں۔ نہ وہ مالی رکھ سکتے تھے، نہ چوکی دار۔ کوئی ذریعہ آمدنی بھی نہیں تھا ان کا۔ ان کا اپنا گزارہ مشکل سے ہی ہوتا تھا انہوں نے مشتاق سے بات کی اور مشتاق نے مجھ سے۔ یوں ان کا مسئلہ حل ہوگیا اب وہ خوش ہیں۔"

"تو یہ بنگلہ بک گیا؟"

"ہاں۔ اسی لیے تو خالی ہے اس وقت۔" مسعود صاحب نے صدر دروازہ کھولا۔

بنگلہ دیکھ کر عبدالحق کی آنکھیں کھل گئیں۔ بات یہ نہیں تھی کہ بنگلہ بڑا تھا۔ اس کی آبائی حویلی اس سے بہت زیادہ بڑی تھی لیکن اس بنگلے کی آرائش قابلِ دید تھی۔ ڈرائنگ روم کو ملا کر وہاں آٹھ کمرے تھے۔ ڈرائنگ روم کے علاوہ ایک اسٹڈی تھی۔ چھ بیڈ روم تھے جن میں سے ہر ایک کا اپنا باتھ روم تھا۔ بہت بڑا کچن تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ فرنیچر بہت اعلیٰ تھا۔ ایسا فرنیچر اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک دروازہ پچھواڑے کی طرف کھلتا تھا۔ مسعود صاحب نے دروازہ کھولا۔ ”یہ سرونٹ کوارٹر ہیں۔“ انہوں نے بتایا۔ ”دیکھو گے؟“

”نہیں۔“

”کیسا لگا تمہیں؟“

”میں حیران ہوں۔ کوئی ہندو کیسے......“

”غلط سمجھ رہے ہو تم۔“ مسعود صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یہ ایک بڑے انگریز افسر کی سرکاری رہائش گاہ تھی۔ ہمارے ہاں کون ایسا بنگلہ بنواتا اور کون ایسی آرائش کرتا۔“

”اوہ۔“

”کہیں بیٹھنا چاہو گے کچھ دیر۔“

عبدالحق کو اسٹڈی بہت پسند آئی تھی...... کشادہ، روشن اور ہوادار۔ وہ مسعود صاحب کے ساتھ وہاں چلا آیا۔ وہاں ایک بڑی میز اور اس کے ساتھ آرام دہ کرسی بھی تھی۔ میز کے ساتھ ریک لگے تھے۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ چھ کرسیاں تھیں۔ پہلو والی دیوار کے ساتھ ایک بڑا دیوان تھا۔ دو دیواروں پر شیلف تھے۔ ایک طرف ایک بڑی راکنگ چیئر تھی لیکن وہ کمرا بہت خالی خالی لگ رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہاں فرنیچر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کتابوں سے محروم خالی شیلف اجڑے اجڑے اور سوگوار لگ رہے تھے۔ یہی حال میز کا اور اس کے ساتھ لگے ریکس کا تھا۔

عبدالحق جانتا تھا کہ لاہور میں قیام کے لیے اتنے بڑے بنگلے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ کمرا اسے بہت پسند آیا تھا۔ اس نے سوچا، اگر میں یہ بنگلا لیتا تو اس کمرے کو اپنا عبادت اور مطالعے کا کمرا بناتا۔ وہاں بڑا سکون تھا۔

”تو یہ چوکی دار......؟“

”میں نے ہی رکھا ہے۔“ مسعود صاحب نے کہا۔ ”کیمپ میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ صادق اپنی فیملی کو بھی لے آیا تھا۔ وہ لوگ یہاں زیادہ بہتر رہیں گے۔ انہیں روزگار بھی مل گیا اور سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی۔ مالی کے لیے میں نے بات کر لی ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں لان کی صورت نکل آئے گی۔“

”اب چلیں؟“ عبدالحق نے کہا۔

وہ باہر نکلے۔ ڈرائیور گاڑی پورچ میں لے آیا تھا۔ اس نے ان کے لیے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔

اس بار گاڑی مسعود صاحب کی کوٹھی کے باہر رکی۔ ”یہاں چائے پئیں گے۔ اور کچھ کام کی باتیں بھی ہو جائیں گی۔“ انہوں نے وضاحت کی۔

اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر مسعود صاحب اندر چلے گئے۔ واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ وہ فائل انہوں نے اس کی طرف بڑھائی۔

”یہ کیا ہے سر؟“

”تمہارے بنگلے کے کاغذات۔“

”میرا بنگلہ؟“ عبدالحق نے حیرت سے کہا اور فائل کھولی۔ سب سے اوپر سیل ایگریمنٹ تھا۔ اس کی رُو سے محمد مبین صاحب نے وہ بنگلہ عبدالحق کے ہاتھوں بیس ہزار روپے میں فروخت کیا تھا۔ نیچے بیس ہزار روپے کی وصولی کی رسید بھی تھی اور اس کے نیچے بنگلے کے کاغذات تھے۔

”یہ آپ نے......“

”مبین صاحب بے تاب ہو رہے تھے۔ میں یہ قدم نہ اٹھاتا تو بنگلہ ہاتھ سے نکل جاتا۔“ مسعود صاحب نے جلدی سے وضاحت کی۔ ”اور نقصان مبین صاحب کا بھی ہوتا، جو مجھے گوارا نہیں تھا۔ وہ تو اسے ہاتھی قرار دیتے تھے، جسے پالنا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ وہ اونے پونے اسے کسی کو بھی بیچ دیتے۔ میری آفر سن کر ان کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔“ وہ کہتے کہتے رکے۔ ”اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ میں نے بنگلہ مہنگا خریدا ہے تو تم اس میں حق بہ جانب ہو۔“

”نہیں سر، یہ بات نہیں......“

”اور ایک بات کہوں۔ تم اسے میری طرف سے تحفہ بھی سمجھ سکتے ہو۔“

”آپ کا شکریہ سر لیکن یہ بنگلہ میری ضرورت کے لحاظ سے بہت بڑا ہے۔ میرے نزدیک یہ اسراف ہے۔“

مسعود صاحب نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔ ”تمہاری آبائی حویلی سے تو یہ بہت چھوٹا ہو گا۔“

عبدالحق کی آنکھوں میں اپنی حویلی کا نقشہ پھر گیا۔ اس نے بے بسی سے سر کو اثباتی جنبش دی۔

”اور تمہارے خاندان میں کتنے افراد ہیں۔“

میری پیدائش سے پہلے صرف دو تھے...... اور میری پیدائش کے بعد تین عبدالحق نے دل میں سوچا۔

مسعود صاحب نے جیسے اس کی سوچ پڑھ لی۔ ”تو کیا تمہاری حویلی سنسان رہتی تھی؟ رونق نہیں ہوتی تھی۔“

عبدالحق کو حویلی کی رونقیں یاد آ گئیں۔ ”نہیں سر۔“

”ایک بات بتاؤں‘ دسترخوان کو جتنا بڑھاؤ گے‘ رزق اتنا ہی بڑھے گا۔ جتنے لوگ تمہار[ے] دسترخوان سے فیض یاب ہوں گے‘ اتنی ہی نعمتیں بڑھیں گی۔ اور عبدالحق‘ معیشت بھی دسترخوان [کی] طرح ہوتی ہے۔ جتنے لوگوں کا روزگار تم سے وابستہ ہوگا‘ اتنی ہی تمہاری معیشت مستحکم ہوگی۔ چ[وکی]دار‘ مالی‘ گھر میں کام کرنے والے ملازمین‘ پھر ڈرائیور۔ جب وہ بنگلہ تم آباد کرو گے تو یقین کر[و] تمہیں اتنا بڑا نہیں لگے گا۔ بلکہ ممکن ہے‘ چھوٹا لگنے لگے۔“

”لیکن سر میں اپنی ذات پر اتنا خرچ نہیں کرنا چاہتا۔“

”ہے تو خرچ کرو‘ خود پر بھی اور دوسروں پر بھی۔ اللہ کی عطا سے منہ موڑنا اچھا نہیں ہوتا۔ یہ سوچو کہ اس بنگلے کی وجہ سے کتنے بے گھروں کو گھر ملے گا۔ اور کتنے بے روزگاروں کو روزگار میسر آئے گا۔ بس آدمی کے دل میں خوف خدا ہو‘ اور وہ خود غرض اور عیش پسند نہ ہو تو سب ٹھیک ہے۔ اللہ تو نیت کا حال جانتا ہے نا۔“

”آپ نے مجھے قائل کر لیا سر۔“ عبدالحق نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ”لیکن آخری فیصلہ اماں کریں گی۔“

”اگر وہ کوئی چھوٹا مکان چاہیں گی تو وہ بھی مل جائے گا۔“ مسعود صاحب نے کہا۔ ”اس صورت میں یہ بنگلہ تمہارے لیے بہت اچھا سرمایہ کاری ثابت ہوگا۔ چند ہی برس میں اس کی قیمت کہیں کی کہیں پہنچ جائے گی۔“

”ایک بات بتائیں سر۔ آپ نے یہ بنگلہ اپنے لیے کیوں نہیں خرید لیا؟“

”میرے پاس سب کچھ تو ہے۔ اپنے آبائی مکان سے مجھے محبت ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔“

”تو سرمایہ کاری سمجھ کر خرید لیتے۔“

”میں سرکاری افسر ہوں۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کاروبار نہیں کرنا چاہتا۔ اسے بددیانتی سمجھتا ہوں۔“

”تو میرے لیے......“

”تم ابھی سرکاری ملازم نہیں ہو۔“ مسعود صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا اور لاہور میں قیام کرو گے تو گھر بھی تو چاہیے ہوگا تمہیں۔ اور پھر میں نے تمہیں بتایا نا کہ میں نے صرف تمہارا فائدہ نہیں سوچا۔ بلکہ مبین صاحب کے فائدے کی بھی فکر کی ہے۔ ان کے لیے یہ بنگلا

مصیبت بن گیا تھا۔ وہ تو اسے پانچ ہزار میں بیچ دیتے۔ جو کہ ان کے ساتھ زیادتی ہوتی۔ اب انہیں گھر بھی مل گیا اور کاروبار کے لیے بھی معقول رقم مل گئی وہ دعائیں دیں گے ہمیں۔ اور زیادتی تمہارے ساتھ بھی نہیں ہوئی۔ بیس ہزار میں یہ بنگلہ مہنگا نہیں۔“

”تو یہ بنگلا وہ خالی کب کریں گے؟“

”وہ تو کر چکے۔ قبضہ بھی ہمیں دے چکے۔“

عبدالحق کا منہ کھل گیا۔ ”اور یہ سامان...... فرنیچر......؟“

”انہیں بنگلہ جس حال میں ملا تھا‘ اسی حال میں ہم نے ان سے لیا ہے۔“

”تب تو یہ زیادتی ہی ہوئی سر۔ میرے خیال میں بیس ہزار سے زیادہ کا تو سامان ہے بنگلے میں۔“

”اور سوچو‘ وہ پانچ ہزار میں بنگلا سامان سمیت بیچنے کے لیے تیار تھے۔“

”مجھے مبین صاحب کا پتا ضرور دیجئے گا سر۔ کسی وقت خدانخواستہ وہ پریشان ہوئے تو ان کا حق ہوگا ہم پر۔“

”تم بہت اچھے انسان ہو بیٹے۔ یقین کرو‘ یہ بات میں نے بھی نہیں سوچی تھی۔“

”اور سر‘ آپ کی رقم میں واپس آنے کے بعد ہی دے سکوں گا۔“

”اس کی فکر نہ کرو۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسے میرا تحفہ سمجھ لو۔“

”اس کے باوجود بھی میرے لیے آپ کا تحفہ ہی ہے۔“

”اب تمہارا کیا پروگرام ہے۔“

”ابھی لاہور میں دو دن اور رکوں گا۔ کچھ خریداری کرنی ہے۔ گھر خالی ہاتھ تو نہیں جاؤں گا۔“

”اچھا......اب چلیں۔“

وہ پھر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ مسعود صاحب نے ڈرائیور کو کچھ ہدایات دیں‘ پھر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ”اب تمہیں خریداری کرنی ہے‘ تو روانگی تک کیمپ میں قیام تو تمہارے لیے مناسب نہیں ہوگا۔“

”جی سر کسی ہوٹل میں کمرا لے لو کر دوں گا۔“

”اس کی کیا ضرورت ہے...... اپنا گھر ہوتے ہوئے ہوٹل میں ٹھہرنا‘ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔“

عبدالحق جھجکا۔ ”اسٹیشن کے پاس گھر لوں گا سر تو روانگی میں آسانی ہوگی۔“

”ارے اس کی کیوں فکر کرتے ہو۔ گاڑی ہے نا اپنے پاس۔“

عبدالحق لاجواب ہو گیا۔ اب وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔

گاڑی ایک بینک کے سامنے رکی۔ ''آؤ میرے ساتھ۔'' مسعود صاحب نے اتر
ہوئے کہا۔

وہ بینک میں گئے۔ مسعود صاحب نے پانچ ہزار روپے نکلوائے اور عبدالحق کی طرف بڑھا دیے۔ ''یہ کیا سر؟''

''گھر کے لیے خریداری کرنی ہے۔ واپس آؤ گے تو مجھے دے دینا۔''

عبدالحق انکار کرنے والا تھا لیکن اس کی نگاہوں میں زرینہ کی صورت پھر گئی۔ کیوں نہ وہ اس کی شادی کو ذہن میں رکھ کر خریداری کرے۔ آخر وہ اس کی بہن ہے۔ اور پھر نور بانو...... اب اس کی شادی بھی تو اسی کو کرنا ہوگی۔ اور ویسے بھی انکار کرنے میں مسعود صاحب کے خلوص کی توہین ہوتی۔ اس نے رقم لے لی۔

''مجھے کیمپ اتار کر تم صاحب کے ساتھ چلے جاؤ۔ اور ان کے ساتھ ہی رہنا۔'' مسعود صاحب نے ڈرائیور سے کہا۔

❁ ❁ ❁

خریداری مکمل ہوتے ہوتے شام ہوگی۔ عبدالحق نے زیورات اور کپڑوں پر زیادہ زور دیا تھا۔ دو سوٹ کیس بھی خرید لیے تھے۔ ان میں ایک نور بانو کا تھا اور دوسرا زرینہ کا۔

یہ کام مکمل ہونے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ لاہور سے رخصت ہو رہا ہے۔ لاہور میں اس نے زندگی کے کئی روپ دیکھے تھے۔ ایک طرح سے یہ شہر اس کے لیے درس گاہ ثابت ہوا تھا۔

اسے افضال صاحب کا خیال آیا اور وہ اداس ہوگیا۔ اسے یاد آیا' اس نے افضال صاحب کے ساتھ ایک پورا دن گزارا تھا...... بھرپور دن! اور اس دن کے بعد افضال صاحب کی زندگی بدل گئی تھی۔ وہ افضال صاحب ہی نہیں رہے' اور اب وہ دماغی امراض کے اسپتال میں تھے۔

اس نے سوچا' آج وہ لاہور کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرے گا۔

اسٹیشن جا کر اس نے اپنے لیے اگلے روز کی سیٹ بک کرائی۔ پھر اس نے ڈرائیور سے کہا وہ سامان لے کر گھر چلا جائے۔ اسے چند ضروری کام ہیں۔ وہ خود ہی گھر پہنچ جائے گا۔

''لیکن صاحب نے کہا تھا......'' ڈرائیور نے احتجاج کیا

''......کہ تمہیں میرے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔'' عبدالحق نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ڈرائیور نے بے بسی سے سر ہلا دیا۔ بات ماننے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

گاڑی کے جانے کے بعد عبدالحق نے گہری سانس لی۔ اب وہ آزاد تھا۔ یہ وقت وہ اس طرح گزارنا چاہتا تھا' جیسے ایک دن افضال صاحب کے ساتھ گزارا تھا۔ اس دن کی طرح' جب اسے بہن مل گئی تھی۔

وہ چل دیا۔ اس کے سامنے نہ کوئی سمت تھی نہ مقصد۔ اس نے اپنے قدموں کو آزاد چھوڑ دیا۔ اور اسے بڑی شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ افضال صاحب اس کے ساتھ موجود ہیں...... بلکہ اس کی رہ نمائی کر رہے ہیں۔

❁ ❁ ❁

نادرہ دوپہر کو سو کر اٹھی تو ظہر کا وقت ہو رہا تھا۔ نہا دھو کر اس نے نماز پڑھی اور قرآن کی تلاوت کرنے بیٹھ گئی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ننھی ارجمند اس کے اردگرد منڈلا رہی ہے۔ پھر جیسے اس کی برداشت جواب دے گئی۔ ''پھپھو...... پھپھو...... مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ قریب آ کر روتی آواز میں بولی نادرہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''تو تمہیں نہیں پتا کہ بھوک لگے تو کیا کرتے ہیں۔''

''پتا ہے لیکن میں آپ کے بغیر کھانا نہیں کھاؤں گی۔''

''اچھے بچے ضد نہیں کرتے میری شہزادی۔''

''بس یہی ایک وقت تو آپ ملتی ہیں مجھے۔'' ارجمند کے لہجے میں شکایت تھی۔ ''رات آپ کے کمرے کا دروازہ بند ہوتا ہے۔ اور صبح ناشتہ کے وقت آپ سو رہی ہوتی ہیں۔ اور پھپھو' مجھے رات کو اکیلے سوتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔''

نادرہ کو اس پر پیار آ گیا۔ چھ سال کی بچی' جو ہمیشہ ماں باپ کے درمیان سوتی رہی۔ اسے ڈر تو لگے گا ہی۔ اور اسے سمجھایا کیسے جا سکتا ہے۔ وہ خوش قسمت تھی کہ اس نے اپنے والدین' دادا دادی اور چچاؤں کو سکھوں کے ہاتھوں شہید ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اور اس نے ظالموں کے ہاتھوں اپنی پھپھو کی پامالی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے لیے افیون کی ایک چٹکی نعمت بن گئی تھی' جو اس کی دادی نے بھوک سے بلکتے دیکھ کر اسے دے دی تھی۔ نادرہ کو یاد تھا' اماں نے کہا تھا...... اسے ہوش آئے گا تو انشاءاللہ پاکستان میں ہوگی' اور کھانا بھی مل جائے گا۔ اماں کو تو خود بھی نہیں معلوم ہوگا کہ وہ اسے بھوک سے نہیں' بے شمار بڑی بڑی بلاؤں سے بچا رہی ہے۔ سو جس وقت اس کے خاندان پر قیامت ٹوٹی' وہ افیون کے زیر اثر بے خبر سو رہی تھی...... اور سوتی رہی۔

''کیا سوچ رہی ہیں پھپھو' مجھے بہت بھوک لگی ہے۔''

ارجمند نے اسے چونکا دیا۔ ''تم بوا سے کھانا نکالنے کا کہو۔ میں بھی آتی ہوں۔''

نادرہ نے قرآن پاک طاق پر رکھا۔ واپس آئی تو ارجمند دسترخوان پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

مگر اس روز نوالے نادرہ کے حلق میں پھنس رہے تھے۔ کھانے کی رغبت تو پاکستان آنے کے بعد اسے رہی ہی نہیں تھی۔ وہ تو بس جینے کے لیے کھاتی تھی۔ ذائقے سے بھی غرض نہیں تھی' جو

کچھ بھی ہو اور جیسا بھی ہو' چاہے نمک تیز ہو' وہ کھا لیتی تھی۔ مگر جب پرانے زخم ہرے ہوتے تو نوالہ حلق سے اترتا ہی نہیں تھا۔

اس وقت بھی کھانے کے بجائے وہ ان زہریلی یادوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سب لوگ ختم کر دیے گئے۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ قیامت ہے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ قیامت تو ابھی اس پر گزرنی ہے۔ وہ جس کا آنچل بھی کبھی سر سے نہیں ڈھلکتا تھا' لباس اس کے جسم سے نوچ کر علیحدہ کر دیا گیا۔ پھر تسلسل کے ساتھ اس پر قیامت گزرتی رہی۔ وہ کتنے تھے' یہ بھی اسے یاد نہیں رہا۔ بس وہ تو دل ہی دل میں مرنے کی دعا کرتی رہی...... اور پھر شاید مر بھی گئی۔ کیونکہ اسے ہوش نہیں رہا تھا۔ مگر ہوش کھونے سے پہلے آخری یاد یہی تھی کہ گدھ اسے نوچ رہے تھے۔ بھنبھوڑ رہے تھے۔

''آپ تو کھا ہی نہیں رہی ہیں پھپھو۔'' ارجمند نے اسے ٹوک دیا۔

نادرہ پھر چونکی۔ نوالہ نہ جانے کب سے اس کے ہاتھ میں تھا۔ ''کھا تو رہی ہوں۔'' اس نے نوالہ منہ میں لے جاتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو بہت بھوک لگتی ہے پھپھو۔'' ارجمند نے کہا۔

''لگنی بھی چاہیے۔ کھاؤ گی نہیں تو بڑی کیسے ہو گی۔''

''تو آپ کیوں نہیں کھاتیں۔''

''میں تو بڑی ہو چکی ہوں نا گڑیا۔ اب اور بڑی تو نہیں ہو سکتی۔''

کھانا زہر مار کر کے وہ ارجمند سے باتیں کرتی رہی۔ ارجمند بہت باتونی تھی۔ ''کہانی سنائیں نا پھپھو۔''

''کہانی تو رات کو سناتے ہیں گڑیا۔''

''رات کو تو آپ مجھے ملتی ہی نہیں۔'' ارجمند نے کہا۔ پھر بولی۔ ''مجھے اکیلے سونا اچھا نہیں لگتا۔ بہت ڈر لگتا ہے۔ میں آپ کے ساتھ سونا چاہتی ہوں پھپھو۔''

''سوری گڑیا' یہ ممکن نہیں۔ اس میں تمہاری ہی بھلائی ہے۔''

''کیسے پھپھو۔''

''اکیلے سوؤ گی تو ہر ڈر نکل جائے گا۔ تم بہادر ہو جاؤ گی۔''

''گھر میں تو میں امی اور بابا جان کے ساتھ سوتی تھی۔'' ارجمند نے اعتراض کیا۔

''اس وقت تم چھوٹی تھیں۔ اب تم بڑی ہو گئی ہو۔''

''اتنے سے دن میں مَیں بڑی ہو گئی؟'' اور ایک اور اعتراض......

''کبھی کبھی تو بچے ایک دن میں بھی بڑے ہو جاتے ہیں لیکن تم نہیں سمجھو گی [illegible] ات۔ ابھی

اتنی بڑی نہیں ہو۔''

ارجمند کچھ دیر خاموش ہو کر سوچتی رہی۔ ''چلیں ٹھیک ہے۔ مجھے بہادر بنانے کے لیے آپ رات کو اکیلے سلاتی ہیں۔ تو پھر کہانی مجھے دن میں سنایا کریں۔ میرا کہانی سننے کو دل بہت چاہتا ہے۔''

اب تو ایک ہی کہانی یاد رہ گئی ہے۔ نادرہ نے دل میں سوچا۔ اور وہ سنا دی تو تمہارا دل پھٹ جائے گا گڑیا۔ ''دن میں کہانی سناؤں تو تمہارے ماموں راستہ بھول جائیں گے۔'' اس نے کہا۔

''مگر میرے ماموں تو سب لوگوں کے ساتھ اللہ میاں کے پاس چلے گئے۔ اللہ میاں کے پاس جا کر تو کوئی راستہ نہیں بھولتا ہو گا۔''

کبھی کبھی ارجمند کے سوالوں کا جواب دینا نادرہ کے لیے مشکل ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی ایسی ہی صورت حال تھی۔ مگر اس کی مشکل آسان ہو گئی۔ نیلم بائی نے دروازے سے جھانکا۔ ''چلو ارجی...... تمہارے استاد جی آ گئے ہیں۔''

''میں ارجی نہیں ہوں۔ میرا نام ارجمند ہے۔'' ارجمند نے بڑے وقار سے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

❁ ❁ ❁

نیلم بائی کی پوری زندگی کوٹھے پر گزری تھی۔ مگر اس نے اپنی زندگی میں نادرہ جیسی کوئی لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ کوٹھے پر آنے والی ہر نئی لڑکی اپنی بساط کے مطابق زبردست مزاحمت کرتی ہے۔ اس مزاحمت کو توڑنا ایک فن ہے' جس میں ہر نائیکہ طاق ہوتی ہے۔ اس مزاحمت کو توڑنے کا اپنا ایک لطف ہوتا ہے۔ مزاحمت جتنی شدید ہو' اسے توڑنے میں نائیکہ کو اتنی ہی لذت ملتی ہے۔

کوٹھا بھی ایک طرح سے صدیوں سے قائم ایک ادارہ ہے۔ ہر نائیکہ ابتدا میں ایک مزاحمت کرنے والی لڑکی ہوتی ہے۔ اور مزاحمت ٹوٹنے کے بعد طوائف بننے والی ہر لڑکی کو مستقبل میں نائیکہ بننا ہوتا ہے۔ اور طوائف کے پاس اپنی مزاحمت توڑنے والی نائیکہ کا دیا ہوا صدیوں کا تجربہ ہوتا ہے۔

لیکن نادرہ ابتدا ہی سے مختلف تھی۔ اسے شیدا نیلم بائی کے پاس لایا تھا۔

پاکستان بنتے ہی شیدے کا دھندا خوب چمکا تھا۔ ہندوستان سے کوئی گاڑی آتی تو شیدا اسٹیشن کا رخ کرتا اور ہر بار کوئی نہ کوئی نگینہ اس گاڑی سے نکال لاتا۔ بعض اوقات تو کئی لڑکیاں لے آتا تھا۔

نیلم کو یاد تھا' نادرہ بہت برے حال میں آئی تھی لیکن نیلم جوہری تھی۔ کتنی ہی کیچڑ لگی ہو' گرد چھپی ہو' ہیرے کو وہ ہر حال میں پہچان لیتی تھی۔ نادرہ کو بچی کے ساتھ ایک کمرے میں پہنچا کر وہ

واپس آئی اور شیدے کو گن کر سو روپے دیے۔

شیدے نے وہ روپے اس کی طرف پھینک دیئے "یہ کیا پکڑا رہی ہو بائی ؟"

"تجھے معلوم ہے کہ مجھ سے زیادہ قیمت دینے والا اس بازار میں کوئی نہیں۔ لڑکی کا حال دیکھو۔"

"میں سب دیکھ بھال چکا ہوں بائی۔ تم جانتی ہو یہ بات۔ دیکھو بائی' یہ تمہارے لیے زندگی بھر کی کمائی ہے۔ زندگی رہی تو چالیس سال ان کی کمائی کھاؤ گی۔ سونا ہے سونا۔"

"چالیس سال!" نیلم نے آنکھیں نکالیں۔ "اب تو دن میں بھی چڑھانے لگا ہے۔ چالیس سال کوئی چلی ہے آج تک۔"

"بنومت بائی۔ میں تمہارے پاس صرف حال نہیں لایا' مستقبل بھی لایا ہوں۔ شراب کی بند بوتل ہے۔ بارہ سال بعد کھلے گی تو لوگ کھنچے چلے آئیں گے اس کی خوشبو پر۔ بیس سال بڑی والے کے ہیں۔ تو اس سے زیادہ اچھے بیس سال چھوٹی کے ہوں گے۔ تم جانتی ہو یہ بات۔"

"اچھا چل' پچاس اور لے لے۔"

"تم پیسے اپنے پاس رکھو اور ان دونوں کو لے آؤ میں کوئی اور گھر دیکھتا ہوں۔"

اور شیدا دو سو روپے لے کر ہی ٹلا۔

نادرہ نیلم کے لیے حیران کن ثابت ہوئی۔ اس نے تو نام کو بھی مزاحمت نہیں کی۔ کوٹھے کی حقیقت کو اس نے ایسے قبول کر لیا' جیسے پہلے سے اس کے لیے تیار بیٹھی ہو۔ ورنہ ابتدا میں تو لڑکیاں بہت ستاتی ہیں۔

پہلے تو نیلم کو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ کبھی اس طرح کی لڑکیاں بھی آجاتی ہیں۔ کوئی کہے کہ یہ بہت بے رحمانہ بات ہے' بہت بڑی زیادتی ہے' لیکن بازار میں عمر گزارنے والی نیلم جانتی تھی کہ پیدائشی طور پر تو کوئی لڑکی طوائف نہیں ہوتی لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ جنسی بے راہ روی میں مبتلا لوگ بعض اوقات چھوٹی بچیوں تک کو لتوں میں لگا دیتے ہیں۔ پھر ان بے چاریوں کے لیے زندگی میں اور کچھ نہیں رہتا وہ کوٹھوں پر ایسے آتی ہیں' جیسے ریت پر پھڑکتی ہوئی مچھلی کو کوئی اٹھا کر پانی میں پھینک دے۔ اور وہ یہ بات اس لیے سمجھتی تھی کہ وہ خود بھی ایسی ہی تھی۔

بہ ظاہر تو نادرہ ایسی لگتی تھی' لیکن کبھی نیلم کو شبہ ہوتا تھا کہ نادرہ کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے۔ وہ کم بولتی تھی' اور بہت شائستہ طبیعت کی تھی۔ گفتگو سے پڑھی لکھی لگتی تھی' اور یہ بھی طے تھا کہ وہ کسی اچھے گھر کی ہے۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بے راہ روی تو اچھے گھروں میں بھی راہ بنا لیتی ہے لیکن نادرہ کے رویے میں کہیں گہرائی میں ایک دبا دبا اکراہ تھا' جو اوپر بہرحال نظر نہیں آیا تھا۔

اور جب نیلم نے نادرہ سے کہا کہ کوٹھے کے لحاظ سے اس کے لیے کوئی اور نام ہونا چاہیے تو

وہ کھل اٹھی تھی۔ "ٹھیک ہے بوا' یہ تو بہت اچھا ہے۔" اس نے کہا تھا۔ "میں تو خود اپنا نام یاد نہیں رکھنا چاہتی۔"

وہ پہلا موقع تھا کہ نیلم کے اندازے کی تصدیق ہوئی۔ نادرہ نے بہت بڑا سمجھوتہ کیا تھا اپنے آپ سے۔ "کوئی نام ہے تمہارے ذہن میں؟" اس نے نادرہ سے کہا۔

نادرہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ "نرگس کیسا رہے گا؟" تاہم اس کے لہجے میں اعتماد نہیں تھا۔

نیلم تو پھڑک گئی۔ "بہت شان دار۔ اس نام کے تو لوگ دیوانے ہیں آج کل۔"

یوں نادرہ نرگس بن گئی۔

تین مہینے گزر گئے۔ نیلم کو نرگس سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ وہ اس کی لاڈلی بن گئی۔ دوسری لڑکیاں حسد کرنے لگیں کہ بوا نرگس کی کوئی بات نہیں ٹالتیں۔ وہاں نیلم بائی کے بعد نرگس کا ہی حکم چلتا تھا۔

پھر ایک دن نیلم بائی کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ نرگس نے سمجھوتہ کیا ہے۔ اور وہ یہ بھی سمجھ گئی کہ سمجھوتہ کیوں کیا ہے۔

اس روز نرگس نے کہا۔ "بوا' میں چاہتی ہوں کہ ارجمند کو تعلیم دلائی جائے۔ آپ اسے اسکول میں داخل کرا دیں۔"

گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والی نیلم بائی ایک لمحے میں بات کی تہ تک پہنچ گئی۔ "دیکھ بیٹی' یہاں قریب میں کوئی اچھا سکول ہے بھی نہیں۔ اور ویسے بھی میں بچی کو باہر نکالنا پسند نہیں کرتی۔"

"کیوں بوا؟" نرگس نے بہت دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"میں اس بات کی قائل ہوں کہ نئے چاند کو چودھویں رات سے پہلے گھٹاؤں میں چھپا کر رکھنا چاہیے۔ تبھی تو دیکھنے والوں کی آنکھیں چکا چوند ہوں گی۔"

اس نے نرگس کو بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

نرگس کے چہرے پر ایک رنگ سا دوڑ گیا۔ نیلم کے اندازے کی مزید تصدیق ہو گئی۔

"چلو ٹھیک ہے بوا۔ مگر گھر پر تو پڑھایا جا سکتا ہے۔ اسے۔"

نیلم بائی نے سکون کی سانس لی۔ کوٹھے کے ماحول میں تناؤ اسے پسند نہیں تھا۔ تناؤ کا روباری لحاظ سے نقصان دہ ہوتا ہے۔ تماش بین پھولے ہوئے منہ دیکھنے کے لیے تو نہیں آتے انہیں تو ہنستے مسکراتے چہرے اچھے لگتے ہیں' چاہے مسکراہٹ جھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔ اس نے فیصلہ کیا کہ یہ بات ماننے میں کوئی حرج نہیں۔ ساتھ ہی وہ اچھے ماحول میں اپنی ایک بات منوا سکتی ہے۔

"دیکھو بیٹی' ہمارے ہاں تو تعلیم ہی اور دی جاتی ہے۔ ابھی سے رقص اور گانے کی تعلیم دی جائے گی تو بچی بڑی ہوتے ہوتے طاق ہو جائے گی۔ میں نے استاد جی سے بات کر لی ہے ارجمند کے لیے۔ سہ پہر کے وقت وہ آیا کریں گے۔"

نرگس کے چہرے پر پھر رنگ دوڑ گیا۔ شاید سمجھوتے کی کچی ڈور پر دباؤ بڑھ گیا تھا۔ یعنی اب وہ کسی بھی لمحے ٹوٹ سکتی تھی۔

نیلم بائی اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ "لیکن نرگس' سچی بات ہے کہ میں تجھے اپنی بیٹی سمجھتی ہوں۔" اس نے لہجے میں محبت سموتے ہوئے بڑے دلار سے کہا۔ "تیری فرماں برداری نے میرا دل جیت لیا ہے۔ تیری بات میں نہیں ٹال سکتی۔ میں ارجمند کے لیے بہت اچھا استاد لگا دوں گی پڑھانے کے لیے۔"

نرگس خوش ہوئی...... "شکریہ بوا۔ اسے قرآن پاک میں خود پڑھاؤں گی۔"

نیلم اپنی ناگواری کو پی گئی۔ آخر نرگس نے بحث مباحثے کے بغیر کوٹھے کی تعلیم قبول کر لی تھی۔

یوں ارجمند کی دونوں طرح کی تعلیم شروع ہو گئی لیکن نیلم نے نرگس کو اور اس کے سمجھوتے کو پوری طرح سمجھ لیا تھا۔ نرگس کا خواب اس پر کھل گیا تھا، وہ ارجمند کو بچانے کے لیے اپنی قربانی دے رہی تھی۔ نیلم نے سمجھ لیا کہ ارجمند ان دونوں کے درمیان وجہ نزاع بن سکتی ہے لیکن ابھی اس میں بہت وقت پڑا ہے۔ اس وقت تک نرگس کو تو نچوڑا جائے۔ الجھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ نیلم بائی جانتی تھی کہ کوٹھے کے ماحول میں کیسا سحر ہوتا ہے۔ کوٹھے پر پلنے بڑھنے والی کچی عمر کی لڑکیاں تو اس سحر سے بچ ہی نہیں سکتیں۔ نرگس کچھ بھی نہیں کر سکے گی۔ کوئی لڑکی رقص سیکھے گی تو اسے رقص دکھانے کا شوق بھی ہوگا۔ اور جوانی کی سرحد میں قدم رکھنے والی لڑکی کے لیے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر سراہنا کافی نہیں ہوتا۔ وہ مردوں سے تعریف سننے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ نیلم بائی مطمئن تھی۔ مناسب وقت پر چپکے چپکے ارجمند کو پر پُرزے نکالنے میں مدد دے گی۔ نرگس سے الجھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب کسی کو گڑ کھلا کر مارا جا سکتا ہو تو زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔

نیلم بائی پلٹی اور اس کمرے کی طرف چل دی' جہاں استاد جی ارجمند کی تربیت کر رہے تھے۔

❀ ❀ ❀

وہ وقت نادرہ کے لیے بہت سخت ہوتا تھا' جب زخم ہرے ہوتے تھے۔ تب وہ پہلے کی طرح مرنے کی آرزو کرتی تھی۔ مرنا اس کے لیے بڑی بات نہیں تھی۔ بلکہ مرنا تو اس کے لیے بہت آسان تھا۔ درحقیقت تو وہ اس دن ٹرین میں ہی مر گئی تھی۔ اس کے بعد مرنا تو اس کے لیے محض ایک رسم تھا لیکن ایک ذمہ داری ایسی آ پڑی کہ موت سے ہزار گنا بدتر زندگی جینا اس کے لیے

ضروری ہو گیا۔

ٹرین کے پاکستان پہنچنے سے کچھ ہی دیر پہلے اسے ہوش آیا تھا۔ ڈبے کا منظر دیکھتے ہی اسے اُبکائی آئی لیکن پیٹ میں کچھ تھا ہی نہیں۔ پھر اچانک اسے اپنی برہنگی کا احساس ہوا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے کپڑے اس قابل نہیں تھے کہ اس کی برہنگی کو مکمل طور پر ڈھانپ سکتے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ یہ تصور بھی اس کے لیے سوہانِ روح تھا کہ وہ مکمل برہنہ حالت میں پاکستان پہنچے۔ چنانچہ اس نے وہی کپڑے پہن لیے۔ پھر اسے اماں کی چادر نظر آئی۔ خون کے دھبے سوکھ چکے تھے۔ اس نے وہ چادر اوڑھ لی۔

ٹرین کی رفتار کم تھی لیکن وہ چل رہی تھی۔

اسے یاد آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ ایک لمحے کو تو اسے لگا کہ اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا لیکن دکھتا ہوا بدن گواہی دے رہا تھا کہ وہ حقیقت تھی۔ پھر ڈبے کی صورت حال دیکھی تو سب کچھ واضح ہو گیا۔ اس لمحے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ وجود کی اس ناپاکی کے ساتھ پاکستان کی سرزمین پر قدم نہیں رکھے گی۔ وہ چلتی ٹرین سے کود کر جان دے دے گی۔

یہ سوچ کر وہ دروازے کی طرف چلی۔ اسی لمحے اس کی نظر ارجمند پر پڑی۔ جو بے سدھ ایک طرف پڑی تھی۔ اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ ارے...... یہ ابھی تک سو رہی ہے۔ کہیں امی نے افیون زیادہ تو نہیں دے دی تھی۔ ننھی بچی کے لیے تو ایک چٹکی بھی بہت ہے۔

وہ گھبرا کر ارجمند کی طرف بڑھی۔ سینے کے تموج سے اندازہ ہو گیا کہ وہ زندہ ہے۔ اور اس کی سانسیں بڑی ہموار تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ سو رہی ہے۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور اسے ہلانے لگی۔ "اٹھو گڑیا......" ارجمند کسمسائی' کچھ منمنائی لیکن شاید آنکھیں کھولنا اس کے بس میں ہی نہیں تھا۔ وہ پھر بے سدھ ہو گئی۔

وہ کچھ دیر ارجمند کا سر اپنے زانو پر رکھ کر بیٹھی رہی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ ٹرین کی رفتار کم ہو رہی ہے۔ پھر رفتار بتدریج کم ہوتے ہوتے ٹرین ٹھہر گئی۔ اس کے ساتھ ہی باہر آوازیں آنے لگیں۔

وہ خوف زدہ ہو کر دبک گئی۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ مر جانا چاہتی تھی لیکن ارجمند کو اس طرح چھوڑنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ لیکن یہ مشکل اپنی جگہ تھی کہ وہ اس حال میں کسی کا سامنا کیسے کرے گی۔

قریب آتی ہوئی آوازیں ابھریں۔ دروازے سے کچھ لوگ ڈبے میں آئے۔ اس نے اماں کی خون آلود چادر اپنے منہ میں ڈال لی اور سانس روک لی۔

"اس ڈبے میں تو کوئی بھی زندہ نہیں ہے۔" ایک مردانہ آواز ابھری۔

''پھر بھی اندر چل کر دیکھنا تو چاہیے۔''

''او یار' پہلے زندوں کی فکر کرنی ہے ہم نے۔ یہ بے چارے تو ہر فکر سے بے نیاز ہیں۔ انھیں بعد میں دیکھ لیں گے۔''

''ضمیر ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' تیسری آواز میں تحکم تھا۔

ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ لوگ۔ نادرہ نے دل میں سوچا۔ میں زندہ کب ہوں۔

وہ لوگ نیچے اترے اور دوسرے ڈبے کی طرف بڑھ گئے۔ نادرہ کچھ دیر بیٹھی رہی۔ پھر اس نے سوچا کہ ٹرین سے اترنا تو ہوگا۔ اس نے سوچا کہ پلیٹ فارم پر اترنے کے بجائے دوسری طرف اترے گی۔ کیوں؟ اور اس کے بعد کیا ہوگا' یہ سب کچھ سوچنے کے وہ قابل نہیں تھی۔

اس نے ارجمند کو جگانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ تھک ہار کر اس نے اسے گود میں اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے ارجمند کو اٹھا لیا۔ پانچ سال کی لاڈلی بھتیجی کو اس نے بارہا گود میں اٹھایا تھا لیکن اس وقت جسم جس طرح نڈھال تھا' اس کی وجہ سے وہ اسے بہت بھاری لگی۔ اس کی ٹانگیں کپکپانے لگیں لیکن ایک احساس اور بھی تھا۔ ارجمند نے جیسے اس کی برہنگی کو اوڑھانپ لیا تھا۔ ورنہ تو وہ اماں کی چادر کے باوجود خود کو برہنہ ہی سمجھ رہی تھی۔

اس نے لڑکھڑاتے ہوئے قدم دروازے کی طرف بڑھائے۔

اسی لمحے دروازے کی آہٹ ابھری اور وہ جوان آدمی اچانک ہی سامنے آ گیا۔ نادرہ کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

جوان آدمی اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا' اور وہ اپنی جگہ ساکت ہو گئی تھی۔ پھر جوان آدمی آگے بڑھا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''ڈریے مت۔ اب آپ اپنے لوگوں کے درمیان ہیں۔'' اس نے بے حد شائستگی سے کہا۔

نادرہ نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی عمر 30، 35 کے درمیان ہوگی۔ وہ بشرٹ اور پینٹ پہنے تھا۔ پیروں میں شوز تھے۔ صورت شکل اور طور طریقے سے بھی شائستہ معلوم ہوتا تھا۔ نادرہ قدرے پُرسکون ہو گئی۔

''مجھے بس اتنا بتا دیں' آپ کا کوئی اپنا بچہ ہے یا نہیں۔''

نادرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔

''میں سمجھ گیا۔ آپ غم نہ کریں۔ میں موجود ہوں نا۔ آیئے میرے ساتھ۔ لایئے' بچی کو مجھے دے دیں۔''

''آ...... آپ...... آپ کون ہیں؟''

''میں عبدالرشید...... دہلی سے تعلق ہے میرا۔ ہم لوگ پہلے ہی ہجرت کر آئے تھے۔ اب یہاں ہمارا اپنا گھر ہے۔'' وہ کہتے کہتے رکا اور اس نے غور سے نادرہ کو دیکھا۔ ''آپ بھی شاید دہلی کی ہیں۔''

نادرہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب ارجمند کو اٹھا کر کھڑے رہنا اس کے بس کی بات نہیں تھا۔ لگتا تھا' کسی بھی لمحے وہ گر جائے گی۔

رشید نے یہ بات بھانپ لی۔ ''لایئے...... بچی کو مجھے دے دیں۔'' اس نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

نادرہ نے ارجمند کو اس کی گود میں دے دیا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''

نادرہ کو لگا کہ وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہا ہے...... جیسے اس کی نظریں چادر کے آر پار ہو رہی ہیں۔ ''میرا نام نادرہ ہے۔'' اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''اور یہ بچی؟''

''میری بھتیجی ہے...... ارجمند۔''

''مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ پر کیا گزری ہے' اور آپ کس حال میں ہیں۔'' رشید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''ایسے میں آپ کو لاوارث کی حیثیت سے کسی کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔''

نادرہ کا چہرہ تمتما اٹھا۔ مگر اسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ بات کڑوی ہے اور اسے بری بھی لگی ہے لیکن ہے سچی۔ یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتی تھی اس حال میں اس ایک آدمی کے سامنے آنا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ تو وہ بہت سارے لوگوں کا سامنا کیسے کر سکتی ہے۔

''آپ میری بات غور سے سنیں۔'' رشید نے کہا۔ ''ہم پلیٹ فارم پر نہیں بلکہ دوسری طرف اتریں گے۔ میں آپ کو اپنے گھر لے جاؤں گا۔ وہاں آپ کو میری بہن کے کپڑے مل جائیں گے۔ راستے میں کوئی پوچھے تو مجھے اپنا رشتہ دار بتایئے گا۔ یوں آپ زیادہ تکلیف دہ پوچھ گچھ سے بچ جائیں گی۔''

''لیکن آپ...... آپ کو تو میں جانتی بھی نہیں۔''

''جانتی تو آپ کسی کو بھی نہیں یہاں۔ میں تو پھر بھی آپ کے شہر کا ہوں۔ اور اس وقت تو آپ کی پہلی ضرورت معقول لباس ہے۔''

لباس نادرہ کی کمزوری بن گیا تھا۔ اس کے حوالے کے بعد وہ انکار کر ہی نہیں سکتی تھی۔

وہ بغیر کسی رکاوٹ کے باہر نکلے۔ رشید نے انہیں تانگے پر بٹھایا۔ تانگے کو اس نے سڑک پر

رکوایا۔ نجانے کتنی گلیوں سے گزرنے کے بعد وہ ایک کچے مکان کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے۔ دروازے پر تالا تھا۔ رشید نے جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا اور انہیں اندر لے گیا۔ ارجمند اب بھی اس کی گود میں تھی۔

اندر سامنے چھوٹا سا صحن تھا۔ سامنے دو کمرے تھے۔ رشید انہیں ایک کمرے میں لے گیا۔ نادرہ نے پہلی بار سکون کی سانس لی اور کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں دو چارپائیاں تھیں۔ ایک چارپائی پر کچھ کپڑے بے ترتیب پڑے ہوئے تھے۔ ان میں مردانہ بھی تھے اور نسوانی بھی۔ چارپائی کے نیچے ٹین کا ایک صندوق تھا۔

رشید نے ارجمند کو دوسری چارپائی پر لٹا دیا۔

نادرہ کے اوسان کچھ بحال ہو گئے تھے۔ وہاں نسوانی کپڑے دیکھ کر اسے اطمینان ہوا تھا لیکن یہ سوچ کر وہ پریشان ہو رہی تھی کہ دروازے پر تالا کیوں تھا۔ رشید نے تو بتایا تھا کہ اس کے گھر میں اس کی ماں اور بہنیں بھی ہیں۔ اس نے یہ بات اس سے پوچھ بھی لی۔

"وہ لوگ تو اس وقت کیمپ میں ہوں گی۔" رشید نے کہا۔ "آج ٹرین آئی ہے نا۔ کیمپ میں تو قیامت کا سماں ہوگا۔ ہم سب رضاکارانہ طور پر مہاجرین کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اماں اور بہنیں کیمپ میں لُٹ کر آنے والی عورتوں کی دل جوئی کر رہی ہوں گی۔"

نادرہ مطمئن ہو گئی۔

"چارپائی کے نیچے صندوق میں سے آپ اپنے مطلب کے کپڑے نکال لیں۔ اب مجھے کیمپ جانا ہے۔ آپ اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔ بھوک لگے تو باورچی خانے میں سب کچھ موجود ہے۔ پکانا آپ کو خود پڑے گا۔ اور آپ آرام کر لیں۔ میں جلدی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔"

نادرہ نے صندوق باہر کھینچ کر اسے کھول دیا تھا۔

رشید جاتے جاتے پلٹا۔ "اور ہاں' آپ گھبرایئے گا نہیں۔ میں باہر سے دروازے پر تالا ڈال کر جاؤں گا۔"

"کیوں؟"

"یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کو کوئی نقصان پہنچے۔ آج کل تو لوگ کسی کے گھر میں بے دھڑک گھس جاتے ہیں...... ہندو کا گھر سمجھ کر۔ ہندو عورتوں کی تو خاص طور پر تلاش ہوتی ہے انہیں۔"

نادرہ سہم گئی۔ رشید کے جانے کے بعد اس نے کپڑے بدلے اور ارجمند کے ساتھ لیٹ گئی۔ نیند اور بھوک دونوں سے برا حال تھا اس کا، اٹھ کر کچھ پکانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے اس نے سونے کو ترجیح دی۔

لیکن نیند کے باوجود سونا آسان نہیں تھا۔ وہ جیسے چارپائی پر نہیں زمین پر تھی۔ جسم کو بار بار جھٹکے لگتے' اور پھر آنکھوں کے سامنے وہ قیامت کے منظر سامنے آ جاتے۔ بار بار وہ اٹھ بیٹھتی۔

پھر ارجمند جاگی اور اس نے سب سے پہلے کھانا مانگا۔ تب اسے افسوس ہوا کہ اس نے کچھ پکا کیوں نہیں لیا۔ وہ ارجمند کو لے کر باورچی خانے میں گئی۔ دال چاول موجود تھے۔ کھچڑی پکنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ اس نے لکڑیاں جلائیں اور کھچڑی چڑھا دی۔

ارجمند کے پاس سوالات ہی سوالات تھے۔ نادرہ نے بہلانے کی بجائے اسے حقیقت بتا دی کہ سب لوگ اللہ میاں کے پاس چلے گئے ہیں' اور اب وہ پاکستان میں ہیں' اور خوش قسمتی سے اللہ نے انہیں یہ ٹھکانہ دے دیا ہے۔

کھانا کھا کر وہ دونوں پھر چارپائی پر لیٹ گئیں۔

شام ہوئی' پھر اندھیرا ہو گیا۔ نادرہ نے لالٹین جلالی۔ ارجمند چپکے چپکے روئے جا رہی تھی۔ نادرہ جانتی تھی کہ چھوٹی بچی ہے۔ حقیقت کو ایک دم قبول نہیں کر سکتی۔ قسطوں میں قبول کرے گی۔ ایک ایک کو یاد کر کے بار بار رویا کرے گی۔

ارجمند کو پھر بھوک لگی۔ کھچڑی بچی ہوئی تھی۔ نادرہ نے وہ اسے کھلا دی۔ دیر تک وہ دونوں بیٹھی رہیں۔ پھر ارجمند سو گئی۔ اسے دیکھ کر نادرہ کو رونا آنے لگا۔ نرم بستر پر سونے کی عادی بچی کھری چارپائی پر بھی کیسے بے سدھ سو رہی ہے۔ شاید افیون کے اثرات ابھی باقی تھے۔

ارجمند کے سونے کے بعد نادرہ کے پاس سوچنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اور وہ اذیتوں کو دہرانا' ان سے دوبارہ گزرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ مثبت انداز میں سوچے، اور ایسا سوچنے کے لیے اس کے پاس مثبت مواد بھی موجود تھا۔ جو ہو چکا تھا' اس کا تو کچھ کیا نہیں جا سکتا تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ وہ پاکستان میں تھی...... پاکستان...... برصغیر میں مسلمانوں کا اپنا وطن، جہاں آبروؤں کے لیٹرے ہندو اور سکھ موجود نہیں تھے۔

نجانے کب تک وہ پاکستان کی عظمت کے بارے میں سوچتی رہی۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز سے چونکی۔ اسے ڈر لگنے لگا۔ باہر صحن میں اندھیرا تھا۔ پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا ہیولہ اسے کمرے کے دروازے میں نظر آیا۔

"بچی سو گئی ہے؟" کسی نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

وہ آواز رشید کی تو نہیں لگتی تھی۔ "کک...... کون......؟" ڈر کے مارے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"ارے میں ہوں شیدا...... اور کون۔"

وہ اور ڈر گئی۔ "کون شیدا؟"

''ارے بھئی ...... عبدالرشید ...... رشید ...... شیدا۔ چلو ...... ادھر دوسرے کمرے میں دیکھو میں کیالایا ہوں تمہارے لیے۔''

وہ اٹھی اور کمرے سے نکلی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ کمرا اس نے دیکھا نہیں تھا۔ وہاں جو چارپائی تھی' اس پر بستر بچھا ہوا تھا۔ لالٹین بھی روشن تھی۔ ''کہاں ہیں آپ؟''

''آؤ ...... یہاں آجاؤ۔'' رشید نے کہا۔ وہ بستر پر بیٹھا تھا۔ ''دیکھو ...... میں تمہارے لیے کباب لایا ہوں۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''تو رکھ لو۔ بھوک لگے تو کھا لینا۔''

وہ کاغذ کی تھیلی تھی' جو نم بھی ہو رہی تھی اور گرم بھی۔ نادرہ اسے لے کر جانے لگی تو رشید نے کہا۔ ''یہ رکھ کر آؤ۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''

نادرہ نے کباب باورچی خانے میں رکھے' اور کمرے میں واپس آئی۔ مگر اسے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ چارپائی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ ''آپ کے گھر والے نہیں آئے ...... آپ کی اماں ......''

''ان سے لڑائی ہو گئی میری ...... تمہاری وجہ سے۔''

''میری وجہ سے؟''

رشید نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ ''ہاں ...... میں نے تمہارے بارے میں انہیں بتایا تھا۔ اس پر وہ بہت ناراض ہوئیں۔ کہنے لگیں کہ لوگ باتیں بنائیں گے۔ محلے میں عزت خراب ہو گی۔ میں نے کہہ دیا کہ میں تم سے شادی کر لوں گا۔ یہ انہیں برا لگا ......''

''ششش شادی ...... شادی۔''

''ہاں۔ اور کیسے جیو گی یہاں۔ دیکھو جو کچھ تمہارے ساتھ ہو چکا ہے' اس کے بعد ......''

''میں جانتی ہوں یہ بات لیکن ......''

''میں تمہیں عزت بھی دوں گا اور گھر بھی۔ تم غم نہ کرو۔'' وہ اسے لپٹانے لگا۔

''آپ کے منہ سے بو آ رہی ہے۔ آپ نے شراب پی ہے۔'' نادرہ نے اسے دھکیلنے کی کوشش کی۔

''تو اس جھگڑے کے بعد اور کیا کرتا۔'' رشید نے کہا۔ اس کی دست درازی بڑھنے لگی۔

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔'' نادرہ نے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کی۔

''فکر نہ کرو کل میں تمہیں خالہ کے گھر لے چلوں گا۔ کل ہی ہم شادی کر لیں گے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔''

''شادی پر تو نادرہ کو اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے تو یہ احسان ہی ہوتا لیکن اس کی

دست درازی پر اسے ضرور اعتراض تھا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن شادی سے پہلے یہ اچھا نہیں۔''

''مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ تم بہت خوبصورت ہو ......''

''لیکن شادی سے پہلے ......''

''چھوڑو اس بات کو۔ تم کون سی کنواری کنیا ہو۔''

طعنہ سن کر نادرہ کی مزاحمت میں شدت آ گئی لیکن رشید نے اسے بے بس کر دیا۔ ''خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔ یہ گناہ ہے۔''

رشید ایک دم سے بپھر گیا۔ اس کا لب و لہجہ اور انداز ہی بدل گیا۔ ''وہاں سے کس حال میں آئی تھی سالی کتی۔ میں نے دیکھا ہے اپنی آنکھوں سے اور سب سے چھپا کر یہاں لے آیا کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ اور تُو مجھے گناہ اور ثواب سکھاتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے پوری قوت سے نادرہ کے رخسار پر تھپڑ مارا۔ انگلیوں کے نشانات اس کے رخسار پر جیسے چھپ گئے۔

ایک لمحے کو نادرہ پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ اس عالم میں بھی اس نے سوچا کہ رشید کی بات تو درست تھی۔ اگر وہ اس حال میں سب کے سامنے جاتی تو کتنی رسوائی ہوتی۔ مر جانے کا مقام ہوتا۔ یہ تو واقعی اس نے احسان کیا تھا اس پر۔ لیکن ایک بات اور بھی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ رشید وہ ہرگز نہیں تھا' جو اس نے ریل کے ڈبے میں خود کو ظاہر کیا تھا۔ کہاں وہ شائستگی اور کہاں یہ گالیاں۔ آپ سے تم' اور اس کے بعد تو تک آنے میں اس نے دیر نہیں لگائی تھی۔ اور یہ جو غصے اور اشتعال میں نظر آیا تھا' یہی اس کا اصلی روپ تھا۔

''وہاں جو میرے ساتھ ہوا' میں تو اس کے بعد زندہ ہی نہیں رہنا چاہتی تھی۔'' اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔

''مگر میں تلافی تو کر رہا ہوں۔ شادی کا وعدہ تو کر رہا ہوں تم سے۔ کل ہماری شادی ہو جائے گی۔''

''تو آپ ایک دن صبر کر لیں۔ آج جو گناہ ہو گا' کل وہ گناہ نہیں ہو گا۔''

''تمہیں اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جو کچھ وہاں ہوا' اس کے بعد تمہارے لیے سب برابر ہے۔''

اس لمحے نادرہ کا دل چھلنی ہو گیا۔ ''وہاں جو کچھ ہوا' وہ ظلم تھا ...... زبردستی تھی۔ میں گناہ گار نہیں' مظلوم ہوں۔ آپ اس فرق کو کیوں نہیں سمجھتے۔'' اس نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔

''میری بات سن نادرہ۔ عورت کی عزت شیشے کی طرح ہوتی ہے۔ اور شیشے پر بال بھی آ جائے تو وہ بے قیمت ہو جاتا ہے۔ تیرا شیشہ تو چور ہو چکا ہے۔ اب تو یہ ٹوٹنے سے رہا۔ اس لیے کہتا ہوں' کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

"آپ مجھ سے شادی کریں گے! زندگی بھر یہی طعنے دیتے رہیں گے۔ اگر میری جگہ آپ کی بہن ہوتی تو کیا کرتے۔"

اس بار تھپڑ اتنا زور کا تھا کہ نادرہ کا ہونٹ پھٹ گیا اور خون نکل آیا۔ "اب میں تجھے سبق سکھاؤں گا کشتی۔" یہ کہہ کر رشید اس پر ٹوٹ پڑا۔ ریل کے ڈبے میں نادرہ پر جو جسمانی قیامت گزری تھی' اس کے سامنے یہ اذیت بے حیثیت تھی لیکن یہاں جو اذیت اس کی روح نے سہی' ریل کے ڈبے میں ان گنت غیر مسلموں کے ہاتھوں پامال ہوتے ہوئے وہ اس پر بالکل نہیں گزری تھی۔ وہاں تو ظالم تھے...... غیر مسلم اور وہ سرزمین ہی کافروں کی تھی۔ مگر پاکستان آ کر اسے تحفظ کا احساس ہوا تھا۔ اس نے سوچا تھا' اس پاک سرزمین پر دیر سے سہی' لیکن اس کے سارے زخم بھر جائیں گے۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ یہاں بھی لوٹ لی جائے گی...... اور لوٹنے والا کوئی مسلمان ہوگا...... وہ مسلمان جو پناہ دینے کا کہہ کر اسے اپنے گھر لے آیا تھا۔

رشید اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ وہ کپڑے پہن کر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ وہ واپس آ گیا "میں دروازے پر تالا ڈال آیا ہوں باہر جانے کا خیال دل میں نہیں لانا۔ ویسے باہر مجھ سے بھی زیادہ لوگ ملیں گے۔" اس نے کہا۔ پھر اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم جا کہاں رہی ہو؟"

"دوسرے کمرے میں...... اپنی بھتیجی کے پاس۔" نادرہ نے بکھرتی آواز میں کہا۔

"تم یہیں سوؤ گی میرے پاس۔" رشید نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "رات کو پھر تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"لیکن ارجمند کی آنکھ کھلے گی تو وہ ڈرے گی۔"

"ڈرے گی تو یہاں آ جائے گی۔"

"میں نہیں چاہتی کہ وہ مجھے اس حال میں دیکھے۔" نادرہ کی نظریں جھک گئیں۔

"اس کا حل ہے میرے پاس۔ ہم دروازہ بند کرلیں گے۔ چلو لیٹ جاؤ۔"

رشید نے دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ نادرہ کو ایسا لگا' جیسے وہ کوئی پرندہ ہے' جسے پنجرے میں قید کر دیا گیا ہے۔

اس رات وہ دوبار پامال ہوئی۔ پھر رشید سو گیا۔ وہ خود نجانے کب تک نیند سے محروم رہی۔ نیند سے اس کا برا حال تھا۔ جسم الگ نڈھال تھا۔ لیکن وہ اس خوف سے نہیں سوئی کہ ارجمند کی آنکھ کھلے اور وہ ڈرے تو وہ اس کی آواز سن لے۔ رات بھر اس کے کان باہر لگے رہے۔ ایک بار جی چاہا کہ وہ اٹھے اور دوسرے کمرے میں چلی جائے لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ رشید وہاں آئے' ارجمند کے سامنے اسے مارے' اس پر دست درازی کرے۔ اللہ نے ارجمند کو بہت کچھ دیکھنے سے

بچا لیا تھا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ بچی رہے۔

وہ نیند سے لڑتی' جاگتی اور سوچتی رہی۔ اس کے سامنے اب امید کی کوئی چھوٹی سی کرن بھی نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ رشید اس سے ہرگز شادی نہیں کرے گا۔ ایسے لوگ شادی نہیں کرتے۔

مگر جب آدمی امید سے محروم ہو جائے تو امید تخلیق کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ رشید نے کہا تھا کہ اس کی ماں اور بہنوں کو اس کے یہاں رہنے پر اعتراض ہے۔ وہ شادی قبول نہیں کریں گی۔ اور رشید نے کہا تھا کہ وہ اسے خالہ کے گھر لے جائے گا۔ خالہ شادی کرا دیں گی۔ ان میں سے کوئی بات بھی جھوٹ نہیں لگتی تھی۔ اس کی ماں اور بہنوں کا ردعمل فطری تھا۔ تو ممکن ہے کہ یہ سچ ہی ہو۔

لیکن پھر اسے دوسری فکر ستانے لگی۔ رشید شراب پیتا ہے۔ گالیاں بھی بدمعاشوں کی طرح دیتا ہے۔ کیا ایسا آدمی ہے اس کے نصیب میں؟ اس لمحے اس کے اندر کسی نے ڈانٹا۔ اب تیری شان کہاں رہ گئی ہے نادرہ کہ تجھے شایانِ شان شوہر ملے۔ جو مل جائے' غنیمت ہے۔ تجھ جیسی بدبخت لڑکی سے کون شادی کرے گا۔ تو تو اب بس ارجمند کے مستقبل کی فکر کر۔ اس کا...... اس کے تحفظ کا خیال کر۔

صبح ہوگئی دن چڑھ آیا۔ رشید سوتا رہا اور وہ نیند سے لڑتی رہی تھی۔ ایک بار اٹھی اور دوسرے کمرے میں جھانک آئی۔ ارجمند اب بھی سو رہی تھی۔

پھر رشید سو کر اٹھا تو اسے لگا کہ زندگی کی صبح ہوگئی ہے۔ جیسے اس کی سوئی ہوئی قسمت جاگ گئی ہے۔

رشید نے آنکھیں کھولیں تو وہ اس کے برابر لیٹی ہوئی تھی۔ رشید کی آنکھوں میں حیرت جھلکی۔

"ارے...... آپ یہاں؟" اس کے لہجے میں بھی حیرت تھی۔ نادرہ کو حیرت ہوئی۔ وہ اسے آپ کہہ رہا تھا۔ "آپ ہی تو مجھے یہاں لائے تھے۔" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"تو...... تو وہ سب سچ تھا...... خواب نہیں تھا۔" رشید نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ پھر بالکل اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "میں...... میں بہت برا ہوں...... میں کمینہ ہوں...... یہ میں نے کیا کر دیا......"

نادرہ حیران رہ گئی۔ رشید پھر سے وہی شائستہ آدمی بن گیا تھا۔

"ارے...... میں تو آپ سے محبت کرتا ہوں۔ یہ میں نے کیا کر دیا...... یہ آپ کے ساتھ ظلم......" رشید سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا پھر اس نے نادرہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ "یہ شراب بڑی کمینی چیز ہے۔ میں پیتا نہیں ہوں لیکن اماں سے لڑنے کے بعد غم غلط کرنے کے لیے پی لی تھی۔ آپ مجھے معاف کر دیں...... خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں' ورنہ میں خود کو ختم کرلوں گا...... خدا

کی قسم' میں خودکشی کرلوں گا۔''

امید نادرہ کی ضرورت تھی' سو پھر سے بندھنے لگی۔ ''ایسی باتیں نہ کریں۔ یہاں ہمارا کون ہے آپ کے سوا۔ اوپر اللہ ہے اور نیچے آپ ہیں۔'' اس نے کہا پھر ایک خیال نے اسے چونکا دیا۔ ''آپ نشے میں تھے سب کچھ خواب سمجھ رہے تھے۔ یہ بتائیں' آپ کو اپنا وعدہ بھی یاد ہے؟''

''کون سا وعدہ؟''

نادرہ کا دل ڈوبنے لگا۔ ''آپ کو یاد نہیں ہے کہ آپ نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔''

''وہ کیسے بھول سکتا ہوں میں۔ اسی کی وجہ سے تو سب کچھ ہوا ہے۔ نہ میں اماں سے لڑتا آپ کی خاطر' نہ شراب پیتا۔ اور شراب نہ پی ہوتی تو یہ سب کچھ بھی نہ ہوتا۔'' رشید کی نظریں جھک گئیں۔ ''آپ مجھے معاف کردیں...... خدا کے لیے مجھے معاف کردیں، ورنہ میں......''

''میں نے آپ کو معاف کردیا۔ بس آپ اپنا وعدہ......''

''اس کی آپ فکر نہ کریں۔ ابھی ناشتے کے بعد ہم خالہ کے ہاں چلیں گے۔ خالہ کا بہت بڑا گھر ہے۔ وہاں آرام ہی آرام ہے۔ آپ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ نجانے کب سے سوئی نہیں ہیں۔ وہاں آرام سے سو جایئے گا۔ میں اماں کے پاس جاؤں گا اور آخری بار انہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ نہیں مانیں تو بس شام کو ہم شادی کرلیں گے۔''

نادرہ بےفکر ہوگئی۔ ارجمند اٹھی تو اس بار پوری طرح ہوش میں تھی۔ اُس نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''یہ کون سی جگہ ہے پھپھو؟''

گزشتہ روز کی باتیں اسے یاد نہیں تھیں۔ نادرہ کو دوبارہ اس مرحلے سے گزرنا پڑا۔ اور اس بار وہ مرحلہ زیادہ سخت تھا۔ ننھی بچی نے جو کچھ نہیں دیکھا تھا، وہ تو شاید وہ سہہ ہی نہیں سکتی تھی۔ اللہ نے رحم کیا کہ اسے اس سے بچا لیا لیکن اس کے لیے تو یہ بھی قیامت سے کم نہیں تھی۔ یہ اجنبی گندا سا، کچا گھر جہاں پھپھو کے سوا کوئی نہیں تھا، اور دادا، دادی، ماں، باپ، چچا...... سب اللہ کے پاس چلے گئے۔ تو وہ اور پھوپھو یہاں اکیلے کیا کریں گے۔ ''پھوپھو...... ہم اللہ میاں کے پاس چلیں۔''

اسے سمجھانا آسان نہیں تھا، جبکہ اس دکھ سے نادرہ کا اپنا دل پھٹا جا رہا تھا۔ دیر لگی لیکن بالآخر ارجمند کو قرار آ گیا۔ نادرہ جانتی تھی کہ ارجمند پر یہ وقت بار بار آئے گا...... مہینوں آتا رہے گا۔ آنکھ دیکھے کو تو صبر آ ہی جاتا ہے، لیکن جو دیکھا نہ ہو، اس پر یقین کرنا آسان نہیں ہوتا۔ آس لگی ہی رہتی ہے۔

ناشتے کے بعد رشید انہیں لے کر نکل آیا۔ وہ تانگے میں بیٹھے اور یوں وہ بوا کے پاس پہنچ گئی۔

رشید نے اپنی خالہ کو ان کے بارے میں بتایا، اپنی ماں سے جھگڑے کا بتایا۔ ''خالہ، میں ان

سے شادی کرنا چاہتا ہوں...... آج ہی۔''

خالہ اسے اپنے کمرے میں لے گئیں۔ وہاں گھر جیسی مسہری تھی۔ خالہ نے اسے لپٹا کر خوب پیار کیا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ آرام سے یہاں رہو۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آرام سے لیٹ جاؤ۔ لگتا ہے، مہینوں سے نہیں سوئی ہو۔''

وہ اسے اور ارجمند کو کمرے میں چھوڑ کر چلی گئیں۔ نیند کو ترسی ہوئی نادرہ چند لمحوں میں ہی سو گئی۔ اور وہ ایسی بےسدھ ہو کر سوئی کہ آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھی تو ہارمونیم اور طبلے کی آواز سنائی دی۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا، ارجمند بھی موجود نہیں تھی۔ وہ کمرے سے نکلی۔ اس گھر کے جغرافیے کا تو ابھی اسے علم نہیں تھا۔ وہ موسیقی کی آواز کی طرف بڑھتی رہی۔ باہر گھر میں برقی روشنی تھی۔

بالآخر اسے ارجمند نظر آ گئی۔ وہ دروازے سے ٹک کر کھڑی اندر دیکھ رہی تھی، اور اتنی منہمک تھی کہ اسے اُس کے آنے کا بھی پتا نہیں چلا۔ نادرہ نے اندر جھانکا تو وہاں رقص کی محفل سجی تھی۔ تماش بین بیٹھے داد دے رہے تھے اور سکے اور نوٹ اچھال رہے تھے۔

ایک لمحے میں نادرہ کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ ارجمند کو لے کر دوبارہ اس کمرے میں آئی۔ وہاں بیٹھ کر وہ سوچتی رہی۔ بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ اسے سمجھوتہ کرنا ہوگا...... ارجمند کی خاطر۔ ارجمند نہ ہوتی تو وہ ٹرین میں ہی خود کو ختم کرلیتی۔ لیکن اسے ارجمند کی خاطر جینا تھا، چاہے اس میں کتنی ہی ذلت ہو۔ اسے بس کسی طرح ارجمند کو ذلت اور گندگی سے بچانا ہے۔

وہ عقل مند تھی۔ اُس نے سمجھ لیا کہ جو ہونا ہے، وہ تو ہو کر رہے گا۔ خواہ وہ مزاحمت کرے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہنسی خوشی سب کچھ قبول کرلیا جائے۔ اس خالہ کو خوش رکھا جائے، تاکہ اس سے اپنی بات منوائی جائے۔ ارجمند کے تحفظ کی یہی ایک صورت تھی۔

اس نے ہر پہلو سے سوچا اور لائحہ عمل طے کرلیا۔ ارجمند کے لیے یہ ماحول بہت ہی خراب تھا۔ اس کا ایک مظاہرہ وہ ابھی دیکھ چکی تھی کہ وہ کتنی رغبت سے رقص دیکھ رہی تھی وہ اسے خوب سمجھتی تھی۔ ارجمند کو قدرت سے فنکارانہ فطرت ملی تھی۔ چھوٹی سی تھی تو تصویریں بنانے لگی تھی، اس عمر میں، جب بچے سے پنسل بھی نہیں تھامی جاتی۔ پڑھنے سے زیادہ اسے ڈرائنگ میں دلچسپی تھی، اور موسیقی بھی اسے مسحور کرلیتی تھی۔ یہاں اس کوٹھے پر یہ بات اس کے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

یوں کوٹھے کی اس زندگی کا آغاز ہوا، جہاں وہ نادرہ سے نرگس بن گئی۔ ارجمند کے لیے اس نے سب سے پہلے رنگین پنسلوں اور ڈرائنگ کی کاپیوں کا بندوبست کردیا۔ پھر بہت تھوڑے

عرصے میں اُس نے نیلم بائی کا دل جیت لیا۔ اُس کی بات سنی اور مانی جانے لگی۔

فنون کی طرف ارجمند کا فطری میلان تھا۔ رقص اور موسیقی میں اُس کی دلچسپی نادرہ کے لیے پریشان کن تھی لیکن اس کا ایک فائدہ بھی ہوا تھا۔ اس دلچسپی کی وجہ سے اس کے زخم جلدی مندمل ہو گئے تھے۔ ابتدا میں وہ سب کو یاد کر کے دن میں کئی کئی بار روتی تھی لیکن جہاں موسیقی کی آواز ابھرتی، وہ مسحور ہو جاتی۔ وہ وہاں جا کھڑی ہوتی اور دیکھتی رہتی۔ یوں وہ جلد ہی پچھلی زندگی کو بھول گئی۔

اس دلچسپی کے توڑ کے لیے نادرہ نے ڈرائنگ کے رجحان کو مہمیز کیا۔ ارجمند ڈرائنگ کی طرف ویسے ہی راغب تھی۔ اُس کی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں ڈرائنگ اس کا مشغلہ بن گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ غیر معمولی تصویر بنا لیتی تھی۔ وہ صلاحیت اس کی فطری تھی۔ تین سال کی تھی تو پھلوں کی تصویریں ایسی بناتی تھی کہ اصلی لگتے تھے۔ اب وہ اور آگے نکل گئی تھی۔ ایک دن تو اس نے نادرہ کی تصویر بنا ڈالی...... ایسی کہ نادرہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس روز نادرہ نے اسے واٹر کلرز منگوا دیے۔

کچھ وقت گزرا، اور نیلم بائی کا اعتماد بحال ہوا تو نادرہ نے ارجمند کی تعلیم کا تذکرہ چھیڑا۔ وہ اسے اسکول تو نہ بھجوا سکی، لیکن گھر پر اُس کی تعلیم کا بندوبست ہو گیا۔ مگر اس کے ساتھ بھی ایک سمجھوتہ کرنا پڑا۔ ارجمند کو رقص اور موسیقی کی باقاعدہ تعلیم دی جانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی نادرہ نے خود ارجمند کو قرآن پڑھانا شروع کر دیا۔

حقیقت پسند تو نادرہ پہلے بھی تھی۔ مگر حالات نے اور زیادہ حقیقت پسند بنا دیا تھا۔ وہ صورتِ حال کا جائزہ لیتی تو مایوسی کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہوتا۔ اس کا اپنا کوئی نہیں تھا، اور وہ اس کوٹھے کی محدود دنیا میں قید تھی۔ ایسے میں یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ارجمند کو بچا پاتی...... اسے ماحول سے نکال دیتی۔ اُس کا سہارا تو بس اللہ کی ذات تھی۔ صورتِ حال کے انتہائی مایوس کن ہونے نے اس رابطے کو اور گہرا...... اور پکا کر دیا تھا۔ قرآن وہ باقاعدگی سے پڑھتی تھی۔ جب بھی موقع ملتا، نماز بھی پڑھتی اور اللہ سے ایک ہی دعا کرتی...... اپنے لیے نہیں، ارجمند کے لیے۔ اللہ کوئی رحمت کا فرشتہ بھیج دے جو اس معصوم بچی کو لعنت کی اس دنیا سے نکال لے جائے...... اور ایسا جلدی ہو جائے...... ارجمند پر یہاں کا رنگ چڑھنے سے پہلے! نادرہ کو احساس تھا کہ یہ ماحول بہت خطرناک ہے...... اور بچی پر یہاں کا رنگ چڑھنا بہت آسان ہے۔

پھر روزانہ اس کی دعا پہلے سے شدید ہو جاتی۔ روتے روتے اس کا دامن تر ہو جاتا۔ پھر روح میں ایسا اطمینان اور سکون اتر جاتا، جیسے اللہ نے اس کی دعا قبول کر لی ہے۔ یہ نعمت حاصل نہ ہوتی تو شاید وہ گھل گھل کر ختم ہو جاتی۔

”میں آ گئی پھپھو۔“

ارجمند کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ ماضی کی یادوں سے نکل آئی......

❁ ❁ ❁

ارجمند نے سمجھ لیا تھا کہ آج پھپھو کی وہی کیفیت ہے...... پرانی والی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا۔ اور جب ایسا ہوتا تو پھپھو کو چپ لگ جاتی تھی۔ وہ بہت اداس ہو جاتی تھیں۔ ایسے میں وہ پھپھو کا خیال رکھتی، اور انھیں خوش کرنے کی کوشش کرتی۔

لیکن آج وہ خود بہت اداس تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اسے چچا جان کی شادی یاد آ گئی تھی۔ کیسے ڈھولک بجی تھی، کیسے گیت گائے گئے تھے۔ ہاتھوں میں مہندی لگی تھی اور نئے کپڑے بنے تھے۔ اُس کے لیے غرارہ......

”پھپھو...... یہاں کسی کی شادی نہیں ہوتی؟“

نادرہ نے سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔ ”یہ خیال کیوں آ گیا تمھیں؟“

”چچا جان کی شادی ہوئی تھی تو کتنا مزہ آیا تھا۔ میرے لیے کتنا خوبصورت غرارہ سیا تھا آپ نے۔“

”غرارہ تو میں اب بھی سی دوں گی تمھارے لیے۔“

”لیکن شادی میں تو اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔“

نادرہ کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔ ”شادی تو اب یہاں ان شاء اللہ تمھاری ہی ہو گی۔“

”واہ...... تب تو مجھے بہت سارے کپڑے ملیں گے...... گوٹے والے، سلمہ ستارے والے اور بہت سارے زیور بھی...... چچی جان کی طرح۔“ ارجمند نے بے حد خوش ہو کر کہا۔ ”کب ہو گی میری شادی پھپھو؟“

”میں تو چاہتی ہوں کہ جلد سے جلد ہو جائے لیکن ابھی تو تم بہت چھوٹی ہو۔“ یہ کہتے ہوئے نادرہ کے لہجے میں اداسی در آئی۔

”تو میں کب تک بڑی ہو جاؤں گی۔“

”بارہ پندرہ سال تو لگیں گے۔“

ارجمند چند لمحے سوچتی رہی۔ ”کس سے ہو گی میری شادی۔“

”دیکھیں گے کوئی اچھا سا لڑکا...... شہزادوں جیسا، خوبصورت، رعب والا، لیکن نرم دل۔“

”مجھے تو کسی کی پسند پر اعتبار نہیں۔“

”میری پسند پر بھی اعتبار نہیں؟“

”نہیں پھپھو۔“ ارجمند نے بڑی صفائی سے انکار کر دیا۔ ”آپ اُس رات جس بڑی بڑی مونچھوں والے کے ساتھ کمرے میں جا رہی تھیں، مجھے تو وہ بہت برا لگا تھا، جیسے...... جیسے کوئی

ڈاکو۔"

نادرہ ٹھرا کر رہ گئی۔ اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

"اچھا ہوا، آپ نے اُس سے شادی نہیں کی۔ بوا کہہ رہی تھیں کہ آپ اپنے لیے دولہا تلاش کر رہی ہیں لیکن اب تک کوئی پسند نہیں آیا ہے۔ مگر پھپھو، اُس مونچھوں والے کو تو آپ کو منہ بھی نہیں لگانا چاہیے تھا۔"

"تو اس وجہ سے تمہیں میری پسند پر اعتبار نہیں رہا۔" نادرہ اور اداس ہو گئی۔

"جی پھپھو، اپنے لیے تو میں خود ہی دولہا پسند کروں گی۔"

"ٹھیک ہے گڑیا۔ اب میں اللہ سے ہر روز دعا کیا کروں گی کہ تمہیں تمہاری پسند کا دولہا دے۔"

ارجمند چند لمحے سوچتی رہی، پھر بولی۔ "پھپھو...... ایک بات مانیں گی میری؟"

"بولو میری گڑیا، کیا بات ہے۔"

"آج مجھے بھی اپنے ساتھ کوٹھے پر لے چلیں۔"

نادرہ کو اپنا وہاں بیٹھنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ارجمند کو تو وہ وہاں ذرا دیر کے لیے بھی لے جانا گوارا نہیں کرتی تھی۔ خود تو وہ مجبور تھی اور وہاں بیٹھ کر اس سے نظر بھی نہیں اٹھائی جاتی تھی۔ یہ احساس اب بھی سوہانِ روح ہوتا تھا کہ ہر گزرنے والا اسے میلی، تولنے والی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے، جیسے وہ کوئی لڑکی نہیں، تھیلے پر رکھا ہوا کوئی پھل یا ترکاری ہے۔

لیکن وہ ارجمند کی بے کلی بھی سمجھ سکتی تھی۔ بچی کا دل باہر جانے کو چاہتا ہوگا۔ وہ خود بھی باہر جانے کو کیسے ہڑکتی تھی۔ اس کے اور نیلم بائی کے درمیان بہ ظاہر کیسا ہی اعتماد ہو، لیکن اندر گہرائی میں بے اعتمادی موجود تھی، اور وہ بھی دوطرفہ۔ بائی نے کبھی اسے باہر جانے کو منع کیا، نہ ارجمند کے جانے پر پابندی لگائی لیکن ان دونوں کو ایک ساتھ اس نے کبھی باہر نکلنے نہیں دیا۔ شاید اس کے نزدیک وہ دونوں ایک دوسری کی واپسی کی ضمانت تھیں۔ وہ کبھی کہتی...... بوا، ارجمند کو کتاب دلا لاؤ، تو بوا کہتی، تم چلی جاؤ۔ ارجمند تو میرا سر دبائے گی۔ بہت درد ہو رہا ہے سر میں۔ یا وہ کہتی...... تم ذرا یہ کام کر لو نرگس۔ ارجمند اچھو میاں کے ساتھ چلی جائے گی۔ اور یہ دوسری بات نادرہ کو قبول نہیں تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ارجمند ایک لمحے کے لیے بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہو۔ اور وہ سوچتی کہ ابھی تو ارجمند صرف چھ سال کی ہے تو اس کی پریشانی کا یہ حال ہے۔ وہ سولہ سال کی ہوگی تو کیا ہوگا۔ ایک لمحے کو خوف سے اس کا جسم سرد ہو جاتا۔ مگر اگلے ہی لمحے اندر سے ایک آواز ابھرتی...... اُس وقت تک انشاء اللہ وہ یہاں ہوگی ہی نہیں۔ کیسے؟ یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ مگر اسے یقین تھا کہ ہوگا یہی۔

اس وقت اسے تنگ پنجرے میں قید ننھی چڑیا جیسی اپنی بھتیجی پر ترس بھی آیا اور پیار بھی۔ کبھی کبھی پنجرے کی تیلیوں کے پار باہر کی دنیا کو دیکھنے کا موقع تو ملنا چاہیے اسے۔

جواب ملنے میں اتنی دیر ہوئی تو ارجمند بے تاب ہو گئی۔ "اچھی پھپھو، آج مجھے لے چلیں۔ پھر بہت دن تک نہیں کہوں گی چلنے کو۔" اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

نادرہ کو اس کی سادگی اور سچائی پر پیار آ گیا۔ بچے کتنے سچے ہوتے ہیں۔ ارجمند نے اپنی بات منوانے کے لیے بھی جھوٹ نہیں بولا۔ یہ نہیں کہا کہ آج لے چلیں، پھر کبھی چلنے کو نہیں کہوں گی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ بات وہ آئندہ بھی کہے گی...... کہتی رہے گی۔

"ٹھیک ہے گڑیا، چلی چلنا۔" پہلی بار وہ مسکرائی۔

ارجمند خوش ہو گئی۔ "میں ڈرائنگ کی کاپی بھی لے چلوں گی۔"

"ضرور میری شہزادی۔"

❁ ❁ ❁

عبدالحق کو اندازہ بھی نہیں ہوا کہ وہ ہیرا منڈی میں داخل ہو چکا۔ اس کے قدم خودکار انداز میں اٹھ رہے تھے۔ وہ عجیب سی کیفیت میں تھا۔ ذہن دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک حصے پر اداسی مسلط تھی...... اداسی کہ وہ لاہور شہر سے رخصت ہو رہا تھا۔ لاہور جو زندگی کے مضمون میں اُس کے لیے درس گاہ ثابت ہوا تھا۔ یہاں اُس نے بہت کچھ دیکھا تھا۔ یہاں سے اس نے بہت کچھ سیکھا اور سمجھا تھا۔ اور ذہن کے دوسرے حصے میں خوشی ہی خوشی تھی...... خوشی کہ وہ گھر واپس جا رہا تھا...... اماں کے پاس...... زبیر بھائی اور رابعہ کے پاس...... اور...... اور...... اور وہاں نور بانو بھی تو تھی۔

نور بانو کا خیال آیا تو اس کے کانوں میں نور بانو کی آواز گونجنے لگی۔ قرأت کی آواز، تبارک الذی بیدہ الملک...... وہ آواز، جس نے اسے محبت سے روشناس کرایا تھا۔ وہ آواز جو اسے کھینچ کر صراطِ مستقیم کی طرف لے گئی تھی۔ کیسی عجیب بات ہے؟ اس نے اداسی سے سوچا۔ دہلی میں اس رات کے بعد اب تک اس نے نور بانو کی قرأت نہیں سنی تھی۔ یہ تو چراغ تلے اندھیرے والی بات ہوئی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ کثرت سے اس کی آواز سنتا۔

اس کی پرانی قرأت کا تو کوئی حوالہ اس کے پاس نہیں تھا، کیونکہ وہ اس وقت اس زبان سے ہی نابلد تھا۔ اُس کے پاس تو بس اسی رات کی قرأت کا حوالہ تھا...... تبارک الذی...... اور کمال یہ تھا کہ وہ جب بھی قرآن کھول کر یہ سورۃ پڑھتا تو اسے اپنی آواز سنائی نہ دیتی۔ بلکہ وہ نور بانو ہی کی آواز سنتا تھا۔

اچانک ناگواری کے بہت شدید احساس نے اس ٹھٹکا دیا۔ اس کے قدم رک گئے۔ اندر ایک تند کراہت ابھری تھی لیکن وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس لیے کہ وہ اپنی منقسم کیفیت کا

اسیر تھا...... خوشی اور اداسی کے بین بین...... اسے گرد و پیش کا احساس ہی نہیں تھا۔

قدم رکے تو ناگواری کی وجہ سمجھنے میں اسے محض چند لمحے لگے۔ وہ ہارمونیم اور طبلے کی آواز تھی، اور کوئی عورت کچھ گا رہی تھی۔ گھنگھروؤں کی جھنکار بھی بے حد نمایاں تھی۔

ناگواری کی وجہ تو سمجھ میں آ گئی۔ مگر وہ اتنی گہری محویت سے باہر آیا تھا کہ گرد و پیش کو اب بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔

اسی لمحے ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''مال چاہیے باؤ جی؟...... ایسی کچی کلیاں ہیں موگرے کی......''

اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہی کوے جیسی چپکے چپکے اِدھر اُدھر چاروں طرف دیکھتی ہوئی آنکھیں۔ مٹھی میں دبا ہوا سگریٹ......

''میرے ساتھ آؤ باؤ جی، دل خوش ہو جائے گا تمہارا...... ایسا کورا مال کہیں نہیں......''

عبدالحق نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔ ''مجھے نہیں چاہیے تمہارا مال۔ ہٹو ایک طرف۔''

''تو یہاں کیا کر رہے ہو باؤ صاب، مسجد تو پیچھے رہ گئی ہے۔'' اس شخص نے طنزیہ لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔

عبدالحق کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اسے افضال صاحب یاد آ گئے اور ان کی باتیں۔ یہ کنکر منڈی ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہاں وہ ہیرے بھی مل جاتے ہیں، جو مٹی میں رُلتے رُلتے یہاں پہنچتے ہیں۔ افضال صاحب نے کہا تھا کہ وہ ہر روز یہاں آتے ہیں، اس امید پر کہ شاید کوئی ہیرا انہیں مل جائے، اور واقعی انہیں ہیرا مل گیا تھا۔ وہ ہیرا...... زرینہ اب اُس کے پاس تھی۔

عبدالحق ایک بار پھر گرد و پیش سے بے خبر ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ہزاروں کنکروں اور پتھروں میں کسی ہیرے کو تلاش کرنا کتنا مشکل، لیکن بڑا کام ہے۔ افضال صاحب نجانے کب سے یہاں آتے ہوں گے۔ کتنی مشقت کے بعد انھوں نے وہ ہیرا تلاش کیا، تو صرف اس لیے کہ وہ اس کی حیثیت جانتے تھے، اسے پہچانتے تھے۔ ویسے خود سے ہیرے کو پہچاننا تو اور مشکل ہوتا ہوگا۔ کوئی کیسے پہچان سکتا ہے۔ اللہ نگاہ عطا فرما دے تو اور بات ہے۔

لیکن اس کا اجر کتنا ہوگا۔ اللہ کتنا خوش ہوا ہوگا افضال صاحب سے۔ کون جانے، اللہ کے ہاں اس ایک عمل سے ان کی تمام خطائیں دھل گئی ہوں۔

اس وقت عبدالحق کی سمجھ میں ایک بات آئی۔ حقارت اچھی چیز نہیں ہوتی۔ نہ کسی شخص کے لیے، نہ کسی چیز کے لیے اور نہ کسی مقام کے لیے۔ اب کہنے کو یہ گناہوں کی بستی ہے لیکن افضال صاحب کو یہاں سے ایک نیکی مل گئی...... بہت بڑی نیکی۔

اس کا دل جیسے پگھلنے لگا۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے اس دلال کو کیسے دھتکارا تھا۔ نہایت حقارت سے...... اسے حقیر سمجھ کر۔ اور اسے حقیر سمجھا تو گویا خود پر غرور کیا۔ جبکہ غرور اللہ کو بہت ناپسند ہے۔ اور کون جانے کہ اس دلال کو اللہ کسی لمحے ہدایت دے اور اسے کوئی مرتبہ مل جائے۔ اپنی اوقات تو دیکھو۔ اس نے خود سے کہا۔ تم مشرک تھے نا۔ اللہ نے تمہیں ہدایت دی، راستہ دکھایا، اور آج تم مسلمان ہو......

وہیں کھڑے کھڑے اس نے دل میں توبہ کی۔ اسے بالکل احساس نہیں تھا کہ کوئی اسے بہت غور سے دیکھ رہا ہے...... دو موٹی موٹی خوبصورت آنکھیں اس کے چہرے کی تمام جزئیات کو محفوظ کر رہی ہیں...... آنکھیں ہی نہیں، انگلیاں بھی۔

اس نے سوچا، میں بھی کوشش کروں۔ کیا پتا، اللہ کی مہربانی سے مجھے بھی کوئی ہیرا مل جائے۔ مگر اس کے لیے نظر اٹھا کر چلنا ضروری ہے۔ اور نظر بھی ٹٹولنے والی ہو۔

وہ آگے بڑھ گیا۔

اب اس کا انداز مختلف تھا۔ وہ نظر اٹھا کر بالا خانوں پر چہروں کو ٹٹولتا تھا لیکن یہ بہت مشکل کام تھا۔ اس کی اٹھی ہوئی نظر کے جواب میں اداؤں، عشووں اور غمزوں کے روپ میں فحش اشارے اور گناہگار بلاوے اسے ستا رہے تھے لیکن اس تکلیف کی افادیت بھی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ یہ تو کنکروں پتھروں کی پہچان تھی۔ یعنی ہیرا ہوگا تو الگ نظر آ جائے گا۔

وہ پورے بازار میں گھومتا پھرا...... بالا خانوں کو نگاہوں سے کھوجتا ہوا۔ کبھی کوئی دلال اسے روکتا، پیش کش کرتا تو وہ بڑی نرمی سے، حلیمی سے اسے منع کر دیتا۔ اس کے اندر جیسے میٹھے پانی کا کوئی چشمہ پھوٹ نکلا تھا۔

وہ تھک گیا۔ لیکن کہیں کوئی ہیرا اسے نظر نہیں آیا۔ پھر اچانک اسے بہت شدید بھوک کا احساس ہوا۔ ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ صبح کے ناشتے کے بعد اس نے اب تک کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامنے چھوٹا سا ایک ہوٹل تھا۔ باہر چارپائیاں بچھی تھیں۔ وہ ہوٹل کی طرف چل دیا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ یہ وہی جگہ ہے، جہاں اس نے دلال کو جھڑکا تھا۔ جہاں کھڑے ہو کر وہ سوچتا رہا تھا اور جہاں سے اس نے اپنی اس ناکام تلاش کا آغاز کیا تھا۔

تپائی پر رکھا جگ اٹھا کر اُس نے ہاتھ دھوئے اور ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہوئے اس کی نظر بورڈ پر پڑی...... اللہ مالک ہوٹل لذیذ اور خوش ذائقہ کھانوں کا مرکز۔ اسی لمحے بیرا اُس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ''کیا کھاؤ گے باؤ جی؟''

عبدالحق کو اس بار بھی احساس نہیں ہوا کہ وہ موٹی موٹی خوبصورت آنکھیں اس بار بھی اسے دیکھ رہی تھیں۔ اگر اس کی نظریں ہوٹل کے بورڈ سے تھوڑا اوپر اٹھی ہوتیں تو اسے وہ بالا خانہ نظر آ

جاتا......اور چھ سال کی وہ بچی بھی، جو اسے بڑی توجہ اور محبت سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس کے نقش دل میں اتار رہی ہو۔ ویسے وہ اس کے نقوش کاغذ پر تو ابھار ہی رہی تھی۔

لیکن اس کی نگاہیں بالا خانوں کو کھنگالتے کھنگالتے اتنی تھک گئی تھیں کہ اب اس میں انھیں اٹھانے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ ہیرے کی تلاش نہیں کر سکا لیکن ایک ناتراشیدہ ہیرے نے اسے ضرور تلاش کر لیا ہے۔

❁ ❁ ❁

نادرہ بالا خانے پر یوں نظریں جھکا کر بیٹھی تھی، جیسے اس کی نظریں جھکی ہونے کی وجہ سے باہر سڑک پر موجود تماش بینوں میں سے کوئی بھی اسے نہیں دیکھ پائے گا لیکن اردگرد موجود دوسری لڑکیوں میں وہ ایسے نمایاں نظر آتی تھی، جیسے ستاروں کے درمیان چاند۔ اور جھکی ہوئی نظریں شاید اس کی کشش میں اور اضافہ کر دیتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ عام طور پر سب سے پہلا گاہک اسے ہی لگتا تھا۔

اس روز بھی یہی ہوا۔ اس کا بلاوا آ گیا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ کیونکہ اس کے ساتھ ارجمند بھی تھی۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ ارجمند اسے کسی کے ساتھ کمرے میں جاتے دیکھے۔

اُس نے کن انکھیوں سے ارجمند کو دیکھا۔ وہ نیچے سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کے انداز میں ایسا انہماک تھا، جیسے اسے گردوپیش کی خبر ہی نہ ہو۔ ہاتھ میں ڈرائنگ کی کھلی کاپی اور دوسرے ہاتھ میں پنسل تھی لیکن اسے ان کا بھی ہوش نہیں تھا۔

ارجمند کی وہ محویت نادرہ کے لیے بہت بڑی نعمت تھی۔ وہ چپکے سے وہاں سے کھسک لی۔

ایک منٹ بعد ارجمند نے سر گھما کر دیکھا تو پھپھو موجود نہیں تھیں۔ اسے تھوڑی سی مایوسی ہوئی، کیونکہ وہ پھپھو کو بہت اہم بات بتانا چاہتی تھی۔ یہ اہم بات کہ اُس نے اپنے لیے دولہا پسند کر لیا ہے۔

مگر اس مایوسی میں وقت ضائع کرنے کے بجائے وہ دوبارہ اُس شہزادے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اتنی سی دیر میں اس نے شہزادے کے کتنے رنگ دیکھ لیے تھے۔

جب پہلی بار اس کی نظر اس پر پڑی تو وہ اس لمحے چلتے چلتے ٹھٹک کر رکا تھا اور حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ چہرے سے ناگواری جھلکنے لگی۔ اسی لمحے ایک بدمعاش نے اس سے کچھ کہا۔ اس نے کچھ جواب دیا اور اس کے جواب میں بدمعاش نے کچھ کہا، اور پھر بدمعاش آگے بڑھ گیا۔

وہ بہت قریب تھے۔ لیکن موسیقی کی تیز آواز کی وجہ سے وہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سن سکی۔ مگر اسے اندازہ ہو گیا۔ بدمعاش نے شاید کوئی اچھی بات کہی تھی۔ لیکن شہزادے نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔ بدمعاش کو یہ بات بری لگی، اس نے جواب میں کچھ کہا اور آگے

آ گیا۔

شہزادہ اب وہیں کھڑا تھا۔ اور اس کے چہرے پر ایسی نرمی تھی کہ اس کی خوبصورتی اور بڑھ گئی تھی۔

ارجمند کا پنسل والا ہاتھ حرکت میں آ گیا۔ پنسل کاغذ پر پھسلنے لگی۔ کاغذ پر نقش ابھرنے لگے۔

وہ بس لمحوں کی بات تھی۔ پھر شہزادہ آگے بڑھ گیا۔ ارجمند کی نگاہیں دور تک اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد ارجمند نے اپنی کاپی کا جائزہ لیا۔ کاغذ پر شہزادے کا خاکہ موجود تھا۔ اس نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں۔ اس کے تصور میں تو وہ جیسے جیتا جاگتا، سانس لیتا شہزادہ تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر پھر خاکے کو دیکھا۔ اسے احساس ہوا کہ خاکے کے نقوش میں بھدا پن تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اس کی ڈرائنگ بہت اچھی نہیں ہے۔

اس نے پھر خاکے کو دیکھا۔ اسے افسوس ہونے لگا۔ پھر اس نے سوچا۔ یہ محض خاکہ ہی تو ہے اس میں رنگ بھروں گی تو اور اچھا ہو جائے گا۔ اور پھر بھی اچھا نہیں ہوا تو کیا۔ وہ اس کی یادداشت میں محفوظ ہے۔ وہ اسے بناتی رہے گی۔ نقوش کی اصل خوبصورتی اجاگر کرنے کی کوشش کرتی رہے گی۔

''اللہ...... کتنی خوبصورت تصویر بناتی ہے یہ۔'' بالا خانے پر موجود لڑکیوں میں سے ایک نے کہا۔

ارجمند نے جلدی سے کاپی بند کر لی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس تصویر کو کوئی دیکھے۔

''واقعی...... اتنی سی ہے۔ مگر اس کے ہاتھ میں کمال ہے۔'' دوسری بولی۔

''ادھر دکھانا ارجی۔'' تیسری نے ہاتھ بڑھایا۔

''میں ارجی پرجی نہیں ہوں۔ میرا نام ارجمند ہے۔'' ارجمند نے بڑے وقار سے کہا۔

''اچھا ارجمند بانو، ذرا ہمیں بھی دکھا دو یہ تصویر۔''

''ابھی نہیں۔ ابھی یہ مکمل نہیں۔ رنگ بھر دوں گی تو دکھا دوں گی۔'' ارجمند نے انہیں ٹالنے کے لیے کہا۔

''ارے اتنی سی ہے۔ مگر نخرے دیکھو، پٹاخا ہے پٹاخا۔'' ایک لڑکی نے کہا۔ ''میں تو ابھی دیکھوں گی۔''

ارجمند کے لیے مشکل ہو جاتی۔ مگر اسی وقت مائی شاداں آ گئی۔ یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ بالا خانے پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں پر نظر رکھے۔ ''یہ کیا شور مچا رکھا ہے۔ بائی تک بھی آواز جا رہی ہو گی تم لوگوں کی۔ ڈانٹ مجھے کھانی پڑے گی۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم لوگ یہاں گاہکوں کو لبھانے کے لیے بیٹھی ہو۔ گپ شپ کے لیے نہیں۔''

تمام لڑکیاں بازار کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ مائی شاداں سے وہ سب ڈرتی تھیں۔ کہنے کو تو وہ

عورت تھی لیکن مردوں کی طرح مضبوط تھی۔ اور ہاتھ تو ایسا بھاری تھا اُس کا کہ دن میں تارے نظر آجاتے تھے اس کے ایک تھپڑ میں۔ وہ کوٹھے پر پولیس کی حیثیت رکھتی تھی۔ کوئی لڑکی نافرمانی کرتی تو بائی اسے شاداں کے حوالے کر دیتی۔ بڑی بڑی ضدی اور تگڑی لڑکیاں مائی شاداں کی پانچ منٹ کی مرمت بھی نہیں جھیل سکی تھیں۔ ایک نادرہ ہی ایسی تھی، جس کا کبھی مائی شاداں سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

ارجمند کا جی چاہا کہ اندر چلی جائے اور شہزادے کی تصویر کو سنوارنے کی کوشش کرے۔ لیکن نجانے کیسے اسے اس بات کا یقین تھا کہ شہزادہ واپس آئے گا۔ چنانچہ وہ وہیں بیٹھی رہی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کاپی کھولی اور کاغذ پر بازار کی چہل پہل کا منظر بنانے کی کوشش کرنے لگی۔

مگر درحقیقت وہ انتظار کی کیفیت میں تھی۔ اور وہ کیفیت اتنی گہری تھی کہ اس نے اسے کچھ سوچنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ بس بے دھیانی میں وہ پنسل چلائے جا رہی تھی۔ انتظار کی وہ محویت ایسی تھی کہ اسے پھپھو کے اچانک چلے جانے کا خیال بھی نہیں آیا۔ ورنہ وہ ضرور چڑتی اور کڑھتی۔ بے چاری پھپھو۔ انہیں کبھی کوئی ڈھنگ کا آدمی نہیں ملتا کہ جس سے شادی کریں۔ پھر بھی ہر روز کوشش کرتی رہتی ہیں۔ اور ان کے لیے ایسے لوگ آتے ہیں، جو دیکھنے سے ہی برے لگتے ہیں..... کہانیوں والے دیو اور جادوگروں جیسے۔

دیر ہو گئی۔ وہ بازار کا خاکہ بناتی رہی۔ پھر اچانک شہزادہ واپس آ گیا۔ اس بار وہ پہلے سے بہت زیادہ قریب تھا۔ نیچے جو ہوٹل تھا، وہ اس کی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ پھر اس نے اٹھ کر ہاتھ دھوئے۔

ارجمند اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا پنسل والا ہاتھ تھم گیا تھا۔ اس بار وہ شہزادے کی تصویر گرد و پیش کی تمام جزئیات کے ساتھ دل کے کینوس پر اتار رہی تھی۔ ایک بات اس نے سمجھ لی تھی۔ آنکھوں سے دیکھ کر کاغذ پر تصویر بنانا یقیناً آسان ہے۔ لیکن یادداشت میں محفوظ کرنے کے بعد تصویر بنانا بہت زیادہ آسان ہو گا۔ اور وہ تصویر زیادہ درست اور زیادہ مکمل ہو گی۔ اس بات کا ابھی اسے تجربہ تو نہیں تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ یہ سچ ہے..... اسی طرح جیسے شہزادے کے جانے کے بعد اسے یقین تھا کہ وہ واپس آئے گا۔

اور اس کا یقین سچا تھا۔ وہ واپس آ گیا تھا!

❁ ❁ ❁

عبدالحق مسعود صاحب کے گھر پہنچا تو بہت رات ہو چکی تھی۔ مسعود صاحب گھر کے باہر بے چینی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر وہ اس کی طرف لپکے۔ ”کہاں چلے گئے تھے تم؟ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔“

”میں ایسے ہی گھومنا چاہتا تھا..... کل واپس جا رہا ہوں نا۔ لیکن آپ پریشان کیوں تھے؟“

”ارے..... اتنی رات ہو گئی..... اور تم نہیں آئے۔ پریشانی کی تو بات تھی۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی دے کر بھیجا کہ تمہیں ڈھونڈ کر لائے۔ اب اتنا بڑا شہر ہے۔ کہاں کہاں ڈھونڈتا پھرے گا وہ تمہیں۔ زیادتی ہو گئی بے چارے کے ساتھ۔“

عبدالحق کو شرمندگی ہونے لگی۔ وہ تو اپنی دانست میں آزادی اور بے فکری کے ساتھ لاہور کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ اسے معلوم بھی نہیں تھا کہ اس کی وجہ سے کون کون کتنا پریشان ہو گا۔ کیسی خودغرضی سرزد ہوئی ہے اُس سے۔

”میں شرمندہ ہوں سر۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اتنی دیر ہو جائے گی۔ وقت کا خیال ہی نہیں رہا مجھے۔“

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“ مسعود صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں سمجھ گیا۔ لاہور کو الوداع کہہ رہے تھے تم۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں۔ ارے بھئی لوٹ کر یہیں تو آنا ہے تمہیں۔“

”جی..... جی ہاں سر۔“

”اچھا، اب جلدی سے اندر چلو۔ تمہارے انتظار میں کھانا بھی نہیں کھایا۔ بھوک سے برا حال ہے میرا۔“

عبدالحق کی شرمندگی اور بڑھ گئی۔ یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ کھانا وہ کھا چکا ہے۔

مسعود صاحب کا ساتھ دینے کے لیے وہ بھوک نہ ہونے کے باوجود ڈھیر سے ڈھیر سے کھاتا رہا۔

”تو کل واپس جا رہے ہو تم۔“

”جی ہاں۔“

”اور واپسی کب ہو گی؟“

”اس بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ کچھ پتا نہیں، وہاں کے کام نمٹانے میں کتنا وقت لگے گا۔“

”کام کیا ہیں، سب کچھ تو نمٹا چکے ہو تم۔ مختارنامہ بھی بنوا دیا ہے زبیر کے نام۔“

”کچھ لوگ میری ذمہ داری ہیں۔ اور سر، زرینہ کی شادی کی بھی فکر ہے مجھے۔“

”زرینہ کی شادی تو لاہور میں بھی ہو سکتی ہے۔“

”نہیں سر۔ یہاں کوئی اسے اس کے ماضی کے حوالے سے پہچان سکتا ہے۔ میں چاہوں گا کہ اس کی شادی یہاں سے کہیں دور ہو۔“

”بات تمہاری ٹھیک ہے۔ تم عقل مند ہو، اور دور تک سوچنے اور دیکھنے والے.....“ مسعود صاحب نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ چونکے، جیسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔

"ارے ہاں..... خریداری کیا کی تم نے؟"

عبدالحق نے انہیں تفصیل بتائی۔

"اور تم نے وہ سب میرے ڈرائیور کے ہاتھ بھجوایا۔ یہ عقلمندی کے خلاف ہے۔ اور زیادتی بھی ہے ڈرائیور کے ساتھ۔"

"میں سمجھا نہیں سر۔"

"ارے بھئی، اگر وہ گاڑی کہیں کھڑی کرتا اور تمہارا سامان لے کر نکل بھاگتا تو۔ تین ساڑھے تین ہزار کے تو صرف زیورات ہی ہوں گے۔"

"میں نے سوچا کہ آپ کا ڈرائیور ہے تو قابلِ اعتبار ہی ہوگا۔"

"دیکھو بھئی، یہ آدمی کو بلاوجہ کی آزمائش میں ڈالنا ہوا۔" مسعود صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔ "بھئی آدمی تو خطا کا پتلا ہے۔ اللہ نے ایسا ہی بنایا ہے اسے کہ گناہ اس کے لیے فطری ہوتا ہے۔ میری بات یاد رکھنا۔ ترغیب گناہ کا دروازہ ہوتی ہے۔ آدمی کو خود کو ترغیبات سے دور رکھنا چاہیے۔ یہی نہیں، دوسروں کو بھی ترغیبات سے بچانا اُس کی ذمہ داری ہے۔ کبھی کبھی نہایت ایمان دار آدمی مجبوریوں کی وجہ سے بھی ہار جاتا ہے۔ ایسے میں اس بات کو سمجھ کر درگزر سے کام لینا چاہیے۔ سرکاری ملازمت میں، اور ویسے بھی عملی زندگی میں ان سب باتوں کا خیال رکھنا چاہیے آدمی کو۔ اب آج اگر میرے ڈرائیور کی نیت خراب ہو جاتی تو وہ تو گناہ گار ہوتا ہی، لیکن اس میں قصوروار تم بھی ہوتے۔"

"شکریہ سر۔ میرا خیال ہے، آج آپ نے مجھے بہت اہم بات سمجھائی ہے۔"

"ایک بات اور۔ اللہ نے آدمی کو فرشتہ نہیں بنایا، اور فرشتوں سے افضل قرار دیا ہے۔ تو آدمی کو آدمی ہی سمجھنا چاہیے۔ اور اُس کو فطری کمزوریوں کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ خطاؤں پر، لغزشوں پر، گناہوں پر مطعون کرنا اور سزا دینا تو بہت آسان ہے، معاف کرنا اور درگزر کرنا بہت مشکل ہے۔ اور رہی بات اعتبار کی تو وہی بات ہے کہ آدمی کو آدمی سمجھو۔ اعتبار کرو تو اس حد تک کہ اُس کی اور اپنی بساط کو ذہن میں رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ اعتبار ٹوٹے تو عمر بھر کسی پر اعتبار کرنے کے قابل ہی نہ رہو۔ یہ اور بڑا نقصان ہوتا ہے۔"

"شکریہ سر۔ میں آپ کی یہ باتیں یاد رکھوں گا۔"

اُس وقت ڈرائیور یہ خبر لے کر آ گیا کہ مہمان کہیں نہیں ملا۔ عبدالحق مسکرا دیا۔ ڈرائیور نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ مہمان ہیرا منڈی میں ملے گا۔

❁ ❁ ❁

ارجمند اس روز صبح ہی سے تصویریں بنانے میں منہمک تھی!

گھر میں یہ وقت اسے عجیب لگتا تھا۔ سبھی لوگ سو رہے ہوتے تھے۔ سناٹا ایسا ہوتا تھا، جیسے رات کو ہوا کرتا ہے۔ مگر اس وقت میں ایک خوبی تھی۔ ارجمند کو ایسا لگتا تھا کہ یہ اس کی حکمرانی کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت وہ جو چاہتی، کر سکتی تھی...... ایک کام کے سوا۔ بس وہ گھر سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ ایک دن اسے خیال آیا تھا کہ سب سو رہے ہیں۔ کیوں نہ وہ باہر جائے اور سیر کرنے کا اپنا ارمان پورا کرے۔ یہ سوچ کر وہ دروازے کی طرف گئی۔ مگر دروازے پر تو یہ بڑا تالا لگا تھا۔

اُس نے تصویر مکمل کر کے دیکھا۔ اس تصویر سے وہ مطمئن تھی۔ اس نے سوچا، اب رنگ بھرنے کے بعد تو یہ بالکل شہزادہ ہی لگے گا۔

رنگ بھرنے کے بعد اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس نے شہزادے کی ویسی ہی تصویر بنا لی تھی، جیسا کہ وہ تھا۔ تصویر کو نظر بھر کر دیکھنے کے بعد اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ شہزادے کا چہرہ اب بھی اس کے سامنے تھا، ویسا ہی، جیسا اس نے دیکھا تھا۔ اب اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو احساس ہوا کہ تصویر میں کچھ کمی رہ گئی ہے۔

کمی کا احساس اپنی جگہ، لیکن وہ تصویر شہزادے ہی کی تھی۔ اس کے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑنے لگی۔ وہ یہ تصویر پھپھو کو دکھانے کے لیے بے تاب ہو گئی۔

لیکن پھپھو سو رہی تھیں!

وہ جھنجھلا گئی۔ یہ پھپھو اتنی دیر تک کیوں سوتی ہیں؟ جب دیکھو، دوپہر کو اٹھتی ہیں۔

اس پر اسے دادی یاد آ گئیں۔ وہ کہتی تھیں، گھر میں کوئی دیر تک سوئے تو نحوست چھا جاتی ہے پورے گھر پر۔ مگر یہاں تو سب کے سب دوپہر تک سوتے رہتے ہیں۔ یہاں تو نحوست بہت ہی زیادہ ہوگی۔ اس نے اِدھر اُدھر، چاروں طرف دیکھا۔ نحوست تو کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ البتہ سناٹا ضرور تھا، جو بہت برا لگتا تھا۔ پتا نہیں، نحوست کیسی ہوتی ہے؟ اس نے سوچا، مجھے نظر کیوں نہیں آتی؟

ذہن کی رو بدلی تو اسے ایک اور بات یاد آئی۔ چچا جان کی شادی کی اگلی صبح وہ چچی جان سے بات کرنے کو بے تاب ہو رہی تھی۔ رات دلہن بنی ہوئی وہ کتنی اچھی لگ رہی تھیں۔ اس نے سوچا تھا کہ ناشتہ وہ ان کے ساتھ کرے گی، اور پھر خوب باتیں کرے گی ان سے۔

صبح دادی نے اسے ناشتہ دیا تو اس نے انکار کر دیا۔ "میں تو چچی جان کے ساتھ ناشتہ کروں گی۔"

"اب بھی کر لو۔ اور دلہن کے ساتھ بھی کر لینا۔" دادی نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"پیٹ بھرا ہوگا تو ناشتہ کرنے میں کیا مزہ آئے گا۔" وہ بولی۔

دادی کے اصرار کے باوجود اس نے ناشتہ نہیں کیا۔ مگر نہ تو چچا جان اٹھے، نہ چچی جان۔ بھوک سے اس کا برا حال ہو گیا۔ "دادی...... کب اٹھیں گی چچی جان۔" اس نے فریاد کی۔

"انہیں چھوڑو، تم ناشتہ کر لو۔"

مگر وہ نہ مانی۔ وہ چچا جان کے کمرے کی طرف گئی اور دروازے کو دھکیل کر کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ غصے میں اس نے دروازہ پیٹنے کا ارادہ کرلیا۔

''نہیں میری شہزادی، بری بات۔'' عقب سے اسے دادی کی آواز سنائی دی۔ اس کا ہاتھ رک گیا۔

''یہ لوگ اٹھتے کیوں نہیں دادی۔''

''تم چلو، ناشتہ کرلو۔ آؤ میرے ساتھ۔'' دادی نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''لیکن میں......''

دادی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں نے کہا نا، تم ان کے ساتھ بھی کرلینا ناشتہ۔''

بھوک سے مجبور ہو کر وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ لہٰذا ناشتے پر ٹوٹ پڑی۔ لیکن پیٹ بھرتے ہی اس کا دماغ پھر کام کرنے لگا۔ ''توبہ کیسی نحوست پھیلی ہوئی ہے گھر میں۔'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

دادی ہنسنے لگیں۔ ''کوئی بھی نہیں۔ آج تو گھر میں برکت ہی برکت ہے۔''

اُس نے حیرت سے دادی کو دیکھا۔ ''دن چڑھے تک سونے سے نحوست نہیں ہوتی گھر میں؟ آپ ہی تو کہتی تھیں۔''

''ہوتی ہے لیکن گھر میں کسی کی شادی ہو جائے تو چالیس دن تک نحوست اس گھر میں گھس ہی نہیں سکتی۔''

''اتنی اچھی چیز ہے شادی۔''

''تو اور کیا۔ کسی کی شادی ہوتی ہے تو اللہ میاں خوش ہوتے ہیں۔''

اللہ میاں پر اسے خیال آیا کہ اب تو اس کے اور پھپھو کے سوا سب لوگ اللہ میاں کے پاس چلے گئے ہیں۔ اور پھپھو کہتی ہیں کہ وہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔ وہ اداس ہو گئی۔ اب وہ ان سے کبھی نہیں مل سکے گی۔ ہاں وہ بھی اللہ میاں کے پاس چلی جائے تو اور بات ہے۔ لیکن ابھی تو یہ پسند نہیں کرے گی۔ ابھی تو اسے شہزادے سے شادی کرنی ہے۔

وہ ان سب لوگوں کے بارے میں سوچنے لگی...... دادا، دادی، ماں باپ، چچا چچی۔ اب وہ سب اللہ میاں کے پاس ہیں۔ اللہ...... اللہ میاں کا گھر کیسا ہوگا۔ یقیناً بہت بڑا ہوگا...... اور بہت خوبصورت۔ وہاں بھی وہ سب لوگ صبح سویرے اٹھتے ہوں گے۔ اور کبھی کوئی دن چڑھے تک سوا ہوگا تو گھر میں نحوست...... نہیں، دادی کہتی تھیں کہ اللہ کے ذکر سے، اس کے کلام سے نحوست دور ہوتی ہے۔ تو اللہ کے گھر میں نحوست کیسے ہو سکتی ہے۔ ہاں اللہ میاں دیر تک سونے والے کو ڈانٹ کر اٹھاتے ہوں گے......

اس کی نظر شہزادے کی تصویر پر پڑی۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ پھپھو کو یہ تصویر دکھانی ہے۔ پھپھو کتنی خوش ہوں گی۔

وہ پھپھو کے کمرے کی طرف چل دی۔ یہ پھپھو اتنے لوگوں کو دیکھتی ہیں، ملتی ہیں، ان سے باتیں کرتی ہیں لیکن شادی کسی سے نہیں کرتیں۔ کوئی پسند ہی نہیں آتا انھیں۔ اس نے سوچا۔ پھر خود ہی بڑبڑائی۔ کوئی اچھا ہوتا بھی نہیں۔ اچھے لوگ کیوں نہیں آتے۔ مگر پھر پھپھو دیر تک کیوں سوتی ہیں۔ بلکہ یہاں تو سبھی دیر تک سوتے ہیں، اور شادی کسی کی نہیں ہوتی۔

وہ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اندر کا منظر عجیب تھا۔ چار لڑکیاں تو مسہری پر سوئی ہوئی تھیں۔ دو نیچے فرش پر بچھے بستر پر پھیلی ہوئی تھیں۔ پھپھو کا بستر الگ تھا۔ ان کے ساتھ کوئی نہیں سوتا تھا۔

اب پھپھو کو جگانا، ایسے کہ کسی اور لڑکی کی نیند خراب نہ ہو، آسان کام نہیں تھا۔ یہاں نیند خراب کرنے پر لوگوں کو بہت غصہ آتا تھا۔ اس پر بہت ڈانٹ پڑ چکی تھی اسے۔ بلکہ ایک بار تو اس منحوس بوا نے اس کے کان اتنے زور سے کھینچے تھے کہ دو دن تک درد ہوتا رہا تھا کانوں میں۔ صرف اس بات پر کہ ایک لڑکی نے بوا سے اس کی شکایت کردی تھی نیند خراب کرنے پر۔

بوا چاہتی تھی کہ وہ اسے نانی کہا کرے لیکن اس نے یہ بات کبھی نہیں مانی۔ وہ تو بوا کو سخت ناپسند کرتی تھی...... بغیر کسی وجہ کے۔ اور بعد میں تو وجوہات بھی مل گئی تھیں اسے۔ ایک تو وہی کان کھینچنے والی بات تھی۔ پھر اس نے پھپھو کا نام نرگس رکھ دیا تھا۔ جبکہ پھپھو کا اتنا اچھا نام تھا...... نادرہ۔ اس نے یہ بات پھپھو سے بھی کہی تھی۔

''یہ سب لوگ اچھے نہیں ہیں گڑیا...... بہت برے ہیں۔'' پھپھو نے اسے سمجھایا تھا۔ ''اس لیے میں نہیں چاہتی کہ یہ میرا نام لیں۔ میں نے خود انھیں اپنا نام نرگس بتایا ہے۔''

وہ کچھ دیر سوچتی رہی تھی۔ اس لمحے پھپھو اسے بہت اچھی لگی تھیں۔ انھیں اپنے اچھے نام کی کتنی فکر تھی۔ پھر اس نے کہا۔ ''تو پھپھو، مجھے بھی اپنا نام ارجمند بہت اچھا لگتا ہے۔ تو میں انھیں ارجی کہنے دوں خود کو۔''

''ہاں...... کیوں نہیں۔'' پھپھو نے کہا تھا۔

مگر اب بھی کبھی کبھی اپنے لیے ارجی سن کر وہ بھڑک اٹھتی تھی......

اُس نے پھپھو کے کان سے ہونٹ ملائے اور سرگوشی میں اسے پکارنے لگی۔ ساتھ ہی وہ ہاتھوں سے اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ ''پھپھو...... اچھی پھپھو...... جلدی سے اٹھ جائیں۔ ایک زبردست خبر ہے۔ اٹھ جائیں نا پھپھو......''

❁ ❁ ❁

گڑھا بہت گہرا تھا۔ اور ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ نادرہ کو احساس تھا کہ وہ کمر تک کیچڑ میں پھنسی ہوئی ہے۔ بدبو اور تعفن اتنا شدید تھا کہ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ وہ محض کیچڑ نہیں ہے۔ بلکہ بدترین نوعیت کی غلاظتوں کا آمیزہ ہے۔ بدبو سے اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ اور وہ ناک بھی بند نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اس کے ہاتھ بھی لتھڑے ہوئے تھے۔

اس نے پہلو بدلنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اپنی ٹانگوں کو حرکت ہی نہیں دے سکی۔ اس سے اسے اندازہ ہوا کہ غلاظتوں کا وہ آمیزہ کیچڑ نہیں بلکہ دلدل ہے۔ اور وہ یہاں سے نکل ہی نہیں سکتی۔

بے بسی کے شدید احساس سے اس کا دماغ شل ہو گیا۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اوپر سیاہی مائل نیلگوں آسمان اسے کسی گٹر کے ڈھکنے کی طرح لگا۔ اور وہ ڈھکنا بہت چھوٹا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ جتنا چھوٹا لگ رہا ہے اتنا ہوگا نہیں۔ کیونکہ اس نے گڑھے میں کھڑے کھڑے اپنے دونوں ہاتھ پوری طرح سے پھیلا کر دیکھا تھا اور وہ گڑھے کی دیواروں کو نہیں چھو سکے تھے۔ اس سے گڑھے کے قطر کا وہ اندازہ لگا سکتی تھی۔ جبکہ ستاروں سے محروم آسمان کا وہ ڈھکنا بہت چھوٹا لگ رہا تھا۔

اس ڈھکنے کی وجہ سے گڑھے کی گہرائی اسے لامتناہی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایسا ہے نہیں۔ جہاں آسمان کے سوا کچھ دکھائی نہ دے وہاں تو فاصلہ زیادہ ہی لگے گا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ گڑھا بہت کم گہرا ہو تب بھی وہ اس میں سے نہیں نکل سکتی۔ کیونکہ وہ اپنے قدموں کو حرکت ہی نہیں دے سکتی۔ اور نہ ہی وہ کسی دیوار کا سہارا لے سکتی ہے۔

بدبو اور تعفن کی وجہ سے اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ وہ زور سے پکار کر اللہ سے مدد مانگنا چاہتی تھی لیکن اتنی گندگی میں یہ مناسب نہیں تھا۔ ہاں...... دل میں وہ دعا کر سکتی تھی۔

سو وہ دل میں دعا کرتی رہی کہ اللہ اسے اس گڑھے سے نجات دے۔ پھر اس نے سر اٹھا کر بلند آواز میں پکارا۔ "کوئی ہے...... ارے کوئی ہے...... میری مدد کرو۔ مجھے یہاں سے نکالو۔"

وہ بار بار پکارتی رہی۔

پھر اچانک جیسے آسمان کے اس ڈھکنے میں رخنہ نمودار ہوا...... ایک انسانی ہیولا جس نے جھک کر اسے دیکھا۔

"پلیز...... پلیز مجھے نکالو یہاں سے۔" وہ گڑگڑائی۔ اب زور سے چیخنے کی ضرورت نہیں تھی۔

جواب میں ایک ہاتھ نیچے کی طرف آیا۔ "لو...... میرا ہاتھ تھام لو۔"

ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے ایک خیال کے تحت اس نے واپس کھینچ لیا۔ وہ آواز جانی پہچانی تھی۔ "کون ہو تم؟"

"تمہیں اس سے کیا؟ تم باہر نکلنا چاہتی ہو اور میں تمہاری مدد کر رہا ہوں۔"

"نہیں...... میرے لیے اس کی بھی اہمیت ہے۔ پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو۔" وہ اس آواز کو پہچان چکی تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ زندگی میں ایک لمحے کے لیے بھی نہ وہ اس صورت کو بھولی تھی نہ اس آواز کو۔

پھر جواب سے اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ "میں اوتار سنگھ ہوں۔" آواز نے کہا۔

"میں نہیں چاہتی کہ تم مجھے نکالو۔"

"لیکن کیوں؟"

"کیونکہ تم مشرک ہو۔"

"اوہ۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "اور اس گڑھے میں تمہیں کس نے گرایا ہے۔ وہ کوئی مشرک تو نہیں تھا۔"

"مگر یہ سب کچھ ہوا تو تم مشرکوں ہی کی وجہ سے ہے۔"

"وہاں کی چھوڑو یہاں کی بات کرو۔ تم تو وطن میں اپنوں کے ہاتھوں غلاظت کے اس گڑھے میں گری ہو۔"

وہ خاموش رہی۔ اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"لاؤ...... ہاتھ دو مجھے۔"

"نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا۔"

پھر اچانک اوتار سنگھ کی آواز بدل گئی۔ وہ کسی چھوٹی سی بچی کی آواز میں بولنے لگا۔

"پھپھو...... اچھی پھپھو......"

"وہ حیران رہ گئی۔ "یہ کیا......؟"

"اچھی پھپھو...... جلدی سے اٹھ جائیں۔"

"یہ تمہاری آواز کو کیا......؟"

"ایک زبردست خبر ہے...... اٹھ جائیں نا پھپھو۔"

اور اوتار سنگھ کا ہاتھ جیسے لمبا ہوتا گیا...... اتنا لمبا کہ اس تک پہنچ گیا اور اسے جھنجوڑنے لگا۔

"ہاتھ ہٹاؤ...... مت چھوؤ مجھے۔"

"پھپھو...... پھپھو...... آپ تکلیف پہنچا رہی ہیں مجھے۔"

اور نادرہ کی آنکھ کھل گئی۔ اسے احساس ہوا کہ ارجمند کی کلائی اس کے ہاتھ میں ہے اور اس کی گرفت بہت سخت ہے۔ ارجمند کے چہرے پر تکلیف کا تاثر تھا۔ "کیا ہوا گڑیا؟"

"آپ میرا ہاتھ تو چھوڑیں نا پھپھو۔"

نادرہ نے جلدی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "اب بولو کیا بات ہے۔"

"دوسرے کمرے میں چلیں۔ میں آپ کو کچھ دکھاؤں گی۔"

نیند تو اب بھی آرہی تھی لیکن اس خواب کے بعد اب وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔ "اچھا...... تم چلو۔ میں منہ دھو کر آتی ہوں۔"

منہ پر پانی کے چھپکے مارتے ہوئے وہ اس خواب کے بارے میں سوچتی رہی۔ تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ یہ خواب وہ ہر دوسرے تیسرے دن دیکھتی تھی۔ اس کی وجہ بھی وہ سمجھتی تھی۔ اوتار سنگھ اس کی پہلی اور آخری محبت تھا۔ اس کے بارے میں وہ ہمیشہ ایک ہی بات سوچتی تھی۔ کاش...... کاش وہ مسلمان ہوتا۔ وہ اپنی محبت سے تو لڑتی رہی۔ لیکن وہ اسے بھلا کبھی نہیں سکی۔

اس وقت بھی اس نے سوچا...... کاش وہ مسلمان ہوتا۔

لیکن ابھی دیکھے ہوئے خواب کا اثر شاید تازہ تھا۔ اس کے اندر سے کسی نے کہا...... چاہے رشید جیسا مسلمان ہوتا!

اس نے آئینے سے نظریں چرالیں اور تولیے سے چہرہ پونچھنے کے بعد کمرے کی طرف چل دی، جہاں ارجمند اس کی منتظر تھی۔

❁ ❁ ❁

"ہاں، اب بتاؤ، وہ کیا بڑی خبر ہے، جس کے لیے تم نے میری نیند خراب کی؟" اس نے ارجمند کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بہت بڑی خبر ہے پھپھو۔"

"بتاؤ تو۔"

"خبر یہ ہے پھپھو کہ مجھے میرا دولہا مل گیا۔"

فرطِ حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔ "ارے...... کیا واقعی؟ لیکن کیسے؟ اور کہاں؟"

"آپ تو اندر چلی گئی تھیں۔ میں کوٹھے پر تھی۔ تب میں نے انہیں دیکھا۔ وہ نیچے تھے۔"

نادرہ کو ہنسی آگئی۔ ارجمند اسی لہجے میں بات کر رہی تھی، جیسے لڑکیاں کسی کو اپنے منگیتر کے بارے میں بتاتی ہیں۔ "یہ بتاؤ، کیا وہ اوپر بھی آئے تھے؟"

اس نے اسی انداز میں اس سے پوچھا۔

"نہیں پھپھو، اوپر تو نہیں آئے وہ۔" ارجمند نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"تم بھی پگلی ہو۔ ضروری نہیں کہ آئندہ وہ تمہیں نظر بھی آئیں۔"

"نہیں پھپھو۔ بس کچھ بھی ہو، میں تو شادی انہی سے کروں گی۔"

"ارے بے وقوف، اب تم انہیں دوبارہ دیکھو گی تو پہچان بھی نہیں سکو گی۔"

"کیسی باتیں کرتی ہیں۔ انہیں تو میں کبھی نہیں بھولوں گی۔" ارجمند نے خفا ہو کر کہا۔

نادرہ کو ہنسی آگئی۔ مدت کے بعد ایسی بے ساختہ ہنسی آئی تھی۔ ارجمند کی معصومیت نے اس ول میں بچی خوشی کا ایسا پھول کھلایا تھا، جسے وہ ترس ہی نہیں رہی تھی۔ بلکہ بھول ہی چکی تھی۔ اس ارجمند کو لپٹا کر پیار کیا۔ "تو تم انہیں کہیں بھی دیکھو گی تو پہچان لو گی۔ اور وہ تمہیں ملیں گے بھی۔ ور۔ اچھا، یہ بتاؤ، کیسے تھے وہ۔ یہ تو یاد ہوگا تمہیں۔"

ارجمند کھل اٹھی۔ "دکھاؤں آپ کو۔"

نادرہ حیران رہ گئی۔ "تو کیا اب بھی نیچے کھڑے ہیں وہ؟"

"ارے پھپھو، آپ بھی پگلی ہیں بس۔" ارجمند نے سی کے انداز میں کہا۔ "میں نے تصویر ئی تھی ان کی۔"

نادرہ کا دل دکھنے لگا۔ معصوم بچی کو جانے کن کن مرحلوں سے گزرنا تھا زندگی میں۔ اور وہ سے دکھوں کا سامان کر رہی تھی۔

"دکھاؤں آپ کو؟"

"ہاں ضرور۔"

ارجمند نے ڈرائنگ کی کاپی کھولی اور تصویر والا صفحہ اس کے سامنے کر دیا۔

نادرہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "اوتار سنگھ!"

نادرہ نے بہت تیزی سے خود کو سنبھالا۔ "نہیں گڑیا۔ البتہ ان کی صورت ملتی ہے اوتار سنگھ سے۔"

"اوتار سنگھ کون تھے؟"

"میرے ساتھ کالج میں پڑھتے تھے...... میری کلاس میں۔ لیکن یہ وہ نہیں ہو سکتے۔ ہاں ل بہت ملتی ہے۔"

"یہ اوتار سنگھ وہی ہیں نا، جن کے بارے میں آپ بہت باتیں کرتی ہیں مجھ سے۔ ہے نا؟"

"ہاں گڑیا۔" نادرہ نے جھجکتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ کو یہ بہت اچھے لگتے تھے؟"

"اچھا تو یہ تھا۔ مگر ہندو تھا۔ بہت اچھا کیوں لگتا مجھے۔"

"لیکن یہ ہندو نہیں ہیں۔" ارجمند نے زور دے کر کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو گڑیا۔ ہندو ہوتو یہاں کیوں ہوتا۔" نادرہ نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا گڑیا، اب میں سو جاؤں۔ بہت نیند آرہی ہے مجھے۔"

"دن چڑھتے تک سونا نحوست ہوتا ہے پھپھو۔ یاد ہے، دادی کہتی تھیں۔"

نادرہ اداس ہو گئی۔ "نحوست سے بھاگنا ہی تو چاہتے ہیں ہم۔ مگر راستہ ہی نہیں ملتا۔"

❁ ❁ ❁

نیند کا تو بس بہانہ تھا۔ نیند اب کیسے آسکتی تھی۔ وہ تو بس سکون سے اوتار سنگھ کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی۔

لفظ محبت ایک اسی نام کے ساتھ تو جڑا تھا۔ لفظ اس لیے کہ محبت تو وہ کر کے بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بس وہ بار بار یہی سوچتی کہ کاش ...... کاش وہ مسلمان ہوتا۔ لیکن لفظ کاش دنیا کا سب سے بے فیض لفظ ہے۔ اس سے معاملات درست کبھی نہیں ہوتے اور حسرت پکی ہو جاتی ہے۔

اس نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگی۔

تصویر تو وہ اوتار سنگھ کی ہی لگتی تھی۔ کہیں بال برابر بھی فرق نہیں تھا لیکن عقلی طور پر اس کا یہاں ہونا ممکن نہیں تھا۔ اوتار سنگھ تو دہلی میں تھا۔ تقسیم کے بعد وہ یہاں کیوں آتا۔ ہندو تو الٹا یہاں سے بھاگ رہے تھے۔ ایسے میں ہندو کا دہلی سے لاہور آنا خلاف عقل تھا۔

دوسری بات ...... اگر مان بھی لیا جائے کہ وہ لاہور آ گیا تھا' تو اس کا یہاں ...... اس بازار میں ...... ہیرا منڈی میں کیا کام؟ یہ دوسری بات تو پہلی سے بھی زیادہ ناممکن تھی۔ اس نے اوتار سنگھ کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ریٹا پارسن کے گھر ہونے والی پارٹی اسے یاد تھی۔ اسے ریٹا کی نظریں بھی یاد تھیں۔ وہ اوتار سنگھ کو پانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اور پھر جس طرح' بالکل اچانک وہ انگلینڈ واپس گئی تھی' حالانکہ اس سے پہلے اس کا یہی کہنا تھا کہ وہ یہاں سے واپس نہیں جائے گی' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اوتار سنگھ نے اسے مایوس کر دیا تھا۔

اوتار سنگھ عجیب آدمی تھا۔ اس میں تعصب کی بجائے وسیع النظری تھی۔ نفرت تو وہ کسی سے کرتا ہی نہیں تھا۔ شراب وہ نہیں پیتا تھا۔ کردار کی مضبوطی ایسی تھی کہ ایک نہایت آزاد خیال انگریز لڑکی بھی اسے ورغلا نہیں سکی۔ محمود کی موت پر کالج میں ہونے والے تعزیتی جلسہ اسے یاد تھا۔ اس روز اس نے اوتار سنگھ کا ایک نیا روپ دیکھا تھا۔

رام گوپال ہمیشہ کی طرح ہرزہ سرائی کر رہا تھا۔ شاید اس نے اوتار سنگھ کو کوئی طعنہ دیا تھا۔ جواب میں اوتار سنگھ نے جس جارحیت کا مظاہرہ کیا' اس نے سبھی کو حیران کر دیا۔ رام گوپال تو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔ اوتار سنگھ نے اس سے کہا تھا...... تم بزدل ہو رام گوپال اور مجھے فخر ہے کہ محمود جیسا بہادر آدمی میرا دوست تھا۔ میں تم جیسے تیس چالیس مسلح افراد سے اکیلا ہی نمٹ سکتا ہوں۔ یاد رکھنا رام گوپال' میں راجپوت ہوں اور بزدلوں سے دوستی نہیں رکھتا۔

وہ آخری موقع تھا کہ نادرہ نے اوتار سنگھ کو دیکھا۔ کیونکہ کالج میں ہندوؤں کے تعصب کے اس مظاہرے کے بعد کہ رام گوپال نے محمود کے قتل کا بلاواسطہ اعتراف کر لیا تھا، اسے کالج جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ ڈر گئی تھی کہ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ یہی سب کچھ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے

تو اس آخری دن اس نے دل میں سوچا تھا کہ اوتار سنگھ ایمان سے محروم ہے' لیکن اس میں ساری خوبیاں مومنوں والی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بیشتر مسلمانوں سے اچھا ہی تھا۔

لیکن وہ بہرحال مسلمان نہیں تھا!

نادرہ کبھی اوتار سنگھ کو نہیں بھلا سکی...... اس کی محبت کو دل سے نہیں نکال سکی۔ اور اسے کسی اور سے محبت نہیں ہوئی' شاید اس لیے کہ اسے موقع ہی نہیں ملا۔ لیکن شاید موقع ملنے پر بھی وہ کسی سے محبت نہیں کر پاتی۔

اسے یاد تھا۔ ٹرین میں جب وہ لٹ رہی تھی تو اسے خیال آیا تھا کہ یہ لوگ اوتار سنگھ ہی کے تو ہم مذہب ہیں۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس کے ساتھ یہ سب کچھ ہونے والا ہے تو وہ اوتار سنگھ کی محبت سے کبھی نہ لڑتی۔ یوں کم از کم ایک سچی خوشی تو مل جاتی اسے۔

پھر لاہور میں وہ رشید کے ہاتھوں لٹی...... اور ایسی لٹی کہ ہر روز لٹنا اس کا مقدر ہو گیا۔ ہندوؤں سے کہیں زیادہ بڑی ذلت اسے مسلمان سے ملی تھی۔ اس کے بعد وہ اوتار سنگھ کی محبت پر کبھی شرمندہ نہیں ہوئی۔ بلکہ ذلت بھرے اس ماحول میں وہی اس کے لیے نشانِ عزت ٹھہری۔ بھی کر دینے والے اس ماحول میں وہی تو ایک سچی خوشی تھی اس کے لیے۔

کوٹھے پر آنے کے بعد اس نے اپنے لیے ڈائری منگوائی تھی' اور وہ باقاعدگی سے ڈائری لکھتی رہی تھی۔ اور اس ڈائری میں اوتار سنگھ کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک اچھی یاد کی طرح تھا' جسے وہ ہر روز لکھ سکتی تھی۔ اور تو وہ کچھ یاد کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

اوتار سنگھ؟ اور لاہور میں! یہ بھی تو ممکن ہے کہ تصویر بناتے ہوئے ارجمند سے نقوش کچھ تبدیل ہو گئے ہوں۔ آخر بچی ہی ہے وہ اور ہم شکل ہونا بھی ایسا ناممکن نہیں۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ سچ مچ اوتار سنگھ ہی ہو۔ وہ ہر روز اللہ سے دعا کرتی تھی...... ایک نجات دہندہ بھیجنے کے لیے التجا کرتی تھی، جو اسے اور ارجمند کو ...... بلکہ صرف ارجمند کو یہاں سے نکال کر لے جائے۔ کیونکہ اب اس کے لیے پوری دنیا میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس پر غلاظت کی ایسی تہیں چڑھ چکی ہیں کہ اسے کبھی کوئی عزت نہیں دے گا۔

اور یہ سوچنے میں بڑی خوشی ...... بڑی لذت تھی کہ وہ اوتار سنگھ ہی تھا...... اس کا محبوب' جسے اللہ نے اس کی دعاؤں کے جواب میں نجات دہندہ بنا کر بھیج دیا تھا۔

اگر وہ وہاں موجود ہوتی اور اسے دیکھ لیتی تو کیا ہوتا؟ اس نے سوچا۔

اسے احساس ہوا کہ اس کے سامنے امکانات کے کئی دروازے ہیں۔ سوچنا یہ تھا کہ اس کا فطری ردعمل یہی ہو سکتا تھا کہ وہ اسے پکارتی...... جسم و جاں کی پوری قوت اور شدت سے آواز دیتی...... اوتار سنگھ! آخر اس کے لیے ارجمند کے بعد روئے زمین پر اوتار سنگھ وہ واحد شناسا شخص

تھا' جو اس کے ماضی سے حال میں آ سکتا تھا اس کے نظر آنے پر اس کا فطری اور یقینی ردِعمل یہی ہو سکتا تھا۔

اب سوال یہ تھا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا؟

یہ امکان بہت قوی تھا کہ اوتار سنگھ کے نام کی پکار بازار میں ہلچل مچا دیتی۔ سب دیکھتے کہ اشارہ کس طرف ہے۔ کون ہے وہ اوتار سنگھ اور شاید کوئی بھی نہیں سمجھتا کہ وہ پکار مدد کے لیے ہے۔ اس نام کے ساتھ سننے والے تو یہی سمجھتے کہ کوئی مظلوم کسی ظالم کی نشان دہی کر رہا ہے...... خاص طور پر اس صورت میں کہ پکارنے والی کوٹھے پر سے پکار رہی ہو۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ اوتار سنگھ کی تکا بوٹی ہو جاتی۔ ابھی تو ہندوؤں اور سکھوں کے لگائے ہوئے زخموں پر پہلے کھرنڈ سے پہلے کی جھلی بھی نہیں آئی تھی۔

دوسری بات یہ کہ اگر وہ کسی طرح اشارہ بھی کر دیتی تو اوتار سنگھ اوپر آ بھی جاتا تو وہ کیا کرتی۔ اور اوتار سنگھ بھی کیا کر سکتا تھا۔ وہ کوئی دعویٰ تو نہیں کر سکتا تھا۔ اور اس بازار میں تو ورثا کا دعویٰ بھی سچا نہیں ہوتا۔ ہاں اگر اوتار سنگھ تماش بین کی حیثیت میں آتا تو وہ اسے اپنی صورتِ حال کے بارے میں بتاتی۔ خود تو وہ اب یہاں سے نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تو زندگی کی سرحد پار کرنے کی خواہاں تھی۔ بشرطیکہ ارجمند کو یہاں سے نجات مل جائے اور باہر کی دنیا میں اچھے مستقبل کی ضمانت بھی۔ لیکن اوتار سنگھ ارجمند کو یہاں سے کیسے نکال سکتا تھا۔ وہ بے چارہ تو یہاں خود بھی غیر محفوظ ہوگا۔ اور نیلم بائی بھلا ارجمند کو نکلنے دے گی۔

پہلی بار اسے احساس ہوا کہ خواب دیکھنا کتنا آسان ہے۔ اور تعبیر پانا کتنا دشوار ہے۔ وہ دعا کرتی رہی تھی کہ کوئی نجات دہندہ آئے اور ارجمند کا نکال کرلے جائے۔ یہ اس کا خواب تھا۔ مگر اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ اللہ کی خاص رحمت ہو تو اور بات ہے۔ ورنہ بہ ظاہر ارجمند کی نجات کا کوئی امکان موجود نہیں ہے۔

مایوسی دھیرے دھیرے اس کے وجود میں سرایت کرنے لگی۔ مگر یہ اسے گوارا نہیں تھا۔ مایوسی کو وہ قبول کر لیتی تو زندہ نہ رہ پاتی۔ اس لیے مثبت انداز میں سوچنا اس کی مجبوری تھی۔

اس کا واحد آسرا اللہ تھا۔ کبھی وہ سوچتی تھی کہ اللہ نے ٹرین کے سفر سے لے کر آج تک کبھی اسے نہیں بچایا۔ کبھی اس کی مدد نہیں کی۔ مگر پھر وہ اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر دل ہی دل میں توبہ کرتی۔ اللہ کی مرضی۔ اس کی مصلحت کون سمجھ سکتا ہے۔ اس میں کوئی بہتری ہوگی...... ہاں اسے نظر نہیں آ سکتی۔ تقدیر بھی کوئی چیز ہے۔ لیکن اللہ کی قدرت تو ایسی ہے کہ صرف کن فرمانے سے زمین آسمان جیسی تخلیقات وجود میں آ گئیں۔ جہاں کوئی راستہ نظر نہیں آتا باہر نکلنے کا' وہاں وہ جیسے چاہے راستہ بنا دے۔

اس نے مثبت انداز میں سوچنے کی کوشش کی۔ اگر وہ اوتار سنگھ ہی ہے تو یہ ناممکن نہیں کہ دوبارہ نظر نہ آئے۔ اب یہ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ اسے پکار نہیں سکتی اس کے نام سے' ورنہ اسے نقصان پہنچے گا۔ تو اب اسے دیکھ کر اسے اپنے فطری اور یقینی ردِعمل کو قابو میں رکھنا ہوگا۔ اور اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوئی اور ترکیب سوچنی ہوگی۔

اسے احساس ہوا کہ اور کچھ نہیں تو زادِ سفر کے لیے اسے ایک اور خواب مل گیا ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے ڈائری لکھنے کا خیال آ گیا تھا۔ ڈائری کا موضوع تو پہلے بھی اوتار سنگھ ہی تھا۔ مگر تب وہ قصہ پارینہ تھا' اور اب ایک داستانِ تازہ!

❁ ❁ ❁

نور بانو اور زرینہ بکریوں کے شیڈ میں تھیں۔ مینو کی ناز برداریاں ہو رہی تھیں۔ اس کے ناشتے کا آخری آئیٹم شروع ہو رہا تھا' جو اسے بہت پسند تھا۔ نور بانو نے ہتھیلی پر بادام کی گری رکھ کر اس کی طرف بڑھائی۔

مینو بے تابی سے بادام کی طرف تھوتھنی لایا۔ اس کی گرم سانسیں نور بانو کی ہتھیلی کو چھونے لگیں۔ مگر اسی لمحے ایک عجیب بات رُونما ہوئی۔ بادام سے منہ اٹھا کر مینو نے سر اٹھایا اور زور زور سے جیسے کچھ سونگھنے لگا۔

''ارے...... اسے کیا ہوا'' زرینہ نے بے ساختہ کہا۔

نور بانو بھی حیران تھی۔ ''لو مینو...... یہ کھاؤ نا۔''

مگر مینو کا ردِعمل اس بار عجیب تر تھا۔ وہ پلٹا اور اندھا دھند بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک لمحے میں وہ شیڈ سے باہر تھا' اور پوری رفتار سے ایک طرف دوڑا جا رہا تھا۔

زرینہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے نور بانو کو دیکھا۔ ''اسے کیا ہو گیا؟''

نور بانو کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ چہرہ تمتما اٹھا۔ ''شاید میں سمجھ گئی ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

نور بانو کے تاثرات کی وہ تبدیلی بھی زرینہ کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اسے اچانک کیا ہو گیا ہے۔ مگر اس نے یہ بات پوچھی نہیں۔ ''مجھے بھی بتائیں۔'' اس نے کہا۔

''ہو سکتا ہے' میرا اندازہ غلط ہو۔ لیکن...... لیکن میرا خیال ہے کہ وہ واپس آ گئے ہیں۔ مینو اس طرح سب کچھ چھوڑ کر کسی کے لیے بھاگ ہی نہیں سکتا۔''

ایک لمحے تو زرینہ کچھ بھی نہیں سمجھی۔ پھر اچانک بات سمجھ میں آ گئی۔ لفظ 'وہ' اس پر روشن ہو گیا۔

''مگر اس کی بے وفائی تو دیکھو۔ اتنے عرصے ہم اس کی ناز برداری کرتے رہے' اور یہ بھی ایسا ہتا رہا جیسے دنیا میں ہم سے زیادہ کسی کو چاہتا ہی نہیں۔ لیکن اب وہ آگئے تو تُو کون اور میں کون۔''

نور بانو کے لفظوں میں تو شکایت تھی' لیکن لہجے میں خوشی اور فخر۔ زرینہ کو ہنسی آگئی۔ وہ بہت تیزی سے سوچنے اور فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس وقت وہاں رکنا کباب میں ہڈی بننے کے مترادف تھا۔ نور بانو کو بھائی سے بات کرنے کا موقع دینا بہت ضروری تھا۔ یہ ضروری تھا کہ سب سے پہلے وہی بھائی سے ملے۔

''میں جاتی ہوں اماں کو خوش خبری سنانے۔'' اس نے کہا اور نور بانو کے جواب کا انتظار کیے بغیر بھاگ کھڑی ہوئی۔

نور بانو کھڑی ہو گئی' اور چند لمحے سوچتی رہی۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟ اس کا حق تھا کہ وہ عبدالحق کا خیر مقدم کرے۔ یہی نہیں' اسے اس سے بڑی سنگین شکایت تھی۔

شیڈ کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے سوچا کہ ضروری تو نہیں کہ اس کا اندازہ درست ہو' اور عبدالحق ہی آئے ہوں کوئی اور بات بھی تو ہو سکتی ہے۔ وہ خواہ مخواہ آس لگا بیٹھی۔

مگر شیڈ سے نکلتے ہوئے خوابوں کی تعبیر اس کے سامنے تھی!

تھوڑے ہی فاصلے پر عبدالحق تھا۔ اس کے کندھے سے ایک بیگ لٹکا ہوا تھا' اور دونوں ہاتھوں میں دو سوٹ کیس تھے۔ اور مینو نے اس کا قدم بڑھانا دوبھر کر رکھا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اس کے جسم سے سر رگڑنا چاہ رہا تھا۔ مگر اسے جگہ نہیں مل رہی تھی' کیونکہ دونوں جانب سوٹ کیس تھے۔ اور سامنے آ کر ٹانگوں سے سر رگڑنے کا شوق پورا کرتے ہوئے وہ عبدالحق کے بڑھنے میں مزاحمت کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ زور زور سے میں میں کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں شکایت تھی۔ کبھی کبھی تو آواز میں رونے کا تاثر آ جاتا تھا۔

نور بانو تیزی سے اس طرف لپکی۔ مینو کی حرکتوں میں الجھے ہوئے عبدالحق نے ابھی اسے دیکھا نہیں تھا۔

''رک جائیے...... نیچے رکھ دیجئے یہ سامان۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔

عبدالحق ٹھٹک گیا۔ اس نے رک کر اسے دیکھا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ وہ اسے براہِ راست نظر بھر کر دیکھ رہا تھا۔ اور چاہنے کے باوجود وہ نظر نہیں ہٹا سکا۔ پھر اسے یقین نہیں تھا کہ یہ وہی ہے۔

بالآخر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ طلسم ٹوٹا۔ لیکن مینو کی میں میں اس دوران بھی جاری تھی۔ ''آپ...... آپ منجھلی بی بی ہیں نا؟''

نور بانو نے ملامتی نظروں سے اسے دیکھا اور تیز لہجے میں بولی۔ ''میں نور بانو ہوں اور کئی برس سے آپ کے گھر میں رہ رہی ہوں۔ اب اتنے دن گھر سے دور رہنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ

[...]ر کے لوگوں کو پہچان نہ سکیں۔''

عبدالحق سن ہو کر رہ گیا۔ وہ اسے باقاعدہ ڈانٹ رہی تھی۔ مگر اس ڈانٹ میں بڑی اپنائیت [...] اور اس نے اسے اتنا بولتے بھی کبھی نہیں سنا تھا۔ ''جی...... وہ میں...... دراصل مینو......'' وہ [...]طرح گڑبڑا گیا۔

مینو کو اب موقع مل گیا تھا اور وہ اس کی ٹانگوں سے سر رگڑ رہا تھا۔

نور بانو نے مینو کا کان پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ ''ہٹ جاؤ مینو۔''

مگر مینو نے ایک جھٹکے میں خود کو چھڑا لیا۔ اب وہ کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

نور بانو کھسیا گئی۔ اب تو یہ اسے پہچان ہی نہیں رہا تھا۔ عبدالحق ہاتھ سے مینو کو سہلا رہا تھا۔

''اور یہ سامان اٹھا کر آپ پیدل چلے آرہے ہیں۔'' نور بانو نے اسے پھر ڈانٹا۔

عبدالحق نے نظریں اٹھا کر اسے ایک پل دیکھا۔ مگر فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔ ارے...... یہ تو [...]ھسہ ور ہو گئی ہیں۔ بات بات پر ڈانٹ رہی ہیں۔ شاید اندر کی جھنجلاہٹ کی وجہ سے...... اور [...] میں ناکامی کی خبر سناؤں گا تو...... تو کیا ہوگا۔ شاید کھا ہی جائیں گی مجھے......

''بتائیے نا پیدل آنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''میں بیل گاڑی میں تھا۔ مینو کی وجہ سے اترنا پڑا۔ یہ پاگل ہو رہا تھا۔ گاڑی کے پیچھے بھی [...]لگتا تھا۔'' عبدالحق نے وضاحت پیش کی۔ نور بانو نے غصے سے مینو کو دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔ وہ [...]خاطر میں لا ہی نہیں رہا تھا۔ اور توہین کرانے کا کیا فائدہ۔ محبوب کی جدائی میں ایک دوسرے کی غم [...]ہاری کرنے والے آخر تھے تو رقیب ہی۔ محبوب کے واپس آنے پر تو رقابت ہی ہو گی۔

''جانتے ہیں میں یہاں کیوں آئی ہوں؟''

عبدالحق اس پر تو حیران ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''مجھے آپ سے لڑنا ہے۔ آپ بہت برے ہیں۔''

عبدالحق کا جھکا ہوا سر اور جھک گیا۔ ''جی...... مجھے معلوم ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''آپ وجہ نہیں پوچھیں گے۔ پتا ہے' آپ کے جانے کے بعد اماں مجھ سے کتنا خفا رہیں۔ [...]بھی نہیں بتاتی تھیں۔ پھر ایک دن پتا چلا کہ آپ نے لاہور جانے سے پہلے کہا تھا کہ آپ میری [...]ے جا رہے ہیں۔ اور جب تک چچا جان نہیں مل جاتے' واپس نہیں آئیں گے۔ اماں سوچتی تھی [...]ہ چچا جان کا ملنا ممکن ہی نہیں' اور آپ وعدہ کے مطابق واپس نہیں آئیں گے۔ کتنا شرمندہ کرایا [...]پ نے مجھے۔''

''مگر یہ تو سچ ہے۔ میں آپ ہی کے لیے لاہور گیا تھا۔ میں تو خود شرمندہ تھا اور ہوں......''

''لیکن میں نے تو آپ سے نہیں کہا تھا کہ لاہور جا کر چچا جان کو ڈھونڈیں۔''

عبدالحق کو وہ منظر اچھی طرح یاد تھا۔ ”مجھے یاد ہے اس دن آپ نے مجھے روک کر کہا تھا کہ آپ کو ایک بہت اہم اور ضروری بات کرنی ہے مجھ سے اور آپ نے کہا تھا کہ یہ بات تو آپ کو بہت پہلے کرنی چاہیے تھی لیکن میری مصروفیت کی وجہ سے نہیں کرسکیں۔ کہا تھا نا آپ نے۔ اور آپ مجھے یہی یاد دلانا چاہ رہی تھیں نا کہ آپ کے چچا جان کو تلاش کر کے آپ کو ان کے سپرد کرنا میری ذمے داری ہے۔ میں تو پہلے ہی اپنی کوتاہی اور وعدہ خلافی پر شرمندہ ہو رہا تھا۔ تو میں چلا گیا.....“

نور بانو بھی وہ دن کیسے بھول سکتی تھی۔ عبدالحق نے اسے بات پوری کرنے ہی نہیں دی۔ بس اس نے کہا...... اب میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کروں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں اب آپ کا کام کر کے ہی واپس آؤں گا۔ تو یہ تھا وہ کام۔ جبکہ وہ اس سے اس کی باپ کی کتابوں اور ڈائری کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی، اسے سونپ دینا چاہتی تھی۔

”آپ کیسے آدمی ہیں اپنے ہی گمان میں رہتے ہیں۔ کسی کی کسی بات سے جو نتیجہ چاہیں، اخذ کرلیں۔“ وہ اس پر برس پڑی۔ ”میں اس روز آپ سے یہ بات کر ہی نہیں رہی تھی۔ مجھے تو چچا جان یاد بھی نہیں تھے۔ میں انہیں تلاش کرنے کا کیوں کہتی آپ سے۔“

”آپ ہمارے پاس خود کو محفوظ نہیں سمجھتی تھیں......“

”وہ وہاں کی بات تھی...... دہلی کی۔ یہاں آپ نے کب مجھے ناخوش دیکھا، کب سہما ہوا دیکھا۔ مگر آپ تو آنکھیں بند کر کے اپنے گمان میں جیتے ہیں۔ ورنہ دیکھ لیتے کہ میں یہاں کتنی خوش ہوں......“

عبدالحق کی آنکھیں پھیل گئیں۔ واقعی یہ تو سچ تھا۔ نور بانو تو یہاں گھل مل گئی تھی۔ ارے...... وہ توتہ خانے میں بھی ان کے ساتھ گئی تھی۔ یہ سوچ کر اس کے دل کا بوجھ کم ہونے لگا۔ اب نور بانو کو اتنا صدمہ تو نہیں ہوگا چچا کے نہ ملنے کا۔

اُدھر نور بانو اپنی کہے جا رہی تھی۔ ”آپ کچھ دیکھتے ہی نہیں۔ جب تک کوئی بات منہ سے نہ کہی جائے، سمجھیں گے ہی نہیں۔ بلکہ مجھے تو شک ہے کہ سننے کے بعد بھی نہیں سمجھیں گے۔ غور سے سن لیں کہ میں......“

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا اس نے یہ بات سنی نہیں تھی۔

”...... میں یہاں بہت خوش ہوں......“

اس وقت زبیر کی پکار سنائی دی۔ ”ارے صاحب...... آ گئے۔“ وہ اس کی طرف دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔

”...... اور یہاں سے کہیں جانا نہیں چاہتی۔“ نور بانو نے اپنی بات مکمل کی۔

مگر عبدالحق نے نہیں سنا۔ وہ زبیر کی طرف متوجہ تھا، جو ان تک آ پہنچا تھا۔

”لائیے...... سامان مجھے دیجیے۔“

بحث سے بچنے کے لیے عبدالحق نے جلدی سے دونوں سوٹ کیس اسے دے دیے۔ اب ے مینو سے نمٹنا تھا۔

نور بانو مطمئن ہوگئی۔ اب اس سے بڑھ کر اظہار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اس نے قدم ہلکے تھے اور گھر میں جانے کی بجائے شیڈ میں چلی گئی۔ اپنی جرأت پر اسے خود بھی حیرت ہو رہی تھی۔ خیال بھی تھا کہ زبیر نے اسے عبدالحق سے باتیں کرتے دیکھ لیا ہے۔ اب وہ دیر تک گھر میں ،جود لوگوں کا سامنا نہیں کرسکتی تھی۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ عبدالحق نے اصل بات اب بھی نہیں سنی!

❁ ❁ ❁

عبدالحق کی واپسی پر اپنی بے پناہ خوشی خود حمیدہ کے لیے بھی حیران کن تھی! نہ تو اس نے عبدالحق کو جانے سے روکا تھا اور نہ ہی اس کی غیر موجودگی کے دن شمار کیے تھے۔ وہ اسے خاص طور پر یاد بھی نہیں کرسکتی تھی۔ یہ الگ بات کہ وہ ہر وقت اسے یاد کرتا رہتا تھا۔ کچھ یہ تھا کہ اللہ نے اسے بنایا ہی ایسا تھا۔ صبر کی نعمت اسے کثیر ملی تھی۔ اور کیوں نہ ملتی۔ ب اللہ کسی کو آزمائش سے دوچار کرتا ہے تو اس سے پہلے ہی اس کے مطابق اسے صبر و برداشت عطا کر دیتا ہے۔ لال آندھی کے بعد وہ جس دور سے گزری تھی، اس نے اس کے ایمان کو پختہ کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس پر اللہ کی عنایت ہے۔ ورنہ کوئی اتنا اکیلا اس طرح جی نہیں سکتا۔ اس نے تو اپنی اندھی آنکھوں سے معجزے دیکھتے تھے۔ عبدالحق کا اس کے پاس واپس آنا تو سب سے بڑا معجزہ تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ تڑپنے اور واویلا کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ اگر کسی کو ملنا ہے تو وہ ضرور ملے گا۔ اور اگر نہیں ملنا تو کسی طرح بھی نہیں ملے گا۔

اور اس سے پہلے کی زندگی میں بھی کیا تھا۔ اس نے تو ہر موسم سے بڑھ کر ہجر کا موسم ہی دیکھا تھا۔ بیٹے کی تعلیم کے لیے دہلی گئے تھے۔ سال بھر بعد چھٹیوں میں گھر واپس آئے تھے...... اور وہ بھی پھر چلے جانے کے لیے۔ اور پھر وصال دین چلا گیا تھا...... وہ بھی واپس نہ آنے کے لیے۔

عبدالحق اس کے سامنے آیا تو بے ساختہ اسے لپٹا لیا۔ جی تو چاہتا تھا کہ کسی طرح اسے دل میں اتار کر چھپا لے۔ کہیں جانے نہ دے۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اسے علیحدہ کر دیا۔ ”اب تو واپس آ گیا ہے نا پتر؟“ اس نے اس سے پوچھا۔

عبدالحق اتنی جلدی دور کیے جانے پر زخمی ہوا تھا اور حیران بھی۔ ”جی اماں۔“

”اب تو کہیں نہیں جانا ہے نا؟“

”ہو سکتا ہے، جانا ہو اماں۔ لیکن تمہارے بغیر نہیں۔“

”بس تو پھر کیا ہے۔ وقت اپنا ہی ہے نا۔“ حمیدہ نے بے فکری سے کہا۔ ”تو جا...... نہا دھو کر

کپڑے بدل۔ آرام سے مردانے میں بیٹھ۔ سب لوگ تیرا انتظار کرتے رہے ہیں۔ تجھ سے ملنے آئیں گے۔ کچھ تھکن بھی اتر جائے گی۔"

"لیکن اماں! ابھی تو میں آپ کی گود میں لیٹنا چاہتا ہوں۔ اتنے دن کے بعد تو ملی ہیں آپ......"

"اس کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ رات کو سکون سے آنا میرے پاس۔ مجھے بھی باتیں کرنی ہیں تجھ سے۔ مگر پہلے دوسرں کے حق ادا کر دے۔ تُو صرف میرا ہی تو نہیں' سبھی کا ہے نا۔"

عبدالحق کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن اماں کی بات ٹالنا بھی ممکن نہیں تھا۔

اماں کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس سے ملنے کے لیے لوگ آئیں گے...... کتنے لوگ۔ اس کا واپس آنا ایسی کون سی خاص بات ہے۔ اسے واپس تو آنا ہی تھا۔

وہ نہا دھو کر' تازہ دم ہو کر نکلا تو زبیر موجود تھا۔ "صاحب' اب آپ لیٹ جائیں تھوڑی دیر۔ آرام کر لیں۔"

"میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا ہوں زبیر بھائی۔"

مگر اس وقت اماں کی بات سچی ہو گئی۔ چاچا رحیم بخش اس سے ملنے آئے تھے۔ زبیر اسے بتا چکا تھا کہ رحیم داد کو سرپنچ بنا دیا گیا ہے۔ وہ اس سے، ملنے مردانے میں چلا گیا۔ اس کے بعد مغرب تک اسے وہاں سے نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ مردانہ پورے دن بھرا رہا۔

اس سے پہلے عبدالحق کو اندازہ ضرور تھا کہ لوگ اس سے محبت کرتے ہیں لیکن جو محبت اس کے سامنے آئی' وہ اس کے تصور سے بھی بہت بڑھ کر تھی...... شاید ہی کوئی' شخص ایسا ہو' جو اس سے ملنے نہ آیا ہو۔ اور کوئی خالی ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اور سب ہی اسے صاحب کہہ رہے تھے...... کیا چھوٹا کیا بڑا۔ اسے زبیر پر غصے آنے لگا۔

ملنے آنے والوں میں ڈاکٹر واسطی واحد آدمی تھے' جنہوں نے صاحب کہنے کی بجائے عبدالحق صاحب کہا تھا۔

عبدالحق کو اطمینان ہو گیا۔ زبیر نے اس کے مشورے پر پوری طرح عمل کیا تھا' اور علاقے کے معاملات اس کے بتاجی کے انداز سے سنبھالے تھے۔ تبھی تو لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ لوگوں کے نزدیک اس کے بعد سب سے معزز زبیر ہی ہے۔ یہ واقعی زبیر کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ زبیر پہلے کے مقابلے میں بہت پُر اعتماد نظر آ رہا تھا۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے ہی اس کا مسئلہ حل کیا۔ "ارے بھئی' کیسی محبت کرتے ہو تم لوگ اپنے صاحب سے۔" انہوں نے کمرے میں موجود لوگوں سے کہا۔ "سفر کی تکان اتارنے کا موقع بھی نہیں دے رہے ہو انہیں۔ ایسے موقع پر تو بس پانچ منٹ بیٹھ کر اٹھ جاتے ہیں لوگ۔ اور ہاں' کل

صاحب کو پنچایت میں بلا لو نا۔"

اس کے نتیجے میں لوگ رخصت ہونے لگے۔ پھر ڈاکٹر صاحب بھی اٹھے۔ "یہ تو میں رسماً آیا تھا عبدالحق صاحب۔" انہوں نے کہا۔ "لیکن آپ سے ایک ضرورت بھی آ پڑی ہے مجھے۔ دو تین دن میں حاضر ہوں گا آپ کے پاس سوالی بن کر۔"

عبدالحق تو تڑپ گیا۔ "تکلف کیسا ڈاکٹر صاحب۔ ابھی حکم کریں نا۔"

"نہیں عبدالحق صاحب۔ یہ تکلف کی بات نہیں' آداب کی ہے۔ ضرورت مند بن کر آؤں گا تو ضرورت کی بات کروں گا۔"

عبدالحق کا ذہن الجھنے لگا لیکن ڈاکٹر صاحب نے مزید بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ادھر نماز کا وقت بھی ہو گیا تھا۔

❁ ❁ ❁

نور بانو شیڈ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکی۔ حالانکہ مینو کی بے وفائی کے بعد وہ اپنی بکریوں کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ مینو کی خاطر اس نے اپنی بکریوں سے بے وفائی کی تھی۔ اب وہ اس کی تلافی کرنا چاہتی تھی۔

لیکن شیڈ میں ایک بھولی بسری یاد نے اسے تڑپا دیا۔

یہ اُس وقت کی بات ہے' جب اوتار سنگھ کے لیے باجی کی محبت اس پر پوری طرح کھل گئی تھی۔ بلکہ ایک دن باجی نے بڑے فخر سے اسے لے جا کر دکھایا تھا کہ چھوٹا ٹھاکر کسی سے عربی پڑھ رہا ہے۔ اور پھر پڑھانے والے نے یٰسین شریف کی تلاوت بھی کی تھی۔

یہ اس کے کچھ عرصہ بعد کی بات ہے کہ ایک دن اب کی رابعہ اور اس وقت کی رنجنا اماں کے پاس ایک فرمائش لے کر آئی تھی...... کھانا پکا کر بھیجنے کی فرمائش۔ چھوٹے ٹھاکر کا کوئی مسلمان دوست آ رہا تھا' وہ اس کے لیے کھانا پکوانا چاہ رہا تھا۔ جس وقت وہ بات ہوئی' وہ اماں کے پاس ہی تھی۔ اماں نے تو بڑی خوشی سے وعدہ کر لیا تھا۔ بلکہ انہوں نے اس سے ہاتھ بٹانے کو بھی کہا تھا۔ مگر اس نے روایتی نخوت کے ساتھ انکار کر دیا تھا۔ اماں کو بھی اس سے امید نہیں تھی۔

مگر اگلی صبح اسے باجی کو باورچی خانے میں دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔ باجی کا معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد کچھ دیر تلاوت کر کے وہ آرام ضرور کرتی تھیں اور کھانا پکانے میں بالکل دلچسپی تھی ہی نہیں۔ اماں کے اصرار کے باوجود وہ پکانے سے جی چراتی تھیں۔ مگر اس وقت وہ نہ صرف باورچی خانے میں موجود تھیں' بلکہ اصرار کر رہی تھیں کہ کھانا وہی پکائیں گی۔ اماں نے کہا بھی آج زیادہ چیزیں ہیں' پھر کسی دن پکا لینا۔ لیکن باجی نے کہا یہ اور بھی اچھا ہے' ایک ہی دن میں وہ اتنا کچھ سیکھ لیں گی۔

نور بانو کو حیرت ہوئی تھی۔ جس وقت رنجنا فرمائش لے کر آئی تھی باجی بہ ظاہر تو کہیں قریب نہیں تھی لیکن یہ طے تھا کہ انہوں نے یہ بات سن لی تھی۔ اسی لیے وہ کھانا پکانے میں گھس رہی تھیں۔

نور بانو کو بہت غصہ آیا۔ جی تو چاہا کہ انہیں باتیں سنائے لیکن بدنیتی کے تحت خاموش رہی۔ اس سے بہتر سزا اور کیا ہوتی کہ چھوٹے ٹھاکر اور اس کے دوست کو باجی کا پکایا ہوا تجرباتی کھانا نصیب ہوتا۔ سو وہ اس میں خوش ہو گی

لیکن جب اس نے کھانا کھایا تو حیران بھی ہوئی اور مایوس بھی۔ باجی نے ہر چیز بہت لذیذ بنائی تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تا کہ وہ کسی کی پہلی بار پکائی ہوئی چیز ہو سکتی ہے۔ شاید وہ محبت کا کمال تھا۔

پھر جب رنجنا نے نیچے آ کر بتایا چھوٹے ٹھاکر کو کھانا اتنا اچھا لگا کہ انہوں نے رات بھی وہی کچھ کھایا...... تازہ کھانے کی بجائے...... اور انہوں نے بہت شکریہ ادا کیا ہے تو اسے اور اذیت ہوئی۔ اس لمحے باجی اسے بہت بری لگی تھیں۔

اور اب اسے یہ سوچ کر حیرت ہو رہی تھی کہ یہاں آنے کے بعد آج تک وہ چیزیں پکانے کا خیال کیوں نہیں آیا' جبکہ اسے معلوم تھا کہ عبدالحق کو وہ کھانا اچھا لگا تھا۔

اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ وہ شروع ہی سے ایسی ٹیڑھی ہے۔ ساری خرابی یہ ہے کہ اس کے لیے کائنات کا مرکز محض اپنی ذات ہے۔ وہ صرف اپنے لیے سوچتی ہے۔ اپنی خوشی میں خوش اور اپنے دکھ میں دکھی۔ کسی اور کی خوشی اور دکھ کا خیال ہی اسے نہیں آتا۔ اماں ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ ایسا آدمی کیسے خوش رہ سکتا ہے۔ اسے تو خوشی ملے گی بھی تو شاید اسے گنوا دے گی۔

لیکن نہیں...... اب وہ خود کو بدل بھی سکتی ہے۔ اور وقت آ گیا ہے کہ وہ خود کو بدل لے۔ اب نہیں بدلا تو شاید آئندہ موقع نہیں ملے گا۔ اس خیال نے اسے ڈرا دیا۔ لیکن پھر اسے اماں سے کیا ہوا اپنا وعدہ یاد آیا...... اس نے کہا تھا...... میرے اندر کی ساری خرابیاں میری بے اعتمادی اور بے یقینی کی وجہ سے ہیں۔ اور اس کا سبب یہ خوف ہے کہ وہ مجھے کبھی نہیں ملیں گے۔ اس لیے کہ وہ بہت اچھے ہیں۔ اور میں بہت بری ہوں۔ میں ان کے قابل ہوں ہی نہیں۔ لیکن اللہ کی مہربانی سے وہ مجھے مل جائیں گے تو میں بالکل بدل جاؤں گی۔

حیرت ہے...... یہ میں نے کہا۔ اس نے سوچا۔ میں اتنا کھل کر بھی بات کر سکتی ہوں۔ اس کا تو مطلب ہے کہ میں بدل رہی ہوں۔ تبدیلی کا عمل شروع ہو چکا ہے۔

اس لمحے اس نے خود سے ایک عہد کر لیا...... وہ اب اپنے بارے میں نہیں' دوسروں کے...... اور خاص طور پر عبدالحق کے بارے میں سوچا کرے گی۔ وہ دوسروں کی خوشیوں اور ان کے دکھوں کے بارے میں سوچا کرے گی۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

وہ جلدی سے اٹھی اور شیڈ سے نکل آئی۔ وقت ضائع کرنے کی بالکل گنجائش نہیں تھی۔ اسے

رات کے کھانے کی...... خاص الخاص کھانے کے اہتمام کی فکر کرنی تھی۔ اور وہ سب کچھ خود ہی کرے گی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق کو اس بات پر حیرت تھی کہ مینو تقریباً تمام وقت بیٹھک میں اس کے پاس بیٹھا رہا تھا' لیکن اس نے وہاں کوئی گندگی نہیں کی تھی۔ وہ اس کے قدموں میں بیٹھا رہا تھا۔ کبھی اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے وہ اس کا پاؤں چاٹ لیتا۔ اور اس نے جب بھی سر جھکا کر دیکھا تو مینو کو اپنی ہی طرف دیکھتے پایا۔ کیا جانور اتنے سمجھدار بھی ہوتے ہیں؟

سب لوگوں کے جانے کے بعد عبدالحق اٹھا۔ مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ ''چلو مینو...... گھر چلیں'' اس نے مینو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

مینو نے مَیں مَیں کر کے باقاعدہ جواب دیا۔

وہ شیڈ کی طرف چل دیا۔ مینو اس کے پیچھے نہیں' بلکہ ساتھ ساتھ تھا۔ کبھی تو وہ اس سے آگے بھی نکل جاتا' جیسے جانتا ہو کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ مگر وہ فوراً پلٹ بھی آتا تھا۔

شیڈ میں پہنچ کر عبدالحق اسے باندھنے لگا تو مینو نے باقاعدہ مزاحمت کی

''بس...... کھلے رہنے کا وقت ختم۔ اب تمہیں سونا ہے۔'' عبدالحق نے محبت بھرے لہجے میں ڈانٹا۔

مینو نے سر جھکا لیا اور بہت کمزور سی آواز میں ممیانے لگا۔

اس کی آواز کی کمزوری سے عبدالحق کو خیال آیا اور اس نے مینو کے پچکے ہوئے پیٹ کو دیکھا۔ اپنی غفلت اور بے پروائی پر اسے شدید غصہ آیا۔ معصوم جانور تمام وقت اس کے قدموں میں بیٹھا رہا' اور اس نے سوچا تک نہیں کہ وہ بھوکا ہو گا۔ شاید صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا۔

اس نے شیڈ کا جائزہ لیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا' جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ کترے کی مشین کے پاس چارے کا ڈھیر تھا۔ وہیں بادام اور اخروٹ کی تھیلیاں بھی موجود تھیں۔

اسی وقت مغرب کی اذان شروع ہو گئی۔ عبدالحق جلدی سے چارہ لے کر آیا' کھلی ملائی اور چارے کا برتن مینو کے سامنے کر دیا۔

لیکن مینو نے منہ پھیر لیا۔

''اوہو' میرے ہاتھ سے کھانا ہے۔ لیکن ابھی تو یہ ممکن نہیں۔ کھا لو'' عبدالحق نے زبردستی اس کا منہ برتن کی طرف دھکیلا۔ مگر مینو کھانے پر آمادہ نہیں تھا۔

''ابھی تم خود کھا لو۔ نماز پڑھ آؤں۔ پھر تمہیں اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''میرے آنے تک یہ سب کھا لینا۔'' اس نے پھر مینو کو ڈانٹا لیکن اس بار مینو کی مَیں مَیں میں واضح انکار تھا۔

اس وقت کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ عبدالحق شیڈ سے نکلا اور مسجد کی طرف چل دیا۔

لیکن نماز کے دوران بھی اسے یہی خیال ستا رہا تھا کہ مینو نے کچھ نہیں کھایا ہوگا۔

نماز کے بعد وہ مولوی مہر علی سے ملا۔ ”تم کب آئے پتر؟“ انہوں نے پوچھا۔

”آج ہی آیا ہوں حضرت۔“

”مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ ورنہ میں تم سے ملنے ضرور آتا۔“

”مگر مجھے اچھا نہیں لگتا۔ آپ کبھی ایسا نہ کیجئے گا۔ آپ سے ملنے کے لیے آنا میرا فرض ہے۔“

”اور سناؤ لاہور کیسا رہا۔ تمہارا کام ہوا۔“

”ہوا بھی اور نہیں بھی ہوا۔ میں نے وہاں بہت کچھ دیکھا مولوی صاحب۔ بہت الجھنیں لے کر آیا ہوں میں وہاں سے۔ آپ سے بہت باتیں کرنی ہیں مجھے۔ ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔“

مولوی صاحب نے پُرتشویش نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تو پتر میں حاضر ہوں۔ ہلکا کر دو دل کا بوجھ۔“

”اس وقت نہیں مولوی صاحب۔“ عبدالحق نے معذرت طلب لہجے میں کہا۔ ”فرصت میں آؤں گا آپ کے پاس۔“ پھر اس نے انہیں مینو کے بارے میں بتایا۔

مولوی صاحب ہنسنے لگے۔ ”اب سمجھ میں آیا کیسی ہوتی ہے محبت۔ جاؤ پتر جاؤ‘ صبح بات کریں گے۔“

عبدالحق بہت تیز قدموں سے شیڈ کی طرف گیا۔ اس کا بس چلتا تو اُڑ کر وہاں پہنچ جاتا۔

شیڈ کا منظر اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ مینو نے چارے کو منہ بھی نہیں لگایا تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ سنی تو سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ ”بہت ضدی ہو یار۔ ہاتھ سے ہی کھاؤ گے۔“

عبدالحق نے ہتھیلی پر چارہ ڈال کر مینو کی طرف بڑھایا۔ مینو نے ایک گہری سانس کی پھونک سے اسے اُڑا دیا۔ وہ گویا اس کا اظہار ناراضگی تھا۔

”اوہو...... خفا ہو۔ تو پہلے منانا پڑے گا۔“ عبدالحق نے کہا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ چند لمحوں میں اسے احساس ہوا کہ مینو کے جسم کا تناؤ کچھ کم ہو گیا ہے۔ اس نے مینو کی تھوتھنی کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ ”اب مان بھی جاؤ یار۔“

اور مینو اس کا ہاتھ چاٹنے لگا۔ وہ گویا قبولیت کا اظہار تھا۔

اب عبدالحق اسے کھلا رہا تھا اور مینو کھا رہا تھا۔ ”یہ بتاؤ‘ اتنے دن تمہارا گزارا کیسے ہوا میرے بغیر؟“ پھر اسے یاد آیا‘ زبیر نے بتایا تھا کہ مینو نجانے کیسے منجھلی بی بی سے مانوس ہو گیا تھا۔ اور سارے لاڈ اسی سے کرنے لگا تھا۔

”ہوں...... تو نور بی بی سے دوستی کر لی تھی۔ بڑے خوش نصیب ہو یار۔“

مینو نے جیسے مَیں مَیں کر کے تائید کی۔

”تو اب میرے ہاتھ سے کھانے میں کیا مزہ آ رہا ہوگا تمہیں۔“

جواب میں مینو نے اس کے سینے پر ہلکی سی ٹکر رسید کر دی۔

”اچھا چلو...... اب بادام اور اخروٹ بھی کھا لو۔“

❁ ❁ ❁

”ارے‘ کھانے کا وقت ہو گیا۔ یہ عبدالحق نہیں آیا ابھی تک۔“ حمیدہ نے کہا۔ وہ بےقرار ہو کر کمرے سے نکل آئی تھی۔ ”رابعہ...... زبیر کو مسجد بھیج۔ وہ مولوی صاحب کے پاس بیٹھا ہوگا۔“

”نہیں اماں۔ وہ بتا رہے تھے کہ صاحب نماز پڑھتے ہی مسجد سے چلے گئے تھے۔“ رابعہ نے کہا۔

باورچی خانے میں موجود نور بانو بھی سن رہی تھی۔ یہ اس کے لیے خلافِ توقع بھی نہیں تھا۔ عبدالحق جیسا کوئی اتنے عرصے کے بعد واپس آئے تو ایسا ہی کچھ ہوتا ہے۔ سہ پہر میں اس سے ملنے والوں کا سلسلہ وہ دیکھ چکی تھی۔ اسی لیے اس نے پلاؤ کو ٹھنڈا ہونے سے بچانے کے لیے یخنی تیار کر کے رکھ لی تھی مگر پلاؤ چڑھایا نہیں تھا۔ ذرا سی دیر ہو جانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ مگر پلاؤ ٹھنڈا ہو کے بے مزہ نہ ہو۔

زرینہ باورچی خانے میں ہی تھی۔ اس نے کیا تو کچھ بھی نہیں تھا لیکن نور بانو کو کھانے پکاتے ہوئے بڑے شوق سے دیکھ رہی تھی۔ حمیدہ اور رابعہ کی گفتگو سن کر جو اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ وہ نور بانو نے بھی دیکھ لی تھی۔

پھر زرینہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

نور بانو کے دل کو کچھ ہو گیا۔ چند لمحے تو وہ سوچتی رہی۔ پھر باورچی خانے سے نکل آئی۔ اپنے کمرے سے اس نے چادر لی اور خاموشی سے گھر سے نکل آئی۔ کچھ فاصلے پر زرینہ اسے جاتی دکھائی دی۔ اس کا رخ شیڈ کی طرف تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے چل دی۔

❁ ❁ ❁

وہ دونوں...... ایک انسان اور دوسرا جانور...... ایک دوسرے سے یوں ٹوٹ کر ملے تھے‘ جیسے برسوں کے بچھڑے محبت کرنے والے ملتے ہیں۔ مینو کا پیٹ بھر چکا تھا۔ مگر وہ عبدالحق کا ہاتھ چاٹے جا رہا تھا۔ عبدالحق جب اٹھنے لگتا تو وہ زوردار آواز میں مَیں مَیں کرنے لگتا۔ اور اس کے بیٹھتے ہی چپ ہو جاتا۔ مطلب صاف تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ عبدالحق ابھی اس کے پاس سے اٹھے۔

عبدالحق کو بھوک لگ رہی تھی۔ مگر وہ وہاں بیٹھا رہا۔ یہ مینو کا اس پر حق تھا۔ اس نے پورے دن مینو کو بھوکا رکھا تھا...... اس کی بھوک کی فکر نہیں کی تھی‘ تو اب اسے خود بھی ہنسی خوشی بھوک

برداشت کرنی چاہیے تھی۔

اسی عالم میں جانے کتنی دیر ہوگئی۔ مینواب اونگھنے لگا تھا۔ دروازے کے طرف سے قدموں کی چاپ سنائی دی تو عبدالحق نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا شیڈ کے دروازے میں ایک ہیولا سا دکھائی دے رہا تھا۔ ”کون؟“ اس نے پکارا۔

”میں ہوں بھائی۔“

پہلے تو عبدالحق کی سمجھ میں ہی کچھ نہیں آیا۔ یہ کون لڑکی ہے جو اسے اتنی اپنائیت سے بھائی کہہ رہی ہے۔ وہ الجھتا رہا۔ پھر جب بات سمجھ میں آئی تو وہ شرمندگی سے پانی پانی ہوگیا۔ یہ مینو والی شرمندگی سے بھی بڑی تھی۔ ارے...... وہ اس لڑکی کو بھول گیا' جیسے اس نے پوری ذمہ داری کے ساتھ یہاں بھیجا تھا۔ ارے اس نے تو یہاں آکر پوچھا بھی نہیں......

”آؤ...... اندر آجاؤ زرینہ۔“ بالآخر اس نے اسے پکارا۔ لہجے میں شرمندگی تھی۔

زرینہ اندر چلی آئی۔ ”بھائی...... وہ میں......“

”میں جانتا ہوں' تمہاری شکایت بجا ہے......“

”نہیں بھائی مجھے کوئی شکایت نہیں۔“ زرینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”شکایت کیسی' یہاں مجھے اتنے سارے لوگ ملے۔ سب مجھ سے محبت کرتے ہیں...... میری عزت کرتے ہیں سب آپ کی وجہ سے پر بھائی' آج مجھے ڈر لگ رہا ہے یہاں۔“

”بھائی کے ہوتے ہوئے ڈر کیسا؟“

”مجھے لگتا ہے' کہ آپ شرمندہ ہو رہے ہیں مجھے بہن بنا کر۔ میں ہوں ہی ایسی۔“

عبدالحق تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”یہ کیسی بات کرتی ہو زرینہ۔ میں رشتے بے سوچے سمجھے نہیں بناتا۔ میں شرمندہ ہوں کہ مجھے تمہارا خیال نہیں رہا۔ مگر ایک تو ملنے کے لیے آنے والوں کی وجہ سے موقع ہی نہیں ملا۔ دوسرے میری تو کبھی کوئی بہن تھی ہی نہیں۔ تو شاید مجھے بھائی ہونے کے آداب نہیں آتے۔ بہن کے لاڈ کرنا نہیں جانتا میں۔ لیکن میں تمہارے لیے جو کچھ لایا ہوں' دیکھو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔“

”میرے لیے تو آپ کا واپس آنا بہت خوشی کی بات ہے بھائی۔“

”اور یہ کبھی نہ سوچنا کہ میں تمہارے اس رشتے پر کبھی شرمندہ ہوں گا۔ اور شرمندگی کی تو کوئی بات ہے ہی نہیں۔ ایسا کبھی سوچا تو میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے بھائی' نہیں سوچوں گی۔“

”[illegible] تم نے یہاں کسی کو بتایا تو نہیں اپنے بارے میں۔“

”کوئی اچھی بات ہوتی تو بتاتی بھائی۔“ زرینہ نے اداسی سے کہا۔

”تم فکر نہ کرو۔ میں سب سنبھال لوں گا۔“

”وہ بھائی اماں' آپ کو کھانے کے لیے بلا رہی ہیں۔“

”اب عشاء کا وقت ہو رہا ہے۔ نماز پڑھ کر ہی آؤں گا۔ تم لوگ کھانا کھالو۔“

باہر کھڑی نور بانو تیزی سے واپسی کے لیے پلٹی۔ وہ دل ہی دل میں خود کو ملامت کر رہی تھی۔ تُو کبھی نہیں سدھرے گی نور بانو۔ یہ کیسا شک' کیسی بے اعتمادی ہے تیرے اندر۔ تُو تو فرشتے پر بھی شک کرنے سے باز نہ آئے......

بس ایک بار یہ میرے ہو جائیں۔ پھر دیکھنا...... اس کے اندر کسی نے چپکے سے کہا۔

مگر اس کے اندر کی شرمندگی کم نہیں ہوسکی۔ بس ایک بات کی خوشی تھی اسے۔ کھانے کا درست وقت معلوم ہوگیا تھا۔ اب اس کا پلاؤ خراب نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ نماز پڑھ کر آئیں گے۔ تو پلاؤ دم پر ہوگا۔

اندر زرینہ کہہ رہی تھی۔ ”نہیں بھائی' اماں کہہ رہی تھیں' آج کھانا سب لوگ ساتھ ہی کھائیں گے۔“

❁ ❁ ❁

وہ پہلا موقع تھا کہ سب نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ ابتدا میں تو نور بانو بہت گھبرائی اور شرمائی، لیکن پھر اس نے سمجھ لیا کہ یہ اس کے لیے مثبت تبدیلی کا نکتہ آغاز ہوسکتا ہے۔

بہر حال پہلا موقع تھا۔ اس سے ٹھیک طرح سے کھایا تو نہیں گیا۔ البتہ وہ چپکے چپکے عبدالحق کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جس رغبت سے کھا رہا تھا' وہ اس کے لیے بہت بڑی خوشی کی بات تھی۔ اس کی محنت اور محبت کامیاب ہوگئی تھی۔

”واہ نور بانو' تُو نے تو کمال کر دیا دھیے۔“ حمیدہ نے داد دی۔

”ایسا کھانا میں ایک بار پہلے بھی کھا چکا ہوں۔“ عبدالحق نے سر اٹھائے بغیر بے دھیانی سے کہا۔

”کہاں پتر؟“ حمیدہ نے پوچھا۔

”دہلی میں اماں۔“

”آپ کو یاد ہے وہ کھانا؟“ نور بانو نے بے ساختہ پوچھا۔

اس کی آواز سن کر عبدالحق نے سر اٹھایا۔ مگر فوراً ہی نظریں جھکالیں۔ ”وہ کھانا کیسے بھول سکتا ہوں میں۔“

ایک لمحے کو نور بانو کو ایسا لگا' جیسے وہ سمجھ رہا ہو کہ وہ کھانا اس نے پکایا تھا۔

مگر اگلے ہی لمحے اس کی خوش فہمی دور ہوگئی۔ ”اور مجھے معلوم ہے کہ وہ کھانا اس کی بڑی بہن حور بانو نے پکایا تھا۔“ عبدالحق نے کہا۔ فوراً ہی اسے احساس ہوگیا کہ اس کے منہ سے غلط بات نکل

گئی ہے۔ دسترخوان پر رابعہ بھی موجود تھی۔

"آپ کو کیسے معلوم؟" نور بانو نے پوچھا اس کے دل میں جیسے پھانس سی چبھ کر اٹک گئی تھی۔ تو کیا باجی سے بھی ہوتی تھی ان کی ظاہر ہے باجی ہی بتا سکتی تھیں انہیں یہ بات۔

"جی...... وہ...... مَیں...... یہ تو مجھے یاد نہیں......" عبدالحق بری طرح گڑبڑا گیا۔

اسی وقت رابعہ بول اٹھی۔ "مجھے یاد ہے۔ میں نے بتایا تھا صاحب کو۔ صاحب نے بوا کا شکریہ ادا کرنے کو کہا تھا۔ پھر میں نے بتایا کہ کھانا بڑی بی بی حور بانو نے پکایا تھا تو صاحب بڑے حیران ہوئے تھے۔ اور واقعی ہر چیز تو بڑی بی بی نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھی۔ حالانکہ مجھے یاد ہے کہ کھانے پکانے میں وہ کبھی دلچسپی نہیں لیتی تھیں۔"

نور بانو جانتی تھی کہ باجی نے وہ محنت اوتار سنگھ کی محبت میں کی تھی۔ اور اب پتا چل گیا تھا کہ وہ محبت اور محنت سراہی بھی گئی تھی۔ عبدالحق چور سا ہو گیا تھا۔ اس بات سے سب سمجھ گئے ہوں گے کہ اس نے تفتیش کیوں کی تھی۔

"اچھا رابعہ، یہ بتا کہ اس دن کا کھانا زیادہ اچھا تھا یا آج زیادہ اچھا ہے؟" حمیدہ نے پوچھا۔

"میں کیا جانوں اماں۔ میں نے تو کھایا ہی نہیں تھا۔ ہم دونوں ماس مچھلی کہاں کھاتے تھے۔ ہاں، یہ مجھے یاد ہے کہ صاحب نے اس دن رات کو بھی وہی کھانا مانگ کر کھایا تھا۔"

عبدالحق گڑبڑا گیا۔ یہ رابعہ راز پر راز کھولے جا رہی ہے۔

حمیدہ عبدالحق کی طرف مڑی۔ "تو پھر تُو ہی بتا پتر، کون سا کھانا زیادہ اچھا تھا؟"

"سچ تو یہ ہے اماں کہ اس کھانے کے سامنے میں اُس کھانے کو بھول ہی گیا۔ نور بی بی نے تو کمال ہی کر دیا۔"

"دل رکھنے کو منہ دیکھے کی تعریف۔" نور بانو چڑ سی گئی تھی۔

عبدالحق نے سر اٹھایا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ وہ براہِ راست نور بانو کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"میں جھوٹ کبھی نہیں بولتا نور بی بی۔" اس نے کہا، اور اس کے بعد بھی نظریں نہیں جھکائیں۔ بلکہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا، جیسے چیلنج کر رہا ہو۔

نور بانو کی آنکھوں میں اپنی اماں کا چہرہ پھر گیا اور سماعت میں ان کی آواز گونجی...... چھوٹا ٹھاکر جھوٹ کبھی نہیں بولتا۔ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے خلوص سے کہا۔

"شکریہ...... آپ کی تعریف مل گئی۔ میری محنت وصول ہو گئی۔" یہ کہہ کر اس نے نظریں جھکا لیں۔

کھانے کے بعد عبدالحق نے حمیدہ سے کہا۔ "اماں...... ایک بات کہوں؟"

"تجھے بھی مجھ سے پوچھنے کی ضرورت ہے پتر۔"

"سب کے ساتھ کھانا بہت اچھا لگا اماں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ رات کا کھانا اسی طرح کھایا

جائے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے پتر۔ ساتھ بیٹھ کر کھانے سے برکت ہوتی ہے۔ اب رات کا کھانا سب ساتھ ہی کھایا کریں گے۔" حمیدہ نے کہا، پھر سب سے مخاطب ہو کر بولی۔ "سن لیا نا سب نے۔"

سب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نور بانو کو ایسا لگا کہ بہت اچھے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔

سب لوگ اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ عبدالحق دونوں سوٹ کیس لے کر حمیدہ کے کمرے میں چلا گیا۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق نے پہلا سوٹ کیس کھولا اور ایک ایک چیز نکال کر حمیدہ کو دکھانے لگا۔ حمیدہ کھلی جا رہی تھی۔ "یہ سب کس کے لیے ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ زرینہ کے لیے ہے اماں۔"

پھر اس نے اماں کے لیے لائی ہوئی چیزیں نکالیں۔ "یہ آپ کے لیے ہے چادر۔" اس نے چادر اماں کے کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "اب اپنا ہاتھ بڑھائیں۔"

حمیدہ نے جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ عبدالحق نے سونے کی چار چوڑیاں اس کے ہاتھ میں پہنا دیں۔

"یہ کیا ہے پتر۔ اب مجھے اس کی کیا......"

"جوان بیٹے کی ماں ہو اماں۔ تمہارے ہاتھ سُونے ہوں گے تو بیٹے کی عزت کم ہو گی۔"

حمیدہ لاجواب ہو گئی۔

پھر عبدالحق نے زبیر اور رابعہ کی چیزیں دکھائیں۔

"سب کچھ بہت اچھا ہے پتر۔ پر تُو مجھے زرینہ کے بارے میں تو بتا......"

"بتانا کیا ہے اماں۔ اس کے سب لوگ پاکستان آتے ہوئے راستے میں شہید ہو گئے۔ کوئی بھی نہیں بچا۔ میں نے دیکھا تو خیال آیا کہ میں بہن سے محروم ہوں اور تم بیٹی سے۔ کیوں نہ یہ محرومی دور کر لی جائے...... اپنی بھی اور اس کی بھی۔" عبدالحق نے کہا، پھر پُرتشویش لہجے میں بولا۔ "مگر تم نے ایسے کیوں پوچھا ہے اماں؟ کیا تمہیں اچھی نہیں لگی؟"

"ارے نہیں پتر، وہ تو بہت اچھی ہے۔ بس اس نے خود اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کہنے لگی، بھائی آ کر بتائیں گے۔"

"میں نے ہی کہا تھا اس سے۔ بار بار زخم کریدے جائیں تو ہر بار پہلے سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔"

حمیدہ نے بڑی محبت سے اسے دیکھا۔ "تُو کتنا عقل مند ہے پتر۔"

تعریف سن کر عبدالحق ہمیشہ کھسیا جاتا تھا۔ اس نے جلدی سے بات بدلی۔ ''جو میری سمجھ میں آیا' وہ میں زرینہ کے جہیز کے لیے لے آیا۔ آگے تم خود دیکھ لینا۔ بس کوئی اچھا سا رشتہ آ جائے تو......''

''رشتہ تو آ بھی گیا ہے اس کا......اور وہ بھی بہت اچھا۔''

عبدالحق کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ''کیا کہہ رہی ہو اماں؟'' اس نے کہا۔ ''کہاں سے آیا ہے اس کا رشتہ۔''

حمیدہ نے اسے ڈاکٹر صاحب کی بیوی کی آمد کے بارے میں بتایا اور اپنا جواب بھی۔ ''پر وہ جلدی چاہتی ہیں پتر۔''

اب عبدالحق کی سمجھ میں ڈاکٹر واسطی کی بات آئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگلی بار وہ سوالی بن کر آئیں گے۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ اس سے اپنے بیٹے کے لیے زرینہ کا رشتہ مانگنے آئیں گے۔

لیکن اتنی جلدی! عبدالحق نہ چاہتے ہوئے بھی اداس ہو گیا۔ بہن......اور بہن کی محبت سے وہ ناواقف تھا۔ اب اللہ نے اسے بہن دی تھی۔ یہ سچ ہے کہ سب سے پہلے اسے اس کی شادی کی فکر ہی ہوئی تھی۔ مگر اندر کہیں یہ خواہش بھی تھی کہ وہ زرینہ کے ساتھ وقت گزارے' دیکھے کہ بہن کی محبت کیسی ہوتی ہے۔ ابھی تو اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ بھائی بہنوں سے کیسی محبت کرتے ہوں گے۔

لیکن نہیں...... یہ تو اسے ابھی معلوم ہوا تھا۔ یہ اداسی اس محبت کا نتیجہ تھی۔ یہ احساس کہ وہ زرینہ کے ساتھ وقت نہیں گزار سکے گا اور وہ ایسی پرائی ہو جائے گی کہ اس کے گھر کبھی آئے گی بھی تو مہمان بن کر' اس احساس نے ہی تو اسے اداس کر دیا تھا۔ اور اس احساس کے پیچھے' بہن کی محبت ہی تو تھی' جس سے وہ ناواقف تھا۔ مگر محبت تو کسی بھی وقت چپکے سے کسی کے پاس بھی آ جاتی ہے' وہ خواہ اس سے واقف ہو یا ناواقف ہو۔ محبت تو اللہ کی عطا ہوتی ہے نا......

''تو کہاں کھو گیا پتر؟'' حمیدہ نے اسے ٹوکا۔

وہ چونکا۔ ''اتنی جلدی اماں۔''

''لے خود ہی اس کے جہیز کا سامان لے کر آیا ہے اور اب کہتا ہے' اتنی جلدی! اور پتر' بیٹیاں اور بہنیں تو ہوتی ہی مہمان ہیں۔ وہ اپنے گھر کی ہو جائیں اور وہاں خوش رہیں' اسی میں ماں باپ اور بھائیوں کی خوشی ہوتی ہے۔''

''پر اماں' میں تو اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ تم نے تو گزار لیا۔''

''تو پتر' شادی دو دن میں تو نہیں ہو جائے گی نا۔ وقت تو لگے گا۔ تو پریشان کیوں ہوتا ہے۔''

''زرینہ سے بھی پوچھنا پڑے گا۔''

اس بار گفتگو کا رخ حمیدہ نے بدلا۔ ''چاروں کی بہن تو تجھے خوب یاد رہی۔'' اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''لیکن نور بانو کا خیال نہیں آیا تجھے۔''

عبدالحق تو جیسے تڑپ گیا۔ ''کیسی باتیں کرتی ہو اماں۔ ان کے لیے بھی پورا سامان لایا ہوں جہیز کا۔'' یہ کہہ کر اس نے دوسرا سوٹ کیس کھولا اور ایک ایک چیز حمیدہ کو دکھانے لگا۔

حمیدہ کی تو خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ ''یہ جہیز لایا ہے یا بری؟''

''کیا مطلب اماں؟'' عبدالحق کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔

''کچھ نہیں پتر۔ تو ابھی کیسے سمجھ سکتا ہے۔'' حمیدہ نے کہا۔ پھر اچانک اسے اصل بات یاد آ گئی۔ ''ارے ہاں' یہ بتا کہ تو جس کام کے لیے لاہور گیا تھا' اس کا کیا بنا؟''

عبدالحق نے گہری سانس لی۔ وہ مرحلہ آ گیا تھا' جس سے وہ گھبرا رہا تھا......

❁ ❁ ❁

نور بانو کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ ایک دم بدلی ہے...... اور بہت زیادہ بدلی ہے۔ اس کی بزدلی کم ہو گئی تھی۔ آتے ہی اس نے جس طرح عبدالحق کا سامنا کیا تھا' وہ اس کی پرانی شخصیت سے تو میل نہیں کھاتا تھا۔ اس طرح سے دو ٹوک اور بے حجابانہ گفتگو کرنا...... اسے یقین تھا کہ عبدالحق بھی حیران ہوا ہوگا۔

پھر اس کے بعد اسے یہ ادراک بھی ہو گیا کہ وہ سب کچھ اس نے کسی وقتی جوش کے تحت نہیں کیا تھا۔ یعنی وہ تبدیلی عارضی نہیں' مستقل تھی پھر ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے نے اس کی تبدیلی کو اور مہمیز کر دیا تھا۔ عبدالحق کی تعریف کے جواب میں' اگر وہ پرانی والی نور بانو ہوتی تو خاموش ہی رہتی۔ مگر اس نے جارحانہ انداز میں تعریف پر تنقید کی تھی' ایسی کہ عبدالحق جیسا نرم خو آدمی جارحانہ جواب دینے پر مجبور ہو گیا تھا مگر اس جواب سے اسے خوشی ہوئی تھی۔ یہ جو پتا چل گیا تھا کہ وہ تعریف سچی تھی۔

اور اب وہ ایک قدم اور آگے بڑھ رہی تھی!

اس نے عبدالحق کے والد کی کتابیں اور ڈائریاں سمیٹ کر یک جا کیں' پھر اس کی چادر اٹھائی اور کمرے سے نکل آئی۔ نکلتے ہوئے اس نے زرینہ کو دیکھا۔ اسے بستر پر لیٹے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ تو امکان یہی تھا کہ وہ سو چکی ہے۔

وہ اماں کی طرف بڑھ گئی لیکن دروازے پر پہنچ کر ٹھٹک گئی۔ اندر اسی کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ اس نے وہیں پلٹنے کا فیصلہ کیا۔ بلکہ اس نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ اب وہ عبدالحق کو یہ چیزیں اس کے کمرے میں ہی لے جا کر دے گی۔ اسے یہ خیال بھی حیرت انگیز لگا...... اتنی جرأت اس میں؟ اور اس کا جواب اثبات میں تھا۔ اب وہ سب کچھ کر سکتی تھی...... یہاں تک کہ اظہار محبت بھی!

وہ پلٹنے لگی۔ مگر اسی لمحے اندر عبدالحق نے جو نام لیا' اس نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔ رضوان صاحب...... وہ تو اس کے چچا کا نام تھا' جن کی تلاش میں عبدالحق لاہور گیا تھا۔

تو کیا چچا چل گئے؟ عبدالحق کی واپسی کا تو ویسے یہی مطلب تھا۔ تو کیا اب اسے یہاں سے جانا ہوگا۔ یہ سوچتے ہوئے اسے بڑی اذیت ہوئی مگر اگلے ہی لمحے اس کے وجود میں بغاوت کی لہر اٹھی۔ نہیں...... میں واپس نہیں جاؤں گی۔ اس نے سوچا۔ میں یہ بات کسی کے سامنے بھی کھل کر کہہ سکتی ہوں' خواہ وہ چچا جان ہوں۔ اس کے اندر پیدا ہونے والی جرأت حقیقی ہے' اس بات کا اسے پہلی بار صحیح معنوں میں احساس ہوا۔

ان سوچوں کی وجہ سے اندر ہونے والی گفتگو کا کچھ حصہ وہ نہیں سن سکی تھی۔ اور وہ بہت اہم گفتگو تھی...... کم از کم اس کے مستقبل کے لیے یہ احساس ہوتے ہی اس نے اپنی توجہ اندر کی گفتگو پر مرکوز کر دی۔

''...... میں ان سے ملا ہوں اماں۔'' اندر سے عبدالحق کہہ رہا تھا۔ ''اور وہ وہی رضوان صاحب تھے۔ انہوں نے گھر کے سب لوگوں کے بارے میں پوچھا۔ میں نے انہیں نور بی بی کے بارے میں بتایا......''

نور بانو سنتی رہی۔ جو کچھ سن رہی تھی' وہ اس پر بہت گہرا اور تند و تیز تاثر مرتب کر رہا تھا۔ بلکہ اسے تاثر کہنا غلط ہوگا۔ کیونکہ وہ دو الگ الگ' ایک دوسرے سے یکسر برعکس اور متصادم تاثرات تھے۔ ایک طرف اس کے اندر شدید غصہ اور شدید نفرت ابل رہی تھی اور دوسری طرف اسے بے پایاں سکون اور اطمینان کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں خوشی تھی اور مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ چچا نے اسے ایسا کہا تھا...... کیسے...... کس دل سے! کیا ان کی اپنی بیٹیاں نہیں ہیں...... اور کیا وہ ان کی بیٹی جیسی نہیں ہے۔ اور انہوں نے تو اس پر تہمت ہی لگا دی۔ نہ صرف اس پر' بلکہ عبدالحق پر بھی۔

اس خیال نے اسے اور تڑپا دیا...... اور مشتعل کر دیا کہ چچا جان نے عبدالحق کی کتنی توہین کی۔ کیسے برداشت کیا ہوگا انہوں نے۔ یہ راج پوت بے عزتی کہاں برداشت کرتے ہیں۔ مگر صرف اس کی خاطر...... اسے شرمندگی ہونے لگی۔

مگر دوسری طرف دل تھا کہ جیسے خوشی سے ناچ رہا تھا۔ سارے مسئلے حل ہو گئے تھے۔ اب اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

وہ پلٹی اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ زرینہ بے سدھ سو رہی ہے۔ وہ اپنے بستر پر دراز ہو کر سوچنے لگی۔ لیکن اس کے کان باہر عبدالحق کے متوقع قدموں کی چاپ پر لگے تھے۔ وہ اس پر ظاہر نہیں ہونے دے گی کہ وہ اس کی بات سن چکی ہے۔ اور اس کی بات سننے سے پہلے ہی وہ اسے پوری سچائی کے ساتھ بتا دے گی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اگر وہ اس کی بات سننے کے بعد یہ سب کچھ کہے گی تو وہ سوچے کہ شاید وہ مروت میں...... اس کا دل رکھنے کے لیے یہ کہہ رہی ہے۔ وہ اظہار محبت کرے گی...... وہ لڑکی ہو کر پہل کرے گی' اور اس میں کوئی حرج

نہیں۔ بلکہ یہ ضروری ہے۔ جو شخص آن والا ہو کر اس کی خاطر اتنی بے عزتی کرا کے آیا ہے' وہ اس کا مستحق ہے' چاہے وہ اس سے محبت نہ کرتا ہو۔ لیکن وہ تو اس سے محبت کرتی ہے نا!

اب وہ اس کے قدموں کی چاپ کی منتظر تھی!

❁ ❁ ❁

''توبہ ہے میری ربا...... خون پانی ہو گیا ہے لوگوں کا۔'' حمیدہ نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن اماں' یہ سچ صرف تمہارے لیے ہے۔''

''کیا مطلب ہے تیرا پتر؟''

''نور بی بی کو میں یہ سب کچھ نہیں بتاؤں گا۔ خواہ مخواہ ان کو عمر بھر کا دکھ دینے کا فائدہ۔ ایک تو ویسے ہی آدمی سب کچھ کھو کر آیا ہو۔ اوپر سے اسے اور زخم لگایا جائے۔''

حمیدہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ''تو پھر تو کیا بتائے گا اسے؟''

''یہی کہ میں انہیں تلاش نہیں کر سکا۔ اور اب ان کے ملنے کا کوئی امکان ہے بھی نہیں۔''

''تو...... تو جھوٹ بولے گا اس سے۔''

''مجبوری ہے اماں۔ انہیں دکھ دینے سے بچانے کے لیے جھوٹ بولنا پڑے گا مجھے۔''

''اور جو میں تجھے بتاؤں کہ سچ سے اسے دکھ نہیں ہوگا' بلکہ خوشی ہوگی۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو اماں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ سگے چچا کا ایسے الفاظ کہنا......''

''مانتی ہوں' اس بات سے دکھ ہوگا اسے۔ لیکن اس سے بہت زیادہ خوشی ہوگی۔''

''کیوں ہوگی خوشی؟''

''یہاں سے نہ جانے کی خوشی اس دکھ سے بڑی ہوگی۔'' حمیدہ نے کہا۔

''نہیں اماں' میری عقل نہیں مانتی یہ بات۔''

''یہ عقل کے نہیں' دل کے سمجھنے کی بات ہے پتر۔'' حمیدہ نے بڑے پیار سے کہا۔ ''تجھے دل سے سوچنا اور کسی کے دل میں جھانکنا کہاں آتا ہے پگلا۔''

''نہیں اماں۔ یہ خطرہ میں مول نہیں لے سکتا۔''

''تو ٹھیک ہے جو جی میں آئے کر۔'' حمیدہ نے سوچا' اس میں نقصان ہی کیا ہے۔ ''خود ہی پتا چل جائے گا تجھے۔''

عبدالحق اٹھ کھڑا ہوا۔ ''تم یہ سب چیزیں سنبھال کر رکھو میں آتا ہوں اماں۔ اب میں چلتا ہوں۔''

''ہاں...... اب سو جا کر دن بھر کا تھکا ہارا ہے۔''

❁ ❁ ❁

وہ کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی' حالانکہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس

نے پلٹ کر دیکھا تو دروازے میں نور بانو کھڑی نظر آئی۔ عبدالحق کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں۔ تو وہ مرحلہ آ ہی گیا۔ اس نے دل میں سوچا۔

"آ جایئے نور بی بی۔"

نور بانو اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چادر اور کچھ پرانی کتابیں تھیں۔

عبدالحق نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھیے۔"

نور بانو بیٹھ گئی۔

"مجھے موقع نہیں ملا کہ آپ......" الفاظ عبدالحق کے گلے میں پھنس رہے تھے۔

نور بانو نے بہت تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کیا کہے گا۔ اور وہ اسے اس کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ یہ ضروری تھا کہ اس سے پہلے ہی وہ اپنے دل کی بات اس پر واضح کر دے۔ "آپ کو شاید یہ بدتمیزی لگے' اس لیے میں پہلے ہی آپ سے معذرت کر رہی ہوں۔" اس نے کہا۔ "مگر اتنی رات کو دن بھر کی تھکن کے بعد آپ کو زحمت دے رہی ہوں تو اس لیے نہیں کہ آپ سے کچھ سننا چاہتی ہوں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں....."

عبدالحق کا چہرہ فق ہو گیا۔ معاملہ اس کی توقع سے زیادہ سنگین تھا۔ "جی..... میں سمجھتا ہوں' لیکن....."

"نہیں..... آپ کچھ بھی نہیں سمجھتے۔" نور بانو نے تیز لہجے میں پھر اس کی بات کاٹ دی۔ "مختصراً بات یہ ہے کہ آپ کو بولنا نہیں ہے' صرف سننا ہے۔ جب تک میری بات پوری نہ ہو جائے' آپ کچھ بھی نہیں کہیں گے۔"

"جی بہتر۔" عبدالحق نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ یہ تو اس نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ گم صم رہنے والی اس کم گو لڑکی میں بہت بڑی تبدیلی آئی ہے۔ اس کے مزاج میں جارحیت آ گئی ہے' اور اس کا نشانہ خاص طور پر وہ ہے۔ ایک لحاظ سے یہ اسے بہتر لگا کہ وہ اسے بولنے سے روک رہی ہے۔

"میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ایک ابتدائی تاثر کی وجہ سے آپ مجھے غلط سمجھتے رہے ہیں۔" نور بانو نے بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات شروع کی۔ "آپ نے یہ نہیں سوچا کہ میرا ردِعمل اور آپ پر قائم ہونے والا تاثر ایک خاص ہنگامی صورتِ حال کے تحت تھا۔ ایسے حالات میں تو مضبوط اور طاقت ور لوگ بھی ہل جاتے ہیں' میں تو ایک کمزور اور اکیلی لڑکی تھی' جس کا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کے فطری ردِعمل کی بنیاد پر اسے احسان فراموش سمجھ لینا بڑی زیادتی ہے....."

"میں نے آپ کو ایسا کبھی نہیں......" عبدالحق نے تڑپ کر کہنے کی کوشش کی۔

"پھر بولے آپ۔ آپ میری بات کیوں نہیں مانتے۔" نور بانو نے سخت لہجے میں کہا۔

"معافی چاہتا ہوں۔ اب نہیں بولوں گا۔" عبدالحق کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

"میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں کم ظرف اور احسان فراموش نہیں ہوں۔ صورتِ حال بہتر ہوئی' میں یہاں آئی اور مجھے مکمل تحفظ ملا تو میری سمجھ میں آیا کہ آپ نے' زبیر بھائی اور رابعہ آپا نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے' وہ سگے رشتہ دار بھی نہیں کرتے۔ یہ آپ لوگوں کا وہ احسان ہے جو جان دے کر بھی نہیں اتارا جا سکتا۔ پھر یہاں اماں کی صورت میں مجھے میری مری ہوئی ماں مل گئی۔ سچ کہوں تو یہاں میں اتنی خوش رہی کہ دہلی میں' اپنے گھر میں' اپنے لوگوں کے درمیان بھی کبھی اتنی خوش نہیں رہی تھی۔ آپ سب لوگ میرے لیے میرے سگے رشتہ داروں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ مگر آپ کو میری اس تبدیلی کو دیکھنے اور سمجھنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ آپ میرے بارے میں اسی پہلے تاثر پر ڈٹے رہے کہ میں آپ لوگوں سے خوف زدہ ہوں اور یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔ اس روز لاہور جانے سے پہلے جو میں آپ کے پاس آئی تھی تو اس لیے نہیں کہ چچا کی تلاش کا وعدہ یاد دلا کر آپ کو لاہور بھیجوں۔ میں تو آپ کی کچھ چیزیں دینے' اور ان کی بے پناہ اہمیت کے بارے میں بتانے آئی تھی۔ آپ نے اپنے اس پہلے تاثر اور میرے بارے میں اپنے مفروضے کے تحت میری بات سنی ہی نہیں اور مجھ سے ملے اور بات کیے بغیر ہی لاہور چلے گئے۔ اگر آپ مجھے بتا دیتے کہ آپ کس لیے لاہور جا رہے ہیں تو پتا ہے' میں کیا کہتی آپ سے......" وہ کہتے کہتے رکی۔ "اب یہ پوچھیے مجھ سے۔"

عبدالحق کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ مگر اس نے بڑی فرماں برداری سے پوچھا۔ "کیا کہتی آپ؟"

"میں کہتی کہ آپ کو لاہور جانے اور میرے چچا جان کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ پچھلے سب رشتے ختم ہو چکے...... بے معنی ہو چکے۔ اب میرے تمام رشتے اس زمین پر' اس گھر میں موجود ہیں۔" یہ کہتے ہوئے نور بانو کی نظریں جھک گئیں۔ "میں خود کو آپ پر تھوپنا نہیں چاہتی۔ لیکن اماں' زبیر بھائی اور رابعہ آپا کے لیے میری اہمیت ہے۔ وہ نہیں چاہیں گے کہ میں یہاں سے جاؤں۔"

"یہ تو میں بھی نہیں چاہتا۔" عبدالحق نے دل میں سوچا۔

"میں آپ سے کہتی کہ چاہے آپ مجھے خود پر بوجھ سمجھیں' مگر مجھے یہاں رہنے دیں۔ اب اگر چچا جان یہاں آ کر مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہیں تو بھی میں انکار کر دوں گی۔ میں یہاں سے کہیں جانا نہیں چاہتی۔ مگر آپ تو ہر چیز کو اپنی مرضی کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں نا' اس لیے مجھے بتائے بغیر چلے گئے۔ اب مجھے بتایئے' اتنا عرصہ گھر سے دور' گھر کے سکون اور آسائشوں سے محروم رہ کر آپ نے کیا پایا؟"

"اب میں بول سکتا ہوں؟" عبدالحق نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"جی ہاں۔ کیونکہ میرا خیال ہے' میں اپنی بات واضح کر چکی ہوں۔"

"تو میں آپ کے آخری سوال کا جواب دیتا ہوں۔ میں نے ناکامی کے سوا کچھ نہیں پایا۔ میں سرتوڑ کوشش کے باوجود آپ کے چچا جان کو تلاش نہیں کر پایا۔ میں شرمندہ ہوں۔ کیونکہ مجھے نہیں لگتا کہ میں کبھی انہیں تلاش کر سکوں گا۔"

نور بانو کی حیرت اتنی شدید تھی کہ چند لمحوں کے لیے تو وہ گنگ ہو کر رہ گئی۔ کچھ بول ہی نہیں سکی۔ پھر اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "یہ...... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔"

نور بانو کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ سچ بولنے والا اس سے جھوٹ کیوں بول رہا ہے۔

"مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔ آپ یہی سمجھ رہی ہیں نا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔"

"اور میں ایسا کیوں سوچوں گی؟"

"اس خیال سے کہ میں آپ کو یہاں روکنا چاہتا ہوں...... آپ کو یہاں سے جانے نہیں دینا چاہتا۔"

"اور میرے خیال میں آپ ایسا کیوں کریں گے؟" نور بانو نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اب یہ تو آپ ہی جانتی ہوں گی۔"

"میں تو جانتی ہوں گی۔ آپ بتائیں' آپ کا کیا خیال ہے۔ اس سلسلے میں۔"

عبدالحق چند لمحے ہچکچاتا رہا' بالآخر بولا۔ "کیونکہ آپ کے خیال میں میں برا آدمی ہوں۔ شاید آپ یہ بھی سمجھتی ہیں کہ آپ کے سلسلے میں میرے عزائم کچھ اچھے نہیں ہیں۔"

یہ سن کر نور بانو نے عملاً سر پیٹ لیا۔ "آپ کس طرح کے آدمی ہیں۔" وہ جھنجھلا کر بولی۔ "اتنے بڑے بڑے نظریات قائم کر لیتے ہیں' اور ان کو عمل کی کسوٹی پر پرکھتے تک نہیں۔ ارے اللہ کے بندے' میں تو آپ کو روئے زمین پر موجود سب سے اچھا اور سچا انسان سمجھتی ہوں...... نہیں' یوں کہنا چاہیے کہ سمجھتی تھی۔" عبدالحق کے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا تھا۔ لیکن نور بانو کے آخری جملے نے اسے پھر سہما دیا۔ "اب نہیں سمجھتیں! اس لیے نا کہ آپ کے خیال میں میں آپ کے چچا جان کے بارے میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

"یہ میرا خیال نہیں' مجھے پورا یقین ہے...... بلکہ میں جانتی ہوں کہ آپ اس معاملہ میں جھوٹ بول رہے ہیں۔"

عبدالحق کی یہ کیفیت ہو گئی کہ کاٹو تو جسم میں خون نہیں۔ نور بانو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پہلے تو اس نے یہ باور کرایا کہ وہ یہاں سے جانا ہی نہیں چاہتی۔ چچا مل جائیں تو بھی نہیں

جائے گی۔ یہ سن کر اسے اطمینان ہو گیا کہ اس کا کام آسان ہو گیا ہے۔ مگر یہ سنتے ہی کہ وہ چچا کو تلاش نہیں کر سکا' اس کا رویہ ہی تبدیل ہو گیا۔ وہ بغیر کسی معقول وجہ کے اسے جھوٹا سمجھنے لگی۔ اور اتنے یقین کے ساتھ اسے جھوٹا کہہ رہی ہے۔ تو کیا دراصل وہ اپنے چچا کے پاس جانا چاہتی ہے۔ اس کا ذہن بری طرح الجھ گیا۔

"تو پھر بات تو وہی ہوئی نور بی بی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "آپ کے خیال میں میرے عزائم اچھے نہیں۔ اور جھوٹ بولنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔"

"نہیں' ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی آپ کے بارے میں۔ مگر میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ آپ جھوٹ کیوں بول رہے ہیں۔ خیر اس بات کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ چچا ملیں یا نہ ملیں' مجھے ان کے ساتھ جانا ہی نہیں ہے۔ میں یہیں رہنا چاہتی ہوں۔"

عبدالحق جھنجلا گیا۔ جی چاہا کہ سر کے بال نوچنے لگے۔ عجیب لڑکی تھی...... کبھی تولہ کبھی ماشہ!

"آپ خود ہی بتا دیں نا کہ آپ چچا جان کے معاملے جھوٹ کیوں بول رہے ہیں۔" نور بانو نے اچانک کہا۔

"بتانا ہو تو جھوٹ ہی بولتا ہی کیوں۔" عبدالحق نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"اچھا چھوڑیں' اب آپ کی ان چیزوں کی بات ہو جائے' جو میں اس دن کرنا چاہتی تھی۔ لیکن آپ نے مجھے موقع ہی نہیں دیا۔ یہ کچھ کتابیں اور دو ڈائریاں ہیں آپ کے والد کی' جو تہ خانے میں ملی تھیں۔ آپ کو یاد ہے' میں نے آپ سے انہیں پڑھنے کی اجازت لی تھی؟"

"جی...... مجھے یاد ہے۔"

"اس کے باوجود آپ سے معافی کی خواستگار ہوں۔ ڈائریاں مجھے نہیں پڑھنی چاہیے تھیں۔ کیونکہ ان میں بہت ذاتی باتیں تحریر ہیں۔"

ایک لمحے کو عبدالحق کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ پھر اس نے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ میں نے آپ کو اجازت دی تھی نا۔"

"شکریہ۔" نور بانو نے کتابیں اور ڈائریاں اس کی طرف بڑھائیں۔ "اب ایک خوش خبری سناؤں آپ کو۔ ان ڈائریوں میں ایک اتنی بڑی خوشی ہے آپ کے لیے کہ جو آپ کے گمان میں بھی نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے میری پیشگی مبارک باد قبول کیجیے۔"

"وضاحت نہیں کریں گی آپ؟" عبدالحق کے چہرے پر حیرت تھی۔

"جی نہیں' خود پڑھ کر جو خوشی آپ کو حاصل ہو گی' وہ بہت...... بہت بڑی ہو گی۔ اور میں اسے خراب نہیں کرنا چاہتی۔"

عبدالحق عجیب سی نظروں سے کتابوں کو دیکھنے لگا۔

"اور یہ چادر ہے آپ کی' جو میں نے آپ کے کمرے سے بلا اجازت لے لی تھی۔" نور بانو نے گود میں رکھی چادر کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن چادر اس کی طرف بڑھائی نہیں۔ "اس لیے میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔"

"تو یہ تو ہے ہی آپ کے پاس۔ آپ نے واپس کب دی ہے۔"

نور بانو نے چادر اب بھی اس کی طرف نہیں بڑھائی۔ "تو مجھے یہ چادر رکھنے کی اجازت دے رہے ہیں نا آپ۔"

"چلیے...... اجازت دی۔"

"شکریہ...... شب بخیر۔" نور بانو اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

عبدالحق کتابوں کی طرف متوجہ تھا۔ نور بانو کی آواز سن کر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ نور بانو دروازے میں کھڑی تھی۔

"اس چادر میں آپ کی خوشبو تھی۔ اس کی وجہ سے آپ دور رہ کر بھی میرے قریب رہے۔" وہ عجیب سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

عبدالحق کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ کیا یہ سب کچھ وہی ہے' جو سمجھ میں آرہا ہے' اسے محسوس ہو رہا ہے؟ کیا یہ اظہار محبت ہے؟

"اور یہ چادر لے کر میں نے ایک طرح سے آپ پر احسان کیا۔" نور بانو نے مزید کہا۔ "ورنہ آپ کا مینو مر گیا ہوتا۔ اس چادر اور اس کی خوشبو کی وجہ سے ہی اس نے میرے ہاتھ سے کھانا گوارا کیا۔"

عبدالحق سے کچھ بھی نہیں کہا گیا۔

"اور اب آخری بات۔ شاید اس کے بعد آپ مجھے کبھی اچھی لڑکی نہ سمجھیں۔ لیکن میں پھر بھی کہوں گی۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ اتنی...... اتنی...... اتنی زیادہ کہ آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔" یہ کہہ کر وہ پلٹی اور ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گئی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق ساکت و صامت بیٹھا تھا...... یوں جیسے سانس لینا بھی بھول گیا ہو!

لیکن نہیں۔ وہ وہاں موجود ہی کب تھا۔ وہ گویا ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔ یہ سب کچھ حقیقت تو نہیں ہو سکتا۔ شاید وہ خواب دیکھ رہا ہے۔

حقیقت میں تو یہ ممکن ہی نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آسمان زمین پر اتر آئے اور اسے چھو کر کہے...... مجھے تم سے محبت ہے۔ ہاں...... اور کیا...... اس کے اور نور بانو کے درمیان اگر کوئی نسبت تھی تو وہ یہی تھی۔ وہ آسمان تھی اور وہ زمین۔

ایک لمحے کو سچ مچ اسے ایسا لگا کہ آسمان نیچے...... نیچے...... اور نیچے چلا آرہا ہے' اور اس کے بہت قریب پہنچ گیا۔ درمیان کی سب چیزیں اوجھل ہوتی جارہی ہیں۔ کمرے کی چھت بھی جیسے اوجھل ہو گئی۔ آسمان جیسے اسے چھونے لگا۔ درمیان سے جیسے آخری چیز' ہوا بھی سلب ہو گئی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ سانس بھی نہیں لی جارہی تھی۔ پھیپھڑوں میں جیسے آگ بھر گئی۔

شدید گھبراہٹ کے عالم میں اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہاں آسمان نہیں تھا' کمرے کی چھت تھی۔ اس نے جینے کے لیے...... پکے یقین کے لیے گہری سانس لی۔ اس سانس نے اسے یقین دلا دیا کہ اس نے خواب دیکھا تھا۔

مگر اس نے نظریں جھکائیں تو اسے اپنی گود میں رکھی پتا جی کی کتابیں' ان کی ڈائریاں نظر آئیں۔ اگر وہ خواب تھا تو یہ کتابیں کہاں سے آئیں اس کے پاس۔ ذہن پھر الجھنے لگا۔

لیکن اس بار عبدالحق کی الجھن مختصر تھی۔ اب وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ نور بانو آئی تھی۔ یہ کتابیں' یہ ڈائریاں اس کا ثبوت تھیں۔ اس نے جو باتیں کی تھیں' وہ بھی اسے یاد تھیں لیکن اس نے جاتے ہوئے جو کچھ کہا تھا' اس پر اسے یقین نہیں تھا۔ وہ شاید اس کے اندر کی خواہش تھی' وہ شاید اس کا تصور تھا۔

وہ بے چین ہو گیا۔ اس نے کتابیں اور ڈائریاں بیڈ پر رکھیں اور کمرے سے نکل آیا۔ اس کے قدم بے اختیار نور بانو کے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ نور بانو بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ وہ دروازے میں رک گیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ دوسری چارپائی بھی ہے' اور اس پر چادر اوڑھے کوئی سو رہا ہے۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟ اس کا الجھا ہوا ذہن اور الجھ گیا۔

پھر اسے احساس ہوا کہ اسے وہاں کھڑے کھڑے کئی لمحے گزر گئے ہیں۔ نور بانو کا رخ اسی طرف تھا۔ یعنی اس نے اسے دیکھ لیا تھا لیکن اس نے اسے پوچھا بھی نہیں کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔

اس خیال نے اسے احساس دلایا کہ یہ کچھ اچھی صورت حال نہیں۔ اتنی رات کو اس کا یہاں آنا...... نور بانو کیا سمجھے گی۔ اور اگر وہ اس سے پوچھے تو وہ کیا کہے گا۔ یہ کہ واقعی اس نے وہ الفاظ کہے تھے۔ اور جب وہ انکار کر دے گی تو...... تو کتنی شرمندگی ہو گی۔

مگر اس سے پلٹا بھی نہیں گیا۔ پلٹنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

وہ بت بنا اسے دیکھتا رہا۔ وہ بھی اسے دیکھ رہی تھی لیکن چند لمحوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کا رخ اس کی طرف ضرور ہے لیکن وہ اسے نہیں دیکھ رہی ہے۔ اس کی نگاہوں میں خالی پن کا ایسا تاثر تھا' جیسے وہ اس کے پار دیکھ رہی ہو۔

وہ اس کے لیے پلٹ جانے کا بہت اچھا موقع تھا لیکن وہ تو ہلنے کے قابل نہیں تھا۔ بے بس

کھڑے رہنے کے سوا وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ پھر نجانے کتنی دیر کے بعد نور بانو کی محویت ٹوٹی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت سی چمکی' اور پھر بے یقینی جھلکنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے تاثر سے واضح تھا کہ جو کچھ دیکھ رہی ہے' اسے فریب نظر سمجھ رہی ہے۔

بے بس کھڑا عبدالحق کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔

چند لمحوں میں نور بانو کو احساس ہو گیا کہ وہ فریب نظر نہیں ہے۔ اس نے بے اختیار دوسری چارپائی پر سوئی ہوئی زرینہ کو دیکھا اور دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھی' جہاں عبدالحق بت بنا کھڑا تھا۔

''آپ...... آپ مجھے ڈانٹنے کے لیے آئے ہیں؟'' اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

عبدالحق کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ بس نفی میں سر ہلا کر رہ گیا۔

وہ کچھ مطمئن نظر آنے لگی۔ ''تو پھر؟''

''یہ کون سو رہا ہے آپ کے کمرے میں؟'' عبدالحق نے گڑبڑا کر پوچھا۔

نور بانو مسکرائی۔ ''زرینہ ہے۔''

''سو رہی ہے نا؟'' عبدالحق کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

نور بانو کی مسکراہٹ اور کشادہ ہو گئی۔ ''جی ہاں، گہری نیند سو رہی ہے۔ مگر آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کیوں آئے ہیں۔''

''وہ...... میں......'' عبدالحق کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ ''آپ...... آپ میرے کمرے میں آئی تھیں نا۔ مجھے چچا جی کی کتابیں بھی دی تھیں نا؟''

نور بانو کا ذہن الجھنے لگا۔ ''جی...... جی ہاں۔ آپ کو شک ہے کیا؟''

''جی نہیں۔'' عبدالحق نے کہا، پھر بے ساختہ اس کے منہ سے وہ بات نکل گئی۔ ''آپ نے آخر میں...... میرے دروازے پر رک کر...... پلٹ کر کچھ کہا تھا؟''

''جی ہاں۔ کیا آپ کو یاد نہیں۔'' نور بانو نے عجیب لہجے میں کہا۔

''کیا کہا تھا آپ نے؟''

''آپ چاہتے ہیں کہ میں وہ دہراؤں؟'' نور بانو کے لہجے میں چیلنج تھا۔

''جی ہاں۔''

نور بانو کی نظریں جھک گئیں۔ ''کیوں؟''

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ مجھے وہم ہو گیا ہے۔''

''عجیب آدمی ہیں آپ۔'' نور بانو نے جھنجلا کر کہا۔ پھر ایک دم اس نے نظریں اٹھائیں اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''آپ مجھے کم ہمت سمجھتے ہیں نا لیکن میں یہ بات کسی کے سامنے بھی کہہ سکتی ہوں۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں...... اتنی...... اتنی کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ اب

بولئے' کچھ اور بھی سننا چاہتے ہیں۔ آپ؟''

''جی نہیں...... شکریہ۔ شب بخیر۔'' عبدالحق نے کہا اور پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

نور بانو کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ پھر اپنے بستر پر چلی گئی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق سوچنے والا آدمی تھا اور سوچ رہا تھا!

ایک بات وہ یقین سے کہہ سکتا تھا۔ یہ اس کی زندگی میں آنے والی سب سے بڑی خوشی تھی۔ شاید سب سے بڑی اس لیے کہ اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ یہ خوشی اسے مل سکتی ہے۔ پہلی بار اس کی آواز میں قرأت سن کر اس کے دل میں عجیب سے جذبے جاگے تھے۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس نے جان لیا تھا کہ وہ محبت ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے' اس کا نام کیا ہے اور وہ دیکھنے میں کیسی ہے۔ بس وہ یہ جانتا تھا کہ اسے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ اس محبت ہی کے سہارے وہ بڑی کٹھن آزمائشوں میں سرخرو ہوا تھا۔ وہ محبت نہ ہوتی تو وہ دہلی میں اس رات ریٹا پارسن کے ساتھ پستی میں گر چکا ہوتا۔ اس رات وہ جسم کے' نفس کے فتنوں سے پوری طرح واقف ہو گیا تھا لیکن وہ اسی محبت کی عظمت تھی کہ وہ نفس کے اس جال سے نکل آیا تھا...... محض روح پر لگنے والی چند خراشوں کے ساتھ۔ اور یہ محبت ہی تھی کہ جس کی وجہ سے اس نے اس رات کے بعد کبھی کسی لڑکی کو اس انداز میں نہیں دیکھا۔ اس کے جسم میں کبھی فتنے نہیں جاگے تھے۔ خواہشوں نے کبھی اسے بے چین نہیں کیا تھا۔

اس نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ آنکھیں بند کرتا تو بند آنکھوں کے پیچھے نور بانو کا سراپا لہرانے لگتا۔ یہ بھی نئی بات تھی۔ پہلے وہ اس بارے میں سوچتا تو اس کی آواز سماعت میں گونجتی۔ مگر اب آواز کی بجائے وہ اس کے سامنے مجسم ہو رہی تھی۔ اور یہی نہیں' اس تصور کو وہ بڑے اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔

نور بانو کو وہ پہلے بھی دیکھتا رہا تھا۔ لیکن وہ اسے تصور میں کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ اس کے پاس حوالہ صرف آواز کا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس وقت وہ محبت یک طرفہ تھی۔ اسے حق نہیں تھا اسے دیکھنے کا۔ مگر اب نور بانو کے اظہار محبت نے اسے یہ حق عطا کر دیا تھا۔ اور ایسا ہوتے ہی آواز کہیں پیچھے چلی گئی تھی۔ اس وقت اسے یہ خیال نہیں آیا کہ وہ آواز محض آواز نہیں تھی۔ اس آواز کا لباس تو قرأت تھی۔ مگر اب تو ہر چیز پر سراپا چھا گیا تھا۔ یہی نہیں' وہ جسمانی طور پر خود کو بے چین محسوس کر رہا تھا۔ ایک تشنگی سی تھی۔ جو جھنجلاہٹ جگا رہی تھی۔ جیسے آدمی کچھ کرنا چاہے اور کر نہ پائے۔ وہ اسے پوری طرح سمجھ نہیں رہا تھا۔

بار بار کوشش کے باوجود وہ نہ سو پایا تو جھنجلاہٹ اور بڑھ گئی۔

اچانک اسے ایک بہت بڑی خوشی یاد آئی۔ اور وہ بھی نور بانو ہی کے دم قدم سے تھی۔ جس رات وہ کوٹھے پر چلا گیا تھا' جہاں نور بانو سورہ الملک کی تلاوت کر رہی تھی۔ جہاں اس نے یکساں اور ہموار آسمان کا مشاہدہ کیا تھا...... اور جب اسے ساتوں آسمان نظر آئے تھے...... اور اس نے کلمہ پڑھا تھا۔ مگر وہاں اسے کیسی میٹھی' پیاری اور پُر سکون نیند آئی تھی' جیسے خوشی اور راحت اس کی روح میں سرایت کر گئی ہو...... اور وہ ایک لمحے میں بے خبر سو گیا تھا۔ وہ بے ہوشی یا غشی ہرگز نہیں تھی۔ بعد کی کیفیت نے یہ بات ثابت کر دی تھی۔

ایک اور بات تھی۔ قرآن پڑھنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ قرآن پڑھنے میں بھی اسے بہت خوشی ملتی تھی۔ قرآن پڑھنے کے دوران نیند ہوا کے خنک اور خوش گوار جھونکوں کی طرح اسے جھولے جھلاتی تھی۔ اور قرآن پڑھنے کے بعد بھی اسے بہت گہری نیند آتی تھی۔

اور اب اسے یہ خوشی ملی تھی' جو اس کے خیال میں اب تک اس کی زندگی میں آنے والی سب سے بڑی خوشی تھی۔ یہ احساس کہ جس لڑکی کو وہ دنیا میں ہر چیز سے بڑھ کر چاہتا ہے' وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے' بلاشبہ بہت بڑی خوشی تھی۔ مگر اس خوشی میں پچھلے تجربات کے برعکس کیوں ہو رہا تھا۔ وہ نیند سے محروم کیوں ہو گیا تھا۔ اس کے اندر بے سکونی کیوں تھی۔ اسے کسی تشنگی کا...... کسی کمی کا ناقابل فہم احساس کیوں ستا رہا تھا۔

اس نے پھر آنکھیں موند لیں' اور نور بانو کا سراپا پھر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اس تصور نے چند لمحے تو اسے خوشی دی۔ مگر پھر اس کے جسم میں اینٹھن ہونے لگی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

وہ جب بھی پریشان ہوتا تھا' قرآن کا سہارا لیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اٹھا' وضو کر کے آیا اور قرآن لے کر بیٹھ گیا۔ سورۃ النبا اس کے سامنے تھی...... عم یتسا لون......

اور وہ ایک دم پُر سکون ہو گیا۔ وہ قرآن میں کھو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ قرآن وہ بہت توجہ سے پڑھتا تھا...... سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔

وہ پڑھ رہا تھا۔ اللہ فرما رہا تھا کہ اس نے زمین کو بچھونا بنایا' اور پہاڑوں کو زمین کی میخیں۔ یہ مضمون وہ کہیں اور بھی پڑھ چکا تھا۔ وہ تین دلیلوں میں سے تھیں۔ اللہ نے زمین کو ہموار کیا تھا' ورنہ اس پر گھر بنانا' رہنا' چلنا پھرنا ممکن نہ ہوتا۔ اور ایک جگہ فرمایا تھا کہ زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں کہ کہیں یہ تمہیں لے کر لڑھک نہ جائے۔ یعنی پہاڑوں کے ذریعے زمین کو متوازن کر دیا تھا۔

یہ بات عبدالحق کی سمجھ میں بہت اچھی طرح آتی تھی۔ کیونکہ قرآن میں کئی جگہ قیامت کا ذکر فرماتے ہوئے۔ اللہ نے پہاڑوں کے مٹ جانے کا ذکر فرمایا تھا۔ گویا قیامت کا ایک سبب زمین کے توازن کا خاتمہ بھی ہوگا۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ یعنی میخیں نہیں رہیں گی' اور زمین

اپنے ہر بوجھ کو لے کر لڑھک جائے گی۔

یہ آیات پڑھتے ہوئے اس پر ہمیشہ لرزہ چڑھ جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اللہ کی قدرت کو پوری طرح وہ کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن وہ جتنی بھی اس کی سمجھ میں آ رہی تھی ہے' وہ اسے لرزا دینے کے لیے ضرورت سے زیادہ ہے۔ شاید اس سے زیادہ سمجھ میں آجائے تو وہ وحشت سے مر ہی جائے

اس نے اللہ کا شکریہ ادا کیا کہ اسے قرآن پڑھنا نصیب ہوا۔ ورنہ اسے اللہ کی قدرت کا کیسے علم ہوتا۔ وہ تو قیامت سے بھی بے خبر ہوتا...... حساب کتاب' جزا و سزا وہ طویل دن' جس سے پیغمبر بھی گھبراتے ہیں۔ اور جب یہ سب اسے معلوم ہی نہ ہوتا تو وہ ڈرتا کیسے۔ اور اللہ انہی لوگوں کو تو بخشے گا' جو ڈرتے ہیں۔

اگلی آیت پر وہ ٹھٹک گیا...... اور تمہیں جوڑوں میں پیدا کیا!

اس بات کا اسے تجربہ تھا۔ ایک آیت آدمی دسیوں مرتبہ سرسری پڑھتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ اور ایک دن اچانک اس سے کوئی بات سمجھ میں آتی ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ اس نے پا لیا۔ وہ اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ مگر کچھ وقت کے بعد وہ مفہوم اس کے ذہن میں محو ہو جاتا ہے' اور اسے پتا بھی نہیں چلتا۔ پھر کسی دن وہی آیت پڑھتے ہوئے ایک اور مفہوم اس پر واضح ہو جاتا ہے۔

عبدالحق نے سمجھ لیا تھا کہ اللہ کا یہ کلام رُوئے زمین پر حکمتوں کا منبع ہے۔ ایک ایک آیت میں' بلکہ ہر ہر لفظ میں ہر حرف میں سینکڑوں' ہزاروں حکمتیں پنہاں ہیں۔ ہر دور کے تمام انسان قیامت تک غور و فکر کرتے رہیں' سمجھنے کی کوشش کرتے رہیں۔ تو بھی اجتماعی طور پر ان حکمتوں کے عشرِ عشیر کو بھی نہ پا سکیں۔ یہی تو اس کے کلام اللہ ہونے کا ثبوت ہے۔ ورنہ تو عام کتابیں کتنی ہی پسند ہوں' چاہے بار بار پڑھ لی جائیں' لیکن بالآخر دل سے اتر جاتی ہیں۔ لیکن آدمی اس چیز کو تو کبھی ترک نہیں کرتا' جسے پوری طرح سمجھ نہ پائے۔ یہی وجہ ہے کہ جسے اللہ قرآن کی رغبت عطا فرما دے اور پڑھنے کی توفیق عطا فرما دے' وہ مرتے دم تک اسے پڑھنا نہیں چھوڑتا۔

تو اس وقت وہ اس آیت پر ٹھٹھک گیا...... اور تمہیں جوڑوں میں پیدا کیا!

یہ بات صرف انسانوں کے لیے نہیں تھی۔ اللہ نے تمام جان داروں کو جوڑوں سے پیدا فرمایا تھا...... یہ اس کا نظام ہے۔ اس کے ذریعے یہ سلسلہ قیامت تک قائم رکھنا تھا۔ اس لیے تو طوفان سے پہلے اللہ نے حضرت نوحؑ کو حکم دیا تھا کہ ہر جان دار کے ایک ایک جوڑے کو اپنی کشتی پر سوار کر لیں۔ تاکہ وہ ناپید نہ ہوں۔

اس نے سوچا' اگر بائیس سال کی محرومی کے بعد اللہ نے میرے ماں باپ پر کرم نہ فرمایا ہوتا اور میں پیدا نہ ہوتا تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی نسل ناپید ہو چکی ہوتی۔ پھر اس نے مزید کرم فرمایا کہ مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا کہ آئندہ کے لیے نسل سیدھی ہو جائے۔

مگر یہ سوچتے ہوئے وہ اداس ہو گیا۔ کاش...... کاش پتاجی مسلمان ہوتے۔

ذہن بھٹکنے لگا تھا۔ اس نے اسے پھر اس آیت پر مرکوز کیا۔ کیا اس کا مطلب ہے کہ اس نے تمام مردوں کے لیے کچھ خاص عورتوں کو مخصوص فرما دیا ہے۔ جوڑوں میں پیدا فرمایا کا مطلب تو یہی ہے۔ کوئی مرد کہیں ہوتا ہے اور عورت کہیں اور۔ کسی کو پتا نہیں ہوتا کہ وہ کس کے لیے ہے۔ لیکن اللہ کے مقرر کردہ وقت پر وہ دونوں مل جاتے ہیں۔ شاید یہ طے ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اللہ نے نور بانو کو میرے لیے بنایا تھا۔ کل تک مجھے اس کا علم نہیں تھا لیکن آج میں جان گیا ہوں کہ وہ میرے لیے ہے۔

اس خیال کے ساتھ ہی ذہن منتشر ہونے لگا۔ وہ نور بانو کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کا سراپا نگاہوں میں پھر گیا۔ اس نے جلدی سے سر جھٹکا' اور اگلی آیت پڑھی۔

مگر اس کا دل اب بھی پیچھے ہی اٹکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ ٹھاکروں کی گڑھی میں پیدا ہوا اور نور بانو دہلی میں۔ وہ ہندو راجپوت گھرانے میں پیدا ہوا اور نور بانو مسلمان گھرانے میں۔ کون سوچ سکتا تھا کہ اللہ نے انہیں ایک دوسرے کے لیے بنایا ہے...... اور ظاہر ہے کہ اس کے ہندو ہوتے تو یہ جوڑ ناممکن تھا۔ تو شاید اسی لیے وہ نواز دیا گیا۔

اس نے سوچا' اگر میں تعلیم کے لیے دہلی نہ جاتا...... اور دہلی جاتا' لیکن میرا قیام کہیں اور ہوتا تو کیا ہوتا، لیکن فوراً ہی اس کے اندر آواز اٹھی کہ یہ سب کچھ یونہی ہونا تھا۔ یہ سب اللہ نے لکھ دیا تھا۔ اور اگر یہ یوں نہ بھی ہوتا' تب بھی انجام کار ان دونوں کو ملنا ہی تھا۔ یوں نہ ہوتا تو کسی اور طرح ہوتا۔

تو کیا یوں ہے کہ اللہ نے انسان کو دو حصوں میں بنایا ہے۔ اور پھر انہیں الگ الگ پیدا فرمایا ہے۔ ساتھ ہی ان کے ملنے کے لیے بھی ایک پروسس ترتیب دیا ہے۔ اور ان کا ملنا دونوں کی تکمیل ہوتا ہے۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اسے ایک بھولی بسری خوشی یاد آئی۔ بچپن سے وہ اسی طرح سوچتا اور کھوجتا آیا تھا۔ مگر جب سے وہ مسلمان ہوا تھا' اسے اس طرح سوچنے اور کھوجنے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ اسلام قبول کرتے ہی سفر کا حکم ملا تھا۔ پھر زندگی کی دوسری مصروفیات ایسی شروع ہوئیں کہ وہ سب کچھ بھول ہی گیا۔ لاہور میں وہ نت نئے مشاہدات میں گھرا رہا۔ یہ البتہ بڑی بات تھی کہ قرآن وہ بہرحال باقاعدگی سے پڑھتا رہا...... اور نماز بھی۔ قرآن کے بغیر تو اسے چین نہیں آتا تھا۔ لیکن سوچنا اور غور کرنا وہ جیسے بھول ہی گیا تھا۔ آج پہلے کی طرح سوچتے ہوئے اسے خوشی ہوئی۔ اس راستے پر چل کر ہی تو اس نے ہدایت پائی تھی۔ آج جیسے وہ پھر سے جی اٹھا تھا اس نے آگے کی تین آیات پڑھیں۔ نیند کو باعثِ سکون بنایا۔ رات کو پردہ پوش اور دن کو رزق کے لیے۔

اللہ اپنی نعمتوں کا بیان فرما رہا تھا۔ نیند...... اللہ کی بہت بڑی نعمت۔ دن بھر کا تھکا ہارا انسان

[...]ب سوتا ہے تو نڈھال ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو انگلی ہلانے کی بھی سکت نہیں ہوتی اس میں۔ اور [...]ب نیند پوری کر کے اٹھتا ہے تو کیسا تازہ دم ہوتا ہے...... توانائی سے لبالب بھرا۔ کارزارِ زندگی [...]ں لڑنے کے لیے ایک بار پھر تیار۔ اور اگر کوئی کسی وجہ سے محض دو رات نہ سو پائے تو اس کا [...]یا حال ہوتا ہے۔ سوچنے سمجھنے' فیصلہ کرنے کی قوت ختم' قوتِ عمل مفلوج...... آدمی کسی کام کا بھی [...]یں رہتا۔ اور رات کو پردہ پوش بنایا!

اندھیرا جو دن میں برا لگتا ہے۔ کیونکہ اللہ نے دن کو معاش کے لیے بنایا۔ دنیا کے کام کرنے [...]تے ہیں' جن کے لیے روشنی ضروری ہوتی ہے۔ اندھیرا' جس سے آدمی ڈرتا ہے۔ اندھیرا' جس [...]ں اَن جانے خوف چھپے ہوتے ہیں۔ لیکن رات کو آرام کے وقت اس اندھیرے میں کتنا سکون [...]تا ہے۔ وہ خود روشنی میں کبھی سو ہی نہیں سکتا۔ مکمل اندھیرے کے بغیر اسے نیند ہی نہیں آتی۔

رات پردہ پوش!

ایک دم اسے خیال آیا کہ رات بھی خلوت ہے۔ اور محبت بھی خلوت کی چیز ہے۔ گویا محبت کا [...]ت سے خاص تعلق ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں اردو شاعری کا باب کھل گیا' [...]ں میں ہجر اور وصال کی بڑی اہمیت تھی۔

اسے حیرت ہوئی اس نے محبت سمجھنے کے لیے اردو کا شاعری کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا [...]۔ لیکن وہ اس بات پر کبھی غور نہیں کر سکا تھا کہ ہجر اور وصل' دونوں ہی اردو شاعری میں رات سے [...]لک ہیں۔ ہجر کی فریاد ہوتی ہے تو شب ہجر کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اور وصل کی کیفیات بھی شب وصل کے حوالے سے بیان کی جاتی ہیں۔ شاعری میں وصل کے حوالے سے ابتذال بھی ہے۔ اردو [...]ے استاد نے اسے محبت اور ہوس کا فرق سمجھاتے ہوئے یہ بات بتائی تھی۔ اسے یاد تھا' انہوں نے [...]لے میں اشعار بھی سنائے تھے۔ دو شعر تو اسے اس وقت بھی یاد تھے......

حائل تھی بیچ میں جو رضائی تمام شب
[...] غم میں ہم کو نیند نہ آئی تمام شب

[...] تو خالص لفنگا پن تھا...... کسی اوباش کا سا چیلنج......

اتنی اونچی بھی تو دیوار تیرے گھر کی نہیں
رات اندھیری کوئی آئے گی نہ برسات میں کیا!

پہلے کی طرح اس وقت بھی اس کی طبیعت مکدر ہو گئی۔

اردو کے استاد نے کہا تھا کہ وصل کوئی بری چیز نہیں۔ برائی تو آدمی کے اندر ہوتی ہے مقدس [...]ل کو آدمی خراب کر دیتا ہے۔ ہوس کو محبت کہہ کر اور گناہ کو وصل قرار دے کر۔ ورنہ وصل تو محبت [...]معراج ہے' اور ہجر اس معراج کی راہ گزر۔ معصیت اور معصومیت میں پاتال اور آسمان جتنا بعد

اور فاصلہ ہے۔

اس نے سوچا...... لیکن گناہ اور وصل دونوں کے لیے ہے رات ہی۔ جسموں کے بازار بھی رات ہی کو سجتے ہیں۔ دن میں سوتے رہتے ہیں۔ ہوس پرست بھی رات ہی کے وقت بازاروں کا رخ کرتے ہیں۔

رات پردہ پوش!

اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے پتاجی اور ماتاجی کو کبھی ایک دوسرے کے بہت قریب دیکھا ہو۔ دن بھر پتاجی یا تو باہر ہوتے تھے' یا باہر دیوان خانے میں' جہاں وہ زمینوں کے معاملات نمٹاتے تھے۔ پھر رات کو وہ اپنے کمرے میں سوتے تھے' اور ماتاجی اس کے کمرے میں اس کے ساتھ سوتی تھیں۔ عبدالحق کو صرف ایک ایسا موقع یاد تھا' جب اس کو ماتاجی کے پتاجی کے کمرے میں جانے کا علم ہوا تھا۔ وہ شاید اس وقت پانچ چھ سال کا ہوگا۔ اچانک اس کی آنکھ کھلی تو ماتاجی اس کے پاس نہیں تھیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تو ماتاجی کمرے سے نکل رہی تھیں۔ اس نے انہیں پکارا

''کیا بات ہے میرے چھوٹے ٹھاکر' آپ کیوں اٹھ گئے؟''

''آپ کہاں جا رہی ہیں؟'' اس نے نندا سی آواز میں کہا۔

''تمہارے پتاجی کے پاس۔''

''کیوں؟''

''ان کی سیوا کرنی ہے۔''

اسے اب بھی یاد تھا۔ وہ سوال بہت کرتا تھا۔ ''کیوں؟'' اس نے پوچھا۔

''پتی کی سیوا تو پتنی کا دھرم ہوتا ہے چھوٹے ٹھاکر۔''

''اور سیوا کیا ہوتی ہے؟''

''پتی کے پاؤں دبانا' سر میں تیل لگانا' ان کی تھکن دور کرنا۔''

''تو آپ روز سیوا کرتی ہیں پتاجی کی؟''

''تو اور کیا۔ میں نے کہا نا کہ یہ تو دھرم ہے میرا۔''

''اوہ مجھے یہاں اکیلا چھوڑ جاتی ہیں۔''

ماتاجی اس کے پاس بیٹھیں اور اس کا سر سہلانے لگیں۔ ''دیکھو چھوٹے ٹھاکر' دن رات تو میں آپ کے پاس ہوتی ہوں۔ آپ ہی کے ساتھ سوتی ہوں۔ ان کی سیوا کے لیے تھوڑے سے کو چلی جاتی ہوں' اور وہ بھی آپ کے سونے کے بعد۔ آپ کہتے ہیں تو نہیں جاؤں گی۔ پرنتو آپ کے پتاجی کے سر میں درد رہے گا۔ ٹانگوں میں پیڑ رہے گی......''

وہ تڑپ گیا۔ نہیں ماتاجی' آپ جائیں۔ روز جایا کریں۔ میری تو ایسے ہی آنکھ کھل گئی تھی۔

و جاؤں گا۔''

ماتاجی چلی گئی تھیں' اور وہ واقعی چند منٹ میں سو گیا تھا۔

مگر اب اس چھوٹے سے حوالے سے بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ ماتاجی کے دیہانت کے بعد پتا
وب صورت کمرا اجڑ گیا تھا۔ وہ وہاں جاتے ہی نہیں تھے۔ وہ تو اس کے ساتھ سوتے تھے......
ی کی جگہ لیٹ کر۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا۔ پتاجی عمر بھر کے ہجر سے دوچار تھے۔ ماتاجی کی جگہ لیٹ
اید انہیں ان کی قربت کا احساس ہوتا ہوگا۔ شاید ہجر وصل میں بدل جاتا ہوگا۔ دوسری طرف وہ
کے ہجر کے دکھ کو بانٹتے تھے۔

اور ماتاجی کے دیہانت کے چھ سات ماہ بعد وہ دہلی چلا گیا تھا۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا پتاجی کی
ن کو۔ ان کا ہجر تو دہرا ہو گیا تھا۔ وہ دوبارہ اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ شاید اس کے کمرے
انہیں اس کی یاد ستاتی ہوگی۔ جبکہ ان کے کمرے میں ماتاجی کی یادیں ہوں گی۔ مگر یہ لمحہ تھا کہ
ان سے روٹھ گئی تھی۔ پہلی بار وہ ٹھیک سے اس دن سوئے تھے' جب انہوں نے اسے اپنے
ہ لیٹ کر سونے کو کہا تھا۔ اس رات اس سے لپٹ کر گہری نیند سو گئے تھے۔

تو اللہ نے دن کو معاش کے لیے بنایا اور رات کو آرام کے لیے...... نیند کے لیے دن کا وقت
کی ذمہ داری پوری کرنا...... لوگوں کے حقوق ادا کرنا...... فرائض کی ادائیگی۔ اور رات...... نیند
آرام کا وقت خالصتاً آدمی کا اپنا ذاتی وقت۔ اور محبت بھی بہت ذاتی چیز ہے۔ تو اس کے لیے
ت ہی کا وقت ہونا۔ رات آرام کا وقت! رات محبت کا وقت!

رات پردہ پوش!

اس کے ذہن میں رات کے حوالے سے سورۃ المزمل کی آیات آئیں' جن میں اللہ نے
ہدایت فرمائی تھی کہ قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھا جائے۔ اس سے اگلی آیات میں تھا کہ رات
ا اٹھنا نفس پر قابو رکھنے کے لیے اور قرآن پڑھنے کے لیے بہت ہی خوب ہے۔ جبکہ دن میں یقیناً
ہاری بہت سی مصروفیات ہیں۔ اور ان آیات میں خطاب حضور ﷺ سے تھا

لیکن ذہن میں اب بھی خلش تھی۔ کچھ اور آیات تھیں' جو یاد آتے آتے رہ جاتی تھیں۔

قرآن کے معاملے میں عبدالحق کا ایک اور تجربہ تھا۔ اس میں اللہ کی رحمت بندے کے ساتھ
وتی تھی۔ اب اسے جو آیات یاد آ رہی تھیں' وہ انہیں پڑھنا چاہتا تھا لیکن یہ یاد کرنا کہ وہ آیات کس
ورۂ مبارکہ میں ہیں' آسان نہیں تھا۔ مگر ایسا بارہا ہوا تھا کہ اس کے دل میں ایک سورۂ کا نام ابھرا'
ور اس نے کھول کر دیکھا تو واقعی وہ آیات اس سورۂ مبارکہ میں تھیں۔

وہ سوچتا تھا کہ کوئی اس دور میں بھی معجزے دیکھنا چاہے تو قرآن کا دامن تھام کر دیکھ لے۔
یہ بھی تو معجزہ ہے کہ قرآن کو وہ لوگ بھی حفظ کر لیتے ہیں۔ جن کی مادری زبان عربی نہیں ہوتی۔ اس

امر پر اس کی حیرت کبھی کم نہیں ہوتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا حافظہ بہت اچھا ہے لیکن وہ کسی درسی کتاب کے دس بارہ صفحات پر مشتمل ایک باب کو بھی لفظ بہ لفظ یاد نہیں کر سکتا تھا...... وہ بھی اس زبان میں' جسے وہ پوری طرح سمجھ سکتا تھا۔ جس پر اسے قدرت حاصل تھی۔

سچ تو یہ کہ وہ بھی قرآن حفظ کرنا چاہتا تھا لیکن اسے ہمت نہیں ہوتی تھی۔

اس وقت بھی اللہ کی مدد اس کے لیے آپہنچی۔ اس کے ذہن میں سورۃ ذاریت کا نام ابھرا۔ اس نے اوراق پلٹے۔ سورہ ذاریت کھول لی۔ اور واقعی وہاں وہ آیات موجود تھیں......

''البتہ متقی لوگ ہوں گے باغوں میں اور چشموں میں' لے رہے ہوں گے جو عطا فرمایا ہوگا انہیں ان کے رب نے' اور اس کے بعد اللہ نے اس عنایت کا سبب اور ان بندوں کی وہ خصوصیات بیان فرمائی تھیں' جو اس کی بارگاہ میں مقبول ہوئی ہیں۔ آگے اللہ فرماتا تھا۔' بلاشبہ یہ لوگ تھے اس سے پہلے بہت اچھا اور معیاری کام کرنے والے تھے۔ یہ لوگ ایسے کہ کم ہی راتوں کو سویا کرتے تھے۔ اور رات کے پچھلے پہروں میں یہ انتظار کیا کرتے تھے۔ اور ان کے مالوں میں حق مانگنے والوں کا اور حاجت مندوں کا۔'

یعنی راتوں کو اپنی نیند اور آرام چھوڑ کر اللہ کی عبادت کرنا' قرآن پڑھنا اور استغفار کرنا اللہ کی مہربانی کو پکارنا ہے۔

وہی رات!

رات پردہ پوش!

رات' نیند اور آرام۔ رات محبت اور عشق۔ رات ہجر اور وصال۔ رات خالص ذاتی وقت!

عبدالحق کو یاد آیا۔ تعلیم کے دوران ایک بار اس نے کتاب میں اللہ کے کسی برگزیدہ بندے کی سوانح میں لکھا دیکھا کہ فلاں تاریخ کو ان کا وصال ہوا۔ یہ وہی عرصہ تھا' جس میں وہ عشق و محبت کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا' اور اردو شاعری اس کے زیر مطالعہ تھی۔ یہ پڑھ کر اس کا ذہن الجھا تو اس نے اردو کے استاد سے رجوع کیا' جو کہتے تھے کہ کوئی الجھن درپیش ہو تو مجھ سے کلاس کے باہر اس پر بات کیا کرو۔

استاد اس کی بات سن کر مسکرائے۔' یہاں وصال کا مطلب انتقال ہے۔' انہوں نے کہا۔

''لیکن وصال اور انتقال میں تو بہت فرق ہے۔'' اس نے اعتراض کیا تھا۔

''یہ تصوف کی اصطلاح ہے۔ عشق حقیقی سے تعلق ہے اس کا۔'' استاد نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔'' دیکھو' جو بندہ اپنے رب سے اور اس کے رسول ﷺ سے عشق کرتا ہے' اس کے لیے یہ زندگی' دنیا میں یہ قیام درحقیقت ہجر ہے۔ اور موت اس کے لیے موت نہیں' اپنے محبوب کا وصل ہے۔ وہ رب سے جا ملتا ہے' تو یہ تو وصال ہوا نا۔''

وہ چند لمحے سوچتا رہا۔ اندر ہی اندر وہ اس جواب سے پھڑک گیا تھا لیکن پھر اس نے [اعتر]اض کیا۔ ''تو وہ محبوب سے ملنے کی آرزو پوری کرنے کے لیے خودکشی کیوں نہیں کر لیتے؟''

استاد مسکرائے۔ ''وصل بہت بڑی نعمت ہے بیٹے' اور بڑی نعمتیں یونہی تو حاصل نہیں ہوتیں۔ [ہجر] تو عشق کی کسوٹی ہے۔ ہجر ہی تو درجہ عشق کا تعین اور اس کی تصدیق کرتا ہے۔ محبوب ہجر میں مبتلا [کر] کے عاشق کو جانچتا ہے۔ اب سوچو' اگر کوئی اللہ سے عشق کرتا ہے تو زندگی کو یعنی محبوب کے ہجر کو [برضا و رغب]ت تو تسلیم کرے گا نا۔ محبوب کی دی ہوئی کسی بھی چیز کو کوئی عاشق ٹھکرا نہیں سکتا' خواہ وہ ہجر ہی [کی]وں نہ ہو۔ اس آزمائش سے سرخ روئی کے ساتھ گزرنے پر ہی تو اسے انعام میں وصل ملے گا۔ [عش]ق تو بیٹے تپسیا مانگتا ہے اور عشق کی تپسیا ہجر ہے۔''

عبدالحق کو یاد تھا' یہ کہتے ہوئے استاد نے ایک شعر سنایا تھا......

یہ عشق نہیں آساں' بس اتنا سمجھ لیجے

اک آگ کا دریا ہے اور تیر کے جانا ہے

اسے یاد تھا کہ وہ عشق حقیقی اور عشق مجازی میں بہت الجھتا تھا...... خاص طور پر شاعری کے [حو]الے سے۔ اردو کے استاد کہتے تھے کہ جو شعر بے ساختہ کہا جاتا ہے۔ وہ الہامی ہوتا ہے۔ اس کا [ث]بوت یہ ہے کہ شاعر کے نزدیک اس کی تشریح ہوتی ہے' اور شعر پڑھنے یا سننے والا اسے ایک بالکل [مختل]ف مفہوم میں لیتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ایک شعر سناتے تھے۔

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں

اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر آتا ہے پروانہ

''اب کوئی اسے عشق مجاز کی طرف لے جائے یا عشق حقیقی کی طرف۔'' استاد نے کہا تھا۔

عبدالحق نے خاصی دیر اس پر غور کیا تھا لیکن اسے تو وہ خالص رومانوی شعر لگا تھا۔ عشق حقیقی کا تو اس پر گمان بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہی بات اس نے استاد سے بھی کہی تھی۔

''اب اس طرح سے سوچو۔'' استاد نے کہا تھا۔ ''تمام انسان پروانے ہیں' شمع یہ دنیا ہے اور پروانے کی فطرت خالق کل نے ایسی بنائی ہے کہ وہ شمع کی طرف لپکتا تھا۔ روز ازل تو اسے نظر ہی نہیں آتا۔''

اب عبدالحق سمجھ سکتا تھا۔ اللہ نے دنیا بنائی' اور بہت خوب صورت بنائی۔ متاع زیست عطا فرمایا اور انسان کے دل میں اس کی محبت ڈال دی۔ پھر خود کو چھپاتے ہوئے اسے سب کچھ بتا دیا۔ یہ بھی کہ دنیا عارضی ہے۔ اور یہ بھی کہ جنت اس سے کروڑوں گنا خوبصورت اور نعمتوں والی ہے' اور وہ اسے ملے گی' جو اس عارضی دنیا کی ترغیبات سے صرف نظر کر کے' بن دیکھے اللہ پر ایمان لائے گا' اور اس کی اور اس کے پیغمبروں کی اطاعت کرے گا۔ مگر آدمی تو دنیا کی رنگینیوں میں ایسے

الجھتا ہے کہ اللہ اسے یاد ہی نہیں رہتا' ویسے ہی جیسے پروانے شمع کی طرف لپکتے ہیں۔

واقعی...... یہ تو عشقِ حقیقی کا معاملہ ہے۔

مگر اسی لمحے اسے کچھ یاد آیا وہ شاک میں رہ گیا۔ ارے...... اس رات ہیرا منڈی میں مغنیہ یہی شعر تو گا رہی تھی۔ اور پھر کیسے تکرار کر رہی تھی' جیسے چیلنج کر رہی ہو...... اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر آتا ہے پروانہ۔

اسی وقت اذان کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ارے صبح ہوگئی۔ اس نے ہڑبڑا کر سوچا۔ پھر دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی۔ ارے...... آج میں تہجد سے محروم ہوگیا۔

اس کے اندر ایک جھنجلاہٹ سی ابھری۔ یہ سونا کیوں ضروری ہے تہجد کے لیے۔ جواب فوری طور پر اس کے اندر ابھرا۔ یہ فرض نماز نہیں ہے نادان' یہ نمازِ محبت ہے اور نہ سونا تو بہت آسان ہے۔ ہاں سونا' اور پھر نیند پوری نہ ہونے کے باوجود تھکے ہوئے جسم کے ساتھ اپنے رب سے خلوت میں...... خصوصی ملاقات کے لیے اٹھنا اور تیار ہونا مشکل ہے' جبکہ ہوا کے جھونکے لوری سناتے ہوں اور تھپکیاں دیتے ہوں' تو جاگنا آسان نہیں ہوتا۔

یہی تو محبت کی نماز ہے!

❁ ❁ ❁

عبدالحق کو یہ احساس تو تھا کہ یہ اس پر ایک ایسی رات گزری ہے' جو زندگی کا رخ تبدیل کر دیتی ہے لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ کتنی زیادہ اور کیسی کیسی تبدیلیاں رُونما ہوئی ہیں۔ یہ بھید تو اس پر رفتہ رفتہ کھلتا تھا۔

پہلی تبدیلی کا احساس تو اسے فجر کی نماز میں ہی ہوگیا۔ نماز میں حضوری کی وہ کیفیت نہیں تھی' جو اس نماز کا خاصہ تھی۔ اب تو نماز میں اس کے تصور میں نور بانو کا سراپا لہرا رہا تھا۔

اسے بے چینی تو ہوئی لیکن اس نے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس کے خیال میں یہ وقتی تبدیلی تھی لیکن باقی نمازوں میں بھی یہی کیفیت رہی تو وہ پریشان ہوگیا۔

اگلے روز سے اس نے اس کیفیت سے لڑنا شروع کر دیا۔ یوں نماز کے دوران وہ ایک باطنی جنگ لڑنے لگا۔ تمام وقت وہ نور بانو کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا تھا لیکن وہ ضدی سراپا تھا کہ اس کے تصور سے چپکا رہتا۔

اُس روز وہ فجر کے بعد مولوی صاحب کے پاس رک گیا۔ اس نے سورۃ المزمّل کی ان آیات کے حوالے سے بات کی۔ "یہ رات کی عبادت کی کیا اہمیت ہے مولوی صاحب؟"

مہر علی صاحب نے چند لمحے سوچا' پھر بولے۔ "دیکھو پتر' دن تو اللہ نے دنیا کے لیے بنایا ہے اور رات آرام کے لیے......"

"مگر نماز دن میں بھی تو پڑھی جاتی ہے۔" عبدالحق نے اعتراض کیا۔

"وہ تو اللہ کی رحمت ہے۔ وہ اپنے کسی بندے کو بھی محروم نہیں رکھنا چاہتا۔ اس لیے دن میں بھی فرض کر دیں۔ اب یہ سمجھ لو کہ دن کی نماز تو ایسے ہی ہے' جیسے دنیا کے کام۔ جیسے رزق کے لیے کوشش کرنی ہے' ویسے ہی نماز بھی پڑھنی ہے۔ یہ اس کی رحمت کہ اس نے رات کی ابتدا میں بھی نماز فرض کر دی۔ تاکہ تم آرام کے لیے لیٹو' تب بھی تمہارے اعمال میں یہ لکھ لیا جائے کہ آرام سے پہلے بھی تم نے عبادت کی تھی۔ اور صبح کی نماز فرض بھی رحمت ہے کہ تم دنیاوی دن کا آغاز بھی عبادت سے کر رہے ہو۔ اور اسی لیے فرض نماز جماعت سے ہے۔ ورنہ تو اللہ کو وہ اعمال بھی ناپسند ہیں' جن میں دکھاوے کا شائبہ بھی ہو۔ تم نے غور نہیں کیا پتر کہ اجتماعی عبادت صرف فرض نماز ہے۔ باقی نماز تو گھر جا کر پڑھنا ہی بہتر ہے۔ تو دن کی نماز کو تو دنیا ہی کا کام سمجھو۔"

"تو دن میں نوافل پڑھے جا سکتے ؟"

"یہ بہت نازک سوال ہے پتر۔ پڑھ سکتے ہو' مگر اس صورت میں کہ تم پر تمہارے اہلِ خانہ کے' پڑوسیوں' رشتہ داروں اور بستی والوں کے جو حقوق ہیں' وہ تم نے احسن طریقے سے ادا کر دیے اور اپنے لیے حلال رزق بھی حاصل کر لیا۔"

"اور اس کے بغیر دن میں نوافل پڑھنے کا اجر نہیں۔"

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا۔ دیکھو نا' دو باتیں ہیں اس میں۔ ایک تو تم کسی کی حق تلفی کر رہے ہو۔ دوسرے لوگ تمہیں دیکھیں گے تو اس عبادت کی بنیاد پر تمہیں عابد و زاہد اور متقی اور پرہیزگار سمجھنے لگیں گے۔ تو تم سمجھو نہ سمجھو' یہ دنیا دکھاوا ہوگا' جو اللہ کو پسند نہیں۔ اسی لیے رات کی عبادت کی بڑی فضیلت ہے۔ بھئی رات کی عبادت تو محبت ہے۔ تھکے ہوئے ہو۔ جی چاہتا ہے کہ بس لیٹو اور سو جاؤ۔ لیکن جا کر وضو کرتے ہو' پھر نماز پڑھتے ہو' قرآن پڑھتے ہو' ذکر و استغفار کرتے ہو' اس وقت میں جو خالص تمہارا اپنا ہے اور تمہیں دیکھنے والا کوئی نہیں۔ اس عبادت سے تم دنیا میں عزت اور شہرت نہیں کما رہے' صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کر رہے ہو۔

"اب دوسرے زاویے سے سوچو۔ اپنے محبوب سے تو ہر کوئی تنہائی میں ملنا چاہتا ہے۔ ربطِ خاص تو خلوت میں ہی ہے نا۔ جلوت میں تو رسوائی ہوتی ہے۔ اچھے عاشق تو رسوائی گوارا نہیں کرتے۔ محبوب کو بھی یہ اچھا نہیں لگتا۔ تو پتر تنہائی اور خلوت تو رات میں...... رات کے اندھیرے میں ہے' جب کوئی تمہیں دیکھنے والا نہیں' سوائے تمہارے محبوب کے۔ سمجھ رہے ہو نا پتر؟"

رات پردہ پوش! عبدالحق نے دل میں سوچا۔ "جی...... میں سمجھ رہا ہوں۔" اس نے مولوی صاحب سے کہا۔

مہر علی صاحب نے گہری سانس لی۔ "دیکھو پتر' انسان کی فطرت ایسی ہے کہ گناہ کی طرف

لپکتا ہے۔ اس کے لیے گناہ ہلکا ہے اور نیکی بھاری۔ اللہ گناہ کو پسند نہیں کرتا' لیکن بندے کی توبہ اسے بہت پسند ہے۔ لیکن بندے کے کھل کر اعلانیہ گناہ کرنے پر اللہ غضب ناک ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ڈھٹائی...... بلکہ اس سے بھی بہت آگے بڑھ کر اللہ کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ اور یاد رکھو' نیکی ہو یا گناہ' اللہ یہ پسند نہیں کرتا کہ بندہ اس پر گواہ بنائے۔ اور اللہ بہت کافی ہے گواہی کے لیے' وہ سمیع وبصیر ہے' علیم وخبیر ہے۔ سب کچھ جانتا ہے۔ گناہ کی تشہیر کی تو تم نے بغاوت کی' اعلانِ جنگ کیا۔ نیکی کی تشہیر کی تو نیک نامی اور عزت کی شکل میں صلہ وصول کر لیا۔ وہ رحیم وکریم اجر سے تو پھر بھی محروم نہیں کرے گا لیکن جو بے حساب اجر مل سکتا تھا' وہ تم نے کھو دیا۔ اور پتر' اللہ ستار العیوب ہے...... پردہ رکھنے والا۔ وہ تو گناہ گاروں کا بھی پردہ رکھتا ہے۔ اس نے رات بنائی' پردہ پوش۔ گناہ بھی چھپا لیتی ہے اور نیکی بھی۔ جبکہ معاف کرنے والا اور اجر دینے والا تو سب کچھ جانتا ہے۔ وہ نیکی' وہ عبادت' جس پر اس کے سوا کوئی گواہ نہیں' وہ تو عشق ہے۔ اور اس کے اجر کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔ اور وہ ستار تو اپنے بندوں کے گناہ بھی بندوں پر عیاں نہیں کرتا۔ اب سوچو' رات نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔''

رات پردہ پوش ہے!

''اللہ نے جو کچھ بھی پیدا فرمایا' اس میں اتنے بھید ہیں کہ بندہ پوری عمر کھوجتا رہے تو بھی اس پر نہ کھلیں۔'' مولوی صاحب نے کہا۔ ''رات کے بھیدوں کے بارے میں سوچتے رہا کرو پتر۔ اور اللہ سے پوچھا کرو۔''

عبدالحق کو میر کا ایک شعر یاد آگیا......

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا میر
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

❁ ❁ ❁

نادرہ کو اب رات سے خوف آتا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسے رات سے نفرت ہو گئی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ رات کا سکون اور راحت وہ پیچھے ہندوستان میں ہی چھوڑ آئی ہے۔ پاکستان میں جو اس نے پہلی رات گزاری تھی' اس سے رات کی خوف ناکی کا آغاز ہوا تھا۔ اور اسی کے بعد اس نے کوئی رات سکون کی نہیں گزاری تھی۔ اور رات کی نیند کو تو وہ ترس ہی گئی تھی۔ شام ہوتے ہوتے اس کا خوف بڑھتا جاتا۔ اور سورج غروب ہونے کے بعد تو وہ اندر ہی اندر لرزتی رہتی تھی۔

دوسرے اسے شام کے بعد سج سنور کر کوٹھے پر بیٹھنے سے نفرت تھی۔ حالانکہ اسے کبھی بہت زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھنا پڑتا تھا۔ اسے ان لڑکیوں پر ترس آتا تھا' جو بعض اوقات گھنٹوں وہاں بیٹھی رہتی تھیں۔

کوٹھے پر وہ جتنی دیر بیٹھتی' سر جھکائے رہتی۔ نگاہ اٹھانا تو اس کے لیے ممکن ہی نہ تھا۔ وہ تو بس یہ سوچتی رہتی تھی کہ زمین دھنس جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس ذلت کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا' اور وہ اس کی مستحق بھی نہیں تھی۔

مگر اب اس میں ایک تبدیلی آگئی تھی۔ اب وہ نظریں اٹھا کر دیکھتی تھی' اور جہاں تک نظر جا سکتی تھی' وہاں تک کا جائزہ لیتی تھی۔

اسے اپنی تبدیلی کا موہوم سا احساس تھا۔ کیونکہ بنیادی طور پر تسلسل کے باوجود اس کا وہ عمل غیر ارادی تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ باہر کے لوگ اس تبدیلی کو جان گئے ہیں' اور اس بارے میں تجسس بھی کرتے ہیں۔

سامنے پان کی دکان پر پان لگانے والے تارے نے دکان کے مالک سے کہا۔ ''استاد...... پنچھی نے پنجرہ قبول کر لیا ہے۔''

منظور نے اسے دیکھا۔ ''کس پنچھی کی بات کر رہا ہے بے؟''

''نرگس کی استاد' اور کس کی۔''

نرگس منظور کی کمزوری تھی۔ جب اس نے پہلی بار اسے دیکھا تھا' تبھی وہ اس پر دل وجان سے فدا ہو گیا تھا۔ حالانکہ تماش بینی اس کی فطرت میں نہیں تھی۔ پان کی یہ دکان تو اس کے لیے روزی کا ٹھیا تھا۔ دوسرے بہتات بھی آدمی کا دل ہرا کر دیتی ہے۔ وہاں دیکھنے کو تماش بینوں کے علاوہ چہروں اور جسموں کے سوا تھا ہی کیا۔ سو وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ اور جگہ ایسی تھی کہ اس کا کام بہت چلتا تھا۔ سہ پہر سے وہ اور تارا پان لگانا شروع کرتے تھے۔ شام ڈھلتے ہی جب پہلا چراغ روشن ہوتا تو بازار میں رونق شروع ہو جاتی۔ ساتھ ہی اس کا کام اور رات گہری ہوتے ہوتے دوبارہ پان لگانے پڑ جاتے۔ ایسے میں فرصت کسے ہوتی کہ کسی کو دیکھے۔

لیکن ایک دن اتفاق سے اس کی نظر سامنے والے کوٹھے کی طرف اٹھی اور اس نے نرگس کو دیکھ لیا۔ وہ اسے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ بازار کی لڑکی تو کہیں سے لگتی ہی نہیں تھی۔ اور وہ بہت خوب صورت اور تر وتازہ تھی۔ سرخی اور غازے کی تو اس کے چہرے کو ضرورت ہی نہیں تھی۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

وہ شام کی پہلی ساعت تھی۔ اس وقت دھندا ذرا ہلکا ہوتا تھا اور زور پکڑ رہا ہوتا تھا۔ اس لیے کچھ فرصت مل جاتی تھی۔ سو وہ اسے دیکھتا رہا۔ وہ اس لڑکی کی آنکھیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن وہ تھی کہ نگاہیں اٹھا ہی نہیں رہی تھی۔

''او منظورے' کہاں کھویا ہوا ہے۔ میری سن ہی نہیں رہا۔'' ایک گاہک نے اسے ٹوک دیا۔

گاہک کو نمٹایا ہی تھا کہ ایک اور گاہک آ گیا۔ درمیان میں مہلت ملی تو اس نے کوٹھے کی

طرف دیکھا۔ مگر وہ موجود نہیں تھی۔

پھر تو وہ معمول بن گیا۔ شام کی فرصت میں وہ اسے دیکھتا رہتا۔ رات کی مصروفیت کا اسے غم نہیں تھا۔ کیونکہ اس وقت وہ کوٹھے پر موجود ہی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن وہ اس کی آنکھیں نہیں دیکھ سکا۔ وہ نظریں اٹھاتی ہی نہیں تھی۔

منظور کو بھی ضد ہوگئی کہ وہ آنکھیں دیکھنی ہیں۔ لیکن شاید اسے بھی ضد تھی کہ وہ نظریں نہیں اٹھائے گی۔ پھر ایک دن اس نے نرگس کو اٹھتے اور جاتے دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ تو بہت خوبصورت ہے۔ اس دن وہ اس پر مر مٹا۔ لیکن آنکھوں کا خبط پھر بھی باقی رہا۔

ایک دن شام سے پہلے اچھو پان لینے کے لیے آیا تو منظور نے اس سے پوچھ لیا۔ اس سے پتا چلا کہ اس کا نام نرگس ہے۔

''خیر تو ہے؟'' اچھو نے پوچھا۔ ''تمہیں تو کبھی کسی میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا۔''

''بس اچھو میاں' دل آ گیا ہے اس پر۔''

''اپنی اوقات میں رہ کر سوچا کرو۔''

''ایسا کیا ہے اچھو میاں؟'' منظور نے تنک کر کہا۔ ''کوٹھے پر تو بیٹھی ہے نا؟''

''صرف اس لیے کہ نیلم بائی چاہتی ہے کہ اس کا دماغ نہ خراب ہو۔ ورنہ تو اس کے دو مستقل چاہنے والے ہیں۔ اور جانتے ہو؟ دونوں کیا دیتے ہیں۔ پانچ پانچ سو روپے۔''

منظور کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ ''بے وقوف بناتے ہو استاد۔''

''نہیں۔ اور یہ بھی بتا دوں کہ پانچ سو روپے میں بھی وہ لوٹ کا مال ہے۔ اسے دیکھ کر تو نواب زادہ اشرف علی خان بھی کڑھتے ہیں۔ وہ تو پوری ریاست کے بدلے میں بھی سستی ہے۔''

منظور کی سمجھ میں بات آ نہیں رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''کڑھتے کیوں ہیں وہ نواب زادے؟''

''اس پر کہ کنکر کے پیچھے سب کچھ لٹا دیا۔ اور کھنکر ہوگئے تو ہیرا نظر آ گیا۔ اب ہیرے کو چھونا بھی چاہیں تو چھو نہیں سکتے۔''

''یہ ہیں کون نواب زادہ۔ کیا نام ہے ان کا۔''

''اشرف علی خان۔ اور یہ نام ہے نہیں تھا۔ نواب کی اولاد تھے۔ باپ بہت کچھ چھوڑ کر مرے۔ دولت' حویلی' زمین جائیداد۔ بدقسمتی سے یہاں بازار میں آئے اور کسی کو دیکھ کر دل ہار بیٹھے تمہاری طرح۔ بس پھر کیا تھا' ایک مسکراہٹ کے لیے دونوں ہاتھوں سے دولت لٹانے لگے۔ اور منظور دولت کتنی ہی ہو۔ لٹاؤ تو ایک دن ختم ہو جاتی ہے۔ سو وہ بھی خالی ہوگئے۔ خاندانی ہیرے جواہرات تو ویسے ہی محبوبہ کی نذر کر دیے تھے۔ مگر اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ طوائف کی تعریف یہ ہے

کہ تحفوں سے کبھی نہیں بہلتی۔ دولت کا چڑھاوا بھی ضروری ہے۔ تبھی تو وہ کچھ دن کے لیے ہی سہی' کسی ایک کی ہو کر بیٹھتی ہے۔ تو زمین جائیداد گروی ہوئی۔ پھر حویلی بھی رہن رکھنی پڑی۔ ایسے خالی ہوئے کہ رہنے کا ٹھکانہ بھی نہیں رہا۔ انہیں کوئی پروا بھی نہیں تھی۔ کوٹھے پر آ کر بتایا تو محبوبہ نے منہ پھیر لیا۔ وصل کا دروازہ تو اسی دن بند ہو گیا۔ لیکن انہوں نے سوچا نہ سہی وصل' دیدار تو ہوتا رہے گا۔ سو اسی در کے کتے بن گئے۔ اب نرگس کو دیکھا تو سوچتے تھے کہ جتنا نیلم پر گنوایا' اللہ نے اس سو گناہ زیادہ بھی دیا ہوتا تو نرگس کی محض ایک مسکراہٹ پر قربان کر دیتے۔ وہ تو میاں منظور ہیرا ہے' ہیرا۔''

منظور حیرت سے وہ داستان سن رہا تھا۔ وہ چپ ہوئے تو بولا۔ ''مگر تم یہ سب کچھ کیسے جانتے ہو اچھو میاں؟''

اچھو میاں کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ مچلی اور آنکھیں نم ہوگئیں۔ ''بہت ناسمجھ ہو میاں...... وہ میں ہی تو ہوں...... جب کا نواب زادہ اشرف علی خاں اور آج کل کا اچھو۔''

منظور سے تو کچھ دیر بولا ہی نہیں گیا۔ مگر آتشِ شوق بھڑک اٹھی تھی۔ پانچ سو روپے بہت بڑی رقم تھی لیکن وہ بھی کیا گزرا نہیں تھا۔ رات تک دس سے پندرہ سیر پان نکال لیتا تھا۔ بچت بھی سو سے کم نہیں ہوتی تھی۔ کبھی دو سو بھی ہو جاتی تھی۔ تو کیا وہ شوق کے لیے ایک بار پانچ سو بھی نہیں خرچ کر سکتا...... صرف ایک بار!

سو اس نے دل کڑا کر کے کہا۔ ''اچھو میاں' میں بھی پانچ سو دوں گا۔ ایک بار مجھے اس سے ملوا دیں۔''

''یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ نیلم بائی نہیں مانے گی۔''

''کیوں نہیں مانے گی۔ بازار میں دکان لیے بیٹھی ہے۔ کھرے پیسے دوں گا۔''

''وہ عقل مند دکان دار ہے۔ اچھے مال کو باسی ہونے سے بھی تو بچانا ہوتا ہے۔ وہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی سے برسوں فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ تبھی تو تیسرے گاہک کو آج تک قبول نہیں کیا اس نے۔''

منظور گڑگڑانے لگا' خوشامد کرنے لگا۔ خدا کے لیے نواب صاحب...... ایک بار' بس ایک بار۔''

اچھو میاں موم ہوگئے۔ ''برسوں کے بعد کسی نے اتنی عزت دی ہے' جو میں بھول ہی چکا تھا۔ اس نوابی کی خاطر کوشش کروں گا۔ لیکن میاں' کام آسان نہیں ہے۔ میں وعدہ نہیں کر سکتا۔''

ایک ہفتہ گزر گیا۔ منظور میاں اچھو میاں سے روز پوچھتا۔ مگر وہ کہتے...... بات نہیں بنی میاں۔

پھر ایک دن وہ آئے تو بولے۔ ''بڑی مشکل سے راضی کیا ہے۔ میاں اوور ٹائم کے لیے۔ یہ جو تھوڑی دیر وہ کوٹھے پر بیٹھتی ہے۔ یہ وقت ایک دن کے لیے تمہارا ہوگا۔ مگر میاں بس ایک گھنٹا ملے گا۔''

منظور تو نہال ہو گیا۔ ''شکریہ نواب صاحب۔''

''مگر ہاں' پانچ سو میں نہیں مانی وہ۔ کہتی تھی' اصول توڑوں گی تو ریٹ بھی زیادہ ہوگا۔ ایک ہزار لے گی وہ۔''

منظور کا دل تو بیٹھ گیا۔ مگر پھر اس نے سوچا' زندگی میں ایک بار تو بیوی بچوں سے ہٹ کر اپنے لیے کچھ سوچا ہے۔ ''ٹھیک ہے نواب صاحب میں دوں گا۔''

''بس تو کل مغرب ہوتے ہی آ جانا۔''

اگلی شام منظور کسی سولہ سالہ عاشق کی طرح نیلم بائی کے کوٹھے پر پہنچا۔ نیلم بائی کو رقم دے کر وہ کمرے میں گیا' جہاں نرگس موجود تھی۔ اسے قریب سے دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔ لڑکی تھی کہ فانوس۔ بس ایک چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی...... اس کے چہرے کی بےزاری!

''آپ مسکراتی نہیں؟'' اس نے بات شروع کی۔ وہ بہت مرعوب ہو رہا تھا۔

''اس کا آپ سے کیا واسطہ۔ آپ اپنا مطلب پورا کریں۔'' بڑی بےرخی سے جواب ملا۔

''اچھا آپ نگاہیں تو اٹھائیں۔ مجھے آپ کی آنکھیں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔''

''آنکھوں کی قیمت آپ نے ادا نہیں کی ہے۔''

''تو وہ بھی لے لیجیے۔'' اس نے خوش دلی سے کہا۔

''اللہ کا شکر ہے۔ ابھی میرے پاس بہت کچھ ایسا ہے' جو برائے فروخت نہیں ہے۔''

وہ اصرار کرتا رہا۔ اور وہ سخت ہوتی گئی۔ آخر وہ جھنجلا گیا۔ ایک ہزار روپے اس کی کم از کم چھ ماہ کی کمائی تھے۔ اور یہاں گھاس ہی نہیں ڈالی جا رہی تھی۔ وہ تو محبت کرنے والے کی حیثیت سے آیا تھا۔ مگر یہاں اسے تماش بین بنایا جا رہا تھا۔

لیکن وہ تماش بین تھا نہیں۔ اپنی بھاری رقم وصول کرنے کی جھنجلائی ہوئی کوشش میں وہ تماش بین بن تو گیا۔ مگر تماش بینوں والی فطری جارحیت اس میں بھی نہیں تھی۔ اور دوسرا فریق عدم تعاون کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ وہ خوب صورت لڑکی اس کے لیے تو برف کی سل ثابت ہو رہی تھی۔

تماش بین نہ ہونے کی وجہ سے منظور احساسِ کمتری میں مبتلا تھا۔ اس نے اس صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کی تو وہ بھی اسی احساس کے تحت۔ اس کا خیال تھا کہ ایک تو 'اوور ٹائم' ہونے کی وجہ سے نرگس جھنجلا رہی ہوگی۔ دوسرے اسے معلوم ہوگا کہ وہ سامنے پان کی دکان چلانے والا منظورا ہے۔ اس لیے وہ اس کی تحقیر کر رہی ہے۔

وہ اپنی دکان پر پہنچا تو اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بری طرح لٹ گیا ہے۔ اتنی بھاری رقم خرچ کرنے کے بعد بھی اسے کچھ نہیں ملا۔ اسے تو عزت بھی نہیں ملی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ بات وہ نرگس سے کہتا تو جواب ملتا...... نادان ہو۔ عزت لینے اس کے پاس آئے ہو' جس کی اپنی کوئی عزت نہیں......

مالی نقصان کا احساس تو خیر فوراً ہی ختم ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا' کوئی بات نہیں۔ چھ مہینے بعد ہی سہی' رقم تو پوری ہو جائے گی۔ وہ سمجھے گا کہ اس کو ایک ہزار روپے میں بہت اچھا سبق مل گیا ہے۔ بازار میں وہ روزی کے لیے بیٹھا ہے' تماش بین کے لیے نہیں۔ یہ تجربہ اسے ہمیشہ یاد رہے گا لیکن رہ رہ کر اسے ایک خیال ستاتا تھا۔ کاش اس نے وہ آنکھیں دیکھ لی ہوتیں۔ پھر اسے کوئی غم نہ ہوتا۔

اور اب اس نے دیکھا کہ نرگس کی نظریں اٹھی ہیں' اور وہ بھی ایسے کہ جھکنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہیں۔ وہ سب کچھ بھول گیا اور اسے دیکھتا رہا۔ ان آنکھوں کو دیکھنے کی تو اسے آرزو تھی۔

فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ درمیان میں پتلی سی سڑک تھی' جس کے اس طرف وہ بیٹھا اور اُس طرف وہ کوٹھا تھا۔ روشنی کی بھی چکاچوند تھی لیکن نرگس دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بہرحال مسحور سا ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ پھر نرگس نے سر گھمایا اور دکان کے برابر ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ یہ وہ لمحہ تھا' جب منظور نے اس کی آنکھیں دیکھیں۔

وہ بہت خوب صورت شربتی آنکھیں تھیں۔ منظور کو لگا کہ اس کے ہزار روپے آج وصول ہوئے ہیں۔ اسی لمحے اس کے دل میں پھر آرزو جاگی کہ وہ ان آنکھوں کو سامنے بیٹھ کر دیکھے لیکن ذرا ہی وہ چوکنا ہو گیا۔ حماقت ایک ہی بار اچھی ہوتی ہے' وہ بھی صرف سبق سیکھنے کے لیے!

نرگس اب دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ مگر منظور اسی کو دیکھتا رہا۔ وہ ان نگاہوں کے سفر کو سمجھ رہا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق چند لمحوں کے بعد وہ نظریں سفر کرتی ہوئی پھر ہوٹل پر آ رکیں۔ اور چند لمحے بعد پھر پہلی سمت گھوم گئیں۔

اتنی دیر میں منظور سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ ''نہیں تارے' تیرا خیال غلط ہے۔'' اس نے تارے سے کہا۔

پان لگانے میں منہمک تارے نے سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔ ''کون سا خیال استاد؟'' وہ اتنی دیر میں اس بات کو بھول بھی چکا تھا۔

''پنچھی نے پنجرے کو اب بھی قبول نہیں کیا ہے۔''

''دیکھو تو استاد کیسے شوق سے بازار کی رونق کو دیکھ رہی ہے۔ پہلے تو نظر ہی نہیں اٹھاتی تھی۔''

''تو ابھی بچہ ہے تارے۔ اس کی نظروں میں شوق نہیں' تلاش ہے۔''

''تلاش! کیسی تلاش استاد؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ پر لگتا ہے کہ پنچھی کیسی ایسے مہربان کو تلاش کر رہا ہے' جو اس کے خیال میں پنجرے کا دروازہ کھول سکتا ہے۔ یہ آنکھیں رہائی کے خواب دیکھ رہی ہیں تارے۔''

اور تارا منظور کو حیرت سے دیکھنے لگا۔

❁ ❁ ❁

''پتر عبدالحق' تم نے لاہور کا حال تو مجھے سنایا ہی نہیں۔'' مولوی مہر علی نے کہا۔ وہ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں بیٹھے تھے۔

''میں تو خود آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''کیا کہوں مولوی صاحب' وہاں تو میں نے ایک اور ہی دنیا دیکھی۔''

''دنیا کے تو اتنے رنگ ہیں پتر کہ' آدمی دیکھے تو حیرت میں ڈوب جائے۔''

''مگر مجھے تو بس دکھ ہوا مولوی صاحب اور دکھ سے بڑھ کر مایوسی۔''

مولوی صاحب نے اس کے لہجے میں آزردگی سے اندازہ لگایا کہ اس کے دل پر بہت بوجھ ہے۔ ''مجھے بتاؤ پتر۔''

پھر عبدالحق بولتا رہا اور وہ سنتے رہے۔ کئی بار ان کا جی چاہا' لیکن انہوں نے اسے درمیان میں نہیں ٹوکا۔

''تمہارا دکھ تو میری سمجھ میں آتا ہے پتر۔ پر مایوسی نہیں۔'' اس کے خاموش ہونے کے بعد مولوی صاحب نے کہا۔

''میں نے مسلمانوں کا جو حال دیکھا ہے' اس میں مایوسی تو ہونی ہے۔ جبکہ میں ایک نو مسلم ہوں۔ میں برائی اور بھلائی کا فرق سمجھ سکتا ہوں' تو وہ کیوں نہیں سمجھتے' جو نسلوں سے ایمان پر ہیں۔ پیدا ہی مسلمان ہوئے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو پتر کہ مسلمان ہونا کامیابی کی ضمانت ہے۔'' مولوی صاحب کے لہجے میں بڑی مانوس سی' مگر ہلکی سی سختی تھی۔ ''اور کیا تم سمجھتے ہو کہ مسلمان ہونے سے بشریت ختم ہو جاتی ہے۔ کیا مسلمان کو دنیا سے اور دنیاوی ساز و سامان سے محبت نہیں رہتی۔ کیا ترغیبات اس پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ کیا شیطان اسے نہیں بہکاتا' نہیں ورغلاتا۔ میرے پتر' وہ تو شاید سب سے زیادہ محنت ہی مسلمان پر کرتا ہے۔''

''مگر مولوی صاحب' مسلمان کے پاس تو روشنی ہے۔ رہنمائی کے لیے قرآن ہے اور سیرت رسول......''

''اسی لیے شیطان سب سے زیادہ محنت اسی پر کرتا ہے۔ اور وہ بھی ان مسلمانوں پر جو قرآن پڑھتے ہیں اور سمجھ کر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو سیرت بھی پڑھتے ہیں۔ اور اکثریت جو قرآن کھول کر بھی نہیں دیکھتی' وہ تو صرف سنے سنائے پر ہی عمل کرتی ہے۔ اور قرآن پڑھنے والوں کی اقلیت میں بھی اکثریت ان لوگوں کی ہے' جو صرف یہ سوچ کر پڑھتے ہیں کہ اس کا پڑھنا باعث برکت ہے۔ وہ سمجھتے بالکل نہیں۔ بس زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

''[illegible] [illegible]ی کی بات اچھی نہیں۔ مایو[illegible] لیے [illegible] رہے۔ اب یہ سوچو کہ کفر

کیوں ہے۔''

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ ''میں نے جو کچھ دیکھا' اس سے مجھے مایوس نہیں ہونا چاہیے تھا؟''

''یہ بتاؤ کہ تم مایوس کس سے ہوئے؟'' جواب میں بھی سوال ہی آیا۔

''میں اپنے بہت سے مسلمان بھائیوں سے مایوس ہوا۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے' بہت سے ایسے مسلمان بھی دیکھے' جن سے تمہیں تقویت ملی؟''

''جی ہاں۔''

''تو مایوسی بے سبب ہو گئی نا۔ جب تم تک امید ہو' مایوسی نہیں ہونی چاہیے۔''

عبدالحق کے ذہن میں روشنی سی ہونے لگی۔ ''جی ہاں' یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''بات اتنی سی نہیں ہے پتر عبدالحق۔ نیک بندہ' جو ہدایت پر ہو' ہر وقت خطرے میں رہتا ہے۔ شیطان بہت چپکے سے وار کرتا ہے۔ تم نے کہا کہ تم بہت سے مسلمانوں کے اعمال دیکھ کر مایوس ہوئے۔ اس ایک بات میں خطرے کے کئی پہلو ہیں۔ ذرا سوچو...... غور کرو۔''

عبدالحق دیر تک سوچتا رہا۔ لیکن کئی پہلو تو کجا' اس کی سمجھ میں ایک پہلو بھی نہیں آیا۔

''نہیں سمجھے نا۔ اب دیکھ لو شیطان کیسے حملہ کرتا ہے۔ اب پہلا پہلو تو یہ ہے کہ تمہیں جن لوگوں سے مایوسی ہوئی' تم نے انہیں حقیر سمجھا اپنے مقابلے میں۔ تو گویا تو نے خود پر' اپنی اچھائی پر غرور کیا......''

عبدالحق تڑپ گیا۔ ''میں پوری سچائی سے کہتا ہوں مولوی صاحب کہ یہ بات نہیں۔''

''انسان کی سچائی ادھوری ہوتی ہے پتر۔ میں جانتا ہوں کہ تمہاری طبیعت میں غرور نہیں' انکسار ہے۔ تم نے دین کی محبت کی وجہ سے ایسا سوچا۔ اب یہی تو شیطان کی عیاری ہے۔ وہ بندے کی نیکی کو بھی کمزوری بناتا' اور پھر اس پر حملہ کرتا ہے۔ وہ پاک صاف دودھ کے کڑھاؤ میں لیموں کی دو بوند ٹپکا دیتا ہے۔''

''میں نہیں سمجھا مولوی صاحب۔''

''تم نے اپنی سچائی کی حد تک کہا کہ تم نے غرور نہیں کیا لیکن پتر' سچ یہ ہے کہ تم اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ آدمی کے وجود میں نجانے کتنے تہ خانے ہوتے ہیں' جن سے وہ مرتے دم تک واقف رہتا ہے۔ ان تہ خانوں سے صرف وہ واقف ہے' جس نے ہمیں پیدا کیا' جو کہتا ہے' الا یعلم من خلق. کیا وہی نہ جانے' جس نے پیدا کیا۔ اور شیطان نیک و رمضبوط بندوں میں چھپے انہی تہ خانوں کو تلاش کرتا رہتا ہے۔''

''تو میری بے خبری کے باوجود کیا اللہ مجھے گرفت کرے گا اس بات پر؟''

''یہ تو وہ جانے۔ وہ رحیم و کریم ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ ابھی یہ غرور کا شائبہ ہے۔ لیکن

جب تم بار بار ایسا کرو گے تو کھلے غرور میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ عادی ہو جاؤ گے نا اس کے چپکے چپکے۔ پھر یہ تمہارے لیے قابل قبول ہو جائے گا۔ تمہاری شخصیت کا حصہ بن جائے گا۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ ہر پل چوکنے رہو۔ زندگی تو آپ ہی پل صراط ہے پتر۔ اپنی ہر سوچ اور ہر عمل پر کڑی نظر رکھو۔ اسے گہرائی میں سوچو۔ کوئی اچھا ایک دم سے برا نہیں ہوتا۔ رائی کے دانوں جیسی برائیاں ایک ایک دانہ کر کے گرتی ہیں۔

"اب ایسا پہلو دیکھو۔ اللہ نے فرمایا کہ ہر آدمی کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ کوئی کسی دوسرے کا ذمہ دار نہیں۔ حتیٰ کہ باپ بیٹے کا نہیں' اور بیٹا باپ کا نہیں۔ تو تم دوسروں کے گناہوں پر مایوس ہو کر کیا یہ اعلان کر رہے ہو کہ قیامت کے دن تم ان کے جواب دہ اور ذمہ دار ہو گے۔"

عبدالحق پر تھرتھری چڑھ گئی۔

"تیسرا پہلو یہ کہ وہ سب کچھ دیکھنے کے بعد کیا تم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ تم ان میں سے ہو سکتے تھے' لیکن اللہ کی رحمت اور ہدایت کی وجہ سے ان میں سے نہیں ہو؟ تمہیں اللہ نے ان اعمال سے بچا لیا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بات میری سمجھ میں آ گئی لیکن یہ سب کچھ دیکھ کر مایوسی تو ہو گی نا مولوی صاحب۔"

"پھر وہی مایوسی۔ ارے پتر' مایوسی تو کفر ہے۔"

"کیسے مولوی صاحب۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتی یہ بات۔"

مولوی صاحب نے ایک گہری سانس لی۔ "دیکھو پتر' امید اور مایوسی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جب تک امید ہے' مایوسی نہیں ہو گی۔ اور امید تو بندے کو صرف اللہ سے رکھنی ہوتی ہے نا۔ تو یہ امید دائمی ہے۔ اور امید ہے تو مایوسی کا سوال نہیں۔ اور مایوس ہوئے تو گویا امید چھوڑ دی۔ اور امید چھوڑ دی تو گویا اللہ کی رحمت کے منکر ہو گئے۔ تو یہ ہو گیا نا کفر۔ اب تم مایوس ہوئے تو تم نے یہ سمجھ لیا کہ ان لوگوں میں سے کوئی کبھی راہِ راست پر نہیں آئے گا۔ توبہ نہیں کرے گا' جس کے دروازے نزع کے وقت تک کھلے ہوتے ہیں۔ اللہ کسی بھی لمحے کسی کو ہدایت دے دے۔ اسے توبہ پسند ہے۔ وہ توبہ قبول کر لے تو بندے کے ساری عمر کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ وہ بچوں کی طرح معصوم ہو جاتا ہے۔ اسی لیے تو کافر کو کافر نہیں کہنا چاہیے۔ کون جانے کہ اللہ کی رحمت سے اس کا خاتمہ ایمان پر ہو۔"

"آدمی خود سے بھی تو مایوس ہو سکتا ہے مولوی صاحب۔"

"پھر وہی بات۔ خود سے مایوس ہونے کا مطلب ہے کہ اس نے امید بھی خود سے رکھی تھی۔ اب غور کرو تو یہ شرک ہے۔ ارے بھئی۔ امید تو اچھائی بھلائی ہی کی ہوتی ہے۔ اور اچھائی بھلائی

صرف اللہ کی طرف سے۔ تم خود سے تو اچھے نہیں ہو گئے نا۔ اللہ نے اچھا بنایا ہے تمہیں۔ یاد رکھو' کسی بھی معاملے میں مایوسی کا آغاز ہوتے ہی دل کی گہرائیوں سے اللہ کو اصلاح کے لیے پکارو۔ مایوسی ختم ہو جائے گی۔ یہ تو حضور ﷺ کی سنت ہے۔ آپ ﷺ سے زیادہ تو کسی کو انسانوں کی فلاح کی فکر نہیں ہوئی۔ سورہ کہف میں اللہ نے آپ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا...... کیا تم اس غم میں خود کو گھلا لو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ تو حضور ﷺ کا معمول تھا کہ رات بھر اُمت کے لیے استغفار اور دعائیں کرتے' اور تمام انسانیت کے لیے صراطِ مستقیم کی دعا فرماتے۔"

تو مایوسی تو حضور ﷺ کو بھی ہوتی تھی۔ عبدالحق نے دل میں سوچا۔ سورہ کہف کی یہ آیت مبارکہ اس کا ثبوت ہے۔ لیکن اسے کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

"آپ ﷺ بدترین اذیت پر بھی کبھی نہیں روئے۔ لیکن انسانوں کے جہنم میں جلنے کا خیال فرماتے تو گھنٹوں آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی رہتی۔ بلاتخصیص پوری انسانیت کے لیے ایسی دردمندی کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ لیکن اللہ نے آپ ﷺ کو بتا دیا کہ تمام انسان ایمان نہیں لائیں گے۔ سورۃ التکویر میں اللہ نے فرمایا کہ قرآن کل کائنات کے لیے نصیحت ہے تم میں سے جو چاہے' ایمان لے آئے۔ لیکن آگے خود ہی فرمایا کہ تم نہیں لا سکتے۔ الا یہ کہ اللہ چاہے۔ یہی مضمون سورۂ مدثر میں بھی ہے...... وما تذکرون اللّٰہ ان یشاء اللّٰہ۔

"لیکن سورہ عصر میں تو عام لوگوں کو بھی......"

"ہاں۔ مگر پہلے پیغمبروں کے لیے رہ نما آیات ذہن میں رکھو' جن سے کہا گیا کہ ان کی ذمہ داری صرف پیغام پہنچانے کی ہے۔ اور پھر یہ بھی فرمایا...... لا اکراہ فی الدین۔ اور ہدایت تو اللہ کی طرف سے ہے ہی۔ پھر پتر عبدالحق' سورۂ عصر کو ہی دیکھو...... ترتیب تو دیکھو۔ خسارے سے محفوظ وہ ہوں گے' جو ایمان لائیں' نیک اعمال اور پھر نصیحت کریں۔ حضور ﷺ تو کتاب اللہ پر عامل تھے' آپ ﷺ تو مشرح تھے۔ عام آدمی کو تو پہلے ایمان سے اور پھر عمل سے گزرنا ہے۔ صرف قرآن پڑھنے سے بات نہیں بنتی۔ پڑھو' سمجھو اور عمل کرو۔ پھر نصیحت کرو ورنہ اللہ نے تو خود قرآن کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس سے بہتوں کو ہدایت ملتی ہے' اور بہت سے اس سے الٹا گمراہ ہوتے ہیں۔"

عبدالحق کو بڑی شدت سے بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔ "تو ہدایت کن لوگوں کو ملتی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جن کے لیے قادرِ مطلق کی مرضی ہو۔ لیکن اس نے اشارہ دے دیا کہ ہدایت وہی پاتے ہیں' جو رجوع کرنے والے ہوں۔"

"ذرا اس بات کو بھی سمجھا دیجئے۔"

"یہ اللہ کی بہت بڑی رحمت ہے۔ آدمی کیسی ہی برائی میں مبتلا ہو' اللہ سے رجوع کرتا رہے۔

یعنی اس سے دعا کرے' بھلائی مانگے' برائی سے نجات مانگے' ہر ضرورت کے لیے اسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے تو وہ جب چاہے گا' اسے اپنی رحمت سے سیدھے راستے پر لے آئے گا۔ لیکن ذرا سوچو' اس کے لیے بھی بنیادی خوبی تو ایمان پر ہونا ہے۔ اللہ سے رجوع تو وہی کرے گا نا' جو اس کی ذات اور صفات پر کامل ایمان رکھتا ہو۔ تو پتر' جب بھی پریشان ہو' کسی معاملے میں مایوسی کی نوبت آئے' کوئی ضرورت ستائے' کسی خرابی میں پڑو تو اللہ سے رجوع کرو۔ وہ سمیع و بصیر ہے' علیم و خبیر ہے۔ اور ہاں' قرآن پڑھو تو اس سے ہدایت طلب کرو اور گمراہی سے اس کی پناہ چاہو۔"

❁ ❁ ❁

عبدالحق تو عجز کا آدمی تھا۔ مولوی صاحب کے منہ سے یہ سنتا کہ وہ غرور میں مبتلا ہوا' اسے اچھا نہیں لگا۔ وہ تو خود کو عام لوگوں سے کم تر سمجھتا تھا۔ اس لیے کہ وہ ٹھاکر پرتاب سنگھ کا بیٹا تھا۔ اور اپنے ماں باپ کے لیے مغفرت کی دعا بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جبکہ دوسرے جدی پشتی مسلمان تھے۔ یہ ایک طرح کا شدید احساسِ کمتری اور احساسِ محرومی اس کے اندر موجود تھا۔

مگر مولوی صاحب کی یہ بات اس کے دل کو لگی کہ آدمی کو ہر پل اپنی تبدیلیوں سے اور شیطان کی کارروائیوں سے چوکنا رہنا چاہیے۔ اس کی روشنی میں اس نے سوچا کہ عین ممکن ہے' اس احساسِ کمتری اور محرومی کے تحت وہ دوسروں کو برائیوں میں مبتلا دیکھ کر بظاہر کڑھتا ہو' لیکن اندر ہی اندر خوش ہوتا ہو' سوچتا ہو کہ وہ ان سے بہتر ہے' جو ایمان پر پیدا ہوئے۔

ویسے وہ ان دنوں باطنی طور پر شدید جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نور بانو کا تصور ہر وقت اس کے ذہن پر چھایا رہتا تھا۔ اس کے نتیجے میں نماز میں حضوری سے بھی محروم ہو گیا تھا' اور قرآن پڑھنے میں بھی وہ بات نہیں رہی تھی۔ اگرچہ نور بانو کا تصور اسے بہت خوشی دیتا تھا۔ لیکن یہ احساس بھی رہتا تھا کہ کوئی بہت قیمتی چیز اس سے چھن رہی ہے۔

پھر اس دن ڈاکٹر صاحب اس سے زرینہ کے لیے اپنے بیٹے اکبر کا رشتہ مانگنے کے لیے آ گئے۔

"ہمارے لیے تو یہ بڑا اعزاز ہے ڈاکٹر صاحب۔" اس نے بڑے خلوص سے کہا۔ "لیکن مجھے اس سلسلے میں اماں سے بات کرنا ہوگی۔ اور پھر زرینہ کی مرضی بھی معلوم کرنا ضروری ہے۔ آپ برا نہ مانیے گا۔ میں آپ کو چند روز بعد جواب دے سکوں گا۔"

"ارے نہیں بیٹے' اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ دیکھو' ہم جو مانگ رہے ہیں' وہ ہمارا حق تو نہیں ہے۔ ہمیں مل جائے تو تمہارا ہم پر احسان......"

"بس آپ ایسا کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ بڑے ہیں۔ میں ان شاء اللہ خود آپ کے پاس حاضر ہوں گا۔"

تو اب اسے زرینہ سے اس سلسلے میں پوچھنا تھا۔ دن بھر وہ سوچتا رہا کہ اس سے کیسے بات کرے' کیا کرے۔ یہ معاملہ وہ اماں پر چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زرینہ کا ماضی کسی کے علم میں آئے' لیکن اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ یہ آسان کام نہیں ہے۔

رات کا کھانا اس کے لیے بڑی راحت بن گیا تھا۔ وہ کھانا کم کھاتا اور نور بانو کو زیادہ دیکھتا۔ اور جب بھی وہ اسے دیکھتا تو وہ اسے اپنی ہی طرف متوجہ پاتا۔ اور وہ نظریں ملنے کے بعد بھی نظریں نہیں جھکاتی تھی۔ یہ بات بھی اسے اچھی لگتی تھی۔

کبھی کبھی اسے ڈر لگتا کہ یہ تبدیلی جو بالکل اچانک اور بہت تیزی سے آئی ہے' کہیں بری تو نہیں۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ہر وقت نور بانو کو دیکھتا رہے۔ ویسے تو وہ تمام وقت ہی تصور میں اس کی نگاہوں کے سامنے رہتی تھی۔ لیکن حقیقت میں رُوبرو دیکھنے کی تو بات ہی اور تھی۔ اس لطف کا تو کوئی نعم البدل تھا ہی نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دن بھر کوشش کرتا رہتا تھا کہ نور بانو سے سامنا ہو جائے۔ اور ایسا ہوتا بھی رہتا تھا۔

دیکھنے کا وہ لطف عجیب تھا۔ اس کے رگ و پے میں سنسنی دوڑنے لگتی تھی۔ ایک عجیب سا ہیجان اس پر طاری ہو جاتا تھا۔ اور وہ لطف اپنی جگہ۔ لیکن وہ نگاہوں سے دور ہوتی تو فوراً ہی اسے کسی کمی' کسی تشنگی کا احساس ستانے لگتا۔ اور وہ کمی' وہ تشنگی اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اور سمجھ میں نہ آنے والی باتوں سے اسے الجھن ہوتی تھی۔ مگر وہ یہ بات کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا...... مولوی صاحب سے بھی نہیں۔

اس رات کھانے کے بعد سب لوگ چلے گئے اور وہ معمول کے مطابق اماں کے پاس بیٹھا رہا۔

"سنا ہے' ڈاکٹر صاحب آئے تھے تیرے پاس؟ زرینہ کے رشتے ہی کے لیے آئے ہوں گے نا۔"

"جی اماں۔"

"تو تُو نے کیا کہا۔ سن پتر' ایسے رشتے قسمت سے ہی ملتے ہیں۔"

"پھر بھی اماں۔ زندگی تو اسے ہی گزارنی ہے۔" عبدالحق نے کہا۔ اور وہ اماں کو اصل بات تو نہیں بتا سکتا تھا۔

"تو پھر دیر نہ کر۔ بات کر لے اس سے۔"

"جی اماں۔ آج ہی کر لوں گا۔"

اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ ایک لمحے کو نور بانو کے دروازے پر رکا۔ "زرینہ......" اس نے پکارا۔ "سو تو نہیں گئی تم؟"

اندر سے زرینہ لپکی ہوئی آئی۔ "جی بھائی۔"

"ذرا میرے کمرے میں آؤ۔ کچھ بات کرنی ہے۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

زرینہ کمرے میں گئی اور اپنی چادر اٹھائی۔ "نجانے کیا بات ہے؟" وہ بڑبڑائی۔ لہجے میں تشویش تھی۔

نور بانو نے سر اٹھا کر دیکھا۔ "تو پریشان کیوں ہو رہی ہو؟"

"بڑی بے رخی سے بات کی ہے بھائی نے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔"

نور بانو مسکرائی۔ "بے رخی نہیں، وہ گھبرائے ہوئے ہوں گے۔ ایسی باتوں کا تجربہ کہاں ہے انہیں۔"

"کیسی بات؟"

"ارے پگلی، آج ڈاکٹر صاحب آئے تھے تمہارے رشتے کے لیے؟"

یہ سنتے ہی زرینہ کا چہرہ فق ہو گیا۔

"ارے یہ کیا؟" نور بانو اٹھ بیٹھی، "تم تو پیلی پڑ گئیں ایک دم۔"

"کچھ نہیں مجھے ڈرنے کی عادت ہو گئی ہے۔" زرینہ نے کہا اور چادر لپیٹ کر کمرے سے نکل گئی۔

❁.......❁.......❁

"آؤ زرینہ، یہاں بیٹھو۔" عبدالحق نے مسہری سے اٹھتے ہوئے کہا۔

زرینہ وہیں بیٹھ گئی۔ جہاں پہلے وہ بیٹھا تھا۔ عبدالحق اپنے لیے کرسی لایا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"جی بھائی، کیا بات ہے۔" زرینہ نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"بات کیا، خوشخبری ہے۔ تمہارے لیے اسی بستی کے سب سے اچھے گھر سے رشتہ آیا ہے۔"

"جی بھائی، مجھے معلوم ہے۔"

عبدالحق نے چونک کر غور سے اسے دیکھا۔ "کیا بات ہے؟ تمہیں پسند نہیں یہ رشتہ۔"

"یہ بات نہیں بھائی۔ لیکن میں کس قابل ہوں، یہ بات تو آپ بھی جانتے ہیں۔" زرینہ نے کہا۔ پھر بولی۔ "میں تو شادی کرنا ہی نہیں چاہتی بھائی۔"

"یہ تو بڑی احمقانہ بات ہے۔ تم جو کچھ بھی تھیں، اب میری بہن ہو۔ اور ہر بھائی اپنی بہن کی شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی۔ مگر مجھے بہت ڈر لگتا ہے شادی سے۔"

"ارے بے وقوف۔ وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔"

"اس بات سے تو اور زیادہ ڈرتی ہوں میں۔ میں ان کے قابل ہوں ہی نہیں۔"

"فضول بات ہے۔ تم مظلوم ہو، گناہ گار نہیں۔"

"یہ آپ سوچتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ دوسرے بھی اسی انداز میں سوچیں۔"

"مگر میری بہن، تم ساری زندگی یونہی تو نہیں گزار سکتیں۔" عبدالحق نے بڑی شفقت سے کہا۔

زرینہ نے ایک گہری سانس لی۔ "دیکھیں بھائی، مجھے آپ سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں لیکن مجبوری ہے۔" اُس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "یہ جو شادی نہیں کرنا چاہتی تو اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اور ہر وجہ اہم ہے۔ اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔"

"اچھا...... مجھے بتاؤ، میں کوئی حل نکال لوں گا۔" عبدالحق نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ میری حقیقت جاننے کے بعد کوئی گیا گزرا گھرانہ بھی مجھے قبول نہیں کرے گا۔"

"تو ہم انہیں بتائیں گے ہی نہیں۔"

"مطلب یہ کہ ہم انہیں دھوکہ دیں گے۔"

عبدالحق سناٹے میں آ گیا۔ اس پہلو سے تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

"اب دوسری اور اس سے زیادہ اہم وجہ سن لیجیے۔ میں آپ کے لئے تکلیف، آزار اور ذلت کا سبب نہیں بننا چاہتی۔ آپ وہ ہیں، جو مجھے گناہوں کی دلدل سے نکال کر عزت کی روشنی میں لائے ہیں۔ مجھ جیسی لڑکی کو آپ نے بہن کا درجہ دیا۔ میں آپ کے لئے ذلت کا باعث نہیں بننا چاہتی۔"

عبدالحق نے غور سے اسے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں، چہرہ چیخ رہا تھا لیکن بات عبدالحق کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ "میں نہیں سمجھتا کہ تمہاری شادی میرے لئے باعثِ ذلت ہو سکتی ہے۔ بھئی میری تو عزت ہے اس میں اور خوشی بھی۔"

زرینہ نے رخسار پر ڈھلک آنے والے آنسو پونچھ ڈالے۔ "فرض کر لیجیے کہ ہم ان لوگوں کو یہ بات نہیں بتاتے۔ انہیں دھوکے میں رکھتے ہیں۔ یہ سوچیں کہ میں تو بازار میں روز نیلام ہوتی تھی۔" یہ کہہ کر وہ باقاعدہ رونے لگی۔ "وہاں کوٹھے پر ہزاروں گزرنے والوں نے مجھے دیکھا ہو گا۔ اور سینکڑوں نے......" اُس کی نظریں جھک گئیں۔ اُس سے بات پوری نہیں کی گئی۔ "......اب ان میں سے کوئی شادی کے بعد مجھے دیکھے اور پہچان لے اور میری سسرال والوں کو بتا دے تو کیا وہ مجھے اپنے گھر میں رکھیں گے۔ ہرگز نہیں، اور اب تو میں عزت سے آپ کے گھر میں رہ رہی ہوں نا۔ اُس وقت رسوائی کے ساتھ آپ کے گھر واپس آؤں گی تو آپ کی ذلت اور رسوائی ہو گی نا۔ اور یہ میں نہیں چاہتی، اور ہونے بھی نہیں دوں گی۔ میں آپ کے پاس آؤں گی ہی نہیں۔ تو پھر میں کہاں بھٹکوں گی۔ کوئی ظالم مجھے پھر اسی جہنم میں پہنچا دے گا۔ نہیں بھائی، میں شادی کیسے کر سکتی ہوں۔"

"مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔" عبدالحق نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "تم پھر بھی میری عزت ہی رہو گی اور میں تمہیں پھولوں کی طرح رکھوں گا میری بہن۔"

"یہ تو آپ کی بڑائی ہے بھائی۔"

"تم مجھے یہ بتاؤ، میں انہیں کیا جواب دوں۔"

"انکار کر دیں۔"

"رشتے تو پھر بھی آتے رہیں گے۔ میں انکار کرتا رہوں گا تو اس پر باتیں نہیں بنیں گی؟"

"کاش...... کاش میں مر گئی ہوتی۔" زرینہ نے کہا اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔

"یہ تو ناشکرا پن ہے۔"

"تو آپ کیا چاہتے ہیں بھائی؟"

"میں ڈاکٹر صاحب کو انکار نہیں کرنا چاہتا۔"

"اور اب میں اپنی خاطر نہیں، آپ کی خاطر چاہتی ہوں کہ آپ انکار کر دیں۔"

"تم سمجھ رہی ہو کہ یہ مسئلے کا حل نہیں۔ رشتے تو آتے رہیں گے۔" عبدالحق نے کہا۔ پھر اچانک زرینہ کی بات اس کی سمجھ میں آئی، اور اُس کی الجھن اور بڑھ گئی۔ "یہ بتاؤ کہ میں اپنی خاطر کیوں انکار کروں۔ میں کوئی مجبور ہوں۔"

"آپ ان شریف لوگوں کو دھوکہ دے سکیں گے؟" زرینہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

عبدالحق سن ہو کر رہ گیا۔ یہ تو واقعی بہت بری بات تھی۔ وہ یہ کیسے گوارا کر سکتا تھا۔

"ایک یہ وجہ بھی ہے کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

عبدالحق کو اچانک طرارہ آ گیا۔ "تو میں انہیں حقیقت بتا دوں گا۔"

"یہ میں نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟"

"میں محسوس کر سکتی ہوں کہ ایسا سچ بولنا ایک بھائی کے لئے کتنا اذیت ناک ہو گا۔ آپ نے مجھے عزت دی، رشتے دیے، گھر دیا، میں آپ کو تکلیف، بلکہ ذلت کیسے دے سکتی ہوں۔"

"مجھے کوئی پروا نہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ انکار کر دیں گے نا۔"

"نہیں بھائی۔ بات ان کے گھر سے نکل کر گاؤں میں بھی پھیل سکتی ہے۔ اس میں تو آپ کی بہت رسوائی ہو گی۔"

عبدالحق نے سوچا کہ مسئلہ واقعی بہت پیچیدہ ہے لیکن چند لمحے سوچنے کے بعد اسے اس خیال سے تقویت ہوئی کہ ڈاکٹر وسطی ایسے آدمی نہیں۔ ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اُس نے کہا۔ "یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔ یہ بتاؤ کہ اگر سب کچھ جاننے کے بعد بھی وہ یہ رشتہ چاہیں تو تمہیں کوئی اعتراض تو

نہیں۔"

"نہیں بھائی، لیکن......"

"میں نے کہا نا، تم سب مجھ پر چھوڑ دو۔"

"ٹھیک ہے بھائی۔ بس اللہ آپ کے سامنے مجھے شرمندہ نہ کرائے۔ آپ کی عزت پر آنچ نہ آئے۔"

"تم بے فکر ہو جاؤ۔ اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔"

"تو میں جاؤں بھائی؟"

"ہاں۔ اور پریشان نہ ہونا۔"

اپنے کمرے میں پہنچ کر زرینہ کو ایک چھوٹی سی خوشی ملی۔ نور بانو سو چکی تھی۔ وہ اُس کے سوال و جواب سے بچ گئی تھی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق کا اپنے گھر آنا تو ڈاکٹر واسطی جیسے معزز آدمی کو بھی اپنے لئے ایک اعزاز ہی لگا۔ وہ کب کسی کے گھر جاتا تھا۔ اتنا وقت ہی نہیں ہوتا تھا اُس کے پاس۔ وہ تو اُس کے سامنے عملاً بچھ گئے۔ "آیئے عبدالحق صاحب۔ آپ نے بڑی عزت بخشی ہمیں۔ غریب خانہ تو جگمگا گیا ہے......"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔" عبدالحق نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ بتائیں، کیا خاطر کروں آپ کی۔ کیا لیں گے آپ؟"

"کچھ بھی نہیں۔ جو لینے آیا ہوں، وہ مل جائے تو عمر بھر آپ کا شکر گزار رہوں گا۔"

"آپ کے پاس اللہ کا دیا سبھی کچھ تو ہے۔ مجھے کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔"

"سب کچھ تو کسی کے پاس بھی نہیں ہوتا۔" عبدالحق نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"تو کچھ فرمایئے تو۔"

"میں یہ بات چچی صاحبہ کی موجودگی میں کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ میرے سامنے آنے میں حرج نہ سمجھیں تو......"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔" ڈاکٹر صاحب نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "آپ تو ہمارے لئے بیٹے جیسے ہیں۔" وہ اٹھے اور اندر چلے گئے۔ ذرا دیر بعد وہ آئے تو انہوں نے کہا۔ "وہ آ رہی ہیں۔ چند منٹ لگیں گے۔"

وہ چند منٹ عبدالحق کے لئے بہت بھاری تھے۔ بار بار اُس کی ہمت جواب دے جاتی، جی چاہتا کہ وہ اٹھ کر بھاگ جائے۔

پھر طشتری پر لسی کا گلاس لیے وہ ادھیڑ عمر خاتون کمرے میں آئیں۔ عبدالحق جلدی سے اٹھ

کھڑا ہوا۔ انہیں سلام کیا۔ انہوں نے جواب دے کر طشتری کو تپائی پر رکھ دیا۔

''یہ ہیں ہماری بیگم صفیہ، اور تمہاری چچی۔'' ڈاکٹر صاحب نے تعارف کرایا۔

صفیہ سامنے ہی بیٹھ گئیں۔ ''ارے، تم تو ہمارے اصغر سے بھی چھوٹے ہو۔ میں تو تمہیں بہت بڑا سمجھتی تھی۔ لوگ تمہارے بارے میں باتیں ہی ایسی کرتے ہیں۔''

''آدمی عمر سے بڑا تھوڑا ہی ہوتا ہے بیگم۔ بڑائی تو اللہ کی دین ہے۔'' ڈاکٹر صاحب بولے۔

عبدالحق کو پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ بعض معاملات کے لئے وہ واقعی چھوٹا اور کم عمر ہے۔ اُس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔

پھر صفیہ بیگم نے ہی اُس کی مشکل آسان کر دی۔ ''ہم نے تم سے کچھ مانگا تھا بیٹے۔ تم شاید اسی کا جواب دینے آئے ہو۔''

''اور مجھے امید ہے کہ جواب مثبت ہی ہوگا۔'' ڈاکٹر صاحب نے جلدی سے ٹکڑا لگایا۔

عبدالحق کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔ اب واپسی کا راستہ بھی نہیں تھا۔ اُس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔

''جی...... یہی بات ہے۔'' اُس نے کہا۔ مگر اپنی آواز اسے خود بھی اجنبی لگی۔ ''بات یہ ہے کہ آپ لوگوں سے اچھا کوئی ہمیں مل نہیں سکتا۔ اس لئے انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......''

''اللہ کا شکر ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے جلدی سے کہا۔

''لیکن میں چاہتا ہوں کہ مکمل حقائق آپ کے علم میں لے آؤں۔'' اب عبدالحق کو بات کرنا اتنا مشکل نہیں لگ رہا تھا۔ اسے تجربہ ہو رہا تھا کہ سنگین سچ بولنے سے پہلے بہت مشکل ہوتا ہے لیکن بولتے ہوئے آسان ہو جاتا ہے۔ ''سب کچھ جاننے کے بعد آپ چاہیں تو خاموشی سے اس رشتے سے دستبردار ہو جائیں۔ اور اگر اس کے باوجود آپ یہ رشتہ مانگیں گے تو ہمیں منظور ہوگا۔'' یہ کہہ کر اُس کے دل پر سے آدھا بوجھ ہٹ گیا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ زہر جیسا کڑوا سچ ابھی باقی ہے۔

''ہم تو حقائق جان کر بھی سوالی ہی رہیں گے۔'' ڈاکٹر صاحب نے بڑے یقین سے کہا۔

''پہلے جان تو لیں کہ حقائق کیا ہیں لیکن اس سے پہلے میں آپ سے ایک التجا کروں گا۔ رشتہ ہو یا نہ ہو، جو میں آپ کو بتاؤں گا، وہ ہمارے درمیان راز رہے گا۔ کیونکہ یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔''

''تو پھر ہماری بیگم صاحبہ کو کیوں شریک کیا۔'' ڈاکٹر صاحب نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔ ''جانتے نہیں کہ عورتیں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں۔''

''غلط۔ عورت کی گہرائی کا تو کبھی کوئی مرد اندازہ ہی نہیں لگا سکا۔'' صفیہ بیگم نے انہیں چیلنج کیا۔ ''کوئی عورت کوئی راز چھپانے پر آ جائے تو کسی کو اُس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتی......''

''حتیٰ کہ خود کو بھی۔'' ڈاکٹر صاحب نے شوخ لہجے میں کہا۔

اُس پُر مزاح گفتگو نے ماحول کو ہلکا پھلکا کر دیا تھا لیکن عبدالحق جانتا تھا کہ وہ جو کچھ کہنے والا

ہے، وہ بہت بھاری اور سنگین ہے۔

''خیر...... تم بتاؤ نا بیٹے، کیا بات ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

''جی...... وہ...... بات یہ ہے کہ زرینہ کو میں سگی بہن جیسا ہی سمجھتا ہوں لیکن خون کے رشتے سے وہ میری بہن نہیں ہے۔''

ڈاکٹر صاحب ہنسنے لگے۔ صفیہ بیگم بھی مسکرا دیں۔ ''یہ بات تو ہم بھی سمجھتے ہیں بیٹے۔ بہنیں چانک تو نمودار نہیں ہوتیں۔'' ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ''اور ہم تمہیں بھی سمجھتے ہیں۔ یہ بستی تم نے آباد کی۔ لٹے پٹے لوگوں کو زمین دی، پیسے سے ان کی مدد کی۔ تمہیں اللہ نے بڑائی دی ہے، بڑا دل دیا ہے۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ لاہور میں تمہیں زرینہ ملی، جو ہجرت کے دوران اپنے تمام رشتے کھو کر آئی۔ تم نے اسے بہن بنا لیا، اور ایک ماں اور ایک بہن بھی اسے دے دی۔ ہم بھی تمہاری اس نیکی میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ ہم اُس کے لئے کھوئے ہوئے ماں باپ کا نعم البدل ثابت ہوں گے...... انشاء اللہ۔''

''اور میں یہ نہیں کہہ رہی ہوں کہ اس میں کوئی خوبی نہیں ہے۔'' صفیہ بیگم بولیں۔ ''وہ ہر لحاظ سے ہمیں پسند ہے۔ وہ بہت اچھی ہے۔ لیکن مجھے سب سے بڑی خوبی یہ لگی کہ وہ دکھی اور محروم لڑکی ہے۔ ہم اسے عزت اور خوشی دے کر اللہ کو خوش کریں گے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے، میں اسے کہاں سے لایا ہوں؟'' عبدالحق نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔

''لاہور میں مہاجروں کے کسی کیمپ سے۔'' انہوں نے بلا جھجک جواب دیا۔

''جی نہیں۔ میں اسے بازارِ حسن کے ایک کوٹھے سے لایا ہوں۔'' عبدالحق نے کہا اور نظریں جھکا لیں۔ اب اس میں نظر اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔

کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ وہ ایسا گہرا سناٹا تھا کہ عبدالحق کا دم گھٹنے لگا۔ اُسی وقت وہ صرف آواز کو ترس رہا تھا۔ خواہ وہ ڈانٹ ڈپٹ ہو یا لعنت ملامت۔ کچھ تو ہو، یہ لوگ مجھے برا بھلا کیوں نہیں کہتے۔

اس کے بس میں ہوتا تو وہ اٹھ کر بغیر کچھ کہے چلا جاتا لیکن اس کا تو جسم ہی شل ہو گیا تھا۔

پھر سسکیوں کی آواز سن کر اُس سے نہیں رہا گیا، اس نے نظریں اٹھائیں تو صفیہ بیگم کا دکھ سے چیختا ہوا آنسوؤں سے تر چہرہ اُس کے سامنے تھا۔ ایک نظر دیکھ کر ہی سمجھ میں آ گیا کہ وہ اپنی چیخوں کو اندر ہی اندر گھونٹ رہی ہیں۔ پھر شاید ان کا ضبط جواب دے گیا۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپا اور اٹھ کر لپکتے قدموں سے کمرے سے نکل گئیں۔

شرمندگی سے عبدالحق کا برا حال تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ اُس نے ان کے خواب چکنا چور کر دیے تھے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں چلتا ہوں ڈاکٹر صاحب۔'' اُس نے

کہا۔ ”اگر آپ اسے راز رکھیں گے تو مجھ پر احسان ہوگا......“

ڈاکٹر صاحب نے یوں چونک کر اسے دیکھا، جیسے وہاں اُس کی موجودگی سے ہی بے خبر رہے ہوں۔ مگر اب وہ اُس کی طرف متوجہ تھے۔

”...... یہ میں اپنے لئے نہیں، زرینہ کی خاطر کہہ رہا ہوں۔ ورنہ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوئی کچھ بھی کہے، زرینہ میری بہن ہے۔“

”بیٹھ جاؤ بیٹے۔ تم ابھی نہیں جاسکتے۔“ ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور تمہارا راز صرف اسی صورت میں راز رہ سکتا ہے کہ تم ہمارے راز کو راز رکھو۔“

عبدالحق پھر بیٹھ گیا تھا۔ ”آپ کس راز کی بات کر رہے ہیں؟“

”بتاتا ہوں۔ آج تک کسی کو نہیں بتایا۔“ ڈاکٹر صاحب نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”ہماری ایک بیٹی بھی تھی۔ اسٹیشن کی طرف آرہے تھے کہ بلوائیوں نے حملہ کیا اور اسے اٹھا کر لے گئے۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا مرگئی۔ کل تک ہم ہر روز یہ خواہش کرتے تھے کہ کاش وہ مرگئی ہو۔ مگر آج سے ہم امید کریں گے کہ اسے کوئی عبدالحق مل گیا ہوگا۔“

صورت حال اتنی غیر متوقع تھی کہ عبدالحق سن ہوکر رہ گیا۔

اسی لمحے صفیہ بیگم کمرے میں واپس آئیں۔ انہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ انہوں نے منہ دھویا ہے۔ آنکھیں اب بھی متورم ہو رہی تھیں لیکن انہوں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ ”تو بیٹے، اب ہم تم سے کچھ نہیں مانگتے۔“ انہوں نے اُس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”اپنی بیٹی بھی کوئی کسی سے مانگتا ہے۔ وہ تو ہے ہی ہماری۔“

عبدالحق سے کچھ بھی نہیں کہا گیا۔

”اور وعدہ کرو بیٹے کہ ہمارا راز، راز ہی رہے گا۔ ہماری بیٹی اور بہو کو کبھی رسوا نہ ہونے دینا۔“ ڈاکٹر صاحب بولے۔

”ارے...... یہ لسی نہیں پی تم نے۔“ صفیہ بیگم کے لہجے میں خفگی تھی۔

”جی چچی جان، اب پیوں گا سکون سے۔“ عبدالحق نے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

”تو ہم کب آئیں تمہارے گھر؟“

”اپنے گھر آنے کے لئے کسی کو پوچھنے کی ضرورت تو نہیں ہوتی۔“ عبدالحق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق باطنی طور پر بہت پریشان، بہت منتشر تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ بہت بڑی باطنی شرمندگی سے دوچار تھا۔ نور بانو کے اعتراف محبت نے اس کے لیے پنڈورا کا بکس کھول دیا تھا۔

بھی کم نہیں تھا کہ وہ ہر وقت اُس کے تصور پر چھائی رہتی تھی۔ حتیٰ کہ نماز میں اور قرآن پاک کی تلاوت کے دوران بھی وہ کوشش کے باوجود اسے ذہن سے نہیں جھٹک پاتا تھا۔ اس کو بددیانتی کا احساس ستاتا رہتا تھا۔

ستم بالائے ستم یہ کہ خوابوں کا سلسلہ شروع ہوگیا!

خواب وہ کم ہی دیکھتا تھا۔ اور خواب اُس نے جب بھی دیکھے تھے، ان میں معنویت ہوتی تھی۔ مگر یہ خواب مختلف تھے۔ ہر خواب میں نور بانو ہوتی تھی اور ہر خواب میں ان کے درمیان جسمانی قربت ہوتی تھی۔

جسمانی قربت کا عملی حوالہ اس کے پاس بس ایک ہی تھا...... ریٹا پارسن کے ساتھ وہ رات، جس میں ریٹا نے اسے دھوکے سے شراب پلا دی تھی۔ اُس قربت کی شرمندگی بھی اسے یاد تھی اور لذت اور سرمستی بھی۔ اس کے علاوہ وہ غیر عملی حوالہ بس اردو شاعری تھی۔

سو معمولی سے ردوبدل کے ساتھ وہ اس رات کو ہی دیکھتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ریٹا پارسن کی جگہ نور بانو ہوتی تھی۔ اور جس محبت نے اُس رات اسے گرنے سے بچالیا تھا، وہی خواب میں اسے بڑھاوا دیتی تھی۔ اور خواب سے آنکھ کھلتی تو وہ عجیب سرشاری کی کیفیت میں ہوتا۔ بعض اوقات تو وہ آنکھیں بند کر کے اس امید پر دوبارہ سونے کی کوشش کرتا کہ شاید خواب کا سلسلہ وہیں سے جڑ جائے لیکن پوری طرح سے جاگنے کے بعد اسے شرمندگی ہوتی۔ پہلی بار تو وہ شرمندگی بہت شدید تھی۔ مگر پھر وہ ہر خواب کے ساتھ بہ تدریج کم ہوتی گئی۔

ان خوابوں نے اُس کا انتشار اور بڑھا دیا۔ نماز اور تلاوت قرآن میں بے دھیانی بڑھتی جا رہی تھی۔

دن میں تو وقت کم ہی ملتا تھا۔ رات میں وہ بیٹھ کر اس مسئلے پر سوچتا، اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا۔ مگر بات اُس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ یہ محبت تو برسوں سے اس کے دل میں تھی۔ اسے اس محبت کا ایک ایک لمحہ یاد تھا۔ اُس محبت میں بڑا سکون تھا، خوشی تھی، ٹھہراؤ تھا، عظمت تھی۔ اب یہ وہی محبت تھی۔ مگر یہ تبدیلی کیوں؟ اس کا کوئی سبب تو ہوگا۔ اب اسی محبت میں بے چینی کیوں ہے۔ اچھی نیند کیوں نہیں آتی۔ جسم میں اینٹھن کیوں ہوتی ہے۔ وجود میں نامعلوم فتنے سر اٹھاتے کیوں محسوس ہوتے ہیں۔ اور یہ خواب کیوں نظر آتے ہیں۔

اُسے دہلی کا وہ دن یاد آیا، جب ماں جی پہلی بار اُس کے سامنے آئی تھیں۔ وہ کرایہ واپس کرنے آئی تھیں مکان کا...... اور یہ بتانے کہ اب وہ اُس کا گھر ہے اور وہ ان کے خاندان کا فرد ہے۔ ورنہ وہ جو شوہر کے انتقال کے بعد گھر کے پشتینی ملازم بہادر علی کے سامنے بھی نہیں آئیں کہ وہ نامحرم اُس کے سامنے کیوں آئیں۔ وہ اسے بیٹا سمجھی ہیں۔ اور انہوں نے کہا تھا کہ تم جب چاہو، پیچھے آؤ، میری بیٹیاں بھی تم سے پردہ نہیں کریں گی۔ اسے بہت اچھی طرح یاد تھا۔ پہلے تو وہ بہت

خوش ہوا تھا۔ اُس نے سوچا تھا کہ وہ اس لڑکی کو دیکھ سکے گا، جس سے وہ بن دیکھے محبت کرتا لیکن پھر اُس نے سوچا کہ یوں وہ ماں جی کی محبت پر پورا نہیں اُتر سکے گا۔ اس کے باوجود اس کے قدم خود بہ خود اُٹھتے تھے اور وہ زینے کے ساتھ، والے دروازے پر پہنچ جاتا تھا۔

اب اسے یاد آیا کہ اس وقت اُس نے کیا سوچا تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ طلب بہت طاقت ور چیز ہے، اور نفس کی ضرورت ہے۔ اور نفس کبھی سیر نہیں ہوتا۔ اسے جتنا ملے، اُس کی طلب، اُس کے تقاضے اتنے ہی بڑھتے ہیں۔ جیسے شیر کو سدھانے کے لئے پہلے بھوکا رکھا جاتا ہے اور پھر ناپ تول کر دیا جاتا ہے، ویسا ہی، بلکہ اس سے بھی آگے کا معاملہ نفس کا ہے۔ اسے کمزور رکھنے میں ہی آخرت کی بہتری ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے بھوکا رکھا جائے، کمزور رکھا جائے۔ ہر پوری ہونے والی خواہش اسے طاقت دیتی ہے۔ اور ایک خواہش پوری ہونے پر وہ سینکڑوں مطالبے کرتا ہے۔ بلکہ انہیں پورا کرنے پر آدمی کو مجبور کر دیتا ہے۔

اسے حیرت ہوئی، یہ بات اُس نے اُس وقت سمجھی تھی، جب وہ مسلمان نہیں ہوا تھا۔

بات اُس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ طلب کی ہوس میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یہی اس کی بے چینی اور بے سکونی کا سبب تھا۔ اور اس کا حل یہ تھا کہ وہ اس سے پہلے کی طرح لڑے گا، اسے زیر کرے گا۔ اب تو وہ اُس وقت کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور ہے۔

مگر ماضی کا وہ حوالہ اسے سوچنے پر مجبور کر رہا تھا اُس نے اپنی محبت کی عظمت دیکھی تھی۔ طبعاً وہ حسن پرست تھا۔ اور کالج میں اس کی ہم جماعت لڑکیاں بہت حسین تھیں۔ نادرہ اسے سب سے حسین لگتی تھی۔ بہت وقار تھا اُس کے حسن میں۔ اس وقت بھی وہ اسے اپنے تصور میں دیکھ سکتا تھا۔ پھر ریٹا اور پشپا تھیں۔ اور اپنے اپنے انداز میں وہ سب اس پر ملتفت تھیں۔ لیکن انہوں نے کبھی اسے کسی ہیجان اور انتشار میں مبتلا نہیں کیا تھا۔ بلکہ ریٹا کی تو عملی کوشش بھی ناکام ہو گئی تھی۔ صرف اس لئے کہ وہ پہلے ہی گرفتار محبت تھا...... ایک اَن دیکھی لڑکی کی محبت میں سرشار، جس کی اُس نے صرف آواز سنی تھی۔ اور اُس محبت نے اُس کے لئے ہر برائی کا راستہ روک دیا تھا۔ یہی محبت کی وہ عظمت تھی جس کا وہ قائل تھا۔ اس محبت میں کیسا سکون تھا...... صرف بے طلبی کی وجہ سے۔ وہ اس محبت کے جواب میں کچھ نہیں مانگتا تھا، محبت بھی نہیں، التفات بھی نہیں، حد یہ کہ دید بھی نہیں۔

اور اب یہ وہی محبت تھی کہ جو بے سکونی کا باعث بن گئی تھی!

کیا اس لئے کہ اُس نے اَن دیکھے محبوب کو دیکھ لیا ہے؟

نہیں۔ مدت سے وہ اُس کے سامنے تھی۔ اُس نے کبھی نظر اٹھا کر اسے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے کہ وہ اُسے بلند اور خود کو حقیر سمجھتا تھا۔ اسے اس سے کچھ چاہئے ہی نہیں تھا۔ اسے تو جدائی کا بھی ڈر نہیں تھا۔ ورنہ وہ اُس کے چچا کو ڈھونڈنے لاہور کیوں جاتا۔

یہ بات طے تھی کہ فساد کی جڑ طلب تھی۔ نور بانو نے اُس کے ساتھ سفر کیا، یہاں آئی، دونوں ایک گھر میں رہے۔ بارہا سامنا بھی ہوا۔ لیکن اُس نے دیکھ کر بھی اسے نہیں دیکھا۔ وہ تصور میں اُس کا چہرہ کبھی نہیں دیکھ سکا۔ یعنی قربت کے باوجود طلب نہیں تھی۔

تو یہ فساد شروع کیسے ہوا؟ بے طلبی طلب میں کیسے تبدیل ہوئی؟ وجود میں ان فتنوں نے سر کیسے اٹھایا، جن کی موجودگی کا بھی اسے علم نہیں تھا یہ ہاتھ اُس کو چھونے کی طلب میں کیوں کپکپاتے ہیں؟ یہ سب کیسے ہو گیا؟

اب اتنا سوچنے کے بعد جواب بالکل واضح تھا۔ فساد کی جڑ نور بانو کا اظہار محبت تھا۔ اُس نے نور بانو کو جس بلند مسند پر بٹھایا ہوا تھا، وہاں وہ سر اٹھا کر آسمان تک کو دیکھ سکتا تھا لیکن اسے نہیں۔ اور جسے دیکھ نہ سکے، آدمی اُس کی طلب میں پاگل کیسے ہو سکتا ہے۔

لیکن اظہار محبت کے لئے نور بانو اس مسند سے اتر آئی...... اُس کے رُوبرُو کھڑی ہو گئی۔ وہ ہم رتبہ ہو گئے۔ غیر مشروط محبت کرنے والے کو جواب میں محبت ملے تو وہ کیا کرے گا۔ طلب ہی طلب!

اسے یاد آیا۔ اس رات ریٹا نے اُس سے محبت کے موضوع پر گفتگو کی تھی۔ وہ جس محبت کی بات کرتا تھا، ریٹا نے اسے آسمانی محبت قرار دیا تھا۔ اور وہ زمینی محبت کی بات کر رہی تھی۔ مرد اور عورت کی محبت۔ اُس نے کہا تھا۔ اس محبت کی بنیاد سیکس پر ہے۔ اس لئے تو شوہر اور بیوی کا رشتہ تخلیق کیا گیا ہے۔ اور اسی محبت سے نسلِ انسانی پھیلی ہے۔

تو میری آسمانی محبت زمینی محبت سے تبدیل ہو گئی ہے۔ اُس نے سوچا۔

اسی لمحے اسے تصور میں نور بانو کا سراپا نظر آیا...... اور اُس نے اسے لپٹا لیا!

اس بار اسے شرمندگی نہیں ہوئی، بلکہ وہ سرشاری میں ڈوب گیا۔ مگر فوراً ہی اسے خیال آ گیا کہ اسے تو طلب کے اس عفریت سے لڑنا، اسے زیر کرنا ہے ورنہ وہ اسی طرح نماز میں حضوری سے محروم رہے گا۔

❁ ❁ ❁

مغرب سے پہلے ہی اندھیرا چھا گیا تھا۔ گھٹا پوری طرح گھر کر آئی تھی۔ موسم کے تیور بہت سنگین تھے۔

نماز پڑھ کر نکلا تو عبدالحق شیڈ کی طرف چل دیا۔ اسے مینو کی فکر ستا رہی تھی۔ وہ شیڈ سے کچھ دور تھا کہ بالکل اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اور وہ صرف بارش نہیں تھی۔ ہوا بارش سے بھی زیادہ تیز [illegible] تھی۔

عبدالحق بھیگنے سے بچنے کے لئے شیڈ کی طرف بھاگا لیکن اُس کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اسے تیز مخالف ہوا کا سامنا تھا۔ ایک قدم آگے بڑھانا بھی دشوار ہو رہا تھا۔

وہ شیڈ کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ ایک بہت زوردار آواز سنائی دی۔ اس آواز کو پہچاننے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ تیز آندھی نے شیڈ کی ٹین کی چھت کو کم از کم جزوی طور پر اُڑا دیا ہے۔ اُس نے سر اٹھایا تو ایک دوسرے سے ہُک کے ذریعے جڑے ہوئے متعدد ٹین اُڑتے نظر آئے اور کچھ آگے جا کر دھماکے سے گر گئے۔

اسی لمحے ایک زبردست کڑاکا ہوا۔ بجلی کا کوندا لہرایا، اور فوراً ہی معدوم نہیں ہوا۔ بلکہ کئی لمحوں تک فضا اس سے جگمگاتی رہی۔ کڑاکا اتنا شدید تھا کہ پیروں کے نیچے زمین واضح طور پر ہلتی محسوس ہوئی تھی۔

عبدالحق کو اس وقت صرف معصوم جانوروں کی فکر تھی...... خاص طور پر مینو کی۔ وہ بے چارے اس افتاد پر کیسے گھبرا رہے ہوں گے۔ اُس کے باوجود اسے احساس ہوا کہ کڑاکے کے ساتھ ہی اُس نے ایک نسوانی چیخ بھی سنی تھی، جو کڑاکے میں دب کر رہ گئی تھی۔

وہ تیزی سے شیڈ میں داخل ہوا، جہاں گھپ اندھیرا تھا اور بارش کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ دو قدم ہی بڑھائے تھے کہ کوئی دوڑتا ہوا آیا اور اُس سے ٹکرا گیا۔ اُس نے بڑی مشکل سے خود کو گرنے سے بچایا اور اضطراری طور پر ٹکرانے والے کو لپٹا لیا۔

اُس کی پشت پر ٹکرانے والے کے ہاتھوں کی گرفت بہت سخت تھی، جیسے کوئی ڈوبتا ہوا آدمی سہارا دینے والے کو پکڑتا ہے۔

ایک پل میں عبدالحق کو احساس ہو گیا کہ وہ کوئی لڑکی ہے۔ اُس کا دل ایک بالکل نئے اور نامانوس انداز میں دھڑکا۔

''کک...... کون...... کک...... کون ہے......؟'' لڑکی خوف سے نڈھال تھی۔ اُس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ مگر اُس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی۔

گھبرائی ہوئی ہونے کی وجہ سے وہ آواز نامانوس لگی۔ لیکن اُس کے باوجود وہ اس آواز کو لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ ''گھبرائیے نہیں نور بی بی، یہ میں ہوں...... عبدالحق۔''

یہ سنتے ہی سکون کی سانس کی آواز...... اور ڈھیلی ہوئی گرفت ایسی سخت ہو گئی کہ جیسے اب کبھی اس سے جدا ہی نہیں ہو گی۔

اسی لمحے دوبارہ کڑاکا ہوا، بجلی دوبارہ چمکی۔ عبدالحق نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ شیڈ کے اسی حصے میں تھے، جس کی چھت اُڑی تھی۔ تیز رفتار بارش انہیں بھگو رہی تھی، اور انہیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

نور بانو اور شدت سے اُس سے لپٹ گئی۔ اُس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا، وہ ایسی قربت تھی کہ عبدالحق کو نور بانو کا دل اپنے سینے میں دھڑ دھڑ کرتا محسوس ہو رہا تھا۔

اُس نے سوچا کہ نور بانو کو لے کر شیڈ کے اس حصے میں چلا جائے، جہاں چھت ابھی موجود

ہے لیکن وہ ہل بھی نہیں سکا۔ وہ عجیب سی سحرزدگی تھی کہ اُس کا جسم جیسے پتھر کا مجسمہ بن گیا تھا۔ مگر نہیں، مجسموں کی رگوں میں سرور اور بےخودی کب دوڑتی ہے۔

لمحے گزرتے گئے۔ وہ دونوں یونہی کھڑے بھیگتے رہے۔ ہوا کا زور تو ٹوٹ گیا تھا لیکن بارش بدستور ہو رہی تھی۔

دونوں نے ایک وقت میں ایک ہی بات سوچی۔ بارش کے ٹھنڈے پانی میں بھیگ کر بھی جسم اتنے گرم کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ کیا جادو ہے۔

عبدالحق تو صحرا کا رہنے والا تھا۔ سمجھ سکتا تھا، جانتا تھا کہ بارش کی ترسی ہوئی زمین پر جب پہلی بارش ہوتی ہے تو وہ حدت اگلنے لگتی ہے۔ اس پر ٹھنڈک کی رُت تو سیراب ہونے کے بعد ہی آتی ہے۔ لیکن نور بانو نہیں سمجھ سکتی تھی۔

پھر اچانک عبدالحق کو احساس ہوا کہ تصادم تو اتفاقی تھا۔ مگر جو کچھ اب ہو رہا ہے، وہ غلط ہے۔ دل تو چاہتا تھا کہ وقت ساکت ہو جائے اور وہ یونہی نور بانو کو بانہوں میں لئے کھڑا رہے۔ لیکن اس احساس نے کہ وہ گناہ کی حد میں داخل ہو چکا ہے، اسے لرزا دیا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے ہاتھوں کی گرفت کمزور ہوئی لیکن جواب میں نور بانو کے ہاتھوں کی گرفت اور سخت ہو گئی۔ اُس نے نور بانو کو علیحدہ کرنا چاہا تو وہ اُس سے اور زیادہ لپٹ گئی۔ اسے دھکیل کر ہٹانا، دور کرنا اُس کے لئے ناممکن تھا۔

اندر سے تسلسل کے ساتھ ایک آواز ابھر رہی تھی...... یہ غلط ہے...... ممنوع ہے...... اللہ نے منع کیا ہے اس سے...... ہٹ جاؤ...... اور دھکیل دو اسے...... مگر دل کہہ رہا تھا کہ اسے جزو جاں کر لو...... ایک ہو جاؤ کہ یہی تکمیلِ بشر ہے۔

اندر کی آواز اسے بےچین کر رہی تھی، ڈرا رہی تھی۔ مگر دوسری طرف وہ ایسی سرمستی اور بےخودی کی کیفیت میں تھا، جو اُس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی، اور وہ اس کیفیت سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔

یہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں اس سے شادی کرنے والا ہوں۔ اس نے اندر کی آواز کو دلیل سے خاموش کرنے کی کوشش کی۔

لیکن ابھی تمہاری شادی نہیں ہوئی اس سے۔ ابھی یہ سب کچھ جائز نہیں۔ دور ہٹ جاؤ۔ دور ہٹا دو اسے۔

یہ محبت ہے، گناہ نہیں۔ اور ہم دونوں کی مرضی ایک دوسرے سے شادی کی ہے۔ ہم گناہ تو نہیں کر رہے ہیں۔

یہ گناہ ہی ہے۔ ہٹ جاؤ۔ ہٹا دو اسے......

دل کی کمزور دلیل کے سامنے اندر کی آواز کمزور پڑتی گئی۔ عبدالحق نے ٹھوڑی تھام کر نور بانو

کا چہرہ اٹھایا، اور اسے غور سے دیکھتا رہا۔ وہ ایسی قربت تھی کہ گھپ اندھیرے میں بھی وہ اس کے چہرے کے ہر نقش کو دیکھ سکتا تھا۔

رات پردہ پوش! اُس کے اندر کسی نے سرگوشی میں کہا۔

وہ جھکا اور بے تابانہ اس چہرے کو چومنے لگا۔ بارش کی طرح وہ اُس چہرے کو خال خال بھگو رہا تھا۔ مگر وہ اپنی اس کیفیت میں ایسا مدہوش تھا کہ اُسے نور بانو کی کیفیت کا احساس ہی نہیں تھا۔

نور بانو ٹھوڑی پر اُس کا ہاتھ لگتے ہی یوں بے خود ہوئی تھی کہ جسم کی ساری توانائی سمٹ کر اُس کے چہرے میں آ گئی تھی۔ اُس کی ٹانگیں اور اُس کا جسم ایسا ہو گیا تھا کہ عبدالحق اسے چھوڑ دیتا تو وہ زمین پر ڈھیر ہو جاتی۔ وہ تو جیسے اپنا وجود ہی کھو بیٹھی تھی۔ مگر اسے احساسِ زیاں نہیں تھا۔ بلکہ یہ سب ہو جانے کے اس عمل میں لذت اور بے خودی کے سوا کچھ نہیں تھا...... اور یہ احساس کہ اپنا ناتواں وجود اُس نے ایک طاقت در وجود کے سپرد کر کے خود کو طاقت ور بنا لیا ہے۔ اب اس سہارے کے ساتھ وہ بہت کچھ ہے، اور اس سہارے کے بغیر کچھ بھی نہیں۔

بارش کا زور بھی بہ تدریج ٹوٹا تھا۔ بارش رکی تو عبدالحق کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ جیسے کسی سحر سے آزاد ہو گیا تھا۔ اُس نے بڑی نرمی سے نور بانو کو خود سے علیحدہ کیا۔

لمحے دبے پاؤں گزرتے رہے۔ عبدالحق سر جھکائے کھڑا تھا، جیسے اُس کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہ رہا ہو۔ اور نور بانو بڑی مشکل سے اپنے پیروں پر کھڑی تھی۔ اُس کے بس میں ہوتا تو وہ گزرے ہوئے لمحوں کی گرفت سے کبھی آزاد نہ ہوتی۔

پھر نور بانو کو پریشانی کا احساس ہونے لگا۔ یہ خاموش کیوں کھڑے ہیں۔ بولتے کیوں نہیں۔ پھر اس کی سمجھ میں جیسے اچانک ہی بات آ گئی۔ اور غضب ہو گیا۔ یہ مجھے ایسی ویسی لڑکی سمجھ رہے ہوں گے۔ میں تو گر گئی ان کی نظروں میں۔

ادھر عبدالحق کی یہ کیفیت تھی کہ ذہن صاف کی ہوئی سلیٹ جیسا ہو گیا تھا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، اور حافظے میں کوئی لفظ ہی نہیں تھا۔

دونوں ایک دوسرے کے رُوبرو خاموش کھڑے رہے۔ عبدالحق کا شرمندگی سے برا حال تھا۔ وہ اس کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ مگر لفظوں تک پہنچنے میں اسے خاصی دیر لگی۔

بالآخر اُس نے سر جھکائے جھکائے کہا۔ ''نور بی بی...... مجھے معاف کر دیجئے۔''

نور بانو کو زبردست جھٹکا لگا۔ یہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ''جی...... جی...... آپ کیا...... ''

''[illegible] شرمندہ ہوں۔''

[illegible] نور بانو کی سمجھ میں آئی، اس کی پریشانی دور ہو گئی۔ اُس نے سکون کا سانس لیا۔

[illegible]

''میں نے آپ کو بہت تکلیف پہنچائی۔'' عبدالحق اب گڑگڑا رہا تھا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔'' نور بانو نے کہا۔

''آپ کو کتنا برا لگا ہوگا۔ مجھے......''

نور بانو نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپایا اور دروازے کی طرف لپکی...... لپکی کیا، لپکنے کی کوشش کی۔ کیونکہ شیڈ میں، جہاں وہ کھڑے تھے خاصا پانی جمع ہو چکا تھا۔ ان لمحوں میں اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

دروازے سے نکلتے نکلتے ایک خیال نے اُس کے قدم جکڑ لیے۔ اگر وہ اس وقت ایسے ہی نکل گئی تو شرمندگی کے زیرِ اثر عبدالحق شاید اس سے ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گا۔ شاید وہ کبھی اس کا سامنا ہی نہیں کرے گا۔

وہ پلٹی اور عبدالحق کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے کسی مجسمے کی طرح کھڑا تھا۔ جسم میں کوئی جنبش نہیں تھی۔

اسے اس پر ترس آنے لگا۔ اپنے باطن میں یہ بڑا آدمی اس وقت خود کو کتنا چھوٹا، کتنا حقیر سمجھ رہا ہوگا۔

حیا اپنی جگہ، لیکن اس وقت لب کشائی بہت ضروری تھی۔ محبت میں حقائق کو سمجھنا اور سمجھوتے کرنا وہ سیکھ چکی تھی۔ اور وہ اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ چناں چہ اُس نے اسے پکارا۔ ''سنیے......''

عبدالحق نے نظریں اٹھائے بغیر مجرموں کے سے لہجے میں جواب دیا۔ ''جی نور بی بی۔''

''مجھے برا نہیں لگا۔ بلکہ اچھا لگا۔ اس لئے کہ اماں میری اور آپ کی شادی کا فیصلہ کر چکی ہیں۔'' نور بانو نے کہا اور اس سے پہلے کہ عبدالحق نظریں اٹھاتا، وہ گھر کی طرف چلی گئی۔

عبدالحق نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایک لمحے کو اسے ایسا لگا کہ وہ سب اُس کا وہم تھا۔ مگر فوراً ہی اسے یاد آ گیا کہ اس اظہارِ محبت والی رات بھی اسے ایسا ہی لگا تھا۔ لیکن وہ وہم نہیں تھا۔

❁ ❁ ❁

زرینہ جیسے ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔ عبدالحق نے سب کچھ اسے بتانے کے بعد کہا تھا۔

''تمہاری شرط پوری ہو گئی۔ اب تو تمہیں کوئی اعتراض ہونا چاہئے نہ خوف۔''

''جی بھائی۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایسی لڑکی کو کیوں قبول کر رہے ہیں؟''

یہ بات عبدالحق اسے نہیں بتا سکتا تھا۔ اُس نے راز داری کا وعدہ جو کیا تھا۔ ''سب اللہ کی رحمت ہے پگلی۔ اب اس کے بعد اگر فکر کرتا اور خوف زدہ ہوتا ناشکرا پن ہوگا۔''

''آپ [illegible] مئن ہیں نا بھائی؟''

''صرف مطمئن ہی نہیں، پوری رضامندی [illegible] ہوں۔''

''تو پھر مجھے کیسا خوف۔''

اور اب زرینہ سوچ رہی تھی کہ واقعی اللہ کیسا کریم ہے۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے وہ کوٹھے پر بیٹھی تھی اور ہر پل موت کی دعا مانگتی تھی، کیونکہ مرنا بھی اُس کے اختیار میں نہیں تھا۔ پھر یہ اللہ کے بھیجے ہوئے بھائی آئے، اور سب کچھ بدل گیا۔

اُس نے اکبر کو دیکھا تھا۔ وہ اسے اچھا لگا تھا۔ اور وہ بستی کا سب سے معزز گھرانہ تھا۔ وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ اُس کی وہاں شادی ہو سکتی ہے۔ مگر سچ کہتے ہیں کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔

ایک اہم بات اس نے بھائی سے نہیں کہی تھی۔ وہ اسے اماں سے کہنی تھی۔ سو وہ اماں کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

❁ ❁ ❁

اُس رات کھانے کے بعد عبدالحق معمول کے مطابق حمیدہ کے پاس بیٹھا تھا۔ ''آج تو زبردست بارش ہوئی۔'' حمیدہ نے کہا۔

عبدالحق کے دل میں چور تھا۔ اُس نے چونک کر حمیدہ کو دیکھا۔ کہیں اشارہ اُس کی طرف تو نہیں ہے۔ ''ہاں اماں، بڑی خطرناک بارش تھی۔'' وہ بولا

''خطرناک کیسی، بارش تو اللہ کی رحمت ہے پتر۔''

''وہ اماں...... دراصل...... اپنے شیڈ کی چھت کا ایک حصہ اُڑ گیا۔''

''ہاں، نور بانو نے مجھے بتایا تھا۔ وہ تو وہیں تھی اُس وقت۔ بھیگی ہوئی واپس آئی تھی۔''

''جی اماں۔''

''کیا تو بھی وہیں تھا اُس وقت؟''

''نہیں اماں۔ جب چھت اُڑی تو اُس وقت تو میں باہر تھا۔'' عبدالحق نے پوری سچائی سے کہا۔

''تُو وہاں نہ پہنچتا تو بچی بے چاری کا تو دم نکل جاتا ڈر کے مارے۔''

عبدالحق نے چپ سادھ لی۔ اب کچھ بولنا خطرناک ثابت ہوتا۔

''ڈنگر تو خیریت سے ہیں نا پتر۔''

عبدالحق نے موضوع تبدیل ہونے پر سکون کی سانس لی۔ ''جی اماں، ان کے سر پر جو چھت تھی، وہ محفوظ رہی۔'' اُس نے کہا۔

''اللہ کی شان ہے پتر۔''

چند لمحے خاموش رہی۔ پھر حمیدہ نے اچانک کہا۔ ''یہ تُو ہر وقت اُڑا اُڑا پھرتا ہے۔ اب تیرے پاؤں باندھنے پڑیں گے۔''

عبدالحق اس پر بری طرح بدکا۔ لگتا تھا، اماں کو کچھ معلوم ہے۔ دل اندر سے ملامت کرنے

لگا۔ مگر اس نے بڑی معصومیت سے حمیدہ سے پوچھا۔ ''ایسا کیا ہو گیا اماں؟''

''شادی کر دوں گی تیری تو پھر ٹک کر رہے گا میرے پاس۔''

عبدالحق کا دل بری طرح دھڑکا۔ وہ دل میں دعا کرنے لگا کہ آج یہ فیصلہ ہو ہی جائے شام کو جو کچھ ہوا تھا، اُس کے بعد یہ بہت ضروری تھا۔

''میں نے نور بانو سے بات کر لی ہے۔ تجھ سے تو پہلے ہی پوچھ لیا تھا۔''

''مگر اماں، پہلے تو زرینہ کی شادی کرنی ہے۔'' اُس نے کہا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ چالاک...... بلکہ مکار ہو گیا ہے۔

''زرینہ کہتی ہے پہلے تیری شادی ہو گی۔''

عبدالحق کا دل خوش ہو گیا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ اسی وقت نور بانو سے شادی کر لیتا۔ اندر کی شرمندگی مٹانے کی یہی واحد صورت تھی۔ تاہم اُس نے بڑی سنجیدگی سے معترضانہ انداز میں کہا۔

''اس کی کیا تک ہے اماں؟''

''زرینہ ٹھیک کہتی ہے۔ تیری شادی کا ارمان ہے اسے بھی۔ وہ کیوں محروم رہے۔''

''تو وہ کون سا پردیس جائے گی۔ یہیں تو ہو گی۔'' عبدالحق کا مکاری کا احساس اور پکا ہو گیا۔

''ارے پگلے۔ شادی ہوئی تو لڑکی پرائی ہو گئی۔ پھر وہ بات کہاں۔ یہاں وہ آزادی سے تیری شادی میں شریک ہو گی۔ پھر تُو اور اُس کی بھابی مل کر اسے بدا کریں گے۔''

''لیکن اماں، ڈاکٹر صاحب جلدی چاہتے ہیں۔''

''اب جلدی کا مطلب کل تو نہیں ہے نا۔''

''میری شادی تو تم کل بھی کر سکتی ہو اماں۔'' عبدالحق نے بظاہر مذاق میں کہا۔ ''پھر ایک مہینے کے بعد زرینہ کی شادی۔''

''میرا بس چلتا تو کل ہی تیری شادی کر دیتی۔ پر یہ ممکن نہیں۔''

''کیوں اماں؟''

''تیری شادی میں رابعہ کا شریک ہونا تو ضروری ہے نا؟''

''ہاں۔ تو اس میں رکاوٹ کیا ہے؟''

''ارے...... بچہ ہونے والا ہے اُس کے ہاں۔ اب ایسے ہی وہ کیسے شریک ہو سکتی ہے؟''

عبدالحق کو منزل دور ہوتی نظر آئی۔ ''کیوں نہیں ہو سکتی اماں۔''

''اب تجھے کیسے سمجھاؤں۔ ایسے میں تو چلنا پھرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ ارے پگلے، وہ پورے دنوں سے ہے۔''

''مطلب؟''

"کسی دن بھی بچہ ہو سکتا ہے اُس کے ہاں۔ پھر سوا مہینہ اور لگا۔ تو دو مہینے سے پہلے نہیں ہو سکتی تیری شادی۔"

عبدالحق کا دل بجھ گیا۔ احساسِ گناہ پھر ابھر آیا، جو اُس کی دانست میں صرف شادی سے مٹ سکتا تھا۔ مگر بحث کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ رابعہ کے بغیر وہ شادی کیسے کر سکتا تھا۔

❊ ❊ ❊

زندگی میں پہلی بار عبدالحق اپنی طرف سے پریشان اور مضطرب تھا!

وہ اس کے لئے ایک نیا اور بے حد ناخوش گوار تجربہ تھا۔ خود سے ناخوش ہونا کتنی تکلیف دہ بات ہے، یہ وہ اب سمجھ رہا تھا۔ اور اب یہ بھی سمجھ میں آ رہا تھا کہ خود سے خوش ہونا اور باطنی طمانیت کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ افسوس اس بات کا تھا کہ اس پر اس نعمت کی قدر نعمت کو کھونے کے بعد کھلی تھی۔

اس سے پہلے وہ خود سے ناخوش کبھی نہیں رہا تھا۔ ایک کمی کا احساس اسے ضرور ہوتا تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد زمین اس کے نام ہوئی تو کاغذات بنے۔ ان کاغذات میں اُس نے اپنا نام عبدالحق اور ولدیت ٹھاکر پرتاپ سنگھ لکھوائی۔ میٹرک کا سرٹیفکیٹ وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور جب اُس نے میٹرک کیا تو وہ ٹھاکر اوتار سنگھ تھا۔ چنانچہ وہ سند اُس نے دوبارہ عبدالحق کے نام سے بنوائی۔ اس میں کوئی دشواری بھی نہیں ہوئی۔

البتہ ایک بات سے اس کا واسطہ تواتر کے ساتھ پڑا۔ جب بھی کاغذات کے حوالے سے کوئی کام ہوتا تو جس آدمی سے بھی واسطہ پڑتا، وہ حیرت سے کہتا...... ارے تمہارے والد ہندو تھے۔ یہ کہتے ہوئے کچھ لوگوں کے لہجے میں اُس کے لئے تضحیک بھی ہوتی لیکن حسن دین اور مسعود صاحب جیسے لوگوں کے لہجے میں ستائش اور خوشی ہوتی۔ تاہم کسی تضحیک کا اس پر کبھی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ بڑی بے نیازی سے کہتا...... جی میں نومسلم ہوں۔ اس جواب میں خوبی یہ تھی کہ اسے یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی کہ اُس کے پتاجی ہندو تھے۔ گویا مسلمان ہوتے ہی اس کے لئے پچھلے تمام معاملات بے معنی ہو گئے تھے۔ البتہ یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ وہ عبدالحق ولد ٹھاکر پرتاپ سنگھ تھا۔

لیکن اسے ہلکا سا تاسف ضرور ہوتا تھا...... خود پر نہیں، تضحیک کرنے والوں پر۔ وہ اسے حقیر سمجھ رہے ہوتے تھے، صرف اس بنا پر کہ اللہ کی مہربانی سے وہ اہلِ ایمان میں پیدا ہوئے تھے۔ حالانکہ اس میں ان کے لئے فخر کی اور اس کے لئے شرم کی کوئی بات نہیں تھی۔ آدمی اپنے اختیار سے تو نہیں پیدا ہوتا۔ یہ تو اللہ کی مرضی پر منحصر ہے۔ اللہ کے عطا کیے ہوئے کسی اعزاز پر کوئی اترائے تو یہ تو جہالت ہے۔ وہ تو سوچتا تھا کہ اس پر اللہ کی عنایت زیادہ بڑی ہے۔ وہ تو ہندو گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اللہ نے اسے رستہ دکھایا، ہدایت سے نوازا اور اسے قبولِ اسلام عطا فرمایا۔ اس سے ولدیت تو تبدیل نہیں ہو سکتی۔ بیٹا تو وہ اپنے باپ کا ہی کہلائے گا۔

تو جب بھی کسی نے ولدیت کے حوالے سے اُس کے ساتھ تضحیک کا رویہ اختیار کیا تو نہ ہی کبھی اسے کم تری کے احساس نے ستایا، اور نہ وہ کبھی ناخوش ہوا۔ ایک بات پر اسے افسوس ضرور ہوتا تھا کہ وہ اپنے پتاجی کے لئے مغفرت کی دعا نہیں کر سکتا اور اس افسوس کی بنیاد اُس کے دل میں پتاجی کی بے پناہ محبت تھی۔ اپنی ذات کے حوالے سے وہ کبھی ناخوش نہیں ہوا۔ کیونکہ اپنی ولدیت کے سلسلے میں اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اور نہ ہی اس سلسلے میں اسے کوئی جواب دہی کرنی تھی۔ جواب دہی تو بندے کو اپنی کسی کوتاہی، کسی خطا، کسی گناہ کی کرنی ہوتی ہے۔

نومسلم ہونا اُس کے لئے اللہ کی طرف سے اعزاز تھا، اور اُس نے اسے ہمیشہ اعزاز ہی سمجھا۔ خواہ کوئی مسلمان اُس کی تضحیک ہی کیوں نہ کرتا ہو۔ اس سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

پھر لاہور میں قیام کے دوران جو اُس نے جمیل جیسے کردار دیکھے، بازارِ حسن دیکھا، وہاں سڑکوں پر عورتوں کو مال قرار دیتے ہوئے دلال دیکھے، بازار میں پھرتے ہوئے، کوٹھوں پر جسم خریدتے ہوئے خریدار دیکھے تو وہ مایوس ہوا۔ ساتھ ہی اپنے اندر کہیں گہرائی میں اسے ایک بے حد کمینی خوشی کا احساس ہوا۔ وہ اسے سمجھ نہیں سکا۔ لیکن اُس کے نتیجے میں ایک تبدیلی اُس میں رُونما ہوئی۔ اس کے بعد کوئی اس کی ولدیت کے حوالے سے اُس کی تضحیک کرتا تو وہ دل میں سوچتا......

یہاں میں نے وہ مسلم معاشرہ دیکھا ہے، جو بازارِ زنا کو ہیرا منڈی، شاہی بازار کو بازارِ حسن کہتا ہے۔ میں نے وہ پیدائشی مسلمان دیکھے ہیں، جن کا معاش ہی گناہ کی خرید و فروخت ہے، جو دو طرفہ گناہ کماتے ہیں۔ ایک طرف بے سہارا اور مجبور عورتوں کو کبھی دھوکے سے اور کبھی جبر سے بازار میں لا بٹھاتے ہیں تو دوسری طرف تھوڑی سی رقم کے حصول کے لئے مردوں کو گناہ کی طرف راغب کرتے ہیں۔ اور نہ بھی کریں تو بھی ان عورتوں کے پاس آنے والے ہر گناہ گار کے گناہ میں حصہ دار بنتے ہیں۔ وہ سوچتا، یہاں میں نے پیدائشی مسلمان بھی دیکھے ہیں، جو اللہ کے لئے ناپسندیدہ ترین گناہوں میں سے ایک کی نیت لے کر بازار آتے ہیں اور گناہ میں لتھڑ کر بے فکری کے ساتھ جاتے ہیں۔ انہیں خیال نہیں آتا کہ وہ اللہ کو ناراض کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اُس کے انداز میں بے پناہ حقارت ہوتی۔ حالانکہ اس سے پہلے اُس نے رام گوپال جیسے لوگوں کے سوا کبھی کسی کو حقیر نہیں جانا تھا۔ اسے یہ احساس نہیں ہوا کہ اس کی فطرت کے اعتبار سے یہ منفی تبدیلی ہے۔

ایک یہی نہیں، بے خبری کے عالم میں دوسرا نقصان اسے یہ ہوا تھا کہ اس کی فطری عاجزی اور انکساری میں کمی ہوئی تھی۔ وہ اپنی تحسین کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ لیکن اب نومسلم ہونے کے حوالے سے، اپنی ولدیت کے حوالے سے خفیف سی تضحیک پر بھی وہ سوچتا، میں نومسلم ان پیدائشی مسلمانوں سے بہتر ہوں کہ اللہ سے ڈرتا اور گناہوں سے بچتا ہوں۔

یہ تبدیلی اُس میں ایسے آئی تھی کہ اسے خود بھی پتا نہیں چلا تھا۔ شیطان ایسے ہی چپکے سے وار

کرتا ہے۔ بے خبری میں!

مگر اب عبدالحق پریشان اور مضطرب تھا...... کسی اور کے لئے نہیں، اپنے لئے۔ اسے رہ رہ کر احساس ہوتا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے ذاتی نقصان سے دوچار ہو گیا ہے۔ نماز میں اب بے لطفی تھی۔ وہ پہلے کی سی حضوری اور ارتکاز نہیں تھا، جس میں وہ واضح طور پر یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ اللہ کے رُوبرو کھڑا ہے اور اللہ پاک اسے دیکھ رہے ہیں اور نماز میں وہ جو کچھ پڑھ رہا ہوتا، اُس کا مفہوم بھی اُس کے ذہن میں ہوتا۔ اکثر اس پر گریہ طاری ہو جاتا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوتے۔ وہ کیفیت اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ مگر اب وہ اس کیفیت سے محروم ہو گیا تھا۔

تلاوتِ قرآن کا بھی یہی حال تھا۔ پہلے وہ تو لفظوں سے آگے اللہ کی تسبیح کو، اس کی بشارت کو، آیت میں چھپے حکیمانہ حکمتوں کو سمجھ رہا ہوتا تھا۔ مگر اب وہ بات نہیں رہی تھی۔ اب تو لفظوں سے آگے اسے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا...... اور لفظ بھی محض لفظ تھے۔

اور اس کی وجہ تھی نور بانو۔ یہ سب کچھ اس رات نور بانو کے اظہارِ محبت سے شروع ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ اُس کے تصور پر چھا گئی تھی۔ نماز میں بھی اور قرآن پڑھتے ہوئے بھی، اُس کا چہرہ، اُس کا سراپا اُس کی نگاہوں کے سامنے رہتا تھا۔ مگر اب صورتِ حال بہت خراب ہو گئی تھی۔ بارش کی شام کے اُس واقعے کے بعد اُس کو جو حوالے میسر آئے تھے، وہ جسمانی اختلاط کے تھے۔ اور ان میں بڑی لذت تھی۔ نماز کے دوران وہ اس کے تصور پر چھا جاتے، اور وہ آلودگی کے احساس سے شرمندہ ہو کر رہ جاتا۔ مگر بار بار جھٹکنے کی کوشش کے باوجود وہ ان سے پیچھا نہیں چھڑا پاتا۔ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے ہوئے تو پھر بھی جیسے تیسے گزارا ہو جاتا تھا۔ مگر خود نماز پڑھنے کے دوران تو صورتِ حال عبرت ناک ہوتی تھی۔ اسے یہ بھی یاد نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس سورۃ کی قرأت کر رہا ہے۔ درمیان میں بھول جاتا تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بالآخر نئی سورۃ شروع کرنی پڑتی۔

ہر بار قرآن پڑھتے ہوئے اور نماز کے دوران شرمندگی اور ندامت قطرہ قطرہ اُس کے اندر گرتی اور جمع ہوتی رہی۔ ہوتے ہوتے اسے ایسا لگنے لگا کہ اس کے اندر شرمندگی کے سوا کچھ رہا ہی نہیں ہے۔ خود سے لڑتے لڑتے وہ تھک گیا تھا۔ وہ ہار رہا تھا، اور یہ احساس بہت اذیت دہ تھا۔

مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ شرمندگی اور ندامت ایک حد کو پہنچ کر بتدریج اپنی اہمیت کھوتے کھوتے معدوم ہو جائے گی۔ اس کی دانست میں اس مسئلے کا واحد حل نور بانو سے اُس کی شادی تھی۔ لیکن وہ بھی ابھی دور تھی۔

پھر ایک دن اُس نے سوچا، چلو...... دو تین مہینے بعد سہی۔ شادی ہو گی تو آپ ہی میری اصلاح ہو جائے گی۔

❁ ❁ ❁

مولوی مہر علی کو عبدالحق میں تبدیلی کا احساس ہو گیا تھا۔ پچھلی بار جو اس سے گفتگو ہوئی تھی تو انہیں پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ اس کی سوچ کسی حد تک منفی ہو گئی ہے۔ دوسرے وہ غرور کی حدود میں داخل ہو رہا ہے۔

انہیں اس باعمل نوجوان سے بہت محبت تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بڑے کھلے دل سے دوسروں کی مدد کرتا تھا، ایسے کہ اسے اس بات کا خیال بھی نہیں ہوتا تھا کہ اُس نے کچھ کیا ہے۔ اتنی بے خبری کے عالم میں کی جانے والی نیکی کا تو بڑا مرتبہ ہوتا ہے۔ پھر وہ ایسا تو مسلم تھا، جسے کتاب اللہ سے عشق تھا۔

خود مولوی صاحب ایسے آدمی تھے، جو صرف قرآن کے حوالے سے زندگی کو سمجھنے، گزارنے اور عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولوی صاحب جانتے تھے کہ عبدالحق میں آنے والی وہ تبدیلی کوئی اچھی تبدیلی نہیں۔ بلکہ اس کی روک تھام نہیں کی گئی تو وہ اس کے لئے تباہ کن ثابت ہو گی۔

چناں چہ ایک دن انہوں نے عبدالحق کو نماز کے بعد روک لیا۔ ''کیا بات ہے پتر؟ کچھ پریشان ہو آج کل؟'' انہوں نے کہا۔

''نہیں مولوی صاحب، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ لیکن آپ کو یہ خیال کیوں آیا؟''

''پہلے تم نماز پڑھتے ہوئے گہرے سکون میں ہوتے تھے، پر اب بہت مضطرب ہوتے ہو۔ پہلے ہلتے ہی بھی نہیں تھے، اور اب پہلو بدلتے رہتے ہو۔''

عبدالحق کو تشویش ہوئی۔ جو کچھ اس پر گزر رہی ہے، وہ دوسروں کو نظر بھی آ رہی ہے۔ تاہم اُس نے سوچی سمجھی بے پروائی سے کہا۔ ''ایسی کوئی خاص بات نہیں مولوی صاحب۔ بس آج کل نماز میں ارتکاز نہیں ہوتا۔''

مولوی صاحب نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ وہ اسے عام سی بات قرار دے رہا تھا۔ لیکن اُس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ اس کے لئے یہ بہت خاص بات ہے اور وہ اس پر پریشان بھی ہے۔

''یہ تو بہت خاص بات ہے پتر۔'' انہوں نے دھیرے سے کہا۔

''اب مولوی صاحب، نماز کے دوران پریشانیوں اور تفکرات کی وجہ سے بے دھیانی تو عام سی بات ہے۔ سوچیں اور خیالات تو خود بہ خود ذہن پر چھا جاتے ہیں۔''

''ہاں پتر۔ اور اللہ اس پر معاف بھی فرما دیتا ہے۔ لیکن اللہ کی خاص عطا اور اس کے فضل کے بعد اس سے محرومی بہت خوف ناک بات ہوتی ہے۔'' مولوی صاحب نے کہا اور گہری سانس لے کر اسے غور سے دیکھتے رہے۔

''میں سمجھا نہیں مولوی صاحب۔''

"دیکھو، گمراہی بہت بری چیز ہے لیکن ہدایت کے بعد گمراہی بہت خوف ناک ہے۔ ایمان کے بعد کفر اور شرک تباہی ہے۔ نیک اعمال کی محبت کے بعد ان سے بے رغبتی بدبختی ہے۔ اب نماز میں حضوری اور ارتکاز تو بندے کے لئے ناممکن ہے۔ اسی لئے تو معافی ہے۔ تو یوں سمجھو کہ کسی کو نماز میں حضوری اور ارتکاز میسر ہے تو وہ اس پر اللہ کی عنایت ہے۔ اور اس کے چھن جانے کا مطلب اللہ کی ناراضی بھی ہو سکتا ہے۔ دیکھو نا، اللہ اپنی جس نعمت کو جب چاہے، واپس لے لے۔"

عبدالحق اندر سے تھرا کر رہ گیا۔ سچ مچ وہ اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔ اور مولوی صاحب اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔

"اللہ کی ناراضی کا کیسے پتا چلتا ہے مولوی صاحب؟"

"دل سے۔ دل سمجھ لیتا ہے۔ دل بتا دیتا ہے۔"

"مگر دل کی بات پر کوئی یقین کیسے کرے۔ دل جو کچھ کہتا ہے، اس کے پیچھے کوئی منطقی دلیل تو نہیں ہوتی۔"

"ٹھیک کہتے ہو پتر۔" مولوی صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔ "یہ کام تو دماغ کا ہے، عقل کا ہے۔ یہ دلیلیں ڈھونڈنا، جواز تلاش کرنا اور تجزیہ کرنا۔ لیکن پتر، دلیل تو ہر چیز کے حق میں مل جاتی ہے۔ وہ تو شرک اور کفر کو بھی جائز قرار دے دیتی ہے۔ اس لئے کہ عقل علم کی روشنی میں بات کرتی ہے اور اس کا علم بہت محدود ہوتا ہے۔"

"تو پھر اللہ نے عقل کیوں دی ہے انسان کو؟"

"دنیا کے لئے دی ہے پتر۔ اور سمجھنے اور غور کرنے کے لئے دی ہے۔ اور عقل غلطی بھی کرتی ہے۔ تو دنیا کا نقصان ہو جائے تو بڑی بات نہیں۔ تم نے یہ غور نہیں کیا پتر عبدالحق کہ ایمان دل سے لانے کا حکم ہے۔ قرآن پڑھتے ہوئے کسی آیت میں چھپی کوئی حکمت، اس کا مفہوم دل پر اترتا ہے...... دماغ پر اور عقل پر نہیں۔ کیونکہ دل میں یقین ہوتا ہے اور دماغ اور عقل میں شکوک۔"

یہ وہ موضوع تھا، جو عبدالحق کو بہت محبوب و مرغوب تھا۔ پریشانی بھول بھال کر وہ اس میں کھو گیا۔ "لیکن مولوی صاحب، قرآن میں اللہ نے فرمایا کہ زمین میں گھومو پھرو، غور کرو۔ تو یہ تو عقل کے لئے ہے نا۔"

"ہاں پتر۔ پر سب سے پہلے ہے دل سے ایمان لانا۔ اب ہم وہ ایمان لائے تو مسلم ہوئے۔ وہ سورۃ الحجرات میں ہے نا کہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے...... تو ان سے کہو کہ نہیں، تم ایمان نہیں لائے۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ تو مسلم سے مومن کے درجے تک پہنچنا اس کے بعد کا مرحلہ ہے۔ یہاں اس آیت پر سوچو، جس کا تم نے حوالہ دیا۔ زمین میں گھومو پھرو اور غور کرو۔ غور کرو گے تو اللہ کی قدرت کے لاکھوں پہلو تمہارے سامنے آئیں گے۔

ی اجڑی ہوئی بستی کو دیکھو گے تو دنیا کی بے ثباتی کو سمجھو گے۔ یعنی دلیل کے ساتھ تجزیہ کرو تو ان کی روشنی میں۔ اس کے بغیر کرو گے تو بھٹک جاؤ گے۔ تو جب ایمان کی روشنی میں دیکھو گے تو یا کی بے ثباتی کو سمجھو گے۔ یعنی دلیل کے ساتھ تجزیہ کرو تو ایمان کی روشنی میں۔ اس کے بغیر کرو ے تو بھٹک جاؤ گے۔ تو جب ایمان کی روشنی میں دیکھو گے اور سمجھو گے تو ایمان کی پختگی بڑھتی ے گی۔ اور دل کی روشنی بھی۔ پھر جب تم ایمان کی روشنی میں اللہ سے ڈرو گے، اس کے کامات بجا لاؤ گے، ممنوعات اور مکروہات سے بچو گے اور نیک اعمال کرو گے تو بڑھتے بڑھتے کسی ی وقت اللہ کی رحمت سے ایمان تمہارے دل میں داخل ہو جائے گا اور تم مومن ہو جاؤ گے۔ تو یں سمجھو پتر کہ دل بادشاہ ہے، سپہ سالار ہے، اور عقل، دماغ اور دیگر حواس اس کی سپاہ ہیں۔ ان کا ام دل کے ایمان کی روشنی میں ایمان کی پختگی کے لئے دلائل و آثار جمع کرنا ہے۔"

"آپ نے کہا کہ اللہ کی ناراضی کا پتا دل کو چل جاتا ہے۔"

"ہاں...... اور اللہ کے راضی ہونے کا بھی۔"

"مگر مولوی صاحب، دل تو بغیر دلیل اور فہم کے چلتا ہے۔ وہ تو بس ایک پل میں فیصلہ کر لیتا ہے کہ بات درست ہے یا غلط، تو اس کا فیصلہ درست ہونے کی تو کوئی ضمانت نہیں۔ اس کا فیصلہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ گمراہی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو پتر۔ اس کے لئے قلب منیب درکار ہوتا ہے...... رجوع کرنے والا دل۔"

"اس دن آپ نے کہا تھا کہ ہدایت ان لوگوں کے لئے ہے، جو رجوع کرنے والے ہوں۔" عبدالحق کو پچھلی گفتگو یاد آئی۔

"ہاں پتر، یہ مرحلے ہیں۔ بنیادی چیز یہ یقین ہے کہ اللہ موجود ہے۔ یقین میں نے اس لئے کہا کہ ایمان آگے کا مرحلہ ہے۔ اور اللہ کے وجود کا یقین کسی ایسے شخص کو بھی مل سکتا ہے، جو کافروں اور مشرکوں میں پیدا ہوا ہو......"

عبدالحق تھرا کر رہ گیا۔ اس کی مثال تو وہ خود تھا۔

"...... مگر سوچتا ہو، غور کرتا ہو اور اس کی سمجھ میں آتا ہو کہ یہ سارا نظام، جس کے تحت دنیا چل رہی ہے، ایک زبردست ہستی کا قائم کیا ہوا ہے۔ تو وہ جب بھی کسی پریشانی میں ہوگا تو چاہے زبان سے نہ کرے، دل سے وہ اللہ سے رجوع کرے گا۔ یہ ہدایت کا آغاز ہے۔ دل میں روشنی میں پہلی کرن کا اترنا ہے۔ اور ہدایت مرحلہ وار ہوتی ہے۔ سوچو نا، حروف کی شناخت کے مرحلے میں موجود بچے کو تم کتاب تو نہیں پڑھوا سکتے۔ پہلے وہ حروف جوڑنا سیکھے گا اور پھر لفظ پڑھنا۔ ہاں، کسی پر اللہ کی خاص رحمت ہو تو وہ اور بات ہے......"

عبدالحق کو ایسا لگ رہا تھا کہ مولوی صاحب اس کی کہانی سنا رہے ہیں۔ وہ اسی طرح سوچا

کرتا تھا اور مہمان ہستی کا قائل ہوا تھا۔ نور بانو اُس کے لئے اتنی زیادہ محترم اسی حوالے سے تھی کہ نہ وہ اس کی آواز سن کر اس پر فدا ہوتا، نہ اسے عربی سیکھنے کا خیال آتا، اور وہ عربی نہ سیکھتا تو اُس رات وہ آیات اُس کی سمجھ میں کیسے آتیں، جو اُس کا ہاتھ تھام کر اسے ایمان کی طرف لے گئی تھیں۔

''تو پتر، رجوع کرنے والا بغیر یقین کے تو رجوع نہیں کرے گا۔ پھر اللہ کی رحمت سے رجوع کرنے کے نتیجے میں وہ ایمان تک پہنچے گا، اور سلسلہ جاری رہے گا تو ایمان میں اُس کے درجات بڑھتے جائیں گے۔ روشنی بڑھتی جائے گی، یہاں تک کہ دل پوری طرح روشن ہو جائے گا۔ یہ قلب منیب ہے۔ وہ دل جو صرف اللہ کی اطاعت کر کے قیامت کے روز اس کے دیدار کا امیدوار ہوتا ہے۔ اس دل کا اللہ سے رابطہ ہوتا ہے، اور وہ اس کے راضی اور ناراض ہونے سے ہر پل باخبر رہتا ہے۔ دل آدمی کے وجود میں اللہ کی نشریات وصول کرنے والا ریڈیو ہے۔ اب ہمیں یہ بتا دیا گیا کہ گناہوں کے نتیجے میں دل پر ایک سیاہ نقطہ نمودار ہوتا ہے۔ اور آدمی مسلسل گناہ کرتا رہے تو وہ نقطہ پھیلتے پھیلتے پورے دل پر محیط ہو جاتا ہے۔ پھر اس دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ اس تک صحیح بات بھی نہیں پہنچتی، الا یہ کہ اللہ چاہے۔''

بات عبدالحق کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ لیکن وہ اسے زیادہ بہتر طور پر سمجھنا چاہتا تھا۔ ''پتا کیسے چلتا ہے مولوی صاحب۔ آپ اگر مجھ سے ناراض ہوں تو چاہے زبان سے کچھ نہ کہیں، آپ کے چہرے سے اظہار ہو جائے گا۔ لیکن اللہ تو نظر نہیں آتا۔ وہ ہم سے کلام تو نہیں کرتا۔''

''دیکھو پتر عبدالحق، میں تو طالب علم ہوں۔ بس اپنا تجربہ تمہیں بتا سکتا ہوں۔'' مولوی صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اللہ نے ہمارے وجود میں، ہمارے باطن میں بھی نشانیاں رکھی ہوئی ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ آنسو اللہ کی رضا کا مظہر ہوتے ہیں، خواہ وہ خوشی کے ہوں، شکر کے ہوں، ندامت کے ہوں یا بے سبب ہوں۔ گریہ مجھے بتاتا ہے کہ میرا رب مجھ سے راضی ہے۔ یہ میں کسی دنیاوی، جسمانی یا قلبی تکلیف اور اذیت کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ نماز پڑھتے ہوئے خوش قسمتی سے کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے......''

یہ بھی عبدالحق کے تجربے میں تھا۔ مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ اللہ کے، بندے سے خوش ہونے کی دلیل ہے۔ اور اب تو وہ اس سے تقریباً محروم ہی ہو گیا تھا، اور اس کی کمی محسوس کر رہا تھا۔

''اور ناراضی کا کیسے پتا چلتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ ناراض ہوتا ہے تو بندہ گریہ سے محروم ہو جاتا ہے۔'' مولوی صاحب نے سادگی سے کہا۔

عبدالحق لرز کر رہ گیا۔ تو کیا اللہ اس سے ناراض ہے۔

''اللہ آپ سے اپنی رضا کا اظہار فرماتا ہے تو دل نرم ہو جاتا ہے، جیسے پگھل رہا ہو، اور آپ بے اختیار رونے لگتے ہیں۔ اور وہ ناراضی ظاہر فرمائے تو دل سخت ہو جاتا ہے۔ آدمی غصے اور

جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو جاتا ہے، جو شیطانی اوصاف ہیں۔ نماز میں قرأت کرتے ہوئے میں کوئی آیت بھول جاؤں، جو مجھے پکی یاد تھی تو مجھے ندامت ہوتی ہے، بے بسی کے احساس سے آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ میں اس سے پچھلی آیت کو بار بار دہراتا ہوں۔ اللہ خوش ہوتا ہے اور مجھے وہ آیت یاد آ جاتی ہے۔ دل کو سکون ہو جاتا ہے۔ اور کبھی اسی صورت حال میں ایسا ہوتا ہے کہ مجھے اپنے بھولنے پر غصہ آتا ہے، جھنجلاہٹ ہوتی ہے، مجھے وہ آیت بار بار کوشش کرنے پر بھی یاد نہیں آتی۔ تنگ آ کر میں کوئی دوسری سورۃ پڑھ لیتا ہوں۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ اللہ مجھ سے ناراض ہے۔''

''لیکن پکی یاد ہوئی آیت آدمی بھول کیسے جاتا ہے؟'' عبدالحق نے سوال کیا۔

''پہلے یہ سوچ کہ پورا قرآن آدمی کو یاد کیسے ہو جاتا ہے؟''

''وہ تو اللہ کی رحمت اور عنایت ہوتی ہے مولوی صاحب۔''

''میں پھر کہوں گا پتر کہ میں عالم نہیں، معمولی سا طالب علم ہوں۔ مجھے تو بھولنا بھی اللہ کی رحمت لگتی ہے۔''

''وہ کیسے مولوی صاحب؟''

''دیکھو، میں حافظِ قرآن ہوں۔ آدمی کسی خوبی پر مغرور بھی تو ہو سکتا ہے۔ تو اللہ مجھے چھوٹی سی ایک آیت بھلا دیتا ہے۔ تاکہ میں سوچوں کہ جو ملا ہے، وہ اُس کا فضل ہے۔ ورنہ میری تو ایک چھوٹی سی آیت یاد کرنے کی بھی بساط نہیں۔ تو یہ اللہ کی رحمت ہے نا کہ وہ مجھے غرور کی حد سے کھینچ کر عاجزی کے دائرے میں لے آتا ہے۔ ذرا سوچو پتر کہ تراویح پڑھانے والے کے پیچھے کئی کئی حافظ کیوں ہوتے ہیں۔ اسی لئے کہ کوئی یہ دعوا نہیں کر سکتا کہ وہ حافظ ہے اور قرآن پڑھنے میں بھول نہیں سکتا۔''

''ذرا قلب منیب کی وضاحت بھی کر دیجئے۔''

''وہ تو بہت منور، بہت روشن دل ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اُس کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ جنگل کے سب سے کمزور جانور کی طرح چوکنا ہوتا ہے، جسے کوئی بھی جانور نقصان پہنچا سکتا ہے۔ دماغ اس کا تابع ہوتا ہے۔ وہ معمولی سی آہٹ پر بھی چوکس ہو جاتا ہے۔ پتے کی سرسراہٹ پر بھی بھڑک اٹھتا ہے۔ یہ وہ دل ہے کہ کوئی اس کی تعریف خلوص سے بھی کرے تو وہ اُس پر خوش ہونے کے بجائے الحمدللہ کہہ کر اس تعریف کو اسی کی طرف بھیج دیتا ہے، جس کے لئے ہر تعریف ہے۔ وہ ہر خیال، ہر سوچ کی طرف سے چوکس رہتا ہے کہ ان میں سے کوئی شیطان کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی چوکسی کا الٹ لفظ ہے غفلت۔ تم غفلت کو معمولی لفظ نہ سمجھنا پتر۔ غفلت دل کی روشنی کم کرتی ہے، اور اندھیرے کو بڑھاتی ہے۔ غافل دل کو شیطان کسی بھی وقت گمراہ کر دیتا ہے۔ اور یاد رکھو، شیطان سب سے زیادہ، روشن دلوں کی تاک میں رہتا ہے۔

''تو پتر، دل روشن ہو تو اللہ کی ناراضی کا فوراً ہی پتا چل جاتا ہے۔ اور بندہ فوراً ہی نادم ہو کر

اللہ سے رجوع کرتا ہے۔توبہ کرتا ہے۔یہ ہے قلبِ منیب۔سورۃ قٓ میں اللہ فرماتا ہے: مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَ جَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ. جو ڈرتا رہا رحمان سے بن دیکھے اور آیا ہے دلِ گردیدہ لیے۔تو یہ ہے قلبِ منیب۔''

عبدالحق سوچ رہا تھا......اس سے بے خبر کہ مولوی صاحب اسے بہت غور سے دیکھ رہے ہیں۔

''عبدالحق پتر، اب تم شادی کرلو۔'' مولوی صاحب نے اچانک کہا۔

عبدالحق بری طرح چونکا۔اس نے نظریں اٹھائیں، مگر گھبرا کر فوراً ہی جھکالیں۔کیا مولوی صاحب جان گئے ہیں کہ میں......؟ آگے اس سے سوچا نہیں گیا۔''یہ کیوں کہا آپ نے مولوی صاحب؟'' اُس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''نکاح میرے پیارے نبی ﷺ کی اہم ترین سنتوں میں سے ہے پتر۔اور نیک بیوی اللہ کی اعلیٰ ترین نعمتوں میں سے ہے۔نکاح حرام کو حلال کرتا ہے۔جیسے تکبیر پڑھ کر ذبح کرنے سے پہلے گوشت آدمی پر حلال نہیں ہوتا، ویسے ہی نکاح کے بغیر عورت بھی مرد پر حلال نہیں ہوتی۔اور پتر، ہر گناہ کی ایک ڈھال ہوتی ہے۔تو زنا کی ڈھال نکاح ہے۔''

عبدالحق پر لرزہ طاری ہوگیا۔''مگر مولوی صاحب، میں تو زنا کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''زیادہ تر گناہ آدمی بے سوچے سمجھے کرتا ہے پتر عبدالحق۔'' مولوی صاحب نے شفقت سے کہا۔''وہ تو جب دل بالکل ہی سیاہ ہوجائے تو آدمی سوچ سمجھ کر منصوبہ بنا کر گناہ کرتا ہے۔لیکن عام آدمی تو بے خبری میں گناہ کرتا ہے، اور اکثر اوقات تو بعد میں بھی اس سے بے خبر ہی رہتا ہے کہ وہ جو کچھ اُس نے کیا، وہ گناہ تھا۔اور مسلمان کو زنا کو عام پہلو سے نہیں دیکھنا چاہئے۔زنا تو ہر عضو کا ہوسکتا ہے، بلکہ ہوتا ہے۔کسی کو بری نظر سے دیکھا تو یہ آنکھوں کا زنا ہے۔زبان سے فحش بات حصولِ لذت کے لئے کہی تو یہ زبان کا زنا ہے۔آگے خود سوچتے چلے جاؤ۔سمجھ میں آجائے گا۔''

عبدالحق کا بہت برا حال تھا۔اُس کا بس چلتا تو جادو کے زور پر وہاں سے غائب ہو جاتا۔

''لیکن مولوی صاحب، یہ کیسی ڈھال ہے۔شادی کے بعد بھی تو لوگ زنا کی طرف چلے جاتے ہیں۔''

''وہ ان کی بدبختی ہے۔'' مولوی صاحب نے آہ بھر کے کہا۔''اور پتر، ڈھال تو بس دشمن کے وار روکنے کے لئے ہوتی ہے۔ذرا سی چوک ہوئی تو دشمن نے جھکائی دے کر چرکا لگا دیا۔ڈھال مکمل تحفظ تو نہیں۔''

''تو مکمل تحفظ تو ممکن ہی نہیں۔''

''ہاں......مکمل تحفظ تو بندے کے اختیار میں ہے ہی نہیں۔بچانے والا تو اللہ ہے۔البتہ بندے کو زرہ پوش ہونا چاہئے۔''

''اور آدمی کی زرہ کیا ہوتی ہے؟''

''اللہ نے قرآن میں فرمایا تو ہے کہ بہترین لباس تقویٰ ہے۔تو گناہوں کے مقابلے میں بندے کی زرہ تقویٰ ہے......اللہ سے ہر پل ڈرنا، اور اس ڈر سے چوکنا رہنا کہ بے اختیار بھی گناہ سرزد نہ ہو۔''

''اور اس زرہ پر بھی چرکا لگ جائے تو؟''

''تو اس کے لئے توبہ کا رَفو ہے۔جس کے جسم پر تقویٰ کا لباس ہوگا، گناہ سرزد ہونے پر اُس کا دکھ بھی تو بہت شدید ہوگا۔کیسے گڑگڑائے گا وہ، کیسے روئے گا۔سچے دل سے۔سچی توبہ ضرور قبول ہوتی ہے۔اور توبہ قبول ہوگی تو جسم پر، روح پر چرکے کا نشان بھی نہیں رہے گا، اور زرہ بھی پہلے جیسی بے داغ ہو جائے گی۔''

''لیکن تقویٰ اختیار کرنا تو بہت مشکل کام ہے مولوی صاحب۔''

''مشکل نہیں، بندے کے لئے تو ناممکن ہے۔تقویٰ کے لئے بندے کو اللہ کی ذات پر، اور اُس کی اپنی بتائی ہوئی صفات پر کامل ایمان ہونا چاہئے۔''

''تو یہ ایمان تو ہر مسلمان کے پاس ہوتا ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

مولوی صاحب نے پھر ایک گہری سانس لی۔''یہ وہی بات ہے، جس کے لئے میں نے سورۃ الحجرات کی آیت مبارکہ کا حوالہ دیا تھا۔ہم عام لوگوں نے مان لیا۔لیکن مان لینا یقین کا سب سے نچلا درجہ ہے۔کبھی آدمی یونہی، بغیر یقین کے بھی کوئی بات مان لیتا ہے۔وہ یقین بھی نہیں ہوتا۔کام یقین سے بھی نہیں چلتا۔یہاں تو ایمان چاہئے......ایمان۔یقین دل میں داخل ہو اور رچ بس جائے تو ایمان کی حد شروع ہوتی ہے۔پھر بندہ جیسے جیسے اللہ کو خوش کرتا ہے تو اللہ اس کے ایمان کے درجات بلند فرماتا رہتا ہے۔اب پتر، ہم مانتے ہیں نا کہ اللہ سمیع ہے۔کیا بولتے وقت ہمیں ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ اللہ سن رہا ہے۔ہم اسے بصیر مانتے ہیں۔لیکن یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ وہ ہمیں ہر پل دیکھ رہا ہے۔اگر ان صفات پر ہمارا ایمان ہو تو ڈر کے مارے بولنا ہی بھول جائیں۔زمین پر قدم بھی پھونک پھونک کر رکھیں۔نہیں پتر، ہم صرف مانتے ہیں، ایمان نہیں رکھتے۔ہم الحمدللہ مسلم ہیں۔ہماری زندگی کا مقصد مسلم سے مومن تک کی مسافت کو طے کرنا ہونا چاہئے۔مگر ہم دنیا میں الجھ کر اپنے اس مقصد کو بھول جاتے ہیں۔اور جب زیادہ الجھتے ہیں تو جو کچھ مانا تھا، اُس میں سے بھی بھولنا شروع کر دیتے ہیں، اور ہمیں پتا بھی نہیں چلتا۔''

عبدالحق نے ستائشی نظروں سے انہیں دیکھا۔''لیکن مولوی صاحب، آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔آپ تو مومن ہیں......''

''نا پتر۔میں مومن کہاں۔ہاں اللہ سے ایمان اور تقویٰ مانگتا ہوں۔سنو پتر، عالم بے عمل بھی تو ہوتا ہے، نا۔سب کچھ جانتا ہے، دوسروں کو نصیحت کرتا ہے، پر خود عمل نہیں کرتا۔اس لئے تو

اُس کی بات میں تاثیر نہیں ہوتی۔ سنو پتر، میرے پاس...... ہر انسان کے پاس جو بھی اچھا ہے، وہ اللہ کی عطا سے، اس کے فضل و کرم سے ہے۔ اس کا دیا ہوا ہے۔ اور جو کچھ میرا اپنا ہے، اُس کا میں حساب نہیں لگانا چاہتا۔ کیونکہ وہ سب برا ہے۔''

''تو مولوی صاحب، بندہ خود سے زرہ پوش نہیں ہو سکتا۔ اور ڈھال پوری طرح دفاع نہیں کر سکتی۔ پھر بندہ کیا کرے؟''

''ڈھال کے ساتھ اللہ کی رحمت اور مغفرت طلب کرتا رہے۔ میری بات سنو پتر، جن کے دلوں پر مہر لگ گئی ہو، ان کی اور بات ہے۔ پر عام بندہ جو بھی گناہ کرتا ہے، وہ غیر فطری نہیں ہوتا۔ سارا فساد نفس کا ہے۔ اور نفس ابتدا میں جو کچھ بھی مانگتا ہے، وہ فطری ہوتا ہے۔ ان ممنوعہ چیزوں میں نفس کے لئے کشش اللہ نے رکھی ہے۔ تو ڈھال کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ بندہ اپنے نفس کو پچھاڑ کر رکھے۔''

''لیکن کہتے ہیں کہ نفس بہت طاقت ور ہوتا ہے۔''

''شروع میں بندہ نفس سے طاقت ور ہوتا ہے۔ مگر وہ تقاضے کرتا رہتا ہے...... ہر ہر پل تقاضے۔ اور بندہ اُس کی معمولی سی طلب بھی پوری کر دے تو اُس کی طاقت بہت بڑھتی ہے۔ اور تقاضوں پر تقاضے پورے کرتے چلے جاؤ تو نفس آقا بن جائے گا اور تم غلام۔ نفس کو ہوس ہوتی ہے۔ وہ سیر کبھی نہیں ہوتا۔ بیوی مل جائے تو اُس سے سیر ہو جاتا ہے اور غیر عورت کا تقاضا کرتا ہے۔ دولت مل جائے تو مزید دولت۔ وہ ہر وقت هَل مِنۡ مَزِيد کی تکرار کرتا ہے۔ اور دیکھو، سورۃ قٓ میں اللہ نے فرمایا ہے کہ دوزخ بھی پوچھنے پر یہی کہے گی...... هَلۡ مِنۡ مَزِيد۔ کہنے کا مطلب یہ کہ نفس کو بھوکا رکھنا ضروری ہے۔ اسی سے یہ کمزوری میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اور وہ تمہیں پوری طرح زیر کر لے تو پھر غیر فطری اور غیر انسانی تقاضے بھی کرنے لگتا ہے، اور بندہ اُس کے سامنے عاجز اور مجبور ہو جاتا ہے۔''

''نجات تو تقویٰ میں ہے مولوی صاحب۔ اور آپ فرماتے ہیں کہ بندہ تقویٰ کو نہیں پہنچ سکتا۔'' عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔ ''تو پھر بندہ کیا کرے کہ اللہ اسے تقویٰ عطا فرمائے۔''

''اللہ سے کچھ بھی حاصل کرنے کے لئے بندے کے پاس ایک ہی راستہ ہوتا ہے...... یہ کہ وہ اللہ سے رجوع کرنے والا بنے۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ ہدایت ان کے لئے ہے جو اللہ سے رجوع کرتے ہیں۔ اور سورۃ الفتح میں اللہ فرماتا ہے...... اور وہ لوگ جنہوں نے ہدایت پائی، مزید عطا فرماتا ہے اللہ ان کو ہدایت اور عطا فرماتا ہے انہیں ان کے حصے کا تقویٰ۔ تو بندہ تسلسل کے ساتھ اپنے رب سے راجع رہے گا تو ہدایت بڑھتی رہے گی، اور ہدایت کی نسبت سے انہیں تقویٰ میں بھی حصہ ملتا رہے گا۔ تو پتر عبدالحق، بندے کی تو عافیت اس میں ہے کہ اللہ سے رجوع کرتا رہے......

نیکی میں بھی اور گناہوں کے بعد بھی۔''

اب عبدالحق اپنی طرف سے فکر مند تھا۔ اور وہ صورتِ حال کو جاننا اور سمجھنا چاہتا تھا۔ مگر وہ جھجک رہا تھا۔ ''تو مولوی صاحب، اللہ نے کچھ عورتیں تو ہر شخص پر حرام کر دی ہیں۔''

''ہاں...... رشتوں کے حوالے سے۔ جیسے ماں، بہن، خالہ، پھوپھی، سگی بھتیجی، سگی بھانجی۔ پھر وہ عورتیں جو باپ کے نکاح میں رہیں حرام ہیں۔ اب رہیں نامحرم عورتیں تو ان کے حلال ہونے کی واحد صورت نکاح ہے۔''

عبدالحق متذبذب تھا...... جھجک رہا تھا۔ مولوی صاحب نے اُس کی کیفیت بھانپ لی۔

''علمی گفتگو میں کبھی نہ شرمایا کرو پتر۔ بندہ بات نہیں کرے گا تو جانے گا کیسے؟'' وہ بولے۔ ''لیکن ہاں، گناہ کے بارے میں بھی کسی کو مت بتاؤ خواہ شرمندگی اور ندامت کے زیرِ اثر بتا رہے ہو۔ اللہ ستار ہے۔ بندوں کا پردہ رکھتا ہے۔ اُس نے کسی کا باطن کسی پر نہیں کھولا۔ اور وہ معاف کرنے والا ہے۔ بڑے سے بڑا گناہ معاف کر دیتا ہے۔ بندے کا عمل بس اُس کے اور اللہ کے درمیان رہنا چاہئے۔ وہ تو نیکی کی تشہیر بھی پسند نہیں کرتا۔ سب سے اجر والی نیکی تو اُس کے ہاں وہ ہے، جس کا علم صرف نیکی کرنے والے کو ہو یا اسے جس کے ساتھ نیکی کی گئی۔ اور وہ تو ہے ہی علیم و خبیر۔ تو وہ یہ کبھی پسند نہیں کرے گا کہ بندہ گناہ کی تشہیر کرے۔ گناہ پر گواہ بنائے۔ یہ بڑائی نہیں، برائی ہے۔'' انہوں نے ایک لمحے کو توقف کیا۔ ''مجھے لگتا ہے، تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔''

''جی، مولوی صاحب، میں یہ سوچتا ہوں کہ نسبت طے پانے کے بعد کا وقت بہت نازک ہوتا ہے۔'' عبدالحق نے کہا، اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کیسے کرے۔ لیکن بات کرنا بھی ضروری تھا۔ ''اب کسی لڑکی کی منگنی ہو گئی کسی سے۔ اور دونوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بھی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے ہیں۔ تو مولوی صاحب، ان کے درمیان کشش تو ہو گی۔ اب اگر کسی دن وہ بہک جائیں لیکن زنا کے مرتکب ہونے سے بہر حال بچ جائیں تو کیا وہ گناہ گار ہوں گے۔''

''بالکل ہوں گے پتر، میں نے کہا نا کہ زنا تو ہر عضو کا ہوتا ہے۔ جو عورت جب تک آپ کے لئے حرام ہے تو آپ کے تمام اعضاء پر حرام ہے۔ البتہ درجوں کا فرق ہوتا ہے۔ اور اللہ غفور الرحیم ہے۔''

''لیکن ایسا ہے کہ ان دونوں کی کچھ عرصے بعد شادی ہونی ہے، اور ہو بھی جاتی ہے۔''

''سنو عبدالحق پتر، اللہ بہت بخشنے والا ہے۔ ہماری بے شمار چھوٹی چھوٹی خطائیں تو وہ ہر پل ایسے معاف کرتا رہتا ہے کہ ہمیں علم بھی نہیں ہوتا لیکن شریعت تو اپنی جگہ ہے۔ جو جس وقت حرام ہے، اُس وقت حرام ہے۔ بعد میں جب حلال ہو گا تو حلال ہو گا۔ لیکن میں پھر کہوں گا کہ اللہ غفور الرحیم ہے، اور بندے پر توبہ لازم ہے۔''

''لیکن مولوی صاحب، اگر بات بہت زیادہ نہیں بڑھی......اور انداز میں معصیت نہیں ہے تو......''

''چمن پتر، چھوٹی چھوٹی لغزشیں ہی تو گناہ کا راستہ ہموار کرتی ہیں۔ جو آسان ہدف نہیں ہوتے، شیطان ان پر اسی انداز میں وار کرتا ہے۔ وہ انہیں بے خبری میں مبتلا کرتا ہے، انہیں تھپکتا ہے، معصیت کے نکتہ آغاز کو معصومیت پر محمول کرنے کا درس دیتا ہے۔ سنو پتر، عافیت ایک دائرے کی مانند ہے۔ لکیر کے باہر گناہ ہے اور گمراہی ہے۔ تو بندہ لکیر کے اندرونی حصے تک جو جا سکتا ہے نا۔ لیکن پتر عبدالحق، وہ بہت باریک لکیر ہوتی ہے۔ اللہ نے اس لکیر کے قریب جانے کو بھی منع فرمایا۔ کیوں؟ کوئی ہلکا سا دھکا دے...... یا آپ خود ہی لڑکھڑا جائیں، پاؤں پھسل جائے تو آپ تو گر گئے نا۔ آپ خود کو نہیں جانتے۔ اللہ سب جانتا ہے۔ آلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَق۔ تو جو بہت بڑے گناہ ہیں پتر، ان سے تو بہت دور رہنا چاہئے۔ ان کے قریب تو پھٹکنا ہی نہیں چاہئے۔

''اور ایک بات بتاؤں۔ اہمیت ہے تو صرف نکاح کی ہے۔ ارادے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ منگنی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ آزمائش بڑھ جاتی ہے بندوں کی۔ اب وجہ بھی بتا دوں۔ بندے کو تو اپنے اگلے پل کا بھی پتا نہیں ہوتا۔ کوئی منگنی کرتا ہے۔ کسی دن اتفاق سے قربت میسر آتی ہے، دونوں بہکتے ہیں اور توبہ بھی نہیں کرتے، اس خیال سے کہ ہماری تو شادی ہونے والی ہے۔ اب ان میں سے کوئی ایک خدانخواستہ مر جائے تو کتنا بڑا نقصان ہوا۔ مرنے والا توبہ کے بغیر ہی چلا گیا نا۔''

عبدالحق اندر ہی اندر بری طرح لرز رہا تھا۔

''اس سے بھی خطرناک بات۔ اگر وہ منگنی ہی ٹوٹ جائے، اور دونوں کی شادی کہیں اور ہو جائے تو خیانت کا جرم اپنی جگہ۔ ضمیر پر تو دونوں کے ہمیشہ بوجھ رہے گا۔ ایسے میں زندگی اچھی تو نہیں گزر سکتی۔ تو پتر، بندے کو اپنے اگلے پل کا پتا نہیں ہوتا۔ وہ کوئی چیز پیشگی کیسے وصول کر سکتا ہے۔ اور پتر، یاد رکھو، اللہ جس بندے پر مہربان ہو، وہ اسے بڑے بڑے گناہوں سے بچاتا رہتا ہے......''

''وہ کیسے مولوی صاحب؟'' عبدالحق نے تیزی سے ان کی بات کاٹ دی۔

''بندے اور گناہ کے درمیان فاصلہ پیدا فرما کے...... فاصلہ بڑھا کے۔ رکاوٹیں کھڑی کر کے۔ اب جس بندے پر اللہ کی رحمت ہو گی، وہ اُس سے رجوع کرنے والا تو ہو گا۔ تھوڑا سا ڈرنے والا تو ہو گا۔ تو دو افراد کی تنہائی میں اللہ کسی تیسرے کو بھیج دے گا۔ یا بندے کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ یا اسے کسی حادثے کی خبر جھنجوڑ دے گی، اسے کہیں جانا پڑ جائے گا۔ وہ سب کچھ کرنے والا ہے۔ اس کے پاس اتنے طریقے ہیں کہ اس کی نعمتوں کی طرح ان کا شمار بھی ممکن نہیں۔''

مولوی صاحب چونکے۔ ''تم نے مجھے اصل بات بھلا دی پتر۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جن پر اللہ کی نظرِ کرم ہوتی ہے، انہیں وہ بڑے بڑے گناہوں سے بچاتا رہتا ہے۔ لیکن ایسے بندے کے لئے

چھوٹی چھوٹی، بے ضرر نظر آنے والی خطائیں خطرناک ہوتی ہیں۔ ان سے بچنا بندے کی ذمہ داری ہے۔ وہ اسے بڑے گناہوں کی طرف لے جا سکتی ہیں۔ وہ ان چھوٹی چھوٹی خطاؤں سے نہ بچے تو اللہ کی نظرِ کرم سے محروم ہو سکتا ہے۔ اور پتر چھوٹی چھوٹی خطاؤں کی طرف سے بے پروائی ایک طرح کا غرور ہے۔ اور غرور شیطان کا وصف ہے۔ جبکہ بندے کا وصف عاجزی ہے، جو اسے استغفار تک لے جاتا ہے۔ اور غرور اللہ کو بہت ناپسند ہے۔ اسی کی وجہ سے تو شیطان راندۂ درگاہ ہوا تھا۔ تو پتر، بندے کو ڈھال کا بندوبست کرنا چاہئے اور اسے مضبوطی سے تھام کر شیطان کی طرف سے ہر وقت چوکنا رہنا چاہئے۔''

''مولوی صاحب آپ نے فرمایا تھا کہ نیک بیوی اللہ کی اعلیٰ ترین نعمتوں میں سے ہے۔''

''ہاں عبدالحق پتر، بیوی کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اچھی ہو تو دنیا میں بھی جنت ہے اور آخرت میں بھی۔ کیونکہ وہ شوہر کو ترغیبات سے بچاتی ہے، اسے خوشی دیتی ہے۔ اور بُری بیوی تو فرمائشیں کر کر کے شوہر کو دنیا میں اور فکرِ معاش میں ایسا الجھاتی ہے۔ کہ وہ اللہ کی یاد سے غافل اور آخرت کی طرف سے بے فکر ہو جاتا ہے۔''

پہلی بار عبدالحق خوش ہوا۔ اللہ کی رحمت سے اسے ایسی بیوی مل رہی تھی، جو اُس کے ایمان لانے کا سبب بنی تھی، جس کی وجہ سے اُس کا قرآن سے تعلق قائم ہوا تھا۔ وہ بلاشبہ نیک اور صالح تھی۔

❁ ❁ ❁

برسات کا موسم تھا۔ لیکن صحرائی علاقوں میں بارش کم ہی ہوتی ہے۔ زیادہ تر گھٹائیں گھر کر آتی ہیں، جیسے برسے بغیر مانیں گی ہی نہیں۔ پھر کچھ دیر گرج کڑک سنا کر تتر بتر ہو جاتی ہیں۔ شاید اسی لئے صحرائی لوگوں سے بڑھ کر بارش کی خوشی کسی کو نہیں ہوتی۔

سو گھٹائیں گھر کر آئیں اور آم کے درختوں پر کوئلیں پی ہو پی ہو پکارنے لگیں تو حمیدہ بھی تڑپ کر اپنے کمرے سے نکل کر دالان میں آ گئی۔ اسے وہاں دیکھ کر کام کے لئے آنے والی شاداں جلدی سے اُس کے لئے کرسی لے آئی۔

حمیدہ وہاں بیٹھ گئی۔ ''ارے...... یہ دونوں لڑکیاں کہاں ہیں میری۔'' اس نے شاداں سے کہا۔ ''انہیں بلا کر لا جلدی سے۔''

شاداں جا کر نور بانو اور زرینہ کو بلا لائی۔ ''کیا بات ہے اماں؟'' نور بانو نے پُرتشویش لہجے میں حمیدہ سے پوچھا۔

اتنی دیر میں پھوار پڑنے لگی تھی۔ ''تم لوگ کیسی ہو۔ یہ موسم نہیں نظر آتا تمہیں؟'' حمیدہ بولی۔

''تو کیا ہوا اماں۔ یہ تو موسم ہی برسات کا ہے۔'' نور بانو نے بے ساختہ کہا اور اچانک ہی، اُس کے ذہن میں برسوں پرانی یاد تازہ ہو گئی۔ کبھی گلناز نے بھی ایسے ہی خوش ہو کر بارش کے

بارے میں بتایا تھا، اور اُس نے کتاب سے سر اٹھا کر اسے یہی جواب دیا تھا۔

لیکن اب وہ بات نہیں تھی۔ اُس کے دل میں اچانک ہی گدگدی سی ہونے لگی۔ اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ اُس کی دونوں بہنیں برسات سے اتنی خوش کیوں ہوتی تھیں۔ اور وہ یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ وہ بارش سے خوش کیوں نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ اس وقت اسے ایک عجیب سی نامعلوم سی خوشی کا احساس ہو رہا تھا...... اور اس سے پہلے اسے بارش میں، شیڈ میں عبدالحق سے لپٹنا یاد آیا تھا۔

''تو کچھ ہوا ہی نہیں۔'' حمیدہ نے جھنجھلا کر کہا۔ ''ارے بارش اللہ کی رحمت ہے۔ اب اس کوئل کو ہی دیکھ لو۔ کیسے کوک رہی ہے۔ اور تم دونوں اپنے کمرے میں منہ لٹکائے بیٹھی تھیں۔''

''نہیں اماں، مجھے تو بارش بہت اچھی لگتی ہے۔'' زرینہ کہا۔

اتنی دیر میں شاداں ان دونوں کے لئے بھی کرسیاں لے آئی تھی۔ وہ دونوں بیٹھ گئیں۔

حمیدہ شاداں کی طرف مڑی۔ ''شاداں...... جھولا لٹکانا آتا ہے تجھے؟''

''لو اماں، حد کر دی تم نے۔ اب کچھ دیر بعد کہو گی، پکوڑے تلنے بھی آتے ہیں تجھے۔'' شاداں نے سخت برا مانتے ہوئے کہا۔

حمیدہ ہنسنے لگی۔ اسی وقت رابعہ بھی آ گئی۔ زرینہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''آؤ بیٹھ بھابی۔''

''نہیں...... تم بیٹھی رہو۔''

''ارے بیٹھو بھابی۔ میں کرسی لے کر آتی ہوں۔''

''اگر تُو نے دو منٹ میں جھولا نہیں لٹکا دیا تو میں پکوڑوں کے بارے میں بھی پوچھوں گی۔'' حمیدہ نے شاداں کو چھیڑا۔

''ابھی لو اماں...... ایک منٹ میں۔'' شاداں نے کہا اور فوراً ہی سرگرم ہو گئی۔

جھولا لٹکا دیا گیا تو زرینہ نے نور بانو سے کہا۔ ''پہلے تم بیٹھو نور بانو۔''

نور بانو کبھی جھولے پر نہیں بیٹھی تھی۔ اسے ڈر لگ رہا تھا۔ ''نہیں پہلے تم بیٹھو۔''

''اللہ، میں تو جھول نہیں سکتی۔ اور ان دونوں کو دیکھو۔ جھولنے کے بجائے ایک دوسری کی خوشامد کر رہی ہیں۔'' رابعہ نے حسرت سے کہا۔

''بیٹھو نا نور بانو۔'' زرینہ نے اصرار کیا۔

نور بانو اداس ہو گئی تھی۔ وہاں گھر میں معاملہ برعکس ہوتا تھا۔ باجی اور گلنار میں بحث ہوتی تھی کہ پہلی باری کس کی۔ پھر باجی کہتی تھیں کہ وہ بڑی ہیں، اس لے پہلے ان کی باری ہو گی۔ اور گلنار مان جاتی تھی۔ اور پھر باجی جو جھولا پکڑتی تھیں تو چھوڑتی ہی نہیں تھیں۔ تنگ آ کر گلنار انہیں پینگ دینا بند کر دیتی تھی۔ مگر وہ پیروں کے زور سے خود ہی اونچی اونچی پینگیں لیتی رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ ان کا جی بھر جاتا تھا۔ اور جب وہ اترتیں تو گلنار جلدی سے جھولے پر بیٹھ کر ان سے

کہتی...... باجی، اب مجھے پینگ دیں نا۔ اور باجی کہتیں...... تم نے بھی تو مجھے اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ میں تو نہیں دیتی پینگ۔ اور گلنار تڑخ کر کہتی...... واہ، ہمارے تو ہاتھ دکھ گئے پینگ دے دے کر۔ اور وہ فرماتی ہیں کہ پینگ ہی نہیں دی۔ مگر باجی اسے ستاتی رہتیں۔ پھر گلنار لڑتے لڑتے خوشامد پر آ جاتی...... اچھی باجی، بس وہ تین لمبی لمبی پینگیں دے دیں۔ پھر میں آپ سے نہیں کہوں گی۔ اور باجی ایسا کر بھی دیتیں۔ پھر گلنار اپنے ہی زور پر دیر تک جھولتی رہتی......

''کہاں کھو گئیں نور بانو۔ بیٹھو نا۔'' زرینہ نے اسے چونکا دیا۔

وہ دہلی میں اپنے گھر کے آنگن سے اداس لوٹ آئی۔ اُس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

''تم بیٹھو زرینہ، میں تمہیں پینگ دوں گی۔'' اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

زرینہ نے اسے غور سے دیکھا اور سب کچھ سمجھ گئی۔ ''گھر یاد آیا ہے نا؟ بچھڑے ہوئے یاد آئے ہیں نا؟''

نور بانو نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''تم رو رہی ہو؟''

''نہیں تو...... پھوار آنکھوں میں چلی گئی ہو گی۔''

حمیدہ نے ان دونوں کی کیفیت دیکھ لی۔ ''ناشکری کرتی ہو۔ ارے یہ بارش اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔'' اُس نے بڑی محبت سے انہیں ڈانٹا۔

''اور یہ یادوں کا موسم بھی تو ہوتا ہے۔'' زرینہ نے اتنے دھیرے سے کہا کہ صرف نور بانو ہی سن سکی۔

نور بانو کی ضد پر زرینہ کو پہلی باری لینا پڑی لیکن نور بانو کو بھی بیٹھنا ہی تھا۔ ''مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں پہلے کبھی جھولے پر نہیں بیٹھی۔'' اُس نے کہا۔

''کمال کرتی ہو نور بانو۔ ارے میں تو کھڑے ہو کر بھی پینگ لے سکتی ہوں۔'' زرینہ نے کہا اور عملی مظاہرہ کر کے دکھایا۔

نور بانو بیٹھی تو خوف سے اُس کا برا حال تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ گر جائے گی۔ اس نے دونوں طرف کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ بارش بھی اب تیز ہو گئی تھی۔ زرینہ بھی بھیگ گئی تھی۔

''ڈرو مت نور بانو۔ جھولے سے کوئی نہیں گرتا۔ سوائے اس کے جو ڈر کے مارے گر جائے۔ ڈر بہت بری چیز ہوتی ہے دھیے۔'' حمیدہ نے اسے دلاسہ دیا۔

''اچھا زرینہ...... دھیرے دھیرے جھلانا۔'' اُس نے خوشامدانہ لہجے میں زرینہ سے کہا۔

اور زرینہ واقعی بہت ہولے ہولے پینگ دے رہی تھی۔ جھولا باہر جاتا اور پھر دالان میں واپس آتا۔ بارش کا پانی جو نور بانو کے بدن کو لگا تو جیسے جادو ہو گیا۔ جسم میں سنسناہٹ سی دوڑنے لگی۔ آنکھوں میں دھنک کے ساتوں رنگ اُتر آئے۔ اداسی جیسے دھل گئی۔ اور ایک اور عجیب بات

ہوئی۔ آسمان پر اسے عبدالحق بالکل صاف دکھائی دیا۔ وہ باہیں کھولے کھڑا تھا، جیسے اسے بلا رہا ہو۔ وہ اس سے لپٹنے کو بے قرار ہوگئی۔ اداسی تو ڈھلی تھی۔ لیکن اس بار جیسے ہر خوف مٹ گیا۔ اسے اوپر جانا تھا...... عبدالحق سے لپٹنا تھا۔

''زور سے پینگ دو زرینہ۔''

زرینہ حیران ہوئی۔ مگر اُس نے زور بڑھا دیا۔

نور بانو آسمان سے قریب تر ہوئی، لیکن عبدالحق کو چھوئے بغیر واپسی کا سفر شروع ہوگیا۔

''اور زور سے زرینہ۔''

کوئل پکار رہی تھی...... پی ہو...... پی ہو...... اور نور بانو کا دل عبدالحق کو پکار رہا تھا۔ جبکہ عبدالحق کی باہیں اسے پکار رہی تھیں۔ ارے...... یہ برسات کا موسم پکار کا موسم ہوتا ہے۔ اُس نے حیرت اور مسرت سے سوچا۔ اور کوئی پاس ہو تو وصل کا موسم۔ اُس کے اندر سے کسی نے چپکے سے کہا۔

اب پینگیں ایسی تھیں کہ وہ بیچ بیچ جیسے آسمان کو چھو رہی تھی لیکن عبدالحق کو چھونے سے پہلے ہی جھولے کی واپسی کا سفر شروع ہو جاتا۔

''اور زور سے زرینہ...... اور زور سے۔''

وہ عجیب سا گہرا سحر تھا۔ حمیدہ نہ بولتی تو وہ کبھی نہ ٹوٹتا، اور وہ زمین آسمان کے درمیان جھولتی میں رہتی۔

''بس کرو نی کڑیو۔ اب آکر گرما گرم پکوڑے کھالو چٹنی کے ساتھ۔'' حمیدہ نے انہیں پکارا۔

وہ دونوں دسترخوان کی طرف بڑھیں۔ شاداں نے وہیں والان میں چٹائی بچھادی تھی۔

''آپ لوگ کھاؤ جی۔ میں گرما گرم پکوڑے لاتی رہوں گی۔'' شاداں نے کہا۔

''یہاں ٹھیک رہے گا نا۔ بارش کے مزے بھی لیتی رہو۔'' حمیدہ بولی۔

نور بانو نے پہلا پکوڑا اٹھایا۔ مگر فوراً ہی رک گئی۔ ''مردانے میں تو بھجوا دیں اماں۔'' اُس نے بے ساختہ کہا۔

''تجھے بڑی فکر ہے ان کی۔ ارے پگلی، اس وقت تو وہ باہر ہوں گے۔ اب دوپہر کے کھانے کے لئے ہی آئیں گے۔'' حمیدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

ایک پل کو نور بانو شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ مگر اگلے ہی پل وہ دہلی میں اپنے گھر میں تھی۔ اس روز ایسے ہی موسم میں اماں نے آلو بھرے پراٹھے بنائے تھے اور باجی نے چٹنی پیسی تھی۔ وہ کھانے کے لئے بیٹھے تو باجی نے پہلے نوالے کو منہ میں لے جاتے ہوئے رک کر کہا تھا...... بوا پہلے چند پراٹھے اوپر دے آؤ نا۔ اور اماں نے کہا تھا...... اے بولا گئی ہو کیا۔ پتا بھی ہے کہ وہ لوگ گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ اور باجی کھسیا گئی تھیں۔

تو کیا ایسا ہے کہ وہ محبت کرنا اپنی مرحوم باجی سے سیکھ رہی ہے! وہ پھر اداس ہوگئی۔ لیکن فوراً ہی اُس نے اداسی کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ''اماں...... آلو تو موجود ہیں نا؟'' اُس نے پوچھا۔

''بہت ہیں دھیے۔ تُو کیوں پوچھ رہی ہے؟''

''آج دوپہر کے کھانے کے لئے آلو بھرے پراٹھے بناؤں گی۔''

❁......❁......❁

اچھو میاں عجیب سی کیفیت میں چل رہے تھے۔ انہیں گردوپیش کا بھی احساس نہیں تھا۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہیں۔ اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

نیلم بائی کے قحبہ خانے سے وہ بڑی افراتفری میں نکلے تھے۔ انہوں نے بس ایک ہی بات سوچی تھی کہ ذلت کے ساتھ، دھکے دے کر نکالے جانے سے بہتر ہے کہ وہ خود ہی رخصت ہو جائیں۔

وہ باہر نکل تو آئے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں جائیں گے۔ کوئی ٹھکانہ تھا ہی نہیں ان کا۔ دل و دماغ پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کچھ سجھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔

مگر چلتے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ ان کے پاؤں دکھنے لگے۔ سانس بھی بے ترتیب ہو رہی تھی۔ ایسا کیوں؟ یہ بھی ان کے لئے ایک سوالیہ نشان تھا۔

وقت کا حساب انہیں یاد بھی نہیں تھا۔ نیلم بائی کے در پر کتنے برس گزرے تھے، انہیں یاد نہیں تھا۔ وہاں تو بس صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے۔ والا معاملہ تھا۔ برسوں سے انہوں نے آئینہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ شیو بڑھ جاتی تو فٹ پاتھ پر حجاموں والی ایک کرسی رکھ کر بیٹھے بالے سے شیو بنوا لیتے۔ بالا بھی آئینہ رکھنے کا قائل نہیں تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ شیو تو اسے بنانی ہے، اور جب شیو بنوانے والے کا چہرہ اُس کے سامنے موجود ہے تو آئینے کی کیا ضرورت ہے۔

نواب زادہ اشرف علی خان سے اچھو میاں بننے کے بعد ان کے لئے وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ نہ انہیں وقت کا احساس تھا نہ اُس کی پرواہ۔ آدھی زندگی انہوں نے اپنی مرضی کے مطابق اپنی حاکمیت کے ساتھ گزاری تھی۔ کوئی چیز ایسی نہیں تھی کہ جس کی انہوں نے خواہش کی ہو اور وہ انہیں ملی نہ ہو۔ وہ سیر ہو گئے تھے، اور اب وہ ہنسی خوشی اس سیری کی، اُس حاکمیت کی قیمت چکا رہے تھے۔ دل میں اب کوئی خواہش تھی ہی نہیں۔ زندگی بس تین وقت کی روٹی تھی، اور کچھ نہیں۔

انہیں یاد تھا۔ جب سب کچھ بک گیا تو وہ آخری رقم جیب میں ڈال کر نیلم بائی کے کوٹھے پر آئے تھے۔ اور صبح جب ان کے پاس تن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں رہا تھا تو وہ نیلم بائی کے قدموں میں بیٹھ گئے تھے۔

''ارے نواب صاحب، مجھے کیوں گناہ گار کرتے ہیں آپ۔'' نیلم بائی نے تڑپ کر کہا تھا اور انہیں اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

"اب ہم نواب اشرف علی خاں نہیں رہے۔ نیلم۔ اب تم ہمارا کوئی اور نام رکھ دو۔"

نیلم بائی صورتِ حال کی سنگینی کو نہیں سمجھ سکی تھی۔ اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھو میاں کیسا رہے گا؟"

"جو تمہاری مرضی۔"

اور جب نیلم بائی کو صورتِ حال کا علم ہوا تو اُس نے نظریں پھیر لیں۔ "تو پھر تمہارا ہمارا تعلق۔" وہ ایک دم سے آپ سے تم پر آ گئی۔

"یہی تو ہم کہہ رہے ہیں۔ نوعیت بدل دو۔ مگر تعلق نہ توڑو۔ ہمیں اپنی ڈیوڑھی میں پڑا رہنے دو۔ دو وقت کی روٹی کے سوا کچھ نہیں چاہئے ہمیں۔"

"مگر کرو گے کیا؟ مفت کی روٹیاں توڑو گے؟"

"تمہاری ٹانگیں دبایا کریں گے۔ اور تم......"

نیلم بائی نے تیز لہجے میں بات کاٹ دی۔ "یعنی شوق وہی رہیں گے تمہارے۔ شہد نہیں ملتا، نہ ملے۔ چھتے کو تو چھولیں۔"

"تم نے بات پوری نہیں سنی نیلم۔ اور جو خدمت تم کہو گی، کریں گے۔"

"یہاں کوٹھے پر تو ایک ہی کام ہوتا ہے۔" نیلم بائی نے تنک کر کہا۔ "کمیشن بھی ہم اچھا دیتے ہیں۔"

اچھو میاں سب سوچ سمجھ کر آئے تھے۔ ذلتوں کے لئے تیار ہو کر۔ وہ پہلی آزمائش تھی۔ سو وہ اس ذلت کو پی گئے۔ "نہیں بائی جی ہم یہ کام نہیں کریں گے ہم، اور ہتھیلی پہلے کبھی اوپر نہیں رکھی تھی، اب بھی نہیں رکھیں گے۔ پیسے تو اتنے دیکھے ہیں کہ اب ان کا ارمان بھی نہیں کہ دلالی کریں۔ چلو، تم سے کھانے کو بھی نہیں مانگیں گے۔ بس یہاں پڑا رہنے دو۔ اوپر کا جو کام کہو گی، کر دیں گے۔ سودا سلف۔ لادیں گے۔"

طوائف کا دل بہت سخت ہوتا ہے۔ مگر نیلم بائی پسیج گئی۔ جانتی تھی کہ جب سے اسے دیکھا تو اشرف علی خاں پھر کسی اور کوٹھے پر نہیں گئے۔ وہ لاکھوں کے آدمی تھے، اور لاکھوں اسی پر لٹاتے تھے۔ "چلو ٹھیک ہے اچھو میاں۔ مگر یہ لہجے کی نوابی بھی نہیں چلے گی۔"

"معلوم ہے مجھے۔ اب آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی بائی جی۔"

یوں وہ اچھو میاں بن گئے۔ سب کچھ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر، حساب کتاب کے ساتھ قبول کیا تھا۔ پیسہ انہوں نے بہت دیکھا تھا، اور اُس کی عزت بھی دیکھی تھی۔ اب جب وہ خالی ہو گئے تھے تو یہ بھی سمجھ میں آ گیا تھا کہ جب عزت ہوتی تھی تو اب ذلت بھی ہوگی۔ اور عزت کے بعد ذلت اٹھانا آسان نہیں ہوتا۔ انہوں نے سوچا، دنیا بہت بڑی ہے، ذلت کا رقبہ بھی زیادہ ہوگا۔ اور

جہاں ان کے آباؤ اجداد عزت کے ساتھ حکومت کرتے آئے تھے، وہاں ذلیل ہونے کا تصور ان کے لئے قابلِ قبول نہیں تھا۔ البتہ کوٹھا بہت محدود تھا۔ اور وہاں جاننے والے بھی نہیں تھے۔ اس سے مناسب جگہ کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

ایک بات اور تھی۔ اچھو میاں نے یہ سب کچھ اتنی آسانی سے اس لئے قبول کر لیا تھا کہ وہ عملِ مکافات کے قائل تھے۔ بھئی عیش بھی تو انہوں نے ہی کئے تھے...... اور بہت بے اعتدالی کے ساتھ، تو اُس کا نتیجہ بھی انہیں ہی بھگتنا تھا۔ تو کیوں نہ خوش دلی سے بھگتیں۔

وہ دن بھر کوٹھے کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے۔ رات کو بھی کوئی گاہک پان، بوتل یا کوئی اور چیز منگواتا تو لا دیتے۔ کبھی کسی سے کچھ نہ مانگتے کوئی کچھ دیتا تو رکھ لیتے۔ نوٹ کبھی قبول نہ کرتے۔ چھٹے میں سے کوئی کچھ دیتا تو رکھ لیتے۔ شیو بنوانے کے سوا ان کی کوئی حاجت تھی ہی نہیں۔ کھانا بھی کبھی وہ منہ سے نہ مانگتے۔ دے دیا کسی نے تو کھا لیا۔ نہیں تو بھوکے ہی سو گئے۔ کھاتے جینے کے لئے تھے۔ اور دنیا کی ہر نعمت پا چکے تھے اس لئے اب آرزو کوئی نہیں رہی تھی۔

پھر ذلت کی اس زندگی میں، جس کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا، ایک دن انہیں روشنی مل گئی۔ انہیں احساس ہوا کہ وہ بہت گناہ گار ہیں۔ اور اللہ غفور الرحیم ہے۔ وہ تھرا گئے۔ کیا کچھ نہیں کیا تھا انہوں نے اللہ کی ہر ہر نافرمانی کی تھی۔ اس وقت سے استغفار ان کا مشغلہ بن گیا۔ بولتے تو وہ بہت ہی کم تھے۔ چنانچہ استغفار کے لئے وقت ہی وقت تھا ان کے پاس۔

اس تبدیلی کے نتیجے میں ان کے اندر ایک انقلاب آیا۔ وہ سوچنے لگے۔ زندگی پر غور کرنے لگے...... پچھلی زندگی پر بھی اور موجودہ زندگی پر بھی۔ وہ سوچتے کہ ان کے پاس کیا کچھ تھا، اور وہ کیا کچھ کر سکتے تھے۔ اللہ نے سب کچھ دیا تھا۔ وہ شادی کرتے تو ان کے بچے ہوتے۔ باپ دادا کی نسل آگے بڑھتی پھر انہوں نے سوچا کہ اچھا ہی ہوا۔ درمیان میں اگر انہیں ہوش آ جاتا اور وہ رک جاتے اور زندگی کا رخ تبدیل کر لیتے تو شاید وہ اللہ سے شرمندہ نہ ہوتے اور حاصل کیا ہوتا۔ شرابیوں اور زانیوں کی نسل آگے بڑھتی تو آخرت کا بوجھ بھی بڑھتا۔ اچھا ہوا کہ اللہ نے سب کچھ ختم کر دیا۔

مگر ان کے اندر کسی نے سختی سے اس بات کو رد کر دیا۔ یہ کیا بکواس ہے۔ اللہ نے کچھ نہیں کیا۔ سب کچھ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے کیا۔ یہ تو اپنے کیے کا نتیجہ ہے۔ اللہ کے ہاں تو ابھی ان کو جواب دینا ہے۔ لہٰذا اس زندگی کی مہلت میں اُس کی فکر کرنی چاہئے۔

اس زندگی میں ہر ہر پل ان کے لئے سزا تھی۔ انہوں نے سوچا، اس سزا کو ہنسی خوشی سہتے ہوئے استغفار کرتے رہیں تو کون جانے کہ وہ غفور الرحیم دنیا کی اس سزا کو ان کے لئے کافی قرار دے کر انہیں بخش دے۔

ایک دن نیلم بائی نے انہیں بڑا ذلیل کیا۔ وہ اُس کی ٹانگیں دبا رہے تھے کہ اُس نے اچانک

ان کے زوردار لات رسید کی۔ وہ دور جا کر گرے۔ حیرت اور صدمے سے وہ سن ہو کر رہ گئے تھے۔
ذرا سنبھلے تو انہوں نے بڑی عاجزی سے پوچھا۔ ''ایسا کیا ہو گیا بائی جی؟''

''مجھ سے پوچھتے ہو کہ کیا ہو گیا۔ ارے مجھ پر ٹھرک جھاڑتے ہو تم۔''

''نہیں بائی جی، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ٹھرک تو محروموں کو ہوتی ہے۔ میں تو اپنے حصے کا ہر عیش حاصل کر کے سیر ہو چکا۔''

نیلم کو یہ بات اور بری لگی کہ وہ ماضی کا حوالہ دے رہے ہیں، اُسے جتا رہے ہیں کہ کبھی وہ ان کی جاگیر تھی۔ ''سنو اچھو میاں، میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ نوابی اب نہیں چلے گی۔''

''تو ہے کہاں نوابی۔'' اچھو میاں نے معصومیت سے کہا۔ ''آپ کی ٹانگیں دبا رہے ہیں۔''

نیلم مصلحتاً غصے کو پی گئی۔ وہ کوٹھے کے محرم راز نہ ہوتے تو اسی وقت انہیں نکال دیتی۔

اچھو میاں کو نہ نیلم بائی کی بات بری لگی، نہ لات۔ وہ تو ان کے اعمال کی سزا تھی، جو انہیں خوش دلی سے برداشت کرنی تھی۔ کیا پتا، اس خوش دلی کے صلے میں اللہ انہیں بخش دے۔ مگر اُس روز سے وہ ٹانگیں دبانے میں محتاط ہو گئے۔

ایک دن نیلم بائی نے انہیں ڈانٹا۔ ''یہ تمہارے ہاتھ گھٹنوں پر کیوں رک جاتے ہیں اچھو میاں۔''

''ڈرتا ہوں بائی جی کہ آپ اسے ٹھرک نہ سمجھ لیں۔''

''برا مان گئے اچھو میاں......''

''نہیں بائی جی، یہ تو اللہ سے میرا عہد ہے کہ کسی بات پر بھی برا نہیں مانوں گا۔ آپ چاہیں تو جوتے مار کر دیکھ لیں۔ اُف بھی نہیں کروں گا۔''

''اچھا...... ٹھیک سے دباؤ۔ اب ایسا کبھی نہیں کہوں گی۔''

برسوں گزر گئے۔ نیلم بائی بھی نیلم نہیں رہی، نیلے کانچ کا بے وقعت ٹکڑا بن گئی۔ اب اُس کے لئے کوئی نہیں آتا تھا۔ وہ محض نائیکہ تھی۔ ایک رات ٹانگیں دبواتے دبواتے وہ عورت بن گئی۔ اُس نے مطلب براری کی بات کی تو اچھو میاں بولے۔ ''اب وہ سب کہاں بائی جی۔ اب تو جسم کے اندر برف کی ایک سل رکھی ہے۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو اچھو میاں۔ مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں بائی جی۔ لیکن کوٹھے پر پڑا رہے تو زنخا ضرور ہو جاتا ہے۔''

مگر نیلم نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ تو پاگل ہو رہی تھی۔ اور اس کی جارحیت کے دوران اچھو میاں کو اندازہ ہو گیا کہ ان کے اندر تو ابھی بہت طوفان چھپے ہیں۔ انہوں نے دل میں گڑگڑا کر اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ، جس مردانگی نے مجھے اس حال کو پہنچایا ہے، وہ مجھ سے چھین لیجئے۔

اور اگلے ہی لمحے ان کی دعا قبول ہو گئی۔

جھنجھلائی ہوئی نیلم بائی نے چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح بل کھا کر ان سے کہا۔ ''دفع ہو جاؤ اچھو میاں۔ اب تم کسی کام کے نہیں رہے۔''

اور وہ کوٹھے پر گزارے ہوئے برسوں میں پہلی خوشی تھی، جو اچھو میں کو ملی۔ اس رات انہیں بہت اچھی نیند آئی۔

عروج کے بعد زوال ہمیشہ عبرت ناک ہوتا ہے۔ مگر اچھو میاں کا زوال بہت زیادہ عبرت ناک تھا۔ شاید اس لئے کہ انہیں اس کی کوئی پروا بھی نہیں تھی وہ تماش بینوں کے ہر حکم کی تعمیل کرتے، طوائفوں کی جھڑکیاں سنتے، اور مسکراتے رہتے۔ صرف اس لئے کہ بغیر کسی معقول وجہ کے انہیں یقین تھا کہ یہ ریاضت اللہ نے قبول فرمالی تو اُن کی بخشش ہو جائے گی۔ اور اس معاملے میں وہ اتنے مخلص تھے کہ بڑی سے بڑی بات بھی دل پر نہیں لیتے تھے۔ اسے اپنے اعمال کی سزا سمجھ کر خوش دلی سے قبول کر لیتے تھے۔

ایسے میں پچھتاوے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جب انہوں نے پہلی بار نادرہ کو دیکھا تو انہیں پچھتاوا ہوا۔ وہ روشن چہرہ، کشادہ اور پاکیزہ پیشانی گواہی دے رہی تھی کہ اُس کا تعلق اچھے خاندان سے ہے، اور وہ خود بھی بہت اچھی ہے۔ بس بدقسمتی سے یہاں آ پھنسی ہے۔ انہوں نے حسرت سے کہا کہ کاش وہ ان کے عروج کے عرصے میں یہاں آئی ہوتی تو وہ چاہے لاکھوں خرچ کر دیتے، مگر اسے یہاں سے نکال کر لے جاتے۔ اور عمر بھر اسے اپنے دل سے لگا کر رکھتے۔

پھر وہ اُس کے کردار کے اور قائل ہو گئے۔ اس طرح کی لڑکیاں ابتدا میں بہت مزاحمت کرتی ہیں لیکن نادرہ نے ایسا نہیں کیا۔ اُس نے ہنسی خوشی سب کچھ قبول کر لیا اور نادرہ سے نرگس بھی بن گئی۔ اس پر نہ انہیں حیرت ہوئی، نہ مایوسی۔ اپنے حوالے سے وہ سمجھ سکتے تھے کہ ان کی طرح نادرہ کا بھی کوئی بڑا مقصد ہوگا۔ پھر وہ مقصد بھی اُن کی سمجھ میں آ گیا...... ارجمند کا تحفظ! وہ اور شدت سے اُس کے قائل ہو گئے۔

وہ اپنی سوچوں سے اس وقت چونک کر نکلے، جب ان کی تھکی ہوئی ٹانگیں بالکل ہی جواب دے گئیں، اور وہ فٹ پاتھ پر گر گئے۔ انہوں نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ داتا دربار کے قریب تھے۔ اور اب ان میں اٹھنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

ایسا کیوں ہے؟ انہوں نے آنکھیں بند کر کے سوچا۔ پہلی بار انہیں احساس ہوا کہ وہ بوڑھے اور کمزور ہو گئے ہیں۔ گزرے ہوئے برسوں کا انہیں پہلی بار احساس ہوا۔ کھاتے بھی وہ کم ہی تھے۔ اور بے شک وہ بازار کے دسیوں چکر لگاتے تھے لیکن فاصلہ زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ آج وہ پہلی بار اتنا زیادہ چلے تھے تو گرنے کی نوبت آ گئی تھی۔

بیٹھے تو انہیں یاد آیا کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

ارے...... برسوں کی ریاضت خاک میں ملا دی میں نے۔ یہ کیا کر دیا میں ۔نے۔ نجات کا واحد دروازہ بند کر لیا خود پر۔ اور یہ ہوا کیوں...... صرف انا کی وجہ سے۔ جبکہ وہ مطمئن تھے کہ پچھلے برسوں میں انہوں نے انا تو کیا، اپنی عزتِ نفس کو بھی اپنے گناہوں کی صلیب پر کفارے کی غرض سے......توبہ کی خاطر لٹکا دیا تھا۔ لیکن ثابت ہوا کہ انا اب بھی زندہ تھی۔

گزشتہ رات جو کچھ ہوا، وہ معمولی بات تھی۔ اس سے کہیں زیادہ بڑی ذلت اور توہین تو پچھلے برسوں میں وہ بار بار برداشت کر چکے تھے۔

اس رات شہناز کسی شادی کے مجرے میں جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس نے ہار منتخب کر کے گلے سے لگا کر دیکھا اور پھر انہیں پکارا۔ ''اچھو میاں، ذرا اس ہار کا کھٹکا لگا دو۔''

کھٹکا لگاتے ہوئے ان کی نگاہ بلا ارادہ بہکی...... اور بہکی ہی تھی کہ شہناز نے انہیں آڑے ہاتھوں لے لیا۔ ''کسی کام کے نہیں رہے بڑے میاں۔ اب آنکھیں ہی تو رہ گئی ہیں تمہارے پاس۔'' اُس نے نجانے کیا کیا کہا، مغلظات بھی بکیں۔

اُس وقت کے کسی لمحے میں اچھو میاں کے اندر دھماکہ ہو گیا تھا۔ مردانگی کے طعنے کو بہانہ بنا کر کچلی ہوئی انا سر اٹھا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

اُس رات دروازے سے کچھ فاصلے پر بچھے ہوئے اپنے بستر پر لیٹ کر وہ پوری رات جاگتے رہے۔ وہ بستر جو آٹے کی پرانی اور بوسیدہ بوری، اور میلی اور جھیر جھیر چادر اور اپنے ہاتھ کے تکیے پر مشتمل تھا، جولاہور کی کڑکتی سردی اور قہر برساتی گرمی میں یکساں طور پر ان کی کفایت کرتا تھا۔ بوسیدہ کپڑے کا وہ گدا، جس سے ان کی ٹانگیں ہمیشہ باہر ہی رہتی تھیں۔ وہاں لیٹ کر انہوں نے سوچا بھی اور خود کو ٹٹولا بھی۔ اگر وہ مرد ہی نہ رہے ہیں تو پھر استغفار کے ساتھ یہ نفس کشی تو رہی نہیں۔ تو کیا وہ لٹ گئے۔ لیکن جسم تسلی دے رہا تھا، گواہی دے رہا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ گواہی کافی نہیں ہے۔ انہیں ثبوت بھی پیش کرنا ہو گا۔

وہ ٹھیک سے سو نہیں سکے۔ وقفے وقفے سے سوتے تھے، پھر آنکھ کھل جاتی تھی۔ اور وہ نیند بھی ہذیانی تھی۔ ہر بار ان کی وحشت سوا ہو جاتی۔

صبح اذانوں کے بعد شہناز واپس آئی تو اُس وقت ان کا برا حال ہو چکا تھا۔ وحشت تو ان کی آسمان کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ برسوں کے کچلے ہوئے نفس نے سر اٹھایا تو شیطان کو ان پر پوری طرح سوار ہونے کا موقع مل گیا۔ اس پر ستم یہ کہ نیند سے محرومی کی وجہ سے دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔

وہ جانتے تھے کہ شہناز گرتے ہی بے سدھ ہو کر سو جائے گی۔ اُس کے باوجود وہ خاصی دیر

انتظار کرتے رہے۔ شدتِ طلب سے ان کا جسم اندر تک سے لرز رہا تھا۔ شیطان خواہش بن کر ان پر مسلط ہو گیا تھا۔

بالآخر وہ اٹھے اور بے دھڑک خوابگاہ میں چلے گئے۔ ان کے ہاتھ پاؤں اب بھی لرز رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ شہناز کے لئے مسہری پر جگہ چھوڑی گئی ہو گی اور وہ بھی کونے کی۔ سو انہوں نے اپنی دانست میں چادر میں لپٹی ہوئی شہناز کو بانہوں پر اٹھایا اور تیزی سے اپنے نام نہاد بستر کی طرف لپکے۔ آج اسے یہ بھی پتا چل جائے گا کہ ہم کتنے مرد ہیں، اور یہ بھی جان لے گی کہ ہم کہاں اور کیسے سوتے ہیں۔

انہیں احساس ہوا کہ وہ پھول جیسی ہلکی ہے۔ مگر نفس فوراً ہی پھول گیا۔ ہماری طاقت کے سامنے تو یہ پھول ہی ہے۔ انہوں نے سوچا۔ اس لمحے وہ دھیرے سے کسمسائی لیکن جاگی نہیں۔

انہوں نے لے جا کر اسے بوری پر پٹخا۔ پھر انہوں نے چادر ہٹائی اور اُس کا رخسار چبا ڈالا۔ وحشت کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ انہوں نے دیکھا، ذہن کو اُس کا ادراک ہونے تک انہوں نے اُس کا رخسار چبا ڈالا تھا۔ اور ادراک ہونے کے بعد وہ بت بن کر رہ گئے۔ ارے...... یہ انہوں نے کیا کر دیا یہ وہ کس کو اٹھا لائے۔

اب وہ اُس کی چیخ کے اور اپنی ذلت اور تباہی کے منتظر تھے۔ لیکن وہاں تو آنکھوں میں گہرا خوف تھا۔ ہونٹ بے آواز لرز رہے تھے۔

شرمندگی اور خوف سے نڈھال، وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکے اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ یہ اندازہ کرنا ان کے لئے ناممکن تھا کہ ان کی شرمندگی بڑی ہے یا خوف۔

اور اب وہ سوچ رہے تھے کہ وہ کہاں جائیں گے اور کیا کریں گے۔ یہ دوسرا سوال بہت خوف ناک تھا۔ انہیں تو کچھ کرنا آتا ہی نہیں تھا۔ تو اب زندگی کیسے گزرے گی۔

وہ اٹھے اور داتا دربار کی طرف چل دیئے۔ سیڑھیوں تک پہنچنے سے پہلے ہی انہیں آواز سنائی دی...... آؤ بھئی، لنگر آ گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اِدھر اُدھر سے لوگ جمع ہونے لگے اور قطار بن گئی۔

ارے...... دو وقت کی روٹی کوئی مسئلہ ہے۔ انہوں نے سوچا۔ یہاں تو ہر وقت لوگ موجود رہتے ہیں اور ہر وقت لنگر چلتا رہتا ہے۔ وہ خوامخواہ پریشان ہو رہے تھے۔ ان کا دل بڑا ہو گیا۔

وہ سیڑھیاں چڑھ کر اندر گئے۔ اندر فرش پر کتنے ہی لوگ انہیں بے خبر سوتے نظر آئے۔ لو ٹھکانا بھی موجود ہے۔ انہوں نے سوچا۔ بے شمار لوگ وہاں چل پھر رہے تھے۔ بہت سے مزار کی جالیوں پر سر لگائے کھڑے تھے۔ بہت سے ہاتھ اٹھائے فاتحہ پڑھ رہے تھے۔

وہ بھی گئے اور بلا ارادہ انہوں نے ہاتھ اٹھا دیے۔ مگر ہاتھ اٹھاتے ہی وہ گھبرا گئے۔ وہ پڑھیں گے کیا۔ عمر بھر میں سورۂ فاتحہ کے سوا انہیں کچھ یاد نہیں تھا۔ اور اب تو وہ بھی محو ہو گئی ہو گی۔

لیکن بسم اللہ پڑھتے ہی انہوں نے روانی سے سورۂ فاتحہ پڑھ ڈالی۔ اس کے بعد تو انہیں استغفر اللہ کے سوا کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ فاتحہ پڑھ کر وہ ذرا دور فرش پر آبیٹھے۔ انہوں نے سوچا، اب وہ یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے۔ یہاں ان کی ہر ضرورت پوری ہوگی۔

نہیں...... تجھے واپس جانا ہوگا۔ اندر سے ایک آواز نے کہا۔

واپس جانے کے خیال سے وہ تھرا گئے۔ وہاں اب جواُن کا حشر ہوگا، وہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ جبکہ یہاں سکون ہی سکون ہے۔

تو وہاں عزت تھی کب۔ وہاں تو پہلے بھی ذلت تھی۔ اندر کی آواز نے ڈپٹ کر کہا۔ تو وہاں کس امید پر بیٹھا تھا۔ گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے مگر اب جو کیا ہے، وہ......

اس کا بھی سامنا کر۔ جو کیا ہے، اس کی سزا تو ملنی ہے۔ یہیں ملنی خوشی قبول کر لے تو شاید اللہ کرم فرمادے۔ یہی تو آخری امید ہے تیری مگر یہاں بڑا سکون ہے۔ وہ منمنائے۔

لیکن ابھی یہاں کے لئے تیری منظوری نہیں۔ اندر کی آواز نے کہا۔ برسوں کا عذاب ہے تیرے سر پر۔ اُس سے مکتی ملے گی تو یہاں جگہ ملے گی۔ کیا برسوں کی ریاضت ضائع کر دے گا۔

وہ تو ضائع ہوگئی۔ میں نے ضائع کر دی۔ اور ریاضت بھی کیا تھی، اپنی بوئی ہوئی فصل کاٹ رہا تھا میں۔

تو ابھی جو بو کر آیا ہے، اس کی فصل کون کاٹے گا۔ چل اٹھ یہاں سے۔ وہیں جا، جو تیرا مقام ہے۔

اس جھڑکی کا کوڑا روح پر پڑا تو وہ تڑپ کر اٹھے اور دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

❁......❁......❁

نادرہ گہری نیند میں تھی۔ اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے ہلا رہا ہے۔ پھر اُس کے چہرے پر قطرے ٹپکے تو اُس کی آنکھ کھل گئی۔ ارجمند کا چہرہ اس کے سامنے تھا، اور وہ اُس کے ہی آنسو تھے، جو اُس کے چہرے پر ٹپکے تھے۔

لیکن ارجمند کے چہرے پر ایسا خوف تھا کہ وہ پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ نادرہ گھبرا کر اٹھ گئی۔

''کیا ہوا میری گڑیا، کیا بات ہے؟''

ارجمند کے ہونٹ ہلے لیکن آواز ندارد تھی۔

وہاں دوسروں کی نیند خراب ہونے کا ڈر تھا۔ نادرہ نے ارجمند کو گود میں اٹھایا اور اسے بڑے ہال میں لے آئی۔ وہاں بٹھا کر اُس نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کیا بات ہے گڑیا، کیا ہوا......''

''وہ...... پھپھو...... وہ......''

ارجمند کی نظر اُس کے رخسار پر پڑی، وہاں دانتوں کے نشان صاف نظر آرہے تھے۔ وہ دہل گئی۔ ''یہ کیا ہوا ہے ارجمند؟''

''وہ...... پھپھو...... اچھو میاں......'' ارجمند نے بہ مشکل کہا۔ اس کے آگے اُس سے بولا ہی نہیں گیا۔

نادرہ کے لیے اس سے زیادہ سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ غصے سے کھول اٹھی۔ ''کہاں ہیں اچھو میاں؟''

ارجمند کی زبان کافی دیر بعد کھلی۔ اس دوران نادرہ اس سے یہی بات پوچھتی رہی...... کہاں ہیں اچھو میاں؟

''وہ تو فوراً ہی دروازہ کھول کر بھاگ گئے تھے۔''

نادرہ جانے لگی تو ارجمند نے گھگھیا کر کہا۔ ''مجھے اکیلا نہ چھوڑیں پھپھو۔''

نادرہ نے اسے بھی ساتھ لے لیا۔ اُس نے جا کر دیکھا۔ دروازہ واقعی کھلا ہوا تھا۔ واپس آتے ہوئے اُس نے سنگھار میز سے تبت سنو کی شیشی نکالی اور ارجمند کو لے کر دوبارہ ہال میں آگئی۔ ارجمند کو سامنے بٹھا کر اُس نے اُس کے رخسار کو چھو کر دیکھا۔ ''بہت تکلیف ہو رہی ہے؟''

''نہیں پھپھو...... بہت تھوڑی۔ مگر مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

نادرہ کو اُس پر پیار آیا۔ اُس نے اُس کی پیشانی چوم لی۔ اُس نے چھو کر دیکھا تھا۔ وہ زخم نہیں تھا، محض دانتوں کا نشان تھا۔ اُس نے اس پر تبت سنو لگائی۔ ''ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تم مجھے بتاؤ۔''

''میں مسہری پر تھی۔ پھر میری آنکھ کھلی تو اچھو میاں نے مجھے بھینچ دیا تھا۔ ان کا چہرہ بہت ڈراؤنا ہو رہا تھا۔ انہوں نے مجھے یہاں کاٹا۔ پھر پیچھے ہٹ کر مجھے دیکھا۔ اور پھپھو، ایسا لگا جیسے وہ مجھ سے ڈر گئے۔ پھر وہ اٹھے اور دروازہ کھول کر باہر بھاگ گئے۔ میں آپ کے پاس آگئی۔''

نادرہ سوچ میں پڑ گئی۔ غصے کو ایک طرف رکھنا ضروری تھا، ورنہ حقیقت کو سمجھنا ناممکن ہو جاتا۔ نیلم بائی نے اسے اچھو میاں کی کہانی سنائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کبھی وہ نواب اشرف علی خاں تھے۔ اور جب سب کچھ ختم ہو گیا تو وہ اچھو میاں بن کر اس کوٹھے ہی کے ہو رہے۔ اور اس بات کو بیس سال سے زیادہ ہو گئے تھے۔ یہ طے تھا کہ دنیا میں ان کا کوئی نہیں۔

نادرہ غصے سے کھول رہی تھی۔ وہ اگر ذلت کی یہ زندگی جی رہی تھی تو صرف ارجمند کے تحفظ کے لئے۔ ورنہ مر جانا کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔ اب ارجمند کے ساتھ ایسا ہو جائے، یہ وہ کیسے گوارا کر سکتی تھی۔

لیکن کوئی انجانی حس اسے بتا رہی تھی کہ وہ اندھا دھند مشتعل ہونے والی بات نہیں۔ یہ تو بہت آسان ہے کہ وہ نیلم بائی کو جگائے اور پھٹ پڑے مگر اس کا کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکل سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ اچھو میاں وہاں سے ذلیل کر کے نکال دیے جاتے۔ اور اس میں اُس کا نقصان تو ہو سکتا تھا، فائدہ نہیں۔

اسے محسوس ہوا کہ اسے بہت یک سوئی سے سوچ کر صورتِ حال کو سمجھنا ہوگا۔

پہلی بات تو یہ کہ اچھو میاں کبھی اسے برے نہیں لگے۔ بلکہ وہ اسے اچھے لگتے تھے۔ وہ تو جیسے کسی کہانی کا کردار تھے، جو حقیقی زندگی میں چلے آئے تھے...... اسی کی طرح۔ فرق یہ تھا کہ وہ گھسیٹ کر لائی گئی تھی، اور وہ اپنی خوشی سے آئے تھے۔

اچھو میاں نواب تھے۔ ہر نعمت انہیں میسر رہی تھی۔ پھر انہیں تماش بینی کی لت پڑی، اُس کے بعد وہ نیلم بائی پر عاشق ہوئے اور سب کچھ اس پر لٹا دیا اور جب کچھ نہیں رہا تو انہوں نے باہر کی وسیع دنیا کی ذلت برداشت کرنے کے بجائے اس کوٹھے کی محدود ذلت قبول کر لی۔

نادرہ نے کوٹھے پر بہت زیادہ وقت نہیں گزارا تھا لیکن سیکھا اور سمجھا بہت تھا۔ اُس نے جان لیا تھا کہ جب مرد کسی بھی طور اپنی خواہش پوری نہ کر پائیں تو اُن کے وجود کی تمام گندگی سمٹ کر اُن کی آنکھوں میں آجاتی ہے۔ اسی لئے تو اسے اچھو میاں پر حیرت ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو اسے لگتا تھا کہ اچھو میاں کی کہانی نیلم بائی نے گھڑی ہے۔ کیونکہ اچھو میاں کی نگاہوں میں کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ اُس نے ان کی نظروں میں کبھی معمولی سا میلا پن بھی نہیں دیکھا تھا۔ انہیں کوئی طلب نہیں تھی۔ کبھی کسی سے کچھ لیتے نہیں تھے۔ کوئی کچھ منگواتا تو واپس آ کر پورا حساب بتا کر اُس کے بچے ہوئے پیسے اسے دے دیتے۔ اور زیادہ تر اصرار کے باوجود بھی کچھ قبول نہ کرتے۔ کبھی قبول کرتے تو شاید صرف شیو بنوانے کے لئے۔ وہی ایک ضرورت تھی ان کی۔ اور نیلم سے تو انہوں نے کبھی کچھ لینا گوارا ہی نہیں کیا تھا۔ وہ تو نادرہ کو ایسا درویش لگتے تھے، جو دنیا تیاگ کر گندگی کے ڈھیر پر ایک کڑی تپسیا میں مصروف ہو۔

وہ کوٹھے پر کسی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے، جیسے کبھی حسن کی خریداری انہوں نے کی ہی نہ ہو۔ ہاں یہ بات نادرہ جانتی تھی کہ وہ اسے دیکھتے تھے۔ بڑے احترام اور عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور وہ کسی سے بات نہیں کرتے تھے...... سوائے اس کے۔ اُس نے کبھی انہیں چپکے چپکے کسی کو دیکھتے تاکتے نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے تو ان کے انداز میں کھانے تک کے لئے رغبت نہیں دیکھی تھی...... وہ تو جیسے ہر خواہش چھوڑ بیٹھے تھے۔

تو پھر یہ واقعہ کیوں ہوا؟

یہ بھی کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی۔ وہ سمجھ سکتی تھی۔ مرد کیسا ہی ہو، کسی بھی حال میں ہو، ہوتا تو مرد ہی ہے۔ اور کچلا ہوا نفس آدمی کی بے پرواہی کے کسی لمحے میں سر اٹھانے کا موقع پا جائے تو اسے پوری طرح چھاپ بیٹھتا ہے۔ اچھو میاں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہوگا۔

لیکن ارجمند ہی کیوں؟ سات سال کی بچی!

یہ سوچتے ہی اُس کا خون کھولنے لگا۔ اگر انہوں نے اُس کے ساتھ ایسا کیا ہوتا تو وہ بلا تردد

انہیں معاف کر دیتی۔ لیکن ارجمند!

اُس نے دماغ ٹھنڈا کر کے پھر معقولیت سے سوچنے کی کوشش کی۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے یقین ہوگیا کہ سب کچھ کسی غلط فہمی میں ہوا ہے۔ اچھو میاں کا آخری ردِعمل اس کا ثبوت تھا۔ انہوں نے اندھا دھند ارجمند کے رخسار پر کاٹا۔ مگر جب اُس کا چہرہ دیکھا تو ڈر گئے، اور بھاگ گئے۔ اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے دانستہ ارجمند کو نہیں اٹھایا تھا۔

"گڑیا...... یاد کر کے بتاؤ، تم کیسے سو رہی تھیں؟" اُس نے ارجمند سے پوچھا۔

"کیسے کا مطلب پھپھو؟" ارجمند نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔ اب اُس کا خوف قدرے کم ہوگیا تھا۔

"کچھ اوڑھا ہوا تھا تم نے؟"

"جی پھپھو، چادر اوڑھی ہوئی تھی۔"

"چہرہ کھلا ہوا تھا تمہارا؟"

"مجھے تو اکیلے سوتے ہوئے ڈر لگتا ہے پھپھو۔" ارجمند نے پرانی شکایت دہرائی۔ "میں تو پوری چادر میں چھپ جاتی ہوں۔"

بات صاف ہوگئی۔ اچھو میاں کسی اور کے دھوکے میں ارجمند کو اٹھا لے گئے تھے۔ انہیں غلط فہمی ہوگئی تھی۔

"تم سوئی کہاں تھیں...... اپنے بستر پر؟"

"ڈر کی وجہ سے میری آنکھ کھلی تھی پھپھو۔ آپ کے پلنگ پر جگہ نہیں تھی۔ مسہری پر جگہ خالی تھی۔ میں وہاں سوگئی تھی جا کر۔"

بات کچھ اور صاف ہوگئی۔ جب کوئی لڑکی رات بھر کے لئے جاتی تھی تو مسہری پر اُس کے لئے جگہ چھوڑ دی جاتی تھی۔ رات شہناز مجرے پر گئی تھی۔ وہ جگہ اس کے لئے تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اچھو میاں شہناز کو اٹھانے آئے تھے۔ تو پھر شہناز کہاں سوئی؟

اُس نے جا کر دیکھا۔ شہناز نیلم بائی کی مسہری پر اُس کے ساتھ سو رہی تھی۔

بات واضح ہوگئی۔ مگر ایک کمزور پہلو اب بھی موجود تھا۔ ارجمند چھوٹی بھی تھی اور اُس کا وزن بھی کم تھا۔ اچھو میاں کو یہ احساس کیوں نہیں ہوا کہ وہ شہناز نہیں ہو سکتی۔

پھر ذہن نے اس اعتراض کا جواب بھی دے دیا۔ خواہش وحشت کا روپ دھار لے تو آدمی کو کچھ ہوش نہیں رہتا۔ نہ دماغ کام کرتا ہے، نہ حواس اور اچھو میاں کی یہی کیفیت تھی۔ اور یہ کتنی بڑی بات تھی کہ ارجمند کو دیکھ کر ان کی وحشت ہوا ہوگئی۔ ایسا نہ ہوا ہوتا تو وہ اس معصوم کو ہی روند ڈالتے۔ اور وہ کتنے عزت دار آدمی ہیں کہ اسے دیکھ کر ۔۔۔ سے پانی پانی ہوگئے۔ اور فرار ہوگئے۔

یہ تو ان کی اچھائی کی دلیل ہے۔

اس طرف سے مطمئن ہوئی تو اسے اچھو میاں کی فکر لاحق ہو گئی۔ وہ کہاں ہوں گے، کیا کر رہے ہوں گے۔ بیس سال سے دنیا سے بے تعلق ہیں، کیسے گزارا ہو گا ان کا۔ وہ دل میں بڑی سچائی سے ان کی واپسی کی دعا کرتی رہی۔

مگر ارجمند کو سمجھانا بھی ضروری تھا۔ اس نے کہا۔ ''گڑیا، میری جان، اس بارے میں کبھی کسی کو کچھ نہ بتانا۔''

''جی پھپھو۔ نہیں بتاؤں گی۔'' ارجمند نے کہا۔ ویسے بھی وہ کسی سے بات ہی کب کرتی تھی۔

''اور اچھو میاں کو نہ کبھی برا سمجھنا، نہ اُن سے ڈرنا۔''

''لیکن پھپھو، انہوں نے مجھے زمین پر اتنے زور سے پٹخا، اور کاٹا بھی۔''

''انہیں پتا تھوڑا ہی تھا کہ وہ تم ہو۔ دیکھو نا، تم تو چادر میں چھپی ہوئی تھیں۔''

''ہاں...... یہ تو ہے۔''

''اور گڑیا، وہ تو آپ سے پیار کرتے ہیں۔''

ارجمند چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ''پتا ہے پھپھو، یہاں کے لوگوں میں اچھو میاں کے سوا مجھے کوئی اچھا نہیں لگتا۔''

بچوں کو قدرتی طور پر، اللہ کی طرف سے اچھوں بروں کی پہچان ہوتی ہے۔ نادرہ نے سوچا، اور مطمئن ہو گئی۔

نیلم بائی اٹھی تو ناشتے کی فکر میں اُس نے اچھو میاں کو پکارا۔ ''اچھو میاں تو گھر میں ہیں ہی نہیں۔'' نادرہ نے انہیں بتایا۔

''تم نے کہیں بھیجا ہے انہیں؟''

''نہیں۔ ہم تو جب اٹھے تو وہ گھر میں نہیں تھے۔''

''تم کب اٹھی تھیں؟''

''آج سویا ہی نہیں گیا۔ آٹھ بجے اٹھ گئی تھی میں۔''

نیلم بائی ہڑبڑا گئی۔ ''اور دروازے کا تالا؟''

''کھلا ہوا ہے۔ چابی تو اچھو میاں کے پاس ہی رہتی ہے نا۔'' نادرہ نے کہا۔ پھر بات اُس کی سمجھ میں آ گئی۔ ''سنو بائی جی، میں بھاگنے والی ہوتی تو کب کی بھاگ چکی ہوتی۔''

''تم پر تو اعتبار ہے مجھے۔'' نیلم بائی نے کھسیا کر کہا۔ ''فکر تو دوسروں کی کرتی ہوں۔'' پھر اُس نے موضوع بدلا۔ ''مگر یہ اچھو کہاں چلا گیا۔ ایسے تو کبھی نہیں جاتا۔ اور اتنی دیر کے لئے تو کبھی گیا ہی نہیں کہیں۔''

نیلم بائی غصے میں بڑبڑاتی رہی، اچھو میاں کو برا بھلا کہتی رہی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اُس کا لہجہ نرم ہوتا گیا۔ ایک گھنٹے میں تشویش ہر چیز پر غالب آ گئی۔ ''ارے، کچھ ہو نہ گیا ہو نامراد کو۔''

❀......❀......❀

اچھو میاں علاقے میں داخل ہوئے تو بری طرح نڈھال ہو چکے تھے۔ اب تو ایک قدم بھی اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ مگر علاقے میں پہنچتے ہی ان پر لرزہ طاری ہو گیا۔ نیلم بائی کے غیض و غضب کا تصور کیا تو ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ اور بات ہی ایسی تھی۔ نیلم بائی کہتی کہ میاں تم تو ہمیں کروڑوں کا نقصان پہنچانے والے تھے۔ جو نتھ ابھی ڈلی نہیں، اسے اتارنا۔ ارے ایسا ہی شوق چرایا تھا تو ہم کیا مر گئے تھے۔ اور محبت تو تم ہم سے ہی کرتے تھے نا۔ یہ جو کچھ کیا ہے، یہ تو ناقابلِ معافی ہے۔

یہ جو کچھ وہ سوچ رہے تھے، جانتے تھے کہ جو ہو گا، اس سے سوا ہو گا، اور بہت ہو گا۔ مگر پھر وہ ڈٹ گئے۔ جو کرو تو سزا سے مت بھاگو۔ اس کے لئے تیار رہو، پوری سزا بھگتو اور استغفار کرتے رہو۔ برسوں پہلے انہوں نے اصول اپنایا تھا۔ اور آج اُس کی تجدید کا دن تھا۔

کوٹھے میں گھسنے سے پہلے ایک فیصلہ انہوں نے کر لیا۔ سزا اپنی جگہ، لیکن اب بات دب کر نہیں کرنی۔ اللہ نے انہیں ٹھکانا دکھا دیا ہے ان کا۔ وہاں عافیت بھی ہو گی اور عزت کے ساتھ دو وقت کی روٹی بھی۔ وہاں سے دھکیل نہ دیے گئے ہوتے تو وہ وہیں کے ہو رہتے۔ وہ تو بس اپنے کیے کی سزا بھگتنے کے لئے لوٹے تھے۔ سزا کے بعد وہ آزاد ہوتے۔ پھر ڈر کا ہے کا اور دبنا کیوں۔

تو اس کیفیت میں وہ کوٹھے میں داخل ہوئے۔

اندر گھستے ہی سب سے پہلے نادرہ سے سامنا ہوا، جس کے وہ اصل مجرم تھے۔ انہوں نے سوچ لیا کہ صفائی میں وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ جو کچھ بھی ہوا، جھیل لیں گے۔

لیکن جو کچھ ہوا، وہ ان کے خدشات کے برعکس تھا۔ ''آپ کہاں چلے گئے تھے اچھو میاں؟'' نادرہ نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''پتا بھی ہے، آپ کی وجہ سے ہم ناشتے سے محروم بیٹھے ہیں۔''

فرطِ حیرت سے ان کا منہ کھلا، اور کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''اے ایسے مر... سے کیا بات کر رہی ہو اس سے۔'' دوسری طرف سے نیلم بائی نے نمودار ہوتے ہوئے نخوت سے کہا۔ پھر وہ اچھو میاں کی طرف بڑھی۔ ''مجھ سے بات کرو میاں۔ کہاں چلے گئے تھے صبح ہی صبح۔''

اچھو میاں کی سمجھ میں نادرہ کا رویہ نہیں آیا تھا۔ وہ تو خاص طور پر تعلق خاطر کا اظہار کر رہی تھی۔ تو کیا منّی ارجمند نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ بہرحال جس کے وہ مجرم تھے، وہ ان سے عزت سے بات کر رہی تھی تو وہ نیلم بائی کو کیوں خاطر میں لاتے۔ انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''کیوں، میں اپنی مرضی سے کہیں نہیں جا سکتا۔ کیا میں تمہارا زر خرید ہوں؟''

اب کے نیلم بائی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ بائیس برس میں اچھومیاں نے کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیا تھا۔ ''تو کیا نہیں ہو؟'' اُس نے انہیں چیلنج کیا۔ ''مفت کی روٹیاں نہیں توڑتے ہو ہماری؟''

''اب یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کون مفت کی روٹیاں توڑ رہا ہے۔'' اچھومیاں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''تم یہ بتاؤ، ناشتہ بھی نصیب ہوا تمہیں ہمارے بغیر۔''

نیلم بائی روہانسی ہوگئی۔ ''نہیں ہوا۔ اس لئے تو دماغ الٹ رہا ہے۔''

''اور سنو بائی جی، یہ مفت کی روٹی کا طعنہ آئندہ نہ دینا۔ اس شہر میں اللہ کی رحمت سے کوئی بھوکا رہ ہی نہیں سکتا۔ خدا کی قسم، داتا دربار جا بیٹھو تو دس بار بھوک لگے تو دس بار عزت سے کھانے کو ملے۔ یہاں تمہارے در پر مجبوری میں نہیں بیٹھے ہیں۔ اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔''

نیلم بائی دہل کر رہ گئی۔ بالا دستی کا بھرم ٹوٹ گیا تھا۔ ''تو دربار چلے گئے تھے۔'' اُس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''مگر واپس بھی آگئے۔ آخر ہماری محبت کھینچ لائی نا تمہیں؟''

''کیوں محبت کو رسوا کرتی ہو نیلم بائی۔ محبت بازار میں دکانوں پر کہاں ملتی ہے۔ یہ کوئی خرید و فروخت کی جنس تھوڑا ہی ہے۔''

''تو پھر لوٹ کیوں آئے؟''

''ایک اور گناہ کی سزا بھگتنے کے لئے آئے ہیں۔ وہ بھگت لیں تو واپس چلے جائیں گے۔'' اچھومیاں نے نادرہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر انہیں اُس کی آنکھوں میں غصہ تو کجا، معمولی سی شکایت بھی نظر نہیں آئی۔

''اچھا، یہ لو۔ جا کر ناشتے کا سامان تو لاؤ۔'' نیلم بائی نے ان کی طرف پیسے بڑھائے۔

''اب تو بالکل ہمت نہیں ہے چلنے کی۔ زندگی میں پہلی بار اتنا پیدل چلے ہیں۔''

''پھر نوابی یاد آنے لگی ہے کیا؟'' نیلم بائی نے طعنہ دیا۔

اچھومیاں وہیں فرش پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے چپل اتار کر پیروں کے تلوے دکھائے۔ ''خود دیکھ لو بائی جی۔ چھالے پڑ گئے ہیں پاؤں میں اور ٹانگیں ایسے دکھ رہی ہیں، جیسے جسم سے الگ کوئی چیز ہوں۔''

بعض چھالے تو پھٹ بھی گئے تھے۔ نادرہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ نیلم بائی کا پتھر دل بھی قدرے نرم ہوگیا۔ ''تو اب کیا ہوگا۔ ہمت کر لو اچھومیاں۔''

''بالکل ہمت نہیں......''

اسی لمحے ارجمند آگئی۔ ''آپ، کہاں چلے گئے تھے اچھومیاں۔ دیکھیں ہم نے تو ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا آپ کی وجہ سے'' اُس نے معصومیت سے کہا۔

اور اچھومیاں فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''اب تو ضرور جائیں گے۔ ہماری گڑیا بیٹی بھوکی ہے۔ لاؤ پیسے دو بائی جی۔''

''نہیں اچھومیاں، اس حال میں آپ کو نہیں جانے دوں گی میں۔'' نادرہ نے کہا۔ اچھو میاں نے جس طرح ارجمند کو گڑیا بیٹی کہا تھا، اس لہجے کی سچائی نے اُس کے دل کو چھو لیا تھا۔ یہ ثابت ہوگیا تھا کہ جو ہوا، وہ غلط فہمی میں ہوا۔

''اپنی بیٹی کو بھوکا تو نہیں رہنے دیں گے ہم۔'' اچھومیاں دروازے کی طرف بڑھے۔ پھر اچانک وہ پلٹے۔ ''ایک بات کہوں۔'' انہوں نے نادرہ سے کہا۔ ''بٹیا کو میرے ساتھ بھیج دیجئے۔''

یہ سن کر ارجمند تو فوراً ہی سہم گئی لیکن نادرہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے دلاسہ دیا۔ ''جاؤ ارجمند۔ اچھومیاں تمہارے بابا جان کی طرح ہیں۔''

بابا جان کے حوالے نے ارجمند کو موم کر دیا۔ لیکن وہ دروازے کی طرف بڑھی تو نیلم بائی نے اسے روک دیا۔ ''نہیں اچھومیاں، تم اکیلے ہی جاؤ گے۔''

''کیوں؟ ارجمند تو پہلے بھی جاتی رہی ہے میرے ساتھ۔''

''اب مجھے تم پر اعتبار نہیں رہا۔''

''واہ......اس کوٹھے پر بیٹھا رہا تو قابلِ اعتبار تھا۔ داتا دربار ہو آیا تو ناقابلِ اعتبار ہوگیا۔''

''جانے دیجئے بوا۔''

''نہیں نرگس، یہ اس بچی کو اڑا لے جائے گا۔''

''سنو بوا، یہ میری بھتیجی ہے۔ اور اس کی فکر مجھے تم سے زیادہ ہے۔ مجھے اچھومیاں پر کبھی بے اعتباری نہیں ہوئی۔'' نادرہ نے سرد لہجے میں کہا۔ پھر وہ ارجمند کی طرف مڑی۔ ''جاؤ گڑیا، تم جاؤ اچھومیاں کے ساتھ۔''

نیلم بائی کو ممکن ہے، نادرہ کا انداز برا لگا ہو، لیکن اُس نے بہر حال ظاہر نہیں ہونے دیا۔

ارجمند ڈری ہوئی تھی اور اچھومیاں بھی اس کے خوف کو سمجھ رہے تھے۔ ان کے لئے تو یہ بھی خواب کی سی بات تھی کہ نادرہ نے اسے ان کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ اور وہ آ بھی گئی تھی۔

زینے سے اترتے اترتے وہ رکے۔ ''دیکھو بیٹی، ہم تمہارے لئے واقعی تمہارے بابا جان جیسے ہیں۔''

''تو پھر صبح آپ نے......''

''وہ غلط فہمی تھی بیٹا۔'' اچھومیاں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا کہ وہ آپ ہیں۔ تبھی تو شرمندہ ہو کر بھاگ گئے تھے۔''

''پھپھو نے بھی یہی کہا تھا۔''

"اور انہوں نے باجی جی سے شکایت بھی نہیں کی ہماری۔"

"جی۔ اور مجھے بھی منع کر دیا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ تو مجھ سے پیار کرتے ہیں۔"

"سچ کہہ رہی تھیں وہ۔ یہ نہیں پتا کہ انہوں نے یہ جانا کیسے۔ تم سمجھو گی نہیں بیٹا۔ پر ہم بتائیں گے ضرور۔ ہم اس قابل تھے ہی نہیں کہ ہمیں اولاد ملتی۔ اور بیٹی کے لائق تو ہم تھے ہی نہیں۔ لیکن ایسا ہوتا تو بالکل آپ کے جیسی بیٹی ہوتی ہماری۔" اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

ارجمند نے ان کے آنسو پونچھے۔ "آپ روئیں نہیں اچھو میاں۔"

"اچھا چلو، اب بازار چلیں۔"

⊛......⊛......⊛

وہ اس کوٹھے پر اچھو میاں کی پہلی رات تھی، جس میں ان کے لئے قلبی طمانیت تھی۔ اور وہ پہلی رات تھی کہ وہ بے سدھ ہو کر سوئے۔ ایک تو وہ بہ مشکل چار گھنٹے سوتے تھے۔ اُس میں بھی کئی بار نیند اچٹتی تھی۔ اس نیند میں ان کے لئے آسودگی نہیں ہوتی تھی۔ وہ جلدی اٹھ جاتے تھے۔ حالانکہ کوٹھے پر تو دن چڑھے تک سونے کا رواج ہوتا ہے۔ مگر انہیں نیند نہیں آتی تھی۔ اُس کے نتیجے میں وہ دن بھر اونگھتے تھے۔

اُس رات وہ سوچتے رہے کہ کیسی عجیب بات ہے۔ عمر بھر کی گمراہی اور گناہوں کے بعد انہوں نے خود اپنی پسند سے اپنے لیے یہ ذلت قبول کی تھی۔ مگر اس بار ایک گناہ کے بدلے انہیں طمانیت اور خوشی ملی تھی۔

اب تو وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ بہ ظاہر کوٹھے پر پڑا رہنے کا فیصلہ اپنا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ اللہ کی طرف سے تھا۔ ورنہ داتا دربار تو اس وقت بھی موجود تھا۔ مگر یہ کوٹھا ہی ان کے لئے عقوبت خانہ بنا دیا گیا تھا۔

اور اب اتنے برسوں کے بعد ان کے نفس نے پھر سر اٹھایا تھا تو اُس کے نتیجے میں انہیں ایک دوسرا در...... بہتر در دکھا دیا گیا تھا۔ ان کے دل کو ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ غیبی اشارہ ہے کہ وہ اپنی سزا کاٹ چکے۔ اس کے باوجود کوئی بات تھی کہ جس کی وجہ سے انہیں دربار میں ٹھہرنے نہیں دیا گیا تھا۔ حالانکہ وہ کوٹھے پر واپس جانا ہی نہیں چاہتے تھے۔

اُس وقت انہوں نے سوچا تھا کہ شاید قدرت چاہتی ہے کہ وہ اس تازہ ترین گناہ کی سزا بھی بھگت کر دربار آئیں۔ اور انہیں یقین تھا کہ اس بار انہیں اتنی ذلت ملے گی کہ اُس کے سامنے کوٹھے پر پہلے گزرے ہوئے بائیس برس باعزت لگنے لگیں گے۔

لیکن وہ واپس آئے تو انہیں ذلت کی جگہ عزت ملی۔ پہلی بار نیلم بائی کو احساس ہوا کہ وہ مجبور اور بے دست و پا نہیں ہیں تو اُس کا انداز بدلا۔ اور دوسری طرف نادرہ اور ارجمند نے ان کی

شکایت بھی نہیں کی۔ تو شاید یوں ہے کہ اللہ نے اس بار انہیں فوراً ہی معاف کر دیا۔

تو پھر وہ کوٹھے پر کیوں واپس بھیجے گئے؟ ہاں، یہ طے تھا کہ وہ کوٹھے پر واپس بھیجے گئے ہیں۔ ورنہ وہ تو وہاں دربار سے نکلنے والے ہی نہیں تھے۔ وہ اس پر سوچتے رہے۔ پھر انہیں ایسا لگا کہ شاید یہاں کوٹھے پر کوئی کام ہے، جو قدرت ان سے لینا چاہتی ہے۔ وہ کام کیا ہے، یہ وہ نہیں جانتے تھے۔ مگر ان کے دل کو یقین تھا کہ وہ کام پورا ہو جانے کے بعد وہ آزاد ہوں گے، اور باقی زندگی دربار میں گزار سکیں گے۔ انہیں یقین تھا کہ قدرت ان کی رہنمائی کر رہی ہے اور آخر تک کرے گی۔

کوٹھے کی رونق ختم ہوئی تو وہاں موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ اور وہ فوراً ہی سو گئے۔ وہ ایسی بے خبری کی لذت بھری نیند تھی، جسے وہ بھول چکے تھے۔ وہ خواب دیکھ رہے تھے۔ خواب میں وہ کبوتروں کے ساتھ اُڑ رہے تھے...... داتا دربار کی فضاؤں میں۔ اور سوتے ہوئے بھی انہیں بے پناہ طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔

پھر وہ خواب بھی ٹوٹ گیا اور نیند بھی۔ کوئی انہیں جھنجھوڑ رہا تھا۔ مگر ان سے آنکھیں نہیں کھولی جا رہی تھیں۔ "کون...... کون ہے؟" انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اٹھیں نا اچھو میاں۔ کیسے بے خبر سو رہے ہیں آپ۔"

"کک...... کون؟" ان کی آنکھ اب بھی نہیں کھلی۔ اور نیند کی وجہ سے زبان میں لکنت تھی۔

"میں ہوں نرگس۔"

اور ایک دم ان کی آنکھ کھل گئی۔ نادرہ ان کے پاس بیٹھی تھی۔ "تم میرے سامنے خود کو نرگس نہ کہا کرو۔ میرے لئے تو تم نادرہ ہی ہو۔ میں نرگس کو نہیں جانتا۔"

"اس وقت تو میں نرگس ہی ہوں اچھو میاں۔"

اچھو میاں نیند کی کیفیت سے نکلے تو پریشان ہو گئے۔ "کیا بات ہے نادرہ، خیریت تو ہے؟" انہوں نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ آیئے۔ اور زور سے نہ بولئے گا۔"

اچھو میاں اٹھے اور اُس کے ساتھ چل دیے۔ نادرہ کا رخ بڑے ہال کی طرف تھا۔

ہال میں اندھیرا تھا چاندنی کے فرش پر شراب کی خالی بوتلوں، سگریٹ کے ٹوٹوں اور مسلے ہوئے پھولوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ انہیں دیوار کی طرف لے گئی، جہاں گاؤ تکیے بے ترتیب پڑے تھے۔ "یہاں بیٹھ جائیں۔"

اچھو میاں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ بیٹھ گئے۔

"آرام سے پاؤں پھیلا کر بیٹھیں...... گاؤ تکیے سے ٹیک لگا لیں۔"

اچھو میاں کی حیرت اور بڑھ گئی۔ "بات کیا ہے نادرہ؟"

نادرہ گئی، اُس نے ہال کا دروازہ بند کیا اور چٹخنی چڑھا دی۔ پھر وہ واپس آئی اور ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

اچھو میاں نے محسوس کیا کہ وہ جھجک رہی ہے۔ ”کیا بات ہے نادرہ؟“

”عزت دار تو میں رہی نہیں۔ پھر بھی عزت سے ڈرتی ہوں۔ ہے نا عجیب بات۔“ نادرہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”بے عزتی کی آخری حد کو پہنچا دی گئی۔ پھر بھی عزت کی فکر کرتی ہوں۔“

”بات کیا ہے؟“

”آپ سے کچھ کہنا ہے، اور وہ کہنا آسان بھی نہیں لیکن ضروری بھی ہے اور میں نے زندگی میں کسی سے ایسی بات نہیں کی۔“

”نادرہ، میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں۔ اسی لئے تو کہا کہ تم خود کو میرے سامنے نرگس نہ کہو۔ میں نے تمہیں کبھی نرگس نہیں کہا۔“

”لیکن اب سمجھیں گے بھی اور کہیں گے بھی۔“

”ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“ اچھو میاں نے بے حد یقین سے کہا۔ ”اب تو مجھ پر احسان ہے تمہارا۔ تم نے مجھے ذلت سے بچالیا۔ اگر تم نیلم بائی سے میری شکایت کر دیتیں تو میرا جو حشر ہوتا، میں اُس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ وہ رکے پھر اچانک پوچھا۔ ”تم نے ایسا کیوں کیا نادرہ؟“

”اس لئے کہ میں آپ کی مجبوری سمجھ گئی تھی۔ آپ انسان ہیں، جو نفس کا غلام ہوتا ہے۔“

اچھو میاں نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”تو ایسا سمجھا تم نے۔ نفس کے جوش میں اندھا ہو کر میں نے ارجمند پر حملہ کیا؟“

”جی نہیں۔ یہ سمجھا ہوتا تو میں آپ کا پردہ نہیں رکھتی۔ مجھے معلوم تھا کہ جو کچھ ہوا، غلط فہمی میں ہوا۔ اور اسی وجہ سے آپ سے بات کر رہی ہوں، وہ پھر جھجکنے لگی۔ ”دیکھیے اچھو میاں، میں نے پہلے بھی کہا کہ میرے لئے یہ کہنا آسان نہیں۔ لیکن ضروری سمجھ کر کہہ رہی ہوں۔ آپ مرد ہیں۔ فطرت کے تقاضے کسی کو بھی نہیں بخشتے۔“ یہ کہتے کہتے اُس کی نظریں جھک گئیں اور آواز لرزنے لگی۔ ”میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ جس وقت بھی ضرورت محسوس کریں، میں آپ کے لئے حاضر ہوں۔ اور بات میرے اور آپ کے درمیان میں رہے گی۔“

اچھو میاں حیرت اور صدمے سے گنگ ہو کر رہ گئے۔

نادرہ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ نظریں اٹھانے کی اُس میں ہمت بھی نہیں تھی۔ ذرا سے توقف کے بعد وہ بولی۔ ”دیکھیں نا، یہ سب کچھ مجھے بائی جی کی خاطر کرنا پڑتا ہے، اور ہر بار میں اپنے اندر مر جاتی ہوں۔ تو کیا آپ کی ضرورت پوری نہیں کر سکتی۔“

”میں شاید خوش فہمی میں مبتلا تھا نادرہ۔ وہ آج دور ہو گئی۔ تم نے یہ اتنی بڑی بات کہی تو یقیناً

تم نے......“

نادرہ نے ان کی بات کاٹ دی۔ ”......یہ اتنی بڑی بات کہہ کر میں کتنی چھوٹی ہو گئی۔“

”تم چھوٹی نہیں ہوئیں۔ تم تو اور بڑی ہو گئیں۔ لیکن میں جو زندگی کو کفارہ سمجھ کر گزار رہا تھا، تباہ ہو گیا۔ شاید نہیں، یقیناً جہنم ہی میرا مقدر ہے۔ میرا سب کچھ ختم ہو گیا۔ شاید گناہ کبھی نہیں مٹتے۔“ اچھو میاں کے لہجے میں گہری مایوسی تھی۔

نادرہ نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ رہے تھے۔ ”میں نے......میں نے الٹا آپ کو دکھی کر دیا۔“

”نہیں۔ تم نے تو ایثار کی حد کر دی۔ اس لئے تو میں نے کہا کہ تم اور بڑی ہو گئیں۔ اور دیکھا جائے تو فرق مجھے بھی نہیں پڑا۔ میں تو تھا ہی حقیر ترین۔ اور حقیر کیا ہوتا۔ بس ایک بھرم ٹوٹ گیا۔ خوش فہمی دور ہو گئی۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”میری آنکھوں میں دیکھو نادرہ۔ کیا ان میں تمہیں ہوس نظر آتی ہے۔“

”نہیں۔ اور آج ہی کیا، میں نے تو آپ کی آنکھوں میں کبھی طلب بھی نہیں دیکھی، ہوس تو بہت دور کی بات ہے۔ اور اچھو میاں، ایک ہوس ہی کی تو پہچان ہے مجھے۔ کیونکہ اس کے سوا کچھ اور دیکھا ہی نہیں میں نے۔ اسی لئے تو آپ کی فکر کر رہی ہوں۔ اسی لئے تو اتنی بڑی بات کہی ہے آپ سے، جو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“

اچھو میاں کی آنکھوں میں طمانیت جھلکنے لگی۔ انہوں نے سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا اور زیر لب بولے۔ ”اللہ کا شکر ہے۔“

”تو پھر یہ سب کیوں ہوا اچھو میاں؟“

اچھو میاں خلاؤں میں گھور رہے تھے، جیسے کچھ دیکھ رہے ہوں۔ پھر انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”جب سب کچھ ختم ہو گیا اور میں نے آخری پونجی نیلم کے قدموں میں رکھ دی تو میں اپنے لئے سزا تجویز کر چکا تھا۔ جو نیلم میرے اشاروں پر ناچتی اور اٹھتی بیٹھتی تھی، میں نے اُس کی غلامی قبول کر لی۔ یہاں بائیس سال سے ہوں میں، اور ہر ایک کے ہر حکم کی تعمیل کرتا رہا ہوں۔ کبھی کسی کو کسی بات سے انکار نہیں کیا۔ بس ایک دلالی نہیں کی۔ اور ذلت کو بے حسی کے ساتھ نہیں، احساس کے ساتھ ذلت سمجھ کر، اور محسوس کر کے قبول کیا۔ ہر ذلت روح کے لئے تازیانہ تھی۔ اور میں یہ سوچ کر قبول کرتا تھا کہ شاید کسی چھوٹے سے گناہ کا کفارہ ہو جائے۔ شاید اس لئے مطمئن ہو گیا کہ نفس پوری طرح کچل دیا گیا ہے۔ لیکن پرسوں......“ انہوں نے شہناز کا واقعہ سنایا۔ پھر بولے۔ ”......بس وہ چیلنج بن گیا مردانگی کے لئے۔ اور غصے اور ہوس میں ہوش و حواس جواب دے

جاتے ہیں۔اس لئے تو پتا نہیں چلا کہ شہناز کی جگہ ننھی بچی کو اٹھائے لئے جا رہے ہیں۔اب سوچتے ہیں، ہاتھ کیوں نہیں ٹوٹ گئے میرے۔اسی لئے تو واپس چلا آیا سزا کے لئے۔ پر تم نے تو......اور اب اس وقت......'' ان سے کچھ کہا نہیں گیا۔وہ پھر رونے لگے نادرہ نے اپنے دوپٹے سے ان کے آنسو پونچھ دیے۔''اب آپ ایک وعدہ کریں مجھ سے۔''

''جو بھی کہو گی، مان لوں گا۔''

''آدمی بہت کمزور ہوتا ہے اچھو میاں۔آئندہ ایسا ہو تو وعدہ کریں کہ آپ میرے پاس چلے آئیں گے۔اس کے سوا کچھ نہیں کریں گے۔''

''اب ایسا ہوگا ہی نہیں۔'' اچھو میاں نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔''اب تو ہم چوکنا ہو چکے ہیں۔''

''اس کے باوجود بھی کچھ ہو سکتا ہے۔آپ وعدہ کریں مجھ سے۔''

''چلو......تمہاری خوشی کی خاطر وعدہ کر لیتے ہیں۔''

''آپ نے یہاں بائیس سال گزار دیے۔آپ کو کبھی پچھتاوا نہیں ہوا؟'' نادرہ نے پوچھا۔

''ہم تو یہاں گناہوں کے کفارے کے لئے عمر قید خوشی سے کاٹ رہے تھے۔ پچھتاوے تو بہت تھے۔مگر انہیں اس چار دیواری سے باہر ہی چھوڑ آئے تھے۔ہاں مگر جب تمہیں دیکھا تو بڑی شدت سے پچھتاوا ہوا۔ہم بے بسی سے ہاتھ مَل کر رہ گئے۔''

نادرہ کو حیرت بھی ہوئی اور تجسس بھی۔''میری وجہ سے پچھتاوا؟''

''ہاں۔ہم نے سوچا، کاش ہمارے پاس ساری دنیا کی دولت ہوتی، اور وہ ہم نیلم کو دے کر تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاتے۔تمہیں عزت کی زندگی دینے کے لئے مشقت مزدوری کرتے۔مگر افسوس۔''

نادرہ سن ہو کر رہ گئی۔اُس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اب بھی کوئی اس کا اس طرح سے خیال کرنے والا دنیا میں ہے۔

اچھو میاں کو کچھ خیال آیا تو وہ بھڑک اُٹھے۔''ارے ہاں......ایک وضاحت کر دیں، اگر تم یقین کر سکو تو کر لینا۔''

''یقین کیوں نہیں کروں گی میں۔''

وہ کوئی جادوئی لمحہ تھا، جس میں اچھو میاں تبدیل ہوئے، کچھ اور بن گئے۔ وہ تن کر بیٹھ گئے۔ چہرے پر تمکنت چھا گئی، اور وہ بولے تو ان کے لہجے میں وقار اور دبدبہ تھا۔''نواب زادہ اشرف علی خان بہت بڑا گناہگار تھا۔لیکن ایک گناہ سے اسے اللہ نے بچائے رکھا۔اُس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، منافقت نہیں کی۔ جب وہ نواب تھا تو مضبوط تھا۔اس لئے اس بات کی کوئی

اہمیت نہیں۔لیکن جب وہ اچھو میاں بن گیا، تب بھی اللہ نے اسے جھوٹ اور منافقت سے بچائے رکھا۔میں یہ وضاحت تمہیں یقین دلانے کے لئے کر رہا ہوں کہ جب تمہیں دیکھ کر مجھے پچھتاوا ہوا تو وہ نہ تو نواب اشرف علی خان کا پچھتاوا تھا، جو تماش بین اور حسن پرست تھا، اور نہ ہی وہ اچھو میاں کا پچھتاوا تھا، جو کچلا ہوا سہی، بہرحال مرد تھا۔اس پچھتاوے میں کوئی غرض، کوئی مطلب نہیں تھا۔ اور اُس کی وجہ یہ بھی نہیں تھی کہ تم بہت حسین تھیں۔ میں تو بس تمہاری مدد کرنا، تمہارا محافظ بن کر تمہاری خدمت کرنا اور خیال رکھنا چاہتا تھا۔بہت خالص اور بہت بے غرض جذبہ تھا وہ۔''

نادرہ نے بڑے احترام سے ان کا ہاتھ تھام کر اوپر اٹھایا اور اسے چوم لیا۔''مجھے یقین ہے نواب صاحب۔''

اچھو میاں نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔''ایسا نہ کرو نادرہ۔یہ ہاتھ اس قابل نہیں۔''

''یہی ہاتھ تو اس قابل ہے۔''

''بس تم ایک احسان کر دو مجھ پر۔'' اچھو میاں گڑگڑائے۔

''آپ حکم کریں نواب صاحب۔میں تعمیل کروں گی۔''

''میرے لئے اللہ سے دعا کرو کہ وہ میری زندگی میں ہی میری مغفرت کر کے مجھے بری کر دیں، پاک کر دیں۔''

نادرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔''میں کیا دعا کروں۔ میں تو خود گناہوں کی دلدل میں دھنسی ہوئی ہوں۔''

''نہیں نادرہ، ایک تمہی تو پاک نظر آئی ہو مجھے۔تم تو زمین کی طرح ہو، جسے اللہ نے پاک صاف بنایا ہے۔اب کوئی زمین پر گندگی پھیلائے تو زمین کا کیا قصور۔ وہ تو قیامت کے دن اللہ سے انصاف مانگے گی۔اور انصاف اسے ملے گا۔گندگی کرنے والے عذاب میں ہوں گے۔تم تو بہت پاک، بہت محترم ہو نادرہ۔وعدہ کرو کہ میرے لئے دعا کرتی رہو گی۔''

رندھے ہوئے گلے کی وجہ سے نادرہ کے لئے جواب دینا ممکن نہیں تھا۔وہ بے اختیار اقرار میں سر ہلاتی رہی۔کوٹھے پر آنے کے بعد وہ پہلا موقع تھا کہ وہ خود کو تنہا محسوس نہیں کر رہی تھی۔ یہ احساس بہت طمانیت خیز تھا کہ کمزور سہی، مگر اس کا کوئی حلیف ہے۔

❁......❁......❁

مولوی صاحب سے گفتگو کے بعد عبدالحق پر سب کچھ واضح ہو گیا تھا، اور یہ اس کے نکتۂ نظر سے اور برا ہوا تھا۔ کیونکہ صورتِ حال میں اس سے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا وجود ایک بوتل کی طرح تھا، جس میں ایک مہیب اور سرکش جن کو بند کر دیا گیا تھا۔اور اب کسی نے ڈھکنا کھول کر اس جن کو آزاد کر دیا تھا۔

دشواری یہ تھی کہ اب اس جن کو دوبارہ بوتل میں بند کرنے کی اُس کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔
صورتِ حال بدستور تھی۔ اُس کی نماز ارتکاز سے محروم تھی۔ قرآن پڑھنا محض آیات کو دہرانا تھا۔ تہجد سے وہ محروم ہو گیا تھا۔ وجہ وہی رات کا فساد تھا۔
مولوی صاحب سے گفتگو کے بعد اُس نے سب سے پہلے توجہ رات کے کھانے پر دی تھی، جس پر وہ سب یکجا ہوتے تھے۔ اُس نے سوچا تھا کہ کھانے کے دوران وہ نور بانو کی طرف ہرگز نہیں دیکھے گا۔

ابتدا میں وہ کامیاب رہا، لیکن کھانے کے اختتام سے ذرا پہلے وہ ہار گیا۔ اُس کی وہ نظر بے اختیار تھی اور ایسی ظالم کہ اسے پتا بھی نہیں چلا۔ اور اس پر ستم یہ کہ اسے پتا چلا کہ نور بانو اسی کو دیکھ رہی ہے۔ اور دونوں کی نگاہوں کی وہ چوری ایسی ماہرانہ تھی کہ وہاں موجود کسی کو بھی اُس کا پتا نہیں چلا تھا۔
عبدالحق نے فوراً ہی نظر ہٹانے کی کوشش کی۔ یہ آسان نہیں تھا۔ پھر نور بانو کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی، اور بلاوا تھا۔ بہرحال ایک لمحے کی جدوجہد کے بعد اُس نے نگاہ ہٹالی۔ لیکن وہ محض ایک لمحے کی کامیابی تھی۔ اور دوسری نظر اس کے چوکنے پن کے باوجود اٹھی تھی۔ وہ اسے روک نہیں سکا تھا۔ اور نور بانو اس وقت بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ البتہ نگاہوں کا تاثر اس بار مختلف تھا۔ اس بار اُس کی نظروں میں شکایت تھی۔ پھر اس میں فتح مندی کی جھلک آئی، جیسے کہہ رہی ہو...... دیکھا، ہم سے بچ کر کہیں جا نہیں سکتے تم۔

یوں وہ پہلی ہی رات ناکام ہو گیا۔ اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کھانا کم کھاتا تھا اور نور بانو کو زیادہ دیکھتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ دوسری طرف بھی یہی حال ہے۔
وہ تو پھر بھی ہلکا معاملہ تھا۔ اپنے کمرے کی تنہائی اُس کے لئے سب سے بڑی آزمائش تھی۔ نیند اسے کم ہی آتی تھی۔ وہ تو بس بستر پر لیٹا نور بانو کو تصور میں دیکھتا اور اُس کے تصور سے کھیلتا رہتا تھا۔ اور نیند سے وہ ڈرنے بھی لگا تھا۔ اول تو وہ سوتا بہت دیر میں تھا۔ اور پھر سوتا تو خوابوں میں نور بانو آجاتی۔ اور ان خوابوں میں لذت ہی لذت ہوتی تھی۔ پہلی بار اسے پتا چلا کہ خواب میں کتنی آزادی ہوتی ہے۔ شاید اس لئے کہ خواب پر آدمی کا مواخذہ نہیں ہوتا۔
بہرحال ان خوابوں کی کیفیت ایسی ہوتی تھی کہ آنکھ کھلنے پر احساسِ زیاں ہوتا تھا...... یہ پچھتاوا کہ آنکھ کیوں کھل گئی۔ مگر اس پہلے احساسِ زیاں کے بعد دوسرا حقیقی احساسِ زیاں ہوتا تھا۔ وہ یہ کہ آنکھ دیر سے کھلی ہے اور وہ فجر کی نماز قضا کر بیٹھا ہے۔ پہلی بار تو اس احساس سے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے کہ آنکھ کھلی ہے تو وہ چڑھی ہوئی دھوپ دیکھ رہا ہے۔
بہت غور کرنے والا، بہت سوچنے والا ہونے کے باوجود وہ یہ بات نہیں سمجھ سکا کہ کسی فرض، کسی نیکی سے محرومی پر، کسی خطا پر ہونے والا وہ رنج اللہ کی طرف سے ایک بہت بڑا تحفہ ہوتا ہے۔

وہ دراصل توبہ کا کھلا ہوا دروازہ ہوتا ہے، اصلاحِ احوال کے لئے اللہ کی طرف سے تائید و ترغیب ہوتی ہے۔ وہ رنج آدمی کو خوابِ غفلت سے جھنجوڑنے کے لئے ہوتا ہے۔ آدمی اُس سے فائدہ نہ اٹھائے تو رنج بہ تدریج دھیما ہوتا جاتا ہے اور دل پر پڑا غفلت کا پردہ دبیز ہوتا جاتا ہے۔
بے بسی کا وہ احساس بہت شدید تھا۔ اسے کئی جہتوں میں لڑنا پڑ رہا تھا۔ لیکن بنیادی لڑائی نور بانو کے تصور سے تھی۔ نور بانو سے اُس کی شادی محض مہینے دو مہینے کی بات تھی۔ وہ ایک بار خطا کر بیٹھا تھا، اور اسے دہرانے سے بچنے کے لئے وہ اُس کا سامنا کرنے سے بھی بچنے لگا۔ اسی وجہ سے اُس نے رات کا کھانا سب کے ساتھ کھانا چھوڑ دیا۔ عذر مصروفیت کا تھا۔
مگر وہ اُس تصور کا کیا کرتا، جس کے پاس اب جسمانی لمس کے لذت بھرے حوالے موجود تھے۔ اُس نے خود کو اُس کی قربت تو کجا، دید سے بھی محروم کر لیا تو تصور بالکل ہی بے لگام ہو گیا۔
پہلی بار اسے پتا چلا کہ آدمی کتنا کمزور اور بے بس ہے۔ وہ جانتا تھا کہ غلطی پر ہے، لیکن سر توڑ کوشش کے باوجود اصلاح نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ اس کے اندر ہو رہا ہے، غلط ہے لیکن وہ اُس کے سامنے بند نہیں باندھ پا رہا تھا۔
مولوی صاحب کے کہنے کے مطابق اُس نے توبہ کا سہارا لیا۔ دل کی گہرائیوں سے وہ نادم تھا۔ اس لئے توبہ میں ارتکاز بھی تھا، اور خلوص بھی۔ لیکن عبرت ناک بات یہ ہوئی کہ توبہ کے فوراً بعد اس کا بے لگام تصور پھر میدان میں کودا اور اسے شرم سار کر گیا۔
پھر بھی وہ توبہ کرتا رہا۔ لیکن توبہ کا دورانیہ سکڑتا گیا اور بے لگام تصور کی دیدہ دلیری بڑھتی گئی۔ پھر نوبت یہاں تک آگئی کہ توبہ کے دوران بھی تصور کی دیدہ دلیری کسی نقب زن کی طرح دراندازی کرنے لگی۔

اس مقام پر وہ بالکل مایوس ہو گیا۔ اسے لگا کہ جو توبہ وہ کر رہا ہے، کیے جا رہا ہے، وہ اس کے لئے الٹی شرم ناک ہو گئی ہے۔ ادھر نماز اور قرآن کی تلاوت کے درمیان بھی یہی صورتِ حال نہ صرف قائم تھی، بلکہ بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ قرآن کی تلاوت سے تو وہ گھبرانے اور کترانے لگا۔ نماز کا جہاں تک تعلق تھا، تو فجر کی نماز قضا ہونا تو معمول بن گیا تھا۔ البتہ آنکھ کھلتے ہی وہ پہلے وضو کرتا اور فجر کی قضا نماز پڑھتا۔ پھر ایک دن کسی کا کوئی کام آپڑا تو فجر کی قضا نماز ظہر سے جا ملی۔ اور اس کے بعد یہ معمول بن گیا۔

وہ جانتا تھا کہ یہ غلط ہے۔ ہر روز وہ عہد کرتا کہ اگلے روز اپنے پرانے معمول کو جاری کرے گا لیکن اگلے روز پھر وہی کچھ ہوتا۔ ہر نماز میں اُس کے دھیان پر نور بانو چھائی رہتی اور وہ کسی مشین کی طرح رکوع و سجود ادا کرتا۔ ہر لمحے وہ لڑنے کی، نور بانو کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا، ارتکاز اور حضوری کے احساس کو بحال کرنے کی کوشش کرتا اور ہار جاتا۔ اس خلل کی وجہ سے وہ شرمندگی کے

مارے قرآن پڑھنے سے کترانے لگا۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اس شرمندگی نے اسے دعا سے بھی محروم کردیا۔ وہ سوچتا کہ اتنی آلودگی کے ساتھ میں اللہ کی بارگاہ میں التجا گزاری کا منہ ہی نہیں رکھتا۔

اسے احساس تھا کہ وہ ایک مسلسل اور مستقل نقصان سے دوچار ہے۔ ہر روز اُس کا خسارہ تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہے، اور جاننے کے باوجود وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ آخر یہ خیال اس کے ذہن میں راسخ ہوگیا کہ اب نور بانو سے شادی ہی اسے بچاسکتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اسے قرار آگیا۔ اُس کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ دھیرے دھیرے شرمندگی ختم ہوتی گئی اور وہ بڑی حد تک مطمئن ہو گیا۔ خلش اب طویل وقفوں کے بعد تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے اسے ستاتی تھی۔

ایک رات اسے پتاجی کی وہ کتابیں اور ڈائریاں نظر آئیں، جو نور بانو نے اسے دی تھیں۔ وہ خود اس کمرے میں آئی تھی، اور اس رات تو پنڈورا کا یہ بکس کھلا تھا۔

اچانک اسے خیال آیا کہ ڈائریوں کے بارے میں نور بانو نے کچھ کہا تھا...... کوئی تبصرہ کیا تھا۔ اور وہ بہت اہم تھا۔ لیکن ذہن پر بہت زور دینے پر بھی اسے وہ بات یاد نہیں آئی۔ اسے تو بس اس رات کی ایک ہی بات یاد تھی...... شاید آپ اس کے بعد مجھے کبھی اچھی لڑکی نہ سمجھیں۔ لیکن میں پھر بھی کہوں گی۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ اتنی...... اتنی...... اتنی زیادہ کہ آپ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ بس وہی ایک بات یاد تھی اسے۔ اور اُس وقت اسے وہ فریب ساعت لگا تھا۔ اور وہ اُس کی تصدیق کے لئے اُس کے کمرے کی طرف دوڑ گیا تھا۔

اور تصدیق کے بعد سے اب تک وہ ایک سحر میں الجھا ہوا تھا۔

وہ ذہن پر زور دیتا رہا۔ لیکن اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ نور بانو نے پتاجی کی ڈائریوں پر کیا تبصرہ کیا تھا۔ بس اسے اتنا احساس تھا کہ وہ بہت اہم بات تھی۔ لیکن نور بانو کے اظہار محبت کے نتیجے میں دب گئی تھی۔

بے بسی سے اُس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔ یہ کیا ہوگیا ہے مجھے۔ وہ بڑبڑایا۔ کیا حافظے سے بھی محروم ہوگیا میں؟

پھر اچانک اُس کے دماغ میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا، اور اُس کے کانوں میں نور بانو کی آواز گونجی۔ وہ معذرت کررہی تھی کہ ان ڈائریوں میں بہت ذاتی باتیں تحریر تھیں، اور اسے وہ ڈائریاں نہیں پڑھنی چاہئے تھیں۔

اور اُس نے کہا تھا...... کوئی بات نہیں۔ میں نے آپ کو اجازت دی تھی نا......

تو اس ڈائری میں ذاتی باتیں تھیں پتاجی کی! تو ڈائری میں تو ہوتی ہی ذاتی باتیں ہیں۔ اس میں کیا اہم بات ہے؟ اس کے بعد بھی کچھ کہا تھا نور بانو نے۔ کیا کہا تھا......؟ کیا کہا تھا......؟

نور بانو کی آواز اُس کی سماعت میں پھر گونجی...... ان ڈائریوں میں ایک اتنی بڑی خوشی ہے

آپ کے لئے کہ جو آپ کے گمان میں بھی نہیں ہوسکتی، پھر اُس نے اس کے لئے پیشگی مبارک باد دی تھی۔ اور اُس نے کہا تھا...... وضاحت نہیں کریں گی آپ۔ اس پر نور بانو نے کہا تھا...... جی نہیں خود پڑھ کر جو خوشی ہوگی آپ کو وہ بہت...... بہت بڑی ہوگی۔ اور میں اسے خراب کرنا نہیں چاہتی۔

اُس کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ بہت بڑی خوش خبری، اور اُس نے پلٹ کر ان ڈائریوں پر دوسری نگاہ بھی نہیں ڈالی۔ کیسی بے حسی اور ذلت میں گرفتار ہوگیا ہے وہ۔ اسے خود پر شرم آنے لگی۔ اتنی بڑی بات وہ بھول گیا، اور اسے تجسس بھی نہیں ہوا! وہ کیسا احسان فراموش بیٹا ہے کہ جس باپ نے اس کی خاطر جان دے دی، اسے اس کے متعلق ایک نامعلوم اور بہت بڑی خوش خبری کو جاننے کا شوق بھی نہیں ہوا۔ وہ اتنی بڑی بات بھول گیا۔

بہر حال اب وہ تجسس سے بے حال ہوگیا تھا۔ وہ میز کی طرف گیا، جہاں کتابیں رکھی تھیں۔ کتابوں میں ایک نسخہ قرآن پاک کا تھا اردو ترجمے کے ساتھ۔ ایک کتاب تھی احکام الٰہی، ایک کتاب قیامت کے بارے میں تھی۔ ایک سیرت طیبہ پر تھی۔

اس نے سوچا کتابوں کا وہ پھر بھی جائزہ لے گا۔ یہ سوچ کر اس نے دونوں ڈائریاں اٹھا لیں۔ نور بانو نے کہا تھا کہ ان میں اس کے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری ہے' ایسی کہ جو اس کے گمان میں بھی نہیں ہوسکتی۔ اور اس وقت اسے خوش خبری کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اپنے معاملات کی طرف سے اس کی مایوسی بہت زیادہ بڑھ چکی تھی۔

اپنے بستر پر نیم دراز ہوکر اس نے ایک ڈائری کھولی۔

ڈائری کھولنے سے پہلے اس نے ایک بات سوچی تھی...... وہ یہ کہ ایک راج پوت کو اور وہ بھی حاکم راج پوت...... اسے ڈائری لکھنے کی کیا ضرورت۔ تو ڈائری کھولتے ہی اسے اس بات کا جواب مل گیا۔ وہ ڈائری درحقیقت اس کی اپنی زندگی کی کتاب تھی...... ایسی کتاب' جس کے بعض ابواب پتاجی کسی کو بھی نہیں سنا سکتے تھے۔

اس نے پڑھنا شروع کیا' اور اس میں کھو گیا۔

اس ڈائری میں بہت کچھ تو ایسا تھا جو وہ جانتا تھا' یا جان گیا تھا۔ اور اب ڈائری اس کی تائید کررہی تھی۔ جیسے یہ بات کہ وہ جس حالت میں پیدا ہوا تھا' اس میں اسے ختنہ کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ بات دائی راجو اور شانتا کے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھی۔

وہ ڈائری کیا تھی' حیرت کدہ تھی۔ اس کی پیدائش والے دن پتاجی بے اختیار گاؤں سے باہر چلے گئے تھے۔ جبکہ گاؤں میں اس کی پیدائش کا جشن منایا جارہا تھا' اور حویلی مہمانوں سے بھری تھی۔ اور وہاں وہ لوگ اس بزرگ سے ملے تھے...... وہی بزرگ جو اس کے قبول اسلام والی رات دلی میں ماں جی کے گھر آئے تھے' اور انہوں نے ہی اس کا نام رکھا تھا۔ پتاجی کی ڈائری گواہی

دے رہی تھی کہ انہوں نے ٹھاکروں کی گڑھی کے بارے میں کہا تھا کہ وہ نہیں رہے گی' اور گاؤں دوبارہ آباد ہوگا تو اس کا نام حق نگر ہوگا۔

اور کیسی عجیب بات ہے کہ ان کی بات سچ ثابت ہوئی۔ اب ٹھاکروں کی گڑھی اور اس کے گردونواح کے تمام گاؤں ایک ہیں' اور اس پورے علاقے کا نام حق نگر۔

پھر پنڈت روپ سہائے' جنہوں نے اس کی جنم کنڈلی بنائی تھی اور اس کا نام اوتار سنگھ رکھا تھا۔ بعد میں وہ اپنے گرو رام دیال کو لے کر آئے تھے۔ پتا جی نے اس سلسلے میں ان کی کہی ہوئی ہر بات لکھی تھی۔ انہوں نے تو ایک طرح سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اوتار سنگھ' ٹھاکر پرتاپ سنگھ اور ٹھاکرانی رنجیتا کا بیٹا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ان دونوں کی کنڈلی میں اولاد تھی ہی نہیں۔

وہ ڈائری زندگی کی طرح آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ اس کے لیے پتا جی کی غیر معمولی بے پایاں محبت کی گواہ تھی۔ ماتا جی کے دیہانت کے بعد وہ دہلی چلا گیا تو پتا جی کی زندگی کیسی ویران ہوگئی۔ کتنے اکیلے' کتنے دکھی' کتنے بوجھل تھے وہ۔

پھر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اسے یاد تھا کہ اس سال پتا جی دہلی آئے تھے۔ یہ وہ عرصہ تھا' جب اس نے نور بانو کی آواز سنی تھی' وراس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ ایسا گم تھا کہ اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ پتا جی نے بہ غور اس کا مشاہدہ بھی کیا ہے' اور اس سے نتائج بھی اخذ کیے ہیں۔

اسے حیرت ہوئی کہ پتا جی نے دو دن میں اسے پوری طرح بھانپ لیا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ محبت کا چکر ہے۔ لیکن اس کی نظریں کسی کی جستجو میں بے قرار نہیں تھیں' اس پر انہیں الجھن تھی۔ بہرحال یہ بات انہوں نے سمجھ لی کہ وہ اس آواز کو سننے کے لیے کوٹھے پر آتا ہے اور ایسا بے سدھ ہو کر اس آواز کو سنتا ہے۔ اور وہ جانتے تھے کہ یہ قرآن پڑھا جا رہا ہے۔

یہ سوچ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ جو آواز اور کلام بالآخر اسے اسلام کی طرف لے گیا تھا' اس نے اس کے پتا جی کو قرآن کے مطالعے کی طرف راغب کیا تھا۔

دراصل پتا جی اس کے معاملے میں دو مختلف ہستیوں کی وجہ سے سپردگی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ دونوں ہستیاں ایک دوسرے کی ضد تھیں' لیکن ایک دوسرے کی تائید بھی کر رہی تھیں۔ ان جانا بزرگ اور پنڈت روپ سہائے۔ بزرگ نے تو تنبیہہ کے ساتھ انہیں جتا دیا تھا کہ مرضی نومولود بچے کی چلی گی۔ ورنہ دینے والا اپنی نعمت واپس بھی لے سکتا ہے۔ اور پنڈت روپ سہائے نے کہا تھا...... چھوٹے ٹھاکر اپنا بھاگیہ آپ لکھیں گے۔ اور دودھ والے معاملے میں ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے واضح طور پر اس بات کی سچائی کو سمجھ لیا تھا۔

پتا جی نے لکھا تھا کہ انہوں نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ ان کے بیٹے کا مسلمانوں سے کوئی نامعلوم مگر بہت گہرا تعلق ہے۔ اس لیے سب سے پہلے تو مسلمانوں سے ان کی انسیت شروع

ہوئی۔ پھر ان کے دل میں مسلمانوں کو اور اسلام کو سمجھنے کی لگن پیدا ہوئی۔ یہ بات بھی وہ ذہنی طور پر قبول کر چکے تھے کہ ان کا بیٹا بالآخر کسی مسلمان لڑکی سے شادی کرے گا۔

ڈائری بتاتی تھی کہ جس شام انہوں نے اوتار سنگھ کو از خود فراموشی کی کیفیت میں قرآن کی تلاوت سنتے دیکھا تو انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ قرآن کے ذریعے اسلام کو اور مسلمانوں کو سمجھیں گے۔

وہ اپنے ایک کلاس فیلو امان اللہ سے ملے۔ اس نے مشورہ دیا کہ قرآن سے پہلے وہ سیرت پڑھیں۔ اس کے علاوہ بھی اس نے مزید چند کتابیں تجویز کیں۔ اور ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے اس پر عمل کیا۔

ٹھاکر نے لکھا تھا کہ حضرت محمد ﷺ کی سیرت پڑھنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ افسانہ ہے۔ ایسا تو منش ہو ہی نہیں سکتا اور اگر وہ ایسے تھے تو پھر دنیا میں کوئی ان کے سوا ایسا نہیں کہ اس کی پوجا کی جائے۔ لیکن وہ کہتے تھے کہ اَن دیکھے اللہ کے سوا کوئی عبادت کا سزاوار نہیں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ ان کے ماننے والے ایسے ہی ہیں۔ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی طرح مسلمان نے نہ کبھی ان کی کوئی مورتی اور نہ ہی کوئی تصویر بنائی۔ وہ جیسے بھی ہوں' اور اپنے اوتار سے کتنی ہی محبت کریں' عبادت وہ اَن دیکھے اللہ کی ہی کرتے ہیں۔ سجدہ صرف اسی کو کرتے ہیں۔

ڈائری بتاتی تھی کہ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد ٹھاکر پرتاپ سنگھ قرآن کی طرف متوجہ ہوا لیکن وہ کوشش کے باوجود جم کر نہیں پڑھ پاتا تھا' اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ پھر ایک دن اچانک ایک صفحہ کھل کر اس کی نگاہوں کے سامنے آیا اور اس کی نظریں خود بخود ایک آیت پر جم گئیں۔

عبدالحق کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ سورۃ الملک کی وہی آیات تھیں' جنہیں سن کر وہ ایمان لایا تھا۔ کیسی عجیب بات ہے!

ڈائری کے مطابق ٹھاکر پرتاپ سنگھ ان آیات کی صداقت جانچنے کے لیے کھلے آسمان کے نیچے چلا گیا تھا۔ پھر اس نے میلوں چلنے کے بعد یہ سمجھ لیا تھا کہ...... اس نے خود لکھا تھا۔ ”میں اپنی دھن میں بہت دور نکل آیا تھا۔ مگر آسمان کی مرکزی حد سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔ مجھ پر ہیبت طاری ہوگئی۔ میرے پاؤں شل ہو گئے۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ دیر تک مجھ سے اٹھا بھی نہیں گیا۔ اب مجھے اتنی دور پیچھے جانا تھا۔

”میں نے بہت غور کیا اور کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ میں دنیا کے کسی بھی ملک چلا جاؤں' آسمان کا مرکز میرے سر کے عین اوپر ہی رہے گا۔ اس کا مطلب؟ آسمان کی وسعت نامعلوم ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آسمان کے مرکز کی وسعت اتنی ہے کہ پوری زمین بس اس کے نیچے ہے۔ میں کہیں بھی کھڑا ہو کر دیکھوں' خود کو اس مرکز کے عین نیچے پاؤں گا۔“

عبدالحق پر ہیبت طاری ہوگئی۔ یہ آسمان کے مرکز والا نکتہ تو وہ بھی نہیں سمجھ پایا تھا۔ اور اس

کے پتاجی نے سمجھ لیا تھا۔ کاش...... میرے پتاجی مسلمان ہوتے! اس نے بڑی حسرت سے سوچا۔

'میرے لیے تو سوچ کے دروازے کھل گئے' ٹھاکر نے ڈائری میں لکھا تھا۔ سائنس داں کہتے ہیں کہ آسمان فریبِ نظر ہے۔ کوئی مجھ سے کہے تو میں کہوں' پہلے ایک چھوٹا سا...... بہت چھوٹا سا ہی فریبِ نظر پیدا کر کے دکھاؤ تو مانوں۔ فریب تو اسے کہتے ہیں' جسے بالآخر دور ہونا ہوتا ہے۔ یہ کیسا فریبِ نظر ہے کہ ہزاروں برسوں سے انسانوں کے سروں پر قائم ہے...... نسل در نسل' اور کبھی دور نہیں ہوا۔

'میں پہلے ہی سے جانتا اور مانتا تھا کہ میرا بیٹا میرے لیے مبارک ہے۔ لیکن اتنا مبارک ہے میں نے نہیں سوچا تھا۔ زندگی میں پہلی بار میں محسوس کر رہا ہوں کہ میرے اندر اندھیرا تھا' جو دھیرے دھیرے چھٹ رہا ہے' اور روشنی بڑھ رہی ہے......'

عبدالحق ڈائری پڑھتا رہا' جس میں اس کے باپ کے تجربات اور مشاہدات تھے...... بلکہ انکشافات بھی تھے۔ وہ پڑھتا اور حیران ہوتا رہا اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کی گھر سے دوری کے دوران پتاجی دنیا تیاگ بیٹھے ہیں۔ انہوں نے اس کی جدائی میں مطالعے میں دل لگایا تھا...... اور مطالعہ بھی وہ' جو اسی عرصے میں وہ خود کرتا رہا تھا۔ کیسی عجیب بات تھی کہ باپ اور بیٹا ایک ہی وقت میں تلاشِ حق میں مصروفِ کار تھے۔ تاریخیں پلٹتی رہیں۔ ایک ڈائری ختم ہوئی اور دوسری شروع ہو گئی۔ کہانی انجام کی طرف بڑھ رہی تھی۔ فیصلہ کن سال یعنی ۱۹۵۶ء شروع ہو چکا تھا۔ عبدالحق کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے ادراک ہو چکا تھا کہ ان صفحات میں کوئی بہت بڑی حقیقت افشا ہونے والی ہے۔

اس ڈائری میں ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی ذاتی کیفیات بھی تھیں اور مطالعے پر تبصرہ بھی۔ سورۃ الملک کی ان آیات کے بعد اس کی سمجھ میں قرآن میں سے کچھ نہیں آیا تھا۔ لیکن اس نے پڑھنا نہیں چھوڑا تھا۔

پھر وصال دین گاؤں واپس آ گیا۔ اس کے امتحان ہو چکے تھے۔ جبکہ اوتار سنگھ کے امتحان ابھی شروع بھی نہیں ہوئے تھے۔

ٹھاکر نے اپنی ڈائری میں وصال دین کے بارے میں بہت کچھ لکھا تھا' جو ہر روز باقاعدگی سے اس کے پاس آتا تھا' تاکہ اسے اوتار سنگھ کی اتنی کمی محسوس نہ ہو۔ اور وہ اوتار سنگھ کی طرح اس کے پاؤں بھی دباتا تھا۔

آگے' ڈائری اس بات کا اظہار کرتی تھی کہ ٹھاکر بیٹے کے [illegible] ایک ایک دن گن رہا تھا۔ مطالعے کا' اور خاص طور پر قرآن کا سہارا نہ ہوتا تو شاید وہ انتظار اسے پاگل ہی کر دیتا۔

عبدالحق کی بے تابی بڑھ گئی تھی۔ تاریخیں بتاتی تھیں کہ اب وہ اپنے باپ کے آخری ایام کی

روداد پڑھ رہا ہے۔ وہ تاریخ قریب آ رہی تھی' جب وہ گاؤں واپس آیا تھا اور اپنے دم توڑتے باپ سے چند لمحوں کے لیے ملا تھا۔

لیکن اس سے پہلے ہی ڈائری میں سنسنی کا آغاز ہو گیا۔ اور وہ سنسنی ایسی تھی کہ پتاجی کا خط بھی اس کی گواہی دے رہا تھا۔ ان کی تحریر پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کی وجہ ان کے ہاتھوں کی لرزش ہے۔ انہوں نے لکھا تھا......

''آج مجھے روشنی مل گئی ہے۔ سچ جھوٹ مجھ پر کھل گیا۔ آج میں قرآن پڑھنے بیٹھا تو جیسے خود بہ خود ورق اُڑے اور ایک صفحہ میرے سامنے کھل گیا۔ اور میری نظر اس عبارت پر پڑی...... کیا کبھی غور کیا تم نے کہ یہ نطفہ جو ڈالتے ہو تم' کیا تم پیدا کرتے ہو بچہ یا ہم ہیں پیدا کرنے والے؟ میں ہر روز بے بسی محسوس کرتا تھا کہ قرآن میری سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن میں پڑھنا نہیں چھوڑتا تھا۔ ہر روز نئے سرے سے کھول کر بیٹھ جاتا تھا۔ آسمان والی عبارت کے بعد میں نے سمجھ لیا تھا کہ اس کتاب میں بڑے بڑے بھید ہیں۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے' مجھے کوشش کرتے رہنا ہے۔

'مگر آج جو یہ صفحہ کھلا اور عبارت نظر میں آئی' اسے تو میں خوب سمجھ سکتا تھا۔ رنجیتا سے شادی کے بائیس سال میں اولاد سے محروم رہا تھا۔ جبکہ یہ مجھ میں کمی تھی نہ رنجیتا میں۔ اور میں نے کیا کیا جتن نہ کیے' کہاں کہاں نہ گئے ہم' کس کس کے چرنوں میں جھکے۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔ یہ پڑھ کر پہلی بار میری سمجھ میں آیا کہ ایک قدرتی سسٹم تو موجود ہے۔ ملاپ کے عمل کے نتیجے میں ایک نظام کے تحت جسموں سے مادے خارج ہوتے ہیں۔ سائنس کہتی ہے کہ انہی کے کیمیاوی عمل کا نتیجہ اولاد ہوتی ہے۔ مگر قرآن اصل حقیقت سے پردہ اٹھا رہا تھا۔ مادے کا اخراج تو ہر بار' ہر موقعے پر ہوتا ہے۔ لیکن اصل چیز نطفہ ہے۔ اس کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور اس پر آدمی کا کوئی اختیار نہیں۔ وہ اللہ دیتا ہے' اور بے شک وہی بچہ پیدا کرتا ہے۔ کون بدبخت اس آیت سے انکار کر سکتا ہے۔ میں تو نہیں کر سکتا۔

''اور یہ پڑھنے کے بعد مجھ پر لرزہ چڑھ گیا۔ میں نے اور رنجیتا نے آخری منت پیپل کے درخت کے سامنے مانی تھی' اور اس کے بعد ہم دونوں نے ایک ہی وقت میں خوش خبری کا ایک ہی خواب دیکھا تھا۔ اور اس کے بعد پیپل کا درخت جل گیا تھا اور ہم مایوس ہو گئے تھے۔ اور اس کے بعد ہی اوتار سنگھ رنجیتا کی کوکھ میں آیا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ اوپر والے نے یہی بات تو سمجھائی تھی ہمیں۔ پر ہم نے نہیں سمجھی۔ اب مجھے رنجیتا پر افسوس ہوتا ہے۔ میں نے تو آج یہ بات سمجھ لی' پر وہ بے چاری تو محروم رہ گئی۔

'میں نے جائزہ لیا۔ وہ سورۃ الواقعہ کی 58 ویں آیت تھی۔ میں اس پر غور کرتا رہا۔ میری سمجھ میں آیا کہ یہ آیت مکمل ہے اور دونوں رخ سے حقیقت ہے۔ میں نے دونوں رخ دیکھے تھے۔ میں

نے بائیس سال ہر ہر طرح سے کوشش کر کے دیکھی تھی' لیکن اولاد سے محروم رہا تھا۔ یہاں تک کہ اوپر والے نے مجھے نواز دیا۔ اور کالج میں میرا ایک انگریز دوست تھا' جس کے ایک ہندو لڑکی کے ساتھ تعلقات تھے۔ وہ دونوں ہر طرح کی احتیاط کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ بغیر شادی کے وہ بچہ نہیں چاہتے تھے۔ مگر ان کی ہر احتیاط دھری رہ گئی۔ اور جب حمل ٹھہر گیا تو انہوں نے اسے مٹانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔ کیا دیسی ٹوٹکے اور کیا انگریزی دوائیں' انہوں نے کچھ نہیں چھوڑا لیکن وہ ناکام رہے۔ بچہ پیدا ہو کر رہا۔

'آسمان والی بات کے بعد مجھے یقین آ گیا تھا لیکن اب تو میں بڑی سے بڑی سوگند کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اللہ ہی سب کچھ ہے' اور یہ اس کا سچا کلام ہے' جسے کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ اور میں اسے مانتا ہوں اور اس کا اعلان کرنا چاہتا ہوں۔

'میرے لیے تو یہ ایک دلیل ہی کافی تھی۔ مگر آگے اور دلیلیں تھیں۔ انہیں پڑھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ ایسی دلیلوں کے ہوتے ہوئے بھی منش کیوں اندھیروں میں سر ٹکراتا پھرتا ہے۔'

'اسی سورۃ میں 63 سے 67 تک کی عبارت میں سب سے مہان اللہ کہتا ہے کہ تم زمین میں بیج ڈالتے ہو اور سمجھتے ہو کہ کھیتی تم اگاتے ہو لیکن نہیں۔ کھیتی ہم اگاتے ہیں۔ ہم چاہیں تو اسے بھس بنا کر رکھ دیں اور تم سر پیٹتے رہ جاؤ اور اپنی تباہی پر روؤ اور اپنے نصیب کو کوسو۔ اسے پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ ہم زمین دار اور کسان لوگ تو اس بات کو خوب سمجھتے ہیں' پر شاید سمجھ کر بھی نہیں سمجھ پاتے۔ میں نے تو کھڑی فصلیں تباہ ہوتے دیکھی ہیں' بارش نہ ہونے اور بارش بہت زیادہ ہونے سے بھی۔ اور کبھی کسی کھیت میں اتنے ہی بیج سے دس من کی فصل ہوتے دیکھی ہے۔ اور کبھی بیس من بھی دیکھا ہے۔ کسانوں کے چہرے میری نگاہوں میں پھرتے ہیں' کبھی ہنسی خوشی لگان دیتے ہوئے اور کبھی رو کر فریاد اور معذرت کرتے ہوئے کہ مالک' اس بار پتا نہیں کیا ہو گیا' فصل ہی اچھی نہیں ہوئی۔ پورا لگان دے دیں تو کھائیں گے کیا۔ اب میری سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی بالی گندم سے لدی کیوں ہوتی ہے اور کوئی بالکل خالی ہوتی ہے۔ بے شک اوپر والا مہان ہے۔

'پھر آگے 68 سے 70 تک کی عبارت میں ایک اور نشانی بتائی...... بہت بڑی نشانی۔ میٹھا پانی جو بڑی نعمت ہے۔ صحرائی لوگوں سے بڑھ کر کون سمجھ سکتا ہے۔ یہ بات۔ وہ کہتا ہے یہ پانی ہم نے نازل کیا ہے یا تم نے؟ وہ کہتا ہے' ہم چاہیں تو بنا دیں اسے نمکین...... سخت نمکین تو پھر تم شکر گزار کیوں نہیں ہوتے؟

'اب یہ تو سب جانتے ہیں' کیا ہندو' کیا مسلمان اور کیا عیسائی کہ ہم پانی نہیں برساتے۔ بارش نہ ہو تو ہم رو رو کر پرارتھنا کرتے ہیں۔ اور مجھے معلوم ہے کہ میٹھا پانی تو دھرتی پر کبھی تھا ہی نہیں۔ ساگر کے سوا یہاں کیا تھا۔ اوپر والے نے یہ اتنا زبردست پلانٹ لگایا۔ کھارے پانی کو میٹھا

کرنے کا پلانٹ۔ تبخیر کے عمل سے کھاری پانی بادل بنا۔ بادل اُڑے۔ اس کے منظور کردہ مقام پر پہنچے اور بارش کر دی۔ میٹھے پانی کی سپلائی آ گئی ہے جی۔ بارش سے تالاب بنے' ندی نالے اور دریا بنے۔ کچھ پانی اس کے حکم سے دھرتی میں اتر گیا۔ بعد میں کبھی وہ چشموں کی شکل میں پھوٹا اور کہیں ہم نے کھدائی کر کے کنویں بنا لیے۔ پانی کی فطرت اس نے ایسی میل ملاپ والی بنائی کہ اکیلا نہیں رہتا۔ جمع ہوتا ہے۔ قطرہ بھی ہو تو دوسرے اور پھر تیسرے قطرے کی طرف لپکتا ہے' چاہے کہیں بھی ہو۔ پانی کی یہ فطرت نہ ہوتی تو ہمارے لیے مسئلہ بنتا۔

'لیکن یہ سب کچھ بارش کے دم سے ہے۔ لمبے عرصے تک بارش نہ ہو تو کنویں' چشمے' ندی نالے' یہاں تک کہ دریا بھی سوکھ جاتے ہیں۔ یہ عبارت پڑھ کر میری تو سمجھ میں یہ بات آ گئی ہے کہ کبھی بارش روک کر وہ منش کو جتاتا ہے کہ اس کا احسان مانے۔ وہ چاہے تو میٹھا پانی ختم ہو جائے۔ بادلوں کے سسٹم میں وہ تبدیلی کر دے اور وہ پانی کے ساتھ نمک بھی اٹھانے لگیں تو میٹھا پانی کہاں سے آئے۔ اور مل جاتا ہے تو منش کو اس کی اہمیت کا پتا نہیں چلتا۔ لیکن نہ ملے تو اسے پتا چلے کہ پانی کے بغیر زندگی ہی ممکن نہیں۔ پھر وہ آخر میں کہتا ہے کہ تم' شکر گزار کیوں نہیں ہوتے۔ واقعی' شکر گزاری کیا' ہم تو سوچتے بھی نہیں۔ مگر میں نے اب جان لیا' مان لیا اور میں شکر گزار ہوں۔

"پھر اگلی عبارت میں آگ کا درخت بیان کیا ہے۔ ایسے کسی درخت کے بارے میں مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا میں نے سمجھ لیا ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ ہے' وہ سچ ہے اور حقیقت ہے' خواہ ہمیں نظر آئے یا نہ آئے۔ اور آگ کے فائدے تو میں بھی جانتا ہوں۔ مگر یہ آگ یاد دہانی کے لیے ہے...... نرک کی یاد دہانی کے لیے۔ یہ پڑھ کر پہلی بار میں نے نرک کے بارے میں سوچا۔ مجھ پر تو تھرتھری چڑھ گئی۔ میں چھوٹا سا تھا تو ایک بار میری انگلی جل گئی تھی۔ اس کی تکلیف مجھے آج بھی یاد ہے۔ میں روتا تھا اس تکلیف سے۔ حیرت ہے' ہمیں نرک کا خیال کیوں نہیں آتا۔ وہ آگ تو بہت...... بہت بڑی اور شدید ہو گی اور مسلسل جلانے والی۔ جبکہ ایک سیکنڈ میں جلنے والی انگلی کی تکلیف مجھے کئی دن تک رلاتی رہی تھی۔ تو نرک میں کیا ہو گا۔ یہ تو میں کبھی سوچتا ہی نہیں تھا۔ شاید کوئی بھی نہیں سوچتا۔ مگر دنیا میں معمولی سی تکلیف پر تڑپ جانے والوں کو سوچنا بھی چاہیے' اور ڈرنا بھی چاہیے۔ میں تو اب یاد رکھوں گا' اور ڈرتا رہوں گا۔

'پھر آگے 79 کی عبارت میں اس کتاب کے پاک ہونے کا اور بڑائی کا تذکرہ تھا اور لکھا تھا کہ اسے وہ چھوئیں جو پاک صاف ہوں۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ آئندہ میں اس کتاب کو پڑھنے سے پہلے خوب اچھی طرح نہایا کروں گا۔

'پھر 84 سے 87 تک کی عبارت میں ایک اور بڑی نشانی تھی۔ پہلے تو اوپر والے نے بتایا کہ پیدا صرف اسی کا کام ہے۔ اب وہ بتا رہا تھا کہ موت پر بھی صرف اسی کا اختیار ہے۔ وہ کہتا ہے

کہ مرنے والے کا آخری وقت آجاتا ہے اور ہم دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ جان اس کے حلق تک آگئی ہے۔ ہم اسے تو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ لیکن اوپر والا ہمیں نظر نہیں آتا۔ اور وہ بتاتا ہے کہ وہ ہم سے زیادہ اس مرنے والے کے قریب ہوتا ہے۔ لیکن ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ وہ حاکم ہے اور ہم محکوم ہیں۔ وہ چیلنج کرتا ہے کہ اگر ہم یہ بات نہیں مانتے تو پھر مرنے والے کو بچا کیوں نہیں لیتے۔ اس کی آتما کو لوٹا کیوں نہیں لیتے۔

'مجھے رنجیتا کی موت اور اپنی بے بسی یاد آگئی۔ میں سو جتن کر کے بھی اسے نہیں بچا سکا۔ دنیا میں کوئی کسی کو نہیں بچا سکا۔ اور کوئی ایسا نہیں، جسے موت نہ آئی ہو۔ تو میں نے مان لیا کہ وہ حاکم ہے اور میں محکوم۔ تو پھر مجھے اس کی ایسی ہی تابع داری کرنی چاہیے، جیسی میری رعیت میری کرتی ہے اور وہ میں کروں گا۔'

عبدالحق ایسے بیٹھا تھا، جیسے سانس لینا بھی بھول گیا ہو۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ پتا جی تو اس سے بہت آگے نکل گئے تھے۔ وہ اس وقت جہاں تھے، وہ اب بھی وہاں نہیں پہنچ سکا تھا۔ آسمان کی جس نشانی کے بارے میں وہ سن کر ایمان لے آیا تھا، پتا جی اس کی تصدیق کے لیے کئی میل پیدل چلے تھے۔ ان کا یقین تو اس کے یقین سے بہت بڑا ہو گا۔

اسے باپ پر رشک آنے لگا۔ انہوں نے اللہ کی کتنی نشانیوں کو دیکھا اور سمجھا تھا۔ سورۃ الواقعہ کی یہ آیات بارہا اس کی نظر سے گزری تھیں لیکن اس نے غور نہیں کیا تھا۔ جبکہ پتا جی نے ان پر غور کیا اور ان کی سچائی کو دل سے تسلیم کیا تھا۔

کاش پتا جی مسلمان ہوتے! اس نے حسرت سے سوچا۔ پھر وہ اگلے اندراج کی طرف متوجہ ہو گیا۔

'آج میں بہت اچھی طرح نہا کر اس کتاب کو پڑھتے بیٹھا تو مجھے ایسا لگا کہ اس میں سے بہت ٹھنڈی روشنی نکل کر آنکھوں کے راستے میرے دل میں جا رہی ہے۔ دل میں ٹھنڈک اور روشنی کا احساس ہو رہا تھا۔

'میں نے پھر وہی کچھ پڑھا جو کل پڑھا تھا۔ اس کے بعد میں نے کتاب رکھ دی اور سوچتا رہا۔ ایک یقین میرے اندر، میرے وجود کی اندرونی دیواروں سے پھوٹ رہا تھا اور پورے وجود میں پھیل رہا تھا۔ یہ کہ اس دنیا صرف سچ وہی ہے جو اس کتاب میں لکھا ہے۔ جو کچھ اس کتاب والا کہتا ہے، بس وہی سچ ہے۔ میں نے سر اوپر اٹھا کر کہا...... اے کتاب والے، میں تجھے نہیں دیکھ سکتا، لیکن تُو مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں تجھے نہیں جان سکتا، لیکن مجھے تیرے سوا کوئی پوری طرح نہیں جان سکتا۔ میں نے پڑھا، جانا اور مان لیا کہ تیری بات کے سوا کچھ سچ نہیں۔ اب میں تیرا ہوں...... صرف تیرا، تجھ اکیلے کا۔

'اس سے جو مجھے سکون ہوا، وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک تشنگی کا احساس بھی تھا، جیسے

سب کچھ نامکمل ہے۔ کہیں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی ہے۔ میں اس پر سوچتا رہا اور میری سمجھ میں آیا کہ مجھے آگے بڑھنا ہو گا۔ میں خود سے نہیں سمجھ سکتا۔ مجھے کوئی سمجھانے والا، کوئی استاد چاہیے۔ مجھے جمال دین کا خیال آیا۔ لیکن نہیں، مجھے معلوم ہے، وہ میری مدد نہیں کر سکتا۔

پھر اچانک مجھے اوتار سنگھ کے مولوی صاحب کا خیال آیا۔ میں نے سوچا، میں ان سے بات کروں گا اور سیکھوں گا۔ ابھی دو تین دن میں ہی وہ آنے والے ہیں۔ بس پھر یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میرے دل کو پورا سکون آجائے گا۔'

تو پتا جی تقریباً مسلمان ہو چکے تھے۔ عبدالحق نے دل میں سوچا۔ کاش پتا جی مسلمان ہو گئے ہوتے۔

وہ اگلے اندراج کی طرف متوجہ ہو گیا۔

'وہ لوگ بس آنے والے ہیں۔ آج نہیں تو کل ضرور آجائیں گے۔ ایسا انتظار میں نے کبھی نہیں کیا۔ میں اپنے پتر کی صورت دیکھنے کے لیے تڑپ رہا ہوں...... بے قرار ہو رہا ہوں۔ اور مجھے مولوی صاحب کا بھی بڑی شدت سے انتظار ہے۔ عجیب بات ہے۔ میں پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اپنے پتر سے ملنے کی خواہش زیادہ ہے یا مولوی صاحب سے ملنے کی۔ بیٹا تو مجھے جان سے بڑھ کر عزیز ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ اس وقت مولوی صاحب سے اکیلے میں ملنا اور ان سے بات کرنا مجھے زندگی کا سب سے اہم کام لگ رہا تھا۔

'آج میں نے پھر وہ سورۃ شروع سے آخر تک پڑھی، جس میں آسمان والی نشانی تھی۔ اس کی آخری عبارت نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ کتاب والے نے کہا...... کیا تم نے سوچا کہ اگر تمہارا پانی خشک ہو جائے تو کون ہے جو تمہارے لیے چشمے کا پانی لائے۔

'میں جانتا ہوں کہ پانی سے زندگی ہے۔ شاید اسی لیے زمین پر خشکی سے زیادہ پانی ہے۔ لوگ اس کی قدر نہیں سمجھتے۔ لیکن ہم صحرائی لوگ خوب جانتے ہیں۔ میں پڑھا لکھا ہوں، سائنس میں مجھے دلچسپی تھی۔ اس لیے کتاب والے کے پانی کے فلٹر پلانٹ کے بارے میں بھی جانتا ہوں۔

'یہ عبارت پڑھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ ایک دن ایسا ضرور آنا ہے، جب زمین پر پانی نہیں رہے گا۔ ویسے دیکھیں تو زمین پر پانی کی کمی نہیں۔ قطبین پر جو برف جمی ہے، وہ بہت زیادہ ہے۔ اتنی کہ پگھل جائے تو شاید ساری دنیا ڈوب جائے۔ میں سوچتا ہوں، شاید وہ کتاب والے نے ہنگامی صورت حال کے لیے ذخیرہ کر رکھا ہے۔

'میں سوچتا رہا کہ وہ بھی سوکھ جائے گا۔ اس پر سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ برسوں سے میرا مشاہدہ ہے کہ ہر آنے والے سال پچھلے سال سے زیادہ گرمی ہوتی ہے۔ اور سمندر اتنی بڑی چیز ہے کہ گرمی سے خشک نہیں ہو سکتا۔

'میں نے سوچا، حقیقت تو صرف کتاب والا جانتا ہے۔ مگر نجانے کیسے مجھے یقین ہو گیا کہ

آخر وقت ایسا میں ضرور ہوگا کہ بہت کثرت سے بھونچال آئیں گے' اور بہت شدید گرمی پڑے گی۔ اب بھونچال بہت شدید ہو تو زمین میں بڑی بڑی دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ اور سمندر بھی تو زمین پر ہی ہیں۔ اگر اس زمین پر بہت شدید بھونچال آئے' جس پر کوئی سمندر ہو' اور بڑی بڑی دراڑیں پڑیں' اور اگر کتاب والے کی مرضی ہو اور سمندروں کا پانی زمین میں اتر جائے تو پانی تو ختم ہو جائے گا نا۔ اور گرمی بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ کیونکہ میرے خیال میں سورج کی گرمی کو سمندر ہی کم کر کے قابل برداشت بناتا ہے۔ اور جب سمندر خشک ہوں گے تو گرمی بڑھے گی پھر وہ برف پگھلے گی اور کچھ عرصہ اس سے کام چلے گا۔ پھر شاید پانی کا وجود ہی نہیں رہے گا۔

'یہ سب سوچتے ہوئے مجھ پر لرزہ چڑھنے لگا۔ کتاب والے اللہ کا سوال میرے ذہن میں ابھر...... کون ہے جو تمہارے لیے چشمے کا پانی لائے؟ میں نے جان لیا' مان لیا کہ کوئی نہیں لا سکتا اس کے سوا۔ لوگ پانی کی تلاش میں کھدائی کریں گے تو بھی کھارا پانی ہی نکلے گا۔ جب سمندر ہی دھرتی میں اتر جائیں تو میٹھے پانی کا کیا کام۔

''یہ سب میرا قیاس تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں قیاس کرنے والا آدمی تو نہیں تھا۔ مگر پھر میری سمجھ میں آیا کہ قیاس سے پہلے میں نے غور کیا۔ پھر اپنی کم علمی کی وجہ سے قیاس کیا۔

'ایک بات طے ہوگئی۔ میں اللہ پر ایمان لے آیا ہوں۔ اور اس کی مہربانی ہے۔ اس نے مجھے بیٹا دیا تو ایسا کہ وہ مسلمانی کی حالت میں پیدا ہوا۔ پھر اس نے دودھ مسلمان عورت کا پیا۔ اس کے بعد میں نے خود دیکھا کہ وہ دہلی میں قرآن کو کیسا بے خود ہو کر سن رہا تھا۔ میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا...... بزرگ اور جیوتشی دونوں نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ اس کی مرضی چلے گی۔ تو شاید اللہ نے بیٹا دیتے ہی میرے لیے اس بھلائی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

'اب تو بس میں بے چینی سے اپنے پتر اور مولوی صاحب کے آنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ اور یہ کہنا مشکل ہے کہ کس کا انتظار زیادہ ہے......' اس کے بعد صرف دو اندراج تھے۔ عبدالحق نے ان میں سے پہلا اندراج بار بار پڑھا۔ وہ واقعی اس کے لیے بہت بڑی خوشی خبری تھی...... بہت بڑی' جیسے دل کی سب سے بڑی مراد اسے بن مانگے مل گئی ہو۔

اس نے بڑی حسرت سے سوچا' کاش میں ان لوگوں کے ساتھ ہی آ گیا ہوتا۔ کاش وہ سب کچھ میرے سامنے ہوا ہوتا۔ لیکن اس کی سمجھ میں آ گیا۔ ہر کام کا وقت اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔ اگر وہ آ گیا ہوتا تو کیا ہوتا۔ شاید وہ بھی مسلمان ہو جاتا۔ اور شاید شہید بھی۔ لیکن اللہ نے اس کے قبول اسلام کے لیے وقت اور مقام کچھ اور رکھا تھا۔ اور اسے زندہ بھی رہنا تھا۔ جو کچھ ہوا' اللہ کے حکم سے اس کے مقررہ وقت پر ہوا۔ اس میں حسرت کرنا بھی ناشکرا پن ہے۔ جبکہ یہ مقام شکر ہے۔

وہ اندراج اس کا دن کا تھا' جب مولوی صاحب گاؤں پہنچے تھے۔ وہ اکیلے ہی تھے۔ رکھو اور رنجنا ماسٹر جی کی بیماری کی وجہ سے نہیں آ سکے تھے۔ اللہ کو ان کی زندگی بھی منظور تھی۔ اندراج کے مطابق پتا جی مولوی صاحب کو اکیلا دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔ پھر مولوی صاحب نے انہیں ماسٹر جی کی علالت اور اس کے پروگرام کے بارے میں بتایا تو وہ تردد کے باوجود مطمئن ہو گئے۔ انہوں نے لکھا تھا...... شاید یہ اچھا ہی ہوا اب میں مولوی صاحب سے اکیلے میں بات کر سکوں گا۔ کون جانے' اوتار سنگھ موجود ہوتا تو میری راہ کی رکاوٹ بن جاتا۔ اب وہ آئے گا تو میں اسے سب کچھ بتا دوں گا۔

عبدالحق نے وہ پورا اندارج کئی بار پڑھا۔ اس تاسف کو مٹانے کی کہ وہ اس روز وہاں موجود نہیں تھا۔ یہ صورت اس کے پاس موجود تھی کہ وہ اپنے تصور میں وہ سب کچھ دیکھے اور سنے جو اس روز ہوا اور کہا گیا۔

اس نے آنکھیں موند لیں۔ تصور کے پردے پر فلم چلنے لگی۔ سماعت میں آوازیں گونجنے لگیں......

ٹھاکر پرتاپ سنگھ بہت بے تاب تھا۔ وہ ایسی بے تابی تھی کہ اس رات وہ وصال دین کی پرخلوص موجودگی کو بھی قبول نہیں کر سکتا تھا۔ وصال دین آیا تو اس نے کہا۔ ''پتر وصال دین' ایک بات کہوں۔ برا تو نہیں مانو گے؟''

وصال دین نے گھبرا کر کہا۔ ''آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میں آپ کی کسی بات کا برا کیسے مان سکتا ہوں۔''

''تو پتر' آج مجھے ایک بہت ضروری کام کرنا ہے۔ آج تم چلے جاؤ۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' وصال دین نے کہا۔ پھر اسے کچھ خیال آیا تو وہ بولا۔ ''بھائی...... میرا مطلب ہے' چھوٹے ٹھاکر نہیں آئے۔''

نہیں پتر وہ میلا دیکھنے چلا گیا ہے۔ شاید کل آئے۔''

وصال دین کے چہرے پر ایک پل مایوسی کا تاثر ابھرا۔ مگر وہ فوراً ہی چلا گیا۔

رات کے کھانے کے بعد ٹھاکر مولوی صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ ''کون ہے؟ آ جاؤ۔'' مولوی صاحب نے پکارا وہ کمرے میں داخل ہوا۔ مولوی صاحب بستر پر دراز تھے۔ اسے دیکھا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ''آپ ٹھاکر جی......؟''

''مولوی صاحب' مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔'' ٹھاکر نے کہا۔

''تو آپ مجھے بلا لیتے۔''

''نہیں مولوی صاحب' کام تو مجھے ہے اس لیے مجھے ہی آپ کے پاس آنا تھا۔''

''آپ بیٹھیے نا۔ فرمائیے' میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لیے۔''

''میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں مولوی صاحب۔''

مولوی صاحب پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔

''میں آپ کے پاس مدد کے لیے آیا ہوں مولوی صاحب۔''

مولوی صاحب چونکے۔ ''کیا آپ کو پورا یقین ہے؟'' ان کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

ٹھاکر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اس فیصلے کی کوئی جذباتی وجہ ہے یا کوئی دنیاوی غرض؟''

ٹھاکر نے مولوی صاحب کو حیرت سے دیکھا۔ ان کے چہرے پر عجیب سا جلال تھا اور لہجے میں دبدبہ۔ ''جی نہیں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔''

''کچھ جانتے بھی ہیں آپ؟''

''زیادہ نہیں۔ بس اتنا ہے کہ میں نے قرآن میں ایسی واضح نشانیاں پڑھی ہیں' جنھیں کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ انہیں پڑھنے کے بعد کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔''

''مثلاً؟''

ٹھاکر نے انہیں سورۃ الملک کی اس آیات اور اپنے کھوج کے بارے میں بھی بتایا۔ پھر سورۃ الواقعہ کی آیات کے بارے میں بتایا۔ مولوی صاحب بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ ان کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔ ''میں تین دن سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ ان آیات کو پڑھنے کے بعد مجھ سے کسی طرح صبر نہیں ہو رہا تھا۔'' اس نے آخر میں کہا۔

''اور جو ایمان پر پیدا ہوئے' وہ اس کتاب کو کھول کر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کرتے۔ گھر میں خیر و برکت کے لیے طاق پر سجا کر رکھ دیتے ہیں' اور جب یاد آئے تو چوم کر' آنکھوں سے لگا کر دوبارہ وہیں رکھ دیتے ہیں۔'' مولوی صاحب نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''نہیں جانتے' نہیں سمجھتے بدنصیب کہ ایمان کے بعد ہر پل تجدید ایمان کی اور ایمان کو طاقت دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور قرآن اس کا واحد ذریعہ ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' ٹھاکر کے لہجے میں الجھن تھی۔

''کچھ نہیں۔ آپ پر اللہ نے رحمت فرمائی ہے۔ یہ بتائیں' آپ اللہ کو واحد اور احد مانتے ہیں۔ اس جیسا کوئی نہیں۔ نہ وہ کسی سے ہے اور نہ کوئی اس سے' اس نے سب کچھ پیدا کیا اور اسے کسی نے پیدا نہیں کیا۔ یہ پوری کائنات اس نے بنائی۔''

''جی مولوی صاحب' میں نے جان لیا اور مان لیا۔''

''اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے پیغمبر بھیجے اور صحیفے اتارے۔ ان سب پیغمبروں پر اور اس کی کتابوں پر ایمان ہے آپ کا۔''

''میں قرآن اور حضرت محمد ﷺ کے سوا کسی کے بارے میں نہیں جانتا۔ لیکن اللہ کا حکم ہے تو پہلے سے میں ان سب پر ایمان لاتا ہوں۔''

''سبحان اللہ' تب تو آپ پہلے ہی مسلم ہیں۔ اچھا' آپ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ نے انسان کو مخصوص عمر عطا فرمائی ہے۔ مقررہ وقت پر اسے مرجانا ہے۔''

''جی' مجھے یقین ہے اس پر۔''

''اور یہ کہ ایک مقررہ وقت پر' جس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں' یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ وہ امت کا دن ہوگا۔ اس دن آدم علیہ السلام سے لے کر آخر تک پیدا ہونے والے تمام انسان باره اٹھائے جائیں گے۔ اور اعمال کا حساب ہوگا اور جنت دوزخ کا فیصلہ ہوگا۔''

''اللہ فرماتا ہے تو میں بالکل مانتا ہوں۔''

مولوی صاحب مسکرائے۔ ''تو پڑھیے میرے ساتھ......''

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے کلمہ پڑھا۔ مولوی صاحب نے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا۔ ''مبارک ؤ اللہ نے آپ کو سیدھا راستہ دکھا دیا۔ آج سے آپ میرے' اور ہر مسلمان کے بھائی ہیں۔ مگر اب پ کو نام تبدیل کرنا ہوگا۔''

''آپ ہی بتائیں۔''

مولوی صاحب چند لمحے سوچتے رہے۔ ''اللہ نے خاص عنایت کی۔ اپنے کلام کے ذریعے راہ راست آپ کو ہدایت دی۔ میرے نزدیک تو عبداللہ سے بہتر آپ کا کوئی نام نہیں ہو سکتا۔''

''اس کا مطلب کیا ہے؟''

''اللہ کا بندہ۔''

''وہ تو میں ہوں۔'' ٹھاکر مسکرایا۔ ''بس اب میرا یہی نام ہے۔''

''آپ کو مبارک ہو۔''

ٹھاکر عبداللہ پریشان نظر آنے لگا۔ ''میں ایک بات سے پریشان ہوں مولوی صاحب۔ قیامت کے دن جب حساب کتاب ہوگا تو میرے پاس گناہ بہت زیادہ ہوں گے اور اچھے عمل بہت کم۔ دیکھیں نا' میں تو عمر کے آخری حصے میں ہوں۔ پوری عمر تو گمراہی میں گزری۔ اب وقت تھوڑا ہے میرے پاس۔ اس میں کیا کر سکتا ہوں۔''

مولوی صاحب مسکرائے۔ ''واقعی' اللہ نے آپ کو ایمان دیا ہے۔ فوراً ہی آخرت کی فکر کرنے لگے آپ...... مگر ابھی آپ اللہ کو نہیں جانتے۔ اس کی رحمت ایسی ہے کہ پوری کائنات پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کی مغفرت بہت وسیع ہے۔ وہ ایسا بخشنے والا ہے کہ بندے کے گناہوں کا ڈھیر ہمالیہ کے پہاڑ سے بھی اونچا ہو تو اسے معاف کر دے۔ اور وہ ایسا پاک کرنے والا ہے کہ بندے کی توبہ

قبول کرے تو اسے معصوم بچے کی طرح پاک صاف کر دے۔ آج جس لمحے آپ اس پر ایمان لائے۔ اس سے پہلے کے تمام گناہ معاف کرنے کا اس کا وعدہ ہے۔ آج آپ نوزائیدہ بچے کی طرح پاک اور معصوم ہو گئے۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" عبداللہ نے دھیرے سے کہا۔ لیکن وہ اب بھی متردد تھا۔ "پھر بھی مولوی صاحب، نیک عمل تو ضروری ہیں۔ آپ مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں، جو اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہو۔ پوری زندگی کی تلافی تو بہرحال نہیں ہو سکتی۔ مگر قیامت کے دن کم از کم میں خالی ہاتھ تو نہ ہوں۔"

مولوی صاحب نے کہا۔ "ایک عمل ایسا ہے جو کئی زندگیوں کے نیک اعمال پر بھاری ہو سکتا ہے۔ وہ ہے جہاد۔ جہاد اللہ سے اپنی جان کا سودا کرنا ہے۔ اس کی راہ میں جان و مال سے لڑنا ہے۔ اس میں موت آجائے تو شہادت کا رتبہ ملتا ہے۔ اور اس کا اجر بہت بڑا ہے۔"

"تو آپ گواہ رہیں مولوی صاحب، میں نے اللہ سے اپنی جان کا سودا کر لیا۔" ٹھاکر عبداللہ کے لہجے میں کامل یقین تھا۔

"اللہ مبارک کرے اور آپ کو استقامت عطا فرمائے۔"

"آپ مجھے نماز پڑھنا سکھائیں گے؟"

"جی...... میں صبح آپ کو نماز کے لیے اٹھا دوں گا۔"

"آپ کا شکریہ مولوی صاحب۔ میں نے آپ کو نیند کے وقت میں زحمت دی......"

"زحمت کیسی۔ یہ تو اللہ کی رحمت ہے۔" مولوی صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے تو آپ کے ذریعے اللہ نے بہت بڑی سعادت عطا فرمائی۔ شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا ہے۔"

عبدالحق چونکا۔ تصور کے پردے سے وہ منظر غائب ہو گیا، آوازیں معدوم ہو گئیں۔ باپ کی ڈائری اس کے سامنے تھی۔ وہ پڑھنے لگا......

آج پھر نیند نہیں آ رہی ہے۔ لیکن آج اس کی وجہ مختلف ہے۔ یہ نیند خوشی کی وجہ سے اڑی ہے۔ اتنا خوش تو بس میں اوتار سنگھ کی پیدائش پر ہوا تھا۔ اور اس رات بھی میں سو نہیں سکا تھا۔ آج میں بہت خوش ہوں۔

اور ایک خوشی بھی آج ملنے والی ہے۔ آج شاید اوتار سنگھ بھی آجائے۔ مگر اب میں کچھ پریشان ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ جب میں اسلام قبول کرنے کی خبر اسے سناؤں گا تو اس کا کیا ردعمل ہو گا۔ کیا پتا، وہ مجھ سے اختلاف کرے۔ کون جانے، وہ مجھے چھوڑ ہی دے۔ اور میں اس بڑھاپے میں منتوں مرادوں والے اکلوتے بیٹے سے محروم ہو جاؤں۔

'مگر ایک بات سے مجھے حوصلہ ہوتا ہے۔ اوتار سنگھ مجھے غیر معمولی حالات میں ملا تھا۔ اس کی پیدائش کے بعد جو واقعات پیش آئے، وہ بھی غیر معمولی تھے۔ بلکہ شاید یوں ہے کہ یہ ایمان کی

دولت بھی مجھے اس کی وجہ سے ملی ہے۔ اس کا رجحان تو شروع ہی سے اسلام کی طرف تھا۔ مسلمان عورت کا دودھ پینے کی ضد، پھر اس کا عربی سیکھنا۔ ارے...... مولوی صاحب بھی تو مجھے اسی کی وجہ سے ملے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ اس خبر سے ناراض نہیں، بلکہ خوش ہو گا۔ ہو سکتا ہے، وہ خود بھی مسلمان ہو جائے۔

'لیکن ایسا نہیں ہوا تو بھی کوئی بات نہیں۔ میں اللہ کی خاطر اس بیٹے کو بھی چھوڑ دوں گا، جو میرے لیے وجہ زندگی ہے۔ اور اسے چھوڑ دوں گا تو سانس لینے کے سوا سبھی کو چھوڑ دوں گا۔ میں کسی لمبے سفر پر نکل جاؤں گا، اور کہیں نہیں رکوں گا، کبھی نہیں رکوں گا۔

'مجھے لگتا ہے کہ اب نیند نہیں آئے گی۔ نماز کے لیے میں ہی مولوی صاحب کو جگاؤں گا۔ اور نماز کے بعد میں دعا کروں گا کہ اوتار سنگھ بھی مسلمان ہو جائے، عبدالحق کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بے شک وہ اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی، جو اس کے خواب و خیال میں نہیں تھی۔

خوشی اور شکر کے ان آنسوؤں کو نہ وہ روکنا چاہتا تھا اور نہ پونچھنا چاہتا تھا۔ یہ تو ناشکرا پن ہوتا۔ پھر آنسو رکے تو وہ ڈائری کے آخری اندراج کی طرف متوجہ ہوا۔

'آج میں وقت سے پہلے ڈائری لکھ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے پتر پر قربان ہونے کا وقت آگیا ہے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اس کے بعد میں کبھی ڈائری نہیں لکھ سکوں گا۔

'ابھی کچھ دیر پہلے کیدار ناتھ کے بتر دو مرتبہ مجھ سے ملنے آئے۔ وہ جے پور سے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے چھوٹے ٹھاکر کی جان کو خطرہ ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو انہوں نے وجہ بتائی۔ اور وہ وجہ سن کر میرا دل خوش ہو گیا۔ انہوں نے بتایا کہ اوتار سنگھ نے جے پور کے بڑے مندر کے تمام بت توڑ ڈالے ہیں۔ پہلے تو مجھے یقین نہیں آیا۔ لیکن ان کا کہنا تھا کہ اس میں کسی قسم کے شک و شبے کی گنجائش نہیں۔ تب میرا جی چاہا کہ میں ہنسوں بڑی مشکل سے میں اپنی مسکراہٹ دبا سکا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ ہم دونوں کو منزل ملنے والی ہے۔

"میں نے انہیں بتایا کہ اوتار سنگھ تو ابھی واپس ہی نہیں آیا۔ انہیں میری بات پر یقین نہیں آیا۔ مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جے پور سے بڑی تعداد میں مشتعل لوگ ٹھاکروں کی گڑھی پر حملہ کرنے آ رہے ہیں۔ میں نے کہا ہم ان سے مقابلے کی تیاری کریں گے اور لڑیں گے۔

'میں نے گاؤں کے تمام لوگوں کو بلوا لیا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہ میری آخری آزمائش ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ گاؤں والوں سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ انہیں بتا دوں گا کہ اوتار سنگھ پر کیا الزام ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے بعد بڑی تعداد میں لوگ میرا ساتھ چھوڑ دیں گے لیکن ضرورت پڑی تو میں تن تنہا لڑوں گا اور آخری سانس تک لڑوں گا۔

'اگر میں نے یہ فیصلہ نہ کیا ہوتا کہ اپنے مسلمان ہونے کی خبر سب سے پہلے اوتار سنگھ کو سناؤں گا' تو آج گاؤں والوں کے سامنے اعلان کر دیتا۔ مجھے خوشی ہے کہ رات میں نے اللہ سے اپنی جان کا سودا کیا اور اس سے اگلے دن ہی مجھے جہاد کا موقع دے دیا۔ اپنے دل کی بات میں جانتا ہوں۔ میں اپنے بیٹے کے دفاع کے لیے نہیں لڑوں گا۔ میں اللہ کی راہ میں لڑوں گا' اور جان دے دوں گا۔ بس میری دعا ہے کہ اللہ اس موت کو شہادت کا درجہ عطا فرمائے۔

'مجھے اس بات کا افسوس ہے۔ میں نے اپنے بارے میں جو سوچا تھا اور فیصلہ کیا تھا' اب مجھے اس بات پر عمل کرنے کی مہلت نہیں مل سکے گی۔ صرف اس لیے کہ اوتار سنگھ واپس نہیں آسکا۔ مگر ساتھ ہی مجھے دو باتوں کی وجہ سے اوتار سنگھ کے نہ آنے خوشی ہے ایک تو یہ کہ وہ آتا تو میری لڑائی میں ذاتی غرض شامل ہو جاتی۔ دوسرے یہ کہ اب میری نسل آگے بڑھ سکے گی۔ اور اللہ نے چاہا تو اوتار سنگھ بھی مسلمان ہو جائے گا اور جس سیدھے راستے پر اللہ نے مجھے ڈالا ہے' میری نسلیں اس پر آگے بڑھیں گی۔

'جس دن اوتار پیدا ہوا تھا' مجذوب نے مجھ سے ایک بات کہی تھی۔ آج وہ بات مجھے رہ رہ کر یاد آرہی ہے۔ مجذوب نے کہا تھا...... جان دے دینا اس کے لیے' پھر تیرا کھوٹا سکہ بھی اشرفی کے مول چل جائے گا۔ آج مجھے لگ رہا ہے کہ وہ بات پوری ہوگی۔ اور یہ تو میں جانتا ہوں کہ میرا کھوٹا سکہ اشرفی کے مول چل چکا ہے۔

'اب گاؤں کے لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ میں ڈائری بند کرتا ہوں۔'

اس کے بعد ڈائری کے صفحات سادہ تھے۔

عبدالحق ہاتھ میں ڈائری لیے دیر تک ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ ذہن میں خیالات کی ایسی یلغار تھی کہ وہ کچھ سوچنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان خیالات کو کیسے ترتیب دے اور کیسے مرتب انداز میں سوچے۔ دماغ اس وقت ایک ایسے بڑے گھر کی طرح تھا' جہاں سب کچھ بکھرا ہوا' کوئی ترتیب نہ ہو اور گھر کا مالک اسے سنوارنے کا ارادہ کرنے کے بعد اس بے ترتیبی کو دیکھ کر یہ سوچ رہا ہو کہ شروع کہاں سے کرے۔

اس بے بسی میں اسے نماز کا خیال آگیا۔ اسے تو شکر کے نفل پڑھنے تھے۔

❁......❁......❁

وہ یقیناً مبارک خبر تھی۔ کافی عرصے کے بعد اس نے وقت پر فجر کی نماز پڑھی تھی۔ اور وہ ایسا خوش تھا کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر ساری دنیا کو بتا دے۔ کم از کم اماں کو تو وہ یہ خبر سنانا چاہتا تھا لیکن اسے لگتا تھا کہ ابھی اسے ذاتی طور پر ایک بیٹے کی حیثیت سے اس پر سوچنا ہے۔

نماز کے بعد ذہن میں انتشار بھی پہلے جیسا نہیں تھا۔ وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ وہ سکون

سے سوچنا چاہتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ اسے اپنی یادوں کو کریدنا ہے۔ کچھ اہم باتیں ہیں' جو وقت پر نہیں سمجھ سکا تھا۔

اسے یاد آیا کہ وہ چھٹیوں میں گھر آیا تو ایک رات پتاجی کے کمرے میں گیا۔ وہ بیٹھے ڈائری میں کچھ لکھ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر انہوں نے قلم روکا اور ڈائری ایک طرف رکھ دی۔

تو پتاجی کا صراط مستقیم کا سفر اس سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔

پھر وہ رات' جب مٹی ہٹانے کے بعد حویلی برآمد ہوئی تھی' اور نور بانو نے پتاجی کی کتابوں اور ڈائریوں کو دیکھ کر حیرت سے کہا تھا کہ یہ سب تو دینی کتابیں ہیں۔ اور اس نے حیرت سے دیکھا تھا تو ان کتابوں میں اسے قرآن پاک کا ایک مترجم نسخہ بھی نظر آیا تھا۔

اور نور بانو نے براہ راست اس سے پوچھا تھا...... کیا آپ کے والد مسلمان تھے؟ اور اس نے بے خبری کا اظہار کیا تھا۔ اور اماں نے کہا تھا...... میں نے تو ان میں بہت ساری باتیں اچھے مسلمانوں والی دیکھی تھیں۔

اب وہ سوچ رہا تھا...... نور بانو نے ٹھیک کہا' وہ اپنے آپ میں گم رہنے والا' غافل اور بے خبر آدمی ہے۔ پتاجی کی کتابوں میں قرآن پاک کا ہونا ایسی غیر معمولی بات تھی کہ اسے اس معاملے میں تجسس کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اس نے تو اتنے طویل عرصے تک ان کتابوں کی خبر بھی نہیں لی۔ بلکہ وہ اسے یاد تک نہیں آئیں۔

خیر...... یہ اس غفلت کی سزا ہے کہ یہ خوشی موجود تھی اور وہ اتنے عرصے اس سے محروم رہا۔ یہ تو اللہ کی رحمت ہے کہ اسے یہ خوشی مل گئی۔ اور یہ سزا ہے کہ وہ عبداللہ کا بیٹا ہونے کے باوجود اپنے باپ کا نام ٹھاکر اوتار سنگھ لکھتا رہا۔

شرمندگی اور دکھ نے اسے بے حال کر دیا۔ اپنی بے پروائی اور خود پرستی میں گم ہو کر کیسی محرومی کمائی تھی اس نے۔

اب پچھتانے کا کیا حاصل۔ اس نے سوچا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ پتاجی سے آخری ملاقات بہت اہم تھی۔ اس اہمیت کا احساس تو اسے ہمیشہ رہا تھا۔ لیکن وہ کبھی اسے سمجھ نہیں پایا تھا۔ مگر اب جبکہ اس پر یہ بات کھل چکی تھی کہ پتاجی مسلمان ہو گئے تھے' تو شاید وہ بہت سی ایسی باتیں سمجھ سکتا تھا' جو پہلے نہیں سمجھ سکا تھا۔

پتاجی کے ساتھ گزرے ہوئے آخری لمحے آج بھی اسے تمام ترین جزئیات کے ساتھ یاد تھے۔ خون بہت زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ بلکہ وہ تو شاید اسی کے انتظار میں جی رہے تھے۔ ان میں بات کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ لیکن وہ اس سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتے تھے...... اور وہ انہوں نے ٹوٹے لفظوں میں کی تھیں۔

پتاجی نے کہا تھا کہ وہ بچیں گے نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کا سب کچھ اسی کا ہے۔ پھر لال آندھی کے آثار دیکھ کر انہوں نے اسے نکل جانے پر اصرار کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا' دیلی جا کر پڑھو۔

پھر انہوں نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا جے پور میں بت واقعی اس نے ہی توڑے تھے۔ اور وہ مرتے ہوئے باپ کو دکھ میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اعتراف کر لیا تھا لیکن اس کے لیے پتاجی کا ردِعمل حیرت انگیز تھا۔ وہ خفا نہیں ہوئے تھے' بلکہ خوش ہوئے تھے۔ اس وقت وہ اس کی وجہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ اتنے خوش ہوئے تھے کہ انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

اب وہ یہ بات سمجھ سکتا تھا۔ ڈائری نے بھید کھول دیا تھا۔ ایک نومسلم باپ کو پتا چلے کہ اس کے غیر مسلم بیٹے نے بت ڈھائے ہیں تو وہ کتنا خوش ہوگا۔ یہ بات وہ اب سمجھ سکتا تھا۔

پھر پتاجی نے کہا تھا کہ وہ اسے ایک بڑی بات بتانا چاہتے تھے لیکن اب ان کے پاس مہلت نہیں ہے۔ کل تک وہ اس بات پر متاسف تھا کہ وہ بڑی بات اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکے گی۔ لیکن آج ڈائری نے وہ بات بھی اسے بتا دی تھی۔ اور واقعی بڑی بات تھی۔ پتاجی اسے بتاتے کہ وہ اسلام قبول کر چکے ہیں۔ اور وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اگر اس کا ردِعمل منفی ہوا تو وہ اپنے عزیز از جان بیٹے کو اللہ کی خاطر چھوڑ کر چلے جائیں گے' اور تنہائی کی زندگی گزاریں گے۔ اگر انہیں موقع ملا ہوتا تو وہ اسے اس بات پر خوش دیکھ کر کتنے خوش ہوتے۔

پھر پتاجی نے ٹوٹتے لفظوں میں کہا تھا...... جلانا نہیں' دفن کرنا۔ اور اس نے سمجھا تھا کہ یہ بات انہوں نے چاچاجی اور رویرجی کے لیے کہی ہے۔ مگر اب وہ جانتا تھا کہ وہ اپنے لیے کہہ رہے ہیں۔

اس وقت وہ بہرحال نہیں سمجھ سکا تھا۔ آندھی نہ آتی اور اسے موقع ملتا تو وہ یقیناً ان کی چتا کو آگ دیتا...... ماسٹر جی کی طرح اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ لال آندھی اللہ کی رحمت تھی۔ اللہ نے اپنے ایمان لانے والے بندے کو دنیا میں بھی آگ میں جلنے کی رسوائی سے بچا لیا تھا' اور انشا اللہ قیامت کے دن بھی اسے آگ سے بچا لے گا۔ اللہ نے خود اپنے نومسلم بندے کی تدفین کا بندوبست کر دیا تھا۔

عبدالحق کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے آنسو پونچھ دیے۔ اب صرف آخری لمحہ بچا تھا' جو اہم ترین تھا۔ اس لمحے میں ان کے ہونٹ بے آواز ہل رہے تھے۔ وہ اس لمحے انہیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے ہونٹوں کی جنبش اسے جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ لیکن وہ اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

اس نے آنکھیں بند کیں' اور تصور میں وہ جیتا جاگتا منظر اس کے سامنے تھا۔ بے آواز ہلتے ہوئے وہ ہونٹ!

ایک خیال کے تحت وہ اٹھا اور سنگھار میز کے آئینے کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے

عکس پر نظریں جمائیں اور کلمہ پڑھا۔ اگلے ہی لمحے اس کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ اس نے کئی بار کلمہ پڑھا اور اپنے ہونٹوں کی جنبش کو ذہن نشیں کرتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کیں اور پتاجی کے آخری لمحے کا تصور کیا۔

شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ آخری معما بھی حل ہو گیا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ اس کے پتاجی نے مرتے وقت آخری کام یہ کیا تھا کہ کلمہ پڑھا تھا۔

اب ڈھکا چھپا کچھ نہیں تھا۔ سب کچھ کھلی کتاب کی طرح تھا۔ اس کے پتاجی مسلمان مرے تھے اور یہ بات صرف اس کے اپنے یقین کی نہیں تھی۔ دستاویزی ثبوت بھی موجود تھے۔ وہ پوری دنیا پر ثابت کر سکتا تھا۔

اس بار وہ رویا تو کھل کر رویا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ دکھ میں لپٹی ہوئی وہ خوب صورت خوشی اس کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھی۔

اور جب طوفان تھما تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ تمام کاغذات میں اپنی ولدیت درست لکھوائے گا۔ ڈائری کی موجودگی میں یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ بس اسے لاہور جا کر مسعود صاحب سے ملنا تھا۔

لیکن سب سے پہلے اسے یہ خوش خبری اماں کو اور پھر زبیر اور رابعہ کو سنانی تھی۔

❀......❀......❀
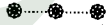
ٹھاکر عبدالحق کی ڈائری سے عبدالحق کو دہرا فائدہ ہوا تھا۔ ایک تو یہ کہ اسے بہت بڑی خوشی ملی تھی۔ دوسری نور بانو سے شادی کی خواہش کا تعلق کہیں پیچھے چلا گیا تھا۔ اس پر اپنی ولدیت درست کرنے کی دھن سوار ہو گئی تھی۔

چنانچہ وہ حمیدہ سے اجازت لے کر لاہور چلا گیا۔

لاہور میں بھی اسے ایک یہی کام نہیں تھا۔ اسے مسعود صاحب کا قرض بھی اتارنا تھا۔ دوسرے اس نے سوچا تھا کہ ایک کار بھی خریدنی ہے۔ اس سہولت کی اب اسے ضرورت تھی۔

مسعود صاحب واقعی اسے دل سے چاہتے تھے۔ وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ اب وہ کیمپ میں نہیں تھے۔ ملٹری اکناؤنٹ ڈویژن میں بہت اہم عہدے پر کام کر رہے تھے۔ ان کی وجہ سے عبدالحق کا کام بہت آسان ہو گیا۔ ٹھاکر عبداللہ کی ڈائری کے متعلقہ صفحات کی نقول تیار کی گئیں اور مسعود صاحب نے ان پر تصدیقی دستخط ثبت کر دیے۔ اس کے بعد تمام کاغذات دوبارہ تیار ہوئے۔ یوں عبدالحق کی ہر دستاویز پر اس کی ولدیت کے آگے عبداللہ کا نام لکھ دیا گیا۔

اب وہ عبدالحق ابن عبداللہ تھا!

اس کا قیام اس بار مسعود صاحب کے گھر پر تھا۔ ان کے اصرار کے سامنے اس کی ایک نہیں چلی تھی۔ لیکن دن میں وہ کیمپ ضرور جاتا تھا۔ اور کبھی وہ پرانے انداز لاہور کی سیر بھی ضرور کرتا تھا۔

ایک بار وہ افضال صاحب سے ملاقات کے لیے بھی گیا لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ ان کی ذہنی حالت اور بگڑ گئی تھی۔

اس شام مسعود صاحب نے اس سے کہا۔ ''لو بھئی' تمہارے تو سب کام ہو گئے۔''

''سب کہاں ہو گئے چچا جان۔'' اس نے کہا۔ یہ چچا جان بھی مسعود صاحب کا اصرار تھا۔ وہ کہتے تھے کہ سر میں بڑی اجنبیت ہے۔

''تو مجھے بتاؤ نا۔''

اس نے کار کے متعلق بات کی۔ اور اگلے دن اسے کار بھی مل گئی۔ ایک دن میں کاغذی کارروائی بھی مکمل ہو گئی۔

''اب مجھے ایک ڈرائیور بھی چاہیے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اس کی تم فکر ہی نہ کرو۔ میں نے پہلے ہی سے دیکھ رکھا ہے۔''

یوں عبدالحق کی ملاقات یعقوب سے ہوئی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے کام میں طاق تھا۔ بیس سال کسی بڑے انگریز افسر کی ڈرائیوری کر چکا تھا۔ ہر طرح کی گاڑی چلا سکتا تھا۔ اور سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ انگریزوں کا عاشق تھا۔ اس حد تک کہ اپنا نام وہ یعقوب کی جگہ جیکب بتاتا تھا۔

''اتنا اچھا نام ہے تمہارا' تو اسے بگاڑتے کیوں ہو؟'' عبدالحق نے اس سے کہا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے اس بات سے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ وہ خود تو نام کی اہمیت بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس کی دو پشتیں پرانے نام چھوڑ کر نئے اور اچھے ناموں کی طرف آئی تھیں۔

''یہ بگاڑ کہاں ہے سر جی۔ اردو میں یعقوب ہے تو انگریزی میں جیکب۔''

''اردو میں نہیں' عربی میں۔'' عبدالحق نے تصحیح کی۔ ''یہ نام تو قرآن میں آیا ہے' اور ایک بہت بڑے پیغمبر کا ہے۔ ایسے پیغمبر کا جن کی اولاد میں نبوت چلتی رہی۔ وہ اسرائیل تھے' اور ان کی نسبت سے بنی اسرائیل کہلاتے ہیں۔''

''تو سر جی' اس پیغمبر کو انگریزی میں جیکب کہتے ہیں۔''

''تمہارے لیے انگریزی عربی کے مقابلے میں قابل قبول ہے؟'' عبدالحق کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

یعقوب کو اس کے صدمے کا احساس ہوا تو دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگا۔ ''توبہ سر جی' میری توبہ۔ عربی تو سر جی اللہ اور رسول کی زبان ہے۔ پر مجھے آتی نہیں ہے نا۔''

''اور انگریزی آتی ہے تمہیں؟''

یعقوب نے سینہ پھلا لیا۔ ''بیس سال خدمت کی ہے گورے صاحب کی۔ پڑھے لکھوں سے

اچھی کٹ پٹ کر لیتا ہوں انگریزی میں۔''

عبدالحق کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس نے بوتل میں قید جن کو آزاد کر کے بڑی مصیبت مول لی ہے۔ اسے بہر حال دکھ ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''کچھ بھی ہو' میں تو تمہیں یعقوب ہی کہوں گا۔''

''مجھے برا نہیں لگے گا سر جی۔'' یعقوب نے گویا مروت سے کام لیا۔

اس نے واپس جانے کا ارادہ کیا تو مسعود صاحب بولے۔ ''ابھی تو تم سے ٹھیک سے بات بھی نہیں کر پایا ہوں میں۔ یہ بتاؤ لاہور آنے کا پروگرام کب کا ہے۔''

''وہ تو شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی ممکن ہوگا۔ یہ بتائیں' آپ نے میرے لیے کیا سوچا ہے؟''

''پہلے تو تم یونیورسٹی میں داخلہ لو گے' بی اے کرو گے۔ پھر مقابلے کے امتحان میں بیٹھو گے۔''

''اور کامیاب نہیں ہوا تو؟''

''مجھے یقین ہے کہ تم کامیاب ہو گے۔ خیر' یہ بعد کی بات ہے۔ یہ بتاؤ' اپنے بنگلے پر نہیں جاؤ گے۔''

''اب تو میں گھر جانے کو بے چین ہو رہا ہوں۔ چچا جان۔''

''دیکھتے تو دل خوش ہو جاتا تمہارا۔ میں نے مالی کا بندوبست کر دیا تھا۔ اب باغیچے کو دیکھو گے تو دیکھتے رہ جاؤ گے۔

''اگلی بار سہی۔''

''ایسا نہ کرو' شادی سے پہلے ایک بار سب لوگوں کو بنگلہ دکھانے کے لیے لے آؤ۔ اس میں ایک سہولت اور ہو گی۔ شادی کے معاملات اور ضروریات تم عورتوں سے زیادہ بہتر طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ خواتین یہاں خریداری بھی کر لیں گی۔''

یہ بات عبدالحق کے دل کو لگی۔ اس نے وعدہ کر لیا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

اصل میں وہ گاڑی کی وجہ سے زیادہ بے تاب ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اماں گاڑی میں بیٹھیں گی تو انہیں کتنی خوشی ہو گی۔ ان کے لیے تو وہ انوکھی بات ہو گی۔ اور نور بانو......!

کئی دن بعد اسے نور بانو کا خیال آیا تھا۔ اور خیال آیا تو اس کی بے تابی اور بڑھ گئی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اُڑ کر پہنچ جاتا۔ اپنی گاڑی میں بھی وہ سفر اسے لمبا لگ رہا تھا۔ اسے خیال نہیں آیا کہ گاڑی کی وجہ سے وہ کتنی زحمتوں سے بچ گیا ہے۔

گھر پہنچتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس بار تھکن بالکل نہیں ہوئی ہے۔ شاید ایسا گاڑی کی خوشی کی وجہ سے تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ گھر پہنچتے ہی اماں کو اور سب لوگوں کو سیر کے لیے لے کر نکلے گا۔

''لیکن وہاں تو نقشہ ہی کچھ اور تھا!

کبھی اللہ کی رحمت ہو تو خوشیاں بھی یوں پیہم اور مسلسل آتی ہیں کہ لگتا ہے' قطار لگائے کھڑی

ہے اور اب دروازے سے اندر آنے کو بے تاب ہو رہی ہیں۔

اس افراتفری میں وہ اماں سے یہ کیسے کہتا کہ وہ اس کے ساتھ چلیں۔ اماں تو مصلے پر بیٹھی دعا کر رہی تھیں۔

چند گھنٹے بعد حق نگر کی فضا میں پہلے نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز ابھری۔ حق نگر نام کے قصبے میں، اور پاکستان کے بعد اس علاقے میں وہ پہلی ولادت تھی۔

زبیر بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ عبدالحق کے پاس آیا۔ ''صاحب مبارک ہو۔ بیٹا ہوا ہے۔''

''اللہ کا شکر ہے۔ اللہ اسے سب کے لیے مبارک کرے۔'' عبدالحق نے دل کی گہرائی سے کہا۔

وہ اس کے لیے بہت بڑی خوشی تھی۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس کی پیدائش پر بتاجی کتنے خوش ہوئے ہوں گے۔ ''تم نے دیکھا اسے؟ کیسا ہے وہ؟ کس کی صورت ہے؟'' اس نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

''میں نے کہا دیکھا صاحب۔ میں کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ اسے سب سے پہلے آپ دیکھیں گے۔ اور آپ ہی اس کے کانوں میں اذان دیں گے۔ اور آپ ہی اس کا نام رکھیں گے۔ پہلے وہ آپ کا ہے، بعد میں ہمارا۔''

عبدالحق کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وفاداری کا یہ کیسا اٹوٹ رشتہ تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ محبت اور وفاداری مل کر کیسے دو آتشہ ہو جاتی ہیں۔

وہ زبیر کے ساتھ اس کے کمرے کی طرف گیا۔ حمیدہ، زرینہ اور نور بانو دروازے پر کھڑی تھیں۔ ''آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں اماں؟ اندر چلیں نا۔'' اس نے حمیدہ سے کہا۔

''نا پتر، پہلے تو اُس کے کان میں اذان دے پھر ہم اندر آئیں گے۔ اور اسے دیکھیں گے۔''

اور اس کے مسلسل اصرار کے باوجود حمیدہ نہ مانی تو وہ اندر چلا گیا۔ پہلے اس کی نظر رابعہ پر پڑی۔ وہ بے سدھ سو رہی تھی، جیسے کوئی شدید تھکن کے بعد سوتا ہے۔ اور اس کے چہرے پر سکون ہی نہیں، عجیب سا نور بھی تھا۔

اس نے سر گھما کر دیکھا۔ زبیر پیچھے کھڑا تھا۔ ''کیا بات ہے۔ آگے کیوں نہیں آتے تم؟'' اس نے کہا۔

''آپ اس کے کان میں اذان دیں تو میں آگے آؤں۔ میں اس سے پہلے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔''

عجیب محبت ہے، عجیب وفاداری ہے، عجیب منطق ہے۔ عبدالحق کچھ جھنجلایا۔ مگر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ اس نے رابعہ کے پہلو میں لیٹے ہوئے ننھے سے بچے کو دیکھا، جو ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔

''میں اسے کیسے اٹھاؤں۔ یہ تو اتنا سا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اتنا نازک سا ہے یہ۔''

''کوئی بات نہیں صاحب۔ اٹھائیں گے تو سیکھ جائیں گے۔ اچھا ہے، مشق ہو جائے گی۔'' زبیر بولا۔

عبدالحق شرما گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بڑی احتیاط سے کپڑے میں اچھی طرح لپٹے ہوئے بچے کو اٹھایا اور غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ ابھی یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کس سے ملتا ہے۔ وہ تو بڑے کچے نقوش تھے، جیسے گیلی مٹی سے بنے ہوئے برتن سوکھنے سے پہلے ہوتے ہیں۔

مولوی صاحب نے اسے بتایا تھا کہ بچے کے کانوں میں اذان کیسے دی جاتی ہے۔ اس نے بچے کے کان سے ہونٹ ملائے۔ اور دھیمی آواز میں اذان دینے لگا، انداز ایسا تھا کہ کوئی تلقین کر رہا ہو۔

پھر اس نے بچے کی پیشانی اور دونوں رخساروں کو چوما۔ اور زبیر کو پکارا۔ ''اب تو آ جاؤ زبیر بھائی۔''

زبیر آگے آیا تو اس نے بچے کو اس کی گود میں دیا۔ زبیر چند لمحے بچے کی صورت دیکھتا رہا، پھر اس کی آنکھوں سے خاموش آنسو بہنے لگے۔ ''الحمدللہ، میرا بچہ مسلمان ہے۔''

''الحمدللہ۔''

حمیدہ بھی دونوں لڑکیوں کے ساتھ اندر آ گئی تھی۔ وہ تینوں بچے کے ساتھ مصروف ہو گئیں۔ سب بہت خوش تھے۔

''اب آپ اس کا نام رکھ دیں صاحب۔''

''ابھی...... اسی وقت۔''

زبیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

عبدالحق سوچتا رہا۔ ایسے کیسے نام رکھا جا سکتا ہے۔ اس نے بے بسی سے سوچا۔ مگر اس لمحے اس کے ذہن میں ایک نام آ گیا۔ ''تو اس کا نام ساجد ہے...... ساجد زبیر۔ اور یہ انشاء اللہ اپنے رب کے حضور بہت سجدے کرنے والا ہو گا۔''

''یہ آپ کا مجھ پر ایک اور احسان ہے صاحب۔''

''اچھا اب چلو۔ مٹھائی کا بندوبست کرنا ہے۔ پورے علاقے میں مٹھائی تقسیم کریں گے ہم۔''

❁......❁......❁

خوشی کے ہر نئے کھلنے والے دروازے کے پیچھے ایک نئی خوشی کا دروازہ تھا۔ ننھا ساجد عبدالحق کے لیے حیران کن حد تک بہت بڑی خوشی تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے زندگی میں کبھی کوئی بچہ دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا بچہ تھا، اور اسے پہلی ہی نظر میں اس سے محبت ہو گئی تھی۔

وہ اس کے لیے خاص طور پر وقت نکالتا۔ اس کی نزاکت سے اسے بہت ڈر لگتا تھا۔ اس لیے وہ اسے گود میں تو نہیں اٹھاتا تھا۔ البتہ وہ تمام وقت بیٹھ کر اسے تکتا رہتا۔

تو یہ ہے نئی زندگی کا آغاز اللہ کا کرم۔ وہ سوچتا۔ اسے بیاجی کی ڈائری کے حوالے سے سورۃ الواقعہ کی آیت یاد آئی۔ تم نے اسے پیدا کیا ہے یا ہم ہیں پیدا کرنے والے۔

اور ساجد کے حوالے سے وہ پہلی بار پروردگار کا مفہوم سمجھ رہا تھا...... پالنے والا۔ پہلے پیدا کرنے والا اور پھر پالنے کی صفت بھی صرف اللہ کی ہے۔ وہ نہ پالے تو کوئی بچہ بڑا نہیں ہوسکتا۔

وہ اس ننھے سے بچے کو دیکھتا۔ اسے احساس ہوتا کہ یہ بچہ کتنا بے بس ہے۔ ہاتھ پاؤں چلانے رونے مسکراہٹ اور پیشاب پاخانہ کے سوا کچھ نہیں کرسکتا۔ کوئی تکلیف اپنی کوئی ضرورت بتا نہیں سکتا۔ پھر بھی اس کی سب ضرورتیں پوری ہوجاتی ہیں۔

ادھر اسے رابعہ پر بھی حیرت ہوئی تھی۔ وہ نجانے کیسے بچے کی ہر ضرورت سمجھ لیتی تھی۔

"یہ کیوں رو رہا ہے؟" وہ پوچھتا

"اسے بھوک لگی ہے۔" رابعہ کہتی۔ "میں ابھی اسے دودھ پلا کر لاتی ہوں صاحب۔"

پھر عبدالحق کو بچے کی طمانیت بھری آواز سنائی دیتی جس سے خوشی چھلک رہی ہوتی اور رونا موقوف ہوچکا ہوتا۔

عبدالحق نے سوچا شاید بچے صرف بھوک کے اظہار کے لیے روتے ہیں لیکن ایک دن اس کی یہ غلط فہمی دور ہوگئی۔ اس روز ننھا ساجد بلک بلک کر رو رہا تھا۔ "آپا...... اسے دودھ پلا دو نا۔"

رابعہ بچے کے پاس آئی۔ چند لمحے کے بعد اس نے کہا۔ "یہ بھوک کا رونا نہیں ہے صاحب۔ اسے کوئی تکلیف ہے۔"

عبدالحق یہ سن کر تڑپ گیا۔ "تو چلو ڈاکٹر صاحب کے پاس چلتے ہیں۔"

رابعہ ہنسنے لگی۔ "نہیں صاحب اسے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔" یہ کہہ کر وہ بچے کے جسم کے مختلف حصوں پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈال کر جیسے کچھ جانچنے لگی۔ پیٹ پر دباؤ پڑتے ہی بچہ خاموش ہوگیا۔ "پتا چل گیا صاحب اس کے پیٹ میں درد ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا؟"

"دیکھیں نا پیٹ پر دباؤ ڈالنے سے اسے آرام ملا اور یہ چپ ہوگیا۔"

"تو اب ڈاکٹر صاحب......"

"ارے نہیں صاحب ابھی اسے پھکی دوں گی اور یہ ٹھیک ہوجائے گا۔"

"تمہیں یہ سب کیسے پتا چل جاتا ہے آپا کہ یہ کب کس وجہ سے رو رہا ہے۔"

رابعہ شرما گئی۔ "یہ تو مجھے پتا نہیں بھائی۔ بس دل کو نجانے کیسے پتا چل جاتا ہے۔"

دل سب کچھ جانتا ہے۔ عبدالحق نے سوچا دل ہی تو حق شناس ہوتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ رجوع کرنے والا دل ہو۔ اور بچے کے معاملے میں ماں سے زیادہ سچا دل کس کا ہوسکتا ہے۔ اور اس کا دل رجوع کرنے والا نہ ہی ہو تو بھی اللہ اس پر حکومت آتا اتارتا ہے۔ کیونکہ وہ پروردگار ہے اور بچے کو پالنا اور بڑا کرنا اس نے اپنے ذمے لیا ہے۔

عبدالحق ساجد کو دیکھتا اور پھر اپنے بارے میں سوچتا۔ میں بھی ایسا ہی رہا ہوں گا۔ بے بس اور لاچار اپنی کوئی ضرورت پوری کرنا تو کیا اس کے بارے میں کسی کو بتانے کے قابل بھی نہیں ہوں گا۔ پھر میں بڑا ہوا۔ میں نے چلنا سیکھا۔ بولنا سیکھا۔ اللہ بہ تدریج مجھے طاقت عطا فرماتا رہا۔ میرا قد میرا جسم میرے تمام اعضا تناسب کے ساتھ بڑھاتا رہا۔ اب میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔ یہ کتنا بڑا کرم ہے اس کا۔

ساجد کا عقیقہ بھی بڑی دھوم دھام سے ہوا۔

اب عبدالحق کو ایک اور خوشی کا کھلا ہوا دروازہ نظر آرہا تھا۔ اب نور بانو سے اس کی شادی کچھ ہی دنوں کی بات تھی۔ یہ خیال آتے ہی نور بانو کے تصور کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے جڑ گیا۔ لیکن ساجد سے اس کا تعلق پھر بھی قائم رہا۔ وہ اس کے لیے خاص طور سے وقت نکالتا تھا۔ رابعہ بچے کو دودھ پلا کر اس کے کمرے میں لاتی اور اس کے پاس چھوڑ کر چلی جاتی۔ وہ بیٹھا بچے کو تکتا اور سوچتا رہتا۔ س کے حوالے سے زندگی کو اور اللہ کی عنایات کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا۔

وہ سوچتا کہ انسان اور درخت میں کتنی مماثلت ہے...... بلکہ فصلوں میں بھی۔ دونوں کا آغاز بج سے ہوتا ہے۔ پھر دونوں ننھے سے کلے کی طرح اگتے ہیں۔ ذرا سی ہوا غذا میں ذرا سی کمی سے رجھا جانے والے۔ ان کی نگہ داشت کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اور بے شک پالنے والا تو اللہ ہے۔ اس کی مرضی ہوگی تو کلا اور بچہ دونوں بڑے ہوں گے۔ کلا تناور درخت بن جائے گا اور بچہ جوان مرد۔ اللہ نے سسٹم بنایا نظام قائم کیا۔ نہ براہ راست درخت پیدا فرمایا اور نہ جوان مرد اور عورت۔ تو بے بسی کے اس عرصے میں نگہ داشت کے لیے اس منتظم اور مسبب الاسباب نے ماں اپ کو اور کسان کو یہ ذمہ داری سونپی۔ اور یہاں کیونکہ صرف فرض شناسی کافی نہیں تھی اس لیے نہیں اپنی جناب سے محبت سونپی۔ اللہ ودود ہے۔ محبت کا سرچشمہ اور منبع ہے۔ اس محبت کا بقدر ضرورت ایک حصہ اس نے ماں کو اور باپ کو اور کسان کو ودیعت فرمادیا۔

بہ قدر ضرورت!

تو سب سے زیادہ محبت ماں کو ملی۔ نرمی ہی نرمی گداز ہی گداز۔ کیونکہ ہمہ وقت اسے بچے کی نگہداشت اس کی ضرورتوں کا خیال رکھنا تھا۔ اس کی آغوش کی محبت بھری حدت سے بچے کو ندگی کی توانائی ملتی تھی۔ تو ماں بچے کے لیے صرف اور صرف محبت بن گئی۔ اور باپ کو اس کی مادی

ضرورتوں کے وسائل فراہم کرنا تھے۔ اس کو محبت بہت عملی نوعیت کی ملی' اور اس میں سختی بھی تھی۔ کیونکہ بچے کے بڑے ہونے پر تربیت اس کی ذمہ داری تھی۔ ماں کو تو صرف لاڈ پیار کرنا تھا۔ باپ کو تربیت بھی کرنی تھی' اور بچے کو سیدھے راستے پر چلانا بھی تھا۔

عبدالحق کو اپنے پتاجی کی محبت یاد آئی۔ اس نے سوچا' باپ کی محبت ماں کی محبت سے بہت تھوڑی ہی کم ہوتی ہوگی۔ فرق ضرورت کے مطابق بنیادی نوعیت کا تھا۔ ماتاجی اسے بہت لاڈ پیار کرتی تھیں' کھل کر محبت کا اظہار کرتی تھیں۔ جبکہ پتاجی محبت شدید کرتے تھے لیکن اظہار کم کرتے تھے۔ پھر ایک رات انہوں نے محبت کا اظہار کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ ماتاجی کے دیہانت کے بعد انہیں اس کے لیے ماں کی محبت بھی مل گئی تھی۔

یہ طے ہے کہ محبت اللہ کی صفت اور اللہ کا احسان ہے۔ وہ اپنی مخلوقات سے جتنی محبت کرتا ہے' اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ زمین پر ماں کی اولاد سے محبت اللہ کی محبت کا محض پرتو ہے۔

دہلی میں اردو کے استاد نے یہی بات کہی تھی۔ محبت کسی کی بھی ہو اور کسی سے بھی ہو' اللہ کی عطا ہوتی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ محبت کو ہر پل جانچنا چاہیے۔ کیونکہ محبت کا دھوکہ بہت عام ہے۔ بعض اوقات تو محبت کرنے والے کو بھی پتا نہیں ہوتا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے' محبت نہیں ہے۔ محبت بے غرض ہوتی ہے۔ اس کا مدعا صرف محبت کرنا ہوتا ہے...... غیر مشروط طور پر۔ بعض لوگ ہوس کو محبت کا نام دے کر رسوا کرتے ہیں۔ اور بعض لوگ نادانستگی میں ایسا کرتے ہیں۔

اور مولوی صاحب نے کہا تھا کہ شیطان کا خاص کام ہر اچھی چیز میں' ہر نیک عمل میں خرابی پیدا کرنا اور خلل ڈالنا ہوتا ہے۔ اور اس کے طریقے بے حد متنوع ہوتے ہیں۔ وہ عبادت میں بھی خلل ڈالتا ہے۔ کبھی عبادت کے دوران فاسد خیالات ذہن میں ڈال کر' اور کبھی عبادت کے غرور میں مبتلا کر کے۔ ایسا ہی محبت کے ساتھ ہے۔ وہ اللہ کی دی ہوئی محبت کو بھی خراب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آدمی کو روح سے جسم کی طرف لے جا کر' یہاں تک کہ محبت محبت نہیں رہتی' ہوس ہو جاتی ہے۔ انہوں نے صلاحیتوں کے سلسلے میں بھی مثالیں دی تھیں۔ اللہ نے کسی کو بہت اچھی آواز' بہت اچھا لحن دیا۔ شیطان اسے قرآن کی قرأت سے ہٹا کر گانے بجانے کی طرف لے گیا۔ کسی کو شہ زوری عطا فرمائی کہ وہ حق کی خاطر ظلم سے لڑے اور شیطان نے اسے بندگان خدا پر ظلم کرنے پر لگا دیا۔ کسی کو لکھنے کی صلاحیت دی کہ وہ اللہ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچائے' اور شیطان نے اسے فحاشی لکھنے پر لگا دیا۔

مولوی صاحب کہتے تھے کہ بندے کو ہر لمحے شیطان کی طرف سے چوکنا رہنا چاہیے' اور ہر پل خود سے باخبر رہنا چاہیے۔ بچانے والا تو اللہ ہے لیکن اللہ ان بندوں کی خاص طور پر حفاظت

فرماتا ہے' جو ہر وقت چوکنا رہیں۔

عبدالحق نور بانو کے لیے اپنی محبت کو بہت پہلے جانچ چکا تھا۔ وہ اللہ کی دی ہوئی سچی محبت تھی۔ اب اس میں جو تبدیلی آئی تھی' وہ اس کے نزدیک فطری تھی۔ لیکن وہ اس امکان کو رد نہیں کر سکتا تھا کہ شیطان اس میں دخل دے رہا ہے۔ شیطان تو اس کی نماز میں بھی خلل پیدا کر رہا تھا' اور وہ خلل بھی صرف نور بانو کے حوالے سے تھا۔

گویا نور بانو اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی!

یہ سوچتے ہوئے اس نے سکون کا سانس لیا۔ اب یہ مسئلہ حل ہونے ہی والا تھا۔ شادی ہی اس مسئلے کا حل تھی۔

مگر اسے مولوی صاحب کی ایک بات سے بہت ڈر لگتا تھا۔ انہوں نے کہا تھا' محبت اللہ کی عطا ہے اور ہوس شیطان کا فساد دونوں میں فرق کرنا کچھ دشوار نہیں۔ لیکن محبت کی طرف سے بھی محتاط رہنا چاہیے۔ جو محبت آدمی کو خدا کی یاد اور اس کے خوف سے غافل کر دے' وہ اچھی ہو ہی نہیں سکتی۔ ماں بھی اگر اولاد کو بغاوت کرتے دیکھے اور اسے اس سے نہ روک پائے تو اس پر ترک محبت لازم ہے۔ نہیں تو وہ اللہ کے آگے جواب دہ ہوگی۔ اللہ سے انکار کرنے پر تو سب رشتے ختم ہو جاتے ہیں۔ نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے کی' اور ابراہیم علیہ السلام اور ان کی والد کی مثال ہر وقت سامنے رکھی جائے۔ اور نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی بیویاں بھی مثال ہیں۔

عبدالحق جھرجھری لے کر رہ گیا!

❁......❁......❁

وہ ایک بہت بڑی تبدیلی تھی!

اچھو میاں کی بے معنی اور بے مصرف زندگی کو بالکل اچانک ایک مفہوم' ایک مقصد مل گیا تھا۔ وہ اسی پر سوچتے اور حیران ہوتے۔ پہلی بار انہیں اللہ کا اور اس کی رحمت کا ادراک ہوا تھا۔

ان کی زندگی میں اللہ کے نام کا کوئی خانہ کبھی نہیں رہا تھا۔ وہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئے۔ عیش میں پرورش ہوئی۔ زندگی محض ایک تفریح تھی۔ دوست کوئی نہیں تھا۔ مصاحب بے شمار تھے۔ تعریف اور خوشامد کے سوا ان کے کان میں کوئی بات نہیں پڑتی تھی۔ 16 سال کی عمر میں ماں اور باپ دونوں سے محروم ہو گئے۔ لیکن انہیں کسی کمی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ ہر خواہش پوری کرنے والی اور عزت کرانے والی دولت جوان کے پاس تھی۔ بلکہ اماں جان کی موت کے بعد تو وہ مادر پدر آزاد ہو گئے۔

دوست نما مصاحبوں نے انہیں تماش بینی کی لت لگا دی۔ صرف بارہ سال میں اپنی تمام دولت بازار میں جھونک کر وہ قلاش ہوئے۔ سب مصاحب ساتھ چھوڑ گئے۔ عزت نہیں رہی' اور وہ

نیلم بائی کے کوٹھے پر پڑے رہے۔

اب اس بات کو بھی بائیس سال۔ یعنی زندگی کے پچاس سال گزر گئے۔

مگر اب ان کی زندگی میں اللہ آ گیا۔ وہ سوچتے اور حیران ہوتے۔ کیسا سنگین جرم سرزد ہوا تھا ان سے۔ ان کے اس عمل میں کوئی مثبت پہلو نہیں تھا لیکن اس کے نتائج ششدر کر دینے والی حد تک مثبت نکلے تھے۔ اسی پر تو وہ اللہ کے قائل ہوئے تھے۔

وہ اپنے جرم کے نتائج سے ڈر کر بھاگے تھے' اور انہیں ایک ایسا ٹھکانا بھی مل گیا تھا' جہاں وہ پہلے کی نسبت ہزار گنا عزت کے ساتھ پوری زندگی گزار سکتے تھے۔ لیکن کوئی طاقت انہیں دوبارہ کوٹھے پر کھینچ لائی تھی۔ وہ اپنے جرم کی بدترین سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو کر آئے تھے لیکن وہاں انہیں ملا گیا' انعام...... اور بہت بڑا انعام!

نادرہ کی وہ پہلے ہی سے عزت کرتے تھے۔ لیکن ان کے اس جرم سے درگزر کر کے تو اس نے ان کا دل ہی جیت لیا تھا۔ وہیں سے انہیں اللہ کا خیال آیا تھا۔ اس مظلوم لڑکی کے درگزر سے انہوں نے اللہ کی مغفرت کو سمجھا تھا۔ انہوں نے سوچا' اگر انسان ...... اللہ کی مخلوق ایسے معاف کرنے والی ہے' تو اللہ کیسا معاف کرنے والا ہوگا۔ بلکہ پھر انہوں نے یہ بھی سمجھ لیا کہ نادرہ کا درگزر بھی اللہ کی رحمت کی وجہ سے ہے' اور اللہ کی مغفرت کا مظہر ہے۔

پھر جو اگلی صبح ہوا' اس کے بعد وہ جیسے نادرہ کے غلام ہو گئے۔ وہ بائیس برس سے کوٹھے پر تھے لیکن اپنے طور پر وہ آزاد تھے۔ غلامی انہوں نے قبول نہیں کی تھی۔ چاہے کوئی کچھ بھی سمجھے' انہوں نے اپنے اندر کی عزت اور وقار کو بچانے کے لیے بے غیرتی اور بے وقاری کی یہ زندگی اپنی مرضی سے قبول کی تھی۔ اور اپنے اندر کی اس عزت اور وقار کو بس وہی جانتے تھے۔ کوٹھے پر وہ غلامی انہوں نے اپنی مرضی سے قبول کی تھی۔ سو اپنے تئیں وہ آزاد تھے۔ جبھی تو وہ اس دن نیلم بائی کے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے تھے۔

مگر نادرہ نے انہیں خرید لیا تھا۔ اور اللہ نے انہیں اپنی رحمت اور مغفرت کا قائل کر لیا تھا۔

اس واقعے کے بعد وہ یہ بات کیسے نہ سمجھتے کہ عزت اور ندامت اللہ کے اختیار میں ہے' اور وہ جسے چاہے' دے دیتا ہے۔ ان جیسے ذلیل کو ایک ذلت ناک جرم کے بعد نہ صرف بے غیرتی سے بچایا تھا۔ بلکہ الٹا عزت عطا فرما دی تھی۔

سو انہوں نے بنیادی طور پر اللہ کی غلامی کا اعتراف کیا' اور نادرہ کے احسان کے صلے میں خود کو اس کا اور ارجمند کا سرپرست مقرر کیا تھا۔ محبت کی انہیں پہچان تھی۔ ماں باپ کے بعد پہلی بار انہیں محبت ملی تھی۔

آزادی کی نعمت کے ادراک کے بعد وہ قید آسان نہیں تھی۔ بار بار ان کا جی چاہتا کہ وہ بس

داتا دربار جائیں اور وہیں کے ہو رہیں لیکن زندگی میں پہلی بار کسی نے ان پر احسان کیا تھا۔ اور پہلی بار کسی کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ ساری عمر اپنی ذات کا مرکز وہ خود رہے تھے۔ بڑی خودغرض زندگی گزاری تھی انہوں نے۔ اب اس کا کفارہ ادا کرنا تھا۔ وہ نادرہ اور ارجمند کو یہاں چھوڑ کر کیسے نکل سکتے تھے۔

جب کوٹھے سے نکل بھاگنے کی خواہش زور کرتی تو وہ خود کو روکتے...... سوچتے کہ اگر اماں جان دو چار سال اور جی لیتیں تو ان کی شادی یقیناً کراتیں۔ اور شادی ہوتی اور اللہ نے انہیں بیٹی دی ہوتی تو وہ نادرہ جیسی ہوتی تو وہ اس بیٹی کو یہاں چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں۔

اس پر ان میں ایک امنگ پیدا ہوئی۔ وہ نادرہ اور ارجمند کو لے کر بھی تو یہاں سے جا سکتے ہیں۔ مگر سوال یہ تھا کہ لے کر جائیں گے کہاں؟ داتا دربار ان کے لیے تو ٹھیک تھا۔ لیکن بیٹیوں کو گھر کی چار دیواری ہی راس آتی ہے۔ پہلے ان کے لیے گھر کا بندوبست کرنا ہوگا۔ مگر کیسے؟ جواب تھا' محنت مزدوری کر کے۔

وہ اس کمرے کی طرف چلے گئے' جہاں نادرہ ارجمند کو قرآن پڑھا رہی تھی۔

نادرہ نے ان کی بات سنی اور ارجمند کو چھٹی دے دی۔ ''تم جا کر یہ دوہراؤ بیٹا' ہم نواب صاحب سے کچھ بات کر لیں۔''

ارجمند خاموشی سے دور جا بیٹھی اور پڑھنے لگی۔

''یہ آسان نہیں ہے نواب صاحب۔'' نادرہ نے ان سے کہا۔ اب اکیلے میں وہ انہیں نواب صاحب کہتی تھی۔ ''ایسا ہوتا تو میں جان پر کھیل کر بھی یہاں سے نکل جاتی۔ مرنا بھی میرے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے۔''

''تو رکاوٹ کیا ہے؟''

''دیکھیے نواب صاحب' میں تو تباہ ہو چکی۔ اس کا غم نہیں کہ تقدیر میں یہی لکھا تھا لیکن اللہ کی رحمت سے اگر میں ارجمند کو بچانے میں کامیاب ہو گئی تو میری بربادی کا ازالہ ہو جائے گا۔''

''تو اس کے لیے بھی یہاں سے نکلنا ضروری ہے۔''

''آپ سمجھ نہیں رہے ہیں نواب صاحب۔'' نادرہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''میں باہر سے اندر آئی ہوں تو باہر کی ایک جھلک دیکھ آئی ہوں۔ اور وہ بڑی ڈراؤنی تھی۔ میں اندازہ لگا سکتی ہوں کہ باہر کیا کچھ ہوتا ہے' اور کتنا کچھ ہو سکتا ہے۔''

''مگر جب تم اکیلی تھیں' اور اب میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''آپ مجھے ایک گھر دے سکتے ہیں۔ لیکن دوسروں سے عزت نہیں دلوا سکتے مجھے۔ میں تو رسوائی کا شکار ہوں۔ اس شہر میں کتنے لوگ ہوں گے جو اس کوٹھے کے حوالے سے مجھے جانتے

ہوں گے۔ وہ تو مجھے وہی درجہ دیں گے۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ دنیا کے لیے اب میں ہمیشہ ایک طوائف ہی رہوں گی۔ تو میرے ساتھ رہنے میں ارجمند کو کبھی عزت نہیں مل سکتی۔''

اچھو میاں کے لیے سوچ کے نئے دروازے کھل گئے۔ جو نادرہ کی صورت حال تھی' وہی ان کی بھی تھی۔ وہ محنت مزدوری کر کے عزت سے رہنا چاہیں' مگر اس شہر کے بے شمار لوگ ایسے ہیں' جن کے لیے وہ پان بیڑی سگریٹ' بلکہ شراب بھی لاتے رہے ہیں۔ وہ جب بھی اور جہاں بھی انہیں دیکھیں گے تو انہیں اسی مقام پر رکھیں گے۔ وہ کبھی ان کی عزت نہیں کریں گے۔

اچھو میاں کو کبھی عزت کی پروا نہیں رہی تھی۔ اب ہوئی تو ان پر یہ راز کھلا کہ بدن پر گندگی لگ جائے تو اسے دھویا' صاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ساکھ پر جو داغ لگ گیا' وہ عمر بھر کے لیے ہوتا ہے۔ اللہ معاف کر دیتا ہے لیکن اس کے بندے' کبھی معاف نہیں کرتے۔

انہیں احساس بھی ہوا کہ نادرہ ان سے زیادہ سمجھ دار' بلکہ عقل مند ہے۔

''اس کا مطلب ہے کہ ارجمند کے لیے ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔'' انہوں نے سب کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

نادرہ نے تاسف سے سر ہلا دیا۔ ''بظاہر تو ایسا ہی ہے لیکن میں اللہ سے ہر وقت دعا کرتی ہوں اس کے لیے۔''

''مگر کوئی امکان بھی ہے تمہارے سامنے۔''

''بس مجھے لگتا ہے کہ اللہ کے حکم سے کوئی رحمت کا فرشتہ آئے گا اور میں ارجمند کو اسے دے دوں گی۔ اس کے بعد میں یہ نہیں چاہوں گی کہ میرا یا میری بدنصیبی کا سایہ بھی اس پر پڑے۔''

''مگر تم تو یہاں اجنبی ہو۔ ہندوستان سے آئی ہو۔ یہاں تمہارا کوئی جاننے والا بھی نہیں۔''

''اللہ مسبب الاسباب ہے نواب صاحب۔'' نادرہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''میرا دل کچھ اچھا ہی ہوگا۔ مگر مجھے بوا سے بنا کر رکھنی چاہیے۔ اور آپ بھی ایسا کریں۔ بوا کو آپ کے اور ہمارے تعلق کی گہرائی کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔''

اچھو میاں نے سوچا' بات معقول ہے۔ اب وہ خیال رکھیں گے۔ ساتھ ہی انہیں ایک اور خیال آیا۔ وہ داتا دربار جائیں تو دھل کر پاک ہو کر کیوں نہ جائیں۔ ساتھ کچھ اچھا لے کر جائیں۔ انہوں نے نادرہ سے کہا۔ ''بیٹا' ایک احسان کرو گی مجھ پر۔''

نادرہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ پہلی بار انہوں نے اسے بیٹا کہا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ پردیس میں' اس کسمپرسی کے عالم میں اللہ نے اسے ایک رشتہ عطا فرمایا۔ پھر مایوس ہونے کی کیا بات ہے۔ وہ ضرور کرم کرے گا۔ ''بیٹی کہتے ہیں اور احسان کی بات کرتے ہیں۔'' اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''اب تو آپ حکم کریں۔''

''مجھے قرآن پڑھنا سکھا دو۔''

''یہ تو سعادت ہوگی میرے لیے۔ میں تو سوتی ہی فجر پڑھ کر ہوں۔ آپ صبح سویرے اٹھیں۔ میں آپ کو قرآن بھی پڑھاؤں گی۔ اور نماز بھی سکھاؤں گی۔ آپ تو باہر جا کر جماعت سے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ مجھے تو پانچوں نمازیں نصیب ہی نہیں ہوتیں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''لیکن بوا کو پتا نہ چلنے دیجیے گا۔''

اچھو میاں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ کوٹھے پر بالکل نئے معمولات کا آغاز تھا!

رابعہ کو چالیس دن ہو گئے تو اس کا نارمل زندگی کا آغاز ہو گیا۔ حمیدہ نے اسی دن عبدالحق کو بلایا۔ ''اب تمہاری اور نور بانو کی شادی کی تاریخ رکھنی ہے۔''

عبدالحق اندر سے خوش ہو گیا۔ ''جو تمہاری مرضی اماں۔''

''اور اس کے ایک ماہ بعد کی تاریخ ڈاکٹر صاحب کو دے دیں گے۔''

''ٹھیک ہے اماں لیکن میں اس سے پہلے تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔''

''تو دکھا دے پتر۔''

''ایسے نہیں۔ اس کے لیے ہمیں سفر کرنا ہوگا۔''

''کہاں جانا ہے۔''

''لاہور۔'' عبدالحق نے کہا۔ ''پر تم فکر نہ کرو اماں میں نے گاڑی بھی لے لی ہے۔''

حمیدہ کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ لیکن اس نے کہا۔ ''زبیر اور رابعہ بھی چلیں گے نا؟''

''ہاں اماں۔ کیوں نہیں۔''

''اور نور بانو......اور زرینہ؟''

''وہ بھی چلیں گی۔'' عبدالحق نے کہا۔ ''لاہور لے جانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ان کی شادی کے لیے جو کچھ خریدنا ہے' وہاں تمہاری مرضی سے خرید لیا جائے۔ اور وہ دونوں بھی خریداری میں شریک ہوں۔''

''بس تو تاریخ وہاں سے واپسی پر طے کریں گے۔'' حمیدہ نے فیصلہ سنایا۔

''ٹھیک ہے اماں۔'' عبدالحق نے کہا۔ وہ خوش تھا کہ نور بانو کے ساتھ ایک اور سفر کرنے کا موقع مل رہا ہے۔

پک اپ اس نے یہی سوچ کر خریدی تھی کہ پوری فیملی اس میں سفر کر سکتی تھی۔

پہلے تو گاڑی ہی حمیدہ کے لیے بہت بڑی خوش خبری تھی۔ بلکہ حمیدہ کیا' سبھی بہت خوش

ہوئے تھے۔ حمیدہ بار بار کہتی......اللہ! سفر اتنا آسان بھی ہو سکتا ہے۔

لیکن سفر بہر حال طویل تھا۔ حمیدہ کو تھکن ہوئی تو زرینہ درمیانی نشست سے پچھلی نشست پر زبیر اور رابعہ کے ساتھ جا بیٹھی اور حمیدہ نور بانو کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

راستے میں ایک جگہ رک کر انہوں نے کھانا کھایا، جو وہ لوگ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہوٹل کی چائے پی، اور کچھ دیر آرام کیا۔ پھر دوبارہ سفر شروع ہوا۔ اب ان کی منزل لاہور تھی۔

کھانے کے بعد عبدالحق نے حمیدہ کو مسعود صاحب کے اور ان کی عنایات کے بارے میں بتایا۔ ''میں انہیں چچا جان کہتا ہوں اماں۔'' اس نے کہا۔ ''اور یہ سمجھ لیجئے کہ وہ بھی ہمارے لیے گھر کے لوگوں جیسے ہیں۔''

''ٹھیک ہے پتر۔ اللہ اسی طرح لوگوں کو لوگوں سے ملاتا ہے۔'' حمیدہ نے کہا۔ ''پر تُو مجھے کچھ دکھانے کی بات کر رہا تھا۔''

عبدالحق مسکرایا۔ ''ایک تو یہی گاڑی تھی اماں! جس میں تم سفر کر رہی ہو۔ دوسری چیز لاہور میں ہے۔ وہ تم دیکھ لوگی۔''

''کچھ بتا تو سہی۔''

''بتانے میں وہ مزہ نہیں اماں! جو دیکھنے میں آئے گا۔ خود ہی دیکھ لینا۔''

لاہور میں عبدالحق کا جی چاہتا تھا کہ ان لوگوں کو سب سے پہلے اپنے بنگلے پر لے جائے۔ لیکن اس نے خود پر قابو رکھا۔ پہلے مسعود صاحب کے ہاں حاضری دینی ضروری تھی۔

اور مسعود صاحب کو پتا چلا کہ وہ سیدھے وہاں آئے ہیں تو ان کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔

''تم نے میرا مان بڑھا دیا بیٹے۔'' انہوں نے عبدالحق سے کہا۔ ''مجھے احساس ہے کہ تم ان لوگوں کو بنگلا دکھانے کے لیے بے تاب ہو رہے ہو گے۔''

''بنگلا کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا چچا جان۔ اور بنگلا خود کیا ہے، وہ تو آپ کے دم سے ہے۔''

مسعود صاحب نے محبت سے اسے لپٹا لیا۔

ذرا سی دیر میں سب لوگ گھل مل گئے۔ لگتا تھا کہ برسوں کی جان پہچان ہے۔ مسعود صاحب کی بیگم اور ان کے بچے بھی بہت خلیق تھے زرینہ سے تو وہ لوگ پہلے ہی سے واقف تھے۔

مسعود صاحب حمیدہ کو باجی کہہ رہے تھے۔

یہ لوگ شام کو پہنچے تھے۔ رات کا کھانا بہت پُر تکلف تھا۔ کھانے کے بعد عبدالحق نے مسعود [illegible] سے اجازت چاہی تو وہ بولے۔ ''نہیں بیٹے۔ رات تو تم یہیں قیام کرو۔ صبح ناشتے کے بعد چ[illegible]۔''

جو حکم آپ کا۔'' عبدالحق نے خوش ہو کر کہا۔

''میں تمہاری بے تابی کو سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ تاخیر بھی تمہاری بہتری کے لیے ہے۔''

اور اگلے روز وہ بہتری بھی عبدالحق کی سمجھ میں آ گئی۔ بنگلے پر تمام انتظامات مکمل تھے۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اور نوکروں نے بنگلے کو اچھی طرح سے جھاڑ پونچھ ڈالا تھا۔

''آج رات کا کھانا آپ لوگ ہمارے ساتھ کھائیں گے۔'' عبدالحق نے چپکے سے مسعود صاحب سے کہا۔

''یہ زیادتی ہو گی۔ ابھی بچوں کی تھکن پوری اتری نہیں ہے، اور تم ان پر یہ بوجھ لا د رہے ہو۔''

''رات کی نیند لے کر سب تازہ دم ہو چکے ہیں چچا جان۔'' عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اور اگر کچھ تھکن رہ بھی گئی ہے تو وہ آپ کا تحفہ دیکھ کر دور ہو جائے گی۔''

''یہ تو تمہاری محبت ہے کہ اپنی ملکیت کو میرا تحفہ کہہ رہے ہو۔''

''آئیے گا ضرور۔''

❁......❁......❁

عبدالحق نے گاڑی بنگلے کی سامنے رکوائی اور پلٹ کر پیچھے حمیدہ کو دیکھا۔ ''اس بنگلے کو دیکھیں اماں۔ کیسا لگ رہا ہے؟''

حمیدہ نے سر گھما کر جائزہ لیا۔ ''اسے بنگلہ کہتے ہیں پتر۔ یہ محل ہے محل۔''

''اگر یہ تمہیں مل جائے تو؟''

''میرے لیے تو محل اور جھونپڑی برابر ہے پتر۔ ہاں، یہ تجھے مل جائے تو بہت خوشی ہو گی مجھے۔''

''اندر سے چل کر دیکھیں اماں؟'' عبدالحق نے کہا۔ ''کیا پتا، اندر سے ایسا نہ ہو۔''

''پتا نہیں کس کا ہو۔''

''ارے نہیں اماں! ابھی تو یہ خالی پڑا ہے۔ مسعود صاحب کے ایک دوست کا ہے۔ ہم اندر جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ بولو اماں، دیکھنا ہے؟''

''دیکھ سکوں تو کیوں نہ دیکھوں۔'' حمیدہ کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

عبدالحق کے اشارے پر یعقوب نے ہارن دیا۔ چند لمحے بعد گیٹ کھول دیا گیا۔ گاڑی اندر پورچ کی طرف بڑھی۔ صادق گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ ''یہ شاید ہمیں روکنا چاہتا ہے پتر۔'' حمیدہ نے معصومیت سے کہا۔

''ابھی دیکھ لینا اماں۔''

اور گاڑی رکتے ہی صادق نے عبدالحق کو سلام کیا۔ عبدالحق نیچے اترا۔ ''سب ٹھیک ہے نا؟'' اس نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔

''بنگلا آئینے کی طرف چمکا دیا ہے صاحب۔ ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔''

یعقوب نے اتر کر دروازہ کھولا اور سب لوگ نیچے اتر آئے۔ صادق اپنے بیوی بچوں کو بلانے کے لیے سرونٹ کوارٹر کی طرف دوڑ گیا۔ عبدالحق حمیدہ کی طرف مڑا۔ "آؤ اندر چلیں اماں۔"

لیکن حمیدہ تو سحر زدہ سی لان کو دیکھ رہی تھی۔ اور ایک حمیدہ ہی کیا' سبھی لوگ لان کو مبہوت سے دیکھ رہے تھے۔ عبدالحق نے لان کی طرف دیکھا تو خود بھی دیکھتا ہی رہ گیا۔

لان کی تو شکل بدل ہی گئی تھی۔ ہر طرف لہلاتی ہوئی گھاس نظر آ رہی تھی۔ سلیقے سے بنی ہوئی کیاریوں میں رنگا رنگ پھول چھب دکھا رہے تھے۔ اور ایک مالی پائپ ہاتھ میں لیے پانی دے رہا تھا۔

صادق اپنی بیوی کے ساتھ آ گیا تھا۔ صادق نے آواز لگائی۔ "رمضان' ادھر آ جا۔ صاحب آئے ہیں۔"

رمضان نے پائپ رکھا اور ان کی طرف چلا آیا۔ "تم نے تو کمال کر دیا رمضان۔" عبدالحق نے اسے کہا۔ "اتنا خوبصورت بنا دیا ہے باغیچے کو۔"

"آپ کو اچھا لگا صاحب۔ میری محنت وصول ہوگئی۔ مگر صاحب اس میں میری خوشی بھی ہے۔ مجھے زمین سے اور پھولوں پودوں سے محبت ہے۔"

"ٹھیک ہے' تم جاؤ۔" عبدالحق نے اسے کہا۔ پھر وہ حمیدہ کی طرف مڑا۔ "اب اندر چلیں اماں۔"

"ارے...... یہاں تو جھولے بھی لگے ہیں...... اور اتنے اچھے۔" حمیدہ نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

عبدالحق کو جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ اسے بنگلا دکھانے کی بے تابی ہو رہی تھی' اور یہاں سب لان میں الجھے ہوئے تھے۔ "اماں' اب اندر چلیں۔" اس نے حمیدہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"ہم یہاں کچھ دیر نہیں بیٹھ سکتے پتر؟" حمیدہ نے کہا۔

"ہاں بھائی' ہمیں جھولا بھی جھولنا ہے۔" زرینہ بولی۔

"شام کو بیٹھیں گے لان میں۔ پھر جو جی چاہے کر لینا۔ ابھی تو دھوپ ہے یہاں۔" عبدالحق نے کہا اور چپکے سے نور بانو کی طرف دیکھا جو گم صم تھی' جیسے کسی سحر میں ہو۔

"شام کو ہم یہاں کہاں ہوں گے۔" حمیدہ نے حسرت سے کہا۔

"کیوں نہیں اماں۔ تم کہو تو ہم تین چار دن یہیں رک جائیں۔"

"نا پتر' کسی پرائے گھر میں مجھے نہیں رکنا۔ پرائے محل سے اپنی کٹیا بھلی۔"

"اچھا چلو' شام تک تو رک جانا۔ شام کو اس باغیچے میں بہت اچھا لگے گا۔ اب اندر چلو۔ بنگلا تو دیکھ لو۔"

کوئی بھی لان چھوڑ کر جانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ بس عبدالحق کے لحاظ میں وہ کھلے صدر دروازے سے بنگلے میں داخل ہوئے۔ تب انہیں پتا چلا کہ وہاں لان جیسی بے شمار حیرتیں ان کی منتظر ہیں۔

وہ حیرت سے ایک ایک کمرا دیکھتے پھرے۔ وہاں کی آرائش بھی ان کے لیے حیران کن تھی۔ ہر چیز خوب صورت' سب کچھ آرام دہ۔ اور کچن دیکھ کر تو رابعہ' زرینہ کی چیخیں نکل گئیں۔

"اتنا بڑا باورچی خانہ!" زرینہ چلائی۔ "پر یہ چولہے تو اوپر ہیں...... اور عجیب ہیں۔"

"لیکن اس طرح پکانے میں تھکن بھی نہیں ہوگی۔" نور بانو نے پُر خیال لہجے میں کہا۔

"پر یہ الماریاں کیسی ہیں؟" رابعہ نے سوال اٹھایا۔

"ان میں مسالے اور ساری چیزیں رکھی جاتی ہوں گی۔" نور بانو بولی۔

عبدالحق کو اس کی فراست پر خوشی ہوئی۔

ایک بیڈ روم دیکھتے ہوئے عبدالحق نے حمیدہ سے کہا۔ "اماں' یہ تمہارا کمرا ہو تو کیسا لگے؟"

"میرا اپنا کمرا بہت اچھا ہے پتر۔ میں کسی اور کی چیز پر کیوں نظر رکھوں۔"

عبدالحق نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ بس مسکرا دیا۔

حمیدہ نے کمرے سے ملحق باتھ روم دیکھا تو پوچھا۔ "یہ کمرے میں دوسرا کمرا کیسا ہے؟"

"یہ غسل خانہ ہے اماں...... اور سنڈاس۔"

حمیدہ نے ٹائل لگے اس کمرے کو حیرت سے دیکھا' اور بے یقینی سے بولی۔ "غسل خانہ...... اور سنڈاس۔"

"ہاں اماں!" عبدالحق نے اسے شاور کھول کر دکھایا۔ "بس اس کے نیچے کھڑے ہوئے اور نہا لیے۔ اور یہ ٹب ہے' اس میں پانی بھرا اور لیٹ گئے۔ ہے نا آرام ہی آرام۔ اور اماں' سردی ہو تو گرم پانی بھی آئے گا نل میں۔"

زندگی بھر کی تمام حیرتیں سمٹ کر حمیدہ کی آنکھوں میں آ گئی تھیں۔ "بہت خوبصورت ہے پتر۔ پر یہ تو بتا' اتنے صاف ستھرے غسل خانے میں سنڈاس کا کیا کام۔ اور سنڈاس ہے کہاں۔"

عبدالحق نے اسے کموڈ دکھایا۔ "یہ ہے' اس پر کرسی کی طرف بیٹھتے ہیں۔"

"پر اس کا فائدہ؟"

"جب تم بوڑھی ہوگی اماں' اور خدانخواستہ سنڈاس پر بیٹھتے ہوئے جھکنا مشکل ہوگا تو......"

"بوڑھی تو میں اب بھی ہوں پگلے۔ اور سنڈاس پر بیٹھتے ہوئے مجھے تکلیف بھی ہوتی ہے۔ ہڈیاں کڑکڑاتی ہیں میری۔" حمیدہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "پتر اتنے صاف ستھرے غسل خانے میں گندگی......"

"صفائی کا خیال رکھیں تو گندگی کیسے ہوگی۔ اب کوئی خیال نہ رکھے تو اور بات ہے۔" عبدالحق نے کموڈ کا ڈھکنا اٹھایا۔ "ایسے بیٹھتے ہوئے' اپنی ضرورت پوری کی' خود کو صاف کیا اور یہ بٹن دبا دیا۔" اس نے فلش کا بٹن دبایا۔ پریشر سے پانی آیا اور گندگی بہا کر لے گیا۔"

حمیدہ متاثر تو ہوئی۔ لیکن اسے اعتراض بھی تھا۔ ''آدمی جہاں سوتا ہو وہیں گندگی......''

''میں نے کہا نا اماں' صفائی کا خیال رکھا جائے تو گندگی ہوگی ہی نہیں۔''

''پتر بدبو تو ہوگی پتر۔''

''گندگی فوراً بہا دی جائے تو بدبو کیسی۔'' عبدالحق نے کہا۔ ''اور اس کے باوجود خوشبو دار جراثیم کش دواؤں سے اس کی دھلائی ہوتی ہے۔ اور پھر یہ اسپرے۔'' اس نے اسپرے کر کے دکھایا۔ باتھ روم میں بھینی بھینی خوشبو پھیل گئی۔

حمیدہ بہت متاثر ہوئی۔ ''تُو ٹھیک کہتا ہے پتر۔ پر میرے لیے تو یہ نیا اور عجیب ہی ہے۔''

''استعمال کرو گی تو دو دن میں ہی عادی ہو جاؤ گی۔''

''مجھے کون سا رہنا ہے یہاں۔''

عبدالحق پھر مسکرایا۔ باقی سب لوگ دلچسپی سے ان کی گفتگو سن رہے تھے۔

عبدالحق نے سرونٹ کوارٹر دکھائے۔ ''اچھے لوگ ہوں گے۔ نوکروں کا بھی خیال رکھا ہے۔'' حمیدہ نے تبصرہ کیا۔

عبدالحق آخر میں انہیں ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ ''اب بیٹھیں' کچھ دیر آرام کر لیں۔ کوئی لیٹنا چاہے تو بیڈروم میں چلا جائے۔''

حمیدہ صوفے پر بیٹھی تو حیران ہوئی۔ ''یہ کرسی تو پتر' لگتا ہے کہ مجھے ہڑپ کر رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہڑپ تو نہیں کرے گی۔'' عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''البتہ جھولا جھولنے کا احساس ہوگا۔ اچھا نہیں لگ رہا اماں؟''

''بہت اچھا لگ رہا ہے پتر۔''

''اب خوشخبری سن لو اماں۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ میں نے خریدا ہے۔''

وہاں سناٹا چھا گیا۔ وہ سب حیرت اور مسرت سے گنگ ہو گئے تھے۔

پھر سب سے پہلے اس خاموشی کو زرینہ نے توڑا۔ وہ اٹھ کر عبدالحق کے پاس آئی' اور اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے دونوں گھٹنوں کو تھام لیا۔ ''آپ کو بہت مبارک ہو بھائی۔ اللہ اس گھر کو آپ کے لیے آباد کرے اور اسے خوشیوں سے بھر دے۔''

وہ بولی تو جیسے سب کی زبان مل گئی۔ سب مبارکباد دے رہے تھے۔ بس نور بانو چپکے چپکے مسکرائے جا رہی تھی۔

عبدالحق نے کہا۔ ''آپ سب کو مبارک ہو۔ ارے بھئی یہ گھر آپ سب کا ہے۔''

❁......❁......❁

یہ جاننے کے بعد کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھے ہیں' وہاں ماحول ہی بدل گیا۔ نور بانو اور زرینہ لان میں جانے کو مچل رہی تھیں۔ اور تو اور' رابعہ بھی جھولے پر بیٹھنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔

''اب گھر تمہارا ہے تو صبر سے کام لو۔ باغیچے میں تو جب چاہو' جا سکتی ہو۔ پر پہلے کھانے کا کچھ کرو۔''

اور اس وقت کے کھانے کی تو کوئی بات نہیں۔ البتہ رات کے کھانے پر میں نے چچا جان کو بلایا ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

اور اسی وقت مسعود صاحب کا ڈرائیور ان لوگوں کے لیے کھانا لے کر آ گیا۔

کھانے کے بعد لوگ کچھ دیر کے لیے لان میں چلے گئے۔ حمیدہ کچھ دیر کے لیے لیٹ گئی۔ عبدالحق اس کے پاس رک گیا تھا۔

سب سے پہلے رابعہ جھولے پر بیٹھی۔ وہ جھولا بھی عجیب تھا۔ وہ تو ایک طرح کا گدے دار پلنگ تھا' جس کے تین طرف دیواریں تھیں۔ ''آئیں آپ نور بی بی' آپ بھی آ جائیں۔'' رابعہ نے پکارا۔

نور بانو کچھ جھجکی لیکن پھر جھولے پر جا بیٹھی۔ وہ تو بہت آرام دہ نشست تھی۔ کہاں وہ لکڑی کا تختہ اور کہاں یہ نرم و دبیز اُڑتا ہوا بستر۔ اس کا تو لطف ہی کچھ اور تھا۔

زرینہ پینگیں دے رہی تھی۔

نور بانو پچھلے تجربے سے اس تجربے کا موازنہ کر رہی تھی۔ وہاں کے مقابلے میں یہاں آسمان کی وسعت زیادہ تھی۔ اور ہر بار ایسا لگتا تھا کہ جھولے کی قوسی اُڑان اسے سرو کے درختوں کی طرف لے جا رہی ہے۔ ہر بار ایسا لگتا کہ وہ ہاتھ بڑھائے تو ان درختوں کو چھو سکتی ہے۔ حالانکہ درخت کافی دور تھے۔

پھر اسے احساس ہوا کہ یہاں سب کچھ اچھا ہے۔ لیکن کوئی کمی ہے۔ کچھ ایسا جو وہاں تھا' یہاں نہیں ہے۔ اگلے ہی لمحے اس کی سمجھ میں آ گیا کہ فرق صرف موسم کا ہے...... اندر کے موسم کا بھی اور باہر کے موسم کا بھی۔ اور شاید بارش ہو جائے تو اندر کی وہی کیفیت لوٹ آئے۔ وہاں تو افق پر اسے عبدالحق نظر آ رہا تھا' اور وہ اسے چھونے کے لیے لپک رہی تھی...... اور تیز...... اور تیز! اور یہاں سرو کے درخت تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں اتریں' تاکہ زرینہ بھی جھول لے لیکن زرینہ نے ایک منٹ بعد ہی جھولا رکوا دیا۔ پھر وہ نیچے اتر آئی۔

''کیا ہوا زرینہ؟''

''بھئی میرے لیے تو وہی تختے والا جھولا اچھا ہے۔'' زرینہ نے دوسرے دو جھولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا' جو عام جھولے تھے۔

"کیوں؟"

"اس کھٹولے کی وہ اڑان کہاں۔" زرینہ نے کہا۔ "وہ تو آسمان پر پہنچا دیتا ہے۔"

کچھ دیر بعد وہ واپس چلی آئیں۔ رات کے کھانے کی فکر جو کرنی تھی۔

رات کے کھانے کی ذمہ داری نور بانو نے قبول کی۔ کچن کی کیبنٹ کا جائزہ لیا گیا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی...... گوشت اور سبزی ترکاری کے سوا۔

"جو کچھ چاہیے، مجھے لکھ کر دے دیں۔" عبدالحق نے نور بانو سے کہا۔ "صادق یعقوب کے ساتھ جا کر لے آئے گا۔"

نور بانو نے فہرست تیار کر کے دے دی۔

رات کے کھانے پر نور بانو کی بڑی واہ واہ ہوئی۔ مسعود صاحب کی بیگم نے کہا۔ "ایسا کھانا ہم نے کبھی نہیں کھایا۔"

مسعود صاحب کی بچیاں نور بانو کے پیچھے پڑ گئیں کہ وہ انہیں ایسا ہی کھانا پکانا سکھائے۔

"اب چار دن میں تو یہ ممکن نہیں۔" نور بانو نے بے بسی سے کہا۔

"ان چار دنوں کے لیے کون کہہ رہا ہے۔" مسعود صاحب کی بڑی بیٹی رضوانہ نے کہا۔ "یہ تو خریداری میں ہی گزر جائیں گے۔"

"اور کیا۔ ہم تو بعد کی بات کر رہے ہیں۔ جب آپ یہاں رہنے کے لیے آ جائیں گی۔" چھوٹی بیٹی شاہانہ بولی۔

نور بانو کی سمجھ نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ بات سمجھ ہی نہیں آئی تھی۔ وہ خاموش ہی رہی۔

مسعود صاحب نے عبدالحق سے کہا۔ "لان میں چلو بھئی۔ مجھے تو چہل قدمی کرنی پڑے گی۔ کھانا حلق تک بھر لیا ہے۔ تھا ہی اتنے مزے کا۔"

"چلیے۔"

وہ دونوں چلے گئے۔

حمیدہ نے بچیوں سے پوچھا۔ "نور بانو یہاں رہنے کے لیے آئے گی؟"

"آپ بھی آئیں گے۔" رضوانہ نے کہا۔ "عبدالحق بھائی نے آپ کو نہیں بتایا؟"

"کچھ بات تو کی تھی۔ میں سمجھ نہیں پائی۔"

باہر لان میں چہل قدمی کے دوران عبدالحق نے مسعود صاحب سے کہا۔ "اب اماں سے لاہور آنے کی بات آپ ہی کریں۔"

"ضرور کروں گا۔ غرض ہی میری ہے تو بات اور کون کرے گا۔"

"آپ کی غرض کیسی۔ بھلا تو میرا ہے؟"

"ملک اور قوم کی غرض میری غرض ہے۔ اور بیٹے، تم تو میرے لحاظ میں راضی ہوئے۔"

"ایسی تو بات نہیں چچا جان۔"

"نہیں بیٹے، میں جانتا ہوں اور سمجھتا ہوں۔ تم آزاد آدمی، ملازمت کی تمہیں کیا ضرورت ہے۔ دیکھو نا، نوکری تو نوکری ہے۔ اس میں جواب دہ بھی ہونا پڑتا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ میں تمہیں تمہارے مقام سے نیچے لا رہا ہوں۔ اور تم ایثار کرو گے...... اپنے ملک و قوم کی خاطر۔"

چہل قدمی کے بعد وہ لوگ اندر گئے۔ "اب چلنا نہیں ہے کیا؟" مسعود صاحب کی بیگم نے ان سے کہا۔

"چلتے ہیں۔ پہلے میں باجی سے بات کر لوں۔ کہاں ہیں وہ؟"

"اپنے کمرے میں۔ آیئے، میں لے چلوں آپ کو۔" زرینہ نے ان سے کہا۔

نور بانو کے ذہن میں پھر اندیشے سرسرانے لگے۔ اس نے رضوانہ اور شاہانہ کو غور سے دیکھا۔ وہ دونوں ہی بہت خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ اور اسے یہ معلوم تھا کہ لاہور میں قیام کے دوران عبدالحق ان لوگوں کے بہت قریب رہا ہے۔ بلکہ یہ بنگلہ بھی عبدالحق کے پیسے سے ضرور خریدا گیا تھا۔ مگر دلوایا مسعود صاحب نے ہی تھا۔ اور اب لاہور آ کر رہنے کی بات مسعود صاحب نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی عبدالحق میں دلچسپی لی ہو گی۔

تو اب کیا وہ اماں سے اپنی کسی بچی کے رشتے کی بات کریں گے؟

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ اسی پرانے انداز میں سوچ رہی ہے۔ اس نے اس سوچ کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی مگر خود کار سوچ پر کب کسی کا اختیار ہوتا ہے۔ اس نے دھیان تو ہٹا لیا لیکن وہ سوچ کسی کیل کی طرح اس کے دماغ میں چبھتی رہی۔

پھر اسے خیال آیا کہ اب ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو اس کے پاس اعتماد تھا۔ عبدالحق براہِ راست اس کے لیے اپنی محبت کا اعتراف کر چکا ہے...... اور وہ بھی عملی طور پر۔ دوسری طرف اماں اسے بہو بنانا چاہتی ہیں۔ مسعود صاحب نے ایسی کوئی بات کی بھی تو وہ انہیں کہہ دیں گی کہ عبدالحق کی شادی پہلے ہی سے طے ہے۔

پھر بھی وہ عبدالحق کو غور سے دیکھتی رہی، جو وہیں بیٹھا تھا۔ اسے اطمینان ہوا کہ عبدالحق ان میں سے کسی کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو اس کی طرف دیکھنے سے بھی گریزاں تھا۔

پھر اس نے دونوں لڑکیوں کو دیکھا۔ ان کے انداز میں بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اصولاً اس کے بعد اسے مطمئن ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن اسے دل میں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ مطمئن ہو جانا شاید اس کی فطرت میں ہی نہیں ہے۔

تھوڑی دیر بعد مسعود صاحب حمیدہ کے کمرے سے آئے تو بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

''چلیں بھئی۔'' انہوں نے اپنی بیگم سے کہا۔

سب لوگ اٹھ گئے۔ عبدالحق انہیں رخصت کرنے کے لیے باہر تک گیا۔ نور بانو حمیدہ کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ مسعود صاحب کا خوش خوش واپس آنا اس کے لیے باعثِ تشویش تھا۔

❁……❁……❁

حمیدہ نے حیرت سے نور بانو کی دیکھا۔ ''تو کیوں آ گئی دھیے؟ پورے دن کی تھکن ہے۔ اب سو جا کر۔''

''ایسی تھکن بھی نہیں ہے اماں۔ میں نے سوچا' آپ کی آنکھوں میں دوا ہی ڈال دوں' اور ٹانگیں بھی دبا دوں۔''

آنکھوں میں دوا ڈالنے کے بعد پاؤں دباتے ہوئے نور بانو نے اچانک پوچھا۔ ''مسعود صاحب آپ سے کیا بات کرنے آئے تھے اماں؟''

حمیدہ نے چونک کر غور سے اسے دیکھا۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''تو کیوں پریشان ہوتی ہے؟''

''نہیں اماں مجھے پریشانی تو کوئی نہیں۔''

''تو کبھی نہیں بدلے گی۔ کتنا سمجھایا تھا میں نے تجھے۔ دیکھ اچھے لوگوں کو اچھے لوگ ہی ملتے ہیں۔ سب غرض کے بندے نہیں ہوتے دنیا میں۔ اور یاد رکھ' اچھے لوگوں کے بارے میں بدگمانی کرنے سے آدمی کو آپ ہی نقصان ہوتا ہے۔ ہر بار تھوڑا سا برا ہو جاتا ہے وہ۔''

نور بانو روہانسی ہو گئی۔ ''میں نے تو کوئی بدگمانی نہیں کی اماں۔''

''جانے دے اس بات کو۔ میں سب سمجھتی ہوں۔'' حمیدہ کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''وہ سب عبدالحق کے سلسلے میں اجازت لینے آئے تھے۔ یہ ان کی بھی بڑائی ہے اور عبدالحق کی بھی۔ ورنہ مردوں کے معاملات میں عورتوں کا کیا دخل۔ اور میں تو دنیا کو سمجھتی بھی نہیں۔ بس اپنے عبدالحق سے پیار کرتی ہوں' اور اسے خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''کیسی اجازت اماں؟'' نور بانو نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھی۔

''عبدالحق نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ شادی کے بعد لاہور میں رہنا چاہتا ہے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''

''لیکن کیوں اماں؟''

''مسعود صاحب عبدالحق کو بڑا افسر بنانا چاہتے ہیں۔''

''تو یہ تو نوکری ہوئی اماں۔ انہیں کیا ضرورت ہے نوکری کی۔''

''میں نے بھی یہی کہا تھا۔ پر وہ بولے کہ یہاں پڑھے لکھے' سچے اور دیانت دار لوگوں کی کمی ہے۔ اور ملک اور قوم کی ایسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ اس میں قوم کا فائدہ ہے۔ ملک کی خدمت ہے۔ عبدالحق دوسروں کی فکر کرتا ہے' غیروں کے بھی کام آتا ہے۔ انہیں اس کی یہ خوبی اچھی لگی۔''

''لیکن اماں......''

حمیدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''دیکھ نور بانو' میں نے تمہیں پہلے ہی سمجھایا تھا۔ شک اور بدگمانی محبت کو خراب کر دیتے ہیں۔ تو ایسی ہی رہی تو خود بھی دکھی ہو گی اور عبدالحق کو بھی پریشان کرے گی۔ یاد رکھ' مرد آزاد ہوتے ہیں۔ ان کی آدھی زندگی گھر سے باہر گزرتی ہے۔ عورت اپنی محبت اور خدمت گزاری کو مرد کے پاؤں کی زنجیر بنا سکتی ہے۔ اور ایک بات بتاؤں تجھے۔ محبت کسی پر قبضہ کر کے بیٹھنے کا نام نہیں۔ محبت کو صرف دینے کی غرض ہوتی ہے۔ جواب میں کچھ مل جائے تو اسے احسان سمجھنا چاہیے' حق نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اب تجھے سب کچھ ملنے والا ہے۔ پر تو پھر بھی نہیں بدلی۔ یہ ناشکرا پن ہے۔ یہ گھر جس میں ہم بیٹھے ہیں' کتنا خوبصورت ہے۔ اور یہ تیرا گھر ہے۔ نہ تو خواب میں بھی سوچ سکتی تھی اس گھر کا اور نہ میں۔ تو اس پر شکر ادا کرنا چاہیے۔ تو الٹا ناشکرا پن کرتی ہے۔ یاد رکھ نور بانو' میں ماں بن کر تجھے سمجھاتی ہوں۔ میری یہ بات یاد رکھنا' آدمی جس چیز پر اللہ کا شکر ادا کرے' اللہ اسے بڑھاتا ہے۔ اور ناشکرا پن کرے تو جب چاہے' اس سے محروم کر دیتا ہے......''

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی......

❁……❁……❁

مسعود صاحب کو رخصت کر کے عبدالحق لان میں سنگِ مرمر کی بنچ پر جا بیٹھا۔ وہاں اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس گھر میں رہنے کا خیال ہی بہت خوش کن تھا۔ یہ تو اللہ کی طرف سے اسے بڑی نعمت ملی تھی۔

پھر وہ نور بانو سے اپنی شادی کے بارے میں سوچنے لگا' اور اس میں ایسا گم ہوا کہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ ایسے میں بالکل اچانک مینو کا خیال آ گیا۔ ارے...... آج تو مینو کو دانہ بھی نہیں دیا۔ وہ یہ سوچ کر اٹھا کہ ابھی شیڈ میں جا کر اس زیادتی کا ازالہ کرے گا۔ اور اٹھتے ہی اسے خیال آیا کہ وہ تو لاہور میں ہے...... مینو سے سینکڑوں میل دور!

وہ تڑپ گیا۔ معصوم اور بے زبان جانور اور وہ بھی وہ جسے آپ نے قربانی کے لیے پالا ہو' اس کے ساتھ زیادتی۔ یہ تو اللہ کو ناراض کرنے والی بات ہے۔

اور وہ لوگ یہاں کم از کم چار پانچ دن کے لیے آئے ہیں۔ تو کیا اتنے دن مینو بھوکا رہے گا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسے خود پر بہت شدید غصہ آیا۔ وہ یہ پروگرام بنا کر چلا اور مینو کا خیال بھی

نہیں آیا...... مینو جو اس کی طرف سے اللہ کے لیے تحفہ ہے۔ اس نے تو غیر ذمہ داری اور غفلت کی حد کر دی۔

وہ سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ اس کے سوا کوئی حل نہیں تھا کہ وہ اماں کو خریداری کے لیے رقم دے کر اسی وقت واپس چلا جائے۔ وہ تیز قدموں سے چلتا بنگلے میں داخل ہوا اور سیدھا اماں کے کمرے کی طرف گیا۔ اندر نور بانو بھی موجود تھی اور اماں کے پاؤں دبا رہی تھی اس نے دروازے پر دستک دی۔

❁.....❁.....❁

حمیدہ کو دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے نور بانو سے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''عبدالحق ہیں۔'' نور بانو نے دبی آواز میں کہا۔ پھر بلند آواز میں بولی۔ ''آ جائیے نا۔''

عبدالحق آیا اور حمیدہ کے پاس بیٹھ گیا۔ ''اماں! مجھے اسی وقت واپس جانا ہے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے۔'' حمیدہ کے بولنے سے پہلے ہی نور بانو بول اٹھی۔

''مجھے خود پر شرم آ رہی ہے۔ مجھے مینو کا خیال کیوں نہیں آیا۔''

یہ سن کر نور بانو سن ہو کر رہ گئی۔ لیکن حمیدہ اس بات کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس نے کہا۔ ''اتنے لوگ ہیں۔ زبیر کے جانوروں کا خیال رکھنے والے نوکر بھی ہیں وہاں۔ وہ مینو کا چار دن خیال نہیں رکھ سکتے۔''

''نہیں اماں۔ وہ میرے علاوہ کسی کے ہاتھ سے کچھ کھاتا ہی نہیں۔''

''تو اتنے دن جو تُو لاہور رہا تو کیا وہ بھوکا تھا۔'' حمیدہ نے تیز لہجے میں کہا۔

عبدالحق نے بے بسی سے نور بانو کی طرف دیکھا۔ ''وہ اماں مجھ سے مانوس ہو گیا تھا۔''

نور بانو نے دبے لہجے میں کہا۔ ''ورنہ واقعی' وہ کسی کے ہاتھ سے کچھ نہیں کھاتا تھا۔ چار دن تو وہ بھوکا رہا۔ اسے دیکھ کر رونا آ رہا تھا مجھے۔''

''پر تجھ سے کیسے مانوس ہو گیا؟''

اب اس بات کا جواب نور بانو کیا دیتی۔ ''پتا نہیں اماں۔ اللہ کا کرم تھا۔''

''ارے..... جانور ہے وہ۔ بھوک لگے گی تو کسی سے بھی مانوس ہو جائے گا۔''

''نہیں اماں۔ وہ مر جائے گا۔'' عبدالحق نے تڑپ کر کہا۔ ''مجھے ابھی جانا ہو گا۔''

''بس تو پھر ہم سب واپس چلیں گے۔'' حمیدہ نے فیصلہ سنایا۔

نور بانو اسی دوران خاموشی سے باہر نکل گئی تھی۔ ذرا سی دیر میں سب لوگ وہاں آ گئے۔

مسئلہ معلوم ہونے کے بعد رابعہ نے کہا۔ ''صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں اماں۔ مینو کچھ نہیں کھائے گا کسی کے ہاتھ سے۔ میں دیکھ چکی ہوں۔ وہ تو مرنے کے قریب ہو گیا تھا۔ پھر نور بی بی

نے پتا نہیں کیا جادو کر دیا۔''

وہاں جو بحث چھڑ گئی۔ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلنا تھا۔ وہ سب عبدالحق کے بغیر رکنے پر آمادہ نہیں تھے' سب واپس جانے کو تیار تھے' اور یہ عبدالحق کو گوارا نہیں تھا۔ اور اکیلے عبدالحق کا جانا ان میں سے کسی کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔

وہ بند گلی تھی!

پھر زرینہ کو ہی وہاں امکان کا روزن نظر آیا۔ ''ایک صورت ہے بھائی۔'' اس نے کہا۔

سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''آپ اپنے ڈرائیور کو بھیج کر مینو کو یہاں منگوا لیں۔''

''یعقوب مینو کے لیے اجنبی ہے۔ مینو اس کے قابو میں نہیں آئے گا۔''

روزن کھلتا ہے تو روشنی بھی ہوتی ہے۔ زبیر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''آپ فکر نہ کریں صاحب میں جاؤں گا یعقوب کے ساتھ۔ اور بس یہ گیا اور وہ آیا۔ آپ اب بالکل پریشان نہ ہوں۔''

عبدالحق نے احتجاج کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی ایک نہ چلی فیصلہ ہو چکا تھا۔

زبیر اسی وقت یعقوب کے ساتھ گاڑی میں حق نگر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اپنی گاڑی کی افادیت عبدالحق پر کھل گئی تھی۔

ننھا ساجد بھوک سے رویا تو رابعہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''تُو نے کہا تھا پتر کہ یہ بنگلہ کسی انگریز کا تھا' اور تُو نے سامان سمیت خریدا ہے؟'' حمیدہ نے عبدالحق سے پوچھا۔

''جی اماں۔''

''تو یہ چادریں' یہ کمبل..... میں تو نہیں اوڑھوں گی۔''

عبدالحق مسکرایا۔ ''یہ سب چچا جان نے خریدا ہے' بالکل نیا ہے۔ ایک دن انہوں نے اصرار کر کے اپنے گھر ہمیں اسی لیے ٹھہرایا تھا کہ یہ سب چیزیں مہیا کر دی جائیں۔ آپ بے فکری سے استعمال کریں اماں۔''

حمیدہ مطمئن ہو گئی۔ ''اب تم لوگ جا کر سو جاؤ۔ آدھی رات ہو گئی ہے۔''

وہ اٹھنے لگا تو زرینہ کو خیال آیا۔ ''ایک مسئلہ ہے بھائی۔ صبح حاجت کے وقت اماں کو پریشانی ہو گی۔''

حمیدہ اچھل پڑی۔ ''سچ ہے دھیے۔ مجھ سے تو نہیں بیٹھا جائے گا اس پر۔''

''ایسی کوئی بات نہیں اماں۔ یہ آسان بھی ہے اور آرام دہ بھی۔ میں ابھی اس کا طریقہ بتاتا ہوں آپ لوگوں کو۔''

عملی مظاہرے کے بعد حمیدہ خاصی مطمئن ہو گئی۔ پھر بھی عبدالحق نے زرینہ سے کہا۔ ''تم

صبح اماں کے پاس آجانا۔ کہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔ تم تو پوری طرح سمجھ گئی ہونا۔"

"جی بھائی۔"

اس دوران نور بانو کو یہ خیال ستاتا رہا کہ وہ پیچھے رہ گئی ہے۔ اس وقت تو ایسا لگ رہا ہے کہ وہ یہاں موجود ہی نہیں تھی۔ کاش اماں کی اس پریشانی کی فکر اس نے کر لی ہوتی۔

⊛......⊛......⊛

پانچ دن گزار کر وہ حق نگر واپس ہوئے۔ وہ دن ان سبھوں کے لیے یادگار تھے۔ مسعود صاحب کی بچیاں ہر روز آجاتی تھیں' اور حمیدہ رابعہ' نور بانو اور زرینہ ان کے ساتھ بازار چلی جاتی تھیں۔ بازار دیکھ کر حمیدہ کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ بہرحال انہوں نے شادیوں کے لیے ہر ضروری چیز خرید لی تھی۔

واپسی کے سفر میں زبیر ان کے ساتھ نہیں تھا۔ سامان اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ گاڑی میں گنجائش نہیں تھی۔ یہ طے پایا کہ زبیر سامان لے کر لاری کے ذریعے حق نگر پہنچے گا۔

لیکن گاڑی میں ایک مسافر بڑھ گیا تھا...... مینو۔ زبیر اگلے روز مینو کو لاہور لے کر آیا تھا تو مالک اور جانور کا ملن دیکھ کر سبھی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ عبدالحق نے تو اس صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ مینو کی بھوک پیاس اس کے لیے بوجھ تھی۔

مینو عبدالحق کو دیکھ کر ایسا بے قرار ہوا تھا کہ کبھی اس کے ہاتھ چاٹتا اور کبھی اس کو ہلکی سی ٹکر مارتا۔ اور عبدالحق کی آنکھوں میں نمی سوکھ نہیں پا رہی تھی۔

مینو کو اپنے ہاتھ سے کھلا کر عبدالحق کو قرار آیا تھا۔ اس کے بعد اس نے دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ مینو کے قیام کا بندوبست ایک خالی سرونٹ کوارٹر میں کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد سب کچھ نارمل ہو گیا تھا۔

⊛......⊛......⊛

اپنے گھر میں پہلی صبح حمیدہ کو لاہور کا بنگلا بڑی شدت سے یاد آیا!

وہ حاجت کے لیے گئی تو پہلی بار اسے پریشانی ہوئی۔ اس نے دل میں تسلیم کیا کہ کموڈ واقعی اس کے لیے بہت آرام دہ تھا۔ پہلی بار یہاں بیٹھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ بوڑھی ہو گئی ہے۔

اس رات کھانے کے بعد سب لوگ چلے گئے اور صرف عبدالحق رہ گیا تو اس نے شادی کی بات شروع کی۔ "دیکھو پتر! اب چار دن بعد رمضان کا مہینہ شروع ہو رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں' عید کے چوتھے دن تیری شادی ہو جائے۔"

عبدالحق خوش ہو گیا۔ "جو تمہاری مرضی اماں۔"

"اور بقر عید کی کوئی تاریخ ڈاکٹر صاحب کو دے دیتے ہیں زرینہ کے لیے۔"

"ٹھیک ہے اماں۔"

حمیدہ خاموش ہو گئی۔ عبدالحق نے کچھ محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے' لیکن جھجک رہی ہے۔ "کوئی بات ہے اماں؟" اس نے پوچھا۔

"ہے ایک بات پر شاید تجھے بری لگے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو اماں۔ تمہاری بات تو حکم ہے میرے لیے۔ برا لگنے کا کیا سوال۔"

"اس بات سے اور ڈر لگتا ہے۔ میں کچھ کہوں اور تُو اپنے دل کی مرضی کے خلاف اسے حکم بنا لے۔ یہ تو مجھے اچھا نہیں لگے گا۔"

"اچھا بتاؤ تو اماں۔" عبدالحق جھنجلانے لگا۔

"پہلے تُو ایک وعدہ کر۔ میری سنے گا ضرور۔ لیکن اپنے دل کی کرے گا۔"

"ٹھیک ہے اماں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔"

حمیدہ نے گہری سانس لی۔ "دیکھو پتر' نور بانو میرے لیے بیٹیوں جیسی ہے۔ میں نے ہی اسے تیرے لیے پسند بھی کیا تھا۔ مجھے وہ اپنی بیٹی جیسی لگتی ہے۔ مجھے تو اللہ نے بیٹی دی نہیں۔ مگر میں اس سے اسی طرح پیار کرتی ہوں۔"

عبدالحق کو اس تمہید سے خوف آنے لگا۔ ضرور کوئی ایسی ویسی بات ہے۔

"پتر تُو تو میرا اصلی بیٹا ہے...... میرا پتر۔ دودھ پلایا ہے تجھے میں نے۔ تجھ سے بڑھ کر تو میں کسی کو نہیں سمجھ سکتی۔ اور ہر ماں کا ارمان ہوتا ہے کہ اس کا بیٹا کامیاب رہے' خوش رہے۔ کبھی پریشان نہ ہو۔ اس کی زندگی میں کبھی دکھ نہ آئے۔ نور بانو میں ایک بڑی خرابی ہے۔ میں اسے سمجھاتی بھی رہتی ہوں اور دعا بھی کرتی ہوں کہ وہ دور ہو جائے۔"

"کچھ بتاؤ تو اماں۔"

"دیکھ پتر' آدمی کی زندگی میں عورت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اچھی بیوی آدمی کے لیے جنت کا راستہ ہموار کرتی ہے۔ اور بیوی بری ہو تو اپنے مرد کو جہنم کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ اس دنیا میں آدمی کی جنت بھی اس کا گھر ہے اور جہنم بھی۔"

مولوی صاحب نے بھی کچھ ایسی ہی بات کہی تھی۔ عبدالحق ویسے بھی اماں کی فراست کا قائل تھا۔ مگر یہ طویل ہوتی ہوئی تمہید اسے خوف زدہ کر رہی تھی۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کسی آزمائش میں نہ پڑ جائے۔ وہ نور بانو سے ایسی محبت کرتا تھا' جو زندگی کی محبت سے بھی بڑی ہوتی ہے اور اس سے جسمانی رابطے کے بعد تو وہ اس کی ذمہ داری بن گئی تھی۔

"نور بانو کی فطرت میں شک اور بدگمانی بہت ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ شکل و صورت میں خود کو کم سمجھتی ہے۔ اب پتر' شک اور بدگمانی کرنے والا خود بھی عذاب میں رہتا ہے اور دوسرے

کو بھی عذاب میں رکھتا ہے۔ پہلے میں سوچتی تھی کہ شاید تجھ سے شادی ہونے کا یقین نہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا بھی' اور یقین بھی دلا دیا کہ تیری شادی اسی سے ہوگی۔ میرا خیال تھا...... اور اس نے بھی کہا تھا کہ اب یہ چیز ختم ہو جائے گی۔ مگر وہ اب بھی ویسی ہے پتر۔ زرینہ آئی تو وہ زرینہ سے چڑنے لگی۔ اور ابھی اس نے ڈاکٹر صاحب کی بچیوں کے بارے میں بھی ایسا سوچا۔ اگر وہ ایسی ہی رہی تو پتر آگے تجھے ستائے گی۔''

عبدالحق کے دل کا بوجھ ہٹ گیا اور وہ ہلکا پھلکا ہو گیا۔ ''تم فکر نہ کرو اماں۔ یہ تو محبت کی وجہ سے ہے۔''

''نا پتر' محبت میں تو آدمی کا دل بڑا ہو جاتا ہے۔ تنگ نہیں ہوتا۔ محبت کسی پر قبضہ کرنا تھوڑی ہے۔''

''میری محبت ملے گی اسے تو یہ خرابی دور ہو جائے گی اماں۔ تم نے اچھا کیا کہ مجھے بتا دیا۔ اب میں خاص طور پر خیال رکھوں گا۔''

حمیدہ پہلے سے جانتی تھی کہ عبدالحق نور بانو سے اتنی محبت کرتا ہے کہ وہ اسے ہر حال میں قبول کر سکتا ہے۔ اب اللہ کرے کہ ہر حال میں خوش بھی رہے۔ بہر حال اس کے دل کا بوجھ ہٹ گیا۔ اس نے بیٹے کو خبردار کر دیا تھا۔ اپنا حق ادا کر دیا تھا۔ ''بس ایک بات تجھ سے اور پوچھنی ہے پتر۔'' اس نے کہا۔

''پوچھو اماں؟''

''سچ سچ بتانا۔''

''میں کبھی جھوٹ بولتا ہوں اماں؟''

''بولتا تو نہیں۔ پر نور بانو ہی کی خاطر بول چکا ہے۔ اس کے چاچا کی حقیقت تو نہیں بتائی نا اسے تُو نے۔ تو جھوٹ ہی بولا نا کہ وہ تجھے نہیں ملے۔'' عبدالحق شرمندہ ہو گیا۔

''وہ تو مجبوری تھی اماں۔ تم بھی سمجھ سکتی ہو۔''

''ہاں میں سمجھتی ہوں کہ تُو نور بانو کی خاطر جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ مجھ سے وعدہ کر کہ مجھے سچا جواب دے گا۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں اماں۔''

تجھے نور بانو کیسی لگتی ہے...... کتنی خوب صورت لگتی ہے؟''

عبدالحق نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کر کے نور بانو کا تصور کیا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنے شعور کی کامل سچائی کے ساتھ کہا۔ ''مجھے وہ بہت خوب صورت لگتی ہے اماں۔ ان سے خوب صورت دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔ کوئی ہو بھی نہیں سکتا۔''

''لیکن پتر' وہ خوب صورت بالکل نہیں ہے۔ اس کی تو صورت شکل بہت معمولی سی ہے۔''

''میں ایک بات بتاؤں اماں۔ میرا یقین کرو' میں نے بہت ...... بہت حسین لڑکیاں بھی دیکھی ہیں لیکن نور بانو ان سب سے کہیں زیادہ حسین ہے۔''

یہ کہہ کر عبدالحق نے غور سے حمیدہ کو دیکھا اسے امید تھی کہ اب اس کے چہرے پر اطمینان نظر آئے گا لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ وہ تو اور زیادہ فکرمند لگ رہی تھی۔

''یہ تو اچھی بات نہیں پتر۔ جس سے محبت کی جاتی ہے' اس کی خرابیوں کو تو سوچ سمجھ کر قبول کیا جاتا ہے۔ ذرا سوچ کہ صحرا کی ریت کو تُو دریا سمجھ کر اس سے محبت کرتا رہے۔ پر جب تو پانی پینا چاہے گا تو وہ پانی تو نہیں ہوگی نا۔ پھر مایوسی ہوگی نا۔ نور بانو تجھے ویسی ہی نظر آنی چاہیے' جیسی ہے۔''

''پتا نہیں اماں۔ شاید اللہ نے مجھے اس کے لیے نظر ہی ایسی دی ہے۔'' عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔

''اور کسی وقت نظر ٹھیک ہو گئی تو۔''

''تم بھی دعا کرو اماں' اور میں بھی دعا کروں گا کہ ایسا کبھی نہ ہو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسا ہوا' تب بھی میری محبت کم نہیں ہوگی۔ اماں' میں نے اسے دیکھ کر اس سے محبت نہیں کی تھی۔ میں نے تو اس کی آواز میں قرآن کی تلاوت سن کر اس سے محبت کی تھی' اور وہ بھی اس وقت جب میں ٹھاکر اوتار سنگھ تھا۔ اور اماں' اس کی تلاوت سن کر ہی تو میں ایمان لایا تھا۔ اس کی وجہ سے میں عبدالحق ہوں۔''

''نا پتر' ایسا نہیں کہتے۔ ایمان تو اللہ کے فضل سے ملتا ہے۔ سبب کوئی بھی ہو۔ تجھے تو اللہ پہلے ہی سے ایمان کے راستے پر چلا رہا تھا۔ ورنہ تُو ننھا سا بچہ جان پر کھیل کر میرے دودھ کے لیے ضد کیوں کرتا۔''

''پھر بھی اماں' وسیلے کی بھی تو اہمیت ہوتی ہے۔''

حمیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ بولی۔ ''تو اب جا پتر۔ میں تیرے لیے ہمیشہ دعا کروں گی۔''

❁......❁......❁

پنجرے میں آنے والے نئے پرندوں کو پنجرے سے مانوس ہونے میں بہت وقت لگتا ہے اور اس سے پہلے وہ رہائی کی بھرپور کوشش کرتے ہیں!

خانم بھی کوٹھے پر آنے والا نیا پنچھی تھی۔ نام تو اس کا فریدہ تھا۔ لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے اس کے نام سے پکارے۔ اس کا اصرار تھا کہ اسے خانم ہی کہا جائے۔ نرگس بننے والی نادرہ اس بات کو سمجھ سکتی تھی۔

خانم نے وہاں کسی کو دوست بنایا تو وہ نادرہ ہی تھی۔ جب بھی موقع ملتا تو وہ دونوں باتیں کرتیں۔ ارجمند کو بھی خانم بہت اچھی لگی تھی۔ وہ اکثر ان کے پاس بیٹھ کر ان کی باتیں سنتی۔

خانم بہت خوب صورت اور شیریں لہجے میں باتیں کرتی تھی۔ ''تم ہندوستانی تو نہیں لگتیں؟'' ایک دن نادرہ نے کہا۔

''نہیں۔ میں ایرانی ہوں۔'' خانم نے کہا۔

''تو یہاں کیسے آ گئیں؟''

''محبت لے آئی۔'' خانم نے گہری سانس لے کر کہا۔

نادرہ کو احساس ہوا کہ وہ بھی کوئی کہانی ہے۔ ''کیسے؟'' اس نے پوچھا۔

''آغا ہندوستانی تھے۔'' خانم نے کہا۔ ''وہ تجارت کے سلسلے میں اصفہان آئے تھے۔ وہاں میں نے انہیں دیکھا اور مجھے پہلی نظر میں ان سے محبت ہو گئی۔ میں نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔''

''پھر؟''

''میں اس وقت صرف 17 سال کی تھی اور اتنی خوب صورت تھی کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔''

''تصور کی کیا ضرورت ہے۔'' نادرہ نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''تم میرے سامنے ہو۔ اور اس وقت بھی ایسی حسین ہو کہ تم پر نظر ٹھہرتی ہی نہیں۔''

''نہیں' اُس وقت تو میں پری تھی' پری۔'' خانم نے سرد آہ بھر کے کہا۔ ''آغا مجھے رد نہیں کر سکتے تھے لیکن بھلے آدمی تھے۔ بولے...... تمہارا میرا کیا جوڑ۔ تم سے تو بڑے میرے بچے ہیں۔ میں تم پر ظلم نہیں کر سکتا۔ مگر میں تو محبت میں اندھی ہو رہی تھی۔ سمجھ نہیں سکی کہ میں واقعی اپنے ساتھ ظلم کر رہی ہوں۔ میں تو ان کے پیچھے پڑ گئی کہ ان سے شادی کروں گی یا جان دے دوں گی......''

''تم سے بڑے بچے تھے ان کے!'' نادرہ نے حیرت سے کہا۔ ''تو ان کی عمر کیا ہو گی۔''

''ساٹھ کے لگ بھگ تھے۔''

''تو تمہیں ان سے محبت کیسے ہو گئی!''

''محبت کا عمر سے' مذہب سے' ذات پات سے اور طبقے سے کیا تصادم۔ محبت تو کسی کو بھی کسی سے بھی وقت ہو سکتی ہے۔ اور یہ تو انہوں نے ہی بتایا تھا کہ وہ ساٹھ سال کے ہیں۔ ورنہ وہ لگتے تو جوان تھے۔ اور اتنے وجیہہ کہ ان جیسا کوئی میں نے آج تک نہیں دیکھا مگر محبت کے لیے وجاہت کی بھی شرط نہیں۔ بس ہو گئی تو ہو گئی۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔'' نادرہ نے آہ بھر کے کہا' اور دل میں سوچا محبت تو اسے بھی ہو گئی تھی اوتار سنگھ سے۔ ''خیر...... پھر کیا ہوا؟''

''اب آغا میرے حسن کے سامنے ٹک تو نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے شادی کر لی اور مجھے اپنے ساتھ الہ آباد لے گئے۔ تب میں نے دیکھا کہ واقعی ان کا سب سے چھوٹا بیٹا بھی مجھ سے بڑا تھا۔''

''ان کی بیوی بچوں نے تمہیں قبول کر لیا؟''

''نہیں۔ مگر مجھے کوئی پروا نہیں تھی۔ آغا کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے الگ گھر لے کر دیا۔ بڑی عزت اور آسائش کے ساتھ رکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ مجھ پر جان دیتے تھے۔''

''پھر ہوا کیا؟''

اس کے بعد وہ عام سی کہانی تھی۔ پانچ سال بعد آغا چل بسے۔ ان کا بڑا بیٹا خانم کے پاس آیا۔ اس نے خانم سے کہا کہ وہ اس کے حصے کا ترکہ دے کر اسے کسی کے ساتھ اصفہان واپس بھیج رہا ہے۔ اور اس کا لہجہ ایسا فیصلہ کن تھا کہ خانم کچھ بھی نہ کر سکی۔

بعد میں پتا چلا کہ سب دھوکہ تھا۔ وہ شخص بردہ فروش تھا۔ اس نے خانم سے سب کچھ چھین لیا۔ شاید وہ سب کچھ آغا کے بیٹے سے پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ پھر اس نے خانم کو بیچ دیا۔ اور وہ لاہور آ گئی۔

نیلم بائی کے پاس آنے سے پہلے وہ ایک اور کوٹھے پر تھی۔ وہ ہمیشہ فرار ہونے کی کوشش کرتی تھی۔ اسی لیے نائیکہ نے اسے نیلم بائی کے پاس فروخت کر کے اپنی جان چھڑا لی۔ ''تم دیکھنا' میں یہاں سے بھاگ جاؤں گی۔ میں رکنے والی نہیں۔''

''مگر جاؤ گی کہاں؟''

''کہیں بھی۔ دنیا بہت بڑی ہے۔''

نادرہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں۔ دنیا بہت چھوٹی ہے۔ اس سے زیادہ لٹو گی تم' اور کہیں پناہ بھی نہیں ملے گی۔ ٹھکانا بھی میسر نہیں ہو گا۔''

''تم مجھے پڑھا رہی ہو۔ تم تو مجھ سے چھوٹی ہو۔''

''لیکن بہت کچھ دیکھ چکی ہوں۔ سنو خانم' ہمیں دنیا میں کہیں عزت نہیں مل سکتی۔ ہم جس گھر میں بھی جائیں گے' وہ ہمارے لیے کوٹھا ہی بن جائے گا۔ پامال ہونا تو ہمارا مقصد ہے۔ سو کوٹھوں پر پامال ہونے سے بہتر ہے کہ ایک کوٹھے پر ہزار بار پامال ہو جائیں۔''

''یہ تمہارا نظریہ ہے۔ میرے حلق سے نہیں اترے گا۔'' خانم نے بے پروائی سے کہا۔

''باہر تمہارے حق میں ہر شخص شکاری ہو گا۔''

''دیکھا جائے گا۔''

''آپ انہیں آغا کیوں کہتی تھیں؟'' ارجمند نے اچانک ہی خانم سے پوچھ لیا۔

نادرہ بری طرح چونکی۔ ''ارے گڑیا' تم یہاں کیوں بیٹھی ہو۔''

ارجمند نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ”بتایئے نا۔“ اس نے خانم سے کہا۔

”آقا سمجھتی ہو نا؟“ خانم نے اس سے پوچھا۔

”جی...... مالک کو کہتے ہیں۔“ ارجمند نے کہا۔

”تو فارسی میں آقا کو آغا کہتے ہیں۔“

خانم نے فرار ہونے کا خیال ترک نہیں کیا تھا۔ اور نادرہ اس کی واحد رازدار تھی۔ اس نے ایسے وقت میں فیصلہ کیا‘ جب نیلم بائی اور لڑکیاں سو رہی ہوں۔ اور وہ خالی ہاتھ بھی فرار ہونا نہیں چاہتی تھی۔

نادرہ کے لیے وہ بڑی عجیب کشمکش تھی۔ خانم کسی طرح اس کی بات سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ باہر کی زندگی اس کوٹھے کی زندگی سے ہزاروں گنا بھیانک ہوگی۔

بالآخر اس نے نیلم بائی کو سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

”تو تم میری ایسی وفادار ہو؟“ سب کچھ سننے کے بعد نیلم بائی نے نادرہ سے پوچھا۔

”جی نہیں۔ میں نے تو خانم کی بہتری کے خیال سے آپ کو مطلع کیا ہے۔“

مجھے تمہارا سچ بھی اچھا لگا نرگس۔ میں تو تمہیں بری لگتی ہوں گی۔ مجھ سے وفاداری کیسی۔ مجھے تم شروع ہی سے اچھی لگی تھیں۔ تم عقل مند ہو‘ پڑھی لکھی ہو۔ سب کچھ سمجھتی ہو۔ لیکن افسوس کہ تم مجھے نہیں سمجھ سکیں۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“

’چھوڑو اس بات کو مجھے بھی کیا فرق پڑتا ہے۔“

اگلے روز خانم زیورات کی پوٹلی لے کر باہر نکلی۔ مگر زینے سے اترتے ہی اسے کوٹھے کے دلال کاسو نے دبوچ لیا‘ اور گھسیٹتا ہوا اوپر لے آیا‘ جہاں نیلم بائی موجود تھی۔ نادرہ کی مخبری کی وجہ سے وہ پہلے جاگ چکی تھی لیکن سوتی بن رہی تھی۔

”لو سنبھالو بائی اس حرام زادی کو۔“ کاسو نے خانم کے تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔ ”کہو تو یہیں زندہ گاڑ دوں سالی کو۔“

”نہیں کاسو تو جا۔“

”تو تم نے مجھے بے خبر سمجھا تھا۔“ نیلم بائی نے خانم سے کہا۔

”دوستوں نے دغا کی ہے‘ ورنہ تمہیں تو پتا بھی نہیں چلتا۔“ خانم نے نادرہ کی طرف دیکھتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

”دغا نہیں کی‘ نادرہ نے بھلا کیا تیرے ساتھ۔ پر یہ تو بتا کہ تُو چوری کر کے بھاگ رہی تھی۔“

”چوری کیسی [illegible] مال تمہارا [illegible] ان سب لڑکیوں کی کمائی ہے‘ جو تم سمیٹ کر بیٹھی ہو۔ کیا دیتی ہو تم انہیں۔“

حیرت انگیز طور پر نیلم بائی پُرسکون تھی۔ ”کیا نہیں دیتی۔ زیور‘ کپڑا جو مانگیں ملتا ہے۔ اپنی مرضی کا کھاتی ہیں۔ اور بتاؤں‘ سب سے بڑی چیز کیا دیتی ہوں میں۔ عزت تو نہ میرے لیے ہے‘ نہ تم میں سے کسی کے لیے۔ اس کے باوجود میں تھوڑی سی سہی‘ لیکن عزت بھی دلاتی ہوں۔ ایک چھت کی عزت تو ہے نا تمہارے پاس۔ اور کوئی گاہک میری کسی لڑکی کو ذلیل نہیں کر سکتا۔ زیادتی نہیں کر سکتا اس کے ساتھ۔“

”اسے عزت کہتی ہو تم؟“ خانم نے حقارت سے کہا۔

”ہم ذلت میں گرے لوگوں کے لیے عزت اتنی بھی بہت ہے۔“ نیلم بائی کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ ”میں اگر لڑکیوں کو بھاگنے سے روکتی ہوں تو صرف ان کے بھلے کے لیے۔ یہ بات صرف نرگس نے سمجھی۔ آج سب لڑکیوں کے سامنے کہتی ہوں‘ جو چاہے‘ یہاں سے چلی جائے۔ میں نہیں روکتی۔ پر ایک شرط ہے۔ سال دو سال میں عزت کی زندگی نہ ملے تو اسی کوٹھے پر واپس چلی آنا۔“

وہاں سناٹا چھا گیا۔ نادرہ بھی حیران تھی۔

”تیرے لیے اس کوٹھے پر عزت نہیں ہے‘ اور باہر ہے‘ تو جا اور اپنے حصے کی عزت حاصل کر لے۔“ نیلم بائی نے خانم سے کہا۔ ”اور یہ زیورات لے کر جا رہی تھی نا‘ جو اونے پونے بیچتی اور زحمت بھی ہوتی تجھے۔ تو میں اس زحمت اور نقصان سے بچا رہی ہوں تجھے۔ یہ لے‘ ہزار روپے ہیں یہ۔“ اس نے نوٹوں کی گڈیاں خانم کے آگے پھینک دیں۔ ”جا...... اور دیکھ کہ باہر کتنی عزت ملتی ہے تجھے۔ جسم فروشی تو مجبوری ہے ہماری۔ پیشہ ہے ہمارا۔ اور اس کی ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ مجھے بھی کسی نے یہاں لا کر بٹھایا تھا۔ میں بھی تم جیسی ہی تھی۔“ اس کی آواز رندھ گئی۔ ”میں بھی بھاگنا چاہتی تھی اور بھاگی بھی۔ پر باہر جا کر سمجھ میں آیا کہ جسم فروشی کا مطلب ہے‘ جسم بیچنا۔ مگر باہر لوگ مفت میں لوٹ لیتے ہیں۔ ساتھ میں ٹھوکر بھی مارتے ہیں اور دل بھر جائے تو مفت کا مال دوستوں میں بھی [illegible] ہیں۔ یہ عزت ملتی ہے سمجھیں...... یہ ہے ہماری عزت اور میرے کوٹھے پر کوئی میری کسی لڑکی سے بدتہذیبی بھی کرے تو میں اسے پٹواتی بھی ہوں‘ اور اٹھوا کر نیچے پھنکوا بھی دیتی ہوں۔ اور ضرورت پڑے تو تھانے میں بند بھی کروا دیتی ہوں جسم فروشی تو مجبوری ہے۔ مگر جو عزت تمہیں مل سکتی ہے‘ میں تمہیں دلواتی ہوں۔ میں ان عزت داروں کو ذلیل بھی کرتی ہوں‘ جنہوں نے ہمیں ذلت اور بے آبروئی دی۔ اب تُو یہ نوٹ اٹھا اور جہاں دل چاہے چلی جا۔ دروازہ کھلا ہے‘ اور تُو میری طرف سے آزاد ہے‘ کبھی مدد کی ضرورت ہو تو واپس آ جانا۔ رات کو یہ دروازہ سب کے لیے کھلا ہوتا ہے۔“

خانم نے نوٹ اٹھائے اور دروازے کی طرف بڑھی۔

''ارے سن۔'' نیلم بائی نے پکارا۔

''اپنے کپڑے تو لے جا۔ کیا اسی ایک جوڑے سے بھٹکتی پھرے گی۔'' پھر وہ دوسری لڑکیوں کی طرف مڑی۔ ''تم میں سے جو بھی جانا چاہے' چلی جائے۔ اور میں خالی ہاتھ بھی نہیں بھیجوں گی کسی کو۔ تمہاری ہی کمائی ہے' تمہیں ہی دوں گی۔''

تمام لڑکیاں پلٹ کر کمروں کی طرف چلی گئیں۔

''مجھے یہاں کے کپڑے بھی نہیں چاہیں۔'' خانم نے نخوت سے کہا۔

''میری ہر بات یاد رکھنا۔''

اور خانم چلی گئی۔

نیلم بائی بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔ نادرہ نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔ ''چلو بوا' اپنے کمرے میں چلو۔''

وہ اسے اس کے کمرے میں لے گئی۔ کٹورے میں پانی لا کر دیا۔ ''ایسا کیا ہو گیا بوا؟''

''کچھ بھی نہیں نرگس۔ بس پرانے زخم ہرے ہو گئے۔''

''اب بس بھی کرو۔''

''کیسے بس کروں۔ برسوں کے رکے ہوئے آنسو ہیں۔ ایسے خشک تھوڑی ہوں گے۔''

نادرہ اسے تھپکتی رہی۔ اس وقت اسے اس عورت پر ترس آ رہا تھا' جو ظالم بھی تھی اور مظلوم بھی۔

❁⋯❁⋯❁

رمضان المبارک بہت طاقت ور مہینہ ہے۔ اللہ کی رحمت کو کھلی آنکھوں سے دیکھنا ہو تو آدمی اس مہینے میں دیکھے۔ جو متوجہ نہ ہو اسے بھی اللہ کی رحمت اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔

یہ بات عبدالحق نے مولوی صاحب سے کی تو وہ مسکرائے۔ ''عبدالحق پتر' اللہ کی ہر رحمت بڑی ہوتی ہے۔ بندہ نہیں جان سکتا کہ کون سی رحمت کتنی بڑی ہے۔ پر بندے کی فطرت ہے۔ وہ قیاس تو کرتا ہے۔ میں بھی کرتا ہوں۔ تو میری سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ نے سب سے بڑی رحمت فرمائی کہ انسانوں کو ہدایت کے لیے پیغمبر مبعوث فرمائے۔ اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ وہ اس نے سورۃ الملک میں فرمایا نا کہ...... الا یعلم من خلق. جس نے پیدا کیا' وہ ہی نہ جانے! وہ جانتا ہے کہ کون بدبختی پر اڑا رہے گا۔ وہ جانتا تھا کہ بدبختی پر اڑے رہنے والے اس کے پیغمبروں کو جھٹلائیں گے۔ وہ جانتا تھا کہ ایمان نہیں لانے والے کسی طور پر ایمان نہیں لائیں گے' خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ مگر رحمت کا تقاضا تھا کہ ان پر اتمام حجت کیا جائے۔ پیغمبروں کو تو اللہ کے قانون کے مطابق رخصت ہو جانا تھا۔ اب کوئی قیامت کے دن اپنی صفائی میں کہے کہ میرے رب' میں تو تیرے پیغمبر کے وصال کے بعد پیدا ہوا تھا۔ یا کوئی کہے کہ پیغمبر کی فلاں بات مجھے بھول

گئی تھی۔ تو اس حجت کے سلسلے کو تمام کرنے کے لیے اللہ نے صحیفے نازل فرمائے۔ اپنے پیغمبروں کو سند اور اپنے بندوں کو تحریری ہدایت سے نوازا۔ بدبختوں نے ان کتابوں میں بھی ترمیم اور تحریف کر ڈالی۔ مفاد کے خلاف جو بات ہوئی' اسے چھپا لیا' یا حذف ہی کر دیا۔ اور اپنے مطلب کی کوئی بات اس میں نہ پائی تو اسے شامل کر دیا۔

''اتمام حجت کا وہ سلسلہ عہد بہ عہد تھا۔ اصل اتمام حجت تو بعد میں ہونا تھا...... قیامت تک کے لیے تو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا۔ دین مکمل فرما دیا۔ شریعت مکمل فرما دی۔ اور اپنی آخری کتاب' حتمی سند جاری کر کے ہمیشہ کے لیے حجت تمام کر دی۔

''اور قرآن کے معاملے میں اللہ نے صرف نزول نہیں فرمایا۔ آخری کتاب تھی' قیامت تک کے لیے تھی۔ اس لیے اس کی حفاظت کا وعدہ بھی فرمایا۔ اور اسے جھٹلانے والوں کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے انہیں ایسا واضح چیلنج بھی کر دیا' جس پر پورا نہ اترنے کے بعد انکار کرنے والے کے لیے انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ وہ چیلنج تھا کہ اگر یہ اللہ کا کلام نہیں' بشری کلام ہے۔ تو تم بھی بشر ہو۔ اس کلام کے جیسی ایک سورۃ بنا کر لے آؤ' چلو' ایک آیت ہی بنا کر لے آؤ۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ اُس دور میں بڑے بڑے اہل زبان اور قادر الکلام شاعر تھے۔ لیکن کوئی اس بے مثل کلام کی مثال نہیں لا سکا۔ اللہ کا چیلنج سچا ہے۔ قیامت تک کوئی نہیں قبول کر سکے گا۔''

عبدالحق بیٹھا سنتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ مولوی صاحب بات کرتے ہوئے بھٹکتے نہیں۔ اس لیے وہ تحمل سے سن رہا تھا۔

''تو پتر' میرے خیال میں قرآن اللہ کی سب سے بڑی رحمتوں میں سے ہے۔ اور یہ قیامت تک انسان کے ساتھ رہے گی۔ یہ معجزہ ہے۔ تاریخ کو دیکھو۔ بغداد کی تباہی ہوئی۔ کتب خانے جلا دیے گئے۔ کتنے ہی علوم ناپید ہو گئے۔ لیکن چاہے دنیا بھر کے کتب خانے جلا دیے جائیں' اللہ کا وعدہ ہے کہ قرآن موجود رہے گا۔ کیسے؟ دنیا میں لاکھوں حفاظ موجود ہیں۔ تو قرآن بھی محفوظ ہے۔''

''درست ہے مولوی صاحب۔ لیکن رمضان......''

'وہی بتا رہا ہوں پتر۔ صحیفے اللہ کی بڑی رحمتوں میں سے ہیں۔ تاریخ ابن کثیر میں ابوزرعہ دمشقی کی عبداللہ بن صالح اور معاویہ بن صالح کے حوالے سے روایت ہے کہ توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ماہ رمضان المبارک کی چھ راتیں گزرنے کے بعد نازل ہوئی۔ زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر رمضان المبارک کی بارہ راتیں گزرنے کے بعد نازل ہوئی۔ انجیل حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام پر ماہ رمضان المبارک کی اٹھارہ راتیں گزرنے کے بعد نازل ہوئی۔ اور قرآن حضرت محمد ﷺ پر ماہ رمضان المبارک کی چوبیس راتیں گزرنے کے بعد نازل ہوا۔ تو پتر' یہ اللہ کی رحمت کا خاص مہینہ ہے نا۔ مسجد کا حال دیکھ رہے ہو اس ماہ میں عام دنوں میں تین صفیں مشکل سے پوری

ہوتی ہیں۔ اور آج کل مسجد کے باہر بھی صفیں بچھانی پڑ رہی ہیں۔ پتر' گیارہ مہینے کے محروم بھی اس مہینے اللہ کے دامن سے لپٹ جاتے ہیں۔ انہیں بھی اللہ اس ماہ مبارک میں اپنی رحمت سے نوازتا اور آخرت کے لیے زادِ راہ عطا فرماتا ہے۔ یہ انسانوں اور بالخصوص مسلمانوں پر اس کی رحمت کا خاص مہینہ ہے۔''

یہ تو واقعی بڑی واضح دلیل تھی۔ اپنی چاروں کتابیں اللہ نے ماہ رمضان میں نازل فرمائیں۔ یعنی اس مہینے میں اللہ کی خاص رحمت ہوتی ہے۔ اور عبدالحق تو ذاتی طور پر اس رحمت کا مشاہدہ کر چکا تھا۔

اسے اس کا تجربہ تھا۔ اسے تو سب کچھ ملا ہی اسی مہینے میں تھا۔ وہ کیسے بھول سکتا تھا کہ رمضان کا چاند طلوع ہوا تو اللہ نے اس پر رحمت کے دروازے کھول دیے۔ رمضان کی پہلی شب میں ہی اس نے اسلام قبول کیا تھا۔ اور اسلام قبول کرتے ہی اس نے پورے روزے رکھے تھے۔

یہ رمضان بھی اس کے لیے بہت مبارک ثابت ہوا۔ اس کے کھوئے ہوئے شب و روز نہ صرف لوٹ آئے۔ بلکہ اور سج سنور گئے۔ اسے اپنا کھویا ہوا ارتکاز واپس مل گیا۔ نماز میں حضوری کی کیفیت واپس آ گئی۔ قرآن دل میں اترنے لگا۔

کیوں نہ اترے۔ یہ مہینہ ہی نزول قرآن کا ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔

اس عرصے میں کبھی بیٹھے بیٹھے اسے محض ایک لمحے کے لیے نور بانو کا خیال آتا' اور فوراً ہی معدوم ہو جاتا۔ ارتکاز کے گہرے پانی میں تصور کا کوئی کام نہیں تھا۔ وہ نور بانو کا تصور کیا کرتا' اسے تو وہاں اپنا عکس ہی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اور پھر یہ اطمینان بھی تھا کہ جدائی کے بس چند روز ہی رہ گئے ہیں۔

پھر ایک دن مولوی صاحب نے اس سے کہا۔ ''پتر عبدالحق' اس بار تم اعتکاف میں بیٹھو۔''

عبدالحق نے یہ لفظ سنا تو تھا لیکن اس کے بارے میں جانتا کچھ نہیں تھا۔ اس نے مولوی صاحب سے اس بارے میں پوچھا۔

''اعتکاف آخری عشرے کا ہوتا ہے۔'' مولوی صاحب نے کہا۔ ''بیسویں روزے کی افطار کے ساتھ بندہ اعتکاف کی نیت سے مسجد میں مقیم ہو جاتا ہے' اور پھر عید کا چاند ہونے کے بعد اعتکاف سے باہر آتا ہے۔ اس دوران وہ اللہ کا مہمان ہوتا ہے۔''

''مگر اس میں کرنا کیا ہوتا ہے۔''

''کچھ بھی نہیں' اور بہت کچھ۔ اصل میں تو وہ ساری دنیا سے کٹ کر اللہ کا ہو رہتا ہے' جو کہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ یہ بات تو اللہ نے قرآن میں کئی جگہ فرمائی ہے کہ سب سے کٹ کر' یکسو ہو کر اللہ کے ہو رہو۔ اور یہ بات اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے بھی فر… کہ وہ

ایسے ہی تھے۔''

''پھر بھی مولوی صاحب' کرنا کیا ہوتا ہے اعتکاف میں؟''

''صرف اللہ کا ہو رہنا ہے۔ دنیا سے کنارہ کر لو۔ دنیا کے مسائل کو بھول جاؤ اور صرف اللہ کی عبادت کرو۔ اب سب سے کٹ جانے کا مطلب یہ ہے کہ دین کی کوئی ضروری بات کسی سے پوچھنی ہے تو پوچھ لو۔ ورنہ غیر ضروری طور پر کسی سے بات بھی نہیں کرو۔''

''یہ تو بہت اچھا ہے۔'' عبدالحق نے خوش ہو کر کہا۔ ''لیکن مجھے تو نماز کے سوا کچھ آتا بھی نہیں ہے۔''

''سب کچھ آتا ہے تمہیں۔ تم فکر مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔'' مولوی صاحب نے کہا۔ ''ایک تو رمضان مہینہ ہی نزولِ قرآن کا ہے۔ کہتے ہیں' اس میں قرآن پر توجہ دو تو اللہ فہمِ قرآن عطا فرماتا ہے۔ پھر یہ آخری عشرہ! قرآن کا نزول اسی عشرے ہی میں شروع ہوا تھا۔''

''کب شروع ہوا تھا؟''

''یہ تو اللہ نے نہیں بتایا۔ بس یہ یقینی ہے کہ اس عشرے میں جو پانچ طاق راتیں ہیں' ان میں سے کسی ایک رات میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا تھا...... یعنی ۲۱ ویں' ۲۳ ویں' ۲۵ ویں' ۲۷ ویں اور ۲۹ ویں شب میں سے کوئی شبِ قدر ہے۔''

''اللہ نے صاف صاف کیوں نہیں بتا دیا؟''

''اپنی مصلحت وہ آپ جانے۔ ہمیں تو بس ماننا ہے۔ اب بندے کی فطرت میں غور کرنا بھی ہے۔ تو ایمان کی بات یہ ہے کہ اللہ سراپا رحمت ہے اور بندوں کی بہتری چاہتا ہے۔ تو اس کو چھپانے میں بھی بندوں کی بہتری ہے۔''

''مجھے بھی سمجھائیے۔''

مولوی صاحب نے ایک گہری سانس لی۔ ''دیکھو' قرآن پاک ہمیں بتاتا ہے کہ شب بیداری کی بڑی اہمیت ہے۔ شب بیداری اللہ کو بہت پسند اور اس کی بارگاہ میں بہت مقبول ہے۔ اور یہ عام راتوں کی بات ہے۔ خاص راتوں میں بیداری کی مقبولیت اور اجر بہت بڑھ جاتا ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ یہ بات جاننے کے باوجود بھی ہم شب بیداری کتنی کرتے ہیں؟''

عبدالحق شرمسار ہو گیا۔ شب بیداری تو بہت دور کی بات ہے۔ وہ تو نور بانو کی محبت میں' اس کے تصور میں اپنی راتیں سیاہ کرتا رہا تھا...... رائیگاں...... بلکہ الٹا گناہ گار۔

''میں تو اس معاملے میں صفر ہوں مولوی صاحب۔'' اس نے شرمندگی سے کہا۔

''ہم عام بات کر رہے ہیں پتر۔ اللہ کے خاص بندوں کی اور بات ہے۔ ہم عام بندے تو بس نمازوں کی پابندی کر لیتے ہیں۔ شب بیداری کا اعزاز کسے نصیب ہوتا ہے۔ اب سوچو کہ یہ

مہینہ رحمت والا ہے۔ اس میں اللہ کی رحمت اور فضل وکرم سے بے نمازی بھی پنج وقت نمازی ہو جاتے ہیں۔ تو اللہ نے شب قدر کی فضیلت سے آگاہ کر کے ہم عام بندوں کے لیے اس اعزاز کو پانے کا سامان کر دیا۔ ہم عام لوگوں میں سے ہر شخص یہ سوچتا ہے کہ شب قدر میں پوری رات اللہ کی بارگاہ میں رکوع وسجود کرے گا اور حاضری لگائے گا۔ اور ایسا ہوتا بھی ہے۔

''اب رحمت والے رب نے اپنی رحمت کو اور بڑھا دیا۔ شب قدر کی ترغیب دے کر' شوق دلا کر اس نے شب قدر کو چھپا لیا۔ اس نے کہا کہ آخری عشرے کی پانچ راتوں میں کوئی ایک شب قدر ہے۔ سو اسے ان پانچ طاق راتوں میں تلاش کرو۔

''تو اب ہم کیا کریں گے؟ ان پانچ راتوں میں دنیا سے کٹ کر اللہ کے ہو کر رہ جائیں گے۔ پانچ راتوں میں قیام کریں گے تو ہمارا اجر بھی تو پانچ گنا ہو جائے گا یہ اس کی رحمت ہے نا۔ جو بندہ ایک رات جاگنے والا نہیں' وہ اسے پانچ راتیں دے رہا ہے۔''

''لیکن مولوی صاحب' شب قدر تو ایک ہی ہو گی نا؟'' عبدالحق نے اعتراض کیا۔

''ٹھیک کہتے ہو پتر۔ لیکن میں نے کہا نا کہ اللہ کے ہاں تو عام رات کا بھی بڑا اجر ہے۔ اگر تم نے پانچوں راتوں میں قیام کیا تو ایک شب قدر تو تمہیں مل گئی نا' جس کا اجر بہت بڑا ہے۔ اور چار عام راتیں سمجھ لو۔ اجر تو ان کا بھی بڑا ہے۔ اور تمہیں تو مفت میں ملیں نا۔ پھر پتر' یہ بہرحال عام راتیں نہیں۔ ماہ نزول قرآن کے آخری عشرے کی راتیں ہیں یہ۔ ان کا اجر عام راتوں سے تو بہت زیادہ ہو گا۔

''پھر اللہ کی رحمت ایسی ہے پتر کہ گناہ کی سزا مقرر ہے۔ مگر وہ قدرت والا چاہے تو معاف کر دے۔ اور نیکی کا اجر مقرر ہے...... مگر کم از کم گناہ کی سزا تو وہ وہی دے گا جو مقرر ہے۔ اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔ لیکن نیکی کا اجر وہ کم از کم تو دے گا ہی۔ پر چاہے تو ستر گناہ زیادہ دے اور چاہے تو سات سو گنا زیادہ دے۔ اور چاہے تو ہمارے تصور سے بھی کہیں بڑھ کر دے۔ تو یہ بندے کے اخلاص اور اللہ کی رحمت پر منحصر ہے۔ وہ چاہے تو ہمیں پانچوں راتوں کا اجر شب قدر کے حساب سے دے۔ اور کون جانے کہ اجر میں اللہ کی طرف ذوق شب بیداری مل جائے۔''

بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔ عبدالحق نے دل میں سوچا۔ کیسی بات ہے کہ گناہ کی سزا بھی مقرر ہے اور نیکی کا اجر بھی۔ لیکن وہ غفور الرحیم سزا کبھی بڑھا کر نہیں دیتا اور اجر کبھی گھٹا کر نہیں دیتا۔ سزا میں کمی بھی کر دیتا ہے اور خوش ہو کر معاف بھی کر دیتا ہے۔ لیکن بندے سے ناراض ہو' تب بھی اس کا اجر کم نہیں کرتا۔ اور خوش ہو تو اجر بے حساب کر دیتا ہے۔

بے شک اس کی رحمت نے پوری کائنات کا احاطہ کر رکھا ہے!

❀......❀......❀

نادرہ کو وہ کوٹھا جہنم کا ایک حصہ لگتا تھا لیکن سال میں چالیس دن ایسے آتے تھے کہ وہ یہاں

بھی خوش رہتی تھی۔ ان میں تیس دن رمضان کے ہوتے تھے اور دس دن محرم کے۔ اس عرصے میں تو اس نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ کوٹھے کا کاروبار چلانے والی نائیکہ بھی عورت ہی ہوتی ہے۔

شعبان کی 29 کو نادرہ بڑے شوق سے کوٹھے پر جاتی تھی' خود کو دکھانے کے لیے نہیں' بلکہ چاند دیکھنے کے لیے۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا ہوتا تھا اور وہ سراپا دعا ہوتی تھی' اللہ میاں' آج چاند ہو جائے۔ اور چاند نظر نہ آتا تو وہ دل گرفتہ سی واپس آتی۔ وہ سوچتی' اب گناہ کی ایک اور تاریک رات گزرانی ہو گی۔

اسے بچپن یاد آیا۔ انتیس کے چاند کی کتنی خوشی ہوتی تھی۔ مگر اس وقت 29 کا چاند اس لیے اچھا لگتا تھا کہ عید میں ایک دن کا فاصلہ کم ہو جاتا تھا۔ اس وقت اصل اہمیت عید کے چاند کی تھی۔ 29 رمضان کو چاند نظر نہ آئے تو بچے کیسے اداس ہو جاتے ہیں کہ عید ایک دن کے لیے دور ہو گئی۔

تو جب کوٹھے پر وہ پہلی بار چاند دیکھنے کے لیے گئی تو اس کی وہی کیفیت تھی...... بچوں والی۔ لیکن جب اس نے کوٹھے پر ایک سال سے زیادہ وقت گزار لیا تو وہ بالکل بدل گئی۔ چاند دیکھنے کے لیے تو وہ اب بھی جاتی تھی۔ لیکن 29 کا چاند اب اسے برا لگتا تھا۔

اور اس کی بہت معقول وجہ بھی تھی!

29 شعبان کو وہ کوٹھے پر جاتی تو باہر بازار کی وہی روز والی کیفیت ہوتی تھی۔ وہی چہل پہل' جس سے اسے نفرت تھی۔ پان' دودھ اور شربت کی دکانوں پر وہی ہجوم' وہی اٹھتی ہوئی' کپڑوں کے آر پار جاتی اور جسم کو چھیدتی ہوئی نظریں۔ اس کا دل ایسا گھبراتا کہ جی چاہتا' پلٹ کر بھاگ جائے۔ لیکن چاند کی دید کی اپنی اہمیت ہے۔ اس کی قیمت کتنی ہی ہو ادا کی جا سکتی ہے۔

پھر چند لمحوں میں وہ باہر کا سب کچھ بھول جاتی۔ اس کی نگاہیں چاند کی تلاش میں افق کو ٹٹولنے لگتیں۔ دل کی دھڑکنوں میں بس یہ دعا ہوتی کہ آج چاند ہو جائے۔

قانون قدرت ہے کہ 29 کا چاند آسمان پر زیادہ دیر نہیں رہتا۔ اسے پتا چل جاتا کہ چاند نہیں ہوا' اور اب وہ ہو گا بھی نہیں۔ پھر بھی وہ کسی معجزے کی امید میں افق کو تکتی رہتی۔ یہاں تک کہ اندر سے کسی گاہک کا بلاوا آ جاتا۔ اور وہ رات اس کی زندگی کی سب سے اذیت دہ رات بن جاتی۔

کہتے ہیں' دنیا کے بیشتر لوگ چاند کے معاملے میں عمر بھر بچے ہی رہتے ہیں' کبھی بڑے نہیں ہوتے۔ لیکن وہ اپنے بارے میں سوچتی کہ وقت نے کس طرح اسے بڑا بنا دیا ہے۔ اس کے رویے صرف ایک سال کے عرصے میں بالکل الٹ گئے ہیں۔ رمضان کا چاند 29 شعبان کو دیکھنے کے لیے وہ ڈرتے ڈرتے کوٹھے پر جاتی۔ لیکن تیس کا چاند ہوتا تو وہ مغرب کی نماز میں ہوتی' مگر اس کا دل کوٹھے پر ہوتا۔ وہ بے تابی سے نماز پڑھتی کہ جلدی سے جائے اور چاند دیکھے۔ وجہ یہ تھی کہ تیس کا چاند حتمی ہوتا ہے۔ کوٹھے پر جا کر دیکھو تو لگتا ہے کہ دنیا پُرسکون ہو گئی ہے۔ ہر طرف سناٹا ہوتا۔

سب دکانیں بند ہوتیں۔ تماش بینوں کا وجود بھی نہیں ہوتا۔ وہ چاند دیکھ کر بڑے سکون سے دعا مانگتی' اور دیر تک وہاں بیٹھی رہتی۔

اور 29 رمضان کو پورے دن اس پر ہول طاری رہتا...... یا اللہ' کہیں چاند نہ ہو جائے۔ اس روز اس میں اتنی ہمت نہ ہوتی کہ جا کر چاند دیکھے۔ بلکہ عید کا چاند تو وہ دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اپنے حصے کے عید کے چاند تمام کے تمام وہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ اب عید کا چاند اس کے لیے ایسا ہی تھا' جیسے قربانی کے بکرے کے لیے بقر عید کا چاند' بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ کیونکہ بکرے کو دس بارہ دن کی مہلت ملتی ہے چاند کے بعد' اسے تو دس بارہ منٹ بھی نہیں ملتے تھے۔ ''چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔'' نیلم بائی چلاتی۔ ''پورے دن چیختی رہی ہوں کہ چاند ہو جائے گا۔ پر میری سنتا کون ہے۔''

پہلی بار اس نے نیلم بائی سے کہا تھا۔ ''اتنا اچھا مہینہ گزارنے کے بعد تین دن تو ملنے جائیں ہمیں۔''

''چاند نظر آتے ہی شیطان آزاد ہو جاتا ہے۔'' نیلم بائی نے کہا۔ ''عید سے زیادہ شوق سے تو لوگ چاند رات مناتے ہیں۔''

''پر بوا' ہمارا بھی تو عید منانے کا حق ہے۔''

''یہاں عید منانے کا حق صرف گناہ گاروں کو ہے۔ ہم تو لوگوں کی خوشی کی چیز ہیں۔''

نیلم کے لہجے میں عجیب سی سوگواری تھی۔

خوشی کی چیز یعنی آلہ تفریح! نادرہ نے دل میں سوچا تھا۔

سو اس بار بھی وہ 29 کا چاند دیکھنے اسی کیفیت میں گئی...... گھبرائی گھبرائی سی' ہولتی ہوئی۔ مگر اسے خوشی بھی اتنی ہی بڑی ملی۔

''وہ رہا۔'' نیچے کسی نے نعرہ لگایا۔ ''چاند ہو گیا۔''

یہ بھی ہر سال ہوتا تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو بے وقوف بناتے تھے۔ اور چاند دیکھنے کی اہمیت نہ جانے کیسی ہے کہ بے وقوف بننے کے قوی امکان کے باوجود لوگ چاند دکھانے والے کے گرد جمع ہو جاتے...... کہاں ہے چاند؟ اور چاند دکھانے والا کہتا...... یہ میری انگلی کی سیدھ میں دیکھو...... وہ بادل کا ٹکڑا ہے نا۔ اب میری انگلی کے ساتھ ساتھ دیکھو۔ اور پھر وہ انگلی قوسی حرکت کرتی کسی کوٹھے پر کھڑی لڑکی کی طرف آ کر رک جاتی...... وہ رہا چاند۔ اور سب قہقہے لگاتے۔ ابے یہ تو چودھویں کا چاند ہے۔ کوئی کہتا' گرہن دکھا رہا ہے ہمیں۔

مگر اس بار ایسا کچھ نہیں ہوا۔ چاند دکھانے والے کی انگلی ساکت تھی۔ ''وہ دیکھو......''

اور لوگ اس انگلی کی سیدھ میں دیکھ رہے تھے۔ کسی نے کہا۔ ''ابے بے وقوف بنا رہا ہے۔''

''نہیں' خدا کی قسم...... بالکل صاف نظر آ رہا ہے۔''

نادرہ ایسی باتوں پر توجہ نہیں دیتی تھی لیکن دکھانے والے کے لہجے میں ایسی سنجیدگی تھی کہ اس نے اس کی انگلی کے اشارے کو مدنظر رکھتے ہوئے افق پر دیکھا...... اور اس کے دل میں ننھی سی موتیے کی کلی کھل گئی۔ اتنا باریک چاند کہ اس پر حیرت ہو کہ نظر کیسے آ گیا۔

اسی وقت نیچے سے ایک اور آواز ابھری۔ ''ہاں...... وہ رہا۔''

''کہاں ہے...... کہاں ہے......؟'' ہیجانی آوازیں ابھریں۔

پھر اور لوگوں نے بھی چاند لیا۔ اوپر نادرہ اب دعا مانگ رہی تھی۔ ''اے اللہ...... میری ارجمند کو کسی آبرو والے گھر میں پہنچا دیجئے۔ اس کے نصیب اچھے کر دیجئے۔ عزت سے زندگی گزارے۔ محبت اور سچی خوشیاں پائے۔ اور میرے اللہ' اس کے بعد مجھے کوئی چاند نہ دکھائیے۔''

''ارے...... یہ کہاں غائب ہو گیا؟'' نیچے کوئی چلایا۔

نادرہ نے دعا مانگ کر چہرے پر ہاتھ پھیرا' اور دوبارہ افق کی طرف دیکھا۔ مگر چاند نظر نہیں آیا۔

یہ 29 کا چاند ہوتا ہی عجیب ہے...... اتنا باریک اور موہوم کہ جیسے فریب نظر ہو۔ ایک جھلک دکھائی اور غائب۔ لیکن ایمان افروز ایسا کہ اس کی ایک جھلک میں ایسا یقین ہوتا ہے کہ نگاہ سے اس کے اوجھل ہو جانے پر بھی متزلزل نہیں ہوتا۔ ورنہ تو آدمی کی فطرت ایسی ہے کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ مگر 29 کے چاند کو ایک بار دیکھ کر اس کے اوجھل ہو جانے پر بھی آدمی کبھی شک نہیں کرتا۔ کیسی رحمت ہے اللہ کی۔

پھر اسے چاند دوبارہ نظر آ گیا...... ننھا سا ہلال۔ اب یہ ہر روز بڑا ہو گا...... موتیے کی کلی کی طرح۔ پھر پھول کی طرح کھل جائے گا' پورا ہو جائے گا۔ پھر گھٹنا شروع ہو گا...... اور گھٹتے گھٹتے غائب ہو جائے گا۔ اس عرصے میں آزادی ہی آزادی۔

پھر نیا چاند طلوع ہو گا...... لوگوں کے لیے عید کا پیغام' اور اس کے لیے دوبارہ روح فرسا قید!

اس نے اداسی کو ذہن سے جھٹکا۔ ابھی وہ دن ایک ماہ دور ہے۔ اس کی فکر میں گھلنے کا کیا حاصل۔ اس ایک ماہ سے استفادہ کیا جائے۔

اتنی دیر میں نیچے دکانیں بند ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ وہ وہیں بیٹھی رہی۔ بس کریانے کی' حلوائی کی اور دودھ دہی کی دکانیں کھلی رہ گئیں۔ اور خلاف معمول قصائی نے دکان کھول لی۔ جبکہ عام دنوں میں وہ دن میں ہی گوشت نمٹا کر دکان بند کر دیتا تھا۔

نادرہ اس مہینے کے بارے میں سوچنے لگی نجانے کیوں اسے لگتا تھا کہ اس بار کا رمضان اس کی زندگی کا سب سے اہم مہینہ ہے۔ کچھ ہونے والا ہے' اور اچھا ہونے والا ہے۔

ایک اچھا کام تو وہ یہاں عام دنوں میں بھی کرتی تھی...... قرآن پڑھانا۔ اور اب تو

اچھومیاں بھی قرآن پڑھ رہے تھے۔ بلکہ اس کے لیے وہ عجوبہ بن گئے تھے۔ جس رفتار سے وہ پڑھ رہے تھے' وہ حیران کن تھی۔ لگتا تھا کہ کچھ ہی دن میں وہ ارجمند کے برابر آجائیں گے۔

''آپ کہتے ہیں کہ آپ نے پہلے کبھی قرآن پڑھا ہی نہیں۔'' ایک دن اس نے ان سے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''تو یہ تو سچ ہے۔''

''میں نے کسی کو اتنی جلدی اتنا اچھا پڑھتے نہیں دیکھا۔ آپ تو آگے کا سبق بھی خود ہی نکال لیتے ہیں۔''

اچھومیاں چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر بے بسی سے بولے۔ ''کیسے بیان کروں۔ سمجھ سکتا ہوں لیکن سمجھانا مشکل ہے۔'' پھر انہوں نے سینے پر بائیں جانب ہاتھ رکھا۔ ''جب میرے سامنے قرآن کا کوئی صفحہ کھلتا ہے تو یہاں کچھ پگھلتا ہے...... با قاعدہ پگھلتا ہے......اور......اور نجانے کیسے مجھے معلوم ہوجاتا ہے کہ وہاں کیا لکھا ہے۔ میری زبان خود بہ خود حرکت کرتی ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ مجھے پورا یقین ہوتا ہے کہ میں جو پڑھ رہا ہوں' وہ ٹھیک ہے۔''

''کمال ہے۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''

اچھومیاں پھر سوچنے لگے۔ ''میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے۔ جس کا قرآن ہے' وہی مجھے پڑھاتا ہے۔''

بات آئی گئی ہوگئی۔ دو تین دن بعد نادرہ نے سورہ رحمٰن شروع کی تو ابتدا ہی میں اٹک گئی۔ الرحمن . علم القرآن. خود بہ خود اس کی نظر ترجمے پر گئی۔ اللہ نے جو بہت مہربان ہے' قرآن سکھایا۔

خوف اور ہیبت سے اس کے جسم کا رواں رواں کھڑا ہوگیا۔ واقعی...... وہ اچھومیاں کو قرآن پڑھا رہا ہے۔

اس نے آگے پڑھا۔ خلق الانسان . علمہ البیان ۔ پیدا فرمایا انسان کو۔ سکھایا اسے بولنا۔

اس پر لرزہ چڑھ گیا۔ ارے...... یہ تو ہم کبھی سوچتے ہی نہیں۔ اگر ہمیں بولنا نہ آتا تو کیا ہوتا۔ ایک وقت تھا کہ انسان کو بولنا نہیں آتا تھا۔ تب وہ اشاروں کی زبان میں باتیں کرتا تھا۔ یعنی اسے لفظوں کا پتا ہی نہیں تھا۔ ایسے میں نہ وہ پڑھ سکتا تھا' نہ سمجھ سکتا تھا۔ اللہ نے کتنی نعمت عطا فرمائی' رحمت فرمائی انسان پر۔ کیسی آسانی عطا فرمائی۔ ہم تو اس پر شکر بھی ادا نہیں کرتے' جیسے یہ کوئی خاص بات ہی نہ ہو۔

اس سے کچھ آگے بھی تو سوچ۔ اس کے اندر کسی نے کہا۔ لفظ عطا فرمائے۔ بولنا سکھایا۔ پھر لکھنا پڑھنا سکھایا۔ پھر قرآن اتارا۔ یعنی محبت تمام کردی۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے رب

مجھے تو تیری پسند اور ناپسند کا علم ہی نہیں تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تُو نے اس کام کا حکم دیا اور اس کام کو منع فرمایا۔ تب تو وہ اس پر بھی پکڑ لے گا کہ تُو نے جاننے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ میرے کلام کو پڑھ کر سمجھا کیوں نہیں۔ تُو تو منہ پھیرنے والا بھی ہے۔ ایک اور جرم!

نادرہ نے فیصلہ کیا کہ اب وہ قرآن کو صرف پڑھے گی نہیں' سمجھنے کی کوشش بھی کرے گی۔ مہلت تو اسے مل گئی ہے ایک ماہ کی۔

پھر اسے نواب اشرف علی خاں کا خیال آیا۔ کیسی رحمت...... نظر عنایت ہوئی ہے ان پر۔ اور کہاں ہوئی ہے! اللہ کی شان اچانک اسے یاد آیا کہ اسے ان کی تراویح پڑھنے کی تاکید کرنی ہے۔

اور اس نے یہ سوچا ہی تھا کہ وہ آگئے۔

''بیٹا...... کچھ منگانا ہو تو بتاؤ۔'' انہوں نے کہا۔

''کہاں جارہے ہیں آپ؟''

''عشاء کی نماز اور تراویح کے لیے۔''

''آپ کو کیسے پتا چلا تراویح کا؟''

اچھومیاں مسکرائے۔ ''اب مسجد جائیں گے تو معلومات تو بڑھیں گی۔ کل ہی تو امام صاحب نے بتایا تھا نماز کے بعد۔''

نادرہ کو خوشی ہوئی۔ اس نے انہیں غور سے دیکھا تو اسے کچھ یاد آگیا۔ کب سے وہ یہی دو جوڑے گھس رہے تھے۔ ایک پہنتے اور دوسرا دھو لیتے۔ اسے خوشی ہوئی کہ اس نے پہلے ہی سے ان کے لیے سوچ رکھا تھا۔ کپڑا منگوا کر ان کے لیے تین کُرتے اور تین پاجامے سی دیے تھے۔ کُرتے سیدھی کلیوں والے تھے۔ جی تو چاہا کہ کڑھائی کرے۔ مگر کڑھائی صرف رمضان میں ہی ممکن تھی۔

اب اس وقت وہ ایک جوڑا پہن سکتے تھے۔ باقی دو جوڑوں میں ایک جمعتہ الوداع کے لیے اور دوسرا عید کے لیے تھا۔ ان پر وہ روزوں میں کڑھائی کرسکتی تھی۔

''اس حال میں جارہے ہیں آپ۔''

''اللہ کے دربار میں کپڑوں کی کیا اہمیت۔ جبکہ آدمی اندر سے گندا ہو۔'' وہ اداس ہوگئے۔

''فضول بات نہ کریں آپ؟'' اس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ''میں نے کپڑے سی رکھے ہیں آپ کے لیے وہ پہن کر جائیں۔''

اس نے جب بنیان کے ساتھ وہ جوڑا اچھومیاں کو دیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''تم نے اتنی فکر کی ہماری۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ اللہ نے سچ مچ ہمیں بیٹی دے دی ہے۔''

''آپ کو ٹھیک ہی لگتا ہے۔'' اس نے شوخی سے کہا۔

اور نواب اشرف علی خان نئے کپڑے پہن کر پہلی بار تراویح کے لیے نکلے۔ وہ بہت خوش

تھے۔

❀....❀....❀

عبدالحق کو لگتا تھا کہ آدمی زندگی میں ہر نئے موڑ پر‘ کسی کی آمد کے موقع پر خود کو دریافت کرتا ہے‘ اور حیران ہوتا ہے کہ ارے‘ یہ چیز مجھ میں پہلے سے موجود تھی۔ مگر میں بے خبر تھا۔

ننھے ساجد نے اس کی زندگی میں داخل ہوتے ہی اسے اپنے اندر چھپی ایک بہت بڑی محبت سے روشناس کرایا تھا...... بچوں کی محبت!

اس محبت کا وہ اس سے پہلے کبھی اندازہ نہیں کر سکا تھا‘ کر بھی نہیں سکتا تھا۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ وہ ساجد کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔

بڑھتے ہوئے بچے کا مشاہدہ بھی اس کے لیے عجیب تجربہ تھا۔ ساجد اب دو ماہ کا ہو چکا تھا۔ بہ ظاہر تو وہ بڑا نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس کی جسمانی حرکات میں نمایاں فرق پیدا ہوا تھا۔ پہلے نظر جما کر نہیں دیکھ پاتا تھا۔ اب نظریں جما کر دیکھتا تھا۔

ایک نمایاں ترین تبدیلی اس کی قوتِ اظہار تھی۔ ابتدا میں وہ بالکل بے بس تھا۔ مگر اب اپنے انداز میں وہ ہر بات کا اظہار کرتا تھا۔ اس کا بھوک کی وجہ سے رونا اور طرح کا تھا‘ اور کسی شکایت پر رونا اور طرح کا تھا۔ خوشی کے اظہار میں وہ بڑی شدت سے ہاتھ پاؤں ہلاتا تھا۔ اس کے علاوہ آوازیں بھی تھیں۔ ہر وقت وہ غوں غاں کرتا رہتا۔ کبھی قلقاری مار کر ہنس دیتا۔

عبدالحق نے دو اوقات اس کے لیے مخصوص کر دیے تھے۔ ایک ظہر سے پہلے اور دوسرا عشاء کے بعد۔ اب وہ بڑے اعتماد سے اسے پنگھوڑے سے اٹھا کر گود میں لے لیتا تھا۔ بعض اوقات تو سب لوگ اس کے کمرے میں جمع ہو جاتے۔ وہ گھر بھر کا کھلونا تھا۔

عبدالحق کو ساجد سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ ان اوقات کے علاوہ بھی وہ رابعہ اور زبیر کے کمرے میں چلا جاتا۔ ساجد کو گود میں لینا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ مقررہ اوقات میں تو رابعہ اور کبھی زبیر پنگھوڑے سمیت بچے کو لا کر اس کے کمرے میں چھوڑ جاتے۔

پھر ایک دن ساجد نے پہلی بار عبدالحق کی گود میں پیشاب کر دیا۔ اس وقت سب لوگ وہاں موجود تھے۔ رابعہ کا تو شرمندگی اور غصے سے برا حال ہو گیا۔ اس نے بچے کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ بچہ ٹکر ٹکر اسے دیکھتا رہا۔

''پاگل ہوئی ہے رابعہ۔'' حمیدہ نے اسے ڈانٹا۔ ''ننھا سا بچہ ہے۔ وہ کیا سمجھے گا تیری بات۔''

اور عبدالحق نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں آپا۔ میں نماز سے پہلے غسل کر لوں گا۔ یہ تو اور فائدہ ہے۔''

''ارے واہ‘ تو کیا ہر نماز سے پہلے غسل کریں گے۔'' رابعہ بولی اور دوبارہ بچے کو ڈانٹنے لگی۔ ''ساجد صاحب پر پیشاب کر دیا تُو نے آئندہ کیا تو مار لگاؤں گی۔''

حمیدہ نے پھر اسے ٹوکا۔ ''یہ کیا بے وقوفی ہے رابعہ۔''

''نہیں اماں۔ ابھی ڈانٹیں گے تو سمجھنے لگے گا۔ اسے پتا ہونا چاہیے کہ صاحب کون ہیں۔''

لیکن ننھا بچہ ابھی کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ وہ بار بار عبدالحق کی گود میں پیشاب کرتا۔ عبدالحق دن میں کئی کئی بار غسل کرنے لگا۔ ایک دن حمیدہ نے کہا۔ ''یہ عبدالحق کتنا پیار کرتا ہے بچوں سے۔ اپنے بچے ہوں گے تو کیا حال ہوگا اس کا۔''

عبدالحق نے دیکھا کہ ننھے بچے کے اپنے معمولات تھے۔ رابعہ بارہ بجے بچے کو اس کے کمرے میں چھوڑ جاتی۔ پھر وقتاً فوقتاً آ کر اسے دیکھتی رہتی۔ بچہ اس دوران عبدالحق کی توتلی آواز کی باتیں سنتے ہوئے اسے تکتا‘ ہاتھ پاؤں چلاتا‘ جواباً غوں غاں کرتا۔ ایک بجے کے قریب وہ تیزی سے ہاتھ پاؤں چلاتا۔ پھر رونے لگتا۔ اسے چپ کرانے کی ہر کوشش ناکام ہو جاتی۔ ایک دن اتفاق سے عبدالحق نے بہلانے کے لیے اسے گود میں لیا تو بھید کھلا کہ وہ اس کی گود میں آنے کے لیے رو رہا ہے۔

اس نے بچے کو کندھے سے لگایا اور ٹہلنے لگا۔ مشکل سے پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ اسے احساس ہوا کہ بچہ سو گیا ہے۔

پھر رات عشاء کے بعد بھی یہی ہوا۔ اب میں بچے کے اشاروں کی زبان سمجھنے لگا ہوں۔ عبدالحق نے خوشی سے سوچا۔

پھر اس پر ایک اور انکشاف ہوا۔ بچے کے اندر کوئی گھڑی نصب تھی۔ اس کا وقت کا حساب پکا تھا۔ اس کا پتا ایسے چلا کہ بڑھتے ہوئے دن کی وجہ سے نمازوں کے اوقات بھی تبدیل ہو رہے تھے۔ عشاء کی نماز پندرہ منٹ آگے چلی گئی۔

اس دن وہ نماز پڑھ کر آیا تو اپنے کمرے کی طرف سے اسے ساجد کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اسے حیرت ہوئی‘ کیونکہ رابعہ اس کے آنے کے بعد ساجد کو لاتی تھی۔

وہ کمرے میں بچے کے پاس گیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی ساجد خاموش ہو گیا اور خوشی سے ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔

''میرے آنے سے پہلے اسے کیوں لے آئیں آپا؟'' اس نے رابعہ سے کہا۔

''پتا نہیں صاحب۔ یہ اچانک رونے لگا۔ کسی طرح چپ نہیں ہوا۔ میں یہاں کمرے میں لائی تو یہاں آتے ہی چپ ہو گیا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھا...... شاید آپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ آپ نظر نہیں آئے تو دوبارہ رونے لگا۔ ابھی آپ کو دیکھتے ہی چپ ہو گیا۔''

پھر روز یہی ہونے لگا۔ اور ایک دن عبدالحق کی سمجھ میں آ گیا۔ بچہ تو اپنے مقررہ وقت پر اس کے پاس آنے کو مچلتا تھا لیکن نماز کا وقت آگے ہو جانے کی وجہ سے وہ خود نماز میں ہوتا تھا۔

ایک دن سب اس کے کمرے میں جمع تھے۔ اس نے حمیدہ سے کہا۔ ''اماں' یہ ہم لوگوں کو پہچاننا کب شروع کرے گا۔''

''اب تو پہچاننے لگا ہوگا۔'' حمیدہ نے کہا۔ ''بچہ سب سے پہلے ماں کو' اور پھر باپ کو پہچانتا ہے۔''

''نہیں اماں میرے بیٹے نے سب سے پہلے صاحب کو پہچانا ہے۔''

''کیوں بھئی؟''

''میری اور رابعہ کی وفاداری اور محبت بھی تو اسے ملی ہوگی۔''

حمیدہ نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اس کے چہرے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ محض دل آزاری سے بچنے کے لیے اس نے اختلاف نہیں کیا۔

لیکن رمضان کی پہلی ہی رات زبیر کی بات سچ ثابت ہو گئی!

نماز کے بدلتے ہوئے اوقات سے تو ننھے ساجد نے خود کار مطابقت پیدا کر لی تھی لیکن تراویح کی وجہ سے گھنٹے سوا گھنٹے کا فرق پڑ گیا تھا' جو اس کے لیے بہت بڑا تھا۔ اس کا تو سونے کا وقت بھی نکل گیا اور عبدالحق واپس نہیں آیا۔

عبدالحق کو گھر میں گھستے ہی احساس ہو گیا۔ وہاں عجیب سا سناٹا تھا۔ جبکہ اسے ڈر تھا کہ ساجد رو رہا ہوگا۔

کمرے میں سب لوگ موجود تھے۔ مگر عبدالحق کی نظر ساجد پر پڑی' جو ٹکٹکی باندھے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کی نظریں ملیں' اور عبدالحق نے بہت کچھ سمجھ لیا۔ ساجد کی آنکھوں میں نیند اور نقاہت تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ زبردستی جاگ رہا ہے..... ضد میں۔ پھر عبدالحق سے نظریں ملیں تو اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھری اور فوراً ہی معدوم ہو گئی۔

عبدالحق تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ ساجد مخصوص انداز میں ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ عبدالحق نے جلدی سے اسے گود میں اٹھا کر کندھے سے لگایا۔ ''یہ رویا تو نہیں؟'' اس نے رابعہ سے پوچھا۔

رابعہ سے بولا ہی نہیں گیا۔ وہ بہت پریشان لگ رہی تھی۔

''اس نے رو رو کر گھر سر پر اٹھا لیا تھا بھائی۔'' زرینہ نے کہا۔ ''چپ تو اس وقت ہوا' جب رونے کی طاقت ہی نہیں رہی اس میں۔''

''مجھے تیرا رونا یاد آ گیا پتر' جب تو میرے دودھ کی ضد میں رو رہا تھا۔ اور پھر نڈھال ہو گیا تھا۔ رونے کی طاقت بھی نہیں رہی تھی۔'' حمیدہ نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''آج میں

زبیر کی بات مان گئی یہ ساجد سب سے زیادہ تجھے پہچانتا ہے' سب سے زیادہ تجھ سے محبت کرتا ہے۔''

''میں اس سے معذرت کر لوں۔'' یہ کہہ کر عبدالحق نے ساجد کو کندھے سے ہٹا کر ہاتھوں پر لیا اور اس کے چہرے کو دیکھا لیکن نیند سے لڑنے والا بچہ شاید اس کے کندھے سے لگتے ہی سو گیا تھا۔

ننھے ساجد کو اپنی نیند اور عبدالحق کے اس نئے نظام الاوقات کے درمیان مطابقت پیدا کرنے میں دو ہفتے لگے۔ مگر فوراً ہی عبدالحق کے سامنے ایک اور سوال سر اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اعتکاف میں بیٹھے گا تو ساجد کا کیا ہوگا؟

''ہاں پتر' یہ تو ہے۔'' حمیدہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

نور بانو پہلے ہی سے یہ سوچ کر ہول رہی تھی کہ دس دن کے لیے عبدالحق کی دید سے محروم ہو جائے گی۔ کئی بار اس نے سوچا کہ چپکے سے عبدالحق کو منع کر دے لیکن ہمت نہیں ہوئی تھی۔ مگر اب اسے سخت غصہ آیا اور سبکی کا احساس بھی ہوا کہ عبدالحق نے اس کی تو کوئی پروا نہیں کی' اور بچے کے لیے فکرمند ہو رہا ہے۔ اس بچے سے اسے ویسے بھی چڑ ہو گئی تھی۔

زبیر اور رابعہ یوں سر جھکائے بیٹھے تھے جیسے ان کے بچے سے کوئی خطا ہو گئی ہو۔

''میں سوچتا ہوں کہ اس سال اعتکاف میں نہ بیٹھوں۔'' عبدالحق نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''اگلے سال بیٹھ جاؤں گا۔''

نور بانو کی برداشت جواب دے گئی۔ ''کمال کرتے ہیں آپ۔ اتنی سی بات کے لیے اعتکاف چھوڑ دیں گے۔''

''دیکھو نا۔ چھوٹا سا بچہ ہے۔ لیکن اپنے مقررہ وقت کو جانتا پہچانتا ہے۔ اس میں چند منٹ کی دیر ہو جائے تو تڑپ کر روتا ہے' تکلیف اٹھاتا ہے۔ دس دن میری صورت نہیں دیکھے گا تو نجانے کیا حال ہوگا اس کا۔''

زبیر اور رابعہ کے چہرے پر کھسیاہٹ تھی اور حمیدہ کے چہرے پر غصہ۔

لیکن نور بانو کو اس وقت کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ''کچھ بھی نہیں ہوگا اسے۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''ننھا سا بچہ ہے۔ الٹا اسے فائدہ ہی ہوگا۔ بگڑی ہوئی عادتیں ٹھیک ہو جائیں گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں سفاکی آ گئی۔

''نور بانو۔'' حمیدہ نے تنبیہی لہجے میں اسے پکارا۔ اس کی نگاہوں میں تنبیہہ تھی۔

''ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں اماں۔ اتنا چھوٹا سا بچہ کچھ سمجھتا تو نہیں ہے نا۔''

''بچے سب کچھ سمجھتے ہیں۔ بس ظاہر نہیں کر سکتے۔ بولتے نہیں ہیں نا۔ پر اشاروں میں' جسم

کی حرکت سے سب کچھ بتا دیتے ہیں۔"

عبدالحق دم بہ خود بیٹھا تھا۔ اسے حمیدہ کی اس روز کی بات یاد آئی' بلکہ سمجھ میں بھی آ گئی۔ اور اسے شاک لگا۔ کیا کوئی اتنے چھوٹے سے بچے سے بھی رقابت محسوس کر سکتا ہے۔

ایک لمحے کو اسے یہ بات بہت سنگین لگی لیکن پھر اگلے ہی لمحے اس نے سوچا' شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔

وہاں سنگین خاموشی چھا گئی تھی۔ پھر اسے رابعہ نے توڑا۔ "نور بی بی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ساجد چھوٹا سا بچہ ہے۔ بچے ضد کرتے ہیں تو انہیں بہلا لیا جاتا ہے۔ ہمیں بہلانا بھی تو سیکھنا چاہیے۔ اور بچے کی عادتیں ویسے بھی بگاڑنی نہیں چاہئیں۔"

عبدالحق کو احساس ہوا کہ رابعہ کو نور بانو کی بچے کے بگاڑ والی بات سے تکلیف ہوئی ہے۔ اب وہ وفادار لوگ تھے...... مالک کے حکم پر اُف بھی نہ کرنے والے۔ شکایت کیا کرتے۔ لیکن اب رابعہ ماں بھی تھی۔ شاید اس وجہ سے اس کے لہجے میں شکایت در آئی تھی۔

"آپ اعتکاف میں ضرور بیٹھیں صاحب" زبیر نے عاجزی سے کہا۔ "اس میں تو ہم سب کی بھلائی ہے۔"

عبدالحق کو ان دونوں پر بہت پیار آیا۔ انہوں نے اس کا راستہ آسان کر دیا تھا۔ نور بانو کی مداخلت کے ساتھ ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ نور بانو کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ وہ تو اسی وقت اعتکاف میں بیٹھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ "ٹھیک ہے۔ آپ لوگوں کی یہی مرضی ہے تو میں اعتکاف میں بیٹھوں گا۔ اللہ مالک ہے۔"

لیکن اس کے ذہن میں ایک پیچیدہ اور سنگین سوال سر اٹھا رہا تھا۔ اگر کبھی اماں کے حکم اور نور بانو کی خواہش میں تصادم ہوا تو اس کا ردعمل کیا ہو گا۔

مگر اس سوال کی پیچیدگی اور سنگینی ایک پل میں ختم ہو گئی۔ اس نے دل میں کہا...... اللہ کے حکم کے بعد بس اماں کا حکم ہے۔ اماں کے حکم کے سامنے کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔

⊛......⊛......⊛

نادرہ جانتی تھی کہ ماہِ رمضان میں وقت کے پر لگ جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ خوش گوار وقت بہت تیزی سے گزرتا ہے۔ اور رمضان کے مہینے سے زیادہ خوش گوار کوئی وقت ہوتا ہی نہیں۔

مگر اس بار وقت کی رفتار اور تیز تھی۔ کام بھی تو بڑھ گئے تھے۔ ارجمند اور اچھو میاں کو قرآن پڑھانے میں وہ زیادہ وقت دیتی۔ پھر اسے ارجمند کے عید کے کپڑے بھی سینے تھے۔ اس کے علاوہ افطار کا پورا اہتمام بھی کرنا پڑتا تھا۔ دوسری لڑکیاں تو اسے ماہِ آزادی کے طور پر منا رہی تھیں۔ جیسے سال بھر کی تھکن اتار رہی ہوں۔

پھر اس روز اس نے ارجمند کو دیکھا' جو اپنی ڈرائنگ کی کاپی لیے بیٹھی تھی۔ وہ اس کے پاس چلی گئی۔ "کیا کر رہی ہو گڑیا؟" اس نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

ارجمند نے جلدی سے کاپی بند کر دی۔ "کچھ نہیں پھپھو۔ ڈرائنگ بنا رہی ہوں۔"

"ہمیں بھی دکھاؤ۔"

"نہیں پھپھو۔" ارجمند نے صاف انکار کر دیا۔

"تم ہمیں منع بھی کر سکتی ہو کسی چیز کے لیے۔" نادرہ نے دل گرفتگی سے کہا۔ "کچھ چھپا بھی سکتی ہو ہم سے۔"

ارجمند نے اس کی بھیگی آنکھیں دیکھیں تو جیسے اس کا دل پگھل گیا۔ ایک لمحے میں بابا' امی' دادا' دادی...... سب لوگ یاد آ گئے۔ اس کی اپنی آنکھیں بھر آئیں' اور وہ نادرہ سے لپٹ گئی۔ "پھپھو...... میں آپ کو کبھی خفا کر سکتی ہوں بھلا۔" اس نے کاپی نادرہ کی طرف بڑھا دی۔

لیکن انداز میں جھجک تھی۔

"نہیں...... رہنے دو۔"

"اب آپ نہیں دیکھیں گی تو میں سمجھوں گی کہ آپ مجھ سے خفا ہیں۔"

"تم سے میں کیسے خفا ہو سکتی ہوں پگلی۔" نادرہ نے اسے تھپتھپایا۔ "تم نہیں جانتیں...... اور شاید سمجھ بھی نہیں سکتیں۔ لیکن میں تو جیتی ہی تمہاری خاطر ہوں۔"

ارجمند سمجھی تو واقعی کچھ نہیں لیکن اس کے حافظے پر وہ آواز' وہ لہجہ اور ایک ایک لفظ ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا۔ "تو پھر دیکھیں نا آپ...... کو میری قسم۔"

نادرہ نے کاپی کھول کر دیکھی' اور حیران رہ گئی۔ وہ ٹھاکر اوتار سنگھ کی تصویر تھی۔ پہلے کے مقابلے میں ڈرائنگ سے اور بہتر ہو گئی تھی۔ اور تصویر اب سو فی صد اوتار سنگھ کی تھی۔ کہیں سر مُو بھی فرق نہیں تھا۔

اس نے کاپی کے ورق الٹے اس کی حیرت بڑھ گئی۔ اس کاپی میں کوئی اور تصویر تھی ہی نہیں۔ ہر تصویر اوتار سنگھ کی تھی۔ "ڈرائنگ تو بہت اچھی ہو گئی ہے تمہاری۔ اب میں تمہیں ولایتی اسکیچ بک اور بہت اچھے کلر منگا کر دوں گی۔"

"سچ پھپھو؟" ارجمند کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔

"ہاں' وہ تمہارا عید کا تحفہ ہو گا۔" نادرہ نے کہا۔ "لیکن گڑیا' تم یہی ایک تصویر کیوں بناتی ہو؟"

"اب میں کوئی اور تصویر بنا ہی نہیں سکتی۔"

"کیوں؟"

"پتا نہیں پھپھو۔ شاید اس لیے کہ ان سے میری شادی ہو گی۔"

نادرہ نے فیصلہ کیا کہ اب اپنی بچی کو سمجھانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ اس نے کہا۔ ”میں نے تمہیں اسی وقت بتا دیا تھا کہ میں انہیں جانتی ہوں۔ یہ کالج میں میرے ساتھ پڑھتے تھے۔“

”جی پھپھو! آپ نے بتایا تھا۔“

”اور میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ ہندو ہیں۔“

”ہو سکتا ہے پھپھو! یہ وہ نہ ہوں' کوئی اور ہوں۔“

”یہ ناممکن ہے گڑیا کہ ہو بہو ایک جیسے دو آدمی دنیا میں۔“

”اگر یہ وہی ہیں تو پھر آپ کی یہ بات غلط ہے کہ وہ ہندو ہیں۔ میں جانتی ہوں' وہ مسلمان ہیں۔“

اس کے اعتماد نے نادرہ کو حیران کر دیا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”مجھے اللہ میاں نے بتایا ہے۔“

نادرہ وحشت زدہ ہو گئی۔ کیا بچی دیوانگی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ”بیٹا نہ اللہ میاں کو کوئی دیکھ سکتا ہے' نہ وہ کسی سے بات کرتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”دیکھا تو میں نے بھی نہیں پھپھو۔ لیکن وہ مجھ سے بات کرتے ہیں۔“

”کیسے؟ کیسی ہے ان کی آواز؟“

”میرے دل سے آتی ہے ان کی آواز۔ اور بالکل میرے جیسی آواز ہے۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”انہوں نے خود مجھے بتایا۔“

نادرہ جھنجھلا گئی۔ ”وہی تو میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔ کیسے بتایا انہوں نے؟“

”میں بہت دعا کرتی ہوں نا پھپھو۔ ایک دن میں نے شکایت کی کہ آپ مجھے جواب نہیں دیتے۔ تو اللہ میاں نے مجھے بتایا کہ میں تمہارے دل میں رہتا ہوں' اور وہیں سے تمہیں جواب بھی دیتا ہوں۔ اور پھپھو! وہ میری جیسی آواز تھی۔ انہوں نے کہا' جب تک تم سچی اور پاک صاف رہو گی' جھوٹ نہیں بولو گی اور میرا کہنا مانتی رہو گی' میں تمہارے دل میں رہوں گا۔ اور بدل گئیں تو چلا جاؤں گا۔“

نادرہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ چھوٹی سی بچی کیسی باتیں کر رہی ہے...... ٹھیک طرح سے جانتی بھی نہیں کہ کیا کہہ رہی ہے لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ سچی ہے۔ ”تم دعا کیا کرتی ہو گڑیا؟“

”میں کہتی ہوں' میں ایسے کسی آدمی سے شادی نہیں کروں گی' جیسے آپ سے شادی کرنے کے لیے آتے رہتے ہیں۔ میں اللہ میاں سے کہتی ہوں کہ وہ جو شہزادے جیسے ہیں' وہ مجھے اچھے لگے۔ مجھے بس ان سے ہی شادی کرنی ہے۔ آپ ان سے میری شادی کرا دیں۔“

نادرہ کا دل بری طرح بجھ گیا۔ ”میں تو مجبور ہوں گڑیا۔ مجھے بھی وہ لوگ اچھے تو نہیں لگتے۔“

ارجمند نے اس کا ہاتھ تھام کر تھپ تھپایا۔ ”میں جانتی ہوں پھپھو! آپ مجبور ہیں۔ اس لیے تو اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ مجھے مجبور نہ بننے دیں۔ مجھے تو بس وہی شہزادہ چاہیے۔“

”پھر تمہیں کیا جواب دیا اللہ نے۔“

”انہوں نے کہا' پاک صاف رہو' سچ بولو اور کہنا مانو۔ وہ تمہیں مل جائیں گے۔ پھر آپ نے کہا کہ وہ ہندو ہیں' تو میں نے اللہ میاں سے کہا کہ آپ انہیں مسلمان کر دیں۔ میں ہندو سے تو شادی نہیں کر سکتی۔ تو انہوں نے کہا' ایسا کبھی نہ سوچنا۔ وہ مسلمان ہیں' اور بہت اچھے مسلمان ہیں۔“

نادرہ نے گہری سانس لی۔ بچی کو سمجھانا بہت ضروری تھا۔ ”دیکھو گڑیا! اللہ سے دعا کیا کرو' ان سے باتیں کیا کرو۔ لیکن ایک بات یاد رکھو۔ ابھی تم بہت چھوٹی ہو۔ خواب اچھے ہوتے ہیں۔ اچھے خواب دیکھنے چاہئیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہم جو خواب دیکھیں' وہ پورا بھی ہو جائے۔ خواب پورا نہ ہو تو بعد میں بہت دکھ ہوتا ہے۔“

”مگر مجھے معلوم ہے پھپھو کہ ایسا ہی ہو گا۔ خود اللہ میاں نے مجھے بتایا ہے۔“

نادرہ پریشان ہو گئی کہ اب کیا کرے۔ اللہ پر اس کے یقین کو متزلزل کرنا تو ظلم تھا' ذرا سوچنے کی بعد اس نے کہا۔ ”دیکھو گڑیا' ابھی تم چھوٹی سی بچی ہو۔ اتنی چھوٹی بچیوں کی شادی تو نہیں ہوتی۔“

”تو پھپھو! میں ہمیشہ بچی تو نہیں رہوں گی۔ بڑی بھی تو ہوں گی۔“

”مگر وہ تمہارا شہزادہ تو اب بھی میرے جتنا بڑا ہے۔“

”تو کیا ہوا۔ میں بڑی ہوں گی تو وہ چھوٹے تو نہیں ہو جائیں گے۔ بڑے ہی رہیں گے۔“

نادرہ کو اس کی معصوم منطق پر ہنسی آ گئی۔ ”چھوٹے تو نہیں ہوں گے۔ مگر بوڑھے ہو جائیں گے۔“

”نہیں پھپھو! مجھے معلوم ہے' وہ بوڑھے نہیں ہوں گے۔“ ارجمند نے کہا۔ پھر کچھ سوچنے لگی۔ ”اور ہو بھی جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔“

”جوان لڑکیوں کی بوڑھے لوگوں سے شادی اچھی نہیں ہوتی۔“ نادرہ نے کہا۔

”ایک بات بتاؤں پھپھو۔“ ارجمند اچانک بولی۔ ”اللہ میاں نے مجھے بتایا ہے کہ مجھ سے شادی کے بعد وہ بڑے ہوں گے۔ میں انہیں بڑا بناؤں گی تو پھپھو اس کا تو مطلب ہے کہ ابھی وہ چھوٹے ہیں۔“

”بھئی عجیب باتیں کرتی ہو تم۔ تم نے دیکھا تو ہے کہ وہ کتنے بڑے ہیں۔ مگر گڑیا' ذرا سوچو۔ وہ یہاں کہیں آئے۔ اتفاق سے تم نے انہیں دیکھ لیا اور انہیں چن بھی لیا۔ اب ضروری نہیں کہ وہ دوبارہ کبھی اس طرف آئیں بھی۔“ دل میں اس نے کہا کہ اچھے لوگ یہاں آتے بھی نہیں۔

''نہیں پھپھو وہ آئیں گے اور مجھے اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ دیکھیں نا' اللہ میاں جھوٹ تو نہیں بولتے۔''

نادرہ کو تھرتھری چڑھ گئی۔ اس نے جلدی سے موضوع بدلا۔ ''اچھا' یہ بتاؤ' تم انہیں کہا کیا کرو گی؟ چچا' ماموں یا بھائی جان؟''

''جی نہیں۔ میں تو انہیں آغا جی کہا کروں گی۔''

نادرہ دہل کر رہ گئی۔ پھر اسے یاد آیا کہ ارجمند' خانم کی باتیں بڑے غور سے سنا کرتی تھی۔ اس سے شہ ملی ہے اسے۔ اس نے سوچا' بات بڑھائے گی تو معصوم بچی نجانے اور کیا کیا کہے۔

''اچھا' باتیں ختم۔ اب تم قرآن پڑھنے کے لیے بیٹھ جاؤ۔''

''جی پھپھو۔''

❁......❁......❁

نادرہ کو ابتدا ہی میں اندازہ ہو گیا تھا کہ اس بار ت کا رمضان اس کے لیے بہت اہم ہے۔ کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہو رہا تھا اسے۔ اس کی ایک نشانی تو اچھومیاں ہی تھے۔ اور اب ارجمند کی یہ باتیں۔ وہ اسے بچے کی بڑ قرار دے رہی تھی لیکن اس کے اندر کوئی حس اسے بتا رہی تھی کہ پس پردہ کچھ ہو رہا ہے...... بلکہ بہت کچھ ہو رہا ہے۔

اس شام افطار کے بعد نیلم بائی نے چپکے سے اس سے کہا۔ ''نرگس' رات کو میرے پاس آنا۔ مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

نادرہ کو اس کے انداز پر حیرت ہوئی۔ مگر اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

عشاء کے بعد وہ نیلم بائی کے کمرے میں گئی۔ نیلم بائی مسہری پر لیٹی تھی۔ اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ ''دروازہ بند کر دو نرگس!'' اس نے کہا۔

حیران نادرہ نے دروازہ بند کیا اور چٹخنی چڑھا دی۔ لیکن اندر ہی اندر وہ ڈر رہی تھی۔

''اب یہاں آ کر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔''

وہ اس کے پاس جا بیٹھی۔ ''کیا بات ہے بوا؟''

''بہت ضروری بات ہے' جو صرف تم سے کر سکتی ہوں میں۔''

نادرہ نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

'میں گھما پھرا کر بات نہیں کروں گی۔ سیدھی اور سچی بات یہ ہے کہ میرا وقت قریب آ گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگلا رمضان میں نہیں دیکھ سکوں گی۔''

نادرہ کے لیے وہ بہت بڑا شاک تھا۔ ''اللہ نہ کرے بوا۔ کیسی باتیں کرتی ہو۔''

''میں جانتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے۔'' نیلم بائی نے زور دے کر کہا۔ ''میں سب کے لیے اتنی

قابلِ نفرت ہوں کہ مجھے کبھی کوئی غور سے دیکھتا ہی نہیں ورنہ سب کو نظر آ جاتا۔'' یہ کہہ کر چپکے چپکے رونے لگی۔

''ارے نہیں بوا۔ ایسی کیا بات ہے۔'' نادرہ نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا لیکن جب اس نے نیلم کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا تو اسے ماننا پڑا کہ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ کم از کم اس حد تک کہ اسے غور سے کوئی دیکھتا نہیں ہو گا۔

نادرہ ہمیشہ حیران ہوتی تھی کہ نیلم بائی چہرے پر اتنا کریم پاؤڈر کیوں تھوپتی ہے۔ مگر اس وقت جو اسے غور سے دیکھا تو پوری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اسے نیلم بائی پر ترس آنے لگا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو اس کی بیماری کا علم ہو۔ اس لیے وہ میک اپ کرتی تھی۔

اس وقت بھی وہ میک اپ کیے ہوئے تھی۔ لیکن غور سے دیکھنے پر نادرہ کو اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے' اندر دھنسے ہوئے گال اور جلد کی کرختگی اور بے رونقی صاف نظر آ گئی۔ اور اس نے ہونٹوں پر سرخی نہیں لگائی تھی۔ چنانچہ صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کے ہونٹ سفید ہو رہے ہیں۔ عام دنوں میں پان کی وجہ سے بھی سرخی کا تاثر بڑھ جاتا تھا۔

نادرہ کو اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ بیمار ہے' اور اس کی بیماری یقیناً سنگین نوعیت کی ہے۔

''ٹھیک ہے بوا۔ یہ تو میں مانتی ہوں کہ تم بیمار ہو۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن تم نے اتنی بڑی بات کیوں کہی کہ تم اگلا رمضان نہیں دیکھ سکو گی۔''

''مجھے معلوم ہے۔''

''اور علاج بھی نہیں کرا رہی ہو؟''

''علاج تو تین سال سے چل رہا ہے۔''

''علاج کس کا ہو رہا ہے۔''

''پہلے تو صرف حکیم جی کا تھا۔ پھر میں اسپتال بھی جانے لگی۔ مگر انگریزی دواؤں سے کچھ فائدہ نہیں۔ حکیم جی کی دوا طاقت دیتی ہے۔ اس پر چلتی رہی ہوں میں۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ اب وقت قریب آ گیا ہے۔''

''پھر وہی بات بوا۔'' نادرہ نے محبت اسے ڈپٹا۔ ''یہ تو بتاؤ بیماری کیا ہے تمہیں۔''

''میں نے اس پر بات کرنے کے لیے تمہیں نہیں بلایا ہے۔'' نیلم بائی نے خشک لہجے میں کہا۔ ''وہ تو ڈاکٹر اور حکیم جانیں۔ میں اور تم اس معاملے میں کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے مرنے کا شوق نہیں۔ کسی کو بھی نہیں ہوتا۔ مجھے تم سے کچھ اور باتیں کرنی ہیں...... بہت ضروری اس کوٹھے کے متعلق۔''

نادرہ متوحش ہو گئی۔ ''کوٹھے کے متعلق؟''

''ہاں۔ یہ کہ میرے بعد کوٹھے کا کیا ہوگا۔''

''کمال کرتی ہو بوا۔ مر رہی ہو اور فکر کوٹھے کی۔'' نادرہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''ارے تم مر گئیں تو کوٹھا ختم ہو جائے گا۔''

''یہی تو نہیں ہوتا۔'' نیلم نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''وہ کہتے ہیں نا کہ آدمی مر جاتا ہے۔ پر دنیا میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ دنیا کا کاروبار پہلے کی طرح چلتا رہتا ہے۔ یہ بات کوٹھے کے لیے سب سے زیادہ سچی ہے۔ طوائف مر جاتی ہے' نائیکہ مر جاتی ہے۔ مگر کوٹھا کبھی ختم نہیں ہوتا۔ تم کیا سمجھ رہی ہو کہ میں مر جاؤں گی' اور تمام لڑکیاں جہاں جی چاہے' چلی جائیں گی۔ یہ کوٹھا ختم ہو جائے گا۔''

''میں تو یہی سمجھ رہی تھی بوا۔''

''غلط سمجھ رہی تھیں۔ یہ کوٹھا جائیداد ہے۔ ہزاروں روپیہ ہے میرے پاس۔ زیورات الگ ہیں۔''

''اور تمہارا کوئی نہیں؟''

نیلم نے افسردگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کوئی اولاد بھی نہیں؟''

نیلم بائی چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''بہت پہلے ایک بچی پیدا ہوئی تھی میرے ہاں۔ میں نے فوراً ہی اس کے منہ پر تکیہ رکھ کر اسے ختم کر دیا تھا۔ کسی کو بھی نہیں معلوم یہ بات۔''

نادرہ دہل کر رہ گئی۔ اس لمحے اسے اس عورت سے ایسی نفرت محسوس ہوئی کہ کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ''تم کتنی ظالم ہو بوا؟''

''مجبور سے زیادہ ظالم کوئی نہیں ہوتا۔ پی اولاد کو ترکے میں گناہ کون دینا چاہتا ہے۔''

''اور اب اس سے پریشان ہو کہ ترکے کا کیا ہوگا۔'' نادرہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''اپنے لیے پریشان نہیں ہوں۔ مرنے والے کو صرف آخرت کی فکر ہوتی ہے۔ میں ان لڑکیوں کے لیے پریشان ہوں' جو میری ذمہ داری ہیں۔ اگر میں یہ سب کچھ یونہی چھوڑ کر مر جاؤں تو پتا ہے' کیا ہوگا۔'' نیلم نے کہا۔ چند لمحے وہ خاموش رہی' جیسے نادرہ کے تبصرے کی منتظر ہو۔ پھر اس نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا۔ ''یہاں مار کٹائی ہوگی۔ لوگ کتے کی طرح لڑیں گے مال پر۔ پھر جو جس کے ہاتھ لگا' وہ لے کر جہاں سینگ سمائے' نکل جائیں گے۔ ہر لڑکی اس مال پر عزت کی زندگی گزارنا چاہے گی۔ لیکن مال بھی گنوائے گی اور رہے گی بھی طوائف کی طوائف۔ بلکہ اور پختہ ہو جائے گی۔ اور اس کوٹھے پر کوئی بھی اثر و رسوخ والا قابض ہو جائے گا۔ یا پھر یہ سرکاری تحویل میں چلا جائے گا اور کسی کو الاٹ کر دیا جائے گا۔ لیکن ہر حال میں رہے گا یہ کوٹھا ہی۔ جیسے

طوائف کی حیثیت کبھی نہیں بدلتی' ویسے ہی کوٹھا بھی ہمیشہ کوٹھا ہی رہتا ہے۔''

نادرہ کے ذہن میں دلدل کا خیال آیا۔ ایک ڈوب گیا تو اس کی جگہ دوسرا ٹخنے ٹخنے دلدل میں کھڑا ہوا۔ ''مگر مر جانے والے کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے بوا۔ تمہیں اس سے کیا۔ جو ہو سو ہو۔''

''یہ تم کہاں سمجھ سکتی ہو ابھی۔''

''دیکھو بوا۔ اب تو میں بھی طوائف ہوں۔ اور موت طوائف کو بھی آتی ہے نا۔ یہ بتاؤ' ایسی صورت حال میں لوگ کیا کرتے ہیں۔''

''کوٹھا لڑکیوں سمیت بیچ دیا جاتا ہے۔''

''تمہارے پاس مال تو پہلے ہی بہت ہے۔ کوٹھا بیچ کر اور مال آئے گا۔ تو تم کیا اسے قبر میں لے جاؤ گی اپنے ساتھ۔'' نادرہ کو کہتے ہی احساس ہو گیا کہ اس نے بڑی سخت بات کہہ دی ہے۔

لیکن نیلم بائی مسکرا دی۔ ''یہی بات تو مجھے پسند ہے تیری۔ کھری اور سچی ہے تُو۔'' اس نے بے تکلفی سے کہا۔ ''میں بتاتی ہوں۔ میں اس مال میں سے کچھ لڑکیوں کو دوں گی۔ لیکن بیشتر کی تجارت کروں گی۔''

''مرنے کے بعد تجارت!''

''ہاں۔ ایک حصہ داتا دربار کے لیے دوں گی۔ دوسرا حصہ مسجدوں کی نذر کروں گی۔ مولوی صاحب کہتے تھے...... اللہ کہتا ہے' مجھ سے تجارت کرو۔ میرے جیسا نفع دینے والا کوئی اور نہیں۔''

''چھی چھی' حرام مال اور اللہ سے تجارت۔''

''دیکھ نرگس۔ بندے نہ جانتے ہیں' نہ سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ سب جانتا ہے۔ میں نیلم بائی کیوں ہوں' اسے معلوم ہے۔ کہتے ہیں' طوائف ماں کے پیٹ سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ پر دنیا میں پہلی بار طوائف ماں کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوئی ہوگی۔ اس کی تو میں قسم کھا سکتی ہوں۔ ہزاروں سال پہلے کسی نے کسی عورت کو پہلی بار طوائف بنایا ہوگا۔ اور اب بھی بنایا ہی جاتا ہے۔ اور طوائف سے عورت بننے کی اس کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا جاتا ہے۔ بلکہ اس کوشش پر سزائیں بھی دی جاتی ہیں۔ تُو بھی نرگس اپنی مرضی سے نہیں بنی۔ اور تجھے نرگس میں نے بنایا۔ تجھے کوئی پہلے نرگس بنا کر میرے پاس لایا تھا۔ اور بیچ کر گیا تھا اور میں نے کبھی اس مال کی' زر و جواہر کی آرزو نہیں کی تھی۔ مگر رنگ تو چڑھتا ہے نا آدمی پر۔ گندگی میں رہے تو آدمی بگڑتا تو ہے۔ میں بھی بہت خراب ہو گئی۔ اب یہ فیصلہ اللہ کرے گا کہ میں کتنی قصوروار ہوں اس میں۔ کسی اور کو تو حق نہیں ہے۔ اس فیصلے کا۔ اب تو بتا کہ میرے پاس حلال کمانے کا کوئی ذریعہ ہے؟ اب میرے پاس حلال کا مال نہیں' اور میرے دل میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا شوق ہے تو میں کیا کروں۔ میرے پاس حرام کا مال ہے تو میں وہ خرچ نہیں کر سکتی اللہ کی راہ میں۔ وہ مالک ہے۔ چاہے تو قبول کر لے۔ میں تو ایک بات جانتی

ہوں۔ایک وہی تو ہے جو ناپاک کو پاک کر دے۔تو کیا میں اس سے امید نہ رکھوں؟"

نادرہ تھرا کر رہ گئی۔واقعی کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ کون کتنا اچھا ہے اور کون کتنا برا۔

"میرے لیے نیکی کے راستے کب سے بند ہیں۔مجھے تو جہنم میں جانا ہی ہے۔مگر یہ تو نہیں کہ ٹوٹی پھوٹی کوشش کرنا بھی چھوڑ دوں۔کون جانے......کون جانے......" نیلم نے چھوٹا سا جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

نادرہ کے وجود میں مایوسی تیر گئی تھی۔"تم نے مجھے کیوں بلایا ہے بوا؟"

"مجھے تیری مدد چاہیے۔"

"کوٹھا بیچنے میں میری مدد کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں کوٹھا بیچنا ہی نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ یہ میری لڑکیوں پر ظلم ہوگا۔" نیلم بائی نے کہا۔پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد جلدی سے بولی۔"مجھے برا، سنگ دل اور ظالم سمجھنا قدرتی بات ہے لیکن میں جانتی ہوں۔بازار میں میرے جیسی کوئی نائکہ ہوتی تو میں کوٹھا دے دیتی۔اب میں کسی کو یہ کوٹھا بیچ دوں تو لڑکیوں پر میری قدر کھلے گی۔پھر وہ کہیں گی......ظلم تو ہم پر اب کیا ہے بائی نے۔" وہ پھر ایک لمحے کو رکی۔"تجھے تو یہی لگے گا کہ میں اپنے منہ آپ میاں مٹھو بن رہی ہوں......"

"نہیں بوا میں یہ بات سمجھتی ہوں۔"

"یہی خوبی تو تیری اچھی لگتی ہے۔ورنہ خوب صورت لڑکیوں کے پاس دماغ کہاں ہوتا ہے۔تُو پڑھی لکھی ہے سمجھ دار ہے۔تجھے خانم یاد ہے نا۔ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے نا۔کتنے دن چلے اس کے دس ہزار۔اور اب کہاں بیٹھی ہے وہ؟"

نادرہ بری طرح چونکی۔"کیا ہوا اسے؟"

"سمن کے کوٹھے پر پڑی ہے۔کبھی ملے تو کہنا اب بھاگ کر دکھائے ذرا۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"سارے جہان کی خبر رکھتی ہوں میں۔خیر...... چھوڑ ان باتوں کو۔میں تو مرنے والی ہوں۔میرے لیے آسان یہی تھا کہ کوٹھا بیچ دیتی لیکن اس میں میری لڑکیوں کے لیے برائی ہے۔"

"تو تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں سب کچھ تیرے نام کرنا چاہتی ہوں۔تُو میری جگہ لے لے۔"

نادرہ کے لیے بہت بڑی حیرت تھی۔اسے سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔"بوا تم مجھے جانتی بھی ہو؟" اس کے لہجے میں چیلنج تھا۔

"ہاں جانتی ہوں۔" نیلم بائی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔"جانتی ہوں کہ تُو کیا کرنا چاہے گی۔اور میں تجھے یہ بھی بتاؤں گی کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔پڑھی لکھی اور سمجھ دار تو ہے تُو۔لیکن دنیا تو نہیں دیکھی ہے تُو نے۔"

"تو مجھے بتاؤ کہ میں کیا کرنا چاہوں گی۔" نادرہ کو یقین نہیں تھا کہ نیلم سچ کہہ رہی ہے۔

"تیرے دماغ میں بہت اچھے اچھے خیال ہوں گے۔" نیلم بائی نے کہا۔"تُو سوچے گی کہ یہاں سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی ہے۔دولت بھی ہے۔اسے گھر سمجھ کر تم سب یہاں عزت سے رہ سکتی ہو۔تُو یہ بھی سوچے گی کہ ان لڑکیوں کو کوئی ہنر بھی دیا جا سکتا ہے جیسے سلائی کڑھائی۔اب میں تجھے بتاتی ہوں کہ یہ ناممکن ہے۔کوٹھا ہمیشہ کوٹھا ہی رہتا ہے۔اس جگہ مسجد نہیں بن سکتی جیسے قبرستان میں پھل دار درخت کبھی نہیں اُگے۔میں جو یہاں بیٹھی ہوں تو صرف اس لیے کہ میرے پیچھے بہت طاقت ور لوگ ہیں۔کوئی جاگیردار ہے تو کوئی بہت بڑا افسر وہ نہ ہوتے تو یہ پولیس ہی ہمیں نوچ کر کھا جاتی۔ان کی وجہ سے پولیس ہماری غلام ہے۔یہ ہماری اور کوٹھے کی حفاظت کرنے والے غنڈے بھی انہی کے ہیں۔ہمارے کوٹھے کی ساکھ انہی کے دم سے ہے۔"

"انہیں تم سے کیا دلچسپی ہے؟"

"دنیا مطلب کی ہے۔ان کا ہم سے کام نکلتا ہے۔اور ہمارا ان سے۔وہ سب بڑے اور شوقین لوگ ہیں۔کوئی محفل سجائیں تو لڑکیاں ہمارے ہاں سے جاتی ہیں۔وہ حاکم لوگ ہیں اور ہم رعایا ہیں ان کی۔اب تُو یہ سوچ کہ بادشاہ کبھی رعایا سے محروم ہونا پسند کرے گا۔کیا وہ یہ چاہے گا کہ رعایا آزاد ہو جائے۔ارے بادشاہت تو ہے ہی رعایا کے دم سے۔اس بازار میں کوٹھا کبھی گھر نہیں بن سکتا۔وہ ایسا کبھی ہونے نہیں دیں گے۔یہ صدیوں کا قائم نظام ہے۔"

"مگر وہ کیسے روکیں گے؟"

"طاقت سے۔غنڈے ان کے پولیس ان کی قانون ان کا۔ہم تو ان کے بغیر کمزور اور بے بس ہیں۔میں یہاں کوٹھا نہ چلاؤں تو وہ مجھے ہٹا دیں گے یہاں سے۔مجھ پر کیس بنا دیں گے۔میں رُلتی پھروں گی۔اور وہ میری جگہ کسی اور کو لا کر بٹھا دیں گے۔"

"مگر یہ تو تمہاری ملکیت ہے۔"

"سمجھنے کی کوشش کر نرگس۔ابھی یہاں ڈاکو گھس آئیں اور سب کچھ لوٹ کر لے جائیں تو؟ اور مجھ سے زبردستی کاغذ پر دستخط کرا لیں تو کیا میں انکار کر سکتی ہوں؟ میں یہ سب کچھ بیچ کر نکل جانا چاہوں تو مجھے لٹنے میں کیا دیر لگے گی۔سن نرگس نظام بنانے والے تبدیلی نہیں آنے دیتے۔آدمی نظام سے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔"

نادرہ کا سر چکرا گیا۔باتیں اس کی سمجھ میں آ رہی تھیں۔وہ سوچ رہی تھی کہ یہ کیسی دنیا ہے۔

''وہ ہمارے سرپرست ہیں۔ سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیں تو ایک معمولی سا پولیس والا تیری ایسی بےعزتی کرسکتا ہے کہ اس کے سامنے کوٹھے پر بیٹھنا' جسم فروشی کرنا تجھے نہایت عزت کا کام لگے گا۔''

نادرہ کی سمجھ یہ بات پوری طرح آ گئی۔ میں جانتی ہوں کہ تجھے ارجمند کی فکر ہے۔ لیکن کوئی موقع ملا تو تُو اسے اس جہنم سے نکال سکتی ہے۔ دوسرے تجھے جسم فروشی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ تُو اپنی مرضی چلا سکے گی۔ کوئی تجھ سے زبردستی نہیں کرسکتا۔ ہاں' سرپرستوں کی بات اور ہے۔ ان کو کبھی انکار نہ کرنا۔ ورنہ سب کچھ کھو دے گی۔ بہت بڑا نقصان ہوگا۔ اب بول۔''

فائدہ تو واقعی بڑا تھا۔ اس کی روحانی اذیت بہرحال کم ہو جاتی۔ اور ارجمند کے معاملے میں فی الوقت تو وہ بےاختیار تھی۔ اس صورت میں اسے اختیار بھی مل جاتا۔ وہ سب کچھ سمجھتی تھی۔ جانتی تھی کہ اب دنیا میں کہیں اسے عزت نہیں مل سکتی۔ لیکن ارجمند کے لیے بہت روشن امکان تھا' اور اس کے لیے وہ دعا بھی بہت کرتی تھی۔ اس وقت اس کی سمجھ میں ایک اہم بات بھی آ گئی۔ اسے ارجمند کو بہت چھپا کر رکھنا تھا۔ ویسے بھی وہ اسے کسی کے سامنے نہیں آنے دیتی تھی۔ اب اس نے فیصلہ کیا کہ ارجمند کو باہر بالکل بھی نہیں جانے دے گی۔ کبھی اللہ کی مہربانی سے ارجمند کو اس جہنم سے نکلنا نصیب ہوا تو نہ صرف یہ کہ وہ پاک صاف ہو۔ بلکہ باہر کوئی اسے پہچاننے والا بھی نہ ہو۔ وہ اس کے لیے اس کوٹھے کا کوئی حوالہ نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

''کس سوچ میں پڑ گئی تُو؟''

نادرہ نے وہ آواز سنی ہی نہیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر ارجمند نہ ہوتی تو وہ یقیناً بہت پہلے ہی خودکشی کرچکی ہوتی۔ بےشک خودکشی حرام ہے۔ لیکن اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ بندوں کی مجبوریوں سے باخبر ہے۔ اور ویسے بھی دو ناگزیر برائیوں میں سے چھوٹی برائی کو منتخب کیا جاتا ہے۔ حرام کاری کی زندگی سے حرام موت بہرحال بہتر ہے۔ نیلم بائی کی پیشکش دلدل میں اترنے کے مترادف تھی۔ طوائف سے نائیکہ کے درجے پر یہ ترقی اسے اچھی تو نہیں لگی تھی لیکن اس میں بہرحال فائدہ تھا۔ ارجمند کے لیے اس میں واضح طور پر بہتری تھی۔

اس نے اس پہلو پر بھی سوچا کہ وہ انکار کر دے اس صورت میں کوٹھا جس کے پاس ہوگا' اس کی نظر ارجمند پر لازمی پڑے گی۔ لڑکیوں کو بڑا ہوتے دیر نہیں لگتی۔ اور وہ بےاختیار ہوگی تو اسے نہ بچا سکے گی۔

یعنی اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ اور اس میں ہی فائدہ تھا۔ عام تماش بینوں سے وہ خود کو بچا سکے گی۔ رہی سرپرستوں کی بات' تو وہ کبھی کبھی کی ہوتی ہے' اور عقل مندی سے کام لے کر انہیں ٹالا بھی جاسکتا ہے۔ اور ارجمند کے نکلتے ہی وہ اپنا فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہوگی۔ اور اپنے لیے اس کا فیصلہ پہلے سے طے شدہ ہے...... موت! اور سچ تو یہ ہے کہ وہ تو اس دن ترین میں ہی

مر گئی تھی۔ ارجمند کو یہاں سے نکال کر وہ بہرحال سکون سے مر سکے گی۔

تو نیلم بائی کی پیش کش قبول کرنا اس کی مجبوری ہے......

''تُو کہاں کھو گئی نرگس؟''

اس بار نیلم بائی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے چونک کر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

''کیا ہوا تجھے۔ میری بات سن بھی رہی ہے یا نہیں۔''

''سن بھی رہی ہوں بوا' اور سمجھ بھی رہی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''بلکہ اسی پر غور کر رہی تھی۔''

''تو کیا فیصلہ کیا تُو نے؟''

''یہ بہت بڑا بوجھ ہے بوا...... میری بساط سے بہت بڑا۔ لیکن یہ بات بھی سمجھتی ہوں کہ تم ہم سب کے لیے بہت اچھی ہو' اور تم جیسا کوئی اور ہمیں نہیں ملے گا۔ دوسری لڑکیاں بےشک نہ سمجھتی ہوں' میں جانتی بھی ہوں اور سمجھتی بھی ہوں۔''

نیلم نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''میں تجھے پہلے دن ہی سمجھ گئی تھی کہ عقل مند بھی ہے اور حقیقت پسند بھی۔ تُو نے مزاحمت نہیں کی۔ پہلے ہی دن سمجھ لیا کہ بات میری یا اس کوٹھے کی نہیں۔ اب تو کسی کام کی نہیں رہی۔ تو بےکار مزاحمت کا کیا فائدہ۔''

''بڑی ذمہ داری ہے بوا۔ لیکن قبول کرنے کے سوا کوئی راستہ بھی میرے سامنے نہیں۔''

نیلم مسکرائی۔ ''لیکن میری کچھ شرطیں ہیں۔''

نادرہ چونکی۔ ''لو...... شرطیں کہاں سے آ گئیں۔''

''میں نے کہا نا کہ میں تجھے پہلے دن ہی سمجھ گئی تھی۔ میں تجھے پوری طرح سمجھتی ہوں۔ تُو نے یہاں مزاحمت نہیں کی تو صرف ارجمند کی خاطر۔ تُو یہاں زندہ رہی تو صرف ارجمند کی خاطر۔ ورنہ تُو خودکشی کرلیتی۔ یہ اور بات ہے کہ میں کرنے نہیں دیتی۔ میری تجھ پر گہری نظر تھی۔'' نیلم سانس لینے کے لیے رکی۔ پھر دوبارہ گویا ہوئی۔ ''اب تُو میری پیشکش قبول کر رہی ہے تو صرف ارجمند کی خاطر۔''

''تو اس میں کیا برائی ہے...... قبول تو کر رہی ہوں نا۔''

''مجھے دور تک دیکھنا ہے' اور تجھے ارجمند سے آگے کچھ دکھائی نہیں دیتا میں جانتی ہوں کہ جس دن تو نے ارجمند کو محفوظ ہاتھوں میں دے دیا' اس دن کے بعد تُو ایک پل بھی اس قید کو قبول نہیں کرے گی۔ تجھے دوسری لڑکیوں کی کوئی پروا نہیں ہوگی۔''

''اس کوٹھے سے نکل جانا میرے مسئلے کا حل نہیں ہے بوا۔ ایسا ہوتا تو میں نے نکلنے کی کوشش تو کی ہوتی۔'' نادرہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اور جس دن خانم یہاں سے گئی ہے' اس روز تم نے سب کو پیشکش کی تھی۔ میں اس دن ہی قبول کر لیتی۔''

"میں نے کہا نا کہ میں تجھے جانتی ہوں۔ تجھے معلوم ہے کہ اس کوٹھے سے باہر تیرے لیے ایک اور کوٹھا...... بہت بڑا کوٹھا' جس میں نہ دروازہ ہے' نہ چار دیواری۔ یہ ایک روندنے والا ہے تو وہاں ہزار ہیں۔ مجھے یہ ڈر نہیں ہے کہ تُو ارجمند کے محفوظ ہو جانے کے بعد یہ کوٹھا چھوڑ کر چلی جائے گی لیکن ارجمند کے جانے کے بعد......"

"تم کیسی باتیں کرتی ہو بوا۔ ارجمند کا یہاں سے نکلنا کوئی آسان ہے کیا۔" نادرہ نے یاس بھرے لہجے میں کہا۔ "جبکہ میرا تو اس دنیا میں کوئی جاننے پوچھنے والا بھی نہیں بچا۔ کون آئے گا اسے بچانے۔"

"ظاہر میں تو ایسا ممکن نظر نہیں آتا۔ لیکن میں دعاؤں کی تاثیر جانتی ہوں۔ گندگی میں بڑے پاک صاف اور بے بس آدمی کی دعا اللہ کے ہاں بہت جلدی قبول ہوتی ہے' اور ضرور قبول ہوتی ہے۔"

نادرہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔ کاش ایسا ہی ہو۔ اس نے دل میں سوچا۔ "اللہ جانے بوا۔ لیکن اللہ کی مہربانی سے ایسا ہوا تو بھی میں اپنی زندگی میں کوٹھے سے باہر قدم نہیں رکھوں گی۔"

"مجھے تیری بات پر یقین ہے۔" نیلم نے کہا۔ "لیکن اللہ کو گواہ بنا کر ایک وعدہ تجھے مجھ سے کرنا ہوگا۔"

"بولو بوا۔" نادرہ نے آہستہ سے کہا۔ اسے عجیب سا احساس ہو رہا تھا' جیسے نیلم بائی اسے آر پار دیکھ رہی ہو۔

"یہ کہ تو اپنی جان نہیں لے گی کبھی۔ خودکشی نہیں کرے گی۔"

نادرہ سناٹے میں آ گئی۔ کتنی تیز اور خطرناک عورت ہے یہ نیلم بائی۔ کیسے جانتی ہے اسے۔ پوری طرح سے واقف ہے۔ کیسے اس نے جان لیا کہ ارجمند کے نکلتے ہی وہ کیا کرے گی۔ اور یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ نیلم یہ بات سمجھ لے گی۔ اس لیے اب فوری طور پر اس کے پاس کہنے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔

نیلم اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ "کیا ہوا؟ کچھ بولتی کیوں نہیں؟"

نادرہ خاموش رہی۔ کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں اس کے پاس۔

"تو مجھے مجبوراً کوٹھا بیچنا پڑے گا۔" نیلم نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"میں نے کہا نا کہ میں نے تمہاری بات مان لی ہے۔" نادرہ بولی۔

"نہیں نرگس' میں سب کچھ تجھے سونپ رہی ہوں...... پورے اختیار کے ساتھ۔ تو ایسے تو نہیں سونپوں گی۔ پہلے میری شرط پوری کر۔ اللہ کو گواہ بنا کر مجھ سے وعدہ کر کہ تُو نہ کبھی کوٹھا چھوڑ کر جائے گی اور نہ ہی خودکشی کرے گی۔"

"اور میں وعدہ کر کے مکر جاؤں تو کیا کر لو گی؟"

"ایسا ہوگا ہی نہیں۔ تو اللہ کو گواہ بنا کر جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتی۔"

"ہم جہاں بیٹھے ہیں بوا' یہاں اللہ کا کتنا خیال کیا جاتا ہے' کتنا لحاظ رکھا جاتا ہے۔" نادرہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

"کوئی نہ رکھے' تُو تو پھر بھی رکھتی ہے نا۔ تُو تو یہاں بھی قرآن پڑھتی اور پڑھاتی ہے۔"

"ارجمند مجبوری ہے بوا۔ اس کے لیے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ جھوٹا وعدہ بھی کر سکتی ہوں۔"

"جھوٹا وعدہ کرنے والے اتنا جھجکتے سوچتے نہیں۔ جھوٹا وعدہ کرنا ہوتا تو تُو فوراً ہی کہہ دیتی کہ مجھے منظور ہے۔"

نادرہ کے دل کو ماننا پڑا کہ نیلم بائی کو آدمی کی پکی پہچان ہے۔ وہ اب بھی سوچ رہی تھی۔ اس کی دعائیں اپنی جگہ' لیکن بہ ظاہر اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ وہ ارجمند کو یہاں سے نکال پائے گی۔ اور اگر وہ نکال پائی تو کوٹھے کی سب سے بڑی اتھارٹی ہونے کے ناتے اس کے تحفظ کے لیے تو کچھ کر سکے گی...... نہیں بہت کچھ کر سکے گی۔ لیکن کوٹھا کسی اور کے اختیار میں گیا...... تو جو کوئی بھی ہو' نیلم بائی سے ہزاروں گنا بدتر ہوگا' تب تو وہ ارجمند کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکے گی۔ بلکہ اپنے اختیار کی وجہ سے تو وہ خود کو بھی بچا سکے گی۔

اس کے باوجود وہ سودا مہنگا لگ رہا تھا۔ وہ تو عمر قید کی سزا تھی...... اور نیلم بائی جیسا متوقع انجام!

نیلم بائی اس کے فیصلے کی منتظر تھی' وہ غور سے اس کے چہرے پر نظر جمائے اس کے پل پل بدلتے رنگ دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ وہ جانتی تھی' فیصلے میں جتنی دیر لگے گی' فیصلہ اتنا ہی مستحکم ہوگا' اور اس کے حق میں ہوگا۔

نادرہ تولتی رہی...... بار بار تولتی رہی۔ لیکن ہر بار ترازو کا وہی پلڑا جھک رہا تھا۔ نیلم کی بات نہ ماننے کی صورت میں جو کچھ ہو سکتا تھا' اس کے مقابلے میں عمر قید بھی بہت ہلکی تھی۔

پھر اس نے سوچا کہ ظاہری امکانات اپنی جگہ' اصل فیصلہ تو اللہ کا ہے۔ بہتری کا یہ راستہ بھی اس نے نکالا ہے۔ اس پر قدم رکھنا چاہیے۔ آگے بھی بہتری ہی ہوگی۔ اور پھر دعا کا حق تو اسے حاصل ہے۔

اس نے گہری سانس لے کر نظریں اٹھائیں اور نیلم بائی کو دیکھا۔ "ٹھیک ہے بوا۔ میں اللہ کو گواہ بنا کر وعدہ کرتی ہوں کہ نہ کبھی کوٹھا چھوڑ کر جاؤں گی اور نہ اپنی جان لوں گی۔"

نیلم مسکرائی۔ "اللہ اس فیصلے کو تیرے اور ارجمند کے لیے مبارک کرے' عید کے بعد میں وکیل کو بلوا کر کاغذات تیار کراؤں گی۔ تاکہ سب کچھ قانونی ہو جائے۔ پھر یہ سب کچھ میری موجودگی میں بھی تیرا ہوگا۔" اس نے گہری سانس لی اور پھر بولی۔ "اب شاید میں سکون سے

مر سکوں گی۔''

❁.......❁.......❁

وہ اعتکاف میں عبدالحق کا پہلا دن تھا!

مولوی مہر علی اس کے رہنما تھے۔ اس کے لیے دو طرف چادریں تان کر ایک گوشے میں حجرہ سا بنا دیا گیا تھا۔ دو طرف مسجد کی دیواریں تھیں۔ خود مولوی صاحب مخالف سمت میں بیٹھے تھے۔

رات کو مولوی صاحب نے اسے تفسیر ابن کثیر لا کر دی۔ ''اس دوران تم اس کا مطالعہ کرو' انشاءاللہ تمہارے لیے فہم اور علم کے دروازے کھل جائیں گے۔ یاد رکھو کہ رُوئے زمین پر قرآن تمام علوم کا منبع ہے۔''

''جزاک اللہ مولوی صاحب۔'' عبدالحق نے کہا۔ ''ایک بات بتائیں۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اعتکاف بے شمار پابندیوں کا نام ہے۔''

''روزہ بھی بے شمار پابندیوں کا نام ہے۔ ہے کہ نہیں۔'' مولوی صاحب نے جواب دیا۔ ''الگ الگ شمار کریں گے تو تب بہت سی چیزیں بھول سکتے ہیں۔ مگر اس کے لیے سادہ سی ایک بات ہی کافی ہے۔ رمضان تزکیۂ نفس کے لیے ہے۔ مختصراً یوں کہہ لو کہ نفس کے ہر تقاضے اور مطالبے کو اللہ کی خوشی کی خاطر روک دینا روزہ ہے۔ تو جن کا نفس بے لگام ہو' ان کے لیے روزہ زیادہ سخت ہے۔ اب ایک بات اور کہوں۔ رمضان کا مہینہ آدمی کے لیے بہ تدریج ذاتی اصلاح اور نفس کو زیر کرنے کا مہینہ ہے۔ یہ ٹھہراؤ کا متقاضی ہے۔ عید کا چاند نظر آتے ہی نفس کو لاڈلے بچے کی طرح آزاد چھوڑ دیا تو کیا فائدہ۔ جو پابندیاں تیس دن میں قبول کرو' انہیں آگے بھی لے جاؤ۔ ہر بار نفس کی کم از کم ایک طلب کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تو اصلاح کا عمل جاری ہو جائے گا۔ اللہ نے نفس کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے قلب' جسم اور روح کو پہنچنے والے نقصانات کے ازالے کا موقع فراہم کرنے کے لیے یہ بابرکت مہینہ عطا فرمایا ہے۔ روزے اور فاقے میں بہت فرق ہے۔ فاقہ مجبوری ہے' اور روزہ اللہ کی رضا کے لیے ہے۔ سو فاقے میں کمزوری ہے اور روزے میں طاقت۔ تو تیس دن میں نفس پر جتنا قابو پایا' اگر رمضان کے جاتے ہی خود کو آزاد کر دیا تو فائدہ محدود ہو گیا۔ اور اگر ایک برائی پر بھی مستقل طور پر قابو پا لیا تو فائدہ ہے۔ زندگی اپنی برائیوں سے لڑنے کا نام ہے۔ اس لڑائی سے خوش ہو کر اللہ بندے کی برائیاں دور کرنے میں مدد فرماتا ہے۔ اور انعام کے طور پر نیکیاں عطا فرماتا ہے۔ اور یہ رمضان کا مہینہ اس کام کے لیے خاص ہے۔ اللہ کی رحمت اس مہینے میں موسلا دھار برستی ہے۔

''اور جیسے ہر چیز کا ایک ست ہوتا ہے...... ماحصل ...... جوہر خاص۔ تو رمضان کا ست یہ آخری عشرہ ہے کہ اس عشرے میں وہ پانچ مبارک راتیں ہیں' جو تمام راتوں سے افضل ہیں۔ ان

پانچ راتوں میں وہ ایک مبارک رات ہے' جسے اللہ نے قرآن میں ہزار مہینوں سے افضل قرار دیا ہے۔ جو شخص ذرا سا بھی علم رکھتا ہے' وہ ان راتوں کو کبھی ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن دنیا بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ ہزار پا ہے' جو آدمی کے وجود کو اپنے پنجوں میں جکڑ لیتا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی کام' کوئی بھی ضرورت آدمی کو لاحق ہو کر اسے اللہ کی راہ سے روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ اس سے کامیابی سے لڑ بھی لے تو اس کی یک سوئی میں فرق پڑتا ہے۔ اور یک سوئی کی بڑی اہمیت ہے۔ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی توصیف فرمائی ہے کہ وہ ساری دنیا سے کٹ کر یک سوئی کے ساتھ اس کے ہو رہے۔ اور یہ اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔

''اب یہاں اعتکاف کی اہمیت سامنے آتی ہے۔ قرآن میں ذکر ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چالیس راتوں کے لیے کوہِ طور پر طلب فرمایا۔ آپ اپنے اور امت کے تمام معاملات اور ذمہ داریاں ہارون علیہ السلام کو سونپ کر چلے گئے۔ اب سوچو' وہ اعتکاف ہی تو تھا۔ سب کچھ چھوڑ کر' بھول کر' یک سو ہو کر اللہ سے لو لگانا۔

''ہم عام بندوں کے لیے نماز اللہ کی رحمت ہے۔ وہ نماز میں ہم پر توجہ فرماتا ہے۔ ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ سمیع و بصیر وہ خبیر' علیم وہ بذات الصدور ہماری طرف متوجہ ہے۔ دنیاوی اصولوں میں بادشاہ کے حضور بے دھیانی اور بے توجہی گستاخی ہے' جس کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے۔ اور نماز میں تو ہم بادشاہوں کے بادشاہ' کائنات کے واحد اور احد مالک کے رُوبرو ہوتے ہیں۔ اور ہمارے دلوں میں دنیا گھسی ہوتی ہے' دماغ میں دنیا کے مسائل کلبلا رہے ہوتے ہیں۔ ہم اللہ کی حمد و ثنا کر رہے ہوتے ہیں نماز میں' لیکن ہمارے قلب و ذہن میں اللہ کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ مگر وہ رحمٰن رحیم و کریم ہے۔ اس گستاخی پر نہ صرف درگزر فرماتا ہے۔ بلکہ چاہے تو وہ ٹوٹی پھوٹی نماز اپنی بارگاہ میں قبول بھی فرما لیتا ہے۔

''تو پتر' ہم عام بندوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہوں' رکوع و سجود و قعود میں ہوں تو دنیا سے کٹے ہوئے اور ایک سو ہوں۔ لیکن ہم یک سوئی کی اہمیت نہیں سمجھتے ہاں' دنیا کے لیے یک سو ہو جاتے ہیں۔ تو دنیا سے کٹ کر یک سو ہونے اور اللہ کی طرف توجہ مرکوز کرنے کی تربیت کا نام ہے اعتکاف۔

''اعتکاف ظاہری بھی ہے اور باطنی بھی۔ اب باطن کا حال تو صرف اللہ جانتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ظاہری اعتکاف تبلیغ کے لیے ہے کہ لوگ دیکھیں' اس کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کی طرف راغب ہوں۔''

عبدالحق سحر زدہ سا سن رہا تھا۔ ''مولوی صاحب' ظاہری اعتکاف کیا ہے؟''

''دیکھو پتر' اللہ تو ہر جگہ موجود ہے نا۔ آپ ہزاروں کے مجمع میں بھی یکسو ہو کر اس کے

ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ تو بہت بعد کے مرحلے ہیں' اور اللہ جسے چاہے' نواز دے۔ رب سے ملنے کا مزہ تو خلوت میں ہی ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ آپ کے لیے جلوت بنا دے۔ تو آپ گھر کا عیش و آرام چھوڑ کر اس دن کے لیے مسجد کے اس گوشے میں آجاتے ہیں' سب کچھ بھول کر اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے کلام کو پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سوتے ہیں تو صرف اس کے لیے عبادت کے لیے تازہ دم ہو جائیں۔ آپ اس گوشے سے نکلتے ہیں تو چہرے کو ڈھانپتے ہیں۔ کیوں؟ تاکہ لوگوں کی نظریں آپ کے چہرے پر نہ پڑیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ آپ اپنے رب کی خلوت میں ہیں۔ وہ آپ کو دیکھتا ہے تو آپ کے چہرے کو کائنات کا سب سے حسین رنگ ملتا ہے۔ آپ نہیں جانتے کہ لوگوں کی نظریں اس رنگ کے پختہ ہونے سے پہلے آپ پر پڑیں اور وہ رنگ خراب ہو۔ آپ کسی سے بات نہیں کرتے کہ آپ کی یکسوئی متاثر نہ ہو۔ آپ بغیر ضرورت کے اپنے اس گوشے سے باہر نہیں نکلتے۔ یہ ظاہری اعتکاف ہے۔"

"لیکن مولوی صاحب' میں اور آپ بھی تو باتیں کر رہے ہیں؟" عبدالحق نے اعتراض کیا۔

"محفل اللہ کے ذکر کی ہو تو وہ بھی خلوت ہوتی ہے۔ محفل میں شریک ہر یک سو شخص کے لیے خلوت ہوتی ہے۔ ہاں' مجھے اور تمہیں دنیا کی بات نہیں کرنی چاہیے۔ مجبوری ہو تو اور بات ہے۔ اللہ سب جانتا ہے اور وہ معاف کرنے والا ہے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ اپنے گھر والوں کے لیے دن کی ضرورتیں بہم پہنچاؤ' پھر اعتکاف کے لیے آؤ۔ تاکہ دنیا کا تم پر کوئی قرض نہ ہو۔"

"اب رات کو آپ نے پہلی طاق رات گزاری۔ آپ گھر میں تو اتنے یک سو ہو کر یہ رات نہیں گزار سکتے تھے نا پتر۔ یہاں اس گوشے میں رات بس آپ تھے اور آپ کا رب۔ اللہ آپ کے اعمال قبول فرمائے اور ان میں اضافہ فرمائے۔ یہاں آپ اللہ کے مہمان ہیں۔ گھر کے کسی آدمی یا کسی بھی فرد سے دس پندرہ منٹ بات کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ آپ کی ہر دھڑکن' ہر سانس' ہر بات صرف اور صرف اللہ کے لیے ہو۔"

عبدالحق پُرسکون ہو گیا۔ ویسے بھی اللہ کی رحمت تھی کہ اسے یہاں آنے کے بعد نور بانو کی یاد بھی نہیں آئی تھی۔

مولوی صاحب نے اسے صلوٰۃ التسبیح سکھائی اور اس کی فضیلت کے بارے میں بتایا۔ یہ نماز پڑھ کر اسے احساس ہوا کہ ارتکاز کے لیے یہ نماز نہایت مؤثر اور مبارک ہے۔

شام کو زبیر اس کے لیے افطاری لے کر آیا۔ نماز کے بعد عبدالحق نے اسے افطاری کے لیے ساتھ بٹھا لیا۔ لیکن اسے محسوس ہوا کہ زبیر کچھ پریشان ہے۔ مولوی صاحب بھی ساتھ ہی بیٹھے تھے۔

"کیا بات ہے زبیر بھائی' کچھ پریشان لگ رہے ہو۔" عبدالحق نے پوچھا۔

"کچھ نہیں صاحب ایسی کوئی بات نہیں۔"

لیکن مولوی صاحب نے بھی دیکھ لیا کہ زبیر کے چہرے پر ہوائیاں بھی اُڑ رہی ہیں۔ "کوئی پریشانی کی بات ہے خدانخواستہ تو بتاؤ۔" انہوں نے بھی کہا۔

"کوئی بات نہیں مولوی صاحب۔"

لیکن عبدالحق خود پریشان ہو گیا۔ "تم نہیں بتاؤ گے زبیر بھائی تو میں پریشان ہو جاؤں گا۔ جبکہ یہاں یک سوئی ضروری ہے۔"

زبیر اب بھی ہچکچا رہا تھا۔ مولوی صاحب نے سخت لہجے میں کہا۔ "پتر عبدالحق ٹھیک کہہ رہا ہے زبیر۔ اس کی یک سوئی میں خلل پڑے گا۔ جو بات بھی ہے' کھل کر بتا دو۔"

"وہ ساجد مسئلہ بن گیا ہے صاحب۔" زبیر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

عبدالحق تو تڑپ گیا۔ "کیا ہوا اسے؟"

"وہی بگڑی ہوئی عادتیں صاحب۔" زبیر کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔ "رات میں تراویح پڑھ کر گیا تو وہ جاگ رہا تھا۔ آپ کی راہ تک رہا تھا۔ بہت بہلانے کی کوشش کی۔ سب نے ہی جتن کر لیے۔ پر وہ نہیں سویا۔ دو بجے رات مجبور ہو کر سویا۔ صبح اپنے وقت پر اٹھ گیا۔ دوپہر کو پھر اپنے وقت پر وہی حال ہوا اس کا۔ ہم آپ کے کمرے میں بھی نہیں لے گئے اسے کہ شاید اس طرح بھول جائے۔ پر وہ تو بری طرح ہاتھ پاؤں چلا کر جیسے ضد کر رہا تھا وہاں جانے کی۔ میں گود میں لے کر ٹہلتا رہا۔ پر وہ تو بس روئے جا رہا تھا۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔"

"ایک ہی دن میں کمزور ہو گیا ہے صاحب۔" زبیر نے کہا۔ پھر جلدی سے اسے دلاسہ دیا۔ "مگر آپ فکر نہ کریں صاحب۔ نا سمجھ بچہ ہے دو تین دن میں سنبھل جائے گا۔"

مولوی صاحب کچھ سمجھے' کچھ نہیں سمجھے۔ "مسئلہ کیا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں مولوی صاحب۔ غلطی میری ہے۔" عبدالحق نے شرمندگی سے کہا۔ "پہلی بار کسی بچے کو دیکھا تھا۔ اچھا لگا۔ اپنی خود غرضی میں اسے اپنا عادی بنا دیا......"

"ایسے نہیں کہتے صاحب۔" زبیر نے تڑپ کر کہا۔

"نا پتر' ایسے نہیں کہتے۔" مولوی صاحب نے بھی عبدالحق کو ٹوکا۔ "یہ تو ہمارے پیارے نبی ﷺ کی سنت ہے۔ حضور ﷺ بچوں سے محبت فرمایا کرتے تھے۔ ہمیشہ ان کی دل جوئی کرتے۔ اپنے نواسوں کا گھوڑا بنتے......"

عبدالحق کو تایا جی اور چاچا جمال دین کا خیال آ گیا۔

"......ان کی نماز میں دخل اندازی بھی گوارا کر لیا کرتے تھے۔" مولوی صاحب نے اپنی

بات پوری کی۔ پھر بولے۔ ''خیر...... مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ۔'' عبدالحق نے انہیں اپنے ساتھ ساجد کے معمولات کے بارے میں بتایا۔

''تم نے ظلم کیا پتر عبدالحق۔ اتنا چھوٹا بچہ ہے وہ' جسے سمجھایا بھی نہیں جا سکتا۔ تمہیں اعتکاف میں بیٹھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔'' مولوی صاحب بولے۔

''میں نے بھی یہی کہا تھا۔ لیکن......'' عبدالحق کہتے کہتے رک گیا۔ اب مولوی صاحب کو کیا بتاتا کہ اس بات پر نور بانو نے کیا کہا تھا۔ اسے تو حیرت اس بات پر تھی کہ مولوی صاحب برعکس بات کر رہے ہیں۔ ''میں اس کی خاطر اعتکاف چھوڑ دیتا۔'' اس نے حیرت سے کہا۔

''میں نے کہا نا پتر کہ اعتکاف دکھاوا نہیں۔ اس میں یک سوئی چاہیے۔ یاد ہے' میں نے کہا تھا کہ گھر کی سب ضرورتیں پوری کر کے آدمی اعتکاف میں بیٹھے۔ اب یہ بھی تو ضرورت ہی ہے گھر کی۔''

''مگر مولوی صاحب' اعتکاف تو عبادت ہے......''

''یہ بات سمجھ لو پتر کہ اعتکاف فرض کفایہ ہے۔ علاقے سے ایک دو آدمی بیٹھ جائیں تو پورے علاقے کی کفایت کرتے ہیں۔ ہر فرد پر فرض لازم نہیں ہے یہ۔ اور پھر عبادت کی بات کرتے ہو تو اللہ کی مہربانی کا یہ عالم ہے کہ بندہ اللہ کو پیشِ نظر اور مقدم رکھے تو اس کا ہر کام عبادت ہے۔ اپنے گھر کی ضرورت پوری کرنے کے لیے رزقِ حلال کی جستجو کا ہر لمحہ مقبول ترین عبادت ہے۔ اپنے کسی مسلمان بھائی کی عیادت کرنا عبادت ہے۔ بیمار بھائی کی عیادت کو جاؤ تو اٹھنے والا ہر قدم عبادت ہے۔ کسی سے اللہ کو خوش کرنے کی خاطر محبت کرو تو عبادت ہے۔ بنیادی بات بس اللہ سے تعلق کی ہے۔''

''تو اب کیا کیا جائے؟'' عبدالحق نے کہا

''کچھ بھی نہیں صاحب۔ جیسے عادتیں بگڑی تھیں' ٹھیک بھی ہو جائیں گی۔'' زبیر نے جلدی سے کہا۔

''کمزور ہو جائے گا۔ خدانخواستہ کہیں......''

''تم اس عذر کی بنیاد پر اعتکاف سے نکل بھی سکتے ہو پتر۔''

''کیا یہ ممکن ہے؟''

مولوی صاحب کو عبدالحق کی ہچکچاہٹ کا احساس ہو گیا۔ اور وہ اسے سمجھ سکتے تھے۔ وہ اس کا پہلا اعتکاف تھا' اور وہ اس سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسری طرف اسے زبیر کا اور بچے کا خیال بھی تھا۔ وہ عجیب گومگو کی کیفیت میں ہو گا۔ ''ہاں پتر' ممکن ہے۔ اگر بچے کو کسی بڑے نقصان کا ڈر ہو تو پھر تم اعتکاف جاری نہیں رکھ سکتے......''

''مگر ایسی کوئی بات نہیں مولوی صاحب۔'' زبیر تڑپ کر بولا۔

''لیکن اب پتر عبدالحق کا دل تو بچے میں ہی اٹکا رہے گا نا۔''

عبدالحق نے تائید میں سر ہلایا۔ یہ بات سو فی صد سچی تھی۔

مولوی صاحب چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر بولے۔ ''ایک صورت اور ہے۔ تم نے بتایا کہ تمہارا بچہ دو مخصوص وقتوں میں پتر عبدالحق کا عادی ہے۔'' انہوں نے زبیر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''تو ان دو وقتوں میں تم بچے کو پتر عبدالحق سے ملوانے کے لیے یہاں لا سکتے ہو۔ یوں بچہ بھی خوش رہے گا۔ اور پتر عبدالحق کے اعتکاف میں بھی خلل نہیں پڑے گا۔''

''لیکن مولوی صاحب' صاحب تو یہاں تو اللہ کی خاطر......''

''یہ بھی عبادت ہی ہو گی زبیر پتر۔'' مولوی صاحب نے کہا۔ ''اور کون جانے' اللہ کے ہاں اس کا اجر پورے اعتکاف سے بھی بڑھ کر ملے۔ خلقِ خدا کے کام آنا' اس کا خیال رکھنا بھی بہت بڑی عبادت ہے۔''

''لیکن مولوی صاحب' چھوٹا بچہ ہے۔ پیشاب پاخانہ بھی کر سکتا ہے۔''

مولوی صاحب نے صرف ایک پل سوچا۔ ''پیشاب پاخانہ کرا کے لاؤ تو انشا اللہ کچھ نہیں ہو گا۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اپنے گھر کی پاکی کا وہ خود خیال رکھتا ہے۔ ہاں' ہمیں اپنے طور پر احتیاط کرنی چاہیے۔ روئی سب کچھ جذب کر لیتی ہے۔ اس کے لیے روئی کے دبیز پوتڑے بنوا لو۔ پھر کچھ ہوا بھی تو زیادہ سے زیادہ پتر عبدالحق کے کپڑے خراب ہوں گے۔''

''وہ کوئی مسئلہ نہیں۔ میں غسل کر کے کپڑے بدل لوں گا۔'' عبدالحق نے جلدی سے کہا۔

''بس تو تم تراویح کے بعد بچے کو لے آنا۔ پتر عبدالحق مسجد کے صحن میں چلے جانا تم۔''

زبیر بھی ہچکچا رہا تھا۔ اس نے دونوں کے چہروں کو دیکھا۔ پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے مولوی صاحب۔''

❀......❀......❀

گھر کا عجیب حال تھا۔ رابعہ اور زرینہ تو بچے کو سنبھالنے میں لگی تھیں۔ نور بانو البتہ ان سے الگ تھلگ تھی۔

پھر زبیر کپڑا اور روئی لے کر آیا تو ننھے ساجد کی اعتکاف میں عبدالحق سے ملاقات کا اہتمام شروع ہو گیا۔ حمیدہ کے چہرے پر رونق آ گئی۔

یہ کام اس نے اپنے ذمے لے لیا۔

''کوئی پریشانی تو نہیں ہو گی اماں؟''

''ارے نہیں۔ جیسے سینہ بند تیار کیا جاتا ہے...... دو طرف کپڑا اور درمیان میں روئی۔ پھر اس

میں ڈورے ڈال دیے جاتے ہیں ویسے ہی میں ساجد کے لیے پوتڑے بنا دوں گی۔" حمیدہ نے کہا۔ "تُو تراویح پڑھ کر آئے گا تو انشاءاللہ تیرا بچہ تیار ملے گا۔"

حمیدہ نے حساب کتاب سے کپڑے میں سے دو برابر کے ٹکڑے کاٹے۔ پھر ان کے درمیان روئی کی تہیں جمانے لگی۔

"میں بھی کاٹوں اماں؟" نور بانو نے پوچھا۔

"نہیں...... اس کی ضرورت نہیں۔"

نور بانو کچھ کھسیا گئی۔ وجہ تو وہ جانتی تھی، پھر بھی اس نے حمیدہ سے پوچھا۔ "تم مجھ سے ناراض ہو اماں؟"

"تو اور کیا خوش ہوں۔ یہ سب تیری وجہ سے ہی تو ہو رہا ہے۔ بچے کی جان کے لالے پڑ گئے۔"

"میرا کیا قصور ہے اماں۔" نور بانو نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"تو اور کس کا قصور ہے۔" حمیدہ جھنجلا گئی۔ "میں تو اسے روک رہی تھی اعتکاف سے۔ تُو ہی اچھل کر بیچ میں آ گئی تھی۔ عبدالحق نے خود بھی یہی فیصلہ کیا تھا۔ تُو نے کہا، اس بچے کے لیے اعتکاف چھوڑ دیں گے آپ......"

"تو اماں، میں نے ان کے بھلے کے لیے کہا تھا......"

"جانتی ہوں میں۔" حمیدہ کے لہجے میں حقارت تھی۔ "تیری وجہ سے وہ اعتکاف میں بیٹھنے سے بچتا تو تُو خوش ہوتی۔ حوصلہ افزائی کرتی اس کی۔ اور کہا کیا تھا تُو نے...... اچھا ہی ہے۔ الٹا فائدہ ہوگا۔ بگڑی ہوئی عادتیں ٹھیک ہو جائیں گی بچے کی۔ تجھے تو احساس ہی نہیں ہوا۔ زبیر اور رابعہ کا دل کیسا دکھا ہوگا۔"

"میں نے یہ سوچ کر تو نہیں کہا تھا۔"

"یہ اور برا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تیرا دل بہت سخت ہے۔ بہت ظالم ہے تُو۔ تجھے کیسے کیسے سمجھایا میں نے۔ تجھے اعتماد دیا، حوصلہ سکھایا پر تیرے دل کی تنگی جانے والی نہیں لگتی مجھے۔"

"اب میں کیا کروں اماں۔" نور بانو نے بے بسی سے کہا۔ "ان کے اور میرے بیچ کوئی آئے، یہ مجھے گوارا نہیں۔"

"تو پھر ایک بات دھیان سے سن لے میری۔ تُو اسے خوشیاں کم اور دکھ زیادہ دے گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے اماں۔"

"دیکھو، ساجد سے عبدالحق کی محبت دیکھ کر تیری سمجھ میں نہیں آتا کہ بچوں سے بے تحاشہ محبت اس کی فطرت میں ہے۔ اگر وہ زبیر کے بچے سے اتنا پیار کرتا ہے تو اپنے بچے سے کتنا پیار کرے

گا۔ پھر تُو کیا کرے گی۔ اپنے بچے سے حسد کرے گی۔ سوچے گی کہ وہ اس کے اور تیرے بیچ آ گیا ہے۔ اسے کس طرح ہٹایا جائے۔"

نور بانو سناٹے میں آ گئی۔ بات تو سولہ آنے سچی تھی۔ وہ عبدالحق کو کسی کے ساتھ بانٹنا نہیں چاہتی تھی۔

"میں نے ہمیشہ تجھے بیٹی سمجھا۔ تجھے پسند بھی میں نے کیا۔ تجھے سمجھایا بھی۔ پر یہ جو آگ تیرے اندر جلتی ہے، تُو اسے بجھانا ہی نہیں چاہتی۔ اور تُو اس آگ میں جلے تو مجھے پروا نہیں۔ تیری اپنی کرنی ہے یہ۔ پر اس میں عبدالحق کو جلائے، یہ مجھے گوارا نہیں۔"

"تو تم میری اور ان کی شادی روک دو گی؟" نور بانو کے لہجے میں چیلنج تھا۔

"میں روکنا نہیں چاہتی۔ ورنہ روک بھی دیتی۔"

"ایک بات میں بھی تم کو بتا دوں اماں۔" نور بانو نے سرد لہجے میں کہا۔ "اب میرے اور ان کے بیچ میں تم بھی نہیں آ سکتیں۔"

حمیدہ نے آخری ڈورا ڈال کر پوتڑے کو ایک طرف رکھا اور نور بانو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "تجھ جیسے لوگوں کے لیے کسی کو ضرورت نہیں نور بانو کہ تجھے نقصان پہنچائیں۔ اس کے لیے تُو آپ ہی بہت کافی ہے۔ تُو خود ہی اپنی بدنصیبی کا سامان ہے۔ اب بھی دیکھ کہ اس وقت تُو نے اللہ کی دی ہوئی ماں کو کھو دیا۔ خدا کی قسم، میری سگی بیٹی بھی ہوتی تو اس بات پر میں اسے چھوڑ دیتی۔ عبدالحق میرے لیے بیٹا ہی نہیں، دنیا کی نعمت سے بڑھ کر ہے۔ اور تُو نے جو اتنی بڑی بات کہی تو اس کا مطلب ہے کہ تُو عبدالحق کو جانتی ہی نہیں۔ ارے وہ کیسی ہی پر جان دیتا ہو تجھ پر۔ میں حکم دوں تو وہ خود شادی سے منع کر دے۔"

نور بانو ایک دم سہم گئی۔ "مجھے معاف کر دو اماں۔ نہ جانے کیا ہو جاتا ہے مجھے۔"

"جنہیں خود پر اعتماد نہیں ہوتا وہ بزدل بھی ہوتے ہیں۔" حمیدہ نے کہا۔ "ڈر گئی نا۔ لیکن ڈر مت۔ میں یہ شادی نہیں رکواؤں گی۔ لیکن اب میں تجھے بیٹی بھی نہیں سمجھوں گی۔ شادی تو عبدالحق سے تیری ہو گی۔ مگر میری ایک بات یاد رکھنا۔ تیرے اندر کی آگ سے عبدالحق کو کبھی نہیں جلنے دوں گی میں۔ وہ وقت نہ آنے دینا۔ ورنہ تجھے معلوم ہو جائے گا کہ عبدالحق کتنا فرماں بردار بیٹا ہے۔"

نور بانو کو احساس ہو گیا کہ بے اعتمادی کے بعد حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی میں وہ بہت بھاری غلطی کر بیٹھی ہے لیکن کمان سے نکلا ہوا تیر اور منہ سے نکلی ہوئی بات کبھی واپس نہیں آتی۔

تاہم اس کا خوف اور بے یقینی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس عالم میں اس نے ایک اور بہت بڑا فیصلہ کر لیا!

❁......❁......❁

عبدالحق کو دور سے ہی ساجد کی آواز سنائی دی۔ اس نے سمجھ لیا کہ زبیر آرہا ہے۔ رونے کی آواز ہر لحہ قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس وقت مسجد کے صحن میں تھا' اور مولوی صاحب اس کے ساتھ تھے۔

بچہ ایسے رو رہا تھا کہ لگتا تھا' کسی قیمت پر چپ نہیں ہوگا۔

زبیر مسجد میں داخل ہوا اور ہچکچاتے قدموں کے ساتھ عبدالحق اور مولوی صاحب کی طرف بڑھا۔ ان دونوں کے چہرے سامنے سے تو کھلے ہوئے تھے لیکن اطراف میں انہوں نے کپڑا ڈال رکھا تھا۔

بچہ زبیر کے کندھے سے لگا' اب بھی روئے جا رہا تھا۔ زبیر نے اسے موڑا اور محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ''لے ساجد' دیکھ میں تجھے صاحب کے پاس لے آیا۔ اب تو چپ ہو جا۔''

وہاں روشنی بھی بہت کم تھی۔ بچے نے سامنے دیکھا بھی نہیں۔ اسے رونے سے فرصت ہی نہیں تھی۔ لیکن اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ وہ یک لخت خاموش ہو گیا۔ اور ٹکر ٹکر عبدالحق کو دیکھنے لگا۔

پھر وہ اتنی تیزی سے اس کی طرف لپکا کہ زبیر چوکنا نہ ہوتا تو وہ اس کے ہاتھوں سے نکل گیا ہوتا۔

''سنبھالیں صاحب۔'' زبیر نے گھبرا کر کہا۔

عبدالحق نے گود میں بچے کو لیا۔ اب وہ بچے کو غور سے اور بچہ غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اور زبیر اور مولوی صاحب انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ ایسے ساکت لمحے تھے کہ لگتا تھا' وقت ٹھہر گیا ہے۔

پھر بچے کا چہرہ جیسے تڑخنے لگا۔ اور اگلے ہی لمحے وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ عبدالحق کو صاف پتہ چل گیا کہ اس رونے میں شکایت پنہاں ہے۔

''کیوں روتے ہو۔ چپ ہو جاؤ۔'' عبدالحق نے بڑے ولار سے کہا۔

اور ایسا لگا ننھے ساجد نے جیسے اس کی بات سمجھ لی۔ اس کا رونا تھمنے میں کچھ دیر لگی۔ لیکن وہ بہر حال چپ ہو گیا۔

عبدالحق کی اپنی کیفیت بھی عجیب تھی۔ یہ محبت کا عجیب معصوم اور بے غرض روپ اس نے دیکھا تھا۔ ''اب تم اتنے چھوٹے سے ہو کہ کچھ سمجھ بھی نہیں سکتے۔ آدمی کبھی مجبور بھی ہوتا ہے۔ بلکہ آدمی تو مجبور ہی ہے۔ مگر تم آزاد ہو۔ کیونکہ ابھی مجبوری سمجھ نہیں سکتے۔ اسی لیے ضد کرتے ہو۔ اور ضد پوری نہ ہو تو اور ضد کرتے ہو۔'' وہ بے اختیار اس ناسمجھ بچے سے باتیں کر رہا تھا۔ اب اسے زبیر اور مولوی صاحب کی موجودگی کا احساس بھی نہیں تھا۔

اور ننھا ساجد بڑی یک سوئی سے اس کے چہرے پر نظریں جمائے جیسے پوری توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی معصوم آنکھوں میں گہرا ارتکاز تھا...... اور تفہیم بھی۔

''تمہیں سمجھنا چاہیے کہ کبھی کوئی ملنے والی چیز بھی نہیں ملتی آدمی کو۔''

زبیر اور مولوی صاحب دم بخود وہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

پھر ایک تبدیلی آئی۔ بچہ بولنے لگا۔ بولنا تو خیر اسے نہیں کہا جا سکتا۔ بس وہ بے معنی آوازیں نکال رہا تھا...... مگر تسلسل سے اور درمیان میں توقف بھی کرتا تھا' جیسے گفتگو میں توقف ہوتا ہے۔

''اب تم مجھ سے ملنے مسجد میں بھی آ گئے ہو۔ حالانکہ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' عبدالحق اپنی کیفیت میں کہہ جا رہا تھا۔

ساجد نے جواب میں کچھ غوں غاں کی۔

''مگر اب اس بات کا خیال رکھنا کہ یہاں پیشاب نہیں کرنا ہے۔''

ساجد نے پھر غوں غاں کی' جیسے اس کی بات کا جواب دے رہا ہو۔

''فکر نہ کریں صاحب!'' زبیر نے جلدی سے کہا۔ ''اس نے کچھ کھایا پیا ہی نہیں پورے دن اور پھر اماں کہہ رہی تھیں کہ یہ کچھ کرے گا بھی تو اندر ہی جذب ہو جائے گا۔''

''تو تم نے روزے بھی رکھنے شروع کر دیے ابھی سے۔'' عبدالحق نے کہا۔

بچہ قلقاری مار کر ہنسا۔

عبدالحق نے اسے کندھے سے لگانا چاہا۔ مگر بچے نے باقاعدہ مزاحمت کی۔ وہ عبدالحق کا چہرہ دیکھنے پر مصر تھا۔ مولوی صاحب کے کہنے پر عبدالحق بیٹھ گیا اور بچے کو گود میں لٹا لیا۔

اب دونوں کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

پھر ذرا دیر بعد بچے کی آنکھیں مندنے لگیں۔ وہ آنکھیں کھلی رکھنے کے لیے کچھ دیر نیند سے لڑتا رہا۔ مگر بالآخر ہار گیا۔ اور بے سدھ ہو کر سو گیا۔

''لائیے صاحب' اب میں اسے لے جاؤں۔'' زبیر نے کہا۔

''نہیں زبیر بھائی۔ اب یہ آ گیا ہے تو اس کا قرض ضرور ادا کروں گا۔'' عبدالحق نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے بچے کو کندھے سے لگایا اور مسجد کے صحن میں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔

''تم خوش نصیب ہو زبیر۔'' مولوی صاحب نے زبیر سے کہا۔ ''ایک تو اس بچے کا نام ساجد ہے۔ پھر یہ اتنا سا مسجد میں آیا ہے' اور آتا رہے گا۔ تو اس کا انشاءاللہ مسجد سے گہرا تعلق رہے گا۔ انشاءاللہ اسے ذوقِ عبادت ملے گا اللہ سے۔''

ذرا دیر بعد عبدالحق نے بچے کو واپس زبیر کی گود میں دے دیا۔ پھر وہ مولوی صاحب کی طرف مڑا۔ ''اب مولوی صاحب کل......''

''تم نے بتایا تھا کہ یہ دو وقت تمہارا عادی ہے؟'' مولوی صاحب نے کہا۔

"جی ہاں۔"

"تو کل بارہ بجے بچے کو یہاں لے آنا۔ ظہر سے پہلے واپس چلا جائے گا۔ اور پھر رات کو تراویح کے بعد۔"

"جو حکم مولوی صاحب۔"

زبیر بچے کو لے کر چلا گیا۔ "میں سمجھا تھا کہ زبیر بڑھا کر بتا رہا تھا۔" مولوی صاحب نے کہا۔ "لوگ محبت کرنے میں ایسا ہی کرتے ہیں نا۔ لیکن پتر عبدالحق یہ بچہ تمہارے لیے سب کچھ چھوڑے بیٹھا تھا۔ تم بہت خوش نصیب ہو پتر۔"

عبدالحق کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"چلو......اب چل کر قرآن کی سیر کریں۔"

عبدالحق ان کے ساتھ مسجد میں چلا گیا۔

❁......❁......❁

مسجد میں جو گزری تھی' وہ زبیر رابعہ کو سنا رہا تھا۔ رابعہ کی آنکھیں نم تھیں۔

"اور یہ باقاعدہ باتیں کر رہا تھا صاحب سے۔ بس لفظ نہیں تھے۔ غوں غاں کر رہا تھا۔"

رابعہ نے جھک کر پہلو میں لیٹے ہوئے ساجد کی پیشانی چوم لی۔ "بہت محبت کرتا ہے یہ ہمارے صاحب سے۔"

"صاحب بھی بہت محبت کرتے ہیں اس سے۔" زبیر نے جلدی سے کہا۔

"پتا ہے مجھے۔ پر زبیر' نور بی بی کو یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ آج تو انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ سب مل کر ساجد کی عادتیں خراب کر رہے ہیں۔ اسے بڑے ہو کر نقصان ہوگا۔"

"ابھی وہ نہیں چاہتیں کہ صاحب کسی اور کو توجہ دیں۔ شادی کے بعد ٹھیک ہو جائیں گی۔" زبیر نے بے پروائی سے کہا۔

"نہیں زبیر۔ شادی کے بعد تو وہ صاحب پر قبضہ ہی کر لیں گی۔" رابعہ نے کہا۔

"تو تو پگلی ہے رابعہ۔"

"نہیں زبیر' عورت سے زیادہ عورت کو کون سمجھ سکتا۔ یہ قبضہ کرنے کی بیماری ہے' جو بڑھتی جاتی ہے۔ دیکھ لینا' وہ تو صاحب کے سائے سے بھی جلا کریں گی۔"

"تو ہمیں اس سے کیا۔"

"ساجد نشانہ بنے گا......اور اس کی وجہ سے ہم بھی۔"

"تو فکر نہ کر۔ ایک بات بتا۔ ہمارے لیے صاحب بڑے ہیں یا نور بی بی؟"

"یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" رابعہ نے برا مانتے ہوئے کہا۔ "نور بی بی تو صاحب کے دم

سے ہیں۔ ہمارا تو سب کچھ صاحب ہی ہیں۔"

"بس تو پھر کیا ہے۔ جو بھی ہوگا' صاحب کی خاطر سہہ لیں گے۔ اور پھر صاحب تو لاہور چلے جائیں گے۔"

"ہاں......یہ تو ہے۔" رابعہ اداس ہو گئی۔ پھر وہ چونکی۔ "ارے......میرا بچہ کب سے بھوکا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ساجد کو جھنجھوڑا۔ مگر وہ اتنی نیند میں تھا کہ کوشش کے باوجود بھی نہیں اٹھا۔

"سوتے میں ہی دودھ پلانے کی کوشش کر۔"

"نہیں پیتا۔ پہلے بھی کوشش کی تھی۔"

"اب شاید پی لے۔ صاحب سے مل کر خوش خوش سویا ہے۔ بھوکا بھی ہے۔ تو کوشش تو کر۔"

رابعہ نے کروٹ بدلی اور سوتے ہوئے ساجد کو دودھ پلانے کی کوشش کی۔ اسے ساجد کے ردعمل پر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں' وہ سو رہا تھا۔ مگر پھر بھی چسر چسر دودھ پی رہا تھا۔

"سنو جی' یہ دودھ پی رہا ہے۔" اس نے پلٹے بغیر زبیر کو خوش خبری سنائی۔

"اللہ کا شکر ہے۔"

"پر کل کیا ہوگا؟"

"آج گزری ہی نہیں اور تو نے کل کی فکر شروع کر دی۔" زبیر نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ "کل سے صاحب کی واپسی تک یہ دن میں دو بار مسجد جایا کرے گا......ظہر سے پہلے اور عشاء کے بعد۔"

❁......❁......❁

نور بانو کے سینے میں ایسی آگ بھڑک رہی تھی' جو لگتا تھا کہ اس کے وجود کو جلا کر راکھ کر دے گی! وہ پہلے سے جانتی تھی کہ یہ آگ اس کے اندر موجود ہے' اور کبھی کبھی کسی موقع پر...... جب وہ عبدالحق کو کسی کے قریب ہوتے یا کسی کو عبدالحق کے قریب ہوتے دیکھتی ہے تو وہ آگ بری طرح بھڑک اٹھتی ہے۔ اور اس آگ میں سب سے پہلے اس کے ہوش و حواس جلتے تھے۔

لیکن جیسا آج ہوا' پہلے کبھی نہیں ہوا تھا!

ننھے ساجد کو عبدالحق سے ملوانے کے لیے مسجد لے جانے کا جو اجتماعی اہتمام کیا گیا' اس نے اس کے اندر کی آگ کو بہت زیادہ بھڑکا دیا تھا۔ سبھی خوش تھے اور اپنے اپنے طور پر اس تیاری میں حصہ لے رہے تھے۔ اور وہ خود پر نہایت جبر کر کے خاموش تھی۔ جانتی تھی کہ زبان کھلی تو نہایت زہریلی کوئی بات زبان سے نکلے گی۔

اس کے اندر کی اس آگ سے حمیدہ پوری طرح واقف تھی۔ اس نے تو بہت پہلے اس آگ کو سمجھ لیا تھا۔ ایک ماں کی طرح اسے خود اعتمادی دینے کی کوشش بھی کی تھی۔ اس سے وعدہ بھی کیا تھا

کہ عبدالحق کی شادی اس کے سوا کسی سے نہیں ہونے دے گی۔ اور اس نے کیا بھی یہی تھا۔

نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ نور بانو نے نہایت سختی سے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ پہلے ہی سے مجھ سے محبت کرتے تھے اور پھر برسات کی اس شام شیڈ میں جو کچھ ہوا...... نہیں، یہ شادی اماں نہیں کرا رہی ہیں۔ یہ عبدالحق خود کر رہے ہیں، اماں کا کوئی احسان نہیں مجھ پر۔ اور ابھی چند گھنٹے پہلے تو اماں سے اس کی اچھی خاصی تلخ کلامی ہوگئی تھی۔ اماں نے اسے ایک چیلنج دیا تھا، اور اس نے ڈر جانے کے باوجود علانیہ طور پر تو نہیں' بڑی خاموشی سے اسے قبول کر لیا تھا۔

اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ احسان فراموش اور خود غرض ثابت ہو رہی ہے...... بلکہ بیوقوف بھی، جو اپنے خیر خواہ کو اپنا دشمن بنا لے، اس سے بڑھ کر تو کوئی بے وقوف ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر وہ کیا کرتی مجبور تھی۔ وہ آگ بھڑکتی تھی تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی تھی۔ اس نے ٹھنڈے دل سے سوچنے کی کوشش کی کہ اس کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ اس کی سمجھ میں آیا کہ عبدالحق اس کے مقابلے میں کسی سے رائی برابر بھی محبت کرے، یہ اسے گوارا نہیں۔ عبدالحق پر کسی کا تسلط تو کجا، معمولی سا حق بھی اسے قبول نہیں۔ اس اعتبار سے اس کی سب سے بڑی دشمن تو حمیدہ ہی تھی جو کہتی تھی کہ میں دکھا دوں گی کہ عبدالحق کتنا فرماں بردار بیٹا ہے۔

اُس نے سوچا' شادی کے بعد اس سے نمٹ لے گی، وہ ایسا کرے گی کہ عبدالحق اس کی بات سے انکار ہی نہ کر سکے۔ برسات کی اس شام شیڈ میں ہونے والے اُس واقعے نے جبلی طور پر اسے سمجھا دیا تھا کہ اس کے لیے جسمانی قربت ہی مکمل فتح کا راستہ ہے۔ وہ اسے عادی بنا دے گی، اور پھر جب ضرورت پڑی، اسی ہتھیار کو استعمال کرے گی۔ پھر وہ دکھائے گی کہ عبدالحق کیسا مطیع شوہر ہے۔

مگر اس وقت تو مسئلہ ساجد تھا۔ عبدالحق پر حق تو صرف اسی کا تھا، اور وہ اس کے لیے ترس رہی تھی۔ جبکہ ساجد کو اتنے اہتمام سے تیار کر کے عبدالحق سے ملوانے کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔ اس خیال نے اس کے اندر ایسی آگ بھڑکائی تھی کہ اسے اپنا وجود پگھلتا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ اس کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ بزدل ہے۔ پہل نہیں کر پاتی۔ اس نے سوچا اور یہ سچ ہے کہ وہ عبدالحق کو اعتکاف میں بیٹھنے سے روکنا چاہتی تھی لیکن کم ہمتی کی وجہ سے کہہ نہ سکی۔ یہاں تک کہ خود عبدالحق نے ساجد کی وجہ سے اعتکاف سے دست برداری کا خیال ظاہر کر دیا۔ اب اس میں بھی خواہش تو اُس کی ہی پوری ہو رہی تھی لیکن نام تو ساجد کا ہو رہا تھا۔ اور یہ سے گوارا نہیں تھا چنانچہ اس نے اس سے اختلاف کیا تھا۔ اگرچہ حمیدہ نے اس کی حمایت کی تھی۔ اور عبدالحق کے عمل سے ثابت ہو گیا تھا کہ اس نے حمیدہ کی بات پر اس کی بات کو فوقیت دی۔

لیکن یہ خوشی اس حقیقت کے سامنے ہیچ تھی کہ اس وقت وہ تو عبدالحق کی دید کے لیے ترس

رہی ہے' اور ساجد مسجد میں عبدالحق کی گود میں کھیل رہا ہے' ناز برداریاں کروا رہا ہے۔ اس خیال سے تو اس کے اندر ایسی آگ بھڑکی تھی کہ اس کے لیے سکون و قرار ناممکن ہو گیا تھا۔

ایسے میں نیند آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ زرینہ نے سونے سے پہلے اس سے معمول کے مطابق اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے چڑچڑے پن سے گھبرا کر خاموش ہو گئی، پھر وہ سو بھی گئی۔ لیکن نور بانو جاگتی رہی۔

اسے یاد آیا' حمیدہ نے کہا تھا' اگر عبدالحق زبیر کے بچے سے اتنا پیار کرتا ہے تو اپنے بچے سے کیسا کرے گا۔ پھر تُو کیا کرے گی۔ اور اب وہ بڑی سنجیدگی سے اس سوال پر غور کر رہی تھی۔

کیا وہ اپنے بچے کی اپنے اور عبدالحق کے درمیان مداخلت گوارا کر سکتی ہے۔ تجربہ تو اسے نہیں تھا۔ وہ بس قیاس ہی کر سکتی تھی۔ وہ اپنے بچے سے محبت کر سکتی تھی۔ اسے وقت دے سکتی تھی لیکن عبدالحق کی اسی پر توجہ وہ گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

تو پھر وہ اس وقت کیا کرے گی؟

اور جواب فوراً ہی اس کے ذہن میں آ گیا۔ جس وقت حمیدہ نے یہ بات اس سے کہی تھی' اس پر دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔ اس لمحے اس نے ایک فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت وہ دیوانگی کا فیصلہ تھا۔ مگر اب وہ ہوش و حواس میں اس کی توثیق کر رہی تھی۔

اسے اولاد نہیں چاہیے!

ایک لمحے کو اسے ڈر لگا۔ یہ تو بہت بڑی بات ہے۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کے وجود میں آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے مسجد میں اعتکاف میں بیٹھے عبدالحق کی گود میں کھیلتے ہوئے ساجد کا تصور کیا تو جیسے اس کا اندر دھڑا دھڑ جلنے لگا۔

نہیں چاہیے مجھے اولاد۔ اس کے اندر سے ایک تند آواز ابھری۔

وہ اٹھی اور دیکھا زرینہ سو چکی تھی۔ وہ کمرے سے نکلی اور اس نے جا کر وضو کیا۔ واپس آ کر اس نے جائے نماز بچھائی اور دو رکعت نماز نفل برائے قضائے حاجت کی نیت کر لی۔

بہت خشوع و خضوع سے اس نے وہ نماز ادا کی۔ سلام پھیرنے کے بعد اُس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اللہ کے حضور اپنی حاجت پیش کی۔ اے اللہ' آپ قدرت والے ہیں۔ میں آپ سے مانگتی ہوں۔ مجھے اولاد کبھی بھی نہیں دیجیے گا...... کبھی بھی نہیں۔

دعا کرتے ہوئے ایک لمحے کو اس کا دل تھرتھرایا...... یہ کیسی دعا کر رہی ہے وہ، مگر پھر اس کی آنکھوں کے سامنے عبدالحق کی گود میں ساجد کا تصور لہرایا۔ سماعت میں حمیدہ کی آواز گونجی...... اپنے بچے سے وہ کیسی محبت کرے گا۔

اس نے جھٹ اپنی دعا دہرائی اور چہرے پر دونوں ہاتھ پھیر لیے۔

جاء نماز سمیٹتے ہوئے اس نے سوچا کہ رمضان میں ہر رات وہ اس حاجت کے لیے دو نفل پڑھ کر دعا کرے گی۔

❀....❀....❀
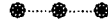
اچھو میاں بھی اعتکاف میں بیٹھ گئے تھے!

نادرہ نے سوچا کہ وہ خود انہیں یہ راہ دکھائے گی لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اچھو میاں خود ہی بہت تیزی سے سیکھ رہے تھے، ہر روز مسجد جانے والے اور باقاعدگی سے تراویح پڑھنے والے اچھو میاں کو اعتکاف کے بارے میں پتا بھی چل گیا تھا' اور انہوں نے اعتکاف میں بیٹھنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔

انہوں نے تین چار دن پہلے ہی نادرہ کو مطلع کر دیا کہ وہ اعتکاف میں بیٹھیں گے۔ نادرہ نے خوشی سے سوچا کہ اللہ میاں کیسے ایک پل میں آدمی کی کایا پلٹ کر دیتے ہیں۔

دوسری طرف نیلم بائی نے باقاعدہ اپنی حیثیت نادرہ کو سونپ دی تھی۔ اس نے تمام لڑکیوں اور دلالوں کو بتا دیا تھا کہ اب انہیں نادرہ کا ہر حکم ماننا ہوگا۔ اور کوئی مسئلہ ہو تو وہ بھی نادرہ کے سامنے رکھا جائے۔

نادرہ نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا لیکن علیحدہ میں نیلم بائی سے کہا۔ ''بوا...... میں تو بہت سی باتوں کو سمجھتی ہی نہیں ہوں۔ میں کوئی فیصلہ کیسے کر سکوں گی؟''

''جو معاملہ نہ سمجھ پاؤ' اس میں مجھ سے مشورہ کر لینا۔'' نیلم نے سادگی سے کہا۔

اچھو میاں اعتکاف میں جانے لگے تو نادرہ نے جمعۃ الوداع اور عید والے جوڑے بھی انہیں دیئے۔ ''عید کے لیے میں آپ کے نئے کپڑے سی دوں گی۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے۔''

''ضرورت ہے۔'' نادرہ نے کہا۔ ''اچھا یہ بتائیں' آپ اعتکاف میں کریں گے کیا؟''

''توبہ کروں گا اور اللہ سے دنیا اور آخرت کی بہتری مانگوں گا۔''

''میرے لیے بھی دعا کیجیے گا۔''

''تمہارے اور ارجمند کے لیے خود سے زیادہ دعا کروں گا۔''

ان کے جانے کے بعد نادرہ نے کاسو کو بلوالیا۔ کاسو آیا تو حیران تھا۔ ''کیا بات ہے بائی؟''

اپنے لیے وہ لفظ نادرہ کو اچھا نہیں لگا۔ لیکن بہرحال وہ اُس کے لیے طاقت کا مظہر تھا۔

''اچھو میاں اعتکاف میں بیٹھے ہیں۔'' اُس نے کہا۔

''تو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔''

''اور نو لاکھ چوہے کھانے والی بلی کو روزہ بھی نصیب نہیں۔'' نادرہ نے سخت لہجے میں کہا۔

''کاسو! اچھا یہی ہے کہ تُو تمیز سے بات کرنا سیکھ لے۔ اس بازار میں طوائف مشکل سے ملتی ہے۔ لیکن تجھ جیسے تو ٹکے میں چار ملتے ہیں۔''

کاسو ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔ ''تم تو برا مان گئیں بائی جی۔ اب اچھو میاں مسجد میں جا بیٹھے تو مجھے کیا۔ یہ کہو کہ میرے لیے کیا حکم ہے؟''

''تجھے ہر روز اچھو میاں کو سحری اور افطاری پہنچانی ہوگی۔''

کاسو کا تو دم ہی نکل گیا۔ ''لو...... بڑھا میری نیند کا دشمن ہو گیا'۔ وہ بڑبڑایا۔

''کچھ کہا تُو نے؟''

''کچھ نہیں بائی جی۔ میں کہہ رہا ہوں کہ جو حکم تمہارا۔ میں آ جاؤں گا۔''

رمضان کے وہ آخری دس دن نادرہ کے لیے بڑی مصروفیت کے تھے۔ اسے ارجمند اور اچھو میاں کے لیے کپڑے بھی سینے تھے۔ پھر رمضان کی اپنی مصروفیات بھی ہوتی ہیں۔ مگر رات تو اس کی اپنی ہوتی تھی۔ اور رات کو وہ اللہ سے باتیں ضرور کرتی تھی۔

نیلم بائی سے عہد کرنے کے بعد سے وہ بہت بے چین اور بوجھل تھی۔ وہ فیصلہ اس کے لیے بوجھ نہیں تھا۔ جتنی بار بھی اس نے اس کے بارے میں سوچا' وہ اسی نتیجے پر پہنچی کہ اس کے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ وہ یہ فیصلہ نہ کرتی اور نیلم بائی کوئی روایتی قدم اٹھاتی تو وہ اس کے اپنے لیے بھی سختی کا موجب ہوتا اور ارجمند کے لیے تو نہایت مخدوش ثابت ہو سکتا تھا۔ جبکہ اس فیصلے میں دونوں کے لیے بہتری تھی۔ اس کے لیے اس اعتبار سے کہ وہ محکوم نہ رہتی۔ وہ آزاد ہوتی اور بڑی حد تک گناہ آلود راتوں سے بچ سکتی تھی۔ اور ارجمند کے لیے تو بہتری ہی تھی۔ وہ اسے مکمل تحفظ فراہم کر سکتی تھی۔ بس بوجھ یہ تھا کہ اللہ کی رحمت سے ارجمند کے یہاں سے نکلنے کا سامان ہو جاتا' تب بھی اس کے لیے آزادی نہیں تھی۔

اس کی آزادی صرف موت میں تھی۔ لیکن وہ عہد کر چکی تھی کہ نہ کوٹھا چھوڑے گی' نہ خودکشی کرے گی۔

ارجمند کے لیے وہ قلب اور روح کی گہرائیوں سے کسی معجزے کی دعا کرتی تھی۔ اللہ کسی کو معتبر بنا کر بھیج دے' جو اسے یہاں سے نکال کر لے جائے' اور اسے ہر طرح سے عزت کی زندگی دے۔ ارجمند کی پچھلی بار کی باتوں سے اسے خوف آیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ پاگل پن کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہ کہنا کہ اللہ میاں اس سے باتیں کرتے ہیں اور وہ ان کی آواز سنتی ہے' یہ کوئی نفسیاتی مرض ہی ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف اس کم عمری میں اس نے اوتار سنگھ کو اپنے دل کا روگ بنا لیا تھا۔

خیر...... اچھی زندگی ملے تو ٹھیک ہو جائے گی وہ۔

سو وہ رات کی تنہائی اور تاریکی میں گڑگڑا کر اللہ سے ارجمند کی بہتری کے لیے دعائیں کرتی

رہتی، مگر اس کی تسلی نہ ہوتی۔ اور آخر میں وہ تڑپ کر اپنے لیے دعا کرتی...... اے اللہ! ارجمند کو یہاں سے نکالنے کے بعد مجھے بھی یہاں نہ رہنے دینا۔ مجھے موت دے دینا میرے رب۔ کیونکہ میں خود سے تو یہاں سے نکل نہیں سکتی۔ اور مجبوری ختم ہونے کے بعد میں یہاں ایک پل بھی نہیں رہنا چاہتی۔

مجھے موت دے دینا میرے اللہ!

اسے خیال آتا کہ یہ وہ برا کر رہی ہے۔ کہیں اللہ ناراض نہ ہو جائے۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ اللہ نے آدمی کو موت کی آرزو کرنے سے منع فرمایا ہے۔ پھر وہ سوچتی کہ اللہ عالم الغیب ہے۔ سب جانتا ہے۔ اپنے بندوں کی ہر حالت، ان کی مجبوریوں سے واقف ہے۔ انسانوں پر ایسا وقت بھی تو آتا ہوگا، جب دنیا اور آخرت...... دونوں کی بہتری کے لیے اس کی موت ناگزیر ہو جائے۔ ایسے میں آدمی موت کی آرزو کے سوا اور کیا کر سکتا ہے۔

اور اس کے دل کو یقین تھا کہ وہ ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہے!

❀......❀......❀

عید کا چاند نظر آ گیا تھا!

مولوی صاحب عبدالحق کو چھوڑنے کے لیے مسجد سے باہر آئے۔ زبیر بھی ان کے ساتھ تھا۔

''ان شاء اللہ تعالیٰ، اللہ تمہارا اعتکاف قبول فرمائے گا۔'' مولوی صاحب نے کہا۔ ''اور اللہ تمہیں ذوقِ علم اور ذوقِ عبادت عطا فرمائے گا۔ اللہ تمہیں بہت آگے لے جائے گا...... بلندی کی طرف۔''

''اللہ آپ کو جزائے عظیم عطا فرمائے۔ آپ سے میں بہت کچھ سیکھتا ہوں۔ یہ راہ بھی آپ نے ہی سجھائی تھی۔'' یہ کہتے ہوئے عبدالحق کو نور بانو کا خیال آ گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ نور بانو نے فیصلہ کن لہجے میں مداخلت نہ کی ہوتی تو وہ اعتکاف میں بیٹھتا ہی نہیں۔

''تم پر اللہ بہت مہربان ہے پتر۔ اب دیکھو، اس اعتکاف میں بھی ایک ظاہری چیز تو تم کو مل گئی۔ باطن کا حال تو اللہ جانتا ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''دس دن شیو نہیں کیا تم نے، تو داڑھی کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔'' مولوی صاحب نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک تو اعتکاف کا نور اور پھر یہ جھلک۔ داڑھی تم پر بہت اچھی لگے گی پتر۔ میری مانو تو اب شیو نہ کرنا۔ خط بنوا لینا۔''

عبدالحق کو کچھ اچنبھا سا ہوا۔ داڑھی رکھنے کا تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ''داڑھی رکھ لوں''۔ اس نے بے ساختہ حیرت سے کہا۔

''ہاں پتر، یہ تو فطری چیز ہے۔'' مولوی صاحب نے کہا۔ ''ہمارے پیارے نبی ﷺ کی سنت ہے۔ ہم آپ ﷺ سے محبت کرتے ہیں تو آپ ﷺ کی پیروی بھی کریں گے نا۔ آپ ﷺ کی طرح بننے کی کوشش بھی کریں گے نا...... ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی۔ باطنی طور پر پیروی دشوار ہے۔ تو پہلے ظاہری سنت اپنائیں گے جو آسان ہے، تو اللہ باطن کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے گا۔''

''میں سمجھ گیا مولوی صاحب۔ ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔''

''جاؤ پتر، صبح عید کی نماز کے بعد ملیں گے۔''

عبدالحق زبیر کے ساتھ گھر کی طرف چل دیا۔ نور بانو کا خیال آنے کے بعد سے اب وہ اس کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ ایسے میں اسے ایک خیال نے دہلا دیا۔ وہ دس دن کے لیے دنیا سے...... ہر محبت اور تعلق سے کٹ کر اللہ کا ہو رہا تھا۔ اللہ کی عنایت تھی کہ ان دس دنوں میں اسے کسی کا خیال نہیں آیا لیکن باہر آتے ہی پھر وہی دنیا۔

مولوی صاحب نے رمضان کے بارے میں کہا تھا کہ یہ مہینہ اللہ کی رحمت ہے۔ ہر شخص کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے۔ لیکن آدمی کو چاہیے کہ رمضان کے بعد بھی معمولات کو قائم رکھنے کی کوشش کرے۔ یہ نہیں کہ عید کا چاند ہوتے ہی پہلے جیسا ہو جائے۔ تو اعتکاف تو اور بڑی رحمت تھا۔ مگر وہ اعتکاف سے نکلتے ہی پہلے جیسا ہو گیا تھا۔

اس نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ دنیا کی محبت تو اللہ نے خود ہی آدمی کے دل میں ڈالی ہے۔ تو یہ فطری ہے کہ آدمی دنیا کی طرف لپکتا ہے۔ اور اللہ نے آدمی کو دنیا ترک کرنے کے لیے کہا بھی نہیں۔

لیکن یہی تو آزمائش ہے۔ اس کے اندر کسی نے کہا۔ اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون سا بندہ دنیا میں رہ کر دنیا سے محبت کرتے ہوئے بھی اسے...... اللہ کو اپنی پہلی ترجیح سمجھتا ہے۔ اور کون ہے جو اسے غیر اہم سمجھ کر بھلا دیتا ہے۔ کون ہے جو دنیا کی محبت پر اسے فوقیت دیتا ہے۔

مگر وہ اس پر سوچ نہیں سکا۔ کیونکہ وہ گھر پہنچ گیا تھا۔

گھر میں قدم رکھتے ہی اس نے سوچا کہ سب سے پہلے وہ اماں سے ملے گا...... انہیں دیکھے گا...... اس کا خیال تھا کہ سب لوگ دروازے پر موجود ہوں گے اور اس کے منتظر ہوں گے لیکن اسے مایوسی ہوئی۔

تاہم وہ آگے بڑھا تو نور بانو سے سامنا ہو گیا۔ ''السلام علیکم''۔ نور بانو نے کہا۔

''وعلیکم السلام''۔ اس نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔ وہ اماں سے پہلے کسی کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

"اعتکاف مبارک ہو آپ کو۔" نور بانو اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

"جی شکریہ۔" اس نے کہا اور اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"صاحب! آپ چلیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔" زبیر اجازت لے کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

وہ اماں کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ نماز میں تھیں۔ اس کے دل کی شکایت دور ہو گئی۔ وہ ایک طرف بیٹھ کر اماں کے سلام پھیرنے کا انتظار کرنے لگا ان کے سلام پھیرتے ہی وہ ان کے قدموں میں جا بیٹھا۔ انہوں نے اسے چھوٹے سے بچے کی طرح لپٹا لیا اور اس کے چہرے کو بوسوں سے بھگو دیا۔

اتنی دیر میں سب لوگ آ گئے۔ ساجد رابعہ کی گود میں تھا۔ اسے دیکھ کر خوشی سے ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ عبدالحق نے اسے گود میں لے لیا۔ سب اسے مبارک باد دے رہے تھے۔

"اللہ گھر کیسا سُونا ہو گیا تھا آپ کے بغیر بھائی!" زرینہ نے کہا۔ "کیسا یاد کرتے تھے ہم سب آپ کو۔ کتنی کمی محسوس ہوتی تھی آپ کی۔"

"میں بھی یہی سمجھتا تھا لیکن مجھے تو کوئی اپنا منتظر نہیں ملا۔ میں تو سمجھا تھا' سب دروازے پر موجود ہوں گے۔"

"میں تو موجود تھی وہاں"۔ نور بانو نے جلدی سے کہا۔ "اور میں نے آپ کو مبارک باد بھی دی تھی۔"

زرینہ کا چہرہ ست گیا۔ "سب کا یہی حال تھا بھائی۔ آپ کی ایک جھلک دیکھنے کو ترپ رہے تھے۔ سب سے پہلا حق تو اماں کا تھا۔ اس لیے دل چاہنے پر بھی ہم نے یہ بدتمیزی نہیں کی۔ اب اتنی دیر سے ہم کمرے کے باہر کھڑے تھے کہ آپ اماں سے مل لیں اچھی طرح۔"

عبدالحق شرمندہ ہو گیا۔ "میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا۔"

"اور مجھے بھی آنا چاہیے تھا تیرے استقبال کے لیے۔" حمیدہ نے کہا۔

"کیوں شرمندہ کرتی ہو اماں۔ میں تمہارے لیے تو نہیں کہہ رہا تھا۔" عبدالحق اور کھسیا گیا۔

"اچھا...... اب کھانا لگاؤ جلدی سے۔" حمیدہ نے کہا۔

کھانا لگایا گیا اور کھایا گیا۔ کھانے کے بعد چائے کے دوران حمیدہ عبدالحق کو بہت غور سے دیکھتی رہی۔ "کیسا نور آ گیا ہے۔ میرے پتر کے چہرے پر" اس نے کہا۔ "آخر اللہ کے پاس تنہائی میں وقت گزار کے آیا ہے۔ ہاں پتر' تجھ پر داڑھی بہت اچھی لگ رہی ہے۔ بس اب تُو داڑھی رکھ لے۔"

"یہی سوچا ہے اماں۔ مولوی صاحب بھی یہی کہہ رہے تھے۔" عبدالحق نے کہا۔

❁ ❁ ❁

شادی میں تین چار دن رہ گئے ہوں' اور جبکہ شادی بھی من پسند آدمی سے ہو رہی ہو تو لڑکیوں کی نیند اُڑ ہی جاتی ہے۔ نور بانو کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی لیکن اس کا سبب مستقبل کے سپنے نہیں تھے۔ وہ اپنے اندر کی آگ میں جل رہی تھی۔

وہ ایسی لڑکی تھی کہ رقابت برداشت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اور یہاں صورت حال یہ تھی کہ رقیبوں کی ایک قطار تھی۔ سب سے بڑی تو حمیدہ تھی' جو اسے چیلنج بھی دے چکی تھی۔ اور کھلم کھلا نہ سہی' دل میں نور بانو نے اس چیلنج کو قبول بھی کر لیا تھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ وہ خوف زدہ بھی تھی۔ ماں سے بڑا درجہ تو کسی کا نہیں ہوتا' اور حمیدہ سچ مچ عبدالحق کی ماں تھی۔ اس نے اسے دودھ پلایا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو نور بانو؟" دوسرے پلنگ پر لیٹی ہوئی زرینہ نے اسے چونکا دیا۔

"اس پر غور کر رہی ہوں کہ کتنی بدتمیز ہو گئی ہوں میں۔"

"کسی نے کچھ کہا ہے تمہیں؟"

"تمہی نے تو کہا ہے۔"

"میں نے کہا؟" زرینہ کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ "میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"تو سوچے سمجھے بغیر کہا ہو گا۔" نور بانو نے بے پروائی سے کہا۔

"میں نے کب ایسا......" زرینہ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ نور بانو کس حوالے سے بات کر رہی ہے۔ "اللہ...... بڑی بدگمان ہو تم۔ میں تو اپنی اور دوسرے لوگوں کی صفائی پیش کر رہی تھی۔ تمہارا تو خیال بھی نہیں تھا مجھے۔ اور جو میں نے کہا تھا' وہ سچ تھا۔"

"مطلب تو یہی نکلتا ہے نا اس بات کا۔ میں نے اماں کو نظر انداز کر کے پہل کی تو بدتمیزی کی۔"

"نہیں۔ اب تمہارا اور بھائی کا تعلق تو مختلف ہے۔ تمہارا تو حق تھا وہ۔ جو تم نے سمجھا' وہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔"

نور بانو ایک دم نرم ہو گئی۔ "سچ کہہ رہی ہو تم؟ وہ میرا حق تھا؟"

"تو اور کیا۔ میاں بیوی جیسا تعلق تو کوئی اور نہیں ہوتا۔"

"اور ماں؟"

"وہ اپنی جگہ ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ اہم ترین رشتے ہیں۔ ماں بہو کو بیٹی سمجھے اور بیٹی ساس کو ماں' تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ دونوں ہی کا تعلق اٹوٹ ہوتا ہے۔ ان میں تصادم نہیں ہونا چاہیے۔"

"مجھے معاف کر دینا زرینہ۔ میں نے بدگمانی کی۔"

"کوئی بات نہیں نور بانو۔"

زرینہ سوگئی۔ لیکن نور بانو کو نیند نہیں آئی۔ وہ سوچے جا رہی تھی۔ حمیدہ اس کے لیے رقیب بن گئی تھی۔ اگر اس نے اسے موقع دیا تو وہ آگے بڑھے گی۔ اس کی پیش قدمی کو پہلے ہی روک دینا بہتر ہے۔ لیکن کیسے؟

دوسری طرف اور بھی بہت لوگ تھے۔ زرینہ تھی' اور بعد میں زرینہ کے حوالے سے اکبر' ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی بھی ہوں گے۔ پھر زبیر اور رابعہ بھی تھے۔ اور سب سے بڑھ کر ننھا ساجد۔ اسے کچھ تو کرنا ہوگا۔

اسے لاہور والے بنگلے کا خیال آ گیا۔ واقعی...... اس نے تو سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اس کے لیے کتنی بڑی نعمت ہے۔ اور شادی کے بعد وہ لوگ ہاں چلے جائیں گے۔ زبیر اور رابعہ تو جا ہی نہیں سکتے۔ زرینہ بھی یہاں رہے گی...... اپنے سسرال میں...... بس ایک اماں رہ گئیں۔ تو اتنے لوگوں کے بغیر وہ ایسی بڑی قوت نہیں رہیں گی۔

وہ کچھ مطمئن ہوگئی۔ لیکن پہلا سوال اپنی جگہ تھا۔ اسے حمیدہ کی قوت کو ایسے کم کرنا تھا کہ خود حمیدہ کو بھی اس کا احساس ہو جائے۔ اصل میں تو وہی اس کی حریف تھی۔ ویسے تو وہ عبدالحق کو کسی کے ساتھ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بانٹ سکتی تھی۔

وہ بے چین تھی۔ کوئی اہم بات تھی' جو یاد آتے آتے پھسل جاتی تھی۔ ذہن اسے گرفت میں نہیں لے پاتا تھا۔ اور وہ بات اس کی حمیدہ کے خلاف جنگی حکمتِ عملی سے تعلق رکھتی تھی۔

ایسی کوئی بات کتنا ہی یاد کرنے کی کوشش کرو' نہیں یاد آتی۔ ایسے میں اس طرف سے دھیان ہٹا لینا بہتر ہوتا ہے۔ سو اس نے بھی یہی کیا۔ اس نے اس پہلی بات کو یاد کیا' جس نے پہلی بار اسے حوصلہ دیا تھا۔ ورنہ وہ تو حمیدہ سے مقابلے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ بلکہ اس سے پہلے تو اس نے حمیدہ سے تصادم کا سوچا بھی نہیں تھا۔ بلکہ وہ تو اس کی سب سے بڑی حلیف تھی۔

اس ایک بے ساختہ بات نے اس پر اپنے اندر کے کتنے ہی بھید کھول دیے تھے۔ اور اس کا سبب ساجد ہی بنا تھا۔ ساجد کے خیال سے عبدالحق نے اپنا اعتکاف منسوخ کرنے کا ارادہ کیا تھا' اور حمیدہ نے اس کی تائید کی تھی۔ اور اس نے بے ساختہ فیصلہ سنایا تھا کہ اتنی سی بات کے لیے اعتکاف نہیں چھوڑنا چاہیے۔

اور اس مرحلے پر یہ بات اس پر کھل گئی تھی کہ عبدالحق اس کی بات کبھی نہیں ٹال سکتا۔ حمیدہ کی تائید اس کے فیصلے کے سامنے غیر موثر ہوگئی تھی' اور عبدالحق نے اس کی بات پر عمل کیا تھا۔

مگر برا یہ ہوا کہ وہ بات حمیدہ پر بھی کھل گئی' اور حمیدہ نے اسے جتا بھی دیا' بلکہ چیلنج بھی کر دیا۔

اب آگے کا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے نور بانو کو اپنی اس بالادستی کی کم از کم ایک بار تصدیق ضرور کرنی تھی۔ تاکہ یہ پتا چل جائے کہ وہ پہلی کامیابی اتفاقی اور اضطراری نہیں تھی۔

اب اس تصدیق کے لیے کیا کیا جائے۔ ایک بات اس نے سوچی تھی ایسی' اس کی سمجھ میں آئی تھی۔ لیکن وہ ذہن سے پھسل گئی تھی۔ اتنا اسے یاد تھا کہ وہ آج ہی کی بات ہے۔ حمیدہ نے عبدالحق سے کچھ کہا تھا اور عبدالحق اس کے لیے آمادہ تھا۔ اس نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ وہ عبدالحق کو اس سے روکے گی۔ یوں اسے عبدالحق پر اپنے اثر و نفوذ کا اندازہ ہو جائے گا۔

پھر اچانک ہی وہ بات اس کے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لہرا گئی!

وہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ بات تو اسے عبدالحق سے اسی وقت کرنا تھی۔ اس نے زرینہ کی طرف دیکھا۔ بظاہر تو وہ گہری نیند سو رہی تھی پھر بھی اپنی تسلی کے لیے اس نے زرینہ کو ہولے سے تین چار بار آواز دی۔ مگر وہ واقعی سو رہی تھی۔

وہ اٹھی اور کمرے سے نکل آئی!

❁......❁......❁

دستک کی آواز نے عبدالحق کو چونکا دیا۔ وہ بڑی دبی دبی سی' سہمی سہمی سی دستک تھی۔ اس کا دل عجیب طرح سے دھڑکنے لگا۔ اس نے سوچا' ہو نہ ہو' یہ تو نور بانو ہی ہے۔

وہ اٹھا' دروازے کی طرف گیا' چٹخنی گرائی اور دروازہ کھول دیا۔ اس کے دل نے سچ کہا تھا۔ وہ نور بانو ہی تھی۔ "آپ یہاں...... اس وقت! خیریت تو ہے؟"

"کیوں...... میں آپ سے مل نہیں سکتی۔ میں آپ کی ہونے والی بیوی ہوں۔" نور بانو نے جارحانہ انداز میں کہا۔ "میں کسی بھی وقت مل سکتی ہوں۔ میں تو آپ کے کمرے میں بھی آ سکتی ہوں۔"

عبدالحق گھبرا گیا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن اب بس چار دن کی تو بات ہے۔ کسی پر کوئی غلط تاثر کیوں چھوڑا جائے۔"

"میاں بیوی کے رشتے میں دوسرے لوگوں کے تاثر کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ کوئی کچھ بھی سمجھے' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

عبدالحق خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی نظروں میں سوال تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ نور بانو کے چہرے پر سختی کتنی بری لگتی ہے۔ درشت لہجہ بھی اس پر نہیں سجتا۔ شاید جارحیت اس کے مزاج سے مناسبت ہی نہیں رکھتی۔

اچانک نور بانو کے چہرے سے سختی دور ہوگئی اور اس کی جگہ نرمی نے لے لی۔ "میں آپ سے ایک بہت اہم بات کرنے آئی ہوں۔"

"جی فرمائیے۔ میں منتظر ہوں۔"

"ہمارے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کو اچھے لگیں۔" نور بانو نے کہا۔

"دوسروں کو چاہے اچھا لگے یا برا۔ ہمارے اچھے لگنے کی اصل اہمیت ایک دوسرے کے لیے ہے۔"

عبدالحق کی سمجھ میں اس کی بات تو آ رہی تھی لیکن اس بات کا اصل مقصد وہ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ "یہ درست ہے کہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" اس نے کہا۔

"اور ہمیں اپنی اپنی پسند ناپسند سے زیادہ ایک دوسرے کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا ہوگا۔"

عبدالحق کا ذہن الجھنے لگا۔ یہ تمہید اسے خطرناک لگ رہی تھی۔ تاہم اس نے کہا۔ "ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔"

"تو میں آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں لیکن داڑھی میں مجھے اچھے نہیں لگے آپ۔"

عبدالحق کو شاک لگا۔ اس نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی داڑھی ہے کہاں میری۔"

"مگر مجھے اسی سے اندازہ ہو گیا ہے کہ داڑھی میں آپ اتنے اچھے نہیں لگیں گے۔"

عبدالحق رسول اللہ ﷺ کی سنت کا حوالہ دینا چاہتا تھا لیکن اس نے خود کو بروقت روک لیا۔ اس وقت نور بانو ضدی کیفیت میں معلوم ہو رہی تھی۔ ایسے میں وہ کچھ سن اور سمجھ نہیں سکتی تھی۔ بلاوجہ وہ گناہ گار ہوتی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کا یہ تحفظ اس کی ذمہ داری ہے۔ "آپ نے قبل از وقت رائے قائم کر لی ہے۔"

"اگر میں بعد میں یہ بات کہتی اور آپ داڑھی منڈواتے تو گناہ گار ہوتے۔" نور بانو نے دلیل دی۔

واقعی ...... یہ بات تو سچ ہے۔ عبدالحق نے سوچا۔ اس کے باوجود وہ اندر ہی اندر جھنجلا رہا تھا۔ "لیکن نور بانو......"

نور بانو نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "سنیں، آپ ابھی جوان ہیں۔ داڑھی رکھنے کو تو عمر پڑی ہے۔"

عبدالحق اس کے جواب میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا حضور ﷺ نے بڑھاپے میں داڑھی رکھی تھی۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اتنے دعوے سے یہ کیسے کہہ رہی ہے کہ داڑھی رکھنے کو تو عمر پڑی ہے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے اس کے پاس کہ وہ جوانی میں نہیں مر جائے گا۔ وہ تو اس لمحے بھی مر سکتا ہے۔ موت تو اللہ کا حکم ہے۔ اس کا وقت تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔

مگر اس نے یہ سب کچھ نہیں کہا۔ نور بانو ضد میں بحث کرتی' اور اسے نقصان ہی ہوتا۔ یہ وہ کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ "ٹھیک ہے...... اب آپ جا کر آرام کریں۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں

کہا۔

نور بانو اٹھی اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر دروازہ بند کر کے اندر چلا آیا۔ بستر پر بیٹھ کر وہ اس صورت حال پر غور کرتا رہا۔ نور بانو کی بات میں معقولیت بھی تھی اور وہ اسے غیر معقول بھی لگ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں جو حاکمیت تھی' وہ اسے ناگوار گزری تھی۔ مگر اس نے سوچا کہ محبت آدمی کو اختیار بھی تو دیتی ہے۔ اس کے باوجود اس کے اندر جھنجلاہٹ سی بھر گئی تھی۔

وہ سوچتا رہا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک اس کی زندگی کا مقصد اللہ کو تلاش کرنا' اسے پہچاننا' اور اس سے محبت کرنا تھا۔ درمیان میں اپنی آواز کے حوالے سے نور بانو آ گئی تھی' اور اسے اس آواز سے محبت ہو گئی تھی۔ جبکہ اس نے اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس محبت سے بھی اسے فیض پہنچا تھا ایک طرف تو اس کی وجہ سے اس نے عربی سیکھی' اور دوسری طرف یہ حوصلہ بھی ملا کہ بن دیکھے اگر وہ کسی انسان سے محبت کر سکتا ہے تو اللہ سے کیوں نہیں کر سکتا۔ جبکہ انسان تو غلط بھی نکل سکتا ہے۔ اور اللہ تو حق ہی حق ہے' سراپا رحمت' نور کا منبع۔ نور بانو اس کے لیے محترم تھی کہ اس کی آواز میں سورۃ الملک کی قرأت سنتے ہوئے اللہ نے اسے نوازا تھا۔

پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ اس کی رگوں میں راج پوتوں کا گرم خون دوڑتا ہے۔

اس نے سوچا' بے شک یہ بیوی کا حق ہے کہ وہ اپنے شوہر سے ویسا ہونے کی فرمائش کرے' جیسے وہ اسے اچھا لگتا ہے لیکن اگر اس کی فرمائش سنت رسول ﷺ کی راہ میں رکاوٹ ہو تو کیا کیا جائے۔

جواب فوراً اس کے اندر سے ابھرا۔ نور بانو سے کہنا چاہیے کہ ابھی ان کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ فی الحال اسے روک دیا جائے۔ پھر جب داڑھی پوری ہو جائے تو نور بانو فیصلہ کرے کہ وہ اسے اچھا لگ رہا ہے کہ نہیں۔ اگر وہ داڑھی سے اسے اچھا نہ لگے تو شادی نہ کرے۔ کیونکہ شادی تو اس سے کرنی چاہیے جو اچھا لگتا ہو۔

حل تو یہی ایک تھا اس مسئلے کا اور بالکل درست تھا۔

لیکن محبت آدمی کو بے بسی اور عاجزی کی حد تک نرم کر دیتی ہے۔ وہ نور بانو سے یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کا دل ٹوٹ جاتا۔ اور پھر بات صرف محبت کی نہیں تھی۔ کچھ اور عوامل بھی تھے۔ محبت سے ہٹ کر دیکھا جائے تو بھی نور بانو اسے بہت مظلوم' بہت کمزور لگتی تھی۔ ایک ایسی لڑکی جس نے اپنی آنکھوں سے اپنے لوگوں پر قیامت ٹوٹتے دیکھی' سب کو ختم ہوتے دیکھا۔ جس کے وجود نے خوف کی آخری حد دیکھی۔ جس کا اپنا کوئی نہیں رہا۔ اس کی دل جوئی کرنا تو اللہ کو خوش کرنا ہے [illegible] کا دل دکھا تو اللہ ناخوش ہوگا۔

[illegible] سچ اور بھی تھا...... شیڈ میں برسات کی اس شام ان کا جسمانی رابطہ! وہ تو ایک طرح

کا کمٹمنٹ تھا۔اب اگر وہ داڑھی کے مسئلے پر نور بانو سے اس طرح بات کرے اور بالآخر وہ داڑھی میں اسے ناپسند کرے اور شادی نہ ہو تو جسم کا وہ رابطہ گناہ بن کر ہمیشہ دونوں کے ساتھ رہے گا۔

نہیں......اس شادی سے تو وہ کسی طرح پیچھے نہیں ہو سکتا۔

وہ بوجھل دل کے ساتھ اٹھا اور شیو کا سامان لے آیا۔اس نے آئینے میں اپنے عکس کا تنقیدی جائزہ لیا۔وہ برا تو ہرگز نہیں لگ رہا تھا بلکہ پہلے سے اچھا لگ رہا تھا۔شاید خود کو......کم از کم خود کو۔ کیونکہ نور بانو کو تو وہ اچھا نہیں لگا تھا۔

اس نے شیو شروع کیا۔لیکن دس دن کی بڑھی ہوئی داڑھی آسان نہیں ہوتی، جبکہ آدمی شیو بھی نیم دلی سے کر رہا ہو۔اس کے نتیجے میں اس کے چہرے پر چھوٹے چھوٹے کئی چر کے لگ گئے اور شیو کے بعد جو اس نے آئینے میں دیکھا تو گھبرا کر اپنے عکس سے نظریں چرالیں۔شیو اس نے پہلی بار تو نہیں کیا تھا لیکن اپنا چہرہ اسے اتنا بدنما اور برا کبھی نہیں لگا تھا۔

اسے ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ کسی متاعِ عزیز سے محروم ہو گیا ہے۔دل دکھ رہا تھا۔پھر آنسوؤں کے چند قطرے اس کے رخساروں سے گزرتے ہوئے اس کے دامن پر آگرے۔

تب اسے پتا چلا کہ وہ تو رو رہا ہے!

❁......❁......❁

عید کا چاند نظر آیا اور شیطان آزاد ہو گیا!

وہ رونقیں بحال ہو گئیں، جن سے نادرہ کا دل گھبراتا تھا، جن کے مقابلے میں ویرانیاں اور سناٹے اسے اچھے لگتے تھے۔سب دکانیں کھل گئیں۔ہار پھول والوں کی دکانوں پر سب سے زیادہ رونق تھی۔

نادرہ نے نیلم بائی سے کہہ دیا کہ دو تین دن وہ کسی کو نہیں ملے گی۔آنے والوں کو کسی طرح ٹال دیا جائے۔

خلاف توقع نیلم بائی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔"میں تجھے اچھی طرح سمجھتی ہوں نرگس!" اس نے ناصحانہ انداز میں کہا۔"میں تو اپنی زندگی میں ہی سب کچھ تجھے سونپ رہی ہوں۔تُو اپنے ہر فیصلے میں آزاد ہو گی۔البتہ میں مشورہ ضرور دیا کروں گی ضرورت پر۔ماننے نہ ماننے تیری مرضی۔"

"میرے سر آنکھوں پر بوا......میں یہاں کی زندگی کو پوری طرح جانتی سمجھتی کب ہوں۔" نادرہ نے کہا۔

"تو پھر غور سے میری بات سن۔دلدل سے ایسے ایک دم کوئی نہیں نکل سکتا۔تیرے کچھ خاص گاہک بھی ہیں۔انہیں ایک دم سے چھوڑنا ٹھیک نہیں ہو گا۔ورنہ وہ اوچھی حرکتوں پر اتر آئیں گے۔تجھے ہر قدم پھونک پھونک کر پیچھے ہٹانا ہو گا۔ان سے پیچھا چھڑانے کی ترکیب میں

تجھے بتاؤں گی، لیکن رفتہ رفتہ عمل کرنا ہو گا۔"

نیلم کہتی رہی اور نادرہ بڑے غور سے سنتی رہی۔

"اور دو ایک نئی اور بہت خوبصورت لڑکیاں مل جائیں تو کام آسان ہو جائے گا۔اس کے علاوہ کوٹھے کی تمام لڑکیاں کو ساتھ ملانا ہو گا کہ وہ اپنی زبان بند رکھیں۔اس کے علاوہ بھڑووں کا منہ بھی بند کرنا ہو گا۔"

بات نادرہ کی سمجھ میں آرہی تھی۔پہلی بار اس نے سوچا کہ نیلم بائی بہت عقل مند عورت ہے۔

"لیکن بڑے افسروں اور اثر و رسوخ والے لوگوں کو نہیں ٹالا جا سکتا۔"

"اس کی بھی کوئی ترکیب تو ہو گی بوا۔"

"تُو نے میری بات سنی ہی نہیں"۔نیلم نے تلخ لہجے میں کہا۔"میں نے کہا نا کہ دلدل سے ایک دم کوئی نہیں نکل سکتا۔اور تُو چاہتی ہے کہ ایک دم پاک ہو جائے۔" پھر اس نے گہری سانس لی۔"تجھ میں کوئی بات ہے، جو مجھے اچھی لگتی ہے۔یا شاید سامنے کھڑی موت نے میرے کس بل نکال دیے ہیں۔ورنہ میں سیدھے سیدھے یہ کوٹھا کسی کو بیچ دیتی۔"

نادرہ ڈر گئی۔"بوا میرے ساتھ نیکی کرو گی تو ان شاء اللہ تمہارے کام آئے گی۔مجھے نجات دلاؤ گی تو میں عمر بھر تمہاری نجات کے لیے دعا کروں گی۔اور ان شاء اللہ اس کے صلے میں اللہ تمہیں نجات دے گا۔"

نیلم کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔"کون جانے۔ویسے تو اللہ کی رحمت اور مغفرت بہت وسیع ہے۔"

"مجھے کچھ بتاؤ نا بوا، کچھ کرو نا۔" نادرہ گڑگڑائی۔

"ہے تو ایک ترکیب لیکن کوٹھے کی بدنامی ہوتی ہے اس میں۔"

"تو کوٹھا نیک نام بھی ہوتا ہے بوا"۔نادرہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

"نہ سہی......لیکن ہر دکان کی طرح اس کی بھی ساکھ تو ہوتی ہے۔اور پھر اس میں تیری بھی بدنامی ہے۔"

"اب مجھے اس کی کیا پروا بوا۔"

نیلم کچھ سوچتی اور ہچکچاتی رہی۔اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔پھر وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی۔"تو سن، بھانت بھانت کے مرد کوٹھوں پر آتے جاتے ہیں۔اب اس سے بڑی قربت تو کوئی اور ہوتی نہیں۔اب آدمی دس جگہ جائے گا تو کہیں سے کوئی بیماری اٹھا لائے گا اور اسے پتا بھی نہیں چلے گا۔پھر وہ اس بیماری کو ادھر اُدھر بانٹتا پھرے گا۔ایسی بیماریاں بہت موذی، بہت خوفناک ہوتی ہیں۔یہ بدکاروں کے لیے اللہ کا عذاب ہے۔اور معاملہ وہی انڈے

اور مرغی والا ہے کہ پہلے انڈا آیا یا مرغی؟ کسی کو نہیں پتا چلتا کہ کون کس کو کیا دے گیا ہے۔ بس یہ سمجھ لے کہ روگ ہے زندگی بھر کا۔ صحت کو گھن لگ جاتا ہے۔ جسم تباہ ہو جاتا ہے آدمی کا۔''

ٹھیک طرح سے نہ سمجھنے کے باوجود نادرہ کو تھرتھری چڑھ گئی۔

''اسی لیے تو کہتے ہیں کہ نکاح اللہ کی رحمت ہے' بہت بڑی نعمت ہے۔'' نیلم نے کہا۔ ''ہر جگہ منہ مارتے پھرنے کا شوق تباہ کر دیتا ہے آدمی کو۔ دنیا بھی گئی' اللہ بھی خفا اور آخرت بھی خراب۔''

''پر بوا...... میرے مسئلے سے اس کا کیا تعلق۔''

''کسی طوائف کے بارے میں یہ بات پھیل جائے کہ وہ اس بیماری میں گرفتار ہے تو لوگ اس کی طرف رخ بھی نہیں کرتے۔''

اب بات نادرہ کی سمجھ میں آئی۔ اس نے غور سے نیلم کو دیکھا۔ لیکن کچھ پوچھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

مگر نیلم نے اس کی بات سمجھ لی تھی۔ ''ہاں نرگس' میں خود اس مرض کا شکار ہوں۔''

نادرہ جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔

''تجھے یا کسی کو بھی مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بیماری صرف جسمانی قربت کے نتیجے میں لگتی ہے۔''

''تو یہ ہوگا کیسے۔''

''بہت آسانی سے۔ ان لڑکیوں کے لیے منہ بند رکھنا تو ناممکن ہے۔ لیکن انہیں ایسا کچھ پتا چل جائے تو یہ سب کو بتاتی پھریں گی۔ میں صرف ایک لڑکی سے یہ بات کہہ دوں تو اسی دن سب کو معلوم ہو جائے گا۔ بلکہ گاہکوں کو بھی پتا چل جائے گا۔''

''تو بوا' یہ کام کر دو نا۔''

''سوچ لے۔ پھر تجھے اچھوت بنا کر رکھ دیں گے یہ سب۔''

''مجھے منظور ہے بوا۔''

''پھر تیرے ساتھ لڑکیوں میں سے بھی کوئی نہیں سوئے گی۔ تجھے میرے کمرے میں میرے ساتھ سونا ہوگا۔''

''مجھے منظور ہے بوا۔ تمہارا احسان ہوگا مجھ پر' یہ احسان کیسے اتار پاؤں گی میں۔''

''میرے لیے دعا کر کے۔''

''ہر سانس تمہارے لیے دعا کروں گی بوا۔''

نیلم نے ذرا دیر بعد ہی بہت سرسری انداز میں یہ خبر چمپا کو دے دی۔ پھر سلیم صاحب نرگس کے لیے تڑپتے ہوئے آئے تو اس نے ان سے کہا۔ ''مجبوری ہے سلیم میاں' نرگس تو ابھی چار پانچ

دن نہیں مل سکے گی تمہیں۔''

''تو کچھ کر بائی' آج تو چاند رات ہے۔''

''تو چمپا کو بلوا دیتی ہوں۔''

یوں اسٹیج پوری طرح تیار ہو گیا۔

ادھر اچھو میاں اعتکاف سے نکل کر آئے تو نادرہ انہیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ایسا نورانی چہرہ ہو گیا تھا ان کا کہ نظر ہی نہیں پڑتی تھی۔ اس پر سفید داڑھی۔

''اب آپ کو یہاں واپس آنا اچھا تو نہیں لگ سکتا۔'' اس نے اداسی سے کہا۔

''نہیں نادرہ' ہے تو یہ کوٹھا ہی۔ مگر جب تک تم اور ارجمند یہاں موجود ہو' یہ میرے لیے گھر ہی ہے۔'' اچھو میاں نے کہا۔

''آپ بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ بس اب داڑھی رکھ لیجیے۔''

''دل تو یہی چاہتا ہے لیکن یہاں رہتے ہوئے تو یہ ممکن نہیں۔''

''ابھی تو اسے گھر کہہ رہے تھے آپ۔''

''نہیں نادرہ' یہاں داڑھی رکھ کر پیارے نبی ﷺ کی سنت کی بے حرمتی تو نہیں کر سکتا میں۔''

نادرہ لاجواب ہو گئی۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔

❁......❁......❁

عید کی نماز پڑھ کر عبدالحق سیدھا حمیدہ کے کمرے میں سلام کرنے کے لیے گیا۔ حمیدہ کو وہ کچھ بدلا بدلا سا لگا۔ اس نے اسے لپٹا کر خوب پیار کیا۔ پیار کرتے ہوئے اس کی سمجھ میں وہ تبدیلی آ گئی۔ اسے جھٹکا لگا۔

''عید مبارک اماں۔''

''خیر مبارک پتر۔ تیری تو یہ خاص عید ہے۔''

وہ شادی کی طرف اشارہ تھا۔ عبدالحق شرما گیا۔

اتنی دیر میں رابعہ اس کے اور حمیدہ کے لیے شیر لے آئی۔ دستر خوان بچھا دیا گیا۔ عبدالحق نے اسے عیدی دی۔ وہ انکار کرتی رہی لیکن حمیدہ کے اصرار پر لینی ہی پڑی۔

عبدالحق نے شیر نکالتے ہوئے اچانک ہاتھ کھینچ لیا۔ ''زبیر بھائی کو تو بلاؤ۔ اور ہاں' میرے شہزادے کو بھی لاؤ۔'' اس کا اشارہ ساجد کی طرف تھا۔

زبیر اور ساجد کے آنے سے پہلے زرینہ آ گئی۔ ''عید مبارک بھائی۔''

عبدالحق نے اسے عیدی دی۔ پھر وہ متوقع نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔

''وہ نہیں آئیں گی بھائی!'' زرینہ نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''دیکھیں نا' اب تین دن رہ گئے

ہیں شادی میں۔ صبر کریں تھوڑا۔"

"تُو نے کہا تھا نور بانو سے آنے کا۔" حمیدہ نے زرینہ سے پوچھا۔

"جی اماں۔ پر وہ کہنے لگیں۔ مجھے شرم آتی ہے۔ میں بعد میں آؤں گی۔"

"بری بات ہے۔ اب یہ تو گھر کا معاملہ ہے۔ جا تُو بلا کر لا اسے۔ بھلے دو منٹ کے لیے سہی۔ اس سے کہنا، مجھے سلام کرنے تو آنا ہی ہے نا۔"

"لے نا پتر!" حمیدہ نے سویوں کی طرف اشارہ کیا۔

"زبیر بھائی تو آ جائیں۔"

حمیدہ کو اس کا یہ رکھ رکھاؤ ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا۔

پھر زبیر آ گیا۔ عبدالحق نے پہلے شیر نکال کر حمیدہ کو دیا، پھر زبیر کو اور پھر اپنے لیے نکالا۔ ایک منٹ بعد اسے خیال آیا تو اس نے زبیر سے کہا۔ "ساجد نہیں آیا۔"

"وہ رابعہ اسے تیار کر رہی ہے۔"

پھر زرینہ کے ساتھ نور بانو بھی آ گئی۔ وہ سچ مچ بری طرح شرما رہی تھی۔ ادھر عبدالحق کا بھی برا حال تھا۔ اس سے نظریں اٹھائی ہی نہیں جا رہی تھیں۔

نور بانو نے حمیدہ کو سلام کیا، عید کی مبارک باد دی۔ حمیدہ نے اسے گلے لگا کر پیار کیا۔ "یہاں اور لوگ بھی بیٹھے ہیں دھیے۔"

نور بانو نے سر جھکائے جھکائے آہستہ سے کہا۔ "آپ سب کو عید مبارک۔"

"اور تُو نور بانو کو عید کی مبارک باد دینا بھول گیا پتر۔" حمیدہ نے عبدالحق سے کہا۔

"عید مبارک نور بانو!" عبدالحق نے بہ مشکل کہا۔

حمیدہ کے اصرار کے باوجود نور بانو نے شیر نہیں لیا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس وقت کچھ بھی نہیں کھا سکتی تھی۔ البتہ اسے وہاں بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ وہ کن انکھیوں سے عبدالحق کو دیکھے لیکن ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔

پھر رابعہ ساجد کو لے کر آ گئی۔ اس نے ساجد کو عبدالحق کی گود میں دے دیا۔

عبدالحق نے گود میں لے کر ساجد کو پیار کیا۔ "پہلی عید مبارک میرے ننھے شہزادے۔" اس نے بڑی محبت سے کہا۔

نجانے کیوں، زبیر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

عبدالحق نے چمچے سے تھوڑا سا شیر ننھے ساجد کے منہ میں ڈالا۔ وہ باقاعدہ چٹخارے لینے لگا۔

"مجھے یاد رکھنا ساجد۔" عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہیں زندگی کا پہلا شیر خرما میں نے دیا ہے۔

اچانک نور بانو اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں جا رہی ہوں اماں" پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر چلی گئی۔

حمیدہ جانتی تھی، اور وہ اس کا سبب سمجھ سکتی تھی۔ وہ غور سے عبدالحق کو دیکھتی رہی، جو ہر بات سے بے خبر ساجد سے باتیں کیے جا رہا تھا غور سے دیکھتے ہوئے حمیدہ کو عبدالحق کے چہرے پر وہ چھوٹے چھوٹے چرکوں کے نشان نظر آئے۔

اسے یاد تھا۔ رات اس نے عبدالحق کو داڑھی رکھنے کو کہا تھا، اور وہ تیار تھا۔ اس نے کہا تھا کہ مولوی صاحب نے بھی یہی بات کی تھی۔ پھر وہ سونے سے پہلے بھی اس کے پاس آیا تھا۔ اس وقت تک اس نے داڑھی نہیں بنائی تھی۔

تو پھر یہ کیا ہوا؟ کیا اس نے آدھی رات کو داڑھی مونڈی۔ یقیناً...... تبھی تو چرکے بھی لگے ہیں۔ اور پھر دس دن داڑھی نہ بنانے کی وجہ سے بال زیادہ بھی ہو گئے ہوں گے اور سخت بھی۔

لیکن کیوں؟ تھوڑی سی دیر میں یہ تبدیلی کیوں آئی؟ اور بات فوراً ہی حمیدہ کی سمجھ میں آ گئی۔ جب اس نے عبدالحق سے داڑھی رکھنے کو کہا تو نور بانو بھی وہاں موجود تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے رات کو عبدالحق سے اسی سلسلے میں بات کی، اور عبدالحق نے اسی وقت داڑھی مونڈ لی۔

پیغام بہت صاف تھا۔ اور حمیدہ بہت جہاں دیدہ عورت تھی۔ نور بانو اسے جتا رہی تھی کہ عبدالحق وہی کرے گا، جو وہ چاہے گی۔ حمیدہ کو نہ ایک لمحے تک کے لیے دکھ ہوا اور نہ ہی کوئی احساسِ شکست۔ لوگ اپنی محبوب بیویوں کی بات مانتے آئے ہیں۔ اسے اس میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کے نزدیک بنیادی بات یہ تھی کہ بیوی شوہر کی خیر خواہ ہو۔ اس کی دنیا اور آخرت کی بہتری ملحوظ رکھے۔

حمیدہ اَن پڑھ تھی۔ لیکن زندگی کو سمجھنے کے لیے کسی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اس نے طویل عمر گزاری تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ دنیا میں دو ہی طرح کی عورتیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کے دل اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ پوری کائنات ان میں سما جائے اور پھر بھی خالی جگہ موجود رہے۔ دوسری وہ جو اللہ کے دیے ہوئے وسیع دل کو خود ہی تنگ کر لیتی ہیں۔ وہ جو صرف خود سے محبت کرتی ہیں۔ اپنی محبت سے آدمی کا دل تنگ ہو جاتا ہے۔ لبالب ہو جاتا ہے، اور دل میں کسی اور کی محبت کے لیے ذرا سی جگہ بھی نہیں بچتی۔ ایسی عورتیں دنیا میں کسی کو کچھ بھی نہیں دے سکتی، نہ اپنے شوہر کو اور نہ اپنی اولاد کو۔ ایسی عورتوں کے شوہر بہت بدنصیب ہوتے ہیں۔

اسے افسوس ہونے لگا کہ اس نے عبدالحق کے لیے اچھی بیوی کا انتخاب نہیں کیا۔ نور بانو کبھی نہیں سدھرے گی۔ اس کے دل کی تنگی کبھی دور نہیں ہو گی۔ اور اس سے عبدالحق کو نقصان ہو گا۔ مگر اب وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ معاملات ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔ اب وہ دعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتی اور اب اسے اللہ سے اپنے لیے لمبی عمر مانگنی ہو گی۔ ایک وہی تو ہے جو بہ وقتِ ضرورت نور بانو کے سامنے

کھڑی ہو سکے گی۔

اسے رنج ہو رہا تھا۔ نور بانو کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ داڑھی کے معاملے میں اس نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کے نزدیک اپنی بے معنی اور احمقانہ ضد کے مقابلے میں عبدالحق کے دین اور آخرت کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔

ہائے...... یہ اس نے کیا کر دیا۔ عبدالحق کو کس کے پلے باندھ رہی ہے وہ......

''اماں' میں چلوں۔ باہر لوگوں سے بھی عید ملنی ہے۔''

عبدالحق کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہاں عبدالحق کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں ایسی منہمک تھی کہ سب لوگ چلے گئے اور اسے پتا نہیں چلا۔

''چلے جانا پتر۔ پر پہلے مجھے یہ تو بتا دے کہ تُو نے داڑھی کیوں مونڈ دی۔''

عبدالحق کھسیا گیا۔ ''بڑھا ہوا شیو تو اچھا نہیں لگتا اماں۔ داڑھی ابھی پوری طرح آئی نہیں تھی۔ اور چار دن بعد شادی تھی۔ میں نے سوچا' ایسے درمیان میں تو اچھا نہیں لگوں گا۔ داڑھی تو بعد میں بھی رکھ سکتا ہوں۔ اس لیے صاف کر لی۔''

''آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ پوری داڑھی تو کبھی نہیں اُگتی۔ یہ درمیان کے دن تو گزارنے ہی پڑتے ہیں' جن میں آدمی عجیب سا لگتا ہے۔'' حمیدہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''پر ابھی تو اماں...... شادی کی وجہ سے......''

''میں یہ کہہ رہی ہوں پتر کہ جب آدمی داڑھی رکھتا ہے تو ایسا ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کو شروع میں اچھا نہیں لگتا۔ اور ایسا ہمیشہ ہوتا ہے۔''

''نہیں اماں۔ میں نے تو بس یہ سوچا یہ وقت مناسب نہیں۔''

''اللہ تجھے حوصلہ دے۔ جا پتر' باہر لوگ انتظار کر رہے ہوں گے۔''

❁......❁......❁
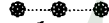
عید کے چوتھے دن وکیل نے کاغذی کارروائی مکمل کر دی۔ اب نادرہ عرف نرگس اس کوٹھے اور جائیداد کی مالک تھی۔

''لے نرگس' میں نے اپنی زندگی میں ہی تجھے سب کچھ سونپ دیا۔ اب تو چاہے تو مجھے نکال دے۔'' نیلم نے نادرہ سے کہا۔

''تم مجھے جانتی ہو بوا۔ ورنہ اتنا بھروسہ کیوں کرتیں مجھ پر۔''

''زندگی اس بازار میں گزری ہے۔'' نیلم نے آہ بھر کر کہا۔ ''اعتبار اور بھروسہ تو میں خود پر بھی نہیں کرتی۔ مجبوری ہے۔ زندگی نے یہی سکھایا ہے مجھے۔ سب کچھ تجھے سونپ دیا...... نقدی اور زیورات کے سوا۔''

''مجھے ان میں دلچسپی ہی کب ہے۔ مجھے تو اس جائیداد میں بھی دلچسپی نہیں تھی۔''

''جانتی ہوں۔ پھر بھی احتیاط کی۔ اپنی طاقت کے لیے بھی کچھ تو پاس ہونا چاہیے۔''

''میرے نزدیک تو سب کچھ اب بھی تمہارا ہی ہے بوا۔''

نیلم نے موضوع بدلا۔ ''ارے ہاں' تیری خبر تو بہت تیزی سے پھیل گئی۔ کل وہ سلیم صاحب آئے تھے تیرے، میں نے کہا' نرگس کی طبیعت اب ٹھیک ہے' بلواؤں۔ کہنے لگے۔ نہیں بائی' وہ اب دل سے اتر گئی ہے۔''

''اللہ کا شکر ہے بوا۔''

''اور تو اور' افسروں تک بھی بات پہنچ گئی۔ یہ لڑکیاں بڑی حرام زادی ہیں۔ پیٹ میں بات نہیں رکتی ان کے۔ خیر اچھا ہی ہے۔ طوائف کے پیٹ میں کچھ رکنا بھی نہیں چاہیے۔''

''اللہ کا شکر ہے بوا' اور ان لڑکیوں کا احسان ہے مجھ پر۔''

''ہاں بوا۔ اور ایک بات میں بھی بتاؤں۔ رات مجھے نیچے فرش پر سونا پڑا۔''

''ارے...... وہ کیوں؟''

''چمپا مجھ سے کہنے لگی کہ تم اب کوٹھے کی مالک ہو۔ یہاں سونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا' مالک ہوں تو میری مرضی۔ جہاں چاہوں' سوؤں۔ اس پر وہ بولی۔ تا کہ ہمیں بھی بیماری لگا دو۔ نا بھئی نا' اب تم جا کر بائی جی کے کمرے میں سویا کرو۔ ورنہ میں سب کو بتا دوں گی۔ اور اس نے مجھے اوپر سونے ہی نہیں دیا۔''

''کم بختوں کو عقل تو ہے ہی نہیں۔'' نیلم نے ظالمانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ''جہاں سے بیماری لگنی ہے' وہاں تو شوق سے جائیں گی۔ اور جہاں سے لگنی نہیں' وہاں احتیاط کریں گی۔'' پھر وہ ایک لمحے خاموش رہی اور غور سے نادرہ کو دیکھتی رہی۔ ''اس پر تو دل دکھا ہوگا تیرا۔''

نادرہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''میں تو الٹا خوش ہوئی بوا۔ مجھے تو نجات مل رہی ہے لعنت سے۔''

''تو اب تُو کیا کرے گی۔''

''وہی کروں گی بوا جو تم نے کہا تھا۔ تمہارے ساتھ سویا کروں گی۔''

''اچھا ہے۔ میں تنہائی میں بہت گھبراتی تھی۔ پر ایک بات تو بتا۔ تجھے میرے ساتھ سوتے ہوئے ڈر نہیں لگے گا۔''

''اگر یہ ایسے لگنے والی بیماری ہوتی بوا تو بھی میں اس لعنت پر اسے ترجیح دیتی۔ تم نہیں جانتیں بوا' میری روح پر کیسا بوجھ ہوتا تھا۔ اب میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں۔''

''میں جانتی ہوں...... سمجھ سکتی ہوں۔''

''ایک اجازت چاہیے بوا'' نادرہ نے اچانک کہا۔

''اب بھی تجھے مجھ سے اجازت چاہیے ہوگی۔''

نادرہ نے سنی اَن سنی کر کے کہا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ ارجمند بھی یہیں سویا کرے...... ہمارے ساتھ۔''

نیلم نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''مجھ سے اجازت مانگ رہی ہے۔ ارے تُو تو مجھے اس کمرے سے بھی نکال سکتی ہے...... اور کوٹھے سے بھی۔''

نادرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''تم جانتی ہو بوا کہ میں ایسی نہیں ہوں۔''

''اچھا۔ اب دل چھوٹا نہ کر۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے مجھے تو اچھا لگے گا۔ میرے لیے تو یہ گھر ہو جائے گا پہلی بار۔''

''وہ تم افسروں کا کچھ بتا رہی تھی۔''

''عید رات کو بھٹی صاحب کے ہاں محفل سجتی ہے نا' وہاں اپنی لڑکیاں گئی تھیں۔ تیرے بارے میں پوچھا تو بدبختوں نے بیماری والی بات بتا دی یہ افسر لوگ تو زیادہ ہی ڈرتے ہیں...... اشراف سمجھتے ہیں نا خود کو۔ تو اگلے روز چیمہ صاحب آئے تھے میرے پاس۔ میں نے کہا...... حضور' میں تو ہمیشہ خیال رکھتی ہوں آپ لوگوں کا۔ اسی لیے روک دیا نرگس کو۔ بڑے شکر گزار ہوئے۔ اس پر بھی خوش ہوئے کہ میں نے تجھے سب کچھ سونپ دیا...... کہنے لگے' نرگس سے کہنا' کبھی کوئی مسئلہ ہو تو ہم حاضر ہیں۔''

نادرہ نے سکون کی سانس لی اور دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے گندگی میں بھی صفائی کا اہتمام کیا۔

''پر یہ لوگ ہیں بڑے کمینے۔'' نیلم نے کہا۔ ''چیمہ کہنے لگا کہ بھٹی صاحب نے بڑا پریشان کیا ہوا ہے آج کل۔ کچھ زیادہ ہی دماغ چڑھ رہا ہے۔ جی میں تو آتا ہے کہ نرگس کو ان کے پاس بجھوا دوں۔ زندگی بھر روتے رہیں بیٹھ کر۔ میں نے کہا' رکاوٹ کیا ہے۔ کہو تو بھیج دوں۔ نرگس تو فارغ ہی ہے آج کل۔ تو بولا کہ آخر میں نقصان تو اپنا ہی ہے۔ قہقہہ لگا کر بولا...... ہم سب ہم پیالہ و ہم نوالہ ہیں آخر اسے کچھ ہوا تو دوسرے برتن خراب کرے گا نا۔ اور پھر کسی برتن سے ہمیں بھی وہی بیماری لگ گئی تو۔ میں نے کہا' ہو بڑے سیانے تم۔''

نادرہ نے خود بڑے اہتمام سے اس کمرے کی نئی سیٹنگ کی۔ مدتوں کے بعد اسے جیسے گھر میسر آیا تھا۔ ابتدا میں وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں نیلم مزاحم نہ ہو۔ مگر یہ دیکھ کر مطمئن ہو گئی کہ نیلم تو الٹا خوش ہو رہی ہے۔ بلکہ وہ اسے مشورے ہی دے رہی تھی۔

اس رات نادرہ نے ارجمند سے کہا۔ ''اب تم میرے ساتھ سویا کرو گی۔''

''ہر رات؟'' ارجمند نے معصومیت سے پوچھا۔

''ہاں۔ ہر رات۔''

''اب آپ کی شادی کا کیا ہوگا؟''

''اب ہماری شادی کبھی نہیں ہوگی۔''

''کیوں پھپھو؟''

''سب لوگوں نے ہمیں ناپسند کر دیا ہے نا۔''

''وہ تو خود اچھے نہیں تھے پھپھو۔ میں کراؤں گی آپ کی شادی۔''

''اپنے شہزادے سے۔''

''نہیں پھپھو!'' ارجمند برا مان گئی۔ ''میں دیکھوں گی۔ دنیا میں شہزادوں کی کمی تو نہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ لیکن ہمیں اب ایسی پروا نہیں۔''

''تو اب یہ ہمارا کمرہ ہے۔''

''ہاں...... ہمارا اور بوا کا۔''

نیلم اس وقت کمرے میں نہیں تھی۔ ارجمند نے ناک چڑھا کر کہا۔ ''بوا کا کیوں؟''

''دیکھو گڑیا۔ کمرا تو یہ اصل میں بوا کا ہی ہے۔ ان کی مہربانی کہ انہوں نے ہمیں جگہ دے دی۔ تو ہمیں ان کا احسان ماننا چاہیے' ان کی عزت کرنی چاہیے۔ اب دیکھو نا' تم ترستی تھیں میرے ساتھ سونے کو۔ اب روز سویا کرو گی میرے ساتھ۔ تو یہ بوا کی مہربانی ہے نا۔ اب تم ان سے کبھی بدتمیزی نہ کرنا۔ عزت سے بات کرنا ان سے۔''

''ٹھیک ہے پھپھو!'' ارجمند نے کہا۔ پھر کچھ خیال آیا تو پوچھا۔ ''آپ مجھے کہانی بھی سنایا کریں گی۔''

''ہاں۔ کیوں نہیں۔''

''تب تو میں بوا کی بہت عزت کروں گی۔''

مگر جب رات ہوئی' اور نادرہ نے ارجمند کو کہانی سنانا شروع کی تو وہ کہانی مکمل ہونے سے پہلے ہی سو گئی۔ مہینوں بعد پھپھو سے لپٹ کر سونے کی حسرت جو پوری گئی تھی۔

وہ ان کے لیے ایک بالکل نئے معمول کا آغاز تھا!

❁......❁......❁
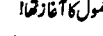
وہ عبدالحق کی زندگی کا ایک ایسا دن تھا' جسے وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا!

اس نے تو وہ پورا دن ایسے گزارا تھا' جیسے خواب دیکھ رہا ہو۔ حالانکہ وہ تعبیر ملنے کا دن تھا۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ اور اس کی خوشی میں علاقے کے سب لوگ شریک تھے۔

مگر اب وہ وقت آ گیا تھا کہ اس کی خوشی میں شریک سب لوگ درجہ بہ درجہ رخصت ہوتے

گئے تھے اور اب اسے اکیلے ہی اپنی منزل کی طرف بڑھنا تھا۔

اس کا کمرا آج سے اس کا کمرا نہیں تھا۔ اب اس میں نور بانو بھی اس کی شریک تھی۔ اور آج تو وہ حجلۂ عروسی تھا۔ اسے بڑے اہتمام سے سجایا گیا تھا۔

حمیدہ' رابعہ اور شہناز اس کے ساتھ دروازے تک آئیں۔ ''میں نے پانی کا جگ اور گلاس بھی اندر رکھ دیا ہے صاحب' اور دودھ بھی۔ بھول نہ جانا۔'' رابعہ نے کہا۔

عبدالحق سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ اس کا حلق بری طرح خشک ہو رہا تھا اور دل عجیب طرح دھڑک رہا تھا۔

''جا پتر' آج سے تیری نئی زندگی شروع ہو رہی ہے۔ اللہ مبارک کرے۔'' حمیدہ نے دعا دی۔

''تم بھی آؤ نا اماں۔'' عبدالحق کو گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

''پگلا کہیں کا۔'' حمیدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اچھا پتر' اب ہم جا رہے ہیں۔ تُو بھی آرام کر۔''

وہ تینوں واپس چلی گئیں۔ عبدالحق انہیں واپس جاتے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے پلٹ کر اپنے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا۔ وہ جیسے اس کی قسمت کا دروازہ تھا۔ ابھی ایک لمحے میں ......اس کے آگے بڑھ کر پٹ پر دباؤ ڈالنے کی دیر ہے۔ اس کی قسمت کھل جائے گی۔

وہ چند لمحے ہچکچاتا رہا۔ پھر آگے بڑھا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

اندر کا نقشہ کچھ بدلا ہوا تھا۔ آرائش کی خاطر مسہری کو دیوار کے پاس سے ہٹا کر کمرے کے درمیان لے آیا گیا تھا۔ مسہری کے چاروں طرف پھولوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ مسہری پر پھولوں کی سیج تھی۔ اور سیج پر......وہ ایک سرخ چھوٹی سی' گول سی گٹھری تھی۔

اس کا دل اس زور سے دھڑکا کہ وہ خود بھی ہڑبڑا گیا۔

وہ بڑے اشتیاق سے مسہری کی طرف بڑھا۔ لڑیوں کے درمیان سے اس نے نور بانو کو دیکھا۔ نور بانو کو تو کیا دیکھتا' وہ اس لمبے سے گھونگٹ کے پار دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا' جس میں سے جھلکتی ہوئی چاندنی نظر آ رہی تھی۔ نور بانو کا سر اپنے گھٹنوں پر جھکا تھا۔

''دروازہ تو بند کر دیں۔'' گھونگٹ میں سے آواز ابھری۔

''آپ کی نظریں جھکی ہوئی ہیں۔'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''آپ نے کیسے دیکھ لیا کہ دروازہ بند نہیں ہے۔''

''صرف نظریں جھکی ہوئی نہیں ہیں۔ بلکہ میری آنکھیں بھی بند ہیں۔'' نور بانو نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''مجھے نظر کچھ نہیں آ رہا ہے لیکن سنائی تو سب کچھ دے رہا ہے۔''

''تو آپ نے ایسا کیا سنا کہ آپ کو دروازہ کھلا ہونے کا پتا چل گیا۔''

''مجھے ایسے پتا چلا کہ میرے کانوں نے کچھ نہیں سنا......'' وہی شوخ آواز' وہی لہجہ......

''میں سمجھا نہیں۔''

''دیکھیں نا' مجھے دروازہ بند ہونے کی آواز نہیں سنائی دی نا۔ اس سے مجھے پتا چل گیا کے دروازہ کھلا ہے۔ اب آپ دروازہ بند کر دیں نا۔'' یہ کہتے ہوئے لہجے میں ہلکی سی جھنجلاہٹ شامل ہو گئی۔

عبدالحق نے جا کر دروازہ بند کیا' چٹخنی چڑھائی اور واپس آ کر مسہری پر بیٹھ گیا۔ ''گھونگٹ تو اٹھائیں۔ میں اپنے چاند کو دیکھوں تو۔'' اس نے فرمائش کی۔

''یہ آپ کا کام ہے' میرا نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کر لیتا ہوں۔'' عبدالحق نے گھونگٹ کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

''ایسے نہیں۔ پہلے ہماری منہ دکھائی تو دیں۔''

عبدالحق کو حمیدہ کی بات یاد آ گئی۔ اس نے شیروانی کی جیب سے مخمل کی ڈبیہ نکالی' اسے کھول کر انگوٹھی برآمد کی اور جھٹ سے نور بانو کی انگلی میں پہنا دی۔ ''یہ لیجیے......اب تو ٹھیک ہے۔''

اس نے گھونگٹ اٹھایا اور دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔

اس سکوت سے گھبرا کر نور بانو نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ وہ مبہوت ہو کر اسے دیکھ رہا ہے۔ ''کیا ہو گیا آپ کو؟''

''اتنا حسین رُوئے زمین پر کوئی ہو ہی نہیں سکتا......آپ کے سوا۔'' عبدالحق نے مسحور لہجے میں کہا۔

وہ الفاظ نہیں تھے' نور بانو کے لیے آبِ حیات تھا۔ وہ ابتدا سے جانتی تھی کہ وہ اوسط سے کم تر شکل و صورت کی لڑکی ہے۔ مگر عبدالحق کے لہجے میں ایسی سچائی تھی کہ آئینہ دیکھنے کو دل مچلنے لگا۔

''آپ بنا رہے ہیں مجھے۔'' اس نے بڑے ناز سے کہا۔

''خدا کی قسم' سچ کہہ رہا ہوں۔''

نور بانو کی سماعت میں اپنی امی کی آواز گونجی......نکاح ایسی رحمت ہے کہ اللہ دلہنوں پر آسمان سے نور اتارتے ہیں۔ اسے دلہن بن کر تو گدھی بھی پری ہو جاتی ہے۔ اور میں بہرحال قبول صورت تو ہوں' نور بانو نے دل میں کہا۔ بدصورت تو کبھی نہیں تھی میں۔

لیکن عبدالحق لاکھ بار بھی اس کی تعریف کرتا تو اس کے لیے کم تھا۔ ''آپ کو خوبصورت لگتی ہوں میں۔ ورنہ من آنم کہ من دانم'' اس نے کہا۔

''میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ سے حسین کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔''

''میری باجی کو دیکھ لیتے تو کیا حال ہوتا آپ کا۔ بے ہوش ہی ہو جاتے شاید۔''

''آپ کی باجی؟''

''ہاں......میری بڑی بہن حور بانو۔ جو آپ سے دیوانہ وار محبت کرتی تھی۔ وہ اتنی حسین تھی کہ میں نے ان جیسا حسین کوئی نہیں دیکھا۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں تو تمہیں دیکھ رہا ہوں اور حیران ہو رہا ہوں۔''

''آپ بھی تو ان سے محبت کرتے تھے۔'' نور بانو کی یادوں کی راکھ میں ایک چنگاری نے سر اٹھایا۔

''میں؟ اور ان سے محبت؟'' عبدالحق نے حیرت سے کہا۔ ''مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ کوئی مجھ سے محبت کرتا تھا۔''

''آپ کوٹھے پر آتے تھے۔ دیر تک بیٹھے رہتے تھے۔ باجی آنگن سے آپ کو دیکھتی رہتی تھی۔ تو آپ بھی انہیں دیکھتے ہوں گے۔''

''میں نے کبھی نیچے نہیں دیکھا۔'' عبدالحق نے برا مانتے ہوئے کہا۔ ''میں ایسا کبھی نہیں رہا۔ کالج میں لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں میرے ساتھ۔ اور ان میں بہت آزاد خیال انگریز لڑکیاں بھی تھیں۔ انہوں نے مجھے ورغلانے کی کوشش بھی کی لیکن میں ایسا نہیں تھا۔ مجھے محبت اور ہوس کی تمیز تھی۔ میں محبت کو بہت اعلیٰ و ارفع جذبہ سمجھتا ہوں۔''

''تو پھر آپ کوٹھے پر کیوں آتے تھے؟''

''پہلی بار میں وہاں گیا تو پڑھنے ہی کی غرض سے گیا' کیونکہ وہ امتحان کا عرصہ تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں کبھی بھول ہی نہیں سکتا۔ وہ مغرب سے پہلے کا وقت تھا۔ مگر میں پڑھ نہ سکا۔ پہلے ہی دن میں نے وہ آواز سنی اور مجھے اس سے محبت ہو گئی......''

''آواز سے؟''

''آواز سے بھی اور صاحب آواز سے بھی اور جو پڑھا جا رہا تھا اس سے بھی۔'' عبدالحق نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ عربی زبان ہے' اور قرآن پاک پڑھا جا رہا ہے۔''

''ایسے کیسے محبت ہو سکتی ہے آواز سے؟''

''پتا نہیں۔ میری تو سمجھ میں بس یہی آیا کہ محبت اللہ کی عطا ہوتی ہے۔''

''عجیب محبت ہے...... دیکھے بغیر۔''

''دیکھے بغیر تو اللہ کو بھی ماننا ہوتا ہے نا۔ اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ اور اسے عجیب محبت نہ کہو۔ وہ محبت سچی اور طاقت ور محبت تھی۔ جب مجھے ویر جی سے پتا چلا کہ وہ عربی زبان ہے تو میں نے عربی پڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ مولوی صاحب مجھے عربی پڑھانے لگے۔ بہر حال میں ہر شام کوٹھے

پر پہنچ جاتا تھا۔ وہ آواز سننے کے لیے۔''

بھید کھل رہے تھے۔ باجی نے اسے دکھایا تھا...... ایک باریش آدمی یٰسین شریف کی تلاوت کر رہا تھا' اور ٹھاکر اوتار سنگھ سر جھکائے سن رہا تھا۔ وہ پورا منظر اس کی نگاہوں میں پھر گیا۔

لیکن راکھ سے چنگاریاں بھی سر اٹھا رہی تھیں۔ ''تو آپ کو اُس آواز سے محبت ہو گئی تھی...... اور آواز والی سے بھی؟'' نور بانو نے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''تو وہ تو میری باجی کی آواز تھی جناب!'' نور بانو نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''ناممکن۔ میں کروڑوں آوازوں میں سے اس آواز کو شناخت کر سکتا تھا۔ وہ تمہاری آواز تھی۔''

''ہم تینوں بہنیں اس وقت میں قرآن پڑھتی تھیں۔''

''وہ آواز تمہاری تھی۔ بہر حال امتحان ختم ہونے تک وہ معمول جاری رہا۔ پھر میں مولوی صاحب کو گرمیوں کی چھٹیوں میں ساتھ لے کر گاؤں چلا گیا۔ وہاں میں نے بہت تیزی سے عربی سیکھی۔ میں نے سوچا تھا کہ واپس آکر سنوں گا تو شاید سمجھ سکوں گا کہ کیا پڑھا جا رہا ہے۔ مگر وہ میرے مقدر میں نہیں تھا۔ واپس آنے کے بعد میں ہر روز کوٹھے پر گیا۔ مگر میں نے وہ آواز پھر کبھی نہیں سنی۔''

وقت کے حوالے سے نور بانو کو بھی بہت کچھ یاد آنے لگا۔ جس عرصے میں اوپر والے گاؤں گئے ہوئے تھے' اماں نے انہیں پڑھانے کے لیے استانی جی کی خدمات حاصل کر لی تھیں اور استانی جی عصر کے بعد آتی تھیں اور مغرب کے بعد واپس جاتی تھیں۔ اس کی وجہ سے تینوں بہنوں کا عصر اور مغرب کے درمیان قرآن پڑھنے کا معمول موقوف ہو گیا تھا۔

لیکن نور بانو کے لیے یہ یقین بہت اہم تھا کہ عبدالحق کو جس آواز سے محبت ہوئی' وہ باجی کی نہیں' اس کی تھی۔ اب یہ یقین کیسے حاصل کیا جائے؟ باجی تو مرنے کے بعد بھی اس کے دل کا کانٹا بنی ہوئی تھیں۔ ''میں کیسے مان لوں کہ وہ آواز میری تھی۔''

''میری بات غور سے سنو۔ وہ آواز تو آج تک میری روح میں اتری ہوئی ہے' سماعت میں محفوظ ہے۔ محرومی کے باوجود ہر روز میں اس آواز کو سنتا تھا۔ اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ تم تین بہنوں میں سے کس کی آواز ہے۔ میں بس اس آواز والی سے سچی محبت کرتا تھا۔ میں نے خود کو جانچا بھی اس سلسلے میں۔ میں نے تصور میں بدصورت ترین لڑکی کو اس آواز کے ساتھ دیکھا' اور میری محبت کم نہیں ہوئی۔ پھر مجھے اپنی محبت پر یقین ہو گیا۔''

نور بانو کو اپنے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔

''پھر وہ سانحہ ہوا۔ تمہاری دونوں بہنیں شہید ہو گئیں۔'' عبدالحق اپنی کہے جا رہا تھا۔ ''تب میں نے سوچا شاید آواز والی انہی میں سے ایک تھی۔ پھر میں نے رمضان کی اس مبارک چاندرات

کو وہ آواز سنی۔ یاد ہے تمہیں۔ تم سورۃ الملک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ آواز پہچان کر ہی تو میں بے
خود ہوا تھا۔ ورنہ میں ایسے بے محابا اوپر آسکتا تھا بھلا۔ کبھی ایسا کیا تھا میں نے۔"
نوربانو نے دل میں تائید کی۔ اسے عبدالحق کی وہ از خود رفتگی آج بھی یاد تھی۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔
"اور اسی آواز کی ڈور تھام کر میں نے حق کی گواہی دی۔ وہ تم ہی تھیں نوربانو تمہیں اللہ نے
میرے لیے محفوظ رکھا تھا۔ تمہارا مجھ پر احسان ہے۔ مجھے اسلام تمہارے ذریعے سے ملا۔
میں برسوں سے تم سے محبت کرتا ہوں۔ نوربانو۔"
خوشی اور فخر سے نوربانو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ میرا عبدالحق سے رشتہ بالادستی کا ہے۔ اس
نے سوچا۔ اسی لمحے اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور بات پوری طرح اس کی سمجھ میں
آگئی۔ "میں نے مان لیا۔ یقین کر لیا کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔
"حیرت ہے کہ مجھے پہلے کیوں یاد نہیں آیا۔ واقعی تینوں بہنوں میں صرف میں تھی' جو بلند آواز میں
قرأت کرتی تھی۔ باجی کی آواز تو گھر میں بھی مشکل سے سنائی دیتی تھی۔ صرف میری آواز کوٹھے تک جا
سکتی تھی اور ہاں' جن دنوں کی آپ بات کر رہے ہیں' ان دنوں باجی کا قرآن پڑھنے میں دل کہاں لگتا
تھا۔ وہ قرآن پڑھنے کی بجائے وضو کے بہانے بار بار جا کر آپ کو دیکھتی تھیں۔ سچ کہتے ہیں آپ۔"
عبدالحق خوش ہو گیا۔ "تم بھی مجھ سے محبت کرتی تھیں نوربانو؟"
"جی ہاں۔ لیکن اس سے زیادہ میں نفرت کرتی تھی آپ سے۔"
عبدالحق کو جھٹکا لگا۔ "محبت سے زیادہ نفرت! لیکن کیوں؟"
"اس پر کہ مجھے ایک ہندو سے محبت کیوں ہوئی۔ میں چڑتی تھی آپ سے..... شدید نفرت
کرتی تھی۔ اس لیے کہ آپ کی محبت کو ختم نہیں کر پاتی تھی۔"
"تو یہ تو تمہاری دین داری ہے اور خوف خدا کا ثبوت ہے۔"
نوربانو نے امی اور باجی کے یقین کے بارے میں اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا' جنہیں
یقین تھا کہ وہ مسلمان ہو جائے گا۔ جنہیں یقین تھا کہ ہندو ہونے کے باوجود وہ مشرک نہیں ہے۔
یہ سب بتا کر وہ اپنی پوزیشن کمزور کیوں کرتی۔
"اچھا..... آج تم مجھے پھر سورۃ الملک سناؤ اسی طرح۔" عبدالحق نے فرمائش کی۔
نوربانو جھنجلا گئی۔ اس رات میں ایسی فرمائش! عجیب غیر رومانی آدمی ہے یہ۔ مگر بہ ظاہر اس
نے خوش دلی سے کہا۔ "اس وقت کیسے سنا سکتی ہوں میں۔"
"کیوں..... کیا رکاوٹ ہے؟"
"دیکھیں نا' مجھے یاد تو نہیں ہے قرآن۔ حفظ تو نہیں کیا ہے میں نے۔"
"تو قرآن یہاں موجود ہے نا۔"

"وضو تو کرنا ہوگا مجھے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد وضو کر کے سنا دوں گی۔"
"ٹھیک ہے۔"
"ایک بات بتائیں۔" نوربانو نے اچانک کہا۔ "امی نے آپ کو نیچے آنے کی اجازت
دے دی تھی۔ پھر آپ کبھی نیچے کیوں نہیں آئے۔"
"میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اگر آ گیا ہوتا تو میں اس وقت اس طرح تمہارے پاس نہ ہوتا۔"
"میں سمجھی نہیں۔"
"ماں جی کو میں بھی سچ مچ ماں ہی سمجھتا تھا۔" عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔ "انہوں
نے مجھے اجازت دی کہ میں جب چاہوں' نیچے آسکتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ وہاں کوئی مجھ سے
پردہ نہیں کرے گا۔ انہوں نے بڑا مان دیا مجھے۔ اب ان کا بیٹا ہونے کے ناتے میں ان کی بیٹیوں کا
بھائی ہی ہو سکتا تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ان میں کوئی ایک وہ ہے' جس سے میں محبت کرتا ہوں۔
نیچے آتا تو مجھے اس محبت سے دستبردار ہونا پڑتا۔ ورنہ ماں جی کے اعتماد کا خون ہوتا۔ مجھے نہ یہ گوارا
تھا اور نہ وہ۔ تو بہتر یہی تھا کہ میں دور ہی رہوں۔"
اس لمحے نوربانو کو شدت سے اس پر پیار آیا..... کیسا سچا اور کھرا آدمی تھا وہ اور وہ اسے کتنا برا
سمجھتی تھی۔ "اچھا ہی ہوا کہ آپ نیچے نہیں آئے۔" اس نے کہا۔ "ورنہ باجی کو دیکھتے تو ان سے
محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔"
عبدالحق نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔ "ایک بات کہوں۔ تم شاید محبت کو سمجھتی ہی نہیں
ہو۔ حسین لڑکیاں تو میرے کالج میں بھی بہت تھیں۔ مگر میرے لیے صورت' شکل اور جسم کی کوئی
اہمیت نہیں تھی۔ مجھے تو قرآن پڑھنے والی اس آواز سے محبت ہوئی تھی۔ اب وہ جیسی بھی ہوتی' وہ
مجھے پوری دنیا سے بڑھ کر محبوب ہوتی..... اور ہے۔"
"آپ نے باجی کو نہیں دیکھا کبھی؟"
"کیسے دیکھتا۔ میں کبھی نیچے آیا ہی نہیں۔ اور مجھے لڑکیوں کو دیکھنے کا شوق بھی نہیں رہا۔"
"مگر اس قیامت کی رات آپ نیچے..... ہمارے گھر آئے تھے۔" نوربانو نے نظریں
جھکاتے ہوئے کہا۔
"قیامت بھی کہہ رہی ہو اور پھر پوچھتی ہو کہ میں نے تمہاری بہنوں کو دیکھا تھا یا نہیں۔"
عبدالحق نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "قیامت کے دن کوئی کسی کو دیکھ سکے گا بھلا۔ اس رات میں پہنچا تو
وہاں صرف لاشیں تھیں..... اچھوتی' ان دیکھی معصوم لڑکیوں کی برہنہ لاشیں۔ میں انہیں دیکھ سکتا
تھا بھلا۔ میں نے بس لاشوں پر چادریں ڈالیں۔ پھر سسکیوں کی آوازیں سن کر تمہیں تلاش کرنے
لگا۔ اور سوچو' تم تو زندہ تھیں۔ تمہیں میں اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر اوپر لے گیا لیکن دیکھا تو میں نے

تمہیں بھی نہیں۔ تم وہاں ہمارے ساتھ رہیں۔ پھر ساتھ سفر کیا...... بے پردہ' پھر یہاں ہمارے ساتھ رہیں۔ میں نے تو کبھی تمہیں نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ میں نے تو تمہیں پہلی بار اس رات دیکھا' جب میں تمہارے چچا جان کی تلاش میں ناکام ہو کر لاہور سے واپس آیا اور تم نے میری خبر لی۔"

"سنیں، میرا کوئی غلط مطلب نہیں تھا۔ پھر بھی آپ مجھے معاف کر دیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ ایک بار پھر میں یہ بات بتا دوں کہ دنیا کی حسین ترین لڑکی بھی آپ جیسی حسین نہیں ہو سکتی۔ یہ بات میں کہہ رہا ہوں حالانکہ آپ دنیا کی بدصورت ترین لڑکی ہوتیں' تب بھی مجھے اتنی ہی محبوب ہوتیں۔ اور سنیں' ایک بات ہمیشہ یاد رکھیے گا۔ میں جھوٹ کبھی نہیں بولتا۔"

"اتنے یقین سے نہ کہیں یہ بات۔" نور بانو نے شوخ لہجے میں کہا۔ "چچا جان کے معاملے میں جھوٹ بول چکے ہیں آپ؟"

"اللہ معاف کرے' لیکن وہ بھی آپ ہی کی بہتری کے لیے تھا۔"

"میری بہتری کے لیے مجھے دنیا کی حسین ترین لڑکی بھی تو بنا سکتے ہیں آپ۔"

"نہیں۔ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ چاہے تم اس پر یقین نہ کرو۔"

نور بانو کو اس کے لہجے میں ہلکی سی خفگی محسوس ہوئی۔ "میں آپ کو دنیا کا سب سے سچا اور اچھا انسان سمجھتی ہوں جناب!" اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"بہت بہت شکریہ۔"

عبدالحق مسہری سے اترنے لگا تو نور بانو نے بے ساختہ کہا۔ "ارے...... ارے...... کہاں چلے آپ؟"

"وضو کر کے آؤں۔ شکر کے دو نفل تو ادا کر لوں۔ اتنی بڑی نعمت دی ہے مجھے اللہ نے۔" عبدالحق نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نور بانو پھر جھنجلا گئی۔ کیا تنہائی اور خلوت کبھی نہیں ملے گی مجھے۔ کچھ نہیں تو اللہ میاں ہی بیچ میں آ جائیں گے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ ڈری بھی۔ لیکن اس وقت عبدالحق کا دور جانا اسے گوارا نہیں تھا۔ "جلدی کیا ہے۔ نفل تو مجھے بھی ادا کرنے ہیں۔" اس نے کہا۔

"تو آ جاؤ۔ تم بھی وضو کر لو۔"

"ابھی ذرا دیر میں کر لیں گے۔ دو باتیں تو کر لیں۔ ایک بات مجھے پوچھنی ہے آپ سے۔"

عبدالحق پھر اس کے قریب ہو گیا۔ "پوچھو۔"

"شرم آتی ہے مجھے۔ کیسے پوچھوں؟" نور بانو نے نظریں جھکا لیں۔

"اب مجھ سے کیسی شرم۔ اب تو میں تمہارا ہوں اور تم میری ہو۔"

"واقعی؟" نور بانو نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کبھی مجھے بے شرم تو

نہیں سمجھیں گے؟"

"کبھی بھی نہیں۔ کسی حال میں بھی نہیں۔"

"یہ بتائیں' اس دن شیڈ میں آپ نے مجھے لپٹایا تو آپ کو میں کیسی لگی؟" نور بانو نے پوچھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ لمس کیا تھا' ایک دھماکہ تھا جو عبدالحق کے وجود میں ہوا۔ پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔ "ابھی بتاتا ہوں۔" اس نے کہا۔ اس کی آواز میں خفیف سی لرزش تھی۔ اس نے بتی بجھا دی اور نور بانو کو لپٹا لیا۔ اس لمحے اس نے سمجھا...... رات پردہ پوش!

"میری بات کا جواب نہیں دیا آپ نے۔" نور بانو نے خواب ناک لہجے میں کہا۔

"پہلے تمہیں دریافت تو کر لوں' پھر جواب بھی دے دوں گا۔"

اور نجانے کتنی دیر بعد' جب وہ دونوں بے سدھ لیٹے تھے تو نور بانو نے اپنا سوال دہرایا۔

"تم پوری کائنات ہو...... اسرار سے بھری۔ میں ساری عمر تمہیں کھوجتا رہوں گا لیکن شاید پوری طرح سمجھ نہیں سکوں گا۔" عبدالحق نے نیند بھری آواز میں کہا۔ اور اس کے چند ہی لمحوں کے بعد وہ بے خبر سو چکا تھا۔

نور بانو اب بھی جاگ رہی تھی۔ وہ احساسِ طمانیت سے سرشار تھی۔ یافت کے سفر کے دوران عبدالحق مسلسل زیرِ لب کچھ کہتا رہا تھا۔ اس نے سننے کی کوشش کی' اور بالآخر سن لیا۔ وہ ہر بڑھتے قدم کے ساتھ' ہر مرحلے پر وارفتہ لہجے میں ایک ہی بات کہتا رہا تھا۔ خدا کی قسم' تم سے حسین کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ کیسی حسین ہو تم...... حسین اور پُر اسرار!

نور بانو نے سمجھ لیا تھا کہ عبدالحق کو ساری عمر اپنا مطیع بنائے رکھنے کے لیے اس کے پاس دو ہتھیار ہیں...... ایک تو یہ احسان کہ عبدالحق کو راہِ ہدایت اس کی آواز کے حوالے سے ملی تھی...... پہلے قدم سے لے کر منزل تک۔ اور دوسرا ہتھیار اس کا جسم تھا' جو عبدالحق کو مسحور کر دیتا تھا۔ اسے عمر بھر اس کی شادابی کا خیال رکھنا تھا۔

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے وہ بھی سو گئی!

عبدالحق کی آنکھ کھلی تو کھڑکی کے پردے پر منعکس ہوتی دھوپ نے اسے بتا دیا کہ دن چڑھ چکا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی نظر سوتی ہوئی نور بانو کی بے ترتیبی پر پڑی تو اس نے جلدی سے چادر برابر کر دی۔

وہ بیٹھ کر سوچتا رہا۔ دل میں اداسی اور تاسف قطرہ قطرہ گر رہا تھا...... ٹپ ٹپ ٹپ! یہ کیا ہو گیا؟ دل میں پچھتاوے نے ڈنک چبھویا۔ کیا کیا سوچا تھا میں نے۔ یہ کیا ہو گیا!

❁...❁...❁

یہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

عشق کا عین

عشق مجازی، عشق حقیقی میں کیسے بدلتا ہے،
محبت کی روح کو سمجھنے والوں کیلئے

علیم الحق حقی کا ایک یادگار ناول

عشق کی ابجد کے پہلے حرف تک پہنچنے کی نصف صدی پر محیط جدوجہد کا احوال

عشق کائنات کا سب سے طاقتور، لازوال اور حسین جذبہ جو شاعری کی بنیاد اور صوفیاء کا مسلک رہا ہے۔ عشق کیا ہے؟ اس پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے اور قیامت تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا لیکن اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکے گا۔ شاید اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ عشق حقیقی ہو تو اپنے صحیح روپ میں نظر آتا ہے۔ پھر یہ عشق انسان کو معرفت عطا کرتا ہے اور اس کیلئے زمان و مکاں کے فاصلے مٹ جاتے ہیں۔

ایچ اینڈ ایچ پبلشرز

ثبہ بابا فرید عقب ضلع کچہری لاہور فون: 042-37311965
0333-4302837

عشق کا شین
علیم الحق حقی

پیش لفظ

قارئین کرام!

السلام علیکم!

اللہ سے یہ دُعا کرتے ہوئے کہ یہ آپ کے انتظار کا بہترین بدل ثابت ہو، ''عشق کا شین'' کا تیسرا اور چوتھا حصہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اور اللہ سے اُمید اور دُعا ہے کہ بہ شرطِ صحت و زندگی 2012ء میں مکمل ''عشق کا شین'' آپ تک پہنچ جائے گی۔

اس کہانی پر کام کرتے ہوئے مجھے گیارہ سال ہو گئے اور بارہواں سال شروع ہو چکا ہے۔ میرے اختیار میں ہوتا تو یہ اس سے بہت کم ضخامت میں اس سے بہت پہلے مکمل ہو چکی ہوتی۔ لیکن میرا کمٹ منٹ اللہ سے اور اس کے بعد آپ سے ہے۔ کہانی کا گلا گھونٹ کر، اپنی ضرورتوں کی وجہ سے اسے جیسے تیسے مکمل کر دینا میرے نزدیک بددیانتی ہوتی۔

یہ صبر آزما کام میرے لئے کسی بھی طرح آسان نہیں تھا۔ اس عرصے میں ذہن میں کئی کہانیوں کے خاکے آئے، جن میں سے کچھ کاغذ پر لکھ لئے گئے اور کچھ ذہن میں موجود ہیں۔ چار نامکمل کہانیاں اس کے علاوہ ہیں، جو میری توجہ کی منتظر ہیں۔ لیکن اس عرصے میں میں نے کسی طبع زاد کہانی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ تراجم البتہ کرتا رہا اور کر رہا ہوں۔ مگر ''عشق کا شین'' کا ارتکاز الحمد للہ اپنی جگہ۔

آپ سب نے ''عشق'' کی جس طرح پذیرائی کی اور جس بے تابی سے اس کے لئے انتظار کیا، وہ پبلشرز کے لئے آزمائش بن گیا۔ وہ تو جلد از جلد ''ہاٹ کیک'' سے پیسہ کما کر آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔ اور آپ بھی جلد از جلد پڑھنا چاہتے ہیں۔ لیکن کہانی لکھنا مشینی کام نہیں، فیکٹری ورک نہیں۔ یہ تو تخلیقی عمل ہے، جو کبھی تیزی سے چلتا ہے اور کبھی بہت آہستگی سے۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ نامکمل ''عشق کا شین'' کمپیوٹر کو دے دی جائے اور وہ اسے مکمل کر کے پرنٹ آؤٹ نکال دے۔ البتہ انسانی مشین سے کام چل سکتا ہے۔

سو میرے لکھے ہوئے تقریباً سو صفحات جو میرے پبلشر کے پاس میری امانت تھے، میرے پبلشر نے ایک انسانی مشین کے سپرد کر کے اسے ''عشق کا شین'' مکمل کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ نتیجتاً چند ماہ میں ''عشق کا شین'' انہوں نے مکمل کر دی، اس وعدے کے ساتھ کہ وہ پوری کتاب ان کی لکھی ہوئی ہے۔ اخلاقی قدروں کی پامالی، جھوٹ اور بددیانتی آج کل بہت چھوٹی اور غیر اہم باتیں ہیں۔ بعد میں انہیں پتا چلا کہ یہ بہت طویل کہانی ہے تو غالباً انہوں نے ایک اور حصہ لکھ مارا۔ (حالانکہ کہانی وہ مکمل کر چکے تھے) ''عشق کا قاف'' اس سے پہلے

ایک اور صاحب تصنیف فرما چکے تھے۔ بعد میں ''عشق کا شین'' مکمل کرنے والی ''انسانی مشین'' قاف سے نمٹنے میں مصروف ہوگئی۔

اس ''انسانی مشین'' نے کراچی میں کتابوں کے ایک میلے میں میری ایک عزیزہ کے استفسار پر کہ انہوں نے ''عشق کا شین'' تصنیف کرنے کی زحمت کیوں کی؟ یہ انکشاف فرمایا کہ علیم الحق حقی کا انتقال ہو چکا ہے، اس لئے یہ ذمہ داری ان کے نازک کندھوں پر آپڑی، جس سے وہ بہ ہزار حسن و بہ ہزار خوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ میری عزیزہ کی برہمی اپنی جگہ، مجھے تو وہ ان کی طرف سے اپنے لئے درازئ عمر کی دُعا ہی لگی۔

دُشواری یہ ہے کہ عشق محض سہ حرفی لفظ ہے۔ اگر ہمارے لسانیات کے علماء اس طرف توجہ فرماتے اور عشق کے لئے ایک ایسا متبادل لفظ تخلیق فرماتے، جس میں اُردو زبان کے ''ا'' تا ''ی'' تمام حروفِ تہجی موجود ہوتے تو ملک وقوم کو بڑا فائدہ ہوتا۔ بے روزگاری میں کمی ہوتی، پبلشنگ میں ترقی ہوتی اور ملکی معیشت کافی بہتر ہوگئی ہوتی۔ کوئی انسانی مشین ''عشق کا ڑے'' ٹائپ کر رہی ہوتی تو کوئی ''عشق کا ڈال'' ہر طرف عشق ہی عشق ہوتا۔ عشق کے سوا کہیں کچھ نہ ہوتا۔ ویسے اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اس پر کام کیا جا سکتا ہے۔

میں بہرحال اپنی رفتار سے ''عشق کا شین'' لکھتا رہا اور لکھ رہا ہوں۔

چار سال بعد پہلا حصہ آپ تک پہنچا، پانچ سال بعد دوسرا اور دو سال بعد تیسرا اور چوتھا۔ اور انشاء اللہ ایک سال بعد آخری حصہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ بہ شرطِ زندگی اور تن درستی۔

کئی پبلشرز نے پیش کش کی، بلکہ اصرار کیا کہ ''عشق کا شین'' اپنی جگہ، میں ''عشق کا قاف'' مکمل کر کے انہیں دے دوں۔ پُرکشش معاوضے کی پیش کش ہوئی۔ بڑی آفرز تھیں۔ ''عشق کا قاف'' کی تھیم بھی میرے پاس موجود تھی۔ لیکن ایک کام مکمل کئے بغیر میں دوسرا شروع نہیں کرنا چاہتا۔

میرے لئے یہ گیارہ سال بڑی آزمائش کے تھے۔ اللہ نے اپنی تائید اور فضل سے مجھے سرخ روئی عطا فرمائی۔ میں ایک ایسا شخص ہوں کہ میری کہانیاں میرے لئے وسیلۂ رزق ہیں۔ پہلے حصے کے معاملے میں رائلٹی میں بددیانتی ہوئی اور دو نمبر دوسرا حصہ چھاپا گیا۔ میرا لکھا ہوا دوسرا حصہ جو ایچ اینڈ ایچ پبلشرز کے نام سے شائع ہوا، وہ سراسر بے ایمانی اور فراڈ کا کیس تھا۔ تیسرا اور چوتھا حصہ میں نے اپنی خوشی سے خزینہ علم و ادب کو دے کر اپنی کچھ ضرورتیں پوری کیں۔ الحمدللہ! میں نے معیار پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ یہ میرے اللہ کا فضل ہے کہ وہ میری ضرورتیں پوری فرماتا ہے۔ رزق اس کا وعدہ ہے، کم ہو یا زیادہ۔ اور وہ جب چاہے گا، اپنے فضل سے بے حساب عطا فرمائے گا۔ اسی سے اُمید رکھتا اور دُعا کرتا ہوں۔ اسی کے حکم پر بے ایمان، غاصب اور چور اپنے کئے کی سزا بھگتیں گے۔ یہ یہاں نہ ہوا تو انشاء اللہ آخرت میں ہوگا۔ اور آخرت میں ہوا تو زیادہ بہتر ہوگا کہ سب سے زیادہ ضرورت مند ہم وہیں تو ہوں گے۔ جنہوں نے یہاں بے ایمانی کی، میرے حقوق غصب کئے، بددیانتی کی، جھوٹ بولے، متعدد جرم کئے اور مجھ پر وہاں الزام لگائے، جہاں میں اپنی تردید بھی نہیں کر سکتا تھا، یقیناً اللہ کے حضور جواب دہ ہیں، خواہ یہ بات سمجھیں یا نہ سمجھیں۔

آپ کے اور میرے درمیان رشتہ سچائی اور محبت کا ہے۔ اللہ کی رحمت سے جو کچھ اچھا سیکھتا ہوں، بڑے خلوص اور محبت سے آپ کی طرف بڑھا دیتا ہوں۔ ساتھ ہی آپ سب کے لئے دُعا بھی کرتا ہوں۔ اور جانتا ہوں کہ اللہ کے فضل سے میں بڑے پاک اور مقدس مقامات پر بھی آپ لوگوں کی دُعاؤں میں رہتا ہوں۔ اللہ آپ سب کو جزائے عظیم عطا فرمائے۔

آپ سے اِلتجا ہے کہ میرے اور اہل خانہ کے لئے ایمان و مغفرت، رزق کی فراخی اور آسانیوں کی اور صحت و تن درستی اور درازیٔ عمر بالخیر کی دُعا فرمائیں۔ دُعا کریں کہ میں آپ کے لئے اسی طرح لکھتا رہوں۔

والسلام

آپ کا اپنا

علیم الحق حقی

***

کتاب چہارم

کسوف

(سورج گرہن)

وہ بہت محدود پیمانے پر ہونے والی ایک نجی محفلِ عیش تھی، جو ایک ایسے افسر کے اعزاز میں برپا کی گئی تھی جس کا تقریباً چار سال پہلے کراچی میں تبادلہ کر دیا گیا تھا اور تب سے وہ اب پہلی بار لاہور آیا تھا۔

اُس افسر کا نام عارف تھا۔ وہ یقیناً اُدھیڑ عمر ہوگا، لیکن دیکھنے میں جوان ہی لگتا تھا۔ خوش شکل بھی تھا اور خوش گفتار بھی اور افسر ہوتے تو پڑھے لکھے ہی ہیں۔

سب کچھ تھا، مگر عارف تماش بین کہیں سے نہیں لگتا تھا۔ اس کے انداز میں شائستگی اور رکھ رکھاؤ تھا۔ اس کے میزبان اسے پروفیسر کہتے تھے۔ سمن کو وہ حیرت انگیز لگا۔

پہلے دور میں دورِ شراب چلا اور ساتھ میں رقص و موسیقی کی محفل بھی۔ پھر جب آوازیں قدرے لڑکھڑانے لگیں تو بھٹی صاحب نے کہا۔

''بھئی......! اب تو یا شیخ ہو جائے۔''

''یا شیخ......! اپنی اپنی دیکھ......!'' عارف نے گنگناتے ہوئے کہا۔

''سب سے پہلے تو ہی دیکھ لے میرے یار......! تیرے نخرے بہت ہیں۔'' شفاعت بھٹی نے عارف سے کہا۔

چاند جب رستہ کاٹ جائے تو
جلتا سورج بھی بجھ سا جاتا ہے

وہاں وہ چھ مرد تھے اور چھ ہی عورتیں۔ ان کے علاوہ جو تھے، وہ یا تو سازندے تھے یا بھٹی کے خدمت گار۔

’’تمہیں تو معلوم ہے کہ میں بڑا افسر ہوں۔‘‘ عارف نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’ہاں.....! پتا ہے مجھے۔ انٹرویو لینے کی عادت ہوگئی ہے تجھے.....!‘‘ ملک صاحب بولے۔

’’عجیب آدمی ہے یار.....!‘‘ چیمہ صاحب بولے۔

’’طوائفوں کو بھی انٹرویو کے بغیر اپائنٹ منٹ لیٹر نہیں دیتا تو.....!‘‘

’’نا.....! بری بات .....! ایسے نہیں کہتے۔‘‘ عارف نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھتے ہوئے کہا۔

’’اس لفظ کو تم ایسے ادا کرتے ہو، جیسے یہ گالی ہو۔‘‘

’’ابے پروفیسر.....! گالی ہی تو ہے یہ..... یہ لفظ ہی برا ہے۔ اپنی بیوی کو کہہ کر دیکھ، پھر پتا چلے گا۔‘‘

’’بیوی کو اسی لفظ کے قابل نہیں سمجھتا ورنہ ضرور کہتا۔‘‘ عارف نے کہا۔

’’اور سنو.....! لفظ برے نہیں ہوتے۔ ان کی ادائیگی اور لہجے انہیں برا بناتے ہیں۔ اسی لفظ کو اچھی طرح بھی تو ادا کیا جا سکتا ہے۔ طوائف!‘‘ اس نے گویا کہہ کر دکھایا۔

’’تجھے تو کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔‘‘ نواز بولا۔

’’اس کے لئے احساس کا زندہ ہونا ضروری ہے۔‘‘

’’ہم کیا یہاں فلسفیانہ گفتگو کے لئے جمع ہوئے ہیں.....؟‘‘ نواز نے احتجاج کیا۔

’’تم مجھے میرا کمرہ دکھا دو۔‘‘ عارف نے کہا۔

شفاعت بھٹی نے سکون کی سانس لی۔

’’یہ سامنے والا کمرہ تیرا ہے۔‘‘ اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

’’بس تو میں چلا.....!‘‘

’’بوتل تو لے لے.....!‘‘

’’تمہیں پتا ہے، میں ایک ساتھ دو نشے بھی نہیں کرتا۔ دونوں ایک دوسرے کو مائنس کر دیتے ہیں۔‘‘ عارف نے اُنگلی نچاتے ہوئے کہا۔

’’اور ہاں! اُمیدواروں کو ایک ایک کر کے بھیج دینا۔‘‘ یہ کہہ کر وہ کمرے میں چلا گیا۔

’’ہم تیرے چپڑاسی ہیں سالے.....!‘‘ مقصود نے چیخ کر کہا۔

’’مہمان نہ ہوتا تو بتاتا سالے کو۔‘‘

’’چپ ہو جا!‘‘ بھٹی نے اسے ڈپٹا۔

’’پیتے ہوئے یہ خیال تو رکھا کر کہ چڑھ نہ جائے۔‘‘

’’چڑھے گی نہیں تو مزہ کیا.....؟‘‘

شفاعت بھٹی نے ایک لڑکی کو اشارہ کیا۔ وہ عارف کے کمرے میں گئی۔ لیکن وہ چند ہی منٹ میں واپس آ گئی۔ اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

’’یہ سالا ایک گھنٹہ تو ہمیں لٹکائے رکھے گا۔‘‘ نواز نے کہا۔

’’یہ نہ بھولو کہ وہ ہمارا خاص مہمان ہے۔‘‘ شفاعت بھٹی نے تنبیہ لہجے میں کہا۔ پھر اس نے سمن کو کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔

کمرے میں داخل ہوتے وقت سمن کا دل عجیب طرح سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اس شخص سے مرعوب ہوگئی تھی اور سچی بات یہ کہ وہ اسے اچھا بھی لگا تھا۔ وہ اسی بات سے ڈر رہی تھی۔ کیونکہ اس پیشے میں کسی کو پسند کرنا نقصان کا ہی سودا ہوتا ہے۔

سمن اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے منتخب کر لے۔

’’کیا نام ہے تمہارا.....؟‘‘

’’سمن.....!‘‘

’’خوب صورت، تمہیں تو سونگنا ہوگا۔‘‘ عارف نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

سمن کو عجیب سا لیکن بہت اچھا لگا۔ کسی نے کبھی اس کی ایسی تعریف

نہیں کی تھی۔

''ہاتھ بڑھاؤ اپنا۔''

سمن نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے تھام لیا۔ ایسے جیسے اس کی نبض دیکھ رہا ہو۔ چہرے پر کسی ڈاکٹر ہی کی طرح کا غور وفکر کا تاثر بھی تھا۔ پھر اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''حدت بھی ہے اور نبض بھی تیز ہوگئی ہے۔ یعنی دل بہ وقت ضرورت زیادہ دھڑکنا ہی جانتا ہے۔'' اس نے ڈاکٹر ہی کے انداز میں تبصرہ کیا۔

اس کے لمس میں سمن کو شرافت اور تہذیب محسوس ہوئی۔ اسے بہت اچھا لگا۔ یہ انداز اس کے لئے بالکل نیا اور اچھوتا تھا۔

''ارے......! گردن پر، نیچے کی طرف یہ خوب صورت براؤن تل بھی ہے۔'' عارف نے ہاتھ بڑھا کر اس تل کو اُنگلی سے چھولیا۔

اس بار سمن اپنے چہرے پر اچانک تیزی سے لپکنے والی سرخی اور تمتماہٹ کو روک نہیں سکی۔

''بہت خوب......! اب پلیز! ایک زحمت کرو۔ جا کر دروازہ بند کردو۔'' عارف نے کہا۔

سمن اُٹھی تو اس کے جسم میں خفیف سی لرزش تھی۔ یہ کیسا شخص ہے؟ جس نے صرف چند لمحوں میں اسے طوائف سے عورت بنا دیا ہے۔ اس نے جا کر دروازہ بند کیا اور چٹخنی چڑھا دی۔

باہر موجود تمام لوگوں نے سکون کی سانس لی۔

''چلو جان چھٹی۔'' مقصود نے بلند آواز میں کہا۔

سمن پھر وہیں جا بیٹھی۔ اس نے اپنے دامن کی طرف ہاتھ بڑھایا تو عارف نے اسے روک دیا۔

''اس کی ضرورت نہیں۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح باتیں کریں گے۔ رات بہت پڑی ہے۔''

سمن نے چند لمحے سوچا، پھر بولی۔

''ایک بات پوچھوں؟ برا تو نہیں لگے گا آپ کو؟''

''جب ہم اچھے دوست ہیں تو برا لگنے کا کیا سوال؟ ابھی تم نے میرے دوستوں کو نہیں دیکھا۔ کیسے برداشت کر رہے تھے مجھے، اور میں بھی ایسے ہی انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہوں۔ تم جو چاہو پوچھ سکتی ہو۔ مگر پہلے آرام سے بیٹھ جاؤ۔ تھکن ہو تو بلاتکلف لیٹ بھی سکتی ہو تم۔''

''جی نہیں......! شکریہ!''

''اچھا تو یہ تکیہ لو اور آرام سے پاؤں پھیلا کر بیٹھ جاؤ۔'' عارف نے اس کی طرف تکیہ بڑھایا۔

سمن نے تعمیل کی اور آرام سے نیم دراز ہوگئی۔ ناچنے کی وجہ سے واقعی تھکن ہوگئی تھی۔

''ہاں! اب پوچھو، کیا پوچھ رہی تھیں تم؟''

''اب آپ مجھ سے میری کہانی سننا چاہیں گے؟''

عارف ہنسنے لگا۔

''غلط سمجھیں تم! میں نے کہا نا، ہم اچھے دوستوں کی طرح باتیں کریں گے اور جہاں تک کہانی کا تعلق ہے تو اس دُنیا میں ہر شخص کی ایک کہانی ہے، یہاں تو کہانیاں ہی کہانیاں ہیں، کسی حد تک ایک جیسی، اور کہیں کہیں مختلف، تم اس وقت یہاں ہو تو یہ بھی ایک کہانی ہے۔ میں اس وقت یہاں ہو تو یہ بھی ایک کہانی ہے۔''

''واقعی؟'' سمن نے بے تکلفی سے کہا۔

''ہاں! اور جب ہم دوست بن کر باتیں کریں گے تو کہانی بے ترتیبی کے ساتھ کہیں کہیں سے کھلے گی۔ یہ اچھا بھی لگے گا۔''

''عجیب آدمی ہیں آپ!''

''یہ بات نہیں۔ ایب نارمل لوگوں کے درمیان میں ایک نارمل آدمی ہوں۔ عجیب کیا لگا تمہیں مجھ میں؟''

''ایک تل کی بنیاد پر مجھے پسند کرلیا۔''

عارف پھر ہنسنے لگا۔

''ارے نہیں......! تل تو ایڈیشنل کوالی فکیشن تھا۔ میرا مطلب ہے، اضافی قابلیت، میں نے تو تمہیں نبض چیک کر کے منتخب کیا تھا۔''

''نبض سے کیا چیک کیا تھا آپ نے؟''

''کیمسٹری، اپنے لمس پر تمہارا ردِعمل۔ میرے چھوتے ہی تمہارے دل کی رفتار بڑھی، جسم میں حدت پیدا ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ تم نے مجھے قبول کر لیا ہے۔ تمہیں میں اچھا لگا ہوں۔ تمہارے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی ہے۔''

''اس کی پرواہ کون کرتا ہے۔'' ثمن نے اُداسی سے کہا۔

''یہ تو ضرورت پوری کرنے کی بات ہے۔''

''میں اس بات کی پرواہ کرتا ہوں۔ میرے لئے اس کی اہمیت ہے اور اس کی وجہ بھی ہے۔ ہو سکتا ہے، رات ختم ہونے سے پہلے تمہیں معلوم بھی ہو جائے۔ دیکھو ثمن......!'' اس نے یوں سانس کھینچی، جیسے اس کی خوشبو وجود میں اُتار رہا ہو۔

''تمہارا نام بھی اچھا لگا تھا مجھے، اور تمہارے لئے مناسب بھی ہے۔ تم نازک بھی ہو اور تم میں مہکار بھی ہے۔''

ثمن بے خود سی ہوگئی۔ اس کے سامنے گاہک نہیں، عاشق بیٹھا تھا۔

''اتنے نخرے کیوں کرتے ہیں آپ؟''

''اس لئے کہ میں انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ انجوائے کرنے کا مطلب سمجھتی ہو تم؟''

ثمن نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''لطف اندوز ہونا۔''

''وہ تو آپ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔''

''نہیں......! یہی تو مسئلہ ہے۔ دیکھو! میں جانتا ہوں کہ میں گناہ کر رہا ہوں، اللہ کو ناراض کر رہا ہوں، مگر بہت بڑی مجبوری ہے، اس لئے کر رہا ہوں۔ اب گناہ کر رہا ہوں تو لذت تو ملنی چاہئے نا مجھے، اسی کی خاطر تو کر رہا ہوں۔

گناہِ بے لذت کا کیا حاصل؟ مجھے بھی کچھ فائدہ نہیں، اور اللہ بھی ناراض ہوگا۔ یہ تو دُہرا خسارہ ہوگیا۔ یہ تو میں کبھی گوارہ نہیں کر سکتا۔''

''تو وہ لذت تو کسی کے بھی ساتھ مل سکتی ہے آپ کو۔'' ثمن کو اب اس گفتگو میں لطف آ رہا تھا۔ وہ بھول گئی تھی کہ وہ ایک طوائف ہے۔

''نہیں مل سکتی نا......! میں دراصل سوچنے والا حساس جانور ہوں۔ میں صرف اپنے احساسات کی فکر نہیں کرتا، دوسروں کے احساسات کی پرواہ بھی کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ جسمانی اختلاط ایک کھیل ہے۔ دو افراد کے درمیان انفرادی کھیل۔ ٹیم گیم نہیں ہے۔ میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ بیڈمنٹن کے بارے میں جانتی ہو تم؟''

''نہیں!''

''خیر......! یہ ایک کھیل ہوتا ہے۔ اُونچا سا نیٹ ہوتا ہے، دونوں طرف ایک ایک کھلاڑی، دونوں کے ہاتھ میں ریکٹ ہوتے ہیں اور ایک چڑیا ہوتی ہے۔''

''ارے......! یہ تو میں نے دیکھا ہے۔ ہاں کھیلا کبھی نہیں۔''

''اب سوچو! ایک کھلاڑی سرو کرتا ہے۔ دوسرا جھپٹ کر چڑیا کو نیٹ کے دوسری طرف اُچھالتا ہے۔ پہلا اسے گرنے سے پہلے ہی ریکٹ کی مدد سے واپس کر دیتا ہے۔ چڑیا اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر آتی جاتی ہے۔ زمین پر نہیں گرتی۔ ہے نا سنسنی اس میں۔ جتنی طویل ریلی ہو، دونوں کھلاڑی اتنا ہی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہار جیت کی حیثیت تو ثانوی ہے۔ اصل چیز ہے لطف اندوز ہونا۔''

''اب سوچو کہ میں نے سروس کی، نیٹ کے اس طرف کھڑے دوسرے کھلاڑی نے ہلنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ وہ اپنی جگہ بُت بنا کھڑا ہے۔ ریکٹ ہلاتا تک نہیں تو اسے سروس کیسے ملی گی؟ کوئی پوائنٹ جیتے، تب ملے گی نا......! اور پوائنٹ اسے جیتنا ہی نہیں بلکہ اسے تو کھیلنا ہی نہیں ہے۔ دو منٹ میں کھیل ختم۔ میں 15-O سے جیت گیا۔ مگر لطف کیسا؟ مجھے تو شدید کوفت ہوگی۔ کھیل کا

مزہ مقابلے میں، جدوجہد اور کشمکش میں ہے۔ لمبی ریلیز میں ہے۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا تم؟''

''جی......! سمجھ رہی ہوں۔''

''اور میں نے تو ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں نیٹ کے دوسری طرف، جن کے ہاتھ میں ریکٹ بھی نہیں ہوتا۔ کھیلنے کا ارادہ ہی نہیں ہوتا ان کا۔ بس جیسے مروّت میں آ کر کھڑے ہوگئے ہوں۔ بس میں اسی طرح کھیلنا نہیں چاہتا۔ گناہِ بے لذت کا قائل نہیں ہوں میں۔ اس لئے اتنے نخرے کرتا ہوں۔''

ثمن نے چپکے سے اسے دیکھا۔ بہت عجیب، بہت پُرکشش آدمی تھا وہ۔

''یہ بتاؤ! تم کہاں سے آئی ہو؟'' عارف نے اچانک پوچھا۔

''وہی کہانی شروع؟''

''غلط سمجھیں تم! میں تمہارے ماضی کے بارے میں نہیں پوچھ رہا ہوں۔ میں حال کی بات کر رہا ہوں۔ کس کوٹھے سے آئی ہو؟''

''اوہ......! میں نرگس بائی کے کوٹھے سے آئی ہوں۔''

''نرگس بائی......؟ یہ کون سا کوٹھا ہے؟ کوئی نیا......''

''آپ نیلم بائی سمجھ لیجئے۔''

''ہاں......! یہ ہوئی نا بات، مگر تم نے اسے نرگس بائی کا کوٹھا کیوں کہا؟''

''اس لئے کہ اب وہ نرگس بائی کا ہی ہے۔ نیلم بائی کو تو مرے ہوئے بھی سال سے اُوپر ہوگیا۔''

''اوہ ......! اب تو مجھے نرگس بھی یاد آ گئی۔ تو اب وہ کوٹھا اس کا ہے۔''

''آپ اتنا کچھ کیسے جانتے ہیں؟''

''ارے......! میں یہیں کا ہوں۔ چار سال پہلے تبادلہ ہوگیا تھا میرا اور ان بازاروں کی خاک تو برسوں سے چھان رہا ہوں۔ کس کو نہیں جانتا میں، تم البتہ نئی ہو۔''

''مجھے ڈھائی سال ہوگئے، اسی کوٹھے پر۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم نیلم بائی کی زندگی میں ہی وہاں پہنچی تھیں۔ پھر تم نے اسے نرگس بائی کا کوٹھا کیوں کہا؟''

''اس لئے کہ وہ اس وقت بھی نرگس بائی کا کوٹھا ہی تھا۔ نیلم بائی زندہ ضرور تھیں لیکن اس سے پہلے ہی وہ سب کچھ نرگس بائی کے نام کر چکی تھی۔ میں نے تو وہاں نرگس بائی کی حکومت ہی دیکھی۔''

''ہائے ہائے......! زخم محرومی ہرا ہوگیا۔'' عارف نے آہ بھر کے کہا۔

''کیسی ہے نرگس؟ مجھے یقین ہے کہ وہ ویسی ہی حسین ہوگی اور اسی طرح کسی نہ آنے والے کی آمد کی منتظر۔''

ثمن نے غور سے اسے دیکھا۔

''ان سے کوئی خاص تعلق ہے آپ کا؟''

''خاص الخاص سمجھو ثمن......!'' عارف نے پھر گہری سانس لی اور جیسے اس کی خوشبو اپنے اندر اُتار لی۔

''تم ادھر قریب آؤ نا! میرے سینے پر سر رکھ کر لیٹ جاؤ۔ کسی بیوی کی طرح۔''

ثمن نے تعمیل کی۔

''آپ نرگس بائی سے اپنے تعلق کے بارے میں بتا رہے تھے۔''

''ہاں! مجھے اسم بامسمّٰی لوگ بہت اپیل کرتے ہیں۔'' عارف نے گہری سانس لے کر کہا۔

''تم اپنی ہی مثال لو۔ نام ثمن ہے، دیکھنے میں بھی ثمن ہو، چھونے میں بھی اور سونگھنے میں بھی۔ ایسے ہی نرگس تھی۔ کھوئی کھوئی سی، اور کسی کی منتظر، حسین اور نازک، مگر نادستیاب۔''

''آپ ان سے ملے کبھی؟''

''صرف ایک بار، مجھے پاگل کر دیا تھا اس کی خوب صورتی نے۔ مگر کھیلنے کے لئے کھڑا ہوا تو پتا چلا ایک وہی تو ہے، جسے میں نے نیٹ کی دوسری

طرف خالی ہاتھ کھڑے دیکھا، ورنہ دوسرے کم از کم دکھاوے کی خاطر تو ریکٹ تھام لیتے ہیں، بس پھر میں پلٹ کر اس کی طرف نہیں گیا۔ اب کیا حال ہے اس کا؟ اب بھی ویسی ہی ہے؟''

''یہ تو کوئی بھی نہیں بتا سکتا آپ کو۔ دھندا تو وہ چھوڑ چکی ہے۔''

''ناممکن! مشکل سے پچیس چھبیس کی ہوگی وہ۔ یہ تو اس کے عروج کا وقت ہے۔''

''کہتے ہیں، انہیں کوئی خوف ناک بیماری لگ گئی ہے۔''

''ناممکن تو نہیں۔ مگر مجھے یقین نہیں آتا۔ دیکھنے میں کیسی ہے وہ؟''

''کوٹھے پر سب سے حسین!''

''تو اب کرتی کیا ہے وہ؟''

''آپ یقین نہیں کریں گے۔ کوٹھے پر بیٹھ کر اللہ اللہ کرتی ہیں وہ۔''

''یہ کوئی ناقابل یقین بات نہیں۔ مجھے تو لگا تھا کہ وہ مردوں کی قربت میں بھی اللہ اللہ ہی کرتی ہے۔ وہ کوٹھے کی شئے تھی ہی نہیں۔ وہ تعلیم یافتہ بھی تھی۔ اس جیسا میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے کبھی خود کو کسی کے حوالے نہیں کیا ہوگا۔''

''میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ وہ سب لڑکیوں پر بہت مہربان ہیں۔ سب کی فکر کرتی ہیں۔ ہفتے میں چار دن سے زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا کسی کو۔''

''اچھا چھوڑو اسے۔ میرے سر میں تیل لگا دو۔ کسی اچھی بیوی کی طرح۔''

''تیل؟ تیل یہاں کہاں؟'' ثمن نے کہا اور حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''چلو...... یوں ہی مالش کر دو سر کی۔''

ثمن اس کے سینے پر سر رکھے رکھے اس کے بالوں میں اُنگلیاں لہرانے لگی۔

''ایک بات پوچھوں؟ یہ ہر بات میں آپ بیوی بیوی کرتے ہیں۔ تو

اب تک شادی کیوں نہیں کی آپ نے؟''

''یہ کس نے کہا کہ شادی نہیں ہوئی میری۔ ارے بیوی ہی کی وجہ سے تو اس حال کو پہنچا ہوں میں۔''

ثمن کے لئے وہ بہت بڑا شاک تھا۔

''وہ کیسے؟'' اس نے پوچھا۔

''دراصل میری بیوی طوائف ہے۔ لیکن بہت بری طوائف۔'' عارف نے سادگی سے کہا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

''میں اس لفظ کو مروّجہ مفہوم میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ میرے نزدیک طوائف گالی نہیں، مظلومیت کا مترادف ہے، جس عورت سے قسمت اس کے سہارے چھین لے اور معاشرہ اس کے وسائل محدود کر دے اور ضروریات اس کے سامنے منہ کھولے کھڑی ہوں، اور اس کے پاس اپنے وجود کے سوا کوئی اثاثہ نہ ہو، اور لوگ اس کے وجود کے ایک حصے یعنی جسم میں دلچسپی رکھتے ہوں، اپنے وجود کی بقاء قائم رکھنے کے لئے اس کے پاس جسم فروشی کے سوا کوئی راستہ نہ ہو، وہ طوائف ہے۔ اپنی ضرورتوں کی خاطر جسم فروخت کر کے ایک طرف تو وہ رُسوائی کماتی ہے، دوسری طرف زندگی کی اور نفس کی بہت بڑی خوشی سے محروم ہو جاتی ہے۔''

''واقعی......! اتنا صحیح کہہ رہے ہیں آپ! میں یہ سب سوچتی تھی، کہہ نہیں سکتی تھی۔ عجیب آدمی ہیں آپ! کیسے آدمی ہیں آپ؟''

''تم اب بھی نہیں سمجھیں؟'' عارف نے تاسف سے کہا۔

''میں بہت محروم آدمی ہوں۔''

''آپ نے یہ کیوں کہا کہ آپ کی بیوی بری طوائف ہے؟''

''اسی لئے کہ ایسا ہی ہے۔ دیکھو نا! وہ طوائف نہیں۔ میری عزت دار بیوی ہے۔ میرے بچوں کی ماں ہے۔ وہ مجبور اور بے سہارا نہیں۔ میں اس کا مضبوط سہارا ہوں۔ گھر کی، بچوں کی، اور اس کی ساری ضرورتیں پوری کرتا ہوں

میں۔ لیکن جب میں اپنی ضرورت کی خاطر اس کی طرف ہاتھ بڑھاؤں تو وہ جھٹک دیتی ہے مجھے۔ دن بھر کی مصروفیات گنواتی ہے اور تھکن کا رونا روتی ہے۔ وہ مجھے وہ آسائش نہیں دیتی جو میرا حق ہے۔ تو وہ بیوی تو نہیں رہی نا؟''

''مگر ان کا عذر تو سچا ہوگا نا؟ گھر کی دیکھ بھال اور بچے سنبھالنے میں تھکن تو ہوتی ہوگی نا؟''

''پھر یہ عذر جائز ہوتا تو اللہ نے بیوی پر سوہر کے حق کو منسوخ کر دیا ہوتا۔ کیونکہ دُنیا میں ہر عورت کا یہی حال ہے۔ یہ سب ان کے فرائض میں شامل ہے۔ میں پڑھا لکھا ہوں۔ میں نے دین کی کتابوں میں دیکھا۔ اللہ کا حکم ہے کہ عورت کو خواہش نہ بھی ہو تو وہ شوہر کی خوشی کی خاطر خود پر مصنوعی خواہش اور رغبت طاری کر لے اسے کسی صورت بھی منع نہ کرے۔ اسی حکم کی حکمت بھی سمجھتا ہوں میں۔ دیکھو نا، نکاح زنا کو روکنے کا راستہ ہے، عورت کا یہ عمل تو مرد کو زنا کی طرف دھکیلنے کا مترادف ہوا نا؟''

''تو آپ کو یہ بات انہیں بتانی چاہیے۔''

''میں نے بتائی تو وہ بولی۔ میں کب منع کرتی ہوں آپ کو؟ میں نے کب روکا ہے آپ کو؟ اب بتاؤ! ہے کوئی جواب اس بات کا؟ میں اکیلا تو بیڈ منٹن نہیں کھیل سکتا نا؟ پھر میں کیا کروں؟ یہ تو کسی مردے کے ساتھ سونے کے برابر ہے۔''

سمن جھرجھری لے کر رہ گئی۔

''بہت سخت باتیں بھی کرتے ہیں آپ! اور اتنے نازک آدمی کے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔''

''ایک نازک اور حساس آدمی ہی تو ایسی باتیں کر سکتا ہے۔''

''پھر بھی آپ کو اپنی بیوی کو طوائف کہنے کا کوئی حق نہیں۔ جبکہ آپ تو بری طوائف کہہ رہے ہیں انہیں۔''

''میں ابھی ثابت کر دیتا ہوں کہ میں غلط نہیں ہوں۔ اچانک کسی رات میری بیوی آتش فشاں بن جاتی ہے۔ پہلے تو میں ایسے موقعوں پر خوش ہوتا تھا،

پھر اصل بات میری سمجھ میں آ گئی۔ جب اسے کوئی ضرورت ہوتی ہے تو وہ میری مرضی کے مطابق بننے کی، میں جو چاہتا ہوں، وہ مجھے دینے کی بھرپور کوشش کرتی ہے۔ اب بولو! وہ طوائف ہے کہ نہیں؟ ہے نا! اور بری طوائف اس لئے کہ وہ مجبور نہیں، بے سہارا نہیں۔ میں اسے ضرورت کی ہر چیز فراہم کرتا ہوں تو جب اسے کچھ ایسا چاہئے ہوتا ہے، جو وہ سمجھتی ہے کہ میں ہرگز نہیں دلاؤں گا، تو وہ مجھ پر یہ جال پھینکتی ہے، لطیف جذبوں کے نام پر بلیک میلنگ تو میں قبول نہیں کر سکتا۔ اب بھی ایسا ہوتا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں، مجھے فریب مت دو۔ سیدھی سیدھی بات کرو۔ کیا چاہئے تمہیں۔ وہ بتاتی ہے، اور میں کہتا ہوں کہ ٹھیک ہے۔ کل دلا دوں گا۔ تم اس طرف کروٹ لے کر سکون سے سو جاؤ۔ مجھے پریشان نہ کرو اور وہ فوراً یہ بات مان لیتی ہے۔ نہ مانے تو میں بھی اسے ویسے ہی جھٹک دیتا ہوں جیسے اور دنوں میں وہ جھٹکتی ہے۔ میں کہتا ہوں، میں دن بھر کا تھکا ہوا ہوں، چین سے سونے دو مجھے۔ تمہاری ضرورت کل پوری ہو جائے گی۔''

''ایسا کیوں کرتے ہیں آپ؟''

''یہ عزت کی بات ہے۔ وہ میری عزت نہیں کرتی، نہ کرے۔ مجھے تو اس کی عزت رکھنی ہے۔ اس کی ضرورت پوری کرنا میرا فرض ہے۔ اس کے بدلے میں اپنی ضرورت پوری کر کے اسے طوائف بنا دوں میں۔ اپنے گھر کا تقدس کیوں پامال کروں؟ میں بیوی کاروبار نہیں کر سکتا۔ کاروبار کے لئے بازار موجود ہے۔ میں اپنے گھر میں جہاں اپنے بچوں کا باپ ہوں، عیاش تماش بین نہیں بننا چاہتا۔''

''تو خود کو کیوں خراب کرتے ہیں؟'' سمن نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

''دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ مذہب بھی اجازت دیتا ہے اس کی اور میرا خیال ہے، آپ حیثیت میں بھی کم نہیں۔''

''ڈرتا ہوں کہ دوسری بھی ایسی ہی نکلی تو کیا کروں گا۔ چھان پھٹک کے بغیر نہیں کر سکتا دوسری شادی؟'' عارف نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''اچھا.....! اب اجازت ہو تو لائٹ آف کر دوں؟''

''عجیب آدمی ہیں آپ! مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟'' سمن نے حیرت سے کہا۔

''یہ ضروری ہے۔ دوسرے کھلاڑی کی مرضی، آمادگی اور دل سے شمولیت میرے لئے بہت ضروری ہے۔تم انجوائے نہیں کرو گی تو میں بھی انجوائے نہیں کرسکوں گا۔''

''آپ واقعی عجیب آدمی ہیں اور یہ میں تعریف کر رہی ہوں آپ کی۔'' سمن نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''بس......بتی میں بجھا دیتی ہوں۔''

وہ سمن کے لئے بے معالف کا تجربہ تھا۔ وہ خود کو ہواؤں کی طرح آزاد محسوس کر رہی تھی۔ وہ تو جیسے اُڑ رہی تھی۔

بہت......بہت دیر بعد سمن نے کہا۔

''آپ واقعی بہت اچھے دوست ہیں۔ میں آپ کو کبھی بھول نہیں سکوں گی۔''

''یہ تم اپنے حق میں بہت برا کرو گی۔'' عارف نے سنجیدگی سے کہا۔

''بہت دُکھی رہو گی تم۔ میں تمہیں اس کا فائدہ بتاتا ہوں۔ جب کبھی کوئی برا توہین آمیز تجربہ ہو تو ان لمحوں کو یاد کر لینا، تازہ دم ہو جاؤ گی۔''

''شکریہ!''

چند لمحے خاموش رہی پھر عارف نے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم میرا ایک کام کر دو۔''

''میرے بس میں ہوا تو ضرور کروں گی۔''

''یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں استعمال کر رہا ہوں۔ کیونکہ یہ سچ نہیں ہوگا۔ میں یہ کام دوسری طرح بھی کرسکتا ہوں۔ لیکن اسے مناسب نہیں سمجھتا۔ اس میں اسے ہتک کا احساس ہوگا۔''

''دوست دوستوں کے کام آتے ہیں۔ اس میں استعمال کرنے اور استعمال ہونے کی کوئی بات نہیں۔''

عارف چند لمحے خاموش رہ کر کچھ سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

''میں نرگس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''یہ......یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔''

''یہ ممکن ہے۔'' عارف نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''اس لئے کہ میں گاہک یا تماش بین کی حیثیت سے نہیں، ایک عزت کرنے والے دوست کی حیثیت سے اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''میں وعدہ نہیں کرتی۔ کوشش کروں گی۔'' سمن نے کہا۔

''میں ناکام ہو جاؤں تو آپ دوسری طرح سے کوشش کر لیجئے گا۔''

''نہیں......! وہ میں نہیں کروں گا۔ وہ اس جذبے کے شایانِ شان نہیں۔ جو میں نرگس کے لئے اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں۔''

''مجھے بتائیں اس کے بارے میں۔''

''نہیں......! میں تمہیں بتاؤں، اور پھر تم نرگس کو قائل کرنے کے لئے اسے بتاؤ تو یہ بلیک میلنگ لگے گی۔''

''اچھی بات ہے۔ میں کوشش کروں گی۔''

''بس......! اب سکون سے سو جاؤ۔''

❁ ❁ ❁

عبدالحق اس روز بہت بے چین اور اندر سے بہت مضطرب تھا۔

ویسے تو اس کی تین سالہ ازدواجی زندگی ایک مستقل سرشاری تھی۔ نور بانو کا سحر اب بھی ویسا ہی تھا۔ بلکہ اور بڑھ گیا تھا۔ وہ اس سے پہلے سے بھی زیادہ محبت کرتا تھا اور وہ بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ اس کی محبت زیادہ بڑی ہے یا نور بانو کی۔ لیکن چند منٹ میں ہی اسے اندازہ ہو جاتا کہ دونوں محبتوں کا موازنہ ممکن نہیں تھا۔ اس لئے انہیں تولا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اس کی روح میں رچی ہوئی، بسی ہوئی بے پایاں محبت تھی۔ وہ نور بانو کے بغیر ایک دن بھی نہیں گزار سکتا تھا۔

دوسری طرف نور بانو کی محبت کسی پہاڑی دریا کی طرح تند، تیز رفتار اور

پرشور تھی۔ اس محبت کی فطرت اس کے قدم اُکھاڑ کر اسے اس طرح بہا کر لے جاتا تھی کہ کسی اور سے اس کا تعلق یہ نہ رہے۔ اس کی زندگی میں جو دوسرے لوگ تھے، اور ان کی محبتیں تھیں، وہ جیسے نور بانو کی محبت کے دریا کی گزرگاہ میں پڑے بہت بڑے بڑے پتھر تھے۔ ان میں سے ہر پتھر دریا کے لئے ایک چیلنج تھا۔ وہ دریا کومہمیز کرتا تھا۔ دریا جس پتھر سے ٹکراتا، اس کی تندی میں، اس کے غضب اور اس کے شور میں اضافہ ہو جاتا۔ دریا کے بس میں ہوتا تو ایسے ہر پتھر کولڑھکا کر بہاتا ہوا لے جاتا، اور کہیں دور چھوڑ آتا۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں تھا۔ پتھر اپنی جگہ رہتے تھے، اور دریا کی تندی اور غیض وغضب اور بڑھ جاتا تھا۔

بنیادی طور پر نور بانو کی محبت جسمانی تھی۔ یا یوں کہا جائے گا کہ اس کا غالب عنصر جسم تھا۔ اس اعتبار سے وہ رات کی رانی تھی۔ رات کو اس کی خوشبو سر چڑھ کر بولتی۔ وہ تند پہاڑی دریا کی طرح ایک پتے کی مثال اسے بہائے پھرتی۔ رات کے ہر لمحے میں وہ اس کا اسیر ہوتا۔ ایسا اسیر، جس کے لئے وہ اسیری ہی کائنات کی سب سے بڑی نعمت ہو۔

اور نور بانو کو ہمیشہ یہ فکر رہتی تھی کہ اس کا اسیر اس کے سحر سے آزاد نہ ہو جائے اور وہ اس کے لئے صرف فکر نہیں کرتی تھی، وہ اس کے لئے حکمت عملی ترتیب دیتی رہتی۔ اس کے ہاں سب کچھ دماغ سے ہوتا تھا، دل سے نہیں۔

''آپ مجھ سے اُکتا تو نہیں گئے؟'' کبھی وہ سوچتی۔

''کیسی باتیں کرتی ہو۔ یہ کہاں ممکن ہے۔''

''ممکن ہے کیا؟ یہی تو ہوتا ہے دُنیا میں۔ لیکن میرے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ میرے پاس کائنات کے تمام پھولوں کی خوشبو ہے۔ میرے اتنے رنگ ہیں کہ نہ کسی نے دیکھے، نہ ان کے نام کسی کو معلوم ہیں۔''

اور یہ سچ تھا۔ اس کی کوئی ایک رات دوسری رات جیسی نہیں تھی۔ رات کا نام تنوع تھا۔

لیکن زندگی میں دن کی بھی تو بہت اہمیت ہے اور دن کو اپنی مصروفیات ہوتی ہیں۔ بے شمار رابطے ہوتے ہیں، فرائض ہوتے ہیں۔ رات کی طمانیت

عبدالحق کو تازہ دم کر دیتی تھی۔ لیکن نور بانو چڑچڑی اور بدمزاج ہو جاتی تھی۔ بات بات پر اُلجھنا، جھنجلانا، مگر اس کے پاس سے گزرتی تو وہ ضرور اس سے ٹکراتی یا جسم مس کرتی۔ بہانے بہانے سے وہ اسے چھوتی۔ ایسے میں اس کے چہرے پر نرمی ہوتی اور آنکھوں میں بلاوے۔

وجہ عبدالحق کو معلوم تھی۔ لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ مضبوط دلائل کے باوجود اسے سمجھانے کی اس کی ہر کوشش ناکام ہوگئی تھی۔

نور بانو چاہتی تھی کہ اس کے اور عبدالحق کے درمیان کوئی نہ ہو۔ اور یہ ممکن نہیں تھا۔

شادی کی پہلی صبح ساجد معمول کے مطابق اس کے کمرے میں آیا تو وہ چڑ گئی۔

''اب یہ بچپنا چھوڑیں آپ! آپ اب شادی شدہ مرد ہیں، کوئی کم عمر لڑکے نہیں۔''

''تقسیم مردوں ہی کا وقت ہوتا ہے۔ لڑکے تو آزاد ہوتے ہیں۔ جو چاہے کریں اور میں تو کبھی لڑکا رہا ہی نہیں۔'' عبدالحق نے بغیر کسی تلخی کے کہا۔

''میرا یہ وقت ساجد کا ہے۔ میں سب کے حقوق ادا نہیں کروں گا تو اچھا انسان کیسے بنوں گا؟'' عبدالحق نے کہا تھا اور یہ کہتے ہوئے اسے خیال آتا تھا کہ اس نے شکر کے نفل بھی نہیں ادا کئے اور اس کی فجر بھی قضاء ہوگئی۔

پھر دن میں زرینہ، رابعہ اور زبیر کو وقت دینا اور رات کو اس کا حمیدہ کے پاس جا کر بیٹھنا بھی نور بانو کو برا لگا۔ لیکن عبدالحق نے اس پر واضح کر دیا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے، اور اس کی محبت میں اپنا کچھ بھی قربان کر سکتا ہے۔ ہر ذاتی قربانی دے سکتا ہے۔ لیکن کسی دوسرے کا فن غضب نہیں کر سکتا۔

زرینہ کی شادی ہوئی تو نور بانو کا ایک بوجھ ہلکا ہوگیا۔ پھر اس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ جو بات عبدالحق کو نہیں مانی، وہ اس سے کسی طور بھی نہیں منوا سکتی۔ اس نے اپنا طریق کار تبدیل کر لیا۔

جب وہ لاہور شفٹ ہونے لگے تو حمیدہ نے زبیر اور رابعہ کے لئے بھی

اصرار کیا۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ! زبیر بھائی یہاں نہیں ہوتے تو یہاں کے معاملات کون سنبھالے گا؟" نور بانو نے کہا۔

"نور بی بی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" زبیر نے جلدی سے کہا۔ وہ اس کا مزاج پہچاننے لگا تھا۔

"مگر ساجد کیسے رہے گا عبدالحق کے بغیر؟" حمیدہ نے اعتراض کیا۔

"چھوٹا بچہ ہے۔ بہل جائے گا اماں!" رابعہ بولی۔

"لیکن میں نہیں رہ سکوں گا اس کے بغیر۔" عبدالحق کو مداخلت کرنا پڑی۔

"کمال کرتے ہیں آپ! بچے کو ماں باپ سے جدا کر کے لے جائیں گے اپنے ساتھ۔" نور بانو جیسے تڑپ اُٹھی۔

"یوں کرتے ہیں کہ رابعہ اور ساجد ہمارے ساتھ چلیں گے۔" حمیدہ نے فیصلہ سنایا۔

"بچے کو باپ سے دُور کرنا......"

"میرا کوئی مسئلہ نہیں۔" زبیر نے جلدی سے کہا۔

"ساجد ویسے بھی مجھ سے زیادہ صاحب سے مانوس ہے۔ پھر میں ہر ہفتے کبھی دو دن کے لئے اور کبھی موقع ملا تو تین دن کے لئے لاہور آجایا کروں گا۔"

اور اس پر عمل بھی ہو گیا۔

پھر زرینہ بھی ماں بن گئی۔ اس کے ہاں بھی پہلا بیٹا ہی ہوا تھا اور اب تو وہ دوبارہ ماں بننے والی تھی۔

عبدالحق رکھ رکھاؤ کا بہت قائل تھا۔ زرینہ اس کی سگی بہن نہیں تھی۔ اس لئے وہ اس رشتے کی نزاکت کا زیادہ خیال رکھتا تھا کہ کہیں وہ وہاں خود کو اکیلا اور لاوارث نہ سمجھ لے۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی ایسے نہیں تھے۔ وہ زرینہ کو بیٹی ہی کی طرح چاہتے تھے اور اکبر بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا۔

زرینہ وہاں بہت خوش تھی۔ پھر بھی عبدالحق نے مہینے میں کم از کم ایک بار وہاں جانا خود پر فرض کر لیا۔ زبیر یہاں آتا تو وہ وہاں جاتا۔ رات کو قیام کے لئے اپنا گھر موجود تھا۔

جب وہ پہلی بار جانے لگا تو نور بانو نے کہا۔

"میں بھی چلوں گی۔" وہ اسے ایک رات بھی اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

عبدالحق کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

اور کبھی زرینہ تین چار دن کے لئے لاہور آجاتی۔ ایسے میں نور بانو کا چڑچڑاپن اور بڑھ جاتا۔

سب کچھ مل گیا تھا، سب کچھ اچھا تھا۔ مگر عبدالحق کو احساسِ زیاں ستاتا تھا۔ لگتا تھا کہ بہت کچھ اس سے چھن گیا ہے۔ نامعلوم محرومی کا احساس اس پر مستزاد تھا اور جب بھی یہ احساس حد سے گزرتا، وہ بے چین اور اندر سے مضطرب ہو جاتا۔

آج بھی وہ اسی کیفیت سے دوچار تھا۔ ایسے میں اسٹڈی ہی اس کی پناہ گاہ ہوتی تھی۔ سب یہی کہتے تھے کہ وہ پڑھائی میں مصروف ہے۔ ایسے میں ڈسٹرب کیا جانا اسے پسند نہیں تھا۔

ویسے تو وہ بی اے کا امتحان دے چکا تھا، اور اب رزلٹ کا منتظر تھا۔ لیکن مسعود صاحب نے اسے خالی نہیں بیٹھنے دیا تھا۔ چنانچہ وہ ان کی راہنمائی میں اب مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔

کتاب سامنے رکھ کر وہ بیٹھا اپنی کیفیت پر غور کر رہا تھا۔ مسئلہ کیا ہے آخر؟

لاہور کی مصروف زندگی بھی ایک وجہ تھی اور وہ جانتا تھا کہ اس کی مصروفیت ابھی اور بڑھ گئی۔ مصروفیات نے اسے قرآن سے دور کر دیا تھا۔ نماز چار وقت کی رہ گئی تھی۔

لیکن یہ سب کچھ تو حق نگر سے ہی ایسے چل رہا تھا۔ فجر کی نماز سے تو

وہ وہیں محروم ہوگیا تھا اور قرآن پڑھنا بھی وہیں کم ہو چکا تھا۔ وہ خواہ مخواہ لاہور پر الزام لاد رہا ہے۔

شاید کچھ ایسی باتیں تھیں، جو کہیں نیچے دبی ہوئی تھیں، کریدتا تو سامنے آجاتیں۔ لیکن وہ کریدنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ انہیں سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔ حالانکہ مزاجاً وہ ایسا نہیں تھا۔ اسے تو عذر کرنا، پیچیدگی کو سادگی میں تبدیل کرنا اور واضح طور پر سمجھنا مرغوب تھا۔ اب ایسا کیا ہوگیا کہ وہ خود سے نظریں چرانے لگا ہے۔

اس نے سوچا، شاید یہی اس کا بنیادی مسئلہ ہے۔ حقیقت جیسی بھی ہو، اسے سمجھنا تو چاہئے۔ سمجھے گا ہی نہیں تو اصلاحِ احوال کیسے ہوگی۔ مسئلہ سامنے ہو تو اس کا حل نکلتا ہے۔

اس نے سوچا، سب سے پہلے یہ یاد کیا جائے کہ زندگی میں سب سے زیادہ خوش وہ کب ہوا تھا؟

اس کے لئے اسے زیادہ سوچنا نہیں پڑا۔ دہلی کی وہ شامیں، جب وہ عصر اور مغرب کے درمیان کوٹھے پر بیٹھ کر نوربانو کی آواز سنتا تھا، اس سے بڑی کوئی خوشی آج تک اس کی زندگی میں نہیں آئی۔ وہ ایک لفظ ہی نہیں سمجھتا تھا۔ مگر اس کے تمام حواس سرشاری کی کیفیت میں گندھے اس آواز پر مرکوز ہوتے تھے اور اندر کی کیفیت بتاتی تھی کہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود جیسے وہ سمجھ رہا ہے، جب وہ کوئی سچائی ہے، جو اس کی روح میں اُتر رہی ہے۔

مگر اس خوشی سے تو وہ دہلی میں ہی محروم ہوگیا تھا۔

ذہن نے فوراً ہی اس کی تردید کر دی۔ وہ آواز تو اس کی سماعت میں محفوظ ہوگئی تھی۔ وہ جب چاہتا، سر جھکا کر بیٹھتا، اور اسے سن لیتا۔ وہ آواز آنی بند ہوگئی تھی۔ پھر بھی وہ محروم نہیں ہوا تھا۔ محروم ہوگیا ہوتا تو وہ محبت بھی کسی نقش کی طرح دھیمی ہوتے ہوتے مٹ جاتی۔ لیکن وہ محبت تو اور توانا ہوگئی تھی۔

پھر اس رات اس نے وہی آواز سنی، اور بے اختیار ہوگیا۔ اپنے آپ میں ہوتا تو وہ کبھی اُوپر نہ جاتا...... یہ جانتے ہوئے کہ اُوپر نوربانو ہوگی۔ اب یہ تو وہی جانتا تھا۔ کوئی اور کیسے جان سکتا تھا کہ وہ اوپر پہنچا تو سراپا سماعت تھا۔ اسے

کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ صرف سن رہا تھا اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے نوربانو کو دیکھا بھی نہیں۔ وہ تو بعد میں بھی کبھی اسے دیکھتا تو پہچان نہ پاتا اور اس کیفیت میں اس نے آسمان کا مشاہدہ کیا اور کلمہ پڑھا۔

اس دن کے بعد اس کے لئے ایک نیا حوالہ بن گیا۔ وہ جب چاہتا، نوربانو کو سورۃ الملک کی تلاوت کرتے سن لیتا تھا۔

مگر نوربانو سے شادی کے بعد وہ اس نعمت سے محروم ہوگیا تھا۔

کیوں؟

شاید اس لئے کہ وہ سوچتا تھا، نوربانو سے شادی کے بعد اس کو سامنے بٹھا کر اس کی قرأت سنا کرے گا۔ اس نے پہلی ہی رات یہ فرمائش کی بھی لیکن نوربانو نے اسے ٹال دیا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ جب بھی نوربانو سے یہ فرمائش کرتا ہے، وہ ٹالتی ہے۔ عموماً وہ یہی کہتی تھی کہ ابھی ذرا دیر میں سناتی ہوں۔

پھر ایک دن وہ اس کے پیچھے پڑ گیا۔

''ابھی وضو کر کے آؤ اور مجھے سناؤ۔''

لیکن جب نوربانو نے تلاوت شروع کی تو اسے مایوسی ہوئی۔ آواز تو وہی تھی، لیکن بے خود اور مبہوت کر دینے والی وہ کیفیت موجود نہیں تھی، جس نے پہلی بار اسے اسیرِ محبت کیا تھا۔ وہ پڑھتی رہی اور وہ سنتا رہا لیکن دل میں کچھ نہیں ہوا۔ اندر سے حق کی وہ آواز نہیں آئی، جو اس رات آئی تھی اور اس پر آسمان کا ایک بھید کھول گئی تھی۔

اس دن پہلے تو عبدالحق کو لگا کہ وہ لٹ گیا ہے۔ جیسے اس سے کوئی متاعِ عزیز چھن گئی ہے اور یہ سچ تھا۔ برسوں سے قرأت کی وہ آواز اس کے لئے متاعِ حیات ہی تو تھی۔ وہ جھنجھلا گیا۔ اس نے سوچا، اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ بہت بڑا دھوکا۔ جیسے اس کی محبت کی بنیاد ہی اس دھوکے پر رکھی گئی تھی اور اب وہ بنیاد ہی نکال لی گئی تھی۔ اب بغیر بنیاد کے محبت کی وہ عمارت کیسے قائم رہ سکے گی۔ اسے تو سچ مچ لگا کہ نوربانو کے لئے اس کے دل میں محبت مٹنے لگی ہے۔

لیکن پھر جادوگر رات آئی، اور رات کے جادو کے سوا کچھ بھی نہیں رہا۔
وہ تو نوربانو سے محبت کرتا تھا۔ مجبور تھا محبت کرنے پر۔ آواز ایک دور کی حقیقت تھی...... قریب ساعت جیسی۔ اور جسم ایک فریب تھا۔ تمام حواس پر حاوی و طاری، اور حقیقت سے بڑھ۔''

راتیں تو ویسی ہی رہیں، لیکن اس کے دن مضطرب ہوگئے۔ اس نے سمجھنے اور سوچنے کی کوشش کی۔ بات کچھ ایسی مشکل بھی نہیں تھی۔ اللہ نے فرمایا۔ علم القرآن، تو بے شک وہ عظیم، زبردست مقتدر رب، وہ کائنات کا مالک...... اپنا کلام وہی تو پڑھا سکتا ہے اور وہی پڑھاتا ہے۔

عبدالحق کو تو ذاتی طور پر تجربہ بھی تھا۔ قرآن پڑھتے ہوئے کبھی کسی آیت پر نظر ہوتی، اور اچانک ان لفظوں کے نیچے اس کا مفہوم، اس کے معانی اُبھر کر آنکھوں کے راستے دماغ میں اُتر جاتے۔ وہ ایسا مفہوم ہوتا، جو اس آیت کے ظاہری مفہوم سے بالکل مختلف ہوتا۔ لیکن تمام ادراکی قوتیں ایک ثانیے میں متفق ہو جاتیں کہ واقعی اس آیت کا یہ مفہوم بھی ہے...... یہ حکمت ہی ہے اس میں۔

اساس کے بعد خود بخود وہ مفہوم حافظے میں محو بھی ہو جاتا۔ ایسے کہ وہ بار بار اس آیت کو پڑھ کر اس مفہوم کو یاد کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن وہ اسے یاد نہ آتا۔ وہ سوچتا۔ یہ بھی اللہ کی رحمت ہے۔ بندہ کھوئے گا نہیں مانے گا کیسے کہ یہ اللہ کا کلام ہے، اور مانے گا نہیں تو ڈرے گا کیسے۔ ایسے میں کبھی اچانک یوں بھی ہوتا کہ وہ پہلا مفہوم تو یاد نہ آتا۔ لیکن اسی آیت کا ایک اور مفہوم اس پر کھل جاتا۔

اور ایسا ہی ہوتا کہ کبھی بلند آواز میں تلاوت کرتے ہوئے کسی آیت پر اس پر کیفیت طاری ہو جاتی۔ آنکھوں سے آنسو بہتے۔ گلے میں پھندے لگنے لگتے، اسی کی ہچکیاں بندھ جاتیں اور آگے پڑھنا اس کے لئے ممکن ہی نہ رہتا۔ بلکہ وہ تو اسی آیت کو بھی نہ دہرایا پاتا۔ وہ کیفیت بہت اچھی لگتی تھی اسے۔ لگتا تھا کہ اسے دھو کر پاک کیا جا رہا ہے۔

اور کئی دن بعد بھی اس کا جی چاہتا کہ پھر وہ کیفیت اس پر طاری ہو۔ وہ اس آیت کو پڑھتا، بار بار دہراتا، لیکن کچھ بھی نہ ہوتا۔ آنکھوں کو تو چھوڑو، دل میں بھی نمی کا احساس تک نہ ہوتا۔ وہ بے بسی اور شوق سے نڈھال ہو جاتا۔ لیکن نامراد رہتا۔

تو اس نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ اقتدار و اختیار اور قدرت کلی طور پر صرف اللہ کی ہے۔ بے شک اس نے اس میں سے کچھ بہت تھوڑا سا انسان کو بھی عطا کر دیا ہے۔ جس پر انسان پھولتا پھلتا ہے۔ یہ نہیں سمجھتا کہ دینے والا جب جس لمحے چاہے، اور جتنی دیر کے لئے چاہے، وہ اختیار اس سے واپس لے لے، اور چاہے تو دوبارہ دے ہی نہیں۔ اس کی سمجھ میں موہوم سے انداز میں یہ بات بھی آئی تھی کہ بندہ تقویٰ، اطاعت اور اللہ کی محبت اپنائے تو وہ دُنیا میں بھی اسی کا انعام دیتا ہے۔ ایسے کہ بندے کو دیئے ہوئے اقتدار و اختیار و قدرت میں اضافہ کر دیتا ہے۔

اور اس نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ اپنے جید کلام میں بھی اللہ نے اپنے اقتدار و اختیار اور قدرت کو منتقل کر دیا ہے۔ عاجزی سے، گڑگڑا کر پڑھو، سوچو کر، اے میرے ربّ کے کلام، مجھے روشن کر دے، تو آدمی پر کائنات کے بھید کھلنے لگتے ہیں۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آئی تھی کہ اللہ نے اپنے اقتدار و اختیار اور قدرت کا جو ایک ذرّہ انسان کو عطا کیا تو اس سے لاکھوں، کروڑوں گنا زیادہ اقتدار و اختیار اور قدرت اپنے کلام میں منتقل کر دی۔ کس کے لئے؟ انسان کے لئے! اس انسان کے لئے جو اس کلام عظیم کو اس طرح پڑھے، جیسا کہ اسے پڑھنے کا حق ہے۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ علم و اقتدار سارے کا سارا اللہ کا ہے۔ یہ اس کی کریمی ہے کہ اس نے اپنے خلیفہ کے لئے اس میں ایک حصہ مقرر کر دیا۔ چھوٹا سا حصہ، مگر وہ بھی انسان کے لئے اتنا بڑا ہے کہ شاید وہ اسے قیامت تک حاصل نہ کر سکے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ بدنصیب یہ بھی نہیں سمجھتا کہ یہ سب کچھ اسے صرف قرآن سے ملے گا۔ وہ قرآن کو چھوڑ کر باہر کی مادّی نشانیوں میں سر کھپاتا ہے۔ وقت ضائع کرتا ہے۔ وہ نہیں سمجھتا کہ قرآن اللہ کی مملکت علم کا

دروازہ ہے، سائنس کو حقیر اور بے معنی کر دینے والے علم کا شارٹ کٹ ہے۔ اسی لئے تو پیغمبر آخر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں تمہارے لئے قرآن چھوڑے جا رہا ہوں۔ اسے مضبوطی سے تھامے رکھنا مگر اُمت اسے طاق پر رکھ کر بھول گئی۔

عبدالحق کو اچھی طرح یاد تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ کوئی بہت بڑا راز اس پر کھلنے والا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس پر عجیب سی گھبراہٹ اور خوف طاری ہو گیا تھا۔ دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہونے لگا تھا اور یہ نہیں کہ ارتکاز کی کمی اور انتشار کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ وہ اپنی بساط کی حد تک مکمل ارتکازی حالت میں تھا۔ مگر کوئی بہت بڑی کمی تھی جو اس کے آگے بڑھنے میں مزاحم تھی۔ شاید اس کے ارتکازی استعداد اس راز کے لئے لازمی استعداد سے بہت کم تھی اور وہ جانتا تھا کہ وہ اسے قرآن سے ہی ملے گی۔ وہ ایسی کیفیت تھی جو ریاضی کا کوئی پیچیدہ سوال حل کرتے وقت ہوتی ہے۔ ایسا سوال، جس میں ہندسوں کی کثرت ہو اور ضرب کرتے وقت آدمی کو کم اوقاتی کا احساس ہونے لگے تو وہ گھبراہٹ میں پورا عمل گنوا کر نقطۂ آغاز پر واپس آجاتا ہے اور تاسف سے ہاتھ ملتا رہتا ہے۔

اس نے سمجھ لیا تھا کہ علم تو صرف قرآن میں ہے اور جن علوم کے پیچھے انسان بھاگ رہا ہے، وہ ساٹھ سال کی مہلت میں کروڑوں سال کی مسافت پر موجود منزل تک پہنچنے کی احمقانہ اور یقینی طور پر ناکام کوشش ہے۔ جبکہ اس منزل تک پہنچنے کا شارٹ کٹ قرآن ہے۔

اس بات کا اسے تجربہ تھا کہ آپ قرآن پڑھ رہے ہوں، سن رہے ہوں، خود سمجھ رہے ہوں یا سمجھا رہے ہوں، ہر بار ایک مختلف کیفیت میں ہوتے ہیں۔ یہ عام لوگوں کی بات ہے۔ وہ دیکھتا تھا کہ مولوی مہر علی کی کیفیت کا معاملہ مختلف ہے۔ اکثر و بیشتر وہ اس سے قرآن کے بارے میں بات کرتے تھے۔ لیکن ان کے ہاں کیفیت ایک ہی ہوتی تھی۔ ان کی بات ہر بار ویسے ہی دل میں اترتی تھی۔

وہ مولوی صاحب سے اپنا موازنہ نہ کرتا، غور کرتا پھر ایک دن اس کی سمجھ میں بات آگئی۔ عام آدمی تو دُنیا سے چپکا ہوتا ہے۔ دُنیا کے مسائل، پریشانیاں اور تفکرات کی وجہ سے وہ یکسوئی سے محروم ہوتا ہے۔ مولوی صاحب کو اس نے کبھی پریشان نہیں دیکھا تھا۔ بیوی بچوں کو وہ مناسب وقت دیتے تھے لیکن اس کے بعد وہ اللہ کے لئے جو کچھ کرتے، نہایت یکسوئی کے ساتھ کرتے۔ قرآن پڑھتے وقت ان کے استغراق کا یہ عالم ہوتا کہ پکارتے رہو اور آواز ان تک نہ پہنچے۔

اس پر عبدالحق کو یاد آیا کہ قرآن میں کئی مقامات پر اللہ نے اسے بہت بڑی صفت قرار دیا ہے۔ اور یہ صفت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تھی۔ وہ جو سب سے کٹ کر صرف اللہ کا ہو رہا، یکسوئی کے ساتھ، ابراہیم خلیل اللہ، آتش نمرود بھی جن کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔

اس نے سوچا، دُنیا میں بے شمار لوگ ہوں گے، جو مولوی صاحب سے بھی آگے ہوں گے۔ یکسوئی میں، بہت آگے۔ وہ ہر وقت قرآن کی کیفیت میں رہتے ہوں گے۔ ان پر آیات کے مفاہیم اترتے ہوں گے، کائنات کے، زندگی اور موت کے بھید کھلتے ہوں گے۔ وہ ایسا کہاں، وہ تو ہر وہ پوش رات کے حوالے سے نوربانو کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ نماز میں ہو یا قرآن پڑھ رہا ہو، اس کا آزاد اور بے لگام نفس تصور میں اسے ترغیبات دکھا رہا ہوتا ہے۔ تو یکسوئی تو نفس پر مکمل غلبہ حاصل کرنے سے مشروط ہے۔

اس نے سوچا، نوربانو کے لحن میں تاشبہ نہ ہونا وقتی چیز ہے، جو کسی بھی لمحے واپس آسکتی ہے۔ لیکن اسے یاد تھا کہ دہلی میں اس آواز میں ہر روز ایک ہی کیفیت ہوتی تھی۔ سرشاری اور بے خودی کی، شاید اس لئے کہ نوربانو اس وقت دُنیا سے، اس کی رنگینیوں سے ناآشنا تھی۔ اس کے نفس کے سامنے دماغ کو منتشر کر دینے والے لاتعداد امکانات نہیں تھے۔ جبکہ اب اس کے پاس اس کی محبت بھی ہے، اور اس محبت کے اظہار کے بے شمار پیرائے بھی ہیں اور جسمانی پیرایہ ان سب پر حاوی ہے۔

تو محبت سے یہ نقصان بھی ممکن ہے۔ اس نے حیرت سے سوچا۔ جبکہ محبت تو اللہ کی عطا ہے۔ فوراً ہی اسے خیال آیا کہ دُنیا میں سب کچھ آزمائش کے لئے ہے۔ اللہ کی ہر عطا آزمائش ہے۔ وہ محبت دیتا ہے یہ دیکھنے کے لئے جس کی محبت بندے کو دی، بندہ اس کی محبت میں محبت دینے والے کو تو نہیں بھول جاتا، وہ محبت دینے والا، جس سے سب سے بڑھ کر محبت کرنا انسان کا فرض ہے، اور محبت کیا، یہ تو ہر نعمت کے لئے ہے۔ بندہ کہتا ہے، میری ماں مجھ سے بہت محبت کرتی ہے، میں بھی اس سے محبت کرتا ہوں۔ وہ یہ کبھی نہیں کہتا کہ میرا ربّ مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ ساری دُنیا میں اتنی محبت ہے ہی نہیں۔ اس لئے میں بھی ہر چیز، ہر شخص اور ہر رشتے سے بڑھ کر اس سے محبت کرتا ہوں۔ وہ نہیں کہتا، کیونکہ اللہ اسے نظر نہیں آتا۔

خود پر شرم آنے لگی۔ لڑکپن میں وہ سوچتا تھا کہ اسے اللہ کو تلاش کرنا اور جاننا ہے۔ تاکہ وہ اس سے محبت کرے۔ کیونکہ اسے سب کچھ اسی نے دیا ہے۔ مگر آج ایمان کو پہنچنے کے بعد وہ اسے بھول بیٹھا۔

مسئلہ یہ ہے کہ آدمی سب سے زیادہ انحصار آنکھوں پر کرتا ہے۔ محاورہ ہے کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ اور سچ ہے، آپ کسی سے محبت کرتے ہوں، اور وہ دور چلا جائے تو اس کی صورت تصور سے بھی ہٹنے لگتی ہے۔ برسوں ہو جائیں تو اسے بھول ہی جاتا ہے۔ کوئی کتنا ہی محبوب ہو، وہ مر جائے تو اسے بھول ہی جاتا ہے نا، تو دیکھے بغیر محبت کیسے ہو؟

مگر اس نے نور بانو کو نہیں دیکھا تھا، پھر بھی اس سے محبت ہوگئی تھی۔

اللہ نے انسان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگوں سے، چیزوں سے ایسی محبت کرتے ہو، جو صرف مجھ سے کرنی چاہئے۔ یہ ایک سیدھا سا بیان ہے، جو حقیقت بیان کرتا ہے، ایک تلقین عطا فرماتا ہے لیکن اصرار نہیں کرتا۔ ہاں اللہ اصرار کرتا ہے، حکم دیتا ہے کہ مجھ پر ایمان لاؤ، مجھے دیکھے بغیر۔ اب ایمان کے درجے میں، اور ایمان کا سفر ہے۔ ایمان زبانی جمع خرچ کی حد تک رہ گیا اور آپ نے ایمان کے ارتقاء کا سفر نہیں کیا تو زندگی رائیگاں ہوئی نا۔

عبدالحق پر کپکپی طاری ہوگئی۔

ایمان اسی محبت کے سفر کا نقطۂ آغاز ہے، جس کا سزاوار صرف اللہ ہے۔ بغیر دیکھے ایمان تو لے آئے لیکن اسے سمجھا، جانا تو نہیں۔ اب ایمان لاکر رُک مت جاؤ، آگے بڑھو، اسے دیکھو، اسے جانو، جان گئے تو محبت کئے بغیر رہ ہی نہیں سکو گے۔

اب دیکھیں کیسے؟ جانیں کیسے؟

اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے محبت سمیت مجھے اتنی نعمتیں دیں، جن کا شمار تو کجا مجھے ادراک تک نہیں۔ عبدالحق نے زیرِ لب کہا۔

یہ اس سوال کا جواب تھا کہ دیکھیں کیسے؟ جانیں کیسے؟ بندہ سوچے، غور کرے تو اللہ رہنمائی فرماتا ہے۔ نعمتوں کا ادراک عطا فرماتا ہے۔ نعمتوں کا علم ہوتا ہے تو بندے کو اپنے ربّ کی، دینے کی قدرتِ کاملہ سمجھ میں آتی ہے۔ سمجھے تو وہ شکر ادا کرتا ہے، اور شکر اللہ کو سمجھنے اور جاننے کا پہلا دروازہ ہے۔ آگے بڑھو تو ایک ایک کر کے دروازے کھلتے جاتے ہیں۔ اللہ کو جاننے اور سمجھنے کا عمل جاری ہو جاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ بندہ خلوص کے ساتھ غور تو کرے۔ غور کے لئے فرصت تو نکالے اور دماغ سے دُنیا کو جھٹک کر ارتکاز کے ساتھ غور کرے۔

دل نے کہا تھا کہ بندہ اللہ کو دیکھ سکتا ہے، جان سکتا ہے۔ لیکن کیسے؟

اس سوال کا جواب خاموشی تھی۔ خاموشی کا مطلب تھا کہ جتنا پتا چل ہے، پہلے اس پر تو عمل کرو۔

مگر وہ تو قرآن سے بھی دور ہوگیا تھا۔ نور بانو کی آواز سے اُمید تھی، وہ بھی پوری نہیں ہو رہی تھی۔

اس نے بار بار نور بانو سے قرأت کی فرمائش کی کہ شاید کسی دن وہ کیفیت لوٹ آئے، چاہے ایک بار ہی کے لئے ہو۔ لیکن وہاں تو ایسا کچھ جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ وہ قرأت جس نے اسے آسمان کے رنگ دکھائے تھے، اس کی سماعت سے بھی محو ہو چکی تھی۔

وہ جھنجھلانے لگا۔ وہ بچہ نہیں تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس کا فرمائش

پر نور بانو جھنجلاتی ہے، ٹالتی ہے، عذر پیش کرتی ہے۔ پھر بھی اصرار قائم رہے تو بے دلی سے پڑھتی ہے۔ ایسے میں کیفیت کیسے آئے گی؟

اب ایک سوال یہ قائم ہوگیا کہ ایسا کیوں ہے؟ نور بانو بدل کیوں گئی؟ اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ سوچتے سوچتے ہار گیا تو اس نے یہ بات نور بانو سے پوچھ لی۔

''یقین سے تو نہیں کہہ سکتی میں۔'' نور بانو نے کہا۔

''لیکن شاید بات یہ ہے کہ دہلی میں میں آزاد تھی۔ جی چاہا تو کوئی کام کرلیا۔ نہیں تو چمن بوا اور امی تو موجود تھیں ہی۔ ذمہ داری کوئی تھی نہیں تو دل لگا کر پڑھتی تھی۔ پورے دھیان کے ساتھ اور جس رات آپ نے مجھے سنا، اس کی تو بات ہی اور تھی۔ وہ رمضان کی چاند رات تھی اور میں...... کیا کیا دیکھا تھا میں نے......'' اس کا جسم کانپنے لگا۔ کیا کیا...... اور وہ سب تازہ تھا۔ اور میں اپنے مرے ہوئے لوگوں کے لئے سورۂ ملک پڑھ رہی تھی۔ اب وہ کیفیت تو آ بھی نہیں سکتی۔''

بات معقول تھی۔ عبدالحق نے کہا۔

''یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اس سے پہلے بھی تو تم پڑھتی تھیں اور میں بے خود ہو جاتا تھا۔''

''میں نے کہا نا، جب میں آزاد تھی۔ اب میں ایک پورے گھر کی ذمہ دار ہوں۔ بے شک نوکر موجود ہیں، لیکن دوسروں سے کام کروانا، نوکروں پر نظر رکھنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اس میں کام کرنے سے زیادہ تھکن ہوتی ہے۔ پورا دن گزر جاتا ہے۔ ایک لمحے کی فرصت نہیں ملتی اور ذرا فرصت ملے تو آپ کے بارے میں سوچتی ہوں۔''

''میرے بارے میں! کیا سوچتی ہو میرے بارے میں؟''

''بس ایک ہی بات! ایسا کیا کروں کہ آپ خوش رہیں۔ بس یہی ایک فکر کرتی ہوں۔''

''مگر میں تو خوش ہوں۔ بہت خوش!''

''ہر خوشی وقت کے ساتھ پھیکی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ خوشی ہی نہیں رہتی۔'' نور بانو نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''میرے ساتھ تو ایسا کبھی نہیں ہوتا۔''

''پتا نہیں چلتا ہوگا آپ کو، یہ تو انسان کی فطرت ہے۔ مجھے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں آپ کے دل سے اُتر نہ جاؤں۔ اس لئے فرصت میں بیٹھ کر آپ کے لئے نت نئی خوشیاں تلاش کرتی ہوں۔''

''اور جو میری اصل خوشی تھی، اسے بھلا بیٹھیں۔'' عبدالحق نے شکایتاً کہا۔

''اب پڑھتی تو ہوں، سناتی تو ہوں، لیکن آپ کو اچھا ہی نہیں لگتا۔ دیکھیں، میری بات ثابت ہوگئی نا، ہر خوشی ملنے کے بعد پل پل پھیکی ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ خوشی ہی نہیں رہتی۔'' نور بانو نے بات اس پر ہی رکھ دی۔

''اب وہی میں ہوں، وہی میری آواز اور وہی اللہ کا کلام۔ مگر آپ کی کیفیت بدل گئی۔''

عبدالحق کو بھلا لگا لیکن وہ معقولیت سے سوچنے والا آدمی تھا۔ اس نے سوچا۔ یہ ناممکن تو نہیں کہ فرق مجھ میں آیا ہو اور وہ جانتا تھا کہ فرق تو اس میں آیا ہے۔ نہ پہلے کی طرح نماز پڑھتا ہے، نہ قرآن۔ فرصت ہی نہیں ملتی اسے۔

کبھی کبھی اس کا جی چاہتا ہے کہ یہ مقابلے کا امتحان چھوڑ کر لاہور چھوڑ کر حق نگر واپس چلا جائے۔ اللہ کے فضل و کرم سے اسے اس کی ضرورت نہیں۔ سب کچھ تو ہے اس کے پاس اور ان غیر ضروری چیزوں کی وجہ سے وہ اہم ترین چیزوں سے دُور ہو رہا ہے۔

لیکن اسے یاد تھا...... مولوی صاحب نے کہا تھا...... اللہ تک پہنچنے کے بے شمار راستے ہیں۔ سب سے آسان یہ ہے کہ اس کے بندوں سے محبت کرو۔ اس کی مخلوق پر مہربانی کرو اور مسعود صاحب کہتے تھے یہ ملک اللہ کی عطا ہے۔ یہ عالم اسلام کی اُمید ہے۔ اس کی فلاح اور ترقی کے لئے کچھ کرنا اللہ کو خوش کرنا ہے۔ اس ملک کو تعلیم یافتہ، عقل مند، دیانتدار اور دردمند افسروں کی ضرورت

ہے۔ ورنہ بددیانت، ظالم اور راشی افسر اس ملک کو کھوکھلا کر دیں گے۔

یہ یاد آتا تو وہ سوچتا کہ یہاں بھی وہ ایک طرح سے اللہ کا کام ہی کر رہا ہے۔ مگر دل کی خلش دور نہیں ہوتی تھی۔

اسی ہاں اور نا میں تین سال گزر گئے۔ اب تو اسے نتیجے کا انتظار تھا اور ادھر وہ مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ بس دل کی یہ بے سکونی ستاتی رہتی تھی۔

نوربانو کی بات ایک اور انداز میں سچ ثابت ہوگئی تھی۔ وجہ چاہے کچھ بھی ہو۔ چیزیں جب اپنی اہمیت کھونے لگیں تو پھر ایک وقت آتا ہے کہ غیر اہم ہی ہو جاتی ہیں۔ جب تسکین ہی نہیں رہتو اس نے نوربانو سے فرمائش کرنا چھوڑ دیا۔ اور نوربانو تو ویسے بھی اس کی فرمائش ہی کی وجہ سے مارے باندھے سناتی تھی۔ فرمائش نہ رہی تو وہ بھی مطمئن ہوگئی۔

''یہ آپ کی چائے۔''

نوربانو نے اسے چونکا دیا۔

''کیا کر رہے تھے آپ؟''

''پڑھ رہا تھا۔''

''لگتا تو نہیں۔'' نوربانو کے لہجے میں شک تھا۔

''نظریں تو خالی خالی ہیں آپ کی۔''

''تمہیں دیکھتا ہوں تو ایسی ہی ہو جاتی ہیں۔''

''اب مجھے بنا رہے ہیں آپ!''

''نہیں......! سچ کہہ رہا ہوں۔'' وہ سنجیدہ ہوگیا۔

''تم ہی کہو، اگر میں پڑھ نہیں رہا تو کیا کر رہا ہوں؟''

''کچھ سوچ رہے ہوں گے۔''

''سوچ تو کچھ بھی سکتا ہے آدمی۔''

''مگر میں کبھی تم سے آگے نہیں بڑھ پاتا۔ میری ہر سوچ تم پر آ کر رک جاتی ہے۔''

''پھر وہی...... مجھے بنا رہے ہیں آپ......''

''نہیں......! سچ کہہ رہا ہوں۔''

''تو اتنے افسوس سے کیوں کہہ رہے ہیں؟'' نوربانو نے رنگ بدلا۔

''مجھے افسوس ہوتا ہے۔'' عبدالحق نے زور دے کر کہا۔

''کبھی کبھی میں تمہیں پیچھے چھوڑے بغیر تم سے آگے جا کر بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔''

نوربانو سہم گئی، دل میں ڈر گئی۔ یہی تو دھڑکا لگا رہتا تھا اسے۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور عبدالحق کی گردن کو سہلانے لگی۔

''کوئی ضرورت نہیں۔'' اس نے بڑے ناز سے کہا۔

''مجھ سے جتنا ہی آگے جائیں گے، وہاں بھی میں ہی ملوں گی آپ کو۔''

عبدالحق بے خود ہوگیا۔ مسحور ہوگیا۔ اس لمس میں آج بھی وہی تاثیر تھی۔ بلکہ شاید بڑھ گئی تھی۔ اس نے نوربانو کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

نوربانو نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''کیا کرتے ہیں، کوئی دیکھ لے گا۔''

''اور تم نے جو ہات رکھا ہوا تھا، وہ کوئی دیکھ لیتا تو؟''

''تو میں ہاتھ اُوپر لے جاتی اور سر دبانا شروع کر دیتی، اور کہتی...... سر میں درد ہو رہا ہے صاحب کے۔''

''بڑی مکار ہو تم!''

''ہاں......! وہ تو میں ہوں۔'' نوربانو نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اچھا اب جاؤ......! مجھے کام کرنے دو۔''

''میں سامنے بیٹھی رہوں تو آپ کام نہیں کر سکتے۔''

''کر سکتا ہوں...... ایک ہی کام کر سکتا ہوں۔ لیکن اس وقت وہ ممکن نہیں۔ اس وقت تو مجھے کچھ اور کرنا ہے۔ جاؤ تم۔''

نوربانو خوش ہوگئی۔ وہ ہنستی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ عبدالحق اپنے کام

کی طرف متوجہ ہو گیا۔

❁ ❁ ❁

''مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' نادرہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''تم نے انہیں بتایا نہیں میرے بارے میں۔''

''بتایا تھا باجی!'' یہ کہتے ہوئے ثمن نے نہ جانے کیوں شرمندگی سے نظریں جھکا لیں۔

''پھر بھی؟''

''وہ کہتے تھے، گاہک یا تماش بین کی حیثیت سے نہیں، عزت کرنے والے دوست کی حیثیت سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''عزت اور دوستی! اور وہ بھی کوٹھے پر۔'' نادرہ نے حقارت سے کہا۔

''نہ تم دودھ پیتی بچی ہو ثمن! اور نہ میں۔ ہم دونوں ہی یہ بات سمجھتے ہیں۔''

''ایک بات کہوں باجی! وہ بہت مختلف آدمی ہیں۔''

''کتنے ہی مختلف ہوں، میں تو مرد ہوں۔''

ثمن بجھ سی گئی۔

''مرد اچھے بھی تو ہوتے ہیں باجی!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

نادرہ نے اسے غور سے دیکھا۔

''تم ان سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئی ہو؟''

''وہ ہیں ہی ایسے۔''

''اچھا......! میں سوچ کر جواب دوں گی۔''

اور نادرہ کو واقعی سوچنا تھا۔ کوئی بڑا افسر ایک کوٹھے کی نائیکہ سے عزت کرنے والے دوست کی حیثیت سے ملنا چاہتا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ غرض کہ کاروبار کی اس دُنیا میں دوستی نہیں چلتی۔ عارف کو اس سے...... بلکہ اس کوٹھے سے کچھ نہ کچھ لینا ہوگا ورنہ وہ اس انداز میں بات کبھی نہ کرتا۔

اور جو نقشہ ثمن نے کھینچا تھا، اس سے وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ عارف

کوئی بڑا اور اہم افسر ہوگا۔ بھٹی جیسے آدمی نے وہ محفل اس کے اعزاز میں برپا کی تھی اور سب سے پہلے لڑکی کے انتخاب کا حق بھی اسے دیا گیا تھا۔ بھٹی یوں ہی بلاوجہ تو کسی کو اہمیت نہیں دے سکتا تھا۔ یہ عارف یقیناً کوئی بڑی چیز ہوگا۔

اعلیٰ افسران کی اہمیت تو نادرہ نے نیلم بائی کی زندگی میں ہی سمجھ لی تھی۔ اس کے بعد اس پر اور رموز بھی کھل گئے تھے۔ ان افسران کا دبا ہوا تحفظ بڑی نعمت تھا۔ ان کی سرپرستی میسر ہوتے ہوئے کوئی بھی کوٹھے کو ٹیڑھی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نہ کوئی بدمعاش نہ کوئی پولیس والا۔ اور وہ بگڑ جاتے تو کوٹھے پر پولیس کا Raid بھی ہو جاتا تھا۔

اور بھٹی تو اعلیٰ افسران کا سرتاج تھا۔ اس کی پہنچ بہت اوپر تک تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی بات کبھی نہیں ٹالی جاتی تھی۔

اس تناظر میں عارف کی استدعا اور اہمیت اختیار کر گئی۔ اس نے خاموشی سے ثمن سے بات کی تھی اور وہ بھی بے حد باعزت انداز میں۔ وہ چاہتا تو بھٹی سے بات کرتا اور نادرہ کو جہاں چاہتا، بلوا لیتا۔ انکار کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس معاملے کو ذاتی بنا لیا۔

تو کیا یہ عارف کی اچھائی ہے؟

لیکن جو کچھ نادرہ نے دیکھا اور بھگتا تھا، اس کے بعد بے غرضی کا فلسفہ اس کے حلق سے اتنی آسانی سے نہیں اُتر سکتا تھا۔ طوائف کی عزت تو کوئی اپنی غرض سے بھی نہیں کرتا، بے غرضی کے ساتھ تو بہت دور کی بات ہے۔

تو یہ طے ہے کہ بات کسی غرض کی ہے۔ اور کسی نائیکہ سے کسی کو کیا غرض ہو سکتی ہے۔ یہی نا کہ کوئی لڑکی پسند آ گئی ہو۔

ایک لمحے کو نادرہ ڈر گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کہیں سے انہیں ارجمند کی سن گن مل گئی ہو۔ لیکن نہیں...... ارجمند تو ابھی بچہ ہے...... اس...... گیارہ سال کی...... لیکن بے راہ رووں کا کیا ٹھکانا؟

مگر پھر اسے ثمن کا انداز یاد آیا۔ عارف کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں احترام اور محبت ہوتی تھی اور اس نے عارف سے متاثر

ہونے کا اعتراف بھی کیا تھا۔

اور خود سمن بھی لاکھوں میں ایک تھی۔ صورت شکل ہی نہیں، اس کی عادات و اطوار بھی بہت اچھے تھے۔ کون جانے، دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کرلیا ہو اور عارف اسی سلسلے میں اس کے پاس آرہا ہو۔

یقیناً یہی بات ہوئی۔ جبھی تو اس نے بھٹی سے بات نہیں کی۔ ان افسروں کا بھی ایک اُصول تھا۔ کوٹھے سے کسی لڑکی کو زندگی بھر کے لئے کبھی نہیں اٹھاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر وہ ایسا کرنے لگے تو کوٹھے ہی اُجڑ جائیں گے۔ پھر جو لڑکی جب جی چاہے، مل سکتی ہو، اسے گلے کا ہار بنانے کا فائدہ؟ تو اگر عارف یہ بات بھٹی سے کرتا تو بھٹی کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے لئے دیوار بن جاتا۔ اسی لئے عارف نے سوچا ہوگا کہ اس سے مل کر بات کرے۔

نادرہ نے سوچ لیا کہ وہ عارف سے ضرور ملے گی۔ لیکن اپنے انداز میں۔

اسی وقت ارجمند نے اسے چونکا دیا۔

''پھپھو! اچھی پھپھو! بھوک لگ رہی ہے مجھے۔''

''تو چلو۔ تمہیں کھانا دے دوں۔''

''آپ نہیں کھائیں گی؟''

''میں بھی کھا لوں گی۔''

کھانا نکالتے ہوئے اس نے اچھو میاں کو آواز دی۔

''آپ بھی کھا لیں۔''

''ابھی تو بھوک نہیں ہے۔ میں بعد میں کھا لوں گا۔'' اچھو میاں نے جواب دیا۔

''تم کھاؤ بیٹا!''

وہ پوچھنا بھی محض رسمی تھا۔ نادرہ جانتی تھی کہ وہ ان کے ساتھ نہیں بیٹھیں گے۔ وہ کبھی ان کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ یہ بات نادرہ کو عجیب

لگتی تھی۔ مگر ایک اطمینان تھا اسے۔ اس کا سبب کراہت ہرگز نہیں تھی۔ بلکہ وہ ہر بار کھانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرتے، اور پھر اس سے کہتے۔ تمہارا احسان ہے بیٹا! اس کوٹھے پر بھی حق حلال کی روٹی کھلا رہی ہو تم۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں نواب صاحب! یہ تو اللہ کا کرم ہے۔''

''مگر وسیلہ تو تم ہو۔''

''ہم برابر کے حصہ دار ہیں نواب صاحب! میں محنت کرتی ہوں، لیکن بھاگ دوڑ تو آپ کرتے ہیں اور کرم اللہ کا ہے۔''

''بے شک! یہ اللہ کی بہت بڑی عنایت ہے؟''

ایک بار پھر ارجمند نے نادرہ کو چونکا دیا۔

''پھر وہی دال پھپھو!'' وہ ٹھنک کر بولی۔

''تم چھوٹی ہو نا، اس لئے تمہیں پتا نہیں ہے کہ یہ دال کتنی بڑی نعمت ہے۔'' نادرہ نے نرم لہجے میں کہا۔

''اوہ! کھا کر تو دیکھو، کتنے مزے کی ہے۔'' اس نے نوالہ ارجمند کی طرف بڑھایا۔

ارجمند نے کوئی تعرض نہیں کیا۔

''اب بتاؤ بچی، مزے کی ہے یا نہیں؟''

''بہت مزے کی ہے پھپھو! لیکن کئی دنوں سے گوشت کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔''

''واقعی! کئی دن ہوگئے گوشت پکے۔'' نادرہ نے کہا۔

''اچھا......! آج اور صبر کرلو۔ کل انشاء اللہ قورمہ کھلائیں گے تمہیں۔''

یہ دیکھ کر اسے خوش ہوئی کہ ارجمند نے بے دلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بلکہ پیٹ بھر کر کھایا۔ اس نے اسے لپٹا کر خوب پیار کیا۔

''سچ میں تم بڑی پیاری اور صابر بچی ہو۔''

''آپ کی بھتیجی جو ہوں پھپھو!'' ارجمند نے معصومیت سے کہا۔

کھانے کے بعد نادرہ کام میں مصروف ہوگئی۔ شام کو اس نے اچھو

میاں کو بلایا۔

''کپڑے تیار ہو گئے ہیں نواب صاحب!'' اس نے تھیلا ان کی طرف بڑھایا۔

''آپ آج ہی لے جائیں۔ اور کوشش کیجئے گا کہ پیسے آج ہی مل جائیں۔''

''کوئی خاص بات؟'' اچھو میاں نے پوچھا۔

''ارجمند کئی دن سے گوشت کو ترس رہی ہے۔''

''تم فکر نہ کرو بیٹا! میں پیسے لے کر ہی آؤں گا۔''

نادرہ مطمئن ہوگئی۔ اللہ نے اسے کبھی مایوس نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کا ہاتھ تھاما تھا اور اس کے لئے راہ نکالی تھی۔

یہ سلسلہ تو نیلم بائی کی زندگی میں ہی شروع ہوگیا تھا۔ اس وقت سے جب نیلم بائی نے سب کچھ اسی کے نام کر دیا تھا۔ اس رمضان سے ہی نادرہ کو یہ خلش ستانے لگی تھی کہ خود تو خود، وہ ارجمند کو بھی حرام کھلا رہی ہے۔ تب اس نے سوچا تھا کہ اسے کچھ کرنا چاہئے۔ مگر کیا؟ اس کا کوئی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ پھر جب اس نے اچھو میاں کے لئے کرتے سیئے اور ان پر کڑھائی کی تو اسے خیال آیا کہ یہ ایک ہنر تو ہے اس کے پاس۔ یہ اس کے لئے رزق کا وسیلہ بن سکتا ہے۔

اس نے اس سلسلے میں اچھو میاں سے بات کی۔

اچھو میاں کو باہر کی دُنیا کا کچھ پتا نہیں تھا۔ لیکن نادرہ کے جذبے نے ان کے دل کو چھو لیا۔ اللہ سے دُعا کر کے ایک دن وہ بازار چلے گئے۔ وہاں جو کچھ ہوا، اور انہوں نے انداز میں معاملات طے کئے وہ ان کے لئے بھی حیران کن تھے۔

بازار میں سلے سلائے کپڑوں کی بہت دُکانیں تھیں۔ وہ کئی کئی بار ہر دُکان کے سامنے سے گزرے۔ مقصد صرف یہ دیکھنا تھا کہ کون سی دُکان زیادہ چلتی ہے، اور کون دُکان دار دیکھنے میں زیادہ معقول لگتا ہے۔

بالآخر ایک جگہ ان کا دل ٹھکا اور وہ دُکان میں چلے گئے۔ انہوں نے دکاندار سے کرتے دکھانے کو کہا۔ دکاندار نے کرتے دکھائے۔ کپڑا تو اچھا تھا۔ لیکن سلائی اچھی نہیں تھی۔

''کڑھائی والے نہیں ہیں۔''

دکاندار نے کڑھائی والے کرتے ان کے سامنے رکھ دیئے۔

''نہ تو سلائی اچھی ہے نہ کڑھائی۔'' انہوں نے اعتراض کیا۔

''یہ میرے کرتے کو دیکھو، ایسے کرتے ہیں تمہارے پاس۔''

دکاندار نے بہت غور سے ان کے کرتے کو دیکھا۔

''اونہیں جی! ایسے کرتے دکانوں پر کہاں ملتے ہیں۔ یہ تو گھر کا سلا ہوا ہے۔ ہاتھ کی سلائی ہے پوری۔ اور کڑھائی بھی بہت اچھی ہے۔ تم پورا بازار دیکھ لو۔ ایسے کرتے نہیں مل سکتے تمہیں۔''

''اور اگر میں ایسے کرتے تمہیں لا کر دوں تو......''

دکاندار چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

''میں تمہیں اچھی قیمت دوں گا ان کی۔ پر ایک شرط ہوگی۔''

''وہ کیا؟''

''بازار میں صرف مجھے دو گے وہ کرتے۔ کسی اور کو نہیں دو گے۔''

''تم اچھی قیمت دو گے تو میں کسی اور کو کیوں دوں گا۔''

''بس تو لے آؤ مال۔ مختلف سائز کے لانا۔''

اچھو میاں دُکان سے نکلے تو جیسے ہواؤں میں اُڑ رہے تھے۔ مگر وہ اللہ کا شکر ادا کرنا نہیں بھولے۔ یہ اللہ ہی کا کرم ہے۔ انہوں نے سوچا۔ ورنہ مجھے تو کاروباری بات کرنی آتی بھی نہیں۔

انہوں نے یہ خوش خبری نادرہ کو پہنچا دی۔

''بس.....! اب تم کرتے تیار کر کے دے دو۔''

مگر نادرہ کے سامنے ایک اور مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ کپڑا خریدنے کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے؟ یہ بات اس نے اچھو میاں سے کہی تو وہ چکرا گئے۔

''پیسوں کی کیا کمی ہے؟ سب کچھ تو ہے تمہارے پاس۔''

''یہ بات ہے تو پھر اتنی محنت کی کیا ضرورت ہے؟'' نادرہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے نواب صاحب! کہ یہ سب تو مالِ حرام ہے، اور ہم رزقِ حلال کی کوشش میں ہیں تو کیا ہم اپنے حلال رزق کی بنیاد حرام رزق پر رکھیں گے؟''

''ہاں......! یہ تو ہے۔''

دونوں اپنی اپنی جگہ سوچتے رہے۔ پھر ایک دن اچھو میاں نے تجویز پیش کی۔

''ایسا کرو، اس میں سے کچھ بطور قرض لے لو۔ کرتوں کی قیمت ملے تو قرض واپس دے دینا۔''

نادرہ نے چند لمحے سوچا، پھر نفی میں سر ہلایا۔

''پھر دوبارہ کپڑا بھی تو لانا ہوگا۔ یوں تو یہ حرام کا قرض ہمیشہ ہمارے سر چڑھا رہے گا۔''

''تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کر دینا۔''

''نہیں نواب صاحب! قرض لینے سے مالِ حرام حلال نہیں ہوگا۔ رہے گا تو حرام کا پیسہ ہی۔ میں نے اللہ سے رزقِ حلال کی دُعا کی ہے۔ حرام مال کے قرض سے بھی میں یہ کام نہیں کروں گی۔''

''تو پھر؟'' اچھو میاں کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''جس نے خیال عطا فرمایا ہے، وہی راستہ بھی بنائے گا۔'' نادرہ نے بڑے یقین سے کہا۔

کئی دن گزر گئے۔ مگر بہت سوچنے پر بھی کوئی صورت نکلتی دکھائی نہیں دی۔ نادرہ کو بھی اپنے دل میں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ کوٹھا ایسی جگہ ہے، جہاں رزقِ حلال کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے باوجود وہ اس کے لئے ذہنی طور پر آمادہ نہیں تھی

کہ اپنے اس اکل حلال کی بنیاد حرام مال پر رکھے، خواہ وہ قرض ہی کیوں نہ ہو اور خواہ وہ قرض ادا بھی کر دے۔ مگر اسے اپنا حلال رزق خالص کبھی نہیں لگے گا۔

دشواری یہ تھی کہ اب نوالے بھی اس کے حلق میں پھنسنے لگے تھے۔ ارجمند کا ساتھ دینے کی خاطر وہ اس کے ساتھ کھانے پر مجبور تھی۔ ورنہ کھانے کو اس کا دل چاہتا ہی نہیں تھا۔ مجبوری یہ بھی تھی کہ ارجمند کو وہ یہ سب کچھ بتانا بھی نہیں چاہتی تھی۔

اچھو میاں اس کے حال سے بے خبر نہیں تھے۔ لیکن وہ بے بس تھے۔

پھر جس نے اکل حلال کا خیال عطا فرمایا تھا، اس نے راستہ بھی بنا دیا۔

اس روز اچھو میاں کی برداشت جواب دے گئی۔ وہ اس ارادے سے نکلے کہ کوئی مزدوری مل جائے تو کر لیں۔ کئی جگہ انہوں نے کوشش کی مگر بات نہیں بنی۔

اچانک کہیں سے کوئی جھپٹ کر آیا اور مضبوطی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

''او بابا جی! تم تو پلٹ کر ہی نہیں آئے اس دن کے بعد؟''

انہوں نے چونک کر دیکھا۔ وہ وہی دکاندار تھا جس سے اس دن انہوں نے کرتوں کے لئے بات کی تھی۔ انہیں پتا بھی نہیں چلا تھا کہ وہ اس بازار کی طرف نکل آئے ہیں۔

چند لمحے تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''او بابا جی! کسی اور دکاندار سے بات کر لی ہے کیا؟'' دکاندار نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''نہیں بھئی......! نہیں تو......''

''دیکھو بابا جی! بازار میں جو سب سے زیادہ دام دے رہا ہو، میں اس سے زیادہ دوں گا۔ پر شرط وہی ہوگی۔ میرے علاوہ کسی کو مال نہیں دو گے تم۔''

''یہ بات نہیں، دراصل ہم کام شروع ہی نہیں کر سکے۔''

''کیوں؟ ایسا کیا ہوگیا؟ اچھا آؤ میرے ساتھ۔'' دکاندار نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ اور ان کا ہاتھ تھام کر انہیں دکان میں لے گیا۔

''یہاں بیٹھو! اور مجھے بتاؤ کہ کیا بات ہے؟'' اس نے اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔

اچھو میاں اسٹول پر بیٹھ گئے۔

''بس کیا بتاؤں؟'' وہ بولے۔

''او کھل کر بتاؤ بابا جی!''

''بات یہ ہے کہ ہمارے پاس کپڑا خریدنے کے لئے پیسے نہیں تھے۔'' اچھو میاں نے شرمندگی سے کہا۔

''او......! یہ پہلے ہی بتا دینا تھا نا بابا جی! یہ کون سا مسئلہ ہے۔ کپڑا، دھاگا، ساری چیزیں میں دے دیتا اور کام کی اجرت طے کر لیتے۔ یہ تو اور اچھا ہے۔ کپڑا میں اپنی مرضی کا دوں گا۔''

اچھو میاں تو کھل گئے۔

''یہ تو خیال ہی نہیں آیا تھا ہمیں۔''

''دیکھو بابا جی! کام جتنا اچھا ہوگا، میں دام بھی اتنے ہی اچھے دوں گا۔ پر بات وہی ایمانداری کی ہے۔ میرے سوا کسی کو مال نہیں دینا، یہ وعدہ کرنا ہوگا۔''

''ہم زبان کے پکے ہیں۔''

''بس تو میں ضرورت کی ساری چیزیں دیتا ہوں۔ کام شروع کرو۔ تعلق بن جائے گا تو میں سلائی کی مشین بھی خرید کر دوں گا تمہیں۔ پھر کچھ کام مشین کا بھی دے دیا کروں گا۔''

''بڑی مہربانی تمہاری۔''

''مہربانی کیسی بابا جی! یہ تو کاروبار ہے۔ مجھے بھی فائدہ ہوگا اور تمہیں بھی۔''

دکاندار نے تھیلے میں ململ کا ایک تھان ڈالا اور اچھو میاں کی طرف بڑھایا۔

''ڈھاکے کی ململ ہے اعلیٰ درجے کی۔ کام کرنے والے کا بھی دل خوش

ہو جائے گا۔''

اچھو میاں دکان سے نکلنے لگے تو دکاندار نے پکارا۔

''او بابا جی! اپنا پتا تو بتاتے جاؤ۔''

اچھو میاں پلٹے اور اس کی طرف بڑھے۔

''دیکھو بھائی! پتا تو میں نہیں بتاؤں گا۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں کپڑے کا پورا تھان دے رہا ہوں تمہیں۔ نہیں آئے تو کہاں ڈھونڈتا پھروں گا تمہیں؟''

''اعتبار کر سکتے ہو تو کر لو، ورنہ یہ رہا تمہارا کپڑا۔'' اچھو میاں نے تھیلا کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

''سنو بابا جی! میں اپنے لڑکے کو تمہارے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔ وہ گھر دیکھ آئے گا۔'' دکاندار نے نرم لہجے میں کہا۔

''اور بات صرف اعتبار کی نہیں، کبھی کوئی ارجنٹ کام ہوا تو لڑکے کے ہاتھ کپڑا بھجوا دوں گا۔ کبھی کچھ منگوانا ہوا تو منگوا لوں گا۔''

''نہیں بھائی! نہ میں پتا بتاؤں گا، نہ اپنا گھر دکھاؤں گا۔ یہ کر سکتا ہوں کہ ہر دوسرے دن تمہارے پاس ایک چکر لگا لوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ آگے تمہاری مرضی۔''

دکاندار سوچ میں پڑ گیا۔ اچھو میاں باہر جانے کے لئے پلٹے تو دکاندار نے کہا۔

''ٹھیک ہے بابا جی! کپڑا لے جاؤ۔''

اچھو میاں کوٹھے پر پہنچے اور نادرہ کو کپڑا دیا اور تفصیل بتائی۔ نادرہ خوش ہو گئی۔

''دو نفل پڑھوں گی شکرانے کے۔ دیکھا آپ نے، اللہ نے راستہ بھی بنا دیا نا......!''

اب اس تعلق کو تقریباً تین سال ہوئے تھے۔ اب نادرہ کے پاس مشین بھی تھی۔ وہ لیڈیز سوٹ بھی سیتی تھی اور کڑھائی کا کام تو وہ ایسا کرتی تھی کہ

دیکھتے رہ جاؤ۔ دکاندار بھی بہت خوش تھا۔ اسے اس کے تصور سے بھی زیادہ فائدہ ہو رہا تھا۔ دکان کی ساکھ کہیں کی کہیں پہنچ گئی تھی۔

''لو بیٹا! یہ گوشت لے آیا ہوں میں۔'' اچھو میاں کی آواز نے نادرہ کو چونکا دیا۔

نادرہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''یہ کہاں سے لے آئے آپ! اور کیوں لے آئے؟''

''تمہاری گڑیا گوشت کو ترسے، یہ ہو سکتا ہے بھلا؟ اور ادھار نہیں لائے۔ نقد پیسے دے کر لائے ہیں۔''

''پیسے کہاں سے آئے آپ کے پاس؟''

''تمہارے ہی دیئے ہوئے ہیں۔ زبردستی دے دیتی ہو تو رکھ لیتے ہیں ورنہ ہماری تو اپنی کوئی ضرورت ہے نہیں۔ کپڑے تو وہ اپنا دکاندار ہی دے دیتا ہے۔''

نادرہ مسکرائی۔

''تب تو بہت امیر ہوں گے آپ! بہت پیسے ہوں گے آپ کے پاس۔'' مگر یہ کہتے کہتے وہ اُداس ہوگئی۔ وہ یہ بات اس شخص سے کہہ رہی تھی جو کبھی نواب تھا۔ ہر رات سینکڑوں لٹا دیتا تھا۔ لیکن اس نے یہ بات کہی نہیں۔

''نہیں بیٹا! ایک دو روپے سے زیادہ نہیں رکھتے ہم اپنے پاس۔'' اچھو میاں نے بے پروائی سے کہا۔

''تو پھر کرتے کیا ہیں؟''

''جب بھی داتا دربار جانا ہوتا ہے...... وہاں لنگر میں خرچ کر دیتے ہیں۔''

نادرہ نے بڑی محبت سے انہیں دیکھا...... جب اس نے پہلی بار انہیں دیکھا تھا...... اس کے مقابلے میں کتنے بدل گئے تھے وہ...... سفید داڑھی...... چہرے پر پاکیزگی اور رونق...... اور پیشانی پر نماز کا نشان...... سب اللہ کی رحمت ہے...... وہ مقلب القلوب کیسے بدل دیتا ہے لوگوں کو...... اور کہاں کہاں بدل دیتا

ہے؟ طوائفوں کے کوٹھوں پر بھی، واقعی اس کی رحمت پوری کائنات پر محیط ہے۔

❁ ❁ ❁

اس بار عبدالحق اور نور بانو حق نگر جانے لگے تو حمیدہ نے کہا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی پتر!''

''کیوں اماں! خوامخواہ اتنا تکلیف دہ سفر کرنا۔ پھر وہاں یہاں جیسا آرام کہاں ملے گا؟'' نور بانو نے جلدی سے مداخلت کی۔

''کیسی باتیں کرتی ہو؟'' عبدالحق نے اسے ٹوکا۔

''جس چیز سے آدمی کو خوشی مل رہی ہو، اس کی تکلیف بھی آدمی کو تکلیف نہیں لگتی اور اماں کہہ رہی ہیں تو کچھ سوچ کر ہی کہہ رہی ہوں گی۔''

نور بانو کھسیا گئی۔

''میں تو اماں ہی کے خیال سے کہہ رہی تھی۔''

''میری بیٹی کتنا خیال رکھتی ہے میرا۔'' حمیدہ بولی۔

''لیکن اس بار تو میں جائے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

''ضرور چلو اماں!''

وہ لوگ گھر پہنچے تو شام ہو رہی تھی۔ حمیدہ دو سال بعد حق نگر آئی تھی۔ وہ حیرت سے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔

''ارے! کتنا بدل گیا ہے اپنا گاؤں۔ اتنے گھر بن گئے۔ یہ تو دنیا ہی بدل گئی۔''

''اب تو یہ شہر بن گیا ہے اماں!'' عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بجلی بھی آگئی ہے گھر گھر۔''

اور حمیدہ گھر دیکھ کر بھی حیران ہوئی۔ وہاں بھی بڑی تبدیلیاں نظر آئیں۔ وہ کمرہ جس میں وہ رہتی تھی، اس کے ساتھ اب باتھ روم بھی تھا اور اس میں کموڈ تھا۔ اسے دیکھ کر حمیدہ خوش ہوگئی۔

''لو! یہی ایک پریشانی تھی مجھے۔ یہ کب بنوایا تم نے؟''

''ایک سال ہوگیا ہے اماں!'' عبدالحق نے کہا۔

''میں نے سوچا، آپ کبھی یہاں آئیں گی تو کموڈ کی وجہ سے پریشان ہوں گی۔ بس یہی سوچ کر یہاں کموڈ لگوا لیا۔''

حمیدہ نے اسے لپٹا کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

''کتنا خیال رکھنے والا ہے میرا بیٹا!'' پھر وہ نور بانو کی طرف مڑی۔

''اور تو کیوں پریشان ہو رہی تھی میرے لئے؟''

''میں تو آپ کی ضعیفی کے خیال سے کہہ رہی تھی۔''

''بڑھاپا تو اپنی جگہ سچ ہے دھیے! مگر میں نے ساری عمر اللہ سے دعا کی ہے کہ چلتے ہاتھ پیروں اُٹھانا میرے مولا۔ کسی کی محتاجی نہ ہو اور وہ تو ایسا کریم ہے کہ اس نے تو آنکھیں بھی مجھے لوٹا دیں۔ میں تو اس گھر میں اکیلی بھی رہ سکتی ہوں۔''

نور بانو رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ عبدالحق نے کہا۔

''میں زرینہ کی طرف جا رہا ہوں۔ ایک گھنٹے میں آ جاؤں گا۔''

''میں بھی چلوں گی پتر!''

عبدالحق نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں یہاں آئی ہی اس لئے ہوں۔'' حمیدہ نے وضاحت کی۔

''زرینہ کی وجہ سے۔ مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ آج کل میں ہی اس کی طرف سے خوش خبری ملے گی۔''

''تو ٹھیک ہے اماں! چلو!''

''مجھے تو اکیلے میں ڈر لگے گا۔'' نور بانو بولی۔

''تو تم بھی چلی چلو۔ کھانا آ کر پکا لینا۔''

وہ تینوں ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچے۔ صفیہ تو حمیدہ کو دیکھ کر کھل اُٹھی۔

''آہا......! آج تو نصیب جاگ گئے ہمارے۔''

''ہاں......! دو سال بعد آئی ہوں میں۔ اب اتنی دُور سے آنا اتنا آسان تو نہیں۔''

''واقعی! آپ نے بڑی ہمت کی۔''

''ہمت کیا؟ یہ زرینہ کی محبت میں آئی ہیں۔'' ڈاکٹر صاحب نے شوخ لہجے میں کہا۔

''سچ کہتے ہیں آپ!'' حمیدہ نے زرینہ کو لپٹاتے ہوئے کہا۔

''اور اب خوش خبری لے کر ہی جاؤں گی۔ آنے والے کا منہ دیکھے بغیر نہیں جاؤں گی میں۔''

زرینہ کے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی۔ یہ کیسے لوگ تھے، جو اس کے اپنے بن گئے تھے۔ اس نے محبت بھری نظروں سے عبدالحق کو دیکھا۔ یہ سب کچھ اس کے دم سے تھا۔ وہ نہ ہوتا تو آج وہ کسی کوٹھے پر بے عزتی کی زندگی گزار رہی ہوتی۔ اب وہ پلٹ کر اس گزرے ہوئے وقت کو یاد کرتی تھی تو پہلے وہ اسے غیر حقیقی لگتا تھا اور اس کے بعد اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔

''آئیں......! اندر چلیں۔'' صفیہ بیگم نے کہا۔

تمام خواتین اندر چلی گئیں۔ بیٹھک میں ڈاکٹر صاحب اور عبدالحق رہ گئے۔

''تمہارا رزلٹ ابھی نہیں آیا بیٹے!'' ڈاکٹر صاحب نے مشفقانہ انداز میں عبدالحق سے پوچھا۔

''اب کسی دن بھی آ جائے گا چچا صاحب!''

''اور مقابلے کے امتحان کی تیاری کیسی چل رہی ہے؟''

''الحمدللہ! بہت اچھی!''

''انشاءاللہ! اللہ تمہیں کامیاب کرے گا۔'' ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ پھر بولے۔

''اس بار دو چار دن رُک جاؤ۔''

''کیوں چچا صاحب! خیر تو ہے؟''

''ہاں ہاں! خیر ہی خیر ہے۔'' ڈاکٹر صاحب مسکرائے۔

''میں چاہتا ہوں کہ اس بار بچے کے کان میں اذان تم دو۔''

''یہ تو اعزاز ہوگا میرے لئے۔'' عبدالحق بھی مسکرایا۔

''اس کے لئے تو میں ایک ہفتہ بھی رُک سکتا ہوں۔''

''میرا اندازہ ہے کہ تین دن اور ہیں۔ اچھا آؤ میرے ساتھ۔ تمہیں کچھ دکھانا ہے۔''

عبدالحق ان کے ساتھ نکل آیا۔

اور جو کچھ ڈاکٹر صاحب نے اسے دکھایا، اسے دیکھ کر اس کا دل خوش ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب کے اسپتال کی عمارت مکمل ہو چکی تھی۔ اسپتال میں میٹرنٹی ہوم بھی تھا۔

''یہ تو آپ نے کمال کر دیا۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔

''اندر تو چلو!''

اندر جا کر پتا چلا کہ اسپتال کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اس کے علاوہ اسٹاف کی کمی کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہاں نرسیں، وارڈ بوائے اور ڈاکٹر بھی موجود تھے۔ کچھ مریض بھی موجود تھے۔

''بہت خوب!''

''مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ لوگوں نے میٹرنٹی ہوم کو قبول کر لیا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''تجربہ کار دائیاں اپنا کام تو جیسے تیسے نمٹا دیتی تھیں، مگر زچہ و بچہ کی بعد کی دیکھ بھال اتنی موثر نہیں ہوتی تھی۔ یہ بہت بڑا کام ہوا ہے۔''

''واقعی! یہ بڑا کام ہے۔ لیکن اسٹاف کا بندوبست کیسے کیا آپ نے؟''

''دیکھو! ایک تو یہ اب کوئی گاؤں نہیں، اچھا خاصا شہر ہے۔''

''زمین لیتے وقت یہی پیش گوئی کی تھی آپ نے۔'' عبدالحق سے رہا نہیں گیا۔

''ہاں! جو میری نگاہوں نے اس وقت تصور میں دیکھا تھا، اب وہ حقیقت ہے۔ اوہ...... میں ڈاکٹروں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ تو اچھی تنخواہ پر یہاں آ کر کام کرنے سے کون انکار کر سکتا ہے اب؟''

''مگر وہ تنخواہیں تو آپ جیب سے دیتے ہوں گے؟''

''اب ایسا بھی نہیں ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر کہا۔

''امیر لوگوں سے میں رعایت نہیں کرتا۔ ہاں غریبوں کی اور بات ہے۔ ضرورت ہو تو انہیں دوائیں بھی مفت دی جاتی ہیں۔''

''تب بھی آپ پر بار تو پڑتا ہوگا؟''

''کوئی بار نہیں پڑتا۔ تم سے زمین خریدتے وقت میں نے سب کچھ سوچ لیا تھا۔'' ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

''اب باہر چل کر دیکھو۔ اکبر کی دکان جدید طرز کے جنرل اسٹور میں تبدیل ہو چکی ہے۔ جہاں ضرورت کی ہر چیز دستیاب ہے۔ پھر جیسا کہ میں نے سوچا تھا، میں نے مارکیٹ بنوا دی ہے۔ پورا بازار بن گیا ہے۔ سب دُکانیں خوب چلتی ہیں۔ پگڑی پر اٹھا رکھی ہیں۔ اسپتال میں جو کمی پڑتی ہے، وہ اس پیسے سے پوری ہوتی ہے۔ میری جیب سے کچھ نہیں جاتا۔ میں کوئی بے وقوف تھوڑا ہی ہوں۔''

''مگر وہ بھی تو آپ ہی کی جیب ہے۔ سرمایہ کاری تو آپ ہی نے کی ہے۔''

''تو اللہ کے دیئے ہوئے مال ہی میں سے تو کی ہے۔''

''ایک بات کہوں؟ وعدہ کریں کہ مانیں گے؟''

''اب تم کوئی ایسی ویسی بات تو کہہ نہیں سکتے۔'' ڈاکٹر صاحب نے خوش مزاجی سے کہا۔

''اس لئے وعدہ کرتا ہوں۔''

''اب کارِخیر میں میری طرف سے بھی حصہ قبول فرما لیں۔ میں ہر ماہ ایک مخصوص رقم دیا کروں گا۔''

''منظور ہے۔ ذمہ داری بڑی اور بھاری ہے۔ مگر میں ذمہ داری سے نہیں گھبراتا۔''

''شکریہ......!''

اور بازار دیکھ کر عبدالحق واقعی حیران رہ گیا۔ جب وہ دکانیں بن رہی تھیں تو انہیں دیکھ کر اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہاں اتنی رونق ہوگی۔ پھر وہاں جاننے والوں سے سلام دعا ہونے لگی۔ وہ دل میں اللہ کا شکر ادا کرتا رہا کہ اس نے اسے اتنی محبتیں عطا کیں۔

ڈاکٹر صاحب کے گھر واپس جاتے ہوئے اس نے ڈاکٹر صاحب سے اصغر کے بارے میں پوچھا۔

''اس نے ایم بی بی ایس کر لیا ہے۔ اب ایف آر سی ایس کے لئے انگلینڈ جانا چاہتا ہے۔''

''تو آپ کے لئے کون سا مسئلہ ہے اس بھیجنا۔''

''بھئی......! میں ٹھہرا کاروباری آدمی۔ میں نے کہہ دیا کہ بونڈ بھر دو کہ واپسی پر کم از کم پانچ سال میرے اسپتال میں کام کرو گے۔ تو میں بھیجنے کے لئے تیار ہوں۔''

''کمال کرتے ہیں آپ......! اس سے ایسی بات کی آپ نے......؟''

''میری طرح وہ بھی عقل مند کاروباری ہے۔ وہ تیار ہوگیا۔ اگلے مہینے اس کی روانگی ہے انشاء اللہ......!''

عبدالحق ہنسنے لگا۔

''آپ دونوں نے ہی فائدے کا سودا کیا ہے۔''

❁ ❁ ❁

نادرہ کرتے کی ترپائی کر رہی تھی کہ سمن آگئی۔

''وہ...... وہ عارف صاحب آئے ہیں آپ سے ملنے۔'' اس کے لہجے میں دبا دبا ہیجان تھا۔

''تم نے تو کہا تھا کہ وہ عزت کرنے والے دوست کی حیثیت سے آئیں گے؟''

''ایسے ہی آئے ہیں وہ۔ کہہ رہے ہیں کہ آپ خوشی سے ملنا چاہیں تو ٹھیک ہے۔ ورنہ وہ واپس چلے جائیں گے۔''

''یہ مطلب نہیں ہے میرا۔ تم خود سوچو، کوٹھے پر یہ تو گاہکوں کے آنے کا وقت ہے۔'' نادرہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''اور یہ بات وہ بھی جانتے ہوں گے۔''

''تو پھر دن میں بلالوں انہیں؟''

''نہیں! تم انہیں میرے پاس لے آؤ۔ میں خود بات کروں گی ان سے۔''

''جی......ٹھیک ہے۔''

سمن گئی اور ایک منٹ بعد عارف کو ساتھ لے کر آگئی۔

''اب میں جاؤں باجی!'' اس نے نادرہ سے پوچھا۔

''ہاں! تم جاؤ۔''

نادرہ نے عارف کو بہت غور سے دیکھا۔ اس کی شخصیت بے حد متاثر کن تھی۔ خوش شکل اور وجیہہ تو وہ تھا ہی، لیکن اس کے چہرے پر شرافت بھی تھی اور غیر معمولی بات یہ تھی کہ اب تک اس نے نظریں نہیں اُٹھائی تھیں۔

''میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے وقت دیا۔'' عارف نے کہا۔

اس کے لہجے اور انداز میں بھی شائستگی اور تہذیب تھی۔

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ ابھی میں نے آپ کو وقت نہیں دیا ہے۔''

عارف نے بے ساختہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''جی! میں سمجھا نہیں۔''

''سمن نے کہا تھا کہ آپ ایک عزت کرنے والے دوست کی حیثیت سے مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟''

''جی ہاں! یہ سچ ہے۔''

''مگر کوٹھے پر اس وقت صرف تماش بین آیا کرتے ہیں۔ یہ بات آپ نہیں جانتے؟''

''سچ پوچھیں تو میں اس وقت آپ سے ملنے کے لئے نہیں آیا تھا۔''

عارف نے کہا۔

''سچ تو یہ ہے کہ مجھے اُمید نہیں تھی کہ آپ رضامند ہوں گی۔ میں تو سمن سے یہ پوچھنے کے لئے آیا تھا کہ آپ نے کیا جواب دیا ہے؟''

''آپ مجھے بھلے آدمی لگے ہیں۔'' نادرہ نے نرم لہجے میں کہا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ سے بیٹھنے کے لئے نہیں کہا، اور کہوں گی بھی نہیں۔''

''میں اس پر گلہ بھی نہیں کروں گا۔ مگر یہ ضرور پوچھوں گا کہ آپ نے بھلا آدمی کیسے سمجھ لیا مجھے؟''

''بہت بڑے افسر ہیں آپ، آپ حکماً بھی مجھ سے مل سکتے تھے۔ میں انکار کہاں کر سکتی ہوں؟''

''پھر عزت اور دوستی کا تعلق کہاں رہ جاتا؟ یہ تو میری سچائی کا ثبوت ہے۔ ویسے میں بھلا آدمی بالکل نہیں ہوں۔''

''میں نے بھی اس وقت عزت اور دوستی کا پاس رکھتے ہوئے آپ کو بلوا لیا کہ سمن سے کہلوانے کے بجائے خود ہی آپ سے کہہ دوں۔''

''یہ کہ آپ مجھ سے ملنا نہیں چاہتیں۔'' عارف کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''جی نہیں! مجھے آپ کو یہ بتانا تھا کہ آپ کل صبح دس بجے مجھ سے ملنے کے لئے آجائیں۔''

عارف ایک دم خوش ہوگیا۔

''بہت شکریہ! میں چلتا ہوں۔ کل حاضر ہوں گا۔'' وہ جانے کے لئے ٹا۔

''سنیں! اس وقت کی بداخلاقی کے لئے میں شرمندہ ہوں۔ معذرت ہتی ہوں۔''

عارف نے اسے پلٹ کر دیکھا اور مسکرایا۔

''یہ بداخلاقی ہرگز نہیں۔ یہ تو رکھ رکھاؤ ہے آپ کا۔ مجھے اچھا لگا۔'' یہ کر وہ چلا گیا۔

نادرہ دیر تک اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ سمن نے ٹھیک کہا تھا، اس شخص میں تماش بینوں والی کوئی بات نہیں تھی اور اس کی شخصیت واقعی مسحور کن تھی۔ سمن تو پھر طوائف تھی، اس سے تو کوئی عام عورت بھی متاثر ہو سکتی تھی۔

اگلی صبح نادرہ نے ارجمند سے کہا۔

''آج میرا ایک مہمان آرہا ہے گڑیا! خیال رکھنا تم اس کے سامنے نہیں آؤ گی۔''

ارجمند کو حیرت ہوئی۔ کب سے پھپھو کے لئے کوئی مہمان نہیں آیا اور دن میں تو یہاں کوئی مہمان کبھی آتا ہی نہیں تھا۔

''کوئی آپ سے شادی کے لئے آرہا ہے؟'' اس نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''ارے نہیں پگلی!'' نادرہ کو ہنسی آگئی۔

''تمہیں تو پتا ہے، ہم نے شادی کا خیال ہی دل سے نکال دیا ہے۔''

''وہ تو لوگ ہی ایسے آتے تھے۔'' ارجمند نے معصومیت سے کہا۔

''کوئی شہزادہ آجائے تو آپ منع تو نہیں کریں گی۔''

''نہیں گڑیا! اب یہ نہیں ہو سکتا۔ ایسی باتیں نہ کرو۔''

مگر سچ یہ تھا کہ نادرہ بھی تجسس سے بے حال ہو رہی تھی۔ کچھ اسے تشویش بھی تھی۔ لیکن عارف کو دیکھنے کے بعد وہ بس برائے نام ہی رہ گئی تھی۔ تاہم وہ سوچتی تھی کہ یہ ملاقات بے مقصد تو نہیں ہو سکتی۔

اس نے بڑے کمرے کی صفائی کی۔ گھڑی دیکھی تو صرف نو بجے تھے۔ اس احساس ہوا کہ وہ بڑی شدت سے عارف کی آمد کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ اخبار لے کر بیٹھی، جواب باقاعدگی سے آتا تھا۔ لیکن اس کا دل نہیں لگا۔ وہ اپنے کمرے سے جا کر وہ کرتا لے آئی، جس پر کڑھائی کر رہی تھی۔ دس بجتے بجتے کرتے مکمل ہوگیا۔

اس نے کرتا برابر والے صوفے پر رکھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اچھو میاں سے اس نے کہہ دیا تھا کہ مہمان کو وہاں لے آئیں۔

چند لمحوں کے بعد عارف کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے سلام کیا۔
نادرہ نے سلام کا جواب دیا اور سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

''شکریہ!'' عارف نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ بیٹھیں، میں ابھی حاضر ہوتی ہوں۔'' نادرہ نے کہا اور کمرے سے نکل کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

عارف نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کرتے پر نظر پڑی تو وہ اُٹھ کر گیا اور کرتا اُٹھا کر اس کا جائزہ لیا۔ پورا کرتا ہاتھ کا سلا ہوا تھا۔ گریبان پر بڑی نفیس کڑھائی تھی۔ وہ بہت ہی خوب صورت کرتا تھا۔

عارف ستائشی نظروں سے کرتے کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کرتا وہیں صوفے پر رکھا اور میز پر رکھے اخبار کا جائزہ لینے لگا۔

چند منٹ بعد نادرہ ہاتھوں پر ٹرے لئے کمرے میں آئی۔ ٹرے پر چائے کی دو پیالیاں اور بسکٹوں کی پلیٹ تھی۔ ٹرے اس نے میز پر رکھ دی۔

''لیجئے پلیز!''

''آپ نے تو تکلف کر ڈالا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ مہمان ہیں، عزت کرنے والے دوست ہیں۔ کوٹھے کے لئے یہ ایک نئی روایت ہے۔ یہ میرا اظہارِ تشکر ہے۔''

عارف نے ایک بسکٹ اُٹھا لیا۔

''آپ باتیں بہت اچھی کرتی ہیں۔''

''پتا نہیں! مجھے تو لگتا ہے کہ میں بات کرنا بھول ہی گئی ہوں۔ آپ بسکٹ اور لیجئے نا......!''

کچھ دیر خاموش رہی۔ دونوں چائے پیتے رہے۔ پھر دونوں نے ایک ساتھ ہی پیالیاں خالی کر کے ٹرے پر رکھیں۔

''میں یہ رکھ آؤں، پھر آپ سے باتیں ہوں گی۔'' نادرہ نے ٹرے اُٹھاتے ہوئے کہا۔

چند منٹ بعد وہ واپس آئی اور عارف کے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی۔

''جی! اب فرمایئے۔''

''کیا عرض کروں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں؟ بات بہت گھسی پٹی اور روایتی ہے۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ آپ اسے اسی پیرائے میں سنیں اور سمجھیں۔ میرے لئے یہ بات بہت سنجیدہ اور اہم ہے۔''

''ہم بالکل غیر روایتی ماحول میں ملے ہیں۔ اس لئے آپ اس کی فکر نہ کریں اور جہاں تک فرسودہ پن کا تعلق ہے تو دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں۔ صرف اندر کا خلوص بات کی سچائی کی گواہی دیتا ہے۔''

''خلوص اور سچائی تو ہے میرے پاس، مگر میں اس سے ڈرتا ہوں کہ وہ ارزاں نہ ہو جائے۔''

نادرہ کو یقین ہو گیا کہ وہ اس سے ثمن کے بارے میں بات کرنے والا ہے۔

''میری طرف سے تو آپ فکر نہ کریں۔ خلوص اور سچائی کو تو میں ترستی رہی ہوں اور اس کی خوب پہچان ہے مجھے۔''

عارف ایک دم مطمئن اور پُراعتماد نظر آنے لگا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور مسکرایا۔

''تو میں گھماؤ پھراؤ کے بغیر سیدھی بات کر سکتا ہوں۔ بات یہ ہے ثمن.....'' وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

''یہ آپ کا اصل نام تو نہیں ہو سکتا۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''بہت فرق پڑتا ہے۔ عزت کرنے والا دوست آپ کو بے عزتی کے نام سے تو نہیں پکار سکتا۔''

اس کے لہجے کے خلوص نے نادرہ کا دل چھو لیا۔ خواہ مخواہ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''میں یہاں اپنا اصل نام سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ کسی کو بتانا تو بہت دور

کی بات ہے۔"

"آپ ایک بات سمجھ نہیں رہی ہیں۔" عارف نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"میں جس طرح آپ سے ملنے آیا ہوں، اور آپ نے کل رات مجھے جس انداز میں لوٹا کر آج یہاں بلایا ہے، اور جس طرح آپ نے میری تواضع کی ہے، اس کے بعد کم از کم اس وقت تو یہ جگہ وہ نہیں رہی، جو یہ درحقیقت ہے، یہ تو اس وقت ایک معزز دوست کا ڈرائنگ روم ہے۔"

نادرہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اس وقت وہ خود کو بہت بے بسی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا کہ اسے خلوص اور سچ کی پہچان ہے۔ سو اب وہ اسے رد بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھا ہوا وہ شخص اس کے لئے بہت عجیب اور انوکھا تھا۔ وہ مخلص بھی تھا اور سچا بھی۔ اسے سمن کی خوش بختی پر رشک آنے لگا۔

"کچھ کہنے والے تھے آپ!" اس نے اپنے خیالات سے چونک کر کہا۔ وہ تو کھو ہی گئی تھی۔

"وہ میں ضرور کہوں گا۔ مگر اس سے پہلے آپ کا نام جاننا چاہتا ہوں۔"

"میرا نام نادرہ ہے۔"

"تو میں یہ کہہ رہا تھا نادرہ! گھماؤ پھراؤ اور لفاظی کے بغیر کہ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ نادرہ کے لئے دھماکا تھا اور وہ بھی بہت اچانک اور یکسر غیر متوقع۔ وہ گنگ ہو کر رہ گئی۔ دیر تک منہ کھولے وہ اسے دیکھتی رہی۔

عارف نے کچھ بھی نہیں کہا۔ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ ردِعمل اس کی توقع کے خلاف ہرگز نہیں تھا۔

نادرہ کو سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔ مگر اس کی آنکھوں میں اب بھی بے یقینی تھی۔

"کیا کہا آپ نے؟ پھر کہیں؟"

"اس کی کیا ضرورت ہے؟" عارف نے کہا۔

"آپ کا ردِعمل بتاتا ہے کہ آپ نے میری بات واضح طور پر سنی بھی ہے اور اس پر یقین بھی کیا ہے۔ ویسے میں یہ بات ہزار بار کہنے کے لئے تیار ہوں۔"

"مگر کیوں؟"

"اس لئے کہ آج سے پہلے آپ مجھے پسند تھیں۔ بہت زیادہ پسند۔ مگر آج میں کہتا ہوں کہ مجھے آپ سے محبت ہے۔"

"سوری! میں شاک میں تھی، اس لئے یہ سوال کر بیٹھی۔"

نادرہ نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"ورنہ مجھے اس سوال کا حق ہی نہیں تھا۔ کیونکہ مجھے تو سیدھا سچا جواب دینا چاہئے تھا، جو میں اب دے رہی ہوں۔ یہ ممکن نہیں ہے۔"

اب سوال پوچھنے کی باری میری ہے۔ مگر کیوں؟" عارف کے لہجے میں گھمبیرتا تھی۔

"جیسے مجھے وہ سوال پوچھنے کا حق نہیں تھا، ویسے ہی آپ کو یہ پوچھنے کا حق نہیں ہے۔"

"آپ خود ہی کہہ رہی ہیں کہ آپ کو حق نہیں تھا، مگر آپ نے پوچھا اور میں نے سیدھا سچا جواب دے دیا۔ اب میں پوچھ بیٹھا ہوں تو آپ کو بھی اخلاقاً جواب دینا چاہئے۔"

"میرا جواب اتنا سادہ نہیں ہے اور پھر معاملہ بے حد ذاتی ہے۔"

"شاید میں سمجھ رہا ہوں۔" عارف نے اداسی سے کہا۔

"یہ گھسا پٹا جملہ بہت سنا ہوگا آپ نے۔ آپ اس پر یقین نہیں کر سکتیں۔"

نادرہ کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ عجیب صورتِ حال تھی۔ اس کے سامنے ایک بہت شاندار اور سچا مرد بیٹھا تھا، اور اس سے اظہارِ محبت کر رہا تھا۔ وہ تو شاید

غیر شعوری طور پر، اور کسی حد تک شعوری طور پر برسوں سے اس کی آرزو کر رہی تھی۔ مگر اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

''آپ ٹھیک سمجھے ہیں۔'' وہ بولی تو اس کے لہجے میں تلخی اور جھنجلاہٹ تھی۔ طوائف کسی اظہارِ محبت کو بھی سنجیدگی سے نہیں لیتی۔ یہ غلطی کرے تو پھر طوائف سے بھی زیادہ بے عزت اور ذلیل ہو جاتی ہے۔''

''پلیز! آپ یہ لفظ استعمال نہ کریں۔ یوں آپ صرف اپنی نہیں، بلکہ ایک عزت کرنے والے دوست کی بھی توہین، تذلیل کر رہی ہیں۔'' عارف نے تڑپ کر کہا۔

''مجھے عورت اور طوائف کے درمیان جو فرق ہوتا ہے، اس کا علم ہے۔ میں نے ایک اچھی اور پسندیدہ بلکہ محبوب عورت کو پروپوز کیا ہے اور میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں اس وقت بازار کے کسی کوٹھے پر نہیں، ایک معزز دوست کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوں۔ آپ پلیز مجھے زخمی نہ کریں۔''

سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ نادرہ کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے منہ سے ہر بات غلط نکل رہی ہے۔ سیدھی بات کر کے وہ معاملے کو آسانی سے رفع دفع کر سکتی تھی۔ مگر بات غلط رخ پر نکلی جا رہی ہے۔

''سوری .....! میں واقعی شرمندہ ہوں۔ مجھے ایسی بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ لیکن دیکھیں نا، میں انکار کر چکی ہوں۔''

''یہ آپ کا حق ہے۔ لیکن میں وجہ جاننا چاہتا ہوں۔''

''آپ یقین کریں وجہ ایسی ہے کہ بتائی نہیں جا سکتی۔'' نادرہ نے بے حد نرم اور معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''آپ مجھ سے جو چاہیں پوچھ سکتی ہیں۔ پھر آپ انکار کریں گی تو کم از کم مجھے بے انصافی کا احساس تو نہیں ہوگا۔'' عارف کے لہجے میں التجا تھی۔

نادرہ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ عارف کو اصل وجہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے یہ بہتر تھا کہ اس کی بات مان لے۔

''پہلے میں ایک بات بتا دوں۔ میرے انکار میں آپ کی بہتری ہے۔ میں ایک ایسی خوفناک بیماری میں مبتلا ہوں، جو لگنے والی ہے۔ آپ مجھے اچھے انسان لگے ہیں۔ میں کیوں آپ کو عمر بھر کے عذاب میں مبتلا کروں۔''

عارف مسکرایا۔

''میں اس کے باوجود آپ سے شادی کرنا چاہوں گا۔ میں آپ کا علاج کرواؤں گا۔ آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں۔'' وہ کہتے کہتے رکا، اور چند لمحے کے توقف کے بعد بولا۔

''اور سچی بات بتاؤں، میں نہیں مانتا کہ آپ کو کوئی بیماری لاحق ہے۔ یہ تو آپ نے خود کو گناہوں سے بچانے کے لئے ایک قلعہ تعمیر کر لیا ہے۔'' وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

نادرہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ کچھ بول بھی نہ سکی۔

''بے فکر ہو جائیں۔ آپ کا راز ایک عزت کرنے والے دوست کے پاس آپ کی امانت ہے۔'' عارف نے کہا۔

''لیکن آپ کے جھوٹ بولنے پر مجھے رنج ہوا۔ میں اور آپ تو یہاں صرف سچ بولنے کے لئے ملے ہیں۔''

نادرہ شرمندہ ہو گئی۔ اب اس کے پاس مدافعانہ انداز اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کے سامنے ایک بہت مختلف مرد بیٹھا تھا۔ وہ بہت اچھا اور نفیس انسان تھا اور وہ ذہین اور معاملہ فہم بھی تھا۔ ایک لمحے میں اس نے سمجھ لیا کہ اس کی بیماری دھوکا ہے۔ اب وہ یہ بات عام کر کے اس کے لئے مسائل بھی کھڑے کر سکتا تھا۔ اگرچہ اس نے یقین دلایا تھا کہ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ لیکن بہر حال وہ اسے بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں تو تھا۔

''کہاں کھو گئیں آپ؟'' عارف نے اسے چونکا دیا۔

''میں ... میں آپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔''

''زہے نصیب.....! یہ تو بڑی خوش آئند خبر ہے۔''

''میں آپ کے بارے میں سوچ کر الجھتی ہوں۔ آپ کس طرح بھی

تماش بین نہیں لگتے۔ لیکن......''

''ہوں میں تماش بین ہی۔'' عارف نے اس کی بات پوری کر دی۔

''ہے نا......!''

''تو کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں؟'' نادرہ نے اسے چیلنج کیا۔

''کر سکتا ہوں۔ لیکن نہیں کروں گا۔''

''تو پھر بتائیں کہ ایسا کیوں ہے؟''

''میری مجبوری ہے۔''

''نفس کی غلامی کو مجبوری کہہ رہے ہیں آپ؟'' نادرہ نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

''آپ عورت بن کر، روایتی انداز میں سوچ رہی ہیں۔ ورنہ یہ بات کبھی نہ کہتیں۔ مگر مجھے کوئی شکایت نہیں ہے آپ سے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ اس معاملے کا کوئی دوسرا زاویہ بھی ہے؟''

''مجھے یہ بتائیں کہ آپ یہاں کیوں موجود ہیں؟''

''مردوں کی وجہ سے۔'' نادرہ نے کہا۔ پھر بات کی تلخی کم کرنے کے لئے جلدی سے اضافہ کیا۔

''اور میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہی ہوں کہ آپ جیسے مردوں کی وجہ سے۔''

''میں یہی جواب سننا چاہتا تھا آپ سے۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ آپ بہت محدود ہو کر، روایتی انداز میں سوچ رہی ہیں۔''

''میں پھر دوسرے زاویے کے بارے میں پوچھوں گی۔''

''اور میں کہوں گا کہ زاویے تو بے شمار ہیں۔ آپ اس پورے معاملے پر خود کو پھیلا رہی ہیں۔ صرف اپنی صورتِ حال کے حوالے سے بات کر رہی ہیں۔ اپنے حوالے سے آپ نے یہ باور کر لیا کہ یہاں صرف مظلوم عورتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ سچ نہیں ہے۔ یہاں ظالم عورتیں بھی موجود ہیں۔''

''عجیب بات کر رہے ہیں آپ! حقیقت سے دور، اور افسانوی بات۔''

''جی نہیں! افسانوی انداز تو وہ ہے جس میں آپ سوچ رہے ہیں۔

ورنہ یہاں عورتیں بھی ہیں، جو اپنی بے راہ روی کی وجہ سے یہاں تک پہنچی ہیں۔ ان میں اپنے شوہروں کے ساتھ بے وفائی کرنے والی عورتیں بھی ہیں اور وہ بھی ہیں، جنہوں نے نام نہاد محبت کے نام پر، جو محض دھوکا تھا، اپنے والدین سے بغاوت کی، اور گھر چھوڑا۔ اب یہ نہ کہئے گا کہ وہ محبت کے نام پر فریب کا شکار ہوئیں اور ان کی ذمہ داری مردوں پر ہے۔ جو عورت گھر کی چار دیواری کے تحفظ کو خود چھوڑے، اس کا یہی حال ہوتا ہے۔ یہاں وہ عورتیں بھی ہیں جو بیک وقت کئی مردوں کو فریب دے رہی تھیں، اسی لئے اس انجام کو پہنچیں اور یہاں وہ عورتیں بھی ہیں جو اچھے لباس، زیورات، آسائشات اور دولت کے لالچ میں یہاں تک آ پہنچیں۔ تو نادرہ! تصویر کا ایک رُخ کبھی نہیں دیکھنا چاہئے۔ یہ بازار، یہ کوٹھے صرف مردوں کے دم سے آباد نہیں ہیں۔ اس میں عورتوں کا بھی حصہ ہے۔''

نادرہ کھسیا گئی۔

''ایک بات بتائیں۔ خریدار نہ ہو تو بازار میں گرمی کہاں سے آئے؟ مرد یہاں کا رخ نہ کریں تو یہ کاروبار کیسے چلے گا؟ کوٹھے تو خود بخود بند ہو جائیں گے۔''

''میں خود اسی طرف آ رہا تھا۔'' عارف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میری باتوں سے یہ نہ سمجھئے گا کہ میں عورتوں پر ہی ذمہ داری ڈال رہا ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ جہنم مردوں اور عورتوں نے باہم تخلیق کیا ہے۔ کہیں مردوں کا حصہ زیادہ ہے تو کہیں عورتوں کا۔ تالی بہرحال دو ہاتھوں سے بجتی ہے، ایک ہاتھ سے نہیں۔''

''بات آپ کے بارے میں ہو رہی تھی۔'' نادرہ نے کچھ چڑ کر اسے یاد دلایا۔

''جی ہاں! میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ یہاں کیوں ہیں؟ تو آپ نے کہا، مردوں کی وجہ سے۔ اب آپ مجھ سے پوچھتی ہیں کہ میں یہاں کیوں ہوں تو میں جواب دوں گا کہ ایک عورت کی وجہ سے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''عورتوں کی طرح مردوں کی بھی بے شمار قسمیں ہیں۔ بے شک عیاش لوگ یہاں آتے ہیں۔ مگر اور بھی بے شمار مرد یہاں آتے ہیں، جن کی مجبوری ہوتی ہے۔''

''مرد اور مجبوری! بظاہر یہ سنجیدہ تبادلہ خیال ہے، اور میں ہنسنا نہیں چاہتی۔''

''آپ کو غور تو کرنا چاہئے۔ نفسانی خواہش تو فطری ہے۔ جسمانی تقاضے تو آدمی کو اللہ نے سونپے ہیں اور یہ بھی طے ہے کہ مردوں میں یہ خواہش فطری طور پر عورتوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنسی بے راہ روی میں مرد زیادہ آسانی سے، اور کثرت سے مبتلا ہوتے ہیں۔''

''تو اللہ نے اس کا علاج بھی تو عطا فرمایا ہے۔'' نادرہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ میں بھی یہی کہنے والا تھا۔ نکاح اللہ کا تحفہ ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اہم ترین سنتوں میں سے ہے۔ تو جس معاشرے میں بھی نکاح کو مشکل بنا دیا جائے گا وہاں بدکاری اور گناہ بڑھ جائیں گے۔ معاشرے کی فلاح اور بہتری نکاح کے فروغ میں ہے اور یہ اسلامی معاشرے میں ہی ممکن ہے۔''

''تو آپ کے خیال میں یہ اسلامی معاشرہ نہیں ہے؟''

''یہ مسلمانوں کا معاشرہ تو ہے، لیکن اسلامی نہیں ہے۔ ہندوؤں کی معاشرت کا اثر ہم پر غالب ہے۔ اسلام سادگی کے ذریعے آسانیوں کا راستہ دکھاتا ہے۔ جبکہ ہم نے شادی کو رسومات کا مجموعہ بنا کر مہنگا اور دشوار بنا دیا ہے۔ اب سوچو، کوئی شخص تیس سال کا ہو جائے، اور اس کی شادی نہ ہو سکے تو وہ کیا کرے گا۔ اس بازار کا رخ کرے گا تو مجبوری تو ہوئی نا۔ اب یہاں آئے گا تو گناہگار ہوگا، اور گناہ کا عادی ہوتا جائے گا۔ نتیجہ یہ کہ شادی کی امنگ ہی کھو بیٹھے گا۔''

نادرہ کو قرآن کی آیت یاد آ گئی۔ پڑھنے کا فائدہ تو ہوتا ہے نا، اس نے کہا۔

''اللہ نے ایسے لوگوں کو نفس پر قابو رکھنے کے لئے روزہ رکھنے اور نماز پڑھنے کی تلقین کی ہے۔''

''درست..... لیکن قرآن پڑھتے کتنے لوگ ہیں اور جو پڑھتے ہیں وہ بھی سمجھنے کے لئے نہیں پڑھتے۔ میں نے کہا نا کہ یہ مسلمانوں کا معاشرہ ہے۔ اسلامی معاشرہ نہیں ہے۔ جو شخص فرض روزہ نہیں رکھتا، وہ نفس کو زیر کرنے کی نیت سے نفلی روزہ رکھے گا بھلا؟ آج سات سال ہو رہے ہیں پاکستان کے قیام کو۔ ماہِ رمضان میں تمام ہوٹل اور ریسٹورنٹ کھلے ہوتے ہیں، بس ایک بھاری پردہ ڈالنے کا تکلف کر دیا جاتا ہے اور اندر اتنے لوگ ہوتے ہیں کہ گیارہ مہینوں میں اتنا رش نہیں ہوتا۔ یعنی لوگوں کو اس بنیادی تصور کی بھی پرواہ نہیں کہ اللہ سب کچھ دیکھتا، سنتا اور جانتا ہے اور ہوٹلوں اور ریستورانوں کے رش کے مقابلے میں مسجدوں کو دیکھو تو رونا آ جاتا ہے۔''

نادرہ کو تو یہ سب معلوم ہی نہیں تھا۔

''کیا واقعی ایسا ہی ہوتا ہے رمضان میں؟''

''اب کے باہر نکل کر خود ہی دیکھ لینا۔ پردے ڈال کر سمجھتے ہیں کہ اللہ سے چھپ گئے۔''

''خیر..... چھوڑیں اس بات کو، اپنی کہیں۔ آپ کی کیا مجبوری ہے۔ آپ تو بڑے افسر ہیں۔ صاحب حیثیت ہیں۔ آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟''

''آپ میری بات توجہ سے نہیں سن رہی ہیں۔'' عارف نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟''

''میں نے کہا تھا کہ میں یہاں ہوں تو اپنی عورت کی وجہ سے اور وہ عورت میری بیوی ہے۔''

''یہ تو عجیب بات کہہ رہے ہیں آپ؟''

دیر تک عارف تفصیل بتاتا رہا اور وہ سنتی رہی۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے دُنیا کی کچھ خبر ہی نہیں تھی۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں دُنیا میں...... ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں۔

وہ سنتی اور سوچتی رہی۔ عارف کی بیوی کیسی ناشکر گزار عورت ہوگی اور عارف نے سچ کہا، پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ دُنیا میں کچھ بھی یکطرفہ نہیں۔ یہ کہنا کہ کوٹھوں کو آراستہ بھی مرد ہی کرتے ہیں اور آباد بھی وہی رکھتے ہیں، غلط ہے، یہ کام تو دونوں مل کر کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ مرد صنف قوی ہونے کی حیثیت سے زیادہ ذمہ داری ہیں۔ لیکن صنف نازک کو بھی بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ استعیالی معاشرے میں دو ہی طبقے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو استعمال کرتے ہیں، دوسرے وہ جن کا استعمال ہوتا ہے اور اس میں جنس کی کوئی تفریق نہیں۔ عورتیں بھی مردوں کا استعمال کرتی ہیں، نسبت میں فرق ہوتا ہے۔ مگر بہرحال معاملہ دوطرفہ۔

سب کچھ سننے کے بعد اس نے کہا۔

''تب بھی آپ کے پاس گناہ کے لئے جواز نہیں۔ آپ دوسری شادی کر سکتے ہیں۔''

''وہی تو میں کرنا چاہتا ہوں۔ مگر آپ انکار کر رہی ہیں۔''

''دُنیا میں عورتوں کی کمی تو نہیں۔'' نادرہ نے سادگی سے کہا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ! لیکن ایک مشاہدہ ہے میرا، زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ آدمی کو دوسری بیوی بھی پہلی بیوی جیسی ہی ملتی ہے۔ میں اس بات سے بہت گھبراتا ہوں کہ میرے ساتھ ایسا ہو۔ اس کے بعد تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔''

نادرہ کو ہنسی آ گئی۔

''یہ تو مفروضہ ہے آپ کا۔ مزدوری تو نہیں کہ ایسا ہی ہو۔''

''یہ بھی ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ! لیکن ہر آدمی کے ساتھ کچھ کمپلیکس بھی ہوتے ہیں۔''

''آپ کا مسئلہ کیا ہے آخر؟''

''میں محبت کا قائل ہوں۔ یہی ایک جذبہ ہے جو دو متضاد شخصیتوں کے درمیان بھی مطابقت پیدا کر دیتا ہے۔'' عارف نے گہری سانس لے کر کہا۔

''اب میری شادی کو ہی لیجئے۔ میں نے اپنی بیوی کو پہلے دیکھا بھی نہیں تھا، والدین نے اسے پسند کیا اور شادی کر دی۔''

''لیکن اسلام تو لڑکے اور لڑکی کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھیں، ناپسندیدگی ہو تو شادی نہ کریں۔ اسلام میں تو اس پر بھی زور دیا گیا ہے کہ دونوں کا جوڑا اچھا ہو اور اگر دونوں ایک دوسرے کو پسند کر لیں تو پھر جوڑا کا مسئلہ ہی نہیں رہتا۔''

''اب میں پھر وہی بات کہوں گا کہ یہ مسلمانوں کا معاشرہ ہے، اسلامی معاشرہ نہیں۔'' عارف نے بڑے جوش سے کہا۔

''ہمارے ہاں انکار کیا جائے تو لڑکا نافرمان کہلاتا ہے اور لڑکی کا انکار تو برداشت ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اسے تو آوارہ اور بدچلن سمجھ لیا جاتا ہے۔ پھر ایسی ہی لڑکیاں تو گھر سے بھاگتی ہیں۔ اس کے بعد ان کا جو حشر ہو، اس کا ذمہ دار کون ہوگا اور دوسری شادی کی بات سنیں۔ شادی کا تو اعلان کیا جاتا ہے نا، کیونکہ مستحسن عمل ہے، اسلام کا ایک اہم ادارہ ہے۔ میں دوسری شادی کا نام بھی لوں تو میری بیوی قیامت کھڑی کر دے گی اور پورا معاشرہ میرے خلاف ہو جائے گا۔ مجھے ظالم اور عیاش قرار دے گا۔''

''حالانکہ آپ کی بیوی کو دوسری شادی کی اجازت دے دینی چاہئے آپ کو......''

''اب خود کو ہی دیکھیں آپ! یہ کیسی غیر اسلامی بات کی ہے آپ نے۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''اسلام نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت دیتے ہوئے صرف حیثیت اور عدل کا مطالبہ کیا ہے۔ یہ کہیں نہیں ہے کہ اسے بیوی سے اجازت لینا ہوگی۔

بیشتر عورتیں اس بات پر دین تک کے خلاف ہو جاتی ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتیں کہ یہ اجازت کیوں دی گئی؟''

''یہ بات تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔''

''حالانکہ سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ تو ایمان کا معاملہ ہے۔ اللہ نے جس چیز سے منع کیا، اس سے سوچے سمجھے بغیر بچو، اور جس کی اجازت دی، اسے بے سوچے سمجھے قبول کرو۔ یہی ایمان ہے۔ اللہ نے کہا، اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی نہ کرو، جو میرے احکام سے متصادم ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ خلوص سے غور کرو تو اللہ کے ہر حکم میں ہر لمحے بے شمار حکمتیں سامنے آتی ہیں۔ خواہش نفس کا اسیر تو اندھا ہوتا ہے۔''

''ذرا چار شادیوں کے بارے میں بتائیں۔ اس کی حکمتوں پر غور کیا آپ نے؟''

''جی ہاں! پوری طرح تو کوئی کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن غور کرنے پر کچھ کچھ میری سمجھ میں آتا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ نکاح ایک بہت عام گناہِ کبیرہ یعنی بدکاری کا راستہ روکتا ہے۔''

''یہ کام تو ایک شادی سے بھی ہو جاتا ہے۔'' نادرہ نے جلدی سے کہا۔

''بعض لوگوں کے لئے نہیں ہوتا ہوگا نا، اسی لئے تو اللہ نے چار شادیوں کی اجازت دی۔ وہ پیدا کرنے والا ہی تو انسان کو پوری طرح جانتا ہے۔ کچھ غور کرو تو بات سمجھ میں بھی آتی ہے۔ بہت سے مردوں میں نفسانی خواہش بہت شدید ہوتی ہے۔ ایک بیوی اس کی ضرورت پوری نہیں کر پاتی۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ اس کی بیوی طبعاً سرد مزاج ہو۔ تو اس صورت میں دوسری شادی ضروری ہوئی نا۔ ایسے لوگوں سے تو ایام کا عرصہ بھی نہیں گزارا جاتا۔ یہ سب مسائل تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں سامنے آ گئے تھے۔ قرآن میں تاکید کی گئی کہ اس مخصوص صورت حال میں لوگ اپنی بیویوں کے قریب بھی نہ جائیں۔ مگر ایسا ہوتا تھا۔ اس لئے سختی سے حکم دیا گیا۔ پھر مرد تنوع پسند بھی ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے، اس لئے بھی مرد کو چار شادیوں کی

اجازت دی گئی۔''

نادرہ کو اس کی معلومات پر حیرت ہو رہی تھی۔

''آپ اتنا کچھ کیسے جانتے ہیں؟''

''اللہ کے احکامات سے بے خبری اور قرآن سے دوری سے مجھے خوف آتا ہے، اس لئے قرآن کو سمجھنے کے لئے پڑھتا ہوں اور اللہ نے قرآن اسی لئے نازل فرمایا ہے کہ آدمی پڑھے اور روشنی حاصل کرے، نہ یہ کہ چومے، آنکھوں سے لگائے اور طاق پر رکھ کر بھول جائے۔''

''مجھے یہ بتائیے کہ یہ مجبوریاں تو عورت کے ساتھ بھی ہو سکتی ہیں تو عورت کو ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت کیوں نہیں دی گئی؟'' نادرہ نے اعتراض کیا۔

''دیکھیں نادرہ! میں بہت گنہگار بندہ ہوں۔ لیکن ایک بات سمجھتا ہوں۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔ اس لئے اللہ کا حکم ماننا بنیادی بات ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اللہ نے جو حکم دیا، اس میں ہماری فلاح ہے، بہتری ہے۔ خواہ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اسی میں عافیت ہے۔ اللہ پیدا کرنے والا ہے، ہمیں جانتا ہے۔ اس نے ہمیں آسانیاں عطا فرمائی ہیں۔ عورتوں کے لئے اس نے یہ حکم نہیں دیا تو یقیناً اس کی ضرورت نہیں ہوگی۔ بلکہ وہ غیر ضروری اور الٹا ضرر رساں ہوگا۔ اللہ کے حکم میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہوتی۔ سو بہتر یہ ہے کہ پہلے حکم مانو، اس پر عمل کرو اور اس پر غور کرتے رہو۔ سو میں یہی کرتا ہوں۔ میرا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ مرد محبت بار بار کرتا ہے، جبکہ عورت محبت صرف ایک بار کرتی ہے۔ یہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت ہے۔ عورت میں صبر ہوتا ہے، مرد میں نہیں ہوتا۔ عورت کی فطرت میں تنوع بھی نہیں۔ سو ہمیں تخلیق کرنے والے نے ہماری فطرت کے مطابق قوانین بنائے۔

''اور ایک بات، عورت کو ایک وقت میں ایک سے زیادہ شادی کی اجازت دی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ اب ذرا دیر کے لئے یہ تصور کریں تو آپ کو چکر آ جائیں گے۔ دیکھیں نا، عورت تو اپنے شوہر کے نطفے کی، اس کی نسلوں کی امین

ہوتی ہے۔ اس کے کئی شوہر ہوتے تو کتنا اُلجھاؤ ہوتا۔ سب کچھ مشتبہ ہو رہ جاتا۔ معاشروں میں رشتوں کی حرمت سے جو پاکیزگی قائم ہے، وہ تباہ ہو جاتی۔ انسانوں اور جانوروں میں کیا فرق رہ جاتا۔ نہیں نادرہ! اللہ نے یہ دُنیا حق کے ساتھ بنائی ہے۔ توازن کے ساتھ نظام قائم فرمایا ہے۔ اس کا ہر قانون اٹل اور نافع ہے۔ جب اس کی خلاف ورزی کی جائے گی تو انسان ذلیل ہوگا۔ نہ صرف ذلیل ہوگا بلکہ مٹ جائے گا۔ اس کی حکمت سچی ہے۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے، مان لو۔ اس میں عافیت ہے اور پھر دیکھو، جہاں بھی تہذیب اور تمدن موجود ہے وہاں مذہب کوئی بھی ہو، یہ قانون وہاں تسلیم کیا جاتا ہے، بلکہ بے دین معاشرے میں بھی اس پر عمل ہوتا ہے۔

''اب دوسرے پہلو سے بھی دیکھو۔ جہاں عورت میں خواہش زیادہ ہو اور مرد میں کم، تو اس کا حل بھی ہے۔ طلاق مستحسن نہیں۔ لیکن اللہ کہتا ہے کہ تم دیکھو کہ اللہ کی حدود قائم نہیں رکھ سکو گے تو احسن طریقے سے علیحدہ ہو جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ عورت صبر کرے تو اللہ کے ہاں اس کا بہت بڑا اجر ہے۔ لیکن بدکاری کا راستہ یہاں بھی روک دیا گیا۔ خلع کا راستہ کھول کر۔ بلکہ مرد یہ بات محسوس کرے تو وہ خود ہی خوش دلی سے طلاق دے دے۔ اللہ نے جس چیز کو منع فرمایا ہے تو اس کے لئے عذر کہیں نہیں چھوڑا۔ اور کہیں عذر ہے تو اس کی مشروط اجازت دے دی۔ جیسے بھوک سے مرتے ہوئے آدمی کے لئے مردار کو بھی حلال کر دیا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ نہ کھائے اور باطن میں نافرمانی نہ ہو۔ بلکہ اقرار ہو۔''

نادرہ اب اسے احترام آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بلا شبہ ہر اعتبار سے ایک پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ ظاہری طور پر تو وہ خوب رو تھا ہی، لیکن اس کی شخصیت میں باطنی رچاؤ بھی تھا۔ بس ایک پہلو کمزور تھا، اور وہ اس کی شخصیت سے میل نہیں کھاتا تھا۔ اس نے اسے کریدنے کا فیصلہ کر لیا۔

''آپ کی ہر بات سچی ہے۔'' اس نے کہا۔

''آپ نے ٹھیک کہا۔ اللہ نے جس چیز کو منع فرمایا، اس کے لئے عذر

نہیں چھوڑا۔ اس کا بہترین متبادل بھی عطا فرما دیا۔ تو پھر آپ جو خود کو خراب کرتے ہیں، اس کا کیا عذر ہے آپ کے پاس۔ اور جو گناہ جان بوجھ کر کیا جائے، وہ تو بغاوت کے زمرے میں آتا ہے۔''

عارف یوں سمٹا جیسے نادرہ نے اسے کوڑا مار دیا ہو۔ وہ جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ یہی احساس تو مجھے سب سے زیادہ مارتا ہے۔ ہر بار میں توبہ کرتا ہوں۔ لیکن ہار جاتا ہوں۔''

''دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے آپ؟''

''ہمارے معاشرے میں یہ سوچنا اور کہنا ہی آسان ہے کرنا بہت مشکل ہے۔'' عارف نے گہری سانس لے کر کہا۔

''کسی اچھے گھرانے میں، ایک بیوی کے ہوتے ہوئے، کوئی شادی کا پیغام دے تو منہ توڑ جواب ملنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے، ویسے ایک تجربے کے بعد آدمی کی ہمت ہی نہیں ہوتی، دوسری کوشش کی۔ لوگ برا سمجھتے ہیں دوسری شادی کرنے والے کو، عیاش سمجھتے ہیں۔''

''کوئی بیوہ، کوئی مطلقہ......؟''

''میں نے کہا نا کہ یہ آسان نہیں۔ میرے پاس وقت نہیں، اور میرا رشتہ لے کر جانے والا کوئی ہے نہیں، اسی لئے تو......''

نادرہ نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔ جانتی تھی کہ وہ کیا کہے گا۔ ''ممن نے بتایا تھا کہ آپ شراب بھی پیتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''جب آپ حرام و حلال کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں تو پھر یہ کیوں؟ اس کا تو آپ کے پاس برائے نام بھی عذر نہیں ہے۔''

عارف کا انداز اب پوری طرح مدافعانہ ہوگیا تھا۔

''یہی تو [illegible] ہے۔ آدمی ایک برائی سے نہ بچ پائے تو ایک کے بعد ایک برائی میں مبتلا ہوتا جاتا ہے۔ بڑھتا جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ میں بنیادی طور پر اپنے گھر میں خوش رہنے والا آدمی ہوں۔ گھر میرے لئے جنت ہے۔ بدقسمتی سے وہ میرے لئے جہنم بنا دیا گیا ہے اور میں ایسا آدمی بھی

نہیں تھا کہ اپنے طور پر اپنی فطری ضرورت کے لئے سامانِ تسکین تلاش کر پاتا۔ سو کچھ ساتھی افسران سے ضرورت کا تعلق استوار کرنا پڑا۔ جو میری ضرورت تھی، وہ ان کا شوق تھا۔ ان کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ہوا تو پینے پلانے کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے گھر کا سکون حاصل ہو جائے تو یہ سب کچھ انشاء اللہ بڑی آسانی سے چھوٹ جائے گا۔''

''اور اگر یہ نہ ہوا تو آپ اس غلط راستے پر بڑھتے ہی جائیں گے۔'' نادرہ نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

عارف نے کندھے جھٹک دیئے۔

''اپنی بے بسی اور گناہوں کے باوجود میں اللہ سے بہتری کی اُمید رکھتا ہوں۔''

''مگر خود کچھ نہیں کر سکتے۔'' نادرہ کے لہجے کی کاٹ بڑھ گئی۔

''کر تو رہا ہوں۔'' عارف نے بے حد معصومیت سے کہا۔

''بس آپ مان جایئے۔''

نادرہ نے سمجھ لیا کہ اب پہلو بچانا ممکن نہیں۔

''یہ بتایئے کہ میں ہی کیوں؟''

عارف مسکرایا۔

''وجہ تو میں بتا چکا ہوں۔ میں آپ کو بہت پہلے سے پسند کرتا ہوں مگر اب تو مجھے آپ سے محبت ہے۔''

نادرہ کے لئے اب اپنے تجسس پر قابو رکھنا ممکن نہیں تھا۔

''آپ مجھے بہت پہلے سے پسند کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ بہت پہلے سے مجھے جانتے ہیں۔ جبکہ مجھے یاد نہیں آتا کہ میں آپ سے کبھی ملی ہوں یا آپ کو کہیں دیکھا ہو۔''

''عام لوگ ایک ملاقات میں دل پر نقش نہیں ہوتے۔ کوئی گہرا اثر نہیں چھوڑتے نا۔ تو میں تو عام سا آدمی ہوں۔ آپ کو کیسے یاد رہ سکتا تھا؟''

نادرہ اس بات کی تردید کرنا چاہتی تھی کہ وہ کوئی عام آدمی ہے۔ وہ تو

ایسا آدمی تھا کہ جسے کبھی بھلایا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن اس نے بروقت خود کو روک لیا۔ اس وقت یہ اظہارِ حقیقت بری طرح گلے پڑ سکتا تھا۔

عارف اس کی کیفیت سے بے خبر اپنی کہے جا رہا تھا۔

''اور خاص لوگ تو ایک لمحے میں بھی دل پر اَن مِٹ نقش چھوڑتے ہیں۔ جیسے آپ ہیں۔ میں نے ایک بار آپ کو دیکھا، اور ہمیشہ آپ کو یاد رکھا...... اور وہ بھی بے حد پسندیدگی کے ساتھ۔ میں کبھی بھولا نہیں آپ کو۔''

''اور دوبارہ کبھی ملنے کی کوشش بھی نہیں کی۔'' نادرہ کے لہجے میں تجسس تھا۔

''جی نہیں!''

''یہ تو عجیب پسندیدگی ہوئی۔'' نادرہ نے اعتراض کیا۔

''دوبارہ کیوں نہیں ملنا چاہا آپ نے؟''

''ایک تجربہ کافی تھا۔ اسی میں سارے زخم ہرے ہوگئے۔ دوسرے تجربے کی ہمت کیسے کرتا؟''

عجیب معمہ تھا۔ بات سمجھ میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سوال پر سوال کرنے پر مجبور تھی۔ نادرہ اندر ہی اندر جھنجلا رہی تھی۔

''آپ کے اس جملے سے پسندیدگی تو نہیں، البتہ شکایت جھلک رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''بخدا! یہ شکایت نہیں، ستائش ہے۔'' عارف نے تڑپ کر کہا۔

''ورنہ پسندیدگی کہاں سے آتی؟''

''وضاحت کریں۔ کیونکہ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔''

''دیکھیں، اپنے گھر میں، اپنی بیوی سے محرومی کے جو زخم مجھے ملتے ہیں، ان پر مرہم رکھنے کے لئے میں ان گلی کوچوں کی خاک چھانتا ہوں۔ ایک رات میں یہاں، اس کوٹھے پر آیا تھا۔ عام تماش بین کی حیثیت سے نہیں، خاص مہمان کی حیثیت سے، اور میں آپ سے ملا۔ آپ مجھے بہت اچھی لگیں۔ لیکن آپ نے مجھے نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ میں نے وہی کیا، جو ہمیشہ کرتا ہوں۔ میں نے

آپ کا ہاتھ تھاما، اسے چوما۔ لیکن وہ برف کی طرح سرد رہا۔ ایسے میں میں فوراً پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔ لیکن آپ مجھے کچھ زیادہ ہی اچھی لگی تھیں۔ میں باتوں کے ذریعے، ہاتھ سہلا کر آپ میں کسی جذبے کی حرارت پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن ناکام رہا۔ میں نے آپ سے آپ کا نام پوچھا تو آپ نے کہا۔ آپ کو نام سے مطلب؟ اپنا مطلب پورا کیجئے اور چلتے بنئے۔ بس پھر میں یہاں سے چلا گیا۔ اس کے بعد کل یہاں آیا تھا پہلی بار۔ اب آپ مجھے کیسے پہچان سکتی ہیں؟ آپ نے تو مجھے دیکھا ہی نہیں تھا۔''

مگر نادرہ کو یاد آ گیا تھا۔ صورت تو اس نے واقعی نہیں دیکھی تھی اس کی۔ لیکن ایسے گاہک کو کون بھول سکتا تھا، جو سرد مہری کے جواب میں جبراً پامال کرنے کی بجائے نامراد ہی چلا گیا تھا۔ کچھ دن تو وہ اسے یاد رہا تھا، مگر اس کے پاس زیادہ دن کسی گاہک کو یاد رکھنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

''زخم ہرے کرنے والے کو اتنی پسندیدگی کے ساتھ اتنی مدت تک یاد کیسے رکھا جا سکتا ہے؟'' اس نے پھر سوال کیا۔

''آپ کا طرزِ عمل میرے لئے غیر معمولی تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ آپ تقدیر کے جبر کا شکار ہوئی ہیں۔ اس بازار میں ایسی بے شمار عورتیں ہوں گی۔ لیکن سب سمجھوتا کر لیتی ہیں۔ مگر آپ یہاں بیٹھ کر بھی، مجبور ہو کر بھی اپنی روح کا سودا کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ آپ اپنی عزتِ نفس اور آبرو کی حفاظت کر رہی تھیں۔ میں اس یقین کے ساتھ یہاں سے رُخصت ہوا تھا کہ میں نے زندگی میں آپ سے زیادہ عزت دار، پاکیزہ اور باحیا عورت نہیں دیکھی۔''

نادرہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''اور اب مجھ سے محبت کیسے ہو گئی آپ کو؟''

''سمن نے بتایا کہ اس کا تعلق اس کوٹھے سے ہے تو مجھے قدرتی طور پر آپ کا خیال آیا۔ پوچھا تو آپ کی بیماری کا پتا چلا۔ میں سمجھ گیا کہ اس طرح آپ خود کو بچا رہی ہیں۔ یہ بتا دوں کہ آپ کو پسندیدگی کے ساتھ یاد رکھتے ہوئے میں نے ہمیشہ سوچا تھا کہ بالآخر آپ کی مزاحمت بھی دم توڑ گئی ہو گی۔ لیکن سمن کی

زبانی یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ بس اسی لمحے مجھے آپ سے محبت ہو گئی۔ میرا خیال ہے، محبت تو مجھے آپ سے پہلی نظر میں ہو گئی تھی۔ اس کا ادراک اس دن سمن سے ملنے کے بعد ہوا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ آپ سے مل کر بات ضرور کروں گا۔''

اس کی سچائی میں نادرہ کو کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ ایسے ہی کسی آدمی کے خواب تو دیکھتی رہی تھی کوٹھے پر۔ اور وہ آیا تو اس وقت جب وہ اپنے ہاتھ خود کاٹ چکی تھی۔ کاش وہ پہلے آ گیا ہوتا۔ نیلم بائی کی زندگی میں۔

عارف کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو وہ محبت اور عزت دوں گا، جس کی آپ کو آرزو رہی ہے۔'' عارف کہہ رہا تھا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ مل گئیں تو شراب بھی چھوڑ دوں گا۔ میں صرف گھر کا ہو جاؤں گا۔ یہ گندگی تو مجھ پر مسلط کر دی گئی ہے۔ میں ایسا ہوں نہیں، بس آپ مجھ سے شادی کر لیں۔''

نادرہ تڑپ گئی۔ عزت کی زندگی اور محبت اس کی چوکھٹ پر ہاتھ پھیلائے قبولیت کا سوال کر رہی تھی۔ یہ وہ کچھ تھا، جو وہ چاہتی تھی، لیکن جانتی تھی کہ ملے گا نہیں۔ مگر آج وہ سب ممکن ہو گیا تھا۔ یہ الگ بات کہ اب وہ اسے قبول نہیں کر سکتی تھی۔

''مجھے افسوس ہے عارف صاحب! لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔'' اس نے آزردہ لہجے میں کہا۔

''نہ سہی..... آپ مجھے اس حد تک تو قبول کر لیں کہ مجھے اپنی مجبوری میں شریک کر لیں۔ میں اسی میں خوش ہو جاؤں گا۔'' عارف کے لہجے میں التجا تھی۔

''وہ کوئی بہت ذاتی بات ہے۔ میں آپ کو نہیں بتانا چاہتی۔''

جواب میں عارف نے جو کیا، وہ اس کے لئے اس قدر غیر متوقع تھا کہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکی۔ وہ اپنے صوفے سے اُٹھا اور اس کے سامنے آ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اس کا ہاتھ تھاما اور سرگوشی میں بولا۔

"آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتا ہوں۔"

مردوں کے فریب اور نفرت انگیز لمس کی ڈسی ہوئی نادرہ کے لئے وہ بے حد انوکھا، خوش گوار اور پہلا تجربہ تھا۔ اس سے پہلے کسی نے محبت سے اسے نہیں چھوا تھا۔ اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس سنسنی میں لذت اور سرشاری بھی تھی۔ وہ شل ہو کر رہ گئی۔ دماغ بھی کچھ سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ اس کا جسم دہک اُٹھا ہے۔ وہ تو خواب جیسی کسی کیفیت میں تھی۔

عارف نے اس کا ہاتھ اُٹھایا اور اس پر ایک طویل بوسہ دیا۔ پھر وہ دوبارہ اپنی جگہ جا بیٹھا۔

نادرہ کو سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔ پھر وہ سنبھلی تو اس نے ذرا خفگی سے کہا۔

"آپ نے ایسا کیوں کیا عارف!"

"یہ ضروری تھا۔ اس سے مجھے وہ معلوم ہو گیا، جو آپ اپنی زبان سے کبھی نہ کہتیں۔"

نادرہ کا دل ایسے دھڑکا کہ پہلے کبھی نہیں دھڑکا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ پر اب بھی عارف کے ہونٹوں کے لمس کا گداز محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ کو دیکھا، جیسے وہاں کوئی نشان نظر آئے گا۔

"کیا معلوم ہو گیا آپ کو؟" اس نے لرزیدہ آواز میں پوچھا۔

"یہ کہ اتنی دیر میں آپ کو بھی مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔"

وہ ایسی سچائی تھی کہ وہ اس کی تردید کی ہمت بھی نہیں کر سکی۔

"مگر میں اب بھی یہی کہوں گی کہ میں مجبور ہوں۔"

"آپ کے دل میں میرے لئے جگہ بھی ہے، اور آپ کو اس جہنم سے نکلنے کا موقع بھی مل رہا ہے۔ آپ اسے گنواتی ہیں تو یقیناً وہ کوئی بڑی مجبوری ہو گی۔ میں وہ مجبوری جاننا چاہتا ہوں۔ شاید اس کا کوئی حل ہم مل کر تلاش کر سکیں۔"

"اس کا کوئی حل ہے ہی نہیں۔"

"آپ بتائیں تو......"

نادرہ نے گہری سانس لی۔

"ٹھیک ہے۔ آپ بھی سن لیں۔" اس نے کہا اور عارف کو نیلم بائی سے اپنے عہد کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

عارف کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ کچھ کہنے کو بے تاب ہے۔ لیکن بہرحال اس نے مداخلت نہیں کی۔ البتہ نادرہ کے خاموش ہوتے ہی اس نے بے ساختہ کہا۔

"یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، قسموں سے نکلنے کے لئے کفارہ ہے۔ ہم وہ ادا کر سکتے ہیں۔"

"وہ قسم نہیں تھی عارف! ایک مرتی ہوئی عورت سے کیا گیا عہد تھا۔ جو میں نے بہت سوچ سمجھ کر اور اللہ کو گواہ بنا کر کیا تھا۔"

"ایسے عہد کی کیا اہمیت ہے، جو ایک عورت کو اس جہنم سے نہ نکلنے پر پابند کرتا ہو؟" عارف نے بہت جوش سے کہا۔

"اس عہد کی تو پاسداری بھی میرے خیال میں گناہ ہے۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتی۔ میرے لئے تو وہ اللہ کا کرم اور بائی مرحومہ کا احسان تھا۔" نادرہ نے تیز لہجے میں کہا۔

"بائی نے مجھ سے دوٹوک بات کی تھی۔ میں وہ عہد نہ کرتی تو وہ کوٹھا کسی بائی کو بیچ دیتی۔ پھر میرا کیا بنتا؟ میں پہلے سے بڑی خرابی میں ہوتی۔ اسی لئے میں نے اللہ کو گواہ بنا کر وہ وعدہ کیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ تب سے اب تک میں اسی جہنم میں رہتے ہوئے بھی گناہ سے محفوظ ہوں۔ بلکہ یوں کہیں کہ اللہ نے آگ کے اس الاؤ کو میرے لئے گلزار بنا دیا۔ اب جبکہ بائی زندہ بھی نہیں تو میں اسی سے کیا ہوا عہد کیسے توڑ سکتی ہوں۔ یہ تو بہت بڑا ناشکرا پن ہو گا۔"

"ہم اس پر فتویٰ لے سکتے ہیں۔" عارف نے تجویز پیش کی۔

"نہیں عارف! یہ معاملہ اپنے ضمیر کا ہے۔ یہ تو میں جانتی ہوں نا کہ جس چیز سے بچنے کے لئے میں حرام موت کو گلے لگانے کے لئے تیار تھی، اللہ

نے مجھے کوٹھے پر رہتے ہوئے بھی اس سے بچا لیا۔''

''تم خودکشی کا سوچتی تھیں؟'' عارف کو جیسے شاک لگا۔

''صرف سوچتی نہیں تھی، کر بھی لیتی، مگر وہاں بھی مجبور تھی۔ میرے لئے یہ پاکستان نہیں، جبرستان ہے۔ یہاں مجھے ذِلت اور مجبوری کے سوا کچھ بھی نہیں ملا۔'' نادرہ کی آواز بھرا گئی۔

''پھر اللہ نے میرے لئے راستہ نکال دیا۔ اب میں بدعہدی کیسے کر سکتی ہوں؟''

عارف کا تجسس بھڑک اُٹھا تھا۔

''مجبوری کیا تھی تمہاری؟''

نادرہ ایک دم چوکنا ہوگئی۔ وہ یہ بات کبھی نہیں بھولتی تھی کہ اپنی مجبوری کے ساتھ وہ بہرحال ایک کوٹھے پر ہے۔ بلکہ اب تو بارہ تیرہ سال کی ارجمند کو دیکھ کر اسے خوف آتا تھا۔ لڑکیاں تو ایک دم سے بڑی ہو جاتی ہیں۔ اب وہ ارجمند کو عارف کے بارے میں بتائے یا......

''آپ نے جواب نہیں دیا۔''

عارف نے اسے چونکا دیا۔ اس نے نظر اٹھا کر عارف کو دیکھا۔ کالج میں ٹھاکر اوتار سنگھ کو اس نے دیکھا اور پسند کیا تھا۔ لیکن محبت کا خیال دل میں نہیں آیا۔ کیونکہ وہ ہندو تھا۔ مسلمان ہوتا تو وہ اس سے محبت کئے بغیر نہ رہتی۔ مگر عارف نے اتنی سی دیر میں ایک ملاقات میں اس کا دل جیت لیا تھا۔ اس کے باوجود یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اسے بتائے یا نہ بتائے۔

پھر اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ کیا پتا، یہ بھی اللہ کی رحمت ہو۔ اللہ اس کے لئے راستہ بنا رہا ہو۔ اس میں ارجمند کی بہتری ہو۔ ورنہ طوائف کے کوٹھے پر شادی کا باعزت پیغام کہاں آتا ہے۔ بالآخر دل نے فیصلہ کیا کہ اسے بتا دینا چاہئے۔

''ہمارے کنبے میں کوئی بھی نہیں بچا۔ سب ٹرین میں شہید کر دیئے گئے۔ سوائے میرے اور میری چھ سالہ بھتیجی ارجمند کے۔ سو ارجمند میری مجبوری

ہے۔ میں اسے اس زندگی سے بچانا چاہتی ہوں۔ اس نے مجھے زندہ رہنے پر مجبور کر دیا۔ ورنہ جان دینا میرے لئے کچھ مشکل نہیں تھا۔''

عارف مضطرب ہوگیا۔

''وہ...... وہ تو اب تیرہ سال کی ہوگی۔ یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔''

''ہاں......! اور اس کی اٹھان بہت اچھی ہے۔ تیزی سے بڑی ہو رہی ہے وہ۔''

''اور اس کے باوجود تم اپنے عہد کو لئے بیٹھی ہو۔'' عارف نے تیز لہجے میں کہا۔

''ایک مری ہوئی عورت سے کیا ہوا عہد ہے، جس پر میں نے اللہ کو گواہ بنایا تھا۔'' نادرہ نے رسان سے کہا۔

''اس عہد کو بھول جاؤ اور مجھ سے شادی کر لو۔ میری خاطر نہیں، اپنی خاطر نہیں، اس بچی کی خاطر کر لو۔ یہ ضروری ہے۔ میں اسے تحفظ، عزت اور اچھا مستقبل، سب کچھ دے سکتا ہوں۔''

''مگر میں یہ نہیں چاہتی۔''

''تو پھر تم چاہتی کیا ہو؟'' عارف جھنجلا گیا۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ بہت دیر سے وہ نادرہ کو تم کہہ کر مخاطب کر رہا ہے۔

''میں نہیں چاہتی کہ وہ میرے ساتھ رہے۔ میں داغ دار ہوں۔ میرا ایک ماضی ہے، جو میرا پیچھا کبھی نہیں چھوڑے گا۔ کہیں بھی، کوئی بھی مجھے پہچان لے گا۔ نہیں عارف! میں اسے اپنے سائے سے بھی دُور رکھنا چاہتی ہوں۔''

''عجیب منطق ہے تمہاری۔ تم گھر میں رہو گی۔ باہر نکلو گی نہیں تو کون پہچانے گا تمہیں؟''

''باہر نکلنے کی ضرورت تو کبھی بھی پڑ سکتی ہے۔ طوائف کے لئے دُنیا بہت چھوٹی ہوتی ہے عارف!''

''پلیز! تم اپنے لئے یہ الفاظ استعمال نہ کیا کرو۔''

نادرہ نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

''اور ارجمند کا رشتہ آیا، اور ان لوگوں نے مجھے پہچان لیا تو......''

''اتنے دور کے اندیشے پالتی ہو تم؟''

''عقل میری کام نہیں کرتی عارف! اور میں دل کے کہنے پر چلتی ہوں۔''

''اچھا! یہ تو بتا دو کہ اس کے لئے کیا سوچا ہے تم؟'' عارف کے لہجے میں اب بے بسی تھی۔

''میں ہر لمحے اللہ سے دعا کرتی ہوں اس کے لئے، اور مجھے یقین ہے کہ کوئی ایسا آدمی اللہ بھیجے گا، جس کے سپرد ارجمند کو کر کے میں مطمئن ہو جاؤں گی۔''

''اور اس کے بعد؟''

''جب تک اللہ زندہ رکھے گا میں یہیں رہوں گی۔ کیونکہ نیلم بائی نے مجھ سے خودکشی نہ کرنے کا بھی عہد لیا تھا۔''

''پھر وہی بات......جہنم سے نکلنے کا ایک اچھی زندگی گزارنے کا یہ موقع بھی تو تمہیں اللہ نے دیا ہے۔ اس سے منہ موڑنا بھی تو ناشکری ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ کفارہ ادا کر کے تم اس عہد سے نکل سکتی ہو۔''

''میرا دل اس بات کو قبول نہیں کرتا۔''

''تو پھر تمہاری بہتری کے لئے میں تمہارے ساتھ زبردستی کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ اتنا بااثر تو ہوں میں۔''

نادرہ نے اسے غور سے دیکھا اور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔

''اس صورت میں آپ کو مجھ سے کوئی خوشی تو نہیں ملے گی۔ بلکہ آپ کو دوسری بیوی بھی پہلی بیوی جیسی ہی ملے گی۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں یہ کام بے غرضی سے کروں گا۔ محبت کی خاطر کروں گا۔ محبت کبھی ہارتی نہیں۔''

[illegible] تھی۔ اس میں کوئی شک

نہیں رہا تھا کہ وہ سچا اور کھرا آدمی ہے۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

''آپ کل دوپہر کو آیئے۔ کھانا یہیں کھایئے گا۔''

''کھانا......؟''

''گھبرایئے نہیں، ہم کو اللہ نے رزقِ حلال سے نوازا ہے۔ میں سلائی کڑھائی کا کام کرتی ہوں۔ کوٹھے کی ایک پائی بھی حرام ہے مجھ پر۔''

''اوہ......!'' عارف کی سمجھ میں وہاں کرتوں کی موجودگی آ گئی۔

''میں ضرور آؤں گا۔ لیکن آپ میرے حق میں فیصلہ سنایئے گا۔''

''اس کی تو کوئی ضمانت نہیں۔ میں اپنے ضمیر کی روشنی میں فیصلہ کروں گی۔''

''میں چلتا ہوں۔'' عارف اُٹھ کھڑا ہوا۔

نادرہ اسے چھوڑنے دروازے تک گئی۔ راستے میں عارف نے پوچھا۔

''میرے لئے دروازہ جن صاحب نے کھولا، وہ کون تھے؟''

''نواب اشرف علی خان صاحب، آپ شاید انہیں اچھو میاں کے نام سے جانتے ہوں۔''

عارف کا منہ کھلا اور کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''تو......تو...... وہ اچھو میاں تھے۔ یقین نہیں آتا...... اچھو میاں......''

''وہ ہمارے رزقِ حلال کے شریک ہیں۔ بلکہ منیجر کہئے انہیں۔''

''یہ تو کایا پلٹ ہے۔''

''اللہ مقلب القلوب ہے عارف صاحب!''

عارف اس سلسلے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر دروازے پر کھڑے رہنا مناسب نہیں تھا۔ وہ خدا حافظ کہہ کر سیڑھیاں اُترنے لگا۔

نادرہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو اس نے دروازہ بند کر لیا۔ وہ اسے بہت بڑی مشکل میں ڈال گیا تھا۔ سوچنے کے لئے بہت کچھ چھوڑ گیا تھا۔

اور سوچنے کے لئے وقت بہت کم تھا۔ نادرہ نے دانستہ ایسا کیا تھا۔ وہ

چاہتی تو اسے ایک ہفتہ بعد بلا لیتی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ سوچنے کو جتنا وقت ملے گا، وہ اتنا ہی زیادہ اُلجھے گی۔ فیصلہ عقل کو نہیں، دل کو کرنا تھا اور دُشواری یہ تھی کہ اس کا دل تقسیم ہوگیا تھا۔ ایسے میں زیادہ مہلت فیصلے کی راہ میں رکاوٹ بنتی۔ کم وقت اور سخت وقت میں فیصلہ بہرحال ہو جاتا تھا۔

وہ گہری سانس لے کر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

✿ ✿ ✿

حمیدہ حق نگر سے واپس آئی تو بہت کھوئی کھوئی سی تھی۔ گاؤں میں اس نے زرینہ کی نومولود بیٹی کو گود میں لیا تو اس کے دل نے کہا، ایسے ہی عبدالحق کے بیٹے کو گود میں لے گی تو کیسا لگے گا۔ بس وہاں سے اس پر سوچوں کے دروازے کھل گئے۔

گھر واپس آکر وہ اس پر سوچنے بیٹھی تو حیران ہوئی کہ پہلے اس محرومی کا خیال کیوں نہیں آیا؟ اب تو عبدالحق کی شادی کو ساڑھے تین سال ہوگئے ہیں اور وہ اب تک اولاد سے محروم ہے۔ ایسا کیوں؟

اس ایسا کیوں کے جواب میں اسے ڈر لگنے لگا۔ عبدالحق بھی تو بائیس برس کے انتظار کے بعد پیدا ہوا تھا۔ شاکر جی اور ٹھاکرانی نے کہاں کہاں ماتھا نہیں ٹیکا تھا۔ مگر پھر اللہ نے انہیں کیسا اچھا اور میٹھا پھل دیا تھا، وہ ایسا مبارک بچہ تھا، جو پہلے دن سے ہی اللہ کے راستے پر چلا تھا۔ اس نے تو پہلا دودھ ہی مسلمان عورت کا پیا تھا اور وہ بھی اپنی جان پر کھیل کر۔

حوالہ تو بہت اچھا تھا۔ اس سے حمیدہ کو حوصلہ ہوا۔ اللہ کے ہاں دیر تو ہے، اندھیر نہیں اور صبر کا پھل بھی میٹھا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ خوف زدہ بھی ہوگئی۔ وہ بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ کون جانے، کب اللہ کے ہاں سے بلاوا آجائے۔ اب اس کا ایک یہی تو خواب تھا۔ عبدالحق کو اس نے دودھ پلایا تھا، اللہ نے اس کے دل میں اسے دودھ پلانے کی کیسی تڑپ دی تھی۔ یہ اسے آج بھی یاد تھا۔ تو وہ اس کے لئے بیٹا ہی تھا۔ بلکہ بیٹے سے بھی بڑھ کر تھا۔ اس کی خاطر تو اس کا شوہر اور بیٹا شہید ہوئے تھے۔ عبدالحق کا خیال نہ ہوتا

تو وہ ان دونوں کے مرنے کے بعد کبھی زندگی کی آرزو نہ کرتی اور اب تو اس کی بس یہی تمنا تھی کہ عبدالحق کے بیٹے کو گود میں لے اور کھلائے۔

اچانک اسے نوربانو کا خیال آگیا اور ساتھ ہی اپنی خودغرضی کا بھی۔ وہ اپنی آرزو کے بارے میں تو سوچ کر فکرمند ہو رہی تھی۔ اسے یہ خیال نہیں آیا کہ نوربانو اس سلسلے میں کتنی پریشان ہوگی۔ ارے......! وہ بن باپ کی بچی، جس نے اپنی ماں اور بہنوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھا۔ اسے بھی تو بچے کی آرزو ہوگی۔ بچہ ہی تو عورت کو مکمل کرتا ہے۔ بچے کے بغیر تو عورت ادھوری ہی ہوتی ہے اور اس نے کبھی اس سے پوچھا بھی نہیں۔

اس پشیمانی میں اسے عبدالحق کا خیال آیا۔ عبدالحق کو بھی تو آرزو ہوگی۔ بلکہ اسے تو بیٹے کی خواہش ہوگی۔ قدرتی بات ہے۔ اللہ نے اسے ایمان سے نوازا۔ پھر اسے خوش خبری ملی کہ اس کا باپ مرا تو مسلمان تھا، وہ کیسے تڑپتا ہوگا کہ اس کا بیٹا ہو۔ جوانی کی گمراہ نسل کو اب اللہ کے راستے پر آگے بڑھائے۔

حمیدہ پر رقت طاری ہوگئی۔ کیسی بے حس اور خودغرض ہے وہ۔

اس نے نسیمہ سے کہہ کر نوربانو کو بلوایا۔

''آ دھیے! یہاں بیٹھ میرے پاس!'' نوربانو آئی تو اس نے کہا۔

نوربانو اس کے پاس بیٹھ گئی۔ حمیدہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تو خوش تو ہے نا؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے سوچا کہ خوش کیسے ہوسکتی ہے؟

''ہاں اماں! بہت خوش ہوں میں۔'' نوربانو بولی۔

حمیدہ نے دل میں سوچا، کیسی صابر و شاکر لڑکی ہے۔ اللہ اسے کبھی محروم نہیں رکھے گا۔

''کوئی کمی ہمیشہ نہیں رہتی دھیے! تو غم نہ کر۔'' اس نے بڑی شفقت سے کہا۔

''اللہ ہر کمی پوری کر دیتا ہے۔''

''غم کیسا اماں! کوئی کمی نہیں، اللہ کا شکر ہے۔'' نوربانو نے بے فکری سے کہا۔

حمیدہ کو اس پر اور پیار آیا۔

''کمی تو ہے، غم بھی کرتی ہوگی۔ پر مجھ سے کیوں چھپاتی ہے۔ میں تو ماں ہوں تیری۔''

''سچ کہتی ہوں اماں! کوئی کمی نہیں، میں بہت خوش ہوں۔'' نوربانو نے بے حد سچائی سے کہا۔

''ارے! زرینہ کی شادی تیرے بعد ہوئی، اور دو بچے بھی ہوگئے اس کے، کمی تو ہے۔''

''مجھے تو اماں بچوں کا ایسا کوئی شوق بھی نہیں۔ پھر کمی کیسی؟''

حمیدہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔ لیکن بعد کے لمحوں میں نوربانو کے لہجے میں موجود سچائی میں لپٹی بے رخی دھیرے دھیرے اس کے دل میں اتری تو اسے بہت صدمہ ہوا۔ کچھ دیر تو وہ بول ہی نہ سکی۔ پھر اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

''تجھے بچے کا کوئی ارمان نہیں؟''

''نہیں اماں! میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' نوربانو نے سادگی سے کہا۔

''تجھے عبدالحق سے محبت نہیں ہے؟''

''بہت ہے اماں!''

''تو پھر تجھے بچے کا ارمان کیوں نہیں؟''

اسی لئے تو نہیں اماں! میں نہیں چاہتی کہ ایک دوسرے کی محبت میں ہمارا کوئی بھی شریک ہو۔ نوربانو نے دل میں کہا۔ پھر بڑی معصومیت سے بولی۔

''ان کی محبت سے اس ارمان کا کیا تعلق اماں؟''

''تعلق تو ہے۔ بچہ آتا ہے تو میاں بیوی کی محبت کو مضبوط کرتا ہے۔ بچے کے بغیر تو ان کی محبت کچے دھاگے جیسی ہوتی ہے۔''

''ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہے اماں!'' نوربانو نے بے حد اعتماد سے کہا۔

''نادان ہے تو! مرد کے لئے اولاد بہت اہم ہوتی ہے۔ خاص طور پر بیٹا۔ کیونکہ اس سے اس کی نسل چلتی ہے۔ اور عبدالحق کے لئے تو یہ اور بھی ضروری ہے۔''

پہلی بار نوربانو کے دل میں خوف جاگا۔

''کیوں اماں؟''

''پگلی ہے تو، اتنا بھی نہیں سمجھتی۔'' حمیدہ نے پیار سے کہا۔

''سوچ تو ذرا، وہ ہندوؤں میں پیدا ہوا تھا۔ اللہ اسے اپنے راستے پر لایا اور اسے ایمان عطا فرمایا۔ اس کے لئے تو بیٹے کی اہمیت دوسروں سے ہزاروں گنا زیادہ ہوگی۔ وہ اس کی نسل میں پہلا بچہ ہوگا، جو پیدا ہی مسلمان ہوگا۔ یہ تو اس کے لئے بہت ضروری ہے۔ وہ اس کی نسل کو آگے چلائے گا۔''

اس بار بات پوری طرح نوربانو کی سمجھ میں آئی، اور وہ واقعی خوفزدہ ہوگئی۔

''بیٹے کی خاطر تو مرد دوسری شادی بھی کر لیتے ہیں۔'' حمیدہ نے اس کا خوف اور بڑھا دیا۔

''جبکہ عبدالحق کے لئے تو یہ عام لوگوں سے بہت زیادہ ضروری ہے۔''

''تو اس سلسلے میں تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ اللہ کی مرضی!'' نوربانو نے بے بسی سے کہا۔

''تو تو بے پرواہ بن کر بیٹھی ہے۔ دُعا تو کیا کر۔''

''اب اس کے لئے بھی دُعا کرنی پڑے گی۔''

حمیدہ دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگی۔

''توبہ کر نوربانو! توبہ کر۔ کیا ہوگیا ہے تجھے۔''

''میرا مطلب تھا اماں کہ یہ تو قدرتی عمل ہے۔ اولاد تو اللہ سبھی کو دیتا ہے۔''

''کچھ کو نہیں بھی دیتا اور دعا کو تو کیا سمجھتی ہے؟ اس کا تو بندہ حق ادا ہی نہیں کر سکتا۔ ورنہ سوچ کہ کھانے کے وقت جو نوالہ میرے ہات میں ہے، میں تو

اسے اپنا ہی سمجھوں گی نا...... کہ ابھی منہ میں لے جاؤں گی اور کھا لوں گی۔ پر اس کے لئے بھی دُعا کرنی چاہئے رب سے۔ وہ چاہے تو وہ نوالہ میرا، نہ چاہے تو وہ میرے منہ میں جا ہی نہیں سکتا۔''

وہ بات ایسی تھی کہ نور بانو سناٹے میں آگئی۔

''ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ جو چیز ہمارے پاس نہیں، ہمارے بس میں نہیں، صرف اس کے لئے دعا کرنی چاہئے۔ نا دھییے! نا، دعا تو شکر ہے، رب کی قدرت کو تسلیم کرنا ہے کہ جو اس نے دیا ہے، وہ جب چاہے، واپس لے لے۔ اس لئے جو تمہارے پاس ہے، اس پر بھی شکر ادا کرو، اور دُعا کرو کہ وہ تمہیں وہ چیز نصیب بھی کرے۔ تو دعا کیا کر گڑگڑا کر۔ دُعا نہ کرنا بھی نعمت سے منہ موڑنا ہے۔ رب کو برا لگ جائے تو بندہ محروم رہ جاتا ہے۔ ورنہ تو اس کی رحمت بہت بڑی ہے۔ وہ ناشکروں کو بھی دیتا ہے اور انکار کرنے والوں کو بھی۔''

اب نور بانو اندر ہی اندر رو رہی تھی۔ حمیدہ جو کچھ کہہ رہی تھی، اس پر صادق آرہا تھا۔ حالانکہ حمیدہ کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اب وہ اسے کیسے بتاتی کہ وہ تو رمضان کی طاق راتوں میں اولاد نہ ہونے کی دُعا مانگتی رہی ہے۔ اب اس کی دعا اگر اللہ کے ہاں قبول ہو چکی ہے تو......

تب تو اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

''تم بھی دعا کیا کروں نا اماں!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''میں تو کرتی ہوں اور اب اور فکر بھی کروں گی۔ یہ تیری دعا کی بات اور ہو گی۔''

''میں بہت دعا کروں گی اماں......!'' نور بانو نے بڑے خلوص سے کہا۔

نور بانو حمیدہ کی باتوں سے ڈر تو گئی لیکن اپنے اور عبدالحق کے تعلق پر سے بڑا بھروسہ تھا۔ عبدالحق تو آج بھی اس کا ویسا ہی اسیر تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ تو اس کے سوا کسی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

پھر بھی اس نے سوچ لیا کہ وہ اسے جانچے گی ضرور۔ دل میں تو اس

کے بہرحال خلش اور ڈر پیدا ہو گیا تھا۔

❁ ❁ ❁

نادرہ اس رات سونے کے لئے لیٹی تو اسے یقین تا کہ وہ سو نہیں سکے گی۔ ذہن بری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ دن بھر کام کے دوران میں بھی وہ اسی پر سوچتی رہی تھی کہ اس الجھن کا کیا حل ہو گا۔

''پھپھو! اب تو آپ شادی کر لیں گی نا۔'' ارجمند نے اسے چونکا دیا۔

''شادی...... کس سے......؟''

''ان سے جو آج آئے تھے۔''

''ارے پگلی! وہ اس لئے تو نہیں آئے تھے۔''

''پھپھو! جھوٹ بولنا بری بات ہے۔''

نادرہ کو جھٹکا لگا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''میں نے خود سنا تھا پھپھو! انہوں نے آپ سے شادی کے لئے کہا تھا۔''

''اچھا! جبکہ میں نے تمہیں باہر آنے کو منع کیا تھا۔'' نادرہ نے اُلٹا اسے پکڑ لیا۔

''یہ کتنی بری بات کی تم نے۔''

''سچ پھپھو! بس میں انہیں ایک نظر دیکھنے کے لئے آئی تھی، اور دروازے کی اوٹ سے انہیں دیکھا تھا۔ اسی وقت انہوں نے آپ سے شادی کی بات کی۔ میں پھر اسی وقت واپس چلی آئی تھی۔''

نادرہ کو یہ فکر تھی کہ کہیں ارجمند نے پوری گفتگو تو نہیں سنی۔ اس گفتگو میں تو ایسے موضوعات شامل تھے، جن کے بارے میں ارجمند کو کچھ معلوم ہی نہیں ہونا چاہئے تھا۔ یہ سن کر اسے کچھ اطمینان ضرور ہوا کہ ارجمند وہاں بس ایک لمحہ رکی تھی۔ مگر پوری طرح تسلی بہرحال نہیں ہوئی تھی۔

''تم جانتی ہو نا ارجمند! کہ جھوٹ بولنا بری بات ہے۔'' اس نے تنبیہ

لہجے میں کہا۔

''جی پھپھو! میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔'' ارجمند نے کہا۔ یہ کہنا اسے اچھا نہیں لگا کہ جھوٹ تو آپ کا پکڑا گیا ہے۔

''تم واقعی بس اتنی دیر کے لئے آئی تھیں؟ سچ کہنا!'' نادرہ کا لہجہ اب بھی سخت تھا۔

ارجمند نے اس کے سر کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''آپ کے سر کی قسم پھپھو! میں جھوٹ نہیں بولتی۔''

نادرہ نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ اسے بڑی شدت سے اس پر پیار آیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ اس کے جھوٹ کا حوالہ دے کر اسے شرمندہ کرنے سے دانستہ گریز کر رہی ہے۔

''ٹھیک ہے بیٹا! لیکن کسی بات کو منع کریں تو مان جانا چاہیے۔''

''اب ایسا نہیں ہوگا اچھی پھپھو! مگر یہ بتائیں آپ ان سے شادی کر رہی ہیں نا؟''

''نہیں گڑیا! یہ ممکن نہیں ہے ہمارے لئے۔''

''کیوں ممکن نہیں ہے۔ پہلی بار تو کوئی اچھا آدمی آیا ہے آپ سے شادی کرنے۔''

نادرہ نے دل میں سوچا، بچی کو خود بھی نہیں معلوم کہ اس نے کیسی خطرناک حد تک سچی بات کہی ہے۔

''یہ تو ٹھیک ہے گڑیا! لیکن کچھ مجبوریاں ہیں، جو میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔''

ارجمند اس سے لپٹ گئی۔

''اچھی پھپھو! آپ میری خاطر ان سے شادی کر لیں۔''

نادرہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''تمہیں اس سے کیا فائدہ ہوگا گڑیا!''

''پہلا تو یہی کہ آپ ان کے ساتھ خوش رہیں گی۔''

''اور؟''

''اور یہ کہ میں بھی خوش رہوں گی۔ اور یہ کہ میں یہاں سے نکل سکوں گی۔''

نادرہ کے دل میں پہلی بار اس امکان نے جگہ بنائی۔ ارجمند نے اپنے یہاں سے نکلنے کا جس انداز میں کہا تھا، وہ چونکا دینے والا تھا۔ لگتا تھا کہ بچی بھی صورتِ حال کو کچھ کچھ سمجھنے لگی ہے۔ اس نے دل میں سوچا کہ اسے یہاں سے نکالنے ہی کی آس میں تو وہ زندہ رہی ہے۔ ورنہ مرنا کیا مشکل تھا۔ ہر روز مرنے کے مقابلے میں ایک بار مرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ اور وہ ارجمند کو کیسے بتاتی کہ اس کی تو ہر سانس اللہ سے دعا کرتی ہے کہ وہ کسی طرح یہاں سے نکل جائے۔

لیکن اس کا دل ایفائے عہد سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

''کیا سوچ رہی ہیں پھپھو؟'' ارجمند نے اسے چونکا دیا۔

''آپ ان سے شادی کر لیں گی نا؟''

''کچھ نہیں کہہ سکتی گڑیا! بظاہر تو یہ ناممکن ہے۔''

''کیوں پھپھو!''

''بہت سی باتیں میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ بس تم دُعا کرو میرے لئے۔''

''کیا دُعا کروں اچھی پھپھو!''

''یہ کہ اللہ میرے بارے میں فیصلہ کر دے۔ ایسا کہ وہ مجھ سے ناراض بھی نہ ہو'' بے بسی سے نادرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''آپ روئیے نہیں پھپھو! اللہ میاں سب ٹھیک کر دیں گے۔'' ارجمند نے کہا اور اس سے لپٹ گئی۔

وہ لمحہ نادرہ کے لئے چشم کشا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ ارجمند بڑی ہوگئی ہے۔ وہ تو اب بھی اسے وہی چھ سال کی بچی سمجھی تھی۔ اس نے غور سے اسے دیکھا تو لگا کہ اب شاید وہ بھی سکون سے سو نہیں سکے گی۔ وہ بے چین ہوگئی۔ اتنی حسین بچی کا کوٹھے پر رہنا اب کسی بھی طرح مناسب نہیں۔

اس کی الجھن اور بڑھ گئی۔ ارجمند تو سو گئی مگر وہ سوتی ہوئی ارجمند کو

دیکھ کر دہلتی رہی۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اسے اپنے قلب اور ضمیر کے خلاف بھی فیصلہ کرنا پڑ سکتا ہے۔

نہ جانے کب اسے نیند آئی۔ لیکن فجر کے وقت اس کی آنکھ خود بخود کھل گئی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق کو چند لمحوں میں ہی اندازہ ہوگیا کہ آج اس کی رات کی رانی کچھ پھیکی پھیکی، بجھی بجھی سی ہے۔

''کیا بات ہے نور بانو! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''جی! میں ٹھیک ہوں۔'' نور بانو نے کہا۔

''کچھ پریشان ہو؟''

''جی ... جی نہیں ... ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

نور بانو اس وقت منقسم تھی۔ وہ اولاد کے موضوع پر عبدالحق سے بات کرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ سوچتی تھی کہ یہ تو آ بیل مجھے مار والی بات ہے۔ عبدالحق نے آج تک کوئی بے تابی ظاہر نہیں کی تھی۔ تو اب وہ خود اس کے دل میں یہ بات کیوں ڈالے؟

لیکن حمیدہ کی باتیں اسے یاد تھیں، اور یہ بھی تھا کہ حمیدہ کی ہر بات معقول تھی۔ عبدالحق نے بات نہیں کی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسے اولاد کی پرواہ ہی نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ دل میں یہ بات سوچتا ہو اور جو بات دل میں ہو لیکن کی نہ جائے وہ زیادہ طاقتور بن جاتی ہے۔ بات کرنے سے مسئلے کی سنگینی بہرحال کم ہوتی ہے۔

اور پھر اس بات کا امکان بھی موجود تھا کہ حمیدہ اس موضوع پر کسی بھی وقت عبدالحق سے بات کر لے گی، جیسے اس سے کی تھی۔ تو اس سے یہ بہتر تھا کہ وہ خود ہی یہ بات کر لے۔

ایک بات کا اندازہ نور بانو کو ہوگیا تھا کہ جیسے عبدالحق کے لئے بیٹے کی

اہمیت ہے، ویسے ہی حمیدہ کے لئے بھی ہے اور یہ فطری تھا۔ دودھ کے رشتے سے عبدالحق حمیدہ کا بیٹا تھا۔ اس کی پوتے کی آرزو فطری ....

''کچھ سوچ رہی ہو تم؟'' عبدالحق نے اسے چونکا دیا۔

''آج کیا ہوگیا ہے تمہیں؟''

''جی ہاں.....! میں کچھ سوچ رہی ہوں۔''

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''یہی کہ ہم ابھی تک اولاد سے کیوں محروم ہیں؟''

عبدالحق کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کے گزر گیا۔

''اللہ کی مرضی! اولاد تو اللہ کی دین ہوتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''آپ کو اس کی وجہ سے کسی کمی کا احساس نہیں ہوتا؟'' نور بانو نے بہت غور سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں نہیں ہوتا؟ بالکل ہوتا ہے۔'' عبدالحق نے صاف گوئی سے کہا۔

''آپ نے کبھی کچھ کہا نہیں اس سلسلے میں؟''

''کہنے سے کیا ہوتا ہے، یہی ایک دُعا تو میں کرتا ہوں اللہ سے۔ جانتا ہوں کہ میرے یا تمہارے چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب اللہ چاہے گا، ہمیں نواز دے گا۔ وہ مرضی کا مالک ہے۔ میں اور تم تو بس دُعا کر سکتے ہیں۔''

اور میں بہت پہلے الٹی دعا کر چکی ہوں۔ نور بانو نے دل میں سوچا۔

''ایک بات بتائیں، مرد کے لئے اولاد کی بہت اہمیت ہوتی ہے نا؟''

''مرد کی تخصیص کیوں کرتی ہو۔ عورت کے لئے تو شاید اولاد مرد کی نسبت زیادہ اہم ہوتی ہے۔''

''کیسے؟''

''بھئی مرد کے لئے تو اہمیت اس لئے ہوتی ہے کہ اس کی نسل چلتی ہے۔ لیکن عورت تو بچے کے بغیر نامکمل رہتی ہے۔ اولاد کے بغیر تو اس کی تکمیل ہی نہیں ہوتی۔ عورت کو تو اللہ نے مامتا دی ہے نا؟''

''تو مجھے یہ کمی کیوں محسوس نہیں ہوتی؟'' نور بانو نے بے ساختہ کہا۔

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا۔

''یہ کیسی بات کی تم نے؟ یہ تو غیر فطری ہے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' نوربانو نے بات بگڑتی دیکھ کر جلدی سے کہا۔

''کمی تو مجھے بھی محسوس ہوتی ہے لیکن مجھ میں صبر ہے اس معاملے میں۔''

''صبر تو مجھ میں بھی ہے۔ میں نے کبھی تم سے اس سلسلے میں بات نہیں کی۔ آج بھی تم نے ہی یہ بات چھیڑی ہے۔ حالانکہ مجھے دوسروں کے مقابلے میں اولاد کی خواہش زیادہ ہے۔''

''کیوں؟'' نوربانو نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

''مجھ پر اور پتا جی پر اللہ نے جو فضل فرمایا، وہ انشاء اللہ میرے بیٹے کے ذریعے آنے والی نسلوں میں منتقل ہوگا۔ میرے لئے تو اس بات کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ تمہیں پتا ہے نا، میں اپنے والدین کے ہاں بائیس سال کے انتظار کے بعد پیدا ہوا تھا۔ جتنی انہیں اولاد کی آرزو تھی، میں یقین سے کہتا ہوں کہ مجھے ان سے بھی زیادہ آرزو ہے۔ حالانکہ ہماری شادی کو تو ابھی تین ساڑھے تین سال ہی ہوئے ہیں۔''

نوربانو چوکنا ہوگئی۔ حمیدہ کی بات بالکل درست ثابت ہو رہی تھی۔

''آپ نے مجھ سے کبھی کچھ کہا نہیں۔'' اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''تم سے کیا کہتا؟ تمہارے اختیار میں تو کچھ نہیں ہے۔ جس کے اختیار میں ہے، اس سے ہر روز دُعا کرتا ہوں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اور پتا جی زندہ ہوتے تو یقیناً وہ مجھ سے بھی زیادہ دُعائیں کرتے میرے لئے بیٹے کی۔''

کوئی بات نہیں، ان کی جگہ اماں جو موجود ہیں۔ نوربانو نے دل میں سوچا۔

''پھر بھی، بات تو کرنی چاہئے تھی آپ کو۔ کسی ڈاکٹر کو بھی دکھانا

چاہئے۔ ممکن ہے کوئی خرابی ہو۔''

''کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' عبدالحق نے بے پرواہی سے کہا۔

''یہ تو بس اللہ کی مرضی کی بات ہے۔ میں قرآن پاک پڑھتا ہوں۔ اللہ کی مرضی ہوئی تو ضعیف شوہر اور بانجھ بیوی کو بھی اس نے اولاد سے نوازا۔ اور وہ نہ چاہے تو یہ نعمت کہیں سے نہیں ملتی۔ ویسے تمہیں بتا دوں کہ میں ڈاکٹر سے مل چکا ہوں۔ ظاہری طور پر تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔''

نوربانو نے تیزی سے موضوع بدل دیا۔

''لوگ تو اولاد کی خاطر دوسری شادی بھی کر لیتے ہیں۔''

''اس میں کوئی برائی نہیں۔ اسلام نے تو چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔''

نوربانو کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ لیکن اس نے بظاہر شوخ لہجے میں چیلنج کیا۔

''تو آپ کب کر رہے ہیں دوسری شادی؟''

''میں کر ہی نہیں سکتا۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

پہلی بار نوربانو کو اطمینان ہوا۔

''کیوں نہیں کر سکتے۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔'' اس نے بے پرواہی سے کہا۔

''تمہیں تو اعتراض کافی ہی نہیں۔ لیکن میں دوسری شادی کر نہیں سکتا۔''

''وہی تو میں پوچھ رہی ہوں۔ کیوں نہیں کر سکتے؟''

''بیویوں کے درمیان عدل کیسے کروں گا میں؟ تمہارے بعد میں کسی اور سے محبت کر ہی نہیں سکتا اور بغیر محبت کے صرف اولاد کی غرض سے شادی کروں تو یہ خودغرضی ہوگی اور دوسری عورت کے ساتھ زیادتی۔ اور پھر میرے نزدیک یہ ایمان کا معاملہ ہے۔ اللہ کو منظور ہے تو اولاد تم سے ہی مل جائے گی اور خدانخواستہ اس کی مرضی نہیں تو پھر یہ ممکن ہی نہیں۔''

نوربانو نے اطمینان کا سانس لیا۔ رات کی رانی پھر سے مہک اُٹھی۔

پھر عبدالحق تو سو گیا۔ لیکن نور بانو جاگتی رہی۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ سکون تو اوپری تھا۔ اندر تو عدم تحفظ کا پرانا، سویا ہوا خوف جاگ اُٹھا تھا۔ اب وہ وہی پرانی نور بانو تھی، جو ہر چیز پر شک کرتی تھی، جو یقین سے محروم تھی۔

اس نے سوچا۔ عبدالحق اس وقت کچھ بھی کہتا رہے لیکن یہ تو اس نے مان لیا ہے کہ اسے اولاد کی خواہش عام لوگ سے زیادہ ہے۔ کون جانے، یہ خواہش اس کی محبت پر بھی حاوی آ جائے۔ اور مردوں کا کیا ہے؟ کسی وقت بھی، کسی سے بھی محبت کر سکتے ہیں۔ اور عبدالحق نہ بدلے تو بھی حمیدہ تو ہے نا۔ وہ اسے دوسری شادی پر مجبور کر سکتی ہے۔

اس لمحے نور بانو کو حمیدہ اپنے دل میں چھپا ہوا کانٹا لگی۔ مگر اس کانٹے کو وہ خود نہیں نکال سکتی تھی۔ اس کانٹے سے تو اللہ ہی نجات دلا سکتا ہے۔ اس نے بے رحمی سے سوچا۔

لیکن اس نے ایک بات اور طے کر لی۔ اب اسے ہر لمحے اللہ سے اولاد کے لئے دُعا کرنی تھی۔

مگر اس کے دل میں ایک اور کانٹا بھی پیوست ہو گیا تھا۔ پچھتاوے کا کانٹا۔ کاش اس نے رمضان کی ان طاق راتوں میں وہ منحوس دعا نہ کی ہوتی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی وہ دعا جسے اب وہ بددعا سمجھ رہی ہے، اللہ کی بارگاہ میں قبول ہو چکی ہے۔

❁ ❁ ❁

فجر کی نماز کے بعد نادرہ دیر تک دُعا مانگتی رہی۔ وہ اللہ کے حضور گڑگڑا رہی تھی۔

''اے اللہ! یہ مجھے کس آزمائش میں ڈال دیا آپ نے؟ اس کے اعتبار سے میں تو بہت چھوٹی ہوں میرے رب! اور آپ سے تو کچھ بھی چھپا ہوا نہیں۔ میں نے آپ کو گواہ بنا کر نیلم بائی سے عہد کیا اور اس کے بعد اپنے لئے کبھی دُعا بھی نہیں مانگی۔ میں تو بس ارجمند کے لئے ہی دُعا کرتی رہی آپ سے۔ اپنے لئے تو میں صرف موت ہی مانگتی ہوں آپ سے۔ مگر ارجمند کے یہاں سے نکلنے

کے بعد ......'' اس کی آواز آنسوؤں سے رُندھ گئی۔

''اب جب میں نے عہد کر لیا تو آپ نے مجھے اس آزمائش میں ڈال دیا۔ اب آپ ہی میری راہنمائی کریں۔ میں بدعہدی نہیں کرنا چاہتی۔ میرا دل کفارے والی بات کو قبول نہیں کرتا۔ اب آپ ہی مجھے راستہ دکھائیے۔'' وہ رونے لگی۔

پھر اچانک ہی بغیر کسی وجہ کے اس کے دل کو سکون آ گیا، جیسے اللہ نے اس کی سن لی ہو۔ اور مدد کا وعدہ بھی کر لیا ہو۔

اس نے اُٹھ کر کھانے کے لئے چیزوں کی فہرست بنائی اور اچھو میاں کو دی۔

''یہ سب کچھ لے آیئے جلدی سے۔''

''کوئی مہمان آ رہا ہے کیا؟'' اچھو میاں نے پوچھا۔

وہ نظریں چرانے لگی۔

''جی نواب صاحب!''

''وہی جو کل آئے تھے۔''

''جی...... جی ہاں......!''

''میرا کوئی حق تو نہیں بیٹا! لیکن ......''

نادرہ نے جلدی سے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''آپ کو سب کچھ جاننے کا حق ہے نواب صاحب! آپ یہ سودا لے کر آ جائیں تو پھر بات کریں گے۔ میں کھانے کی تیاری تو شروع کروں۔''

اچھو میاں چلے گئے۔ واپس آئے تو نادرہ نے انہیں سب کچھ بتایا۔

اچھو میاں سے تو خوشی چھپائی ہی نہیں جا رہی تھی۔

''بہت بہت مبارک ہو بیٹا!'' وہ بولے۔

''آپ مبارک باد دے رہے ہیں۔ جبکہ آپ جانتے ہیں کہ میں نیلم بائی سے کوٹھا نہ چھوڑنے کا عہد کر چکی ہوں۔'' نادرہ نے حیرت سے کہا۔

''اس وقت تمہارے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا بیٹا! وہ تمہاری

مجبوری تھی۔'' اچھو میاں بولے۔

''اور دیکھو بیٹا! یہاں زندگی اس کوٹھے پر گزری ہے۔ آدمی کی بڑی پہچان ہے ہمیں۔ وہ آدمی ہیرا ہے ہیرا۔''

''لیکن نواب صاحب! میں نے اللہ کو گواہ بنا کر عہد کیا تھا بائی سے۔''

''میں نے کہا نا کہ وہ تمہاری مجبوری تھی۔''

''نہیں نواب صاحب! میں سمجھتی ہوں کہ اللہ نے میرے لئے وہ راستہ نکالا تھا۔ اور میں نے سوچ سمجھ کر وہ عہد کیا تھا۔ اور اس کا مجھے فائدہ بھی ہوا۔ میں اسے مجبوری کیسے کہہ سکتی ہوں؟''

''لیکن بیٹا! یہ بہرحال کوٹھا ہے۔ تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ اللہ نے تمہیں یہاں سے نکلنے کا موقع دیا ہے؟''

''میرے نزدیک یہ آزمائش ہے میری کہ اس ترغیب کے سامنے میں اللہ کے سامنے کئے ہوئے عہد کا پاس رکھتی ہوں یا نہیں؟''

اچھو میاں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''معاف کرنا بیٹا! میرا نکتہ نظر مختلف ہے۔ میرے نزدیک اس پیش کش کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہے۔ اللہ نے تمہارے لئے کوٹھے سے نجات کی راہ نکالی ہے۔ تم کیسے منہ موڑ سکتی ہو؟''

''آپ جذباتی ہو کر سوچ رہے ہیں نواب صاحب!'' نادرہ نے کہا۔

''یہ نہ بھولیں کہ اس عہد کی ہی وجہ سے میں اس کوٹھے پر بھی عزت کے ساتھ جی رہی ہوں۔ اور کون سوچ سکتا ہے کہ اس کوٹھے پر ہی ہمیں اللہ کی مہربانی سے رزق حلال مل رہا ہے۔ جیسے اللہ نے اس کا اہتمام کیا، آپ خود اس پر گواہ ہیں۔ اب میں خودغرض اور مطلبی بن کر اس عہد سے منہ موڑ لوں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہاں سے نکل کر میں اس عزت سے جی سکوں گی؟ جیسے اس کوٹھے پر جی رہی ہوں۔''

اچھو میاں دم بخود رہ گئے۔ چند لمحے تو وہ بول ہی نہیں سکے۔ پھر انہوں نے کہا۔

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے بیٹا! اس طرح تو ہم نے سوچا ہی نہیں تھا۔''

''اب میں کیا کروں نواب صاحب!'' نادرہ نے بے بسی سے کہا۔

اچھو میاں چند لمحے سوچتے رہے پھر بولے۔

یہ تو بہت نازک معاملہ ہے۔ دونوں طرف اللہ کی ناراضی کا خطرہ ہے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''مجھے بتایئے نا! میں کیا کروں؟'' نادرہ روہانسی ہوگئی۔

''اللہ کی ناراضی کا معاملہ ہے۔ اللہ پر ہی چھوڑ دو۔''

''مگر مجھے عارف صاحب کو جواب بھی دینا ہے آج!''

''اللہ سے لو لگاؤ۔ وہی تمہیں درست راستہ دکھا دے گا۔ وہی تمہیں درست جواب سجھا دے گا۔''

''مگر کیسے؟''

''انشاء اللہ تمہارے دل کو خود بخود جواب مل جائے گا۔''

اور نادرہ کا دل سچ مچ مطمئن ہوگیا۔ وہ کھانے میں مصروف ہوگئی۔

❁ ❁ ❁

عارف پوری رات نہیں سو سکا۔ عجیب ملی جلی سی، ہیجانی سی کیفیت تھی اس کی۔ خوشی بھی تھی مگر ڈر بھی تھا کہ نادرہ انکار نہ کر دے۔ اس بات کا اسے یقین ہوگیا تھا کہ برسوں سے اسے جس کی تلاش تھی، وہ نادرہ ہی ہے۔

اسے یاد تھا، اس نے وہاں بہت عمدہ سلے ہوئے، بے حد نفیس کڑھائی والے کرتے دیکھے تھے۔ وہ اسے بہت اچھے لگے تھے۔ لیکن وہ ان کی اہمیت نہیں سمجھ سکا تھا۔ پھر جب نادرہ نے اسے کھانے پر مدعو کیا تو وہ اپنا اکراہ چھپا نہیں سکا تھا تو نادرہ نے کیسے کہا تھا کہ ہمیں اللہ نے رزقِ حلال سے نوازا ہے۔

طوائف کے کوٹھے پر رزقِ حلال؟

اس نے حیرت سے سوچا تھا۔ اور اسی وقت نادرہ نے کہا تھا کہ اچھو میاں اس کے رزقِ حلال کے کاروبار کے منیجر ہیں اور ایک لمحے میں بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ سناٹے میں آگیا تھا اور پھر وہ اللہ کی قدرت کا قائل

ہوگیا۔ واقعی وہ جہاں چاہے، جسے چاہے، جتنا نواز دے اور یہ نادرہ کیسی غیر معمولی عورت ہے کہ طوائف کے کوٹھے کی مالک ہے۔ دولت کی کوئی کمی تو ہو ہی نہیں سکتی اسے۔ مگر وہ کپڑوں کی سلائی کڑھائی کر کے رزقِ حلال کما رہی ہے۔ یہ تو اللہ کی رحمت ہے اس پر، اور وہ بڑے بڑے معززین سے بڑھ کر معزز ہے۔

وہ واقعی غیر معمولی عورت تھی۔ کوٹھے پر بیٹھی ایفائے عہد کی فکر کر رہی تھی۔ اس کے لمس پر جو اس کا ردِعمل تھا، وہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ بھی اسے کم از کم پسند ضرور کرنے لگی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے اس کی محبت پر یقین ہے، اور وہ اسے اچھا آدمی سمجھتی ہے۔

اور وہ جو کوٹھے پر بیٹھ کر بھی رزقِ حلال کی جستجو کرتی ہے، کوٹھے سے نجات تو اس کا خواب ہوگا اور وہ اسے کوٹھے سے نجات دلا کر عزت کی زندگی دینے کی بات کر رہا تھا۔ یعنی اسے اپنے ناممکن خواب کی تعبیر مل رہی تھی۔ مگر وہ اپنا عہد توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس عہد کی خاطر گھر آئی محبت اور عزت کو ٹھکرا رہی تھی، جو ایک مطلبی طوائف نے اللہ کو گواہ بنا کر اس سے لیا تھا۔

ایسی سچی اور کھری عورت کے لئے تو دنیا بھی چھوڑی جا سکتی ہے۔

عارف نے سوچا۔ اس کے دل میں نادرہ کی محبت اور گہری...... اور زیادہ ہوگئی۔

کاش...... کاش وہ اسے مل جائے۔

ویسے یہ پورا معاملہ ہی عجیب تھا۔ کہانی کی سی بات لگتی تھی۔ چار سال پہلے نرگس کی شہرت سن کر وہ نیلم بائی کے کوٹھے پر گیا تھا۔ وہاں سچ مچ اس کے زخم ہرے ہوگئے تھے۔ وہ عورت نہیں تھی، پتھر جیسی برف سے تراشا ہوا خوب صورت مجسمہ تھی۔ وہ اسے کہیں اور ملی ہوتی تو وہ اسے اپنی بیوی سے بھی برا سمجھتا۔ لیکن کوٹھے پر بیٹھی ہوئی طوائف ایسی ہو تو اس سے بڑھ کر عزت کے لائق کون ہو سکتا ہے۔ خوب صورتی کی تو اس کے نزدیک کوئی ایسی خاص اہمیت نہیں تھی لیکن عزت کے حوالے سے وہ اسے ہمیشہ یاد رہی۔

یاد رکھنا اپنی جگہ، لیکن محبت کا تو وہاں کوئی سوال نہیں تھا۔

پھر اس رات وہ سمن سے ملا۔ نرگس بائی کا نام اسے یاد نہیں تھا۔ مگر نیلم

بائی کے کوٹھے کے حوالے سے وہ اسے یاد آ گئی، پوچھنے پر اس کی نام نہاد بیماری اور پیشے سے کنارہ کشی کا پتا چلا، اور وہ سمجھ گیا کہ اپنی زندہ عزت نفس کی خاطر برف کی سل بن جانے والی عورت نے اپنے لئے راستہ نکال لیا ہے۔ بس اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ اسے نرگس سے محبت ہوگئی ہے۔

اور ملاقات نے اس کی محبت کو پختہ کر دیا۔ کردار کے کتنے قابل رشک پہلو اس ملاقات میں اسے نظر آئے۔ کوئی اور عورت ہوتی تو اس کے لئے یہی بہت ہوتا کہ اسے مردوں کے جبر سے نجات مل گئی ہے، اور وہ عزت کی زندگی گزار رہی ہے۔ اسے تو عیش کی زندگی گزارنی چاہئے تھی۔ لیکن نہیں! نادرہ کے لئے یہ کافی نہیں تھا۔ اس نے اپنے لئے رزقِ حلال کی جدوجہد کی اور اس پر اس کی ایفائے عہد کی فکر، اور وہ بھی اس حد تک کہ اسے زنداں سے باعزت رہائی بھی قبول نہیں۔

ایسی عورت سے تو بس محبت ہی کی جا سکتی ہے۔

وہ مل جاتی تو زندگی سنور جاتی۔ لیکن عارف کو اندازہ ہوگیا تھا کہ اسے قائل کرنا اتنا آسان نہیں۔ اس لئے ت اس نے اپنے مزاج کے خلاف دھمکی بھی دے دی تھی، جس پر وہ اب شرمندہ تھا۔ بس طمانیت اس بات کی تھی کہ نادرہ نے اس دھمکی میں چھپے خلوص کو بھی پہچان لیا تھا۔ ورنہ اس کے انداز میں تکدر ضرور محسوس ہو جاتا۔

عارف کو اس پر حیرت تھی کہ اتنے بڑے فیصلے کے لئے نادرہ نے صرف ایک دن کی مہلت کیوں مانگی؟ اس پر سوچتے ہوئے اسے احساس ہونے لگا کہ جیسے اس کے اور نادرہ کے درمیان کوئی رابطہ ہے۔ جیسے وہ اور رہ کر بھی نادرہ کو سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

اور بات ایک زاویے سے اس کے لئے خوش آئند تھی۔ اور دوسرے زاویے سے تشویش میں مبتلا کرنے والی۔ خوش آئند پہلو یہ تھا کہ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ نادرہ اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی ہے۔ اس کے دل میں اس کے لئے گنجائش بنی ہے۔ یعنی وہ اس معاملے پر خود سے بحث کرے گی تو

اسے اس کے حق میں بہت زیادہ دلیلوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ورنہ تو وہ ایفائے عہد پر جس طرح قائم ہے، اس میں تو اسے اسی وقت فیصلہ سنا دینا چاہئے تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کی۔ شاید اس لئے کہ دل اس فیصلے کی راہ میں مزاحم تھا۔

مگر دوسرا پہلو تشویش میں مبتلا کرنے والا تھا۔

اتنے بڑے فیصلے کے لئے اتنی سی مہلت؟ وجہ وہ اس کی بھی سمجھ گیا تھا۔ اسی لئے تشویش میں مبتلا ہوگیا تھا۔ نادرہ کو اپنے دل کی طرف سے اپنے فیصلے پر شدید مزاحمت کی توقع تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اس پر جتنا سوچے گی، اتنا ہی زیادہ الجھے گی۔ اور کسی نتیجے پر پہنچنا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دشوار ہوتا جائے گا۔ اس لئے اس نے خود کو کم مہلت کا پابند کرلیا۔ اس میں تشویش ناک پہلو اس امکان کی وجہ سے تھا کہ نادرہ نے خود پر اپنا پہلا فیصلہ مسلط کرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔

لیکن مزید غور کرنے پر اس کی تشویش کم ہوگئی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اسی وقت فیصلہ سنا دیتی، اسے اگلے روز کیوں بلاتی؟

بالآخر وہ اصل بات سمجھ گیا۔ نادرہ خوفِ خدا رکھنے والی تھی۔ اسے اپنے عہد کی فکر بھی تھی۔ لیکن کوٹھے کے اس جہنم سے نجات کی وہ ترغیب بھی اس کے لئے بہت بڑی تھی۔ اس نے اس فیصلے کے معاملے میں اللہ سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اور اللہ سے رجوع کرنے کے لئے لمحے بھی بہت ہوتے ہیں۔

ویسے نادرہ کی بات میں وزن تھا۔ وہ جو خود کو اپنی بھتیجی سے علیحدہ رکھنا چاہتی تھی۔ تو اس کا خوف بے جا نہیں تھا۔ چاہے اس کا سبب جبر ہو، مگر بہرحال اس کا ایک ماضی تھا۔ کہیں بھی کوئی تمش بین اسے اس کی ماضی کی حیثیت میں پہچان سکتا تھا۔ لیکن عارف جانتا تھا کہ بدلے ہوئے اس منظر نامے میں یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ کراچی تیزی سے بڑھتا ہوا شہر تھا۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کو اکثریت نے وہاں کا رخ کیا تھا۔ عارف نے سوچ لیا تھا کہ وہ نادرہ اور اس کی بھتیجی کو لے کر کراچی چلا جائے گا۔ وہاں اگر کوئی نادرہ کو پہچانے گا بھی تو ہندوستان کے پرانے اور عزت والے حوالے سے۔ یہاں کا کوئی تماش

بین کراچی کہاں جائے گا؟

اس نے سوچا کہ یہ بات وہ کل نادرہ کو بھی سمجھائے گا۔

جاگتے سوچتے اسے صبح ہوگئی۔ رات بھر جاگنے والوں کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ صبح کے وقت بالآخر وہ سو جاتے ہیں۔

عارف کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ آنکھ کھلی تو دن چڑھ چکا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور جانے کی تیاریوں میں لگ گیا۔

❁ ❁ ❁

وہ اسی کمرے میں بیٹھے تھے، جہاں پچھلی بار ملے تھے۔

نادرہ بہت نروس تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اسے عارف کو جواب دینا تھا اور فی الحال اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ نواب صاحب نے کہا تھا کہ اللہ تمہیں خود راستہ سجھا دے گا۔ سو اب وہ دل میں اللہ سے مدد کی دعا کرنے، اور اس کی طرف سے جواب کا انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتی تھی۔

نروس ہونے کی دوسری وجہ اس کی سمجھ اس وقت آئی، جب اس نے سامنے بیٹھے عارف کو نظر اٹھا کر دیکھا، اور فوراً ہی نظریں جھکانے پر مجبور ہوگئی۔ عارف کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کے دل کی دھڑکنیں بہت خوش گوار اور کیف آور انداز میں بے ترتیب ہوگئی تھیں۔

ایک لمحے میں اسے احساس ہوگیا کہ وہ عارف کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ اس احساس نے اسے اور نروس کر دیا۔ وہ جواب جو وہ عارف کو دینا چاہتی تھی، اس کے لئے اور دشوار ہوگیا تھا۔

اس نے بڑی مشکل سے، کوشش کر کے نظر اٹھائی اور عارف کو دیکھا۔ وہ پہلے ہی سے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کیسے ہیں آپ؟'' اس نے پوچھا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی آواز میں لرزش ہے۔

''آپ نہیں سمجھ سکتیں کہ اس وقت میرا کیا حال ہے؟'' عارف نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

''جی..... میں سمجھی نہیں۔''

''میرا حال اس وقت اس ملزم جیسا ہے، جسے سزائے موت بھی ہو سکتی ہے، اور تمام تر رعنائیوں اور خوشیوں کے ساتھ زندگی بھی مل سکتی ہے اور آج فیصلہ سنائے جانے کا دن ہے۔'' وہ کہتے کہتے رکا اور اس نے گہری سانس لی۔ اس کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

''اب تو آپ سمجھ سکتی ہیں کہ میرا اس وقت کیا حال ہے؟''

''چھوٹی باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے۔''

''زندگی اور موت سے بڑی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔''

''کسی کے ملنے نہ ملنے سے کوئی مر نہیں جاتا۔''

''یہی تو اور بری اور بڑی بات ہے۔'' عارف نے کہا۔

''مر جانا تو آسان بات ہے۔ لیکن جس کے ساتھ جینا آدمی کے لئے زندگی کی سب سے بڑی اور اہم ترین خواہش بن جائے، اس کے بغیر جینا موت سے بھی بدتر ہوتا ہے۔''

نادرہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

''آپ ایسی باتیں کرتے ہیں، جبکہ آپ نے پریشانی دیکھی بھی نہیں۔ مجھے دیکھیں، جو جو کچھ دیکھا اور سہہ چکی ہوں، اس کے بعد بھی زندہ ہوں۔ ایک معصوم بچی کی خاطر۔''

''تو میں آپ کی تمام پریشانیاں ہی تو بانٹنا چاہتا ہوں۔ آپ کے دکھ میرے، اور میری تمام خوشیاں آپ کی۔''

''خوشی تو نصیب سے ہوتی ہے۔ کسی کے دینے سے کہاں ملتی ہے کسی کو، ایسا ہوتا تو دنیا میں بھی کوئی خوشی سے محروم نہیں ہوتا۔'' نادرہ نے آزردگی سے کہا۔

''اب نصیب کا کسی کو کیا پتا؟''

''میرا ہاتھ تھام کر دیکھئے۔ پتا چل جائے گا۔''

''قوتِ فیصلہ سے محروم نادرہ کو اس گفتگو نے اور پریشان کر دیا۔ وہ گھبرا

کر اٹھی۔

''کہاں چلی آپ؟''

''کھانا لگا دوں، تیار ہے۔''

''مجھ یقین ہے کہ آپ کھانا بھی بہت اچھا پکاتی ہوں گی۔'' عارف نے کہا۔

''لیکن یقین کریں، اس بے یقینی کے عالم میں تو لذیذ ترین کھانا بھی میرے حلق سے نہیں اُترے گا۔''

''آپ چاہتے کیا ہیں؟''

''پہلے فیصلہ سنا دیں۔''

''اور فیصلہ آپ کو ناپسند ہوا تو آپ کھانا بھی نہیں کھائیں گے۔''

''وہ تو فیصلہ سننے سے پہلے بھی نہیں کھایا جائے گا۔''

''جی نہیں! ہمارے درمیان یہ بات طے ہوئی تھی کہ آپ کھانا یہاں کھائیں گے، اور پھر میں آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کروں گی۔''

''مجھے یاد ہے۔ لیکن میں التجا کرتا ہوں کہ آپ ترتیب بدل دیں۔''

''جی نہیں!''

''اچھا! ایک وعدہ کر لیں۔ مجھ پر احسان ہوگا آپ کا۔''

''آپ جانتے ہیں، میں وعدہ نہیں کر سکتی۔''

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔'' عارف نے گہری سانس لے کر کہا۔

''میں بے انصاف آدمی نہیں ہوں۔ میں آپ سے اپنے حق میں فیصلہ کرنے کا وعدہ نہیں لوں گا۔''

نادرہ نے ٹٹولنے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

''اچھا! کہئے، کیا چاہتے ہیں آپ؟''

''میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ بھی بے انصافی سے کام نہ لیں۔ چاہے فیصلہ میرے خلاف ہو، مگر اسے سن کر مجھے یہ احساس ہو کہ آپ نے میرے ساتھ بے انصافی نہیں کی ہے۔''

''لیکن آپ کو تو اپنی مرضی کے خلاف فیصلہ بے انصافی ہی لگے گا۔''

''آپ مجھے سمجھی ہی نہیں ابھی تک۔'' عارف نے اداس لہجے میں کہا۔

''نہ میں بے انصاف ہوں، اور نہ ہی نامعقول۔ اور انہی دو باتوں کی آپ سے اُمید رکھتا ہوں۔''

اس لمحے نادرہ کو اس شائستہ اور خوش اطوار شخص پر بہت پیار آیا۔ درحقیقت وہ بہت اچھا اور معقول آدمی تھا۔ لیکن وہ اس سے جو اُمید رکھ رہا تھا، اسے پورا کرنا آسان نہیں تھا۔

اسے ہچکچاتا دیکھ کر عارف نے کہا۔

''ایک بات بتائیں، کیا آپ فیصلہ کر چکی ہیں؟''

''جی نہیں......!''

''تو کھانے کے بعد کریں گی؟''

''مجھے معلوم نہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''دراصل یہ معاملہ میں نے اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔''

''اللہ اپنے بندوں سے کلام تو نہیں کرتا۔'' عارف نے اعتراض کیا۔

''لیکن قلب کے ذریعے ان کی راہنمائی تو کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے، وہ میری راہنمائی کرے گا۔''

عارف کے چہرے سے پریشانی جیسے دھل گئی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

''ارے! یہ تو کمال کر دیا آپ نے۔ لیجئے، میں تو مطمئن ہو گیا کہ بے انصافی ہو ہی نہیں سکتی۔ اب تو آپ کا ہر فیصلہ مجھے منظور ہو گا۔''

نادرہ بھی خوش ہو گئی۔ اس کی خوبیاں کھلتی ہی جا رہی تھیں۔ وہ سچا اور سادہ دل بھی تھا، اور بھروسہ کرنے والا بھی۔ ایسے آدمی سے کون محبت نہیں کرے گا۔

''تو پھر میں......؟''

''جلدی جائیں، اب تو مجھے بہت شدید بھوک لگ رہی ہے۔'' عارف

نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں تو آج ناشتہ بھی نہیں کر سکا ہوں۔''

نادرہ کے دل کا بوجھ جیسے ہٹ گیا۔

مگر کھانا کھاتے ہوئے عارف کے انداز میں بے رغبتی تھی۔

''آپ کو کھانا اچھا نہیں لگا؟'' نادرہ نے پوچھا۔

''جی نہیں......! اتنا لذیذ اور خوش ذائقہ کھانا میں نے پہلے کبھی نہیں کھایا۔''

''آپ کے انداز سے تو ایسا لگ رہا ہے کہ آپ زہر مار کر رہے ہیں۔''

''وہ جب بھوک نہ لگے تو ایسا ہی ہوتا ہے، چاہے کیسی ہی نعمت سامنے رکھی ہو۔''

''ذرا دیر پہلے تو آپ کہہ رہے تھے کہ بہت شدید بھوک لگی ہے۔''

نادرہ نے اسے غور سے دیکھا۔

''جیسے ایک لمحے میں اچانک لگی تھی، ویسے ہی اچانک ختم ہو گئی۔'' عارف نے سادگی سے کہا۔

نادرہ کو اس پر بڑی شدت سے پیار آیا۔ وہ اس سے وجہ نہیں پوچھ سکتی تھی، کیونکہ وجہ اسے معلوم تھی۔ خود اس سے بھی ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا جا رہا تھا۔ وہ اللہ سے جس راہنمائی کی اُمید کر رہی تھی، ابھی تک اس سے محروم تھی اور لمحے تیزی سے گزر رہے تھے۔ جواب دینے کا مرحلہ سر پر آ رہا تھا۔ وہ اسے روکنے کے لئے دھیرے دھیرے، بے دلی کے ساتھ نوالے ٹونگ رہی تھی۔

باآخر وہ دونوں ہی ہاتھ روکنے پر مجبور ہو گئے۔

نادرہ اُٹھنے لگی تو عارف نے کہا۔

''بس نادرہ! مجھے اور آزمائش میں نہ ڈالیں۔''

نادرہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔''

''اب آپ برتن سمیٹیں گی، پھر چائے لائیں گی۔ سکون سے چائے پی جائے گی۔ مگر میرے اعصاب اب یہ بوجھ نہیں اٹھا سکیں گے۔ یقین کیجئے، اب کچھ ہو جائے گا مجھے۔''

''تو پھر؟'' نادرہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

''یہ سب کچھ یہیں رہنے دیجئے۔ آپ پہلے مجھے جواب دے دیجئے۔''

نادرہ نے ہمدردانہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ واقعی بہت زیادہ اعصاب زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ مگر وہ بھی مجبور تھی۔ اللہ کی طرف سے جواب۔ تواب بھی دل پر نہیں اترا تھا۔ ایسے میں تو وہ بس ایک ہی جواب دے سکتی تھی۔ میں اللہ کو گواہ بنا کر کیا ہوا وعدہ نہیں توڑ سکتی۔ بلکہ توڑوں گی بھی نہیں۔ لیکن وہ یہ جواب دینا نہیں چاہتی تھی۔

''دیکھئے! ابھی تو میرے پاس کوئی جواب......'' اس نے معذرت طلب انداز میں بات شروع کی لیکن اسی لمحے جیسے کچھ ہو گیا۔ دماغ میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ وہ اپنی بات پوری کئے بغیر رک گئی ہے۔ پھر اسے یہ بھی نہیں پتا چلا کہ وہ اب کیا کہہ رہی ہے۔

''ٹھیک ہے، میں آپ کو جواب دیتی ہوں۔'' وہ کسی تنویم زدہ معمول کی طرح بول رہی تھی۔

''میں نے جو وعدہ اللہ کو گواہ بنا کر بائی سے کیا تھا، وہ دل کی گہرائی سے، پوری سچائی کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے بعد سے ہر روز میں نے اللہ سے بس یہی دعا کی ہے کہ ارجمند کو اس جہنم سے نکالنے کے لئے غیب سے کسی کو بھیج دیں۔ میں ہر روز اس دعا کی قبولیت کا انتظار کرتی ہوں۔''

عارف چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

''اچھا! کسی دن ایسا ہوگا تو پھر؟ اپنے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے؟''

''اپنے بارے میں سوچنے کو میرے پاس ہے ہی کیا؟ وعدہ مجھے پورا کرنا ہے، جب تک زندگی ہے، اس کوٹھے پر ہی گزارنی ہے اور یہ میرے لئے

بہت بڑی سزا ہے۔ اس لئے دوسری دعا کرتی ہوں کہ اللہ میری ارجمند کو محفوظ کرتے ہی مجھے موت دے دے۔''

عارف جھرجھری لے کر رہ گیا۔

''زندگی کی نعمت کو ٹھکرانا، رد کرنا، اور موت کی دعا کرنا، یہ تو اللہ کے لئے ناپسندیدہ ہے۔ ناشکرا پن ہے۔ اللہ کو غضب ناک کرنا ہے۔''

''بندے کچھ نہیں سمجھتے، کچھ نہیں جانتے، اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ اسی لئے تو اس نے بہت سے معاملات میں استثنیٰ دیا ہے۔'' نادرہ نے سادگی سے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ اللہ اس دعا پر مجھ سے خفا نہیں ہوگا۔''

''میری دعا ہے کہ اللہ آپ سے کبھی خفا نہ ہو۔'' عارف نے بڑے خلوص سے کہا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر اچانک چونک کر بولا۔

''میں بھی کن باتوں میں الجھ گیا۔ یہ آپ نے کیا کہا کہ اپنے بارے میں سوچنے کو آپ کے پاس کچھ ہے ہی نہیں۔ آپ اس کے بارے میں سوچیں، جو آپ کے سارے دکھ درد بانٹنا چاہتا ہے۔ جو عزت سمیت آپ کو ہر خوشی دینا چاہتا ہے۔ وہ میں ہوں۔ آپ میرے بارے میں سوچیں نا۔''

نادرہ نے سر اُٹھا کر عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہاں! آپ ہیں۔ اور میں آپ کے بارے میں سوچتی بھی ہوں۔ حالانکہ دو دن کا ہی تعلق ہے۔''

وہ عارف کے لئے بہت بڑی خوشی تھی۔ پتھر کی جونک لگی تھی۔ وہ اعترافِ محبت کر رہی تھی۔

''اگر آپ کے بارے میں سوچتی نہ ہوتی تو فیصلہ کیا مشکل تھا۔ کل ہی سنا دیتی۔'' نادرہ نے اپنی بات پوری کی۔

''یہ میرے لئے بہت بڑی خوشی ہے۔ اب فیصلہ تو سنا دو۔'' عارف کے لہجے اور تخاطب میں بے تکلفی آ گئی۔

''آپ یہی کہتے ہیں نا کہ بے انصافی نہیں ہونی چاہئے۔''

''جی ہاں!''

"میرا خیال ہے کہ یہ فیصلہ بے انصافی کا نہیں۔"
عارف کی دھڑکنیں جیسے تھمنے لگیں۔
"اب خدا کے لئے کہہ بھی دو۔"
"میرا فیصلہ یہ ہے کہ میں تین مہینے اپنی دعا کی قبولیت کا انتظار کروں گی۔ اگر اس عرصے میں کوئی ارجمند کو اس جہنم سے نکالنے کے لئے نہیں آیا تو میں آپ سے شادی کرلوں گی۔ پھر آپ جہاں لے جائیں گے، میں اور ارجمند آپ کے ساتھ وہاں جائیں گے۔"
خوشی سے عارف کی سانسیں رکنے لگیں، اسے مثبت جواب ملا تھا اور وہ بھی اپنی توقع کے برعکس۔ لیکن پھر اس کے دماغ میں ایک اندیشہ سرسرایا۔
"اور اگر اللہ نے ارجمند کے لئے کوئی نجات دہندہ بھیج دیا تو؟" اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔
نادرہ چند لمحے خاموش رہی۔ جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ جیسے کوئی نامعلوم سرگوشی سننے کے لئے سماعت پر زور دے رہی ہو۔ پھر بالآخر وہ بولی۔
"تب تین ماہ بعد اسی تاریخ کو اگر میں زندہ ہوئی تو خود کو آپ کے سپرد کردوں گی۔"
عارف چوکنا ہوگیا۔
"لیکن آپ خودکشی نہیں کریں گی۔"
"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ خودکشی تو حرام موت ہے۔"
عارف کو خیال آیا کہ نادرہ ہر روز ارجمند کے لئے کوٹھے سے یہ عافیت نجات اور اس کے ساتھ ہی اپنے لئے موت کی دعا کرتی رہی ہے۔ خودکشی تو وہ نہیں کرے گی۔ لیکن موت کی دعا......
"اب کہئے! اس فیصلے میں آپ کے ساتھ بے انصافی تو نہیں ہوئی؟"
"فیصلہ تو آپ کا منصفانہ ہے۔ لیکن ایک معاملے میں مجھے اختلاف ہے۔ اور اس کے علاوہ مجھے آپ سے ایک یقین دہانی بھی چاہئے۔" عارف نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"فرمائیے! میں ہر معقول بات پر غور کروں گی۔"
"پہلے یقین دہانی کے بارے میں بات کروں۔ آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ اب آپ ایسی ویسی دعا کبھی نہیں کریں گی۔"
"یہ کیسے ممکن ہے کہ میں زندہ ہوں اور ارجمند کی بہتری کے لئے دعا نہ کروں۔"
"غلط سمجھیں آپ! میں نے کہا، ایسی ویسی دعا۔" عارف نے بڑے تحمل سے کہا۔
"ابھی ذرا دیر پہلے آپ نے بتایا تھا کہ آپ ہر روز دعا کرتی ہیں کہ ارجمند کو محفوظ کرتے ہی اللہ آپ کو موت دے دے۔ آپ وعدہ کریں کہ اب یہ دعا کبھی نہیں کریں گی۔"
نادرہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر سر کو یقینی جنبش دیتے ہوئے بولی۔
"میں وعدہ کرتی ہوں، اب ایسی دعا کبھی نہیں کروں گی۔"
"اب میں آپ کو اپنے اختلاف کے بارے میں بتاتا ہوں۔" عارف نے کہا۔
"وہ ہے مدت کے بارے میں۔ تین مہینے بہت زیادہ ہیں۔"
"جب فیصلہ غیر منصفانہ نہیں لگا تو پھر آپ اختلاف کیوں کر رہے ہیں؟" نادرہ نے اعتراض کیا۔
"میری بات معقول ہوئی تو آپ ترمیم کرلیں گی۔"
چند لمحے غور کرنے کے بعد نادرہ نے کہا۔
"ٹھیک ہے! لیکن اگر مجھے آپ کی بات معقول نہیں لگی، اور ظاہر ہے کہ آپ تو معقول سمجھ کر ہی کہیں گے......"
"مجھے آپ پر بھروسہ ہے۔ آپ کے نزدیک وہ معقول نہیں ہوئی تو میں دست بردار ہو جاؤں گا۔"
نادرہ نے بڑی محونیت اور محبت سے اسے دیکھا۔
"آپ سچ مچ بہت اچھے ہیں۔ چلئے، کہئے!"

’’آپ کو اللہ پر بھروسہ نہیں ہے۔‘‘ عارف نے پوچھا۔

’’توبہ توبہ! اسی پر تو بھروسہ ہے مجھے۔‘‘

’’آپ یہ یقین نہیں رکھتیں کہ اس کے حکم پر پلک جھپکنے میں کچھ کا کچھ ہوسکتا ہے۔‘‘

’’کیوں نہیں؟ مجھے یقین ہے اس پر۔‘‘

’’تو پھر تین مہینے کی شرط کیوں؟ میرے حق میں تو یہ ظالمانہ فیصلہ ہے۔‘‘

’’بات آپ کی معقول ہے۔ تو آپ کیا چاہتے ہیں؟‘‘

’’اسے ایک ہفتہ کر لیجئے۔‘‘

’’اتنے بڑے فیصلے کے لئے ایک ہفتے کی مدت بہت کم ہے۔‘‘

’’اللہ تو ایک پل میں ناممکن کو ممکن بنا دے۔ جس بات کی آپ دعا کرتی ہیں، وہ تو ناممکن بھی نہیں۔‘‘

نادرہ اس سے نظریں چرانے لگی۔ درحقیقت اس نے ایسی بات کہی تھی کہ وہ اس وقت خود سے بھی نظریں چرا رہی تھی۔ ارے...... آدمی خاک بھروسہ کرتا ہے اللہ پر۔ اس نے دل میں سوچا۔

’’اب کچھ کہئے بھی......‘‘

عارف کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

’’ٹھیک ہے! اسے ایک ماہ کر لیتے ہیں۔‘‘

’’چلیں، منظور ہے۔‘‘

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا دیئے۔ پھر نادرہ اٹھنے لگی تو عارف نے اسے ٹوک دیا۔

’’کہاں جا رہی ہیں؟‘‘

’’برتن سمیٹ لوں۔‘‘

’’کمال کرتی ہیں۔ یہاں بھوک سے برا حال ہے اور آپ کھانا اٹھا رہی ہیں۔‘‘

نادرہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

’’آپ تو کھا چکے تھے۔‘‘

’’خوف کی وجہ سے بھوک ہی اُڑ گئی تھی۔ مگر اب خوف دور ہونے کے بعد تو ایسی بھوک لگی ہے کہ بس۔ ایک بات بتائیں! آپ کو بھوک نہیں لگ رہی؟‘‘

نادرہ نے غور کیا اور ہنس دی۔

’’سچی......! بھوک تو مجھے لگ رہی ہے۔‘‘

’’بس تو آ جائیں۔‘‘

’’ٹھنڈا ہوگیا ہے۔ گرم کر لاؤں؟‘‘

’’اس کی ضرورت نہیں۔ اتنا انتظار نہیں ہوگا۔ ویسے بھی کھانا آپ نے بہت لذیذ بنایا ہے۔‘‘

نادرہ بھی بیٹھ گئی۔ اس بار دونوں بڑی رغبت سے کھا رہے تھے۔

✿ ✿ ✿

اب وہ اس طرح گھل مل کر بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے کہ کوئی انہیں دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ وہ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

ارجمند کو تو معلوم تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ پھر بھی اسے ایسا ہی لگ رہا تھا۔

اور وہ بہت خوش تھی۔ سامنے بیٹھ کر قریب سے دیکھنے پر عارف اسے اور زیادہ اچھا لگا تھا۔ وہ ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھ رہی تھی، اور خوش ہو رہی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اور زیادہ اچھے لگ رہے ہیں۔ جیسے...... جیسے وہ ایک دوسرے کے لئے بنے ہوں۔

پھپھو نے اسے کھانا دیا تھا اور کہا تھا کہ کھانے کے بعد برتن باورچی خانے میں رکھ دے۔ وہ جانتی تھی کہ کون آیا ہوا ہے؟ اس لئے اس نے پھپھو سے اپنے ساتھ کھانے کو کہا بھی نہیں۔

’’اور اس کے علاوہ تم کمرے سے باہر نہیں آؤ گی۔‘‘ پھپھو نے کہا تھا۔

’’چھپ کر دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بری بات ہوتی ہے۔‘‘

وہ اداس ہوگئی۔ اس سے ٹھیک سے کھایا بھی نہیں گیا۔ وہ یہی سوچتی اور کڑھتی رہی کہ پھپھو انہیں کوئی اچھا جواب نہیں دیں گی۔ یہ تو انہوں نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا۔

کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ جائے اور جا کر دیکھے۔ لیکن اس نے خود کو روک لیا۔ پھپھو کا حکم وہ کبھی ٹالتی نہیں تھی۔ مرضی کے خلاف بات بھی وہ مان لیتی تھی۔ ابھی کچھ دن پہلے پھپھو نے اسے چادر جتنا، بہت بڑا دوپٹہ دیا تھا، اور اوڑھنے کا طریقہ بھی بتایا تھا۔ اور انہوں نے کہا تھا کہ اب وہ بغیر دوپٹے کے کبھی کمرے سے نہ نکلے، چاہے سب لوگ سو رہے ہوں۔ اور کمرے میں بھی صرف پھپھو کی موجودگی میں ہی وہ بغیر دوپٹے کے رہ سکتی تھی۔ اسے دوسری عورتوں کے سامنے بھی اس طرح دوپٹہ اوڑھنا تھا، اور یہ پھپھو کا حکم تھا۔

اسے وہ دوپٹہ بہت بھاری، بہت بڑا بوجھ لگتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ جیسے اس کی آزادی سلب کر لی گئی ہے اور اسے اس دوپٹے میں قید کر دیا گیا ہے۔ وہ دوپٹہ اسے ایک تنگ کوٹھری لگتا تھا۔ لیکن پھپھو کا حکم وہ ٹال نہیں سکتی تھی۔ اور پھپھو نے کہا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کہی ہیں، اس کی بہتری کے لئے کہتی ہیں اور ارجمند کو پھپھو کی ہر بات پر یقین تھا۔ پھپھو کبھی جھوٹ نہیں بولتی تھیں۔

سو وہ کمرے میں اکیلی اداس بیٹھی یہی سب کچھ سوچ رہی تھی۔ اکیلی ہونے کے باوجود اس نے بڑے سلیقے سے دوپٹہ اوڑھ لیا، شاید خود کو یہ یاد دلانے کے لئے کہ پھپھو کا حکم چاہے اس کی مرضی کے خلاف ہو، اسے ہر حال میں ماننا ہے۔ وہ اندر ہی اندر جھنجلا رہی تھی۔

اسی وقت پھپھو کمرے میں آگئیں۔

''کھانا کھا لیا تم نے؟''

ان کی آواز اور لہجے میں تازگی اور ایک نئی اور انوکھی سی خوشی تھی۔ جس نے ارجمند کو سر اٹھا کر حیرت سے انہیں دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ یہ آواز اور یہ لہجہ تو اس نے دہلی میں اپنے گھر کے بعد آج سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

اس نے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ پھپھو کے چہرے پر ایسی روشنی تھی کہ وہ

جگمگا رہا تھا۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے؟''

''کیا پھپھو!'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''کھانا کھا لیا تم نے؟''

''جی پھپھو! کھا لیا۔''

''تو چلو میرے ساتھ!''

''کہاں پھپھو؟''

''میں تمہیں عارف سے ملواؤں گی۔''

ارجمند کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

''سچ پھپھو!''

''ہاں بھئی! کیا میں تم سے مذاق کر رہی ہوں۔''

وہ خوشی سے ہڑبڑا کر اٹھی تو دوپٹہ اس کے سر سے ڈھلک گیا۔

''ٹھیک سے دوپٹہ لو سر پر۔'' پھپھو نے تنبیہ لہجے میں کہا۔

اور اب وہ بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھی اور ان کی باتیں سن رہی تھی۔ پھپھو جس طرح باتیں کر رہی تھیں، ان سے نہیں لگتا تھا کہ انہوں نے شادی سے انکار کیا ہوگا۔ اور یہ اس کے لئے بڑی خوشی کی بات تھی۔

''آپ کی پھپھو نے مجھے بتایا کہ آپ ڈرائنگ بہت اچھی کرتی ہیں۔''

عارف اس کی طرف اچانک مڑا۔

''جی..... وہ یوں ہی.....'' ارجمند گڑبڑا گئی۔

''مجھے لا کر تو دکھائیں ذرا۔''

''ارے..... چھوڑیں نا، آپ بھی .....'' اس بار نادرہ بوکھلائی تھی۔

''نہیں بھئی..... ! مجھے تو دیکھنی ہے۔ اچھی لگی تو بہت خوب صورت تحفہ دوں گا بیٹا کو۔''

نادرہ منع تو نہیں کر سکی۔ لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے ارجمند کو تنبیہ کر دی۔

ارجمند سمجھ گئی کہ اس کی ڈرائنگ کی کاپیوں میں سب سے زیادہ تصویریں تو شہزادے کی ہیں۔ پھپھو نہیں چاہتیں کہ وہ انہیں دکھائے اور پھر شہزادے کے بارے میں بات کرے۔

''لایئے نا بیٹا! میں وہ دیکھے بغیر تو نہیں جاؤں گا یہاں سے۔'' جملے کا دوسرا حصہ عارف نے نادرہ سے کہا تھا۔

نادرہ مجبور ہوگئی۔

''لے آؤ ارجمند!'' اس نے کہا۔ مگر اس کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

ارجمند سمجھ گئی کہ اسے شہزادے کے بارے میں بات بالکل نہیں کرنی۔

وہ اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔

نادرہ اب نروس ہو رہی تھی۔ نہ جانے ارجمند کیا کہے، اور عارف کیا سمجھے؟ مگر اب کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔ گھبراہٹ چھپانے کے لئے اس نے عارف سے پوچھا۔

''کیا تحفہ دیں گے آپ ارجمند کو؟''

''یہ کیوں بتاؤں میں؟''

''چلیں، نہ بتائیں۔''

''یہ بات ہے تو بتا دیتا ہوں۔'' عارف نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ایک انگریز نے مجھے ایک نہایت شان دار اسکیچ بک اور بہت ہی اچھا واٹر کلر باکس دیا تھا۔ میرے تو کسی کام کا ہے نہیں۔ وہ میں بیٹا کو دوں گا تو وہ خوش ہو جائے گی۔''

ادھر اپنے کمرے میں ارجمند اپنی ڈرائنگ کی تمام کاپیوں کو چیک کر رہی تھی۔ بڑی تلاش کے بعد اسے ایک ایسی کاپی مل گئی، جس میں شہزادے کی تصویریں قدرے کم تھیں۔ کچھ بازار کے مناظر بھی تھے۔ وہ اس کاپی کو لے کر نکل آئی۔

کاپی لاکر اس نے بڑے ادب اور احترام سے عارف کو دی۔ اسے احساس تھا کہ پھپھو اسے بری طرح گھور رہی ہیں۔ لیکن اسے نظریں اٹھانے کی

جرأت نہیں ہوئی۔ دل ہی دل میں وہ خود کو محتاط رہنے کی تلقین کر رہی تھی۔

عارف نے کاپی کھولی اور پہلی ہی تصویر کو دیکھ کر جیسے بت بن گیا۔ کافی دیر خاموشی رہی۔ پھر عارف نے ارجمند کو دیکھا، جو نظریں جھکائے کھڑی تھی۔

''یہ تصویر تم نے بنائی ہے؟ یقین نہیں آتا؟'' بالآخر اس نے کہا۔

''یہ میری سب سے خراب ڈرائنگ کی کاپی ہے۔'' ارجمند نے نظریں اٹھائے بغیر بڑی سچائی سے کہا۔ جس کاپی میں شہزادے کی تصویریں سب سے کم ہوں، وہ تو سب سے خراب کاپی ہی ہوگی۔

''یہ خراب ہے تو پھر اچھی کیسی ہوگی؟''

ارجمند کی نظریں بے ساختہ اٹھیں تو اس نے نادرہ کو خود کو گھورتے پایا۔

''جی! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ یہ میری سب سے پہلی کاپی ہے نا، اور ابھی تو میں بچی ہوں نا۔''

''کون کہہ سکتا ہے یہ بات؟'' عارف نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور ورق الٹا۔

پوری کاپی کا جائزہ لینے کے بعد عارف نے کہا۔

''اس میں ایک آدمی ہے، جو تم نے بار بار بنایا ہے۔''

''یہ اچھے لگے تھے نا، اس لئے بار بار بن جاتے ہیں خودبخود۔'' ارجمند کے منہ سے نکلا۔ اس کے ساتھ ہی اسے پھپھو کی نظریں اپنے جسم کو چھیدتی محسوس ہونے لگیں۔

''ہاں! چہرے پر شرافت اور معصومیت ہے۔'' عارف نے کہا۔ پھر دھیرے سے بولا۔

''لیکن اس بیک گراؤنڈ میں مس فٹ لگ رہا ہے۔''

ارجمند کی سمجھ میں اس کی دوسری بات نہیں آئی۔ لیکن پھپھو کی نظروں کی گرمی کم کرنے کے لئے اس نے کہا۔

''میں نے زیادہ لوگ دیکھے کہاں ہیں، اس لئے بار بار......''

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' عارف نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔

''لیکن اب میری تصویر تو بنا سکتی ہو نا؟''

''جی! ضرور بناؤں گی۔''

''بس! اب تم جاؤ۔'' نادرہ نے کہا۔

عارف نے کاپی ارجمند کی طرف بڑھائی۔

''تمہارا تحفہ پکا ہوا۔ کل دیکھو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔''

''آپ کی عنایت ہوگی۔'' ارجمند نے کہا اور کاپی لے کر کمرے سے نکل گئی۔

''بہت پیاری، ذہین اور تمیزدار بچی ہے۔'' عارف نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''بس اس کی طرف سے پریشان رہتی ہوں۔ اللہ اسے اپنی امان میں رکھے۔''

''انشاء اللہ یہ اللہ کی امان میں ہی رہے گی۔ اور انشاء اللہ اس کے نصیب بھی اچھے ہوں گے۔''

''بس! تو اب یہ طے ہوگیا کہ آپ اگلے ماہ کی سترہ تاریخ کو یہاں آئیں گے۔ دیکھیں، اللہ کیا فیصلہ کرتا ہے؟'' نادرہ نے کہا۔

''تو کیا میں درمیان میں یہاں نہیں آ سکتا؟'' عارف کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی نہیں...... سترہ تاریخ سے پہلے آپ یہاں ہرگز نہیں آئیں گے۔''

''یہ تو زیادتی ہے۔''

''اس معاملے میں اختلاف مجھے گوارا نہیں۔'' نادرہ کا لہجہ سخت ہوگیا۔

''مگر ایک بات اور ہے۔'' عارف جیسے سہم گیا۔

''فرمایئے!'' نادرہ کے لہجے میں اب بھی سختی تھی۔

''ایک...... ایک کرتا...... ایک جوڑا میرے لئے بھی سی دیں۔''

نادرہ کے چہرے پر ایک دم نرمی چھا گئی۔ پھر وہ بولی تو اس کا لہجہ بھی ریشم سا تھا۔

''ایک نہیں! انشاء اللہ سترہ تاریخ کو دو جوڑے ملیں گے آپ کو۔''

عارف کھل سا گیا۔

''ٹھیک ہے، میں کل کپڑا لیتا آؤں گا۔''

''کل؟ میں نے کہا، اب آپ سترہ تاریخ کو ہی یہاں آئیں گے۔''

''دیکھئے! کل تو آنا ہی ہوگا مجھے۔ ارجمند بیٹی کا تحفہ بیٹی لانا ہے۔ اور مجھے اس سے اپنی تصویر بھی بنوانی ہے۔ اس سے تو آپ مجھے نہیں روک سکتیں۔''

''چلئے، ٹھیک ہے۔'' نادرہ نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔

''لیکن کپڑا لانے کی ضرورت نہیں۔''

''تو پھر؟''

''وہ میں منگوا لوں گی اپنی مرضی سے۔ یہ آپ کے لئے تحفہ ہوگا میری طرف سے۔'' یہ کہتے کہتے نادرہ کے لہجے میں شرمیلا پن آ گیا۔

برسوں کے بعد اس نے خود کو ایک الھڑ اور نوخیز لڑکی کی طرح محسوس کیا تھا۔

''زہے نصیب!'' عارف مسکرایا۔

''تو ناپ تو لے لیجئے۔''

نادرہ نے ایک لمحے کو نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور فوراً ہی نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔

''اس کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ آپ کو کسی طرح کی شکایت نہیں ہوگی۔''

''چھوٹا بڑا ہوا تو ٹھیک بھی آپ سے ہی کراؤں گا۔''

''انشاء اللہ ایسا ہوگا ہی نہیں۔'' نادرہ نے بڑے یقین سے کہا۔ پھر کچھ خیال آنے پر بولی۔

''اور ہاں! کل صبح ہی آیئے گا۔''

''میں تو جانا ہی نہیں چاہتا۔'' عارف نے کہا، پھر شوخ لہجے میں بولا۔

''کھانا بچانا چاہتی ہیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔''

''تو پھر صبح سات بجے آجاؤں؟''

''یہ سروچشم، ہم تو فجر کے وقت اُٹھنے والے ہیں۔''

دونوں بات سے بات نکال رہے تھے۔ دونوں ہی رفاقت کے ان لمحوں کو طول دینا چاہ رہے تھے۔ لیکن جدائی تو طے تھی۔ عارف کو گھٹن محسوس ہونے لگی تو وہ خود ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''اب میں چلتا ہوں نادرہ!''

❁ ❁ ❁

ارجمند کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ سحرزدہ سی اس بہت بڑی اسکیچ بک اور کلر باکس کو دیکھے جا رہی تھی۔ دونوں چیزیں بہت خوب صورت تھیں۔ اسکیچ بک کے بارے میں تو وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ ایسی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ ڈرائنگ کی کاپی سے آگے تو اسے کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔

عارف اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا گڑیا! اچھا نہیں لگا یہ تحفہ آپ کو؟''

''جی...... جی...... بہت خوب صورت ہیں دونوں چیزیں۔''

''آپ کچھ بول ہی نہیں رہی تھیں۔ میں سمجھا......''

''میں لفظ ڈھونڈ رہی تھی، شکریہ ادا کرنے کے لئے۔''

''نہیں ملے نا؟'' عارف نے ہنس کر کہا۔

ارجمند نے کچھ کہا نہیں۔ نفی میں سر ہلا دیا۔

''ملیں گے بھی نہیں۔ لیکن میں آپ کو شکریہ ادا کرنے کا بہت اچھا طریقہ بتا سکتا ہوں۔''

ارجمند نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''اس اسکیچ بک میں آپ سب سے پہلے میری تصویر بنا دیجئے۔ پھر سمجھ لیجئے کہ آپ نے میرا شکریہ ادا کر دیا۔'' عارف نے کہا۔ پھر بولا۔

''ویسے شکریہ کی ضرورت ہے نہیں۔ کیونکہ یہ تو وعدے کے مطابق آپ

کا انعام ہے۔''

ارجمند جو اس کی فرمائش سن کر بوجھل ہوگئی تھی، دوسری بات سن کر خوش ہوگئی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اس خوب صورت اسکیچ بک میں پہلی تصویر وہ اپنے شہزادے کی نہ بنائے۔ پھر بھی اس نے بات بنانے کے لئے کہا۔

''آپ کی تصویر تو میں ضرور بناؤں گی۔ لیکن پہلے کاپی میں بناؤں گی۔ بعد میں اسے اسکیچ بک میں منتقل کرلوں گی تاکہ کچا پن نہ رہے۔''

''جیسی آپ کی مرضی! مگر تصویر آپ کو آج ہی بنانی ہوگی۔ کیونکہ پھر میں ایک ماہ بعد آؤں گا۔''

نادرہ نے اب تک کچھ نہیں کہا تھا۔ خاموشی سے دیکھتی اور سنتی رہی تھی۔ ارجمند نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ بولی۔

''مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو؟ یہ تو تمہاری اور ان کی بات ہے۔''

''ایک بات کہوں اچھی پھپھو! آپ خفا تو نہیں ہوں گی؟'' ارجمند نے بڑی لجاجت سے کہا۔

''کہو گڑیا!''

''آپ ان کے ساتھ اس والے صوفے پر بیٹھ جائیں۔ میں دور اس کھڑکی سے آپ کو دیکھ کر تصویر بنالوں گی۔''

عارف تو خوش ہوگیا۔ لیکن نادرہ بھڑک گئی۔

''میں اس بیچ میں کہاں سے آگئی؟''

''وہ تو آپ پہلے ہی سے ہیں۔'' ارجمند کے بجائے عارف نے کہا۔

''تصویر تمہیں ان کی بنانی ہے۔'' نادرہ نے ارجمند پر آنکھیں نکالیں۔

ارجمند کو اس لمحے پھپھو بہت اچھی، بہت خوب صورت لگیں۔ پرانی جیسی، دہلی والی پھپھو۔ اس نے ایک لمحے کو آنکھیں موند لیں، جیسے نادرہ کے اس عکس کو محفوظ کر رہی ہو۔ کیسی گلابی ہوگئی ہیں پھپھو۔ اس نے دل میں سوچا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولتے ہوئے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

''آپ ناراض نہ ہوں اچھی پھپھو!'' آپ دونوں کی تصویر بہت اچھی

بنے گی۔''

''اور کیا، مجھ اکیلے کی تصویر کیا خاک اچھی بنے گی۔'' عارف نے ٹکڑا لگایا۔

''دیکھا.....! یہ بدتمیزی کی ہے تم نے۔'' نادرہ نے ارجمند کو ڈانٹا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' ارجمند روہانسی ہوگئی۔

''کیوں بچی کو پریشان کر رہی ہیں آپ! میں نے تو مذاق میں کہی تھی یہ بات۔''

نادرہ کہنا چاہتی تھی کہ ساتھ بیٹھنا کیوں ضروری ہے۔ دونوں سامنے بیٹھے ہوں، تب بھی تصویر بن سکتی ہے۔ لیکن وہ بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ ارجمند کھسیا رہی ہے۔ اور وہ اس کا دل میلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''چلو ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔

''لیکن یہ بتاؤ، دیر کتنی لگے گی۔''

ارجمند کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''دیر کیا اچھی پھپھو! دس منٹ بھی نہیں لگیں گے۔''

''صرف دس منٹ!'' عارف نے حیرت سے کہا۔

''اس سے بھی کم، دیکھیں نا، میں بس خاکہ ہی تو اتاروں گی۔ پھر باقاعدہ تصویر تو اپنے کمرے میں جا کر بناؤں گی۔ آپ باتیں کرتے کرتے چونک کر کھڑکی کی طرف دیکھیں گے تو میں غائب ہوں گی۔''

اور واقعی، باتیں کرتے کرتے انہوں نے ایک ساتھ کھڑکی کی طرف دیکھا تو ارجمند وہاں موجود نہیں تھی۔ وہ دونوں ہنسنے لگے۔

''آپ ہنستے ہوئے بہت اچھی لگتی ہیں۔'' عارف نے کہا۔

''تو کیا میں ہنسی تھی؟'' نادرہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''آپ کو نہیں پتا؟''

''بے خیالی میں ہوا ہوگا۔ ورنہ ہنسنا تو میں بھول چکی ہوں۔''

''میرے ساتھ رہیں گی تو سب اچھی باتیں یاد آجائیں گی۔''

''دیکھیں گے عارف صاحب! ہم نے تو کھلے آسمان کے نیچے تیز ہوا میں دیا جلایا ہے۔''

''ایسی اداس باتیں نہ کریں۔ مجھے پورا ایک مہینہ گزارنا ہے۔ اور وہ بھی پل پل کر کے۔ آپ کے پاس تو مصروفیت بھی ہوگی۔ ارجمند بھی ہوگی اور اچھو میاں بھی۔ میرے پاس تو اس انتظار کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جو اکیلے ہونے کی وجہ سے طویل تر لگے گا۔ ایک ایک لمحہ برس کی طرح گزرے گا میرا۔''

''اور یہ بھی نہیں معلوم کہ اس انتظار کا کوئی حاصل بھی ہے یا نہیں۔'' نادرہ نے بے رحمی سے کہا۔ شاید اس طرح وہ اپنے اندر موجود بے یقینی کی اذیت سے لڑ رہی تھی۔

''پلیز نادرہ! ایسی باتیں نہ کریں۔'' عارف اب فریاد کر رہا تھا۔

''تو پھر کیا کروں؟''

''میری مدد کریں۔''

''کس طرح؟''

''اس ایک ماہ کی مسافت کے لئے مجھے کوئی زادِ راہ دے دیں۔''

''میرے پاس ہے ہی کیا؟ میں کیا دے سکتی ہوں آپ کو؟'' نادرہ نے اُداسی سے کہا۔

''اتنا تو کہہ سکتی ہیں کہ آپ بھی مجھ سے محبت کرتی ہیں۔''

''کیسے کہہ دوں۔ میرے پاس نہ محبت کی اہلیت ہے اور نہ ہی حق۔''

''اور ایک ماہ بعد.....؟''

''دیا روشن رہا تو آپ کو انشاء اللہ سب کچھ ملے گا۔'' نادرہ نے کہا۔ پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔

''جھوٹ میں نہیں بولتی۔ فی الوقت تو محبت کرنے کا حق مجھے نہیں ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ میں آپ کو پسند کرتی ہوں۔ بہت زیادہ۔''

''شکریہ! مجھے زادِ راہ مل گیا۔'' عارف نے خوش ہو کر کہا۔

پھر ایک ماہ کے لئے جدا ہونے کا کڑا وقت آ گیا۔ نادرہ اور ارجمند نے دروازے پر عارف کو خدا حافظ کہا۔ اچھو میاں اسے چھوڑنے کے لئے باہر آ گئے۔

کچھ سوچ کر نادرہ کوٹھے پر چلی گئی۔ اسے عارف پر ترس آ رہا تھا۔ وہ تیس دن اس کے لئے درحقیقت بہت سخت ہوں گے۔ اس نے سچ کہا تھا کہ وہ اپنے انتظار میں اکیلا ہوگا۔ سو وہ اسے جاتے جاتے کچھ اور دینا چاہتی تھی۔ کوئی دید، اوہ ہوسکتا ہے، یہ آخری دید ہو۔ اس نے اداسی سے سوچا۔

وہ کوٹھے پر کھڑی عارف کو اچھو میاں کے ساتھ جاتے دیکھتی رہی۔ دل میں پکارتی رہی۔ ایک بار تو پلٹ کر دیکھ لو۔ پھر کون جانے...... کون جانے......

اور بالآخر عارف نے پلٹ کر اسے دیکھا، جیسے وہ پکار اس تک پہنچ گئی ہو۔ وہ مسکرایا اور چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ پلٹ کر چل دیا۔

''الوداع میری آخری محبت۔'' نادرہ نے سرگوشی میں کہا۔ اس کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔

جب تک عارف نظر آتا رہا، وہ کوٹھے پر کھڑی رہی۔ پھر پلٹ آئی۔

❁ ❁ ❁

نور بانو کو ان دنوں ایک اور پریشانی لاحق ہوگئی تھی اور اس کا سبب بھی حمیدہ ہی تھی۔ یہ تو ہمیشہ سے تھا کہ وہ ملازموں سے نچلے طبقے کے لوگوں سے گھل مل کر بات کرتی تھی لیکن ان دنوں وہ نسیمہ اور اس کی بچیوں سے کچھ زیادہ ہی گھل مل گئی تھی۔ بلکہ اس نے انہیں زیادہ ہی سر چڑھا لیا تھا۔ اب نسیمہ کو ساتھ لے کر یعقوب کے ساتھ گاڑی لے کر نکل جانا روز کا معمول بن گیا تھا اور انہوں نے اسے کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہاں کہاں جا رہی ہیں۔

یہ سوچتے ہوئے نور بانو کو احساس ہوا کہ اس کا ایک دکھ تو نہیں۔ یہ دکھ تو اور بڑا تھا کہ اماں اب اسے اپنا نہیں سمجھتی۔ سمجھتیں تو اسے ساتھ لے کر جاتیں۔ نہ جاتیں تو بھی اسے بتاتیں تو کہ کہاں جا رہی ہیں۔

وہ اندر ہی اندر جھنجلاتی، مٹھیاں بھینچتی، غصہ کرتی۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سلسلے میں کیا کرے۔ یہ حقیقت اس نے بہت پہلے تسلیم کر لی تھی

کہ عبدالحق پوری طرح اس کا اسیر ہے۔ لیکن اماں کے مقابلے میں کبھی اس کا ساتھ نہیں دے گا۔ یعنی اسے حمیدہ سے تصادم سے ہر حال میں بچنا ہے۔ یہ بات ویسے ہی اس کے لئے سوہانِ روح تھی کہ حمیدہ اس کی مکمل اقتدار کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اور اب بڑھیا کی یہ من مانیاں، اس کے اندر نفرت امنڈنے لگی۔ نہ جانے کتنے عرصے اور جیے گی یہ۔

حمیدہ اپنے مسئلے میں اس بری طرح الجھی ہوئی تھی کہ اسے نور بانو کے غصے کا بھی پتا نہیں چلا۔ ورنہ نور بانو تو اپنے اندر کا حال چھپانے پر قادر ہی نہیں تھی۔ خاص طور پر غصہ اور نفرت کہ اس کے چہرے پر فوراً غصے اور نفرت کی تحریر اُبھر آتی تھی۔ اور حمیدہ تو ویسے بھی نور بانو کو بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ یہ تو سامنے کی بات تھی، وہ تو اس کے اندر کا حال بھی جان لیتی تھی۔ وہ تو جیسے اس کے اندر اتر کر اسے دیکھ لیتی تھی۔

مگر کب تک؟ آخر ایک دن اسے پتا چل ہی گیا۔

اس روز سر میں کچھ بھاری پن تھا، ہلکا سا درد بھی تھا۔ اس نے نور بانو کو آواز دے لی۔ وہ آئی تو اس نے کہا۔

''دھیے! ذرا میرے سر میں تیل تو لگا دے۔''

نور بانو خاموشی سے تیل کی شیشی لینے چلی گئی۔ لیکن یہ غیر معمولی بات تھی کہ نہ اس نے بلائے جانے پر اس سے پوچھا تھا کہ کیا بات ہے اماں! اور نہ تیل لگانے کی فرمائش پر کچھ کہا تھا۔

نور بانو آئی تو حمیدہ نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ جو کچھ نظر آیا، اسے دیکھنے کے لئے تو ایک نگاہ ہی کافی تھی۔

پھر سر پر تیل ملتے ہوئے بھی اس کی بے دلی کا صاف پتا چل رہا تھا۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔ پھر حمیدہ نے کہا۔

''تو مجھ سے ناراض ہے دھیے!''

''میں کیوں ناراض ہونے لگی؟ میرا ایسا کیا حق ہے آپ پر؟''

حمیدہ نے جان لیا کہ آتش فشاں پھٹنے کو تیار ہے۔

"تو بیٹی ہے میری، میں نے کبھی بہو نہیں سمجھا تجھے۔"

"مجھ سے اچھی تو نوکرانیاں ہیں، جن میں گھسی رہتی ہیں آپ۔" نور بانو نے تنک کر کہا۔

"مجھے تو کئی کئی دن پوچھتی تک نہیں۔"

"تو بیٹی ہے، مجھے پوچھنا، میرا خیال رکھنا تیرا کام ہے، نہ کہ میرا۔ اب میں نے آواز دے کر بلایا اور سر میں تیل لگانے کو کہا تو یہ تو تجھے خود ہی پوچھنا تھا مجھ سے۔ اور تو مجھ سے شکایت کر رہی ہے۔" حمیدہ نے محبت سے کہا۔

"یہ بات آپ کی ٹھیک ہے۔" نور بانو کا لہجہ نرم ہوگیا۔

"لیکن آپ تو نوکرانیوں کو بیٹی پر فوقیت دیتی ہیں۔"

"توبہ توبہ! بیٹی تو بیٹی ہوتی ہے۔" حمیدہ نے کہا۔ پھر بولی۔

"ایک بات بتا! تو اپنی ماں سے بھی ایسے ہی ناراض ہوتی تھی؟"

نور بانو کے تیل لگاتے ہوئے ہاتھ رُک گئے۔ وہ جیسے اپنی دہلی کے گھر میں پہنچ گئی۔

"آپ کے نزدیک میں تو جیسے آپ کی بیٹی ہی نہیں۔" وہ امی سے تلخ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"میں تو نوکرانی ہوں اس گھر کی۔ یہ کرلو، وہ کرلو، یہ کیا کر دیا، تم تو پھوہڑ ہو، بے ڈھنگی ہو۔"

"اے ہے! ایسا کب کہا میں نے؟" امی کے لہجے میں حیرت اور فریاد تھی۔

مگر وہ جب بولتی تھی ایسے میں تو سنائی کچھ نہیں دیتا تھا اور اندر کا ملغوبہ پوری طرح نکالے بغیر رکتی ہی نہیں تھی۔ اس کی زبان چلتی رہی۔

"اور محبت کے لئے یہ دونوں ہیں، حسین و جمیل مہرباں آپ کی۔ مجھے تو آپ نے شاید کسی سے لے کر پال پوس لیا ہے ہمدردی میں۔"

"توبہ توبہ! اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں کسی کے لئے سب سے دعا کرتی ہوں۔" امی نے آسمان کی طرف رخ کر کے جیسے گواہی مانگی۔

"لیکن محبت تو نہیں کرتیں نا؟"

"پتا نہیں! تو محبت کسے سمجھتی ہے؟ اور کیسی محبت چاہتی ہے؟"

"جو صرف میرے لئے ہو، جس میں کوئی شریک نہ ہو۔"

"ایسی محبت میرے اختیار میں ہوتی تو اپنے اللہ سے نہ کرتی۔ تجھ جیسی چڑیل اور جل ککڑی سے کرتی، جو اپنی بہنوں تک سے جلتی ہے۔" امی نے غضب ناک ہو کر کہا۔

ہاتھ کو رکے ہوئے دیر ہوگئی تھی۔ اور نور بانو کا چہرہ حمیدہ کو نظر نہیں آ رہا تھا۔

"تو کہاں کھو گئی دھیے!" اس نے پوچھا۔

"اپنے گھر چلی گئی تھی اماں!" نور بانو نے بہت آہستہ سے، نرم لہجے میں کہا۔

"تو نے جواب نہیں دیا میری بات کا۔"

"وہ سچ ہی تو ڈھونڈ رہی تھی اماں!"

"تو پھر ملا؟"

"ہاں اماں!"

"مجھے بھی بتا۔"

"میں امی سے اس سے بھی زیادہ ناراض ہوتی تھی۔"

"تو پھر اور ناراض ہوا کر مجھ سے۔" حمیدہ نے شفقت سے کہا۔

"مجھے اپنی امی سے کم نہ سمجھا کر۔"

کچھ دیر کے لئے حمیدہ کی محبت نے نور بانو کے دل کے اس غبار کو دھو ڈالا۔

"لیکن اماں! نوکرانیوں کو اتنا سر نہیں چڑھانا چاہئے۔"

"میری بات سن دھیے! دیکھو ہوتے تو سبھی انسان ہیں نا، اور انسان تو سبھی برابر ہوتے ہیں۔"

"لیکن اماں! فرق تو پھر بھی ہوتا ہے۔ چھوٹے آدمی کی سوچ بھی چھوٹی

ہوتی ہے۔''

''نا دھیے! یہ فرق بھی رب نے ڈالا ہے۔ اس میں آزمائش بھی ہے اور یہ یاد دلانا بھی ہے کہ غنی صرف اللہ ہے۔ بندے تو محتاج ہیں۔ اللہ کے تو ہیں ہی، ایک دوسرے کی بھی ہیں۔''

''واہ اماں! کیسی بات کی آپ نے۔ اب بھلا بادشاہ کو کیا محتاجی ہو سکتی ہے؟''

''ہوتی ہے۔'' حمیدہ نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''رعایا کے بغیر بادشاہت کیسی؟ اگر اللہ نے انسانوں میں سے ہی نوکر چاکر، خدمت گار نہ بنائے ہوتے تو بادشاہ کو بادشاہ کون کہتا۔ اور کہتا بھی تو بادشاہت کا کیا فائدہ ہوتا۔ اپنے محل میں خود جھاڑو لگاتا ہوا بادشاہ کیسا لگتا؟ اور دنیا کا نظام کیسا چلتا۔ اناج کون اگاتا۔ تجارت کون کرتا۔ لوگوں کی ضرورتیں کیسے پوری ہوتیں۔ اسی لئے اللہ نے ہر ایک کو اس کا اپنا ایک مقام دیا۔ لیکن ہیں تو سب برابر۔ اللہ کے ہاں تو بڑا وہ ہے جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے۔ چاہے دنیا میں وہ نوکر ہی ہو۔ ظالم اور مغرور بادشاہ بھی اللہ کے ہاں چھوٹا ہوگا۔ تو دھیے! نوکروں سے بھی عزت سے بات کرنی چاہئے۔ ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ قیامت کے دن اللہ ان کے بارے میں بھی پوچھے گا اور پھر اللہ جب چاہے، فقیر کو بادشاہ بنا دے۔ تو کبھی فقیر کی بے عزتی جس نے کی ہوگی، وہ فقیر کے بادشاہ بننے کے بعد اسے جھک کر سلام کرے گا تو اسے کیسا لگے گا۔ اس لئے سب سے عزت سے بات کرنی چاہئے۔''

''لیکن اماں......!''

''دیکھ دھیے! میرے وصال دین کا ابا بھی کمی تھا۔ پر اللہ نے اسے عزت دی۔ اس کا کرم ہے کہ آج میں مالکن ہوں۔ ورنہ میں تو نوکرانی تھی۔''

''میں یہ تو نہیں کہہ رہی ہوں اماں! کہ نوکروں کی بے عزتی کرو۔ میں تو بس سر چڑھانے کے خلاف ہوں۔''

''تو سر کون چڑھاتا ہے؟''

''آپ ہر وقت نسیمہ سے بات کرتی ہیں۔ روز اسے گاڑی میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتی ہیں اور کیسا ہوتا ہے سر چڑھانا؟''

حمیدہ نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

''تو یہ ہے تیرے خیال میں سر چڑھانا؟''

''تو اور کیا؟''

''ایک بات بتا! کبھی تو نے نسیمہ کو مجھ سے بدتمیزی کرتے دیکھا؟''

''نہیں!''

''کبھی تجھ سے بدتمیزی کی اس نے؟''

''نہیں اماں!''

''تو پھر وہ سر چڑھی کہاں سے ہوگئی؟ کبھی دیکھے بھی ہیں سر چڑھے نوکر۔ برابری کرنے لگتے ہیں۔''

''پر روز روز اسے گاڑی میں لے کر جانا......''

''وہ تو اپنی غرض ہے نا، یہ تو اس کا احسان ہے کہ وہ جاتی ہے میرے ساتھ۔'' حمیدہ نے آہ بھر کر کہا۔

نور بانو کا تجسس بھڑک اُٹھا۔

''آپ کی کیا غرض ہے اس سے؟''

''جانے دے اس بات کو۔ یہ میں نہیں بتا سکتی۔''

''آپ نے کبھی مجھ سے ساتھ چلنے کو نہیں کہا اماں!'' نور بانو نے شکایت کی۔

''آپ نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اس طرح آپ نسیمہ کی نظر میں مجھے حقیر کر رہی ہیں۔''

''جب نسیمہ نے تجھ سے کبھی بدتمیزی نہیں کی تو پھر تو یہ بات کیسے کہہ سکتی ہے؟''

''لیکن اماں! آپ نسیمہ کو چھوڑ کر مجھے ساتھ لے جا سکتی تھیں۔''

''نہیں لے جا سکتی نا!'' حمیدہ نے پھر آہ بھری۔

"کیوں نہیں لے جا سکتیں؟"

"تجھے اچھا نہیں لگے گا، اس لئے، تیری ہی تو فکر کرتی ہوں ہر طرح سے۔"

"اچھا! مجھے یہ تو بتا دیں کہ جاتی کہاں ہیں آپ؟"

"کوئی ایک در تھوڑی ہے۔"

نور بانو کو اندازہ ہوگیا کہ حمیدہ اسے کچھ نہیں بتائے گی۔ خود اس نے سوچنا چاہا تو وہ اسے ایسی الجھی ہوئی ڈور لگی، جس کا سرا ڈھونڈے سے بھی نہ ملے۔

تاہم کچھ اہم اشارے تو اسے مل گئے تھے۔ حمیدہ نے کہا تھا کہ غرض اپنی ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ کوئی ایسی جگہ ہوگی، جہاں اس کا جانا معیوب لگے گا۔ تبھی تو حمیدہ نے کہا کہ تجھے اچھا نہیں لگے گا۔ تیسری بات یہ کہ وہ کوئی ایک خاص مقام نہیں۔ بلکہ حمیدہ نے تو ایک طرح سے اسے در در بھٹکنا قرار دیا تھا۔

تو کیا ایسا ہے کہ حمیدہ کو کوئی خطرناک مرض لاحق ہوگیا ہے؟

نور بانو کا دل جیسے اُچھل پڑا۔ شاید کانٹا نکلنے والا ہے۔

اس امکان پر اس نے جتنا سوچا، اتنا ہی اس کا یقین بڑھتا گیا۔ ضرور یہی بات ہے۔ اور یقیناً بڑی بات ہے۔ ورنہ حمیدہ تقریباً ہر روز یوں گھر سے نہ نکلتی، اور رہا سوال یہ کہ وہ کہاں جاتی ہے، تو حمیدہ نے خود ہی کہا تھا کہ وہ در در پھرتی ہے۔ تو یقیناً وہ حکیموں، ویدوں اور سنیاسیوں کے لئے پھرتی ہوگی۔ اب یہ ایسی جگہیں تو نہیں جہاں وہ اسے ساتھ لے جا سکے۔ تو پھر وہ نسیمہ ہی کو تو لے کر جائے گی۔

تمام کڑیاں مل گئی تھیں۔ نور بانو مطمئن ہوگئی۔

ایک اور بات اس کی سمجھ میں آئی۔ جس بیماری میں حمیدہ مبتلا ہے، وہ کوئی عام بیماری نہیں، بلکہ وہ ایسی بیماری ہے کہ وہ اس کے بارے میں عبدالحق کو بھی نہیں بتانا چاہتی۔

چلو، جو بھی ہے، کچھ امکان تو ہے۔ نور بانو نے بڑی بے رحمی سے

سوچا۔ وہ جانتی تھی کہ حمیدہ کی زندگی میں تو اس کا اقتدار بھی مکمل نہیں ہوگا۔ اس کا اور حمیدہ کا رشتہ تو چاند سورج کا رشتہ ہے۔ دن کے وقت، سورج کی روشنی میں چاند بھلا کہاں نظر آتا ہے۔ اسے تو بس رات کو ہی موقع ملتا ہے چمکنے کا۔

✿ ✿ ✿

مقابلے کے امتحان کی تیاری ہی گم ہونے کے باوجود عبدالحق کو احساس ہوگیا کہ پٹرول کا خرچ غیر معمولی حد تک بڑھ گیا ہے۔ وہ تو بمشکل ہفتے میں ایک آدھ بار ہی کہیں نکلتا تھا۔ تو پھر یہ اتنا پٹرول......

اسے یعقوب پر شک ہونے لگا۔ کبھی آدمی پر سے نگاہ ہٹا لی جائے تو وہ خرابی کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ یہ بات اس نے پاکستان آکر سیکھی تھی۔ اور ویسے میں خراب ہونے والا اور خراب کرنے والا، دونوں برابر کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

وہ خود ہی یعقوب کے کوارٹر کی طرف نکل گیا۔

"گڈ نائٹ سر!" یعقوب نے دروازہ کھول کر اسے دیکھتے ہی سلیوٹ کیا۔ پھر اسے کچھ حیران سا دیکھ کر جلدی سے وضاحت کی۔

"رات کا وقت ہے نا سر! یہ سمجھیں کہ میں نے شب بخیر کہا ہے آپ کو۔" انداز ایسا تھا، جیسے کسی ان پڑھ کو سمجھا رہا ہو۔

"اوہ! میں سمجھا نہیں تھا۔"

"کہیں چلنا ہے سر؟"

"نہیں اپنے لان تک چلیں گے ذرا۔"

"میں اپنی کیپ لے آؤں سر!" یعقوب اس وقت بھی وردی میں تھا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔"

عبدالحق اسے لان میں لے گیا اور بے تکلفانہ انداز میں گھاس پر بیٹھ گیا۔

"آؤ بیٹھو۔"

"یہ آپ کی شان اور میری وردی کے خلاف ہے سر!" یعقوب نے صاف انکار کر دیا۔

”آپ ادھر جھولے پر بیٹھیں تو میں نیچے بیٹھ جاؤں گا۔“

”بیٹھ جاؤ! ورنہ تمہاری وردی پر پابندی لگا دوں گا۔“

”نا سر...... سوری سر...... پھر تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔“ یعقوب کی تو جیسے جان نکل گئی۔ وہ بیٹھ گیا۔

”کیا حکم ہے سر!“

”کیسی چل رہی ہے؟“

”بہت بڑا حال ہے سر! انگریز کیا گئے، یہاں تو قاعدہ قانون ہی ختم ہوگیا۔“ یعقوب شروع ہوگیا۔

”ہر ایرا غیرا پولیس والا روک لیتا ہے۔ بس ایک چونی کے لئے۔ ورنہ چالان کی دھمکی دیتا ہے۔ ایسے میں یہ وردی ہی تو کام آتی ہے سر! تین چار لفظ انگریزی کے رسید کرتا ہوں سالے کو، اور کہتا ہوں، پتا بھی ہے، کس کا ڈرائیور ہوں، تب جا کر کہیں سیدھے ہوتے ہیں سالے۔ وردی نہ ہو تو سر! مہینے کے تیس چالیس چالان یا چونیاں تو سر پر پڑیں ہی پڑیں۔“

”ارے! میں گاڑی کے بارے میں پوچھ رہا تھا مسٹر جیکب!“ عبدالحق کو اسے ٹوکنا پڑا۔

”گاڑی کیسے چل رہی ہے؟“

”وہ تو اچھی ہی چلے گی سر! انگلش جو ہے۔“ یعقوب جیکب پکارے جانے پر اور ترنگ میں آگیا۔

”یہ انگریز جو بھی چیز بناتے ہیں، لائف ٹیم ہوتی ہے سر! بس سروس کراتے رہو باقاعدگی سے۔ کوئی پربیلم نہیں سر! گاڑی فس کلاس ہے۔“

”مجھے لگتا ہے، پٹرول زیادہ کھا رہی ہے آج کل۔“

”اوہ نو سر! آج کل چل زیادہ رہی ہے۔“

”اچھا! مجھے تو پتا نہیں، میرا تو آج کل نکلنا ہی نہیں ہوتا۔“

”پر مدر صاحبہ تو روز جاتی ہیں سر! اور ان کا ٹرپ کبھی چھوٹا نہیں ہوتا۔ ابھی تین دن پہلے تو قصور لے گئی تھیں مجھے۔“

”بیگم صاحبہ بھی ہوتی ہیں ساتھ؟“

”نو سر! وہ کالی نوکرانی ہوتی ہے ان کے ساتھ۔“ یعقوب نے منہ بنا کر کہا۔

”تو جاتی کہاں ہیں؟“

”کبھی کسی مزار پر جاتی ہیں سر! تو کبھی کسی زندہ بابے کے پاس۔“ یعقوب نے بدمزگی سے کہا۔

یہ انکشاف عبدالحق کے لئے خلاف توقع تھا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ چند لمحوں میں اس نے خود کو کوشش کر کے سنبھالا۔

”کبھی یہ بھی پتا چلا کہ کیوں جاتی ہیں وہاں؟“ اس نے پوچھا۔

”اب سر! مدر صاحبہ سے تو میں پوچھ نہیں سکتا۔ اور چھوٹے لوگوں سے میں بات نہیں کرتا۔“ یہ دوسری بات کرتے ہوئے یعقوب کے لہجے میں حقارت آگئی۔

”پر مجھے پتا ہے، یہ سب چھوٹے سر کے لئے کرتی ہیں وہ۔“

عبدالحق پریشان ہوگیا۔

”یہ چھوٹے سر کون بلا ہیں مسٹر جیکب؟“

”وہ چھوٹے سر! سوری سر! میرا مطلب ہے سر! مجھے بابا کہنا چاہئے تھا۔“ یعقوب بری طرح گڑبڑا گیا۔

”کوئی زندہ بابا؟“

”وہ بابا نہیں سر! آپ کا بابا...... آپ کا بیٹا سر!“

”کیا بک رہے ہو؟ میرا بیٹا کہاں سے آگیا؟“ عبدالحق کو غصہ آنے لگا۔

”یہی تو میں کہہ رہا ہوں سر! بابا ابھی نہیں ہے اور مدر صاحبہ مزاروں پر اور زندہ بابوں کے پاس اس لئے تو جاتی ہیں سر! کہ آپ کا بابا آجائے۔ وہ دعا کرتی ہیں اور دعا کراتی ہیں اس کے لئے۔“

بات سمجھ میں آئی تو عبدالحق کا دماغ جیسے بھک سے اُڑ گیا۔

''یہ...... یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''انٹیلی جنس سر! انٹیلی جنس!'' یعقوب نے انگشت شہادت سے اپنی کن پٹی تھپ تھپائی۔

''ابے گدھے! وہ تیرے پاس کہاں سے آ گئی۔'' عبدالحق نے بھنا کر کہا۔

''انسلیٹ کرتے ہیں سر! کرنل جعفری بولتا تھا...... تم بھوت ذہین ہے جیکب!''

''کرنل جعفری؟''

''کرنل جعفری پیڈسن سر!''

''وہ کرنل جعفری پیڈسن ہوگا۔'' عبدالحق نے تصیح کی۔

''وہی سر! کرنل جعفری......''

''میں نے پوچھا تھا، تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ میرے لئے بیٹا مانگتی ہیں؟''

''وہی تو بتا رہا ہوں سر! میں اپنے کان کھلے رکھتا ہوں۔ ایک دن مدر صاحبہ اس کالی عورت سے کہہ رہی تھیں۔ اللہ میرے بیٹے کو ایک بیٹا دے دے اور میں اسے گود میں کھلاؤں تو خوشی سے مرنے کے لئے تیار ہوں۔''

''ارے مسٹر جیکب! بس اب تم جاؤ، تھینک یو ویری مچ۔''

''تھینک یو فور تھینک یو سر!'' یعقوب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر کمر کے بل جھکتے ہوئے بولا۔

''گڈ نائٹ سر!''

اس کے جانے کے بعد عبدالحق وہیں گھاس پر ہاتھوں کا تکیہ بنا کر اس پر سر رکھ کر لیٹ گیا اور ستاروں بھرے آسمان کو تکنے لگا۔ بیٹا! اس کا خواب، اور اس خواب کی تعبیر کے لئے اماں در بہ در پھر رہی تھیں۔ اور وہ...... وہ کیا کر رہا تھا؟ وہی جو کر سکتا تھا۔ دعا، صرف دُعا۔ اللہ کہہ رہا تھا۔ یہ جو نطفہ تم گراتے ہو تو سمجھتے ہو کہ تم خالق ہو؟ نہیں! خالق میں ہوں۔ تو پھر آدمی کیا کر سکتا ہے دعا کے

سوا۔ اور اللہ تو مرضی کا مالک ہے۔ دل چاہے تو دریا دے دے، اور دل چاہے تو ایک بوند کو بھی ترسا دے۔

اس نے خود کو ٹٹولا، پھر کھکھوڑا۔ بیٹے کی آرزو تو بہت شدید تھی۔ لیکن وہ بس دعا پر قانع اور مطمئن تھا۔ اس کے اندر کوئی بے چینی نہیں تھی۔ کوئی جھنجلاہٹ نہیں تھی۔ وہ بس اس سے مانگتا تھا، جو دینے والا ہے۔ لیکن اماں......

اماں کی بے چینی اور تڑپ سے وہ بے خبر تھا۔ مگر اب اسے محسوس کر سکتا تھا۔ وہ تو اس کے لئے قصور تک ہو آئی تھی۔ ہر روز در در کی خاک چھانتی تھی۔ جیسے کسی در سے کوئی بابا اس کی جھولی میں ننھا سا بچہ ڈال دے گا۔ کیسی بھولی ہے اماں۔ ایسے کہیں بچہ ملتا ہے۔ ارے وہ تو جب اللہ کی مرضی ہوگی تو ملے گا۔ اور وہ بھی اماں کی جھولی میں نہیں ٹپکے گا۔ وہ تو نور بانو کی کوکھ میں اترے گا۔ پورا سسٹم ہے اللہ کا بنایا ہوا۔ ایسے تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

اس کے پتا جی اور ماتا جی بھی اسی طرح در در بھٹکتے تھے اس کے لئے۔ پر اماں تو مسلمان ہے۔ ایمان پر پیدا ہوئی ہے۔ یہ اماں کو کیا ہوگیا۔ سہارا دینے والی واحد ذات کو چھوڑ کر ادھر ادھر سہارے تلاش کر رہی ہے۔ جبکہ وہ تو بعد میں ایمان لایا ہے۔ اماں جیسا ایمان تو نہیں ہوگا اس کا۔ مگر وہ تو بس اللہ سے مانگتا ہے۔

یہ بھی سسٹم ہی ہے۔ اللہ کا بنایا ہوا۔ اس کے اندر سے کسی نے کہا۔ اس نے ہر انسان کو ایک جیسے نقوش کے باوجود الگ الگ صورت دی، ویسے ہی شخصیت، کردار اور مزاج بھی الگ الگ دیا۔ سب کی اپنی اپنی سوچ ہے۔ اور اللہ نے انسانوں کو برابر تو نہیں بنایا۔ ہر اعتبار سے درجے ہیں، تفریق ہے۔ بادشاہ، امیر، غریب، فقیر، آخر میں تلیں گے سب اپنے اپنے عمل پر اور تقویٰ پر، کون کتنا ڈرتا رہا اللہ سے۔ یہی حال ایمان کا ہے۔ کوئی ایمان کے کسی درجے پر ہے، اور کوئی کسی درجے پر۔ پھر ایمان گھٹتا بڑھتا بھی تو ہے۔ آزمائش کا کوئی باٹ ترازو میں آ گرتا ہے تو اس بات اور آدمی کی ظرف کی نسبت سے ایمان ہلکا ہو جاتا ہے۔ آزمائش کا لمحہ گزر جاتا ہے تو کبھی بحال ہو جاتا ہے۔ کبھی بڑھ جاتا ہے اور

بھی گھٹ جاتا ہے۔ اور کسی کو اللہ ظرف اور استقامت دے تو بہت بھاری بات سے بھی ایمان ہلکا نہیں ہوتا۔

اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ بہت عرصے کے بعد، وہ بہت پہلے کے سے انداز میں سوچ رہا ہے۔

کسی نے کہا تھا کہ جتنے انسان ہیں، اللہ تک پہنچنے کے اتنے ہی راستے ہیں۔ تو اللہ نے گنجائش سب کے لئے برابر چھوڑی ہے۔ کوئی یہ شکایت نہیں کر سکتا کہ مجھے تجھ تک پہنچنے کا راستہ نہیں ملا۔ اپنے مزاج کی مناسبت سے اپنے راستے پر چلو۔ ہر راستے کا انت اللہ ہے۔

اللہ نے فرمایا کہ وہ ہماری رگِ جاں سے بھی نزدیک ہے۔ وہ سب سنتا، دیکھتا اور جانتا ہے۔ اس نے کہا۔ مجھ سے مانگو۔ مجھے تمہارا مانگنا اچھا لگتا ہے۔ میں تمہیں دوں گا۔ لیکن کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ مانگے جاؤ اور کچھ نہیں ملے۔

اسے یاد آیا، مولوی مہر علی سے کسی نے یہی کہا تھا تو مولوی صاحب نے کہا۔

''جب ایسا ہو تو کثرت سے استغفار کرو۔''

اس آدمی نے شکایتی نظروں سے مولوی صاحب کو دیکھا۔

''اتنے لوگوں میں ایک میں ہی گناہ گار نظر آتا ہوں آپ کو؟ چھوٹے موٹے گناہ تو سبھی کرتے ہیں۔ میں کوئی برا آدمی تو نہیں۔''

''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم گناہ گار ہو۔'' مولوی صاحب نے بڑے تحمل اور محبت سے کہا۔

''بزرگوں نے کہا ہے کہ دعا قبول نہ ہو، پریشانیاں گھیر لیں اور نہ ٹلیں، اور بارش نہ ہو تو استغفار کرو۔ اور دیکھو، ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم روز استغفار کرتے تھے۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی تلقین کرتے تھے اس کی۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم بھی وہ، جنہیں ان کی زندگی میں مغفرت اور جنت کی نوید مل گئی تھی۔ ہم تو ہیں ہی معمولی اور گناہ گار لوگ۔ دن میں لاکھوں گناہ تو بے خبری میں

ہی کرتے ہیں۔''

تو ایک بات تو یہ ہوئی۔ دوسرا زاویہ بھی مولوی صاحب نے ہی دکھایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا، ہمیں تو اگلے پل کی خبر نہیں، اور اللہ ابد تک سب کچھ جانتا ہے۔ ہم بے خبری میں ایسی دعا کرتے ہیں، جس میں ہمارے لئے زر ہوتا ہے۔ تو سب جاننے والا رب ہماری بہتری کی خاطر اس دعا کو قبول نہیں کرتا۔ یہ اس کی رحمت ہے کہ وہ اسے آخرت کے لئے جمع کر لیتا ہے اور وہاں انشاء اللہ اس کا زیادہ بہتر اجر دے گا۔

اور اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے دعا کرنے کا حکم بھی تو ہے۔ اس حکم کا دوسرا پہلو یہ بھی تو ہوا کہ دوسروں سے اپنے لئے دعا کو کہو۔ اور لوگ ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔ دعاؤں میں یاد رکھنا۔

اور یہ بھی طے ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو دنیا کی ہر نعمت سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں تو وہ اللہ کے دوست ہیں۔ اولیاء...... ہمیں اس کا علم ہو یا نہ ہو، تو اللہ...... سب کچھ جاننے والا اللہ ان کی دعا تو نہیں ٹالے گا۔ تو اماں اگر ایسے لوگوں کے پاس دعا کرانے کے لئے جاتی ہیں تو اس میں حرج کیا ہے؟

لیکن مزار والی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ صاحب مزار اپنی قبر میں تو نہیں ہوگا۔ وہ تو عالم ارواح میں ہوگا۔ اللہ کا ولی ہے تو اللہ کی رحمت کے سائے میں ہوگا۔ اور پھر کسی سے دعا کرانا اور بات ہے۔ اور غیر اللہ سے مانگنا اور بات۔ اسے یاد تھا، مزار پر ایک عورت بلند آواز میں پکار رہی تھی۔ داتا صاحب! مجھے تو بیٹا چاہئے..... بیٹا، تمہارے در سے لے کر ہی ٹلوں گی۔ تو کیا داتا صاحب اسے بیٹا دینے کی قدرت رکھتے ہیں؟ وہ کانپ گیا۔ نہیں بھئی..... وہ عورت جانے، داتا جانے اور اللہ جانے۔ مجھے یہ سب کچھ نہیں سوچنا۔ میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ اللہ کے ہاں شرک کی معافی نہیں۔

بیٹے کی آرزو تو اسے بھی بہت تھی کہ وہ ہو تو اس کی ایمان والی نسل چلے۔ دل تو اس کا بھی چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ کرے، لیکن شرک سے ڈرتا تھا۔

مولوی صاحب سے البتہ وہ دعا کے لئے کہتا رہتا تھا۔ لیکن اور کسی سے کہتے ہوئے اسے شرم آتی تھی۔

مگر اماں اس کے لئے ہر جگہ بیٹا مانگتی پھر رہی تھیں۔

اس نے سوچا، اللہ کو عاجزی اور انکساری بہت پسند ہے بندے میں، تو یہ تو اماں کا عجز ہی تھا۔ وہ تو گھر کی ملازمہ نسیمہ سے ہی دعا کے لئے کہتی تھیں۔ کہتی تھیں، اللہ نے میرے عبدالحق کو بیٹا دیا تو میں خوش کر دوں گی تجھے۔ تو کوئی کسی سے اپنے لئے دعا کو کہے تو وہ اس کو خود سے بہتر سمجھ رہا ہوتا ہے۔ وہ شخص کتنا اچھا لگے گا اللہ کو، جو دنیا میں ہر شخص کو خود سے بہتر سمجھتا ہو۔ تو اماں تو بہت اچھی ہیں۔ لیکن یہ مزاروں پر جانا......

پھر اس کی سمجھ میں ایک بات آئی۔ ہر شخص کا زاویہ نظر اور اس کا عمل درست ہو سکتا ہے۔ خواہ بظاہر غلط نظر آ رہا ہو۔ بنیادی شرط ایک ہی ہے۔ اللہ کا ڈر۔ اس شرط کے ساتھ دلوں کا حال...... سب کچھ جاننے والے ربّ نے برابر کی گنجائش چھوڑی ہے۔ اور پھر ہر بندے کا اللہ کے ساتھ الگ معاملہ ہے۔ دوسرے بندوں کا کیا بیچ۔ جو اللہ کے محبوب دوستوں سے محبت کرتے ہیں تو وہ اللہ ہی سے تو محبت کر رہے ہوتے ہیں۔ بس اس کی محبت میں بھی شرک کی طرف سے خبردار رہنا چاہئے۔ ایک لمحے میں آدمی مغفرت سے محروم ہو سکتا ہے۔

اس نے خود کو ٹٹولا۔ وہ جو بس خود ہی دعا کرتا ہے اپنے لئے تو یہ غرور تو نہیں۔ ایسا تو نہیں کہ وہ دوسروں کو اس قابل نہیں سمجھتا ہو۔ اس کا جواب نفی میں تھا، اور بالکل سچا تھا۔ وہ بس محتاط تھا۔ اور محتاط بندوں کے لئے اللہ نے بتا دیا تھا کہ وہ ان کی رگِ جاں سے بھی نزدیک تر ہے۔ اور وہ سمیع و بصیر اور علیم و خبیر ہے۔ اس کا دل مطمئن ہو گیا کہ وہ راستی پر ہے، اور دوسروں کو جواب وہی بھی اس کے ذمے نہیں۔

اس نے سوچا، اور یاد کیا۔ وہ اللہ سے اپنے لئے بیٹا مانگتا ہے تو اس کے دل میں ایک ہی خیال ہوتا ہے۔ یہ کہ اس کے زندگی کے آخری ایام میں ایمان سے سرفراز ہونے والے باپ کی نسل آگے بڑھے۔ یہ اس کے اور اس کے

باپ کے لئے اعزاز ہوگا۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔ اسی لئے تو وہ اس کے لئے اتنا تڑپ رہا تھا۔

مگر یہ طے تھا کہ اماں کی تڑپ اس کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ تبھی تو وہ یوں ماری ماری پھر رہی ہیں۔ لیکن کیوں؟ اماں کی تڑپ اس سے بڑھ کر کیوں ہے؟

وہ اس پر سوچنے لگا۔

اس میں تو کوئی شک ہی نہیں تھا کہ اماں اس سے اپنے بیٹے سے بھی زیادہ محبت کرتی تھیں۔ اسے یاد تھا، لال آندھی آنے سے پہلے کیسے وہ اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اسے کچھ دینے کو، زندگی کا زادِ راہ دینے کو۔ اور جب اس نے انہیں چاچا اور ویرجی کی موت کے بارے میں بتایا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ انہیں یہ بات معلوم ہے۔ انہوں نے اسے دھکیل کر وہاں سے بھگا دیا تھا، اور خود وہیں رہ گئی تھیں۔ اپنی دانست میں اس کی دولت کو محفوظ کرنے کے لئے، جو درحقیقت انہی کی تھی، اور وہ اس کی وہ دولت سمیٹ کر آنکھوں سے محروم ہونے کے باوجود اس کا انتظار کرتی رہیں۔

ایک تو اس کے لئے اماں کی بے پناہ محبت، پھر اس کے پتا جی سے رشتہ وفا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے پاس جینے کے لئے اس کے سوا بچا ہی کیا تھا؟ تو اس کے لئے ان کے بیٹے کی آرزو تو فطری تھی۔

یہ تو ایک پہلو تھا۔ دوسرا یہ تھا کہ وہ اپنے شوہر اور اکلوتے بیٹے کو کھو چکی تھیں۔ ان کے شوہر کی نسل منقطع ہو چکی تھی۔ لیکن ایک بہت بڑا رشتہ، بہت بڑا امکان ان کے لئے موجود تھا۔ انہوں نے اسے بہت محبت سے دودھ پلایا تھا۔ اور اس وقت انہیں معلوم بھی نہیں تھا کہ زندگی میں ایک مرحلے پر یہ تعلق اتنا اہم ہو جائے گا کہ وہ صرف اسی کے سہارے زندگی کا ایک طویل حصہ گزاریں گی۔

خون کا رشتہ خون سے ہوتا ہے۔ لیکن خون بھی تو ماں کے دودھ سے بنتا ہے۔ تبھی تو دودھ پلانے والی کو ماں کا درجہ ملتا ہے، اور اس کی اولاد سگے بھائی بہنوں جیسی ہوتی ہے۔ محرم کہلاتی ہے۔

تو اماں کے لئے اس کے بچے کی اہمیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کا پوتا ہوگا اور ماں باپ کو اولاد کی اولاد بہت عزیز ہوتی ہے۔ اور یوں بھی کہ اس کی شکل میں اماں کو جینے کا اور مضبوط جواز مل جائے گا۔

اماں کے لئے تو وہ ایک طرح سے ویر جی..... وصال دین کا بھی بیٹا ہوگا۔ کیونکہ اس کی رگوں میں ان کے دودھ سے بننے والا خون دوڑ رہا ہوگا۔ وہ ان کا پوتا ہوگا۔

پھر وہ اس سے محبت کرتی ہیں۔ وہ پتا جی کی عزت کرتی تھیں۔ اب جبکہ انہیں معلوم ہے کہ پتا جی تو اس سے بھی پہلے مسلمان ہو چکے تھے تو وہ ان کی نسل کو بڑھتے دیکھنا چاہیں گی۔

وہ سمجھ گیا کہ اس کے پاس بیٹے کی چاہت کے لئے صرف ایک زاویہ تھا۔ لیکن اماں کے پاس کئی زاویے ہیں۔ اس لئے تو ان کی تڑپ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اسی لئے تو وہ اس کے لئے در در بیٹا مانگتی پھر رہی ہیں، جیسے بیٹا کوئی سکہ ہے کہ کوئی بھی ان کے کاسے میں ڈال دے گا۔

اس لمحے اسے اپنی خودغرضی کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ صرف اپنے، اپنے پتا جی اور اپنی نسل کے لئے بیٹے کی خواہش کر رہا ہے۔ اس نے کبھی نہیں سوچا کہ اماں کو اس کے بیٹے کی اس سے زیادہ ضرورت ہے۔ کیا محبت کرتا ہے وہ اماں سے؟ اور اس نے کبھی نہیں سوچا کہ نور بانو کو بھی اولاد کی آرزو ہوگی۔ اسے نور بانو کا خیال کبھی نہیں آیا۔ کیسا خودغرض ہے وہ.....

مگر اسی لمحے اسے نور بانو کی بے ساختہ کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔ نور بانو نے کہا تھا..... مجھے اولاد کی کمی کیوں محسوس نہیں ہوتی۔ پھر اس کے چہرے کا تاثر دیکھ کر اس نے بات بدل دی تھی۔

لیکن اب عبدالحق سمجھ سکتا تھا کہ نور بانو نے سچ کہا تھا۔ وہ کبھی اولاد کے لئے پریشان نہیں ہوئی تھی۔ پریشانی تو وہ چھپا ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کی پریشانی ہمیشہ جھنجلاہٹ کی شکل میں سامنے آتی تھی۔ وہ پریشان صرف اس کے لئے ہوتی تھی۔ کبھی اس کی دانست میں وہ اسے کم توجہ دیتا تو وہ پریشان ہوتی اور

جھنجلاتی۔ کبھی وہ دوسروں کو..... زرینہ کو، بھائی اور آپا کو اور ان کے بچوں کو زیادہ وقت دیتا تو اسے غصہ آتا، اور کسی نہ کسی طرح وہ اس کا اظہار کر دیتی۔ لیکن اس نے زرینہ اور آپا کے بچوں کو دیکھ کر بھی کبھی اپنے لئے بچے کی آرزو نہیں کی تھی۔

یہ تو بڑی غیر فطری بات ہے۔ عبدالحق نے سوچا۔ شاید اس لئے کہ وہ بس مجھ پر قناعت کر کے بیٹھ گئی ہے۔ شاید وہ مجھے کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرنا چاہتی۔ بچوں کے ساتھ بھی نہیں۔

اس خیال پر نہ جانے کیوں عبدالحق خوفزدہ ہوگیا۔ یہ کیسی باتیں سوچ رہا ہے وہ۔ ایسا کہیں ہوتا ہے بھلا۔ اولاد تو مرد اور عورت کے رشتے کو مضبوط کرتی ہے، وہ تو مشترکہ دولت ہوتی ہے۔

وہ اٹھا اور اندر چلا گیا۔

❁ ❁ ❁

نادرہ کے لئے وہ طویل انتظار تھا۔ شاید اس لئے کہ اسے نہیں معلوم تھا کہ اللہ کیا فیصلہ کریں گے۔ شاید اس لئے بھی کہ وہ اس معاملے میں غیر جانبدار نہیں رہی تھی۔ نہ جانے کب، کیسے وہ عارف کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔ اور اب اسے پتا چل رہا تھا کہ کسی کی محبت زندگی کی محبت کو کیسے بڑھا دیتی ہے۔ وہ جو ہر وقت مرنے کے لئے تیار رہتی تھی، اب موت سے ڈرنے لگی تھی۔

اور محبت کی سرشاری کا بھی اسے پہلی بار پتا چلا تھا۔ کام کرتے کرتے اچانک عارف کا چہرہ سامنے آ جاتا۔ اور اس کا ہاتھ خود بخود رک جاتا۔ اسے پتا بھی نہ چلتا اور وہ دیر تک ایسے ہی بیٹھی رہتی۔ پھر کوئی آ کر اسے چونکاتا، یا وہ خود چونکتی تو اسے بہت اچھا لگتا۔ شرم بھی آتی۔

کیسی عجیب بات ہے۔ وہ سوچتی۔ مجھے محبت بھی ہوئی تو کب اور کہاں؟ متاعِ آبرو پامال ہو جانے کے بعد اور طوائف کے کوٹھے پر؟ پھر اسے خیال آتا کہ یہ بھی اللہ کا کرم، اسی کی عطا ہے۔

اور اتنی تلخی کے بعد کیسے ہوگئی اسے محبت؟

جواب میں وہ تصور میں عارف کو دیکھتی، اس کی باتیں سنتی، اور اسی کی

سمجھ میں آ جاتا۔ جب اس نے سمن کے انداز میں عارف سے عارف کے لئے محبت محسوس کی تھی۔ تو وہ بہت حیران ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بدنصیب عورت طوائف بنتے ہی محبت کے جذبے سے محروم ہو جاتی ہے۔ پھر اس سمن کو کیا ہوگیا؟ طوائف کی محبت تو حماقت ہی کہلاتی ہے۔

لیکن جب اس نے عارف کو دیکھا تو سمجھ لیا۔ ایسے شخص سے تو محبت کئے بغیر رہا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ ہے ہی ایسا۔ اور جس سے عارف محبت کرے، تو وہ اس کے لئے اعزاز ہی ہوگا۔ تو اللہ نے یہ اعزاز اسے عطا فرما دیا تھا۔

اور اب تیس دن کاٹنا تھے۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اسے تو ایسا لگ رہا تھا کہ تین ہفتے گزر گئے ہیں۔ لیکن اخبار پر تاریخ دیکھ کر پتا چلا کہ ابھی تو صرف تین دن گزرے ہیں، صرف تین دن۔ یا اللہ! یہ انتظار کے دن ایک ایک پل کر کے کیوں گزرتے ہیں؟

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس وقت کا تصور کرنے لگتی، جب وہ عارف کے ساتھ ہوگی۔ عزت کی محبت بھری زندگی۔ لیکن پھر دل میں کانٹا سا چبھ جاتا۔ اسے یہ سوچنے کا حق نہیں تھا۔ اس نے نیلم بائی سے وعدہ کیا تھا کہ نہ وہ خودکشی کرے گی، اور نہ ہی کبھی کوٹھا چھوڑے گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے فیصلہ اسی اللہ پر چھوڑا ہے جسے گواہ بنا کر نیلم بائی سے وعدہ کیا تھا۔ لیکن اس کے اندر کہیں بہت گہرائی میں یہ خیال موجود تھا کہ اس عہد شکنی کے بعد وہ کسی حال میں بھی خوش نہیں رہ سکتی۔ حتیٰ کہ عارف بھی اسے خوش نہیں رکھ سکتا۔ اسے بس وعدہ نبھانا چاہئے۔

اور یہ خیال آتا تو مایوسی کی تیز لہر اس کے وجود کو اندر سے تہ و بالا کر کے گزر جاتی۔ وہ اداس اور بے چین ہو جاتی۔ زندگی محبت، خوشیوں، اور رعنائیوں کے ساتھ سامنے کھڑی اسے بلا رہی ہے اور اشارے کر رہی ہے۔ دو قدم کا فاصلہ ہے۔ لیکن وہ جانتی ہے، اس کا ضمیر بتاتا ہے کہ اس زندگی سے زیادہ وہ موت کی مستحق ہے۔ کم از کم اس محبت، خوشیوں اور رعنائیوں سے سجی اس زندگی پر اس کا ذرا بھی حق نہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے اندر جیسے خوش ہونے کی

خوبی دم توڑ دیتی۔

وہ سوچتی کہ فیصلے کا حق تو اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا بھی نہیں ہے تو پھر کیا اسے یہ حق بھی حاصل نہیں کہ اپنے تصور میں تھوڑے سے دن اپنی پسند کی زندگی جی لے۔ پھر کون جانے، فیصلہ کیا ہو؟ اس تصور کے ساتھ یہ ایک مہینہ اس کے لئے حاصل عمر ہو سکتا ہے۔ اس میں تو زندگی اور تقدیر کے دیئے ہوئے ہر دکھ اور ہر ذلت کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

لیکن ضمیر بہت طاقتور تھا، اور وہ اس کے مقابلے میں بہت کمزور تھی۔ ضمیر کہتا تھا، اسے تصور کا بھی حق نہیں۔ یہ ایک مہینہ تو اسے پہلے کی طرح گزارنا ہے۔ ہاں، فیصلہ حق میں آ گیا تو پھر تصور کی ضرورت نہیں۔ حقیقی زندگی ہی محبت، خوشیوں اور رعنائیوں کے ساتھ مل جائے گی۔ اس عرصے میں یہ خوش کن تصور تو درحقیقت عہد سے منہ موڑنے کے مترادف ہے۔

وہ اچھی..... بہت اچھی تھی۔ اس لئے ضمیر سے ہار گئی۔ ورنہ ضمیر سے کون ہارتا ہے۔ ضمیر کو ہرا بھی نہیں سکتے۔ تو سنی ان سنی کر کے اس کی آواز دبا دیتے ہیں، اسے سلا دیتے ہیں۔

پہلی بار اس کے سامنے ایک خوشگوار مستقبل کا امکان آیا تھا۔ اس کے تصور سے گریز کرنا آسان نہیں تھا۔ سو اس نے خود کو مصروف کر لیا۔ لیکن کام کرنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اور پھر نگاہ کا کام۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگتا تھا۔ اور پھر یہ اندیشہ الگ کہ نگاہ ہی نہیں جم رہی تو کام اچھا کیسے ہوگا؟

تو جب کام کرنا ممکن نہ رہتا تو وہ قرآن کی تلاوت کرتی۔ نماز تو وقت سے تھی۔ البتہ دعا سے وہ محروم ہوگئی تھی۔ اپنے لئے دعا کرنے کی تو اس میں ہمت ہی نہیں تھی۔ عارف نے اچھا کیا کہ اسے پابند کر دیا۔ ورنہ ذہنی خلفشار اور مایوسی کی اس کیفیت میں وہ موت کے سوا اور کیا دعا کرتی۔ ہاں! ارجمند کے لئے وہ بڑی شدت سے دعا کرتی کہ اللہ اسے اس جہنم سے نکال دے۔

اس نے اپنے تصور کے لئے یہ پابندی تو قبول کر لی کہ وہ مستقبل بینی نہیں کرے گی۔ لیکن عارف کے لئے تو وہ خود ہی خود کو پابند نہیں کر سکتی تھی اور وہ

بھی آزاد تھا۔ جب چاہتا، تصور میں اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ اور کبھی کبھی تو تادیر اسے اس بات کا علم بھی نہ ہوتا۔

پھر اس کے جی میں کیا آئی کہ ہاتھ کا کام چھوڑ کر وہ عارف کے لئے دو جوڑے تیار کرنے میں لگ گئی۔ وہ ان پر ایسی خوب صورت کڑھائی کرنا چاہتی تھی، جو اس نے پہلے کبھی نہیں کی ہو۔ بہت باریک، بہت نفیس، بہت خوب صورت۔

اور یہ اس کے لئے کچھ مشکل نہیں تھا۔ اتنی محبت سے تو اس نے پہلے کبھی کچھ کیا ہی نہیں تھا۔

✿ ✿ ✿

اس کوٹھے پر گزرنے والی زندگی میں اچھو میاں پہلی بار اتنے خوش تھے۔

عارف اور نادرہ کے معاملے میں انہیں بڑی تشویش تھی۔ اس کی وجہ صرف اور صرف نادرہ تھی۔ ان کے خیال میں نادرہ کا سوچنے کا انداز بہت منفی تھا۔

ان کے نزدیک وہ سادہ سا معاملہ تھا۔ انہوں نے قرآن میں پڑھا تھا کہ ہر اچھی بات، ہر اچھی چیز اللہ کی طرف سے ہے۔ اور ان کے لئے یہ کافی تھا۔ قرآن کی کسی بات پر شک کرنا تو کفر ہے۔

تو وہ اپنے وجود کی سچائی کے ساتھ یہ یقین رکھتے تھے کہ یہ اللہ نے نادرہ اور ارجمند کی نجات کا راستہ نکالا ہے۔ عارف یوں ہی اتفاقاً نہیں چلا آیا تھا۔ اسے اللہ نے بھیجا تھا۔ تو پھر اس سے منہ موڑنا کیسا؟

لیکن نادرہ کی منطق بالکل مختلف تھی۔ اس کے نزدیک یہ آزمائش تھی، ویسی ہی آزمائش جیسی اس دنیا میں دی جانے والی زندگی ہے، جس سے آدمی دل لگا بیٹھتا ہے۔ اس کے نزدیک وہ عہد ہر چیز سے مقدس تھا، جو اس نے خدا کو گواہ بنا کر نیلم بائی سے کیا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اسے نبھانا ہر چیز سے زیادہ ضروری ہے۔
اپنا یقین اپنی جگہ، لیکن اچھو میاں نادرہ سے اختلاف بھی نہیں کر سکتے۔

عہد کی تو بڑی اہمیت ہے۔ اور ہر انسان سے پہلا عہد تو اللہ نے ہی لیا ہے۔ عہد شکنی اللہ کو ناراض کرتی ہے۔

وہ ایسی بند گلی تھی، جس سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اور ایسا تھا، جیسے واپسی کے راستے میں کوئی خون خوار کتا کھڑا ہو۔

پچھلے عرصے میں اچھو میاں نے ایک بات سیکھ لی تھی۔ جب آپ کوئی فیصلہ کر نہ سکیں تو صدقِ دل سے اللہ سے راہنمائی طلب کریں۔ اور اس کی فکر چھوڑ دیں۔ اللہ یقیناً راہنمائی فرمائے گا۔ اور اس میں دونوں جہان کی بہتری ہوگی۔

انہیں یاد تھا کہ وہ اس کوٹھے سے شرمندہ ہو کر نکلے تھے۔ کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔ اس وقت ان کے سامنے کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ اور زندگی کیسے گزاری جاتی ہے، یہ تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

تو اس کڑے وقت میں، ان کی دعا کے بغیر اللہ نے پہلے تو ان کے قدموں کی راہنمائی کی تھی اور انہیں دکھا دیا تھا کہ ان کا ٹھکانا کہاں ہے۔ اور پھر اسی نے ان کے دل کے ذریعے ان کی راہنمائی کی تھی کہ ابھی یہ ٹھکانا ان کے لئے نہیں ہے۔ انہیں واپس جانا ہے، اور دو معصوموں کی فکر کرنی ہے، اور ان کا خیال رکھنا ہے۔

اچھو میاں سے زیادہ کون جان سکتا تھا کہ وہ واپس آنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ اس شرمندگی کے بعد کوٹھے پر جانا اور کسی کو منہ دکھانا...... اس کے مقابلے میں تو مر جانا بہت آسان تھا۔ لیکن اللہ کا فیصلہ اٹل تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ واپس آئے کہ اللہ کا حکم تھا اور پھر تعمیل کے صلے میں بدترین ذلت کے بجائے انہیں عزت ملی۔ اور سب سے بڑی چیز ملی، جس سے محروم ہو کر انہوں نے زندگی گزاری تھی۔ رشتے، نادرہ ان کے لئے بیٹی تھی اور ارجمند نواسی یا پوتی۔

وہ جانتے تھے کہ اللہ نے کرم فرمایا اور ان کے یقینی نقصانات کو نفع میں بدل دیا۔ کیسا انعام کیا اللہ نے ان پر کہ وہ جو جانوروں کی سی زندگی گزار رہے تھے، انہیں انسان بنا دیا۔ اپنا راستہ دکھایا۔ نماز نصیب فرمائی۔ قرآن پڑھوایا۔ کیسا

راہنما ہے وہ۔

سو جب نادرہ پر بحران آیا تو انہوں نے اپنے تجربے کی روشنی میں اسے بھی یہی مشورہ دیا کہ وہ فیصلہ اللہ پر چھوڑ دے۔ اور نادرہ کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی۔

اس کے باوجود وہ پریشان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ معاملہ بن جائے۔ کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ وقت تیزی سے پھسل رہا ہے۔ ارجمند تیزی سے بڑی ہو رہی تھی۔ اس کا اب یہاں سے نکلنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔

مگر اُمید کی ایک کرن انہیں نظر آ گئی تھی۔

عمر انہوں نے جیسے بھی گزاری، لیکن بہرحال انہوں نے دنیا دیکھی تھی۔ طوائف کے کوٹھے سے دنیا دیکھنا شاید سب سے بڑا مشاہدہ، سب سے بڑا تجربہ ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک نظر میں پہچان لیا کہ نادرہ کو بھی عارف سے محبت ہو گئی ہے۔ اور یہ بڑی خوش آئند اور مثبت پیش رفت تھی۔ بس اُلجھن نادرہ ہی کی طرف سے تھی۔ وہ جو اپنے عہد کو زندگی سے بھی زیادہ اہمیت دیتی تھی۔

پھر انہوں نے انہیں ہنسی خوشی جدا ہوتے دیکھا تو ان کی اُمید اور توانا ہو گئی۔ کیونکہ اس صبح ہی تو انہوں نے نادرہ کو پریشان دیکھا تھا اور اس نے کہا تھا کہ ابھی تک وہ اللہ کی راہنمائی سے محروم ہے۔ انہوں نے اسے اطمینان دلایا تھا۔

اور ان دونوں کو دیکھ کر لگا تھا کہ دونوں ہی مطمئن ہیں۔

نادرہ نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ انہوں نے بھی کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

اگلے دن عارف پھر آ گیا۔ اس دن بھی وہ دونوں بہت خوش تھے۔ پھر نادرہ نے ان سے کہا کہ وہ عارف کو چھوڑ آئیں۔

عارف کے ساتھ چلتے ہوئے اچھو میاں کا بہت جی چاہ رہا تھا کہ اس سے بات کریں۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر عارف نے خود ہی اچھو میاں سے کہا۔

''آپ ہمارے لئے بہت دعا کیجئے گا۔''

''وہ ت میں پہلے ہی سے کر رہا ہوں میاں!'' اچھو میاں نے سادگی سے کہا۔

''اللہ آپ کو خوشیاں نصیب فرمائے۔ ان بچیوں کا خیال رکھئے گا۔''

''تو میں تو آپ کو بھی ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

''نہیں میاں! میری منزل کوئی اور ہے۔ میں تو اب یہاں صرف ان بچیوں کی وجہ سے پڑا ہوں۔''

عارف نے چلتے چلتے سر گھما کر انہیں دیکھا۔ اس نے ایک نظر میں جان لیا کہ وہ جو کہہ رہے ہیں، حتمی ہے۔

وہ چلتے رہے۔ پان کی ایک بند دُکان کے سامنے عارف رکا۔ اس نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور پھر وہ کاغذ ان کی طرف بڑھا دیا۔

''دیکھئے چچا صاحب......!''

اچھو میاں کی آنکھیں بھر آئیں۔ کیسا عزت دینے والا ہے میرا اللہ......! پان سگریٹ، شراب لانے والے اچھوں میاں کو اتنا مرتبہ عطا فرمایا۔

''میں تو اب سترہ تاریخ کو ہی یہاں آؤں گا۔ لیکن اسی دوران آپ کو کسی بھی طرح کی مدد کی ضرورت پڑے تو ان صاحب کے پاس چلے جایئے گا۔ کوئی بھی مسئلہ ہو، یہ انشاء اللہ حل کر دیں گے۔''

''لیکن میاں......!''

''میں اب نادرہ اور ارجمند کو ایک لمحے کے لئے بھی اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا۔ لیکن نادرہ نے پابندی لگا کر مجبور کر دیا ہے۔'' عارف نے ان کی بات کاٹ دی۔

''آپ کی موجودگی سے مجھے اطمینان ہے۔ مگر کسی وقت کوئی مسئلہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''یہ صاحب کون ہیں؟'' اچھو میاں نے پوچھا۔

''بہت بڑے افسر ہیں، اور میرے استاد ہیں۔'' عارف نے کہا۔

"یہ رقعہ لے کر ان کے پاس جائیں گے تو وہ ہر ممکن مدد کریں گے آپ کی۔"

اچھو میاں نے رقعہ تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ عارف ان سے گلے مل کر رخصت ہوگیا۔

واپس آتے ہوئے وہ یہی سوچتے رہے کہ یہ کیسا خیال رکھنے والا، محبت کرنے والا آدمی ہے۔ جس طرح سے وہ انہیں رقعہ دے کر گیا تھا، اس سے وہ اندازہ کر سکتے تھے کہ دوری کے اس ایک مہینے میں وہ نادرہ اور ارجمند کی طرف سے کتنا فکرمند رہے گا۔

وہ واپس آئے تو ارجمند نے انہیں کمرے میں بلا لیا۔ یہ دیکھ کر انہیں خوشی ہوئی کہ وہ مسکرا رہی تھی۔

"کیا ہوا بیٹا! بہت خوش ہو؟"

نادرہ نے ان کے ہاتھ چوم لئے۔

"آپ کی زبان مبارک تھی۔ اللہ نے راہنمائی فرما دی۔"

"تو کیا ملے پایا؟"

نادرہ نے انہیں پوری تفصیل سنا ڈالی۔

"بہت خوشی ہو رہی ہے یہ سن کر۔"

"یہ تو تھی اللہ کی راہنمائی۔ اب دیکھتے ہیں اللہ فیصلہ کیا کرتا ہے۔"

نادرہ کے لہجے میں ہلکی سی اداسی در آئی۔

"سب کچھ اچھا ہوگا انشاء اللہ!" انہوں نے بڑے خلوص سے کہا۔

اس رات اپنے بستر پر لیٹنے کے بعد اچھو میاں نے ایک ماہ بعد کا تصور کیا تو ان کے جسم میں خوشی اور سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ پہلی بار انہیں احساس ہوا کہ اگرچہ یہ بات ان کے شعور تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ لیکن درحقیقت شرمندگی کے اس دن سے آج تک وہ یہاں ایک قیدی کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ یہ الگ بات کہ وہ قید انہوں نے خود ہی قبول کی تھی۔ شاید اسی لئے انہیں اس کا شعوری احساس نہیں تھا۔ لیکن اب یہ سوچ کر کہ ایک ماہ بعد وہ بیڑیاں انشاء اللہ کھل

جائیں گی، ان کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔

بس ایک ماہ کی بات ہے۔ پھر وہ آزاد ہوں گے۔ انہوں نے خوشی سے سوچا۔ اپنی مرضی کا کام، اپنی مرضی کی زندگی۔

اب وہ ایک ایک دن گن رہے تھے۔

اور وہ نادرہ کو دیکھتے تو انہیں خوشی ہوتی۔ کام کرتے کرتے اس کا ہاتھ جیسے رک جاتا۔ آنکھیں ان دیکھے خلاؤں میں نہ جانے کیا دیکھتیں کہ ان میں دھنک کے ساتوں رنگ جھلملا رہے ہوتے۔ دیر تک وہ اس کیفیت میں رہتی۔ پھر چونک کر ادھر ادھر دیکھتی۔ وہ جلدی سے منہ پھیر لیتے۔ پھر چند لمحے بعد وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھتے تو وہ کام میں مصروف نظر آتی۔ لیکن اس کے رخساروں پر شفق پھول رہی ہوتی۔

مگر چوتھے دن نہ جانے کیا ہوا کہ ایک تبدیلی آگئی۔ نادرہ اب بھی کام کرتے ہوئے کھو سی جاتی اور نہ جانے کیا دیکھنے لگتی۔ لیکن اب اس کی آنکھیں بجھی بجھی ہوتیں۔ اس کا چہرہ بھی خوشی کی اس چمک سے محروم ہوگیا تھا۔ جو پہلے تین دن انہیں نظر آئی تھی۔

انہوں نے سوچا کہ اس سے پوچھیں، پھر اسے سمجھائیں۔ جانے کس بات نے اس سے امید چھین کر مایوسی سے دوچار کر دیا ہے۔ شاید وہ اسے بحال کر سکیں۔ لیکن پھر وہ جھجک گئے۔ کہیں جلد بازی میں وہ اسے نقصان نہ پہنچا دیں۔

لیکن وہ تیس دن ان کے لئے ساری عمر کی دعاؤں کے تیس دن تھے۔ وہ مجسم دعا بن گئے۔ اتنے خشوع و خضوع سے تو انہوں نے رمضان کے تیس دنوں میں بھی دعا نہیں کی تھی۔ ایسی سچائی اور حضوری کے ساتھ تو انہوں نے اعتکاف کے دوران بھی دعا نہیں کی تھی۔

✿ ✿ ✿

عارف کے اس تحفے نے، اس کلر باکس اور اسکیچ بک نے ارجمند کو دنیا و مافیا سے بے خبر کر دیا تھا۔ ایک دن تو ایسا گزرا کہ وہ بس اسکیچ بک کے صفحے کو

بے یقینی سے دیکھتی، پھر اس پر انگلی پھیرتی۔ اور اسے احساس ہوتا کہ اس کی انگلی نے صفحے کو میلا کر دیا ہے۔ وہ ہاتھ سے اس خیالی میل کے دھبے کو مٹانے لگ جاتی۔ وہ خوب صورت دبیز صفحہ اسے اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ اس پر ڈرائنگ کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی ڈرائنگ ابھی اس خوب صورت صفحے کے قابل نہیں ہے۔

لیکن فنکار کا دل بہرحال دل ہوتا ہے۔ وہ اسکیچ بک کی خوب صورتی کے سحر سے نکلی تو دل ڈرائنگ کے لئے مچلا، اور ایسے مچلا کہ اور کسی چیز کا خیال ہی نہیں رہا۔

یہ تو اس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ پہلی تصویر تو شہزادے ہی کی بنائے گی۔ اس نے ڈرائنگ شروع کی تو اسے کاغذ کی خوبی کا پتا چلا۔ عام کاغذ کے برعکس اس اسکیچ بک کا کاغذ اس کے ہاتھ اور پنسل، دونوں کی معاونت کر رہا تھا۔ یہی نہیں، وہ انہیں اکسا بھی رہا تھا۔ اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کر رہا تھا۔

ڈرائنگ مکمل کرنے کے بعد اس نے اسے دیکھا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ اتنی اچھی ڈرائنگ بھی کر سکتی ہے۔

پھر اس نے تصویر میں رنگ بھرے تو اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔ نہ جانے کیسے رنگوں کے استعمال کا سلیقہ اسے آتا تھا۔ اور یہ ان رنگوں کا کمال تھا کہ وہ حقیقی رنگ تھے۔ تصویر تصویر نہیں لگ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ منہ سے بول اٹھے گی۔

دیر تک وہ اپنی ہی بنائی ہوئی تصویر کے سحر میں الجھی رہی۔ پھر اس کے دل میں شکرگزاری کا احساس ابھرا۔ اب اسے اس کی تصویر بنانی تھی، جس نے یہ تحفے اسے دیئے تھے۔ یہ خوب صورت تحفے......

اس نے پھپھو اور عارف صاحب کی وہ ڈرائنگ نکالی، جو اس روز بنائی تھی۔ یہ عارف صاحب کیا ہوتا ہے۔ اس کے دل نے کہا۔ یہ تو بدتمیزی ہے۔ اتنے بڑے ہیں وہ، نہیں بھئی! میں تو انہیں چچا جان کہوں گی۔ اس نے سوچا۔ مجھے تو وہ کہیں سے بھی بیگانے نہیں لگتے۔ بہت اپنے اپنے سے ہیں وہ۔ یہ پھپھو

بھی نہ جانے کیوں نخروں میں اتنا وقت ضائع کر رہی ہیں۔

اس نے ڈرائنگ پر نظر ڈالی۔ اور خوش ہوگئی۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ جیسے اللہ نے انہیں ایک دوسرے کے لئے ہی بنایا ہو۔ پھپھو کچھ بھی کہیے، لیکن یہ ڈرائنگ ثابت کرتی ہے کہ وہ بھی انہیں بہت پسند کرتی ہیں۔ اس نے دل میں سوچا۔

اس نے اس تصویر کو اسکیچ بک میں بنایا۔ اور اس کا دل خوش ہوگیا۔ واقعی یہ تو اسکیچ بک اور رنگوں کا کمال ہے۔ ویسے تو وہ اتنی اچھی تصویریں نہیں بناتی تھی۔ وہ چند لمحے اس تصویر کو دیکھتی رہی۔ اگر پھپھو کی زندگی ایسی ہو جائے تو کتنا اچھا ہوگا۔ اس نے سوچا۔

پھر اسے یاد آیا کہ یہ تصویر تو اس نے فرمائش پر بنائی تھی۔ تو فرمائش کرنے والے کا یہ حق تھا کہ تصویر اسے دی جائے۔ تو کیا اسے یہ صفحہ اسکیچ بک سے پھاڑنا ہوگا۔ وہ کچھ پریشان ہوگئی۔

لیکن اگلے ہی لمحے اسے اسکیچ بک کی ایک اضافی خوبی نظر آئی، جس نے اس کی پریشانی دور کر دی۔ اسکیچ بک کا ہر صفحہ ایسا تھا کہ اسے بآسانی اسکیچ بک سے الگ کیا جا سکتا تھا۔

لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اس کی اسکیچ بک اس یادگار تصویر سے محروم ہو۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس تصویر کو دوبارہ بنائے۔ ایک وہ چچا جان کو دے دی گی۔ اور دوسری اس کی اسکیچ بک میں محفوظ رہے گی۔

دوسری تصویر پہلی سے بھی اچھی بنی۔ اس نے سوچا۔ یہ وہ چچا جان کو دے دے گی۔

''ارجمند! چلو کھانا کھالو۔''

پھپھو کی پکار نے اسے چونکا دیا۔

''جی پھپھو! ابھی آئی۔''

اس نے چیزیں سمیٹ کر رکھیں اور کھانے کے لئے چلی گئی۔

''اسکیچ بک کیا مل گئی، تم تو بس اسی کی ہوگئیں۔'' پھپھو نے کہا۔

"وہ پھپھا جان سے وعدہ......"

نادرہ کا چہرہ تمتما اٹھا۔

"گڑیا! ایسے ہی رشتہ نہیں جوڑتے، بری بات ہے۔" اس نے اسے ٹوکا۔

"مگر پھپھو! آپ سے شادی ہوگی تو پھر وہ پھپھا......"

نادرہ نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔

"اللہ ہی جانتا ہے کہ ایسا ہوگا یا نہیں۔ مگر ایسا ہونے سے پہلے تمہیں یوں نہیں کہنا چاہئے۔"

ارجمند کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ لیکن یہ کہتے ہوئے پھپھو کے لہجے میں ایسی گہری اداسی تھی کہ اس کا دل کٹنے لگا۔ وہ سہم گئی کہ پھپھو بھی یہی چاہتی ہیں لیکن ڈرتی ہیں کہ ایسا نہیں ہوگا۔ وہ خوفزدہ ہیں۔ اب ایسے میں وہ ان سے بحث تو نہیں کر سکتی تھی۔

"تو پھر میں انہیں کیا کہوں پھپھو!" اس نے سادگی سے پوچھا۔

"کچھ بھی کہہ لو۔ چچا کہہ لو۔"

"یہ بھی تو رشتہ جوڑنا ہی ہوگا پھپھو!"

نادرہ لاجواب ہوگئی۔

"سب مسلمان آپس میں بھائی ہوتے ہیں۔" اس نے کچھ جھنجلا کر کہا۔

"تو اس طرح وہ تمہارے بابا جان کے بھائی، اور تمہارے چچا ہی ہوئے نا؟"

"تو پھپھا میں کیا برائی ہے؟"

"یہ تو ان کا مجھ سے رشتہ جوڑنا ہوا نا؟" نادرہ اور جھنجلائی۔

"تو یہ تو ہونا ہی ہے نا پھپھو!"

"کیا پتا؟" نادرہ پھر افسردہ ہوگئی۔ پھر اچانک اس نے کہا۔

"تمہیں یقین ہے کہ تمہارا شہزادہ تمہیں ملے گا؟"

"جی پھپھو!"

"اور تم نے بتایا تھا کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری آواز میں باتیں کرتے ہیں۔"

"جی پھپھو! انہوں نے ہی تو مجھے بتایا تھا۔"

نادرہ جھجکتی رہی مگر پھر اس سے رہا نہیں گیا۔

"تو میرے بارے میں بھی پوچھو نا؟"

"ٹھیک ہے پھپھو! اب پوچھوں گی۔"

* * *

ویسے تو حمیدہ ہمیشہ سے ہی اس کے لئے مہربان اور شفیق تھی لیکن نور بانو نے محسوس کیا تھا کہ پچھلے چند دنوں سے وہ اس پر زیادہ ہی مہربان ہو رہی ہے۔ کبھی وہ اسے بلا کر اپنے پاس بٹھاتی، اور بہت غور سے اسے دیکھتی۔ پھر کہتی۔ اپنا خیال رکھا کر دھیے! دیکھو تو کتنی دبلی ہو رہی ہے۔

"ایسی کوئی بات ہیں اماں! تمہیں محبت کی وجہ سے ایسا لگتا ہے۔" وہ جواب دیتی۔

"کچھ کھاتی پیتی تو ہے نہیں۔ دیکھو رنگ روپ کو عورت سے منہ موڑتے دیر نہیں لگتی۔"

اور یہ سن کر نور بانو کو ڈر لگتا کہ جیسے وہ رنگ روپ کے نہیں، عبدالحق کے منہ موڑنے کی بات کر رہی ہے۔ دن بھر وہ اعتماد سے محروم، بولائی بولائی پھرتی۔ رات آتی تو وہ اپنے جادو کی آزمائش کرتی، اور جادو سر چڑھ کر بولتا تو وہ مطمئن ہو جاتی۔ وہ سوچتی کہ اماں تو یوں ہی ڈراتی رہتی ہیں مجھے۔

پھر ایک دن اماں نے اسے ایک پڑیا دی۔ اس نے کھول کر دیکھا تو وہ ثابت چنے تھے۔ اس نے سوالیہ نظروں سے حمیدہ کو دیکھا۔

"رات کو سونے سے پہلے چند دانے کھا لیا کر۔ اللہ فائدہ دینے والا ہے۔" حمیدہ نے کہا۔

"مگر کیوں اماں!"

"جو میں کہتی ہوں، خاموشی سے کر لے۔ حجت بازی، سوال جواب نہ

کیا مجھ سے۔'' حمیدہ کچھ جھنجلا گئی۔

''پھر بھی اماں!''

''کچھ تیرے نقصان کے لئے تو نہیں کہہ رہی ہوں گی میں۔ تیرا فائدہ ہی سوچتی ہوں ہمیشہ۔ ماں ہوں نا تیری۔''

بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ نور بانو خاموشی سے وہ پڑیا اپنے کمرے میں لے آئی اور بیڈ کے سرہانے پر پٹخ دی۔ اس نے سوچا، انکار کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اماں کو کون سا پتا چلے گا نہ کھانے کا۔

چند روز بعد حمیدہ نے اس سے پوچھا۔

''وہ میٹھے چنے تو ختم ہوگئے ہوں گے؟''

''جی اماں! کل رات ہی ختم ہوئے ہیں۔'' اس نے صاف جھوٹ بولا۔

حمیدہ نے اس بار نسبتاً ایک بڑا پڑا اس کی طرف بڑھایا۔

''لے..... ! یہ بتاشے ہیں۔ رات کو گرم دودھ میں دو تین بتاشے گھول کر پی لیا کر۔ اللہ بہتر کرے گا۔''

اب تو نور بانو کو یقین ہوگیا کہ حمیدہ کوئی چکر چلا رہی ہے۔ اس نے سوچا، یہ ضرور اولاد کا چکر ہے۔ بڑی بی کہیں سے یہ چیزیں پڑھوا کر لائی ہیں کہ میں کھاؤں تو رام ہو جاؤں۔ اور یہ عبدالحق کی دوسری شادی کرا دیں۔

بہرحال بحث سے بچنے کا نسخہ تو اس کے ہاتھ آگیا تھا۔ اس نے بتاشوں کو بھی وہیں لے جا کر پٹخ دیا مگر وہ بری طرح جھنجلا گئی تھی۔

پھر اس رات عبدالحق کی نظر ان دونوں چیزوں پر پڑ گئی۔

''یہ کیا ہے بھئی! چیونٹیاں آ رہی ہیں یہاں۔''

وہ گڑبڑا گئی۔

''کچھ نہیں! لائیے میں پھینک دوں۔''

مگر عبدالحق نے تجسس کے مارے پڑیا کھول لی۔

''ارے! یہ تو میٹھے چنے ہیں۔'' اس نے کہا۔ چیونٹیوں کی مہربانی سے میٹھے کی تہہ جگہ جگہ سے غائب ہوگئی تھی، اور چنے کی جھلکیاں نظر آ رہی تھیں۔

بتاشے بھی کھوکھلے ہوگئے تھے۔

نور بانو نے دونوں چیزیں اس سے لینے کی کوشش کی مگر وہ اڑ گیا۔

''پہلے مجھے بتاؤ، یہ سب کیا ہے؟'' اس نے کہا۔

''یہ تم نے یہاں رکھے کیوں؟ اور رکھے تو کھائے کیوں نہیں؟''

رات کی رانی اپنے پورے مان کے ساتھ جاگ اُٹھی۔

''میں کیوں کھاؤں؟'' اس نے تنک کر کہا۔

''تو یہاں رکھے کیوں؟''

''غلطی ہوگئی۔ مجھے پہلے ہی پھینک دینے چاہئیں تھے۔'' نور بانو اور جھنجلا گئی۔

''ایسی کیا بات ہے؟'' عبدالحق نے کہا۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کی سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگا۔ یہ تو اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اماں اس کے لئے ایک بیٹے کی تلاش میں مزاروں کی خاک چھان رہی ہیں۔ ہوسکتا ہے، وہی یہ چیزیں لائی ہوں۔

''اماں نے دیئے تھے یہ تمہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''آپ کو کیسے معلوم؟''

''مجھے نہیں معلوم ہے۔ میں پوچھ رہا ہوں تم سے۔'' عبدالحق نے بڑے تحمل سے کہا۔

''ہاں..... ! انہوں نے ہی دیئے تھے۔''

عبدالحق کو اس کے لہجے کی جارحیت بہت بری لگی۔

''تو تم نے کھائے کیوں نہیں؟''

''میں کیوں کھاؤں؟ ان کا مقصد پورا کر دوں؟''

''اور تمہارے خیال میں ان کا مقصد کیا ہے؟''

''یہی کہ میں گونگی بہری ہو جاؤں۔ تا کہ وہ من مانی کر سکیں۔'' نور بانو اس کے لہجے کی تبدیلی کو محسوس نہیں کر سکی تھی۔ اس کے لہجے میں اشتعال بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

''اور تمہارے خیال میں وہ من مانی کیا ہے؟ جو وہ کرنا چاہتی ہیں؟''

''اولاد کی خاطر دوسری شادی کرانا، اور کیا؟''

عبدالحق کو ایسا شاک لگا کہ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہ سکا۔ حیرت اور ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

''آپ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں مجھے؟''

''سنو نور بانو! جو کچھ تم نے کہا، وہ بہت شرم ناک ہے۔ بات اتنی سی نہیں کہ میں آئندہ ایسی کوئی بات سننا نہیں چاہتا، میں چاہتا ہوں کہ تم آئندہ ایسی بات سوچنے کی بھی غلطی نہیں کرو۔''

''لیکن میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔''

''غلطی کرنا برا ہوتا ہے نور! لیکن غلطی کے بعد اسی پر اصرار کرنا بدترین ہوتا ہے۔'' اس بار عبدالحق کا لہجہ بہت سخت تھا، اور آواز بھی بلند ہوئی تھی۔

''شیطان نے یہی تو کیا تھا۔''

نور بانو سہم گئی۔ اس نے عبدالحق کے یہ تیور پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اب چپ رہنے ہی میں عافیت تھی۔

''جب کوئی کسی سے محبت کرتا ہے تو وہ بغیر کہے سنے اس کو پوری طرح سمجھتا ہے اور جانتا ہے۔'' اب عبدالحق کے لہجے میں قدرے نرمی تھی۔

''تم اتنا بھی نہیں سمجھتیں کہ اماں اور میں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں۔''

اور میں اور تم؟ نور بانو نے دل میں سوچا۔ میں تو تمہیں جانتی اور سمجھتی ہوں۔ یعنی میں تو تم سے محبت کرتی ہوں۔ لیکن تم نہ مجھے جانتے ہو نہ ہی سمجھتے ہو۔ کیونکہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔

''میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا کہ دوسری شادی کوئی برائی نہیں۔ اللہ نے چار کا حق دیا ہے مردوں کو۔ لیکن میں تمہارے علاوہ کسی سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے نہیں کروں گا۔'' عبدالحق کہہ رہا تھا۔

''اور یہ بات میں نے اماں سے کبھی نہیں کی۔ لیکن وہ جانتی ہیں۔ اس

کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسی وجہ سے وہ مجھے دوسری شادی کو نہیں کہتیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔'' نور بانو کو تو وہ تضاد لگا۔

''سمجھا رہا ہوں، کوشش کرو سمجھنے کی۔ اگر اماں مجھ سے دوسری شادی کو کہیں تو میں انکار کر دوں گا۔ لیکن اگر انہوں نے کبھی مجھے یہ حکم دے دیا تو میں انکار نہیں کر سکتا۔ اور یہ بات بھی اماں جانتی ہیں۔''

نور بانو کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ عبدالحق پر حمیدہ کے ایسے تسلط کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

''تو جو کام صرف ان کے کہنے سے ہو سکتا ہے، اور اس میں کوئی شرعی رکاوٹ بھی نہیں، اس کے لئے وہ تمہیں پڑھے ہوئے میٹھے چنے اور بتاشے کیوں کھلائیں گی؟ یہ بات اپنی موٹی عقل میں بٹھا لو۔''

نور بانو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ عبدالحق نے کبھی اس سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔

''یہ آنسو اگر ندامت کے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ یہ کسی کام کے نہیں۔'' عبدالحق نے بے رحمی سے کہا۔

''تم بہت شکی اور وہمی ہو۔ اماں کو میری دوسری شادی کے لئے تمہیں گونگا بہرا بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں وہ میری اور تمہاری اولاد کے لئے در در ہاتھ پھیلاتی پھرتی ہیں۔ اس کے لئے وہ ماری ماری پھرتی ہیں۔ اور یہ پڑھے ہوئے چنے اور بتاشے لا کر تمہیں دیتی ہیں اور تمہاری سوچ یہ ہے؟''

اوہ! تو یہ بات ہے۔ نور بانو نے سوچا۔

''آپ کو کیسے پتا چلا؟''

''میں نے کہا نا کہ محبت میں آدمی دوسرے کو سمجھتا اور جانتا ہے۔ یہ بتاؤ! اب تمہیں کچھ شرم آئی؟''

نور بانو نے کچھ نہیں کہا۔

''بس اب میں تمہیں ہر رات خود یہ کھلاؤں گا۔ لو یہ چنے کھاؤ۔''

اس کے لہجے میں ایسی سختی تھی کہ نور بانو انکار نہ کر سکی۔ باسی اور بدمزہ

چنے اس نے جیسے تیسے حلق سے اتارے۔ پھر وہ عبدالحق کی طرف مڑی۔

''آپ ان توہمات پر یقین رکھتے ہیں؟''

''نہیں! میں صرف اللہ پر یقین رکھتا ہوں۔ اور اسی سے مانگتا ہوں۔ لیکن اماں کے یقین کا بھی ویسے ہی احترام کرتا ہوں، جیسے اپنے یقین کا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بزرگوں کی دعاؤں سے لوگوں کو اولاد ملتی رہی ہے۔ بس اب سو جاؤ۔'' عبدالحق نے کہا اور دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

نور بانو کو اُمید تھی کہ ابھی وہ پلٹے گا اور...... لیکن ذرا دیر میں اسے احساس ہوا کہ وہ تو سو چکا ہے۔

وہ پہلا موقع تھا کہ عبدالحق نے اسے نظرانداز کیا تھا۔ اس کی تو نیند اُڑ گئی تھی۔ اب وہ صرف ایک بات پر سوچ رہی تھی۔ محبت ہو تو لوگ بغیر کچھ کہے ایک دوسرے کو سمجھ لیتے ہیں۔ جیسے عبدالحق اور حمیدہ۔

اب تک اسے یقین تھا کہ وہ عبدالحق سے محبت کرتی ہے اور عبدالحق اس سے محبت کرتا ہے۔ لیکن آج وہ اس پر غور کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اتنی قربت کے باوجود وہ عبدالحق کو جان، سمجھ نہ سکی۔ ورنہ بات یہاں تک پہنچتی ہی نہیں۔ وہ تو جھوٹی خوداعتمادی لئے بیٹھی تھی۔ مگر آج عبدالحق نے صاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ حمیدہ اسے دوسری شادی کا حکم دے تو وہ انکار نہیں کر سکتا۔ جبکہ وہ سمجھتی تھی کہ عبدالحق اس کی مٹھی میں ہے۔

اس سے تو یہ ثابت ہوگیا کہ وہ عبدالحق سے محبت نہیں کرتی۔ ورنہ اتنی بڑی بات سے بے خبر نہ ہوتی۔

سوال یہ تھا کہ یہ محبت نہیں تو کیا ہے؟ وہ تو دہلی میں ہی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی محبت میں گرفتار ہوئی تھی۔ وہ اس محبت سے لڑتی رہی تھی۔ بلکہ نفرت کرتی رہی تھی۔ اس کی وجہ سے اسے تو محبت سے ہی نفرت ہوگئی تھی۔

مگر وہ اسے سمجھتی کیوں نہیں؟

شاید اس لئے کہ اس نے کبھی اسے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اسے حمیدہ کی وقتاً فوقتاً کہی ہوئی باتیں یاد آئیں۔ وہ اسے سمجھاتی رہی تھی۔ وہ اسے

بتاتی تھی کہ وہ اعتماد سے محروم ہے، اور شک بہت کرتی ہے۔ ابھی چند لمحے پہلے عبدالحق نے بھی یہی کہا تھا۔ حمیدہ کہتی تھی، شک میں آدمی خود اپنے محبوب کو کھونے کا سامان کرتا ہے۔ اور حمیدہ کہتی تھی، محبت آسان نہیں۔ اس لئے کہ محبت دینے کا نام ہے، لینے کا نہیں۔ آدمی جس سے محبت کرتا ہے، اس کے فائدے کی ہر وقت فکر کرتا ہے، اور اس کے لئے اپنے نقصان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ کہتی تھی۔ محبت محبوب پر قابض ہونا نہیں سکھاتی بلکہ اسے اعتماد بھری آزادی دیتی ہے۔ وہ اسے بانٹتی ہے، تاکہ وہ پھیلے، اسے وسعت ملے، اسے اور محبتیں ملیں۔

اب وہ اس تعریف پر حمیدہ کی محبت کو جانچے تو بے شک وہ سچی محبت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے عبدالحق سے حمیدہ نے ہی ملایا تھا۔ وہ نہ چاہتی تو ان کی شادی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اور اب بھی...... اگر عبدالحق کی بات سچی ہے تو حمیدہ اس کے اور عبدالحق کے فائدے ہی کی سوچ رہی ہے۔ ورنہ دوسری شادی کرانا تو بہت آسان ہے اس کے لئے۔ اور وہ یہ بات بھی بتا چکی ہے کہ عبدالحق اس کی کوئی بات کبھی نہیں ٹال سکتا۔

تو عبدالحق اور حمیدہ کی باہمی محبت دونوں طرف سے سچی ہے۔ اور اس کی محبت؟

وہ تو عبدالحق پر یوں قابض ہونا چاہتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی کا بھی نہیں رہے۔ تو یہ محبت نہیں؟ حمیدہ کہتی تھی، یہ تو خود سے محبت کرنا ہے۔ تو وہ در حقیقت عبدالحق سے نہیں، خود سے محبت کرتی ہے۔

ذہن اسے تسلیم کر رہا تھا کہ اچانک اس کے مزاج کی مخصوص تند موج اسے اور ہر خیال کو بہا کر لے گئی۔ بکواس ہے، اس نے سوچا۔ ماں اور بیٹے کی محبت اور مرد اور عورت کی محبت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ وہ عبدالحق سے ماں جیسی محبت کیسے کر سکتی ہے۔ وہ تو اسے کبھی کسی کے ساتھ نہیں بانٹ سکتی۔

کسی عورت کے ساتھ ایک مرد کی حیثیت میں نہیں بانٹ سکتیں۔ اس کے اندر کسی نے کہا۔ لیکن تم تو حمیدہ سے، زرینہ سے، رابعہ اور زبیر سے۔ حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے بچوں سے بھی رقابت محسوس کرتی ہو۔

ہاں! میں ایسی ہی ہوں۔ اس نے جھنجلا کر سوچا۔ وجہ یہ ہے کہ میں عبدالحق سے ایسی محبت کرتی ہوں کہ کسی نے کسی سے نہیں کی۔ ہوا چلے اور عبدالحق کو اس کا لمس اچھا لگے تو مجھے ہوا سے بھی رقابت ہوتی ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ کاش میں ہوا بن جاؤں۔

یہ محبت نہیں، دیوانگی ہے۔ اندر کی آواز نے کہا۔

اب وہ کمزور موقف کی وجہ سے اس پر بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے جلدی سے سوچ کا زاویہ بدل دیا۔ عبدالحق حمیدہ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اس کا حکم نہیں ٹال سکتا۔ اسے نظر انداز کر کے دوسری شادی بھی کر سکتا ہے۔ تو اس کے لئے عبدالحق کی محبت کیسی ہے؟ کیا اس کی محبت، محبت کی تعریف پر پوری اترتی ہے؟ کیا وہ اسے سمجھتا ہے؟

یہ سوچ کر وہ گھبرا گئی۔ اگر وہ اسے سمجھتا اور جانتا تو اس سے محبت کیسے کرتا۔ اس کی تنگ دلی، اس کا حسد، اس کا گھٹیا پن...... یہ سب کچھ جان کر کوئی کسی سے کیسے محبت کر سکتا ہے۔

لیکن اسے یاد آیا، ابھی کچھ دیر پہلے عبدالحق نے اسے پہلی بار برا بھلا کہا تھا۔ اسے شکی اور وہمی کہا تھا۔ اور سچ کہا تھا۔ اس کا تو مطلب ہے کہ وہ اسے سمجھتا ہے۔ لیکن کیونکہ کسی کو برا کہنے کی اس کی عادت نہیں، اس لئے کچھ کہتا نہیں۔ آج اس کی برداشت جواب دے گئی تو اس نے کہہ دیا۔ لیکن عین ممکن ہے کہ یہ نتیجہ اس نے اس کی آج کی باتوں سے اخذ کیا ہو۔

اسے احساس ہوا کہ وہ عجیب مشکل میں پھنس گئی ہے۔ وہ یہ مان لے کہ عبدالحق اسے جانتا، سمجھتا ہے تو اسے گھبراہٹ اور شرمندگی ہوتی ہے کہ وہ اس کے گھٹیا پن سے واقف ہے۔ ایسے میں وہ اس سے کتنے دن محبت کر سکے گا۔ بالآخر وہ اس سے دُور ہو جائے گا۔

اور اگر وہ مان لے کہ عبدالحق اسے نہیں سمجھتا تو اس کے سینے میں یہ سوچ کر آگ بھڑک اُٹھتی ہے کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔ وہ صرف جسمانی ضرورت کی وجہ سے اس کا اسیر ہے۔ اور یہ خود کو عدم تحفظ میں مبتلا کرنے والی

بات تھی۔ وہ تو خوب صورت بھی نہیں۔ دنیا میں ایک سے ایک خوب صورت عورتیں پڑی ہیں۔ جانے کب اسے کوئی بہا لے جائے۔

آخر میں اس کی تان حمیدہ پر ٹوٹی۔ یہ سارا فساد اماں ہی کی وجہ سے ہے۔ اس نے سوچا۔ وہ واقعی اس کے دل کا کانٹا بن گئی ہیں۔ ایک لمحے کو اس کے دل میں ملامت ابھری کہ وہ بے چاری تو اسے امی سے بڑھ کر چاہتی ہیں۔ ہمیشہ اس کی بھلائی کی فکر کرتی ہیں۔ لیکن وہ ان کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے وہ سو گئی۔

✿ ✿ ✿

پندرہ تاریخ آ گئی تھی۔ اب بیچ میں صرف دو دن تھے۔ ان اٹھائیس دنوں میں نادرہ کو ہر روز ایسا لگا تھا کہ کسی بھی لمحے کوئی آ جائے گا۔ اور اس بات سے وہ ڈرتی تھی۔ پھر اس پر شرمندہ بھی ہوتی تھی کہ وہ اپنے عہد کو بھول کر نفس کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔

اب تک وہ عارف کے ساتھ مستقبل کا تصور کرنے سے بچتی رہی تھی۔ لیکن اب وہ سامنے کی بات لگتی تھی۔ اس نے سوچا۔ یہ دو دن اور گزر گئے تو سترہ تاریخ کو کیا ہوگا؟ عارف آئے گا، اور اسے اور ارجمند کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔

وہ دن اس نے بہت بھاری گزارے تھے۔ لیکن پندرہ تاریخ کی اس صبح وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے خود کو ٹٹولا۔ وہ پوری سچائی کے ساتھ کہہ سکتی تھی کہ اللہ کو گواہ بنا کر کئے گئے اپنے عہد کے بارے میں وہ مخلص تھی اور یہ بھی کہ اللہ کے ہر فیصلے میں وہ خوش تھی۔ اسے یقین تھا کہ جو فیصلہ بھی ہوگا، اس میں اس کی بہتری ہوگی۔ نیلم بائی نے جو کچھ اس کے نام کیا تھا، وہ ممن کو بتائے بغیر اس کے نام کر چکی تھی۔

اس عرصے میں اچھو میاں نے اسے بہت سہارا دیا تھا۔ وہ اسے سمجھاتے رہے تھے، زندگی کے مثبت اور روشن پہلوؤں کو دیکھنے کی تلقین کرتے

رہے تھے۔ ویسے ہی وہ اس کے لئے بہت بڑا سہارا تھے۔ اس کے جسم کا رواں رواں ان کے لئے دعا کرتا تھا۔

اخبار دیکھتے ہوئے وہ اس تصویر کو دیکھ کر بری طرح چونکی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ لیکن دھوکے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ وہ سو فیصد ٹھاکر اوتار سنگھ کی تصویر تھی۔

بس ایک معمولی سا فرق تھا۔ تصویر میں وہ اس کے تصور کے مقابلے میں کچھ بڑا بڑا سا لگ رہا تھا۔ مگر یہ بھی قدرتی بات تھی۔ اس کے تصور اور اس تصویر کے درمیان برسوں کا فاصلہ تھا۔

دیر تک وہ اس تصویر کو دیکھتی اور سوچتی رہی کہ کیا یہ اس کی دعاؤں کا جواب ہے۔

پھر بالآخر اس نے تصویر کے نیچے عبارت پر نظر ڈالی۔ عبدالحق ولد عبداللہ، جنہوں نے اس سال بی اے کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔

اس کا ذہن الجھنے لگا۔ کیا یہ کوئی غیر معمولی مشابہت ہے؟ ہم شکل بھی ہوتے تو ہیں، اگر ولدیت نہ لکھی ہوتی تو وہ یہ سوچ سکتی تھی کہ اوتار سنگھ مسلمان ہوگیا ہوگا۔ لیکن صاحب تصویر کا باپ بھی مسلمان تھا۔ نہیں...... یہ اوتار سنگھ نہیں ہوسکتا۔

اس سوچ کے بعد وہ اسے نظرانداز کر کے بھول جاتی۔ لیکن اسے احساس تھا کہ اس پر بہت بھاری ذمہ داری ہے۔ عجلت میں اوتار سنگھ کے عبدالحق نہ ہونے کا فیصلہ یہ شبہ پیدا کرتا تھا کہ وہ اپنے من پسند مستقبل کے لئے راہ ہموار کر رہی ہے۔ یہ عبدالحق بے شک ایک بند دروازہ تھا۔ لیکن اس پر دستک دینا، اسے کھلوا کر دیکھنا کہ کہیں اس کے پیچھے وہ راستہ تو نہیں، جس کے لئے وہ دعا کرتی رہی ہے، اس کی ذمہ داری ہے۔ اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کے ضمیر پر زندگی بھر بوجھ رہے گا۔

اس کے باوجود وہ دیر تک سوچتی اور الجھتی رہی۔ اس سلسلے میں کیا قدم

اٹھائے، کیا کرے؟ اور جو کچھ بھی کرنا تھا، بہت جلدی کرنا تھا۔ کیونکہ وقت بہت کم تھا۔ پرسوں سترہ تاریخ تھی۔

اس نے اچھو میاں کو بلالیا۔

''ایک بہت اہم اور ضروری کام ہے نواب صاحب!''

''کہو بیٹا!''

نادرہ نے اخبار میں چھپی تصویر اسے دکھائی۔

''ان صاحب کا پتا معلوم کرنا ہے اور پھر ان سے ملنا ہے۔''

اچھو میاں بھونچکے رہ گئے۔

''صرف تصویر سے پتا کیسے معلوم ہوسکتا ہے؟''

''مشکل تو ہے، ناممکن نہیں۔ اخبار کے دفتر سے معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ اگر یہ اللہ کی طرف سے ہے تو خود بخود آسانی ہو جائے گی۔''

''ٹھیک ہے بیٹا!'' اچھو میاں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''لیکن پتا معلوم کر کے پہلے میرے پاس آیئے گا۔''

✿ ✿ ✿

اچھو میاں کے لئے وہ بہت طویل دن تھا۔

اخبار کے دفتر میں تو ایک منشی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اچھو میاں کے استفسار پر وہ بولا۔

''یہ تو رات کی دنیا ہے جی، دن میں تو بس میں ہی ہوتا ہوں یہاں۔ کام کیا ہے آپ کو؟''

اچھو میاں نے اخبار میں چھپی تصویر دکھائی اور مدعا بیان کیا۔

''میں تو نہیں سمجھتا جی کہ اس کا پتا ہمارے دفتر میں کسی کو بھی معلوم ہوگا۔''

''کیوں بھئی؟''

''دیکھو نا، یونیورسٹی نے نتیجے کا اعلان کیا۔ چھاپنے کے لئے ہمیں دیا۔ اول، دوم، اور سوم نمبر پر آنے والوں کی تصویریں ہمیں دیں۔ وہ سب ہم نے

چھاپ دیا۔ تو یہ تو خبر تھی نا، اب پاس ہونے والوں کا پتا تو خبر نہیں ہوتا۔''

بات معقول تھی۔

''تو پتا کہاں سے ملے گا؟'' اچھو میاں نے پوچھا۔

منشی نے مشتبہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''پتے کی ضرورت کیوں ہے تمہیں؟''

''یہ بھتیجا ہے میرا۔ ہندوستان سے آتے ہوئے بچھڑ گیا تھا۔'' اچھو میاں نے کہا۔

''ہاں! یہ تو بہت برا ہوا ہے۔'' منشی نے آہ بھر کے کہا۔

''اب پتا تو تمہیں یونیورسٹی سے ہی مل سکتا ہے۔''

اچھو میاں یونیورسٹی چلے گئے۔ وہاں پہلے تو ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کس سے ملے، کس سے پوچھیں۔ اور جب سمجھ میں آیا تو چھٹی کا وقت ہو چکا تھا۔

وہ تھکے ہارے، مایوس اور ناکام لوٹ آئے۔

''چلیں، کوئی بات نہیں۔'' نادرہ نے اپنی مایوسی چھپاتے ہوئے انہیں دلاسہ دیا۔

''جو نصیب میں نہ ہو، وہ ملتا نہیں۔ آپ کھانا کھائیں اور آرام کریں۔ تھک گئے ہوں گے۔''

لیکن اچھو میاں سے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ وقت بھی زیادہ ہو چکا تھا۔

شام کو وہ دُکان چلے گئے۔ نادرہ نے کام مکمل کر دیا تھا۔ وہ انہوں نے دکاندار کو لے جا کر دیا۔ دکاندار اور کپڑا دینے لگا تو انہوں نے منع کر دیا۔

''کیا بات ہے بڑے میاں! کسی دوسرے دکاندار سے بات بنا لی ہے کیا؟''

اچھو میاں کو بہت غصہ آیا۔ اس دکاندار کو ہمیشہ یہی شک ہوتا تھا کہ وہ کسی اور کے لئے کام کرنے لگیں گے۔

''یہ بات نہیں ہے میاں!'' انہوں نے کچھ جھنجلا کر کہا۔

''ہوسکتا ہے کہ پرسوں ہم یہ شہر چھوڑ جائیں۔ اس لئے......''

''اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نہ جاؤ۔'' دکاندار نے اُمید بھرے لہجے میں کہا۔

''اس کا امکان بہت کم ہے۔''

''ہے تو نا، دیکھو، اگر نہ جاؤ تو پھر کام میرے ہی لئے کرنا۔''

''ہم در در پھرنا پسند نہیں کرتے۔ بس ایک در کے ہوگئے، سو ہوگئے۔ اب تم حساب کر دو۔''

وہ پیسے لے کر واپس آئے۔

''اب تک کا حساب صاف ہوگیا ہے۔'' انہوں نے پیسے نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

''رہنے دیجئے۔ اپنے پاس ہی رکھئے۔'' نادرہ نے انہیں روک دیا۔

''کیوں؟''

''ایک بات کہوں، آپ خفا نہ ہوئیے گا۔''

''کہو بیٹا! ہم تم سے کیسے خفا ہو سکتے ہیں؟''

''زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو......''

اچھو میاں تڑپ گئے۔

''ایسی باتیں نہ کرو بیٹا!''

''دیکھئے، ایک پل کا پتا نہیں ہوتا۔ آدمی کو بات کر لینی چاہئے۔''

''تو ہماری زندگی کا پتا ہے تمہیں؟'' اچھو میاں چڑ گئے۔

''اس بحث کو چھوڑیں، میری بات سنیں۔'' نادرہ شاید اوتار سنگھ کا پتا نہ ملنے کی وجہ سے مایوسی اور دل گرفتہ تھی۔

''میں یہ نہیں چاہتی کہ مجھے موت یہاں آئے۔ مجھے یہاں نہ مرنے دیجئے گا۔''

اچھو میاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''دوسری بات یہ کہ کفن مجھے میری محنت کے پیسوں کا دیجئے گا۔''

''تمہاری محنت کے پیسے میرے پاس پہلے ہی بہت ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اچھو میاں نے پھر جیب میں ہاتھ ڈالا۔

''میں نے کہا نا......'' نادرہ کہتے کہتے رک گئی۔ اچھو میاں کا ہاتھ جیب میں تھا اور چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔

''کیا ہوا نواب صاحب!''

اچھو میاں نے کچھ کہا نہیں، البتہ جیب سے ہاتھ نکالا تو اس میں ایک تہہ کیا ہوا کاغذ تھا۔

''ہم تو بھول ہی گئے تھے۔'' انہوں نے کہا۔

''عارف میاں نے جاتے جاتے یہ تعارفی رقعہ ہمیں دیا تھا اور کہا تھا کہ کوئی بھی مسئلہ ہو تو ان صاحب کے پاس چلے جانا۔ یہ حل کر دیں گے۔''

''تو پھر......؟''

''یہ ہمارا مسئلہ حل نہیں کر سکتے؟ میرا تو خیال ہے کہ ہمیں پتا مل جائے گا۔''

اب نادرہ کی سمجھ میں بات آئی۔ اس کی آنکھیں امید سے چمک اٹھیں۔

''مگر یہ ہیں کون؟''

''بہت بڑے افسر ہیں۔ عارف میاں کے استاد بھی ہیں۔''

''تو ان کا پتا ہے آپ کے پاس۔ کیونکہ اب تو رات ہو رہی ہے۔ دفتر تو بند ہو چکا ہوگا۔''

''گھر کا پتا بھی دیا ہے عارف میاں نے۔ بس میں چلتا ہوں۔ انشاء اللہ کام کر کے ہی آؤں گا۔''

✿ ✿ ✿

اچھو میاں کو مطلوبہ پتے پر پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ ایک پرانے طرز کا چھوٹا سا بنگلہ تھا۔ انہوں نے گیٹ بجایا تو ایک نوجوان لڑکا آیا۔

''جی فرمایئے؟'' اس نے بڑی شائستگی سے پوچھا۔

''بیٹے! مسعود احمد خان صاحب یہیں رہتے ہیں نا؟''

''جی......! لیکن اس وقت وہ گھر پر نہیں ہیں۔''

''کوئی بات نہیں، میں انتظار کر لوں گا۔''

''تو اندر آ جایئے۔''

اچھو میاں نے منع بھی کیا لیکن لڑکا انہیں اندر لے گیا۔ یہی نہیں، انہیں بٹھا کر وہ اندر گیا اور چند منٹ بعد ان کے لئے شربت لے آیا۔

اچھو میاں اس کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بڑے وضع دار شرفا کا گھرانہ ہے۔ بہرحال تھوڑی دیر بعد وہ بے چین ہونے لگے۔ وقت نکلا جا رہا تھا لیکن انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

کوئی ایک گھنٹے بعد مسعود صاحب آ گئے۔

''مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اتنا انتظار کرنا پڑا۔'' انہوں نے معذرت کی۔

''فرمایئے! کیسے آنا ہوا؟ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟''

اچھو میاں نے عارف کا دیا ہوا رقعہ ان کی طرف بڑھا دیا۔

مسعود صاحب نے رقعہ پڑھا۔ ان کے چہرے پر محبت بھری نرمی پھیل گئی۔ عارف نے دس سال ان کی ماتحتی میں کام کیا تھا۔ وہ ہونہار بھی تھا اور دیانتدار بھی۔ لیکن اس کے ساتھ کچھ ذاتی، گھریلو قسم کے مسائل تھے۔ اس کے نتیجے میں وہ برے افسروں کی صحبت میں جا پھنسا، اور ان کے دور ہو گیا۔ مگر وہ اب بھی اس سے محبت کرتے تھے۔

''ہے کہاں وہ نالائق؟'' انہوں نے اچھو میاں سے پوچھا۔

''اس کی تو پوسٹنگ کراچی ہو گئی تھی۔''

''جی......! مجھے نہیں معلوم۔''

مسعود صاحب ان سے پوچھنا چاہتے تھے کہ ان کا عارف سے کیا تعلق ہے، لیکن انہوں نے اسے مناسب نہیں سمجھا۔

''آپ یہ فرمایئے کہ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟''

اچھو میاں نے اخبار میں چھپی وہ تصویر انہیں دکھائی۔

''مجھے ان سے ملنا ہے، ان کا پتا چاہئے۔''

مسعود صاحب حیرت سے دیکھتے رہے۔ ابھی تو وہ عبدالحق کے گھر سے آ رہے تھے۔ وہ اس کے اول آنے کی خوشی کی مٹھائی لے کر گئے تھے۔ وہ بہت خوش تھے۔ مگر یہ......

''آپ عبدالحق کو کیسے جانتے ہیں؟''

اچھو میاں ایک لمحے کو ہچکچائے۔ مسعود صاحب نے جس طرح عبدالحق کا نام لیا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس سے واقف ہیں۔ ایسے میں وہ اسے اپنا بھتیجا کہتے تو کوئی گڑبڑ ہو سکتی تھی۔

''جی......! میری بھتیجی دہلی میں ان کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔'' انہوں نے کہا۔

''تصویر دیکھ کر وہ بے تاب ہو گئی کہ بس ان سے ملنا ہے۔''

مسعود صاحب اندر جا کر کاغذ اور قلم لائے اور عبدالحق کا پتا لکھ کر انہیں دے دیا۔

اچھو میاں کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ پتا اتنی آسانی سے انہیں مل گیا ہے۔

''آپ نے تو واقعی بہت بڑا مسئلہ چٹکی بجاتے ہی حل کر دیا۔ بہت شکریہ آپ کا۔'' انہوں نے ستائشی لہجے میں کہا۔

''یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ عبدالحق میرے لئے بیٹے جیسا ہے۔'' مسعود صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بلکہ اس وقت میں اس کے گھر ہی گیا تھا، مبارک باد دینے۔ اگر اس کی جگہ آپ کسی اور کا پتا جاننا چاہئے تو کم از کم آج تو میں آپ کی مدد نہ کر سکتا تھا۔ البتہ کل کوشش کرتا۔ اور اس میں بھی وقت لگتا۔''

''میں اجازت چاہتا ہوں۔'' اچھو میاں اٹھ کھڑے ہوئے۔

باہر نکل کر انہوں نے سوچا کہ عبدالحق کا گھر یہاں سے قریب ہی ہے۔

لیکن نہیں، وہ اسے سے کیا کہتے۔ انہیں تو پہلے نادرہ کے پاس جانا تھا۔

✿ ✿ ✿

نادرہ کو خوشی بھی تھی اور اسے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ ابتداء میں تو ایسا لگا تھا جیسے یہ معاملہ بنے گا ہی نہیں۔ مگر پھر بہت تیزی سے بات بنتی گئی۔ اور اب اچھو میاں اس عبدالحق کا پتا لے آئے تھے جو اس کے خیال میں اوتار سنگھ ہو سکتا تھا۔

اس نے کلاک میں وقت دیکھا رات کے نو بج چکے تھے۔ ارجمند سونے کے لئے لیٹ گئی تھی۔ یہ اچھی بات تھی۔ اگر یہ عبدالحق وہی ہے تو وہ ارجمند کی وجہ سے اسے یہاں نہیں بلا سکتی تھی۔ مگر یہ قدرتی طور پر بہت اچھا وقت بن گیا تھا۔ اب اس وقت اس کا نکلنا تو مناسب نہیں تھا اور ارجمند کے سونے کے بعد اسے یہاں بلانے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔

لیکن اسے اچھو میاں پر ترس آنے لگا۔ صبح سے ہی وہ اس بھاگ دوڑ میں لگے تھے۔ ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا تھا انہوں نے۔ اور اب انہیں پھر دوڑنا تھا۔

یہ بات اس نے اچھو میاں سے کہی تو وہ برا مان گئے۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ اب یہ تو ہمارا کام ہے اور کون کرے گا؟'' انہوں نے احتجاج کیا۔

''اچھا! اب کھانا تو کھا لیں۔''

''اب اس معاملے کو نمٹا کر ہی بیٹھیں گے۔''

''دیکھیں، اب میں اس کے لئے رقعہ لکھوں گی۔'' نادرہ نے کہا۔

''آپ اتنی دیر میں کھانا کھا لیں۔ ویسے بھی کوئی جلدی تو ہے نہیں۔''

''کیوں؟''

''میں چاہتی ہوں کہ وہ آئے تو ارجمند سو چکی ہو۔''

''لیکن بیٹا! اگر وہ ...... وہ نہ ہوئے جو تم سمجھ رہی ہو تو اتنی رات کو زحمت دینا......''

''جی ہاں! لیکن مجبوری ہے۔ اس شرمندگی سے تو نہیں بچ سکتے۔''

نادرہ نے انہیں کھانا لا دیا۔ انہوں نے اس سے بھی کھانے کو کہا۔ لیکن اسے رقعہ لکھنا تھا۔ ویسے بھی ابھی تو وہ کھا بھی نہیں سکتی تھی۔ اس امکان نے اس کی بھوک اُڑا دی تھی۔

لیکن رقعہ لکھتے ہوئے اس نے دیکھا کہ اچھو میاں بھی بے دلی سے کھا رہے ہیں۔ شاید ان کی بھی اس جیسی ہی کیفیت تھی۔

اس نے رقعہ لکھ کر، تہہ کر کے اچھو میاں کی طرف بڑھایا۔

''یہ آپ اسے دے دیجئے گا۔''

''ٹھیک ہے بیٹا!'' اچھو میاں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کے جانے کے بعد وہ بے چینی سے ادھر ادھر پھرتی رہی۔ کوٹھے کی سرگرمیاں عروج پر تھیں اور ارجمند سوگئی تھی۔ مگر اسے قرار نہیں تھا۔ یہ معاملہ بہت اہم تھا۔

یہ ایسی بات تھی کہ لمحوں میں زندگی کا رخ بدل سکتا تھا۔ اگر وہ کوئی اور عبدالحق تھا تو بات یہیں ختم ہو جاتی۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی رہتا۔ مگر اس صورت میں بھی زندگی کا رخ تو بدلنا ہی تھا۔ کوئی بڑا فیصلہ تو ہونا ہی تھا۔ یہ پندرہ تاریخ اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کے بعد درمیان میں صرف ایک دن تھا۔ سولہ تاریخ۔ اور سترہ تاریخ کی صبح ..... اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ نہ جانے کیا فیصلہ ہو؟

پھر اس نے سوچا، ابھی تو یہ معاملہ اہم ہے۔ اگر یہ وہی اوتار سنگھ ہے تو کیا ہوگا؟

اس کے ذہن میں تو یہ تھا کہ وہ ارجمند کو اس کے سپرد کر دے گی۔ اسے یقین تھا کہ اس کے پاس ارجمند ہر طرح سے محفوظ رہے گی۔ بلکہ اس کا مستقبل بھی محفوظ ہوگا۔ بس ایک پیچیدگی تھی۔ وہ ارجمند کے خوابوں کا شہزادہ تھا۔ ابتداء میں تو اس نے سوچا تھا کہ یہ بچپن کی بات ہے۔ ہوتے ہوتے غیر اہم آ جائے گی۔ ایسی کہ بعد میں اسے یاد کر کے خود ارجمند بھی ہنسا کرے گی۔ لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ اس کی یہ سوچ غلط تھی۔ وہ سوچ تو بچی ہی کی تھی۔ لیکن

قدرت نے اسے پختگی دے دی تھی اور یہی نہیں، ارجمند کو یقین بھی تھا۔ وہ کہتی تھی کہ اللہ میاں اس سے باتیں کرتے ہیں۔

سوال یہ تھا کہ کیا وہ عبدالحق اس پیچیدگی کو سنبھال پائے گا؟ یہ معاملہ اس بیچارے کے لئے مصیبت تو نہیں بن جائے گا۔

پھر اس نے سوچا، یہ تو قبل از مرگ واویلا والی بات ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ عبدالحق ماضی کا اوتار سنگھ ہی ہو۔

مگر اس کی بے چینی کم نہیں ہوئی۔ وہ ٹہلتی رہی۔

❁ ❁ ❁

صادق گیٹ کو تالا لگا کر اپنے کوارٹر میں آ چکا تھا۔ وہ سونے کے لئے لیٹ ہی رہا تھا کہ گھنٹی بجنے لگی۔

''یہ کون آ گیا اس وقت؟'' نسیمہ نیند میں ڈوبی آواز میں بڑبڑائی۔

''تم سو جاؤ۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔'' صادق نے کہا۔ پھر جاتے جاتے اسے خیال آیا تو اس نے دیوار پر کیل سے لٹکی چابی اُتار لی۔

اس نے گیٹ کی کھڑکی کو کھول کر باہر دیکھا۔ باہر سفید بالوں اور داڑھی والا ایک معمر شخص کھڑا تھا۔ وہ بہت باوقار لگ رہا تھا۔

''ہاں بابا! کیا بات ہے؟'' صادق نے پوچھا۔

''ہمیں عبدالحق صاحب سے ملنا ہے۔'' معمر شخص نے بڑے وقار سے کہا۔

بات چیت سے تو نواب لگتا ہے۔ صادق نے سوچا۔ لباس صاف ستھرا ضرور ہے لیکن قیمتی نہیں۔

''دیکھو بابا! صاحب تو سونے کے لئے چلے گئے ہیں۔ صبح آ جانا۔''

''میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔''

''اس وقت تو نہیں مل سکتے۔''

باہر کھڑے اچھو میاں نے تیزی سے سوچنے کی کوشش کی کہ اس چوکیدار کو کیسے متاثر کیا جائے۔

''یہ بہت اہم معاملہ ہے۔'' بالآخر انہیں کچھ سوجھ گئی۔
''مجھے مسعود صاحب نے بھیجا ہے۔''
اس کا فوری نتیجہ برآمد ہوا۔ صادق نے گیٹ کھولا اور اسے لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ پھر وہ عبدالحق کے پاس گیا، جو اس وقت حمیدہ کے پاس بیٹھا تھا۔
''صاحب! مسعود صاحب نے کسی بزرگ کو بھیجا ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''
''انہیں اندر بٹھایا کہ نہیں؟'' عبدالحق فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔
''جی صاحب! وہ ڈرائنگ روم میں ہیں۔''
عبدالحق ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو اچھو میاں وہاں کھڑے تھے۔
''ارے! آپ کھڑے کیوں ہیں؟ تشریف رکھئے نا!''
''ناوقت تکلیف دینے پر شرمندہ ہوں۔'' اچھو میاں نے کہا۔
''معاملہ اہم نہ ہوتا تو.....''
''اس تکلیف میں نہ پڑیئے! بیٹھ کر سکون سے بات کریں۔ چچا جان کیسے ہیں؟ خیریت تو ہے نا؟''
اچھو میاں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ مسعود صاحب کو چچا جان کہہ رہا ہے۔
''جی وہ ٹھیک ہیں، میں یہ رقعہ لایا ہوں آپ کے لئے۔'' انہوں نے رقعہ اس کی طرف بڑھایا۔
عبدالحق نے رقعہ کھولا۔ پہلی سطر پڑھتے ہی وہ حیران رہ گیا۔ بغیر خطاب و القاب کے لکھا تھا۔
''یہ رقعہ ٹھاکر اوتار سنگھ کے لئے ہے۔ اگر آپ وہ نہیں ہیں تو آگے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ رقعہ نواب صاحب کو واپس کر کے انہیں بتا دیجئے کہ آپ مطلوبہ آدمی نہیں ہیں۔ اور اگر آپ کبھی ٹھاکر اوتار سنگھ تھے تو یہ رقعہ آپ

ہی کے لئے ہے۔''
عبدالحق نے اس مختصر سی تحریر کو کئی بار پڑھا۔ اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ یہ تو ماضی سے آنے والی کوئی آواز معلوم ہوتی ہے۔ اس نے سوچا۔ کوئی ایسا شخص، جو میرا پرانا واقف کار ہے۔ لیکن اسے میرے مسلمان ہونے کا علم نہیں۔
کون ہو سکتا ہے وہ؟ اس کا تجسس بھڑک اٹھا۔ اس نے صفحہ پلٹا اور وہاں لکھی تحریر پڑھی۔ وہ بھی مختصر ہی تھی۔
''ٹھاکر! مجھے نہیں معلوم کہ میں تمہیں یاد ہوں یا نہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ تم میری واحد امید ہو۔ یہاں میرا تمہارے سوا کوئی جاننے والا نہیں۔ مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ اور تمہارے سوا کوئی میری مدد نہیں کر سکتا۔
میں تمہیں یاد دلا دوں کہ دہلی میں کالج کی تعلیم کے دوران میں تمہاری کلاس فیلو تھی۔ شاید تمہیں جیمز اور ریٹا پارسن، محمود، امرتا، پشپا اور رام گوپال یاد ہوں۔ اور ریٹا کے گھر ہونے والی پارٹی.....''
وہ میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ عبدالحق نے سوچا۔
اچھو میاں اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے دل میں روشنی ہو گئی تھی۔ یہ یقیناً مطلوبہ آدمی تھا۔
عبدالحق آگے پڑھنے لگا۔
''یاد ہو... اور شاید تمہیں نادرہ بھی یاد ہو۔ تو میں وہی نادرہ ہوں ٹھاکر! اگر تم میری مدد کرنا چاہتے ہو تو اسی وقت نواب صاحب کے ساتھ میرے پاس چلے آؤ۔ باقی باتیں بالمشافہ ہوں گی۔''
نادرہ! اسے میں کیسے بھول سکتا ہوں؟ عبدالحق نے سوچا۔ اس نے ہی تو مجھے کلمہ سکھایا تھا۔ اور اس کی اہمیت مجھے بتاتی تھی۔ اس کا تو احسان ہے مجھ پر۔

اس نے دروازے کی طرف رخ کر کے صادق کو پکارا۔ ایک منٹ بعد صادق اندر آیا تو اس نے کہا۔

''یعقوب سے کہو کہ فوراً گاڑی نکالے۔ مجھے کہیں جانا ہے۔''

''بہتر صاحب!''

✿ ✿ ✿

گاڑی کو مین روڈ پر لانے کے بعد عبدالحق نے کہا۔

''اب بتائیے! کہاں جانا ہے نواب صاحب!''

اچھو میاں نے چونک کر اسے دیکھا۔ مگر اگلے ہی لمحے ان کی سمجھ میں آ گیا کہ نادرہ نے اس رقعے میں انہیں نواب صاحب لکھا ہوگا۔ انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''شاہی بازار۔''

عبدالحق نے بھرپور کوشش کر کے اپنے چہرے کو بے تاثر رکھا۔ اور اس نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ یعقوب کو ساتھ نہیں لایا۔

اس کے حکم پر صادق نے یعقوب کو سوتے سے اٹھایا تھا۔ وہ چلنے کے لئے تیار بھی تھا۔ حکم کا بندہ جو ٹھہرا۔ لیکن عبدالحق نے اس کا ہاتھ چھو کر دیکھا تو پتا چلا کہ اسے بہت تیز بخار ہے۔ بس پھر اس نے یعقوب کے اصرار کے باوجود اسے آرام کرنے کا حکم دیا اور خود ہی گاڑی نکال لی۔

اور اب اس کی افادیت سامنے آ رہی تھی۔ شاہی بازار اور نادرہ؟ اچھا ہی ہے، پردہ رہ گیا۔ یعقوب ساتھ آتا تو گواہ بن جاتا۔

اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے کن انکھیوں سے نواب صاحب کو دیکھا۔ نواب کا شاہی بازار میں کیا کام؟ اس نے سوچا۔ نواب نام بھی تو ہوتا ہے۔ ذہن میں جوابی سوچ اُبھری۔

اب وہ پھر کن انکھیوں سے ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان کے سر اور داڑھی کے بال مکمل طور پر سفید تھے۔ اس سے ضعیفی کا تاثر بنتا تھا۔ لیکن چہرے پر تازگی اور روشنی تھی۔ وہ چہرہ جوان تو نہیں، البتہ ادھیڑ عمری کا چہرہ ضرور تھا۔

دوسرے اس پر واضح طور پر نیکی تحریر تھی۔ ایسے آدمی کا شاہی بازار میں کیا کام؟

اس کی آنکھوں میں زرینہ کا چہرہ بھر گیا۔ زرینہ جسے وہ اپنی بہن سمجھتا تھا۔ کیا وہ شاہی بازار کے قابل تھی؟ لیکن وہ اسے وہیں ملی تھی۔ وہاں تو کوئی بھی پہنچ سکتا تھا۔ جو اللہ کی عافیت میں ہیں، وہ اس بازار سے وابستہ ہر مرد اور عورت کو مطعون کرتے ہیں، مجرم سمجھتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ تقدیر جو انہیں بھی اس قابل نفرت مقام پر پہنچا سکتی ہے۔

وہ نادرہ کا شاہی بازار میں تصور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی سوچوں کا رُخ موڑ دیا۔ وہ اس نادرہ کو یاد کرنے لگا، جو دہلی میں اس کے ساتھ پڑھتی تھی۔

ادھر اچھو میاں بھی اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی آدمی ہے۔ عمر تو اس کی زیادہ نہیں تھی۔ لیکن شاہی بازار کے حوالے پر جس طرح اس نے اپنے ردِعمل پر قابو رکھا تھا، وہ آسان نہیں تھا۔ اس سے اس کا رکھ رکھاؤ بھی ثابت ہوتا تھا، اور انسانیت نوازی بھی۔ نادرہ نے اس سے امید لگائی تھی، تو غلط نہیں لگائی تھی۔ شاہی بازار کے حوالے پر اس نے نادرہ کے بارے میں کچھ پوچھا بھی نہیں تھا۔

''ایسا کریں کہ یہاں روک دیں۔'' اچھو میاں نے کہا۔

''آگے تھوڑا فاصلہ ہے۔ ہم پیدل طے کرلیں گے۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے نواب صاحب! آگے کوئی کیچڑ تو ہے نہیں کہ گاڑی کے گندے ہونے کا ڈر ہو۔ اور ہو تو بھی کیا؟ گاڑی کو تو ہر طرح کے راستوں پر چلنا ہوتا ہے۔''

اچھو میاں شرمندہ ہوگئے۔ وہ اب بھی انہیں نواب صاحب کہہ رہا تھا۔ وہ راستہ بتانے لگے۔ چند لمحے بعد انہوں نے گاڑی رکوائی اور نیچے اترے۔ عبدالحق شیشے چڑھا کر گاڑی لاک کر رہا تھا۔

اس خیال سے اچھو میاں کو حیرت ہوئی کہ اتنا راستہ انہوں نے طے کیا، اور ان میں سے کسی نے بھی نادرہ کا تذکرہ نہیں چھیڑا۔ یہ عبدالحق یقیناً بڑا عالی

ظرف اور گہرائی والا جوان ہے۔

"جی نواب صاحب!"

عبدالحق کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

"جی.....! تشریف لائیے۔" انہوں نے کہا۔ ہارمونیم، طبلے کی آواز اور گھنگھروؤں کی آواز جیسے وہ پہلی بار سن رہے تھے، اور اس سے انہیں شرمندگی ہو رہی تھی۔

یہ بھی اس جوان کا کمال ہے۔ زینے پر قدم رکھتے ہوئے انہوں نے سوچا۔

❁ ❁ ❁

وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے یوں دیکھ رہے تھے، جیسے گویائی سے محروم ہو گئے ہوں۔ وہ دونوں کے لئے شاک تھا۔ عبدالحق نے نادرہ کو بارہا یاد کیا تھا، لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اسے یہاں ملے گی۔ اسی طرح نادرہ اس سے ملنے کی دعائیں کرتی رہی تھی، لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ وہ کبھی آئے گا۔ اس کے نزدیک اوتار سنگھ کو تو ہندوستان میں ہی ہونا تھا۔

وہ خاموشی سے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ وہ خاموشی ہر گزرتے لمحے کے ساتھ دبیز ہوتی جا رہی تھی۔

پھر عبدالحق نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

"مجھے افسوس ہے نادرہ! کہ وقت نے تمہیں یہاں لا پھینکا۔"

اور وہ جادوئی لفظ تھے۔ کوٹھے پر پہلی بار کسی اپنے نے وہ الفاظ کہے تھے۔ نادرہ کو پتا ہی نہیں تھا کہ اس کے وجود میں کیسی کالی گھٹا تلی کھڑی ہے۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ایسے کہ خود کو سنبھالنا ناممکن ہو گیا۔ پہلی بار سچی ہمدردی کے پرخلوص بول اس کے کانوں نے سنے تھے۔

عبدالحق اس کے پاس چلا آیا اور اس کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

"نہیں نادرہ! اب نہیں! اب تو رونے کا دور سمجھو کہ ختم ہو گیا۔"

وہ لمس بھائی جان کے ہاتھوں کا تھا یا وہ ابا جان تھے۔ نادرہ کے اندر کا طوفان اور بپھر گیا۔ وہ عبدالحق سے لپٹ گئی۔

عبدالحق کبھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا، کبھی اس کی پیٹھ تھپ تھپاتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے؟

بالآخر طوفان تھم گیا۔ عبدالحق اپنی جگہ جا بیٹھا۔

نادرہ اب شرمندہ ہو رہی تھی۔

"تمہارے لفظوں نے سارے زخم ہرے کر دیئے۔ کسی اپنے کی کسی ایسی ہی ہمدردی کو تو ترس رہی تھی میں۔" اس نے کہا۔

"اگلا جملہ تو تم نے مجھے بولنے ہی نہیں دیا تھا نادرہ! تم ایسے روئیں کہ میں سب کچھ بھول گیا۔"

نادرہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ جیسے اگلے جملے کے بارے میں پوچھ رہی ہو۔

"مگر مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے ڈھونڈ لیا۔ اب انشاء اللہ تم یہاں نہیں رہو گی۔" عبدالحق نے کہا۔

"لیکن تم نے مجھے ڈھونڈا کیسے؟"

"تم نے ناپ کیا، تمہاری تصویر چھپی اخبار میں۔ پھر پتا چلایا۔" نادرہ نے کہا۔ پھر وہ پہلی بار مسکرائی۔

"مجھے بھی بہت بڑی خوشی ملی۔ پتا دلی میں میرا بہت جی چاہتا تھا کہ تم مسلمان ہوتے۔"

آٹھ برس بعد ملنے والوں کو اس درمیانی عرصے کی روداد بھی کہنی اور سننی تھی۔ عبدالحق کی کہانی تو طویل نہیں تھی۔ لیکن نادرہ پر گزرنے والے وہ آٹھ برس بہت طویل تھے۔ اس کی کہانی سنتے ہوئے عبدالحق بار بار مٹھیاں بھینچتا تھا۔

نادرہ نے اسے سب کچھ سنا دیا۔ سب کچھ بتا دیا... ارجمند کے بارے میں، اچھو میاں کے بارے میں اور عارف کے بارے میں۔

"دیکھو اللہ کی کرنی، ایک ماہ پورے ہونے سے پہلے ہی مجھے تم سے ملا

دیا۔"

"واقعی......! اللہ بڑا رحیم و کریم ہے۔"

"اور یہاں، اس مقام پر بھی تم پر کیسے کیسے کرم فرمائے۔ نواب صاحب اور عارف جیسے لوگ، اور یہاں رزقِ حلال کی عطا، کوئی معمولی بات تو نہیں۔ مجھے تو فخر ہو رہا ہے تم پر۔"

"نہیں اوتا...... عبدالحق! یہ تو مقامِ شکر ہے۔" نادرہ نے کہا۔ پھر شرمندہ ہو کر بولی۔

"زبان پر وہ نام چڑھا ہوا ہے نا! آسانی سے تو نہیں اُترے گا۔" پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔

"اگر میں تمہیں ٹھاکر کہوں تو تمہیں برا تو نہیں لگے گا۔"

"نہیں بھئی! برا کیوں لگے گا؟ مجھے اللہ نے ٹھاکر پیدا کیا ہے۔ قبیلہ تو آدمی کی پہچان ہوتا ہے۔" عبدالحق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔

"یہ بتاؤ! مجھ سے کیا چاہتی ہو تم؟"

"میں چاہتی ہوں کہ میری بھتیجی ارجمند تمہارے گھر رہے۔ اور تم ہر طرح سے اس کا خیال رکھو۔"

"یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔"

"مسئلہ ہے، اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟"

"کوشش تو کرو۔ اب میں اتنا ذکمزور بھی نہیں ہوں۔"

"بھئی شرم بھی آتی ہے مجھے۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

"ارجمند تم سے محبت کرتی ہے، تم اس کے خوابوں کے شہزادے ہو۔"

عبدالحق کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ پھر اس نے سنبھل کر کہا۔

"وہ مجھے کیا جانے؟"

نادرہ اٹھ کر گئی۔ پھر وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ڈرائنگ کی ایک کاپی تھی۔

"لو......! خود دیکھ لو۔"

عبدالحق نے کاپی کھولی تو دیکھتے کا دیکھتے ہی رہ گیا۔ وہاں پہلے سے بڑی حیرت اس کی منتظر تھی۔ اس کی تصویر...... اسی بازار میں...... ہوٹل کے باہر بیٹھے ہوئے ...... اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

چند لمحے بعد اس نے بمشکل کہا۔

"یہ...... یہ کیسے؟"

"یہ تو تم ہی بتاؤ! مجھے تو حیرت ہوئی تھی کہ تم یہاں بھی آ سکتے ہو۔"

پھر عبدالحق کو یاد آ گیا۔

"ہاں......! میں یہاں تین چار بار آیا ہوں۔ کسی کی تلاش تھی۔ **پھر** اسے نکالنا تھا۔"

"یہ سامنے جو ہوٹل ہے، یہاں بیٹھے ہوئے ارجمند نے تمہیں دیکھا۔ تمہاری تصویر بنائی۔ اور بس، اسی روز سے تم اس کے شہزادے ہو گئے۔"

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔

"کیا عمر ہو گی تمہاری بھتیجی کی؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"جب اس نے تمہاری یہ تصویر بنائی تو شاید چھ سات برس کی تھی۔"

عبدالحق کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"تب تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، تم بلاوجہ پریشان ہو رہی ہو۔"

"اب ارجمند تیرہ برس کی ہے۔" نادرہ نے سنگین لہجے میں کہا۔

"تو بچی ہی ہے نا؟"

"اس عمر میں بچیاں بڑی ہونے لگتی ہیں۔" نادرہ نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

"اور ارجمند ویسے بھی ایک مختلف بچی ہے۔"

"بچیاں تو سبھی ایک جیسی ہوتی ہیں۔"

"وہ غیر معمولی بچی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر تم وہی مہ حہ میں سمجھ رہی ہوں تو تم ہندو ہو۔ اس پر اس نے پورے یقین سے کہا کہ نہیں، وہ

مسلمان ہیں۔ اور یہ بات اسے اللہ میاں نے بتائی ہے۔ میں گھبرا گئی۔ میں نے کہا، اللہ میاں کب بات کرتے ہیں کسی سے، کہنے لگی، مجھ سے تو کرتے ہیں۔ میرے دل سے آتی ہے ان کی آواز، اور بالکل میری آواز جیسی ہے۔ سچ ٹھاکر! مجھے تو بہت ڈر لگا۔''

عبدالحق کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اللہ کسی کو بھی، کسی بھی وقت حیران کر دینے والی حد تک نواز دیتا ہے۔ میں خود اس کی مثال ہوں۔ کون جانے تمہاری بھتیجی بھی '' وہ کہتے کہتے رُکا۔

''میرے بارے میں اور کیا کہا اس نے؟''

''وہ کہتی ہے کہ اللہ میاں نے اسے بتایا ہے کہ اس سے شادی کے بعد تم بڑے ہوگے، اور وہ تمہیں بڑا بنائے گی۔ اس نے کہا تھا کہ تم آؤ گے اور اسے اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔ اب تم خود ہی بتاؤ۔''

عبدالحق سوچتا رہا۔ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن اتنا اس نے سمجھ لیا کہ بات کرنے کا یہ رمز یہ انداز وہ پہلے بھی دیکھ اور سن چکا ہے۔ بلکہ اس کے پتا جی کو بھی اس کا تجربہ تھا۔ جس مجذوب نے اس سے کلمہ پڑھوایا تھا، وہ اسی انداز میں باتیں کرتا تھا۔ لیکن بارہ تیرہ سال کی بچی، اور جب اس نے یہ باتیں کی ہوں گی تو وہ اور بھی چھوٹی رہی ہوگی۔ لیکن کون جانے؟

بات سمجھ میں نہیں آئی، لیکن ذہن کے کسی نہاں خانے میں محفوظ ہوگئی۔

''لیکن عارف صاحب سے شادی کے بعد وہ عزت کے ساتھ تمہارے ساتھ رہ سکتی ہے۔'' اس نے کہا۔

نادرہ نے اسے غور سے دیکھا۔

''ڈر گئے ٹھاکر!''

''یہ بات نہیں!'' عبدالحق نے جلدی سے کہا۔

''کچھ پیچیدگیاں میرے ساتھ بھی ہیں۔''

''ایک بات بتا دوں۔ ارجمند تمہاری ہر بات مانے گی۔ تمہارے لئے

اس کی فرمانبرداری مثالی ہوگی۔ یہ میں جانتی ہوں۔''

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

''مجھے یقین نہیں ہے کہ عارف سے میری شادی ہو سکے گی۔''

''کیوں؟ ایسا کیوں سوچتی ہو تم؟''

''اللہ نے مجھ پر کرم کیا تھا۔ اور میں نے اللہ کو گواہ بنا کر ایک عہد کیا تھا۔ سچ پوچھو تو میں عہد شکنی کر کے خوش نہیں رہ سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ مجھے عہد شکنی سے بچائے گا۔ تو ظاہر ہے کہ ایسا ہوا تو عارف سے میری شادی نہیں ہو سکے گی۔''

''پرسوں سترہ تاریخ ہے۔ فیصلہ ہو جائے گا۔''

''کس نے دیکھی ہے سترہ تاریخ؟'' نادرہ کے لہجے میں گہری اداسی تھی۔

عبدالحق نے ٹٹولنے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم کوئی منفی فیصلہ تو نہیں کر چکی ہو؟'' اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''جو لوگ فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیں، وہ خود کوئی فیصلہ نہیں کرتے۔ یہ تو بے ایمانی ہے نا!''

''دیکھو نادرہ! ایک بات سوچو! تمہیں اللہ نے عزت کی زندگی دی تو یہ بات سب کو عجیب اور غیر فطری لگے گی کہ ارجمند تمہاری بجائے میرے پاس رہے۔''

''چلو چھوڑو۔ مجھے لگتا ہے کہ میں زبردستی تم پر ایک ناگوار بوجھ ڈال رہی ہوں۔'' نادرہ نے دل گرفتگی سے کہا۔

عبدالحق تڑپ گیا۔

''غلط سمجھ رہی ہو مجھے۔ میں نے تو سامنے کی ایک بات یاد دلائی تھی۔ تم بس یہ بتاؤ کہ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟ دوستوں اور محسنوں کے لئے تو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''میں تمہارے لئے معاملے کو آسان کر دیتی ہوں۔'' نادرہ نے گہری

سانس لے کر کہا۔

''کل تم مجھے داتا دربار کے صحن میں ملو۔ میں ارجمند کو لے کر وہاں آؤں گی۔ اور تمہیں سونپ دوں گی۔ پھر اگر عارف سے میری شادی ہوگئی تو میں اسے اپنے ساتھ رکھوں گی۔ یہ تو ٹھیک ہے نا؟''

''اب مجھے صحیح اور غلط، آسان اور مشکل سے کوئی سروکار نہیں۔ جو تم کہو گی، میں کروں گا۔''

''لیکن اگر مجھے کچھ ہوگیا تو پھر تم ہی ارجمند کے وارث ہوگے، اور اسے اپنے ساتھ رکھو گے۔''

''ٹھیک ہے!''

''اور اگر میری قسمت میں اٹھارہ تاریخ کو دیکھنا نہیں ہے تو وہ تمہارے ہی پاس رہے گی۔''

''تم بہت قنوطی ہوگئی ہو۔ دیکھ لینا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

نادرہ نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

''میں ارجمند کو سمجھا دوں گی۔ وہ انشاء اللہ تمہارے لئے کبھی مسئلہ نہیں بنے گی۔ لیکن تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

''کہو.....!''

''بن ماں باپ کی بچی ہے۔ دُنیا میں اس کا کوئی نہیں۔ اس کی کوئی بات بری لگے تو بھی نرمی اور شفقت سے کام لینا۔ اس کا دل میلا نہ ہونے دینا کبھی۔''

''ارے.....! میں اسے اولاد کی طرح رکھوں گا۔''

''یہی تو میں نہیں چاہتی، وہ بھی نہیں چاہے گی۔ اس سے اپنے تعلق کو کسی رشتے کا نام نہ دینا۔ اسے بہن، بیٹی کہہ کر بھی نہ پکارنا۔ جیسے میرے اندر ایک یقین ہے، ویسے ہی اس کے اندر بھی ہے۔ اور اس کے خیال میں وہ یقین اللہ ہی کا دیا ہوا ہے۔''

''اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ انشاء اللہ وہ تمہارے پاس ہی رہے

گی۔'' عبدالحق نے بے حد خلوص سے کہا۔

''لیکن جو وعدہ تم چاہتی ہو، وہ میں کر رہا ہوں۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کل ہی کیوں؟ تم اٹھارہ تاریخ تک انتظار بھی تو کر سکتی ہو۔ دو تین دن کے لئے اسے مجھے سونپنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''تم نہیں سمجھو گے۔ یہ اللہ سے میرا کمٹمنٹ تھا۔ تم سا کوئی آ گیا تو ارجی کو فوراً ہی کوٹھے سے رُخصت کردوں گی۔ اس وقت آدھی رات نہ ہوتی، اور وہ سو نہ رہی ہوتی تو میں اسی وقت اسے تمہارے ساتھ بھیج دیتی۔''

''چلو ٹھیک ہے! اچھا ایک بات اور...... اگر وہ میرے پاس رہی تو اس کے مستقبل کے فیصلے میں ہی کروں گا نا؟''

''ظاہر ہے! لیکن ٹھاکر! کچھ فیصلوں میں تو اس کی مرضی کی اہمیت ہوگی۔''

''ہاں.....! اتنا تو میں سمجھتا ہوں۔''

''بس تو کل گیارہ بجے داتا دربار کے صحن میں ملاقات ہوگی۔''

''انشاء اللہ!''

❁ ❁ ❁

نوربانو اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ اس نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''کہاں چلے گئے تھے آپ!''

''ایک ضروری کام سے جانا پڑا۔''

''کم از کم مجھے بتا تو دیتے جانے سے پہلے۔''

''اتنا موقع ہی نہیں تھا۔ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی تھی۔''

نوربانو اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھتی رہی۔ لیکن وہ مزید کچھ کہنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

''کون تھے وہ بزرگ، جو آپ کو لینے آئے تھے؟''

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا۔

''وہ صادق نے مجھے بتایا تھا۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''خود سے تو نہیں بتایا ہوگا، تم نے پوچھا ہوگا۔'' عبدالحق نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کوئی جرح ہے اس میں؟'' نوربانو نے معصومیت سے پوچھا۔

''یہ تو تمہارے سوچنے کی بات ہے۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ صادق نے کیا سمجھا ہوگا۔''

''کیا سمجھا ہوگا؟''

''یہی کہ ہم دونوں ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے، اور ایک دوسرے سے اپنے معاملات چھپاتے ہیں۔''

''اللہ! یہ تو مجھے خیال ہی نہیں آیا..... سچ!'' نوربانو نے اٹھلا کر کہا۔ پھر بولی۔

''مگر آپ خود دیکھیں، آپ نے تو مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔''

''تم نے موقع ہی کب دیا؟ آتے ہی تفتیش شروع کر دی۔'' عبدالحق نے کہا۔

''ورنہ مجھے تو بتانا ہی تھا۔''

''اچھا بابا! معاف کر دیں، اب بتائیں تو.....''

''اس وقت نہیں۔ کل بات کریں گے اس پر۔''

''کیوں؟ اس وقت کیوں نہیں؟''

''بھئی! پہلے اماں کو بتاؤں گا۔ ان سے اجازت لوں گا۔''

نوربانو کو بہت برا لگا۔ لیکن اس کا تجسس اور بھڑک اٹھا۔ عبدالحق نے حمیدہ سے اجازت لینے کی بات کی تھی۔ ایسی کیا بات ہے؟ ایسے موقعوں پر وہ حمیدہ سے بری طرح چڑنے لگتی تھی۔

عبدالحق نے دیکھا۔ رات کی رانی کچھ مرجھا سی گئی تھی۔ یہ اس کی خفگی کی علامت تھی۔ لیکن وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اماں سے بات کرنے سے پہلے وہ نوربانو سے کیسے بات کرسکتا تھا۔

لیکن پھر رات کی رانی خود ہی مہک اُٹھی۔ نازک بیل درخت سے لپٹ گئی۔ وہ ایک سحر تھا، جس نے اسے جکڑ لیا تھا۔

پھر کچھ دیر بعد نوربانو نے بھاری سانسوں کے درمیان بکھرتی سرگوشی میں پوچھا۔

''بتایئے نا! کہاں گئے تھے آپ؟''

اور نہ جانے کیسے، مگر سحر ٹوٹ گیا۔ عبدالحق کو لگا کہ کسی نے اس کے سر پر بالٹی بھر کے ٹھنڈا پانی اُنڈیل دیا ہے۔

''کہا نا! پہلے اماں کو بتاؤں گا۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

نوربانو کو لگا کہ اس کا جادو تاثیر میں کچھ کم ہوگیا ہے۔

❁❁❁

پہلے تو نادرہ نے سوچا کہ وہ ارجمند کو سرپرائز دے گی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ اسے تو ارجمند کو سمجھانا تھا، بہت کچھ بتانا تھا۔

ناشتے کے بعد اس نے ارجمند سے کہا۔

''تمہارے لئے ایک خوش خبری ہے گڑیا!''

ارجمند نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا۔

''مگر آج تو سولہ تاریخ ہے پھپھو!'' اس نے حیرت سے کہا۔

نادرہ کو حیرت ہوئی۔ کیا وہ بھی ایک ایک دن گن رہی ہے؟

''یہ خوش خبری تمہارے لئے ہے..... بہت بڑی۔ اوتار سنگھ، جنہیں تم نے دیکھا تھا، جن کی تم تصویریں بناتی ہو، وہ مسلمان ہو چکے ہیں۔ اب ان کا نام عبدالحق ہے۔''

ارجمند کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''آپ کو کیسے پتا چلا پھپھو!''

''آپ بے فکر رہی پھپھو! مجھے تو ان سے بھی محبت ہے۔''

''کس سے.....؟''

"آغا جی کی بیوی سے۔"

اس جواب نے نادرہ کو اور حیران کر دیا۔

"تو تمہیں یہ بھی معلوم ہے؟"

"جی پھپھو! مجھے معلوم ہے کہ وہ ان سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اسی لئے تو مجھے بھی ان سے محبت ہوگئی ہے۔"

نادرہ کو لگا کہ یا تو وہ پاگل ہوگئی ہے، یا ارجمند کا دماغ اُلٹ گیا ہے۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق جانتا تھا کہ یہ ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اس بچی ارجمند کو گھر لانے سے پہلے گھر میں موافقت کی فضا تیار کرنا ضروری تھا۔ اماں کو تو اس نے سب کچھ بتا دیا تھا اور اماں تو جگت اماں تھیں۔ ان کے پاس تو ساری دُنیا کے لئے ممتا تھی۔ وہ سب کے لئے دردمند تھیں، سب سے محبت کرتی تھیں۔ بلکہ وہ تو خوش ہوئیں کہ ان کی تنہائی دور ہوگی۔

لیکن نوربانو ٹیڑھی کھیر تھی۔ دُشواری یہ تھی کہ اسے سب کچھ بتایا نہیں جا سکتا تھا۔ خاص طور پر کوٹھے سے تعلق کے بارے میں۔ اور اسے مطمئن کرنا بھی ضروری تھا۔ جبکہ اس کے لئے جھوٹ بولنا بھی آسان نہیں تھا۔ بلکہ وہ جھوٹ بولنے سے بچتا تھا۔

لیکن کسی کی عزت کے لئے تو جھوٹ بولنے سے نہیں بچا جا سکتا۔ اس کے دل نے کہا۔

"اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ رات کو میں کہاں گیا تھا۔" اس نے نوربانو سے کہا۔

نوربانو کے لئے تو وہ زخم تھا۔ دل میں اس نے سوچا۔ اماں کو بتا آئے تو اب مجھے بتا رہے ہیں۔ تاہم اس نے اپنا ردِعمل ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"جی......! بتایئے! کیا بات ہے؟"

"دہلی میں کالج میں میری ایک ہم جماعت تھی...... نادرہ......رات اس نے مجھے بلوایا تھا۔"

یہ نوربانو کے لئے اور تشویش کی بات تھی۔

"پاکستان آتے ہوئے نادرہ کا پورا خاندان ختم ہوگیا۔" عبدالحق نے مزید کہا۔

"اس کے اور اس کی بھتیجی کے سوا کوئی نہیں بچا۔ جو شاید اس وقت چار پانچ سال کی ہوگی۔"

اور اب گیارہ بارہ سال کی ہوگی۔ نوربانو نے سوچا۔ اور وہ ہم جماعت نادرہ تو ان کے ہی برابر ہوگی۔

"میں سمجھ گئی۔" اس نے کہا۔

"اب ان کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اس لئے آپ انہیں اپنے گھر لا کر رکھیں گے۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں؟"

عبدالحق کو کرنٹ سا لگا۔ بات بہت سخت تھی۔ لیکن لہجہ نہ تو سخت تھا نہ طنزیہ۔ اور یہ خوش آئند بات تھی۔ پھر بھی اس موقع پر اپنے لہجے میں قطعیت اختیار کرنا بہت ضروری تھا۔

"یہ بات نہیں ہے۔ دراصل نادرہ کی شادی ہو رہی ہے۔"

نوربانو نے واضح طور پر سکون کا سانس لیا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آپ اسے سرپرست بن کر رخصت کیجئے گا۔"

عبدالحق نے اسے غور سے دیکھا۔ لیکن چہرے کا تاثر طنز کی غمازی نہیں کر رہا تھا۔

"ہاں! انشاء اللہ!" اس نے کہا۔

"یہ نادرہ کی خوش نصیبی ہے کہ اس کا گھر بسنے کا سامان ہوگیا۔ لیکن اب اسے اپنی بھتیجی ارجمند کی فکر ہے۔"

"کیوں بھئی؟"

"جس سے نادرہ کی شادی ہو رہی ہے، وہ اسے جانتی نہیں۔ اسے اندازہ نہیں کہ بڑی ہوتی ہوئی ارجمند وہاں محفوظ ہوگی یا نہیں؟"

''یہ تو شہر کے اندیشے والی بات ہے۔'' نور بانو نے کہا۔

''ایسا ہوتا ہے نور بانو! اصل میں مسئلہ ہمارا نہیں۔ اس لئے ہم اسے اس طرح نہیں سمجھ سکتے۔'' عبدالحق نے بے حد تحمّل سے کہا۔

''نادرہ نے یہاں جو سات آٹھ سال گزارے ہیں، وہ آسان نہیں تھے۔ اس لئے وہ عدم تحفظ کا شکار ہے۔ بھتیجی کی طرف سے وہ خاص طور پر پریشان ہے۔ وہ کسی اجنبی پر اپنے معاملے میں تو بھروسہ کر سکتی ہے۔ لیکن ارجمند کے لئے نہیں۔''

''تو پھر....؟''

''وہ چاہتی ہے کہ ارجمند کچھ دن ہمارے ہاں رہے۔ پھر جب وہ اپنے شوہر کی طرف سے مطمئن ہو جائے گی تو ارجمند کو اپنے گھر لے جائے گی۔''

''اور وہ مطمئن نہ ہوئی تو؟''

''تو ارجمند ہمارے ہاں ہی رہے گی۔'' عبدالحق نے اندر کی جھنجلاہٹ کو دباتے ہوئے کہا۔

''تو پھر سنیں! وہ کبھی مطمئن نہیں ہوگی۔'' نور بانو نے غصے سے کہا۔

''وہ اپنی بلا ہمارے سر منڈھ رہی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''جوان لڑکی کو وہ اپنے ساتھ رکھے، تاکہ شوہر ہی ہاتھ سے نکل جائے۔ وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے۔ اس لئے اپنے مسئلے کو ہمارا مسئلہ بنا رہی ہے۔''

عبدالحق کو بھی غصہ آ گیا۔ لیکن وہ غصہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''سب عورتیں تمہاری طرح نہیں ہوتیں۔''

''لو.....! میں کہاں سے بیچ میں آ گئی۔'' نور بانو نے معصومیت سے کہا۔

''اس معصوم بچی کو بلا کہہ رہی ہو۔ اور ہمارے سر منڈھنے کا تو یہی مطلب ہوا نا کہ تم سمجھتی ہو، میں تمہارے ہاتھ سے نکل جاؤں گا۔'' عبدالحق کے لئے اب برداشت کرنا ممکن نہیں تھا۔

''میں جانتا ہوں، تم تنگ دل ہو، زرینہ سے، آپا سے، معصوم بچوں تک

سے تمہیں رقابت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن آج جو تم نے کہا، وہ تو میرے کردار پر حملہ ہے۔ کیا سمجھتی ہو تم مجھے۔ میں ناقابل اعتبار ہوں۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ!'' نور بانو کا انداز مدافعانہ ہو گیا۔

''میں نے ایسا کب کہا؟ میں تو دنیا کی بات کر رہی تھی۔ کیا کیا ہوتا ہے دُنیا میں...؟''

''دُنیا دیکھی ہی تو نہیں ہے تم نے۔ ورنہ یہ ناشکرا پن کیوں کرتیں؟ تمہیں کیا پتا ہے دنیا ہے؟ دیکھتی کہ دنیا میں کیسے کیسے مظلوم لوگ پڑے ہیں تو دل بڑا ہوتا۔ تب دوسروں سے ہمدردی اور غم گساری کا جذبہ پیدا ہوتا۔''

عبدالحق کے جارحانہ انداز نے نور بانو کو سیدھا کر دیا۔ نہ صرف وقتی طور پر، بلکہ آگے کے لئے بھی۔ اس نے جلدی سے موضوع بدلا۔

''ارے یہ بتائیں کہ اتنے برسوں کے بعد نادرہ نے آپ کو کیسے ڈھونڈ نکالا۔''

''وہ امتحان کے رزلٹ کے ساتھ تصویر بھی چھپی تھی نا میری''

نور بانو چند لمحے سوچتے رہی۔

''مگر وہ تو آپ کو اوتار سنگھ کی حیثیت سے جانتی ہوگی۔ جبکہ اخبار میں نام عبدالحق کا تھا۔''

''اس نے خط میں یہی لکھا تھا کہ اگر میں کبھی اوتار سنگھ رہا ہوں تو خط پڑھوں ورنہ واپس کر دوں۔''

''اوہ.....! اللہ کیسے ملاتا ہے لوگوں کو۔'' نور بانو نے بے حد خلوص سے کہا۔ پھر بولی۔

''تو اب آپ اس بچی کو لینے جا رہے ہیں؟''

''ہاں!'' عبدالحق نے کہا۔ اور پھر سنجیدہ ہو گیا۔

''دیکھو نور بانو! اس بچی نے پانچ سال کی عمر میں ماں باپ، بہن بھائی، دادا دادی، چچا تایا، سب رشتے کھو دیئے۔ ایسے لوگ بڑے نازک ہوتے ہیں۔ انہیں تو دل جوئی اور محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم اس پر مہربان کرو گی تو

اللہ خوش ہوگا۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ میں یہ درد سمجھتی ہوں۔ میں اس کا دل میلا نہیں ہونے دوں گی۔ میں اس کا ہر طرح خیال رکھوں گی۔"

"اور یہ ذہن میں رکھو کہ مجھ پر شک کرو گی تو میں کبھی برداشت نہیں کروں گا۔"

نور بانو دن میں ہی رات کی رانی بن گئی۔

"آپ پر شک کون بدبخت کرے گا؟ ایک آپ ہی پر تو یقین ہے ہمیں۔ بس آپ اتنے قیمتی ہیں ہمارے لئے کہ آپ کو کھونے کے تصور سے بھی ڈر لگتا ہے۔" اس نے اٹھلا کر کہا اور عبدالحق سے لپٹ گئی۔

ہمیشہ کی طرح عبدالحق موم ہوگیا۔

"صرف موت ہی مجھے تم سے جدا کر سکتی ۔"

نور بانو نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بس.....! ایسی باتیں نہ کریں۔"

❁ ❁ ❁

عبدالحق کو احساس تھا کہ نور بانو کی وجہ سے وہ کچھ لیٹ ہوگیا ہے۔ داتا دربار کے صحن میں کھڑا وہ ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ عقب سے کسی نے اسے سلام کیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو نادرہ اس کے سامنے تھی۔ وہ برقع میں تھی، اور اس کے ساتھ بارہ تیرہ سال کی ایک بچی تھی، جس نے بڑے اہتمام اور سلیقے سے خود کو دوپٹے میں چھپا رکھا تھا۔ بچی کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔

عبدالحق نے سلام کا جواب دیا اور کہا۔

"آؤ میرے ساتھ۔"

"کہاں؟"

"چلو تو.....!"

باہر عبدالحق کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور بچی سے کہا۔

"ارجمند! آپ آگے بیٹھیں گی میرے ساتھ۔"

ارجمند نے حیرت اور خوشی سے اسے دیکھا۔

"آپ کو میرا نام معلوم ہے؟"

"جی ہاں! بیٹھئے!"

ارجمند بیٹھ گئی تو عبدالحق نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر نادرہ کو بٹھایا اور پھر خود ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا۔ پھر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔

"کہاں جا رہے ہو؟" نادرہ نے پوچھا۔ اسے ڈر تھا کہ عبدالحق انہیں اپنے گھر نہ لے جائے۔

"وہاں، جہاں سکون سے بیٹھ کر بات کر جاسکے۔"

"داتا دربار سے زیادہ سکون کہاں ہوگا؟" نادرہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

"ارجمند کے ساتھ وہاں بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔ تم فکر نہ کرو۔"

ڈرائیو کرتے ہوئے عبدالحق کو احساس ہوا کہ ارجمند ٹکٹکی باندھے، پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہی ہے۔ اس نے سر گھمائے بغیر دھیرے سے کہا۔

"کیا بات ہے ارجمند! کیا میں آپ کو جانا پہچانا لگ رہا ہوں؟"

"لگنا کیسا؟ آپ تو ہیں ہی جانے پہچانے۔" ارجمند نے بے ساختہ کہا۔ پچھلی نشست سے نادرہ کھنکھاری تو اس نے جلدی سے اضافہ کیا۔

"آپ مجھے اجنبی نہیں لگتے۔"

عبدالحق نے سوچا، شاید مجھ میں اس کے کسی بچھڑی ہوئی محبوب ہستی کی مشابہت ہوگی۔ کوئی چچا، بھائی، ماموں ... اور کون جانے باپ کی ہی ہو۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ مجھے اس بات کی بڑی فکر تھی۔"

چند لمحے خاموشی رہی پھر ارجمند نے اچانک کہا۔

"ایک بات بتائیں۔ آپ پھپھو کو تو تم کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، اور مجھے آپ کہتے ہیں جبکہ پھپھو مجھ سے بڑی ہیں۔"

عبدالحق ہنس دیا۔

''واقعی! آپ کو تو عجیب لگے گی یہ بات۔ دراصل میں اور آپ کی پھپھو کالج میں ساتھ پڑھتے تھے۔ تو ہم بے تکلف ہیں۔ اور آپ سے میں آج ہی ملا ہوں۔''

''تو پھر آپ مجھ سے بھی بے تکلف ہو جایئے۔''

اس بار عبدالحق اسے دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی نگاہوں میں حیرت تھی۔

''آپ مجھے بھی تم ہی کہیں۔ آپ کہتے ہیں تو لگتا ہے، بہت دور سے بات کر رہے ہیں۔''

نادرہ بہت زور سے کھنکھاری۔

''ارجی! تم بہت بول رہی ہو گڑیا!''

''بولنے دو۔ اچھا لگتا ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''بہت پیاری باتیں کرتی ہے ماشاء اللہ!''

''میری باتیں بھی یاد ہیں نا ارجی؟'' نادرہ نے کہا۔

''جی پھپھو! سب یاد ہے۔ سوری پھپھو!''

اسی لمحے عبدالحق نے گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے سامنے روک دی۔

❁ ❁ ❁

ارجمند کو ایسی خوشی کبھی نہیں ملی تھی۔ وہ تو جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اس بات کا تو اسے یقین تھا کہ اس کے آغا جی اسے ملیں گے۔ لیکن وہ یہ ضرور سوچتی تھی کہ یہ کیسے ہوگا؟ اور کب ہوگا؟

اس نے انہیں صرف ایک بار دیکھا تھا، اور وہ بھی بازار کی مصنوعی روشنیوں کے درمیان۔ اس کے بعد اس نے بارہا سوچا تھا کہ کیا ان کے چہرے کی وہ روشنی بازاری روشنیوں کی وجہ سے تو نہیں تھی۔ کیا ان کا چہرہ واقعی ایسا ہی روشن ہوگا؟

اور اب وہ دن کی روشنی میں اس کے سامنے تھے، اور ان کا چہرہ اس

رات سے بھی زیادہ روشن تھا۔ اور ان کی آواز، بات کرنے کا اپنائیت اور محبت بھرا انداز، اس چہرے کو اور روشن کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں وہ تہذیب اور شائستگی تھی، جو ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے کہیں بھی نہیں دیکھی تھی۔ ہاں بابا جان اور دادی بھولی بسری یاد ابھرتی تھی۔

وہ اداس ہو گئی۔ مدتوں کے بعد اسے اپنا گھر، اپنے لوگ یاد آئے تھے۔ لیکن خوشی کے اس دن وہ اداس ہونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھتی رہی۔ انہیں احساس ہوا، انہوں نے پوچھا کہ کیا وہ اسے جانے پہچانے لگتے ہیں۔ اب وہ انہیں کیا بتاتی۔ اس نے جو کہا، اس پر پھپھو کھنکھاریں۔ وہ اسے احساس دلا رہی تھیں، کہ یاد دلا رہی تھیں۔

پھر گاڑی رکی۔ وہ ایک ریسٹورنٹ تھا۔ آغا جی نے پہلے اس کے لئے دروازہ کھولا اور پھر پھپھو کے لئے۔ وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے، جو خاصا خوب صورت تھا۔ آغا جی انہیں ایک فیملی کیبن میں لے گئے۔

ارجمند نے بہت پہلے پرانی باتوں کو یاد کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ دل بند ہو جائے گا۔ لیکن آغاز جی سے مل کر وہ سب یاد آنے لگا تھا۔ اس وقت بھی اسے وہ دن یاد آ گیا۔ جب بابا جان اسے اور امی کو کناٹ پیلس کے ایسے ہی ریسٹورنٹ میں لے گئے تھے۔

لیکن ایک فرق تھا۔ آج ماضی کی یادوں سے اسے گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ اچھا لگ رہا تھا۔

وہ بیٹھ گئے۔ آغا جی نے اس سے پوچھا۔

''کیا لیں گی آپ...؟'' پھر شاید انہیں اس کی بات یاد آ گئی۔ انہوں نے جلدی سے کہا۔

''سوری بھئی! خیر، یہ بتاؤ، کیا لو گی...؟''

''جو آپ لیں گے۔''

''ہم تو کبھی کڑوی چیزیں لیتے ہیں۔ تم اپنے لئے کچھ میٹھا پسند کر لو۔''

''جو آپ منگوائیں گے، وہی مجھے اچھا لگے گا۔''

آغا جی پھپھو کی طرف مڑے۔

''کافی منگوائیں۔''

پھپھو کے چہرے سے لگتا تھا کہ انہیں بھی کچھ بھولی ہوئی باتیں یاد آ گئی ہیں۔ انہوں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''ضرور.....!''

کافی آئی تو پھپھو نے کہا۔

''ریٹاپارسن کی پارٹی یاد آ گئی۔''

''اور کالج کی کینٹین.....''

''اور وہاں ہونے والے مباحثے.....''

''اور محمود کی شہادت.....''

ارجمند کو لگا کہ وہ وہاں محض ایک مداخلت کار ہے۔ لیکن نہیں، یہ بات نہیں۔ ان کے نزدیک تو وہ وہاں موجود ہی نہیں۔ وہ تو اسے بھول چکے ہیں۔ لیکن اسے برا نہیں لگا۔ بس اسے پھپھو پر رشک آنے لگا۔

''چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی بعض اوقات کتنا پیچھے لے جاتی ہیں آدمی کو۔'' آغا جی نے کہا۔

''اور کتنا اچھا لگتا ہے۔'' پھپھو بولیں۔

''تمہارا خط پڑھنے کے بعد، تم سے ملنے کے بعد مجھ سے سویا نہیں گیا۔ سب کچھ یاد آتا رہا۔''

''حالانکہ ہمارے درمیان ایسا گہرا تعلق نہیں تھا۔''

آغا جی چند لمحے سوچتے رہے، جیسے ایک ایک لفظ کو تول رہے ہوں۔

''تعلقات کا تعین عرصے پر نہیں، معاملات کی نوعیت پر ہوتا ہے۔'' انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بعض اوقات چند لمحوں کا تعلق کسی کو کسی کے لئے اتنا اہم بنا دیتا ہے کہ وہ ساری زندگی اسے نہیں بھولتا۔'' وہ کہتے کہتے رکے، پھر گہری سانس لے کر بولے۔

''تمہارے لئے ہمارا تعلق چھوٹا اور غیر اہم ہوگا۔ لیکن میرے لئے.....''

''یہ درست نہیں۔'' پھپھو نے احتجاج کیا۔

''میرے لئے وہ بہت بڑا تعلق ہے۔ تم سے میرا احسان کا رشتہ ہے۔ جو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔''

ارجمند سحر زدہ سی سب کچھ سن رہی تھی۔ اس گفتگو سے وہ ان دونوں کو سمجھ رہی تھی۔ وہ زور سے سانس بھی نہیں لے رہی تھی کہ کہیں انہیں اس کی موجودگی کا احساس نہ ہو جائے۔

''یہ ظرف کی بات ہے۔ عالی ظرف آدمی ایک سرسری بات کو بھی احسان سمجھ لیتا ہے۔''

''وہ سرسری اور معمولی بات نہیں تھی۔'' آغا جی نے احتجاج کیا۔

''تم نے مجھے بہت کچھ دیا تھا اس رات۔ تم نے مجھے اللہ کے اور شرک کی خوف ناکی کے بارے میں بتایا تھا۔ تم نے مجھے کلمے سنائے تھے۔''

''اور عربی میں ہونے کے باوجود تم نے ان کا مطلب بتا دیا تھا۔'' پھپھو کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''ہاں! اور وجہ یہ تھی کہ میں بہت اچھے استاد سے عربی پڑھتا رہا تھا۔'' آغا جی نے کہا۔

''اب احسان کی بات یہ ہے کہ تم سے وہ کلمے سننے کے بعد وہ کلمے میرا معمول بن گئے۔ ناپاکی کا احساس ہوتا تو میں کلمہ طیبہ پڑھتا۔ اللہ کی قدرت دیکھتا تو کلمہ شہادت پڑھتا۔ یہ معمول تھا میرا۔ اور جس رات میں نے اسلام قبول کیا، کسی کو مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بلکہ بتانے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ میں نے خود اللہ کی وحدت کی گواہی دی۔ یہ تمہارا احسان تھا مجھ پر، اور کوئی چھوٹا احسان نہیں تھا۔ اللہ سے دعا ہے کہ تمہیں اس کا اعلیٰ ترین اجر عطا فرمائے۔''

''یہ بتاؤ، تمہیں اسلام قبول کرنے کا خیال کیسے آیا؟''

''سورۂ ملک کی آیات سن کر اور آسمان کو دیکھ کر۔'' آغا جی نے کہا اور

تفصیل بتانے لگے۔

''تم شروع ہی سے غیر معمولی انسان تھے ٹھاکر..... عبدالحق!'' پھپھو نے کہا۔

''نہیں.....! یوں کہو کہ مجھ پر ابتداء ہی سے اللہ کا خاص فضل و کرم تھا، الحمدللہ!''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن یہ بات سمجھتا کون ہے؟ خود کو بڑی سادگی سے سیلف میڈ کہنے والوں کو پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ اللہ کے فضل کی نفی کر رہے ہیں، اور خود پر غرور کر رہے ہیں۔''

''اللہ نے اپنے فضل سے یہ بات مجھے سمجھا دی۔ میں پہلے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اور پھر اس کے بنائے ہوئے وسیلے کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جس نے کسی بندے کے احسان کو نہیں مانا، وہ نظر نہ آنے والے مگر ہر جگہ موجود اللہ کا شکر کیسے ادا کر سکتا ہے۔ اسی لئے تو میں تمہیں محسن مانتا ہوں۔ میں تمہارے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''میں نے اپنا سب کچھ تمہیں سونپ دیا ہے۔ اس معصوم بچی کے ذریعے۔'' پھپھو نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''غلطیاں تو بڑوں سے بھی ہوتی ہیں، یہ تو بچی ہے۔ اس کی غلطیوں سے درگزر کرتے رہنا، اور یہ محروم ہے، اس کی محرومیوں کو دور کرنا۔''

''تم فکر نہ کرو، میں محبت کی دنیا کا آدمی ہوں، اور غیر ذمہ دار نہیں، ذمہ دار ہوں۔ اب چلیں؟''

وہ باہر آئے۔ عبدالحق کا اصرار تھا کہ وہ نادرہ کو اپنی گاڑی میں چھوڑ کر آئے گا۔ لیکن نادرہ اس کے لئے تیار نہیں تھی۔

''یہ مناسب نہیں ہے ٹھاکر عبدالحق! میں خود ہی چلی جاؤں گی۔''

وہ نادرہ اور ارجمند کی الوداعی ملاقات تھی۔ نادرہ نے ارجمند کو لپٹا لیا اور بے تابانہ اسے پیار کرنے لگی۔

''ارجی! میری جان! میری ہر بات یاد رکھنا۔ ایثار اور قربانی اور سچائی

سے اللہ کو خوش کرنے سے عزت ملتی ہے آدمی کو۔ عاجزی سے رہنا میری بچی۔ خدمت کو شعار بنانا۔ اپنی غرض اور ضرورتوں کو بھول جانا۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔''

ارجمند بڑی مشکل سے آنسو روکے ہوئے تھی۔

''ہم پھر ملیں گے نا پھپھو!''

''ہاں میری بچی! زندگی رہی تو ضرور ملیں گے۔ اب تم جاؤ۔''

عبدالحق اپنی آنکھیں بھگونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے منہ پھیر لیا تھا۔

''اچھا عبدالحق، خدا حافظ!'' نادرہ نے اس سے کہا۔

''خدا حافظ نادرہ! فی امان اللہ!''

وہ دونوں نادرہ کو جاتے دیکھتے رہے۔ نادرہ سائیکل رکشہ میں بیٹھ گئی تو عبدالحق نے بڑی اپنائیت سے ارجمند کو پکارا۔

''چلیں ارجی!''

ارجمند نے چونک کر اسے دیکھا۔ ارجی پہلے کبھی کسی کے منہ سے اتنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اور لہجے میں کیسی محبت تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

عبدالحق نے اس کے لئے دروازہ کھولا، اور اس کے بیٹھنے کے بعد بند کر دیا۔ پھر وہ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آیا۔

راستے میں ارجمند کی عجیب متضاد کیفیات تھیں۔ وہ خوش تھی کہ اپنے آغا جی کے ساتھ جا رہی تھی۔ وہ خوف زدہ تھی کہ ایک اجنبی دیس میں، اجنبی لوگوں کے درمیان جا رہی تھی۔ اور وہ غم زدہ تھی کہ پہلی بار پھپھو سے دور ہو رہی تھی۔

اسے پتا بھی نہ چلا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

عبدالحق نے اس کے آنسو دیکھے تو تڑپ گیا۔ اس نے گاڑی سائیڈ میں روکی اور پھر اس کی طرف مڑا۔

''تم تو ابھی سے رو رہی ہو ارجی! میں نادرہ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟''

''آپ کو پھپھو کا بہت خیال ہے؟'' ارجمند نے سسکیوں کے درمیان کہا۔

"اب اس سے زیادہ تمہارا خیال ہے۔ میں تمہارے آنسو برداشت نہیں کرسکتا۔" عبدالحق کے لہجے میں سچائی تھی۔

"انہیں روکنے کے لئے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔"

"کچھ بھی؟"

"ہاں! بس تم رونا کبھی نہیں۔"

"مجھ سے شادی کریں؟" ارجمند کے منہ سے بے سوچے سمجھے نکلا۔ وہ جیسے بہت چھوٹی سی بچی بن گئی تھی۔

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے نادرہ کی بات یاد آ گئی۔ اس نے برابر والی سیٹ پر خود کو دوپٹے میں اچھی طرح لپیٹ کر سمٹی ہوئی لڑکی کو دیکھا۔ وہ بچی تھی، اور اس نے بات بھی بچوں کے انداز میں کی تھی۔ اسے ہنسی آ گئی۔

"ابھی تو تم بہت چھوٹی ہو۔" اس نے بھی بے سوچے سمجھے جواب دیا۔ بلکہ کہنے کے بعد بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔

ارجمند اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو جیسے ہمیشہ کے لئے پونچھ دیئے۔ پھر اس نے نظریں جھکاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"جی ..... ! ٹھیک ہے۔"

"بس میرے سامنے....." وہ کہتے کہتے رکا۔

"نہیں..... ! بس تم کبھی بھی نہیں رونا۔ ورنہ میرے لئے یہ بوجھ ہوگا۔"

"جی ..... ! اب کبھی نہیں روؤں گی میں۔" ارجمند نے کہا۔

عبدالحق نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

❁ ❁ ❁

نادرہ کی عجیب کیفیت تھی۔ سب لڑکیاں ابھی تک سو رہی تھیں۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ بس ایک ارجمند نہیں تھی تو کوٹھا سونا سونا لگ رہا تھا۔ سینہ بھی خالی خالی سا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی کیفیت اس ماں کی سی ہوگی، جو اپنی بیٹی کو وداع کر کے بیٹھی ہو۔ یہ وہ قیاس ہی کرسکتی تھی۔ کیونکہ اسے خوشی

بھی تھی کہ ایک بھاری بوجھ سر سے ہٹ گیا۔ اور افسردگی بھی تھی کہ اب اس کے پاس زندگی کا کوئی جواز نہیں رہا۔ وہ متاع جسے وہ برسوں سے دل سے لگائے بیٹھی تھی، وہ اب اس کی نہیں رہی۔ اس نے سوچا، اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ پھر اس نے سوچا، اچھا ہی ہوا۔ میں اس قابل تھی بھی کہاں؟

خوشی کے ساتھ اسے یہ اطمینان ہی تھا کہ ارجمند محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔

اسے اس کیفیت سے اچھو میاں نے نکالا، جو اس کے پاس آ بیٹھے تھے۔ اس نے غور سے انہیں دیکھا۔ وہ بہت اُجڑے اُجڑے لگ رہے تھے۔ اپنی کیفیت بھول کر اس نے کہا۔

"کیا بات ہے نواب صاحب! اتنے اداس کیوں ہیں؟"

"ارجی کیا گئی کہ لگتا ہے، سینے میں دل ہی نہیں رہا۔" اچھو میاں نے اداسی سے کہا۔

"آپ جب چاہیں، جا کر اس سے مل سکتے ہیں۔"

اچھو میاں نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں بیٹا! اب تو وہ پرائی ہوگئی۔ بیٹیاں تو ہوتی ہی پرائی ہیں۔"

"یہی حال میرا بھی ہے۔"

اچھو میاں نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

"تم تو ازل سے اکیلے تھے۔ پھر اللہ نے کرم کر دیا۔ تم اور ارجی مل گئے ہمیں، اب سوچتے ہیں، آدمی کتنی جلدی عادی ہو جاتا ہے رشتوں کا۔ چاہے وہ عارضی ہوں۔" پھر انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"آج وہ گئی، کل تم بھی چلی جاؤ گی۔ تو پھر ہم رہیں پہلے کی طرح اکیلے۔"

اس بات پر نادرہ کو عارف یاد آیا۔ اور یاد آیا کہ آج سولہ تاریخ ہے، اور کل سترہ ہوگی..... فیصلے کا دن!

"تم کیوں اداس ہوتی ہو؟ کل عارف میاں آئیں گے اور تم ان کے

ساتھ چلی جاؤ گی۔''

''کون جانے نواب صاحب!'' نادرہ نے آہ بھر کے کہا۔

''جو اللہ کو منظور!''

''اب ایسی مایوسی کی باتیں زیب نہیں دیتیں تمہیں۔'' اچھو میاں نے فہمائش کی۔

''ذرا سوچو، پرسوں تک ارجی کی طرف سے کیسی پریشان تھیں تم! پھر اللہ نے وہ کر دکھایا جو تم سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ بچھڑے ہوئے لوگ کہیں یوں ملتے ہیں اتنی آسانی سے؟ اب وہ بہتری فرما رہا ہے تو تم ناشکرا پن کر رہی ہو۔''

''نہیں نواب صاحب! میں تو آج شکرانے کے نفل ادا کروں گی۔ سچ میں بڑی مدد کی ہے اللہ نے۔''

''کل اس کا اور کرم ہوگا تم پر انشاء اللہ!''

نادرہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

''اگر کل میں عارف کے ساتھ جاتی ہوں تو آپ بھی چلیں گے میرے ساتھ؟''

''نہیں بیٹا! اللہ تمہارا گھر آباد کرے۔ ہماری تو منزل پہلے سے طے ہے۔''

''آپ کو میری اور ارجمند کی کمی نہیں محسوس ہوگی؟''

''بالکل ہوگی۔ تمہاری یادیں ہمارے دل میں رہیں گی۔ لیکن ہم اس کے ہو جائیں گے، جو انسانوں کا واحد سہارا ہے۔ کسی کا بھی اس کے سوا کوئی نہیں۔ بس آدمی اس بات کو سمجھ نہیں پاتا تو بدنصیبی ہے۔''

''کبھی کبھی ملنے تو آئیں گے ہم سے؟''

''باپ بیٹیوں کے گھر کب جاتے ہیں؟ بیٹیاں آتی ہیں باپ سے ملنے۔ یاد رکھنا، ہمارا گھر داتا دربار کا صحن ہوگا۔ جب جی چاہے، ملنے کے لئے آجانا۔''

اچھو میاں چلے گئے۔ نادرہ وہیں بیٹھی سوچتی رہی۔ تو کل سترہ تاریخ

ہے۔ جو کچھ ہوا، کیسا ناقابل یقین ہے۔ اس نے سوچا۔ اسے یاد تھا کہ ایک ماہ پہلے اس نے عارف سے کیا کہا تھا ..... اگر ایک ماہ کے عرصے میں کوئی ارجمند کو اس جہنم سے نکالنے کے لئے نہیں آیا تو میں آپ سے شادی کر لوں گی۔ ارے! اللہ کیسا رحیم و کریم ہے۔ دو دن پہلے .... صرف دو دن پہلے اس نے ارجمند کے لئے نجات دہندہ بھیج دیا۔ کیسے اس کی تصویر نظر آئی، کیسے اس کا پتا چلا، معجزہ سا لگتا ہے۔

اس کے کانوں میں عارف کی آواز گونجی ..... اور اگر اللہ نے ارجمند کے لئے کوئی نجات دہندہ بھیج دیا تو ..... ؟

اسے یاد تھا کہ اس سوال پر وہ گم سم ہوگئی تھی۔ جواب اس کے پاس تھا ہی نہیں۔ اپنے عہد کی زنجیر بھی تو تھی اس کے پاؤں میں۔ لیکن پھر وہ جواب اس کے اندر سے ہی ابھرا تھا۔ تب اسی تاریخ کو میں زندہ ہوئی تو خود کو آپ کے سپرد کر دوں گی۔

اور کل وہی تاریخ تھی۔ کل وہ زندہ ہوئی تو وعدے کے مطابق عارف کے ساتھ چلی جائے گی۔ لیکن اس سے پیچھے ایک وعدہ اور تھا ..... اس وعدے سے بھی بڑا ..... اللہ کو گواہ بنا کر کیا ہوا وعدہ۔ عارف سے وعدہ نبھا کر وہ عہد شکنی کی مرتکب ہوگی۔ تو کیا اس کے بعد وہ صحیح معنوں میں کبھی خوش رہ سکے گی؟

پھر اس نے سوچا، اب اس پر پریشان ہونے کا کیا فائدہ؟ اللہ جو فیصلہ بھی فرمائے گا، اسی میں میرے لئے بہتری اور سکون ہوگا۔

❁ ❁ ❁

نور بانو حمیدہ کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ عبدالحق آنے والی کو سب سے پہلے اماں سے ملوائے گا۔ اور وہ خود اس سے ملنا چاہتی تھی۔ دیکھے تو، وہ کون ہے؟ کیسی ہے؟

مگر عبدالحق اس بچی کو لے کر کمرے میں آیا تو وہ اسے دیکھ کر دم بخود ہوگئی۔ اس سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔ وہ بس ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ لیکن اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں تھا۔

حمیدہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''یہ میری اماں ہیں ارجی!'' عبدالحق نے ارجمند سے کہا۔

ارجمند نے بے بسی سے عبدالحق کو دیکھا۔

''کیا بات ہے؟''

''میرا رونے کو جی چاہ رہا ہے۔'' ارجمند نے سادگی اور معصومیت سے کہا۔

''کیوں؟''

''اماں بالکل میری دادی جیسی ہیں۔ انہیں دیکھ کر دادی یاد آ گئیں۔''

اتنی دیر میں حمیدہ نے اسے لپٹا لیا۔

''تو میں بھی تیری دادی ہی ہوں نکی!''

ارجمند نے لپٹے لپٹے چپکے سے اپنے آنسو پونچھ لئے۔

حمیدہ نے اسے الگ کر کے پیچھے ہٹایا اور غور سے اسے دیکھا۔

''لگتا ہے، دن میں چاند نکل آیا۔ تیرا نام کیا ہے نکی!''

''میرا نام ارجمند ہے دادی اماں!'' ارجمند نے کہا۔

''اور دادی اماں! نکی کا کیا مطلب ہے؟''

''چھوٹی کو کہتے ہیں۔'' عبدالحق نے جلدی سے وضاحت کی۔

''آپ مجھے نکی ہی کہا کریں دادی اماں! اچھا لگتا ہے۔''

''اور یہ میری بیوی نور بانو!'' عبدالحق نے تعارف کرایا۔ پھر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نور بانو رو رہی ہے۔

''ارے! تمہیں کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں! کوئی یاد آ گیا تھا۔'' نور بانو نے کہا۔ وہ اب بھی ٹکٹکی باندھے ارجمند کو دیکھے جا رہی تھی۔ کیسی غیر معمولی مشابہت ہے۔ اس نے سوچا۔ وہی سرخ و سفید رنگت، ویسی یہ ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں اور ترشے ہوئے ہونٹ اور عمر بھی وہی تھی، جس میں گلنار اس سے بچھڑی تھی۔ اس کی آخری دید اس کی آنکھوں میں تازہ ہوگئی تھی۔ اس کی کم سن معصوم بہن، جو بے لباس تھی،

جسے درندے بھنبھوڑ رہے تھے۔ وہ بہن جس کے حسن و جمال سے وہ حسد کرتی تھی۔ لیکن اسے کھو کر اس نے جانا کہ وہ چھوٹی بہن اسے کس قدر محبوب تھی۔

وہ اس لڑکی کو غور سے دیکھتی رہی۔ اسے احساس ہوا کہ مشابہت تو ہے لیکن یہ لڑکی گلنار کے مقابلے میں دراز قد ہے۔ وہ جو گلنار کو حسن کا معیار سمجھتی تھی، یہ تسلیم کئے بغیر نہ رہ سکی کہ یہ لڑکی گلنار سے کہیں زیادہ حسین ہے۔ اس کم سنی میں بھی اس کی شخصیت میں شہزادیوں کا سا وقار اور تمکنت تھی، جو اس کے حسن کو اور بڑھا رہی تھی۔

''کون یاد آ گیا؟'' عبدالحق نے اسے چونکا دیا۔

اسے احساس ہوا کہ لڑکی بھی اسے بہت غور سے دیکھ رہی ہے۔ اس نے دھیرے سے کہا۔

''میری چھوٹی بہن گلنار...... ارجمند کی صورت اس سے بہت ملتی ہے۔''

''تو میں آپ کو باجی کہہ سکتی ہوں؟'' ارجمند اس سے مخاطب ہوئی۔

''نہیں!'' اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

عبدالحق نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

چند لمحوں کے توقف کے بعد نور بانو نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''تم مجھے آپی کہا کرو۔ گلنار مجھے آپی ہی کہتی تھی۔''

''ٹھیک ہے آپی!'' ارجمند نے خوش ہو کر کہا۔ اس لمحے وہ بہت چھوٹی سی، ننھی سی بچی لگی۔ وہ خوش تھی۔ بچوں کی طرح خوش۔ کتنے عرصے کے بعد اسے ایک گھر اور کچھ رشتے نصیب ہوگئے تھے۔

مگر پھر وہ اداس ہوگئی۔ اسے پھپھو یاد آ گئی تھیں۔

''آؤ! میں تمہیں گھر دکھاتی ہوں۔'' نور بانو نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

وہ چلی گئیں تو عبدالحق نے سکون کا سانس لیا۔ خلافِ توقع صورتِ حال خراب نہیں تھی، بلکہ بہت اچھی تھی۔

''بہت پیاری بچی ہے۔'' حمیدہ نے کہا۔

''مجھے اسے دیکھ کر ایسا لگا کہ برسوں سے جانتی ہوں۔''

ادھر ارجمند بہت خوش تھی۔ ایک تو یہ کہ اسے آتے ہی وہ اپنائیت اور محبت ملی تھی، جس کی اسے امید نہیں تھی۔ دوسرے گھر بہت بڑا اور بہت خوب صورت تھا۔ خاص طور پر عبدالحق کا مطالعے کا کمرہ اسے بہت اچھا لگا۔ پر باغیچے نے تو اسے مسحور ہی کر دیا۔ درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں، بہت ترتیب سے بنی پھولوں کی کیاریاں، اور جھولے۔

''یہاں تھوڑی دیر بیٹھیں آپی!'' اس نے نور بانو سے کہا۔

''کیوں نہیں! آؤ!''

وہ سنگ مرمر کی خوب صورت بینچ پر بیٹھ گئیں۔

نور بانو کو ماضی کو یاد کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ دکھی ہونا کسے اچھا لگتا ہے۔ لیکن ارجمند آج اسے زبردستی کھینچ کر ماضی میں لے گئی تھی۔ اور بہنوں کے، اور خاص طور پر گلنار کے آخری لمحوں کے تصور نے وہ زخم کرید ڈالے تھے، جن کے بارے میں وہ سمجھتی تھی کہ بھر چکے ہیں۔

اور اب اس نے اس وقت ارجمند کو جھولوں کی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے پایا تو وہ پھر ماضی میں چلی گئی۔

دہلی میں ان کے گھر میں باغیچہ تو نہیں تھا، لیکن برسات کے موسم میں باجی اور گلنار برآمدے میں جھولا ڈال لیتی تھیں۔ ان دونوں کو برسات سے عشق تھا۔ جبکہ اسے نہ برسات سے کوئی دلچسپی تھی نہ جھولوں سے۔ وہ تو پہلی بار حق نگر میں جھولے پر بیٹھی تھی۔ تب اسے پتا چلا تھا کہ لڑکیوں کے دلوں کا جھولوں سے کیا ناطہ ہے۔

اسے یاد تھا۔ باجی بڑی ہونے کے ناطے جھولے پر پہلی باری لیتیں، اور پھر اُترتی ہی نہیں تھیں۔ گلنار کہتی رہتی کہ باجی بھئی! یہ تو بے ایمانی ہے۔ پھر باجی اُترتیں،تو دو چار پینگیں دے کر کھسک لیتیں اور گلنار اکیلی ہی پینگیں بڑھانے کی کوشش کرتی رہتی۔ ہر بار یہی کچھ ہوتا تھا۔ اور اس دوران وہ خود بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی ہوتی تھی۔ گلنار اس کے پاس آتی اور جھولے کے لئے کہتی تو وہ صاف

انکار کر دیتی۔ نہیں بھئی! مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو پڑھ رہی ہوں۔ اور گلنار تنک کر کہتی۔ آپی! حد ہے آپ سے بھئی! آپ تو بڈھی روح ہیں۔

یہ سب یاد کرتے ہوئے نور بانو نے سوچا، کتنی بدل گئی ہوں میں۔ اب تو کسی کتاب کو ہاتھ لگائے مہینوں ہو جاتے ہیں۔ مطالعے کی عادت ختم ہوگئی۔ ہاں برسات اچھی لگتی ہے۔ جھولا جھولنا اچھا لگتا ہے۔ خیر یہ تو اچھی تبدیلی ہے۔ لیکن اندر سے میں ویسی ہی ہوں۔ خود غرض، جل ککڑی، ہر وقت محبت مانگنے والی اور محبت دینے کے نام پر صفر...... خود اعتمادی سے محروم اور خوف زدہ۔

اس کی نظر پھر ارجمند پر پڑی۔ جو جھولوں کو تک رہی تھی۔

''جھولا جھولو گی؟'' اس نے بے ساختہ اس سے پوچھا۔

ارجمند چند لمحے جھجکتی رہی پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو آؤ!'' نور بانو اسے جھولے کی طرف لے گئی۔

''بیٹھو! میں تمہیں پینگ دوں گی۔''

ارجمند بیٹھ تو گئی لیکن پھر گھبرا کر بولی۔

''مجھے ڈر لگے گا آپی! کب سے میں جھولے پر نہیں بیٹھی۔''

''ڈرنے کی تو کوئی بات ہی نہیں۔'' نور بانو نے اسے دلاسہ دیا۔

''الٹا مزہ آئے گا۔ اور پھر اترنا ہی نہیں چاہو گی۔''

نور بانو نے ہلکے ہلکے پینگ دی۔ شروع میں ارجمند کے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکلیں۔ مگر پھر اس کا اعتماد بحال ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی نور بانو اونچی پینگیں دینے لگی۔

اس لمحے نور بانو کو اپنے اندر ایک غیر معمولی خوشی کا احساس ہوا، جسے وہ گلنار کو پینگ دے رہی ہو۔ جیسے وہ ماضی کی کسی کوتاہی کا ازالہ کر رہی ہو۔ شاید گلنار کی روح خوش ہوگی اس سے۔

''بس آپی!''

نور بانو نے ہاتھ روکا۔ ارجمند نیچے اُتر آئی۔

''اب آپ بیٹھیں آپی!''

نور بانو بے جھجک بیٹھ گئی۔ ارجمند اسے پینگ دینے لگی۔ اس لمحے نور بانو کو سچ مچ ایسا لگا، جیسے وہ ارجمند نہیں، گلنار ہی ہے۔

چند منٹ جھولنے کے بعد اس نے جھولا روکا اور نیچے اُتر آئی۔

''آؤ! اب دونوں ساتھ جھولیں گے۔''

وہ دونوں جھولے پر ایک دوسرے کے روبرو کھڑی ہوگئی۔ اس طرح جھولنا نور بانو کو اور اچھا لگا۔

''ارے! یہ تو گلنار ہی ہے۔ اس نے سوچا۔

عبدالحق نے اپنی اسٹڈی کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھا تو اس کا دل خوش ہوگیا۔ وہ پھر حمیدہ کے کمرے میں چلا گیا۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں واپس آئیں۔

''آپ کا گھر بہت خوب صورت ہے۔'' ارجمند نے عبدالحق سے کہا۔

''ہمارا گھر کہو نا اسے۔ گھر ایک آدمی کا تو نہیں ہوتا۔''

''میں ارجمند کے لئے کمرہ ٹھیک کرا دوں۔'' نور بانو نے کہا اور جانے کے لئے مڑی۔

''ذرا رک تو......!'' حمیدہ نے اسے پکارا۔ پھر وہ ارجمند کی طرف مڑی۔

''نکی! ایک بات پوچھوں؟ سچ سچ بتائے گی نا؟''

''جی دادی اماں!''

''تجھے اکیلے سوتے ہوئے ڈر تو نہیں لگے گا؟''

''ڈر تو لگے گا دادی اماں!'' ارجمند نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''میں تو پھپھو کے ساتھ سوتی تھی۔ ان سے لپٹ کر۔''

''بس تو اب میرے ساتھ سویا کر۔ مجھ سے لپٹ کر۔''

اور ارجمند یوں خوش ہوئی، جیسے کوئی بہت بڑی دولت مل گئی ہو۔

''شکریہ دادی اماں!''

''چلیں! یہ تو اور بھی اچھا ہے۔'' نور بانو نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس رات سونے سے پہلے نور بانو نے عبدالحق سے کہا۔

''سنیں! ارجمند اپنے ساتھ کپڑے نہیں لائی ہے۔ کل ہی اس کے لئے ہر طرح کے کپڑوں کا بندوبست کریں۔''

''یہ ہر طرح کے کپڑوں سے کیا مراد ہے تمہاری؟''

''بھئی! گھر میں پہننے کے عام کپڑے، اور باہر جانے یا کسی تقریب کے لئے بہت اچھے کپڑے۔''

''تم کل یعقوب کے ساتھ چلی جانا بازار۔ یہ کام تو تم ہی کو کرنا ہوگا۔''

اور نور بانو خوش ہوگئی۔

❁ ❁ ❁

اس رات نادرہ کا دل چاہتا تھا کہ نوافل ادا کرتی رہے۔ اللہ نے جو کرم کیا تھا، اس کا شکر ادا کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ سوچ کر اس کا دل خوش ہوتا تھا کہ آج ارجمند اس چھت کے نیچے نہیں، بلکہ اس کے سر کے اوپر عزت کی چھت ہے۔

مگر جب وہ بستر پر لیٹی تو اسے ایسی مہیب تنہائی کا احساس ہوا، جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ نیلم بائی کی موت کے بعد سے ہر رات ارجمند اس سے لپٹ کر سوتی رہی تھی۔ ابتداء میں تو اسے الجھن ہوئی، کیونکہ وہ اس وقت تک ہر طرح کے لمس سے متنفر ہو چکی تھی۔ ایک طرف اسے لمس سے کراہت آتی تھی، تو دوسری طرف اپنی غلاظت کا احساس ستاتا تھا۔

لیکن پھر اللہ نے اسے غلاظت کے احساس سے نجات عطا فرما دی۔ ارجمند کا لپٹ کر سونا اسے نعمت معلوم ہونے لگا۔ وہ اس کی عادی ہوگئی اور اب اسے اس کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ بار بار اس جگہ پر ہاتھ رکھتی، اسے سہلاتی، جہاں ہر رات ارجمند لیٹتی تھی۔ لیکن بستر کا وہ حصہ حدت سے محروم، بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ ارجمند کے بغیر کیسے سو سکے گی؟

پھر اس نے سوچا، یہ آج [illegible]ت ہی کی تو بات ہے، صبح عارف آجائیں

گے۔ لیکن اندر ایک بے یقینی تھی، کون جانے؟ اس نے سوچا۔ اللہ کا فیصلہ کیا ہو اور یہ تو وہ ارادہ کر چکی تھی کہ عارف اسے اللہ کی رحمت سے مل جائیں تو اور بات ہے۔ وہ خود عارف کی قربت کا تصور نہیں کرے گی۔ اسے تو بس اللہ کو گواہ بنا کر اپنا کیا ہوا عہد یاد رکھنا تھا۔

یوں وہ رات اس کے لئے اور مشکل ہوگئی۔ وہ عارف کے ساتھ اپنے خوش گوار مستقبل کا تصور کرتی تو وقت آسانی سے گزر جاتا، اور شاید وہ سو بھی جاتی۔ لیکن یوں نیند آنا محال تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیا ارجمند اکیلی سو رہی ہوگی؟ کیا اسے ڈر لگے گا؟

ارجمند کی خالی جگہ کو چھوتے، سہلاتے، کروٹیں بدلتے وہ جاگتی رہی۔

ایسی بیداری میں بڑی اذیت ہوتی ہے۔ اور پھر اس کوٹھے کے ہر گوشے سے ابھرتی گناہ گار سرگوشیاں۔ پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ نیند کتنی بڑی نعمت ہے۔ ہر رات وہ سو جاتی تھی تو ان سرگوشیوں کا اسے پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ مگر رات کے سناٹے میں وہ چیختی ہوئی سرگوشیاں اسے ڈس رہی تھیں۔ اس رات سے پہلے اسے احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوٹھے پر ہے۔ مگر اس رات میں تو تمام عمر کی اذیتیں پنہاں تھیں۔

اس سے سویا نہیں گیا تو اس نے جا کر وضو کیا، اور قرآن پڑھنے بیٹھ گئی۔ اللہ نے کرم فرمایا۔ ایسی محویت اور ارتکاز عطا فرمایا کہ وہ گرد و پیش سے بےخبر ہوگئی۔ اس کے بعد فجر کی اذان کی آواز نے ہی اسے چونکایا۔

وہ صبح کا وقت تھا۔ باہر پرندوں کے چہچہے گونج رہے تھے۔ لیکن کوٹھے پر اس سناٹے کا راج تھا جو دنیا پر آدھی رات کو قابض ہوتا ہے۔ اسے یاد آیا کہ گناہ کی اس چار دیواری میں راتیں جاگتی ہیں اور دن سوتے ہیں، اور دن رات کا ایک ایک لمحہ نحوست سے ملبوس ہوتا ہے۔

اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ بے یقینی اور بے چینی ہوا ہوگئی۔ یہ سترہ تاریخ کی صبح ہے۔ اس نے خوشی سے سوچا۔ آج مجھے اس نحوست سے، اس کوٹھے سے نجات مل جائے گی؟ چاہے زندگی کے ساتھ ملے، چاہے موت کے ذریعے۔

آج بہر حال یوم نجات ہے۔

فجر کی نماز پڑھ کر اس نے عارف کے دونوں جوڑے نکالے اور ان پر استری کرنے لگی۔ وہ کپڑے اس نے سیے بھی محبت سے تھے اور اب ان پر استری بھی محبت سے کر رہی تھی۔

استری کئے ہوئے کپڑے اس نے بڑی احتیاط سے پرانے اخبار میں پیک کئے، اور انہیں تھیلے میں رکھ دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ استری ٹوٹے، اور کپڑوں پر شکنیں پڑیں۔

اتنی دیر میں اچھو میاں نماز پڑھ کر آئے۔ وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

''کیا بات ہے، آج آپ بہت خوش ہیں؟'' نادرہ نے ان سے پوچھا۔

''کیوں نہ ہوں؟ یہ تو عید جیسا مبارک دن ہے ہمارے لئے۔'' اچھو میاں نے کہا۔

''یہ یوم نجات ہے۔''

''آپ خوش رہیں گے نا؟''

''خوش ہیں، اور اس سے بھی زیادہ خوش رہیں گے۔'' اچھو میاں نے بڑے یقین سے کہا۔

''اب کسی بھی وقت عارف میاں آجائیں گے۔''

نادرہ نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ پھر چند لمحے بعد وہ بولی۔

''کون جانے؟'' پھر کچھ توقف کے بعد وہ بولی۔

''میں ناشتہ بناتی ہوں آپ کے لئے۔''

''آج تو کچھ کھایا ہی نہیں جائے گا۔ بس چائے بنا دو۔''

''سلائس تل لیتی ہوں۔ دیکھیں گے تو بھوک لگے گی اور کھا لیا جائے گا۔''

''کچھ زیادہ کر لینا۔ ہمیں یقین ہے کہ عارف میاں ناشتہ کئے بغیر آئیں گے۔''

نادرہ بغیر کچھ کہے باورچی خانے میں چلی گئی۔

❁ ❁ ❁

عارف کا کراچی میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ تو کراچی جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ لاہور میں رہا تو وعدہ نبھانا مشکل ہو جائے گا۔ اور وہ نادرہ سے ملنے ضرور آئے گا۔ جبکہ یہ نادرہ کو گوارا نہیں ہوگا۔

کراچی میں اس نے ایک ایک دن گن گن کر کاٹا تھا۔ کام میں بھی اس کا دھیان نہیں تھا۔ وہ تو بس دن رات نادرہ کی قربت کے تصور میں جی رہا تھا۔ یہ نہ ہوتا تو وہ وقت گزرتا ہی نہیں۔

وہ رات کو ہی لاہور پہنچا تھا۔ اس میں اس کے لئے آسانی تھی۔ اب صبح سترہ تاریخ تھی۔ اسے بس یہی ایک رات تو گزارنا تھی۔ لیکن یہ بھی آسان نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایک رات میں شاید کئی لاکھ لمحے ہوتے ہیں۔

اس سے سویا ہی نہیں گیا۔ وہ نیچے ہوٹل کے استقبالیہ پر گیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھا کلرک اونگھ رہا تھا۔ ہوٹل کا دروازہ بند تھا۔ عارف کو اس بیچارے کی بے آرام نیند خراب کرنا اچھا نہیں لگا۔ لیکن مجبوری تھی۔

''ذرا سنو!'' اس نے بہت دھیمی سرگوشی میں کہا۔

کلرک سوتا رہا۔ وہ سرگوشی اس کی سماعت تک نہیں پہنچ سکی تھی۔

عارف کو حیرت ہوئی کہ اتنی بے   میں بھی کوئی اتنی گہری نیند سو سکتا ہے۔ شاید اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ نیند کانٹوں پر بھی آجاتی ہے، اور یہ سچ ہے۔

اس نے نرمی سے کلرک کو ہلایا۔ وہ ہڑبڑا کر بیدار ہوا۔ چند لمحے تو جیسے اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ پھر اس نے عارف کو دیکھا تو گھبرا کر پوچھا۔

''کیا بات ہے سر!''

''مجھے قرآن پاک مل سکتا ہے؟''

''قرآن پاک؟'' کلرک نے حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔ جیسے وہ قرآن پاک کو جانتا ہی نہ ہو۔

''ہاں بھئی! مجھے قرآن پاک چاہئے۔''

''مشکل ہے سر!''

''کیا بات کرتے ہو؟''

''یہ ہوٹل ہے سر! یہاں قرآن کون طلب کرتا ہے۔''

عارف کو غصہ آگیا۔

''یہاں کام کرنے والے کیا مسلمان نہیں ہیں؟''

''ہیں سر! لیکن......'' کلرک کہتے کہتے رکا، جیسے کچھ خیال آگیا ہو۔

''ایک منٹ سر! میں اسٹاف روم میں دیکھتا ہوں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''ایک ساتھی ہمارا قرآن پڑھتا تو ہے۔''

کلرک چلا گیا۔ دو منٹ بعد وہ مسکراتا ہوا آیا تو اس کے ہاتھ میں قرآن پاک کا ایک نسخہ تھا۔

''یہ لیجئے سر!'' اس نے فخریہ لہجے میں کہا، اور سکون کی سانس لی۔ جیسے اس نے اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دیا ہو۔

عارف نے آدھا پارہ ہی پڑھا تھا کہ نیند آنے لگی۔ ہمیشہ اس کے ساتھ یہی ہوتا تھا۔ ترجمے کے ساتھ سمجھ کر پڑھتا تو اور بات تھی لیکن قرأت کرتا تو ذرا دیر میں ہی نیند آنے لگتی۔ وہ اس پر ہمیشہ شرمندہ ہوتا تھا۔ ایک بار اس نے کسی کے سامنے کہا بھی کہ میرے اندر شاید کوئی شیطان ہے۔ قرآن پڑھوں تو وہ مجھے سلاتا ہے۔ اس پر ایک بار اس کے چچا نے اسے ٹوک دیا تھا کہ ایسے نہیں کہنا چاہئے۔

''یہ اللہ کا کلام ہے بیٹے!'' انہوں نے کہا تھا۔

''یہ آدمی کی ہر کمی پوری کرتا ہے۔ اندر بے سکونی ہو تو سکون دیتا ہے۔ پریشانیوں کو کم کر دیتا ہے۔ مسائل کی بلاضرورت بڑھی ہوئی اہمیت کو کم کر کے ان کا حل سمجھاتا ہے۔ اور میاں! جب آدمی پرسکون ہو جائے تو قدرتی بات ہے کہ اسے نیند آجاتی ہے۔''

عارف نے قرآن پاک سرہانے رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ذرا دیر میں وہ سو گیا۔

لیکن وہ بہت گہری نیند نہیں تھی۔ دو بار اس کی آنکھ کھلی، شاید اس لئے کہ وہ تو محض وقت گزاری کر رہا تھا۔ صبح کے انتظار میں۔ دونوں بار اس نے گھڑی دیکھی اور دل میں سوچا کہ جہاں اسے جانا ہے، یہ اس کے لئے مناسب وقت نہیں۔

تیسری بار اس کی آنکھ کھلی تو سات بجے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ کوٹھوں پر راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں۔ لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ نادرہ فجر کے وقت اُٹھتی ہے، اور پھر سوتی نہیں۔

طویل اور اعصاب شکن انتظار ختم ہو گیا تھا۔

✿ ✿ ✿

ارجمند حمیدہ سے لپٹی تو ایسے سوئی کہ اسے پتا بھی نہ چلا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے دہلی والے گھر میں ہے۔ اور سچ مچ اپنی دادی اماں کے ساتھ ہے۔ اور وہ بہت گہری اور بہت میٹھی نیند تھی۔

مگر فجر کے وقت حمیدہ نے بڑی نرمی سے اسے خود سے علیحدہ کیا تو وہ اُٹھ بیٹھی۔ آنکھیں پوری طرح کھلی نہیں تھیں کہ اس نے کلمہ شہادت پڑھا، پھر بڑی محبت سے کہا۔

''السلام علیکم دادی اماں!''

حمیدہ نے اسے جواب دیا۔ وہ بہت خوش ہو گئی تھی۔

''تو سو جا نکی!'' اس نے شفقت سے کہا۔

''نہیں دادی اماں! میں تو روز اسی وقت اُٹھتی ہوں۔'' ارجمند نے کہا۔ ''اور خود ہی اُٹھتی ہوں۔ آج نہ جانے کیوں آنکھ نہیں کھلی۔''

''اپنی دادی کے پاس تھی نا!''

''جی دادی اماں! یہی بات ہے۔''

حمیدہ اُٹھنے لگی تو ارجمند نے اسے روک دیا۔

''آپ یہیں بیٹھیں دادی اماں! میں ابھی آئی۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

حمیدہ کو حیرت ہو رہی تھی۔ عبدالحق نے اس سے کچھ نہیں چھپایا تھا، سب کچھ بتا دیا تھا۔ مگر اس لڑکی کے طور طریقے دیکھ کر وہ حیران ہو رہی تھی۔ چار پانچ سال کی عمر کے بعد کوٹھے پر پلی بڑھی بچی ایسی ہو سکتی ہے؟ فجر کے وقت اُٹھنا، سب سے پہلے اپنے ربّ کی گواہی دینا، اور پھر بڑوں کو سلام کرنا؟ ایسا تو کبھی نور بانو نے بھی نہیں کیا تھا۔ حالانکہ پہلے تو وہ جلدی اُٹھتی تھی۔ اور اب تو وہ دن چڑھے ہی سو کر اُٹھتی تھی۔ بلکہ اس نے تو عبدالحق کی عادت بھی خراب کر دی تھی۔

ضرور اس لڑکی کا تعلق کسی بہت اچھے خاندان سے ہے۔ کسی بہت اچھے گھر کی بچی ہے یہ۔ اور صرف یہی نہیں، اس کی پھپھو بھی بہت نیک ہو گی جو اس نے کوٹھے پر بھی اس بچی کو ایسی تربیت کی۔ ورنہ پانچ سال کی بچی کوٹھے پر گزرے ہوئے سات برسوں میں ایسی نہ ہوتی کچھ اور ہوتی۔

یااللہ! حمیدہ نے بڑے دکھ سے سوچا۔ کیسے کیسے لوگ اس پاکستان میں آ کر کہاں پہنچ گئے، تیری مصلحتیں تو ہی جانے......

ارجمند نے اسے چونکا دیا۔

''یہ لیجئے دادی اماں! وضو کر لیجئے۔''

حمیدہ نے دیکھا، وہ وضو کا لوٹا ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔

''یہ کیا؟ تو کہاں گئی تھی نکی!''

''وضو کے لئے پانی گرم کرنے گئی تھی دادی اماں!''

''گرم پانی؟ لیکن موسم اتنا ٹھنڈا تو نہیں ہے نکی!''

ارجمند مسکرائی۔

''پھپھو کہتی ہیں، آدمی کو صبح کے وقت احتیاط کرنی چاہئے۔ گرم پانی کی ضرورت نہ ہو، تب بھی کنکنا ضرور کر لو۔''

''کنکنا؟''

''جی دادی اماں! بس اتنا گرم کہ پانی کی ٹھنڈک مر جائے۔ اسے کنکنا

کہتے ہیں۔"

حمیدہ نے وضو شروع کیا تو بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ پانی گرم ہرگز نہیں تھا۔ وہ سردی کے موسم میں کنویں سے نکلنے والے پانی جیسا تازہ تھا۔ اور واقعی، وضو کرتے ہوئے اسے بہت اچھا لگا۔

وہ وضو کر کے نکلی تو ارجمند بھی وضو کر چکی تھی، اور نماز کے لئے کھڑی ہو رہی تھی۔ حمیدہ نے سوچا، اللہ کی رحمت آ گئی ہے ہمارے گھر میں۔

دونوں نے نماز پڑھی۔ پھر حمیدہ ارجمند کے سلام پھیرنے کا انتظار کرتی رہی۔

ارجمند اُٹھنے لگی تو حمیدہ نے کہا۔

"ایک بات تو بتا نکی! تیری پھپھو نے یہ بھی بتایا کہ پانی گرم کیوں ہونا چاہئے۔"

"جی دادی اماں! وہ کہتی ہیں کہ حرارت زندگی ہوتی ہے۔ آدمی کے جسم کو نہ بہت گرم ہونا چاہئے اور نہ ٹھنڈا۔ زندگی ختم ہو جائے تو جسم ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اس لئے جسم کو کبھی ٹھنڈا نہیں ہونے دینا چاہئے۔ وہ کہتی ہیں، یہ اللہ کا نظام ہے۔ اسی لئے تو کنویں میں سے گرمی میں پانی ٹھنڈا اور سردی میں گرم نکلتا ہے۔"

واقعی، یہ تو سچ ہے۔ حمیدہ نے دل میں سوچا۔ اس کی پھپھو کتنی عقلمند ہے۔

ارجمند اب قرآن کی تلاوت کر رہی تھی۔ اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی، اور وہ پڑھ بھی بہت اچھا رہی تھی۔

"ذرا زور سے پڑھو نکی! تجھے تو بہت اچھا قرآن پڑھنا آتا ہے۔"

"جی ...! مجھے پھپھو نے پڑھایا ہے۔"

حمیدہ سوچتی رہی، وہ کیسی لڑکی ہوگی، جس نے کوٹھے پر بیٹھ کر یہ سب کچھ کیا ہے۔

ارجمند پڑھ رہی تھی، اور حمیدہ بڑے اشتیاق اور خوشی سے سن رہی تھی۔

ذرا دیر بعد اچانک ارجمند کی آواز بکھرنے لگی۔ اگلے ہی لمحے وہ رو رہی تھی۔ ضبط

کے باوجود اس کے حلق سے بھینچی بھینچی آوازیں نکل رہی تھیں۔

حمیدہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیا ہوا نکی! تجھے کیا ہوا؟"

ارجمند کے ہونٹ لرزے۔ لیکن آواز نہیں نکلی۔ بڑی مشکل سے اس نے کہا۔

"پھو......پھپھو......"

"پھپھو یاد آ رہی ہیں؟" حمیدہ نے اسے لپٹاتے ہوئے پوچھا۔

ارجمند نے نفی میں سر ہلایا۔

حمیدہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ اسے لپٹا کر تھپکیاں دیتی رہی۔

"کچھ تو بتا نکی! بات کیا ہے؟"

کچھ دیر بعد ارجمند کی طبیعت سنبھلی تو اس نے کہا۔

"میری پھپھو بہت بڑی تکلیف میں ہیں دادی اماں!"

"تجھے کیسے پتا؟" حمیدہ نے حیرت سے کہا۔

"یہ تو مجھے نہیں پتا، لیکن بس مجھے معلوم ہے۔"

"پہلی بار دور ہوئی ہے پھپھو سے، اس لئے ایسا لگ رہا ہے نکی!"

"نہیں دادی اماں! مجھے معلوم ہے، انہیں یہاں درد ہو رہا ہے۔" ارجمند نے سینے پر بائیں جانب ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

حمیدہ کے خیال میں وہ اس کی پھپھو سے جدائی کا ردِعمل تھا لیکن اس نے اصرار نہیں کیا۔

"تو اپنی پھپھو کے لئے اللہ سے دعا کر نکی! سکون آ جائے گا۔" اس نے ارجمند سے کہا۔

ارجمند نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے ہونٹ بے آواز ہل رہے تھے۔

❁ ❁ ❁

نادرہ کو گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ سانس لینے میں یوں دشواری ہو رہی

تھی، جیسے گرد و پیش میں آکسیجن کی کمی ہوگئی ہو۔ وہ گھبرا کر کھنکھاری۔ اسی لمحے اس کے سینے میں درد کی افقی لہریں اٹھنے لگیں۔

اس نے سنبھلتے ہوئے ٹوسٹ پلیٹ میں رکھے۔ اس پلیٹ کو مکھن کے پیالے کے ساتھ ٹرے پر رکھا، جس پر چائے دانی پہلے ہی موجود تھی۔ ٹرے اس نے اُٹھالی۔ سوچا، پیالیاں اور دوسری چیزیں وہ بعد میں لے جائے گی۔

ٹرے لے کر باورچی خانے سے نکلنے لگی۔ اسی لمحے درد کی ایک تند لہر نے جیسے اس کے سینے کے اندر کچھ کاٹ دیا۔ وہ لہر اتنی اچانک اور اتنی شدید تھی کہ اس کے دماغ میں اندھیرا چھا گیا۔ ہاتھ پاؤں جواب دے گئے۔ پہلے ہاتھوں سے ٹرے چھوٹی اور پھر اس کی بے جان ہوتی ہوئی ٹانگوں نے جسم کا بوجھ اُٹھانے سے انکار کر دیا۔

اسے لگا کہ وہ لٹو کی طرح گھوم رہی ہے۔ پھر وہ نیچے گر گئی۔

اچھو میاں نے پہلے تو گرتے ہوئے برتنوں کی آواز سنی، پھر دوسری آواز...... کسی جسم کے گرنے کی آواز۔ وہ تیزی سے باورچی خانے کی طرف لپکے۔ ان کا دل اندیشوں سے بھر گیا تھا۔

بکھرے ہوئے برتنوں کی طرف تو ان کا دھیان ہی نہیں گیا۔ نادرہ نیچے گری ہوئی تھی۔ اس کا ہاتھ سینے پر تھا اور چہرہ اذیت کی شدت سے چیخ رہا تھا۔ انہوں نے اسے سہارا دے کر اُٹھانے کی کوشش کی لیکن اس کے لئے نادرہ کا تعاون بھی ضروری تھا جو وہ نہیں کر پا رہی تھی۔ یہ بات ان کے نکتہ نظر سے اور تشویش ناک تھی۔

''کیا ہوا بیٹا! اُٹھو تو......'' انہوں نے متوحش لہجے میں کہا۔

نادرہ کے ہونٹ ہلے، مگر بے آواز۔ چہرے پر موجود اذیت کے تاثر میں بے بسی بھی گھل مل گئی۔ اس میں بولنے کی طاقت ہی نہیں تھی۔

''ہمت تو کرو بیٹا!'' اچھوں میاں نے شفقت سے کہا۔

لیکن نادرہ اُٹھ نہیں سکی۔ اب اسے گھسیٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ جیسے تیسے اسے کمرے کی طرف گھسیٹنے لگے۔ اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی۔

ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ اپنے کام میں لگے رہے۔

وہ کمرے کے دروازے پر پہنچے تھے کہ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ اس بار آواز ذرا تیز تھی۔

اچھو میاں کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ عارف کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

لیکن نادرہ کو بستر تک پہنچانا پہلی ترجیح تھی۔ اور وہ مشکل کام تھا۔

تیسری دستک، دستک دینے والے کی بے تابی اور دستک کی مظہر تھی۔

اچھو میاں نے جیسے تیسے نادرہ کو بستر پر ڈال دیا۔

''میں دروازہ کھول دوں، عارف میاں آ گئے ہیں۔'' اچھو میاں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''تم خود کو سنبھالو بیٹا!''

اتنی دیر میں دروازے پر چوتھی، پانچویں دستک بھی ہو چکی تھی۔ اچھو میاں نے دروازہ کھولا۔ وہاں عارف کے سوا کون ہو سکتا تھا؟

عارف دروازہ نہ کھلنے کی وجہ سے پہلے ہی پریشان تھا۔ ان کے چہرہ دیکھ کر وہ اور متوحش ہوگیا۔

''کیا ہوا نواب صاحب!'' اس نے دروازے پر کھڑے کھڑے ہی پوچھا۔

''اندر آجاؤ میاں! بٹیا کی طبیعت اچانک ہی بہت خراب ہوگئی ہے۔''

وہ دونوں کمرے کی طرف لپکے۔ کوٹھے کا دروازہ بند کرنے کا انہیں خیال بھی نہیں رہا۔

کمرے میں عارف نے نادرہ کا ہاتھ بے تابی سے تھاما، جو ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا نادرہ؟''

اسے دیکھ کر نادرہ کی آنکھوں میں چمک اُبھری۔

''آج...... فیض...... لے کا...... دن ہے...... نا......؟'' اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

عارف کا دل ڈوبنے لگا۔

''میں تمہیں لینے کے لئے آگیا ہوں۔''

نادرہ نے اچھو میاں کو کپڑے اٹھانے کا اشارہ کیا، جو پرانے اخبار میں لپٹے ہوئے تھے۔ اچھو میاں نے وہ اُٹھائے تو نادرہ نے عارف کی طرف اشارہ کیا۔ اچھو میاں نے وہ عارف کو دے دیئے۔

''یہ کیا؟'' عارف نے پوچھا۔

''آپ کے دو جوڑے...... وعدے کے مطابق......'' نادرہ نے کہا۔ یہ خود اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی طبیعت بہتر ہوئی ہے یا وہ قوتِ ارادی کے زور پر بول رہی ہے۔

''تمہارا کیا حال ہے؟'' عارف کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''میرا خیال ہے...... اللہ کا حکم آگیا ہے۔''

نادرہ نے اٹک اٹک کر کہا۔

''اور میں یہاں مرنا نہیں چاہتی۔'' وہ اچھو میاں کی طرف مڑی۔

''نواب صاحب! ثمن کو جگا دیجئے۔''

اچھو میاں تیزی سے باہر کی طرف لپکے۔

''کچھ بتاؤ تو، کیا ہوا ہے؟'' عارف کے لہجے میں وحشت تھی۔

''درد ہے، بہت شدید درد ہے سینے میں۔ سانس لینی بھی مشکل ہو رہی ہے۔''

عارف اس کے ہاتھوں کو سہلا کر گرم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نادرہ کی پیشانی پسینے میں بھیگ گئی تھی۔

ثمن گھبرائی ہوئی آئی۔

''کیا ہوا باجی!''

''میں نے رات تم سے کہا تھا نا، تو وقت آگیا ہے۔ میں یہاں سے رخصت ہو رہی ہوں۔ اب تمہیں یہ سب سنبھالنا ہے۔''

ثمن رونے لگی۔

''میں...... باجی...... یہ سب......'' اس سے بولا نہیں گیا۔

''خدا کے لئے، مجھے یہاں سے نکالیں۔'' نادرہ نے عارف سے کہا۔

''میں یہاں مرنا نہیں چاہتی۔''

عارف نے اچھو میاں کی طرف دیکھا۔

''میں ابھی ٹیکسی لاتا ہوں۔'' اچھو میاں نے کہا اور باہر کی طرف لپکے۔

✿ ✿ ✿

عارف اگلی سیٹ پر تھا۔ نادرہ عقبی نشست پر لیٹی تھی۔ اس کا سر کونے میں بیٹھے ہوئے اچھو میاں کی گود میں تھا۔

''نواب صاحب! میرے کفن کے پیسے ہیں نا آپ کے پاس؟'' نادرہ نے کہا۔

''بیٹا! خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو۔'' اچھو میاں نے کہا اور رونے لگے۔

وہ اسپتال پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نادرہ کے معائنے میں مصروف ہو گیا۔ عارف اور اچھو میاں کاریڈور میں ٹہلتے رہے۔

''یہ سب کیا ہو گیا؟'' عارف نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''بس دعا کرو عارف میاں!''

اتنی دیر میں ڈاکٹر آگیا۔

''دل کا شدید درد ہے۔'' اس نے کہا۔

''دو گھنٹے خیریت سے گزر جائیں تو بہتری کی اُمید ہے۔''

''کچھ کریں ڈاکٹر! خدا کے لئے، اسے بچا لیں۔''

''زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے عارف صاحب! ہم تو بس کوشش کر سکتے ہیں۔'' پھر وہ اچھو میاں کی طرف مڑا۔

''وہ آپ کو بلا رہی ہیں نواب صاحب!'' اس نے ان سے کہا۔

اچھو میاں اندر چلے گئے۔

عارف نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کپڑوں کو اخبار ہٹا کر دیکھا۔ استری

کئے ہوئے نفیس کپڑے، اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے اس پر حیرت تھی کہ وہ تو کوٹھے سے نکلتے ہوئے انہیں بھول گیا تھا۔ لیکن نادرہ نے کہا تھا...... یہ کپڑے یہاں نہ چھوڑی عارف! انہیں ساتھ لے لیجئے۔ یہ میرے ایفائے عہد کا ثبوت ہیں۔ آپ کے لئے میری محبت۔

اور عارف نے سوچا، یہ وہیں رہ جاتے تو شاید پھر کبھی ملتے ہی نہیں۔

وہ اس وقت اپنے اندر موجود ایک خوف ناک یقین سے لڑ رہا تھا۔ یہ یقین کہ نادرہ بچے گی یا نہیں؟ اس وقت اس کے دل کی ہر دھڑکن، اس کی ہر سانس نادرہ کے لئے زندگی کی دعا کر رہی تھی۔ لیکن اس خوف ناک یقین کی لو کسی طرح مدھم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

اچھو میاں باہر آئے تو بہت پریشان اور دل گرفتہ تھے۔

''وہ ارجمند کو بلا رہی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

ارجمند! عارف کو حیرت ہوئی کہ اسے ارجمند کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔

''کہاں ہے ارجمند؟''

''آپ یہاں کا خیال رکھیں عارف میاں! میں اسے لینے جا رہا ہوں۔''

اچھو میاں نے کہا اور چلے گئے۔

عارف کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ارجمند کوٹھے پر نہیں تھی۔ ہوتی تو نادرہ اسے ساتھ لئے بغیر کبھی نہیں نکلتی۔ وہ جسے اتنی اذیت میں بھی اس کے کپڑے یاد رہے تھے، اس ارجمند کو کیسے بھول سکتی تھی؟ جس کے لئے وہ زندہ تھی۔

تو گویا اس ایک مہینے میں بہت کچھ ہوا تھا۔ نادرہ کی امید کے مطابق کوئی ایسا شخص آ گیا تھا، جس پر وہ اعتبار کر سکتی تھی، جسے وہ ارجمند کو بے فکری کے ساتھ سونپ سکتی تھی۔

عارف کو نادرہ کی آخری باتیں یاد آنے لگیں۔ اس نے کہا تھا، سترہ تاریخ کو اگر وہ زندہ ہوئی تو اس کی ہو جائے گی۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ اسے بڑی حد تک یقین تھا کہ اسے کچھ ہو جائے...... حالانکہ وہ بیمار بھی نہیں ہوتی تھی۔

ہوتی تو اسے ضرور بتاتی۔

اسے اپنے عہد کی بہت فکر تھی۔ اور اب اس سے وعدے کے بعد اس عہد کے پورے ہونے کی ایک ہی صورت تھی۔ اس کی موت......! اور اس نے فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔

عارف جھرجھری لے کر رہ گیا۔ سب کچھ اتنا عجیب اور ناقابل یقین تھا، جو ہو چکا تھا، وہ بھی اور جو ہو رہا تھا وہ بھی۔ اور جو کچھ ہو چکا تھا، وہ ابھی اس کے علم میں بھی نہیں تھا۔ وہ بس یہ جانتا تھا کہ ارجمند کوٹھے پر موجود نہیں تھی۔

وہ پریشان اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہا۔ دعا کے لئے اس کے پاس لفظ نہیں تھے۔ لیکن اس کی سانسیں، اس کی دھڑکنیں لفظوں کے بغیر، خیال کی شکل میں دعا کر رہی تھیں۔

❁ ❁ ❁

اس کی ہر سانس سینے میں چلنے والی دودھیا تلوار تھی۔ درد کی افقی لہریں اس کے سینے کو دونوں طرف سے کاٹ رہی تھیں۔ اذیت ایسی تھی کہ اس کے لئے کچھ سوچنا بھی مشکل تھا۔

لیکن سوچ تو خود کار عمل ہے۔ اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ اس کا آخری وقت ہے۔ وہ بچے گی نہیں۔ اس یقین کے تحت اسے سوچنا تھا۔ یہ بات خوش آئند تھی کہ اللہ کی مہربانی سے تمام معاملات نمٹ گئے تھے۔ کوٹھے سے اس کی جان ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئی تھی۔ اب کوٹھے سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ارجمند کو اس نے عبدالحق کے محفوظ ہاتھوں میں دے دیا تھا۔ اس کی موت کے بعد نواب صاحب بھی آزاد ہو جائیں گے۔ جو سوچا ہے، وہ سب کر سکیں گے۔ کتنے مسائل تھے، جو اللہ نے اپنے فضل و کرم سے حل کر دیئے۔ اب وہ سکون سے مر سکتی ہے۔

اس نے حیرت سے سوچا۔ اپنی موت کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ کتنی پرسکون ہے۔ یہ اللہ کی رحمت ہے، اور رہی یہ اذیت، تو یہ ذرا دیر کی بات ہے۔ یہ سب تو زندگی کے بکھیڑے ہیں۔ موت ابدی سکون ہے۔

سب کچھ ٹھیک تھا، سب کچھ ٹھیک ہوگیا تھا۔ لیکن ایک پہلو دکھ کا تھا۔
عارف ...... وہ بہت اچھا انسان، جو اس سے محبت کرتا تھا، جو آج اس کے ساتھ زندگی بھر کا ساتھ حاصل کرنے کے لئے بڑی امیدیں لے کر آیا تھا، کتنا مایوس، کتنا دکھی ہوگا وہ اسے کھو کر۔ بس یہ ایک ملال تھا اس کے دل میں۔

مرتے وقت آدمی سچا ہوتا ہے۔ وہ کسی فریب، کسی بہلاوے کا سہارا نہیں لیتا۔ نادرہ اس حقیقت سے کیسے انکار کرسکتی تھی کہ اسے بھی عارف سے محبت ہوگئی تھی۔

اس نے سوچا، کہیں یہ ملال بھی دو دھاری تلوار تو نہیں۔ اس نے خود کو بہت گہرائی میں جا کر ٹٹولا کہ کہیں وہ اپنے لئے بھی تو مایوس اور دکھی نہیں، کہ اسے عارف کا ساتھ، اور اس کے قرب کی سچی خوشیاں نہیں مل سکیں۔ زندگی کا پل اس وقت ٹوٹ رہا ہے، جب خوشیاں اور زندگی کی رعنائیاں باہیں پھیلائے بڑھتے بڑھتے اس کے بہت قریب آگئی ہیں۔

لیکن اس سچے لمحے نے اس کی اذیت سے بوجھل وجود کو سکون اور طمانیت سے بھر دیا۔ اسے اپنا کوئی غم نہیں تھا۔ بلکہ خوشی تھی کہ وہ اللہ کے سامنے سرخ رو ہوگی۔ ورنہ وہ ساری عمر اپنی عہد شکنی پر کڑھتی رہتی۔ وہ خوشیوں میں بھی خوش نہ رہتی۔ وہ تو اب خوش تھی۔ اللہ نے سارے مسئلے حل کر دیئے تھے۔ وہ بوجھل نہیں، ہلکی تھی۔ اللہ کا فیصلہ اٹل، سچا اور بہترین ہوتا ہے۔

مگر وہ عارف کے لئے افسردہ تھی۔ یہی تو محبت ہے۔ وہ اس کے لئے کچھ نہیں کرسکتی تھی اور کڑھ رہی تھی۔ وہ جو آس لے کر آیا تھا، مایوس جائے گا تو اس پر کیا گزرے گی؟ کیا وہ یوں ہی محروم رہے گا؟ کاغذ کے پھولوں میں خوشبو کی جستجو کرتا رہے گا؟ کیا اتنا اچھا انسان ضائع ہو جائے گا؟

اسے اس لمحے عارف پر ایسی محبت آئی کہ وہ خود بھی حیران ہوگئی۔ اس نے دھیرے سے ڈاکٹر کو پکارا۔ ڈاکٹر آیا تو اس نے کہا۔
''پلیز! عارف صاحب کو بلا دیجئے۔''
''بی بی! آپ کو اس وقت صرف تنہائی اور آرام کی ضرورت ہے۔''

ڈاکٹر نے کہا۔
''آپ ڈاکٹر ہیں، لیکن آپ نہیں سمجھ سکتے، میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ آپ انہیں بلا دیجئے۔''

ڈاکٹر چند لمحے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ وہ اس مریضہ سے سب کچھ پوچھ چکا تھا۔ اسے اس سے پہلے کبھی ایسی کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ کوئی ایسی علامت بھی کبھی ظاہر نہیں ہوئی تھی، جو مسئلہ دل کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ پھر اس عمر میں دل کا دورہ! بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ لیکن حقیقت تھی، اور اب وہ کہہ رہی تھی کہ اس کے پاس وقت بہت کم ہے۔

ان آنکھوں میں ڈاکٹر کو وہ نقاہت ...... شدید نقاہت نظر آئی، جو اس نے مرنے والوں کی آنکھوں میں اکثر دیکھی تھی۔

اس نے خاموشی سے سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔ چند لمحے بعد عارف اندر آ گیا۔
''یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ اور میرا ہاتھ تھام لو۔'' نادرہ نے کہا۔
عارف نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''اب تم بہتر محسوس کر رہی ہونا؟'' اس کے لہجے میں اُمید بھی تھی اور التجا بھی۔
''نہیں عارف! سچ یہ ہے کہ ہم جدا ہونے والے ہیں۔ ابھی کچھ دیر میں نواب صاحب ارجمند کو لے کر آ جائیں گے۔ تب تک کا وقت میں تمہارے ساتھ جینا چاہتی ہوں۔ بس یہی وقت ہے ہمارے پاس۔''
''تم بلاوجہ......''
''اس وقت کا ضایع نہ کرو عارف! تمہاری ایک امانت ہے میرے پاس۔ وہ تمہیں دینی ہے۔ عارف! میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ لیکن اللہ کو ہمارا ساتھ منظور نہیں تھا۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ جو بھی تھوڑا بہت وقت تمہارے ساتھ گزرا، وہ میری زندگی کا خوب صورت ترین عرصہ تھا۔ میں اس کے لئے تمہاری شکرگزار ہوں۔''

"تم نے تو مجھے سب کچھ دے دیا نادرہ!" عارف نے کہا۔

"یہ اللہ کا کرم ہے۔ اس پر میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں۔"

"تم یہ کبھی نہیں بھولنا کہ میں تم سے محبت کرتی تھی۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے کیا امید کرتی ہو، کیا چاہتی ہو؟ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب کبھی کوئی سہارا تلاش نہیں کروں گا۔ میرے لئے تمہاری محبت بہت کافی ہے۔ اب میری محفل میں تمہاری یادوں کے سوا کوئی نہیں ہوگا۔"

نادرہ نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"شکریہ عارف! اب میں سکون سے مر سکوں گی۔"

"لیکن یہ ضروری نہیں ہے، کون جانے......"

"بس اب ہم لمس اور آنکھوں سے باتیں کریں گے عارف! اور یہ باتیں تمہیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ یہ لمحے تمہیں ہمیشہ خوشی دیں گے۔ تمہیں کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیں گے۔ بس میرا ہاتھ تھام کر میری آنکھوں میں دیکھتے رہو عارف!"

❁ ❁ ❁

عبدالحق نے کہا۔

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے ارجی!"

ارجمند گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔

"کیا ہوا میری پھپھو کو؟"

عبدالحق کو حیرت ہوئی، لگا جیسے وہ پہلے ہی سے اس بات کی توقع کر رہی تھی۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ کچھ طبیعت خراب ہے نادرہ کی۔ اس نے تمہیں بلایا ہے۔"

"تو وہ وہاں نہیں ہیں۔" ارجمند نے دھیمی آواز میں خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

"وہاں ہوتیں تو نہ، وہ مجھے بلاتیں اور نہ آپ مجھے ان سے ملانے لے

کر جاتے۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"پتر عبدالحق! میں بھی چلوں۔" حمیدہ نے کہا۔

"ضرور اماں! بس آجایئے۔"

وہ باہر نکلے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اچھو میاں پہلے ہی اگلی نشست پہ موجود تھے۔ ارجمند نے انہیں سلام کیا۔ عبدالحق نے حمیدہ اور اچھو میاں کا تعارف کرایا۔

راستے میں ارجمند نے اچھومیاں سے پوچھا۔

"نانا! پھپھو کیسی ہیں؟"ذ

"ٹھیک ہے بیٹا! بس تمہیں یاد کر رہی ہیں۔" اچھو میاں نے جواب دیا۔

اس کے بعد راستے بھر خاموشی رہی۔

❁ ❁ ❁

اچانک نادرہ نے کہا۔

"ہمارا وقت ختم ہوگیا عارف!"

عارف نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

"کیا......؟ کیا کہہ رہی......"

"وہ لوگ آگئے ہیں۔" نادرہ نے دھیرے سے کہا۔

عارف نے سر گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اچھومیاں اور ارجمند کو تو وہ پہچانتا تھا، ان کے ساتھ ایک جوان لڑکا اور بوڑھی عورت بھی تھی۔ اس نے نادرہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"الوداع عارف!"

عارف جانے کے لئے پلٹا تو نادرہ نے اسے پکارا۔ عارف نے پلٹ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"جاؤ نہیں! میرے سامنے ہی رہو۔"

عارف وہیں رُک گیا۔ اتنی دیر میں وہ لوگ قریب آگئے۔ ارجمند اتنی

متوحش تھی کہ عارف کو دیکھ بھی نہیں سکی۔ وہ نادرہ پر جھک گئی۔

''کیا ہوگیا پھپھو!'' اس نے نادرہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں؟''

''اللہ کا حکم! اللہ کا فیصلہ گڑیا!'' نادرہ نے کہا۔ پھر اس نے عبدالحق کے ساتھ کھڑی ہوئی بوڑھی عورت کو دیکھا۔

''یہ کون ہیں؟'' اس نے عبدالحق سے پوچھا۔

''یہ میری اماں ہیں۔''

''اماں ..... یہ بالکل میری امی جیسی ہیں۔ آپ میرے پاس بیٹھئے اماں!''

حمیدہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''یہ بات نکی نے بھی کہی تھی کہ میں اس کی دادی جیسی ہوں۔''

''جی اماں! آپ میری شہید امی سے بہت ملتی ہیں۔'' نادرہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''اب میں اور مطمئن ہوگئی۔ مائیں ہی بیٹیوں کے دل کو سمجھ سکتی ہیں۔ میں اپنی ارجی کو اللہ کے بعد آپ کی امان میں دے رہی ہوں۔''

''سر آنکھوں پر بیٹی! لیکن مایوسی کی باتیں نہیں کرتے۔'' حمیدہ نے کہا۔

''شاید بندے کو پتا چل جاتا ہے اماں! میں جانتی ہوں۔''

حمیدہ کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ نادرہ کے یقین نے اسے ہلا دیا تھا۔

''اللہ آپ کو صحت کے ساتھ بڑی عمر دے اماں! میری ارجی کو اپنے سائے میں رکھیئے گا۔ بچی ہے، غلطیاں بھی کرے گی، پھر بھی آپ اسے دھوپ سے بچاتی رہئے گا۔''

''تو فکر نہ کر دھیے! یہ میری پوتی ہی ہے۔''

''ارجی! سب کا خیال رکھنا گڑیا! اور یاد رکھنا، خدمت اور فرمانبرداری سے ہی دل جیتے جاتے ہیں۔'' نادرہ نے ارجمند سے کہا۔

ارجمند سے بولا بھی نہیں گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''اور عبدالحق! ..... دوست! میں تمہارا شکریہ ادا نہیں کروں گی۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو نادرہ!''

''لیکن اس بند ہوتے دل کی ہر دھڑکن تمہارے لئے، نواب صاحب کے لئے، اور عارف کے لئے دُعا بن گئی ہے۔ نواب صاحب! میرے پاس بیٹھئے ذرا۔''

ارجمند جلدی سے ہٹ گئی اور اس نے اچھو میاں کو جگہ دے دی۔

''نواب صاحب! اب مجھے وہاں نہ لے جایئے گا۔ عبدالحق کے گھر سے وداع کیجئے گا مجھے۔''

اچھو میاں کا چہرہ پتھر کا ہوگیا تھا۔ انہوں نے خاموشی سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''اور میرے کفن کے پیسے تو ہیں نا، آپ کے پاس؟ انہی سے کفن دیجئے گا مجھے۔''

''تم بے فکر رہو بیٹا!'' اچھو میاں نے بڑی مشکل سے کہا۔

''عارف! اپنا وعدہ یاد رکھئے گا۔''

عارف نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ حیران تھا، نادرہ سے اس کا کوئی ظاہری رشتہ نہیں تھا۔ لیکن نادرہ نے کتی خوب صورتی سے اسے بے نام تعلق کے بارے میں سب کو بتا دیا تھا۔ عبدالحق اور نواب صاحب کے ساتھ دُعاؤں میں اسے شامل کرے۔ وہ کیسی عقل مند اور سمجھ دار عورت تھی۔

''ارجی! دیکھو تو، میں کتنے سارے لوگ تمہیں دے کر جا رہی ہوں۔ اللہ کی مہربانی ہے۔ ایک پھپھو کے بدلے اتنے لوگ۔'' یہ کہتے کہتے نادرہ کی رنگت متغیر ہوگئی۔ اس کی سانس اٹکنے لگی، اور کھڑکھڑاہٹ نمایاں ہوگئی۔

عارف تیزی سے ڈاکٹر کی طرف لپکا۔

نادرہ کے ہونٹ بھی اٹک اٹک کر جنبش کر رہے تھے۔ حمیدہ کا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ بلکہ اس کی گرفت اور سخت ہوگئی تھی۔ حمیدہ نے صاف

سنا۔ اکھڑتی ہوئی سانسوں کے درمیان وہ اٹک اٹک کر کلمۂ شہادت پڑھ رہی تھی۔

ڈاکٹر آیا تو اس نے کہا۔

''پلیز! آپ سب یہاں سے ہٹ جائیں۔''

وہ سب باہر آگئے۔ سب اپنے اپنے طور پر اکیلے تھے۔ کسی کو کسی کی موجودگی کا احساس نہیں تھا۔

دو منٹ بعد ڈاکٹر عارف کے پاس آیا۔

''آئی ایم سوری مسٹر عارف!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

❁ ❁ ❁

اس رات عبدالحق عارف اور نواب صاحب کے ساتھ لان میں بیٹھا تھا۔

عارف نے عبدالحق سے کہا۔

''اب میں اجازت چاہوں گا عبدالحق صاحب!''

''اور میں بھی۔'' اچھو میاں بولے۔

عبدالحق نے ان دونوں کو دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔

''دیکھیں عارف بھائی! میں آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا، لیکن نادرہ ہمیں ملا کر گئی ہے۔ تو یہ ایک تعلق قائم ہو چکا ہے ہمارے درمیان۔ آپ میرے ساتھ کچھ دن گزاریں، تاکہ ہم ایک دوسرے کو جان سکیں۔'' پھر وہ اچھو میاں کی طرف مڑا۔

''اور نواب صاحب! آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ آپ کا ہی گھر ہے۔ اب آپ کہاں جائیں گے؟ اور ارجمند تو ویسے بھی آپ سے مانوس ہے۔ اس کا دل بہلا رہے گا۔''

''اب مجھے نواب صاحب نہ کہیں..... میں تو اچھو میاں ہوں..... نادرہ نے مجھے دوبارہ نواب صاحب بنا دیا تھا۔'' اچھو میاں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اور دوسری بات یہ کہ میں رک نہیں سکتا۔ میں تو وہاں ایک ڈیوٹی پر تھا، سمجھ لیں اصل ڈیوٹی سے مجھے عارضی رخصت دی گئی تھی نادرہ بیٹی کے لئے۔ اب یہ ڈیوٹی ختم ہوتے ہی میری اصل ڈیوٹی شروع۔ مجھے تو جانا ہی ہے۔''

''اچھا تو سوئم تک تو رک جائیں۔''

عبدالحق نے ایسے کہا کہ اچھو میاں انکار نہیں کر سکے۔

''یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ کراچی میں ہوتے ہیں۔'' عبدالحق نے عارف سے کہا۔

''یہاں آپ کا قیام کہاں تھا؟''

''ریجنٹ ہوٹل میں۔''

''بس تو آپ کمرہ نمبر بتائیں، میں اپنے ڈرائیور کو بھیج کر سامان منگوا لیتا ہوں۔''

''میں پورے گھر کو آپ کی زحمت نہیں دینا چاہتا۔''

''آپ یقین کریں کہ میرے گھر والوں کے لئے یہ ہرگز کوئی زحمت نہیں ہوگی۔'' عبدالحق نے کہا۔

''لیکن آپ کو زحمت سے بچانے کے لئے میں نے آپ کے ٹھہرنے کا بندوبست انیکسی میں کر دیا ہے۔''

''چلیں، ٹھیک ہے۔'' عارف نے کہا۔

عبدالحق ان دونوں کو انیکسی میں لے گیا۔

''یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' اس نے کہا۔

''اب آپ کمرہ نمبر بتائیں۔''

''میں خود ہی لے آؤں گا سامان۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے۔ ڈرائیور لے آئے گا۔ آپ اتنی دیر میں نہا دھو کر تازہ دم ہو جائیں۔ میں یہ کام نمٹا کر آتا ہوں۔ پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ بہت سی خالی جگہیں پر کرنی ہیں۔''

''ٹھیک ہے!''

عبدالحق کمرہ نمبر معلوم کر کے باہر نکل آیا۔

✿ ✿ ✿

عبدالحق معمول کے مطابق حمیدہ کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ وہاں سے انیکسی کی طرف جانے کے لئے اٹھنے لگا تو ارجمند نے کہا۔

''آغا جی! وہ ..... مجھے نانا سے ملنا ہے۔''

''تو چلو میرے ساتھ۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔''

''ایک منٹ رکیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔''

وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں اخبار میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی۔

''چلئے!'' اس نے کہا۔

انیکسی میں ماحول سوگوار تھا۔ اچھو میاں مضطرباز انداز میں ادھر اسے اُدھر اور اُدھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ عارف کرسی میں بیٹھا خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ اسے تو ان کے آنے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ لیکن ٹہلتے ہوئے اچھو میاں رک گئے۔

ارجمند جا کر ان سے لپٹ گئی۔ اچھو میاں اس کا سر تھپ تھپانے لگے۔

''نانا! کیا پھپھو سچ مچ چلی گئی ہیں؟'' ارجمند نے ان سے پوچھا۔

''ہاں بیٹا! اللہ کی یہی مرضی تھی۔''

ارجمند اچانک ہی بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ اب تک وہ روئی ہی نہیں تھی۔ اسپتال سے آنے کے بعد وہ اب پہلی بار اچھو میاں سے ملی تھی اور شاید ایک وہی تھے، جن سے لپٹ کر وہ رو سکتی تھی۔

پھر اسے تسلیاں دیتے ہوئے اچھو میاں کا اپنا ضبط بھی جواب دے گیا۔ وہ بھی رونے لگے۔

عبدالحق نے عارف کو دیکھا، جو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس لمحے عبدالحق کو احساس ہوا کہ وہ کتنا تنہا ہے۔ وہ عارف کے برابر جا بیٹھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میں آپ کا دکھ سمجھ سکتا ہوں ہوں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں بھائی! یہ بس آدمی کا گمان ہوتا ہے۔ کوئی کیسے سمجھ سکتا ہے کسی کا دُکھ؟'' عارف نے کہا۔

''اور یہ گمان وہ اپنے ہی کسی دکھ کے حوالے کے بل پر کرتا ہے۔ لیکن دنیا میں ایک جیسے دو حوالے ہوتے ہی نہیں دوست! ہر تعلق ایک منفرد اکائی ہوتا ہے۔''

عبدالحق کو اس کی گہرائی پر رشک آنے لگا۔ اس نے سوچا، کاش! کاش نادرہ زندہ ہوتی۔

''بہرحال یہ میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کی محرومی بہت بڑی ہے۔''

''ہاں! یہ تو ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ جو ہوا، وہی بہتر تھا۔'' عارف نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''میں کتنی ہی کوشش کر لیتا، نادرہ کو خوش نہیں رکھ سکتا تھا۔ اور ایسے میں میں خود بھی خوش نہیں رہتا۔''

عبدالحق نے کچھ نہیں کہا، سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

''ایسے زندہ ضمیر والے لوگ میں نے کم ہی دیکھے ہیں۔'' عارف نے کہا۔

''وہ بڑی شاندار عورت تھی، سچی عورت، جسے جھوٹ کی دنیا میں پھینک کر خدا نے آزمایا کہ وہ کتنی سچی ہے۔ اس نے اللہ کو گواہ بنا کر جو وعدہ کیا تھا، وہ اور اس کی حرمت اسے بہت عزیز تھی۔ عزت کی زندگی سے بھی زیادہ، زندگی کی سچی خوشیوں سے بھی بڑھ کر.....'' وہ چونکا اور بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ ارجمند اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

''میں نے پھپھو سے کہا تھا کہ میں آپ کو پھپا کہوں گی۔'' ارجمند نے اس سے کہا۔

''لیکن پھپھو نے منع کر دیا۔ کہنے لگیں، ایسے زبردستی رشتے جوڑنا بری بات ہوتی ہے۔''

عارف کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

”اب پھپھو چلی گئیں، میں آپ کو کیا کہوں؟“

”جو جی چاہے کہو! بھائی کہو، چچا کہو۔“

”یہ بھی تو جوڑے ہوئے رشتے ہوں گے۔“

”تم اپنی پھپھو کی بات سمجھی نہیں۔ اصل میں پھپھا تو پھپھو کا شوہر ہوتا ہے نا۔ اور نادرہ نہیں چاہتی تھی کہ مجھ سے اس کی شادی ہونے سے پہلے تم مجھے پھپھا کہو۔ اب تم مجھے جو چاہو کہہ سکتی ہو۔“

”میں تو پھپھا ہی کہنا چاہتی ہوں۔“

”تو یہی کہو۔ مجھے بھی یہ زیادہ اچھا لگے گا۔“

”مگر پھپھو کو برا لگے گا۔“

”انشاء اللہ اب برا نہیں لگے گا۔“

”پھپھا جان! یہ میں آپ کی امانت لائی ہوں۔“ ارجمند نے اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس کی طرف بڑھائی۔

عارف نے حیرت سے اسے دیکھا مگر وہ لے لیا۔ اس نے اخبار ہٹا کر دیکھا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”شکریہ بیٹا! میری گڑیا!“

عبدالحق نے حیرت سے عارف کو دیکھا۔ صبح سے وہ پہلا موقع تھا کہ اس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔

ارجمند وہاں بیٹھ کر اچھو میاں اور عارف سے باتیں کرتی رہی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں۔ عبدالحق کو احساس ہوا کہ وہ اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتی ہے۔

”آپ مجھ سے ملنے آیا کریں گے نانا!“ ارجمند نے اچھو میاں سے پوچھا۔

”نہیں بیٹا! یہ تو بہت پہلے کا عہد ہے ہمارا۔ جب اس کے ہو گئے تو ہو گئے۔“ اچھو میاں نے چھت کی طرف اُنگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

ارجمند اداس ہو گئی۔

”تمہارا جب جی چاہے، ملنے آ جانا۔“ اچھو میاں بولے۔

”تمہیں تو معلوم ہے نا کہ ہم کہاں ہوں گے؟“

ارجمند نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”لیکن میں تم سے ملنے یہاں آتا رہوں بیٹا!“ عارف نے اس کی اداسی کم کرنے کے لئے کہا۔

”شکریہ پھپھا جان!“

تھوڑی دیر بعد ارجمند اٹھ گئی۔ اچھو میاں نے اسے لپٹا کر پیار کیا۔

”میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔“ عبدالحق نے کہا اور ارجمند کے ساتھ چلا گیا۔

وہ واپس آیا تو عارف اس تصویر کو دیکھ رہا تھا، جو ارجمند اسے دے کر گئی تھی۔ اور اچھو میاں یوں بیٹھے تھے، جیسے انہیں کسی نے کرسی سے باندھ دیا ہو۔ عبدالحق ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

وہ تینوں خاموش بیٹھے ایک ہی ہستی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ وہ جس نے انہیں ایک چھت کے نیچے یکجا کیا تھا ورنہ شاید زندگی میں وہ کبھی ایک دوسرے سے ملتے اور نہ ہی واقف ہوتے۔

پھر عارف نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

”میں بہت خوش نصیب ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔“

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا، جیسے اس کی ذہنی حالت پر شبہ کر رہا ہو۔

عارف نے اس کی نگاہوں میں یہ بات پڑھ لی۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”مجھے وہ سب کچھ ملا، جو مجھے مل سکتا تھا۔ اور جو نہیں ملا، وہ میرے لئے بہتر نہیں تھا۔ اس سے اللہ نے مجھے بچا لیا۔“

”کیا ملا آپ کو؟ مجھے بتائیں گے؟“

”مجھے نادرہ کی محبت ملی۔ سچی اور خالص محبت، اور جاتے جاتے وہ اپنی محبت کی نشانی مجھے دے گئی۔ یہ کپڑے دیکھ رہے ہو۔“ اس نے میز پر رکھے

کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

''انتظار اور فیصلے کے اس ایک مہینے میں یہ اس نے بہت محبت سے میرے لئے سیئے۔ یہ میں اتنے یقین سے اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ شدید ترین اذیت میں اس جہنم سے نکلتے ہوئے بھی وہ انہیں نہیں بھولی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ یہ کپڑے لے لیں۔ یہ اس نے سیئے اپنے ہاتھ سے، ان پر کڑھائی کی۔ ان کے ایک ایک ٹانکے اور ایک ایک کلی میں اس کی محبت چھپی ہے۔ یہ تو خزانہ ہے، خزانہ۔''

''عارف میاں ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اچھو میاں نے تائید کی۔

''میں نے اسے ان کپڑوں پر کام کرتے دیکھا ہے۔ اس کی آنکھوں میں محبت نمایاں ہوتی تھی۔ آج صبح فجر پڑھتے ہی اس نے ان پر استری کی تھی۔''

''یہ میں عمر بھر سنبھال کر رکھوں گا۔ جب وہ یاد آئے گی تو انہیں چھولوں گا۔ ان پر سے اس کے ہاتھوں کا لمس کبھی نہیں مٹے گا۔'' عارف کہتے کہتے رکا، اور ایک گہری سانس لے کر پھر سلسلۂ کلام جوڑا۔

''اس نے مجھ پر بڑے احسان کئے۔ اس کی محبت نے مجھے بدل ڈالا۔ میری اصلاح کر دی۔ مجھے سچا راستہ دکھا دیا۔ اب انشاء اللہ میں کبھی نہیں بھٹکوں گا۔ اس نے برائی کے جنگل میں رہتے ہوئے مجھے بھلائی کا راستہ دکھا دیا۔ اور ابھی ارجمند مجھے ایک خزانہ دے گئی۔ یہ دیکھو۔''

عبدالحق اور اچھو میاں اس تصویر کو دیکھتے رہے۔ وہ تصویر لگ ہی نہیں رہی تھی۔ نادرہ کی آنکھوں میں زندگی اور محبت کی چمک تھی۔ نیم وا ہونٹوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ ابھی بول پڑے گی۔ وہ خوش بھی تھی، لیکن شرما رہی تھی۔

''عجیب عورت تھی وہ، جیسے کیچڑ میں کنول کا پھول۔'' عارف نے کہا۔

''بہت پاکیزہ، بہت حیا والی، اب کہو، میں خوش نصیب ہوں یا نہیں؟''

عبدالحق نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ارجمند! کمال کی ڈرائنگ کرتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں! قدرتی صلاحیت ہے۔ آدمی کا باطن بھی تصویر میں اجاگر کر دیتی

ہے۔'' عارف نے کہا۔

''آج سے پہلے میں نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔ مجھے تمہارا نام معلوم نہیں تھا۔ پھر بھی میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔''

عبدالحق نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ منہ سے کچھ نہیں کہا۔

''ارجمند کی ڈرائنگ کے ذریعے۔'' عارف نے وضاحت کی۔

''اس کی ڈرائنگ کی کاپیوں میں تمہارے سوا کسی کی تصویر نہیں تھی۔''

عبدالحق کا چہرہ تمتما اُٹھا۔

''وہ میرا تم سے تعارف تھا۔'' عارف نے کہا۔

''تمہارے اندر کی نیکی ان تصویروں میں پوری طرح اجاگر تھی۔ اور ایک بات کسی کے بتائے بغیر میں نے سمجھ لی۔ وہ بچی ہے، لیکن تم سے بڑوں جیسی محبت کرتی ہے۔ اور جس عمر میں اسے وہ محبت ہوئی، وہ اس عمر کے بچے کے لئے ممکن ہی نہیں۔ میرے میرے نزدیک اس بات کا ایک ہی مطلب ہے۔ یہ کہ وہ محبت اللہ کی دی ہوئی ہے۔''

''بچے بڑے ہوتے ہیں، شعور آتا ہے تو سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''تم بھی ابھی کم عمر ہو۔ میں نے دنیا دیکھی ہے عبدالحق! بچوں کی عام محبت میں اتنی پختگی، ٹھہراؤ اور خاموشی نہیں ہوتی۔ یہ تو ان لوگوں کو ملتی ہے، جو محبت کے دکھ خوشی سے سہنے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں۔'' عارف نے کہا۔ پھر گفتگو کا رخ بدلا۔

''تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ عبدالحق!''

''میں نے ابھی بی۔ اے کیا ہے اور سی۔ ایس۔ پی کے امتحان میں بیٹھ رہا ہوں۔''

''تمہارے رہن سہن سے لگتا نہیں کہ تمہیں اس کی ضرورت ہے۔''

''بنیادی طور پر تو میں گاؤں کا آدمی ہوں۔ اللہ کی دی ہوئی زمین بہت ہے، جو بظاہر میری ہے، لیکن میرے نزدیک ہر ضرورت مند کی ہے۔ تو مجھے واقعی

ملازمت کی ضرورت نہیں۔ لیکن میرے ایک بزرگ کا حکم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان کو مجھ جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔''

''وہ بزرگ ٹھیک کہتے ہیں۔'' عارف نے کہا۔

''یہ بتاؤ کہ نادرہ نے تمہیں تلاش کیسے کیا؟''

عبدالحق شرمندہ سی ہنسی ہنسنے لگا۔

''وہ دراصل میں نے بی۔ اے میں ٹاپ کیا ہے۔ تو اخبار میں میری تصویر چھپی۔ وہ نادرہ نے دیکھی پھر بھی وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ میں ہوں۔ کیونکہ وہ جب آخری بار مجھ سے ملی تھی تو اس وقت میں ہندو تھا اور میرا نام ٹھاکر اوتار سنگھ تھا۔''

''اوہ! لیکن اخبار میں چھپنے والی تصویر سے پتا کیسے معلوم کیا جا سکتا ہے؟''

''کمال ہے! یہ بات تو میں نے نواب صاحب سے پوچھی بھی نہیں۔ مجھے خیال بھی نہیں آیا۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ یہ کسی طرح مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں میرے گھر آئے تھے۔'' عبدالحق نے اچھو میاں کی طرف اشارہ کیا۔

عارف نے سوالیہ نظروں سے اچھو میاں کو دیکھا۔

''آپ نے کیسے تلاش کر لیا انہیں؟''

''اخبار کے دفتر سے تو کچھ بھی نہیں معلوم ہوا۔ پھر مجھے اس رقعے کا خیال آیا، جو آپ مجھے دے کر گئے تھے۔''

''مسعود صاحب کے نام؟'' عارف نے پوچھا۔ وہ اچھو میاں کی طرف متوجہ تھا۔ عبدالحق کی حیرت نوٹ نہیں کر سکا۔

''جی ہاں! بس ایک امکان تھا، میں نے سوچا، وہ اِدھر اُدھر بات کر کے شاید کسی طرح معلوم کر لیں۔''

''اور انہوں نے ان کا پتا معلوم کر کے بتا دیا۔'' عارف کے لہجے میں حیرت تھی۔

''معلوم کرنا کیا، وہ تو انہیں جانتے تھے۔ انہوں نے تھوڑی سی تفتیش

کی، اور پھر ان کا پتا بتا دیا۔''

''تو آپ کو چچا جان سے میرا پتا ملا تھا؟'' اب عبدالحق سے نہیں رہا گیا۔ وہ بھی حیران تھا۔

عارف اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''مسعود صاحب تمہارے چچا ہیں؟''

''نہیں! وہی تو مجھے سول سروس میں لانا چاہتے ہیں۔'' عبدالحق نے شرمیلے لہجے میں کہا۔

''میں انہیں چچا جان کہتا ہوں۔ لیکن آپ انہیں کیسے......''

''وہ میرے استاد ہیں۔'' عارف نے کہا، پھر بتایا کہ کس طرح وہ اچھو میاں کو وہ رقعہ دے کر گیا تھا۔

''اب دیکھو! اللہ نے لوگوں کو کیسے ملایا ہے؟ ارجمند کو تم تک پہنچنا تھا، نادرہ کا جنازہ یہاں سے اُٹھنا تھا۔ کوئی سوچ سکتا تھا کہ یوں ہوگا؟''

''ٹھیک کہتے ہیں آپ!''

''میں تم سے مل کر خوش ہوا تھا عبدالحق!'' عارف نے کہا۔

''لیکن اب یہ خوشی دوچند ہوگئی ہے۔ میرے استاد کے پاس جوہر شناس نگاہیں ہیں۔ انہوں نے تمہیں منتخب کیا ہے، تو تم کچھ ہو۔''

عبدالحق اٹھ کھڑا ہوا۔

''اب آپ لوگ آرام کریں۔ کل بیٹھ کر بات کریں گے۔ اب تو آپ سے ایک اور تعلق نکل آیا ہے۔''

''مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے روک لیا۔'' عارف نے کہا۔

''صبح کس وقت اُٹھتے ہیں آپ!''

''مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ میں سو بھی سکوں گا یا نہیں؟''

''اللہ آپ کو سکون عطا فرمائے، شب بخیر!''

❁ ❁ ❁

عبدالحق اس روز سویرے ہی اُٹھ گیا تھا۔ اس نے رات کو صادق سے

کہہ دیا تھا کہ مہمانوں کا خیال رکھے۔ وہ اٹھ جائیں تو اسے بھی اٹھا دے۔ وہ ناشتہ ان لوگوں کے ساتھ ہی کرے گا۔

مگر صادق نے اسے نہیں اٹھایا۔ آٹھ بجے کے قریب خود ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ نوربانو اب بھی سو رہی تھی۔ وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ وہاں سے تازہ دم ہو کر نکلا تو وہ صادق سے ملا۔

''مہمان ابھی نہیں اٹھے؟'' اس نے اس سے پوچھا۔

''بڑے صاحب تو فجر کے وقت اٹھ کر چلے گئے تھے۔ کہتے تھے، نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔''

''واپس نہیں آئے ابھی تک؟''

''نہیں صاحب!''

عبدالحق کو یقین ہو گیا کہ اب وہ نہیں آئیں گے۔ وہ تو رکنا ہی نہیں چاہ رہے تھے۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کہیں جانے کے لئے بے تاب ہیں۔ شاید وہ اپنے لئے کسی راستے اور منزل کا تعین پہلے ہی کر چکے تھے۔

''ٹھیک ہے! تم دوسرے مہمان کا خیال رکھو۔ وہ اٹھ جائیں تو مجھے بتا دینا۔'' یہ کہہ کر عبدالحق حمیدہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔

مگر کچھ پیچھے ہی وہ ٹھٹک گیا۔ حمیدہ کے کمرے سے قرآن پڑھنے کی خوب صورت آواز آ رہی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے کا منظر عجیب تھا۔ ارجمند بیٹھی قرآن پڑھ رہی تھی، اور اماں اس محویت سے سن رہی تھیں کہ انہیں اس کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

وہ ان کے قریب کھڑا ہو کر سنتا رہا۔

فَسَحَقَ الْاَصْحَابِ السَّعِیْرِ O اسے احساس ہوا کہ ارجمند سورۃ الملک پڑھ رہی ہے۔

وہ ایسی مقدس فضا تھی کہ ہر طرف نور برستا محسوس ہو رہا تھا۔ ارجمند کی آواز بھی بہت خوب صورت تھی، اور قرأت بھی۔ اور اللہ کا کلام تو پتھروں کو بھی رُلا دیتا ہے۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

اگلے ہی لمحے سورۃ الملک کے حوالے سے اسے کچھ یاد آ گیا۔ دہلی میں رمضان کی وہ پہلی شب، جس نے اس کی زندگی بدل دی تھی اور وہ بے چین ہو گیا۔ اس کیفیت میں مداخت کرنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن اندر کی خواہش بہت شدید تھی۔ اس سے رہا نہیں جا رہا تھا۔

ارجمند نے ایک آیت مکمل کی تو اس نے دھیرے سے پکارا۔

''ارجمند!''

اور سب کچھ جیسے بکھر کر رہ گیا۔ اماں اور ارجمند، دونوں نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر حمیدہ کے چہرے پر ناگواری کا تاثر ابھرا۔

''میں معافی چاہتا ہوں اماں! کوشش کے باوجود مجھ سے رہا نہیں گیا۔'' اس نے معذرت کی۔ پھر ارجمند سے بولا۔

''سورۃ ملک شروع سے سناؤ۔''

ارجمند چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر سر جھکا کر پڑھنے لگی۔

''بہت بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہے بادشاہی......''

عبدالحق کھڑکی کی طرف بڑھ گیا، جہاں سے اسے صبح کا روشن آسمان صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ آسمان کو تکنے لگا۔ لیکن اس کی سماعت ارجمند کی آواز پر مرکوز تھی۔ اس کے دل میں ایک آواز تھی، جو ارجمند کی پڑھی ہوئی آیات کا ترجمہ سنا رہی تھی۔

''اور وہ ہر چیز پر قادر ہے......''

''وہ ذات جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو، تاکہ آزمائش کرے تمہاری کہ کون تم میں سے زیادہ اچھا ہے عمل میں......''

''اور وہ ہے زبردست، بے انتہا معاف فرمانے والا......''

''وہ ذات جس نے بنائے سات آسمان تہہ بہ تہہ......''

عبدالحق کی نگاہیں آسمان کو ٹٹول رہی تھیں۔ لیکن اسے صرف آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ اسے مایوسی ہوئی، اور پھر شرمندگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''نہیں دیکھو گے تم رحمٰن کی تخلیق میں کوئی بے ربطی......''

بے شک! سامنے سے بلند ہوتے ہوئے، اور آگے، بہت آگے اپنی بلندی کی انتہا کے نکتے کو چھونے کے بعد جھکتے ہوئے آسمان میں کہیں کوئی بے ربطی نہیں تھی۔ کیسی خوب صورت اور بے عیب تخلیق ہے یہ......

''ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھو، بھلا نظر آتا ہے تم کو کوئی خلل......''

نہیں! کوئی خلل نہیں، کوئی بے ربطی نہیں۔

''پھر دوڑاؤ نظر۔ بار بار پلٹ آئے گی تمہاری طرف نگاہ تھک کر۔ اور وہ نامراد ہوگی اپنی تلاش میں......''

عبدالحق کی نگاہ جھک گئی۔ نہیں میرے رب! میں یہ گستاخی نہیں کروں گا۔ ایسا ہموار آسمان بنایا ہے آپ نے، اور آپ نے مجھے ایمان عطا فرمایا ہے۔

پھر اس نے بلند آواز میں گواہی دی۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

ارجمند اور حمیدہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

وہ واپس آیا اور کرسی کھینچ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

ارجمند نے دوبارہ قرأت شروع کر دی۔ سورہ ختم ہوئی تو عبدالحق نے جزاک اللہ کہا۔ پھر عبدالحق نے ارجمند سے پوچھا۔

''قرآن تم نے دہلی میں پڑھا تھا۔''

''جی نہیں! اس وقت تو میں بہت چھوٹی تھی۔ وہاں تو بس بسم اللہ ہوئی تھی میری۔''

''تو یہاں پڑھا ہے تم نے؟''

اس لفظ ''یہاں'' میں سوال سے زیادہ بے پناہ حیرت تھی، اور بھی بہت کچھ تھا، جو ارجمند نے ہی نہیں، حمیدہ نے بھی سمجھ لیا تھا اور حمیدہ خود بھی حیران تھی۔ گناہ کے بازار میں، کوٹھے پر قرآن!

ارجمند نے سر جھکاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''جی ہاں! مجھے قرآن یہیں پڑھایا گیا ہے۔''

''کس نے پڑھایا ارجی؟''

''پھپھو نے...... مجھے بھی اور نانا کو بھی۔'' ارجمند نے کہا اور رونے لگی۔

''بلاشبہ اللہ جسے چاہے اور جہاں چاہے عزت دے۔ عزت ذلت اس کے ہاتھ میں ہے۔ تمہاری پھپھو کو اللہ نے بڑائی دی تھی۔'' عبدالحق نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''اس قرآن کو کبھی نہیں چھوڑنا۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

کمرے کی طرف آتے ہوئے صادق نے اس سے کہا۔

''صاحب! مہمان اٹھ گئے ہیں۔''

''نواب صاحب واپس آئے۔''

''جی نہیں!''

''ٹھیک ہے، میں وہاں جا رہا ہوں۔ ناشتہ لے آؤ۔''

❁ ❁ ❁

عارف نہا کر باہر نکلا تھا اور تولیے سے بال خشک کر رہا تھا کہ عبدالحق آ گیا۔

''رات کیسی گزری؟'' اس نے سلام کے بعد پوچھا۔

''گزرنے کے لئے ہوتی ہے۔ گزر ہی گئی۔ نیند بھی آ گئی۔''

''اللہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ کانٹوں پر، انگاروں پر بھی آرام عطا فرما دیتا ہے اپنے بندوں کو۔''

''بے شک!'' عارف نے کہا اور ادھر ادھر دیکھا۔

''نواب صاحب کہاں ہیں؟''

''وہ تو چلے گئے۔ فجر پڑھنے گئے تھے، تب سے واپس نہیں آئے۔''

''مجھے حیرت نہیں ہوئی۔'' عارف نے کہا۔

''وہ تو بس مروّت میں رک گئے تھے۔ رات بھر اضطراب کے عالم میں

ٹہلتے رہے تھے وہ۔ کہیں جانے کے لئے کسی کو ایسا بے تاب میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''

''کہاں جانا تھا انہیں؟''

''داتا دربار!''

''ہاں! یاد آیا۔ نادرہ نے مجھے بتایا تو تھا۔''

''کیسے اللہ لوگوں کو ملاتا ہے۔ کیسے انہیں ایک دوسرے سے فیض پہنچاتا ہے۔''

''واقعی! یہ حیران کن مثال ہے۔''

صادق ناشتہ لے آیا۔ وہ ناشتے میں مصروف ہوگئے۔

ناشتے کے بعد ان کے درمیان مسعود صاحب کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔

''آج ملنے چلیں ان سے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''نہیں! اگلی بار لاہور آؤں گا تو چلیں گے۔''

''آج کیوں نہیں؟''

''مجھے ان سے ملے چار سال ہوگئے۔'' عارف نے سرد آہ بھر کے کہا۔

''بہت جی چاہتا ہے ملنے کا۔ لیکن ہمت نہیں ہوتی۔''

''ایسی کیا بات ہے؟''

''اب تمہیں کیا بتاؤں۔ زندگی میں سب کچھ ان سے ہی سیکھا ہے۔ وہ ایسے استاد ہیں میرے۔ وہ بھی مجھ پر بہت فخر کرتے تھے۔ مگر میں اپنی نفسانی کمزوریوں کی وجہ سے غلط رات پر نکل گیا۔ غلط افسروں میں اٹھنے بیٹھنے لگا۔ ایسے میں ان کے سامنے کیا منہ لے کر جاتا۔ بس چور سا بن گیا تھا۔ پھر نادرہ نے مجھے بدل ڈالا۔ اب میں پہلے والا عارف ہوں۔ اگلی بار لاہور آؤں گا تو تمہارے ساتھ ہی ان سے ملنے چلوں گا۔''

''چلیں، ٹھیک ہے۔''

''دیکھو عبدالحق، ہم کل ہی ملے ہیں۔'' عارف نے کہا۔

''لیکن اتنے حوالوں کے ساتھ کہ اب تم میرے لئے چھوٹے بھائی کی طرح ہو۔ میں اگر تم سے ذاتی گفتگو کروں تو تمہیں برا تو نہیں لگے گا؟''

''کیسی باتیں کرتے ہیں عارف بھائی! میں تو بھائی سے محروم ہوں۔ یہ میرے لئے بڑا اعزاز ہے۔''

''میں نے کل تمہیں پہلی بار دیکھا۔ لیکن میں تمہیں پہلے سے جانتا تھا۔ یہ الگ بات کہ مجھے تمہارا نام معلوم نہیں تھا۔''

''کیسے؟''

''ارجمند کی ڈرائنگ کی کاپی میں تمہاری تصویریں دیکھی تھیں میں نے۔''

عبدالحق کھسیا گیا۔

''اوہ......!''

''وہ صرف تمہاری ہی تصویریں بناتی رہی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ تم جیسا آدمی اس بازار میں کیسے پہنچا؟''

''نادرہ جیسی ہی کسی لڑکی کی تلاش میں اس بازار میں گھومتا پھرا تھا میں۔''

''اور جب ارجمند نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو تم اس کوٹھے کے سامنے والے ہوٹل میں بیٹھے تھے۔''

''جی ہاں!''

''اللہ کی شان ہے۔'' عارف نے آہ بھر کے کہا۔

''اس کے ہاں ہر چیز کا، ہر بات کا وقت مقرر ہے۔ اس دن تم نادرہ کو یا نادرہ تمہیں دیکھ لیتی تو یہ سب کچھ یوں نہ ہوتا۔''

''جی ہاں! میں نادرہ اور ارجمند کو اسی وقت نکال کر لے جاتا۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''پانچ سال تو ہو ہی گئے ہیں۔''

''اور تم انہیں لے گئے ہوتے تو میں نادرہ سے کبھی نہ ملتا۔''

’’اور آپ اتنے دکھی بھی نہیں ہوتے۔‘‘

’’ایسے نہ کہو۔ وہ مجھے نہ ملتی تو میں ویسا ہی اوباش کا اوباش رہتا۔ تم نہیں جانتے۔ میں دکھی ضرور ہوں۔ لیکن اس سے زیادہ خوش ہوں۔ میرے اندر سینے میں کئی خلا تھا، جسے نادرہ نے اپنی محبت سے بھر دیا۔ اور نادرہ سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ وہ کوٹھے پر بیٹھ کر بھی پاک صاف تھی۔ اور میں معزز ہو کر بھی آوارگی کرتا تھا۔ یقین کرو، وہ میری ہر محرومی کا ازالہ کر گئی۔ اور اس نے مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا۔ وہ میرے لئے اللہ کی رحمت تھی۔ میں اب انشاء اللہ اچھا ہی رہوں گا۔‘‘

’’واقعی اپنی مصلحتیں اللہ ہی جانتا ہے۔ اس رات میں اس کوٹھے کے سامنے دیر تک بیٹھا رہا۔‘‘ عبدالحق جیسے کھو سا گیا۔

’’شاید نظر اٹھا کر دیکھتا تو وہ نظر آ جاتی یا وہ ہی مجھے دیکھ لیتی اور ایسا ہوتا تو آپ کی زندگی میں انقلاب کبھی نہ آتا اور اچھو میاں نواب اشرف علی خان کبھی نہ بنتے۔ نہ ہی ان کی زندگی بدلتی۔‘‘

’’اللہ جو کچھ ہی کرتا ہے، وہ اس کے بندوں کے لئے بہترین ہوتا ہے۔‘‘ عارف نے کہا۔ پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔

’’ایک بات آؤ! پانچ سال پہلے جب تم اس کوٹھے کے سامنے ہوٹل میں بیٹھے تھے تو ارجمند نے پہلی بار تمہیں دیکھا۔ اس وقت اس کی عمر کیا ہوگی۔‘‘

’’زیادہ سے زیادہ سات آٹھ سال۔‘‘

’’اس کے بعد وہ صرف تمہاری ہی تصویریں بناتی رہی، کیوں؟‘‘

عبدالحق اس کا جواب جانتا تھا۔ لیکن اس نے کہا۔

’’میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ شاید میں اسے اچھا لگا تھا۔‘‘

’’شاید تم سمجھنا اور کہنا نہیں چاہتے۔ لیکن یہ بات بہت اہم ہے۔ میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔‘‘

’’کم عمر بچیوں کو بعض لوگ اچھے لگتے ہیں۔ وہ ان سے محبت کرتی ہے۔ لیکن بعد میں سمجھ جاتی ہیں کہ وہ ان کے لئے نہیں۔‘‘

’’میں تم سے اختلاف کروں گا۔‘‘ عارف نے کہا۔

’’ارجمند میں کوئی غیر معمولی بات ہے۔ میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ لیکن کچھ ہے اس میں۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ اس نے ایک ہی تصویر بار بار کیوں بنائی ہے تو اس نے کہا تھا...... یہ مجھے اچھے لگے تھے، اس لئے خود بخود بار بار ان کی تصویر بن جاتی ہے۔ اس پر نادرہ نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ نادرہ یہ بات جانتی تھی۔‘‘

’’نادرہ نے ارجمند کو مجھے سوچنے سے پہلے ہی یہ بات بتا دی تھی۔‘‘ عبدالحق نے کہا۔

’’اور تم نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔‘‘

’’جی ہاں! میں نے کہا نا کہ بچے بالآخر بچپن کی حماقت کو بھول جاتے ہیں۔‘‘

’’مگر میں یقین سے کہتا ہوں کہ ارجمند کے اندر تمہارے بارے میں ایک بہت گہرا یقین اور اعتماد ہے۔ اس کا سبب تو مجھے نہیں معلوم، مگر یہ ہے حقیقت۔ اور یہ بھی طے ہے کہ ارجمند کا یہ جذبہ ختم ہونے والا نہیں۔ یہ تمہارے لئے مسئلہ بھی بن سکتا ہے۔ ویسے یہ امکان اس لئے کمزور ضرور ہے کہ اس لڑکی میں گہرائی اور رکھ رکھاؤ ہے۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ اس میں وہ دانش ہے، جو عام طور پر لوگوں کو بڑی عمر میں نصیب ہوتی ہے۔ پھر بھی محبت کو چھپانا آسان نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ تو ہے۔‘‘

’’انشاء اللہ! اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔‘‘ عبدالحق نے کمزور لہجے میں کہا۔

’’تم سوچو گے کہ میں نے تم سے یہ بات کیوں کی؟‘‘ عارف نے کہا۔

’’دیکھو! ارجمند کو کوئی تکلیف، کوئی دکھ ہوا تو نادرہ کی روح تڑپے گی۔ میں یہ بات تمہارے بڑے بھائی کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں۔ کوئی مسئلہ بنے تو مجھے آواز دے لینا۔ میں تمہیں اپنا پتا دے کر جاؤں گا۔ اور ہم رابطے میں رہیں گے۔‘‘

"جی! ٹھیک ہے!"

"میں ہر طرح سے ارجمند کا خیال رکھ سکتا ہوں۔"

عبدالحق کو برا تو لگا۔ لیکن عارف کی طرف سے اس کا دل میلا نہیں ہوا۔ اس نے مروّتاً اقرار تو کر لیا۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ارجمند کو کسی اور کو سونپ دے؟ نادرہ خود بھی تو ارجمند کو عارف کے سپرد کر سکتی تھی۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اور اس نے جو کچھ ارجمند کے بارے میں اس سے کہا تھا، وہ ایک طرح کی وصیت تھی۔ تو ارجمند اس کی ذمہ داری تھی۔

"آیئے! لان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" اس نے عارف سے کہا۔

صادق ناشتے کے برتن سمیٹنے آ گیا تھا۔

❁ ❁ ❁

عارف نے تین دن عبدالحق کے ہاں قیام کیا۔ اور پھر کراچی واپس چلا گیا۔ عبدالحق اسے مزید رکنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے اصرار نہیں کیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ تین بھی محض مروّت کی وجہ سے اسے ملے ہیں۔

ادھر مقابلے کے امتحان کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ وہ سب کچھ بھول کر اس کی تیاری میں لگ گیا۔

ارجمند بہت خوش تھی۔ بس کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے پھپھو اسے یاد آتیں تو اس کے دل میں ہوک سی اُٹھتی۔ ایسا لگتا کہ دل بند ہو جائے گا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ مگر ایسا اکیلے میں ہی ہوتا تھا۔ اور اکیلی وہ بہت کم ہی ہوتی تھی۔

وہ سوچتی کہ پھپھو اس سے کیسی محبت کرتی تھیں۔ ان سے اس کی کبھی بات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ بہت سی باتیں وہ خود بخود سمجھ جاتی تھی۔ اور بہت سی باتیں اللہ میاں اسے سمجھا دیتے تھے۔

اس نے پھپھو کے بتائے بغیر سمجھ لیا تھا کہ جہاں وہ رہ رہی تھی، وہ کوئی اچھی جگہ نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پھپھو مجبور ہیں۔ مجبور نہ ہوتیں تو وہاں سے اسے لے کر بھاگ چکی ہوتیں۔ اور اب آخر میں تو وہ اسے جیسے سب سے چھپا کر رکھنے لگی تھیں۔ وہاں بھرا ہوا گھر تھا۔ لیکن وہ پھپھو اور نانا کے سوا کسی سے بات

نہیں کر سکتی تھی۔

اور اس نے دیکھا تھا کہ بوا کے مرنے کے بعد کوٹھا تو نہیں بدلا تھا۔ لیکن پھپھو کی دُنیا بدل گئی تھی۔ ان کے چہرے پر اب وحشت نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ وہ پُرسکون لگتی تھیں۔ وہ وہاں کی مالک بن گئی تھیں، سب سے بڑی۔ لیکن وہ وہاں ہر چیز سے بے تعلق ہو گئی تھیں۔ ان سے شادی کا کوئی امیدوار اب وہاں نہیں آتا تھا۔ آتا بھی ہوگا تو بہرحال وہ اس سے نہیں ملتی تھیں۔ وہ ہر رات اس کے ساتھ سوتی تھیں۔ اسے یہ سب بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ پھپھو سے لپٹ کر سوتی، اور سوچتی کہ کتنا اچھا ہوا کہ بوا مر گئیں۔ پہلی بار اسے پتا چلا تھا کہ کسی کا مرنا بھی اچھا بھی ہوتا ہے۔

اسے یاد تھا، اس نے یہ بات پھپھو سے کہی تھی تو وہ بگڑ گئی تھیں۔

"کبھی کسی کے لئے ایسی بات نہیں کرتے ارجمند!" انہوں نے سخت لہجے میں کہا تھا۔

"مرنے والوں کے لئے تو بس مغفرت کی دعا کی جاتی ہے اور بوا نے تو ہم پر احسان کیا۔ ورنہ تم اکیلی ہی سوتی رہتیں۔"

اس نے بحث نہیں کی تھی۔ اسے خیال آ گیا تھا۔ پھپھو کی بات سچی تھی۔ پھپھو تو بوا کی زندگی میں ہی اس کے ساتھ سونے لگی تھیں۔

اور بوا کے بعد سب کچھ پھپھو کے ہاتھ میں تھا۔ کسی کو بھی کوئی ضرورت ہوتی تو وہ پھپھو سے مانگتا۔ اور پھپھو کبھی منع نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ زیادہ ہی دے دیا کرتی تھیں۔ لیکن اپنے اور اس کے لئے وہ نہ جانے کیوں سخت ہو گئی تھیں؟

اسے یاد تھا، ایک بار اس نے رنگوں کے لئے کہا تو پھپھو نے منع کر دیا۔ اس نے شکایتی لہجے میں پھپھو سے کہا۔

"اتنے پیسے تو ہیں آپ کے پاس۔ سب کو دیتی ہیں، تو مجھے رنگ کیوں نہیں منگا کر دیتیں؟"

"دیکھو بیٹا! تم اللہ سے دعا کرو۔ یہ پیسے تو اپنے نہیں ہیں۔ امانت ہیں ہمارے پاس، اور امانت بھی اچھی نہیں ہے۔"

''کیا مطلب؟''

''دیکھو، یہ پیسہ اچھا نہیں ہے۔ میں یہ خرچ نہیں کرنا چاہتی۔''

''مگر پہلے تو اسی سے آپ مجھے سب کچھ دلاتی تھیں۔''

''پہلے کی بات اور تھی ارجی! اب ہم مجبور ہیں۔ اب ہمارے پاس اختیار ہے۔''

ارجمند کی سمجھ میں تو بات نہیں آئی لیکن اس نے بحث نہیں کی۔

پھر اس نے دیکھا، کھانے پینے میں بھی فرق پڑ گیا تھا۔ اب تو وہ اچھے کھانے کو ترسنے لگی تھی۔ زیادہ تر دال ہی ملتی، اور وہ بھی کم۔ اس نے شکایت کی تو پھپھو نے کہا۔

''بس تم دُعا کرو اللہ سے کہ وہ ہمارے لئے عزت کا رزق جاری کر دے۔''

اور پھپھو نے کپڑے سینے شروع کر دیئے تو حالات بہتر ہوگئے۔

اسے یاد تھا کہ پہلی بار اس نے کوٹھے پر خود کو پُرسکون اور محفوظ سمجھا تھا۔ اور پھپھو بھی پہلے سے زیادہ خوب صورت ہوگئی تھیں۔ اور نانا، جنہیں وہ پہلے اچھو میاں کہتی تھی، وہ تو بالکل ہی بدل گئے تھے۔ پہلے ان کے چہرے پر، ان کی آنکھوں میں کیسی وحشت ہوتی تھی۔ بولتے تو جھنجلائے ہوئے لگتے۔ لیکن جب سے انہوں نے پھپھو کو بیٹی کہا تھا، ان کے چہرے پر نرمی آگئی تھی۔ پھر جب انہوں نے داڑھی رکھ لی تو ان کا چہرہ جگمگاتا ہوا، روشن روشن لگنے لگا تھا۔ وہ بہت خوب صورت ہوگئے تھے۔

''یہ نانا اتنے خوب صورت کیسے ہوگئے پھپھو!'' اس نے پوچھا تھا۔

''جو لوگ دل سے، اللہ کو خوش کرنے کے لئے نماز پڑھتے ہیں، اور قرآن پڑھ کر سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اللہ انہیں خوب صورت بنا دیتا ہے۔''

''قرآن پر عمل کیسے کیا جاتا ہے پھپھو!''

''قرآن میں اللہ نے جو کام کرنے کا حکم دیا ہے، وہ کرو۔ اور جن

کاموں سے روکا ہو، وہ نہ کرو۔ یہ قرآن پر عمل ہوتا ہے۔''

''مگر مجھے تو معلوم ہی نہیں پھپھو! کہ قرآن میں کیا لکھا ہے؟ مجھے تو عربی نہیں آتی نا۔''

''ترجمے والا قرآن پڑھو گی تو پتا چلے گا۔''

''اس سے اچھا یہ نہیں کہ میں عربی سیکھ لوں۔''

''اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے؟ مگر مجھے عربی نہیں آتی۔''

''تو جب تک مجھے ترجمے والا قرآن دے دیں۔''

''ابھی نہیں! ابھی تم چھوٹی ہو۔ قرآن تو بڑوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتا۔''

''تو پھر پڑھنے والوں کو کیسے سمجھ میں آتا ہوگا؟''

''بھئی! قرآن پڑھنے والے کو اللہ کو خوش کرنا چاہئے اور اس سے دعا کرنی چاہئے کہ وہ اسے سمجھا دے، تو اللہ چاہے تو اس کے لئے قرآن آسان کر دیتا ہے۔ اور بھئی! موٹی موٹی باتیں تو سب کو معلوم ہیں۔ جھوٹ کبھی نہیں بولو، بڑوں کا ادب کرو، کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ، کسی سے تکلیف پہنچے تو اسے معاف کر دو، لوگوں کی خدمت کرو، ان کے کام آؤ، ان سب باتوں سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ اور خوش ہو کر وہ چاہے تو ایسے لوگوں کے سینوں کو قرآن کے لئے کھول دیتا ہے۔ بس ابھی تم ان باتوں پر عمل کرنا سیکھ لو۔''

اور وہ بات ارجمند کے دل میں اتر گئی تھی۔

اور ارجمند کو لگتا تھا کہ وہ پہلے پھپھو کو اتنا نہیں سمجھتی تھی، جتنا اب سمجھنے لگی ہے۔ پھپھو سامنے تھیں تو وہ بس انہیں دیکھتی تھی۔ ان کے بارے میں سوچتی نہیں تھی۔ اب وہ انہیں دیکھ نہیں سکتی تھی تو ان کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کو یاد کرتی تھی۔ اور ان کے بارے میں سوچتی تھی، تو اب وہ انہیں زیادہ بہتر طور پر سمجھنے لگی تھی۔

اسے پھپھو کا پرانا معمول یاد تھا۔ وہ دیر سے سو کر اُٹھتیں، نماز پڑھتیں، قرآن پڑھتیں، اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتیں، پھر وہ اسے بھی پڑھانے لگی

تھیں۔

مگر بوا کے مرنے سے کچھ عرصہ پہلے ہی سب کچھ بدل گیا تھا۔ پھپھو صبح سویرے اُٹھتی، نماز اور قرآن کے بعد وہ اسے اور نانا کو قرآن پڑھاتیں۔ پھر ناشتہ بناتیں، اور دوپہر کا کھانا تیار کرنے کے دوران اسے پڑھاتیں۔ انگریزی، اُردو اور حساب۔ کہتی تھیں، کبھی یہ تمہارے کام آئے گا۔

اور بوا کی موت کے بعد تو وہ مشین ہوگئی تھیں۔ کپڑے سینے اور ان پر کڑھائی کرنے کا کام جو زیادہ ہوگیا تھا۔ تب تو جیسے ان کے پاس وقت ہی نہیں رہا تھا۔ اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ کتنا تھک جاتی ہوں گی۔ اس وقت تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

ایک دن اس نے دیکھا، پھپھو نے سوئی دھاگہ اور وہ کرتا جس پر وہ کڑھائی کر رہی تھیں، ایک طرف رکھ دیا اور اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگیں۔ مگر آنسو پھر آجاتے تھے۔

''یہ کیا پھپھو! آپ رو رہی ہیں؟'' اس نے تڑپ کر کہا۔

''ارے نہیں پگلی! اللہ کا شکر ہے، رونے کا وقت تو گزر گیا۔ روئیں ہمارے دُشمن!''

''تو پھر یہ آنسو......؟''

''یہ آنسو نہیں ہیں۔ بہت نظر جما کر کام کرنا پڑتا ہے تو آنکھوں میں پانی آجاتا ہے۔''

''تو آپ اتنا کام نہ کیا کریں۔''

''زیادہ کام کرنا ضروری ہے ارجی! میں تمہاری تمام ضرورتیں پوری کرنا چاہتی ہوں۔ اور چاہتی ہوں کہ تمہیں تمہاری پسند کا کھانا ملے۔ رزقِ حلال کے لئے محنت تو کرنی پڑتی ہے۔''

''مجھے اچھا کھانا نہیں چاہئے۔ میں دال بھی کھا سکتی ہوں۔''

''زیادہ کام کر کے مجھے خوشی بھی تو ہوتی ہے۔ اللہ نے کرم فرمایا ہے تو کام کر کے ایک طرح سے میں اس کا شکر ادا کرتی ہوں۔ کاش! کاش میں تمہیں

اسکول بھیج سکتی۔''

''تو بھیج دیں نا! میرا بھی جی چاہتا ہے۔''

''نہیں بھیج سکتی گڑیا!'' پھپھو نے افسردگی سے کہا تھا۔

''میں تمہیں باہر نہیں بھیج سکتی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم پر کسی کی نظر بھی پڑے۔ کوئی سنبھالنے والا نہ ہو تو یہ دنیا بہت بری جگہ ہے گڑیا!''

پھپھو نے پوری زندگی میرے لئے گزاری۔ اس نے سوچا۔ کتنی اکیلی تھیں وہ۔ میں تو چھوٹی تھی، سو وہ دل کی بات کسی سے بھی تو نہیں کہہ سکتی تھیں۔ کیسے بڑے بڑے لوگ ان سے شادی کرنے کے لئے آتے تھے۔ اچھا ہوا کہ انہوں نے ان سے شادی نہیں کی۔

پھر اس کی آنکھوں میں عارف کی صورت پھر گئی اور جب کوئی اچھا نہیں ملا تو اللہ میاں نے ان سے زندگی چھین لی۔ یہ تو بڑا ظلم ہو، بڑی بے انصافی کی اللہ میاں نے......

''نہ ایسا کہتے ہیں، نہ ایسا سوچتے ہیں۔'' اس کے اندر بیٹھے ہوئے اللہ میاں نے خفگی سے کہا۔

''اللہ جو کرتا ہے، اس میں اس کے بندوں کی بہتری ہوتی ہے۔''

''تو مجھے بتائیں کہ اس میں کیا بہتری تھی۔ پھپھو زندہ رہتیں تو پھپھا کے ساتھ کتنی خوش رہتیں۔'' وہ بڑبڑائی۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو۔ تمہیں کیا معلوم؟''

واقعی، یہ بات تو سچ ہے۔ ارجمند نے سوچا۔ میں یہ یقین سے کیسے کہہ سکتی ہوں۔

''صرف اللہ ہی ہے، جو سب کچھ جانتا ہے۔'' اللہ میاں نے کہا۔

''وہی بہتری کو سمجھتا ہے، کیونکہ شروع سے آخر تک ہر بات...... سب کچھ جانتا ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ ابھی ایک پل بعد کیا ہوگا؟''

اس نے سوچا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

''ابھی آپی آئے گی اور تم سے بات کرے گی۔ یاد رکھو، اللہ سے بحث

نہیں کرتے۔ صرف مانتے ہیں اس کی بات، اسی میں بھلائی ہے۔ اس کی بات مانو، اور اسے خوش رکھو۔ وہ خوش ہو کر تمہیں نعمتیں دے گا۔ کیا اس نے تمہیں آغا جی سے نہیں ملوایا؟ شکر ادا کیا کرو اس کا۔"

"اللہ میاں آپ کا شکر ہے۔" ارجمند نے بڑے خلوص سے کہا۔

اور اسی لمحے آپی آ گئیں۔

اللہ شروع سے آخر تک سب کچھ جانتا ہے، اور بندوں کو ایک پل کا بھی پتا نہیں ہوتا۔ ارجمند نے سوچا۔

✿ ✿ ✿

نور بانو کو ارجمند پر بڑی محبت آتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ کسی سے بغیر کسی خوف اور دھڑکے کے محبت کر رہی تھی۔ کوئی ڈر نہیں تھا اسے۔ بس یہ خیال تھا کہ کھوئی ہوئی چھوٹی بہن خوش قسمتی سے اسے مل گئی ہے، جو اس کی محبت کو ترستی رہی تھی۔ اسے تلافی کا موقع مل گیا تھا۔

وہ دروازے میں کھڑی خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

ارجمند کسی گہری سوچ میں تھی۔ کبھی وہ بڑبڑاتی، پھر اس کے چہرے کے تاثر سے لگتا کہ کسی کی بات بڑے دھیان سے سن رہی ہے۔ ایک بار اس نے سر بھی جھٹکا۔ پھر کا چہرہ پُرسکون ہو گیا۔

نور بانو کمرے میں چلی گئی۔

"کیا بات ہے ارجی! اکیلی بیٹھی ہو۔ اماں کہاں ہیں؟"

"غسل خانے میں ہیں۔"

"اور تم اتنی محویت سے کیا سوچ رہی تھیں؟"

"وہ میں آپی! اللہ میاں سے بات کر رہی تھی۔"

جواب اتنا غیر متوقع تھا کہ نور بانو سناٹے میں آ گئی۔ اسے سنبھلنے میں چند لمحے لگے۔ پھر اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"اللہ میاں تم سے بات کرتے ہیں؟"

"جی آپی!"

"کیسے؟"

"وہ میری آواز میں مجھ سے بات کرتے ہیں۔ کبھی مجھے ڈانٹتے ہیں، کبھی پیار سے سمجھاتے ہیں۔"

"تو اللہ میاں کیوں، یہ سمجھو کہ تم خود سے باتیں کرتی ہو۔ ایسا ہوتا ہے سب کے ساتھ۔"

"نہیں آپی! وہ اللہ میاں ہی ہیں۔"

"ابھی کیا بات ہو رہی تھی ان سے؟"

"میں سوچ رہی تھی کہ اب تو پھپھو کی شادی ہونے والی تھی......"

ارجمند نے پوری تفصیل اسے سنا دی۔ پھر بولی۔

"اب دیکھیں، اللہ میاں ہی تو سب کچھ جانتے ہیں۔"

"بندوں کو بھی تو سمجھ دی ہے اللہ نے۔"

"لیکن آپی! آخر میں اللہ میاں نے پوچھا، تمہیں پتا ہے کہ ایک پل بعد کیا ہونے والا ہے۔ میں نے انکار میں جواب دیا تو انہوں نے کہا کہ ایک پل بعد تمہاری آپی آنے والی ہیں، اور دیکھ لیں، آپ آ گئیں۔ مجھے تو نہیں معلوم تھی یہ بات۔" ارجمند نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

نور بانو متاسف ہو گئی۔ ارجمند کو جھوٹا سمجھنے کو تو اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ یہ ضرور نفسیاتی بیماری ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔ اکیلی رہی ہے بیچاری بچی، اس لئے......

"تم کمرے میں بند کیوں رہتی ہو؟ چلو! باہر باغیچے میں چلیں۔"

وہ دونوں باہر لان میں آ گئیں۔

کچھ دیر جھولا جھولنے کے بعد وہ ستانے کے لئے بینچ پر بیٹھ گئیں۔

"تم کبھی باہر گھومنے جاتی تھیں ارجمند!" نور بانو نے پوچھا۔

"نہیں آپی! تین چار سال سے تو میں گھر سے نکلی ہی نہیں۔"

"کیوں؟"

"پھپھو کو بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ مجھے سب سے چھپا کر رکھتی تھیں۔ وہ نہیں

چاہتی تھیں کہ مجھ پر کسی کی نظر پڑے۔''

نوربانو نے غور سے اسے دیکھا، اوردل میں سوچا، ٹھیک ہی کرتی تھی وہ۔

''گھر میں صحن تھا تمہارے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں آپی! ہاں کوٹھا تھا۔ مگر میں وہاں بھی نہیں جاتی تھی۔''

نوربانو کو اس پر ترس آنے لگا۔

''توبہ! بند دیواروں کے بیچ دم گھٹنے لگتا ہوگا تمہارا؟''

''پھپھو کی خوشی میں میری خوشی تھی آپی!''

''کبھی دل نہیں چاہتا تھا باہر جانے کو؟''

''باہر جانے کو تو نہیں، ہاں اسکول جانے کو بہت دل چاہتا تھا۔''

''تو تم اب تک اسکول نہیں گئیں؟'' نوربانو نے حیرت سے پوچھا۔

''مگر تم تو انگریزی بھی پڑھ لیتی ہو۔''

''پھپھو گھر پر ہی مجھے پڑھاتی تھیں، قرآن، اُردو، انگریزی اور حساب۔''

نوربانو چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر اس نے پوچھا۔

''اسکول جانا چاہتی ہو تم؟''

''جی آپی!''

''میں عبدالحق صاحب سے بات کروں گی۔ تم اسکول ضرور جاؤ گی۔''

''شکریہ آپی!''

''بہنیں بہنوں کے لئے سب کچھ کرتی ہیں۔ اس میں شکریہ کی ضرورت نہیں۔ اور ہاں! آج ہم گھومنے بھی چلیں گے۔''

دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ پھر ارجمند کو احساس ہوا کہ نوربانو کچھ بے چین ہے۔

''کیا بات ہے آپی!'' اس نے پوچھا۔

''بہت زور کی پیاس لگی ہے، اور اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔''

یہ سنتے ہی ارجمند اندر کی طرف دوڑی۔

''ارے.....! کیا ہوا ارجی! کہاں جا رہی ہو؟'' نوربانو نے اسے پکارا۔

''ابھی آئی آپی!''

اور ذرا دیر بعد وہ آئی تو اس کے ہاتھ میں دھری ٹرے پر پانی کا جگ اور گلاس موجود تھا۔ اس نے گلاس میں پانی انڈیل کر بڑے ادب اور تمیز سے نوربانو کو پیش کیا۔ نوربانو نے سوچا، اس لڑکی کی بہت اچھی تربیت کی ہے اس کی پھپھو نے۔

پانی پی کر اس نے گلاس ارجمند کو دیا اور بولی۔

''شکریہ ارجی!''

''ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ بہنیں بہنوں کے لئے سب کچھ کرتی ہیں۔'' ارجمند نے اسے یاد دلایا۔

''اس میں شکریہ کی ضرورت نہیں۔ اور میں نے آپ کو بس پانی ہی تو پلایا ہے، جو ویسے بھی ثواب کا کام ہے۔''

''تم بہت اچھی ہو ارجمند!''

کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھ کر گھر میں جاتے ہوئے نوربانو نے کہا۔

''ایک بات کہوں؟ برا نہ ماننا۔''

''میں آپ کی بات کا برا کیسے مان سکتی ہوں؟''

''یہ اللہ میاں والی بات تمہارا وہم ہے۔ اللہ اپنے بندوں سے کلام نہیں کرتا۔ ہر انسان کے اندر ایک اچھائی ہوتی ہے، جو اس کی راہنمائی کرتی ہے۔ اسے ضمیر کہتے ہیں۔ آدمی اچھا ہو تو اس کا ضمیر بہت طاقتور ہوتا ہے، اور آدمی برائی میں بڑھتا جائے تو ضمیر کمزور ہوتا جاتا ہے۔ پھر برائی بالکل اسی طرح آدمی کو غلط راستہ دکھانے لگتی ہے۔

ارجمند نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

* * *

اب تو صرف مقابلے کے امتحان کی تیاری رہ گئی تھی۔

عبدالحق اپنی اسٹڈی میں پڑھائی میں مصروف تھا کہ نور بانو اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ وہ ایک بار بس چائے دینے کے لئے یہاں آتی تھی۔

''کیا بات ہے نور! خیریت تو ہے؟''

''مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے؟'' نور بانو نے خشک لہجے میں کہا۔

''تو وہ بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔ یہ تو پڑھائی کا وقت ہے۔''

''ہر وقت پڑھائی اور صرف پڑھائی......''

''تھوڑے ہی دن رہ گئے ہیں امتحان میں۔''

''ایسا بھی کیا کہ پڑھائی کی وجہ سے آپ جیسا ذمہ دار آدمی غیر ذمہ دار ہو جائے۔''

عبدالحق کو جھٹکا لگا۔ اس نے کتاب اُلٹ کر رکھ دی۔

''کوئی غیر ذمہ داری ہوئی مجھ سے؟''

''تو اور کیا؟ آپ ایسے تو نہیں تھے، آپ تو دوسروں کا...... سب لوگوں کا خیال رکھنے والے تھے۔''

''پتا تو چلے کہ ہوا کیا ہے؟''

''ارجمند کا اب اس دنیا میں کوئی نہیں۔'' نور بانو نے افسردگی سے کہا۔

''سوائے ہمارے، اب وہ ہماری ذمہ داری ہے۔ اور سب سے بڑھ کر آپ کی۔''

عبدالحق گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا ہوا ہے؟''

''بیٹھ جائیے، اسے کچھ نہیں ہوا ہے۔ آپ سکون سے میری بات سنئے!''

عبدالحق بیٹھ تو گیا لیکن اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ تو

ارجمند کو اماں کو سونپ کر مطمئن ہو گیا تھا۔ مگر اب اسے احساسِ جرم ہو رہا تھا۔ وہ تو کبھی ارجمند سے بات بھی نہیں کرتا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ اس سے ڈرتا تھا۔ اس کے بچپنے سے جسے وہ محبت سمجھتی تھی۔

''کچھ بتاؤ تو! ہوا کیا ہے؟'' اس نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

''بھئی! دنیا کی بچیاں اسکول جاتی ہیں۔ اس بیچاری نے تو آج تک اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ اس بات کا خیال بھی نہیں آیا آپ کو حالانکہ آپ کو اس کی فکر کرنی چاہئے تھی۔''

عبدالحق کو افسوس ہوا کہ اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا؟

''اب اسکول کی پہلی جماعت کے حساب سے تو وہ بہت بڑی ہے۔'' اس نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

''ایسی بات نہیں۔ اس کی پھپھو اسے گھر پر انگریزی، اُردو اور حساب پڑھاتی رہی تھیں۔ اسے لکھنا پڑھنا آتا ہے۔ بس اسکول کبھی نہیں گئی وہ۔''

''تو پھر مسئلہ کیا ہے؟''

''عمر کے حساب سے اسے ساتویں یا آٹھویں جماعت میں تو داخلہ ملنا چاہئے۔''

''داخلہ ٹیسٹ میں کامیابی کے بغیر تو نہیں ملے گا۔'' عبدالحق نے پرخیال لہجے میں کہا۔

''یہی تو فکر ہے، جو آپ کو کرنی چاہئے تھی۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو تم! اسے گھر پر تیاری کرانی ہوگی۔ پھر داخل کا امتحان دلوانا ہوگا۔''

''یہ تیاری تو آپ کو ہی کرانی ہے۔''

''لیکن میری مصروفیت......'' عبدالحق کہتے کہتے رک گیا۔ اسے کچھ خیال آ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے! اس کے لئے ٹیچر کا انتظام کر دوں گا میں۔'' یہ کہتے ہوئے اسے خیال آیا کہ اس کے اور ارجمند کے درمیان یہ ایک قدر مشترک ہے۔

اس کے ماں باپ نے اسے جدا نہ کرنے کے خیال سے اسکول نہیں بھیجا تھا۔ پھر اسکول میں داخلے کے امتحان کی تیاری کے لئے اسی طرح پا جی نے اس کے لئے ٹیچر کا بندوبست کیا تھا۔ یوں اسے ماسٹر جی ملے تھے اور اسی طرح زیادہ نے ارجمند کو چھپا کر رکھا تھا، اور اسکول نہیں بھیجا تھا۔ اب وہ اس کے لئے ٹیچر کا بندوبست کرے گا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ!'' نادرہ نے اسے چونکا دیا۔

''وہ بھی اپنا سب کچھ کھو کر ہمارے پاس آئی ہے۔ اسے ہم سے اپنائیت، محبت اور خود اعتمادی چاہئے۔ اور پھر بڑی ہوتی ہوئی بچی کو ٹیچر سے پڑھوانا مجھے مناسب نہیں لگتا۔''

''تو پھر؟''

''اسے آپ ہی پڑھائیں گے۔ اس کے لئے وقت نکالنا پڑے گا آپ کو۔''

''مگر میں کیسے نکالوں گا وقت؟''

''گیارہ بجے اپنی پڑھائی شروع کرتے ہیں آپ!'' نوربانو نے کہا۔

''دیر تک سوتے ہیں۔ جلدی اُٹھ جائیں تو اسے دو گھنٹے دے سکتے ہیں آپ؟''

''ہاں! یہ تو ہے۔ چلو ٹھیک ہے۔ کوشش کریں گے۔''

''کوشش نہیں! بس کل سے یہ کام کرنا ہے آپ کو۔''

''جو حکم سرکار کا!''

''ایک بات اور.....''

''اور کچھ بھی ہے؟''

''جی ہاں! وہ بیچاری چار دیواری میں قید رہی ہے۔ ایسا گھر جہاں صحن بھی نہیں تھا، جہاں سے آسمان بھی نظر نہیں آتا تھا۔''

عبدالحق نے سکون کی سانس لی۔

''تو یہاں تو کھلی فضا ہے سانس کے لئے۔''

''اتنا کافی نہیں ہے۔ وہ کبھی گھر سے نکلی ہی نہیں۔ اس نے باہر کی دنیا کبھی نہیں دیکھی۔''

''تو پھر؟''

''شام کو اسے سیر کے لئے لے جانا چاہئے۔ لاہور دکھایا جائے اسے۔ یہاں تاریخی مقامات بھی بہت ہیں اور یہی نہیں، اگلی بار حق نظر جائیں تو اسے بھی ساتھ لے کر جائیں۔''

''اب بھئی! سیر کرانے تو اسے تم بھی لے جا سکتی ہو۔ یعقوب موجود ہے نا!''

''پھر وہی بات! ہمیں اس کو اپنائیت اور محبت دینی ہے۔ آپ کا ہونا ضروری ہے۔ دیکھیں نا! آپ ہی لائے ہیں اسے، اور میں آپ کے بغیر کہیں جاتی ہوں بھلا۔ آپ کو شام کا وقت ہمارے لئے نکالنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے بھئی! اب تو مجھے پڑھنے دو۔''

''بس تو شام کو لارنس گارڈن چلیں گے۔''

''ٹھیک ہے! اب جاؤ بھی۔''

اس کے جانے کے بعد عبدالحق نے سکون کا سانس لیا۔ وہ حیران بھی تھا اور خوش بھی۔ اسے تو ابتداء سے یہ خوف تھا کہ ارجمند کی وجہ سے اس کے اور نوربانو کے درمیان تلخی رہا کرے گی۔ ورنہ وہ کہاں کسی کا ایسا خیال رکھنے والی تھی۔ اسے تو ہمیشہ اس سے یہی شکایت رہتی تھی کہ وہ دوسروں کو اس سے زیادہ توجہ اور اہمیت دیتا ہے۔

اس نے دل ہی دل میں اللہ کا شکریہ ادا کیا۔ اب وہ آسانی سے اس محروم بچی کی دلجوئی کر سکے گا، اس کے زخموں پر مرہم رکھ کر انہیں مندمل کرنے کی کوشش کر سکے گا۔

وہ پھر پڑھائی میں مصروف ہوگیا۔

❁ ❁ ❁

نوربانو ارجمند کو اپنے کمرے میں لے گئی۔

''شام کو تیار ہو جانا۔ ہم سیر کے لئے چلیں گے۔''

''سچ آپی!'' ارجمند کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''تو اور کیا؟ یہ کوئی بڑی بات ہے۔''

ارجمند کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''میرے لئے تو بڑی بات ہے آپی!'' اس نے کہا۔

''میں نے تو کبھی جی بھر کے آسمان بھی نہیں دیکھا۔ میں تو تازہ ہوا کو بھی ترستی رہی ہوں آپی!''

''میں تمہارے ہر دُکھ، ہر محرومی کی تلافی کروں گی ارجی! اور ہاں! کل سے عبدالحق تمہیں پڑھائیں گے۔ تاکہ آنے والے دو سال اسکول میں تمہارا داخلہ بھی ہو جائے۔''

یہ ارجمند کے لئے اور بڑی بات تھی۔

''آغا جی پڑھائیں گے.....؟ مجھے.....؟''

''ہاں! اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟''

''آغا جی خود ہی پڑھتے رہتے ہیں ہر وقت۔ انہیں فرصت کہاں؟''

''میرا کہنا ٹال نہیں سکتے وہ۔ دیکھ لینا کل۔'' پھر کچھ خیال آیا تو اس نے ارجمند کو غور سے دیکھا۔

''یہ تم انہیں آغا جی کیوں کہتی ہو؟''

ارجمند پہلے تو گڑبڑائی۔ پھر اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''پتا نہیں کیوں؟ بس آغا جی کہنا اچھا لگتا ہے۔''

نور بانو اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

ارجمند کو اس کی نظروں سے گھبراہٹ ہونے لگی۔

''وہ مجھے آغا جی ہی لگتے ہیں آپی!''

''سمجھی! کسی کو گھر میں آغا جی کہتی ہوگی نا! کسی بہت پیارے کو..... اپنے بابا کو..... چچا کو.....''

ارجمند نے سکون کی سانس لی۔ لیکن کچھ کہا نہیں۔ وہ جھوٹ نہیں بولنا

چاہتی تھی۔

نور بانو نے اس کے چہرے کی گھبراہٹ کو اداسی اور افسردگی پر محمول کیا۔

''چلو.....! تمہیں کوئی کھویا ہوا مل گیا۔'' اس نے چہک کر کہا۔

''اب تم پچھلی باتیں سب بھول جاؤ۔ خوش رہا کرو۔ افسردہ ہوگی تو میں خفا ہو جاؤں گی۔''

نور بانو کے لہجے میں ایسی محبت تھی کہ ارجمند شرمندہ ہوگئی۔ یہ کیسی محبت مل گئی ہے مجھے۔ اس نے دل میں کہا۔ کیا میں اس محبت کرنے والی ہستی کو دکھ دے سکتی ہوں، جو مجھ میں اپنی مرحوم بہن کو دیکھتی ہے۔

اسی لمحے اس کے دل میں اللہ میاں نے کہا۔

''کوئی کسی کو دکھ نہیں دے سکتا۔ یہ سب تو اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اور وہ چاہے تو کسی کے لئے اس کے دکھ کو بھی سکھ بنا دے۔''

اور وہ مطمئن ہوگئی۔

❁ ❁ ❁

وہ ارجمند کے لئے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

ایسی شام اس کی زندگی میں دہلی کے بعد سے اب تک نہیں آئی تھی۔

آغا جی گاڑی چلا رہے تھے۔ آپی آگے ان کے ساتھ تھیں، اور وہ دادی اماں کے ساتھ پیچھے بیٹھی تھی۔ دل میں یہ یقین تھا کہ وہ سب اس کے اپنے ہیں اور پچھلا زمانہ ابھی سے یادوں میں دھندلانے لگا تھا۔ بس ایک پھپھو کی یاد تازہ تھی۔ ان کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ افسردہ ہوگئی۔ کاش وہ بھی ساتھ ہوتیں۔ لیکن نہیں، وہ پھپھا جان کے ساتھ ہوتیں تو اور اچھا ہوتا۔

اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ سب کچھ بھول سکتی ہے، لیکن پھپھو کو نہیں بھول سکتی۔ یہاں وہ پھپھو ہی کی وجہ سے تو پہنچی تھی۔ پھپھو ہی تو آغا جی کو جانتی تھیں۔ ورنہ وہ آغا جی تک کیسے پہنچتی۔ اور آغا جی کی وجہ سے اسے دادی اماں کا نعم البدل ملا، ایسی محبت کرنے والی بہن ملی، اور یہ پرسکون اور آزاد زندگی۔ ایسی

ہوا میں تو اس نے کبھی سانس نہیں لیا تھا۔

وہ باہر دیکھتی اور گہری گہری سانس لیتی رہی۔ کون جانے، پھر یہ ہوا اس سے چھن جائے۔ جتنی ہوا پھیپھڑوں میں بھر سکو، بھر لو۔

اور لارنس گارڈن دیکھ کر تو وہ حیران رہ گئی۔ اتنا بڑا باغ...... پوری دنیا جتنا بڑا، اور اتنا خوب صورت، درمیان میں وہ چھوٹی سی جھیل اسے بہت ہی اچھی لگی۔

وہ گھاس پر بیٹھ گئے۔

''کیسا لگ رہا ہے اماں!'' عبدالحق نے حمیدہ سے پوچھا۔

''بہت اچھا پتر! یہاں تو کبھی کبھی لایا کر بچوں کو۔''

''بالکل اماں!''

اسی وقت اس کی نظر دس بارہ سال کے ایک لڑکے پر پڑی۔ اس کے ہاتھوں پر ایک بہت بڑی تھالی تھی، جس میں تلی ہوئی چنے کی دال تھی۔ وہ ادھر ادھر آواز لگاتا پھر رہا تھا۔

''خستہ کراری دال لے لو۔'' عبدالحق نے اسے آواز دے لی۔

لڑکا ان کی طرف چلا آیا۔

''یہاں بیٹھو۔'' عبدالحق نے کہا۔

لڑکا بیٹھ گیا۔ تھالی اس نے سامنے رکھ لی۔ تھالی پر دال کے علاوہ ایک چوڑے منہ کا ڈبہ تھا، جس کے اُوپری ڈھکنے میں کئی سوراخ تھے۔ اس کے علاوہ وہ کاغذ کے تکونی ساخت کے پڑے تھے، جو ایک اندر ایک رکھے تھے۔

''کیسی ہے تمہاری دال؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''کھا کر دیکھ لیں آپ!'' لڑکے نے دال کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''ایسے نہیں! کتنے کی دیتے ہو ایک پڑیا''

''ایک پیسے کی جناب!''

لب و لہجے سے لڑکا مقامی نہیں لگ رہا تھا۔ عبدالحق نے پوچھا۔

''تم ہندوستانی ہو؟''

''نہیں جناب! میں پاکستانی ہوں۔''

عبدالحق کھسیا گیا۔

''تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ میں پوچھ رہا ہوں، تم لوگ ہندوستان سے آئے ہو؟''

''جی جناب! ہم میرٹھ سے آئے تھے۔ لیکن میرے اور اماں کے سوا وئی نہیں بچا۔''

''کہاں رہتے ہو؟''

''ایک جھونپڑی ڈال لی ہے جناب!''

اُف یہ ہجرت کی الم ناک کہانیاں۔ عبدالحق نے سوچا۔ اتنا سا بچہ کیسے بڑوں کی طرح بات کر رہا ہے۔ ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں، اور غم روزگار میں الجھا ہوا ہے۔

''تم پڑھتے نہیں ہو؟''

''پڑھتا ہوں جناب! صبح سرکاری اسکول میں جاتا ہوں۔ تیسری جماعت میں ہوں۔'' لڑکے نے فخر سے کہا۔

''اماں تمہاری کیا کرتی ہیں؟''

ارجمند بہت غور سے دیکھ اور سن رہی تھی۔

''اماں کچھ نہیں کرتی جناب! وہ زخمی آئی تھیں۔ اسپتال میں ایک ٹانگ کاٹ دی گئی۔ اب بیساکھی سے چلتی ہیں۔''

''اور تم کیا کرتے ہو؟''

''میں اسکول سے آ کر پڑھتا ہوں، کچھ آرام کرتا ہوں، اور شام کو یہ کام کرتا ہوں۔''

''کیا مل جاتا ہے؟''

''کبھی ایک، کبھی ڈیڑھ روپیہ۔''

''روز یہاں آتے ہو؟''

''جی ہاں جناب! ہاں کبھی اپنے جیسے بچوں کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے تو

کسی بستی میں چلا جاتا ہوں۔ مگر یہاں کمائی زیادہ ہوتی ہے۔''

اتنا سا بچہ اور کمائی کی فکر؟ عبدالحق کا دل دکھنے لگا۔

''سنو! تمہارا نام کیا ہے؟''

''شاکر، جناب!''

''تو شاکر! تم مجھے بھائی جان کیوں نہیں کہتے؟'' عبدالحق نے کہا۔ پھر اسے کچھ بدلنے کا موقع دیئے بغیر بولا۔

''یہ پوری دال کتنے کی ہوگی؟''

''دو ڈھائی روپے کی تو ہوگی جناب!''

''پھر وہی جناب؟'' عبدالحق نے اسے ٹوکا۔

''اب اتنی سی دیر کا ملنا ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے جناب!''

اس بات سے عبدالحق کھسیا گیا۔ کیسی تلخی، کیسی حقیقت پسندی تھی اس جواب میں۔ اس نے جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر شاکر کی طرف بڑھایا۔

''یہ لو! یہ دال میری ہوئی۔''

''میرے پاس کھلا نہیں ہے جناب!''

''میں تم سے پیسے واپس نہیں مانگ رہا ہوں۔ رکھ لو۔''

''آپ میری مدد کر رہے ہیں اور اتنی دال کا آپ کیا کریں گے؟ کھا تو نہیں سکتے، نہیں جناب! اماں کہتی ہیں، دوسروں کی مدد سے اپنی محنت کی کمائی اچھی ہوتی ہے، میں یہ پیسے نہیں لوں گا۔''

''تم غلط سمجھ رہے ہو شاکر! دیکھو، تم چار پڑے تو ہمیں دو، پھر کسی بھی غریب بستی میں جاؤ، وہاں ایسے بچے ہوتے ہوں گے، جن کا جی چاہتا ہوں دال خریدنے کو مگر ان کے پاس پیسے نہیں ہوتے ہوں گے۔ دال دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آتا ہوگا۔ تم نے دیکھے ہوں گے ایسے بچے......''

''جی......! میں کبھی کبھی انہیں تھوڑی سی دال دے دیتا ہوں۔'' شاکر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم آج وہاں جاؤ، اور یہ دال تمام بچوں کو مفت

دو۔''

''یہ ٹھیک ہے جناب! لیکن دال تو زیادہ سے زیادہ ڈھائی......''

''دیکھو! دال تو میں نے تم سے ڈھائی روپے میں لے لی۔ اب یہ میری ہے نا؟'' عبدالحق نے کہا۔ شاکر نے اقرار میں سر ہلایا۔

''اب میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ اسے کہیں لے جا کر بانٹ دو، تو اس کام کی مزدوری بھی تو ہوگی نا؟ تو ڈھائی روپے اس کی مزدوری۔ اس میں مدد کی کیا بات ہے؟ تم میرا کام کرو گے تو میں تمہیں اس کی اجرت دوں گا۔''

لڑکے نے چار پڑے انہیں بنا کر دیئے اور خاموشی سے تھال اٹھا کر چلا گیا۔

وہ لوگ خاموش بیٹھے دال ٹونگتے رہے۔ دال بہت خستہ تھی، اور مسالے نے اس کا لطف دوبالا کر دیا تھا۔

ذرا دیر بعد حمیدہ نے کہا۔

''ارے تم لوگ گھومو پھرو نا، میں یہیں بیٹھی ہوں، جاؤ۔''

''آپ کو اکیلا چھوڑنا اچھا نہیں لگتا اماں!'' عبدالحق نے کہا۔

''ارے! اتنے لوگوں کے بیچ کوئی اکیلا ہوتا ہے بھلا؟ پگلا کہیں کا۔''

عبدالحق اور نور بانو اٹھ کھڑے ہوئے۔ نور بانو نے ارجمند کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھایا۔

''چلو ارجی!''

''نہیں آپی! میں دادی اماں کے پاس رہوں گی۔''

''لو! ہم تو تمہیں سیر کرانے کے لئے آئے ہیں۔ چلو ایسا کرو، اماں کے پاس میں رک جاتی ہوں۔ تم چلی جاؤ ان کے ساتھ۔''

ارجمند کا گلا خشک ہوگیا۔

''نہیں آپی! آپ جائیں نا، میرا دل بھی نہیں چاہ رہا ہے۔ بیٹھ کر یہاں سب کچھ دیکھنا زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔''

''یہاں بیٹھے بیٹھے تمہیں نہیں معلوم ہوسکتا کہ یہ کتنا بڑا باغ ہے۔ خیر،

اگلی بار سہی۔''

وہ دونوں چلے گئے۔ ارجمند بیٹھی آغا جی کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس کے ذہن میں ایک الجھن تھی۔ آپی نے کہا تھا، اللہ میاں کسی سے بات نہیں کرتے۔ یہ اس کا وہم ہے۔ اور اسے یاد تھا، اللہ میاں نے اس سے کہا تھا کہ وہ آغا جی کو بڑا بنائے گی، وہ اس سے شادی کے بعد بڑے ہوں گے۔ لیکن ان چند دنوں میں اس نے دیکھ لیا تھا، اور ابھی اس دال بیچنے والے کے معاملے میں بھی دیکھا تھا۔ آغا جی تو بہت بڑے آدمی ہیں۔ وہ تو پہلے ہی بڑے آدمی ہیں۔ اس سے شادی کے بعد کیا بڑے ہوں گے۔

اس کا یقین متزلزل ہونے لگا کہ اللہ میاں اس سے بات کرتے ہیں۔ شاید آپی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔

لیکن اسی لمحے اسے کچھ یاد آ گیا۔

وہ تو آغا جی کو جانتی بھی نہیں تھی۔ اس نے تو بس ایک بار انہیں دیکھا تھا، اور ان کی تصویر بنا لی تھی۔ اسے ان کے بارے میں کچھ بھی تو معلوم نہیں تھا۔ لیکن وہ اس کے لئے بہت اپنے ہو گئے تھے، دل میں بس گئے تھے۔ مگر پھپھو تو انہیں بہت اچھی طرح جانتی تھیں۔ وہ تو ان کے ساتھ کالج میں پڑھی تھیں۔ انہوں نے اس کی بنائی ہوئی تصویر دیکھ کر انہیں پہچان لیا تھا۔ اور ان کے منہ سے آغا جی کا نام نکلا تھا ..... اوتار سنگھ، اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ بہت اچھے ہیں۔ مگر ہندو ہیں۔ لیکن اس کا دل نہیں مانا تھا۔

پھر اس نے اللہ سے دعا کی تھی کہ آغا جی مسلمان ہو جائیں تو اللہ میاں نے اسے بتایا تھا کہ وہ ہندو نہیں، مسلمان ہیں۔ اور جب پھپھو نے ان کے سپرد کرنے سے پہلے اسے بتایا تھا کہ وہ مسلمان ہو چکے ہیں، اور اب وہ ان کے پاس رہے گی۔

اس نے محض تصدیق کے لئے حمیدہ سے پوچھا۔

''دادی اماں! کیا آغا جی پہلے ہندو تھے۔''

حمیدہ کو یہ بات ناگوار لگی۔

''مجھے تو وہ کبھی ہندو نہیں لگا۔ ہاں وہ ہندو گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باپ بھی مرنے سے پہلے ایمان لے آئے تھے۔ ارے میں نے اسے دودھ پلایا ہے نکی!''

''ان کا نام پہلے اوتار سنگھ تھا دادی اماں؟''

''ہاں نکی! ٹھاکر اوتار سنگھ!''

ارجمند کھل اٹھی۔ آغا جی وہی تھے، جو پھپھو نے انہیں سمجھا تھا۔ پھپھو نہیں جانتی تھیں، اور وہ نہیں جانتی تھی۔ پھپھو کو نہیں معلوم تھا، لیکن اللہ میاں نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔ تو یہ اس کا وہم نہیں، اللہ میاں اس سے بات کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے۔ ورنہ اسے کیسے معلوم ہوتا کہ وہ مسلمان ہیں۔

حمیدہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوشی دیکھ کر اسے بھی خوشی ہوئی۔

''پر تو نے یہ بات کیوں پوچھی نکی!'' اس نے پوچھا۔

''پھپھو کو یہ بات معلوم نہیں تھی۔ لیکن مجھے معلوم تھی دادی اماں!''

حمیدہ کو حیرت ہوئی۔

''پر تو تو اسے جانتی بھی نہیں تھی۔''

''جی دادی اماں! میں نے تو بس ایک بار دور سے انہیں دیکھا تھا۔''

''پھر تجھے کیسے معلوم ہوا نکی!''

''مجھے اللہ میاں نے بتایا تھا دادی اماں!'' ارجمند نے بے ساختہ کہا، اور کہتے ہی ڈر گئی کہ اب وہ بھی اسے سمجھائیں گی کہ یہ اس کا وہم ہے۔

لیکن حمیدہ کا ردِعمل حوصلہ افزاء تھا۔ وہ مسکرائی۔

''تو اللہ میاں تجھ سے باتیں کرتے ہیں نکی! کیسے؟''

اس مسکراہٹ نے ارجمند کو سب کچھ بتانے کا حوصلہ دیا۔

حمیدہ خاموشی سے سنتی رہی۔ کچھ بولی نہیں۔

''آپی کہہ رہی تھیں کہ یہ میرا وہم ہے۔ مگر دادی اماں! یہ وہم ہوتا تو مجھے کیسے پتا چلتا کہ آغا جی مسلمان ہیں۔''

''آپی تیری کو کیا پتا ان باتوں کا۔ وہ تو بس اپنی دنیا میں مگن ہے۔''

''تو دادی اماں! اللہ میاں لوگوں سے باتیں کرتے ہیں نا؟''

''ہاں نکی! وہ تو ہم سب کے اندر ہی ہوتے ہیں نا...... یہاں......''

حمیدہ نے حلقوم پر انگلی رکھی، اور پھر سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''اور یہاں، دل میں۔ پر نکی! بندے کو ڈرنا چاہئے۔ کیونکہ ہر ایک کے اندر شیطان بھی ہوتا ہے۔ اور وہ بھی اس کی ہی آواز میں باتیں کرتا ہے۔''

یہ بالکل نئی بات تھی۔ ارجمند کو ڈر لگنے لگا۔

''تو یہ کیسے پتا چلے گا دادی اماں! کہ کون سی بات اللہ میاں نے کہی ہے اور کون سی شیطان نے؟''

''یہ بات تو بس دل ہی بتا سکتا ہے۔ اسی لئے تو دل کا صاف اور روشن رہنا ضروری ہے۔'' حمیدہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

''اللہ میاں نے تو خود ہی تجھے سمجھا دی ہے یہ بات۔ انہوں نے کہا تھا نا کہ جب تک تو سچی اور پاک صاف رہے گی، اور ان کا کہنا مانے گی تو وہ تیرے دل میں رہیں گے ورنہ چلے جائیں گے۔ اب جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں، اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں تو دل سیاہ ہونے لگتا ہے۔ پھر کسی موقع پر آدمی کو کسی معاملے میں مشورے کی ضرورت ہوتی ہے تو شیطان اسے مشورہ دیتا ہے، اور دل کی سیاہی کی وجہ سے وہ اسے اللہ کا مشورہ سمجھتا ہے۔ یوں وہ اور برا ہو جاتا ہے اور برا ہوتا رہتا ہے۔ پھر وہ اللہ سے اور اس سے دور ہو جاتا ہے۔ اور وہ بس شیطان کا ہو جاتا ہے۔''

ارجمند جھرجھری لے کر رہ گئی۔

''اللہ کی نافرمانی سے کیسے بچتے ہیں دادی اماں!''

''اللہ نے جس کام کو منع کیا ہے، وہ نہ کرے، اور اللہ کے سارے حکم مان کرے۔''

''اور یہ پتا کیسے چلے گا دادی اماں!''

''قرآن کو پڑھ کر سمجھا کر نکی!''

یہی بات پھپھو نے کہی تھی۔ اور اس نے سوچا تھا کہ وہ عربی ضرور پڑھے گی۔

''اب دیکھو، میرا عبدالحق قرآن پڑھتا بھی ہے، اور سمجھتا بھی ہے۔''

''آغا جی کو عربی آتی ہے؟''

''قرآن سے بھی پہلے اس نے عربی پڑھی اور سیکھی تھی۔''

چلو، عربی پڑھانے والا گھر میں ہی مل گیا۔ ارجمند نے خوش ہو کر سوچا۔

اسی لمحے ارجمند کے روشن چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے حمیدہ کے دل میں خیال آیا کہ کاش یہ لڑکی اس کی بہو ہوتی۔ اس میں کوئی بہت اچھی بات ہے۔ اللہ بہت مہربان ہے اس پر۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے؟ اللہ مہربان نہ ہوتا تو وہ بھلا ایسی ہوتی۔ اور پھر نور بانو جیسی شکی عورت اس سے ایسی محبت کرتی۔

لیکن بہت چھوٹی ہے ابھی۔ حمیدہ نے دل میں کہا۔ اور پھر عبدالحق شادی شدہ ہے، اور نور بانو سے بہت محبت کرتا ہے۔ پھر بھی...... کون جانے...... اللہ نے تو چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔ اور اولاد تو مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ بات تو بہت دور کی، بہت ناممکن لگتی ہے...... کون جانے۔ اللہ نے ہی تو ملایا ہے۔ کیا ضروری تھا کہ یہ ہمیں ہی ملتی۔ اور جیسے یہ عبدالحق کو ملی، یہ بھی تو اللہ کی قدرت ہے۔ ایسے کہیں لوگ ملتے ہیں بھلا......

اسی لمحے عبدالحق اور نور بانو واپس آ گئے۔

❁ ❁ ❁

جیسے ہی الارم کی گھنٹی بجنی شروع ہوئی، عبدالحق کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے نور بانو کو نیند میں کسمساتے دیکھا تو جلدی سے الارم بند کر دیا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے الارم کیوں لگایا تھا۔

دیر تک سونے کی عادت ہوگئی تھی، اس لئے لگتا تھا کہ نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔ وہ سوچتا رہا، یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ الارم لگانے کا کیا سبب تھا۔ لیکن نیند کے غلبے کی وجہ سے ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔

وہ سونے کے ارادے سے دوبارہ لیٹ گیا۔ اسی وقت ایک جھٹکا سا لگا، اور اسے یاد آگیا۔ ارے......! اسے تو ارجمند کو پڑھانا ہے، اور یہ نوربانو کا حکم ہے۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور باتھ روم میں چلا گیا۔

❁ ❁ ❁

ارجمند قرآن پڑھ کر بیٹھی حمیدہ سے باتیں کر رہی تھی۔ بات کرنا کیا، وہ بولتی بہت کم تھی۔ البتہ حمیدہ کی باتیں بہت غور سے سنتی تھی۔ وہ اس کی دادی سے صرف مشابہ نہیں تھیں، بلکہ باتیں بھی ویسی ہی کرتی تھیں۔ وہی بات بات میں عقل اور حکمت، وہی سمجھانے والا انداز، وہی دل میں اتر جانے والا لہجہ۔ اسے حمیدہ کی باتیں سننا بہت اچھا لگتا تھا۔

لیکن اس صبح اس کا دھیان حمیدہ کی باتوں میں نہیں تھا۔ وہ عبدالحق کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ آپی نے اسے بتایا تھا کہ اب آغا جی اسے ہر روز پڑھایا کریں گے۔ وہ ان کی منتظر تھی۔

کئی بار اس نے سوچا کہ باہر نکل کر دیکھے۔ کیا پتا، آغا جی اٹھ گئے ہوں، اور اس کا انتظار کر رہے ہوں۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ ان کے معمول سے واقف تھی۔ وہ اٹھ کر سب سے پہلے دادی اماں کے پاس سلام کے لئے آتے تھے، اور کچھ دیر ان سے باتیں کرتے تھے۔ پھر وہ ناشتہ کرتے اور اس کے بعد ان کی پڑھائی شروع ہو جاتی۔

پھر باہر سے قدموں کے قریب آتی ہوئی وہ چاپ سنائی دی، جسے اب وہ خوب پہچانتی تھی۔

چند لمحے بعد عبدالحق کمرے میں داخل ہوا۔ حمیدہ کو سلام کر کے اس نے سر جھکایا۔ حمیدہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

''کیا بات ہے پتر! آج اتنے سویرے کیسے اُٹھ گیا؟'' اس نے پوچھا۔
عبدالحق کھسیا گیا۔

''وہ اماں! ارجمند کو پڑھانا ہے نا!'' پھر اس نے جلدی سے گویا صفائی پیش کی۔

''نوربانو نے پابند کر دیا ہے اماں! ورنہ میں نے سوچا تھا کہ اپنے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد ارجمند کی پڑھائی کی فکر کروں گا۔''

اس کی پہلی بات سن کر ارجمند افسردہ ہوئی تھی، آپی نہ کہتیں تو آغا جی مجھے نہ پڑھاتے۔ لیکن بعد کے لفظ سن کر اس کی شکایت دور ہوگئی۔

''چل پتر! یہ تو بہت اچھا ہے۔ اسے پڑھائے گا تو تیری پڑھائی میں اللہ برکت اور آسانی پیدا کرے گا۔''

''انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا اماں!''

تھوڑی دیر وہ حمیدہ سے باتیں کرتا رہا، پھر ارجمند کی طرف مڑا۔

''اب مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں کیا کچھ آتا ہے؟''

لیکن ارجمند کے کچھ کہنے سے پہلے ہی حمیدہ نے مداخلت کر دی۔

''نا پتر! پڑھائی ایسے تو نہیں ہوتی۔ تو اسے اپنے پڑھائی والے کمرے میں پڑھایا کر، میز کرسی پر بٹھا کر۔''

عبدالحق گڑبڑا گیا۔ بے شک، نوربانو نے ہی یہ فرمائش کی تھی مگر وہ جانتا تھا کہ وہ کتنی شکی طبیعت کی ہے۔ خوامخواہ کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔ دوسری طرف ارجمند بھی یہ سن کر گھبرا گئی تھی۔

''اب دیکھ کیا رہا ہے پتر! جا اور اسے پڑھا۔'' حمیدہ نے کہا۔ پھر اسے کچھ خیال آیا تو بولی۔

''تو نے تو ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا ہوگا۔''

''وہیں اسٹڈی میں کرلوں گا اماں!'' عبدالحق نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ چلیں، میں آپ کا ناشتہ لاتی ہوں۔'' ارجمند بھی اٹھ گئی۔

عبدالحق اسٹڈی میں چلا گیا۔ ذرا دیر بعد ارجمند اس کا ناشتہ لے آئی۔ ٹوسٹ، فرائی انڈے اور چائے۔ ٹرے اس نے میز پر اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لیں آغا جی! توس میں نے جلا تو نہیں دیئے ہیں۔"

عبدالحق نے ٹوسٹ اٹھا کر دونوں طرف سے دیکھا۔

"تم نے سینکے ہیں؟"

"جی ہاں!"

"نسیمہ سے کہہ دیتی۔"

"مجھے بھی کام کرنا آتا ہے۔ لایئے مکھن لگا دوں۔"

"مجھے بتاؤ، حساب میں تمہیں کیا کچھ آتا ہے؟" عبدالحق نے ناشتے کے دوران پوچھا۔

"آپ پہلے سکون سے ناشتہ کر لیں۔"

ناشتے کے بعد عبدالحق نے اس کا مختصر سا انٹرویو کیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ نادرہ نے بڑی محنت اور محبت سے اسے پڑھایا تھا۔ بلکہ اس کی انگریزی استعداد تو غیر معمولی تھی۔ وہ اس کی اپنی انگریزی کی کتابوں کو روانی سے پڑھ رہی تھی۔ البتہ سمجھ نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ اس کا ذخیرۂ الفاظ محدود تھا۔

"کاپیاں ہیں تمہارے پاس؟" اس نے ارجمند سے پوچھا۔

ارجمند نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ ڈرائنگ کی کاپیوں، اپنی اسکیچ بک اور رنگوں کے سوا کچھ بھی نہیں لائی تھی۔ اور ڈرائنگ کی کاپیاں تو اس نے دادی اماں کی الماری میں سب سے نیچے چھپا دی تھیں۔

عبدالحق نے اپنا رجسٹر اٹھایا اور جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم کے کچھ سادہ سوال اسے کرنے کے لئے دیئے۔ ارجمند نے وہ بغیر کسی غلطی کے بہت تیزی سے حل کر دیئے۔

جس دوران وہ اس کا کام چیک کر رہا تھا، ارجمند ٹکٹکی باندھے اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ مگر اسی لمحے اللہ میاں نے اسے ٹوک دیا۔

"کسی کو ایسے نہیں دیکھتے۔ اپنی نظریں نیچی رکھا کرو۔ اللہ کو حیا پسند ہے،"
اور ارجمند نے فوراً نظریں جھکا لیں۔

عبدالحق بہت خوش تھا، ارجمند کی اردو اور انگریزی کی رائٹنگ بھی بہت اچھی تھی، اور املا بھی درست تھی۔ حساب میں، اسے بیس تک کے پہاڑے یاد تھے۔ اور کسر کے اور اشاریہ کے سوال بھی حل کر لیتی تھی۔ بس دوسرے مضامین میں ذرا زیادہ محنت کرانی تھی۔

"تھوڑی سی تیاری کی ضرورت ہے۔ پھر انشاء اللہ تمہارا داخلہ آٹھویں جماعت میں ہو جائے گا۔" اس نے کہا۔

ارجمند نے خوشی سے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

"اب ہمیں تمہارے لئے آٹھویں کا پورا کورس، کاپیاں اور قلم پنسل وغیرہ خریدنے ہوں گے۔ کل سے تمہاری باقاعدہ پڑھائی شروع۔"

"شکریہ آغا جی!"

"ایسا کیوں کہتی ہو؟ یہ تو میرا فرض ہے۔"

"اور شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے۔" ارجمند نے نگاہیں جھکائے کہا۔

"ٹھیک کہتی تھیں وہ۔"

ان دونوں کو احساس نہیں تھا کہ نور بانو دروازے میں کھڑی انہیں دیکھ رہی ہے۔ اس کی نگاہوں میں پسندیدگی تھی۔ ارجمند کی جھکی ہوئی نظریں، اس کا انداز اسے بہت اچھا لگا تھا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر پاکیزگی کا احساس ہوتا تھا۔

"میں اندر آ سکتی ہوں؟" اس نے کھنکھانے کے بعد کہا۔

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آجاؤ نا! تمہیں اجازت کی ضرورت کب سے پڑ گئی؟"

"دیکھو نا! آپ ارجی کو پڑھا رہے ہیں، اور میں مخل ہو رہی ہوں۔"

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ آپی!" ارجمند نے شکایتی لہجے میں کہا۔

نور بانو ذرا دور صوفے پر بیٹھ گئی، جبکہ ارجمند عبدالحق کے سامنے بیٹھی تھی۔

"یہ تو اصول کی بات ہے۔ جب یہ پڑھ رہے ہوتے ہیں، میں اس

وقت بھی سوائے ان کے لئے چائے لانے کے کبھی اس کمرے میں نہیں آتی۔ پوچھ لو ان سے۔'' اس نے کہا۔

''یہ سچ ہے، لیکن کبھی کبھی چائے کا وقفہ طویل ضرور ہو جاتا ہے۔'' عبدالحق نے ہنس کر کہا۔

''یہ بتائیں! کیسی رہی ارجمند؟''

''فرسٹ کلاس! تھوڑی سی تیاری کرانی ہوگی۔ اگلے تعلیمی سال میں انشاء اللہ اس کا داخلہ آٹھویں میں ہو جائے گا۔''

''ابھی پڑھا رہے ہیں اسے؟''

''نہیں بھئی! آج پڑھائی کا دن نہیں تھا۔ آج تو میں اسے تول رہا تھا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''پڑھائی تو انشاء اللہ کل سے شروع ہوگی۔ ابھی تو اسے کتابیں اور کاپیاں دلانی ہیں۔''

''تو جائیے، دلا لائیے۔''

''تم بھی چلو نا!''

''نہیں بھئی! آپ ہی چلے جائیں۔ مجھے تو ابھی ناشتہ کرنا ہے اور پھر آپ کی پڑھائی کا وقت ہو جائے گا۔ بس فوراً ہی چلے جائیے۔''

''آپ بھی چلیں نا آپی!'' ارجمند نے کہا۔

''نہیں گڑیا! تم ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ مجھے تیار ہونے میں دیر لگے گی۔ اور پھر ان کی پڑھائی کا حرج ہوگا۔''

''تو چلو ارجمند!'' عبدالحق نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اور ارجمند بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

❁ ❁ ❁

ارجمند کو دیر سے احساس ہو رہا تھا کہ کوئی اہم بات آغا جی سے کرنی تھی، جو وہ بھول گئی ہے۔ کچھ یاد آتے آتے رہ جاتا تھا۔ لیکن راستے میں گاڑی میں بیٹھے ہوئے اسے اچانک وہ بات یاد آ گئی۔

''آغا جی! ایک بات میں آپ کو بتانا بھول گئی تھی۔''

''تو اب بتا دو!''

''میں چاہے کچھ بھی نہ پڑھوں، لیکن عربی ہر قیمت پر پڑھنا اور سیکھنا چاہتی ہوں۔''

گاڑی چلاتے ہوئے عبدالحق نے ایک لمحے کو سر گھما کر اسے حیرت سے دیکھا۔

''تو یہ کیا مشکل ہے؟''

''دادی اماں نے مجھے بتایا تھا......''

''ہاں! اللہ کا شکر ہے، میں تمہیں عربی بھی پڑھا سکتا ہوں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''لیکن ایک بات بتاؤ، عربی پر اتنا زور کیوں دے رہی ہو؟'' اسے اپنا خیال آ گیا تھا۔ یہ ارجمند کے ساتھ ایک اور قدرِ مشترک نکل آئی تھی...... عربی کی محبت۔

''میں قرآن کو صرف پڑھنا نہیں سمجھنا بھی چاہتی ہوں۔''

عبدالحق شرمندہ ہو گیا۔ یہ چھوٹی سی بچی اس پر سبقت لے گئی تھی۔ اس نے تو نور بانو کی آواز سنی تھی، اور اسے آواز اور آواز والی، دونوں سے محبت ہو گئی تھی۔ مگر زبان نامانوس تھی۔ پھر جب اس پتا چلا کہ وہ عربی ہے تو اس نے عربی سیکھی، اور اللہ کے فضل و کرم سے بڑی محبت سے سیکھی۔ لیکن بہرحال اس کی غرض دنیاوی تھی۔ جبکہ یہ بچی خالص قرآن کی محبت میں عربی سیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے دل میں اس بچی کے لئے احترام سے ملتے جلتے کسی جذبے نے سر اٹھایا۔ عمر سے کیا ہوتا ہے، اس نے سوچا، بڑائی تو اللہ دیتا ہے۔ جسے جب چاہے، دے دے۔''

اس نے آزمانے کے خیال سے کہا۔

''اس کے لئے عربی سیکھنے اور پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ ترجمے والا قرآن پڑھ لیا کرو۔''

''نہیں آغا جی! میں چاہتی ہوں کہ قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے ان آیات کا مطلب میرے ذہن میں موجود ہو، جو میں پڑھ رہی ہوں۔''

''بہت خوب! تب تو تم بہت جلدی سیکھ لوگی۔''

''کیوں؟''

''اللہ خوش ہوگا نا، تو آسان کر دے گا تمہارے لئے۔'' عبدالحق نے کہا اور دل میں تاسف سے سوچا۔

میں تو اپنے دل کی خوشی کے لئے پڑھتا تھا۔ اور جس آواز کی محبت میں عربی سیکھی تھی، وہ مل گئی ہے۔ مگر اس سے سب کچھ سن سکتا ہوں، سوائے قرآن کے۔

''آپ اداس کیوں ہوگئے آغا جی!'' ارجمند اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

''یوں ہی......! اپنی محرومی کا خیال آگیا تھا۔''

''اللہ نہ کرے۔ آپ کبھی محروم ہو ہی نہیں سکتے۔'' ارجمند نے تڑپ کر کہا۔

عبدالحق نے سر گھما کر ایک پل اسے غور سے دیکھا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''میں ہمیشہ دعا جو کرتی ہوں آپ کے لئے۔''

''ضروری تو نہیں کہ ہر دُعا قبول ہو۔''

''لیکن جب اللہ میاں وعدہ کریں تو وہ تو پورا ہو کر رہتا ہے۔''

''اللہ نے کسی سے وعدہ نہیں کیا کہ اس کی ہر دعا قبول فرمائے گا۔''

ارجمند گھبرا گئی۔ نوربانو کا ردّعمل وہ دیکھ چکی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اب آغا جی بھی اسے پاگل سمجھنے لگیں۔ یہ اللہ میاں والی بات دادی اماں کے سوا کسی کے سمجھ میں نہیں آئے گی۔

''پھپھو کہتی تھیں آغا جی! کہ سچے دل کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ خاص طور پر اگر وہ اپنے لئے نہیں، کسی اور کے لئے کی جائے۔''

''نہیں ارجی! یہ ہرگز ضروری نہیں۔ ہاں! کہتے ہیں کہ جو دُعا دنیا میں قبول نہ ہو، اس کا اجر آخرت میں ملتا ہے۔ اور دعا سے کہیں بڑھ کر ملتا ہے۔''

''تو اس میں بھی آپ کا فائدہ ہے۔'' ارجمند نے بات ٹالنے کے لئے کہا۔

''ہاں! دنیا کے فائدے تو وقتی طور پر بڑے لگتے ہیں، اصل فائدہ تو آخر کا ہی فائدہ ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اتنی چھوٹی بچی سے وہ اتنی بھاری گفتگو کر رہا ہے۔ چنانچہ اس نے موضوع بدلا۔

''ایک بات ہے۔ اب میں تمہیں پڑھاؤں گا تو تمہیں مجھے فیس بھی تو دینی ہوگی۔''

ارجمند اداس ہوگئی۔

''میں بھلا آپ کو کیا دے سکتی ہوں؟ مجھے تو کتابیں بھی آپ ہی دلا رہے ہیں۔''

عبدالحق تڑپ گیا۔

''ایسی بات آئندہ کبھی نہ کہنا۔ میں جو کچھ بھی تمہیں دلاؤں گا، وہ دراصل تمہاری پھپھو دلا رہی ہوں گی۔''

''کیسے......؟''

''تمہیں نہیں معلوم کہ میں تمہاری پھپھو کا کتنا مقروض ہوں۔ تم جانتی ہو نا کہ تمہاری پھپھو خوددار تھیں۔ وہ کسی کا احسان نہ لیتی تھیں کبھی؟''

ارجمند کو پانی سے بھری وہ آنکھیں یاد آگئیں۔ اتنی محنت اس لیے تو کرتی تھیں وہ۔ کوٹھے پر سب کچھ ان کے اختیار میں تھا، مگر وہ اپنی اور اس کی ضرورتوں کے لئے سلائی کڑھائی کرتی تھیں۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''جی......! میں جانتی ہوں۔''

''تو سوچو کہ انہوں نے تمہیں میرے سپرد کیوں کیا؟''

''وہ کہتی تھیں کہ آپ کے سوا یہاں ان کا کوئی ہے ہی نہیں۔''

عبدالحق کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ نادرہ تو نہیں جانتی تھی کہ وہ مسلمان

ہو چکا ہے۔ پھر بھی وہ یہاں بس اسے ہی اپنا سمجھتی تھی۔

''یہ بات نہیں ہے ارجی! دیکھونا، وہ عارف صاحب سے شادی کر رہی تھیں نا؟''

ارجمند نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

''تو آدمی جس سے شادی کرے، وہ اس کے نزدیک سب سے معتبر ہوتا ہے۔''

ارجمند نے کچھ نہیں کہا، وہ اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھتی رہی۔

''اور عارف صاحب جب نادرہ کو ملے تو میں تو اسے ملا بھی نہیں تھا۔ اب تم سوچو کہ نادرہ نے تمہیں عارف کے سپرد کیوں نہیں کیا؟ میرے سپرد کیوں کیا؟''

اس لئے کہ وہ جانتی تھیں کہ آپ میرے شہزادے ہیں۔ ارجمند نے دل میں کہا۔ لیکن یہ بات وہ کہہ نہیں سکتی تھی۔

''مجھے نہیں معلوم، یہ تو آپ ہی مجھے بتائیں۔''

''بتا تو رہا ہوں۔ وہ خوددار تھی، عارف پر اس کا کوئی احسان نہیں تھا، اور مجھ پر تھا۔ وہ تمہیں عارف کو سونپتی تو اس پر عارف کا احسان ہوتا۔ لیکن میری بات دوسری تھی اور ہے۔ میں تو جو کچھ بھی کروں گا، وہ اس کے احسان کے جواب میں ہوگا۔ اور احسان اتنا بڑا ہے کہ اس کا حق پھر بھی ادا نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے آغا جی! میں سمجھ گئی۔''

''تو اب آئندہ ایسا نہیں کہنا۔ تمہارے لئے کچھ بھی کرنا میرے فرائض میں شامل ہے اور وہ احسان نہیں، تمہاری پھپھو کے احسان کے صلے کی معمولی سی قسط ہوگی۔''

''جی، ٹھیک ہے۔''

وہ اُردو بازار پہنچ گئے۔

ارجمند تو صرف دیکھتی رہی۔ عبدالحق نے ہر چیز اپنی مرضی سے خریدی۔

کتابیں، کاپیاں، قلم، پنسل، شارپنر، ربڑ، اور ہر چیز دکان پر موجود اعلیٰ ترین چیز تھی۔

ارجمند بہت خوش تھی۔

عبدالحق نے تمام چیزیں پچھلی سیٹ پر رکھیں اور اس کے لئے اگلا دروازہ کھولا۔ پھر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آیا۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ گاڑی آگے بڑھانے سے پہلے اس نے ارجمند کو غور سے دیکھا۔

''میں نے تم سے پوچھے بغیر تمہارے لئے ہر چیز پسند کی، تمہیں برا تو نہیں لگا؟''

''مجھے تو اچھا لگا آغا جی! میری پسند آپ کی پسند سے اچھی تو نہیں ہو سکتی۔''

''ہو بھی سکتی ہے۔ اصل میں بات تو آدمی کی پسند کی ہے۔''

''آئندہ ایسا سوچئے گا بھی نہیں۔ جو کچھ بھی آپ کو پسند ہے، وہ میرے نزدیک بہترین ہے۔''

عبدالحق نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

✿ ✿ ✿

حمیدہ اب مایوس ہونے لگی تھی۔ شہر کا کوئی مزار، کوئی بزرگ ایسا نہیں تھا، جہاں وہ عبدالحق کے لئے بیٹا مانگنے نہ گئی ہو۔ لیکن بات کسی طرح بن ہی نہیں رہی تھی۔

مگر مایوسی کے باوجود اس کے دل کی اُمید ختم نہیں ہوتی تھی۔ وہ سوچتی، اللہ کا کوئی کام بے سبب نہیں ہوتا۔ اس نے ٹھاکر پرتاپ سنگھ پر کرم فرمایا اور اسے بڑھاپے میں بیٹے سے نوازا۔ اور وہ کوئی عام بیٹا نہیں تھا۔ وہ ایسا بچہ تھا، جس نے مشرک ماں کا دودھ قبول نہیں کیا۔ ننھے بچے کی جان پر بن گئی، مگر اس نے ضد نہیں چھوڑی۔ اور اللہ نے اسے یہ اعزاز عطا فرمایا کہ ٹھاکروں کی گڑھی میں وہی ایک مسلمان عورت تھی، اور اللہ کی قدرت کہ اس کی گود میں ایک دودھ

پیتا بچہ بھی تھا۔ یعنی اس کی چھاتیوں میں دودھ بھی تھا۔ ننھے ٹھاکر کے لئے۔ یہ سب اللہ کا ہی تو انتظام تھا۔

اور اللہ نے اس بچے کو کیسا مبارک بنایا تھا۔ اس کی پوری زندگی حمیدہ کے سامنے تھی۔ وہ کیسے کیسے سوال کرتا تھا، کیسی جستجو تھی اس کے اندر۔ اور وہ خود تو مسلمان ہوا ہی، لیکن اس سے پہلے اس کا راج پوت باپ مسلمان ہوگیا تھا۔ کیسی عجیب بات تھی۔

اللہ کسی پر فضل عظیم فرماتا ہے تو اس کی نسلوں کے لئے صراطِ مستقیم آسان کر دیتا ہے۔ وہ فضل عظیم تو نسلوں تک جاتا ہے۔ بڑے ٹھاکر کو کسی انسان نے اسلام کی طرف راغب نہیں کیا تھا۔ اس نے تو کبھی کسی سے اس بارے میں بات بھی نہیں کی تھی۔ اسے تو اللہ نے ہی راستہ دکھایا تھا۔ بس اسے اس کا اعلان کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

اس اعتبار سے عبدالحق اس نسل میں اللہ کے دین سے رجوع کرنے والا دوسرا شخص تھا۔ حمیدہ نے سوچا، یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ اتنا بڑا فضل فرمائے اور پھر اسے روک دے۔ اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ عبدالحق اولاد سے محروم رہے گا۔ اسے یقین تھا کہ اللہ کا وہ فضل عبدالحق کی آنے والی نسلوں تک جائے گا۔

بس یہ یقین تھا، جو اسے مکمل مایوسی سے بچائے ہوئے تھا۔ ورنہ ہر ناکامی کے بعد وہ یہی سوچتی تھی کہ شاید اللہ کو یہ منظور نہیں۔ لیکن اللہ کے فضل کا خیال پھر سے اُمید جگا دیتا تھا۔

اس روز بھی وہ نسیمہ کے ساتھ کہیں گئی، اور وہاں سے پڑھا ہوا پانی لے کر آئی۔ مگر اس نے دل میں سوچ لیا تھا کہ اب اس کے بعد وہ کسی در پر نہیں جائے گی۔ وہ اس پانی کو مہینوں چلائے گی۔ اللہ کو منظور ہوا تو نور بانو کی گود ہری ہو جائے گی۔

وہ پانی کی خاصی بڑی بوتل تھی۔ اس نے سوچا، عبدالحق کے کمرے میں رکھی صراحی میں ہر روز وہ اس بوتل میں دو گھونٹ پانی شامل کر دیا کرے گی۔

وہ واپس آئی تو ارجمند اس کے کمرے میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس

نے اسے سلام کیا۔

''کہاں گئی تھیں دادی اماں!'' اس نے پوچھا۔

''ایک کام سے گئی تھی نکی!'' حمیدہ نے کہا اور پانی کی بوتل مسہری کے سرہانے پر رکھ دی۔

''دادی اماں! آپ تو ہر دوسرے تیسرے دن کہیں نہ کہیں جاتی ہیں۔''

''ہاں نکی! اپنی غرض کے لئے ماری ماری پھرتی ہوں۔''

ارجمند نے تجسس بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''مجھے ساتھ کیوں نہیں لے کر جاتیں دادی؟''

''تو بچی ہے ابھی، اس لئے۔'' حمیدہ نے بے ساختہ کہا۔ پھر جلدی سے بولی۔

''اور پھر تو تو اس وقت پڑھ رہی ہوتی ہے۔ تو محنت نہیں کرے گی تو تیرا داخلہ کیسے ہوگا؟''

''لیکن دادی! آپ کی کیا غرض ہو سکتی ہے، آپ کے پاس تو اللہ کا دیا سبھی کچھ ہے۔''

''سب کچھ تو کسی کو بھی نہیں ملتا نکی! بادشاہوں کو بھی نہیں۔''

ارجمند چند لمحے سوچتی رہی۔ وہ کیسی نایاب چیز ہوگی کہ دادی اس کے لئے ماری ماری پھرتی ہیں، اور انہیں نہیں ملتی۔ اتنے بڑے بڑے بازار ہیں، سینکڑوں دُکانیں ہیں، مگر وہ چیز نہیں ملتی۔ ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے؟ پھر اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ دادی کو پتا ہی نہیں ہوگا کہ وہ چیز کس دکان پر ملے گی۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے۔

''آپ آغا جی سے کہیں نا دادی! وہ لا دیں گے آپ کو۔ آپ کو دکانوں کا کیا پتا؟ آغا جی کو سب کچھ معلوم ہے۔''

حمیدہ اداس ہوگئی۔

''عبدالحق بھی نہیں لا سکتا وہ چیز۔ لا سکتا ہوتا تو بات ہی کیا تھی۔''

ارجمند کا تجسس اور بڑھ گیا۔

"اور ضرورت تو اصل میں وہ عبدالحق ہی کی ہے۔ اسی کے لئے تو پھرتی ہوں میں۔"

آغا جی کو کس چیز کی ضرورت ہے؟ اور دادی اس کی تلاش میں پھرتی ہیں۔ ارجمند نے حیرت سے سوچا۔ اگر وہ آغا جی کو نہیں ملتی تو دادی کو کیسے ملے گی؟ اور ایسی کون سی چیز ہے؟ اب تجسس کے ساتھ وہ چیز ارجمند کے لئے اہم بھی ہوگئی۔ وہ کچھ نہیں کر سکتی تو اللہ سے دعا تو کر ہی سکتی ہے۔ اور جو چیز کہیں سے نہیں ملتی، وہ اللہ چاہے تو کہیں سے بھی دے دے۔

مگر یہ تو پتا چلے کہ وہ چیز کیا ہے؟

"آپ مجھے بتائیں نا دادی اماں! کیا چاہئے آغا جی کو؟ جو انہیں نہیں مل رہا ہے۔" اس نے حمیدہ سے کہا۔

"تو چھوٹی ہے نکی! تجھ سے کیا بات کروں؟" حمیدہ نے کہا۔ پھر اچانک اسے ایک خیال آیا۔

"یہ تو عبدالحق کو آغا جی کیوں کہتی ہے؟" اس نے پوچھا۔

سوال ارجمند کے لئے خلافِ توقع تھا، وہ گم سم ہوگئی۔

"بس دادی اماں! یوں ہی......"

حمیدہ اب اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

"یہ کوئی رشتہ تو نہیں ہے نا؟"

ارجمند نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو اسے بھائی جان بھی کہہ سکتی ہے، چاچا، ماموں بھی کہہ سکتی ہے۔ پھر یہ آغا جی کیوں؟"

"بس دادی اماں! وہ مجھے آغا جی ہی لگتے ہیں۔ میرے دل کو یہی کہنا اچھا لگتا ہے۔"

حمیدہ کو خیال آیا، ارجمند نے اسے بتایا تھا کہ اللہ میاں اس سے باتیں کرتے ہیں۔

"یہ تجھ سے اللہ میاں نے تو نہیں کہا؟" اس نے پوچھا۔

ایک لمحے کو ارجمند نے سوچا کہ ہاں کہہ دے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ جھوٹ اللہ میاں کو بہت ناپسند ہے۔ اس نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر......؟"

"اب دیکھیں نا دادی اماں! نہ وہ میرے بھائی ہیں، نہ چچا نہ ماموں۔ تو میرے دل نے کہا، انہیں آغا جی کہا کروں، بس!"

حمیدہ کا دل خوش ہوگیا۔ بچی جھوٹ نہیں بولتی۔ اسی لئے تو اللہ میاں اس سے بات کرتے ہیں، ضرور کرتے ہوں گے۔ اس پر اس کے ذہن میں ایک بات آرہی تھی۔ لیکن ارجمند نے اسے چونکا دیا۔

"مجھے بتائیں نا دادی! ایسا کیا ہے آغا جی کو جو انہیں کہیں نہیں مل رہا ہے؟"

"اولاد چاہئے تیرے آغا جی کو، بیٹا چاہئے، نسل بڑھانے والا پتر۔" حمیدہ کے منہ سے نکل گیا۔

ارجمند حیران رہ گئی۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں، اسے خیال ہی نہیں آیا۔ جیسے وہ اپنے بابا کی اولاد تھی، جیسے بابا اور پھپھو، دادا جان اور دادی جان کی اولاد تھے، ویسے ہی آغا جی کو بھی...... ہاں! ہونا تو چاہئے تھا۔ لیکن یہ دادی آغا جی کے لئے بیٹے کی تلاش میں کہاں ماری ماری پھرتی ہیں؟ بچے کوئی بازار میں...... دکانوں پر ملتے ہیں بھلا؟"

اس نے یہ بات دادی اماں سے کہہ بھی دی۔

حمیدہ ہنسنے لگی۔

"تو تو جھلی ہے نکی! میں دکانوں پر نہیں، مزاروں پر جاتی ہوں، بزرگوں کے پاس جاتی ہوں۔"

"آپ کو اللہ میاں سے مانگنا چاہئے دادی اماں!"

"وہ تو ہر وقت مانگتی رہتی ہوں۔ پر بزرگوں کے پاس اس لئے جاتی ہوں کہ وہ اللہ کے ولی ہوتے ہیں۔ مجھ سے زیادہ تو اللہ ان کی سنے گا نا!"

"اللہ تو سب کی سنتا ہے دادی!"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" حمیدہ نے کہا۔ پھر اسے وہ خیال آ گیا، جو ارجمند کے چونکانے سے وہ بھول گئی تھی۔ اس نے سوچا، یہ بچی بن ماں باپ کی ہے، معصوم بھی ہے اور نیک اور سچی بھی۔ اور اللہ اس سے باتیں بھی کرتا ہے۔ تو کیوں نہ اس سے کہے۔

"سن نکی! اللہ میاں تجھ سے باتیں کرتے ہیں نا؟"

"جی دادی اماں!"

"تو تو ان سے پوچھنا کہ اتنی دعا کرنے پر بھی عبدالحق کو پتر کیوں نہیں دیتے؟ پوچھے گی نا؟"

"جی دادی اماں!"

"اور تو دعا بھی کرنا ان سے۔"

"ضرور کروں گی دادی!" ارجمند نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔

"اچھا! اب جا کر عبدالحق کے کمرے سے صراحی لا، اور اس میں تازہ پانی بھر، مگر بھر کر پہلے میرے پاس لانا۔"

ارجمند کی سمجھ میں بات تو نہیں آئی، مگر ایسے میں وہ بس عمل کرنے کی قائل تھی۔ صراحی میں پانی بھر کر وہ حمیدہ کے پاس لائی۔ حمیدہ نے سرہانے رکھی بوتل میں سے چند قطرے صراحی میں ڈال دیئے۔

"جا! اب یہ اس کے کمرے میں رکھ دے۔"

"یہ پانی کیسا ہے اماں!" ارجمند نے بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا

"ایک بزرگ نے دم کر کے دیا ہے...... دعا کا پانی ہے۔ پر نکی! نور بانو کو یہ پتا نہ چلے۔"

"ٹھیک ہے دادی اماں!" ارجمند نے کہا اور صراحی لے کر کمرے سے نکل گئی۔

✿ ✿ ✿

عبدالحق ارجمند کی بے پناہ ذہانت پر حیران تھا۔ کوئی بات دوسری بار

سمجھانے کی اسے ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ بغیر کسی پریشانی کے ارجمند کو اسکول میں داخلہ مل جائے گا۔

عربی کے معاملے میں وہ اور زیادہ حیران تھا۔ اسے یاد تھا کہ اس کی عربی سمجھنے اور سیکھنے کی صلاحیت پر مولوی صاحب حیران ہوتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے، لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی وجہ اس کی لگن ہے۔ اب وہ دیکھ رہا تھا کہ ارجمند کی لگن اس کی لگن سے بھی زیادہ ہے۔ اور اس کی لگن دنیاوی تھی، جبکہ ارجمند قرآن سمجھنے کے لئے عربی پڑھ رہی تھی۔ اس لئے اس پر اللہ کی رحمت اور زیادہ تھی۔ وہ بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔

لیکن ارجمند کا اصل راز اسے معلوم نہیں تھا۔

ارجمند جب پہلی بار اس سے پڑھنے کے لئے بیٹھی تو اس کی عجیب کیفیت تھی۔ نہ وہ کچھ سن رہی تھی، نہ کچھ سمجھ رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ بس وہ عبدالحق کو تکتی رہے۔

مگر پھر ابتدائی لمحوں میں ہی اس کے اندر تنبیہ اُبھری۔

"نگاہ نیچی رکھو۔"

"میں بے بس ہوں۔" اس نے کہا۔

"بے بسی سے لڑو، اس سے جیتو، اسی میں بہتری ہے۔"

"دل نہیں مانتا۔"

"جو دل نہیں مانتا، پھر اس میں سیاہی کا پہلا نقطہ پڑ جاتا ہے۔ پھر دل سیاہ ہوتا جاتا ہے۔"

"لیکن میں ان سے محبت کرتی ہوں تو انہیں دیکھوں گی بھی۔"

"دیکھو گی تو محبت محبت نہیں رہے گی۔"

"کیوں؟"

"بغیر حق کے کسی کو یوں نہیں دیکھنا چاہئے۔ ورنہ محبت حقیر ہو جاتی ہے۔ حقیر ہوتے ہوتے مٹ جاتی ہے۔ پھر محبت نہیں رہتی، کچھ اور، خراب چیز ہو جاتی ہے۔ اور آدمی اسے محبت ہی سمجھتا رہتا ہے۔ یہ تو محبت کو خراب کرنا ہوا۔"

''جب مجھے دیکھنے کا حق نہیں تو محبت کا حق کیسے مل گیا؟''

''وہ تمہیں اللہ نے دیا ہے۔''

''اور انہیں دیکھنے کا حق نہیں دیا۔''

''ہاں!''

''تو اب میں کیا کروں؟ میں تو مشکل میں پھنس گئی۔''

''بری بات، جو اللہ دے، اس پر شکر ادا کرنا چاہئے اور جو نہ ملے، اس پر صبر کرنا چاہئے۔ شکایت تو شکر کو ضایع کر دیتی ہے۔ ابھی تمہیں معلوم نہیں کہ محبت کتنی بڑی نعمت ہے۔''

''اللہ آپ کا شکر ہے، مگر مجھے دیکھنے کا حق کب ملے گا؟''

''وقت آنے پر، اس سے پہلے کا وقت آزمائش ہے۔ جیسے اسکول میں داخلے کے لئے امتحان پاس کرنا ضروری ہے، ویسے ہی حق پانے کے لئے صبر کا امتحان بھی ہوگا۔''

اور ارجمند نے سوچا، محبت تو اللہ نے ہی دل میں ڈالی ہے، اور واقعی یہ بڑی نعمت ہے۔ یہ محبت نہ ہوتی تو اس کوٹھے پر جہاں پھپھو ہمیشہ ناخوش رہیں، میرا وقت کیسے گزرتا؟ وہ تو برسوں کی قید تھی، ہر دن، ہر رات پھر ہر دن اور ہررات کی مسلسل قید۔ اسی کی وجہ سے تو میں وہاں بھی خوش رہی۔ اور اللہ میاں نے وعدہ پورا کیا۔ مجھے آغا جی تک پہنچا دیا۔ اس کا بھی ایک وقت ہی تھا۔ کتنے برس لگے اس میں، لیکن اللہ کے بھروسے پر گزر گئے۔ سو یہ حق بھی وقت پر ہی ملے گا اور چاہے اس میں برسوں لگیں۔ لیکن یہ برس بھی گزر ہی جائیں گے۔

اور اس کا دل سکون اور یقین سے بھر گیا۔

اس نے عہد کر لیا کہ آغا جی کو کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔ اس کے بعد جیسے اس کی تمام حسیں سماعت میں مرتکز ہوگئیں۔ وہ آغا جی کے سامنے ہوتی تو سر جھکائے ان کی بات دھیان سے سنتی رہتی۔ اور سب کچھ جیسے دل میں اُتر جاتا۔ یہ تھا اس کی ذہانت کا راز۔ اس نے اللہ کی رضا کو تسلیم کر کے خوش رہنے کا، بے سکونی سے نجات پانے کا راز پا لیا تھا۔

اور وہ بہت خوش تھی۔

اور عبدالحق بھی بہت خوش تھا۔ ابتداء میں وہ ڈر رہا تھا۔ اسے نادرہ نے بھی ڈرایا تھا، اور بعد میں عارف نے بھی کہ یہ بچی، جو بہت چھوٹی ہے، اس سے دیوانہ وار محبت کرتی ہے۔ اب کوئی کسی کو جواب میں محبت نہ دے سکتا ہو تو بھی کسی سے محبت کرنے کا حق تو نہیں چھین سکتا۔ مگر نور بانو کی تنگ دلی اور حسد سے وہ واقف تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ نور بانو سے اس بچی کو کوئی تکلیف پہنچے، جو چھوٹی سی عمر میں ہر رشتے اور ہر سچی خوشی سے محروم ہوگئی تھی۔ اس لئے وہ بہت خوفزدہ تھا۔

لیکن اب وہ سمجھ رہا تھا۔ اللہ نے کرم فرمایا تھا اور ہر مشکل کی جگہ آسانی عطا فرما دی تھی۔ ارجمند کو دیکھ کر نور بانو کے دل میں اپنی چھوٹی بہن کی یاد تازہ ہو چکی تھی، اور وہ اس سے اپنی بہن جیسی محبت کرنے لگی تھی۔ اسے سیر کرانے کا خیال بھی نور بانو ہی کو آیا تھا، اور اسے پڑھانے کی فرمائش بھی نور بانو نے ہی کی تھی۔

اور اب ارجمند کا طرزِ عمل!

اسے یاد آیا کہ جب وہ اپنی کار میں اسے گھر لا رہا تھا تو وہ رو رہی تھی، اور اسے چپ کرانے کے لئے اس نے کہا تھا کہ وہ اس کے آنسو روکنے کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے تو اس بچی نے کہا تھا۔ مجھ سے شادی کریں گے۔ وہ سٹ پٹا گیا تھا، اور اسی نے بے ساختہ کہا تھا کہ ابھی تو وہ بہت چھوٹی ہے۔ اس پر ارجمند نے بس اتنا کہا تھا۔ جی ٹھیک ہے۔ اور وعدہ کیا تھا کہ وہ کبھی نہیں روئے گی۔

اور اب یہ وہی بچی ہے کہ اس کی موجودگی میں نگاہ بھی نہیں اٹھاتی ہے۔ ارجمند کے معاملے میں عبدالحق کے ذہن میں یہ بات ہمیشہ رہتی تھی کہ اس کے اور اس بچی کے درمیان بہت کچھ مشترک ہے۔ نادرہ نے اسے ارجمند کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ ایسا بہت کچھ جو حیران کن تھا اور اس نے سوچا تھا کہ جیسے اس پر اللہ کی خاص رحمت ہے، ویسے ہی ارجمند پر بھی ہے۔ بلکہ شاید

ارجمند پر اس سے بھی زیادہ ہے۔ اللہ نے ہمیشہ اس کی راہنمائی کی تھی، اسے گمراہی سے نکال کر اپنا سیدھا راستہ دکھایا تھا، اسے جستجو اور پھر منزل عطا کی تھی۔

لیکن ارجمند کا کہنا تھا کہ اللہ میاں اس سے باتیں کرتے ہیں۔ یہ بتاتے ہوئے نادرہ کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ ارجمند کی ذہنی صحت پر شبہ کر رہی ہو۔ مگر جس نے اللہ کی رحمت دیکھی بھی ہو، اور اسے یاد بھی رہتی ہو، وہ اس بات کو سمجھ سکتا تھا اور عبدالحق ایسا ہی تھا۔ اس نے سوچا، جب نادرہ کو اس کے مسلمان ہونے کا علم نہیں تھا تو ارجمند کو کیسے ہو گیا؟ جو اسے جانتی بھی نہیں تھی، جس نے بس ایک بار اسے دیکھا تھا، تو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اللہ اس بچی کے دل پر القا فرماتے ہیں۔ اب بچی تو یہی سمجھے گی، یہی کہے گی کہ اللہ میاں اس کی آواز میں اسی سے باتیں کرتے ہیں۔ وہ کم عمر بچی ہی تو ہے۔ اور بچی بھی ایسی، جس نے دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں...... معصیت اور خطا سے دور، اور معصوم۔ اللہ ایسے ہی دلوں میں تو رہتا ہے۔

بہرحال عبدالحق بہت خوش تھا۔ اس کے تمام خدشے اور وسوسے دور ہو گئے تھے۔ اور اس کی کم محنت بہت اچھے نتائج لا رہی تھی۔ عربی پڑھانے کا فائدہ تو اسے بھی پہنچ رہا تھا۔ اس کی عربی تازہ ہو رہی تھی۔ مگر اسے لگتا تھا کہ تھوڑے ہی عرصے میں ارجمند کی اور اس کی عربی کی استعداد برابر ہو جائے گی۔ تب وہ اسے عربی پڑھا نہیں سکے گا۔ ہاں! وہ دونوں مل کر عربی پڑھ سکیں گے۔

ادھر اس کا مقابلے کا امتحان بھی اب سر پر آ چکا تھا۔

✿ ✿ ✿

نوربانو کو ارجمند سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ اسے دیکھے بغیر اس کی صبح ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ دیر سے اُٹھتی تھی۔ ناشتے کے لئے نکلتی تو عبدالحق کی اسٹڈی کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ وہاں رک جاتی۔ وہ ارجمند کے پڑھنے کا وقت ہوتا تھا۔ وہ کچھ دیر دروازے میں کھڑی ہو کر اسے دیکھتی رہتی۔ اسے گلنار یاد آتی۔ وہ گلنار سے محبت کرتی تھی، لیکن اس نے کبھی گلنار کو محبت دی نہیں تھی۔ اس بات کا اسے پچھتاوا تھا۔ اب قدرت نے ارجمند کے روپ میں اسے وہ محبت

لٹانے کا موقع دیا تھا، اور وہ اس سے استفادہ کر رہی تھی۔

عبدالحق اور ارجمند دونوں ہی کا ارتکاز بلا کا تھا۔ وہ دیر تک کھڑی انہیں دیکھتی رہتی اور انہیں پتا بھی نہیں چلتا۔ مگر وہاں کھڑے ہو کر دیکھتے ہوئے اس کی نگاہوں کا مرکز و محور ارجمند ہوتی تھی، عبدالحق نہیں۔ ان لمحوں میں اس کی نظروں سے جیسے محبت برستی۔

ارجمند کی ایک بات اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ پڑھتے ہوئے اس کی نظریں ہمیشہ جھکی رہتی تھیں۔ وہ نظر کبھی اٹھاتی ہی نہیں تھی۔ اور چہرے پر نظر آنے والے ارتکاز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ عبدالحق کی ہر بات بہت غور سے سن رہی ہے...... بلکہ ذہن نشین کر رہی ہے۔ اس کے چہرے پر ایسی پاکیزگی ہوتی کہ اس سے روشنی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔

وہ کچھ دیر انہیں دیکھتی تھی، پھر خاموشی سے چلی جاتی تھی۔ اور انہیں پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ اس روز بھی وہ جانے ہی والی تھی کہ ایک دلچسپ بات نے اسے روک لیا۔

پڑھائی کے دوران شاید عبدالحق نے ارجمند سے کوئی ایسی بات پوچھی تھی، جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ ارجمند نہیں جانتی تھی، لیکن ارجمند نے اسے درست جواب دے دیا۔

عبدالحق کے چہرے پر حیرت اُبھری۔ چند لمحے وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

''یہ تمہیں کیسے معلوم ہے ارجمند؟''

''پتا نہیں کیسے آغا جی! بس مجھے معلوم ہے۔'' ارجمند نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ کسی نے تمہیں بتایا ہوگا؟''

''نہیں آغا جی! کسی نے نہیں بتایا۔''

''تو پھر کتاب میں پڑھا ہوگا؟''

''نہیں آغا جی!''

''تو پھر کیسے معلوم ہوا تمہیں؟''

''یہ تو مجھے معلوم نہیں۔''

اب عبدالحق کچھ جھنجلا گیا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟ ہو ہی نہیں سکتا۔''

''اللہ کا شکر ہے آغا جی! میں جھوٹ کبھی نہیں بولتی۔'' لفظوں کے برعکس ارجمند کے لہجے میں عاجزی تھی۔

''اچھا! تم میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو کہ نا! یہ تم نے کسی کتاب میں پڑھا، نہ کسی نے تمہیں بتایا۔''

''یہ تو میں نہیں کر سکتی آغا جی!'' ارجمند کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

''کیوں نہیں کر سکتیں؟ میں تمہارا اُستاد ہوں اور تمہیں حکم دے رہا ہوں۔''

ارجمند نے بڑی مشکل سے صرف ایک لمحے کے لئے اسے دیکھا، مگر فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں آغا جی!''

''تم یہ بات میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو۔''

''یہ میں نہیں کر سکتی آغا جی!''

''کیوں؟''

''اللہ نے منع کیا ہے نا! اس لئے......''

عبدالحق کے چہرے پر پھر حیرت اُبھری۔ مگر وہ فوراً ہی مسکرا دیا۔

''چلو ٹھیک ہے! میں مان لیتا ہوں۔ لیکن مجھے یقین نہیں ہے۔''

''میں جھوٹ نہیں بولتی آغا جی!''

اور نور بانو خاموشی سے، دبے پاؤں کمرے سے نکل آئی۔

ناشتہ کرتے ہوئے وہ اس بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بھی حیرت تھی، لیکن عبدالحق کی حیرت سے مختلف۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ عبدالحق نے کیا پوچھا تھا

اور ارجمند نے کیا جواب دیا تھا۔ اسے حیرت اس بات پر تھی کہ ارجمند نے وہ جواب کیوں نہیں دیا؟ جس کی اسے یقین کی حد تک اُمید تھی۔ ارجمند کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ یہ بات اسے اللہ میاں نے بتائی ہے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کہا۔ شاید یہ اس کے سمجھانے کا اثر ہے۔

دوسری بات اسے اور اچھی لگی تھی کہ ارجمند نے عبدالحق کو نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ اور کیسے اس نے کہا تھا کہ اللہ نے منع کیا ہے۔ اتنی چھوٹی لڑکی اور اتنی بڑی بات؟ یہ ایک غیر معمولی لڑکی ہے۔ اس نے سوچا۔ جھوٹ نہیں بولتی۔

مگر اس نے سوچا کہ اس پر وہ ارجمند سے بات کرے گی۔

سہ پہر کو وہ دونوں لان میں بڑے جھولے پر بیٹھی تھیں کہ نور بانو نے بات شروع کی۔

''ارجی! تم نظر اٹھا کر بات نہیں کرتی، کیوں؟''

''کرتی تو ہوں آپی!'' ارجمند نے معصومیت سے کہا اور نظریں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

''پتا نہیں کیوں؟ میرا یہ خیال تھا۔'' نور بانو بولی۔

''ہاں! عبدالق کے سامنے میں نے تمہیں کبھی نظر اٹھاتے نہیں دیکھا۔''

''وہ اور بات ہے آپی! اور صرف آغا جی سے ہی نہیں، میں تو غفور اور یعقوب سے بھی نظر نیچی کر کے ہی بات کرتی ہوں۔''

''اچھا! لیکن کیوں؟''

''اللہ کا حکم ہے نا آپی!''

نور بانو کو اس پر پیار آ گیا۔

''تم بہت اچھی ہو ارجی!''

''لیکن آپ سے اچھی نہیں ہوں آپی!'' ارجمند نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''اور شاید کبھی ہو بھی نہیں سکتی۔''

نور بانو اس کے لہجے کو سمجھ نہیں سکی۔ لیکن وہ شرمندہ ہوگئی۔ وہ کتنی اچھی تھی، یہ وہ خوب جانتی تھی۔

❁ ❁ ❁

اب ارجمند ہر نماز کے بعد عبدالحق کے لئے اولاد کی دُعا کرتی تھی۔ اور وہ بھی بیٹے کی۔ اور ہر روز وہ تنہائی میں اللہ میاں سے پوچھتی کہ انہوں نے آغا جی کو اب تک اولاد کیوں نہیں دی؟ لیکن اسے جواب نہیں ملتا تھا۔

وہ پہلا موقع تھا کہ اسے جواب نہیں مل رہا تھا۔ اللہ میاں جواب نہیں دے رہے تھے۔ پہلی بار اس نے سوچا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے۔ اسے اپنے اندر کسی کمی کا احساس ستانے لگا۔ اسے لگا، جیسے اس سے کوئی بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے، اور اس کے نتیجے میں اللہ میاں اس سے خفا ہوگئے ہیں۔

اسے بہت ڈر لگا۔ جب بھی وہ اس پر سوچتی، اندر باہر سے بری طرح کانپنے لگتی۔ اس نے اللہ میاں کو خفا کر دیا۔ اب وہ کیا کرے؟ انہیں کیسے منائے؟ اسے کسی کو منانا آتا ہی نہیں تھا۔ نہ کبھی کوئی اس سے روٹھا تھا، اور نہ ہی اسے کبھی کسی کو منانے کی ضرورت پڑی تھی۔

یہ اس کے لئے بہت بڑی خلش بن گئی۔ جب بھی اسے فرصت ہوتی، وہ بڑی اُمید سے اللہ سے وہی سوال کرتی کہ شاید اس بار اسے جواب مل جائے گا۔ اور جواب نہ ملتا تو وہ خوفزدہ اور اُداس ہو جاتی۔

وہ سوچتی، اللہ میاں تو ہر چیز کے مالک ہیں، سب کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ لیکن وہ ہر چیز سے خود بے نیاز ہیں۔ انہیں کسی سے کچھ نہیں چاہئے۔ تو پھر انہیں کیسے منایا جا سکتا ہے؟ کیسے خوش کیا جا سکتا ہے؟ یہ سوچتے سوچتے اس کی سمجھ میں یہ تو آ گیا کہ انسان روٹھ جائے تو اسے کیسے منایا جا سکتا ہے۔ انسانوں کی کچھ ضرورتیں ہوتی ہیں، کچھ طلب ہوتی ہے ان کو۔ پھر پسند ناپسند بھی ہوتی ہے ان کی۔ تو انہیں خوش کر کے منایا جا سکتا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے اسے خیال آیا کہ پسند ناپسند تو اللہ کی بھی ہے۔ بندوں کا قرآن پڑھنا، نماز

پڑھنا، جھوٹ نہ بولنا، برے کام نہ کرنا، اللہ کی بات ماننا۔

اس نے سوچا، وہ اللہ کو خوش کرنے کے لئے نفل پڑھے گی۔

وہ ہر روز عشاء کے بعد دو زائد نفل پڑھنے لگے۔ اللہ کو خوش کرنے کے لئے۔ لیکن بات نہیں بنی۔ اس نے نفل چار کر دیئے۔ بات پھر بھی نہیں بنی۔ اب اسے تشویش ہونے لگی۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے یوں ہی اسے خیال آیا کہ ممکن ہے، وہ غلط سمجھ رہی ہو، اور اللہ میاں اس سے خفا ہی نہیں ہوں۔

''اللہ میاں! آپ اب بھی میرے دل میں رہتے ہیں نا؟'' اس نے پوچھا۔

جواب ہاں میں ملا تو وہ خوش ہوگئی۔

''تو پھر میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے آپ؟''

''کون سی بات کا؟''

''یہی کہ آپ آغا جی کو اولاد کیوں نہیں دیتے؟''

''اس کا تم سے کوئی تعلق جو نہیں ہے۔''

ارجمند اُداس ہوگئی۔ سچ تو ہے، اس بات کا اس سے کیا تعلق؟ اس نے سوچا۔ مگر پھر میں دعا کیوں کرتی ہوں ان کے لئے؟ یہ تو دادی اماں نے کہا ہے نا! اس لئے۔

اور دادی اماں منع کر دیں تو......؟

وہ دیر تک اس پر سوچتی رہی، خود کو ٹٹولتی رہی۔ اسے جواب ملا تو حیرانی بھی ہوئی۔ اسے معلوم ہوگیا کہ اب دادی اماں بھی اسے منع کر دیں، تب بھی وہ یہ دعا کرتی رہے گی۔ اس لئے کہ اس میں آغا جی کی خوشی ہے۔

پھر ایک دن حمیدہ نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

''نکی! تو عبدالحق کے لئے بیٹے کی دعا کرتی ہے نا؟ بھول تو نہیں گئی؟''

''کیسے بھول سکتی ہوں دادی! ہر روز دعا کرتی ہوں۔''

''اور تو نے اللہ میاں سے پوچھا تھا......؟''

''جی دادی اماں! مگر انہوں نے جواب نہیں دیا۔''

''کیوں......؟''

''وہ کہتے ہیں، اس بات سے میرا تعلق نہیں ہے۔''

حمیدہ سوچ میں پڑ گئی۔

''یہ کہا انہوں نے؟''

''جی دادی اماں! لیکن میں دعا تو پھر بھی کرتی رہوں گی۔''

''تو بہت اچھی ہے نکی! پر ایک بات کہوں، تو ہر روز ان سے یہ بات پوچھا کر۔ کبھی نہ کبھی تو وہ جواب دیں گے ہی۔''

''لیکن دادی اماں! اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''فرق پڑتا ہے نکی! اگر کسی غلطی یا گناہ کی سزا ہے تو توبہ کرنے سے بات بن سکتی ہے۔''

ارجمند کو یہ نیا نکتہ معلوم ہوا۔

''سچ دادی اماں!''

''ہاں نکی! توبہ سچی ہو تو اللہ بڑے سے بڑا گناہ معاف کر دیتا ہے۔''

''توبہ کیسے کرتے ہیں دادی اماں!''

''گڑگڑا کر اللہ سے اپنے کئے پر معافی مانگتے ہیں، روتے ہیں، بخشش کی دُعا کرتے ہیں اور یہ اللہ کو بہت اچھا لگتا ہے۔''

''ٹھیک ہے دادی اماں! میں روز پوچھتی رہوں گی۔''

❁ ❁ ❁

ارجمند کے لئے زندگی معمولات میں ڈھل گئی تھی۔ کوٹھے پر تو وہ ایک ایک دن گنتی تھی، حالانکہ وہاں پر دن ایک سا ہوتا تھا۔ جبکہ یہاں تنوع تھا۔ سب سے بڑھ کر آزادی کا احساس۔ باغیچہ تو گھر میں ہی موجود تھا، جہاں جا کر آسمان کی بے کرانی کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن باہر بہت بڑی دنیا تھی۔ اور اب اسے احساس ہوتا تھا کہ اس میں اس کا بھی حصہ ہے۔ وہ اس کے لئے بھی ہے۔ کوٹھے پر تو اس کی پوری دنیا بس ایک کمرہ تھا۔

تو یہاں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ دن پھسلتے جاتے تھے اور پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ آغا جی کے امتحان بھی ہو گئے، نتیجہ بھی نکل آیا۔ بی۔ اے کی طرح انہوں نے اس امتحان میں بھی پہلی پوزیشن لی تھی۔

اس روز آغا جی بہت خوش تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے یہ خبر دادی اماں کو سنائی۔ وہ بھی وہاں موجود تھی۔

''اب اماں! ہمیں مٹھائی لے کر چچا جان کے ہاں چلنا چاہئے۔'' انہوں نے کہا۔

''ہاں! کیوں نہیں؟''

ارجمند کو مسعود صاحب اور ان کے گھر کے سب لوگ بہت اچھے لگتے تھے۔ دونوں گھروں کا ایک دوسرے کے ہاں جانا آنا لگا رہتا تھا۔ مسعود صاحب ارجمند سے بہت لاڈ کرتے تھے۔ وہ انہیں تایا کہا کرتی تھی۔ شاہانہ باجی سے تو اس کی بہت دوستی ہو گئی تھی۔ حالانکہ عمر میں وہ اس سے چار پانچ سال بڑی تھیں۔

وہ لوگ جانے کے لئے تیار ہو ہی رہے تھے کہ مسعود صاحب خود ہی پوری فیملی کے ساتھ آ گئے۔ وہ مٹھائی بھی لائے تھے۔ مٹھائی حمیدہ کی گود میں رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''مبارک ہو آپ کو، آپ کا بیٹا اوّل آیا ہے۔''

''شکریہ پتر! اس کی کامیابی میں تمہارا بھی بڑا ہاتھ ہے۔'' حمیدہ نے کہا۔

''ارے نہیں اماں! آپ کا بیٹا لائق بھی ہے اور محنتی بھی۔''

''مگر آپ ہمیشہ زیادتی کرتے ہیں ہمارے ساتھ۔'' عبدالحق نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''ہمیں آپ کے گھر آنا تھا مٹھائی لے کر۔ اب ہم نکلنے ہی والے تھے کہ آپ خود آ گئے۔''

مسعود صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، جیسے ناراض ہو گئے ہوں۔

’’تمہیں ہمارا آنا اچھا نہیں لگا تو ہم واپس چلے جاتے ہیں۔‘‘

’’ارے نہیں بیٹا! کیوں ناراض ہوتے ہو؟ جم جم آؤ! سر آنکھوں پر۔‘‘ حمیدہ جلدی سے بولی۔

’’پر پتر! عبدالحق بھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ چھوٹا ہے۔‘‘

’’تو میں بڑا ہوا نا! اور مٹھائی تو مٹھائی ہے، وہ بھی خوشی کی۔ میں لے آیا تو کیا حرج ہے؟‘‘ مسعود صاحب نے کہا۔

’’بلکہ سچ پوچھیں تو یہ میرا فرض ہے۔ عبدالحق کو سرکاری نوکری کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے تو مجھ پر احسان کیا ہے، میری بات مان کر۔‘‘

’’اب آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔‘‘ عبدالحق نے کہا۔

’’سچی بات کہہ رہا ہوں۔‘‘

’’آپ پر احسان کیسا؟ میں اگر ملک و قوم کے کسی کام آسکوں تو انکار کروں گا کیا؟‘‘

’’اچھا! اب باتیں چھوڑو۔ پہلے منہ میٹھا کر لو۔‘‘ مسعود صاحب نے اپنے ہاتھ سے پہلے حمیدہ کو اور پھر عبدالحق کو مٹھائی کھلائی۔

’’خوش رہو پتر!‘‘ حمیدہ نے انہیں دعا دی۔

’’میں تو سچ مچ بہت خوش ہوں اماں!‘‘ مسعود صاحب بولے۔

’’یہ بتاؤ! اب کیا ہوگا؟‘‘ حمیدہ نے پوچھا۔

’’اب کچھ دن بعد شہزادے کی پوسٹنگ ہو جائے گی۔‘‘ مسعود صاحب نے عبدالحق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جو مسکرا رہا تھا۔

’’اور اس کے بعد میری طرح کام شروع۔‘‘

’’پھر یہ ہر روز کام پر جایا کرے گا؟‘‘ حمیدہ کے لہجے میں استعجاب تھا، جیسے یہ کوئی آن ہونی ہو۔

’’ہاں اماں! پھر یہ آزاد نہیں رہے گا۔‘‘ مسعود صاحب نے کہا۔

’’بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی تبادلہ ہو جائے تو کسی دوسرے شہر میں جا کر رہنا پڑے۔‘‘

اس پر حمیدہ بری طرح چونکی، جبکہ نور بانو کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

’’یہ...... یہ تو غلط ہوگا۔ کیا سامان سر پر اُٹھائے پھریں گے ہم؟‘‘ حمیدہ نے کہا۔

’’اب یہ تو نوکری ہے اماں! چاہے نام افسری کا ہو۔‘‘ مسعود صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔

’’اور آپ کو فکر کی کیا ضرورت ہے؟‘‘

’’دیکھو! اب میری نکی کا اسکول میں داخلہ ہوگا۔‘‘ حمیدہ نے ارجمند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’تو کیا اس کے ساتھ یہاں سے وہاں پھرتے رہیں گے۔ تعلیم کیسے مکمل ہوگی اس کی۔ ہر بار نیا سکول......‘‘

’’تو اماں! آپ کو کیا ضرورت ہے اس کے ساتھ مارے مارے پھرنے کی؟ آپ کا گھر تو موجود ہے نا! آپ شہزادی کے ساتھ یہیں رہیں، اور اسے پھرنے دیں۔ آپ کا خیال رکھنے کے لئے ہم سب ہیں نا!‘‘

’’اس کے بغیر کیا اچھا لگے گا۔ خیر......!‘‘ حمیدہ نے سرد آہ بھری۔

’’کیوں اماں! تمہیں گاؤں چھوڑ کر دہلی بھی تو جانا تھا۔ تب تو ایسا نہیں کہا کبھی تم نے؟‘‘ عبدالحق نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔

’’تب کی بات اور تھی۔‘‘

’’اور ابھی کچھ عرصہ پہلے جو میں لاہور آیا تھا تمہیں چھوڑ کر۔‘‘

’’کہا نا، تب کی بات اور تھی۔ پر اب میں بوڑھی ہوگئی ہوں۔‘‘

’’ہم لوگ وقت سے پہلے ہنگامہ کر رہے ہیں۔‘‘ مسعود صاحب نے مداخلت کی۔

’’فی الحال تو ایسا کچھ نہیں، میں تو اسے اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کروں گا۔ بعد میں جو ہو سو ہو۔‘‘

لیکن حمیدہ کا ملال کم ہونے والا نہیں تھا۔

’’میں تو شروع ہی سے اس نوکری کے خلاف تھی۔‘‘

مسعود صاحب منہ سے نکلنے والی بات پر پچھتانے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔ انہوں نے مثبت پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی۔

''اب اماں، اسکول میں داخلہ آسانی سے نہیں ہوتا۔ اب یہ شہزادہ افسر بن جائے گا تو شہزادی کا داخلہ یہی کرائے گا نا! فائدے بھی تو ہیں نا نوکری کے اماں!''

ارجمند کو مسعود صاحب کی یہ بات بہت اچھی لگتی تھی کہ وہ آغا جی کو شہزادہ اور اسے شہزادی کہتے تھے۔

''ارے! داخلہ تو تم بھی کرا دیتے نا!'' حمیدہ کے لہجے میں اب بھی ملال تھا۔

''اور بھی فائدے ہیں اماں! گاؤں کے دسیوں کام کرا دے گا آپ کا بیٹا!'' مسعود صاحب بھی ہار ماننے والے نہیں تھے۔

''اور گاؤں کیسا؟ اب تو حق نگر اچھا خاصا شہر بن گیا ہے۔''

''ہاں! میرے پتر کے خلوص کی برکت ہے۔'' حمیدہ سب کچھ بھول کر فخریہ لہجے میں بولی۔

''ریت میں سے نکالی ہے اس نے وہ بستی، سچا تھا، سو اللہ نے ہاتھ تھام لیا اس کا۔''

مسعود صاحب نے سکون کا سانس لیا کہ حمیدہ کا دھیان کچھ بٹا۔ انہوں نے حمیدہ کے پیچھے کھڑی ارجمند سے کہا۔

''ارے! وہاں کہاں چھپی ہوئی ہے شہزادی! ادھر آ، تجھے مٹھائی کھلاؤں۔''

ارجمند ان کے پاس چلی آئی۔ وہ مٹھائی اسے بہت اچھی لگی۔ آغا جی کی کامیابی کی جو تھی۔

✿ ✿ ✿

کسی بھی فرد کی زندگی میں آنے والی بڑی تبدیلی اس کے پورے گھر پر اثر انداز ہوتی ہے۔ گھر کے ہر فرد پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور ابتداء میں وہ سبھی

کے لئے بہت بڑی تبدیلی ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بہت بڑا، ناقابل تلافی کوئی فرق پڑ گیا ہے۔ مگر یہ زندگی کا نظام ہے اور آدمی کی فطرت کہ غیر محسوس طور پر وہ خود بخود اس سے ہم آہنگ ہونے لگتا ہے۔ زندگی اس تبدیلی کے ساتھ مطابقت پیدا کر لیتی ہے۔

عبدالحق نے ملازمت جوائن کر لی تھی۔ اس کی پوسٹنگ مسعود صاحب کے ساتھ ہی ہوگئی تھی۔

ابتداء میں وہ حیران تھا۔ وقت کی پابندی تو اس کے لئے مسئلہ نہیں تھی۔ بس ایسا لگتا تھا، جیسے کالج کا زمانہ، یونیورسٹی کا زمانہ لوٹ آیا ہے۔ لیکن اس سے آگے وہ بہت بڑی تبدیلی تھی۔ اس سے پہلے وہ آزاد تھا۔ لیکن اب اس پر ذمہ داریاں تھیں۔ کچھ لوگ اسے جواب دہ تھے، اور وہ بھی کچھ لوگوں کو جواب دہ تھا۔ اسے احساس تھا کہ اگر اسے مسعود صاحب کے ماتحتی کی نعمت حاصل نہ ہوتی تو یہ تبدیلی اس سے بھی بڑی لگتی۔ بلکہ اس صورت میں اس سے مطابقت آسان نہ ہوتی۔ جبکہ ان کے ہوتے ہوئے بھی مطابقت کا عمل آسان ثابت نہیں ہو رہا تھا۔

بہرحال اسے عارف کی بات یاد تھی کہ مسعود صاحب اس کے استاد ہیں۔ پہلے ہی دن اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ کیسے استاد ہیں۔ بلکہ اس کی سمجھ میں یہ بھی آگیا کہ عارف کس پائے کا افسر ہوگا۔ اب اس کی سمجھ میں یہ بھی آگیا کہ عارف مسعود صاحب سے ملے بغیر کیوں چلا گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگلی بار ان شاءاللہ وہ اس کے ساتھ ہی مسعود صاحب سے ملے گا۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ پرانا ہونہار شاگرد اپنے استاد اور محسن کا سامنا کرنے سے کیوں کترا رہا تھا۔

مسعود صاحب بہت اصول پرست افسر تھے، اور وہ بہت سخت استاد تھے۔ یہ بات پہلے دن ہی ثابت ہوگئی۔ اس نے جو اسٹلنگ رپورٹ دی، اس کے جواب میں مسعود صاحب نے اسے بلوا لیا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس نے لپک کر کہا۔

''السلام علیکم چچا جان!''

جواب میں مسعود صاحب نے بے حد خشک لہجے میں کہا۔

''تو آپ ہیں مسٹر عبدالحق! تشریف رکھیے پلیز!''

عبدالحق کے لئے تو وہ لمحہ شاک کا تھا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے مسعود صاحب کے چہرے کو دیکھا، مگر وہاں اجنبیت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

''سول سروس میں خوش آمدید مسٹر عبدالحق!'' مسعود صاحب نے کہا۔

''آپ یہاں سیکشن آفیسر کی حیثیت سے آئے ہیں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ پہلے میرے اسپیشل اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کریں۔ میں جس حد تک آپ کی راہنمائی کر سکا، ضرور کروں گا۔ تاکہ آپ اس ملک کے لئے ایک قیمتی اثاثہ بن سکیں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔''

''نو.....نو سر.....!'' عبدالحق نے جلدی سے کہا۔

''یہ تو میرے لئے سعادت ہوگی سر!''

''گڈ! تو پہلی بات آپ نے سمجھ لی ہوگی۔ آفس میں ڈسپلن کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے افسر کا رشتہ اور تعلق صرف اپنے کام سے ہوتا ہے۔ قوم کا مفاد ذاتی تعلقات اور رشتوں سے بالاتر ہوتا ہے۔''

عبدالحق کے دل میں ایک موج سی اٹھی۔ وہ مسعود صاحب کو بہت اچھا انسان سمجھتا تھا۔ لیکن آج پہلی بار ان کی بلندی اس کی سمجھ میں آئی تھی۔

''جی سر! یہ بات تو میں بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔''

''گڈ! تو برابر والا کمرہ آپ کا ہے۔ آپ کو اپنی میز پر کچھ فائلیں رکھی ملیں گی۔ آپ جا کر ان کا جائزہ لیں۔ سرسری طور پر۔ میں آدھے گھنٹے کے بعد انٹرکام پر آپ سے رابطہ کروں گا۔''

''رائٹ سر! تھینک یو سر!'' عبدالحق نے کہا، اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کا کمرہ نسبتاً چھوٹا تھا۔ بیرونی حصے میں ایک اسٹول پر باوردی چپڑاسی اور ایک میز پر ٹائپسٹ بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے سلام کیا۔ وہ جواب دیتا ہوا اندرونی کمرے میں چلا گیا۔

کمرے میں ایک خاصی بڑی میز تھی۔ ایک بڑی کرسی اور سامنے ملاقاتیوں کے لئے تین عام کرسیاں۔ اس کی کرسی کے عقب میں دیوار پر قائد اعظم محمد علی جناح کا ایک پورٹریٹ آویزاں تھا۔ پہلو کی ایک دیوار کے ساتھ دو فائلنگ کیبنٹ تھے۔

وہ گھوم کر کرسی کی طرف گیا اور کرسی پر بیٹھ کر میز کا جائزہ لیا۔ سامنے ہی چند فائلیں رکھی تھیں۔ ان کے آگے ایک قلم دان تھا۔ اس میں دو قلم رکھے تھے۔ قلم دان کے کناروں پر موجود دو چھوٹے پیالی نما گڑھوں میں روشنائی موجود تھی۔ میز پر داہنی جانب ایک گھنٹی رکھی تھی۔

عبدالحق نے محسوس کیا کہ وہ نروس ہو رہا ہے۔ کیا وہ اس مقام، اس منصب کا اہل ہے؟ اس کا سچا جواب..... فی الحال نہیں..... تھا۔ لیکن کیا وہ آگے اس کا اہل ثابت ہو سکے گا؟ اس کا جواب تو آنے والا وقت ہی دے سکتا ہے۔

اسے پہلے ان فائلوں کا سرسری جائزہ لینا تھا۔

اس نے فائلوں کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا اور باہر کے کمرے میں بیٹھے ہوئے دونوں افراد کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ دونوں اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

''سر! میں آپ کا اسسٹنٹ ہوں، ایل ڈی سی ذوالفقار'' ٹائپسٹ نے کہا۔

''تشریف رکھیے۔'' عبدالحق نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔

ذوالفقار کے چہرے پر بے یقینی اور گھبراہٹ نظر آئی۔ چند لمحے وہ ہچکچاتا رہا۔ پھر بیٹھ گیا۔

عبدالحق نے باوردی چپڑاسی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں سر! آپ کا چپڑاسی شمریز خان۔''

''آپ بھی بیٹھیے۔''

لیکن چپڑاسی میں اتنی جرأت نہیں تھی۔

''میں ٹھیک ہوں سر!'' اس نے جسم کا بوجھ ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا! میں تو سمجھا تھا کہ آپ کا فرض میرا حکم ماننا ہے۔'' عبدالحق کے لہجے میں مصنوعی حیرت تھی۔

شمریز خان کے چہرے پر زلزلے کا سا تاثر ابھرا۔

''سوری سر!'' اس نے گھبرا کر کہا اور جلدی سے بیٹھ گیا۔

عبدالحق خود بھی مخمصے میں تھا۔ اس کے استاد مسعود احمد صاحب نے اسے پہلا سبق ڈسپلن کا سکھایا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس نے پہلے ہی لمحے میں اپنے دفتر میں خراب ڈسپلن کی بنیاد ڈال دی ہے۔

لیکن وہ کیا کرتا؟ یہ خوش اخلاقی اس کا مزاج تھا، اس کی فطرت تھی۔

اگلے ہی لمحے وہ مطمئن ہوگیا۔ اپنے مزاج کے خلاف جائے بغیر اسے ڈسپلن قائم رکھنا تھا۔ یہ توازن قائم کرنا مشکل سہی، ناممکن نہیں۔

''دیکھو بھئی! ہمارے عہدے الگ الگ ہیں، لیکن مقصد ایک ہی ہے۔ اپنی اپنی حیثیت میں ہم کو ملک و قوم کی، عوام کی خدمت کرنی ہے۔ لیکن عزت تو ہم تینوں کی ہی ہے نا! میں چاہتا ہوں کہ آپ دونوں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں۔ ہمیں عزت کام سے ملے گی، عہدے یا خوشامد سے نہیں۔''

''جی سر! ہم سمجھ گئے۔'' ذوالفقار نے کہا۔

''ہم عزت افزائی پر آپ کے شکر گزار ہیں۔''

''بس! اب آپ جائیں۔ مجھے کچھ کام دیکھنا ہے۔''

وہ دونوں اٹھے اور دروازے کی طرف بڑھے۔ پھر شمریز خان جاتے جاتے پلٹا۔

''میں یہ پوچھنے آیا تھا سر! کہ آپ چائے پئیں گے؟''

''فی الحال تو ضرورت نہیں۔''

''کوئی بھی کام ہو سر! تو مجھے بلانے کے لئے گھنٹی بجا دیں۔'' شمریز خان نے گھنٹی کی طرف اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے شمریز خان!''

ان کے جانے کے بعد عبدالحق نے فائلیں اپنی طرف سرکائیں اور اُوپر والی فائل کا جائزہ لیا۔

چند ہی لمحوں میں اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے؟ کتنا اہم مقام ہے یہ، یہ اکنامک پلاننگ ڈویژن کا دفتر تھا۔ یہاں اس نوزائیدہ مسلم ملک کے مستقبل کی بہتری کے لئے منصوبے سوچے جاتے تھے اور پھر انہیں قابل عمل بنانے کے بارے میں غور کیا جاتا تھا۔ یہ ملک اور قوم کی ترقی کے لئے کام کرنے والا تھنک ٹینک تھا، اور مسعود صاحب اس کے سربراہ تھے ... ڈائریکٹر جنرل۔

مسعود صاحب کی عظمت اس پر اور عیاں ہوگئی۔ وہ ملک اور قوم سے محبت کے معاملے میں کتنے سچے اور مخلص تھے، انہوں نے اسے قائل کیا، اس راستے پر لائے اور کہا کہ یہ اس کا ان پر احسان ہے۔ حالانکہ احسان تو ان کا تھا کہ انہوں نے اس بیکار کو کارآمد بنایا تھا۔

پانچوں فائلوں کا جائزہ لیتے لیتے وہ خواب دیکھنے لگا۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا کہ وہ اس مشین کا ایک پرزہ تھا، معمولی سا ہی، جو اس ملک کو ترقی اور خوشحالی کی طرف لے جانے کے لئے کام کر رہی تھی۔

انٹرکام کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

''جی سر!''

''وہ فائلیں دیکھ لیں تم نے؟'' دوسری طرف سے مسعود صاحب نے پوچھا۔

''جی سر!''

''تمہیں ان میں سے کسی ایک کو ترجیحی بنیاد پر کام کرنے کے لئے منتخب کرنا ہے۔''

''یہ تو سبھی اہم ہیں جناب!''

''مگر سب پر بیک وقت تو کام کیا جا سکتا۔ ارتکاز کی بہت اہمیت

ہے۔"

"تو ٹھیک ہے سر! میں وِنج کمیشن ایوارڈ کو ترجیح دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ اب اس کی فائل کو بہت باریک بینی سے اسٹڈی کرو۔ پھر ہم اس پر ڈسکس کریں گے۔ اور ہاں! انٹرکام پر وَن دبا کر تم مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔ کسی مدد یا مشورے کی ضرورت ہو تو ہچکچانا نہیں۔"

"تھینک یو سر!"

اس نے ریسیور رکھا اور فائل کی طرف متوجہ ہوگیا۔

دو تین گھنٹے میں فائل کا سسٹم اس کی سمجھ میں آ گیا۔ دائیں جانب مجوزہ دستاویزات تھیں اور بائیں جانب ان کے متعلق ہونے والی نوٹنگ اور ڈرامنٹنگ۔ اس میں خوب صورتی یہ تھی کہ ہر بات تحریری طور پر سامنے آجاتی تھی۔ زبانی کچھ بھی نہیں تھا۔

ایک بجے انٹرکام کا بزر پھر چیخا۔ اس نے ریسیور اُٹھایا۔

"یس سر!"

"ایک بجے سے دو بجے تک یہاں لنچ ہوتا ہے۔" دوسری طرف سے مسعود صاحب نے اسے مطلع کیا۔

اس نے حیرت سے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیا۔ ایک بج چکا تھا۔ وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا اور اس نے تو چائے بھی نہیں پی۔

"ہیلو!" مسعود صاحب نے اسے پکارا۔

"یس سر!"

"میرے کمرے میں آجاؤ!" یہ کہہ کر مسعود صاحب نے رابطہ منقطع کر دیا۔

❁ ❁ ❁

بیرونی کمرے میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ عبدالحق چند لمحے ہچکچایا، پھر اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

"آجاؤ بھئی! اب تکلف کیسا؟" اندر سے مسعود صاحب نے بے

تکلفانہ لہجے میں پکارا۔

وہ حیرت زدہ سا، دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ مسعود صاحب ٹفن کھول رہے ۔تھے۔ میز پر پانی کی ایک بڑی بوتل اور دو خالی گلاس رکھے تھے۔

وہ ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"یس سر!"

"پاگل ہوگئے میاں! بیٹھ جاؤ سکون سے۔" مسعود صاحب نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

"اور تم نے مجھے چچا جان کیوں نہیں کہا؟"

وہ ایک ہی دن میں، ایک ہی مقام پر عبدالحق کے لئے دوسرا شاک تھا۔

"وہ سر.....! آفس ڈسپلن.....؟"

"ارے میاں! یہ لنچ بریک ہے۔ یہ ہمارا اپنا وقت ہے۔ اس وقت نہ میں افسر ہوں اور نہ تم میرے ماتحت۔ اس وقت تو میں اپنے چپڑاسی کے ساتھ بھی ہنسی مذاق کر لیتا ہوں۔"

"جی سر! میرا مطلب ہے، چچا جان!" عبدالحق بری طرح گڑبڑا گیا۔

مسعود صاحب نے ٹفن کھول کر سامنے رکھے۔ ایک میں سالن تھا، دوسرے میں کباب اور تیسرے اور چوتھے میں پراٹھے۔ انہوں نے سر اٹھا کر عبدالحق کو دیکھا، جو اب بھی کھڑا تھا۔

"ارے میاں! تم تو ابھی تک کھڑے ہو، بیٹھو نا!"

عبدالحق بیٹھ گیا۔ وہ ابھی تک سنبھلا نہیں تھا۔

"کنفیوز ہو؟ چند روز میں عادی ہو جاؤ گے۔ ایک اچھے افسر کے لئے وقت اور مقام کا شعور بہت ضروری ہے۔ جو وقت اپنا ہے، اس میں میں مسعود احمد ہوں۔ جو وقت سرکار کا ہے، اس میں میں ڈائریکٹر جنرل ہوں۔ اس میں مجھے یہ خیال رکھنا ہے کہ کس ماتحت سے کیا کام لینا ہے، اور کس طرح لینا ہے، اور جنہیں میں جواب دہ ہوں، ان کا سامنا کس انداز میں کرنا ہے۔ یہی ایک

اچھے افسر کی خوبی ہے۔"

عبدالحق کا ذہن جیسے روشن ہو گیا۔

"آپ نے مجھے بہت اچھی طرح سمجھا دیا چچا جان! لیکن یہ سب کچھ اختیار کرنے میں مجھے چند روز لگیں گے۔ پہلی بار تو میں نے یہ بات سمجھی ہے کہ آدمی کو ایک ہی دن میں کئی کردار ادا کرنے ہوتے ہیں۔"

"حالانکہ یہ بات تم پہلے سے جانتے ہو، ہر شخص جانتا ہے۔"

"نہیں چچا جان! مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔"

"معلوم تھا بیٹے! اور تم اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ لیکن پابند نہیں تھے۔ اس لئے پتا نہیں چلتا تھا۔" مسعود صاحب نے کہا۔

"دیکھو نا! تم اماں سے جس طرح بات کرتے ہو، نور بانو سے ویسے نہیں کرتے اور جیسے نور بانو سے کرتے ہو، ویسے شہزادی سے نہیں کرتے۔"

ارجمند کے حوالے پر عبدالحق کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ وجہ البتہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس وقت غور کرنے کا موقع بھی نہیں تھا۔

اس کی کیفیت سے بے خبر مسعود صاحب نے اپنی بات جاری رکھی۔

"اور جیسے تم شہزادی سے بات کرتے ہو، ویسے اپنی ملازمہ نسیمہ سے نہیں کرتے۔"

"نہیں چچا جان! میں تو نسیمہ سے بھی بڑی شفقت اور عزت سے بات کرتا ہوں۔"

"تو تم نے مان لیا نا کہ اپنے کئی رول سے تم آگاہ تھے۔" مسعود صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا! اب کھانا شروع کرو۔ وقت تیزی سے گزر جاتا ہے۔ پتا بھی نہیں چلتا۔ سرکاری وقت شروع ہوگا تو میں تم سے ہاتھ کا لقمہ بھی رکھوا لوں گا۔"

عبدالحق کو بھی ہنسی آ گئی۔ دونوں کھانا کھانے لگے۔

"تم نے کہا کہ تم نسیمہ سے بھی بہت اچھی طرح بات کرتے ہو۔ اس میں کوئی برائی نہیں۔ البتہ توازن اور اعتدال ضروری ہے۔ وہ قائم نہیں رکھو گے تو

خود بھی نقصان میں رہو گے اور دوسرے بھی۔"

"لیکن چچا جان! ملازم بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔"

"میں نے کب کہا کہ نہیں ہوتے؟ لیکن بیٹے! یہ مناصب اور درجات اللہ کی طرف سے ہیں۔ ان کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ میں ڈی جی اس لئے ہوں کہ یہ اللہ کی مرضی تھی۔ تمہیں اللہ نے مجھ سے زیادہ دولت عطا فرمائی، لیکن تم میرے ماتحت ہو، اس لئے کہ اللہ کی یہی مرضی ہے۔ جو کچھ ہم زندگی میں بغیر سوچے سمجھے کرتے ہیں، اس لئے ہم سے کوتاہیاں بھی ہوتی ہیں۔ سول سروس ہمیں وہی سب کچھ ڈسپلن کے ساتھ کرنا سکھاتی ہے۔ میں اپنے چپڑاسی سے نرمی اور شفقت سے پیش آتا ہوں۔ لیکن اسے بے تکلف نہیں کرتا۔ کروں گا تو کسی دن وہ کہہ دے گا کہ سر اس وقت تو میرا کام کا موڈ نہیں ہے۔ اس میں اس کا بھی نقصان ہوگا، میرا بھی اور سرکار کا بھی۔"

"آپ نے تو ایک ہی دن میں مجھے بہت کچھ سکھا دیا۔"

"نہیں! میں نے تو تمہیں بس بنیادی باتوں سے متعارف کرایا ہے۔ باقی تو وقت خود ہی تمہیں سکھا دے گا۔ ہاں! یہ جو تعارف میں کرا رہا ہوں، اس کی وجہ سے تمہیں سیکھنے میں نسبتاً آسانی ہوگی۔"

"جی! میں سمجھ رہا ہوں۔"

کھانے سے فارغ ہو کر مسعود صاحب نے ٹفن باکس کو بند کیا اور اُٹھے۔

"اب وضو کر لیں نماز کے لئے۔"

"نماز کہاں پڑھیں گے؟"

"یہیں دفتر میں۔ وہ رکھی ہے میری جاء نماز۔" مسعود صاحب نے فائلنگ کیبنٹ کے ٹاپ کی طرف اشارہ کیا۔

عبدالحق کو افسوس ہونے لگا کہ اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا؟

"تمہارے لئے میں آج ہی نئی جاء نماز لایا ہوں۔ وہیں رکھی ہے، لے لو! اپنے دفتر میں نماز پڑھو گے تو تمہارے اسٹاف کے لئے تبلیغ بھی ہوگی۔ آفس

میں بھی خیر و برکت ہو گی۔''

عبدالحق اُٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے عرصے میں اسے کبھی یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ مسعود صاحب نمازی ہیں۔

''یہاں چھٹی پانچ بجے ہوتی ہے۔ موسم گرما میں میں عصر پڑھ کر گھر جاتا ہوں۔ سردیوں میں گھر جا کر پڑھ لیتا ہوں۔''

''لیکن چچا جان! جماعت.....''

''مسجد یہاں سے خاصی دور ہے۔ آنے جانے میں ہی ایک گھنٹہ لگ جائے اور سرکاری وقت میں مستعار لینا نہیں چاہتا۔''

عبدالحق نے اپنی جاء نماز اُٹھائی اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

وہ دن ہی شاید ایسا تھا۔ اس سے پہلے اس نے ایک ایسا دن گزارا تھا..... دہلی میں، جب مجذوب نے قبولِ اسلام کے بعد اسے ایک دن میں بہت کچھ سکھایا تھا۔ اس کے بعد یہ دن تھا کہ جس میں اس نے اتنا کچھ سیکھ لیا تھا۔

اور دن ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

شام کو یعقوب حسب ہدایت اسے لینے کے لئے آیا۔ لیکن مسعود صاحب کے کہنے پر عبدالحق نے اسے واپس بھیج دیا۔

''تم میرے ساتھ چلنا، میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔'' انہوں نے کہا تھا۔

جب وہ نکلے تو ان کا رخ گھر کی طرف نہیں تھا۔

''کہاں کا ارادہ ہے چچا جان!'' عبدالحق نے پوچھا۔

''کچھ دیر لارنس گارڈن میں گزاریں گے۔''

عبدالحق سمجھ گیا کہ وہ اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

ڈرائیور گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ وہ دونوں باغ میں چلے گئے۔ بیٹھنے کے لئے مسعود صاحب نے قریب ترین بینچ کا انتخاب کیا۔ اس سے عبدالحق کے اندازے کی تائید ہوتی تھی۔ مقصد چہل قدمی نہیں، اسے کچھ سمجھانا تھا۔

اور مسعود صاحب نے بغیر کسی تمہید کے بات شروع کر دی۔

''دیکھو بیٹے! یہ سول سروس ایماندار اور مخلص لوگوں کے لئے کانٹوں کا بستر ہے اور بدعنوان لوگوں کے لئے پھولوں کی سیج۔ میں تمہیں یہاں لایا ہوں، اس لئے تمہیں سمجھانا بھی میری ذمہ داری ہے۔''

''جی چچا جان!''

''جو کچھ میں نے سیکھا اور سمجھا، وہ تمہیں منتقل کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی.....!''

''میرے پاس تمہارے جتنی دولت تو نہیں، لیکن الحمدللہ! مجھے بھی اس ملازمت کی ضرورت نہیں تھی۔'' مسعود صاحب نے کہا۔

''ابا جان اس پر مجھ سے بہت خفا ہوئے تھے۔ اس وقت یہ ہندوستان تھا۔ پاکستان بننے کے آثار کم از کم واضح ہرگز نہیں تھے۔ لیکن اللہ میری راہنمائی کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پاکستان بنے گا۔ اور میاں جانتا تھا کہ اس نئے ملک کو، جس میں افراتفری اور بدنظمی ہو گی، ایک منظم انتظامیہ کی اشد ضرورت ہو گی، جو تجربہ کار، ایماندار، مخلص افسروں پر مشتمل ہو۔ یہ سوچ کر ہم چند دوست اس طرف آئے۔ حالانکہ مسلمان ملازمت کو برا سمجھتے تھے۔ بلکہ وہ تو انگریزی تعلیم کے بھی خلاف تھے۔ آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ قدرت کی راہنمائی کبھی غلط نہیں ہوتی۔

''میں نے انگریزوں کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ وہ اپنے ملک کو اور طرح سے چلاتے ہیں اور اپنی نوآبادی کو اور طرح۔ ہمارے ہاں انہوں نے دانستہ کرپشن کو فروغ دیا۔ یہاں انہوں نے بیوروکریسی کو افسر شاہی بنا ڈالا۔ کچھ تو ان کی ضرورت تھی کہ وہ ہزاروں افسروں کے ذریعے کروڑوں کی آبادی پر حکومت کرنا چاہتے تھے۔ یہ شارٹ کٹ تھا ان کے لئے۔ مگر مجھے شک ہے کہ ان کا دوسرا مقصد بھی تھا۔ انہیں یقین تھا کہ جلد یا بہ دیر دیگر نوآبادیوں کی طرح انہیں یہ ملک بھی چھوڑنا ہوگا۔ وہ یہاں فساد چھوڑنا چاہتے تھے۔ یہاں ایک بنائے فساد تو پہلے سے تھی، وہ یہ کہ یہاں ہندو بھی تھے، مسلمان اور سکھ بھی۔ نفاق کی صورت پہلے ہی سے موجود تھی۔ دوسرا فساد انہوں نے اس کمزور اور کرپٹ بیورو

کرسی کی شکل میں چھوڑا، جس کے نزدیک اس سرزمین پر دو قانون مروّج تھے۔ ایک آقاؤں کے لئے اور دوسرا غلاموں کے لئے۔ اور انہیں انگریزوں نے عہدوں کی طاقت سے فائدہ اٹھانا بھی سکھا دیا۔ نذرانوں کی رشوت، خوشامد، موقع پرستی، مکاری اور سیاسی جوڑ توڑ۔ میں انگلستان میں رہ کر دیکھ چکا ہوں۔ وہاں یہ سب نہیں تھا، جو یہاں ہے۔ اور یہ انہوں نے دانستہ کیا۔

''خیر یہ تو بڑی لمبی کہانی ہے۔ مجھے تم کو کچھ سمجھانا تھا۔ تم صاحب ثروت آدمی ہو۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے تمہارے پاس۔ تمہارے لئے ابتداء ہی سے اس کا اظہار مزدوری ہے۔''

''میں سمجھا نہیں چچا جان!''

''دیکھو، میں اور الحمدللہ میرے اہل خانہ بھی سادگی پسند ہیں۔ گاڑی رکھنا ہماری ضرورت نہیں۔ لیکن پھر بھی میں نے خریدی اور ڈرائیور بھی رکھا۔ صرف اس لئے کہ کبھی خاندانی عزت پر حرف نہ آئے۔ جواز کے ساتھ کرپشن کا الزام نہ لگے مجھ پر۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھا۔''

مسعود صاحب نے گہری سانس لی۔

''یہاں جو لوگ معاشی طور پر کمزور ہوتے ہیں، وہ اپنے اور اپنی نسلوں کے مستقبل کو روشن بنانے کے لئے سول سروس کا رخ کرتے ہیں۔ یہاں عہدہ اور اختیارات ملتے ہیں۔ پھر انہیں کیش کرایا جاتا ہے۔ غلط اور ناجائز کام کئے جاتے ہیں۔ درست اور جائز کاموں میں رکاوٹ ڈالی جاتی ہے۔ دو وجوہات کے تحت۔ ایک اپنے سے بڑے افسروں کو خوش کرنے اور ان کی خوشامد کے لئے۔ دوسرے عام لوگوں سے مالی منفعت حاصل کرنے کے لئے۔ انہیں ملک و قوم کی بہتری سے کوئی غرض نہیں۔ صرف چند برس کی ملازمت میں وہ معاشی طور پر مجھ جیسے لوگوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ گاڑیاں، بنگلے، دولت کی ریل پیل۔

''تو یہ بہتی گنگا ہے، جس میں جسے موقع ملتا ہے، ہاتھ دھونے کے لئے ہی نہیں، نہانے کے لئے چلا آتا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں بدنامی بڑھتی جا

رہی ہے۔ میں تمہیں یہاں لایا ہوں .... خلوص اور دردمندی کے ساتھ۔ تم میری ذمہ داری میں نہیں چاہتا کہ دس سال بعد کوئی منہ کھول کر کہے کہ عبدالحق صاحب نے سول سروس میں جتنا مال بنایا ہے، کسی نے نہیں بنایا۔ اس لئے کہ پوری دُنیا اس پر یقین کر لے گی۔''

''اس سے کوئی فرق پڑتا ہے۔'' عبدالحق نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں پڑتا ہے۔ آدمی اپنے خلوص، اپنی سچائی اور خدمت کرنے کے جذبے سے بے زار ہو جاتا ہے۔''

''تو پھر....؟''

''ابتدا ہی سے اپنی ثروت کا اظہار کرو۔ یہ تاثر اچھی طرح لوگوں پر قائم کر دو کہ تم کو اللہ نے سب کچھ دیا ہے۔ تم یہاں سے کچھ لینے کے لئے نہیں، بلکہ بہت کچھ دینے کے لئے آئے ہو۔''

''بات تو معقول ہے، لیکن یہ میں کیسے کروں؟''

''وہی بتانے کے لئے تو یہاں لایا ہوں۔'' مسعود صاحب مسکرائے۔

''ایک اور کار خریدو۔ اس میں دفتر آیا کرو۔ وہ یہاں کھڑی رہے دن بھر۔ اور وہ شاندار اور مہنگی کار ہونی چاہئے۔ اس کے علاوہ جہاں موقع ملے، زمین جائیداد خریدو۔ سال میں ایک بار یہاں اثاثوں کا فارم بھرا جاتا ہے۔ تمہارا نام بھرا جائے تو ایسا ہو کہ اس کے ساتھ جائیداد اور بینک اکاؤنٹس کی تفصیل کئی صفحات پر مشتمل ہو۔ تاکہ سرکاری ریکارڈ پر تمہاری اصل حیثیت آ جائے۔ کوئی تمہاری کسی چیز کو دیکھ کر یہ نہ کہے کہ یہ حرام کی کمائی ہے۔ میں یہ سننا پسند نہیں کروں گا۔ خدانخواستہ ایسا ہوا تو میں خود سے بھی شرمسار رہوں گا۔''

عبدالحق کو ان پر بہت پیار آیا۔ اس نے بڑی محبت سے ان کا ہاتھ تھاما۔

''آپ خوامخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ یہ سب کچھ تو اللہ کا ہے۔ میں تو اسے اپنا سمجھتا بھی نہیں۔''

''نہ سمجھو، پوری دنیا کو بانٹتے رہو۔ کہلائے گا تو تمہارا ہی۔'' **مسعود** صاحب نے خفگی سے کہا۔

''اگر تمہاری بے پرواہی کی وجہ سے لوگوں نے اللہ کے فضل کو حرام **کا** مال کہا تو اللہ تم سے خوش ہوگا؟''

بات ایسی تھی کہ عبدالحق اندر سے لرز کر رہ گیا۔ وہ جھرجھری لے کر رہ گیا۔

''جی! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ویسے بھی آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کے حکم سے انحراف نہیں **کر** سکتا۔''

''بس تو ٹھیک ہے۔'' مسعود صاحب نے اطمینان کی سانس لی۔

''اور ہاں! میری بات یاد رکھنا۔ زمین ایسی چیز ہے، جس کی **قیمت** ہمیشہ بڑھتی ہے۔ باقی ہر چیز کی قیمت وقت کے ساتھ کم ہوتی جاتی ہے۔ **سو جہاں** موقع ملے، زمین ہو، دکان ہو یا مکان، خرید لیا کرو۔''

''لیکن آپ نے تو وہ بنگلہ مجھے دلوا دیا، جو آپ خود لے سکتے تھے۔ **بلکہ** اس کی قیمت تو آپ نے ہی ادا کی تھی۔''

''وہ اور بات تھی بیٹے! لیکن تمہیں بتا دوں کہ زرعی زمین کافی ہے میرے پاس۔ کچھ آبائی ہے اور کچھ میری خریدی ہوئی۔''

''اب میں بھی آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور پوچھو!''

''جب میں پہلی بار کیمپ میں آپ سے ملا تو آپ تین پیروں والی کرسی پر بیٹھے تھے اور وزٹرز چیئرز کی جگہ خالی کھوکھے تھے۔ اور آپ کے دفتر **کا** دروازہ سب کے لئے کھلا تھا۔ آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی تھی اور **لہجے** میں تپاک......''

''مسکراہٹ تو اب بھی ہے میرے ہونٹوں پر۔ دیکھو لو!'' **مسعود** صاحب مسکرائے۔

''آج وہی تاثر لئے میں آپ کے کمرے میں داخل ہوا تو صورتِ حال مختلف تھی۔''

''جیسا دیس ویسا بھیس!'' وہ پھر مسکرائے۔

''وہاں کیمپ میں میں خود اصرار کر کے گیا تھا۔ وہاں میں ڈی جی نہیں تھا، لٹ پٹ کر، زخم کھا کر آنے والوں کا میزبان تھا۔ ان کی خدمت، ان کے مسائل کے حل کے لئے وہاں بیٹھا تھا، افسر نہیں، خدمت گار، کیمپ کا ڈسپلن اور تھا، دفتر کا اور ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کہاں مجھے کیسا ہونا چاہئے۔ دوسرے میں آج صرف اپنے ڈیپارٹمنٹ کا ڈی جی ہی نہیں، تمہارا اُستاد بھی تھا، سمجھ گئے؟''

''سمجھ گیا سر! اور سیکھنے کی کوشش بھی کروں گا۔'' عبدالحق نے انہیں سلیوٹ کیا۔

''تو اب چلیں!''

''جی سر!''

اور وہ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

❁ ❁ ❁

گھر میں اس بہت بڑی تبدیلی کا سب سے کم اثر حمیدہ پر ہوا تھا۔ شاید اس لئے کہ گھر میں وہی سب سے زیادہ جہاں دیدہ تھی۔ اور اس لئے بھی کہ قابض ہو جانا اس کی فطرت میں نہیں تھا۔ برسوں پہلے ..... بہت پہلے اس نے جان لیا تھا اور سمجھ لیا تھا کہ شوہر ہوں یا بیٹے، مردوں کا تعلق باہر کی دنیا سے بھی ہوتا ہے۔ وہ پھیلنے والے ہوتے ہیں۔ بلکہ انہیں تو چھا جانے والا ہونا چاہئے۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ عورت کا کام مرد کو بنانا اور سنوارنا ہے، قابض ہونا نہیں۔ انہیں مردوں کو خود اعتمادی اور مضبوطی فراہم کرنی ہوتی ہے۔ تاکہ وہ باہر نکلیں، اپنے فرائض انجام دیں اور اللہ کے حکم کے مطابق باہر پھیلیں، دوسروں کو متاثر کریں اور چھا جائیں۔ وہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ لیکن جانتی تھی کہ عورت کا کام شوہر کو اپنی زُلفوں کا اسیر کر کے ان کے سائے میں سلا کر ان پر قابض ہو جانا نہیں ہے۔ اور بیٹے کو پلّو سے باندھ کر رکھنا نہیں ہے۔ عورت کو تو اپنے مردوں کو ہر

طرح کا سکون فراہم کرنا، ان کی دل بستگی کرنا ہے، ان سے تقاضے اور مطالبے کر کے بے سکون کرنا نہیں ہے۔

یہ بات نہ ہوتی تو گاؤں پر حملے والے دن وہ جمال دین اور وصال دین کو گھر سے نہ نکلنے دیتی۔ کم از کم وصال دین کو تو روک ہی لیتی۔ لیکن جیسے وہ یہ جانتی تھی کہ ان کے واپس آنے کا امکان بہت کم ہے، ویسے ہی وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ اپنا فرض نبھانے جا رہے ہیں۔ وہ مردوں کا کام تھا، ان کی ذمہ داری تھی۔ اسے گھر میں رہ کر اپنی ذمہ داری نبھانی تھی، اور وہ اس نے نبھائی۔ نہ تو اسے شوہر اور بیٹے کو ان کا فرض یاد دلانے کی ضرورت تھی، اور نہ یہ ان دونوں کو اسے اس کا فرض یاد دلانے کی۔ لوگ اپنے اپنے فرض کا خیال رکھنے لگیں تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں رہتا۔ جانے والے اور رخصت کرنے والے، دونوں ایک دوسرے کو رب راکھا کہتے ہیں اور بس، آگے جو رب کی مرضی۔

اس نے نماز کے بعد عبدالحق کے لئے خاص طور پر کامیابیوں اور آسانیوں کے لئے دعا کی۔ اور جب ناشتے کے بعد وہ رخصت ہونے لگا تو اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔

''اللہ تجھے ہمیشہ کی طرح وہاں بھی عزت دے پتر! اللہ تجھے تیرے مقصد میں کامیاب کرے۔''

پھر ارجمند تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اسے معلوم تھا کہ پھپھا جی بڑے افسر ہیں۔ اور تایا جان تو ان سے بھی بڑے افسر ہیں۔ اور اب اس کے آغا جی بھی اس راستے پر قدم رکھ رہے ہیں، اور انشاء اللہ سب سے بڑے افسر بنیں گے۔ اس کے لئے اس نے دعا بھی کی تھی۔

لیکن تھوڑی دیر بعد اسے ان کی کمی محسوس ہونے لگی۔ یہ وہ وقت تھا، جس میں وہ ان سے پڑھتی تھی۔ اسے خیال آ رہا تھا کہ وہ وقت اسے کتنی خوشی دیتا تھا اور یہ کہ اب وہ وقت اسے کبھی نہیں ملے گا۔ اب اس وقت میں وہ کبھی ان کے سامنے نہیں بیٹھے گی۔

اسے یاد تھا، گزشتہ روز آغا جی نے اس سے کہا تھا۔

''کل سے میں دفتر جایا کروں گا۔ اور تمہیں پڑھا نہیں سکوں گا۔''

کس شدت سے اس کا جی چاہا تھا کہ وہ نظریں اٹھا کر انہیں دیکھے۔ لیکن وہ اللہ میاں کی نافرمانی کر کے انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔

آغا جی کو شاید اس کی خاموشی میں شکایت یا دل گرفتگی محسوس ہوئی ہوگی۔ انہوں نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

''لیکن تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں آغا جی!'' اس نے احتجاج کیا تھا۔

''فرق تو بہت پڑے گا۔'' اسی وقت اس کے اندر سے آواز آئی۔ زیادہ باتیں کرنے میں یہی تو نقصان ہوتا ہے۔ آدمی اللہ کو بھول جاتا ہے۔ اور وہ سہم گئی۔

''مجھے معلوم ہے نا! تم نے ماشاء اللہ ثابت کر دیا ہے کہ اب تمہیں میری مدد کی ضرورت نہیں۔ اب تمہیں ویسے بھی داخلہ مل جائے گا۔''

اس بار وہ اندر کی ڈانٹ کی وجہ سے خاموش رہی۔

''فرق نہیں پڑے گا، کا ایک مطلب تو یہ تھا۔'' اسے خاموش دیکھ کر آغا جی نے جلدی سے وضاحت کی۔

''اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں عشاء کے بعد ایک گھنٹہ تمہیں پڑھا دیا کروں گا۔''

اور وہ خوش ہوگئی۔

''شکریہ آغا جی!''

تو یہ وقت نہ سہی، دوسرا وقت سہی۔ وہ محروم تو نہیں ہوئی ہے۔ اس نے سوچا۔ اور اس وقت کے لئے بھی ترکیب تھی اس کے پاس۔ اس نے کتابیں اٹھائیں اور حمیدہ سے کہا۔

''میں پڑھنے کے لئے جا رہی ہوں دادی جان!''

''ٹھیک ہے بچی! خوب دل لگا کر پڑھو۔''

وہ کمرے میں چلی گئی اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ فرض صرف اتنا تھا کہ

سامنے آغا جی نہیں تھے۔ اس نے کاپی کھولی اور آغا جی کے دیئے ہوئے سوال حل کرنے میں مصروف ہوگئی۔ انہماک ایسا تھا کہ تمام سوال حل کرنے کے بعد اس نے نگاہیں نیچی کئے کئے کاپی سامنے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ لیجئے آغا جی! میں نے سارے سوال حل کر لئے۔''

چند لمحے ایسے ہی گزر گئے۔ نہ آغا جی نے ویل ڈن کہا اور نہ ہی اس کے ہاتھ سے کاپی لی۔ تب اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا، اور خالی کرسی کو دیکھ کر اسے یاد آیا کہ آغا جی تو دفتر گئے ہیں۔

اس کا دل اداس ہوگیا۔

پڑھنا بھول کر وہ آغا جی کے بارے میں سوچتی رہی۔ چند گھنٹوں ہی کی تو بات ہے۔ شام کو آغا جی واپس آجائیں گے۔ پھر یہ کمرہ اتنا بدلا بدلا، اتنا سونا سونا کیوں لگ رہا ہے۔ اور میں اداس کیوں ہوں؟

لیکن سچی بات یہ ہے کہ اداسی کی کیفیت اسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔

پھر اسے خیال آیا، تایا نے کہا تھا کہ آغا جی کا کسی دوسرے شہر تبادلہ بھی ہوسکتا ہے۔ تو ایسا ہوا تو کیا ہوگا؟ دادی اماں تو تڑپ گئی تھیں۔ انہیں اس کی تعلیم کی کتنی فکر تھی۔ اور تایا نے کہا تھا، آپ اطمینان سے شہزادی کے ساتھ یہاں رہئے گا۔ اپنے گھر میں، آپ کا خیال رکھنے کے لئے ہم سب ہیں نا!

اس خیال سے تو اسے ایسا لگا کہ اس کی جان نکل گئی ہے۔ ارے! تو آغا جی دور چلے جائیں گے...... کسی اور شہر...... اور جانے کب تک وہاں رہیں...... ہوسکتا ہے، کئی سال! اس کا دم گھٹنے لگا، سانس رکنے لگی۔ نہیں بھئی نہیں! میں تو مر ہی جاؤں گی۔ وہ بڑبڑائی۔

''کوئی نہیں مرتا کسی کے بغیر۔ موت تو اللہ کے حکم سے آتی ہے۔'' اندر سے تبصرہ آیا۔

''لیکن میں خوش تو نہیں رہوں گی۔''

''یہ تو اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تجھے یہاں پہنچا دیا، اس سے ملوا دیا۔ ایسا نہ ہوتا تو تو کہاں ہوتی، ذرا سوچ تو سہی!''

اور ارجمند کو تھرتھری چڑھ گئی۔ واقعی! وہ کہاں جاتی پھپھو کے بعد؟

''تو سمجھ لے کہ یہ ملنا تو بس تیری بہتری تھا، تیری ضرورت تھی۔ ابھی وہ تجھے ملا کہاں ہے؟ اور ملا نہیں تو حق بھی تیرا کوئی نہیں۔ نہ دیکھنے کا، نہ کوئی آس لگانے کا۔ تو پھر قربت میں خوشی کیسی اور جدائی کیسی، دکھ کیسا؟''

''لیکن آپ نے تو وعدہ کیا ہے مجھ سے؟'' اس نے تڑپ کر شکایت کی۔

''بچی ہے نا ابھی! شکایت بھی کرنے لگی۔ در در بھٹکنے سے بچایا تو اس پر شکر نہیں، الٹی شکایت؟ وعدہ یاد دلاتی ہے۔ وہ تو وعدہ ہی پورا کرنے کے لئے کرتا ہے۔ پر تجھے تو شکر کرنا بھی سیکھنا ہے اور صبر کرنا بھی۔ اس سے راستے آسان اور منزل قریب ہوتی ہے اور شکایت تو راستے کو لمبا بھی کر دیتی ہے اور کٹھن بھی، اور منزل بھی دُور ہو جاتی ہے۔

اس بار تو ارجمند پوری جان سے لرز کر رہ گئی۔ ہر بات جیسے اس کے دل و دماغ میں اُتر گئی تھی۔ کیسے اسے سمجھایا جا رہا تھا۔ سچ ہے، وہ یہاں نہ پہنچی ہوتی تو در در بھٹکتی۔ اور اسے تو کچھ بھی نہیں پتا، نہ دنیا کا اور نہ لوگوں کا۔ اللہ نے اس پر احسان کیا، اور وہ شکایت کر رہی ہے۔

اس نے معصومیت سے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑے، پھر رخساروں پر طمانچے لگائے۔

''اللہ میاں! آپ کا شکر ہے۔ میں توبہ کرتی ہوں اللہ میاں! اب بھی شکایت نہیں کروں گی۔ اب میں صبر بھی کروں گی، اور آپ کا شکر بھی ادا کروں گی۔ مجھے معاف کر دیں۔ اللہ میاں! آپ ہی راستہ دکھانے والے ہیں، آپ ہی راستہ دکھاتے ہیں۔ غلطیوں پر ٹوکتے رہئے، لیکن اللہ میاں! نرمی سے، دیکھیں نا! آپ کے سوا میرا کون ہے۔ کوئی بھی تو نہیں۔ سب کو آپ نے بلا لیا...... بابا کو، امی کو، دادی کو...... سب کو۔ اور اب پھپھو کو بھی۔'' یہ کہتے کہتے اسے احساس ہوا کہ وہ پھر شکایت کر رہی ہے۔ اس نے پھر کان پکڑ لئے۔

''نہیں! میں شکایت نہیں کر رہی ہوں اللہ میاں! آپ کا شکر ہے۔ مجھے

یاد ہے پھپھو کہتی تھیں، ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اللہ کی طرف سے صرف بہتری ہوتی ہے، چاہے ہماری سمجھ میں نہ آئے، آپ کا شکر ہے اللہ میاں! میں بھول جاؤں، غلطی کروں تو مجھے معاف کر دیا کریں، سمجھا دیا کریں۔ دیکھیں نا! میں تو چھوٹی سی بچی ہوں اور آپ کے سوا مجھے کوئی سمجھانے والا بھی نہیں۔''

''جس کا اللہ ہے، اس کی ساری کائنات ہے نادان بچی!''

اس وقت دروازے کی طرف سے آواز آئی۔

''اے ارجی! اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟ آغا جی کہاں ہیں تمہارے؟''

ارجمند نے سر گما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں نور بانو کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

❁ ❁ ❁

نور بانو کے لئے وہ ایک عام سا دن تھا...... اور دنوں کی طرح۔

وہ سو کر اُٹھی، معمول کے مطابق غسل خانے میں گئی۔ وہاں سے نکلی، سنگھار میز کے سامنے بیٹھ کر بالوں میں کنگھی کی۔ پھر وہ کمرے سے نکل آئی۔ اس وقت اسے ناشتے کی بڑی شدید طلب ہوتی تھی۔

عبدالحق کی اسٹڈی کے سامنے سے گزرتے ہوئے عادت کے مطابق وہ رکی اور اندر دیکھا۔ ایک ثانیے میں ہی اسے کئی تبدیلیوں کا احساس ہوگیا۔ پہلی بات تو یہ کہ ارجمند کی نظریں خلافِ معمول اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ ادھر دیکھ رہی تھی، جہاں عبدالحق ہوتا تھا۔ دوسری تبدیلی تھی کہ وہاں عبدالحق موجود نہیں تھا۔ ہاں یہ وہ کہہ سکتی تھی کہ اگر وہ موجود ہوتا تو اس وقت ارجمند کی نظریں اس کے چہرے پر ہوتیں۔

اب بھی، ان تبدیلیوں کے باوجود اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس نہیں ہوا۔ اس نے بس یہ سوچا، یہ عبدالحق اس وقت کہاں چلے گئے؟

''اے ارجی!'' اس نے ارجمند کو پکارا۔

''اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟ آغا جی کہاں ہیں تمہارے؟''

ارجمند نے سر گھما کر اسے دیکھا، اور پہلے سلام کیا۔ پھر بولی۔

''آغا جی تو چلے گئے آپی!''

نور بانو کمرے میں داخل ہوگئی۔

''کہاں چلے گئے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ کو یاد نہیں آپی! انہیں تو آج سے دفتر جانا تھا۔''

نور بانو کو شرمندگی سی ہوئی۔ وہ کھسیا گئی۔

''ارے......! مجھے یاد ہی نہیں رہا۔'' اس نے کہا۔

''تو تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ وہ تمہیں پڑھانا تو نہیں چھوڑیں گے۔ اب رات کو پڑھایا کریں گے۔''

''جی آپی! مگر ان کا دیا ہوا کام تو کرنا ہے۔''

''وہ تم کہیں بھی کر لیتیں۔ یہاں آؤ گی تو وہ یاد آئیں گے نا!'' نور بانو کو احساس بھی نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

''وہ تو ہر جگہ یاد آئیں گے آپی!'' ارجمند نے معصومیت سے کہا۔

''اب یہاں کی عادت ہوگئی ہے نا! یہاں بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے۔''

''ہاں! یہ تو ہے۔ ٹھیک ہے، تم کام کرو۔'' نور بانو نے کہا اور پلٹ کر کمرے سے نکل آئی۔

تو آج سے زندگی میں یہ تبدیلی آ گئی۔ نور بانو نے سوچا۔ ناشتہ کرتے ہوئے وہ زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ اس کے نزدیک یہ تبدیلی خوش آئند تھی۔ بلکہ وہ تو آئندہ کے امکانات کی راہ تک رہی تھی، وہ امکانات، جن کی راہنمائی مسعود صاحب نے کی تھی۔

عبدالحق کا تبادلہ کسی دوسرے شہر بھی ہوسکتا ہے۔

جب سے اس نے یہ سنا تھا، یہ اس کا وہ خواب بن گیا تھا، جس کی تعبیر کا اس نے پہلے ہی لمحے سے انتظار شروع کر دیا تھا۔

اگر تبادلہ ہوتا اور وہ سب ساتھ جاتے تو اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ صرف گھر، شہر اور گرد و پیش ہی تو بدلتا۔ نئے شہر کا خیال تو بہرحال اچھا لگتا ہے۔ لیکن اپنا یہ گھر نور بانو کو بہت پسند تھا۔

مگر جب تبادلے کے امکان پر بات آگے بڑھی تو وہ اسی کا خواب بن گیا۔ اس امکان میں پہلی اچھائی تو نور بانو کے تعصب کی وجہ سے تھی، کیونکہ حمیدہ نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اور نہ جانے کیوں؟ نور بانو کو حمیدہ کی مخالفت کرنا اچھا لگتا تھا۔

لیکن یہاں مخالفت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ تبادلے پر نہ کسی کا اختیار تھا، اور نہ ہی کوئی اسے روک سکتا تھا۔ حمیدہ کو ارجمند کی تعلیم کی فکر تھی۔ اور مسعود صاحب نے یہ کہہ کر مسئلہ حل کر دیا تھا کہ حمیدہ اور ارجمند کو یہاں سے کہیں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور حمیدہ کی خاموشی بتاتی تھی کہ اس نے اس بات کو قبول کر لیا ہے۔

اندر کی بات یہ تھی کہ نور بانو کے خیال میں حمیدہ کی موجودگی میں اس کا اقتدار مکمل نہیں ہوتا تھا۔ اور مکمل اقتدار اس کا خواب تھا۔ اس کے لئے تو وہ حمیدہ کے لئے بدترین بدخواہ بھی بن جاتی تھی، ایسی کہ کبھی غور کرنے پر اسے خود بھی اس پر شرم آتی تھی۔

کبھی وہ سوچتی کہ حمیدہ تو اس کی محسن ہے۔ وہ نہ ہوتی تو عبدالحق سے اس کی شادی کیسے ہوتی؟ یہ ناقابل تردید حقیقت تھی کہ یہ شادی حمیدہ نے ہی کرائی تھی۔ ورنہ عبدالحق تو منہ سے کچھ کہنے والا نہیں تھا۔ اور اعتماد سے محروم نور بانو کو بھی حوصلہ حمیدہ نے ہی دیا تھا۔

لیکن حمیدہ میں ایک بہت بڑی خرابی تھی۔ وہ ہر معاملے میں دخل اندازی کرنے کی عادی تھی۔ نور بانو کو اس کی نصیحتوں کی وجہ سے اس سے چڑ ہوگئی تھی اور عبدالحق حمیدہ کا مطیع تھا۔ نور بانو کو احساس ہوتا تھا کہ اس کا اقتدار صرف رات کا ہے...... ادھورا اور محدود اقتدار۔

پھر حمیدہ کے دماغ پر اولاد کا بھوت چڑھ گیا۔ اس سلسلے میں اس نے جو جو کچھ کیا، اس نے نور بانو کی چڑ اور بڑھا دی۔ حمیدہ جانے کہاں کہاں سے کیا اٹھا لاتی تھی، اور پھر اس سے فرمائشیں ہوتیں۔ یہ کھا لے، یہ پی لے، یہ پہن لے۔ اس میں نور بانو کو توہین کا احساس ہوتا تھا۔

پھر یہ سلسلہ اچانک ہی رک گیا۔ شاید...... نہیں، یقیناً...... ارجمند کے آنے کے بعد۔ شاید بڑی بی کو صبر آ گیا۔ اس نے مرغی کی طرح ارجمند کو اپنے پروں میں چھپا لیا اور عبدالحق کے بچے کے معاملے میں صبر کر بیٹھی۔

لیکن نور بانو کا دل تو برا ہو چکا تھا۔

ویسے پہلے کی بات اور تھی۔ اب تو نور بانو کا بھی جی چاہتا تھا کہ اس کا کوئی بچہ ہو۔ وہ اس سے محبت کرے، اس کو پالے، اسے بڑا ہوتا دیکھ کر خوش ہو۔ اب اسے احساس ہوتا تھا کہ یہ تو بہت بڑی خوشی ہوتی ہوگی۔

لیکن اس معاملے میں وہ ڈرتی بھی تھی۔ اسے وہ بات معلوم تھی، جو کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

حمیدہ ہر بار کسی بزرگ سے، کسی مزار سے کچھ لے کر آتی اور پورے یقین سے استعمال کرتی۔ ہر بار اسے یقین ہوتا کہ اس بار نتیجہ برآمد ہوگا۔ لیکن ہوتا کچھ بھی نہیں تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ نور بانو جانتی تھی۔ رمضان کی طاق راتوں میں اولاد نہ ہونے کی دعا تو اس نے کی تھی، اور بڑی سچائی کے ساتھ کی تھی۔ قبولیت کی راتوں میں قبول ہونے والی اس کی وہ دعا اب کوئی اور کیسے ردّ کرا سکتا تھا۔

اب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ دعا اس کی نادانی تھی۔ اولاد کی اہمیت تو اس کی سمجھ میں اب آئی تھی۔ وہ خود بھی اس کی ضرورت محسوس کرتی تھی بلکہ وہ جان گئی تھی کہ اس محرومی کی وجہ سے عبدالحق بھی اس سے دور ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اس کی قربت کی خاطر اس نے وہ دعا کی تھی۔

جب اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور حمیدہ نے اسے جتا بھی دیا کہ اولاد کی خاطر تو وہ عبدالحق کو دوسری شادی پر بھی مجبور کر سکتی ہے، تو وہ ڈر گئی۔ اس نے نہ صرف یہ کہ اولاد کے لئے دعا شروع کر دی، بلکہ وہ اپنی پچھلی احمقانہ دعا پر توبہ بھی کرنے لگی۔ لیکن اب اتنے دن گزر جانے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ اس کی قبول ہوئی دعا اب منسوخ ہونے والی نہیں۔

عبدالحق کی طرف سے تو اسے یقین تھا۔ کسی بھی چیز کے ملنے یا نہ ملنے

کو اللہ کی طرف سے سمجھنا اور اسے قبول کرنا اس کا ایمان تھا۔ اور وہ اس سے ایسی محبت کرتا تھا کہ کسی اور سے محبت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن حمیدہ کی طرف سے تو خطرہ تھا۔ عبدالحق حمیدہ کا حکم ٹال نہیں سکتا تھا، اور حمیدہ کسی بھی وقت اسے دوسری شادی کا حکم دے سکتی تھی۔

شاید یہی سب سے بڑی وجہ تھی کہ نور بانو کو تبادلے کا خیال اچھا لگا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ حمدیہ سے دور، بہت دور رہ کر زندگی گزار دیتی۔ بہرحال اسے ایک دُعا اور مل گئی۔ عبدالحق کے تبادلے کی۔

❁ ❁ ❁

دوپہر کا کھانا تو سب ساتھ ہی کھاتے تھے۔ آغا جی کا خیال آیا تو ارجمند کی بھوک اُڑ گئی۔ ان کے بغیر کھانا کیا اچھا لگے گا۔ پھر دوسرے خیال نے اسے تڑپا دیا۔ پتا نہیں، آغا جی نے وہاں کھانا کھایا ہو یا نہیں۔ وہ کچھ لے کر بھی تو نہیں گئے۔

سو کھانے کے وقت اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔

''کیا بات ہے نکی! کھانا کیوں نہیں کھاتی؟'' حمیدہ نے پوچھا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے ارجی؟'' نور بانو کے لہجے میں تشویش تھی۔

''مجھے جلدی بھوک لگ گئی تھی۔ تو میں نے پہلے ہی کھا لیا۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل آئی۔

باہر ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھ کر وہ سوچنے لگی کہ آغا جی اس وقت کیا کر رہے ہوں گے۔ مگر ڈائننگ روم سے آنے والی آواز میں اسے ڈسٹرب کر رہی تھیں۔ وہ وہاں سے اُٹھنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ وہاں ہونے والی گفتگو سننے پر مجبور ہوگئی۔

''کیا ہوا اماں! ہاتھ کیوں روک لیا تم نے؟'' نور بانو نے کہا۔

''نا دھیے! کھایا نہیں جائے گا مجھ سے۔ نوالے حلق میں پھنس رہے ہیں۔'' حمیدہ نے جواب دیا۔

''ایسا کیا ہوگیا اماں؟''

''عبدالحق کے ساتھ کھانے کی عادت ہے نا! اس کی یاد آ رہی ہے۔''

اور ڈرائنگ روم میں بیٹھی ارجمند کی آنکھیں یہ سن کر نم ہوگئیں۔ اس کا اور دادی اماں کا ایک سا حال تھا۔

''اب ایسا کیا اماں! مرد تو باہر جاتے ہی ہیں نا!'' نور بانو نے کہا۔

''میں بھی ان کی کمی محسوس کر رہی ہوں۔ لیکن کھانا پینا تو نہیں چھوڑ بیٹھوں گی۔ یہ تو روز کی بات ہے۔''

''دو چار دن میں عادی ہو جاؤں گی دھیے! تو کھا آرام سے۔''

چند لمحے خاموشی رہی، پھر نور بانو نے کہا۔

''تم پریشان کیوں ہو اماں؟''

''پتا نہیں، وہاں اسے کھانے کو کچھ ملا بھی ہوگا یا نہیں۔'' حمیدہ کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

''ارے اماں! بلاوجہ پریشان ہوتی ہو۔'' نور بانو ہنسنے لگی۔

''بھئی! وہاں چچا جان ہیں۔ وہ بھی تو کھاتے ہوں گے نا۔ تو ان کے ہوتے ہوئے کیا وہ اکیلے کھانا کھالیں گے۔''

''ہاں! یہ تو ہے۔ پر دھیے! تجھے بھی خیال تو کرنا چاہئے۔''

''کیسا خیال اماں! کس بات کا خیال؟''

''یہی کہ نہ تجھے اس کے ناشتے کی فکر ہے، نہ کھانے کی۔''

''تو کیا وہ ناشتہ کر کے نہیں گئے؟''

باہر بیٹھی ارجمند اب ہر بات بڑے غور سے، بڑے دھیان سے سن رہی تھی۔

''وہ تو نسیمہ نے اسے دے دیا تھا۔ پر بیوی تو تو ہے اس کی۔'' حمیدہ کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

''تو روز نسیمہ ہی دیتی تھی انہیں ناشتہ۔''

''وہ بھی غلط تھا۔ کام تو یہ تیرا ہے دھیے!''

''پہلے کبھی نہیں کہا تم نے؟'' نور بانو نے چڑ کر کہا۔

''گھر میں ہوتا تھا نا، اس لئے۔'' حمیدہ نے اداسی سے کہا۔

''پر دھیے! بیوی کو شوہر کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔''

''یہ بھی تو بتاؤ کہ خیال کیسے رکھا جاتا ہے؟''

''اللہ بخشے وصال دین کے ابا کو، انہیں سویرے ہی کھیتوں پر جانا ہوتا تھا۔'' حمیدہ کی آواز جیسے بہت دور سے آ رہی تھی۔

''میں صبح اٹھ کر ان کے لئے ناشتہ بناتی۔ ناشتہ کرا کے انہیں بھیجتی۔ پھر دوپہر کا کھانا تیار کرتی اور خود جا کر انہیں دے کر آتی۔ پھر وصال دین بڑا ہوگیا تو وہ کھانا لے جانے لگا۔ مگر پھر وہ دلی چلا گیا تو میں نے دوبارہ یہ کام سنبھال لیا۔''

نوربانو کی نگاہوں میں خاموش طبع وصال دین کی صورت پھر گئی۔ مگر اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

''تو یہ کام تو میں بھی کرلوں گی اماں! میں کھانا لے کر ان کے دفتر چلی جایا کروں گی۔''

''میں یہ نہیں کہہ رہی ہوں دھیے! بات تو خیال رکھنے کی ہے۔'' حمیدہ شاید کھسیا گئی تھی۔

''مردوں کے دل ایسے ہی جیتے جاتے ہیں۔ خیال رکھ کر انہیں محبت کا احساس دلایا جاتا ہے۔''

''اس کے اس سے بھی بہتر طریقے ہیں اماں!'' نوربانو شوخی سے ہنسی۔

اس ہنسی میں کوئی بھید، کوئی اسرار تھا، جو ارجمند سمجھ نہیں سکی۔

''تو نہیں سمجھے گی دھیے! اللہ نے میرے پتر کے دل کو تیری اتنی محبت ویسے ہی دے رکھی ہے نا! اس لئے تجھے قدر نہیں اس کی۔'' حمیدہ نے کہا۔ پھر اچانک اس کے لہجے میں ملامت آگئی۔

''اور جن طریقوں کی تو نے بات کی، وہ تو ہر عورت کو آتے ہیں۔ اگر ان سے گزارا ہوتا نا! تو دنیا کی کوئی عورت اپنے مرد کی خدمت نہیں کرتی۔ لیکن نہیں! جسے اپنے مرد سے محبت ہوگی، وہ تو خدمت کرے گی ہی.....''

''اماں! سچ کہہ رہی ہوں، تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' اب

نوربانو کے لہجے میں کچھ شرمساری تھی۔

''تیرے ابا بھی تو سرکاری نورکر تھے نا!'' حمیدہ کو جیسے یاد آگیا۔

''جی اماں!''

''تو تو نے اپنی امی کو ان کا خیال رکھتے نہیں دیکھا؟''

''نہیں اماں!'' نوربانو نے اداسی سے کہا۔

''ہمارے ہوش سنبھالنے سے پہلے تو ابا رخصت ہوگئے تھے۔''

''پھر تیرا قصور نہیں میری بٹی!'' حمیدہ نے بہت خلوص اور محبت سے کہا۔

''بیٹیاں یہ سب کچھ دیکھ کر ہی تو سیکھتی ہیں۔ اور پھر میری امی کو تو وقت ہی نہیں ملا کہ تجھے یہ سب سکھاتیں۔'' اس نے کچھ توقف کیا، پھر بولی۔

''اب میں تجھے سکھا رہی ہوں نا؟''

''اچھا اماں! اب کوشش کروں گی۔''

باہر بیٹھی ارجمند نے دل میں سوچا کہ اس کی تربیت کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا، اللہ نے یہ سب باتیں اس تک پہنچا دیں۔ ہر ہر بات اس نے اپنے حافظے پر نقش کر لی تھی۔ ویسے اسے یاد تھا، اس کی امی بابا کی بہت خدمت کرتی تھیں۔ ان کے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ اور سونے سے پہلے منع کرنے کے باوجود وہ بابا کی ٹانگیں دباتی تھیں۔ کبھی سر میں تیل لگاتی تھیں۔

تو یہ ہوتی ہے محبت، اور یہ ہوتی ہے خدمت، اچھا ہوا، مجھے معلوم ہوگیا۔ اس نے طمانیت سے سوچا۔

''اور دیکھ، کھانا تو یعقوب کے ہاتھ بھی تو دفتر بھجوا سکتی ہے۔'' اندر حمیدہ نے نوربانو سے کہا۔

''ٹھیک ہے اماں!''

❁ ❁ ❁

شام ہوگئی، اور یعقوب عبدالحق کو لانے کے لئے گاڑی لے کر نکلا تو نوربانو نے سوچا کہ جو خیال رکھنا آسان ہے، وہ تو رکھا جائے۔ اس خیال کے

تحت اس نے نسیمہ کو چائے تیار رکھنے کی ہدایت کی اور خود ارجمند کے ساتھ باہر لان میں چلی آئی۔

''کوئی خاص بات ہے آپی!'' ارجمند نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

نور بانو اسے لے کر لان میں صدر دروازے کے عین سامنے والی بینچ پر بیٹھ گئی۔

''ابھی تمہارے آغا جی آئیں گے نا، ان کا استقبال کریں گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ارجمند نے حمیدہ کی گفتگو سن کر یاد ہی نہیں رکھی تھی، بلکہ اپنے طور پر اسے آگے بھی بڑھایا تھا۔ اس نے دل میں سوچا، اس سے تو بہتر یہ ہوتا کہ آپی غسل خانے میں آغا جی کے کپڑے تیار کر کے لٹکاتیں۔ وہ باتھ روم سے تازہ دم ہو کر نکلتے تو وہ اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی چائے لے کر کمرے میں ان کی منتظر ہوتیں، اور کون جانے، آغا جی کہتے ...... یہ کیا، ارے بھئی لان میں سب ساتھ بیٹھ کر چائے پئیں گے۔ دیکھو نا، دوپہر کا کھانا تو ہم ساتھ نہیں کھا سکے۔ اب شام کی چائے تو ساتھ پی لیں۔

لیکن اس نے نور بانو سے کچھ کہا نہیں۔ یہ اس کا معاملہ تھا ہی نہیں۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی واپس آئی۔ مگر عبدالحق اس میں نہیں تھا۔ نور بانو پریشان ہوگئی۔ اس نے آواز دے کر یعقوب کو بلایا۔

''یعقوب! تیرے صاحب نہیں آئے؟'' اس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''جی میم صاحب! وہ مسعود صاحب کے ساتھ کہیں چلے گئے۔ بولا، میں ان کے ساتھ ہی آجاؤں گا، تم جاؤ۔''

یہ سن کر نور بانو کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ وہ پیر پٹختی ہوئی گھر کی طرف چل دی۔ ارجمند اس کے پیچھے تھی۔

پھر نور بانو تو ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی، اور ارجمند اپنے کمرے میں چلی

گئی، جو درحقیقت دادی اماں کا کمرہ تھا۔ آپی بالکل سمجھدار نہیں ہیں۔ اس نے تاسف سے سوچا۔ غصہ بہت کرتی ہیں۔ ذرا غور کرنے پر یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ نور بانو کسی کو کچھ دینے سے زیادہ لینے کی فکر کرتی ہیں۔ البتہ اس کے معاملے میں اس کا رویہ مختلف ہے۔

''کیا ہوا نکی! کیا سوچ رہی ہے؟'' حمیدہ نے اسے گہری سوچ میں دیکھ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں دادی اماں! ایسے ہی......''

تھوڑی دیر بعد عبدالحق کمرے میں آیا۔ اس نے آتے ہی حمیدہ کو سلام کیا اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔ حمیدہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور دعا دی۔

''تم کیسی ہو ارجی!'' عبدالحق نے اس سے پوچھا۔

''ہوم ورک کر لیا نا تم نے؟''

''جی آغا جی!''

''پتر! کیسا رہا تیرا یہ پہلا دن؟'' حمیدہ نے پوچھا۔

''بہت اچھا اماں! چچا جان نے ایک دن میں اتنا کچھ سکھا دیا کہ میں برسوں میں نہیں سیکھ سکتا......'' وہ جملہ پورا نہ کر سکا۔ کیونکہ نور بانو آندھی طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا اور جسم لرز رہا تھا۔

عبدالحق نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

''کیا ہوگیا، اتنی برہم کیوں ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ پوچھیں، کیا نہیں ہوا؟'' نور بانو نے تنک کر کہا۔

''پہلے تو میں جناب کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ پھر یعقوت نے آکر بتایا کہ آپ مسعود صاحب کے ساتھ چلے گئے ہیں۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔''

''دیکھو نور بانو! میں اس پر معذرت نہیں کروں گا۔'' عبدالحق نے بڑے تحمل سے کہا۔

''ابھی میں ٹھیک سے نہیں جانتا، لیکن سمجھ سکتا ہوں کہ دفتر میں کسی بھی وقت کوئی کام پڑ سکتا ہے۔ اس لئے تم اپنے طور پر مجھ پر آنے کے وقت کی پابندی لگانے کے کوشش نہ کرو۔ مجھے دیر بھی ہو سکتی ہے۔''

''تو پھر یعقوب کو کیوں بلایا تھا؟''

''پہلا دن تھا نا، میں نے تو دفتر کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔'' عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔

''مجھے کیا پتا تھا کہ دیر بھی ہو سکتی ہے۔''

لیکن نور بانو کا پارہ نیچے نہیں آیا۔ ارجمند سر جھکائے بیٹھی تھی، اور حمیدہ حیرت اور افسوس سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تو پھر یعقوب کو واپس کیوں بھیج دیا؟''

''نہ بھیجتا تو تم اور پریشان ہوتیں۔''

''مجھ بات پوری کرنے دیں۔ اور آپ کسی دفتری کام سے نہیں رکے تھے۔ آپ تو مسعود صاحب کے ساتھ تھے۔''

اب عبدالحق کے چہرے پر سختی اور سنگینی اُبھر آئی۔

''سنو نور بانو! یہ باہر کے معاملات ہیں، جن پر میں گھر میں بات کرنا کبھی پسند نہیں کروں گا۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''بس آج اس پر آخری بار بات ہو رہی ہے۔ چچا جان دفتر میں میرے افسر ہیں، اور میں ان کا ماتحت۔ انہوں نے مجھے دفتری کام سے ہی روکا تھا، لیکن ذاتی طور پر بھی میں ان کا حکم نہیں ٹال سکتا۔ اور یہ بھی ذہن میں رکھو کہ میں اپنی کسی ذاتی کام سے بھی دفتر کے بعد کہیں جا سکتا ہوں۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم میرا انتظار نہ کیا کرو۔''

ذلت کے احساس سے نور بانو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''چلیں ٹھیک ہے۔ دیر ہو گئی، آپ آئے تو میں ڈرائنگ روم میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے سلام کیا، آپ نے جواب تک نہیں دیا اور سیدھے یہاں چلے آئے۔ جیسے میں کچھ ہوں ہی نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ باقاعدہ رونے لگی۔

''مجھے یہ رونا دھونا اچھا نہیں لگتا، اور وہ بھی بلاوجہ کا۔'' عبدالحق نے جھنجلا کر کہا۔

''میں نے سلام کا جواب دیا تھا لیکن غصے میں آدمی کا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے اور سماعت معطل۔ تم نے نہیں سنا تو میں کیا کروں؟ اور دوسری بات یہ کہ گھر آ کر میں سب سے پہلے اماں کو سلام کروں گا۔ یہ اماں کا حق اور میرا فرض ہے۔ اس پر کبھی مجھ سے شکایت نہ کرنا۔''

نور بانو اندر ہی اندر صدمے سے بے حال ہو گئی۔ حمیدہ کی یہ فوقیت ہی تو اسے کھٹکتی تھی۔ کاش تبادلہ ہو جائے جلدی سے۔

''نور بانو! تو بھی بچی بن جاتی ہے دھیے! چل ادھر آ! میرے پاس بیٹھ۔'' حمیدہ نے ماحول کی کشیدگی کم کرنے کی کوشش کی۔

نور بانو کے لئے وہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا تھا۔ وہ اس کے پاس جا بیٹھی۔

اسی لمحے نسیمہ ہدایت کے مطابق چائے لے آئی۔ ٹرالی پر چند پلیٹوں میں بسکٹ بھی تھے۔

''نہیں بھئی! دن بھر میں آپ سب کو مس کرتا ہوں۔'' عبدالحق نے یوں ہلکے پھلکے انداز میں کہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''اوپر کا کھانا ہم ساتھ نہیں کھا سکتے۔ مگر شام کی چائے تو ساتھ پی سکتے ہیں، اور وہ بھی لان میں۔ بس میرے آنے کے بعد شام کی چائے کا اہتمام لان میں کیا کرو۔''

ارجمند خوش ہو گئی۔ بالکل یہی تو اس نے سوچا تھا۔ اللہ کا شکر ہے۔ وہ آغا جی کو سمجھنے لگی ہے۔

''لیکن آپ کے آنے کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہو گا۔'' نور بانو اب بھی باز نہیں آئی۔

عبدالحق کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔

''جس سے صبر نہ ہو، وہ پہلے ہی پی لے۔ اور جس کا جی چاہے، میری

آمد کا انتظار کر لے۔''

حمیدہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو باغیچے میں، نسیمہ چائے وہیں لے آؤ۔''

نور بانو بھی سب کے ساتھ تھی۔ مگر اس کا موڈ بہت خراب تھا۔

❁ ❁ ❁

حمیدہ نے اسی رات نور بانو کو اپنے پاس بٹھا کر سمجھایا۔

''دیکھ دھیے! میں تیری ماں ہی ہوں۔ اسی لئے تجھے سمجھاتی ہوں۔ تجھے تو کچھ بھی نہیں آتا۔ تو عبدالحق کا خیال رکھنا سیکھ لے۔''

''اب کیا ہے اماں!'' نور بانو جھنجلا گئی۔

''مرد کام سے واپس آتا ہے تو تھکا ہارا اور چڑچڑا ہوتا ہے۔ گھر سے دوری، کام کی تھکن اور دس باتیں ایسی ہوئی ہوتی ہیں جو اس کی مرضی کے خلاف ہوں تو ایسے میں گھر آ کے اسے شکایت سننا اچھا نہیں لگتا۔''

''اب نہیں کروں گی اماں!''

''میں تجھے یہ بتا رہی ہوں کہ کیا کرنا چاہئے؟ بیوی شوہر کے آنے سے پہلے نہا دھو کر وہ کپڑے پہنے جو شوہر کو اچھے لگتے ہوں۔ چہرے پر سرخی پوڈر لگائے تاکہ وہ اسے دیکھ کر خوش ہو، تازہ دم ہو جائے اور ہر وہ کام کرے، جس سے شوہر کو خوشی ملتی ہو۔''

نور بانو نے سوچا، یہ نسخہ تو آسان ہے۔ دوپہر والے کام تو مشکل بھی تھے، اور اسے ضروری بھی نہیں لگ رہے تھے۔ رات کی رانی نسخہ تو اسے پہلے سے ہی آتا تھا۔ اب یہ شام کا گر بھی اس میں شامل کر لے۔

عبدالحق ارجمند کو پڑھانے بیٹھا تو نور بانو اپنی تیاریوں میں لگ گئی۔

عبدالحق کمرے میں آیا تو رات کی رانی مہک رہی تھی۔ شام کی تلخی کا دُور دُور تک نام و نشان بھی نہیں تھا۔ وہ خود بھی بات دل میں رکھنے والا آدمی نہیں تھا۔ اور بیوی اسے محبوب بھی بہت تھی۔ وہ خوش ہو گیا۔

لیکن اب وہ پہلے والی راتیں نہیں رہی تھیں۔ جب سے عبدالحق نے

ارجمند کو پڑھانے کے لئے جلدی اُٹھنا شروع کیا تھا، پہلے والی بات نہیں رہی تھی۔ مگر اب تو دن بھر کی تھکن تھی۔ عبدالحق کو نیند آ گئی۔ وہ سویا اور بے سدھ ہو کر سویا۔

نور بانو جاگتی رہی۔ اسے تو دیر تک جاگنے کی عادت تھی۔ وہ سوتے ہوئے عبدالحق کو دیکھ کر کڑھتی رہی۔ کیا اب وہ راتیں بھی پلٹ کر نہیں آئیں گی؟ بظاہر تو یہی لگتا ہے۔ لیکن تبادلہ ہو جائے تو یہ ایسا ناممکن بھی نہیں۔

بہت دیر تک وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ پھر جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چند لمحے وہ سوچتی رہی، پھر اُٹھی اور کمرے سے نکل آئی۔ اس کا رخ اسٹڈی کی طرف تھا۔

اسٹڈی میں لائٹ آن کرنے کے بعد وہ کتابوں کے دیواری شیلف کی طرف بڑھی۔ یہ وہ شیلف تھا، جس میں اُردو ادب کی کتابیں رکھی تھیں۔ اس نے ایک کتاب نکالی اور پڑھنے کے لئے بیٹھ گئی۔

وہ پہلا موقع تھا کہ اسے مطالعے کا خیال آیا تھا۔

❁ ❁ ❁

اگلی صبح ارجمند نماز اور تلاوتِ قرآن کے بعد باورچی خانے میں چلی گئی۔ اس کے ذہن میں حمیدہ کی باتیں تھیں۔ نور بانو ابھی سو کر نہیں اٹھی تھی۔ اس نے سوچا، وہ ہی عبدالحق کے ناشتے کا اہتمام کر لے۔

شاہانہ سے اس نے کھانے پکانے کی کئی ترکیبیں سیکھی تھیں۔ پکانے کا اسے شوق بہت تھا۔ نور بانو کھانا بہت اچھا پکاتی تھی، اور اس نے نور بانو سے سیکھا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی تو رات کا کھانا وہ پکاتی بھی تھی۔

اس وقت اس نے شاہانہ کی ترکیب سے فرنچ ٹوسٹ بنا لئے۔ اس نے سوچا تھا کہ ایک جیسا ناشتہ بھی تو برا لگتا ہوگا۔ مختلف ناشتہ ملتا رہے تو یقیناً اچھا لگے گا۔ کسی دن پوریاں تل لیں، کسی دن پراٹھے اور رات کا سالن، کسی دن فرائی انڈوں کے ساتھ پراٹھے اور کسی دن مکھن ڈبل روٹی۔

اس نے حمیدہ کو بتا دیا تھا کہ آج سے اسے عبدالحق کے ساتھ ناشتہ کرنا

ہوگا۔

عبدالحق صبح حمیدہ کو سلام کرنے کے لئے آیا تو حمیدہ نے اسے روک لیا۔

''اب تو میرے ساتھ ناشتہ کیا کر پتر!''

''آپ نے ابھی ناشتہ نہیں کیا؟'' عبدالحق نے حیرت سے پوچھا۔ کیونکہ روز وہ پہلے ہی ناشتہ کر چکی ہوتی تھی۔

''نہیں! اب روز تیرے ساتھ ہی ناشتہ کیا کروں گی۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے اماں!'' عبدالحق شرمندہ ہونے لگا۔

''آپ کی تو عادت ہے بہت پہلے ناشتہ کرنے کی۔''

''اب اس وقت کی عادت ہو جائے گی۔ دوپہر کو تیرے ساتھ کھانا کھانے کی عادت بھی تو تھی۔ عادتیں تو بدلنی پڑتی ہیں آدمی کو۔''

اسی وقت نسیمہ ناشتے کی ٹرالی لے آئی۔

''آج تو کوئی نئی چیز نظر آ رہی ہے۔'' عبدالحق نے ٹوسٹ دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا بنایا ہے نسیمہ!''

''پتا نہیں صاحب!''

عبدالحق اس کے جواب پر حیران ہو رہا تھا کہ حمیدہ نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''یہ میری نکی نے بنایا ہے!''

عبدالحق کے لئے وہ ایک اور حیرت تھی۔

''ارے......! اسے یہ سب کرنا بھی آتا ہے؟''

''ہر چیز سیکھنے کی کوشش کرتی ہے نکی!''

''تو اسے بھی تو بلائیں ناشتے پر۔ وہ بھی تو ہر روز آپ کے ساتھ ہی ناشتہ کرتی تھی۔''

حمیدہ نے نسیمہ سے کہا کہ وہ ارجمند کو بھیج دے۔

عبدالحق نے چائے کی پیالی حمیدہ کے سامنے رکھی اور پلیٹ پر ٹوسٹ رکھ دیا۔

''لیجئے اماں!'' اس نے کہا۔ خود وہ خوفزدہ تھا کہ نہ جانے ارجمند نے کیا تجربہ کیا ہوگا۔

حمیدہ نے ٹوسٹ کا ٹکڑا منہ میں رکھا اور بے ساختہ بولی۔

''واہ......! بہت مزے کا ہے۔ سواد آ گیا۔''

عبدالحق کو حوصلہ ہوا۔ اس نے بھی ٹوسٹ لیا۔ وہ واقعی بہت مزے کا تھا۔ بالکل نئی چیز۔ وہ خوش ہو گیا۔

ارجمند پلیٹ میں ٹوسٹ لے کر آئی۔

''آ نکی! تو بھی بیٹھ جا۔'' حمیدہ نے کہا۔

ارجمند بیٹھ گئی۔ عبدالحق نے کہا۔

''تم نے تو کمال کر دیا ارجی! یہ سب کچھ بھی آتا ہے تمہیں؟''

''جی......! سیکھ رہی ہوں۔'' ارجمند نے آہستہ سے کہا۔

''تو بتا، پڑھنے میں کیسی ہے میری نکی؟ سکول میں داخلہ ہو جائے گا نا اس کا؟'' حمیدہ نے عبدالحق سے کہا۔

''مجھے تو حیرت ہوتی ہے اماں! یہ اتنا جلدی سیکھتی ہے کہ کیا بتاؤں؟ اس کے داخلے میں کوئی دُشواری نہیں ہوگی۔''

حمیدہ نے محبت سے ارجمند کو دیکھا۔

''جس گھر میں بھی جائے گی میری نکی، وہ روشن ہو جائے گا۔''

''میں یہاں بہت خوش ہوں اماں!'' ارجمند نے اداسی سے کہا۔

''کیا آپ مجھے یہاں سے نکال دیں گی؟''

حمیدہ کو اس کی معصومیت پر اور پیار آیا۔

''لڑکیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں نکی! ہر ایک کو جانا ہوتا ہے ایک دن۔ قدرت کا قانون ہے نا! میرے بس میں ہو تو تجھے جانے ہی نہ دوں کبھی۔''

''تو سب سے بڑی آپ ہی ہیں دادی اماں! آپ روکیں گی تو مجھے

کوئی نہیں نکال سکے گا۔''

عبدالحق اس گفتگو سے کھسیا رہا تھا۔ ناشتہ کر کے وہ دفتر چلا گیا۔

ارجمند نے نسیمہ سے کہہ دیا کہ نور بانو کا ناشتہ بھی وہی بنائے گی۔ پھر وہ اپنی کتابیں اور کاپیاں لے کر اسٹڈی میں آ گئی۔ ذرا دیر میں وہ پڑھائی میں منہمک ہو گئی۔

پھر نور بانو کی آواز نے اسے چونکا دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے باورچی خانے کی طرف جاتے دیکھا تو نور بانو نے کہا۔

''کہاں چلی ارجی!''

''آج سے ناشتہ میری ذمہ داری ہے آپی!''

ارجمند کو اس خدمت کا صلہ بھی فوراً ہی مل گیا۔ نور بانو نے فرنچ ٹوسٹ کی تعریف کی۔

''یہ تم نے کہاں سے سیکھا ارجی!''

''شاہانہ باجی سے۔ اچھا ہے نا آپی!''

''ہاں! اچھا ہے۔ مگر اس سے ملتی جلتی ایک دیسی چیز مجھے بنانی آتی ہے۔ کھاؤ تو انگلیاں چاٹتی رہ جاؤ۔ یہ تو انگریزی ترکیب ہے نا! ہمارے دیسی کھانوں سے اچھے نہیں ہو سکتے ان کے کھانے۔''

''مجھے بتائیں نا آپی!'' ارجمند نے اشتیاق سے کہا۔

''انہیں شاہی ٹکڑے کہتے ہیں۔ مگر وہ بہت جلدی نہیں بنتے۔ محنت بھی زیادہ کرنی ہوتی ہے۔ اور وقت بھی زیادہ لگتا ہے۔''

ارجمند نے جھٹ ایک کاپی کھولی اور قلم سنبھال لیا۔

''آپ ترکیب تو بتائیں آپی!''

''لو...... تو لکھو گی کیا؟''

''جی آپی! میں تو ہر کھانے کی ترکیب لکھ لیتی ہوں۔ یہ کاپی میں نے مخصوص کر لی ہے اس کے لئے۔''

نور بانو بتاتی رہی اور ارجمند نوٹ کرتی رہی۔

''ٹھیک ہے آپی! کل تو نہیں، دو چار دن بعد میں آپ کو ناشتے میں کھلاؤں گی شاہی ٹکڑے۔'' اس نے کہا۔

''دیکھیں گے!'' نور بانو نے گیا چیلنج کیا۔

❁ ❁ ❁

دوسرا ہفتہ شروع ہونے کے بعد عبدالحق اس زندگی کا عادی ہو گیا۔ دفتر اس کے لئے ایک جز وقتی گھر بن گیا اور دفتر کے ساتھی گھر کے افراد جیسے لگنے لگے۔ مسعود صاحب تو ویسے ہی اس کے لئے گھر کے بزرگ تھے۔

اس کا پرسنل اسٹاف بہت اچھا تھا۔ ذوالفقار بہت کم گو اور بہت محنتی تھا۔ کام میز پر چھوڑ کر گھر جانا اسے گوارا ہی نہیں تھا۔ تین بار ایسا ہوا کہ عبدالحق عصر کی نماز پڑھ کر گھر جانے کے لئے دفتر سے نکلا تو ذوالفقار بیرونی کمرے میں ٹائپنگ میں مصروف تھا۔

''کیوں بھئی! گھر نہیں جانا؟'' عبدالحق نے اس سے پوچھا۔

ذوالفقار جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''جی سر!'' اس نے شاید اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔

''سنو! ہر بار میری آمد پر تمہیں کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں۔'' عبدلاحق نے زور دے کر کہا۔

''اور خاص طور پر کام کرتے وقت۔''

''یس سر!'' ذوالفقار نے کہا اور بیٹھ گیا۔ مگر انداز ایسا تھا جیسے بھاگ کھڑا ہو گا۔

''آپ کچھ کہہ رہے تھے سر!''

عبدالحق نے اپنی بات دہرائی۔

''آج کا کام کل پر چھوڑنا اچھا نہیں لگتا جناب! کام مکمل کر کے ہی جاؤں گا۔''

''لیکن میں نے تو تمہیں کوئی لمبا کام دیا ہی نہیں۔ میرا کام تو تم ٹائپ کر کے میری میز پر رکھ چکے ہو۔'' عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

''وہ اجمل صاحب کے پی۔ اے کے پاس کام زیادہ ہوتا ہے نا سر! تو وہ مجھے دے دیتے ہیں۔''

''اوہ.....! ٹھیک ہے۔'' عبدالحق باہر نکل آیا۔

باہر نکل کر وہ خاص طور پر اجمل صاحب کے دفتر کی طرف گیا۔ لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

ان دن دنوں میں عبدالحق نے بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔ اگر تمام سرکاری دفاتر کا ماحول ایک سا ہوتا ہے تو پھر یہ خرابی ہر جگہ عام ہوگی۔ اس نے دیکھا تھا کہ یہاں جو شخص اپنے کام کے ساتھ مخلص ہو، اس سے دوسرے لوگ ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب یہ ذوالفقار کی مثال سامنے تھی۔ وہ دفتر کا وقت ختم ہونے کے بعد جس شخص کا کام نمٹا رہا تھا، وہ خود بے فکری سے گھر جا چکا تھا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ کل اس سلسلے میں کچھ کرے گا۔ اپنے ماتحتوں کو استحصال سے بچانا اس کی ذمہ داری تھی۔ ورنہ ایک دن ایسا ہوگا کہ ذوالفقار بھی یہی روش اختیار کرے گا۔ یہ تو اچھے لوگوں کو بگاڑنا ہوا۔

پلٹ کر وہ مسعود صاحب کے دفتر کی طرف آ رہا تھا کہ دوسری طرف سے شمریز آتا دکھائی دیا۔

''ارے! تم بھی نہیں گئے ابھی تک۔''

''بابو صاحب کو چھوڑ کے کیسے جاؤں صاحب!''

یہ دوسرا بھی ویسا ہی ہے، اللہ کا شکر ہے۔ عبدالحق نے دل میں سوچا۔

راستے میں اس نے مسعود صاحب سے اس سلسلے میں بات کی۔

''ہاں! وہ دونوں ہی بہت اچھے ہیں۔'' مسعود صاحب نے اس کی بات سن کر کہا۔

''میں نے خاص طور پر انہیں تمہارے لئے منتخب کیا تھا۔''

''یہ کیسی تربیت ہے چچا جان!'' اس نے شکایت کی۔

''آپ پہلے مجھے نکمے لوگ دیتے، تاکہ میں ان سے نمٹنا سیکھتا۔''

مسعود صاحب ہنسے۔

''اچھوں کو دیکھنے کے بعد ہی تو بروں کی برائی کو پوری طرح سمجھ سکو گے۔ ویسے نکموں اور حرام خوروں کی تو بھرمار ہے یہاں۔ لوگ سرکاری ملازمت میں اس لئے آتے ہیں کہ عیش کریں۔ ابھی تم نے دیکھا کیا ہے؟ زیادہ تر لوگ دیر سے آتے ہیں اور وقت سے پہلے گھر چلے جاتے ہیں۔''

''تو ان کے خلاف کارروائی کرنی چاہئے۔''

''یاد رکھو، ماتحت اپنے افسروں کے ہی نقش قدم پر چلتے ہیں، انہی سے سب کچھ سیکھتے ہیں۔ ہاں کارروائی پر یاد آیا۔ کل میں تمہیں سروس رولز کی کاپی بھجوا دوں گا۔ اسے دیکھ لینا۔ کام آئے گا۔''

''لیکن چچا جان! میرے کلرک کے ساتھ جو زیادتی ہو رہی ہے۔''

''اسے روکنا تمہارا کام ہے، میرا نہیں!'' مسعود صاحب نے بے رخی سے کہا۔

''اپنے ماتحتوں کو تو تمہیں ہی پروٹیکٹ کرنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے چچا جان!''

❁ ❁ ❁

ارجمند کو امید تھی کہ حمیدہ کے سمجھانے کے بعد نور بانو میں تبدیلی آئے گی۔ لیکن کئی دن گزر گئے اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہر روز وہ یہی سوچتی کہ نہ جانے آغا جی نے کیا کھایا ہوگا۔ کچھ کھایا بھی ہوگا یا نہیں۔

آخر اس نے نور بانو سے بات کر ہی لی۔

''آپی! میں سوچتی ہوں، دوپہر کا کھانا میں پکا لیا کروں۔''

''نسیمہ پکا تو لیتی ہے۔''

''میں نے ترکیبیں تو لکھ لی ہیں۔ لیکن پکائے بغیر تو کچھ نہیں آئے گا آپی!''

''تو ٹھیک ہے۔ اس میں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''ایک بات اور..... آپ اجازت دیں تو آغا جی کو بھی کھانا بھجوا دیا

کروں۔''

پہلی بار نور بانو کے کان کھڑے ہوئے۔

''یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟''

''وہاں کہیں باہر کا کھانا کھاتے ہوں گے۔ اچھا تو نہیں ہوتا ہوگا۔ گھر میں پک رہا ہے تو ان کے لئے بھی چلا جائے۔''

نور بانو اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

''تو یوں کہو کہ تم میرے میاں پر ہاتھ صاف کرنا چاہتی ہو۔'' اس نے کہا۔

''جی نہیں آپی!'' ارجمند نے معصومیت سے کہا۔

''اب اتنا برا تو نہیں پکاؤں گی میں کہ کسی پر ہاتھ صاف کرنا کہلائے۔''

نور بانو کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ اس کی کہی ہوئی رکیک بات کو ارجمند نے کسی معصومیت سے ایک محاورے کے حوالے سے خوش گوار بنا دیا تھا۔ اسے خود پر شرم بھی آئی۔ یہ وہ لڑکی تھی، جسے وہ اپنی مرحوم بہن کا مقام دیتی تھی۔ اتنی مدت میں پہلی بار اس کا سفلہ پن ابھر کر آیا تھا، اور یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

''اب بھی تم جانو اور تمہارے آغا جی جانیں۔'' اس نے خوش دلی سے کہا۔

''میں کیوں بیچ میں پڑوں؟''

یوں ارجمند نے عبدالحق کے ساتھ گزارا جانے والا وہ وقت عبدالحق کے ہی نام کر دیا۔ اس نے سوچا۔ پڑھائی کے لئے سہ پہر کا وقت اچھا رہے گا۔ اسے کھانے پکانے کا شوق بھی بہت تھا۔ پھر کھانا، اور وہ بھی آغا جی کے لئے، یہ تو دہری خوشی تھی۔

پہلے دن اس نے کھانا پکایا تو اسے پھپھو یاد آگئیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کتنی محنت کرتی ہیں پھپھو۔ کپڑوں کی سلائی کڑھائی پھر دونوں وقت کھانا پکانا۔ اور اسے پڑھانے کے لئے بھی وقت نکالتی تھیں۔ آرام کرنے کے لئے وقت ہی کہاں ملتا تھا انہیں۔ اور ایک دن اس نے یہ بات کہی تو بولیں۔

تمہیں نہیں معلوم ارجی! کہ ان کاموں میں کیسی راحت ملتی ہے؟ یہی تو عورت کی زندگی ہے۔

وہ ان سے اصرار کرتی تھی کہ اسے بھی کھانا پکانا سکھائیں تو وہ کہتی تھیں، وقت آنے پر سکھاؤں گی۔ ابھی تم پر کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی۔ اللہ تمہارا نصیب اچھا کرے۔ کون جانے کہ آنے والے وقت میں تم پر کتنی ذمہ داری ہو؟

پھر بھی وہ ان سے پوچھتی رہتی تھی، اور جو وہ بتاتیں، اسے کاپی میں لکھ لیتی۔ یہ ترکیبیں نوٹ کرنے کی عادت وہیں سے تو پڑی تھی اسے۔ اس کاپی میں پھپھو کی بتائی ہوئی کتنی ہی ترکیبیں لکھی تھیں۔

سو اب وہ پھپھو اور آپی، دونوں ہی کی ترکیبوں سے استفادہ کر سکتی تھی۔

اس روز کھانا پکاتے ہوئے وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ پھپھو کو یاد کرتی رہی۔ پھپھو ہمیشہ کہتی تھیں۔ بھئی! آدمی گیارہ بجے تک کھانا پکا کر فارغ ہو جائے تو پورا دن بچ جاتا ہے۔ اب رات کا کھانا تو ہلکا ہی ہوتا ہے نا! رات کو مرغن کھانے اچھے نہیں لگتے۔

آغا جی کے لئے کھانا بھجوانے کے خیال کو تحریک اسی بات سے ملی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ وہ دن میں تو دفتر میں ہوتے ہیں۔ باہر کا کھانا کھاتے ہیں۔ اور رات کو کھانا ہلکا ہوتا ہے۔ یہ اسے آغا جی کے ساتھ زیادتی لگتی تھی۔

اس نے کھانا تیار کیا اور ٹفن میں رکھا۔ ٹفن لے کر وہ باہر آئی۔ گھڑی میں وقت دیکھا تو گیارہ بجنے والے تھے۔ اس نے نسیمہ کی بیٹی رضیہ سے کہا کہ جا کر یعقوب کو بلا لائے۔

نور بانو ابھی سو کر نہیں اٹھی تھی۔ رات کو مطالعے کے بعد اسے نیند اور گہری آئی تھی۔

ذرا دیر بعد رضیہ نے آکر اسے بتایا کہ یعقوب آگیا ہے، اور دروازے پر کھڑا ہے۔ وہ اندر کبھی نہیں آتا تھا۔

ارجمند دروازے کی طرف چلی گئی۔ اس نے یعقوب کو ٹفن دیتے ہوئے

کہا۔

''یہ کھانا صاحب کو دے کر آنا ہے۔''

''کہاں بے بی صاحب؟''

''صاحب کہاں جاتے ہیں ہر روز؟''

''اپنے آفس!''

''تو کھانا بھی وہیں دے کر آنا ہے مسٹر جیکب!''

مسٹر جیکب پکارے جانے پر یعقوب کے دانت نکل پڑے۔

''تھینک یو بے بی صاحب! یس بے بی صاحب!'' یہ کہہ کر وہ جانے لگا۔

کچھ خیال آیا تو ارجمند نے اسے پکارا۔

''سنو مسٹر جیکب!''

یعقوب پلٹ کر آیا۔

''جی بے بی صاحب!''

''صاحب کو بولنا کہ کھانا میم صاحب نے بھجوایا ہے۔''

''لیکن ہم جھوٹ......''

ارجمند نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

''مسٹر جیکب! کیا تم آرڈر کے خلاف کام کرتا.....'' اس نے اسی کے انداز میں کہا۔

اور یہ یعقوب کی کمزوری تھی۔

''نہیں بے بی صاحب! جو آپ کا آرڈر! میں ہمبل سرونٹ۔''

''ٹھیک ہے، جاؤ!'' ارجمند اندر چلی گئی۔

یہ وہ وقت تھا، جب نور بانو بیدار ہوئی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق نے ذوالفقار کو کمرے میں بلایا اور بیٹھنے کو کہا۔

''شمریز کو بھیج کر اجمل صاحب کے پی۔ اے کو بلاؤ۔ کیا نام ہے اس

کا؟''

''آفتاب، سر! لیکن آپ کیوں بلا رہے ہیں انہیں؟''

''تم خود ہی دیکھ لینا۔ اب تم کھڑے ہو جاؤ، اوراس کے رخصت ہونے تک کھڑے ہی رہنا۔'' عبدالحق نے گھنٹی بجائی، شمریز اندر آیا تو اس نے کہا۔

''شمریز! اجمل صاحب کے پی۔ اے سے کہنا کہ میں بلا رہا ہوں۔''

''جی سر!''

شمریز کے جانے کے بعد ذوالفقار عبدالحق کی ہدایت کے مطابق کھڑا ہوگیا۔ دو منٹ بعد اجمل کا پی۔ اے شمریز کے ساتھ آگیا۔ سلام کر کے وہ کرسی پر بیٹھنے لگا تو عبدالحق نے اسے ٹوک دیا۔

''میں نے آپ کو بیٹھنے کے لئے نہیں کہا ہے آفتاب!''

آفتاب کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔

''سوری سر! آپ نے مجھے کیسے یاد کیا سر؟''

''میرا خیال ہے کہ آپ کے آفس میں کام بہت زیادہ ہے۔ شاید ضرورت سے زیادہ بوجھ ہے آپ پر؟''

''جی سر! کچھ زیادہ تو ہے۔'' آفتاب نے محتاط لہجے میں کہا۔

''تو میں اجمل صاحب سے اسٹاف میں اضافے کے سلسلے میں بات کروں؟''

آفتاب بوکھلا گیا۔

''اس کی ضرورت نہیں سر! میں کام چلا لیتا ہوں۔''

''لیکن جس انداز میں آپ کام چلاتے ہیں، وہ مجھے پسند نہیں۔'' عبدالحق نے سخت لہجے میں کہا۔

''میں سمجھا نہیں سر!''

''میں نے کل دیکھا کہ ذوالفقار آفس ٹائم کے بعد یہاں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اور وہ کام آپ کا تھا۔''

''اس کے پاس کام نہیں تھا، اور میرے پاس زیادہ کام تھا، اس لئے میں نے اسے دے دیا تھا۔''

''کیا آپ کا یہ حق ہے اس پر؟''

''میں اسٹینو ہوں سر! اور یہ ایل۔ ڈی۔ سی۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ میرا ماتحت ہے، تمہارا نہیں۔''

''میں نے تو اس سے ریکوسٹ کی تھی سر! اور یہ بھی نہیں کہا تھا کہ آفس ٹائم کے بعد بھی کام کرتا رہے۔'' آفتاب کا انداز مدافعانہ ہوگیا۔

''اور میں تمہارے دفتر کی طرف گیا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ تم بھی نہیں تھے۔''

''چھٹی کے وقت میں چلا گیا تھا سر!''

''حالانکہ تمہارا کام باقی تھا، جو کہ ذوالفقار آفس ٹائم کے بعد کر رہا تھا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ تم خود آفس ٹائم کے بعد رک کر اپنا کام نمٹاتے یا پھر چھٹی کے وقت اپنا نامکمل کام ذوالفقار سے واپس لے جاتے۔ ان فائلوں کو میرے آفس میں تو نہیں ہونا چاہئے نا؟'' عبدالحق نے سامنے رکھی اس کے دفتر کی فائلوں کو تھپ تھپایا۔

''یس...... یس سر!''

''میں نے اس بار تو ذوالفقار کو معاف کر دیا ہے۔ لیکن اگلی بار ایسا ہوا تو اسے شوکاز نوٹس دے دوں گا۔ اور رہی تمہاری بات، تو تم اپنی خود جانو۔ کام زیادہ ہے تو دیر تک بیٹھ کر کام کرو یا اجمل صاحب سے ایک اسسٹنٹ مانگو۔ کہو تو میں ان سے بات کروں۔''

''اس کی ضرورت نہیں سر!''

''آئندہ ایسا نہ ہو۔ ورنہ میں تم سے نہیں، اجمل صاحب سے بات کروں گا۔ اب یہ فائلیں لے جاؤ یہاں سے۔''

آفتاب کے جانے کے بعد عبدالحق نے ذوالفقار سے کہا۔

''ہاں! اب بیٹھ جاؤ، کچھ سمجھ میں آیا؟'' ذ

''اس کی غلطی نہیں تھی سر! میں نے خود اس سے کہا تھا۔''

''یہی تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آفس کا ڈسپلن بہت اہم ہوتا ہے۔ وہ اسٹینو ہے اور تم ایل۔ ڈی۔ سی۔ یہ درجے اور تنخواہ کا فرق ہے۔ تم اس کے ماتحت نہیں۔ تم اسے نہیں، مجھے جواب دہ ہو۔ یوں تم میری اجازت کے بغیر کسی اور کا کام نہیں کر سکتے۔ اگر تم ایسا کرو گے تو آفتاب جیسے لوگ تمہیں بے دردی سے استعمال کریں گے۔ یوں تم ان کی حرام خوری میں اضافے کا سبب بنو گے۔ وہ عیش کریں گے اور اپنا کام تم پر ڈال دیں گے۔ اور زیادہ نکمے ہو جائیں گے۔ یہ تو قومی نقصان ہوا نا! اور اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔ اس کے علاوہ وہ موقع بہ موقع تم کو کم تر کہہ کر دبائیں گے۔ ڈسپلن خراب ہوگا، تم اعتماد سے محروم ہو جاؤ گے اور وہ ضرورت سے زیادہ پُراعتماد ہو جائیں گے۔ دفتری طور پر تمہیں اپنے اور دوسروں کے حقوق کا علم ہونا چاہئے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کون سے مقامات ہیں، جہاں تم میرا حکم ماننے سے بھی انکار کر سکتے ہو۔''

ذوالفقار ہونق ہوگیا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے کہا۔

''میرے پاس کام نہیں ہوتا سر! تو میں خود کو مجرم سمجھنے لگتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں حرام خوری کر رہا ہوں اور پھر مجھے نکمے پن کی عادت ہو جائے گی۔''

''اس انداز میں سوچنے والا آدمی کبھی حرام خور نہیں ہو سکتا۔ بہر حال کام نہ ہونے کی شکایت ہو تو مجھ سے بات کرو۔''

''جی سر......!''

''تعلیم کہاں تک ہے تمہاری؟''

''میٹرک کیا ہے سر!'' ذوالفقار نے شرمندگی سے کہا۔

''تو آگے پڑھو، کتابیں ساتھ لاؤ۔ دفتر میں مصروفیت نہ ہو تو یہاں بیٹھ کر پڑھو۔ تم جیسے لوگوں کو تو آگے جانا چاہئے۔'' عبدالحق نے مسعود صاحب کی بھیجی ہوئی آفس رولز کی کاپی اس کی طرف بڑھائی۔

"فی الحال یہ دفتری کام ہے۔ بہت اچھی طرح اسے پڑھو، اپنی حیثیت، حقوق اور فرائض کو سمجھو۔ پھر میں اسے پڑھوں گا اور بعد میں ہم اس پر ڈسکس کریں گے۔ اب جاؤ!"

ذوالفقار بیرونی کمرے میں چلا گیا۔ عبدالحق کچھ سوچ رہا تھا۔ اس نے ذوالفقار کو جو مشورہ دیا تھا، اس نے خود اسے بھی چونکا دیا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال تھا، اس نے سوچا، شام کو وہ اس پر مسعود صاحب سے بات کرے گا۔

وہ ایک فائل میں الجھا ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ شمریز خان اندر آیا۔

"آپ کا ڈرائیور آیا ہے صاحب!"

عبدالحق پریشان ہوگیا۔ خیر تو ہے۔ یعقوب کی یہ بے وقت آمد۔ اس کے دل کی دھڑکن کچھ بے ربط ہوگئی۔

"بھیج دو اسے۔"

شمریز خان گیا اور اگلے ہی لمحے یعقوب اندر آ گیا۔

"خیریت تو ہے یعقوب!" عبدالحق نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"آل رائٹ سر! لنچ فور یو!" یعقوب نے ٹفن اس کے سامنے رکھ دیا۔

عبدالحق کو حیرت ہوئی۔ پریشانی میں اسے ٹفن نظر ہی نہیں آیا تھا، جو کہ یعقوب کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ حیرت دور ہوئی تو وہ اس بات پر حیران ہوا کہ اس کے لئے کھانا آیا ہے، گھر سے، مگر وہ خوش گوار حیرت تھی۔

"کس نے بھیجا ہے؟" اس نے یعقوب سے پوچھا۔

"میم صاحب نے سر!"

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔"

عبدالحق کام میں مصروف ہوگیا۔ ایک بجنے میں پانچ منٹ پر اس نے مسعود صاحب سے انٹرکام پر رابطہ کیا۔

"آج میرے گھر سے بھی کھانا آ گیا ہے سر!"

"مبارک ہو۔ تو کیا اب کھانا اپنے آفس میں ہی کھاؤ گے؟"

"نہیں سر! میں تو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اب کھانا زیادہ ہو جائے گا۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ تمہارے آنے سے پہلے میں اپنے کھانے میں سے اپنے اسٹاف کو دیتا تھا۔ آج پھر ان کا بھلا ہو جائے گا۔ اور ایسے ہی تم اپنے اسٹاف کا بھلا کر دو۔"

"رائٹ سر!"

"بس تو میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" مسعود صاحب نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

عبدالحق نے شمریز کو بلا کر ٹفن اس کی طرف بڑھایا۔

"دو روٹیاں اور تھوڑا سا سالن میرے لئے نکال دو۔ باقی تمہارے اور ذوالفقار کے لئے ہے۔"

شمریز خان نے بڑی شکرگزاری سے اسے دیکھا۔

وہ عبدالحق کے لئے بہت بڑی خوشی تھی۔ نور بانو نے اس کے لئے اہتمام کیا، کھانا پکایا اور بھیجا۔ اس نے کبھی کہا تو نہیں تھا۔ لیکن اسے یہ خیال ضرور ستاتا تھا کہ نور بانو کو اس کی پرواہ نہیں ہے۔

اور جب مسعود صاحب نے کھانے کی تعریف کی تو اس کی خوشی دو چند ہوگئی۔

"یہ بات تو ماننے والی ہے بھئی! کہ نور بیٹی کے ہاتھ میں ذائقہ ہے۔" مسعود صاحب نے کہا۔

"اور سچ یہ ہے کہ آج تمہارے لئے گھر سے کھانا آیا ہے تو مجھے بہت زیادہ خوشی ہوئی ہے۔ جانتے ہو کیوں؟"

"اس لئے کہ اس سے آپ کے اور میرے اسٹاف کا بھلا ہوگا۔"

"نہیں! دراصل مجھے ملال ہوتا تھا کہ نور بیٹی نے تمہارے نئے معمولات کے ساتھ مطابقت نہیں پیدا کی۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ اپنے ہی معمولات میں گم ہے۔ جبکہ ایسا ہونا نہیں چاہئے۔ میاں بیوی کو ایک دوسرے کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ خود کو ایک دوسرے کی ضروریات کے مطابق ڈھالنا ہوتا ہے۔ لیکن مجھے

یہ خیال نہیں آیا کہ بڑی تبدیلیوں میں وقت لگتا ہے۔ نور بیٹی نے میرا دل خوش کر دیا۔''

وہ عبدالحق کے لئے ایک اور خوشی تھی۔ اسے نور بانو پر فخر کا احساس ہوا۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ دوسرے بھی ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور کرتے ہیں، اور ان سے نتائج بھی اخذ کرتے ہیں۔

نور بانو نے اس کی اور اپنی عزت رکھ لی تھی۔

❁ ❁ ❁

اس رات جب وہ سونے کے لئے لیٹے تو عبدالحق نے نور بانو کا ہاتھ تھام کر بڑی محبت سے کہا۔

''میں تمہارا شکرگزار ہوں نور بانو!''

''ارے! ایسا کیا کر دیا میں نے؟''

''بعض کام کرنے والوں کو چھوٹے اور غیر اہم لگتے ہیں۔ لیکن جن کے لئے کئے جائیں، ان کے نزدیک بڑے اور اہم ہوتے ہیں۔''

''کیوں پہیلیاں بجھوا رہے ہیں؟''

''تم نے جو آج کھانا بھجوایا، میں اس کی بات کر رہاں ہوں۔''

وہ خواب گاہ کا اندھیرا تھا، جس نے پردہ رکھ لیا۔ ورنہ نور بانو کی حیرت چھپنے والی نہیں تھی۔ تاہم اس نے بڑی تیزی سے خود پر قابو پا لیا۔

''اوہو! اس میں کیا خاص بات ہے؟'' اس نے اقرار نہ انکار والے انداز میں کہا۔

''میرے لئے اس کی اہمیت ہے۔ یہ تم نہیں سمجھ سکو گی۔''

نور بانو کے اندر اپنے لئے ملامت اُبھری۔ وہ واقعی اس بات کی اہمیت نہیں سمجھتی تھی۔ لیکن جب شوہر کے لئے ایک بات کی اہمیت ہو تو پھر اسے اہم ہی سمجھنا چاہئے۔ یہ بات تو اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس نے سوچا، اس کوشش کرے گی کہ ہر روز عبدالحق کو کھانا دفتر بھجوائے۔

''یہ بتائیں، کیسا لگا آپ کو؟''

''بہت اچھا! جیسا تم ہمیشہ پکاتی ہو، اس سے بہت اچھا۔ یوں سمجھ لو، اتنا اچھا تم نے پہلے کبھی نہیں پکایا۔''

''واہ! کمال ہے۔'' نور بانو نے کہا۔

''اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی، آپ کا کیا خیال ہے؟'ز

''کھانا محبت سے پکایا جائے تو اس کا ذائقہ بہت بڑھ جاتا ہے۔''

ہاں، یہ تو ہے۔ نور بانو نے دل میں سوچا۔ بلاشبہ ارجی ہر کام بڑی محبت سے کرتی ہے۔ اور اس نے عبدالحق سے کہا۔

''مجھے خوشی ہے کہ آپ کو اس سے خوشی ملی۔''

عبدالحق نے ہاتھ بڑھا کر بڑی نرمی سے اسے چھوا۔ وہ محبت اور خوشی کو کئی گنا بڑھا کر واپس دینے والا آدمی تھا۔

پھر جب عبدالحق سو گیا تو نور بانو کو اس پر سوچنے کا موقع ملا۔ اس معاملے نے اس پر سوچوں کے کئی دروازے کھول دیئے تھے۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سو وہ اندھیرے میں لیٹ کر سکون سے سوچ سکتی تھی۔

حمیدہ نے یہ بات اسے سمجھائی تھی کہ محبت اور ازدواجی زندگی، دونوں میں خیال رکھنے کی کتنی اہمیت ہوتی ہے۔ اس نے اسی بات کی تلقین کی تھی لیکن اس نے اسے نظرانداز کر دیا تھا۔ مگر اب اس کی سچائی اور اہمیت اس پر روشن ہوگئی تھی۔

اب یہ تو اس کی خوش قسمتی تھی کہ ارجمند کو کھانا پکانے کا شوق ہوگیا۔ اور شاید اعتماد کی کمی کی وجہ سے اس نے رات کا کھانا پکانے کے بجائے دن کا انتخاب کیا۔ اور قدرتی بات ہے کہ اسے عبدالحق کو کھانا بھیجنے کا خیال آیا۔

اب سوال یہ تھا کہ عبدالحق نے یہ کیوں سمجھا کہ کھانا اس نے ہی بھیجا ہے۔ اس کے کئی ممکنہ جواب تھے۔ پہلا یہ کہ اس نے خود ہی یہ فرض کر لیا ہوگا۔ اسے تو یہ معلوم بھی نہیں ہوگا کہ ارجمند کو کھانا پکانا آتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ عبدالحق نے یعقوب سے پوچھا ہوگا اور ارجمند نے یعقوب کو کھانا نسیمہ کے ہاتھ بجھوایا ہوگا۔ تو یعقوب نے اپنے طور پر یہ فرض کر لیا ہوگا کہ کھانا میم صاحب نے

بھجوایا ہے۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہ بات نسیمہ نے اس سے کہی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود ارجمند نے ہی اس کا نام استعمال کیا ہو۔

اب اس وقت تو یہ معاملہ صاف نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ چھان بین تو کل ہی ہوسکتی تھی۔

اس نے کروٹ بدلی اور آخری بات پر غور کرنے لگی۔ ارجمند نے اس کا نام استعمال کیا تو کیوں؟

اس کا جواب بہت آسان تھا۔ ابھی ارجمند کو اپنی صلاحیت پر اعتماد نہیں تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اس کا نام استعمال کرے، تاکہ کھانے میں کوئی کمی یا خرابی ہو تو عبدالحق اس کی محبت کی وجہ سے خاموشی سے برداشت کرلے۔

ایک لمحے کو اسے برا لگا۔ یہ تو بہت بری بات ہے کہ ارجمند اسے اس طرح استعمال کرے۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کی ناگواری دور ہوگئی۔ اس سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ ارجمند سے کیسی محبت کرتی ہے۔ ورنہ یہ حرکت تو وہ کسی کی بھی برداشت نہ کرتی۔

ارجمند بچی ہی تو ہے۔ اس نے سوچا۔ بچے ڈانٹ سے ڈریں تو اس بڑے ہی کو تو آگے کرتے ہیں، جو ان سے محبت کرتے ہوں اور جن سے وہ محبت کرتے ہوں۔

ایک لمحے کو اسے یہ خیال بھی آیا کہ یہ ارجمند کا ایثار بھی تو ہوسکتا ہے۔
لیکن اس نے اس خیال کو فوراً ہی ذہن سے جھٹک دیا۔

وہ سونے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ اس نے سوچا کہ صبح وہ جلدی اٹھے گی، اور وہ سب کچھ کرے گی، جس کی حمیدہ نے نصیحت کی تھی۔ لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ صبح اٹھنے کے خیال سے مایوس ہوتی جا رہی تھی۔

اور جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ صبح سویرے نہیں اٹھ سکے گی تو اس نے دل میں سوچا کہ عبدالحق کی محبت ان سب باتوں سے بلند اور بے غرض ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن سونے سے پہلے کی عبدالحق کی محبت اور اس کی گرم

جوشی اس بات کی تردید کر رہی تھی۔

بہرحال اس سے سویا نہیں گیا تو وہ اٹھی اور دبے پاؤں اسٹڈی کی طرف چل دی۔

❁ ❁ ❁

صبح وہ اپنے معمول سے بھی دیر سے اٹھی۔ اس لئے کہ وہ رات کو اور دیر سے سوئی تھی۔

غسل خانے میں نہاتے ہوئے وہ سوچتی رہی کہ کھانے والے معاملے کی تفتیش کس طرح کرے؟ پہلے نسیمہ سے پوچھے۔ لیکن ممکن ہے کہ نسیمہ کو اس بات کا علم یہ نہ ہو۔ یعقوب سے پوچھا جائے؟ لیکن پھر اس کی سمجھ میں بات آگئی۔ نوکروں کو اس معاملے میں ملوث کرنا ٹھیک نہیں۔ جب ارجمند سے حقیقت معلوم ہوسکتی ہے تو نوکروں کو منہ لگانے کی کیا ضرورت ہے؟

اور جب اس نے ارجمند سے پوچھا تو اسے خوشی ہوئی کہ اس کا فیصلہ درست تھا۔

وہ ناشتہ کر رہی تھی اور ارجمند اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

''ارجی! تم نے اپنے آغا جی کو کھانا بھجوا دیا؟'' اس نے ارجمند سے پوچھا۔

''جی آپی!''

''نسیمہ کے ہاتھ بھجوایا ہوگا؟'' اس نے بے حد سرسری انداز میں استفسار کیا۔

ارجمند نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''نہیں آپی! یہ کام تو یعقوب ہی کرسکتا ہے نا!''

''تم میرا مطلب نہیں سمجھیں۔ میرا مطلب تھا کہ یعقوب کے پاس تم نے نسیمہ کو بھیجا ہوگا ٹفن دے کر؟''

''نہیں آپی! میں نے خود ٹفن دیا تھا اسے۔''

''اور تم نے کچھ کہا بھی تھا اس سے؟''

''جی! میں نے کہا تھا کہ صاحب پوچھیں تو کہنا کہ کھانا میم صاحب نے بھجوایا ہے۔''

''نور بانو اب اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

''یعنی میں نے......؟''

''جی آپی!''

''اور ایسا کیوں کیا تم نے؟ جبکہ کھانا تم ہی نے پکایا اور تم ہی نے بھیجا؟''

''آپ کا نام آئے گا تو آغا جی کو اتنی خوشی ہوگی کہ اور کسی طرح ہو ہی نہیں سکتی۔'' ارجمند نے بلاجھجک جواب دیا۔

جواب بے ساختہ تھا، اور اس میں بناوٹ نہیں تھی۔ لیکن نور بانو کی تسلی نہیں ہوئی۔

''لیکن ارجی! انہیں کھانا اچھا نہیں لگا تو بری بھی تو میں ہی بنوں گی؟ یہ نہیں سوچا تم نے؟''

ارجمند کا چہرہ فق ہوگیا۔

''اللہ! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا آپی!'' یہ کہہ کر وہ سوچنے لگی۔ پر کسی خیال سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''ایک ترکیب ہے آپی! جب کبھی ایسا ہو تو آپ کہہ دیجئے گا کہ آج کھانا ارجمند نے پکایا تھا۔ بہت ضد کر رہی تھی۔ ٹھیک ہے نا آپی!''

''مگر تمہیں مجھے بتانا تو چاہئے تھا۔ اگر رات وہ پوچھ لیتے تو......؟''

''معاف کر دیں آپی! اس بات کا بھی مجھے خیال نہیں آیا تھا۔ خیر! اب ایسا ہی کریں گے۔''

نور بانو کے لئے وہ مقام حیرت تھا۔ کوئی کسی کے لئے بے غرضی سے ایسا بھی کر سکتا ہے۔ نہیں! کوئی نہ کوئی غرض تو ہوگی ہی۔ اس نے خود کو ارجمند کی جگہ رکھ کر سوچا۔ سچی بات یہ تھی کہ وہ کبھی ایسا نہیں کرتی۔ اپنی اچھی کارکردگی کون کسی دوسرے کے نام کرتا ہے۔

ہر شخص دوسروں کو خود پر قیاس کرتا ہے۔ نور بانو کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ بدقسمتی سے اس کی دونوں بہنیں بہت خوب صورت تھیں۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ خود کو کم از کم قبول صورت تو ضرور سمجھتی۔ لیکن بہنوں کی خوب صورتی ہر پل اسے یاد دلاتی رہتی تھی کہ وہ بدصورت ہے۔ اس کا بچپن احساسِ کم تری کے تکلیف دہ جھولے میں گزرا۔ نہ وہ کبھی اونچی پینگ لے سکی، نہ محبت کرنا سیکھ سکی۔ بلکہ وہ تو ان فطری محبتوں سے بھی محروم ہوگئی، جو اسے حاصل تھیں۔ بہنیں بھی اس کی حریف بن گئیں۔ اسے صرف اپنی بقا کی، خود کو منوانے کی فکر تھی۔ اس چیز نے اس کے وجود کو تلخی سے بھر دیا۔

یہی وجہ تھی کہ اب جبکہ محبت...... اور وہ عبدالحق جیسے مرد کی محبت سمیت اسے دنیا کی ہر نعمت حاصل تھی تو ارجمند کو دیکھ کر اسے اپنی گلنار کی محبت یاد آئی، جو تشنہ ہی رہ گئی تھی۔ خوش قسمتی سے اسے ارجمند کے ذریعے ماضی کا وہ قرض ادا کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

اب اس وقت وہ یہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ ارجمند سے خالص اور سچی محبت کرتی ہے؟ بہت سوچنے پر اسے معلوم ہوگیا کہ اس کا جواب اثبات میں ہے۔ لیکن ابھی تک وہ اپنے اندر کے چھوٹے پن کو دور نہیں کر پائی ہے۔

اسے یاد تھا کہ رات عبدالحق نے بھجوائے ہوئے کھانے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اتنا اچھا کھانا اس نے پہلے کبھی نہیں پکایا تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ ارجمند نے پکایا تھا۔ تو کیا ارجمند اس سے اچھا پکانے لگی ہے؟ یہ بات اس نے رات کو بھی سوچی تھی۔ مگر اس کا خیال تھا کہ خلافِ توقع دفتر کھانا بھیجے جانے پر جو عبدالحق کو خوشی ہوئی، اس کے زیرِ اثر انہیں کھانا زیادہ ہی اچھا لگا ہوگا۔

مگر وہ کھانا خود اس نے بھی تو کھایا تھا۔ اور اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کی رات کی تاویل خود پسندی کی وجہ سے تھی۔ ورنہ ارجمند نے سچ مچ اس سے بہتر پکایا تھا۔

پھر اسے خیال آیا کہ ارجمند نے پہلے اس سے اجازت لی تھی اور اس اجازت کے تحت وہ کھانا اپنے نام سے بھجوا سکتی تھی۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

اور اس نے اس کی تاویل ارجمند میں خود اعتمادی کی کمی کی دی۔ اس نے یہ نہیں سمجھا کہ یہ ارجمند نے اس کی محبت کی وجہ سے کیا ہوگا۔ لیکن اب جو ارجمند نے یہ تجویز کیا کہ عبدالحق کو کھانا برا لگے تو وہ کہہ دے کہ ارجمند نے پکایا ہے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ ارجمند کا عمل صرف اور صرف خلوص اور محبت پر مبنی ہے۔

تو اس وقت جہاں ارجمند کے خلوص اور محبت کی سچائی واضح ہوگئی، ویسے ہی یہ بات بھی اس کی سمجھ میں آگئی کہ ارجمند سے اس کی محبت میں ابھی کھوٹ ہے۔ بلکہ یہ کہ ابھی وہ اپنے اندر کے زہر سے پوری طرح چھٹکارا نہیں پا سکی ہے۔ دوسروں کے محرکات کے بارے میں وہ اب بھی تنگ نظر اور بدگمانی سے کام لیتی ہے۔

مثبت بات یہ تھی کہ اسے ارجمند کا اتنا اچھا پکانا اچھا لگا تھا۔ عبدالحق نے کھانے کی جو تعریف کی، اسے تو نہیں معلوم تھا، لیکن وہ تو جانتی تھی کہ درحقیقت وہ ارجمند کی تعریف کر رہا تھا۔ ارجمند کی جگہ کسی اور کا معاملہ ہوتا تو وہ برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں تو اسے الٹا اچھا لگا۔ مطلب یہ کہ وہ ارجمند سے سچ مچ گلنار جیسی محبت کرتی ہے۔ لیکن ابھی اس میں وسیع النظری اور کشادہ دلی کی کمی ہے۔ اس بھی اس نے اپنی توجہ کا مرکز اپنی ذات کو بنا رکھا ہے۔ جبکہ اب یہ بات اس کی سمجھ میں آچکی ہے کہ محبت لینے کا نہیں، دینے کا نام ہے۔ اس تعریف کی کسوٹی پر اگر وہ خود کو پرکھے تو اب تک اس نے کسی سے بھی محبت نہیں کی ہے۔

اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ خود کو بدلے گی۔ محبت کرنا سیکھے گی۔

وہ اٹھی اور اس نے ارجمند کو لپٹا لیا۔

''تم بہت اچھی ہو میری بہن! مجھے تم سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں آپی!'' ارجمند حیران تھی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں ارجی!''

❁ ❁ ❁

ارجمند کے لئے وہ بہت کچھ سوچنے کا مقام تھا۔

وہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی، نہ کوئی بہن نہ بھائی۔ اسے ان محبتوں کا تجربہ نہیں تھا۔ لیکن وہ محبت سے بے خبر بھی نہیں تھی۔ ماں، باپ، دادا، دادی اور چاچا، سب اسے محبوب تھے۔ آج بھی اسے ان کو کھونے کا غم تھا۔ اور ان سب کے جانے کے بعد اس کے پاس پھپھو کے سوا کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ تمام کھوئی ہوئی محبتیں یک جا ہو کر پھپھو کے نام ہوگئی تھیں۔

پھر اس نے عبدالحق کو دیکھا اور اسے اس سے محبت ہوگئی۔ حالانکہ اس وقت وہ محبت کو سمجھتی بھی نہیں تھی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ محبت تو اللہ نے اس کے دل میں ڈالی ہے۔ وہ مختلف محبت تھی، یقین دینے والی محبت۔

اس کے بعد اس نے محبت کے اور روپ دیکھے۔ اچھو میاں، جنہیں وہ نانا کہتی تھی، اور عارف، جسے وہ چچا کہتی تھی۔ یوں کہو کہ اسے کم عمری میں ہی محبت کے تنوع سے متعارف کرا دیا گیا تھا۔

اب اس وقت نور بانو نے اسے گلے لگایا تو اسے احساس ہوا کہ بہن کی محبت کیسی ہوتی ہے۔ وہ جانتی تھی، دیکھ چکی تھی کہ نور بانو کتنی سخت ہے۔ لیکن اس کے لئے وہ پھولوں سے زیادہ نرم تھی۔ صرف اس لئے کہ اسے دیکھ کر اسے اپنی مرحوم بہن کا خیال آتا تھا۔ اس میں اس کی مرحوم بہن کی شباہت تھی۔ تو جس بہن سے مشابہ لڑکی کے لئے وہ ایسی نرم ہوگئی، اس بہن سے وہ کتنی محبت کرتی ہوگی۔

اور اس کے ساتھ ہی ارجمند کو خود پر شرمندگی ہونے لگی۔ نور بانو کی اتنی خالص محبت کے بعد وہ آغا جی سے محبت کیسے کر سکتی ہے۔ اگر آپی کو پتا چل جائے تو انہیں کیسا صدمہ ہوگا۔

لیکن جب اس نے آغا جی کو دیکھا تھا تو اسے تو آپی کے وجود تک کا علم نہیں تھا اور آغا جی سے اس نے ارادے سے محبت کب کی تھی۔ وہ تو ایسا تھا کہ جیسے اس کے وجود میں ان کی محبت کا بیج پہلے سے پڑا ہو، جسے ان کی دید نے نمو دے دی۔ وہ محبت تو اسے اللہ میاں نے دی تھی ورنہ وہ تو اس وقت محبت کا جانتی سمجھتی بھی نہیں تھی۔

یہ ارجمند کا واحد دفاع تھا۔

لیکن اب وہ جانتی تھی کہ وہ دفاع اس کے لئے ناکافی ہے۔ بے شک اللہ نے اسے محبت دی۔ لیکن اسے محترم سمجھنا، محترم بنانا تو اس کی ذمہ داری ہے۔ اس محبت کے آداب مختلف ہیں، اور وہ اسے سیکھنے ہوں گے۔ محبت کرنے والی آپی کے شوہر سے محبت کرنے کا اسے کوئی حق نہیں۔ مگر وہ محبت اسے اللہ نے دی ہے، اور وہی اسے یہاں لایا ہے اور اسے ان سب لوگوں سے ملایا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اس کے لئے نعمت ہے۔ تو اس صورتِ حال میں اللہ اس سے کیا چاہے گا؟

وہ سوچتی رہی۔ اس سے جم کر سوچا نہیں جا رہا تھا۔ بہرحال یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ اسے آغا جی کی محبت سے لڑنا ہوگا۔ اللہ کی دی ہوئی آغا جی کی محبت سے، یعنی اب وہ کبھی ان کے بارے میں محبت سے نہیں سوچ سکتی۔ اسے ان کے بارے میں تصور کرنے کا بھی حق نہیں۔ وہ اس کے خیالوں میں بھی آئیں تو اسے ان کو جھٹکنا ہوگا۔ بلکہ اصولاً تو اسے ان کی محبت دل سے نکالنے کی مسلسل کوشش کرنا ہوگی۔

اور یہ کتنا مشکل ہے۔ ایک تو ہوتا ہے اپنی خواہش کو مارنا، مگر یہاں تو اس کے برعکس عمل کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ وہ تو ہر وقت آغا جی کے بارے میں سوچنا چاہتی ہے، آنکھیں بند کر کے تصور میں انہیں دیکھنا چاہتی ہے۔ ایسے ہی بے اختیار سوچوں کو جھٹکنا، تصور میں ازخود سجنے والی محفل کو درہم برہم کرنا کتنا مشکل ہے۔

لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ چاہے وہ اس کوشش میں ہارے، لیکن یہ کوشش مسلسل کرتے رہنا اس پر لازم ہے۔ یہ اس کی آزمائش ہے اللہ کی طرف سے، اور وہی اس کی مدد بھی کرے گا۔ اور انشاء اللہ اس کوشش کا انعام بھی بڑا ہوگا۔

انعام کا خیال آتے ہی اس نے سوچا، آغا جی سے بڑا انعام اور کیا ہوگا۔ اور اس کے دل نے فوراً ہی اسے ٹوک دیا، پھر وہی آغا جی کی بات۔ وہ تو

جو اللہ کی مرضی ہے، وہ ہوگا، اور جب وہ چاہے گا، تب ہوگا۔ لیکن مجھے تو اللہ کی دی ہوئی اس محبت سے لڑنا ہے۔

اس رات اس نے نماز کے بعد اللہ سے مدد کے لئے بہت دیر تک دُعا کی۔

✿ ✿ ✿

عبدالحق کی سمجھ میں مسعود صاحب کی بات پوری طرح آگئی تھی۔ اگرچہ اس نے مال و دولت کو ہمیشہ اللہ کی عطا سمجھا تھا۔ صرف عطا بھی نہیں، امانت بھی۔ اور وہ اسے ضرورت مندوں پر خرچ کر کے خوشی محسوس کرتا تھا۔ لیکن اب وہ سول سروس میں تھا۔ یہاں اسے اپنی ثروت کا مظاہرہ کرنا تھا، جتانا تھا۔ ورنہ یہ بات اس کے لئے بے حد تکلیف دہ ہوتی کہ لوگ اشارے کنائے میں بھی اور علانیہ بھی اس پر اللہ کے فضل کو مالِ حرام قرار دیتے۔ اللہ کی دی ہوئی عزت کی رسوائی تو دہرا ظلم ہے۔

اس نے مسعود صاحب کے کہنے کے مطابق اپنے لئے ایک کار خرید لی تھی۔ درحقیقت یہ اس کے پاس تیسری گاڑی تھی۔ پہلی گاڑی خریدنے کے بعد دوسری گاڑی اس نے زبیر کے لئے خریدی تھی۔ اب تو زبیر کو ڈرائیونگ بھی آگئی تھی۔

جس دن اس نے تیسری گاڑی خریدی، اسی دن اس نے مسعود صاحب سے وہ بات بھی کر لی، جو ملازمت کے پہلے دن سے اس کے دل میں تھی۔

''یہ خیال تمہیں کیوں آیا بیٹے!'' مسعود صاحب نے پوچھا۔

''اور پھر معاشیات ہی کیوں؟''

''جب پہلے دن آپ نے مجھے فائلیں دیکھنے کو کہا اور میں نے فائلوں کا سرسری جائزہ لیا، اسی لمحے میں نے اس کا ارادہ کر لیا تھا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''خاص طور پر وہ فائل اس کی تحریک بنی، جسے میں ترجیح دینا چاہتا تھا۔ لیکن اپنی کم علمی کو محسوس کر کے میں نے اسے ڈراپ کر دیا۔ حالانکہ وہ سب سے اہم معاملہ تھا۔''

''کس فائل کی بات کر رہے ہو؟''

''وہ جو پاکستان کے معاشی اور اقتصادی مستقبل کی پالیسی لائن ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔ لیکن بیٹے! معاشیات تو تمہارا مضمون تھا بی۔ اے میں۔ اور تمہارے نمبر اسی مضمون میں تمہاری دلچسپی اور اہمیت کے گواہ ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ جہاں تک میں پہنچا ہوں، وہ تو اس مضمون کی ابتداء ہے۔ میں اس میں صرف ماسٹرز ہی نہیں، ڈاکٹریٹ بھی کرنا چاہتا ہوں۔''

''خیر! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔''

''میں صرف مطالعے کے ذریعے بھی استعداد بڑھا سکتا ہوں۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''لیکن میں نے ڈگری کی اہمیت بھی سمجھ لی ہے۔ آپ کتنا ہی جانتے ہوں، سند کے بغیر کچھ بھی مستند نہیں ہوتا۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تو بسم اللہ کرو۔ یہ امتحان تو تم پرائیویٹ اُمیدوار کی حیثیت سے بھی دے سکتے ہو۔''

''جی چچا جان! اور میرے سامنے کوئی راستہ بھی نہیں۔''

''لیکن تمہاری مصروفیت بہت بڑھ جائے گی۔ گھر کے لوگوں کو شکایت بھی ہو سکتی ہے۔''

''اللہ کا شکر ہے چچا جان! گھر میں شکایت کرنے والا کوئی بھی نہیں۔''

''اس کا قاعدہ یہ ہے کہ تم سرکاری طور پر تحریراً مجھ سے اس کی اجازت مانگو۔''

''جی......! بہتر ہے۔''

اس عرصے میں وہ اپنے معمولات میں جم چکا تھا، ان کا عادی ہو چکا تھا۔ دفتر میں اس نے ایک اصول بنا لیا تھا۔ ہر ماہ کے آخری سنیچر کو، جو ہاف ڈے ہوتا تھا، وہ اپنے اسٹاف کے ساتھ ایک غیر سرکاری میٹنگ کرتا تھا۔ اس میں وہ ایک دوسرے سے بے تکلفانہ گفتگو کرتے تھے۔ ذاتی معاملات اور مسائل پر بھی بات ہوتی تھی۔ عبدالحق ان کے ذاتی مسائل کو حل کرنے کی ہر ممکن کوشش

کرتا تھا۔

یہ سلسلہ شروع کرتے ہوئے عبدالحق نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے اتنے مثبت نتائج نکلیں گے۔ پہلی ہی میٹنگ میں اس نے اپنے دونوں ماتحتوں کے پس منظر کو سمجھ لیا۔ وہ دونوں بہت مختلف تھے۔

ذوالفقار لاہور کا رہنے والا تھا۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس کی منگنی ہو چکی تھی اور امکان تھا کہ اگلے سال اس کی شادی بھی ہو جاتی۔ اس کی ملازمت کو ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے تھے۔

شمریز کا تعلق مری سے تھا۔ وہ شادی شدہ تھا اور اس کے تین بچے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ اس لحاظ سے لاہور اس کے لئے پردیس تھا۔ اس کے گاؤں کا ایک دوست یہاں کسی بنگلے میں چوکیدار تھا۔ اس نے اپنے صاحب سے شمریز خان کے لئے اجازت لے لی تھی کہ وہ اس کے سرونٹ کوارٹر میں رہ سکتا ہے۔ یہ شمریز کے لئے بڑی سہولت تھی۔

دوسری میٹنگ میں شمریز نے ڈرتے ڈرتے عبدالحق سے کہا۔

''سر! میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔''

''تو جھجک کیوں رہے ہو؟'' عبدالحق نے کہا۔ شاید ابھی اس کے ماتحت اس میٹنگ کے بنیادی فلسفے کو نہیں سمجھ سکے تھے۔

''اس وقت تم لوگ مجھ سے کوئی بات بھی کر سکتے ہو۔ نہ میں افسر ہوں اور نہ تم ماتحت۔ اس وقت ہم دوست ہیں۔''

مگر شمریز اب بھی جھجک رہا تھا۔

''ڈرتا ہوں سر! کہ آپ ناراض نہ ہو جائیں۔''

''پھر وہی بات! اس میٹنگ میں تم مجھ سے آزادی سے بات کر سکتے ہو۔''

''وہ سر! آپ نے اپنے لئے گاڑی لی ہے نا......!''

''ہاں ہاں! آگے بولو!''

''افسر گاڑی چلاتا اچھا نہیں لگتا سر! اس کے پاس ڈرائیور ہونا چاہئے۔''

عبدالحق مسکرایا۔

''بات تو ٹھیک ہے تمہاری۔''

''جی سر جی......!'' اب شمریز پھر جھجک رہا تھا۔

''تو کوئی ڈرائیور ہے تمہاری نظر میں؟''

''جی سر! پر میں اس کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی تو ایک اور بات ہے۔''

''وہ بھی بول دو!''

''ابھی جمعہ کو پچیس دسمبر کی چھٹی ہے سر جی! ہفتے کی چھٹی مل جائے تو میں بچوں کے پاس گھر جا سکتا ہوں۔''

''ذوالفقار! تمہاری درخواست لکھ دے گا۔ میں منظور کر دوں گا، اور کچھ؟''

''جی سر! میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی بچوں کے ساتھ میرے ساتھ چلیں۔''

بچوں کا سن کر عبدالحق کے دل میں ہوک سی اُٹھی۔ وہ تو اس نعمت سے محروم تھا۔ ویسے وہ جانتا تھا کہ بچوں سے شمریز کی مراد فیملی ہے۔ یہ لوگ بیوی کا تذکرہ نہیں کرتے تھے۔ بچے ہوں یا نہ ہوں، کہا یہی جاتا ہے کہ بچوں سے ملنے جانا ہے۔

''تمہارا مطلب ہے کہ میں فیملی کے ساتھ مری چلوں؟''

''جی سر!''

''مگر شمریز خان! یہ مری تو پہاڑی علاقہ ہے نا! تو وہاں تو لوگ موسم گرما میں جاتے ہیں۔ اس وقت تو وہاں سردی ہوگی بہت۔''

''سردی تو ہوگی سر! لیکن ایک نظارہ بھی ہوگا۔''

''کیسا نظارہ......؟''

''برف باری کا سر! پچیس دسمبر کو ہر حال میں برف گرتی ہے سر!''

عبدالحق کا دل اشتیاق سے بھر گیا۔ اس نے برف باری کبھی نہیں دیکھی

تھی۔ گھر میں کسی نے بھی نہیں دیکھی تھی۔ اماں دیکھیں گی تو کتنا خوش ہوں گی۔ اس نے سوچا۔

''لیکن شمریز! برف باری کے بعد تو راستے بند ہو جاتے ہوں گے۔ واپسی کیسے ہوگی؟''

''یہ برف باری کا موسم نہیں ہے سر جی! اللہ کی قدرت ہے کہ پچیس دسمبر کو برف ضرور گرتی ہے۔ بس ایک دن، برف کا سیزن تو آدھے جنوری کے بعد شروع ہوتا ہے سر جی! ہم جمعرات کو چلیں گے اور اتوار کو واپس آ جائیں گے۔''

''اور ہم رہیں گے کہاں؟''

''کمال کرتے ہیں سر جی! اپنا گھر ہے نا وہاں!'' شمریز نے کہا۔ پھر اسے عبدالحق کی ہچکچاہٹ کا اندازہ ہوگیا۔

''ویسے سر! وہاں ہوٹل بھی بہت ہیں۔ پر آپ کو اس کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کو وہاں بنگلہ مل جائے گا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے! ہم چلیں گے۔''

اور شمریز خان خوش ہوگیا۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق نے گرم کپڑوں کا خاص طور پر اہتمام کیا تھا۔ برف باری اس کے لئے محض ایک تصور تھی، جس کا دوسرا مطلب نہایت درجہ کی سردی تھی۔ اس نے موزوں اور دستانوں کا بھی خیال رکھا تھا۔

ایک دن پہلے اس نے شمریز سے راستوں اور سڑکوں کے بارے میں استفسار کیا۔

''سڑک تو پکی ہے سر! لیکن راستے خطرناک ہیں۔'' شمریز نے کہا۔

''پہاڑی راستے تو ہوتے ہی خطرناک ہیں۔ ایک طرف پہاڑ ہوتا ہے تو دوسری طرف کھائی۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ میرے ڈرائیور کو ان سڑکوں کا تجربہ ہے یا نہیں؟''

عبدالحق کے لہجے میں تشویش تھی۔

''تو میں حاضر ہوں سر!''

''کیا مطلب؟''

''میں ڈرائیو کرلوں گا سر!''

''تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟''

''ہمارے ہاں بچے ہوش سنبھالتے ہی ڈرائیونگ سیکھ لیتے ہیں سر!'' شمریز نے فخریہ لہجے میں کہا۔

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر اس نے فیصلہ کرلیا کہ یعقوب کی نسبت شمریز ہی بہتر رہے گا۔ وہ راستے اس کے لئے جانے پہچانے ہوں گے۔

''ٹھیک ہے شمریز خان!'' اس نے کہا۔

اس شام عبدالحق نے خاص طور پر شاپنگ کی...... خصوصی شاپنگ۔ اس کے لئے اسے اپنے وجدان کا سہارا لینا پڑا۔ مگر وہ اعتماد سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے مناسب چیزیں خریدی ہیں۔ وہ بس دعا ہی کرسکتا تھا۔

اگلی شام کو وہ روانہ ہوئے۔ ابتداء میں ہی عبدالحق کو اندازہ ہوگیا کہ یعقوب کے مقابلے میں شمریز کہیں اچھا ڈرائیور ہے۔ جبکہ یعقوب بھی بہت اچھا ڈرائیور تھا۔ مگر شمریز کی خوبی یہ تھی کہ تیز رفتاری کے باوجود وہ اتنے کنٹرول سے ڈرائیو کرتا تھا کہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ لطف آتا تھا۔

جی ٹی روڈ پر ٹریفک رات کو بھی ہیوی تھا۔ مال بردار ٹرکوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ وہ کوئی انسان ڈرائیو نہیں تھی۔ لیکن شمریز خود کو بہت اچھا ڈرائیور ثابت کر رہا تھا۔

رات ڈھائی بجے وہ راولپنڈی پہنچے۔

''اب کیا حکم ہے سر!'' شمریز نے پوچھا۔

''کیا مطلب؟''

''سفر جاری رکھنا ہے یا یہاں رکنا ہے؟''

''مری تک کتنی دیر کی ڈرائیو ہے۔''

''اس وقت تو تین گھنٹے لگیں گے سر! رات ہے نا۔''

عبدالحق کو خیال آیا کہ راستے خطرناک ہیں۔ پھر اب تک کی ڈرائیو نے سب لوگوں کو تھکا ڈالا تھا۔ خاص طور پر حمیدہ تو بہت زیادہ تھک گئی تھی۔

''رکنا ہی بہتر ہے۔'' اس نے کہا۔

''کسی ہوٹل کا رخ کرو۔''

ہوٹل پہنچ کر عبدالحق نے دو ڈبل بیڈ والے اور ایک سنگل بیڈ والا روم طلب کیا۔ ہوٹل اچھا لگ رہا تھا۔

''سر! میرے لئے کمرے کی ضرورت نہیں۔'' شمریز نے عاجزی سے کہا۔

''کیوں بھئی!''

''تین چار گھنٹے تو باقی ہیں سر! میں یہیں صوفے پر کمر سیدھی کر لوں گا۔'' شمریز نے لابی میں پڑے صوفوں کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ نہیں ہوسکتا۔''

ایک کمرے میں حمیدہ اور ارجمند اور دوسرے میں عبدالحق اور نور بانو چلے گئے۔ سب لوگ نڈھال ہو رہے تھے۔ فوراً ہی سو گئے۔ لیکن عبدالحق نے شمریز کے کمرے کا رخ کیا۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔ شمریز نے دروازہ کھولا۔

''آیئے سر!''

عبدالحق اندر چلا گیا۔

''سوری! میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔'' اس نے معذرت کی۔

''ارے نہیں سر!'' شمریز نے شرمندگی سے کہا۔

''کیا حکم ہے سر!''

''صبح کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ کس وقت نکلنا ہے؟''

''جب آپ کا حکم ہوگا سر!''

''میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ تمہیں ہی فیصلہ کرنا ہوگا۔''

''آپ لوگ تھکے ہوئے ہیں۔ نیند پوری کرنا چاہیں گے، ورنہ......''

شمریز کی بات اُدھوری تھی۔

''تم بے فکر ہو کر بتاؤ کہ بہتر کیا ہے۔ ہماری تھکن اور نیند کو بھول جاؤ۔''

''تو سر! فجر کے بعد ناشتہ کر کے نکلنا چاہئے۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے برف گر گئی تو مجھے شرمندگی ہوگی۔''

''برف باری کس وقت ہوتی ہے؟''

''اس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے سر!'' شمریز نے بے بسی سے کہا۔

''بس بڑے دن پر ہوتی ضرور ہے۔''

''تو ٹھیک ہے، فجر کے بعد ہم چل دیں گے۔ اور کوئی بات؟''

''جی سر! ناشتہ بہت ہلکا کرنا ہوگا۔ بس چائے یا کافی اور دو چار بسکٹ۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''جی سر! پہاڑی سڑکیں چکر دار ہوتی ہیں۔ پیٹ بھرا ہو تو اُلٹیاں ہونے لگتی ہیں۔''

''اوہ......!'' عبدالحق کو یاد آ گیا۔ ایک پہاڑی سفر تو وہ بھی کرتا رہا تھا۔ ماسٹر جی سے ملنے کے لئے۔ لیکن اسے تو چکر بھی نہیں آئے تھے۔ بہر حال عورتوں کا معاملہ مختلف تھا۔

''ٹھیک ہے شمریز! انشاء اللہ صبح ملاقات ہوگی۔'' اس نے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔

❁ ❁ ❁

صبح سات بجے مری کے لئے ان کے سفر کا آغاز ہوا۔

نیند تو کسی کی بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ لیکن کیفیت سب کی الگ الگ تھی۔ شمریز خان اور عبدالحق دونوں تازہ دم تھے۔ عبدالحق کو اس روز یاد آیا کہ

ایک زمانے میں اس کے لئے محض دو گھنٹے کی نیند بھی کافی ہوتی تھی۔ وہ زمانہ تھا، جب وہ باقاعدگی سے تہجد پڑھا کرتا تھا۔ پھر فجر کی نماز اور اس کے بعد تلاوتِ قرآن پاک۔

اسے اتنی شدت سے احساسِ زیاں ہوا کہ آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ارے...... وہ کہاں سے چلا تھا، اور کہاں آ پہنچا۔ اتنے عرصے میں کتنی محرومیاں اس نے کما لیں۔ یہ سب کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ یہ اس وقت سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ اس وقت تو وہ بس اس کا دکھ ہی کر سکتا تھا۔

خواتین کا سب کا برا حال تھا۔ لیکن نور بانو تو تقریباً سو ہی رہی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے لئے رات کو دیر سے سونا تو معمول کے مطابق تھا۔ لیکن اتنی صبح اٹھنا تو اس کے لئے نئی بات تھی۔ کتنے برس ہو گئے تھے کہ وہ گیارہ بجے سے پہلے اٹھی ہی نہیں تھی۔

سو وہ اٹھ تو گئی تھی، لیکن درحقیقت سو ہی رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود سردی کا احساس بڑی شدت سے ہو رہا تھا۔

دوسری کھڑکی کے ساتھ حمیدہ بیٹھی تھی۔ نیند تو اس کی پوری نہیں ہوئی تھی، لیکن دن میں سونے کی اسے عادت نہیں تھی۔ اب تو وہ بس عشاء کے بعد یہ سو سکتی تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ وہی لاہور جیسی سڑکیں، کوئی نئی بات نہیں۔ اسے اس سفر میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو بس عبدالحق کی خوشی کے لئے چلی آئی تھی۔ ہاں یہ تجسس ضرور تھا کہ برف کیسے گرتی ہوگی۔ اس نے تو عمر بھر آسمان سے ریت اور گرمی ہی برستے دیکھی تھی۔

اور ارجمند ان دونوں کے بیچ میں بیٹھی تھی۔ نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اسے کچھ فرق نہیں پڑا تھا۔ سوائے اس کے رہ رہ کر نیند کی ہوا کا ایک جھونکا آتا اور وہ ایک جھپکی لے لیتی۔ درحقیقت وہ جھپکی بھی اسے بری لگ رہی تھی۔ پاکستان آنے کا سفر اسے ہلکا ہلکا یاد تھا، اور وہ خوش گوار نہیں تھا۔ اور اس کا انجام تو برسوں ناخوش گوار رہا تھا۔ لیکن یہ سفر اسے خوشی دے رہا تھا۔ اس ناخوش گوار

سفر کے بعد یہ اس کا پہلا سفر تھا۔ لاہور سے راولپنڈی کا سفر اگرچہ رات میں ہوا تھا مگر اسے بہت اچھا لگا تھا اور یہ سفر اسے اور بھی اچھا لگ رہا تھا۔ ایک تو صبح کی اپنی خوب صورتی، پھر راستے بھی خوب صورت۔ وہ بہت خوش تھی۔ لیکن بیچ میں ہونے کی وجہ سے وہ بے چین تھی۔ کبھی وہ ایک طرف کی کھڑکی سے دیکھنے کی کوشش کرتی، کبھی دوسری کھڑکی سے۔

تھوڑی دیر بعد چڑھائی کا سفر شروع ہوگیا۔ ماسٹر جی کے حوالے سے عبدالحق کو وہ راستے اور وہ سفر جانا پہچانا لگ رہا تھا۔

''تو اب اصل سفر شروع ہو رہا ہے؟'' اس نے شمریز خان سے کہا۔

''جی سر! اب ہم اوپر ہی اوپر جائیں گے۔''

نوربانو سو رہی تھی۔ ارجمند نے اس کی طرف ہوتے ہوئے باہر دیکھا۔ چکردار سڑک اوپر ہی اوپر جا رہی تھی۔ اسے اپنا دل جھولے پر پینگیں لیتا محسوس ہوا۔ جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔

پھر ذرا ہی دیر میں وہ حیران ہوگی۔ کھائی کو دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ پتا بھی نہیں چلا تھا اور وہ اتنے اوپر آگئے تھے۔ کیا اور اوپر جائیں گے؟ اس نے خوشی سے سوچا۔

اسی وقت نور بانو ایک جھٹکے سے جاگ اٹھی۔ اس کا دل گھبرایا تھا، اور گھبراہٹ کی وجہ سے اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اسی لمحے اس نے کھڑکی سے دیکھا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ اسے ایسا لگا کہ وہ زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہے، اور گرنے والی ہے۔ ساتھ ہی اس کا جی متلانے لگا۔

''میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' اس نے گھبرا کر کہا۔

عبدالحق نے پلٹ کر اسے دیکھا، اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

''تم ارجمند سے جگہ بدل لو۔'' اس نے تجویز پیش کی۔

یوں ارجمند کو بغیر کہے، بغیر مانگے وہ جگہ مل گئی۔ جو وہ چاہتی تھی۔

اب وہ مزے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اب اسے سب کچھ زیادہ بہتر طور پر نظر آ رہا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ دنیا بہت...... بہت بڑی ہے۔

کھڑکی سے نظر آنے والا وسیع منظر کا ایک چھوٹا سا حصہ اسے اتنا بڑا لگ رہا تھا تو وہ پورا منظر کتنا بڑا ہوگا۔ اور دنیا ایسے بہت بڑے بڑے اور بے شمار مناظر پر محیط ہے۔ اسے اپنا وجود بھی بڑا بڑا محسوس ہونے لگا۔

''سبحان اللہ! سبحان اللہ!'' حمیدہ کی آواز نے ان سب کو چونکا دیا۔

''کیسی قدرت ہے میرے ربّ کی۔ اس نے پہاڑوں پر راستے بنائے ہمارے لئے۔ ورنہ پہاڑ کو دیکھ کر کون سوچ سکتا ہے کہ وہ اس پر چل سکتا ہے، رہ سکتا ہے۔''

''بے شک اماں! اللہ نے زمین پر، پہاڑوں پر، سمندر میں اور آسمان میں، ہر جگہ راستے بنائے ہیں۔ تاکہ انسان ان میں آزادانہ چل پھر سکے۔ یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کا احسان ہے۔''

شمریز کو اس بات پر بہت حیرت ہوئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بول پڑا۔

''آسمانوں میں اور سمندروں میں بھی راستے ہیں سر!'' اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''ہاں شمریز خان!''

''لیکن وہ نظر تو نہیں آتے سر!''

''آدمی غور سے دیکھے تو نظر آتے ہیں شمریز خان! دراصل راستے نشانیوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ غور کرنے پر وہ نشانیاں نظر آتی ہیں، اور راستوں کا تعین ہوتا ہے۔ سمندر میں جہاز چلانے والے ناخداؤں کو اور فضا میں جہاز اڑانے والوں کو وہ راستے نظر آ رہے ہوتے ہیں۔ وہ اندھا دھند تو نہیں اڑتے۔ ورنہ آئے دن جہاز ٹکراتے۔ اب بھی کہیں کوئی جہاز ٹکرائے تو اس کا سبب کی ایک کا کسی وجہ سے راستہ سے بھٹکنا ہوتا ہے۔''

''تھوڑا تھوڑا تو میں سمجھ گیا سر!''

ارجمند نے یہ گفتگو سنی، پھر دوبارہ کھڑکی سے باہر کے منظر کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اتنے لمبے اور اونچے درخت اس نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اور وہ اس

ترتیب سے لگے ہوئے تھے کہ دیکھ کر لگتا تھا کہ پہاڑی چوٹی سے وہ کسی فوج کی طرح اترتے آرہے ہیں۔ لمبے تڑنگے سپاہی جو قطار در قطار منظم انداز میں اتر رہے ہوں۔ اس کے دل میں ہیبت بھر گئی۔

پھر اسے احساس ہوا کہ گاڑی کی آواز بدل گئی ہے اور رفتار بھی کم ہوگئی ہے۔ گاڑی کی آواز سن کر اسے ایسا لگ رہا تھا، جیسے کوئی شخص دوڑتے دوڑتے تھک کر ہانپنے لگا ہو، اور اب اسے چلنا مشکل ہو رہا ہو۔

اسی لمحے عبدالحق نے شمریز خان سے یہ بات پوچھ لی۔

''چڑھائی کا سفر ہے نا سر! تو انجن پر بوجھ پڑتا ہے۔ انجن گرم ہو جاتا ہے۔''

''تو یہ خطرناک ہوا نا!''

''اگلے موڑ پر ایک جگہ آئے گی سر! وہاں گاڑی روکیں گے دس پندرہ منٹ، اور پانی بھی ڈالیں گے۔''

اور دس منٹ بعد وہ مقام آگیا۔

✿ ✿ ✿

جہاں شمریز خان نے گاڑی روکی، وہاں سامنے ہی ایک بڑی سی جھونپڑی کی شکل میں ایک چائے خانہ تھا۔ شمریز نے وہاں بیٹھے ہوئے ایک کم عمر لڑکے سے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنے کو کہا۔ عبدالحق بھی گاڑی سے اُتر آیا تھا۔

پانی ڈالتے ہی گاڑی سے جو دھویں کا بادل اٹھا تو عبدالحق گھبرا گیا۔

''یہ کیا؟'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''اس سے اندازہ لگائیں صاحب کہ انجن پر کتنا بوجھ پڑا ہے۔'' شمریز نے کہا۔

''اوپر آنے والی تمام گاڑیاں یہاں رکتی ہیں سر! گرمیوں میں یہاں پانی بہت ہوتا ہے۔ وہ اوپر سے آتا ہے۔'' اس نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

عبدالحق نے اشارے کی سمت دیکھا۔ پانی اب بھی تھوڑا تھوڑا آرہا تھا۔ لیکن نشانات اور نمی سے پتا چلتا تھا کہ کبھی وہ خاصا بڑا جھرنا سا رہا ہوگا۔

''تو اب کیا ہوگیا؟'' اس نے پوچھا۔

''سردیوں میں پانی کم ہو جاتا ہے نا سر!'' شمریز نے جواب دیا۔ پھر پوچھا۔

''چائے پئیں گے سر!''

گرم کپڑوں کے باوجود سردی ہڈیوں تک میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ چائے تو اس وقت کی بہت بڑی ضرورت تھی۔ عبدالحق گاڑی کی طرف بڑھا۔ گاڑی میں نور بانو باقاعدہ سو رہی تھی۔ ارجمند نے کھڑکی کا شیشہ اُتار لیا تھا۔ اس نے ارجمند سے پوچھا۔

''چائے پیو گی؟'' ارجمند نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔

''اماں سے بھی پوچھ لو۔''

چائے سے وہاں کون انکار کرسکتا تھا۔

''آغا جی! میں نیچے آسکتی ہوں۔'' ارجمند نے دبی دبی سی آواز میں پوچھا۔

عبدالحق کو ہنسی آگئی۔

''اگر تمہاری ٹانگیں سن نہیں ہوئی ہیں تو بالکل آسکتی ہو۔''

اور اگلے ہی لمحے ارجمند دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ گہری سانس لے کر اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ کار میں بیٹھے ہوئے وہ منظر اسے حقیقی نہیں، بلکہ کسی مصور کی بنائی ہوئی خوب صورت تصویر لگ رہا تھا۔ مگر باہر آکر اسے احساس ہوا کہ وہ حقیقی ہے۔

شمریز چائے کے لئے کہنے چلا گیا تھا۔ ارجمند سامنے پہاڑ کو دیکھتی رہی۔ چوٹی تک وہی فوجیوں کی طرح درخت چلے گئے تھے۔ مگر ان میں زیادہ تر ٹنڈ منڈ درخت تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے، جن پر پتے موجود تھے۔ لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اور وہ عجیب سے لگ رہے تھے۔

شمریز چائے کے ساتھ آگیا۔ چائے لانے والے لڑکے نے ایک پیالی گاڑی میں بیٹھی حمیدہ کو دے دی۔

"یہ سارے درخت سوکھے ہوئے کیوں ہیں آغا جی!" ارجمند نے عبدالحق سے پوچھا۔

"یہ خزاں کا موسم ہے نا! اس میں درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ اسی لئے اس موسم کو پت جھڑ بھی کہتے ہیں اور یہ سوکھے ہوئے درخت نہیں ہیں ارجی! یہ زندہ ہیں۔ بہار آئے گی تو نئے پتے نکلیں گے اور یہ پھر سے ہرے بھرے ہو جائیں گے۔"

"مگر یہ کچھ درخت ہرے بھرے بھی تو ہیں۔ ان کے پتے کیوں نہیں جھڑے؟"

عبدالحق چکرا گیا۔ یہ بات تو اسے بھی نہیں معلوم تھی۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم!"

"میں بتاؤں سر!" شمریز نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ضرور بتاؤ شمریز!"

"چوڑے پتے والے درختوں پر خزاں آتی ہے سر! پر نکیلے پتوں والے درخت سدا بہار ہوتے ہیں۔"

عبدالحق خوش ہوا کہ اسے ایک نئی بات معلوم ہوگئی۔

پھر چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے ارجمند سڑک کے اس طرف چل دی۔ وہاں پہاڑ نہیں تھا۔ وہ وہاں کا منظر دیکھنا چاہتی تھی۔

شمریز خان نے بے ساختہ اسے پکارا۔

"رک جائیں بی بی جی!"

ارجمند نے پلٹ کر دیکھا۔

شمریز اب اپنی اضطراری پکار پر شرمندہ ہو رہا تھا کہ اسے بی بی جی کو براہِ راست نہیں پکارنا چاہئے تھا۔ وہ عبدالحق سے مخاطب ہوگیا۔

"اس طرف کھائی ہے نا سر! اس کا دھیان کر کے ادھر جانا چاہئے۔"

عبدالحق اس کے انداز کو سمجھ گیا اور اسے یہ بات بہت اچھی لگی۔

"آؤ! تم بھی آجاؤ۔" یہ کہہ کر وہ ارجمند کی طرف بڑھ گیا۔ جو وہیں

رکی ہوئی ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

عبدالحق نے شمریز کی کہی ہوئی بات اسے سمجھائی۔ پھر بولا۔

"اب چلو!"

اور وہ واقعی کافی گہری کھائی تھی۔ خاصا پیچھے رکھ کر نیچے دیکھنے کے باوجود ایک لمحے کے لئے ارجمند کو چکر سا آیا۔ مگر پھر وہ سنبھل گئی اور نیچے دیکھنے لگی۔

وہ بڑا خوب صورت، لیکن پُراسرار سا منظر تھا۔ یہاں فوجی درخت نیچے کی جانب جاتے محسوس ہو رہے تھے۔ ارجمند کو ان میں باقاعدہ تحرک کا احساس ہو رہا تھا۔

"خوب صورت!" اس نے زیرِ لب کہا۔

اوپر کی طرف قدرے روشنی تھی۔ لیکن نیچے بتدریج اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ خاص طور پر جہاں پتوں والے درخت تھے، وہاں اندھیرا زیادہ تھا۔ حالانکہ درخت زیادہ گھنے نہیں تھے۔ اور اسی اندھیرے ہی کی وجہ سے وہ منظر پُراسرار لگ رہا تھا۔

اچانک بادلوں میں سے سورج نے ایک جھلک دکھائی، اور وہ پورا منظر جگمگا گیا۔ ہلکی ہلکی دھوپ نکل آئی تھی، جو ٹھنڈک کو تم کم نہیں کر سکی تھی۔ مگر اس نے منظر کو جیسے سنہرے رنگ سے رنگ دیا تھا۔

اس نے آنکھیں موند لیں۔ وہ اس منظر کو اپنی یادداشت میں محفوظ کر لینا چاہتی تھی۔

عبدالحق اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

"ڈر لگ رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جی نہیں! اس منظر کو دیکھ کر تصویر بنانے کو جی چاہتا ہے۔" ارجمند نے بے ساختہ سچائی سے جواب دیا۔

"ارے ہاں! تم تو بہت اچھی تصویریں بناتی تھیں۔" عبدالحق نے کہا۔

"اب بھی بناتی ہو کیا؟"

''جی نہیں!''

عبدالحق نے پوچھا۔

''کیوں؟''

''ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔'' ارجمند نے سادگی سے کہا۔

''لیکن آج جی چاہا ہے۔''

عبدالحق کو اس پر بہت کچھ یاد آ گیا۔ وہ یہ بھی سمجھ گیا کہ ارجمند کیا کہہ رہے ہے۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم یہاں سے بہت کچھ لے کر جاؤ گی۔''

''جی ہاں!''

''صاحب! اب چلیں۔'' شمریز خان نے انہیں چونکا دیا۔

❁ ❁ ❁

ہوٹلوں کے سائن بورڈ دیکھ کر عبدالحق کو اندازہ ہوا کہ وہ منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ اس نے شمریز کی طرف دیکھا، جو اب بہت کم رفتار سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ نہ جانے کیوں عبدالحق کو لگا کہ شمریز کچھ کہنا چاہتا ہے، لیکن جھجک رہا ہے۔

''تمہیں کچھ کہنا ہے شمریز؟'' اس نے کہا۔

''جی سر!'' شمریز اب بھی جھجک رہا تھا۔

''آپ برا تو نہیں مانیں گے؟''

''ارے نہیں شمریز! جو دل میں ہے، بے فکری سے کہو۔''

''یہ بات تو میں خود تم سے کہنے والا ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔ شمریز حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''بات یہ ہے شمریز کہ ناشتہ ہم تمہارے گھر ہی کریں گے۔''

شمریز نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔ اب وہ پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صاحب نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اب یہ ان کا بڑا پن ہے کہ انہوں نے اس کی اَن کہی اِلتجا کو اپنی فرمائش بنا دیا۔

لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عبدالحق اس کے گھر کے ہر ہر فرد کے

لئے کوئی نہ کوئی تحفہ لایا ہے۔ صاحب لوگ ملازموں کی بات کہاں غور سے سنتے ہیں۔ لیکن یہ صاحب مختلف تھا۔ اس نے اس کو اپنے گھر کے لوگوں کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ اسے یاد تھا۔ اسے اس کے گھر کا ہر فرد یاد تھا۔

وہ ایک بڑے کمرے میں تھے، جو آرائش کے اعتبار سے بہت سادہ، لیکن بہت آرام دہ تھا۔ آتش دان کی وجہ سے کمرے میں بڑی خوش گوار تمازت تھی۔ وہاں بیٹھنے کے بعد انہیں احساس ہوا کہ باہر کتنی سردی ہے۔

شمریز نے عبدالحق کو اپنے باپ اور چھوٹے بھائی سے ملوایا۔ اس کے بھائی کا نام نوریز تھا۔ اس کی عمر کے بارے میں عبدالحق کا اندازہ تھا کہ وہ انیس بیس برس کا ہوگا۔ وہ دبلا پتلا اور دراز قد تھا۔ چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔

''شمریز آپ کی بہت تعریف کرتا ہے صیب!'' شمریز باپ کا لہجہ شمریز سے بہت مختلف تھا۔

''شمریز خود بہت اچھا ہے نا جناب! اس لئے۔''

ذرا دیر میں ہی انہیں ناشتہ مل گیا۔ وہی عام سا ناشتہ تھا۔ فرائی انڈے اور پراٹھے۔ لیکن نہ جانے کیوں، بہت مختلف اور بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ان سبھی نے طبیعت سے ناشتہ کیا۔

ناشتہ کے بعد شمریز نے اپنے باپ کو کہا۔

''بابا! چابی مجھے دے دو۔''

''ہاں پتر! یہ لے۔'' باپ نے چابی اس کی طرف بڑھائی۔

''اور میں بھی پیچھے ہی آتا ہوں۔''

''نوریز کو بھی ساتھ لے آنا بابا!''

وہ لوگ باہر آ گئے۔ ہلکی ہلکی دھوپ نکل آئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ احساس ہو رہا تھا کہ سردی بڑھ گئی ہے۔

نوربانو کی نیند تو پوری نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب وہ جاگ چکی تھی اور حیرت سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی، جیسے کسی نے بے ہوش کر کے اسے

اس اجنبی مقام پر پہنچا دیا ہو۔ پھر اس نے بڑے بے زار لہجے میں عبدالحق سے کہا۔

''لاہور میں سردی کچھ کم تھی آپ کے لئے کہ یہاں لے آئے۔''

''یہ خوب صورتی نہیں نظر آ رہی ہے تمہیں؟'' عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

''کیسی خوب صورتی؟ ٹنڈ منڈ درخت ہیں۔ مٹیالے پہاڑ ہیں۔ سبزے کا نام ونشان نہیں......''

''تو یہ تو پت جھڑ کا موسم ہے نا!''

''میں نے کب کہا تھا کہ پت جھڑ میں یہاں لائیں؟ بہار میں لے آتے۔''

عبدالحق کھسیا کر چپ ہو گیا۔

''آپ بھول گئیں آپی! کہ ہم یہاں برف باری دیکھنے آئے ہیں۔'' ارجمند نے کہا۔

''تو کہاں ہو رہی ہے برف باری؟'' نوربانو بری طرح چڑھی ہوئی تھی۔

''ہوگئی ہوتی تو مزہ خراب ہو جاتا۔ جب ہو تو دیکھئے گا۔''

گاڑی ایک بنگلے کے سامنے رُکی تو گفتگو کا یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ شمریز اترا اور اس نے لوہے کا گیٹ پر لگا ہوا تالا کھولا، اور پھر گیٹ پوری طرح کھول دیا۔ پھر وہ دوبارہ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی اندر لے گیا۔

وہ لوگ گاڑی سے اُترے، شمریز نے کہا۔

''یہ بنگلہ ہے صاحب! یہاں آپ لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

وہ سبھی جائزہ لے رہے تھے۔ وہ ان کے لاہور کے بنگلے سے کچھ مختلف تھا۔ وہاں بنگلے سے داخل ہوتے ہی بہت بڑا لان تھا۔ جبکہ یہاں ایسا نہیں تھا۔ سامنے بہت تھوڑی جگہ تھی اور وہاں سیمنٹ کا فرش تھا۔ سامنے ہی صدر دروازہ تھا۔ اور بنگلے کے پہلو میں سرونٹ کوارٹرز تھے۔ مگر عبدالحق کو ایک چیز بہت اچھی

لگی۔ سامنے پہلی منزل پر بنگلے کی پوری چوڑائی میں ایک بہت بڑی گیلری تھی، جس میں تین دروازے نظر آ رہے تھے۔ شاید وہ تین کمرے ہوں گے۔ گیلری کیا، وہ اچھا خاصا برآمدہ تھا۔ اس نے سوچا، یہاں کرسیاں ڈال کر بیٹھنے میں بہت لطف آئے گا۔

شمریز نے صدر دروازہ کھولا۔

''آپ لوگ چلیں، میں آپ کا سامان لے کر آتا ہوں۔''

اندر داخل ہو کر عبدالحق کو کچھ حیرت ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ اندر ہر چیز پر گرد ہوگی۔ نہ جانے بنگلہ کب سے بند ہوگا۔ مگر وہاں نہ تو گرد تھی نہ گھٹن۔

نچلی منزل پر دو کمرے سامنے کی طرف تھے اور تین عقبی سمت میں۔ سامنے کے دو کمروں میں ایک ڈرائنگ روم تھا اور دوسرا ایک بڑا کمرہ تھا۔ لاہور میں اس کی اسٹڈی جیسا۔ مخالف سمت میں تین بیڈ روم تھے۔

شمریز خان سامان لے آیا تھا۔ نوربانو تو نیند سے بوجھل اور بیزار تھی۔ ارجمند سامان رکھنے کی فکر میں لگ گئی۔

''ایک بات کہوں صاحب!'' شمریز نے کہا۔

''کیا بات ہے شمریز!''

''بی بی صاحب سے کہیں کہ سامان کو چھوڑ دیں۔ ابھی میری گھر والی اور بہن آ کر سب سنبھال لیں گی۔ آپ لوگ پہلے بنگلہ تو دیکھ لیں۔'' اس کے لہجے میں بچوں کی سی خوشی اور سنسنی تھی۔

''چلو ٹھیک ہے۔''

لیکن نوربانو نے جانے سے انکار کر دیا۔

''یہاں دیکھنے کو کیا رکھا ہے؟'' اس نے بے زاری سے کہا۔

عبدالحق کو بہت برا لگا۔ اسے شمریز خان کی دل آزاری کا احساس رہا تھا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ تم یہیں بیٹھو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔''

شمریز انہیں زینے کی طرف لے گیا۔ حمیدہ بھی ان کے ساتھ تھی۔

نور بانو کو اکیلے میں ڈر لگنے کا احساس ہوا تو وہ بھی زینے کی طرف لپکی۔

وہ اوپری منزل پر پہنچے۔ عام طور پر اوپر کی منزل نیچے جیسی ہوتی ہے۔ عبدالحق کو حیرت ہوئی کہ وہاں اوپر کی منزل نیچے سے مختلف تھی۔ اوپر سامنے کے رخ پر تین کے بجائے دو کمرے تھے۔ ایک کمرہ بہت بڑا تھا۔ اس میں دو دروازے تھے، جو گیلری میں کھلتے تھے۔ اور گیلری بہت کشادہ تھی۔ وہاں سے نظر آنے والا منظر بہت خوب صورت تھا۔ سڑک کے اس طرف ڈھلوان تھی، جہاں سربلند درخت تھے۔

لیکن عقبی حصہ اور زیادہ مختلف تھا۔ کمرے تو وہاں بھی صرف تین تھے۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہ نیچے کے کمروں کے مقابلے میں کافی بڑے تھے۔ پھر نیچے کے کمروں میں عقبی سمت کھلنے والے دروازے تھے، جبکہ یہاں صرف کھڑکیاں تھیں۔ عبدالحق کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اوپر کے کمرے نیچے والے کمرے سے بڑے کیسے ہو سکتے ہیں۔

پھر شمریز نے ایک کھڑکی کھولی اور پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''اب یہاں سے دیکھئے سر!''

انہوں نے اس کھڑکی سے باہر دیکھا اور حیران رہ گئے۔ سامنے کافی بڑا قطعہ زمین تھا۔ وہ تین چار ایکڑ زمین تو ہوگی۔ اور آگے خاردار تاروں کی باڑھ نظر آ رہی تھی۔ وہ باڑھ تین اطراف میں تھی۔

''یہ زمین......؟''

''یہ اس بنگلے کے ساتھ ہی ہے سر! اور اس زمین پر ایک چشمہ بھی ہے پانی کا۔ گرمی کے موسم میں آپ یہاں آئیں گے تو جنت کا خیال آئے گا۔''

''بے شک! میں اندازہ کر سکتا ہوں۔''

''میں نیچے جاتا ہوں سر! بچے آنے والے ہوں گے۔''

اب عبدالحق کی سمجھ میں اوپر اور نیچے کا فرق پوری طرح آ گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ نچلی منزل کے کمروں کے دروازے اوپری منزل کے سامنے والے حصے کی طرح ایک گیلری میں کھلتے ہوں گے...... یا اسے برآمدہ کہہ لیں...... اور

اس برآمدے میں ایک دروازہ ہوگا، جو عقبی احاطے میں کھلتا ہوگا۔ اوپر والے کمروں میں وہ برآمدہ بھی شامل تھا۔ اس لئے وہ نچلے کمروں سے زیادہ بڑے تھے۔

نیچے جا کر اس نے چیک کیا تو اس کے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ پھر اس کی سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ سرونٹ کوارٹر سائیڈ میں اس لئے بنائے گئے تھے کہ عقبی حصے میں بدنما بھی لگتے اور جاگیر کا لک بھی خراب ہو جاتا۔

اس نے سوچا، ایک بار گرمی کے موسم میں یہاں آنا ہوگا۔

نیچے آتش دان دہکائے جا چکے تھے۔ شمریز کی بیوی اور بہن آ گئی تھیں اور نور بانو پھر سو گئی تھی۔

✿ ✿ ✿

نور بانو دوپہر کو سو کر اٹھی تو تازہ دم تھی اور اس کا چڑچڑا پن دور ہو چکا تھا۔ ارجمند کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ کھانے کے لئے سامان نوریز لے آیا تھا اور شمریز کی بیوی اور بہن اس کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔

''تم سوئی نہیں؟'' نور بانو نے ارجمند سے پوچھا۔

''نہیں آپی! اب رات کو ہی سوؤں گی۔ آپ سنائیں، اب کیسا لگ رہا ہے؟''

''بہت اچھا! نیند پوری نہ ہو تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔'' نور بانو نے کہا۔

پھر وہ بڑی خوش اخلاقی سے فاطمہ اور جیناں سے باتیں کرنے لگی۔ فاطمہ شمریز کی بیوی تھی اور جیناں اس کی بہن۔

اس کو خوش دیکھ کر وہ دونوں بھی خوش نظر آنے لگیں۔

''یہ بتاؤ! یہ بنگلہ اتنے دنوں سے بند تھا تو یہاں گرد کیوں نہیں ہے؟'' نور بانو نے فاطمہ سے پوچھا۔

''کل ہی تو ہم دونوں نے صفائی کی ہے بنگلے کی۔'' فاطمہ نے کہا۔

''تو تمہیں پتا تھا کہ ہم لوگ آ رہے ہیں؟''

''جی بی بی......! انہوں نے کہلوایا دیا تھا۔''

نور بانو کو عبدالحق کا خیال آ گیا۔

"یہ تمہارے آغا جی کہاں ہیں؟" اس نے ارجمند سے پوچھا۔

"باہر باتیں کر رہے ہیں۔"

نور بانو نے دروازے سے باہر دیکھا۔ اس کی گاڑی کے ساتھ ایک جیپ بھی کھڑی تھی۔ لیکن عبدالحق کہیں نظر نہیں آیا اور سردی کی وجہ سے باہر نکلنے کی نور بانو کو ہمت نہیں ہوئی۔ وہ دوبارہ اندر آ گئی۔

عبدالحق اس وقت عقبی احاطے میں شمریز کے ساتھ تھا۔ وہ اس جگہ کا ایک خاص نکتہ نظر سے جائزہ لے رہا تھا۔

"یہ زمین کتنی ہوگئی شمریز؟"

"آٹھ ایکڑ سے کچھ کم ہے سر!" شمریز نے جواب دیا۔

"آپ کو کیسے لگی سر!"

"بہت اچھی، ایسی کوئی اور جگہ نظر میں ہو تو مجھے بتانا۔"

"کوئی اور جگہ کیا سر! چاہیں تو یہی خرید لیں۔"

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا۔

"اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے؟"

"جی سر! جن صاحب کی یہ زمین ہے، ان کی وفات ہوگئی ہے سر! ان کے بچے اسے بیچنا چاہتے ہیں۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔ اپنے بابا سے کہو، بات کر کے مجھے بتا دیں۔ میں پے منٹ کر دوں گا۔"

"آپ خود ہی بات کر لیں نا سر!" شمریز نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"مجھے ان معاملات کا تجربہ نہیں ہے۔"

"لیکن سر......"

عبدالحق اس کی جھجک کی وجہ سمجھ گیا۔

"دیکھو شمریز! آدمی کی بڑی پہچان ہے مجھے۔ تم سب لوگ بہت اچھے ہو۔ اور پھر مجھے یہاں کوئی رہنا تو نہیں ہے۔ کبھی کبھی آیا کریں گے ہم۔ تمہارے

بابا ہی کو دیکھ بھال کرنی ہوگی۔"

"جی سر!"

"اور ہاں! یہ تمہارا بھائی بہت اچھا ڈرائیور ہے۔ میں اس کے ساتھ بازار گیا تو مجھے اندازہ ہوا۔"

"جی سر!"

"یہ ہمارے ساتھ لاہور چل سکتا ہے؟"

"میں سمجھا نہیں سر!"

"مجھے ایک ڈرائیور کی ضرورت ہے نا!"

"یہ تو میں آپ سے کہنے والا تھا سر!"

"بس تو ٹھیک ہے۔ تم اپنے گھر میں بات کر لو۔ اس سے بھی پوچھ لو۔"

"اس کی ضرورت نہیں سر! یہ تو آپ کا احسان ہوگا ہم سب پر۔"

اسی وقت نوریز دوڑتا ہوا ان کی طرف چلا آیا۔

"بی بی آپ کو بلا رہی ہیں سر جی!"

❁ ❁ ❁

ان کے اصرار کے باوجود شمریز کے ہاں سے کسی نے بھی کھانے پر ان کا ساتھ نہیں دیا۔ عبدالحق بھی یہ سوچ کر رہ گیا کہ ان کے ساتھ بیٹھ کر وہ تکلف کرتے اور ٹھیک طرح سے کھانا نہیں کھاتے۔ ان لوگوں نے بعد میں کھانا کھایا اور وہ بھی سرونٹ کوارٹر میں۔

کھانے کے بعد عبدالحق نے شمریز سے کہا۔

"یہ بتاؤ کہ تم نے جیپ کیوں رکھی ہوئی ہے؟"

"یہاں جیپ زیادہ کارآمد ہے سر! یہ فور وہیل ڈرائیو ہے۔ بہت تنگ موڑ بھی کاٹ لیتی ہے۔"

"فور وہیل ڈرائیو کا مطلب؟"

"عام گاڑیوں کے دو وہیل چلتے ہیں، جیپ میں جب آپ چاہیں تو چاروں وہیل چلتے ہیں۔"

عبدالحق کی سمجھ میں نہیں آیا۔شمریز کو عملی مظاہرہ کر کے دکھانا پڑا۔

''ٹھیک ہے، لیکن اس کا فائدہ؟''

''بہت سیدھی چڑھائی میں کام آتا ہے سر!''

''میرا خیال ہے،تم مجھے ڈرائیو کر کے دکھاؤ۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اور نوریز کو ساتھ لے لو۔''

اس کا واقعی فائدہ ہوا۔عبدالحق کی سمجھ میں آ گیا۔بعض مقامات پر موڑ ایسے تھے کہ عام گاڑی سے ان سے گزرنا آسان نہیں تھا۔ جبکہ جیپ ہر طرح کا موڑ کاٹ لیتی تھی۔

''تمہیں میرے لئے ایک جیپ بھی خریدنی ہوگی شمریز خان!''

''ہو جائے گا سر!''

عبدالحق نوریز سے ڈرائیونگ کے بارے میں سوالات کرنے لگا۔

اچانک شمریز نے کہا۔

''اب واپس چلنا ہے سر!''

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا۔

''خیریت؟''

''برف پڑنے والی ہے سر!''

عبدالحق کے وجود میں خوشی کی ایک لہر اُٹھی۔ یہاں آ کر وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ برف باری دیکھنے کے لئے آئے ہیں۔ دراصل یہ بات اس کے حلق سے نہیں اتری تھی کہ ایک مخصوص دن برف باری ہو سکتی ہے۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے فضا میں غیر معمولی تبدیلی کا ادراک ہوا۔

''ٹھیک ہے! واپس چلو۔''

❁ ❁ ❁

نور بانو کو جنیاں بہت اچھی لگی تھی۔ وہ بہت تیزی سے اس سے گھل مل گئی تھی۔ جنیاں اور فاطمہ کے انداز میں بھی اب وہ جھجک نہیں تھی۔ وہ کچھ بے تکلف ہوگئی تھیں۔ لیکن ایک حد انہوں نے پھر بھی قائم رکھی تھی۔

انہیں کھانا کھائے ایک گھنٹہ ہوگیا تھا۔ جنیاں نے نور بانو سے کہا۔

''آپ باہر تو نکلیں بی بی صاحب!''

''نہیں بھئی! بہت سردی ہوگی۔''

''شروع شروع میں لگے گی۔ پھر جب چلیں گی تو سردی کم ہوتی جائے گی۔''

نور بانو نے سوالیہ نظروں سے ارجمند کو دیکھا۔ ارجمند نے اثبات میں سر ہلا دیا۔نور بانو کو حیرت ہوئی کہ حمیدہ بھی باہر نکلنے کے موڈ میں ہے۔

''چلو...... چلتے ہیں۔''

وہ عقبی دروازے سے احاطے میں نکل آئے۔ سردی تو تھی۔ لیکن نور بانو کو وہاں سانس لینا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہاں کی ہوا بہت صاف اور پاکیزہ ہے۔

اور واقعی کچھ دیر بعد سردی کا احساس کم ہوگیا۔

بنگلے سے خاردار تاروں کی باڑھ تک وہ ایک ہلکی سی، لیکن مسلسل چڑھائی تھی۔ سامنے پہاڑی تھی۔ وہیں کہیں وہ جگہ ہوگی جہاں پانی کا چشمہ تھا۔اس وقت تو اس کا سوتا خشک تھا۔لیکن پانی بہنے کا واضح نشان موجود تھا۔ جو اس کے وجود کی گواہی دے رہا تھا۔ خاردار تاروں کی باڑھ کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر درخت تھے مگر سب پتوں سے محروم تھے۔

''ان درختوں پر پتے بھی لگتے ہیں کبھی؟'' نور بانو نے پوچھا۔

''جی بیگم صاحب! بہار آئے گی تو سب درخت ہرے ہو جائیں گے۔'' جنیاں نے جواب دیا۔

لیکن نور بانو کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسے تو لگ رہا تھا کہ سب درخت مر چکے ہیں۔

''اور بہار میں یہاں زمین نظر نہیں آئے گی۔ ہر طرف گھاس ہوگی۔''

ارجمند نے تصور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ تصور بھی محال ہی تھا۔

وہاں بہت ہلکی ہلکی دُھوپ تھی، جس میں تمازت نام کو بھی نہیں تھی۔

''برف باری کب ہوگی؟'' ارجمند نے پوچھا۔

''یہ سو کسی کو بھی نہیں پتا بی بی صاحب!''

''کیا پتا؟ آج ہوگی بھی یا نہیں۔'' ارجمند کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''نہیں بی بی صاحب! ہوگی ضرور، بڑے دن پر برف ضرور پڑتی ہے۔'' فاطمہ نے اسے تسلی دی۔

اچانک دھوپ غائب ہوگئی۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ سردی کا احساس کچھ اور کم ہوگیا تھا۔

وہ لوگ باڑھ اور درختوں تک پہنچ گئی تھیں۔ نور بانو اور ارجمند نے باڑھ کے دوسری طرف دیکھا۔ باڑھ سے آگے کچھ دور سے ڈھلوان بہت زیادہ نمایاں تھی۔ آگے یقیناً کوئی کھائی تھی۔ لیکن وہ یہاں اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔

''آؤ اب واپس چلیں۔'' نور بانو نے کہا۔

واپسی کا آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ بھی کو فضا میں کسی غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہوا۔ اور کسی کی سمجھ میں اس تبدیلی کی نوعیت نہیں آ رہی تھی۔ بلا ارادہ وہ لوگ رُک گئے...... ٹھٹک گئے، جیسے اس تبدیلی پر غور کر رہے ہوں، اسے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

حمیدہ نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ مگر وہاں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ نور بانو اور ارجمند ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔ تبدیلی کا احساس انہیں بھی ہوا تھا لیکن ابھی تک وہ اس کی نوعیت نہیں سمجھ سکی تھیں۔

وہ اس تبدیلی کو سمجھنے کی کوشش میں اتنی منہمک تھیں کہ انہوں نے فاطمہ اور جنیاں کے درمیان نگاہوں کے اس تبادلے کو بھی نہیں دیکھا اور ان کے لبوں پر مچلتی معنی خیز مسکراہٹ بھی نہیں دیکھ سکیں۔

پھر حمیدہ کے چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کا تاثر اُبھرا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

''لال آندھی!'' لیکن اس کی بات کوئی نہیں سمجھا۔ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں دعا کرنے لگی۔

''اے اللہ! رحم فرما، اے اللہ مصیبت ٹال دے۔''

ارجمند نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''کیا ہوا دادی اماں!''

لیکن حمیدہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور زیر لب دعا کر رہی تھیں۔

پھر شاید نور بانو اور ارجمند دونوں کی سمجھ میں بات آ گئی۔ دنیا میں ہر منظر کے ساتھ قدرتی عناصر کی کچھ آوازیں ہوتی ہیں۔ یہ الگ بات کہ آدمی ان کا عادی ہونے کی وجہ سے ان پر دھیان نہیں دیتا۔ وہ قدموں کی چاپیں ہوں یا ٹریفک کی آوازیں، پرندوں کے چہچہے ہوں یا ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹیں۔ کچھ نہیں ہوتا تو ہوا کی سرسراتی سرگوشیاں ہوتی ہیں۔ اور رات کو جب انسان اور تمام مخلوقات محو خواب ہوتی ہیں، لگتا ہے کہ شجر حجر، ہر چیز سو رہی ہے، تب سناٹا بھی ایک آواز کی طرح بولتا ہے، اور کبھی اس میں جھینگروں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کوئی بھی منظر خاموش بھی نہیں ہوتا۔

ان دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہی تو غیر معمولی بات تھی، جس کا احساس انہیں خود بخود ہوگیا تھا۔ یہ منظر، یہ ماحول جس میں وہ موجود تھیں اور سانس لے رہی تھیں، بالکل خاموش تھا۔ یہاں تو ہوا کی نرمی سے بہنے کی آوازیں بھی نہیں تھی۔ انہیں ہوا کا لمس بھی اپنے چہروں پر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اگر وہ سانس نہ لے رہی ہوتیں تو کہہ دیتیں کہ اس وقت ہوا بھی موجود نہیں ہے۔

تب انہیں احساس ہوا کہ یہ تو ایسا سکوت ہے، جیسے پوری کائنات نے سانس روک لی ہے۔ کہیں معمولی سا بھی کوئی تحرک نہیں تھا۔ انہیں گھبراہٹ ہونے لگی۔

انہوں نے حمیدہ کو دیکھا۔ وہ اب بھی آنکھیں بند کئے ہوئے تھی۔ ہونٹوں کی لرزتی ہوئی جنبش سے اندازا ہوتا تھا کہ وہ بھی گھبرائی ہوئی ہے۔ اور دعا کر رہی ہے۔

''کیا ہوا دادی اماں!'' ارجمند نے حمیدہ سے پوچھا۔

حمیدہ نے آنکھیں کھولیں۔

''اللہ رحم کرے۔ لال آندھی آنے والی ہے۔'' اس کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

ارجمند کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ لیکن نوربانو نے صحرا دیکھا تھا اور لال آندھی کے پس منظر سے بھی واقف تھی۔ اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''کیسی باتیں کرتی ہو اماں! یہ کوئی صحرا تھوڑی ہے۔ یہاں ریت کہاں اور لال آندھی کہاں؟''

''مگر اس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا، جب لال آندھی آئی تھی۔''

''یہ کوئی اور بات ہے اماں!'' نوربانو نے کہا اور فاطمہ اور جنیاں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ دونوں مسکرا رہی تھیں۔

''کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے جنیاں؟''

''نہیں بیگم صاب! آپ اندر چلیں...... جلدی جلدی۔''

اس کا لہجہ تو اطمینان دلانے والا تھا لیکن...... جلدی جلدی...... کی تاکید ڈرا رہی تھی۔ وہ سب تیز قدموں سے بنگلے کی طرف چل دیئے۔

''بات کیا ہے؟'' نوربانو نے پوچھا۔

''برف پڑنے والی ہے بیگم صاب!''

''اوہ...... واہ......!'' نوربانو کے دل میں خوشی جاگ اٹھی۔ وہاں آنے کے بعد وہ پہلی بار خوش ہوئی تھی۔

''تو اندر چلنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''یہاں مزہ نہیں آئے گا، اندر سے دیکھیں گے تو بہت اچھا لگے گا۔'' فاطمہ بولی۔

وہ لوگ عقبی دروازے سے بنگلے میں داخل ہوئے، اور اسی وقت عبدالحق سامنے والے دروازے سے اندر آیا۔ انہیں دیکھتے ہی اس نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔

''برف باری ہونے والی ہے۔''

اور ماحول ایک دم بدل گیا۔ حمیدہ بھی خوش نظر آنے لگی۔

❁ ❁ ❁

وہ اندھیرا ایسا تھا، جیسے رات شروع ہو رہی ہو۔ سردی بالکل غائب ہوگئی تھی۔ عبدالحق کی فرمائش پر نوربانو اور ارجمند کافی بنانے کے لئے نیچے چلی گئی تھیں۔ شمریز اور اس کے گھر والے سرونٹ کوارٹر میں تھے۔ شمریز کے کہنے کے مطابق عبدالحق نے تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کر لئے تھے۔ اس نے اس کی وجہ بھی بتا دی تھی۔

نوربانو اور ارجمند کافی لے کر اوپری منزل پر آئیں اور وہ لوگ بیٹھ کر کافی پینے لگے۔

''دروازے اور کھڑکیاں تو کھول دیں۔ گھٹن ہو رہی ہے۔'' نوربانو نے عبدالحق سے کہا۔

''نہیں......! ابھی نہیں۔''

''کیوں بھئی!''

''سردی میں دروازے کھڑکیاں کون کھولتا ہے؟''

''مگر سردی تو ہے ہی نہیں۔''

''سردی ہے۔ بس محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ یہ بات بہت خطرناک ہوتی ہے۔'' عبدالحق نے اسے سمجھایا۔

نوربانو نے بحث نہیں کی۔ خاموشی سے کافی کے گھونٹ لیتی رہی۔

''پتر عبدالحق! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' حمیدہ سے رہا نہیں گیا۔

''لال آندھی آنے کے وقت بھی ایسی ہی خاموشی تھی پتر! شاید تجھے یاد ہو۔''

''ڈرو مت اماں! وہ اللہ کا قہر تھا، اور یہ اس کی رحمت ہے۔''

عبدالحق بھی اس سکوت پر غور کر رہا تھا۔ جاگتی راتوں کا اسے کافی تجربہ تھا۔ یہ سکوت اس سناٹے سے مختلف تھا۔ سناٹے کی اپنی خاموش آوازیں ہوتی ہیں، جو سنائی نہیں دیتیں، محسوس کر لی جاتی ہیں۔ شاید ان کا تعلق، حسیات سے

نہیں، روح سے ہوتا ہے۔ مگر یہ تو مکمل سکوت تھا، جس میں سانسوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ اور ہر سانس کا زیر و بم سنائی نہیں، جیسے دکھائی دے رہا تھا۔

پھر سکوت کا وہ شیشہ ایک آواز سے چٹخا... بھد بھد بھد..... وہ عجیب سی آواز تھی، جیسے کوئی چھت پر دبے پاؤں چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن بھاری جثے کی وجہ سے وہ آواز پیدا ہو رہی ہو۔

نور بانو اور ارجمند ڈر گئیں۔ ارجمند نے کہا۔

''آغا جی! چھت پر کوئی چل رہا ہے۔''

''چاروں طرف سے ڈھلوان چھت ہے۔ اس پر کوئی کیسے چل سکتا ہے؟'' عبدالحق نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

''کوئی بھوت ہو تو اور بات ہے۔''

''ڈرایئے نہیں!'' نور بانو نے گھبرا کر کہا۔

حمیدہ مطمئن تھی۔ بیٹا اس کے ساتھ تھا، اور مطمئن بھی نظر آ رہا تھا۔ تو پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔

''سنو! وہ جو چھت پر چل رہا ہے، وہ نیچے بھی چل رہا ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

اور واقعی، وہ آواز نیچے سے بھی آ رہی تھی، بلکہ گیلری کی طرف سے بھی آ رہی تھی... بھد بھد بھد......

عبدالحق اٹھا اور اس نے کھڑکیاں کھول دیں۔

''آؤ.....! اور دیکھو۔''

نور بانو اور ارجمند کھڑکی کی طرف لپکیں۔ ان کے پیچھے حمیدہ بھی تھی۔

وہ سب سحر زدہ سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ آسمان سے روئی کے بڑے بڑے گالے سے گر رہے تھے۔ ان کے گرنے کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ روئی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ روئی ہلکی ہوتی ہے۔ وہ فضا میں اُڑتی ہے۔ اس طرح گر نہیں سکتی۔ جبکہ یہ یقیناً بھاری تھے اور سیدھے زمین پر گر رہے تھے۔ اور زمین سے ٹکراتے تو بھد کی آواز سنائی دیتی۔

کچھ دیر تو وہ سب ساکت و صامت، سحر زدہ سے کھڑے رہے۔ پھر نور بانو اور ارجمند نے بچوں کی طرح کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالے۔ لیکن پھر وہ مایوس ہو گئیں۔ ان کے ہاتھ پر تو کچھ بھی نہیں گرا تھا۔

پھر ارجمند نے خوشی سے چیخ ماری۔ اس کے ہاتھ پر ایک گالا گرا تھا۔

''یہ دیکھیں میرے ہاتھ.....!'' اس نے ہاتھ اندر کھینچ کر نور بانو کو دکھایا۔ مگر خود بھی حیران رہ گئی۔ ایک ثانیے کو تو وہ سفید پر کا چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ مگر فوراً ہی وہ نمی میں تبدیل ہو گیا۔ شاید کچھ تو اس کے جسم کی گرمی سے، اور کچھ کمرے کے گرم ماحول سے، جو آتش دان کو سرد کرنے کے باوجود ابھی تک گرم تھا۔

''یہاں آیئے آپ لوگ!'' دوسری طرف سے عبدالحق کی آواز آئی۔ وہ سامنے کے رُخ والے کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے لہجے میں بچوں کی سی خوشی اور سنسنی تھی۔

وہ تینوں ادھر گئیں۔ عبدالحق نے گیلری کی طرف کھلنے والا دروازہ کھول دیا تھا۔

گیلری میں پہنچ کر وہ خوش ہو گئیں۔ کھڑکی سے جو افسانہ لگ رہا تھا، گیلری میں وہ حقیقت تھی۔ وہاں سے وہ برف باری کا پورا منظر دیکھ رہی تھیں۔ بلکہ گیلری کی ریلنگ پر تو برف جم رہی تھی۔

وہاں کھڑے ہو کر تو حمیدہ نے بھی بچوں کی طرح ہاتھ باہر نکالا اور اس کے ہاتھ پر برف کے گالے گرے تو اس نے جلدی سے ہاتھ واپس کھینچا، جیسے تتلی پکڑنے والا کوئی بچہ ڈرے کہ کہیں تتلی اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔ وہ چند لمحے بڑی بے یقینی سے اپنی کلائی سے اوپر تک جمی ہوئی اس برف کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے دوسرے ہاتھ کی اُنگلیوں سے بڑی نرمی اور نزاکت سے اس برف کو چھوا۔ جیسے وہ کوئی خواب ہو۔ اور برف کو چھو کر اس کی بوڑھی آنکھوں میں خوشی کی ایسی چمک ابھری، جیسے وہ پھر سے جوان ہو گئی ہو۔

ویسے تو جو پہلی بار برف گرتے دیکھ رہ ہو، وہ اس کے لئے بہت خوب

صورت ہوتا ہے۔ لیکن صحرا میں زندگی گزارنے والی حمیدہ کے لئے تو وہ خواب سے بھی بڑھ کر تھا۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ آسمان سے یوں برف بھی گر سکتی ہے۔ وہ جہاں رہتی تھی، وہاں ہاتھوں اور چہرے پر صرف ریت ہی جمتی تھی۔ وہاں تو بارش بھی آدمی کو بہت بڑی خوشی دینے والا خواب تھی۔ کہاں یہ برف......

اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور دل میں عبدالحق کو دُعائیں دیں۔ وہ اس کے لئے ایک اور یادگار...... کبھی نہ بھولنے والا دن تھا۔

وہ دن سبھی کے لئے یادگار تھا۔ ان میں سے کوئی بھی اس دن کو کبھی نہیں بھولا۔ نوربانو نے دہلی میں پالا ضرور دیکھا تھا، اور اس کے لئے وہی برف تھا۔ لیکن یہ سچ مچ کی برف باری، اس نے سامنے ٹنڈ منڈ درختوں کو دیکھا۔ اجڑی ہوئی شاخوں پر دیکھتے ہی دیکھتے برف نے بسیرا کر لیا تھا اور شاخیں یوں جھک گئی تھیں، جیسے ان پر بے شمار پرندے بیٹھ گئے ہوں۔

اس نے ایک شاخ کو غور سے دیکھا۔ شاید یہ اس کا وہم ہے۔ درحقیقت شاخ جھکی نہیں ہے۔ اس نے سوچا۔ وہ نظریں جما کر اس شاخ کو دیکھتی رہ گئی۔ مزید برف گرے گی تو یہ مزید جھکے گی، اور وہ اسے دیکھ سکے گی۔ زندگی میں پہلی بار وہ بڑے صبر و تحمل اور یکسوئی سے کسی چیز کا انتظار کر رہی تھی۔

شاخ پر برف کی تہہ دبیز تر ہوتی گئی۔ پھر اس نے شاخ میں ہلکی سی لچک محسوس کی۔ لیکن وہ ایسی واضح بھی نہیں تھی۔ اب بھی وہ اسے فریب نظر ہی لگا۔ اپنا کوئی وہم۔

اور ارجمند کے لئے تو وہ اس دنیا کا منظر ہی نہیں تھا۔ کہاں وہ ایک کوٹھے کے پنجرے میں قید ایک ننھی سی چڑیا، جو آسمان دیکھنے کو بھی ترستی تھی۔ اللہ نے کیسے دن پھیرے کہ اسے آزادی ملی۔ اس نے دیکھا اور جانا کہ دنیا محض ایک کوٹھا نہیں، وہ بہت بڑی ہے...... اتنی بڑی کہ آدمی ساری زندگی گھومتا رہے، پھر بھی دعویٰ نہ کر سکے کہ اس نے زمین کا چپہ چپہ دیکھ لیا ہے۔ اور آج اس نے منظر دیکھا، جو اس کے حافظے میں ہمیشہ زندہ اور متحرک رہے گا۔ کتنے احسان

ہیں اس پر آغا جی کے؟ یہ خیال اسے پہلی بار آیا اور ذہن میں ہمیشہ کے لئے جم کر بیٹھ گیا۔ یہ خوب صورتی بھی انہوں نے ہی اسے دکھائی ہے۔ کیا وہ کبھی ان کے احسانات کا صلہ دے سکے گی؟

اس کا دل عبدالحق کی محبت سے سرشار ہوگیا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کتنا بے غرض ہے۔

پھر اس خوب صورت کیفیت میں اس کے دل میں پھانس سی چبھی۔ پھپھو زندہ ہوتیں، وہ بھی یہ منظر دیکھتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ کتنا خوش ہوتیں وہ۔ مگر فوراً ہی جوابی سوچ ابھری۔ وہ ہوتیں تو وہ خود یہاں نہ ہوتی۔ وہ تو کوٹھے پر ہوتیں اور وہ ان کے ساتھ ہوتی۔

ارے...... یہ تو اللہ کا کرم ہے۔ اس نے شرمندگی سے سوچا۔ اللہ نے ہی مجھے عزت اور آبرو کے ساتھ آزادی عطا فرمائی۔ اللہ نے ہی آغا جی کو...... نہیں، صرف آغا جی کو نہیں، آپی اور دادی اماں کو میرے لئے مہربان بنایا۔ ورنہ یہ سب لوگ تو اجنبی تھے۔ مجھے جانتے بھی نہیں تھے۔

اس نے سوچا، مغرب کے بعد وہ شکر کے دو نفل ضرور پڑھے گی۔

عبدالحق کی کیفیت ان سب سے مختلف تھی۔ وہ نہ صرف سحر زدہ سا اس منظر کو دیکھ رہا تھا، بلکہ سفر کے تمام مناظر بھی اس کی نگاہوں میں پھر رہے تھے، اور اسے قرآن کی آیتیں یاد آ رہی تھیں۔ زمین میں چلو پھرو...... سفر کرو...... گھومو...... اللہ کی نشانیاں دیکھو...... سمجھو...... ایمان لاؤ۔ اس کی مناعی کو داد دو۔ کیسے اس نے زمین کو تمہارے لئے بچھونا بنایا، ہموار کیا، اس میں راستے بنائے، تاکہ تم اس میں چل پھر سکو۔ اس نے زمین میں پہاڑوں کے لنگر ڈالے کہ کہیں وہ تمہیں لے کر لڑھک نہ جائے۔

یہ تو اس نے لڑکپن میں ہی سمجھ لیا تھا کہ ہر منظر میں، حتیٰ کہ ہر چھوٹی سی چیز میں اللہ کی نشانیاں ہیں۔ مگر اب بہت عرصے کے بعد وہ اس انداز میں گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا، غور کر رہا تھا۔

پھر اس پر غور کرتے ہوئے اسے اس پر شرمندگی ہونے لگی۔ یہ کیسی

غفلت ہے، جس میں وہ برسوں مبتلا رہا۔ اسے یاد تھا، ماسٹر جی کی علالت کے دوران وہ بارہا پہاڑی علاقے میں گیا، اور بڑی باقاعدگی کے ساتھ گیا۔ اس نے وہاں کے حسن کو بہر حال دیکھا اور سراہا۔ لیکن کبھی اس انداز میں اس پر غور نہیں کیا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟

اور اس کیوں کا جواب اسے فوراً ہی مل گیا۔ وہ جب بھی وہاں گیا تو اس کا ذہن ماسٹر جی اور ان کے مسائل میں الجھا رہا اور وہ صرف ماسٹر جی کی صحت کے مسائل نہیں تھے۔ وہ ان کے معاشرتی مسائل بھی تھے۔ وہ ان کے اندر کے دکھ تھے، جو ان کے لئے روگ بن گئے تھے، اور وہ انہیں محسوس کرتا تھا۔ وہ ان کے لئے دکھی تھا کہ کوشش کے باوجود وہ ان کے دکھوں کا مداوا نہیں کر سکا تھا۔ وہ بوڑھا شخص، جس نے ساری زندگی اولاد کے لئے محنت کی تھی، ان کی ضرورتوں اور خوشیوں کا خیال رکھا تھا، جب اس پر وہ وقت آیا کہ اولاد اس کا خیال رکھے تو اولاد نے اسے اچھوت بنا کر ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ڈال دیا۔ چلو یہاں تک بھی ٹھیک تھا۔ لیکن اس سے سینی ٹوریم میں آکر ملنے کے لئے بھی اس کے بیٹوں میں سے کوئی وقت نہیں نکال سکا۔ سر توڑ کوشش کے باوجود عبدالحق ان میں سے کسی کو قائل نہیں کر سکا، وہ ماسٹر جی کو یہ خوشی نہ دلا سکا۔

یوں وہ پہاڑی علاقے میں کئی بار جانے کے باوجود اس پر غور نہیں کر سکا، بلکہ صحیح معنوں میں اسے دیکھ بھی نہیں سکا۔ یہ زندگی کی الجھنیں تھیں، دنیا کے جھنجٹ تھے۔ ان میں الجھ کر آدمی کچھ بھی دیکھ اور سوچ نہیں سکتا۔

اور اس نے تو برسوں میں نہ کچھ دیکھا تھا، نہ سوچا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد وہ اپنی خاندانی حویلی کو، ریت میں دبے ہوئے گاؤں کو برآمد کرانے میں الجھا رہا۔ پھر نور بانو کے چچا کی تلاش میں لاہور آ گیا۔ اس کے بعد شادی، پھر لاہور منتقلی، اور اب یہ ملازمت۔ زندگی کے جھنجٹ تھے کہ پھیلتے ہی چلے جا رہے تھے۔ ہاں! ان برسوں میں اسے مشاہدات کا خزانہ ملا تھا۔ لیکن وہ دنیاوی تھا۔ اس نے بھانت بھانت کے لوگ دیکھے، انسانوں کی مجبوریاں، ان کی بے بسی، ان کی محرومیاں، ان کے دکھ اور ان کے عذاب، جہاں تک ہو سکا، اس نے

لوگوں کے دکھ بانٹے، ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بہر حال یہ مشاہدۂ حق تو نہیں تھا۔ چپے چپے پر، ہر شے میں بکھری ہوئی اللہ کی نشانیاں تو وہ نہیں دیکھ پایا تھا۔

اس نے جھنجلا کر سوچا۔ یہ وہ میں تو نہیں ہوں، جو کبھی تھا۔ میں نے تو آگہی کی راہ پر چلتے چلتے نہ جانے کب دنیا کے میلے میں کھو گیا، بھیڑ میں گم ہو گیا۔ یہ میرا راستہ تو نہیں۔ مجھے دنیا میں الجھنے کی ایسی کیا ضرورت ہے؟

اسی لمحے اسے اپنی ملازمت بری لگنے لگی۔ ملک و قوم کی کیا خدمت کر رہا ہوں میں؟ یہ کام تو کوئی اور بھی کر سکتا ہے۔ اس نے موازنہ کیا تو احساس ہوا کہ وہ پہلے زیادہ خوش تھا۔

اسے مولوی مہر علی بڑی شدت سے یاد آئے۔ اس نے سوچا۔ پہلی فرصت میں وہ حق نگر جا کر ان سے بات کرے گا۔

''دیکھیں تو، سڑک پر کتنی برف جم گئی ہے۔'' نور بانو کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

اس نے دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ واقعی اتنی دیر میں کافی برف گر چکی تھی۔ گرد و پیش بالکل سفید ہو گیا تھا۔ کہیں بھی زمین نظر نہیں آ رہی تھی۔

''اب باہر چلیں نا!'' نور بانو نے کہا۔

''ابھی نہیں..... ! مغرب پڑھ کر چلیں گے۔ ٹوپیاں ضرور پہن لیجئے گا آپ لوگ۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اور برف باری رک گئی تو؟''

''انشاء اللہ نہیں رکے گی۔''

✿ ✿ ✿

اور مغرب کے بعد وہ لوگ عقبی دروازے سے نکلے تو برف باری کا سلسلہ جاری تھا۔ ہر طرف برف ہی برف نظر آ رہی تھی۔ رات ہو گئی تھی۔ لیکن برف کی وجہ سے اندھیرا نہیں لگ رہا تھا۔

"ایسا لگتا ہے کہ آسمان سے پھول برس رہے ہیں۔" ارجمند نے خوشی سے کہا۔

"ہاں ارجی! اللہ میاں تم پر پھول برسا رہے ہیں۔" نور بانو نے محبت سے کہا۔

وہ لوگ خاردار تاروں کی باڑھ تک گئے۔ اس کے پار، ڈھلان پر برف چمک رہی تھی۔

"ہم اس طرف نہیں جا سکتے کیا؟" ارجمند ت چھوٹی سی بچی بن گئی تھی۔

"رات کے وقت یہ مناسب نہیں۔" عبدالحق نے اُسے سمجھایا۔

"اور پھر ادھر جانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم سڑک کی طرف سے چلیں گے۔ ڈھلانوں پر برف خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔"

"تو پھر باہر چلیں۔" ارجمند نے بے صبرے پن سے کہا۔

"کل صبح چلیں گے۔"

"سورج نکل آیا اور برف پگھل گئی تو؟"

"ارے نہیں! انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔"

وہ بنگلے کی طرف واپس چل دیئے۔ عبدالحق اور نور بانو آگے تھے۔ اور ارجمند حمیدہ کا ساتھ دینے کے لئے پیچھے چل رہی تھی۔ پھر اچانک حمیدہ رکی اور برف پر اکڑوں بیٹھ گئی۔

ارجمند بھی رک گئی۔

"کیا ہوا دادی اماں! تھک گئیں؟"

"نہیں نکی! بس تو دیکھتی جا۔" حمیدہ کے لہجے میں بچوں کی سی سنسنی تھی۔

ارجمند بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

حمیدہ نے چمڑے کے لمبے بوٹ میں چھپے پاؤں کو سیدھا کر کے رکھا اور اس کے اوپر برف جمانے لگی۔

"اوہو...... ! آپ گھروندہ بنا رہی ہیں دادی اماں!" ارجمند نے چہک

کر کہا۔

"ہاں نکی!"

ارجمند بھی اسی کوشش میں مصروف ہوگئی۔

عبدالحق کو خاصا آگے جا کر احساس ہوا کہ اماں اور ارجمند ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کچھ دور برف پر بیٹھی وہ دونوں سائے کی طرح نظر آ رہی تھیں، اور دونوں کے ہاتھ مسلسل حرکت میں تھے۔

"کیا ہوا اماں؟" عبدالحق نے پکارا۔

"کچھ نہیں پتر! ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔" حمیدہ نے جواب دیا۔

"پتا نہیں! کیا کر رہی ہیں۔" عبدالحق پُرتشویش لہجے میں بڑبڑایا۔

لیکن نور بانو سمجھ گئی تھی۔

"اماں بھی بچہ بن گئی ہیں۔ گھروندا بنا رہی ہیں۔"

"تو بڈھا اور بچہ برابر ہی ہوتے ہیں۔" عبدالحق نے مسکرا کر کہا۔

"کاش میرے پاس کیمرہ ہوتا اور میں ان دونوں کی تصویر بنا سکتا۔ اس کا عنوان ہوتا...... دو بچے...... کیسی یادگار تصویر ہوتی۔"

اسی وقت سرونٹ کوارٹر کی طرف سے جنیاں دوڑتی ہوئی ان کی طرف آئی۔ اس کے ہاتھ میں کیمرہ تھا۔

"صاحب جی! یہ بھائی نے بھجوایا ہے۔ وہ بولتے ہیں، اس میں فلم بھی ہے۔"

عبدالحق نے سوچا، اس وقت میں کچھ بھی مانگتا، مل جاتا۔ اور اسے شمریز پر رشک آیا۔ وہ جس بات کا خیال نہیں رکھ سکا تھا، شمریز نے اس کا خیال رکھا تھا۔

اس نے جنیاں سے کیمرہ لیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ!"

"آ پتر! تو بھی آ جا! دیکھ، بچپن لوٹ آیا ہے۔" حمیدہ نے ایک لمحے کو سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پکارا۔ اور پھر فوراً ہی اپنے گھروندے پر جھک گئی۔

عبدالحق نور بانو کے ساتھ آگے بڑھا۔ مناسب فاصلے سے اس نے ان دونوں کی تصویر کھینچی، جو اپنے اپنے گھروندے میں الجھی ہوئی تھیں۔ انہیں اس کا علم بھی نہیں تھا کہ کیمرے کی آنکھ اس لمحے کو دیکھ کر محفوظ کر رہی ہے۔

دوسری تصویر عبدالحق نے جس لمحے کھینچی، وہ جادوئی لمحہ تھا۔ حمیدہ نے اپنا پاؤں باہر نکالا، اور فوراً ہی اس کا گھروندا ڈھے گیا۔ اس نے سر اُٹھایا اور مایوسی سے بولی۔

''ہائے ربا...... ! ٹوٹ گیا۔'' اور کیمرے نے اس کے تاثرات، ٹوٹے ہوئے گھروندے کو اور گھروندا بناتی ہوئی ارجمند کو محفوظ کر لیا۔

ذرا دیر بعد یہی کچھ ارجمند کے گھروندے کے ساتھ ہوا۔ عبدالحق نے وہ تصویر بھی کھینچ لی۔

''اب چلیں!'' عبدالحق نے کہا۔

''نا پتر! میں نے تو گھروندا بنانا ہے۔'' حمیدہ نے بچوں کے سے ضدی لہجے میں کہا۔ اور اٹھتی ہوئی ارجمند بھی دوبارہ بیٹھ گئی۔ وہ دونوں، گرد و پیش سے بے خبر ہو کر پھر گھروندا بنانے میں مصروف ہو گئیں۔

کئی کوششوں کی ناکامی کے بعد حمیدہ نے سر اٹھا کر بے بسی سے عبدالحق کو دیکھا۔

''یہ کیوں نہیں بنتا پتر!''

عبدالحق سوچ میں پڑ گیا۔ جواب اسے معلوم نہیں تھا، لیکن اس کا کوئی جواب تو ہوگا۔

''اس برف سے تو میری ریت اچھی۔'' حمیدہ نے جھنجلا کر کہا۔

''نہیں اماں! ایسا نہ کہو۔''

''تو پھر گھروندا کیوں نہیں بنتا میرا۔''

''آج چھوڑ دو۔ انشاء اللہ کل بن جائے گا۔'' عبدالحق نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

''آج کیوں نہیں بنتا؟ اور کل کیسے بن جائے گا؟'' حمیدہ چڑ کر بولی۔

عبدالحق اس بات کا جواب نہ ہونے کی وجہ سے شرمندہ ہونے لگا۔ لیکن اسی لمحے اس کے اندر ایک خیال ابھرا۔ اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''دیکھو اماں! ریت تو زمین کی ہی چیز ہے نا!'' اس دوران وہ ازخود ابھرنے والا خیال اس کے ذہن میں اپنے خدوخال اجاگر کر رہا تھا۔

''اور برف!''

''یہ تو آسمان سے آئی ہے نا اماں!'' وہ ایسے سمجھانا چاہتا تھا کہ بات حمیدہ کی سمجھ میں آ جائے۔

''تو پھر؟'' حمیدہ نے جرح کی۔

''یہ جہان سے آئی ہے، وہاں اتنی سردی ہے کہ بارش کے قطرے جم کر برف بن گئے ہیں۔''

''تو یہاں بھی تو سردی ہے۔'' حمیدہ نے اعتراض کیا۔

ارجمند اب ٹکٹکی باندھے عبدالحق کے چہرے کو تک رہی تھی، جس پر گہرے انہماک کا ایسا تاثر تھا، جیسے وہ کسی ایسی بات پر غور کر رہا ہو، جسے سمجھنا اس کے لئے بھی آسان نہیں، جبکہ وہ تو دوسروں کو سمجھانے کے مرحلے سے گزر رہا ہے۔

''یہ برف اس زمین کی چیز نہیں، یہ یہاں اجنبی ہے اماں!'' عبدالحق پُرخیال انداز میں کہا۔

''اور زمین کتنی ہی ٹھنڈی ہو؟ اس برف کے لحاظ سے تو گرم ہی ہے۔''

''تو کل گھروندا کیسے بن جائے گا؟'' حمیدہ کے لہجے میں چیلنج تھا۔

''زمین پر برف کی تہہ اتنی ہو جائے گی اماں! کہ بعد میں گرنے والی برف جم جائے گی، سخت ہو جائے گی۔ تب گھروندا بن جائے گا۔'' یہ کہتے کہتے عبدالحق کو ایک خیال نے چونکا دیا۔

''اور اماں! ریت کا گھروندا بھی گرمی میں کب بنتا تھا؟''

حمیدہ نے چند لمحے سوچا، پھر بولی۔

''سچ کہتا ہے پتر! گھروندا تو گیلی ریت سے بنتا تھا۔ بارش کے دنوں

میں، یا پھر ندی کے کنارے بنتا تھا۔''

''ہاں اماں! زمین پر پڑی ہوئی برف جس جگہ تک زمین کے اندر کی گرمی کو جذب کرے گی تو اس سے اوپر کی برف ویسی ہی ٹھنڈی رہے گی، جیسی آسمان سے آئی ہے۔ پھر وہ جم کر سخت ہوگی۔ تب تم گھروندا بنا سکو گی۔''

''میں سمجھ گئی پتر!'' حمیدہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''آپ کتنے عقل مند ہیں آغا جی!'' ارجمند نے بے ساختہ ستائشی لہجے میں کہا۔

''ہاں نکی! عقل مند تو ہے میرا پتر!'' حمیدہ کے لہجے میں فخر تھا۔

''نہیں اماں! یہ بات میں نے عقل سے نہیں، دل سے سمجھی ہے۔ اور سمجھانے والا اللہ ہے۔''

''اب چلیں پتر!'' حمیدہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

ارجمند بھی اللہ اللہ کر کے کھڑی ہوئی۔ وہ بنگلے کی طرف چل دیئے۔

حمیدہ نے تو عبدالحق کی بات کو اس کی فطری عاجزی سمجھا تھا۔ لیکن ارجمند اس کی بات پر بہت سنجیدگی سے غور کر رہی تھی۔ وہ اس بات کو سمجھ سکتی تھی۔ اسے دل کی سچی راہنمائی کا تجربہ تھا۔ عقل اور دماغ جہاں نہیں پہنچ سکتے، دل آدمی کو وہاں پہنچا دیتا ہے۔ دل میں جو خیال آتا ہے، دماغ اس پر ہمیشہ شک کرتا ہے، اسے گمان سمجھ کر اپناتا ہے۔ لیکن دل اس پر یقین کرتے ہوئے اسے ایمان کے درجے پر پہنچا دیتا ہے۔

اچانک اسے حمیدہ کی کہی ہوئی بات یاد آگئی۔ حمیدہ نے کہا تھا کہ جب تک بندہ اللہ سے ڈرتا ہے، اس کا کہنا مانتا ہے، سچ بولتا ہے اور پاک صاف رہتا ہے تو اس کا دل اللہ کا گھر رہتا ہے۔ اللہ اس سے باتیں کرتا ہے، اسے راستہ دکھاتا ہے۔ اور دل سیاہ ہو جائے تو شیطان آدمی کو بہکاتا بھٹکاتا رہتا ہے اور آدمی سمجھتا ہے کہ اللہ اس کی راہنمائی کر رہا ہے۔

اس وقت کی طرح وہ اس وقت بھی خوف سے جھرجھری لے کر رہ گئی۔

دل کو پاک صاف رکھنا چاہئے۔ اسی لمحے اسے خیال آیا کہ آغا جی کا دل کیسا

روشن اور پاک صاف ہے۔ اسے رشک آنے لگا۔

❁ ❁ ❁

صبح وہ سو کر اٹھے، تب بھی برف باری ہو رہی تھی۔ باہر اب برف کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ہر چیز برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ سب کی کیفیت بچوں کی سی تھی۔ وہ باہر نکلنے کو تڑپ رہے تھے۔ کسی سے ٹھیک سے ناشتہ بھی نہیں کیا گیا۔

جنیاں اور فاطمہ آگئی تھیں۔ عبدالحق باہر شمریز اور نوریز کے پاس چلا گیا۔

''کیا ساری رات برف باری ہوئی ہے؟'' نوربانو نے جنیاں سے پوچھا۔

''جی بی بی صاحبہ!'' جنیاں نے فخر اور خوشی سے کہا۔

''ابھی تک نہیں رکی ہے۔ بڑے دن پر اتنی برف پڑتی کبھی نہیں دیکھی۔''

''لگتا ہے، اللہ میاں آپ کی مہمان نوازی کر رہے ہیں۔'' فاطمہ نے ہنس کر کہا۔

''مگر سردی تو بالکل نہیں ہے۔''

''برف رکے گی تو اتنی ٹھنڈی ہوا چلے گی کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔'' فاطمہ نے کہا۔

''برف باری کے بعد اصل سردی ہوتی ہے۔''

''اچھا!'' نوربانو کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

نوربانو تو فوراً ہی بنگلے سے نکل کر باہر کی سیر کرنا چاہتی تھی۔ لیکن حمیدہ کے سر پر گھروندا سوار تھا۔ عبدالحق نے کہا۔

''پہلے عقبی حصے میں چلتے ہیں۔ برف باری کسی بھی وقت رک سکتی ہے۔ اس کے بعد خطرناک سردی ہوگی۔ میں بغیر تیاری کے باہر نہیں نکلنا چاہتا۔ مجھے اماں کی فکر ہے۔'' اور نوربانو برا سا منہ بنا کر رہ گئی۔

وہ باہر نکلے۔ حمیدہ ارجمند کو لے کر اس طرف گئی، جہاں رات وہ

گھروندا بنانے کے ناکام کوشش کرتی رہی تھی۔ اس نے بڑے خشوع و خضوع سے بسم اللہ پڑھی اور بیٹھ گئی۔ اس نے برف کو چھوا لیکن اس کے انداز میں بڑی بے یقینی تھی۔

عبدالحق نے کیمرہ سنبھال لیا تھا۔

اس بار گھروندا گرا نہیں، قائم رہا۔ حمیدہ کی بوڑھی آنکھوں میں ایسی چمک ابھری، جو عبدالحق نے برسوں سے نہیں دیکھی تھی۔

''میرا گھروندا بن گیا۔ تیرا شکر ہے ربا!'' حمیدہ نے آسمان کی طرف سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

ارجمند بھی بچوں کی طرح تالیاں بجا رہی تھی۔ نوربانو بھی مسکرا رہی تھی۔ پھر وہ بھی گھروندا بنانے بیٹھ گئی۔ حمیدہ دوسرا گھروندا بنانے لگی۔ لگتا تھا کہ اس کا دل ابھی نہیں بھرا ہے۔

پھر اچانک ہی حمیدہ کو شدید سردی کا احساس ہوا۔ اس کا جسم کپکپانے لگا۔ نوربانو اور ارجمند پہلے کی سی بے فکری کے ساتھ اپنے اپنے گھروندے میں لگی ہوئی تھیں۔

''پتر! مجھے تو بڑی ٹھنڈ لگ رہی ہے۔'' حمیدہ نے کپکپاتی آواز میں عبدالحق سے کہا۔

عبدالحق نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔

''یہ ایک دم سے کیا ہوا اماں!'' اس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ برف باری رک گئی ہے۔ برف باری کب رکی، اس کا اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ تو ان لوگوں کو دیکھنے اور تصویریں بنانے میں منہمک تھا۔

''برف باری رک گئی ہے۔ آپ لوگ جلدی سے اندر آجائیں۔ میں اماں کو لے کر جا رہا ہوں۔'' اس نے کہا اور تیزی سے حمیدہ کو گود میں لے کر گھر کی طرف دوڑنے لگا۔

نوربانو اور ارجمند نے چونک کر دیکھا تو وہ احتجاج کرتی ہوئی حمیدہ کو

گود میں لئے بنگلے کی طرف دوڑتا نظر آیا۔

''یہ انہیں کیا ہو گیا اچانک؟'' نوربانو بڑبڑائی۔

''وہ کہہ رہے تھے کہ برف باری رک گئی ہے۔'' ارجمند نے کہا۔ لیکن ابھی وہ محض لفظ تھے۔ ان کی معنویت اس کے دماغ تک نہیں پہنچی تھی۔ پھر اسے یاد آیا تو اس نے اضافہ کیا۔

''اور آپی! اس سے پہلے دادی اماں نے کہا تھا کہ انہیں سردی لگ رہی ہے۔''

نوربانو نے ادھر ادھر دیکھا اور بولی۔

''ارے واقعی! یہ برف باری کب رکی؟''

اس بار ارجمند کو احساس ہو گیا کہ برف باری رک گئی ہے۔

''معلوم نہیں آپی! مجھے تو پتا بھی نہیں چلا۔ اور اب مجھے سردی لگ رہی ہے۔''

''لگ تو مجھے بھی رہی ہے۔ لیکن اماں نے اتنا شور کیوں مچا دیا؟''

''اماں بوڑھی اور کمزور ہیں نا آپی!'' ارجمند نے اسے سمجھایا۔ ''اب اندر چلیں آپی! آغا جی کہہ کر گئے ہیں۔''

''یہ گھروندا مکمل کر لیں، پھر چلتے ہیں۔''

لیکن گھروندا مکمل ہوتے ہوتے ان دونوں کو بھی باقاعدہ سردی لگنے لگی۔

وہ اندر پہنچیں تو حمیدہ کمبل میں لپٹی بیٹھی تھی اور عبدالحق اسے کافی کی پیالی دے رہا تھا، جو اس نے خود بنائی تھی۔

''اسے گرم گرم پی لو اماں!''

حمیدہ نے پہلا گھونٹ لیا اور برا سا منہ بنا کر بولی۔

''یہ تو کڑوی زہر ہے۔''

''اسے سردی بھگانے والی دوا سمجھ کر پی لو اماں!''

اور واقعی، کافی پیتے ہی حمیدہ نے کمبل اتار پھینکا۔

''یہ تو بڑے کام کی چیز ہے پتر!''

عبدالحق مسکرا دیا۔

''اب باہر چلیں نا!'' نور بانو نے عبدالحق سے کہا۔

''اب یہ خطرناک سردی ہے۔'' عبدالحق بولا۔

''پوری تیاری سے نکلنا ہوگا۔ گرم کپڑوں اور تمام لوازمات کے ساتھ، تیار ہو جاؤ۔''

وہ سب تیار ہونے لگے، سویٹر، جیکٹ اور جیکٹ پر چیسٹر، کانوں پر اونی مفلر لپیٹے گئے اور سروں پر اونی ٹوپیاں، ہاتھوں میں چمڑے کے دستانے۔ یہ سب کچھ شمریز کی ہدایات کے مطابق تھا۔

''پہلی بار مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں بہت موٹی ہوں۔'' نور بانو نے ہنستے ہوئے کہا۔

لیکن حمیدہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''پتر! میں بیل تو نہیں ہوں کہ یہ بوجھ اٹھا سکوں۔''

عبدالحق نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''کیا کہہ رہی ہو اماں!''

''میں تو اس حال میں دو قدم بھی نہیں چل سکتی پتر! تم لوگ جاؤ۔ میں یہیں رکوں گی۔''

''تو یہ لوگ چلی جائیں گی۔ میں تمہارے ساتھ رکوں گا اماں!'' عبدالحق نے کہا۔

''تو کیا ہم اکیلی جائیں گی۔'' نور بانو نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

''اکیلی کیوں؟ نوریز اور جنیاں جائیں گے تمہارے ساتھ۔''

''نا پتر! تو ان لوگوں کے ساتھ جا۔'' حمیدہ نے جلدی سے کہا۔

''تمہیں اکیلا چھوڑ کر؟''

''میرے ساتھ یہ جنیاں اور فاطمہ ہیں نا، تو میری فکر نہ کر۔''

عبدالحق کا دل نہیں مان رہا تھا۔ لیکن انکار ممکن نہیں تھا۔

''آؤ چلیں۔'' اس نے نور بانو اور ارجمند سے کہا۔

✿ ✿ ✿

شمریز نے نوریز کو ان کے ساتھ کر دیا تھا۔

پہلے تو انہوں نے مال روڈ کا رخ کیا۔ وہاں خاصی رونق تھی۔ انہوں نے ایک دکان سے چوڑیاں خریدیں۔ پھر وہ ادھر ادھر گھومتے پھرے۔ ایک دکان سے عبدالحق نے ڈرائی فروٹ خریدے۔

''گھر میں بیٹھ کر کھائیں گے۔'' اس نے کہا۔

ارجمند کو کوئی چیز رہ رہ کر ستا رہی تھی۔ اندر جیسے کوئی تکلیف میں تھی، اور اس کا تعلق کسی ایسی چیز سے تھا، جو وہ دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر وہ ذہن پر زور دیتی رہی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

مگر پر بات سمجھ میں آ گئی۔ اسے دکھ ہونے لگا۔

''ہائے.....! یہ برف کتنی میلی ہوگئی ہے لوگوں کے چلنے سے۔'' اس نے کہا۔

نور بانو نے چونک کر اسے دیکھا۔

''واقعی! مجھے بھی برا لگ رہا تھا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کیا ہے؟''

''کتنی پاک صاف، کتنی سفید برف تھی۔'' ارجمند نے آزردگی سے کہا۔

''اب دیکھ کر لگتا ہے کہ اس کی خوبصورتی کو داغ لگ گیا ہے۔''

عبدالحق اداسی سے مسکرایا۔

''اللہ انسان کو ایسی ہی پاک صاف، شفاف اور بے داغ روح دے کر بھیجتے ہیں دنیا میں۔ اور وہ یہاں اسے میلا اور داغ دار کر لیتا ہے۔ اسی کا تو جواب دینا پڑے گا قیامت کے دن۔''

''آپ بھی بس فلسفہ شروع کر دیتے ہیں۔'' نور بانو نے لاڈ سے کہا۔

''ان دونوں باتوں کا کیا تعلق آپس میں؟''

''محسوس کرنے کی بات ہے۔'' عبدالحق نے برا مانے بغیر کہا۔

ارجمند نے اسے محسوس بھی کیا تھا، اور اس نکتے پر غور بھی کر رہی تھی۔ نور بانو کی مداخلت اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔

"یہ کیسے محسوس کیا آپ نے؟" نور بانو نے عبدالحق سے پوچھا۔

"دیکھو نا، آدمی تو خاک کا پتلا ہے۔ سو اس کا جسم زمین پر پھلتا پھولتا ہے، بڑھتا ہے، لیکن روح تو آسمانوں کی چیز ہے۔"

"کیسے......؟"

"غور کیا کرو، سوچا کرو۔ آدمی مرتا ہے تو اس کا جسم تو مٹی میں دبا دیا جاتا ہے۔ لیکن روح آسمان پر پرواز کر جاتی ہے۔ اب سوچو، زندگی کیا ہے؟ اور روح کیا ہے؟ زندگی روح کے دم سے ہے۔ روح کرنٹ ہے، بیٹری ہے، جسے ہم زندگی کہتے ہیں۔ موت اللہ کے حکم سے، اس کے مقرر کردہ وقت پر روح قبض کر لینے کا نام ہے۔ روح نکل جاتی ہے تو جسم بے جان ہو جاتا ہے۔ کبھی بیٹری سے چلنے والی موٹر نہیں دیکھی۔ بیٹری نکال لو تو موٹر رک جاتی ہے۔ روح توانائی ہے۔ وہ اس دنیا کی زمین کی چیز نہیں۔ وہ تو اللہ کی امانت ہے۔ زندگی کی کامیابی یہ ہے کہ اللہ روح واپس لے تو وہ ویسی ہی پاک صاف ہو، جیسی اللہ نے دی تھی۔"

"لیکن یہ تو ممکن نہیں۔" ارجمند نے کہا۔

"ٹھیک کہتی ہو۔ یہ میلی برف ہمیں یہی بتاتی ہے۔" عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

"لیکن اللہ غفور الرحیم ہے۔ سب کچھ جانتا ہے۔ وہ ہماری فطرت سے واقف ہے، اور یہ دنیا بھی اسی کی بنائی ہوئی آزمائش ہے۔ روح جیسی اللہ نے دی، ویسی تو شاید صرف پیغمبر ہی واپس کرتے ہوں گے۔ عام بندے تو آلودہ ہوتے ہی ہیں۔ تو اللہ نے ان کے لئے نرمی بھی یقیناً رکھی ہے۔ وہ تو بہت بخشنے والا ہے۔ سمندر کے جھاگ جتنے گناہ بھی بخش دے۔ لیکن جنہوں نے شرک کی، اور اس سے بغاوت کی، انہیں وہ نہیں بخشے گا۔ شاید یہی دو چیزیں روح کو سب سے زیادہ آلودہ کرتی ہوں گی؟"

ارجمند سوچ رہی تھی۔ یہ آغا جی کیسے آدمی ہیں؟ کیسے مختلف انداز میں سوچتے ہیں، اور کتنا اچھا سوچتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا عمل بھی اچھا ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی سمجھ میں ایک بات آئی، جو اسے بہت اہم لگی۔ انسان کی سوچ بہت اہم ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اس کے عمل کی بنیاد ہوتی ہے۔ جس شخص کی سوچیں اور خیالات برے ہوں گے، وہ اچھا عمل کیسے کرے گا۔ بے شک اچھا سوچنے والا بھی اپنی سوچ کے برابر عمل نہیں کر سکتا۔ لیکن کم از کم برے عمل سے تو بچا رہتا ہے، اور کسی حد تک اچھا عمل بھی کرتا ہے۔ اس نے سمجھ لیا کہ آدمی کو اپنی سوچوں پر نظر رکھنی چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ اس کی سوچیں درست ہوں۔

"لیکن آغا جی! اس برف میں اور آدمی میں کچھ فرق بھی تو ہے۔" اس نے عبدالحق سے کہا۔

عبدالحق چند لمحے غور کرتا رہا۔ پھر اس نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" اس نے کہا۔

"فرق تو بڑا ہے۔ برف تو مجبور ہے۔ اپنی مرضی سے میلی نہیں ہو رہی ہے۔ انسان بے شک برف کی طرح دوسرے لوگوں سے، اپنے گرد و پیش اور اپنے ماحول سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ بڑا نقصان اسے اپنی نفسانی خواہشوں سے ہوتا ہے۔ جبکہ اسے مزاحمت کا اختیار بھی دیا گیا ہے۔ اسی لئے تو اسے جواب دہی کرنی ہے۔ اسی لئے تو جزا اور سزا ہے۔"

سنتے سنتے ارجمند کی نظر اچانک ایک چیز پر پڑی، اور وہ خوشی سے چلائی۔

"وہ دیکھیں تو...... ارے واہ......!"

عبدالحق اور نور بانو نے اشارے کی سمت دیکھا۔ ایک ٹیلے پر چار پانچ بچے برف سے مجسمے بنا رہے تھے۔ مجسمہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ عبدالحق سحر زدہ سا اسے تکنے لگا۔

نور بانو نے سکون کی سانس لی۔ اس خشک موضوع سے چھٹکارا مل رہا

تھا۔ جو اس کے لئے محض کوفت کا سبب تھا۔ اسے ارجمند پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اس میں کیسے دلچسپی لے رہی تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بات اسی کی وجہ سے بڑھی تھی۔

وہ تینوں، بچوں کی طرف بڑھ گئے، جو اپنے مجسمے میں منہمک تھے۔ وہ دیکھتے رہے۔

''کل تو گھروندا بھی نہیں بن رہا تھا اور آج یہ اتنا بڑا مجسمہ......'' وہ بڑبڑائی۔

''اب برف سخت ہوگئی ہے نا!'' عبدالحق نے کہا۔

''مجھے یاد ہے، آپ نے کل کہی تھی یہ بات۔'' ارجمند بولی۔

بچوں کو ان کی موجودگی کا احساس ہوگیا تھا۔ وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی نگاہوں میں فخر تھا۔

''یہ کیا بنا رہے ہو؟'' نوربانو نے ان سے پوچھا۔

''یہ......سنو مین ہے۔'' ایک بچے نے جواب دیا۔

نوربانو کی سمجھ میں نہیں آیا۔ عبدالحق نے اس کے کان میں کہا۔

''یہ انگریزی میں کہہ رہے ہیں، برفادمی۔''

''یہ برفادمی کیا ہوتا ہے؟''

''میں نے تو ترجمہ کیا ہے۔'' عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے، برف کا آدمی۔''

ارجمند ان کی باتوں سے بے خبر، بچوں کے ساتھ شامل ہوگئی تھی۔

مجسمہ مکمل ہوگیا تو ایک بچے نے انگلی سے اس کے سینے پر Snow man لکھ دیا۔ پھر وہ سب تالیاں بجانے لگے۔

وہ چاروں بھی آگے بڑھ گئے۔ کچھ دیر وہ ایک گہری کھائی کے کنارے پر کھڑے نیچے دیکھنے لگے۔ وہاں کوئی چلنے والا نہیں تھا، اس لئے وہاں برف ویسی ہی سفید اور پاکیزہ تھی۔ جیسی آسمان سے برسی تھی۔

''اللہ جسے چاہے، محفوظ کر دے، جسے چاہے بچا لے۔'' عبدالحق نے خود

کلامی کے انداز میں کہا۔

نوربانو کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آئی۔ لیکن بات بڑھ جانے کے ڈر سے اس نے وضاحت نہیں چاہی۔ اور ارجمند اس بات کو پوری طرح سمجھ گئی تھی۔ اسے کسی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

ذرا دیر بعد ارجمند نے کہا۔

''آغا جی! اب گھر چلیں۔''

''کیوں؟ بھوک لگ رہی ہے؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''واقعی! بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔'' نوربانو نے جلدی سے کہا۔

''دادی اماں نہیں آئیں نا! تو ہم انہیں وہاں باہر لے کر چلیں گے، اور ان کے لئے سنو مین بنائیں گے۔'' ارجمند نے جواب دیا۔

''پتا بھی ہے کہ سنو مین کیا ہوتا ہے؟'' نوربانو نے جیسے اسے چیلنج کیا۔

''جی آپی! آغا جی نے مجھے انگریزی پڑھائی ہے نا، اس لئے مجھے معلوم ہے۔'' ارجمند نے سادگی سے کہا۔

❁ ❁ ❁

انہوں نے کھانا کھایا، نماز پڑھی، کچھ دیر آرام کیا اور پھر بنگلے کے عقبی حصے میں نکل گئے۔ حمیدہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن ارجمند کی ضد کے سامنے اسے ہار ماننا پڑی۔

''پر اس کی ضرورت کیا ہے نکی!'' حمیدہ نے نکلتے نکلتے بھی احتجاج کیا۔ بہت زیادہ گرم کپڑوں کے بوجھ کی وجہ سے اسے قدم اٹھانا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔

''ضرورت ہے دادی اماں!'' ارجمند نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''آپ بھی کہہ سکیں گی کہ برف باری کے بعد بھی آپ باہر گھومی تھیں۔ یہاں ہم وہی سب کریں گے، جو ہم نے باہر کیا تھا......آپ کے لئے۔''

''اور باہر کیا کیا تھا تم لوگوں نے؟''

''خود ہی دیکھ لیجئے گا۔''

ارجمند نے عبدالحق سے اس کا ایک کوٹ اور ہیٹ مانگ لیا تھا۔
چھڑیاں تو سب کے ہاتھ میں تھیں، حمیدہ کے لئے وہ چھڑی سب سے زیادہ کام کی ثابت ہو رہی تھی۔
باہر نکلتے ہی حمیدہ کو سب سے پہلے اپنے گھروندے کا خیال آیا۔
''مجھے میرا گھروندا دکھاؤ پہلے۔''
وہ وہاں پہنچے تو حیران رہ گئے۔ رات بھر ہونے والی برف باری کے نتیجے میں ان کے گھروندے تقریباً غائب ہو گئے تھے۔ تاہم وہ جگہ اتنی ابھری ہوئی ضرور تھی کہ انہیں بغیر کسی دشواری کے مل گئی۔
''ہائے ربا! میرا گھروندا؟'' حمیدہ نے تاسف سے کہا۔
''اس کا تو دروازہ ہی بند ہو گیا۔''
''شکر کریں اماں! اندر کوئی نہیں تھا۔ ورنہ دم گھٹ جاتا اس کا۔'' نور بانو نے شوخ لہجے میں کہا۔
''کوئی بات نہیں دادی اماں! اب آپ پہلے سے بھی بڑا گھروندا بنا سکتی ہیں۔'' ارجمند نے حمیدہ کو دلاسہ دیا۔
''اتنی مشکل سے تو وہ بنا تھا۔''
''اب اتنی مشکل نہیں ہوگی۔ برف سخت ہو گئی ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔
حمیدہ گھروندا بنانے میں مگن ہو گئی۔ ارجمند اور نور بانو سنو مین کے لئے جُت گئیں۔ لیکن چند ہی منٹ میں نور بانو بے زار ہو گئی۔ اسے ویسے بھی اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اور نہ ہی اس کی سمجھ میں کچھ آ رہا تھا۔
ارجمند کچھ دیر تو اکیلی کام کرتی رہی۔ پھر اس نے عبدالحق کو پکارا۔
''آغا جی! میری مدد کیجئے نا!''
''مجھے تو یہ سب کچھ آتا ہی نہیں!'' عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔
''آپ آئیں تو! میں سکھا دوں گی۔''
یوں عبدالحق ارجمند کے ساتھ شامل ہو گیا۔
''آپ اس کی ایک ٹانگ بنائیں آغا جی۔''

سنو مین کی وہ نامکمل ٹانگ نور بانو کی بنائی ہوئی تھی، اور جس ٹانگ پر ارجمند کام کر رہی تھی، اس کے مقابلے میں بہت بے ڈھنگی تھی۔ ارجمند کی بنائی ہوئی ٹانگ میں صفائی بھی تھی اور حسن تناسب بھی۔ عبدالحق کو خیال آیا کہ مصوری کی خداداد صلاحیت کی وجہ سے ارجمند کو جسمانی اعضاء کا مکمل شعور حاصل ہے۔
اس نے بھی اسی انداز میں کام شروع کر دیا۔
اچانک حمیدہ نے پکارا۔
''مجھے اٹھا پتر! میں خود سے نہیں اُٹھ سکتی۔''
عبدالحق نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ وہ گھروندا بنا چکی تھی۔ اور ہاتھوں کے زور پر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔
''تو ابھی بیٹھی رہو اماں! کھڑی ہوگی تو تھک جاؤ گی۔'' عبدالحق نے کہا۔
حمیدہ نے ان کی مصروفیت کو دیکھا۔
''یہ تم دونوں کیا بنا رہے ہو؟ ڈنڈے؟''
ارجمند ہنسنے لگی۔
''دیکھتی رہیں دادی اماں!''
لیکن حمیدہ دوسرا گھروندا بنانے میں مصروف ہو گئی تھی پھر نور بانو بھی تھک کر بیٹھ گئی، اور بیکار مباش کچھ کر کے مصداق اس نے بھی گھروندا بنانا شروع کر دیا۔
سنو مین کی ٹانگیں مکمل ہو گئی تھیں۔ مگر وہ ایک دوسرے سے مختلف لگ رہی تھیں۔ عبدالحق نے یہ بات ارجمند سے کہی تو اس نے کہا۔
''آپ فکر نہ کریں آغا جی! میں ابھی ٹھیک کر دیتی ہوں۔''
اور واقعی ذرا دیر میں دونوں ٹانگیں ایک سی لگنے لگیں۔
''اب میں آگے تمہاری مدد نہیں کر سکوں گا۔'' عبدالحق نے کہا۔
''ایک مدد تو کر سکتے ہیں۔ میرے لئے برف اکٹھی کر دیں یہاں۔''
عبدالحق ادھر ادھر سے برف لا کر وہاں ڈھیر کرنے لگا۔ پھر اسے ایک

اور خیال آیا۔

''لیکن تمہارا ہاتھ اوپر کیسے جائے گا؟'' اس نے کہا۔

''ہاں آغا جی! یہ تو ہے۔''

''چلو! یہ مسئلہ بھی حل کرتے ہیں۔'' عبدالحق نے کہا اور بنگلے کی طرف چل دیا۔

وہ بنگلے میں داخل ہوا۔ اسی وقت شمریز اور نوریز بھی وہاں آ گئے۔

''کیا بات ہے سر!'' شمریز نے پوچھا۔

''کرسی لے جانے کے لئے آیا ہوں۔''

''ہم نے غلطی ہوگئی سر! ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے تھا۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہم پہنچا دیں گے۔''

عبدالحق نے سوچا، باہر کافی کی ضرورت ہے۔ وہ کافی بنانے میں مصروف ہوگیا۔

تھرماس میں کافی بھر کر وہ باہر نکلا تو شمریز واپس آتا نظر آیا۔

''اور کوئی حکم سر جی!''

''پیالیاں لے آؤ اندر سے۔''

باہر نقشہ بدلا ہوا تھا۔ شمریز اور نوریز نے چھ کرسیاں وہاں پہنچا دی تھیں، اور فاطمہ اور جنیاں نے دور دور سے لا کر برف کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ یہی نہیں، سنومین کا اوپری دھڑ مکمل ہو چکا تھا۔ ارجمند کرسی پر کھڑی ہو کر اب اس کے چہرے پر کام کر رہی تھی۔ حمیدہ اور نوربانو کرسی پر بیٹھی تماشہ دیکھ رہی تھیں۔

عبدالحق کے آتے ہی جنیاں بنگلے کی طرف دوڑ گئی۔ فاطمہ، شمریز اور نوریز سرونٹ کوارٹر کی طرف چلے گئے۔ شمریز نے پیالیاں لا کر ایک خالی کرسی پر رکھ دی تھیں۔

سنومین کو دیکھ کر عبدالحق کافی کو بھول گیا۔ ارجمند کا تناسب اعضاء کا شعور واقعی غیر معمولی تھا۔ اوپری دھڑ اور ٹانگوں کے درمیان کا تناسب کمال کا تھا اور ارجمند نے اس کے کندھوں پر جیسٹر ڈال کر تمام بٹن بند کر دیئے تھے اور اب

وہ گردن پر کام کر رہی تھی۔

عبدالحق نے سوچا، اچھا ہوا کہ میں نے کوٹ کے بجائے جیسٹر دیا۔ اس قد و قامت کے ساتھ اس کا کوٹ تو سنومین کے لئے محض ایک تنگ سی واسکٹ ہی ثابت ہوتا۔

ارجمند سنومین کی گردن بنا چکی تھی اور اس کے چہرے پر کام کر رہی تھی۔ اب مشکل مرحلہ ہے۔ عبدالحق نے سوچا۔ چہرے کے خدوخال کے تناسب کا خیال رکھنا آسان نہیں ہے۔

جنیاں آئی اور ایک ٹرے دوسری خالی کرسی پر رکھ کر واپس چلی گئی۔ ٹرے میں بڑی پلیٹ پر اُبلے ہوئے انڈے تھے۔ لیکن کس کو پتا نہیں چلا۔ وہ سب سحر زدہ سے ارجمند کے متحرک ہاتھوں کو دیکھ رہے تھے۔

پھر چہرہ بھی مکمل ہوگیا۔ ارجمند نے سنومین کے سر پر ہیٹ ترچھا کر کے لگا دیا۔

عبدالحق کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیسے اس کی تعریف کرے۔ وہ چہرہ اور سر سنومین کے جسم کے عین مطابق تھا۔ حسن تناسب کا شاہکار، اور پھر چہرے کی خوب صورتی، ناک، بھویں، ہونٹ، جبڑا...... سب تناسب کے ساتھ تھے۔ بس ایک کمی تھی......

''ذرا ایک طرف ہٹ نکی! میں دیکھوں تو......'' حمیدہ نے کہا۔

ارجمند ایک طرف کو ہٹی۔

''واہ......! بہت خوب صورت ہے۔'' نوربانو نے کہا۔

''تو نے تو کمال کر دیا نکی!'' حمیدہ بولی۔

''لیکن ایک کمی ہے۔'' نوربانو نے عبدالحق کے دل کی بات کہی۔

ارجمند پھر ان کے اور سنومین کے درمیان آئی۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا اور سنومین کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ پھر وہ پلٹ کر بولی۔

''مجھے تو کوئی کمی نظر نہیں آتی آپی!''

''اس کی آنکھیں.....'' نور بانو جملہ مکمل نہ کر سکی۔ ارجمند ایک دم سے کرسی سے اُتر آئی تھی، اور سنومین کا چہرے سامنے آ گیا تھا۔ ہیٹ کے سائے میں اس کی نیلی آنکھیں تقریباً سیاہ لگ رہی تھیں۔ اور وہ گول آنکھیں نہیں تھیں۔ بڑی اور بیضوی آنکھیں تھیں۔

وہ سب حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ آنکھیں تو سچ مچ کی لگ رہی تھیں۔

''یہ آنکھیں تو کہاں لائی نکی!'' حمیدہ نے پوچھا۔

نور بانو بھی اسے تجسس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''وہ بندے مجھے آپی نے دلائے تھے نا.....!''

نور بانو کو یاد آ گیا۔

''وہ نیلے نگ والے.....؟''

''جی آپی! ابھی میں آتے ہوئے وہ نگ نکال لائی تھی۔ ان کی ساخت آنکھوں جیسی ہے نا.....!''

''ہاں.....!''

عبدالحق کو کافی اور انڈوں کا خیال آ گیا تھا۔ اس نے پیالیوں میں کافی انڈیلی۔

''یہ لیں! سردی دور کریں۔ پھر میں اس سنومین کے ساتھ آپ سب کی تصویریں بناؤں گا۔''

✿ ✿ ✿

لاہور واپسی کے بعد زندگی ویسے ہی جاری ہو گئی تھی۔ وہی معمولات، وہی روز و شب۔ ارجمند کو مری میں گزارے ہوئے وہ تین دن بالکل الگ سے لگتے تھے، جیسے کسی طویل کہانی میں غلطی سے کسی اور کہانی کا ایک ورق شامل ہو گیا ہو۔

لیکن ایک بہت بڑا فرق پڑا تھا۔ مصوری کا شوق پھر سے زندہ ہو گیا تھا۔ پھپھا کی دی ہوئی اسکیچ بک نکالنے کی تو اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس نے

عبدالحق سے کہا تو اسے نئی اسکیچ بک مل گئی۔

مری کے وہ منظر اس کے لئے خواب جیسے تھے۔ وہ آنکھیں بند کرتی تو کوئی منظر جزئیات سمیت اس کے تصور میں تازہ ہو جاتا۔ اور وہ سنو مین..... اسے یاد تھا، بنگلے کی کھڑکی سے اس نے دیکھا تو ایسا لگا، جیسے وہ سچ مچ کا کوئی آدمی ہے، جو تنہا برف باری میں گھر گیا ہے۔ دور دور تک کوئی ایسی جگہ نہیں، جہاں اسے پناہ مل سکے۔ بلکہ اسے تو اس کے چہرے پر بے چارگی کا تاثر بھی نظر آ رہا تھا۔

واپس نکلنے تک وہ بار بار اس سنومین کو دیکھتی رہی۔ اس میں کوئی جادو تھا۔ دور سے دیکھنے پر وہ بہت لمبا اونچا نہیں، بلکہ ایک عام آدمی دکھائی دیتا تھا۔ اور جیسے وہ کوئی آئینہ تھا۔ وہ جس باطنی کیفیت میں اسے دیکھتی، اس کا عکس اسے اس کے چہرے پر نظر آتا۔ وہ خوش ہوتی تو وہ مسکرا رہا ہوتا۔ وہ خود کو تنہا محسوس کرتی تو وہ اسے خوفزدہ دکھائی دیتا۔ اس کے دل میں دبی ہوئی محبت سر اٹھانے کی کوشش کرتی تو وہ عبدالحق بن جاتا۔ وہ بے روح تھا، لیکن شاید دیکھنے والے کی روح کا ایک حصہ وقتی طور پر مستعار لے لیتا تھا۔ اس میں شاید انسانی باطن کے تمام رنگ تھے۔

ارجمند حیران تھی۔ وہ لاہور میں رہتی تھی، جو شہر تھا۔ وہاں انسانوں کی بنائی ہوئی عمارتیں تھیں، بہت قدیم بھی اور جدید بھی۔ وہاں تاریخی عمارتیں بھی تھیں، جو یادگار کی حیثیت رکھتی تھیں، بنگلے بھی تھے، اور غریبوں کی جھونپڑیاں اور کچے مکان بھی۔ انہیں دیکھ کر اللہ کا خیال نہیں آتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ یہ سب انسانوں نے بنایا ہے۔

لیکن پھر اس نے دو انتہائیں دیکھیں۔ پہلے وہ حق نگر گئی تھی۔ سفر کے دوران صحرا دیکھ کر وہ بہت حیران، بہت مرعوب ہوئی تھی۔ وہ تو لامتناہی تھا۔ جہاں وہ نظر کی حد سے باہر نکلتا تو آسمان سے مل کر بے کراں ہو جاتا اور پھر ریت کے ڈیزائن، جیسے ایک خوب صورت اور مرتب نمونے کی دری اللہ میاں نے بچھا دی تھی۔ کہیں کوئی شکن نہیں تھی اور کہیں ڈیزائن میں کوئی فرق نہیں تھا۔

ارجمند مصوری کرتی تھی، سو جانتی تھی کہ تصویر چھوٹی ہو تو غلطیوں کو چھپا لیتی ہے۔ اسے بڑا کرو تو چھوٹی چھوٹی غلطیاں بھی نمایاں ہو کر نظر آنے لگتی ہیں۔ لیکن صحرا تو جیسے آسمان کی اونچائی تک کے میلوں چوڑے کینوس پر بنی بہت...... بہت بڑی تصویر تھا۔ اور باریک بینی سے دیکھنے پر بھی اس میں کہیں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ اسے دیکھ کر دل پر اللہ کی ہیبت طاری ہوتی تھی۔

پھر اس نے پہاڑ دیکھا۔ سفر کے دوران اس نے سوچا، پہاڑ پر بہت سے لوگ کیسے رہتے ہوں گے؟ اتنی تو جگہ بھی نظر نہیں آتی۔ بلکہ پہاڑی چوٹی کے بارے میں تو وہ سوچتی تھی کہ وہاں تو مشکل سے ایک آدمی کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔ لیکن اوپر جا کر اس نے دیکھا کہ وہاں بھی زمین میدان کی طرح ہموار اور وسیع ہے۔ مکان اور بنگلے ہیں، سڑکیں اور راستے ہیں۔ لوگ چلتے پھرتے ہیں۔ وہ لڑھکتے بھی نہیں۔ ایک طرف جھکتے بھی نہیں۔ جیسا کہ سفر کے دوران وہ سوچتی رہی تھی۔ بلکہ اگر اسے یقینی طور پر معلوم نہ ہوتا کہ وہ پہاڑ پر ہے تو شاید وہ کبھی یہ بات تسلیم بھی نہ کر پاتی۔

تو ان دونوں مقامات نے اسے اللہ کی بے پناہ قدرت کا احساس دلایا، اور اس بے بسی کا بھی کہ اللہ کی قدرت کو کوئی سمجھ بھی نہیں سکتا۔ قرآن سے اس کا تعلق اور گہرا ہو گیا۔ اور مصوری کا شوق بھی جاگ اُٹھا۔ اب اس شوق کا مرکز قدرتی مناظر تھے۔

✿ ✿ ✿

عبدالحق حق نگر خاص طور پر مولوی صاحب سے ملنے کے لئے گیا تھا۔ ان کے ساتھ طویل نشست کے آغاز میں اس نے ان کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔

''میں سمجھا نہیں پتر!'' مولوی صاحب نے کہا۔

''تم چاہتے کیا ہو؟''

''میں ملازمت چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔''

''کیوں......؟''

''اس میں الجھ کر میں اللہ سے دور ہو گیا ہوں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اور مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اللہ نے معاش اور روزگار کو میرے لئے مسئلہ نہیں بنایا۔ تو پھر مجھے چاہئے کہ میں قرآن پر توجہ دوں اور اللہ کو سمجھنے کی کوشش کروں۔''

مولوی مہر علی چند لمحے سوچتے رہے، پھر بولے۔

''پتر! آزمائش تو سب کے لئے ہے۔ انداز الگ الگ ہیں۔ اللہ کسی کو فراخی اور کشادگی دے کر آزماتا ہے اور کسی کو تنگی اور عسرت دے کر۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں مولوی صاحب!'' عبدالحق نے جوش سے کہا۔

''تو پھر تم نے ملازمت قبول ہی کیوں کی تھی؟''

عبدالحق نے انہیں مسعود صاحب کے نظریے کے بارے میں بتایا، جس کے زور پر انہوں نے اسے قائل کیا تھا۔

''بات ان کی سولہ آنے سچی ہے۔'' مولوی صاحب بولے۔

''انسانوں کی خدمت سے بڑی کوئی عبادت نہیں۔''

''لیکن یہ کام تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔''

''یہ بات تو اس کام کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے، جو تم اس کام کو چھوڑ کر کرنا چاہتے ہو۔'' مولوی صاحب نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''دنیا میں عابدوں کی، اللہ کے کلام پر غور کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ آدمی کو بدلتے وقت سے ڈرنا چاہئے کہ کہیں غرور اور خود پسندی میں تو مبتلا نہیں ہو رہا ہے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' عبدالحق نے شرمندگی سے کہا۔

''میں تو آخرت کی جواب دہی سے ڈر رہا ہوں۔''

مولوی صاحب پھر سوچنے لگے۔ پھر انہوں نے کہا۔

''دیکھو پتر عبدالحق! اللہ نے ہر آدمی کو ایک مقام، ایک مرتبہ اور ایک کام دے کر پیدا فرمایا ہے۔ آدمی تو بڑی چیز ہے، گھاس کی ایک پتی اور ریت کا ایک ذرہ بھی بے مصرف نہیں۔ جہاں جو کچھ بھی ہے، اپنی جگہ اہم ہے، اور اس

بہت بڑے نظام کا حصہ ہے، جسے قیامت تک کوئی سمجھ نہیں سکے گا۔ اب آدمی یہ سوچ کر اپنے بچے کو تعلیم دلاتا ہے کہ وہ اسے ڈاکٹر بنائے گا۔ لیکن ضروری نہیں کہ ایسا ہو۔ اللہ نے اس کے لئے جو فیصلہ کیا ہے، وہ وہی بنے گا۔''

''تو کوشش کی کوئی اہمیت نہیں؟''

''کوشش ایک کھلونا ہے، انسان کو بہلانے کا۔ اس کو اعتماد عطا کرنے کا اور اس پر ایک بہت بڑا بھید کھولنے کا۔''

''اور وہ بھید کیا ہے؟''

''مشیت ..... اللہ کی مرضی، جس کے بغیر ریت کا ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ دیکھو حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے کتنا سہل کر کے ہمیں بتا دیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنے ارادوں کو ٹوٹنے سے اللہ کو پہچانا۔''

عبدالحق نے چند لمحے اس بات کی گہرائی پر غور کیا۔ اس کے دل نے کہا۔

''سبحان اللہ!'' پھر وہ بولا۔

''آپ نے فرمایا، کوشش کے ذریعے اللہ نے آدمی کو اعتماد عطا فرمایا۔ لیکن مولوی صاحب! کوشش ناکام ہو تو آدمی خود اعتمادی سے محروم ہو جاتا ہے۔''

''بالکل ٹھیک! لیکن ایک بہت بڑی نعمت پا لیتا ہے ..... ایمان ..... مشیت پر ایمان، اور یہ بات سمجھ لے تو مایوسی سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتا ہے۔''

''یعنی بندہ اپنی کوشش کرتا رہے، اور صلے کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دے۔''

''لیکن سعی ناکام سے اللہ کی پناہ مانگتا رہے۔ کوشش کی درست سمت کے لئے اللہ سے راہنمائی طلب کرتا رہے۔'' مولوی صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔ پھر چند لمحے سوچنے کے بعد وہ گویا ہوئے۔

''تم نے بہت چھوٹی عمر میں یہ بات سمجھ لی تھی کہ اللہ نے ایک زبردست نظام قائم فرمایا ہے ..... مکمل نظام۔ لیکن تم نے بہت سرسری طور پر یہ بات سمجھی تھی۔ بچے تھے نا! لیکن پوری طرح تو اس نظام کو کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔

دیکھو اللہ نے ہر چیز کا، ہر آدمی کا ایک مقام متعین فرمایا ہے، اور اس کے لئے ایک مہلت مقرر کرتے ہوئے اس کو ایک راستہ بنا کر دیا ہے۔ یہ تقدیر ہے، جس سے مفر نہیں۔''

''تو پھر کوشش اور تدبیر ....؟''

''وہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں پتر!'' مولوی صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

''دیکھو، آدمی قرآن کو پڑھے اور سمجھے بغیر غور کرے تو اسے گمراہی کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا۔ تمہارا کیا خیال ہے پتر! کہ کوئی بادشاہ خود بنا ہے؟''

عبدالحق کوئی جواب نہ دے سکا، مستفسرانہ نگاہوں سے مولوی مہر علی کو دیکھتا رہا۔

''نہیں پتر! بادشاہ بنتا نہیں، پیدا ہوتا ہے، چاہے بادشاہ کے گھر پیدا ہو، چاہے فقیر کے گھر۔ اس کے اقتدار کی مہلت بھی اللہ کی متعین کی ہوئی ہوتی ہے۔''

''یعنی موروثی؟''

''نہیں! ہرگز نہیں! ایسا ہوتا تو ہمایوں برسوں در در کی خاک کیوں چھانتا؟ اور شیر شاہ جیسے معمولی سپاہی کو دیکھ کر بادشاہ یہ کیسے سمجھتا کہ وہ بادشاہت کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اور پھر اسی شیر شاہ سوری کا پانچ سالہ دور تاریخ میں بڑے بڑے بادشاہوں کے بڑے بڑے ادوار پر بھاری کیوں ہوتا؟ اور اسی برصغیر میں خاندانِ غلامان کا عہد شاہی کیسے ممکن ہوتا؟''

''آپ یہ سب کچھ قرآن کی روشنی میں سمجھ کر کہہ رہے ہیں؟''

''بالکل!'' مولوی صاحب نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''سورۃ الزخرف کے تیسرے رکوع میں آیت مبارکہ ہے، جس کا مفہوم ہے کہ اللہ نے ہی انسانوں کے درمیان دنیاوی زندگی میں روزی تقسیم کی ہے اور بعض کو مرتبے کے لحاظ سے بعض پر فوقیت عطا کی ہے، تاکہ ان میں سے بعض بعضوں کے خدمت گار ہوں۔ اس آیت کا یہ چھوٹا سا حصہ ایک بہت بڑے اور

مرتب نظام کی نشان دہی کرتا ہے، جسے ہم بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ سوچو، غور کرو پتر! اگر تمام انسان ہدایت پر ہوتے، قرآن کو پڑھنے، سمجھنے اور اللہ کی عبادت کے سوا کچھ بھی نہ کرتے تو اس دنیا کا نظام کیسے چلتا؟ خدمت گار نہ ہوتے تو بادشاہ کی بادشاہت کی کیا حیثیت ہوتی؟ اسے تو پانی پینے کے لئے بھی خود صراحی کے پاس جانا پڑتا۔''

عبدالحق کی آنکھوں کے سامنے جیسے مفاہیم کا ایک بہت بڑا اور روشن دریچہ کھل گیا۔ بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی، لیکن وہ اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

مولوی صاحب کی بات جاری تھی۔

''کسان کی مثال لو۔ وہ ہل جوتتا ہے، زمین میں بیج ڈالتا ہے، پانی دیتا ہے، فصل تیار کرتا اور کاٹتا ہے۔ یہ اس کی روزی روٹی ہے۔ وہ تو صرف اپنے لئے محنت کرتا ہے نا! لیکن اس کی محنت کتنے لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ روٹی کھانے والا تو ایک پل کے لئے بھی نہیں سوچتا کہ یہ کس کس کی محنت کے نتیجے میں اس تک پہنچی ہے۔ کسان نے فصل کاٹی، گندم بازار میں پہنچی، چکی والے نے اس سے آٹا بنایا اور دکان والے کو دیا۔ دکان دار نے آٹا فروخت کیا۔ تم گھر لے کر گئے۔ بیوی نے آٹا گوندھ کر روٹی بنائی، تب تمہارے پیٹ بھرنے کا سامان ہوا۔ یہ نظام ہے نا! ایسے لاکھوں کروڑوں چھوٹے چھوٹے نظام اللہ نے قائم فرمائے، جو ایک بہت بڑے مرکزی نظام کا حصہ ہیں۔''

عبدالحق کو یاد آیا، وہ بہت چھوٹا سا تھا، جب حمیدہ نے یہ بات اس سمجھائی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ مناسب وقت پر بارش اور دھوپ اللہ فراہم کرتا ہے۔ ورنہ فصلیں تباہ ہو جاتیں۔ اور فصلیں تباہ ہوتی ہیں تو قحط پڑتا ہے، اور لوگ بھوکے مرنے لگتے ہیں، چاہے غریب ہوں، چاہے دولت مند۔ قحط سب کے لئے ایک جیسا ہوتا ہے۔

''اور پتر! سورہ کہف میں اللہ فرماتا ہے کہ اس نے زمین کو خوب صورت بنایا کہ دیکھے اس کے بندوں میں سے کون نیک اعمال کرتے ہیں۔ تو پتر! میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ اللہ نے اس دنیا کو آدمی کے لئے پرکشش بنایا۔

تاکہ وہ اس کی رنگینیوں میں کھو جائے۔ تو یہ امتحان ہے، جیسا امتحان تم نے پچھلے سال دیا تھا نا! تین گھنٹے کا پرچا تھا نا؟ تو سمجھ لو، یہ زندگی بھی تین گھنٹے کا ایک پرچا ہے۔ کئی جگہ قرآن میں اللہ نے فرمایا کہ قیامت کے دن انسان دنیا کی زندگی کو یاد کرے گا تو اسے لگے گا کہ وہ عرصہ یا تو صبح کا ایک حصہ تھا یا شام کا۔ تو تین گھنٹے ہی سمجھ لو نا! اب تم نے امتحان میں پاس ہونے کے لئے کتنی محنت کی تھی۔ دن رات ایک کر دیئے تھے۔ پاس ہو گئے تو کیا ملا؟ بی۔ اے کی ڈگری! فیل ہو جاتے تو کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ دوبارہ موقع مل جاتا امتحان دینے کا۔ لیکن یہ زندگی کا جو امتحان ہے نا پتر! اس میں دوسرا موقع نہیں ملتا۔ اور اس میں پاس اور فیل ہونے کی بڑی اہمیت ہے۔ پاس ہونے تو جنت اور فیل ہوئے تو جہنم اور دونوں میں ہی ابدی زندگی۔

تو پتر عبدالحق! یہ دنیا امتحان گاہ ہے۔ قرآن اس کا کورس ہے۔ اور امتحان تحریری یا زبانی نہیں، عملی ہے۔ اللہ نے دنیا کو ہمارے لئے پرکشش بنا کر ہمیں یہاں بھیجا۔ یہاں ہمارے لئے بڑی بڑی ترغیبات رکھیں۔ پھر پیغمبروں اور کتابوں کے ذریعے اپنی وحدانیت اور مطلق قدرت ہم پر روشن کی اور احکام نازل فرمائے۔ کیا کام کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا، ہمیں بتایا۔ پھر آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آخری کتاب قرآن حکیم بھیج کر پرچا فائنل کر دیا۔''

''تو مولوی صاحب! کورس کی کتاب پڑھنا تو لازمی ہے نا؟''

''ہاں پتر! لیکن یہ کبھی نہ بھولو کہ امتحان عملی ہے۔ کتاب پڑھے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ لیکن پڑھنے کے ساتھ ساتھ ہی عمل بھی ہے۔ پڑھتے جاؤ اور اس پر عمل بھی کرتے جاؤ۔ یہ نہیں کہ کتاب پڑھنے میں ہی عمر گزار دو۔ دیکھو پتر! قرآن کے چار حقوق ہیں بندے پر۔ اور اسے چاروں ادا کرنے ہیں، ایک یا دو سے کام نہیں چلتا۔ پہلا حق ہے پڑھنا، دوسرا سمجھنا، تیسرا اس پر عمل کرنا اور چوتھا اسے دوسروں تک پہنچانا۔

اب اس امتحانی پرچے کا پہلا بنیادی سوال ہے ایمان۔ بغیر دیکھے اللہ پر ایمان لانا، اس کے فرشتوں، اس کے صحیفوں اور اس کے تمام پیغمبروں پر ایمان

لانا اور آخرت پر ایمان لانا۔ زبان سے بھی اور دل سے بھی۔ اب کہنے کو یہ زبانی
اور نظریاتی سوال ہے۔ لیکن میں نے کہا نا کہ یہ پورا پرچا عملی ہے۔ اس ایمان کو
تمہارے اقوال و افعال میں عملاً نظر آنا چاہئے۔ اور قرآن میں جہاں بھی ایمان کا
ذکر ہوا ہے تو عمل صالحات کا ذکر بھی ہوا ہے۔ ایسے جیسے وہ شرط ہو۔ سچ تو یہ ہے
کہ وہ شرط ہی ہے۔ ایمان اور صالح اعمال لازم اور ملزوم ہیں۔ نہ ایمان کے بغیر
صالح اعمال کی کوئی حیثیت ہے اور نہ صالح اعمال کے بغیر ایمان کی۔''

''ٹھیک کہتے ہیں آپ!'' عبدالحق نے تائید کی۔

''قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ جو ایمان سے محروم ہوں گے، ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے لیکن مولوی صاحب! ایمان تو زبانی چیز ہے۔ یہ عملی کیسے ہوگا؟''

''دیکھو پتر عبدالحق! سائنس کی مثال لو۔ کوئی سائنس دان غور و فکر کے
بعد ایک نظریہ ہی لاتا ہے نا، مگر نظریے سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب تک تجربے کی عملی
کسوٹی پر پرکھا نہ جائے، اسے کوئی تسلیم نہیں کرتا۔ پھر وہ درست ثابت ہوتا ہے تو
بات آگے بڑھتی ہے اور ایجاد تک پہنچتی ہے۔ ہے نا؟ تو اب ایمان کو لو۔ میں اللہ
کی تمام کتابوں پر ایمان رکھتا ہوں۔ اب اللہ کی کتاب سود لینے سے منع کرتی
ہے۔ اگر میں سود لوں تو ایمان کہاں رہا۔ کتاب شراب پینے کو منع کرتی ہے۔ میں
اس پر ایمان رکھتا ہوں تو شراب تو نہیں پیوں گا نا، اور میں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں
کہ وہ حاضر و ناظر ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا، سنتا اور جانتا ہے۔ اگر مجھے کوئی
ممنوعہ کام کرتے ہوئے یہ خیال نہیں آتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے تو ایمان
کیا رہا۔ میرا ایمان ہے کہ اللہ سینوں کے تمام بھید جانتا ہے، میری سوچوں تک
سے واقف ہے تو میں کسی برائی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ سوچوں تو
ایمان کہاں رہا؟ سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی مولوی صاحب!''

''سب سے مشکل آخرت ہے۔'' مولوی مہر علی نے اپنی بات جاری
رکھی۔

''قیامت کا تصور، جنت اور دوزخ اور ابدی زندگی، قرآن میں بہت
تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ آدمی جہنم پر یقین رکھتا ہو، اس کا تصور کرتا ہو تو ڈر کے
مارے گناہ سے بچ نکلے، لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ اصل میں آدمی صرف حواس پر انحصار
کرتا ہے۔ جو چیز دیکھے گا نہیں، اس پر یقین کرنا مشکل ہے۔ یہی تو ایمان بالغیب
ہے۔ ایک بادشاہ اعلان کرتا ہے کہ میرے سامنے پیش ہونے والے ہر شخص پر
لازم ہے کہ مجھے سجدہ کرے۔ جو سجدہ نہیں کرے گا، اس کی گردن مار دی جائے
گی۔ تو موت کے خوف سے ہر شخص اسے سجدہ کرے گا اور اللہ کہتا ہے کہ پانچ
وقت خالص میری عبادت کی نیت سے نماز پڑھو، ورنہ ابد تک کے لئے جہنم میں
ڈال دیئے جاؤ گے۔ مگر لاکھوں کروڑوں لوگ ایسے ہیں، جو کبھی ایک وقت کی
نماز بھی نہیں پڑھتے۔ انہیں نہ اللہ کا ڈر ہے نہ جہنم کا۔ البتہ کلمہ شہادت وہ ضرور
پڑھتے ہیں۔ تو سوچو کہ انہیں کتنے نمبر ملیں گے؟''

عبدالحق کو لگا کہ جیسے وہ اپنے بچپن، لڑکپن کے دور میں پہنچ گیا ہے۔

''مجھے لگتا ہے مولوی صاحب! کہ آدمی اللہ پر تو یقین رکھتا ہے لیکن
قیامت کے دن کی پیشی اور جہنم کو نہیں سمجھ پاتا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس نے اللہ کو
بھی نہیں دیکھا اور جہنم کو بھی نہیں دیکھا۔''

''پتر عبدالحق! نادیدہ قوت کا خوف تو انسان کی فطرت میں ہے۔ ان
دیکھے اللہ پر یقین نہیں کرتا تو وہ عبادت کے لئے کوئی بت تراش لیتا ہے۔''

''مگر مولوی صاحب! دنیا میں ملحدوں کی بھی تو کمی نہیں۔''

''ہاں! لیکن وہ تو ہر طاقتور سے ڈرتے ہیں۔ وہ اقبال صاحب نے کہا
ہے نا......

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اور پتر! اس پر مجھے سورۃ الزمر کے تیسرے رکوع کی ایک آیت یاد آتی
ہے۔ دیکھو، اللہ اپنے بندوں کو کیسے آسان کر کے سمجھاتا ہے۔ اللہ مثال پیش کرتا
ہے ایک شخص کی، جس کے بے شمار آقا ہوں، اور کج خلق، اور ایک دوسرے شخص

کی، جس کا ایک ہی آقا ہو، پھر وہ پوچھتا ہے، کیا ان دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے۔ اب تم خود غور کرو۔''

''سبحان اللہ!'' عبدالحق نے بے ساختہ کہا۔

''پتر! اگر اللہ آدمی کو ایک بار جہنم کا نظارہ کرا دے تو کوئی مسئلہ ہی نہ رہے۔ بلکہ وہ اپنے بندوں کو اپنی ہی ایک جھلک دکھا دے تو کفر اور ایمان کا جھگڑا ختم ہو جائے۔''

''میں سمجھا نہیں مولوی صاحب!''

''بھئی! یہ تو ممکن نہیں کہ اللہ کو دیکھنے کے بعد بھی کوئی ایمان نہ لائے۔ بات وہی ہے کہ یہ دنیا امتحان گاہ ہے۔''

''تو پھر مولوی صاحب! بہتر یہی ہے نا کہ بندہ اللہ کا ہو جائے، سمجھ لے کہ یہ دنیا فریب ہے، یہ زندگی کی مہلت امتحان کا عرصہ ہے اور اصل زندگی آخرت ہے۔''

''یہ تو ٹھیک ہے پتر! کہ آپ نے حقیقت جان لی۔'' مولوی صاحب نے کہا۔

''لیکن دنیا ترک کرنے کا مطلب امتحان سے فرار ہوگا۔ آپ امتحان میں بیٹھے ہی نہیں تو کیا پاس ہونا اور کیا فیل ہونا؟ تو پھر جزا کس بات کی؟''

عبدالحق کا ذہن الجھنے لگا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''بات توازن کی ہے پتر! نمبر تو صالح اعمال سے ملیں گے نا!''

''تو اگر میں قرآن کے چاروں حقوق ادا کرنے میں زندگی گزار دوں، دل سے عبادت کروں تو یہ صالح اعمال ہی ہیں نا!''

''دیکھو پتر! یہ جو پرچا ہے نا زندگی کا، اس کے دو حصے ہیں اور دونوں لازمی ہیں۔ اور میں نے کہا نا کہ نصاب قرآن ہے۔ تو ایک حصہ آخرت کا ہے اور دوسرا دنیا کا۔ ایک اللہ کے حقوق کا ہے تو دوسرا بندوں کے حقوق کا۔ اللہ کے حقوق ادا کرتے رہو اور بندوں کے چھوڑ دو تو جواب دہی ہوگی۔ نمبر کٹیں گے۔

امتحان پاس نہیں کر سکو گے۔ پر یہ پتا تو جب چلے گا کہ قرآن پڑھو اور سمجھو۔ والدین کے حقوق ہیں پھر بیوی بچوں کے حقوق ہیں، پھر آدمی گھر سے نکل کر پھیلتا جاتا ہے۔ رشتہ داروں، پڑوسیوں کے حقوق، عام لوگوں کے حقوق، سارے سوال لازمی ہیں۔ سب کا جواب دینا ہے۔ اکل حلال کو عبادت کیوں کہا گیا؟ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کی، ضرورت مندوں کی مدد کی تلقین کیوں کی گئی؟ اس لئے کہ یہ نصاب میں شامل ہے۔ دن کو اللہ نے معاش کے لئے بنایا، رات کو آرام کے لئے۔ سورۂ مزمل میں فرمایا کہ قرآن پڑھنے کے لئے رات کا وقت بہت موزوں ہے جب تم دنیا کی فکروں سے آزاد ہو۔ یعنی دنیا کی فکر کو منع نہیں فرمایا۔ دوسرے تمہیں تمہارے آرام کے وقت میں سے قرآن کے، عبادت کے لئے وقت نکالنے کے لئے کہا۔ یہی تو یکسو ہو کر عبادت کرنا ہے۔ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے پتر عبدالحق! اللہ کے احکام کے مطابق فطری زندگی گزارنا ضروری ہے۔ تم پر تمہارے اپنے بھی حقوق ہیں۔ بشری تقاضے ہیں۔ وہ اللہ نے ہی عطا کئے ہیں تمہیں۔ لیکن ان کے لئے جائز و ناجائز کی وضاحت کر دی ہے۔ شادی کرو گے تو بیوی بچوں سے خوشی اور راحت ملے گی۔ وہ تم پر تمہارا حق ہے۔ غلط طریقے سے فطری تقاضے پورے کرو گے تو گناہ ہے۔ یہی تو امتحان ہے۔ دنیا کو بھی وقت دو، بیوی بچوں کو بھی وقت دو اور اللہ کو بھی وقت دو۔ خاص اور یکسو ہو کر اسے پکارو، اس کی عبادت کرو۔ اس توازن میں ہی خوب صورتی ہے زندگی کی۔ یوں دنیا میں بھی انعام ہے اور آخرت میں بھی۔''

''آدمی شادی ہی نہ کرے تو ذمہ داریاں بھی نہیں ہوں گی۔ پھر وہ یکسوئی کے ساتھ اللہ کا ہو سکتا ہے۔''

''یہ کہنا آسان ہے اور کرنا مشکل ہے پتر! کیونکہ ایسی زندگی غیر فطری ہوگی نا! رہبانیت کو اسی لئے تو منع کیا گیا ہے۔ اسلام میں ترک لذت نہیں۔ اللہ کی نعمتوں سے منہ موڑنا ناشکرا پن ہے۔ جو اللہ نے حلال کیا، اس سے جائز طریقے سے استفادہ کرو، اور پھر اس پر اللہ کا شکر ادا کرو تو یہ عبادت ہے۔ لذت کی لذت اور منافع میں اضافی نمبر۔ اب سوچو، رہبانیت ناکام کیوں ہوئی؟ غیر

فطری زندگی پادریوں کو راہباؤں کو گناہ کی طرف لے گئی۔ ایک لمحے میں برسوں کی تپسیا غارت ہوگئی۔ ایسے لوگ تو شیطان کا آسان ہدف ہوتے ہیں۔ پادریوں کے ان اعمال ہی کی وجہ سے عیسائی مذہب سے عملاً دور بلکہ بے زار ہوگئے۔ ذرا آگے جا کر سوچو کہ اللہ کے قائم کردہ نظام میں شادی کی کتنی اہمیت ہے۔ اگر سب لوگ محض اللہ اللہ کرتے تو نسل انسانی کا سلسلہ منقطع ہو جاتا۔

تو پتر! اللہ نے انسان کو بڑی نعمت گھر عطا فرمایا۔ انسانی معاشرے میں بنیادی اہمیت گھر کی ہے۔ یہ پردہ بھی ہے اور دارالسکون بھی۔ ہر برائی کے خاتمے کا آغاز بھی گھر سے کرنا ہوتا ہے اور ہر نیکی کا آغاز بھی۔ ہر گھر ٹھیک ہو جائے تو معاشرہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ بیوی کے اور بچوں کے حقوق ادا کرنا بھی عبادت ہے۔ ان کے لئے ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا، انہیں تحفظ کا احساس دلانا، بچوں کی پرورش اور تربیت، شوہر اور بیوی مل کر کرتے ہیں۔ بچوں کو دونوں سے محبت اور شفقت بھی چاہئے ہوتی ہے، کیونکہ اس سے ان کی شخصیت بنتی ہے۔ ان فرائض سے منہ موڑ کر آدمی کبھی فلاح نہیں پا سکتا۔ آپ ان سے دور جائیں گے تو خرابیاں پیدا ہوں گی۔ بیوی سے دور جاؤ گے تو اسے آزمائش میں ڈالو گے نا...... بہت بڑی آزمائش میں، کیونکہ اس کی بھی نفسانی ضروریات ہیں، جنہیں پورا کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ وہ بہک گئی تو آپ بھی ذمہ دار ہوں گے۔ ایک عمر تک بچوں کے بھی آپ ہی ذمہ دار ہیں۔ وہ غلط راستے پر نکل گئے تو آپ کو جواب دہی کرنا ہوگی۔ نہیں پتر! اللہ نے بندے کو آخرت کمانے کے لئے دنیا میں ہی بھیجا ہے...... دنیا کے لوازمات کے ساتھ۔ اسلام چلّوں کا، تپسیاؤں کا مذہب نہیں ہے۔ توازن قائم کرنا بہت ضروری ہے پتر!''

''لیکن مولوی صاحب! یہ نوکری کرنا تو ضروری نہیں ہے میرے لئے۔''

''فرض تو نہیں ہے پتر! فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے۔ اگر اس سے بہت سارے لوگوں کو فائدہ ہوتا ہے، اور یہ قومی خدمت ہے تو دیانت کے ساتھ یہ بھی عبادت ہے۔ سوچو، تمہاری جگہ کوئی بے ایمان آجائے تو کتنے لوگوں کو، بلکہ قوم کو بھی نقصان ہوگا۔''

''تو میں ملازمت کرتا رہوں؟''

''میری رائے تو یہی ہے پتر! جب اللہ چاہے گا، تمہیں وہاں سے ہٹا دے گا۔ اور پتر! اللہ کے لئے اپنے آرام کے وقت میں سے وقت نکالو۔ اس میں بڑی برکت ہوتی ہے اللہ کی طرف سے۔ اللہ بھی پوری طرح متوجہ ہوتا ہے بندے کی طرف۔ وہ سورۂ ذاریات میں اللہ نے خوش نصیبوں کے بارے میں فرمایا ہے نا...... کَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَھْجَعُوْنَ ○ وَبِالْاَسْحَارِ ھُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ○''

''جزاک اللہ مولوی صاحب!'' عبدالحق کے لہجے میں طمانیت تھی۔

''ایسی گفتگو میں اختصار کی وجہ سے ربط کی کمی ہوجاتی ہے پتر! تم خود قرآن پڑھ کر غور کیا کرو۔''

''انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا مولوی صاحب!''

❁❁❁

ایک سرونٹ کوارٹر اور آباد ہوگیا تھا۔ مری سے نوریز خان آگیا تھا۔ عبدالحق نے شمریز کو بھی اصرار کر کے وہاں بلا لیا تھا۔ بلکہ اس کا تو کہنا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو بھی بلا لے۔ لیکن شمریز کا کہنا تھا کہ اس کی وہاں گھر میں موجودگی بہت ضروری ہے۔ وہ اماں اور ابا کی خدمت بھی کرتی ہے، اور اس سے جنیاں کو بھی دوسراہٹ رہتی ہے۔ عبدالحق نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔

نوریز اب عبدالحق کی ذاتی کار چلاتا تھا۔ لیکن شمریز کبھی اس کے ساتھ دفتر نہیں گیا اور نہ ہی اس کے ساتھ گھر واپس آیا۔ یہ ایک اور بات تھی، جو اس نے عبدالحق کے اصرار کے باوجود نہیں مانی تھی۔

''یہ آپ کی شان کے خلاف ہے سر!'' اس نے کہا تھا۔ سو وہ عبدالحق کے دفتر جانے سے پہلے دفتر کے لئے نکلتا تھا۔ اور چھٹی عبدالحق کے گھر جانے کے بعد کرتا تھا۔

فروری میں عبدالحق نے مری والا بنگلہ خرید لیا۔ لیکن جیپ نہیں خریدی گئی۔ شمریز کا کہنا تھا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں، جیپ تو جب ضرورت ہو، خریدی جا

سکتی ہے۔ ابھی خرید لی تو استعمال نہ ہونے کی وجہ سے اس میں خرابیاں پیدا ہوں گی۔

ارجمند کے اسکول میں داخلے کے دن قریب آ رہے تھے۔ لیکن عبدالحق کو کوئی فکر نہیں تھی۔ ارجمند میں اس وقت بھی اتنی قابلیت تھی کہ وہ بغیر کسی دشواری کے میٹرک کا امتحان بھی پاس کر سکتی تھی۔ داخلے کا امتحان تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

مولوی صاحب سے ملاقات کے بعد عبدالحق نے ایک نیا معمول شروع کیا تھا۔ رات کو وہ ایک گھنٹہ قرآن پڑھتا تھا اور پڑھنے سے زیادہ وہ غور کرتا تھا، چاہے کچھ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ ایک بات تو تھی، احکام تو بالکل واضح تھے۔ باقی اللہ کی حکمتیں تو اسی وقت سمجھ میں آتی ہیں، جب اللہ کرم فرمائے۔

اس نے کئی بار نور بانو کو بھی اس طرف راغب کرنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ وہ پڑھتی بھی تو بے دلی سے۔ اور دو دن بعد وہ پڑھنا چھوڑ دیتی۔ عبدالحق افسوس کے سوا کیا کر سکتا تھا؟ بات صرف اتنی نہیں تھی۔ نور بانو اس کے ارتکاز میں بھی خلل ڈالتی رہتی تھی۔ ایسا نادانستگی میں ہی ہوتا ہوگا۔ یہ تو عبدالحق سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ دانستہ ایسا کرتی ہوگی۔

اس مسئلے کا عبدالحق کو ایک ہی حل سجھائی دیا۔ اس نے رات کے معمول کو ترک کیا اور صبح ایک گھنٹہ پہلے کا الارم لگانے لگا۔ اس کا ایک اضافی فائدہ بھی ہوا۔ اسے تہجد بھی میسر آنے لگی۔

ارجمند ہر صبح نماز کے بعد تلاوت کرتی تھی۔ عبدالحق فجر کی نماز کے بعد ہر روز باقاعدگی سے اس کی تلاوت سننے لگا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ ارجمند کی تلاوت نور بانو کی اس تلاوت سے بہت زیادہ خوب صورت ہے، جو اس نے دہلی میں سنی تھی۔ ارجمند کی قرأت میں عجیب سا گداز تھا۔ اسے سنتے ہوئے آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔

ارجمند کی تلاوت اس نے پہلے بھی سنی تھی۔ مگر جب میں اور اس میں زمین میں آسمان کا فرق تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اب جو وہ پڑھتی تھی، اسے

سمجھتی بھی تھی۔ عربی کے استعداد میں وہ اس سے آگے نکل گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ کوئی تنبیہی آیت پڑھتی تو اس کی آواز میں جاہ و جلال ہوتا۔ سننے والے پر لرزہ طاری ہونے لگتا۔ اور کوئی آیت مبشرہ پڑھتے ہوئے اس کی آواز میں نرمی اور مٹھاس ہوتی۔ سننے والے کا دل امید سے بھر جاتا۔ اس کی قرأت میں جہنم کا نقشہ کھینچنے والی آیت سن کر عبدالحق پر ہیبت طاری ہو جاتی، او جہاں جنت کی نعمتوں کا بیان ہوتا، وہاں جی چاہتا کہ اللہ کی رضا اور تائید و خوشنودی میسر ہو تو اس لمحے مر جایئے۔

عبدالحق کو ان لمحوں میں ایسا لگتا کہ اس کی کوئی کھوئی ہوئی چیز واپس مل گئی ہے۔ نور بانو سے شادی سے پہلے وہ سوچا کرتا تھا کہ اس کا سونا بھی اس خوب صورت معمول کے ساتھ ہوگا اور اس کی بیداری بھی۔ لیکن اسے محرومی کے سوا کچھ بھی نہیں ملا تھا۔ کبھی کبھی وہ جھنجلاتا کہ نور بانو ارجمند کی جگہ کیوں نہیں ہے۔ اسے افسوس ہوتا۔ لیکن اس بات کی خوشی بھی ہوتی کہ اس کی محرومی دور ہوگئی ہے۔ یہ خیال اس کے دل میں پختہ ہوگیا تھا کہ ارجمند اس کے لئے بہت بڑی نعمت ہے، اللہ کا دیا ہوا تحفہ ہے۔

ایک اور بات کی اسے خوشی ہوتی۔ جس بچی نے اس سے شادی کی فرمائش کی تھی، اب اس کے کسی انداز میں وہ بات نہیں تھی۔ سو اس کا وہ ڈر بھی نکل گیا تھا کہ اس بچی کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل جائے گی، جو اس کے لئے، پورے گھر کے لئے مسئلہ بن جائے گی، اس کی اپنی عزت کم کر دے گی۔ وہ بے فکری کے ساتھ اس سے بے تکلف ہوگیا تھا۔

ارجمند نے قرأت ختم کی، قرآن کو چوما، آنکھوں سے اور پھر دل سے لگایا اور اٹھ گئی۔ اب اسے ناشتہ بنانا تھا۔

ناشتہ بناتے ہوئے وہ بڑی محبت سے قرآن کے بارے میں سوچتی رہی۔ یہ کیسی نعمت ہے، یہ اسی کی برکت ہے کہ آغا جی میرے سامنے بیٹھتے ہیں۔ میں دل سے پڑھتی ہوں اور وہ دل سے سنتے ہیں۔ یہ دل سے دل کا کیا پاکیزہ اور خوب صورت تعلق ہے۔ یہ نہ ہوتا تو میں آغا جی کے پاس بیٹھ بھی نہیں سکتی

تھی۔

اس نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا اور زیرِ لب بولی۔

''اے میرے رب کے سچے کلام! میں عمر بھر تجھ سے بڑھ کر کسی سے محبت نہیں کروں گی۔ تو ہی میرا ساتھی، میرا دم ساز، میرا راز دار اور میرا مددگار ہے۔ مجھے بھٹکنے اور بہکنے سے بچاتے رہنا، مجھے سیدھا راستہ دکھاتے رہنا۔''

٭٭٭

اس شام عبدالحق دفتر سے ایک اہم فائل اسٹڈی کے لئے گھر لے آیا تھا۔ رات کو اس نے وہ فائل نوربانو کو دی۔

''یہ احتیاط سے الماری میں رکھ دو۔ صبح دفتر لے کر جانی ہے۔''

صبح دفتر کے لئے تیار ہونے کے بعد اس نے اس فائل کی تلاش میں پوری الماری چھان ماری۔ لیکن فائل اسے نہیں ملی۔ نوربانو بے سدھ سو رہی تھی۔ وہ ہچکچاتا رہا۔ کسی کو سوتے سے اٹھانا اسے کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اس وقت بھی اس کا جی نہیں چاہا کہ نوربانو کو جگائے، وہ جانتا تھا کہ وہ بہت دیر سے سوتی ہے۔

آخر اس کی سمجھ میں ایک بات آگئی۔ دفتر جانے سے پہلے اس نے یعقوب کو بلایا۔

''یعقوب! آج ایک بہت اہم کام کرنا ہے تمہیں؟'' اس نے کہا۔

''حکم کریں سر!''

''آج جب میم صاحب تم کو کھانا دیں تو ان سے کہنا کہ جو فائل رات کو میں نے انہیں دی تھی، وہ بھی دفتر لے کر جانی ہے، وہ بھی تمہیں دے دیں۔''

''یس سر......!''

لیکن عبدالحق مطمئن نہیں ہوا۔

''مجھے بتاؤ! تم کیا کہو گے میم صاحب سے......؟''

''میں کہوں گا کہ صاحب نے آپ کو جو فائل دی تھی، وہ نکال دیں۔ صاحب نے منگوائی ہے۔''

''ویری گڈ......! اور یہ بہت اہم ہے۔ بھول نہ جانا۔''

''یس سر......! آئی نو فور گیٹ امپورٹنٹ۔'' یعقوب نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''ویری گڈ! مسٹر جینیئس!''

''تھینک یو سر......!''

عبدالحق آفس چلا گیا۔

لیکن دوپہر کو یعقوب لنچ لے کر آیا تو فائل اس کے پاس نہیں تھی۔ عبدالحق کو عام طور پر غصہ نہیں آتا تھا، لیکن اس وقت اسے غصہ آگیا۔ بہرحال اس نے اپنے غصے پر قابو رکھنے کی کوشش کی۔

''تم فائل نہیں لائے یعقوب!''

''سوری سر!''

''اتنی اہم بات، میری اتنی تاکید کے باوجود بھول گئے؟''

''نو سر! آئی نو فور گیٹ امپورٹنٹ۔''

''تو پھر فائل کیوں نہیں لائے؟''

''ہیلپ لیس سر! میم صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی۔'' یعقوب نے معذرت طلب لہجے میں کہا۔

''میں نے بی بی صاحب سے بولا تھا کہ مجھے میم صاحب سے ضروری کام ہے۔ وہ بولیں کہ وہ سو رہی ہیں۔ اب میں کیا کرتا سر!''

عبدالحق کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔

''تو کھانا تمہیں کس نے دیا؟''

''وہ تو ہمیشہ بی بی صاحب ہی دیتی ہیں سر!''

''ہمیشہ......؟''

''یس سر......!''

''تو میم صاحب کھانا کیوں نہیں دیتیں؟''

''وہ تو سو رہی ہوتی ہیں نا سر!'' یعقوب کو احساس بھی نہیں تھا کہ وہ

جال میں پھنس رہا ہے۔ بات اتنی پرانی تھی کہ وہ بھول گیا تھا۔ پہلی بار کے بعد عبدالحق نے کبھی اس سے پوچھا بھی نہیں تھا۔

''پہلے دن تم نے کہا تھا کہ کھانا میم صاحب نے بھجوایا ہے۔''

یعقوب اب بھی صورتِ حال کو نہیں سمجھا تھا۔

''وہ تو بی بی صاب نے کہا تھا کہ صاب پوچھیں تو کہنا کہ کھانا میم صاحب نے بھجوایا ہے۔''

''اچھا، ٹھیک ہے۔ اب یہ بات کسی کو نہیں بتانا کہ میں نے تم سے یہ پوچھا تھا۔''

''کوئی پوچھے گا ہی نہیں۔''

''پوچھے تو بھی نہیں بتانا۔ اٹس این آرڈر! سمجھ گئے؟''

''یس سر......!''

''اب تم جاؤ۔''

یعقوب جاتے جاتے پلٹا۔

''اب میم صاب اٹھ گئی ہوں گی، فائل لے کر آؤں سر؟''

''نہیں! اس کی ضرورت نہیں۔ بس اب تم اپنا منہ بند رکھنا۔''

خوش قسمتی سے اس روز مسعود صاحب دفتر نہیں آئے تھے، اس لئے فائل کی فوری طور پر ضرورت نہیں تھی۔ اس نے سوچا کہ اگلے روز میں خود لے آؤں گا۔

اس روز کھانا اس نے اکیلے ہی کھایا۔ کھانے کے دوران وہ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ جب پہلی بار گھر سے کھانا آیا تو اسے حیرت ہوئی تھی، اور اس کے پوچھنے پر یعقوب نے بتایا تھا کہ کھانا نور بانو نے بھیجا ہے۔ اور اس نے رات کو نور بانو سے پوچھا اور کھانے کی تعریف کی تو نور بانو نے اس تعریف کو ایسے قبول کیا، جیسے وہ اس کا حق تھا۔ اور اس دن کے بعد کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کھانا گھر سے نہ آیا ہو۔ اب یعقوب کا کہنا یہ ہے کہ اسے دفتر لے جانے کے لئے کھانا ہر روز ارجمند دیتی ہے۔

قرائن سے تو یہی ثابت ہوتا تھا کہ ارجمند ہی کھانا پکاتی اور بھیجتی ہے۔

لیکن عبدالحق کا ذہن اسے تسلیم نہیں کر پا رہا تھا۔ اس میں کچھ معقولیت بھی تھی۔ لیکن کچھ نور بانو کی محبت کی وجہ سے بھی تھا۔

ارجمند اس کے نزدیک چھوٹی سی بچی تھی۔ ہر صبح ناشتہ تو وہی بناتی تھی۔ لیکن اس میں کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ کھانا پکانا مختلف تھا۔ اس کے خیال میں ارجمند ابھی اس قابل نہیں تھی۔ پھر اسے پڑھائی بھی کرنی ہوتی تھی۔ اور گھر میں کبھی کسی نے نہیں کہا تھا کہ آج کھانا ارجمند نے پکایا ہے۔ اور صبح کے علاوہ اس نے بھی کبھی اسے باورچی خانے میں نہیں دیکھا تھا۔ چلو یہ عذر بھی مان لیں کہ وہ دن بھر گھر سے باہر رہتا ہے۔ اس لئے اسے پتا نہیں چلتا۔ لیکن چھٹی کے دن تو وہ گھر میں ہوتا تھا۔ اس نے تو ہمیشہ نور بانو کو ہی کھانا پکاتے دیکھا تھا۔

اس پر اسے خیال آیا کہ چھٹی کے دن تو کھانا دیر سے ہی کھایا جاتا تھا۔ وہ خود بھی فجر پڑھ کر سو جاتا تھا اور دیر سے اٹھتا تھا۔ نور بانو بھی دیر سے ہی اٹھتی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ نور بانو بہت دیر سے سونے اور بہت دیر تک سونے کی عادی ہے۔ اسی لئے تو گھر سے کھانا آنے پر اسے اور زیادہ خوشی ہوئی تھی کہ اس کی محبت میں نور بانو اپنی نیند پوری کئے بغیر اٹھتی ہے اور کھانا پکا کر اسے بھیجا ہے۔ لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ نور بانو کو تو اس کے ناشتے کا خیال بھی کبھی نہیں آیا تھا۔ بلکہ اس نے تو کبھی اس سے یہ ہی نہیں پوچھا تھا کہ وہ دفتر ناشتہ کر کے بھی جاتا ہے یا نہیں۔ جیسے اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ تو پھر یہ کھانے کی اہمیت کیسے اتنی ہوگئی کہ وہ اپنی نیند قربان کرنے لگی۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ مری میں بھی نور بانو نے کبھی اپنا معمول ترک نہیں کیا تھا۔ وہ سوتے ہوئے ہی مری پہنچی تھی۔ ناشتہ بھی اسے اچھا نہیں لگا تھا اور وہ بنگلے میں پہنچتے ہی سو گئی تھی۔ اور وہاں قیام کے دوران بھی وہ ہمیشہ گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان ہی سو کر اٹھتی تھی۔

اشارے کچھ بھی کہہ رہے ہو، عبدالحق کی محبت نور بانو کے خلاف کوئی

دلیل ماننا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سوچا، ناشتے کے وقت تو اٹھنا نور بانو کے لئے ممکن ہی نہیں۔ البتہ اس کے کھانے کے لئے وہ ایثار کرسکتی ہے، اور کرتی ہے۔ اور پھر ارجمند اتنا اچھا کھانا کہاں پکا سکتی ہے۔

لیکن یعقوب نے بتایا تھا کہ اسے ہر روز کھانا ارجمند ہی دیتی ہے۔

اس میں کیا خاص بات ہے، اس نے سوچا۔ اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ کھانا ارجمند ہی پکاتی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ ٹفن تیار کر کے ارجمند کو دیتی ہو کہ وہ یعقوب کے ہاتھ دفتر بھجوا دے۔

یہ سب سوچتے سوچتے عبدالحق جھنجلا گیا۔ اس بات کی اہمیت کیا ہے کہ میں اتنا سوچ رہا ہوں اس پر۔ جب گھر سے کھانا نہیں آتا تھا تو مجھے کسی محرومی کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

لیکن پھر اسے مسعود صاحب کا ردعمل یاد آیا...... وہ اس کے گھر سے کھانا آنے پر بہت خوش ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کا اظہار کیا تھا کہ کھانا نہ بھیجنے کی وجہ سے نور بانو کے بارے میں ان کا تاثر منفی ہوگیا تھا...... اور انہوں نے میاں بیوی کے تعلقات کے بارے میں تبصرہ بھی کیا تھا کہ اچھے میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ مطابقت پیدا کرتے ہیں، ایک دوسرے کے لئے ایثار کرتے ہیں۔

اس کا مطلب تھا کہ اسے پرواہ ہو یا نہ ہو، معاشرتی اعتبار سے اس بات کی بڑی اہمیت ہے۔ اس نے تو کبھی کسی بات کے لئے بھی نور بانو پر دباؤ نہیں ڈالا تھا، زور نہیں دیا تھا۔ اور شاید اسی لئے نور بانو کو بہت سی باتوں کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔

لیکن نہیں! ایک بات ایسی تھی، وہ پیچھے پڑ جانے والا، اپنی بات پر اصرار کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ لیکن قرآن پڑھنے کے معاملے میں اس نے نور بانو سے اصرار تک کیا تھا۔ نور بانو نے اسے قرآن سنایا بھی، لیکن بے دلی سے۔ اور اس کی تنقید اور شکایت کے باوجود وہ پہلے کی طرح نہیں سنا سکی۔ پھر اس نے اس سے کہنا بھی چھوڑ دیا۔

اس پر پہلی بار عبدالحق کے دل میں ایک خیال نے سر اٹھایا...... یہ کہ نور بانو احسان شناس نہیں ہے۔ قرآن پڑھنے ہی کے نتیجے میں تو اسے وہ ملا تھا۔ اور وہ قرآن سے ہی دور ہوگئی۔ اس کا یہ مطلب بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس کے نزدیک اس کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ وقعت ہوتی تو وہ اللہ کا، قرآن کا احسان مانتی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ خود ہی خوش رہا۔ نور بانو نے اسے خوش کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اور یہ تو سچ ہے کہ جو اللہ کا احسان نہیں مانتا، وہ بندے کا احسان کیا مانے گا۔ یہ الگ بات کہ اس نے نور بانو کے لئے جو کچھ کیا، درحقیقت اپنی غرض سے، اپنی محبت کی وجہ سے کیا۔ وہ بے اماں تھی، اکیلی تھی، وہ اسے پاکستان لایا، عزت سے رکھا، شادی کی، نور بانو کے نکتۂ نظر سے تو یہ احسان ہونا چاہئے۔ مگر وہ تو زندگی کے بے سمت گھپ اندھیرے میں روشن راہ دکھانے والے اللہ سے منہ موڑے بیٹھی تھی۔ تو ایسے میں وہ کس شمار میں تھا۔

وہ سب سوچتے سوچتے عبدالحق چونکا۔ اسے پہلے بار احساس ہوا کہ وہ نور بانو کا شاکی ہو رہا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ یہ شکایت حادثاتی نہیں۔ کوئی شکایت بھی حادثاتی نہیں ہوتی۔ وہ مدتوں، برسوں لاشعور میں پلتی ہے، تب کہیں شعور تک پہنچتی ہے۔ اسے خود پر شرم آنے لگی۔ وہ شکایت دل میں رکھنے والا کب سے ہوگیا! شکایت، اور وہ بھی نور بانو سے۔

اس نے سر جھٹکا، بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ وہ تو صرف اس پر غور کر رہا تھا کہ اسے کھانا کون بھیجتا ہے...... نور بانو یا ارجمند...... اور یہ جاننا کچھ مشکل نہیں تھا۔ وہ باتوں باتوں میں نسیمہ سے پوچھ لے تو حقیقت سامنے آجائے گی۔

لیکن نہیں! یہ تو گھر کے ملازموں کو گھر کے معاملات میں دخیل کرنا ہوا۔ گھر کے کسی فرد کو ملازم کے سامنے شرمندہ کرنا تو مناسب بات نہیں۔ یعقوب والا معاملہ تو غیر ارادی تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ یعقوب تو گھر پہنچتے پہنچتے بات بھول بھی چکا ہوگا۔ لیکن نسیمہ سے تفتیش بری بات ہوگی۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ نور بانو اور ارجمند سے ہی حقیقت معلوم کرے

گا۔

٭ ٭ ٭

رات کو ارجمند کو پڑھاتے ہوئے اس نے تفتیش کا آغاز کیا۔ ایک بات کا اسے یقین تھا کہ وہ جھوٹ کبھی نہیں بولتی۔

''ارجمند! تمہیں کھانا پکانا آتا ہے؟'' اس نے بے حد سرسری انداز میں پوچھا۔

''کچھ کچھ آتا ہے آغا جی!''

''کچھ کچھ کا مطلب؟''

''سیکھ رہی ہوں۔ سیکھتی رہتی ہوں۔''

''یہ کوئی پڑھائی تو نہیں ہے، عملی معاملہ ہے۔ پکائے بغیر کیسے سیکھ سکتی ہو۔'' اس نے اسے اُکسایا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں آغا جی!''

''اس کا مطلب ہے، تم پکاتی بھی ہوگی۔''

''جی کبھی کبھی پکاتی بھی ہوں۔''

''مگر میں نے تمہیں کبھی پکاتے نہیں دیکھا۔''

''آپ گھر میں ہوتے ہی کب ہیں، اور رات کا کھانا تو آپی پکاتی ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم دوپہر میں پکاتی ہوگی۔''

یہ وہ لمحہ تھا، جب ارجمند خود بخود چوکنا ہوگئی۔

''میری مشق تو بس ناشتے تک ہے آغا جی!'' اس نے سادگی سے کہا۔

ناشتے اور کھانے میں تو بہت فرق ہوتا ہے ارجی!''

نہ جانے کیوں ارجمند کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''جی..... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

عبدالحق نے اُردو کی کتاب کے اس سبق میں سے جو وہ اسے پڑھا رہا تھا، جملے پڑھے۔

''جھوٹ بولنا بہت عام سی بات ہے۔ لیکن اللہ جھوٹ کو بہت ناپسند کرتا ہے۔ اسی لئے جھوٹ گناہِ کبیرہ ہے۔ اب یہ بتاؤ ارجمند کو جھوٹ کا سب سے بڑا نقصان کیا ہے۔''

''جھوٹ دل کو سیاہ کرتا ہے اور آدمی کے اللہ سے تعلق کو کمزور کرتا ہے۔'' ارجمند نے بے جھجک جواب دیا۔

''کتاب میں تو یہ نہیں لکھا ہے۔'' عبدالحق نے اعتراض کیا۔

''کتابوں میں سب کچھ تو نہیں لکھا ہوتا۔ کتابیں تو آدمی کو سوچنا اور سمجھنا سکھاتی ہیں۔''

''واہ..... بڑی عقل مند ہو تم، اچھا یہ بتاؤ، کبھی دوپہر کو بھی کھانا پکاتی ہو تم؟''

''جی..... کبھی کبھی۔'' ارجمند نے جواب دیا۔ اور عبدالحق کو بولنے کا موقع دیئے بغیر بولنے لگی۔

''ایک بات بتاؤں آغا جی! میرے داخلے کے ٹیسٹ میں ایک ہفتہ رہ گیا ہے، اور مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

عبدالحق اپنی بات بھول گیا۔

''ڈر لگنے کا کیا سوال ہے؟ کیسا ڈر؟''

''مجھے لگتا ہے، میں فیل ہو جاؤں گی۔''

''یہ کیسے ممکن ہے، تمہاری تیاری تو ایسی ہے کہ تم میٹرک کے امتحان میں بھی نہیں ہو سکتی۔''

''میں جانتی ہوں، لیکن امتحان کا خوف ڈراتا ہے آغا جی! کتنا ہی کچھ آتا ہو، لیکن آزمائش تو امتحان میں ہی ہوتی ہے۔ میں سوچتی ہوں، امتحان کے وقت سب کچھ بھول گئی تو کیا ہوگا۔''

''ارے نہیں! ڈرو نہیں، انشاء اللہ تم کچھ نہیں بھولو گی۔''

''آپ نے یہ بات کہی اور انشاء اللہ کے ساتھ کہی تو کچھ اعتماد آیا مجھ میں۔''

''اللہ سے دعا بھی کیا کرو۔''

''کرتی ہوں آغا جی! بہت کرتی ہوں۔'' ارجمند نے دھیمی آواز میں کہا۔

''ہر چیز کے لئے اللہ سے دعا کرتی ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہر دعا قبول نہیں ہوسکتی۔''

''یہ تمہیں کس نے بتایا؟'' عبدالحق نے چونک کر پوچھا۔

''اللہ میاں نے۔'' ارجمند نے بے ساختہ کہا۔ پھر جلدی سے وضاحت کی۔

''سورہ نجم میں آیت ہے آغا جی! اَمْ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰیo کیا ضروری ہے کہ انسان کی ہر تمنا پوری ہو جائے۔''

عبدالحق کو بہت حیرت ہوئی۔ اتنی سی بچی قرآن کے حوالے سے بات کر رہی ہے۔ اس نے جانچنے کی خاطر بات آگے بڑھائی۔

''اور قرآن میں جگہ جگہ اللہ نے بندوں کو دعا کی تلقین کی ہے کہ اپنے ربّ سے سب کچھ مانگو۔''

''جی ہاں! سوائے خلافِ فطرت دعا کے۔''

''یہ خلافِ فطرت دعا کیا ہوتی ہے؟''

''سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کی دعا۔ ایسی دعا، جس کی قبولیت سے اللہ کے قائم کئے ہوئے نظام میں خلل پڑتا ہو۔''

اب تو عبدالحق کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔ اور وہ مرعوب بھی تھا۔

''تم تو عالم بن گئیں ارجی!''

''جی نہیں آغا جی! مجھے تو پڑھنا بھی نہیں آتا۔ اللہ کچھ سمجھا دے تو الگ بات ہے۔''

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

''تو پھر تم ہر چیز کے لئے اللہ سے دعا کیوں کرتی ہو؟ جب کہ جانتی ہو کہ ہر دعا قبول نہیں ہوسکتی۔''

''آپ ہی نے تو بتایا ہے کہ اللہ نے بندوں کو دعا کی تلقین کی ہے۔ اور اسی نے بتایا ہے کہ ہر دعا قبول ہونے والی نہیں۔''

''تو پھر.....؟''

ارجمند سوچتی رہی، پھر بولی۔

''اب مجھے تو نہیں معلوم کہ جو دعا میں کر رہی ہوں، وہ قبول ہوگی یا نہیں، لیکن اللہ کے حکم کے مطابق مجھے تو دعا کرنی ہے نا!''

''تو دعا کا فائدہ؟'' عبدالحق نے دل ہی دل میں توبہ کرتے ہوئے سوال اٹھایا۔ اسے لگتا تھا کہ کوئی گہرا بھید کھلنے والا ہے۔ ورنہ وہ یہ جرأت نہ کر پاتا۔

''اللہ کا حکم ماننے میں تو فائدے ہی فائدے ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے آغا جی کہ ان فائدوں کا ہمیں علم ہے یا نہیں۔''

وہ روک دینے والا جواب تھا، لیکن عبدالحق رکنا نہیں چاہتا تھا۔

''پھر بھی آدمی کو جاننے کی کوشش کرنی چاہئے۔ تم مجھے دعا کا فائدہ بتاؤ۔''

''اس پر میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ میں تو بس مان لیتی ہوں۔''

''بہت اچھی بات ہے۔ لیکن اب اس پر غور کرو، پھر جواب دو۔''

ارجمند کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ خود عبدالحق بھی اس بات پر غور کر رہا تھا۔

بالآخر ارجمند سر اٹھایا۔

''میں نے سب سے پہلے اس بات پر غور کیا ہے آغا جی کہ اللہ نے بندوں کو دعا کی تلقین کی۔ پھر انہیں یہ بھی بتایا کہ ضروری نہیں، ان کی ہر دعا قبول بھی ہو۔ تو یہ دوسری بات اس نے بندوں کو کیوں بتائی؟ ظاہر ہے، ضروری تھا تو بتائی۔ تو ضرورت کیا تھی بتانے کی۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں، کوئی جواب ملا تمہیں؟''

''جی..... ملا۔ اگر اللہ یہ نہ بتاتا تو دعائیں قبول نہ ہونے پر بندے

مایوس ہو جاتے اور دعا کرنی چھوڑ دیتے۔ یوں ان کا نقصان ہوتا، اور اللہ کو اپنے بندوں کا نقصان پسند نہیں۔''

عبدالحق کا دماغ جیسے روشن ہوگیا۔ اس نے بے ساختہ کہا۔

''سبحان اللہ!'' پھر اس نے بے یقینی سے آنکھیں ملیں، جیسے آنکھیں ملنے سے منظر تبدیل ہو جائے گا، اور وہ خود کو اپنے اسٹڈی کے بجائے مولوی صاحب کے حجرے میں ان کے رو بہ رو پائے گا۔

لیکن ایسا کچھ ہوا نہیں۔ اس کے سامنے مولوی مہر علی نہیں، چودہ سالہ ارجمند ہی بیٹھی تھی۔

''بے شک!'' اس نے تائید میں کہا۔

''اور نقصان بھی بہت بڑا ہوتا، کیونکہ اللہ نے مایوسی کو کفر قرار دیا ہے۔''

''یہ میں نہیں سمجھ پائی تھی۔'' ارجمند نے ستائشی لہجے میں کہا۔

''آپ مجھ سے بہت زیادہ جانتے ہیں آغا جی!''

''لیکن تم مجھ سے بہت زیادہ سمجھتی ہو۔ اور سمجھنا جاننے سے بہت زیادہ اہم ہے۔ سمجھے ہی نہیں تو جاننے کا کیا حاصل؟ اب آگے چلو۔''

ارجمند پھر سوچنے لگی۔

''اللہ نے دعا کی تلقین کی، پھر بتایا کہ ہر دعا کی قبولیت ضروری نہیں، تاکہ بندے اس پر مایوس نہ ہوں تو آغا جی! دُعا بہت ہی اہم اور ضروری ہوئی نا!''

عبدالحق نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

''یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ لیکن وہ اہمیت ہے کیا، اس پر غور کرنا ہے۔''

''دماغ میں بہت ساری سوچیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں، جیسے بری طرح الجھا ہوا دھاگا سلجھانے کی کوشش میں اور الجھ جاتا ہے۔ لیکن میرے دل میں صاف خیال آتا ہے۔ صحیح ہے یا غلط اس پر ڈر لگتا ہے۔''

''مجھے بتاؤ!''

''میرا دل کہتا ہے، دعا عبادت سے بھی بہت بڑی چیز ہے۔ اس لئے تو اس سے محرومی بہت بڑا نقصان ہے۔''

''کیسے؟'' اب عبدالحق خود بھی اس پر غور کر رہا تھا، اور اس کی نظر میں ارجمند کے چہرے پر جمی تھی۔

''یہ تو مجھے نہیں معلوم، سب کچھ گڈمڈ ہو رہا ہے۔'' ارجمند نے بے بسی سے کہا۔ اس کے چہرے پر بے بسی اور الجھن تھی اور آنکھوں میں وحشت، جیسے وہ کسی بھول بھلیاں میں راستہ تلاش کر رہی ہو، اور کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہو۔

''یہ بتائیں، میری یہ بات کہ دعا عبادت سے بھی بہت بڑی چیز ہے، آپ کو ڈراؤنی تو نہیں لگی۔ مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

''ڈراؤنی تو نہیں لگی، لیکن میرا دماغ اسے تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ عبادت بندگی ہے، اور بندوں کے لئے بندگی سے بڑی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ لیکن میرا دل تمہاری بات کو سچ مانتا ہے۔ کیسے، یہ سمجھ میں نہیں آتا۔''

اچانک ارجمند کے چہرے پر طمانیت پھیل گئی۔

''آپ کا دل بھی یہی کہتا ہے۔ اب میرا ڈر دور ہوگیا۔''

''مگر اس پر سوچنا تو ہے۔''

وہ دونوں سوچتے رہے۔ پھر ارجمند نے کہا۔

''آغا جی! بندگی سے بھی بڑی ایک چیز ہے۔''

''وہ کیا؟''

''ایمان..... ایمان کے بغیر زندگی ممکن نہیں، تو ایمان بندگی سے بڑا ہوا نا.....!''

عبدالحق کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''ٹھیک کہتی ہو۔ ایمان کے بغیر تو کچھ بھی نہیں۔ نہ بندگی، نہ اعمال۔ ایمان کے بغیر صالح اعمال بھی آخرت میں رائیگاں ہیں۔ بس دنیا میں اجر مل جاتا ہے ان کا۔ ٹھیک کہتی ہو ارجی! لیکن دعا سے ایمان کا تعلق؟''

''ایمان نہ ہو تو دُعا کیسی؟''

"نہیں ارجمند! وقت پڑنے پر تو کافر بھی دعا کرتا ہے۔"

"یقین ہوتا ہے، تبھی تو دعا کرتا ہے۔" ارجمند نے کہا۔

اب تک کی گفتگو کے دوران عبدالحق کو ایسا لگتا رہا تھا جیسے ارجمند اس سے بڑی ہے۔ اس کی راہنمائی کر رہی ہے۔ اب پہلی بار اسے وہ چھوٹی لگی۔ اس نے کہا۔

"یقین اور ایمان میں بہت فرق ہے ارجمند! صرف یقین سے آدمی مومن نہیں ہو جاتا ہے، بلکہ مومن کیا، مسلم بھی نہیں ہوتا۔ قرآن میں ہے کہ وقت پڑتا ہے تو وہ رب کو پکارتے ہیں اور جب وہ انہیں پریشانی سے نکال لیتا ہے تو وہ سب سے پہلے اسی سے منہ پھیرتے ہیں، یعنی وہ کافر ہی رہتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں آغا جی! اس پر تو میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔" ارجمند کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"تو بات یہ ہے کہ دعا عبادت سے بھی بڑی ہے، اور عبادت بندگی ہے۔ تو دعا بندگی کا اعلیٰ ترین اظہار ہے۔ اور ایمان کے بغیر نہ اعمال ہیں، نہ دعا ہے اور نہ بندگی۔ تو دعا اور ایمان میں تعلق تو ہے نا!"

"جی ہاں! ضرور ہوگا۔"

"تو بتاؤ!"

"سمجھ میں نہیں آتا۔" ارجمند نے بے بسی سے کہا۔

"بہت کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"تو اس پر سوچنا چاہئے، سوچو!"

ارجمند کہنا چاہتی تھی کہ آپ بڑے ہیں، زیادہ جانتے ہیں، آپ سوچیں، لیکن یہ بدتمیزی ہوتی۔ اس نے سوچا، مجھے تو حکم کی تعمیل کرنی ہے، اس نے آنکھیں بند کیں اور بڑے ارتکاز کے ساتھ، بڑی عاجزی کے ساتھ اللہ سے دعا کی..... اللہ میاں! میری مدد کیجئے۔ مجھے سمجھا دیجئے۔

عبدالحق اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ ارجمند کا چہرہ کتنا حسین، دل کش اور دل نشیں ہے۔ وہ سچائی کے ساتھ کہہ سکتا تھا

کہ اتنا خوب صورت چہرہ اس نے پہلے کہیں نہیں دیکھا۔ اسے حیرت بھی ہوئی کہ اتنے دنوں کے ساتھ کے باوجود اس نے پہلے کبھی یہ بات محسوس نہیں کی۔

خوب صورتی سے بڑھ کر اس کی پاکیزگی تھی۔ بند آنکھوں کے ساتھ اس کے چہرے پر محویت کے تاثر کو دیکھ کر نہ جانے کیوں عبدالحق کو ایسا لگا کہ ارجمند اس وقت اللہ سے رابطہ میں ہے۔ اور اس بات کے یقینی ہونے پر اس کا دل گواہی دے رہا تھا۔

عبدالحق نے اس سے پہلے نوربانو کے سوا کسی کو اس طرح نہیں دیکھا تھا۔ اس بات کا احساس ہوتے ہی اس نے نظریں جھکا لیں۔

اسی لمحے ارجمند سر اٹھایا۔

"جی آغا جی! کچھ کچھ تو میری سمجھ میں آتا ہے۔ میں خود پر غور کر رہی تھی۔ جب میں نماز پڑھتی ہوں تو مجھے اللہ کی موجودگی کا اتنا قوی احساس نہیں ہوتا، جتنا دعا مانگتے وقت ہوتا ہے۔ دعا مانگتے ہوئے مجھے خیال آتا ہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے تو میں اور جھک جاتی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے پیروں پر گر پڑوں۔ اور مجھے یقین ہوتا ہے کہ وہ میری بات سن رہا ہے، میرے دل کا حال جان رہا ہے، اور سورۂ نجم کی اس آیت کے حوالے سے میں جانتی ہوں کہ میں کچھ بھی نہیں جانتی اور اللہ سب جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میری دعا میرے حق میں بہتر ہے یا نہیں، اور دوسرے تمام لوگوں کے لئے، ساری دنیا کے لئے نقصان دہ تو نہیں ہے۔ میں نہیں جانتی اور اللہ سب جانتا ہے۔ اسی لئے اس نے بتا دیا کہ میری ہر دعا قبول نہیں کی جا سکتی۔ تو میں نے اس سے یقین کے ساتھ یہ سیکھا کہ اللہ میاں میری اور سب کی بہتری چاہتے ہیں۔ تو پھر وہ میرے اور سب کے دوست ہوئے نا، اور میں نے یہ بھی سمجھ لیا کہ وہ ایسے قادرِ مطلق ہیں کہ جو چاہیں، کر سکتے ہیں، وہ کُن کہتے ہیں تو زمین آسمان وجود میں آ جاتے ہیں۔ تو ہماری دعا کی قبولیت میں ہماری بہتری ہی رکاوٹ بن سکتی ہے۔ ورنہ اللہ میاں کے لئے کچھ بھی کرنا ناممکن نہیں۔"

"لیکن دعا کی اہمیت.....؟"

''میں سمجھ رہی ہوں، سمجھا نہیں پا رہی۔'' ارجمند نے بے بسی سے کہا۔

''میں قرآن میں پڑھتی ہوں، جگہ جگہ اللہ نے اپنی صفات بیان فرمائی ہیں۔ میں اس پر سوچتی تھی کہ کیوں بیان فرمائیں۔ پھر میری سمجھ میں آیا کہ ہماری آسانی کے لئے۔ ہمیں اللہ پر بغیر دیکھے زبان اور دل سے ایمان لانا ہے۔ یہ تو بہت مشکل ہوتا ہمارے لئے۔ تو اللہ نے ہمارے لئے آسانی فرما دی۔''

''مشکل کیسے ہوتا؟''

''میں تو اپنے ہی حوالے سے بات کروں گی آغا جی! دوسروں کا تو مجھے نہیں پتا۔ میں جانتی ہوں کہ میرے اللہ میاں سب کچھ سنتے، سب کچھ دیکھتے، اور سب کچھ جانتے ہیں۔ وہ میرے دل کا بھید بھی جانتے ہیں۔ میں یہ جانتی بھی ہوں، اوراس پر ایمان بھی رکھتی ہوں۔ لیکن کئی کئی دن مجھے اس کا خیال نہیں آتا۔ میں بری بات بھی کرتی ہوں اور مجھے یہ خیال نہیں آتا کہ اللہ میاں سن رہے ہیں، خفا ہوں گے۔ میں غلط کام بھی کرتی ہوں اور نہیں سوچتی کہ اللہ میاں دیکھ رہے ہیں۔ اور دل میں برائی سے تو میں ڈرتی ہی نہیں۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ اللہ میاں سب کچھ جانتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ میرا ایمان کمزور ہے نا! میں اللہ میاں کو اور ان کی صفات کو اس طرح یاد نہیں رکھ پاتی، جیسے یاد رکھنا چاہئے..... ہر ہر پل، ہر ہر لمحہ، یاد رکھوں تو نڈر نہ رہوں۔''

عبدالحق کا ذہن اب بھی الجھ رہا تھا۔

''تو دعا سے اللہ کی صفات کا شعور پختہ ہو جاتا ہے؟''

''جی..... مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔''

''کیسے.....؟''

ارجمند چند لمحے سوچتی رہی، جیسے الجھے ہوئے دھاگے کو سلجھا رہی ہو۔ پھر پُرخیال لہجے میں بولی۔

''مجھے کاپی کی ضرورت ہوتی ہے تو میں آپی سے کہتی ہوں، وہ منگا دیتی ہیں۔ لیکن کوئی ایسی ضرورت ہو، جسے کوئی پورا نہ کر سکے تو بے بسی محسوس ہوتی ہے اور میں اللہ سے دعا کرتی رہوں۔''

''مثلاً.....؟''

ارجمند گڑبڑا گئی۔ ضرورتوں کے حوالے تو اس کے پاس زیادہ تھے ہی نہیں۔

''میں آپ کے لئے دعا کرتی ہوں۔'' اس نے گھبرا کر کہا۔

''میرے لئے کیا دعا کرتی ہو تم.....؟'' عبدالحق کے لہجے میں حیرت تھی۔

''میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ آپ کو بیٹا دے۔'' ارجمند نے بے ساختہ کہا۔

''اب دیکھیں نا آغا جی! یہ کام تو اللہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ وہی تو پیدا کرنے والا ہے۔'' اب وہ شرمندہ ہو رہی تھی کہ یہ اس کے منہ سے کیسے نکل گیا؟ آغا جی کیا سوچیں گے۔

''اس دعا کے لئے مجھ سے دادی اماں نے کہا تھا۔'' اس نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

عبدالحق سن ہو کر رہ گیا تھا۔ اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

''آپ کو برا لگا ہے آغا جی!'' ارجمند نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''نہیں بھئی! کوئی کسی کے لئے دعا کرے تو اسے برا کیسے لگ سکتا ہے؟'' عبدالحق نے خود کو سنبھالا۔

''میں تو تمہارا شکرگزار ہوں۔ تم میرے لئے دعا کرنا کبھی نہ چھوڑنا۔ اور بھی کوئی دعا کرتی ہو میرے لئے؟''

''جی..... میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ آپ کو اپنے خاص پسندیدہ بندوں میں شامل فرمائے۔''

''جزاک اللہ!'' عبدالحق نے کہا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ بات سے بات نکلی اور رُخ ہی بدل گیا۔ ایسے ہی تو اصل بات کہیں پیچھے رہ جاتی ہے۔

''ہاں تو ہم بات کر رہے تھے دعا کی۔ دعا سے اللہ کی صفات کا شعور پختہ ہوتا ہے، اور اس کے نتیجے میں ایمان مستحکم ہوتا ہے۔ اور ایمان کے استحکام

سے عبادت میں بہتری اور سچائی آتی ہے۔ اور عبادت بندگی ہے، تو دعا بندگی کا عبادت سے بڑا روپ ہے۔ تم نے مجھے بہت بڑی بات سمجھا دی۔ دعا اپنی مکمل محتاجی اور اللہ کے قادر مطلق ہونے کا عملی اعتراف ہے۔ یہی تو بندگی ہے۔ لیکن اللہ نے عقل دے کر بندے کو گمان میں مبتلا کر دیا۔ یہ اس کی آزمائش ہے۔ وہ اپنی طاقتوں اور وسائل پر بھروسہ کرتا ہے۔ اور خود بے بس ہو جائے تو دوسروں کی طاقتوں اور وسائل سے امید لگاتا ہے۔ اللہ کو نہیں پکارتا۔ نہیں سمجھتا کہ یہ راستہ شرک کی طرف لے جاتا ہے۔ مگر اس سے بچنا بہت مشکل ہے۔'' وہ اب ایک کیفیت میں بول رہا تھا۔ مدتوں کے بعد وہ اس طرح غور کر رہا تھا، اور سوچ رہا تھا۔

''نہیں آغا جی! اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ تو رحمت والا ہے۔''

ارجمند نے اسے چونکا دیا۔

''اس نے اپنے بندوں کی ایسی راہنمائی کی ہے کہ وہ کبھی بہک ہی نہیں سکتے۔ قرآن بہت بڑی رحمت ہے اللہ کی۔ اب بندہ اس سے ہی منہ موڑ لے تو پھر اللہ سے دور تو ہوگا نا! یہ تو بدنصیبی ہے کہ روشنی میسر ہو اور بندہ سوئچ دبانا بھول کر اندھیرے میں بھٹکتا پھرے۔''

عبدالحق یوں تڑپا، جیسے جسم پر کسی نے کوڑا مارا ہو۔ اسے ایسا لگا کہ ارجمند خصوصیت سے اس کے بارے میں بات کر رہی ہے۔ واقعی وہ برسوں سے منہ موڑے ہی تو بیٹھا ہے۔

''کبھی کبھی اللہ کی رحمت سے صرف ایک آیت آدمی کی زندگی بدل دیتی ہے۔'' ارجمند اس کی حالت سے بے خبر اپنی کہے جا رہی تھی۔

''آدمی بس قرآن سے جڑ کر رہے۔ روز پڑھے اور سمجھنے کی کوشش کرے تو اللہ اسے اندھیرے میں رہنے ہی نہیں دے گا۔ ہر آیت میں بے شمار حکمتیں ہیں۔ اللہ خوش ہو تو اس پر بھید کھول دے۔ زندگی آسان ہو جائے۔''

''تمہارے ساتھ کبھی ایسا ہوا؟'' عبدالحق نے اس سے پوچھا۔

''جی.....! ابھی دس پندرہ دن پہلے ہی ہوا'' ارجمند جیسے کھو سی گئی۔

''میں سورۃ الحج کی تلاوت کر رہی تھی کہ ایک آیت پر جیسے کسی نے مجھے روک دیا۔ میں نے ٹھہر ٹھہر کر اس آیت کو کئی بار پڑھا اور حیران ہوتی رہی۔ کچھ نہیں تو سو بار میں اس آیت کو پڑھ چکی ہوں۔ مگر نہ کبھی اس پر رکی اور نہ ہی غور کیا۔ پھر مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ اس میں کوئی پیچیدگی ہے ہی نہیں۔ وہ تو بالکل کھلی، واضح اور روشن آیت ہے۔ پہلے کیوں نہیں سمجھ سکی میں؟ بہرحال اسے پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔''

''کون سی آیت ہے وہ.....؟'' عبدالحق نے تجسس سے پوچھا۔

''۷۳ ویں آیت ہے سورۃ الحج کی۔ مفہوم کچھ یوں ہے..... اے لوگو! بیان کی جاتی ہے ایک مثال تو غور سے سنو اسے۔ یقیناً وہ جن کو تم پکارتے ہو اللہ کو چھوڑ کر، ہرگز نہیں پیدا کر سکتے وہ ایک مکھی بھی، اگرچہ جمع ہو جائیں وہ سب اس کام کے لئے۔''

''بے شک.....! سبحان اللہ.....!''

''آگے تو سنیے۔ اللہ فرماتا ہے..... اور اگر چھین لے جائے مکھی ان سے کوئی چیز تو نہیں چھڑا سکتے اس کو اس سے۔ کمزور ہیں مدد مانگنے والے بھی اور وہ بھی جن سے مدد مانگی جاتی ہے۔''

ہیبت سے عبدالحق کا جسم شل ہو گیا۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ لیکن وہ سمجھ گیا تھا کہ اس وقت مداخلت نامناسب ہوگی۔

''میں نے سوچا، یہ کیسی کھلی، واضح اور دوٹوک بات ہے۔'' ارجمند کہتی رہی۔

''اور پہلے کبھی میں نے اس پر غور نہیں کیا۔ اس روز میں آگے بڑھ ہی نہیں سکی، اس پر سوچتی اور غور کرتی رہی۔ جس نے یہ آیت پڑھی یا سنی، وہ تو اللہ کا انکار کر ہی نہیں سکتا آغا جی!''

''پھر کیا ہوا ارجی.....؟''

''اس پر غور کرتے کرتے اچانک میرے اندر روشنی ہوگئی۔ اس میں چھپے ہوئے معنی بھی میری سمجھ میں آنے لگے۔ میری حالت خراب ہوگئی۔ لگتا تھا،

دماغ کو کچھ ہو جائے گا۔ دماغ کے اندر اتنے بہت سے معنی مچل رہے تھے، کہ دماغ انہیں گرفت میں نہیں لے پا رہا تھا۔ جیسے بند کمرے میں بہت سی تتلیاں اُڑ رہی ہوں اور سب کی سب پکڑی جا سکتی ہوں اور میں کبھی ایک کے پیچھے بھاگوں اور کبھی دوسری کے، اور بس چھو کر رہ جاؤں۔ کوئی تتلی ہاتھ ہی نہ آئے۔''

عبدالحق اس کیفیت سے گزر چکا تھا، اسے سمجھ سکتا تھا۔ اسے محرومی کا، زیاں کا احساس ہونے لگا اور اسے ارجمند پر رشک بھی آ رہا تھا۔ اتنی سی بچی اور یہ باتیں، یہ سب کیا ہے؟

''پھر کچھ ہاتھ بھی آیا؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت تھوڑا۔ جیسے بہت تیز روشنی میں آنکھیں چندھیا جاتی ہیں نا آغا جی! میرے دماغ کی آنکھیں بھی ویسے ہی چندھیا گئی تھیں۔''

''جو سمجھ میں آیا، وہ تو بتاؤ!''

''سب سے کھلی اور واضح بات تو یہ ہے کہ اللہ قادرِ مطلق ہے، اور وہی تمام عالموں کا واحد پیدا کرنے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی کچھ پیدا کرنے والا نہیں۔ اور یہاں اللہ نے مکھی کی مثال دی، جو بہت چھوٹی، بہت حقیر مخلوق ہے۔ اللہ نے جتایا کہ بڑی چیز تو کجا، تم مکھی جیسی حقیر چیز بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ دوسری بات یہ کہ جیسے اللہ کی قدرت لامحدود ہے، ویسے یہ بندوں کی کمزوری اور بے بسی بھی لامحدود ہے۔ اللہ نے انسان کو اپنا نائب بنایا، اشرف المخلوقات بنایا تو یہ عزت محض اللہ کے کرم سے ہے۔ اس پر انسان کو غرور نہیں کرنا چاہئے، پھولنا نہیں چاہئے، اسے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے رہنا چاہئے۔ یہاں اللہ نے انسان کے غرور کو پاش پاش کر دیا۔ اس کے لئے کسی گمان کی گنجائش بھی نہیں چھوڑی۔ حوالہ وہی حقیر سی مکھی کا ہے کہ انسان اس پر بھی قدرت نہیں رکھتا۔ مکھی ان سے کچھ چھین لے تو وہ اسے واپس بھی نہیں لے سکتا، چاہے وہ اپنے جیسے اور لوگوں کو بھی جمع کر لے۔ تو وہ اپنے سے طاقتور سے کیسے نمٹ سکتا ہے۔''

عبدالحق کو بھی اپنا دماغ روشن روشن محسوس ہو رہا تھا۔ ارجمند کی باتوں سے اس کا ذہن کھل گیا تھا۔ وہ دور تک دیکھ اور سمجھ سکتا تھا۔

''اللہ نے تم پر کریمی کی ارجمند کہ تمہیں سمجھایا۔ اور مجھ پر کریمی کی کہ تمہارے ذریعے مجھ تک یہ بات پہنچی اور میرا ذہن کھلا۔ الحمد للہ! میں اور آگے دیکھنے اور سمجھنے کے قابل ہوا۔''

''تو جو آپ کی سمجھ میں آیا، مجھے بھی سمجھائیے!'' ارجمند کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

''اللہ نے بہت سختی کے ساتھ دوٹوک انداز میں انسان کو اس کی اوقات بتا دی۔ اسے جتا دیا کہ اس کے لئے غرور نہیں، عاجزی ہے۔ اللہ کی محتاجی میں اس کے لئے عزت ہے۔ اسی میں اس کے لئے افتخار ہے۔ میں نے اس بے بسی کا تصور کیا اور لرز کر رہ گیا۔ میرے سامنے کی لذیذ چیز کی کوئی تاب رکھی ہے۔ مکھی اس پر آ کر بیٹھی ہے، اور اگلے ہی پل اُڑ جاتی ہے۔ جو کچھ وہ لے کر اُڑی، اس کی کیا اہمیت ہے۔ وہ تو ذرّے سے بھی چھوٹا ایک ذرہ ہوگا، جو اگر مکھی میرے دامن پر بھی گرا دے تو شاید مجھے نظر نہ آئے۔ اس میں تو میرا کچھ نقصان نہیں۔ نقصان تو یہ ہے کہ تاب میں موجود وہ پوری کی پوری چیز میرے نزدیک خراب ہوگئی۔ اب میں اسے کھا نہیں سکتا۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ!'' ارجمند نے ستائشی لہجے میں کہا۔

''ہمیں یہ سوچ کر گھن آئے گی کہ مکھی نہ جانے کیسی کیسی غلاظتوں پر بیٹھ کر، گندگی سمیٹ کر آئی ہوگی اور اس چیز پر چھوڑ گئی ہوگی۔ اس بات کو میں نے نہیں سوچا تھا۔ آغا جی! آپ بہت عقل مند ہیں۔''

''نہیں ارجمند! یہ اللہ کا فضل ہے۔ اور یہ بات تو تمہاری بات سننے کے بعد میں سمجھا ہوں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اب اس میں بھی اللہ کی مطلق قدرت اور ہماری بے بسی ہے، فرض کر لو، وہ چیز میں نے بہت شوق سے پکائی تھی، وہ میری دست رس میں تھی کہ ہاتھ بڑھا کر اسے لے لینا۔ لیکن اللہ کی مرضی نہیں تھی، تو طاقت اور اختیار کے باوجود میں محروم رہ گیا۔''

''لیکن اس کے باوجود آپ اسے کھا سکتے ہیں۔'' ارجمند بولی۔

''اوّل تو گھن آئے گی۔ دوسرے یہ احساس ستائے گا کہ مکھی کی چھوڑی ہوئی غلاظت اور جراثیم کی وجہ سے وہ ضرر رساں بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اسے کھا کر میں بیمار بھی ہو سکتا ہوں۔ اور اسے کھاؤں تو شاید بیمار ہو بھی جاؤں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اور بھی کچھ سمجھ میں آیا آپ کی؟'' ارجمند نے پوچھا۔

''ہاں..... ! اپنی بے بسی کا احساس اور شدید ہوگیا۔ سمجھ میں آگیا کہ جس چیز کو ہم اپنی دسترس میں سمجھتے ہیں، وہ بھی ہماری نا سمجھی ہے۔ وہ دسترس ظاہری ہے اصل میں وہ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اللہ چاہے تو مجھے اس سے روک دے۔ میں کچھ اٹھا کر پھینکنا چاہوں تو پھینک سکتا ہوں۔ لیکن اللہ نہ چاہے تو میرا ہاتھ ہی شل ہو جائے۔ میں اپنے اختیار پر اصرار کروں تو مجھے کوئی بڑا نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔''

ارجمند جھرجھری لے کر رہ گئی۔

''میں نے سمجھ لیا کہ جو کچھ مجھے میسر ہے اور جس پر بظاہر میرا اختیار ہے، اس سے استفادے کے لئے بھی مجھے اللہ سے اجازت لینی چاہئے۔''

''تب تو ہر لمحہ اجازت لینا ہوگی، اور ذرا دیر بعد یہ خود ہمیں بھی دکھاوا معلوم ہوگا۔''

عبدالحق مسکرایا۔

''اللہ بڑا مہربان ہے۔ وہ آسانیاں فراہم کرتا ہے۔ اس کے لئے اس نے ہمیں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم عطا فرمایا ہے۔ کچھ بھی کرو، بسم اللہ پڑھ کر اللہ کی قدرت اور بے بسی کا اعلان کر دو۔''

''جی..... ! میں سمجھ گئی۔'' ارجمند نے کہا۔ پھر بولی۔

''ایک بات بتاؤں آغا جی! مجھے اللہ کی قدرت اور اپنی بے بسی کا خیال اس آیت کو سمجھ کر ہی آیا؟''

''کیسے.....؟''

''میں نے سوچا، سب لوگوں کے گھروں میں قرآن موجود ہوتا ہے۔

لیکن وہ کبھی پڑھتے نہیں۔ اللہ کا کرم ہے کہ وہ مجھے پڑھنا نصیب کرتا ہے۔ پھر یہ آیت میں نے بارہا پڑھی اور گزر گئی۔ کھلی اور روشن آیت، لیکن کبھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس روز اللہ نے مجھے اس آیت پر روک دیا۔ تبھی تو میں سمجھ سکی۔ اللہ نے مجھے سمجھایا۔ یہ تو نشانی ہے کہ اس کی مدد کے بغیر میں کچھ نہیں پچھ سکتی۔''

عبدالحق مسکرایا۔

''یہ تو اللہ نے قرآن میں خود بھی فرمایا ہے قرآن کے لئے، سورۂ مدثر یاد ہے؟''

ارجمند نے نفی میں سر ہلایا۔

''اللہ سورۃ المدثر کی آخری آیات میں فرماتا ہے ..... خبردار! یہ تو ایک نصیحت ہے۔ سو جس کا جی چاہے، سبق حاصل کر لے۔ اور نہیں سبق حاصل کریں گے یہ لوگ اس سے، الا یہ کہ چاہے اللہ، وہ لائق ہے ڈرنے کے اور وہ مالک ہے بخشش کا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اب دیکھو، قرآن کی دعوت بھی عطا فرمائی، اور یہ بھی جتا دیا کہ روشنی تو اللہ کی مرضی سے ہی ملے گی۔''

''بے شک! لیکن آغا جی.....''

''مطلب یہ کہ اللہ سے لو لگا کر قرآن نصیحت حاصل کرنے کے لئے پڑھتے رہو، سمجھنے کی کوشش کرتے رہو، چاہے سمجھ میں نہ آئے۔'' عبدالحق کی طبیعت میں روانی آگئی تھی۔

''پھر آخر میں اپنے بارے میں وضاحت بھی فرما دی اور راہنمائی بھی فرما دی کہ صرف اسی سے ڈرتے رہو اور اسی سے بخشش طلب کرتے رہو۔ اس کے نتیجے میں سمجھ سکو گے اور روشنی حاصل کر سکو گے۔'' عبدالحق نے ایک لمحہ توقف کیا، پھر بولا۔

''اب تم دیکھ لو، تم نے خود کہا کہ نہ جانے کتنی بار تم سورۃ الحج کی اس آیت کو پڑھ کر گزر گئیں۔ لیکن پھر ایک دن اللہ نے تمہیں اس پر روکا اور روشنی عطا فرما دی۔ تو قرآن سے جڑا رہنا، رابطہ رکھنا، اللہ سے ڈرنا اور بخشش طلب کرنا

ضروری ہے۔''

''آپ نے کتنی اچھی طرح سمجھا دیا آغا جی!'' ارجمند نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔

''اللہ نے سمجھایا ہے، تمہیں بھی اور مجھے بھی۔ اور ہاں! سورۃ الدھر میں بھی اسی طرح کا مضمون ہے۔ ۲۱ ویں اور ۳۰ ویں آیت میں اللہ فرماتا ہے ... یقیناً یہ ایک نصیحت ہے، پس جو شخص چاہے بنا لے اپنے ربّ کی طرف جانے کا راستہ۔ اور تم چاہ بھی نہیں سکتے مگر یہ کہ چاہے اللہ یقیناً اللہ ہے سب کچھ جاننے والا، بڑی حکمت والا۔ اب دیکھو، تقریباً وہی مضمون ہے۔ سورۃ المدثر میں بات ہے سب حاصل کرنے کی۔ سبق کیسا؟ پچھلی اُمتوں، اللہ کی نافرمانی، اس کا انکار کرنے والوں، خودسروں، سرکشوں اور مغروروں کے انجام سے سبق۔ سبق حاصل کرو گے تو ڈرو گے اپنے اعمال پر بخشش طلب کرو گے۔ یوں اللہ کی رضا حاصل ہوگی۔ اور سورۃ الدھر کی آیت مبارکہ کے مطابق تم اپنے ربّ کی طرف جانے والا راستہ پالو گے۔ یہاں بھی فیصلہ اللہ کی مرضی سے ہوگا۔ اور یہاں اللہ نے اپنی دو صفات کا ذکر فرمایا ہے۔ فرماتا ہے کہ وہ ہے سب کچھ جاننے والا اور بڑی حکمت والا۔ یعنی ہم نے اللہ سے ڈرنے اور بخشش طلب کرنے کی شرط پوری کر دی۔ اب اللہ سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ ہمارے باطن کے ان گوشوں سے بھی واقف ہے جو خود ہم سے بھی پوشیدہ ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ ہمارا اس سے ڈرنا محض زبانی ہے یا واقعتاً ہم اس سے ڈرتے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ ہم یوں ہی بخشش طلب کررہے ہیں اس سے یا اس کے ساتھ ہم نے اصلاحِ اعمال کا ارادہ بھی کیا ہے۔ جب اس نے جان لیا اور ہمیں اپنی رحمت کا حق دار قرار دے دیا تو وہ ہمارے لئے اپنی طرف آنے کا راستہ بنائے گا۔ یہاں اس نے ہمیں بتایا کہ وہ بڑی حکمت والا ہے۔''

''راستہ بنانے کا کیا مطلب آغا جی! راستہ تو موجود ہے پہلے سے۔''

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا۔

''مولوی صاحب نے ایک بار کہا تھا کہ دنیا میں جتنے انسان ہیں، اللہ

تک پہنچنے کے اتنے ہی راستے ہیں۔''

''راستہ تو ایک ہی ہے آغا جی..... ! صراطِ مستقیم!'' ارجمند نے عاجزی سے کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آگے، بہت آگے جا کر وہ راستے آپس میں جا ملتے ہیں۔''

''لیکن ہر شخص کا اللہ تک پہنچنے کا راستہ الگ ہے، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔''

''یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اور اس وقت میں نے مولوی صاحب سے پوچھا نہیں، جب اس طرح کی گفتگو ہو رہی ہوتی ہے تو بات سے بات نکلتی ہے، اور باتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں، اور وقت کم۔ یوں ذہن منتشر بھی ہو جاتا ہے۔''

''تو اب اس پر سوچیں۔''

عبدالحق کچھ دیر سوچتا رہا، پھر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''شاید میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔'' اس کے لہجے میں یقین کی کمی تھی۔

''مولوی صاحب نے سورۂ زخرف کی ایک آیت کا حوالہ دیا تھا، جس کے مطابق اللہ نے دنیا میں روزی تقسیم کی ہے، اور بعض لوگوں کو بعض لوگوں پر فوقیت عطا فرمائی ہے۔ کوئی کسان ہے، کوئی بادشاہ، ہر شخص کو اپنا کام کرنا ہے۔ یہ اللہ کا نظام ہے..... ارے..... ہاں، بات سمجھ میں آرہی ہے۔'' اس کے لہجے سے ہیجان جھلکنے لگا۔

''ٹھیک تو ہے، روزی کیا ہے..... متاعِ حیات، دنیا کی زندگی کا زادِ راہ۔ ہر آدمی کو اپنی زندگی بھی گزارنی ہے، اور نیک اعمال بھی کمانے ہیں، اللہ نے سب انسانوں کو ایک جیسا نہیں بنایا۔ ہر طرح کی تفریق موجود ہے انسانوں میں۔ امیر غریب، گورا کالا، خادم اور آقا، آجر اور اجیر، اور اللہ اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔ اس کی کم سے کم رحمت انصاف ہے۔''

''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔''

''میں تو خود سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری سنو، شاید تمہاری سمجھ میں مجھ سے زیادہ آ جائے۔ روشنی تو بس اللہ دیتا ہے۔'' عبدالحق نے عاجزی سے کہا۔

''قیامت کے دن کوئی بندہ اللہ سے یہ شکایت نہیں کر سکے گا کہ اے اللہ! مجھے نیکی کرنے کے اتنے مواقع نہیں ملے، جو دوسروں کو ملے تھے۔ ہر نیکی کا کوئی طے شدہ وزن نہیں ہے۔ وہ نیکی کرنے والے کی حیثیت کے مطابق اللہ طے کرتا ہے، جو سب کچھ جاننے والا ہے، ذرا سوچو تو کوئی غریب صرف چونّی سے اپنے سے زیادہ کسی غریب کی مدد کرے تو ہمیں تو وہ حقیر ہی لگے گی۔ ہمیں امیر کے دیئے ہوئے سو روپے بہت بڑے لگیں گے نا! لیکن اللہ کے ہاں وہ چونّی سو روپے سے بہت بھاری ہوگی کہ اس غریب کے پاس وہی ایک چونّی تھی، جو اس نے اپنے سے زیادہ ضرورت مند کو دے دی۔ امیر کے پاس لاکھوں روپے تھے، جس میں سے اس نے سو روپے دیئے۔''

''جی.....! میں سمجھ گئی۔''

''اور جس کے پاس دینے کے لئے کچھ بھی نہیں، اس نے اپنے پریشان حال بھائی کو ایک حوصلہ افزاء مسکراہٹ سے، دلاسے اور تسلی سے نوازا، اس کی غم گساری کی، اس کے لئے دعا کی تو وہ بھی بہت بڑی نیکی ہوگی اللہ کے ہاں۔''

''بات ربّ کی طرف جانے والے راستوں کی ہو رہی ہے آغا جی!'' ارجمند نے یاد دلایا۔

عبدالحق کھسیا گیا۔

''دیکھ لو، بات سے بات نکلتی ہے تو اصل بات پیچھے رہ جاتی ہے۔ بات ربّ کی طرف جانے والے راستوں کی ہو رہی تھی۔ مولوی صاحب نے کہا تھا، جتنے انسان اتنے ہی راستے۔ میں نے سنا اور توجہ نہیں دی۔ غور ہی نہیں کیا۔ اب سوچا تو اللہ کی رحمت سے کچھ کچھ سمجھ میں آیا ہے۔ تمام راستوں کا آغاز تو ایمان سے ہے۔ اس کے بعد زندگی میں جس شخص کا جو مقام، حیثیت اور مرتبہ ہے، اسی کے اعتبار سے اس کا راستہ ہوگا، جو آگے جا کر دوسرے تمام راستوں سے مل جائے گا۔ ہمارا تمام تاثر یہ ہے کہ صرف علم دین ہی آدمی کو اللہ تک پہنچاتا ہے۔

لیکن اللہ نے خود بتایا کہ اس نے ہر شخص کو الگ طرح کی متاعِ حیات عطا فرمائی.....یعنی روزی۔ اور حیثیت اور مرتبے بھی مختلف بنائے۔ اس لئے ہر شخص کا اللہ تک پہنچنے کا ایک اپنا ہی راستہ ہے۔ اسے اس راستے کو کھوجنا ہے اور اس پر آگے بڑھنا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے ربّ تک پہنچ جائے۔

اب اللہ نے یہ بھی بتا دیا کہ تم وہ راستہ نہیں کھوج سکتے۔ بغیر اس کی مرضی اور خوشنودی کے۔ اور اپنی خوشنودی حاصل کرنے کا راستہ اس نے دکھا دیا۔ قرآن پڑھو کہ وہ نصیحت ہے۔ پڑھو گے تو سبق حاصل کرو گے۔ اللہ کو، خود کو اور زندگی کو سمجھو گے۔ سمجھو گے تو ڈرو گے اور اللہ سے بخشش طلب کرو گے۔ وہ خوش ہوگا تو تمہیں نہ صرف راستہ دکھائے گا، بلکہ راستے کو تمہارے لئے آسان بھی فرما دے گا۔''

''مگر جتنے انسان اتنے راستے.....؟''

''میں اب اسی طرف آ رہا تھا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اللہ نے لوگوں کے درمیان معیشت تقسیم کی۔ ایک مکمل اور مربوط نظام قائم فرمایا۔ اسی کی وجہ سے ہر شخص کا راستہ الگ ہے۔ کوئی عالم ہے، کوئی ڈاکٹر، کوئی انجینئر، کوئی افسر، کوئی خدمتگار، کوئی زمین دار، کوئی کسان، کوئی مزدور، کوئی صنعت کار۔ کسی کو ظاہری طور پر زیادہ آسانیاں میسر ہیں، اور کسی کو کم۔ اب ایمان لانے کے بعد اللہ کے کچھ حقوق تو سب پر مشترک ہیں، اور ان کو ادا کرنے میں کسی کی حیثیت مانع نہیں۔ پانچ وقت کی نماز پڑھنی ہے، صاحب حیثیت ہو تو زکوٰۃ ادا کرنی ہے، اور ماہِ رمضان کے روزے رکھنے ہیں۔ اس کا ہر ایک کو اپنے عمل کے خلوص کے لحاظ سے اجر ملے گا۔ جس غریب کو سحری میسر نہیں تھی، اور اس نے صرف پانی پی کر روزہ رکھا، اور پھر افطار کے وقت بھی صرف دو کھجوریں میسر آئیں۔ اس نے افطار کیا، اللہ کا شکر ادا کیا اور سحری کے آسرے کے بغیر اگلے روز کا قصد کیا، تو اس کے روزے کا اجر تو میرے روزے سے کہیں زیادہ ہوگا نا! پھر اللہ نے اکلِ حلال کو عبادت کا درجہ دیا۔ یعنی جو کام بھی آدمی کرے، خلوص اور دیانت کے ساتھ احسن ترین طریقے سے کرنے کی کوشش

کرے۔ پھر حقوق العباد اور حسن اخلاق کے بارے میں بتایا۔ لوگوں کی خدمت کو عین عبادت قرار دیا۔

''تو اب راستے تو الگ الگ ہو گئے نا! دولت مند کا اپنا راستہ ہے۔ وہ اللہ سے ڈرے اور بخشش طلب کرے تو اللہ اسے راستہ دکھائے گا۔ وہ سمجھ لے گا کہ دولت اس کی ملکیت نہیں، اللہ کی عطا ہے، اور اسے اس دولت سے اللہ کو خوش کرنا ہے، وہ صدقہ خیرات کرے گا، لوگوں کی مدد کرے گا، ضرورت مندوں کے کام آئے گا، یتیموں پر مہربانی کرنے گا، بھوکوں کو کھانا کھلائے گا، مال دے کر لوگوں کی گردنیں چھڑائے گا، اور دکھاوے کے لئے نہیں، بلکہ خالصتاً اللہ کو خوش کرنے کے لئے۔ پھر اس کا راستہ ربّ سے ملانے والی شاہراہ یعنی صراطِ مستقیم سے جا ملے گا۔ غریب اپنے راستے کو صبر، شکر، قناعت اور ایثار جیسے اوصاف سے سجائے گا، ڈاکٹر اپنے فرض سے بھی آگے جا کر بیماروں کی خدمت اور دل جوئی کرے گا۔ تو ہر شخص کا راستہ الگ ہے نا، اور وہ خود سے اس راستے کو نہیں پا سکتا۔ وہ اللہ سے ڈرے گا اور بخشش طلب کرے گا تو اللہ اس کے لئے راستہ بنائے گا۔ اور جب تک وہ اللہ کو، اس کی صفات اور قدرتِ کاملہ کو نہیں سمجھے گا تو نہ اللہ سے ڈرے گا اور نہ بخشش طلب کرے گا۔ اور اللہ کو، اس کی صفات اور قدرتِ کاملہ کو وہ اس وقت تک نہیں سمجھ سکے گا، جب تک وہ اللہ سے روشنی اور راہنمائی طلب کرتے ہوئے قرآن نہیں پڑھے گا، اس پر غور نہیں کرے گا۔''

''میں سمجھ گئی آغا جی!'' ارجمند نے خوش ہو کر کہا۔

''اللہ کا شکر ہے، اس نے ہمیں روشنی عطا فرمائی۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔ بہت دیر سے وہ خود کو بہت بوجھل بوجھل محسوس کر رہا تھا۔ پھر اسے کچھ خیال آیا۔

''بات سورۂ نجم کی آیت مبارکہ سے شروع ہوئی تھی۔ اس کے حوالے سے اللہ نے اپنی رحمت سے ہمیں سمجھایا کہ قرآن ہمیں اللہ کی صفات اور قدرتِ کاملہ کا شعور عطا کرتا ہے، جس سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔''

''یعنی اتنا کافی نہیں کہ ایمان لائے اور مطمئن ہو گئے۔ ایمان کو تازہ

اور مستحکم کرتے رہنا بھی ضروری ہے۔''

''بالکل ..... اور اللہ نے ہمیں یہ بھی سمجھایا کہ دُعا بندگی کا اعلیٰ تر درجہ ہے۔ وہ اللہ کی صفات اور قدرتِ کاملہ کے اس شعور کو جو قرآن نے ہمیں عطا کیا، پختہ اور مستحکم کرتی ہے، اور ایمان بڑھاتی ہے۔''

''اور یہ کہ دعا قبوت نہ ہونے پر ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے۔'' ارجمند نے کہا۔

''اور اللہ نے ہمیں یہ بھی سمجھایا کہ ہم جو کچھ چاہتے اور مانگتے ہیں، وہ سب کچھ دیا نہیں جا سکتا۔ اور جب قادرِ مطلق یہ فرمائے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم بہت کچھ ایسا مانگتے ہیں..... اپنی بے علمی اور بے خبری کی وجہ سے..... جو ہمارے حق میں، یا دوسروں کے حق میں یا دنیا کے نظام کے لئے بہتر نہیں۔ مختصراً یہ کہ وہ مشیت کے خلاف ہے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ ہمیں نہیں دیا جا سکتا۔''

''مشیت کا کیا مطلب ہے آغا جی.....؟''

''اللہ کی مرضی، جو حرفِ آخر ہے۔''

''اس کے بعد تو مجھے دعا سے بھی ڈر لگنے لگا ہے۔'' ارجمند سہم گئی تھی، جیسے اندر ہی اندر لرز رہی ہو۔

''لیکن دعا تو بہت ضروری ہے۔ وہ بندگی ہے۔ ایمان کو مستحکم کرتی ہے۔ بس یہ ہے کہ لفظوں میں دعا ذمہ داری کے ساتھ کی جائے۔ ورنہ ہمیں نقصان بھی ہو سکتا ہے۔''

''کیسے.....؟''

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ کوئی مثال ہی نہیں سوجھ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

''تم میرے لئے اولاد کی دعا کرتی ہو نا! اب اگر اللہ قبول کر لے اور خدانخواستہ مجھے ایسا بیٹا دے، جو نابینا ہو، یا اس کے ساتھ کوئی اور محرومی ہو، یا یہ کہ وہ صالح نہ ہو تو میرا نقصان ہوگا نا!''

''آپ تو مجھے اور ڈرا رہے ہیں دعا سے۔'' ارجمند کی آواز لرزنے لگی۔

''ڈرنے کی ضرورت نہیں، مجھے مولوی صاحب نے اس مسئلے کا حل بتایا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہر دعا کے ساتھ ''بالخیر'' کا اضافہ کر لیا کروں۔ اگر اس میں شر ہوگا تو اللہ یا تو اس کا شر دور فرما دے گا یا پھر وہ دعا قبول ہی نہیں کرے گا۔ تو ظاہر ہے کہ اس دعا کے قبول نہ ہونے میں بہتری ہی ہوگی۔ دعا جیسی نعمت سے کیوں محروم ہو آدمی۔''

ارجمند خوش ہوگئی۔

''واہ......! یہ بات تو دل کو لگتی ہے۔ اور کتنی آسان ہے۔''

''مولوی صاحب اللہ والے ہیں، اور قرآن سے محبت کرتے ہیں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''تو یہ تو ہوئی دعا کی بات۔ ایک بات میں یہ سمجھا کہ اللہ کے سوا کوئی دینے والا نہیں۔ سو اللہ کے سوا کسی سے کچھ نہیں مانگنا چاہئے۔''

''لیکن آغا جی! یہ دنیا تو اسباب کا نظام ہے۔ اب اللہ میاں مجھے کاپی تو نہیں دیں گے۔'' ارجمند نے معصومیت سے کہا۔ پھر خود ہی ڈر گئی اور رخسار پیٹتے ہوئے توبہ توبہ کرنے لگی۔

''نہیں سمجھیں تم!'' عبدالحق نے کہا۔

''فرض کرو، تمہیں کوئی ضرورت ہے۔ تم نے اپنی آپی سے کہا، انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر مجھ سے کہا، میں نے بھی انکار کر دیا۔ اب وہ چیز بہت ضروری ہے تمہارے لئے، تو تم کیا کرو گی؟''

ارجمند چند لمحے سوچتی رہی، پھر بولی۔

''میں دادی اماں سے کہوں گی۔''

عبدالحق مسکرایا۔

''بالکل ٹھیک! اس لئے کہ اماں کے پاس اس گھر کا اقتدار ہے۔ ان کا حکم نہیں ٹلے گا۔ میں اور نور بانو چاہیں یا نہ چاہیں، ہمیں تمہاری ضرورت پوری کرنی پڑے گی۔ تب تم یہ نہیں سوچو گی کہ اس سے تو اچھا تھا، تم پہلے ہی اماں سے کہہ دیتیں۔''

''لازمی بات ہے، میں یہی سوچوں گی۔''

''تو اللہ کے پاس تو بلاشرکت پوری کائنات کا اقتدار ہے، تو آدمی کو ہر ضرورت کے لئے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلانا چاہئے۔ تم نے میرے اور نور بانو کے انکار کے بعد اماں سے کہا تو اماں نے خود تو تمہاری ضرورت پوری نہیں کی نا! ہمیں حکم دیا اور تمہارا کام ہوگیا۔ تو اللہ تو قدرت والا ہے۔ وہ تمہارے دل میں ڈالے گا کہ میرے بجائے تم اماں سے بات کرو، بلکہ وہ چاہے گا تو میرے دل میں ڈالے گا، اور میں خود ہی وہ چیز تمہیں لا کر دے دوں گا۔ تمہیں کسی سے مانگنے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔''

''جی آغا جی! میں سمجھ گئی۔'' نور بانو نے خوش ہو کر کہا۔

''اور مکھی والی آیت سے بھی میں نے ایک بات سیکھ لی۔'' عبدالحق نے کہا۔

''کوئی ہم سے زیادہ طاقت ور ہمیں ستاتا ہے تو ہم کسی ایسے کو تلاش کرتے ہیں جو اس سے بھی زیادہ طاقت ور ہو، یا کم از کم اس کا ہم پلّہ تو ہو۔ تو ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ سب سے زبردست اور طاقت ور ہے۔ ہم کتنے ہی طاقت ور لوگوں کو جمع کر لیں تو مکھی کا اٹھایا ہوا ایک ذرّہ بھی اس سے نہیں چھڑا سکتے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ظاہری طور پر طاقت ور نظر آنے والے بھی درحقیقت کمزور ہیں۔ حقیقی طاقت تو بس اللہ کی ہے۔ تو وہ دعا والی سہولت یہاں بھی کام آئے گی۔ انفرادی طور پر ہو یا قومی سطح پر، ہمیں اللہ سے مدد مانگنی ہوگی۔ وہی بچانے والا اور حفاظت فرمانے والا ہے۔ اس نے صاف اور واضح طور پر ہمیں بتا دیا کہ مدد مانگنے والے بھی کمزور ہیں اور وہ بھی جن سے مدد مانگی جاتی ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ہر چیز کے لئے اور ہر مسئلے کے لئے صرف اللہ سے رجوع کرنا چاہئے۔ جو کچھ ہماری دسترس میں، ہمارے قبضے میں ہے، وہ بھی اللہ کی مرضی اور حکم کے بغیر ہمارے تصرف میں نہیں آتا۔''

''لیکن آغا جی! بات تو پھر ایمان پر آ رکی۔'' ارجمند نے کہا۔

''اللہ کی صفات پر تو راسخ یقین ہو۔''

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔ صرف زبانی ایمان سے کام نہیں چلتا۔ اب مجھے لگتا ہے کہ ایمان تو ایک طویل اور مشکل سفر کا آغاز ہے، جو اللہ کی تائید کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اتنا کافی نہیں کہ زبان سے، دل سے ایمان لے آئے۔ زندگی پر، تمام معاملات پر، وہ چھوٹے ہوں یا بڑے ہوں، ہمارے ہر فعل اور ہر عمل پر ایمان کی حکومت ہونی چاہئے۔ زندگی کا اصل مقصد یہی ہے۔ جبکہ ہم دنیا میں الجھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔"

"میں یہ بات یاد رکھوں گی، اللہ سے مدد کی دعا کروں گی۔ اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتی رہوں گی۔"

"مجھے بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔"

"آپ مجھے ہمیشہ یاد رہتے ہیں آغا جی!" ارجمند نے بے ساختہ کہا۔ پھر جلدی سے اضافہ کیا۔

"سب سے زیادہ تو میں آپ کے لئے دعا کرتی ہوں۔"

"جزاک اللہ!" عبدالحق نے کہا اور گھڑی میں وقت دیکھا۔

"ارے......! اتنی دیر ہوگئی۔ اور پڑھائی تو ہوئی ہی نہیں۔"

"جو کچھ آج حاصل ہوا ہے، وہ پڑھائی سے بہت بڑھ کر ہے۔"

"اچھا......! اب جا کر سو جاؤ۔"

✿ ✿ ✿

عبدالحق بستر پر لیٹا تو نیند سے بے حال تھا۔ لیکن کھانے والی بات دل میں اٹکی ہوئی تھی۔ اس نے بے حد سرسری انداز میں نور بانو سے پوچھا۔

"آج کھانا تم نے پکایا تھا؟"

"روز میں ہی پکاتی ہوں۔"

"میں دوپہر کے کھانے کی بات کر رہا ہوں۔"

نور بانو چوکنا ہوگئی۔ یہ بات وہ بلاوجہ تو نہیں پوچھ رہا ہوگا۔ لیکن وہ یہ تاثر نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ سوچ رہی ہے۔ سوچنے کی مہلت حاصل کرنے کے لئے اس نے بات آگے بڑھائی۔

"دوپہر کے کھانے کو کیا ہوگیا؟"

"میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ آج جو کھانا مجھے دفتر بھیجا گیا، کیا وہ تم نے پکایا تھا؟"

"کیوں پوچھ رہے ہیں آپ!"

"تمہارا پکایا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔"

نور بانو نے سمجھ لیا کہ حکمت سے کام لینا ہوگا۔ کوئی بات ضرور ہے۔ ارجمند سے کوئی گڑبڑ ہوگئی ہوگی۔

"واہ بھئی......! آپ تو خوب پہچانتے ہیں۔" اس نے خوشی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"کمال کر دیا آپ نے۔"

"کیا مطلب......؟"

"خوب پہچانا آپ نے۔ آج میں اٹھ نہیں سکی تھی۔ کھانا ارجی نے پکایا تھا" نور بانو نے کہا۔

"کیا بہت فرق تھا ذائقے میں؟"

"نہیں......!" عبدالحق نے بے پرواہی سے کہا۔ پھر بولا۔

"ایسا کم ہی ہوتا ہوگا؟"

نور بانو نے محتاط لہجے میں کہا۔

"کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ پھر آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ارجی کو کھانا پکانے کا کتنا شوق ہے۔"

"ہاں......! میں جانتا ہوں۔ اور وہ پکاتی بھی اچھا ہے۔"

"کبھی میں نہ اٹھ پاؤں تو وہ کھانا پکا کے آپ کو بھجواتی ہے۔ بہت ذمہ دار ہے۔"

نور بانو کی بات معقول لگ رہی تھی۔ لیکن یعقوب کا کہنا تھا کہ اسے کھانا ہمیشہ ارجمند ہی دیتی ہے، اور پہلی بار بھی کھانا اس نے ہی دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ پوچھے تو بتائے کہ کھانا نور بانو نے بھجوایا ہے۔ یہی نہیں، یعقوب نے تو یہ

بھی کہا تھا کہ جب وہ کھانا لے کر آتا ہے تو نوربانو سو رہی ہوتی ہے۔

وہ اتنی اہم بات نہیں تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں عبدالحق کو بہت اہم لگ رہی تھی۔ اسے خیال آیا کہ ارجمند نے کہا تھا کہ اس کی پکانے کی مشق ناشتے تک محدود ہے۔ وہ مزید کریدتا، لیکن بات کہیں کی کہیں نکل گئی تھی۔

تو نوربانو کی بات معقول تھی۔ لیکن اس کے دل کو نہیں لگ رہی تھی۔

نوربانو بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیا سوچ رہے ہیں آپ؟''

عبدالحق نیند سے بے حال ہو رہا تھا۔ لیکن اچانک اسے خیال آ گیا۔

''ارے ہاں......! وہ فائل نکال کر باہر رکھ دینا۔ آج میں لے جانا بھول گیا تھا۔ کل لے جانا بہت ضروری ہے۔''

''تو جاتے ہوئے لے لیجئے گا۔''

''تم سو رہی ہوتی ہو۔'' عبدالحق نے سادگی سے کہا۔

''صبح میں نے تلاش کی، مگر مجھے نہیں ملی۔ تم ابھی نکال کر رکھ دو۔''

نوربانو اٹھی۔ اس نے الماری کے سیف سے فائل نکال کر مسہری کے سرہانے رکھ دی۔

عبدالحق سو گیا۔ مگر نوربانو عادت کے مطابق جاگ رہی تھی۔ وہ اسی مسئلے پر سوچ رہی تھی۔ بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ سب کچھ فائل ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ عبدالحق صبح فائل نہیں لے جا سکا ہوگا۔ اس نے یعقوب سے کہا ہوگا کہ کھانے کے ساتھ فائل بھی لے آئے۔ اب سوال یہ تھا کہ یعقوب نے کیا کچھ کہا ہوگا؟ کیا یہ کہ کھانا ہر روز ارجمند دیتی ہے؟ یہ بھی کہ وہ دوپہر تک سوتی رہتی ہے؟

وہ پریشان ہوگئی۔ لیکن یہ اطمینان ہوگیا کہ یعقوب نے اس کے سونے کے متعلق نہیں بتایا ہوگا۔ اسے کیا معلوم! وہ گھر کے اندر تو آتا نہیں ہے۔ مگر یہ تو ضرور بتایا ہوگا کہ کھانا ہر روز ارجمند ہی دیتی ہے۔

اور اس نے کس کس طرح بات بنائی۔ اب اگر اس کا جھوٹ کھل جائے

تو......؟ یہ پریشانی بہت بڑی تھی۔

اس پر سوچتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ ایسا ہونے کا امکان بہت کم ہے۔ نوکروں سے عبدالحق کبھی گھر کی بات نہیں کرتا ہے اور ارجمند بتانے والی نہیں ہے۔

وہ کچھ مطمئن ہوگئی۔ اس نے سوچا، کل یعقوب سے ضرور پوچھنا ہوگا۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ کل وہ جلدی اٹھے، کھانا پکائے اور خود یعقوب کو دے، اور اس سے تفتیش بھی کر لے۔ لیکن نہیں، کھانا تو وہ ارجمند سے ہی بھجوائے۔ معمول میں فرق نہیں آنا چاہئے۔ یوں وہ کہہ سکتی ہے کہ کھانا وہ پکاتی ہے، اور یعقوب کو ارجمند ٹفن پہنچاتی ہے۔

وہ پوری طرح مطمئن ہوگئی۔ لیکن نیند اسے پھر بھی نہیں آئی۔ بری عادتیں آسانی سے پیچھا کہاں چھوڑتی ہیں۔

✿ ✿ ✿

اس رات ارجمند کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔

وہ بہت خوش تھی۔ ویسے تو یہاں آنے کے بعد وہ خوش ہی رہی تھی۔ لیکن اتنی خوشی اسے پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔ آج عبدالحق کے ساتھ جو وقت اس نے گزارا تھا، وہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ اس نے عبدالحق سے کتنا کچھ سیکھا اور سمجھا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ پہلی بار عبدالحق نے اسے اہمیت دی تھی۔ بلکہ اس کے انداز میں ایسا احترام تھا، جیسے وہ بڑی...... بہت بڑی ہوگئی ہو۔

اب سے کافی پہلے اس نے عبدالحق کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا...... نہیں، سوچنا تو وہ نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ لیکن اس کے بارے میں پہلے والے انداز میں اب وہ نہیں سوچتی تھی۔ اور اس کے لئے اس نے بہت کوشش کی تھی۔ اس کوشش میں کامیاب ہونا آسان نہیں تھا۔ لیکن دو بہت بڑے جواز اسے میسر آ گئے تھے، جنہوں نے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔ ان میں ایک تو نوربانو تھی، جس کے روپ میں اسے بہت شفیق اور محبت کرنے والی بہن مل گئی تھی۔

بے شک وہ عبدالحق سے بہت پہلے سے محبت کرتی تھی، اس وقت جب

شاید اس نے صحیح معنوں میں ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا اور اس کا ایمان تھا کہ وہ محبت اللہ نے اس کے دل میں ڈالی ہے۔ نشانیاں بھی یہی بتاتی تھیں۔ اللہ میاں کہتے تھے کہ وہ اسے ضرور ملے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اور جس طرح وہ اسے ملا، وہ معجزہ ہی تھا۔ اللہ ہی نے تو اسے اس کے گھر پہنچایا۔ ورنہ تو یہ ممکن ہی نظر نہیں آتا تھا۔

وہ محبت اس کے لئے کبھی باعث شرم نہیں تھی۔ بلکہ وہ تو محترم تھی۔ اللہ کی دی ہوئی ہر چیز محترم ہی ہوتی ہے۔ اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ عطا کے ساتھ آزمائش بھی ہوتی ہے۔ اگر نور بانو اس پر مہربان نہ ہوتی، اس سے محبت نہ کرتی تو وہ پہلے ہی کی طرح عبدالحق سے محبت کرتی رہتی۔ لیکن نور بانو نے صورتِ حال بدل دی۔ اور غیر معمولی بات یہ تھی کہ سوائے اس کے نور بانو ہر ایک کے لئے سخت اور تنگ دل تھی۔ لیکن اس کی خاطر نور بانو کچھ بھی کر سکتی تھی۔ تو پھر اس کی بھی تو کچھ ذمہ داری تھی۔

تو اب وہ محبت کرنے والی بہن کے شوہر سے کیسے محبت کر سکتی تھی۔ یہ الگ بات کہ وہ محبت پر مجبور تھی۔ تو اسے محبت کے آداب سیکھنے پڑے، محبت کو دبانا، خود سے بھی چھپانا سیکھنا پڑا۔ اس نے عبدالحق کے بارے میں اس طرح سے سوچنا چھوڑ دیا۔ اللہ میاں کہتے تھے، وقت آنے پر وہ اسے ملے گا..... ضرور ملے گا۔ مگر اب وہ اس کے ملنے سے ڈرنے لگی تھی۔ وہ سوچتی، کیا خدانخواستہ......؟ اور اس سے آگے اس نے سوچا بھی نہیں جاتا۔ وہ باقاعدگی سے نور بانو کے لئے درازیٔ عمر کی دعا کرتی۔ نور بانو سے محرومی، دائمی جدائی کے نتیجے میں ملنے والی محبت اسے گوارا نہیں تھی۔ یہ بات اس نے اللہ میاں سے بھی کہہ دی تھی۔ مگر جواب نہیں ملا تھا۔ اور ملنے کی کوئی اور صورت اسے نظر نہیں آ سکتی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ اس محبت کو ترک کر دیتی۔

اب اسے پتا چل رہا تھا کہ محبت کتنی طاقت ور ہوتی ہے۔ وہ عبدالحق کی قربت سے بچنا چاہتی تھی۔ اب اسے عبدالحق سے پڑھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ تھکے ہارے عبدالحق کو اس غیر ضروری زحمت

سے بچا لے۔ لیکن دل مانتا نہیں تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ اپنی محبت کی تہذیب کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ سرسری انداز میں دیکھ لینا اور بات، وہ ارادے سے کبھی اسے نظر اٹھا کر دیکھتی بھی نہیں تھی۔ محبت سے دیکھنا تو بہت دور کی بات ہے۔

اور آج اسی قربت کی وجہ سے اسے کتنا کچھ ملا تھا۔ کتنی نئی باتیں اس کی سمجھ میں آئی تھیں۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ عبدالحق غیر معمولی آدمی ہے، اس پر اللہ کی عنایت ہے۔ اس احساس نے اس کی محبت اور بڑھا دی۔

جب سے عبدالحق کے تبادلے کا امکان سامنے آیا تھا، وہ یہ سوچتی تھی کہ اس کا تبادلہ ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ یہ آزمائش اسے بہت کڑی اور بڑی لگتی تھی کہ وہ سامنے ہو اور وہ خواہش کے باوجود اسے نہ دیکھ سکے۔ نظر اٹھنے کو بے تاب ہو، اور وہ اسے روکے بیٹھی رہے۔ وہ اس کے بارے میں سوچے بھی نہیں کہ سوچے گی تو اس میں محبت ضرور شامل ہوگی۔ وہ سوچتی تھی، اس سے تو اچھا ہے کہ وہ دور چلا جائے۔ نہ وہ ہوگا، نہ وہ نظروں پر قابو رکھنے کی جدوجہد ہوگی، جو اسے اندر ہی اندر گھلاتی ہے، کمزور کرتی ہے۔ وہ سامنے نہیں ہوگا تو اس کے بارے میں سوچنا بھی آزمائش نہیں بنے گا۔ وہ اسے بھول جائے گی اور اپنی پڑھائی میں گم ہو جائے گی۔

اسے اپنی عمر کا کبھی خیال نہیں آتا تھا۔ اس محبت نے پہلے اسے بڑا بنا دیا تھا۔ رازدار اس کا کوئی تھا نہیں، جو اسے یہ احساس دلاتا کہ اتنی کم عمری میں اس پر وہ بوجھ ڈال دیا گیا ہے، جو بڑے پختہ کار اور عالی ظرف لوگوں کو بھی ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ ایسا ہوتا تو وہ یقیناً خود ترسی کا شکار ہو جاتی۔ وہ تو عالم بے خبری میں یہ بوجھ اٹھائے بیٹھی تھی۔

مگر اس رات عبدالحق سے اس تبادلہ خیال نے اس کی سوچ بدل دی۔ عبدالحق کی قربت اس کے لئے اہمیت اختیار کر گئی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ قرآن کے بارے میں عبدالحق سے بات کرنا اور اس کی باتیں سننا بہت بڑی نعمت ہے۔ زندگی کا مفہوم اور مقصد سمجھ میں آنے لگا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ

کہ اس گفتگو کے دوران نگاہوں اور سوچوں پر قابو رکھنا مسئلہ نہیں رہا تھا۔ پہلی بار اس کے رو بہ رو اس نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔

ہاں، ایک بات وہ اسے نہیں بتا سکی تھی، بتا بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ سورۂ نجم کی اس آیت مبارکہ...... اَمْ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی...... کو اس نے اس کی محبت کے حوالے سے سمجھا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس کے لئے وہ چاند ہے، جس کو دیکھا جا سکتا ہے، جس کی آرزو کی جا سکتی ہے، لیکن اس کے حصول کی دعا نہیں کی جا سکتی۔

بستر پر لیٹ کر اس نے سوچا، اب میں بالکل نہیں چاہتی کہ آغا جی کا کسی دوسرے شہر میں تبادلہ ہو۔

✿ ✿ ✿

کھانے کے بارے میں الجھن عبدالحق کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اس نے اسے غیر اہم قرار دے کر ذہن سے جھٹکنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ مشکل یہ تھی کہ اس الجھن کے سلجھنے کی کوئی تدبیر بھی نہیں سوجھ رہی تھی۔

ناشتے سے پہلے وہ حمیدہ کے ساتھ بیٹھا تھا، اور اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔ نوکروں کو وہ گھریلو معاملات میں بھی ملوث کرنے کا قائل نہیں تھا، جبکہ یہ تو ذاتی معاملہ تھا۔ وہ تو اس پر بھی خود سے شرمندہ تھا کہ نادانستگی میں اس نے یعقوب کو اس معاملے میں ملوث کر دیا ہے۔ اگرچہ اس میں نہ اس کے ارادے کا کوئی دخل تھا، نہ ہی اس کا کوئی قصور تھا۔

اس کے جی میں آئی کہ حمیدہ سے یہ بات پوچھ لے۔ لیکن یہ بھی اسے اچھا نہیں لگا۔ اصل میں تو اسے اپنا تجسس بھی برا لگ رہا تھا۔ لیکن وہ اس کے لئے بے چین کر دینے والی خلش بن گیا تھا۔

پھر اسے ایک خیال سوجھ گیا۔ اس نے حمیدہ سے کہا۔

''ارجمند کی بھی کچھ فکر کیا کرو اماں!''

حمیدہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیسی فکر پتر!''

''لڑکیوں کو بڑے ہوتے دیر نہیں لگتی۔ اچانک ہی کوئی رشتہ آجائے تو پتا چلتا ہے کہ بچی تو بڑی ہو گئی۔''

''تو فکر کی کیا بات ہے؟ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے تیرے پاس۔'' حمیدہ نے کہا۔

''اب زرینہ کی بھی تو شادی کی تھی نا تو نے۔''

''میرا مطلب یہ نہیں اماں! سینا پرونا، کڑھائی، کھانا پکانا...... یہ سب اسے سکھانا ہوگا۔''

حمیدہ بری طرح بھڑکی۔

''یہ سب کچھ وہ نور بانو سے سیکھتی رہتی ہے۔ اور کھانا تو وہ ایسا پکاتی ہے کہ نور بانو بھی کیا پکائے گی۔''

عبدالحق نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''کمال ہے، مجھے تو پتا بھی نہیں۔''

''تجھ سے زیادہ کسے پتا ہوگا پتر! پر تو تو ہے ہی سدا کا بے خبر۔'' حمیدہ نے جل کر کہا۔

''میں سمجھا نہیں اماں!''

''ہر روز دفتر میں اس کا پکایا ہوا کھانا کھاتا ہے، اور کہتا ہے، مجھے تو پتا ہی نہیں۔''

''تو دفتر ہر روز کھانا ارجمند بھیجتی ہے؟''

''اور کون بھیجے گا؟ تیری بیوی تو پڑی سوتی رہتی ہے دوپہر تک۔ کتنی بار کہا کہ نحوست ہوتی ہے۔''

عبدالحق کو کام کی بات معلوم ہو گئی تھی۔ اس نے جلدی سے موضوع بدلا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو اماں! دیر تک سونا بہت برا ہوتا ہے۔''

''تیری یہ نوکری مجھے بہت بری لگتی ہے۔ پر اس کا ایک فائدہ تو ہوا۔ تو پہلے کی طرح سویرے اٹھنے لگا۔ ورنہ تو تو خود دوپہر تک سوتا رہتا تھا۔''

عبدالحق شرمندگی کے احساس سے شل ہوگیا۔ اس سے کچھ بھی نہیں کہا گیا۔

اس کی شرمندگی محسوس کر کے حمیدہ نے اس اس کی دل جوئی کی۔

''جو ہوا سو ہوا پتر! اب تو تو پہلے جیسا ہوگیا ہے۔''

پہلے جیسا کہاں ہوا ہوں اماں! عبدالحق نے دل میں کہا۔ پھر حمیدہ سے بولا۔

''تم نور بانو کو سمجھاتی رہا کرو اماں!''

''سمجھاتی ہوں، سر پھوڑتی ہوں اپنا۔ وہ کہاں مانتی ہے؟''

اتنی دیر میں ارجمند ناشتہ لے آئی۔ حمیدہ خاموش ہوگئی۔ وہ ناشتہ کرنے لگے۔

الجھن سلجھ گئی تھی۔ عبدالحق ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔

✿ ✿ ✿

نور بانو کی آنکھ کھلی تو گھڑی دیکھ کر وہ دہل گئی۔ اس نے ارادہ کیا تھا کہ جلدی اٹھے گی اور کھانا پکا کر عبدالحق کو بھجوائے گی۔ لیکن لگتا تھا کہ بری عادتیں آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتیں۔

وہ اس قدر جھنجلائی ہوئی تھی کہ اس سے ناشتہ بھی نہیں کیا گیا۔ صرف چائے پی کر اٹھ گئی۔ اسے یاد تھا کہ اسے یعقوب سے بہت ضروری پوچھ گچھ کرنی ہے۔

وہ انتظار کرتی رہی۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ یعقوب واپس آچکا ہوگا تو وہ باہر آئی اور اس کے کوارٹر کی طرف چل دی۔ وہ یعقوب سے علیحدگی میں گفتگو کرنا چاہتی تھی۔

پورچ میں کھڑی گاڑی گواہی دے رہی تھی کہ یعقوب واپس آچکا ہے۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔

یعقوب نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھ کر دہل گیا۔

''میم صاحب آپ؟ کیا حکم ہے میم صاحب؟''

''تم ڈر کیوں گئے مجھے دیکھ کر؟'' نور بانو نے بگڑ کر کہا۔

''نہیں...... ڈرا نہیں میم صاحب! آپ آتی نہیں ہیں نا ایسے، کہیں جانا ہے؟''

''نہیں! کچھ پوچھنا ہے تم سے۔''

''حکم میم صاحب!''

''کل صبح دفتر جاتے ہوئے صاحب نے تم سے کچھ کہا تھا؟''

یعقوب اتنی دیر میں خود کو سنبھال چکا تھا۔ اسے صاحب کی صبح کی بات بھی یاد تھی اور دوپہر کی بھی۔ اسے صاحب کا آرڈر بھی یاد تھا، اور آرڈر کے خلاف وہ کبھی کچھ نہیں کرتا تھا۔ یہ تو انگریزوں نے اسے سکھایا تھا۔

''صاحب اب دفتر میرے ساتھ تو نہیں جاتے ہیں۔'' اس نے معصومیت سے کہا۔ وہ حتی الامکان جھوٹ بولنے سے بچتا تھا۔ یہ بھی اسے انگریزوں نے ہی سکھایا تھا۔

''وہ مجھے بھی معلوم ہے۔'' نور بانو نے بھنا کر کہا۔

''میں پوچھ رہی ہوں، صبح دفتر جاتے ہوئے صاحب نے تم سے کچھ کہا تھا؟''

''وہ ملے ہی نہیں تو کہتے کیا؟''

''جتنا پوچھوں، اتنا جواب دو۔''

یعقوب کو اتنی سخت تفتیش کی امید نہیں تھی۔ اس نے تو یقین سے کہا تھا کہ کوئی کچھ پوچھے گا ہی نہیں۔ وہ اور محتاط ہوگیا۔ صاحب نے سختی سے کہا تھا...... کوئی پوچھے تو بھی نہیں بتانا۔ اٹس این آرڈر!..... نو میم صاحب! صاحب نو ہے......'' اس نے انگریزی جھاڑی۔

نور بانو اس کی انگریزی سے بہت چڑتی تھی۔ لیکن اس وقت بات اتنی اہم تھی کہ اس طرف دھیان ہی نہیں دے سکی۔

''اچھا! جب تم کھانا لے کر گئے تو صاحب نے کچھ پوچھا تم سے؟''

''نو میم صاحب!''

"کسی فائل کے بارے میں کچھ نہیں کہا تم سے؟"

"نو میم صاحب!"

"تم نے صاحب کو کبھی بتایا کہ کھانا تمہیں کون دیتا ہے دفتر لے جانے کے لئے؟"

"ایک بار بتایا تھا میم صاحب!" یعقوب نے بے ضرر سچ بولا۔

"کب......؟"

"جب پہلی بار کھانا لے کر گیا تھا۔"

لیکن نوربانو کی تسلی ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"بعد میں کبھی نہیں بتایا...... کل بھی نہیں بتایا؟"

"نو میم صاحب......!"

"کیوں نہیں بتایا؟"

عجیب مصیبت ہے، یعقوب نے سوچا، لگتا ہے، پولیس نے پکڑ لیا ہے مجھے۔

"نو کوئچسن نو آنسر میم صاحب!"

اس بار نوربانو کو جلال آ گیا۔

"ہزار بار کہا، یہ انگریزی میں گٹ پٹ نہ کیا کر مجھ سے۔"

"میرا مطلب ہے میم صاحب کہ جب کوئی پوچھے گا ہی نہیں تو میں بتاؤں گا کیوں؟"

"ٹھیک ہے! اب کسی کو یہ نہیں بتانا کہ میں نے یہ سب پوچھا تھا تم سے۔"

"نو کوئیس...... میرا مطلب ہے میم صاحب! کوئی پوچھے گا ہی نہیں تو......"

"کوئی پوچھے تو بھی نہیں بتانا۔" نوربانو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ پھر مٹھی میں دبا دس کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ رکھ لو۔"

یعقوب نے سوچا، یہی بات صاحب نے بھی کہی تھی۔

"تھینکس یو میم صاحب!"

"پھر وہی انگریزی؟"

"سوری میم مس!" یعقوب نے جلدی سے اپنے منہ کو دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیا۔

نوربانو اب پوری طرح مطمئن ہو گئی تھی۔

❁❁❁

عبدالحق پہلے تو بظاہر ہلکا ہوا۔ مگر پھر اسے احساس ہوا کہ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ بوجھل ہو گیا ہے۔ جاننے کے مقابلے میں بے خبری کتنی بہتر ہوتی ہے، یہ اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

جو صورتِ حال سامنے تھی، اس میں یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ نوربانو اور ارجمند کے درمیان موازنہ نہ کرتا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ دونوں ایک دوسرے کے برعکس روپ میں سامنے آئی تھیں۔

جو کچھ اس نے سمجھا تھا، اس میں ایک زاویے سے اس کے لئے تاسف تھا اور دوسرے زاویے سے خوشی۔ لیکن افسوس بہت زیادہ بھاری تھا، کیونکہ وہ نوربانو کی وجہ سے تھا، جو اس کی شریک حیات تھی، اس کی اپنی متاع تھی۔ جبکہ خوشی ارجمند سے ملی تھی، جو کسی اور کی متاع ہو گی۔ اسے یاد آیا، اماں ہمیشہ کہتی تھیں، نکی جس گھر میں جائے گی، اسے روشن کر دے گی۔ وہ خوش نصیب ہو گا، جس سے نکی کی شادی ہو گی۔

ایک اور بات تھی۔ نوربانو ایک عورت تھی، اور بیوی بھی۔ اسے ذمہ دار ہونا چاہئے تھا۔ جبکہ ارجمند ابھی بچی ہی تھی۔ ابھی تو اس کے کھیل کود کے، پڑھنے لکھنے کے دن تھے۔ لیکن وہ ذمہ دار ثابت ہوئی تھی۔ بلکہ وہ کہہ سکتا تھا کہ اس میں ایک بڑا پن ہے۔ اور نوربانو کے رویے سے لگتا تھا کہ اس میں بچپنا ہے، بلکہ چھوٹا پن ہے۔

وہ جانتا تھا کہ ان دونوں میں باہم بڑی محبت ہے، اگرچہ شخصیت اور

اپنے رویوں کے اعتبار سے وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ارجمند کو تو لگتا تھا کہ اللہ نے محبت کی مٹی سے بنایا ہے۔ وہ تو سبھی سے محبت کرتی تھی۔ لیکن نوربانو کا کسی سے یوں محبت کرنا غیر معمولی بات تھی۔

عبدالحق کی نوربانو سے محبت غیر اختیاری تھی۔ وہ تو بغیر دیکھے ہی اس کی محبت میں گرفتار ہوا تھا۔ اور محبت اس کے لئے بہت بڑی چیز تھی، اس لئے اس نے آنکھیں بند کر کے اسے قبول نہیں کیا تھا۔ اس نے بارہا اس پر شک کیا تھا، لیکن ہر بار اس پر یہی ثابت ہوا تھا کہ وہ محبت سچی ہے اور اللہ کی دی ہوئی ہے۔ اور اس نے کبھی خود کو نوربانو کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے مقابلے میں احساسِ کم تری میں مبتلا رہا۔ شاید اس بنیاد پر کہ وہ ایمان والوں میں پیدا ہوئی تھی، اور وہ مشرکوں میں، قرآن سے تو وہ واقف ہی اس کے ذریعے ہوا تھا۔ بلکہ وہ تو ایمان تک بھی اسی سیڑھی کے ذریعے پہنچا تھا۔ اس لحاظ سے وہ اس کے لئے بہت محترم تھی۔

عبدالحق محبت کی عظمت کا قائل تھا، اس لئے وہ اندھی محبت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ خامیاں اور کمزوریاں ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ اس نے نوربانو کی کمزوریوں کو سمجھنے کی کوشش کی تھی، اور شعوری طور پر اس نے اسے اس کی کمزوریوں سمیت قبول کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ حاسد ہے، تنگ دل اور تنگ نظر ہے۔ محبت کے معاملے میں بہت شکی بھی ہے۔ قابضانہ فطرت کی مالک بھی ہے۔ یہ سب کچھ شادی سے پہلے حمیدہ نے اسے بتایا اور سمجھایا بھی تھا۔ لیکن وہ پوری سچائی کے ساتھ سمجھتا تھا کہ وہ نوربانو کی تمام خامیوں سے صرفِ نظر کر سکتا ہے۔ اس کی محبت بہت گہری ہے۔

لیکن پھر اس نے نوربانو کی خوبیوں کو ختم ہوتے دیکھا اور وہ بھی وہ خوبیاں جو اسے بہت عزیز تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ نہایت خوش الحانی کے ساتھ قرآن پڑھتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ علم دین حاصل کرتی رہی ہے۔ مگر شادی کے ساتھ ہی سب کچھ بدل گیا۔ قرآن پڑھنا موقوف ہوا۔ صبح سویرے اٹھنا بھی موقوف ہوا۔ بلکہ وہ اپنے ساتھ اسے بھی لے بیٹھی۔ اماں نے آج سچ ہی تو کہا

تھا۔ ملازمت نہ ہوتی تو وہ بھی نوربانو کے ساتھ دوپہر تک سویا کرتا۔

عبدالحق کے مزاج میں عاجزی اور انکسار تھا۔ اس نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ نوربانو کو اس کی وجہ سے نقصان پہنچا ہے۔ لیکن اپنے اندر گہرائی میں وہ جانتا تھا کہ یہ بات درست نہیں ہے۔ اس نے تو شادی کی رات بھی نوربانو سے سورۂ ملک کی فرمائش کی تھی۔ لیکن نوربانو نے ٹال دیا تھا۔ وہ تو شادی کی رات شکر کے دو نفل پڑھنا چاہتا تھا۔ مگر نوربانو کی وجہ سے وہ نوافل تو کیا صبح کی فرض نماز سے بھی محروم ہوگیا تھا۔

اپنی خرابی دوسرے پر کیوں رکھتے ہو۔ اس نے خود کو ٹوکا۔ یہی اس کا مزاج تھا۔ وہ دل میں توبہ کرنے لگا۔

لیکن یہ سچ تھا کہ نوربانو نے ازدواجی زندگی کا عنوان جسمانی تعلق رکھا تھا، اور وہ اس طوفان میں بہہ گیا تھا۔ اب سمجھ میں آتا تھا کہ اس نے کتنا کچھ کھو دیا، وہ کتنا پیچھے چلا گیا۔ شاید اس پر اس نے کبھی سوچنا ہی نہیں چاہا۔ وہ خود سے نظریں چراتا رہا۔ صرف اس لئے کہ وہ نوربانو کو الزام سے بچانا چاہتا تھا۔ اللہ نے اسے وہ محبت دی تھی، جو اسے اس کے دین کی طرف لے آئی تھی۔ وہ اس محبت میں ذرا سی بھی کمی نہیں چاہتا تھا۔

مگر اب وہ نوربانو اور ارجمند کا موازنہ کرنے پر مجبور تھا...... ایک عورت اور ایک کم عمر بچی کا موازنہ۔

اسے سب سے زیادہ دکھ اس بات پر ہوا تھا کہ نوربانو جھوٹی ہے۔ جب پہلی بار دفتر کھانا آیا تو اس رات اس نے نوربانو کی تعریف کی۔ اس کا شکریہ ادا کیا، اور نوربانو نے اسے قبول کر لیا۔ وہ محض ایک جھوٹ تھا، نہ ہی اتفاقی جھوٹ۔ رات کو اس نے اس جھوٹ کو نبھانے کے لئے کتنے جھوٹ بولے۔ کس شان سے کہا کہ کبھی کبھی ارجمند دوپہر کا کھانا پکاتی ہے۔ جبکہ یعقوب نے بتایا تھا کہ وہ تو اس وقت سو رہی ہوتی ہے۔ اور اماں نے بھی تائید کی کہ اس نے کبھی کھانا نہیں پکایا۔ وہ تو دوپہر تک سوتی ہے۔ رات نوربانو کو جھوٹ بولتے ہوئے یہ ڈر بھی نہیں لگا کہ اس کا جھوٹ کھل بھی سکتا ہے۔ اتنا نڈر تو عادی جھوٹا ہی ہو سکتا

ہے۔

اور عبدالحق کو جھوٹ بہت ناپسند تھا۔

اسے یاد تھا کہ کھانے کے سلسلے میں اس کی تفتیش پر ارجمند نے کتنے محتاط جواب دیئے تھے۔ کئی سوالوں کے جواب میں اس نے بڑی مشکل سے اعتراف کیا تھا کہ وہ کبھی کبھی کھانا پکاتی ہے۔ پھر اس نے جھوٹ کے گناہِ کبیرہ ہونے کے بارے میں بات چھیڑی اور اس کے بعد اپنا سوال دہرایا تو اس نے کھلا جھوٹ بولنے کے بجائے موضوع بدل دیا۔ اور جھوٹ کے بارے میں اس نے غیر نصابی، لیکن کتنی بڑی بات کہی کہ جھوٹ دل کو سیاہ کرتا ہے اور آدمی کے اللہ سے تعلق کو کمزور کرتا ہے۔ یہ اس کے اندر کی بات تھی، اسی لئے تو وہ جھوٹ بولنے سے بچنے کی کوشش کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اسے موضوع ہی بدلنا پڑا۔

لیکن جھوٹ تو اس نے بہرحال بولا۔ عبدالحق کے اندر اعتراض ابھرا۔ سچ تو یہ ہوتا کہ وہ کہتی، ہاں، دوپہر کو روز کھانا میں ہی پکاتی ہوں۔

ایسا ایک جھوٹ عبدالحق نے بولا تھا۔ نوربانو کو بڑے دکھ سے بچانے کے لئے، یہ کہ اس کے چچا کو وہ تلاش نہیں کر سکا اور اسے اس جھوٹ پر شرمندگی بھی نہیں تھی۔ وہ اس کے نزدیک مجبوری تھی، وہ سچ سے بہتر تھا۔ یہ بات اس نے اماں سے بھی کہی تھی۔

اسے ارجمند پر پیار آ گیا۔ اس کا جھوٹ اور خوب صورت، اور ضروری تھا۔ کیسی عجیب بات تھی کہ اس نے بھی نوربانو کی خاطر جھوٹ بولا تھا۔ کسی دکھ سے بچانے کے لئے نہیں، بہت بڑی شرمندگی سے بچانے کے لئے، اسے اس کی نظروں میں جھوٹا ثابت ہونے سے بچانے کے لئے، اس کی نظروں میں گرنے سے بچانے کے لئے......

تو کیا ایسا ہے کہ نوربانو سے جو بھی محبت کرے گا، اسے نہ چاہتے ہوئے بھی جھوٹ بولنا پڑے گا؟

دوسرا موازنہ محبت کا تھا۔ جب اس نے پہلی بار کھانا بھیجنے پر نوربانو کا شکریہ ادا کیا، یہ بتایا کہ اس سے اسے بہت خوشی ملی تو نوربانو کو یہ خیال نہیں آیا

کہ یہ خوشی تو وہ اسے ہر روز دے سکتی ہے۔ کیا وہ اس کی محبت کی خاطر یہ ایثار نہیں کر سکتی تھی کہ اپنی نیند قربان کر کے اس کے لئے وہ زحمت کرتی۔ جبکہ یہ تو اس کی ذمہ داری تھی، اس کا فرض تھا۔ مسعود صاحب نے یہی بات تو کہی تھی۔ بلکہ ارجمند کے ایثار نے بھی اسے نہیں جھنجوڑا۔ ارجمند کی تو کوئی ذمہ داری نہیں تھی اس سلسلے میں۔ مگر نوربانو اسے استعمال کرتی رہی۔ اس کی کارکردگی پر بے حسی سے داد سمیٹتی رہی۔ وہ کبھی اسے ناشتہ دینے کے لئے بھی نہیں اٹھی۔

اسے یاد تھا، مسعود صاحب نے کہا تھا کہ انہیں ملال ہوتا تھا کہ نوربانو نے اس کے نئے معمولات کے ساتھ مطابقت نہیں پیدا کی۔ وہ اپنے ہی معمولات میں گم ہے۔ جبکہ میاں بیوی کو ایک دوسرے کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ انہیں خود کو ایک دوسرے کے معمولات اور ضرورتوں کے مطابق ڈھالنا ہوتا ہے۔

یہ گویا اچھی بیوی اور اچھے شوہر کی تعریف تھی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ نوربانو کبھی اس تعریف پر پوری نہیں اتری۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ اس کی بیوی کبھی نہیں بنی، ہمیشہ محبوبہ ہی رہی۔ اب وہ پلٹ کر گزری ہوئی زندگی پر نظر ڈالتا تھا تو سمجھ میں آتا تھا کہ نوربانو نے جسمانی آسائش کے سوا اسے کبھی کچھ نہیں دیا، اور وہ بھی ایسے، جیسے پنجرے میں بند پرندے کو قید میں خوش رہنے کا عادی بنانے کے لئے اس کے دال پانی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس کی روحانی ضرورتوں کا اس نے کبھی خیال نہیں رکھا۔ اس کے نتیجے میں وہ خود بھی خسارے سے دوچار ہوئی، اور اسے بھی دوچار کیا۔ اب وہ نقصان اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ نوربانو نے خود کو بہت ..... بہت چھوٹا کر لیا تھا۔ وہ اللہ کے دیئے ہوئے مقام سے بہت نیچے آ گئی تھی، بلکہ اسے بھی نیچے لے آئی تھی۔

یہاں نوازنے کی ایک اور شاخ نکل آئی۔ ایک نوربانو تھی، جسے گھر پر باقاعدہ دینی تعلیم دلائی گئی تھی۔ جو قرآن پڑھنے کی عادی تھی، پنج وقتہ نمازی تھی۔ دین کا مطالعہ کرتی تھی۔ یہ سب کچھ شادی سے پہلے اس نے خود دیکھا تھا، ورنہ اب اسے وہ افسانہ ہی لگتا۔ مگر شادی کے بعد، سکون، تحفظ اور آسودگی ملتے ہی وہ سب کچھ بھول بیٹھی۔ مدت ہوئی کہ اس نے کبھی اسے نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔

دوسری طرف کم عمر ارجمند تھی، جس نے کوٹھے کے ماحول میں ہوش سنبھالا۔ وہیں اس کی پھپھو نے اسے قرآن پڑھایا، نماز سکھائی، اللہ نے اسے گھر کا تحفظ عطا فرمایا تو وہ اس راہ پر آگے بڑھی۔ اس نے عربی پڑھنے کو اوّلیت دی، صرف اس لئے کہ وہ قرآن کو سمجھ بھی سکے۔ نماز باقاعدگی سے پڑھتی۔ شکر گزاری اور احسان مندی کا یہ عالم ہے کہ نوربانو کی عزت اور خوشی کے لئے ہر روز اسے کھانا بھیجتی ہے، اور نام نوربانو کا کرتی ہے۔ اسے اللہ نے کیسی بڑائی دی کہ قرآن کے حوالے سے اس کی گفتگو سن کر وہ خود اس کے سامنے چھوٹا ہو گیا تھا۔

وہ پھر محبت پر پہنچ گیا۔ اسے یاد تھا کہ ارجمند کو گھر لاتے ہوئے وہ کتنا خوفزدہ تھا۔ نادرہ نے اسے بتایا تھا کہ ارجمند بہت چھوٹی تھی، جب اس نے اسے دیکھا تھا اور اس کی تصویر بنائی تھی۔ وہ ہمیشہ کہتی تھی کہ وہ اس کا شہزادہ ہے، اور وہ اسی سے شادی کرے گی۔ لیکن نادرہ نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ ارجمند کو بہت اچھی طرح سمجھا چکی ہے۔ اور وہ اس کے لئے مسئلہ نہیں بنے گی۔ پھر اسے یاد تھا، جب ارجمند پہلی بار روئی تھی تو اس نے اس سے کہا تھا کہ اس کے آنسو روکنے کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے تو ارجمند نے بچوں کی طرح اس سے کہا تھا...... مجھ سے شادی کریں گے...... اور وہ ہنس دیا تھا۔ اس نے کہا تھا، ابھی تو تم بہت چھوٹی ہو۔ اور وہ سر جھکا کر بولی تھی...... جی ٹھیک ہے...... جیسے کہہ رہی ہو کہ وہ اپنے بڑے ہونے کا انتظار کرے گی۔ پھر عارف صاحب نے بھی اسے اس حوالے سے ڈرایا تھا۔ لیکن بعد میں سب بے بنیاد ثابت ہوا تھا۔ ارجمند نے کبھی اسے شرمندہ نہیں کروایا تھا۔ شاید وہ اس کا بچپنا تھا، جسے وہ بھول گئی تھی۔

اسے یاد تھا، شادی سے پہلے اماں نے اسے سمجھایا تھا۔ انہوں نے محبت کے بارے میں کہا تھا کہ محبت میں آدمی کا دل تنگ نہیں ہوتا، بلکہ بڑا ہو جاتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا...... محبت کا مطلب کسی پر قبضہ کرنا تھوڑا ہی ہے۔

اس حوالے سے ثابت ہوتا تھا کہ ارجمند کو محبت کرنا آتا ہے۔ وہ صرف دینا جانتی تھی، لینا نہیں۔ اس نے ثابت کر دیا تھا کہ اسے ایثار کرنا آتا ہے۔ اور کسی پر قابض ہونا کجا، وہ تو اپنے وجود کا ایک ایک حصہ سب کو سونپ دیتی تھی۔

اس کا تو شاید خمیر ہی محبت کی مٹی سے اٹھا تھا۔

کیا وہ اب بھی مجھ سے اسی طرح محبت کرتی ہے؟ یہ خیال عبدالحق کے دل میں خود بخود ابھرا۔

وہ اس خیال کو جھٹک بھی سکتا تھا، اس سے نظریں بھی چرا سکتا تھا، اور یہ سوچ کر ٹال بھی سکتا تھا کہ وہ ارجمند کا بچپنا تھا، جبکہ اب وہ بڑی ہو چکی ہے لیکن اس وقت وہ پرانا والا عبدالحق تھا، جو کبھی کسی سوال سے نظریں نہیں چراتا تھا، بلکہ تجزیے کے ذریعے اس کا جواب کھوجتا تھا۔

اس نے ارجمند کے اپنے ساتھ رویے کو ذہن میں تازہ کیا۔ اسے کوئی ایسی بات یاد نہیں آئی، جس سے اس خیال کی تائید ہوتی۔ ارجمند صرف پڑھائی کے وقت اس کے قریب ہوتی تھی، پڑھائی کے دوران بلاضرورت وہ کبھی نہیں بولتی تھی۔ اور وہ کبھی اسے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔ بلکہ ایک بار تو وہ جھنجلایا بھی تھا۔ اس کے اصرار پر بھی ارجمند نے نظریں نہیں اٹھائی تھیں۔

اور پڑھائی کے وقت کے علاوہ تو ان کا سامنا بھی کم ہی ہوتا تھا۔ اب اسے خیال آ رہا تھا کہ ارجمند بلاضرورت اس کے سامنے نہیں آتی تھی۔ یعنی وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ اسے بلاوجہ ارجمند سے ڈرایا گیا تھا۔

اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ بچے تو محبت سے بھرے ہوتے ہیں۔ انہیں کسی سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔ اور محبت کی مختلف قسموں اور درجوں سے وہ واقف نہیں ہوتے۔ بڑے ہوتے ہیں تو انہیں اپنی ہر محبت کو الگ الگ خانے میں رکھنا آ جاتا ہے۔ اور پھر ایسے بچے، جو عدم تحفظ کے شدید احساس کا شکار ہوں، وہ تو امید کی بنیاد پر بھی محبت کرتے ہوں گے۔ شاید ارجمند کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اور جب عدم تحفظ سے چھٹکارا ملا تو محبت ختم ہو گئی۔

یہ بات اس کے لئے باعث طمانیت تھی کہ ارجمند اب اس سے محبت نہیں کرتی۔ ہاں، وہ نوربانو سے بہت محبت کرتی ہے۔ یہ پورا معاملہ اس محبت کا ثبوت ہے۔ نوربانو کی خاطر اس نے جھوٹ تک تو بول لیا۔

اطمینان اپنی جگہ، لیکن عبدالحق کو ایک لمحے کے لئے افسوس ہوا کہ وہ

اس محبت سے محروم ہو گیا۔ وہ محبت سے خائف نہیں تھا، کبھی ہو بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے نزدیک محبت اللہ کی بہت بڑی نعمتوں میں سے تھی۔ ہاں وہ محبت کے اس روپ سے خائف تھا، جو ایک بچی سے کسی بڑی عمر کے مرد کے لئے یہ کہلوا دے کہ میں تو انہی سے شادی کروں گی۔

مگر وہ افسوس بس ایک لمحے کا تھا۔ اگلے ہی لمحے عبدالحق نے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ تو ایک بڑی پیچیدگی تھی جو اللہ نے اپنی رحمت سے دور کر دی۔

گزشتہ رات ارجمند سے ہونے والے تبادلہ خیال نے جہاں اسے فائدہ پہنچایا تھا، اور خوشی دی تھی، وہیں ایک بہت بڑی محرومی کے احساس کو اجاگر کر دیا تھا۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ محرومی برسوں سے اس کے اندر موجود تھی، لیکن شعور کی سطح پر نہیں آسکی تھی۔

دراصل وہ اس کا خواب تھا، اور اس نے نور بانو کو اس کی تعبیر سمجھا تھا۔ لیکن وہ تعبیر ثابت نہیں ہوئی۔ یہ اس کا خواب تھا کہ وہ تنہائی میں نور بانو کی قرأت سنے گا، وہ دونوں گھنٹوں بیٹھ کر قرآن کی آیات کو سمجھنے کے لئے باتیں کریں گے۔ وہ باہم اپنی زندگی کے لئے راہِ عمل کے ہر ہر قدم کا تعین کریں گے کہ ہر بڑھتا ہوا قدم انہیں اللہ سے قریب تر کر دے گا۔

لیکن تعبیر تو کجا، نور بانو نے تو اسے خواب سے ہی محروم کر دیا۔ اس کے تو اپنے معمولات، اپنے روز و شب ہی بگڑ گئے۔ آگے بڑھنا تو دور کی بات، وہ جو تھا، وہی نہیں رہا۔ وہ اس پر سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن سوچیں تو خود بخود ابھرتی ہیں۔ ایسا کوئی خیال دل میں آتا تو وہ اس سے فرار اختیار کرتا۔ سوچتا تو نور بانو سے شکایت دل میں پیدا ہوتی، اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس محبت کی ناقدری کیسے کرتا، جس نے اس کی راہنمائی کی تھی، جو اسے دین اسلام کی چوکھٹ تک لانے کا سبب بنی تھی۔

مگر گزشتہ رات ارجمند سے بات کر کے جہاں محرومی کا ادراک پوری طرح شعوری سطح تک آیا تھا، وہاں اس محرومی سے نجات کا راستہ بھی اسے مل گیا

تھا۔ ارجمند بچی ضرور تھی لیکن اس پر اللہ کی خاص عنایت تھی۔ شاید ویسی ہی، جیسی خود اس پر تھی۔ اللہ ارجمند کی بھی راہنمائی کرتا تھا۔ اس راہنمائی کے بغیر کوئی اللہ کی کسی آیت کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔ بہرحال بات یہ تھی کہ وہ قرآن پڑھ کر ارجمند سے تبادلہ خیال کر سکتا تھا، اور اس میں دونوں کا ہی فائدہ تھا۔

اس خیال پر وہ ٹھٹکا۔ ارجمند سے وہ ڈرتا بھی تو تھا۔ لیکن نہیں، یہ اس کی زیادتی ہے۔ ارجمند نے پہلی ملاقات کے بعد اس سے کبھی ویسی کوئی بات نہیں کی۔ بلکہ اس نے تو کبھی نظر بھی نہیں اٹھائی۔ نہیں، وہ بے فکری سے اس کے ساتھ بیٹھ کر بات کر سکتا تھا۔ یہ اس کے لئے بہت بڑی خوشی تھی۔ اس نے سوچا، وہ ارجمند کے ساتھ ہر روز ایسا ہی وقت گزارے گا۔

لیکن اس کے اس دکھ کا کوئی ازالہ نہیں تھا کہ نور بانو جھوٹ بولتی ہے، اور دھڑلے سے جھوٹ بولتی ہے۔

❁ ❁ ❁

ارجمند ٹیسٹ میں کامیاب ہو گئی تھی اور اسکول میں اس کا داخلہ بھی ہو گیا تھا۔ نور بانو اسے ساتھ لے کر گئی اور اسے کورس کی کتابیں، کاپیاں، یونیفارم اور دوسری چیزیں دلا کر لائی۔ ارجمند بہت خوش تھی۔ اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو رہا تھا۔

اسکول شروع ہونے سے ایک دن پہلے ناشتے کے دوران حمیدہ نے فکرمندی سے کہا۔

''نکی کا اسکول گھر سے کتنی دور ہے؟''

''زیادہ دور نہیں ہے اماں! پانچ منٹ کا راستہ ہے۔''

''پیدل کا......؟''

''نہیں اماں! یہ تو گاڑی میں جائے گی۔''

''کون لے کر جائے گا......؟''

''میں چھوڑ آؤں گا اماں!''

حمیدہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''نا پتر! بڑی باتوں میں بہت سوچنا سمجھنا چاہئے بندے کو۔ کام وہ شروع کرے کہ آگے تک دشواری نہ ہو۔''

''میں سمجھا نہیں اماں!''

''کسی دن تو نہیں جا سکا تو کیا ہوگا؟''

''عبدالحق ہنس دیا۔

''تو اماں! گاڑیاں تو دو ہیں ہمارے پاس۔ ایک تو ہر وقت گھر پر ہی رہتی ہے آپ لوگوں کے لئے۔''

حمیدہ نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

''اور تو لے بھی جائے تو اسکول سے واپس کون لائے گا؟''

''میں نے کہا نا اماں! ایک گاڑی تو گھر پر ہی رہتی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے پتر! پر یہ جائے آئے گی کس کے ساتھ؟''

''خوامخواہ پریشان ہو رہی ہو اماں! یعقوب ہے نا! آپ کبھی مزاروں پر جاتی تھیں تو میرے ساتھ تو نہیں جاتی تھیں۔ یعقوب ہی لے کر جاتا تھا آپ کو۔'' کہتے کہتے عبدالحق کو احساس ہوگیا کہ وہ مزاروں کا حوالہ غلط دے گیا ہے۔

لیکن حمیدہ نے جیسے اس کی بات پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

''وہ اور بات تھی پتر! نکی کی بات اور ہے۔ دیکھو نا! اب یہ بڑی ہو رہی ہے۔ اکیلے ڈرائیور کے ساتھ تو میں نہیں بھیج سکتی اسے۔''

اپنے بڑے ہونے کی بات پر ارجمند کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ کیا واقعی وہ بڑی ہوگئی ہے۔ اس کا جی چاہا کہ آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو جائے، اور خود کو دیکھے۔

''تو بھی کیا مسئلہ ہے اماں!'' عبدالحق نے بے پرواہی سے کہا۔

''گاڑی تو ہے، آپ ہی اسے چھوڑ بھی آیئے گا اور اسکول سے واپس بھی لے آیئے گا۔''

''ہاں! یہ ٹھیک ہے۔'' حمیدہ نے سکون کی سانس لی۔ پھر بولی۔

''بڑی ہوتی ہوئی بچیوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے پتر!''

عبدالحق کے خیال میں ارجمند محض بچی تھی، بڑے ہونے کے مرحلے سے بہت دور۔ تاہم اس نے حمیدہ کا دل رکھنے کے لئے کہا۔

''میں سمجھ گیا اماں!''

عبدالحق کے جانے کے بعد ارجمند سے رہا نہیں گیا۔ حمیدہ کے سامنے تو اسے شرم آ رہی تھی۔ اسے عبدالحق کے کمرے کا خیال آگیا۔ لیکن پھر اس نے سوچا، بری بات ہے۔ آپی سو رہی ہوں گی وہاں۔

تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اکیلی ہی تو ہوں گی۔ دل نے کہا۔

لیکن کسی کے کمرے میں یوں بغیر اجازت داخل ہونا کوئی اچھی بات نہیں۔ اس نے دل کو سمجھایا۔

مگر وہ زیادہ دیر خود کو روک نہیں سکی۔ اشتیاق اتنا زیادہ تھا کہ اس نے اخلاقیات کی مضبوط دیوار میں درز بنا دی۔

وہ عبدالحق کے کمرے کی طرف چل دی۔

اس نے دروازے کو بڑی آہستگی سے دھکیلا کہ کہیں نوربانو کی آنکھ نہ کھل جائے۔ دروازہ بے آواز کھلا۔ اندر نوربانو بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے دروازے کو بڑی احتیاط سے بند کر دیا۔

اس کا دل یوں دھڑک رہا تھا، جیسے وہ کچھ چرانے آئی ہو۔ وہ بار بار نوربانو کو دیکھتی۔ اسے ڈر تھا کہ کسی بھی لمحے وہ جاگ جائے گی، اور پھر اس کی چوری پکڑی جائے گی۔

کچھ دیر وہ سانس روکے، دروازے پر کھڑی نوربانو کو دیکھتی رہی۔ آگے بڑھنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن اتنی دیر میں نوربانو کسمسائی تک نہیں تھی۔

بالآخر اسے اطمینان ہوگیا۔ پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھی اور ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس کے جسم میں لرزش تھی۔

اس نے ایک بار پھر سوتی ہوئی نوربانو کو دیکھا اور پھر آئینے میں اپنے

عکس پر بھرپور نگاہ ڈالی۔

اس کی مایوسی کی کوئی حد نہیں رہی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو ویسی ہی تھی...... بالکل ویسی...... وہی پرانی والی ارجمند۔ وہی ہونٹ، وہی ناک، وہی آنکھیں اور وہی بھویں۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔

پھر بھی وہ دیکھتی رہی۔ اپنے چہرے کو، چہرے کے نقوش کو متجسس نگاہوں سے ٹٹولتی رہی۔ لیکن اسے کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ وہ تو بالکل پہلے ہی جیسی تھی۔

اس کی مایوسی جھنجلاہٹ میں تبدیل ہوگئی۔ دادی اماں نے اسے بڑی ہوتی ہوئی بچی کیوں کہا تھا؟ غلط تو نہیں کہا ہوگا۔ تو پھر وہ بڑا پن اسے نظر کیوں نہیں آ رہا ہے؟

اچانک اسے خیال آیا کہ شاید اس کا قد بڑھا ہوگا۔ ضرور یہی بات ہے۔ دل نے اس کی تائید کی۔

اس بار اس نے آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ ایک لمحے کو اسے ایسا لگا کہ اس کا قد بڑھا ہے۔ مگر فوراً ہی اس نے سمجھ لیا کہ دراصل یہ اس کی خواہش ہے۔ وہ خود کو جانبداری سے نہیں دیکھ رہی ہے۔ وہ یہ تسلیم کرنا چاہتی ہے کہ وہ بڑی ہو رہی ہے۔ اس لئے اسے اپنا قد بڑھا ہوا لگا ہے۔ ورنہ درحقیقت وہ ویسی ہی ہے، جیسی کل تھی، جیسی پرسوں تھی۔

جھنجلاہٹ اور مایوسی ایسی تھی کہ وہ دبے پاؤں چلنا بھی بھول گئی۔ بے احتیاطی سے دھڑ دھڑ چلتی وہ دروازے تک پہنچی۔ مگر وہاں پہنچ کر اسے یاد آ گیا کہ وہ اس کمرے میں ہے، جہاں اس وقت موجود ہونے کا اسے کوئی حق نہیں، اور وہ یہاں چوری چھپے آئی ہے۔ اس نے پلٹ کر نور بانو کو دیکھا جو اب بھی بے خبر سو رہی تھی۔ پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر نکلنے کے بعد بڑی احتیاط سے دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ اسٹڈی کی طرف چلی گئی۔

وہاں بیٹھ کر وہ یہی سوچتی رہی کہ حمیدہ نے یہ بات کیوں کی تھی؟ اس پر وہ کتنا سوچتی، اس کی مایوسی اور جھنجلاہٹ بڑھ جاتی۔ اب وہ یوں ہی بیٹھی

رہتی۔ لیکن اچانک ہی ایک اور پریشان کن خیال نے اس کے ذہن میں سر اٹھایا۔ وہ بری طرح چونکی...... ارے...... کل...... تو مجھے اسکول جانا ہے۔ اس نے سوچا۔

حالانکہ وہ اس کے لئے بہت بڑی خوشی تھی۔ لیکن ایک پریشانی کا پہلو تو اس میں بھی تھا۔ میں اسکول چلی جاؤں گی تو آغا جی کے دوپہر کے کھانے کا کیا ہوگا؟ اس نے سوچا۔ کھانا نہیں جائے گا تو پول کھل جائے گی۔ اور آغا جی کتنے ناراض ہوں گے اور آپی کے لئے تو یہ بہت ہی بری بات ہوگی۔

وہ سوچتی رہی، سوچتی رہی۔ اس مسئلے کو حل کرنا بہت ضروری تھا۔ اور ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تو ہوتا ہے۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق اس روز بہت خوش تھا۔ وہ ارجمند کے اسکول جانے کا پہلا دن تھا۔ وہ خود ہی اسے اور حمیدہ کو لے جانے کے لئے تیار تھا۔ لیکن حمیدہ نے منع کر دیا۔

''میں نے کہا نا پتر! وہ کام نہیں شروع کرنا چاہئے جو آدمی نبھا نہیں سکے۔ ہمیں یعقوب ہی چھوڑ کر آئے گا۔''

''لیکن اماں! آج پہلا دن ہے۔'' اس نے احتجاج کیا۔

''آج تو مجھے ہی لے چلئے۔''

حمیدہ کو اس پر پیار آ گیا۔ جانتی تھی کہ وہ کتنا ذمہ دار ہے۔ اسی لئے تو وہ اس کی ذمہ داری میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ بھی وہ سمجھ رہی تھی کہ عبدالحق کے لئے یہ ایک جذباتی معاملہ ہے۔

''اچھا! چل یوں ہی سہی۔''

عبدالحق نے گاڑی اسکول کے سامنے روکی۔ حمیدہ بھی ارجمند کے ساتھ اترنے لگی تو اس نے کہا۔

''تم کہاں چلیں اماں!''

''بچی کو اندر تک چھوڑ کر آؤں گی۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے اماں!''

''اس میں میری خوشی ہے۔'' حمیدہ نے کہا۔

''پھر یہ ہے کہ مجھے اطمینان بھی ہو جائے گا۔''

وہ ارجمند کے لئے بہت بڑا لمحہ تھا۔ یہ لوگ مجھ سے کیسی محبت کرتے ہیں، وہ سوچ رہی تھی۔ میں کیسے اس محبت کا صلہ دے سکوں گی۔ یہ بے لوث، بے غرض محبت۔ آغا جی کو کیا ضرورت تھی زحمت کرنے کی۔ لیکن نہیں، یہ ان کے لئے خوشی تھی۔ اور دادی اماں اپنی خوشی پوری کر رہی ہیں۔

اس لمحے اسے اپنے کھوئے ہوئے لوگ یاد آ گئے۔ آج وہ زندہ ہوتے تو بابا اور امی اسے اسکول لے کر آتے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''تو رو رہی ہے نکی!'' حمیدہ نے تڑپ کر کہا۔

''خوشی کے آنسو ہیں دادی اماں!''

''مجھے سب پتا ہے۔ کچھ خوشی کے ہیں تو کچھ دکھ کے ہیں۔'' حمیدہ نے کہا۔

''پر نکی! سب سے اچھے آنسو شکر کے ہوتے ہیں۔ سوچ تو سہی، اللہ کچھ لیتا ہے تو اس سے زیادہ دیتا بھی تو ہے۔ چل! آ جا .....!''

عبدالحق کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ پھر حمیدہ ارجمند کو اسکول میں چھوڑ کر واپس آئی تو اس نے اس کے لئے دروازہ کھولا۔ حمیدہ اس کے برابر ہی بیٹھ گئی۔

''چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی بھی ہوتی ہیں پتر!'' حمیدہ نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں اماں!''

''میں اسے چھوڑنے گئی، تاکہ نکی کو خود پر اعتماد ہو، وہ خود کو اکیلا نہ سمجھے۔ سکول میں بھی تو سر اٹھا کر رہنا ضروری ہوگا پتر!''

''ہاں اماں! اب میں سمجھ گیا۔''

''بندہ جس سے محبت کرے تو اس کی ضرورتوں کو بھی سمجھے۔''

''ایک بات بتاؤ اماں! ارجمند دکھ سے رو رہی تھی کیا؟''

''خوشی بھی تھی اسے پتر! اور دکھ بھی تھا۔''

عبدالحق نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''دکھ کس بات کا اماں!''

''خوش تو اسے ہونا ہی تھا پتر! بات ہی خوشی کی تھی۔'' حمیدہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

''پر خوشی کے موقع پر ہی تو دکھ یاد آتے ہیں۔ اسے اپنے ماں باپ، دادا دادی اور اپنی پھپھو یاد نہیں آئی ہوگی؟ اس نے نہیں سوچا ہوگا کہ کاش وہ اسے چھوڑنے کے لئے آئے ہوتے؟''

''ٹھیک کہہ رہی ہو اماں! پر تم نے اسے شکر کے بارے میں خوب سمجھایا۔''

''میں نے سمجھایا نہیں پتر! بس اسے یاد دلایا تھا۔ وہ ایسی باتوں کو خوب سمجھتی ہے۔ بس بندہ کبھی دکھ میں بھول ہی جاتا ہے۔ تو ایسے میں محبت کرنے والے اسے یاد دلا دیتے ہیں، تو نہیں جانتا پتر! وہ بچی ہے، پر بہت بڑی ہے۔''

عبدالحق خاموش رہا۔ کیسے کہتا کہ یہ بات وہ بھی سمجھ چکا ہے۔

خوش تو وہ تھا۔ لیکن دفتر میں ایک خیال نے اسے پریشان کر دیا۔ اب اس کے دوپہر کے کھانے کا کیا ہوگا۔ اسے یہ فکر نہیں تھی کہ اب اس کے لئے گھر سے کھانا نہیں آئے گا۔ وہ یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ یہ معمول رکنے کے سلسلے میں وہ مسعود صاحب کو کیا بتائے گا؟ اب وہ انہیں حقیقت تو نہیں بتا سکتا تھا۔

وہ سوچتا رہا، اور اس کی سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہیں آیا کہ اسے جھوٹ بولنا پڑے گا۔ اس کے سوا اس کے سامنے کوئی راستہ نہیں ہے۔ پہلی بار جھوٹ کی برائی اتنی گہرائی کے ساتھ اس کی سمجھ میں آئی۔ اس نے تو مسعود صاحب سے جھوٹ بولا بھی نہیں تھا۔ جھوٹ تو اس سے بولا گیا تھا۔ مگر اب گھر سے کھانا نہ آنے کی وجہ تو مسعود صاحب پوچھیں گے۔ اور وہ کیا بتائے گا؟ یہ کہ نوربانو کی طبیعت بہت خراب ہے۔ لیکن کب تک؟ پھر اس جھوٹ کی خاطر اور نہ جانے

کتنے جھوٹ بولنے پڑیں گے۔

نہیں! اس نے جھنجلا کر سوچا۔ میں چچا جان کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔ میں جھوٹ کیوں بولوں۔ جبکہ اللہ نے سختی سے جھوٹ بولنے کو منع کیا ہے۔ میں کیوں اللہ کی نافرمانی کروں۔

مگر اسے خیال آیا کہ یہ سب کچھ سن کر مسعود صاحب نور بانو کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ اور وہ اسے برا سمجھیں، یہ وہ گوارا نہیں کر سکتا۔ تو اسے نہ چاہتے ہوئے جھوٹ بولنا پڑے گا۔

وہ سوچتا اور الجھتا رہا۔ اللہ کا حکم اور نور بانو کا بھرم! ان میں کوئی مقابلہ تھا ہی نہیں۔ بھرم اور جھوٹے بھرم کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے..... اور پھر اللہ کے حکم کے سامنے تو کسی چیز کی کوئی حیثیت نہیں۔

یہ دل کا فیصلہ تھا۔ پہلی بار عبدالحق کی سمجھ میں آیا کہ عقل تو بس گمراہ کرتی ہے۔ کیونکہ عقل نے ایک دلیل پیش کر دی تھی۔ وہ اس جھوٹ کو جائز قرار دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اللہ ستار ہے، اپنے بندوں کا پردہ رکھنے والا ہے، اور وہ دوسروں کا پردہ رکھنے والوں کو پسند فرماتا ہے، اور قیامت کے دن وہ ان کا پردہ رکھے گا۔ تو اسے نور بانو کا پردہ رکھنا چاہئے چاہے اس کے لئے اسے جھوٹ بولنا پڑے۔

وہ جھنجلا گیا۔ ارے.....! اتنی آسان اور خوب صورت نظر آنے والی زندگی، جسے چھوڑنے کو آدمی کا دل نہیں چاہتا، درحقیقت اتنی مشکل ہے۔

مشکل ہے، جبھی تو اس میں کامیابی کا انعام جنت اور اس کی نعمتیں ہیں۔ دل نے کہا۔ سیدھا چلنا آسان تو نہیں۔

اس لمحے عبدالحق نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جھوٹ ہرگز نہیں بولے گا۔ عزت اور ذلت تو اللہ کے ہاتھ ہے۔ وہ نہ کسی کو عزت دے سکتا ہے نہ کسی کی عزت بچا سکتا ہے۔ نہ وہ کسی کو ذلیل کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور نہ ہی کسی کو ذلت سے بچا سکتا ہے۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ پُرسکون ہو گیا۔

لیکن تھوڑی ہی دیر بعد یہ بھی اس کی سمجھ میں آ گیا کہ جو بندہ نڈر ہو کر اللہ کا حکم مانے، اللہ اس کی کیسی مدد کرتا ہے۔

شمریز نے کھانے کا ٹفن میز پر لا کر رکھا تو وہ حیران رہ گیا۔

''یہ..... یہ کہاں سے آیا؟''

''گھر سے صاحب!'' شمریز کو اس کی حیرت پر حیرت ہو رہی تھی۔

''کون لایا؟''

شمریز کو لگا کہ صاحب کا دماغ چل گیا ہے۔

''یعقوب لایا ہے سر!''

''اسے بلاؤ۔'' عبدالحق نے کہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ یعقوب تو جا رہا ہوگا۔

''اگر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا ہو تو نوریز کو گاڑی میں اس کے پیچھے بھیجو۔ اس سے کہو کہ گھر پہنچنے سے پہلے یعقوب کو یہاں واپس لانا ہے۔''

شمریز بات کی اہمیت کو تو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن وہ یہ بہرحال سمجھ گیا کہ بات اہم ہے۔ وہ عبدالحق کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کمرے سے نکل گیا اور باہر کی طرف لپکا۔ اس کا اندازہ تھا کہ اب تک یعقوب گاڑی میں بیٹھ کر نکل چکا ہوگا اور نوریز کو اس کے پیچھے بھیجنا پڑے گا۔

یہ دیکھ کر اسے سکون ہوا کہ گاڑی پارکنگ میں موجود ہے۔ لیکن یعقوب اس میں موجود نہیں تھا۔ یہ ایک اور مشکل آ گئی۔ اب وہ یعقوب کو کہاں ڈھونڈے۔ اور وہ ڈھونڈ رہا ہو اور ادھر یعقوب آ کر گاڑی میں بیٹھ کر نکل جائے تو.....''

اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ سامنے چھوٹے سے باغیچے میں اسے یعقوب نظر آ گیا۔ وہ گھاس پر پاؤں پھیلائے بیٹھا نوریز سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ ان کی طرف بڑھ گیا۔

''اے یعقوب! صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔''

یعقوب ہمیشہ کی طرح بگڑ گیا۔

"کیا یاقوب یاقوب کرتا ہے۔ مائی نیم جیکب!" اس نے سینے کو انگلی سے ٹھونکتے ہوئے کہا۔

"تم سالا کالا انڈین، تم کو بات کرنا نہیں آتا۔"

"اندھا ہوگیا ہے کیا۔ نہ میں کالا ہوں نہ انڈین۔ تو آئینہ دیکھا کر ہر روز۔ گوروں کے چھوڑے ہوئے کالے سائے، اور مجھ کو غور سے دیکھ۔ میں تیرے انگریزوں سے بھی گورا ہوں۔ مجھے سلوٹ کیا کر صبح شام۔"

"یو بلڈی ہمبل سرونٹ۔ تجھ کو انگریزی آتی ہے؟"

اب وہ ساتھ رہتے تھے تو یہ نوک جھونک ان کا روز کا معمول تھی۔ لیکن نوریز چھوٹا ہونے کی وجہ سے یعقوب کا احترام کرتا تھا۔

"میں نے کہا، صاحب تجھے بلا رہے ہیں۔"

یعقوب کو تشویش ہونے لگی۔

"کیا بات ہے؟"

"جیسے بلایا ہے، اس سے تو ایمرجنسی ہی لگتی ہے۔"

یعقوب جلدی سے اٹھا اور دفتر کی طرف تیز قدموں سے چل دیا۔ شمریز اس کے پیچھے تھا۔

یعقوب نے دروازہ پر دستک دی اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ شمریز کو اندازہ تھا کہ وہ کوئی ذاتی نوعیت کا معاملہ ہے۔ اس لئے اس کا کمرے میں جانا مناسب نہیں ہوگا۔

"یو کال می سر!" یعقوب نے اندر داخل ہوتے ہی گڑبڑا کر کہا۔

"دروازہ بند کرو۔"

یعقوب اور ڈر گیا۔ دروازہ بند کر کے وہ پلٹا۔

"سم سنیک فرام می سر!"

"یہ ہر وقت اپنی انگریزی نہ جھاڑا کرو۔" عبدالحق نے اسے جھاڑا۔

"یس سر! میرا مطلب ہے حاضر جناب!"

"یہ کھانا تمہیں کس نے دیا؟"

پھر وہی کھانے کا کیس۔ یعقوب نے گھبرا کر سوچا۔ پھر اس نے جلدی سے جواب دیا۔

"یور میڈ سر! سٹی گیو می دِس ٹفن۔"

"میں کہتا ہوں، سیدھی طرح بات کرو مجھ سے۔"

"وہ میں نروس ہو رہا ہوں سر! یہ ٹفن مجھے آپ کے اس نوکرانی نے دیا ہے۔ کیا نام ہے اس کا..... ہاں، نسیمہ نے۔"

"اور نسیمہ کو کس نے دیا؟"

"میم صاحب نے۔"

"تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے اس میڈ نے ہی بتایا سر! میرا مطلب ہے، نوکرانی نسیمہ ہے۔"

عبدالحق چند کے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"ٹھیک ہے، تم جاؤ، یہ سمجھ لو کہ میں نے تم سے کچھ نہیں پوچھا ہے۔"

"سمجھ گیا جناب!"

اس کے جانے کے بعد بھی عبدالحق اس پر سوچتا رہا۔ ارجمند کو تو وہ خود ہی اسکول چھوڑ کر آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کھانا یا تو نسیمہ نے پکایا ہے یا نوربانو نے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ رات کا کھانا ہو۔ خیر..... کھائیں گے تو پتا چل جائے گا۔

لیکن کھانے کے بعد وہ اور الجھ گیا۔

بیشتر کھانے ایک ہی ترکیب سے پکائے جاتے ہیں۔ لیکن شاید ان میں پکانے والے کے ہاتھ کا ذائقہ اور شاید محبت بھی شامل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے ہر کسی کے پکائے ہوئے قورمے کا ذائقہ ایک سا ہونے کے باوجود کچھ منفرد بھی ہوتا ہے۔ آپ کس کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا روز کھائیں تو آپ اس انفرادی ذائقے کی عادی ہو جاتے ہیں۔ کبھی اس میں فرق ہو تو آپ کو فوراً ہی محسوس ہو جاتا ہے۔ آپ فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ یہ کھانا کسی اور نے پکایا ہے۔

یہ اندازہ تو اسے ٹفن کھولتے ہی ہوگیا کہ کھانا رات کا نہیں ہے۔ مگر

کھاتے ہوئے اسے حیرت ہوئی۔ کیونکہ وہ ویسا ہی تھا، جیسا ہمیشہ ہوتا تھا۔ اسے الجھن ہونے لگی۔ ارجمند نے کھانا پکانا نوربانو سے سیکھا تھا۔ مگر وہ ان دونوں کے کھانے میں فرق کرنے لگا تھا۔ شاید اس لئے کہ دوپہر کا کھانا ارجمند کا اور رات کا نوربانو کا ہوتا تھا۔

اگر وہ کھانا نسیمہ کا پکایا ہوا ہوتا تو وہ فوراً ہی سمجھ لیتا۔ لیکن اسکا دل تو یہ ماننے کو بھی تیار نہیں تھا کہ یہ کھانا نوربانو نے پکایا ہوگا۔ اس میں وہی ذائقہ تھا، جو دفتر بھیجے جانے والے کھانے کا ہوتا تھا، اور وہ جانتا تھا کہ وہ ارجمند کا پکایا ہوا ہوتا ہے۔

لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ارجمند اسکول گئی ہوئی ہے۔ تو پھر یہ نوربانو ہی کا ہوگا۔ لیکن اس کا دل یہ نہیں مان رہا تھا۔

بغیر مسعود صاحب کو کچھ بتائے، اپنی الجھن دور کرنے کے لئے اس نے ان کا سہارا لیا۔

''آج آپ کو کھانے کے ذائقے میں کچھ فرق محسوس نہیں ہو چچا جان!''

اس نے بڑی معصومیت سے ان سے پوچھا۔

مسعود صاحب نے سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔

''نہیں بھئی! نور بیٹی کے ہاتھ کا ذائقہ میں خوب پہچانتا ہوں۔''

''یہ تو آپ بغیر سوچے سمجھے کہہ رہے ہیں۔ اب ذرا کھاتے ہوئے محسوس کرنے کی کوشش کریں۔''

مسعود صاحب نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا، مگر اس کی فرمائش پر عمل کیا۔ نوالہ حلق سے اترنے کے بعد وہ بولے۔

''وہی ذائقہ ہے روز والا اور میاں! کسی کے ہاتھ کا ذائقہ پہچاننے کے لئے غور نہیں کرنا پڑتا۔ وہ تو منہ سے بولتا ہے اور آدمی خود بخود پہچان جاتا ہے۔''

مسعود صاحب نے اس کے اندازے کی تائید کر دی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ گھر سے جو کھانا آتا ہے، وہ نوربانو نہیں، ارجمند پکا کر بھیجتی ہے۔ اور وہ یہ بات جانتا تھا۔

تو یہ کھانا ارجمند کا پکایا ہوا ہے۔ اس نے سوچا، مگر وہ یہ بات پورے یقین سے صرف اس لئے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خود ارجمند کو اسکول چھوڑ کر آیا تھا۔ تو ممکن ہے، یہ نوربانو کا کام ہو۔

اس نے سوچا، رات کو نوربانو سے کسی ترکیب سے یہ بات پوچھ لے گا۔ لیکن فوراً ہی اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اس کی تفتیش کے نتیجے میں نوربانو پھر جھوٹ بولے گی۔ کیوں کسی سے جھوٹ بلوایا جائے۔

❁ ❁ ❁

زرینہ کے ہاں دوسرا بیٹا ہوا تھا۔ حمیدہ اسے دیکھنے کے لئے حق نگر گئی۔ وہ بہت خوب صورت بچہ تھا۔ بات خوشی کی تھی۔ حمیدہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ لیکن محرومی کے جس احساس کو اس نے مدت سے دبا رکھا تھا، اچھل کر سطح پر آگیا۔ اللہ میرے عبدالحق کو بیٹا کیوں نہیں دیتا۔ اس کے دل میں شکایت سی ابھری۔

ارجمند بھی بچے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے بچے دیکھے ہی کہاں تھے۔

حمیدہ رخصت ہونے لگی تو زرینہ نے کہا۔

''ابھی تو آپ کچھ دن حویلی میں رکیں گی نا اماں!''

''نا دھیے! بس تھوڑی دیر بعد لہور واپس جاؤں گی۔''

''کیوں اماں! رکو نا کچھ دن!''

''بلکہ اس بار تو ہمارے گھر میں ہی رہیں۔'' اکبر نے کہا۔

''نا پتر! اب تو میں رک ہی نہیں سکی۔ نکی کا اسکول میں داخلہ ہوگیا ہے نا، اب تو تم لوگ آکر رہو ہمارے ہاں۔''

''میں تو آجاؤں گی اماں! لیکن یہ نہیں آسکتے۔ اسٹور کو کس پر چھوڑیں گے۔'' زرینہ نے اکبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اسکول کی چھٹیوں میں ہم آئیں گے باجی!'' ارجمند نے بڑے خلوص سے کہا۔

''انشاء اللہ......! اور تمہارے ساتھ رہیں گے بھی۔''

لاہور واپس آتے آتے حمیدہ پر محرومی کا بخار پوری طرح چڑھ چکا تھا۔

اگلے روز وہ ارجمند کو اسکول چھوڑ کر آئی تو نسیمہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

''آ...... بیٹھ ادھر!''

''کیا بات ہے اماں جی......؟''

''مجھے اپنے پتر کی محرومی کا دکھ کھا رہا ہے نسیمہ!'' حمیدہ نے کہا۔ وہ رات بھر اپنی اور عبدالحق کی محرومی پر سوچتی اور کڑھتی رہی تھی۔ اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اس کی محرومی بڑی ہے یا عبدالحق کی۔ وہ جانتی تھی کہ عبدالحق بے نیاز بنا رہتا ہے۔ لیکن اندر ہی اندر ترستا ہے اولاد کو۔ پھر بھی اللہ نے اسے صبر دیا تھا۔ مگر خود اسے تو قرار نہیں تھا۔ اس لحاظ سے شاید اس کی محرومی بڑی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ عبدالحق کے ہاں بیٹا ہوگا تو شاید وہ اس کے وصال دین جیسا ہوگا۔

''میں پوتے کی صورت دیکھے بغیر، اسے گود میں لئے بغیر مرنا نہیں چاہتی نسیمہ!''

''ایسی باتیں کیوں کرتی ہو اماں جی! اللہ تمہیں بہت عمر دے گا، اور انشاء اللہ پوتا بھی دے گا۔'' نسیمہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ حمیدہ سے وہ ماں جیسی محبت کرتی تھی۔

''پر کب دے گا، میں تو بوڑھی ہو چکی۔ ہر دن موت کی طرف قدم بڑھتا ہے میرا۔'' حمیدہ کے لہجے میں مایوسی اور دل گرفتگی تھی۔

''ایسا کچھ نہیں ہے اماں جی! لوگ تو سو سو سال جیتے ہیں۔ تمہیں سب کچھ ملے گا اماں جی!''

''پر اللہ کے کسی نیک بندے کی دعا تو ملے۔ تو کچھ کرنا نسیمہ!''

''تم ہی پیچھے ہٹ گئی تھیں اماں جی!'' نسیمہ نے کہا۔ پھر رازدارانہ لہجے میں بولی۔

''یہ تیسرے بنگلے میں ایک نوکرانی ہے اماں جی! پندرہ سال سے خالی

گود لئے بیٹھی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ بانجھ ہے، کبھی ماں نہیں بنے گی۔ پر اماں! کل ہی چھلا نہا کر بیٹھی ہے۔''

''کیسے......؟'' حمیدہ کے لہجے میں ہیجان ابھر آیا۔

''ایک اللہ والے نے دعا دی تھی۔''

''کہاں ہیں وہ؟ مجھے بھی لے چل ان کے پاس۔''

''ٹھیک ہے اماں جی! میں آج ہی پتا معلوم کرلوں گی اس سے مل کر۔ پھر کسی دن چلیں گے۔''

''کسی دن کیوں؟ کل ہی چلیں گے۔'' حمیدہ نے تڑپ کر کہا۔

''مجھ سے تو اب صبر نہیں ہوتا۔''

''ٹھیک ہے اماں جی! پر بڑی بیگم کو نہ بتانا۔ وہ مجھ سے چڑنے لگی ہیں۔''

''اسے پتا بھی نہیں چلے گا۔ کل نکی کو اسکول چھوڑ کر ادھر ہی نکل چلیں گے۔''

❁ ❁ ❁

عبدالحق کی الجھن اپنی جگہ تھی۔ کھانے کا ذائقہ ہر روز وہی پرانا والا تھا۔ اور ارجمند ہر روز اسکول جاتی تھی۔ اس کے لئے تو کھانا بھیجنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اور نسیمہ ایسا کھانا نہیں پکا سکتی تھی۔ ایسے میں ایک ہی امکان رہ جاتا تھا، اور وہ بڑا خوش آئند تھا۔ یہ کہ نور بانو کو ہی خیال آ گیا تھا، اور اب ہر روز وہی کھانا پکا کر اسے بھیجتی تھی۔ وہ اس پر یقین کر لینا چاہتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں؟ دل نہیں مانتا تھا۔

ایک رات اس سے رہا نہیں گیا۔

''آج کھانا تم نے بھیجا تھا؟''

نور بانو بری طرح چونکی۔

''کیوں؟ اچھا نہیں تھا؟''

''نہیں! بہت اچھا تھا۔''

''تو پھر پوچھا کیوں آپ نے؟''

''ایسے ہی .....!'' عبدالحق نے ٹالنے کے لئے کہا۔ اب وہ یہ قصہ چھیڑ کر پچھتا رہا تھا۔ نوربانو کے انداز سے اس نے بروقت سمجھ لیا تھا کہ اس بار بھی ہ کہے گی کہ وہ اٹھ نہیں پائی تھی، ارجمند نے اپنا شوق پورا کیا تھا۔ اس کی چھٹی س بتا رہی تھی کہ نوربانو کو یہ بھی یاد نہیں ہے کہ ارجمند اب اسکول جانے لگی ہے۔ اب اس نے بات آگے بڑھائی تو کسی نہ کسی مرحلے پر اسے یاد آئے گا کہ رجمند تو اسکول جاتی ہے۔ پھر وہ نسیمہ سے پوچھ گچھ کرے گی، اور وہ نوکروں کو ن معاملات میں ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ وہ تو نوربانو سے جھوٹ بھی نہیں انا چاہتا تھا۔ یہ کیسی غلطی کر بیٹھا ہے وہ۔

''کوئی بات تو ہوگی؟'' نوربانو نے اسے کریدا۔

وہ جانتا تھا کہ اب وہ پیچھے پڑ جائے گی۔ اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔

''آج کھانا معمول سے زیادہ اچھا تھا۔'' اس نے سچائی سے کہا۔

نوربانو نے سکون کی سانس لی۔

''آپ نے بہت محبت سے کھایا ہوگا، اس لئے اچھا لگا۔'' اس نے اٹھلا کر کہا۔

''یہ تو تمہارا انکسار ہے۔ اور محبت تو میں تم سے ہر پل کرتا ہوں۔''

بات ادھر ادھر ہوگئی۔ لیکن عبدالحق کی الجھن اس صبح ہی دور ہوگئی۔

وہ معمول کے مطابق تہجد کے لئے اٹھا۔ لیکن طبیعت میں کچھ بھاری پن سا تھا۔ نماز پڑھ کر وہ لان میں چلا گیا۔ ننگے پاؤں گھاس پر چلنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ذرا سی چہل قدمی کے بعد وہ بھاری پن دور ہو جائے گا۔

وہ ٹہلتا ہوا آگے بڑھا تو اسے ایک غیر معمولی بات نظر آئی۔ کچن کی کھڑکی روشن تھی۔ اس نے سوچا، ممکن ہے کوئی لائٹ آف کرنا بھول گیا ہو۔ اور کھڑکی بند تھی۔ اس نے سوچا کہ اندر جائے گا تو لائٹ آف کر دے گا۔

ذرا دیر بعد طبیعت ہلکی ہوئی تو وہ اندر گیا۔ کچن کی لائٹ اب بھی اس

کے دماغ میں چبھ رہی تھی۔ چنانچہ وہ کچن کی طرف چلا گیا۔ لیکن وہاں پہنچ کر اسے حیرت ہوئی۔ کچن میں کوئی کام میں مصروف تھا۔

وہ حیرت در حیرت تھی۔ کچن میں اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ملازم ابھی جاگے بھی نہیں ہوں گے۔ اگر نوربانو کو وہ بیڈروم میں سوتا چھوڑ کر نہ آیا ہوتا تو یہی سمجھتا کہ وہ نوربانو ہوگی۔ رات کو اکثر اس کی نیند اڑ جاتی تھی تبھی تو وہ دن چڑھے تک سوتی تھی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ وقت نوربانو کے جاگنے کا ہے ہی نہیں۔

مستحسانہ انداز میں وہ دبے پاؤں آگے بڑھا، اور اندر جھانکا۔ وہ ارجمند تھی۔ اور یقیناً وہ کھانا پکا رہی تھی۔

وہ آگے بڑھ کر اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے بروقت خود کو روک لیا۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس کے دفتر کے لئے کھانا اب بھی ارجمند ہی پکاتی تھی۔ اسے حیرت نہیں ہوئی۔ شاید اس کے لاشعور نے یہ حقیقت پہلے ہی سمجھ لی تھی۔

پھر بھی استفسار کو اس کا جی چاہا، وہ اس کی زبانی حقیقت سننا چاہتا تھا۔ لیکن اسے یاد آیا کہ رات اس نے جھوٹ کی عادی نوربانو کو جھوٹ سے بچانے کے لئے بات ختم کر دی تھی۔ تو یہ تو ہمیشہ سچ بولنے والی ارجمند کا معاملہ تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ اس کے پوچھنے پر ارجمند کو نہ چاہتے ہوئے بھی جھوٹ بولنا پڑے گا۔ اور یہی نہیں، ارجمند شرمندہ بھی ہوگی۔ اور جب وہ حقیقت جان گیا ہے تو کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

وہ جیسے دبے پاؤں آیا تھا، ویسے ہی واپس پلٹ گیا۔ اس روز اسے ارجمند پر بہت پیار آیا۔ اسے پہلے بار احساس ہوا کہ اس بچی میں کوئی غیر معمولی بات ہے.....ایسی بات جو اللہ کے ان بندوں میں ہوتی ہے جنہیں اس نے بڑائی دی ہو۔ وہ چھوٹی سی تھی لیکن سچ بولتی تھی۔ اللہ سے ڈرتی تھی۔ عالی ظرف تھی۔ اس کے ایثار کی شان ہی اور تھی۔ صرف اتنا نہیں تھا کہ وہ کسی اور کو کریڈٹ دلوانے کے لئے خود محنت کرتی تھی بلکہ اسے شرمندگی سے بچانے کے لئے وہ

جھوٹ بھی بولتی تھی، جو اسے سخت ناپسند تھا۔ ایسا ایثار محبت کے بغیر کوئی نہیں کر سکتا۔ اور عبدالحق نے یہ بات بھی سمجھ لی تھی کہ ارجمند کا خمیر ہی محبت کی مٹی سے اٹھایا گیا ہے۔

وہ اسٹڈی میں گیا اور قرآن کی تلاوت میں مصروف ہو گیا۔

❁ ❁ ❁

کمرہ عورتوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ کمرے میں آتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ برابر والے کمرے میں مرد ہی مرد تھے۔ حمیدہ اور نسیمہ کو دروازے کے قریب ہی بیٹھنے کی جگہ ملی، وہ بھی مشکل سے۔ جیسے تیسے وہ وہاں سمٹ کر بیٹھ گئیں۔

حمیدہ نے کمرے کا جائزہ گیا۔ جس دروازے سے وہ آئی تھی، اس کے عین سامنے والی دیوار میں ایک اور دروازہ تھا۔ دروازے پر بھاری چق تھی۔ یہ یقیناً بابا جی کا کمرہ ہے۔ اس نے سوچا۔

اب حمیدہ کو احساس ہو رہا تھا کہ یہاں آ کر اس نے غلطی کی ہے۔ کم از کم اس وقت اسے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ ادھر عورتوں کے ہجوم کو دیکھ کر ہی اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ کئی گھنٹوں تک اس کی باری نہیں آئے گی۔ جبکہ دوسری طرف مرد بھی کم نہیں تھے۔ جلد بازی اور بے صبرا پن بہت بری چیزیں ہیں۔

لیکن غلطی اس کی بھی نہیں تھی۔ وہ تو صبح سویرے یہی سوچ کر چلی آئی تھی کہ اس وقت زیادہ لوگ نہیں ہوں گے۔ اور اس کا کام آسانی سے ہو جائے گا۔ لیکن یہاں تو لگتا تھا کہ لوگ فجر سے آئے بیٹھے ہیں۔

اور کہنے کو وہ کمرہ تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر حمیدہ کو ٹھاکر جی کی حویلی کی بیٹھک یاد آ گئی۔ وہاں سو آدمی بھی ہوتے تھے تو پتا نہیں چلتا تھا۔ یہاں بھی اس کے اندازے کے مطابق عورتیں سو سے زیادہ ہی تھیں۔

حمیدہ کو ارجمند کی طرف سے تشویش ہونے لگی۔ اب یہاں سے وہ بابا سے ملے بغیر تو نہیں جا سکتی تھی اور اس دوران یقیناً اسکول کی چھٹی ہو جاتی۔ ارجمند بے چاری کو تو گھر کا راستہ بھی معلوم نہیں تھا۔

وہ سب کچھ بھول کر اس مسئلے کا حل سوچتی رہی۔ پھر اس کی سمجھ میں آ گیا۔ اس نے سوچا، وہ نسیمہ کو چھٹی کے وقت یعقوب کے ساتھ سکول بھیج دے گی۔ نکی کو گھر پہنچا کر وہ دونوں پھر واپس آ جائیں گے۔

اس فیصلے پر پہنچ کر وہ پُرسکون ہو گئی۔ اس نے چق پڑے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک عورت کھڑی تھی۔ وہاں موجود عورتوں کی طرح وہ دیکھنے میں ضرورت مند نہیں لگ رہی تھی۔ البتہ اس کا انداز دربانوں جیسا تھا۔

حمیدہ عورتوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ وہ سب دبی آواز میں ایک دوسرے کو اپنے اپنے دکھڑے سنا رہی تھیں۔ کسی کی ساس ظالم تھی تو کسی کو اپنے شوہر سے شکایت تھی۔ لیکن وہاں زیادہ معاملات بیماریوں کے تھے۔

''بڑی تائید ہے بابا کی دعا میں۔'' ایک عورت کہہ رہی تھی۔

''پڑھا ہوا پانی دیتے ہیں۔''

''اور بندہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔'' دوسری نے ٹکڑا لگایا۔

''دوبارہ آنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

''اللہ لوگ ہیں۔'' تیسری بولی۔

حمیدہ کو ان باتوں سے ڈھارس ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کو اس کی نظریں چق والے دروازے کی طرف اٹھیں۔ دروازے پر کھڑی عورت چق اٹھا کر اندر جا رہی تھی۔ اب تک نہ اس نے کسی کو کمرے میں جاتے دیکھا تھا اور نہ باہر آتے۔

وہ سحر زدہ سی چق کو تکتی رہی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کیا؟ یہ اسے معلوم نہیں تھا۔

پھر وہی عورت باہر آئی اور عورتوں کے درمیان جگہ بناتی آگے بڑھنے لگی۔ بیٹھی ہوئی عورتیں بڑے احترام سے اس کے لئے جگہ بنا رہی تھیں۔ حمیدہ دربان عورت کو دیکھ رہی تھی۔ اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ بھی اس کو دیکھ رہی ہے۔ لیکن شاید یہ اس کا وہم تھا۔

لیکن چند لمحوں میں وہ عورت عین اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''چلو......! بابا تمہیں بلا رہے ہیں۔''

حمیدہ نے بے یقینی سے ادھر ادھر دیکھا کہ شاید وہ کسی اور سے مخاطب ہوگی۔ کیونکہ وہ تو سب سے آخر میں یہاں آئی ہے۔

''میں تم سے کہہ رہی ہوں۔'' عورت نے حمیدہ سے کہا۔

''مجھ سے؟ مجھے بلا رہے ہیں بابا؟'' حمیدہ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے خیال میں عورت کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔

''ہاں تمہیں، تمہارا نام حمیدہ ہے نا؟''

اب حمیدہ کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔ لیکن شک کی کوئی گنجائش بھی نہیں تھی۔ دل نے کہا۔ یہ بابا یقیناً اللہ کا کوئی ولی ہے۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ادھر ادھر دیکھا۔ لیکن اس کا خدشہ بے بنیاد تھا۔ کسی عورت نے کوئی احتجاج نہیں کیا تھا۔

نسیمہ بھی اٹھی لیکن عورت نے اسے منع کر دیا۔

''تیرا کوئی کام نہیں ہے۔ تو بیٹھی رہ۔''

حمیدہ دربان عورت کے ساتھ آگے بڑھی۔ بیٹھی ہوئی عورتیں اب ان دونوں کے لئے احترام کے ساتھ راستہ بنا رہی تھیں۔

دروازے پر پہنچ کر دربان عورت رک گئی۔

''تم اندر جاؤ۔''

حمیدہ ایک لمحے کو جھجکی، پھر اس نے چیت اٹھائی اور اندر والے کمرے میں داخل ہوگئی۔

وہ ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ اور بہت سادہ۔ ایک دری بچھی تھی، جس پر وہ بابا بیٹھا تھا۔ وہاں نہ کوئی تکیہ تھا نہ گاؤ تکیہ، نہ کوئی میز۔ دیوار کے ساتھ بس ایک مصلی تہہ کیا ہوا رکھا تھا۔ دوسری دیوار کے ساتھ ایک مٹکا تھا، جس پر پانی نکالنے کا مگ اور ایک کٹورا رکھا تھا۔

اس نے ایک چھوٹے سے پل کو، بس ایک نظر بابا کو دیکھا، پھر اس کی نظریں خود بخود جھک گئیں۔ اس چہرے پر ایسا ہی جلال تھا کہ اسے نظر بھر کر نہیں

دیکھا جا سکتا تھا۔ حمیدہ کا جسم کانپنے لگا۔

''بیٹھ جا!'' بابا نے کہا اور خود اٹھ کر مٹکے کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے وہ کٹورے میں اس کے لئے پانی لے کر آیا۔

''لے یہ پی لے۔ پرائے معاملے میں خود کو تھکاتی ہے۔ ماری ماری پھرتی ہے۔''

''پرایا معاملہ کیسا بابا؟ وہ میرا بیٹا ہے۔'' حمیدہ نے تڑپ کر کہا۔

''بے شک وہ تیرا بیٹا ہے۔'' بابا نے اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اور بچہ پیدا ہو جائے تو سب کا ہوتا ہے۔ پر اس سے پہلے تو وہ کسی کا معاملہ نہیں ہوتا، تیرا کیا بیچ اس میں۔''

''میں کچھ نہیں لگتی اس......''

''میں نے کہا نا! بچے کا معاملہ شوہر اور بیوی کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ اس میں کسی کا بیچ نہیں۔''

''میں اس کے بچے کی آس میں تو جی رہی ہوں۔''

''بری بات!'' بابا نے نرم لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

''نہ کوئی اپنی مرضی سے جیتا ہے، نہ کوئی اپنی مرضی سے مرتا ہے۔ اوپر والے نے جتنی دی ہے اتنی ہی جیئے گی تو۔ اور جب اس کا حکم ہوگا، مر جائے گی۔''

''پر بابا......!''

''پھر وہی بات، مدعی سست خواہ چست۔'' بابا نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔

''تو مدعی تو نہیں ہے۔''

''پر ضرورت مند تو ہوں۔'' حمیدہ نے بڑی لجاجت سے کہا۔

''مدعی تو تو ہے نہیں۔ اور خود کہتی ہے کہ ضرورت مند ہے۔ تو ضرورت مند کی تو گواہی بھی سچی نہیں ہوتی۔''

حمیدہ کو لگا کہ وہ صحیح جگہ پہنچ گئی ہے۔

"کچھ بھی ہو بابا! میں یہاں نامراد نہیں جاؤں گی۔"

"جو تیری مراد ہے، ہی نہیں، اس کے لئے کوئی کیا کرے؟"

"تم میری سفارش کرو اللہ سے۔"

"اس کے ہاں سفارش بھی اس کے اذن سے ہے۔ ورنہ کسی کی کیا مجال؟" یہ کہتے کہتے بابا پر تھرتھری چڑھ گئی۔

"تو لے تو نا اجازت!"

"نہیں ملے گی۔ کیسے مل سکتی ہے۔ اگر وہ پہلے ہی کسی سے وعدہ کر چکا ہو۔" بابا نے چھت کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"وہ اپنے وعدے کے خلاف کبھی نہیں کرتا۔ میں اس سے وعدہ شکنی کو کہوں تو وہ مجھ سے ناراض ہوگا، مجھے چھوڑ دے گا۔"

"میرے لئے دعا کرو بابا!" حمیدہ گڑگڑائی۔

"تیرے لئے تو دعا کر سکتا ہوں، اور کروں گا۔ لیکن جو تو چاہتی ہے، اس کے لئے دعا نہیں کر سکتا۔ تو مدعی کو لے کر آ، تبھی کچھ ہو سکتا ہے۔"

حمیدہ کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

"دعا تو آدمی کچھ کر سکتا ہے۔" اس نے دلیل دی۔

بابا کو جلال آ گیا۔

"تو کیا تجھے خوش کرنے کے لئے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کی دعا کروں میں۔ تباہ ہو جاؤں تیری خاطر۔"

"یہ ایسی دعا تو نہیں ہے بابا!"

"تجھے کیا معلوم، تو سمجھ بھی نہیں سکتی۔"

حمیدہ نے لپک کر بابا کے پاؤں پکڑ لئے۔

"کچھ کرو بابا!"

"یہ کیا کرتی ہے، چھوڑ میرے پاؤں۔" بابا نے اسے جھٹکنے کی کوشش کی۔

لیکن حمیدہ مضبوطی سے اس کے پاؤں پکڑے ہوئے تھی۔

"اچھا! پاؤں چھوڑ میرے، میں کچھ سوچتا ہوں۔"

حمیدہ نے پاؤں چھوڑ دیئے۔ بابا نے آنکھیں موند لیں۔ اس کے چہرے پر گہرا استغراق تھا۔ ان لمحوں میں حمیدہ اسے دیکھ سکتی تھی، اور دیکھتی رہی لیکن جب ہی بابا نے آنکھیں کھولیں۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

چند لمحے خاموش رہی۔ حمیدہ میں کچھ بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ بالآخر بابا نے کہا۔

"بس ایک ہی صورت ہے۔ پہلے کسی اور سے اجازت لینی ہوگی۔ اس کے بعد شاید اللہ سے بھی اجازت مل جائے۔"

"تو اجازت لے لو نا بابا!"

"اس لئے تو کہتا ہوں کہ مدعی کو ساتھ لے کر آ۔"

حمیدہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

"کسے ساتھ لاؤں؟"

"اسے جس کے ہاں اولاد کی آرزو ہے تجھے۔ اپنی بہو کو لے کر آ۔"

حمیدہ حیران رہ گئی۔

"تم اس سے اجازت لو گے بابا؟"

"ہاں! اس کے بغیر بات نہیں بن سکتی۔"

"پر کیوں بابا؟"

"یہ تو سمجھ نہیں سکتی۔ اور میں تجھے سمجھاؤں گا نہیں۔"

"لیکن بابا......!"

"بس اب تو جا...... چلی جا...... تجھ سے بن پڑے تو اسے لے کر آ۔ اس کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔"

حمیدہ جانا نہیں چاہتی تھی لیکن سمجھتی تھی کہ اب رکنا نقصان دہ ہوگا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں اسے لے کر آؤں گی بابا!"

"کوشش کر لے۔ آگے ربّ جانے۔" بابا نے کہا۔ پھر دوسری طرف

والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

''ادھر سے جانا۔''

حمیدہ اس دروازے سے نکلی تو سامنے ایک احاطہ تھا۔ نسیمہ وہاں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

***

حمیدہ کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بھید کیا ہے۔ عبدالحق کے لئے اولاد کی دعا سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کی دعا کے برابر کیسے ہوگئی۔ سورج تو مغرب سے کبھی نہیں نکلتا۔ لیکن یہ تو عام بات ہے کہ لوگوں کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔ وہ خود بھی دعا کرتے ہیں اور جگہ جگہ دعا کے لئے جھولی پھیلائے پھرتے ہیں۔ اور اللہ والے بابے ان کے لئے دعا بھی کرتے ہیں، اور وہ قبول بھی ہوتی ہے۔ پھر محروميوں کے ہاں اولاد بھی ہوتی ہے۔ تو پھر اس کے عبدالحق کے ساتھ ایسا کیسے ہوگیا۔

اس پر اسے سوچتے ہوئے ایسا لگا کہ یہ معاملہ عبدالحق کا نہیں، نور بانو کا ہے۔ وہ محض ایک خیال تھا، جس کی کوئی وجہ اسے معلوم نہیں تھی۔ لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا کہ بات یہی ہے۔ اس نے بابا سے ہونے والی بات چیت کو یاد کیا۔ بالآخر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ بابا نے بار بار کہا تھا کہ مدعی کو لے کر آ۔ مدعی ست گواہ چست۔ تو تو بس گواہ ہے، مدعی نہیں۔ پھر بابا نے ایک عجیب بات کہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اللہ سے دعا کرنے سے پہلے کسی اور سے اجازت لینی ہوگی۔ اور اس کے پوچھنے پر اس نے کہا تھا کہ اپنی بہو کو لے کر آ۔

تو یہ تو طے تھا کہ اس معاملے میں عبدالحق مدعی نہیں ہے، صرف نور بانو ہے۔ مگر الجھن کی بات تو یہ بھی تھی۔ بچہ تو ماں اور باپ دونوں کا ہوتا ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو وہ باپ کا زیادہ ہوتا ہے۔ وہ باپ کا خون کہلاتا ہے، باپ کی نسل کو آگے بڑھاتا ہے۔ تو پھر یہاں باپ مدعی کیوں نہیں، ماں کیوں مدعی ہے۔ اور وہ بھی ایسی کہ اس دعا کے لئے بابا کو نور بانو سے اجازت لینی ہے۔

وہ سوچتی رہی، مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ تھک کر اس نے سوچا۔

سمجھنے کی ایسی ضرورت بھی کیا ہے۔ سمجھ کر اسے کیا کرنا ہے۔ اسے تو بس اولاد چاہئے اپنے بیٹے کے لئے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ وہ نور بانو کو بابا کے پاس لے جائے اور بابا کی شرط پوری کر دے۔ پھر بابا دعا کرے گا، اور اللہ نے چاہا تو اس کی مراد پوری ہو جائے گی۔

تو اس کے لئے اسے نور بانو سے بات کرنی تھی، اسے بابا کے پاس چلنے پر راضی کرنا تھا۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ جانے کیا بات تھی کہ بچے کے بارے میں بات کرنے پر نور بانو بھڑک جاتی تھی۔

کوئی بات نہیں، حمیدہ نے سوچا۔ ضرورت پڑی تو انگلیاں ٹیڑھی کر لے گی۔ وہ کمزور تو نہیں۔ وہ تو ایک فرمانبردار بیٹے کی ماں ہے، جو اس کی بات کبھی نہیں ٹالتا۔ تو نور بانو کی کیا ہستی ہے۔

اس نے نور بانو کو کمرے میں بلوا لیا۔ لیکن بات شروع کرنے سے پہلے ایک تجسس نے اسے جکڑ لیا۔ یہ نور بانو کو جو اتنی اہمیت ہے کہ بابا کے دعا کرنے کے لئے اس کی اجازت چاہئے، تو اس کا نور بانو کو بھی پتا تو ہوگا۔ پہلے اس سے یہ تو پوچھا جائے۔

نور بانو اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے اماں؟''

''ایک بات پوچھنی ہے تجھ سے۔''

''پوچھو اماں!''

لیکن اب حمیدہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا پوچھے، اور کس طرح پوچھے؟ کیا وہ اس سے یہ پوچھے کہ اولاد کے معاملے میں اس کی اہمیت عبدالحق سے زیادہ کیوں ہوگئی ہے۔ یہ تو بے وقوفی کی بات ہوگی۔ بہتر یہی ہے کہ کام کی بات کی جائے۔

''تجھے بچے کی کوئی فکر نہیں ہے دھیے!''

''کیوں نہیں ہے اماں! لیکن میں کیا کروں؟ سویٹر تو ہے نہیں کہ بن کر تمہاری گود میں ڈال دوں۔ بچہ ہے۔ اللہ کی مرضی کے بغیر تو کچھ ہوگا نہیں۔''

نوربانو نے دکھ اور بے بسی سے کہا۔

حمیدہ کو اس پر ترس آنے لگا۔ کہہ تو وہ سچ ہی رہی تھی۔

''دیکھو میری دھی! اولاد نہ ہو تو سمجھ کہ اللہ ناراض ہے۔ اور اللہ ناراض ہو تو اسے منانا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔''

نوربانو نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم سمجھتی ہوں اماں! کہ میں کچھ نہیں کرتی۔ میں بہت دعا کرتی ہوں۔''

''بندے کے اپنے مانگنے سے کچھ نہ ملے تو سفارش ڈھونڈنی پڑتی ہے۔''

اس بار زبان کی فطری تیزی نوربانو کی مصلحت پر غالب آ گئی۔

''میری اولاد کی فکر تو تمہیں بھی بہت ہے اماں! بلکہ شاید مجھ سے بھی زیادہ ہی ہے۔'' وہ بولی۔

''ہاں ہے، تو اس میں بری بات کیا ہے؟'' حمیدہ نے تحمل سے نرم لہجے میں کہا۔

''تو تم مجھ سے زیادہ ہی دعا کرتی ہو گی؟''

''یہ تو مجھے نہیں پتا، پر دعا میں بہت کرتی ہوں۔''

''قبول تو نہیں ہوئی آج تک۔'' نوربانو نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اللہ تم سے ناراض ہے۔''

حمیدہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔

''ہاں دھیے! بات سچی ہے۔''

''تو پھر مناؤ نا اللہ کو، کوئی سفارش ڈھونڈو نا، جو کام کر جائے۔''

اس بار حمیدہ کی برداشت جواب دے گئی۔

''میں تیری طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھی رہتی۔ ہر طرح کی کوشش کرتی ہوں۔''

''تو سفارش بھی کام نہیں آئی، اور کسی کوشش سے بھی کچھ حاصل نہیں

ہوا؟''

''صرف تیری وجہ سے۔'' حمیدہ نے غصے سے کہا۔

''تو چاہتی ہی نہیں کہ تیرے ہاں بچہ ہو۔''

حمیدہ کی اس بات نے نوربانو کو ڈرا دیا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سچ ہے۔ ایسے ہی مدافعانہ انداز اختیار کرنا اچھا نہیں تھا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو اماں!'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔

''یہ تو الزام لگانا ہے۔ تمہیں اللہ سے ڈر نہیں لگتا۔''

''وجہ ہے تو کہہ رہی ہوں، بے وجہ نہیں۔''

''وہ وجہ مجھے بھی تو معلوم ہو ذرا۔''

''میں تیری اولاد کے لئے کہاں کہاں نہیں گئی۔ کسی نے دم کر کے پانی دیا، کسی نے پڑھے ہوئے چنے دیئے، پر مجھے معلوم ہے، تو نے کبھی نہ پانی پیا، نہ کوئی چیز کھائی۔''

''غلط کہہ رہی ہو اماں! کھایا بھی، پیا بھی...... صرف تمہاری خاطر۔''

''لیکن باقاعدگی سے نہیں کیا۔''

''میری بات سنو اماں! میں تمہیں بتاتی ہوں کہ اللہ تم سے کیوں ناراض ہے؟ تمہارا معاملہ یہ ہے کہ مدعی سست اور گواہ چست......''

حمیدہ دہل کر رہ گئی۔ یہی بات تو بابا نے کہی تھی۔

نوربانو اس کی کیفیت سے بے خبر اپنی کہتی رہی۔

''میری اولاد کی تمہیں مجھ سے زیادہ آرزو ہے۔ اسے کہتے ہیں۔ ماں سے زیادہ چاہے، پھپھے کٹنی کہلائے۔ اپنے حق سے بڑھ کر کچھ کرو گی تو اللہ تو ناراض ہو گا ہی۔''

ایک لمحے کو تو حمیدہ کو احساسِ جرم ہونے لگا۔ لیکن پھر اسے بابا کی بات یاد آ گئی۔

''چل ٹھیک ہے۔ مدعی تو ہے۔ میں نے تجھ سے آگے بڑھ کر کوشش کی تو اللہ مجھ سے ناراض ہو گیا۔ وہ معاف کرنے والا ہے۔ میں توبہ کر لوں گی۔ پر تو

یہ تو مانتی ہے نا کہ مدعی تو ہے؟''

نور بانو حمیدہ کی اس مدافعت پر خوش ہوگئی۔

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔''

''تو کیا پتا، اللہ تجھ سے اس لئے ناراض ہو کہ تو مدعی ہو کر بھی کچھ نہیں کرتی۔ تیرا شوہر تجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کی بھی یہی آرزو ہے۔ پر وہ تجھ سے اس لئے کچھ نہیں کہتا کہ تیرا دل دکھے گا۔ لیکن تو اس کی آرزو پوری کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں کرتی۔''

''کرتی تو ہوں۔ دعا بھی کرتی ہوں اور توبہ بھی۔'' نور بانو نے جھنجلا کر کہا۔

''تو پھر کوئی سفارش تلاش کر۔''

''کہاں سے لاؤں کوئی سفارش؟''

''میری طرح در در پھر کر تلاش کر۔''

''تمہاری ہی کب کسی نے سن لی۔'' نور بانو نے زہریلے لہجے میں کہا۔

مگر اب حمیدہ کو دلیل مل گئی تھی۔

''میں تو گواہ تھی، میرا کوئی پیچ نہیں تھا۔ میں تو پچھے کٹنی تھی۔ میری کون سنتا۔ پر تو تو مدعی ہے۔ تیری تو انشاء اللہ ضرور سنی جائے گی۔''

''میں کہیں نہیں جا سکتی اماں! مجھے شرم آتی ہے۔''

''میں تجھے نہیں چھوڑوں گی۔ تجھے میرے ساتھ جانا ہی ہوگا۔''

''کوشش کر لو اماں! میں مر جاؤں گی پر وہاں نہیں جاؤں گی۔''

''میں عبدالحق سے بات کروں گی۔''

نور بانو اتنی خوفزدہ تھی کہ اس دھمکی کا بھی اس پر اثر نہیں ہوا۔ وہ تو بس ایک بات جانتی تھی۔ یہ کہ اسے اس بابا کا سامنا نہیں کرنا ہے۔ اس کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔

''وہ کہیں گے، تب بھی نہیں جاؤں گی۔'' اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

حمیدہ اسے گھورتی رہی۔ غصے سے اس کا برا حال تھا۔

''میں اب تک ایک امید پر صبر کرتی رہی۔'' اس نے کہا۔

''لیکن آج تو نے میری آس توڑ دی۔ میں نے ہمیشہ تجھے بیٹی سمجھا۔ لیکن تو کبھی بیٹی بنی نہیں۔ اب میں تجھے بتا دوں کہ میں عبدالحق کو حکم دوں گی دوسری شادی کا۔ اور تو جانتی ہے کہ وہ ٹال نہیں سکتا۔ میں اسے اولاد سے محروم نہیں رہنے دوں گی۔ اس کی نسل کو ختم نہیں ہونے دوں گی۔ میں اس کی دوسری شادی کرواؤں گی۔ تو جو کر سکتی ہے کر لے۔ تیری خالی کوکھ تجھے مبارک۔ لیکن عبدالحق کے آنگن میں اس کے بچے ضرور کھیلیں گے۔''

نور بانو کے تو پیروں تلے سے جیسے زمین نکل گئی۔ اتنے شدید ردعمل کی اسے توقع نہیں تھی اور وہ جانتی تھی کہ حمیدہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ تو اب یہ ہو کر رہے گا۔ دشواری یہ تھی کہ وہ خود فیصلہ کن بات کر چکی تھی، اور پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ اپنی فطرت کے خلاف، خود پر جبر کر کے وہ سر جھکا بھی لیتی۔ لیکن بابا کا سامنا کرتی تو اس کا گھٹیا پن کھل جاتا۔ وہ تو اس کے لئے مر جانے کے برابر تھا۔ اور دوسری طرف حمیدہ نے بھی ہر راستہ بند کر دیا تھا۔ کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے دل میں کوئی گنجائش رہی ہی نہیں۔ ہوتی تو وہ آخر میں کہتی...... سوچ لے۔ ابھی تیرے پاس موقع ہے۔ میرے ساتھ بابا کے پاس چلی چل۔ لیکن اس نے یہ نہیں کہا۔

وہ اور کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''تیرے آنسو دیکھ کر کبھی میں تڑپ جاتی تھی۔ پر اب ان سے کچھ نہیں ہونے والا!'' حمیدہ نے بے رحمی سے کہا۔

''تجھے نہ تو میرا لحاظ ہے اور نہ ہی عبدالحق سے محبت ہے۔ نہ تو اچھی بیٹی ہے، نہ اچھی بیوی۔ تو پھر اچھی ماں کیسے بن سکتی ہے۔ جا...... تو میرے کمرے سے چلی جا۔ میں آج رات کو ہی عبدالحق سے بات کروں گی۔''

نور بانو ڈھیٹ بنی بیٹھی روتی رہی کہ شاید حمیدہ کا دل پسیج جائے۔

''جا...... چلی جا یہاں سے۔ میں اب تیری صورت بھی نہیں دیکھنا

چاہتی۔'' حمیدہ نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

نور بانو اٹھی اور خواب گاہ میں چلی گئی۔ آنسو اس نے پونچھ ڈالے تھے۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ کیسی بدترین غلطی کی ہے اس نے۔ جب اس نے اللہ سے اولاد نہ ہونے کی دعا...... اور وہ بھی رمضان کی طاق راتوں میں صدقِ دل سے کی تھی، اس وقت اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کتنی بڑی بات ہے، اور اس کے کتنے بھیانک نتائج نکلیں گے۔ ہائے مجھے میرا جذبہ رقابت...... میرا احساسِ کمتری کھا گیا۔ اس نے خودترسی سے سوچا۔ اور اب تو کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔

اسے حمیدہ کی بات یاد آگئی۔ وہ کبھی اچھی بیٹی نہیں بنی، نہ اپنی امی کی اور نہ اس محبت کرنے والی ماں جیسی حمیدہ کی۔ بلکہ وہ تو کبھی اچھی بہن بھی نہیں تھی۔ یہ بات حمیدہ کو...... کسی کو بھی نہیں معلوم تھی۔ اور واقعی وہ کبھی اچھی بیوی بھی نہیں بنی۔ اور حمیدہ کی یہ بات بھی سچی تھی کہ وہ کبھی اچھی ماں بھی نہیں بن سکتی۔ یہ ثابت کرنے کے لئے تو اس کی رمضان کی طاق راتوں میں کی جانے والی وہ بددعا ہی کافی تھی۔ تو اللہ اسے ماں کیوں بنائے دے گا۔

آخر خرابی کیا ہے مجھ میں؟ اس نے سوچا۔ اور جواب فوراً ہی مل گیا۔ اسے خود تو محبت کی ہوس ہے، ہوکا ہے، لیکن وہ خود کسی سے بھی محبت نہیں کرتی...... کسی سے بھی نہیں۔ عبدالحق سے بھی نہیں۔

اس بار وہ سچ مچ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

کافی دیر بعد اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو اس نے دل میں کہا...... میرے اللہ! اس بار مجھے بچا لیجئے۔ پھر میں سب سے محبت کروں گی...... بے غرض محبت!

لیکن آنے والی رات کا خوف دل میں پنجے گاڑے بیٹھا رہا۔

❁ ❁ ❁

شام کا معمول تھا کہ عبدالحق کے دفتر سے آنے کے بعد وہ سب لان میں چائے پیتے تھے۔ اس روز نور بانو کا بس چلتا تو وہ وہاں ہرگز نہ جاتی لیکن اس میں یہ ڈر تھا کہ حمیدہ رات کو کرنے والی بات شام کو ہی نہ کر بیٹھے۔ دن بھر وہ اس بارے میں سوچتی رہی تھی۔ کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس اس نے یہ

سوچا تھا کہ اپنی طبیعت خراب کر لے گی اور عبدالحق کو الجھائے رکھے گی، حمیدہ کی طرف جانے ہی نہیں دے گی۔

لیکن شام کو میدان خالی نہیں چھوڑنا تھا، اس لئے وہ لان میں چلی آئی۔

بہرحال اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اس میں نظر اٹھا کر کسی کو بھی دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ چائے کی پیالی کو یوں گھور رہی تھی، جیسے اس میں کچھ ڈھونڈ رہی ہو۔

اسے یہ اندازہ بھی نہیں ہوا کہ عبدالحق بہت بجھا بجھا ہے۔ لیکن حمیدہ نے یہ بات دیکھ لی۔ عبدالحق کچھ پریشان تھا۔ بار بار اس کے ہونٹ تھرتھراتے، جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہو، لیکن رک جاتا ہو۔

''کیا بات ہے پتر! تو کچھ پریشان ہے آج۔'' بالآخر حمیدہ نے پوچھ ہی لیا۔

یہ سن کر نور بانو سے بھی نہیں رہا گیا۔ اس نے نظر اٹھا کر عبدالحق کو دیکھا۔ وہ واقعی پریشان لگ رہا تھا۔ وہ اور پریشان ہوگئی۔ اسے لگا کہ شاید یہ بھی اس کی وجہ سے ہے۔ آدمی جب ڈرا ہوا ہو تو ہر پریشانی کو خود سے منسوب کر لیتا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن اور تیز ہوگئی۔ وہ اندر ہی اندر لرز رہی تھی۔ چائے کی پیالی اٹھا کر گھونٹ لینے کا بھی اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ چائے کی پیالی اٹھا سکے گی۔ لگتا تھا کہ اس کے ہاتھ لرز رہے ہیں۔

''کچھ نہیں اماں! کوئی خاص بات نہیں۔'' عبدالحق نے کہا۔ لیکن لہجے سے لگتا تھا کہ وہ کوئی بڑی بات چھپا رہا ہے۔

''کچھ تو ہے پتر!'' حمیدہ نے کہا۔

''جو کہنا ہوتا ہے وہ تو کہنا ہوتا ہے۔ تو اچھا ہے، پہلے ہی بوجھ ہلکا کر دے۔''

''وہ اماں...... بات یہ ہے کہ......'' عبدالحق کہتے کہتے رک گیا۔

''کہہ دے پتر! نہ کہنے سے کچھ بدلتا نہیں ہے۔'' حمیدہ کے لہجے میں تھکی تھی۔

''میرا کراچی تبادلہ ہوگیا ہے اماں!'' عبدالحق نے کہا۔

عبدالحق کا کہنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ ایک پل کو نور بانو کو دھچکا لگا اور وہ گھبرا گئی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کا جی چاہا کہ وہ زور زور سے ہنسے، قہقہے لگائے۔ ارے ...... یہ تو وہ کب سے دعا کر رہی تھی۔ اور اللہ نے کیسے موقع پر اس کی دعا قبول کی، جب اس کا سب کچھ ختم ہونے والا تھا۔ یہ تو غیبی امداد تھی اس کے لئے۔

اس کا انداز بالکل بدل گیا۔ اب وہ پُراعتماد تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر ایک ایک کو دیکھا۔ اب حمیدہ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ عبدالحق تو پہلے ہی پریشان تھا۔ ایک ارجمند تھی، جس کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔

بات ایسی تھی کہ شعور تک پہنچنے میں کچھ وقت لگا۔ اتنی دیر خاموشی رہی۔ پھر حمیدہ نے دھیرے سے کہا۔

''جو اللہ کی مرضی!''

''میں استعفیٰ دے سکتا ہوں اماں! ملازمت چھوڑ سکتا ہوں۔ مجھے اس کی ضرورت تو نہیں ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''بس تم ایک بار حکم کر دو۔''

نور بانو کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ یہ کیا ......؟ پہلا حکم نوکری چھوڑنے کا ہوگا، وہ بھی فرمائشی۔ اور اس کے بعد دوسرا حکم دوسری شادی کا ہوگا۔ نوکری کی طرح پہلی بیوی بھی چھوڑ دو۔

وہ ایک ٹک حمیدہ کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے حمیدہ کے چہرے پر مضبوطی ابھری۔

''نہیں پتر! مولوی صاحب کا حکم نہیں ٹالنا۔'' وہ بولی۔

''اور وہ تیرے چچا کہتے ہیں کہ یہ قوم کی ضرورت ہے۔ تو میں خود غرض تو نہیں ہوں پتر!''

''میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں اماں!'' عبدالحق کی آواز لرزنے لگی۔

''کیوں نہیں جا سکتا۔ دہلی پڑھنے کے لئے نہیں گیا تھا تو ...... میرے وصال دین کے ساتھ۔'' حمیدہ جیسے کہیں بہت دور سے بول رہی تھی۔

''اس کے چاچے کو ڈھونڈنے یہاں لہور نہیں آیا تھا تو ......'' حمیدہ نے نور بانو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تب اور بات تھی اماں! تمہارے ساتھ بہت لوگ تھے۔''

''آدمی کے ساتھ بس ربّ ہوتا ہے اس کا۔'' حمیدہ نے آہ بھر کے کہا۔ پھر ملامت بھرے لہجے میں بولی۔

''بندہ کیسے بھول جاتا ہے اپنے وقت کو۔ لال آندھی میں تو میں اکیلی تھی۔ گاؤں کے گاؤں ختم ہوگئے۔ بندہ نہ بندے کی ذات۔ اس پر اندھا پن، تب کس نے مجھے پالا تیرے آنے تک۔ وہ سب بھول گیا تو......''

عبدالحق شرمندہ ہوگیا۔ واقعی، وہ تو اب بہت دور کے قصے کہانیوں کی بات لگتی تھی، وہ بھی یاد آنے پر۔ ورنہ یاد ہی کہاں تھا وہ سب۔ آدمی واقعی بڑا ناشکرا ہے۔

''میں شرمندہ ہوں اماں! بہرحال میں تو اب تم سے دور نہیں رہنا چاہتا۔''

''دل سے دور ہو بندہ تو دوری ہے پتر!'' حمیدہ نے بڑے رسان سے کہا۔

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

''ٹھیک ہے اماں! پھر ہم سب کراچی چلیں گے۔''

''وہاں کوئی ٹھکانا بھی ہے؟'' نور بانو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی۔ لیکن کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔

''میں نے عارف بھائی کو فون کیا تھا۔ وہ سب بندوبست کر لیں گے۔''

نور بانو اب پھر اذیت میں تھی۔ جان چھوٹنے کا سامان ہوا تھا۔ لیکن جان اب بھی نہیں چھوٹ رہی تھی۔ اس کے لئے تو وہ پل پل رنگ بدلتی صورتِ حال ......

''پر پتر! ہم کراچی نہیں جا سکتے۔'' حمیدہ نے کہا۔ نور بانو کی پھر جان میں جان آئی۔

''کیوں اماں!''

''دیکھ نا، اب میری نکی کی پڑھائی شروع ہوئی ہے۔ اب میں یہاں سے کہیں نہیں جانے والی۔''

''لیکن اماں! ابھی داخلہ ہوئے کچھ دن ہی ہوئے ہیں۔ اور اسکول تو کراچی میں بھی ہیں۔''

نور بانو پھر سانس روک کر بیٹھ گئی۔

''تو ٹھیک ہے، تو نکی سے پوچھ لے۔''

عبدالحق ارجمند کی طرف مڑا۔

''لو......! اماں نے فیصلہ تم پر چھوڑ دیا ہے۔''

''ویسے تو جو آپ لوگوں کی مرضی، میرے لئے وہ حکم ہے۔'' ارجمند نے کہا۔

''لیکن مجھ سے پوچھیں تو میں یہیں پڑھنا چاہتی ہوں۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جانا چاہتی۔ دہلی کے بعد یہی میری پھپھو کا شہر ہے۔''

عبدالحق کو صدمہ سا ہوا۔ اسے ارجمند سے اس جواب کی امید نہیں تھی۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ وہ ہر حال میں اس کے ساتھ جانا چاہے گی۔ لیکن لمحے بعد وہی جواب اس کے لئے خوشی اور اطمینان کا باعث بن گیا۔ اس جواب کا مطلب تھا کہ ارجمند اپنے بچپن کی بات کو بھول چکی ہے۔ چلو، یہ پیچیدگی بھی دور ہوئی۔ اس نے طمانیت سے سوچا۔

نور بانو کا اس وقت جی چاہتا تھا کہ وہ ارجمند کے چہرے کو بوسوں سے بھگو دے۔ اتنا پیار کرے اسے، اتنا پیار کرے کہ بس، اس نے مسئلے کو مستقل بنیاد پر حل کر دیا تھا۔

''تو آپ گاؤں بھی نہیں جائیں گی؟'' عبدالحق نے حمیدہ سے پوچھا۔

''کہا نا پتر! یہاں سے کہیں نہیں جانے والی میں۔ نکی کی پڑھائی کا

سوال ہے۔''

''تو پھر اکیلی رہیں گی یہاں؟''

''اکیلی کہاں؟ اتنے اچھے نوکر دیئے ہیں اللہ نے۔''

''لیکن اماں! کوئی مرد نہ ہو تو بڑا فرق پڑتا ہے۔''

حمیدہ نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

عبدالحق کسی گہری سوچ میں تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے اماں! اس کا حل بھی ہے میرے پاس۔ زبیر بھائی کو یہاں بلا لیں گے۔''

حمیدہ کو اس کی ذمہ داری پر بہت پیار آیا۔ سدا کا ذمہ دار تھا وہ۔

''لیکن گاؤں کا کیا ہوگا؟''

عبدالحق مسکرایا۔

''تم اسے اب بھی گاؤں سمجھتی ہو اماں! ویسے ہی جیسے میں چھوٹا سا بچہ ہوں تمہاری نظر میں۔ وہ تو اچھا خاصا شہر بن گیا ہے اماں! دو تو تھانے ہیں وہاں۔ اور ڈاکٹر صاحب کی بڑی عزت ہے وہاں۔ وہ وہاں کے معاملات سنبھال سکتے ہیں۔ تم فکر نہ کرو اماں! میں خود وہاں جاؤں گا۔''

''اور کراچی کب جانا ہے تجھے؟''

''میرے پاس ایک ہفتے کی مہلت ہے اماں!''

''بس ٹھیک ہے۔ تو یہاں کی فکر نہ کر۔ بس مجھے تو تیری فکر ہے۔ تو وہاں اکیلا ہوگا۔''

''نہیں اماں! عارف بھائی بھی تو ہیں وہاں۔''

❁ ❁ ❁

ایک بہت بڑی تبدیلی بالکل اچانک آ گئی تھی۔ اس رات سونے کے لئے لیٹ کر وہ سب اپنے اپنے انداز میں اسی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ نیند کسی کو بھی نہیں آ رہی تھی۔

حمیدہ وہ بات بھول گئی تھی، جو وہ آج رات عبدالحق سے کرنا چاہتی تھی۔

یاد بھی ہوتی تو اس صورتِ حال میں وہ کبھی نہ کرتی۔ اس وقت تو وہ اس جدائی کے بارے میں سوچ رہی تھی، جو چپکے سے سر پر آ کھڑی ہوئی تھی۔

اس کے پاس برسوں کا تو کوئی پیمانہ نہیں تھا۔ لیکن اتنی سادہ سی بات وہ سمجھ سکتی تھی کہ اب وہ بوڑھی ہوگئی ہے۔ اللہ کا کرم تھا کہ اس نے بڑھاپے کو اس کے لئے کمزوری نہیں بننے دیا تھا۔ وہ کسی کی محتاج نہیں تھی۔ خود اٹھ کر وضو کرتی تھی۔ کھڑی ہو کر نماز پڑھتی تھی۔ یہ دعا اس نے ہمیشہ کی تھی کہ اللہ مرتے وقت تک اسے اس طاقت سے محروم نہ ہونے دے۔ اس کی زندگی میں ایسا کبھی نہ ہو کہ اس میں وضو کرنے کی طاقت نہ رہے یا اسے بیٹھ کر نماز پڑھنی پڑے۔ رکوع و سجود کی جو لذت کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں ہے، وہ بیٹھنے میں کہاں؟

اور ابھی تک اللہ نے اسے محروم نہیں ہونے دیا تھا۔

لیکن وہ جانتی تھی کہ ہے تو اب وہ بوڑھی ہی۔ اور اللہ نے کسی کو اس کی قوت کے بارے میں نہیں بتایا ہے۔ تو قوت تو کسی بھی وقت آ سکتی ہے۔ کسی کو بڑھاپے کیا جوانی میں، اور جوانی کیا، بچپن میں۔ البتہ بڑھاپے میں یہ ضرور ہوتا ہے کہ آدمی بڑھاپے میں اپنی سماعت کو موت کی آہٹ پر مرکوز کئے بیٹھا رہتا ہے۔ چھینک بھی آجائے تو سوچتا ہے کہ کہیں بلاوا تو نہیں آ گیا۔

اسے خیال آیا کہ یہ بھی تو اللہ کی رحمت ہے۔ ورنہ لوگوں کو تو بڑھاپے میں بھی یہ خیال نہیں آتا کہ مرنا ہے، اور پھر اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ آدمی تو مرتے دم تک زندگی کی، اس کے لوازمات کی محبت میں گرفتار رہتا ہے۔ وہ آخری وقت میں بھی دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! تھوڑی سی مہلت اور دے دے، تاکہ میں یہ کرلوں، اپنے بچوں کی اولاد کو گود میں اٹھالوں۔

یہ سوچتے ہوئے اسے جھرجھری سی آ گئی۔ اس کا تو اپنا یہی حال ہے۔ ہاں، یہ اللہ کی رحمت ہے کہ وہ موت سے نہیں ڈرتی۔ نہ جانے کیسے اسے یہ یقین ہے کہ اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ اللہ اس کے ساتھ اچھا معاملہ کرے گا۔ وہ یہاں سے بہتر وہاں رہے گی۔ ورنہ تو لوگ موت سے ڈرتے ہیں۔ لیکن اس ایک معاملے میں تو وہ بھی ایسی ہی ہے۔ ابھی موت سامنے آ کھڑی ہو تو وہ

تڑپ کر اللہ کو پکارے گی کہ ابھی نہیں میرے رب! بس ایک بار...... صرف ایک بار عبدالحق کے بچے کو گود میں لے کر پیار کرلوں۔ پھر ہنسی خوشی چلی آؤں گی۔

اس بات پر اسے نور بانو کی گفتگو یاد آ گئی۔ اور اپنا فیصلہ یاد آ گیا۔ نہیں، اب وہ اس پر عمل نہیں کرسکتی۔ وہ اتنی دور جا رہا ہے تو اس سے ایسی بات کیسے کی جا سکتی ہے۔

تب پہلی بار اسے اس جدائی سے خوف آیا۔ بڑھاپے میں کسی سے جدا ہونا تو ہے ہی خوفزدہ کر دینے والی بات۔ بوڑھا آدمی سوچتا ہے، یہ خیال تو لاشعور میں ہی دبا رہ جاتا ہے کہ اب کبھی اس سے مل بھی سکیں گے۔ اسے دیکھ بھی سکیں گے یا نہیں۔ کیا پتا، یہ آخری ملاقات ہو۔ تو اسے چھو لیں، انگلیوں کی پوروں پر لمس کی صورت اسے محفوظ کر لیں۔ خوب دیکھیں۔ جی بھر کے دیکھیں، ایسے کہ آنکھوں کے راستے اسے دل میں اتار لیں۔

وہ جدائی سے ایسی ڈرنے والی نہیں تھی۔ جدائی اس کے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ اس نے تو دائمی جدائی بھی دیکھی تھی۔ اس نے شوہر بھی کھویا تھا اور اکلوتا بیٹا بھی۔ اور اس نے دیکھ لیا، اور جان لیا تھا کہ اللہ بندے سے کوئی قیمتی چیز لیتا ہے تو اس سے کہیں زیادہ قیمتی چیز دیتا بھی ہے...... صبر......! اور پھر اپنے ہی دیئے ہوئے اس صبر کے اجر میں اور بہت بڑی بڑی نعمتیں دیتا رہتا ہے، جیسے اپنا تعلق اور دوستی، اندر کی طمانیت اور آخرت کا شعور۔

لیکن شوہر اور بیٹے کو کھونے کے بعد اس کے پاس دو ہی چیزیں بچی تھیں۔ ان میں بھی ایک خیالی تھی۔ آرزو، تصور تک محدود۔ اس کے پاس عبدالحق کے سوا کیا رہا تھا، اور پھر اس کے بچے کی آرزو۔ تبھی تو آج اس نے نور بانو سے ظالمانہ حد تک بے رخی سے بات کی تھی۔ شاید غلط کیا تھا۔ شاید اسی لئے آج جدائی کا یہ حکم آ گیا۔ مگر وہ کیا کرتی۔ نور بانو کسی کوشش کے لئے آمادہ نہیں تھی۔ اور اپنی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ وہ مجبور ہوگئی تھیں۔ اور اب معاملات اس کے ہاتھ میں نہیں رہے تھے۔

معاملات تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اس نے کانوں کو چھوتے

ہوئے دل میں اللہ سے توبہ کی۔

بہر حال اس جدائی سے وہ صرف اپنے بڑھاپے کی وجہ سے نہیں ڈر رہی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ اس جدائی کی مدت نامعلوم تھی۔ وہ کئی برسوں پر بھی تو پھیل سکتی تھی۔ یہاں اس کا بڑھاپا اسے خوف میں مبتلا کر رہا تھا۔ اتنے برسوں کی مہلت بھی ہوگی اس کے پاس؟

یہ سوچتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک شک نے سر ابھارا۔ کہیں وہ مایوس تو نہیں ہو رہی ہے۔ خوف کے بعد مایوسی ہی تو آتی ہے۔ اور یہ دنیا میں سب سے بری بات ہے۔ اللہ کی رحمت ہوتے ہوئے مایوس کیوں ہو آدمی۔ یہ بھی آزمائش ہوتی ہے ایک طرح کی۔

دوسروں کی دوسرے جانیں۔ اسے تو ڈرنا ہی نہیں چاہئے۔ ابھی شام کو ہی تو اس نے عبدالحق کو بتایا تھا۔ لیکن خود نہیں سمجھا تھا۔ اس سمجھ میں آ رہا تھا۔ یہ جدائی تو کچھ بھی نہیں۔ لال آندھی والے دن کی جدائی تو اس سے بہت بڑی تھی۔ جب اس نے عبدالحق کو رخصت کیا تو لال آندھی سر پر کھڑی تھی۔ عبدالحق اسے ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن وہ نہیں گئی۔ وہ جانتی تھی کہ عبدالحق کو تیز دوڑنا ہوگا۔ وہ ساتھ گئی تو اس کے لئے رکاوٹ بن جائے گی۔ اس سے نقصان ہی ہوگا عبدالحق کو۔

پھر کچھ امانتوں کا خیال بھی تھا اسے۔ لیکن جب موت سر پر کھڑی ہو تو امانت کی فکر کون کرتا ہے؟ اسے اپنی وہ پوری کیفیت یاد آ گئی۔ اسے ان لمحوں میں موت کا خیال نہیں تھا، امانت کی فکر تھی۔ تو یہ بھی تھا کہ اسے یقین تھا کہ وہ عبدالحق سے پھر ملے گی اور اس کی امانتیں اسے سونپے گی۔ یہ یقین کس نے دیا تھا اسے؟ اللہ کے سوا کون دے سکتا ہے؟

اور پھر عبدالحق کا واپس آنا اور اس سے ملنا معجزہ ہی تو تھا۔ لیکن اس سے بھی بڑا معجزہ تو اس کا اپنا زندہ رہنا تھا۔ یہ تو وہی جانتی تھی کہ اللہ نے کیسے اسے زندہ رکھا تھا، کیسے اسے زندگی کا سامان عطا کرتا رہا تھا۔ جہاں گاؤں کے گاؤں ریت میں دفن ہوگئے تھے، اللہ نے اسے اس زمین پر زندہ رکھا تھا، کیسے؟

یہ اس نے دیکھا تو نہیں تھا۔ لیکن سمجھ تو سکتی تھی۔ محسوس تو کر سکتی تھی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگی...... توبہ میرے ربّ! توبہ! مجھے ایمان دے میرے اللہ!

اس کا ہر ڈر، ہر خوف لٹ گیا۔ آندھی والے دن کی طرح اسے یقین تو نہیں تھا۔ لیکن وہ راضی بہ رضا ہوگئی تھی۔ اللہ کی مرضی کے آگے کس کی چلتی ہے۔ وہ جانے، جو اس نے لکھا ہے، وہی ہوگا۔ ہم دوبارہ ملے تو اس کا شکر، اور نہ ملے تو بھی اس کا شکر کہ اس میں بھی اس کی طرف سے کوئی بہتری ہی ہوگی۔

دل کو سکون آ گیا تھا۔ اور سکون آ جائے تو نیند تو آتی ہی ہے۔

❁ ❁ ❁

نوربانو بہت خوش اور بہت مطمئن تھی۔ ایسی خوشی، ایسا اطمینان اسے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ وہ ذلت اور معزولی کے گہرے گڑھے میں گرنے والی تھی۔ لیکن اللہ نے اس وقت پر نہ صرف اسے بچا لیا تھا، بلکہ مکمل اقتدار بھی عطا کر دیا تھا۔

حمیدہ نے اسے بارہا بتایا تھا۔ لیکن آج اپنے دل میں پہلی بار اس نے یہ بات سمجھی تھی کہ وہ ناشکری ہے۔ نہ اللہ کا شکر ادا کرنے والی اور نہ ہی بندوں کی شکرگزار۔ اور اس کی وجہ بھی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ جانوروں کی سی زندگی گزارتی رہی تھی۔ وہ پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی عادی نہیں تھی۔ نہ اچھے وقت کو اور نہ کڑے وقت کو۔ اور جب آدمی پیچھے پلٹ کر ہی نہیں دیکھے گا تو اسے یہ کیسے یاد آئے؟ کہ اللہ نے اس پر کیسی کیسی کریمی کی۔ اور کیسے کیسے کڑے وقت میں اس کی کیسی کیسی مدد فرمائی۔ اور جب اسے یہ یاد ہی نہیں ہوگا تو وہ شکر کیسے ادا کرے گا۔

اس نے پلٹ کر گہری نظر سے ماضی کو دیکھا تو اس کی سمجھ میں آیا کہ اس کی زندگی تو قصے کہانیوں جیسی ہے۔ اس پر تو بڑی عنایت رہی ہے اس کے ربّ کی۔ لیکن شکر تو کیا، وہ تو آج تک دل میں ربّ کے خلاف یہ شکایت لئے بیٹھی ہے کہ اس نے اسے اتنی معمولی شکل وصورت کے ساتھ کیوں پیدا کیا۔ اس

نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اللہ نے اس معمولی شکل وصورت کے ساتھ کیسا غیر معمولی نصیب عطا فرمایا۔ اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ نصیب شکل وصورت کے مقابلے میں بہت بڑی چیز ہے۔

اسے عبدالحق اچھا لگا۔ اس نے عبدالحق کو چاہا۔ وہ اس وقت ہندو تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کبھی اسے پا سکتی ہے۔ اور وہ صورت شکل سے اس کے لائق تھی، نہ سیرت کے اعتبار سے۔ لیکن اللہ کا کرم کہ وہ اسے مسلمان ہو کر ملا۔ اور کتنا اچھا شوہر ثابت ہوا۔

پھر دہلی میں اس کا گھر اُجڑ گیا۔ سب لوگ مارے گئے۔ اللہ نے اسے بچایا، اور عزت کی زندگی عطا فرمائی۔ ورنہ اس عرصے میں کتنی ہی لڑکیوں نے عزت بھی گنوائی اور زندگی بھی۔ اور جو زندہ رہیں اور ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئیں۔ ارے..... اللہ نے تو کانٹوں سے بھرے اس راستے پر اس کے پیروں میں ایک معمولی سا کنکر بھی نہیں چبھنے دیا۔

وہ واقعی بہت ناشکری ہے۔

پھر اسے اللہ نے پھولوں سے سجا ہموار راستہ عطا فرمایا۔ اس پر خود اس نے اپنے لئے کانٹے بچھائے۔ رمضان کی طاق راتوں میں اس نے اپنی حاسدانہ فطرت سے مجبور ہو کر اپنی بدبختی کی دعا کی۔ اور اللہ کا کرم یہ ہے کہ اس نے اس کے پیروں کو اس کے اپنے بچھائے ہوئے کانٹوں سے بھی زخمی نہیں ہونے دیا۔ اور آج تو اللہ نے اس کی زندگی کو برباد ہونے سے بچا لیا۔

اب میں ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کروں گی۔ اس نے دل میں سوچا۔

وہ پہلا موقع تھا کہ اسے جلدی نیند آ رہی تھی۔ شاید خوف سے نجات اور باطنی سکون کی وجہ سے۔ اس کیفیت میں اسے خیال آیا کہ اسے فوری طور پر شکر کے دو نفل ادا کرنے چاہئیں۔

اس نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو ایک خیال نے اسے روک دیا۔ فرض نماز تو پڑھنی نصیب نہیں ہوتی، اور شکر کے نفل ادا کرے گی۔

تو کیا ہوا؟ آج سے نماز بھی شروع کر دینی چاہئے۔ دل میں کسی نے

کہا۔

لیکن اس اعصاب شکن دن نے اسے توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ شدید اعصابی دباؤ کے بعد سکون ملے تو آدمی ڈھیر ہو جاتا ہے۔ نیند سے اس کا برا حال تھا۔

عشاء کی لمبی نماز، اس وقت تو ہمت نہیں، دماغ نے کہا۔

تو مختصر نماز پڑھ لی جائے۔ نور رکعت، دل بولا۔ اور پھر شکر کے دو نفل۔ آدھا گھنٹہ بھی نہیں لگے گا۔

اس وقت تو اس کی بھی ہمت نہیں۔ دماغ نے فیصلہ سنایا۔

چلو کوئی بات نہیں۔ اس نے سوچا۔ صبح ان کے الارم کے ساتھ اٹھوں گی اور فجر پڑھ لوں گی۔

لیکن وہ سوئی پھر بھی نہیں۔ دماغ میں سوچوں کا ہجوم تھا۔ طبیعت شکر کی طرف مائل تھی۔ یہ الگ بات کہ ابھی تک اس نے مسئلہ حل ہونے کا زبان سے بھی اللہ کا شکر ادا نہیں کیا تھا۔

اسے خیال تھا کہ انسانوں کی عنایات پر ان کا شکر گزار ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ اور یوں دیکھا جائے تو اس کی سب سے زیادہ مستحق حمیدہ ہے۔ اس نے اسے سگی ماں کی طرح چاہا ہے۔ اس نے سوچا، اب وہ ہمیشہ حمیدہ کی عزت کرے گی، اس کی ہر بات مانے گی۔

لیکن یہ مزاروں پر جانا، بزرگوں کے پاس جانا، اسے یقین تھا کہ اس طرح کسی نہ کسی دن اس کی پول کھل جائے گی۔ یہ بات نہ ہوتی تو آج بات اتنی بڑھتی ہی نہیں۔ اس پر تو وہ سمجھوتہ کر نہیں سکتی۔ اور اس پر سمجھوتہ حمیدہ بھی نہیں کرے گی۔

ایک لمحے میں سب کچھ بدل گیا۔ یہ بات تو بن ہی نہیں سکتی۔ اس نے تلخی سے سوچا۔ اور ماضی میں جو بھی ہوا ہو، لیکن اب تو یہ تعلق دشمنی کا ہے، خاص طور پر حمیدہ کی آج کی دھمکی کے بعد۔ یہ طے ہے کہ حمیدہ کو جب بھی موقع ملا، وہ اس پر یہ وار ضرور کرے گی۔

ایک لمحے میں سارا تشکر تحلیل ہوگیا اور دفاعی تیاریوں کی فکر کرنے لگی۔

اب وہ دشمن بن کر ایک دشمن کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ چند لمحے پہلے اس سے بہت چھوٹی باتوں پر وہ شرمسار ہو رہی تھی۔

اللہ آدمی کو بار بار موقع دیتا ہے..... دیتا رہتا ہے، اور بدنصیب اسے ضائع کرتے رہتے ہیں۔

نوربانو نے سوچا، کراچی جا کر وہ حمیدہ کے شر سے محفوظ ہو جائے گی۔

لیکن کب تک؟ اللہ کرے، وہ زندگی بھر کراچی میں رہی۔ لیکن اس کے باوجود عبدالحق حمیدہ سے ملنے تو آیا کرے گا اور وہ بھی اس کے ساتھ ہوگی۔ چلو، عام دنوں میں نہ سہی، عید بقرعید پر تو ایسا ہوگا ہی۔ تب وہ حمیدہ کو کیسے روک سکے گی۔ اس کی کوئی ترکیب کرنی ہوگی۔

ذہین تو وہ بے پناہ تھی، اور منفی معاملات میں اس کی ذہانت خوب کام کرتی تھی۔ اس نے ترکیب سوچ لی۔ اور اسے بھروسہ تھا کہ وہ کامیاب رہے گی۔ اسے خوشی تھی کہ اس نے دور اندیشی سے کام لیا، اور پہلے ہی مسئلے کا حل تلاش کر لیا۔ ورنہ عین موقع پر بہت دشواری ہوتی۔

اس پر سوچتے سوچتے وہ سوگئی۔

الارم کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔ نیند دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ لیکن اسے یاد تھا کہ اس نے فجر کا ارادہ کیا تھا۔ ابھی وہ فجر پڑھتی، اور دوپہر میں ظہر کے بعد شکر کے دو نفل ادا کرتی۔

لیکن اس نیند میں بھی دماغ کام کر رہا تھا۔ اس نے بتا دیا کہ ابھی فجر کی اذان نہیں ہوئی ہے۔ عبدالحق تو اپنے معمول کے مطابق تہجد کے لئے اٹھا ہے۔ اسے اس بات پر بھی حیرت ہوئی کہ الارم کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکی کہ یہ اللہ کی رحمت ہے۔

تھوڑی دیر اور سو لوں۔ فجر کے وقت اٹھ جاؤں گی۔ اس نے سوچا۔ ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں سرسراتے اس خیال سے بھی وہ ناواقف نہیں تھی کہ اب اس کی آنکھ معمول کے مطابق دوپہر سے پہلے نہیں کھلے گی۔

وہ مطمئن ہو کر دوبارہ سوگئی۔ اگلی بار اس کی آنکھ کھلی تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

ارے.....! یہ میں کیسے اٹھ گئی؟ سوتے ہوئے ذہن نے سوچا۔ ہاں، نماز پڑھنی ہے۔ مگر ابھی تو وقت ہے۔ زیادہ نہیں، میں بس پانچ منٹ اور سو لوں۔ اور وہ پھر سوگئی۔

اس کے بعد آنکھ کھلی تو سورج چڑھ چکا تھا۔

اس نے کچھ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اللہ نے رحمت کی تھی۔ اس جیسی سونے والی کو عین فجر کی نماز کے وقت جگا دیا تھا۔ لیکن اس نے رحمت سے منہ موڑ لیا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا، یہ بھی نہیں سمجھا کہ وہ رحمت اس کی اپنی بھلائی کے لئے تھی۔ اللہ کو نہ تو اپنے بندوں کی نماز کی ضرورت ہے، نہ ان کے شکر کی۔ وہ تو بے نیاز ہے۔ وہ رحیم و کریم ہے۔ سرکشی اور نافرمانی کے باوجود اپنے بندوں پر کرم کرنا اس نے خود پر واجب کر لیا ہے۔ اس کی رحمت بے پایاں ہے۔

وہ اٹھی تو اسے نماز اور شکر کا نہیں، بس ناشتے کا خیال آیا۔

❁ ❁ ❁

ارجمند کی عجیب ملی جلی کیفیت تھی۔ بظاہر تو وہ خوش تھی۔ جب سے اس نے تبادلے کے امکان کے بارے میں سنا تھا، اس کا جی چاہتا تھا کہ آغا جی کا تبادلہ کہیں دور ہو جائے۔ وہ دور چلے جائیں گے تو وہ بڑی مشکل آزمائشوں سے بچ جائے گی۔

اللہ سے رابطے کی، اور اللہ کو راضی رکھنے کی اہمیت کو وہ کسی نہ کسی حد تک سمجھ گئی تھی۔ بڑے بڑے دانش مند لوگ بھی اس گمان میں رہتے ہیں کہ وہ سمجھ گئے ہیں، وہ تو پھر بہرحال چھوٹی سی بچی تھی۔ یہ کیسے سمجھ سکتی تھی کہ سب کچھ سمجھنا آسان ہوتا ہے۔ بس یہ سمجھنا دشوار ہوتا ہے کہ سمجھاتا صرف اللہ ہی ہے۔ ورنہ عقل تو عقل مندوں کو صرف بھٹکاتی ہی ہے۔

وہ یہ تو سمجھتی تھی کہ اس پر اللہ کی بڑی رحمت ہے۔ اللہ کی رحمت نے تو

پوری کائنات کا احاطہ کر رکھا ہے۔ وہ ہر وقت، ہر ایک کے ساتھ ہے۔ لیکن ہوا کی طرح اسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے، دیکھا نہیں جا سکتا۔ اب ہوتا یہ ہے کہ آدمی دنیا میں ایسا الجھا اور پھنسا ہوا ہوتا ہے کہ اس کے پاس سوچنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ اور اللہ کی رحمت محسوس تب ہوگی، جب آدمی اپنے معاملات کے بارے میں سوچے گا۔ اور اگر فرصت مل بھی جائے، اور وہ سوچے بھی تو اوّل تو دنیا دار بن کر سوچے گا، اور دوسرے عقل سے سوچے گا۔ تو دنیا اسباب کا کارخانہ ہے۔ اور عقل محسوس کچھ نہیں کرتی، آنکھوں دیکھے اور کانوں سنے کا تجزیہ کرتی ہے۔ تو پھر یوں ہوتا ہے کہ اس کا کوئی کام ہو جائے تو جس کے ذریعے کام ہوا ہو، وہ اسے سب سے پہلے نظر آتا ہے۔ ارے بھائی! اس بے مروّت آدمی کے دل میں جانے کیا آئی کہ میرا یہ کام کر دیا۔ ورنہ وہ ایسا ہے تو نہیں۔

اب دنیادار بھی دو طرح کے ہوتے ہیں، احسان شناس اور احسان ناشناس۔ احسان ناشناس لوگوں کا حافظہ بہت مختصر ہوتا ہے۔ کبھی تو چند منٹ کے بعد بھی بات یاد نہیں رہتی۔ دوسرے وہ غرض کے بہت قائل ہوتے ہیں۔ کسی نے ان کا کام کر دیا تو وہ ایک لمحے کو اس کی تعریف کرتے ہیں۔ پھر اگلے ہی لمحے سوچتے ہیں کہ اس میں اس کی اپنی بھی تو کوئی غرض ہوگی۔ بے غرض کون کسی کے لئے کچھ کرتا ہے۔ سو ذرا ہی دیر میں وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں۔

اور احسان شناس کی یادداشت اس کی احسان شناسی کی نسبت دیرپا ہوتی ہے۔ جتنا وہ احسان شناس ہوگا، اتنا ہی اس کا حافظہ قوی ہوگا۔ وہ کہے گا کہ ان صاحب نے مجھ پر بڑی مہربانی کی۔ میرا کام کر دیا۔ اور وہ اس کام کرانے والے کو یاد رکھے گا اور اس کی عزت کرتا رہے گا۔

اللہ نیکی کے بدلے نیکیاں عطا فرماتا ہے۔ اور احسان شناس بھی نیکی ہے۔ جس نے احسان شناسی کی، اس نے دنیا کے اسباب کے نظام کو تسلیم تو کیا۔ چاہے یہ نہیں سمجھا کہ یہ نظام اللہ نے قائم کیا ہے۔ اس نے بندے کا احسان تو مانا۔ یہ عمل اللہ سے رجوع کرنے کا ہے۔ غیر ارادی سہی، بے خبری میں سہی۔ تو اس کی یہ نیکی اللہ بڑھائے گا۔ احسان شناس بھی بڑھے گی اور ادراک بھی۔ یہ

عمل جاری رہے گا تو ایک دن وہ سمجھ لے گا کہ اسباب کا وہ سلسلہ اللہ کا قائم کیا ہوا ہے، اور پہلے اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

عجیب بات ہے۔ ہم لفظوں کی شکل میں دل کا استعمال بہت کثرت سے کرتے ہیں، اور عقل کا بہت کم۔ لیکن عملی زندگی میں معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ عقل دماغ میں موجود ایک غیر مرئی صلاحیت ہے۔ اسے آپ قوتِ تجزی کہہ لیجئے۔ وہ معاملات کی چھان پھٹک کرتی ہے، اور اس کے بعد فیصلہ کرتی ہے۔ جو لوگ دل کی باتوں پر عمل کرتے ہیں، انہیں ہم جذباتی اور غیر عملی قرار دیتے ہیں۔

ارجمند کو دل کا تجربہ بہت کم عمر میں ہو گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ باہر کی دنیا میں اس کے پاس پھپھو کے سوا کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ اور جب آدمی کے پاس باہر کچھ نہ بچا ہو تو وہ اپنے اندر کی دنیا سے رجوع کرتا ہے، اور اندر کی دنیا دل کی دنیا ہے۔ ایسا تو بڑے لوگوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے، ارجمند تو بہت چھوٹی بچی تھی۔

جب ارجمند نے پہلی بار عبدالحق کو دیکھا تو وہ اسے بہت اچھا لگا...... شہزادوں جیسا۔ اور اس نے سوچ لیا کہ بس وہ اسی سے شادی کرے گی۔ اس وقت وہ شادی کا مطلب بھی نہیں سمجھتی تھی۔ پوری طرح تو وہ اب بھی نہیں جانتی تھی۔ بس اتنا سمجھتی تھی کہ شادی ہو جائے تو دو افراد زندگی بھر ایک ساتھ رہتے ہیں۔

وہ دل کی بات تھی۔ عقل اس وقت اس میں نہیں تھی۔ اس نے تو بس اسے تصور میں بسا لیا، اور اس کی تصویریں بنانے لگی۔ تصویر اس نے پھپھو کو بھی دکھائی۔ پھپھو عقل والی تھیں، دنیا میں پھنسی ہوئی۔ انہوں نے اسے سمجھایا کہ ایسا ممکن نہیں۔ ایک شخص آپ کے سامنے سے گزر رہا ہو تو آپ اس سے تعلق نہیں جوڑ سکتے۔ کیونکہ ضروری نہیں کہ آپ کو دوبارہ اسے دیکھنا بھی نصیب ہو۔ پھر اتفاق کی بات کہ پھپھو اسے جانتی بھی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ہندو ہے۔

لیکن ارجمند جیسے پھپھو سے بات کرنے کا موقع بھی کم ہی ملتا تھا، اس کے پاس باتیں کرنے کے لئے خود اپنے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ سو وہ دل سے

باتیں کرنے کی عادی تھی۔ اور نہ جانے کیا بات تھی کہ اسے اپنے دل کی باتوں پر بہت یقین تھا۔ دل نے اسے بتایا کہ اس کا شہزادہ بہت اچھا ہے، اور وہ اسے ملے گا بھی، تو اس نے یقین کرلیا۔ پھپھو اسے سمجھاتی رہیں۔ لیکن وہ تو بس اپنے دل کی سنتی تھی۔

پھر اسے پتا چل گیا کہ دل میں اللہ میاں رہتے ہیں۔ اور جب تک اللہ میاں دل میں ہیں، دل کی بات سچی ہوتی ہے۔ دل سچ بولتا ہے، صحیح راستہ دکھاتا ہے۔ بس اس کے لئے دل کو پاک صاف رکھنا ضروری ہے۔ اور اس کے لئے آدمی کو بری باتوں سے بچنا ہوتا ہے۔ اللہ کے حکم ماننے ہوتے ہیں، نافرمانی سے بچنا ہوتا ہے، جن کاموں کو اللہ نے منع کیا ہو، وہ ہیں کرنے ہوتے۔ اس کے خلاف ہو تو اللہ میاں اس دل میں نہیں رہتے۔ اور وہ نہیں رہتے تو دل کی بات بھی سچی نہیں رہتی اور دل صحیح راستہ بھی نہیں دکھاتا۔

پھر اس نے یہ دیکھ بھی لیا کہ دل کیسا سچا تھا۔ کیسے عبدالحق اس تک پہنچا اور کیسے وہ اس تک پہنچی، اس پر پھپھو بھی حیران تھیں۔ اور وہ خود اس وقت بچی نہیں رہی تھی۔ کچھ بڑی ہوگئی تھی۔ دنیاوی معاملات کی مشکلیں اور ناممکنات پوری طرح نہ سہی، کچھ کچھ تو اس کی سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ جو کچھ ہوا، وہ بظاہر ناممکن تھا۔

لیکن سب سے بڑی بات، جس نے اس کے دل اور اللہ کے تعلق کے ایمان کو پختہ کر دیا، وہ یہ تھی کہ پھپھو کی معلومات غلط ثابت ہوئیں۔ اور اس کا دل سچا نکلا۔ جب اس نے عبدالحق کو پہلی بار دیکھا، وہ اس وقت مسلمان تھا۔

اس کے بعد اس نے اپنے دل کو، اور اس میں موجود اللہ کی آواز کو اپنی سب سے قیمتی چیز سمجھ لیا۔ عبدالحق کی محبت سے بھی قیمتی! دل اس کا راہنما تھا۔ وہ اسے بعض اوقات ایسی باتوں پر بھی ٹوک دیتا تھا، جو اس کے نزدیک بری نہیں تھیں۔ لیکن وہ دل کی بات مان کر ان سے رک جاتی تھی۔ بعد میں اسے پتا چلتا تھا کہ اگر وہ بری نہیں بھی تھیں تو اس کے لئے نقصان دہ ضرور تھیں، اور دل کی بات مان کر وہ کسی نقصان سے بچ جاتی تھی۔ اب ایسے قیمتی راہنما کو تو کسی بھی

قیمت پر نہیں چھوڑا جا سکتا ہے نا!

لیکن اب وہ بڑی ہو رہی تھی۔ وجود میں ایسے انجانے، ناقابل فہم جذبے سر اٹھانے لگے تھے۔ وہ خواب دیکھتی، جو آنکھ کھلنے پر اسے یاد نہیں ہوتے تھے۔ لیکن دل سینے میں زور زور سے دھڑک رہا ہوتا تھا۔ اور وہ ڈراؤنے خواب نہیں تھے، اور دل کی وہ کیفیت خوف کی بھی نہیں ہوتی تھی۔ یہ بات خواب یاد نہ رہنے کے باوجود وہ پورے یقین سے کہہ سکتی تھی۔ بلکہ معاملہ برعکس تھا۔ اس کی وہ کیفیت بہت لطیف، بہت خوب صورت ہوتی تھی۔ اس کا سبب کیا تھا، یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ البتہ وہ جاگنے کے بعد بھی کبھی کبھی آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتی کہ شاید وہ خواب پھر آجائے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔

اور کم کم، کبھی کبھی وہ ایسا خواب بھی دیکھتی تھی کہ آنکھ کھلتی تو وہ محجوب ہوتی۔ حیا سے اس کی پلکیں لرز رہی ہوتیں۔ وہاں حمیدہ سو رہی ہوتی تھی، اور کمرے میں کوئی بھی نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ کوشش کے باوجود نظر نہیں اٹھا پاتی تھی۔ ایک بار تو وہ اٹھ کر آئینے کے سامنے بھی گئی کہ اپنے چہرے کو دیکھے تو سہی، کوئی خاص بات ہے کیا۔ لیکن اس سے نظر اٹھائی ہی نہیں گئی۔

اور ایک بار...... صرف ایک بار ایسا ہوا کہ وہ خواب دیکھ کر اٹھی تو اس کا جسم پسینے میں نہا رہا تھا۔ اور شرمندگی کا بہت شدید احساس اسے ستا رہا تھا۔ اس بار بھی خواب کی ایک جھلک تک اسے یاد نہیں تھی۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ شرمندگی کے شدید احساس کے باوجود اس کے اندر کی کیفیت میں وہی لطافت اور خوب صورتی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔

اس نے دل سے پوچھا، یہ سب کیا ہے؟ وہاں سے بے پرواہی سے جواب ملا...... کوئی خاص بات نہیں۔ ایسا سب کے ساتھ ہوتا رہتا ہے اس پر سوچنے کی ضرورت بھی نہیں۔

وہ دل کی بات ماننے والی تھی۔ وہ اللہ کو خفا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سو حد درجہ تجسس کے باوجود اس نے دل کی یہ بات بھی مان لی۔

لیکن جب وہ عبدالحق کے ساتھ تنہائی میں اس سے پڑھنے کے لئے

بیٹھی تو وہ اس کے لئے آزمائش بن گئی۔ عبدالحق کو وہ ویسے ہمیشہ دیکھا کرتی تھی۔ اسے دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ مگر پڑھنے بیٹھی تو عجیب بات ہوئی۔ اس نے عبدالحق کی طرف دیکھنا چاہا تو اسے پہلی بار ایسا لگا کہ جیسے یہ کوئی بری بات ہے۔ پھر بھی ایک بار اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ عبدالحق اس وقت اس کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے فوراً ہی نظر جھکا لی۔ یہ اسے اچھا نہیں لگا۔ نہ جانے کیوں اسے ایسا لگا کہ عبدالحق کو یہ بات اچھی نہیں لگے گی۔

تب تک دل نے اسے اس بات پر نہیں ٹوکا تھا۔

مگر پھر وہ چپکے چپکے عبدالحق کو دیکھنے لگی۔ یہ وہ پہلا موقع تھا، جب اسے اپنے وجود میں انجانے اور ناقابل فہم جذبوں کے سر اٹھانے کا احساس ہوا۔ وہ اسے دیکھتی تھی تو کچھ جی چاہتا تھا...... کیا؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

اور وہی موقع تھا کہ دل نے اسے ٹوک دیا۔ بری بات...... ایسا نہیں کرتے۔ وہ دل کی سدا کی فرمانبردار تھی۔ فوراً مان گئی۔ مگر آگے جا کر یہ احساس ہوا کہ اس بار یہ اتنا آسان نہیں۔ عبدالحق کو دیکھنے کو بار بار جی چاہتا تھا۔ آنکھیں مچل مچل جاتی تھیں۔ انہیں روکنا مشکل ہو جاتا تھا، ناممکن لگنے لگتا تھا۔ عبدالحق کی آواز اسے سنائی نہیں دیتی تھی۔ اسے کسی بھی چیز کا احساس نہیں رہتا تھا۔ جسم و جاں کی ساری توانائی نظر کو اٹھنے سے روکنے میں صرف ہو جاتی تھی۔

پھر وہ مسئلہ ختم تو نہیں ہوا، لیکن آگے جا کر اتنا مشکل بھی نہیں رہا۔ دل نے اسے سمجھا دیا کہ اسے قرآن پر زیادہ توجہ دینی چاہئے۔

یہی وہ عرصہ تھا جب عبدالحق کے بیرونِ شہر تبادلے کا امکان سامنے آیا، اور اس کا جی چاہا کہ کاش وہ تبادلہ ہو ہی جائے۔

اب وہ بڑی ہو رہی تھی۔ دنیا کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی۔ عبدالحق کے لئے اس کی محبت ویسی ہی تھی۔ لیکن نور بانو کے حوالے سے اب محبت اسے بوجھ لگنے لگی تھی۔ وہ اس سے بہن جیسی سچی محبت کرنے والی نور بانو کا شوہر تھا۔ کیا ایسے میں اس کی عبدالحق سے محبت درست ہے؟ وہ اکثر بے بسی سے اس پر سوچتی۔ بس ایک بات اس کے حق میں جاتی تھی۔ جب اسے عبدالحق سے محبت

ہوئی تو وہ نور بانو کو جانتی بھی نہیں تھی۔ دوسرے دل نے اس سے کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ اس محبت کو ختم کر دے۔ بلکہ اس کی الجھن پر دل نے کہا تھا کہ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، اور ہر کام اپنے وقت پر خود بخود ہو جاتا ہے۔ دل نے کبھی یہ نہیں کہا کہ عبدالحق اسے نہیں ملے گا۔ بلکہ دل نے ہمیشہ یقین دلایا کہ عبدالحق اسے ضرور ملے گا۔ لیکن اپنے وقت پر۔ اور وہ اس کی کوشش سے نہیں، اس کے صبر اور اللہ کے حکم سے اسے ملے گا۔

اس پر غور کرنا تو فطری تھا کہ اس صورتِ حال میں وہ اسے کیسے مل سکتا ہے۔ وہ سوچ سوچ کر تھک گئی۔ لیکن ایک امکان کے سوا اسے کچھ سجھائی نہیں دیا۔ اور وہ واحد امکان ایسا تھا کہ وہ ذہن میں آیا تو تھرا کر رہ گئی۔ نہیں...... یہ تو وہ ہرگز بھی نہیں چاہتی۔ اس کے مقابلے میں تو عبدالحق کی محبت کو زبردستی اپنے دل سے نکال دینا کہیں بہتر ہے۔

اس دن سے وہ نور بانو کے لئے درازیٔ عمر کی دعا کرنے لگی۔

دل نے اسے محبت ختم کرنے کا حکم نہیں دیا تھا، صرف اس پر پابندیاں لگائی تھیں۔ لیکن ان پابندیوں پر عمل کرنا ہرگز آسان نہیں تھا۔ بلکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ان پر عمل کرنا دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔

ایسے میں عبدالحق کے تبادلے کی بات سامنے آگئی۔ جو وہ کب سے چاہتی تھی۔ اور اللہ کی قدرت اور اس کی آزمائش کہ فیصلے کا بوجھ اس پر ڈال دیا گیا۔ عبدالحق نے کہہ دیا تھا کہ اسکول تو کراچی میں بھی ہیں، اور حمیدہ نے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا تھا۔

اس کا فیصلہ تو جدائی قبول کرنے کا تھا۔ لیکن اسے حمیدہ کا خیال تھا، اس کے لئے اس عمر میں عبدالحق سے دور ہونا ظلم تھا۔ لیکن حمیدہ کے انداز سے واضح تھا کہ وہ جانا نہیں چاہتی۔ اس طرح فیصلہ اس کے لئے آسان ہو گیا۔

بڑی بات یہ تھی کہ عبدالحق نے پڑھائی کے معاملے میں اسے اس کے پیروں پر کھڑا کر دیا تھا۔ اس کا پڑھانے کا طریقہ ہی ایسا تھا۔ چنانچہ ارجمند کو اس طرف سے تو کوئی فکر نہیں تھی۔ اور رہا ذاتی معاملہ، تو اس میں ایثار کرنا وہ پہلے ہی

سیکھ چکی تھی۔

بس ایک بات سے اس کا دل گھبراتا تھا۔ جدائی کا فیصلہ تو اس کے اختیار میں تھا۔ لیکن اس کے بعد اس کے بس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ جدائی کتنی طویل ہوگی۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ انتظار میں اس کی آنکھیں ہی پتھرا جائیں۔

ایک لمحہ کو اسے ڈر لگا۔ لیکن پھر اسے دل کی بات یاد آگئی۔ دل نے کہا تھا..... وہ تجھے ضرور ملے گا۔ لیکن مقررہ وقت، جب وہ وقت آئے گا تو ہر مشکل خود بخود آسان ہو جائے گی۔ سب کچھ خود بخود ہو جائے گا۔

اس کے بعد وہ بے فکر ہوگئی۔

✿ ✿ ✿

وہ ایک ہفتہ تو پر لگا کر اُڑ گیا۔ کام ہی اتنے تھے، مصروفیت ہی اتنی تھی۔ وہاں ایک نہیں، دو ٹرانسفر ہو رہے تھے۔ گاؤں سے زبیر اپنی فیملی کے ساتھ لاہور منتقل ہو رہا تھا۔

عبدالحق کو کراچی سے زیادہ یہاں کی فکر تھی۔ سب سے ضروری کام ٹیلی فون کا کنکشن لینا تھا۔ کراچی جانے کے بعد وہ فون پر رابطہ تو رکھ سکتا تھا۔ اماں کی آواز تو سن سکتا تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ حمیدہ بھی فون پر اس کی آواز سنے گی تو فاصلوں کو بھول جائے گی۔

لیکن فون کا کنکشن ملنا آسان نہیں تھا۔ مسعود صاحب نے اس سلسلے میں اس کی بہت مدد کی۔ بالآخر کنکشن مل ہی گیا۔

زبیر کو اس نے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ بینک میں اس کا اکاؤنٹ بھی کھلوا دیا تھا۔ زبیر کہتا رہا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ گاؤں کے تمام معاملات تو اسی کے اختیار میں تھے۔ لیکن عبدالحق جانتا تھا کہ زبیر آمدنی کا بڑا حصہ اس کے اکاؤنٹ میں جمع کراتا ہے۔ اس لئے اس نے یہاں کے اکاؤنٹ میں زبیر کے نام کافی رقم جمع کرا دی۔

اتنے برسوں میں زبیر کافی تبدیل ہوا تھا۔ گاؤں کے معاملات کلی طور پر

سنبھالنے کے نتیجے میں اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوئی تھی۔ پھر عبدالحق بھی مسلسل اس کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ عبدالحق کے مسلسل ٹوکنے پر اس نے عبدالحق کے لئے ایک نیا لفظ وضع کر لیا تھا..... کاکا۔ یہ عبدالحق کو بھی اچھا لگتا تھا۔

سب کچھ ہوا، لیکن زبیر کی وفاداری ناقابل شکست رہی۔ عبدالحق اور اس کے گھر کے لوگوں کے لئے وہ آج بھی ویسا ہی وفادار غلام تھا۔ ہاں، اب اسے بولنا بھی آ گیا تھا۔ اس کی زبان بھی مختلف ہوگئی تھی۔

اس رات کھانے کے بعد وہ ساتھ بیٹھے تھے کہ زبیر نے کہا۔

''آپ جانتے ہیں کاکا کہ میں لاہور آنے کی آرزو کرتا تھا۔''

''اور آپ کی آرزو پوری ہوگئی۔'' عبدالحق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں! وہ تو آپ کے قدموں میں رہنے کی آرزو تھی۔''

عبدالحق نے اسے گھور کر دیکھا۔

''میرا مطلب ہے کاکا کہ میں اماں کے قدموں میں زندگی گزارنا چاہتا تھا۔'' زبیر نے جلدی سے گھبرا کر تصحیح کی۔

''تو اماں تو یہاں موجود ہیں نا!'' عبدالحق پھر مسکرایا۔

''جی ہاں کاکا..... !'' زبیر نے بے بسی سے کہا۔

''اماں تو موجود ہیں، پر آپ تو نہیں ہوں گے نا!''

''تو اسی لئے تو آپ کو لاہور بلایا ہے۔ ورنہ تو گاؤں میں آپ کی موجودگی زیادہ ضروری تھی۔''

''گاؤں کی تو آپ فکر نہ کریں۔ وہاں اپنے تمام کارندے آپ سے محبت کرنے والے ہیں کاکا! وہاں سب کچھ ٹھیک رہے گا۔''

''لیکن ساجد کی تعلیم کا حرج نہ ہو۔''

''نہیں ہوگا کاکا! یہاں تو اور اچھے اسکول میں پڑھے گا وہ۔ میں تو شروع ہی سے اسے آپ کے پاس یہاں چھوڑنا چاہتا تھا۔''

عبدالحق شرمندہ ہوگیا۔ وہ یہ بات جانتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ صرف نور بانو کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ ورنہ وہ تو ساجد سے بہت محبت کرتا تھا۔

اور ساجد کے لئے تو بس اتنا کہنا ہی کافی تھا کہ وہ زبیر اور رابعہ کا بیٹا تھا۔ عبدالحق سے وفاداری اور محبت تو اس کے خون میں شامل تھی۔

عبدالحق نے زبیر کو اپنے مری والے بنگلے کے متعلق بھی بتا دیا تھا اور شمریز اور نوریز سے اس کا تعارف بھی کرا دیا تھا۔ اس نے طے کیا تھا کہ یعقوب کو اپنے ساتھ کراچی لے جائے گا۔ یوں وہ گاڑی بھی اس کے پاس رہے گی۔

لاہور میں اپنے آخری دن میں عبدالحق کو ایک بڑی کامیابی یہ ملی کہ ساجد کا بھی اسکول میں داخلہ ہو گیا۔

اور اگلا دن جدائی کا تھا۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے، سوائے حمیدہ کے۔ وہ عبدالحق کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تڑپ گئی۔

''نا پتر! ایسا نہیں کرتے۔'' اس نے کہا۔

''تو تو دیکھ چکا ہے کہ ربّ کیسے بچھڑے ہوؤں کو ملا دیتا ہے۔''

''ہاں اماں! جانتا ہوں۔ پر کیا کروں، دل نہیں مانتا۔''

حمیدہ نے اس کے اور نور بانو کے امام ضامن باندھے اور سر پر ہاتھ رکھا۔

''سوہنا ربّ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔''

اس لمحے حمیدہ کے خلوص اور محبت نے نور بانو کے دل کو چھو لیا۔ ایک دم نہ جانے کیا ہوا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اور پھر حمیدہ سے لپٹ گئی۔

''اماں! میرا سب کہا سنا معاف کر دینا۔ کبھی کبھی مجھے نہ جانے کیا ہو جاتا ہے۔''

حمیدہ اس کی پیٹھ تھپکتی رہی۔

''تو تو میری دھی ہے۔ بیٹی ہے میری۔ میں تجھ سے خفا ہی نہیں تو معاف کرنا کیسا؟''

اچانک عبدالحق کو ارجمند کا خیال آیا۔

''ارے...... ! یہ ارجمند کہاں ہے؟''

''میں دیکھ کر اسے لاتی ہوں۔'' نور بانو نے کہا۔

ارجمند اسٹڈی میں دبکی بیٹھی تھی۔ پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ فیصلہ کرنا ایک بات ہے، اور اس پر عمل کرنا دوسری بات۔ فیصلہ تو زبان ہلائی اور کر دیا۔ لیکن بڑے فیصلے عمل درآمد کے وقت آدمی کے لئے آزمائش بن جاتے ہیں۔

ابھی تک اس کی آنکھیں بھیگی بھی نہیں تھیں۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ پلکوں کے پیچھے سمندر موجیں مار رہا ہے، بس ایک بہانے کا منتظر ہے۔ وہ جانتی تھی کہ جانے والوں کا سامنا کرنا اور انہیں خدا حافظ کہنا اس کے بس کی بات نہیں۔

یوں کہنے کو تو اس نے بڑی بڑی جدائیاں دیکھی تھیں۔ اپنا پورا گھرانہ، گھر کا ایک ایک فرد اس سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا تھا۔ ماں، باپ، دادا، دادی، چچا...... سب کے سب، لیکن ان کے بچھڑنے کا علم اسے پھپھو کی زبانی ہوا تھا۔ اس نے تو ان میں سے کسی کی بھی جدائی کا منظر نہیں دیکھا تھا۔ اس نے بس ایک جدائی دیکھی تھی...... پھپھو کی جدائی...... اور اس نے اس کا دل جیسے کاٹ ڈالا تھا۔ اس ایک جدائی میں پچھلی تمام جدائیاں بھی شامل ہو گئی تھیں۔

اس نے دل کو بہت تسلی دی تھی کہ یہ جدائی انشاء اللہ عارضی ہے...... آگے کسی بہتر وقت میں ملنے کے لئے ہے۔ اس کے باوجود اس میں ہمت نہیں تھی کہ جانے والوں سے ملے، اور انہیں الوداع کہے۔

''ارے...... ! تم یہاں چھپی بیٹھی ہو۔''

نور بانو کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اٹھی اور دل کو حوصلے کی تلقین کرتے ہوئے نور بانو کا سامنا کیا۔

''نہیں آپی! چھپی ہوتی تو آپ تلاش کیسے کرتیں مجھے؟''

نور بانو نے اسے لپٹا لیا۔

''میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں ساتھ لے جاتی۔''

''نہیں آپی! جو ہوتا ہے، اس میں اللہ کی طرف سے بہتری ہوتی ہے۔''

نور بانو نے محبت سے اس کے آنسو پونچھ دیئے۔

''چلو! چل کر ان سے بھی مل لو۔ وہ تمہیں بلا رہے ہیں۔''

ارجمند نے حوصلہ مجتمع کیا، ضبط کا ایک اور بند باندھا، اور نوربانو کے ساتھ چل دی۔

عبدالحق نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ روئی روئی متورم آنکھیں۔

''کیا تم ہمیں خدا حافظ بھی نہیں کہنا چاہتی تھیں؟'' اس نے پوچھا۔

''میں تو آپ دونوں کو پہلے ہی اللہ کی امان میں دے چکی تھی آغا جی!''

عبدالحق کو اس کی عمر کے لحاظ سے وہ جملہ بہت بڑا لگا۔ لیکن اب وہ اس کا عادی ہونے لگا تھا۔

''پھر بھی، لوگوں کو رخصت کرنا، الوداعی ملاقات کرنا اور زبان سے خدا حافظ کہنا بھی ضروری ہوتا ہے۔''

''مجھے خدا حافظ نہیں، خوش آمدید کہنا اچھا لگتا ہے آغا جی!'' ارجمند نے بڑی مشکل سے کہا۔ ضبط کسی بھی لمحے جواب دے سکتا تھا۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

''میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں ارجمند! اگر تم کچھ کر سکو تو......''

''آپ کا کہنا میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے آغا جی!''

''اماں کا خیال رکھنا، اپنی پڑھائی پر دھیان رکھنا اور کبھی رونا نہیں۔'' عبدالحق نے آگے بڑھ کر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ ارجمند کے لئے بڑی آزمائش کا لمحہ تھا۔ اس ہاتھ کے لمس نے اس کے وجود میں پھر انجانے جذبے جگا دیئے۔ بڑی شدت سے اس کا جی چاہا کہ وہ آغا جی سے لپٹ جائے۔ ایک ثانیے میں وہ سمجھ گئی کہ اس جذبے میں معیت نہیں، معصومیت ہے۔ اس لمحے وہ چھوٹی سی بچی تھی، اور آغا جی اس کے بڑے۔ لیکن دل میں موجود محبت کا تقاضا تھا کہ وہ اس آزمائش سے سرخ رو نکلے۔

اس نے سر اٹھا کر ایک پل آغا جی کو اور پھر آپی کو دیکھا۔ پھر اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''خدا حافظ آغا جی! خدا حافظ آپی!'' اور اس کے ساتھ ہی ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ پلٹی اور روتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بھاگتی چلی گئی۔

ماحول کی اداسی اور گہری ہوگئی۔ جانے والوں کی روانگی کا وقت بھی ہو چکا تھا۔

✿ ✿ ✿

گھر سنسان لگ رہا تھا۔

ارجمند نے سوچا، کیسی حیران کر دینے والی بات ہے۔ تعداد کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ تعداد کے اعتبار سے گھر میں کوئی کمی تو نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ دیکھا جائے تو ایک اہم اضافہ ہی ہوا تھا۔ دو افراد گھر سے گئے تھے، اور تین آئے تھے۔ اس طرح گھر کی رونق میں اضافہ ہونا چاہئے تھا۔ بلکہ چھ سالہ ساجد کے آنے سے گھر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جبکہ عبدالحق اور نوربانو کی جگہ زبیر اور رابعہ آگئے تھے۔ لیکن گھر تھا کہ خالی خالی، اجڑا اجڑا لگ رہا تھا۔

پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ مکان اور گھر میں فرق ہوتا ہے۔ اسے تو یہ بات پہلے ہی سمجھ لینی چاہئے تھی۔ دہلی میں اس نے گھر دیکھا تھا، اور لاہور آکر مکان۔ لاہور میں وہ جہاں رہتی تھی، وہ بڑا گھر تھا۔ لیکن نہیں، نہ تو وہ اس کے لئے گھر تھا، نہ ہی پھپھو کے لئے۔ پھپھو نے کبھی اس سے کہا نہیں۔ لیکن اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ پھپھو ایک گھر کی آرزو کرتی تھیں۔ اگر اللہ نے انہیں زندگی دی ہوتی اور پھپھا سے ان کی شادی ہوگئی ہوتی تو انہیں گھر مل جاتا۔

مکان! مکان اینٹوں اور گارے سے بنی چار دیواری کے اندر کمرے ہوتے ہیں۔ وہ خالی ہو، تب بھی مکان ہوتا ہے۔ وہاں ضرورت کی تمام چیزیں ہوں، فرنیچر ہو، کتابیں ہوں، کھانے پینے کا سامان ہو، تب بھی وہ مکان ہی ہوتا ہے۔ گھر تو وہ انسانوں کے آباد ہونے سے بنتا ہے۔ اور گھر والے چلے جائیں تو وہ پھر مکان ہو جاتا ہے۔ جیسے اجڑا ہوا دل......!

اسے یاد تھا، جب وہ پہلی بار سب لوگوں کے ساتھ گاؤں گئی تو وہ لوگ گاؤں والے مکان میں ٹھہرے۔ تھا تو وہ مکان ہی، لیکن نہ جانے کیوں سب لوگ اسے حویلی کہتے تھے۔ تو وہاں اس کا دل بہت گھبرایا تھا۔ حالانکہ وہاں گرد کا نام و نشان نہیں تھا۔ ہر چیز صاف ستھری تھی، اور اپنی جگہ پر قرینے سے رکھی تھی۔

پوچھنے پر پتا چلا کہ رابعہ خالہ وہاں ہر روز آتی ہیں، اور صفائی کرتی ہیں۔ اس نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ لوگ یہاں کیوں نہیں رہتے تو رابعہ نے کہا تھا...... کاکا اور اماں کے بغیر دل ہی نہیں لگتا ہے یہاں۔ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ یہ کیا بات ہوئی۔ یہ لوگ دوسرے گھر میں بھی تو رہتے ہی ہیں نا...... اور وہ بھی آغا جی اور دادی اماں کے بغیر۔ تو وہاں انہیں یہ لوگ کیوں یاد نہیں آتے۔ اس نے رابعہ سے یہ بات پوچھی بھی تھی۔ لیکن سیدھی سادی رابعہ کوئی وضاحت نہ کر سکی۔ وہ تو بس یہی کہتی رہی کہ کاکا اور اماں کے بغیر حویلی میں دل نہیں لگتا۔ حویلی سنسان لگتی ہے۔

اب آغا جی اور آپی کے بغیر گھر اسے سنسان لگ رہا تھا۔ خود پر گزری تو بات سمجھ میں آئی۔ وہ گھر میں کہیں بھی جاتی، چلتی پھرتی، اسے ایک انجانی سی کمی کا احساس ستاتا۔ غور کرنے پر بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ تو اس شام وہ پڑھنے کے لئے اسٹڈی میں گئی تو پرانے ایک حوالے سے بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

ارے......! یہ تو پہلے بھی ہو چکا ہے میرے ساتھ۔

آغا جی جب پہلی بار دفتر گئے تھے تو ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ یہاں اکیلی پڑھنے کے لئے بیٹھی تو اسے لگا کہ اسٹڈی ویران ہے۔ حالانکہ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ بس آغا جی موجود نہیں تھے۔ ان کی خالی کرسی کو دیکھ کر اسے لگا تھا کہ اس کے دل میں کوئی آباد گوشہ تھا، جو اچانک خالی ہو گیا ہے۔

مگر جب میں اور اب میں بہت فرق تھا۔ جب اسے معلوم تھا کہ آغا جی شام کو دفتر سے آجائیں گے۔ رات کو وہ اسی کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھائیں گے۔ جبکہ اب وہ جانتی تھی کہ وہ بہت دور چلے گئے ہیں، اور یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کی واپسی کب ہوگی۔

یہ خیال آتے ہی اسے ایسا لگا کہ اس کا پورا دل ویران ہو گیا ہے۔

اب وہ سمجھ سکتی تھی۔ آدمی دوسروں کے تجربات سے کچھ سیکھ تو سکتا ہے، لیکن گہرائی کے ساتھ سمجھ صرف اسی وقت سکتا ہے، جب اس پر گزرے۔ اس کا اپنا تجربہ ہو۔ اور شاید وہ اس لئے زیادہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ پیدائشی طور پر مصورہ

تھی۔

مکان کی ایک اپنی شکل و صورت ہوتی ہے، اپنے خدوخال ہوتے ہیں، جو کبھی نہیں بدلتے۔ جیسے انسان بوڑھے ہوتے ہیں، ویسے یہ مکان بھی بوڑھے ہوتے ہیں۔ خدوخال کا تیکھا پن رخصت ہو جاتا ہے۔ صورت سے بوسیدگی جھلکنے لگتی ہے۔ لیکن بنیادی نقشہ وہی رہتا ہے۔ اور اس کا تعلق آنکھوں سے ہوتا ہے۔

لیکن گھر آراستہ ہوتا ہے۔ مکین اس کی آرائش، اس کا سنگھار ہوتے ہیں۔ مکان ظاہری جسم ہے تو گھر باطنی شخصیت۔ جسم کتنا ہی خوب صورت ہو، شخصیت کے بغیر کشش سے یکسر محروم ہوتا ہے۔ گھر مکینوں کی شخصیت مستعار لیتا ہے۔ وہ اسٹڈی کو دیکھتی ہے تو آغا جی کا سراپا نظر آتا ہے۔ نہیں، نظر نہیں آتا، محسوس ہوتا ہے۔ یہی تو باریک سا فرق ہے۔ جیسے دل کی آنکھ دیکھتی ہے۔ مکان آنکھوں کو نظر آتا ہے۔ اور گھر کے بارے میں سب کچھ محسوس کیا جاتا ہے۔ گھر کے خدوخال مکینوں سے بنتے ہیں۔ آپی کی خواب گاہ میں وہ کم ہی جاتی تھی۔ پتا نہیں کیوں، اس کمرے کی فضا میں اسے سختی کا احساس ہوتا تھا۔

وہ پورے گھر میں گھومتی پھری۔ سب کچھ وہی تھی۔ مکان تو ویسا ہی تھا لیکن گھر ویران لگ رہا تھا۔ کمی کیا تھی۔ وہ سوچتی رہی۔ آپی کی کھنکتی ہوئی ہنسی، ان کی آواز، وہ کسی کو ان کا پکارنا، نسیمہ کو ڈانٹنا، اماں سے بات کرنا، اس کی دل جوئی کرنا، اور آغا جی کے قدموں کی چاپ۔ وہ نہیں تھی۔ لیکن وہ چاہتی تو اسے اپنے دل میں سن سکتی تھی۔ لیکن وہ موجود نہیں تھی۔ اور ان کا تبسم! تبسم کی تو کوئی آواز نہیں ہوتی۔ اسے کوئی سن نہیں سکتا۔ لیکن دل میں اس کے چٹکنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ان کی باتیں۔

اسے لگا کہ مکان بے روح ہوتا ہے، لیکن گھر نہیں۔ گھر تو شاید سب کچھ محسوس بھی کرتا ہے۔ وہ اپنے مکینوں کی آوازیں، ان کے رویے، ان کی خوشیاں، ان کے دکھ محفوظ بھی کرتا ہے اور محسوس بھی۔ مکین خوش ہوں تو گھر ہنستا مسکراتا لگتا ہے۔ وہ اداس ہوں تو گھر بھی اداس ہو جاتا ہے۔ گھر اپنے مکینوں کی محبتیں، ان کے جذبے سنبھال کر رکھتا ہے۔ مکان کا فرش روز صاف کیا جاتا ہے

تو سب کچھ مٹ جاتا ہے۔ لیکن گھر کے صاف فرش کو غور سے دیکھو تو ہر چلنے
والے کے قدموں کے برسوں کے نشان الگ چمکتے نظر آتے ہیں۔ مکان کی
دیواریں رنگ و روغن سے چمک رہی ہوتی ہیں۔ لیکن گھر کی انہی دیواروں میں
مکینوں کی ہر آواز محفوظ ہوتی ہے۔ مکان کی کوئی فضا نہیں ہوتی۔ لیکن گھر کی اپنی
فضا ہوتی ہے۔ اس فضا، اس ماحول میں سب کچھ محفوظ ہوتا ہے۔ گھر کی دیواروں
پر، ہر بے جان چیز پر مکینوں کا لمس ہمیشہ محفوظ رہتا ہے۔ دل کی آنکھوں سے
دیکھو تو چمکتا دمکتا نظر آتا ہے۔ یعنی گھر اپنے ساز و سامان سمیت زندہ ہوتا ہے،
اس میں روح بھی ہوتی ہے، اور احساس بھی، اور وہ یہ سب مکینوں سے مستعار
لیتا ہے۔ مکین گھر چھوڑ جائیں تو چند ہی دنوں میں وہ اپنے ساز و سامان سمیت مر
جاتا ہے۔ بس پھر مکان ہی رہ جاتا ہے...... بے روح مکان۔

یہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ یہ میں کیا سوچ
رہی ہوں۔ کیا چند گھنٹوں میں ہی پاگل ہوگئی ہیں؟ وہ گھبرا کر لان میں آگئی۔
جھولا اسے بلا رہا تھا۔ وہ جھولے پر بیٹھی۔ بے دھیانی میں اس نے پہلو کی خالی
جگہ کو چھوا۔ وہاں آپی کا لمس موجود تھا۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھا کرتی تھی۔

اچانک ساجد دوڑتا ہوا اس کے پاس چلا آیا۔

''میں یہاں آپ کے ساتھ بیٹھ جاؤں چھوٹی چاچی!''

اس نے چونک کر ساجد کو دیکھا۔ اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا
تھا، جو گہری سوچ میں ہونے کی وجہ سے اس کے شعور تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ اس
نے بے دھیانی میں محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''کیوں نہیں ساجد! آؤ میرے پاس بیٹھو نا!''

ساجد اس کے برابر بیٹھ گیا، جہاں آپی بیٹھا کرتی تھیں۔

''آپ مجھے جھلائیں گی چھوٹی چاچی!''

اس بار بات شعور تک پہنچ گئی، اور وہ گھبرا گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا
اور پھر ساجد سے کہا۔

''اے...... ! کیا کہا تم نے......؟''

''جھولا جھلانے کو کہا نا چھوٹی چاچی!''

''وہ تو مجھے معلوم ہے۔ لیکن یہ چھوٹی چاچی کیوں کہا مجھے تم نے؟''

ساجد چند لمحے اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں شاید یہ نہیں آرہا
تھا کہ اسے یہ بات بری لگی ہے یا اچھی۔ اور چہرے پر تو اسے دونوں ہی باتیں
نظر آرہی تھیں...... تھوڑی تھوڑی۔ ''بس یہ مجھے اچھا لگا۔

''اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ پھر پوچھا۔

''آپ کو برا لگا ہے؟''

ارجمند نے پھر ادھر ادھر دیکھا، اور سرگوشی میں بولی۔

''برا کیسے لگ سکتا ہے؟ مجھے تو بہت اچھا لگا۔ لیکن تم نے یہ کہا کیوں؟''

''پتا نہیں، بس میرا دل چاہتا ہے۔'' ساجد نے کہا۔ پھر پوچھا۔

''یہ بری بات ہے؟''

''پہلے تو کبھی نہیں کہا تم نے۔''

''پہلے کبھی دل نہیں چاہا تھا۔'' ساجد نے معصومیت سے کہا۔ پھر اس
نے اپنی بات دہرائی۔

''کیا یہ بری بات ہے؟''

''نہیں! آدمی اچھا ہو اور سچا ہو تو دل کبھی غلط نہیں ہوتا۔''

ساجد کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔ ارجمند اسے سمجھا بھی نہیں رہی تھی۔ وہ
تو اپنے یقین اور اعتماد کو تازہ کر رہی تھی۔

''لیکن تم مجھے کسی کے سامنے چھوٹی چاچی کبھی نہ کہنا۔'' اس نے ساجد کو
سمجھایا۔

''اکیلے میں جی چاہے تو کہہ لینا۔''

''تو سب کے سامنے کیا کہوں؟''

''جو پہلے کہتے تھے...... باجی......!''

ساجد کے چہرے پر ایک لمحے کو الجھن نظر آئی۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ ہنس
دیا۔

"واہ......! بڑا مزہ آئے گا۔ سب کے سامنے باجی، اور اکیلے میں چھوٹی چاچی!" اس کے نزدیک جیسے وہ ایک دلچسپ اور مشکل کھیل تھا۔

"اور جو سب کے سامنے منہ سے نکل گیا تو......؟"

"تو بہت برا ہوگا...... بہت ہی برا" ارجمند نے کڑے لہجے میں کہا۔

"ایسا کبھی نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا ہوا تو میں بہت شرمندہ ہوں گی۔ پھر میں کبھی تم سے پیار نہیں کر سکوں گی۔"

"نہیں چھوٹی چاچی! ایسا نہیں ہوگا۔ میں خیال رکھوں گا۔ اب جھولا جھلائیں نا چھوٹی چاچی!"

ارجمند پیر سے زور لگا کر پینگیں دینے لگی۔ لیکن اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ساجد نے اسے چھوٹی چاچی کیوں کہا...... اور آج ہی کیوں کہا...... اس سے پہلے تو کبھی نہیں کہا تھا۔

اس کی سمجھ میں ایک ہی بات آئی۔ یہ اللہ نے رحمت فرمائی تھی۔ اس کے نامعلوم لمبی جدائی سے دکھے ہوئے دل پر مرہم رکھ دیا تھا۔ پہلے ہمیشہ اسے اپنے اندر سے تسلی ملتی تھی...... دل کے ذریعے۔ لیکن اس بار تسلی باہر سے ملی تھی۔ شاید اس لئے کہ تسلی دینے والا دل خود دکھ میں مبتلا تھا۔ وہ دل جو ہمیشہ کہتا تھا کہ وقت آنے پر خود بخود سب کچھ مل جائے گا۔ آج خود بے یقینی میں مبتلا تھا۔ تو اس کے مہربان رب نے اسے ساجد کی زبانی یہ خوش خبری سنوا دی۔ بات تو وہی تھی کہ جو وہ چاہتی ہے، وقت آنے پر خود بخود ہو جائے گا۔

جھولے کی رفتار کم ہوگئی تھی۔ اس نے پاؤں کے دھکے سے اسے اٹھان دی۔

✿ ✿ ✿

حمیدہ اس رات سونے کے لئے لیٹی تو اس کا دل بوجھل تھا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ کہنا بہت آسان تھا اور گزارنا بہت مشکل۔ آخری عمر کی جدائی تو ویسے بھی نڈھال کر دیتی ہے۔ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اب ملنا بھی ہوگا یا نہیں۔ آج تو پہلی رات تھی جدائی کی، اور وہی بہت بھاری لگ رہی تھی۔ اب وہ پچھتا رہی تھی

کہ عبدالحق کے ساتھ جانے سے انکار کیوں کیا، چلی ہی جاتی۔ نکی کو وہاں اسکول میں داخلہ مل جاتا، اس کی پڑھائی بھی چلتی رہتی۔ اور عبدالحق بھی نگاہوں کے سامنے رہتا۔

لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔ اس نے تو آخری فیصلہ نکی پر چھوڑ دیا تھا۔ اور نکی نے وہی فیصلہ سنایا، جو اس نے کیا تھا۔ لیکن نکی نے ایسا کیوں کیا؟ کیا نکی کو اس جدائی کا ڈر نہیں تھا۔

ذرا دیر میں اسے احساس ہوا کہ وہ نکی کو سمجھ سکتی ہے۔ یہ نکی کا پہلا سکول تھا۔ اسے وہ کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ پہلے سکول کی محبت تو بہت بڑی ہوئی ہوگی۔ اور پھر نکی ابھی جدائی کے دکھ کو کیا جانے۔

تو جو ہوا، اچھا ہی ہوا۔ اس نے سرد آہ بھر کر سوچا۔

وہ کچھ دیر آنکھیں بند کر کے لیٹی رہی۔ لیکن آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اب آدمی جاگے گا تو سوچے گا بھی۔ اس نے خود کو عبدالحق کی اور وصال دین کی پرانی یادوں سے بہلانے کی کوشش کی۔ وہ خوشگوار ماضی میں چلی گئی۔

اگر وصال دین زندہ ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اللہ کی مرضی...... کون جانے، اسے کھونے کا کتنا اجر اللہ نے اسے دیا ہے۔ یہ سب کچھ اجر ہی تو ہے۔ کیسے عیش و آرام سے رہ رہی ہے وہ۔ کھوئی ہوئی آنکھیں بھی واپس مل گئیں۔ عبدالحق بھی مل گیا۔ معجزہ اور کسے کہتے ہیں۔

ذہن نے ایک جست لگائی اور ماضی سے حاصل میں آ گیا۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک عجیب خیال نے سر ابھارا۔ اگر عبدالحق کا کوئی بیٹا ہوتا تو اس وقت وہ اسے اپنے پاس رکھ لیتی۔ پھر اسے جدائی کا پتا بھی نہ چلتا۔ اور نور بانو بچے کو اس کے پاس چھوڑ بھی دیتی۔ اسے کون سا شوق ہے بچوں کا۔

اس خیال نے اسے چپکے سے محرومی کے اسی صحرا میں لا چھوڑا، جس میں وہ برسوں سے جھلس رہی تھی۔

اس کے بعد جو خیال اسے آیا تو وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ نکی دوسری طرف کروٹ لئے بے خبر سو رہی تھی۔

ارے...... ! یہ بات میں نے اب تک سوچی ہی نہیں۔ اسے حیرت ہو رہی تھی۔ عبدالحق کی اولاد کے لئے وہ بابا کے پاس گئی تھی، اور بابا نے کہا تھا کہ مدعی کو ساتھ نہ لے کر آ۔ اس نے نور بانو سے بات کی۔ نور بانو نے انکار کیا۔ اس نے اصرار، بات بڑھی اور نور بانو نے نہایت بدتمیزی، اور بے مروّتی سے کہہ دیا کہ وہ کسی قیمت پر بھی اس کے ساتھ کہیں نہیں جائے گی۔ تب پہلی بار اسے بھی جلال آیا اور اس نے عبدالحق سے بات کرنے کی، اور پھر دوسری شادی کرانے کی دھمکی دی۔ اسے یاد تھا کہ نور بانو ڈر گئی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ اس نے محض دھمکی نہیں دی تھی۔ وہ سچ مچ عبدالحق سے بات کرتی، اس سے کہتی کہ وہ نور بانو کو اس کے ساتھ جانے کا حکم دے۔ آخر کام تو نور بانو کا ہی ہے۔ اور بات نہ بنتی تو وہ عبدالحق کو دوسری شادی کا حکم دیتی۔

لیکن ہوا کیا؟ اسی شام تو عبدالحق تبادلے کی خبر لے کر آ گیا۔ اور وہ سب کچھ بھول گئی۔ اب ان دونوں کے جانے کے بعد یاد آ رہا ہے سب کچھ...... اس نے جو سوچا تھا، وہ کچھ بھی نہیں کر سکی۔ یہ تو اللہ کا حکم ہے۔

ہے ربا! تو نے بھی اسی کا ساتھ دیا، اس نے بے ساختہ شکایت کی۔ تو تو سب کچھ جانتا ہے۔

لیکن اگلے ہی لمحے وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹتے ہوئے توبہ کرنے لگی۔ اللہ میری توبہ! تیرے بھید تو ہی جانے۔ تو تو جو کچھ بھی کرتا ہے، وہی بہتر ہوتا ہے۔

اب اس کی سمجھ میں آ گیا کہ نہ وہ عبدالحق کی دوسری شادی کا ارادہ کرتی، نہ یہ تبادلہ ہوتا۔ جو اللہ کو منظور نہیں ہے، وہ کیسے ہو سکتا ہے، اور جو اللہ چاہے، اسے کون روک سکتا ہے۔

مگر اللہ دلوں کا حال جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی نیت بری نہیں تھی۔ وہ تو عبدالحق کی بہتری کے لئے سوچ رہی تھی۔ اب یہ تو اللہ ہی جانتا ہے

کہ کس کے لئے کیا بہتر ہے۔

وہ بابا سے اپنی ملاقات یاد کرنے لگی۔ وہ بابا یقیناً اللہ کا ولی تھا۔ بابا نے بار بار ایک ہی بات کہی تھی...... مدعی کو لے کر آ۔ اور اس نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ مدعی نور بانو ہے، عبدالحق نہیں۔ یہ بات حمیدہ کی سمجھ میں اب تک نہیں آئی تھی کہ اس معاملے میں عبدالحق مدعی کیوں نہیں ہے۔ بچے سے نسل تو اس کی آگے بڑھے گی، نہ کہ نور بانو کی۔

اور بابا نے کہا تھا کہ وہ اس کے لئے تو دعا کر سکتا ہے، لیکن جو وہ چاہتی ہے...... یعنی عبدالحق کے لئے اولاد...... وہ اس کے لئے دعا نہیں کر سکتا۔ اور اس کے اصرار پر اس نے جھنجلا کر کہا تھا...... تو کیا تجھے خوش کرنے کے لئے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کی دعا کروں...... تباہ ہو جاؤں تیری خاطر......؟

اس کا مطلب تھا کہ عبدالحق کے لئے اولاد کی دعا کرنا ایسا ہی ہے، جیسے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کی دعا کہ اس پر اللہ کے غضب ناک ہونے کا ڈر ہے۔ اور یہ بات اللہ کا ایک ولی کہہ رہا تھا، جو بہت کچھ جانتا تھا۔ حمیدہ خوف سے تھرا کر رہ گئی۔

پھر جب اس نے پاؤں پکڑے اور چھوڑے نہیں تو بابا نے کہا کہ اس دعا کے لئے پہلے کسی سے اجازت لینی ہوگی۔ پھر شاید اللہ سے بھی اجازت مل جائے۔ اور اس کے بعد اس نے اس سے کہا تھا کہ اپنی بہو کو لے کر آ۔ اس نے کہا تھا کہ اجازت نور بانو سے لینی ہوگی۔ اس کے پوچھنے پر بابا نے کہا تھا، یہ بات تو سمجھ نہیں سکتی، اور میں سمجھاؤں گا بھی نہیں۔

واپس آنے کے بعد حمیدہ کو کوئی انجانی خلش ستاتی رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ آیا نہیں تھا۔ لیکن اب جبکہ عبدالحق اور نور بانو یہاں سے جا چکے تھے تو اپنی وہ خلش اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ خلش یہ تھی کہ وہ بابا کی کہی ہوئی کوئی اہم بات بھول گئی ہے۔

وہ ذہن پر زور دیتی رہی، اس ملاقات کو بار بار دہراتی رہی۔ لیکن بات

بن ہی نہیں رہی تھی۔ نیند سے محروم دماغ جھنجلانے لگا۔ لیکن وہ اس پہیلی کو بوجھنے پر تل گئی تھی۔ اگرچہ اب کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ مدعی اس کی پہنچ سے بہت دور جا چکا تھا۔

پھر اچانک اس کے ذہن میں بلب سا چمکا، اور بات اسے یاد آ گئی۔

ارے...... یہ بات میں بھول کیسے گئی تھی۔

اسے یاد آ گیا۔ بابا نے لرزتے ہوئے کہا تھا کہ اللہ کے ہاں سفارش بھی اس کی اجازت کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔ اس پر اس نے کہا تھا کہ بابا! اجازت لے لونا! اور بابا نے کہا تھا...... نہیں ملے گی۔

یہاں پہنچ کر اس کے سامنے جیسے کوئی بند گلی آ گئی۔ اس نے پوچھا تھا کہ اجازت کیوں نہیں ملے گی، اور بابا نے وجہ بھی بتائی تھی۔ اور وہی تو اصل بات تھا۔ اور اب وہی یاد نہیں آ رہی تھی۔

اس کا اضطراب اتنا بڑھ گیا کہ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ لیکن وہ ٹہل رہی تھی۔ وہ جیسے چالیس چوروں کے غار کے سامنے کھڑی تھی اور کھل جا سم سم اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ وہ ڈر بھی رہی تھی، لیکن یاد کرنے کی کوشش سے باز نہیں آ رہی تھی۔

پھر اللہ نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ اسے یاد آ گیا۔

بابا نے کہا تھا...... اجازت نہیں ملے گی۔ کیسے مل سکتی ہے؟ اگر اللہ پہلے ہی کسی سے وعدہ کر چکا ہو۔ وہ اپنے وعدے کے خلاف کبھی نہیں کرتا۔ میں اس سے وعدہ توڑنے کو کہوں تو وہ مجھ سے ناراض ہوگا، مجھے چھوڑ دے گا۔

دماغ کا بوجھل پن دور ہوگیا۔ وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوگئی۔ بات صاف تھی، بس کڑیاں ملانی تھیں۔ بابا نے سب کچھ تو بتا دیا تھا۔ کسی نے عبدالحق کے ہاں اولاد نہ ہونے کی دعا کی تھی، اور وہ اللہ نے قبول کر لی تھی۔ بابا کو یہ معلوم تھا، اس لئے وہ عبدالحق کے لئے اولاد کی دعا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اللہ سے وعدہ توڑنے کے لئے کیسے کہہ سکتا تھا۔

سوال یہ تھا کہ وہ کون بدبخت ہے جس نے عبدالحق کو یہ بددعا دی۔

اس کا جواب بھی سامنے تھا۔ بابا نے کہا، کسی سے اجازت لینی ہوگی۔ پھر کہا، اسی لئے تو کہتا ہوں کہ مدعی کو لے کر آ، پھر کہا، تو اپنی بہو کو لے کر آ۔

اس کا مطلب ہے کہ بابا کو دعا کے لئے نوربانو سے اجازت لینی تھی۔ اور اس کا مطلب ہے کہ وہ بددعا نوربانو نے کی تھی۔ اور اللہ نے اسے قبول بھی کر لیا تھا۔

یہ بات شعور تک پہنچی تو حمیدہ سن ہو کر رہ گئی۔ نوربانو ایسی دعا کیسے کر سکتی ہے؟ کیوں کرے گی؟ اس کا جواب حمیدہ کے پاس نہیں تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ ہوا یہی ہے۔ شک و شبے کی کوئی گنجائش تھی ہی نہیں۔ یہی بات تھی۔ جبھی تو نوربانو مدعی قرار پاتی تھی، جیسے اس معاملے میں عبدالحق کا کوئی بیچ ہی نہ ہو۔ وہ مدعی ہی نہیں رہا۔

اسے غصہ آنے لگا۔ اس میں عبدالحق کا کیا قصور؟ سوال تو اس کی نسل آگے بڑھنے کا ہے۔ نوربانو کو کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔ وہ تو دعا کر کے بیٹھ گئی۔ سزا تو عبدالحق کو مل رہی ہے۔ یہ تو زیادتی ہے۔

بابا نے شرط لگائی تھی کہ اگلی بار بہو کو ساتھ لے کر ہی آئے۔ لیکن اب نوربانو کو وہ نہیں لے جا سکتی تھی۔ پھر بھی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ صبح ہی بابا کے پاس جائے گی، اس سے پوچھے گی کہ عبدالحق کا کوئی قصور نہیں تو سزا اسے کیوں مل رہی ہے؟

یہ فیصلہ کر کے وہ ایسی مطمئن ہوئی کہ اسے نیند آ گئی...... پرسکون نیند۔

✿ ✿ ✿

ارجمند کی آنکھ اپنے معمول کے مطابق کھلی۔ سالن کو دھیمی آنچ پر رکھ کر اس نے تہجد پڑھی۔ واپس آ کر اس نے کھانا تیار کیا۔ پھر وہ فجر پڑھنے کے لئے گئی، وہاں سے واپس آ کر اس نے ناشتہ بنایا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے نسیمہ کے لئے دروازہ کھولا۔ سلام کرنے میں وہ ہمیشہ پہل کرتی تھی اور نسیمہ شرمندہ ہوئی تھی۔ نسیمہ نے اس کے سلام کا جواب دیا۔

اندر آتے ہوئے اس نے نسیمہ سے کہا۔

''کھانا میں نے تیار کر دیا ہے۔ آپ بھیج دیجئے گا۔''

پیچھے آتی ہوئی نسیمہ نے کہا۔

''کھانا اب کہاں بھیجنا ہے؟''

''آغا جی کے دفتر، اور کہاں؟'' ارجمند نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔

''آپ کو یاد ہی نہیں، صاحب تو کراچی چلے گئے ہیں۔''

یہ سن کر ارجمند ایسی ٹھٹکی کہ جیسے ٹھوکر لگی ہو۔ وہ گرتے گرتے بچی۔ نسیمہ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کچن کی طرف چلی گئی۔ اور وہ بت بنی وہیں کھڑی رہی۔

آغا جی چلے گئے، اس احساس نے دل میں جیسے ڈنک سا چبھو دیا تھا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔ آنکھوں کی جلن نے اس بات کا احساس دلایا۔ اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن پیر جیسے پتھر کے ہو گئے تھے۔

وہ بے بس کھڑی رہی۔ یہ کیسے ہوا کہ اسے آغا جی کا جانا بھی یاد نہیں۔ اسے یاد تھا، رات وہ ہمیشہ کی طرح سوئی تھی۔ شاید اسے یہ خیال آ جاتا تو نیند بھی نہیں آتی۔ اور نیند نہیں آتی تو وہ تہجد سے محروم ہو جاتی۔ یہ تو اللہ نے رحمت فرمائی اس پر۔

وہیں کھڑے کھڑے اس نے اللہ سے دعا کی کہ اسے نیند سے کبھی محروم نہ ہونے دے۔ اسے صبر دے اور ظرف دے۔

جانے کتنی دیر وہ وہاں کھڑی رہی۔ پھر شل جسم میں جیسے جان سی پڑنے لگی۔ اس نے قدم بڑھائے۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو حمیدہ سلام پھیر رہی تھی۔

''یہ کیا دادی اماں! آپ دیر سے اٹھی ہیں آج!''

حمیدہ نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر نظریں جھکا لیں۔

''ہاں نکی! رات کو بہت دیر تک جاگتی رہی تھی۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی۔''

وہ سمجھ گئی کہ دادی اماں آغا جی کے بارے میں سوچتی رہی ہوں گی۔

بے چاری دادی اماں!

اچانک اسے ساجد کا خیال آیا، اور اس کے ساتھ ہی زبیر اور رابعہ کا۔ کوئی گیا ہے تو کوئی آیا بھی تو ہے۔ رحمت ہے اللہ کی۔ اس نے خوش ہو کر سوچا۔ ابھی ایک لمحہ پہلے وہ اداسی سے سوچ رہی تھی کہ آج آغا جی ناشتے پر نہیں ہوں گے، اب کبھی بھی نہیں ہوں گے۔ بلاوجہ اس نے اتنا ناشتہ بنایا، اور اب اسے یاد آیا کہ ناشتہ تو اور بنانا ہوگا۔ ایک آدمی کم ہوا، اور ماشاء اللہ تین کا اضافہ ہوا۔ مگر وہ لوگ ہیں کہاں؟

''دادی اماں، چچا جان، ساجد اور چچی جان کیا دیر تک سوتے ہیں؟''

حمیدہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''نکی! وہ لوگ تو سویرے ہی اٹھ جاتے ہیں۔''

''تو پھر وہ آئے کیوں نہیں؟''

''بڑے لحاظ والے لوگ ہیں۔'' حمیدہ نے کہا۔

''وہ تو عبدالحق کے جاتے ہی وہاں چلے گئے تھے..... وہ جو مہمان خانہ ہے نا..... کیا کہتا ہے عبدالحق اسے..... اسکینی..... نہیں..... اکیسی.....''

''انیکسی اماں!'' ارجمند نے جلدی سے تصحیح کی۔

''لیکن، کیوں دادی! اتنا بڑا گھر چھوڑ کر وہاں جانا، جبکہ آغا جی تو انہیں اپنا بڑا بھائی سمجھتے ہیں۔''

''یہ وفادار لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں نکی!''

''ناشتہ کرنے بھی نہیں آئے۔''

''وہیں کچھ کر رہی ہوگی رابعہ۔''

ارجمند تڑپ گئی۔

''میں جا کر انہیں لاتی ہوں۔ اور آپ انہیں حکم دیجئے گا کہ وہ یہیں رہیں۔ آپ کا حکم تو کوئی نہیں ٹال سکتا نا؟''

اداسی کے باوجود حمیدہ کو ہنسی آ گئی۔ پھر اس نے کہا۔

"نسیمہ کو بھیج کر انہیں بلوا لے۔"

"نہیں اماں! میں خود جاؤں گی۔ وہ میرے چچا جان ہیں۔"

وہ انیکسی کی طرف چل دی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے دستک دی اور اندر چلی گئی۔ کمرے میں زبیر اور ساجد بیٹھے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ زبیر کے انداز میں پریشانی تھی۔

"کیا بات ہے نکی! خیر تو ہے؟"

"خیر کیسی؟ آپ لوگ گھر چھوڑ کر یہاں بیٹھے ہیں۔" ارجمند نے محبت بھری خفگی سے کہا۔

"ہم یہاں بہت آرام سے ہیں نکی!"

"آپ ہوں گے، لیکن ہم آرام سے نہیں ہیں۔ یہ تو مہمان خانہ ہے۔ اور آپ کوئی مہمان ہیں، آپ کو تو آغا جی یہاں گھر کی اور ہم سب کی حفاظت کے لئے چھوڑ کر گئے ہیں۔ اور آپ ہمیں چھوڑ کر یہاں آ بیٹھے۔"

"وہ نکی! ہم یہاں......"

"آپ آغا جی کے حکم کے خلاف کر رہے ہیں۔ انہیں پتا چلا تو کتنا دکھ ہوگا انہیں۔"

اس بات پر تو زبیر تڑپ گیا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔

"بس اٹھیں اور چلیں میرے ساتھ۔" ارجمند نے ساجد کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ پھر بولی۔

"چچی جان کہاں ہیں؟"

"وہ ...... وہ چائے بنا رہی ہے۔"

ارجمند کچن میں پہنچی اور اس نے چولہا بجھا دیا۔

"چلیں چچی جان!"

رابعہ نے سوالیہ نظروں سے زبیر کو دیکھا، جو ارجمند کے پیچھے پیچھے وہاں آ گیا تھا۔ زبیر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"واقعی ہم سے بھول ہوئی۔ کاکا کو پتا چلا تو وہ بہت خفا ہوں گے۔"

"بس چلیں میرے ساتھ!"

❁ ❁ ❁

ایک معمول ختم ہوگیا تھا، دوسرا شروع ہو رہا تھا۔ زندگی معمولات سے عبارت ہوتی ہے۔ اپنے لوگوں کے حلقے میں، گرد و پیش میں اور معمولات میں تبدیلی ہو تو زندگی میں تبدیلی آتی ہے۔

ارجمند نے ان تینوں کو ڈائننگ روم میں بٹھا دیا تھا۔ پھر وہ حمیدہ کے پاس گئی۔

"چلیں دادی اماں!"

"کہاں ... ؟"

"کھانے کے کمرے میں۔ اب ناشتہ وہیں کیا کریں گے۔"

حمیدہ مسکرائی، اور اس کے ساتھ ڈائننگ روم کی طرف چل دی۔

پوریاں دیکھ کر رابعہ کا تو دل خوش ہوگیا۔ ساتھ میں آلو کی ترکاری بھی تھی اور اچار بھی۔ ارجمند گرم گرم پوریاں اتار کر نسیمہ کے ہاتھ بھجوا رہی تھی۔ رابعہ نے اس سے کہا۔

"نکی کو تو بلاؤ۔"

"وہ کہتی ہے، میں ابھی ذرا دیر میں آ رہی ہوں۔"

پھر ارجمند بھی آئی اور جلدی جلدی ناشتہ کرنے لگی۔ اسے ڈر تھا کہ اسکول کے لئے لیٹ نہ ہو جائے۔

"آپ کو ناشتہ کیسا لگا چچی جان!" اس نے رابعہ سے پوچھا۔

"بہت اچھا تھا۔ لیکن اتنا مزہ نہیں آیا، جتنا آنا چاہئے تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"کیوں......؟" ارجمند نے حیرت سے پوچھا۔

"تم تو ساتھ بیٹھی ہی نہیں۔"

"اب انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔" ارجمند نے معذرت کی۔

"آج مجھے نہ تو آغا جی کا جانا یاد تھا اور نہ ہی آپ لوگوں کی موجودگی۔

کل سے انشاء اللہ ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کریں گے۔''

''پر نکی! تم ٹھیک سے کھا کیوں نہیں رہی؟'' زبیر نے اسے ٹوکا۔

''اسکول کو دیر ہو رہی ہے نا چچا جان!''

ارجمند اسکول کے لئے تیار ہو کر آئی تو حمیدہ بھی چادر اوڑھ چکی تھی۔ اسے دیکھ کر زبیر نے کہا۔

''آپ کہیں جا رہی ہیں اماں!''

''ہاں! روز جاتی ہوں۔ نکی کو اسکول چھوڑنے اور واپس لانے کے لئے۔''

''پر اماں! گاڑی تو ہے نا!''

''او پتر! بڑی ہوتی ہوئی لڑکی کو ڈرائیور کے ساتھ اکیلے تو نہیں بھیج سکتی۔''

''ٹھیک کہتی ہیں اماں! پر اب میں جو ہوں یہاں۔ میرے پاس گاڑی بھی ہے۔ میں چھوڑ آیا کروں گا۔'' زبیر کو کچھ خیال آیا تو وہ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر شرمندگی سے بولا۔

''یہ مناسب نہیں تو آپ کی جگہ رابعہ بھی جا سکتی ہے۔''

حمیدہ اس کی بات سمجھ گئی۔

''نہیں نہیں زبیر! تجھ سے زیادہ اعتبار والا کون ہوگا۔ تو تو چاچا ہے اس کا۔'' وہ بولی۔

''پر آج تو اسے میں ہی چھوڑ کر آؤں گی۔ کل سے تو یہ کام سنبھال لینا۔'' درحقیقت اسے بابا کے پاس جانا تھا۔ وہ نسیمہ کی طرف مڑی۔

''یعقوب نے گاڑی نکال لی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ اماں! یعقوب یہاں کہاں؟ وہ تو کراچی جا چکا ہے۔'' نسیمہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

حمیدہ کو ایک لمحے کو دھچکا سا لگا۔ پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

''تو نوریز سے کہہ دے۔''

نسیمہ جانے لگی تو زبیر نے کہا۔

''میں چلتا ہوں نا اماں!''

حمیدہ آج یہ نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔

''نا پتر! آج تو آرام کر۔ میں نے کہا نا! کل سے یہ تیری ذمہ داری ہوگی۔'' پھر اس نے نسیمہ سے کہا، جو زبیر کی بات سن کر رک گئی تھی۔

''جا! جلدی سے نوریز سے کہہ، نکی کو دیر ہو رہی ہے۔''

ارجمند کو اب گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ وہ بار بار کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ دادی اماں نے زبیر کی بات کیوں نہیں مانی۔

بالآخر نسیمہ نے آ کر اطلاع دی کہ گاڑی باہر کھڑی ہے۔ ارجمند تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔ حمیدہ نے نسیمہ سے کہا۔

''تجھے بھی چلنا ہے میرے ساتھ۔''

نسیمہ نے سر ہلا دیا۔

''مجھے کچھ دیر لگے گی واپسی میں، تم لوگ پریشان نہ ہونا۔'' حمیدہ نے زبیر اور رابعہ سے کہا۔

''نکی کو اسکول چھوڑ کر میں ایک ضروری کام سے کہیں جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے اماں!'' زبیر نے کہا۔

✿ ✿ ✿

اس بار تو کمرے میں گھسنے سے پہلے ہی کام ہوگیا۔ دربان عورت دروازے پر ہی کھڑی تھی۔ جیسے اس کا انتظار کر رہی ہو۔ اس نے نسیمہ سے کہا۔

''تم یہیں کھڑی رہو۔'' پھر حمیدہ سے بولی۔

''آپ میرے ساتھ آئیں۔''

حیران حمیدہ اس کے ساتھ بڑے کمرے میں داخل ہوئی۔ آج بھی وہاں وہی حال تھا کہ تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں تھی۔ دربان عورت نہ ہوتی تو حمیدہ بابا کے کمرے کے دروازے تک کبھی نہ پہنچ پاتی۔ لوگوں سے ٹکراتی، لوگوں

کو پھلانگتی وہ آگے بڑھتی رہی۔ ہجوم کی وجہ سے اتنا سا فاصلہ بہت طویل ہو گیا تھا۔

''آپ اندر جائیں۔'' دربان عورت نے کہا۔ وہ دروازے پر ہی رک گئی تھی۔

حمیدہ نے کمرے میں قدم رکھا تو اس کی عجیب کیفیت تھی۔ سینے میں دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ وہ خوفزدہ بھی تھی، کیونکہ اس نے بابا کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی۔ وہ اپنی بہو کو لئے بغیر آئی تھی۔

وہ نظریں جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ بغیر اجازت بیٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔ اور بابا آنکھیں بند کئے اپنی ہی کسی کیفیت میں مستغرق تھا۔ ادھر خوف سے حمیدہ کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ وہ تو رات کسی کیفیت میں اس نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا، اور صبح بغیر سوچے سمجھے اس پر عمل بھی کر ڈالا تھا۔ ورنہ بابا کی حکم عدولی وہ کیسے کر سکتی تھی۔

لمحے گزرتے گئے۔ اس کی ٹانگوں کی لرزش بڑھتی گئی۔ اس کا جی چاہا کہ خاموشی سے دوسرے دروازے سے باہر نکل جائے۔

اسی لمحے بابا نے کہا۔

''نہیں! اب آئی ہے تو بیٹھ جا۔ ڈرنے کی کیا بات ہے؟ بندے کو بس اللہ سے ڈرنا چاہئے۔''

وہ بیٹھ گئی۔ بابا کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ اسے دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ یہ بات اس نے کہی ہوگی۔

''لیکن ظالم خود پر ظلم کرتا ہے۔'' بابا کے ہونٹ پھر ہلے۔

''اللہ سے نہیں ڈرتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری عمر خوف میں مبتلا رہتا ہے۔ سب سے ڈرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ خود سے بھی ڈرتا رہتا ہے۔''

حمیدہ پر تھرتھری چڑھ گئی۔ شاید بابا اس کے بارے میں کہہ رہا ہے۔

پھر بابا نے آنکھیں کھول دیں۔

''پنچھی اُڑ گیا نا، پنجرہ چھوڑ کر؟''

حمیدہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''کون سا پنچھی بابا!''

''وہی جسے ساتھ لانے کو کہا تھا تجھ سے۔''

''تم تو سب جانتے ہو بابا!'' حمیدہ نے عاجزی سے کہا۔

جواب میں بابا نے اتنے غصے سے اسے گھورا کہ وہ تھرا گئی۔ لیکن اگلے ہی لمحے بابا کے چہرے پر نرمی چھا گئی۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''یہ زبان بہت بری چیز ہے۔ سب سے زیادہ اس کی وجہ سے ہلاکت میں پڑے گا آدمی۔ بات کرتے ہوئے پہلے کچھ دیر سوچ لیا کر۔ کوئی کچھ نہیں جانتا۔ بس اللہ ہے، جو سب کچھ جانتا ہے۔ وہ جتنا جسے چاہے، بتا دیتا ہے، کسی کو کم، کسی کو زیادہ، کسی کو بہت زیادہ۔ مرضی ہے اس کی۔ اور بندے کا کام جاننا نہیں، ماننا ہے۔ اور جب اللہ چاہے تو وہ جان بھی جاتا ہے، جیسے تو نے جان لیا۔''

میں کیا جان لیا؟ گھبرائی ہوئی حمیدہ نے سوچا۔

''اور زبان کو بالکل برا بھی نہ سمجھ لینا۔'' بابا نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

''زبان بھی بہت اچھی ہے، بس ایک کام کے لئے۔ اچھی بات کے لئے اور اللہ کے ذکر کے لئے۔ اللہ نے تو کچھ بھی برا نہیں دیا ہمیں، سب اچھا ہی اچھا دیا۔ ہم بدنصیب اسے برا بنا دیتے ہیں۔ اس میں نعمت کا کیا قصور؟''

اس بار حمیدہ کی سمجھ میں کچھ آیا۔

''میں سمجھ گئی بابا! میں اللہ سے توبہ کروں گی۔ تم میرے لئے دعا کرو۔''

''اللہ پاک کرنے والا ہے مائی! بندہ سب کچھ اس پر چھوڑ دے تو بے فکری ہی بے فکری ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ پنچھی پنجرہ چھوڑ کر اُڑ گیا نا! اور تو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔''

''ہاں بابا! اسی لئے تو میں اسے نہیں لا سکی۔'' حمیدہ نے افسردگی سے کہا۔

''تو نے اپنی طاقت پر، بیٹے کی فرمانبرداری پر گھمنڈ کیا تھا۔ تو سمجھتی تھی

کہ یا تو اسے یہاں آنے پر مجبور کر دے گی یا بیٹے کی دوسری شادی کرا دے گی۔ لیکن دیکھ لے، تو کچھ بھی نہیں کر سکی۔ بندہ اسی گمان میں تو مارا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔ ارے اللہ سے معاملہ کیا کر۔ وہ چاہے تو کچھ بھی ہو جائے۔ وہ نہ چاہے تو کوئی منہ کا نوالہ بھی حلق سے نہیں اُتار سکتا۔''

''مجھ سے بھول ہوگئی بابا! ورنہ میں ایسی گھمنڈی تو نہیں۔'' حمیدہ نے شرمندگی سے کہا۔

''تبھی تو اللہ کی رحمت ہوئی اور تجھے سزا مل گئی ورنہ اللہ کو بھول کر گھمنڈ کرنے والوں کا تو وہ کامیابی سے، گھمنڈ اور بڑھا دیتا ہے۔'' بابا نے چھت کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں اس لئے آئی ہوں بابا کہ......''

بابا نے اس کی بات کاٹ دی۔

''اللہ سب جانتا ہے، اس نے تجھے سب کچھ بتا تو دیا۔ اب کیا پریشانی ہے تجھے؟''

''نور بانو نے خود اپنے لئے اولاد نہ ہونے کی دعا کی۔ اس بات کی مجھے سمجھ نہیں آتی۔'' حمیدہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''گمراہی میں آدمی بھلا سمجھ کر برا مانگتا ہے۔ یہ تو ہوتا آیا ہے، اور ہوتا رہے گا۔''

''لیکن کیوں بابا....؟''

''شکر بڑی چیز ہے مائی! اور شکر نہ کرنا کفر ہے۔''

حمیدہ کا جسم لرزنے لگا.... کفر! نور بانو ناشکری تھی۔ یہ بات وہ جانتی تھی، اور یہ وہ اسے سمجھاتی بھی رہی تھی۔

''بندہ نعمتوں سے منہ موڑے تو نعمتیں خود بخود اس سے دور ہوتی جاتی ہیں۔ بندہ شکر ادا نہیں کرتا اور نعمتوں کو غیر اللہ سے منسوب کرتا ہے تو اللہ سے دور اور نعمتوں سے محروم ہوتا جاتا ہے۔ اپنی چال بازیوں پر بھروسہ کرنے والے کو یہ کہاں معلوم ہوتا ہے کہ سب سے مضبوط چال اللہ کی ہوتی ہے۔ اب تیری بہو

خوش ہوگی کہ اس کی مشکل آسان ہوگئی۔ وہ پریشانی سے بچ کر دو چلی گئی۔''

''تو یہ تو سچ بھی ہے بابا!'' حمیدہ کے لہجے میں ہلکی سی شکایت تھی۔

''سچ تو یہ ہے کہ اللہ نے اسے آخری موقع دیا تھا، اور بدنصیب نے اسے بھی گنوا دیا۔ صرف اپنی انا کی وجہ سے۔ وہ یہاں آتی، میرے سامنے اللہ سے رجوع کرتی، توبہ کرتی تو مجھے اسے کے لئے دعا کی اجازت ملتی۔ اور کون جانے، اللہ میری دعا قبول ہی فرما لیتا۔'' بابا کے لہجے میں بلا کی عاجزی تھی۔

''تو اب......؟''

''اب تو مہر لگ گئی۔'' بابا نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔

''اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب وہ ساری عمر محروم رہے گی۔''

حمیدہ دہل گئی۔ پھر اسے وہ بات یاد آئی جو کرنے کے لئے وہ یہاں آئی تھی۔

''لیکن بابا! اس میں .....''

''تو کچھ نہ کہو، میں تجھے سب سمجھا دوں گا۔'' بابا نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔

''تیرے بیٹے کا براہ راست کوئی قصور نہیں۔ لیکن ایک قصور ہے۔ دیکھ، جب دو افراد نکاح کے رشتے سے جڑتے ہیں تو کسی حد تک ان کے اعمال بھی جڑ جاتے ہیں۔ وہ شریک حیات ہوتے ہیں نا! تو ایک دوسرے کے بعض اعمال کی جزا اور سزا میں بھی وہ ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی بابا؟''

''اسی لئے تو کہتے ہیں کہ صورت، دولت ہر چیز چھوڑ کر مومن اور متقی شریک حیات منتخب کرو۔ سوچ تو سہی، اولاد میں ماں اور باپ، دونوں کی خصوصیات اور عادات آتی ہیں نا، یہ رشتہ ہی ایسا ہے۔ اب ایک ناشکرا ہے اور دوسرا شکر گزار تو بس اللہ کی رحمت ہی اولاد کو ناشکرے پن سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ جو ماں اچھی نہیں ہوگی، اس کی اولاد کیسے اچھی ہو سکتی ہے۔ ہاں اللہ چاہے تو اور بات ہے۔ اور میں نے کہا نا کہ شکر کا الٹ کفر ہے۔''

حمیدہ کو لگا کہ اس کے اردگرد اندھیرا چھا گیا ہے۔ وہ بڑی گہری مایوسی تھی۔ تو کیا میں ساری عمر عبدالحق کے بیٹے کو ترستی رہوں گی۔ اس نے سوچا۔ کیا میرے عبدالحق کی نسل یہیں ختم ہو جائے گی۔

''یہ میں نے کب کہا؟'' بابا نے اسے چونکا دیا۔

''تم نے کہا نا! بابا کہ اب وہ ساری عمر محروم رہے گی۔''

''ہاں! لیکن میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تیرا بیٹا محروم رہے گا۔''

چند لمحے تو حمیدہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکی۔

''جب وہ ایک دوسرے سے جڑے ہیں بابا تو ایک کی محرومی دوسرے کی محرومی ہے۔'' اس نے دکھ سے کہا۔

''میری بہو کی محومی میرے بیٹے کی بھی تو ہے۔''

''ہرگز نہیں! تیرا بیٹا اللہ والا ہے، صابر ہے، اپنی خواہش کسی پر ظاہر بھی نہیں کرتا۔ صرف اللہ سے مانگتا ہے۔ اپنے ایسے بندے کو اللہ کبھی محروم نہیں رہنے دیتا۔''

حمیدہ کے دل میں روشنی کی کرن سی پھوٹی۔

''تو میرے عبدالحق کے ہاں......''

بابا نے اس کی بات کاٹ دی۔

''اللہ دینے والا ہے۔ جس نے جو مانگا ہے، اسے وہی ملے گا۔''

''لیکن کیسے......؟''

''کیا ہوگیا ہے تجھے......؟ سامنے کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔'' بابا نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔

''مرد کو تو چار شادیوں کی اجازت ہے۔''

اور حمیدہ کو خود پر حیرت ہونے لگی۔ واقعی! سامنے کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے تو نور بانو کو بھی دوسری شادی کرانے کی دھمکی دی تھی۔ مگر اب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ محض دھمکی تھی۔ وہ اسے ڈرا کر بابا کے پاس لانا چاہتی تھی اور بس۔ لیکن اب تو عبدالحق کی دوسری شادی کرانا اس کا فرض تھا۔ اگر

نور بانو نے دعا سمجھ کر اپنے لئے بددعا کی تو اس میں عبدالحق کا کیا قصور؟ اب نور بانو ماں نہیں بن سکتی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ عبدالحق کی نسل یہیں پر ختم ہو جائے۔ سیدھی سی بات ہے۔

''تو مجھے دوسری شادی کرانی ہوگی اپنے بیٹے کی؟'' اس نے کہا۔ پھر ایک خیال آیا تو وہ پریشان ہوگئی۔

''لیکن بابا! کیسے کراؤں گی دوسری شادی؟ وہ دونوں تو دوسرے شہر چلے گئے۔''

''تجھے کچھ کرنے کرانے کی ضرورت نہیں۔'' بابا نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔

''اللہ کو جو منظور ہے، خود ہو جائے گا۔ تجھے تو خوش خبری مل گئی نا!''

لیکن خوش خبری نے حمیدہ کو بے صبرا بنا دیا تھا۔

''تو وہ کب ہوگا بابا؟''

''اللہ جانتا ہے، کون جانے، برسوں لگیں۔''

حمیدہ کا چہرہ ست گیا۔

''برسوں......؟''

''خوش ہو جا، ڈرمت، اللہ سے دعا کیا کر۔ انشاء اللہ تیرا پوتا تیری گود میں کھیلے گا۔''

''اتنے برسوں سے انتظار کر رہی ہوں بابا! اور تم اور برسوں کی بات کر رہے ہو۔''

''ناشکرا پن مت کر۔'' بابا نے پرجلال لہجے میں کہا۔

''تجھے برسوں سے کہا۔ کہا نا، تو اپنے پوتے کو کھلائے گی۔''

حمیدہ لرز گئی۔ دل میں توبہ کرنے لگی۔

''پہلے ہی کہا تھا نا کہ تو مدعی نہیں۔ تجھے اپنے بیٹے سے زیادہ اولاد کی آرزو نہیں۔ اور تیرا بیٹا تو بس ایک ہی در کو مانتا ہے، ایک ہی در سے مانگتا ہے۔ اب اللہ جانے اور وہ جانے۔ تیرا کیا پیچ اس میں۔ انتظار تو جتنا نصیب میں ہے،

کرنا ہی ہوگا۔ اپنے بیٹے کو دیکھ۔ صبر اور وقار کے ساتھ انتظار کرتا ہے۔ تیرے بے صبرے پن سے انتظار کم نہیں ہوگا۔ ہاں تجھے اور برا لگنے لگے گا۔ کام تو اپنے وقت پر ہی ہوگا۔''

''ٹھیک ہے بابا! اللہ مجھے معاف کرے۔ تم میری زندگی کے لئے دعا کرنا۔'' حمیدہ نے گھبرا کر کہا۔ اس کا ذہن الجھا ہوا اور منتشر تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ہر خوش خبری تو دے دی گی اسے، تو اب اسے پریشانی کس بات کی ہے۔

پھر اچانک بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے کہا۔

''مگر ایک بات تو ہے بابا! اپنے بیٹے کی دوسری شادی تو مجھے ہی کرانی ہوگی۔ خود سے تو نہیں ہوگی نا!''

''پھر وہی بچوں کی سی بات۔'' بابا جھنجلا گیا۔

''وہ دونوں تجھ سے دور چلے گئے۔ تو کیسے کرائے گی اس کی دوسری شادی؟''

''تو پھر......؟''

''تجھے کچھ بھی نہیں کرنا ہوگا۔ تجھے تو بس پوتا چاہئے۔ وہ انشاء اللہ تجھے مل جائے گا۔ اور کیا چاہئے تجھے؟''

''مجھے کچھ نہیں کرنا تو کسی کو تو کرنا ہوگا۔'' حمیدہ کے دماغ میں وہ بات ایسی پھنسی تھی کہ اس کے دل سے ہر ڈر نکل گیا تھا۔

''اللہ کی مرضی! جس سے جو کام چاہے، لے لے۔''

''پر بابا! مجھے بتاؤ تو...... خدا کے لئے۔''

''تو سن! میں بتاتا ہوں۔ پر پہلے یہ سمجھ لے کہ جان لینے سے آدمی کی خوشی اور اس کا لطف کم ہو جاتا ہے۔ تیری بہو خود ہی کرائے گی تیرے بیٹے کی دوسری شادی۔ وہ نادان اسے کھیل کھیل سمجھ کر کھیلے گی۔''

حیرت سے حمیدہ کا منہ کھلا، اور کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔

''اور تجھے میں سختی سے تاکید کر رہا ہوں کہ تو خود کچھ بھی نہیں کرنا۔ زبان سے بھی کچھ نہ کہنا۔ سب اللہ پر چھوڑ دے، اپنے بیٹے کی طرح۔''

حمیدہ نے سر جھکا لیا۔ پھر اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ بات سمجھ میں نہیں آنے والی تھی، لیکن اس کے دل نے مان لی۔

''کون جانے، تجھے بہو وہ ملے، جو تجھے دل سے پسند ہو۔'' بابا کی آنکھیں بند تھیں اور وہ عجیب سی کیفیت میں بول رہا تھا۔

''کون جانے، وہ تیرے بیٹے کو اس کا کھویا ہوا مقام اور مرتبہ دلانے والی ہو۔ کون جانے، وہ اس کی تقدیر بدل دینے والی ہو، کون جانے...... بس اللہ ہی جانے۔''

حمیدہ کے دل میں خیال آیا۔ اللہ کا دیا اتنا کچھ ہے اس کے پاس، کچھ یہاں دیتی ہی چلے۔

بابا نے آنکھیں کھول دیں۔ اور خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''یہاں میں دکان کھولے نہیں بیٹھا ہوں۔'' اس نے غصے سے کہا۔

''دعاؤں کا کاروبار نہیں کرتا ہوں میں۔ مجھے دینا والا اللہ ہے، جو تمام خزانوں کا مالک ہے۔ اور میں اس پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امتی ہوں، جو چاہتا تو اس کے لئے پہاڑ سونے کی بن جاتے۔ لیکن جو پیٹ پر پتھر باندھ کر جہاد کرتا رہا، بس اب تو چلی جا!''

حمیدہ دوسرے دروازے کی طرف بڑھی۔

اسی لمحے بابا نے اسے پکارا۔

''ٹھہر ذرا۔ پانی تو پیتی جا۔'' اس نے مٹکے کی طرف اشارہ کیا۔

حمیدہ مٹکے کی طرف چلی گئی۔ نیچے بیٹھ کر اس نے کٹورا نیچے رکھا، مٹکے کو کھولا۔ وہ صاف شفاف پانی سے اوپر تک بھرا ہوا تھا۔ اس پانی کو دیکھ کر پاکیزگی کا احساس ہوتا تھا۔ اس نے ڈونگے سے پانی نکال کر کٹورا بھرا۔ پھر مٹکے کو بند کر کے ڈونگا اس پر رکھ دیا۔

نیچے بیٹھے بیٹھے اس نے کٹورا اٹھایا، بسم اللہ پڑھی اور کٹورے کو ہونٹوں سے لگا کر ایک گھونٹ لیا۔

حیرت سے وہ سن ہوگئی۔ وہ پانی تو نہیں ہوسکتا تھا۔ زبان سے حلق تک

اسی کا ذائقہ موجود تھا۔ وہ تو دودھ تھا۔ خالص دودھ، جس میں شہد کی خوشبو بھی تھی اور ذائقہ بھی۔ اور وہ زندگی بھر خالص دودھ پینے والی قسم کھا کر کہہ سکتی تھی کہ اس نے زندگی میں کبھی اتنا خوش ذائقہ دودھ نہیں پیا تھا۔

اس نے کٹورے کی طرف دیکھا تو اسے ایک اور جھٹکا لگا۔ کٹورے میں تو محض صاف شفاف پاکیزہ پانی تھا۔

اس نے پانی پر نظریں جمائے ہوئے دوسرا گھونٹ لیا۔ لیکن وہ وہی دودھ تھا، جس کا گھونٹ اس نے ایک لمحہ پہلے حلق سے اتارا تھا۔

اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ کٹورے میں اب بھی پانی تھا۔

اس نے تیسرا گھونٹ لیا اور کٹورا خالی کر کے مٹکے پر رکھ دیا۔ اسے یقین تھا کہ اس دودھ کا ذائقہ وہ کبھی نہیں بھولے گی۔

وہ کھڑی ہوئی تو اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ بابا کی طرف دیکھنے کی اسے ہمت ہی نہیں ہوئی۔ وہ لرزتے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی۔

''کون جانے......'' بابا نے کہا۔

''بس اللہ ہی جانتا ہے۔ وہ جسے جو چاہے دے دے، چاہے تو بے حد و بے حساب دے دے۔''

وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی، دروازہ بند کیا اور منتظر نسیمہ کی طرف بڑھی۔

اس کے دل میں بس ایک ہی خیال تھا۔ اس پر اللہ کی بہت بڑی عنایت ہوئی ہے۔ اللہ نے بہت کرم فرمایا ہے اس پر۔

اس کے چہرے پر نہ جانے کیا تھا کہ نسیمہ پریشان ہوگئی۔ جسم کی لرزش تو ویسے ہی نمایاں تھی۔

''کیا ہوا اماں! خیر تو ہے؟'' اس نے پوچھا۔

حمیدہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھے بغیر جواب دیا۔

''سب ٹھیک ہے نسیمہ۔ اللہ کا شکر ہے۔'' پھر وہ دل میں ......اللہ کا شکر ہے...... کی گردان کرتی رہی۔

✿ ✿ ✿

کراچی پہنچ کر نور بانو کو احساس ہوا کہ اس کی خوشی کتنی سطحی تھی۔

یہ نیا شہر تو اس کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ اجنبی اور نامانوس۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ تبدیلی اس کے لئے کوئی نئی چیز ہو۔ دہلی سے نکل کر اس نے ریگستان کا سفر کیا تھا۔ پھر جو اس کا پاکستان میں پہلا ٹھکانا تھا، وہ ایک گاؤں تھا، جو کبھی ٹھاکروں کی گڑھی کہلاتا تھا، جو ٹنوں ریت کے نیچے دب گیا تھا۔ بعد میں اس نے اسے برآمد ہوتے بھی دیکھا۔

وہ بہت بڑی تبدیلی تھی۔ موسم تو دہلی میں بھی سخت تھے۔ ایک طرف گلابی جاڑا تو دوسری طرف آگ برساتا موسم گرما۔ لیکن یہاں صحرا میں تو موسموں کے تیور ہی اور تھے۔ دہلی تو اس کے سامنے معتدل علاقہ لگتا تھا۔

پھر زبان کی تبدیلی، رسم و رواج اور رہن سہن کی تبدیلی۔ دہلی میں پردہ کتنا سخت تھا۔ مجال ہے کہ کسی غیر مرد کو انگلی بھی نظر آسکے۔ باہر نکلنا اوّل تو ہوتا ہی نہیں تھا۔ اور ہوتا تو اس کے لئے پالکی میں سفر ہوتا۔ جس میں پردے کا خاص اہتمام ہوتا۔ اور وہاں برقع لازمی تھا۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ وہاں ماڈرن لوگ نہیں رہتے تھے۔ لیکن وہ جس طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتی تھی، اس میں فیشن ایبل اور بے پردہ عورتوں اور لڑکیوں کو پرکٹی میم اور انگریزوں کی نقال کہا جاتا تھا۔ اور کہا جاتا تھا کہ یہ سب سرسید احمد خان کا کیا دھرا ہے۔

لیکن صحرا میں پہنچتے ہی صورت حال بدل گئی۔ وہاں عورتیں گھر کی بوبو نہیں تھیں، نہ وہ باورچی خانے کی شہزادی تھیں۔ وہاں تو انہیں باہر کے کام بھی کرنے ہوتے تھے۔ وہاں عورتوں کے لئے نزاکت اگر کوئی شے تھی تو وہ اندر کی چیز تھی۔ محنت کرنے میں وہ مردوں سے کم نہیں تھیں۔ وہاں باورچی خانے اور گھر کے کاموں میں باہر سے پانی لانا بھی تھا۔ اور بعض اوقات وہ میلوں چل کر جاتیں اور صرف دو گھڑے پانی کے لئے اتنی مشقت جھیلتیں۔ نازک اور کمزور عورتوں کے بس کے تو دو گھڑے تھے بھی نہیں، کہ ایک سر پر رکھ کر اور دوسرا بغل میں دبا کر ریت پر چلنا آسان کام نہیں تھا۔ باہر مرغیوں اور مویشیوں کی دیکھ بھال اور ان کا چارہ پانی کی فکر الگ۔

اب وہ حمیدہ کی محبت اور عنایات کیسے بھول سکتی تھی۔ اسی نے تو اسے بدلے ہوئے ماحول سے، زندگی سے مطابقت پیدا کرنا سکھایا تھا۔ اسی نے تو بتایا تھا کہ پردہ محض برقع لپیٹ لینے کا نام نہیں۔ یہ کام بڑی چادر سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ پردہ تو بس اپنی زینت کو، اپنے حسن کو نہاں رکھنے کا نام ہے۔ یہ خیال رکھنے کا نام ہے کہ آپ کی کوئی نظر، آپ کا کوئی انداز، آپ کی کوئی بے حجابی کسی کے لئے ترغیب اور آزمائش کا سبب تو نہیں بن رہی ہے۔

جب پہلی بار حمیدہ نے اسے دھکیل کر بھیجا کہ وہ عبدالحق کو بلا کر لائے تو اس کا کتنا حال تھا۔ لیکن فوراً ہی اس نے اس تبدیلی کو قبول کر لیا، کیونکہ وہ اسے اچھی لگی۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے نزدیک دنیا محض چار دیواری کے اندر چند سو گز زمین تھی، اور اسے بھی مزید دیواروں کے ذریعے تقسیم اور محدود کر دیا گیا تھا۔ یہ تو اس نے اس وقت دیکھا کہ آسمان کیسا لامتناہی ہے اور زمین کتنی وسیع و عریض ہے کہ حد نظر بس انسان کی بے بسی کا نام ہے۔ اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہ گھٹن میں پلی بڑھی تھی۔ اور یہ کہ گھٹن بھی انسان کو خود اعتمادی نہیں دے سکتی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ خود اعتمادی تو اسے وہاں رہ کر ہی ملی تھی۔ اور خود اعتمادی کی تحریک اسے حمیدہ نے ہی دی تھی۔ حمیدہ نے ہی اسے بیٹی کہا اور سمجھا اور حمیدہ ہی کے دم سے عبدالحق اسے ملا۔

وہ مانے یا نہ مانے، حمیدہ کے اس پر بڑے احسان ہیں۔

پھر اس نے ایک اور تبدیلی دیکھی۔ صحرا سے وہ شہر میں آئی۔ شہر لاہور! نہ جانے کیوں اسے دہلی اور لاہور میں بہت فرق نہیں لگا۔ جب وہ اور بہنیں چھوٹی تھیں اور ابا زندہ تھے تو وہ کبھی انہیں سیر کے لئے لے جاتے تھے۔ جمنا کا کنارہ، قطب مینار، شاہی قلعہ، تاریخی عمارتیں، مغلوں کی یادگاریں۔ لاہور میں ویسا ہی تھا۔ وہ سب کچھ، بس دریا کا نام بدل گیا تھا۔ یہاں دریائے راوی تھا، جمنا سے چھوٹا سہی، لیکن تھا تو دریا ہی۔ بادشاہی مسجد یہاں بھی تھی، قلعہ بھی تھا۔ تھوڑا سا زبان کا فرق تھا۔

تو وہ اسے سرے سے تبدیلی ہی نہیں لگی۔ بس یہاں وہ آزاد تھی۔ آزاد

اور پُراعتماد۔

لیکن کراچی میں تو داخل ہوتے ہی اسے بہت بڑی تبدیلی کا احساس ہوا۔ وہ احساس وہاں کی فضا میں سانس لیتے ہی ہوا تھا۔ کوئی بڑی مختلف سی چیز تھی ہوا میں، جسے وہ سمجھ نہیں سکی۔

لیکن نہیں، پہلے تو اسے لاہور میں جہاز میں بیٹھتے ہی ڈر لگا تھا۔ دیکھنے میں جہاز بس سے تھوڑا ہی مختلف تھا۔ لیکن یہ خیال کہ یہ بس چلے گی نہیں، اڑے گی، ڈرا دینے والا تھا۔ اگر وہ حمیدہ سے ڈر کر بھاگ نہ رہی ہوتی، اور اگر عبدالحق اس کے ساتھ نہ ہوتا تو وہ توبہ کرتی ہوئی اس سے اتر کر گھر واپس بھاگ جاتی۔ عبدالحق نے اس کی بیلٹ کس دی تھی، اور اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''ڈرو نہیں! میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' اس نے اسے دلاسہ دیا تھا۔

اور جب جہاز نے چلنا شروع کیا تو وہ چلنا بھی کار کے دوڑنے سے زیادہ تیز تھا۔ اس نے ڈر کے مارے کھڑکی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اس کے باوجود اس کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

اور وہ لمحہ جب جہاز نے زمین چھوڑی اور فضا میں اٹھنے لگا، وہ تو بہت ہی بھاری تھا۔ پہلے تو وہ اسے جھولے کی پینگ لگی، اور اس احساس نے اسے زیادہ نقصان پہنچایا۔ وہ تو اپنے تصور میں جھولے پر بیٹھی پینگ لے رہی تھی۔ لیکن جھولے کی پینگ اتنی اونچی کب جاتی ہے۔ جاتے تو جھولنے والا ڈر کر گر جائے۔

اسے ایسا ہول چڑھا کہ بس، وہ تو شکر ہے کہ الٹی کا اس کا سسٹم نہیں تھا۔ اسے تو کبھی بیماری میں بھی الٹی نہیں ہوتی تھی۔ ورنہ اسے یقیناً قے ہو جاتی۔ اس نے عبدالحق کا ہاتھ بہت سختی سے پکڑ لیا تھا۔

پھر پرواز ہموار ہوگئی تو اس نے سکون کی سانس لی۔

لیکن جہاز کے اترنے کا مرحلہ اس سے بھی سخت تھا۔ اس کے پیٹ میں کوئی گولا سا بنا اور اوپر اٹھنے لگا۔ اس کے ذہن میں اس کے لئے بس ایک ہی لفظ تھا..... ہول ..... اور اسے لگا کہ جہاز نیچے اتر رہا ہے۔ اور وہ اوپر کی طرف اٹھتی جا رہی ہے، اور بالآخر اسے گر جانا ہے۔

پھر جہاز کے پہیوں نے کئی بار زمین کو چھوا، پھر اٹھے اور پھر چھوا۔ جھٹکوں سے اس کا برا حال ہوگیا۔ پھر جہاز جیسے تھما، وہ تھما تو بہر حال نہیں تھا۔ اب وہ کار کی طرح چل رہا تھا، لیکن رفتار کار سے بہت تیز تھی۔ البتہ یہ تدریج کم ہو رہی تھی۔

تب وہ پرسکون ہوگئی۔ لیکن اس نے دل میں عہد کر لیا کہ اب زندگی میں کبھی جہاز پر نہیں بیٹھے گی۔

باہر عارف ان کا منتظر تھا۔

عبدالحق اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ نوربانو پچھلی سیٹ پر تھی۔ وہاں پہلی سانس لیتے ہی اسے احساس ہوگیا کہ یہاں کی ہوا بالکل مختلف ہے۔

عارف عبدالحق سے لاہور کے بارے میں پوچھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

''ارجمند نہیں آئی تمہارے ساتھ؟''

''نہیں! اس کا اسکول میں داخلہ ہوگیا ہے۔ وہ وہیں پڑھنا چاہتی تھی۔'' عبدالحق نے کہا۔ پھر تاسف سے بولا۔

''اس کی وجہ سے اماں بھی نہیں آئیں۔''

''جو بھی ہوتا ہے، بہتر ہی ہوتا ہے عبدالحق!''

نوربانو کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ البتہ عبدالحق نے کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں۔'' پھر چند لمحے بعد اس نے پوچھا۔

''عارف بھائی! ہمارے قیام کا بندوبست تو کر رہا ہے نا آپ نے؟''

''میں نے کہا تھا کہ نہ تم اس کی فکر نہ کرو۔ البتہ دو تین دن تمہیں ہمارے ہاں قیام کرنا ہوگا۔''

''کیوں......؟''

''میری عزت افزائی کے لئے۔'' عارف نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر ہنسنے لگا۔

''ارے بھائی! مکان کا بندوبست تو میں نے کر دیا۔ لاہور سے کوئی سامان تو تم لائے نہیں ہو۔ اب مکان کو گھر کرنے کے لئے ضروری چیزیں تو

خریدنی ہوں گی تمہیں۔''

''اوہ...! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ خیر......!''

نوربانو اب باہر دیکھ رہی تھی۔ یہ عجیب شہر تھا۔ بستی سے جڑی ہوئی بستیاں یہاں نہیں تھیں۔ خاصے فاصلے پر اکا دکا کوئی بستی نظر آتی تو وہ بھی ایسی، کہ لگتا تھا، کچھ لوگ ویرانے میں آکر آباد ہوگئے ہیں۔ زیادہ تر جھونپڑیاں ہی نظر آتی تھیں۔ اور ان میں بھی ترتیب نہیں تھی۔ ایک یہاں ہے تو دوسری سو قدم دور۔ اور یہ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کب وہ بستی ختم ہوئی اور ویرانے کا تسلسل قائم ہوگیا۔

پھر ایک بڑی بستی نظر آئی۔ لیکن وہاں نہ رونق تھی نہ چہل پہل۔ اسے کوفت ہونے لگی۔

''یہ کیسا شہر ہے؟'' وہ بڑبڑائی۔

''یہ مستقبل کا بہت بڑا اور اہم شہر ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''کمال کرتے ہیں آپ! حال تو دیکھا نہیں آپ نے اس کا، اور مستقبل دیکھ لیا۔'' نوربانو کا انداز مضحکہ اڑانے والا تھا۔

''تم نہیں سمجھو گی۔'' عبدالحق نے متانت سے کہا۔

''کیسے سمجھ سکتی ہو۔ اسے سمجھنے میں تو انگریز اور ہندو، دونوں دھوکا کھا گئے۔ اگر انہوں نے اس کی اہمیت سمجھ لی ہوتی تو آج یہ پاکستان میں نہ ہوتا۔ لیکن اللہ کو جو منظور ہوتا ہے، وہ ہو کر رہتا ہے۔ وہ جسے جو مرتبہ چاہے عطا فرما دے۔''

عارف اخلاقاً چپ تھا۔ ان کی باتوں میں دخل دینا خلافِ تہذیب ہوتا۔

عبدالحق نے یہ بات محسوس کر لی۔ اس نے اسے گفتگو میں شریک کرنے کے لئے تائید طلب لہجے میں کہا۔

''کیوں عارف بھائی! میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں۔''

عارف مسکرایا۔

"تم سو فیصد ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن میں اس پر حیران ہوں کہ تم نے یہ سمجھا کیسے؟"

"میں ہر لمحہ پاکستان کو سمجھنے، اس کے ممکنہ وسائل کو ڈھونڈنے اور انہیں تولنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"پھر بھی، کراچی کو دیکھے بغیر سمجھنا آسان نہیں۔"

"میری سمجھ میں آپ دونوں کی باتیں نہیں آ رہی ہیں۔" نور بانو نے کہا۔

"اور آپ تو انگریزوں اور ہندوؤں کو بے وقوف قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں۔" اس کا یہ خطاب عبدالحق سے تھا۔

"اور وہ بھی اس ویرانے کی وجہ سے، جسے آپ لوگ شہر کہہ رہے ہیں۔"

"تم میری بات سمجھ نہیں سکیں نور بانو!" عبدالحق نے برا مانے بغیر کہا۔

"میں نے انگریزوں اور ہندوؤں کو بے وقوف نہیں کہا۔ کہہ بھی نہیں سکتا۔ ان عیاروں نے مل کر بدنیتی سے تقسیم ہند میں آخری لمحوں میں گڑبڑ کی اور جن علاقوں کو پاکستان میں ہونا تھا، انہیں ہندوستان میں شامل کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ پاکستان منتشر تو پہلے ہی ہوگا، اپنی ابتداء ہی سے معاشی ابتری کا شکار ہو جائے۔ اور آخر میں اکھنڈ بھارت، ایسی اسکیم بنانے والوں کو بے وقوف کوئی بے وقوف ہی کہہ سکتا ہے۔ وہ تو عیار اور مکار ہیں۔ یہ تو اللہ کی شان ہے کہ اس اجاڑ اور ویران پڑے قطعہ زمین کی وقعت وہ نہ سمجھ سکے۔ تو یہ اللہ کی طرف سے بہتری ہوئی نا۔"

"مگر آپ مجھے اس کی وقعت تو سمجھائیے ذرا۔"

گاڑی اب ایک بڑی آبادی کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ وہاں جھونپڑیوں کے ساتھ کچے اور پکے دونوں طرح کے مکان تھے۔ بازار بھی تھا اور وہاں رونق اور چہل پہل بھی تھی۔

"یہ ڈرگ روڈ ہے بھابی!" عارف نے کہا۔ پھر وہ عبدالحق کی طرف

مڑا۔

"تم مجھے یہ تو سمجھاؤ کہ کراچی کی اہمیت تم نے کیسے سمجھی؟"

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا۔

"بنیادی بات یہ ہے عارف بھائی! کہ پاکستان اللہ کی بہت بڑی عطا ہے۔ نعمت عظمیٰ ہے مسلمانوں کے لئے۔ ورنہ یہ بنتا نہیں، اور بنتا تو قائم نہ رہ پاتا۔ اب تو ہندو پریشان ہیں۔ انہوں نے پاکستان اس لئے بننے دیا تھا کہ ان کے خیال میں دو تین سال کے اندر وہ ناکام ریاست ثابت ہو جائے گا۔ اور مسلمان ہاتھ جوڑ کر کہیں گے کہ خدا کے لئے، ہمیں واپس لے لو۔ لیکن پاکستان ہر گزرتے دن کے ساتھ مستحکم ہوتا جا رہا ہے۔"

"بات اس شہر کی ہو رہی تھی۔ اور آپ اسے کہیں کا کہیں لے گئے۔" نور بانو نے مداخلت کی۔

عبدالحق اب بھی برا نہیں مانا۔

"میں اس طرف آ رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

"اس تقسیم کے نتیجے میں، اور خاص طور پر عین وقت پر کی جانے والی بددیانتی اور زیادتی کے نتیجے میں ہندوستان سے ہجرت کرنے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ شہید ہونے والوں سے صرف نظر کر کے سوچیں تو بھی ہندوستان سے لگ بھگ ساٹھ لاکھ مسلمان ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ یہ کوئی معمولی تعداد نہیں۔ دنیا کی تاریخ میں اتنی بڑی ہجرت کی مثال نہیں ملتی۔ اور اس وقت پاکستان کی حالت ایک ایسے جہاز کی تھی، جس پر اس کی گنجائش کے مطابق مسافر موجود تھے اور جو شدید طوفان سے نبرد آزما تھا۔ ایسے میں بڑی تعداد میں مسافر سوار کرنے پڑ جائیں تو جہاز ڈوب جاتے ہیں۔ ہندوؤں کا خیال بھی یہی تھا۔" عبدالحق نے گہری سانس لی۔

اس دوران نور بانو اکتاہٹ کے عالم میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ پیشانی پر اور بالائی ہونٹ کے اوپر پسینے کا احساس ہوا تو اس نے رومال سے اپنا پسینہ پونچھا۔ اسے حیرت ہوئی۔ ابھی ایک منٹ پہلے تو پسینہ پونچھا تھا۔ یہ پھر

اوہ ۔۔۔ یہ بھی ایک تبدیلی ہے۔ یہاں پسینہ آجائے تو ہوا کی موجودگی میں بھی خشک نہیں ہوتا۔ اس نے سوچا۔

''اب ذرا سوچیں، عارف بھائی، ساٹھ لاکھ افراد کی آمد، جن کی اکثریت بڑے شہروں سے آئی تھی اور بڑے شہروں میں ہی رہنا چاہتی تھی۔ اور یہاں بڑے شہر تھے ہی کتنے، یہ تو بہت بڑا بحران پیدا ہو جاتا تھا۔ لیکن پلاننگ تو اللہ کی تھی نا! مہاجرین کی اکثریت نے کراچی کا رخ کیا۔ حالانکہ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ تو قصبہ کہلانے کا مستحق بھی نہیں تھا۔ لیکن ایک بہت بڑی نعمت یعنی بے حساب زمین وہاں موجود تھی۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم!'' عارف نے کہا۔

''اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بڑے شہروں کا توازن نہیں بگڑا۔ اور مستقبل کے ایک بے شہر کی داغ بیل پڑ گئی۔ معیشت پر دباؤ بھی نہیں پڑا۔ بلکہ الٹا معیشت کے استحکام کا سامان ہوگیا۔ یہ چھوٹی سی جگہ، جس کی ہندوستان کے نقشے میں کوئی اہمیت نہیں تھی، اس کی اہمیت نہ انگریز سمجھ سکے اور نہ ہندو۔''

نور بانو باہر کے منظر سے اکتا کر پھر عبدالحق کی باتیں سننے لگی تھی۔ بے زاری سے بولی۔

''مگر اس کی اہمیت کیا ہے؟''

عبدالحق مسکرایا۔

''میرا خیال ہے، اتنی مکمل قدرتی بندرگاہ دنیا میں شاید ہی کوئی اور ہو۔''

''تو اس سے کیا ہوتا ہے؟''

''دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ ساحلی شہر سب سے زیادہ پھلتے پھولتے ہیں۔ وہ اپنے ملک کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔ اور پھر ایسا شہر جہاں قدرتی بندرگاہ ہو۔''

''یہ قدرتی بندرگاہ کیا ہوتی ہے؟''

''جہاں جہاز کنارے پر آکر لگتے ہوں۔ ورنہ عام ساحلی شہروں میں جہازوں کو بندرگاہ سے دور کھلے سمندر میں لنگر انداز ہونا پڑتا ہے۔ پھر کشتیوں

کے ذریعے تجارتی سامان کنارے پر پہنچایا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہر چیز مہنگی پڑتی ہے۔ اور یہ کراچی کوئی چھوٹی بندرگاہ نہیں، بہت بڑی بندرگاہ ہے۔ یہاں بیک وقت درجنوں جہاز لگ سکتے ہیں۔ پورے ہندوستان میں اس جیسی ایک بندرگاہ بھی نہیں۔''

''تو بندرگاہ کے ہونے نہ ہونے سے کسی ملک پر کیا فرق پڑتا ہے؟'' نور بانو جھنجلاہٹ میں سوال پر سوال کئے جا رہی تھی۔

''بین الاقوامی تجارت کی اہمیت سمجھتی ہو؟'' عبدالحق نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

''جو چیزیں ہمارے پاس ہماری ضرورت سے زیادہ ہوں، وہ ہم ان ممالک کو فروخت کرتے ہیں، جہاں ان کی کمی ہوتی ہے۔ اور جن چیزوں کی ہمارے پاس کمی ہوتی ہے، وہ ہم ان ممالک سے خریدتے ہیں، جہاں ان چیزوں کی افراط ہوتی ہے۔ اس سامانِ تجارت کو بھیجنے اور منگوانے کے لئے بحری جہاز کام آتے ہیں، اور ان کے لئے بندرگاہ کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''تو ایسے ملک بھی تو ہیں جو سمندر سے محروم ہیں۔'' نور بانو نے پتے کی بات کہی۔

''تو وہ تجارت کیسے کرتے ہیں؟''

''وہ زمینی راستوں سے تجارت کرتے ہیں، اور زیادہ تر ان ممالک سے تجارت کرنا ان کی مجبوری ہوتی ہے، جن سے ان کی سرحدیں ملتی ہوں، دور سے مال منگوانے میں بین الاقوامی پیچیدگیاں حائل ہوتی ہیں اور نقل و حمل پر بھاری اخراجات بھی ہوتے ہیں۔ یوں اشیاء مہنگی بھی پڑتی ہیں۔''

''لیکن کیوں؟'' نور بانو نے معترفانہ لہجے میں پوچھا۔

''مجھے تو یہ اندیشہ دور دراز لگتا ہے۔''

''ملکوں اور قوموں کے بارے میں اہم فیصلے کرتے ہوئے دور کے اندیشوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا عارف بھائی! کراچی پر بحری حملہ تو بے حد آسان، لیکن فضائی حملہ بھی آسان ہے۔ میں تاریخ کا طالب علم ہوں۔ میں محمد

بن تغلق کی فراست اور دور اندیشی کا قائل ہوں۔ صدیوں میں ہندوستان میں کتنے ہی حکمراں آئے۔ لیکن دارالحکومت دہلی ہی رہا۔ حالانکہ ہر حملہ آور نے اسے روندا۔ دلی اجڑتی رہی اور بستی رہی۔ کسی کو خیال نہیں آیا کہ یہ کوئی مناسب دارالحکومت نہیں۔ محمد بن تغلق ہی تھا جس نے دہلی کی جگہ دکن کو دارالحکومت بنانے کا سوچا۔''

''لیکن اس پر پوری طرح عمل بھی نہیں ہو پایا تھا کہ اس نے فیصلہ بدل دیا'' عارف نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''حکومت کو کتنا مالی خسارہ اٹھانا پڑا، اور دارالحکومت وہی دہلی۔''

''میرے نزدیک اہمیت خیال کی ہے۔ اس کی بدقسمتی تھی، کچھ امراء اور سرکاری عمالوں کی سازشیں، جنہوں نے اس کے منصوبے کو روبہ عمل نہیں ہونے دیا۔ بڑے بڑے مورخین نے اسے جینیس قرار دیا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ وہ اپنے دور سے بہت آگے کا حکمراں تھا۔ آپ یہی دیکھ لیں کہ وہ پہلا آدمی تھا، جس نے کاغذی زر کے بارے میں سوچا کہ اس کے نزدیک سکے ڈھالنا دھاتوں کا ضیاع تھا۔''

''لیکن وہ اس میں بھی ناکام رہا'' عارف نے پھر حملہ کیا۔

''جینیس لوگوں کے ساتھ یہی تو مسئلہ ہوتا ہے۔'' عبدالحق نے متانت سے کہا۔

''وہ بعض اوقات صدیوں بعد کی بات سوچتے ہیں۔ غالب کی شاعری آج بھی تازہ ہے۔ اور شاید صدیوں بعد بھی اس کی تازگی برقرار رہے گی۔ محمد بن تغلق خود تو ناکام ہوگیا۔ لیکن آج آپ دیکھیں، پوری دنیا میں کاغذی زر کی اہمیت تسلیم کر لی گئی ہے۔ دس بیس سال بعد سکے تو شاید آثار قدیمہ ہی بن جائیں گے۔''

''یہ بات تو ٹھیک ہے تمہاری۔''

''بات دور نکل گئی عارف بھائی! ایک دوسری بات بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کراچی بہت پھیلے گا۔ آبادی بھی مستقبل میں اس کی بہت زیادہ ہوگی۔ ایسے

شہر کے لئے یہ مناسب نہیں کہ اس پر دارالحکومت کا بوجھ بھی ڈال دیا جائے۔''

''تو تمہارے ذہن میں کوئی متبادل بھی ہوگا اس کا؟''

''میں اس پر سوچتا رہا ہوں۔'' عبدالحق نے پرخیال لہجے میں کہا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ وہ کوئی ایسا مقام ہو، جس پر بحری، زمینی اور فضائی، کوئی بھی حملہ کرنا آسان نہ ہو۔ نہ پنجاب کی طرف سے، نہ سندھ کی طرف سے اور نہ ہی کشمیر کی طرف سے۔ اور یہ بھی طے ہے کہ دارالحکومت بننے کے بعد وہ شہر پھیلے گا۔ تو یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں توسیع کی گنجائش بھی ہو۔''

''اگر بھارت کے خطے کو مدنظر رکھا جائے تو اس کی جگہ صوبہ سرحد ہی بنتی ہے۔''

''نہیں عارف بھائی! اس طرف افغانستان ہے، اور بلوچستان کی طرف ایران ہے۔ دونوں ممالک کی بھارت سے دوستی ہے۔ بلکہ افغانستان کا رویہ تو پاکستان کے ساتھ مدافعانہ ہے۔''

''تو پھر...!''

''مجھے راولپنڈی میں گنجائش نظر آتی ہے۔ اس میں پھیلنے کی گنجائش بھی بہت ہے۔''

''تو اکنامک ڈویژن میں بیٹھ کر یہ سب سوچتے رہے تم؟''

''جی عارف بھائی!''

''سوچا بھی یا کچھ کیا بھی؟''

''کر کیا سکتے ہیں ہم۔ تجاویز فائلوں کو سونپ کر فائلیں آگے بڑھا دیتے ہیں۔''

''یہ جو صنعت کی بات کر رہے تھے تم...''

''جی ہاں! اس کے لئے ہمیں پوری تیاری کے ساتھ طویل المیعاد منصوبے بنا کر ان پر عمل کرنا ہوگا۔ میں جو کچھ سوچتا ہوں، اس میں جو کچھ قابل عمل لگتا ہے، اس کو کاغذ پر لکھ کر اس پر عمل درآمد کا تفصیلی خاکہ لفظوں میں بناتا ہوں، اور آگے بڑھا دیتا ہوں۔''

''ابھی تک کسی تجویز پر عمل بھی ہوا؟''

''نہیں......!''

''اچھا! طویل المیعاد منصوبوں سے کیا مراد ہے تمہاری؟''

''معیشت کا رخ تبدیل کرنا کوئی آسان کام تو نہیں ہے عارف بھائی! اور وہ بھی ایک نوزائیدہ ملک میں۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''ایک زرعی ملک میں جب آپ صنعت کو فروغ دینا چاہیں گے تو وقت تو لگے گا۔ یہاں تو صنعت کا کوئی انفرااسٹرکچر موجود ہی نہیں ہے۔ تو یہ مرحلہ وار کام ہوگا ... قدم بہ قدم، آہستہ آہستہ۔ یہاں تو ملیں ہیں ہی نہیں۔ سب ہندوستان کے پاس چلی گئیں۔''

''یہ تو واقعی بڑا اور لمبا کام ہے۔ اتنی اہمیت بھی ہے اس کی؟'' عارف کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''یہ کئی پہلوؤں سے فائدہ مندہ ہے۔ دیکھیں، ہم خام مال برآمد کرتے ہیں، جو کہ ہماری مجبوری ہے، تو بین الاقوامی مارکیٹ میں اس کی قیمت کم ملتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خریدار ہماری کمزوری سے واقف ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ قیمت کم دیتے ہیں۔ ہم اپنی پیداوار کو یہاں رکھ کر خراب ہونے سے بہتر سمجھتے ہیں کہ اونے پونے بیچ دیں اسے۔ دوسری طرف اسی خام مال سے بنی مصنوعات کی ہمیں ضرورت ہوتی ہے تو ہمیں وہ درآمد کرنا پڑتی ہیں اور وہ ہمیں مہنگی ملتی ہیں۔ یہ دہرا نقصان ہوا۔ اس کی وجہ سے درآمدات اور برآمدات کا توازن بگڑتا ہے، اور ہماری کرنسی غیر مستحکم ہوتی ہے۔''

''معاشیات سے میں بالکل نابلد ہوں۔'' عارف نے بے بسی سے کہا۔

''میں تو اس مضمون کی اہمیت سے واقف ہی نہیں تھا۔ پہلی بار مجھے اس کی اہمیت کا احساس ہو رہا ہے۔ لیکن میرے لئے اسے سمجھنا آسان نہیں۔ بنیادی تصور تک سے بے خبر ہوں نا!''

''میں آسان کر کے سمجھاتا ہوں آپ کو۔'' عبدالحق کے لہجے میں بلا کا انکسار تھا۔

''میں دو مثالیں دوں گا آپ کو۔ ایک تو پٹ سن ہے۔ پوری دنیا میں اس کی جو پیداوار ہے، اس کا اسی فیصد مشرقی پاکستان میں پیدا ہوتا ہے۔ انگریزوں اور ہندوؤں کی ملی بھگت بہت پرانی ہے۔ آپ دیکھ لیں، صنعتیں ان علاقوں میں قائم ہی نہیں کی گئی تھیں، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ تاکہ وہ خوش حالی سے محروم رہیں اور معاشی احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جائیں۔ اب تقسیم کے بعد کی صورتِ حال دیکھئے۔ پٹ سن مشرقی پاکستان میں پیدا ہوتا ہے، اور جوٹ ملز تمام کی تمام کلکتہ اور مغربی بنگال میں ہیں۔ ہم پٹ سن برآمد کرنے پر مجبور ہیں۔ اب زرعی ملک ہونے کے ناطے پٹ سن کی مصنوعات ہماری بنیادی ضرورت بھی ہیں ... بوریاں وغیرہ۔ تو وہ ہمیں ہندوستان سے مہنگے داموں درآمد کرنی پڑتی ہیں۔ ہندوستان فائدے میں ہے، اور ہم نقصان میں۔ اب اگر ہم مشرقی پاکستان میں ہی جوٹ ملز قائم کریں، اور وہاں پٹ سن کی مصنوعات تیار کریں تو وہ مصنوعات پوری دنیا کی ضرورت ہوں گی۔ اور اجارہ داری کی وجہ سے ہم اپنی مرضی کی قیمت بھی لے سکیں گے۔ ہماری برآمدات بہتر ہوں گی اور درآمدات پر سے پٹ سن کی مصنوعات کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ یوں برآمدات اور درآمدات کا توازن ہمارے حق میں ہو جائے گا، اور روپیہ عالمی منڈی میں مستحکم ہوگا۔ اس ایک اور زاویے سے دیکھئے۔ ملیں قائم ہوں گی تو ہمارے لوگوں کے لئے روزگار کے دروازے کھلیں گے۔ بے روزگاری کم ہوگی، اور افرادی قوت بے روزگاری کی شکل میں قومی معیشت پر بوجھ بننے کے بجائے، الٹا اسے سہارا دے گی، بلکہ مستحکم کرے گی۔ یہی نہیں، ہندوستان کی معیشت کے لئے یہ دھچکا ہوگا۔ انہیں ہم سے پٹ سن نہیں ملے گا تو ان کی جوٹ کی صنعت تباہ ہو جائے گی۔ ان کا سرمایہ بھی ڈوبے گا۔ اور وہ پٹ سن کی مصنوعات ہم سے خریدنے پر مجبور ہوں گے۔

دوسری مثال میں کپاس کی دوں گا۔ اس کا تعلق برطانیہ کی معیشت سے ہے۔ آپ کو یاد......''

''ارے...! یہ کیسا بندر روڈ ہے؟'' نور بانو کی آواز نے ان دونوں کو

چونکا دیا۔

''بندر تو یہاں ایک بھی نہیں ہے۔ اور نام بندر روڈ.....''

عارف کی سمجھ میں بات دیر سے آئی۔ دراصل وہ پورے انہماک سے عبدالحق کی بات سن رہا تھا۔ بات سمجھ میں آئی تو وہ ہنس دیا۔

''ارے وہ بندر نہیں بھائی! دراصل یہ روڈ بندرگاہ کی طرف جاتا ہے، اس لئے اس کا نام بندر روڈ ہے۔ پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا کہ یہاں بندر بہت ہوں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے معذرت طلب نظروں سے عبدالحق کو دیکھا۔

''تمہاری باتیں سن کر میری آنکھیں کھل رہی ہیں۔ لیکن اب ہم گھر پہنچنے والے ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد تم مجھے تفصیل سے یہ سب بتانا۔''

عبدالحق نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

نور بانو کو اب ہوا میں تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ نمی کا احساس بڑھ گیا تھا۔ اور عجیب بات یہ تھی کہ اسے اپنے منہ میں نمک کا ذائقہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ ہوا کچھ خنک ہوگئی تھی۔ لیکن پسینہ تھا کہ اب بھی خشک نہیں ہو رہا تھا۔

وہ اس سلسلے میں استفسار کرنے ہی والی تھی کہ عبدالحق نے گہری گہری سانسیں لیں اور عارف سے بولا۔

''عارف بھائی! لگتا ہے کہ ہم سمندر کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں۔''

عارف نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''تمہیں کیسے اندازہ ہوا اس کا؟''

''ہوا میں نمی کی وجہ سے۔ منہ میں نمک کا ذائقہ آ گیا ہے۔''

نور بانو کو اس کے سوال کا جواب سوال کئے بغیر مل ہی گیا۔

''مگر تم تو پہلی بار یہاں آئے ہو۔ تمہیں کیسے معلوم؟'' عارف نے کہا۔

''لڑکپن میں ایک بار بمبئی گیا تھا میں ماسٹر جی کے ساتھ۔ میں دنیا کے بارے میں بہت سوچتا اور غور کرتا تھا۔ سمندر کے بارے میں بہت متجسس تھا میں۔ تو ماسٹر جی کی سفارش پر میرے والد مجھے سمندر دکھانے بمبئی لے گئے تھے۔

وہ یاد آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔ جبھی تو ذائقے کی اس تبدیلی کو میں نے فوراً ہی پہچان لیا۔''

نور بانو کو پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ وہ عبدالحق کو بالکل نہیں جانتی۔ وہ تو اسے بس ایسا ہی سمجھتی تھی۔ لیکن عارف جس طرح مرعوب ہو کر اس کی باتیں سن رہا تھا، وہ عبدالحق کی قابلیت کا ثبوت تھا۔

اسے شرمندگی ہونے لگی۔ آسانی سے قیمتی چیز مل جائے تو آدمی کو اس کی قدر ہی نہیں ہوتی۔ وہ اسے گردانتی ہی نہیں تھی۔ اسے پتا بھی نہیں تھا کہ وہ اندر سے کیسا بھرا ہوا آدمی ہے۔ اس نے کبھی کوشش ہی نہیں کی تھی اسے جاننے اور سمجھنے کی۔ اس وقت بھی عارف سے یہ گفتگو نہ ہوئی ہوتی تو اسے اندازہ ہی نہیں ہوتا۔

❁ ❁ ❁

زبیر اور رابعہ ساجد کے ساتھ نیچے منتقل ہو چکے تھے۔ عبدالحق کی جدائی اپنی جگہ، لیکن سچ تو یہ تھا کہ حمیدہ کے لئے گھر کی رونق بڑھ گئی تھی۔ رابعہ اور زبیر تو شروع ہی سے اس سے قریب تھے۔ اور ساجد اسے نانی کہتا تھا۔

اس وقت بھی ساجد اس کے پاس بیٹھا تھا۔ اس سے لپٹ کر۔ اور وہ اس سے حق نگر کی باتیں سن رہی تھیں، جو اس کے نزدیک اب بھی چھوٹا گاؤں تھا۔

رابعہ کمرے میں آئی۔

''ابھی میں کھانا پکانے گئی اماں! تو دیکھا کہ کھانا تو تیار ہے۔'' اس نے حمیدہ سے کہا۔ اس کے لہجے میں شکایت تھی، جیسے وہ کسی سعادت سے محروم ہوگئی ہو۔

''یہ تو روز کا معمول ہے۔'' حمیدہ نے بے پروائی سے کہا۔

''نگی اسکول جانے سے پہلے دوپہر کا کھانا پکا کر جاتی ہے۔ جب عبدالحق یہاں تھا تو اسے دفتر کھانا بھیجنا ہوتا تھا۔''

''وہ تو منجھلی بی بی بھیجتی ہوں گی نا؟''

''اس نے تو کبھی نہیں بھیجا..... میرے سمجھانے پر بھی نہیں بھیجا۔'' حمیدہ نے آہ بھر کر کہا۔

''وہ تو بارہ بجے تک پڑی سوتی رہتی تھی۔''

''پر اماں! نکی کیسے کرتی ہوگی یہ سب......؟''

''وہ بہت سویرے اٹھتی ہے۔ تہجد پڑھ کر کھانا پکاتی ہے۔ پھر ناشتہ تیار کر کے، مجھے کرا کے اسکول جاتی ہے۔'' حمیدہ کے لہجے میں فخر تھا۔ پھر وہ کچھ دیر سوچتی رہی، جیسے کچھ یاد کر رہی ہو۔

''مجھے یاد آتا ہے۔ پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جب عبدالحق دفتر جانے لگا تو نکی نے یہ کام سنبھال لیا۔ ہاں ناشتہ تو پہلے بھی وہی بناتی تھی۔''

''تو کاکا کے دفتر کانا بھیجنے کے لئے...''

حمیدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ہاں، یہی بات ہے۔ اب میری سمجھ میں آیا۔ اسے یہ فکر تھی کہ عبدالحق کے دفتر کھانا نہیں بھیجا جاتا ہے۔ اس نے یہ ذمہ داری خود ہی اٹھا لی۔''

رابعہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر افسردگی سے بولی۔

''منجھلی بی بی کو یہ کیا ہوگیا ہے۔ ایسی تو نہیں تھیں وہ۔ پہلے تو بہت خیال رکھتی تھیں کاکا کا۔ یہ تو ان کی خوش قسمتی ہے کہ کاکا انہیں ملے۔ ورنہ کاکا کے لئے کیا کمی تھی؟''

حمیدہ کو بابا کی بات یاد آگئی۔

''وہ ناشکری ہوگئی ہے رابعہ!''

رابعہ اب بھی کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے شاید حمیدہ کی بات سنی بھی نہیں تھی۔

''اور اولاد بھی نہیں ہوئی ابھی تک؟''

حمیدہ کو پھر بابا کی یاد آئی۔

''جب اللہ کا حکم ہوگا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اولاد بھی ہو جائے گی انشاء اللہ!''

رابعہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''سات سال تو ہوگئے اماں!'' اس کے لہجے میں دبا دبا احتجاج تھا۔

''بڑے ٹھاکر کا انتظار یاد نہیں تجھے۔''

''اللہ نہ کرے کہ کاکا کو اتنا انتظار کرنا پڑے۔'' رابعہ نے تیزی سے کہا۔ پھر بولی۔

''تمہیں بھی کوئی فکر نہیں اماں!''

''کل تک تو تھی، آج ہی تو بے فکر ہوئی ہوں۔ تو بھی فکر نہ کر رابعہ! اللہ نے چاہا تو میری گود میں کھیلے گا عبدالحق کا بچہ۔''

''انشاء اللہ اماں! پر تمہاری بے فکری میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''میری تیری فکر سے کچھ نہیں ہوتا پگلی!'' حمیدہ نے اسے سمجھایا۔

''جو اوپر والے کا حکم۔''

''پر نیچے والوں کو بھی تدبیر تو کرنی پڑتی ہے۔''

''توبہ کر توبہ!'' حمیدہ کی آواز لرزنے لگی۔

''میں نے کہا نا! اللہ جب چاہے گا تو سب کچھ ہو جائے گا۔''

''پر اماں! تدبیر...''

حمیدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تو کیا سمجھتی ہے۔ مجھ سے زیادہ بے تاب کون ہوگا؟ میں فکر بھی کرتی رہی اور تدبیر بھی۔ کہاں کہاں نہیں گئی میں اپنے پتر کی اولاد کے لئے...''

''پر ایک تدبیر تو رہ گئی نا اماں!'' رابعہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ گاؤں میں کبھی اتنا وقت، اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ حمیدہ سے اس بارے میں بات کرتی۔ لیکن سوچتی تو رہتی تھی وہ۔ اور اب موقع بھی تھا بات کرنے کا۔

''ہم بس اللہ سے دعا کر سکتے ہیں۔ اس سے مانگ سکتے ہیں، اور کچھ نہیں کر سکتے۔''

''پر اماں! کاکا تمہیں انکار تو نہیں کر سکتے نا!'' رابعہ نے دوسری شادی کا تذکرہ کئے بغیر دل کی بات کہی۔

''ہاں! یہ تو ہے۔ پر اللہ کا حکم کچھ اور ہے۔''

''میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔''

''تجھے کچھ معلوم ہی نہیں، تو سمجھ میں کیسے آئے گا؟''

''یہ نکی تمہاری عجیب لڑکی ہے۔'' رابعہ نے موضوع بدلا۔

''اتنی محنتی، نماز کی پابند، ہر ایک کی فکر، صبح تڑکے ہمیں بلانے کے لئے آ گئی اور ناشتہ کتنا اچھا بنایا۔''

''اس کی کیا بات کرتی ہے تو رابعہ! اس جیسا تو میں نے کوئی اور دیکھا ہی نہیں۔''

''اور کتنی پیاری صورت ہے ماشاء اللہ!''

ساجد حمیدہ سے لپٹا بڑے شوق سے یہ گفتگو سن رہا تھا۔ حمیدہ اور رابعہ کو اس کی موجودگی کا احساس بھی نہیں تھا۔

''اللہ نصیب اچھے کرے اس کے۔'' حمیدہ نے دونوں ہاتھ پھیلا کر دعا دینے والے انداز میں کہا۔

''اماں! عمر کتنی ہوگی نکی کی؟'' رابعہ نے اچانک پوچھا۔

حمیدہ کی سمجھ میں وجہ تو نہیں آئی، لیکن نہ جانے کیوں وہ چوکنا ہوگئی۔ وہ جانتی تھی کہ ارجمند چودہ پندرہ کی ہے۔ لیکن اس نے پتا نہیں کیوں اس کی عمر میں دو سال کا اضافہ کر کے بتایا۔

''سولہ سترہ کی ہوگی۔''

''لگتی تو اور چھوٹی ہے۔ کاش کچھ اور بڑی ہوتی۔''

''نانی ...... نانی، چھوٹی چا ......'' ساجد بڑے جوش سے کچھ کہنے والا تھا کہ بروقت ٹھٹک گیا۔

دونوں عورتوں کو پہلی بار اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ حمیدہ نے محبت سے اسے دیکھا۔

''تو کیا کہہ رہا ہے ساجد...؟''

''میں یہ کہہ رہا تھا نانی! کہ باجی بہت اچھی ہیں۔''

''پر تو کہہ کچھ اور رہا تھا۔'' رابعہ نے اسے گھورا۔

''باجی تو نہیں کہا تھا تو نے۔''

ساجد گڑبڑا گیا۔

''وہ تو نانی انہیں نکی کہتی ہیں نا......!''

''تو پھر......؟''

''نکی کو اُردو میں چھوٹی کہتے ہیں نا!'' ساجد نے بات بنائی۔

''اچھا! اب تو باہر جا کر کھیل کچھ دیر۔ باغ میں جھولا جھول کر آ۔'' رابعہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

ساجد اٹھنا تو نہیں چاہتا تھا۔ لیکن ماں کے اس لہجے سے واقف تھا۔ وہ اٹھا اور باہر چلا گیا۔

اتنی دیر میں حمیدہ اپنے چوکنے پن کو سمجھ گئی تھی۔ وہ یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ اس نے نکی کی عمر بڑھا کر کیوں بتائی ہے۔ یہ دل میں دبی خواہش تھی، جو اس وقت پوری شدت سے ابھر آئی تھی۔

''میں کہہ رہی تھی اماں! کہ نکی کچھ اور بڑی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔''

حمیدہ سمجھ گئی کہ رابعہ کے دل میں بھی یہی بات ہے۔

''عمر سے کیا فرق پڑتا ہے رابعہ!'' اس نے رسان سے کہا۔

''اللہ کی مرضی، اس کا حکم ہو تو کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''میں پھر وہی کہوں گی اماں! کہ بندے کو حیلہ تو کرنا پڑتا ہے۔''

''کبھی بندے کو کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا، اور اسے مل جاتا ہے۔'' حمیدہ نے کہا۔ اسے بابا کی بات یاد آ رہی تھی۔ اس نے کہا تھا...... کون جانے، تجھے وہ بہو ملے، جو تجھے دل سے پسند ہو۔ اور اس نے کہا تھا...... تیری بہو خود ہی کرائے گی تیرے بیٹے کی دوسری شادی۔ اور اس نے کہا تھا ...... کون جانے، اس میں برسوں لگیں۔

اب دو کڑیاں جوڑ سکتی تھی، اس کے دل میں امید کی کلیاں کھلنے لگیں۔ برسوں لگیں گے تو نکی بڑی ہوگی نا، تو یہ برسوں کا انتظار ضروری ہے نا، صبر کا پھل

بیٹھا ہوگا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ اس کی بہو نکی جیسی ہو۔ نکی چھوٹی تھی، اس لئے وہ اس کے بارے میں نہیں سوچ سکتی تھی۔ پر اسے دل سے تو وہی پسند تھی۔ اللہ چاہے گا تو برس یوں گزر جائیں گے ہوا کے جھونکے کی طرح۔ اور نکی بڑی ہو جائے گی۔

اور دنیا میں ایک نکی ہی تو تھی، جس سے نوربانو بہن جیسی...... سگی بہن جیسی محبت کرتی تھی۔ نوربانو نے خود عبدالحق سے کہا تھا کہ وہ نکی کو پڑھائے۔ ورنہ تو وہ بڑی تنگ دل تھی۔ تو کون جانے، نوربانو خود......

حمیدہ کے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی۔ اس کے کانوں میں بابا کی آواز گونج رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں سب کچھ آرہا تھا۔ وہ اب خوشی سے برسوں صبر کر سکتی تھی، انتظار کر سکتی تھی، بس وہ اللہ سے دعا کرتی رہے گی۔

رابعہ اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسے حمیدہ کی کچھ دیر پہلے کہی ہوئی بات یاد آئی، جس پر وہ توجہ نہیں دے سکی تھی۔

''اماں! ابھی تم نے کہا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں تو سمجھوں گی کیسے؟''

حمیدہ نے چونک کر اسے دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔

''تو مجھے بتا دو نا اماں! مجھے سمجھا دو۔''

حمیدہ نے ایک گہری سانس لی اور اسے بابا کے بارے میں بتانے لگی۔

کہتے ہیں، خوشی میں کسی کو شریک کر لیا جائے تو خوشی بڑھ جاتی ہے۔ حمیدہ کی خوشی بھی بڑھ گئی تھی۔

❁ ❁ ❁

ساجد کمرے سے نکلا تو گھبرایا ہوا تھا۔ ایک تو اسے پچھتاوا تھا کہ اس نے بول کر گڑبڑ کر دی۔ ورنہ وہ وہاں بیٹھا رہتا، اور نہ نانی کو پتا چلتا نہ اماں کو۔ اور وہ دونوں چھوٹی چاچی کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔

یہ خیال آتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس سے ایک بڑی غلطی ہوگئی تھی۔ اس کے منہ سے چھوٹی چاچی نکلنے والا تھا۔ بس صحیح وقت پر اسے خیال آگیا۔ اور اس نے خود کو روک لیا۔ ورنہ چھوٹی چاچی ناراض ہو جاتی۔

وہ باہر لان میں چلا گیا اور جھولے پر بیٹھ گیا، جہاں وہ ارجمند کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہاں بیٹھتے ہی اسے چھوٹی چاچی یاد آئی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ جھولے کو اس طرح نہیں ہلا پایا تھا، جیسے چھوٹی چاچی نے چلایا تھا۔

وہ بیٹھ کر چھوٹی چاچی کے بارے میں سوچنے لگا۔ آخر اس نے انہیں چھوٹی چاچی کیوں کہا۔ جبکہ وہ چاچی کو جانتا تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ چھوٹی چاچی اس کی چاچی نہیں ہیں۔

اسے چاچا کا خیال آگیا۔ چاچا اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ جب بھی گھر آتے تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی چیز لے کر آتے۔ اور وہ اسے کبھی گود میں، اور کبھی اپنے پاس بٹھا کر اس سے خوب باتیں کرتے۔ وہ اس سے سوال کرتے، اور وہ جواب دیتا تو وہ بہت خوش ہوتے۔ یہ تو اسے ہوش سنبھالتے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔

وہ خود بھی ان سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ انہی کے پاس رہتا۔ لیکن نہ جانے کیوں، چاچی اس سے چڑتی تھیں۔ چاچا بھی ان کے ہوتے ہوئے اس سے دور رہتے تھے۔ چاچی انہیں ٹوک بھی تو دیتی تھیں۔ اب چھوڑ بھی دیں اس بیچارے کو۔ آپ تو پکڑ کر بیٹھ ہی جاتے ہیں اسے۔ وہ ان سے کہتیں، لیکن دیکھتیں اسے۔ اور ان کی نظروں میں اس کے لئے ناپسندیدگی ہوتی۔ چاچا کھسیا کر ہٹ جاتے۔

اسے یاد تھا، ایک بار جب چاچا لاہور واپس آرہے تھے تو وہ ان سے لپٹ گیا تھا۔

''میں آپ کے ساتھ چلوں گا چاچا!''

چاچا یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔

''میں تو لاہور جا رہا ہوں۔ پتا بھی ہے، لاہور بہت دور ہے۔'' وہ بولے۔

''تو کیا ہوا، میں چلوں گا آپ کے ساتھ۔''

''پھر وہاں اماں اور بابا یاد آئیں گے تو رو کر مجھے پریشان کرو گے۔''

"نہیں چاچا! میں انہیں یاد ہی نہیں کروں گا۔ اور روؤں گا بھی نہیں۔"

"یہ تو بہت بری بات ہے۔" چاچی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"اپنی اماں کو اکیلا چھوڑ دو گے یہاں؟"

"نہیں چاچی! اماں کے پاس بابا ہوں گے نا۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"نہیں! کوئی اچھا بچہ اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر نہیں جاتا۔" چاچی نے سخت لہجے میں کہا۔

"تم ہمارے ساتھ نہیں جا سکتے۔"

"ایسے سختی سے بات نہیں کرو نور بانو!" چاچا نے چاچی سے کہا۔

"بچوں کا دل بہت نازک ہوتا ہے۔"

"بس رہنے دیں۔ آپ کے پاس ہوتا تو اب تک آپ اس کی عادتیں تباہ کر چکے ہوتے۔"

پھر بھی اس نے ضد کی تو چاچی نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا۔

اسے یاد تھا، ان کے جانے کے بعد بھی وہ روتا رہا۔ اماں اور بابا اسے پیار کرتے رہے، سمجھاتے رہے، لیکن اس کا دل دکھا ہوا تھا۔ اپنے آنسو روکنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ بھوک ہی نہیں لگ رہی تھی۔ اماں ابا کھانے کے لئے اصرار کرتے رہے۔ وہ جان چھڑانے کے لئے منہ لپیٹ کر پڑ لیا، اور یہ ظاہر کیا کہ جیسے وہ سو رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اماں اور بابا کی باتیں نہ سن پاتا۔

"یہ منجھلی بی بی کو کیا ہوگیا ہے۔ اتنا چھوٹا دل ہے ان کا۔" اماں نے کہا۔

"بے کار کی باتیں مت کر رابعہ!" بابا نے سختی سے کہا۔

"تو کیا غلط کہہ رہی ہوں میں ے اتنا رلایا ہے میرے بچے کو۔ کھانا بھی نہیں کھایا اس نے۔ بھوکا ہی سو گیا۔"

"اس میں منجھلی بی بی کا کیا قصور؟ وہ تو اسے اچھی بات ہی سمجھا رہی تھیں۔"

"تو پیار سے سمجھاتیں نا!"

"سختی کی بات زیادہ یاد رہتی ہے بچوں کو۔"

"بس! رہنے دو۔" اماں چونک گئیں۔

"وہ تو شروع ہی سے چڑتی ہے میرے بچے سے۔ چھوٹا سا تھا، اس وقت سے۔ کاکا تو اس کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ منجھلی بی بی نے انہیں دور کر دیا میرے بچے سے۔"

"میں پھر کہتا ہوں رابعہ! ایسی باتیں نہ کرو۔ ہم تو بس وفادار نوکر ہیں۔ مالکوں کے بارے میں......"

"یہ رشتہ تو ہمارا بس کاکا سے ہے، منجھلی بی بی سے نہیں۔ اور کاکا تو ہمیں مان دیتے ہیں۔ تمہیں بڑا بھائی سمجھتے ہیں۔"

"سمجھنے سے رشتے نہیں بدل جاتے۔ آدمی کو اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہئے۔ اور میری بات دھیان سے سن۔ منجھلی بی بی اب ہمارے لئے صرف منجھلی بی بی نہیں۔ وہ کاکا کی بیوی ہیں۔ ان کے بارے میں سوچ سمجھ کر بات کیا کر۔"

"لیکن ساجد کے ابا! کاکا نے خود کہا کہ اب ہم ان کے نوکر نہیں ہیں۔ دیکھو نا، اب ہم مسلمان ہیں۔"

"تو سمجھتی کیوں نہیں پگلی!" بابا کا لہجہ نرم ہوگیا۔

"کاکا نے اس وقت جو کیا، اب میں سمجھ سکتا ہوں۔ ہم انہیں مالک نہیں کہہ سکتے۔ دیکھو نا، مالک تو بس اللہ ہے۔ اب یہ تو سوچ کہ اللہ نے ہمیں عزت دی۔ سیدھے راستے پر لایا۔ ہم اس دین میں داخل ہوئے۔ اللہ کا فضل، پر یہ راستہ تو ہم نے کاکا کی محبت میں ہی دیکھا۔ ہماری وفاداری نے ہی تو ہمیں ان کے پیچھے چلایا۔ اب مسلمان ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم اس وفاداری کو، اپنے اصل تعلق کو بھول جائیں۔ یہ تو نقصان کا سودا ہوگا۔"

"میں تو بس یہ کہہ رہی تھی......"

''تو جو بھی کہہ رہی تھی، وہ غلط تھا۔''

ساجد کی سمجھ میں بہت سی باتیں نہیں آئی تھیں۔ لیکن وہ اتنا سمجھ گیا تھا کہ اماں کو چاچی کا رویّہ پسند نہیں، پسند بابا کو بھی نہیں، لیکن وہ اس پر بات نہیں کرنا چاہتے۔

یہ وفاداری والا معاملہ بھی عجیب تھا۔ ماں اور باپ دونوں ہی الگ الگ اسے یہ سبق پڑھایا کرتے تھے۔ وہ اسے بتاتے تھے کہ وہ دونوں چاچا کے بابا کے نوکر تھے اور اب چاچا کے نوکر ہیں۔ یہ تو چاچا کی مہربانی ہے کہ وہ انہیں عزت دیتے ہیں۔ چاچا کے اور ان کے بابا کے ان پر بڑے احسان ہیں۔ آج وہ جو کچھ بھی ہیں، اللہ کے بعد انہی کی مہربانی سے ہیں۔ وہ اسے سمجھاتے تھے کہ اسے ان سے بڑھ کر چاچا سے محبت کرنی ہے۔ اسے ہمیشہ ان کی غلامی کرنی ہے۔ ان کے حکم کے خلاف کبھی نہیں کرنا۔ اس سے کوئی غلطی ہوئی تو ان دونوں کے لئے مر جانے کے برابر ہوگا۔

وہ اب بھی نہیں سمجھ پایا تھا کہ وفاداری کیا ہوتی ہے، کیسے کی جاتی ہے، اس کے لئے کیا کیا کرنا ہوتا ہے۔ سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔ لیکن اب تصور میں وہ چاچا کو دیکھتا تو وہ اسے بہت اونچے، بہت لمبے، بڑے رعب والے لگتے، اور اسے ان سے ڈر لگنے لگتا۔ لیکن جب وہ سامنے آتے تو وہ وفاداری کا ہر سبق بھول جاتا۔ وہ اپنا ڈر بھی بھول جاتا۔ وہ بس ان سے محبت کرتا۔

ایک دن رات کے کھانے کے بعد وہ اماں اور بابا کے ساتھ بیٹھا تھا۔ نہ جانے کس بات پر اماں نے کہا۔

''میرا بیٹا دنیا میں سب سے زیادہ محبت مجھ سے کرتا ہے۔''

''نہیں رابعہ! تو غلط کہہ رہی ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔'' بابا نے کہا۔

''یہ سب سے زیادہ محبت مجھ سے کرتا ہے۔''

اس نوک جھونک میں بھی خوشی اور محبت تھی۔ کچھ دیر وہ ایک دوسرے سے الجھتے رہے۔ پھر بابا نے کہا۔

''ٹھیک ہے، ساجد سے پوچھ لو۔''

اماں اس کی طرف مڑیں۔

''کیوں ساجد! تو دنیا میں سب سے زیادہ محبت مجھ سے کرتا ہے نا؟''

ان کے انداز میں بڑا مان تھا۔

وہ اماں کو غور سے دیکھتا رہا، پھر انکار میں سر ہلا دیا۔

اماں کا منہ اتر گیا۔ وہ اسے بے یقینی سے دیکھتی رہیں۔ انہیں صدمہ ہوا تھا۔

بابا ہنسنے لگے۔

''دیکھا...... میں کہتا تھا نا!'' ان کے لہجے میں فخر تھا۔

اماں اب اسے شکایتی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''تو تو سب سے زیادہ اپنے بابا سے محبت کرتا ہے؟''

اس نے اس بار بھی انکار میں سر ہلا دیا۔

اماں ہنسنے لگیں۔ بابا کھسیا گئے۔

''تو اب تو خود ہی بتا دے کہ دنیا میں تو سب سے زیادہ محبت کس سے کرتا ہے؟''

اس نے بغیر جھجکے فوراً جواب دے دیا۔

''چاچا سے......!''

اماں اور بابا کی نگاہوں میں ایک لمحے کو حیرت نظر آئی۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ہنسنے لگے۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔

ساجد کو حیرت ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ اب اسے ڈانٹ پڑے گی۔ وہ بھی حیران سا انہیں دیکھتا رہا۔

''دیکھا، میرا بیٹا کتنا اچھا ہے۔'' بابا نے فخر سے کہا۔

''اسے پتا ہے کہ کس کی محبت سب سے ضروری ہے۔''

''یہ محبت اسے مجھ سے ملی ہے۔'' اماں نے اسے لپٹا لیا۔

''اللہ کی قدرت ہے رابعہ! یہ تو اللہ کی دین ہے۔ اور ذرا سوچو تو سہی، ہماری غلامی اسے محبت کے روپ میں ملی ہے۔ اسے کہتے ہیں ترقی۔ اللہ کے دین

میں کتنی برکت ہے۔''

اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ بابا نے اسے گود میں بٹھا لیا۔

''شاباش ساجد!'' انہوں نے کہا۔

''تو نے ہمارا دل خوش کر دیا ہے۔ اب ہمیشہ ایسے ہی رہنا۔ سب سے زیادہ محبت چاچا سے کرنا۔''

''پر بابا! آپ تو کہتے تھے، وفاداری.....'' اس نے الجھن بھرے لہجے میں کہنا چاہا۔

بابا نے اس کی بات کاٹ دی۔

''محبت بہت بڑی ہوتی ہے ساجد! ہر چیز سے بڑی۔ اس میں سب کچھ شامل ہوتا ہے، عزت بھی، وفاداری بھی، احترام بھی۔''

اس کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ لیکن وفاداری کے ناقابل فہم بوجھ سے اسے نجات مل گئی۔ بس محبت ہی کافی تھی۔

چاچی کو وہ چاچا کی وجہ سے پسند کرتا تھا۔ ورنہ جب وہ ان دونوں کو ساتھ دیکھتا تو اسے وہ بے جوڑ لگتے۔ چاچا کتنے خوب صورت، کتنے بڑے اور لمبے تھے اور چاچی چھوٹی سی۔ اور ان کی صورت بھی اچھی نہیں تھی۔ اور وہ مغرور بھی تھی۔ زیادہ بات نہیں کرتی۔ اور مسکراتی وہ تھی ہی نہیں۔ جوڑ کا تصور اسے بابا اور اماں کو دیکھ کر سمجھ میں آیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت اچھے لگتے تھے۔

پھر ایک دن وہ لوگ آئے تو ان کے ساتھ باجی بھی تھی۔ وہ اسے بہت اچھی لگیں۔ وہ ہر ایک سے محبت سے بات کرتی۔ ہر وقت مسکراتی رہتی۔ اس نے بغیر کسی کے بتائے انہیں باجی کہنا شروع کر دیا۔

لیکن اب وہ لاہور آیا، اور چاچا کراچی جا رہے تھے۔ اسے افسوس ہوتا رہا۔ کتنا اچھا ہوتا کہ وہ لوگ یہاں رہتے اور چاچا بھی ان کے ساتھ ہوتے۔ پہلے تو اسے اپنا لاہور آنا اچھا ہی نہیں لگا۔ لیکن یہ گھر بھی اچھا تھا اور شہر بھی اسے اچھا لگا تھا۔

چاچا جب رخصت ہو رہے تھے تو اس وقت اس نے باجی کو چاچا کے سامنے کھڑا دیکھا۔ خود بخود اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ چاچا اور باجی ایک ساتھ اچھے لگ رہے ہیں۔ ان کی جوڑی اچھی ہے۔

اس کا جی چاہا کہ وہ باجی کو چاچی کہے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ چاچی تو موجود تھی، اچھی لگے یا نہ لگے، لیکن وہ تھی تو چاچی ہی۔ اور دل باجی کو چاچی بنانے پر تلا ہوا تھا۔ ایسے میں اسے بس یہی سوجھا کہ وہ باجی کو چھوٹی چاچی کہے۔

جب چاچی چلی گئی تو اس نے ہمت کر کے باجی کو چھوٹی چاچی کہا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ اس طرح پکارا جانا انہیں اچھا لگا۔ لیکن انہوں نے شرط رکھ دی کہ وہ صرف اکیلے میں انہیں چھوٹی چاچی کہہ سکتا ہے، کسی اور کے سامنے نہیں۔ اس کے نزدیک وہ کوئی بڑی نہیں تھی۔ لیکن اب اسے پتا چلا کہ یہ آسان نہیں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اماں اور نانی کے سامنے اس کے منہ سے چھوٹی چاچی نکلتے نکلتے رہ گیا تھا۔ چھوٹی چاچی کو پتا چل جائے تو شاید وہ اس سے بات کرنا بھی چھوڑ دیں۔

اس نے سوچا، اب اس معاملے میں بہت زیادہ احتیاط کرے گا۔

اچانک اسے یاد آیا کہ اماں اور نانی چھوٹی چاچی کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔ نہ جانے کیوں اسے احساس ہونے لگا کہ وہ ضرور کوئی کام کی بات تھی۔ اس نے بول کر گڑبڑ کر دی۔ ورنہ اسے پتا چل جاتا کہ وہ کیا بات تھی۔

باہر نکلتے ہوئے بھی اس کا جی چاہا تھا کہ وہ چھپ کر ان کی بات سنے۔ لیکن اماں ہمیشہ بڑی سختی سے اس بات کو منع کرتی تھیں۔ اس لئے وہ خود پر جبر کر کے وہاں سے چلا آیا تھا۔ مگر اب اس کا دل مچلنے لگا۔

وہ دوبارہ نانی کے کمرے کی طرف گیا۔ دروازے پر رک کر اس نے سننے کی کوشش کی۔ لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ اماں اور نانی اب کچھ اور باتیں کر رہی تھیں۔ وہ دوبارہ باہر آ گیا۔

وہ دوبارہ نانی کے کمرے کی طرف گیا۔ دروازے پر رک کر اس نے سننے کی کوشش کی۔ لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ اماں اور نانی اب کچھ اور باتیں کر رہی

تھیں۔ وہ دوبارہ باہر آ گیا۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق نے چارج کو کراچی پہنچنے کے دوسرے دن ہی سنبھال لیا تھا۔ ایک ہفتہ وہ عارف کے گھر رہے۔ پھر وہ اپنے گھر میں منتقل ہو گئے، جو عارف کے گھر کے بہت قریب تھا۔

اس ایک ہفتے میں اس نے عارف کے گھر کے ماحول کا مشاہدہ کیا۔ وہ اسے اچھا نہیں لگا۔ اس کی سمجھ میں عارف کا کرب آنے لگا۔ عارف طبعاً نفیس آدمی تھا۔ لیکن اس کے گھر میں بدنظمی اور بے ترتیبی تھی، جو اسے بے چین رکھتی تھی۔ اس کی بیوی اسے بالکل اچھی نہیں لگی۔ وہ صرف عملاً ہی پھوہڑ نہیں تھی، زبان کی بھی پھوہڑ تھی۔ بچوں کی تربیت بھی اس نے اچھی نہیں کی تھی۔ ان کے تعلیمی معاملات سے تو وہ بالکل ہی بے تعلق تھی۔ عبدالحق نے اب تک عارف کو گھر سے باہر ہی دیکھا تھا۔ گھر میں اسے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ کیونکہ گھر میں عارف پر بیزاری اور چڑچڑا پن طاری رہتا تھا۔

عبدالحق نے سمجھ لیا کہ عارف کی شادی بے جوڑ ہوئی ہے۔ بات اتنی نہیں تھی کہ عارف کی بیوی صورت شکل کی معمولی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ پڑھی لکھی بھی نہیں تھی۔ عبدالحق نے محسوس کیا کہ عارف گھر میں کم سے کم وقت گزارنا چاہتا ہے، اور اس میں اس کا قصور بھی نہیں ہے۔

لیکن نور بانو کی رضوانہ سے گاڑھی چھننے لگی تھی۔ پہلے تو عبدالحق کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ لیکن فوراً ہی اس کی افادیت اس کی سمجھ میں آ گئی۔ نور بانو کے ساتھ تو بچے بھی نہیں تھے۔ وہ تو بہت اکیلی تھی۔ اس کی دوسراہٹ کے لئے عارف کا گھر بہت بڑی نعمت تھا۔ وہ رضوانہ کے ساتھ خریداری کے لئے بازار بھی چلی جاتی۔ پھر کبھی رضوانہ اس کے گھر آ جاتی۔ اور بچوں کا آنا جانا تو لگا ہی رہتا تھا۔ پہلی بار عبدالحق نے نور بانو کو بچوں سے محبت کرتے دیکھا۔ یہ اس کے لئے خوشی کی بات تھی۔

پھر ایک دن عبدالحق کے گھر میں بیٹھ کر عارف نے وہ بات شروع کی،

جو اس روز ائیر پورٹ سے گھر آتے ہوئے ادھوری رہ گئی تھی۔

''اس روز تم ملکی معیشت کی بات کر رہے تھے۔'' عارف نے اسے یاد دلایا۔

''جی ہاں! اور بات ادھوری رہ گئی تھی۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اب تو مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں کیا کہہ رہا تھا۔''

''مگر مجھے یاد ہے۔'' عارف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم کچھ طویل المیعاد منصوبوں کی بات کر رہے تھے۔''

''جی ہاں! منصوبے بنانے کے سوا ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''تم نے کہا کہ تم منصوبے بنا کر آگے بڑھا دیتے ہو، اور ان پر عمل نہیں ہوتا۔''

''آپ میری بات کر رہے ہیں۔ میری تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ چچا جان نے کتنا کچھ کیا، مگر سب بے سود۔ بہت اہم باتوں کو نظرانداز کر دیا گیا۔ انہوں نے کچھ محکموں کے ملازمین کو بہت معقول تنخواہیں دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ ابتدائی طور پر ان میں کسٹم، انکم ٹیکس اور پولیس کے محکموں کو شامل کیا گیا تھا۔ اس کی اہمیت بھی بتا دی گئی تھی۔ مگر وہ تجویز نہیں مانی گئی۔ اب اس کا نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں۔''

''کیسا نتیجہ؟ میں سمجھا نہیں۔''

''میں اور آپ، دونوں ہی اس وقت کسٹمز میں ہیں۔ میں نے دیکھ لیا کہ یہاں رشوت کتنی عام ہو گئی ہے۔ آپ بھی جانتے ہیں۔''

''اب میں سمجھا، تنخواہیں بڑھانے سے کیا رشوت کا سلسلہ رک جاتا۔'' عارف نے اعتراض کیا۔

''دیکھو عبدالحق! میں کئی سال سے اس محکمے میں ہوں۔ رشوت کے معاملے کو میں سمجھتا ہوں۔ کسی شخص کو کوئی غلط کام کرانا ہوتا ہے تو وہ رشوت کی پیش کش کرتا ہے۔ اب کوئی کسی کو رشوت دے گا تو لینے والا لے گا بھی۔ اس کا

تنخواہوں کے بڑھنے سے کوئی تعلق نہیں۔''

''تعلق ہے عارف بھائی! لوگ ہر طرح کے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ترغیب کے سامنے ہار جانے والے، کچھ کمزور پڑ جانے والے اور کچھ مضبوطی سے ڈٹ جانے والے ہوتے ہیں۔ کم تنخواہ اور بڑھتی ہوئی ضرورتیں ان کے لئے جواز بن جاتی ہیں۔ ابتداء میں ایک جھجک اور شرمندگی ہوتی ہے، جو آہستہ آہستہ مٹتی جاتی ہے اور پھر آدمی رشوت کا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ برائی نہیں رہتی، اور اس کے معمول میں شامل ہو جاتی ہے۔

اور ایک بات بتاؤں عارف بھائی! بات صرف اتنی نہیں کہ رشوت کا استعمال غلط کام کرانے میں ہی ہوتا ہے، اور ترغیب رشوت دینے والے کی طرف سے ہوتی ہے۔ جب رشوت کا چسکا پڑ جائے تو رشوت لینے والا، رشوت دینے والے کو مجبور کر دیتا ہے۔ میں نے باہر نکل کر بڑی خاموشی سے مشاہدہ کیا ہے۔ لوگ اعتراضات لگا کر، کام میں تاخیر کر کے کلیئرنگ ایجنٹس کو رشوت دینے پر مجبور کرتے ہیں۔ بعض کلیئرنگ ایجنٹس نے تو کلرکوں کے لئے ماہ بہ ماہ رشوت کا اہتمام کر رکھا ہے۔ اب بلز آف انٹری تو بہت بڑی تعداد میں ہوتی ہیں۔ تو ان لوگوں کا کام ہمارے کلرک ہاتھ کے ہاتھ کر دیتے ہیں۔''

عارف حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''تم کیا بلا ہو بھائی!'' اس نے کہا۔

اور فرائض کیا ہیں۔ قاعدے اور ضابطے کیا ہیں۔ کام کس انداز میں ہونا چاہئے اور کس انداز میں ہو رہا ہے۔ ضابطوں میں کتنی گنجائش ہے۔ کون اس سے کتنا فائدہ اٹھاتا ہے۔ لوگ کیا کیا کر رہے ہیں۔ میرے ماتحتوں میں کتنے محنتی اور ایماندار ہیں، اور کتنے حرام خور اور بے ایمان ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ہر سیٹ پر رشوت کی گنجائش نہیں ہے۔ کچھ سیٹیں سوکھی کہلاتی ہیں۔ ان پر کام کرنے والے عام طور پر دیر سے دفتر آتے ہیں، اور جلدی نکل جاتے ہیں۔ اور جو رشوت والی سیٹوں پر بیٹھے ہیں، وہ وقت سے بھی پہلے دفتر آجاتے ہیں، اور دفتر کا وقت ختم ہو جانے کے بعد بھی کام کرتے رہتے ہیں۔''

عارف کی حیرت اور بڑھ گئی تھی۔

''اور اس سب کا کیا فائدہ؟''

''اسسٹنٹ کلکٹر ہونے کی حیثیت سے میں اپنے ماتحتوں کا ذمہ دار ہوں۔ وہ غلط کرتے ہیں تو جواب دہی میری بھی ہے۔ میں یہ سب سمجھ لوں گا تو ردوبدل کروں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ اچھے اور ایماندار لوگوں کو آگے لاؤں، انہیں زیادہ اہم ذمہ داریاں سونپوں۔ میں اصلاح کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ میرا فرض ہے۔ میں ڈسپلن کو یقینی بناؤں گا۔ ایماندار اور محنتی لوگوں کو اس کا کچھ صلہ دلواؤں گا۔ تاکہ وہ مایوس ہو کر دوسروں کے رنگ میں نہ رنگ جائیں۔''

''اب میں سمجھا کہ تم مسعود صاحب کو اتنے پسند کیوں ہو؟'' عارف نے گہری سانس لے کر کہا۔

''لیکن میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔ میں یہاں برسوں سے ہوں۔ تم رشوت کا خاتمہ نہیں کر سکتے۔ یہ بیماری تو اوپر ... بہت اوپر تک گئی ہوئی ہے۔''

''میں برائی سے پوری طاقت اور سچائی کے ساتھ لڑنے کا قائل ہوں۔ ختم ہونا نہ ہونا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ لڑنا ہر انسان پر فرض ہے۔''

''بات کہیں اور نکل گئی۔'' عارف نے چونک کر کہا۔

''میں تو تم سے طویل المیعاد منصوبوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ ابھی تک کوئی کام تو نہیں ہوا اس پر۔ تم آگے بڑھا دیتے ہو، اور اس کے بعد

شائیں شائیں فش۔''

''اسی پر تو یہ تنخواہوں والی بات نکلی تھی۔ طویل المیعاد منصوبے تو بڑی چیز ہوتے ہیں۔ یہاں تو چھوٹے معاملات بھی آگے نہیں بڑھ پاتے۔''

''وجہ......؟''

''بنیادی وجہ سیاسی عدم استحکام ہے۔''

''ذرا اس کی وضاحت بھی کر دو۔''

''آپ کے سامنے تو ہے سب کچھ۔ یہاں کتنی تیزی سے حکومتیں بدلتی ہیں۔ ایک فائل جس وزیر کو بھیجی جاتی ہے، وہ ابھی اس فائل کو پوری طرح پڑھ بھی نہیں پاتا کہ حکومت ختم ہو جاتی ہے۔ جس حکومت کے پاس اپنے قائم رہنے کی ضمانت بھی نہ ہو، وہ کیا کوئی فیصلہ کرے گی۔ مجھے تو نہرو کے اس بیان پر شرم آئی کہ ہم مذاکرات کس سے کریں، اور معاہدے کس سے کریں۔ یہ تو عالمی سطح پر ہماری عزت کم ہو رہی ہے۔ ایک غیر محفوظ حکومت، جسے ہر لمحہ اپنی بقا کی فکر لاحق رہتی ہو، نہ تو ملک کے داخلی مسائل حل کر سکتی ہے، نہ خارجی مسائل۔''

''اس کا سبب......؟''

''ایک تو یہ کہ ہمارا ملک ابتداء ہی سے ہنگامی صورتِ حال سے دوچار رہا۔ اس پر ستم کہ قائد اعظم کو مہلت ہی نہیں ملی۔ لیکن چھوٹا منہ بڑی بات، میں یہ ضرور کہوں گا کہ قائد اعظم سے ایک بنیادی غلطی سرزد ہوئی۔ انہیں ابتداء ہی میں نو آبادیاتی طرزِ حکومت سے قوم کو چھٹکارا دلا دینا چاہئے تھا۔ اس کے بغیر آزادی اور تعمیرِ نو، دونوں کا تصور ممکن نہیں تھا۔ گورنر جنرل کا عہدہ انگریزوں کی یادگار تھا۔ اس کا خاتمہ بہت ضروری تھا۔ خاص طور پر اس لئے کہ اس عہدے میں سیاسی قوت کا ارتکاز تھا۔ پارلیمانی نظام میں ایسا نہیں ہوتا۔ چیک اینڈ بیلنس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ گورنر جنرل تو مطلق انسان ہوتا ہے۔ اب سوچیں، قائد اعظم قیامِ پاکستان کے بعد صرف ایک سال زندہ رہے۔ اس کے بعد اقتدار کے بھوکے اور غیر مخلص سیاست دانوں نے جن کے پاس مسندِ اقتدار تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، سازشیں شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ کہ قائد اعظم کی وفات کے تین

سال بعد لیاقت علی خان کو شہید کر دیا گیا، اس کے بعد سے اب تک جو کچھ ہوا، وہ آپ کے سامنے ہے۔ حکومتیں بنتی ہیں اور مہینوں میں رخصت ہو جاتی ہیں۔ سارا فساد گورنر جنرل کے عہدے کا ہے۔''

''چلو، قائد اعظم یہ کام نہ کر سکے۔ لیکن گورنر جنرل کا عہدہ تو آج بھی اہم ترین ہے۔ دس برس ہو گئے۔ اب تو آئین بھی بن گیا، تو اس عہدے سے نجات کیوں نہیں پا لی گئی؟''

''یہی تو مسئلہ ہے۔ اسی لئے تو ہر حکومت کے خلاف ریشہ دوانیاں ہوتی ہیں۔ جو آئین بنایا گیا، وہ اچھا نہیں ہے۔ جو آئین ایک آئینی حکومت کو تحفظ فراہم نہیں کر سکتا، اسے کیسے اچھا کہا جا سکتا ہے۔ آئین بنانے والوں نے قوم کو مایوس کیا۔''

''لیکن عبدالحق! گورنر جنرل کا عہدہ تو ہندوستان میں بھی رہا۔'' عارف نے اعتراض کیا۔

''جی ہاں! بالکل رہا۔ لیکن انہوں نے اسے اپنایا نہیں، ماؤنٹ بیٹن ہی وہاں کا گورنر جنرل رہا۔ لیکن انہوں نے اسے محض ایک نمائشی اور بے اختیار عہدہ بنا دیا۔ پھر اسے ختم بھی کر دیا۔ آئین بننے میں تو وہاں بھی وقت لگا۔ لیکن آئین سے محرومی کے اس عرصے میں بھی ہندوستان میں گڈ گورننس رہی۔ سیاسی عدم استحکام اور انتشار نہیں رہا۔ انہوں نے جمہوریت کو اور جمہوری حکومت کو مستحکم رکھا اور اس کا تسلسل قائم رکھا۔ اور انہوں نے اپنی قوم کو ایک اچھا اور لچکدار آئین دیا۔''

''تو خرابی تو ہمارے سیاست دانوں نے ہی پیدا کی نا!''

''جی ہاں! بدقسمتی سے ہم اپنی مخلص اور مقبول قیادت سے، تحریک پاکستان کی صفِ اوّل کی قیادت سے محروم ہو گئے۔ کچھ کو موت نے ہم سے چھین لیا۔ ایک کو سازش کر کے شہید کر دیا گیا۔ کچھ طالع آزما سیاست دانوں کی سازشوں سے دل برداشتہ ہو کر بددل ہو گئے، اور کنارہ کر کے بیٹھ گئے۔ اب سیاست اس کا نام ٹھہرا کہ قوم کے مفادات سے صرفِ نظر کر کے اقتدار اور

مفادات کے لئے سودے بازی کی جائے۔ سیاست اور جمہوریت کے اصول
ترک کر کے دونوں کو ہی رسوا کر دیا جائے۔

''بہرحال بات یہ ہو رہی تھی کہ معاشی استحکام کی خاطر دور تک دیکھتے
اور سوچتے ہوئے ملکی معیشت کو ایک طے شدہ راستے پر ڈال کر مکمل منصوبے بندی
کے تحت آگے بڑھایا جائے۔ یہ کام طویل المیعاد منصوبوں کے بغیر ممکن نہیں۔ اور
طویل المیعاد منصوبوں پر عمل درآمد کے لئے سیاسی استحکام اور حکومتی تسلسل لازی
ہے۔ اس سے ہم محروم ہیں۔ یہ محرومی ہمیں آگے بڑھانے کے بجائے خدانخواستہ
اور پیچھے دھکیل سکتی ہے۔''

''اچھا! تم مجھے یہ بتاؤ کہ آگے تک کس انداز میں دیکھتے ہو تم؟''

''کسی بھی ملک اور قوم کے لئے بنیادی طور پر اہم ایک مہذب اور خوش
حال معاشرہ ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اور ایسے معاشرے کے لئے غربت سے پاک ہونا ضروری ہے۔
کیونکہ غربت آدمی کو برائیوں پر مجبور کر دیتی ہے، اور اسے ترغیبات کے لئے
آسان ہدف بنا دیتی ہے۔ غربت کو دور کرنے کے لئے روزگار اور مسائل ضروری
ہیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں تو کچھ اس طرح کی تصویر سامنے آتی ہے۔ پاکستان فی
الوقت زرعی ملک ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ زمین بڑھ نہیں سکتی۔ بلکہ زمین کی
پیداواری قوت بھی بتدریج کم ہوتی ہے۔ دوسری طرف پاکستان میں اضافہ
آبادی کی شرح بھی کافی بلند ہے۔ اعداد وشمار سے پتا چلتا ہے کہ پندرہ سال میں
پاکستان کی آبادی دگنی ہو جائے گی۔ اب ایک زرعی ملک کی حیثیت سے تصور
کریں تو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کی صورت میں پندرہ سال بعد صورتِ حال کتنی
بھیانک ہوگی۔ غربت تو کیا، ہم تو خدانخواستہ قحط جیسی صورتِ حال سے بھی دوچار
ہو سکتے ہیں۔ تو اس کے لئے ہمیں ابھی سے منصوبہ بندی کرنی ہوگی۔''

''مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''یہی تو سوچنا ہوتا ہے۔ اس وقت پاکستان میں ناقابل کاشت اراضی
بہت زیادہ ہے۔ ہمیں اس کو قابل کاشت بنانے کے لئے اقدامات کرنے ہوں

گے۔ دوسری طرف ہمیں کاشت کاری کے جدید طریقے اپنانے ہوں گے، جدید
آلات کا استعمال کرنا ہوگا، پیداوار میں اضافے کے لئے اقدامات کرنے ہوں
گے۔ اور صرف اس سے کام نہیں چلے گا۔ آبادی بڑھے گی تو محنت کرنے والے
ہاتھ بھی بڑھیں گے۔ اگر ہم روزگار کے مواقع بڑھا سکے تو وہ فائدہ مند ثابت
ہوں گے۔ لیکن اگر ہم نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا تو بے روزگاری اور غربت
میں اضافہ ہوگا۔ اس کے لئے موثر ترین ذریعہ صنعت کو فروغ دینا ہے۔ اس کے
بارے میں میں آپ کو بتایا تھا......''

''ہاں! مجھے یاد ہے۔ خام مال کے مقابلے میں مصنوعات کی برآمد
فائدہ مند ہے۔'' عارف نے کہا۔

''جی ہاں! صنعت کے فروغ سے ایک طرف تو زرمبادلہ کا توازن
ہمارے حق میں بہتر ہوگا اور ملک کی معیشت کو مستحکم کرے گا تو دوسری طرف
روزگار کے مواقع بڑھیں گے۔ یوں تو عارف بھائی، خدمات بھی روزگار کا ذریعہ
ہیں۔ لیکن ان کی نوعیت غیر پیداواری ہے۔''

''یہ بات تو میری سمجھ میں بالکل بھی نہیں آئی۔'' عارف نے کہا۔

''سیدھی سی بات ہے عارف بھائی! کسان محنت کرتا ہے تو پیداوار ہوتی
ہے۔ صنعتی مزدور محنت کرے گا تو پروڈکشن ہوگی۔ لیکن وکیل، پلمبر، الیکٹریشن اور
دوسرے لوگ جو دوسروں کو خدمات فراہم کرتے ہیں، وہ پروگریسو نہیں ہیں۔ یہ
لوگ خوش حال معاشرے میں ہی پھلتے پھولتے ہیں۔ تو جو پیداواری صلاحیت
رکھنے والے ہیں، وہ حقیقی قومی آمدنی بڑھاتے ہیں۔ جبکہ خدمات میں یہ بات
نہیں۔ ایک دکاندار، جو درآمد کردہ اشیاء فروخت کر رہا ہے، وہ ملکی معیشت کو کوئی
فائدہ نہیں پہنچا رہا ہے۔ لیکن یہ خدمات بھی ضروری اور اہم ہیں۔ مگر پیداواری
صلاحیتیں ترقی پذیر ہوں تو معیشت متوازن رہتی ہے۔ اور پیداوار کم ہو جائے تو
توازن بگڑنے لگتا ہے۔''

''میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔ لیکن منصوبہ بندی کیا ہوتی ہے؟''

''میں نے پچھلی بار آپ سے کہا تھا نا کہ پاکستان میں تو فی الحال

صنعت ہے ہی نہیں۔ صنعت کیا، یہاں تو اس کا بنیادی ڈھانچہ بھی موجود نہیں ہے۔ اب ہم پندرہ سال بعد کی ممکنہ تصویر سامنے رکھ کر سوچتے ہیں، تو پہلی چیز زرعی اصلاحات ہیں۔ زمین کی پیداواری صلاحیت بڑھانا، ناقابل کاشت اراضی کو قابل کاشت بنانا، کاشت کے سلسلے میں کاشت کاروں کی راہنمائی، تاکہ غذائی اجناس کے معاملے میں خود کفالت حاصل کی جائے اور اس کے بعد وہ فصلیں کاشت کی جائیں، جن سے ہماری صنعت کو خام مال حاصل ہو۔ اس سب کے لئے مربوط پلاننگ ضروری ہے۔ یہ ریاست کو طے کرنا ہوگا کہ کہاں کتنی زمین پر کون سی فصل کاشت کی جائے۔ اس کے لئے کاشت کار کو تحفظ فراہم کرنا ضروری ہوگا۔

''دوسرے مرحلے میں صنعت کے لئے انفرااسٹرکچر قائم کرنا ہوگا۔ یہ طویل اور صبر آزما کام ہے، جو ترتیب اور تسلسل کے ساتھ کرنا ہوگا۔ اور برسوں پر محیط ہوگا۔ اور ابتداء میں اس کے لئے بہت قربانیاں دینی ہوں گی۔ پھر اس کا پھل ہمیں زندگی بھر ملتا رہے گا۔ یہ ایسا ہی ہے، جیسے آم کا درخت لگانا۔''

''قربانیاں کیسی؟''

''بھاری سرمایہ کاری کرنا ہوگی۔ انڈسٹری کے لئے بھاری مشینری درآمد کرنی ہوگی۔ اس کے لئے کثیر زرِ مبادلہ درکار ہوگا۔ درآمدات اور برآمدات کا توازن بگڑے گا۔ روپے کی قیمت مستحکم رکھنا دشوار ہو جائے گا۔ مہنگائی بھی ممکن نہ ہوسکتی ہے۔ پوری قوم کو یہ قربانی دینی ہوگی۔ لیکن خدانخواستہ تسلسل میں فرق آیا تو سب کچھ ضائع ہو جائے گا۔ یہ وہ مقام ہے، جہاں سیاسی اور حکومتی استحکام کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔

اب عارف بھائی! یہ سب کچھ کر بھی لیا جائے تو پندرہ برس بعد کی آبادی کے لئے کم از کم معاشی استحکام اور خوش حالی کے لحاظ سے کم پڑ جائے گا۔ اس کے لئے کاٹیج انڈسٹری کے فروغ کے لئے کام کرنا ہوگا۔ یوں کوئی بھی فرد، حتیٰ کہ خواتین خانہ بھی بے کار نہیں رہیں گی۔ میں نے عرض کیا تھا نا کہ سب سے پہلے میسر وسائل کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ پھر ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاتا

ہے۔ ہمارے ہاں وسائل میں ایک بہت بڑی چیز یہ ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے لوگ ہنرمند بھی ہیں اور محنتی بھی۔ یہاں ہاتھ سے جو کام کیا جاتا ہے، وہ بیرونِ ملک ہاتھوں ہاتھ لئے جانے والا کام ہے۔ کاٹیج انڈسٹری کے ذریعے ہر شخص کو کارآمد بنایا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں، اس سے ہمیں کثیر زرِ مبادلہ بھی حاصل ہوسکتا ہے۔''

عارف چند لمحے سوچتا رہا۔ درحقیقت وہ عبدالحق سے بہت مرعوب ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے استادِ محترم کے علاوہ تمام لوگ ایسے ہی دیکھے تھے، جو صرف اپنے اور اپنے مفادات کے بارے میں سوچتے تھے۔

''لیکن یہ سب کچھ تو تم سوچتے ہو، اور منصوبہ بندی کر کے آگے بڑھا دیتے ہو۔'' اس نے کہا۔

''اس کا حاصل کیا ہے۔ تم نے خود بتایا کہ آج تک تمہاری کسی تجویز پر عمل نہیں کیا گیا۔''

''پہلی بات تو یہ عارف بھائی! کہ یہاں اکیلا میں ہی نہیں ہوں، میری کیا حیثیت اور کیا بساط؟ بہت لوگ ایسے موجود ہیں، جو درحقیقت اس ملک کا سرمایہ ہیں۔ صاحب علم لوگ اور عمل کرانے کی صلاحیت سے مالا مال۔ میں تو ابھی چچا جان جیسے لوگوں سے سیکھ رہا ہوں۔ وہ لوگ مخلص بھی ہیں اور جرأت مند بھی۔ وہ اپنی بات اونچی سے اونچی سطح پر بھی کہنے سے نہیں چوکتے۔''

''لیکن سیاسی استحکام، جسے تم ضروری قرار دیتے ہو، اس کے تو دور دور تک آثار نہیں۔ اور اس کے بغیر کچھ ہو نہیں سکتا۔''

''میں وہی بات کرنے والا تھا عارف بھائی! میرے نزدیک یہ پاکستان معجزہ ہے، اللہ کی رحمت ہے، اور یہ بے سبب بھی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ پاکستان سے کوئی بڑا کام لیں گے۔ دیکھیں نا! اللہ نے نہ چاہا ہوتا تو یہ اب تک ختم ہو چکا ہوتا۔ تو یہ ملک قائم رہے گا۔ اور اس ملک اور قوم کو کوئی بڑا کام کرنا ہے تو اللہ اسے طاقت بھی دے گا، اور استحکام بھی۔ مجھے یقین ہے، یہاں سیاسی استحکام بھی آئے گا، مضبوط حکومتیں بھی قائم ہوں گی اور طویل المیعاد منصوبوں پر

کام بھی ہوگا۔ شاید مستقبل میں امت مسلمہ کا دفاع بھی پاکستان ہی کرے گا۔''

عارف اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر ایمان کی چمک تھی۔

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' اس نے کہا۔

''لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ یہاں اس محکمے میں تمہارا تبادلہ تمہیں ضائع کرنے کے مترادف ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں عارف بھائی! ہر نیا تجربہ آدمی کو کچھ نیا سکھانے، کچھ آگے بڑھانے کے لئے ہوتا ہے۔''

''تم بہت اچھے ہو عبدالحق! لیکن یہاں کا تجربہ کچھ اچھا اور حوصلہ افزا نہیں ہوگا تمہارے لئے۔''

''جو اللہ کی مرضی عارف بھائی! میں تو یہ یقین رکھتا ہوں کہ ہر کام میں اللہ کی طرف سے بہتری ہی ہوتی ہے۔''

''اچھا یہ بتاؤ، یہاں دل بھی لگا تمہارا؟'' عارف نے موضوع بدلا۔

''اللہ کا شکر ہے، آپ کی وجہ سے یہ مرحلہ بہت آسان ہوگیا۔''

''لیکن سب لوگ یاد تو آتے ہوں گے؟''

''یہ تو قدرتی بات ہے عارف بھائی! لیکن جدائی میرے لئے نئی چیز نہیں ہے۔ اللہ نے مجھے اس کا ظرف دیا ہے۔''

✿ ✿ ✿

ارجمند کی بہت عجیب سی کیفیت تھی۔ یہ کیفیت اس پر آغا جی اور آپی کے کراچی جانے کے بعد غیر محسوس انداز میں شروع ہوئی تھی۔ اور بتدریج بڑھتی گئی تھی۔ مگر اب اس کے خدوخال بہت واضح ہوگئے تھے۔

اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ خوفزدہ ہے۔ آغا جی اس کے لئے شاید عافیت کی، تحفظ کی علامت تھے۔ اب وہ دور چلے گئے تھے تو اسے عدم تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ احساس بے حقیقت ہے۔ یہاں دادی اماں تھیں، جنہیں ہروقت اس کے تحفظ کی فکر رہتی تھی۔ انہوں نے کبھی اسے ڈرائیور کے ساتھ اکیلے اسکول نہیں جانے دیا تھا۔ کبھی ایسی نوعیت آتی تو وہ خود اس کے

ساتھ جاتیں اور اسکول سے گھر لے جانے کے لئے بھی آتیں۔ لیکن ایسا اب تک صرف ایک بار ہوا تھا۔

پھر چچا جان اور چچی جان تھے۔ ان کے رویے سے تو اسے شرمندگی ہوتی تھی۔ وہ بڑے تھے۔ مگر اسے اتنی عزت دیتے تھے، جیسے وہ ان سے بڑی ہو۔ وہ اس بارے میں سوچ کر الجھتی، مگر اس کی وجہ کبھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ اس کی طرف دیکھتے تو ان کی نگاہوں سے ایسی بے پناہ محبت چھلکتی کہ وہ بھیگ بھیگ جاتی۔ وہ اس کی ہر طرح سے فکر کرتے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتے۔ کبھی کبھی اسے ایسا لگتا کہ شاید ان کے نزدیک وہ کانچ کی بنی کوئی نازک گڑیا ہے، جو ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ سکتی ہے۔ ایسی محبت اسے پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔

اسے اسکول پہنچانے اور گھر واپس لانے کی ذمہ داری چچا جان نے سنبھال لی تھی۔

پھر ساجد تھا، جو آغا جی کے حوالے سے اسے چھوٹی چاچی کہتا تھا۔ ارجمند نے دیکھا تھا کہ وہ آغا جی سے عشق کرتا ہے۔ اسی لئے تو وہ اسے زیادہ عزیز ہوگیا تھا۔ پھر وہ ان کے جان کے بعد اسے چھوٹی چاچی کہنے لگا۔ اسے بہت اچھا لگتا تھا، ورنہ تو وہ اسے کبھی اس طرح پکارنے کی اجازت ہی نہ دیتی۔ اس میں خطرہ ہی اتنا بڑا تھا۔ کسی کے سامنے وہ کہہ دیتا تو شاید وہ کبھی کسی کے سامنے نظر اٹھانے کے قابل بھی نہ رہتی۔ لیکن اچھا اتنا لگتا تھا کہ وہ اسے منع نہیں کر سکی۔ البتہ اس نے اسے خبردار کر دیا کہ کسی کے سامنے وہ اسے اس طرح نہ پکارے۔ اس کے باوجود وہ مطمئن نہیں تھی آخر وہ بچہ ہی تھا۔ بچوں کو اتنا ہوش کہاں رہتا ہے۔ لیکن اب تک ساجد نے اسے مایوس نہیں کیا تھا۔

ساجد کے اور اس کے درمیان اتنی گہری محبت صرف۔ اور صرف آغا جی کے حوالے سے تھی۔ دونوں گھنٹوں بیٹھ کر ان کے متعلق باتیں کرتے۔ اس دن ارجمند کے دل میں اس کی محبت اور بڑھ گئی۔ جب اس نے بڑی معصومیت سے بتایا کہ وہ اللہ سے ہر روز دعا کرتا ہے کہ وہ چھوٹی چاچی کو سچ مچ اس کی چاچی بنا دیں۔ اس

کے باوجود ارجمند نے بھی اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ بھی اس کی چاچی بننا چاہتی ہے۔
لیکن وہ جانتی تھی کہ ساجد یہ بات جانتا ہے۔ کیسے؟ یہ اسے معلوم نہیں تھا۔

بہر حال، یہ طے تھا کہ ساجد نہ ہوتا تو شاید آغا جی کی جدائی اس کے لئے آسان نہ ہوتی۔

تو اس سب کے باوجود یہ حال تھا کہ ہر وقت اس کے دل میں یہ دھڑکا رہتا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ وہ خوفزدہ رہتی، خود کو غیر محفوظ سمجھتی۔ جب وہ کیفیت ختم ہوتی تو وہ اس کے بارے میں سوچ کر جھنجلاتی۔ کیونکہ اس کے پاس خوفزدہ ہونے کا کوئی معمولی سا جواز بھی نہیں تھا۔ اسے خیال آتا کہ یہ تو ناشکرا پن ہے۔

ایک دن وہ اسٹڈی میں بند ہو کر بیٹھ گئی کہ آج یہ مسئلہ حل کرنا ہے۔ تحفظ ملنے کے بعد یہ عدم تحفظ کیسا؟ اس نے سمجھ لیا کہ اس کے لئے اسے اپنے ماضی میں جھانکنا ہوگا۔

دہلی میں وہ بھرے پرے گھر میں تھی۔ امی، بابا، دادا، دادی، چاچا، پھپھو...... سبھی اس کی دل داری کرتے تھے۔ وہاں سوائے محبت اور تحفظ کے کچھ اور تھا ہی نہیں۔ پھر وہ وقت بھی اس نے دیکھا کہ سب خوفزدہ تھے۔ وہ گھر چھوڑ کر نکلے اور اس جگہ گئے، جسے کیمپ کہا جاتا تھا۔ اس کی سمجھ میں اپنے دہلی والے گھر میں یہ کبھی نہیں آیا کہ سب لوگ کیوں خوفزدہ ہیں۔ لیکن کیمپ میں پہنچ کر وہ سمجھنے لگی۔ وہاں ہزاروں لوگ تھے۔ کئی کئی وقت کھانے کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ پینے کو پانی ملتا تو گندا اور بدبودار۔ ابتداء میں تو پہلا گھونٹ لیتے ہی اسے الٹی ہو جاتی تھی۔ مگر پھر وہ اسی پانی کو پینے لگی۔ اس سے کم از کم پیاس تو بجھتی تھی۔

وہ چھوٹی تھی، سمجھتی کچھ نہیں تھی، لیکن سنتی تو سب کچھ تھی۔ کیمپ میں شور مچ جاتا کہ حملہ ہوگیا ہے تو افراتفری مچ جاتی۔ خوف ناک آوازیں سنائی دیتیں، جن کے بارے میں کہا جاتا کہ گولیاں چل رہی ہیں۔ ایسے میں امی اسے ڈھانپ لیتیں۔ وہ گھراتی تو امی کہتیں، گھبراؤ نہیں، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ وہ سب کچھ ٹھیک کر دے گا۔

وہاں گھر والا بستر بھی نہیں تھا۔ امی فرش پر چادر بچھا دیتیں اور اس پر

اسے لٹا دیتیں۔ اس کا جسم دکھنے لگتا۔ اس پر بھوک اور پیاس۔ وہ گھبرا کر کہتی۔

''امی! گھر چلیں نا! اپنے گھر۔''

''اب وہ ہمارا گھر نہیں ہے۔'' امی کہتیں۔

''تو اب ہمارا گھر یہ ہے؟'' وہ حقارت سے کہتی۔

''نہیں! یہ تو کیمپ ہے۔''

''تو ہمارا گھر کہاں ہے؟''

''ہمارا گھر پاکستان میں ہے۔''

''تو پاکستان چلیں!''

''اسی کے لئے تو یہاں بیٹھے ٹرین کا انتظار کر رہے ہیں۔ ٹرین آئے گی اور ہم اس میں بیٹھ کر پاکستان جائیں گے۔''

''ٹرین کیسی ہوتی ہے امی!''

''آئے گی تو خود ہی دیکھ لینا۔''

''ٹرین کب آئے گی؟''

''یہ تو کسی کو نہیں معلوم بیٹا! تم اللہ سے دعا کیا کرو۔''

مگر ٹرین آ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ دن بھر ایک چبوترے پر بیٹھی ادھر ادھر دیکھتی رہتی۔ وہ چبوترا کیمپ میں ان کا گھر تھا، اور دادا جی کہتے تھے کہ وہ بڑی نعمت ہے۔ وہ حیرت سے سوچتی، کتنے دن ہوگئے، امی نے نہ اس کا منہ دھلایا، نہ بال بنائے اور نہ ہی کپڑے بدلوائے۔ کیا کیمپ میں لوگ سب کچھ بھول جاتے ہیں؟ پھر اس نے دوسروں کو دیکھا۔ سبھی کا برا حال تھا۔ بابا اور چاچا کا شیو بڑھ گیا تھا۔ اب وہ ان کے رخسار سے اپنا رخسار نہیں مل سکتی تھی۔ دادا کی داڑھی جھاڑ جھنکاڑ ہوگئی تھی۔ سب کے کپڑے میلے اور بال چکٹ ہو رہے تھے۔

پھر وہ ان سب باتوں کی عادی ہوگئی۔ جیسے اس نے سمجھ لیا کہ جب بھوک پیٹ کے اندر بیٹھ کر نکیلے دانتوں سے کاٹتی اور تیز پنجوں سے کھرچتی ہو تو کسی اور چیز کی پرواہ نہیں رہتی۔

ابتداء میں وہ روتی تھی۔ پھر آنسو خشک ہوگئے، اور اس کا رونا محض

بسورنے تک محدود ہوگیا۔ اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ آنسوؤں کے لئے جسم میں پانی موجود ہونا ضروری ہے۔

پھر ایک دن بابا نے کہا کہ اسٹیشن جانا ہے۔ ٹرین آنے والی ہے۔ سب لوگ کیمپ سے نکلے اور اسٹیشن چلے گئے۔ بھوکے ہونے کے باوجود سب خوش تھے۔ وہ پاکستان جانے والے تھے۔

اسے اب بھی یہ سوچ کر گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ وہ ٹرین میں کیسے دھکم پیل کے عالم میں سوار ہوئے تھے۔ عجیب افراتفری تھی وہاں۔ ہر شخص دوسرے کو دھکیل کر خود اندر گھس جانا چاہتا تھا۔

اندر اور مصیبت تھی۔ پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ سانس لینے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ گری ایسی تھی کہ دم گھٹ رہا تھا۔ اسے یاد تھا کہ ٹرین میں اس نے سوچا کہ اس سے تو کیمپ ہی بہتر تھا۔

ٹرین چلی تو کچھ ہوا آئی، اور گری کم ہوئی۔ مگر پھر اسے بھوک نے ستایا اور بلکنے لگی۔ پچھلے دو دن میں ان نے صرف دو بسکٹ کھائے تھے۔ اس کے بلکنے پر دادی تڑپ گئیں۔ انہوں نے اپنے چھالیا کے بٹوے سے وال سے بھی چھوٹا ایک دانہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

''لے میری شہزادی! یہ کھالے۔''

پھپھو نے تڑپ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔

''کیا کرتی ہیں امی! اتنی سی بچی ہے۔''

دادی نے نرمی سے ان کا ہاتھ ہٹا دیا۔

''یہ دو دن کی بھوکی ہے۔ سو جائے گی تو بھوک کا پتا بھی نہیں چلے گا۔ بس خیریت سے پاکستان پہنچ جائیں۔ وہاں تو انشاء اللہ سب کچھ مل جائے گا۔''

دادی نے وہ ننھی سی چیز اس کی طرف بڑھائی تو اس نے معصومیت سے کہا۔

''مجھے بہت بھوک لگی ہے دادی اماں! بہت ساری چیز دیں۔''

دادی کی آواز ایسی ہوگئی، جیسے وہ رو رہی ہوں۔

''تم کھا کر تو دیکھو میری شہزادی! پھر کہو گی تو اور دے دوں گی...

بہت ساری۔''

مگر وہ کھاتے ہی تو بے سدھ ہوگئی۔ اسے ہوش ہی نہیں رہا۔

اس کی آنکھ کھلی۔ مگر وہ ایسا تھا، جیسے خواب دیکھ رہی ہو۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ پھپھو نے اسے کھچڑی کھلائی تھی۔ اس کے بعد وہ پھر سوگئی تھی۔

اس کے بعد آنکھ کھلی تو وہ ایک اجنبی جگہ تھی، ایک گندا سا کچا گھر، جہاں صفائی بھی ہیں ہوئی تھی۔ پھپھو وہاں موجود تھیں۔ اس نے پھپھو سے پوچھا۔

''یہ کون سی جگہ ہے پھپھو!''

''اب میں تمہیں کیا بتاؤں گڑیا!'' پھپھو نے بے بسی سے کہا۔

''کیا یہ پاکستان ہے پھپھو!'' اپنے لہجے کی مایوسی اسے آج بھی یاد تھی۔

پھپھو یہ سن کر تڑپ گئیں۔

''یہ ایک چھوٹا سا گھر ہے بیٹا! مگر ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ اور گڑیا! پاکستان تو بہت بڑا، بہت خوب صورت ہے۔''

پھر اس نے امی، بابا، دادی، دادا اور چاچا، سب کے بارے میں پوچھا۔ پھپھو کے پاس اس کے ہر سوال کا ایک ہی جواب تھا۔

''ان سب کو اللہ میاں نے اپنے پاس بلا لیا ہے۔''

''کہاں بلا لیا ہے پھپھو!''

''آسمان پر۔''

وہ چند لمحے سوچتی رہی، پھر بولی۔

''آسمان تو بہت دور ہے نا پھپھو!''

''ہاں گڑیا! بہت...... بہت دور۔''

''تو وہاں سے واپس آنے میں تو انہیں بہت دن لگیں گے؟''

''نہیں گڑیا! وہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔''

''تو وہ اب کبھی واپس نہیں آئیں گے؟'' اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''نہیں گڑیا!''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی

''میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی پھپھو!''
پھپھو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
''میں تو تمہارے پاس ہوں نا!''
''نہیں پھپھو! مجھے تو سب لوگ چاہئیں...... سب لوگ۔''
''اب تو وہ کبھی واپس نہیں آ سکتے بیٹا!'' پھپھو نے کہا اور رونے لگیں۔
وہ پھپھو کو پیار کر کے چپ کرانے لگی۔
''آپ روئیں نہیں اچھی پھپھو! اب تو ہم پاکستان آ گئے ہیں نا! سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اسے ٹرین میں دادی کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی تھی۔
پھپھو یہ سن کر اور زیادہ رونے لگیں۔
وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔
''پھپھو! وہ لوگ تو واپس نہیں آ سکتے، تو ہم دونوں بھی اللہ میاں کے پاس چلیں۔ وہاں سب مل جائیں گے۔''
پھپھو رونا بھول گئیں۔
''نہیں گڑیا! اللہ میاں کے ہاں کوئی خود سے نہیں جا سکتا۔ بس وہی جا سکتا ہے، جسے اللہ میاں بلائیں۔''
''یہ تو بڑی مشکل ہو گئی۔'' اس نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔
''اچھا! میں اللہ میاں سے دعا کروں گی کہ وہ ہمیں بھی بلا لیں۔''
''نہیں گڑیا! ایسا کبھی نہ کرنا۔ یہ بات اللہ میاں کو پسند نہیں۔ وہ اس پر ناراض ہوتے ہیں۔''
تب وہ بے بسی سے رونے لگی۔
''تم یہاں روؤ گی گڑیا! تو آسمان پر سب لوگوں کو تکلیف ہوگی۔ وہ بھی روئیں گے۔''
وہ روتے روتے چپ ہو گئی۔ لیکن اس کے باوجود وہ انہیں یاد کر کے بار بار روتی رہی، بہت دنوں تک روتی رہی۔ اب اسے یہ یاد نہیں تھا کہ اسے صبر کب آیا، اور کب اس کا رونا موقوف ہوا۔

پھر ایک گندا سا آدمی آیا، جو اسے بہت ہی برا لگا۔ لیکن پھپھو بڑی عزت سے اسے رشید صاحب کہہ رہی تھیں۔ اس بات پر اسے پھپھو پر غصہ آتا رہا، لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ شکر ہے، اس سے جلدی جان چھوٹ گئی۔ وہ انہیں بوا کے گھر لے گیا تھا۔ اس کے بعد وہ وہیں رہیں۔
یہاں تک یادوں میں کہیں کہیں خلا بنتے تھے۔ لیکن بوا کے گھر کی تو ہر بات اس کے ذہن میں تازہ تھی۔ وہ بڑا اور اچھا گھر تھا۔ وہاں ہر چیز آرام دہ اور قیمتی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں اسے وہ گندا لگتا تھا۔ ایک بار اس نے یہ بات پھپھو سے کہی تو وہ کچھ دیر اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہیں، پھر بولیں۔
''بچی ہو نا! جو جانتی نہیں، سمجھتی نہیں، وہ بھی تمہیں نظر آ جاتا ہے۔''
اس کے باوجود ارجمند کو وہ گھر نعمت لگتا تھا۔ کبھی وہ سوچتی کہ پاکستان میں جس گھر میں اس کی آنکھ کھلی تھی، اگر اسے وہیں رہنا پڑتا تو کیا ہوتا۔ اس کے مقابلے میں تو بوا کا گھر جنت ہی تھا۔ اور وہاں اسے تکلیف ہی کیا تھی؟ بس یہی کہ وہ وہاں پنجرے میں قید چڑیا کی طرح تھی۔ باہر نکلنے کو جی مچلتا۔ مگر وہ آزادانہ نہیں نکل سکتی تھی۔
لیکن پھپھو وہاں کبھی خوش نہیں رہیں۔ اداس تو وہ ہمیشہ ہی رہتی تھیں۔ لیکن کبھی کبھی تو اداسی کی حد ہو جاتی، اور انہیں چپ سی لگ جاتی۔ ایسے میں وہ ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتی۔ وہ اس گھر کو جہنم کہتی تھیں۔
ارجمند کو وہ گھر آج بھی اچھا لگتا تھا۔ اس کی وجہ تھی۔ وہاں سے اسے بہت کچھ ملا تھا۔ نانا بھی اسے وہیں ملے تھے اور پھپا جان بھی۔ آغا جی کو بھی اس نے وہیں دیکھا تھا، یعنی زندگی کی سب سے بڑی اور قیمتی چیز...... آغا جی کی محبت بھی اسے وہیں ملی تھی۔ اور وہیں سے وہ ان کے پاس پہنچی تھی۔ وہیں پھپھو نے اسے قرآن پڑھایا اور نماز سکھائی تھی۔ اسے تو وہ گھر اللہ کی نعمت لگتا تھا۔
آخر کے عرصے میں، بوا کے مرنے کے بعد ایک دن اس نے پھپھو کو اس کیفیت میں دیکھا تو کہا۔
''آپ ایسے اداس نہ ہوا کریں پھپھو! دیکھیں نا، یہاں آپ کا حکم چلتا

ہے۔ ہر چیز کی آپ مالک ہیں۔''

''جہنم کا داروغہ بننا کسے اچھا لگتا ہے؟'' پھپھو نے جھنجلا کر کہا۔

اسے بہت برا لگا۔

''ایسے نہ کہیں پھپھو!''

''تم کیا جانو، تمہیں کیا پتا کہ یہاں کتنے زخم کھائے ہیں میں نے۔''

''زخم......؟'' وہ بری طرح سہم گئی۔

''آپ کو زخم لگے ہیں؟ آپ نے مجھے دکھائے ہی نہیں۔''

وہ اپنی اداسی بھول کر، کھلکھلا کے ہنس دیں۔ انہوں نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔

''تم سمجھ نہیں سکتیں کہ اللہ کی کیسی رحمت ہے تم پر۔ اس نے کہاں کہاں تمہیں کیسے کیسے بچایا ہے۔ تم بے خبری کی جنت میں ہو۔ تمہیں تو کچھ پتا ہی نہیں۔''

وہ حیرت سے انہیں دیکھتی رہی۔

''آپ زخموں کی بات کر رہی تھیں۔''

''وہ جسم کے زخموں سے زیادہ گہرے زخم ہیں۔ اور کسی کو نظر بھی نہیں آتے۔ وہ روح کے زخم ہیں گڑیا!''

اس نے ان کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔

''مجھے دیکھیں پھپھو! سب لوگوں کو اللہ نے بلا لیا۔ مجھے اب بھی وہ سب یاد آتے ہیں۔ لیکن میں صرف آپ کے ساتھ خوش رہتی ہوں۔''

''تم کیا جانو، میں تو جی ہی تمہارے لئے رہی ہوں، اور کیسے جبر کر کے جی رہی ہوں، یہ تم سمجھ بھی نہیں سکتیں۔ اس جینے کے مقابلے میں مر جانا بہت آسان تھا میرے لئے۔ میری خوشی کیا، میرے تو جینے کا سبب بھی صرف تم ہو۔ اللہ کا شکر ہے کہ تم نے ان سب لوگوں کے اللہ کے پاس جانے کا منظر نہیں دیکھا۔ دیکھ لیتیں تو زندگی بھر کے لئے مسکرانا بھول جاتیں، اور جو کچھ مجھ پر گزری، وہ تم صرف دیکھ لیتی تو......'' وہ کہتے کہتے رک گئیں۔

''چھوڑو اس بات کو، میری شہزادی! اللہ تم پر مہربان ہے، وہ ہمیشہ تم پر

مہربان رہے۔ تم کبھی نہیں جان سکو گی کہ اس نے تمہیں کیسے کیسے دکھوں سے بچا لیا ہے۔ تم کبھی نہیں جان سکتیں اور تمہارے لئے اسے نہ جاننے میں ہی بہتری ہے۔ بس شکر ادا کرتی رہا کرو۔''

پھپھو کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ وہ تھرا کر رہ گئی۔ عام طور پر ایسی بات سن کر آدمی کو تجسس ہوتا ہے، وہ جاننا چاہتا ہے۔ لیکن وہ ڈر گئی۔ اس نے دل میں سوچا۔ میں وہ سب کچھ نہیں جاننا چاہتی، جس سے اللہ نے مجھے بچا لیا ہے۔

آگے کچھ یاد کرنا ضروری نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں آگیا کہ عدم تحفظ کا احساس ایمان کی کمی کی دلیل ہے۔ اسے حیرت تھی کہ آج تک اس نے اپنے اس بہت پیچھے کے وقت کو کبھی یاد نہیں کیا تھا۔ کبھی نہیں دہرایا تھا۔ لیکن شاید پہلے اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ جبکہ اب اس نے بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔ پھپھو بہت اچھی تھیں۔ مگر بوا کے گھر کو وہ جہنم کہتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ حفاظت کرنے والا تو بس اللہ ہے۔ کبھی وہ نانا سے کہتی تھیں، کیسی رحمت ہے اللہ کی کہ وہ اس جہنم میں ہمیں رزقِ حلال عطا فرماتا ہے۔ ہماری ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ اور جب سے انہوں نے سلائی کا کام شروع کیا تھا، انہوں نے اپنے برتن، اپنا کھانے پینے کا سامان الگ کر لیا تھا۔ کبھی اس کا گوشت کھانے کو دل چاہتا اور دال پکی ہوتی تو وہ اسے کہتیں۔ یہ دال اس گھر کے گوشت سے اچھی ہے۔ کھا کر تو دیکھو۔ جب ہمارے پیسے آجائیں گے تو میں تمہیں بہت مزے کا گوشت پکا کر کھلاؤں گی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس گھر کا کھانا پھپھو کے نزدیک حرام تھا۔ لیکن سلائی کے کام سے پہلے، بوا کی زندگی میں تو وہ وہیں سے کھاتی اور کھلاتی تھیں۔ تب شاید وہ مجبوری تھی۔ اور اسے یاد تھا کہ پھپھو کبھی رغبت سے نہیں کھاتی تھیں۔

ایک لمحے کو ارجمند نے سوچا کہ بوا کے گھر کا کھانا پھپھو کو حرام کیوں لگتا تھا۔ مگر فوراً ہی اس نے اس تجسس کو جھٹک دیا۔ پھپھو کی وہ بات اسے یاد آگئی۔ انہوں نے کہا تھا...... اللہ کا شکر ہے کہ تم نے ان سب لوگوں کے اللہ کے ہاں جانے کا منظر نہیں دیکھا۔ دیکھ لیتیں تو زندگی بھر کے لئے مسکرانا بھول جاتیں۔ اور جو کچھ مجھ پر گزری، وہ تم صرف دیکھ لیتی تو...... اس کے بعد انہوں نے بات

پوری نہیں کی تھی۔ پھر چند لمحے بعد انہوں نے کہا تھا...... اللہ تم پر مہربان ہے۔ وہ ہمیشہ تم پر مہربان رہے۔ تم کبھی نہیں جان سکو گی کہ اس نے تمہیں کیسے کیسے دکھوں سے بچالیا ہے۔ تم کبھی نہیں جان سکتیں اور تمہارے لئے نہ جاننے ہی میں بہتری ہے۔ بس شکر ادا کرتی رہا کرو۔

اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ راہنما جملے تھے۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ کچھ دل کو پھاڑ دینے والے، روح پر گہرے زخم لگانے والے معاملات تھے، جن سے اللہ نے اسے بے خبر رکھا تھا۔ پھپھو کو وہ سب معلوم تھا تو وہ کتنی زخمی، کتنی دکھی تھیں۔ تو جس دکھ سے اللہ نے اسے بچالیا، وہ اس کی کھوج کیوں کرے؟ اسے تو بس شکر ادا کرتے رہنا چاہئے۔

اب اتنا پیچھے تک جا کر دیکھنے کے بعد وہ سمجھ سکتی تھی کہ اللہ جو ازل سے ابد تک، ہر لمحے کو جانتا ہے، ایک وہی تو ہے، جو اپنے بندوں کی ہر ضرورت سے باخبر ہے، اور وہی ضرورت پوری کرنے والا ہے۔ وہی بچانے والا اور دعائیں قبول کرنے والا ہے۔ وہ بندوں کو نعمتیں عطا فرماتا رہتا ہے، ان پر عنایات کرتا رہتا ہے، ان ضرورتیں پوری کرتا رہتا ہے، اور بندوں کو پتا بھی نہیں چلتا۔

اس نے سوچا، شکر ادا کرنا ضروری ہے۔ لیکن شکر ادا کرنا ممکن نہیں۔
دل نے کہا، کوشش تو کرتا رہے بندہ، کیسی کوشش؟ دو رکعت نفل برائے شکر، پھر اللہ کی معلوم اور نامعلوم نعمتوں، عنایتوں، اس کی عطا کی ہوئی ہر امداد اور ہر تحفظ پر اس کا شکر ادا کر کے اس سے پوری زندگی کے لئے شکر کی توفیق اور شکرگزاری مانگی جائے۔ اور وہ بھی ہر روز۔

یہ سوچ کر دل کو قرار سا آگیا۔ لیکن فوراً ہی دل میں ایک اور خیال ابھرا۔ ماضی میں جھانکنے کے بعد یہ بات تو سمجھ میں آگئی تھی کہ اللہ اپنے بندوں کی وہ ضرورتیں تک پوری فرماتا ہے، جن کی انہیں خبر بھی نہیں ہوتی۔ تو کیوں نہ وہ ہر روز دو نفل برائے حاجت پڑھ کر اللہ سے اپنی معلوم، نامعلوم حاجتوں کے لئے دعا بھی کر لیا کرے۔ دعا بندگی ہے، اور اللہ اس سے خوش ہوتا ہے۔ وہ بغیر مانگے حاجت روائی فرمانے والا انشاء اللہ اس کے بعد نہ اسے کبھی محتاج ہونے

دے گا اور نہ ہی عدم تحفظ کے احساس کا شکار۔ باقی رہ گئی تقدیر تو بندے کے سامنے اس کی قبول کرنے اور اللہ سے دعا کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

یہ ارادہ کر کے اس کا وجود طمانیت سے بھر گیا۔ فوراً ہی اسے عبدالحق کا خیال آیا۔ کتنا اچھا ہوتا، اگر آغا جی یہاں ہوتے۔ وہ اس پر ان سے گفتگو کرتی۔ شاید وہ کوئی اور اچھی بات سمجھا دیتے۔ پچھلی بار دعا کے ہی موضوع پر ان سے کتنی اچھی گفتگو ہوئی تھی، اور اس نے ان سے کتنا کچھ سیکھا تھا۔

عشاء کی نماز کے بعد اس نے اپنے اس معمول کا آغاز کیا۔ شکر کی نماز کے بعد شکر ادا کرتے ہوئے اس نے اس راہنمائی پر بھی اللہ کا شکر ادا کیا، جس کا صرف ارادہ کرنے ہی سے اسے طمانیت حاصل ہوئی تھی۔

پھر اس نے نمازِ حاجات پڑھی اور اللہ سے اپنی اور تمام متعلقین کی دنیا، دین اور آخرت کی تمام حاجتوں کی قضا کے لئے اور ہر طرح کے تحفظ کے لئے دعا کی۔ پھر اسے ایک اور خیال آیا تو اس نے اللہ سے دعا کی کہ وہ اپنی رحمت سے ان چار رکعتوں کو اس کا عمر بھر کا معمول بنا دے۔

اسے یہ خیال آیا تھا کہ حاجت کی نماز تو دن کا آغاز کرتے ہوئے ادا کرنی چاہئے۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ فجر کے بعد کسی سجدے کی اجازت نہیں۔ اور اشراق کے وقت اسے اسکول جانا ہوتا تھا۔ اس لئے عشاء کے بعد کا وقت ہی مناسب تھا۔ ویسے بھی مغرب کے بعد تاریخ بدل جاتی ہے۔

وہ نماز پڑھ کر اٹھی تو عدم تحفظ کا وہ احساس پوری طرح دور ہو چکا تھا۔ وہ خوشی سے مسکرا دی۔ اس کا دل شکر سے معمور ہو گیا۔

بستر پر لیٹی تو اسے پھر عبدالحق کا خیال آیا۔ اس نے سوچا۔ وہ اللہ سے آغا جی کی جلد از جلد واپسی کی دعا تو ضرور کرے گی۔ باقی سب کچھ، تو اللہ کی مرضی سے ہی ہوگا۔ اللہ انہیں اور آپی کو اپنی امان میں رکھیں۔ جب اللہ چاہیں گے، تبھی ان کی واپسی ہوگی۔ اور کون جانے، وہ چند روز میں ہی واپس آ جائیں۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ برسوں کی جدائی ہے۔

❁ ❁ ❁

عشق کا شین
علیم الحق حقی
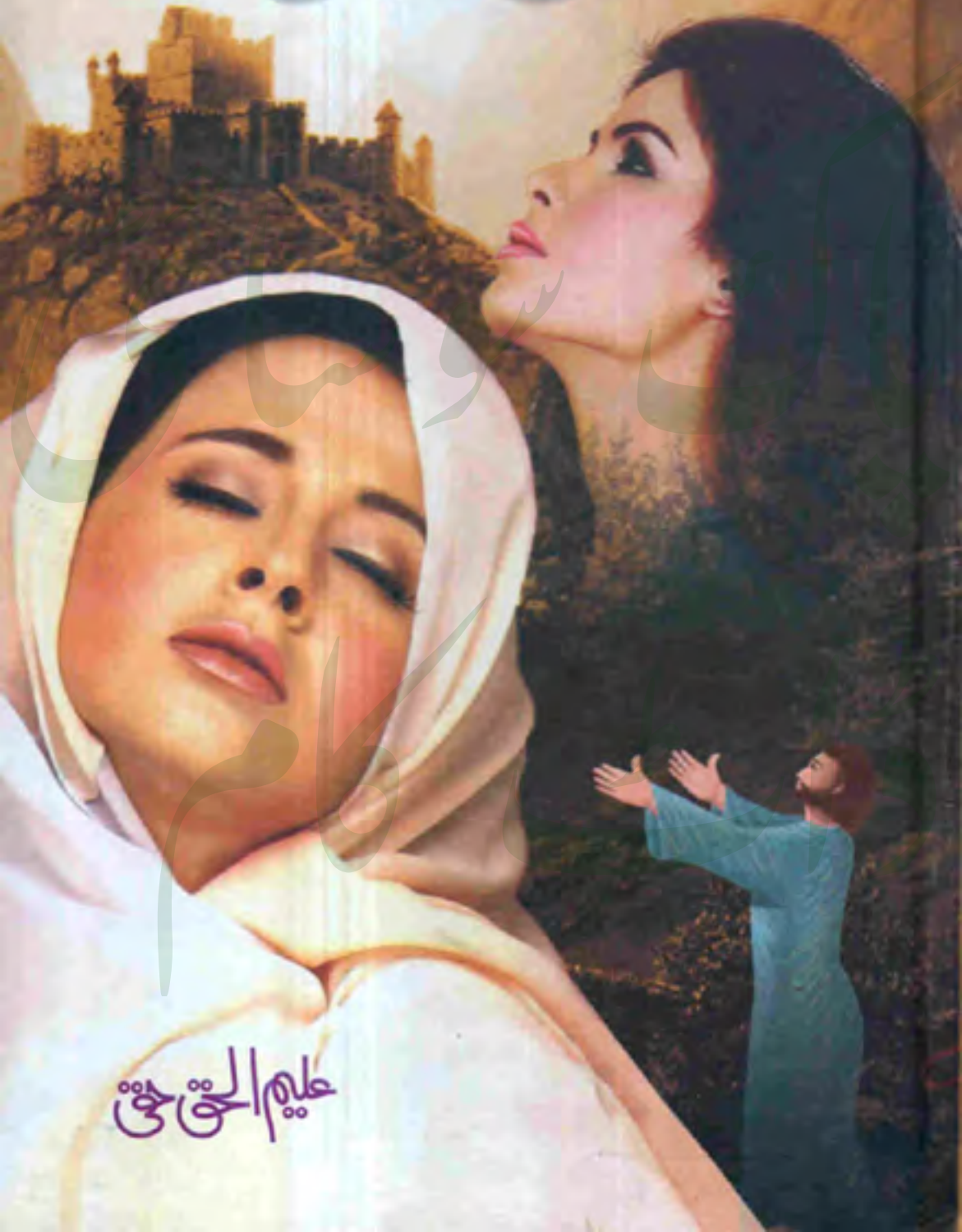
فرحان آج بہت اُداس تھا۔

آج اس کا وہ کچا دھاگا بھی ٹوٹ گیا تھا، جسے وہ تقریباً تین برس سے تھامے ہوئے تھا۔ کتنی چاہت اور ارمان سے اس نے امی اور باجی کو وہاں بھیجا تھا۔ لیکن وہ ناکام رہیں۔

جو کچھ ہوا، وہ اس کے لئے خلافِ توقع نہیں تھا۔ پھر بھی اسے دکھ ہوا۔ شاید اس لئے کہ توقع اس کے بہت اندر، کہیں بہت نیچے تھی کہ وہ ناکام ہوگیا۔ لیکن اوپر تو امید تھی، آدمی امید کا دامن کہاں چھوڑتا ہے، چاہے وہ کچے دھاگے کی سی موہوم امید ہو۔

اسے اس پر حیرت تھی کہ امی اور باجی اس ناکامی پر اس سے کم اداس نہیں تھیں۔ اس احساس نے اس کی اداسی اور دکھ کو اور بڑھا دیا تھا۔ کیونکہ اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ واقعی ایک بہت قیمتی چیز سے محروم ہوگیا ہے۔ وہ امی اور باجی کو بھی اچھی لگی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ واقعی بہت اچھی ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ اس نے اسے محبت کی نظر سے دیکھا اور جتنی اچھی وہ ہے، اسے اس سے بھی اچھا سمجھا۔

اس نے امی اور باجی سے کہا تھا کہ وہ ڈرائیور کے ساتھ چلی جائیں۔ لیکن باجی کا دماغ بہت تیز کام کرتا تھا۔ انہوں نے کہا۔

گہن کے اندھیرے کنویں سے جو نکلا
تو سورج ہوا اور بھی تاب ناک

"ڈرائیور کی ضرورت نہیں، تم ہمیں وہاں لے کر چلو۔"

"میں...؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"یہ تو اچھا نہیں لگے گا۔"

"پاگل ہو تم تو... ارے... ! تم ہمیں وہاں لے کر جاؤ گے۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھنا اور ہم تمہارے سامنے تو بات نہیں کریں گے۔"

"اور پھر...؟"

"پھر تم امی سے کہنا کہ تم جا رہے ہو۔ جب آنا ہو تو فون کر دیں تاکہ تم ہمیں لینے کے لئے آ جاؤ۔"

"اس کا فائدہ...؟" اس نے اعتراض کیا۔

"بدھو ہو تم تو۔ ارے اس طرح اس کے گھر والے تمہیں دیکھ لیں گے۔ انہیں پتا تو چلے کہ تم بھی لاکھوں میں ایک ہو۔"

امی نے بھی باجی کی تائید کی۔ بات اس کی بھی سمجھ میں آ گئی۔

وہ ان کے ساتھ چلا گیا۔ کچھ دیر وہ وہاں بیٹھا۔ وہاں اس کی دادی اور چچی تھی۔ چچا سے وہ پہلے ہی مل چکا تھا۔ وہ بھی اسے جانتے تھے۔ وہ اس سے بڑے تپاک سے باتیں کرتے رہے اور جب وہ واپس آنے کے لئے اٹھا تو وہ اسے رخصت کرنے کے لئے پورچ تک آئے۔ اس بات نے اس کے دل میں امید کو اور توانا کر دیا۔

گھر واپس آ کر وہ مضطرب رہا۔ ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وقت کس طرح گزارے۔ آدھا گھنٹہ ہو گیا تو وہ فون کے پاس جم کر بیٹھ گیا۔

اب اسے امی یا باجی کے فون کا انتظار تھا۔

آدھا گھنٹہ اور گزر گیا۔ فون کی گھنٹی نہیں بجی۔ اس نے اٹھ کر فون کو چیک کیا کہ کہیں وہ ڈیڈ تو نہیں ہے۔ لیکن فون بالکل ٹھیک تھا۔ اسے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بغیر بلائے ہی چلا جائے۔ مگر اسی وقت امی اور باجی آ گئیں۔

"آپ نے مجھے بلایا ہی نہیں۔" اس نے آتے ہی باجی سے شکایت کی۔

"جواز ہی نہیں چھوڑا انہوں نے۔" امی نے جواب دیا۔

"آپ آئیں کیسے...؟"

"انہوں نے کہا کہ اپنی گاڑی میں ہمیں بھجوا دیں گی۔ اب ہم منع تو نہیں کر سکتے۔"

"اس کے چچا آئے ہوں گے آپ کو چھوڑنے...؟"

"نہیں! ڈرائیور تھا۔"

فرحان کو تھوڑی سی مایوسی ہوئی۔ یہ کوئی حوصلہ افزا علامت نہیں تھی۔

"اچھا! یہ تو بتائیں کہ کیا رہا؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"انہوں نے ایک ہفتے بعد جواب دینے کو کہا ہے۔"

"کیوں...؟"

"ان کی مرضی... ! یہ ان کا حق ہے۔ ہم ان سے بحث تو نہیں کر سکتے تھے۔" باجی بولیں۔

"اچھا... ! یہ بتائیں، وہ لوگ آپ کو کیسے لگے؟ اور لڑکی کیسی لگی آپ کو...؟"

"سچ تو یہ ہے فرحان! کہ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔" امی نے کہا۔

فرحان کا دل بیٹھنے لگا۔

"کیا مطلب...؟"

"اتنی اچھی لڑکی پسند کی ہے تم نے۔ ہم تو تمہیں ایسا ہی بونگا سا سمجھتے تھے۔" باجی نے شوخ لہجے میں کہا۔

"اور سب لوگ بہت اچھے ہیں۔" امی بولیں۔

"بھئی میں نے تو اسے اپنی بہو مان لیا۔ میرے دل میں اتر گئی ہے وہ۔"

فرحان کا خون سیروں بڑھ گیا۔ مگر فوراً ہی اسے خدشات ستانے لگے۔

اور وہ خدشات بے سبب بھی نہیں تھے۔

"لیکن یہ ایک ہفتہ..."

امی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"یہ طریقہ ہوتا ہے لڑکی والوں کا۔ فوراً ہی ہاں نہیں کی جاتی۔ پھر اس کی

دادی نے کہا کہ وہ تنہا فیصلہ نہیں کرسکتیں۔ انہیں اپنے چھوٹے بیٹے سے بھی مشورہ کرنا ہوگا۔ اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔''

مگر فرحان کے لئے تو یہ ایک گھنٹہ گزارنا دوبھر ہوگیا تھا۔ ایک ہفتہ تو اس کے لئے ایک عمر کے برابر تھا۔ لیکن وہ انتظار کے سوا کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

آج وہ یونیورسٹی سے گھر آیا تو سب سے پہلے اسے باجی کی صورت نظر آئی۔ اسے غیر معمولی پن کا احساس ہونے لگا۔ باجی کا سسرال سے یہاں آنا اتنا آسان نہیں تھا۔ وہاں وہ اتنا مصروف رہتی تھیں کہ کبھی امی کے بلانے پر ہی آئیں تو آئیں۔ پھر باجی کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ امی بھی اداس نظر آرہی تھیں۔ اس کا دل گھبرانے لگا، کہیں باجی کی سسرال میں تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوگئی۔

''خیریت تو ہے باجی؟'' اس نے باجی سے پوچھا۔

''ہاں! سب ٹھیک ہے۔'' امی نے جلدی سے کہا۔

''دیکھنے سے تو ایسا نہیں لگتا۔ آپ بھی پریشان لگ رہی ہیں اور باجی بھی۔''

باجی اور امی چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ ان کے درمیان جیسے خاموشی میں کوئی بات ہو رہی تھی۔ پھر باجی نے امی سے کہا۔

''کیا فائدہ امی! کب تک چھپا سکتی ہیں آپ اس بات کو؟''

امی بے بسی سے انہیں دیکھتی رہیں۔

''تو پھر تم ہی بتا دو اسے۔ میری تو ہمت نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اس سے نظریں ملائے بغیر کچن کی طرف چلی گئیں۔

وہ اور پریشان ہوگیا۔ یقیناً باجی کی سسرال میں ہی کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ اس نے خود کو ذہنی طور پر تیار کرلیا۔

''بتائیں نا باجی! کیا بات ہے؟''

لیکن باجی نے جو کہا، وہ اس کے لئے خلاف توقع تھا۔ بہت بڑا شاک تھا اس کے لئے۔

''آج ان کا فون آیا تھا۔'' باجی نے کہا۔

''کن کا......؟''

''جن کے ہاں ہم تمہارا رشتہ لے کر گئے تھے۔ انہوں نے انکار کر دیا ہے۔''

فرحان کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟''

''دیکھو بھائی! زندگی میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ جو نصیب میں نہ ہو، وہ تو نہیں ملتا نا آدمی کو......''

''لیکن انہوں نے کہا کیا......؟''

''انہوں نے اپنے چھوٹے بیٹے سے بات کی تھی۔ وہ شاید پہلے ہی کہیں اس لڑکی کا رشتہ طے کر چکا ہے۔ اس نے منع کر دیا۔ دادی بے چاری نے بہت معذرت کی امی سے۔ تمہاری بہت تعریف کی۔ کہہ رہی تھیں کہ انہیں افسوس ہے۔ اتنے اچھے لڑکے تو نصیب سے ملتے ہیں۔ تمہیں بہت دعائیں دیں انہوں نے۔''

فرحان سے بولا بھی نہیں گیا۔ کچھ کہنا ممکن ہی نہیں تھا اس کے لئے۔

''اب دل چھوٹا نہ کرو میرے بھائی! ابھی تمہیں یہ بہت بڑی بات لگ رہی ہے۔ بعد میں کبھی اس سوچ پر ہنسو گے۔ زندگی میں سبھی کچھ من چاہا تو نہیں مل جاتا آدمی کو۔ انشاء اللہ تمہیں اس سے بھی اچھی لڑکی ملے گی۔''

فرحان نے دل میں سوچا۔ عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں۔ لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔ اسے یقین تھا کہ اس ناکامی اور محرومی کا احساس اسے ہمیشہ ستاتا رہے گا۔

''اب چھوڑو نا! اتنا اداس ہونے کی ضرورت نہیں۔''

اس بار اس سے رہا نہیں گیا۔

''میری بات چھوڑیں۔ اداس تو آپ بھی ہیں اور امی بھی۔''

''قدرتی بات ہے۔ ہمیں لڑکی بھی بہت اچھی لگی تھی، اور اس کے گھر والے بھی۔''

"تو پھر مجھے کیوں منع کرتی ہیں اداس ہونے سے۔ میرے لئے تو یہ اور زیادہ قدرتی بات ہے۔"

دن بھر اس نے مسکراتے رہنے کی کوشش کی۔ لیکن اداسی تو روح تک اتر گئی تھی۔ رات کو کمرے کی تنہائی میں وہ اداسی طوفان کی طرح امڈی اور اس پر چھا گئی۔ اس نے آنکھیں بند کیں، اور وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ جیتی جاگتی، سانس لیتی کہ بس ہاتھ بڑھاؤ اور چھولو۔ وہ اسے کیسے بھول سکتا تھا۔

اسے اس کی پہلی دید یاد آ گئی۔

وہ تھرڈ ائیر میں تھا، اور وہ کالج کا پہلا دن تھا، جسے سینئر طلبا فرسٹ ائیر والوں کے لئے مشکل دن بنا دیتے ہیں۔ فرسٹ ایز فول۔ اس کا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں ہوتا، وہ تو بس بے ضرری دل لگی ہوتی ہے۔

وہ بے وقوف بنانے والوں کا سردار تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی وقت سے کافی پہلے کالج آ گئے تھے۔ اور انہوں نے دروازوں پر لگی دو الگ الگ تختیوں کو باہم تبدیل کر دیا تھا۔ لیڈیز ٹوائلٹ کی تختی XIA کے کلاس روم کے دروازے پر، اور XIA کی تختی لیڈیز ٹوائلٹ کے دروازے پر۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ فرسٹ ائیر والے جھجکتے، گھبراتے ہیں، اس لئے پہلے گراؤنڈ میں جمع ہوتے اور ایک دوسرے سے گھلتے ملتے ہیں، پھر گروہوں کی شکل میں کلاس کا رخ کرتے ہیں اور فرسٹ ایئر فول بنائے جانے کے ڈر سے وہ سینئر طلباء سے راستہ بھی نہیں پوچھتے۔ اس لئے انہوں نے فرسٹ ایئر کی کلاسز کا سائن لکھ کر اسے لیڈیز ٹوائلٹ کے رخ پر اٹکا کر اس پر تیر کا نشان بھی بنا دیا تھا۔

اب وہ لوگ گراؤنڈ میں کھڑے تھے۔ فرسٹ ائیر کے طلباء اور طالبات کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ لوگ اپنے گھبرائے ہوئے انداز سے الگ ہی پہچانے جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھتے.... آپ فرسٹ ایئر میں ہیں.... تعارف ہوتا اور ٹولیاں بن جاتیں۔ وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے۔ لیکن صاف نظر آتا کہ وہ بری طرح نروس ہو رہے ہیں۔

ایسے میں وہ لڑکی کالج کے گیٹ سے داخل ہوئی۔ فرحان اسے دیکھتے کا

دیکھتا رہ گیا۔ بات صرف اتنی نہیں تھی کہ وہ غیر معمولی طور پر حسین اور سرو قد تھی۔ اس نے ایک بڑی سی چادر میں جس اہتمام سے خود کو لپیٹ رکھا تھا، وہ ایک بالکل نئی بات تھی۔ ورنہ کالجوں سے تو فیشن کی شروعات ہوتی ہے۔ اسے دیکھ کر پاکیزگی کا غیر معمولی احساس ہوتا تھا۔ اور اس کے انداز میں بلا کا اعتماد تھا.... اعتماد ہی نہیں، وقار اور تمکنت بھی۔

ایک اور غیر معمولی بات یہ تھی کہ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ تین لڑکیاں اور تھیں۔ وہ عام سی لڑکیاں تھیں.... بے نیازی سے گلوں میں دوپٹے ڈالے ہوئے۔ اور وہ جس طرح گھل مل کر بات کر رہی تھیں، اس سے لگتا تھا کہ وہ بہت عرصے سے ایک دوسرے کو جانتی ہیں۔

فرحان ٹکٹکی باندھے اس لڑکی کو دیکھتا رہا۔ وہ ان لڑکیوں کے درمیان ایسی تھی، جیسے بجھے بجھے پھیکے ستاروں کے درمیان چودھویں کا چاند۔

ایک اور غیر معمولی بات یہ تھی کہ لڑکیوں کی وہ ٹولی عین وقت پر کالج آئی تھی۔ ورنہ پہلے دن فرسٹ ائیر کے اسٹوڈنٹ وقت سے پہلے ہی کالج پہنچتے ہیں۔

وہ ٹولی آگے بڑھتی رہی۔ فرحان اور اس کے ساتھی اب برآمدے میں تیر کے اشارے والے سائن بورڈ سے کچھ فاصلے پر جا کھڑے ہوئے تھے۔

پھر پہلے پیریڈ کی گھنٹی بجی، اور ہلچل سی مچ گئی۔

تیر کے اشارے والا سائن بہت نمایاں تھا۔ بیشتر طلبا اور طالبات نے اس سے استفادہ کیا۔ لیکن کچھ اتنے نروس تھے کہ اسے بھی نہ دیکھ پائے۔ ان کی غلط راہنمائی کے لئے فرحان اور اس کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ وہ انہیں اس طرف بھیج رہے تھے۔

لیکن فرحان اب اپنے ساتھیوں میں شامل ہونے کے باوجود ان میں شامل نہیں تھا۔ وہ تو مبہوت سا اس لڑکی کو دیکھے جا رہا تھا، جو اپنی سہیلیوں کے ساتھ بڑے اعتماد سے آگے بڑھ رہی تھی۔

فرحان کے دل میں اچانک خیال آیا کہ اسے اس لڑکی کو فرسٹ ائیر فول بننے سے بچانا ہوگا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کٹ کر تیر کے نشان والے سائن بورڈ کی

طرف چل دیا۔ لیکن اس کی نظریں اس لڑکی پر جمی تھیں۔

اسی لمحے لڑکی کی ایک ساتھی کی نظر تیر والے سائن بورڈ پر ٹھہری، اور اس نے منفرد لڑکی سے سائن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا۔ منفرد لڑکی نے اس کی طرف دیکھا۔ ایک ثانیے کو اس کی نظریں فرحان سے ملیں، پھر وہ سائن بورڈ کو دیکھنے لگی۔ اگلے ہی لمحے اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنی سہیلی سے کچھ کہا۔ فرحان کو حیرت ہوئی، کیونکہ لڑکیاں سائن بورڈ کی طرف نہیں آ رہی تھیں۔

ان لڑکیوں کا رخ اب اس طرف تھا، جہاں کلاس روم تھے۔ فرحان حیران تھا، لیکن مطمئن بھی تھا۔ وہ اپنی ٹولی کی طرف چل دیا۔ اس دوران اس نے سعید کو ان لڑکیوں کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس کا جی چاہا کہ سعید کو آواز دے لے۔ لیکن موقع مناسب نہیں تھا۔

وہ اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ چکا تھا۔ سعید اور ان لڑکیوں کے درمیان ہونے والی گفتگو صاف سن سکتا تھا۔

''ایکسکیوزمی.....!'' سعید نے ان لڑکیوں سے کہا۔

وہ چاروں رک گئیں۔ منفرد لڑکی نے بڑی شائستگی سے کہا۔

''جی فرمائیے.....!''

اس کی آواز بھی بہت خوب صورت تھی اور لہجہ نرم۔ لیکن سعید جیسا پُراعتماد اور بے باک لڑکا بھی مرعوب ہوگیا۔ وہ بولتے ہوئے یوں اٹک رہا تھا، جیسے جو کہنا چاہتا ہو، اسے ترتیب نہ دے پا رہا ہو۔

''آپ لوگوں نے شاید وہ بورڈ نہیں دیکھا؟'' اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی! دیکھا ہے۔'' منفرد لڑکی نے کہا۔

''تو پھر.....؟'' اس سے زیادہ سعید سے کچھ نہیں کہا گیا۔

''اسی سے تو راہنمائی حاصل کی ہے ہم نے۔'' منفرد لڑکی کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

''لیکن کلاس روم تو اس طرف ہیں۔''

''ہم کلاس روم میں تو نہیں جا رہے ہیں۔''

''تو پھر آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

''اصولاً آپ کو ہم سے یہ بات نہیں پوچھنی چاہئے۔'' منفرد لڑکی کے لہجے میں تحکم در آیا۔

''دیکھیں نا، ہمیں بتانا اچھا نہیں لگے گا اور آپ کو سننا۔'' تحکم کے باوجود اس کے لہجے میں وہی نرمی اور آواز میں وہی شیرینی تھی۔

سعید حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھتا رہا۔

ایک اور لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہم لیڈیز ٹوائلٹ جا رہے ہیں۔''

''آپ کو کوئی اعتراض؟'' دوسری لڑکی بولی۔

منفرد لڑکی نے انہیں گھور کر دیکھا۔ لیکن بولی کچھ نہیں۔

''مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔'' سعید نے گڑبڑا کر کہا۔

''لیکن آپ کی کلاس نکل جائے گی۔''

''آپ اس کی فکر نہ کریں۔''

سعید پلٹ آیا، اور لڑکیاں آگے چلی گئیں۔ سعید کے چہرے پر کھسیاہٹ تھی۔

''مجھے تو تم فرسٹ ائیر کے لگ رہے ہو۔'' طارق نے اس پر چوٹ کی۔

سعید کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''یار.....! یہ لڑکیاں تو بہت تیز ہیں۔ فرسٹ ائیر کی تو ہرگز نہیں لگتیں۔''

''تو پھر.....؟''

''کسی اور کالج سے فیل ہو کر آئی ہیں۔ اسی لئے اتنی خرانٹ لگ رہی ہیں۔ تجربہ کار معلوم ہوتی ہیں۔''

''یہ ہمارا کالج ایسا گیا گزرا تو نہیں۔'' فرحان نے کہا۔

اتنی دیر میں فرسٹ ائیر فولز کی ٹولیاں، کلاس روم، کی زیارت کے بعد واپس آنے لگی تھیں۔ اب وہ لوگ پہلے سے بھی زیادہ نروس تھے۔ اس بار فرحان اور

اس کے ساتھیوں نے ان کی صحیح راہنمائی کر دی۔

تو یہ تھا ان کا تعارف! اب تک لڑکیاں فرحان کے پیچھے بھاگتی رہی تھیں۔ مگر اس نے کبھی ان میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ اب یہ لڑکی اسے بھا گئی تھی۔ اور وہ عام لڑکوں کی طرح وقت گزاری کا قائل بھی نہیں تھا۔ اس لئے وہ اندھا دھند اس لڑکی کے پیچھے نہیں بھاگا۔ اس نے خود کو بہت وقت دیا۔ وہ خود کو اور اپنے جذبے کو اچھی طرح تولنا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہاں یہ امکان تھا کہ وہ محض اپنے منفرد ہونے کی وجہ سے اچھی لگی ہو۔ ایسی پسندیدگی وقتی ہوتی ہے، اور وہ وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں تھا۔ چنانچہ وہ دور دور سے مشاہدہ کرتا رہا۔ اور اپنی پسندیدگی کا تجزیہ بھی کرتا رہا۔

درحقیقت اسے اس سے بہت فائدہ ہوا۔ اس عرصے میں وہ صرف خود کو ہی نہیں، اس لڑکی کو بھی سمجھتا رہا۔ وہ آنکھیں بند کر کے پہلی نظر کی پسندیدگی کو اہمیت دینے کا قائل بھی نہیں تھا۔ اس نے عقل مند لڑکیاں بھی دیکھی تھیں۔ جو لڑکوں کے لئے جال کے طور پر انفرادیت اپناتی تھیں۔ بعد میں وہ عام لڑکیاں ہی ثابت ہوتی تھیں۔

اس کی توقع کے عین مطابق چند ہی روز میں کالج کا ہر لڑکا اس لڑکی کا دیوانہ ہو گیا۔ جو خود کو دکھانے کے بجائے چھپاتی تھی، بہت سنبھال کر رکھتی تھی۔ ہر سینئر لڑکے نے اس کی طرف بڑھنے، اور راہ و رسم پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن پہلی کوشش کے بعد دوسری کوشش کسی نے بھی نہیں کی۔ یوں اس لڑکی کے ناکام عاشقوں کی انجمن بنتی گئی۔

اپنی ناکامی پر ہر لڑکا اپنے اپنے انداز میں تبصرہ کرتا تھا۔ مگر خلاصہ یہی تھا کہ انگور کھٹے ہیں۔ فرحان سب کی باتیں بہت غور سے، اور خاموشی سے سنتا تھا۔ اس نے کبھی کسی بیہودہ تبصرے پر کسی کو نہیں ٹوکا۔ وہ اپنی کہانی نہیں بنوانا چاہتا تھا۔ وہ تو بس اس لڑکی کو سمجھنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اسے غیر معمولی تحمل سے کام لینا پڑا تھا۔ ورنہ بعض تبصروں نے تو اسے جارحیت پر اکسایا تھا۔ اور اس نے بڑی مشکل سے خود کو روکا تھا۔

''اس چادر کو تم کیا سمجھتے ہو؟'' ایک ناکام لڑکے نے سینہ پھلاتے ہوئے

کہا۔

''وہ اس میں خود کو چھپا کر رکھتی ہے۔'' دوسرے لڑکے نے جو اپنی واجبی شکل و صورت اور چھوٹے قد کی وجہ سے دوڑ میں شامل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، بڑے احترام سے کہا۔

''درست! لیکن یہ چادر حسن کا خزانہ چھپانے کے لئے نہیں، وہ چھپانے کے لئے ہے، جو اس کے پاس نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ....؟''

''مطلب یہ کہ اندر ایسا کچھ ہے ہی نہیں، جسے چھپایا جائے۔''

''ایگزیکٹلی!'' ایک سینئر ناکام عاشق نے اچھل کر کہا۔

''وہ چادر اتار دے تو کوئی اس پر دوسری نظر بھی نہیں ڈالے گا۔''

''غلط! اس کا چہرہ اتنا خوب صورت ہے کہ کوئی بار بار دیکھے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔'' مستقبل قریب میں قسمت آزمائی کا ارادہ رکھنے والے ایک امیدوار نے کہا۔

لیکن تمام ناکام عاشقوں کو یہ تازہ ترین تھیوری پسند آئی تھی۔

''میں نے تو اسی لئے زیادہ وقت برباد نہیں کیا اس پر۔'' ان میں سے ایک بولا۔

مگر ایک بات تھی، جس پر وہ سب متفق تھے۔ وہ لڑکی مغرور تھی نہ بداخلاق۔ اس نے کبھی کسی کی ناشائستگی پر بھی جارحیت سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ بہت مہذب تھی۔ سخت اور حتمی الفاظ بھی اتنے نرم لہجے میں بولتی کہ برا نہیں لگتا۔ اس نے کبھی کسی کی توہین نہیں کی تھی، کبھی کسی کو شرمندہ نہیں کیا تھا۔

''صرف اس لئے کہ وہ جانتی ہے کہ اس کے پاس غرور کرنے کو کچھ ہے بھی نہیں۔'' تازہ ترین ناکام عاشق نے کہا۔

اس پر ایک اعتراف سامنے آیا۔ ایک پرانے ناکام عاشق نے دھیرے سے کہا۔

''نہیں یار! وہ سچ مچ بہت اچھی ہے۔''

''کیسے......؟''

''میں نے مختلف اسٹریٹجی اپنائی تھی اس کے لئے۔ میں نے کہا...... لڑکے آپ کے بارے میں بہت خراب باتیں کرتے ہیں۔ اس پر وہ بولی...... میرے غیاب میں اگر کوئی میرے بارے میں ایسی باتیں کرے، جو اللہ کو بری لگیں تو وہ اپنا نقصان ہی کر رہا ہے نا! مجھے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے کہا...... وہ ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ میرا جی مرنے مارنے کو چاہنے لگتا ہے۔ کسی دن...... اس نے میری بات کاٹ دی، کہنے لگی...... ایسا کچھ کریں گے تو آپ اپنی حد سے تجاوز کریں گے۔ میں نے پوچھا کیسے؟ بولی...... آپ میرے بھائی ہوتے تو آپ کو یہ حق ہوتا۔ اور میں تو پھر بھی آپ کو روکتی۔ برداشت بڑی چیز ہوتی ہے۔ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ لیکن میرا اور آپ کا کوئی رشتہ قائم بھی تو ہو سکتا ہے۔ اس پر اس نے کہا...... دیکھیں، ہم یہاں علم حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں، رشتے قائم کرنے نہیں۔ میں نے اسے اکسایا...... آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ وہ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ کے بارے میں۔ اس نے بے نیازی سے کہا...... اچھا ہی ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہوتا، تب بھی میں انہیں برا نہیں سمجھتی۔ بلکہ میں ان کے لئے اللہ سے ہدایت کی دعا کرتی۔ ہم سب اس کالج کے اسٹوڈنٹ ہونے کے ناطے ایک دوسرے کے لئے بہت محترم ہیں۔ اب کوئی میرا احترام کرے، نہ کرے، میں تو سب کا احترام کرتی ہوں۔ میں نہ زبان سے کسی کی برائی کرتی ہوں، نہ دل میں کسی کے لئے برائی رکھتی ہوں۔'' وہ کہتے کہتے رکا، اور بڑی حسرت سے بولا۔

''اب تم ہی بتاؤ، ایسی لڑکی سے تو اظہارِ محبت بھی نہیں کیا جا سکتا۔''

''چھوڑو یار...... ! یہ سب دکھاوا ہے۔ اس کی چادر کی طرح......'' تازہ ترین ناکام عاشق نے بلبلا کر کہا۔

''ابھی تو تم اس کی چادر کو پردہ قرار دے رہے تھے...... اس کے خالی پن کا۔'' مستقبل قریب کے عاشق نے احتجاج کیا۔

''ارے یار...... ! یہ اپنے شہزادہ گلفام نے کچھ نہیں کیا اس سلسلے میں۔'' سعید نے اچانک کہا۔ اشارہ فرحان کی طرف تھا۔

''اس کا تو معاملہ ہی الٹا ہے۔ ہمیشہ سے لڑکیاں اس کے پیچھے بھاگتی رہی ہیں اور یہ ان سے بھاگتا رہا ہے۔'' طارق نے کہا۔

اب سب فرحان کی طرف متوجہ تھے اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''مجھ سے کچھ سننا چاہتے ہو تم لوگ......؟'' فرحان نے پوچھا۔

''ارشاد......!'' سعید نے مسخرے پن سے کہا۔

''اچھا نہیں لگے گا تم لوگوں کو۔''

''برداشت کر لیں گے۔'' طارق بولا۔

''تو سچ یہ ہے کہ تم لوگ بڑی گھٹیا گفتگو کرتے ہو۔ اور یہ گفتگو ثابت کرتی ہے کہ تمہاری سوچ اور ذہنیت اس لئے بھی بری ہے۔ ایک اچھی اور نیک لڑکی کے بارے میں اتنے گندے انداز میں سوچنا، اور ایسی رکیک گفتگو کرنا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ ہم طالب علم ہیں۔ یہاں سے علم حاصل کر کے نکلنے کے بجائے ہم یہاں سے یہ سب سیکھ کر نکلیں گے۔ یہ تو اس درس گاہ کی بھی توہین ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتا۔'' فرحان نے نرم لہجے میں کہا۔

بیشتر لڑکے شرمندہ نظر آنے لگے۔ لیکن ان میں کچھ ڈھیٹ بھی تھے۔

چھ ماہ کے عرصے میں فرحان نے خود کو بھی اچھی طرح جانچ لیا اور اس لڑکی کو بھی خوب اچھی طرح سمجھ لیا۔ وہ اس کے دل میں گھر کر گئی تھی۔ وہ تھی ہی ایسی۔ شاید کوئی خوبی ایسی نہیں تھی، جو اس میں موجود نہ ہو۔ برداشت اور تحمل ایسا کہ کبھی کسی سے اس نے سختی سے بات نہ کی۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اب تک کم از کم چار پانچ لڑکے کالج سے نکالے جا چکے ہوتے۔ پڑھائی کے معاملے میں وہ بہت سنجیدہ تھی۔ خالی پیریڈ ہوتا تو زیادہ تر وہ لائبریری میں ہوتی۔ کینٹین وہ جاتی ضرور تھی۔ مگر اس کے ساتھ صرف لڑکیاں ہوتیں۔ ظاہری خوبیاں تو تھیں ہی، اس کی باطنی خوبیاں اور زیادہ تھیں۔

فرحان کے دل میں اس کے لئے گہری پسندیدگی تھی۔ وہ اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ لیکن دوسرے لڑکوں کی طرح وہ کبھی اس کی طرف نہیں لپکا۔ کبھی اس

کا دل بھی نہیں چاہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے ناپسند کرے۔

لیکن نہ جانے وہ پسندیدگی محبت میں تبدیل ہوگئی اور ہر گزرتے دن کے ساتھ گہری ہوتی گئی۔ وہ اس کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ خود پر اس کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ اس سے بات کرنے کو، اس کے ساتھ مل بیٹھنے کو دل مچلنے لگا۔ وہ بچوں کی طرح بے تاب ہوگیا۔ لیکن اس کے لئے یہ بھی بہت اہم تھا کہ وہ اسے برا نہ سمجھے، عام لڑکوں جیسا نہ سمجھے۔ یعنی اسے خود پر قابو رکھنا تھا۔ اندھا دھند کچھ نہیں کرنا تھا۔

اس کی پڑھائی متاثر ہونے لگی۔ گھر میں بھی وہ کھویا کھویا رہتا۔ ہر وقت اس کا تصور اس کے دماغ پر چھایا رہتا۔ ہر لمحہ وہ اس کے بارے میں سوچتا۔ اس نے خود کو ٹٹولا اور جان لیا کہ وہ اس کے لئے کالج کی کوئی ایکٹی وٹی نہیں۔ وہ اس کے لئے نشانِ منزل ہے..... نشانِ مستقبل۔ اور یہ بہت سنجیدہ معاملہ ہے۔

وہ لائبریری جانے لگا۔ جاتا تو وہ پہلے بھی تھا، لیکن صرف کسی ضرورت کے تحت۔ لیکن اب وہ تواتر سے جانے لگا۔ لائبریری میں کبھی بہت زیادہ ہجوم نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ لائبریری بہت بڑی تھی۔

دشواری یہ تھی کہ وہ سب کے سامنے اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس سے اس کا امیج خراب ہوتا۔ لڑکے سمجھتے کہ دوسروں کے تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے اب وہ اس پر جال ڈال رہا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ اسے اس بات کی فکر تھی کہ کہیں وہ اسے غلط نہ سمجھ لے۔ یہ تو بہت بڑا نقصان ہوتا اس کے لئے۔

وہ سوچ سوچ کر تھک گیا کہ اس سے کہاں ملے، کیسے ملے اور کس طرح بات کرے۔ لیکن کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

پھر قدرت نے اسے موقع فراہم کر دیا۔

اس روز صبح سے بارش ہو رہی تھی۔ کالج جانے کا موڈ نہیں بن رہا تھا۔ پھر بھی اس نے گاڑی نکالی اور کالج کی طرف چل دیا۔ بارش اس وقت بھی ہو رہی تھی۔

وہ کالج پہنچا تو وہاں حاضری برائے نام تھی۔ کلاسوں میں کوئی تھا ہی

نہیں۔ اسٹوڈنٹ تو کیا، لیکچرز بھی غائب تھے۔ کینٹین میں دو تین لڑکے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان میں اس کا شناسا کوئی نہیں تھا۔

وہ کامن رومز کی طرف گیا۔ گرلز کامن روم تو سنسان تھا۔ بوائز کامن روم میں لڑکے اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ کچھ کیرم کھیل رہے تھے، کچھ شطرنج اور کچھ ٹیبل ٹینس۔

وہ وہاں سے پلٹ آیا۔ گھر واپس جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ موسم اتنا اچھا تھا۔ اس نے سوچا، لائبریری میں اس وقت کوئی نہیں ہوگا۔ وہ وہاں تنہائی میں بیٹھ کر ارجمند کے بارے میں سوچ سکے گا۔

راستے میں اسے خداداد مل گیا۔ وہ کالج کا چپڑاسی تھا، اور کالج کی حدود میں ہی بنے ایک کوارٹر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ فرحان اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ بھی فرحان کی بہت عزت کرتا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فرحان کالج کی اسٹوڈنٹس یونین کا جنرل سیکرٹری بھی تھا۔

فرحان نے سلام کیا۔

''کیسے ہو بابا!''

''اللہ کا شکر ہے فرحان بابو! واپس جا رہے ہیں؟''

''نہیں بابا! سوچا ہے، کچھ دیر لائبریری میں بیٹھوں۔ لائبریری کھلی ہے نا؟''

خداداد کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''وقت پر کھول دی تھی فرحان بابو! پر مس صاحبہ نہیں آئی ہیں آج۔''

وہ لائبریرین کی بات کر رہا تھا۔ مگر فرحان کو اس سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ اسے کوئی کتاب ایشو تو کرانی نہیں تھی۔

وہ لائبریری میں داخل ہوا اور کسی ایسی جگہ کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگا، جہاں سے لائبریری میں داخل ہوتے ہی اسے نہ دیکھا جا سکے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے ڈسٹرب کرے۔

ایسا ایک گوشہ اسے نظر آیا۔ مگر ایک لمحے کو اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول

گیا۔ وہاں ارجمند بیٹھی تھی۔ وہ مطالعے میں ایسی منہمک تھی کہ اسے اس کی آمد کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

اس کے دل میں بس ایک ہی خیال آیا..... قدرت نے اسے بات کرنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔

اس نے دھیرے سے کھنکھار کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ وہ ایک دم سے اسے چونکانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ تو بدتہذیبی ہوتی۔

ارجمند نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''السلام علیکم!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ وعلیکم السلام کہتا ہوا اس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے سامنے پہنچ کر وہ رکا۔

''آپ کوئی اعتراض نہ ہو تو میں یہاں بیٹھ جاؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''اعتراض تو مجھے ہے۔'' ارجمند نے بڑی نرمی اور شائستگی سے کہا۔

''وجہ پوچھ سکتا ہوں میں؟''

''پوری لائبریری خالی پڑی ہے۔ آپ اور کہیں بھی بیٹھ سکتے ہیں۔''

''دیکھئے، مجھے یہاں آپ کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔ میں تو سکون سے کچھ دیر یہاں بیٹھ کر سوچنے، اور کچھ مطالعہ کرنے کے لئے آیا تھا.....''

''وہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔ آپ کہیں بھی بیٹھ کر یہ سب کچھ کریں، میں آپ کو بالکل ڈسٹرب نہیں کروں گی۔''

''آپ کو اپنی ڈسٹرب کرنے کی بے پناہ صلاحیت کا علم ہی نہیں ہے۔'' فرحان نے بے ساختہ زیرِ لب کہا۔

اس نے کچھ سنا تو..... لیکن پوری بات سن نہیں سکی۔

''سوری.....! مجھ سے کچھ کہا آپ نے.....؟''

''جی نہیں.....! میں تو خود کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔'' فرحان نے کہا۔

''آپ نے مجھے بات پوری نہیں کرنے دی۔ میں کہہ رہا تھا کہ آپ کو

بیٹھے دیکھا تو سوچا، آپ سے کچھ بات کرلوں۔ اس پر کوئی اعتراض ہے آپ کو.....؟''

''جی نہیں.....!''

''تو میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں.....؟'' فرحان بیٹھنے لگا۔

''اس پر مجھے اعتراض ہے۔'' ارجمند نے جلدی سے کہا۔

''میں دور..... وہاں بیٹھ کر آپ سے باتیں کروں.....؟'' فرحان نے افتادہ تر گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

''تو ہمیں چیخ چیخ کر باتیں کرنی ہوں گی۔ اور اگرچہ یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ کچھ عجیب سا نہیں لگے گا۔''

وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ یہ گوشہ تنہائی کے لئے ہے۔ کوئی لائبریری میں داخل ہوگا تو اس کی نظر براہِ راست اس طرف نہیں اٹھے گی۔ لیکن آپ مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ہمارا دروازے کے سامنے بیٹھنا مناسب ہوگا۔''

''جو آپ کی مرضی.....!''

وہ نسبتاً سامنے کی میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

''جی.....! فرمایئے.....!''

اچانک فرحان کو اپنا گلا خشک ہوتا محسوس ہوا۔ چند لمحے تو وہ بول ہی نہیں سکا۔ پھر اس نے ہڑبڑا کر کہا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''

ارجمند نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کو میرا نام معلوم نہ ہو۔ آپ شاید نروس ہو رہے ہیں۔''

فرحان نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ارجمند! میں واقعی نروس ہو رہا ہوں۔ حالانکہ ایسا ہونا نہیں چاہئے۔'' اچانک ہی وہ پُراعتماد ہو گیا۔

''آپ نے وہاں بیٹھ کر بات کرنے سے احتراز کیا، تو کیا آپ لوگوں سے ڈرتی ہیں؟''

''جب تک میں کچھ غلط نہ کروں، اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتی۔'' ارجمند نے کہا۔

''لیکن احتیاط برتنا میرا فرض ہے کہ کوئی بلاوجہ میرے بارے میں کوئی برا گمان نہ کرے، غلط رائے قائم نہ کرے۔''

اس جواب نے فرحان کے اس پہلے تاثر کو اور مستحکم کر دیا کہ وہ ایک غیر معمولی لڑکی ہے۔

''مگر آپ مجھ سے یہ بات تو نہیں کرنا چاہتے تھے۔''

''جی نہیں......!'' فرحان پھر نروس ہو گیا۔

''دراصل میں بہت متجسس ہوں آپ کے بارے میں۔''

''تجسس تو بس علمی ہی اچھا ہوتا ہے۔'' ارجمند نے کہا۔

''پہلے میں ایک بات بتا دوں آپ کو۔ میں کسی کے بارے میں بھی بری رائے نہیں رکھتی۔ لیکن اپنے بارے میں اچھی رائے قائم کرنے کا موقع کم ہی لوگ دیتے ہیں۔ آپ ان لوگوں میں سے ہیں، جن کے بارے میں میری رائے بہت اچھی ہے۔ یہ نہ بھولئے گا کہ ہمارا تعلق اس درس گاہ کے دم سے ہے، اور اس درس گاہ کے تقدس کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔ ہم دونوں طالب علم ہیں۔ آپ سینئر ہیں، اور میرے لئے محترم ہیں۔ میں آپ کو محترم ہی دیکھنا چاہتی ہوں۔''

فرحان کو حیرت ہونے لگی۔ اس نے کس عقل مندی اور شائستگی سے اسے بہت سی باتوں سے روک دیا تھا۔ پھر اسے تجسس کے حوالے سے ہی بات سوجھ گئی۔

''میں آپ کا شکر گزار ہوں۔'' اس نے کہا۔

''میں اپنے تجسس کی بات کر رہا تھا۔ چھ ماہ سے مجھے یہ تجسس ہے کہ آپ...... اور آپ کی وجہ سے آپ کی سہیلیاں کالج کے پہلے دن فرسٹ ایئر فول بننے سے کیسے بچ گئیں؟''

ارجمند کے چہرے سے تشویش کا وہ تاثر ڈھل گیا، جو تجسس پر فرحان کے

اصرار پر اس کے چہرے پر نمودار ہوا تھا۔ وہ خوش دلی سے مسکرائی۔

''آپ نے اس پر سوچنے اور غور کرنے کی کوشش نہیں کی؟''

''بہت کی، لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔''

''سیدھی سی بات تھی، میں دو دن پہلے اپنے چچا جان کے ساتھ آئی تھی، اور میں نے پورے کالج کا جائزہ لیا تھا۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ ہمارا کلاس روم کس طرح ہے۔ پھر میں نے پہلے دن کالج میں داخل ہوتے ہی آپ کا سیٹ اپ بھی سمجھ لیا۔ تیر کے نشان والا سائن بورڈ بہت مؤثر جال تھا۔ اور کوئی اس سے بھی بچ نکلے تو اصل راستے پر آپ کی ٹولی موجود تھی، راہنمائی کے لئے۔''

''کمال ہے!'' فرحان نے ستائشی لہجے میں کہا۔

''نہیں......! اس میں کمال کی کیا بات ہے؟''

''میرے نزدیک تو ہے۔''

''غلط تصور کی وجہ سے ہے۔''

''ذرا اس کی وضاحت بھی کر دیجئے۔''

''آپ کا تصور یہ ہے کہ فرسٹ ائیر والے سبھی گھبرائے ہوئے اور نروس ہوں گے۔''

''تو ہوتا بھی یہی ہے۔''

''لیکن آپ کو دوسرا امکان بھی ذہن میں رکھنا چاہئے۔ فرسٹ ایئر Fools کے درمیان فرسٹ ایئر Sages بھی تو ہو سکتے ہیں۔''

''میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ آپ نے کمال کر دیا۔''

''دیکھیں، ایک تو میں پہلی بار کہیں جاؤں تو اس کے بارے میں جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ یہ میری فطرت ہے۔ دوسرے اسکول میں میری ایک کلاس سینئر ایک لڑکی سے بڑی دوستی تھی۔ اس نے مجھے فرسٹ ایئر فول کے بارے میں بتا رکھا تھا۔ تو میں نے چچا جان کے ساتھ آ کر کالج کے محل وقوع کو پوری طرح ذہن نشین کر لیا۔ بے وقوف بنائے جانے کا سب سے قوی امکان غلط راہنمائی کے ہی ذریعے تھا۔ اس کے باوجود میں چوکنا تھی، اور اندر سے اتنی زیادہ پراعتماد بھی نہیں

تھی۔'' اس نے توقف کیا، ایک گہری سانس لی اور بولی۔

''تو اس روز آپ کو میری وجہ سے مایوسی ہوئی؟''

''جی نہیں!''

''میں سمجھی نہیں۔''

''جب میں نے آپ کو کالج میں داخل ہوتے دیکھا تو اسی وقت سوچ لیا تھا کہ آپ کو بے وقوف نہیں بننے دوں گا۔''

وہ اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''آپ کو یقین نہیں آیا نا اس بات پر؟'' فرحان نے پوچھا۔

''آپ سمجھ رہی ہیں نا کہ میں انگور کھٹے ہیں، والی بات کر رہا ہوں۔''

''جی نہیں ..... ! میرے ذہن میں ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔

''تو آپ نے کوشش کی تھی مجھے بچانے کی۔ مگر کیسے؟ اس بارے میں کچھ بتائیں گے آپ۔''

''جی نہیں! جو بات ہوئی ہی نہیں، اسے بتانے کی ضرورت بھی نہیں۔''

''میں جانتی ہوں۔ الحمد للہ، میرا مشاہدہ بہت اچھا ہے۔ کالج میں داخل ہوتے ہی میں نے گردوپیش کا جائزہ لیا تھا۔ تبھی تو آپ کا پورا سیٹ اَپ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ میں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ آپ ہی اپنی ٹولی کے سردار ہیں۔''

فرحان اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''مگر آپ نے میری کوشش کو کیسے سمجھا؟''

''اس وقت تو نہیں سمجھا تھا۔ اس وقت تو میرا ذہن الجھ گیا تھا'' ارجمند نے بڑی سچائی سے کہا۔

''سمجھ میں تو اب آیا ہے، آپ کی بات سننے کے بعد۔''

''مجھے تو اب بھی یقین نہیں ہے کہ آپ سمجھ پائی ہیں؟''

''سن لیں تو شاید یقین آ جائے۔'' وہ بولی۔

''جب ہم نے بڑھنا شروع کیا تو میں نے دیکھا کہ آپ اپنی ٹولی سے

الگ ہو کر تیر کے نسان والے بورڈ کی طرف چلے گئے۔ میری سمجھ میں اس کی وجہ نہیں آئی۔ کیونکہ ہم تو صحیح سمت میں جا رہے تھے، اور آپ لوگ وہاں ہمیں بھٹکانے کے لئے کھڑے تھے۔ پھر آپ کو وہاں سے ہٹنے کی کیا ضرورت تھی؟ میری سمجھ میں اس کی وجہ نہیں آئی۔''

''اور اب آپ سمجھ گئیں؟''

''ہاں! ہم آپ کی ٹولی کے پاس سے گزرنے والے تھے۔ آپ یہ سوچ کر تیر کے نشان والے بورڈ کی طرف چلے گئے کہ آپ کے ساتھی یقیناً ہمیں اس طرف بھیجیں گے۔ آپ نے سوچا کہ جب ہم وہاں آئیں گے تو آپ ہمیں صحیح راستہ دکھا کر ہمیں بے وقوف بننے سے بچا لیں۔ ہاں! یہی بات تھی۔ اب میں سمجھ سکتی ہوں۔''

فرحان نے سر جھکا لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کتنی عجیب لڑکی ہے۔ غیر معمولی طور پر ذہین اور سمجھدار۔

''آپ تو یوں شرمندہ ہو رہے ہیں، جیسے خدانخواستہ چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہوں۔''

''میں نے کیا تو کچھ بھی نہیں۔''

''عمل کا خلوص ہی تو سب کچھ ہوتا ہے. فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے۔'' ارجمند نے کہا۔

''مجھے خوشی ہے کہ آپ میری قائم کی ہوئی رائے سے بہتر اور بلند ثابت ہوئے۔ میرے دل میں ہمیشہ آپ کی عزت رہی، اور اب اور بڑھ گئی ہے۔''

''یہ تو بتائیں کہ میں نے آپ کو بچانے کی کوشش کیوں کی؟ جبکہ میں آپ کو جانتا بھی نہیں تھا۔''

''اس میں بتانے کی کیا بات ہے؟ یہ تو Under Stood ہے۔''

ایک لمحے کو فرحان کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ وہ جیسے ہواؤں میں اڑنے لگا۔ مگر ارجمند کی آواز اسے پھر زمین پر لے آئی۔

''پسندیدگی تو فطری اور قدرتی چیز ہے۔'' ارجمند نے کہا۔

''کوئی کسی کو پہلی نظر میں اچھا لگتا ہے۔ لیکن اس پسندیدگی کو غلط رخ پر نہیں جانا چاہئے۔''

''پسندیدگی کے کچھ رُخ درست اور فطری بھی تو ہوتے ہیں۔''

''لیکن درس گاہوں میں آدمی کا بنیادی مقصد صرف حصولِ علم ہونا چاہئے۔ ہر جذبہ ہر مقام کے لئے نہیں ہوتا، چاہے اچھا ہو۔''

''ہمارے درمیان دوستی بھی تو ہوسکتی ہے۔'' فرحان نے تجویز پیش کی۔

''میں صرف لڑکیوں سے دوستی کی قائل ہوں۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''میں نہیں چاہتی کہ میرے کسی بے ضرر اور صاف ستھرے ظاہری عمل کی بنیاد پر کوئی میرے متعلق غلط رائے قائم کرے، کوئی بدگمانی ہو۔''

''تو پھر میرے اور آپ کے درمیان تعلق ہی کیا رہ جاتا ہے؟'' فرحان نے مایوسی سے کہا۔

''تعلق تو ہے۔ آپ میرے کالج فیلو ہیں، میرے سینئر ہیں، اور میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ اور میں آپ سے بھی یہی اُمید رکھتی ہوں کہ آپ کبھی کسی بات سے میری عزت میں کمی نہیں ہونے دیں گے۔ نہ اپنی نظر میں اور نہ دوسروں کی نظر میں۔ اور نہ ہی درس گاہ کے تقدس کو مجروح ہونے دیں گے۔''

''میں آپ کی امید پر پورا اتروں گا۔'' فرحان اٹھ کھڑا ہوا۔

''لیکن آپ کو کسی بھی وقت، کسی بھی طرح کی مدد درکار ہو تو مجھ سے ضرور کہیئے گا۔ میں طلبا کی یونین کا صدر بھی ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے۔ شکریہ......!''

''خدا حافظ......! اب آپ اپنے گوشۂ عافیت میں سکون سے بیٹھ سکتی ہیں۔''

فرحان لائبریری سے نکلنے والا تھا کہ خداداد لائبریری میں داخل ہوا۔

''میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ آپ کے لئے چائے لاؤں فرحان بابو!''

''میں تو جا رہا ہوں بابا! آپ ارجمند بی بی کے لئے چائے لے آئیں۔

اور ہاں! ان کا خیال رکھیئے گا۔''

یہ کہہ کر وہ لائبریری سے نکل آیا تھا۔

اس کے بعد ان کے درمیان اتفاقیہ طور پر سامنا ہوتا رہا۔ دونوں کے درمیان پُرتکلف علیک سلیک ہوتی۔ اور بس، ارجمند کو بھی اس سے کسی بھی مدد کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ بہت اچھی اسٹوڈنٹ تھی، اور اپنی پڑھائی کے بارے میں بہت سنجیدہ تھی۔

فرحان بھی اپنی پڑھائی میں مصروف ہوگیا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ یہ عام معاملہ نہیں ہے۔ اس نے اپنے لئے راستے کا تعین کرلیا تھا۔

بی اے کر کے اس نے سکون کا سانس لیا۔ ماسٹرز کے لئے اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ یوں وہ کالج سے رُخصت ہوگیا، یعنی ارجمند کی عائد کی ہوئی ایک پابندی سے آزاد ہوگیا۔

اب وہ اس سے بات کرنے کا حق رکھتا تھا۔ اب وہ کوئی عملی قدم بھی اٹھا سکتا تھا۔

پہلے تو اس نے سوچا کہ کسی دن کالج جائے، وہاں سے ارجمند کو پک کرے اور کسی مناسب جگہ پر سکون سے بیٹھ کر اس سے دل کی بات کہے، تاکہ اس کے بعد معاملات آگے بڑھائے جاسکیں۔ لیکن صرف چند لمحوں میں اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ ارجمند کو اپنی عزت کا، دوسروں کی نظر میں اپنے امیج کا کتنا خیال رہتا ہے۔ وہ کالج سے، سب کی نظروں کے سامنے باہر آکر اس کی گاڑی میں بیٹھنا کیسے گوارہ کرتی۔ اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد کالج میں اس کے متعلق کیسی کیسی چہ میگوئیاں ہوتیں۔ یہ تو وہ خود بھی پسند نہیں کرتا۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے ایک فیصلہ کرلیا۔

ارجمند کے گھر کا فون نمبر اس کے پاس تھا۔ سہ پہر کے وقت اس نے نمبر ملایا۔ وہ یہ سوچ کر گھبرا رہا تھا کہ کسی اور نے فون ریسیو کیا تو وہ کس طرح بات کرے گا؟ کیسے کہے گا کہ ارجمند کو بلا دیجئے۔ اور کون جانے، ارجمند کو یہ بات بری لگے۔

لیکن اس کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

قسمت بہرحال اس کے ساتھ تھی۔ فون ارجمند نے ہی ریسیو کیا۔

''ارجمند! میں فرحان بول رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ارے آپ......! کہیئے......! میرا فون نمبر کیسے ملا آپ کو......؟'' وہ حیران تھی۔

''کالج میں آپ کے مکمل کوائف موجود ہیں۔''

''تو یہ زحمت کیسے کی آپ نے......؟'' اس کے لہجے میں اچانک بے رخی آ گئی۔

''اتنی اجنبیت سے بات نہ کریں ارجمند......! آپ کا کہنا تھا کہ آپ میری بہت عزت کرتی ہیں، اور آپ کا خیال تھا کہ میں اس عزت کا مستحق بھی ہوں۔''

''سوری فرحان!'' وہ فوراً ہی شرمندہ ہوگئی۔

''دراصل یہ اتنا اچانک...... میں حیران ہوں۔''

''یہ ایسی اَن ہونی تو نہیں۔''

''میرے لئے تو اَن ہونی ہی ہے، خیر...... کیسے یاد کیا آپ نے......؟''

''یاد تو میں کرتا ہی رہتا ہوں آپ کو۔ اس وقت ایک ضروری بات کے لئے فون کیا ہے۔ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

چند لمحے خاموشی رہی۔ شاید یہ فرمائش اس کے لئے اس کے فون سے بھی زیادہ حیران کن تھی۔ پھر وہ بولی۔

''ملنا چاہیئے ہیں......؟ کہاں......؟''

''کہیں بھی، جہاں ہم سکون سے بیٹھ کر بات کرسکیں۔''

''لیکن کیوں......؟''

''مجھے آپ سے ایک بہت ضروری اور اہم بات کرنی ہے۔''

''دیکھیئے......! یہ مناسب نہیں، اور میں اسے اچھا بھی نہیں سمجھتی۔''

''بہت ضروری ہے ارجمند......!'' اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

''دیکھیں...... میں نے دو سال میں بھی آپ سے ایسا کچھ نہیں کہا۔ کالج میں بھی ہمیشہ خیال رکھا۔''

''تو ٹھیک ہے۔ آپ میرے گھر آ جائیں۔''

وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔ یہ عجیب غیر رومانوی لڑکی ہے۔ اس نے سوچا۔ بھلا کوئی کسی سے اظہارِ محبت کرنے کے لئے اس کے گھر جاتا ہے؟

''یہ...... یہ کیسے ممکن ہیں......؟''

''اس میں حرج بھی کیا ہے......؟''

''عجیب سا لگے گا۔ میں آپ سے کہیں باہر ملنا چاہتا ہوں۔''

''مگر یہ مجھے عجیب سا لگے گا۔'' وہ سرد لہجے میں بولی۔

''آپ جانتی ہیں کہ میں کوئی ایسا ویسا......''

''اگر میں آپ کو ایسا ویسا سمجھتی تو آپ سے بات ہی نہ کرتی۔''

''تو پھر میری بات مان جائیں۔''

وہ ہچکچاتی رہی۔

''دیکھیں...... ہمارے ہاں ایسا ہوتا نہیں، اور نہ کبھی ایسا ہوا ہے۔ میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ لیکن گھر کی عزت سے زیادہ تو نہیں کرسکتی۔ بس یہی ایک صورت ہے کہ آپ میرے گھر آ جائیں۔''

''مجھے آپ سے بہت ذاتی بات کرنی ہے۔ وہاں کیسے کرسکتا ہوں؟''

یہ سن کر وہ بدک گئی۔

''ذاتی بات......! ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں بے مہری تھی۔

''تعلق تو ہے۔ اور وہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ میں آپ کا کالج فیلو رہا ہوں۔''

''اور اب نہیں رہے۔ تعلق تو ختم ہوگیا۔''

اس کا بہت دل دکھا یہ سن کر۔

''یہ تو عجیب بات کی آپ نے۔ جب میں کالج میں آپ کے ساتھ تھا تو آپ نے درس گاہ کے تقدس کا واسطہ دے کر مجھے سمجھایا۔ میں اس کا احترام کرتا

رہا۔ اور اب درس گاہ کا تعلق ختم ہو گیا تو آپ ایسے بے رخی سے بات کر رہی ہیں۔''
اس نے زخمی لہجے میں کہا۔

اس کا لہجہ شاید اثر کر گیا تھا۔ وہ نرم ہو گئی۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے آپ کو بہت شائستہ اور مہذب پایا۔ لیکن میرے لئے یہ بہت مشکل ہے۔ آپ فون پر بات کیوں نہیں کر لیتے؟''

''فون پر اتنی تفصیلی بات نہیں ہو سکتی۔ پلیز ارجمند! ایک بار میری بات مان لیں۔''

وہ پھر ہچکچائی۔

''چلیں ...... ٹھیک ہے۔ کہاں ملنا چاہتے ہیں آپ ......؟''

''کسی ریسٹورنٹ میں۔''

''نہیں! یہ تو مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا۔''

وہ بے بسی سے سوچتا رہا۔

''لارنس گارڈن ......!''

''چلیں...... ٹھیک ہے۔''

''شکریہ......!'' وہ خوش ہو گیا۔

''تو پانچ بجے۔ میں اندر گیٹ کے قریب ہی کھڑا ملوں گا۔ اور ہاں! میں اپنی گاڑی میں نہیں آؤں گا۔ میرا گھر درمیان میں ہے۔ واپسی میں آپ مجھے ڈراپ کر دیجئے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں پہنچ جاؤں گی۔''

اس ملاقات کے لئے وہ بڑے اہتمام کے ساتھ تیار ہوا۔ وہ تو جیسے بر دکھوے میں جا رہا تھا۔

وہ پونے پانچ بجے لارنس گارڈن پہنچ گیا۔ گیٹ کے اندر کی طرف کھڑے ہونے کی بات اس نے ارجمند کے خیال سے کی تھی کہ شاید اس کے ساتھ گارڈن میں داخل ہونا وہ پسند نہ کرے۔

ارجمند پورے پانچ بجے آئی۔ فرحان نے گاڑی باہر رکتے دیکھی تو جھنجلا

گیا۔ اسے امید تھی کہ وہ گاڑی خود ہی ڈرائیو کر رہی ہو گی۔ لیکن نہیں، وہ تو ڈرائیور کے ساتھ آئی تھی۔ وہ ہاتھ میں باسکٹ لئے اتری۔ اس نے ڈرائیور سے کوئی بات کی۔ ڈرائیور گاڑی آگے لے گیا، اور وہ گیٹ کی طرف مڑی۔

اندر آتے ہی اس نے فرحان کو دیکھ لیا۔

''السلام علیکم!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

فرحان نے سلام کا جواب دیتے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔ وہ عام سے کپڑوں میں بھی خوب صورت لگ رہی تھی۔ چادر ہمیشہ کی طرح اس نے بڑے سلیقے سے اوڑھی ہوئی تھی۔

وہ اندر گئے۔

''کہاں بیٹھیں گی؟'' فرحان نے اس سے پوچھا۔

''کوئی پرسکون گوشہ ہو، جہاں ہجوم نہ ہو۔''

فرحان کو وہ جواب بہت حوصلہ افزا لگا۔

وہ دونوں سائے میں گھاس پر بیٹھ گئے۔ ارجمند نے باسکٹ سے تھرماس نکالا۔ پھر دو پیالیاں، اور ایک بڑی پلیٹ برآمد کی۔ پھر ایک نیپ کن نکالا۔ اس میں چھ سموسے لپٹے ہوئے تھے۔ وہ اس نے پلیٹ میں رکھ دیئے۔ آخر میں اس نے کپڑے کے دو اور نیپ کن نکالے، ایک اس کی طرف بڑھایا اور دوسرا اپنے آگے پھیلا لیا۔

''یہ لیجئے ...... چائے جب آپ کہیں گے، نکال دوں گی۔''

فرحان اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

''آپ نے تو اچھی خاصی پکنک کر ڈالی۔'' اس کے لہجے میں خوشی تھی۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔ میں قرض رکھنا پسند نہیں کرتی۔ موقع ملتے ہی چکا دیتی ہوں۔'' اس نے جلدی سے وضاحت کر دی۔

''میں سمجھا نہیں ......!''

''آپ نے اس روز بارش کے موسم میں، لائبریری میں مجھے چائے پلائی تھی نا......!''

"مگر سموسے تو نہیں کھلائے تھے میں نے۔"

"وہ چائے اس وقت میرے لئے نایاب تھی۔ ضرورت محسوس کر رہی تھی میں، لیکن کینٹین نہیں جا سکتی تھی۔ تو وہ آپ کا احسان تھا۔ اب ان سموسوں کو آپ اپنا منافع سمجھ لیں۔"

فرحان نے سموسہ اٹھایا۔ وہ اب بھی گرم تھا، یعنی بہت تازہ۔ اس نے کھا کر دیکھا۔ خستہ اور لذیذ۔

"بہت لذیذ منافع ہے۔" اس نے شوخی سے کہا۔

"کہاں سے لئے ہیں؟"

"خود بنا کر لائی ہوں۔ بازار کے سموسے مجھے اچھے نہیں لگتے۔"

فرحان کے لئے وہ بھی حوصلہ افزائی تھی۔

"کمال کر دیا آپ نے۔ بازار میں تو ایسے سموسے مل ہی نہیں سکتے۔"

"تو آپ طبیعت سے کھائیے۔ مجھے خوشی ہوگی۔"

وہ خود ایک سموسہ لینے کے بعد رک گئی تھی۔ فرحان نے اسے ٹوکا تو وہ بولی۔

"میرے لئے بس ایک ہی کافی ہے۔"

"تو پھر اتنے سارے کیوں لے آئیں؟"

"یہ سوچ کر کہ شاید آپ کو اچھے لگیں تو کمی کا احساس نہ ہو۔"

اور واقعی فرحان نے سارے سموسے صاف کر ڈالے۔ ارجمند نے پیالیوں میں چائے انڈیلی۔ انہوں نے ٹیپ کن سے ہاتھ صاف کئے، اور ارجمند نے ٹیپ کن باسکٹ میں ڈال دیئے۔

فرحان نے چائے کا پہلا گھونٹ لے کر کہا۔

"چائے بھی بہت عمدہ ہے۔ آپ نے ہی بنائی ہوگی۔"

ارجمند نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔

"سوا پانچ بجے ہیں۔ چھ بجے میری گاڑی آئے گی۔ ہمیں اس سے پانچ منٹ پہلے گیٹ پر پہنچ جانا چاہئے۔"

"اتنا کم وقت......؟"

"کوئی بھی بات کرنے کے لئے چالیس منٹ ضرورت سے زیادہ ہی ہیں۔ یہ ایک گھنٹہ میں نے خاص طور پر آپ کے لئے نکالا ہے۔"

"میں شکر گزار ہوں۔"

کب سے وہ ان لمحوں کا انتظار کر رہا تھا... دو سال سے۔ اور اب وہ مل گئے تھے تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے؟ وہ گنگ سا بیٹھا تھا۔ اور یہ احساس اسے گھبراہٹ میں مبتلا کر رہا تھا کہ لمحے تیزی سے گزر رہے ہیں۔

ارجمند بھی خاموش بیٹھی تھی۔ وہ اس کی مشکل آسان کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ البتہ چائے پیالی خالی ہوئی تو اس نے پوچھا۔

"اور چائے دوں آپ کو...؟"

"جی ہاں! پلیز......!"

چائے کی پیالی سے ایک گھونٹ لے کر اس نے ارجمند کو دیکھا، جو گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ اور نروس ہو گیا۔ اتنے رکھ رکھاؤ والی، باوقار اور پاکیزہ لڑکی سے دل کی بات کہنا آسان نہیں تھا۔

اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

"ارجمند......!"

وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"جی......! میں سن رہی ہوں۔"

"میں نے ہمیشہ آپ کی ہر بات کا پاس رکھا۔" اس نے تمہید باندھی۔

"جیسے آپ چاہتی تھیں، اس طرح درس گاہ کا احترام کیا، اس کے تقدس کا، اور آپ کی عزت کا خیال رکھا۔ مگر اب میں اس پابندی سے آزاد ہوں۔ اب میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ مگر وہ بے تاثر تھا۔

"جب میں نے پہلے دن، پہلے لمحے آپ کو کالج میں داخل ہوتے دیکھا تھا، مجھے اسی لمحے آپ سے محبت ہوگئی تھی۔"

وہ خاموش بیٹھی رہی۔

''آپ کو بری لگی میری بات......؟''

ارجمند نے نفی میں سر ہلایا۔

''محبت کوئی بری چیز تو نہیں ہے۔ پھر آپ نے جس طرح سے دو سال خود پر قابو رکھا، میری نظر میں تو آپ کی عزت اور بڑھ گئی۔''

فرحان نے سکون کا سانس لیا۔

''اور آج میں ہلکا ہوگیا۔''

''میں سمجھ سکتی ہوں، دل پر رکھا ہوا بوجھ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ زیادہ بھاری ہوتا جاتا ہے۔''

فرحان نے حیرت سے اسے دیکھا۔وہ کم عمر تھی لیکن اس کی سوچوں میں، باتوں میں گہرائی تھی۔لگتا تھا کہ وہ بھی محبت کرتی ہے،اس سے؟ یہ وہ سوال تھا،جس کا جواب اسے معلوم کرنا تھا۔

وہ متوقع نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔لیکن اب وہ خاموش تھی۔

''آپ بھی کچھ کہیں نا......!'' چند لمحے بعد اس نے کہا۔

''میں یہاں کچھ کہنے تو نہیں آئی تھی۔''

لہجے میں تو نہیں، الفاظ میں بے رخی تھی۔

''لیکن بات کے جواب میں تو بات کی جاتی ہے۔''

''آپ کی بات کے جواب میں میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں۔''

وہ مایوس ہوا۔

''میں نے ایک بات آپ سے کی،جس سے آپ کا تعلق ہے۔اب کچھ تو کہنا ہوگا آپ کو۔''

''اگر آپ میرا ردِعمل جاننا چاہتے ہیں تو میں یہی کہوں گی کہ آپ ہر اعتبار سے بہت اچھے انسان ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جذبوں پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ آپ کو مجھ سے محبت ہوگئی تو یہ آپ کا حق ہے۔ میں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں کرسکتی۔''

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا آپ بھی......''

ارجمند نے نرم لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

''نہیں......! میں تو تعلیم کے دوران محبت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آپ مجھے ناپسند تو نہیں کرتیں۔'' فرحان کا انداز مدافعانہ ہوگیا۔ہلکی سے بے اختیار مایوسی اس پر چھانے لگی۔

''یہ تو آپ شروع سے ہی جانتے ہیں کہ میں آپ کو ناپسند نہیں کرتی۔''

''تو آپ مجھے پسند کرتی ہیں۔''

''بالکل کرتی ہوں۔لیکن پسندیدگی اور محبت میں بہت فرق ہوتا ہے......زمین آسمان کا فرق۔''

''محبت کی بنیاد تو پسندیدگی ہی ہوتی ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد......''

''اس کا دوہوم سا امکان بھی نہیں۔ اور میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کے وقت کا زیاں ہو،آپ زندگی کے کسی معاملے میں بھی پیچھے رہ جائیں۔''

''آپ نہیں جانتیں کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میں آپ کے بغیر نامکمل ہوں۔آپ کے انکار سے نقصان تو مجھے ہونا ہی ہونا ہے۔''

''کسی دوسرے کی محبت کو کوئی کبھی نہیں جان سکتا۔'' نہ جانے کیوں ارجمند کا لہجہ اُداس ہوگیا۔

''مجھے افسوس ہے۔لیکن بہتر یہی ہے۔ ابھی آپ کا کچھ نقصان ضرور ہوگا۔مگر تھوڑے وقت میں آپ سنبھل جائیں گے۔ میں آپ کے لئے بہت دعا کروں گی۔''

''مگر کوئی وجہ تو بتائیں......!''

''کوئی کسی سے پوچھے کہ اسے کسی سے محبت کیوں ہوگئی؟ تو اس کا جواب نہیں دے سکتا۔لیکن کوئی کسی سے یہ نہیں پوچھتا کہ اسے کسی سے محبت کیوں نہیں ہوئی۔ اس کی تو کوئی وجہ ہوتی ہی نہیں۔محبت بس ہوتی ہے تو ہو جاتی ہے۔خود بخود

ہو جاتی ہے۔لیکن محبت نہ ہونے کی کوئی اہمیت نہیں۔ ورنہ دنیا کے ننانوے فیصد لوگ دنیا کے ننانوے فیصد لوگوں سے یہی بات پوچھتے نظر آتے کہ تمہیں مجھ سے محبت کیوں نہیں ہے۔''

وہ دل کو کاٹ دینے والا جواب تھا۔فرحان نے آزردگی سے کہا۔

''مجھ میں کوئی کمی ہے.....؟''

''یہ کمی زیادتی کی بات نہیں، محبت میں حساب کتاب، اعداد و شمار کا کوئی دخل نہیں۔''

''آپ کسی اور سے محبت کرتی ہیں؟'' فرحان نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر پوچھا۔

ایک لمحے کو اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''یہ تو بہت ذاتی سوال ہے۔آپ کو مجھ سے نہیں کرنا چاہئے تھا۔'' اس نے اضطراری طور پر کہا۔مگر فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔

''دیکھیں..... میں اگر کسی سے محبت کرتی ہوتی تو بھی میرے بارے میں حتمی فیصلہ میرے گھر والوں کا ہوتا اور میں اسے قبول کرتی..... اور وہ بھی ہنسی خوشی۔ میں شادی کو محبت کا فطری، لازمی اور منطقی انجام نہیں سمجھتی۔''

فرحان اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا پہلا ردعمل تو یہی بتاتا تھا کہ وہ کسی سے محبت کرتی ہے۔لیکن بعد کی بات اس نے جس یقین سے کہی تھی، وہ اس تاثر کی نفی کرتی تھی۔فرحان کے لئے یہ بات بہت اہم تھی۔

''میں نے آپ سے ذاتی سوال اس لئے کیا تھا کہ اس سے میرے لئے آسانی ہو جاتی۔اگر آپ کو کسی سے محبت ہے تو یہ آپ کا حق ہے۔یہ معلوم کر کے میں ہمیشہ کے لئے اس خیال سے دست بردار ہو جاتا۔اگر چہ میرے نزدیک شادی کا انجام محبت ہی ہے۔''

وہ پھر ایک لمحے کو ہچکچائی۔

''جواب تو میں نے آپ کو دے دیا۔'' اس نے کہا، پھر وہ پیالیاں اور خالی پیٹ باسکٹ میں رکھنے لگی۔یہ اشارہ تھا کہ وقت ختم ہو رہا ہے۔ اور پھر اس کے

بعد شاید کبھی بات نہیں ہو سکے گی۔

''اس کا یہ مطلب ہوا کہ اگر آپ کے گھر والے میرا رشتہ آپ کے لئے قبول کر لیں تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟''

''جی ہاں.....! بالکل یہی بات ہے۔'' ارجمند نے بے جھجک کہا۔

''تو میں اپنی امی کو آپ کے گھر بھیج سکتا ہوں رشتے کے لئے.....؟''

''جی..... بالکل.....!''

''تو میں یہ نیک کام کل ہی کروں گا۔''

ارجمند نے جواب دینے کی بجائے گھڑی میں وقت دیکھا۔

''ایک منٹ اوپر ہو گیا ہے۔اب چلیں.....؟''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''لائیے..... باسکٹ مجھے دے دیجئے۔''

وہ مسکرائی۔

''اس کی ضرورت نہیں۔لائی بھی تو میں ہی تھی۔''

وہ باہر آ کر گیٹ سے ذرا ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ٹھیک چھ بجے ان کے سامنے گاڑی آ کر رکی۔فرحان نے بڑھ کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور اسے بیٹھنے کا موقع دیا۔لیکن جب وہ بیٹھنے لگا تو ارجمند نے دروازہ بند کر لیا۔

''آپ اگلی سیٹ پر بیٹھئے۔''

وہ فرحان کے لئے بہت بڑا شاک تھا۔اسے توہین کا احساس ہوا۔

''ڈرائیور کے ساتھ.....؟'' اس نے ناراضی سے کہا۔

''سوری.....! یہ ڈرائیور نہیں، میرے چچا جان ہیں۔''

وہ تھا شاک پہ شاک..... صرف چند سیکنڈ میں دو شاک۔اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ارجمند پر اسے شدید غصہ آیا۔ چچا کے ساتھ آنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ کھڑے کا کھڑے رہ گیا۔

''اب بیٹھ بھی جائیے۔'' ارجمند نے اسے چونکایا۔

دل تو چاہتا تھا کہ بیٹھنے سے انکار کر دے۔ اور رکشہ میں گھر چلا جائے۔

لیکن یہ بد اخلاقی ہوتی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اگلی سیٹ پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ سہمے ہوئے کسی بچے کی طرح۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا کام شروع ہونے سے پہلے ہی خراب ہوگیا ہے۔ اس نے چچا کی طرف دیکھا اور شرمندگی سے کہا۔

''سوری چچا جان! مجھے معلوم نہیں تھا۔''

چچا نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے شفقت سے کہا۔

''کوئی بات نہیں بیٹے! غلط فہمی تو ہو جاتی ہے۔ کہاں اترنا ہے.....؟ مجھے راستہ بتاتے رہو۔''

گھر کے سامنے اترتے ہوئے اس نے چچا جان سے ہاتھ ملایا۔ بڑے تپاک سے ان کا شکریہ ادا کیا، پھر پلٹ کر ارجمند کی طرف دیکھا۔

''خدا حافظ ارجمند.....!''

''خدا حافظ فرحان.....!''

اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ پھر گھر کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے امی سے بات کی۔ امی نے باجی کو بلوایا۔ وہ انہیں ارجمند کے گھر لے کر گیا۔ وہاں اس کی دادی اور چچی سے ملا۔ پھر وہ واپس آگیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کے نتیجے میں اب وہ رات کو اپنے کمرے کی تنہائی میں اداس اور نیند سے محروم بیٹھا تھا۔

❁ ❁ ❁

ارجمند کوئی بچی نہیں تھی۔ شروع ہی سے جانتی تھی کہ فرحان اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ بہت اچھا ہے۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی ہمدردی کے سوا۔ وہ خود بھی تو ایک ناممکن کی اسیر تھی۔ اسے تو اس وقت محبت ہوئی تھی، جب وہ محبت کا مفہوم بھی نہیں سمجھتی تھی۔ بچپن میں، نادانی میں اس نے اس محبت کا اظہار بھی بڑے زور سے کیا تھا۔ پھپھو کے سامنے بھی، اور آغا جی کے سامنے بھی۔ مگر پھر رگ میں موجود اللہ نے اسے محبت کے طور طریقے سکھائے، سو اس نے محبت کو دل میں کھلنے والی مہکتی کلی کی طرح چھپا لیا کہ خوشبو کو جتنا قید رکھو، وہ اتنی ہی توانا ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ آغا جی بھی بھول گئے کہ وہ ان سے محبت کرتی ہے۔ اب وہ اس

محبت کو اس کا بچپنا سمجھ کر دل میں ہنستے ہوں گے۔

دل میں موجود راہنما نے اس کی بڑی مدد کی۔ اسے حوصلہ دیا۔ یقین اور اعتماد عطا کیا۔ مگر جب اس نے قرآن میں وہ آیت مبارکہ پڑھی ..... اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی ..... تو وہ ہر چیز کے لئے تیار ہوگئی۔ سب کچھ اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے تو بندہ بس دعا کر سکتا ہے اور انتظار۔

وہ فرحان کو فون پر بھی منع کر سکتی تھی۔ لیکن خود واقف حال تھی۔ اس لئے ایسا نہیں کیا۔ وہ اسے ٹال بھی سکتی تھی، لیکن یہ اخلاقی اعتبار سے اچھا نہیں تھا۔ تقریباً تین سال سے وہ اسے ٹال ہی تو رہی تھی ..... بہلا ہی تو رہی تھی ..... اور اس نے اس کی ہر بات مانی تھی۔ اب یہ اس کے ساتھ زیادتی ہوتی۔ ویسے تو اس کے ساتھ ہونی ہی زیادتی تھی۔ اس سے مفر ہی نہیں تھا۔

اس نے دادی اماں سے کہا۔

''مجھے شام کو کہیں جانا ہے دادی اماں!''

''تو اپنے چچا سے بات کرنا۔''

''نہیں دادی! پہلے تو آپ سے اجازت لینی ہے۔''

''اجازت کی تجھے کیا ضرورت؟'' حمیدہ نے بے پرواہی سے کہا۔

''ضرورت ہے دادی اماں! آپ نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ میں کہاں جا رہی ہوں؟''

''کسی کام سے ہی جا رہی ہوگی میری نکی! پوچھنے کی کیا بات ہے اس میں؟''

''وہ دادی اماں ..... کالج میں پچھلے سال تک ایک لڑکا پڑھتا تھا میرے ساتھ .....'' یہ کہتے کہتے اسے شرم آنے لگی۔

''ابھی اس کا فون آیا تھا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔'' وہ اچانک جلدی جلدی بولنے لگی۔

''میں نے اسے کہا کہ یہاں ..... ہمارے گھر آجائے۔ لیکن وہ باہر ملنا چاہتا ہے۔ مجھے اچھا تو نہیں لگ رہا ہے دادی اماں! لیکن کالج میں میرے ساتھ

بہت بھلائی کی تھی اس نے، اس لئے میں منع نہیں کر پائی۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے آپ سے پوچھے بغیر ملنے کے لئے ہاں کر دی۔ اب مجھے تو اس کا فون نمبر بھی نہیں معلوم کہ اسے منع کر سکوں۔ لیکن آپ منع کریں گی تو میں ہرگز بھی نہیں جاؤں گی۔'' وہ نظریں جھکائے بولتی چلی گئی، احساس ہوا تو اس نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھائیں۔ دادی اماں اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ ان کی نگاہوں میں تشویش کا تاثر بھی نہیں دیکھ سکی۔

''تو نے وعدہ کر لیا تھا! تو میں اجازت کیوں نہیں دوں گی؟'' دادی اماں نے کہا۔

''تیری بات خراب کرا سکتی ہوں میں؟''

''شکریہ دادی اماں! لیکن میں اپنی غلطی پر شرمندہ ہوں۔''

''یہ تو بتا، تو اس سے ملنے کہاں جائے گی؟''

''لارنس گارڈن اماں! وہی بڑا باغ، جہاں ہم جاتے رہتے ہیں۔''

دادی سوچ میں پڑ گئیں۔ اس بار ان کی تشویش اس کو محسوس ہوگئی۔ مگر وہ اس کی وجہ بھی سمجھ سکتی تھی۔

''وہ ایسا ویسا لڑکا نہیں ہے دادی اماں! اور پھر گارڈن میں شام کے وقت سینکڑوں لوگ ہوتے ہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''تو کسی کی عزت کرے نکی! تو وہ ایسا ویسا ہو ہی نہیں سکتا۔'' دادی اماں نے کہا۔ لیکن ان کی نگاہوں میں اب بھی تشویش تھی۔ پھر وہ بولیں۔

''میری طرف سے اجازت ہے۔ تو اپنے چچا سے جا کر بات کر لے۔''

ارجمند نے جا کر زبیر سے بات کر لی۔ وہ کب انکار کرنے والا تھا۔ اس نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ جانا کہاں ہے؟

وقت کافی تھا۔ اس نے باورچی خانے میں جا کر سموسے تلے اور چائے بنا کر تھرماس میں بھر لی۔ پھر وہ دادی اماں کو سلام کرنے کے لئے گئی۔ اس کی باسکٹ دیکھ کر دادی جان اور تشویش زدہ دکھائی دینے لگیں۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

وہ چچا جان کے ساتھ باہر نکلی۔

''لارنس گارڈن چلنا ہے چچا جان!'' اس نے اگلی سیٹ پر ان کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔

چچا جان بھی عجیب آدمی تھے۔ سوال کرنا تو جانتے ہی نہیں تھے۔ انہوں نے چپ چاپ گاڑی آگے بڑھا دی۔

''ایک زحمت دینی ہے آپ کو چچا جان!'' راستے میں اس نے ان سے کہا۔

''بولو بیٹی۔۔۔!''

''آپ ٹھیک چھ بجے مجھے واپس لے جانے کے لئے آجایئے گا۔''

''ٹھیک ہے بیٹی!''

اب بھی کوئی سوال نہیں۔ پہلے انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ انہیں لے کر لارنس گارڈن کیوں جا رہی ہے۔ اور اب یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ ایک گھنٹہ وہاں اکیلی کیا کرے گی، یا اسے کسی سے ملنا ہے۔ بس انہوں نے اس کی بات سنی اور مان لی۔

ٹھیک پانچ بجے وہ لارنس گارڈن کے گیٹ پر تھے۔ وہ باسکٹ لے کر اتری اور اس نے جھک کر انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک چھ بجے۔''

''تم بے فکر رہو بیٹی!'' انہوں نے کہا اور گاڑی آگے بڑھا لے گئے۔ یہ دیکھنے کے لئے بھی نہیں رکے کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے، کس سے ملنے آئی ہے۔ کتنے اچھے تھے یہ سب لوگ ... اللہ کی بہت بڑی نعمت ... وہ اس پر کتنا مان، کتنا بھروسہ کرتے تھے۔

مگر اپنی بے پناہ خود اعتمادی اور اللہ پر بھروسے کے باوجود وہ نروس ہو رہی تھی۔ یہ بھی شکر کا مقام تھا کہ وہ جانتی تھی کہ کس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا ہے۔ لیکن بہرحال اس سے گزرنا آسان نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ فرحان کیا امید لے کر آیا ہے، اور یہ بھی جانتی تھی کہ اس بے چارے کو دکھی ہونا ہے۔ یہی سب سے سخت

مرحلہ تھا۔اسے ایک اچھے آدمی کو مایوس کرنا تھا۔

پھر وہ مرحلہ بھی آ گیا، جس سے وہ خوفزدہ تھی۔فرحان نے اظہارِ محبت کیا۔ اس کے بعد قدرتی بات تھی کہ وہ اس کا ردِعمل جاننا چاہتا تھا۔اس نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔کھل کر بات کرنا آسان نہیں تھا،اور وہ اسے غیر ضروری طور پر زخمی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے بڑی مصلحت سے کام لیا۔ اس نے کہا کہ وہ تعلیم کے دوران محبت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔

وہ تھوڑا سا مایوس ہوا۔

''میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آپ مجھے ناپسند تو نہیں کرتیں؟'' اس نے پوچھا۔

ارجمند کو اطمینان ہوا۔ ایک دم جھٹکے سے یہ بہتر تھا کہ بات بتدریج آگے بڑھے۔ یوں وہ آخری مرحلے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو چکا ہوگا۔ اس نے کہا۔

''یہ تو آپ شروع ہی سے جانتے ہیں کہ میں آپ کو ناپسند نہیں کرتی۔''

''تو آپ مجھے پسند کرتی ہیں۔''

وہ ایک قدم اور آگے بڑھی۔

''بالکل کرتی ہوں۔ لیکن پسندیدگی اور محبت میں بہت فرق ہوتا ہے......زمین آسمان کا فرق۔''

''محبت کی بنیاد تو پسندیدگی ہی ہوتی ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد......''

''اس کا موہوم سا امکان بھی نہیں۔ اور میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کے وقت کا زیاں ہو۔آپ زندگی کے کسی معاملے میں پیچھے رہ جائیں۔''

''آپ نہیں جانتیں کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتا ہوں۔میں آپ کے بغیر نامکمل ہوں۔آپ کے انکار سے نقصان تو مجھے ہونا ہی ہے۔'' اس کے لہجے میں یاس تھی۔

ارجمند کے دل پر چوٹ لگی۔وہ اداس ہوگئی۔آغا جی کو بھی کب پتا ہے کہ وہ ان سے کتنی محبت کرتی ہے۔ وہ جان بھی جائیں،تو بھی پوری طرح تو نہیں جان

سکیں گے لیکن وہ تو یہ بات سوچتے بھی نہیں ہوں گے۔ اس اعتبار سے کتنی محروم ہے وہ۔

''کسی دوسرے کی محبت کو کوئی کبھی نہیں جان سکتا۔'' اس نے اداسی سے کہا۔

''مجھے افسوس ہے،لیکن بہتر یہی ہے۔ابھی آپ کا کچھ نقصان ضرور ہوگا۔ مگر تھوڑے وقت میں آپ سنبھل جائیں گے۔ میں آپ کے لئے بہت دعا کروں گی۔''

پھر اچانک ایک اور سخت مرحلہ آ گیا، جب فرحان نے اس سے پوچھا۔

''آپ کسی اور سے محبت کرتی ہیں؟''

وہ سچ بولنے والی تھی۔ جھوٹ بولنا اسے پسند نہیں تھا،لیکن پوچھنے والا کتنا ہی اچھا انسان سہی، اس کے لئے بہرحال اجنبی تھا۔ جبکہ اس راز میں تو اس نے کسی کو بھی شریک نہیں کیا تھا۔ وہ محبت کو ارزاں نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بری طرح جھنجلا گئی۔

''یہ تو بہت ذاتی ہے۔آپ کو مجھ سے نہیں کرنا چاہئے تھا۔'' اس نے چڑ کر کہا۔لیکن فوراً ہی خود کو سنبھال بھی لیا۔ اس کے نتیجے میں اسے جھوٹ سے کو ہلکا کرنے کی ترکیب بھی سوجھ گئی۔

''دیکھیں، اگر میں کسی سے محبت بھی کرتی ہوتی تو بھی میرے بارے میں حتمی فیصلہ میرے گھر والوں کا ہوتا، اور میں اسے قبول کرتی...... اور وہ بھی ہنسی خوشی۔ میں شادی محبت کا فطری، لازمی اور منطقی انجام نہیں سمجھتی۔''

اس کے جواب نے فرحان کو بہرحال الجھا دیا۔ اس کے جواب کے پہلے حصے پر فرحان کا تاثر واضح تھا۔اسے گویا یقین ہو گیا تھا کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ لیکن جواب کے دوسرے حصے نے اس کے چہرے سے اس پہلے تاثر کو مٹا ڈالا تھا۔اس نے بڑی شائستگی سے وضاحت کی کہ اس نے وہ ذاتی سوال کیوں کیا اور وہ وضاحت بڑی اہم تھی۔ اسے سن کر ارجمند کو ایک لمحے کے لئے افسوس ہوا کہ اس نے سچ کیوں نہیں بتا دیا۔ اگر بتا دیا ہوتا تو فرحان کے لئے آسانی ہو جاتا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔

مگر اس کے منفی جواب نے ایک اور مشکل کھڑی کر دی۔ فرحان کے ذہن میں یہ خیال آ گیا کہ وہ اپنے گھر والوں کو اس کے گھر رشتہ مانگنے کے لئے بھیج سکتا ہے۔ لیکن اس پیچیدگی کے باوجود خوشی کی بات یہ تھی کہ فرحان اس کی محبت سے بے خبر ہی رہا تھا۔ چنانچہ اس نے بے جھجک کہہ دیا کہ اسے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

اس کے بھی دو فائدے تھے۔ ایک اس کا اپنا کہ اس کی بات سچی ثابت ہو گئی تھی کہ وہ کسی سے محبت نہیں کرتی۔ دوسرا فائدہ، فرحان کا تھا کہ اب اس کا دکھ ہلکا ہو جاتا۔

واپس آتے ہوئے فرحان کو ڈراپ کرنے کے بعد وہ کچھ دیر انتظار کرتی رہی کہ چچا جان اس سے فرحان کے بارے میں پوچھیں گے۔ لیکن انہوں نے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ اس نے خود ہی انہیں چھیڑا۔

''چچا جان! آپ نے اس لڑکے کے بارے میں مجھ سے کچھ نہیں پوچھا؟''

''کیا ضرورت ہے بیٹی! بتانے والی بات ہوتی تو تم خود بتا دیتیں۔''

''تو آپ اپنا حق نہیں سمجھتے مجھ پر۔ میرے بڑے نہیں ہیں آپ!''

''کیوں نہیں! لیکن جتنا حق ہے، اس سے زیادہ بھروسہ ہے تم پر۔ اور تم چچا جان کہتی ہو تو بڑا تو میں ہوا۔''

''یہ لڑکا کالج میں میرے ساتھ پڑھتا تھا۔''

''یہ بات تو میں ویسے ہی سمجھ گیا تھا۔''

ارجمند خاموش ہو گئی۔ اب اسے ایک اور سخت مرحلے سے گزرنا تھا۔ اسے دادی اماں کو اس رشتے سے انکار پر قائل کرنا تھا۔ ورنہ فرحان ایسا لڑکا تھا کہ شاید دادی اماں کبھی انکار نہ کر پاتیں۔

گھر میں داخل ہوتے ہی وہ دادی اماں کے کمرے میں چلی گئی۔

''آ گئی میری نکی!'' دادی اماں نے اسے دیکھتے ہی بڑے دلار سے کہا۔

''جی دادی اماں......!''

اب وہ منتظر تھی کہ دادی اماں اس سے پوچھیں کہ وہ لڑکا اس سے کیا بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ لگتا تھا، گھر میں کوئی بھی اس کا کام آسان کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

''کیسا لگا نکی؟ پر تو تو بڑی جلدی آ گئی؟''

وہ جھنجلا گئی۔

''آپ یہ کیوں نہیں پوچھتیں مجھ سے کہ اس لڑکے نے مجھے کیوں بلایا تھا؟ وہ کیوں ملنا چاہتا تھا مجھ سے؟''

''لے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ضروری ہوا تو تو خود ہی بتا دے گی۔''

وہ اور جھنجلا گئی۔

''بات یہ ہے دادی اماں! کہ وہ لڑکا مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

دادی اماں تو ہکا بکا ہو گئیں۔

ارجمند کے لئے ان کا ردِ عمل بڑا حیران کن تھا۔ اسے خود پر شرم آنے لگی۔ دادی اماں یقیناً اسے غلط سمجھ رہی تھیں۔ برا سمجھ رہی تھیں۔ کتنا برا ہوا۔ اور یہ سب فرحان کی وجہ سے ہوا۔ اسے فرحان پر غصہ آنے لگا۔

دادی اماں کو خود کو سنبھالنے میں چند لمحے لگے پھر انہوں نے کہا۔

''تو پھر...؟ تو نے کیا کہا اسے...؟''

''میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا دادی اماں! اس نے کہا کہ کل اپنے گھر والوں کو ہمارے گھر بھیجے گا رشتے کے لئے۔'' اس نے جواب دیا۔ اب وہ دادی اماں کو وہ پوری تفصیل تو نہیں سنا سکتی تھی۔

اس بار تو دادی اماں کا چہرہ فق ہی ہو گیا۔

وہ اور شرمندہ ہو گئی۔

''اب میں کیا کرتی دادی اماں! اسے منع تو نہیں کر سکتی تھی۔''

''چل نکی! تیری مرضی! لڑکیوں کو تو ایک دن رخصت کرنا ہی ہوتا ہے۔'' دادی اماں نے آہ بھر کے کہا۔

''تیری مرضی ہے تو یوں ہی سہی۔ ہم تو تیری خوشی میں خوش ہیں۔''

اب حیران ہونے کی باری ارجمند کی تھی۔

''میری مرضی؟ میری خوشی؟ یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں دادی اماں!'' اس کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''تو یہی تو کہہ رہی ہے نا کہ تیری مرضی یہی ہے، اور میں ہاں [illegible] ں۔''

ارجمند سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ابھی یہ بات نہ کی ہوتی تو پورا معاملہ ہی الٹ جاتا۔

''کیا ہو گیا تجھے؟ میں نے کہا نا کہ ہم تو تیری خوشی میں خوش ہیں۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا دادی اماں! میں انکار کرتی تو اچھی بات نہیں تھی۔ یہ معاملات تو بڑوں کے ہوتے ہیں نا، میں تو آپ سے یہ کہہ رہی ہوں کہ وہ لوگ آئیں تو چاہے وہ لڑکا آپ کو کتنا ہی اچھا لگے، اور چاہے وہ لوگ بھی اچھے لگیں، آپ انکار کر دیجئے گا۔''

یہ سن کر دادی اماں کے چہرے پر ایسی خوشی اور سکون نظر آیا کہ وہ دمکنے لگا۔

''تو تجھے وہ لڑکا پسند نہیں؟''

''مجھے تو کوئی لڑکا بھی پسند نہیں۔''

''پر یہ تو بتا کہ لڑکا ہے کیسا......؟''

''ہے تو بہت اچھا۔ لیکن دادی اماں! مجھے شادی وادی نہیں کرنی۔''

''یہ تو سبھی لڑکیاں کہتی ہیں۔ پر شادی تو ہوتی ہی ہے نا!''

ارجمند نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ جب تک وہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ وہ یہ چاہتی ہے تو پریشان تھیں۔ اب اس نے انکار کو کہا تو خوش ہو گئیں۔ اور اب لڑکے میں دلچسپی لے رہی ہیں۔

''ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ میری مرضی کی بڑی اہمیت ہے۔ اور آپ میری خوشی میں خوش ہیں۔''

''تو میں کب انکار کر رہی ہوں اس سے۔''

''تو بس آپ ان لوگوں کو منع کر دیجئے گا۔''

''پر نگی! ایسے تو منع نہیں کیا جا سکتا۔ اگر لڑکا مجھے اچھا لگا تو میں کیا کروں گی؟'' دادی اماں کے لہجے میں شرارت تھی۔

''بس میں کچھ نہیں جانتی۔'' ارجمند نے کہا۔

''آپ کو انکار کرنا ہو گا۔''

''چل ٹھیک ہے۔ لیکن اس کے بھی کچھ طور طریقے ہوتے ہیں۔''

ارجمند اس طرف سے تو مطمئن ہو گئی۔ یہ طے تھا کہ اب دادی اماں اس معاملے کو سنبھال لیں گی۔ وہ اسٹڈی میں چلی گئی۔ وہاں بیٹھ کر وہ سکون سے سوچ سکتی تھی۔ دادی اماں کے رویے نے اسے الجھا دیا تھا۔ اب یہ بات تو بالکل واضح تھی کہ ابتداء میں وہ پریشان بھی ہو گئی تھیں۔ بلکہ انہیں صدمہ بھی ہوا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی، جب ان کے خیال میں وہ اس رشتے میں دلچسپی لے رہی تھی۔ لیکن جب اصل صورتِ حال ان پر واضح ہو گئی تو وہ ایسی خوش ہوئیں کہ خوشی ان سے چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ بلکہ وہ الٹا اسے ستانے لگیں۔ یہ کیا بات تھی، یہ کیا بھید تھا؟

اسے تشویش ہونے لگی۔ ابھی وہ ایک مسئلے سے پوری طرح نجات حاصل نہیں کر پائی کہ دوسری تشویش لاحق ہو گئی۔ دادی اماں کے انداز کی ایک ہی توضیح اس کی سمجھ میں آئی تھی، یہ کہ شاید وہ پہلے ہی سے اس کے لئے کسی کو پسند کئے بیٹھی تھیں اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ بہرحال یہ تو بعد کی بات تھی۔ فی الحال تو مسئلہ فرحان کا تھا۔ اس کی طرف سے بھی اب اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ دادی اماں اسے سنبھال لیں گے۔

پر اس کے خیالات کی رو آغا جی کی طرف مڑ گئی۔ وہ کوشش کرتی تھی کہ آغا جی کو یاد نہ کرے۔ لیکن وہ ہر روز ان کی جلد از جلد واپسی کے لئے دعا کرتی تھی۔ وہ ان کی اور آپی کی خیریت اور بہتری کے لئے بھی باقاعدگی سے دعا کرتی تھی۔ اور آغا جی کے لئے اولاد کی دعا تو وہ کبھی بھولتی ہی نہیں تھی۔ لیکن آخر میں بس اس کے دل میں اسی آیت مبارکہ کی گونج رہ جاتی...... اَمْ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ مَاتَمَنّٰی ...... واپسی تو

دور کی بات تھی، پچھلے چھ برسوں میں اسے آغا جی کی دید بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ تو عید پر بھی نہیں آسکے تھے۔ اس پر مزید پریشانی کی بات یہ تھی کہ ایسا آپی کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے ہوتا رہا تھا۔ کچھ ایسا تھا کہ کراچی جانے کے بعد آپی صحت کے مسائل میں بری طرح گھر گئی تھیں۔

چھ سال! اس نے سرد آہ بھر کے سوچا۔ چھ سال تو گزر گئے۔ اور نہ جانے کتنا انتظار باقی ہے۔

❁ ❁ ❁

اس میں کوئی شک نہیں کہ حمیدہ بڑے صبر والی تھی۔ دیکھا جائے تو اس کی زندگی کا عنوان ہی انتظار تھا۔ پہلے وہ اپنے وصال دین کے بڑے ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ اور جب ارمانوں سے سر اٹھانا شروع کیا تو وہ باپ کے ساتھ چلا گیا۔ کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔ اس نے ساری امیدیں عبدالحق سے جوڑ لیں۔ مگر جس دن اس نے شوہر اور بیٹے کو کھویا، اس دن اسے عبدالحق کو بھی رخصت کرنا پڑا۔ پھر وہ آنکھوں سے محروم ہوئی، اور اس نے جانا کہ آنکھیں نہ رہیں تو پل دن کے برابر ہو جاتے ہیں۔ وہ اتنا طویل انتظار نہیں تھا، جتنا اس کے لئے ہو گیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ امید ہی چھوڑ بیٹھی تھی۔ رب نے کرم فرمایا کہ نہ صرف اسے عبدالحق سے ملایا، بلکہ اس کی آنکھیں بھی سے لوٹا دیں۔ اس کے بعد تو ایسی تلافی ہوئی کہ اللہ کی کریمی پر اس کا ایمان پختہ ہو گیا۔ جتنا کچھ کھویا تھا، اللہ نے عبدالحق کے ذریعے اس سے زیادہ عطا فرما دیا۔ رابعہ، زبیر، نوربانو، پھر زرینہ اور زرینہ کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کا گھرانا، پھر مسعود صاحب اور ان کا گھرانا اور آخر میں نکی، اس کا تو گھر بھر گیا۔

عبدالحق کا کراچی تبادلہ ہوا تو وہ نہیں گھبرائی۔ وہ تو بڑی جدائی دیکھ چکی تھی۔ اس کے سامنے تو یہ جدائی ہی نہیں تھی۔ عبدالحق کی آواز تو وہ سنتی ہی رہتی تھی۔ لیکن جب پہلی عید آئی اور عبدالحق گھر نہیں آیا تو اسے صدمہ ہوا۔ اور وجہ تھی نوربانو۔ وہ وہاں بیمار ہو گئی تھی۔ بلکہ عبدالحق نے بتایا کہ وہ زیادہ تر بیمار ہی رہتی ہے۔ لیکن عید بقرعید پر اس کی بیماری بڑھ جاتی تھی۔

ابتداء میں تو حمیدہ نے بدگمانی نہیں کی۔ لیکن جب تیسری عید بھی بیٹے کی دید کے بغیر گزر گئی تو اس نے جان لیا کہ اس سے ڈری ہوئی نوربانو اب یہاں واپس آنا ہی نہیں چاہتی۔ اب وہ اسے کیسے بتاتی، کیسے سمجھاتی کہ اس کا ڈر بے بنیاد ہے۔ اسے تو اللہ نے اطمینان دے دیا ہے، اور اس نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ اب کوئی قدم نہیں اٹھائے گی۔

تب اسے نوربانو پر غصہ آنے لگا۔ بدگمان لڑکی نے ہمیشہ اسے اپنا حریف، اپنا دشمن سمجھا۔ اب یہ جو وہ کر رہی تھی، یہ تو بدترین ظلم تھا۔

پھر بھی اس نے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ نوربانو کی دل جوئی ہی کرتی رہی۔ عبدالحق شرمندہ ہوتا تھا، اس نے اسے بھی سمجھایا کہ وہ دل چھوٹا نہ کرے۔ زندگی میں ایسی آزمائشیں آتی ہیں، اور ان کے بعد بڑی خوشیاں ملتی ہیں۔

اور اب اسے عبدالحق کی شکل دیکھے چھ سال ہو گئے تھے۔

لیکن نوربانو کی تھوپی ہوئی اس جدائی میں وہ اکیلی نہیں تھی۔ رابعہ، زبیر اور ساجد اس کے ساتھ تھے۔ مسعود صاحب بیوی بچوں کے ساتھ ہفتہ دس دن میں ایک چکر ضرور لگاتے تھے۔ گاؤں سے زرینہ اپنے بچوں کے ساتھ آتی رہتی تھی۔ پھر کبھی وہ لوگ خود بھی گاؤں چلے جاتے تھے۔ تو وہ کوئی سخت جدائی نہیں تھی۔ لیکن عید سے دس پندرہ دن پہلے جو عبدالحق کے آنے کی آس بندھتی تھی، اور پھر اس آس کے ٹوٹنے کے بعد کتنے ہی دن تک اس کا دکھ رہتا تھا، وہ بہت بڑی سختی تھی۔ اب اس پر تو کسی کا اختیار ہوتا نہیں ہے۔ وہ تو امکان نہ ہوتے ہوئے بھی لگ جاتی ہے۔

لیکن اس دکھ کے باوجود حمیدہ کے لئے خوشیوں کی کمی نہیں تھی۔ بچوں کو اپنے سامنے بڑے ہوتے دیکھنا بہت بڑی خوشی ہوتی ہے۔ زرینہ کے بچے تو خیر دور تھے، اور کبھی کبھی ہی آتے تھے، لیکن ساجد تو اس کی آنکھوں کے سامنے بڑا ہو رہا تھا۔ وہ بہت پیارا اور نیک لڑکا تھا۔ آیا تو چھوٹا سا تھا لیکن اب اس نے بڑی تیزی سے قد نکالا تھا۔

مگر سب سے بڑی خوشی تو نکی تھی۔ عبدالحق کے بعد اگر حمیدہ کو کسی سے ویسی محبت ہوئی تھی تو نکی سے ہوئی تھی۔ اور جب سے اس کے دل میں وہ خواہش

جا گئی تھی تو نکی کی محبت اور بڑھ گئی تھی۔ اور بابا کی خوش خبری کے بعد تو وہ اس کی آنکھوں کا تارا بن گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ مرحوم ٹھاکر کی نسلوں کی امین ہے۔ وہ اسے دیکھ کر جیتی تھی۔

بچے آنکھوں کے سامنے بڑے ہوں تو اتنا پتا نہیں چلتا۔ چھ برس میں نکی اس کے سامنے بڑی ہوتی رہی، اور اسے پتا نہیں چلا۔ پھر کچھ دن پہلے وہ ایک صبح کالج جاتے ہوئے اسے سلام کرنے کے لئے آئی تو رابعہ اس کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ نکی کتنی بڑی ہوگئی ہے۔ رابعہ کا قد کم تو نہیں تھا، لیکن نکی اب اس سے ایک ہاتھ اونچی ہوگئی تھی۔

تب اس نے غور سے نکی کو دیکھا اور اس کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔ ارے ... اتنی خوب صورت، اس نے حیرت سے سوچا۔ حالانکہ نکی شروع ہی سے غیر معمولی حسین تھی۔ لیکن اب تو ... نظر تو اسے لگتی ہی رہتی ہوگی۔ اس نے دل ہی دل میں اس کی بلائیں لیں، اور تصور میں اس کے ساتھ عبدالحق کو کھڑا کر کے دیکھا۔ کیا خوب صورت جوڑی تھی۔

اس دن سے نکی کو دیکھنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی بن گئی۔

پھر دو دن پہلے نکی نے اچانک اس کے دل کو اندیشوں سے بھر دیا۔ وہ اس سے کہیں جانے کی اجازت مانگنے آئی تھی۔ حمیدہ کو تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ اس نے بے پروائی سے اسے زبیر سے بات کرنے کو کہا۔ مگر وہ اس کی اجازت پر اصرار کر رہی تھی۔

''اجازت کی تجھے کیا ضرورت؟'' حمیدہ نے کہا۔

اس پر نکی نے اسے کالج میں اپنے ساتھ پڑھنے والے ایک لڑکے کے بارے میں بتایا۔ اور بات کرتے کرتے وہ شرمانے لگی۔

حمیدہ کے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے ابھی کچھ ہی دن پہلے تو پہلی بار محسوس کیا تھا کہ نکی جوان ہوگئی ہے۔ جوانی کا اپنا ایک نکھار ہوتا ہے۔ لیکن نکی تو اتنی خوب صورت ہوگئی تھی کہ کروڑوں میں الگ نظر آئے۔ اور وہ اس پر خوش ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے وہ ہر روز اس کی نظر اتارنے لگی تھی۔

مگر اس لڑکے کے تذکرے پر اسے خیال ہوا کہ اس نے دیر کر دی۔ نکی کو تو پہلے ہی نظر لگ چکی ہے۔ اور اسے اپنی بے وقوفی پر غصہ آنے لگا۔ خوشی اپنی جگہ، وہ اتنی جہاں دیدہ عورت، اسے ڈر کیوں نہیں لگا۔ یہ تو عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ نکی تو ہر کسی کو اچھی لگتی ہوگی۔ لیکن نکی کو بھی تو کوئی اچھا لگ سکتا تھا۔ اور لگتا تھا کہ اسے کوئی بھا گیا ہے۔ اب وہ کیا کرے؟ اس نے ہراساں ہو کر سوچا۔

نکی اسے بتا رہی تھی کہ وہ لڑکا اس سے ملنا چاہتا ہے۔ نکی نے تو اسے گھر بلانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ کہیں باہر ملنا چاہتا تھا۔ اور نکی نے اس کے لئے ہاں کر دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اس لڑکے کو پسند کرتی ہے۔ اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا اور وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ پہلی پہلی بار ہے نا ....

پھر حمیدہ نے سوچا، میں کر ہی کیا سکتی ہوں۔ اللہ کو جو منظور ہوگا، وہی ہوگا۔ بابا نے یہی کہا تھا۔ نہ وہ کچھ روک سکتی ہے، نہ اس کے چاہنے سے کچھ ہو سکتا ہے۔ اب یہ تو نکی کی اچھائی ہے کہ وہ ملنے کے لئے ہاں کرنے پر شرمندہ ہے، اس سے پوچھے بغیر ہاں کرنے پر۔ اور وہ کہہ رہی تھی کہ وہ منع کر دے گی تو وہ ہرگز نہیں جائے گی۔ اس کی اس ادا پر، اس دکھی کر دینے والی صورت حال کے باوجود حمیدہ کو اس پر پیار آنے لگا۔

اس نے نکی کو اجازت دے دی۔ پر اندر ہی اندر اس کا دل ڈوب رہا تھا۔

نکی نے اس کا شکریہ ادا کیا، اور دوبارہ شرمندگی کا اظہار کیا۔

اچانک حمیدہ کو خیال آیا کہ اس نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ وہ اس سے ملنے کہاں جائے گی؟ سو اس نے پوچھ لیا۔ باغ کا سن کر وہ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ خود بھی اکثر وہاں جاتی رہی تھی۔ شام کو وہاں بڑی رونق ہوتی تھی۔ لیکن وہ بہت بڑا باغ تھا۔ وہاں بہت سی جگہیں سنسان بھی ہوتی تھیں۔

نکی نے اسے اطمینان دلایا کہ وہاں سینکڑوں لوگ ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی اس نے لڑکے کی تعریف بھی کر دی۔ اس سے حمیدہ کی تشویش اور بڑھ گئی۔

بہرحال اس نے اجازت دیتے ہوئے کہا کہ وہ زبیر سے بات کر لے اور اس کے ساتھ چلی جائے۔

اس لمحے سے اس نے نکی پر گہری نظر رکھی۔ مگر اس کی تشویش اور بڑھ گئی۔ نکی باقاعدہ اہتمام کر رہی تھی۔ اس نے سموسے تیار کئے، چائے بنا کر تھرمس بھرا اور باسکٹ میں رکھ لی۔ حمیدہ کا جی چاہا کہ زبیر سے اس کا خیال رکھنے کو کہے۔ لیکن فوراً ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ تو کوئی اچھی بات نہ ہوتی۔ زبیر بھی کیا سوچتا، اور اس کی نظروں میں نکی کی عزت بھی کم ہوتی۔

اسے پھر بابا کا خیال آ گیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ لیکن پھر خیال آیا کہ انہوں نے تو یہ بات نور بانو کے سلسلے میں کہی تھی کہ وہ خود ہی سب کچھ کر دے گی۔ یہاں تو معاملہ ہی اور تھا۔

بہر حال اللہ توکل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

نکی چلی گئی۔ ایک ایک لمحہ اسے برس لگ رہا تھا۔ وہ جو خیالوں میں تنکا تنکا کر کے آشیاں بنا رہی تھی، کہیں بکھر نہ جائے۔ اس دوران اس نے کچھ بھی نہیں کیا، بس اللہ سے دعا کرتی رہی۔

بالآخر خدا خدا کر کے نکی واپس آ گئی اور وہ سیدھی اسی کے پاس آئی۔ حمیدہ نے بڑے غور سے اسے دیکھا۔ وہ گئی تھی کہ کچھ پریشان اور گھبرائی ہوئی تھی۔ مگر اب کافی بہتر لگ رہی تھی۔ حمیدہ کو اس سے بھی تشویش ہونے لگی۔

کہنا تو وہ چاہتی تھی کہ بڑی دیر لگا دی نکی! لیکن اس نے پوچھا۔

''تو تو بڑی جلدی آ گئی نکی!''

''آپ یہ کیوں نہیں پوچھتیں کہ اس لڑکے نے مجھے کیوں بلایا تھا؟'' نکی جھنجلا گئی۔

حمیدہ نے دل میں سوچا، کیونکہ میں جاننا ہی نہیں چاہتی۔ اس نے کہا۔

''پوچھنے کی کیا بات ہے؟''

''بات یہ ہے دادی اماں کہ وہ لڑکا مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

حمیدہ کے لئے اندیشے کے باوجود وہ ایسا دھماکا تھا، جس نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ جس بات سے وہ ڈر رہی تھی، وہی بات نکلی نا! بہت کوشش کر کے اس نے خود کو سنبھالا۔

''تو پھر.....! تو نے کیا کہا اس سے.....؟''

''میں نے تو کچھ بھی نہیں دادی اماں! اس نے کہا کہ کل اپنے گھر والوں کو ہمارے گھر بھیجے گا رشتے کے لئے۔''

حمیدہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ بات اتنی تیزی سے آگے بڑھے گی، یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اب نکی لڑکی تھی، اور وہ بھی شرم و حیا والی۔ یہ کیسے بتاتی کہ اس نے لڑکے سے کیا کہا۔ لیکن دونوں کے درمیان یہ بات طے ہوئی ہوگی۔ اور اب وہ رشتہ مانگنے آئیں گے..... کل۔

نکی کو بھی شاید اس کا دکھ نظر آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔

''اب میں کیا کرتی دادی اماں! اسے منع تو نہیں کر سکتی تھی۔''

حمیدہ کے اندر امید کا ٹمٹماتا ہوا اکلوتا دیا بھی بجھ گیا۔ اب لڑکی اس سے زیادہ صاف طور پر اپنی مرضی کیسے بتا سکتی ہے۔ وہ کہہ تو رہی ہے کہ اسے منع نہیں کر سکتی تھی۔ گویا معاملہ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اللہ کو پکارا اور بولی۔

''چل نکی! تیری مرضی! لڑکیوں کو تو ایک دن رخصت کرنا ہی پڑتا ہے۔ تیری مرضی ہے تو یوں ہی سہی۔ ہم تو تیری خوشی میں خوش ہیں۔''

مگر اس بات کے جواب میں نکی نے جو کہا وہ سن کر حمیدہ پھر سے حمیدہ پھر سے جی اٹھی۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ چاہے اسے لڑکا اچھا لگے، اس کے گھر والے بھی اچھے لگیں، اسے انکار کرنا ہوگا۔

حمیدہ کے لئے اپنی خوشی کو چھپانا ناممکن ہو گیا۔ تاہم اس نے موقع غنیمت جانا اور چہرہ پکا کر کے تفصیل سے پوچھ گچھ کر ڈالی۔ پتا یہ چلا کہ نکی کو تو کوئی لڑکا بھی پسند نہیں، اور نہ ہی وہ شادی کرنا چاہتی ہے۔ حمیدہ نے بظاہر کہا کہ لڑکا اچھا لگا تو وہ ہاں بھی کر سکتی ہے۔ کیونکہ لڑکیوں کی شادی تو کرنی ہی ہوتی ہے۔ اس پر نکی خوشامدیں کرنے لگی۔

اگلے روز لڑکا اپنی ماں اور بہن کے ساتھ آیا۔ حمیدہ نے لڑکے کو بھی دیکھا۔ وہ اسے بہت اچھا لگا۔ اگر اس کے ذہن میں عبدالحق نہ ہوتا تو وہ اس لڑکے کو

انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی ماں اور بہن کو دیکھ کر بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ اچھے گھر کے ہیں۔

لڑکا تھوڑی دیر بیٹھا۔وہ شاید ان دونوں کو لے کر آیا تھا۔ یہ کہہ کر چلا گیا کہ جب وہ فون کر دیں گی تو وہ انہیں لے جانے کے لئے آجائے گا۔ یہ بھی اس کی شرافت کی دلیل تھی۔

لڑکے کے جانے کے بعد اس کی ماں نے جھجکتے جھجکتے رشتے کی بات شروع کی۔ان کے انداز میں عاجزی اور شائستگی تھی۔

''مجھے آپ لوگ بھی اچھے لگے اور آپ کا بیٹا بھی۔'' حمیدہ نے سچائی سے کہا۔

''لیکن ہمیں اس پر سوچنا اور مشورہ کرنا ہوگا۔''

''جی ضرور...!'' لڑکے کی ماں نے کہا۔

''شادی تو زندگی بھر کا معاملہ ہوتا ہے۔''

''آپ اپنا فون نمبر نکی کو دے دیجئے۔''

انہوں نے بیٹے کو فون کرنا چاہا تو حمیدہ نے کہا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے؟ گاڑی موجود ہے۔ ہمارا ڈرائیور آپ کو چھوڑ آئے گا۔''

ان کے جانے کے بعد نکی خوش خوش اس کے پاس آئی۔

''آپ نے انہیں منع کر دیا نا دادی اماں!''

''نہیں نکی! ابھی تو میں نے ان سے سوچنے کے لئے وقت مانگا ہے۔''

نکی ایک دم بجھ سی گئی۔

''یہ کیا کیا آپ نے دادی اماں! میں نے کہا تھا نا...''

''تو تو بچی ہے نکی! ان باتوں کو نہیں سمجھتی۔ ایسا منع تو نہیں کیا جاتا کہ دوسروں کو بے عزتی محسوس ہو۔'' حمیدہ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ تو یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دے۔ ہوگا وہی جو تو چاہے گی۔''

''ٹھیک ہے دادی اماں!'' نکی نے کہا۔لیکن وہ اب بھی بے چین تھی۔

حمیدہ کو اس کے انداز سے شبہ ہونے لگا کہ وہ ضرور کسی کو پسند کرتی ہے۔ ورنہ اس رشتے سے انکار کے لئے اتنی بے تاب نہ ہوتی۔ اس بات نے اسے پھر تشویش میں مبتلا کر دیا۔

''نکی...! مجھے سچ سچ بتا، تجھے کوئی اچھا لگتا ہے...؟'' اس نے پوچھا۔

اس پر نکی نے ایسی شکایت بھری نظروں سے اسے دیکھا کہ اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔

''میں جھوٹ نہیں بولتی دادی اماں.....!'' اس نے کہا۔

''گھر سے باہر کالج میں یا کہیں بھی، میں کسی کو نظر اٹھا کر دیکھتی ہی نہیں۔ تو مجھے کوئی اچھا کیسے لگے گا۔ اور مجھے کوئی شوق بھی نہیں ہے ایسی باتوں کا۔''

اس کے لہجے میں ایسی سچائی تھی کہ حمیدہ دل کی گہرائی تک مطمئن ہوگئی۔لیکن یہ بات بھی اس کی سمجھ میں آگئی کہ گھر میں بیری کا درخت اونچا ہوگیا ہے۔ اور اب رشتوں کے پتھر آتے ہی رہیں گے۔ اس کے دل کی گہرائی سے دعا نکلی کہ بس اب عبدالحق واپس آجائے۔ جو ہونا ہے، ہو جائے۔

✿ ✿ ✿

کراچی میں انہیں چھ سال ہوگئے تھے۔نور بانو کے لئے وہ بن باس تھا۔ لیکن وہی اس کا حفاظتی قلعہ بھی تھا۔ اس کے باوجود وہ یہاں خود کو بہت تنہا محسوس کرتی۔ یہاں بس ایک عارف کا ہی گھر تھا اس کے لئے۔

آدمی کا کوئی نہ ہو تو اسے صبر آجاتا ہے، جیسے امی اور بہنوں کو کھو کر اسے آیا تھا۔لیکن اس کے بعد اللہ نے اسے بہت نوازا تھا۔ اسے اتنی محبتیں ملی تھیں کہ شاید وہ ناقدری کرنے لگی تھی۔ اسے عبدالحق ملا، اماں ملیں۔ انہوں نے ہمیشہ اسے بیٹی سمجھا، ویسی ہی محبت کی۔ درمیان میں یہ بیچ نہ آجاتا تو... مگر نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ درحقیقت بات اس بیچ کی نہیں ہے۔ چلو، اماں کو ہٹاؤ، اور بھی تو کتنے لوگ تھے، جو اس سے محبت کرتے تھے۔ زبیر اور رابعہ، پھر زرینہ اور ڈاکٹر صاحب کا گھرانہ، مسعود صاحب اور ان کا گھرانہ۔لیکن اس نے کبھی کسی کی قدر نہیں کی۔وہ نہیں چاہتی تھی کہ

اس کے اور عبدالحق کے درمیان کوئی آئے۔ اور اسی کی وجہ سے اس نے شادی سے پہلے رمضان کی طاق راتوں میں وہ ناقص دعا کی، جو اس کے لئے بددعا بن گئی۔
جس پر اب وہ پچھتاتی تھی، توبہ کرتی تھی۔ لیکن لگتا تھا کہ نہ اس کی توبہ کبھی قبول ہوگی، اور نہ اس کی وہ مقبول جاہلانہ بددعا اب کبھی ساقط ہوگی۔

انہی خراب معاملات کی وجہ سے تو وہ اس تبادلے پر خوش ہوئی تھی۔ وہ جو اپنے اور عبدالحق کے درمیان اولاد کا وجود بھی گوارا نہیں کرتی تھی، اب اس کے سر پر سوکن کی تلوار لٹک رہی تھی۔ کسی کا اس کے اور عبدالحق کے بیچ میں آنا تو بہت چھوٹی بات تھی، یہاں تو عبدالحق کو بانٹنے کی نوبت آ رہی تھی۔ ایسے میں یہ تبادلہ اس کے لئے بڑی نعمت تھا۔ وہ ایک بڑی مشکل سے بچ کر یہاں چلی آئی تھی۔

لیکن یہاں کی تنہائی میں اس پر کھلا کہ وہ محبتیں کتنی بڑی نعمت تھیں، جن کی وہ ناقدری کرتی رہی تھی۔ وہ سب لوگ کتنی عزت کرتے تھے اس کی، کتنا خیال رکھتے تھے اس کا۔ اور اب یہاں عارف کی بیوی کے سوا کوئی اسے پوچھنے والا بھی نہیں تھا۔ اور وہ بھی کچھ اسی طرح کی تھی۔ ابھی خوش مزاج ہے، اور ابھی ایک پل میں بدمزاج اور بے مروت۔ بہرحال وہ پھر بھی غنیمت تھی۔

تو ایک بہت بڑے نقصان سے بچنے کے لئے یہ کالے پانی کی سزا اس نے گوارہ کر لی تھی۔ لیکن سب لوگ اسے یاد آتے تھے اور ارجمند کو تو وہ دن میں سینکڑوں بار یاد کرتی تھی۔ وہ تو اس کی بچھڑی ہوئی محبوب بہن تھی، جسے اللہ نے اپنی رحمت سے دوبارہ اس سے ملا دیا تھا۔ وہ تو وہاں بھی اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔

کاش وہ...... صرف وہ اس کے ساتھ کراچی آ گئی ہوتی۔ لیکن پھر اس کے ساتھ حمیدہ بھی ہوتی۔

نور بانو طبعاً دوراندیش تھی۔ یہ تبادلہ عین اس وقت ہوا تھا، جب حمیدہ اس کے گلے میں سوکن کا طوق ڈالنے ہی والی تھی۔ اس نے اس وقت سوچ لیا تھا کہ وہ جب بھی کراچی سے واپس آئے، چاہے عارضی طور پر ہی آئے ہوں، سوکن کا مرحلہ پھر سامنے آئے گا۔ اس سے بچنے کی ایک ہی تدبیر تھی۔ لاہور واپس نہ جانا اور یہ آسان کام نہیں تھا۔ مگر اس نے اس کی ترکیب سوچ لی تھی۔

اور کراچی آتے ہی اس نے اس پر عمل درآمد شروع کر دیا۔
کراچی آئے انہیں دس دن ہی ہوئے تھے کہ اس نے عبدالحق سے کہا۔
''یہاں آنے کے بعد سے مجھے پیٹ میں ہلکا ہلکا درد رہنے لگا ہے۔''
''آب و ہوا تبدیل ہوتی ہے تو ایسا ہو جاتا ہے۔'' عبدالحق نے بے پرواہی سے کہا۔
''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔''
لیکن ایک مہینہ ہوا ہوگا کہ اس نے پیٹ کے شدید درد کا پہلا عملی مظاہرہ کر کے دکھایا۔ صرف پیٹ پکڑ کر تڑپنا ہی کافی نہیں تھا۔ چہرے پر شدید اذیت کا تاثر بھی لانا تھا۔ وہ بھی اس کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اسے صرف اتنا تصور کرنا تھا کہ حمیدہ عبدالحق کی دوسری شادی کرا رہی ہے۔ پھر وہ عبدالحق کی سہاگ رات کا تصور کرتی، اور اسے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔
عبدالحق دہل کر رہ گیا۔ وہ اسے اسپتال لے کر گیا۔ بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ لیکن مسئلہ حل نہیں ہوا۔ ہوتا کیسے، مسئلہ تھا ہی نہیں۔
نور بانو نے ایک بات کا خیال رکھا تھا۔ پیٹ کا وہ درد روز کا معمول نہیں تھا۔ وہ تو مہینے میں ایک بار اٹھتا تھا، اور وہ چار پانچ دن شدید اذیت میں نظر آتی۔ اس کے بعد وہ کافی دنوں تک ٹھیک رہتی۔
فون پر ان کی لاہور بات ہوتی رہتی تھی۔ ابتداء میں تو اس نے عبدالحق کو اپنی صحت کے مسئلے پر بات کرنے ہی نہیں دی۔
''چھوڑیئے...... اب ایسا بھی نہیں، وہ لوگ سنیں گے تو بلاوجہ پریشان ہوں گے۔''
لیکن جب عید کی چھٹیوں پر لاہور جانے کا معاملہ سامنے آیا اور عین وقت پر اسے شدید درد اٹھا تو عبدالحق کو بتانا ہی پڑا۔
''اماں......! میں عید پر لاہور نہیں آسکوں گا۔ نور بانو کی طبیعت بہت خراب ہے۔''
''کیا ہوا اسے......؟'' حمیدہ نے تشویش سے پوچھا۔

''یہاں آتے ہی پیٹ میں تکلیف کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اسے دورے سے پڑتے ہیں اماں!''

''ڈاکٹر کو دکھایا.....؟''

''کوئی ڈاکٹر نہیں چھوڑا اماں! مگر کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔''

''ہوا پانی کی تبدیلی لگتی ہے۔''

''شاید یہی بات ہے۔ مگر اماں! مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''اچھا تو فکر نہ کر۔ علاج کراتا رہ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ.....!''

''مجھے تو بس یہ غم ہے اماں کہ عید تمہارے بغیر.....''

''دور ہونے سے کیا ہوتا ہے پتر.....! میں تو ہر وقت تجھے یاد کرتی ہوں۔ دعا کرتی ہوں تیرے لئے۔''

''پھر بھی اماں.....!''

''تو غم نہ کر پتر.....!''

عید کے بعد بقر عید بھی نکل گئی۔ علاج چلتا رہا۔ ڈاکٹر بدلتے رہے۔ افاقہ نہ ہونا تھا، نہ ہوا۔ عبدالحق کی پریشانی بڑھتی رہی۔

اگلی عید پر پھر وہی صورتِ حال تھی۔ پھر وہی معذرت، پھر وہی دلاسے۔ وہی عید کی تنہائی، وہی اپنوں کی یادیں۔

''کراچی تمہیں راس نہیں آیا۔'' عبدالحق نے اس سے کہا۔

''ہونے والی بات تو کہیں بھی ہو جاتی۔''

''کہیں اور کبھی ایسا نہیں ہوا۔'' عبدالحق مصر تھا۔

''وقت وقت کی بات ہے۔''

''میں سوچتا ہوں، ہم واپس لاہور چلیں۔''

یہ سن کر نور بانو کی جان نکل گئی۔ لگتا تھا طبیعت پھر خراب ہو رہی ہے۔

''تبادلہ ہو سکتا ہے آپ کا.....؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''کیسے.....؟''

''میں ملازمت چھوڑ دوں گا۔''

''نہیں.....! ایسا تو سوچئے گا بھی نہیں۔'' نور بانو نے تڑپ کر کہا۔

''چچا جان کو کتنا دکھ ہو گا۔ اور یہ تو قومی خدمت ہے۔''

''مگر تمہاری زندگی سے بڑھ کر تو کچھ بھی نہیں۔''

''کیسی بات کرتے ہو۔ آپ اماں کو چھوڑ کر آ گئے۔ آپ نے تو اس وقت بھی نوکری چھوڑنے کو کہا تھا۔ لیکن اماں کا دل دیکھیں، انہوں نے آپ کو منع کر دیا۔ میں تو اماں کے قدموں کی خاک بھی نہیں۔ میری وجہ سے آپ دو بڑوں کو دکھ پہنچائیں، یہ میں گوارہ نہیں کر سکتی۔''

عبدالحق بہت متاثر ہوا اس کے ایثار سے۔

''لیکن نور بانو.....!''

''کچھ نہیں جناب! جو ہونا ہے، وہ تو ہو کر ہی رہتا ہے۔ یہاں ہو یا وہاں ہو۔ آپ ایسی باتیں کریں گے تو میں اپنی تکلیف آپ سے چھپانا شروع کر دوں گی۔ کچھ بھی گزر جائے مجھ پر، بتاؤں گی ہی نہیں آپ کو۔''

''نہیں نور.....! ایسا غضب کبھی نہ کرنا۔ تمہیں میری قسم.....!'' عبدالحق گھبرا گیا۔

''بس تو آپ بھی میری وجہ سے نوکری چھوڑنے کا خیال بھی دل میں نہ لائیے گا۔''

یوں بات ختم ہو گئی۔ عبدالحق پر بھی اس کی دھاک بیٹھ گئی۔

لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بات کب تک نبھائی جا سکے گی۔

اگلی عید پر بھی ظاہر ہے کہ وہی صورتِ حال تھی۔ لیکن نور بانو بہر حال تنوع کی قائل تھی۔

''بت بہت ہو گئی۔'' اس نے غصے سے کہا۔

''میں اب اور برداشت نہیں کر سکتی۔ اس بار کم از کم آپ تو چلے ہی جائیں۔''

عبدالحق نے حیرت اور تاسف سے اسے دیکھا۔

"تمہیں اکیلا چھوڑ کر......؟"

"اکیلا کیوں......؟ عارف بھائی کا پورا گھرانہ موجود ہے۔"

"میں اپنا بوجھ دوسروں پر ڈالنے کا عادی نہیں ہوں۔"

نوربانو کو موقع مل گیا۔ وہ رونے لگی۔

عبدالحق گھبرا گیا۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا اچانک......؟"

"اب میں بوجھ ہو گئی نا آپ کے لئے۔ اللہ دشمن کو بھی بیماری سے محفوظ رکھے۔ سچ ہے کہ تن درستی بڑی نعمت ہے۔"

عبدالحق کا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا نور......!"

نوربانو نے اس کی بات کاٹ دی۔

"بخدا مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ یہ تو مقدر کی بات ہے کہ پردیس میں مجھے یہ بیماری لاحق ہو گئی۔ وہاں ہوتی تو اماں، ارجمند اور سب لوگوں کا سہارا ہوتا۔ آپ پر اتنا بوجھ بھی نہ پڑتا۔ اب یہاں تو آپ اکیلے ہیں۔ بوجھ تو آپ کو بڑا ہی لگے گا نا! لیکن پھر بھی میں آپ کو ملازمت نہیں چھوڑنے دوں گی۔"

"ارے......! میری بات تو سن لو۔" عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔

"بدقسمتی سے غلط لفظ نکل گیا زبان سے۔ میں ذمہ داری کہنا چاہتا تھا، بوجھ نہیں، کیا تم میری ذمہ داری نہیں ہو......؟"

"یہی تو رونا ہے کہ ذمہ داری بوجھ بن گئی ہے آپ کے لئے۔"

"میں کہہ رہا ہوں کہ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"ایک تو میں سب سے بچھڑ کر رہ گئی۔" نوربانو نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔

"اس پر یہ بیماری، اب تہوار تو اپنے لوگوں کے درمیان ہی اچھے لگتے ہیں۔ پردیس میں کیا تہوار۔ کیسے میرا دل تڑپتا ہے اماں سے ملنے کو۔ لیکن نہیں جا

سکتی۔ اور جانتی ہوں کہ میرا یہ حال ہے ان کے بغیر، تو آپ کا کیا حال ہوگا۔ آپ تو مجھ سے بہت زیادہ چاہتے ہیں انہیں۔ آپ کی تو وہ ماں ہیں۔ اسی لئے تو میں نے کہا کہ مجھے چھوڑیں، آپ اس بار عید پر گھر ضرور چلے جائیں۔ لیکن آپ نے تو بوجھ قرار دے کر دل ہی توڑ دیا میرا۔"

"میری بات سنتی سمجھتی ہی نہیں ہو۔ اپنی ہی کہے جاتی ہو۔" عبدالحق نے بڑی مشکل سے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پایا۔

"میرا مطلب یہ تھا کہ عارف بھائی بہت اچھے ہیں، اپنوں جیسے ہیں، لیکن خدانخواستہ تمہاری طبیعت خراب......"

"رضوانہ بھابی بھی تو ہیں، بچے بھی تو ہیں۔"

"میں تمہیں کسی اور پر چھوڑ کر چلا جاؤں، یہ کیسے ممکن ہے......؟"

"تین دن ہی کی تو بات ہے۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

نوربانو کو لگا کہ عبدالحق کے اندر اس خیال کی قبولیت سر اٹھا رہی ہے تو اس نے جلدی سے پینترا بدلا۔

"میں جانتی ہوں کہ رضوانہ بھابی بہت تنگ مزاج ہیں، پل میں ماشہ پل میں تولہ، کبھی کبھی ایسے ہو جاتی ہیں، جیسے جانتی ہی نہیں۔ لیکن بہرحال زیادہ وقت تو خیال ہی رکھتی ہیں میرا۔ اب یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ کبھی آپ کے پیچھے میری طبیعت خراب ہی نہیں ہوئی۔ پھر بھی بہت اچھی ہیں وہ......"

عبدالحق خود بھی اس طرف سے متردد تھا۔ جو عورت شوہر کا خیال نہ رکھے، جو اس کی ذمہ داری ہوتا ہے، وہ کسی اور کی کیا فکر کرے گی۔ وہ ایسی نہ ہوتیں تو عارف بھائی زیادہ وقت گھر سے دور گزارنے کی کوشش کیوں کرتے۔

سو اس نے دل میں حتمی فیصلہ کر لیا۔

"دیکھو نوربانو! یہ بچھڑنا اور ملنا بھی اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ مجھے اس کا بہت تجربہ ہے۔ سو میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں۔ جب اللہ کی مرضی ہوتی، مل جائیں گے۔"

''لیکن وہاں لوگ یہ بھی تو سمجھ سکتے ہیں کہ یہ سب میرا کیا دھرا ہے۔''

''کیوں سمجھیں گے، بیماری پر کسی کا اختیار ہوتا ہے بھلا.....!''

''پھر بھی یہ تیسری عید ہوگی۔ کوئی کہے نہیں، لیکن دل میں تو سوچ سکتا ہے۔''

''نہیں.....! میں نہیں مانتا۔''

''دیکھیں..... لوگ بدگمانی بھی تو کرتے ہیں، اور جبکہ وجہ بھی موجود ہو۔''

عبدالحق اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

''وہاں کوئی بدگمان کرنے والا نہیں۔ وہ سب تو الٹا ہمارے لئے پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' اس نے کہا۔ پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔

''بدگمانی کرتے ہوئے تو میں نے بس تمہیں ہی دیکھا ہے۔''

نوربانو کو احساس ہوا کہ وہ معقولیت کی لکیر سے آگے بڑھ گئی ہے۔

''جی ہاں! میں تو خیر بری ہوں ہی.....''

''میں نے یہ نہیں کہا۔ اب کمزوریاں تو ہر آدمی میں ہوتی ہیں۔ مجھ میں تم سے زیادہ ہیں۔ البتہ یہ میرا مشاہدہ ہے کہ تم بدگمانی بہت کرتی ہو۔ تم دوسروں کی محبت اور خلوص پر کبھی یقین نہیں کرتیں۔ ہمیشہ شک ہی کرتی ہو۔''

''بدگمانی تو سبھی کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کوئی منہ سے نہیں کہتا۔ میں کہہ دیتی ہوں۔ مجھے منافقت نہیں آتی۔''

''اب یہ تو بہت برا لفظ ہے۔ اور سوچو تو، کن لوگوں کے لئے یہ لفظ استعمال کر رہی ہو تم۔'' اب عبدالحق کے لہجے میں برہمی تھی۔

نوربانو کو احساس ہوا کہ معاملات بگڑ رہے ہیں۔

''آپ خوامخواہ بات بڑھا رہے ہیں۔'' اس نے نرمی سے کہا۔

''میں آپ سے بس اتنا کہہ رہی ہوں کہ اس بار آپ عید پر گھر چلے جائیں۔''

''اور اب میں جو تم سے کہہ رہا ہوں، چاہتا ہوں کہ تم اسے ہمیشہ یاد رکھو۔'' عبدالحق نے کہا۔

''آئندہ کبھی مجھ سے اس موضوع پر بات نہ کرنا۔ جب میں جانے کا فیصلہ کروں گا تو خود ہی تمہیں بتا دوں گا۔''

نوربانو کا دل خوش ہوگیا۔ اس کا تو مسئلہ ہی حل ہوگیا۔ تاہم اس نے سہمے ہوئے لہجے میں عبدالحق سے کہا۔

''آپ مجھ سے ناراض ہوکر یہ بات کہہ رہے ہیں؟''

''نہیں.....! تم جانتی ہو کہ میں تم سے ناراض نہیں ہو سکتا۔ میں تمہاری بہتری کے لئے کہہ رہا ہوں۔ اب اگر اس سلسلے میں کوئی بھی تم سے شکایت کرے تو تم اسے یہ بات بتا سکتی ہو کہ اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ ہم کبھی لاہور نہیں گئے تو اس کا ذمہ دار میں ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ بس آپ مجھ سے خفا نہ ہوں۔''

اس کے بعد بھی عید کے عرصے میں ہمیشہ اس کی طبیعت خراب ہوتی رہی۔ ہر بار وہ عبدالحق سے یہی کہتی کہ میں کچھ کہوں گی تو آپ خفا ہو جائیں گے، لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ اس بار..... اور ہر بار عبدالحق اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا۔

''تم ایک بار کی بات سنتی کیوں نہیں ہو؟''

اور وہ چپ ہو جاتی۔

یوں چھ برس گزر گئے۔ کراچی میں محفوظ تو تھی لیکن مطمئن نہیں تھی۔ اسے لگتا تھا کہ لاہور میں حمیدہ تیار بیٹھی ہوگی۔ ادھر عبدالحق وہاں پہنچا اور ادھر اس کی دوسری شادی۔ بہتری اسی میں تھی کہ وہ کراچی ہی میں رہیں، لاہور نہ جائیں۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ مستقل حل نہیں ہے۔ کبھی نہ کبھی تو انہیں لاہور جانا ہی ہوگا۔

اب یہ ہر سال ہر ماہ اسے اپنی طبیعت خراب کرنی ہوتی تھی۔ اگر فرضی بیماری کو صرف عید بقرعید تک محدود کر دیا جاتا تو وہ مشتبہ قرار پا سکتی تھی۔ دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ طبیعت ٹھیک ہونے کی صورت میں عبدالحق اچانک کسی بھی وقت لاہور جانے کا پروگرام بنا سکتا تھا۔ چھٹی لینا اس کے لئے کوئی مسئلہ نہ ہوتا، کیونکہ چھٹی وہ کبھی کرتا ہی نہیں تھا۔ سو ہر ماہ پیٹ کے درد کا دورہ اس کی مجبوری تھی۔

علاج اس کا مسلسل ہو رہا تھا۔ رضوانہ بھابی نے روحانی علاج کی تجویز

پیش کی تو وہ ڈر گئی۔ وہ جانتی تھی کہ بیشتر جعلی بزرگ ہوتے ہیں، جن کا مقصد ضعیف الاعتقاد لوگوں کو لوٹنا ہوتا ہے۔ لیکن ان کے درمیان کہاں کوئی برگزیدہ ہستی موجود ہے، اس کا کسی کو کہاں پتا چلتا ہے۔ اس کا تجربہ اسے لاہور میں ہوگیا تھا، جہاں ایک بزرگ نے حمیدہ کے سامنے تقریباً اس کی پول کھولدی تھی۔ اس نے حمیدہ سے اسے ساتھ لانے کو کہا تھا، اور اس نے ڈر کے مارے صاف انکار کر دیا تھا۔ بات صحیح معنوں میں خراب ہی وہیں ہوئی تھی۔ اس کے نتیجے میں تو وہ یہاں جلاوطنی کی سزا بھگت رہی تھی۔

ایک دن رضوانہ بھابی نے عبدالحق کے سامنے یہ تذکرہ چھیڑ دیا۔

''ایک بابا ہیں، کیسا ہی مریض چلا جائے، شفایاب ہوتا ہے۔ لیکن نور بانو مانتی ہی نہیں۔''

عبدالحق نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''اس میں حرج ہی کیا ہے۔ چلی جاؤ نا !''

''آپ بھی اس ضعیف الاعتقادی پر یقین رکھتے ہیں۔'' نور بانو نے شکایتاً کہا۔

''فضول باتیں مت کرو۔ میں صرف اللہ پر یقین رکھتا ہوں۔ لیکن اللہ کے برگزیدہ بندوں کا انکار تو نہیں کر سکتا۔''

''پہچان بھی ہے آپ کو ان کی ؟''

''اب چہرے پر تو کسی کے نہیں لکھا ہوتا۔''

''تو ان کی امید پر آدمی جعلی بزرگوں سے کیوں دھوکا کھائے۔''

رضوانہ کو یہ بات بہت بری لگی۔

''میں جو کہہ رہی ہوں کہ بابا صرف کچھ پڑھ کر دم کرتے ہیں، اور مریض ٹھیک ہو جاتا ہے۔''

''میں نہیں مانتی۔''

''دیکھو نور بانو! اس شہر کا کوئی ایسا ڈاکٹر نہیں، جس کے پاس میں تمہیں لے کر نہیں گیا۔ مگر کوئی تمہارے مرض کی تشخیص بھی نہیں کر سکا۔ کوئی تمہارے مرض کی

نوعیت بھی نہیں سمجھ سکا۔''

''لیکن دوا سے مجھے آرام تو آتا ہے نا!''

''وقتی طور پر۔ بیماری ختم تو نہیں ہوتی۔ وہ بس تمہیں درد روکنے کی دوا دیتے ہیں، جو مسئلے کا حل نہیں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اس کا ایک ہی مطلب ہے یہ کہ تمہاری بیماری روحانی ہے۔ تو اس کا علاج بھی روحانی ہونا چاہئے۔''

''نہیں بھئی ! میں تو اسے شرک سمجھتی ہوں۔'' نور بانو نے کہا۔

اس کے بعد عبدالحق کے لئے کچھ کہنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن رضوانہ تین دن تک اس سے منہ پھلائے رہی۔

دوا تو اسے مستقل طور پر کھانے کے لئے دی جاتی تھی۔ لیکن کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اسے کوئی بیماری ہے ہی نہیں۔ اس لئے عام دنوں میں وہ دوا کھانے کے بجائے اسے تلف کر دیتی تھی۔ لیکن جتنے دن وہ پیٹ میں درد کی اداکاری کرتی، اسے دوا کھانے پڑتی۔ کیونکہ اس عرصے میں عبدالحق خود اپنے ہاتھ سے اسے دوا کھلاتا۔

وہ طبعاً وہمی تو تھی ہی۔ جبکہ یہاں تو صورت حال یہ تھی کہ وہ بغیر کسی ضرورت کے دوا استعمال کر رہی تھی۔ اسے دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں اس کے نتیجے میں اسے سچ مچ کوئی بیماری لاحق نہ ہو جائے۔

کراچی میں رہتے ہوئے چھٹا سال شروع ہوا تھا کہ ایک دن اچانک سچ مچ اس کے پیٹ میں ایسا درد اٹھا کہ وہ ماہی بے آب ہوگئی۔ اس وقت عبدالحق بھی دفتر گیا ہوا تھا۔ اس کی چیخیں نکل گئیں۔ لیکن پڑوس میں رضوانہ اور اس کے بچوں تک آواز نہیں پہنچی۔ اس روز پہلی بار اس نے اپنی خوشی سے وہ دوا استعمال کی، جو وہ تلف کر دیا کرتی تھی۔

دوا کے استعمال کے آدھے گھنٹے بعد اس کا درد تھم گیا۔ لیکن اس وقت تک وہ پسینے میں نہا چکی تھی، اور کمزوری ایسی تھی کہ اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر اس سے اٹھ کر بیٹھا بھی نہیں گیا۔ جسم سے جیسے جان نکل گئی تھی۔

دیر تک وہ بستر پر پڑی رہی۔ رضوانہ اتفاق سے کچھ لینے کے لئے آئی

تو اس نے دیکھا کہ نور بانو کا چہرہ پیلا پڑا ہے، اور وہ ملنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ اس نے فون کر کے عبدالحق کو دفتر سے بلوا لیا۔

عبدالحق پریشان ہو گیا۔ کیونکہ شدید درد کے دوران بھی اس نے نور بانو کو کبھی اس حال میں نہیں دکھا تھا۔ وہ اسے اس ڈاکٹر کے پاس لے گیا جس کے وہ ان دنوں زیر علاج تھی۔

ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''یہ السر کا معاملہ ہے۔ معدے کے منہ میں واضح طور پر ورم ہے۔''

''تو پھر آپ کیا تجویز کرتے ہیں؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''پہلے تو دواؤں سے علاج کریں گے۔ ٹھیک نہ ہوا تو پھر آپریشن کرانا ہو گا۔''

اس بار ڈاکٹر نے بڑی سختی سے پرہیز کی تاکید کی۔

لیکن نور بانو نے اسے اہمیت نہیں دی۔ اس کے نزدیک اسے کوئی بیماری تھی ہی نہیں۔ یہ تو ان دواؤں کا فساد تھا، جو وہ بے ضرورت استعمال کرنے پر مجبور تھی۔ اس لئے اس نے پرہیز پر مطلق توجہ نہیں دی۔

ڈاکٹر نے دوا تبدیل کر دی تھی۔ لیکن وہ اس دوا کے ساتھ بھی وہی سلوک کر رہی تھی۔ دوا وہ لیتی ہی نہیں تھی۔ البتہ چند ایک بار درد اٹھا تو اس نے دوا لے لی۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس بار دوا اس کے لئے ضروری ہے، اور دوا اسے اس کے مرض کو پیچیدہ کر رہا ہے۔

اس بار عید آئی تو اس کی طبیعت سچ مچ اتنی خراب تھی کہ اداکاری کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد کہہ دیا کہ اب آپریشن ناگزیر ہو گیا ہے۔

آپریشن کا سن کر تو نور بانو کے ہوش اڑ گئے۔ اس کا پیٹ کاٹا جائے گا، یہ تصور ہی اس کے لئے سوہانِ روح تھا۔ اس نے تو واویلا مچا دیا۔

''میں تو آپریشن نہیں کراؤں گی۔''

''معمولی سا آپریشن ہے۔ خوامخواہ گھبرا رہی ہو۔'' عبدالحق نے اسے

سمجھایا۔

''معمولی سا؟ ارے پیٹ کاٹا جائے گا میرا۔''

''کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تم فکر نہ کرو۔''

''نہیں، میں نہیں کراؤں گی آپریشن۔''

''یوں تو بڑا نقصان ہو جائے گا خدانخواستہ۔''

نور بانو چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

''مرنا ہی ہے تو اپنوں میں جا کر کیوں نہ مروں؟ بس آپ مجھے لاہور لے چلیں۔''

''چلو ٹھیک ہے، میں چھٹی کی بات کرتا ہوں۔''

نور بانو بیٹھ کر سوچتی رہی۔ اب اسے لاہور جانا تھا۔ اور کون جانے کہ وہ زندہ بچے یا نہ بچے۔ اب حمیدہ تو اپنی مرضی کر کے رہے گی۔ تو کیا وہ ہار جائے گی۔ نہیں ..... ہارنا تو نہیں ہے اسے۔

اور سوچ سوچ کر ایک حل اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ حمیدہ کو کیوں کچھ کرنے دے۔ وہ سب کچھ خود ہی نہ کر لے۔ اور جب متاعِ جان لٹانی ہی ہے، تو کسی غیر پر کیوں لٹائی جائے؟

❁ ❁ ❁

عبدالحق کے لئے کراچی میں وہ چھ سال سزائے قید بامشقت کے تھے۔ لیکن طبعاً وہ قناعت پسند تھا۔ سمجھتا تھا کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ اور ایمان رکھتا تھا کہ اس میں نہ صرف اس کی، بلکہ سبھی کی بہتری ہے۔ اور جب آدمی زندگی کو اللہ کی رضا سمجھ کر گزارے تو مشکل بھی مشکل نہیں رہتی، آسان ہو جاتی ہے۔ سو وہ عرصہ اس کے لئے اتنا ناخوش گوار بھی نہیں رہا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اماں کو اور سب لوگوں کو یاد کرتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ نور بانو کی بیماری کی وجہ سے وہ ان سے ملنے کے لئے ایک بار بھی لاہور نہ جا سکا۔

یہ نور بانو کی بیماری کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ اس جیسا بدگمانی سے بچنے والا آدمی بھی بدگمانی کا شکار ہو گیا۔ بات ہی ایسی تھی، ویسے تو مہینے میں ایک بار وہ درد

ضرور اُٹھتا تھا، اور کئی دن تک رہتا تھا، لیکن عید بقر عید سے تو جیسے اس درد کو دشمنی تھی۔ وہ عید پر لاہور جانے کا پروگرام بناتا اور ادھر وہ درد نور بانو پر حملہ آور ہو جاتا۔ نتیجتاً لاہور جانے کا پروگرام دھرا رہ جاتا۔

عبدالحق کو حمیدہ اور نور بانو کی چپقلش کا علم تھا، اور وہ اس کے سبب سے بھی واقف تھا۔ ایسے میں بدگمانی تو فطری تھی۔ اسے افسوس ہوتا تھا کہ نور بانو اس پر بھی بھروسہ نہیں کرتی، اور اماں کو تو وہ سمجھتی ہی غلط ہے۔

لیکن تیسری عید پر جب نور بانو کی طبیعت خراب ہوئی تو وہ ضد کرنے لگی کہ وہ اسے اس حال میں چھوڑ کر ہی لاہور چلا جائے۔ اس دن اس کی بدگمانی دور ہوئی۔ وہ بہت شرمندہ ہوا اور نور بانو پر اسے بہت پیار آیا۔ اس روز اس نے رب کی مرضی کے سامنے پوری طرح سر جھکا دیا۔ اس نے نور بانو سے سختی سے کہہ دیا کہ یہ معاملہ اس کا ہے، اس میں وہ بھی اس سے ضد نہ کرے۔

اور اب چھ سال بعد آپریشن کی نوبت آئی تو اسے پتا چلا کہ وہ درد حقیقی تھا۔ اس کی بدگمانی بہت پیچھے کی بات تھی، مگر پھر بھی اس کی شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔

ان چھ برسوں میں اسے سب سے زیادہ فکر حمیدہ کی صحت کی طرف سے رہی۔ لیکن اللہ کے فضل وکرم سے اس معاملے میں خیر ہی رہی۔ موسمی بیماری کی بات الگ، ورنہ اسے کبھی پتا نہیں چلا کہ اماں بیمار ہوئی ہیں۔ وہ ہر روز ان کے لئے خاص طور پر دعا کرتا تھا۔

اس عرصے میں ٹیلی فون بہت بڑا سہارا تھا۔ ہفتے میں ایک بار وہ لاہور فون ضرور کرتا تھا، اور سبھی سے بات ہو جاتی تھی۔ حمیدہ کو تو فون پر بات کرنا عجیب لگتا تھا، اس لئے وہ زیادہ دیر بات نہیں کرتی تھی۔ ارجمند کا بھی یہی حال تھا۔ لگتا تھا کہ اس کے پاس بات کرنے کے لئے کوئی موضوع ہی نہیں ہے۔ البتہ زبیر تفصیل سے بات کرتا تھا۔ وہ زمینوں کے معاملات پر اس سے مشورے بھی لیتا تھا۔

دوسری طرف سے ارجمند بھی باقاعدگی سے فون کرتی تھی۔ لیکن وہ عام طور پر اس وقت فون کرتی تھی جب وہ دفتر میں ہوتا تھا۔ قدرتی طور پر اسے نور بانو

سے اور نور بانو کو اس سے بہنوں جیسی محبت تھی۔ جب بھی ارجمند کا فون آتا تو دفتر سے واپسی پر نور بانو اسے بتاتی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ لاہور کی تفصیلی خیر خبر تو انہیں ارجمند سے ہی ملتی تھی۔

عبدالحق کبھی سوچتا کہ ارجمند اس سے جھجکتی ہے۔ شاید بچپن میں، نادانی میں اس کے بارے میں اپنی کی ہوئی باتیں اس میں جھجک پیدا کرتی ہیں۔ اب وہ بھی اسے نہیں سمجھا سکتا تھا کہ اس نے کبھی بھی اس کی اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔

لیکن اسے یاد تھا کہ وہ لاہور میں اسے پڑھاتا رہا تھا۔ پڑھائی کے دوران اس کے انداز میں حیاء تو ضرور ہوتی تھی، لیکن وہ اس سے جھجکتی بالکل نہیں تھی۔ شاید وہ بھی اپنے بچپن کی احمقانہ سوچ کو بھلا چکی تھی۔ تو پھر اب اسدوری پر یہ جھجک کیسی، یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اس کے تصور میں وہ اب بھی وہی چھوٹی سی بچی تھی۔ بہت سلیقے سے دوپٹہ اوڑھ کر بڑی بڑی باتیں کرنے والی سمجھ دار بچی۔ اور ان کے درمیان قرآنی آیات کے حوالے سے جو بھی گفتگو ہوئی تھی، وہ اسے کبھی نہیں بھولا تھا۔ بلکہ اس گفتگو کے حوالے سے تو وہ اسے اور عزیز ہوگئی تھی۔

اپنے محبوب لوگوں سے دوری کے وہ چھ برس اس کے لئے بے کار بہر حال نہیں تھے اس عرصے میں بہت کچھ ہوا اور اس نے بہت کچھ سیکھا۔ اسے بڑھے قیمتی تجربات اور مشاہدات بھی حاصل ہوئے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے بڑی خوشیاں بھی ملیں۔ ملکی اور قومی سطح پر بھی اس عرصے میں بہت کچھ ہوا۔ اس نے ایک اہم بات سیکھ لی۔ بظاہر منفی نظر آنے والے واقعات اور معاملات مثبت نتائج بھی لاتے ہیں۔ اور اس عرصے میں اس کا یہ ایمان بھی پختہ ہوا کہ پاکستان اللہ کی خاص رحمت ہے، اور انشاء اللہ پاکستان سے اللہ کو عالم اسلام کے لئے کچھ بڑے کام لینے ہیں۔

سیاسی عدم استحکام، نام نہاد جمہوریت اور آئے دن بدلتی حکومتوں کی وجہ سے ملک کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ قوم ایک اچھے آئین سے بھی محروم تھی۔ اختیارات

اور اقتدار کا سرچشمہ گورنر جنرل کا عہدہ تھا۔ عبدالحق کے خیال میں وہ قائد اعظم محمد علی جناح کی سب سے بڑی سیاسی غلطی تھی۔ قوم بظاہر آزاد ہو چکی تھی لیکن ذہنی آزادی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ گورنر جنرل کا عہدہ برقرار رکھنے کے نتیجے میں انگریزوں کی ذہنی غلامی سے نجات نہیں مل پا رہی تھی۔ تمام قوانین ہی انگریزوں کے زمانے کے چل رہے تھے۔ گورنر جنرل کا عہدہ تو غیر ملکی آقاؤں کے اقتدار کی علامت تھا۔ پہلے گورنر جنرل انگریز ہوتا تھا اور وہ مطلق انسان ہوتا تھا۔ کم از کم ہندوستان میں تو وہ کسی کو جواب دہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ اس لئے تھا کہ انگریز اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پھر وہاں چیک اینڈ بیلنس کا کوئی نظام سرے سے موجود نہیں تھا، جو کہ جمہوریت میں بہت ضروری ہوتا ہے، تاکہ کوئی بھی پوری طرح من مانی کرنے کے قابل نہ رہے۔ دنیا بھر میں یہ اصول رائج ہے کہ ریاست تین ستونوں پر قائم ہوتی ہے، مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ۔ اور جہاں ایسا نہیں ہوتا، وہاں یا تو بادشاہت قائم ہوتی ہے یا آمریت۔ ایک جمہوری ملک میں ان تینوں ستونوں کے درمیان توازن کے ساتھ طاقت تقسیم کر دی جاتی ہے، پھر ایک مربوط نظام کے تحت وہ تینوں چیک اینڈ بیلنس کے ذریعے ایک دوسرے پر نظر رکھتے ہیں۔ یہاں سب کچھ گورنر جنرل کے پاس تھا۔ اور کسی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس لئے سیاسی جوڑ توڑ، ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا، جس کے نتیجے میں مستحکم حکومت قائم ہی نہیں ہو پاتی تھی۔

پھر بدقسمتی سے ایک ذہنی مریض اور جسمانی طور پر معذور شخص گورنر جنرل کے عہدے پر مسلط ہو گیا۔ اس کے دور میں کسی کی بھی عزت نہیں رہی۔ امور مملکت کی باگیں بیمار انا کے ہاتھوں میں چلی گئیں۔

عبدالحق سمجھتا تھا کہ اس مسلسل صورت حال کے نتیجے میں جو خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں، وہ خود بھی بہت دیرپا ہیں اور ان کے اثرات بھی بہت دیرپا ہیں۔ قومی سطح کے معاملات کی اصلاح آسان نہیں ہوتی۔ اس کام میں برسوں کی نہیں دہائیاں لگتی ہیں۔ عبدالحق کا تجزیہ یہ تھا کہ اس صورت حال سے سیاسی اور جمہوری عمل کو نقصان پہنچ رہا ہے، ایسا نقصان جس کی تلافی میں سو سال بھی لگ سکتے ہیں۔ اس

کے علاوہ سیاست دانوں میں منفی سوچ اور رجحانات پیدا ہو رہے ہیں۔ ہر سیاست دان کا بنیادی ہدف حصول اقتدار ہوتا ہے۔ نارمل حالات میں اس کے لئے وہ عوام کو خوش کرنے اور خوش رہنے کی کوشش کرتا ہے، تبھی تو ملک اور قوم کی خدمت کا نظریہ ابھرتا ہے۔ لیکن یہاں دس برس ہونے کو آئے تھے، اور اس عرصے میں سیاست دانوں کی سیاسی تربیت غلط خطوط پر ہوتی رہی تھی۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ عوام کے منتخب کرنے کی کوئی اہمیت نہیں۔ جو اقتدار پر کلی طور پر قابض ہے، اسے خوش کرنا ضروری ہے، خواہ اس میں ملک اور قوم کا نقصان ہو، خواہ وہ عوامی مفادات سے متصادم ہو۔ اقتدار کی ہتھیلی میں سے اقتدار کے ایک گڑ کی ڈلی حاصل کرنے کے لئے اس کی خوشامد کرنی ہوگی، جو ہتھیلی پر قابض ہے۔ وہ تو ایک طرح سے سیاسی نیلام گھر تھا، جو چاہے اونچی بولی دے کر چند روزہ عارضی اقتدار اپنے نام چڑھا لے۔ اور یہ احساس کہ یہ اقتدار کسی بھی لمحے چھن سکتا ہے، کرپشن کے فروغ کا سبب بن رہا تھا۔ صاحب اقتدار، اقتدار کے ہر لمحے کو کیش کرا لینا چاہتا تھا۔ ورنہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو کیسے خوش رکھتا۔ ایسے میں سیاست کی اعلیٰ اقدار کا فروغ کیسے ممکن تھا۔ وہ تو ایک خاص اور یقینی عرصے کے لئے اقتدار ملے، اور اس کے بعد دوبارہ عوام کے پاس جانا ہو تو جواب دہی کا خوف ہوتا ہے۔ دوبارہ اقتدار کے لئے سیاست دان کارکردگی کی فکر کرتا ہے۔ یہاں تو ایسا کچھ تھا ہی نہیں۔ یہاں تو عارضی اور محدود اقتدار کے لئے فرد واحد کی گالیاں تک سننی پڑتی تھیں۔ تو سیاست دانوں میں عزت نفس تو رہی ہی نہیں تھی۔

1956ء میں آئین بنا۔ وہ اگرچہ بہت اچھا آئین نہیں تھا، لیکن بہرحال آئین تو تھا۔ آئین سے محروم قوم کی حیثیت تو افریقہ کے پس ماندہ علاقے میں پائے جانے والے جنگلیوں کے کسی قبیلے سے بھی حقیر ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے وہ آئین غنیمت تھا۔

لیکن 1958ء میں عجیب واقعہ ہوا۔ ملک میں پہلا مارشل لاء لگا اور جنرل محمد ایوب خان نے آئین معطل کر کے اقتدار سنبھال لیا۔ سیاست دانوں کی زبان بندی کا قانون بنا دیا گیا۔ یعنی آزادیٔ تقریر و تحریر پر قدغن لگا دیا گیا۔ یوں نام نہاد

جمہوریت بھی ختم ہوگئی۔اب ملک میں مکمل اور مسلم آمریت تھی۔ایک مہذب ملک اور قوم کے لئے یہ امر نہایت شرم ناک تھا۔

مگر کچھ عرصے کے بعد اس کے فوائد سامنے آنے لگے۔آمریت کے سائے میں ہی سہی، لیکن ایک مستحکم حکومت ملک میں پہلی بار قائم ہوئی تھی۔پھر اقتدار کیونکہ بہرحال غصب کیا گیا تھا تو غصب کرنے والے کو کچھ کر کے دکھانے کا خیال بھی تھا۔اور اکیلا آدمی کچھ کر نہیں سکتا، جبکہ یہاں تو ہر میدان میں کچھ کر کے دکھانا ضروری تھا۔چنانچہ ہر فیلڈ کے بہترین لوگوں کو جمع کیا گیا۔پہلی بار بہت غور وخوض کے بعد معاشی اور اقتصادی پالیسیاں بنانے کی طرف توجہ دی گئی۔اس کے نتیجے میں ملک کے لئے ایک اقتصادی راہ کا تعین کیا گیا۔اس بات کی ضرورت سمجھ لی گئی کہ زراعت پر مکمل انحصار ترک کر کے صنعت کو فروغ دینا ہوگا۔یوں پہلا پنج سالہ منصوبہ سامنے آیا، جس کے اہداف ترقی لانے والے تھے۔

عبدالحق خوش تھا کہ پرانی دبی ہوئی فائلیں حرکت میں آئی ہیں۔اس کی اپنی بہت سی تجاویز پر عمل درآمد ہو رہا تھا اور کچھ کی اصلاح بھی کی گئی تھی۔پہلی بار ملک وقوم کے لئے کچھ سوچا جا رہا تھا۔اور صرف سوچا نہیں، اس پر عمل بھی کیا جا رہا تھا۔

اس کے نتیجے میں ملک میں معاشی استحکام بھی آیا۔بے روزگاری میں بھی کمی ہوئی اور روپے کی قیمت مستحکم ہوگئی۔درآمدات کے مقابلے میں برآمدات بڑھیں تو زرِمبادلہ کی صورت حال بھی بہتر ہوئی۔پہلی بار پاکستانی روپے کی قدر بھارتی روپے سے بڑھ گئی۔پاکستان خوش حالی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

مسعود صاحب سے بات ہوتی رہتی تھی۔وہ بھی اس بات سے خوش تھے کہ صحیح سمت میں قدم اٹھایا جا رہا ہے اور کام ہو رہا ہے۔ان کا کہنا تھا کہ وہ اسے واپس بلوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔انہوں نے بتایا کہ اس کا کام بے کار نہیں گیا۔اب اس سے استفادہ ہو رہا ہے۔

چھ برس کم نہیں ہوتے۔چھ برس کی اس زندگی میں بے شمار یادگار واقعات پیش آئے۔لیکن تین واقعے ایسے تھے، جنہیں عبدالحق کبھی بھلا نہیں سکتا تھا۔تینوں کی

نوعیت بھی الگ تھی اور اختتامی تاثر بھی مختلف تھا۔

ان میں سے ایک شفیق صاحب سے ملاقات کا تھا۔

اسے کراچی آئے ایک سال ہوا تھا کہ ایک دن عارف نے کہا۔

''آج میرے ساتھ چلو عبدالحق!''

وہ اتوار کا دن تھا۔

''کہاں جا رہے ہیں؟''عبدالحق نے پوچھا۔

''ایک بڑے صاحب علم آدمی ہیں، شفیق صاحب۔کب سے سوچ رہا تھا کہ تمہیں بھی ملوا دوں ان سے۔میں تو اکثر جاتا رہتا ہوں۔اس بار کچھ زیادہ ہی عرصہ ہوگیا ان سے ملے ہوئے۔''

''کرتے کیا ہیں....؟''

''کاروبار بچوں کے سپرد کر دیا ہے۔اب تو بس لوگوں کی روحانی امداد کرتے ہیں۔نجوم پر بڑی دسترس ہے ان کی۔لیکن بہت عرصے سے زائچہ بنانا چھوڑ رکھا ہے۔''

عبدالحق کو ان میں بڑی کشش محسوس ہوئی۔

''میں ضرور چلوں گا آپ کے ساتھ عارف بھائی!''

شفیق صاحب لالوکھیت میں رہتے تھے۔وہ عارف کی گاڑی میں وہاں پہنچے۔اٹھارہ بیس سال کے ایک لڑکے نے دروازہ کھولا۔عارف کو پہچان کر اس نے بڑے تپاک سے سلام کیا، ان دونوں سے ہاتھ ملایا اور بولا۔

''میں بیٹھک کا دروازہ کھولتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

ذرا دیر بعد اس نے مرکزی دروازے سے ذرا ہٹ کر ایک اور دروازہ کھولا۔

''تشریف لائیے۔''اس نے کہا۔

وہ بہت سادہ سی بیٹھک تھی۔چند کرسیاں تھیں، ایک صوفہ تھا، اور سامنے ہی ایک چارپائی تھی، جس پر صاف ستھری چادر بچھی ہوئی تھی۔

''آپ بیٹھئے! بابا جان ابھی آ رہے ہیں۔''لڑکے نے کہا۔

"پانی پیجئے گا۔"

"نہیں شکریہ.....!"

وہ دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔ چند لمحے بعد شفیق صاحب کمرے میں آئے۔ عبدالحق نے اندازہ لگایا کہ ان کی عمر پینسٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ لیکن صحت اچھی تھی۔ وہ پچپن سے زیادہ کے نہیں لگتے تھے۔ چہرے پر خوش نما داڑھی تھی، جو پوری طرح سفید نہیں تھی۔

ان دونوں نے اٹھ کر ان سے مصافحہ کیا۔ شفیق صاحب نے کہا۔

"اس بار آپ بہت عرصے کے بعد آئے ہیں عارف صاحب!"

"جی.....! مصروفیت کچھ زیادہ ہی رہی۔" عارف نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ لیکن یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ وہ عبدالحق کو بہت غور سے دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ شاید انہوں نے اس کی بات سنی بھی نہیں تھی۔

عبدالحق کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ اس نے نظریں جھکا لی تھیں۔ وہ کچھ عجیب سا ہوگیا تھا۔

عارف نے جلدی سے متعارف کرایا۔

"حضرت! یہ میرے بہت اچھے دوست اور کولیگ ہیں..... عبدالحق..... اور عبدالحق! یہ شفیق صاحب ہیں۔ میرے بہت محترم بزرگ اور راہنما۔"

شفیق صاحب نے جیسے اب بھی اس کی بات نہیں سنی۔

"ماشاء اللہ! کیسا روشن چہرہ ہے، اور کشادہ پیشانی۔" انہوں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

"آپ بیٹھئے نا.....!"

وہ دونوں بیٹھ گئے۔ شفیق صاحب بھی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

"اپنے دوست کے بارے میں کچھ اور بھی بتاؤ نا!"

"ان کا تعلق لاہور سے ہے۔ پچھلے سال تبادلہ ہو کر یہاں آئے ہیں۔"

"پتا نہیں، دل کیوں ان کی طرف کھنچتا ہے۔" شفیق صاحب نے کہا۔

"یہی تو کمال ہے حضرت! جو ملتا ہے، یہی بات کہتا ہے۔"

عبدالحق شرمندہ ہوگیا۔

"یہ تو اللہ کی عطا ہے۔ میری کوئی خوبی نہیں۔"

جس لڑکے نے اس کے لئے بیٹھک کا دروازہ کھولا تھا، وہ چائے لے آیا۔ ایک پلیٹ میں بسکٹ بھی تھے۔ شفیق صاحب اصرار کر کے انہیں کھلاتے رہے۔ پھر انہوں نے باتوں ہی باتوں میں عبدالحق سے پوچھا۔

"آپ کے بچے کتنے ہیں.....؟"

"ابھی تک تو محروم ہوں۔" عبدالحق نے کہا۔

"شادی کو کتنے برس ہوگئے.....؟"

"شاید چھ سال ہونے والے ہیں۔" سچ تو یہ ہے کہ عبدالحق کو یاد ہی نہیں تھا۔ لگتا تھا، ہمیشہ سے وہ نور بانو کے ساتھ ہے۔

"اوہ.....! کوئی بات نہیں۔ انشاء اللہ آپ اس نعمت سے بھی نوازے جائیں گے۔ جس نے یہ پیشانی دی ہے آپ کو، وہ کوئی محرومی نہیں ہونے دے گا۔"

شفیق صاحب کے لہجے میں خلوص تھا۔

"آپ عبدالحق کا زائچہ بنائیے نا حضرت.....!" عارف نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

شفیق صاحب ہچکچائے۔

"آپ جانتے ہیں کہ یہ شوق چھوڑے برسوں ہوگئے مجھے۔ لیکن نہ جانے کیوں، ان کا زائچہ بنانے کو دل چاہتا ہے۔"

"نجوم سے تو آپ کی دلچسپی پرانی ہوگی۔ کہاں سے حاصل کیا آپ نے.....؟" عبدالحق نے بات ٹالنے کے لئے کہا۔ وہ زائچے وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ کچھ اس لئے کہ اس کے نزدیک یہ ایمان میں کمزوری لانے والی چیز تھی۔ اور کچھ اس لئے کہ اولاد کے معاملے میں وہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"پرانی ہی ہوسکتی ہے۔ اس دور کے بڑے گیانی استاد سے سیکھا تھا میں نے۔" شفیق صاحب نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"تو آپ پروفیشنل بھی رہے.....؟"

''اللہ معاف کرے، گمراہی کے دور میں تو وسیلہ رزق ہی اس علم کو بنا رکھا تھا۔'' شفیق صاحب نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''اللہ نے ہدایت سے نوازا تو پھر کبھی پیسے نہیں لئے زائچہ بنانے کے۔'' وہ اٹھے۔

''میں معذرت چاہتا ہوں۔ ابھی حاضر ہوا۔'' یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے۔

''یہ کس چکر میں پھنسا دیا آپ نے؟'' عبدالحق نے سرگوشی میں عارف سے شکایت کی۔

''اسے اعزاز سمجھ بھائی...! یہ تو اب ....''

عارف کی بات اُدھوری رہ گئی۔ شفیق صاحب واپس آ گئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بہت پرانی بوسیدہ سی کتاب تھی۔ ساتھ میں ایک کاپی اور پنسل بھی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گئے۔ کتاب انہوں نے ایک طرف رکھی اور کاپی گود میں رکھ کر کھول لی۔

پھر کسی خیال نے انہیں چونکا دیا۔ انہوں نے غور سے عبدالحق کو دیکھا۔

''میں بھی بچوں کی طرح بے تاب ہو گیا۔ یہ تو پوچھا ہی نہیں آپ سے کہ آپ کو اپنی پیدائش کے کوائف کا علم بھی ہے یا نہیں۔''

عبدالحق جھوٹ سے ہمیشہ بچتا تھا۔ ورنہ اس وقت یہ کہہ کر جان چھڑا سکتا تھا کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔ اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹکا اور بولا۔

''والد صاحب ہر اہم بات ڈائری میں لکھ لیتے تھے۔''

''چلیں، آسانی ہو گئی۔ ورنہ زائچہ تو اس کے بغیر بھی بن سکتا تھا۔'' شفیق صاحب نے کہا۔

''اگرچہ اس پر سو فیصد اعتماد میں نہیں کر سکتا تھا۔''

عبدالحق نے بھی سوچا کہ اچھا ہوا، جھوٹ سے بچ گیا۔

''تو مجھے اپنی پیدائش کا سال، ماہ، تاریخ اور وقت بتا دیجئے۔''

عبدالحق ہچکچایا۔

''چھوڑیئے! رہنے دیجئے نا! مجھے اس میں زیادہ دلچسپی نہیں۔''

شفیق صاحب نے چونک کر اسے دیکھا۔ اپنے شوق کی بے تابی میں وہ یہ بات نوٹ نہیں کر سکتے تھے کہ عبدالحق کے انداز میں شروع سے ہی دلچسپی نہیں تھی۔ ورنہ جس کا زائچہ بنایا جا رہا ہو، وہ تو بہت بے تاب ہوتا ہے۔

''مجھے آپ میں کچھ کشش سی محسوس ہو رہی ہے۔ ورنہ اب تو میں کسی کا زائچہ بناتا ہی نہیں۔'' ان کے لہجے میں شکایت بھی تھی اور شرمندگی بھی۔

عبدالحق شرمندہ ہو گیا۔ ایک بزرگ آدمی اس کی وجہ سے شرمندہ ہو رہا تھا۔ لیکن وہ بھی کیا کرتا۔

''تو چلیں، آپ بھی بچ گئے۔'' اس نے کہا۔

''لیکن آپ کیوں بچتے ہیں اس سے؟'' شفیق صاحب نے پوچھا۔

''اللہ کے خوف کی وجہ سے۔'' عبدالحق نے مختصراً کہا۔

شفیق صاحب چند لمحے سوچتے رہے۔

''دیکھئے، اللہ سے ڈرنا تو ایمان کا حصہ ہے اور ایمان کو مستحکم کرنا ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ اگر میں غلطی پر ہوں، وہ نیت سے بھی واقف ہے۔ سب کچھ جانتا ہے۔ سب کچھ اللہ کا ہے۔ علم بھی اللہ کا ہے۔ اب وہ جسے جتنا چاہے دے، یہ اس کی مرضی۔ آپ سائنسی ایجادات کی بات کریں تو موجد تو صرف اللہ کی ذات ہے۔ بدیع اس کا اسم ہے۔ بے مثال چیزوں کا بنانے والا۔ اور سائنس اللہ علم کی ایک بہت معمولی شاخ ہے۔ ذرا سوچیں تو کہ نیوٹن پر کشش ثقل کا راز کیسے کھلا....؟''

عبدالحق بہت غور سے سن رہا تھا۔ اس مقام پر وہ چونکا۔ یہ سب کچھ تو اس نے اس وقت سوچا تھا، جب وہ بہت چھوٹا تھا۔

''اللہ کے دینے کے انداز بھی نرالے ہوتے ہیں۔'' شفیق صاحب کی بات جاری تھی۔

''کسی کے سر پر سیب گرے اور وہ اتنا بڑا بھید پا لے۔ یہ اللہ کا کرم ہی تو ہوتا ہے۔ اللہ نے انسان کے لئے پوری کائنات کو مسخر کر دیا۔ لیکن اس سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ اللہ کی راہنمائی کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ جب جب اللہ نے

راہنمائی فرمائی، انسان آگے بڑھا۔ تو کسی علم کو برا کیسے کہہ سکتے ہیں یا سمجھ سکتے ہیں آپ؟''

''استغفر اللہ! میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' عبدالحق نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

''ہاں! میں یہ سمجھ سکتا ہوں کہ ہر علم انسان کے لئے نہیں۔''

''کیوں نہیں! اللہ نے انسان کو اپنا نائب، اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ اپنی تمام صفات کا ایک ذرے کا ذرہ بھی اسے سونپا ہے۔ اور علم بھی اللہ کی صفات میں سے ایک ہے۔ تو علم تو اللہ ہی کا دیا ہوا ہے نا!''

''شیطان معلم الملکوت تھا۔ اسے بھی تو اللہ نے علم دیا تھا۔ اس علم سے ہی اس کا مرتبہ تھا، اس کی فضیلت تھی اور اسی پر اسے غرور تھا۔ تو علم تو شیطان بھی دے سکتا ہے۔'' عبدالحق نے دلیل دی۔

''ہاروت ماروت کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ ان کے پاس بھی اللہ کا دیا ہوا ایک علم تھا، جو انسانوں کے لئے نہیں تھا۔ لیکن انسانوں نے ان سے سیکھا، اور انسانوں کو تباہی کا سامان کیا۔''

''دیکھیں عبدالحق صاحب! وہ تو اللہ کی طرف سے آزمائش تھی۔ وہ دونوں فرشتے اس بات کا اعلان بھی کرتے تھے۔'' شفیق صاحب نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''میں بحث نہیں کر رہا ہوں۔ صرف اپنا نکتہ نظر واضح کر رہا ہوں۔ اللہ سب جانتا ہے۔ اللہ جانتا تھا کہ لوگ تنبیہ کے باوجود ان فرشتوں سے وہ علم سیکھیں گے۔ وہ جو سورۂ ملک میں اللہ نے فرمایا ﴿ اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ﴾ کیا وہی نہ جانے، جس نے پیدا کیا۔ تو یہ آزمائشیں ہیں جنت اور دوزخ کے لئے۔ اصل بات یہ ہے کہ علم جس ذریعے سے بھی پہنچا، ہے تو اللہ کا ہی۔ اور اللہ کی ہر نعمت کی طرح یہ بھی آزمائش ہے۔ نعمت پر آدمی پھول گیا، اترا گیا کہ یہ میرے علم، میری محنت یا میرے کسی کمال کی وجہ سے ہے تو گمراہ ہو گیا۔ اور سمجھا کہ یہ اللہ کی امانت ہے، اس کا فضل ہے اور اس سے دوسروں کو بھی فیض پہنچایا جائے، اسے انسانوں کے فائدے

کے لئے استعمال کیا جائے تو اس میں فلاح ہے۔

''اب ذرا سوچیں، اللہ اپنے عام بندوں کو بھی نوازتا ہے۔ ذہن میں کوئی خیال آتا ہے، کوئی بات سمجھ میں آتی ہے، جس کے بارے میں آپ کچھ بھی نہیں جانتے۔ کسی دستک پر آپ سوچتے ہیں کہ یہ فلاں شخص ہوگا۔ عقل تردید کرتی ہے، کیونکہ وہ شخص آپ سے ہزاروں میل دُور بیٹھا ہوگا۔ لیکن آپ دروازہ کھولتے ہیں تو وہیں شخص سامنے ہوتا ہے۔ کسی نے آپ کو یہ اطلاع دی؟ ہر شخص خواب دیکھتا ہے، جو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ زیادہ تر وہ تعبیر سے بے خبر ہوتا ہے۔ لیکن کبھی علم تعبیر سے بے بہرہ ہونے کے باوجود کوئی تعبیر اس پر واضح ہو جاتی ہے، اور درست بھی ثابت ہوتی ہے۔ کیسے؟ اور علم تعبیر کی بات کریں تو بنیادی طور پر اللہ نے یہ علم انبیاء کرام کو دیا۔ لیکن پھر یہ عام بندوں تک بھی پہنچا۔

یونانی محض آنکھ سے ستاروں کو دیکھتے، پہچانتے، مشاہدہ کرتے تھے۔ یہ صلاحیت انہیں کس نے دی تھی؟ نجوم پر تحقیق کی گئی، اصول ترتیب دیئے گئے۔ مختلف نشانیوں سے مختلف نتائج اخذ کئے گئے۔ یہ اخذ کرنے کی صلاحیت کس کی دی ہوئی تھی؟ کیا اللہ کی اجازت کے بغیر یہ ممکن تھا؟

عبدالحق صاحب! اللہ نے قرآن میں فرمایا کہ عزت ساری کی ساری اللہ کی ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جسے چاہے اور جتنی چاہے، عزت دیتا ہے۔ یہ اس کی مرضی ہے۔ کسی بادشاہ کو بھی عزت نہیں ملتی اور کسی نادار کو اتنی عزت ملتی ہے، جس پر لوگ رشک کریں، اور سوچیں تو اس عزت کی کوئی وجہ بھی نظر نہ آئے، اس کے باوجود خود بھی اس کی عزت کریں۔ یہی حال اور تمام نعمتوں کا بھی ہے اور علم کا بھی۔

اب میں اپنی مثال دیتا ہوں۔ کبھی میں زائچے بناتا تھا تو اس علم کے اصولوں کے تحت اس کی تشریح و تعبیر بیان کرتا تھا۔ میرے ذہن میں دور دور تک اللہ کا تصور بھی نہیں ہوتا تھا۔ مجھے تو صرف مال سے غرض ہوتی تھی۔ میری کوئی پیش گوئی درست ثابت ہوتی تھی تو میں خود پر، اپنے علم پر اتراتا تھا۔ میں اپنے استاد کو اور خود کو صاحب کمال سمجھتا تھا۔ یہ گمراہی تھی۔ مگر اب اللہ نے مجھ پر فضل فرمایا ہے، اور مجھے شعور عطا فرما دیا ہے کہ یہ سب اللہ کی عطا ہے۔''

"آپ اپنے علم سے کوئی پیش گوئی کرتے ہیں، اور وہ کسی کو مایوسی میں مبتلا کرتی ہے یا کسی کو خوش فہمی میں مبتلا کرتی ہے۔ اور بعد میں غلط ثابت ہوتی ہے تو دونوں صورتوں میں اس شخص کا نقصان ہوا نا!" عبدالحق نے کہا۔

"اسی لئے ہم واللہ اعلم بالصواب کہہ کر یہ واضح کر دیتے ہیں کہ حقیقت سے تو اللہ ہی باخبر ہے۔ ہم سے غلطی بھی ہو سکتی ہے اور عبدالحق صاحب! ہم نے آغاز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھا تو میرا ایمان ہے کہ اس میں اللہ کی طرف سے خیر ہی ہوگی۔ شر کا امکان بھی ہوگا تو انشاء اللہ رفع ہو جائے گا۔"

"لیکن مستقبل میں جھانکنے کی کوشش ہی کیوں کی جائے؟" عبدالحق نے اعتراض کیا۔

"یہ انسان کے لئے فطری ہے۔" شفیق صاحب نے کہا۔

"ہر شخص کسی نہ کسی حد تک خود کو غیر محفوظ سمجھتا ہے۔ اس لئے مستقبل کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔"

"لیکن یہ تو ایمان کی کمی ہوئی نا!"

"کامل ایمان کا دعویٰ کون کر سکتا ہے عبدالحق صاحب! ایمان تو گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اوّل تو اب میں زائچہ بناتا ہی نہیں۔ کسی کو بہت پریشان دیکھوں تو اس کی پرخلوص مدد کے خیال سے، اللہ کا نام لے کر بناتا ہوں۔ اللہ سے راہنمائی کی دعا کرتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ اسے مایوسی سے نکال کر امید کی طرف لے جاؤں۔ اور اسے اللہ کی طرف بڑھا دوں۔ میں اس سے کہتا ہوں، اللہ سے دعا کیا کرو۔ وہ مسبب الاسباب ہے۔ ہر پریشانی دور کر دے گا۔"

"جب آپ اسے درست سمجھتے ہیں تو آپ نے زائچہ بنانا چھوڑا کیوں؟"

"میں انسان ہوں، اور بہت کمزور انسان ہوں، اس لئے۔ خود کو آزمائش میں کیوں ڈالوں کہ کس وقت غرور میں مبتلا ہو کر خسارے میں پڑ جاؤں۔ یوں بھی میرے نزدیک یہ اچھا روزگار نہیں تھا۔"

"تو آپ میرا زائچہ کیوں بنانا چاہتے ہیں؟"

عارف خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ

مداخلت کرے، لیکن نامناسب سمجھ کر رک گیا۔

"پتا نہیں کیوں! بس دل چاہتا ہے میرا۔"

عبدالحق کے دل میں خاصی دیر سے ایک خیال بار بار سر اٹھا رہا تھا۔ اسے حج کی بڑی آرزو تھی۔ اور وہ حمیدہ کے ساتھ حج پر جانا چاہتا تھا۔ لیکن اب یہاں کراچی میں آ پھنسا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ زائچہ بنوا کر اس سلسلے میں سوال کرے۔

شفیق صاحب نے اس توقف کو اس کا انکار سمجھا تو اسے قائل کرنے کے لئے ایک اور دلیل دی۔

"دیکھیں عبدالحق صاحب! نجوم صرف مستقبل کا حال بتانے کے لئے نہیں ہے۔ یہ الگ بات کہ تقریباً تمام لوگ زائچہ صرف اس لئے بنواتے ہیں۔ ورنہ زائچے میں بہت کچھ دیکھا جا سکتا ہے۔ صاحب زائچہ کی شخصیت، اس کے عادات و اطوار، اس کی صلاحیتیں، اس کی خوبیاں، اس کی خامیاں اور کمزوریاں...... یہ سب چیزیں اس کی زندگی پر بہت مثبت اثر ڈال سکتی ہیں۔ کمزوریوں کا علم ہو تو آدمی ان سے لڑ کر، انہیں دور کر کے اپنی زندگی میں بہتری لا سکتا ہے، اپنی بیشتر صلاحیتوں سے آدمی ناواقف ہوتا ہے۔ واقف ہو جائے تو ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔"

عبدالحق اب بے تاب ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔

"ٹھیک ہے! میں زائچہ بنواؤں گا آپ سے۔"

شفیق صاحب کھل اٹھے۔ عارف نے بھی سکون کی سانس لی۔

"اپنے پیدائش کے کوائف لکھوایئے مجھے۔" شفیق صاحب نے کاپی کھولی اور پنسل سنبھالی۔

عبدالحق نے اپنا وقت، تاریخ، ماہ اور سالِ پیدائش انہیں بتایا۔

شفیق صاحب نے کاپی میں لکھا، پھر غور سے اسے دیکھا۔ ان کے چہرے پر الجھن کے ساتھ ایسا تاثر بھی تھا، جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ کئی بار انہوں نے ہلکے سے سر جھٹکا۔ جیسے کچھ فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں۔

"مقام بھی تو بتایئے۔" بالآخر انہوں نے کہا۔

"اب مقام آپ کو کیا بتاؤں؟" عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''میں جس گاؤں میں پیدا ہوا تھا، وہ تو لال آندھی کی لپیٹ میں آ کر صفحۂ ہستی سے مٹ گیا تھا۔'' اس کو شفیق صاحب کی کیفیت کا بالکل علم نہیں تھا، جن کے چہرے پر اب شدید حیرت تھی۔

''اب اس جگہ ایک اور قصبہ آباد ہے۔''

''آپ مجھے اس گاؤں کا نام بتایئے، جہاں آپ پیدا ہوئے تھے۔'' شفیق صاحب کے لہجے میں اضطراب تھا۔

''اسے ٹھاکروں کی گڑھی کہا جاتا تھا۔'' عبدالحق نے افسردگی سے کہا۔

شفیق صاحب ایک دم سے اٹھے۔ کاپی ان کی گود میں لڑھک کر نیچے گر گئی، لیکن انہیں اس کا احساس بھی نہیں ہوا۔ پنسل ان کے ہاتھ میں تھی۔ وہ گھر کے اندر جانے والے دروازے کی طرف لپکے۔

عارف نے سوالیہ نظروں سے عبدالحق کو دیکھا۔ عبدالحق نے کندھے جھٹک دیئے۔ خود اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا تھا۔ اس نے کاپی اٹھا کر پلنگ پر رکھ دی۔

چند منٹ بعد شفیق صاحب واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک پرانی سی پشتک تھی۔ پلنگ پر بیٹھ کر انہوں نے کاپی کا وہ صفحہ کھولا، جس پر انہوں نے عبدالحق کی تاریخ پیدائش وغیرہ لکھی تھی۔ اس صفحے کو سامنے پھیلانے کے بعد انہوں نے وہ پرانی پشتک کھولی، جو ابھی وہ گھر کے اندر سے لائے تھے، اور اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔

ایک صفحے پر وہ رکے اور انہوں نے جیسے کاپی کے صفحے سے اس کا موازنہ کیا۔ پھر انہوں نے بے یقینی سے سر ہلایا۔

''یہ کیسے ممکن ہے......؟'' وہ بڑبڑائے۔

عبدالحق تو خاموش بیٹھا رہا۔ لیکن عارف سے نہیں رہا گیا۔

''کیا بات ہے حضرت......!''

''اَن ہونی ہوگئی۔'' شفیق صاحب نے کہا۔ پھر خود ہی نفی میں سر ہلایا۔

''لیکن نہیں......! یہ ہو ہی نہیں سکتا۔''

''کیا نہیں ہو سکتا حضرت......!''

لیکن شفیق صاحب نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ تو بار بار دونوں صفحوں کو

دیکھے جا رہے تھے۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا اور بہت غور سے عبدالحق کو دیکھا۔

''میں آپ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ بولے۔

عارف نے جلدی سے کہا۔

''میں باہر چلا جاتا ہوں۔''

لیکن عبدالحق نے عارف کا ہاتھ تھام لیا۔

''میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔''

''میں آپ ہی کے خیال سے کہہ رہا ہوں جناب!'' شفیق صاحب نے بے حد لجاجت سے کہا۔ عبداحلق کے لئے ان کے لہجے میں عجیب سی تبدیلی آئی تھی۔ اس ان کے انداز میں اس کے لئے بے حد احترام تھا۔

''الحمد للہ! میری نجی زندگی میں کوئی ایسی بات نہیں، جسے میں کسی سے بھی چھپانا چاہوں۔'' عبدالحق نے نہایت اطمینان سے کہا۔

''اور عارف بھائی سچ مچ میرے لئے بھائی جیسے ہیں۔ آپ بے فکری سے ان کے سامنے بات کر سکتے ہیں۔''

شفیق صاحب اب بھی ہچکچا رہے تھے۔ بالآخر انہوں نے کہا۔

''میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں، میری بات بری لگے تو معاف کر دیجئے گا۔'' پھر انہوں نے جلدی سے وضاحت کی۔

''پوچھنا ضروری نہ ہوتا تو میں پوچھتا ہی نہیں۔''

''آپ جو چاہیں پوچھیں، مجھے برا نہیں لگے گا۔''

عارف متجسس بھی تھا اور کچھ خجالت سی بھی محسوس کر رہا تھا۔

''میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ......'' شفیق صاحب کہتے کہتے رک گئے۔ پھر انہوں نے نظریں جھکاتے ہوئے بات پوری کی۔

''کیا آپ ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے تھے......؟''

ایک لمحے کو عبدالحق حیران ہوا۔ زائچہ بنائے بغیر ہی یہ بات انہیں معلوم ہوگئی، یہ کیسا علم ہے۔ لیکن وہ بس ایک پل کی حیرت تھی۔ پھر اس نے بے حد پرسکون لہجے میں کہا۔

''جی ہاں......!''

شفیق صاحب اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھے اور انہوں نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

''اور آپ کا نام اوتار سنگھ رکھا گیا تھا، آپ ٹھاکر تھے......؟'' اس بار عبدالحق کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔

''یہ سب کیسے جانتے ہیں آپ؟'' اور اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ اس کا ہاتھ بھیگ رہا ہے۔ شفیق صاحب رو رہے تھے۔

''میں نہیں جانوں گا تو کون جانے گا؟ آپ کا وہ نام میں نے ہی تو رکھا تھا۔'' شفیق صاحب بار بار اس کا ہاتھ چومنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

عبدالحق کے لئے وہ شدید ذہنی جھٹکا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟

''آپ...... آپ کون ہیں......؟'' اس نے بمشکل پوچھا۔

''آپ کی رعیت......'' شفیق صاحب نے عاجزی سے کہا۔

''میں نے عرض کیا نا کہ گمراہی کے عرصے میں نجوم میرا ذریعہ معاش تھا، اللہ مجھے معاف کرے۔ میں ٹھاکروں کی گڑھی میں رہتا تھا۔ پنڈت روپ سہائے نام تھا میرا۔ آپ کی پیدائش ہوئی تو میرے بھاگ جاگ اٹھے۔ آپ کے پتا جی نے مجھے بلوایا۔ میں نے آپ کی جنم کنڈلی بنائی۔ آپ کا وہ نام بھی میں نے تجویز کیا۔ آپ کے پتا جی نے مجھے اتنا دھن دیا کہ میں آج تک کھا رہا ہوں۔''

عبدالحق کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

''تو پھر آپ مسلمان کیسے ہوئے؟''

''یہ تو اللہ کا فضل ہے ٹھاکر صاحب!'' شفیق صاحب انگشت شہادت اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''آپ بہت بابرکت تھے۔ آپ کو اللہ نے ایسا بنایا تھا۔ آپ کی جنم کنڈلی بنا کر مجھے صرف دھن دولت نہیں ملا، دنیا کی سب سے بڑی دولت بھی مل گئی۔ جس

پر آپ کا سایہ پڑا، اللہ کی رحمت سے اسے ایمان کی دولت مل گئی۔''

عارف دم بخود بیٹھا تھا۔ کمرے میں موجود دونوں افراد کو اس کی موجودگی کا بھی احساس نہیں تھا۔ وہ چاہتا تو اٹھ کمرے سے چلا جاتا۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلنے کے قابل بھی نہیں تھا۔

عبدالحق کو شفیق صاحب کی بات سن کر زبیر اور رابعہ کا خیال آیا۔ اور بھی بہت کچھ یاد آنے لگا۔

''آپ مجھے تفصیل سے بتائیں نا!'' اس نے کہا۔

''آپ کی جنم کنڈلی بنانے کے بعد میں نے ٹھاکر جی کو جو کچھ آپ کے بارے میں بتا سکتا تھا، بتا دیا۔ مگر پہلی بار مجھے بے بسی کا احساس ہوا۔ اس کنڈلی میں بہت کچھ ایسا تھا، جو میری سمجھ سے باہر تھا۔ میں نے ٹھاکر جی سے اس کا اعتراف کیا اور کہا کہ میں اپنے گرو کو ان کے پاس لے کر آؤں گا۔ کیونکہ اس کنڈلی کے لئے میرا علم چھوٹا ہے۔''

''پھر......؟''

''پھر میں اپنے گرو جی کے پاس گیا، جو بنارس میں ہوتے تھے۔ پنڈت رام دیال نام تھا ان کا۔ میں نے آپ کی کنڈلی انہیں دکھائی۔ وہ علم میں مجھ سے بہت آگے تھے۔ مگر آپ کی کنڈلی کے سامنے وہ بھی عاجز تھے۔ ہمارے درمیان کئی دن آپ کی کنڈلی پر بات ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف اس ایک کنڈلی سے میں نے گرو جی سے جتنا سیکھا، اس سے پہلے برسوں میں نہیں سیکھا تھا۔''

''کچھ مجھے بھی بتائیں۔'' عبدالحق پر تجسس حاوی آ گیا۔

''بتا رہا ہوں۔ اصطلاحات کی تو ضرورت نہیں۔ گرو جی نے سب سے پہلی بات تو یہ کہی کہ آپ اس دھرم کے نہیں ہیں، جہاں پیدا ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب میں نے یہ لیا کہ آپ دھرم تبدیل کریں گے۔ اس پر گرو جی نے کہا کہ تبدیلی کیسی؟ تبدیلی تو جب ہوتی کہ آپ ہندو دھرم میں پیدا ہوتے۔ آپ ہندو دھرم والوں میں پیدا ہوئے ہیں، لیکن ہندو دھرم کے نہیں ہیں۔ پھر کنڈلی دیکھ کر وہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔

گرو جی بچوں کی طرح خوش تھے۔ان کا کہنا تھا کہ زندگی میں ایک ایسی جنم کنڈلی بھی دیکھنے کو مل جائے تو بھاگیہ کی بات ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ کس طرح گرو جی کو ٹھاکروں کی گھڑی چلنے پر راضی کروں گا۔ پرنتو خود مجھ سے کہنے لگے کہ مجھے وہاں لے کر چلو، جہاں اس شکتی شالی بالک کا جنم ہوا ہے۔ان کا کہنا تھا کہ وہ بڑے ٹھاکر اور ٹھاکرانی کی جنم کنڈلی دیکھنا چاہتے ہیں۔لیکن سچی بات یہ کہ ان کا اصل مقصد آپ کا دیدار کرنا تھا۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ اس وقت آپ سولہ سال کے ہو چکے تھے۔ اسی کو نصیب کہتے ہیں۔ میں پہلی بار گرو جی سے ملنے بنارس گیا تھا تو وہ دہلی گئے ہوئے تھے۔ میں واپس آ گیا۔ایسے ہی کئی بار کوشش کی۔لیکن ملنے کا موقع سولہ سال بعد ملا۔''

عبدالحق کو شفیق صاحب کی گفتگو میں بے ترتیبی محسوس ہوئی۔لیکن وہ ان کی کیفیت سمجھ سکتا تھا۔ اس لئے نظرانداز کر دیا۔اب اسے اشتیاق تھا، کیونکہ پتا جی کا تذکرہ آ رہا تھا۔

''انہوں نے آپ کو بتایا نہیں تو آپ کو ان کے اصل مقصد کا علم کیسے ہوا.....؟'' اس نے اعتراض کیا۔

''بعد میں خود ان کے منہ سے اصل بات نکل گئی تھی۔'' شفیق صاحب نے وضاحت کی۔

''میں قطع کلامی پر معذرت خواہ ہوں'' عبدالحق نے معذرت کی۔

''کوئی بات نہیں، خیر! میں گرو جی کو لے کر گڑھی گیا۔ پھر ہم دونوں حویلی چلے گئے۔آپ کے پتا جی اپنے کارندوں سے باتیں کر رہے تھے۔انہوں نے مجھے ذرا خفگی سے دیکھا اور بولے۔

''روپ سہائے! تم تو اس دن آنے کا وعدہ کر کے ایسے غائب ہوئے کہ میں تمہاری صورت بھی بھول گیا، اب میں انہیں تفصیل کیا بتاتا؟ ان سے معافی مانگتے ہوئے میں نے کہا کہ دیر سے سہی، میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ پھر میں نے گرو جی سے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا، یہ میرے گرو جی ہیں۔ بڑے گیانی ہیں۔مگر سیلانی بھی ہیں۔ بڑی مشکل سے ہاتھ آئے ہیں۔

ٹھاکر نے غور سے گرو جی کو دیکھا اور ان کا نام پوچھا۔گرو جی نے نام بتا دیا۔ ٹھاکر جی نے آنے پر ان کا شکریہ ادا کیا۔گرو جی بولے۔ نا ٹھاکر جی! یہ تو میرا سو بھاگیہ ہے کہ آپ کے درشن ہوئے۔ میں تو تڑپ رہا تھا۔ یہاں آنے کے لئے۔

ٹھاکر جی نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا..... میں نے گرو دیو کو چھوٹے ٹھاکر کی جنم کنڈلی دکھائی تو یہ یہاں آنے کو، آپ سے ملنے کو بے چین ہو گئے۔ یہ آپ کی جنم کنڈلی بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔

اس وقت گرو جی نے لرزتی آواز میں کہا۔

''مجھے راج کمار کے درشن تو کرا دیجئے ٹھاکر جی! اب تو وہ جوان ہو گئے ہوں گے۔''

''اوتار سنگھ تو دہلی میں رہتا ہے۔'' ٹھاکر جی نے کہا۔

''وہاں اسکول میں پڑھتا ہے۔بس گرمی کی چھٹیوں میں گھر آتا ہے۔''

یہ سن کر گرو جی نراش نظر آنے لگے۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ وہ تو بس آپ کی دید کے لئے وہاں گئے تھے۔انہوں نے اداسی سے کہا۔

''میں سوچتا تھا کہ ان کی دید ہو گی تو بھاگ جاگ جائیں گے۔ پرنتو مجھے سمجھنا چاہئے تھا کہ میرے ایسے بھاگ کہاں۔ٹھیک ہے ٹھاکر جی! چلتے ہیں۔''

وہ اٹھنے لگے تو ٹھاکر جی نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں بٹھا لیا۔ بولے۔اب ایسے تو میں نہیں جانے دوں گا آپ کو۔یہ تو بتائیں، آپ کہاں سے آ رہے ہیں۔گرو جی نے بتایا کہ بنارس سے۔تو ٹھاکر جی حیرت سے بولے۔ اتنی دور سے، اتنا کشٹ اٹھا کر آپ یہاں آئے ہیں میرے پتر کو دیکھنے کو۔ اور میں نہ روکتا تو آپ ایسے ہی واپس چلے جاتے؟ گرو جی نے کہا۔ ٹھاکر جی! میں بس اسی کی دید کے کارن تو آیا ہوں اتنی دور سے۔ پر اماوس کی لمبی رات ہے تو چاند کی دید تو نہیں ہونی۔ پھر رکنا کیسا؟

میں حیران تھا۔ مجھے گرو جی نے یہ بات نہیں بتائی تھی۔ ٹھاکر جی نے ان کی بات سن کر کہا۔نہیں پنڈت جی! آپ دو چار دن یہاں رکیں۔ مجھے خدمت کا موقع دیں۔ ایسے تو آپ نہیں جا سکتے۔

ٹھاکر جی نے بہت اصرار کیا۔ میں نے بھی گرو جی کی خوشامد کی۔ گرو جی رکنا نہیں چاہتے تھے۔مگر بس مروت میں ایک رات کے لئے رکنے پر آمادہ ہوگئے۔ ٹھاکر جی نے ہمیں مہمان خانے میں ٹھہرایا۔ رات کھانے میں بڑا اہتمام کیا۔ کھانے کے بعد انہوں نے گرو جی سے آپ کے بارے میں بتانے کو کہا۔ گرو جی عاجزی سے بولے...... میں کیا بتاؤں؟ میں کیا بتا سکتا ہوں؟ میں تو خود سمجھنا چاہتا ہوں۔ٹھاکر جی نے حیرت سے انہیں دیکھا اور بولے...... پر اس کی جنم کنڈلی تو آپ کے سامنے ہے۔ اس پر گرو جی نے جو کچھ کہا، وہ میں کبھی نہیں بھولتا۔ وہ بولے...... ایسی ہی کنڈلیاں تو گیان دیتی ہیں۔جیون بھر میں ایک ایسی کنڈلی کسی کو مل جائے تو وہ گیانی بن جاتا ہے۔ سچ یہ ہے ٹھاکر جی کہ میں نے ایسی جنم کنڈلی کبھی نہیں دیکھی۔ میرے بہت سے چیلے ہیں ٹھاکر جی، اور میں روپ سہائے کو سب سے اچھا چیلا سمجھتا ہوں۔ پرنتو یہ کنڈلی دیکھی تو مجھے اس پر شک ہونے لگا۔ مجھے لگا کہ اس سے کوئی غلطی ہوئی ہے کنڈلی بنانے میں، یا پھر جنم کے سمے میں کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔

اس پر ٹھاکر جی نے برا مان کر کہا کہ یہ تو ممکن ہی نہیں، وہ بھول ہی نہیں سکتے آپ کی پیدائش کا وقت۔ اور انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں تو پرکھوں سے یہ سلسلہ ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی اس کی کنڈلی بنائی جاتی ہے۔ گرو جی بولے...... میں آپ کی اور آپ کی سورگ باسی پتنی کی کنڈلی بھی بنانا چاہتا ہوں۔ ٹھاکر جی نے کہا کہ دونوں کی جنم کنڈلی موجود ہے۔ پھر وہ جا کر دونوں کنڈلیاں لے آئے۔

گرو جی دونوں کنڈلیوں کو غور سے دیکھتے رہے۔ وہ پریشان لگ رہے تھے۔ پھر انہوں نے اپنی پتشنک نکالی اور آپ کی اور آپ کے ماتا پتا کی جنم کنڈلیاں خود بنائیں۔ ان کو بنی ہوئی کنڈلیوں سے ملانے کے بعد انہوں نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ تیری بنائی ہوئی کنڈلی میں رتی بھر کھوٹ نہیں ہے روپ سہائے! یہ سولہ آنے سچی ہے۔ میں نے عاجزی سے کہا، جو بھی سیکھا، آپ ہی سے سیکھا ہے مہاراج!

گرو جی اب تینوں کنڈلیوں کو بار بار دیکھ رہے تھے۔ وہ جیسے مجھے اور

ٹھاکر جی کو بھی بھول گئے تھے۔ ٹھاکر جی بھی پریشان لگ رہے تھے۔

پھر اچانک گرو جی نے بولنا شروع کیا۔ مگر وہ جیسے خود سے باتیں کر رہے تھے...... عجیب...... بہت عجیب...... چھوٹے ٹھاکر کی جنم کنڈلی میں راج یوگ ہے...... بہت شکتی والا راج یوگ...... میں نے ایسی ہزاروں کنڈلیاں دیکھی ہیں، جن میں یہ دونوں یوگ تھے۔ پرنتو ہوتا یوں ہے کہ دونوں یوگ ایک دوسرے کو کاٹ دیتے ہیں۔ منشی نہ راجا رہتا ہے نہ بھکاری۔ بس عام سا منشی بن جاتا ہے۔ یا یوں ہوتا ہے کہ وہ من کا راجا ہوتا ہے اور بھاگیہ کا فقیر۔ یا پھر جس یوگ کی شکتی زیادہ ہو، اس کا اثر رہتا ہے، پر کمزور۔ اس کنڈلی میں دونوں کی شکتی زبردست ہے، لیکن دونوں کی شکتی برابر بھی ہے۔

''یعنی دونوں نے ایک دوسرے کی کاٹ کر دی؟'' ٹھاکر جی نے کہا۔

''گرو جی بری طرح چونکے۔ انہیں سچ مچ ہماری موجودگی کا احساس نہیں رہا تھا۔ وہ خود سے ہی باتیں کر رہے تھے۔ سنبھل کر انہوں نے ٹھاکر جی کو دیکھا اور بولے۔ ہونا تو یہی چاہئے تھا کہ ٹھاکر جی، پھر ہوا نہیں، کنڈلی میں دونوں کے لئے سنگی یوگ بھی ہیں۔ سہارا دینے والے یوگ، جنہوں نے کسی کو کٹنے نہیں دیا۔ سو میں کہتا ہوں کہ دونوں یوگ پورا اثر ڈال رہے ہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کام کر رہے ہیں۔ میں نے ایسا کبھی نہیں دیکھا۔''

''مطلب کیا ہے؟'' ٹھاکر جی نے بے چینی سے پوچھا۔

''چھوٹے ٹھاکر راجا ہوں گے، لیکن جیون غلامی کا گزاریں گے۔ اور روپ سہائے سچ کہتا ہے۔ اس کنڈلی میں روشنی اتنی زیادہ ہے کہ کچھ بجھائی نہیں دیتا۔ کچھ ن ہیں آنے لگتا ہے تو روشنی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ سب کچھ چھپ جاتا ہے۔''

''ٹھاکر جی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا...... یہ تو روپ سہائے نے بھی بتا دیا تھا۔ کچھ اور نہیں بتائیں گے آپ؟ اس پر گرو جی بولے کہ روپ سہائے میرا سب سے گیانی چیلا ہے۔ پرنتو میں آپ کو جو کچھ بتا سکتا ہوں، اوش بتاؤں گا۔ چھوٹے ٹھاکر کی زندگی کئی بار خطرے میں پڑے گی۔ مگر

خطرے ہار جائیں گے اور چھوٹے ٹھاکر لمبا جیون پائیں گیاور چھوٹے ٹھاکر پریم کریں گے...... دوبار...... اور وہ سچا پریم ہوگا۔ دونوں میں وہ سچل ہوں گے۔ اور چھوٹے ٹھاکر کے بھاگیہ میں بدیشی سفر نہیں ہے۔ مگر ان کا دیہانت اپنے دیس میں نہیں ہوگا۔ اس میں ٹھاکر جی جھنجلا گئے۔ بولے...... کیسی باتیں کرتے ہیں آپ...... جب بھاگیہ میں بدیشی سفر ہے ہی نہیں تو دیہانت بدیش میں کیسے ہوگا؟ گرو جی نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا، شما کیجئے ٹھاکر جی! جو دیکھ اور سمجھ رہا ہوں، وہی بتا رہا ہوں۔ سمجھ میں تو یہ بات میری بھی نہیں آتی۔ پر کنڈلی یہی بتاتی ہے۔ اور ٹھاکر جی، چھوٹے ٹھاکر بڑے گیانی ہوں گے، پرنتو ان کا پریم زیادہ بڑا ہوگا۔ ہوتا یوں ہے ٹھاکر جی کہ منشی جیون میں بہت کچھ کماتا ہے۔ علم، دولت، عزت، شہرت، پر جب وہ مرتا ہے تو اوش راکھ رہ جاتا ہے۔ سب کچھ ختم۔ چھوٹے ٹھاکر کو جیون میں سب کچھ ملے گا پر وہ ہر چیز سے بھاگیں گے۔ صرف پریم کی تلاش میں۔ وہ ہر چیز کو ٹھوکر مار دیں گے۔ اور جب ان کا انتم سمے آئے گا کہ موت ہی انہیں سب کچھ دے گی۔ وہ مرنے کے بعد بڑا مقام پائیں گے۔'' شفیق صاحب نے گہری سانس لی۔ وہ جیسے کسی ٹرانس میں تھے۔

''گرو جی یہ سب کچھ کہے جا رہے تھے۔'' انہوں نے سلسلہ کلام پھر جوڑا۔

''اور میرا دم نکل رہا تھا۔ آپ کے مرنے کی بات ٹھاکر جی کو کیسے اچھی لگ سکتی تھی چھوٹے ٹھاکر! انہیں غصہ آ رہا تھا مگر وہ ضبط کر رہے تھے۔''

عبدالحق بھی سحر زدہ سا یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ یہ وہ باتیں تھیں، جو اسے معلوم نہیں ہو سکتی تھیں۔ لیکن اللہ کا حکم تھا تو کیسے ناقابل یقین انداز میں اس تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کے تصور میں اپنے پتا جی کا چہرہ تھا۔

ادھر شفیق صاحب بھی ماضی میں بہہ گئے تھے۔ انہیں اچانک خیال آیا کہ بے ساختگی میں وہ اصطلاحات بھی بول رہے ہیں، جو یہاں کسی کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔

''آپ کو الجھن تو نہیں ہو رہی ہے چھوٹے ٹھاکر! میں پیچیدہ اصطلاحات

بھی بیان کر گیا۔''

''میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں شفیق صاحب! لیکن اگر میں آپ کو پنڈت جی کہوں تو آپ کو کیسا لگے گا؟'' عبدالحق نے بے حد تحمل سے کہا۔

اور شفیق صاحب پر لرزہ چڑھ گیا۔

''معاف کر دیجئے عبدالحق صاحب! ماضی میں کھویا ہوا تھا، اس لئے بھول ہو گئی۔'' انہوں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''مقصد آپ کی توہین تو نہیں ہو سکتا نا! دیکھئے تو میں آپ کے قدموں میں بیٹھ کر باتیں کر رہا ہوں۔''

پہلی بار عبدالحق کو احساس ہوا کہ وہ اب تک اس کے قدموں میں بیٹھے ہیں۔ اس نے جلدی سے ان کے ہاتھ تھامے۔

''پلیز...... ! ایسا نہ کریں۔ آپ وہاں بیٹھیں میرے سامنے۔''

''نہیں...... ! یہ میری حیثیت نہیں۔''

''آپ میری بات نہیں مانیں گے؟'' عبدالحق کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا۔

شفیق صاحب بے بسی سے اٹھے اور پلنگ پر بیٹھ گئے۔

''آپ نے میری بھول پر مجھے معاف تو کر دیا نا......؟'' وہ گڑگڑائے۔

''بھول پر معافی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ پلیز مجھے آگے کی بات بتائیں۔''

شفیق صاحب کی نظریں دیوار پر کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ کھو سے گئے، جیسے پرانی یادوں کو ترتیب دے رہے ہوں۔ پھر وہ بولے۔

''اس کے بعد گرو جی نے آپ کے پتا جی سے کہا کہ اب وہ ان کی اور سورگ باشی ٹھکرائن کی کنڈلیوں کا جائزہ لیں گے۔ ٹھاکر جی نے کہا، اس کا کیا حاصل پنڈت جی، ٹھکرائن تو جا چکی اور میرا بھی کیا ہے...... گرو جی بولے، بات یہ ہے ٹھاکر جی کہ جب کوئی کنڈلی سمجھ میں نہ آئے تو اس کے لئے ماتا پتا کی کنڈلی دیکھی جاتی ہے۔ ان دونوں کنڈلیوں کی مدد سے میں چھوٹے ٹھاکر کی کنڈلی کو شاید زیادہ سمجھ سکوں۔''

''ٹھاکر جی چپ ہوگئے اور میرے گرو جی آپ کے ماتا پتا کی کنڈلیوں کو بہت غور سے دیکھتے رہے۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ ٹھاکر جی کی نظریں بھی انہی پر جمی تھیں۔ گرو جی کا انہماک غضب کا تھا۔ مگر پھر انہوں نے ایک جھرجھری سی لی اور بری طرح چونکے۔ ان کے چہرے پر بے یقینی تھی۔ چند لمحے بعد انہوں نے سر اٹھایا، مگر فوراً ہی نظریں جھکا لیں اور بولے...... شما چاہتا ہوں ٹھاکر جی! پرنتو میں اور کچھ نہیں بتا سکتا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ دونوں کنڈلیوں میں کوئی بات انہوں نے دیکھی ہے، اور وہ کوئی ایسی بات ہے، جو ٹھاکر جی کو نہیں بتائی جا سکتی۔ ٹھاکر جی بھی کوئی بچے نہیں تھے۔ انہو نے بھی یہ بات سمجھ لی تھی۔ انہوں نے کہا...... آپ کو بتانا ہوگا ٹھاکر جی! میں بے خبر نہیں رہنا چاہتا۔

گرو جی نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ لئے۔

''ایسی کوئی بات نہیں ٹھاکر جی! جو بتانے لائق ہو۔''

''بتانے لائق نہیں، تب بھی بتائیں۔ میں اپنے پتر کے متعلق ہر بات جاننا چاہتا ہوں۔''

عبدالحق کی آنکھیں جلنے لگیں۔ پتا جی کیسی محبت کرتے تھے اس سے۔ بلکہ احترام کرتے تھے اس کا، اور وہ شرمندہ ہوتا تھا۔ وجہ اب اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

شفیق صاحب اس کی کیفیت سے بے خبر اپنی کہتے رہے۔

''گرو جی نے عاجزی سے کہا۔ میرا وشواس کریں ٹھاکر جی! یہ بات چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں نہیں ہے، اس پر ٹھاکر جی سمجھ گئے کہ بات ان کے اور ان کی پتنی کے متعلق ہے۔ وہ بولے...... تب تو ضرور بتائیں مہاراج!

گرو جی نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔

''میں شما چاہتا ہوں ٹھاکر جی!''

اب میں بھی اندر ہی اندر دہل رہا تھا۔ کوئی بہت ہی بڑی بات ہوگی۔ ٹھاکر جی اصرار کر رہے تھے کہ پنڈت جی انہیں وہ بات بتا دیں۔ لیکن گرو جی ہچکچاتے تھے۔ پر میں جانتا تھا کہ بات کرنے کو ان کا من کرتا ہے، تاکہ آگے کی

بات جان سکیں۔ کچھ اصرار کے بعد انہوں نے کہا کہ وہ بات ایسی ہے کہ ٹھاکر کو اچھی نہیں لگے گی۔ اس پر ٹھاکر جی نے وچن دے دیا کہ بات کیسی ہی ہو، وہ ناراض نہیں ہوں گے۔''

اب تو عبدالحق کا بھی تجسس سے برا حال تھا۔ لگتا تھا، کسی بڑے راز پر سے پردہ اٹھنے والا ہے۔

''گرو جی اب بھی ہچکچا رہے تھے، اور میں ڈر رہا تھا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو......؟ ٹھاکر جی بہت نرم دل تھے، پر تھے تو راج پوت۔ آخر گرو جی نے ہمت کر کے کہا...... آپ سے ایک بات پوچھنی ہے ٹھاکر جی! ٹھاکر جی نے کہا...... پوچھو...... گرو جی بولے...... چھوٹے ٹھاکر آپ کے اپنے پتر تو نہیں ہیں نا......؟'' یہ کہہ کر شفیق صاحب خاموش ہوگئے۔

عبدالحق کے دل میں کچھ ٹوٹنے لگا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ پتا جی اس سے اتنی محبت کرتے تھے، اور خود وہ بھی...... نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔

''خوف سے میرا برا حال ہوگیا۔'' شفیق صاحب نے کہا۔

''میرا بس چلتا تو جادو کے زور پر وہاں سے غائب ہو جاتا۔ میں جانتا تھا کہ ٹھاکر جی کے لئے تو وہ گالی ہے، اور کوئی راج پوت گالی کبھی برداشت نہیں کرتا۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ گرو جی نے اپنے ساتھ مجھے بھی مروا دیا۔ میری ٹھاکر جی کے چہرے کی طرف دیکھنے کی مجال نہیں تھی۔ مگر میں کن انکھیوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ غصے سے کھول رہے تھے۔

''مگر ٹھاکر جی بڑے آدمی تھے۔ وہ اپنے غصے کو پی گئے۔ انہوں نے گرو جی سے وضاحت چاہی۔ گرو جی نے کہا...... میں یہ پوچھ رہا ہوں ٹھاکر جی کہ چھوٹے ٹھاکر لے پالک تو نہیں؟ ایسا تو نہیں کہ آپ نے کسی کا بچہ لے کر پالا ہو، اور اسے اپنا بیٹا بنا لیا ہو۔

ٹھاکر صاحب آگ بگولا ہوگئے۔ مگر انہیں اپنے وچن کا بھی پاس تھا۔ انہوں نے بڑے تحمل سے کہا...... ہم راج پوت اپنے خون پر بہت مان کرتے ہیں مہاراج، اپنے خون میں ملاوٹ برداشت نہیں کرتے ہم۔ گرو جی بولے...... پر

ٹھاکر جی! اصل راج پوت بچہ بھی تو مل سکتا ہے۔ ٹھاکر نے کہا، یہ بتائیں مہاراج کہ یہ خیال آپ کو کیوں آیا؟ اس پر گرو جی نے دھماکہ کر دیا..... آپ کے اور آپ کے سورگ باسی پتنی کے بھاگیہ میں اولاد ہے ہی نہیں ٹھاکر جی! آپ دونوں کی جنم کنڈلیاں یہی بتاتی ہیں۔ اور کنڈلیاں بنانے میں مجھ سے کوئی غلطی بھی نہیں ہوئی ہے ٹھاکر جی۔

ٹھاکر جی کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بولے..... اوتار سنگھ میرا ہی پتر ہے گرو جی.....!''

عبدالحق نے سکون کی سانس لی۔ اس کے لئے اس بات کی بڑی اہمیت تھی۔

شفیق صاحب اپنی کہے جا رہے تھے۔

''ٹھاکر جی نے بتایا عبدالحق کہ آپ کی پیدائش سے پہلے انہوں نے اور آپ کی ماتا جی نے ایک ہی وقت میں ایک ہی سپنا دیکھا تھا۔ اس سپنے میں یہ خوش خبری دی گئی تھی۔ میرا پتر پورے نو ماہ میری پتنی کے پیٹ میں رہا۔ پورا گاؤں اس کا گواہ ہے۔ میں آپ کو اس کی پیدائش کا پورا ریکارڈ دکھا سکتا ہوں۔

گرو جی بولے..... میرے لئے آپ کا کہنا ہی کافی ہے۔ پر میں نے ایک نئی بات سمجھ لی۔ جو بھاگیہ لکھتا ہے، اس کا من چاہے تو وہ کبھی اسے بدل بھی دیتا ہے۔ اور ہم کنڈلی دیکھنے والوں کو پتا بھی نہیں چلتا۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ پرارتھنا میں بڑی شکتی ہے۔ اس سے بھاگیہ بھی بدل جاتا ہے۔ ٹھیک ہے ٹھاکر جی! میں اور دیکھتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ پھر کنڈلیوں پر جھک گئے۔ ذرا دیر بعد انہوں نے سر اٹھایا تو وہ مسکرا رہے تھے۔ آپ بھی بھاگوان ہیں ٹھاکر جی اور چھوٹے ٹھاکر بھی۔ آپ کی وجہ سے میرے گیان میں اضافہ ہوا۔ آپ سے بات نہیں ہوتی تو میں کبھی سمجھ نہیں پاتا۔ پر اب مجھے نظر آ رہا ہے.....اوش نظر آ رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ کنڈلیوں کے حساب سے آپ کے بھاگیہ میں اولاد نہیں تھی۔ پر وہاں چھوٹے ٹھاکر کی آمد کی نشانیاں موجود ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر کے جنم کے ساتھ آپ دونوں کا نیا دور شروع ہوا۔ آپ کے جیون کی دشا بدل گئی۔ آپ کا راستہ بدل گیا۔ آپ نے ہنسی خوشی اس

تبدیلی کو مان لیا۔ بلکہ آپ خود ہی اس نئے راستے پر چل پڑے۔ پر آپ کی پتنی کے لئے یہ آسان نہیں تھا۔ وہ چھوٹے ٹھاکر جیسی نہیں بن سکیں۔ اس لئے..... گرو جی کہتے کہتے رکے اور کنڈلی کو دیکھتے ہوئے کچھ حساب لگایا، پھر بولے..... ان کا دیہانت تین دوش پہلے ہوا تھا نا.....؟ انہوں نے تاریخ اور وقت تک بتا دیا۔ ٹھاکر جی نے تائید میں سر ہلایا۔ گرو جی بولے..... وہ چھوٹ ٹھاکر جیسی بن جاتیں تو ابھی جیوت ہوتیں، اور کچھ ورش جیتیں۔ آپ بھاگوان ہیں ٹھاکر جی کہ آپ نے خود کو بدل لیا۔ اب آپ چھوٹے ٹھاکر کے لئے اپنا جیون بھینٹ کریں گے، اور آپ کو اس کا بڑا پھل ملے گا۔

پھر جانے کیا ہوا کہ ٹھاکر جی ایک دم ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے..... آپ آرام کریں۔ اب صبح آپ کے درشن ہوں گے۔ پھر اگلی صبح ٹھاکر جی نے ہمیں بہت کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا۔''

کچھ دیر ایسی خاموشی رہی، جیسے کوئی بولنا ہی نہیں چاہ رہا ہو۔ پھر عبدالحق نے پوچھا۔

''میرے محترم! آپ مسلمان کب ہوئے؟''

شفیق صاحب بری طرح چونکے۔

''مجھے معاف کیجئے گا عبدالحق صاحب! دراصل آپ کا اس قدر اچانک ملنا اور یہ پتا چلنا کہ آپ کون ہیں، میرے لئے بہت بڑا دھماکہ تھا۔ پھر ایک دم ماضی میں جانا، میں ترتیب قائم نہیں رکھ سکا۔ کچھ باتیں رہ گئیں۔ وہ اب بتاتا ہوں۔ گرو جی نے آپ کی جنم کنڈلی دیکھی تو ایک بات کہی۔ وہ بولے..... اس بچے سے جو بھی جڑے گا، وہ خوش قسمت ہوگا۔ اس میں بدلام آئے گا۔ اور ان بھاگوانوں میں تم بھی ہو روپ سہائے اور میں بھی ہوں۔ میں نے پوچھا، بدلام کیسا گرو جی، کہنے لگے..... پہلے بالک کے درشن کر لیں، پھر بتاؤں گا۔

اور جب ہم گڑھی سے رخصت ہوئے تو گرو جی مجھے دہلی لے گئے۔ وہاں انہوں نے مجھے بتایا کہ ہمیں مسلمان ہونا ہے۔ میں تو حیران رہ گیا۔ دھرم تبدیل کرنے کا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کبھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو وہ بولے۔ میں

نے کہا تھا نا کہ بدلام آئے گا۔ سو یہ ہے وہ بدلام۔ ٹھاکرائن نے خود کو نہیں بدلا تو دنیا چھوڑ گئی۔ بدقسمت تھی۔ اور ٹھاکر کا من بدل چکا ہے۔ اسے بس رسم پوری کرنی ہے۔ میں نے کہا، گرو جی! مجھے تو ٹھاکر جی میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ وہ بولے ... ابھی کچے ہو۔ ٹھاکر جی سمجھ گئے تھے کہ میں جان گیا ہوں۔ اسی لئے رات انہوں نے اچانک ہی بات ختم کر دی تھی۔ روپ سہائے، ٹھاکر جی اندر مسلمان ہیں۔ ہم پر یہ بھید نہیں کھولنا چاہتے تھے۔ پر یہ نہ سمجھ سکے کہ ہم تو اشاروں کو زیادہ سمجھنے والے ہیں۔ ہمیں تو اوپر والے نے گیان دیا ہے۔ اب دیکھو روپ سہائے، جن کے بھاگ میں اولاد نہیں تھی، انہیں اوپر والے نے سپنے میں خوش خبری دی، اور پھر ایسا بھاگیہ وان بچہ دیا، تو کیا ہم اسے ماننے سے انکار کریں گے۔ گیان سب اسی کا ہے۔ اس کا رائی برابر حصہ اس نے ہمیں دیا، اور جب چاہا، اسے ہماری آنکھوں سے چھپا لیا۔ تو اسے تو ماننا پڑے گا۔

میں ہچکچا رہا تھا۔ گرو جی تو سنیاسی تھے، پر عبدالحق صاحب! میرے تو بیوی بچے بھی تھے۔ گرو جی نے جب یہ بات کہی تو سارا مال مجھے سونپا اور بولے۔ تم میرے چیلے ہو روپ سہائے، تمہاری ہی وجہ سے مجھے یہ آخری گیان، یہ سچی روشنی ملی ہے۔ اسی لئے تم سے کہا۔ ورنہ میرا تم پر کوئی زور نہیں۔ پر اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ سب سے بڑی دولت تمہیں مل رہی ہے۔ آگے تمہاری مرضی۔ میں تو یہ آخری کام ضرور کروں گا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

گرو جی! میں یہاں بھی آپ کے پیچھے ہوں۔ سو ہم دونوں جامع مسجد گئے اور وہاں اسلام قبول کر لیا۔ گرو جی کا نام نورالدین رکھا گیا اور میرا محمد شفیق۔ گرو جی بہت خوش تھے۔ ہم نماز پڑھنے لگے۔ قرآن پڑھنا سیکھتے رہے۔ لیکن صرف چھ ماہ بعد گرو جی کا انتقال ہو گیا۔ ان کا کوئی تھا نہیں۔ میں نے ان کی تدفین کی، اور اس کے بعد گھر چلا گیا۔ میرا گھر مہیش پور میں تھا۔''

''لیکن مہیش پور تو لال آندھی میں دفن ہو گیا تھا شفیق صاحب!'' عبدالحق نے اسے یاد دلایا۔

''جی ہاں! اس قبولِ اسلام ہی نے تو مجھے بچا لیا۔ میں نے گھر پہنچ کر بیوی

بچوں سے بات کی۔ وہ تو بری طرح بھڑک گئے۔ بیٹے تو اتنے مشتعل ہو گئے کہ گاؤں والوں کو سب کچھ بتانے پر تُل گئے۔ مگر بیوی میری پتی ورتا عورت تھی۔ اس نے انہیں روکا۔ کیونکہ گاؤں والوں کو پتا چل جاتا تو وہ میری تکا بوٹی کر دیتے۔ ان لوگوں نے مجھے سوچنے کا موقع دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ڈانواں ڈول تھا۔ مگر تیسری رات میں نے اپنے گرو جی نورالدین مرحوم کو خواب میں دیکھا کہ وہ ایک بہت خوب صورت باغ میں بیٹھے ہیں، جہاں انہیں دنیا جہان کی نعمتیں میسر ہیں۔ اور وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں..... خسارے کا سودا نہ کرنا شفیق! مجھے دیکھو، اسی سال کی گمراہی کے باوجود صرف چھ مہینے کے انعام کا یہ صلہ مجھے ملا ہے۔ بیوی بچوں کی محبت میں دوبارہ گمراہی کی طرف نہ جانا۔ ورنہ یہ تمہیں جہنم میں لے جائیں گے۔ بس پھر میں نے فیصلہ کر لیا۔ سب سے چھوٹا بیٹا میرے ساتھ تھا۔ یہ اس وقت سات آٹھ سال کا تھا۔ ٹھاکر جی کا دیا ہوا مال میرے پاس تھا۔ میں نے چھوٹے بیٹے کو ساتھ لیا اور لاہور چلا گیا۔ یہ میرا وہ بیٹا ہے، جس نے آپ کے لئے دروازہ کھولا تھا۔ شکیل نام ہے اس کا۔''

''تو اب آپ اکیلے ہیں؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''نہیں.....! اللہ کی مہربانی سے گھر بس گیا۔ پاکستان بننے کے بعد میں لاہور میں مہاجروں کے ایک کیمپ میں گیا۔ وہاں ایک بے سہارا جوان عورت نظر آئی۔ اس کے گھر کا کوئی فرد نہیں بچا تھا۔ اس سے میری شادی ہو گئی۔ 1950ء میں میں کراچی چلا آیا۔ پیسہ پاس تھا۔ ایک دکان کر لی۔ اب الحمدللہ وہ بچے سنبھالتے ہیں۔ اور میں عیش کرتا ہوں۔'' وہ ہنسنے لگے۔

''کیسی عجیب کہانی ہے آپ کی۔''

''اللہ کے معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' شفیق صاحب نے کہا۔

''اب یہی دیکھیں کہ اللہ نے میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو کیسے پوری کی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں جناب.....!''

''آپ کو دیکھنے کی حسرت دل میں لئے میرے گرو جی دنیا سے رخصت

ہو گئے۔ اب تو میرے نزدیک بھی یہ حسرت ہی بن گئی تھی۔ ملنے کا کوئی امکان تھا ہی نہیں۔ میں آپ کو کیسے تلاش کر سکتا تھا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ آپ اب اوتار سنگھ نہیں ہیں، بلکہ گرو جی کے مطابق تو آپ اوتار سنگھ کبھی تھے ہی نہیں، یعنی میں آپ کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ آپ سے ملاقات ممکن ہی نہیں تھی۔ لیکن دیکھیں، اللہ آپ کو ملانے کے لئے میرے گھر لے آیا۔''

''اور مجھے دعا دیجئے۔'' عارف نے پہلی بار مداخلت کی۔

''میں زائچہ بنانے کا نہ کہتا تو آپ کو ملنے کے باوجود یہ پتا نہ چلتا کہ عبدالحق ہی وہ شخص ہے، جس سے ملنے کی آپ کو آرزو تھی۔''

''بے شک! اللہ نے ہم کو ہر طرح سے ملانے کا ذریعے بنایا۔ اللہ کا شکر ہے، اور میں آپ کا شکر گزار ہوں۔'' شفیق صاحب نے نہایت خلوص سے عارف کو شکریہ کہا۔

عبدالحق کو حیرت ہو رہی تھی۔ اس کے سامنے وہ شخص بیٹھا تھا، جس نے اس کا پہلا نام رکھا تھا۔ اور جس طرح سے وہ مسلمان ہوا، وہ اللہ کی بہت بڑی رحمت تھی۔ اور جس طرح سے وہ ملے تھے، وہ بھی چھوٹا سا ایک معجزہ ہی تھا۔

''عبدالحق صاحب! آپ مجھے ٹھاکر جی کے بارے میں بتائیے۔'' شفیق صاحب نے اسے چونکا دیا۔

''آپ کے گرو جی کی اللہ نے سچی راہنمائی کی تھی۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''پتا جی کی ڈائریوں سے پتا چلا کہ وہ برسوں قرآن کا، دینی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے تھے اور اللہ کی رحمت سے انہوں نے حق کو پا لیا تھا۔ جو مولوی صاحب مجھے عربی پڑھاتے تھے، انہوں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا، اور مولوی صاحب نے ان کا نام عبداللہ رکھا تھا۔ وہ اس کا اعلان کرنے سے پہلے مجھے بتانا چاہتے تھے۔ لیکن ان کی یہ دونوں خواہشیں پوری نہ ہو سکیں۔ آپ کے گرو جی کی دوسری پیش گوئی بھی اللہ کے فضل سے درست ثابت ہوئی۔ پتا جی مجھ پر قربان ہو گئے۔

ہمارے گاؤں پر جے پور والوں نے حملہ کیا تھا۔ پتا جی اس لڑائی میں شدید زخمی ہوئے تھے۔ میں پہنچا تو وہ آخری سانسیں لے رہے تھے۔ انہوں نے مجھے سب کچھ بتانے کی کوشش کی، لیکن بات نہیں کی جا رہی تھی۔ سب کچھ مبہم رہ گیا۔ میرے سامنے ہی ان کی جان نکلی۔ ان کے ہونٹ ہلے تھے اس وقت۔ یہ تو میں نے بعد میں جانا کہ وہ کلمہ پڑھ رہے تھے۔''

''سبحان اللہ!'' شفیق صاحب نے بے ساختہ کہا۔

''اور انہوں نے مجھے وہاں سے چلے جانے کو کہا تھا، کیونکہ لال آندھی سر پر کھڑی تھی۔''

''اوہ......! تو یہ اس دن کی بات ہے......؟''

''جی ہاں! اور مجھے بھی اللہ نے بچا لیا۔ ورنہ لال آندھی کی لپیٹ میں میں بھی آیا تھا۔ مجھے آج تک یقین نہیں آتا کہ میں اس سے بچ گیا۔''

''اللہ کے حکم سے کچھ بھی باہر نہیں ہے۔'' شفیق صاحب نے کہا۔ پھر جھجکتے ہوئے بولے۔

''ایک بات پوچھ سکتا ہوں آپ سے......؟''

''ضرور پوچھیے......!''

''عبداللہ صاحب آپ پر قربان کیسے ہوئے؟ جے پور والوں نے ٹھاکروں کی گڑھی پر حملہ کیوں کیا تھا؟''

عبدالحق نے انہیں مختصراً جے پور میں اپنی کارروائی کے بارے میں بتایا۔ وہ اور عارف حیرت سے سب کچھ سن رہے تھے۔

'' یہ میں نہیں سمجھ سکا کہ انہیں میرے بارے میں معلوم کیسے ہوا کہ میں ٹھاکروں کی گڑھی کا ٹھاکر اوتار سنگھ ہوں۔ بہرحال وہ پتا جی سے مجھے طلب کر رہے تھے، جبکہ میں وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ میں تاج محل دیکھنے نہ جاتا تو وہیں موجود ہوتا۔''

''یہ سب اللہ کے حکم سے ہے۔''

عبدالحق کو اس بات کی بہت خوشی تھی کہ شفیق صاحب ہر بھلائی کو اللہ سے

منسوب کرتے ہیں۔ ہر بات پر اللہ کا ذکر کرتے ہیں، اور اللہ کا نام لیتے ہوئے ان کے انداز میں بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ وہ ان کا گرویدہ ہوگیا تھا۔

''آپ نے کہا تھا کہ میری کہانی کتنی عجیب ہے۔'' شفیق صاحب نے کہا۔

''لیکن درحقیقت میری کہانی تو آپ کی کہانی کا ایک بہت چھوٹا سا بابا ہے۔ آپ کی کہانی تو واقعی حیران کر دینے والی ہے۔''

''الحمدللہ! جو کچھ بھی ہے، محض اللہ کے فضل و کرم سے ہے۔''

''اب اجازت ہو تو میں آپ کا زائچہ دیکھ لوں......؟''

''جی ضرور......!'' اب عبدالحق انکار کیسے کرسکتا تھا۔ انکار تو وہ پہلے بھی نہیں کرسکا تھا۔ جبکہ اب صورتِ حال ہی مختلف تھی۔

شفیق صاحب زائچے پر جھک گئے۔ کچھ دیر حساب کتاب بھی کرتے رہے۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا تو ان کی آنکھوں میں چمک تھی۔

''اللہ کا شکر ہے۔'' انہوں نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''میں پریشان تھا کہ یہ کہانی ایسے ختم ہونے والی تو نہیں۔ مگر اللہ نے میری پریشانی دور کر دی۔'' ان کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ آپ کو اولاد نہ دے۔ انشاء اللہ! اللہ تعالیٰ آپ کو دوبارہ نعمت سے نوازیں گے۔ انشاء اللہ دو بیٹے ہوں گے آپ کے۔''

''الحمدللہ! انشاء اللہ!'' عبدالحق کے دل میں جیسے روشنی ہوگئی۔

''لیکن یہاں کراچی آتے ہی میری بیوی بیمار رہنے لگی ہے۔''

''آپ کے زائچے میں دو شادیاں ہیں عبدالحق صاحب!'' شفیق صاحب نے کہا۔

''پہلی بیوی سے تو اولاد نہیں ملے گی آپ کو۔''

''میں تو دوسری شادی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' عبدالحق نے تڑپ کر کہا۔ اس کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''تو کیا آپ یہ فرما رہے ہیں......؟''

''دیکھیے عبدالحق صاحب! آپ کا زائچہ میرے سامنے ہے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اسے بنایا ہے۔ آپ دیکھ لیجیے کہ میں آپ کا پرانا زائچہ نہیں دیکھ رہا ہوں۔ جو میں نے اپنی گمراہی کے دنوں میں بنایا تھا۔'' شفیق صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ہدایت پانے کے بعد میں نے یہ کام چھوڑ دیا۔ لیکن اللہ کا دیا ہوا علم مجھے حاصل رہا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کسی ایسے شخص مجھ سے مدد چاہی، جسے میں انکار نہیں کرسکتا تھا...... کسی بھی وجہ سے، تو میں نے اللہ کے خوف سے، اور اللہ کی رحمت اور ہدایت سے اس کے لئے ایک طریق کار طے کیا۔ تو میں اللہ کا نام لے کر، اس سے مدد چاہتے ہوئے زائچہ بناتا ہوں کہ زائچہ غلطی سے پاک ہو۔ پھر زائچے کا جائزہ لینے سے پہلے میں اللہ سے راہنمائی طلب کرتا ہوں۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ جو کچھ مناسب سمجھے، وہ مجھ پر روشن کر دے۔ اور عام طور پر یہ کام میں صاحب زائچہ کی پرخلوص امداد کے لئے، اس کی دل جوئی کے لئے، اس کا حوصلہ بڑھانے کے لئے کرتا ہوں۔ اور جو کچھ اسے بتا رہا ہوں، اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ جو کچھ اللہ پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے، وہ مجھ پر روشن نہیں ہوتا۔ لیکن آپ کا معاملہ مختلف ہے۔ اس میں میری ذاتی غرض بھی شامل ہے۔ مجھے تجسس ہے آپ کے بارے میں، کیونکہ میں نے آپ کی پیدائش کے فوراً بعد آپ کا زائچہ بنایا تھا۔ اس لئے میں نے اللہ سے اور زیادہ گڑگڑا کر دعا کی۔ اب جو کچھ میں بتاؤں گا، اسے حتمی ہرگز نہ سمجھئے گا۔ میں انسان ہوں، مجھ سے حساب کتاب میں غلطی بھی ہوسکتی ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اللہ جو کچھ چھپانا چاہے گا، وہاں میرا علم بھی لڑکھڑا جائے گا۔ وہاں مجھے کچھ دکھائی نہیں دے گا۔''

اس طویل وضاحت نے عبدالحق کا شرک کا خوف دور کر دیا۔ علم کے بارے میں شفیق صاحب کا نظریہ اس کے دل کو لگتا تھا کہ علم سارے کا سارا اللہ کا ہے، اس میں سے وہ جب، جسے، جتنا چاہے، دے دے۔ شفیق صاحب کی شخصیت اس کے لئے حیران کن ثابت ہو رہی تھی۔

لیکن اس کی پریشانی اور وحشت اپنی جگہ تھی۔

''آپ اپنی دوسری شادی کا سن کر پریشان ہوگئے۔'' شفیق صاحب نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔

''زائچہ بتاتا ہے کہ آپ کو اپنی بیوی سے عشق ہے۔اور یہ بھی کہ آپ کی زندگی کا عنوان ہی عشق ہے۔ مسلسل عشق، ہر لمحہ عشق۔ جب آپ اپنی بیوی سے عشق نہیں کر رہے ہوں گے تو آپ اپنے پیدا کرنے والے سے عشق کر رہے ہوں گے۔آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات......؟''

عبدالحق کو بڑی شرمندگی ہوئی۔شفیق صاحب نے اس کا پردہ رکھتے ہوئے اسے بڑی نزاکت سے یہ احساس دلایا تھا کہ اس کی زندگی کا مقصد عشق حقیقی ہے نہ کہ بیوی سے عشق۔اور جب سے وہ بیوی کے عشق میں مبتلا ہے، اپنے مقصد سے دور ہوگیا ہے۔اسے جو ہونا تھا، وہ نہیں بن سکا ہے۔ اس نے لہجے کو ہموار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''جی......!میں سمجھ رہا ہوں۔''

''اور آپ نے ٹھیک کہا کہ آپ دوسری شادی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔'' شفیق صاحب نے بات آگے بڑھائی۔

''لیکن آپ جانتے ہیں کہ بندوں کا اختیار کتنا سطحی ہے۔ جو ہم چاہتے ہیں،وہ سب تو نہیں ہوسکتا۔اور بہت کچھ ہمیں ایسا کرنا پڑتا ہے جو ہم نہیں چاہتے۔''

عبدالحق کے ذہن میں آیت مبارکہ گونجی ......اَمْ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ مَاتَمَنّٰی۔

''جی......!میں جانتا ہوں۔آپ شاید میری بات سمجھ نہیں پائے۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ دوسری شادی میرے لئے ناقابل تصور ہے۔اس لئے دوسری شادی کا مطلب خدانخواستہ......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر اس نے جلدی سے کہا۔

''میں نے آپ سے عرض کیا نا کہ جب سے ہم کراچی آئے ہیں، میری بیوی بیمار رہنے لگی ہے۔'' اس نے کہا۔

''میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں عبدالحق صاحب!'' شفیق صاحب

بولے۔

''دیکھئے، جب سے میں نے ہدایت پائی، زائچے میں موت کا کھوج لگانا چھوڑ دیا۔''

لفظ موت پر عبدالحق جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔

اس کی کیفیت سے بے خبر شفیق صاحب نے اپنی بات جاری رکھی۔

''اب کوئی بیمار میرے پاس آتا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں کہ زائچہ بنوانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ سے دعا کریں کہ وہ آپ کو اس طبیب تک پہنچا دے، جس کے ہاتھ میں اللہ نے آپ کے لئے شفاء رکھی ہو۔میرے نزدیک موت اللہ کا وہ راز ہے، جس کے بارے میں تجسس کرنا ہی نہیں چاہئے۔''

عبدالحق حیران رہ گیا۔ وہ شرک سے ڈر رہا تھا، جبکہ اس کے سامنے بیٹھا ہوا تو مسلم اللہ کے سوا کسی حوالے سے بات کرتا ہی نہیں تھا۔ یہاں تو شرک کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

''اب میں آپ کو بتا دوں کہ انشاء اللہ آپ کی دوسری شادی آپ کی بیوی کی موجودگی میں ہوگی۔زائچہ یہ نہیں ظاہر کرتا کہ آپ پہلی بیوی کی موت کے بعد دوسری شادی کریں گے۔''

عبدالحق نے سکون کی سانس لی۔ نور بانو کی موجودگی میں وہ دوسری شادی کیسے کر سکتا تھا۔

شفیق صاحب نے جیسے اس کی سوچ پڑھ لی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جس کی وجہ سے اولاد سے محرومی کے باوجود آپ دوسری شادی نہیں کرنا چاہتے، عجب نہیں کہ اسی کی وجہ سے آپ کو دوسری شادی کرنی پڑے۔''

عبدالحق نے سر جھٹکا۔ اس کے نزدیک یہ امر محال تھا۔وہ تو اس بات سے ڈرتا تھا کہ کسی دن اماں اسے دوسری شادی کا حکم دیں گی، اور وہ انکار نہیں کر سکے گا۔نور بانو تو اس کے قریب کسی کا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔

''اب میں آپ کو اس دوسری لڑکی کے بارے میں بتاؤں، جو آپ کی

زندگی میں آئے گی۔'' شفیق صاحب نے زائچے سے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''وہ ہر اعتبار سے آپ کی پہلی بیوی کا الٹ ہوگی۔ مزاج اور فطرت کے اعتبار سے بھی اور قسمت کے اعتبار سے بھی۔''

''مزاج اور فطرت کی بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ یہ قسمت کے لحاظ سے الٹ ہونے کا کیا مطلب ہے......؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''دیکھیں...... پہلی بیوی سے آپ کو عشق ہے۔ لیکن دوسری بیوی کو آپ بس قبول کریں گے۔ دوسری بیوی کو آپ سے عشق ہوگا۔ پہلی بیوی کا مزاج اگر قابضانہ ہے تو دوسری آپ کی قید میں رہنا پسند کرے گی۔ پہلی بیوی اگر یہ چاہتی ہے کہ آپ اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہیں تو دوسری آپ کی خوشی کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار رہے گی۔ پہلی بیوی لینے والی ہے تو دوسری صرف دینے والی ہوگی۔ پہلی بیوی کی وجہ سے آپ نے جو کچھ گنوایا، دوسری آپ کو وہ سب کچھ واپس دلوائے گی۔ پہلی بیوی مطالبے کرنے والی ہے تو دوسری آپ سے کچھ بھی طلب نہیں کرے گی۔ حتیٰ کہ محبت بھی نہیں۔ پہلی بیوی سے آپ کو اگر کچھ بھی نہیں ملا تو دوسری آپ کو سب کچھ دے گی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انشاء اللہ اس سے آپ کو دو بیٹے ملیں گے۔ آپ کی یہ دوسری بیوی بہت مبارک ہوگی۔ آپ کی دوسری بیوی بہت صابر ہوگی...... آپ کی طرح۔''

''جب ہوگی تو دیکھیں گے۔'' عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''ایک بات بتائیں عبدالحق صاحب! اولاد کی وجہ سے بھی آپ کو کبھی دوسری شادی کا خیال نہیں آتا۔ کیوں......؟''

''میرا ایمان ہے کہ اللہ نے میرے لئے اولاد لکھی ہے تو ضرور ملے گی۔ اور اگر نہیں لکھی تو میں کچھ بھی کرلوں، محروم ہی رہوں گا اور الحمدللہ! میں اللہ کی رضا میں خوش ہوں۔''

''بے شک! اللہ اگر آپ کو پہلی بیوی سے اولاد دینا چاہے تو کون روک سکتا ہے۔'' شفیق صاحب نے ستائشی لہجے میں کہا۔

''جی ہاں......! یہی تو کہہ رہا ہوں میں۔''

''اور اگر وہ آپ کو پہلی بیوی سے اولاد نہ دینا چاہے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔''

''جی......!'' عبدالحق کے لہجے میں الجھن تھی۔

''بے شک......!''

''تو اللہ کو اگر آپ کی پہلی بیوی سے اولاد دینا منظور نہیں، لیکن اس نے آپ کے نصیب میں اولاد لکھی ہے تو آپ چاہیں یا نہ چاہیں، دوسری شادی تو آپ کی ہوکر رہے گی۔''

عبدالحق شرمندہ ہوگیا۔

''جی......! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اللہ کی مرضی تو پوری ہوکر رہتی ہے۔ لیکن وہ کسی کو بتاتا کب ہے؟'' اصل میں وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ بات تو زائچے کے حوالے سے کہی جارہی ہے اور غلط بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ کہنا بداخلاقی ہوتی۔

''میرا خیال ہے کہ اللہ بتاتا ہے، اور سب کو بتاتا ہے۔'' شفیق صاحب نے بڑی سادگی سے اس کی بات سے اختلاف کیا۔ پھر وضاحت کرتے ہوئے بولے۔

''کبھی کسی کو خواب کے ذریعے بشارت یا تنبیہ، کبھی کسی کو کسی علم کے حوالے سے، کبھی کسی کو کسی دوسرے شخص کے ذریعے، اور کبھی براہ راست۔''

''براہِ راست کیسے......؟''

''کبھی دل پر خیال القا کرکے، دیکھیں نا! جسے ہم وجدان کہتے ہیں، درحقیقت اللہ کی راہنمائی ہے۔'' شفیق صاحب نے کہا۔

''اور اللہ کی طرف سے اشاروں کا سلسلہ تو جاری ہی رہتا ہے۔ اشارے اجتماعی بھی ہوتے ہیں اور انفرادی بھی۔ جب گھٹا چھاتی ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ بارش ہونے والی ہے۔ بارش زحمت کا باعث بن جائے، فصلیں تباہ ہو جائیں، سیلاب آجائیں تو ہم کہتے ہیں کہ اللہ ناراض ہے۔ میں کوئی غلط کام کرنے لگوں تو میرے اندر اکراہ پیدا ہوتا ہے۔ میں جب بے نام خوف میں مبتلا ہو جاؤں،

اللہ کے سوا کسی بھی چیز سے ڈرنے لگوں تو سمجھ جاتا ہوں کہ اللہ ناراض ہے۔ کیونکہ ایمان والوں کے لئے اللہ نے فرمایا ہے کہ نہ انہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔ تو اللہ کی طرف سے اشارے تو ملتے رہتے ہیں۔ آدمی اللہ سے رابطے میں نہ ہو تو وہ اس کی سمجھ میں نہیں آتے۔“

عبدالحق کو احساس ہوا کہ شفیق صاحب نے بہت گہری، بہت بڑی بات کہی ہے۔ اس نے اسے ذہن میں محفوظ کر لیا کہ اس پر غور کرنا ہے۔ اسے اس ملاقات پر خوشی ہو رہی تھی۔ وہ بہت کچھ سمجھ رہا تھا، بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔

”لیکن حضرت! جو لوگ غلط راستے پر ہوں، اللہ سے متصادم ہوں، وہ اللہ کی دی ہوئی خوش حالی کو اللہ کا اپنے لئے تائیدی اشارہ سمجھتے ہیں۔“

”جی ہاں! شاید ہر پیغمبر کی امت پر یہ گزری ہے۔ ہمیشہ حقیر اور غریب لوگ ایمان لائے اور صاحب ثروت یہ سوچ کر مگن رہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، وہ درست ہے، ورنہ وہ اتنے زیادہ نوازے کیوں جاتے؟ اور ایمان لانے والے اتنے تباہ حال کیوں ہوتے؟“

”تو اس کا سبب......؟“

”اللہ بہتر جانتا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ جنہوں نے پیغمبر کو جھٹلایا، انہوں نے گویا اللہ نے بغاوت کی۔ تو اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی۔ اور پھر پیغمبر کی موجودگی میں اشاروں کی ضرورت بھی کہاں رہتی ہے۔ تو جس نے پیغمبر کو جھٹلا دیا، وہ اشارے کہاں سمجھے گا۔ آلِ فرعون کو ہی دیکھ لیجئے۔ اللہ نے خبردار کرنے کے لئے کیسے کیسے عذاب بھیجے ان پر، اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اپنے ربّ سے دعا کرو کہ یہ عذاب ہٹا لے، ہم ایمان لے آئیں گے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا پر وہ عذاب ہٹا بھی لئے گئے۔ یعنی انہوں نے عذاب بھی دیکھا اور پیغمبر کی دعا کا اثر بھی۔ اس کے باوجود بھی ایمان نہیں لائے تو اس سے زیادہ واضح اشارے اور کیا ہو سکتے تھے۔ اللہ خود فرماتا ہے کہ جسے وہ گمراہ کر دے، اسے کہیں سے ہدایت نہیں مل سکتی۔ میں تو اللہ کی پناہ مانگتا ہوں گمراہی سے، جبکہ وہ مجھے ہدایت دے چکا ہے۔ میں تو ہر اچھی بری بات میں اللہ کے

اشاروں کی جستجو کرتا ہوں اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”سبحان اللہ......!“ عبدالحق نے بے ساختہ کہا۔

”مجھے بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ اور میں نے بہت کچھ سیکھا آپ سے۔“

”سب اللہ کی طرف سے ہے۔“ شفیق صاحب نے چھت کی طرف اُنگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ایک بات اور کہوں آپ سے۔ یہ دنیا اسباب کا کارخانہ ہے، اور اللہ مسبب الاسباب ہے۔ اس نے اسباب کا ایک ایسا سلسلہ قائم فرمایا ہے، جسے اس کے بندے نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی کھوج سکتے ہیں۔ یہ دنیا حیلے بہانے اور اسباب پر چل رہی ہے۔ یہ بھی شاید اللہ کی طرف سے آزمائش ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر کام کے پیچھے واضح طور پر اللہ کارفرما نظر آتا تو کون ایسا ہوتا جو ایمان نہ لاتا۔ ہم جو آنکھوں سے دیکھتے اور عقل سے سمجھتے ہیں، اسی کے مطابق تو بات کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے، میرا باپ بس کے نیچے آ کر کچلا گیا اور مر گیا۔ یہ نہیں کہتا کہ اللہ کے حکم سے اسے موت آ گئی۔ کوئی کہتا ہے، بارش نہ ہونے سے میری فصل تباہ ہو گئی۔ کوئی کہتا ہے کہ طوفانی بارش اور سیلاب نے میری فصل تباہ کر دی۔ یہ خیال کسی کو نہیں آتا کہ بارش کا ہونا نہ ہونا اللہ کے حکم سے ہے۔ کوئی کہتا ہے، فلاں نے مہربانی کی، میرا فلاں کام کر دیا۔ مگر اسے اللہ کی رحمت کا خیال نہیں آتا۔ ہم اسباب کے حوالے سے معاملات کو جانچتے ہیں۔ جبکہ صرف ایک ظاہری سبب ہی ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ اس ظاہری سبب سے جڑا ہوا اسباب کا وہ سلسلہ جس نے معاملے کو کامیابی کی اس نہج تک پہنچایا، اس کا ہمیں علم نہیں ہوتا۔ ایسے میں ہم اس مسبب الاسباب کے بارے میں کیسے سوچ سکتے ہیں، جس نے وہ اہتمام فرمایا۔

میں سوچتا ہوں عبدالحق صاحب! ہمارے ہاں یہ جو محاورہ ہے...... حیلے روزی بہانے موت...... کتنا سچا ہے۔ موت کا کوئی بہانہ ہوتا ہے، حادثہ ہو یا بیماری۔ اور روزی کے لئے حیلہ ضروری ہے۔ سب کچھ اللہ کرتا ہے، لیکن پس پردہ رہ کر۔ تو عبدالحق صاحب! آدمی کو کچھ درکار ہو تو اسے حیلہ تو کرنا ہوتا ہے۔“

''میرے خیال میں تو دعا ہی حیلہ ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''نہیں عبدالحق صاحب! حیلہ تو عملی کوشش ہے، چاہے برائے نام ہو۔''

''اچھا......! آپ بتائیں، حیلہ کیا ہے آپ کے نزدیک؟''

''کسان کا بیج بونا، فقیر کا صدا لگانا۔ اب کوئی فقیر کہے کہ میرا حال ایسا ہے کہ صدا لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی، تو اس کا گھر سے نکلنا ہی حیلہ ہے۔ حیلہ ضروری ہے عبدالحق صاحب!''

''اور دعا کیا ہے حضرت......!''

''دعا بندگی ہے عبدالحق صاحب!''

''اور بندگی کیا ہے......؟''

''بندگی قلب اور روح کی سچائی کے ساتھ اللہ کے حضور اس بات کا اعتراف ہے کہ ہمارے نزدیک اللہ کے سوا کوئی معبود، کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ واحد، احد اور یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ نہ وہ کسی سے ہے اور نہ کوئی اس سے ہے۔ ہماری چھوٹی سے چھوٹی کوئی ضرورت بھی اس کے سوا کوئی پوری کرنے والا نہیں۔''

''بس! اتنی ہی اہمیت ہے دعا کی......؟'' عبدالحق کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''آپ بندگی کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ یہی تو اصل سبب ہے زندگی کا۔ اس پر تو جنت اور جہنم ہے۔ اگر دعا بندگی ہے تو بہت بڑی چیز ہوئی نا!''

''لیکن جنت اور دوزخ کا فیصلہ تو اعمال پر ہوگا۔''

''بے شک! دعا بندگی کا زبانی اور قلبی اظہار ہے۔ یعنی آپ نظریاتی طور پر اللہ کے بندے ہوگئے۔ سوچ کی، خیال کی بڑی اہمیت ہے۔ اعمال آدمی کے باطن کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔''

''یہاں میں آپ سے اختلاف کروں گا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''ایمان سے محروم لوگ بھی اچھے اعمال کرتے ہیں۔''

''لیکن ایمان کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ انہی کے لئے تو اللہ فرماتا ہے کہ ان

کے اعمال ضائع ہوگئے۔ یعنی دنیا میں ان کا پورا اجر ملے گا۔ لیکن آخرت میں وہ تول پر پورے نہیں اتریں گے۔ شمار ہی نہیں ہوں گے۔ تو پہلی شرط تو ایمان ہی ہے۔''

عبدالحق کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اسے شفیق صاحب پر رشک آ رہا تھا۔ ثابت ہوگیا تھا کہ وہ قرآن پڑھتے اور اس پر غور کرتے ہیں۔

''اور آپ نے اعمال کی بات کی ......'' شفیق صاحب نے اپنی بات جاری رکھی۔

''تو عام انسانوں میں سے شاید ہی کوئی خوش نصیب عمل کی میزان پر پورا اترے۔ جہنم سے تو بس اللہ کی رحمت اور فضل ہی بچائے گا ہمیں، انشاء اللہ! عملی بندگی آسان نہیں۔ یہ دنیا جگہ ہی ایسی ہے۔ پھر ہمارے ساتھ نفس لگا ہوا ہے۔ میں سوچتا ہوں عبدالحق صاحب! کہ زندگی ایک امتحانی پرچا ہے سو نمبر کا۔ اللہ کی رحمت کہ اس نے مشکل پرچے کو اپنے بندوں کے لئے آسان کردیا۔ تو شاید یوں ہے کہ پہلا سوال لازمی ہے تیس نمبر کا۔ جس نے یہ سوال چھوڑ دیا، اس کا باقی پرچا کینسل ہوجائے گا۔ یعنی ستر فیصد لانے پر بھی صفر......''

عبدالحق اس مثال پر پھڑک گیا۔ اس نے بے ساختہ کہا۔

''اور تیس نمبر کا وہ سوال ہے ایمان۔''

''جی ہاں! اور جس نے اللہ کی رحمت سے پہلے سوال کے تیس فیصد نمبر لے لئے، اسے پاس ہونے کے لئے صرف تین نمبر ہی تو درکار ہیں۔ وہ اللہ اپنی رحمت سے ایمان کے صلے میں بھی دے دے گا۔''

''لیکن تھرڈ ڈویژن آئے گی۔'' عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ تو دنیا میں بھی ہوتا ہے۔ سب سے بڑی تعداد تھرڈ ڈویژن والوں ہی کی ہوتی ہے۔'' شفیق صاحب اب بھی سنجیدہ تھے۔

''فرسٹ ڈویژن تو بہت کم طلبا کی آتی ہے۔ اللہ کے ہاں وہ ہیں سبقت لے جانے والے۔'' وہ کہتے کہتے رکے، اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولے۔

''خیر......! بات تو کچھ اور ہو رہی تھی۔ دعا کی بات کر رہے تھے آپ۔ ذرا دیر کو فرض کریں کہ زمین پر زندگی جاری و ساری کرنے کے بعد اللہ اعلان فرماتا کہ

وہ ہر دعا قبول فرمائے گا، لیکن بغیر دعا کے کسی کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس صورت میں آپ کے خیال میں دنیا کا کیا نقشہ بنتا؟''

''میں اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔'' عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔

''میں نے ایک بار یہ تصور کیا، اور میری سمجھ میں آ گیا کہ اس صورت میں زندگی ایک گھنٹہ بھی جاری نہیں رہ سکتی تھی۔ ذرا سوچیں، اللہ سمیع و بصیر ہے، علیم و خبیر ہے، عالم الغیب ہے۔ اس سے کچھ چھپا نہیں...... نہ ساتوں آسمانوں میں، نہ ساتوں زمینوں میں اور نہ ان کے درمیان، اور نہ سینوں میں۔ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ ہر چیز سے باخبر ہے۔ اپنی تمام مخلوقات کی ہر ضرورت کا علم ہے اسے، اور وہ بغیر مانگے ان کی ہر ضرورت پوری کرتا ہے۔ زندگی کے تمام لوازمات انہیں عطا کرتا ہے۔ وہی تو پروردگارِ عالم ہے۔ اور باقی مخلوقات کو تو چھوڑیئے، اشرف المخلوقات کو دیکھئے، ہم وہ ہیں جنہیں اپنے اگلے پل کے بارے میں یہ خبر تک نہیں کہ اس میں ہمارے لئے زندگی بھی ہے یا نہیں، جبکہ دنیا کی ضرورتیں تو زندگی کے دم سے ہیں۔ زندگی نہیں تو سب کچھ ختم۔ ایسے لوگ اپنی ضرورتوں کو کہاں سمجھ سکتے ہیں۔ ہم کیا مانگیں گے اللہ سے۔ وہ بغیر مانگے ہیں ہمیں سامانِ زیست عطا فرماتا ہے۔ بس اپنی ایک ضرورت کا ہمیں پوری طرح علم ہے۔ یہ کہ قیامت کے دن ہم اپنے اپنے نامہ اعمال کے اسیر، جہنم کے حقدار، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت اور اللہ کی مغفرت اور بخشش اور حسابِ یسیر کے محتاج ہوں گے۔ تو دعا بندگی ہی ہوئی نا...... !''

''جی......! میں سمجھ گیا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''مگر حیلے کی اور وضاحت کر دیں۔''

''میں نے مثال دی تھی نا...... ! کسان اور فقیر کی۔''

''لیکن حیلے کے باوجود کچھ نہیں ہوتا تو...... فصل تباہ ہو جاتی ہے یا بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ بھیک بالکل نہیں ملتی یا ضرورت بھر نہیں ملتی۔''

''تو یہ تو مشیت ہے۔ آپ اسے تقدیر کہہ لیجئے۔ بندے کا کام دعا کرنا اور حیلہ کرنا ہے، آگے اللہ کی مرضی۔ اب دیکھئے نا، یہ مثالیں تو عام ہیں۔ ایک شخص صبح سے شام تک سخت محنت کرتا ہے۔ اور اسے بمشکل دو وقت کی روٹی ملتی ہے۔ اور کوئی

شخص ایک گھنٹے میں کوئی خاص مشقت کئے بغیر ہزاروں کما لیتا ہے۔ یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔ قرآن میں کئی جگہ اللہ نے فرمایا کہ وہ جسے چاہے فراخی دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے، تنگ دست کر دیتا ہے۔ یعنی اللہ نے اپنے بندوں کے لئے اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی کہ جو کچھ انہیں حاصل ہوا، وہ ان کی محنت، ان کے ہنر یا ان کے علم کی وجہ سے ہے۔ سعی اور عمل تو بس آخرت کے لئے ہے۔ تو دنیا میں حیلہ ضروری ہے۔ لیکن آخرت کے لئے خاص عمل۔ اب حیلے کی یہ بات دیکھئے کہ میرے پاس اللہ کا عطا کیا ہوا علم کا ایک بہت چھوٹا ذرہ ہے، جو میری اوقات سے بہت زیادہ ہے۔ میں اللہ کا نام لے کر، اس کے دیئے ہوئے علم سے استفادہ کرتے ہوئے، زائچہ بناتا ہوں۔ پھر اس پر غور کرتا ہوں اور بتاتا ہوں۔ اب وہ کتنا مجھ پر روشن ہوتا ہے، یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ میں جو بتاتا ہوں، اس کا صحیح اور غلط ہونا بھی اللہ کی طرف سے ہے۔''

''تو حیلہ بہت ضروری ہے؟'' عبدالحق کے لہجے میں اب بھی بے یقینی تھی۔

''جی ہاں! اب آپ سوچئے تو، کسی کو اولاد کی آرزو ہو اور وہ اللہ سے اس کی دعا کرتا ہے۔ لیکن شادی کئے بغیر، تو اولاد اسے کہاں سے ملے گی؟ تو اولاد کے لئے شادی کا حیلہ ضروری ہے۔''

''لیکن میں تو شادی کر چکا ہوں۔'' عبدالحق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شفیق صاحب کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''میں نے تو بے خیالی میں ایک مثال دی تھی۔ میرا اشارہ آپ کی طرف نہیں تھا۔''

''مگر حیلہ تو میں کر چکا ہوں نا!''

''گستاخی معاف، آپ کو سوچنا چاہئے کہ شاید اللہ کی مرضی اس بیوی سے اولاد عطا کرنے کی نہیں، تو آپ کو دوسری شادی کرنی چاہئے۔''

''لیکن حضرت...... ! اللہ کی قدرت سے کچھ بھی باہر نہیں۔ اس کی مثالیں موجود ہیں۔''

"دیکھئے عبدالحق صاحب ...! ہم اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں تو ایک بات واضح ہو جاتی ہے۔ یہ دنیا ایک مربوط نظام، ایک سسٹم کے تحت چل رہی ہے۔ یہ اللہ کا قائم کیا ہوا نظام ہے۔ دن اور رات کی تقسیم، سورج ہر روز اپنے وقت پر نکلتا اور غروب ہوتا ہے۔ دن روشن ہے، اس لئے دنیا کے کام اس میں آسانی سے ہوتے ہیں۔ اور رات اندھیری ہے، اس لئے آرام کے لئے ہے۔ موسم بھی مقررہ وقت پر آتے ہیں۔ اسی حساب سے فصلوں کے لئے وقت بھی مقرر کئے گئے ہیں۔ کبھی آسمان پر گھٹا ہوتی ہے، اور دھوپ نہیں نکلتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سورج نہیں نکلا۔ سورج تو اپنے وقت پر ہی نکلا، لیکن گھٹا کی وجہ سے ہمیں نظر نہیں آیا۔ دن مقررہ وقت پر شروع ہو گیا اور مقررہ وقت پر ہی رات بھی آئے گی۔ سورج اور چاند گرہن کا حساب 2000 تک کا تو یونانیوں نے لگایا ہوا ہے کہ اس دوران کب، کتنے بج کر کتنے منٹ پر سورج یا چاند گرہن ہو گا۔ اور وہ اب تک سیکنڈز کی حد تک درست ثابت ہوتا آیا ہے۔ صرف اس لئے کہ اللہ کا قائم کیا ہوا نظام مکمل ہے۔ اللہ نے راہنمائی فرمائی، انسان کو اس کا ادراک عطا فرمایا اور اسے آسانی کے ساتھ اس کا پابند کر دیا۔ ہمیں معلوم ہے کہ فصل ربیع کا وقت کون سا ہے اور خریف کا کون سا ہے۔ سب مقررہ وقت پر ہل چلاتے اور بوائی کرتے ہیں، اور فصل بھی مقررہ وقت پر ہی اترتی ہے۔ اللہ اپنے نظام میں خلل نہیں پڑنے دیتا۔ اب اس مربوط نظام کی بنیاد پر دہریے کہتے ہیں کہ کوئی خدا نہیں، ایک خلائی تصادم کے نتیجے میں زمین وجود میں آئی، اور کیمیاوی عمل اور ردعمل کے نتیجے میں اس پر زندگی کا آغاز ہوا۔ یہ خودکار نظام ہے اور خودبخود چل رہا ہے۔"

عبدالحق اس وقت سراپا سماعت تھا۔ وہ سحر زدہ سا شفیق صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اپنے لڑکپن میں پہنچ گیا تھا، جب وہ گرد و پیش پر غور کرتا اور اسی طرح کی باتیں سوچتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے کب اور کیسے، وہ پیچھے چلا گیا۔ یہ سب تو اسے خود ہی سمجھ لینا چاہئے تھا۔

"لوگ اس طرح گمراہی میں پڑتے ہیں۔" شفیق صاحب کہہ رہے تھے۔

"اللہ کی رحمت بے پایاں ہے۔ اسے اپنے بندوں کی گمراہی گوارہ نہیں۔

ان کی ہدایت کے لئے اس نے معجزے بھی دکھائے۔ اللہ نے اپنے بندوں پر حجت تمام کر دی۔ ان کے لئے گمراہی کا کوئی معقول جواز نہیں رہنے دیا۔ پیغمبر بھیجے، انہیں معجزے عطا فرمائے، صحیفے اتارے، اپنی کھلی نشانیاں دکھائیں۔ قیامت کے دن کوئی اپنے کفر، اپنی گمراہی کا عذر نہیں پیش کر سکے گا۔"

"بے شک.....!" عبدالحق نے کہا۔

"آپ نے جس طرف اشارہ کیا عبدالحق صاحب! وہ تین واقعات ہیں، جن کا اللہ نے قرآن میں ذکر فرمایا ہے۔ ان میں دو پیغمبر تھے اور ایک، ایک جلیل القدر پیغمبر کی ماں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی زوجہ کی موجودگی میں فرشتوں نے بیٹے کی بشارت دی تو ان کی زوجہ نے کہا کہ وہ بوڑھی اور بانجھ، اور ان کے شوہر ضعیف، اولاد کا کیا سوال؟ یعنی انہوں نے دنیاوی سسٹم کا حوالہ دیا۔ اور فرشتوں نے کہا، ایسا ہی ہو گا، کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ کیونکہ اللہ کا حکم پورا ہو کر رہتا ہے۔ پھر حضرت ذکریا علیہ السلام نے اولاد کے لئے اللہ سے دعا کی ... ایسے عالم میں کہ ضعیف تھے اور ان کی زوجہ بھی بوڑھی اور بانجھ تھیں۔ اللہ نے دعا قبول فرمائی اور انہیں حضرت یحیٰی علیہ السلام کی ولادت کی بشارت دی۔ تب انہیں خیال آیا کہ اولاد کی اہلیت نہ تو وہ خود رکھتے ہیں اور نہ ان کی اہلیہ۔ لیکن اللہ نے فرمایا کہ یہ ہو کر رہے گا۔ پھر حضرت بی بی مریم کنواری تھیں۔ لیکن اللہ کے حکم سے حاملہ ہوئیں۔ انہیں بھی اس کی اطلاع دی گئی تو انہوں نے بھی حیرت سے فرمایا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، جبکہ مجھے تو کسی مرد نے چھوا تک نہیں۔ اور اللہ نے فرمایا کہ ایسا ہی ہو گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔"

"میں اس پر سوچتا ہوں عبدالحق صاحب! تو میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ یہ معجزے درحقیقت اس وقت سے لے کر قیامت تک اس زمین پر پیدا ہونے اور زندگی گزارنے والے انسانوں کے لئے عظیم ترین رحمت تھے۔ میں غور کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ یہ کلمہ شہادت کی شہادت دیتے ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی معبود، کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ واحد، احد اور یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ یعنی اس کی قدرت سے کچھ باہر نہیں۔ اس نے ایک مکمل نظام قائم اور جاری فرمایا۔ اس

نظام کو اصولوں اور ضابطوں کا پابند فرمایا۔ قوانین بنائے اور ان کا اطلاق فرمایا۔ سب اس کے پابند ہیں، سوائے اس کے۔ وہ اپنے بنائے ہوئے نظام سے باہر جب، جو چاہے کر سکتا ہے۔ اصول، ضابطے اور قوانین اس کے لئے نہیں۔ تو یہ گواہی ہے نا اس گواہی کی کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ واحد، احد اور یکتا ہے۔ کیونکہ اس کے سوا باقی سب اس نظام کے اصولوں، ضابطوں اور قوانین کے پابند ہیں۔''

''اب یہاں انسان کی بدبختی دیکھیں کہ وہ اللہ کی عظیم رحمت کو ہدایت کے بجائے گمراہی کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ سو بدبختوں نے پیغمبر کو اللہ کا بیٹا مان لیا۔ جبکہ اللہ نے کتاب میں واضح کر دیا کہ وہ انسانوں میں انہی جیسے کسی انسان کو پیغمبر بنا کر بھیجتا ہے۔ اور وہ بدبخت اللہ کو ماننے والے ہیں، لیکن پورے کلمہ شہادت کی نفی کرتے ہیں۔ بیٹا تو باپ کا وارث ہوتا ہے۔ نسل آگے بڑھاتا ہے۔ بیٹا تو ہر چیز میں باپ کا شریک ہوتا ہے۔ معبود کا بیٹا ہو تو معبود واحد اور احد کیسے ہو سکتا ہے۔ باپ کی عبادت ہوگی تو بیٹے کی بھی ہوگی۔ تو ظالموں نے اللہ کو ماننے کے باوجود سب کچھ گنوا دیا۔ بلکہ اللہ کے شدید غیض و غضب کے حق دار ہو گئے۔ کیونکہ اللہ کو سب سے زیادہ غضب اس بات پر آتا ہے کہ اس پر رشتوں کی تہمت لگائی جائے۔ یہ بدترین شرک ہے۔'' شفیق صاحب کہتے کہتے رکے، پھر گہری سانس لے کر بولے۔

''بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ ہم تو حیلے کے بارے میں بات کر رہے تھے، تو بات یہ ہے کہ اللہ کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ کن فرما دیں تو زمین آسمان جیسی تخلیقات وجود میں آجائیں، اور جس امر کا وہ محض ارادہ کر لیں، وہ رونما ہو جائے۔ لیکن اللہ نے یہ نظام قائم فرمایا۔ اس کے لئے اصول، ضابطے اور قوانین بنائے۔ اسباب کا سلسلہ قائم فرمایا۔ اسی لئے تو کائنات کا نظام بغیر کسی خلل کے چل رہا ہے۔ اللہ کی مرضی ہو تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ لیکن یہ نظام اس نے میزان کے ساتھ، عدل کے ساتھ قائم فرمایا ہے۔ تو دیکھ لیں کہ سورج ہر روز مقررہ وقت پر طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ لیکن قیامت کی نشانیوں میں سے ہے کہ ایک دن سورج الٹا چلے گا اور مشرق میں غروب ہوگا۔ یعنی نظام میں انتشار شروع ہوگا، جو قیامت پر ختم

ہوگا۔ قیامت تو سب کچھ تہس نہس ہو جانے کا نام ہے نا! اب آپ کو ایک ہزار روپے کی ضرورت ہے اور آپ اللہ سے اس کے لئے دعا کرتے ہیں تو اس کے بعد آپ کو حیلہ کرنا ہوگا۔ یعنی اللہ کے بندوں میں سے کسی سے سوال کرنا ہوگا۔ اب دعا کی اور پہلے اللہ سے سوال کیا، تو اللہ خوش ہو کر آپ کو اس بندے کی طرف بھیجے گا، جو اس کے حکم سے آپ کی ضرورت پوری کرنے والا ہوگا۔ اور اس کی مرضی ہوئی، کرم زیادہ ہوا تو یہ ہوگا کہ بغیر مانگے کوئی آپ کو یہ رقم دے جائے گا۔ لیکن آپ یہ امید نہیں کر سکتے کہ آپ کے گھر کی چھت سے یہ رقم آپ پر ٹپک جائے گی۔ اگرچہ یہ بھی اللہ کی قدرت سے باہر نہیں۔ لیکن آپ کو بہرحال سسٹم میں رہ کر امید رکھنی ہے۔ اللہ سے معجزے کا تقاضا کرنا گستاخی ہے۔ جن لوگوں نے بھی یہ شرط لگائی، وہ ایمان سے ہمیشہ کے لئے دور ہوئے، اور کفر میں جا پڑے۔ لیکن دعا بندگی ہے اور بندگی میں بڑی طاقت ہے۔ میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں، جنہیں ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ ان کے ہاں کبھی اولاد نہیں ہو سکتی۔ لیکن اللہ نے ان کی دعا سنی اور اولاد عطا فرما دی۔ میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں، جنہیں بیماری میں ڈاکٹروں نے جواب دے دیا کہ ان کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ لیکن وہ شفایاب ہو گئے، اور ڈاکٹروں کے دیئے گئے وقت کے برسوں بعد، آج بھی زندہ ہیں۔ اللہ کی قدرت، رحمت، عطا اور فضل برحق ہے عبدالحق صاحب! لیکن میرے خیال میں حیلہ ایمان کے استحکام کے لئے ضروری ہے۔''

''جزاک اللہ! حضرت! آپ نے مجھے بہت اچھی طرح سمجھا دیا۔'' عبدالحق نے پرخلوص لہجے میں کہا۔

''اور کچھ پوچھنا چاہتے ہیں آپ......؟''

عبدالحق ہچکچا رہا تھا۔ لیکن بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔

''مجھے حج کی بڑی آرزو ہے حضرت...!''

''تو یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ وہاں اللہ کے بلاوے کے بغیر کوئی نہیں جا سکتا۔''

''جی...! بے شک...! لیکن آپ کی ایک بات نے مجھے فکرمند کر دیا

ہے۔"

"آپ کھل کر کہیں نا.....!"

"آپ کے گرو جی نے میرے زائچے کے بارے میں کہا کہ میرے نصیب میں غیر ملکی سفر نہیں ہے.....؟"

"جی ہاں.....! زائچہ تو یہی بتاتا ہے۔"

"اور یہ بھی بتایا کہ میری موت ملک سے باہر ہوگی.....؟"

"جی ہاں.....! آپ کے زائچے میں یہ دونوں متضاد باتیں موجود ہیں۔"

"اگر میری قسمت میں غیر ملکی سفر نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ میں حج نہیں کر سکوں گا۔"

شفیق صاحب چند لمحے سوچتے رہے، پھر بولے۔

"دیکھئے..... میں حج کو اس معاملے سے الگ سمجھتا ہوں۔"

"لیکن علم تو آپ کو یہی بتاتا ہے نا.....؟"

شفیق صاحب ہچکچاتے رہے۔ پھر انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اب یہ بتائیں کہ اس تضاد کے بارے میں آپ کا علم کیا کہتا ہے کہ غیر ملکی سفر میں کروں گا نہیں اور موت میری بیرون ملک ہوگی۔"

شفیق صاحب پھر سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ دیر وہ زائچے کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا۔

"اس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ پہلے زائچے میں موجود ایک اور تضاد پر بات کر لیں۔ زائچے کی رو سے آپ بادشاہ بھی ہیں، فقیر بھی اور غلام بھی۔ اب میں تو آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ ہاں عبداللہ صاحب کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ بادشاہ تھے۔ لیکن لال آندھی میں تو سب کچھ ختم ہو گیا ہوگا۔ اب آپ ہی مجھے بتائیں، عارف صاحب نے جو آپ کا تعارف کرایا تو اس سے تو یہ لگتا ہے کہ آپ نوکری کر رہے ہیں۔"

"جی ہاں! یہ درست ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"لیکن کسی مجبوری اور ضرورت کے تحت نہیں۔ میرے ایک شفیق بزرگ

ہیں۔ یہ ان کے حکم کی تعمیل ہے۔ ان کے نزدیک یہ قومی خدمت ہے۔"

"تو آپ ضرورت مند نہیں۔ حالانکہ لال آندھی کے بعد"

"اللہ کا فضل ہے، اماں، جنہوں نے مجھے دودھ پلایا تھا، انہوں نے لال آندھی سے پہلے بہت کچھ مجھے دے دیا تھا۔ وہی میرے لئے بہت کافی تھا۔"

عبدالحق نے انہیں قیام پاکستان کے بعد کی تفصیل بتائی۔

"افسروں نے ادھر ادھر کے گاؤں کی زمین بھی میرے نام کرا دی۔ اور کھدائی کے بعد حویلی کے تہ خانے سے بھی بہت کچھ نکلا۔ لیکن میں نے سب کچھ زبیر بھائی کو سونپ دیا ہے۔ میرے پاس تو اتنی فرصت ہی نہیں۔"

"یہ زبیر صاحب کون ہیں؟"

"حویلی کے ملازم تھے، پتا جی نے انہیں اور ان کی بیوی کو میرے ساتھ دہلی بھیجا تھا۔ وہ دونوں میرے ساتھ ہی مسلمان ہوئے تھے۔"

"ماشاء اللہ! ہدایت کا سلسلہ کتنی دور تک جاتا ہے۔" شفیق صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ پھر بولے۔

"تو بات تو سچ ہے۔ آپ بادشاہ ہیں۔ لیکن مزاج میں فقیری ہے۔"

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"جی نہیں! پیسہ میں دل کھول کر خرچ کرتا ہوں۔ کئی جگہوں پر زمینیں خریدی ہیں میں نے۔ گاڑیاں کئی ہیں میرے پاس۔ ابھی حال ہی میں ایبٹ آباد میں زمین خریدی ہے۔"

"بہر حال میری سمجھ میں بات آ گئی۔" شفیق صاحب نے کہا۔

"زائچے کے جس تضاد کی آپ نے بات کی، میں اس کے بارے میں بتاتا ہوں کہ میں اسے کیسے دیکھتا ہوں۔ ایک پہلی بات تو یہ ہے کہ عین ممکن ہے، مجھ سے تشریح میں کوئی غلطی ہوئی ہو، اور ان میں سے ایک بات غلط ہو، یعنی بیرون ملک وفات اور غیر ملکی سفر میں سے کوئی ایک۔ دوسری بات، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ حج کا معاملہ میں سب سے الگ سمجھتا ہوں۔ بادشاہوں کا بادشاہ، جسے جب چاہے، اپنے ہاں مہمان بلا لے۔ اور اس کا بلاوا نہ ہو تو زائچے میں موجود

غیر ملکی سفر بھی بے کار ہے۔ ابھی ہم اس پر بات کر چکے ہیں کہ اللہ جب چاہے، اپنے لکھے ہوئے مقدر میں، اپنے بنائے ہوئے اٹل قوانین میں بھی وقتی ترمیم کر لیتا ہے۔ قادر مطلق جو ہوا۔ تو اس صورت میں زائچے کی کسی بات کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ اور عبدالحق صاحب، یہ بھی ممکن ہے کہ زائچہ بھی درست ہو اور میری تشریح بھی درست ہو۔ اور دونوں متضاد باتیں درحقیقت واقع ہو کر رہیں۔''

''یعنی میں غیر ملکی سفر بھی نہ کر سکوں اور میری موت بیرون ملک ہو۔'' عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہے.....؟''

''جب اللہ کی بات ہو رہی ہو تو ایسا جملہ کبھی منہ سے نہ نکالیں عبدالحق صاحب!'' شفیق صاحب کے لہجے میں ہلکی سی تنبیہ تھی۔

''یہ ممکن اور ناممکن تو ہم بے بس اور فانی انسانوں کے لئے ہے۔''

عبدالحق پر تھرتھری چڑھ گئی۔ وہ دل ہی دل میں توبہ کر رہا تھا۔ اسے شرمندگی ہو رہی تھی کہ زائچے کو شرک سمجھنے والا وہ تو ایسی بات کر رہا تھا، اور زائچہ بنانے والا اسے ٹوک رہا تھا۔ تو وہ زائچہ بنانے والا اللہ سے کتنا ڈرتا ہے، اور وہ خود.....!

''اللہ کے لئے کچھ ناممکن نہیں، معجزہ کیا ہوتا ہے۔ خلاف معمول، خلاف عقل اور خلاف علم ہونے والا کوئی ایسا کام، جس کی توجیہہ سے انسان عاجز ہو، اور معجزہ صرف اللہ کے لئے ہے، صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس کی رحمت اور حکم سے کسی بندے سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جائے تو اسے کرامت کہتے ہیں، معجزہ نہیں، اور ہوتی وہ بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ اور اس کے حکم سے ہوتی ہے۔''

''جی.....! میں سمجھ گیا۔'' اس بار عبدالحق کے لہجے میں بلا کا عجز تھا۔

''یہ کائنات اسرار سے پٹی پڑی ہے عبدالحق صاحب!'' شفیق صاحب نے کہا۔

''ہر ہونی میں کتنے ہی رموز ہیں۔ اللہ نے انسان کو پیدا فرمایا تو اس پر بڑے کرم فرمائے۔ اسے تمام مخلوقات پر فضیلت عطا فرمائی۔ زمین پر اسے اپنی

نیابت عطا فرمائی۔ اپنا خلیفہ بنایا اور سب کچھ اس کے لئے تسخیر کر دیا۔ لیکن دیکھیں تو انسان ابھی اپنے نظام شمسی کو بھی نہیں سمجھ پایا۔''

''اللہ نے سب کچھ تسخیر کر دیا تو انسان بے خبر کیوں ہے.....؟''

''میں بھی اس پر سوچتا ہوں۔ اللہ کا نائب ہونا کوئی مذاق نہیں۔ اللہ نے کتنی صلاحیتیں، کتنی طاقتیں انسان کو عطا کی ہوں گی، اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اچھے بادشاہ اپنے ولی عہد کو ہر طرح کی تربیت دلاتے تھے، تمام علوم وفنون میں انہیں طاق کیا جاتا تھا، جنگی صلاحیتیں ابھاری جاتی تھیں۔ اسلحہ کا استعمال سکھایا جاتا تھا۔ جبکہ یہ تو اللہ کی نیابت کا معاملہ ہے۔ اور یہ نیابت کسی ایک انسان کے لئے نہیں، تمام انسانوں کے لئے ہے۔ جو چاہے، خود کو اہل ثابت کر دے، منصب اسی کا ہے۔ تو وہ بے پناہ صلاحیتیں اور طاقتیں ہر انسان میں موجود ہیں۔ لیکن وہ ان سے بے خبر ہے، ان کے ادراک سے محروم ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ہر آدمی کے اندر ایک غار ہے، جس میں یہ خزانے موجود ہیں۔ چالیس چوروں کے غار کا تصور کیجئے۔ اس کا دروازہ کھل جا سم سم کہنے پر کھلتا تھا۔ تو یہ ہماری صلاحیتوں اور طاقتوں کے خزانے کا دروازہ کیسے کھلے گا؟ میرا خیال ہے، کلمہ شہادت کے ذریعے، یہ گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے آخری پیغمبر ہیں۔ لیکن یہ کوئی چوروں کا خزانہ نہیں کہ بس لفظ ادا کئے اور دروازہ کھل گیا۔ دنیا دارالعمل ہے۔ کبھی میں غور کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ سورۂ اخلاص کلمہ شہادت کی تصریح ہے۔ کلمہ شہادت میں تو صرف اللہ کا معبود ہونا ہے۔ سورۂ اخلاص وضاحت کرتی ہے وحدانیت کی۔ یہاں وہ واحد ہی نہیں، احد بھی ہے۔ اور پھر اللہ کی ایک بڑی صفت، وہ صمد بھی ہے۔ بے نیاز، اسے کسی کی ضرورت نہیں، اسے کچھ چاہئے بھی نہیں، کیونکہ جو کچھ بھی ہے، سب اسی کا ہے۔ اسے تو ہماری بندگی کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ تو اس بندگی کے لئے بڑے بڑے انعامات لئے بیٹھا ہے۔ وہ تو دینے والا ہے۔ اور آگے فرماتا ہے، نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ کسی سے جنا گیا۔ تو وراثت کا سلسلہ ختم۔ یہ جو ہمارے دنیاوی رشتے ہیں، ماں، باپ، بیوی، اولاد..... یہ وہ بنیادی رشتے ہیں، جس سے رشتہ داریاں

آگے بڑھتی ہیں، اللہ ان سب سے پاک ہے۔ یہاں اس کی صفت پر آخری مہر لگ گئی کہ وہ صمد ہے، ہر احتیاج سے پاک، ہر ضرورت سے بے نیاز۔ تو ثابت ہو گیا کہ وہ یکتا ہے، اس جیسا کوئی نہیں۔ کوئی اس کا ہم پلہ، کوئی اس کا ہم سر نہیں۔ وہ سب سے بلند ہے اور ہر کمزوری سے پاک کہ ضرورت ہی تو کمزور بنانے والی چیز ہے۔ جبکہ وہ قادرِ مطلق ہے۔ دنیا میں یہ واضح ہے کہ بیٹا باپ جیسا ہوتا ہے، کبھی وہ باپ سے آگے بھی نکل جاتا ہے۔ اللہ نیوا ضح کر دیا کہ نہ اس کے ماں باپ ہیں، نہ بیوی اور نہ اولاد۔ تو اس جیسا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ کلمہ شہادت کا ''لاشریک لہٗ'' ہو گیا۔ اور آخری آیت میں اس نے اعلان فرما دیا کہ کوئی اس کا ہم سر نہیں، کسی اعتبار سے اس جیسا نہیں، جو کہ پچھلی آیات سے اخذ ہونے والا منطقی نتیجہ ہے۔ یہ ہے سورۂ اخلاص، بندے خالص شرک سے پاک کر دینے والی، بندے کو اللہ کا بندہ بنا دینے والی سورۂ مبارکہ ...کلمہ شہادت کی بلیغ تشریح۔

''تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ چابی ہے، اللہ کی نیابت اور خلافت کی۔ اپنا اصل منصب حاصل کرنا ہے تو اس پر عمل کرو۔ یہ پہلی سیڑھی ہے اس مقام پر پہنچنے کی۔ اب اللہ کی نیابت کوئی ایسی چیز نہیں کہ ایک سیڑھی چڑھ کر حاصل کر لی جائے۔ لیکن اس سے آپ کے سامنے وہ پورا زینہ آ جاتا ہے، جو آپ کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ اور زینہ ہے کتاب اللہ، جس میں یہ چھوٹی سی راہنما سورۂ مبارکہ ہے۔''

''تو اللہ نے یہ کائنات اور اس کی ہر چیز مسخر فرما دی۔ اپنے خلیفہ کے لئے، ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی۔ باطنی طور پر صرف ان لوگوں کے لئے، جو اس کے بندے ہیں۔ اور ظاہری طور پر سب کے لئے، چاہے وہ اسے نہ مانتے ہوں۔ اب دیکھیں، چار اہم ترین عناصر ہیں، مٹی، پانی، ہوا اور آگ۔ مٹی یعنی زمین تو ہمیں عطا ہی مسخر کر کے فرمائی کہ وہ جائے قرار ہے۔ کشش کا اور میزان کا نظام قائم فرمایا اور زمین میں پہاڑوں کے لنگر گاڑے کہ وہ ہمیں ہمیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔ وزن کا نظام قائم فرمایا کہ بے وزنی کی کیفیت میں تو ہم اپنی مرضی سے چل بھی نہ پاتے۔ زمین کو تسخیر فرمایا کہ ہم اس پر مکان بناتے ہیں، کھیتی باڑی کرتے

ہیں، جنگلات اگاتے ہیں۔ یہ سب بغیر مانگے عطا فرمایا اور القا کے ذریعے راہنمائی فرمائی۔ پھر آگ پر قابو عطا فرمایا کہ تمام مخلوقات کے برعکس ہم کھانا پکا کر کھاتے ہیں۔ آگ پر باطنی طور پر مسخر کرنے کی نشانی آتش نمرود ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک رواں بھی نہیں جلا سکی۔ پھر پانی ہے، جس میں ہم تیرتے بھی ہیں، کشتیاں اور بڑے بڑے جہاز بناتے ہیں، جن پر اسباب تجارت لاد کر ہم سمندر کے سینے پر مہینوں کی مسافت طے کرتے ہیں، سمندر پر، جس کی گہرائی نامعلوم ہے۔ صرف اس لئے کہ اللہ نے اسے ہمارے لئے مسخر کر دیا۔ اور ہوا کو لیجئے۔ پرندے اللہ کی نشانی ہیں کہ اس نے ہوا کو مسخر کر دیا ہے۔ انہیں اڑتے دیکھ کر ہی انسان کے دل میں اڑنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے اس پر سوچا، یوں جہاز بنائے گئے، جنہوں نے سفر کو آسان کر دیا۔ یہ سب ظاہری طور پر سامانِ زیست ہے۔ سب کے لئے ہے۔ لیکن اس میں حیلے کی ضرورت پڑی اور پھر اللہ نے راہنمائی فرما دی۔ غور و فکر اور تجسس بھی حیلہ ہے، اور اللہ نے قرآن میں اس کا حکم دیا ہے۔

''اب انسان کی فطرت اترا جانا ہے۔ غرور نہ کرنے لگے، یہ نہ سمجھنے لگے کہ وہی ہر چیز پر قادر ہے، اس کے لئے اللہ نے رحمت فرمائی۔ زمین مسخر کر دی۔ لیکن جب زلزلے کا حکم دیا تو نہ انسان کو اس کا پتا چلتا ہے اور نہ وہ اسے روک سکتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں بڑے بڑے سفر کرتی ہیں، لیکن آدمی اپنے بنائے ہوئے جن بڑے بڑے جہازوں کو ناقابل تسخیر سمجھتا ہے، وہ پہلے ہی سفر میں اپنی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی غرق ہو جاتے ہیں۔ اللہ کے حکم سے سمندر چڑھ جائے تو بستیاں نیست و نابود ہو جاتی ہیں اور بے بس انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ اللہ کے حکم سے ہوا غضب ناک ہو جائے تو آدمی کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں ہوتا۔ سب کچھ تہ و بالا ہو کر رہ جاتا ہے۔ جنگل میں آگ بھڑک اٹھے تو بجھائے نہیں بجھتی اور اتنی تیزی سے پھیلتی ہے کہ سنبھلنے کا موقع نہیں دیتی۔ یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں بندوں کے لئے اصل مالک وہ ہے۔ سب اس کی قدرت ہی ہے۔ اس کے نائب کے لئے اس کی اطاعت اور بندگی لازمی ہے۔'' شفیق صاحب کہتے کہتے رکے۔

''معاف کیجئے گا، میں بھی کہاں کا کہاں نکل گیا''

''آپ کہتے رہیئے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''جب اللہ کے مظاہر پر بات ہو تو ارتکاز کہاں ممکن ہے۔ عقل تو کثرت سے حیران اور عاجز ہو جاتی ہے۔ آپ یقین فرمائیں، میں بڑی دلچسپی سے سن رہا ہوں۔ بلکہ اس دوران میری سمجھ میں عناصر کی باطنی تسخیر کی مثالیں بھی آئیں۔ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت کے لئے سمندر کو پھاڑ کر اسے پار کرنے کا راستہ بنا دیا۔ اور پھر اسی سمندر کو ملا کر فرعون کو اس کی فوج سمیت غرق کر دیا۔''

''جی ہاں ! یہ عناصر کی بات تو ضمنی طور پر نکل آئی۔ ویسے یہ بنیادی بات ہے۔'' شفیق صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔

''دراصل میں ان دو اہم ترین جہتوں کی بات کر رہا تھا، جو اس نظام میں کارفرما ہیں، جن کے بارے میں انسان کم ہی غور کرتا ہے۔ وہ ہیں زمان و مکاں۔ یعنی وقت اور مقام، آپ وقت کہہ لیجئے یا زمانہ۔ اللہ نے آدم علیہ السلام اور بی بی حوا کو زمین پر بھیجا۔ یہ مقام ہے۔ پہلے ان کا مقام جنت تھا۔ اور وقت اس کائنات کی اہم ترین چیز، اللہ کی قدرت کا بہت بڑا مظہر اور بہت بڑا راز۔ وقت جو جاری و ساری ہے۔ کبھی رکتا نہیں۔ جس کی ابتداء ازل ہے اور انتہاء ابد، لیکن ازل اور ابد کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، کوئی نہیں جان سکتا۔ یہ وقت یہاں زندگی کا پیمانہ ہے۔ یہ میعاد کا، مہلت کا تعین کرتا ہے۔ اس کی اہمیت تو دیکھیں کہ اللہ نے اس کی قسم کھائی، تو ہم زمان و مکاں کے پابند ہیں۔ اگر ہمیں یہاں سے ایک میل دور جانا ہے بغیر سواری کے تو مجھے وہاں پہنچنے میں پندرہ منٹ لگیں گے اور آپ کو شاید دس منٹ لگیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ ہم ایک سیکنڈ میں وہاں پہنچ جائیں۔ یہ وہ قانون ہے، جس کے تحت زندگی کا نظام چل رہا ہے۔ ہم سب وقت کے تابع ہیں۔ وقت ہمیں آگے بڑھاتا اور اس منزل تک پہنچاتا ہے، جو اللہ نے ہمارے لئے متعین کی ہے۔ ہم وقت میں سفر کرتے ہیں۔ پیدا ہوتے ہی وقت سے ہمارا تعلق قائم ہوتا ہے۔ اس میں سفر کرتے ہوئے ہم بچپن، لڑکپن، جوانی اور ادھیڑ عمری سے گزر کر بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہوتے ہیں، اور اللہ نے ہمارے لئے جو میعاد مقرر کی ہے، اس تک پہنچ کر قوت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ ہم زمان و مکاں کی قید میں ہیں۔

لیکن اللہ نے اپنے بندوں، اپنے غلاموں کے لئے سب کچھ تسخیر کر رکھا ہے، اور اس میں زمان و مکاں بھی شامل ہیں۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں.....؟'' عبدالحق نے اعتراض کیا۔

''میری کیا مجال کہ کچھ کہہ سکوں۔'' شفیق صاحب عاجزی سے بولے۔

''یہ تو قرآن کہتا ہے۔ میں معراج شریف کا حوالہ نہیں دوں گا کہ وہ اللہ اور اس کے سب سے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معاملہ ہے، اور ایسا معاملہ کسی انسان کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن سورۂ کہف میں اصحاب کہف کا معاملہ دیکھ لیجئے کہ وہ ایمان سے جبراً محروم کئے جانے کے خوف سے پناہ لینے کے لئے ایک غار میں پہنچے، اور وہاں سو گئے۔ اٹھے تو ان کا گمان یہی تھا کہ وہ چند گھنٹے سوئے ہوں گے باہر نکلنے پر انہیں پتا چلا کہ زمانے گزر گئے۔ قرآن میں ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ لوگ تین سو سال اس غار میں رہے اور کچھ اس میں نو سال کا اضافہ کرتے ہیں، جبکہ حقیقت اللہ ہی جانتا ہے۔ اور وہ سو کر اٹھے تو ویسے ہی جوان تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس غار میں وقت کی گردش اللہ کے حکم سے ٹھہر گئی تھی۔ وہ اللہ کا راز ہے۔ وہ ایک نشانی تھی کہ اللہ قادرِ مطلق ہے۔

''مگر اب میں سورۂ نمل کا حوالہ دیتا ہوں۔ ہدہد حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس خبر لایا سبا کے بارے میں اور انہیں ملکہ سبا کے بہت بڑے تخت کے بارے میں بتایا۔ آیت نمبر ۳۸ اور ۴۰ کے درمیان کچھ یوں ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے کہا، اے اہل دربار! کون تم میں سے لا سکتا ہے میرے پاس اس کا تخت اس سے پہلے کہ وہ حاضر ہوں میرے حضور مطیع فرمان ہو کر۔ عرض کیا ایک قوی ہیکل جن نے، میں حاضر کر دوں گا آپ کے پاس وہ تخت، اس سے پہلے کہ آپ اٹھیں اپنی جگہ سے۔ اور یقیناً میں اس کی طاقت رکھتا ہوں اور امانت دار بھی ہوں۔ کہا اس شخص نے جس کے پاس تھا کتاب کا علم کہ میں لے آتا ہوں وہ تخت آپ کے پاس اس سے پہلے کہ جھپکے آپ کی پلک۔ چنانچہ جب دیکھا سلیمان علیہ السلام نے اس تخت کو رکھا ہوا اپنے پاس تو پکار اٹھے، یہ فضل ہے میرے رب کا۔''

''میں نے ان آیات کو پڑھا عبدالحق صاحب! تو مجھے لگا کہ یہ ایک بہت

بڑی حقیقت کی اطلاع دے رہی ہیں۔ قوی ہیکل جن طاقت ور تھا اس نے دربار برخواست ہونے سے پہلے تخت لانے کی پیش کی کی۔ جو دنیاوی نظام کے مطابق تھی۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ جبکہ کتاب کا علم رکھنے والے نے وہ بھاری تخت پلک جھپکنے سے پہلے سلیمان علیہ السلام کے سامنے پیش کر دیا۔ جبکہ وہاں زمان و مکاں کا بڑا فاصلہ حائل تھا۔ یہ قوی ہیکل جن کی بات سے ثابت ہے۔ تو میرے خیال میں یہ آیت مبارکہ راہنمائی فرماتی ہے کہ ایمان اور اللہ کی مکمل تابع داری کے بعد تیسری سیڑھی کتاب ہے۔ اور جسے اللہ کے فضل سے، کہ اس کے فضل کے بغیر تو کچھ بھی ممکن نہیں، کتاب کا علم حاصل ہو جائے تو وہ ان بندوں میں شامل ہو جاتا ہے، جن کے لئے اللہ پاک نے کائنات کو تسخیر کر دیا۔ زمان و مکاں کے فاصلے اس کے لئے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ وہ ان پر حاوی ہو جاتا ہے۔ میں سوچتا ہوں، ان آیات میں جس صاحب علم کا ذکر ہے، ان کے پاس پچھلی ہی کسی کتاب کا علم ہوگا۔ جبکہ قرآن اللہ کی آخری اور مکمل کتاب ہے اور یقیناً ہر پچھلی کتاب سے بڑھ کر ہے، کیونکہ اس میں اللہ نے دین کو مکمل کر دیا تو جسے اس کتاب کا علم حاصل ہو جائے اس کا کیا مقام ہوگا۔''

''کتاب کا علم حاصل کیسے ہوگا ...؟'' عبدالحق نے کہا۔

''یہ تو اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہے عطا فرمادے ... نبوت کی طرح۔ بنی اسرائیل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر حسد کی وجہ سے ایمان نہیں لائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ انہی کا حق ہے۔ اور اللہ نے فرمایا کہ یہ اس کا فضل ہے، وہ جسے چاہے، نواز دے۔ یہ تو اللہ کے منتخب بندے ہوتے ہیں، اور اس انتخاب کی وجہ منتخب کرنے والا ہی جانتا ہے۔ بندوں کا نہ اس میں کوئی پیچ ہے اور نہ ہی ان کے سوچنے کی بات ہے۔'' شفیق صاحب کہتے کہتے رکے اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر بولے۔

''بہرحال مجھے لگتا ہے کہ اللہ کو کسی بندے کی اطاعت اور بندگی پسند آجائے تو وہ اسے اپنی عطا کی ہوئی طاقتوں اور صلاحیتوں کا ادراک عطا فرماتا ہے اور ان کے استعمال کا طریقہ بھی سکھا دیتا ہے، تاکہ وہ ان سے استفادہ کر سکیں۔''

''اور کتاب کا علم حاصل کیسے ہوتا ہے......؟'' عبدالحق نے سوال اٹھایا۔

''بنیادی بات تو وہی ہے، اللہ کا فضل۔ اور حیلہ ہے، کتاب کا مطالعہ کرنا۔ تو پہلا پہلو تو اکتسابی ہوا۔ وہ بہت محدود ہے، یعنی الفاظ کے ظاہری معانی سمجھنا۔ اب ہم جانتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ میں، اور بین السطور میں بے شمار حکمتیں ہیں، جنہیں سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ اسی لئے تو اللہ نے فرمایا کہ اس سے بہت لوگوں کو ہدایت ملتی ہے، اور بہت لوگ گمراہ بھی ہوتے ہیں۔ اب یہ بڑی ڈراؤنی بات ہے کہ قرآن پڑھ کر بندہ گمراہ ہو جائے۔ پھر اللہ نے فرمایا کہ ہدایت انہیں ملتی ہے، جو رجوع کرنے والے ہوں۔ تو واضح طور پر راہنمائی فرمادی کہ قرآن پڑھنے سے پہلے آدمی اللہ سے رجوع کرے اور راہنمائی اور ہدایت کی دعا کرے اور گمراہی سے پناہ مانگے۔ اللہ کی رحمت ہوتی ہے تو معانی اور اسرار کھلنے لگتے ہیں۔ اللہ دلوں پر مفاہیم القا فرماتے ہیں، اور یہ علم اکتسابی نہیں ہوتا۔''

عبدالحق اس بات کو سمجھتا تھا۔ اسے اس کا تجربہ بھی تھا۔ جن آیات کا شفیق صاحب نے حوالہ دیا تھا، وہ اس نے بارہا پڑھی تھیں۔ لیکن وہ کتاب کا علم رکھنے والے کی طاقت کے نکتے کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ جبکہ شفیق صاحب نے اسے سمجھ لیا تھا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے لئے نئے در کھل گئے ہیں۔ یہاں آنے میں بھی اس کے لئے اللہ کی رحمت تھی۔

''میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ اللہ کی قدرت کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' شفیق صاحب نے اپنی بات جاری رکھی۔

''اس کے لئے عاجز کو دینے والا ایک حوالہ ہی کافی ہے کہ اللہ نے کن فرمایا اور زمین اور آسمان جیسی تخلیقات وجود میں آگئیں۔ جبکہ ہم اللہ کے نائب اور خلیفہ ہونے کے باوجود ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ تو اللہ جسے چاہے، زمان و مکاں کی قید سے آزاد کر دے۔ حج اللہ کی میزبانی کا شرف ہے، جو اس کے حکم کے بغیر ممکن نہیں۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں، جن کے پاس تمام وسائل موجود ہیں، لیکن شدید خواہش کے باوجود حج نہیں کر پاتے۔ ان میں سے ایک صاحب تو پانچ

سال سے مکہ معظمہ میں مقیم ہیں، لیکن حج نہیں کر پائے۔ ایک صاحب کا نام چار سال سے قرعہ اندازی میں آ رہا ہے لیکن روانگی سے ذرا پہلے ایسا کچھ ہو جاتا ہے کہ وہ نہیں جا پاتے۔ اور میں نے بے حیثیت لوگوں کو، جنہیں نہ خواہش ہے، نہ امید، بالکل اچانک، بے گمان حج پر جاتے دیکھا ہے تو عبدالحق صاحب! یہ سعادت تو اللہ کی طرف سے ہے۔ زائچہ آپ کے لئے کیا بتاتا ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ ممکن ہے، مجھ سے تشریح میں کوئی غلطی ہوئی ہو۔ کیونکہ بظاہر یہ ممکن نہیں کہ آپ غیر ملکی سفر بھی نہ کریں اور آپ کی موت، اب سے دور، بیرون ملک واقع ہو۔ ان میں سے کوئی ایک بات غلط ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ زائچہ بھی درست ہو اور میری تشریح بھی۔ اور قادرِ مطلق کے حکم سے یہ دونوں متضاد باتیں عملی طور پر واقع ہو کر رہیں۔''

چند لمحے خاموشی رہی، جیسے کسی کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں رہا ہو۔

پھر شفیق صاحب نے کہا۔

''کچھ مطمئن ہوئے آپ ... !''

''جی الحمدللہ! مطمئن بھی اور کچھ سیراب بھی۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اور الحمدللہ! پیاس بھی بڑھ گئی۔''

''الحمدللہ! یہ اللہ کا کرم ہے۔''

اسی لمحے شفیق صاحب کا بیٹا اندر آیا۔

''بابا جان! کھانا لے آؤں.....؟''

عبدالحق وہاں سے واپس آیا تو اس کے پاس سوچنے کے لئے بہت کچھ موجود تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اسے اس کا کھویا ہوا راستہ مل گیا ہے۔ وہ دوبارہ اس ماضی سے جڑ گیا ہے، جسے یاد رنے کا اسے وقت کم ہی ملتا تھا۔

دوسرا واقعہ تصور صاحب سے تعلق رکھتا تھا۔

تصور صاحب اس کے پاس کام کرنے والے دو چپڑاسیوں میں سے ایک تھے۔ بڑی عجیب اور اثر انگیز شخصیت تھی ان کی۔ بہت خوب صورت اور وجیہہ آدمی تھے۔ دراز قد، متناسب الاعضا، گورا رنگ اور دل کش نقوش۔ انہیں دیکھ کر کوئی کہہ

ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ چپڑاسی ہیں۔ ظاہری شخصیت کے علاوہ بھی ان میں بہت خوبیاں تھیں۔ خوش گفتار اور نرم خو تھے۔ بہت شائستہ الفاظ استعمال کرتے تھے۔ اور لہجے میں بھی شائستگی تھی۔ البتہ گفتگو بہت کم کرتے تھے۔ مزاج میں متانت بھی تھی، اور سنجیدگی ایسی کہ سنگین کی حدوں کو چھوتی محسوس ہوتی تھی۔ اور ایک غیر معمولی بات یہ تھی کہ وہ بات کرتے وقت نظر کبھی نہیں اٹھاتے تھے۔ بلکہ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ وہ نظر اٹھائیں۔ ان کی نگاہیں ہمیشہ جھکی رہتی تھیں۔ کبھی کسی کام سے انکار نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ہر کام نہایت مستعدی اور ذمہ داری سے کرتے تھے۔

عبدالحق کا اندازہ تھا کہ ان کی عمر تیس بتیس سے زیادہ نہیں ہوگی۔

عبدالحق کے اسٹاف میں ایک اسٹینو تھا، جو اس کا پی۔ اے بھی تھا۔ پھر ایک کلرک تھا اور دو چپڑاسی۔ دوسرا چپڑاسی شاید بہت تیز وطرار آدمی تھا۔ زبان بھی اس کی بہت تیز چلتی تھی۔ البتہ افسروں کے سامنے وہ چرب زبانی میں تبدیل ہو جاتا تھا۔

عبدالحق جب یہاں آیا تو اس نے اپنے معمول کے مطابق اپنے اسٹاف میں سے ہر فرد کو الگ الگ بلوا کر ان سے اپنا تعارف کرایا، ان کے بارے میں معلوم کیا اور انہیں اپنے اصول سمجھائے۔

تصور صاحب کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ وہ یقیناً کسی اعلیٰ خاندان کے ہیں۔ اس کے دل میں ان کے لئے خودبخود احترام ابھرا تھا۔

''آپ تشریف رکھئے۔'' اس نے بے حد احترام سے کہا۔

وہ ہچکچائے۔ پھر کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولے۔

''میں ایسے ہی ٹھیک ہوں جناب!''

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔ اور یہ مناسب نہیں ہوگا کہ آپ اتنی دیر کھڑے رہیں۔''

''میرا تو کام ہی یہی ہے جناب!''

''مگر مجھے یہ اچھا نہیں لگے گا۔ تو پھر ایک ہی صورت ہے۔ میں بھی کھڑا ہو جاتا ہوں۔'' عبدالحق نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

"نہیں حضرت! یہ کیسے ممکن ہے؟" تصور صاحب تڑپ گئے۔

"آپ تشریف رکھئے۔ میں بھی بیٹھ جاؤں گا۔"

عبدالحق بیٹھ گیا۔ تصور صاحب بھی بیٹھ گئے۔ اگرچہ وہ کرسی کی پٹی پر بیٹھے تھے، جیسے، کسی بھی لمحے اٹھ کھڑے ہونے کو تیار ہوں۔

"آپ سکون سے بیٹھ جائیے۔ مجھے آپ کے ساتھ کام کرنا ہے۔"

"قطع کلامی کے لئے معافی چاہتا ہوں جناب عالی! لیکن آپ کو میرے ساتھ نہیں، درحقیقت مجھے آپ کے ساتھ کام کرنا ہے۔"

"ایک ہی بات ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنا ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"اور معافی کی کوئی بات نہیں۔ میری کوئی بات غلط لگے تو آپ کو قطع کلامی کا حق حاصل ہے۔ آپ کا نام کیا ہے......؟"

"تصور حسین!"

"آپ کا تعلق کہاں سے ہے......؟"

"جی کراچی سے، پاکستان سے۔"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ میرا اندازہ ہے کہ آپ ہجرت کر کے آئے ہیں۔"

"جی ہاں...... الحمدللہ!"

"تو میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ آپ کہاں سے ہجرت کر کے آئے ہیں......؟"

تصور صاحب کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"جس وقت ہم وہاں سے پاکستان آنے کے لئے نکلے تو اسی لمحے ہم نے وہاں کی ہر چیز سے اپنا تعلق ختم کر دیا۔ اس لمحے سے میں پاکستانی ہوں اور مرتے دم تک رہوں گا۔"

"پھر بھی آدمی جہاں پیدا ہو، پلے بڑھے، اس جگہ سے انسیت تو ہوتی ہے اسے۔"

"مسلمان کے لئے مقام کی اہمیت نہیں۔ وہ علامہ اقبال نے فرمایا نا کہ مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔ البتہ پاکستان سے مجھے غیر معمولی محبت ہوگئی ہے۔ یہ میرا وطن ہے، کیونکہ یہ ہم پر اللہ کی بہت بڑی عنایت ہے۔"

"تو یہ تو آپ کی پہلی بات کی نفی ہوئی۔" عبدالحق نے اعتراض کیا۔

"میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ مکہ اور مدینہ کی اہمیت تو مسلمان کے لئے مسلم ہے، چاہے وہ وہاں نہ رہتے ہوں۔"

"لیکن پاکستان......!"

"قطع کلامی پر معذرت جناب عالی! یہ پاکستان کوئی عام قطعہ زمین نہیں۔ یہ پہلی ریاست ہے جو صرف مسلمانوں کے لئے قائم ہوئی ہے۔ میرے والد حضور کے نزدیک اس کا قیام معجزہ تھا، اور اس کے لئے لاکھوں مسلمانوں نے اپنے جان و مال، بلکہ عزت اور آبرو تک کی قربانی دی ہے۔ یہ بہت قیمتی سرزمین ہے، جس سے محبت کو میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"

"تو آپ یہ بتانا پسند نہیں کریں گے کہ آپ کا تعلق کہاں سے ہے......؟"

"آپ کا حکم تو ٹال نہیں سکتا۔ دراصل آپ مجھ سے پچھلا تعلق پوچھ رہے ہیں۔ ورنہ بنیادی طور پر تو میری نسل کا تعلق کرۂ ارض کی مقدس ترین سرزمین عرب سے ہے۔ بہرحال ہم نے 1947ء میں لکھنؤ سے ہجرت کی تھی۔ اب گستاخی نہ ہو تو ایک عرض کروں......؟"

"فرمائیے......!"

"میں یہاں نوکری کر رہا ہوں، آپ میرے افسر ہیں۔ آپ کی بات میں ٹال نہیں سکتا۔ لیکن میرے ماضی سے اس ملازمت کا کوئی تعلق نہیں۔ میں ماضی سے مکمل طور پر تعلق منقطع کر چکا ہوں۔ اب آپ جو پوچھنا چاہیں، پوچھ لیں۔"

"آپ جو کچھ بتانا چاہیں، خود ہی بتا دیں۔ بتانا نہ چاہیں تو یہ بھی آپ کا حق ہے۔"

تصور صاحب شرمندہ سے نظر آنے لگے۔

"آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟"

''جی نہیں! ہرگز نہیں۔ بلکہ مجھے آپ کی صاف گوئی اچھی لگی۔'' عبدالحق نے کہا۔

''میں ڈرگ روڈ میں رہتا ہوں۔ شادی شدہ ہوں۔ میرے پانچ بچے ہیں اللہ کے فضل سے۔ تین بیٹے اور دو بیٹیاں۔ اب آپ اجازت دیں تو میں آپ سے ایک التجا کروں۔''

''جی ضرور ...!''

''میں آپ کو سر نہ کہوں تو آپ کو برا تو نہیں لگے گا...؟''

''اگر میں کہوں کہ برا لگے گا تو...؟''

''تو میں آپ کو سر کہا کروں گا۔ نوکری کی ہے تو حکم بھی ماننا ہے افسر کا۔''

''آپ جس طرح چاہیں، مجھے مخاطب کر سکتے ہیں۔ میرا نام عبدالحق ہے۔ مجھے اس نام سے پکارے جانا بہت اچھا لگتا ہے۔''

''بہت شکریہ آپ کا۔ لیکن میں یہ جرأت کبھی نہیں کروں گا۔''

''لگتا ہے، لفظ سر سے آپ کو چڑ ہے۔ اس کی کوئی وجہ...؟''

''بس اتنی سی بات ہے کہ اس سے مجھے انگریزوں کی غلامی کا عہد یاد آتا ہے۔ میرا یہ احساس مجروح ہوتا ہے کہ اب ہم ایک آزاد قوم ہیں۔''

''آپ کی یہ بات مجھے تو بہت اچھی لگی۔ مجھے خود بھی یہ پسند نہیں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اب میں آپ سے ایک بہت اہم بات کر رہا ہوں۔ میں کہیں بھی جاؤں، اپنے ماتحتوں سے یہ بات ہمیشہ کہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھیں۔''

''آپ حکم فرمائیے جناب عالی! میں انشاء اللہ ہمیشہ خیال رکھوں گا۔''

''دفتر میں ڈسپلن کی بڑی اہمیت ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اسے برقرار رکھتے ہوئے میں آپ سب کا دوست، آپ کے دکھ درد میں شریک ہوں۔ آپ کو ذاتی زندگی میں کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو تو مجھے بتائیے۔ سرکاری طور پر اگر میں اسے حل نہ کر سکا تو انشاء اللہ ذاتی طور پر حل کروں گا۔ اللہ

کے فضل و کرم سے میں اس کی حیثیت رکھتا ہوں۔ بعض اوقات ذاتی مسائل ہماری دفتر کی کارکردگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لئے میں ان مسائل کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ اب یہاں ہم لوگ ایک ٹیم ہیں۔ یہ دفتر ایک طرح سے ہمارا دوسرا گھر ہے اور ہم ایک گھر کے لوگ۔ ہمیں ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رہنا ہے، ایک دوسرے کا خیال رکھنا ہے۔ صرف دکھ درد کا نہیں، عزت کا بھی۔ اور آپ جانتے ہیں تصور صاحب! کہ ہمارا محکمہ کتنا بدنام ہے، اور ایسا بھی نہیں کہ بلاوجہ بدنام ہو۔ میرا اندازہ ہے کہ میرے ساتھ ایماندار ہیں۔ لیکن میں نے انسانی مجبوریاں دیکھی بھی ہیں، اور انہیں سمجھتا بھی ہوں۔ بعض اوقات آدمی اتنا مجبور ہو جاتا ہے کہ اسے ایمان بھی بیچنا پڑتا ہے۔ اسی لئے میں نے اپنے اسٹاف کے ہر فرد سے یہ بات کہی ہے کہ اپنی کسی اہم ضرورت کے بارے میں مجھے ضرور بتائیے گا، ایسا کوئی کام نہ کیجئے گا جو ہمارے سب کے لئے شرمندگی کا باعث ہو۔''

''دوسروں کی میں نہیں جانتا بڑے صاحب! لیکن میں اپنے بچوں کے لئے حرام رزق کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ بے فکر رہیں۔ جو اپنی شرمندگی سے ڈرتے ہوں، وہ دوسروں کو شرمندہ نہیں کراتے۔'' تصور صاحب نے بڑے اعتماد سے کہا۔

عبدالحق انہیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

''بات صرف رزق کی نہیں ہوتی تصور صاحب! زندگی بہت پیچیدہ ہوتی ہے۔ خیر، آپ میری یہ بات بس ہمیشہ یاد رکھئے گا۔ میں ہر خدمت، ہر تعاون کے لئے حاضر رہوں گا۔''

''جی بڑے صاحب! میں آپ کی بات یاد رکھوں گا۔''

دن گزرے تو عبدالحق کو جیسے تصور صاحب سے محبت سی ہوگئی۔ وہ اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ لیکن وہ کوشش کے باوجود اپنے اور ان کے درمیان بے تکلفی قائم نہ کر سکا۔ ایک بات یہ تھی کہ وہ کبھی اس کے لئے چائے یا کھانا لے کر آتے تو اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ لگتا تھا، یہ کام ان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ دوسرے اسے ان پر چپڑاسی کی وردی اچھی نہیں لگتی تھی۔

ایک دن اس نے غور کیا کہ عارف بھائی کا چپڑاسی وردی نہیں پہنتا ہے۔ پھر اس نے سوچا، ممکن ہے، وہ چپڑاسی ہی نہ ہو۔ اس نے یہ بات عارف سے ہی پوچھ لی۔

''ہاں......! ہے تو وہ چپڑاسی ہی۔'' عارف نے جواب دیا۔

''تو پھر وہ وردی کیوں نہیں پہنتا......؟'' عبدالحق نے اعتراض کیا۔

''بھئی بڑے افسروں کی مرضی پر ہے۔ وہ چاہیں تو انہیں اس پابندی سے آزاد کر دیں۔ اب وہ میرے پاس ہے اور مجھے اس کا وردی پہننا اچھا نہیں لگتا تو میں نے اسے منع کر دیا وردی پہننے سے۔''

کوئی اور وقت ہوتا تو عبدالحق اسے سمجھاتا کہ یہ دفتر کے ڈسپلن کے منافی ہے۔ لیکن اس وقت اس کے ذہن میں کچھ اور تھا۔

''تو کیا میں بھی اپنے چپڑاسی کو منع کر سکتا ہوں۔''

''کیوں نہیں......! گزیٹڈ آفیسر ہو۔'' عارف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اسسٹنٹ کلکٹر ہو تم!''

اگلے روز صبح کے وقت تصور صاحب اس کے سامنے چائے رکھ کر جانے لگے تو اس نے انہیں پکار لیا۔

تصور صاحب پلٹے۔

''کیا حکم ہے جناب عالی!''

''یہاں آیئے۔ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

وہ اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

''بیٹھئے......!'' عبدالحق نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''معاف کیجئے گا بڑے صاحب، یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔''

عبدالحق نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''میں نہیں سمجھتا تھا کہ آپ کبھی میرے کسی حکم سے انکار کریں گے۔''

''میں نے پہلے ہی آپ سے معذرت کر لی ہے بڑے صاحب!'' تصور صاحب نے بے حد لجاجت سے کہا۔

''مگر مجھے وجہ تو بتائیں گے نا آپ......!''

''دفتر کے ڈسپلن کی بات ہے جناب......!''

''میرا حکم ماننا یہاں ڈسپلن کا پہلا اور بنیادی اصول ہے۔''

تصور صاحب نظریں جھکائے خاموش کھڑے رہے۔

عبدالحق انہیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اصل بات کچھ اور ہے۔

''اب مجھے اصل بات بتایئے۔'' اس نے کہا۔

''دیکھئے بڑے صاحب! ہمارے پاس عزت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اور ہم وہ گنوانا نہیں چاہتے۔''

''تو میرے کہنے سے اس کرسی پر بیٹھنے سے آپ کی عزت کم ہو جائے گی؟'' عبدالحق کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی ہاں! اس بات کا امکان موجود ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔ کچھ وضاحت کریں گے آپ۔''

تصور صاحب واضح طور پر ہچکچا رہے تھے۔

''جو بات ہے، آپ بے جھجک کہیں۔'' عبدالحق نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔

''آپ سے پہلے جو بڑے صاحب تھے یہاں، انہوں نے ایک دن باہر والے کمرے میں مجھے کرسی پر بیٹھے دیکھ لیا تو سب کے سامنے میری بہت بے عزتی کی۔ کہنے لگے، چپڑاسی بھی کرسی پر بیٹھیں گے تو ان میں اور بابو میں کیا فرق رہ جائے گا۔ چپڑاسی کا کام تو کھڑے رہنا ہے۔ بیٹھنا ہو تو اسٹول رکھا ہے دفتر کے باہر دروازے پر۔ اس پر بابو صاحب نے کہا، بیٹھنا نہیں۔ پھر مجھے جھڑک کر بولے، آئندہ تمہیں کبھی کرسی پر بیٹھے نہ دیکھوں۔ مجھے ایسا لگا بڑے صاحب! کہ کسی نے بھرے بازار میں مجھے بے لباس کر دیا ہے۔''

ان کے لہجے میں ایسا کرب تھا کہ عبدالحق تڑپ گیا۔ اور ان کی آواز آخر میں ایسے بھرا گئی تھی، جیسے رو رہے ہوں۔ لیکن آنکھوں میں نمی بھی نہیں تھی۔

"مجھے بہت دکھ ہوا یہ سن کر۔" اس نے کہا۔

"لیکن تصور صاحب! سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ یہ بات جانتے ہیں آپ!"

"جی ہاں......!"

"اور میں خود آپ کو بیٹھنے کو کہہ رہا ہوں۔"

"آج بیٹھوں گا، آپ بیٹھنے کی اجازت دیں گے تو عادت ہو جائے گی۔ پھر آپ چلے گئے اور کوئی پہلے والے صاحب جیسا آ گیا تو پھر وہی بے عزتی۔ اس سے بہتر ہے جناب! کہ ہم اپنی اوقات میں رہیں۔"

"جس وقت جو صورتِ حال ہو، اس سے مطابقت پیدا کرنی ہوتی ہے۔ سمجھوتے کرنے ہوتے ہیں آدمی کو۔ آپ تو ہجرت کر کے آئے ہیں۔ بہت کچھ دیکھا ہو گا آپ نے۔ سمجھوتے بھی کیے ہوں گے۔"

"یہ ملازمت بھی ایک سمجھوتہ ہی ہے جناب!" اس بار تصور صاحب کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ انہوں نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔

"تو پھر ڈریئے مت! میرے ساتھ کام کرتے ہوئے کبھی آپ کی بے عزتی نہیں ہو گی۔ اور خدانخواستہ میرے بعد کوئی پہلے والے صاحب جیسا آ جائے تو آپ خود کو اس کے مطابق ڈھال لیجئے گا۔" عبدالحق نے کہا۔ پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔

"میری بات غلط تو نہیں ہے تصور صاحب!"

"جی نہیں جناب......!"

"تو پھر تشریف رکھئے۔"

تصور صاحب بیٹھ گئے۔

"کیا حکم ہے بڑے صاحب......!"

"میں چاہتا ہوں کہ آپ وردی میں دفتر نہ آیا کریں۔"

"جی......! میں سمجھا نہیں۔"

"آپ سادہ لباس میں دفتر آیا کریں۔"

"لیکن جناب......!"

عبدالحق نے کرسی کے ساتھ رکھا ہوا تھیلا اٹھایا اور ان کے سامنے رکھ دیا۔

تصور صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"لیکن جناب! دفتر کا ڈسپلن......"

"آپ کو یہ حکم دینا میرا حق ہے۔ آپ اس وردی میں مجھے اچھے نہیں لگتے۔ اس تھیلے میں آپ کے لئے کپڑا ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں بڑے صاحب......!" تصور صاحب کے لہجے میں تناؤ سا تھا۔

"آپ کا حکم ہے تو میں سادہ لباس میں دفتر آیا کروں گا۔ گھر میں بھی تو میں کپڑے پہنتا ہی ہوں۔"

"دیکھیں...... وردی آپ کو سرکار دیتی ہے۔ اب میں وردی میں خوش نہیں ہوں تو متبادل لباس فراہم کرنا بھی میری ذمہ داری ہے۔"

تصور صاحب ہچکچا رہے تھے۔

"آپ آج چھٹی کے بعد ایک گھنٹہ رُکئے گا، اور جاتے وقت اپنی یہ چیزیں یہاں سے لے جائیے گا۔"

"میں پھر عرض کروں گا جناب! کہ اس کی ضرورت نہیں۔"

"میں نے کہا نا کہ یہ کوئی احسان نہیں ہے آپ پر۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ بات بس میرے اور آپ کے درمیان رہے۔ اس لئے ایک گھنٹہ رکنے کو کہہ رہا ہوں۔"

تصور صاحب اب بھی ہچکچا رہے تھے۔ تاہم انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"بہت بہتر جناب! اب میں جا سکتا ہوں؟"

"جی......! ضرور۔"

تصور صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"ایک بات اور...... اس تھیلے کو گھر جا کر ہی کھولئے گا۔"

تصور صاحب کے چہرے سے لگا کہ وہ کچھ سمجھ نہیں پائے ہیں۔ تاہم

انہوں نے سر کو خفیفی جنبش دی اور کمرے سے نکل گئے۔

عبدالحق نے تھیلا اٹھا کر میز کے ایک طرف رکھ دیا۔ اس میں بغیر سلی ململ اور لٹھا تھا، بنیان تھے، اور ایک لفافہ، جس میں دس روپے تھے، اور عبدالحق کا رقعہ کہ یہ لباس اس کی ذمہ داری ہے، اس لئے سلائی کے پیسے بھی وہی دے گا۔

شام کو چھٹی کے وقت سب لوگ چلے گئے۔ عبدالحق آدھے گھنٹے تک کام کرتا رہا۔ تصور صاحب بیرونی کمرے میں بیٹھے تھے۔ پھر عبدالحق باہر آیا۔

''آپ دس منٹ بعد دفتر بند کر دیجئے گا۔ اور ہاں، تھیلا لے جانا نہ بھولیے گا۔'' یہ کہہ کر وہ انہیں کچھ بولنے کا موقع دیئے بغیر دفتر سے نکل آیا۔

یوں تصور صاحب کو وردی سے چھٹکارا مل گیا۔ اب وہ کرتا پاجامہ پہن کر دفتر آتے تھے۔ پہلی بار عبدالحق نے انہیں اس لباس میں دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ ایسی شخصیت! پہلی بار اسے احساس ہوا کہ چپڑاسی کی وردی شخصیت کو کیسے دبا دیتی ہے۔

لیکن تصور صاحب اب بھی ویسے ہی تھے۔ ان کی عاجزی ویسی ہی تھی۔ منع کرنا تو بہت دور کی بات، کسی کام کو کہا جاتا تو اسے ٹالتے بھی نہیں تھے۔ صاحب انہیں اہمیت دیتے ہیں، اس سے انہیں کوئی غرض نہیں تھا۔ وہ تو بس اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔

ایک دن شاہد عبدالحق کے پاس چلا آیا۔

''ایک بات کرنی ہے سر! آپ سے۔ غصہ تو نہیں ہوں گے۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

عبدالحق اس کی تیزی اور طراری کی وجہ سے اس سے چڑتا تھا۔ اس وقت بھی اسے یقین تھا کہ زبان کھلے گی تو وہ ضرور کوئی فساد کھڑا کرے گا۔ تاہم اس نے کہا۔

''بولو......! کیا بات ہے......؟''

''یہاں میرے ساتھ بہت زیادتی ہو رہی ہے سر......!'' شاہد نے روہانسا ہو کر کہا۔ آواز بھی بھرا گئی تھی۔

عبدالحق جانتا تھا کہ وہ مکار بھی ہے۔ ابھی چاہے تو آنسوؤں کے ساتھ

رونے لگے۔

''کون کر رہا ہے زیادتی......؟''

''اپنے اسٹینو صاحب، وہی......ارے کیا نام ہے ان کا......؟''

عبدالحق جانتا تھا کہ یہ اس کا خاص انداز ہے۔ اپنی بات مخاطب کے منہ سے کہلوانا۔ اس نے اسے نظر انداز کر دیا اور متوقع نظروں سے اسے گھورتا رہا۔

شاہد نے چند لمحے ذہن پر زور دینے کے بعد بالآخر کہا۔

''میں سعید صاحب کی بات کر رہا ہوں سر......!'' یہ کہتے ہوئے اس نے کئی بار پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا، جو بند تھا۔

''کیا زیادتی کر رہے ہیں وہ تمہارے ساتھ......؟''

''اب دیکھیں نا سر......! یہاں دو چپڑاسی ہیں۔ تو دونوں سے برابر کا کام لینا چاہئے۔ یہ کیا کہ ایک پر بوجھ لاد دیا جائے اور دوسرا عیش کرے۔''

''یہ فیصلہ تو افسر ہی کریں گے کہ کس سے کیا کام لینا ہے؟ یا ہمیں یہ فیصلہ چپڑاسیوں پر چھوڑ دینا چاہئے۔'' عبدالحق نے سخت لہجے میں کہا۔

شاہد کچھ گڑبڑا گیا۔ لیکن تھا بہت ڈھیٹ۔ پیچھے نہیں ہٹا۔

''لیکن سر! انصاف تو ہونا چاہئے۔''

''کوئی بے انصافی ہو رہی تمہارے ساتھ......؟''

''جی سر......! یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔'' شاہد نے جوش سے کہا۔

''تو بتاؤ نا مجھے۔''

''اب سر! کھانے کے برتنوں کو ہی لیجئے۔ ایک دن برتن میں دھوتا تھا تو دوسرے دن تصور صاحب۔ پھر اچانک اپنے سعید صاحب نے حکم لگا دیا کہ برتن صرف میں ہی دھوؤں گا۔ تصور صاحب کی چھٹی۔ اب یہ تو بے انصافی ہے نا صاحب! اور کاموں میں بھی یہی حال ہے۔ تصور صاحب نے نہ جانے ان پر......کیا نام ہے ان کا......؟ ہاں سعید صاحب، سعید صاحب پر نہ جانے کیا پڑھ کر پھونک دیا ہے۔ وہ تو بس ان کے شیدائی بن گئے ہیں۔ کام کے لئے انہیں میرے سوا کوئی نظر ہی نہیں آتا ہے۔''

''اوں ہوں......!'' عبدالحق نے ہنکارا بھرا۔

''اب آپ کے سوا یہاں کون مجھے انصاف دلا سکتا ہے۔'' شاہد نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ میں دیکھوں گا اس معاملے کو۔''

''ایک گزارش ہے سر......!''

''کچھ اور بھی ہے۔'' عبدالحق جھنجلا گیا۔

''پوچھ گچھ اپنے طور پر ہی کیجئے گا سر! میرا نام نہ لیجئے گا۔ ورنہ تو کیا نام ہے ان کا...... سعید صاحب میرے دشمن ہی ہو جائیں گے۔''

''شکایت بھی کرتے ہو، انصاف بھی مانگتے ہو اور ڈرتے بھی ہو۔ یہ تو منافقت ہے۔'' عبدالحق نے طنزاً کہا۔

''منافقت نہیں، مجبوری ہے سر! افسر کی گاڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی سے تو ڈرنا ہی پڑتا ہے۔''

عبدالحق کو اس پر بہت زور کا غصہ آیا۔

''افسر تو میں سعید صاحب سے بھی بڑا ہوں۔ میری گاڑی سے ڈر نہیں لگا تمہیں......؟''

''آپ جیسے افسر ہوں تو کیا بات ہے سر......! آپ کی تو بات ہی الگ ہے۔''

''اچھا......! اب تم جاؤ۔''

اس کے جانے کے بعد عبدالحق اس معاملے پر غور کرتا رہا۔ سعید بہت اچھا اور معقول آدمی تھا۔ اس سے یہ امید نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ وہ دو ماتحتوں کے درمیان اتنی واضح تفریق کرے۔ لیکن بہر حال کچھ ذاتی پسند ناپسند بھی ہوتی ہے۔ وہ خود تصور صاحب کو بہت پسند کرتا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کے باوجود دفتری معاملات میں وہ ان کی کسی کوتاہی کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔

چھٹی سے ایک گھنٹہ پہلے اس نے سعید کو بلا لیا۔

''بیٹھئے سعید صاحب......!''

سعید سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''شکریہ جناب......!''

پہلے تو عبدالحق اس سے کام کے سلسلے میں باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے اچانک پوچھ لیا۔

''یہ کھانے کے برتن کون دھوتا ہے سعید صاحب......!''

''شاہد دھوتا ہے سر......!'' سعید نے بے جھجک کہا۔

''مجھے یاد پڑتا ہے کہ پہلے شاہد اور تصور صاحب باری باری برتن دھوتے تھے۔''

''جی سر......! یہ درست ہے۔''

''تو پھر یہ تبدیلی کیسی......؟''

''کسی نے مجھے بتایا تھا سر......! کہ تصور صاحب سیّد ہیں، تو مجھے اچھا نہیں لگا کہ ان سے اس طرح کا کام کرایا جائے۔''

''کام میں بے عزتی کبھی نہیں ہوتی۔'' عبدالحق نے خشک لہجے میں کہا۔

''بلکہ کام اچھی طرح سے کیا جائے تو اس کا درجہ عبادت کا ہوتا ہے۔''

''یہی بات تصور صاحب بھی کہتے ہیں اور عمل سے ثابت بھی کرتے ہیں سر......! انہوں نے کبھی کسی کام کو منع نہیں کیا۔ یہ تو میں نے خود انہیں چھوٹ دے دی ہے۔''

''اس کا اختیار ہے آپ کے پاس......؟'' عبدالحق کے لہجے میں چیلنج تھا۔

''اس کا فیصلہ تو آپ کریں گے سر......! بس مجھے وضاحت کی اجازت دے دیں۔''

''وضاحت تو میں سننا چاہتا ہوں۔ یہ آفس کے ڈسپلن کا معاملہ ہے۔'' عبدالحق نے سخت لہجے میں کہا۔

''تو سر......! شاید آپ کو علم نہ ہو کہ دفتر کی چابی تصور صاحب کے پاس ہوتی ہے۔ صبح دفتر کے وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے وہ آ جاتے ہیں۔ دروازہ کھولتے ہیں، جمعدار آ کر جھاڑو لگاتا ہے۔ پھر تصور صاحب ہر میز، ہر کرسی اور ہر الماری سے گرد

جھاڑتے ہیں۔ تازہ پانی بھر کر لاتے ہیں اور شام کو چاہے آپ دیر تک رکیں، وہ آپ کے ساتھ رکتے ہیں۔ کیونکہ دفتر انہیں بند کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ ان کا روز کا معمول ہے۔ جبکہ شاہد ہر روز کم از کم ایک گھنٹہ لیٹ ہوتا ہے۔''

''یہ بھی غلط ہے۔'' عبدالحق نے نرم لہجے میں کہا۔

''یہ ذمہ داری بھی دونوں پر برابر ڈالی جانی چاہئے۔''

''ڈالی تھی سر! شاید آپ بھول گئے۔ ایک دن آپ اور ہم سب دفتر آئے تو دفتر میں تالا لگا تھا۔ آپ ڈی سی صاحب کے دفتر میں جا بیٹھے تھے۔ اور ہم لوگ ادھر ادھر وقت گزاری کرتے رہے تھے۔ اس روز دفتر شاہد کو کھولنا تھا۔ چابی اس کے پاس تھی۔''

''تو اس کے خلاف کارروائی کیوں نہیں ہوئی؟''

''یہ تو کئی بار ہو چکا ہے سر......! اور گستاخی معاف، کارروائی کا خیال تو آپ کو بھی نہیں آیا۔''

عبدالحق کو شرمندگی کا احساس ہوا۔

''میں تو اس وقت محض وضاحت پیش کر رہا ہوں سر! اب ایک طرح سے دیکھیں تو تصور صاحب نے ایک بڑی ذمہ داری قبول کر رکھی ہے۔ اور انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ شاہد کی بھی یہ ذمہ داری ہے۔ برتن دھونا تو اس کے مقابلے میں چھوٹا کام ہے۔ اب یہ سمجھ لیں کہ تصور صاحب ہر روز دفتر بند کرتے اور کھولتے اور صفائی کرتے ہیں اور شاہد ہر روز برتن دھوتا ہے تو یہ زیادتی تو نہیں ہوئی کسی کے ساتھ۔''

''نہیں......! بلکہ زیادتی تو تصور صاحب کے ساتھ ہو رہی ہے۔'' عبدالحق نے بے ساختہ کہا۔

''اب ایک بات اور...... اس برتن دھونے کے صلے میں آپ بیس روپے ہر ماہ دیتے ہیں۔ تصور صاحب نے برتن دھونے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ بلکہ اکثر شاہد برتن دھونے کے وقت کوئی بہانہ کر کے غائب ہو جاتا تھا اور اس کے حصے کا کام بھی تصور صاحب کو کرنا پڑتا تھا۔ اور وہ خوش دلی سے کرتے تھے۔ لیکن آپ کے

دیئے ہوئے دس روپے لینے سے انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ میں اپنا کام کرتا ہوں اور اس کی تنخواہ مجھے ملتی ہے۔ ان پیسوں پر میرا کوئی حق نہیں۔''

''حالانکہ یہ ان کا کام نہیں ہے۔ اس لئے تو میں وہ دیتا ہوں۔'' عبدالحق بڑبڑایا۔

''اور ہمارے اصرار کے باوجود تصور صاحب نے پیسے نہیں لئے تو شاہد کو پورے بیس روپے ملنے لگے، اور اب تک ملتے ہیں۔ تو سر......! فرض تو اس کا ویسے ہی پورے مہینے برتن دھونے کا ہے۔ اب آپ فیصلہ کیجئے کہ میں نے تصور صاحب کو چھوٹ دے کر غلطی کی ہے......؟''

''ہرگز نہیں......! لیکن آپ کو مجھے بتانا چاہئے تھا۔''

''آپ نے ابتداء میں ہی کہا تھا سر......! کہ چھوٹے موٹے معاملات میں خود نمٹا لیا کروں۔ لیکن سر......! میں نے ان معاملات میں بددیانتی کبھی نہیں کی۔''

''میں جانتا ہوں سعید صاحب، اور میں آپ سے بہت خوش ہوں۔''

''شکریہ سر......!''

''لیکن تصور صاحب کے سلسلے میں کچھ کرنا چاہئے۔ اوور ٹائم تو یہاں ہوتا نہیں۔'' عبدالحق جیسے خود کلامی کر رہا تھا۔ پھر اس نے نظر اٹھا کر سعید کو دیکھا۔

''اب آپ شاہد کو صرف دس روپے دیں گے۔ اور دس روپے تصور صاحب کو اوور ٹائم کہہ کر دیں گے...... ایک گھنٹہ صبح جلدی آنے اور ایک گھنٹہ دیر سے جانے کا اوور ٹائم۔ میں ایک واؤچر بک لا دوں گا آپ کو۔ اس پر ان سے دستخط کرا لیا کیجئے گا۔ تاکہ انہیں تسلی رہے کہ یہ سرکاری اوور ٹائم ہے۔''

''ٹھیک ہے سر......!''

شاہد اس پر بہت بلبلایا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ احتجاج بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے تو...... آ بیل مجھے مار...... والی حرکت کی تھی۔ اور اس میں اسے دس روپے کا نقصان ہو گیا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسے وقت پر دفتر پہنچنے کا تحریری نوٹس مل گیا تھا۔

اس بات کو کوئی چھ ماہ ہوئے ہوں گے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔
عبدالحق کے ایک واقف کار نے اسے فون کیا کہ اس کا ایک دوست ایکسپورٹ کا کام شروع کرنا چاہتا ہے۔ وہ اسے راہنمائی اور مشورے کے لئے اس کے پاس بھیج رہا ہے۔
''تو میں انہیں امپورٹ ایکسپورٹ کے اے سی سے ملوا دوں گا۔'' عبدالحق نے کہا۔
''جی نہیں.....! میں جانتا ہوں کہ ان معاملات کو تم اس اے سی سے زیادہ سمجھتے ہو گے۔'' اس کے دوست نے ہنستے ہوئے کہا۔
''تم تو بس یوں ہی.....!''
''ان کا نام سلطان ہے۔ اور یار.....! وہ میرے بہت خاص دوست ہیں۔ کل دس بجے آئیں گے تمہارے پاس۔ انہیں باہر انتظار نہ کرانا۔''
''میں تو ایسا کسی کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔''
''بس یار.....! ان کا ہر طرح سے خیال رکھنا۔''
اگلے روز اتفاق سے شاہد دفتر نہیں آیا۔ عبدالحق نے دفتر پہنچتے ہی سعید کو بلا لیا۔
''دس بجے ایک صاحب مجھ سے ملنے آئیں گے۔'' اس نے سعید سے کہا۔
''ان کا نام سلطان ہے۔ تم انہیں فوراً اندر بھیج دینا..... بلاخیر.....!''
''جی سر.....!''
''اور ہاں.....! ان کی تواضع کے لئے چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ بھی منگوا لینا۔''
''بہت بہتر سر.....!'' سعید نے کہا۔ عبدالحق کے پیسے اس کے پاس رہتے تھے۔ مہمانوں کی تواضع اور عبدالحق کے کھانے میں وہ خرچ کرتا رہتا تھا، اور اس کا حساب رکھتا تھا۔
دس بج کر پانچ منٹ پر سلطان صاحب دفتر کے بیرونی کمرے میں داخل

ہوئے۔ وہ سیدھے سعید کی طرف بڑھے۔ تصور صاحب وہیں بیٹھے تھے۔ تصور صاحب نے انہیں دیکھا تو ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ سلطان صاحب نے ان پر محض ایک نظر ڈالی تھی۔ جبکہ تصور صاحب کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑے تھے۔
''میرا نام سلطان احمد ہے، اور مجھے عبدالحق صاحب سے.....'' سلطان صاحب کہتے کہتے رکے اور چونک کر پلٹے۔ انہیں پلٹتے دیکھ کر تصور صاحب بہت تیزی سے دفتر سے نکل گئے۔
''میر صاحب.....!'' سلطان صاحب نے عین اس وقت پکارا، جب تصور صاحب دروازے سے نکل رہے تھے۔
سعید نے تصور صاحب کا ردعمل بھی نہیں دیکھا تھا، وہ کچھ سمجھ بھی نہیں سکا۔
سلطان صاحب چند لمحے حیرت سے دروازے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر سعید کی طرف پلٹے۔
''یہ.....''
لیکن سعید نے انہیں بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔
''آپ اندر چلے جائیں سر!'' اس نے عبدالحق کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔
''صاحب آپ کے منتظر ہیں۔''
چہرے کے تاثر سے لگتا تھا کہ سلطان صاحب کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ لیکن پھر انہوں نے سر جھٹکا اور اندرونی کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔
سعید دوبارہ ٹائپ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ لیٹر مکمل کر کے اس نے ٹائپنگ مشین سے نکالا اور صاحب کے دستخط والے فولڈر میں رکھ دیا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا تو اس نے چونک کر کلرک سے کہا۔
''واجد.....! یہ تصور صاحب کہاں چلے گئے؟''
''وہ تو ان صاحب کے آتے ہی چلے گئے تھے۔'' واجد نے جواب دیا۔
''کچھ کہہ کر نہیں گئے.....؟''

"نہیں......!"

"حالانکہ ہمیشہ بتا کر جاتے ہیں۔" سعید کے لہجے میں تشویش تھی۔

"آج شاہد بھی نہیں آیا ہے۔ مہمان کے لئے چائے اور بسکٹ کا بندوبست کرنا تھا۔"

"پریشان کیوں ہوتے ہو۔ ابھی آ جائیں گے۔" واجد نے اسے تسلی دی۔

لیکن اب سعید کو وہ صورتِ حال غیر معمولی لگ رہی تھی۔

"سنو! ہم پانچ منٹ انتظار کریں گے۔" اس نے واجد سے کہا۔

"اگر اس دوران تصور صاحب نہ آئے تو ایک زحمت کرنی ہوگی تمہیں۔"

واجد کا منہ بن گیا۔ اس کا خیال تھا کہ سعید اس سے چائے اور بسکٹ لانے کو کہے گا۔ وہ سوالیہ نظروں سے سعید کو دیکھتا رہا۔

سعید نے دراز سے پانچ کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔

"ڈی سی صاحب کے چپڑاسی سے چائے اور بسکٹ لانے کا کہہ دینا۔"

اس کا اشارہ عارف کے چپڑاسی کی طرف تھا۔

"ٹھیک ہے......!" واجد نے نوٹ لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرے خیال میں تم بلاوجہ پریشان ہو رہے ہو۔"

اندر کمرے میں عبدالحق سلطان صاحب کو ایکسپورٹ کے طریقہ کار کے بارے میں بتا رہا تھا۔ سلطان صاحب بڑی توجہ اور دلچسپی سے سن رہے تھے۔

"حکومت ایکسپورٹ کی خاص طور پر حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"لیکن ایکسپورٹ پروموشن بیورو سے تو مجھے یہ تاثر نہیں ملا۔" سلطان صاحب بولے۔

"بدقسمتی سے کسی بڑے افسر سے ملاقات ہوگئی ہوگی آپ کی۔"

"شاید یہی بات ہے۔" سلطان صاحب نے کہا۔

"یہ بتائیں! کیا ایکسپورٹ کرنا بہتر رہے گا۔"

"میرے خیال میں باہر ہماری دستکاری کی مصنوعات کے لئے بڑی

گنجائش ہے۔" عبدالحق نے کہا۔ لیکن اب اس کے لئے گفتگو پر توجہ مرکوز رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کے حساب سے تو اب تک چائے اور بسکٹ آ جانے چاہئیں تھے۔

بہرحال وہ گفتگو کرتا رہا۔ سلطان صاحب بہت مطمئن اور خوش دکھائی دے رہے تھے۔

آخر عبدالحق کو ایکس ٹینشن پر سعید کو کال کرنا پڑا۔

"کیا بات ہے سعید......؟"

"سوری سر......! بس دو منٹ انتظار کر لیں سر......!" سعید نے کہا۔ وہ عارف کے چپڑاسی کو چائے لانے کے لئے بھیج چکا تھا۔

"ٹھیک ہے......! شکریہ سعید......!" عبدالحق کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

لیکن چند منٹ بعد عارف کے چپڑاسی کو چائے اور دیگر لوازمات کے ساتھ کمرے میں آتے دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی اور تشویش بھی۔ یہ تو اسے معلوم تھا کہ شاہد نے آج چھٹی کی ہے۔ لیکن تصور صاحب تو موجود تھے، اور وہ بہت ذمہ دار آدمی تھے۔ کہیں خدانخواستہ ان کی طبیعت تو خراب نہیں ہوگئی۔

"آپ نے تو تکلف کر ڈالا حضرت......!" سلطان صاحب نے کہا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں، بسکٹ لیجئے نا۔"

چائے پیتے ہوئے اچانک سلطان صاحب نے کہا۔

"جب میں آیا تو باہر ایک اور صاحب بیٹھے تھے آپ سے ملنے کے لئے۔ آپ انہیں اتنا انتظار کروا رہے ہیں۔"

"مجھ سے ملنے کے لئے......؟" عبدالحق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ایسا ہوتا تو سعید مجھے بتاتا۔"

سلطان صاحب نے لباس اور حلیہ بیان کیا تو عبدالحق سمجھ گیا کہ یہ تصور صاحب کی بات ہو رہی ہے۔

"مجھے دیکھتے ہی وہ کمرے سے نکل گئے۔" سلطان صاحب نے بتایا۔

"انہیں یقیناً آپ سے کوئی کام ہوگا۔"

"وہ آپ کو دیکھتے ہی چلے کیوں گئے......؟ آپ جانتے ہیں انہیں۔"

''جی......! میں میر صاحب کو ایک عمر سے جانتا ہوں، بلکہ ان کے ابی جان کو بھی۔''

''میر صاحب......!'' عبدالحق نے حیرت سے دہرایا۔

''لکھنؤ کے بڑے رئیس تھے بڑے میر صاحب...... آم کے باغات، زمینیں، حویلی، کیا کچھ نہیں تھا ان کے پاس۔ لیکن پاکستان کے نام پر سب کچھ چھوڑ کر، پورے گھرانے کو صرف تن کے کپڑوں میں لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ میر صاحب ان کے اکلوتے بیٹے ہیں۔''

''نام کیا ہے ان کا......؟''

''سید تصور حسین، اعلیٰ نسب بھی ہیں، نجیب الطرفین سید ہیں۔''

''مجھے تو اشتیاق ہونے لگا ان سے ملنے کا۔''

''بہت نفیس آدمی ہیں۔ اور وہ یقیناً آپ سے ملنے آئے تھے۔''

''مجھے تو علم نہیں۔ ممکن ہے، پھر آئیں۔''

''آئیں تو انہیں میرا سلام کہیے گا۔'' سلطان صاحب نے ایک کاغذ پر اپنا پتا اور فون نمبر لکھ کر عبدالحق کی طرف بڑھایا۔

''اور یہ انہیں دے دیجیے گا۔ ان سے کہیے گا کہ بس فون پر اپنا پتا بتانے کی زحمت کرلیں۔ میں خود ان کے دولت خانے پر حاضری دوں گا۔''

سلطان صاحب کے جانے کے بعد عبدالحق بیٹھا تصور صاحب کے بارے میں سوچتا رہا۔ سلطان صاحب کے لہجے میں کتنا احترام تھا ان کے لئے۔ اور انہوں نے تصور صاحب کو اپنے گھر آنے کے لئے نہیں کہا، بلکہ کہا کہ وہ خود ان کے گھر حاضری دیں گے۔ تو کیا دبدبہ رہا ہوگا ان کے گھرانے کا۔

دوپہر کے کھانے کے وقت تک تصور صاحب واپس آگئے تھے۔ مگر اس روز عبدالحق کو ان کا کھانا لے کر آنا اچھا نہیں لگا۔ لیکن ان کی خودداری کا اسے اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ انہیں ٹھیس بھی نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ تاہم کھانے کے بعد اس نے عارف کو فون کر کے اس سے درخواست کی کہ اپنے چپڑاسی کو کچھ دیر کے لئے بھیج دے۔ چنانچہ برتن اسی نے سمیٹے۔ عبدالحق نے اسے پانچ روپے دیئے تو وہ خوش

ہوگیا۔ برتن دھو بھی اسی نے دیئے۔

کھانے کے بعد عبدالحق نے تصور صاحب کو بلا لیا۔ حسب سابق بڑی ردّ و قدح کے بعد انہوں نے کرسی پر بیٹھنا قبول کیا۔

''آپ اچانک کہاں غائب ہوگئے تھے؟'' عبدالحق نے ان سے پوچھا۔

''طبیعت خراب ہوگئی تھی بڑے صاحب......! ڈسپنسری چلا گیا تھا۔'' تصور صاحب کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کسی سے منہ چھپانا چاہتے ہوں......؟''

تصور صاحب کا چہرہ فق ہوگیا۔ سمجھ گئے کہ ان کا راز کھل گیا ہے۔

''جی بڑے صاحب......! یہ درست ہے۔'' انہوں نے گویا اعترافِ جرم کیا۔

''جب آپ سمجھتے ہیں کہ کام میں کبھی بے عزتی نہیں ہوتی تو پھر......''

''میں اس لئے منہ نہیں چھپا رہا تھا بڑے صاحب......!'' تصور صاحب نے تڑپ کر اس کی بات کاٹ دی۔

''مجھے اس میں ہرگز شرم محسوس نہیں ہوتی کہ میں ان کے سامنے چپڑاسی بن کر آتا۔ میں تماشا نہیں بننا چاہتا تھا دفتر میں۔ میں لوگوں کی ہمدردی بھی نہیں چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ مجھ پر ترس کھائیں۔ اس لئے کہ میں جو کچھ ہوں، اس میں خوش ہوں۔ میں ماضی سے تعلق توڑ چکا ہوں۔ اب دیکھئے نا، اس فرار سے یہ فائدہ تو ہوا نا کہ میرا ماضی صرف آپ پر کھلا۔ آپ سے میری التجا ہے بڑے صاحب......! کہ میرے راز کو راز رکھیں۔''

''آپ کا ماضی کوئی عیب تو نہیں کہ اسے آپ یوں چھپائیں۔''

''میں نہیں چاہتا کہ اس سے مجھے کوئی فائدہ ملے یا میری تضحیک ہو۔ کیونکہ دونوں ہی باتیں ممکن ہیں۔''

''تضحیک کوئی کیوں کرے گا آپ کی......؟''

''یہاں یہ سب کچھ ہوتا ہے بڑے صاحب......! شاید آپ کو معلوم نہیں۔''

’’میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اتنا کچھ تھا آپ کے پاس، تو آپ نے یہاں آ کر کلیم کیوں داخل نہیں کیا.....؟‘‘

تصور صاحب نے ایک سرد آہ بھری اور خلاؤں میں گھورنے لگے، جیسے گزرے ہوئے ماضی کو دیکھ رہے ہوں۔

’’جب ہم حویلی سے نکلے..... پاکستان آنے کے لئے، تو میں نے در و دیوار کو، گزرتے ہوئے باغات اور اپنی زمینوں کو حسرت سے دیکھا.....‘‘ ان کی آواز کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

’’.....تو ابی جان نے کہا، نظریں نیچی کر لو فرزند! سب کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے۔ یہ زمین بھی اللہ کی تھی۔ اس کا کرم کہ اس نے ہمیں عطا کر دی۔ اب ہم اسی کے لئے اس زمین کو چھوڑ کر پاک سرزمین کی طرف جا رہے ہیں۔ تم سوچتے ہو گے فرزند! کہ آخر ہم یہاں کیوں نہیں رہ سکتے؟ تو یہ بات نہیں، رہ سکتے ہیں ہم۔ لیکن مسلمانوں نے ہزار سال حکومت کی ہے یہاں، مسلمانوں کی روایتی رواداری کے ساتھ، وسیع القلبی کے ساتھ۔ مگر اب یہاں ہندو حکومت کرے گا، اکثریت کے بل پر۔ اور وہ طبعاً گھٹیا، تنگ نظر ہے۔ میری نظریں جو دیکھ رہی ہیں، تم نہیں دیکھ سکتے میاں۔ پچاس سال..... زیادہ سے زیادہ پچاس سال میں یہاں مسلمانوں کا مسلمان بن کر رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ اور فرزند! یہ زمینیں، حویلیاں، جاگیریں، جن کے لئے احمق مسلمان یہیں پڑے رہنے کی سوچیں، یہ تو اس سے بہت پہلے ہی چھن جائیں گی۔ پاکستان کی دو گز زمین ان تمام زمینوں سے افضل ہے ہمارے لئے۔ اور میاں! فراخی کے بعد تنگی تو ہوتی ہے۔ اللہ آزماتا ہے۔ تنگی میں کبھی دل چھوٹا نہ کرنا۔ خوش رہنا کہ مسلمان ہو اور مسلمان بن کر عزت کے ساتھ جی رہے ہو۔ ہماری دعائیں انشاء اللہ تمہارے ساتھ ہوں گی۔‘‘

عبدالحق کی عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ احترام سے سامنے بیٹھے اس شخص کو دیکھ رہا تھا، جو اس کا چپڑاسی تھا۔

’’تو آپ کے والد محترم تو یہاں بہت خوش ہوں گے؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’وہ یہاں زندہ پہنچے ہی کب؟ انہوں نے پاکستان میں دو گز زمین مانگی

تھی، وہ انہیں مل گئی۔‘‘ تصور صاحب نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

’’بلکہ ہمارے گھر میں تو کوئی بھی نہیں بچا..... سوائے ہمارے۔ اماں بیگم بھی گئیں اور بہنیں بھی۔‘‘

عبدالحق سن ہو کر رہ گیا۔ کمرے میں بہت دیر تک خاموشی رہی۔ پھر عبدالحق نے کہا۔

’’آپ نے میرے سوال کا جواب تو دیا ہی نہیں۔ آپ نے یہاں اپنی جائیداد کا کلیم داخل کیوں نہیں کیا؟‘‘

’’جواب تو دے دیا بڑے صاحب! شاید آپ تک پہنچ نہیں سکا۔‘‘ تصور صاحب بھی کسی اور ہی کیفیت میں تھے۔

’’میں سمجھا نہیں!‘‘

’’وہاں کے بدلے کی زمین تو ہمیں یہاں مل گئی بڑے صاحب! ابی جان، اماں بیگم اور تینوں بہنوں کو دو دو گز زمین۔ اور ہم زندہ ہیں تو اللہ کا شکر کہ اس نے رہنے کو ٹھکانا دیا۔ اور کیا چاہئے۔ ابی جان نے واضح کر دیا تھا کہ یہاں کی دو گز زمین وہاں کی تمام زمینوں سے افضل ہے۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو ہم فائدے میں ہی رہے۔ ہمیں ہمارے حق سے زیادہ ہی مل گیا۔‘‘

’’آپ سید ہیں، اپنے نام کے ساتھ سید کیوں نہیں لکھتے آپ.....؟‘‘

’’نسبت اوقات اور اعمال دونوں سے بہت بڑی ہے، اس لئے۔‘‘ تصور صاحب نے سادگی سے کہا۔

’’مگر دوسروں کے بھلے کے لئے آپ کو اس کا اعلان کرنا چاہئے۔ کسی سے انجانے میں کوئی زیادتی.....‘‘

’’کیسی باتیں کر رہے ہیں بڑے صاحب! یہ تو اللہ کا دیا ہوا اعزاز، اس کا فضل ہے۔ میں تو پسند نہیں کرتا کہ اس حوالے سے دوسروں کو مرعوب کروں۔ انہیں اس عزت پر مجبور کروں۔ اللہ جسے چاہے، عزت دے، چپڑاسی ہوں، مگر اس نے مجھے عزت سے نوازا ہے۔‘‘

’’لیکن میں نے سنا ہے تصور صاحب کہ نسب کو چھپانا نہیں چاہئے۔‘‘

"نسب تبدیل کرنا تو بہت بڑا جرم ہے جناب!"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" عبدالحق نے کہا۔

"یہاں لوگوں نے اپنا حسب نسب ہی تبدیل کر لیا ہے بڑے صاحب!" تصور صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔

"یوں سمجھیں کہ پاکستان میں سب کچھ الٹ پلٹ گیا۔ جو وہاں سے یہاں آئے، تتر بتر تھے، سب نے یہی سوچا کہ اب یہاں کون پہچانے گا۔ جو جی چاہے، دعویٰ کر لو۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا۔"

"دیکھئے حضرت! یہاں میں کتنے ہی ایسے شناساؤں سے ملا، جو خاندانی اعتبار سے کم تر تھے، مگر اب وہ سیّد صاحب کہلاتے ہیں۔ جن کے پاس وہاں رہنے کو بس ایک چھوٹا سا گھر تھا، انہوں نے یہاں کلیم داخل کرا کے زرعی زمینیں حاصل کر لیں۔ زمیندار بن گئے۔"

"لیکن آپ کے سامنے تو انہیں شرم آئی ہو گی۔"

"نہیں حضرت! شرم تو ہمیں آئی۔ انہیں شرم ہوتی یا ڈر ہوتا تو وہ ایسا کرتے ہی کیوں؟ وہ تو اللہ سے بھی نہیں ڈرتے کہ حسب نسب تبدیل کرنے والوں کے لئے کیسی وعید ہے۔"

"اب میں سمجھا۔" عبدالحق نے کہا۔

"اس لئے آپ نے اپنے نام کے ساتھ سیّد لکھنا چھوڑ دیا۔"

"جی حضرت......! جب کوئی عزت کی چیز ارزاں ہو جائے تو اسے چھپا لینا ہی بہتر ہے۔"

"جب آپ جیسے حقدار کلیم نہیں کریں گے تو لوگ جھوٹے کلیم تو بھریں گے ہی۔"

تصور صاحب نے بڑے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔

"بے شک ہم جیسے لوگ بھی بہت تھے، جو صرف پاکستان کی بے غرض محبت لے کر یہاں آئے تھے۔ لیکن ایسے بھی تھے، جنہوں نے کلیم داخل کئے تو پتا چلا

کہ ان کے حصے کی زمین جائیداد تو کلیم کے ذریعے کسی اور کو دی جا چکی ہے۔"

"کیسے......؟"

"بہت کچھ ہوا ہے بڑے صاحب! کچھ تو ایسے تھے، جنہیں شہید لوگوں کے کاغذات مل گئے۔ کچھ ایسے تھے، جنہیں افراتفری میں ایسے کاغذات مل گئے۔ اور کچھ ایسے تھے، جنہوں نے کلیم افسر کو حصہ دار بنا کر جعلی کلیم داخل کئے اور منظور بھی کرا لئے۔ نتیجہ یہ کہ حق دار محنت مزدوری کر کے پیٹ پال رہے ہیں اور وہاں کے مزدور یہاں بادشاہ بن گئے۔"

لاہور میں عبدالحق نے یہی کچھ سنا بھی تھا اور دیکھا بھی تھا۔

"آپ کو اس پر دکھ نہیں ہوتا میر صاحب......!"

"الحمد للہ......! بالکل نہیں ہوتا۔ ہم یہاں دل میں کوئی لالچ لے کر تو نہیں آئے تھے۔ ہم جس حال میں ہیں، خوش ہیں۔ دوسرے یہ تو اس دنیا کی رسم ہے۔ وقت بدلتا رہتا ہے۔ اللہ جس سے چاہے، بادشاہت لے کر، جسے چاہے دے دیتا ہے۔ باری بھی تو لگتی ہے یہاں۔ ہم نے بہت عیش کئے، اللہ کا شکر ہے، اب ان کی باری ہے، جو عیش سے محروم تھے۔"

"سلطان صاحب کو آپ کیسے جانتے ہیں؟"

"ابی جان سے یاد اللہ تھی ان کی۔ اسی لئے ہم سے بھی واقف ہیں۔" تصور صاحب نے سرسری انداز میں کہا۔

عبدالحق نے سلطان صاحب کا دیا ہوا پرچا ان کی طرف بڑھایا۔

"وہ کہہ رہے تھے کہ بس آپ انہیں فون کر کے اپنا بتا دیں، وہ خود آپ کے گھر پر حاضری دیں گے۔ بہت احترام کرتے ہیں وہ آپ کا۔"

"محبت ہے ان کی۔" تصور صاحب نے کہا اور پرچا خاموشی سے جیب میں رکھ لیا۔

"اب تو میرے لئے بھی آپ نہایت محترم ہیں۔ ایک بار پھر آپ سے عرض کروں کہ کوئی بھی ذاتی پریشانی یا مسئلہ ہو تو مجھے ضرور بتائیے گا۔ یہ سمجھ لیجئے کہ دفتری معاملات سے ہٹ کر میں آپ کے لئے ایک بھائی ہوں۔"

تصور صاحب کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''عزت افزائی کے لئے شکر گزار ہوں۔ بس ایک احسان ضرور کر دیجئے گا مجھ پر۔''

عبدالحق سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔

''میرا پردہ رکھ لیجئے گا۔''

''یہ وضاحت آپ نے اب بھی نہیں کی کہ آپ کا ماضی آپ کے لئے تضحیک کا باعث کیسے ہے؟''

''اللہ کا شکر کہ اس نے مجھے محفوظ رکھا۔ لیکن میں نے اپنے جیسوں کی تضحیک ہوتے دیکھی ہے۔ کوئی کہے کہ ہندوستان میں ہم پر اللہ کا بڑا فضل تھا، تو جواب ملتا ہے، وہاں سے آنے والے تو سبھی یہی کہتے ہیں۔ اور ذرا لحاظ کیا تو پدرم سلطان بود کہہ کر گویا یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ تمہاری اپنی اوقات کیا ہے۔ کوئی کہے کہ میں سید ہوں تو کہا جاتا ہے کہ وہاں سے تو کنجڑے قسائی بھی یہاں کر سید بن بیٹھے۔ اب آپ ہی بتایئے بڑے صاحب کہ آدمی یہ سب کچھ سن کر اپنے آباء و اداد کو رسوا کیوں کرے۔''

''آپ نے ٹھیک فرمایا میر صاحب!''

''اور آپ سے گزارش ہے کہ مجھے اس طرح پکاریئے بھی نہیں، وہی پہلے والا رویہ رکھئے۔''

''میں معذرت خواہ ہوں میر صاحب کہ یہ بات میں نہیں مانوں گا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اب تو آپ میرے لئے بہت محترم ہیں۔ اور پھر میں آپ کا احترام کروں گا تو دوسرے لوگ بھی کریں گے۔ اس میں کوئی نقصان نہیں آپ کا۔''

''میرا آپ پر کوئی زور تو ہے نہیں۔'' تصور صاحب نے مایوسی سے کہا۔

لیکن عبدالحق کی بات درست ثابت ہوئی۔ ماتحت افسروں کے رویے سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ عبدالحق کے انداز میں تصور صاحب کے لئے احترام دیکھا تو اس کے ماتحت بھی ان کا احترام کرنے لگے۔ اور ان کی دیکھا دیکھی دفتر

کے دوسرے لوگ بھی انہیں میر صاحب کہنے لگے۔

دو سال گزر گئے۔ تصور صاحب عبدالحق کے احسان مند تھے۔

پھر عبدالحق کو احساس ہوا کہ تصور صاحب کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں۔ ان کے چہرے سے تو اس کا اندازہ نہیں ہوتا تھا لیکن وہ کچھ غائب دماغ رہنے لگے تھے۔ جبکہ پہلے وہ ایک بار کی کہی ہوئی بات بھولتے ہی نہیں تھے۔

ایک دن عبدالحق نے ان سے اس سلسلے میں بات بھی کی۔

''میر صاحب! ان دنوں خدانخواستہ کچھ پریشان ہیں آپ؟''

''جی نہیں جناب! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ کو یہ خیال کیسے آیا؟''

''بس ایسے ہی۔''

''کیا مجھے دیکھ کر ایسا لگتا ہے آپ کو؟''

''نہیں! دیکھ کر تو نہیں لگتا۔''

''ایسی کوئی بات ہے بھی نہیں بڑے صاحب!''

لیکن اگلے چند روز میں عبدالحق کا یہ تاثر اور گہرا ہوگیا۔ البتہ وہ اسے اہمیت نہیں دے سکا۔ وجہ یہ تھی کہ ان دنوں آوٹ پارٹی آئی ہوئی تھی۔ حسابات کی سالانہ پڑتال ہو رہی تھی۔ اس کے اور اس کے اسٹاف کے لئے وہ بڑی مصروفیت کا عرصہ تھا۔

اس روز آوٹ پارٹی کے کچھ لوگ اس کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ اہم دفتری باتیں ہو رہی تھیں کہ تصور صاحب جھجکتے ہوئے اندر آئے۔ عبدالحق ان کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''خیریت تو ہے میر صاحب!'' عبدالحق نے پوچھا۔

''مجھے چھٹی چاہئے جناب عالی!''

''کل کی...؟''

''مجھے ابھی گھر جانا ہے بڑے صاحب! اور کل بھی دفتر نہیں آ سکوں گا۔''

''خیریت تو ہے میر صاحب!''

''جی، الحمدللہ!'' تصور صاحب نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''تو آپ چلے جایئے۔ سعید صاحب کو بتا دیجئے گا۔''

لیکن تصور صاحب پھر بھی کھڑے رہے۔ انداز میں اب بھی جھجک تھی۔
عبدالحق آؤٹ پارٹی والوں کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں تصور صاحب کا مسئلہ حل ہوگیا تھا۔

تصور صاحب نے جھجکتے جھجکتے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک تہہ شدہ رقعہ نکالا اور کھنکھار کر گویا عبدالحق کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

عبدالحق کچھ جھنجلا سا گیا۔ تاہم اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''کیا ہوا میر صاحب! آپ گئے نہیں؟''

تصور صاحب نے رقعہ اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ رکھ لیجئے سر! میری التجا ہے کہ گھر جا کر اسے پڑھ لیجئے گا۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹے اور کمرے سے نکل گئے۔

عبدالحق کو سچ مچ غصہ آیا۔ چھٹی کی درخواست وہ سعید کو بھی دے سکتے تھے۔ بہرحال رقعہ اس نے قمیص کی جیب میں رکھ لیا۔ یہ مداخلت اسے بہت بری لگتی تھی۔

''یہ تو شاید چپڑاسی ہے آپ کا؟'' آؤٹ پارٹی کے لوگوں میں سے ایک نے پوچھا۔

''جی ہاں!'' عبدالحق اس کے لہجے پر بھی جھنجلا گیا۔ وہ دن ہی شاید جھنجلاہٹ کا تھا۔

''زیادہ ہی منہ لگا رکھا ہے آپ نے!''

''میں جانتا ہوں کہ کسے کتنی اہمیت دینی ہے۔'' عبدالحق اپنے لہجے کی تلخی نہیں چھپا سکا۔

''دفتر کا ڈسپلن خراب کر دیتے ہیں ایسے لوگ۔''

عبدالحق کو شرمندگی ہوئی۔ کیونکہ کہی گئی بات درست تھی۔ اور اس کی تردید ممکن نہیں تھی۔ اسے پھر تصور صاحب پر غصہ آنے لگا۔ چھٹی کی درخواست وہ سعید کو دے سکتے تھے۔ بلکہ وہ چھٹی کا بھی سعید سے ہی پوچھ لیتے۔ وہ ایکس ٹینشن پر اس

سے اجازت لے لیتا۔ یہ دفتری طریق کار ہوتا، جس پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ کیونکہ تصور صاحب کبھی چھٹی نہیں کرتے تھے۔ کجا یہ کہ دفتر آنے کے بعد چھٹی لے کر جانا۔

اس نے جواب دینے کے بجائے کام کی بات شروع کر دی۔

جس عرصے میں آؤٹ ہوتا تھا، وہ اس کے اور اس کے اسٹاف کے لئے بہت تھکا دینے والا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو دفتری اوقات کے بعد بھی کافی دیر رک کر کام کرنا ہوتا تھا۔ اس روز زیادہ ہی دیر ہوگئی تھی۔ مغرب کی نماز اس نے دفتر میں ہی پڑھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے عشاء کا وقت ہوگیا تھا۔

گھر پہنچا تو نور بانو نے کہا۔

''اتنی دیر کر دی آپ نے۔''

''کام زیادہ ہو تو دیر ہو ہی جاتی ہے۔'' عبدالحق نے جھنجلا کر کہا۔

''وہ کام کل بھی تو کیا جا سکتا تھا۔ چھٹی کے وقت تو آدمی گھر پر آ جائے۔ میں یہاں اکیلی ہوتی ہوں۔''

''نوکرانی ہے تمہارے پاس۔ برابر میں ہی عارف بھائی ہیں۔''

''مگر آپ کی بات تو اور ہے۔ پتا ہے، کتنی طبیعت خراب ہوئی ہے میری آج۔''

''میں تو کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ تم لاہور چلی جاؤ۔''

''آپ سے دور نہیں رہ سکتی میں۔'' نور بانو نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس وقت عبدالحق تھکن کی وجہ سے چڑچڑا ہو رہا ہے۔ ایسے میں بحث و تکرار نقصان دہ ثابت ہوگی۔

''تو پھر برداشت کی عادت ڈالو، میں آج کا کام کل پر چھوڑنے کا قائل نہیں ہوں۔''

''کپڑے نکال کر رکھ دیئے ہیں میں نے۔ آپ کپڑے تبدیل کر کے، ہاتھ منہ دھو کے آئیں۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔''

عبدالحق بیڈروم کی طرف چلا گیا۔

کھانا کھا کر اس نے عشاء کی نماز پڑھی، کچھ دیر قرآن پڑھا، اور پھر سو گیا۔

اگلے روز تصور صاحب دفتر نہیں آئے۔ عبدالحق کے ذہن سے وہ بات ہی نکل گئی۔ پھر اس کے بعد تصور صاحب دفتر آئے تو پریشان ہی نظر آ رہے تھے۔ لیکن عبدالحق کی پوری توجہ آؤٹ پارٹی کی طرف تھی۔ وہ اس طرف دھیان ہی نہیں دے سکا۔

اس روز بھی آؤٹ پارٹی کے لوگ اس کے دفتر میں بیٹھے رہے۔ تصور صاحب کئی بار کمرے میں آئے، کبھی چائے لے کر اور کبھی کھانا لے کر۔ عبدالحق کو احساس ہوا کہ وہ کچھ مضطرب ہیں، اس سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مگر اس نے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ پچھلی بار بھی ان کی وجہ سے اسے آؤٹ پارٹی والوں کی بات سننی پڑی تھی۔ اور یہ اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ اس پر وہ ان سے چڑا ہوا تھا۔ اس نے انہیں نظرانداز کر دیا۔

اگلے روز آؤٹ پارٹی والوں کے آنے سے پہلے تصور صاحب اس کے کمرے میں آئے۔ اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

''جی میر صاحب!''

''آپ مجھ سے کچھ خفا ہیں بڑے صاحب!''

''آپ کے خیال میں نہیں ہونا چاہئے۔'' عبدالحق نے الٹا ان سے سوال کیا۔

تصور صاحب کے چہرے کی رنگت متغیر ہوگئی۔

''میں سمجھا نہیں جناب!''

''میں نے آپ سے پہلے دن ہی کہا تھا کہ دفتر کے ڈسپلن کی بڑی اہمیت ہے۔'' عبدالحق کا لہجہ سخت تھا۔

تصور صاحب نادم کھڑے تھے۔ عبدالحق نے ان سے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔ ویسے ڈسپلن کی بات سننے کے بعد شاید وہ اس کے کہنے پر بھی نہیں بیٹھتے۔

''آپ نے آؤٹ پارٹی والوں کے سامنے اس دن مجھے شرمندہ کرا دیا۔

دیکھیں نا! وہ تو باہر کے لوگ ہیں۔''

''میں بہت شرمندہ ہوں جناب عالی! دراصل اہلیہ کی طبیعت بہت خراب ہے۔''

تو آپ سعید صاحب سے بات کر سکتے تھے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''وہ تو میں نے کر لی تھی۔''

''تو پھر میرے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟ کم از کم آؤٹ پارٹی والوں کے سامنے نہ آتے۔''

''مجبوری تھی جناب عالی!''

''میں تو نہیں سمجھ سکا آپ کی مجبوری۔''

''ہم نے تو ساری تفصیل لکھ دی تھی جناب!'' وہ بے بسی سے بولے۔

''تفصیل کی اتنی ضرورت بھی نہیں تھی۔'' عبدالحق نے بے رخی سے کہا۔

تصور صاحب گنگ ہو کر رہ گئے۔ ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

عبدالحق نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اسے ان کی نگاہوں میں التجا نظر آئی۔

''کچھ کہنا چاہتے ہیں آپ؟''

تصور صاحب جھجکتے رہے۔ کچھ گومگو کی کیفیت میں تھے۔

عبدالحق کو ان پر ترس آنے لگا۔ اچانک اسے ان کا پس منظر یاد آیا۔

''کہئے نا! کیا کہنا ہے آپ کو؟''

''اب کیا کہیں صاحب! جو نہیں کہنا تھا، وہ بھی کہہ چکے ہم تو۔''

''تو پھر......؟''

''ہمیں بتا دیجئے کہ آپ کا فیصلہ کیا ہے؟''

''فیصلے کی کیا بات ہے، اتنی سی بات......''

اسی وقت ایڈیٹر صاحب آ گئے۔

''میرے لئے کیا حکم ہے بڑے صاحب!''

''آپ دوسری درخواست لکھ کر سعید کو دے دیجئے۔'' عبدالحق نے کہا۔

تصور صاحب کے چہرے پر الجھن نظر آئی۔ جیسے وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہے ہوں۔

''دوسری درخواست لکھوں؟''

''جی ہاں! یہی کہا ہے میں نے۔''

''اور وہ سعید صاحب کو دے دوں؟'' تصور صاحب نے زخمی لہجے میں کہا۔ ان کے لہجے میں تعجب اور بے یقینی بھی تھی۔

''جی......! دفتر کا یہی طریق کار ہے۔''

تصور صاحب کے کندھے جیسے ڈھلک گئے۔ وہ جانے کے لئے پلٹے۔

''اور ہاں میر صاحب!'' عبدالحق نے انہیں پکارا۔

وہ پلٹے تو ان کی نگاہوں میں امید کی چمک تھی۔

''جی بڑے صاحب!''

''چائے بھجوا دیجئے گا شاہد سے۔''

''بہت بہتر جناب!''

عبدالحق نے ان کی مایوسی بھی دیکھی تھی۔ ان کا زخمی لہجہ اس کی سماعت تک پہنچا تھا۔ لیکن وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ دوسری درخواست لکھنے کی بات پر ان کا ردِعمل کچھ ایسا تھا، جیسے وہ ان کے لئے توہین ہو۔ اسے نہیں لگتا تھا کہ وہ دوسری درخواست لکھ کر دیں گے۔

اسے افسوس ہونے لگا۔ قصور تو اس کا بھی تھا۔ انہوں نے درخواست لکھ کر اسے دی تھی۔ اور وہ جیب میں رکھ کر بھول گیا تھا۔ اس نے سوچا، آج وہ نور بانو سے پوچھے گا کہ جیب میں سے وہ درخواست نکالی ہے اس نے، اور کہاں رکھی ہے۔

لیکن اسے پھر جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ درخواست براہ راست اسے دینے کی تک کیا تھی۔ سعید کو دینی چاہئے تھی۔

''کس سوچ میں ہیں عبدالحق صاحب!'' ایڈیٹر صاحب نے چونکا دیا۔

''کچھ نہیں، اور آپ سنائیں۔''

بات آئی گئی ہوگئی۔

اس شام بھی دفتر میں دیر تک کام رہا۔ گھر جانے کے لئے وہ ایڈیٹر صاحب کے ساتھ ہی آفس سے نکلا تو بیرونی کمرے میں صرف تصور صاحب تھے۔

''سب لوگ چلے گئے؟'' اس نے ان سے پوچھا۔

''جی بڑے صاحب!''

''ٹھیک ہے۔ اب میں بھی جا رہا ہوں۔ آپ دفتر بند کر دیجئے گا۔''

''جی بہتر!''

اس روز بھی وہ نور بانو سے درخواست کے بارے میں پوچھنا بھول گیا۔

اگلے روز گھر جانے کے لئے نکلتے ہوئے اسے شاہد کو باہر بیٹھے دیکھ کر حیرت ہوئی۔

''تم یہاں کیسے؟''

''دفتر لاک کرنا ہے نا سر!''

''میر صاحب کہاں ہیں؟''

''وہ تو تین دن کی چھٹی لے کر گئے ہیں۔''

عبدالحق کو حیرت بھی ہوئی اور تشویش بھی۔ تصور صاحب تو کبھی چھٹی کرتے ہی نہیں تھے۔ اور اب پہلے ڈیڑھ دن کی چھٹی، اسے دو دن بعد یہ تین دن کی چھٹی۔ اور کئی دن سے وہ پریشان بھی نظر آ رہے تھے۔

صبح وہ دفتر پہنچا تو دروازہ مقفل تھا۔ سعید باہر کھڑا تھا۔

''کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ سر! چابی شاہد کے پاس ہے نا! میر صاحب تو تین دن کی چھٹی پر ہیں۔'' سعید نے جواب دیا۔

عبدالحق کو شدت سے غصہ آیا۔ ابھی آؤٹ پارٹی والے آجائیں تو کتنی شرمندگی ہوگی۔

''میں عارف صاحب کے دفتر میں بیٹھا ہوں۔ آفس کھل جائے تو مجھے بلا لینا۔'' اس نے کہا اور عارف کے آفس کی طرف بڑھ گیا۔

پانچ منٹ بعد شاہد اسے بلانے آگیا۔ اللہ نے عزت رکھ لی تھی۔ آؤٹ

پارٹی والے ابھی نہیں آئے تھے۔

اپنی کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے شاہد کو طلب کرنے کے لئے گھنٹی بجائی۔ شاہد خوفزدہ سا کمرے میں آیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی شامت آئی ہے۔

''تو تم سدھرو گے نہیں شاہد!''

''وہ سر......! میں...... وہ بسوں میں بہت رش ہوتا ہے سر! میں نے پوری کوشش کی تھی۔''

''نہیں کی تھی۔'' عبدالحق میز پر ہاتھ مارتے ہوئے دہاڑا۔

''پوری کوشش کی ہوتی تو تم وقت سے پہلے یہاں پہنچ گئے ہوتے۔ میر صاحب کی طرح!''

''میں سچ کہہ رہا ہوں سر!''

''بسوں میں رش ہوتا ہے، دیر ہو جاتی ہے تو گھر سے جلدی نکلا کرو۔''

''یس سر!''

''پہلے میں ان کوتاہیوں کو نظرانداز کرتا رہا ہوں۔'' عبدالحق نے سنگین لہجے میں کہا۔

''میں نہیں چاہتا کہ مجھ سے کسی کو نقصان پہنچے۔ لیکن تم نے میری نرمی کا غلط مطلب لیا۔ تم بے حس آدمی ہو۔ تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ان دنوں آؤٹ والے آئے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے ہماری بے عزتی ہوگی۔''

''میں معافی چاہتا ہوں سر! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''

''ہونا بھی نہیں چاہئے۔ اس میں تمہاری بہتری ہے۔''

''یس سر!''

''میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ اب اس کے بعد میں تمہیں کوئی موقع نہیں دوں گا۔'' عبدالحق نے کڑے لہجے میں کہا۔

''اگلی بار میں کوئی بات کئے بغیر تمہیں معطل کر دوں گا۔''

''اب ایسا نہیں ہوگا سر!''

اس کے جانے کے بعد عبدالحق کو تصور صاحب کا خیال آیا۔ وہ کتنے اچھے

تھے، کتنے ذمہ دار اور محبت سے کام کرنے والے۔ وقت نے انہیں کہاں سے اٹھا کر کہاں لا پھینکا تھا۔ لیکن وہ کوئی شکایت کئے بغیر پوری دیانتداری سے اپنا کام کر رہے تھے۔

اس نے سعید کو اندر بلا لیا۔

''تصور صاحب نے چھٹی کی درخواست دی تمہیں۔''

''جی سر!'' سعید نے دو درخواستیں ان کی طرف بڑھا دی۔

عبدالحق نے اوپر والی درخواست کو دیکھا۔ وہ تین دن کی چھٹی کے لئے تھی۔

''میں اس سے پہلے کی چھٹی کی بات کر رہا ہوں۔''

''جی سر! وہ تو جب انہوں نے آدھ دن کی چھٹی لی تھی تو جانے سے پہلے ہی اگلے دن کی چھٹی کی درخواست دے دی تھی۔ وہ بھی نیچے موجود ہے سر!''

عبدالحق پڑھے بغیر کبھی دستخط نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس وقت اس نے پڑھے بغیر ہی دونوں درخواستوں پر منظوری کے دستخط کر دیئے۔ اسے حیرت ہو رہی تھی۔ اگر تصور صاحب سعید کو چھٹی کی درخواست دے کر گئے تھے تو جانے سے پہلے اسے انہوں نے کیا دیا تھا۔ کیا وہ چھٹی کی درخواست نہیں تھی۔

''مسئلہ کیا ہے میر صاحب کے ساتھ؟''

''آپ کو نہیں بتایا انہوں نے......؟''

''نہیں......!'' عبدالحق نے کہا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے درخواست میں وجہ پڑھی ہی نہیں۔ اور دستخط کر کے درخواستیں وہ سعید کی طرف بڑھا چکا تھا۔

''ان کی اہلیہ کی آنکھوں میں کوئی تکلیف تھی، جو بہت بڑھ گئی۔ خدانخواستہ بینائی تک جا سکتی ہے۔''

''اوہ......!'' عبدالحق کو یاد آیا کہ تصور صاحب نے اس صبح اسے بھی اپنی اہلیہ کی بیماری کے بارے میں بتایا تھا۔

''تو اب کیا صورتِ حال ہے؟''

”آج آپریشن ہے سر! اللہ کرے، کامیاب ہو جائے۔ تین چھٹیوں کے ساتھ میر صاحب کو چوتھی چھٹی اتوار کی مل جائے گی۔“

”ٹھیک ہے، تم جاؤ۔“

اب عبدالحق کی سمجھ میں بات آ رہی تھی۔ وہ اس پر سوچتا رہا۔ تصور صاحب نے رقعہ اسے دیتے ہوئے التجائیہ انداز میں کہا تھا کہ گھر جا کر اسے پڑھ لیجئے گا۔ اس نے اپنے طور پر فرض کر لیا تھا کہ وہ چھٹی کی درخواست ہوگی۔ اس لئے اس نے بے پرواہی برتی۔ اور کچھ کام اور مصروفیت میں وہ سوچ بھی نہیں سکا، اور بھول گیا لیکن اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ تصور صاحب کو علاج کے سلسلے میں ضرورت رہی ہوگی۔ اور ضرورت بھی شدید ہوگی۔ اب زبان سے تو وہ کہہ نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے اسے وہ رقعہ لکھ دیا ہوگا۔ بدقسمتی سے وہ اس نے پڑھا ہی نہیں۔

اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ اس صبح وہ اس سے کیوں پوچھ رہے تھے کہ اس کا فیصلہ کیا ہے۔ اور وہ حیران ہوا تھا کہ اس میں فیصلے کا پہلو کہاں سے نکل آیا۔ پھر جاتے جاتے انہوں نے پوچھا تھا۔ میرے لئے کیا حکم ہے بڑے صاحب! اب ان کی التجا، ان کا زخمی لہجہ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ اور اس نے بے پرواہی سے کہا تھا کہ دوسری درخواست لکھ کر سعید کو دے دیں۔ اس پر وہ حیران بھی ہوئے تھے اور دکھی بھی۔ لیکن وہ ان کا دکھ اور ان کی حیرت نہیں سمجھ سکا تھا۔ پھر جب وہ جانے لگے اور اس نے چائے کے لئے کہنے کو انہیں پکارا تو انہوں نے کیسی امید اور تشکر سے اسے دیکھا تھا۔ اور اس کی چائے کی فرمائش سن کر وہ مایوس ہوئے تھے، اور دفتر سے چلے گئے تھے۔

مگر اس شام وہ دفتر سے نکلا تو اکیلے تصور صاحب باہر بیٹھے تھے۔ اس وقت انہوں نے اس سے کیوں نہیں کہہ دیا؟ جواب فوراً ہی اس کی سمجھ میں آ گیا۔ زبان سے کہہ نہیں سکتے تھے، اسی لئے تو انہوں نے دو روز پہلے اسے اپنی ضرورت لکھ کر دی تھی۔ وہ کبھی رئیس تھے، ان کی زبان مدد کے لئے کیسے کھلتی۔

اور شاید کھل بھی جاتی۔ ضرورت بڑے بڑوں کو مجبور کر دیتی ہے۔ لیکن اس وقت اس کے ساتھ ایڈیٹر صاحب تھے۔ اور صبح وہ آفس ڈسپلن کے حوالے سے

تصور صاحب سے خاصی سختی سے بات کر چکا تھا۔ کوئی گنجائش ہی نہیں تھی بات کرنے کی۔ تصور صاحب کے خیال میں تو وہ ان کے رقعے کا جواب نفی میں دے چکا تھا۔

عبدالحق خود کو ملامت کرتا رہا۔ اس کا تاسف گہرا ہوتا گیا۔ تصور صاحب ایسے کہنے والے کہاں تھے۔ وہ تو اس نے دوبارہ انہیں جتا کر کہا تھا کہ کوئی ذاتی پریشانی ہو تو وہ ایک بھائی کی طرح ان سے مدد طلب کر سکتے ہیں۔ اسی کے زور پر تو انہوں نے وہ رقعہ لکھا ہوگا اور جانے کس دل سے لکھا ہوگا۔

اور ان کا دل کیسے ٹوٹا ہوگا۔ عبدالحق کو اپنا دل لرزتا محسوس ہوا۔ اور نہ جانے کیا ہوا ہوگا، کیا ہو رہا ہوگا؟

پورے دن اس کا دل تصور صاحب میں اٹکا رہا۔ اس نے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ کام کی طرف سے اس کے بے توجہی آؤٹ والوں نے بھی محسوس کر لی۔

شام کو عبدالحق نے ایڈیٹر صاحب سے کہا۔

”سوری! آج میں نہیں رک سکوں گا۔ مجھے ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے۔“

”عبدالحق صاحب! ہمیں ہفتے تک ہر حال میں کام مکمل کرنا ہے۔“ ایڈیٹر صاحب بولے۔

”آپ فکر نہ کریں۔ میں کل اور پرسوں میں تلافی کر دوں گا۔ ہفتے تک انشاء اللہ کام مکمل ہو جائے گا آپ کا۔“

”دیکھ لیں، ہمیں بھی اپنے محکمے میں جواب دینا ہوگا۔“

”آپ بے فکر ہو جائیں۔ بس آج مجھے جانے دیں۔“

”چلیں..... ٹھیک ہے۔“

اس نے تصور صاحب کی سروس بک منگا کر اس میں سے ان کا پتا نوٹ کیا اور دفتر سے نکل آیا۔

”ہمیں ڈرگ روڈ چلنا ہے۔“ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے یعقوب سے کہا۔

"سر جی! میں تو ڈرگ روڈ پہلے بھی نہیں گیا۔" یعقوب نے اسے جتایا۔

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم کبھی بھی وہاں نہیں جا سکو گے۔" عبدالحق نے خشک لہجے میں کہا۔

"ویسے مجھے کچھ اندازہ ہے۔" عبدالحق کو یاد تھا کہ کراچی آنے پر عارف اسے ریسیو کرنے ائیر پورٹ آیا تھا۔ راستے میں اس نے ڈرگ روڈ کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ ائیر پورٹ کے قریب ہی کوئی علاقہ تھا۔

"چلیں سر! گاڈ از ماسٹر!" یعقوب نے ہمیشہ کی طرح انگریزی جھاڑی۔ وہ اب بھی اسی طرح انگریزوں کا فین تھا۔

ڈرگ روڈ پہنچنے میں تو زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ لیکن تصور صاحب کا گھر تلاش کرنا مسئلہ بن گیا۔ وہاں مکان نمبر ترتیب سے تھے نہیں، اس پر ستم یہ کہ اکثریت کچے مکانوں اور جھونپڑیوں کی تھی، جن پر نمبر بھی نہیں لکھے تھے۔ اگر پتے کے ساتھ "نزد شرف الدین کریانہ اسٹور" نہ لکھا ہوتا تو شاید وہ تلاش کر ہی نہ پاتے۔ بہرحال شرف الدین کریانہ اسٹور ڈھونڈنا بھی آسان نہیں تھا۔ جیسے تیسے پوچھتے پاچھتے وہ وہاں تک پہنچ ہی گئے۔

شرف الدین نے حیرت سے پہلے کار کو پھر باوردی یعقوب کو اور پھر عبدالحق کو دیکھا۔

"تصور میاں کو پوچھ رہے ہیں آپ؟"

"جی ہاں!"

شرف الدین عقل مند آدمی تھے۔ انہوں نے پتا یعقوب کو سمجھایا۔ لیکن عبدالحق بھی سن کر ذہن نشین کرتا رہا۔

وہ پتا یعقوب کے لئے اتنا پیچیدہ تھا کہ شرف الدین کا بتایا ہوا پہلا موڑ مڑتے ہیں اس نے گاڑی روکی اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا مسٹر جیکب!"

"سر! دِس بلڈی بھول بھلیاں۔ اب پتا نہیں، لیفٹ مڑنا ہے کہ رائٹ؟"

"تم بس میرے کہنے پر عمل کرتے رہو مسٹر جیکب!"

یعقوب نے گاڑی پھر اسٹارٹ کی۔

"انگریز میں بڑی خوبیاں تھیں سر! اس نے کبھی ایسی بے نشاں بستیاں آباد نہیں کیں۔ نہ یہاں کوئی نمبر ہے، نہ بستی کا کوئی سر پیر۔ ات میری بل سر!"

"انگریز نے نہ کبھی ایسے آزادی حاصل کی، نہ ایسے اپنا وطن بنایا۔" عبدالحق نے حقارت سے کہا۔

"تم گاڑی چلاؤ یعقوب!"

یعقوب چوکنا ہو گیا۔ یعقوب کہہ کر پکارنا اس بات کی دلیل تھی کہ اب انگریزوں کی تعریف کرنا مخدوش ہو گا۔

کئی بار کی لیفٹ رائٹ کے بعد عبدالحق نے ایک کچے مکان کے سامنے گاڑی رکوا دی۔

"یہی ہونا چاہئے تصور صاحب کا گھر۔"

اب وہاں اندھیرا ہو گیا تھا۔ گاڑی کے گرد بچے جمع ہو گئے۔ عبدالحق نے باہر اتر کر جائزہ لیا۔ مطلوبہ مکان کے دروازے پر تالا لگا تھا۔ اس نے بچوں سے پوچھا۔

"تصور صاحب یہاں رہتے ہیں؟"

لیکن تصور صاحب کے نام سے کوئی بچہ واقف نہیں تھا۔ اور عبدالحق یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ تصور صاحب کا گھر ہے۔ اس نے برابر والے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، بچوں سے کہا۔

"اس گھر میں سے کسی کو بلا دو۔"

ایک بچے نے دوسرے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو نوید کا گھر ہے۔"

نوید، اپنے ابو کو بلائیے ذرا۔"

نوید اپنے گھر چلا گیا۔ بچے حیرت اور خوشی سے کار کو دیکھتے رہے، جو ان کے لئے عجوبہ تھی۔

ایک منٹ بعد برابر والے مکان سے ایک ادھیڑ عمر شخص نوید کے ساتھ

نکلا۔ عبدالحق نے اسے سلام کیا۔ پھر پوچھا۔

''تصور صاحب، یہاں رہتے ہیں؟''

''وہی نا، جو کسٹم میں کام کرتے ہیں۔''

''جی ہاں!''

''یہ انہی کا گھر ہے۔''

''تو تالا کیوں لگا ہے یہاں؟''

''آج ان کی گھر والی کی آنکھوں کا آپریشن ہے۔''

''اور ان کے بچے؟''

''انہیں شاید کسی جاننے والے کے گھر چھوڑ گئے ہیں وہ۔ یہ مجھے نہیں معلوم کہ کہاں چھوڑا ہوگا۔''

عبدالحق نے ان کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی میں آ بیٹھا۔

''واپس چلو!'' اس نے یعقوب سے کہا۔

یعقوب نے سکون کی سانس لی۔

عبدالحق سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ تصور صاحب سے ملنا، ان کی ضرورت کے بارے میں پوچھنا اور ان کی مدد کرنا ضروری تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کراچی میں، آنکھوں کا ایک ہی اسپتال ہے۔ آپریشن وہی ہو رہا ہوگا۔ تصور صاحب وہیں ملیں گے۔

اب وہ مین روڈ پر تھے۔ عبدالحق نے یعقوب سے کہا۔

''لی مارکیٹ تو تمہیں معلوم ہے نا کہ کہاں ہے؟''

''یس سر! ویری ویل سر!''

''وہاں آنکھوں کا اسپتال دیکھا ہے؟''

''نو سر.....!''

''خیر، تم لی مارکیٹ چلو۔ اور کل سے مجھے دفتر چھوڑ کر شہر میں گھومنا شروع کرو۔ اس وقت تک جب تک تمہیں پورے شہرے کے بارے میں معلوم نہ ہو جائے۔ یہ تو بڑے شرم کی بات ہے کہ آدمی جس شہر میں رہے، اس کی بھی خبر نہ ہو

اسے۔'' عبدالحق چڑ چڑا ہو رہا تھا۔

یعقوب نے بھی ''یس سر!'' کہنے میں ہی عافی جانی۔ صاحب کو ایسے موڈ میں اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

آنکھوں کے اسپتال پہنچنے میں بہرحال کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ لیکن تصور صاحب کا وہاں بھی کوئی سراغ نہیں ملا۔ یہ بات طے ہوگئی کہ تصور صاحب کی اہلیہ اس اسپتال میں نہیں ہیں۔

مگر ایک نرس کو تصور صاحب کا حلیہ سن کر یاد آ گیا۔

''وہ تو بہت پیچیدہ کیس تھا جناب!'' وہ بولی۔

''ڈاکٹر نے انہیں کہیں اور جانے کو کہا تھا۔ وہ آپریشن یہاں نہیں ہو سکتا تھا۔''

''کہاں.....؟ مجھے بتائیے کہ وہ کہاں گئے ہوں گے؟''

''یہ تو مجھے معلوم نہیں۔''

''کسی ڈاکٹر سے بات ہوئی تھی ان کی؟''

''ڈاکٹر جعفر سے۔''

''وہ کہاں ہیں؟''

''وہ تو کل سے گئے ہیں، دس دن کی چھٹی پر۔'' نرس نے جواب دیا۔ پھر اس کے اگلے سوال کو بھانپ کر پہلے ہی سے بولی۔

''وہ گھر میں بھی نہیں۔ چھٹیاں گزارنے شہر سے باہر گئے ہیں۔''

بات وہیں ختم ہوگئی۔ اب عبدالحق کے سامنے کوئی سراغ نہیں تھا۔

''اب گھر چلو!'' اس نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد یعقوب سے کہا۔

یعقوب نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

وہ دن بھر کا بھوکا تھا۔ اس پر یہ تھکن اور ناکامی کی کوفت۔ کھانے کے بعد بمشکل اس نے نماز پڑھی اور سو گیا۔ نوربانو سے کچھ پوچھنے کا اسے خیال ہی نہیں رہا۔

اگلی صبح شاہد وقت سے پہلے دفتر آ چکا تھا۔ عبدالحق نے سعید کو اندر بلا لیا۔

''میر صاحب کی کوئی خیر خبر؟'' اس نے پوچھا۔

''اب تو پیر کو ہی کچھ معلوم ہو سکے گا سر!''

''ہو سکتا ہے، درمیان میں وہ ذرا دیر کے لئے آئیں۔ ایسا ہو تو مجھے فوراً بتانا۔ چاہے کوئی بھی بیٹھا ہو میرے کمرے میں۔''

''یس سر!''

''یہ بہت ضروری ہے سعید!''

''یس سر! وہ آئے تو میں آپ کو فوراً بتاؤں گا، اور انہیں آپ سے ملے بغیر نہیں جانے دوں گا۔''

''گڈ!''

لیکن اگلے دو دن بہت مصروفیت کے تھے۔ تصور صاحب آئے بھی نہیں، اور اسے ان کی طرف جانے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ ایڈیٹر صاحب سے وہ کام نمٹانے کا وعدہ جو کر چکا تھا۔ اب اس سے پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتا تھا۔

دونوں دن بہت دیر تک کام کرنے کے باوجود کام ختم نہیں ہو سکا۔ اس کے نتیجے میں اتوار کو بھی دفتر آنا پڑا۔ اتوار کی سہ پہر کام نمٹانے کے بعد وہ ایڈیٹر صاحب کے ساتھ الوداعی چائے پی رہا تھا۔ تھکن کے باوجود سب خوش تھے کہ کام وقت پر نمٹ گیا۔

''میں آپ سے بہت متاثر ہوا ہوں عبدالحق صاحب!'' ایڈیٹر صاحب نے کہا۔

''آپ کے ساتھ کام کر کے خوشی ہوئی۔''

''ایسی کیا بات دیکھی آپ نے مجھ میں؟''

''لطف یہ ہے کہ آپ کو پتا ہی نہیں۔'' ایڈیٹر صاحب ہنسنے لگے۔

''آپ اس محکمے کے سربراہ ہیں۔ لیکن آوٹ کے تمام عرصے میں عام اسٹاف کی طرح کام میں لگے رہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔''

''میرے خیال میں تو یہ میرا فرض تھا۔''

''ممکن ہے، ایسا ہو، لیکن میں نے تو کچھ اور ہی دیکھا ہے۔ یہ کام ماتحتوں

کو سونپ دیا جاتا ہے۔ میں نے کبھی کسی اسسٹنٹ کلکٹر کو اس کام میں دلچسپی لیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ تو بس ایڈیٹر سے پوچھ لیتے ہیں کہ کام کیسا چل رہا ہے۔ آفس ٹائم کے بعد ان کے رکنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔''

''لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ ذمہ داری میری ہے۔ کمی بیشی کی جواب دہی بھی مجھے کرنی ہے، میرے ماتحتوں کو نہیں۔ بڑے عہدے کی ذمہ داری بھی تو ہوتی ہے نا۔ کوئی مسئلہ ہو، کوئی واؤچر غائب ہو یا کہیں کوئی گھپلا ہو تو مجھے اس کا جواب دینے کے لئے موجود ہونا چاہئے۔''

''کم از کم میں نے تو ایسا کوئی افسر نہیں دیکھا عبدالحق صاحب! بہر حال آپ کے ساتھ کام کرنا نیا اور اچھا تجربہ تھا۔ زندگی رہی تو اگلے سال پھر انشاء اللہ ساتھ کام کریں گے۔''

''انشاء اللہ!''

اس شام عبدالحق گھر پہنچا تو ہلکا پھلکا تھا۔ تھکن کے باوجود تازہ دم۔ کام مکمل کرنے کی خوشی نے تھکن کو جیسے مٹا ڈالا تھا۔ پھر اچانک اسے تصور صاحب کا خیال آیا۔ اس نے ان کے گھر جانے کا سوچا، لیکن اب کچھ فائدہ نہیں تھا۔ وہاں تو جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ اور کل وہ دفتر تو آئیں گے ہی۔ لیکن وہ کم از کم اس رقعے کو تو تلاش کرے۔

اس نے نور بانو سے اس سلسلے میں استفسار کیا۔

''ہاں......! نکلا تو تھا ایک کاغذ۔'' نور بانو نے بے پروائی سے کہا۔

''اب مجھے یہ یاد نہیں کہ میں نے کہاں رکھ دیا اسے۔''

''حالانکہ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ دفتر کے کپڑوں میں سے کچھ نکلے تو سنبھال کر رکھو، بلکہ فوراً مجھے دو۔ کیونکہ وہ بہت اہم ہوگا، کسی کام کا ہوگا۔''

''ایسا کچھ نہیں تھا اس میں۔ نہ وہ کسی کام کا تھا، نہ اس کی کوئی اہمیت تھی۔'' نور بانو نے نخوت سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم نے اسے پڑھا تھا؟''

''ہاں، پڑھا تھا۔ لوگوں کو دنیا میں آپ سے بڑا کوئی بے وقوف نظر نہیں

آتا۔ جسے دیکھو، فقیروں کی طرح آپ سے مانگنے چلا آتا ہے۔ اور آپ کو بھی اس طرح بے وقوف بننا اچھا لگتا ہے۔"

عبدالحق کا غصے سے برا حال تھا۔ لیکن وہ خود پر قابو رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم وہ کاغذ لا کر دو مجھے۔"

"کہا نا، مجھے یاد نہیں کہ کہاں رکھا ہے میں نے۔"

"تو ڈھونڈو اسے۔ حالانکہ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اب کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔"

"تو پھر چھوڑیں نا اسے۔"

"تم نہیں جانتیں کہ کتنا بڑا ظلم سرزد ہوا ہے مجھ سے، اپنی نظروں میں گر گیا ہوں میں۔ کاش تلافی کی کوئی صورت نکل آئے۔" عبدالحق کے لہجے میں تڑپ تھی۔

"تم وہ کاغذ فوراً تلاش کر کے دو مجھے۔"

نور بانو عبدالحق کے تیور دیکھ کر سمجھ گئی کہ اس وقت صرف اس کی بات ماننے میں ہی عافیت ہے۔ پندرہ بیس منٹ کی جستجو کے بعد بہرحال وہ رقعہ اسے مل گیا اور اس نے وہ عبدالحق کو دے دیا۔

رقعے کی تہیں کھولتے ہوئے عبدالحق کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے رقعہ کھولا اور پڑھنے لگا۔ لکھا تھا.....

"بڑے صاحب!

ایک ایسی مشکل میں ہو کہ چپ رہے بھی نہیں بنتی اور کہا بھی نہیں جاتا۔ آپ نے کہا تھا کہ کوئی ذاتی پریشانی ہو تو بھائی کی حیثیت سے آپ کو ضرور بتاؤں۔ آپ نے اپنی حیثیت کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ بس آپ کی بات سے ہی کچھ حوصلہ ہے۔ اب زبان سے کہنے کی تو ہمت نہیں کہ اللہ نے ہمیشہ اس سے بچائے رکھا۔ زبان تو کھل ہی نہیں سکتی۔ اس

لئے قلم کا سہارا لے رہا ہوں۔

میری اہلیہ کی آنکھوں میں کافی عرصے سے تکلیف تھی۔ دوا ڈالتے رہے، فرق نہیں پڑا۔ بلکہ تکلیف اور بڑھ گئی۔ اب آنکھوں کے اسپتال لے کر گئے تھے انہیں، ڈاکٹر نے چیک کیا اور کہا کہ یہ بڑی بیماری ہے۔ فوراً آپریشن نہیں کرایا تو خدانخواستہ بینائی جا سکتی ہے۔ اور وہ آپریشن اسپتال میں ممکن نہیں۔ انہوں نے ایک خاص ڈاکٹر کا کہا، بلکہ ان سے فون پر بات بھی کی۔ وہ مہنگے ڈاکٹر ہیں۔ آپریشن کی فیس اور دواؤں کا خرچ ملا کر آٹھ سو روپے کا تخمینہ دیا ہے انہوں نے۔ ہم تو اتنی رقم خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتے جناب!

ایک وضاحت کرنا چاہتا ہوں بڑے صاحب! میں اس آپریشن کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا تو اصولاً مجھے اس پر صبر کر لینا چاہئے۔ لیکن میرے پانچ بچے ہیں، جن میں سب سے بڑا آٹھ سال کا ہے اور سب سے چھوٹا ایک سال کا۔ میری اہلیہ ہی انہیں سنبھالتی ہیں۔ میں تو صبح کا نکلا غروب آفتاب کے بعد گھر میں گھستا ہوں۔ اگر خدانخواستہ میری اہلیہ بینائی سے محروم ہوگئیں تو سب الٹ جائے گا جناب! تب تو انہیں خود اس بات کی ضرورت ہوگی کہ کوئی ان کا خیال رکھے۔ اور بچے میرے بہت چھوٹے ہیں جناب! وہ تو خود اپنا اور ایک دوسرے کا خیال بھی نہیں رکھ سکتے۔ بس اس لئے مجبور ہوگیا ہوں۔

آپ سے امداد نہیں مانگتا۔ قرض مانگ نہیں سکتا کہ واپس دینے کی نہ سکت ہے نہ امکان۔ ایسے میں قرضِ حسنہ ہی مانگ سکتا ہوں آپ سے۔ اس وعدے کے ساتھ کہ ساری زندگی سہی، تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کرتا رہوں گا، اور آپ کا

احسان مند بھی رہوں گا۔

اللہ سے دعا کی ہے اور امید ہے کہ آپ اس موقع پر
میرا ہاتھ تھام لیں گے۔

آپ کا خادم......!''

خط پڑھتے پڑھتے عبدالحق کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ احساسِ جرم سوا ہوگیا۔ کیا گزری ہوگی تصور صاحب پر۔ کیا کیا ہوگا انہوں نے۔ بہرحال اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ اپنی اہلیہ کو آپریشن کے لئے لے گئے تھے، اس کا مطلب تھا کہ کہیں سے رقم کا بندوبست ہوگیا تھا۔

لیکن اس معاملے میں اپنی غفلت اس کے لئے ناقابل معافی تھی۔ تلافی کی بھی کوئی صورت نہیں تھی۔ اب وہ اللہ کو کیا جواب دے گا؟

''آپ اتنے غمزدہ کیوں ہو رہے ہیں؟ لوگ یوں ہی لوٹتے رہتے ہیں آپ کو۔'' نور بانو نے اسے چونکا دیا۔

عبدالحق تڑپ گیا۔

''تم نہیں جانتیں کہ تم کس کے بارے میں بات کر رہی ہو؟'' اس نے کہا۔ پھر اس نے نور بانو کو تصور صاحب کی کہانی سنائی۔

لیکن نور بانو پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

''یہاں کون ایسا ہے، جو لٹ کر نہیں آیا؟ جو زخم زخم نہیں۔'' اس نے بے رخی سے کہا۔

''لیکن کسی نے کسی پر احسان نہیں کیا یہاں آکر۔ جو آیا، اپنی مرضی سے اپنی خوشی سے آیا۔ کوئی ہندوستان مسلمانوں سے خالی تو نہیں ہوگیا۔''

''تم اپنی مرضی سے، اپنی خوشی سے نہیں آئیں۔ تم تو اپنے چچا جان کے پاس جانا چاہتی تھیں۔'' عبدالحق سے رہا نہیں گیا۔

''قدرتی بات تھی۔ چچا سے میرا خون کا رشتہ تھا۔ آپ تو غیر تھے۔ میں چچا جان کے سوا اور کس کا سوچتی؟''

عبدالحق اس وقت احساسِ جرم سے دوچار تھا۔ اگرچہ اپنی فطرت کے

مطابق وہ الزام پوری طرح اپنے سر لے رہا تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ اس میں نور بانو کی بھی بڑی غلطی ہے۔ اور اب وہ جس بے رحمی سے بات کر رہی تھی، اس سے ثابت ہوتا تھا کہ اس نے تصور صاحب کا رقعہ پڑھا اور جان بوجھ کر اسے نہیں دیا۔ کیونکہ اس کے خیال میں تصور صاحب اسے لوٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ بات، یہ انداز اس کی بیوی کے شایانِ شان نہیں تھا۔

جھنجلاہٹ میں اس نے دوسرا وار بھی کر دیا۔

''انہی چچا جان کی بات کر رہی ہو نا، جنہوں نے تمہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جنہوں نے تم پر تہمت بھی لگائی۔ مجھ سے منسوب کر کے۔''

نور بانو کا چہرہ سپید پڑ گیا۔

''آپ مجھے طعنہ دے رہے ہیں؟'' اس کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور اذیت بھی۔

''نہیں! میں تمہیں یاد دلا رہا ہوں۔''

نور بانو نے اپنا سب سے موثر ہتھیار استعمال کیا۔ وہ رونے لگی۔

لیکن اس روز اس کے آنسو بھی کام نہ آئے۔ عبدالحق نے بے رخی سے کہا۔

''کاش، یہ آنسو ندامت کے، افسوس کے ہوتے، تم نے سمجھا بھی نہیں کہ تم نے کتنا برا کیا... کتنا ظلم کیا۔''

''میں کیوں نادم ہوں؟'' نور بانو نے تنک کر کہا۔

''میں نے وہی کیا، جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔ آپ کو بے وقوف بننے دوں؟''

''میں تمہیں ضرور بتاؤں گا کہ تمہیں کیوں نادم ہونا چاہئے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''میں نے ابتداء ہی سے تم میں سخت دلی بھی دیکھی اور تنگ نظری بھی۔ میں نے تمہیں سمجھانے کی کوشش بھی کی۔ تمہارے پاس کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ لیکن تمہارے اس مزاج سے گھر میں کوئی بھی محفوظ نہیں رہا۔ ننھے ساجد سے لے کر اماں

تک، تمہاری سوچ یہی رہی کہ مجھ پر، میری ہر چیز پر تمہارے علاوہ کسی کا حق نہیں۔ محبت ہے تو میں نے اسے بھی قبول کر لیا۔ لیکن محبت ہی کی وجہ سے تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ اس مزاج کی وجہ سے تم خوفِ خدا سے دور ہوگئی ہو۔ اس میں تمہارا ہی نقصان ہے۔“

”آپ میرے بارے میں اتنا بڑا اعلان کر رہے ہیں؟“

”ثبوت سامنے ہے۔ تصور صاحب بڑے بچے اور عزت دار آدمی ہیں۔ میں نے ہمت دلائی تھی تو ان کی اتنی ہمت ہوئی، وہ بھی زبانی نہیں، لکھ کر۔ ورنہ وہ کسی سے سوال کرنے والے نہیں۔ بہت بڑی ضرورت تھی ان کی۔ تم نے یہ رقعہ چھپا کر ان پر اور مجھ پر ہی نہیں، خود پر بھی ظلم کیا۔ اللہ کی شان کہ اس نے ان کے لئے تو بندوبست کر دیا۔ ان کا تو کام ہوگیا اللہ کے فضل سے۔ نقصان تو میرا اور تمہارا ہوا۔“

”لو..... کیا نقصان ہوگیا ہمارا؟“

”یہ اور بڑا نقصان ہے کہ تم اسے نقصان ہی نہیں سمجھتیں۔ دیکھو سچ یہ ہے کہ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے، اللہ کا دیا ہوا، اللہ کی امانت ہے، اس نے ہمیں استطاعت دی تو ہمارا فرض ہے کہ کسی کو پریشان دیکھیں تو اس کی مدد کریں۔ دولت جمع کرنے کی، محبت کرنے کی چیز نہیں۔ اسے تو اللہ کی راہ میں، اس کی خوشی کے لئے خرچ کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اور یاد رکھو نور بانو! اللہ جب چاہے، اپنی عطا کی ہوئی کوئی نعمت بھی واپس لے سکتا ہے۔ دولت بھی ان نعمتوں میں سے ایک ہے۔ اور دولت کا حساب بھی دینا ہوتا ہے آپ کو۔“

”تو آپ کی طرح آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھوں سے دولت لٹانی چاہئے سب کو؟“ نور بانو نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”تم کیوں غم کرتی ہو؟ تمہارے نکتہ نظر سے بھی یہ دولت میری ہے، تمہاری نہیں۔“

”تو آپ کی ہر چیز میری ہی تو ہے۔ آپ نے تو مجھے باہر ہی کر دیا۔“

”اللہ کو حساب مجھے دینا ہوگا تو دولت میری ہی ہوئی نا! تمہاری ہوتی تو

تمہیں فکر ہوتی جواب دہی کی۔“

”عجیب منطق ہے آپ کی۔“ نور بانو جھنجلا گئی۔

”تم میری بات غور سے سنو۔ ایک تو اس معاملے میں تم نے تنگ دلی اور سخت دلی کا مظاہرہ کیا۔ دوسرے تم نے خیانت بھی کی۔“

”آج آپ کو مجھ میں ایک دم اتنی خرابیاں نظر آنے لگیں؟“

”پہلے بھی نظر آتی تھیں، مگر میں چشم پوشی کرتا تھا۔ اب احساس ہوا ہے کہ میں تو محبت کے نام پر تمہیں نقصان پہنچا رہا ہوں۔ یہ تو محبت کے منافی ہے۔ اس لئے تمہیں سمجھا رہا ہوں۔“

”یہ بتائیں، خیانت کیا کی ہے میں نے؟“

”وہی تو بتا رہا ہوں۔ میری جیب میں سے کچھ نکلے تو تمہاری ذمہ داری ہے کہ وہ مجھے دو۔ وہ دفتر کی کوئی اہم دستاویز بھی ہو سکتی تھی۔“

”نہیں تھی نا، میں نے پڑھ لیا تھا۔“

”یہ بھی ایک خیات ہے۔ بہت بری بات ہے۔ تمہیں اسے پڑھنے کا کوئی حق نہیں تھا۔“

”آپ تو آج مجھ سے ہر حق چھین رہے ہیں۔“

”نہیں! تمہیں تمہاری حدود سمجھا رہا ہوں۔ اب میں سختی سے کہہ رہا ہوں کہ آئندہ ایسا کبھی نہ کرنا۔ میری جیب سے کچھ نکلے تو مجھے دو۔ اور میری دولت کی طرف سے تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“ عبدالحق کے لہجے میں قطعیت تھی۔

اس رات عشاء کے بعد اس نے توبہ کے لئے دو نفل پڑھے، اور اللہ سے اپنی مجرمانہ غفلت اور بے پرواہی پر رو رو کر بخشش کی دعا کی۔ بالآخر اس کے دل کو قرار آ گیا۔ ورنہ وہ شاید سکون سے سو بھی نہ پاتا۔

اگلی صبح وہ صور صاحب کا انتظار کرتا رہا۔ کافی دیر ہوگئی۔ لیکن وہ نہیں آئے۔ اسے لگا کہ وہ آج بھی چھٹی کریں گے۔ اسے تشویش ہونے لگی۔ وہ مایوس ہوگیا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے کہا۔

"کم آن!"

اور تصور صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ عبدالحق انہیں دیکھتے ہی کھڑا ہوگیا۔

"آیئے میر صاحب! کب سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں میں۔ اب تو مجھے لگ رہا تھا کہ آپ نہیں آئیں گے۔"

تصور صاحب اس کے سامنے مجرم کی طرح سر جھکا کر کھڑے ہوگئے۔

"بیٹھئے نا!"

"نہیں بڑے صاحب! میرا یہ مقام نہیں۔"

"میں آپ سے کہہ رہا ہوں نا!"

"آپ نہیں سمجھتے بڑے صاحب! میں ایک مجرم کی حیثیت سے آپ کے رو بہ رو کھڑا ہوں۔"

عبدالحق کو حیرت ہوئی۔ تاہم اس نے خوش دلی سے کہا۔

"تب تو میرا حکم ماننے میں آپ کو تامل نہیں ہونا چاہئے۔"

تصور صاحب ہچکچاتے ہوئے بیٹھ گئے۔

"میں اعترافِ جرم کے لئے اور سزا کے لئے حاضر ہوا ہوں جناب!"

"سب سے پہلے آپ مجھے یہ بتایئے کہ آپریشن ہوگیا؟ کامیاب رہا؟"

"جی...... ! اللہ کے فضل سے کامیاب رہا۔ ڈاکٹر صاحب کا تو یہی کہنا ہے۔ اب چار دن بعد پٹی کھلے گی تو پتا چلے گا۔"

"اب میں پہلے صفائی پیش کروں۔ آپ کا دل تسلیم کرے تو مجھے معاف کر دیجئے۔"

"ایسی باتیں نہ کیجئے جناب! مجرم تو میں ہوں اور خود کو سزا کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ میں بدترین سزا کا حق دار ہوں جناب!"

"آپ پہلے میری بات سنیے!" عبدالحق نے کہا اور پھر ان کے رقعے کے بارے میں گزشتہ رات تک کی تفصیل سنا دی۔

"اب میں آپ سے کس منہ سے کہوں کہ مجھے معاف کر دیں۔ ویسے تو

اس نیکی سے محروم ہونا بھی میرے لئے بڑی سزا ہے۔ لیکن آپ معاف نہیں کریں گے تو اللہ بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔"

"آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ مجھ سے معافی مانگیں۔ لیکن میں سچ مچ بڑا مجرم ہوں جناب! آپ میرا اعترافِ جرم تو سن لیں۔" یہ کہتے کہتے تصور صاحب رونے لگے۔

عبدالحق کو پہلی بار احساس ہوا کہ کوئی بڑی بات ہے۔ تصور صاحب کو اس نے پہلی بار روتے دیکھا تھا۔

"دیکھیں تصور صاحب! اب میں آپ کا افسر ہونے کے ناطے آپ کو حکم دے رہا ہوں کہ آپ مجھے ترتیب اور تفصیل سے سب کچھ بتایئے۔ یہ فیصلہ میں کروں گا کہ آپ مجرم ہیں یا نہیں۔ آپ خود فیصلہ نہ کریں۔"

"میں مجرم ہوں صاحب! آپ کا مجرم کہ آپ کے اعتبار کو ٹھیس پہنچائی میں نے۔ سرکار کا مجرم کہ میں نے خیانت کی، بددیانتی کی۔"

عبدالحق نے ان کی بات کاٹ دی۔

"آپ میری نافرمانی کر رہے ہیں میر صاحب!" اس کا لہجہ سخت تھا۔

"میں نے کہا کہ آپ شروع سے سب کچھ بتائیں۔"

تصور صاحب نے گہری سانس لی۔

"ٹھیک ہے بڑے صاحب! لیکن اس سے میرے جرم کی سنگینی کم نہیں ہوگی۔"

"آپ اس قت سے سب کچھ بتائیں، جب میں نے نادانستگی میں، اپنی غفلت اور بے پروائی کی وجہ سے آپ کو مایوس کیا۔"

"میں اس صبح آپ کے پاس بڑی امید سے، بڑے یقین کے ساتھ آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا رقعہ آپ نے پڑھ لیا ہوگا۔ اور مجھے آپ کے کہے ہوئے لفظ بھی یاد تھے کہ آپ صاحب حیثیت بھی ہیں، اور ذاتی پریشانی میں بھائی کی حیثیت سے کام آئیں گے۔ لیکن جب آپ نے مجھ پر عنایت کرنے کے بجائے ڈسپلن کے معاملے میں سرزنش کی تو میرے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔ پھر

بھی میں نے آپ کو یاد دلانے کی غرض سے پوچھا۔ میرے لئے کیا حکم ہے
صاحب! اور آپ نے فرمایا کہ دوسری درخواست لکھ کر سعید صاحب کو دے دوں۔
میں نے سوچا، شاید آپ میری گزارش پر سرکاری طور پر کارروائی کرنا چاہتے ہیں۔
میری تنخواہ اتنی کم ہے اور جی پی فنڈ بھی اتنا نہیں۔ سرکاری طور پر میری ضرورت
پوری ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

میں مایوس ہوگیا صاحب! اہلیہ کی آنکھوں کی بڑی اہمیت تھی۔ چھوٹے
چھوٹے بچے، اور میری دن بھر کی مصروفیت، گھر چل ہی نہیں سکتا تھا۔ اللہ مجھے
معاف کرے، شاید اسی لئے کہا گیا ہے کہ مایوسی کفر ہے۔ میں نے اللہ سے مانگنے
کے بجائے خود کچھ کرنے کا ارادہ کیا۔ اور یوں وہ کچھ ہوگیا، جس پر اپنی جان کی
روح بھی تڑپ رہی ہوگی۔ میں نے بہت برا کیا بڑے صاحب! اب اس داغ کو
دھو بھی نہیں سکتا میں۔'' اتنا کہہ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

عبدالحق کرسی سے اٹھا، گھوم کر ان کی طرف گیا اور ان کے دونوں کندھے
تھام لئے۔

''ہر داغ دھل جاتا ہے میر صاحب! آپ مجھے بتائیں تو سہی کہ ایسا کیا
کر دیا آپ نے؟''

''جو کچھ کیا، اس کے بارے میں سوچنا بھی مجھے اچھا نہیں لگتا۔ صرف اس
لئے سنا سکوں گا کہ آپ کے پاس آیا ہی اعترافِ جرم کے لئے ہوں۔'' تصور
صاحب نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

عبدالحق کمرے سے باہر گیا اور شاہد سے ایک گلاس پانی طلب کیا۔

''کمرے میں کوئی نہیں آئے گا۔ میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔''
اس نے سعید سے کہا۔ دروازہ بند کر کے وہ کمرے میں واپس آیا اور بڑے احترام
سے تصور صاحب کو پانی پیش کیا۔

''لیجئے! اور خود کو سنبھالئے۔ کوئی بات بھی بہت بڑی نہیں ہوتی۔ ابھی آپ
نے کہا کہ مایوسی کفر ہے۔ بے شک کفر ہے، اس لئے کہ اس کا مطلب ہے کہ آپ
نے اللہ سے بھی اُمید چھوڑ دی۔ ورنہ اللہ نے تو توبہ کا دروازہ سب کے لئے کھلا رکھا

ہے۔ بدترین گناہ بھی دھل جاتا ہے۔''

تصور صاحب نے بڑی مشکل سے دو گھونٹ پانی لیا اور پھر گلاس میز پر
رکھ دیا۔

عبدالحق نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اعتراف تصور صاحب کے لئے کتنا مشکل
ہے۔ اس نے اسے آسان کرنے کی کوشش کی۔

''میں شرمندہ ہوں میر صاحب! کہ نادانستگی میں اپنے قول سے انحراف
کیا۔ اس وقت میں آپ کا بھائی نہیں بن سکا۔ لیکن اس وقت میں آپ کا افسر نہیں،
بھائی ہوں۔ اس لئے اس کرسی پر بیٹھ کر نہیں، آپ کے برابر، آپ کے ساتھ بیٹھ کر
آپ کی بات سنوں گا۔ ایک بھائی کی حیثیت سے۔''

تصور صاحب نے سر اٹھا کر متشکرانہ نظروں سے اسے دیکھا، مگر فوراً ہی
نظریں جھکا بھی لیں۔

''اب بے فکری سے بتائیے، ایسا کیا سرزد ہوگیا آپ سے؟''

''وہ جناب! اصغر ٹیکسٹائل کی ایک فائل ہے، جس پر ویلیویشن والوں نے
گیارہ ہزار سات روپے کی ڈیمانڈ نکالی ہے۔ انہیں فائنل ریمائنڈر دیا جا چکا ہے،
اور اب وصول کے لئے کیس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بھیجا جانے والا ہے۔''

عبدالحق کو یاد تھا۔ آؤٹ پارٹی کے آنے سے پہلے اس نے خود فائل پر یہ
آرڈر کیا تھا۔

''جی..... ! مجھے یاد ہے۔'' اس نے کہا۔

''ان کے نمائندے ہیں نا جعفر صاحب! انہوں نے مجھ سے تین چار ماہ
پہلے کہا تھا کہ میں وہ فائل انہیں دے دوں تو وہ مجھے ایک ہزار روپے دیں گے۔ میں
نے انہیں بہت ڈانٹا اور منع کر دیا۔ یہاں ساری چابیاں میرے پاس رہتی ہیں۔ میں
نے سوچا، میرے انکار کے بعد وہ کسی اور سے بھی بات کر سکتے ہیں۔ اتنی بڑی رقم
کے لئے تو کوئی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اور ذمہ داری میرے سر آئے گی۔ اس خال
سے میں نے اس پوری فائل کی کاپی بنوا کر اپنے پاس محفوظ کر لی۔''

''واہ..... ! کمال کر دیا آپ نے۔'' عبدالحق نے بے ساختہ کہا۔ ایک

چپڑاسی سے اتنی ہوشیاری کی امید نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

''آپ زوال کی سنیے بڑے صاحب! اس روز مایوس ہوا تو میں نے دفتر لاک کرتے ہوئے وہ فائل نکالیا اور جعفر صاحب کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے فائل لی اور وعدے کے مطابق ایک ہزار روپے مجھے دے دیئے۔ گھر جاتے ہوئے میں سوچتا اور لرزتا رہا کہ میں نے کیا کر دیا۔ لیکن اہلیہ کی صورت نگاہوں میں پھر جاتی تھی۔ اگلے روز میں اہلیہ کو آپریشن کے لئے لے گیا۔ یہ سنگین جرم کیا ہے میں نے بڑے صاحب!''

عبدالحق نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

''اس معاملے میں آپ سے بڑا مجرم میں ہوں میر صاحب! یہ سب میری غفلت اور غیر ذمہ داری کی وجہ سے ہوا۔''

''آپ مجھے ڈس مس کر دیں صاحب! میں نے رشوت لی ہے۔ اپنے ابی جان کی روح کو شرمندہ کرایا ہے۔''

''اللہ پردہ رکھنے والا ہے میر صاحب! یہ تو مجھے اپنے جرم کی تلافی کا موقع ملا ہے۔ سرکاری رقم میں خود جمع کرا دوں گا آپ فکر نہ کریں۔''

''اس کی ضرورت نہیں بڑے صاحب! میں آج صبح جعفر صاحب کو وہ ہزار روپے واپس کر آیا ہوں۔''

حیرت سے عبدالحق کا منہ کھل گیا۔

''کیسے میر صاحب......!''

''اس روز میں نے ایک نہیں، دو بے ایمانیاں کی تھیں بڑے صاحب!'' تصور صاحب نے پشیمانی سے کہا۔

''ایک تو میں نے ہزار روپے رشوت لی۔ پھر گھر جاتے ہوئے جب ضمیر کچوکے لگا رہا تھا تو مجھے اچانک یاد آیا کہ میرے پاس اس فائل کی کاپی موجود ہے۔ میں نے سوچا، میں سرکاری رقم ڈوبنے نہیں دوں گا۔ آپریشن کے بعد وہ کاپی آپ کو دے دوں گا۔ اور میں سوچتا رہا کہ یہ دوسری بے ایمانی تو نیکی ہے۔ حالانکہ بے ایمانی کبھی نیکی نہیں ہوسکتی۔ یہ تو دھوکا دہی بھی ہے۔ یہ وہ فائل ہے صاحب!'' تصور

صاحب نے ہاتھ میں موجود فائل عبدالحق کی طرف بڑھا دی۔

عبدالحق نے فائل میں دلچسپی نہیں لی۔

''یہ بتایئے! آپ نے ہزار روپے جعفر صاحب کو واپس کیسے کیئے؟''

''اللہ بڑا کارساز ہے بڑے صاحب! میں اہلیہ کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا۔ باہر بیٹھا انتظار کر رہا تھا کہ ابی جان کے ایک بہت عزیز دوست وہاں آ گئے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ حال احوال پوچھا۔ میری پریشانی کا سن کر افسردہ ہوئے۔ پھر بولے۔ اجازت ہو تو میں ڈاکٹر صاحب سے پہلے مل لوں، مجھے تو چھوٹا سا کام ہے۔ میں نے کہا، بسروچشم۔ وہ اندر گئے، دو منٹ میں واپس آئے اور دعائیں دے کر رخصت ہو گئے۔ ان کے بعد میں ڈاکٹر سے ملا۔ انہوں نے مجھے اطمینان دلایا کہ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے پیسے جمع کرانے کو کہا تو انہوں نے منع کر دیا، کہنے لگے کہ دواؤں سمیت سب کچھ کلینک کے ذمے ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے تو کچھ اور بتایا گیا تھا۔ وہ بولے، کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا صاحب! لیکن میرا احساسِ جرم اور بڑھ گیا کہ میں نے بلاوجہ رشوت لی۔ خیر، آپریشن ہوا اور کامیاب رہا۔ اہلیہ پٹی کھلنے تک اسپتال میں ہی رہیں گی۔ ہمارا تو ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوا۔ آج میں جعفر صاحب کے دفتر گیا اور ہزار روپے واپس کیئے۔ وہ کہنے لگے، اس کی کیا ضرورت ہے، فائل تو میں پھاڑ چکا ہوں۔ میں نے کہا، مجھے معلوم ہوا ہے کہ فائل کی کاپی موجود ہے۔ ادائیگی تو آپ کو کرنی پڑے گی۔ پھر انہوں نے وہ رقم واپس لے لی۔ اور یہ فائل کی کاپی اب آپ کو تحویل میں ہے۔''

عبدالحق حیران بیٹھا تھا۔

''تو آپ نے جرم کیا کیا ہے میر صاحب!'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''رشوت بھی لی، کسی کو دھوکا بھی دیا۔ یہ جرم ہی تو ہیں بڑے صاحب!''

مگر عبدالحق کو کوئی اور بات رہ رہ کر چبھ رہی تھی۔ پھر وہ اس کے شعور تک پہنچ ہی گئی۔

''یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ڈاکٹر مہربان کیسے ہوگیا۔ اس کا اپنی فیس چھوڑنا تو

سمجھ میں آتا ہے، لیکن ......''

''میں آپ کو بتانا بھول گیا تھا۔ نرس نے اسی دن مجھے بتا دیا تھا۔ وہ جو ابی جان کے دوست تھے نا، وہ ڈاکٹر صاحب ان کے بیٹے ہیں۔ انہوں نے اندر جا کر ڈاکٹر صاحب کو سمجھا دیا تھا۔ بعد میں وہ میری اہلیہ کی عیادت کے لئے بھی آئے۔ اللہ بڑا کارساز ہے صاحب!''

''بے شک......!'' عبدالحق نے افسردگی سے کہا۔

''اب میرے لئے کیا حکم ہے صاحب!''

''کچھ نہیں! ابھی آپ کی اہلیہ اسپتال میں ہیں۔ ان کے ٹھیک ہو کر گھر جانے تک میری طرف سے آپ کو چھٹی۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں صاحب!'' تصور صاحب نے حیرت سے کہا۔

''میں اعترافِ جرم کر چکا۔ میرا جرم ثابت ہے۔ آپ کو تو مجھے ڈس مس کرنا چاہئے۔''

''نہیں میر صاحب! سرکار کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ رقم آپ نے واپس کر دی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ آپ کے ساتھ ہے اور اس نے آپ کو معاف کر دیا ہے۔ پھر میں کون ہوتا ہوں آپ کو سزا دینے والا۔''

''لیکن صاحب......!''

''دیکھئے میر صاحب! یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا، تب بھی میں آپ کو سزا نہ دیتا'' عبدالحق نے ان کی بات کاٹ دی۔

''بلکہ سچ کہوں، میں سوچتا ہوں کہ کاش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ کاش، آپ نے فائل کی کاپی بھی نہ بنائی ہوتی۔''

''اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوتا بڑے صاحب!''

''کوتاہی میری تھی۔ میں آپ کا مجرم تھا۔ یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا تو مجھے تلافی کا موقع مل جاتا۔''

''میں سمجھا نہیں بڑے صاحب!''

''میں خود وہ رقم سرکار کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتا۔ کیونکہ میری بے

پرواہی اور غفلت کی وجہ سے یہ نوبت آئی۔''

''اللہ نے آپ کو بڑا آدمی بنایا ہے بڑے صاحب!''

''نہیں میر صاحب! میں تو یہ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ اللہ مجھ سے جواب طلب کرے گا کہ میں نے اس کے ایک نیک بندے کو برائی کی طرف دھکیل دیا۔ جبکہ میں اس کی مدد کر کے اسے بچا سکتا تھا۔ اللہ آپ سے خوش ہے میر صاحب کہ اس نے آپ کو بچا لیا اور آپ کے سارے کام سیدھے کر دیئے۔''

''بے شک بڑے صاحب!''

''اور اللہ یقیناً مجھ سے ناراض ہے، کیونکہ اس نے مجھے تلافی کا موقع بھی نہیں دیا۔''

''تو بڑے صاحب! آپ میرے خلاف کارروائی نہیں کریں گے؟'' تصور صاحب نے پوچھا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

تصور صاحب رونے لگے۔

''آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے صاحب! میری عزت رکھ لی، میرا پردہ رکھ لیا۔'' انہوں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''اب ایک احسان اور کر دیجئے مجھ پر۔''

''آج آپ کا حق ہے کہ آپ مجھے حکم دیں۔''

تصور صاحب نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''مجھے گناہ گار نہ کریں۔''

''آپ کہیں نا، کیا بات ہے؟ کیا چاہتے ہیں آپ؟'' عبدالحق کے لہجے میں عاجزی تھی۔

تصور صاحب نے جیب سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔

''میرا استعفیٰ آج ہی منظور کر لیں، یہ آپ کا احسان عظیم ہوگا مجھ پر۔''

عبدالحق ہکا بکا رہ گیا۔

''یہ کیوں میر صاحب!''

''اللہ نے اور آپ نے میرا پردہ رکھ لیا۔ لیکن میں تو سب جانتا ہوں۔ میں اپنی نظروں میں گر چکا ہوں۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ میں اس ملازمت کا اہل نہیں ہوں۔ یہ ملازمت تو پل صراط ہے صاحب!''

''آزمائشیں آتی ہیں میر صاحب! اللہ ان سے گزار دیتا ہے بندے کو۔ میری مانیں، آپ ایسا نہ کریں۔''

''نہیں بڑے صاحب! اب میں یہاں ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتا۔ یہاں سر اٹھا کر نہیں چلا سکتا اب۔ اور جہاں سر جھک جائے، آدمی کو وہاں سے چلے جانا چاہئے۔'' تصور صاحب نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے اور رونے لگے۔ طبیعت ذرا سنبھلی تو بولے۔

''مجھے معلوم ہے کہ استعفیٰ فوری طور پر منظور ہونے کی صورت میں میری پندرہ دن کی تنخواہ کٹے گی۔ لیکن صاحب! آپ آج ہی، ابھی میرا استعفیٰ منظور کر لیں۔ یہ آپ کا احسان ہوگا مجھ پر۔''

عبدالحق حیران تھا۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اور وہ بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ انہیں قائل نہیں کر سکتا۔ اس عالم میں کہ ان کی بیوی ابھی اسپتال میں ہے، وہ اپنے قلم سے انہیں بے روزگار کیسے کرے۔

''میری بات مانیں میر صاحب! جانے دیں......''

''نہیں بڑے صاحب! میں جانتا ہوں کہ میں نے گناہ کیا، یہ اس کی عملی توبہ ہے۔''

''لیکن آپ بے روزگار ہو جائیں گے۔''

''ہم بھول گئے تھے بڑے صاحب! کہ اللہ بندوں کی ضرورتیں پوری فرماتا ہے، اس لئے بھٹک گئے تھے۔ اللہ نے کرم فرمایا، ہمیں یاد دلا دیا کہ اس نے رزق دینے کا وعدہ کیا ہے۔''

''اچھا تو ایسا ہے کہ میں آپ کے لئے کسی ملازمت کا بندوبست کر دیتا ہوں۔''

''نہیں صاحب! بس آپ میرا استعفیٰ منظور کر لیں۔ ابھی دستخط کر دیں۔''

عبدالحق نے دستخط کر دیئے۔ اس کے اصرار کے باوجود تصور صاحب نے اس سے کچھ لینے سے انکار کر دیا۔ وہ اسے پریشان اور دکھی چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ بہت بوجھل ہو گیا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس معاملے میں اسے بہت بڑا خسارہ ہوا ہے۔

لیکن تصور صاحب کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

چوتھے دن اچانک سلطان صاحب اس سے ملنے کے لئے آ گئے۔ عبدالحق کو حیرت ہوئی۔ کیونکہ وہ انہیں ان کے ایکسپورٹ کے کاروبار کے سلسلے میں مکمل مشورے دے چکا تھا

''کہئے......! کیسے زحمت کی آپ نے......؟ کوئی دشواری پیش آ رہی ہے......؟''

''جی نہیں......! آج تو میں ذاتی کام سے آیا ہوں۔''

''حکم کیجئے......!''

''میر صاحب سے ملاقات ہوئی تھی آپ کی......؟''

''کون میر......؟'' کہتے کہتے عبدالحق کو اچانک یاد آ گیا۔

''جی ہاں......! ہوئی تھی۔''

''آپ نے میرا پتا اور فون نمبر دیا تھا انہیں......؟''

''جی ہاں......!''

''انہوں نے رابطہ نہیں کیا مجھ سے۔'' سلطان صاحب کے لہجے میں افسردگی تھی۔

''اب آئیں تو ان سے کہئے گا کہ خدا کے واسطے، مجھے بس ایک فون کر لیں۔ میں خود ان کے پاس حاضر ہو جاؤں گا۔''

''اب وہ یہاں نہیں آئیں گے سلطان صاحب!''

''کیا مطلب......؟ کیوں......؟''

''میر صاحب یہاں نوکری کرتے تھے۔ چار روز پہلے استعفیٰ دے کر چلے

گئے۔''

سلطان صاحب کو جیسے کرنٹ لگا۔

''نوکری..... یہاں.....؟ کیسی نوکری.....؟''

''اب آپ کو بتا ہی دوں، وہ یہاں چپڑاسی تھے۔'' عبدالحق نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

اگلا لمحہ اس کے لئے حیرت کا تھا۔ سلطان صاحب بیٹھے بیٹھے اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

عبدالحق بوکھلا گیا۔

''کیا ہوا سلطان صاحب!''

لیکن لگتا تھا کہ سلطان صاحب کو خود پر قابو نہیں ہے۔ وہ خاموش بیٹھا انہیں تکتا رہا۔ وہ سر جھکائے روتے رہے۔

بالآخر انہوں نے سر اٹھایا اور شرمندگی سے عبدالحق کو دیکھا۔

''ہو کیا گیا تھا آپ کو.....؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''میں مر بھی جاتا تو کم تھا عبدالحق صاحب! جی چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ لعنت ہو میری زندگی پر۔ میں اور میرے بیوی بچے عیش کریں اور میرے شہزادے، میرے میر صاحب چپڑاسی کی ملازمت کریں۔ لوگوں کے چائے پانی کا اہتمام کریں۔ اب میں سمجھا کہ اس روز وہ مجھے پہچان کر چلے کیوں گئے تھے؟ وہ نہ جاتے تو انہیں چائے پیش کرنی پڑتی مجھے۔ یہی بات ہے نا.....!''

عبدالحق نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تف ہے مجھ پر..... میری زندگی پر۔''

''اس میں آپ کا کیا قصور.....؟''

''اس دن نہیں بتائی تھی، آج میں آپ کو حقیقت بتاتا ہوں۔'' سلطان صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔

''اللہ جنت نصیب فرمائے بڑے میر صاحب کو۔ میں ان کی جاگیر کا منتظم

تھا، منیجر۔ سب کچھ انہوں نے مجھے سونپ رکھا تھا۔ جب پاکستان جانے کا وقت آیا تو میں نے انہیں سمجھایا کہ زمینوں کے کاغذات لے لیں، اور زیورات اور نقد رقم بھی ساتھ رکھ لیں۔ انہوں نے پرواہی سے کہا..... سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا، جب لاد چلے گا بنجارہ۔ مال ساتھ لے کر نکلوں گا تو لٹنے کا خطرہ اپنی جگہ، مال کی وجہ سے جان بھی جائے گی۔ اللہ نے یہ سب کچھ دیا تھا۔ وہ چاہے تو وہاں بھی دے دے گا۔ اور رہے زمینوں کے کاغذات، تو ہم وہاں پاکستان کی محبت میں جا رہے ہیں۔ قیمت وصول کر لی تو محبت کہاں رہی۔ مجھے ان سے اختلاف تھا عبدالحق صاحب! لیکن قائل کرنے کی حیثیت نہیں تھی میری۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ کاغذات، نقدی اور زیورات، سب لے کر نکلوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کے ساتھ نہیں نکلا۔ میں ان کے بعد روانہ ہوا۔ اللہ کا کرم کہ میں بخیر و عافیت پاکستان پہنچ گیا۔ یہاں آ کر کاغذات کے زور پر تین کوٹھیاں اور اراضی حاصل کی۔ دولت بھی بہت تھی۔ لیکن اس دولت کے مالک موجود نہیں تھے۔ میں انہیں تلاش کرتا رہا۔ لیکن کوئی سراغ نہیں ملا۔ میں بے چین رہتا تھا۔ دل کو سکون نہیں تھا۔ پھر اس روز آپ کے دفتر میں چھوٹے میر صاحب کو دیکھا تو قرار آ گیا۔ سوچا، اب ان کی ہر امانت انہیں سونپ کر پھر ان کی غلامی میں جیوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ آپ کے پاس آئیں گے، آپ انہیں میرا پتا دیں گے، وہ مجھے فون کریں گے اور میں ان کی قدم بوسی کے لئے وہاں پہنچ جاؤں گا۔ لیکن اتنے دن ہو گئے، کچھ بھی نہیں ہوا۔ آخر پریشان ہو کر آپ کے پاس چلا آیا۔''

اس دوران تصور صاحب پر کیا گزری، یہ احوال عبدالحق نے انہیں سنایا۔

وہ تڑپ گئے۔

''خدا کے لئے، مجھے ان کا پتا دے دیجئے۔''

''میرے ڈرائیور نے ان کا گھر دیکھا ہے۔ وہ آپ کو لے جائے گا۔''

''بہت شکریہ.....!'' سلطان صاحب اٹھنے لگے۔

''اب ایسا کیا، چائے پی کر جایئے گا۔''

''اتنا کچھ ہونے کے بعد میں کیسے.....''

''آدھے گھنٹے کا ہی تو فرق پڑے گا ..... میری خاطر .....''

سلطان صاحب انکار نہ کر سکے۔ وہ چائے کے لئے رک گئے۔

''دیکھا عبدالحق صاحب! کردار اسے کہتے ہیں۔'' انہوں نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''خود کو سزا دینے کے لئے بے روزگاری قبول کر لی۔''

''جی ہاں! بہت بڑی بات ہے۔ اور کسی طرح رکے نہیں۔ میں نے بہت سمجھایا۔''

''یہ خالص خون کا کمال ہے عبدالحق صاحب!''

''سب اللہ کی عطا ہے سلطان صاحب! اس کا کرم ہے۔''

عبدالحق نے یعقوب کو بلا کر سمجھا دیا۔ سلطان صاحب یعقوب کے ساتھ چلے گئے۔

اس کے بعد عبدالحق نے تصور صاحب کو اب سے ایک سال پہلے دیکھا۔ شیروانی پہنے ہوئے وہ بہت باوقار لگ رہے تھے۔ وہ ایک کار میں تھے، جسے باوردی شوفر ڈرائیو کر رہا تھا۔

دونوں کاریں ساتھ ہی رکیں۔ تصور صاحب کی نظر عبدالحق پر پڑی تو وہ اس کی طرف لپکے۔ عبدالحق تو اس حال میں انہیں پہچان ہی نہیں سکا تھا۔ آسودگی کا رنگ و روغن تو چہرے کے خدوخال بھی بدل دیتا ہے۔

عبدالحق ان کے چہرے کے تاثر پر حیران تھا۔ اس کے لئے وہ اجنبی آدمی تھے۔ اور اتنی محبت سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ کون صاحب ہیں؟ شناسا تو لگتے ہیں لیکن میں انہیں پہچان کیوں نہیں رہا؟

پھر تصور صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''السلام علیکم بڑے صاحب!''

اور اس ''بڑے صاحب'' پر عبدالحق کو یاد آ گیا۔ وہ اس کے سامنے سر جھکائے، دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑے تھے۔ عبدالحق نے انہیں لپٹا لیا۔

''کیسے ہیں میر صاحب......!''

''اللہ کا فضل ہے۔ جو کچھ بھی ہوں، اللہ کے بعد آپ کی مہربانی سے ہوں۔''

''مجھے شرمندہ نہ کریں میر صاحب!''

سرِ راہ ان کے درمیان چند لمحے گفتگو ہوئی۔ تصور صاحب نے اسے اپنا کارڈ دیا اور دوبارہ ملنے کا کہہ کر رخصت ہو گئے۔

اور تیسرا واقعہ بہت ذاتی تھا۔ اللہ کی بہت بڑی عنایت تھی اس پر۔ کراچی آئے ہوئے اسے تین سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔

اس صبح وہ بہت سویرے اٹھ گیا۔ ایسا لگا، جیسے کسی نے جھنجوڑ کر اسے اٹھا دیا ہو۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا، چار بجنے والے تھے۔ ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ آنکھیں دوبارہ بند کر لے اور سو جائے۔ لیکن پھر اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ یہ تو نعمت تھی، اس سے استفادہ کرنا تھا۔

اس نے اٹھ کر وضو کیا اور تہجد پڑھی۔ اس کے بعد وہ قرآن پڑھنے بیٹھ گیا۔

اجالا ہونے سے پہلے کا وقت، جب ہر طرف سناٹا اور خاموشی ہوتی ہے، جب پرندے بھی بیدار نہیں ہوتے، قرآن پڑھنے کے لئے بہت اچھا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت ایسی تنہائی، ایسی یکسوئی ہوتی ہے کہ اللہ آس پاس محسوس ہوتا ہے، اور کبھی کبھی ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ عبدالحق کو اس کا تجربہ تھا۔

وہ بڑی خوب صورت کیفیت میں تھا۔ گرد و پیش کا احساس ہی نہیں تھا۔ اپنی عادت کے مطابق وہ پہلے عربی میں آیت پڑھتا تھا۔ پھر اس کا ترجمہ پڑھتا تھا، اور اس پر غور کرتا تھا۔ عام طور پر توقف مختصر ہوتا تھا، اور پھر وہ اگلی آیت پر چلا جاتا تھا۔

پھر پڑھتے پڑھتے اچانک وہ چونکا، اور اسے اپنے جسم میں سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ وجود میں یہ احساس ابھرا کہ اس پر کچھ انکشاف ہونے والا ہے۔ کوئی بڑی بات ہے، جو اس کے دل کے توسط سے اسے بتائی، سمجھائی جا رہی ہے۔

اس کے دل کی دھڑکن بہت تیز ہوگئی تھی۔

اس نے سوچا کہ ان آیات کے ترجمے کو دوبارہ پڑھے۔ وہ سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۶۷ سے ۷۱ تک تھیں۔ جسم میں دوڑتی ہوئی سنسنی اور دل کی دھڑکنوں کی بے ربطی میں اضافہ ہوگیا تھا۔

اس نے وہ آیات دوبارہ پڑھیں۔

''اور جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے، بے شک اللہ حکم دیتا ہے تم کو کہ ذبح کرو ایک گائے، کہنے لگے، کیا کرتے ہو تم ہم سے مذاق؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا، اللہ کی پناہ اس سے کہ میں ہوں جاہلوں میں سے۔'' (۶۷)

''وہ بولے، درخواست کیجئے ہماری خاطر اپنے رب سے کہ کھول کر بتائے ہمیں کہ وہ گائے کیسی ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا، بے شک اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے ہو نہ بوڑھی اور نہ بچھیا۔ بلکہ اوسط عمر کی، درمیان بڑھاپے اور جوانی کے۔ لہٰذا تعمیل کرو تم اس حکم کی، جو دیا جارہا ہے۔'' (۶۸)

''کہنے لگے، درخواست کیجئے ہماری خاطر اپنے رب سے کہ وہ کھول کر بتائے ہمیں کہ کیسا ہو رنگ اس کا؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا، بے شک وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے ہو زرد رنگ کی، ایسی خوش رنگ کہ جی خوش ہو جائے دیکھنے والوں کا۔'' (۶۹)

''کہنے لگے، درخواست کیجئے ہماری خاطر اپنے رب سے کہ وہ کھول کر بتائے ہمیں کہ وہ کیسی ہو۔ بے شک گائے مشتبہ ہوگئی ہے ہم پر اور بے شک ہم انشاء اللہ اب اس کا ٹھیک پتا پالیں گے۔'' (۷۰)

''موسیٰ علیہ السلام نے کہا، بے شک اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے، جو نہیں ہے محنت کرنے والی کہ زمین

جوتتی ہو اور پانی دیتی ہو کھیتی کو، صحیح و سالم، بے داغ۔ کہنے لگے، اب لائے ہو تم بالکل ٹھیک بات۔ بالآخر ذبح کر دیا انہوں نے اسے، اگرچہ لگتا تھا کہ وہ ایسا کریں گے۔'' (۷۱)

عبدالحق نے ان آیات کے ترجمے کو کئی بار پڑھا۔ اسے احساس ہوا کہ کہیں گہرائی سے کوئی خیال ابھر کر شعوری سطح پر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن شعور اسے گرفت میں نہیں لے پا رہا تھا۔ اسے بڑی شدت سے بے بسی کا احساس ہوا۔ لیکن اس کی کیفیت کی خوب صورتی مجروح نہیں ہوئی۔

وہ پہلا موقع تھا کہ اسے ارجمند یاد آئی، اور بہت شدت سے یاد آئی۔ کاش...... کاش اس وقت وہ ساتھ ہوتی۔ ہم ان آیات پر بات کرتے، اور سمجھنے میں آسانی ہو جاتی۔ لاہور میں کیسے ان کے درمیان گفتگو ہوتی تھی۔ کتنا اچھا لگا تھا۔

چلو، تو مل کر سمجھتے ہیں۔ اندر سے ایک آواز ابھری۔

حیرت کا سایہ سا اس کے ذہن پر سے گزرا۔ اس کی کیفیت ایسی تھی کہ ان آیات سے باہر کی کوئی چیز اس کے ذہن کو نہیں چھو سکتی تھی۔

یہ تو بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے؟ وہ شاید اس کی اپنی آواز تھی۔

مجھے یقین ہے کہ ان آیات میں کوئی بہت بڑا پیغام چھپا ہے، کوئی تلقین موجود ہے۔ وہ بڑبڑایا۔ میں اسے سمجھنا چاہتا ہوں۔

تو پھر سے پڑھو۔

اس نے ایک بار پھر ان آیات کا ترجمہ پڑھا۔ بے بسی کا احساس اور شدید ہوگیا۔

نکتہ کہیں آخر میں ہوگا۔ آخری آیات سے شروع کرو۔ ذہن کو چوکس رکھو۔

بات معقول تھی۔ اس نے سوچا۔ پھر آخری آیات کا آخری حصہ پڑھا۔ اگرچہ نہ لگتا تھا کہ وہ ایسا کریں گے۔

اس نے ایک ایک لفظ پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ اللہ فرما رہا تھا کہ ظاہری طور پر یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ایسا کریں گے...... یعنی اللہ کے حکم کی

تعمیل .....

اور حکم کیا تھا...

بالآخر ذبح کر دیا انہوں نے اسے، اگرچہ نہ لگتا تھا کہ وہ ایسا کریں گے۔

یعنی اللہ نے انہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن وہ اس حکم کی تعمیل سے گریزاں تھے۔

اور اللہ فرما رہا ہو.... اگرچہ نہ لگتا تھا کہ وہ ایسا کریں گے.... تو اس کا مطلب ہے کہ ان کا یہ رویہ حتمی تھا۔

عبدالحق کو ذہن میں، اپنے سینے میں روشنی سی پھوٹتی محسوس ہوئی۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ خود ہی سوال اٹھا رہا ہے اور خود ہی جواب بھی دے رہا ہے۔

لیکن ارادہ نہ ہونے کے باوجود انہوں نے اللہ کے حکم کی تعمیل کر دی اور نافرمانی سے بچ گئے۔ کیسے....؟ اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی....؟ اور وہ ان آیات میں بیان بھی کی گئی ہوگی۔

اور یہ لوگ کون ہیں، جن کی بات ہو رہی ہے....

بنی اسرائیل کی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت کی، ان لوگوں کی جو بدتمیز، منہ پھٹ اور گستاخ تھے، نافرمان تھے۔ ان کے اس طرزِعمل کی کتنی ہی مثالیں قرآن پاک میں اللہ نے بیان فرمائی ہیں۔ یہ وہ ہیں، جنہیں حضرت ہارون علیہ السلام کے سپرد کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے بلاوے پر گئے تھے، اور ان کی غیر موجودگی میں انہوں نے ساری کے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی تھی۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں۔ ہمیں اس کا ایک بت بنا دو۔ دوسری قوموں کے پاس بھی بت ہیں۔ انہوں نے من و سلویٰ جیسی نعمتوں سے اکتا کر پیاز اور مسور کی دال جیسی عام چیزیں اللہ سے طلب کرنے کی فرمائش کی تھی۔ انہوں نے پیغمبر علیہ السلام سے کہا تھا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! تم اور تمہارا خدا جا کر ان لوگوں سے لڑو۔ جب تم شہر خالی کرا لو گے تو ہم اس میں داخل ہو جائیں گے۔ ورنہ ہم ان طاقت ور اور قد آور لوگوں سے لڑنے والے نہیں۔

یہ وہ لوگ تھے، جنہوں نے اللہ کے پیغمبر کو بہت ستایا تھا، بہت ایذاء پہنچائی تھی انہیں۔ وہ تھے ہی نافرمان۔ مفاد کے خلاف کو قبول نہیں کرتے تھے۔

وہ طرزِعمل ان آیات میں، اور ان میں موجود اس واقعے میں بھی نمایاں ہے۔ انہوں نے نشانیاں دیکھی تھیں، معجزے دیکھے تھے۔ کوہِ طور ان کے سروں پر معلق رہا تھا اور انہوں نے عہد کیا تھا۔ لیکن پاسِ عہد کبھی نہیں کیا۔ ان آیات کے سوال ان کے گستاخانہ طرزِعمل کو ثابت کرتے ہیں۔ اللہ نے اسے ایک بڑی بات سمجھائی۔ پھر اس نے ذہن کو کھلا چھوڑ دیا تاکہ یہ دوسری بات بالآخر شعوری سطح پر آ جائے۔

پھر ہوا بھی یہی، وہ بات شعور تک آ گئی۔ ابھی جو آیات اس نے پڑھی اور اللہ کی رحمت اور فضل و کرم سے سمجھی تھی، ان میں انشاء اللہ کہنے کی افادیت نمایاں ہوئی تھی۔ مگر ساتھ ہی اسے سورۂ قلم کا خیال آیا تھا۔ اس میں انشاء اللہ نہ کہنے کے نتائج تھے۔ ان آیات میں اللہ کریم نے ایک باغ والوں کا واقعہ بیان فرمایا تھا۔

عبدالحق نے قرآن دوبارہ کھولا اور سورۂ قلم نکالی۔ وہ ۱۷ ویں آیت سے ۳۳ ویں آیت تک تھیں، اور وہاں رکوع ختم ہو رہا تھا۔ وہ پڑھنے لگا۔

''ہم نے آزمائش میں ڈالا ہے ان کفارِ مکہ کو، جس طرح آزمائش میں ڈالا تھا ہم نے ایک باغ والوں کو۔ جب انہوں نے قسم کھائی تھی کہ ضرور ہم پھل توڑیں گے اپنے باغ کے صبح سویرے۔ (۱۷)

''اور انشاء اللہ نہ کہا تھا۔'' (۱۸)

''تو پھر گئی اس باغ پر ایک آفت تیرے ربّ کی طرف سے، جبکہ وہ سو رہے تھے۔'' (۱۹)

''پس ہو کر رہ گیا وہ کٹے ہوئے کھیت کی طرح۔'' (۲۰)

عبدالحق پر تھرتھری چڑھ گئی۔ اس نے کھیت بھی دیکھے تھے اور فصل کٹنے کے بعد کھیت کی خالی جگہ بھی دیکھی تھی۔ اپنی اس وقت کی کیفیت اسے اب بھی یاد

تھی۔ کٹے ہوئے کھیت کو دیکھ کر دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ لگتا تھا، جیسے سب کچھ لٹ گیا ہے۔ حالانکہ فصل کاٹنا اور اٹھانا کسان کے لئے بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے، اور اس پر جشن منایا جاتا ہے۔ لیکن کٹا ہوا کھیت کوئی اچھا منظر پیش نہیں کرتا۔ جبکہ وہ اللہ کی رحمت کا مظہر ہوتا ہے۔ اور یہاں تو اس باغ پر اللہ کی طرف سے آفت آئی تھی۔ تو اس کا منظر کٹے ہوئے کھیت سے لاکھوں گنا ڈراؤنا ہوگا۔

وہ جسم کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ چند لمحے بعد اس نے آگے کی آیات پڑھیں۔

''پھر پکارا انہوں نے ایک دوسرے کو صبح سویرے۔'' (۲۱)

''یہ کہ چل پڑو صبح سویرے اپنی کھیتی کی طرف، اگر تمہیں پھل توڑنے ہیں۔'' (۲۲)

''چنانچہ وہ چل پڑے اور وہ آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے۔'' (۲۳)

''کہ نہ داخل ہونے پائے آج یہاں تمہارے پاس کوئی مسکین۔'' (۲۴)

عبدالحق نے توقف کیا اور غور کرتا رہا۔ یہ وہ لوگ تھے، جنہوں نے کسی امر کا ارادہ کیا، لیکن اللہ سے رجوع نہیں کیا، جو اختیار سمیت ہر چیز اپنے بندوں کو دیتا ہے۔ گویا انہوں نے نہ صرف سمجھا، بلکہ اعلان کر دیا کہ وہ باغ ان کے تصرف میں ہے، اور اس پر ان کا کامل اختیار ہے۔ اور رعونت کا ان کی یہ عالم تھا کہ وہ کسی غریب مسکین کو ان پھلوں میں حصہ دینے کو تیار نہیں تھے۔ کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ باغ ان کی ملکیت ہے۔ جبکہ اللہ نے باغ کے پھلوں میں اپنا حصہ بھی مقرر کیا ہے، جو ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے، اور اللہ والے تو اپنی ہر چیز میں محروم اور مسکین لوگوں کو شریک کرتے ہیں۔

یعنی اللہ سے رجوع نہ کرنے والا غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ عبدالحق نے سوچا۔ اور وہ دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے اور بڑے بڑے فیصلوں کا اعلان کرتا ہے۔ یہ

زوال کی نشانی ہے اور اللہ کے غضب کو للکارنا ہے۔

اس نے آگے کی آیات پڑھیں۔

''اور گئے وہ صبح سویرے لپکتے ہوئے، گویا وہ ہر چیز پر قادر ہیں۔'' (۲۵)

جبکہ قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ ہے۔ عبدالحق نے سوچا۔ بندے کے پاس جو بھی، جتنی بھی قدرت ہوتی ہے، وہ اللہ کی عطا کی ہوئی ہوتی ہے۔ اور ہر چیز کی طرح وہ اسے جب چاہے، واپس لے لیتا ہے، خواہ عارضی طور پر ہو یا مستقل طور پر۔ اللہ کی مرضی کے بغیر تو ایک سانس بھی ممکن نہیں، جس سے زندگی ہے..... اور زندگی، جس کے دم سے سب کچھ ہے۔

وہ اور آگے بڑھا۔

''مگر جب دیکھا انہوں نے باغ کو تو کہنے لگے، ہم یقیناً راستہ بھول گئے ہیں۔'' (۲۶)

''نہیں! بلکہ ہماری قسمت ہی پھوٹ گئی ہے۔'' (۲۷)

ان دو آیات کی کیفیت نے اسے دہلا دیا۔ باغ پر اللہ کی طرف سے آفت پہنچنے پر جو اس باغ کا حال اللہ نے بیان فرمایا تھا، اور اسے کٹے ہوئے کھیت سے مشابہ قرار دیا تھا، وہ تو اسی پر تھرا گیا تھا۔ لیکن ان دو آیات سے تو اس پر ایسا لرزہ چڑھا کہ تادیر وہ سنبھل نہ سکا۔

اس کی یہ کیفیت اس احساس کے باوجود تھی کہ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ اس صبح اس باغ کے مالکوں نے دیکھا، وہ نہیں دیکھ سکتا۔ اور اسے دیکھ کر ان پر جو گزری، وہ اللہ کے بیان کرنے کے باوجود بھی اسے محسوس نہیں کر سکتا۔

آدمی جس جگہ کا مالک ہو، اسے خوب پہچانتا ہے۔ اردگرد کی تمام نشانیاں اسے یاد ہوتی ہیں۔ وہ اپنی اس ملکیت کو کبھی بھولتا ہے، نہ اس کے گرد و پیش کو۔ اس کے باوجود کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اسی جگہ کو نہیں پہچانتا یا پہچاننا نہیں چاہتا۔

عبدالحق نے اس منظر کو دیکھنے کی، ان لوگوں کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش

کی۔ وہ لوگ جن کا نگاہوں میں اپنا پھلوں سے لدا باغ بسا ہو، وہ اپنے باغ کی طرف آ رہے ہیں۔ راستہ انہیں ایسا یاد ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے بھی وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچتے ہیں تو ان کے سامنے تباہی کا ایک منظر ہوتا ہے۔ جہاں ان کے باغ کی کوئی ایک نشانی بھی موجود نہیں۔ جبکہ وہ پورے یقین کے ساتھ اس باغ کے پھل توڑ کر کھانے کی نیت سے آئے تھے۔ اور وہاں درخت تو کیا، پھل کا ایک دانہ بھی نہیں۔ ایسا منظر دیکھنے کے بعد آدمی کو کیسا شاک لگے گا۔ اگر وہ کئی ہیں تو ان کے درمیان کچھ اس طرح کے مکالمے ہی ہوں گے۔

''یار..... ! یہ وہ جگہ تو نہیں۔''

''شاید ہم راستہ بھول گئے۔''

''یہاں تو ہمارا باغ تھا، نہیں ! یہ وہ جگہ ہے ہی نہیں۔''

اور یہ سب کچھ کہتے ہوئے، اپنے اندر وہ یقینی طور پر آگاہ ہوں گے کہ یہ وہی جگہ ہے، اسے وہ کبھی بھول نہیں سکتے، اور یہاں تک آنے کا راستہ انہیں ایسا یاد ہے کہ وہ اندھیری سیاہ رات میں بھی یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ اور انہوں نے دیکھتے ہی سمجھ لیا ہوگا کہ ان کا باغ تباہ ہو چکا ہے۔

اب آدمی جتنا دنیادار ہوگا، جتنا دنیا سے محبت کرنے والا ہوگا، اتنا ہی بڑا اس کا صدمہ ہوگا دنیاوی نقصان پر۔ اور اللہ نے آدمی کے اندر اس طرح کی صورتِ حال کے لئے کچھ دفاعی میکنزم کے تحت وہ اپنی توجہ ہٹانے کی غرض سے پہلے اس حقیقت کا انکار کرتا ہے، اور اس وقفے میں وہ اس صدمے سے گزرنے، اس جھیلنے کے لئے خود کو تیار کر رہا ہوتا ہے۔ بہت دنیا دار آدمی تو ایسے کسی صدمے سے مر بھی سکتا ہے۔

اور جو اللہ کو ماننے والا ہوگا، جو ہر وقت یہ خیال دل میں رکھتا ہوگا کہ یہ دنیا، یہاں اس کا قیام، یہاں کے رشتے ناطے، یہاں اس کے املاک، سب کچھ عارضی ہے اور اللہ کی طرف سے ہے، جسے وہ جب چاہے، واپس لے لے، وہ صدمے کی حالت میں بھی کہے گا۔

''اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔''

''بے شک ! ہم بھی اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔''

تو ان باغ والوں نے بھی پہلے یہی کہا کہ ہم یقیناً راستہ بھول گئے ہیں۔ یہ وہ جگہ نہیں۔ اگرچہ وہ جانتے تھے کہ صحیح مقام پر آئے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد انہوں نے کہا، نہیں، بلکہ ہماری قسمت بھی پھوٹ گئی ہے۔

عبدالحق غور کرتا رہا۔ انہوں نے ابتداء میں اللہ سے رجوع نہیں کیا تھا۔ وہ خود کو قادر سمجھ رہے تھے۔ لیکن تھے وہ اللہ کو ماننے والے ہی۔ ورنہ انشاء اللہ نہ کہنا ان کے لئے جرم نہ ہوتا۔ جیسے رجوع کرنے میں ہدایت بڑھتی ہے، ویسے ہی رجوع نہ کرنے میں آدمی ہدایت سے دور ہوتا ہے۔ اب یہ تو اللہ ہی جانے کہ ان کا آج کا ردِعمل اللہ سے رجوع نہ کرنے کا شاخسانہ محض تھا یا اس میں ان کی حد سے بڑھی ہوئی دنیاداری کا بھی دخل تھا۔ بہرحال دنیا کے کسی بھی نقصان پر قسمت کا گلہ کرنا، قسمت پھوٹنے کا جملہ ادا کرنا بہت بڑی ناشکری ہے۔ ایک باغ اجڑ گیا تو کیا، ہاتھ پاؤں، جسم کے تمام اعضاء تو سلامت ہیں۔ تمام حواس اور عقل و شعور تو کام کر رہے ہیں۔ ان کا شکر ادا کرنے کے بجائے یہ ناشکرا پن۔ اور اگر آدمی معذور بھی ہو جائے، تب بھی شکر واجب کہ زندگی تو قائم ہے، جس میں نیکی کا ایک لحہ بھی اللہ کے فضل و کرم سے عاقبت سنوار سکتا ہے۔

یہ تمام خودکار سوچیں تھیں عبدالحق کی، جیسے اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جیسے اس کے سینے میں بیٹھا کوئی معلم اسے پڑھا رہا ہو، سمجھا رہا ہو۔ اس نے چونک کر جھرجھری سی لی اور شرمندگی سے نظریں جھکا لیں۔ اللہ اسے اپنی امان میں رکھے، آزمائش سے بچائے اور اسے ہدایت سے نوازتا رہے۔ کون جانے، یہ سب کچھ اس کے ساتھ ہوا ہوتا تو وہ بھی یہی سب کچھ کہتا۔ اور کرتا۔ وہ دل میں استغفار کرنے لگا۔

پھر وہ آگے بڑھا۔

''کہا ان کے بہتر آدمی نے، کیا نہیں کہا تھا میں نے تم سے کہ کیوں نہیں تسبیح کرتے تم؟'' (۲۸)

عبدالحق ٹھہر گیا۔ قرآن کے ایک ایک لفظ میں ہزاروں حکمتیں ہیں، پیغام ہیں، کوئی انہیں سمجھ نہیں سکتا، الا یہ کہ اللہ خود سمجھا دے، جسے چاہے۔ بس بندہ خلوص سے پڑھے، اللہ سے التجا کرے کہ مجھے کچھ عطا کر دیں۔

اور عبدالحق کو صاف احساس ہو رہا تھا کہ اللہ اسے سمجھا رہا ہے۔

اس آیت میں ایک پیغام تھا۔ اللہ کا ذکر کرتے رہو، اس کی بڑائی بیان کرتے رہو۔ پھر وہ چاہے گا تو وہ تمہارے اندر اُتر جائے گی۔ اور جب تمہیں ہر وقت اللہ کی بڑائی، ان کی قدرت اور اس کی رحمتوں کا احساس رہے گا تو تم ہر معاملے میں اس سے رجوع کرو گے۔ کبھی غلطی نہیں کرو گے۔ تسبیح بڑی چیز ہے۔

اور جس آدمی نے یہ بات کہی، وہ ان باغ والوں میں سب سے اچھا تھا۔ وہ اپنے شرکاء کو تسبیح کی تلقین کرتا تھا، جو نہیں مانی جاتی تھی، اور اب اپنے اجتماعی نقصانِ عظیم کو دیکھ کر انہیں یہ بات یاد دلا رہا تھا۔ سوال یہ تھا کہ نصیحت وہ کرتا تھا، لیکن خود تسبیح بھی کرتا تھا یا نہیں؟ اب اس کی حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن اللہ نیکی کو بہت اہمیت دیتا ہے، حالانکہ وہ گنتی میں کم ہوتی ہے۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ روئے زمین پر جب تک اللہ کا ایک ماننے والا بھی موجود ہوگا، قیامت نہیں آئے گی۔

تو اگر نصیحت کرنے والا تسبیح کرتا ہوتا تو شاید باغ پر یہ آفت نہ آتی۔ واللہ اعلم! مگر یہ تو حقیقت ہے کہ انشاء اللہ تو اس نصیحت کرنے والے نے بھی نہیں کہا تھا۔

عبدالحق کی عجیب کیفیت تھی۔ اسے اپنا وجود تنگ محسوس ہو رہا تھا۔

''ایسی کوٹھری، جس میں بہت زیادہ سامان بھر دیا گیا ہو، جہاں کوئی چیز ڈھونڈنا آسان نہ ہو۔ ذہن میں اتنا کچھ تھا کہ سب گڈمڈ ہو رہا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ذرا دیر میں کیفیت بہتر ہوگئی۔

اس نے آگے کی آیات پڑھیں۔

''وہ پکار اٹھے، پاک ہے ہمارا رب، بے شک ہم ہی

تھے ظالم۔'' (۲۹)

''پھر ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے باہم ملامت کرنے لگے۔'' (۳۰)

یعنی بالآخر یاد دلانے پر انہوں نے اللہ سے رجوع کیا۔ اس کے بعد ردِعمل فطری تھا۔ کسی اجتماعی کام کا برا نتیجہ نکلے، نقصان ہو جائے تو تمام شرکاء ایک دوسرے پر خرابی کا الزام عائد کرتے ہیں، مطعون کرتے ہیں۔ اللہ سے رجوع کرنے کے باوجود یہ عمل توبہ کو ردّ کرتا ہے۔ کیونکہ توبہ تو اعتراف کے بعد ہے۔ اب آپ اعتراف تو سطحی اور زبانی کریں اور پھر خرابی کا الزام دوسروں پر عائد کر دیں۔ نتائج کی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے ذمہ داری دوسروں پر ڈال دیں تو یہ آپ توبہ تو نہیں کر رہے ہیں۔ توبہ کے لئے تو ندامت شرط ہے۔ جس درجہ ندامت ہوگی، اتنی ہی مقبول توبہ ہوگی۔

وہ آگے بڑھا۔

''کہنے لگے، ہائے بدنصیبی! ہم ہی تھے سرکش۔'' (۳۱)

''کچھ بعید نہیں کہ ہمارا رب بدلے میں دے ہمیں بہتر اس باغ سے۔ بے شک ہم اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ (۳۲)

اب حقیقت تو بس اللہ ہی جانتا ہے۔ انہوں نے اپنی سرکشی کو تسلیم کیا کہ وہی ان کی بدنصیبی کا سبب بنی۔ انہوں نے اللہ سے رجوع بھی کیا۔ لیکن بظاہر یہ لگتا تھا کہ اب بھی وہ دُنیا دار ہی ہیں۔ اللہ سے رجوع کرتے ہوئے انہوں نے آخرت میں بھلائی کی امید نہیں باندھی۔ بلکہ جو باغ ان کا تباہ ہوا تھا، امیدوار ہوئے کہ عجیب نہیں کہ اللہ انہیں اس سے بہتر باغ عطا فرما دے۔

بظاہر یہی لگتا تھا کہ اس نقصان کے باوجود ان کے دلوں سے دنیا کی محبت کم نہیں ہوئی۔ اور انہوں نے آخرت کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ انہیں آخرت کی کوئی فکر ہی نہیں۔ شاید رکوع کی آخری آیات اسی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

اللہ نے فرمایا۔

''ایسا ہوتا ہے عذاب۔ اور عذاب آخرت تو کہیں
بڑھ کر ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے۔'' (۳۳)

پہلے اللہ نے بتایا کہ دنیا کا عذاب ایسا ہوتا ہے۔ پھر بتایا کہ عذابِ آخرت تو کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ اللہ کے اقتدار، اس کے ذکر سے غفلت برتنے والوں کا انجام ہے۔ اور آخر میں اللہ نے گویا ان کی بدنصیبی پر مہر ثبت کر دی۔ یہ کہہ کر کہ کاش یہ لوگ جانتے۔ لیکن یہ بے خبر غفلت میں پڑے ہوئے لوگ دنیا کا عذاب دیکھ کر بھی آخرت کے عذاب کو نہیں سمجھ پاتے۔

عبدالحق پر لرزہ چڑھ گیا۔ دیر تک اس کے جسم پر تھرتھری رہی۔ اس نے سوچا کہ وہ کیسی زندگی گزار رہا ہے۔ دینا کی مصروفیات میں گم ہے۔ اور اسے اللہ کے ذکر کے لئے فرصت نہیں ملتی۔ اس کا خیال بھی نہیں آتا۔ اللہ کے اتنا نوازنے پر اس کی بے خبری، غفلت اور دنیاداری کا یہ حال ہے۔ تو اس کا انجام کیا ہوگا؟

اس کے ذہن میں آخری آیت کے الفاظ گردش کرتے رہے۔ ایسا ہوتا ہے عذاب۔ اور آخرت کا عذاب تو کہیں بڑھ کر ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے.... عذابِ آخرت تو کہیں بڑھ کر ہے۔ کاش ..... اور اسے صاف طور پر ایسا لگا کہ اللہ اس سے فرما رہا ہے، تو یہ بات سمجھ لے، جان لے۔ تو خود کو اس بدنصیبی سے، اور بدترین عذاب سے بچانے کی کوشش کر۔

خوف کے اس عالم میں وہ استغفار کرتا رہا، ایسے کہ اسے اس کا ہوش بھی نہیں تھا۔ استغفار بے اختیار ان کی زبان پر، اور آنسو اس کی آنکھوں سے جاری تھے۔ دیر تک وہ اسی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ پھر اذان کی آواز نے اسے اس کیفیت سے نکالا۔

اذان کے بعد وہ نماز کے ارادے سے اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا..... اس کا مطلب ہے کہ دنیا کا نقصان، کوئی محرومی، کوئی عذاب درحقیقت اللہ کی رحمت ہے۔ اس خیال کی بازگشت اس کے دل و دماغ میں چکرا رہی تھی۔

پہلے تو وہ نقطوں کے پار کچھ دیکھ، کچھ سمجھ نہیں سکا۔ پھر بالآخر وہ الفاظ اس کے شعور کی گرفت میں آئے۔ اس کا پہلا ردِّعمل حیرت کا تھا۔

نقصان، محرومی اور عذاب ..... اور اللہ کی رحمت! وہ کیسے؟ اس نے خود سے پوچھا۔ کیسے بھلا؟

خود سوچو، غور کرو۔ اندر اس سوال کا جواب ابھرا۔

وہ سوچنے لگا۔ پھر اچانک بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ آیت کا آخری حصہ پکار رہا تھا..... کاش یہ لوگ جانتے۔ اللہ فرما رہا ہے کہ میں انہیں بتا رہا ہوں، سمجھا رہا ہوں۔ یہ لوگ نہیں سمجھتے پھر بھی۔ کاش..... کاش یہ لوگ جانتے۔ دنیا کے نقصان، دنیا کے عذاب کے بعد، اللہ بتا رہا تھا کہ سمجھ لو، عذابِ آخرت اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ مان جاؤ، سمجھ لو، مجھ سے رجوع کر لو۔ تو یہ رحمت ہی تو ہے۔

جب کوئی بڑی بات، بہت بڑی بات آدمی کی سمجھ میں آتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لئے شل ہو کر رہ جاتا ہے۔ عبدالحق کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ ذہن کو بس اتنا پتا تھا کہ اس نے ایک بہت بڑا راز پا لیا ہے۔ اس کے سوا وہاں اور کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی وضاحت نہیں تھی، کچھ بھی نہیں۔

پھر اچانک ذہن جیسے جگمگا اٹھا۔

بے شک، ہر نقصان، ہر محرومی، ہر تکلیف درحقیقت اللہ کی رحمت ہے۔ آدمی کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھتا ہے تو وہ اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ وہ اسے بتاتی ہے کہ اگر اس نے اپنی سمت درست نہ کی اور اللہ سے رجوع نہ کیا تو کانٹا چبھنے سے تڑپنے والا جہنم کا عذاب کیسے برداشت کرے گا، جو ناقابلِ تصور حد تک اذیت ناک ہوگا تو ہر نقصان، ہر محرومی اور ہر تکلیف کے ذریعے اللہ اپنے بندے کو عذابِ آخرت یاد دلاتا ہے، اور بے شک یہ اس کی رحمت ہے۔

پھر اسے خیال آیا کہ اللہ کی رحمت بے پایاں ہے، اور اللہ نے اس سے پوری کائنات کا احاطہ کر رکھا ہے۔ تو کوئی شخص کسی بھی لمحے اللہ کی رحمت سے باہر نہیں۔ اور اللہ نے ہمیں اپنی جن صفات کے بارے میں بتایا ہے، وہ سب رحمت ہیں۔ اس کا قہر بھی اس کی رحمت ہے، کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔

تو بندے کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ ہر پل، ہر معاملے میں اللہ سے رجوع کرتا ہے۔ اور اس کے لئے اللہ نے بندوں کو زبان پر رواں اور آسان کلمات عطا فرماتے ہیں ..... الحمد للہ، سبحان اللہ، ماشاء اللہ، انشاء اللہ، اور کسی نقصان کے لئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بلکہ اگر بندہ سمجھے تو ہر نقصان میں بھی اللہ کی رحمت ہے۔ اور اگر وہ ایمان رکھتا ہو کہ ہر چیز میں اللہ کی طرف سے بہتری ہے تو نقصان پر بھی الحمد للہ کہے۔

عبدالحق نماز کے لئے کھڑا ہوگیا۔ لیکن اس تشنگی کا احساس ستا رہا تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال چبھ رہا تھا کہ کچھ اور بھی ہے، جو وہ اس وقت سمجھ سکتا ہے۔ لیکن وہ اس کی نوعیت سمجھنے سے قاصر تھا۔ اور یہ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اس کے لئے اسے کیا کرنا ہے۔

نماز کے بعد اس نے اللہ سے راہنمائی کی دعا کی، ورنہ وہ جانتا تھا کہ یہ تشنگی، یہ خلش نہ جانے کب تک اسے بے چین رکھے گی۔ دعا کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیر کر چند لمحے وہ بیٹھا رہا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں سورۂ نمل کا خیال ابھرا۔

یعنی مجھے سورۂ نمل پڑھنی چاہئے۔ اس نے سوچا۔ اس پر اسے خیال آیا کہ شفیق نے اس سورۂ مبارکہ کا حوالہ دیتے ہوئے کتاب کے علم کی اہمیت اور قوت واضح کی تھی، اور زمان و مکاں کے فاصلوں کی سمت جانے کو بیان کیا تھا۔

وہ پھر قرآن لے کر بیٹھ گیا۔ اس نے سورۃ النمل کی وہ آیات نکالیں۔ اندر سے انہی کی طرف اشارہ ہو رہا تھا۔

جہاں ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے عرض کی تھی ..... اور لایا ہوں میں آپ کے پاس سب سے ایک یقینی اطلاع ..... وہاں سے وہ تمام آیات ترجمے کے ساتھ اس نے کئی بار پڑھیں۔ کتاب کا علم جاننے والے نے پلک جھپکنے سے پہلے وہ تخت حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر کر دیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ کتاب کا علم کیسا ہے، اور اس کے عالم کے پاس کتنی قوتیں ہوتی ہیں۔ درحقیقت وہی تو اللہ کا خلیفہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ ایں سعادت بزور بازو

نیست۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہے عطا کر دے۔

لیکن وہ خلش اب بھی دور نہیں ہوئی تھی۔ عبدالحق بے چین تھا۔

اس نے آخری آیات کو پھر پڑھا۔ کہا اس شخص نے جس کے پاس تھا کتاب کا علم کہ میں لے آتا ہوں وہ تخت آپ کے پاس اس سے پہلے کہ جھپکے آپ کی پلک۔ چنانچہ جب دیکھا سلیمان علیہ السلام نے اس تخت کو رکھا ہوا اپنے پاس تو پکار اٹھے، یہ فضل ہے میرے رب کا۔

یہ آیت مبارکہ ظاہر کر رہی تھی کہ سلیمان علیہ السلام نے پلک بھی نہیں جھپکی تھی، اور تخت ان کے دیکھتے ہی دیکھتے اس طرح موجود ہوگیا تھا کہ دیکھتے ہوئے بھی انہیں پتا نہیں چلا تھا کہ وہ کب آ گیا۔

عام انسانوں کے لئے تو یہ محیر العقول واقعہ تھا۔ لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ کے نبی تھے۔

عبدالحق نے تصور کیا کہ اس کے سامنے ایسا ہی کوئی واقعہ پیش آیا ہے۔ اس کا کیا ردِعمل ہو سکتا ہے۔ پہلے تو وہ سکتے میں رہ جاتا۔ دیر تک اس کے ہونٹ لرزتے، اور منہ سے آواز نہ نکلتی۔ پھر جب وہ کافی دیر بعد سنبھلتا، گویائی بحال ہوتی تو اس کا کیا ردِعمل ہوتا۔

اس کے لئے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ عبدالحق نے بے ساختہ بلند آواز میں کہا، جس پر وہ خود بھی حیران رہ گیا ..... یہ تو کمال کر دیا آپ نے۔ واقعی آپ باکمال آدمی ہیں۔

ہاں! اس کا یہی ردِعمل ہوتا۔ اس نے دل میں اعتراف کیا۔

لیکن سلیمان علیہ السلام کا کیا ردِعمل تھا۔

چنانچہ جب دیکھا سلیمان علیہ السلام نے اس تخت کو رکھا ہوا اپنے پاس تو پکار اٹھے، یہ فضل ہے میرے رب کا۔

ایسی ناقابل یقین کارکردگی دیکھنے کے بعد کیا پہلا جملہ تھا حضرت سلیمان علیہ السلام کا .....

''ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ''

''یہ فضل ہے میرے رب کا۔''

سبحان اللہ! عبدالحق کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ کارکردگی دکھانے والے کی تعریف نہیں کی، اب ربّ کی تعریف بیان کی، جو تنہا، واحد اور احد ہر تعریف کا سزاوار ہے۔ جس کے پاس جو خوبی، جو صلاحیت، جو طاقت، جو ملکیت، جو چیز بھی تعریف کے قابل ہے، وہ اسی کی عطا کی ہوئی ہے۔ اس لئے ہر تعریف بھی صرف اسی کے لئے ہے۔ اس نے فرمایا...... اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ...... کسی کی تعریف کرنے سے پہلے اپنے ربّ کی تعریف کرو، جو رب ہے تمام جہانوں کا، اور ہر تعریف کا سزاوار وہی ہے۔

واہ! عبدالحق نے دل میں سوچا۔ یہ فرق ہے عام آدمی اور نبی کا...... مگر یہ سوچتے ہوئے اچانک میں وہ ٹھرا گیا۔ یہ وہ کیا کر رہا ہے؟ ابھی جو سکھایا گیا ہے، اسی کے خلاف کر رہا ہے۔ اللہ سے پہلے کسی کی تعریف، خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو۔

''ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ'' اس نے عاجزی سے دہرایا۔ کلام اللہ کا ہے۔ وہ اتنی اہم تعلیم دے رہا ہے۔ اور میں توصیف کر رہا ہوں نبی کی۔ تعلیم کو تو سمجھا ہی نہیں میں نے۔ تعلیم کو تو پیچھے چھوڑ دیا۔

''ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ''

اور ''ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ'' کے بعد کیا فرمایا نبی نے۔ یہ اس لئے ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری۔

تو جو بھی اللہ کی طرف سے نعمت ہے، اس کا فضل ہے، درحقیقت بندے کی آزمائش ہے۔ اللہ اس سے یہ جانچتا ہے کہ بندہ شکر گزار ہے یا احسان ناشناس۔

تو شکر کیا ہے اور ناشکری کیا؟

شکر، یہ ہے کہ وسیلوں میں، ظاہری اسباب میں نہ الجھو، اپنے معبودِ حقیقی کو، اپنے ربّ کو پہچانو اور اس کی تعریف کرو۔ اور اس کی تعریف و توصیف میں بھی کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔

اور ناشکری؟

دودھ دینے والی بھینس کے کُھر چوم لینا، اسے بھول کر جس نے وہ دودھ

بھینس کو عطا فرمایا، پھر بھینس سے اسے دلوایا، اسے پینا نصیب فرمایا، اس کے ذائقے سے فرحت عطا فرمائی، اسے مضر اثرات سے پاک فرمایا، اسے جزوِ بدن بنایا اور اس سے اسے طاقت عطا فرمائی۔ کتنے احسان فرمائے ایک نعمت کے ساتھ ربّ نے، اور بندے نے شکر ادا کیا تو بھینس کا۔ یہ ناشکری ہے۔

اور آیت کے آخری حصے میں کیا فرمایا سلیمان علیہ السلام نے؟

اور جو کوئی شکر کرتا ہے تو درحقیقت وہ شکر کرتا ہے اپنے ہی فائدے کے لئے۔ اور جو کوئی کفر کرتا ہے تو میرا ربّ بے نیاز اور بہت کریم ہے۔

اللہ بے نیاز ہے، اور سب اس کے محتاج ہیں، اسے کسی سے کچھ نہیں چاہئے۔ نہ تعریف، نہ توصیف نہ کلمہ شکر۔ وہ ہر طرح کی حاجتوں سے پاک ہے۔ اور وہ کریم ہے۔ بغیر کسی استحقاق اور جواز کے اپنی تمام مخلوقات کی ضرورتیں پوری فرماتا ہے، اور بن مانگے پوری فرماتا ہے۔ بلکہ مخلوق کو اپنی حاجت کا علم بھی نہیں ہوتا۔ اللہ پوری فرماتا ہے، اور بعض اوقات مخلوق کو حاجت روائی کے بعد معلوم تک نہیں ہوتا کہ اس کی کوئی حاجت پوری ہوگئی ہے۔ یہ کریمی ہے، بے گمان، بے سبب، بے کاوش عطا فرمانا۔

تو بے نیاز اور کریم رب کا جو شکر ادا کرے تو اس سے رب کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اس میں فائدہ شکر ادا کرنے والے کا ہی ہوتا ہے۔ اب یہ مقامِ فکر تھا، غور کرنے کی بات تھی۔ عبدالحق نے سوچا، اسے شکر کے فوائد کے بارے میں سوچنا ہوگا، غور کرنا ہوگا۔ وہ بھی یقیناً بے شمار ہوں گے۔

اور آخری حصے سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ چاہے کم تر درجے میں ہو، لیکن ناشکری بہرحال کفر ہے۔ کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے پہلے فرمایا کہ رب آزماتا ہے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری۔ اور دوسرے حصے میں شکر اور کفر کا تذکرہ کیا۔

عبدالحق کی روح سرشار ہوگئی۔ الحمد للہ! اس نے سوچا، اللہ نے مجھے ایک اور کلمہ عطا فرما دیا۔ کسی سے کچھ ملے، کوئی مہربانی کرے، کوئی ناممکن کو ممکن بنا دے، کوئی غیر معمولی بات رونما ہو تو مجھے سب سے پہلے ہر بات کو بھول کر ''ھٰذَا مِنْ

فَضْلِ رَبِّی'' کہنا ہے۔ اے اللہ! جو کچھ آج آپ نے مجھے سمجھایا ہے، مجھے اس پر عامل بھی کر دیجئے۔ اس نے دل کی گہرائیوں سے اللہ کو پکارا۔

اور اس کا دل جیسے قبولیت کی روشنی سے بھر گیا۔

لیکن دل میں ایک خلش اب بھی تھی۔ البتہ اس بار اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ اسے درحقیقت سورۃ البقر کی ان آیات کا خیال آ رہا تھا، جن میں انا للہ وانا الیہ راجعون بھی تھی۔

اس نے سورۂ بقر کی وہ آیات نکالیں اور ترجمے کے ساتھ پڑھیں۔

''اور ضرور آزمائیں گے ہم تم کو کسی قدر خوف اور بھوک سے اور نقصان میں مال و جان کے اور آمدنیوں کے، اور خوش خبری دو صبر کرنے والوں کو۔'' (۱۵۵)

''وہ کہ جب پہنچتی ہے انہیں کوئی مصیبت تو کہتے ہیں، بے شک! ہم للہ ہی کے ہیں اور بے شک ہمیں اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)'' (۱۵۶)

''یہی وہ لوگ ہیں کہ ان پر ہیں عنایتیں ان کے رب کی، اور رحمتیں بھی۔ اور یہی لوگ ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں۔'' (۱۵۷)

کیسی حوصلہ افزاء آیات ہیں یہ، کیسی خوش خبری دیتی ہیں پریشان حال لوگوں کو۔ انہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ پورے یقین کے ساتھ، خود کو ہر گلے اور تاسف سے پاک کر کے، خود کو اللہ کی رضا پر چھوڑ کر انا للہ وانا الیہ راجعون کہیں۔ تو پھر ان کے لئے ان کے رب کی طرف سے عنایتیں اور رحمتیں ہیں اور ان کے لئے ہدایت ہے۔ کتنی بڑی خوش خبری ہے یہ۔

عبدالحق جب بھی ان آیات کو پڑھتا تھا، اس پر گریہ طاری ہو جاتا تھا۔ اللہ کتنی محبت کرتا ہے اپنے بندوں سے۔ دنیا میں تو انہیں سامانِ زیست عطا کرتا ہی ہے، لیکن ان کی فکر بھی کرتا ہے۔ ان کے لئے بشارتوں کا اہتمام بھی فرماتا ہے۔ ورنہ اس کے لئے کیا بڑی بات ہے کہ وہ انہیں محرومیوں سے بچا لے۔ لیکن وہ

محرومیاں، اگر ان پر صبر کیا جائے تو دنیا اس آخرت میں بندے کے لئے اللہ کی عنایات، رحمتوں اور ہدایات کا سبب بن جاتی ہیں۔ اور پھر بھی تو وہی دیتا ہے۔ بندے کا تو کچھ بھی نہیں۔

اللہ کی رحمت ہی رحمت ہے۔ عبدالحق کے دل نے کہا۔ ہر کام میں رحمت، ہر بات میں رحمت۔ بس بندہ سمجھ نہیں پاتا۔ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ سمجھتا بھی وہی کچھ ہے، جو اللہ سمجھا دے۔ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے، اللہ ہی اللہ۔ بندہ تو بس گمان میں مبتلا رہتا ہے کہ میں نے یہ کر دیا اور وہ کر دیا۔

اور اللہ کی رحمت کہ اس نے کلمہ صبر بھی عطا فرمایا...... انا للہ وانا الیہ راجعون...... بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور بے شک ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ کتنا آسان کر دیا اللہ نے۔ صبر کہاں آتا ہے بندے کو۔ تو صبر آئے یا نہ آئے، زبان پر کلمہ صبر جاری رکھو۔ اللہ قبول کرنے والا ہے۔ اور یہ کلمہ زبان پر جاری رہے گا تو صبر بھی آ ہی جائے گا۔ ذکر کا یہی تو کمال ہے۔ بے دھیانی میں بھی کرتے رہو تو اندر اتر جائے۔ آخر اللہ کا کلام ہے۔

عبدالحق اس کلمہ صبر پر غور کرنے لگا۔ بے شک ہم اللہ کے ہیں، اور بے شک سبھی کچھ اللہ کا ہے۔ اور بے شک ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اور بے شک جو کچھ بھی اس نے عطا فرمایا، وہ اس کا احسان ہے، وہ جب چاہے واپس لے لے۔ جب یہ مان لیا تو غم کاہے کا۔ زندگی کے دم سے سب کچھ ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یہ روح کی بیڑی ہے، جس کی توانائی سے جسم کی مشین چل رہی ہے۔ اللہ کے مقرر کئے ہوئے وقت پر یہ روح جسم کو چھوڑ کر اللہ کی طرف چلی جائے گی۔ یہ جسد خاکی بے جان ہو جائے گا۔ مشین رک جائے گی۔

تو کوئی بھی پریشانی ہو، خوف ہو یا بھوک، اور کوئی بھی نقصان ہو، جان و مال کا ہو یا آمدنی کا، بندہ کلمہ صبر ادا کرے کہ اللہ کی دی ہوئی چیز تھی، سو اس نے واپس لے لی۔ اور ایک دن ہم خود بھی اسی کے پاس چلے جائیں گے۔ غم کی کوئی بات ہی نہیں۔

وہ چونکا۔ غم کا کیا سوال ہے۔ پہلے تو شکر ادا کرنا چاہئے۔ اس کے دل

بس یہ خیال ابھرا۔

چند لمحے وہ اس کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آئی تو وہ ہل کر رہ گیا۔ شکر ادا نہ کرنا گویا ناشکری ہے اور ناشکری کفر ہے۔ بات کہاں سے کہاں تک جاتی ہے۔

تو کلمہ صبر سے پہلے کلمہ شکر ہے...... الحمد اللہ......!

کیوں؟

اللہ نے تمہیں دیکھتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ پیدا فرمایا تو کیا یہ تمہارا حق تھا؟

نہیں! یہ اس کا احسان تھا۔

کبھی اس پر شکر ادا کیا تم نے؟

نہیں! کبھی نہیں۔

کیوں نہیں کیا؟

کبھی خیال ہی نہیں آیا۔

اور ابھی، اسی لمحے آنکھوں سے، بینائی سے محروم ہو جاؤ تو کیا کرو گے؟

عبدالحق سوچتا رہا۔ وہ جیسے اللہ کے روبرو کھڑا تھا۔ غلط جواب تو نہیں دے سکتا۔ بہت سچائی کے ساتھ جواب دینا تھا اسے۔ بجھ کر رہ جاؤں گا کہ میرے لئے دنیا ہی اندھیر ہوگئی۔ وہ بڑبڑایا۔

یعنی غم کرو گے نا...... شدید غم؟

ہاں!

لیکن جو کچھ آج سیکھا ہے، اس کی روشنی میں کیا کرنا چاہئے تمہیں؟

صبر کرنا چاہئے، محرومی پر جب بھی دکھ ہو تو انا للہ وانا الیہ راجعون کہنا چاہئے۔

نہیں! اس سے پہلے بھی کچھ ہے۔

عبدالحق نے ذہن پر زور دیا۔ کلمہ شکر ادا کرنا چاہئے...... الحمد للہ!

کس لئے؟

وہ سوچتا رہا، پھر بے بسی سے بڑبڑایا۔ یہ سمجھ سکتا ہوں کہ صبر سے پہلے شکر لازم ہے۔ لیکن کیوں؟ یہ نہیں سمجھ پایا۔

جواب اگلے ہی لمحے اس کے اندر ابھرا۔ صبر سے پہلے شکر اس پر کہ اللہ نے اتنے برسوں تک تمہیں یہ نعمت عطا فرمائی۔

بے شک! میں سمجھ گیا۔

لیکن شکر سے بھی پہلے ایک چیز اور ہے۔

وہ کیا؟

استغفار، اس کی وجہ جاننا چاہتے ہو۔

ہاں! تاکہ آئندہ کے لئے محتاط ہوں۔ عبدالحق نے عاجزی سے کہا۔

جب بینائی سے محروم ہوگئے اور صبر سے پہلے تم نے شکر ادا کیا کہ اللہ نے اتنے برسوں تک تمہیں اس نعمت سے سرفراز رکھا تھا، اور وہ بھی بغیر مانگے تو تمہیں اس پر شرم نہیں آئی کہ اتنے برسوں تک اتنی بڑی نعمت تمہارے پاس رہی اور تمہیں اس پر اللہ کا شکر ادا کرنے کا خیال بھی نہیں آیا، جیسے یہ کوئی نعمت تھی ہی نہیں۔ محروم ہوئے تو جانا۔ تو اتنے برسوں ناشکری کے مرتکب ہوتے رہے۔ اتنی بڑی نعمت سے بے نیازی بھی برتی، جبکہ بے نیازی صرف اللہ کو زیبا ہے۔

عبدالحق پر ایسی تھرتھری چڑھی کہ وہ نڈھال ہوگیا۔

بہت دیر تک وہ ساکن بیٹھا رہا۔ دماغ میں اتنی روشنی تھی، ایسی چکاچوند تھی کہ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

زندگی آخرت کے نکتہ نظر سے کتنی دشوار ہے۔ کافی دیر بعد اس نے سوچا۔

اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کا شمار تو ممکن ہی نہیں۔ شکر کیا ادا کرسکتا ہے بندہ!

یہ تو غلط بات ہے۔ اندر کی آواز ابھری۔ زندگی سامنے کی نعمت ہے۔ اللہ نے ہدایت دی، تمہیں دین اسلام میں لایا، سامنے کی نعمت ہے۔ بصارت، سماعت، گویائی، تمام حواس، فہم وادراک، سمجھ بوجھ سب سامنے کی نعمتیں ہیں۔ پر ان کا خیال ہی نہیں آتا تمہیں۔ اور اللہ نے آخرت کے لئے زندگی کتنی آسان کردی، جب کوئی نعمت یاد آئے، اس پر شکر ادا کرلو۔ جب کچھ اچھا ملے تو الحمد للہ اور ھذا من فضل

ربی کہہ لو۔ جب کوئی پریشانی اور محرومی زندگی میں آئے، انا للہ وانا الیہ راجعون کہو اور اللہ کی ہدایت اور رحمت پا جاؤ۔ چھوٹے چھوٹے کلمے، مقبول کلمے اسی نے تمہیں عطا کیے۔ لا الہ الا اللہ کہو اور اس کی وحدانیت کا اعلان کرو۔ سبحان اللہ کہو اور اس کی پاکی بیان کرو۔ اللہ اکبر کہو تو اس کی بڑائی بیان کرو۔ الحمدللہ کہو اور شکر کرو اور ہر اچھی چیز اس کی طرف سے ہونے کا اعلان کرو۔ انشاء اللہ کہو اور معاملات اسے سونپ کر خیر اور فلاح پا جاؤ۔ ماشاء اللہ کہو اور غرور اور اتراہٹ سے محفوظ ہو جاؤ۔ ھذا من فضل ربی کہو اور شرک سے دور ہو جاؤ۔ اور کیا چاہیے تمہیں، اور کتنی آسانیاں چاہتے ہو۔ مسئلہ یہ ہے کہ انسان غفلت میں پڑا رہتا ہے۔ اپنی خوبیوں کو اپنا جانتا ہے، اور ہر نعمت کو اپنی کسی خوبی، کارکردگی اور محنت کا سبب جانتا ہے۔ عام طور پر اللہ کی نعمت کو نعمت اس وقت تک نہیں مانتا، جب تک اس سے محروم نہ ہو جائے۔ اور کبھی کبھی تو شرمندہ ہونے کے بجائے الٹا گلے شکوے کرنے لگتا ہے۔

سب کچھ آسان ہو جائے، اگر تم ہر وقت اور ہر لمحہ اپنے دل میں اللہ کو یاد رکھو، ہر کام کرتے ہوئے، ہر بات کرتے ہوئے، تو تمہیں سب کچھ اللہ سے منسوب کرنے میں آسانی رہے گی۔ غور تو کرو صرف اس کی ان نعمتوں پر جن کا تمہیں شعور ہے، ان کو تو بھول جاؤ، جن کا تمہیں ادراک ہی نہیں ہے، تو احسان مند ہو کر ہمیشہ ہر لمحہ اسے یاد کرنا چاہو گے۔ ارے، وہ تو ایسا ہے کہ تم ہر وقت اس کی بات، اس کا ذکر کرتے رہو، یہاں تک کہ لوگ تمہیں دیوانہ کہنے لگیں۔ جب وہ ہر لمحہ تمہیں یاد رہے گا تو اس کی صفات بھی تمہارے ذہن میں رہیں گی، اور تمہیں پتا چلتا رہے گا کہ کون سی نعمت جو تمہیں ملی، اس کی کس صفت کی مرہونِ منت ہے۔ تمہیں خیال رہے گا تو شکر ادا کرتے رہو گے۔

اور کثرت سے استغفار کرو۔ کیونکہ جیسے اللہ کی نعمتوں کا شمار ممکن نہیں، ویسے ہی تمہارے گناہوں کا شمار بھی ناممکن ہے۔

عبدالحق کا حال ایسا تھا، جیسے کسی بھکاری کو خزانہ مل گیا ہو۔ اس نے سوچا، کاش اس وقت ارجمند یہاں موجود ہوتی۔ ہم دونوں بات کرتے تو شاید کچھ اور روشنی مل جاتی۔

اس نے قرآن کو چوما، سینے سے لگایا اور الماری میں رکھ آیا۔ اسے احساس ہوا کہ دھوپ چڑھ آئی ہے، اور وہ دفتر کے لئے تیار بھی نہیں ہوا ہے۔ وہ باتھ روم کی طرف لپک رہا تھا کہ اسے خیال آیا، یہ اتوار کا دن ہے...... چھٹی کا دن۔

تو پھر کیا فکر ہے۔ ایک اہم کام کر لیا جائے۔ اس نے میز کی دراز کھول کر اپنی ڈائری نکالی اور اس میں یاد کر کے یہ سب کچھ لکھنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسی باتیں کتنی تیزی سے ذہن سے محو ہوتی ہیں۔

ڈائری لکھتے ہوئے اس نے سوچا، موقع ملا تو یہ ارجمند کو ضرور پڑھوائے گا۔

اور اب وہ لاہور واپس جا رہا تھا۔

کلکٹر صاحب کو تمام صورتِ حال بتاتے ہوئے اس نے تبادلے کی بات کی تھی۔ لیکن کلکٹر صاحب بھڑک گئے۔

''نہیں بھئی! تمہیں تو میں نہیں چھوڑ سکتا۔'' ان کے لہجے میں قطعیت تھی۔

''تمہارا متبادل تو مجھے کوئی مل ہی نہیں سکتا۔''

''میری مجبوری ہے جناب!''

''ایسی کیا مجبوری ہے؟ یہاں بہترین علاج ہو سکتا ہے تمہاری اہلیہ کا، میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں۔''

''وہ بہت ضدی ہے جناب! اور آپریشن سے ڈری ہوئی ہے۔ اپنوں میں شاید آپریشن کروا بھی لے، یہاں ہرگز نہیں کرائے گی۔''

کلکٹر صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ بھلے آدمی تھے۔ اور عورت کی ضد کا تجربہ نہیں ہوتا۔ بالآخر وہ بولے۔

''تبادلے کی بات بھول جاؤ۔ میں تمہیں ایک ہفتے کی چھٹی دے رہا ہوں۔''

''ایک ہفتے سے کیا ہوگا جناب! چھ سال سے میں نے اپنی اماں کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ پھر بیوی کو آپریشن کے لئے رضامند کرنا......''

''چلو...... دو ہفتے سہی۔ اس سے ایک دن زیادہ بھی نہیں۔''

"یہ بھی بہت کم ہے۔"

"تمہارے پیچھے یہاں سب کچھ چوپٹ ہو جائے گا۔" وہ بولے۔

"نہیں بھئی! یہ ناممکن ہے۔"

"تو پھر میرے سامنے ایک ہی راستہ ہے جناب! میں استعفیٰ دے رہا ہوں۔"

کلکٹر صاحب دہل گئے۔

"نہیں بھئی! ایسا سوچنا بھی نہیں۔ اچھا! یہ بتاؤ، کم سے کم کتنی چھٹی چاہئے تمہیں؟"

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔

"ایک ماہ تو ضروری ہے سر.....!"

کلکٹر صاحب چند لمحے ہچکچاتے رہے۔ پھر انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے عبدالحق! مگر توسیع نہ کرنا۔" پھر وہ مسکرائے۔

"چھٹیوں کا حق تو تمہارا بہت زیادہ کا ہے۔ اور تم اصرار کرو تو سرکاری طور پر میں انکار بھی نہیں کر سکتا۔ یہ تمہاری لیاقت اور لحاظ ہے کہ تم نے اپنا حق بھی عاجزی سے مانگا۔ لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں بھی تمہیں چھوٹے بھائی جیسا سمجھتا ہوں۔ ورنہ تمہیں روکنے کی کوشش کبھی نہ کرتا۔ یہ تو مان کی بات ہے نا، تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے میرا مان رکھا۔"

"ایسی بات نہ کریں جناب! آپ میرے لئے بہت محترم ہیں۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے استعفیٰ کی بات کی۔ میں کبھی نہ کرتا جناب! لیکن دل بہت پریشان ہے۔ اہلیہ کی اس بیماری کی وجہ سے تو کبھی اماں سے ملنے نہیں جا سکا۔ اب چھ سال بعد جا رہا ہوں تو ان سے رخصت ہو کر اتنی جلدی آنا آسان تو نہیں ہوگا۔ اور اماں کا حکم ٹال بھی نہیں سکتا میں۔"

"میں سمجھتا ہوں۔ تو بس یہ ایک ماہ تمہارا ہوا۔"

"شکریہ جناب!"

عبدالحق نے گھر آ کر نور بانو کو خبر سنائی۔ طے یہ پایا کہ بغیر بتائے لاہور پہنچ

کر سب کو سرپرائز دیں گے۔

"چار دن ہیں روانگی میں۔"

"کل سب کے لئے تحفے خرید لیں گے بازار چل کر۔" نور بانو نے کہا۔

وہ بھی خوش نظر آ رہی تھی۔

عبدالحق نے یعقوب سے بات کی کہ اسے یہیں رہنا ہے تو اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"ایلون سر.....؟" اس عالم میں بھی وہ انگریزی جھاڑنا نہ بھولا۔

"کیوں.....؟ آپ کو ڈر لگے گا؟" عبدالحق نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔

"سر! آپ جانے سے پہلے میری میرج کرا دیجئے۔" یعقوب نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ارے.....! چار دن بعد میں جا رہا ہوں۔ شادی کوئی ایسے ہوتی ہے؟"

"میرج میں تو ایک گھنٹہ بھی نہیں لگتا سر!"

عبدالحق نے متجسس نظروں سے اسے دیکھا۔ کوئی پسند کر رکھی ہے.....؟"

"یس سر.....! ایک ونڈو ہے سر! چار بچے بھی ہیں اس کے۔ بے سہارا ہے۔ وہ میرا خیال رکھے گی۔ میں اسے سہارا دوں گا۔"

"یہ ونڈو کیا بلا ہے مسٹر جیکب!"

"آپ اُردو اسپیکنگ لوگ شاید اسے بیوہ کہتے ہیں۔" یعقوب نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

عبدالحق کو ہنسی آ گئی۔

"اوہ.....! ہم جاہل لوگ انگریزی میں اسے وِڈو کہتے ہیں۔ آپ نے اسے کھڑکی بنا دیا..... ونڈو۔"

"لفظوں میں کیا رکھا ہے سر.....! اصل چیز ہے کام....."

"رہتی کہاں ہے وہ.....؟"

"یہ ریلوے کالونی کے ساتھ کچی بستی ہے نا سر.....! وہ وہاں رہتی ہے۔"

''اور کب شادی کرنا چاہتے ہیں آپ......؟''

''ابھی چلے چلیں سر......!''

''تو ٹھیک ہے۔ آج شام کو تمہاری شادی ہے۔ میں ابھی تمہاری میم صاحب سے بات کرتا ہوں۔ آج میں دفتر عارف بھائی کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ تم میم صاحب کے ساتھ جانا۔ وہ تمہاری دلہن کے لئے زیور اور کپڑے اور تمہارے لئے لباس خرید دیں گی۔ ٹھیک ہے......؟''

''تھینکس ٹو سر......!'' یعقوب نے کھٹ سے ایڑیاں بجا کر اسے سلیوٹ کیا۔

نور بانو بھی شاید بہت خوش تھی۔ عبدالحق نے اسے پیسے دیئے۔ اس نے یعقوب کے ساتھ جا کر بہت خوش دلی سے بہت اچھی خریداری کی۔ پھر وہ یعقوب کے ساتھ اس عورت کے گھر گئی اور تمام معاملات طے کر آئی۔

شام کو یعقوب کی شادی ہوگئی۔ عبدالحق اور نور بانو کے علاوہ عارف اور اس کی فیملی اس میں شریک تھی۔

اگلے روز عبدالحق نے ٹرین کی نشستیں بک کرالیں۔ نور بانو ہوائی جہاز کے سفر پر آمادہ نہیں تھی۔

❁ ❁ ❁

سہ پہر کا وقت تھا۔ رابعہ اپنے کمرے میں تھی اور حمیدہ اپنے کمرے میں۔ ارجمند لاؤنج میں بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی کہ ساجد آندھی طوفان کی طرح لاؤنج میں داخل ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں سوٹ کیس تھے۔ چہرہ تمتما رہا تھا، دانت نکلے ہوئے تھے۔ ارجمند کو دیکھ کر وہ ہر احتیاط بھول گیا۔

''چھوٹی چاچی! چھوٹی چاچی! چاچا آگئے۔''

ارجمند کو چھوٹی چاچی کے سوا کچھ بھی سنائی نہیں دیا۔ آگے کی بات تو اس کے شعور تک پہنچی ہی نہیں۔ ساجد نے اتنی بلند آواز میں اسے چھوٹی چاچی کہا تھا اور وہ بھی لگاتار دو بار، کہ وہ بوکھلا گئی۔ یہ آواز تو پورے گھر میں گونجی ہوگی، سب نے سن لی ہوگی۔

اس نے آنکھیں نکالیں اور ساجد کو گھورتے ہوئے تنبیہی لہجے میں کہا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے ساجد! میں نے کتنی بار تمہیں سمجھایا کہ......'' وہ دبی دبی آواز میں بولی تھی کہ بات صرف ساجد تک پہنچے۔

ساجد اس کی بات سمجھ بھی نہیں سکا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں چھوٹی......''

ارجمند نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

''میری بات کیوں نہیں سنتے ساجد! کوئی سن لے تو۔''

اس بار ساجد کی سمجھ میں بات آگئی۔

''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ چاچا آگئے ہیں۔'' اس نے کہا۔

ارجمند اس بار سنا بھی اور اس کے ہاتھوں میں سوٹ کیس بھی دیکھے۔ وہ ایک دم سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ گود میں رکھی کتاب نیچے گر گئی۔

''آغا جی آگئے......؟'' اس کا دل عجب طرح دھڑکا۔ اس نے جھک کر کتاب اٹھائی اور میز پر رکھی۔

اسی لمحے عبدالحق بیگ اٹھائے کمرے میں آیا۔ اس کے پیچھے نور بانو تھی۔

ارجمند کے لئے وقت جیسے رک گیا۔ وہ شاید خواب دیکھ رہی تھی۔

رابعہ کا کمرہ اندر کی طرف تھا۔ اس تک ساجد کی آواز پہنچی ہی نہیں۔

لیکن حمیدہ نے وہ آواز صاف سنی۔ البتہ اس کے ساتھ معاملہ ارجمند کے برعکس ہوا۔ چھوٹی چاچی کی پکار اس کے ذہن کو چھو کر گزری ضرور، لیکن شعور تک نہیں پہنچی۔ آگے کی بات اس پر حاوی آگئی تھی...... چاچا آگئے۔ عبدالحق آگیا؟ کیا سچ مچ!

وہ تو بابا کی بات پر صبر کیے بیٹھی تھی۔ کبھی سوچتی ضرور تھی کہ ہو تو گئے برسوں، اور کتنے برس لگیں گے۔ انتظار تو عبدالحق کے باپ بننے کا تھا، اور آرزو بھی۔ لیکن قیمت یہ تھی کہ برسوں سے اس نے عبدالحق کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ تو اس کی دید سے بھی محروم ہوگئی تھی۔

اور اب ساجد کہہ رہا تھا کہ وہ آگیا ہے۔ وہ آگیا ہے تو اس کا مطلب

ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

وہ مسہری سے اتری اور دروازے سے گزر کر لاؤنج کی طرف لپکی۔ ادھر سے وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو ادھر دوسرے دروازے سے عبدالحق آ رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ سننے اور دیکھنے کے بعد بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

عبدالحق نے اسے دیکھا تو بیگ چھوڑا اور اس کی طرف لپکا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس لپٹائے ہوئے دھیرے دھیرے..... اماں..... اماں..... پکار رہا تھا۔

ادھر نور بانو نے ارجمند کو لپٹا لیا تھا۔ پھر اس نے ارجمند کو ہٹایا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر اسے بہت غور سے دیکھا۔ ماشاء اللہ.....! اس کے دل نے بے ساختہ کہا۔ سچ یہ تھا کہ اس کی گلنار بہت حسین تھی۔ لیکن ارجمند کے ساتھ کھڑا کر دیا جاتا تو وہ بھی بجھ جاتی۔ اور وہ بڑی ہوگئی تھی۔ اس کو دیکھنے کی خوشی دوچند ہوگئی۔

عبدالحق حمیدہ کو تکے جا رہا تھا۔ حمیدہ کی آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹ ہل رہے تھے۔ عبدالحق نے کان لگا کر سنا۔ وہ کہہ رہی تھی، تیرا شکر ہے ربا! تیرا شکر ہے۔

خود عبدالحق نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ حمیدہ کو جیسا چھوڑ کر گیا تھا، وہ ویسی ہی ہے۔ ورنہ وہ بہت ڈرتا تھا کہ وہ بوڑھی ہوگئی ہوگی۔

''آنکھیں تو کھولو اماں.....!''

حمیدہ اس وقت نظر اتارنے کی دعا پڑھ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور اس کے سینے پر دم کیا۔

''اللہ تیرا شکر ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔

''اماں.....! میں شرمندہ ہوں کہ اتنے برس.....''

''سب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے پتر! اور اچھا ہی ہوتا ہے۔'' حمیدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تیرا اس میں کیا قصور.....؟''

''آؤ اماں.....! اب بیٹھ جاؤ۔ تھک گئی ہوگی۔'' عبدالحق نے کہا۔

''تھکن تو آج دور ہوگئی ہے پتر! ابھی تو اپنی پتری سے ملنا ہے مجھے۔'' وہ

عبدالحق کو چھوڑ کر نور بانو کی طرف بڑھی۔

نور بانو اس سے نظریں چرا رہی تھی۔

حمیدہ نے اسے دیکھا تو اپنی بدگمانیوں پر شرمندہ ہوگئی۔ اسے دکھ ہونے لگا۔ نور بانو بہت کمزور ہوگئی تھی۔

''یہ تجھے کیا ہوگیا ہے دھیے.....!'' اس نے بڑی محبت سے کہا۔

''کتنی کمزور ہوگئی ہے تو.....!''

یہ سننا تھا کہ نور بانو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ کئی طرح کے آنسو تھے، جو گھل مل کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ وہ شرمندگی کے بھی تھے، پچھتاوے کے بھی اور دکھ کے بھی۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ یہاں سے دور جا کے اس نے کیا پایا تھا..... تنہائی، خوف، زبردستی کی پالی ہوئی بیماری، جواب سچ مچ بیماری بن گئی تھی، ایسی کہ اسے چیر پھاڑ کے لئے کہا جا رہا تھا۔

حمیدہ نے اسے گلے سے لگا لیا۔

''تو فکر نہ کر دھیے! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تیری ضرورت یہ ہے کہ میں تیرا خیال رکھوں۔''

نور بانو کے آنسو اور بڑھ گئے۔

عبدالحق اب ارجمند کے سامنے کھڑا تھا۔

''تم کیسی ہو ارجمند.....!'' اس نے ابھی تک اسے نظر بھر کر نہیں دیکھا۔

''الحمدللہ آغا جی! میں ٹھیک ہوں۔''

عبدالحق چونکا۔ یہ تو کوئی اجنبی آواز ہے۔ اس نے سوچا۔ ایسی کھنکتی ہوئی، روح میں اتر کر انجان سی چھیڑ چھاڑ کرتی ہوئی آواز تو نہیں تھی اس کی۔ اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا، اور دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ ایسا حسن، ایسی رنگت اور ایسا قد و قامت۔ اس کا سر اس کے کندھے کو چھو رہا تھا۔

ارجمند کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اور عبدالحق کے لئے نگاہیں جھکانا آسان نہیں رہا تھا۔ نہ وہ حسن پرست تھا اور نہ یہ بوالہوسی۔ لیکن پہلی بار اسے حسن کی طاقت کا احساس ہو رہا تھا۔ اطمینان کی بات بس یہ تھی کہ دل میں کوئی برا خیال نہیں

تھا۔

''تمہاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے ارجمند......؟'' اس نے گڑبڑا کر پوچھا۔

''جی......! سب ٹھیک ہے۔''

''میٹرک تو تم نے کرلیا ہوگا۔''

ارجمند دھیرے سے ہنسی۔

''میں فورتھ ائیر میں ہوں آغا جی!'' اس بار اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

عبدالحق بوکھلا گیا۔

''ارے ہاں......! اتنے برس ہوگئے۔''

''آپ سے ایک شکایت کروں......؟''

''شکایت......؟'' عبدالحق اور گھبرا گیا۔

''ہاں ہاں......! کہو نا!''

''آپ نے مجھے اتنا نالائق سمجھا۔ حالانکہ میں آپ کی شاگرد ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں......!''

''آپ کو لگا کہ میں سات برس میں بھی میٹرک نہیں کرسکوں گی۔''

''نہیں نہیں! یہ بات نہیں۔ مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ اتنا وقت گزر چکا ہے۔''

''آپ کے لئے سات برس ہوا کا جھونکا تھے۔'' اس بار اس کے لہجے میں گہری افسردگی تھی۔

''اور میں نے ان برسوں میں......'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''میرا مطلب ہے کہ میں آٹھویں سے چلتے چلتے فورتھ ائیر میں آ گئی۔ کتنا فاصلہ طے کرلیا میں نے۔''

اس کی دل گرفتگی عبدالحق کے لئے دل کا بوجھ بن گئی۔

''سوری ارجی......!'' اس نے بے تکلفی سے پکار کر ازالہ کرنے کی کوشش کی۔

اور ارجمند کھل اٹھی۔ عبدالحق نے پہلی بار اسے ایسے پکارا تھا۔ لیکن عبدالحق کو پتا نہیں چلا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

''یوں ہی منہ سے نکل گیا تھا۔ ورنہ یہ برس سب سے زیادہ بھاری تو مجھ پر تھے۔ تمہارے ساتھ تو سب تھے، جبکہ میں وہاں اکیلا تھا۔''

''یہ اکیلا پن تو اندر کی بات ہے آغا جی! ورنہ آدمی بھری محفل میں بھی اکیلا رہتا ہے۔''

ہر طرح سے بڑی ہوگئی یہ لڑکی۔ عبدالحق نے سوچا۔ پھر اس نے شوخی سے کہا۔

''لیکن حساب میں کمزور ہو تم۔ میں سات برس دور نہیں رہا۔ وہ تو چھ سال تھے۔''

''میں نے تو اپنے تعلیمی سفر سے حساب لگا کر کہا ہے۔'' ارجمند نے وضاحت کی۔

''اب رہی حساب کی بات تو آپ چھ سال سات ماہ اٹھارہ دن کے بعد واپس آئے ہیں۔ بس اس میں سے سوا دو گھنٹے کم کرلیں۔''

''اتنا حساب تو میں نے نہیں لگایا تھا۔'' عبدالحق نے شرمندگی سے کہا۔

''یہ ہے نا اکیلے پن کی بات!'' ارجمند بولی۔ پھر رخ بدلتے ہوئے کہا۔

''آپ بیٹھیں! میں آپ کے لئے کچھ کروں۔ آپ نے تو استقبال کی خوشی بھی نہیں دی ہمیں۔''

اور عبدالحق کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ کچن کی طرف چلی گئی۔

''تمہارے لئے استقبال میں زیادہ خوشی ہوتی اس سرپرائز سے۔'' عبدالحق بڑبڑایا۔

❁ ❁ ❁

نور بانو نے بہت سوچا تھا، اور دور تک سوچا تھا۔ بڑی طویل منصوبہ بندی کی تھی اس نے۔ اسے یاد تھا کہ کراچی جانے سے چند دن پہلے تک کیا معاملات چل رہے تھے۔ حمیدہ اسے کسی بابا کے پاس لے جانا چاہتی تھی، اور اس نے محسوس

کیا تھا کہ وہ کوئی پہنچی ہوئی ہستی ہے، اسے اس کا بھید معلوم ہے...... یہ بھید کہ اس نے مقبول وقت میں اپنے لئے خود اولاد نہ ہونے کی دعا کی تھی۔ لیکن وہ اس کا اعتراف کسی کے سامنے بھی نہیں کر سکتی تھی، اور حمیدہ کے سامنے تو یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ اس لئے اس نے حمیدہ کے ساتھ اس بابا کے پاس جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس پر حمیدہ نے اسے دھمکی دی تھی کہ وہ عبدالحق کی دوسری شادی کرا دے گی۔ عین وقت پر اللہ نے مدد کی اور عبدالحق کا کراچی تبادلہ ہوگیا۔ ورنہ نہ جانے کیا کچھ ہوگیا ہوتا۔

لیکن نور بانو مسائل کو بھولنے والی نہیں تھی۔ اس کی کبوتر کی فطرت نہیں تھی، جو آنکھیں بند کر کے یہ سمجھ لیتا ہے کہ اب وہ بلی کو نظر ہی نہیں آ رہا ہے۔ اور وہ ایسی بھی نہیں تھی کہ خطرہ ٹل جانے پر سکون کا سانس لے اور مطمئن ہو کر بیٹھ جائے۔ اس کے نزدیک خطرے کا ٹلنا اس کے لئے مہلت تھی کہ وہ خطرے کا تدارک کرنے کے بارے میں سوچے۔

چنانچہ کراچی میں وہ سوچتی رہی۔ ذہین تو وہ تھی ہی۔ یہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ حمیدہ عبدالحق کی دوسری شادی کرا کے رہے گی، اور عبدالحق نہ چاہتے ہوئے بھی انکار نہیں کر سکے گا۔ تو اس سے بہتر تھا کہ وہ خود ہی عبدالحق کی دوسری شادی کرا دے۔

دوسری بات یہ کہ یہ اس کے لئے بہت بڑا طعنہ تھا۔ اس کی انا پر بڑی ضرب تھی کہ وہ ماں نہیں بن سکتی۔ بے شک اپنی اس احمقانہ دعا پر وہ پچھتاتی تھی۔ لیکن کر کچھ نہیں سکتی تھی۔ وہ تو کمان سے نکلا ہوا تیر تھا، جو نشانے پر بھی جا بیٹھا تھا۔ وہ اس دعا کے ردّ کے لئے دعا کر سکتی تھی، اور اس نے بہت دعا کی تھی۔ لیکن اسے یقین تھا کہ اس دعا کی قبولیت کے بعد اب یہ دعا قبول نہیں ہوگی۔

تو اب اس کا ایک ارمان تھا...... یہ کہ حمیدہ کو ماں بن کر دکھائے۔ اور اللہ کی مرضی کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ ماں نہیں بن سکتی تھی۔ لیکن کچھ ترکیب تو کر سکتی تھی۔ ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ ماں نہیں بن سکتی۔ مگر دوسروں کو دکھا تو سکتی ہے، ان پر ثابت تو کر سکتی ہے کہ وہ ماں بن گئی ہے۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے ایک منصوبہ بنا لیا تھا، جو عمل درآمد کے اعتبار سے دشوار تھا۔ لیکن ناممکن نہیں تھا۔ بس اسے موجود وسائل کو سلیقے اور ذہانت سے استعمال کرنا تھا، اور ایسی دھند پھیلانا تھی کہ کسی کو کچھ نظر نہ آئے۔

اب وہ حمیدہ سے بات کرنے کے لئے بے تاب ہو رہی تھی۔ لیکن عبدالحق حمیدہ کے پاس سے اٹھ ہی نہیں رہا تھا۔ جبکہ اسے حمیدہ سے تنہائی میں بات کرنا تھی۔ بالآخر زبیر آیا تو اسے موقع مل ہی گیا۔

عبدالحق کمرے سے نکلا اور زبیر کے پاس گیا تو وہ کمرے میں داخل ہوگئی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور پھر حمیدہ کے پاس جا بیٹھی۔

حمیدہ حیران نظر آئی۔

”کیا بات ہے نور بانو! دروازہ کیوں بند کر لیا تو نے؟“

”اکیلے میں بہت خاص بات کرنی ہے تم سے اماں!“

حمیدہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”ایسی کیا بات ہے دھیے!“

”اماں! عبدالحق صاحب کی نسل آگے نہ بڑھے، یہ تو بڑا ظلم ہوگا۔“

حمیدہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔ بس اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میرے دل میں ایک خیال آتا رہا ہے اماں...... ! یہ کہ ہم ان کی دوسری شادی کرا دیں۔“

حمیدہ کی حیرت دو چند ہوگئی۔

”یہ کیسی بات کر رہی ہے تو......؟“

”یہ تو تم بھی کہتی تھیں اماں! یاد نہیں تمہیں۔ لیکن اس وقت یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔“

”تو اب کیا ہوگیا......؟“

”میں نے جان لیا کہ میں تنگ دل اور خود غرض ہوں، اور ایسے لوگوں کو کبھی کچھ نہیں ملتا۔“

حمیدہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تو پھر......؟''

''میں نے سوچا، کیوں نہ اپنا دل بڑا کروں اور خود سے زیادہ دوسروں کے لئے سوچوں۔ میرے دل میں آیا کہ اگر میں خود عبدالحق صاحب کی دوسری شادی کرا دوں، اور وہ بھی ہنسی خوشی، محبت کے ساتھ تو ممکن ہے، اللہ کو یہ بات پسند آئے۔''

''اللہ ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتا ہے دھیے!'' حمیدہ نے بڑے خلوص سے کہا۔

نور بانو نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

''اور کون جانے کہ اللہ میرے اس خلوص سے خوش ہو کر مجھے اولاد ہی دے دے۔''

''بے شک پتری! اللہ بڑا مہربان ہے۔ اس کے ہاں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ سب خزانے اس کے ہیں۔ وہ جسے جو چاہے عطا کر دے۔''

''بس تو میں یہ فیصلہ کر کے آئی ہوں اماں! تین دن میں صاحب کی شادی کرانی ہے۔''

''تین دن......!'' حمیدہ کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔

''کوئی گڈے گڑیا کی شادی ہے؟ ارے پہلے تو......''

نور بانو نے اس کی بات کاٹ دی۔

''صرف ایک مہینے کی چھٹی ملی ہے انہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنی دُلہن کے ساتھ گزار لیں۔''

''ایسا کیا ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ کراچی بھی تو لے جا سکتا ہے۔'' حمیدہ نے اعتراض کیا۔

نور بانو سب کچھ سوچ کر آئی تھی۔

''نہیں لے جا سکتے۔ اس کی وجہ میں بعد میں بتاؤں گی۔'' نور بانو نے کہا۔

''بات یہ ہے اماں! کہ میں اب کراچی نہیں جاؤں گی۔ یہیں علاج

کراؤں گی اپنا۔''

''تب تو اس کی دلہن کو اسی کے ساتھ جانا ہی چاہئے۔ وہ وہاں اکیلا رہے گا کیا......؟''

''میں نے کہا نا اماں! کہ اس پر بعد میں بات کریں گے۔''

''پر یہ تو بتا کہ یہ سب کچھ اچانک تجھ پر سوار کیوں ہو گیا ؟''

''ایک وجہ تو میں نے تمہیں بتا دی اماں!'' نور بانو نے گہری سانس لے کر کہا۔

''اب دوسری بات بھی سن لو۔ میری صحت ایک دم سے بہت خراب ہوئی ہے۔ تم سمجھ نہیں سکتیں کہ کیسی تکلیف ہوتی ہے مجھے۔ زندگی کا کچھ پتا نہیں اماں......!'' اس کی آواز رندھ گئی۔

''سوچا! اپنی زندگی میں ہی عبدالحق کی شادی کرا دوں۔ اگر میں یوں ہی مر گئی تو......''

''اللہ نہ کرے......!'' حمیدہ نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ماؤں سے ایسی بات نہیں کرتے پتری!''

نور بانو نے نرمی سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔

''اب یہ تو اللہ ہی جانتا ہے نا اماں! لیکن مجھے ڈر لگتا ہے کہ میرے بعد شاید عبدالحق صاحب تمہارے کہنے پر بھی دوسری شادی کے لئے تیار نہ ہوں۔''

حمیدہ نے اس پر سوچا۔ واقعی، یہ ناممکن تو نہیں ہے۔

''لیکن یہ تین دن والی بات سمجھ نہیں آئی مجھے۔'' اس نے کہا۔

''دیکھو نا، ابھی تو اس کے لئے لڑکی تلاش کرنی ہے......''

''میں بہت سوچ سمجھ کر بات کر رہی ہوں اماں......!'' نور بانو نے مستحکم لہجے میں کہا۔

''لڑکی بھی میں نے تلاش کر لی ہے۔''

اس پر حمیدہ کے کان کھڑے ہوئے۔

''اور مجھے پتا بھی نہیں۔'' اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

''مجھے خود ابھی پتا چلا ہے۔''

''کیا مطلب ....؟''

''تم نے کب سے ارجمند کو غور سے نہیں دیکھا اماں ....؟''

حمیدہ کا منہ کھلا اور کھلے کا کھلا رہ گیا۔

اس کی کیفیت سے بے خبر نور بانو اپنی کہے جا رہی تھی۔

''وہ کتنی بڑی ہوگئی ہے اماں! اور کتنی خوب صورت۔ چاند گھر میں ہے اماں! تو ہم داغ ڈھونڈنے گھر کے باہر کیوں پھریں؟ یہ تو بے وقوفی ہوگی۔''

حمیدہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ خواب اس کا، اور تعبیر دینے والی نور بانو .... نور بانو ....!

''اب بولو اماں! ایسے میں تین دن کم تو نہیں ہوتے۔ خریداری کے لئے دو دن بہت ہیں۔''

چند لمحے تو حمیدہ سے بولا ہی نہیں گیا۔

''لیکن نکی کی مرضی نہ ہوئی تو ....'' دل کا اندیشہ بالآخر زبان پر آ گیا۔

''تم فکر نہ کرو اماں! میں ہوں نا....! یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ انہیں بھی میں ہی منا لوں گی اور ارجی کو بھی۔ تم بس تیاری کرو شادی کی۔ کل صبح میں تمہیں پکی خوش خبری سناؤں گی۔ پھر رابعہ آپا سے بھی بات کر لینا اور گاؤں بھی فون کر دینا زرینہ کو.... اور مسعود چچا کو بھی۔''

''ٹھیک ہے....!'' حمیدہ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب نور بانو اٹھی اور کب دروازہ کھول کر چلی گئی۔ وہ تو جاگتی آنکھوں خواب دیکھ رہی تھی۔ لیکن دل میں اندیشے بھی تھے۔ کہیں نکی.... لیکن نہیں، وہ تو بتا چکی تھی کہ وہ کسی کو پسند نہیں کرتی۔ لیکن عبدالحق کیسے مانے گا؟ وہ تو اس کے سامنے کی بچی ہے۔ وہ تو اسے بچی ہی سمجھتا ہے۔

اچانک اس کی سماعت میں بابا کی آواز گونجی .... تجھے کچھ نہیں کرنا، تیری بہو خود ہی کرائے گی تیرے بیٹے کی دوسری شادی۔ وہ نادان اسے بھی کھیل سمجھ کر کھیلے گی۔ اور وہ کھل اٹھی۔ اللہ کے ولی کی بات سچی ثابت ہوئی۔ اس نے خوش ہو کر

سوچا۔

لیکن آگے کی بات نے اسے ڈرا دیا۔ اگر یہ نور بانو کا کھیل ہے تو کیسا کھیل ہے؟ اس میں اس کا کیا فائدہ؟ وہ کیا چاہتی ہے؟ کیا سوچا ہے اس نے؟ نہیں، مجھے تو اس کی باتوں میں خلوص ہی نظر آیا ہے۔ بندہ تائب بھی تو ہو جاتا ہے۔

وہ الجھنے لگی.... نور بانو سے پوچھے، اسے کریدے....

بابا کی آواز پھر اس کے کانوں میں گونجی.... اور تجھے میں سختی سے تاکید کر رہا ہوں کہ تو خود کچھ بھی نہیں کرنا۔ زبان سے بھی کچھ نہ کہنا۔ سب اللہ پر چھوڑ دے، اپنے بیٹے کی طرح۔

اور اسے سکون آ گیا۔

بابا نے کہا تھا.... تجھے تو بس پوتا چاہئے، وہ انشاء اللہ تجھے مل جائے گا۔ اور کیا چاہئے تجھے؟

تیرا شکر ہے ربا....! پر بندہ تو محتاج ہے۔ کچھ نہ کچھ مانگتا ہی رہے گا۔ وہ بڑبڑائی۔ اس نے جواب میں یہ کہنے کی غلطی نہیں کی کہ اور مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ یہ سبق تو اس نے نور بانو سے ہی سیکھا تھا۔ بندے کو بھی یہ کہنے کی غلطی نہیں کرنی چاہئے کہ اور مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ ارے....! بندہ تو محتاج ہے اپنے رب کا۔ اس کا اعلان کرتے رہنا چاہئے۔

اور بابا نے کہا تھا.... کون جانے، تجھے بہو وہ ملے جو تجھے دل سے پسند ہو۔

اور یہ سچ تھا۔ اسے ایسی ہی بہو مل رہی تھی، اور وہ بھی بن مانگے۔

اس نے ذہن پر زور دیا۔

اور بابا نے کہا تھا۔ کون جانے، وہ تیرے بیٹے کو اس کا کھویا ہوا مرتبہ اور مقام دلانے والی ہو۔

مجھے تو نہیں معلوم کہ عبدالحق کا کوئی مقام اور مرتبہ تھا، جو کھو گیا ہے، اس نے سوچا۔

اور بابا نے کہا تھا ..... کون جانے، وہ اس کی تقدیر بدل دینے والی ہو۔
اولاد ہوگی تو تقدیر تو بدلے گی نا!
اور آخر میں بابا نے کہا تھا ..... کون جانے، بس اللہ ہی جانے۔
وہ مطمئن اور پرُسکون ہوگئی۔ سچ تو ہے۔ کوئی نہیں جان سکتا۔ بس اللہ یہ جانتا ہے۔
اس کی خوشی کو کوئی حد نہیں تھی۔ وہ بے قرار تھی کہ جلدی سے مغرب ہو تو وہ نماز کے بعد شکر کے نفل بھی پڑھے۔

❁ ❁ ❁

ارجمند تو اپنی خوشی میں کچن میں یوں گھسی کہ درمیان میں صرف نماز کے لئے ہی نکلی۔ شام کی چائے پر اس نے بالکل اہتمام نہیں کیا کہ اس کے بعد شاید کھانا ٹھیک سے نہ کھایا جائے۔
شام کی چائے باہر لان میں پی گئی اور وہاں سب موجود تھے۔ پرانے دنوں کی یاد تازہ ہوگئی تھی۔ لیکن ارجمند کو تو کھانے کی فکر تھی۔ وہ چائے پیتے ہی اندر جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
''اتنے برسوں کے بعد ملے ہیں، اور تم بات ہی نہیں کر رہی ہو۔'' نور بانو نے شکایتاً کہا۔ یہ بات آمد کے بعد سے اب تک وہ مسلسل محسوس کر رہی تھی کہ ایک بار ملنے کے بعد ارجمند سامنے ہی نہیں آئی ہے۔ اس کا دل اندیشوں سے بھر گیا تھا۔
''کہیں تم خفا تو نہیں ہو ہم سے.....؟'' اس کے لہجے میں خوف تھا۔
''کیسی باتیں کرتی ہیں آپی! میں آپ سے خفا ہو سکتی ہوں بھلا!''
اس پر عبدالحق کو لگا کہ ارجمند شاید اس سے خفا ہے۔ لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ خاموش رہا۔
''تو پھر ہمارے پاس بیٹھتی کیوں نہیں؟ باتیں کیوں نہیں کرتیں ہم سے؟'' نور بانو بولی۔
''رات کے کھانے کے بعد اطمینان سے باتیں کریں گے آپی!'' ارجمند نے جواب دیا اور جیسے رسی تڑا کر بھاگ نکلی۔

نور بانو کے لئے یہ تشویش کی بات تھی۔ اتنا سن کر بھی نہیں رکی ارجمند، کہیں کوئی بات تو نہیں۔
اس کے بعد تو وہ پریشان ہی رہی۔ اس کے منصوبے میں ارجمند کی خاص اہمیت تھی۔ اس کے بغیر تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اور اب تو وہ حمیدہ کے سامنے بات بھی منہ سے نکال بیٹھی تھی۔
اس کے بعد وہ تمام وقت اپنے کمرے میں بند اسی پر سوچتی رہی۔ ارجمند نے ایک بار بھی آ کر اسے نہیں پوچھا۔ اسے یقین ہونے لگا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ منصوبہ بناتے ہوئے وہ سب سے اہم بات نظرانداز کر گئی تھی۔ ارجمند اسے سچ مچ بہت چاہتی تھی، اور وہ خود بھی اس سے ایسی ہی محبت کرتی تھی۔ ورنہ اپنی عزیز ترین متاع میں اس کے ساتھ ساجھے کا کیوں سوچتی؟ لیکن جب تک ارجمند سامنے تھی تو اور بات تھی۔ جب وہ یہاں سے فرار ہوگئی تو معاملات اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ چھ سال کی دوری بہت ہوتی ہے، اور وہ بھی ایک بڑی ہوتی ہوئی بچی کے معاملے میں۔ جب وہ اسے چھوڑ کر گئی تھی تو وہ آٹھویں جماعت میں پڑھ رہی تھی، اور اب واپس آئی ہے تو وہ چودھویں جماعت پاس کرنے والی ہے۔ اس دوران وہ کالج میں بھی تو پڑھی ہے۔ عبدالحق کی طرح۔ اور وہاں لڑکے بھی ہوتے ہوں گے۔ ارجمند اس عمر میں تھی، جہاں لڑکیوں کو محض محبت سے محبت ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی اچھا لگنے لگتا ہے۔
نور بانو کا دل اندیشوں سے بھر گیا۔ اس نے واقعی بڑی غفلت کی۔ اسے پہلے ہی سے ارجمند کو تیار کرنا چاہئے تھا۔ لیکن کیسے کرتی۔ وہ بچی ہی تو تھی اس سے ایسی بات کیسے کرتی؟
دراصل چھ سال کی دوری میں بھی وہ اسے وہی بچی لگی۔ آدمی کسی کو چھوڑ کر دور جاتا ہے تو کتنے ہی برس دور رہے، ان کی آنکھوں میں اس کی وہی آخری دید رہتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو ارجمند کو دیکھ کر اسے جھٹکا کیوں لگتا؟ وہ تو حیران رہ گئی تھی اسے دیکھ کر۔ ارے.....! ارجمند تو جوان ہوگئی اور کتنی حسین ہے۔ اتنا لمبا قد۔ کالج میں کتنے ہی لڑکے اس کے خواب دیکھتے ہوں گے۔ اچھی تو وہ بھی

کو لگتی ہوگی۔ حسن کی تعری اور اس عمر میں، لڑکیاں تو موم ہو جاتی ہیں۔ کچھ عجب تو نہیں کہ اسے بھی کسی سے محبت ہوگئی ہو۔ اگر ایسا ہوگیا ہے تو معاملہ آسان نہیں۔

مگر اس کے اندر کہیں یہ اعتماد بھی تھا کہ اس صورت میں بھی وہ ارجمند کو رضامند کر لے گی۔ اس نے ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہیں سوچا کہ اس طرح وہ ارجمند کو اس کی بہت بڑی خوشی سے محروم کرے گی، بلکہ اسے بددیانتی میں بھی مبتلا کرے گی۔ اور یہ کہ یہ اس کی خود غرضی ہوگی۔

بہرحال وہ متردد ہی رہی۔

لیکن جب کھانا لگا تو وہ حیران رہ گئی۔ ارجمند نے کئی طرح کے کھانے پکائے تھے۔ یہ سب کرنا تھا تو وہ کسی کو وقت کیسے دے سکتی تھی؟ اور یہ بھی اس کی محبت کا ہی ثبوت تھا۔

حمیدہ خود حیران تھی۔

''ٹکی......! اتنا کچھ کرلیا تو نے......؟''

اور عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔

''اتنی بھوک لگ رہی ہے مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کھاؤں؟''

''سب کچھ کھائیں آغا جی......!''

''اتنا کھانا دیکھ کر تو بھوک ہی ختم ہوگئی میری۔''

''تو میری محنت رائیگاں گئی؟'' ارجمند نے اداسی سے کہا۔

حمیدہ نے عبدالحق کو خفگی سے گھورا۔ وہ پہلے ہی شرمندہ ہو رہا تھا۔

''میں نے تو محاورتاً کہا تھا ارجمند!'' وہ جلدی سے بولا۔

''ورنہ اب تم دیکھنا، یہ تو کم پڑ جائے گا۔''

ارجمند بچوں کی طرح خوش ہوگئی۔

''اس کی فکر نہ کریں آغا جی! میں اور لے آؤں گی۔''

اور جب کھانا شروع ہوا تو سبھی نے بہت اچھی طرح کھایا، اور سبھی نے تعریف کی۔

''بھئی! میں تو زیادہ ہی کھا گیا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''برسوں کا بھوکا تھا۔ برسوں سے ایسا کھانا نہیں کھایا تھا۔''

اس پر نور بانو اسے گھورنے لگی۔ عبدالحق گڑبڑا گیا۔

''میں تو کھانا پکانا ہی بھول گئی اماں!'' نور بانو نے وضاحت کی۔

''طبیعت ہی اتنی خراب رہتی تھی۔''

''وہ تو نظر آ رہا ہے۔'' حمیدہ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''کیا حال ہوگیا ہے تیرا! پر تو فکر نہ کر۔ میں سب ٹھیک کر دوں گی۔''

یوں موضوع بدل گیا۔

کھانے کے بعد نور بانو نے سرگوشی میں ارجمند سے کہا۔

''اب تو میرے پاس بیٹھو گی نا تم...... ؟''

''نماز پڑھ کر آتی ہوں آپی!''

''میں اپنے کمرے میں ہوں۔ خوب باتیں کریں گے ہم۔ میں تو ترس گئی ہوں تم سے باتیں کرنے کے لئے۔''

ارجمند خوشی سے مسکرائی۔

''میرا بھی یہی حال ہے آپی......!''

***

رات برسوں کے بعد ملنے والوں کی دو محفلیں جمیں۔ ایک حمیدہ کے کمرے میں، جہاں رابعہ، زبیر اور ساجد بھی تھے۔ دوسری عبدالحق کی خواب گاہ میں، جہاں بس نور بانو اور ارجمند تھیں۔

پہلے تو ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ارجمند نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

''آپ بہت کمزور ہوگئی ہیں آپی! کراچی میں رہ کر صحت بہت خراب ہوگئی آپ کی۔ اس سے تو اچھا تھا آپ کراچی نہ جاتیں۔''

''یہ وہ بات نہیں پگلی......!'' نور بانو نے آہ بھر کر کہا۔ اب وہ سوچی سمجھی گفتگو کرنے والی تھی۔

''یہ تو اندر کا روگ ہے میری گڑیا......!''

''کیسا روگ آپی.....! مجھے بھی نہیں بتائیں گی.....؟''

''تم سے تو میں دل کی ہر بات کہہ سکتی ہوں۔ ایک تم ہی تو ہو۔ لیکن یہ تو کھلا روگ ہے۔''

''میں سمجھی نہیں آپی.....!''

''مجھے اولاد کی بڑی آرزو ہے۔ کسے نہیں ہوتی۔ مگر اللہ کی مرضی کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ اب یہ آرزو روگ بنی تو صرف عبدالحق صاحب کی خاطر۔ میں نہیں چاہتی کہ ان کی نسل آگے نہ بڑھے، انہی پر ختم ہو جائے۔''

''اللہ نہ کرے۔'' ارجمند نے بے ساختہ کہا۔

''یہ روگ مجھے اندر ہی اندر چاٹ رہا ہے۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ! میں بہت دعا کرتی ہوں آپی!'' ارجمند نے بڑے خلوص سے کہا۔

''مجھے لگا ہے کہ میرے اندر کوئی کمی ہے۔ اب تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں کبھی ماں نہیں بن سکوں گی۔''

''ایسی ناامیدی کی باتیں نہیں کرتے آپی!''

''یہی تو بات ہے ارجی! میں امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑتی۔ لیکن میں حقیقت پسند بھی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میرے نصیب میں ماں بننا نہیں ہے۔''

''یہ ناامیدی نہیں تو اور کیا ہے؟'' ارجمند کے لہجے میں ہلکی سی خفگی تھی۔

''میں ناامید کب ہوں۔ حقیقت سامنے رکھتی ہوں، اور مسئلے کا حل سوچتی ہوں۔ امید تو نہیں چھوڑی میں نے۔ میں ماں نہیں بن سکتی، لیکن مجھے اولاد مل سکتی ہے۔ میں نے بہت سوچا ہے اس پر۔ بس ایک ہی حل ہے۔ صرف تم ہی میری مدد کر سکتی ہو۔''

''میں تو بہت دعا کرتی ہوں آپی!'' ارجمند نے سادگی سے کہا۔

''لیکن اس کے لئے دعا کے ساتھ اور کچھ بھی کرنا ہوگا تمہیں۔''

''میں آپ کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہوں آپی!''

''سوچ لو.....! کہنا بہت آسان ہوتا ہے۔''

''میرے لئے کرنا زیادہ آسان ہے کہنے سے۔ آپ بس مجھے یہ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا ہے؟''

''پہلے یہ بتاؤ! تم کسی کو پسند کرتی ہو.....؟ کسی سے محبت کرتی ہو.....؟''

سوال اتنا اچانک تھا کہ ارجمند کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''جی.....!'' لیکن جی ہاں کہنے سے پہلے ہی اس نے خود کو روک لیا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''جی نہیں آپی!''

سوال کرتے ہوئے نور بانو نے اس کے چہرے پر نظر رکھی تھی۔ اس نے ارجمند کے نہ کہنے کے باوجود وہ ''جی ہاں'' سمجھ لیا۔ اس نے جان لیا کہ بعد کی ''جی نہیں'' محض رہی تھی۔ وہ تشویش میں مبتلا ہو گئی۔ لیکن تھی وہ دُھن کی پکی۔ ایک کم عمر لڑکی کو اس کی محبت سے ہٹانا آسان نہیں تھا، لیکن ناممکن بھی نہیں تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ اس کے لئے بہت ضروری تھا۔ اسے ہر صورت میں رضامند کرنا تھا۔

''تم کچھ بھی کر سکتی ہو میرے لئے.....؟'' اس کے لہجے میں چیلنج تھا۔

اس بار ارجمند نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''جی آپی..... ! میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔''

اپنے آنسوؤں پر نور بانو کو پورا کنٹرول تھا۔ وہ جب چاہتی، رو سکتی تھی۔ چنانچہ اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رونے لگی۔

''کیا ہو گیا آپی! ایسے نہ روئیں۔'' ارجمند نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''میرا دل کٹتا ہے آپی!''

نور بانو کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

''آپ تو کچھ کہہ رہی تھیں کہ آپ امید نہیں چھوڑتیں، اور آپ نے کہا کہ میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں، تو پھر رو کیوں رہی ہیں؟ حکم دیں مجھے۔''

''یہ سچ ہے کہ صرف تم ہی مجھے اولاد دلا سکتی ہو۔'' نور بانو نے ہچکیوں کے

درمیان کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتی یہ بات ......!'' ارجمند نے بے بسی سے کہا۔

''اولاد بازار میں ملتی ہوتی تو میں آپ کی گود بھر دیتی۔''

''تم اس کے باوجود میری گود بھر سکتی ہو۔''

''تو مجھے بتائیں تو ...... حکم تو کریں۔'' ارجمند نور بانو کی تیار کی ہوئی رو میں بہہ رہی تھی۔

''لیکن تم میری بہن ہو...... میری کھوئی ہوئی بہن ...... جو اللہ کی رحمت سے مجھے واپس مل گئی۔ اور جو کچھ میں تم سے چاہتی ہوں، وہ بہت بڑی خودغرضی ہے۔ میں یہ کیسے کر سکتی ہوں؟ تم سے اتنی بڑی قربانی...... تمہارے وجود کی قربانی کیسے مانگ سکتی ہوں میں......؟''

''میں جو کہہ رہی ہوں آپ سے۔ میں کچھ بھی کر سکتی ہوں آپ کے لئے۔''

''تم اپنی محبت قربان کر سکتی ہو میرے لئے ......؟'' نور بانو نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

ارجمند کے ہوش اُڑ گئے۔ کیا آپی جانتی ہیں میری محبت کے بارے میں؟ اور قربانی؟ پھر اسے خیال آیا کہ اس کا دل اسے کیسے کیسے یقین دلاتا رہا ہے۔

''آپی! مجھے کسی سے محبت نہیں۔'' اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''لیکن ہوتی تو بھی میں اسے آپ کے لئے قربان کر دیتی۔''

نور بانو کا یقین پختہ ہو گیا کہ ارجمند کسی سے محبت کرتی ہے۔ لیکن یہ اطمینان بھی ہو گیا کہ اب وہ اس کی بات نہیں ٹالے گی۔

''تمہیں میری خاطر ...... میری گڑیا......! بہن ......! میری خاطر شادی کرنی ہوگی۔''

ارجمند کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ خوفزدہ نظروں سے نور بانو کو دیکھتی رہی۔ اس کے وجود میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

''ہاں......! تمہیں اپنے آغا جی سے شادی کرنی ہوگی۔''

ارجمند کے چہرے کا تاثر تیزی سے بدلا۔ اب وہاں حیرت ہی حیرت تھی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' وہ کہیں دور سے بول رہی تھی۔

نور بانو نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میری خاطر میری جان ......!'' اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''یہی ایک صورت ہے گڑیا......! میں جانتی ہوں کہ میں تم سے بہت بڑی قربانی مانگ رہی ہوں۔ لیکن بہن سمجھتی ہوں تمہیں، تو یہ تم پر میرا حق بھی ہے۔ یہ مجھ پر احسان ہوگا تمہارا، جو میں کبھی نہیں بھولوں گی۔''

ارجمند نے سنا تھا اور بالکل صاف سنا تھا۔ لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ شاید آپی سے کہنے میں غلطی ہوئی ہے یا پھر اس نے سننے میں۔

''یہ...... یہ کیسے ممکن ہے آپی!''

''کیوں ممکن نہیں؟'' نور بانو نے اس کا ہاتھ تھامے تھامے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

''خدا گواہ ہے کہ میں تمہیں اپنی چھوٹی بہن گلنار کا مقام دیتی ہوں، اتنی ہی محبت کرتی ہوں تم سے۔ لیکن خدا کا شکر کہ تم گلنار نہیں ہو۔ میں اور تم چاہے سمجھیں، لیکن اللہ کے ہاں ہم سگی بہنیں تو نہیں ہیں۔ ورنہ تو میں تم سے یہ بات نہیں کہہ سکتی تھی، کیونکہ اللہ نے دو سگی بہنوں کو نکاح میں یکجا کرنا حرام کیا ہے مردوں پر۔''

تو یہ سچ ہے۔ ارجمند نے بے یقینی سے سوچا۔ یہ وضاحت ثابت کر رہی ہے۔ نہیں ...... یہ ضرور کوئی خواب ہے۔

نور بانو اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اس بے یقینی کو ہچکچاہٹ پر محمول کیا۔

''میں جانتی ہوں کہ تم نے کبھی اپنے آغا جی کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا ...... سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ اور وہ تم سے بہت بڑے ہیں عمر میں۔ لیکن تم جانتی ہو کہ وہ بہت اچھے ہیں۔ اور پھر تم مجھ پر احسان کر رہی ہو۔''

ارجمند اب ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔ یہ کیسی اَن ہونی تھی۔ آپی خود اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری کر رہی ہیں، اور کہہ رہی ہیں کہ یہ ان پر احسان ہوگا۔ یہ تو آغا جی پر کسی کی پرچھائیں بھی برداشت کرنے والی نہیں۔ اور یہ خود میرے دل کی مراد میری جھولی میں ڈال رہی ہیں۔ میرے اندر بیٹھے اللہ میاں نے یہی کہا تھا...... سب کچھ ہوگا، مگر اپنے مقررہ وقت پر۔ تو وہ اللہ میاں ہی تھے۔ اور وقت آ گیا۔

اس کی سوچوں نے نور بانو کو پریشان کر دیا۔

''میری خاطر...... میری بہن......! میری خاطر ہاں کر دو۔'' اس نے ارجمند کو جھنجوڑ دیا۔

ارجمند نے ان لمحوں میں یہ بات سمجھ لی کہ اسے آغا جان میں اپنی دلچسپی، ان کی محبت چھپانی ہے۔ ورنہ آپی کو تکلیف ہوگی۔ اللہ جس طرح سے عطا فرما رہا ہے، اسی طرح سے اسے قبول کرنا ہوگا۔ اور اظہار کی ضرورت بھی کیا ہے، جبکہ آغا جان اسے مل رہے ہیں۔

''مجھ پر احسان کر دو میری بہن......!'' نور بانو کا بس نہ چلا تو وہ رونے لگی۔

ارجمند سچ مچ تڑپ گئی۔ یہ تو ناشکرا پن ہوگا کہ اس کی جھولی منہ مانگی خوشیوں سے بھرنے والی نور بانو روئے۔ اس نے نور بانو کو لپٹا لیا۔

''احسان کیسا آپی! یہ تو آپ کا احسان ہے کہ آپ نے مجھ پر مان کیا، بہن سمجھا، میں آپ کو انکار کر سکتی ہوں بھلا؟''

نور بانو خوشی سے ہنس دی۔

''میں آخری سانس تک تمہاری شکرگزار رہوں گی۔''

''اس کی ضرورت نہیں آپی! یہ تو بہنوں کا معاملہ ہے۔ مگر مجھے ایک الجھن ہے۔ میں ہی کیوں؟ آغا جی اتنے اچھے ہیں۔ ان کے لئے کوئی کمی تو نہیں تھی۔ پھر میں ہی کیوں......؟''

نور بانو نے محبت سے اس کے رخسار تھپتھپائے۔

''تم بہت معصوم ہو پگلی! کچھ بھی نہیں سمجھتیں۔'' اس نے بے حد محبت سے کہا۔

''تمہارے آغا جی میرا بہت قیمتی خزانہ ہے۔ اس خزانے میں سے کسی کو ایک ذرّہ دینا بھی مجھے گوارہ نہیں۔ ان کی دوسری شادی کے مقابلے میں تو مجھے مرنا قبول ہوتا۔ لیکن اللہ نے مجھے تمہاری ایسی محبت دی ہے کہ اگر مجھے پتا چلے کہ اس میں تمہاری خوشی ہے تو پورا خزانہ تمہیں دے دوں۔ یہ تو خیر میں اپنی غرض کے لئے کر رہی ہوں۔ لیکن سچ کہہ رہی ہوں ارجی! دنیا میں ایک تمہی تو ہو، جس کے ساتھ میں ان کا ساجھا کر سکتی ہوں۔''

اللہ کے کام کیسے ہوتے ہیں، جس سے جو چاہے دلا دے کسی کو۔ ارجمند نے سوچا۔

''چلیں آپی! میں نے آپ کی بات مان لی۔ مگر مجھے یہ تو بتائیں کہ اس سے آپ کو اولاد کیسے ملے گی؟''

''ابھی تم یہ باتیں سمجھتی نہیں ہو۔'' نور بانو نے مربیانہ انداز میں کہا۔

''بس تم میرے کہنے پر عمل کرتی رہنا۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔'' وہ چند لمحے خاموشی سے کچھ سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

''مگر ایک بات پہلے ہی بتا دوں۔ تمہیں اپنا بچہ مجھے دینا ہوگا۔''

ارجمند تو بیر بہوٹی ہوگئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔

''اور وہ بھی ایسے کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ لوگ یہی سمجھیں کہ وہ میرا بچہ ہے۔''

ارجمند پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ کیسے ممکن ہے، لیکن شرم سے نہ پوچھ سکی۔

''آپ جانیں آپی! میں تو بس وہی کروں گی جو آپ کہیں گی۔''

''بس تو ٹھیک ہے۔ خوش رہو میری بہن......! اتنی قربانی تو میری گلنار بھی نہیں دیتی میرے لئے۔'' نور بانو نے کہا۔ پھر کچھ یاد آیا تو وہ اداس ہوگئی۔

''اور گلنار کو تو بڑی آرزو تھی بھائی کی۔ وہ تو انہیں بھائی سمجھتی تھی۔'' وہ پھر بولی۔

"تم نے تو کبھی انہیں بھائی نہیں سمجھا نا......؟" اس نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"نہیں آپی......!" ارجمند نے بے ساختہ کہا اور فوراً ہی گھبرا بھی گئی۔

"خدا کا شکر ہے......!" نور بانو نے بے حد خلوص سے کہا۔

***

ارجمند نے نور بانو کے پاس سے آتے ہی شکر کے دو نفل ادا کئے، اور وہ سجدے میں روتی رہی۔ اتنی بڑی نعمت جو اس طرح بے گمان ملی اور خیر کے ساتھ ملی، تو اس کے پاس اس کا شکر ادا کرنے کے لئے لفظ تھے ہی نہیں۔ اور آنسوؤں سے اچھا، سچا اور بلیغ ترجمان کوئی نہیں ہوتا۔

وہ ایسی خوش تھی کہ اس رات وہ سو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ بستر پر لیٹی سوچتی رہی۔ اپنی زندگی کے بارے میں۔ کہاں کہاں سے گزر کر وہ کہاں پہنچی تھی۔ زندگی کا ہر ہر لمحہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے عبارت تھا۔

اسے یاد تھا کہ وہ نیلم بائی کے گھر کیسے پہنچی تھی۔ وہ معصوم بچی تھی۔ لیکن اس کا حافظہ بلا کا تھا۔ ہر بات یاد تھی اسے۔ لیکن وہ سمجھ نہیں سکتی تھی۔

لیکن اب وہ سب کچھ سمجھ چکی تھی۔

اُردو ادب سے اسے لگاؤ تھا۔ کالج میں تعلیم کے دوران وہ کثرت سے مطالعہ کرتی رہی۔ لیکن جب اس نے غلام عباس کا شاہکار افسانہ "آنندی" پڑھا تو جیسے اس پر حجرۂ ہفت بلا کا در کھل گیا۔ اس ایک افسانے نے اس کی معصومیت کو آگہی میں تبدیل کر دیا۔ وہ افسانہ وہ بار بار پڑھتی رہی۔ ہر بار اپنی اور پھپھو کی زندگی کا نکتہ اس پر کھل جاتا۔

اس کا وہاں دم گھٹتا تھا۔ لیکن بہرحال اسے وہ گھر سمجھتی تھی۔ اب اسے پتا چلا کہ وہ طوائف کا کوٹھا تھا۔ اب اسے پتا چلا کہ پھپھو کے پاس آنے والے ان سے شادی کی امیدوار نہیں، ان کے جسم کے خریدار تھے۔ پھپھو ہر رات کس قیامت سے گزرتی تھیں، یہ سوچ کر اس کی روح تک میں زخم پڑ گئے۔ وہ بالا خانے پر سج سنور کر بیٹھی ہوئی لڑکیاں گاہکوں کو لبھاتی، بلاتی تھیں۔ تبھی تو پھپھو اسے وہاں نہیں

جانے دیتی تھیں۔ پھپھو اس کا اتنا خیال کیوں رکھتی تھیں؟ یہ بھی اس کی سمجھ میں آ گیا۔ اور اس نے جان لیا کہ پھپھو نے اسے اس دلدل سے محفوظ رکھنے کے لئے کتنی بڑی قربانی دی۔ ورنہ وہ جان دے دیتیں، وہ سب کچھ قبول نہ کرتیں۔

پہلے تو سارے منفی رخ اس پر کھلے۔ اسے خود سے بھی گھن آنے لگی۔

لیکن پھر دل میں رہنے والے اللہ میاں نے اسے مثبت انداز میں سوچنا سکھایا۔ پھپھو اس کوٹھے پر بھی نماز پڑھتی تھیں، قرآن پڑھتیں تھی، اور اور اسے پڑھاتی بھی تھیں۔ یہ اللہ کی رحمت ہی تو تھی۔

اور کیسی عجیب بات تھی کہ اس نے پہلی بار آغا جی کو دیکھا تو وہ بالا خانے پر ان لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہیں اس نے ان کی تصویر بنائی تھی، اور وہیں سے وہ اس کی نگاہوں میں ایسے بسے کہ کبھی دور نہ ہوئے۔ اس روز وہ بہت ضد کر کے بالا خانے پر آئی تھی۔ ورنہ پھپھو اسے وہاں کبھی جانے ہی نہیں دیتی تھیں۔ یہ اللہ کا انداز تھا۔ کسی کو کسی سے ملانے کا۔ کوڑے کے ڈھیر پر دو پاک روحوں کی ملاقات۔

اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ کوٹھے پر گزری ہوئی اس زندگی میں اللہ نے اپنی کتنی کھلی نشانیاں دکھائی تھیں اسے۔

پھر اسے اچھو میاں والا واقعہ یاد آیا۔ وہ کتنا ڈر گئی تھی۔ لیکن پھپھو نے اسے سمجھایا تھا کہ اچھو میاں برے آدمی نہیں۔ جو کچھ ہوا، وہ غلطی سے ہوا۔ وہ کسی سے اس بات کا تذکرہ نہ کرے۔ اب وہ کسی حد تک اس واقعے کو بھی سمجھ سکتی تھی کہ وہ کس طرح کی غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ اور اسے اچھو میاں کا اسے بیٹا کہہ کر، پھوٹ پھوٹ کر رونا بھی یاد تھا۔ بعد میں تو وہ انہیں نانا کہنے لگی تھی۔ ویسے تو اس کوٹھے پر وہ واحد آدمی تھے، جو اسے اچھے لگتے تھے۔

پھر اس نے یہ معجزہ بھی دیکھا کہ اچھو میاں کیسے تبدیل ہو گئے۔ وہ ان دونوں کی ڈھال بن گئے۔ اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ ان دونوں کا خیال نہ ہوتا تو وہ بہت پہلے کوٹھا چھوڑ کر چلے گئے ہوتے۔ پھر تو یہ ہوا کہ اچھو میاں اس کے ساتھ بیٹھ کر پھپھو سے قرآن پڑھنے لگے۔ پھر انہوں نے نماز بھی شروع کر دی۔ کتنے خوب صورت ہو گئے تھے وہ۔ ان کے چہرے سے روشنی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔

اور وہ بچی تھی۔ سمجھتی نہیں تھی، لیکن دیکھتی تھی کہ پھپھو کوٹھے پر کبھی رغبت سے کھانا نہیں کھاتی تھیں۔

پھر اس نے ایک اور معجزہ دیکھا۔ بوا ایک کونے میں پڑ گئیں اور ان کی حیثیت پھپھو کو مل گئی۔ اب وہ ہر چیز کی مالک تھیں۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ اس کے ساتھ سونے لگیں۔ اب وہ اس کی وجہ بھی سمجھ سکتی تھی۔ اللہ نے اپنی رحمت سے انہیں محفوظ کر دیا تھا۔ انہیں اس زندگی سے سے بچا لیا تھا، جس سے وہ چڑتی تھیں۔ اللہ نے کوٹھے پر ہوتے ہوئے بھی انہیں محفوظ کر دیا تھا۔

اس نے ان دنوں کا تصور کیا اور حیران رہ گئی۔ کوٹھے کی مالک بننے کے بعد پھپھو نے ہر دن وہاں ایسے گزارا تھا، جیسے کوئی خاتونِ خانہ، عشاء پڑھ کر وہ سو جاتیں۔ فجر کے وقت اٹھتیں، نماز پڑھتیں، قرآن پڑھتیں، پھر کرتوں کی سلائی کڑھائی۔ کھانا وہ خود پکاتی تھیں، اور رغبت سے کھاتی تھیں۔ کوٹھے سے وہ ایک پیسہ بھی نہیں لیتی تھیں۔ کہتی تھیں، یہ حرام ہے۔ اللہ نے ہمارے لئے رزقِ حلال جاری فرما دیا ہے...... الحمدللہ!

اسے یاد تھا، کبھی کئی کئی دن تک گھر میں دال پکتی تھی۔ اور باقی لوگوں کے لئے تو باہر سے کھانا آتا تھا۔ وہ مزے مزے کے کھانے ہوتے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر گوشت کھانے کو ترستی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پھپھو ہر چیز کی مالک ہیں۔ کوئی لڑکی کچھ بھی مانگے، اسے دیتی ہیں۔ مگر اپنے لئے گوشت بھی نہیں منگا سکتیں۔ ایسے میں پھپھو نے اسے سمجھایا تھا۔

اب وہ اللہ کی رحمت کو سمجھ سکتی تھی۔ وہ تو معجزہ ہی تھا۔ اللہ میاں نے طوائف کے کوٹھے کو پھپھو، نانا اور اس کے لئے گھر بنا دیا تھا۔ جہاں حرام کے سوا کچھ نہیں تھا، وہاں اللہ نے ان کے لئے رزقِ حلال جاری فرما دیا تھا۔ پھپھو مزدوری کرتی تھیں، اور نانا وہ کرتے دکان والے کو دے کر آتے تھے۔ اور وہ تینوں کوٹھے پر رہ کر بھی اللہ کا عطا کیا ہوا حلال رزق پاتے تھے۔

اور اس پر آغا جی کے معاملے میں اللہ نے کیسا کرم فرمایا تھا۔ دل کے ذریعے اس کی راہنمائی کی۔ وہ تو جانتی تھی۔ لیکن کسی کو بتاتی تو کوئی یقین نہ کرتا۔ وہ

چھوٹی ہی تو تھی، جب اسے آغا جی سے پہلی نظر میں محبت ہوئی اور پھپھو نے آغا جی کی تصویر دیکھ کر انہیں پہچان لیا کہ وہ اوتار سنگھ ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ہندو ہیں۔ تو اس نے کیسے یقین سے اس کی تردید کی۔ اس نے پورے یقین سے کہا کہ وہ مسلمان ہیں۔ کون تھا، جس نے اسے یہ بات بتائی تھی؟ اللہ! اور کون تھا، جو اس کے دل میں بیٹھ کر قدم قدم اس کی راہنمائی کرتا رہا۔ کون اسے بتاتا رہا کہ جب تک وہ سچی ہے اور پاک ہے، اس کے دل کی ہر بات سچی ہوگی۔ کون تھا؟ جس نے راستہ بتایا کہ پھپھو کی موت سے پہلے وہ آغا جی کے پاس پہنچ جائے۔ ورنہ خدانخواستہ وہ بھی کوٹھے کی زینت بن جاتی۔ یہ سوچتے ہوئے اسے جھرجھری آگئی۔

اللہ آپ کا شکر ہے۔ وہ بڑبڑائی۔

اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ پھپھو صرف اس کی خاطر، اسے بچائے رکھنے کے لئے وہ ذلت بھری زندگی گزارتی رہی تھیں۔ ورنہ وہ اتنی بہادر تھیں کہ مرجانا ان کے لئے مشکل نہیں تھا۔ اور اب وہ محسوس کر سکتی تھی کہ پھپھو اپنے آخری لمحوں میں پرسکون ہوں گی۔ کیونکہ اس کی طرف سے وہ مطمئن ہوگئی تھیں۔

اور اب یہ صورتِ حال! یہ بھی تو معجزہ ہی تھا۔

وہ سوچتی تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آغا جی اسے کیسے مل سکتے ہیں؟ لیکن دل کہتا تھا کہ ایک مقررہ وقت پر ایسا ہوگا۔ اس کے سامنے تو ایسی کوئی صورت، ایسا کوئی امکان نہیں تھا۔

اور اللہ نے آغا جی کے گھر میں اس کے لئے زندگی کتنی آسان کر دی۔ اسے دادی بھی مل گئیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ نے آپی کے دل میں اس کی محبت ڈال دی۔ وہ آپی کو ان کی اس بہن جیسی لگی، جسے وہ کھو چکی تھیں۔ تبھی تو وہ انہیں اتنی محبوب ہوگئی۔

ارجمند کم عمر تھی۔ لیکن اللہ نے اسے بہت سمجھ دار بنایا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ درحقیقت آپی کیسی ہیں؟ آغا جی کے معاملے میں تو وہ ایسی تھیں کہ ان کے سر کا ٹوٹا ہوا بال بھی کسی کو نہ دیں۔ وہ تو دادی اماں سے بھی رقابت محسوس کرتی تھیں۔ لیکن اللہ نے انہیں اس کے لئے کیسا مہربان کر دیا کہ انہوں نے خود آغا جی سے ضد کی

کہ وہ اسے پڑھائیں۔ اور وہ اسے آغا جی کے ساتھ بے فکری سے اکیلا چھوڑ دیتی تھیں۔ حالانکہ یہ ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ یہ الگ بات کہ آغا جی خود بہت نیک اور پاک نیت تھے۔

اللہ نے کیسے کیسے اس کی مدد کی۔ اسے مایوس بھی نہیں ہونے دیا، اور اس کی محبت کی معصومیت کو بھی داغ دار نہیں ہونے دیا۔ پھر اتنے برسوں کی دوری۔ اگر کوئی پہلے سے اسے بتا دیتا کہ ساڑھے چھ سال تک وہ آغا جی کو دیکھ بھی نہیں سکے گی تو شاید وہ صدمے سے ہی مر جاتی۔

اور اللہ نے اس سے کیا ہوا وعدہ پورا فرمایا، اور وہ بھی کس شان کے ساتھ۔

یہ معجزہ نہیں تو اور کیا ہے کہ آپی جیسی عورت اس سے خوشامد کرے، وہ بھی اس لئے کہ وہ آغا جی سے شادی کر لے۔ ارے......! یہ تو اس کا خواب تھا، جو اسے امر محال لگتا تھا۔ بس وہ تو اللہ کے وعدے سے آس لگائے بیٹھی تھی۔ وہ تو سوچتی تھی کہ آپی کے ہوتے ہوئے تو یہ ممکن ہی نہیں۔ اور یہ بھی اس کے وجود کی سچائی تھی کہ آپی کو کھونے کا وہ تصور بھی نہیں کرتی تھی۔ چنانچہ ان کی زندگی کے لئے اور ان کی گود بھرنے کے لئے تو وہ خاص طور پر دعا کرتی تھی۔ اور اب آپی خود اس سے کہہ رہی تھیں کہ اسے ان کی خاطر...... ان کی خاطر آغا جی سے شادی کرنی ہے۔

یہ بات ان کی وہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ وہ انہیں اولاد کیسے دے سکے گی؟ ماں بننے کا تصور تو اس وقت تنہائی میں بھی اس کے لئے ایسا تھا کہ اس نے سوچوں کی تمام کھڑکیاں بند کر کے حیا سے آنکھیں بند کر لیں۔

مجھے اس پر کیا سوچنا؟ اس نے سوچا۔ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔ میں تو جیسا وہ کہیں گی، ویسا ہی کروں گی۔ آگے وہ جانیں۔

ایسا لگ رہا تھا کہ اسے نیند ہی نہیں آئے گی۔ یہ خیال بہت تکلیف دہ تھا کہ یوں وہ تہجد سے محروم رہ جائے گی۔ اس کا دل کٹنے لگا۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کے وجود میں جیسے سکون کا کوئی جھرنا گرنے لگا۔ اس کی آنکھیں مندتی گئیں۔

اسے تو ایسا ہی لگا کہ وہ بمشکل پانچ منٹ سوئی ہے۔ شاید وہ بہت گہری

اور پرسکون نیند تھی۔ اس کی آنکھ کھلی تو پتا چلا کہ وہ اپنے معمول کے مطابق پیدا ہوئی ہے۔

اللہ نے اسے تہجد سے محروم نہیں ہونے دیا۔

✿ ✿ ✿

”میں نے آج تک آپ سے کچھ نہیں مانگا......“ نور بانو نے کہا۔

”الحمدللہ! بغیر مانگے ہی تمہیں اس سے زیادہ مل گیا۔“ عبدالحق نے کہا۔ وہ ایسے کہنے والا نہیں تھا۔ لیکن سفر کی تکان، اور اس کے بعد سب لوگوں کے ساتھ بیٹھنا، باتیں کرنا، وہ اس وقت نیند سے بھرا ہوا تھا۔ اس وقت وہ بس سو جانا چاہتا تھا۔

”مل گیا۔ لیکن محرومی تو پھر بھی ہے۔“

”محرومی......؟“

”ہاں! اولاد تو نہیں ملی مجھے۔“

”کہہ کر دیکھو، وہ بھی کہیں نہ کہیں سے لا دوں گا تمہیں۔“ نیند سے مجبور عبدالحق نے جھنجلا کر کہا۔

”ویسے یہ محرومی صرف تمہاری نہیں، میری اور اماں کی بھی ہے۔ اور جو اللہ نہ دینا چاہے، میرا تو ایمان ہے کہ اس میں ہماری بہتری ہی ہوگی اور جو اللہ نہ دینا چاہے، وہ کہیں سے مل بھی نہیں سکتا۔“

”یہ آپ نے کیا کہا کہ کہیں سے بھی لا دیں گے......؟“

”بھئی......! ایسے بچے بھی تو ہوتے ہیں، جو ماں یا باپ سے، یا دونوں سے محروم ہو گئے ہوں۔ میں ایسا کوئی بچہ لے لوں گا، تم اسے پال لینا، تمہارا ارمان بھی پورا ہو جائے گا اور اس بچے کی محرومی بھی دور ہو جائے گی۔“

”مگر وہ آپ کا بچہ تو نہیں ہوگا۔“

”ہم اسے اپنا لیں گے تو وہ قانونی طور پر ہمارا بچہ ہی کہلائے گا۔“

”مگر ہمارا ہوگا تو نہیں۔ میرا مطب ہے، وہ آپ کا بچہ تو نہیں ہوگا۔ وہ آپ کی نسل، تو نہیں بڑھا سکے گا۔“

عبدالحق کی سماعت میں ارجمند کی آواز گونجی ..... اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَاتَمَنّٰی۔

''اب سب کچھ تو نہیں مل جاتا آدمی کو۔'' اس کے لہجے میں ہلکی سی اداسی تھی۔

''کوشش کرے تو مل ہی سکتا ہے۔'' نوربانو نے کہا۔

''کوشش تو بس حیلہ ہے۔ مرضی تو اللہ کی ہی چلتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اسے خیال آیا کہ یہ بات تو شفق صاحب نے کہی تھی، اور اسی ضمن میں کہی تھی۔ اور انہوں نے کہا تھا کہ اولاد کے لئے حیلہ شادی ہے..... یعنی اس کے لئے دوسری شادی۔ اور اسے یاد آیا کہ انہوں نے اس کے لئے دوسری شادی کی پیش گوئی بھی کی تھی۔ بلکہ ان کے حساب سے تو شاید کم وبیش یہ عرصہ بھی اس کی دوسری شادی کا تھا۔

اس نے سر جھٹکا، جیسے ذہن سے اس خیال کو جھٹک رہا ہو۔

''تو حیلے کے بغیر تو کچھ نہیں ہوسکتا نا!''

''کیوں نہیں ہوسکتا؟ اللہ چاہے تو کچھ بھی ممکن ہے۔''

''کیسے.....؟''

''تم یہ بات نہیں سمجھ سکتیں۔'' عبدالحق نے جھنجلا کر کہا۔

''بات کچھ اور ہو رہی تھی۔''

''ہاں.....! میں یہ کہہ رہی تھی کہ میں نے آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ آج کچھ مانگنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے.....! اب مانگ بھی لو۔ مجھے بہت نیند آرہی ہے۔''

''میں چاہتی ہوں کہ آپ دوسری شادی کرلیں۔''

عبدالحق کی آنکھوں سے نیند ہوا ہوگئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

''کیا کہا تم نے.....؟''

''آپ نے غلط نہیں سنا ہے۔'' نوربانو نے بے حد اطمینان سے کہا۔

''میں آپ کی دوسری شادی کرانا چاہتی ہوں۔''

عبدالحق پھر سے لیٹ گیا۔

''اس پر کل فرصت سے بات کریں گے۔''

''نہیں.....! آپ ابھی ہاں کریں۔ صبح تو مجھے اماں کو جواب دینا ہے۔''

عبدالحق اس بار گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

''کیا.....؟ تم نے اماں سے بھی بات کرلی ہے.....؟''

''وہ تو سب سے بڑی ہیں، تو کیا انہیں نہ بتاتی.....؟''

عبدالحق جانتا تھا کہ اماں تو خود بھی یہی چاہیں گی۔ لیکن یہ نوربانو کو کیا ہوگیا؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

''یہ کیا کھچڑی پکا رہی ہو تم.....؟''

''آپ کو کیا ہے؟ آپ تو بس ہاں کردیں۔''

''میں نے کہا نا کہ اس پر کل بات کریں گے۔''

''آپ سمجھ ہی نہیں رہے ہیں۔ صبح تو مجھے اماں کو خوش خبری سنانی ہے۔ ورنہ میری ناک کٹ جائے گی۔''

''وہ کیسے.....؟''

''اماں کہہ رہی تھیں کہ آپ نہیں مانیں گے۔ جبکہ مجھے اپنی محبت پر بڑا مان ہے، کہ آپ میری بات ٹال ہی نہیں سکتے۔''

''میں نے مان لیا، لیکن یہ کل صبح کا وقت کیا اوپر سے طے ہوا ہے.....؟'' عبدالحق جھنجلا گیا۔

''تین دن بعد شادی ہونی ہے۔ تو یوں وقت ضائع تو نہیں کیا جاسکتا۔''

اب بار عبدالحق کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔

''دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا! تین دن میں شادی؟ رشتے بازار میں، دکانوں پر تو نہیں ملتے۔''

نوربانو حیرت انگیز طور پر پرسکون تھی۔

''یہ کوئی اچانک بات نہیں ہے صاحب! میں کراچی میں اس پر سوچتی رہتی ہوں۔ اور وہاں سے فیصلہ کر کے یہاں آئی ہوں۔ سب کچھ سوچ رکھا ہے میں

نے۔"

"سب کچھ سوچ کر فیصلہ کر چکی ہو تو اس کا مطلب ہے کہ سب اختیارات تمہارے ہی پاس ہیں؟" عبدالحق نے تلخ لہجے میں کہا۔ اسے ہتک کا احساس ہو رہا تھا۔

"تو پھر مجھ سے پوچھ کیوں رہی ہو؟ میری کیا حیثیت ہے؟"

"میں تو آپ کے لئے ہی سوچتی رہی ہوں، اور آپ الٹا خفا ہو رہے ہیں مجھ پر۔"

"ایسا تو اماں نے بھی کبھی نہیں کیا میرے ساتھ!" عبدالحق کے لہجے میں شکایت تھی۔

"حالانکہ ان کا تو حق تھا۔"

"بس ایک میرا ہی حق نہیں ہے آپ پر!"

"تم اماں سے اپنا موازنہ نہ کیا کرو۔ ہر ایک کا اپنا مقام ہوتا ہے۔"

عبدالحق کے لہجے کی سختی نے نور بانو کو احساس دلا دیا کہ اب آخری چال چلنی پڑے گی۔ وہ منہ پھیر کر لیٹ گئی۔

عبدالحق کو احساس ہوا کہ نور بانو کا جسم دھیرے دھیرے ہل رہا ہے۔ پھر سسکیاں بھی سنائی دینے لگیں۔ وہ رو رہی تھی۔ عبدالحق گھبرا گیا۔ وہ اس کے آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ اس کی کمزوری تھی۔

"رو کیوں رہی ہو؟" اس نے اسے ہلایا۔

"اچھا......! اٹھ کر بات تو کرو مجھ سے۔"

"مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں آپ! جب آپ کو ماننی ہی نہیں میری بات......"

"میں نے کب کہا کہ نہیں مانوں گا؟" عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔

"میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اسی وقت بات کرنا کیا ضروری ہے؟"

"اس کی وجہ میں نے بتا دی آپ کو۔" نور بانو نے بے رخی سے کہا۔

"بے شک! بتا دی، لیکن یہ تو نہیں بتایا کہ تین دن میں شادی کیوں

ضروری ہے؟"

نور بانو اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ایک مہینے کی چھٹی ہے آپ کی۔ جلدی تو کرنی ہے۔"

"یہ تمہیں سوجھی کیا ہے......؟"

"ایک بات بتائیں......! میں مر گئی تو آپ دوسری شادی کر لیں گے......؟ میں جانتی ہوں، نہیں کریں گے۔ اس لئے یہ شادی مجھے ہی کرانی ہے۔"

"تم ایسی باتیں مت کرو۔" عبدالحق نے خفگی سے کہا۔

"مجھے واقعی ایسا لگتا ہے کہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"اچھا......! یہ بتاؤ، تین دن میں شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"ہو جائے گی، آپ ہاں تو کریں۔"

"لگتا ہے، میرے لئے دوسری بیوی کا انتخاب تم کر چکی ہو۔" عبدالحق نے غور سے اسے دیکھا۔

"جی ہاں......! میں نے کہا نا کہ سب کچھ میں نے کراچی میں ہی سوچ لیا تھا۔"

عبدالحق کو غصہ آنے لگا۔ سوچ لیا، فیصلہ کر لیا اور اس سے بات کرنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ یہ کیسی حاکمیت ہے اس کے مزاج میں۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ وہ اس سے محبت کتنی کرتی ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ خدانخواستہ...... اس سے آگے سوچا بھی نہیں گیا۔ تو میں دوسری شادی کبھی نہ کروں۔ تو اسے کتنی فکر ہے میری۔

"اچھا......! تو کون ہے وہ بدنصیب جو تمہاری سوکن بننے والی ہے......؟"

"سوکن کیوں؟ وہ تو میری بہن ہے۔ میرا ارمان پورا کرے گی۔ مجھے بیٹا دے گی، جو میرے نصیب میں نہیں۔"

"وہ ہے کون......؟"

"اب بھی نہیں سمجھے! ارے......! وہ میری ارجی ہے۔"

عبدالحق ہکا بکا رہ گیا۔ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہیں سکا۔ پھر اس نے جھنجلا کر کہا۔

''پاگل ہوگئی ہو تم......! وہ میرے سامنے کی بچی...... میں کتنا بڑا ہوں اس سے۔ یہ حق تمہیں کس نے دیا کہ اپنے ارمان کی خاطر کسی کی زندگی تباہ کر دوں؟''

''خود ارجمند نے۔ اس کی مرضی کے بغیر تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔''

''تمہارے لحاظ میں...... مروت میں وہ چپ رہی ہوگی۔ میرا اور اس کا کیا جوڑ؟''

''جی نہیں......! وہ ہنسی خوشی آمادہ ہے اس شادی پر۔'' نور بانو نے کہا۔

''بس اب آپ ہاں کر دیں۔ صبح میں اماں کو بتا دوں گی۔ پھر تیاری شروع۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔ بے قاعدہ کام مجھے پسند نہیں۔'' عبدالحق نے خشک لہجے میں کہا۔

''سب سے پہلے تو میں اماں سے بات کروں گا۔ ان سے اجازت لوں گا۔''

''یہ تو میں پہلے ہی کر چکی ہوں۔ وہ بہت خوش ہیں۔''

''تم نے انہیں ارجمند کے بارے میں بتایا تھا......؟''

''ہاں......! اس پر تو وہ اور خوش ہوئیں۔''

''بہرحال......! مجھے اس سے اطمینان نہیں ہوگا۔'' عبدالحق کے لہجے میں قطعیت تھی۔

''وہ بھی تم سے محبت کرتی ہیں...... بہت لحاظ کرتی ہیں تمہارا۔ میں خود ان سے پوچھوں گا اور ارجمند سے بھی......''

اس پر نور بانو ڈری کہ کہیں ارجمند بدل نہ جائے۔

''آپ کو لحاظ نہیں آئے گا اس سے بات کرتے ہوئے......؟''

''مجھ سے شادی کے لئے اس نے ہاں کی ہے تو لحاظ اور شرم کی کیا بات......؟ یہ ہم دونوں کا حق ہے کہ بات کریں۔''

''آپ کو نہ سہی، اسے تو شرم آئے گی۔''

''تو پھر میں تو یہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔ مجھے بات کرنے کی ضرورت

بھی نہیں۔''

''زندگی میں ایک چیز مانگی آپ سے، اس میں بھی یہ حیل وحجت!''

''تمہاری بات مان تو لی۔ لیکن اماں اور ارجمند سے بات کئے بغیر میں جواب نہیں دوں گا۔'' عبدالحق نے کہا اور لیٹ گیا۔

''اب منظور ہو تو بتا دو......!''

''جو آپ کی مرضی......!'' نور بانو نے بے دلی سے کہا۔

عبدالحق تو لمحوں میں سو گیا لیکن نور بانو کی نیند اڑ گئی۔ کبھی کوئی چیز آسانی سے...... اچھی طرح کیوں نہیں ملتی مجھے؟ اس نے سوچا۔ اب کل تک بے یقینی رہے گی کہ بات بنتی بھی ہے یا نہیں۔

صبح صادق کے قریب اسے نیند آئی۔

❁ ❁ ❁

حمیدہ سے بات کر کے تو عبدالحق حیران ہی رہ گیا۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ پوتے کی آرزو کی وجہ سے وہ اس کی دوسری شادی کی خواہاں ہے۔ یہ بھی وہ جانتا تھا کہ ارجمند سے وہ بہت محبت کرتی ہے۔ لیکن اس درجے کی پسندیدگی کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''تو اجازت مانگ رہا ہے پتر! ارے یہ تو میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔'' حمیدہ نے کہا۔

''کیسی بات کر رہی ہو اماں......! وہ تو بچی ہے ابھی۔''

''وہ بچی نہیں ہے، بڑی ہوگئی ہے۔ اس کا تو ایک رشتہ بھی آچکا ہے۔''

یہ عبدالحق کے لئے انکشاف تھا۔ وہ اصل بات بھول گیا۔

''کیسے لوگ تھے اماں......!''

''بہت اچھے لوگ تھے۔ لڑکا بھی بہت اچھا تھا۔ مجھے تو بہت پسند آیا تھا۔''

''تو پھر......؟''

''نکی نے مجھ سے خوشامد کی کہ میں انہیں منع کر دوں۔''

''انہوں نے ارجمند کو کہاں دیکھا تھا......؟''

''لڑکا اس کے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا، اور اسے پسند کرتا تھا۔ گھر والے بھی بہت اچھے اور مہذب لوگ تھے۔''

''تم نے مجھے بتایا بھی نہیں اماں......!'' عبدالحق کے لہجے میں شکایت تھی۔

''بات آگے بڑھتی تو بتاتی نا......! اب انکار کرنے کے لئے تجھ سے کیا مشورہ لیتی......؟''

''کیا بہت اچھا لڑکا تھا؟ بہت اچھے لوگ تھے؟''

''بہت خوب صورت اور تمیز دار لڑکا تھا۔ اس کی ماں اور بہن بھی بہت اچھی تھیں۔ وہ اتنے اچھے تھے پتر! کہ اگر مجھے تیرے لئے نکی کی آرزو نہ ہوتی تو میں نکی کو سمجھاتی کہ ایسے لوگوں کو انکار کرنا اچھا نہیں۔''

''لیکن اماں......! میرے لئے ارجمند کا تم نے سوچا بھی کیسے......؟ کوئی جوڑ ہے میرا اور اس کا......؟'' عبدالحق نے احتجاج کیا۔

''سوچنا تو آدمی چاند کے لئے بھی ہے۔ یہ کب سوچتا ہے کہ وہ نہیں ملے گا۔ اور سوچے تب بھی آرزو تو کرتا رہتا ہے نا! اور جوڑ کی بھی تو نے اچھی کہی۔ مجھ سے پوچھ تو، چاند سورج کی جوڑی ہے تیری اور نکی کی۔''

''ارے......! میں اتنا بڑا ہوں عمر میں اس سے۔''

''عمر سے کچھ نہیں ہوتا پتر! جوڑ دیکھا جاتا ہے۔ عادل طبیعت ملائی جاتی ہے۔ اور اللہ رکھے، تو ابھی ادھیڑ عمر بھی نہیں ہوا۔ جوان ہے۔ یہ الگ بات کہ خود کو بہت بڑا سمجھتا ہے، بہت بڑا بنا لیا ہے تو نے خود کو۔''

''لیکن اماں......! ارجمند کا ہمارے سوا کوئی نہیں۔ لیکن وہ بھیڑ بکری تو نہیں کہ جس کھونٹے سے چاہو، باندھ دو۔''

''میں سمجھتی ہوں پتر! کہ نکی بھی خوش ہوگی اس رشتے سے۔''

''یعنی تم نے اس سے پوچھا بھی نہیں ابھی۔'' عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

''نور بانو نے کہا کہ وہ نکی سے خود بات کر لے گی۔'' حمیدہ کا انداز

مدافعانہ ہوگیا۔

''یہ تو بڑی خطرناک بات ہے اماں! میں نور بانو کو جانتا ہوں اور ارجمند کو بھی۔ نور بانو کو اپنی بات منوانا آتا ہے، اور ارجمند نور بانو کی کسی بات کو رد نہیں کر سکتی، خواہ وہ اسے ناپسند ہو۔ وہ نور بانو سے بہت محبت کرتی ہے۔''

حمیدہ سوچ میں پڑ گئی۔

''بات تو تیری ٹھیک لگتی ہے پتر......!''

''اور اماں! ہم تو نہیں سمجھتے، لیکن ارجمند یقیناً خود کو ہمارا زیر بار سمجھتی ہے کہ ہمارا کوئی احسان ہے اس پر۔ اس کے بدلے میں وہ اپنے وجود کی قربانی بھی دے سکتی ہے۔ اور اماں......! یہ میں کبھی نہیں چاہوں گا...... کم از کم اپنے لئے تو کبھی نہیں۔''

''تو ٹھیک کہہ رہا ہے پتر! پر مجھے یقین ہے کہ ارجمند اس رشتے سے خوش ہوگی...... بلکہ شاید اس کی خوشی ہی اس رشتے میں ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو اماں......!''

''بہت کچھ ایسا ہے پتر......! جو تو نہیں جانتا، میں جانتی ہوں۔'' حمیدہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

''وہ میں سب کچھ تو تجھے بتا بھی نہیں سکتی۔ پر تو خود غور کر تو تجھے ایسا لگے گا کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔''

''میں سمجھا نہیں اماں......!''

''یہ معجزہ نہیں لگتا تجھے کہ نور بانو ضد کر کے تیری شادی کرائے۔ اور میں نے تو اس وقت دل میں سوچا تھا کہ تیری بیوی تو ایسی ہونی چاہئے، جیسی نکی ہے۔ اس وقت تو نکی بہت چھوٹی تھی۔ یہ جب کی بات ہے، جب وہ پہلی بار یہاں آئی تھی۔ میرے دل میں یہ خیال آیا تو میں نے سوچا کہ نکی تو بہت چھوٹی ہے۔ تو پتا ہے، میرے دل نے کیا کہا؟ بولا کہ لڑکیوں کو بڑے ہوتے دیر لگتی ہے کیا؟ اور پھر میرے دل سے یہ خیال کبھی نہیں نکلا۔''

عبدالحق حیرت زدہ سا حمیدہ کی بات سن رہا تھا۔

"پھر میں پوتے کی آرزو لے کر در در کی خاک چھانتی پھر رہی تھی کہ ایک بابا ملا۔ اس نے مجھ سے جو کچھ کہا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ نور بانو کا خود کچھ ایسا معاملہ ہے کہ اس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔ شاید کوئی کوتاہی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی بہو کو لاؤں۔ پر نور بانو نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر بابا نے کہا کہ اس کے بغیر تو اللہ اس کی دعا بھی نہیں سنے گا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا پتر! کہ میں اس معاملے کو بھول جاؤں، نہ کچھ کہوں، نہ کچھ کروں، میری بہو خود میرے بیٹے کی دوسری شادی کرائے گی، اور اس سے کرائے گی جو مجھے پسند ہے۔ اب تو بتا پتر! کہ چھ سات سال تو نور بانو کے ساتھ کراچی میں رہا۔ اور اب آیا تو نور بانو نے خود ہی یہ سلسلہ شروع کر دیا۔ تو پتر! یہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ارجمند بھی یہی چاہتی ہوگی۔"

عبدالحق غور کرتا رہا۔ جانتا تھا کہ عورتیں تو ہوتی ہی ضعیف الاعتقاد ہیں۔ بالآخر اس نے کہا۔

"لیکن اماں......! میں پوری طرح اطمینان کے بغیر یہ قدم کیسے اٹھا سکتا ہوں؟ انجانے میں ارجمند کے ساتھ کوئی زیادتی ہوگئی تو تلافی بھی نہیں کر سکوں گا۔"

"تو ٹھیک ہے پتر! تو اپنا اطمینان کر لے۔"

"تو تم ارجمند سے پوچھو نا......!"

"نا پتر......! میں اس سے نہیں پوچھوں گی۔"

"کیوں اماں......؟"

"ایک تو یہ کہ میرا دل مطمئن ہے۔ پھر بابا نے مجھے منع کیا تھا کہ میں کچھ بھی نہ کروں۔ بہو جو کرے، اسے کرنے دوں۔" حمیدہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"اور ویسے بھی پتر! تیرا دل میرے نکی سے بات کرنے پر بھی مطمئن ہونے والا نہیں۔ تو خود ہی پوچھ لے اس سے۔"

عبدالحق خوش ہوگیا کہ اماں نے اسے ارجمند سے بات کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ سچ تھا کہ خود بات کیے بغیر مطمئن ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

نور بانو ابھی سو رہی تھی۔ وہ ارجمند کو اسٹڈی میں لے گیا۔

"بیٹھو ارجمند! تم سے تو بات ہوئی ہی نہیں۔"

ارجمند سلیقے سے دوپٹہ سر پر لیے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

اب بات کرنے کا وقت آیا تو عبدالحق کو احساس ہوا کہ یہ کتنا مشکل مرحلہ ہے۔ کیسے بات کرے؟ کس طرح شروع کرے؟

"آپ کے لیے چائے لے آؤں آغا جی......!" ارجمند نے اسے چونکا دیا۔

عبدالحق نے سوچا، یہ اسے مہلت مل رہی ہے۔ اتنی دیر میں لائحہ عمل طے کر لے گا۔

"ہاں ارجی! لے آؤ......!"

اور واقعی جب تک ارجمند چائے لے کر آئی، وہ سوچ چکا تھا۔ ارجمند نے اس کے سامنے چائے رکھی تو اس نے دھیرے سے شکریہ کہا۔

عبدالحق پہلے تو اس کی پڑھائی کے بارے میں پوچھتا رہا پھر اس نے کہا۔

"اماں بتا رہی تھیں کہ تمہارا ایک رشتہ آیا تھا۔ اماں کو اچھا لگا۔ لیکن تم نے انکار کر دیا"

"جی آغا جی......!" ارجمند نے سر جھکائے جھکائے کہا۔

"تمہارے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا وہ......؟"

"وہ مجھ سے سینئر تھے۔ میرے ہم جماعت نہیں تھے۔"

"تم کالج میں اسے دیکھتی رہی تھیں۔ تمہیں اس کے بارے میں معلوم ہوگا۔ کوئی خرابی، کوئی برائی تھی اس میں......؟"

"جی نہیں......! وہ تو بہت اچھے انسان ہیں آغا جی......!"

"تو پھر تم نے انکار کیوں کیا......؟"

"جو آپ جانتے ہیں، وہ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں......؟"

عبدالحق گڑبڑا گیا۔

"میں کیا جان سکتا ہوں تمہارے بارے میں......؟ تقریباً سات برس تم

سے دور رہا ہوں۔"

"دور رہنے سے کچھ فرق پڑتا ہے آغا جی......؟" ارجمند نے الٹا اسی سے سوال کر دیا۔

"فرق تو پڑتا ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"جب میں گیا تو تم بچی تھیں۔ اب ماشاء اللہ عاقل و بالغ ہو۔"

"میں تو جو تھی، اب بھی وہی ہوں۔ اب یہ مجھے نہیں معلوم کہ بچی ہوں یا عاقل و بالغ۔ رہی رشتے کی بات تو میں اچھے سے اچھے رشتے سے بھی انکار کر دوں گی۔"

"وجہ......؟"

"میں کسی بھی معاملے میں بددیانتی کی قائل نہیں۔ اور یہ تو پوری زندگی کا معاملہ ہے۔"

"لیکن میرے خیال میں تم اپنے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔"

"شکر ہے، آپ نے بددیانتی نہیں کہا۔ اور اپنے ساتھ زیادتی کرنے کا تو مجھے حق ہے۔" ارجمند نے اطمینان سے کہا۔

"اب یہ نکتہ نظر کا فرق ہو سکتا ہے، ممکن ہے، آپ زیادتی سمجھ رہے ہوں جسے، میرے نزدیک اس میں میری بھلائی ہو۔"

عبدالحق کو حیرت ہونے لگی۔ ارجمند پہلے بھی اپنی عمر سے بڑی تھی، اور اب بھی ہے۔ بلکہ تعلیم نے اسے اور نکھار دیا ہے۔ اسے بات کرنا آتی ہے۔ اپنا موقف موثر انداز میں پیش کر سکتی ہے۔ اور مدلل انداز میں اس کا دفاع بھی کر سکتی ہے۔

"لیکن تمہارا نکتہ نظر غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"جی یقیناً! لیکن اس سے کسی اور کو نقصان تو نہیں ہوگا۔"

"تمہیں تو ہو سکتا ہے۔"

"آپ مجھ سے وہ پوچھیں نا آغا جی......! جو درحقیقت پوچھنا چاہتے ہیں۔"

یہ عبدالحق کے لئے بلاواسطہ چیلنج تھا۔ اسے یہ احساس بھی ہوا کہ واقعی وہ وقت برباد کر رہا ہے۔

"ٹھیک ہے ارجمند! میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے نور بانو کی احمقانہ بات کے جواب میں ہاں کر دی۔ یہ تمہاری اپنے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی؟"

"آپ کا خیال ہے کہ میں نے آپ سب کے احسانوں کے بوجھ کی وجہ سے ہاں کی ہے......؟"

"میرا یہی خیال ہے......!"

"یہ آپ کی زیادتی ہے میرے ساتھ۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں۔"

"بچپن میں آدمی نادان ہوتا ہے۔ بڑا ہوتا ہے تو شعور پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ سمجھنے لگتا ہے ان نادانیوں کو۔"

"مجھے افسوس ہے کہ آپ اسے نادانی سمجھ رہے ہیں۔ دراصل بچی تو میں کبھی تھی ہی نہیں آغا جی! میرے دل میں جو جذبہ پیدا ہوا، وہ بہت سچا اور بے ساختہ تھا، اور میں نے سمجھ لیا کہ وہ اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت ہے۔ جبکہ میں اس وقت اللہ کو جانتی اور سمجھتی بھی نہیں تھی۔ لیکن جب سے اب تک کے ہر لمحے میں وہ بات ثابت ہوتی رہی۔ گستاخی معاف آغا جی، لیکن بڑے لوگوں میں یہ خامی ہوتی ہے۔ بچوں کی جو بات انہیں اچھی نہیں لگے، وہ اسے ان کی نادانی قرار دے کر نظرانداز کرتے رہتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ کبھی بچے اپنی جگہ درست بھی ہو سکتے ہیں۔"

عبدالحق خود کو اس کے سامنے چھوٹا محسوس کرنے لگا۔

"تم نے میرے خیال کی اب بھی تردید نہیں کی۔" اس نے سنگین لہجے میں کہا۔

"میں جھوٹ سے ہمیشہ بچتی ہوں آغا جی! بس کبھی دوسروں کی خاطر سچ بولنے سے گریز کرنا پڑ جاتا ہے۔ مگر آپ سے میں پوری سچائی کے ساتھ بات کروں گی۔ آپ اگر مجھ سے جان بھی مانگیں تو میں انکار نہ کروں۔ لیکن اس معاملے میں ایسا نہیں ہوا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو آپ کو معلوم ہے، ہے نا......؟" پہلی بار

اس نے نظریں اٹھا کر عبدالحق کی آنکھوں میں دیکھا۔

عبدالحق نظریں چرانے لگا۔ تاہم اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور دوسری وجہ......؟''

''میں واقعی بڑی ہوگئی ہوں آغا جی......! جو کچھ میں بچپن میں نہیں سمجھ سکی، اب سمجھ گئی ہوں۔ میں نے جان لیا ہے آغا جی......! کہ اللہ نے کتنی غلیظ جگہ سے نکال کر مجھے آپ تک پہنچایا...... وہ بھی آپ تک......'' اس نے زور دے کر کہا۔

عبدالحق ششدر رہ گیا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ارجمند کو کبھی یہ بات معلوم ہو سکے گی۔

''اب میں سمجھ سکتی ہوں کہ آخری عرصے میں، جب پھپھو کے ہاتھ میں سب کچھ تھا، وہ بااختیار تھیں، اور انہیں نانا کا سہارا بھی حاصل تھا تو وہ بازار سے نکلیں کیوں نہیں؟ انہیں ڈر تھا کہ یہ داغ مٹنے والا نہیں۔ عمر بھر ان کا پیچھا کرے گا۔ انہیں کبھی عزت نہیں مل سکے گی، اور میں بھی داغدار ہو جاؤں گی۔ وہ صرف میری ہی وجہ سے تو زندہ تھیں۔ اور دیکھ لیں، مجھے آپ کو سونپنے کے بعد وہ دو دن بھی نہ جی سکیں۔'' ارجمند کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''آپ کو بتاؤں آغا جی......! کہ کوٹھے پر جب سب کچھ ان کے ہاتھ میں آیا تو انہوں نے کبھی اپنے یا ہمارے لئے وہاں سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا۔ وہ اس کوٹھے پر بیٹھ کر کرتے سیتی اور کاڑھتیں، اور اس محنت مزدوری کے پیسے سے وہ ہمیں رزقِ حلال کھلاتیں۔''

عبدالحق کو یاد آیا کہ عارف نے بھی کرتوں کا تذکرہ کیا تھا، جو نادرہ نے اس کے لئے کاڑھے تھے۔ اس کو اس معصوم اور کم عمر لڑکی پر پیار آنے لگا، جس نے زبردستی کی آگہی سے خود کو دکھی کر لیا تھا۔

''تو آغا جی......! وہ اللہ کی رحمت تھی، اس کی طرف سے امداد تھی۔ میں نے بچپن سے ہی اللہ کی تائید اور رحمت دیکھی ہے۔ میں یہاں ہوں تو یہ اللہ کی رحمت ہے۔ لیکن آغا جی......! اب پھپھو کا خوف مجھے منتقل ہوگیا ہے۔ میں کسی اجنبی گھر میں نہیں جا سکتی۔''

''تمہیں یہ سب کیسے پتا چلا......؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''یہ بات تو گھر میں میرے سوا کسی کو معلوم نہیں۔''

''اردو ادب کا مطالعہ کرتی ہوں نا......!'' ارجمند نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

''اور وہ ماحول تو مجھے آج بھی یاد ہے۔''

''لیکن تمہاری بات اور ہے۔ تمہیں انشاء اللہ کبھی یہ طعنہ نہیں سننا پڑے گا۔ اس لئے اس خوف کی بنیاد پر فیصلے کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں آغا جی......! یہ تو ثانوی اور اضافی وجوہات ہیں۔ میں کہہ چکی ہوں کہ بنیادی اور اصل وجہ جو ہے میرے ہاں کرنے کی، وہ آپ جانتے ہیں، اور آپ نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔''

''تو یہ تو بچپنا ہوا نا......! جذباتی فیصلہ ہوا نا......!''

''آپ شاید سمجھ ہی نہیں سکتے۔ جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا تو کچھ سوچا...... ایسا جو میری عمر کی بچی نہیں سوچ سکتی۔ اب میں جانتی ہوں کہ وہ اللہ کی طرف سے تھا۔ اسی لمحے اللہ نے مجھے یقین عطا فرمایا کہ آپ مجھے ملیں گے...... اس کے مقرر کردہ وقت پر۔'' یہ کہتے ہوئے ارجمند کے چہرے پر گلابی رنگ دوڑ گیا۔

''اس کے بعد سے ہر لمحے مجھے اللہ کی راہنمائی میسر رہی۔ آپ یقین نہیں کریں گے۔ لیکن اللہ میاں نے خود مجھ سے یہ بات کہی تھی۔''

''یہی تو بچپنا ہے۔ اللہ بندوں سے بات نہیں کرتا۔''

''پھپھو نے بھی یہی کہا تھا۔ بعد میں میں نے جس سے بھی یہ بات کی، اس نے یہی کہا...... دادی اماں نے بھی، اور آپی نے بھی......''

''تم نے انہیں بھی بتا دیا تھا......؟'' عبدالحق بری طرح گڑبڑا گیا۔

''نہیں آغا جی......! وہ بات تو میں نے پھپھو کے علاوہ کبھی کسی سے نہیں کہی۔ اور پھپھو نے مجھے آپ کے پاس لانے سے پہلے سمجھا دیا تھا کہ مجھے کبھی کسی سے بھی یہ بات نہیں کرنی۔ دادی اماں اور آپی کو کسی موقع پر میں نے یہ بتایا تھا کہ اللہ میاں مجھ سے بات کرتے ہیں۔ اس پر وہ دونوں ڈر گئیں۔ میں نے ان سے

بحث بھی نہیں کی۔"

"یہ تو بتاؤ کہ اللہ میاں تم سے کیسے بات کرتے ہیں ؟" عبدالحق اصل بات بھول کر متجسس ہو گیا۔

"میرے دل میں بیٹھ کر دل سے ... میری اپنی آواز میں۔" ارجمند نے سادگی سے کہا۔

عبدالحق کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔

"ننھی لڑکی! یہ تو آدمی کے اندر کی آواز ہوتی ہے۔ اللہ کی طرف سے ہو تو خیال، شیطان کی طرف سے ہو تو وسوسہ۔ لیکن دونوں میں تمیز کرنا بہت مشکل، تقریباً ناممکن ہے۔"

"نہیں آغا جی! یہ بہت آسان ہے۔ آدمی جھوٹ نہ بولے، اللہ کے احکامات پر عمل کرے، ان کی خلاف ورزی نہ کرے اور پاک صاف رہے تو دل پاک رہتا ہے۔ اس میں اللہ رہتا ہے اور آدمی کی راہنمائی کرتا ہے۔"

"یہ تمہیں کس نے بتایا ... ؟"

"اللہ میاں نے ... !"

"اسی طرح ... دل میں بیٹھ کر ... ؟"

"جی ہاں ... !"

"یہ تو گمراہ کن بات ہے ارجمند ... !"

"لیکن میں نے پھپھو پر ثابت کر دیا تھا۔"

"کیسے ... ؟"

ارجمند کھو سی گئی۔

"میں نے آپ کو دیکھا تو آپ کی تصویر بنائی۔ پھر وہ تصویر پھپھو کو دکھائی تو ان کے منہ سے بے اختیار نکلا ... اوتار سنگھ ... انہوں نے مجھے بتایا کہ آپ ان کے ساتھ کالج میں پڑھتے تھے اور ہندو ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ نہیں، آپ مسلمان ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ مجھے کیسے معلوم؟ تو میں نے انہیں بتایا کہ یہ بات مجھے اللہ میاں نے بتائی ہے۔ پھپھو نے یقین نہیں کیا۔ لیکن جب آپ ملے تو میری

بات سچی ثابت ہو گئی۔"

عبدالحق کو اپنے پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"اور میرے بارے میں تمہیں کچھ بتایا تھا اللہ میاں نے ... ؟" اس نے پوچھا۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سے جانچنا چاہتا تھا۔

"جی ہاں ... ! بتایا تھا۔ لیکن وہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔"

"اب میں اگر تم سے کہوں کہ تم نے نور بانو کی بات مان کر غلط فیصلہ کیا ہے تو ... ؟"

"سچ یہ ہے آغا جی ... ! کہ میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ میں نے تو اللہ کے فیصلے پر سر جھکایا ہے، جبکہ اسی میں میری خوشی بھی ہے۔"

"یہ جان کر بھی کہ شاید خوشی تمہیں نہ مل سکے۔"

"میں سمجھی نہیں آغا جی ... !"

"تم جانتی ہو کہ میں نور بانو سے بہت محبت کرتا ہوں۔ شاید میں کسی اور سے محبت کر ہی نہیں سکتا۔ اسی لئے میں نے کبھی دوسری شادی کا سوچا بھی نہیں۔ اور مجھے اولاد ہونے یا نہ ہونے کی بھی پرواہ نہیں۔"

"میں جانتی ہوں، اور یقین کریں، یہ میرا وعدہ ہے کہ میں آپ سے کبھی کچھ بھی طلب نہ کروں گی۔"

"یہ کہنا بہت آسان ہے، عملی زندگی میں ایسا کر نہیں سکو گی۔"

"اللہ سے دعا کرتی رہی ہوں آغا جی ... ! انشاء اللہ میں ایسی ہی رہوں گی۔ اللہ نے اپنی رحمت سے مجھے شکر ادا کرنے والا بنایا ہے۔ میں نے اس کا بے پناہ فضل و کرم دیکھا ہے اور مجھے یاد بھی ہے۔ اللہ مجھے اس سے محفوظ رکھے کہ میں زندگی کی سب سے بڑی نعمت پر شکر ادا کرنے کے بجائے میں شکایت کروں۔"

عبدالحق حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ پاکیزہ چہرے پر بچوں کی سی معصومیت، لیکن باتوں میں جہاں دیدگی، لہجے میں ایسی پختگی۔

"ایک بات کہوں آپ سے آغا جی! اسے گستاخی نہ سمجھئے گا۔ روئے زمین پر آپ میرے لئے سب سے محترم ہیں۔" ارجمند کے لہجے میں عقیدت تھی۔

''کہو......! کیا بات ہے......؟''

''آپ کے انداز میں ہچکچاہٹ ہے۔ آپ یہ نہیں چاہتے۔ مجھے ایسا لگا کہ آپ انکار کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن نہیں کر سکتے۔ اس لئے یہ چاہتے ہیں کہ میں انکار کر دوں۔''

''میں تو تمہارا بھلا سوچ رہا ہوں۔''

''جب آپ مجھے سمجھتے جانتے ہی نہیں تو میرا بھلا کیسے جان سکتے ہیں؟ میری بات مانیں، آپ انکار کر دیں۔ بخدا مجھے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں ارجمند......! لیکن میں نے تمہیں کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔ تمہیں اس حیثیت سے قبول نہ کر سکا تو تمہارے لئے دکھ کا سبب بنوں گا۔ یہ مجھے گوارا نہیں۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ اسے کیا جواب دوں گا۔''

''بس اتنی سی بات......!'' ارجمند نے خود ہو کر کہا۔

''میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ آپ کے ساتھ رہتے ہوئے، آپ کی کسی بات پر کبھی دکھ نہیں کروں گی انشاء اللہ! اور خدانخواستہ دکھ ہوا تو میں ابھی سے آپ کو اللہ کے سامنے اس سے بری قرار دیتی ہوں۔''

''تم نہیں جانتیں کہ تم کتنی بڑی بات کہہ رہی ہو؟''

''آپ نہیں جانتے کہ یہ میرے لئے کتنی چھوٹی بات ہے۔'' ارجمند نے بے ساختہ کہا۔

''میں نے سمجھ لیا ہے کہ محبت صرف دینے کا نام ہے، لینے کا نہیں۔''

''میں اتنا محترم ہوں تمہارے لئے تو تم میرا کوئی حکم کیسے ٹال سکتی ہو......؟''

''میں نے کب کہا ایسا......؟''

''تو پھر مجھے بتاؤ کہ تمہیں اللہ میاں نے میرے بارے میں اور کیا بتایا تھا؟''

''مجھے وہ کہنا آپ کے سامنے اچھا نہیں لگے گا۔ آپ اصرار نہ کریں۔''

''میں تو تمہیں حکم دے رہا ہوں۔''

''پہلی بار آپ کو دیکھنے کے بعد آپ مجھے شہزادے لگنے لگے......میرے شہزادے!'' ارجمند جیسے کہیں بہت دور چلی گئی۔

''میں ہر وقت آپ کی تصویر بناتی رہتی تھی۔ اور ہر وقت اللہ سے دعا کرتی تھی کہ آپ مجھے مل جائیں۔ پھر ایک دن میں نے اللہ میاں سے شکایت کی کہ میں آپ سے ہر وقت دعا کرتی رہتی ہوں، اور آپ مجھے جواب تک نہیں دیتے، تو اس دن اللہ میاں نے پہلی بار مجھے جواب دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ میرے دل میں رہتے ہیں اور وہیں سے مجھے جواب بھی دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جب تک میں سچی اور پاک صاف رہوں گی، جھوٹ نہیں بولوں گی اور ان کا کہنا مانتی رہوں گی تو وہ میرے دل میں رہیں گے۔ اور بدل گئی تو میرے دل سے چلے جائیں گے۔

پھر میں نے ایک دن اللہ میاں سے کہا کہ آپ میرے شہزادے کو مسلمان کر دیں۔ میں ہندو سے شادی تو نہیں کر سکتی۔ اس پر اللہ میاں نے کہا کہ ایسا کبھی سوچنا بھی نہیں۔ وہ مسلمان ہے...... بلکہ بہت اچھا مسلمان ہے۔''

''یہ کہا اللہ میاں نے...... میرے لئے......؟'' عبدالحق خوش ہو گیا۔

''جی آغا جی......!''

''لیکن اصل بات تم نے ابھی نہیں بتائی ہے۔ وہ بتاؤ مجھے......''

''آپ بہت چالاک ہیں آغا جی......! میں سچ کہہ رہی ہوں، مجھے کہنا اچھا نہیں لگے گا۔''

''مگر میرا حکم ہے۔''

''اچھا بتاتی ہوں۔'' ارجمند نے بے بسی سے کہا۔

''مگر پہلے پس منظر بتانا پڑے گا۔''

''تو بتاؤ......!''

''پھپھو نے میری کاپی دیکھی تو اس میں ہر صفحے پر آپ کی تصویر تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ میں کیا سوچتی ہوں۔ انہوں نے مجھے سمجھانے کے لئے کہا کہ وہ تم سے بہت بڑے ہیں۔ ان سے تمہاری شادی کیسے ہو سکتی ہے؟ میں نے یہی بات اللہ

میاں سے کہی تو......'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''اللہ میاں نے کیا جواب دیا......؟ بتاؤ......!'' عبدالحق نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''اللہ میاں نے کہا کہ وہ تم سے شادی کے بعد بڑے ہوں گے۔ تم انہیں بڑا بناؤ گی۔'' ارجمند نے بے ساختہ کہا، پھر جیسے ہی اسے احساس ہوا تو اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔

''آپ مجھ سے کیسی باتیں کروا رہے ہیں آغا جی......!'' اس کے لہجے میں حیا میں لپٹی ہوئی شکایت تھی۔

لیکن عبدالحق تو سن ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے شفیق صاحب یاد آ رہے تھے......

گمراہی کے عرصے کے پنڈت روپ سہائے، جنہوں نے اس کی پیدائش کے بعد اس کی جنم پتری بنائی، جن سے کراچی میں وہ ملا تھا۔ انہوں نے اسے کہا تھا کہ اس کی دو شادیاں ہیں۔ ان کی آواز اب بھی وہ سن سکتا تھا...... انہوں نے کہا تھا، جس بیوی کی وجہ سے آپ دوسری شادی سے بچتے ہیں، عجب نہیں کہ اسی کی وجہ سے آپ کو دوسری شادی کرنی پڑے۔ اور یہی ہو رہا تھا۔ نور بانو نے ہی ارجمند کو منتخب کیا تھا اور وہ بہ اصرار اس کی شادی کرا رہی تھی۔

اور شفیق صاحب نے کہا تھا...... دوسری بیوی آپ کی پہلی بیوی کا الٹ ہوگی، مزاج اور فطرت کے اعتبار سے بھی اور قسمت کے اعتبار سے بھی۔ اور وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ پہلی بیوی سے آپ کو عشق ہے، لیکن دوسری بیوی کو آپ بس قبول کریں گے۔ یہ قسمت کے لحاظ سے الٹ ہونے کی بات تھی۔ پھر انہوں نے اور وضاحت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا...... پہلی بیوی سے آپ کو عشق ہے، دوسری بیوی آپ سے عشق کرے گی، پہلی بیوی کا مزاج قابضانہ ہے، دوسری آپ کی قید میں رہنا پسند کرے گی، پہلی بیوی چاہے گی کہ آپ اسے خوش رکھیں، جبکہ دوسری بس آپ کو خوش رکھنا چاہے گی، وہ آپ کی خوشی کے لئے کچھ بھی کرے گی، پہلی بیوی لینے والی ہے اور دوسری صرف دینے والی ہوگی۔ اور ابھی ذرا پہلے ارجمند نے خود یہ بات کہی تھی کہ اس نے جان لیا ہے، محبت صرف دینے کا نام

ہے، لینے کا نہیں۔

اور شفیق صاحب نے کہا تھا...... پہلی بیوی مطالبے کرنے والی ہے تو دوسری آپ سے کچھ بھی نہیں طلب کرے گی، حتیٰ کہ محبت بھی نہیں۔ پہلی بیوی سے اگر آپ کو کچھ بھی نہیں ملا تو دوسری آپ کو سب کچھ دے گی۔ اس سے آپ کو دو بیٹے ملیں گے۔ دوسری بیوی بہت مبارک، بہت صابر ہوگی...... آپ کی طرح۔

آثار بتاتے تھے کہ ارجمند ایسی ہی ہے۔ وہ تو اس سے محبت بھی نہیں مانگ رہی ہے۔ وہ تو اللہ کو گواہ بنا کر مستقبل میں اس سے سرزد ہونے والی ہر کوتاہی، ہر زیادتی کو ابھی سے معاف کر رہی ہے۔

اور بھی شفیق صاحب نے کچھ کہا تھا...... پہلی بیوی کی وجہ سے آپ نے جو کچھ گنوایا، دوسری آپ کو وہ سب کچھ واپس دلائے گی۔

ایسا کیا ہے، جو نور بانو کی وجہ سے میں نے گنوا دیا۔ وہ ذہن پر زور دیتا رہا۔ لیکن بات سمجھ میں نہیں آئی۔

اس نے ذہن میں ارجمند کی آخری بات کو تازہ کیا۔ اس نے کہا...... اللہ میاں نے کہا کہ وہ تم سے شادی کے بعد بڑے ہوں گے۔ تم انہیں بڑا بناؤ گی۔

دونوں باتوں کا آپس میں اگر کوئی تعلق تھا تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ نور بانو سے شادی کر کے وہ کچھ چھوٹا ہو گیا...... گھٹ گیا۔ اب یہ بات ایسی تھی کہ اس پر سوچا جاتا۔

ارجمند نے دیکھا کہ وہ سوچوں میں گم ہے۔ اس نے سوچا۔ بات مکمل ہو چکی ہے۔ یہ سوچ کر وہ اٹھی اور دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھی۔

عبدالحق ایسا گم تھا کہ اسے احساس بھی نہیں ہوا۔

دروازے پر پہنچ کر ارجمند رکی۔

''آپ کو یاد ہے آغا جی......؟'' اس نے عبدالحق کو پکارا۔

عبدالحق چونکا اور اس نے سر اٹھا کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''جب پہلی بار آپ مجھے یہاں لا رہے تھے، جب پھپھو مجھے آپ کے پاس لائی تھیں تو پھپھو سے جدا ہونے کے بعد میں رونے لگی تھی۔ تب آپ نے کیا

کہا تھا مجھ سے ۔۔۔؟''

عبدالحق نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں ۔۔۔ ! مجھے یاد نہیں۔''

''آپ نے کہا تھا کہ آپ میرے آنسو برداشت نہیں کر سکتے۔ انہیں روکنے کے لئے آپ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔''

''اچھا ۔۔۔ ! ایسا کہا تھا میں نے ۔۔۔؟''

ارجمند نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

''اور میں نے کہا تھا، کچھ بھی؟ تو آپ نے کہا ۔۔۔ ہاں کچھ بھی، بس تم رونا کبھی نہیں۔''

عبدالحق کو وہ بات یاد آگئی۔

''ہاں ۔۔۔ ! یاد آگیا مجھے۔''

''تو میں نے آپ سے کچھ مانگا تھا۔ اور آپ نے جواب میں کہا تھا ۔۔۔ ابھی تو تم بہت چھوٹی ہو۔''

عبدالحق ذہن پر زور دینے لگا۔

''میں نے آپ کی بات مان لی۔ پھپھو کی موت کے علاوہ میں کبھی نہیں روئی۔ اکیلے میں بھی نہیں روئی۔ مجھے خوشی ہے کہ اب میں بڑی ہوگئی ہوں، اور اللہ نے آپ کے وعدے کی لاج رکھ لی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹی چلی گئی۔

عبدالحق اس خالی جگہ پر نظریں جمائے ذہن پر زور دیتا رہا، جہاں ایک لمحہ پہلے ارجمند کھڑی تھی۔

پھر اچانک اسے یاد آگیا ۔۔۔ ہر بات لفظ بہ لفظ یاد آگئی۔ ہاں ۔۔۔ اس نے یہ کہا تھا کہ میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ بس تم کبھی بھی نہیں رونا۔ ورنہ یہ میرے لئے بوجھ ہوگا۔ ارجمند نے ننھے بچوں کی طرح کہا تھا ۔۔۔ مجھ سے شادی کریں گے۔

اور اس نے حیرت سے گاڑی کی اگلی سیٹ پر اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی اس بچی کو دیکھا تھا۔ دو دوپٹے میں خود کو بہت اچھی طرح لپیٹ کر سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ لیکن تھی تو بچی ہی۔ تب اس نے انکار کرنے کے بجائے بے ساختہ کہا تھا ۔۔۔ ابھی تو تم بہت چھوٹی

ہو۔

وہ پورا منظر اب اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ ارجمند نے اپنے آنسو ایسے پونچھے جیسے ہمیشہ کے لئے پونچھ رہی ہو۔ پھر اس نے نظریں جھکاتے ہوئے آہستہ سے کہا تھا ۔۔۔ جی ٹھیک ہے۔ اب میں کبھی نہیں روؤں گی۔

اب وہ سمجھ گیا تھا۔ ارجمند نے اس کی بات کو وعدہ سمجھ لیا تھا اور اپنی طرف سے شرط پوری کر دی تھی۔ لیکن اس وقت اس نے تو اسے بچی کی بات ہی سمجھا تھا۔ نہ اہمیت دی تھی، نہ اسے سنجیدگی سے لیا تھا۔ لیکن اب دوسری شرط بھی پوری ہوگئی تھی۔ ارجمند بڑی ہوگئی تھی۔ اور وہ بات اللہ کی طرف سے پوری ہو رہی تھی ۔۔۔ اور وہ بھی کس انداز میں ۔۔۔ آسانی کے ساتھ۔ جسے سب سے بڑی رکاوٹ ہونا تھا، وہ خود ہی سب کچھ کروا رہی تھی ۔۔۔ نور بانو ۔۔۔!

اس کے تمام وسوسے دور ہوگئے۔

وہ جو بنیادی طور پر یہ سمجھنے والا تھا کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے، اور اس میں بہتری بھی ہے، اس معاملے میں پہلی بار یہ سمجھ پایا کہ یہ سب کچھ تو اللہ کی طرف سے ہے، ورنہ تو وہ خود بھی چاہتا تو یہ ممکن نہ ہوتا۔ پہلی بار اس نے شفیق صاحب کی بات کو اہمیت دی۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ اللہ سے راہنمائی طلب کرتے ہیں، اور اللہ جو چاہتا ہے، ان پر روشن کر دیتا ہے۔ اور جب اللہ کی مرضی نہیں ہوتی تو انہیں زائچے میں اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

علم سارے کا سارا اللہ کا ہے!

جو وہ چاہے، وہ ہو کر رہتا ہے!

اس کی سمجھ میں آنے لگا کہ ارجمند کو اللہ نے بہت اچھا بنایا ہے۔ بہت پاکیزہ ہے وہ۔ اور اس میں اب اسے کوئی شک نہیں رہا کہ اللہ میاں اس سے بات کرتے ہیں، اس کی راہنمائی فرماتے ہیں۔ حالانکہ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے ارجمند سے کہا تھا کہ یہ گمراہ کن بات ہے۔ لیکن اب وہ سمجھ گیا تھا۔

یہ آدمی کی یادداشت کیسی ہوتی ہے۔ ارجمند کی اس بات کو اس سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا۔ ایک وہی تو تھا، جو پورے وثوق کے ساتھ اس کی تائید کر سکتا تھا

گواہی دے سکتا تھا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، اللہ کو اپنے اندر پایا تھا، حالانکہ وہ اس وقت جانتا نہیں تھا۔ وہ کون تھا، جو اندر رہ کر اس کی رہنمائی کرتا تھا، ذہن میں سوالات اٹھاتا تھا، تجسس کو ہوا دیتا تھا، اور پھر غور و فکر کے ذریعے درست جواب عطا کرتا تھا۔ وہ کون تھا، جس کے اشاروں پر دنیا کی ہر شے اسے وحدانیت کی گواہی دیتی نظر آتی تھی۔ وہ کون تھا، جس نے اسے بت پرستوں میں پیدا کیا، لیکن کبھی بت پرستی نہیں کرنے دی، مشرکوں میں پیدا کیا، لیکن شرک سے بچائے رکھا۔ وہ کون تھا، جس نے نور بانو کی آواز میں اسے قرآن کی قرأت سنوائی، اور اس کی محبت دل میں ڈالی۔ وہ کون تھا، جس نے اسے عربی زبان پڑھوائی۔ وہ کون تھا، جس نے سورۂ ملک کی وہ آیات اس پر کھولیں اور اسے ایمان سے نوازا۔ وہ کون تھا، جس نے اسے ساتوں آسمانوں کا جلوہ دکھایا۔ وہ کون تھا، جو بے خبری میں بھی اسے پاکی کے طریقے سکھاتا تھا۔ وہ کون تھا، جس نے ایمان سے بھی پہلے اسے کلمہ طیبہ سے نوازا تھا۔

ارے وہ اللہ ہی تو تھا، اور اس کے اندر موجود تھا۔

تو کیا اس نے یہ سمجھا کہ یہ عنایت صرف اس پر ہے۔ ارے وہ تو ہادی ہے، سب کے دلوں میں رہتا ہے۔ بس آدمی خود کو پاک رکھے، اللہ سے رجوع کرنے والا ہو اور اللہ کا فرمانبردار ہو۔

اور ارجمند ایسی ہی ہے۔ بلکہ جیسا وہ تھا، ارجمند اس سے بھی بہتر ہے۔

پہلی بار وہ مطمئن اور بے فکر ہوا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں بہتری ہے۔

اس نے سر گھما کر دیکھا اور حیران ہوا کہ ارجمند موجود نہیں ہے۔ پھر اسے اس کی آخری بات، اور اس کا جانا یاد آیا۔ وہ اتنا مستغرق رہا تھا کہ وہ سب کچھ بھول گیا۔ ارجمند سے ہونے والی گفتگو بھی اسے خواب سی لگتی تھی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اسے اماں کو...... اور نور بانو کو بتانا تھا...... کہ وہ تیار ہے۔

***

پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ کیا نوکر ملازم اور کیا گھر کے لوگ، سب ایک دوسرے سے بڑھ کر خوش نظر آ رہے تھے۔ ہر چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اور ساجد تو ابھی سے ارجمند کو چھوٹی چاچی کہہ رہا تھا۔

اب یہ نور بانو کی فطرت تھی۔ وہ کڑھنے لگی۔ کیا یہ سب لوگ اسی دن کے منتظر تھے؟ ان میں سے کسی کو میرا خیال نہیں آتا؟ اور ساجد... اس نے کبھی مجھے محبت سے چاچی نہیں کہا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے اسے خیال نہیں آئی کہ اس نے کبھی ساجد کو منہ ہی نہیں لگایا۔ وہ تو اسے ہمیشہ رکاوٹ سمجھتی رہی۔ اس نے دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنا رویہ بھی یاد نہیں کیا۔ بس اس پر یہ ثابت ہوگیا کہ یہ سب اس کے اور اس کی خوشیوں کے دشمن ہیں۔

لیکن ایک اچھی بات تھی۔ کہانی کے تین مرکزی کرداروں کا طرز عمل مختلف تھا۔ ارجمند تو جیسے خود میں سمٹ گئی تھی۔ نماز تو وہ پڑھتی ہی تھی مگر اس کی نمازیں، اور نماز کے بعد کی دعائیں، دونوں طویل ہوگئی تھیں۔ کچن میں وہ اپنے معمول کے مطابق گھسی رہتی۔ باقی وقت میں وہ زیادہ تر قرآن پڑھتی۔ اس تمام عرصے میں نور بانو کو اس کے چہرے پر مسکراہٹ نظر نہیں آئی۔ ساجد اسے چھوٹی چاچی کہہ کر چھیڑتا تو وہ اسے خفگی سے گھورتی اور پھر نظریں جھکا لیتی۔

نور بانو کو یقین تھا کہ ارجمند اس شادی سے خوش نہیں ہے۔ وہ صرف اس کی بات مان کر، اس کی خوشی کے لئے ایثار کر رہی ہے۔

اور عبدالحق پہلے جیسا ہی تھا۔ نہ وہ خوش تھا، نہ اداس۔ پہلے کی طرح وہ اس کی فکر کرتا بات بات میں، اور اس کا خیال رکھتا۔ یہ الگ بات کہ نور بانو کو اس کا نارمل نظر آنا بھی اچھا نہیں لگا۔

''آپ تو بہت خوش نظر آ رہے ہیں اس شادی سے؟'' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

اور عبدالحق بری طرح بھڑک گیا۔

''تم کیسی ناشکر گزار عورت ہو۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''خود ہی یہ کھیل رچایا، میری مرضی کے خلاف۔ اور اب چاہتی ہو کہ میں

بیٹھ کر روتا رہوں۔''

''میں نے یہ تو نہیں کہا۔ میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ ....'' نور بانو نے مدافعانہ لہجے میں کہنے کی کوشش کی۔

لیکن عبدالحق نے اس کی بات کاٹ دی۔

''میں صرف تمہاری خاطر یہ شادی کر رہا ہوں۔ اب اگر تم نے ایسی کوئی بات کی تو یہ سب کچھ ختم سمجھنا۔''

نور بانو سہم گئی۔

''آپ تو خوامخواہ بھڑک گئے۔''

''تمہارا طنزیہ لہجہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' عبدالحق کا لہجہ بدستور سخت تھا۔

''اور میری بات غور سے سنو! یہ جو تم نے شروع کیا ہے، یہ زندگی بھر کا کھیل ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ بہت سنجیدہ معاملہ ہے۔ مجھے ارجمند کے حقوق کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔''

''آپ سے زیادہ اس کے حقوق کا خیال میں رکھوں گی۔''

''ابھی سوچ لو۔ اس شادی کے بعد یہ رویہ سامنے آیا تو اس کا نقصان تمہیں ہوگا، پھر مجھ سے شکایت نہ کرنا۔''

''میں تو مذاق کر رہی تھی۔ آپ سنجیدہ ہو گئے۔''

اور حمیدہ نے تو نور بانو کو حیران ہی کر دیا۔

جیسے ہی عبدالحق نے منظوری دی، حمیدہ نے اسے بلا لیا۔

''ہوگا وہی دھیے! جو تو چاہے گی۔'' حمیدہ نے اس سے کہا۔

''لیکن یہ تین دن والی بات آسان تو نہیں ہے نا! میرا تو خیال ہے، جمعے کا دن مبارک رہے گا۔''

نور بانو نے حیرت سے اسے دیکھا۔ گھر کی سب سے بااختیار ہستی اتنی عاجزی سے بات کر رہی تھی۔

حمیدہ نے اس کی نظروں کا کچھ اور ہی مفہوم لیا۔ وہ جلدی سے بولی۔

''میں نے تو صرف مشورہ دیا ہے۔ تو چاہے تو آج ہی کر دے نکاح۔

میں تو بس تیری خوشی میں خوش ہوں دھیے....!''

''اماں ....! آپ ایسے بات نہ کریں۔ آپ کو تو حکم دینے کا حق ہے۔''

نور بانو نے تڑپ کر کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ جمعہ ہی مناسب رہے گا۔ اور وقت ....؟''

''عصر اور مغرب کے درمیان کیسا رہے گا....؟''

نور بانو حیران بھی ہوئی اور خوش بھی۔ اب بھی حمیدہ مشورہ ہی دے رہی تھی، حکم نہیں!

''جی اماں ....! نہایت مناسب ہے۔''

تو اب دوسرے لوگوں کی خوشی سے نور بانو کو اتنا ناخوش نہیں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اپنی فطرت کا وہ کیا کرتی۔ اس کے دل میں ان خوش ہونے والوں کے لئے بال آ گیا تھا۔ تاہم بار بار وہ خود کو یاد دلاتی کہ یہ سب کچھ اس کی اپنی مرضی سے، اس کے بھلے کے لئے ہی ہو رہا ہے۔ اس کا تو نفع ہی نفع ہے اس میں۔ اسے تو خوش ہونا چاہئے۔ اسے تو اولاد ملنے والی ہے، ماں بننے کا اعزاز ملنے والا ہے، جو کسی طرح اسے نہیں ملنا تھا۔

زبیر گاؤں چلا گیا۔ وہاں اسے ڈاکٹر صاحب اور مولوی مہر علی صاحب کے علاوہ کچھ لوگوں کو مدعو کرنا تھا۔ اور مولوی صاحب کو تو نکاح پڑھانا تھا۔ یہاں صرف مسعود صاحب تھے، سو ان کے ہاں حمیدہ اور نور بانو چلی گئیں۔ مسعود صاحب کی لڑکیاں تو اس کے ساتھ ہی آ گئیں کہ کپڑوں اور زیورات کی خریداری میں نور بانو کا ساتھ دیں گی۔

گھر میں ایک طرح سے ہنگامی حالات کا نفاذ ہو گیا۔ لیکن مثبت انداز میں۔

مسعود صاحب کی بیٹیوں کے آنے سے نور بانو کو بہت فائدہ ہوا۔ ایک طرف تو ان سے مدد ملی اور دوسری طرف سے اس کی انا کو سکون ملا۔ ان دونوں کے نزدیک تو وہ بہت بڑی ہستی بن گئی تھی .... محبت اور ایثار کی معراج کی علامت۔

''آپ نے تو کمال کر دیا نور باجی....! کوئی بیوی ایسا نہیں کرتی۔''

رضوانہ نے کہا۔

"واقعی......! آپ نے تو مثال قائم کر دی۔" شابانہ بولی۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ میں اتنی محبت بھری ہے۔"

"مجھے تو آپ اکھڑ سی لگی تھیں ہمیشہ۔"

"اتنا بڑا دل ہے آپ کا، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔"

گھر میں خوش ہونے والوں نے نور بانو کو جو زخم دیا تھا، رضوانہ اور شابانہ کی باتیں اس کے لئے مرہم بن گئیں۔ اس نے جیسا سوچا تھا، اس سے بھی بڑھ کر خریداری کی۔ ارجمند کے لئے ہر چیز وہ اعلیٰ درجے کی لائی۔

❁❁❁

حمیدہ اپنے کمرے میں تھی کہ ساجد گھبرایا ہوا اس کے پاس آیا۔

"دادی......! دادی......! جلدی سے چلئے میرے ساتھ۔" اس نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوگیا پتر! خیر تو ہے......؟"

"چھوٹی چاچی رو رہی ہیں...... بہت رو رہی ہیں۔ میں نے بہت چپ کرایا، پر وہ روئے جا رہی ہیں۔ بہت برا حال ہوگیا ہے ان کا۔"

حمیدہ گھبرا گئی۔ کہیں رنگ میں بھنگ تو نہیں پڑ گیا۔ نکی نے مروت اور لحاظ میں ہاں کر دی ہو اور اب پچھتا رہی ہو۔ بے بس بچی، جس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے، بے بسی سے رونے کے سوا کیا کر سکتی ہے۔

وہ اٹھی اور ساجد کے ساتھ چل دی۔

ساجد اسے گیسٹ روم میں لے گیا۔ وہاں ارجمند بیڈ پر لیٹی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ چہرے پر تھے اور جسم بری طرح لرز رہا تھا۔

حمیدہ اس کے پاس جا بیٹھی۔ ساجد کھڑا رہا۔ حمیدہ نے دھیرے سے ارجمند کو ہلایا۔

"نکی......! کیا ہوا میری نکی......!" اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

ارجمند نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔

حمیدہ نے ایک نظر میں دیکھ لیا کہ اس کا بہت برا حال ہے۔ گیسٹ روم کی طرف تو کوئی آتا بھی نہیں۔ یہ تو شکر ہے کہ ساجد نے اسے دیکھ لیا۔ ورنہ یہ یہاں روتے روتے مر جاتی۔ حمیدہ نے سوچا۔ اور ہو نہ ہو، بات یہی ہے کہ ارجمند اس شادی سے خوش نہیں ہے۔ اس نے ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا کہ اگر ایسا ہے تو وہ یہ شادی ہرگز نہیں ہونے دے گی۔ کسی کے بھی خواب بچی کی زندگی سے اہم نہیں ہو سکتے۔

وہ ساجد کے سامنے بات نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے ساجد سے کہا۔

"تو جا پتر! میں اسے سنبھال لوں گی۔"

مگر چھوٹی چاچی کے لئے پریشان ساجد جانا نہیں چاہتا تھا۔

"جا تو یہاں سے۔ مجھے نکی سے بات کرنے دے پتر! سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"اور کسی سے کچھ کہنا نہیں...... اماں سے بھی نہیں۔"

طبعاً فرمانبردار ہونے کی وجہ سے ساجد وہاں سے ٹل گیا۔ ورنہ اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔

ارجمند اب بھی روئے جا رہی تھی۔ اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔

"نکی......! کیا ہوا تجھے؟ بول نا، کیا بات ہے؟" حمیدہ نے اسے چمکارا۔

ارجمند کے ہونٹ لرزتے رہے۔ جسم ہچکیوں سے کانپتا رہا۔ وہ کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں تھی۔

"تو غم نہ کر۔ میں ہوں نا تیری دادی! تیری مرتی ہوئی پھپھو نے تجھے میرے حوالے کیا تھا۔"

اس حوالے پر تو ارجمند کا گریہ اور بڑھ گیا۔ ہچکیاں گھٹی گھٹی چیخوں میں بدل گئیں۔

"تو مجھے بتا! تیری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہونے دوں گی میں۔" حمیدہ نے شفقت سے کہا۔

"شادی مروت میں نہیں ہوتی۔ تیری مرضی نہیں ہے تو یہ شادی میں کبھی نہیں ہونے دوں گی۔"

اس بات پر ارجمند کا ردعمل بہت واضح تھا۔ اس نے گریہ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھوں میں پہلے حیرت سی جھلکی اور پھر خوف۔ لیکن اس کا جسم اب بھی لرز رہا تھا۔ اور وہ کوشش کے باوجود بول نہیں پا رہی تھی۔

حمیدہ نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

''تو یہ شادی نہیں کرنا چاہتی؟ یہی بات ہے نا نکی ....؟''

ارجمند کے ہونٹ بے آواز ہلے۔ پھر اس نے بے بسی سے بڑی شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

حمیدہ سمجھ نہیں سکی کہ سر کی وہ جنبش شادی کے حق میں ہے یا خلاف؟

''مجھے بتا! کیا تو اس شادی سے خوش ہے؟''

ارجمند نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔

حمیدہ نے سکون کا سانس لیا۔ لیکن فوراً ہی پریشان بھی ہوگئی۔

''تو پھر کیا بات ہے پتری!''

ارجمند اپنی ہچکیوں پر اور جسم کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن یہ آسان نہیں تھا۔

''میں تیرے لئے پانی لاتی ہوں۔ پھر تو سکون سے مجھے بتانا کہ کیا بات ہے؟ ارے ....! میں تیری دادی ہوں، کچھ بھی کر سکتی ہوں تیرے لئے۔''

ارجمند کو پھر رونا آ گیا۔ اس کا دل بہت نازک ہو رہا تھا۔

حمیدہ اس کے لئے پانی لے کر آئی تو وہ خود کو بڑی حد تک سنبھال چکی تھی، اور اب بیٹھی ہوئی تھی۔ حمیدہ نے اس کی طرف گلاس بڑھایا۔

''لے پتری! دو گھونٹ پی لے۔''

ارجمند نے پانی پیا اور گلاس کو سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

حمیدہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

''مجھے پتا ہے نکی! کہ تو جھوٹ نہیں بولتی۔'' اس نے کہا۔

''پھر بھی خاص طور پر کہہ رہی ہوں کہ اس وقت بالکل سچی بات کرنی ہے۔ مجھے صاف صاف بتا، کسی کی مروّت اور لحاظ میں تو شادی کے لئے ہاں نہیں

کی ہے تو نے ....؟''

''نہیں دادی اماں! ایسی کوئی بات نہیں۔''

''تو اس شادی سے خوش ہے نا ....؟''

''جی دادی اماں....!''

حمیدہ کے دل سے کوئی بھاری بوجھ ہٹ گیا۔

''تو پھر تو ایسے رو کیوں رہی تھی ....؟'' اس نے محبت سے پوچھا۔

''سب لوگ یاد آ گئے تھے اماں ....!''

حمیدہ کا دل دکھنے لگا اس کے لئے۔

''اللہ نے انہیں واپس بلا لیا، اس کی مرضی! پر بدلے میں بھی تو تجھے کچھ لوگ دیئے ہیں نا....!''

''جانے والے تو چلے گئے دادی! لیکن جو موجود ہے، وہ تو میری شادی میں شریک ہو جاتا۔''

''ایسا کون ہے نکی....!''

''نانا ....! ان کو تو پتا بھی نہیں چلے گا۔''

''نانا ....؟'' حمیدہ نے دہرایا، پھر ذہن پر زور دیتی رہی۔

''وہ جنہیں تیری پھپھو نواب صاحب کہہ رہی تھیں، اس دن اسپتال میں۔''

ارجمند کی آنکھیں پھر بھرنے لگی تھیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''اور تجھے پہلے کبھی ان کا خیال نہیں آیا ....؟''

''انہیں تو میں روز یاد کرتی ہوں دادی ....!''

''تو ان سے ملنے کے لئے کیوں نہیں گئی کبھی ....؟''

''کس کے ساتھ جاتی دادی اماں ....!''

''تو اپنے چاچا زبیر سے کہہ دیتی۔''

اب ارجمند اسے کیسے بتاتی کہ نانا داتا دربار میں رہتے ہیں، جہاں ہر

وقت ہجوم رہتا ہے۔

"آغا جی کے سوا انہیں کوئی نہیں پہچانتا۔ آغا جی ہی انہیں پہچانتے بھی ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ اور آغا جی تو اتنے برس کراچی میں رہے۔"

حمیدہ کا دل کٹنے لگا اس کے لئے۔

"تو فکر نہ کر۔ آج ہی تجھے ان سے ملوا دوں گی۔ ارے وہ تو تیرے سرپرست، تیرے ولی ہیں۔ وہی تیرا نکاح کرائیں گے۔ آنے دے عبدالحق کو۔ میں اس سے بات کرتی ہوں۔"

ارجمند رو دی۔ لیکن اس بار وہ خوشی کے آنسو تھے۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق سے پہلے نور بانو واپس آ گئی۔ حمیدہ نے اس سے بات کی۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔" نور بانو نے کہا۔

"وہ اس کے بزرگ ہیں۔ عبدالحق صاحب انہیں یہاں لائیں گے۔ وہ انیکسی میں رہیں گے اور ارجی بھی وہیں رہے گی۔ اب تو ہم اسے انیکسی سے ہی رخصت کرا کے لائیں گے۔"

حمیدہ بھی خوش ہو گئی۔

"یہ تو بہت اچھا رہے گا۔"

عبدالحق کے آنے پر اس سے بات ہوئی تو وہ شرمندہ ہو گیا۔

"یہ تو میری غیر ذمہ داری ہے۔ مجھے ان کا خیال کیوں نہیں آیا؟"

"دیر آید درست آید! اب آپ انہیں لے آیئے جا کر۔" نور بانو نے کہا۔

"میں ابھی جا رہا ہوں۔"

"بچی کو ساتھ لے کر جا پتر.....!" حمیدہ نے کہا۔

اس پہ عبدالحق گڑبڑا گیا۔

"اب میں اسے ساتھ لے کر کہاں ڈھونڈتا پھروں گا انہیں۔"

"ڈھونڈنا کیسا؟ وہ اپنے گھر میں ہوں گے۔" حمیدہ نے کہا۔

"اور ڈھونڈنا بھی پڑے تو کیا، تو تو گاڑی میں جائے گا نا!"

عبدالحق نے چپ سادھ لی۔ نواب صاحب کے ٹھکانے کے بارے میں بتاتے ہوئے اسے یہ ڈر ہوا کہ کسی طرح بات نہ کھل جائے۔

"لیکن اماں! ارجمند کو ساتھ لے کر جانے کی کیا ضرورت ہے؟ میں جا کر انہیں اپنے ساتھ لے آؤں گا۔"

مگر اس بار نور بانو آگے بڑھی۔

"آپ سمجھ نہیں رہے ہیں۔ سات سال ہو گئے، ارجی ان سے نہیں ملی۔ یہ تو زیادتی ہے نا.....! انہیں یقیناً گلہ ہو گا اس بات کا۔ اب آپ جائیں اور ان سے کہیں کہ ارجمند کی شادی ہے، آپ میرے ساتھ چلیں، تو یہ اچھا تو نہیں لگے گا۔ بھئی قاعدے کی بات تو یہ ہے کہ آپ پہلے ارجی کو لے جا کر ان سے ملائیں۔ وہ خوش ہوں گے۔ پھر معذرت کریں اور بتائیں کہ اس تمام عرصے میں آپ کراچی میں رہے۔ آپ کا عذر قابل قبول ہو گا ان کے لئے۔ پھر آپ..... بلکہ ارجی ان سے ساتھ چلنے کو کہے۔ یہ ہے عزت کی بات۔"

بات معقول تھی۔ عبدالحق نے دبی زبان سے کہا۔

"لیکن میں ارجمند کو ساتھ..... ذرا سوچو تو....."

"باہر والوں کی بات چھوڑیں جی.....!" نور بانو نے تنک کر کہا۔

"اور باہر کس کو پتا ہے کہ آپ کی شادی ہو رہی ہے ارجی کے ساتھ۔ اور پتا بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے؟ میں آپ کی بیوی ہوں۔ میں آپ کے ساتھ اسے بھیج رہی ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔"

اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق نے ارجمند کے لئے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا مگر ارجمند گھوم کر دوسری طرف چلی گئی۔

"کیا ہوا.....؟" عبدالحق نے پوچھا۔

"میں آگے بیٹھوں گی۔"

عبدالحق نے دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں ارجمند بھی برابر والی سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔

''پیچھے بیٹھنے میں کیا حرج تھا.....؟''

''دیکھنے والے آپ کو ڈرائیور سمجھتے۔'' ارجمند نے محجوب لہجے میں کہا۔

عبدالحق نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی اور پھر حیرت سے اسے دیکھا۔

''یہ تمہیں کیسے پتا چلا.....؟''

''کالج میں لڑکیوں سے۔ اس کے بعد میں چاچا کے ساتھ کبھی پچھلی سیٹ پر نہیں بیٹھی۔''

''اوہ.....!''

داتا دربار کے پہلو والی سڑک پر عبدالحق نے گاڑی پارک کی۔ انجن بند کرنے کے بعد وہ ارجمند کی طرف مڑا۔

''اب یہاں ہجوم میں نواب صاحب کو ڈھونڈنا ہوگا۔ تم ساتھ نہ چلو تو بہتر ہے۔''

''جو آپ مناسب سمجھیں۔''

''میں گاڑی لاک کر کے جا رہا ہوں۔ تم شیشہ بھی نیچے نہ کرنا۔ ہلنا بھی نہیں یہاں سے۔''

''جی آغا جی.....! آپ فکر نہ کریں۔''

عبدالحق گاڑی سے اترا اور دروازہ لاک کرنے کے بعد آگے بڑھ گیا۔

❁ ❁ ❁

اچھو میاں مزار کے سامنے وسیع و عریض صحن کے درمیان اردگرد موجود ہجوم سے الگ تھلگ بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ اور وہ استغفار کر رہے تھے۔

سات سال پہلے وہ نادرہ کو دفنانے کے بعد اور ارجمند کو عبدالحق کے گھر چھوڑ کر سیدھے داتا دربار آئے تھے۔ تب سے وہ یہیں تھے۔ لگے بندھے معمولات تھے ان کے۔ فجر کے بعد قرآن پڑھتے، پھر صحن کے فرش کو صاف کرتے۔ پھر تسبیح

لے کر بیٹھ جاتے۔ ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد بھوک لگتی تو باہر جا کر قطار میں لگ کر لنگر سے کھانا لیتے اور وہیں بیٹھ کر کھا لیتے۔ اس کے بعد پھر قرآن کی تلاوت اور پھر وہی تسبیح۔ یہی ان کا معمول تھے۔ نماز، قرآن اور تسبیح۔

کچھ ہی دنوں میں لوگ انہیں دیکھنے کے عادی ہو گئے۔ وہاں بہت سے لوگ ایسے تھے، جو مزار پر حاضری کے لئے باقاعدگی سے آیا کرتے تھے۔ کچھ تو ہر روز آتے تھے، کچھ جمعرات کے جمعرات۔ اور لاہور کے قریبی شہروں میں رہنے والے بھی ماہ بہ ماہ آتے رہتے تھے۔ وہ سب انہیں پہچاننے لگے۔

ایک دن ایک شخص نے انہیں کاغذ کا ایک تھیلا دیا۔

''یہ کیا ہے.....؟'' اچھو میاں نے تھیلے کی طرف ہاتھ بڑھائے بغیر پوچھا۔

''کپڑے ہیں آپ کے لئے۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے.....؟''

''ضرورت ہے۔'' دینے والے نے زور دے کر کہا۔

''آپ کے کپڑے بہت میلے ہو گئے ہیں۔''

اچھو میاں نے سر جھکا کر اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی میلے ہو رہے تھے۔

''جزاک اللہ.....!'' انہوں نے تھیلا لیتے ہوئے کہا۔

انہوں نے نہا دھو کر کپڑے بدلے۔ حمام سے نکل کر اپنے میلے کپڑے بغل میں دبائے وہ دربار کی طرف جا رہے تھے کہ باہر بیٹھے ہوئے ایک فقیر نے انہیں پکار لیا۔

''یہ کپڑے مجھے دے جا بابا.....!''

وہ ہچکچائے۔

''تو تو اندر رہتا ہے۔ کہاں رکھے گا؟ یہ کپڑے مجھے دے دے۔ اللہ تجھے اور دے گا۔''

''دھلوا کر دے دوں گا۔''

"میں آپ ہی دھلوا لوں گا۔" فقیر نے کہا۔

اچھو میاں نے کپڑے اسے دے دیئے۔

اس دن کے بعد یہ بھی معمول بن گیا۔ ہر تیسرے چوتھے دن کوئی نہ کوئی انہیں جوڑا دے دیتا۔ وہ حمام جا کر نہاتے۔ نئے کپڑے پہنتے اور پرانے اسی فقیر کو دے دیتے۔ اس دن کے بعد کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی لباس انہوں نے دوسری بار پہنا ہو۔ ہر بار وہ نیا کپڑا پہنتے تھے۔

"واہ میرے مالک......!" اچھو میاں نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہا۔

"اتنے عیش تو میں نے باپ کی دولت اڑاتے ہوئے بھی نہیں کئے، جتنے آپ کرا رہے ہیں۔"

لوگوں کو ان کے بارے میں تجسس بھی ہونے لگا۔ وہ کسی سے بات تو کرتے ہی نہیں تھے۔ شاید اس لئے ان کی کشش بڑھ گئی تھی۔

ایک دن کسی نے انہیں پیسے دینے چاہے تو انہوں نے انکار کر دیا۔

"لے لو......! رکھ لو......!"

"مجھے ضرورت ہی نہیں۔" انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

"کبھی ضرورت پڑ بھی سکتی ہے۔"

"ضرورت پڑی تو مانگ لوں گا۔"

"کس سے مانگو گے......؟"

"اللہ سے...... اور کس سے مانگوں گا......؟ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔" انہوں نے بہت یقین سے کہا۔

"یہ کیسے کہہ سکتے ہو......؟"

"جانتا ہوں نا! بغیر مانگے دینے والا مجھے کسی بندے سے تو سوال نہیں کرنے دے گا۔"

اور دینے والے پر تھرتھری چڑھ گئی۔ اچھو میاں تسبیح پڑھنے لگے تھے۔ وہ چند لمحے انہیں دیکھتا رہا، پھر خاموشی سے مزار کی طرف چلا گیا۔

ایک دن کسی نے کہا۔

"بڑے میاں! کبھی مزار میں نہیں دیکھا تمہیں۔"

"میں مزار میں جاتا ہی نہیں۔"

"دن رات اسی صحن میں پڑے رہتے ہو۔ اس کا مطلب ہے، کوئی ٹھکانا نہیں ہے......؟"

اچھو میاں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آگے پیچھے کوئی نہیں ہے......؟"

"اعمال کے سوا آگے پیچھے ہوتا کیا ہے......؟"

"ٹھیک کہتے ہو۔ یہ تو سب کے ساتھ ہے۔ پر اندر کیوں نہیں جاتے مزار کے......؟"

"اپنی اوقات تو اس صحن کی بھی نہیں، تم اندر کی بات کرتے ہو۔ یہ تو مالک کا کرم ہے کہ اس نے یہاں پناہ دے دی۔"

وہ پوچھنے والا بھی کچھ جھکی تھا۔

"کرم تو اندر اور زیادہ ہے۔ کیوں خود کو محروم کرتے ہو......؟"

"کہا نا کہ اوقات نہیں ہے اپنی۔"

"مطلب کیا ہے اس بات کا......؟"

"ناپاک ہوں۔ پاک ہو جاؤں گا تو اندر بھی چلا جاؤں گا انشاء اللہ......!"

"تو جاؤ......! نہا دھو کر پاک ہو جاؤ۔"

"نہانے سے جسم کی غلاظت دھلتی ہے، روح کی نہیں۔ اعمال نہیں دھلتے نہانے سے۔"

"کمال ہے۔ لوگ تو پاک ہونے کے لئے اندر جاتے ہیں۔"

"ہر شخص کو اپنی غلاظت کا پتا ہوتا ہے۔ وہ بھی ٹھیک کرتے ہیں، اور میں بھی ٹھیک کرتا ہوں۔"

"تو تمہیں کون پاک کرے گا......؟"

"کیسی بات کرتے ہو......؟" اچھو میاں نے برا مانتے ہوئے کہا۔

"پاک کرنے والا تو ایک ہی ہے۔" انہوں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔

"تمہیں کیسے پتا چلے گا اپنے پاک ہونے کا......؟"

"پاک ہو جاؤں گا تو دل روشن ہو جائے گا۔ سب کچھ صاف نظر آنے لگے گا......اندر بھی اور باہر بھی۔"

"یقین سے محروم ہو۔ یقین ہوتا تو اندر جاتے اور پاک ہو کر باہر آتے۔"

"یقین دینے والا بھی تو وہی ہے۔" اچھو میاں نے پھر آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔

ایک دن ایک پریشان حال عورت ان کے پاس آ بیٹھی۔

"میرے لئے دعا کرو بابا......!"

"ہر روز دعا کرتا ہوں تمہارے لئے۔" اچھو میاں نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

"جانتے ہو نہیں مجھے، دیکھا ہے نہیں مجھے، اور کہتے ہو کہ ہر روز دعا کرتا ہوں۔"

"دعا کرنے کے لئے جاننا کب ضرورت ہے......؟"

"تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ میری پریشانی کیا ہے......؟"

"مجھے معلوم ہو نہ ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پریشانی دور کرنے والے کو، ہر ضرورت پوری کرنے والے کو تو معلوم ہے۔"

"میرا دل نہیں مانتا۔" عورت نے کہا۔

"پہلی بار میں نے تم سے بات کی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم روز میرے لئے دعا کرتے ہو۔ کیوں کرتے ہو بھلا؟"

"اپنی غرض کے لئے کرتا ہوں۔"

"تمہاری کیا غرض ہے......؟"

"توبہ کرو توبہ! غرض سے پاک، غنی اور بے نیاز تو بس اللہ کی ذات ہے۔ میں ہر روز اس سے دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ! تو یہاں آنے والوں میں سے ہر ایک

کی دعا قبول فرما لے۔ سب کی ضرورتیں پوری فرما دے۔ سب کی پریشانیاں دور کر دے اور سب کے طفیل میری بھی سن لے۔"

"یہ تو کوئی بات نہیں۔" عورت نے مایوسی سے کہا۔

"تم خاص طور پر میرے لئے دعا کرو۔"

"ٹھیک ہے۔ اب خاص طور پر تمہارے لئے دعا کروں گا۔"

"کیا دعا کرو گے......؟"

"وہی جو سب کے لئے کرتا ہوں۔"

"نہیں......! میری تو خاص حاجت ہے۔ اس کے لئے دعا کرو۔"

"تو بتا دو! دعا میں کر دوں گا۔ آگے رب جانے۔"

"میرے گھر میں تنگی بہت ہے۔ میرے شوہر کے روزگار کی ترقی کے لئے دعا کرو۔ خوش حالی کے لئے دعا کرو۔"

عورت مطمئن ہو کر چلی گئی۔ اچھو میاں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔

ایک دن وہ تسبیح پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص ان کے پاس آیا۔ تسبیح مکمل ہونے والی تھی، اور اچھو میاں کو ذکر کے دوران بولنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ انہوں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ شخص کھڑا رہا۔

اچھو میاں نے تسبیح مکمل کی، پھر کھڑے ہو کر اسے تعظیم دی۔

"تم کیسے بداخلاق آدمی ہو۔ تسبیح پڑھتے رہے۔ میری بات کا جواب نہیں دیا۔" اس آدمی نے معترضانہ لہجے میں کہا۔

"مجبوری تھی۔ معافی چاہتا ہوں۔"

"میری سمجھ میں تو نہیں آئی تمہاری مجبوری۔"

"تم اپنے باپ سے کچھ بات کر رہے ہو اور میں تمہیں پکاروں تو تم اپنی بات پوری کئے بغیر مجھے جواب دو گے......؟ نہیں نا......؟ کیونکہ یہ عزت اور احترام کی بات ہے۔ اب میں تو اللہ کے حضور تھا۔ تسبیح پوری کئے بغیر بولتا تو بے ادبی ہوتی۔"

"یہ تو خلوت کی بات ہے۔ جبکہ تم تو ہجوم کے درمیان بیٹھے ہو۔"

''اللہ تو ہر جگہ موجود ہے۔ جہاں آدمی اس سے لو لگا لے، وہ اس کے لئے خلوت ہی ہوتی ہے۔''

''آپ سے یہاں بیٹھے ہو......؟''

''چند روز ہی ہوئے ہوں گے۔''

''تین چار سال سے تو میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔'' اس شخص نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

''خوشی کے دن بہت تیزی سے گزرتے ہیں نا! مجھے تو یہ چند روز ہی لگتے ہیں۔''

''میرا مطلب یہ ہے کہ آدمی پابندی سے مسلسل ذکر کرتا رہے تو ذکر قلب میں جاری ہو جاتا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں، لوگ تسبیح بھی پڑھتے رہتے ہیں، اور باتیں بھی کرتے رہتے ہیں۔''

''میرے قلب میں تو ذکر جاری نہیں ہوا۔'' اچھو میاں نے بڑی حسرت سے کہا۔

''اور ایسا ہو جائے تو بھی میں درمیان میں نہ بولوں۔''

''کیوں بھئی......؟''

''اپنا اپنا نکتہ نظر ہے۔ دیکھو، اگر اللہ کے فضل سے میرے دل میں ذکر جاری ہو جائے اور میں ایسا کروں تو کچھ لوگ تو مجھے ڈھونگی سمجھیں گے کہ میں دکھاوا کر رہا ہوں۔ اس میں تو میرا کوئی نقصان نہیں۔ لیکن کچھ لوگ اس غلط فہمی میں پڑ جائیں گے کہ میں کسی مقام پر ہوں۔ اور ایسا ہے نہیں تو اس میں میرے لئے نقصان ہے۔ اور پھر دل میں ذکر جاری ہو تو ہاتھ میں تسبیح رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

''ایک بات پوچھوں تم سے......؟ یہ بتاؤ، تم ذکر کیا کرتے ہو......؟''

''یہ تو بندے اور خدا کے درمیان معاملہ ہے۔ کسی کو کسی سے نہیں پوچھنا چاہئے۔''

''ہجوم میں بیٹھ کر کرو گے تو ہر شخص کو تم سے پوچھنے کا حق ہے۔''

اچھو میاں لاجواب ہو گئے۔ چند لمحوں کے بعد انہوں نے کہا۔

''تو یہ میرا حق ہے کہ میں بتاؤں یا نہ بتاؤں۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو، تمہارا حق ہے۔'' اس شخص نے نرم لہجے میں کہا۔

''مگر میں تمہارے بھلے کے لئے پوچھ رہا ہوں۔ ممکن ہے، کوئی کام کی بات تمہیں بتا دوں اور وہ تمہارے دل کو لگ جائے۔ نہ لگے تو اللہ کی مرضی ہے۔ کیونکہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہی ہے۔''

اچھو میاں نے چونک کر اسے دیکھا۔ عمر تو اس کی زیادہ نہیں تھی۔ گہری سیاہ گھنی اور خوش نما داڑھی اور چہرے پر پاکیزگی۔ پیشانی پر ایسی چمک تھی کہ نگاہ نہیں پڑتی تھی۔ ان کا دل اس کی طرف کھنچنے لگا۔

''ذکر کیسا، بس دو کلمے ہی پڑھتا ہوں میں۔'' انہوں نے شرمندگی اور عاجزی سے کہا۔

''دن میں شکر اور رات کو اور صبح کے وقت استغفار۔''

''دن میں شکر کیوں......؟''

''اللہ نے معاش کی فکر سے آزاد کر کے یہ فرصت عطا فرمائی ہے۔ اس پر شکر ادا کرتا ہوں۔ اصل میں گناہ گار ایسا ہوں کہ دن رات استغفار کروں تو بھی کم ہے لیکن دن کو اللہ نے معاش کی فکر کے لئے بنایا ہے۔ اب اس میں اللہ نے فرصت دی تو شکر لازم ٹھہرا۔''

''بہت اچھی بات ہے۔ لیکن یہ دونوں چیزیں تو جتنی بھی کرو کم ہیں...... شکر بھی اور استغفار بھی۔ سو بے حساب ہی کرنا چاہئے۔ تم دن میں چالیس ہزار بار شکر کرو اور رات میں چالیس ہزار بار استغفار، تو بھی کم ہے۔ حساب کرنے سے چیزوں کی قدر کم ہوتی ہے۔ تو سیدھی سی بات ہے۔ حساب رکھنا چھوڑ دو۔ پھر شکر و استغفار کرو تو کون جانے کہ رب اسے بے حساب مان لے۔''

''آپ کی بات دل کو لگتی ہے۔'' اچھو میاں نے شکر گزاری سے کہا۔

''اور پھر سوچو، رب بھی تمہاری طرح حساب کرنے لگے تو کیا ہو۔ مگر وہ بے حساب دیتا ہے۔ تو تمہیں بھی شکر بے حساب کرنا چاہئے۔ اور تمہیں تو اس کی نعمتوں کا علم ہی نہیں ہے...... بیشتر کا، اور اپنے گناہوں کا سوچوں، تو مجھے معلوم ہے

کہ وہ اتنے کثیر ہیں کہ میں انہیں یاد بھی نہیں کر سکتا۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ جن گناہوں کا اپنے مجھے علم ہی نہیں، وہ تو معلوم گناہوں سے ہزاروں گنا زیادہ ہیں۔ تو استغفار بھی بے حساب ہی ضروری ہے۔ اب بے حساب کچھ کرنے کی تو اپنی بساط ہی نہیں ہے۔ بس اتنا کر سکتے ہیں کہ گنتی چھوڑ دیں۔ اب اللہ کی رحمت اسے بے حساب مان لے، یہ کوئی بڑی بات نہیں۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ......!'' اچھو میاں نے تسبیح سمیٹ کر جیب میں رکھ لی۔

''اب اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گا کبھی۔''

''اب ایسا بھی نہیں کرو۔ آدمی کی فطرت ہے کہ گنتی کے بغیر کبھی خوش نہیں ہوتا۔ کچھ نہیں تو مال ہی شمار کرتا رہتا ہے۔''

''تو پھر کیا کروں میں......؟''

''ایک تسبیح بتاتا ہوں۔ جب سورج عین سر پر ہو اور جب سورج غروب ہونے کو ہو، ستر بار سید الاستغفار پڑھ لیا کرو۔'' یہ کہہ کر اس شخص نے انہیں سید الاستغفار یاد کرا دیا۔

''اب یہ یاد رکھنا۔ اس سے استغفار کا وزن بڑھتا ہے۔''

''جی...... ٹھیک ہے......!''

''میں تمہیں اور بھی کچھ بتاتا۔ اللہ کے کچھ نام، چند آیات......''

''مجھے تو استغفار کے لئے یہ وقت بھی کم ہی لگتا ہے۔''

''ایک بات کہوں! اللہ کے ہاں تعداد اور مقدار سے زیادہ اہمیت اخلاص کی ہے۔ کون جانے، کوئی دل کی، روح کی گہرائی سے ایک بار استغفر اللہ کہے اور اللہ اس کے کل گناہ بخش دے۔ لیکن اللہ کو بندے کا گناہ گاری کا شدید احساس اور اس پر شرمندگی اور فکرمندی بھی اچھی لگتی ہے۔ ہر ایک کا اپنا طریقہ ہوتا ہے، اپنے مزاج اور فطرت کے مطابق۔ دنیا میں جتنے بھی راستے ہیں، شاید اس سے بھی زیادہ راستے انسان کے سامنے ہوتے ہیں، اور ہر راستہ اسے اللہ تک پہنچاتا ہے۔ اب کوئی اتنی آسانی پر بھی نہ پہنچے اس تک تو اس کا نصیب۔ اچھا یہ بتاؤ، استغفار سے کب

فرصت ملے گی تمہیں؟''

''وہ کہاں مل سکتی ہے۔ گناہ کب چھوڑتے ہیں آدمی کو۔'' اچھو میاں نے آہ بھر کر کہا۔

''یہ جو تم کر رہے ہو، یہ تو غیر معمولی ہے نا! میں اس کی بات کر رہا ہوں۔''

''ٹھیک کہا آپ نے۔ یہ تو عمر رائیگاں کا ہے۔ جس دن مجھے پتا چل گیا کہ اللہ نے کامل بخشش فرما دی ہے، مجھ غلیظ کو دھو کر پاک کر دیا ہے، وہ میری زندگی کا سب سے خوب صورت دن ہوگا۔''

''تو کیسے پتا چلے گا اس کا......؟''

''وہ میں نے اللہ پاک سے ایک شرط لگا لی ہے۔ وہ پوری ہوگی تو مجھے پتا چل جائے گا۔''

''اللہ سے شرطیں بھی لگاتا ہے کوئی......؟''

''ہاں......! مجھ جیسے گناہ گار ہی لگا سکتے ہیں۔ اطاعت شعار تو چوں بھی نہیں کرتے اس کے سامنے۔''

''دلچسپ بات ہے۔ مگر دل کو لگتی ہے۔'' اس شخص نے کہا۔ پھر پوچھا۔

''شرط کیا ہے تمہاری......؟''

''کسی اور کو کیوں بتاؤں؟'' یہ تو میرا اور اس کا معاملہ ہے۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔ نہ بتاؤ......!'' اس شخص نے کہا اور چلا گیا۔

اس دن سے اچھو میاں کے معمولات بدل گئے۔ تسبیح صرف دو وقت ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ باقی وہ اپنا کام خاموشی سے کرتے رہتے تھے۔ لیکن انہیں احساس ہوتا تھا کہ الحمد للہ اور استغفر اللہ ان کے دل کی گہرائی سے نکل رہا ہے اور وہ ہلکے پھول ہوتے جا رہے ہیں۔

باہر کی دنیا میں ایک ارجمند انہیں یاد آتی تھی اور دوسرا عبدالحق۔ وہ ان دونوں کے لئے باقاعدگی سے دعا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ان کا دل مچلتا کہ عبدالحق کے گھر جائیں اور ارجمند کو دیکھیں۔ اب تو وہ بڑی ہوگئی ہوگی۔ لیکن وہ اب مزار کی

حد سے نکلنا ہی نہیں چاہتے تھے، اور اس بات کا انہیں یقین تھا کہ وہ اللہ کی امان میں ہے۔

کوئی ایک سال ہوا ہوگا کہ ایک عورت سیدھی ان کے پاس آئی اور ان کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے سلام کیا، انہوں نے سلام کا جواب دیا۔

''آپ نے مجھے پہچانا نہیں بابا.....؟''

''نہیں.....! میرا خیال ہے، میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' اچھو میاں نے کہا۔ انہوں نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ اس کے لباس اور ظاہری وضع قطع سے امان جھلکتی تھی۔ چہرے پر بھی خوش حالی کی چمک اور رنگ تھا۔ لیکن آنکھوں میں پریشانی اور اضطراب تھا۔

''میں نے تم سے ضد کر کے دعا کے لئے کہا تھا، یاد نہیں.....؟''

وہ اچھو میاں کیسے بھول سکتے تھے۔ ایک ہی عورت تو ایسی تھی۔

''اوہ.....تو تمہاری دعا قبول ہوگئی۔''

''میری دعا کہاں قبول ہوئی؟ تم نے کی تو قبول ہوگئی۔''

''یہ سب اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ میں اپنے لئے جو دعا کرتا ہوں، وہ تو قبول نہیں ہوئی اب تک۔ سمجھ رہی ہو نا! سب اس کی طرف سے ہے۔''

''تم کہہ رہے ہو تو ٹھیک ہی ہوگا۔'' عورت نے بے دلی سے کہا۔

''تم اب تک وہ دعا کرتے ہو میرے لئے.....؟''

''ہاں.....! بلا ناغہ، وعدہ جو کیا تھا۔''

''اب چھوڑ دو وہ دعا۔''

''ہاں! لگتا ہے، تمہیں اللہ نے سب کچھ دے دیا۔ سب دلدر دور ہوگئے تمہارے۔''

''دلدر تو اور بڑھ گئے بابا.....!''

''دیکھنے میں تو خوش حال ہی لگتی ہو۔''

''خوش حال تو ہوں۔ مگر یہ سمجھ گئی کہ خوش حالی صرف روپے پیسے سے نہیں ہوتی۔ خوش حالی تو اندر کی خوشی سے ہے، باہمی محبت سے ہے، اندر کے اور گھریلو

سکون سے ہے۔''

''بڑی تلخ ہوگئی ہو۔ ہوا کیا ہے تمہارے ساتھ.....؟''

''اللہ نے کرم فرمایا، تنگی دور کی، بلکہ دولت کی برسات کر دی۔ شوہر میرا تنگ دل بھی نہیں ہے۔ مجھے اور بچوں کو سب کچھ دے رکھا ہے اس نے۔ زندگی کی ہر آسائش فراہم کی ہے۔ لیکن اب نہ وہ میرے لئے پہلے جیسا ہے، نہ بچوں کے لئے۔''

''مصروفیت بڑھ گئی ہوگی۔'' اچھو میاں نے خیال ظاہر کیا۔

''نہیں.....! وہ عیاشی میں پڑ گیا ہے۔ دوسری عورتوں کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ کئی کئی دن گھر نہیں آتا۔''

''مگر تم نے جو مانگا تھا، وہ تو تمہیں مل گیا۔ اب کیوں ناخوش ہو.....؟''

عورت رونے لگی۔

''وہ تنگ دستی اس خوش حالی سے اچھی تھی۔ تنگی کی وجہ سے ہم لڑتے تھے۔ لیکن ہمارے درمیان محبت تھی۔ بچے چھوٹی چھوٹی چیزوں کو ترستے تھے۔ لیکن تمیز دار اور کہنا ماننے والے تھے۔ اب گھر میں محبت نہیں، میں شوہر کی توجہ سے محروم ہوں۔ ادھر بچے بدتمیز اور نافرمان ہوگئے ہیں۔ میں آسائشوں کا کیا کروں۔ انہیں تو شوہر اور بچوں کے ساتھ بانٹنے پر خوشی ملتی ہے۔ میں تو اکیلی ہوگئی بالکل، میں تو لٹ گئی۔''

''مجھے دکھ ہوا یہ سن کر۔'' اچھوں میاں نے تاسف سے سر ہلایا۔

''مگر کوئی نہیں سمجھتا کہ اللہ نے جو کچھ اسے دیا ہے، وہ اس کے لئے بہترین ہے۔ اب محروم ہونے کے بعد وہ تنگ دستی تمہیں اچھی لگ رہی ہے۔''

''آپ اب بھی میرے لئے وہی دعا کرتے ہیں بابا.....؟''

''ہاں.....!''

''اب وہ دعا چھوڑ دو۔''

''چھوڑ دوں گا۔''

''اب میرے لئے بس یہ دعا کرو کہ میرا شوہر مجھے واپس مل جائے.....

پہلے جیسا ہو جائے۔''

عورت اتنی دل برداشتہ ہو رہی تھی کہ اس سے اصرار بھی نہیں کیا گیا۔ بس یہ کہہ کر چلی گئی۔

اچھو میاں دیر تک سوچتے رہے۔ وہاں برسوں انہوں نے بازار میں گزارے، اور اب یہاں مزار میں۔ زندگی کا ایک ہی عام روپ انہوں نے دیکھا۔ زندگی صرف خواہشوں کے پیچھے بھاگنا، ان کے حصول کے لئے تگ و دو کرنا تھا۔ یہاں بھی اور وہاں بھی۔ اور خواہش کیسی ہی ہو، جائز ہو یا ناجائز، فائدہ پہنچانے والی ہو یا ضرر رساں، آدمی اس کے پیچھے باؤلا ہو جاتا ہے۔ خواہشیں پوری نہ ہو تو اللہ کی طرف لپکتا ہے۔ اور المیہ یہ ہے کہ ہر خواہش پوری ہو جانے پر حقیر اور بے معنی لگنے لگتی ہے۔ اس کی جگہ پہلے سے زیادہ جوش و خروش سے وہ کوئی اور خواہش کرنے لگتا ہے، اور پھر اس کے لئے وہی دیوانگی۔ آہ...! اب سمجھ میں آیا زندگی کی بے سکونی کا راز۔ خواہشوں کے سامنے سپر ڈالنا ہے۔ شاید یہی بھی آزمائش ہے۔ آدمی خواہشوں کو نظر انداز کرے تو زندگی پُرسکون ہو جاتی ہے۔ قناعت اختیار کرے تو زندگی خوب صورت ہو جاتی ہے۔ جو مل گیا، اسے نعمت سمجھا اور اس پر اللہ کا شکر ادا کیا، یہ ہے سچی خوشی کا راز، جو آدمی کے باطن سے ابھرتی ہے۔ اس میں روح کی طمانیت ہے۔

وہ سب کچھ دیکھ کر آئے تھے، اور جہاں سے وہ ہو کر آئے تھے، اور جہاں وہ آئے تھے، انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ خود نہیں آ سکتے تھے۔ اللہ انہیں لے آیا تھا... جانے کیوں؟ مگر اس جانے کیوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے بارے میں کوئی تجسس زیبا نہیں کہ تجسس شیطان کا اکساوا ہے، اور اس کا حاصل غرور، جو شیطان کی صفت ہے۔ جانے کیوں کیسا؟ کریمی کا کوئی سبب نہیں ہوتا۔ کریمی کے لئے کسی اہلیت کی ضرورت نہیں۔ وہ تو اللہ کا کرم ہے، اور بس! اللہ کی رحمت کو کسی جواز کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ان کے وجود میں سنسنی سی ابھری۔ یہ احساس ہوا کہ انہوں نے بہت اہم نکتہ سمجھ لیا ہے، کوئی بہت اہم بھی پا لیا ہے۔ اور یہ انہیں ہر شخص کو بتانا چاہئے...

ساری دنیا کو بتانا چاہئے۔ یہ بنی نوع انسان کی امانت ہے۔

لاحول ولا قوۃ...... انہوں نے بلند آواز میں بے ساختہ کہا، اور خود بھی چونک گئے۔ ارے......! یہ شیطان کبھی نہیں چوکتا۔ کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ میں کیا اور میری اوقات کیا؟ اللہ نے یہ بھید مجھ گناہ گار پر کھولا، اس کی رحمت، مگر میرے لئے کھولا۔ میں ایک فرد ہوں، حقیر، گناہ گار زندگی کے روئے زمین پر پھیلے ہوئے بے کراں صحرا میں ریت کا ایک بے نشاں ذرّہ، جو کسی کو دکھائی بھی نہیں دیتا...... سوائے میرے ربّ کے۔ تو میں ہوں کیا؟ ایک فرد! میں کوئی مصلح نہیں۔ میرا یہ کام نہیں، میں کسی کو کیا سمجھا سکتا ہوں، میں تو خود بھی نہیں سمجھ سکتا اس کی رحمت کے بغیر۔ اور اس نے کتنے انبیاء بھیجے، کتنے پیغمبر بھیجے، زندگی کے تمام بھید کھولنے کے لئے...... ہر اہم نکتہ سمجھانے کے لئے، لیکن کتنے لوگ سمجھ پائے؟ اکثریت نے تو بس انہیں جھٹلایا ہی۔ یہ دنیا، اس کے تمام لوازمات، ساری نعمتیں جو اللہ نے مسخر کر دیں آدمی کے لئے، یہی آدمی کو غفلت میں ڈالتی ہیں، اسے طاقت کا، خود مختاری کا احساس دلاتی ہیں۔ ایسے میں وہ سننے اور سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔

یہ بہت بڑا سوال ہے کہ زندگی کیا ہے؟

اور اس کا بہت چھوٹا سا جواب ہے...... اللہ سے تعلق!

لیکن اس تعلق کے حوالے، اس کی جہتیں بے شمار ہیں۔ تم بندے ہو اور وہ معبود ہے، تو اس کی عبادت کرو۔ تم غلام ہو اور وہ آقا ہے تو اس کی اطاعت کرو۔ سرکشی اور گناہ تمہاری فطرت میں ہے اور وہ غفور الرحیم ہے تو اس سے مغفرت طلب کرو۔ تم سراسر محتاج ہو اور وہ غنی ہے تو سب کچھ اسی سے مانگو۔ اپنی ہر ضرورت کے لئے اسی کی طرف دیکھو، اسی سے مدد چاہو۔ تمہاری ہر سانس اور ہر دھڑکن اور کائنات کی ہر شے اس کے قبضہ قدرت میں ہے تو جو چاہئے، صرف اس سے مانگو۔ نہ ملے تو اس سے دست بردار ہو جاؤ کہ وہی تو سب کچھ جانتا ہے، اور وہی سب سے بڑھ کر تم سے محبت کرتا ہے، وہی سب سے بڑھ کر...... تم سے بھی بڑھ کر تمہاری بہتری کی فکر کرتا ہے۔ تم سرکش سہی، لیکن اس کی غلامی کے تصور کو اپنے قلب و ذہن

میں زندہ رکھو کہ آقاؤں کا آقا ایک وہی تو ہے، جو سرکش غلاموں کو بھی بخش دیتا ہے۔ نہ یقین آئے تو اپنی دنیا کے چھوٹے آقاؤں کو دیکھ لو کہ وہ تمہاری ذرا سی سرکشی کو بھی معاف نہیں کرتے۔ تو اس کی غلامی کرو اور زمین میں اس کے خلیفہ بن جاؤ۔ نعمتیں تمہاری غلام بن جائیں گے اور تمہیں ان کی پرواہ بھی نہیں رہے گی۔ غلامی کا محض تصور بھی اپنے قلب و ذہن میں قائم رکھو لے تو عجب نہیں کہ وہ خوش ہو کر تمہیں یہ سب سے بڑا شرف عطا فرما دے... اپنی غلامی کا۔ اور اس نے اہتمام فرمایا، اپنے غلاموں کے لئے ایسی جنتیں آراستہ کر دیں، جن کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے، اور سرکشوں کے لئے دوزخ بنا دی کہ جیسے اعمال کرو، ویسا صلہ پا لو، اور وہ بھی ابدی زندگی میں۔ تم اپنی فطری سرکشی اور اپنے نفس کی غلامی کے باوجود اس کی غلامی کے تصور کو زندہ رکھو تو عجب نہیں کہ وہ تمہیں جنت کا مستحق بنانے کے لئے اچھے اعمال عطا فرما دے۔ بلکہ اس کی رحمت تو ایسی ہے کہ خوش ہو جائے تو بغیر اعمال کے ہی تمہیں جنت نصیب فرما دے۔ تم اس کی غلامی کا تصور تو رکھو، موہوم سا ہی سہی۔ اور اپنی بے بسی کو، اپنے بے حیثیت ہونے کو تو سمجھو۔ اللہ سے تعلق تو قائم رکھو۔

وہ عجیب سی کیفیت تھی۔ اچھو میاں، اچھو میاں ہی نہیں رہے تھے۔ ان کے اندر جیسے کوئی اور بیٹھا ہوا تھا۔

اللہ سے تعلق...!

عبادت تو لازمی ہے کہ بندگی ہے۔ دل سے ایمان لانا نظریاتی عبادت ہے۔ اور نماز عملی عبادت۔ اللہ کے احکام ماننا بھی عملی عبادت، اور جو نعمتیں اس نے عطا فرمائیں، ان کا شمار تو دور کی بات ہے، تمہارے لئے ان کا ادراک بھی ممکن نہیں۔ تو ان کا شکر ادا کرتے رہو۔ لیکن یہ زبانی شکر بھی محض نظریاتی ہے، اور دنیا کو اللہ نے دارالعمل بنایا ہے۔

اب حقیقت یہ ہے کہ تمہارے پاس جو نعمت بھی ہے، خواہ ظاہری طور پر اسے تم نے خود حاصل کیا ہو... اپنی محنت، طاقت یا تدبر سے... درحقیقت وہ اللہ کی عطا کی ہوئی ہے، اور اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ وہ تو تم سے تمہارے جسم

کے اعضاء کا بھی حساب لے گا۔ تو عملی شکر، یہ ہے کہ اس کی عطا کی ہوئی نعمتوں کو اس کے احکام کے خلاف استعمال نہ کرو، بلکہ اس کے احکام کے مطابق استعمال کرو۔ کسی چیز کو اپنی ملکیت نہ سمجھو۔ وہ اللہ کی امانت ہے تمہارے پاس، اور ایک مخصوص مدت کے لئے ہے، جس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ تو اللہ سے ڈرو اور شکر ادا کرتے رہو۔

اور تمہارے پاس نفس ہے، جو گناہوں پر اکساتا ہے، ہوس جس کے خمیر میں ہے، یہ جان رکھو کہ جیسے تم سانس لیتے ہو، ویسے ہی گناہ کرتے ہو۔ گناہ تو تم غیر شعوری طور پر بھی کرتے ہو، بے خبری میں بھی کرتے ہو، اور خود کو پاک و صاف سمجھتے رہتے ہو۔ تو اس کے لئے ضروری ہے کہ استغفار کرتے رہو۔ بے خبری میں بھی استغفار کرو، کیونکہ بے خبری میں گناہ بھی تو کرتے ہو۔ اللہ استغفار کی برکت سے تمہیں دھوتا، پاک کرتا رہے گا۔ تمہیں بھاری نہیں ہونے دے گا۔ تم ہلکے رہو گے۔

یہ ہے زندگی...!

مگر تم تو خواہشوں کے پیچھے بھاگتے رہے، جیسے کتا ہڈی پر لپکتا ہے، اس سے زیادہ رفتار سے تم خواہشوں پر لپکتے رہے... اچھے برے کی تمیز کئے بغیر۔ حالانکہ اللہ نے خواہشوں کے حصول کے بعد بھی تمہیں اپنی نشانی دکھا دی۔ ناجائز خواہش نے تمہیں بس ایک پل کی خوشی دی۔ اس کے بعد طویل مدت تک کا تاسف، بے لذتی اور بے کیفی۔ تمہیں بتا دیا گیا کہ اللہ کے حکم سے باہر جو کچھ بھی ہے، اس کی لذت اور خوشی بے حد عارضی ہے۔

اچھو میاں کو گزری یاد آئی۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے۔ ان کی داڑھی تر ہوگئی۔ چہرہ بھیگ گیا۔ قمیص کا دامن تر ہوگیا۔ پھر اچانک انہیں قرار آگیا، جیسے دکھتے، دہکتے ہوئے دل پر کسی نے ٹھنڈے مرہم کا پھایہ رکھ دیا ہو۔

زندگی کیا ہے، وہ کسی کو کیا بتائیں گے اور کون سمجھے گا۔ پیغمبروں کے ہوتے ہوئے امتیں تباہ کر دی گئیں۔ قرآن موجود ہے، سب کچھ بتانے کے لئے۔

مگر پڑھنے والوں کو بھی نہیں پتا چلتا کہ زندگی کیا ہے۔

یہ تو اللہ کی کریمی ہے ان پر...... اور ان کے لئے۔

اللہ نے جو کچھ بھی انہیں دیا، وہ استحقاق کے بغیر دیا ہے۔ اور جو کچھ استحقاق کے بغیر ملا ہو، اس کا حساب تو دینا پڑتا ہے۔ اب جس کا سرے سے کوئی استحقاق ہی نہ ہو، اس کے حساب کی طوالت کا کیا کہنا۔

ان پر تھرتھری چڑھ گئی۔

اس دن کے بعد ان کے شکر میں اور گہرائی آ گئی۔ ان کے استغفار میں شامل گریہ وزاری میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ اللہ سے گڑگڑا کر، رو رو کر دعا کرتے کہ انہیں بخش دیا جائے، انہیں دھو کر پاک کر دیا جائے۔

اور ابھی بیس دن پہلے انہیں لگا کہ اللہ نے ان کی دعا قبول کر لی اور انہیں بخش دیا۔ ایسے وہ ماننے والے کب تھے۔ لیکن اللہ نے ان کی شرط بھی پوری کر دی۔ ارے......! وہ کیسے ناز برداری کرتا ہے اپنے گناہ گار بندوں کی۔

اس روز وہ ستون سے ٹیک لگائے سیّد الاستغفار کی تسبیح کر رہے تھے۔ تسبیح مکمل کر کے انہوں نے جیب میں رکھی ہی تھی کہ ایک شخص ان کے پاس چلا آیا۔ وہ کلین شیو تھا اور پینٹ شرٹ پہنے تھا۔

وہ ان کے پاس بیٹھ گیا۔

''حضرت آپ کا نام اشرف علی ہے......؟'' اس نے بے حد ادب سے پوچھا۔

اچھو میاں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''جی ہاں! مگر آپ مجھے کیسے جانتے ہیں......؟''

''میں آپ کو جانتا ہوتا تو آپ کا نام پوچھتا بھلا!''

''تو پھر......؟''

''مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ اس وقت مجھے یہاں ملیں گے۔ ایسے کپڑے پہنے ہوئے ہوں اور ایسی تسبیح ہوگی آپ کے ہاتھ میں۔ میں کب سے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ مگر حکم تھا کہ تسبیح پوری ہونے سے پہلے آپ سے بات نہ کروں۔ پھر آپ سے

آپ کے نام کی تصدیق کروں۔''

''یہ کس نے بتایا تھا آپ کو......؟'' اچھو میاں اب بھی حیران تھے۔

''میں تو انہیں بھی نہیں جانتا۔''

''اور پھر بھی ان کے کہنے پر یہاں میری تلاش میں دوڑے آئے......؟''

''بات ہی ایسی تھی۔ خیر اسے چھوڑیں۔ یہ بتائیں، بیت اللہ شریف جائیں گے آپ......؟''

اچھو میاں کو اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آیا۔

''یہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں آپ......؟''

''جی ہاں......! یہ پوچھنے ہی کے لئے آیا ہوں آپ کے پاس!''

یقین آیا تو اچھو میاں اضطراری طور پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر انہیں خیال آیا تو مایوسی سے بولے۔

''مگر میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''اسے چھوڑیں۔ میرے سوال کا جواب دیں!''

''جواب کیسا؟ چلئے......!'' اچھو میاں نے اس شخص کا ہاتھ تھام لیا۔

''ارے ارے......! اب ایسا تو نہیں ہوتا۔'' وہ شخص بوکھلا گیا۔

''ابھی تو میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔''

''کون بدبخت انکار کرے گا وہاں جانے سے؟ میری تو یہی ایک آرزو ہے زندگی میں۔''

''تو سمجھ لیں، آپ کی آرزو پوری ہونے کا وقت آ گیا ہے۔''

''مجھے کیا کرنا ہوگا......؟'' اچھو میاں تو اب ایسے بے قرار تھے کہ انہیں چین ہی نہیں تھا۔

''سب کچھ میں کروں گا، آپ فکر نہ کریں۔ یہ بتائیں، انٹرنیشنل پاسپورٹ ہے آپ کے پاس......؟''

اچھو میاں نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان معلق تھے۔ بات بات پر ایسا لگتا کہ یہ نہیں ہوگا۔

"کوئی بات نہیں! پہلے ہمیں آپ کا پاسپورٹ بنوانا ہوگا ..... وہ بھی ارجنٹ۔"

"مگر میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

"میں نے کہا نا کہ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ آپ چلیں میرے ساتھ۔"

اچھو میاں اس کے ساتھ چل دیئے۔ رہ رہ کر انہیں خیال آتا کہ کہیں وہ کوئی نوسرباز تو نہیں۔ پھر سوچتے، ان کے پاس ہے کیا کہ کوئی نوسرباز ان پر اپنا وقت ضائع کرے۔

برسوں بعد وہ مزار کی حدوں سے باہر نکلے۔ باہر جیسے دنیا بدل گئی تھی۔ پہلے سے زیادہ بھیڑ تھی راہ گیروں کی۔ تانگے اور رکشے تو خیر تھے ہی، لیکن گاڑیوں کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی۔

وہ شخص سب سے پہلے تو انہیں فوٹوگرافر کے پاس لے کر گیا۔ وہاں زندگی میں پہلی بار انہوں نے تصویر کھنچوائی۔ تصویریں دو دن بعد ملنی تھیں۔ پھر وہ پاسپورٹ آفس گئے۔ وہاں سب لوگ اس شخص کو جانتے تھے، اور اس کا احترام کرتے تھے۔ اس بات سے اچھو میاں کے دل کو اطمینان ہوا۔

وہاں سے اس شخص نے کچھ فارم لئے اور اچھو میاں سے پوچھ کر وہ فارم بھرے۔ پھر فارم پر کئی جگہ ان سے انگوٹھا لگوایا۔

"یار محسن صاحب! میرے کام کا کیا ہوا.....؟" ایک کلرک نے اس شخص سے پوچھا۔

"مجھے یاد ہے۔ ہو جائے گا انشاء اللہ.....!"

واپسی میں وہ شخص انہیں ایک بڑے مہنگے ریسٹورینٹ میں لے گیا۔ اچھو میاں نے اس کے اصرار کے باوجود کھانے کی کسی چیز کا نام نہیں لیا۔ بالآخر اس شخص نے خود ہی کئی طرح کے سالن منگوا لئے۔

برسوں کے بعد اچھو میاں نے پُرتکلف کھانا کھایا۔ ورنہ وہ تو بس لنگر کی دال اور چنوں والے چاولوں اور زردے کے عادی تھے۔ انہیں اچھا لگا۔ لیکن وہ بہرحال تکلف کر رہے تھے۔

"اچھی طرح کھایئے اشرف صاحب.....!"

"میں اچھی طرح ہی کھا رہا ہوں۔" اچھو میاں نے کہا۔

"آپ مجھے یہ تو بتایئے کہ یہ سب کیا ہے.....؟"

"آپ آم کھایئے! پیڑ کیوں گنتے ہیں؟"

"تجسس کی وجہ سے۔ میں جانتا ہوں کہ اس بھری دنیا میں کوئی مجھے نہیں جانتا۔ پھر آپ کیسے میرے پاس آئے؟ کیسے مجھے پہچانا؟ کسی نے تو آپ کو بتایا ہوگا میرے بارے میں؟ کون ہو سکتا ہے وہ؟"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔"

"یہ کیسے ممکن ہے.....؟"

"یقین کریں ایسا ہی ہے۔"

"اچھا.....! مجھے اپنے بارے میں بتائیں۔"

"میرا نام محسن ہے۔ میں پاسپورٹ آفس میں کام کرتا تھا۔ پھر میں نے نوکری چھوڑ دی۔ باہر کے کچھ ملکوں میں میرے دوست ہیں۔ تو میں نے یہاں لوگوں کو غیر ملک بھیجنے کا کام شروع کر دیا۔ حج کا سیزن آتا ہے تو لوگوں کے پاسپورٹ بنوانے میں ان کی مدد کرتا ہوں۔ عام لوگوں کو تو پاسپورٹ بنوانا بہت مشکل کام لگتا ہے۔ میری اچھی آمدنی ہو جاتی ہے اس کام میں۔ بس یہ ہے کہ سعودی عرب کا معاملہ بن جائے تو میں کہیں کا کہیں پہنچ جاؤں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ سعودی، پاکستانیوں کو منہ ہی نہیں لگاتے۔ ان کا جھکاؤ ہندوستان کی طرف رہتا ہے۔ مگر ابھی کچھ بہتری شروع ہوئی ہے۔ سعودی عرب نے کچھ لوگ مانگے ہیں وہاں کام کرنے کے لئے۔"

اچھو میاں کو لگا کہ ان کی خوشی چھننے والی ہے۔ انہوں نے گھبرا کر کہا۔

"لیکن مجھے تو کوئی کام نہیں آتا۔"

"جو کام وہ چاہتے ہیں، وہ آپ کو آتا ہے۔" محسن نے مسکرا کر کہا۔

"آپ مزار میں صحن کی صفائی تو کرتے ہیں نا؟"

اچھو میاں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو یہ کام آپ بیعت اللہ شریف میں نہیں کر سکتے؟''

اچھو میاں کو لگا کہ خوشی سے ان کا دل بند ہو جائے گا۔ ان سے بولا بھی نہیں گیا۔ بس مضطربانہ انداز میں سر ہلانے لگے۔

''اب اس کام کے لئے تو مسلمان ہی بلائے جا سکتے ہیں نا! تو مجھے یہ کام مل گیا۔ چالیس بندے چاہئیں وہاں کے لئے۔''

''مجھ تک کیسے پہنچے آپ......؟''

''آپ یقین نہیں کریں گے۔'' محسن نے گہری سانس لے کر کہا۔

''آپ بتائیں تو......''

''رات میں نے خواب دیکھا۔ خواب میں ایک شخص تھا، بہت پاکیزہ صورت، جوان، چہرے پر گھنی سیاہ داڑھی، پیشانی چمکتی ہوئی۔ اس نے مجھ سے کہا، اچھا کام ملا ہے تمہیں۔ مگر میرا ایک کام کرو تو عمر بھر کامیاب رہو گے۔ میں نے پوچھا، کیا کام ہے؟ وہ بولا ..... آؤ میرے ساتھ۔ وہ مجھے مزار میں لے گیا اور مجھے آپ کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ کہنے لگا، انہیں اچھی طرح پہچان لو۔ کل دوپہر بارہ بجے یہاں آنا، یہ تمہیں یہیں ملیں گے۔ تسبیح پڑھ رہے ہوں گے، تسبیح کے دوران نہ چھیڑنا انہیں۔ تسبیح پڑھ لیں تو بات کرنا۔ سب سے پہلے ان کے بیت اللہ شریف جانے کا بندوبست کرنا ہے تمہیں۔ اور سب کچھ خود ہی کرنا، خرچہ بھی کرنا، ان کی خدمت بھی کرنا، جو خرچ کرو گے، عمر بھر ملتا رہے گا۔

پھر میری آنکھ کھل گئی۔ میں خوابوں پر یقین نہیں رکھتا۔ لیکن گیارہ بجے مجھے بے چینی ہونے لگی۔ میرا کوئی ارادہ نہیں تھا مزار پر آنے کا۔ لیکن بے چینی بڑھتی گئی۔ پھر میرے قدم خود بخود اٹھنے لگے۔ میں بھی چل دیا۔ سوچا تھا کہ کوئی نہیں ملے گا اور میں دعا کر کے واپس آ جاؤں گا۔ مگر وہاں تو آپ سچ مچ موجود تھے۔ بس پھر میں نے خواب کی ہدایات پر عمل کیا۔ اتنی سی بات ہے۔''

''تو میں کب جاؤں گا......؟'' اچھو میاں نے بے قراری سے پوچھا۔

''پندرہ بیس دن تو لگیں گے۔ ابھی پاسپورٹ بنے گا۔ پھر میں کاغذات جمع کراؤں گا۔ اس کے بعد جب بھی ٹکٹ ملا، آپ کی روانگی۔ لوگ بحری جہاز سے

جاتے ہیں، بہت دن لگتے ہیں سفر میں۔ لیکن آپ کو سعودی حکومت ہوائی جہاز کا ٹکٹ دے گی۔''

''اب واپس چلیں!''

اچھو میاں داتا دربار واپس آ گئے۔ ان کی عجیب کیفیت تھی۔ کبھی وہ سب کچھ سچ لگتا اور کبھی خواب۔ اب وہ تنہائی کے گوشے ڈھونڈنے لگے۔ لیکن پھر انہیں خیال آتا کہ وہ شخص انہیں ڈھونڈتا ہوا اسی جگہ آئے گا۔ انہوں نے وہی جگہ پکڑ لی۔

نظریں تو وہ ویسے ہی کم اٹھاتے تھے، مگر اب تو وہ نظریں اٹھانا بھول ہی گئے۔ آنکھیں ہر وقت بھری رہتیں۔ دل جیسے اندر سے پگھلتا رہتا۔ ہر آہٹ پر وہ سمجھتے کہ ان کا محسن آ گیا۔ لیکن نظر نہ اٹھائی جاتی۔

ایک ہفتہ ہو گیا اور وہ نہ آیا، تو وہ مایوس ہو گئے۔

''میرے ایسے نصیب کہاں؟'' وہ بڑبڑاتے۔

''کہاں بیت اللہ شریف کی جاروب کشی اور کہاں میں گناہ گار، میں تو اس قابل ہی نہیں ہوں۔ اللہ کا شکر کہ اس نے چند روز کی خوشی دے دی۔''

لیکن آٹھویں دن وہ آ گیا۔

''پاسپورٹ بن گیا ہے آپ کا......''

''آپ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ میں انتظار کرتا رہا آپ کا۔'' اچھو میاں جیسے پھٹ پڑے۔ ان کے لہجے میں شکایت تھی۔

محسن نے حیرت سے انہیں دیکھا، پھر شرمندگی سے بولا۔

''یہ تو خیال ہی نہیں رہا تھا مجھے۔ میں نے تو آپ کو زحمت سے بچا لیا۔ آپ کی تصویریں بس فارم پر لگائیں۔ اب پاسپورٹ بن گیا تو آپ کو لینے آیا ہوں۔ معاف کر دیں مجھے۔'' اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔

اچھو میاں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر لبوں سے لگا لیے۔

''ارے نہیں......! آپ تو میرے محسن ہیں۔''

وہ محسن کے ساتھ گئے۔ اپنا پاسپورٹ لیا۔ دوپہر کا کھانا پھر محسن نے انہیں کھلایا۔ پھر کچھ فارم بھرے اور کئی جگہ ان کا انگوٹھا لگوایا۔

"اب سب کچھ مکمل ہو گیا ہے۔ بس آپ کا ٹکٹ آنے کی دیر ہے۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔"

رخصت ہوتے وقت محسن نے کہا۔

"آپ حکم کریں تو میں روز آیا کروں۔"

"نہیں! اب مجھے خیال آیا ہے کہ آپ کی تو بہت مصروفیت ہوگی۔"

"جی ہاں .....! بھاگ دوڑ کا کام ہے۔"

"بس اب آپ میرے لئے خوش خبری ہی لے کر آیئے گا۔"

اس کے بعد ان کے دل کو قرار آ گیا۔ اب تو وہ سراپا شکر تھے۔ ان کی ہر سانس شکر تھی۔ ارے..... کیسا کریم ہے میرا رب! کیسی عطا ہے اس کی۔ جو چاہے عطا فرما دے، جیسے چاہے عطا فرما دے اور جہاں سے چاہے عطا فرما دے۔ ارے ..... کیسی محبت کرنے والا ہے۔ مجھ حقیر گناہ گار کے لاڈ اٹھاتا ہے۔ میں کیا، میری اوقات کیا؟ بے کراں صحرا میں گزوں، ٹنوں ریت کے نیچے دبا ہوا ایک ذرہ بے نشان، اور اس کی توجہ!

انہیں یاد تھا، مزار میں بیٹھ کر وہ استغفار کرتے، ہونٹ ہلتے، لیکن اپنے دل سے نکلنے والی روتی ہوئی صدا، پکار صرف وہی سن سکتے تھے۔ وہ تو ایک چیخ تھی جو ان کے سینے میں گونجتی تھی۔ لگتا تھا کہ سینے کی دیوار توڑ کر باہر نکل آئے گی ..... اے اللہ.....! مجھے معاف کر دے، بخش دے، میں غلیظ ہوں اور تو ہی تو پاک کرنے والا ہے۔ اپنی بے پایاں رحمت کے پانی سے دھو کر پاک کر دے مجھے۔

پھر ایک رات انہوں نے خواب دیکھا کہ وہ مزار کے صحن میں بیٹھے استغفار کر رہے ہیں، اور کوئی پکار کر کہتا ہے..... بخش تو دیا گیا تجھے۔ پر تو سمجھتا ہی نہیں۔

انہوں نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں کوئی نہیں تھا۔

تو تو اندر کی آواز بھی نہیں سنتا۔ اس بار انہیں احساس ہوا کہ وہ آواز ان کے اندر سے آئی ہے۔

سنتا ہوں۔ لیکن یقین نہیں آتا مجھے۔ انہوں نے بلند آواز میں پکارا۔

تو یقین کیسے کرے گا؟ تجھے اس کی رحمت پر یقین نہیں؟

کیوں نہیں، ایک اس پر تو یقین ہے۔

تو پھر؟

وہ مجھے اپنے گھر بلائے گا تو میں مانوں گا کہ اس نے مجھے بخش دیا ہے۔

رحمت پر یقین ہے اور شرطیں لگاتا ہے اس سے؟

یہی تو ثبوت ہے میرے یقین کا۔ انہوں نے بڑے مان سے کہا۔ ورنہ میری اوقات کیا۔ اس کی رحمت ہی تو حوصلہ دلاتی ہے۔

اور ان کی آنکھ کھل گئی۔ اس دن سے ان کا پچھتاوا، ان کا استغفار اور ان کی بے چینی اور بے یقینی، سب بڑھ گئی۔ انہوں نے اس خواب کی نشانی کو اپنی نشانی بنا لیا۔ جس دن وہ انہیں بخشے گا، پاک کرے گا، انہیں اپنے گھر بلا لے گا۔

اور اب وہ انہیں اپنے گھر بلا رہا ہے..... وہاں، جہاں اس کے بلاوے کے بغیر کوئی نہیں جا سکتا۔

وہ مطمئن ہو گئے۔ بات اللہ کی مرضی کی ہے تو فکر کیسی؟ اپنا تو اس میں کچھ ہے نہیں۔

اور کل رات محسن خوش خبری لے کر آیا تھا۔ ان کا ٹکٹ مل گیا تھا۔ اتوار کو شام پانچ بجے ان کی روانگی تھی۔

"اب آپ ہوٹل چل کر رہیں۔" محسن نے ان سے کہا تھا۔

محسن نے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"آپ نے تو کہا تھا کہ آپ کا کوئی نہیں ہے؟"

"لیکن میں تو کسی کا ہوں۔ اور یہاں سے جانے کے بعد نہیں رہوں گا۔"

"قاعدہ یہ ہے کہ اب سعودی حکومت کی طرف سے آپ کی رہائش ان کے ذمے ہے۔ آپ کو ہوٹل میں ہی ٹھہرنا ہوگا۔"

"کوئی صورت نکالئے.....!"

"چلیں، ٹھیک ہے۔ میں ہفتے کی شام یہاں آؤں گا اور آپ کو ہوٹل لے جاؤں گا۔"

"یہ مجھ پر احسان ہوگا آپ کا۔"

محسن نے جیب سے سو کے دس نوٹ نکالے اور ان کی طرف بڑھائے۔

"یہ رکھ لیں......!"

"نہیں......! مجھے کچھ نہیں چاہئے۔" اچھو میاں نے کہا۔

"اور مجھے ضرورت بھی نہیں۔"

"یہ سرکاری ہے۔ سعودی حکومت کی طرف سے ہے۔ اور آپ کو ضرورت بھی ہے۔ جس سے ملنے جائیں گے، اس کے پاس خالی ہاتھ جائیں گے......؟"

اچھو میاں نے نوٹ جیب میں رکھ لئے۔

اس رات وہ سو نہیں سکے۔ یہ سوچتے رہے کہ شکر کیسے ادا کریں۔ کوئی طریقہ ہے اس کا۔ سینے سے دل نکال کر رکھ دیں۔ مگر نہیں...... جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ ارے...... اپنے پاس ہے کیا......؟ اور اسے تو چاہئے بھی کچھ نہیں۔ تو پھر کیا کریں؟

آخر میں انہوں نے بے بسی سے کہا۔ اے اللہ! میری اس بے بسی کو ہی قبول کر لے۔

اور دل کو قرار آ گیا!

صبح سے ہی وہ سوچ رہے تھے کہ ارجمند سے ملنا ہے۔ اللہ نے یہ کرم بھی فرما دیا تھا کہ وہ خالی ہاتھ نہیں تھے۔ لیکن جانے کا سوچتے تو انہیں گھراہٹ ہوتی۔ انہیں گھر یاد بھی ہوگا یا نہیں! بھٹک گئے تو؟ اور کون جانے، اب وہ لوگ اس گھر میں رہتے ہی نہ ہوں۔ اتنے برسوں یہاں رہتے ہوئے وہ شہر کو بھول ہی گئے تھے۔ شہر کے خیال سے انہیں گھبراہٹ ہوتی تھی۔

جانا تو ہے، لیکن کیسے جائیں؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس سفر پر جا رہے ہوں، جس سے واپس نہ آنے کی دعا ان کی ہر سانس کرتی ہو، اور وہ ارجمند سے ملے بغیر چلے جائیں، یہ تو آخری دید والا معاملہ ہے۔

لیکن یہ اعتماد ان میں نہیں تھا کہ وہ اس دروازے پر پہنچ جائیں گے، جسے سات برس پہلے انہوں نے نادرہ کے کہنے پر تلاش کیا تھا۔ گومگو کی اس کیفیت میں

دوپہر ہوگئی۔

انہوں نے سوچا، سیّد الاستغفار کی تسبیح پڑھ لی جائے، پھر دیکھیں گے۔

وہ ہمیشہ کی طرح سر جھکائے، نظریں جھکائے پڑھتے رہے تھے کہ بالکل اچانک...... نہ جانے کیسے ان کی نظر اٹھ گئی۔ اور نگاہ اٹھاتے ہی انہیں عبدالحق نظر آیا، جو متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

اچھو میاں اسے آواز دینے ہی والے تھے کہ انہیں خیال آ گیا۔ وہ تسبیح پڑھ رہے تھے، اور اس کے دوران وہ بولتے نہیں تھے۔ وہ تڑپ گئے۔ انہیں خیال آیا کہ عبدالحق تو اب انہیں پہچان بھی نہیں سکتا۔ اس نے انہیں داڑھی میں کب دیکھا تھا۔

ایک ثانیے میں اچھو میاں نے سب کچھ سمجھ لیا۔

انہوں نے سر جھکایا اور تسبیح پڑھنے لگے۔ اس دوران وہ ہر خیال کو ذہن سے جھٹکتے رہے۔ یہاں تک کہ آخر میں ان پر استغراق کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ سب کچھ بھول گئے۔

تسبیح پوری کرکے انہوں نے اسے جیب میں رکھا اور عبدالحق کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ ایک ننھے سے لمحے کو انہیں مایوسی ہوئی، پھر اس مایوسی میں سے ایسا یقین ابھرا کہ وہ حیران رہ گئے۔ مایوسی! ارے...... یہ تو شکر کا مقام ہے۔ انہوں نے خود سے کہا۔ تمہیں یقین نہیں تھا کہ تمہیں معافی مل سکتی ہے، اس نے تمہیں معاف کر دیا۔ تم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اس کے مہمان بن سکتے ہو، اس نے تمہیں یہ شرف بھی عطا فرما دیا۔ اب تم نے سوچا کہ ارجمند سے کیسے ملو گے تو اس نے عبدالحق کو بھیج دیا تمہارے لئے۔ اور تم ڈر رہے ہو، مایوس ہو رہے ہو!

وہ اٹھے۔ انہوں نے سوچا کہ اب انہیں خود عبدالحق کو تلاش کرنا ہوگا۔ لیکن نہیں! یہ سوچ کر وہیں بیٹھ گئے۔ تم اسے تلاش نہیں کر سکتے اور نہ ہی وہ تمہیں تلاش کر سکتا ہے۔ اللہ کو ملوانا ہے تو وہ ملوا دے گا۔

وہ بیٹھ گئے۔ لیکن اب ان کی نظریں اٹھی ہوئی تھیں، آتے جاتے لوگوں کو

ٹٹول رہی تھیں۔ اندر ایک امنڈتی ہوئی بے تابی تھی، جسے وہ تھپک کر پُرسکون کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

خاصی دیر ہوگئی، اور عبدالحق انہیں نظر نہیں آیا تو ان کے اندر کی کشمکش بڑھ گئی۔ انہیں اٹھنا ہوگا، اسے تلاش کرنا ہوگا۔ لیکن کیا ضمانت ہے کہ تلاش کرنے سے وہ انہیں مل جائے گا۔ وہ پورا لاہور چھان ماریں تو بھی ضروری نہیں کہ وہ مل جائے۔ اور اللہ چاہے تو یہیں بیٹھے بیٹھے مل جائے۔ کیا یہیں بیٹھے بیٹھے کوئی ان کی حاصلِ عمر آرزو پوری کرنے کے لئے خود انہیں ڈھونڈتا ہوا نہیں چلا آیا۔ اتنا دیکھنے کے بعد بھی ...

اور اسی لمحے انہیں عبدالحق نظر آ گیا۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق کا بے بسی سے دم گھٹ رہا تھا۔ اتنے ہجوم میں کیسے تلاش کرے نواب صاحب کو..... اور کہاں تلاش کرے؟ اس نے ایک بار ہی تو انہیں دیکھا تھا۔ صرف ایک دن کے لئے۔ ہلکا سا خاکہ تھا ان کا اس کے ذہن میں اور درمیان میں سات برس۔ جانے کتنے بدل گئے ہوں گے وہ؟

اس کے دل میں مایوسی اترنے لگی۔ کیا وہ ناکام واپس جائے گا؟ کیا ارجمند عمر بھر تڑپتی.....

اسی لمحے کسی نے اسے پکارا۔

''عبدالحق صاحب.....!''

اس نے آواز کی سمت دیکھا۔ ایک ستون کے پاس ایک بوڑھا شخص کھڑا ہوتا نظر آیا۔ اس کی گھنی اور لمبی سفید داڑھی تھی اور سر کے بال بھی بالکل سفید تھے۔ مگر وہ اس کے لئے اجنبی تھے، اور یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ انہوں نے ہی اسے پکارا ہو۔ وہاں تو بہت سے لوگ تھے۔

وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

لیکن بوڑھا شخص تیزی سے اس کی طرف چلا آیا۔

''السلام علیکم عبدالحق صاحب!''

عبدالحق نے سلام کا جواب دیتے ہوئے غور سے انہیں دیکھا۔ پہلے تو شناسائی کی کوئی جھلک اسے نظر نہیں آئی۔ پھر اچانک اس کی یادداشت میں بسے دھندلے سے نقوش اس چہرے پر کھلنے ملنے لگے۔

اچھو میاں نے اسے لپٹا لیا۔ پھر اس کی پیشانی چومنے لگے۔

''خدا کی قسم! مجھے آپ کی ضرورت تھی اس وقت۔''

''آپ..... نواب صاحب.....؟''

''ہاں.....! اور میں آپ کو یاد کر رہا تھا۔''

''اور میں آپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔''

''مجھے آپ کے گھر آنا تھا۔ لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ مجھے یاد ہوگا، اور میں وہاں پہنچ سکوں گا۔''

''اور میں آپ کو گھر لے جانے کے لئے آیا ہوں۔''

''سبحان اللہ.....! کیا شان ہے میرے رب کی۔''

اچھو میاں عبدالحق کے ساتھ چل دیئے۔ لیکن گاڑی میں ارجمند کو بیٹھے دیکھا تو وہ رو دیئے۔ ان کے لئے خود پر قابو رکھنا ناممکن ہوگیا تھا۔ عبدالحق نے ان کے لئے دروازہ کھولا۔ پھر اس نے اگلی نشست کا دروازہ کھولا اور ارجمند سے کہا۔

''تم بھی اب پچھلی سیٹ پر بیٹھو گی نواب صاحب کے ساتھ!''

''لیکن آغا جی.....! میں.....'' ارجمند نے رندھی ہوئی آواز میں احتجاج کیا۔

''یہ میرا حکم ہے۔ اور تمہیں میرا حکم ماننا سیکھ لینا چاہئے اب۔''

''وہ تو مجھے پہلے ہی آتا ہے۔'' ارجمند نے اترتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔

عبدالحق بہت ہلکی رفتار سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ ارجمند پچھلی سیٹ پر کسی ننھی سی بچی کی طرح اچھو میاں سے لپٹی ہوئی تھی۔ دیر تک وہ دونوں ہی روتے رہے۔ پھر ارجمند ان سے علیحدہ ہوگئی۔

''آپ کو میرا کبھی خیال نہیں آیا نانا.....!'' اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''ایک تمہارا ہی تو خیال تھا۔ ہر روز دعا کرتا تھا تمہارے لئے۔''

''کبھی ملنے نہیں آسکتے تھے......؟''

''کہا تو تھا کہ میں تو نہیں آؤں گا۔ تمہیں ملنا ہو تو آجانا۔''

''میں تو آ ہی نہیں سکتی تھی نانا......! آغا جی کے سوا کوئی لانے والا نہیں تھا اور آغا جی کا ٹرانسفر ہوگیا۔ برسوں یہ کراچی میں رہے۔ ابھی تین دن پہلے ہی تو آئے ہیں۔''

''بیٹا......! یہ ملنا ملانا بھی اللہ کے حکم سے ہی ہوتا ہے۔ اب دیکھ لو، آج میں تمہارے پاس آنا چاہتا تھا، اور سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ شاید گھر میں تلاش نہیں کرسکوں گا کہ عبدالحق صاحب آگئے۔''

اس پر ارجمند چونکی۔

''آپ تو آنے والے نہیں تھے۔ آپ کو یہ خیال کیسے آیا؟''

اچھو میاں نے اسے تفصیل بتائی۔

''تو اب میں اتوار کو جا رہا ہوں...... کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔''

''ایسے نہ کہیں نانا......!''

''اسی میں میری خوشی ہے بیٹا! اللہ کرم فرمائے تو وہیں مرنا، وہیں دفن ہونا چاہتا ہوں۔''

اگلی سیٹ پر بیٹھا عبدالحق حیران تھا۔ بازار میں، کوٹھے پر رہنے والے نواب صاحب اور یہ مقام! اور پھر یہ ٹائمنگ!

اچھو میاں نے ایک جگہ گاڑی رکوا کر مٹھائی لی۔ وہ خالی ہاتھ نہیں جانا چاہتے تھے، اور اللہ نے تو انہیں جھولی بھر کر دیا تھا۔

✿ ✿ ✿

اچھو میاں اور ارجمند انیکسی میں تھے۔ آنسو بھی ختم ہو چکے تھے اور باتیں بھی۔ دونوں نے نادرہ کو بہت یاد کیا تھا۔

پھر حمیدہ، نور بانو اور رابعہ کے ساتھ آئی۔ رابعہ کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔ وہ اس نے ارجمند کو دیا۔ ارجمند تو گلنار ہوگئی۔ اچھو میاں نے یہ منظر دیکھا۔

لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ارجمند کا ردِعمل سمجھنے سے وہ قاصر تھے۔

''اور آپ کیسے ہیں بھائی جی......!'' حمیدہ نے بیٹھتے ہوئے ان سے پوچھا۔

''کہاں رہے اتنے دن! ہم لوگ یاد بھی نہیں آئے؟''

''بس! کیا عرض کروں بہن! مصروفیت ہی ایسی تھی۔'' اچھو میاں نے کہا۔ پھر بولے۔

''آپ لوگوں کا احسان تو میں اتار ہی نہیں سکتا۔ البتہ عمر بھر دعا کروں گا آپ کے لئے۔ بیٹا نے بتایا کہ وہ پڑھ رہی ہے۔''

''یہ کیا بات ہوئی بھائی جی! خود پر بھی کوئی احسان کرتا ہے۔ اس کی پھپھو نے اسے میرے سپرد کیا تھا، تو یہ میری ذمہ داری ہے۔'' حمیدہ نے کہا۔

''لیکن سچ پوچھیں تو آپ کا والا مقام ہمارا نہیں ہے۔ آپ ہی تو اس کے باپ کی جگہ ہیں۔''

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر حمیدہ نے کہا۔

''اس وقت تو بھائی جی! میں آپ کے در پر سوالی بن کر آئی ہوں۔''

''در بھی آپ کا ہے، اور میں بھی آپ کا ہوں بہن! پر میرے پاس ہے کیا؟''

''میں آپ سے آپ کی ارجمند کو اپنے عبدالحق کے لئے مانگ رہی ہوں۔''

یہ بات تو اچھو میاں کے گمان میں بھی نہیں تھی۔ وہ تو سناٹے میں آگئے۔ یہ تو انہیں معلوم تھا کہ پگلی ارجمند کب سے یہ آس لگائے ہوئے ہے۔ اور وہ سوچتے تھے کہ یہ ان ہونی ہے۔ لیکن اللہ تو ان پر خوشیاں برسا رہا تھا۔

حمیدہ نے ان کی خاموشی کا اور مطلب لیا۔

''آپ کو یہ بات بری لگی بھائی جی......!''

''نہیں بہن! اچھی بات کیسے بری لگتی ہے۔ لیکن عبدالحق صاحب کی تو شادی ہو چکی ہے نا......؟''

حمیدہ کچھ کہنے والی تھی، لیکن نور بانو بول اٹھی۔

"جی.....! میں ان کی بیوی ہوں، نور بانو.....!"

اچھو میاں نے حیرت سے اسے دیکھا کہ وہ بھی یہاں موجود ہے۔ پھر اسے دیکھ کر انہیں مزید حیرت ہوئی۔ عبدالحق کے ساتھ اس کا کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔ اور انہوں نے تصور میں ارجمند کو عبدالحق کے ساتھ دیکھا۔ ان کی جوڑی بہت اچھی تھی..... بہت خوب صورت۔

"میں نے ارجمند کو ہمیشہ اپنی سگی بہن سے بڑھ کر چاہا ہے۔" نور بانو نے وضاحت کی۔ اچھو میاں کی خاموشی نے اسے ڈرا دیا تھا۔ اس کا اعتماد ہل گیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا ترتیب دیا ہوا کھیل خراب ہونے والا ہے۔

"جی.....! مجھے بتایا ہے ارجمند نے۔ میں آپ کا شکرگزار ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں، دراصل میری امی اور بہنوں کو دہلی میں ہندوؤں نے شہید کر دیا تھا۔ میں سمجھتی ہوں، اللہ نے اس کے صلے میں ارجمند کو مجھے دیا ہے۔"

ارجمند اتنی دیر میں وہاں سے ہٹ چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ کیا بات ہونے والی ہے۔

"تو آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ آپ کے شوہر کی شادی ارجمند سے ہو.....؟" اچھو میاں نے نور بانو سے پوچھا۔

"ہرگز نہیں.....! بلکہ یہ میری تجویز..... میرے اصرار پر ہی ہو رہا ہے۔"

اچھو میاں سوچ میں پڑ گئے۔ یہ بات انہیں کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔

"اللہ گواہ ہے کہ ارجمند میرے لئے سگی بہن جیسی ہے۔ اور میں اسے ایسے ہی رکھوں گی۔ کبھی دل بھی میلا نہیں ہونے دوں گی اس کا۔" مایوسی کی وجہ سے نور بانو روہانسی ہو گئی۔

"اور عبدالحق صاحب کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔" اس نے ملتجیانہ نظروں سے حمیدہ کو دیکھا۔

"اب بھائی جی.....! ہمیں خالی ہاتھ نہ لوٹایئے گا۔" حمیدہ نے عاجزی

سے کہا۔

"ارے نہیں بہن.....! میں آپ کو انکار کر سکتا ہوں بھلا.....؟ لیکن میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" اچھو میاں نے کہا۔

"عبدالحق نے بتایا تھا مجھے۔ آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ اللہ نے بہت نوازا ہے آپ کو۔ ہمارے لئے دعا کرتے رہئے گا۔"

"جی ضرور.....!" اچھو میاں بولے۔

"اور یہ تو اللہ کا فضل عظیم ہے کہ جانے سے پہلے وہ اس فرض سے بھی سبک دوش کرا رہا ہے مجھے۔"

"تو پھر ہمارے لئے کیا حکم ہے.....؟"

"دیکھئے..... مجھے ہفتے کی شام تک جانا ہے۔" اچھو میاں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تو جمعے کا نکاح رکھ لیں.....!"

"جی..... بہت مناسب ہے.....!"

"بہتر ہوگا کہ آپ ارجمند سے بھی پوچھ لیں.....!"

"اس کی ضرورت نہیں بہن.....! میں اس کا بڑا ہوں۔ مجھے فیصلے کا حق ہے، اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس فیصلے سے اختلاف نہیں کرے گی۔"

"بس تو ٹھیک ہے، جمعے کے دن عصر مغرب کے درمیان نکاح۔ اور ہفتے کی دوپہر ولیمہ، تاکہ آپ بھی شریک ہو لیں۔"

"جی، بہت مناسب ہے.....!"

نور بانو نے جلدی سے مٹھائی کا ڈبہ کھولا۔

✽ ✽ ✽

گاؤں سے ڈاکٹر صاحب آ گئے تھے اور مولوی مہر دین بھی۔ مسعود صاحب کی بچیاں پہلے ہی آئی ہوئی تھیں۔ گھر میں رونق ہو گئی۔ زرینہ اور مسعود صاحب کی لڑکیاں انیکسی میں آ گئیں، جہاں ارجمند موجود تھی۔ وہاں ڈھولک بجنے لگی۔ شادی کے گیت گائے جانے لگے۔

اچھو میاں باہر لان میں آ بیٹھے۔ وہ خوشی سے کھلے پڑ رہے تھے۔ ایسی خوشی دیکھنا تو کجا، اس کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اور وہ سچ مچ انہیں مل گئی تھی۔ ایک بیٹی، اسے وداع کرنے کا اعزاز اور وہ بھی اس اعتماد کے ساتھ کہ وہ تہی دامن نہیں ہیں۔

عبدالحق گھر سے نکلا۔ انہیں بیٹھے دیکھا تو ان کی طرف چلا آیا۔

''کیسے ہیں نواب صاحب.....! کیا ہو رہا ہے.....؟''

''تمہیں یاد کر رہا تھا بیٹے.....!'' اچھو میاں نے پہلی بار اسے بیٹا کہا۔

''کوئی حکم.....؟''

''اب تمہارے سوا میرا کون ہے.....؟ کئی کام ہیں ضروری۔''

''تو مجھے بتائیں نا.....!''

''ایک تو یہ کہ تم مجھے بازار لے چلو.....! کچھ خریداری کرنی ہے۔''

''تو چلیں.....! میں گاڑی نکالتا ہوں۔''

پانچ منٹ بعد عبدالحق ڈرائیو کر رہا تھا، اور اچھو میاں اس کے برابر کی سیٹ پر بیٹھے تھے۔

''اللہ کا شکر کہ اس نے یہ سعادت بھی نصیب فرمائی۔'' اچھو میاں نے کہا۔

''..... کہ جانے سے پہلے میں ارجمند کی طرف سے بھی بے فکر ہو جاؤں۔''

''بے شک نواب صاحب! اللہ بڑا کریم ہے۔''

''تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی فرمائیے.....!''

''یہ نہ سمجھنا کہ میں محبت کی وجہ سے ایسا کہہ رہا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ تم بہت خوش نصیب ہو۔ ارجمند کی صورت میں اللہ نے تمہیں ایک بیش بہا خزانہ عطا فرمایا ہے۔ وہ کتنی اچھی ہے، اللہ نے اسے کتنا اچھا بنایا ہے، یہ بات پوری طرح تو شاید ہی کبھی کوئی سمجھ سکے۔ اور وہ تم سے کتنی محبت کرتی ہے، اس کا بھی میں بس اندازہ

ہی کر سکتا ہوں۔ پوری طرح سمجھ نہیں سکتا۔''

عبدالحق شرمندہ ہونے لگا۔

''جی نواب صاحب.....!''

''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تم بھی اس سے محبت کرنا، وہ سب کچھ اسے دینے کی کوشش کرنا، جو وہ چاہتی ہے۔''

''انشاء اللہ! اسے سب کچھ ملے گا نواب صاحب.....!''

''نہیں سمجھے میری بات! اسے دنیا میں کچھ بھی نہیں چاہئے۔ تمہاری محبت کے سوا۔ کوشش کرنا کہ وہ اسے ملتی رہے۔ اس کی کوتاہیوں سے درگزر کرنا، اس کے ساتھ نرمی برتنا، سختی کبھی نہ کرنا، کوئی محرومی نہ دینا اسے۔ اس لئے نہیں کہ دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔'' یہ کہتے کہتے اچھو میاں کی آواز بھرا گئی۔

''بلکہ اس لئے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے..... اتنی کہ شاید کم ہی لوگوں کو ایسی محبت نصیب ہوئی ہوگی۔''

''انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا نواب صاحب!''

''اس نے دنیا میں دنیا کی کسی چیز کی آرزو نہیں کی..... تمہارے سوا۔ اور یہ اللہ کا خاص کرم ہے کہ اس نے تمہیں ملا دیا۔ اور انشاء اللہ اس سے تمہیں نیک اور عادت مند اولاد ملے گی۔ تمہاری نسل اللہ کی فرمانبرداری کے راستے پر آگے بڑھے گی۔ رات میں نے جو خواب دیکھا، وہ صاف اور واضح ہے۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ انشاء اللہ اس سے تمہیں دو بیٹے ملیں گے، جن کی وہ بہت اچھی تربیت کرے گی۔ بس تم اس کا دل نہ دکھنے دینا کبھی۔''

عبدالحق حیران تھا۔ کراچی میں شفیق صاحب نے اس سے یہی بات اپنے کے حوالے سے کہی تھی، اور اب نواب صاحب اپنے خواب کو حوالے سے کہہ رہے تھے۔ دو بیٹے..... کیا یہ ممکن نہیں کہ بیٹا نور بانو سے ہو؟

اچھو میاں نے بازار میں گاڑی رکوا دی۔

وہ سب سے پہلے مردانہ ملبوسات کی دکان پر گئے۔

''بیٹے! اپنے لئے بہت اچھے کپڑے پسند کرو۔ وقت نہیں ہے، ورنہ میں

تمہیں شیروانی سلوا کر دیتا۔ لیکن بہت اچھے کپڑے خریدنا۔ تکلف نہ کرنا۔''

عبدالحق کے دل میں گزشتہ روز سے ہی یہ بات تھی کہ اسے نواب صاحب کو کچھ دینا ہوگا کہ وہ اپنا بھرم رکھ سکیں۔ اب بھی وہ جیب میں دو ہزار روپے ڈال کر لایا تھا۔ اس نے کہا۔

''میں تکلف نہیں کروں گا۔ بس اتنا کہہ دیں کہ آپ مجھے بیٹا سمجھے ہیں نا!''

''یہ کوئی کہنے کی بات ہے میاں! پہلے بھی سمجھتا تھا، اور اب تو دوسری طرح سے بھی تم میرے لئے بیٹے ہی ہو۔''

''تو میں ایک بیٹے کا فرض نبھا رہا ہوں۔ مجھے روکئے گا نہیں۔'' یہ کہہ کر عبدالحق نے دو ہزار روپے ان کی طرف بڑھا دیئے۔

اچھو میاں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ پھر مسکرا دیئے۔

''ان کی ضرورت نہیں بیٹے! پیسے میرے پاس بہت ہیں۔''

''اب یہ غیریت کی بات ہے۔'' عبدالحق کے لہجے میں احتجاج تھا۔

اچھو میاں نے جیب سے نوٹ نکال کر اسے دکھائے اور بولے۔

''دیکھو، رب کا کرم ہے۔ اسے سب معلوم ہے۔ وہ پہلے ہی سے بندوبست کر دیتا ہے اپنے بندوں کے لئے۔ مجھے پتا بھی نہیں تھا کہ مجھے جانے سے پہلے بیٹی کو وداع کرنا ہے۔ لیکن اس نے مجھے اس سے پہلے ہی نواز دیا۔ خود دیکھ لو۔''

عبدالحق یوں مایوس ہوا، جیسے کسی نعمت سے محروم ہو گیا ہو۔

''لیکن میں سچ مچ تمہیں بیٹا سمجھتا ہوں۔'' اچھو میاں نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔

''اور میں اس شادی میں اپنے تمام ارمان پورے کرنا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے کمی پڑی تو میں تم سے مانگ لوں گا۔ بیٹے ہو نا!''

''جی..... ٹھیک ہے.....!''

اچھو میاں نے اسے کپڑے، جوتے..... ہر چیز دلائی۔ پھر وہ عورتوں کے

ملبوسات کی دکان پر گئے۔ وہاں انہوں نے اس کے لئے ایک بہت اچھا جوڑا خریدا۔ پھر چار جوڑے عام سے خریدے۔

''بیٹی کو بھی تو کچھ دینا چاہئے۔'' انہوں نے جیسے خود سے کہا۔

پھر انہوں نے ارجمند کے لئے سونے کا ایک سیٹ لیا۔ وہ بھاری تو نہیں تھا، لیکن بہت نازک اور خوب صورت تھا۔

خریداری مکمل کر کے وہ گاڑی میں آ کر بیٹھے۔ عبدالحق نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''مجھے دنیاداری کا کچھ پتا نہیں۔'' اچھو میاں نے کہا۔

''لیکن یاد آتا ہے کہ نکاح کا کھانا لڑکی والوں کی طرف سے ہوتا ہے۔''

عبدالحق نے اس سے کچھ کہا نہیں۔ بس شکایتی نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔

''مجھے نہیں معلوم کے اچھے باورچی کہاں ملیں گے۔ میں خود تو بس لنگر کا کھانا پکوا سکتا ہوں۔'' اچھو میاں نے کہا۔

''تم ہی مجھے لے چلو تو کل کے لئے کھانے کا آرڈر دے دیں۔''

عبدالحق نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔

کھانے کا آرڈر دینے کے بعد وہ گاڑی میں آ کر بیٹھے۔

''اب کہاں چلنا ہے.....؟'' عبدالحق نے ان سے پوچھا۔

''بس..... اب گھر چلو۔''

اپنی انیکسی میں پہنچ کر اچھو میاں نے اپنی جیب چیک کی۔ اسے کہتے ہیں برکت۔ انہوں نے دل میں خود سے کہا۔ آخری کام کے لئے بھی معقول رقم بچی تھی ان کے پاس۔ اللہ کیسے ضرورتیں پوری کرتا ہے، آدمی کی۔ لیکن انہیں عبدالحق کی مایوسی بھی یاد تھی۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ اس کے لئے بھی کچھ کرنا ہے۔

رات کو حمیدہ انیکسی میں چلی آئی۔ نور بانو اور رابعہ بھی اس کے ساتھ تھیں۔ وہ ارجمند کے لئے سہاگ کا جوڑا اور دوسری چیزیں لے کر آئی تھیں۔

''بھائی صاحب! ہم نے ولیمہ ہفتے کے دن کا رکھا ہے۔'' حمیدہ نے

اچھوں میاں سے کہا۔

''جی ...! بہت مناسب ہے۔ لیکن مجھے پانچ بجے چلے جانا ہے۔''

''اسی لئے ہم نے ولیمہ دوپہر کا رکھا ہے۔''

اچھو میاں کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''بہت بہت شکریہ میری بہن ...!''

❁ ❁ ❁

جمعے کی نماز پڑھنے وہ داتا دربار گئے۔ وہ تو اکیلے جانا چاہ رہے تھے۔ لیکن عبدالحق نے کہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ ہی نماز پڑھے گا۔

نماز کے بعد وہ باہر نکلے، اور انہوں نے لنگر کے لئے چار دیگوں کا آرڈر دیا۔ باورچی نے انہیں ایک بینچ پر بٹھا دیا۔

''آپ بھی لو گے بابا جی ...!''

''کیوں نہیں ...؟'' اچھو میاں نے کہا۔

''کچھ ایسے لوگ بھی آتے ہیں بابا جی ...! جو خود نہیں کھاتے۔''

''میں نے تو اپنی بہترین زندگی میں کھانا ہی یہیں کھایا ہے بیٹے'' اچھو میاں نے سادگی سے کہا۔

''اس سے اچھا کھانا کہیں نہیں ملا مجھے۔''

انہوں نے عبدالحق کے ساتھ وہیں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ باورچی کے لڑے نے آواز لگائی۔

''ہاں بھئی ...! لنگر آیا ہے ... آجاؤ ...!''

اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں قطار لگ گئی۔

عبدالحق نے دیکھا، اچھو میاں رو رہے تھے۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

❁ ❁ ❁

نمازِ عصر کے بعد نکاح ہوا۔ عورتیں رسمیں کرتی رہیں۔ مردوں نے مغرب کی نماز ادا کی۔ پھر لان میں ہی کھانے کا اہتمام کیا گیا۔ اس کے بعد ارجمند کو ٹیکسی سے رخصت کرا کے گھر میں لے جایا گیا۔

اچھوں میاں اس روز بھی نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ جمعے کی نماز سے واپس آنے کے بعد عبدالحق ان کے وہ کپڑے لے کر ان کے پاس آیا تھا اور اچھو میاں نے بغیر کسی ردّ و قدح کے انہیں قبول کر لیا تھا۔

انہوں نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ اپنا آپ انہیں بہت اچھا لگا۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے، جیسے ہر بوجھ سے آزاد ہو گئے ہوں۔

''اب مجھے شکر کے سوا کیا کام ہے میرے ربّ!'' انہوں نے دھیرے سے اللہ کو پکارا۔

''تیرا شکر ہے میرے معبود! تیرا شکر ہے۔ اب میں تیرے در پہ پہنچنے کو بے تاب ہوں۔''

❁ ❁ ❁

وہ سہاگ رات تھی۔

مگر ارجمند بہت بے چین تھی۔ تمام وقت لڑکیوں نے اسے گھیرے رکھا تھا۔ اب بالآخر اسے حجلۂ عروسی میں پہنچا دیا گیا۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ پورے کمرے کو اور سیج کو گلاب کے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ اور یہ سب کچھ آپی نے خود کیا تھا۔

بے شک اللہ بڑی قدرت والا ہے۔

قدموں کی آہٹ سنائی دی تو اس کا دل جیسے بے قابو ہو گیا۔ دھڑکنیں تھیں کہ لگتا تھا، سینے میں کوئی تیز رفتار پنکھا چلا دیا گیا ہے۔

دروازہ بند ہونے کی آواز ... پھر اپنی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ ... اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

پھر مسہری پر کوئی بیٹھ گیا ... وہ اس کے آغا جی تھے۔

''السلام علیکم ...!'' آغا جی نے کہا۔

اس نے دھیرے سے سلام کا جواب دیا۔

عبدالحق اس شادی کے بارے میں اب تک فلسفیانہ انداز میں سوچتا رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ ارجمند بچی ہے، وہ اس سے بہت بڑا ہے۔ وہ سوچتا تھا کہ

نور بانو نے اس پر یہ سب کچھ تھوپ دیا ہے۔ لیکن ارجمند کا کہنا تھا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اور وہ اس کی تردید کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ارجمند کے ساتھ ازدواجی زندگی کا تصور نہیں کر پایا تھا۔ یہ سوچا ہی نہیں جاتا تھا اس سے۔ اسے ڈر لگتا تھا کہ جو کچھ نور بانو کے ساتھ اس کا تعلق ہے، وہ ارجمند کے ساتھ تو کبھی قائم نہیں ہو سکے گا۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ جبکہ اب یہ ارجمند کا حق ہوگا۔ اور وہ حق نہیں ادا کرے گا تو اللہ کے ہاں جواب دینا پڑے گا۔ یہ سب سوچ کر وہ پریشان ہوتا رہا تھا۔ سچ یہ ہے کہ بس یہ شادی ہو رہی تھی، لیکن اس کے دل میں اس خوشی کا نام ونشان بھی نہیں تھا، جو شادی کا لازمہ ہے۔ شادی کا تو مطلب ہی خوشی ہے۔

لیکن حجلۂ عروسی کی اپنی فضا ہوتی ہے۔ اور نکاح کے رشتے میں ویسے ہی اللہ کی طرف سے تائید ہوتی ہے۔ یہ بات اسے معلوم نہیں تھی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے وہ حیران تھا کہ یہ اتنا وقت وہ کیسے گزارے گا، کیا کرے گا وہ؟

مگر گلابوں سے مہکتا ہوا وہ کمرہ، اور سرخ گلابوں کی وہ متحرک گھڑی......

ایک لمحے میں وہ بدل گیا۔ اب وہ جیسے کوئی شوخ اور بےفکرا نوجوان تھا۔

''اب یہ گھونگھٹ تو مجھے ہی اٹھانا پڑے گا۔'' اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

جواب ہلکی سی کسمساہٹ کی شکل میں آیا۔

''اور وہ تم مجھے ایسے اٹھانے نہیں دو گی۔ کہو گی، پہلے مجھے منہ دکھائی دیں۔''

ارجمند نے بڑی شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

''گونگی ہوگئی ہو کیا؟ بولنا نہیں آتا؟'' عبدالحق نے اسے چھیڑا۔

''مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ میری منہ دکھائی تو آپ ہیں۔'' ارجمند نے دھیمی آواز میں کہا۔

''اور اگر میں کہوں کہ تم خود ہی گھونگھٹ اٹھا دو تو .....؟''

''میں انشاء اللہ آپ کا کوئی حکم کبھی نہیں ٹالوں گی۔''

''تم نے تو میری ذمہ داری بڑھا دی۔'' عبدالحق نے کہا۔ اس کی شوخی ہوا

ہوگئی۔ وہ بے حد سنجیدہ ہوگیا۔

''اللہ مجھے اس سے محفوظ رکھے کہ میں کبھی تمہیں کوئی غلط اور ناروا حکم دوں۔ گھونگھٹ بھی میں اٹھاؤں گا اور منہ دکھائی بھی دوں گا۔'' عبدالحق نے اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنائی اور پھر اس کا گھونگھٹ الٹ دیا۔

وقت جیسے ساکت ہوگیا۔ کائنات کی ہر چیز ٹھہر گئی۔ عبدالحق مبہوت ہو کر ارجمند کو دیکھتا رہا، جس کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر پپوٹے یوں تھرتھرا رہے تھے، جیسے پلکوں کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہوں۔ وہ ایسا بے مثال حسن تھا کہ عبدالحق نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا ..... بے داغ، متناسب۔

کوئی کسی کو کتنا ہی دیکھے، اور چاہے بے شرمی سے دیکھے، پوری طرح نہیں دیکھ سکتا ..... چاہے عمر بھر دیکھتا رہے۔ چہرے پر حجابات ہوتے ہیں..... ان دیکھے حجابات۔ جب آدمی اللہ کے حکم کے مطابق کسی کو اپناتا ہے اور استحقاق کے ساتھ اسے دیکھتا ہے تو وہ حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ عبدالحق نے تو ارجمند کو نظر بھر کر بھی کم ہی دیکھا تھا..... اور وہ بھی بچی سمجھ کر۔ لیکن جانتا تھا کہ وہ بہت خوب صورت ہے۔ مگر اب اور بات تھی۔ اب تو وہ حیرت سے سوچ رہا تھا کہ کیا کوئی اتنا حسین بھی ہو سکتا ہے۔ سبحان اللہ .....!

اور اسی لمحے اسے نور بانو کا خیال آیا۔ نور بانو بھی بہت حسین ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔ مگر حسن کا موازنہ ممکن نہیں۔ اللہ نے اپنی جگہ ہر انسان کو، مرد ہو یا عورت، خوب صورت بنایا ہے۔ ہر ایک کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ خوب صورتی اس شخصیت کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ اس لئے موازنہ ممکن نہیں۔

وہ نہیں سمجھ سکا کہ دراصل وہ نور بانو کا دفاع کر رہا ہے۔ جو اس کے نزدیک دنیا کی حسین ترین عورت تھی۔ اور وہ اسے اس مقام سے نیچے نہیں لانا چاہتا تھا۔ نور بانو اس کے دل کی آرزو تھی، جبکہ ارجمند اس پر تھوپی گئی تھی۔

اس کے باوجود وہ بے پناہ کشش محسوس کر رہا تھا۔ اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔

کچھ بناؤ سنگھار کی وجہ سے بھی خوب صورت لگ رہی ہے یہ۔ اس نے

دل میں سوچا۔

''اچھا......! آنکھیں تو کھولو۔'' اس نے کہا۔

پلکیں اٹھیں، پھر نظر اٹھی، مگر صرف ایک پل کو۔ اور فوراً ہی جھک گئی۔

بغیر کسی ارادے کے عبدالحق نے ارجمند کا ہاتھ تھاما اور غور سے اسے دیکھنے لگا۔ گلابی، خوب صورت، نازک، ترشا ہوا ہاتھ۔ جلد ایسی شفاف کر لگے آر پار دیکھ رہے ہیں۔

اس نے بڑی نزاکت سے اس ہاتھ کو چوم لیا۔

ارجمند کا پورا جسم مرتعش ہوگیا۔ وہ لجا کر دہری ہوگئی۔

اللہ نے آدمی کو ایسا ہی بنایا ہے۔ مرد اپنی دانست میں کتنا ہی بے طلب ہو، عورت کی پسپائی اس کے اندر پیش قدمی کے جذبے کو ابھارتی ہے۔ عبدالحق نے بھی قدم آگے بڑھایا۔

لیکن ارجمند نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا۔

''مجھے ایک اجازت دیں گے آغا جی.....!'' اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔

عبدالحق نے اپنی مایوسی اور بدمزگی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

''بولو......! کیا بات ہے......؟''

''سب نے گھیر رکھا تھا۔ جیسے تیسے میں نے نماز تو پڑھ لی تھی۔ مگر سب کے سامنے پوری نماز نہیں پڑھ سکی تھی۔ اجازت دیں تو اب پڑھ لوں؟''

اور عبدالحق پر جیسے کسی نے یخ بستہ پانی کی پوری بالٹی انڈیل دی۔ وہ جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ اسے خیال ہی نہیں آیا، اور یہ لڑکی ...

''اس کے لئے اجازت مانگوں گی سمجھ سے ......؟''

''جی ... کیونکہ یہ فرض نماز نہیں ہے۔ اور انشاء اللہ آئندہ ایسا ہوگا بھی نہیں۔ آپ کے وقت سے پہلے ہی نماز پڑھ لیا کروں گی میں۔''

''ضرور پڑھو......! شکر کے نفل تو مجھے بھی ادا کرنے ہیں۔'' عبدالحق نے شرمندگی سے کہا۔

ارجمند اٹھ کر باتھ روم میں گئی۔ چند لمحے بعد اس نے پکارا۔

''آجایئے آغا جی! وضو کر لیجئے۔''

عبدالحق باتھ روم میں گیا تو وہ لوٹا ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔

''بیٹھیے اور وضو کیجئے۔''

عبدالحق نے حیرت سے دیکھا۔

''لاؤ......! لوٹا مجھے دو۔ میں وضو کر لوں گا۔ روز کرتا ہوں۔''

''اتنے کنجوس نہ بنیں۔ آپ کے اجر میں کوئی کمی تھوڑا ہی ہوگی۔ البتہ مجھے فائدہ ہو جائے گا۔''

وہ پانی ڈالتی رہی، اور وہ وضو کرتا رہا۔ وضو کرنے کے بعد اس نے کہا۔

''جزاک اللہ......! یہ بتاؤ، کسی اور کو ایسے وضو کرایا ہے کبھی......؟''

''دادی اماں کو روز کراتی ہوں۔''

عبدالحق نے واپس آکر شکر کے نفل پڑھے۔ اتنی دیر میں ارجمند بھی نماز شروع کر چکی تھی۔ نماز سے اٹھ کر وہ بستر پر جا لیٹا، اور ارجمند کو دیکھتا رہا۔ اسے حیرت ہوئی کہ ارجمند نے دو دو کر کے چھ رکعتیں پڑھیں۔ پھر وہ اٹھ کر چلی آئی۔

عبدالحق نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ پاکیزہ اور کہیں زیادہ خوب صورت لگ رہا تھا۔ بناؤ سنگھار کے بغیر وہ زیادہ حسین لگ رہی تھی۔

''اب سکون ہوگیا تمہیں......!''

''جی......! ایک معمول ابھی باقی رہ گیا ہے۔'' ارجمند نے مہین سی آواز میں کہا۔

''پھپھو کے لئے روز سورۃ الملک پڑھتی ہوں۔''

سورۂ ملک کا سن کر وہ تڑپ گیا۔

''تو بلند آواز میں پڑھو۔ میں بھی سنوں گا۔''

ارجمند نے سورۂ ملک کی تلاوت شروع کی، اور عبدالحق پر ایک کیفیت سی طاری ہوگئی۔ ارجمند نے سورۃ مکمل بھی کر لی۔ مگر وہ گم صم بیٹھا رہا۔ ارجمند نے بھی

اسے اسی حال میں رہنے دیا۔ بس اسے غور سے دیکھتی رہی۔

بالآخر عبدالحق کی محویت ختم ہوئی۔ اس نے چونک کر ارجمند کو دیکھا۔

''جزاک اللہ ...... ! تمہاری قرأت بہت اچھی ہوگئی ہے۔'' اس نے کہا۔

''یہ سب اللہ کا فضل ہے۔''

عبدالحق کے ذہن میں ایک بات تھی، اور اس بات کی وجہ سے ایک ہچکچاہٹ تھی۔ وہ بات اسے ارجمند سے کرنی تھی۔ اب وہ اس کے لئے مناسب الفاظ، مناسب پیرایہ تلاش کر رہا تھا۔

''ارجمند...... ! ایک بات کہوں! تم برا تو نہیں مانو گی ...؟''

''میں انشاء اللہ کبھی آپ کی کسی بات پر برا نہیں مانوں گی۔'' ارجمند نے زور دے کر کہا۔

''دیکھو! میرے دل میں تو کبھی تمہارا خیال نہیں تھا ...''

''جانتی ہوں۔'' ارجمند کے لہجے میں ہلکی سی یاس تھی۔

''لیکن یہ تو آپ کی نیکی کی دلیل ہے۔''

''اور یہ رشتہ قربت کا ہے۔ جب تک قلبی اور ذہنی قربت نہ ہو، ہر قربت بے معنی ہوتی ہے۔ تو میں تمہیں جاننا اور سمجھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔''

''میری کہانی کے ہر صفحے پر آپ ہی آپ ہیں۔'' ارجمند نے کہا۔

''بالکل شروع میں کچھ مٹی مٹی سی یادیں ہیں ... امی اور بابا کی ... دادی اور چاچو کی ... سب لوگوں کی ...... بہت دھندلی یادیں، جو حقیقت نہیں، خواب لگتی ہیں۔ پھر وہ کوٹھا، جہاں مجھے گانا بھی سکھایا جاتا تھا اور رقص بھی۔ میں بہت چھوٹی تھی تب۔ اور وہاں پھپھو کے سوا کوئی نہیں تھا۔ پھپھو بہت مجبور، بہت دکھی تھیں۔ وہ بہت کڑھتی تھیں۔ وہ مجھ سے بہت باتیں کرتی تھیں، جو اس وقت میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ مگر اب میں انہیں سمجھ سکتی ہوں۔ وہ صرف مجھے بچانے کے لئے زندہ تھیں، ورنہ مر جاتیں۔ اور وہ صرف میرے لئے دعائیں کرتی تھیں۔

پھر نانا ہمیں مل گئے۔ تھے تو وہ وہاں پہلے ہی سے، مگر ہمارے نہیں تھے۔

اللہ نے رحمت کی تو وہ ہمارے ہوگئے۔ پھر اللہ نے رحمت کی اور آپ مجھے نظر آ گئے۔ پھر اللہ نے رحمت کی اور پھپھو کو اختیار مل گیا ... کیوں اور کیسے؟ یہ شاید میں کبھی نہیں سمجھ سکوں گی۔ بس میں اتنا جانتی ہوں کہ ہم جہاں رہتے تھے، وہاں رزقِ حلال کا کوئی تصور نہیں تھا۔ لیکن اللہ نے اپنے فضل سے ہمارے لئے وہاں بھی رزقِ حلال جاری کر دیا تھا۔

میں بے خبر اور بے فکر تھی۔ میرا کام ہی کیا تھا؟ قرآن پڑھنا، نماز پڑھنا، آپ کے بارے میں سوچنا اور آپ کی تصویر بنانا اور آپ کے بارے میں اللہ سے باتیں کرنا۔

پھر اللہ نے رحمت کی۔ میں آپ کے پاس آ گئی۔ آپ کے توسط سے اللہ نے مجھے بہت محبت کرنے والے لوگ عطا فرمائے۔ پھپھو چلی گئیں۔ نانا دور ہوگئے۔ مگر آپ مجھے مل گئے۔ یہ ہے میری مختصر سی محدود زندگی کی کہانی۔ ہر کہانی میں بہت سے کردار ہوتے ہیں، مگر مرکزی کردار ایک ہی ہوتا ہے آغا جی! اور میری کہانی کا مرکزی کردار صرف آپ ہیں۔ اور ہر کہانی کا ایک عنوان ہوتا ہے۔ میری کہانی کا عنوان ہے اللہ کی رحمت، اللہ کا فضل۔ میں نے کبھی اللہ سے آپ کو نہیں مانگا کہ اس میں آپی دکھی ہوں گی اور میں آپی کے لئے صحت، تندرستی اور بڑی عمر کی دعا کرتی رہی۔ مجھے حق نہیں تھا اللہ سے آپ کو مانگنے کا۔ اب اس کی رحمت کہ آپ مجھے مل گئے، اور وہ بھی کچھ کھوئے بغیر۔ کسی کو دکھ پہنچے بغیر۔ اللہ نے آپی سے ہی سب کچھ کرا دیا۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ اس شادی پر رضامند کرنے کے لئے آپی نے کیسی کیسی خوشامد کی میری۔ میں دل میں سوچتی اور حیران ہوتی کہ اللہ کی شان ہے۔ اس کے لئے تو میں اپنے ہاتھوں سے اپنا سر کاٹ کر آپی کے قدموں میں رکھ سکتی ہوں، اور وہ الٹا میری خوشامد کر رہی ہیں۔

یہ اللہ کا کرم ہے۔ ورنہ آپ کو تو کبھی میرا خیال نہیں آتا۔ آپی نے ہی آپ کو مجبور کر دیا نا ...! ورنہ آپ کے مسودے میں تو میرا نام بھی نہیں تھا۔''

عبدالحق شرمندہ سا، سر جھکائے سن رہا تھا۔ یہ کیسی محبت ہے؟ وہ حیران تھا۔

''مجھے آپ کے سوا کبھی کچھ نہیں چاہئے تھا اور اب بھی مجھے کچھ نہیں چاہئے، کیونکہ مجھے سب کچھ مل گیا ہے۔ مجھے تو آپ کی محبت بھی نہیں چاہئے۔ وہ جو میں آپ سے محبت کرتی ہوں، وہ میرے لئے بہت کافی ہے۔ بس میں آپ کی خوشی چاہتی ہوں ... وہ سامانِ زیست جس میں آپ کی خوشی ہو۔''

وہ خاموش ہوئی اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''میں تمہیں ہر خوشی دینے کی کوشش کروں گا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اتنی غیریت سے بات کیوں کرتی ہو؟ جس بندھن میں ہم بندھے ہیں، وہ اللہ کے نام کا بندھن ہے۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ تمہیں کوئی محرومی ہو۔''

''میں نے تو بس اللہ کا فضل ہی دیکھا ہے۔ الحمد للہ کوئی محرومی نہیں دیکھی۔''

''ایک بات بتاؤ ...! تم نے کہا کہ تم نے پوری نماز نہیں پڑھی تھی۔ اور یہ جو تم نے باقی نماز پڑی ... دو دو کر کے چھ رکعت، یہ تو میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''یہ مجھ سے نہ پوچھئے آپ ...!'' ارجمند شرم سار نظر آنے لگی۔

''کیوں ...؟ میاں بیوی میں تو کوئی پردہ نہیں ہوتا۔''

''جو معاملہ بندے کا اللہ کے ساتھ ہو، اس کی تو اور بات ہوتی ہے۔''

''تو تم بتانا نہیں چاہتیں ...؟''

''مجھے لگتا ہے کہ بتاؤں گی تو کوئی نقصان ہو جائے گا میرا۔''

عبدالحق کو خود پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ کبھی دوسروں کے معاملات میں تجسس نہیں کرتا تھا۔ تجسس تو اس کی فطرت میں تھا ہی نہیں۔ لیکن اس وقت وہ تجسس سے بے حال تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ عشاء کی نماز ارجمند پوری پڑھ چکی ہے۔ تو پھر یہ چھ رکعت ...!

''میری خاطر نقصان نہیں گوارہ کر سکتیں تم ...!''

''کیوں نہیں کر سکتی، کچھ بھی کر سکتی ہوں۔'' ارجمند نے کہا۔

''لیکن اپنی نظروں میں چھوٹی ہو جاؤں گی میں۔''

عبدالحق خاموش ہو گیا۔

ارجمند کو وہ خاموشی ناراضی لگی۔

''آپ ناراض ہو گئے مجھ سے ...؟''

''نہیں ...! ناراضی کی کیا بات ہے ...؟ پورا وجود ... سب کچھ تو کوئی ی کو نہیں دیتا۔''

''مگر میں تو ایسی ہی ہوں۔ پورا وجود، اپنا سب کچھ سونپ دوں گی آپ و۔ چلئے! یہاں سے ہی شروع کرتے ہیں۔''

عبدالحق متوقع نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

وہ چند لمحے خاموش رہی، کچھ سوچتی رہی۔ پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''میں بچی تھی آغا جی ...! معصوم بچی ... جب آپ کی آرزو میرے دل ں پیدا ہوئی۔ میں دنیا کے بارے میں ... امکانات کے بارے میں ... اسباب ے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ بس میرے اللہ کا دیا ہوا یقین تھا کہ آپ ھے ملیں گے۔ اور میرا ایمان تھا اس پر۔ ہم عام لوگوں کا شاید سب سے پختہ ایمان، چپن میں، اور زیادہ سے زیادہ لڑکپن میں ہی ہوتا ہے۔ بعد میں تو ہم خود کو دنیا کے ظام کے مطابق ڈھال لیتے ہیں، اور ایمان گھٹتا جاتا ہے۔ تو میرا ایمان تھا کہ ایسا رہے گا۔ کیسے ہوگا؟ اس سے مجھے غرض نہیں تھی۔ پھپھو سوچتی تھیں کہ ایسا نہیں ساتا، کیونکہ وہ امکانات پر نظر ڈالتی تھیں۔

اور جب یہ ہو گیا، میں اس گھر میں آگئی تو میرا ایمان اور پختہ ہو گیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ آدمی بس اللہ کا حکم مانے ... اور اپنی مرضی کو نظر انداز کر کے مانے تو اس کی ہر بات مانتا ہے۔ جو وہ مانگے، اسے دیتا ہے۔ اور میں نے سمجھ لیا کہ بس اللہ ہی ایسا ہے، جس کے لئے کچھ بھی ان ہونی نہیں ہے۔ اس کی قدرت سے ... بھی نہیں ہے۔

مجھے اس وقت یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ نے مجھے دوزخ سے نکال کر جنت ں بھیجا ہے۔ میں تو بس یہ سوچ کر خوش تھی کہ اللہ نے وعدہ پورا کیا اور مجھے آپ ے ملا دیا۔ اب میں عمر بھر آپ کے ساتھ رہوں گی۔ تاہم میں نے یہ سبق سیکھ لیا کہ ... ے حکم کے خلاف نہیں کرنا چاہئے۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ انسان کے لئے یہ

کتنا مشکل کام ہے۔ جب میں پڑھتے ہوئے چپکے چپکے آپ کو دیکھنا چاہتی تھی اور دل روکتا تھا۔ اللہ نے انسان کو بنایا ہی ایسا ہے۔

پھر ایک دن میری سمجھ میں آیا کہ میں ناسمجھی اور بے خبری کے عالم میں ایک جہنم میں رہ رہی تھی، جہاں سے اللہ نے کرم فرما کر مجھے نکال دیا۔ یہاں سے مجھ پر سوچوں کے نئے دروازے کھل گئے۔ اللہ نے کرم فرمایا کہ میری خواہش کے مطابق مجھے آپ تک پہنچا دیا۔ لیکن اس سے بڑا جو کرم فرمایا، وہ یہ تھا کہ مجھے اس جہنم سے رہائی دلا دی۔ مگر اس سے میں بے خبر رہی۔ تب میں نے سوچا کہ اگر اللہ نے مجھے وہاں سے نہ نکالا ہوتا تو کیا ہوتا؟ یہ سوچ کر میری روح تھرا گئی۔ میری سمجھ میں آیا کہ پھپھو ہمیشہ ناخوش کیوں رہتی تھیں۔ میری سمجھ میں آیا کہ وہاں ان پر کیا گزرتی رہی، اور وہی سب کچھ میرے ساتھ بھی ہوسکتا تھا۔ سچ مچ میں بہت ڈر گئی۔ میں نے آپ کے حوالے سے تو شکر ادا کیا تھا لیکن اس حوالے نہیں کیا تھا۔

میں غور کرتی رہی۔ میری سمجھ میں آیا، پھپھو کہتی تھیں ..... اللہ تم پر بہت مہربان ہے۔ تم کبھی نہیں جان سکو گی کہ اس نے تمہیں کیسے کیسے دکھوں سے بچا لیا ہے۔ نہ جاننے میں ہی تمہاری بہتری ہے۔ بس تم اللہ کا شکر ادا کرتی رہا کرو۔

آپ کے جانے کے بعد بہت سی باتیں میری سمجھ میں آئیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ان پر آپ سے بات کروں، آپ کی راہنمائی طلب کروں۔ لیکن آپ بہت دور تھے۔ اور سب سے بڑا راہنما ساتھ تھا۔ اس نے ہی راستہ دکھایا۔

میری سمجھ میں ایک بات آئی۔ مسئلہ یہ ہے کہ آدمی بڑا بے خبر ہے۔ وہ کچھ جانتا ہی نہیں۔ جیسے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس جہنم سے نکال کر اللہ نے مجھے کروڑوں مصائب سے بچایا ہے، ویسے ہر روز وہ میری لاکھوں ضرورتیں پوری کرتا ہوگا۔ لاکھوں نعمتیں عطا فرماتا ہوگا۔ عنایات کرتا رہتا ہوگا۔ لیکن مجھے پتا نہیں چلتا ہوگا۔ کبھی پتا چلتا بھی ہوگا تو اس کی اہمیت سمجھ میں نہیں آتی ہوگی۔ بندہ یہ تو کبھی دیکھ اور سمجھ نہیں سکتا کہ یوں ہو جاتا تو کیا کیا ہوتا اور کب تک ہوتا، اور یوں نہ ہوتا تو کیا کیا ہوتا اور کب تک ہوتا۔ شاید پوری زندگی ہوتا رہتا۔ کیونکہ یہ سب کچھ تو صرف وہ جانتا ہے، جس کے پاس مکمل علم ہے اور جو ہر چیز جانتا ہے۔ ہمیں تو یہ بھی

پتا چلتا کہ ہمارے اپنے دل میں اور دماغ میں کیا کیا پل رہا ہے۔ سچ ہے، بندہ تو بے خبر ہے۔ اور پتا چلے بھی تو کتنا پتا چل سکتا ہے۔ اللہ تو ہر ہر پل ہماری ہزاروں ضرورتیں ایسے پوری کرتا رہتا ہے کہ ہمیں نہ ضرورت کا پتا چلتا ہے اور نہ اس کے پورے ہونے کا۔ سانس کو ہی لے لیجئے۔ ہم کب سوچتے ہیں کہ یہ سانس اللہ نے دی، اور یہ باہر نکالی۔ نہ ہوتا تو زندگی ختم تھی۔

مجھ پر بے بسی طاری ہونے لگی آغا جی! میں سمجھ گئی کہ شکر ادا کرنا ضروری ہے۔ لیکن شکر ادا کرنا ممکن ہی نہیں۔ پھر میں نے سوچا، اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ناممکن قرار دے کر شکر کا خیال ہی دل سے نکال دیا جائے۔ تو پھر کیا کروں؟ دل نے کہا، دو رکعت نماز شکر ادا کیا کر..... اللہ کی عطا کی ہوئی معلوم، نامعلوم تمام نعمتوں پر، اس کی تمام عنایات پر، اس کی عطا کی ہوئی ہر امداد اور ہر تحفظ پر۔ پھر اس سے اپنے لئے شکر کی توفیق اور شکر گزاری مانگا کر۔

اس پر مجھے قرار آ گیا۔ دل کو سکون ہوا اور بے بسی کا احساس کم ہوگیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ اللہ کی طرف سے راہ دکھائی گئی ہے۔ اب اس پر عمل کرنا میرا کام ہے۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ عشاء کے بعد ہر روز دو رکعت شکر کے لئے پڑھوں گی۔

''پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ مجھے اپنی ضرورتوں کا علم ہی کب ہے۔ بعض اوقات تو ایک لمحے بعد کی ضرورت کا علم بھی نہیں ہوتا۔ اللہ کا کرم ہے کہ وہ ہر ضرورت پوری کرتا ہے۔ اور سب سے بڑی ضرورت تو یہ ہے کہ میں گناہوں سے بچوں، اللہ کی نافرمانی نہ کروں، اس کا حکم مانوں۔ اور اللہ بغیر مانگے بھی میری تمام ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ تو کیوں نہ ہر روز دو نفل برائے حاجات ادا کر کے اس سے دعا کروں کہ وہ میرے اگلے روز کی تمام حاجتیں عزت کے ساتھ پوری فرمائے۔ مجھے اپنی نافرمانی سے، گناہوں سے بچائے اور مجھے اپنا فرمانبردار بنائے۔ دعا بندگی بھی ہے اور اس سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ تو یوں یہ چار رکعتیں اللہ کے فضل سے میرا روز کا معمول بن گئیں۔''

عبدالحق سن سا بیٹھا سنتا رہا تھا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ ارجمند

خاموش ہوگئی ہے۔ خاصی دیر بعد وہ چونکا۔

''مگر تم نے تو ابھی چھ رکعتیں ادا کی ہیں۔'' اس نے کہا۔

ارجمند کے چہرے پر رنگ دوڑ گیا۔

''اب اسے رہنے دیجئے نا.....!'' اس نے شرمیلے لہجے میں کہا۔

''اب پوری بات ہی بتا دو نا.....!''

ارجمند کی نظریں جھک گئیں۔

''آج دو رکعتیں آپ کے ملنے پر شکر کی بھی تو ہوئی تھیں۔''

عبدالحق کو کبھی اس لڑکی پر محبت نہیں آئی تھی، بلکہ وہ سوچتا تھا کہ شادی کے بعد اس سے محبت کیسے کرے گا؟ لیکن اس کی بات سن کر نہ جانے کہاں سے اس کے اندر محبت کا سمندر اُمنڈ پڑا۔ اس نے محبت سے اسے لپٹا لیا۔

''تم بہت اچھی ہو ارجمند.....!''

''یہ تو اللہ کا فضل ہے۔'' ارجمند نے عاجزی سے کہا۔

عبدالحق کے ذہن میں کوئی یاد سی سرسرائی۔ لیکن وہ اسے گرفت میں نہ لے سکا۔

''تم مجھے اللہ کے فضل سے ملی ہو۔ میں تمہارا مستحق نہیں تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ کبھی ہو بھی نہیں سکوں گا۔''

''ایسی باتیں نہ کریں.....شرمندہ کرنے والی۔ اسی لئے تو میں بتانا نہیں چاہ رہی تھی آپ کو۔''

''تم مجھے ہر روز یاد کرتی تھیں۔''

''ہر روز نہیں، ہر وقت۔ لیکن میں آپ کے دور جانے سے خوش تھی۔ میری آزمائش آسان ہوگئی تھی نا! اس لئے، لیکن آپ نے تو کبھی یاد نہیں کیا ہوگا مجھے؟''

''خیال تو آتا تھا کبھی کبھی، لیکن ایک دن میں نے بڑی شدت سے تمہیں یاد کیا تھا۔ وہ تہجد کا وقت تھا۔ تہجد کے بعد میں قرآن پڑھنے بیٹھا تھا کہ اللہ کی رحمت ہوئی اور بارہا کی پڑھی ہوئی آیات اچانک سمجھ میں آنے لگیں۔''

''کون سی آیات تھیں.....؟'' ارجمند نے پوچھا۔ اس کی آنکھیں اچانک چمکنے لگی تھیں۔

''میں نے انہیں اپنی ڈائری میں لکھ لیا تھا۔ لیکن الحمد للہ میں انہیں کبھی بھولا نہیں۔ وہ سورۂ بقر کی آیات تھیں۔''

''۶۷ سے ۷۱ تک۔'' ارجمند نے مداخلت کی۔

''جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو بتایا کہ اللہ کا حکم ہے کہ وہ ایک گائے قربان کریں۔''

''ہاں.....! تمہیں کیسے معلوم.....؟'' عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

''مجھ سے بھی اللہ نے ان آیات پر غور کروایا تھا اور اپنی رحمت سے مجھ پر واضح کر دی تھیں۔ بہت دیر تک میں بار بار پڑھتی اور الجھتی۔ اس وقت میں نے سوچا، کاش آپ یہاں ہوتے تو شاید مجھے سمجھا دیتے۔''

''میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ کاش تم ساتھ ہوتیں تو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی۔''

''اور پھر میری سمجھ میں انشاء اللہ کی اہمیت آئی۔ آخر میں اللہ نے خود فرمایا کہ بالآخر انہوں نے ذبح کر دیا اسے، اگرچہ نہ لگتا تھا کہ وہ ایسا کریں گے۔''

''ہاں! اگرچہ انشاء اللہ کہتے ہوئے بھی وہ حجت ہی کر رہے تھے۔ ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔''

''انشاء اللہ تو بس ان کے منہ سے نکل گیا تھا۔''

دونوں حیران تھے کہ ایک دوسرے کی بات پوری کر رہے ہیں۔

''اس پر مجھے سورۂ قلم کی آیات یاد آئی تھیں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''مجھے بھی..... وہی نا، جن میں باغ والوں کا حصہ ہے۔''

''جنہوں نے اپنے باغ سے پھل توڑنے کا ارادہ کیا، لیکن انشاء اللہ نہیں کہا۔''

''اور ان کا باغ اجڑ گیا۔''

''اور اللہ نے بتایا کہ دنیا کا عذاب ایسا ہوتا ہے۔ اور آخرت کا عذاب تو

کہیں بڑھ کر ہے۔"

"اس میں تسبیح کی اہمیت بھی بیان کی گئی ہے۔"

"ان آیات کو پڑھ کر میں نے سیکھا کہ ہر نقصان پر انا للہ وانا الیہ راجعون کہنا چاہئے۔"

"میں نے بھی آغا جی....."

"پھر اذان ہوئی اور میں نماز کے لئے اٹھا....."

"لیکن میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا کہ دنیا کا ہر نقصان، ہر محرومی اور ہر عذاب درحقیقت اللہ کی رحمت ہے۔" ارجمند جیسے از خود رفتگی کے عالم میں تھی۔

"کمال ہے، یہی خیال مجھے بھی آیا تھا، اور اس کی وضاحت اس آیت نے کی تھی..... ایسا ہوتا ہے عذاب..... اور عذابِ آخرت تو کہیں بڑھ کر ہے۔ میں نے سمجھا کہ دنیا کا عذاب اللہ کی تنبیہ ہے، سمجھانا ہے، تاکہ آدمی آخرت کے بڑے عذاب سے بچ جائے۔ اس لحاظ سے یہ اللہ کی رحمت ہے۔"

"اور اسی روز نماز کے بعد اللہ نے رحمت فرمائی اور ھٰذا من فضل ربی کی اہمیت میری سمجھ میں آئی۔ ارجمند نے کہا۔

"سورۂ نمل کی آیات کے حوالے سے بات کر رہی ہو نا.....!"

"جی آغا جی.....! جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا تھا کہ کوئی ہے جو ملکہ سبا کا تخت میرے سامنے حاضر کر دے۔"

"ہاں! وہی..... اسی دن میں نے بھی یہ نکتہ سمجھا تھا۔"

"مجھے تو وہ تاریخ بھی یاد ہے آغا جی.....! چار اکتوبر۔"

"تاریخ تو مجھے یاد نہیں۔ لیکن میری ڈائری سے پتا چل جائے گا۔"
عبدالحق نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ بچوں کی سی ہیجانی کیفیت سے دوچار تھا۔

عبدالحق ڈائری لے کر آیا۔ اس نے صفحہ کھولا۔

"چار اکتوبر ہی ہے۔" اس نے حیرت سے کہا۔

"مجھے دکھایئے!"

ارجمند نے پوری تفصیل پڑھی، پھر بولی۔

"یہ ایک ہی دن کی بات ہے۔ اور میں نے بھی اسی ترتیب سے سوچا تھا۔"

"اور ایک بات بتاؤں! یہاں ایک بار قرآنی آیات پر تم سے بات ہوئی تھی۔ تم سے بہت کچھ سمجھا تھا میں نے۔ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ تو اس روز کراچی میں مجھے وہ بات یاد آئی اور میں نے سوچا، کاش اس وقت تم میرے ساتھ ہوتیں تو میرے اندر سے کسی نے کہا..... چلو، مل کر سمجھتے ہیں....."

"آپ یقین نہیں کریں گے آغا جی.....! اس صبح مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے آپ میرے سامنے بیٹھ کر مجھے سمجھا رہے ہوں۔ بس آپ نظر نہیں آ رہے تھے۔ لیکن آپ کی آواز سن رہی تھی۔"

عبدالحق نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن جان لیا کہ یہ لڑکی اس کے لئے اللہ کی رحمت ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو اس نے اسے روز شکر ادا کرنا اور اللہ سے قضائے حاجات کی دعا کرنا سکھایا ہے۔ اللہ اپنے بندے کو اس کے توسط سے بڑائی کی طرف لے جا رہا ہے۔

اب کہیں کسی طرح کی دوری نہیں تھی..... نہ قلبی، نہ ذہنی..... ایک پاکیزہ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اس کی تھی..... اس کی اپنی..... اللہ کی طرف سے بیش بہا تحفہ! رات پردہ پوش! عبدالحق نے زیرلب کہا اور لائٹ آف کر دی۔

❀ ❀ ❀

نور بانو نے سب کچھ خود ہی کیا تھا۔ مگر اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے بہت بھاری کام کیا ہے۔ رات کو وہ ویسے ہی دیر سے سونے کی عادی تھی لیکن اس رات تو لگ رہا تھا کہ اسے نیند آئے گی ہی نہیں۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے کیا کر دیا..... اور کیسے کر دیا۔ اب پہلی بار اس پر اس کی معنویت کھل رہی تھی۔ یہ تو زندگی بھر کا سودا تھا۔ اس نے عبدالحق میں کسی کو شریک کر لیا تھا..... اس نے! خود اس نے!!

اس وقت وہ حمیدہ کے کمرے میں تھی..... حمیدہ کے بستر پر، اور ارجمند اس کی خواب گاہ میں تھی..... عبدالحق کے ساتھ..... اس کے بستر پر۔

نہیں! اس نے جلدی سے تصحیح کی۔ اس کے بستر پر نہیں، اپنے نئے بستر پر۔ اور ہر اعتبار سے اس کا اہتمام خود اس نے کیا تھا، اور بڑے شوق سے کیا تھا۔ ضد کر کے اس نے عبدالحق کو بھی منایا اور ارجمند کو بھی۔ یہ باطنی اہتمام تھا۔ اور پھر اس نے اپنی خواب گاہ میں نئی مسہری کا اہتمام بھی کیا تھا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے پتری!'' حمیدہ نے اسے ٹوکا تھا۔

''کیسی باتیں کرتی ہو اماں......!'' اس نے کہا تھا۔

''وہ کنواری لڑکی ہے۔ کہیں بھی شادی ہو سکتی تھی اس کی۔ اچھے سے اچھا رشتہ مل جاتا اسے۔ میری محبت میں اس نے اتنی بڑی قربانی دی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے دھیے! پر میں تو مسہری کی بات کر رہی ہوں۔ نئی مسہری کی کیا ضرورت ہے؟''

''وہ نئی نویلی دُلہن میرے بستر پر کیوں سوئے؟ اس کے لئے تو نیا بستر ہونا چاہئے۔'' اس نے تنک کر جواب دیا تھا۔

''ہاں! یہ بات تو ٹھیک ہے تیری۔ تو تو بہت عقل مند ہے نور بانو!''

''سب تم نے ہی سکھا ہے اماں!'' نور بانو نے متکسرانہ لہجے میں کہا۔

مگر اب وہ تڑپ رہی تھی۔ وہ سب کچھ کرتے ہوئے اپنی فطرت کو بھول گئی تھی۔ مگر فطرت حالات کے تحت وقتی طور پر دب تو جاتی ہے، ختم کبھی نہیں ہوتی۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ یہاں حمیدہ کے ساتھ ہے، اور وہاں ارجمند عبدالحق کے ساتھ۔ اور ارجمند ایک تو کم عمر اور اس پر ایسی حسین کہ اتنی حسین لڑکی اس نے کبھی دیکھی ہی نہیں۔ اب عبدالحق اسی کا ہو جائے تو اس میں کسی کا کیا قصور؟ وہ خود ہی اس کی ذمہ دار ہے۔

وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ لیکن حمیدہ کی وجہ سے اٹھی نہیں۔

یہ میں نے کیا کر دیا۔ اس نے سوچا۔ اپنے ہاتھوں اپنا گھر اجاڑ ڈالا میں نے۔

پھر اسے یاد آیا کہ یہ اس نے کوئی ایثار کیا ہے، نہ غلطی کی ہے۔ یہ تو سوچ سمجھ کر کیا ہے اس نے۔ یہ تو سودا ہے۔ اور اس سودے میں اسے اولاد ملے گی، جبکہ

اس کے نصیب میں اولاد تھی ہی نہیں۔ اسے تو شکایت کا، جلنے کڑھنے کا کوئی حق ہی نہیں۔ اس معاملے میں سبھی فائدے میں رہے، عبدالحق بھی، حمیدہ بھی اور وہ خود بھی۔ خسارے میں تو بس ایک ارجمند ہے...... بے چاری۔

اس خیال نے اس کے جلتے تپتے دل پر جیسے برف کا پھایا رکھ دیا۔

مگر وہ سکون بس تھوڑی دیر کا تھا۔ حسد تو اس کی فطرت میں تھا۔ وہ تو بے سبب بھی حسد کر سکتی تھی کسی سے۔ جبکہ یہاں تو حسد کا بہت بڑا سبب بھی موجود تھا۔

خوابہ گاہ میں کیا ہو رہا ہوگا؟ اس خیال نے اس کے دماغ میں بچھو کی طرح ڈنک مارا۔ اور تن بدن میں آگ سی دہک اٹھی۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھے اور جا کر دروازہ پیٹ ڈالے۔ چلا کر کہے کہ بس کرو، ختم کرو یہ کھیل۔

لیکن نہیں! وہ یہ نہیں کہہ سکتی۔ یہ کھیل شروع اس نے ہی کیا تھا۔ لیکن ختم کرنے کا اختیار اسے نہیں تھا۔

اسے اپنی سہاگ رات یاد آ گئی۔

وہ بہت قیمتی، خوش کر دینے والی یادیں تھیں۔ وہ ان سے کچھ دیر بہلی رہی۔ پھر اسے خیال آیا کہ اب یہی کچھ ارجمند......

اور آگ پھر بھڑک اٹھی۔

اس نے کروٹ بدلی اور حمیدہ کو دیکھا۔ شاید وہ سو چکی تھی۔ لیکن وہ خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ حمیدہ اس کی بے قراری دیکھے۔ وہ دم سادھے لیٹی، اسے تکتی رہی۔

اس کا تصور بے لگام ہو رہا تھا۔ خواب گاہ کے مناظر اس کے تصور میں پھر رہے تھے۔ اپنے بستر پر اسے انگارے بچھے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ بار بار خود کو یاد دلاتی کہ اس نے ایک بہت بڑی نعمت کو پانے کے لئے ایک نسبتاً چھوٹی نعمت کھوئی ہے...... لیکن نہیں! کھوئی کہاں، صرف بانٹی ہے۔ مگر یہ خیال بس تھوڑی دیر اسے بہلاتا تھا، اس کے بعد پھر وہی بھڑکتی ہوئی آگ۔ اور بہلاوے کے یہ دورانئے بھی سکڑتے جا رہے تھے۔

جب اسے یقین ہو گیا کہ حمیدہ سو چکی ہے تو وہ اٹھی اور کمرے سے نکل

آئی۔

پورے گھر میں سناٹا تھا۔ سب سو رہے تھے۔ پھر بھی وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں چلتی اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھی، جو اب ارجمند کی خواب گاہ تھی۔ کئی بار وہ دروازے سے پلٹی ..... شرمندہ ہو کر، مگر پھر دروازے کی طرف کھنچی چلی گئی، جیسے وہاں اس کے لئے کوئی مقناطیسی کشش ہو۔

بالآخر وہ جھکی اور اس نے دروازے سے کان لگا دیا۔

اگلا لمحہ شدید حیرت کا تھا۔

اندر صرف ایک ہی آواز تھی...... ارجمند کی آواز۔ اور اس آواز میں ایک تسلسل تھا۔ لفظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

نور بانو سیدھی کھڑی ہوئی اور اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس بات کا اسے بڑی شدت سے احساس تھا کہ اگر کسی نے اسے دروازے سے کان لگائے دیکھ لیا تو اس کی بڑی سبکی ہوگی۔

یہ بات طے تھی کہ سب لوگ سو رہے ہیں۔ لیکن کوئی کسی بھی وقت، کسی ضرورت کے تحت اٹھ سکتا ہے۔ اور یہ بھی ناممکن نہیں کہ عبدالحق خود ہی کسی ضرورت کے تحت دروازہ کھول کر باہر آئے۔ ایسا ہوا تو وہ اسے منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہے گی۔

لیکن آدمی تجسس پر قابو پانا نہ سیکھے تو تجسس میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ آدمی ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ وہ پھر دروازے پر جھکی، اور کان لگا دیا۔ وہی ارجمند کی آواز! وہ مسلسل بول رہی تھی ..... اور ایک خاص آہنگ میں۔

اس بار اس نے سماعت پر زور دیا اور حیران رہ گئی۔ ارجمند قرآن پڑھ رہی تھی۔

نور بانو کے ذہن میں کئی سوالات نے سر اٹھایا۔ کیا عبدالحق سو چکا ہے؟ کیا عبدالحق نے ارجمند کو قبول نہیں کیا؟ شادی کی تو صرف اس کی مروت میں؟ اور اب مایوس ارجمند قرآن پڑھ رہی ہے؟

اس کا پہلا ردِعمل تو خوشی کا تھا۔ مگر پھر اسے مایوسی ہوئی۔ یوں تو اس کا

منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔

وہ واپس حمیدہ کے کمرے میں چلی آئی اور بستر پر لیٹ گئی۔ لیکن اب وہ مایوس تھی۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا اس کی قربانی رائیگاں جائے گی؟

اس سے زیادہ دیر لیٹا نہیں گیا۔ وہ پھر کمرے سے نکلی اور خواب گاہ کی طرف گئی۔ اس بار اندر سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس بار عبدالحق کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

اب کے وہ بستر پر آ کر لیٹی تو قدرے مطمئن تھی۔ لیکن ذرا دیر بعد پھر وہی کیفیت ..... وہی انگاروں کا بستر، وہی دل کی جلن۔

اب کیا عمر بھر یہی ہوتا رہے گا......؟ اس نے گھبرا کر سوچا۔ لیکن اس کے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔

اس رات وہ بار بار جیتی اور مرتی رہی۔ نہ جانے کس وقت اسے نیند آئی۔ اور وہ نیند بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ ہذیانی نیند تھی وہ۔

❁ ❁ ❁

حمیدہ سونے کے لئے لیٹی تو بہت خوش اور مطمئن تھی۔ اس کا ایک خواب پورا ہو گیا تھا، اور اس تعبیر میں اس کا دوسرا خواب چھپا تھا۔ جس انداز میں اللہ کی طرف سے پہلے خواب کو تعبیر ملی تھی، اس سے لگتا تھا کہ انشاء اللہ دوسرے خواب کو بھی تعبیر مل جائے گی۔

عام طور پر وہ لیٹتے ہی سو جاتی تھی۔ لیکن اس وقت تو اس خوشی نے اس کے اندر ہیجان سا بھر دیا تھا، اور ہیجان میں بھلا نیند کہاں آتی ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔ اللہ کی شان، کچھ کرنا تو دور، اسے کچھ کہنا بھی نہیں پڑا۔

اس بے خوابی میں بے سکونی نہیں تھی، بلکہ لذت تھی۔ وہ ایک ایک لمحے کو ...کے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ کیسی عجیب بات تھی کہ عبدالحق کی اس شادی سے سبھی خوش تھے۔ مسعود صاحب اور ان کی بچیاں بھی، زبیر اور رابعہ بھی، اور گاؤں سے آنے والے لوگ بھی۔ اور ساجد کی خوشی کی تو کوئی حد ہی نہیں تھی۔ وہ تو چھوٹی ... چھوٹی چاچی کرتے نہیں تھک رہا تھا۔ بلکہ اس سے تو حمیدہ کی سمجھ میں

ایک بات آئی۔ اسے یقین ہوگیا کہ ساجد ارجمند کو پہلے سے چھوٹی چاچی کہتا رہا ہے۔ دو تین بار تو اس کے سامنے بھی اس نے چھوٹی کہا...... اور رک گیا۔ اس کی تفتیش پر بولا کہ نکی کو اردو میں چھوٹی کہتے ہیں۔

لیکن کیوں......؟ ساجد نے یہ چھپانے کی کوشش کیوں کی؟ اس کا ایک ہی جواب تھا، اور وہ سامنے تھا۔ ارجمند نے اسے منع کیا ہوگا۔ لیکن کئی بار اس کے اور رابعہ کے سامنے ساجد کے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا چھوٹی چاچی...... تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اکیلے میں ارجمند کو چھوٹی چاچی کہتا ہوگا۔ یعنی ارجمند نے اسے اس کی اجازت دے رکھی ہوگی کہ وہ اکیلے میں اسے ایسے پکار سکتا ہے۔ اور اس کا مطلب ہے کہ ارجمند کو یہ اچھا لگتا تھا، اور اس کا مطلب تھا کہ ارجمند بہت پہلے سے عبدالحق کو پسند کرتی ہے۔

حمیدہ کو خود پر غصہ آنے لگا۔ اتنی سمجھدار بنتی ہوں اور سامنے کی بات بھی نہیں سمجھ سکی۔ اسے وہ دن یاد آیا جب ارجمند نے اس لڑکے سے ملنے جانے کی اجازت مانگی تھی، اور وہ ڈر گئی تھی کہ شاید ارجمند اس لڑکے کو پسند کرنے لگی ہے۔

اب سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ بے وقوف تھی۔ ارجمند ایسی لڑکی نہیں تھی کہ اس لڑکے سے ملنے جانے کے لئے اجازت لیتی، جسے وہ پسند کرتی ہو۔ وہ تو اسے سمجھانے کے لئے، منع کرنے کے لئے، اپنا انکار اس پر واضح کرنے کے لئے، تاکہ بات وہیں ختم ہو جائے۔ اگر اسے اس لڑکے میں دلچسپی ہوتی تو ملنے کے بجائے وہ اسے کہہ دیتی کہ وہ رشتہ بھیج دے۔ ارجمند ایسی ہی تھی۔

مگر وہ لڑکا اسے کتنا چاہتا ہوگا کہ ارجمند کے انکار کے باوجود اس نے رشتہ بھیجا۔ اور جب یہ نوبت آئی تو ارجمند نے اس سے مدد چاہی...... صاف کہہ دیا کہ انکار کر دیں، مجھے شادی نہیں کرنی۔ اور اس کے لئے کتنی خوشامد کی تھی اس نے۔

تو یہ عبدالحق کے لئے تھا!

اور لڑکا کتنا اچھا تھا...... بلکہ وہ لوگ ہی بہت اچھے تھے۔ اور عبدالحق کو پانے کا تو ارجمند نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔ پھر بھی بغیر امکان کے اتنا اچھا رشتہ چھوڑ دینا۔ کتنی محبت کرتی ہوگی وہ عبدالحق سے۔

حمیدہ کو ارجمند پر پیار آنے لگا۔

اور پھر جس دن وہ اپنی مرحوم پھپھو اور بچھڑے ہوئے نانا کو یاد کر کے رو رہی تھی، اور وہ ڈر گئی تھی کہ شاید ارجمند نے مروّت میں ہاں کر دی ہے، تو اس نے صاف تو بتا دیا تھا۔

میں پھر بھی نہیں سمجھی۔ شاید بوڑھی ہوگئی ہوں بہت، عقل کام نہیں کرتی۔

اب وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کا خواب محض اس کا خواب نہیں تھا، وہ ارجمند کا بھی تھا، وہ ساجد کا بھی تھا، رابعہ کا بھی تھا...... بلکہ سب کی خوشی دیکھ کر سمجھ میں آتا ہے کہ وہ سب کا خواب تھا...... اجتماعی خواب...... اور اجتماعی خواب تو طاقت ور ہوتے ہی ہیں۔ ان کی تعبیر ضرور ملتی ہے۔

خوشی اور پریشانی میں ایک بات مشترک ہوتی ہے۔ نیند اڑ جاتی ہے۔ پھر وہ تو حمیدہ کے لئے بہت بڑی خوشی تھی۔ کوشش کے باوجود اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ لیکن وہ آنکھیں بند کئے لیٹی رہی۔ کم از کم جسم تو بے آرام نہ ہو۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ نور بانو بھی جاگ رہی ہے۔

شادی سے پہلے تو نور بانو اس کے ساتھ سوتی رہی تھی۔ لیکن شادی کے بعد کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ حمیدہ کو یاد تھا کہ وہ جلدی سوتی تھی، اور گہری سکون نیند لیتی تھی۔ عبدالحق سے شادی کے بعد ایک تبدیلی آئی تھی، یہ کہ وہ بہت دیر تک سونے لگی تھی۔ اس کا سبب یہی رہا ہوگا کہ وہ دیر سے سوتی ہوگی۔ اب بری عادتیں آسانی سے کہاں چھوٹتی ہیں۔

حمیدہ نے یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا کہ یہ نور بانو کا روز کا معمول ہوگا۔ تاہم اس نے یہ ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ وہ خود بھی جاگ رہی ہے۔ اس نے دوسری طرف کروٹ لے لی۔

ذرا دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ وہ یقیناً سو جاتی۔ لیکن بستر ہونچال کی سی کیفیت تھی۔ نور بانو بار بار کروٹ بدل رہی تھی۔ بلکہ اسے کروٹ بدلنا تو نہیں کہا جا سکتا۔ وہ تو ایک بے چینی سی تھی...... بلکہ اس سے بھی بڑھی ہوئی کوئی چیز۔

کیا یہ روز اسی طرح کرتی ہوگی؟ حمیدہ نے سوچا۔ تو عبدالحق کیسے سوتا ہوگا؟

حمیدہ سیدھی ہوگئی۔ تجسس اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ نور بانو کو دیکھے اور اس کی کیفیت کو سمجھے۔

نور بانو مسلسل کروٹیں بدلتی رہی۔ حمیدہ نے پلکوں کی جھری سی بنالی تھی اور اسے دیکھ رہی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ لیکن کچھ دیر میں وہ اس اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوگئی۔

نور بانو نے اس کی طرف کروٹ لی اور اسے دیکھنے لگی۔ حمیدہ نے اپنا ہاتھ ایسے رکھا تھا کہ اس کی آنکھیں اس کی کلائی کی اوٹ میں تھیں۔ وہ کلائی کو ذرا سرسرکا کر نور بانو کو دیکھ سکتی تھی۔

نور بانو ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہی تھی۔ حمیدہ نے پلکوں کی جھری بند کر لی۔ ذرا دیر بعد اس نے پھر پلکوں کی جھری سی بنائی۔ نور بانو نے اس وقت سے کروٹ نہیں لی تھی۔ لیکن اب وہ اسے دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ پل پل اس کے چہرے کے رنگ بدل رہے تھے۔ حمیدہ کو ڈر لگنے لگا۔

خوف کے باوجود حمیدہ اسے دیکھتی رہی۔ اندھیرے میں بھی وہ اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کی کیفیت سمجھ سکتی تھی۔ اور وہ پل پل بدلتی کیفیت تھی۔ ابھی برہمی، ابھی بے بسی...... اور پچھتاوا تو بہت نمایاں تھا۔

دو تین بار تو ایسا لگا کہ نور بانو بستر چھوڑ کر اٹھ جائے گی۔ لیکن اس نے بہت کوشش کر کے خود کو روک لیا۔ پھر وہ دوبارہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔

حمیدہ نے آنکھوں کی جھری پھر بند کر لی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ عورت تھی...... اور نور بانو کے مزاج کو تو وہ خوب پہچانتی تھی۔ ابھی ذرا دیر پہلے ہی تو وہ حیران ہو رہی تھی کہ نور بانو نے کیسے عبدالحق کی ارجمند سے شادی کرا دی۔ وہ تو ایسی تھی کہ عبدالحق کا سایہ بھی کسی کے ساتھ نہ بانٹے۔

وہ اب بھی نہیں سمجھی تھی کہ یہ اَن ہونی کیسے ہوگئی۔ بس اللہ کا حکم ہی تھا۔ ورنہ نور بانو ایسی نہیں تھی۔

کچھ دیر سکوت رہا۔ پھر بستر کی جنبش نے بتایا کہ نور بانو بستر سے اٹھ رہی ہے۔

حمیدہ نے آنکھیں کھولیں اور نور بانو کو دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ پھر وہ کمرے سے نکل گئی۔

اب یہ بات سمجھنا تو حمیدہ کے لئے مشکل نہیں تھا کہ نور بانو کس آگ میں جل رہی ہے۔ وہ یہ بھی سمجھ سکتی تھی کہ نور بانو کہاں جا رہی ہے۔ وہ اس کے پیچھے جانا چاہتی تھی، لیکن جانتی تھی کہ یہ مناسب نہیں ہوگا۔ وہ اسے روک بھی نہیں سکتی تھی۔ بلکہ یہ بات کہ حمیدہ نے اسے دیکھ لیا ہے، نور بانو کو اور بھڑکا دے گی۔

حمیدہ کے دل میں ہول اٹھنے لگے۔ وہ نور بانو کو جانتی تھی۔ جب وہ حسد کا شکار ہوتی تو آنکھوں کی ہی نہیں، عقل کی بھی اندھی ہو جاتی تھی۔ یہ ناممکن نہیں کہ ابھی وہ جا کر عبدالحق کے کمرے کا دروازہ پیٹ ڈالے۔ ہنگامہ مچا کر رکھ دے۔ اتنے مہمان موجود ہیں۔ تماشا بن جائے گا۔

حمیدہ پر لرزہ طاری ہوگیا۔ وہ اللہ سے دعا کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سو وہ گڑگڑا کر اللہ سے دعا کرتی رہی۔ اس کی سماعت رات کے سکوت میں کسی ہنگامے کی منتظر تھی۔

لیکن اسے نور بانو پر ترس بھی آ رہا تھا۔ وہ عورت تھی۔ سمجھ سکتی تھی کہ نور بانو پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اس کا شوہر کسی اور کے ساتھ سہاگ رات گزار رہا تھا۔ ایک عورت کے لئے یہ وقت آسان نہیں ہوتا۔ اور پھر نور بانو!

اللہ نے حمیدہ کی دعا سن لی۔ آتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر نور بانو کمرے میں داخل ہوئی اور آکر بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ لیکن وہ کچھ پرسکون بھی نظر آ رہی تھی۔

مگر وہ بھی لمحوں کی بات تھی۔ اس کے تاثرات پھر پل پل بدلنے لگے۔ ایک بار پھر وہ اٹھی اور دروازے کی طرف چل دی۔

اس بار حمیدہ دہل گئی۔ نور بانو کا دوسری بار جانا اس بات کی دلیل تھا کہ اب اس کا ضبط جواب دے گیا ہے۔ اب تو اس کے جسم کا ہر رواں عافیت کے لئے

دعا کر رہا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ کسی بھی لمحے شور شرابا ہو جائے گا۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس بار نور بانو جلدی واپس آ گئی اور وہ اس بار زیادہ مطمئن تھی۔

مگر اس بار بھی وہ سکون لمحوں کا تھا۔ پھر وہی پل پل بدلتی کیفیت، پھر وہی کروٹیں۔ لیکن حمیدہ کے لئے یہ بات خوش آئند تھی کہ نور بانو بہرحال اس کے کمرے میں تھی۔

جانے کتنی دیر کے بعد نور بانو سوئی۔ پھر حمیدہ کو بھی نیند آ گئی۔ لیکن وہ اپنے معمول کے مطابق فجر کے وقت اٹھ گئی۔ نیند کی کمی سے اسے چکر آ رہے تھے۔ اس نے سوچا، کوئی بات نہیں، بعد میں سو جائے گی۔ نماز قضا کرنا تو ٹھیک نہیں۔

اس نے آنکھیں ملیں اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے دیکھا کہ نور بانو بے سدھ، بے خبر سو رہی ہے اور اس کے چہرے پر سکون ہے۔

وہ اٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ ارجمند کمرے میں آ گئی۔ اس نے اسے سلام کیا۔ حمیدہ نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد حیرت سے کہا۔

''ارے نکی..... !تو اٹھ بھی گئی.....؟''

''مجھے تو اٹھے ہوئے دیر ہوگئی دادی اماں!'' ارجمند نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کو وضو کرانے آئی ہوں۔''

❁ ❁ ❁

اچھو میاں بہت خوش تھے۔ لیکن نیند انہیں کسی طرح نہیں آ رہی تھی۔ وہ بستر پر لیٹے کروٹیں بدلتے رہے۔ پھر بے چین ہو کر اٹھ بیٹھے۔

وہ کبھی بہت زیادہ نہیں سوتے تھے۔ کوٹھے پر تو انہیں کبھی اچھی نیند ہی نہیں آئی تھی۔ ہاں داتا دربار کے صحن میں انہیں اتنی اچھی نیند آتی تھی کہ وہ ہمیشہ تازہ دم اٹھتے تھے۔

تو اب یہ کیا ہو رہا ہے؟ انہوں نے تشویش سے سوچا۔ شاید یہ ہے کہ ان کے معمول میں فرق آیا ہے۔ وہ اپنے معمول کے مطابق ذکر بھی نہیں کر سکے۔ اللہ

...ب جانتا ہے، اللہ معاف کرنے والا ہے۔ ان کو گھٹن کا احساس ہونے لگا۔

وہ تسبیح کرنے لگے۔ لیکن دو گھنٹے بعد بھی نیند ان کی آنکھوں سے اتنی ہی دور تھی۔

اچانک بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔

یہاں سب کچھ، ہر چیز اس ماحول کے برعکس تھی، جس میں سونے کے وہ عادی ہو چکے تھے۔ وہاں وہ بے شمار لوگوں کے درمیان، اللہ کے شامیانے کے نیچے، صحن کے فرش پر سوتے تھے۔ اور اللہ کی شان کہ سردی ہو یا گرمی، وہ فرش ان کے لئے مہربان تھا۔ سخت سردی میں بھی وہ اس ٹھنڈے فرش پر سوتے تھے اور جسم پر ایک چادر کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ تکیہ اپنے ہاتھوں کا ہوتا تھا۔

یہاں نرم آرام دہ بستر تھا اور تنہائی تھی۔ وہ ان دونوں کے ہی عادی نہیں تھے۔ نیند کیسے آتی۔

انہیں لان کا خیال آیا۔ وہ باہر چلے آئے۔

ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر لیٹنا انہیں بہت اچھا لگا۔ لیکن نیند انہیں وہاں بھی نہیں آئی۔ انہوں نے سوچا۔ وہ فرش کے عادی ہیں، اور یہاں بنچ کی صورت میں اس کا متبادل بھی موجود ہے۔ چنانچہ وہ بنچ پر لیٹ گئے۔

لیکن نیند اب بھی ان کی آنکھوں سے دور تھی۔ بلکہ ایک عجیب سی بے چینی سی تھی، جیسے دل انہیں کچھ سمجھا رہا ہو، اور وہ اسے سمجھ نہ پا رہے ہوں۔

کچھ دیر وہ سوچتے اور الجھتے رہے۔ پھر اچانک جیسے روشنی کا ایک جھماکا سا ...ا، اور بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔

یہ تو شکر کی رات ہے، اور میں اسے ضائع کر رہا ہوں۔ انہوں نے خود ...ی۔ پھر ان پر جیسے دریچے سے کھلتے گئے۔ اپنی پوری زندگی انہیں ان دریچوں ...جھانکتی نظر آئی۔ وہ کیا تھے، انہوں نے خود کو کیا بنا لیا۔ کن پستیوں میں گر گئے۔ ...کا دیا ہوا سب کچھ دے کر وہ گناہ میں گناہ خریدتے رہے۔ یہاں تک کہ تہی ...ت ہو کر گناہوں کی دلدل میں اتر گئے۔

پھر اللہ نے صرف اپنی کریمی سے کہ کرم اس کا شیوہ ہے، ورنہ ان کا کوئی

حق نہیں تھا، انہیں سہارا دیا۔ انہیں راستہ دکھایا۔ انہیں نادرہ اور ارجمند ملیں، اور پھر اللہ نے طوائف کے کوٹھے پر انہیں ان نعمتوں سے نوازا، جو لوگوں کو عزت اور عافیت کے گھروں میں بھی نصیب نہیں ہوتیں۔ اس کوٹھے پر انہوں نے نماز پڑھی، قرآن پڑھا، اللہ کے حکم کے مطابق رمضان کے مبارک مہینے گزارے، اور انہیں رزقِ حلال عطا فرمایا۔ یہی نہیں، آگے کے لئے ان کی راہ بھی متعین کر دی۔

یہ سب یاد کرتے ہوئے ان پر تھرتھری چڑھ گئی۔ اتنا کسے ملتا ہے؟ اللہ نے تو ان پر بے حساب فضل فرمایا تھا۔

ارجمند کے روپ میں اللہ نے انہیں واحد تعلق اور رشتہ عطا فرمایا تھا۔ ورنہ ان کا تو دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ پھر اسے عبدالحق کے گھر چھوڑ کر وہ داتا دربار آگئے۔ وہاں کیسے عیش کرائے اللہ نے انہیں۔ ان کی ہر ضرورت عزت کے ساتھ پوری کی۔ انہیں بے فکری اور فرصت عطا فرمائی کہ وہ سب کچھ بھول کر اللہ کے حکم کے مطابق بس اسی کے ہو رہیں۔ پھر اس نعمت سے استفادہ نصیب فرمایا کہ انہیں شکر و استغفار کی توفیق عطا فرمائی۔

اب ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

وہ کیا تھے؟ ان کی اوقات کیا تھی؟ سر سے پاؤں تک غلاظتوں میں لتھڑا ہوا ایک حقیر اور عاجز بندہ، جسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ کبھی معزز اور پاک ہو سکتا ہے۔ اور عالم یہ تھا کہ وہ اللہ سے شرط لگا بیٹھے۔ بے اوقات ہوتے ہوئے انہوں نے اپنی توبہ کی قبولیت کے لئے اس کی ایک نشانی متعین کر لی کہ انہیں اپنی توبہ قبول ہونے کا، اپنی غلاظتوں کے دھلنے کا یقین جب آئے گا کہ وہ بے نیاز انہیں اپنے گھر بلا لے۔

اور ربِ کریم کی عنایت کہ اس نے اپنے گناہ گار بندے کی یہ شرط بھی پوری فرما دی۔ کون ایسا مان رکھتا ہے کسی کا۔ دنیا کا ہر رشتہ آدمی کو اس کی اوقات کے مطابق نوازتا ہے۔ بس وہ ربّ ہے بے حساب دینے والا۔

ارے..... اس نے مجھے اپنے گھر بلایا ہے۔ وہ بڑبڑائے۔ اور کس شان سے بلایا ہے۔ اجازت نامہ بھی اس کا اور فراخی کے ساتھ زادِ راہ بھی اس کی عطا۔

اور اعزاز کتنا بڑا۔ اپنے در کی پاسبانی عطا فرما دی۔ اپنے گھر کا خدمت گار، صفائی کرنے والا بنا دیا۔ کوئی گندا غلیظ آدمی کیسے صفائی کر سکتا ہے اس کے گھر کی۔ تو گویا اس نے پاک کر دیا کہ پاک کرنا بس اسی کی تو صفت ہے۔

اب آنسو ان کی آنکھوں سے دھاروں بہہ رہے تھے۔

اور اپنے گھر بلانے سے پہلے اس نے ایک اور بہت بڑا اعزاز عطا فرما دیا۔ دنیا میں آدمی کا اعتبار رشتوں سے ہوتا ہے، جس سے وہ برسوں پہلے محروم ہو چکے تھے۔ اسی نے انہیں اپنی رحمت سے وہ اعتبار بھی عطا فرما دیا۔ عبدالحق خود انہیں لینے کے لئے آیا کہ اس بچی کی شادی ہو رہی تھی، جس کا دنیا میں کوئی ایک رشتہ دار بھی نہیں بچا تھا۔ اور وہ انہیں نانا کہتی اور سمجھتی تھی۔

اور یہی نہیں، اس نے انہیں وہاں عزت اور وقار کے ساتھ جانے کے لئے ان کی تہی دامنی بھی دور فرمائی۔ انہوں نے بہت کچھ تو نہیں دیا، لیکن اس بچی کو خالی ہاتھ بھی رخصت نہیں کیا۔ ایک باپ جو کچھ کر سکتا ہے، وہ اللہ کی مدد سے ان کے لئے ممکن ہوا۔

اب ان کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

زندگی کیا ہے؟ کسی نے ان سے سرگوشی میں پوچھا۔

اپنے آغاز سے لے کر انجام تک، صرف اور صرف اللہ کا احسان۔ انہوں نے بلا جھجک جواب دیا۔ وہ مجھے پیدا نہ فرماتا تو میں کچھ بھی نہ ہوتا.... محض عدم۔ نہ دنیا کی نعمتوں میں کوئی حصہ ہوتا میرا اور نہ آخرت کی بے بہا نعمتوں میں کسی حصے کا کوئی امکان۔ اور آخرت کی نعمتیں بھی اگر ملیں تو اس کا فضل ہی ہوگا کہ وہ مجھے میرے گناہوں پر بخشے گا تو ہی کچھ ملے گا۔ اعمال کا حساب ہوا تو صرف خسارہ ہی ہوگا مجھے۔ اور یہاں جو برائیوں سے بچایا، دور کیا، راہ دکھائی، ہدایت سے نوازا، نیک اعمال جو بھی نصیب ہوئے، سب اس کا فضل۔

احسان ہی احسان۔ انہوں نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔ فضل ہی فضل۔

دیر تک وہ روتے رہے۔ وہ کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔ ذرا دیر میں طبیعت سنبھلی تو انہوں نے سوچا، اس رات کے اختتام پر ان کے لئے ایک

نیا دن ہے..... اللہ کی رحمت سے ایک بڑا دن، دوپہر میں ولیمہ ہوگا، اور شام کو وہ چلے جائیں گے۔ پھر انہیں روانہ ہونا ہے..... اللہ کے گھر کی طرف۔ اور وہاں رہیں گے۔ اللہ کی چاکری کریں گے اور انشاء اللہ وہیں مریں گے اور اس پاک سرزمین پر ہی دفن ہوں گے۔

ان پر پھر تھرتھری چڑھ گئی۔ وہ کیسا دینے والا ہے۔ مجھ سیاہ کار کو بھی کچھ دے دیا..... میری سوچ، میرے خوابوں اور خیالوں اور تصور کی حدوں سے بھی بہت آگے تک۔ اور میں سونے کی فکر کر رہا ہوں۔

وہ اٹھے اور جاءنماز لانے کے لئے انیکسی کی طرف چل دیئے۔

یہ تو شکر کی رات ہے۔ اور اب تو ہر سانس شکر کی سانس ہونی چاہئے۔ وہ سوچ رہے تھے۔

❁❁❁

عبدالحق بہت گہری، بہت آسودہ نیند میں تھا۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ جیسے زلزلہ آ گیا ہے۔ زمین آسمان، دنیا کی ہر چیز ہل رہی تھی، گھوم رہی تھی۔ وہ جیسے گر رہا تھا۔ گھبراہٹ نے اس گہری نیند میں نقب لگانی شروع کی۔

زلزلہ وقفے وقفے سے آ رہا تھا۔ یہ وقفے شاید اسے اٹھنے کی مہلت دینے کے لئے تھے۔ اسے احساس تھا کہ وہ سو رہا ہے۔

پھر نیند ٹوٹنے لگی۔ اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے جھنجھوڑ رہا ہے۔ لیکن نیند ایسی تھی کہ اس سے آنکھیں نہیں کھولی جا رہی تھیں۔ اس نے دھیرے سے پوچھا۔

''کیا زلزلہ آ رہا ہے.....؟''

ارجمند نے حیرت سے اسے دیکھا۔ یہ کیسا سوال ہے؟ اس نے سوچا۔

''نہیں آغا جی.....!'' اس نے جواب دیا۔

''تو پھر میں ہل کیوں رہا ہوں؟'' وہ اب بھی نیند میں تھا۔

''اس لئے کہ میں آپ کو ہلا رہی ہوں۔''

''کیوں ہلا رہی ہو؟'' عبدالحق کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

''کیونکہ آپ کو جگانا چاہتی ہوں۔''

''کیوں جگانا چاہتی ہو۔ ابھی میری نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔ میں ابھی اٹھنا نہیں چاہتا۔''

''مگر آپ کا جاگنا ضروری ہے۔''

''چھوڑ دو مجھے۔ سو جاؤ! اور مجھے بھی سونے دو۔''

''ایک بار اٹھ جائیں، پھر چاہے سو جائیے گا۔''

''کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہو۔ سونے دو مجھے۔'' عبدالحق نے غصے سے کہا۔

''یہ میرا فرض ہے آغا جی! آپ ایک بار اٹھ جائیں۔''

''کس نے عائد کیا ہے یہ فرض تم پر.....؟'' عبدالحق کا لہجہ بہت خراب تھا۔

''اللہ نے.....!''

اور عبدالحق کو ایسا لگا، جیسے اس کے جسم پر کسی نے کوڑا رسید کیا ہو۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ لیکن نیند ایسی تھی کہ اس کی نظر دھندلا رہی تھی۔ اسے اپنے اوپر جھکی ارجمند نظر آئی۔

''کیا بات ہے ارجمند!'' اس بار اس کا لہجہ نرم تھا۔

''فجر کا وقت ہے آغا جی! اور آپ کو غسل کرنا ہے۔''

عبدالحق پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس کی نیند ہوا ہوگئی۔ اس نے زیر لب کلمہ پڑھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''مجھے تو لگ رہا تھا کہ جیسے زلزلہ آ گیا ہے۔'' اس نے کہا۔

''مجھے افسوس ہے آغا جی! لیکن آپ کی نیند اتنی گہری تھی کہ مجھے جھنجھوڑنا پڑا آپ کو۔'' ارجمند کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

''کیسی نیند ہے، اٹھا ہی نہیں جا رہا ہے۔ آنکھ ہی نہیں کھل رہی ہے کسی طرح۔'' عبدالحق کراہا۔

''اس کا علاج ہی غسل ہے۔'' ارجمند نے کہا۔

"آپ باتھ روم چلے جائیے۔ بالٹی میں کنکنا پانی موجود ہے۔ اس سے نہائیے گا۔"

"لیکن کیوں؟ یہ موسم سرما تو نہیں ہے۔"

"صبح سویرے ایسے ہی پانی سے نہانا چاہئے۔ بس میں نے اتنا گرم پانی ملایا ہے کہ خنکی ختم ہو جائے ٹھنڈے پانی کی۔"

عبدالحق باتھ روم میں چلا گیا۔

نہاتے ہوئے تمام وقت وہ ارجمند کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ کم عمر تھی لیکن کتنی مضبوط۔ اسے یاد تھا کہ نور بانو نے کبھی اسے فجر کے لئے نہیں جگایا۔ بلکہ کبھی تو اسے گمان ہوتا تھا کہ وہ چاہتی ہی نہیں کہ وہ فجر کے لئے اٹھے۔ رات کو وہ کوشش کرتی تھی کہ اسے جگائے رکھے...... زیادہ سے زیادہ۔ اسے یاد تھا کہ نور بانو سے شادی کے بعد اس کی فجر مستقل قضا ہونے لگی تھی۔ وہ تو پھر ملازمت کا آغاز ہوا تو اس کا معمول بحال ہوا۔

عبدالحق نے سر جھٹکا۔ میں خواہ مخواہ بدگمانی کر رہا ہوں۔ اس نے سوچا۔ اپنی کوتاہی اور غفلت کا دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرانا کتنی بری بات ہے۔

مسجد میں نواب صاحب پہلے ہی سے موجود تھے۔ واپسی میں دونوں ساتھ ہی گھر واپس آئے۔

"رات کیسی گزری نواب صاحب!"

"الحمد للہ......! اللہ کے فضل و کرم کے سائے میں...... بہت اچھی۔"

اچھوں میاں نے سادگی سے کہا۔

"آج آپ کی روانگی ہے......؟"

"الحمد للہ......!"

اچھو میاں انیکسی کی طرف جانے لگے تو عبدالحق نے انہیں ٹوک دیا۔

"میرے ساتھ گھر ہی چلئے نا! انیکسی تو بس ارجمند کا گھر تھا۔ جہاں سے اسے وداع ہونا تھا۔ ورنہ تو یہ گھر آپ کا ہی ہے۔"

"جانتا ہوں۔" اچھو میاں مسکرائے۔

"لیکن کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے انیکسی ہی مناسب رہے گی۔"

"بہتر ہے۔ جو آپ کی خوشی!"

اچھو میاں کو اس کے لہجے میں کچھ آزردگی سی محسوس ہوئی۔

"کوئی تکلف نہیں ہے بیٹے! البتہ گھر میں میں تکلف ضرور کروں گا، اور وہ آرام نہیں مل سکے گا، جس کی.. ۔"

عبدالحق شرمندہ ہو گیا۔

"آپ کی بے آرامی میں نہیں چاہتا۔ لیکن آج آپ رخصت ہو جائیں گے۔ ارجمند آپ کی کمی محسوس کرے گی۔ میں چاہتا تھا کہ آپ ناشتہ ہمارے ساتھ کرتے۔"

اچھو میاں خوش دلی سے ہنس دیئے۔

"تو یوں کہو نا بیٹے! نعمت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ ناشتہ تو کرنا ہی ہے۔"

ناشتے کی میز پر گھر کے تمام افراد موجود تھے، سوائے نور بانو کے۔ باقی سب لوگ تو اس کے دیر سے اٹھنے کے عادی تھے۔ لیکن اچھو میاں کو اس کی غیر موجودگی کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ تو پہلے ہی حیران ہو رہے تھے کہ ایک بیوی اپنے شوہر کی دوسری شادی کیسے کرا سکتی ہے۔ یہ تو بڑے ظرف کی بات ہے۔ لیکن ایک حد سے آگے تو ظرف بھی جواب دے جاتا ہے۔ انہوں نے سوچا۔

عبدالحق کو نور بانو کی غیر موجودگی پر کھسیاہٹ ہو رہی تھی۔

"نور بانو کی طبیعت خراب رہتی ہے پچھلے کئی سال سے۔" اس نے اچھو میاں سے کہا۔

"رات کو نیند بڑی دشواری سے آتی ہے۔ پھر نیند پوری کرنا بھی ضروری ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" اچھو میاں نے جواب دیا۔ دل میں وہ سوچ رہے تھے کہ شوہر کے ساتھ سونے والی بیوی کے لئے اس سے دور رہ کر سونا کتنا مشکل

ہوتا ہوگا۔ اور خاص طور پر اس صورت میں کہ اسے معلوم ہو کہ اس کا شوہر اپنی دوسری بیوی کے ساتھ ہے۔ چاہے وہ شادی خود اس نے کرائی ہو۔

انسانی ظرف کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے۔

ان کے دل میں نور بانو کی عزت اور بڑھ گئی۔

اور اس گھر کے سبھی لوگ اچھے تھے۔ ہر اعتبار سے یہ ایک مکمل اور مثالی گھرانا تھا۔ ان کی باہمی محبت کو کسی اظہار کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو خوشبو کی طرح خود ہی اپنی موجودگی کا احساس دلاتی تھی۔ ایک شفیق، مہربان اور نرم خو ماں، دو بیٹے، دو بہوئیں اور ایک پوتا۔ اور وہاں ارجمند ایک نئی نویلی دلہن کی طرح نہیں تھی۔ وہ گھر کا ایک فرد تھی، جس کی موجودگی کے وہ سب عادی تھے۔ سب کے انداز میں اس کے لئے بے پناہ محبت تھی۔ لیکن اچھو میاں کو ساجد کی محبت پسند آئی۔ کیسی محبت سے وہ ارجمند کو دیکھتا تھا، اور کیسے اسے چھوٹی چاچی کہہ کر پکارتا تھا۔ بے شک ارجمند اس کے لئے پہلے سے جانی پہچانی تھی۔ لیکن اس نئے رشتے کی پکار میں کوئی نامانوسیت نہیں تھی۔ جیسے وہ پہلے بھی اسے اس طرح چھوٹی چاچی کہہ کر پکارتا رہا ہو۔

اچھو میاں کو نہیں معلوم تھا کہ یہ حقیقت ہے۔

انہوں نے تو یہ دیکھا کہ اس گھر میں ارجمند کو کیسے چاہا جاتا ہے۔ انشاء اللہ یہ ہمیشہ یہاں خوش رہے گی۔

اور ان کا دل سکون سے بھر گیا۔

❁ ❁ ❁

اچھو میاں انیکسی چلے گئے۔ حمیدہ نے عبدالحق اور ارجمند سے کہا۔

''جاؤ! تم دونوں بھی گھنٹے دو گھنٹے آرام کر لو۔ صبح سویرے ہی اٹھ گئے تھے۔''

''لیکن دادی اماں! گاؤں کے مہمان اور تایا......''

حمیدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''نسیمہ ہے نا! اور میں بھی ہوں۔ ہم انہیں ناشتہ کرا دیں گے۔ ویسے بھی نئی نویلی دلہنیں اپنی پہلی صبح اٹھ کر ناشتہ نہیں بناتیں۔ وہ تو تجھے دیکھ کر حیران

ہوتے۔'' اس کے لہجے میں محبت تھی۔

''جا پتر عبدالحق! اسے لے جا۔'' وہ عبدالحق کی طرف مڑی۔

عبدالحق خود بھی تنہائی چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں بہت سی باتیں وضاحت طلب تھیں۔

''ٹھیک ہے اماں!'' اس نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے نرمی سے ارجمند کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھایا۔

''چلو ارجمند......!''

حمیدہ ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ کیسی چاند سورج کی جوڑی ہے۔ اللہ تیرا شکر ہے۔ وہ خوشی سے گنگنائی۔

❁ ❁ ❁

بند کمرے کی تنہائی میں عبدالحق نے ارجمند سے کہا۔

''تمہیں میرے آرام اور بے آرامی کی کوئی پرواہ نہیں۔'' اس کے لہجے میں بے رخی تھی۔

ارجمند کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

''وہ آغا جی، میں تو مہمانوں کے خیال سے......''

''میں اس وقت کی بات نہیں کر رہا ہوں۔'' عبدالحق نے کہا۔

ارجمند نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''تو پھر......؟''

''جس طرح صبح تم نے مجھے جگایا، میں اس کی بات کر رہا ہوں۔''

''آپ اس پر خفا ہیں آغا جی......!''

عبدالحق نے دانستہ کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایک خاص مقصد کے تحت ایک خاص تاثر چھوڑتے ہوئے بات کرنا چاہتا تھا...... ناراضی کا تاثر!

''وہ تو میری ذمہ داری تھی آغا جی!'' ارجمند نے مدھم تر آواز میں کہا۔

''تو مجھے بے آرام کرنا، میری نیند خراب کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔'' عبدالحق نے ترش لہجے میں کہا۔

''آپ کی بہتری کی خاطر آغا جی!'' اب ارجمند کے لئے بولنا مشکل ہو رہا تھا۔

''کیسی بہتری؟ کس بہتری کی بات کر رہی ہو تم ......؟''

''فرض نماز کی بہتری آغا جی! فرض نماز چھوٹ جاتی تو آپ کا خسارہ تھا۔''

''اس کی جواب دہی تمہاری تو نہیں، میری ہے۔''

''جی ......! بے شک، لیکن ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ دوسرے مسلمان کو نماز کے وقت پر یاد دلائے۔''

''بس یاد دلانا ہی تو ذمہ داری ہے۔ اصرار تو نہیں۔ اصرار سے اکراہ بھی پیدا ہو سکتا ہے، جو بڑا خسارہ ہے۔''

ارجمند ایک دم بچوں کی طرح رونے لگی۔

''میں نے تو آپ کو محبت کی وجہ سے ایسا کیا آغا جی ......!'' یہ کہتے ہوئے اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ رونا بھول کر ایک لمحے کو وہ لجا کر رہ گئی۔ پھر اسے خیال آیا کہ اب اللہ نے اظہارِ محبت کا حق اسے دے دیا ہے۔ اس بار وہ بولی تو اس کے لہجے میں خود اعتمادی تھی۔

''اسی لئے خاموشی سے آپ کا خسارہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔''

''اتنی محبت کا دعویٰ ہے اور پھر بھی تم نے میری نیند خراب کی......؟''

''میں نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا آغا جی! کہ محبت بہت مشکل ہوتی ہے۔'' ارجمند نے گہری سانس لے کر کہا۔

''صرف محبوب کو خوش دیکھنا اور اسے خوش رکھنا، اس کی ہر بات ماننا، اسے سب کچھ دینا ...... یہ تو بڑی آسان بات ہے۔ کوئی بھی کر سکتا ہے۔ محبت تو محبوب کی بہتری دور...... بہت دور تک دیکھنا اور اس کا خیال رکھنا ہے۔ بعد کے بڑے آرام کے لئے اسے لمحہ موجود میں تکلیف دینا اصل محبت ہے، جو آسان نہیں۔ جب میں آپ کو جگانے کی کوشش کر رہی تھی، اور آپ سوتے ہوئے اتنے اچھے لگ رہے تھے کہ کئی بار میرا جی چاہا کہ آپ کو سونے دوں۔ میرا دل بھی دکھ رہا تھا آپ کو

جگاتے ہوئے۔ لیکن میں نے وہ تکلیف گوارہ کر لی۔ آپ کی فجر کی نماز کا معاملہ تھا۔''

عبدالحق اچانک مسکرا دیا۔ ارجمند نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''میں نے مان لیا کہ تم واقعی مجھ سے بہت محبت کرتی ہو۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اب میں خود تم سے کہہ رہا ہوں کہ نماز کے لئے تم جس طرح چاہو، مجھے جگا سکتی ہو۔''

''شکریہ آغا جی! جزاک اللہ......!'' دیر کے بعد ارجمند کے چہرے پر پریشانی کی جگہ خوشی نظر آئی۔

''ایک بات بتاؤ! تمہارے لئے میری محبت دنیا کی ہر چیز سے اہم ہے؟''

''اللہ کے حکم اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے بعد۔''

''مجھے تمہارا یہ جواب بھی اچھا لگا۔ تم بہت اچھی ہو ارجمند ......! درحقیقت میں تمہارا اہل نہیں تھا۔''

''جی نہیں......! اللہ نے مجھے آپ کے لئے... صرف آپ کے لئے اتنا اچھا بنایا ہے۔ مگر مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ میں واقعی اتنی اچھی ہوں۔''

عبدالحق کسی گہری سوچ میں تھا۔ بالآخر اس نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم بچوں کی تربیت بہت اچھی کرو گی۔''

ارجمند شرم سے گلنار ہو گئی۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ!''

''تم کم عمر ضرور ہو ارجمند! لیکن نا سمجھ نہیں۔'' عبدالحق نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''تم زندگی کے بارے میں سوچتی بھی ہو، اور بہت کچھ جانتی بھی ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ اب میرا اور تمہارا تعلق اور رشتہ کس نوعیت کا ہے۔ یہ ازدواجی زندگی کا بہت اہم معاملہ ہے۔''

ارجمند نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اب وہ اپنی عمر سے بڑی لگ رہی

تھی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں آغا جی.....!'' اس نے بڑی متانت سے کہا۔

''یہ تو مجھے یقین تھا کہ آپ مجھے ضرور ملیں گے۔ لیکن میں اس پر کبھی سوچتی نہیں تھی۔ لیکن میں جانتی تھی کہ آپ کے لئے اولاد کتنی اہم ہے۔ میں آپ کے اور آپی کے لئے اس سلسلے میں بہت دعا کرتی تھی۔ اور مجھے یقین تھا کہ ایسا ہوگا۔ اور میں سوچتی تھی کہ جب ایسا ہوگا تو میں آپ کے بچے کو بہت وقت دوں گی۔ اسے بہت اچھی اچھی باتیں سکھاؤں گی۔ سچ یہ ہے کہ میں اس کی تربیت کے بارے میں سوچتی تھی۔''

''ایسا ہوتا تو تم اسے کیا سکھاتیں؟'' عبدالحق نے تجسس سے پوچھا۔

ارجمند نے ایک لمحہ سوچا، جیسے کچھ یاد کر رہی ہو، پھر وہ حیران نظر آنے لگی۔

''کمال ہے! میں ہمیشہ سوچتی تھی کہ میں اسے صرف محبت کرنا سکھاؤں گی۔ صرف محبت ہی تو شخصیت بناتی ہے۔''

عبدالحق کو بھی حیرت ہوئی۔

''یہ خیال تمہیں کیسے آیا.....؟''

''آپ کو دیکھ کر!'' ارجمند نے کہا اور پھر شرما گئی۔

''مجھے دیکھ کر.....؟'' عبدالحق کی حیرت اور بڑھ گئی۔

''جی ہاں! میں چھوٹی سی تھی، جب آپ کو پہلی بار دیکھا اور دیکھتے ہی مجھے احساس ہوا کہ آپ سراپا محبت ہیں۔ آپ کے وجود میں صرف اور صرف محبت ہے۔ بعد میں جب آپ کو دیکھا تو پوری طرح سمجھ گئی کہ محبت آپ کی شخصیت کا جزوِ اعظم ہے، اساس ہے آپ کی شخصیت کی۔ اور آپ کی شخصیت بہت خوب صورت ہے۔ میں سوچتی تھی، آپ کے بچے کو آپ جیسا بناؤں گی۔''

عبدالحق ہمیشہ کی طرح اپنی تعریف سن کر شرمندہ ہو گیا۔ لیکن وہ متجسس بھی تھا۔

''صرف محبت..... یہ تو بچکانہ بات ہے۔''

''نہیں آغا جی.....! میں یہ کہنے کی جرأت تو نہیں کر سکتی کہ آپ محبت کو نہیں جانتے۔ شاید یوں ہے کہ آپ سراپا محبت ہیں، لیکن محبت پر غور نہیں کرتے۔''

''چلو! تو تم مجھے محبت کے بارے میں سمجھاؤ۔'' عبدالحق نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

''آپ کو یہ چھوٹا منہ بڑی بات لگی ہے نا آغا جی!'' ارجمند نے افسردگی سے کہا۔

عبدالحق کو زیادتی کا احساس ہونے لگا۔

''ارے نہیں.....! یہ بات نہیں.....''

ارجمند نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

''اور یہ سچ بھی ہے۔ دیکھیں نا، آپ کو اللہ نے محبت سے بنایا ہے۔ آپ سراپا محبت ہیں تو آپ کو محبت کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں۔ مگر مجھے سوچنا پڑتا ہے۔ سمجھتی میں آپ کو دیکھ کر ہوں۔ آپ محبت کو چھوٹی چیز سمجھتے ہیں۔ لیکن جتنے رنگ محبت میں ہیں، دنیا کے کسی جذبے میں نہیں۔ اور سارے کے سارے اوصافِ حسنہ کے، اور خوب صورت ترین رنگ ہیں۔ سوچیں تو ہر اچھا اور علوی جذبہ محبت کی شاخ پر پھوٹتا ہے۔ نرمی، تحمل، ایثار، سخاوت، اچھا گمان، درگزر، سچائی، احسان شناسی، عزت اور احترام، ہمدردی، لفظوں کی تہذیب، دعا اور نہ جانے کیا کیا۔ یہ سب محبت سے پھوٹنے والے رنگ ہیں۔ محبت جیسے دھنک ہے..... اچھے اوصاف کے تمام رنگوں کا منبع.....''

عبدالحق بہت غور سے سن رہا تھا۔

''یہ لفظوں کی تہذیب کا کیا مطلب ہے؟''

''اپنی مشکل ترین بات کو سخت، مکروہ اور جارح الفاظ سے پاک کر کے، اچھے لفظوں اور دل نشیں پیرائے میں بیان کرنا۔''

عبدالحق نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ کیا یہ خواب ہے؟ یہ اتنی کم عمر لڑکی..... اور اتنی بڑی باتیں۔

''جیسے آپ کرتے ہیں۔'' ارجمند نے اپنی بات مکمل کی۔

عبدالحق پھر شرمندہ ہوگیا۔

''میں کہاں، ابھی تمہارا مضحکہ اڑا رہا تھا۔ اور اس سے تمہارا دل بھی دکھایا۔''

''نہیں آغا جی! آپ نے میرا مضحکہ نہیں اڑایا۔ آپ عملی آدمی ہیں نا! اللہ نے آپ کو عمل سے نوازا ہے۔ آپ پر اللہ کا فضل ہے کہ آپ کو کبھی سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ آپ کا ردِعمل مضحکہ اڑانا نہیں تھا۔ وہ حیرت تھی اور تجسس تھا۔''

''میں سمجھ گیا۔ یہ اچھا گمان ہے، جسے حسن ظن کہتے ہیں۔'' عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بہرحال محبت کی بڑائی میری سمجھ میں آگئی۔ لیکن آدمی نفرت بھی تو کرتا ہے۔''

''دنیا میں ہر جذبے کی ایک ضد بھی ہوتی ہے آغا جی! جیسے محبت کی ضد نفرت، احسان شناسی کی ضد احسان فراموشی۔ لیکن آدمی محبت کو توانا کر لے تو ان سے محفوظ رہتا ہے۔ میں نے یہ سبق سیرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر شخص سے محبت کرتے تھے، خواہ وہ زمین کے کسی دور دراز کے خطے میں رہتا ہو، خواہ وہ ان پر ایمان نہ لایا ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب کے لئے دعا کرتے تھے، ان کے لئے بھی جو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، جو قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا سے، اللہ کی آپ کے توسط سے عطا کی ہوئی روشنی پاتے رہیں گے۔''

''تو تم میرے بچے کو صرف محبت کرنا سکھاؤ گی۔ مگر کس سے......؟''

''سب سے بڑھ کر اللہ سے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، پھر قرآن حکیم سے اور اس کے بعد آپ سے۔''

''اور باقی دنیا......؟''

''جب وہ محبت کرنا سیکھ لے گا تو پھر سب سے محبت کرے گا۔''

عبدالحق مسحور ہوگیا۔ یہ تو اس کا خواب تھا۔

''مجھے یقین ہوگیا کہ تم میرے بچے کی بہت اچھی تربیت کرو گی۔'' اس نے کہا۔

''تم اسے محبت کرنا سکھانا، مگر اپنے بچے کو نفرت کرنا بھی سکھانا۔''

ارجمند اتنی حیران ہوئی کہ شرما بھی نہیں سکی۔

''نفرت......! وہ کیوں آغا جی......!''

''اس لئے کہ تمام جذبے انسان کے لئے فطری ہیں۔ تم نہیں سکھاؤ گی، تب بھی وہ کرے گا تو۔ اور خود کرے گا تو بے سمت ہوگا۔''

''مگر نفرت تو بری چیز ہے آغا جی......!''

''اب میں تمہیں وہ بتاتا ہوں، جو سمجھتا ہوں۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''محبت کا آغاز پسندیدگی سے ہوتا ہے اور نفرت کا ناپسندیدگی سے۔ کچھ ہمیں پسند ہوتا ہے اور کچھ ناپسند۔ پسندیدگی بڑھتی ہے تو محبت بنتی ہے اور ناپسندیدگی بڑھتی ہے تو نفرت۔''

''واقعی......! یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''کوئی فطری جذبہ، علوی ہو یا سفلی، ہر حال میں اچھا یا برا نہیں ہوتا۔ اہمیت اس کی سمت کی ہوتی ہے۔''

''وضاحت کیجئے۔ میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔'' ارجمند نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

''سمت سے کیا مراد ہے آپ کی۔''

''نماز پڑھنا نیک عمل ہے نا!''

ارجمند نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اگر تم قبلے کی طرف پیٹھ کر کے نماز پڑھو تو وہ نیکی ہوگی۔''

ارجمند جھرجھری لے کر رہ گئی۔

''استغفراللہ!'' اس نے گھٹی گھٹی سرگوشی میں کہا۔

''ڈر گئیں نا! یہ ہے سمت، آدمی اللہ کی طرف رخ، رکھے تو مثبت جذبہ

ارفع ہو جائے گا۔ نہیں تو وہ خراب بھی ہو سکتا ہے۔ گناہ بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ نے کچھ جانوروں کا گوشت ہمارے لئے حلال کر دیا۔ لیکن ذبیحے کے بغیر وہ بھی حرام ہے۔ اور ذبیحہ کیا ہے؟ اس پر اللہ کا نام لینا۔ کچھ سمجھیں؟"

"جی ..... کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا ہے۔" ارجمند کے لہجے میں احترام تھا۔ اور وہ عبدالحق کو محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"اب محبت ہی کو لو۔ تم نے ابھی کچھ دیر پہلے اس کی عظمت بیان کی۔ بالکل درست ہے۔ کسی نے اللہ کے لئے، اس کی خاطر کسی سے محبت کی تو یہ عبادت ہے۔ اور اپنے نفس کے لئے کی، لیکن اللہ کے حکم کے مطابق کی تو وہ اچھی ہے۔ لیکن اپنے نفس کے لئے کی اور اللہ کے حکم کے خلاف کی تو وہ برائی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ آدمی اپنے ہر عمل میں، ہر لمحہ اللہ کو شریک رکھے تو سب ٹھیک ہے۔"

"یہ ممکن ہے کہ سفلی جذبہ بھی اچھا بن جائے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ بس ہر چیز میں اللہ کی شمولیت ہو، اس کی محبت اور اس کی رضا ہو۔"

"اس کی کوئی مثال .....؟"

"احسان شناسی بہت اچھی بات ہے۔ اللہ کا حکم بھی ہے۔ اب کسی نے مجھ پر احسان کیا۔ بعد میں کسی موقع پر اس نے اللہ کو، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یا اس کے کلام کو برا کہا تو میں اسے اس پر منع کروں گا، کرتا رہوں گا۔ وہ نہ مانے گا تو اس کا احسان بھول کر اپنی بساط اور حیثیت کے مطابق اس سے لڑوں گا۔ یہ احسان فراموشی ہوگی، لیکن اللہ کے ہاں نیکی ہوگی۔ اس لئے کہ درحقیقت اس کا احسان اللہ کی طرف سے تھا۔ دشمنی اچھی چیز نہیں۔ لیکن میں اللہ کی خاطر کسی سے دشمنی کروں تو نیکی ہے۔"

"میں سمجھ گئی!" ارجمند نے خوش ہو کر کہا۔

"نفرت شیطان سے اور اس کے چیلوں سے اور اس کے اعمال سے، اللہ کے لئے، اللہ کی خاطر۔"

"بالکل درست.....!"

"الحمدللہ ..... ! اللہ نے آپ کو کتنی اچھا۔ کتنا سمجھ دار بنایا ہے۔"

"یہ سب اللہ کا فضل ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"تو نفرت بھی بری چیز نہیں۔" ارجمند نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"لیکن ارجمند! نفرت کا ہدف انسان کو نہیں ہونا چاہئے۔"

"کیا مطلب ..... !"

"نفرت صرف شیطان سے اور اس کے اعمال سے۔"

"تو جو انسان شیطان کی پیروی کرے ....."

"نفرت برے آدمی سے نہیں کرنی، برائی سے کرنی ہے۔ یہی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں سکھایا ہے۔"

"تو پھر شیطان سے نفرت کیوں آغا جی ..... !"

"اس لئے کہ اس کے بارے میں اللہ فیصلہ کر چکا، اعلان کر چکا۔ باقی سب کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔ ہم نہیں جانتے کہ کون بخشا جائے گا؟ اور کون نہیں بخشا جائے گا؟"

"کیوں آغا جی ..... !"

"اللہ جب چاہے، جسے چاہے، ہدایت دے دے۔ جب چاہے، کسی کی ہدایت دور کر دے۔ اور اسے بھلائی کی توفیق دے دے۔ ہم اس کے بارے میں فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ ہمیں تو ان کے لئے خیر کی دعا کرنی چاہئے۔ یہی سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔"

"میں سمجھ گئی۔" ارجمند نے خوش ہو کر کہا۔ اب وہ عبدالحق کو تفاخرانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

عبدالحق نے کھسیا کر نظریں چرائیں۔

چند لمحے دونوں خاموش رہے۔ پھر عبدالحق نے کہا۔

"تمہیں نیند تو نہیں آ رہی ہے ارجمند!"

"جی نہیں آغا جی .....!"

"چاہو تو کچھ دیر سو سکتی ہو۔"

''میری نیند تو پوری ہو چکی۔''

''تو پھر ایک کام کرو۔ تم جا کر اپنی آپی کو جگا دو۔ ورنہ وہ سوتی ہی رہیں گی۔ انہیں یاد دلاؤ آج گھر میں تقریب ہے۔''

''جی بہت بہتر......!'' ارجمند اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن وہ ہچکچا رہی تھی۔

عبدالحق نے اس کی ہچکچاہٹ محسوس کر لی۔

''کیا بات ہے؟ ڈر لگ رہا ہے ان سے؟''

''جی نہیں......!''

''تو پھر کیا بات ہے......؟''

''آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔'' اب اس کے لہجے میں بھی جھجک تھی۔

''کہو! کیا بات ہے......؟''

''میری ایک بات مانیں گے......؟''

''اب اس کا انحصار تو بات پر ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔ پھر جلدی سے اضافہ کیا۔

''لیکن تمہیں اس طرح جھجکنے کی ضرورت نہیں۔ اب تمہارا مجھ پر حق ہے۔ تم مجھ سے کچھ بھی کہہ سکتی ہو۔ کوئی بات بھی کر سکتی ہو۔''

ارجمند نے ایک پل کو نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ مگر فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔ منہ سے اب بھی کچھ نہیں کہا۔

''کہو نا......! کیا بات ہے......؟''

''آپ آپی سے یہ بات کبھی نہ کہیئے گا۔''

''کون سی بات......؟''

''یہ کہ...... یہ کہ میں آپ سے......'' اس سے بات نہیں کی جا رہی تھی۔

''ارے...... کہو بھی......!'' عبدالحق جھنجلا گیا۔

''یہ کہ میں آپ سے بہت پہلے سے محبت کرتی ہوں۔ بلکہ آپ انہیں یہ بھی نہیں بتائیے گا کہ اب......''

عبدالحق کو اس پر بڑی شدت سے پیار آیا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ تو میں بھی بتا ہی نہیں سکتا۔ ایک تو اس لئے ا۔ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ اس میں کسی اور کو شریک نہیں کیا جا سکتا۔ شوہر اور بیوی ے درمیان جو معاملات ہوتے ہیں، وہ بہت ذاتی ہوتے ہیں۔ دوسرے اس لئے ہی کہ یہ بہت بڑا فتنہ ہوگا۔ میں نوربانو کو جانتا ہوں۔ میرا تو کچھ نہیں جائے گا، لیکن وہ تمہاری زندگی اجیرن کر دے گی۔ تم بےفکر رہو۔''

لیکن ارجمند سہم گئی تھی۔

''تو میں آپی پر یہ ظاہر کروں کہ مجھے آپ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے؟''

''یہ تو غیر فطری بات ہوگی۔ اب اتنا ڈرنے کی ضرورت بھی نہیں۔'' بدالحق نے اسے تسلی دی۔

''کبھی وہ کوئی ایسی ویسی بات کرے تو اسے یاد دلا دینا کہ اس کی خوشامد ے نتیجے میں، اور صرف اس کی خاطر تم نے یہ شادی کی تھی۔''

''یہ...... یہ میں کیسے کہہ سکتی ہوں ان سے......؟''

''کیوں نہیں کہہ سکتیں......؟''

''اس لئے کہ یہ جھوٹ ہوگا۔''

''تو پھر سچ بتا دینا۔ کہہ دینا کے اس گھر میں آنے سے پہلے ہی تم مجھ سے بت کرتی تھیں۔'' عبدالحق نے جھنجلا کر کہا۔

ارجمند کا چہرہ فق ہوگیا۔

''سچ ہے، تم ابھی بچی ہی ہو۔'' عبدالحق نے لہجہ نرم کر لیا۔

''نادان لڑکی! اتنا بھی نہیں سمجھتیں کہ جو سچ بولنے میں پٹنے کا ڈر ہو، اس کا اظہار اچھا نہیں ہوتا۔ فتنہ تو قتل سے بھی بڑا ہے۔''

''جی......! میں سمجھ گئی۔'' اس بار ارجمند کے لہجے میں شکرگزاری تھی۔

''بس! اب تم جاؤ اور نوربانو کو جگا دو۔''

ارجمند چلی گئی۔

عبدالحق بستر پر دراز ہوگیا۔ وہ ارجمند کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شفیق ساحب کی کہی ہوئی ہر بات سچ ثابت ہوئی تھی۔ ارجمند نوربانو کا بالکل الٹ تھی۔ وہ

سیدھی سادی لڑکی تھی۔ چالاکی اور مکاری اس میں نام کو بھی نہیں تھی۔ وہ اندر سے سچی تھی۔ نوربانو کی طرح ہر حال میں اپنا مقصد حاصل کرنا اسے نہیں آتا تھا۔ وہ بس اللہ پر بھروسہ کرتی تھی۔

پہلی بار عبدالحق کو احساس ہو رہا تھا کہ محبت کیا چیز ہے۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ ارجمند کی محبت دیکھنے سے پہلے وہ محبت سے واقف ہی نہیں تھا۔ محبت اس کے نزدیک محض ایک خیال تھا، ایک تصور، لیکن ارجمند نے محبت کا عملی رخ اس پر واضح کر دیا تھا۔ اب وہ کہہ سکتا تھا کہ اس نے محبت دیکھی ہے۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ خود اس نے بھی محبت کبھی نہیں کی۔

اسے شفیق صاحب کی ایک اور پیش گوئی یاد آئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ دوسری بیوی سے اس کے دو بیٹے ہوں گے۔

صحیح معنوں میں پہلی بار اس شادی کی معنویت اور اہمیت اس پر روشن ہوئی۔ ورنہ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ اسے کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی تو اسے یہ خواب ہی لگتا تھا۔

مگر اس وقت اولاد کے امکان کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے وجود میں روشنی سی ہوگئی۔ اسے ایسی خوشی کا احساس ہوا جو اس کے لئے بہت انوکھی اور نئی تھی۔ اگرچہ اب بھی وہ اسے دور از کار لگ رہی تھی۔ اس کے باوجود اس خوشی کا اپنا ایک منفرد رنگ تھا۔

اس نے رات شکر کے دو نفل پڑھے تھے۔ مگر اب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ ناقص رہے تھے۔ کیونکہ اس وقت تو اسے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اسے کتنی اور کیسی کیسی نعمتیں ملی ہیں، اور وہ بھی کوشش کئے بغیر ...... بلکہ مانگے بغیر۔

اس کے دو بیٹے ہوں گے، یہ خیال ہی اس کے لئے بے حد خوش کن تھا۔ اس کی، اس کے باپ کی نسل آگے بڑھے گی۔ یہ اللہ کے فضل و کرم سے ایمان کے ساتھ ان کی تیسری نسل ہوگی۔ اور اسے یقین ہوگیا تھا کہ ارجمند اس کے بچوں کی اچھی طرح تربیت کرے گی، انہیں بہت اچھا مسلمان بنائے گی۔ شفیق صاحب نے سچ کہا تھا، ارجمند دینے والی ہے۔ وہ محبت کرتی ہے، صلہ نہیں چاہتی۔ وہ تو اللہ کا

بہت بڑا انعام ہے۔

عبدالحق نے سوچا کہ اب وہ پورے شعور اور احساس کے ساتھ شکر کے نفل ادا کرے گا۔

❁ ❁ ❁

"کون ہے بھئی! کیا مصیبت ہے؟" نوربانو نے چڑچڑے پن سے کہا۔ وہ بہت دیر سے سوئی تھی، اور اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ ایسے میں وہ نیند پوری کر کے ہی اٹھتی تھی، ورنہ اس پر چڑچڑاپن طاری رہتا تھا۔

"میں ہوں اچھی آپی...... آپ کی ارجمند......!"

وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔

"تم اور اتنے سویرے......؟"

"سویرا کہاں کا آپی! دس بجنے والے ہیں۔"

"تو نیند کہاں پوری ہوئی ہوگی تمہاری۔"

"میں تو اپنے وقت پر ہی اٹھ گئی تھی آپی!"

"یعنی فجر سے بھی پہلے؟"

"جی آپی......!"

نوربانو کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔

"اس کا مطلب ہے، کچھ بھی نہیں ہوا۔" اس نے وحشت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا نہیں ہوا آپی......!" اس کی بات ارجمند کی سمجھ میں ہی نہیں آئی۔

نوربانو جھنجلا گئی۔ ایک تو نیند پوری نہیں ہوئی تھی، اور اسے رات کے معاملات یاد آ گئے۔

"ارے وہی...... جس کے لئے میں نے عبدالحق صاحب سے شادی کرائی ہے تمہاری۔"

ارجمند کا چہرہ لال بھبھوکا ہوگیا۔ اس نے دونوں ہاتھ سے چہرہ چھپا لیا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپی؟"

اچانک نور بانو کو کرنٹ سا لگا۔ اسے یاد آیا کہ وہ حمیدہ کے کمرے میں سوئی تھی۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ حمیدہ نظر نہیں آئی تو اس نے سکون کی سانس لی۔

''ارجی! مجھے بتاؤ کہ رات کیا کچھ ہوا....؟ سب ٹھیک ہے نا....؟''

''ہاں آپی! سب ٹھیک ہے۔''

''عبدالحق صاحب تمہارے پاس آئے تھے نا....؟''

''جی آپی....! وہ وہیں سوئے تھے۔''

نور باد دانت پیسنے لگی۔

''تم میری بات سمجھ کیوں نہیں رہی ہو؟ تمہیں یاد ہے، میں نے تم سے کچھ مانگا تھا؟''

ارجمند کا چہرہ پھر تمتما اٹھا۔

''مجھے یاد ہے آپی! لیکن وہ تو اللہ کی مرضی پر ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے....''

''وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تم یہ بتاؤ کہ رات کیا کیا ہوا؟''

ارجمند نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''آپی! ایسی باتیں نہیں پوچھتے۔ یہ بے حیائی ہوتی ہے۔ اور اللہ کو بے حیائی بہت ناپسند ہے۔''

''بے حیائی کی اس میں کیا بات ہے....؟'' نور بانو تنک کر بولی۔

''اللہ کے حکم کے مطابق نکاح ہوا ہے تمہارا۔ جو کچھ بھی ہو، وہ جائز اور حلال ہوگا۔''

ارجمند کو پہلی بار صحیح معنوں میں نور بانو کے دل کی سختی کا اندازہ ہوا۔ اس کے لفظوں میں درشتی بھی تھی اور پھوہڑ پن بھی، ایک ایسی بے پرواہی جو جہالت کی نشان دہی کر رہی تھی۔ اسے اچھا نہیں لگا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اسے دوسروں کے سامنے بیان کرنا صریحاً بے حیائی ہے آپی!'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''ایسی باتیں نہ کرتے ہیں نہ پوچھتے ہیں۔''

''اتنے برسوں میں تم تو ملانی بن گئی ہو میری ارجی!'' نور بانو نے بڑے ... سے کہا۔

''ذرا اس کی وجہ بھی بتا دو۔''

''ایسی باتوں سے دل میں برے خیال، ذہن میں بری سوچیں پیدا ہوتی ہیں۔ تصور بے لگام ہوتا ہے۔ دل، دماغ، اور نظر سب کچھ خراب ہو جاتا ہے۔ ...نیات آدمی پر چڑھائی کر دیتی ہیں، جن کے سامنے وہ ٹھہر نہیں سکتا۔ اللہ اسے بچا لے تو اور بات ہے۔ آدمی میں حیا نہیں رہتی، اور حیا نہ ہو تو آدمی مومن کبھی نہیں بن پاتا۔''

نور بانو اندر ہی اندر جھنجلا رہی تھی۔ وہ کچھ جاننا چاہتی تھی۔ اس کی عجیب ...یت تھی۔ یہ صورتِ حال اس کے لئے دو دھاری تلوار تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ ...جو کچھ اس نے چاہا تھا، وہ ہوا یا نہیں۔ جواب نفی میں ملتا تو اسے افسوس ہوتا، کیونکہ اس میں اس کی اسکیم کی ناکامی تھی۔ اور جواب اثبات میں ملتا تو اسے خوشی ملتی، امید ...ندھتی، لیکن اندر ایک کبھی نہ بجھنے والی آگ دہک اٹھتی۔ وہ سوچ رہی تھی، یہ کیسا ...کیا ہے میں نے؟ جس میں ہر طرف خسارہ ہی خسارہ ہے۔

اس پر یہ ملانی لڑکی، جو کچھ بتا کر ہی نہیں دیتی۔

اس نے سوچا، جھنجلاہٹ کا کچھ فائدہ نہیں۔ نرمی سے بات کر کے ہی کچھ ...حاصل ہوگا۔ ویسے جس طرح سے ارجمند نے بے حیائی کی بات کی تھی، اس سے تو ...ثابت ہو رہا تھا کہ بات بن گئی ہے۔

''میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ عبدالحق صاحب نے ردّ تو نہیں کر ...دیا؟'' اس نے پیرایہ بدل کر پوچھا۔

''نہیں آپی....! لیکن وہ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ورنہ وہ شاید ...آپ کے قریب بھی نہ آتے۔'' یہ کہتے ہوئے ارجمند نے نظریں جھکا لیں۔ وہ جانتی ...تھی کہ وہ غلط بیانی کر رہی ہے، لیکن عبدالحق کا کہنا تھا کہ فتنہ نہیں کھڑا ہونا چاہئے۔

نور بانو خوش ہوگئی۔ دونوں اطلاعات مثبت تھیں۔

"میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے کتنا چاہتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"کیا کیا جتن کیئے ہیں میں نے ان سے اپنی یہ بات منوانے کے لئے۔ خیر، یہ بتاؤ تمہیں وہ کیسے لگے.....؟"

"میرے نزدیک، میرے لئے تو وہ پہلے دن والے ہی آغا جی ہیں آپی..... اور ہمیشہ ویسے ہی رہیں گے۔" ارجمند نے اس بار پوری سچائی سے کہا۔

"وہ ایک بہت اچھے انسان ہیں۔"

"ارے..... میں تم سے ان کی دوسری حیثیت کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔" نوربانو نے شوخ لہجے میں کہا۔

"وہ تو میں نے سوچا ہی نہیں، اور سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ یہ شادی تو صرف آپ کی وجہ سے ہوئی ہے آپی!" ارجمند نے اس بار بھی پورا سچ بولا۔

"ورنہ آغا کو تو مجھ میں کوئی دلچسپی تھی ہی نہیں۔ انہوں نے تو آپ کی محبت میں یہ بہت بڑی قربانی دی ہے۔" اس نے لہجے میں تاسف سمونے کی کوشش کی۔

نوربانو اور خوش ہوگئی۔ مگر یہ افسوس بھی ہونے لگا کہ اس نے اپنی غرض کی خاطر ایک نہیں، دو افراد کو استعمال کیا ہے۔

"تم بہت اداس لگ رہی ہو۔" اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"لگتا ہے، عبدالحق صاحب نے تمہیں بہت مایوس کیا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں آپی!" ارجمند نے بے ساختہ کہا۔ لیکن فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔

"میں نے تو جب آپ کی بات مانی تھی، تبھی یہ سمجھ لیا تھا کہ مجھے کوئی امید نہیں رکھنی۔ میرا کام تو صرف دینا ہے، اور الحمدللہ میں اس میں خوش رہتی ہوں۔"

ارجمند نے کچھ ایسے لہجے میں بات کہی کہ نوربانو کا دل کٹ کر رہ گیا۔

اس نے ارجمند کو لپٹا لیا۔

"یہ تمہارا مجھ پر احسان ہے۔ میں تو تمہیں کبھی اس کا صلہ نہیں دے سکتی۔ اللہ سے دعا کرتی ہوں۔"

"احسان کی بات نہ کیجئے آپی! میرا سرمایہ تو آپ کی دعائیں ہیں۔"

"بس تم میری آرزو پوری کر دو۔"

"یہ میرے بس کی بات نہیں آپی! سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔" ارجمند نے کہا۔ پھر اس کے لہجے میں الجھن در آئی۔

"لیکن آپی! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے ممکن....."

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ یہ مجھ پر چھوڑ دو۔"

"ٹھیک ہے آپی!"

"اب تم جاؤ، اور مجھے سونے دو۔" نوربانو نے کہا اور پھر لیٹ گئی۔

"آپ بھول رہی ہیں آپی کہ میں آپ کو اٹھانے کے لئے آئی تھی۔"

"لیکن کیوں.....؟ ابھی میری نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔"

"آج گھر میں تقریب ہے آپی.....! آپ کا ابھی اٹھنا بہت ضروری ہے۔"

"کیوں.....؟"

"آپ نظر نہ آئیں تو لوگ سمجھیں گے کہ اب آپ اپنے فیصلے پر پچھتا رہی ہیں۔ بلکہ کچھ تو یہ بھی سوچیں گے کہ یہ سب شاید آپ کی مرضی کے خلاف ہوا ہے، گویا یہ آپ پر ظلم ہے۔ پھر وہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔ یہ تو میرے ساتھ زیادتی ہوگی آپی! میں نے تو صرف آپ کے خاطر....."

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" نوربانو نے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم چلو..... میں آتی ہوں۔"

❁ ❁ ❁

ولیمے کی تقریب بھی خیر و خوبی نمٹ گئی۔

اب مرحلہ اچھو میاں کے رخصت ہونے کا تھا۔ عبدالحق نے گاڑی نکالی۔

اس دوران حمیدہ نے انہیں ایک سفری بیگ لا کر دیا۔

"یہ کیا ہے.....؟" اچھو میاں نے حیرت سے کہا۔

"اس میں کچھ چیزیں ہیں آپ کے لئے۔ ہم سب کی طرف سے۔"

"مگر مجھے تو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

''یہ ہماری ضرورت ہے۔ آپ اتنی اچھی جگہ جا رہے ہیں، ہم سب کو یاد رکھئے گا۔''

''میرے پاس یاد رکھنے کے لئے آپ سب کے سوا ہے ہی کون......؟''

''اور یہ آپ کا حق بھی ہے۔ آخر آپ ہمارے سمدھی ہیں۔''

اچھو میاں نے بیگ لے لیا۔

انہیں چھوڑنے کے لئے ارجمند بھی ساتھ گئی۔ عبدالحق نے اس بار بھی ان دونوں کو پچھلی نشست پر بٹھایا تھا۔

''آپ واپس کب آئیں گے نانا......!'' ارجمند نے راستے میں ان سے پوچھا۔

''سچ کہوں بیٹا! تو میں واپس آنا ہی نہیں چاہتا۔ آگے جو اللہ کی مرضی......!''

''آپ کو مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں......؟'' ارجمند کے لہجے میں شکایت تھی۔

''اتنی محبت ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ اللہ کے دربار میں بیٹھ کر تمہیں یاد کرتا رہوں گا اور دعائیں کرتا رہوں گا تمہارے لئے۔''

عبدالحق نے گاڑی روک دی، اور پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

ارجمند اچھو میاں سے لپٹ گئی۔

''آپ مجھے بہت یاد آئیں گے نانا......!''

''میں بھی تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا میری بچی......!''

''میرا دل رونے کو چاہ رہا ہے نانا......!''

''تو رو لو میری بچی! آنسو تو بڑی نعمت ہوتے ہیں۔''

''میں روتی اور اتنا روتی کہ روتے روتے مر جاتی۔ لیکن میں نہیں روؤں گی نانا......!''

''کیوں بیٹیا......!''

''ایک تو مجبوری ہے کہ وعدہ خلافی نہیں کرسکتی۔'' یہ کہتے ہوئے ارجمند

نے عبدالحق کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

''دوسرے آپ اتنی اچھی جگہ جا رہے ہیں کہ رونا ناشکرا پن ہوگا۔''

''تم بہت سمجھ دار ہو بیٹا!'' اچھو میاں نے بڑی محبت سے کہا۔

''اچھا......! اب ہم چلتے ہیں۔ فی امان اللہ......! ہمارے لئے دعا کرتی رہنا۔''

''فی امان اللہ نانا جان......!''

عبدالحق نے دروازہ کھولا اور اچھو میاں بیگ لے کر نیچے اترے۔ بیگ نیچے رکھ کر انہوں نے عبدالحق کو لپٹا لیا۔

''میری ارجی کا خیال رکھنا بیٹے......! اور اپنا بھی۔'' انہوں نے کہا۔

''آپ بے فکر رہیں۔ بس ہمارے لئے دعا کرتے رہیں۔''

''فی امان اللہ......!''

''فی امان اللہ......!''

کار میں بیٹھی ارجمند اور باہر کھڑا عبدالحق انہیں جاتا دیکھتے رہے۔ دروازے پر پہنچ کر اچھو میاں پلٹے، انہوں نے انہیں دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور پھر مڑ کر دروازے میں داخل ہوگئے۔

کار کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا تھا۔ ارجمند اتری۔

''اب میں آگے بیٹھوں گی۔''

''شکریہ ارجمند......!''

واپسی جاتے ہوئے عبدالحق نے اس سے پوچھا۔

''تو تم میرے وعدے کی وجہ سے نہیں روئیں؟''

''جی......! آپ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا، تو میں وعدہ خلافی کیسے کرسکتی تھی۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

عبدالحق نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

''میں تمہیں اجازت دے رہا ہوں، تم رو سکتی ہو۔'' اس نے محبت سے

''جی نہیں ...! میں وعدہ خلافی کرنا ہی نہیں چاہتی۔'' ارجمند نے کہا۔

''اس کا تعلق تو میری زندگی سے ہے۔''

عبدالحق کو اس پر بڑی شدت سے پیار آیا۔ کیسی سچی اور مضبوط لڑکی ہے یہ۔ اس نے سوچا۔ اس پر ہر طرح سے اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

❁ ❁ ❁

جس وقت ارجمند نے نور بانو سے پوچھا تھا کہ یہ کیسے ہوگا، تو اس نے بڑے اعتماد سے کہا تھا، یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ لیکن وہ اس پر پورے دن سوچتی رہی اور حیران ہوتی رہی۔ واقعی یہ کیسے ممکن ہے۔ اور اس نے بچوں کی سی اس سوچ کے تحت اپنے شوہر کو کسی اور کے سپرد کر دیا۔ یہ تو بڑی نادانی کی اس نے۔ کہتے ہیں، چاند چڑھتا ہے تو دنیا دیکھتی ہے۔ یہ تو چاند سے بھی بڑا معاملہ تھا۔ چاند کو تو کبھی کبھی گھٹا بھی چھپا لیتی ہے۔ لیکن حاملہ عورت کا پیٹ کہاں چھپتا ہے؟

اور یہاں تو اسے ایک نہیں، دو ان ہونیاں درپیش تھیں۔ یعنی اسے ارجمند کا پیٹ چھپانا تھا اور خود کو حاملہ دکھانا تھا۔ یہ کیسے ہوگا، یہ کیسے ہو سکتا ہے، پورے دن وہ یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوتی رہی۔

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اس نے عبدالحق اور ارجمند کی شادی کرانے سے پہلے اس اسکیم پر غور تو کیا ہوگا۔ اور وہ اسکیم قابل عمل بھی ہوگی۔ ورنہ وہ اتنا بڑا داؤ کیوں کھیلتی۔ داؤ بھی کیسا؟ مہابھارت میں راجا نل نے اپنی پتنی درو پدی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ یہاں اس نے اپنے محبوب شوہر کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ اور یہ بہت بڑی بات تھی۔ کیونکہ راجا نل درو پدی سے اتنی محبت نہیں کرتا تھا، جتنی وہ عبدالحق سے کرتی تھی۔ دوسرے راجا نل ایک دنیادار تھا۔ مردوں کی دنیا بہت وسیع ہوتی ہے۔ مردوں کے نزدیک ایک دو نہیں، بہت سی چیزیں اہم ہوتی ہیں۔ بچے، دولت، اقتدار اور جانے کیا کیا۔ بے شک ان کے لئے عورت بھی اہم ہوتی ہے، مگر صرف وہ جو مجبور ہو ... اور مجبور بھی وہ، جسے وہ دور سے دیکھ کر آہیں بھرتے اور سپنے دیکھتے ہوں، چھو نہیں سکے ہوں۔ بیوی اہم چیزوں کی فہرست میں سب سے نیچے ہوتی ہے۔

اسی لئے تو راجا نل نے رانی درو پدی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ اس کی باری دنیاوی دولت کے سامنے بے حقیقت تھی۔

لیکن عورتوں کا معاملہ مختلف ہوتا ہے۔ ان کا مرد، ان کا شوہر ان کے لئے کائنات کی سب سے اہم چیز ہوتا ہے۔ اور اگر وہ ان کا محبوب بھی ہو، تو اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ عورت کے سامنے ساری دنیا کی دولت بھی رکھ دی جائے تو وہ اس کے بدلے میں اپنے شوہر کی پرچھائیں تک کسی دوسری عورت کو دینا گوارہ نہیں کرتی ہے۔

میں نے یہ کیسے کر لیا؟ اس نے حیرت سے وحشت سے سوچا۔ کیا سمائی تھی میرے دماغ میں؟

اور راجا نل ہار گیا تھا ... راجا نل نہیں ہارا تھا، درو پدی نیلام ہو گئی تھی۔

تو کیا وہ بھی ہار جائے گی۔

یہ خیال ہی اس کے لئے روح فرسا تھا۔

یہ فیصلہ کرتے وقت اس نے کیا سوچا تھا؟ کچھ تو سوچا ہوگا۔ اتنا بڑا فیصلہ یوں ہی تو نہیں کر لیا ہوگا اس نے۔ اور اس نے سوچا کہ بچہ ارجمند کا ہوگا، لیکن اس کا کہلائے گا۔ یہ بات قابل عمل کیسے ہو سکتی ہے؟ نطفہ بیج ہی کا کوئی بیج تو نہیں کہ ایک کیاری سے نکالا اور دوسری کیاری میں بو دیا۔ بلکہ ایسے میں تو بیج بھی ضائع ہو جاتا ہے۔

چاند چڑھے گا تو دنیا دیکھے گی۔ سب دیکھیں گے کہ وہ مشرقی افق سے ابھرا ہے۔ اس کا دعویٰ کون سنے گا، کون مانے گا کہ یہ چاند درحقیقت مغربی افق سے طلوع ہوا ہے۔

اسے یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس نے اس سلسلے میں کوئی قابل عمل منصوبہ سوچا تھا۔

تو پھر اس نے یوں ہی اپنے شوہر کو داؤ پر لگا دیا۔

اس کا جواب البتہ اسے مل گیا۔

اس کے پاس کوئی اور چارۂ کار تھا ہی نہیں۔ وہ بہت لڑی تھی۔ قدرت

نے بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ بالآخر اسے ہار جانا ہے۔ اس کے جیتنے کا تو کوئی امکان تھا ہی نہیں۔

قدرت نے تو اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ حمیدہ اسے کسی بابا کے پاس لے جانا چاہتی تھی...... اولاد کے سلسلے میں۔ اور اس نے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے کہ جو کچھ اسے معلوم تھا، وہ حمیدہ نہیں جانتی تھی۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ جو وہ جانتی ہے، وہ حمیدہ کو بھی معلوم ہو۔ اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ ماں کبھی نہیں بن سکتی کہ یہ اس کی مقبول دعا ہے۔

تو اس کے انکار پر برہم ہو کر حمیدہ نے اسے چیلنج کیا تھا کہ اگر وہ اس سے تعاون نہیں کرے گی تو وہ عبدالحق کی دوسری شادی کرا دے گی۔ اس نے چیلنج کیا تھا کہ عبدالحق اس کی بات کبھی نہیں ٹالے گا۔

وہ جانتی تھی کہ حمیدہ سچ کہہ رہی ہے۔ عبدالحق ایسا ہی تھا، اور پھر حمیدہ کا مطالبہ معقول بھی ہوتا۔

یعنی اسے ہار جانا تھا۔ شاید وہ بس چند روز ہی کی مہلت تھی۔

لیکن فوری طور پر اللہ کی طرف سے مدد آ گئی۔ سان نہ گمان، ایک دم سے عبدالحق کا ٹرانسفر کراچی ہو گیا۔ بات ٹل گئی اور وہ بچ گئی۔

لیکن اس یقینی شکست کا خدشہ سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ حمیدہ وہاں رشتہ تیار رکھے گی۔ اور وہ چند روز کے لئے بھی لاہور جائیں گے تو حمیدہ عبدالحق کی دوسری شادی کرا دے گی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لاہور کے نام سے بھی ڈرنے لگی۔ لیکن ان کا لاہور نہ جانا نہ صرف غیر فطری تھا، بلکہ ناممکن بھی تھا۔

لیکن اس نے اس ناممکن کو ممکن بنائے رکھا ...... وہ بھی ایک دو نہیں، سات برس تک۔ کیسی کیسی مکاریاں کیں اس نے۔ بلکہ شاید اس کے نتیجے میں اس نے ایک خوف ناک بیماری پال لی۔ جس درد سے تڑپنے کی وہ اداکاری کرتی تھی، اس سے بھی خوف ناک درد اسے سچ مچ ہونے لگا۔ ایسا درد کہ اسے اپنی موت صاف اور سامنے نظر آنے لگی۔

تب وہ خود سے ہی ہار گئی۔ ایسا درد اور تنہائی۔ وہ خود ہی لاہور جانے کے لئے تڑپنے لگی۔ لیکن وہاں وہی خدشہ درپیش تھا۔ اس کے لئے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہ کام حمیدہ کو کیوں کرنے دے، خود ہی یہ شادی کرا دے۔ سہرا بھی اس کے سر بندھے گا، اور سبھی اس کی عظمت کو سلام کریں گے۔ اس میں یہ بھی تھا کہ ارجمند دنیا میں وہ واحد ہستی تھی، جس سے وہ سچ مچ محبت کرتی تھی۔ اور ارجمند بھی اسے بہت چاہتی تھی۔ وہ اس کے لئے کوئی بھی قربانی دے سکتی تھی اور عبدالحق سے شادی کر کے اس نے یہ بات ثابت بھی کر دی۔

وہ جانتی تھی کہ ارجمند اس سے ہر ممکن تعاون کرے گی۔ سوال یہ تھا کہ ہونے والا بچہ ارجمند کا نہیں، بلکہ اس کا ہے، یہ وہ دنیا کو کیسے دکھا سکے گی۔

مایوسی کی آخری حد کو چھونے کے بعد اس کے اندر ایک یقین ابھرا۔ ارجمند کی وجہ سے یہ دور از کار امکان کسی نہ کسی طرح حقیقت میں بدل سکتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ قدرت پہلے کی طرح پھر اس کی مدد کرے۔

وہ جیسے مایوس ہوئی تھی، ویسے ہی مطمئن بھی ہو گئی۔

اب اسے دوسرے محاذ کی فکر کرنی تھی۔ یہ محاذ بھی آسان نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی اپنی شکل و صورت معمولی ہے، جبکہ ارجمند تو یقیناً حسین ترین لڑکیوں میں سے ہے۔ یہ مرد ہوتے ہی دل پھینک ہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ارجمند جیسی حسین بیوی کو پا کر عبدالحق اسی کا ہو جائے اور پرانی بیوی کو دل سے نکال پھینکے۔ اگرچہ یہ مسئلہ محض چند روز کا ہے۔ چھٹیاں ختم ہوں گی اور عبدالحق کراچی چلا جائے گا۔ پھر کہاں وہ اور کہاں ارجمند۔ بے شک وہ خود بھی عبدالحق کی قربت سے محروم رہے گی۔ لیکن یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔

اس نے سوچ لیا کہ اب اسے ہر چال بہت سوچ سمجھ کر چلنی ہے۔

❁ ❁ ❁

وہ عبدالحق کے لئے بڑی آزمائش کی رات تھی۔

نواب صاحب کو رخصت کر کے آنے کے بعد وہ زندگی کے اس نئے موڑ کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں کے دوران اس پر زندگی کی بڑی

بڑی حقیقتیں آشکار ہوئی تھیں۔ ایک اچھی بیوی کو کیسا ہونا چاہئے، یہ اس نے ارجمند کو دیکھ کر سمجھا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ نور بانو اچھی بیوی ہرگز نہیں ہے۔

اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ نور بانو کی محبت اب بھی پہلے جیسی ہی تھی۔ اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن دل کے ایک گوشے میں ارجمند کی محبت کا ننھا سا کلا بھی سر اٹھا رہا تھا۔

وہ حقیقت پسند آدمی تھا۔ دونوں بیویوں کا موازنہ کرنا فطری بات تھی۔ اور موازنے کا نتیجہ بالکل صاف اور واضح تھا۔ وہ طبعاً نزاکت اور خوب صورتی کو پسند کرنے والا تھا۔ ارجمند ایسی لڑکی تھی کہ عبدالحق نے ایسا حسن کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ظاہری حسن کے معاملے میں اس کا اور نور بانو کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔

عبدالحق کو اعتراف کرنا پڑا کہ نور بانو میں اس کے لئے ایک خاص اور غیر معمولی کشش ہے۔ ورنہ عام اور غیر جانبدار نظر سے دیکھا جائے تو وہ کسی اعتبار سے بھی نہ تو خوب صورت ہے اور نہ ہی نازک۔

اب پتا چلے گا کہ میری محبت کس درجے کی ہے؟ اس نے سوچا۔

اور ارجمند باطنی اعتبار سے بھی بہت خوب صورت تھی۔ اللہ کا خوف اور اس کی شخصیت کا جزو اعظم تھا۔ یعنی ظاہری طور پر وہ جتنی حسین تھی، باطنی طور پر اس سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ جبکہ نور بانو کی فطری کمزوریوں سے وہ خوب آگاہ تھا۔ بلکہ بعض سے تو وہ نالاں تھا۔ اگر اسے نور بانو سے محبت نہ ہوتی تو وہ ان کمزوریوں کو کبھی برداشت نہ کر پاتا۔ دوسری طرف وہ دین سے اور اللہ سے تقریباً بے تعلق ہی تھی۔ شادی کے بعد وہ نماز اور قرآن سے دور ہوگئی تھی۔ یہ بات عبرت ناک بھی تھی اور عبدالحق کو اس پر شرم بھی آتی تھی۔ اکثر وہ سوچتا کہ وہ تو باقاعدگی سے نماز اور قرآن پڑھتی تھی۔ شادی کے بعد دور ہوئی تو یقیناً اس میں اس کا کوئی قصور ہے۔

لیکن ایک بات عبدالحق کی سمجھ میں آگئی۔ کسی کو خوش الحانی کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتے سن کر یہ رائے قائم نہیں کی جا سکتی کہ وہ دین دار بھی ہے۔ کسی کا بہت اچھا قاری یا حافظ محض ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ بہت اچھا

سلمان بھی ہے۔ اللہ نے قرآن کو انسانوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لئے اتارا ہے۔ محض اس لئے نہیں کہ نہایت خوش الحانی سے پڑھ لیا جائے، دوسروں کو سنا دیا جائے اور اس کے بعد اسے چوم کر طاق پر رکھ دیا جائے۔ ہدایت اور راہنمائی تو اس وقت حاصل ہوگی، جب آپ سمجھ کر پڑھیں اور غور کریں۔ اور بات صرف زبان کی نہیں، اہل زبان تو قرآن کی ہر آیت کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں۔ پھر بھی اللہ نے حکم دیا کہ اسے پڑھو اور اس پر غور کرو۔ اس لئے کہ بات صرف مفہوم کی نہیں، لفظوں میں چھپی ہوئی ان حکمتوں کی ہے، جنہیں جستجو کرنے والے قیامت تک ڈھونڈتے رہیں گے، لیکن پوری طرح نہیں سمجھ پائیں گے۔ قرآن کے بارے میں خود اللہ نے فرمایا۔ وَاِنَّهٗ فِیْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَكِیْمٌ○ تو اب ایسے میں عربی زبان سے ناواقف شخص اسے توتے کی طرح دہراتا چلا جائے اور اسے مطلب ایک لفظ کا بھی معلوم نہ ہو تو دوسروں کی تو بات الگ، خود اسے ہی کیا فائدہ پہنچے گا؟

نور بانو کی محبت اس کے لئے بہت قیمتی تھی۔ اس محبت کا اس پر بڑا احسان تھا۔ بنیادی طور پر وہ محبت اسے نور بانو کی آواز سے ہوئی تھی۔ لیکن اس آواز نے اس پر رحمتوں کے، راہِ حق کے کتنے دروازے کھول دیئے تھے۔ وہ آواز اسے عربی زبان کی طرف لے گئی تھی۔ اس آواز نے اسے عربی زبان کی محبت سونپی تھی۔ اور اس آواز میں سورۂ ملک سن کر ہی اس پر ایمان کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے عربی نہ سیکھی ہوتی، اور وہ ان آیات کا مطلب نہ سمجھتا تو کیسے اس نے اس کلام کے برحق ہونے کی گواہی دی تھی۔

بے شک، نور بانو کی محبت نے اس پر زندگی کا سب سے بڑا احسان کیا تھا، اس کو کائنات کی سب سے بڑی نعمت دلوائی تھی۔ شاید اس لئے وہ اس کی ناقابل برداشت باتیں بھی برداشت کر لیتا تھا۔

اس محبت کی اساس بہت مضبوط تھی۔

لیکن وہ آواز، جس کی محبت نے اسے یہاں تک پہنچایا تھا، شادی کے بعد اس آواز میں قرآن سننے کو وہ ترس گیا تھا، وہ دنیا بھر کی باتیں کرتی تھی، لیکن قرآن نہیں پڑھتی تھی۔

اسی سورۂ ملک کی قرأت اس نے گزشتہ رات ارجمند کی آواز میں سنی تھی۔

اس سے پہلے بھی وہ ایک بار ارجمند سے سورۂ ملک سن چکا تھا۔ مگر وہ سات برس پہلے کی بات تھی، اور جب میں اور اب میں بہت فرق تھا۔ پہلی بار بھی اسے دل میں اعتراف کرنا پڑا تھا کہ ارجمند کی قرأت نور بانو کی قرأت سے زیادہ اچھی ہے۔ لیکن گزشتہ رات کی تو بات ہی اور تھی۔ فرق اس کی سمجھ میں واضح طور پر آ گیا تھا۔ پہلی بار وہ محض قرأت تھی، جبکہ گزشتہ رات ارجمند کی آواز اور لہجے کا اتار چڑھاؤ اس سورۂ مبارکہ کی ہر ہر آیت سے پوری طرح ہم آہنگ تھا۔ اللہ کی بے مثال قدرت کا بیان کرنے والی آیات میں اس کے لہجے میں دبدبہ تھا، جو سننے والے کے دل کو اپنے رب کے حضور سجدہ ریز کر دینے والی عاجزی سے معمور کر دیتا تھا۔ اور جہنم اور اہل جہنم کا بیان کرنے والی آیات میں اس کے لہجے میں دل کو لرزا دینے والی ہیبت اور تنبیہ تھی۔ اور جنت اور اللہ کے انعامات کے بیان والی آیات میں لہجے میں نرمی، مٹھاس اور خوش خبری تھی۔ احساس ہوتا تھا کہ تلاوت کرنے والا ہر آیات کا مفہوم سمجھ رہا ہے۔

عبدالحق ماضی میں، دہلی کی اس مبارک رات کی طرف چلا گیا۔

اسے یاد تھا کہ اس نے سورۂ ملک کی ابتدائی آیات سنیں۔ عربی اس نے پڑھی اور سیکھی تھی۔ ان آیات کا ہلکا سا خاکہ اس کے ذہن میں ابھرا۔ انہیں پوری طرح سمجھنے کے لئے اس نے نور بانو سے دوبارہ ان آیات کو پڑھنے کو کہا ..... اور وہ بھی ٹھہر ٹھہر کر۔ پھر اس نے ان کا مفہوم سمجھا، ان کی حقانیت اس پر روشن ہوئی اور اس نے کلمہ شہادت پڑھا۔

لیکن گزشتہ رات کا تجربہ مختلف تھا۔ سنتے ہوئے مفہوم تو وہ سمجھ ہی رہا تھا۔ لیکن ارجمند کی آواز اور لہجے کا اتار چڑھاؤ جیسے اس نے آیات کے مفہوم کی گہرائی سے روشناس کرا رہا تھا۔ اس کے جسم کے اندر اور باہر کی کیفیات ان مفاہیم کے تابع ہوگئی تھیں۔

یہ بہت واضح فرق تھا، جس سے انکار ممکن نہیں تھا۔ ارجمند یہاں بھی نور بانو سے بہت آگے تھی۔

اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ وہاں نور بانو کی محبت چاند کی طرح تھی۔ جبکہ ارجمند کی محبت محض ایک ٹمٹماتے ہوئے دیے کی طرح تھی۔

کچھ بھی ہو، نور بانو، نور بانو ہی ہے۔ اس سے صرف محبت کا نہیں، احسان کا رشتہ بھی تو ہے ..... اور احسان بھی کتنا بڑا احسان! اس نے سوچا۔

لیکن ایک بات اور واضح ہوگئی۔ اولاد اس کے لئے بہت اہم تھی۔ نور بانو کی محبت کی خاطر وہ اس اہمیت کو خود سے بھی چھپا کر رکھتا تھا۔ لیکن اب ایک مضبوط امکان سامنے آنے پر وہ اہمیت کھل کر سامنے آ گئی تھی۔

اور یہ رات نور بانو کی رات تھی۔

❁❁❁

نور بانو کے لئے بھی وہ بہت اہم رات تھی۔

اس کی کیفیت ایک ایسے جرنیل کی سی تھی، جس نے یقینی طور پر ہاری جانے والی جنگ میں مکمل شکست سے بچنے کے لئے صلح کر لی ہو۔ اب اسے یہ جائزہ لینا تھا کہ ریاست کے کون سے علاقے صلح کے نتیجے میں اس کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں اور کون سے علاقوں پر اس کی گرفت کمزور پڑ گئی ہے۔

وہ خواب گاہ میں یوں داخل ہوئی، جیسے وہ کوئی اجنبی علاقہ ہو، جہاں دشمن گھات لگائے بیٹھے ہوں۔

لیکن عبدالحق کا ردِعمل بہت حوصلہ افزا تھا۔

اس نے بے تابی سے نور بانو کو لپٹا لیا۔ اس کی گرفت میں بڑی شدت، بڑی گرم جوشی تھی۔

نور بانو کا اعتماد بحال ہونے لگا۔

''مجھے تم سے محبت ہے، اتنی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔'' عبدالحق کے لہجے میں بھی بے تابی تھی۔

نور بانو کا اعتماد اور بڑھ جانا چاہئے تھا۔ لیکن اس کی شکی طبیعت نے اسے بھڑکا دیا۔ یہ جملہ تو عبدالحق کبھی کہتا ہی نہیں تھا..... اس کے بے حد اصرار پر بھی نہیں۔ وہ ہمیشہ کہتا تھا کہ لفظ پامال ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعے اظہار خوب صورت

اور نازک جذبوں کو ارزاں کر دیتا ہے۔ لیکن آج وہ بغیر فرمائش، لفظوں سے اظہارِ محبت کر رہا تھا۔ اس کا کوئی سبب تو ہوگا۔

''یہ آپ مجھ کو یقین دلا رہے ہیں یا خود کو.....؟'' اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

عبدالحق گڑبڑا گیا۔

''کیا مطلب.....؟''

''بھئی.....! کسی نہ کسی کو تو یقین دلا ہی رہے ہوں گے.....؟''

''یقین دلانے کی ضرورت تو تب ہو، جب اس میں شک ہو۔'' عبدالحق نے سنبھل کر کہا۔

''اور کم از کم مجھے تو اس میں شک نہیں ہے۔ تمہیں ہوتو ہو۔''

نور بانو کو بروقت خیال آ گیا۔ اس اہم رات میں تلخی کی گنجائش نہیں۔ اس نے مفاہمانہ انداز میں کہا۔

''آپ جانتے ہیں کہ مجھے بھی اس میں کوئی شک نہیں۔ بس مجھے یہ بات غیر معمولی لگی۔ آپ پہلے کبھی منہ سے کہتے نہیں تھے یہ بات۔''

''پہلے کبھی یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں۔''

''تو اب کیسے ہوگیا؟''

''تم نے محبت میں ساجھا کیا تو پتا چلا مجھے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ نہ جانے کب سے تم سے دور ہوں۔ تڑپ رہا تھا تمہارے لئے۔''

نور بانو خوش ہوگئی۔ لیکن اسے حیرت بھی ہوئی۔ عبدالحق کہاں ایسی باتیں کرنے والا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کا عبدالحق کی دوسری شادی کرانے کا فیصلہ عمل انگیز ثابت ہو رہا ہے۔

اس نے عبدالحق کے سینے پر سر رکھ دیا۔

''سنو.....! تم پہلے مجھے سورۂ ملک سنا دو۔''

نور بانو یہ سن کر ہمیشہ کی طرح بدمزہ ہوگئی۔ جب نفس کی آندھی چل رہی ہو وجود میں تو ایسی باتیں کہاں اچھی لگتی ہیں۔ ہمیشہ کی طرح اس نے اس بار بھی

عبدالحق کو بہلایا۔

''جلدی کیا ہے ایسی..... ابھی دل کی کچھ باتیں کرنی ہیں آپ سے۔ پھر سنا دوں گی۔''

''نہیں.....! پہلے سناؤ! باتیں کرنے کو تو پوری رات پڑی ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''پتا ہے، مجھے ایسا لگ رہا ہے، جیسے میں پہلی بار تم سے ملنے والا ہوں، سنسنی سی دوڑ رہی ہے جسم میں۔''

نور بانو کی خوشی کی تو کوئی حد نہیں تھی۔

''مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔''

''اچھا.....! تم سورۂ ملک سناؤ نا.....!''

''بعد میں سن لیجئے گا۔''

''ابھی کیوں نہیں.....؟''

''مجھے وضو کرنا پڑے گا۔''

''کیوں.....؟ تمہیں تو سورۂ ملک یاد ہے۔''

''اب کچھ اٹکنے لگی ہوں۔ ایسے میں بغیر دیکھے، پڑھنا اچھی بات نہیں۔''

''تو وضو کرلو۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟''

''آلکس آتی ہے۔'' نور بانو نے بڑی ادا سے کہا اور انگڑائی لی۔ یہ وہ انگڑائی تھی، جو سادہ دل اور صالح عبدالحق کے دل کی دنیا کو زیر و زبر کر دیتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ اسے لپٹا لے گا، اور فرمائش ٹل جائے گی۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔

''وضو میں آلکس.....؟ بری بات.....!'' عبدالحق نے نرم لہجے میں کہا۔

لیکن اس میں بھی اصرار واضح تھا۔

''جاؤ.....! وضو کر کے آؤ۔''

نور بانو وضو کے لئے چلی گئی۔

✿ ✿ ✿

عبدالحق کو بہت دکھ ہوا۔ ایک لڑکی جو ہر روز باقاعدہ قرآن کی تلاوت کرتی تھی، جو اس سے اس کی محبت کی وجہ تھی، اب قرآن سے اتنی دور ہوگئی کہ جو سورتیں اسے یاد تھیں، وہ بھی بھول گئی۔ چلو، کوئی بات نہیں۔ رجوع کر لے گی تو اللہ اپنے فضل سے بحال فرما دے گا۔ لیکن یہ کیا کہ وضو سے اکسانے لگی۔ وضو تو پاکی ہے۔ اللہ کی رضا تو اس میں ہے کہ آدمی ہر وقت باوضو رہے۔ وضو سے بھاگنا تو پاکی سے دوری ہوئی۔

کیا اس کا ذمہ دار وہ ہے؟ یہ خیال اسے رہ رہ کر ستا رہا تھا۔

نوربانو وضو کر کے واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں قرآن پاک تھا، اور رحل تھی۔ اس نے قرآن پاک کو رحل پر رکھا اور تلاوت شروع کر دی۔

مگر وہ بے روح قرأت تھی۔ جلدی جلدی اس نے سورۃ مکمل کی اور قرآن پاک اور رحل رکھنے کے لئے چلی گئی۔

عبدالحق اداس تھا۔ گزشتہ رات اس نے کیسی روح پرور قرأت سنی تھی، اور آج .....!

یہ تو بہت بڑا زیاں تھا۔

وہ بستر پر دراز ہوگیا۔

نوربانو نے لائٹ آف کی اور آ کر اس کے ساتھ لیٹ گئی۔

لمحے خاموشی اور سکوت میں دبے پاؤں گزرتے رہے۔ نوربانو حیران تھی کہ عبدالحق نے کوئی پیش قدمی نہیں کی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو اس نے کہا تھا کہ وہ ایسی سنسنی سے دوچار ہے، جیسے وہ ان کی پہلی رات ہو۔ تو یہ کیا ہوگیا؟

وہ اس کے دکھ اور اداسی کو سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔ حالانکہ وہ اس کے ہی لئے تھا۔

اس نے اپنا ہاتھ عبدالحق کے سینے پر رکھ دیا۔

برف کے نیچے سویا ہوا آتش فشاں دہک اٹھا۔ وہ اس لمس کا اسیر تھا..... غلام تھا۔

لیکن نوربانو کا کھیل کچھ اور تھا۔ اس نے عبدالحق کو روک دیا۔

"میں آپ سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"تو کرو نا.....!" عبدالحق نے مخمور لہجے میں کہا۔

"ایک بات بتائیں۔ کل کی رات کیسی گزری؟"

اور عبدالحق کو جیسے بجلی کی کسی ننگے تار نے چھولیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم.....؟"

"آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں، جیسے میں نے کوئی بہت بری بات کہہ دی ہو۔" نوربانو نے تنک کر کہا۔

"یہ تو ہے ہی بری بات.....! اور تم اسے برا بھی نہیں سمجھ رہی ہو.....؟"

"کیا برائی ہے اس میں.....؟"

"یہ بے حیائی ہے.....!"

"میاں بیوی کے درمیان ایسا کچھ نہیں ہوتا۔" نوربانو نے بے پرواہی سے کہا۔

"تم حیا کا مفہوم ہی نہیں سمجھتی ہو۔"

"مجھے جاہل نہ سمجھیں۔ میاں بیوی کی خلوت میں شیطان بھی داخل نہیں ہوتا۔ ان کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔ شیطان داخل نہیں ہوسکتا تو انسان کیسے داخل ہوسکتا ہے؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ تم بھی کیسے داخل ہوسکتی ہو؟"

"بیوی ہوں نا! اس لئے۔ اور میاں بیوی کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔"

"اور میاں بیوی کے درمیان بے حیائی جائز ہے؟" عبدالحق کے لہجے میں تلخی آگئی۔

"ان کے درمیان جو کچھ بھی ہو، وہ بے حیائی نہیں۔"

"غلط سوچ ہے تمہاری۔ وہاں بھی کچھ ممنوعات اور مکروہات ہیں۔"

"میں تو آپ سے بس اتنا پوچھ رہی ہوں کہ کل رات کیسی گزری آپ

کی؟ ارجمند کیسی لگی آپ کو؟'' نوربانو نے ڈھٹائی سے کہا۔

''ایک بات بتاؤ! اللہ نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت دی ہے نا.....!''

''بے شک.....! بالکل دی ہے۔''

''لیکن کیا اسے یک وقت، ایک ہی خلوت میں دو بیویوں کے ساتھ شب بسری کی اجازت بھی دی ہے.....؟''

نوربانو سناٹے میں آ گئی۔ چند لمحے وہ کچھ بول ہی نہیں سکی۔ مگر تھی وہ بہت ہی پکی۔ چند لمحے بعد بڑے سکون سے بولی۔

''میں نے ایسا کرنے کو تو نہیں کہا آپ سے۔''

''جو کام عملاً نہیں کیا جا سکتا، اس کے متعلق بات کرنا، اس کا بیان بھی بے حیائی ہے۔''

''رشوت لینا گناہ ہے، تو کیا اس کے بارے میں بات کرنا بھی گناہ ہے.....؟''

''اگر اس میں ترغیب ہو تو بالکل گناہ ہے۔ ہاں نصیحت کے لئے ہو تو اور بات ہے۔'' عبدالحق اس کی کٹ حجتی پر کڑھ رہا تھا۔ اسے شدت سے غصہ آ رہا تھا، اور وہ اسے برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''لیکن تم وہاں کیوں گھس رہی ہو؟ جہاں شیطان بھی داخل نہیں ہو سکتا۔''

''میں کوئی شیطان تو نہیں ہوں۔'' نوربانو نے مسکراتے ہوئے حاضر جوابی کا مظاہرہ کیا۔

''وہاں کسی انسان کا داخل ہونا اس سے بھی بڑی بات ہے۔''

''میں تو بس آپ سے پوچھ رہی ہوں۔''

''اپنی خلوت کے بارے میں بات کرنے والا بھی بے حیا ہوتا ہے اور پوچھنے والا بھی۔'' عبدالحق نے سخت لہجے میں کہا۔

''دنیا پوچھتی ہے اور دنیا بتاتی ہے۔ مرد اپنے دوستوں کو اور لڑکیاں اپنی سہیلیوں کو بتاتی ہیں۔''

''برا کرتے ہیں۔ یہ بے حیائی ہے، اور بے حیائی گناہ کی بہت بڑی

ترغیب ہوتی ہے۔ وہ گناہ کی طرف لے جاتی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ تم نے مجھے ان لوگوں میں شمار کیا۔''

''آپ نے تو بات کا بتنگڑ بنا دیا۔'' نوربانو نے تیزی سے پینترا بدلا۔

''میں تو آپ سے بس یہ پوچھ رہی تھی کہ ارجمند کیسی لگی آپ کو.....؟''

عبدالحق نے بھی بات کو ختم کرنا مناسب سمجھا۔

''ارجمند کوئی اجنبی تو ہے نہیں میرے لئے۔'' اس نے کہا۔

''پہلے سے جانتا ہوں میں اسے۔ وہ اچھی لڑکی ہے۔''

''وہ تو ہے۔ میں بیوی کی حیثیت سے پوچھ رہی ہوں۔ اب کیسی لگی وہ آپ کو.....؟''

''ایک دن میں تو فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔''

''مگر اس کا ساتھ تو اچھا لگا آپ کو.....؟''

بات گھوم پھر کر وہیں آ گئی تھی۔ نوربانو کے دماغ میں کوئی بات پھنس جاتی تو نکلتی ہی نہیں تھی۔

''میرے لئے اچھا کیا اور برا کیا.....؟'' اس نے بےزاری سے کہا۔

''میں نے تو تمہارے کہنے پر شادی کی ہے۔ اب جو بھی ہو۔''

نوربانو خوش ہو گئی۔

''آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں، جیسے میں نے آپ کے ساتھ کچھ برا کر دیا۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''

''ارے.....! کہیں اس بے چاری کو محروم تو نہیں رکھا آپ نے.....؟''

بات پھر وہیں آ گئی۔

''الحمد للہ! میں اللہ کے احکام کے ساتھ کھیل نہیں کرتا۔'' عبدالحق نے بھنا کر کہا۔

نوربانو کو احساس ہو گیا تھا کہ عبدالحق کی طبیعت مکدر ہو گئی ہے۔ لیکن وہ اسے دور کرنا بھی جانتی تھی۔ عبدالحق کے سلسلے میں تمام ہنر آتے تھے اسے، ذرا سی

دیر میں عبدالحق موم ہوگیا۔

پھر عبدالحق سو گیا۔

لیکن نور بانو جاگ رہی تھی۔ اسے اب نتائج اخذ کرنا تھے اور ان کا تجزیہ کرنا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ایک ہی بات ایک طرف تو اس کے لئے سکون بخش تھی تو دوسری طرف اس کے اندر آگ بھڑکا دیتی تھی۔

اس کے لئے اس بات کی بہت اہمت تھی کہ عبدالحق اور ارجمند ملیں۔ یہ نہ ہوتا تو اس کا کھیل ہی ٹھپ ہو جاتا۔ پھر اسے اولاد کہاں سے ملتی؟ تو وہ مطمئن تھی کہ امکان کا دروازہ کھل گیا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس پر جہنم کا دروازہ بھی کھل گیا تھا۔ وہ تصور میں عبدالحق کو ارجمند کے ساتھ دیکھ رہی تھی ..... اور تصور اس کا بے لگام تھا۔ جب آگ اسے جھلسانے لگتی تو وہ اس بچے کا تصور کرتی جو اس قربت کے نتیجے میں آئے گا، جو ارجمند کی کوکھ سے پیدا ہوگا، لیکن کہلائے گا اس کا۔ اس کی خاطر تو وہ کچھ بھی برداشت کر سکتی ہے۔

وہ ویسے ہی دیر سے سوتی تھی۔ اوپر سے یہ ادھیڑ بن۔ پھر نیند آئی بھی تو معمول کے مطابق گہری نیند نہیں تھی۔ اس کی پریشان خیالی اسے نیند میں خواب بن کر ستاتی رہی۔

پھر شاید کسی خواب ہی کی وجہ سے اس کی نیند اچٹ گئی۔ اس کی آنکھ کھلی، لیکن ایسے کہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پہلو کی طرف ہاتھ بڑھایا ..... عبدالحق کو چھونے کے لئے۔ لیکن بستر خالی تھا..... نہ صرف خالی، بلکہ وہ اسے ٹھنڈا بھی محسوس ہوا۔ جیسے عبدالحق کو بستر سے اٹھے دیر ہوگئی ہو۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئی تھیں۔

اس نے روشنی کی اور کلاک میں وقت دیکھا۔ صبح کے ساڑھے چار بجے تھے۔ اس نے بستر کو یوں دیکھا، جیسے اس کی اس طرح دیکھنے سے واں کسی طرح عبدالحق نمودار ہو جائے گا۔ لیکن ایسا ہونا تھا نہ ہوا۔

اس کے وجود میں ایک دم سے آگ بھڑک اٹھی۔ تو اب یہ بھی ہوگا۔ وہ بڑبڑائی۔

وہ اٹھی اور دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ اس کا رخ حمیدہ کے کمرے کی طرف تھا۔ اپنے اندر کی آگ پر وہ اس سوچ کا پانی ڈال رہی تھی کہ ارجمند اسے حمیدہ کے ساتھ سوتی ملے گی۔

لیکن حمیدہ کے کمرے پر نظر ڈالتے ہی اس کے جسم میں جیسے کوئی آتش فشاں پھٹ گیا۔ غم او غصہ اتنا شدید تھا کہ اس کے جسم کا پور پور کانپ رہا تھا۔ قدم اٹھانا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ وہ دونوں یکجا ہوں گے۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ کہاں ہوں گے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اضافی بیڈروم کی طرف بڑھی۔

اس کی توقع کے عین مطابق دروازہ بند تھا۔ تو یہاں رنگ رلیاں منائی جا رہی ہیں۔ اس نے سوچا۔

آخری حد تک خود پر قابو رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے دروازے کے لٹو کو نرمی سے تھاما اور بڑی آہستگی سے گھمایا۔

اس کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔ لٹو گھوم گیا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔

یعنی وہ خلوت کے تقدس کی باتیں کرنے والے کی خلوت میں داخل ہونے جا رہی تھی۔ اس کا تصور پھر بے لگام ہونے لگا۔

اس نے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ حیران رہ گئی۔ وہاں ارجمند نماز پڑھ رہی تھی۔

تو عبدالحق صاحب کہاں ہیں؟ اس کمرے کے علاوہ اور کہاں ہو سکتے ہیں وہ؟

وہ اندر داخل ہوئی اور باتھ روم کی طرف بڑھی۔ باتھ روم میں بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ پلٹی۔

اسی لمحے ارجمند نے سلام پھیرا۔ نور بانو پر نظر پڑی تو وہ متوحش ہوگئی۔

''کیا ہوا آپی! خیر تو ہے.....؟''

''عبدالحق صاحب کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ نہ جانے کہاں چلے گئے؟''

ارجمند کو اس کے لہجے میں پریشانی سے زیادہ وحشت محسوس ہوئی۔ پھر

نور بانو کے چہرے کے تاثر سے بھی بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اسے نور بانو پر ترس آنے لگا۔

''نماز کے لئے گئے ہوں گے آپی!'' اس نے دلاسہ دینا چاہا لیکن خود ہی تردید بھی کر دی۔

''لیکن نہیں! ابھی تو اذان میں کچھ دیر ہے۔''

وحشت ایسی تھی کہ نور بانو کو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ ارجمند نماز پڑھ رہی تھی۔

''تم کب سو کر اٹھیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی ذرا دیر پہلے۔''

''کیوں......؟ نیند نہیں آ رہی تھی کیا......؟''

ارجمند لاکھ سمجھ دار سہی، لیکن صالح بھی تھی اور معصوم بھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ صبح چار بجے اٹھنا اس کا معمول ہے۔ لیکن اس کے نزدیک یہ جتانے کے مترادف ہوتا کہ وہ باقاعدگی سے تہجد پڑھتی ہے۔ چنانچہ اس نے کہا۔

''نیند تو ٹھیک آئی تھی آپی! آج بس ذرا کچھ جلدی آنکھ کھل گئی۔''

''عبدالحق صاحب کی کمی محسوس ہو رہی ہوگی۔'' نور بانو نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں آپی!'' ارجمند نے کھسیا کر کہا۔

نور بانو کو زیادتی کا احساس ہو گیا۔ اس نے جلدی سے موضوع بدلا۔

''پتا نہیں کہاں چلے گئے اتنی رات کو؟''

''گھر میں ہی ہوں گے۔'' ارجمند نے کہا اور سوچا، رات کیسی، یہ تو صبح کا وقت ہے۔

''پورا گھر چھان مارا ہے میں نے۔''

''اپنے کمرے کے باتھ روم میں بھی دیکھا؟''

''نہیں......!''

''تو پریشان نہ ہوں۔ وہیں ہوں گے وہ۔''

نور بانو باہر نکلی اور اپنے کمرے کی طرف گئی۔ ادھر وہ کمرے داخل ہوئی اور ادھر عبدالحق باتھ روم کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔

اس کی شکی طبیعت نے پر رنگ دکھایا۔ ارجمند کو کیسے معلوم تھا کہ یہ باتھ روم میں ہوں گے۔ اس نے سوچا۔ ہو نہ ہو، یہ دونوں ملے ہوں گے۔ اس نے ایک پل بھی یہ نہیں سوچا کہ وہ خود اچھی نیند نہیں سوئی تھی۔ عبدالحق نے اگر دروازہ کھولا ہوتا تو وہ جاگ گئی ہوتی۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ وہ تو اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔

عبدالحق نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ارے......! تم جاگ رہی ہو...... اور وہ بھی اس وقت......؟''

نور بانو کوئی جلی کٹی بات کہنے والی تھی۔ لیکن اس نے بروقت خود کو روک لیا۔

''ہاں......! نیند اچٹ گئی ...... نہ جانے کیوں......؟''

''اور تم آ کہاں سے رہی ہو......؟''

''آپ کو تلاش کرنے نکلی تھی۔'' نور بانو نے بے ساختہ کہا۔

''مجھے......؟ میں تو غسل کر رہا تھا۔'' عبدالحق نے سادگی سے کہا۔ پھر اچانک ہی ایک لمحے میں بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

''اوہ......! میں سمجھ گیا۔ تمہاری آنکھ کھلی ہوگی، اور یہ دیکھ کر کہ میں بستر پر نہیں ہوں، تمہیں فوراً شک ہوا ہوگا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم سیدھی اماں کے کمرے کی طرف گئی ہوگی۔ وہاں تمہیں ارجمند بھی نظر نہیں آئی ہوگی، اور پھر تم پاگل ہو گئی ہوگی۔ تم نے......''

''ایسا کچھ نہیں ہوا۔'' نور بانو نے اس کی بات کاٹ دی۔

مگر عبدالحق رکا نہیں۔

''...... تم نے ایک ایک کمرہ چیک کیا ہوگا، اور بالآخر ارجمند تمہیں نماز پڑھتی ملی ہوگی۔''

نور بانو اپنی تردید بھی بھول گئی۔

''یہ آپ کو کیسے معلوم ہے؟'' اس نے بے ساختہ پوچھا۔

''اس لئے کہ یہ اس کا روز کا معمول ہے۔ مگر تم تو اپنی شکی فطرت سے مجبور ہو۔''

''یہ اتنی بڑی بات کیسے کہہ رہے ہیں آپ ....؟'' نور بانو نے تیز لہجے میں کہا۔

''ایسے کہ اگر تمہاری آنکھ کھلی اور تم نے مجھے بستر پر نہ پایا تو اوّل تو اس میں پریشانی کی کوئی بات ہی نہیں۔ اور اگر تمہیں پریشانی ہوئی بھی تو فطری طور پر سب سے پہلے تمہیں باتھ روم کو چیک کرنا چاہئے تھا۔ لیکن جب آدمی شک کی آگ میں جل رہا ہو تو سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے تم کمرے کا دروازہ کھول کر مجھے وہاں تلاش کرنے کے لئے دوڑ گئیں، جہاں تمہیں اندیشہ تھا کہ میں موجود ہوں گا۔''

نور بانو لپکی اور اس سے لپٹ گئی۔

''بے بات کا افسانہ بنانا کوئی آپ سے سیکھے۔'' اس نے اٹھلا کر کہا۔ وہ جانتی تھی کہ عبدالحق نے اسے آر پار دیکھ لیا ہے، اور اب اس تاثر کو زائل کرنے کی اور کوئی صورت نہیں۔

لیکن عبدالحق نے نرمی سے اسے خود سے علیحدہ کر دیا۔

''میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔ اب تم سکون سے لیٹ کر سو جاؤ۔''

نور بانو نے غور سے اسے دیکھا۔ یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ وہ طنز نہیں کر رہا ہے۔

''ویسے اگر تم غسل کر لو تو بہتر ہے۔'' عبدالحق نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

نور بانو نے ایک انگڑائی لی اور بستر پر دراز ہو گئی۔ پہلے نیند تو پوری کر لوں۔ وہ بڑبڑائی۔ غسل تو ہوتا رہے گا۔

اور اس بار وہ بے سدھ ہو کر سوئی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق کو لاہور آئے پندرہ دن ہو چکے تھے۔ اب صرف پندرہ دن کی چھٹیاں باقی تھیں۔ مہمان داری ختم ہو چکی تھی۔ زندگی نئے معمولات اختیار کر چکی تھی۔

حمیدہ بہت خوش تھی۔ وہ باقاعدگی سے شکر کے نوافل ادا کر رہی تھی۔ ارجمند اس کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ ایسی ہی بہو کی تو اسے آرزو تھی۔ وہ اللہ کا جتنا شکر ادا کرتی کم تھا۔

پھر اسے گزشتہ رات بابا کا خیال آیا، جس نے اس کی راہنمائی کی تھی، اور اسے خوش خبری سنائی تھی۔ اسے شرمندگی ہونے لگی۔ اسے یہ خیال ہی نہیں آیا کہ جا کر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔

لیکن ایک بات عجیب ہوئی تھی۔ بڑی خوش خبری بھی اسے مل گئی تھی، جس کی وہ برسوں سے منتظر تھی۔ لیکن توقع کے برعکس خوش خبری ارجمند کی طرف سے نہیں، نور بانو کی طرف سے آئی تھی۔ بہر حال اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ بلکہ یہ تو اور خوشی کی بات تھی۔ کون جانے، اسے ایک ساتھ دو پوتے ملیں۔

نور بانو نے اسے خوش خبری سنائی تو اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

''ایک خوش خبری ہے اماں ....! بہت بڑی خوش خبری۔ بوجھو تو جانوں!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

اور حمیدہ کے نزدیک خوش خبری تو بس ایک تھی۔ سو اس نے جھٹ سے کہا۔

''ارجمند کے ہاں ....''

''نہیں اماں ....!''

حمیدہ مایوس ہو گئی۔ اور کسی خوش خبری سے اسے کیا غرض تھی۔

''تو پھر ....؟'' اس نے بے دلی سے پوچھا۔

''سوچو اماں ....! ایسی خبر ہے کہ سنو گی تو نہال ہو جاؤ گی۔''

حمیدہ کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ لیکن نور بانو کا دل رکھنے کے خیال سے وہ چند لمحے چہرے پر غور و فکر کا تاثر سجائے بیٹھی رہی۔ پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''مجھے تو کچھ نہیں سوجھ رہا ہے بیٹی!''

''اللہ نے میری نیک نیتی، میری قربانی قبول کر لی اماں! اور مجھے اس کا بہترین صلہ دے دیا۔''

''کیا مطلب......؟''

''میں ماں بننے والی ہوں اماں!''

حمیدہ چند لمحے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

نوربانو اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے اماں......! تمہیں خوشی نہیں ہوئی......؟''

''ارے......! اس سے بڑی اور خوشی کیا ہوگی۔ مجھے تو یقین نہیں آ رہا ہے۔ سچ کہہ رہی ہے تو......؟''

''ہاں اماں......! بالکل سچ......!''

حمیدہ نے اسے لپٹا لیا۔

''سچ کہتی ہو، اتنی خوشی تو مجھے ارجمند کی خوش خبری سے بھی نہ ہوتی۔'' اس نے بڑی سچائی سے کہا۔

''کیسی آرزو تھی مجھے کہ تیری گود ہری ہو۔ اللہ کا شکر ہے۔''

اس لمحے حمیدہ کے خلوص اور محبت نے نوربانو کے دل کو چھو لیا۔

''اللہ کرے، ایسا ہی ہو پتری! لیکن کسی اور کو ابھی نہ بتانا۔ دیکھ نا! کبھی کبھی بے قاعدگی بھی تو ہو جاتی ہے۔''

''بس تمہیں بتایا ہے اماں......! اور ان کو۔ ویسے مجھے یقین ہے، میرے معاملات میں آج تک کبھی بے قاعدگی نہیں ہوئی۔ ایک ہفتہ اوپر ہو چکا ہے اماں......!''

''اللہ کا شکر ہے پتری!'' حمیدہ نے کہا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا۔

''عبدالحق تو بہت خوش ہوا ہوگا؟''

''بہت زیادہ اماں......! بچوں کی طرح خوش ہو رہے تھے وہ تو۔''

''اللہ مبارک کرے بیٹی......!''

حمیدہ کا ویسے ہی بابا کے پاس جانے کا ارادہ تھا۔ اس خوش خبری کے بعد تو وہ راسخ ہو گیا۔ اس نے نسیمہ کو بلایا۔

''نوریز سے کہو کہ گاڑی نکالے۔''

''کہاں جائیں گی بیگم صاحبہ......!''

''بابا کے پاس......!''

راستے میں اس نے مٹھائی کا بڑا ڈبہ لے لیا۔

بڑے کمرے میں بہت ہجوم تھا۔ اس بار اسے کوئی رعایت نہیں ملی۔ چار گھنٹوں کے بعد کہیں اس کی باری آئی۔

وہ اندرونی کمرے میں داخل ہوئی اور بابا کو سلام کیا۔ بابا نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔

''مبارک ہو! تجھے تیرے دل کی مراد مل گئی۔ یہ اچھی بات ہے کہ تو اللہ کا شکر ادا کرتی ہے۔ میرا شکریہ ادا کرنے کے لئے آئی ہے۔ لیکن اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔''

''اللہ نے بندے کا شکریہ ادا کرنے کا بھی تو حکم دیا ہے بابا......!''

''یہ اور بھی اچھی بات ہے۔'' بابا نے خوش ہو کر کہا۔

''تجھ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔ اس نے تجھے اچھا بنایا ہے۔''

''اس کا کرم ہے بابا......!'' حمیدہ نے کہا۔ پھر جھجکتے ہوئے بولی۔

''میں مبارک باد کی مٹھائی لائی ہوں بابا......!''

''ٹھیک ہے، ادھر لا۔''

حمیدہ نے ڈبہ بابا کو دے دیا۔ بابا نے ڈبہ کھولا، ایک لڈو نکالا اور اس میں سے تھوڑا سا اپنے منہ میں رکھ لیا۔ باقی لڈو اس نے حمیدہ کی طرف بڑھایا۔

''لے...... یہ تو کھا لے۔ اللہ تجھے خوش رکھے اور اپنے پیاروں میں شامل فرمائے۔''

حمیدہ نے وہ لڈو منہ میں رکھ لیا۔

اسی لمحے بابا کی خدمت گار عورت کمرے میں آئی۔

"کیا حکم ہے بابا.....!"

بابا نے مٹھائی کا ڈبہ اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ لے جا! خود بھی کھانا اور سب لوگوں کو بھی کھلانا۔"

عورت ڈبہ لے کر باہر چلی گئی۔ حمیدہ نے شرمندگی سے کہا۔

"مٹھائی اتنی زیادہ تو نہیں ہے بابا.....!"

"نیت اچھی ہو تو ہر چیز میں برکت ہوتی ہے۔ تو فکر نہ کر۔ سب کو حصہ ملے گا۔"

"اللہ نے بڑا کرم فرمایا ہے بابا.....!" حمیدہ نے کہا۔

"لگتا ہے کہ مجھے ایک ساتھ دو پوتے ملیں گے۔"

بابا ایک لمحہ خاموش رہا، پھر بولا۔

"پوتے تو انشاء اللہ تجھے دو ہی ملیں گے۔ لیکن دس برس کے وقفے سے۔"

"میں سمجھی نہیں بابا.....!"

"تجھے کیا ضرورت ہے سمجھنے کی.....؟ کھیل تو جاری ہے۔ نیچے والے اپنا کھیل رہے ہیں۔ کھیلنے دے انہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ کا ناؤ تیرتی رہے گی، بلکہ بھی لگ جائے گی۔ اللہ کی مرضی ہے تو وہ ان کی مدد بھی کر رہا ہے، پردہ بھی رکھ دیا ہے۔ لیکن جھوٹ سچ سے کبھی جیت نہیں سکتا۔"

حمیدہ کا دل پریشان ہوگیا۔ بابا کی بات میں جو اشارہ تھا، وہ کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

"تو پریشان نہ ہو۔ تو آم کھا، پیڑ گننے کی کیا ضرورت ہے؟ سب کچھ اللہ پر چھوڑ دے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے بابا! آپ میرے اور میرے پیاروں کے لئے دعا کرتے رہیں گے نا.....؟"

"انشاء اللہ.....! اور ہاں.....! اگلی بار مت آنا۔ اب میں تجھ سے کبھی نہیں ملوں گا۔"

"کیوں بابا.....! ناراض ہوگئے ہو.....؟"

"نہیں.....! ناراض نہیں ہو۔ بس جو کہہ دیا، وہ مان لے۔"

حمیدہ سلام کر کے باہر نکل آئی۔

گھر واپس جاتے ہوئے وہ بابا کی بات پر غور کرتی رہی۔ ایک بات کا اسے یقین ہوگیا..... یہ کہ نور بانو جھوٹ بول رہی ہے۔ لیکن کیوں؟ اور اسے اتنے بڑے جھوٹ کو وہ کیسے نبھا سکے گی؟ یہ بات کسی طرح اس کی سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ چاند چڑھتا ہے تو دنیا دیکھتی ہے۔

پھر اسے بابا کی بات یاد آئی۔ اللہ کی مرضی ہے تو وہ ان کی مدد بھی کر رہا ہے، پردہ بھی رکھ رہا ہے۔

لیکن کیوں.....؟ کیسے اور کب تک.....؟

اور بابا نے آخر میں کہا تھا، جھوٹ سچ سے کبھی جیت نہیں سکتا۔

❁ ❁ ❁

نور بانو کو احساس ہو رہا تھا کہ اس نے بہت جلد بازی سے کام لیا ہے۔ حمیدہ ٹھیک ہی کہتی تھی کہ وہ بڑی کم ظرف ہے۔ اس سے رہا نہیں گیا، اور جیسے ہی اسے ارجمند کی طرف سے مثبت اشارے ملے، اس نے عبدالحق اور حمیدہ کو خود سے منسوب کر کے وہ خوش خبری سنا دی۔

عبدالحق کی خوشی کی تو کوئی حد نہیں تھی۔ وہ تو جیسے ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔

ارجمند کو تو اس نے پکا کر دیا تھا۔ یہ طے تھا کہ وہ کسی سے کچھ نہیں کہے گی۔ لیکن درحقیقت اس نے بے صبرے پن سے کام لیا تھا۔ ایک تو یہ معاملہ کسی طرح بھی آسان نہیں تھا، بلکہ نہایت پیچیدہ تھا۔ اس پر اس کی کم ظرفی۔ عبدالحق کے جانے میں ابھی بارہ دن باقی تھے، اور اس کی تاریخ صرف تین دن کے فاصلے پر تھی۔ اسے وہ کیسے چھپا سکے گی۔

اس کے دل میں ہول اٹھتے رہے۔ وہ مسکرانا تک بھول گئی۔ دو دن باقی رہ گئے تھے۔ پھر اچانک اللہ کی طرف سے مدد آ گئی۔

گاؤں سے آنے والی ایک بری خبر اس کے لئے امداد بن گئی۔ دل کا دورہ پڑنے سے اچانک ڈاکٹر محمد واسطی کا انتقال ہوگیا تھا۔ اکبر اور فرزانہ کی شادی کے

بعد ان لوگوں کے لئے ڈاکٹر صاحب کی حیثیت گھر کے فرد کی سی تھی۔ عبدالحق تو ان کا بہت ہی زیادہ احترام کرتا تھا۔ بلکہ سچ پوچھو تو اسے ان سے بہت محبت تھی۔ جس صورت حال میں انہوں نے زرینہ کو اپنی بہو کی حیثیت سے قبول کیا، وہ اسے کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں، انہوں نے اس کے بے عزتی کے احساس کو زائل کرنے کے لئے اپنا وہ زخم اس کے سامنے کھول دیا، جسے لوگ کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ وہ بہت عالی ظرف، بہت بڑے انسان تھے۔

روانگی کا مرحلہ آیا تو حمیدہ نے عبدالحق سے کہا۔

''نکی کو یہیں رہنے دے پتر! اس کا وہاں جانا مناسب نہیں۔''

''کیوں اماں ....؟''

''نئی نویلی دلہن ہے، اور وہ موت کا گھر ہے۔''

''یہ سب بے کار کی باتیں ہیں، ہندوانہ توہمات ہیں اماں!'' عبدالحق نے اختلاف کیا۔ ایسا بہت ہی کم ہوتا تھا کہ وہ حمیدہ کی بات رد کرے۔ لیکن اس وقت اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

''موت کوئی چھوت کی، لگنے والی بیماری نہیں ہوتی۔ وہاں ہماری فرزانہ بھی ہے، جسے ڈاکٹر صاحب نے باپ کی محبت دی تھی۔ وہ ان کے صدمے سے نڈھال ہو رہی ہوگی۔ ارجمند اور نوربانو سے مل کر اس کا غم ہلکا ہوگا۔ اور پھر ہم یہاں ارجمند کو کس کے پاس چھوڑ کر جائیں گے۔ یہاں ملازموں کے سوا تو کوئی ہوگا نہیں۔''

حمیدہ نے اختلاف نہیں کیا۔ بات معقول تھی۔ وہ سب حق نگر کے لئے روانہ ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے حق نگر کے لئے اتنا کچھ کیا تھا کہ وہ عبدالحق کے بعد وہاں کے سب سے زیادہ چاہے جانے والے آدمی تھے۔ پوری آبادی واں امنڈ آئی تھی۔ عبدالحق سے ملنے والوں کا بھی ہجوم تھا۔ برسوں کے بعد وہ وہاں آیا تھا۔

وہیں نوربانو کے ایام شروع ہو گئے۔ وہ خوش تھی کہ بغیر کسی تردد اور پریشانی کے اس کا پردہ رہ گیا۔

تین دن گزارنے کے بعد واپسی کی بات ہوئی۔ حمیدہ نے صاف انکار کر دیا۔

''میں تو عدت کے پورے دنوں میں صفیہ کے ساتھ رہوں گی۔'' اس نے کہا۔

''اس اتنے بڑے دکھ میں اسے اکیلا کیسے چھوڑ دوں میں ....؟''

یہ نوربانو کے لئے اور بڑی خوشی تھی۔ بغیر کچھ کئے اس کی ایک اور مشکل خود بخود آسان ہوگئی تھی۔ حمیدہ کی موجودگی میں بہرحال پیچیدگیاں تو پیدا ہوتی تھیں۔ لیکن یہ کانٹا خود بخود نکل گیا تھا۔

عبدالحق اس معاملے میں بحث نہیں کر سکتا تھا۔

نوربانو نے کہا۔

''میں بھی کم از کم ایک ہفتہ یہاں رکوں گی۔ ورنہ زرینہ بالکل اکیلی رہ جائے گی۔''

حمیدہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ کیا یہ وہی خودغرض لڑکی ہے؟ آج یہ دوسروں کی فکر کر رہی ہے۔ بہرحال اسے خوشی ہوئی۔

''تم جانتی ہو کہ میری چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں۔'' عبدالحق کے لہجے میں شکایت تھی۔

''نو دن بعد میری واپسی ہے۔''

''میں دو دن پہلے آجاؤں گی، آپ فکر نہ کریں۔''

''تو ہم بھی یہیں رک جاتے ہیں۔ ساتھ ہی چلیں گے۔'' عبدالحق نے کہا۔

یہ نوربانو کو کیسے گوارہ ہوتا۔ اس طرح تو ایک بڑی آسانی الٹا بڑی دشواری میں تبدیل ہو جاتی۔

''جی نہیں ....! آپ ارجی کو لے کر واپس جائیں گے۔ وہ بے چاری نئی نویلی دلہن ہے۔ اسے گھمائیں، پھرائیں، سیر کرائیں۔ اس کے ساتھ بہت اچھا وقت گزاریں۔''

اس لمحے حمیدہ کو لگا کہ نور بانو سچ مچ ماں بننے والی ہے، اور اتنی بڑی خوشی ملی ہے تو اس میں ظرف بھی پیدا ہوگیا ہے۔ ویسے ارجمند سے تو وہ سچ مچ بہت محبت کرتی تھی۔ لیکن ایسی محبت!

''لیکن نور بانو.....'' عبدالحق نے کچھ کہنا چاہا۔

''میں اب کچھ نہیں سنوں گی۔'' نور بانو نے اس کی بات کاٹ دی۔

''شادی میں نے ہی کرائی ہے اور ارجی میری ذمہ داری بھی ہے۔''

''نور بانو ٹھیک کہہ رہی ہے پتر!'' حمیدہ نے بھی تائید کی۔ یوں فیصلہ ہوگیا۔

نور بانو بہت خوش تھی۔ اس کی مشکل بھی آسان ہوگئی تھی، اور اس نے اعلیٰ ظرفی کی مثال بھی قائم کر دی تھی۔

❁ ❁ ❁

وہ ایک ہفتہ ارجمند کی زندگی کا سب سے خوش گوار اور یادگار عرصہ تھا۔

اس ہفتے کے ایک ایک لمحے میں عبدالحق اسی کے ساتھ تھا۔ وہ باہر تفریح کے لئے بھی گئے۔ انہوں نے قرآن پر بات کرتے ہوئے بھی وقت گزارا۔ ان کے باہمی تعلق میں اس قدر تنوع تھا کہ اکتاہٹ یا بے زاری کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

اس ایک ہفتے میں عبدالحق کی سمجھ میں بہت کچھ آ گیا۔ اس پر یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ اپنی کم عمری کے باوجود ارجمند ایسی مثالی بیوی ہے، جو اپنے شوہر کی آخرت کی ہر لحہ فکر کرتی ہے، ہر لمحہ خیال رکھتی ہے۔ لیکن اس نے یہ بات بھی سمجھ لی کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ وہ آنکھیں بند کرتا تو اس کے تصور میں عکس نور بانو کا ہی ابھرتا تھا۔

اسے خوشی تھی کہ وہ اپنی محبت میں سچا نکلا۔

کراچی سے کلکٹر صاحب کا فون آیا۔ انہوں نے اسے یاد دلایا کہ اسے مقررہ تاریخ پر آفس پہنچنا ہے۔

''آپ بے فکر رہیں جناب! میں انشاء اللہ پہنچ جاؤں گا۔ میں وعدہ کرتا

ہوں تو پورا بھی کرتا ہوں۔ البتہ اللہ کو منظور نہ ہو تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔''

''دیکھو! یہ ہیں حیلے بہانے کی باتیں۔'' کلکٹر صاحب نے کہا۔

''جی نہیں سر.....! یہ حقیقت ہے۔ بندہ اتنا ہی کر سکتا ہے، جتنا اس کا اختیار ہے۔ اصل چیز اللہ کی مرضی اور منظوری ہے۔''

''یہی تو خرابی ہے ہمارے ہاں.....!'' کلکٹر صاحب نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی مجھے حیلہ ساز یا جھوٹا سمجھے۔'' عبدالحق نے سرد لہجے میں ان کی بات کاٹ دی۔

''کہیں تو میں اپنا استعفٰی بھجوا دوں آپ کو۔''

''ارے بھئی.....! برا مت مانو۔'' کلکٹر صاحب نے جلدی سے کہا۔

''لوگ اللہ کے نام کو اسی طرح اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اب کون سچا ہے اور کون جھوٹا؟ یہ کسی کی پیشانی پر تو نہیں لکھا ہوتا۔''

''میں تو اپنی بات کر رہا ہوں۔ دوسروں سے میرا کوئی واسطہ نہیں، آپ فرمائیں، کیا حکم ہے میرے لئے؟''

''میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' کلکٹر صاحب نے کہا اور فون رکھ دیا۔

ان کی قربتوں کا ایک ہفتہ پورا ہوگیا تھا۔ نور بانو بھی گاؤں سے واپس آ گئی تھی۔

ارجمند سے اکیلے میں ملی تو نور بانو نے اس سے پوچھا۔

''کیسا وقت گزارا ارجی!''

''جی.....! اللہ کا شکر ہے۔''

نور بانو احسان جتانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔

''وہاں میرا رکنا کچھ ایسا ضروری نہیں تھا۔'' اس نے کہا۔

''لیکن میں جان بوجھ کر رک گئی..... تمہاری خاطر، کہ تمہیں ان کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع مل جائے۔''

''میں آپ کی **احسان مند** ہوں آپی.....!'' ارجمند نے تشکر سے کہا۔

''بہنوں کے درمیان احسان کیسا.....؟'' نور بانو بولی۔ پھر فوراً ہی وہ

مطلب کی بات پر آ گئی۔

''اب ان کے جانے میں صرف دو دن ہیں۔''

ارجمند اس کا مطلب سمجھ گئی۔

''اور یہ دو دن صرف آپ کے ہیں آپی......!'' اس نے کہا۔

''نہیں ......! اصولاً تو ان میں سے ایک تمہارا ہے۔''

''آپ مجھے پہلے ہی میرے حق سے زیادہ دے چکی ہیں۔''

''پھر وہی بات......! میں نے کہا نا کہ بہنوں کے درمیان حساب کتاب نہیں ہوتا۔''

''وہ تو آپ کر رہی ہیں۔ میں تو محبت اور خوشی سے یہ آپ کو دے رہی ہوں۔''

''سچ کہو......! تمہیں ملال تو نہیں اس کا......؟''

''آپ کی خاطر تو میں اپنی عمر بھر کی باریاں آپ کو دے سکتی ہوں آپی......!'' ارجمند نے پوری سچائی سے کہا۔

نور بانو نے اسے لپٹا لیا۔

''تم بہت اچھی بہن ہو میری۔''

❁ ❁ ❁

نور بانو بہت خوش تھی۔ قدرت نے اس کے لئے تمام معاملات آسان کر دیئے تھے۔ حمیدہ کا کانٹا بھی دور ہو گیا تھا۔ اب وہ پُر اعتماد تھی کہ اسے اتنے بڑے فریب کو بھی وہ کامیابی سے نبھا سکے گی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ارجمند اس کی مٹھی میں تھی۔

اس رات عبدالحق کو بھی بڑی شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ ایک لمبی جدائی درپیش ہے۔ وہ جوش سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن اسے احساس ہو رہا تھا کہ نور بانو کا دھیان کہیں اور لگا ہے۔

''نور......! میں کراچی میں اکیلا نہیں رہنا چاہتا۔'' اس نے کہا۔

''یا تم میرے ساتھ چلو یا ارجمند کو بھیج دو۔''

نور بانو یہ سن کر بھڑک گئی۔

''صاف صاف کہیں نا کہ ارجمند کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں آپ......!''

''نہیں......! میری پہلی ترجیح تو تم ہو۔'' عبدالحق نے برا مانے بغیر کہا۔

نور بانو کے لئے یہ ممکن ہوتا تو وہ ضرور ایسا ہی کرتی۔ لیکن اس کا اور ارجمند کا ایک ساتھ رہنا ضروری تھا۔

''مگر یہ ممکن نہیں ہے عبدالحق صاحب!'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''مگر ایسی حالت میں......''

عبدالحق نے اس کی بات کاٹ دی۔

''اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ ارجمند کو میرے ساتھ بھیج دو۔''

''آپ اتنا اصرار کیوں کر رہے ہیں......؟''

''بیوی کی موجودگی میں شوہر کا اس سے دور ہونا کوئی اچھی بات نہیں۔ یہ اللہ کا حکم بھی ہے کہ اسے اس آدمی آزمائشوں اور فتنوں سے محفوظ رہتا ہے۔''

اس پر نور بانو کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ وہ تو ویسے ہی شکی طبیعت کی تھی، اور عبدالحق نے بڑی بات کہی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ سب کچھ بھول کر عبدالحق کے ساتھ چلی جائے۔ لیکن اس طرح تو سب کئے کرائے پر پانی پھر جاتا۔ اس کا کھیل ہی چوپٹ ہو جاتا۔

''میں بلا جھجک ارجمند کو آپ کے ساتھ بھیج دیتی۔'' اس نے لہجے میں محبت سموتے ہوئے کہا۔

''لیکن مجھے ارجمند کی بہت ضرورت ہے، اور یہ بات تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں کتنی خودغرض ہوں۔''

''خیر یہ تو غلط ہے۔ لیکن تمہارے ساتھ تو سب لوگ ہیں۔ پھر ارجمند کی ایسی کیا ضرورت ہے؟''

ارجمند کی اہمیت تو وہ عبدالحق کو نہیں بتا سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے بے حد اداس لہجے میں کہا۔

"میرا پہلا پہلا موقع ہے۔ میں خوفزدہ بھی ہوں۔ ایسے میں لوگوں کی تعداد کی اہمیت نہیں ہوتی۔ اپنے قریبی لوگوں کا، محبت کرنے والوں کا سہارا چاہئے ہوتا ہے۔ اب اماں تو چار ساڑھے چار مہینے گاؤں میں رہیں گی۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ارجمند کو میں اپنی سگی بہنوں کی طرح چاہتی ہوں۔ ایسے میں وہی ایک سہارا ہوگی میرے لئے۔"

عبدالحق قائل ہوگیا۔ اپنی بات کی سچائی تو نور بانو اس کے نزدیک ارجمند سے اس کی شادی کرا کے ثابت کرا چکی تھی۔ نور بانو کی بات بالکل درست تھی۔ اماں کی غیر موجودگی میں ارجمند ہی نور بانو کے لئے سب کچھ تھی۔

"چلو ٹھیک ہے......!" اس نے خوش دلی سے کہا۔

لیکن قربت کے لمحوں میں ایک بار پھر عبدالحق کو تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ نور بانو کا دھیان واقعی کہیں اور تھا۔

"کیا بات ہے نور......! کوئی اور بوجھ بھی ہے تمہارے ذہن پر......؟"

نور بانو نے عبدالحق سے اہم ترین بات کرنی تھی۔ اور وہ موقع نکالے بغیر وہ بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اب موقع مل رہا تھا۔

"جی ہاں......! ہے تو، لیکن بہت خوش گوار اور خوب صورت بوجھ۔"

"تو اسے بھی ہلکا کر دو۔"

"میں اپنے اور آپ کے بچے کے بارے میں باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

عبدالحق مسکرا دیا۔

"یہ تو مجھے بھی بہت اچھا لگے گا۔ کرو نا......!"

"میں چاہتی ہوں کہ وہ ایسا ہو کہ دنیا میں اس جیسا دوسرا بچہ نہ ہو۔"

"تم کیسا دیکھنا چاہتی ہو اسے......؟"

"بہت خوب صورت، بہت حسین......!"

عبدالحق پر ارجمند اور نور بانو کا فرق پھر واضح ہونے لگا۔ دونوں واقعی ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ نور بانو دنیا دار تھی، سو وہ ظاہری حسن کے بارے میں ہی سوچ سکتی تھی۔ جبکہ ارجمند کو بچے کی تربیت کی فکر تھی۔ اس کا مقصد اسے اچھا مسلمان بنانا

تھا۔

"اور آپ کیا چاہتے ہیں......؟" نور بانو نے اسے چونکا دیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ وہ تم جیسا ہو۔"

"تو پھر خوب صورت کہاں سے ہوگا وہ۔ میں تو ایسی ہی ہوں، واجبی سی۔"

"کبھی میری نظر سے دیکھو خود کو۔"

"مگر میں چاہتی ہوں کہ میرے بچے کو دشمن بھی دیکھے تو اسے خوب صورت کہنے پر مجبور ہو۔"

"تو اس کے لئے دعا کرو۔"

"دعا کے ساتھ کوشش بھی تو ضروری ہوتی ہے۔"

"کیسی کوشش......؟"

"عورت بے فکر اور خوش رہے۔ اچھے ماحول میں رہے، جہاں گرد و پیش خوب صورت ہو، تاکہ اس کی سوچیں بھی خوب صورت ہوں۔ کہتے ہیں، ہر چیز، ہر سوچ کا عکس پڑتا ہے بچے پر۔"

"ارے......! یہ سب تمہیں کس نے بتا دیا......؟" عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

"سب جانتی ہوں پہلے سے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ ایسا ماحول بنا لینا۔"

"مجھے مری کا خیال آتا ہے۔" نور بانو نے خواب ناک لہجے میں کہا۔

"کیا میں مری نہیں جا سکتی......؟"

"کیوں نہیں......!" عبدالحق نے کہا۔ لیکن اس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"مگر وہاں طبی سہولتوں کی بہت کمی ہوگی۔"

نور بانو وہاں جانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہاں شمریز کا پورا گھرانا موجود تھا، جو اس کے راز کو راز نہیں رکھتا۔ اس نے تو مری کا تذکرہ ایک خاص مقصد کے تحت

چھیڑا تھا۔ بات وہ عبدالحق سے ہی کہلوانا چاہتی تھی۔

اور اس کا مقصد پورا ہو گیا۔

''لیکن ایبٹ آباد بہت مناسب رہے گا۔'' عبدالحق نے جوش سے کہا۔

''بہت ہی خوب صورت جگہ ہے۔ فوج کا شہر ہے۔ وہاں تمام طبی سہولتیں بھی موجود ہیں۔ ہمارا بنگلہ بھی ہے وہاں۔''

''سوچ لیں......!''

''سوچنے کی کیا بات ہے......؟ نوریز وہاں تم لوگوں کے ساتھ رہے گا۔''

''ایسی حالت میں نوریز کا سامنا......''

''پگلی ہو تم تو...... وہ سرونٹ کوارٹر میں رہے گا۔ باہر کے کام کرے گا۔ گھر سنبھالنے کے لئے عورتیں بھی مل جائیں گی تمہیں۔ چاہو گی تو لیڈی ڈاکٹر گھر پر آ جائے گی۔ کسی قسم کی پریشانی نہیں ہو گی تمہیں۔ میں نوریز سے کہہ کر تمہارے اور ارجمند کے بینک اکاؤنٹ بھی کھلوا دوں گا وہاں۔''

''بس تو ٹھیک ہے۔ آپ کے جاتے ہی ہم ایبٹ آباد چلے جائیں گے۔''

''اتنی جلدی کیا ہے......؟'' عبدالحق کے لہجے میں حیرت تھی۔

''میں تمام وقت وہاں گزارنا چاہتی ہوں۔''

''چلو...... ٹھیک ہے۔''

''ایک بات بتائیں۔ آپ نے یہ خوش خبری کسی کو سنائی ہے؟''

''نہیں......! تم کیوں پوچھ رہی ہو......؟''

''کسی کو بتایئے گا نہیں، اماں کہہ رہی تھیں، نظر بھی لگ جاتی ہے۔''

''میں ایسا بتانے والا کہاں؟ مجھے تو شرم آتی ہے۔''

یوں نور بانو کو رابعہ اور زبیر کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ ورنہ وہ سوچتی کہ زبیر بھائی کو تو وہ پردہ کرنے کے بہانے سے روک دے گی لیکن رابعہ کے لئے اس کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔

اب ایک مرحلہ اور رہ گیا تھا۔

''آپ ہمارے بغیر اتنے عرصے رہ لیں گے......؟'' اس نے پوچھا۔

''جب موقع ملے گا، میں تم سے ملنے کے لئے آ جایا کروں گا۔''

''نہیں......! یہی تو میں نہیں چاہتی۔''

عبدالحق نے حیرت سے اور صدمے سے اسے دیکھا۔

''کیوں بھئی...... ! یہ تو ظلم ہو گا۔''

''مجھے اس پر معاف کر دیجئے گا۔'' نور بانو نے شرمندہ نظر آنے کی کوشش کی۔

''دراصل میں نے منت مانی تھی کہ اللہ نے مجھ پر یہ کرم فرمایا تو میں ماں بننے سے پہلے آپ کے سامنے نہیں آؤں گی۔''

''یہ تو بہت بری بات ہے۔ اس کی کوئی تک ہی نہیں تھی۔''

''غلطی ہو گئی۔ چلیں کوئی بات نہیں۔ میں منت توڑ دوں گی۔ میں خود بھی آپ کے بغیر کہاں رہ سکتی ہوں۔ اصل میں تو یہ میں نے خود پر ظلم کیا ہے۔''

عبدالحق نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔

''عہد شکنی اور زیادہ بری بات ہے۔ اب منت مانی ہے تو اسے نبھاؤ بھی۔''

''جی بہت بہتر......!'' نور بانو نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ لیکن حقیقت وہ خوش اور مطمئن تھا۔ اللہ اس کھیل میں ہر قدم پر اس کی مدد کر رہا تھا۔

سکون ایسا تھا کہ اس رات خلافِ معمول وہ جلدی سو گئی۔

❁ ❁ ❁

حمیدہ بڑی وضع دار عورت تھی۔ ایک تو ڈاکٹر صاحب اور صفیہ سے ویسے ہی تعلق تھا۔ دوسرے رشتہ بھی ایسا تھا کہ اسے نبھانے کی بڑی اہمیت تھی۔ زرینہ عبدالحق کی بہن اور اس کی بیٹی تھی۔ چنانچہ وہ بڑے خلوص سے وہاں رکی تھی۔ اور اسے یہ بھی احساس تھا کہ اس کا یہاں رکنا بہت فائدہ مند ثابت ہو رہا ہے۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب کی اتنی طویل رفاقت کے بعد یہ تنہائی صفیہ کو شاید مار ہی ڈالتی۔

جب بھی صفیہ اداس اور ملول ہوتی، وہ ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی۔ دکھ ایسے ہی تو بٹتا ہے۔

لیکن اس خوشی کا خیال اس کے ذہن سے کبھی نہیں ہٹتا تھا، جو اللہ کی طرف سے اسے ملنے والی تھی...... عبدالحق کی اولاد، وہ اس کے بارے میں سوچتی تو اس کا وجود ہیجان سے چھلکنے لگتا۔ اور عجیب بات تھی۔ وہ سوچتی تو بس اس کے ذہن میں ایک ہی لفظ آتا۔ عبدالحق کا بیٹا! اور فوراً ہی اسے خیال آتا کہ ضروری تو نہیں کہ بیٹا ہی ہو۔ یہ تو اللہ کی دین ہے۔ ایک نعمت ہے تو دوسری اللہ کی رحمت۔ اور سچ یہ ہے کہ رحمت نعمت سے بڑی ہوتی ہے۔ وہ بہت وسیع ہوتی ہے۔

پھر یہ عبدالحق کا بیٹا! جیسے نور بانو سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ اس نے کئی بار خود کو ٹوکا، سمجھایا۔ لیکن جب بھی خیال آیا تو وہ عبدالحق کا بیٹا، وہ ہار گئی۔

اسے ضمیر پر بوجھ محسوس ہونے لگا۔ یہ تو نور بانو کے ساتھ زیادتی تھی۔ اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں، جیسے وہ بس غرض پوری کرنے کا کوئی وسیلہ ہو۔ ایسا ہے تو نہیں۔ اس کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود وہ نور بانو کو بیٹیوں ہی کی طرح چاہتی تھی۔

پھر اسے ارجمند کا خیال آتا۔ ارجمند سے اسے ایسی محبت تھی، جیسی اولاد کی اولاد سے ہوتی ہے۔ سو یہ طے تھا کہ وہ ارجمند کو نور بانو سے بہت بڑھ کر چاہتی ہے۔ اور اب اس کی عبدالحق سے شادی کے بعد تو اس کی محبت اور بڑھ گئی تھی۔

وہ بہت خوش تھی۔ لیکن کبھی اسے خیال آتا کہ ارجمند کو عبدالحق کے بچے کی ماں بننا چاہئے تھا۔ وہ اتنی دیندار اور نیک ہے۔ بڑے ٹھاکر کی ایمان والی نسل کی امانت تو اسے ملنی چاہئے تھی۔ وہ اس کی بہت اچھی پرورش کرتی۔

پھر اسے خیال آتا کہ وہ ناشکرے پن کی مرتکب ہو رہی ہے۔

وہ یہاں اپنی خوشی سے، بغیر کسی دباؤ کے رکی تھی۔ اور خلوصِ دل سے رکی تھی۔ لیکن اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ہر لمحہ لاہور میں گزارے۔ عبدالحق کی سب سے بڑی خوشی کے ہر مرحلے سے باخبر رہے۔

کئی دن وہ انتظار کرتی رہی کہ لاہور سے فون آئے گا۔ یہاں بے تکلفی کے باوجود ایک تکلف تھا۔ یہ بیٹی کی سسرال تھی، اور پھر موت کا گھر۔ یہاں سے فون کرنا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔

لاہور سے فون نہیں آیا۔ لیکن اس سے بڑی بات یہ تھی کہ کراچی سے عبدالحق نے بھی اسے فون نہیں کیا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ اسے پریشانی ہونے لگی۔ کوئی ایسی ویسی بات، کوئی گڑبڑ تو نہیں۔

دل بہت گھبرایا تو بالآخر اس نے ہر تکلف کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اس روز اکبر شام کو دکان پر جانے لگا تو اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''اکبر بیٹے! ذرا لاہور میری بات تو کرا دے۔''

اکبر نے حیرت سے اسے دیکھا، پھر شرمندہ نظر آنے لگا۔

''تو کیا لاہور اب تک آپ کی بات نہیں ہوئی؟''

''نہیں پتر! میں سوچتی رہی کہ فون آئے گا، پر پتا نہیں، کیا بات ہے......؟''

''اور آپ نے مجھ سے کہا بھی نہیں؟'' اکبر نے کہا، پھر زرینہ کی طرف پلٹا۔

''تم نے بھی حد کر دی۔ تمہیں یہ خیال نہیں آیا۔ کیا خیال رکھتی ہو اماں کا......؟''

''واقعی......! مجھے خیال ہی نہیں آیا۔'' زرینہ نے شرمندگی سے کہا۔

''لیکن اماں کو خود کہہ دینا چاہئے تھا۔''

''اماں تو بیٹی کے سسرال سمجھ کر تکلف کرتی ہیں۔'' اکبر بولا۔ پھر اس نے نمبر ملایا۔ رابطہ ملا تو وہ ریسیور حمیدہ کو دے کر خود دکان پر چلا گیا۔

ذرا دیر بعد دوسری طرف سے ساجد کی آواز ابھری۔

''ارے ساجد......!''

''جی دادی اماں......!''

حمیدہ جانتی تھی کہ رابعہ فون پر بات کرنے سے گھبراتی ہے۔ لیکن درحقیقت اسے توقع تھی کہ فون ارجمند اٹھائے گی یا نور بانو۔

''تو کیا ہے پتر......!'' اس نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں دادی اماں......! لیکن اب یہاں میرا دل نہیں لگ رہا

ہے۔"

"اچھا.....! اپنی چھوٹی چاچی سے یا چاچی سے بات کرا دے میری۔"

"وہ تو یہاں نہیں ہیں دادی اماں.....!"

حمیدہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

"کیا ہوا.....؟ خیر تو ہے.....؟"

"وہ دونوں تو ایبٹ آباد چلی گئیں۔ پندرہ دن ہو گئے دادی اماں!"

حمیدہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے.....؟

"اچھا.....! تو رابعہ سے میری بات کرا۔"

رابعہ نے بتایا کہ ان دونوں کو عبدالحق نے خود ایبٹ آباد بھجوایا ہے۔ نوریز بھی ساتھ ہے۔ وجہ اسے نہیں معلوم۔

حمیدہ کو صدمہ ہوا۔ عبدالحق نے اسے بتانے کی زحمت بھی نہیں کی۔ کم از کم ارجمند ہی سے اسے فون کر دیتی۔ کیا دنیا ہی بدل گئی۔ لیکن اتنا وہ سمجھتی تھی کہ نور بانو کسی سے کچھ بھی کرا سکتی ہے۔ اپنا دل برا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

"عبدالحق نے کراچی پہنچنے کے بعد کوئی فون کیا.....؟"

"نہیں اماں.....! میرا تو دل بڑا پریشان ہے ان کی طرف سے۔ وہ ایسا کر نہیں سکتے۔ خدانخواستہ کوئی بات ہے۔"

حمیدہ کا دل اور پریشان ہو گیا۔ واقعی! یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ عبدالحق فون نہ کرے۔

مگر اس رات ہی عبدالحق کا فون آ گیا۔

"تو کیسا ہے پتر! خیریت تو ہے.....؟" حمیدہ نے تڑپ کر پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے اماں.....! میں شرمندہ ہوں کہ اتنے دن فون نہیں کیا۔"

"فون نہیں کیا تو کوئی وجہ بھی ہوگی۔ مجھے بتا نا.....!"

"یہاں پہنچتے ہی بیمار ہو گیا تھا اماں! گردے میں پتھری تھی۔ آپریشن ہوا۔ ابھی اسپتال سے گھر واپس آیا ہوں۔"

حمیدہ کا دل ہولنے لگا..... آپریشن..... گردے کا۔ اب کیسا ہے تو.....؟"

"اب بالکل ٹھیک ہوں اماں.....! تین دن گھر پر آرام کروں گا، پھر دفتر جاؤں گا۔ تم پریشان نہ ہونا، بس دعا کرتی رہنا میرے لئے۔"

یہ تفتیش کرنے کا موقع نہیں تھا۔ حمیدہ کی الجھن دور نہیں ہوئی۔ عبدالحق نے زرینہ، اکبر اور اصغر سے بات کی۔ پھر فون رکھ دیا۔

حمیدہ یہ سوچ کر کڑھتی رہی کہ اتنی بڑی بیماری کے دوران بھی عبدالحق اکیلا تھا۔ اور اب بھی اکیلا ہے۔ عبدالحق نے اسے یعقوب کی شادی کا بتایا تھا۔ مگر وہ لوگ اتنا خیال تو نہیں رکھ سکتے اس کا۔ ارجمند کو اس کے ساتھ جانا چاہئے تھا۔

ایبٹ آباد کی پریشانی تو وہ بھول گئی۔ اسے کراچی کی فکر لاحق ہو گئی۔

اگلی بار عبدالحق سے فون پر بات ہوئی تو اس نے اس سلسلے میں بات کی۔

"وہاں تو سفر کی مصروفیت سر پر سوار تھی اماں.....!" عبدالحق نے شرمندگی سے کہا۔

"اور یہ بات صرف ایک دن پہلے طے ہوئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ کراچی پہنچتے ہی تمہیں فون کروں گا۔ مگر درد اتنا شدید اٹھا، اور پھر....."

"مگر اس حال میں ایبٹ آباد جانے کی تک کیا تھی.....؟"

"نور بانو یہ تمام عرصہ کسی بہت خوب صورت مقام پر گزارنا چاہتی ہے۔ کہتے ہیں اماں.....! کہ ان سب باتوں کا بچے پر بھی اثر پڑتا ہے۔"

"تو تو صحرا میں پیدا ہوا تھا پتر.....! پر ہر طرح سے کروڑوں میں ایک ہے، خیر....." حمیدہ کہنا چاہتی تھی کہ بالکل ابتداء میں اتنا لمبا سفر، جس میں اتنے جھٹکے لگیں، کسی طرح اچھا نہیں۔ یہ تو حمل ضائع کرنے والی حرکت ہے۔ مگر اس نے کہا نہیں کہ عبدالحق پریشان ہو جائے گا اور اپنی پریشانی اس نے یہ سوچ کر دور کر لی کہ جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے۔ اللہ کا حکم ہے تو اسے کون روک سکتا ہے۔

عبدالحق اس کی خاموشی سے گھبرا گیا۔

"تم مجھ سے ناراض ہو گئیں اماں؟"

"ارے نہیں پتر! تو جانیا ہے، تجھ سے ناراض میں نہیں ہو سکتی۔"

"مگر میری غلطی ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں اماں! مجھے تم سے اجازت

لینی چاہئے تھی۔ لیکن نور بانو کا تو تمہیں پتا ہے۔ وہ جب پیچھے پڑ جائے تو.....''

''جانتی ہوں پتر.....! پر ارجمند کو ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ ایسے میں تو ارجمند کو تیرے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔ تو کتنا اکیلا ہے۔''

''یہاں یعقوب اور اس کی بیوی بھی ہے اماں.....! اور عارف بھائی بھی ہیں۔ میری فکر نہ کرو۔ میں ٹھیک ہوں۔''

''پر ارجمند کو ساتھ لٹکانے کی کیا تک تھی.....؟''

''تم جانتی ہو اماں! کہ نور بانو ارجمند کو اپنی بہنوں کی طرح چاہتی ہے۔ ایسے میں اس سے ڈھارس مل سکتی ہے اسے۔''

حمیدہ نے حجت نہیں کی۔ بابا نے کہا تھا، خاموشی سے تماشا دیکھنا۔

فون رکھنے کے بعد وہ اس پر غور و فکر کرتی رہی۔ ہر بات اسے غیر معمولی لگ رہی تھی۔ موت اللہ کا حکم ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی موت نے اسے پانچ مہینے کے لئے تمام معاملات سے دور کر دیا تھا۔

اسے بابا کے الفاظ یاد آئے، اور اسے یقین ہوگیا کہ کوئی بہت بڑا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ یہ تو وہ جانتی تھی کہ کھیل نور بانو کا ہے۔ لیکن کھیل کی نوعیت وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

اور بابا نے کہا تھا..... کھیلنے دے انہیں۔ وہ سمجھتے ہیں جھوٹ کی ناؤ تیرتی رہے گی، بلکہ پار بھی لگ جائے گی۔ اللہ کی مرضی ہے تو وہ ان کی مدد بھی کر رہا ہے، پردہ بھی رکھ رہا ہے۔ لیکن جھوٹ سچ سے کبھی جیت نہیں سکتا۔

تو کیا اس کا یہاں طویل قیام بھی کھیلنے والوں کے لئے اللہ کی طرف سے پردہ ہے؟ اس نے سوچا۔

مگر بچہ پیدا ہوگا، تب تو وہ ان کے ساتھ ہوگی۔

❁ ❁ ❁

ارجمند شرمندہ بھی تھی اور افسردہ بھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب وہ دادی اماں کا سامنا کبھی کیسے کر سکے گی؟

اس نے چاہا تھا کہ ایبٹ آباد روانگی سے پہلے دادی اماں کو فون کر کے بتا

دے۔ بلکہ اصولاً تو انہیں ان سے اجازت لینی چاہئے تھی۔

لیکن نور بانو نے سختی سے اسے منع کر دیا۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''کیوں آپی.....؟'' اس نے احتجاج کیا۔

''انہیں ہم اپنے معاملات سے جتنا دور، جتنا بے خبر رکھیں گے، اتنا ہی بہتر ہوگا۔'' نور بانو نے سرد لہجے میں کہا۔

''یہ بدتمیزی ہوگی آپی! وہ ہماری بڑی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''اور اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ ہمارا جانا تو طے ہو چکا ہے۔''

''تم نہیں سمجھو گی۔ ہمارے معاملات میں رازداری کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ بہت نازک معاملہ ہے۔ ایسی بات چھپانا کوئی آسان ہوتا ہے۔''

''پھر بھی آپی.....!''

اس بار نور بانو نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

''تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم میری ہر بات مانو گی۔''

''جی آپی.....! مجھے یاد ہے۔''

پھر وہ عبدالحق کی طرف سے پریشان ہوگئی۔ جب سے عبدالحق گیا تھا، اس نے کوئی رابطہ ہی نہیں کیا تھا۔ یہ بات خلافِ معمول تھی۔ پہلے وہ ہر دوسرے تیسرے دن فون کیا کرتا تھا۔ اور جاتے ہی فون کرنا تو لازم تھا۔

اس نے نور بانو سے یہ بات کہی تو نور بانو بے پرواہی سے بولی۔

''اتنی چھٹیوں کے بعد گئے ہیں تو کام میں جت گئے ہوں گے۔ ایسے ہی ہیں وہ۔ کام سے تو عشق ہے انہیں۔ میں وہاں کراچی میں تھی تو کام کے دوران میری یاد بھی نہیں آتی تھی انہیں۔''

''مگر آپی.....! مجھے یقین ہے کہ وہ جاتے ہی فون کرتے۔''

''تم انہیں مجھ سے زیادہ تو نہیں جانتیں۔'' نور بانو نے تنک کر کہا۔

''تم یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ تم بس خوش رہو۔ کہتے ہیں کہ اس عرصے میں بس خوش رہنا چاہئے۔ پریشانی سے بچے کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

یہ سن کر ارجمند سہم گئی۔ اسے کچھ بھی نہیں معلوم تھا، اور اس کے پاس عبدالحق کی بہت قیمتی امانت تھی، بلکہ نور بانو کی بھی۔ اللہ اسے سرخ رو کرے، وہ بس یہ دعا ہی کرسکتی تھی۔

لیکن پریشانی کا آدمی کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ بس ہوتی ہے تو ہوتی ہے۔ اور جب پریشانی کی وجہ بھی موجود ہو تو کوئی پریشانی سے کیسے بچ سکتا ہے؟

اس نئے گھر کے تمام معاملات نمٹانے کے بعد نور بانو خود بھی فکر مند ہوگئی۔ اس نے خود کراچی فون کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی، لیکن فون ریسیو نہیں کیا گیا۔ اس نے سوچا، ممکن ہے عبدالحق ابھی تک دفتر میں ہو۔ لیکن رات کو دیر سے فون کرنے پر بھی فون ریسیو نہیں ہوا۔

ارجمند کے برعکس نور بانو اس پر پریشان نہیں ہوئی۔ وہ تو صدا کی بدگمان تھی۔ بدگمانی کے سوا کیا کرتی؟ اسے غصہ آیا اور وہ کڑھنے لگی۔ لیکن بار بار کوشش کے باوجود رابطہ نہیں ہوا تو وہ پریشان ہو ہی گئی۔

پھر بالآخر عبدالحق کا فون آیا، اور پتا چلا کہ وہ بہت بیمار تھا اور اس کا آپریشن ہوا ہے۔

''کمال کرتے ہیں آپ......! میں یہاں آپ کے لئے پریشان ہوتی رہی۔ کم از کم اسپتال جانے سے پہلے فون تو کر دیتے یہاں۔'' نور بانو اس پر برس پڑی۔

''اللہ کی بندی......! میں اسپتال خود نہیں گیا تھا، لے جایا گیا تھا۔'' دوسری طرف سے عبدالحق نے برا مانے بغیر کہا۔

''اب میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ گردے کا درد کتنا شدید ہوتا ہے۔ درد کے اور اللہ کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا، الحمدللہ......!''

نور بانو کو ہنسی آگئی۔

''اس کے لئے بھی الحمدللہ کہہ رہے ہیں۔''

''الحمدللہ تو ہر حال میں کہنا چاہئے۔ بہرحال اب میں ٹھیک ہوں۔ فون

کرتا رہوں گا۔ اور ہاں......! تمہیں اماں کو فون کرنے کی توفیق بھی نہیں ہوئی؟''

''افراتفری میں خیال ہی نہیں رہا۔ اب کر لوں گی۔'' نور بانو نے بے پرواہی سے کہا۔

''اور سناؤ......! ارجمند کیسی ہے؟ بات ہوسکتی ہے اس سے؟''

نور بانو نے ریسیور ارجمند کو تھما دیا۔ لیکن جتا دیا کہ یہ بات اسے اچھی نہیں لگی ہے۔

ارجمند نے عبدالحق سے مختصر گفتگو کی۔ نور بانو کے تیور اس نے پہچان لئے تھے۔ اس نے عبدالحق سے اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔

عبدالحق نے آخر میں کہا۔

''نور بانو کا بہت خیال رکھنا ارجمند......!''

''جی......! آپ فکر نہ کریں۔'' ارجمند نے کہا اور دل میں بولی، جانتی ہوں، مجھے اپنا اور آپ کی امانت کا خیال رکھنا ہے، اور آپی کا بھی۔ لیکن اس کی اس سوچ میں کوئی گلہ، کوئی شکایت نہیں تھی۔

''کیا کہہ رہے تھے تم سے......؟'' رابطہ منقطع کرنے کے بعد نور بانو نے ارجمند سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں تناؤ تھا۔

''آپ کی طرف سے بہت فکر مند تھے۔'' ارجمند نے سادگی سے کہا۔

''آپ کا خیال رکھنے کی تلقین کر رہے تھے۔''

نور بانو عجیب سے انداز میں ہنسی۔

''حالانکہ خیال تو مجھے تمہارا رکھنا ہوگا۔ لیکن انہیں کیا معلوم......''

ارجمند کو اندازہ ہوگیا کہ زندگی اتنی آسان نہیں ہے، جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ نور بانو ایک ایسی آگ میں جل رہی ہے، جو کبھی بجھنے والی نہیں۔ اور وہ جلے گی تو جلائے گی بھی۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ وہ اس کے لئے تیار تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جو کچھ اس نے پایا ہے، وہ اللہ کی عطا ہے، بہت بڑا فضل ہے، اور اس کی وہ کوئی بھی قیمت ادا کرسکتی ہے...... ہنسی خوشی۔ عبدالحق کا ملنا تو ایک خواب تھا اس کے لئے۔ اللہ نے اسے تعبیر عطا فرما دی۔ اور یہی نہیں، اسے ایک

بہت بڑا اعزاز بھی عطا فرما دیا، جو وہ ہنسی خوشی نور بانو کو سونپ سکتی ہے۔
وہ ہر آزمائش کے لئے تیار تھی۔

❁ ❁ ❁

نوریز کو اس پر حیرت تھی کہ بالکل اچانک ہی گھر کی بیبیوں نے اس سے پردہ شروع کر دیا۔ ویسے تو وہ لاہور میں بھی کبھی گھر کے اندر نہیں جاتا تھا، سرونٹ کوارٹر ہی میں رہتا تھا۔ لیکن وہاں ایسا پردہ نہیں ہوتا تھا۔ اور چھوٹی بی بی تو اس کے سامنے ہی بڑی ہوئی تھیں۔ وہ تو شروع ہی سے چادر لیتی تھیں۔ لیکن بیگم صاحبہ اس سے بے نیاز تھیں۔ البتہ لاہور سے روانہ ہوتے ہوئے انہوں نے پہلی بار چادر لی تھی۔

ایبٹ آباد چھوٹی بی بی تو پہلے ہی آ چکی تھیں۔ لیکن بیگم صاحبہ کا یہ پہلا موقع تھا۔

بنگلے کے چوکیدار نے گیٹ کھولا اور نوریز گاڑی اندر لے گیا۔ گاڑی روکی اور اس نے اتر کر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ لیکن بیگم صاحبہ نیچے نہیں اتریں۔ چھوٹی بی بی بھی بیٹھی رہیں۔

''یہ چوکیدار یہاں اکیلا رہتا ہے؟'' بیگم صاحبہ نے اس سے پوچھا۔
''اس کے بیوی بچے تو نہیں ہیں یہاں......؟''
''جی نہیں بیگم صاحبہ......! یہ یہاں اکیلا ہی ہوتا ہے۔ گھر اس کا قریب ہی ہے۔''

بیگم صاحبہ نے واضح طور پر سکون کا سانس لیا۔
''اب میری بات غور سے سنو نوریز......! ہمیں یہاں ملازماؤں کی ضرورت ہوگی۔ دو عورتیں ہوں کم از کم، ایک ہی گھر کی ہوں تو زیادہ اچھا ہے۔ مگر ابھی تو پہلا مرحلہ گھر کی صفائی کا ہے۔''
''اس کی فکر نہ کریں بیگم صاحبہ......! چوکیدار کی بیوی اور بیٹی ہفتے میں ایک دن آ کر صفائی کرتی رہی ہیں۔ اور میں نے فون کر دیا تھا۔ کل صفائی ہو چکی ہوگی۔ گھر آپ کو بالکل صاف ملے گا۔''

''چلو...... یہ بہت اچھی بات ہے۔ لیکن ملازماؤں کا بندوبست جلد از جلد کرنا ہوگا۔''
''یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں بیگم صاحبہ......! چوکیدار کے گھر والے یہاں سرونٹ کوارٹر میں آ جائیں گے۔ عورتیں اندر کا کام سنبھال لیں گی۔''
''نہیں......! میں اسے مناسب نہیں سمجھتی۔'' بیگم صاحبہ نے کہا۔
''تم اپنے طور پر کوئی بندوبست کرو۔''
نوریز کو حیرت ہوئی۔ چوکیدار کے گھر والوں سے بہتر کون ہو سکتا تھا؟ وہ آدمی بھی بھروسے کا تھا۔ تاہم اس نے کہا۔
''ہو جائے گا بیگم صاحبہ......! ہو جائے گا بیگم صاحبہ......! یہاں میری کافی جان پہچان ہے۔''
وہ دونوں نیچے اتریں۔
''تمہارا کوارٹر کہاں ہے......؟''
نوریز نے اشارے سے بتایا۔
''وہاں چھوٹا ٹیلی فون بھی لگوا دیا ہے صاحب نے۔ ویسا ہی ایک ٹیلی فون اندر بھی ہے۔ آپ اس پر ایک نمبر بتائیں گی تو مجھے پتا چل جائے گا۔''
نور بانو تو نہیں سمجھ سکی۔ لیکن ارجمند سمجھ گئی کہ وہ انٹر کام کی بات کر رہا ہے۔

نوریز نے فوری طور پر ادھر ادھر بات کی۔ وہاں غربت بہت تھی، اس لئے کام لوگوں کے لئے بڑی نعمت تھا۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ یہ کام اس کے گھر میں کسی کو مل جائے۔
وہاں تو امیدوار عورتوں کا تانتا بندھ گیا۔
لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ بیگم صاحبہ کو ان میں سے کوئی بھائی ہی نہیں۔
نوریز خود پہاڑی علاقے کا رہنے والا تھا۔ جانتا تھا کہ یہ لوگ عام طور پر سیدھے سادھے اور وفادار ہوتے ہیں۔ لیکن ایبٹ آباد کے لوگوں میں تو خوبیاں کچھ زیادہ ہی تھیں۔ نوریز دل سے مانتا تھا کہ اس کے اپنے علاقے کے لوگ ایبٹ آباد کے

لوگوں کے مقابلے میں کہیں تیز وطرار ہوتے ہیں۔

رات کو بیگم صاحبہ نے انٹرکام پر اسے طلب کیا۔ وہ گیا تو انہوں نے اس کا اور چوکیدار کا کھانا اسے دیا۔

''آپ کو کوئی ملازمہ اچھی نہیں لگی؟'' نوریز نے یوں ہی پوچھ لیا۔

''سچ تو یہ ہے کہ سبھی اچھی تھیں۔ ضرورت سے زیادہ اچھی۔'' بیگم صاحبہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

''لیکن میرے مطلب کی ان میں کوئی بھی نہیں تھی۔''

اب نوریز کی یہ پوچھنے کی ہمت تو نہیں ہوئی کہ اس کی پسند کا معیار کیا ہے؟ اور ضرورت سے زیادہ اچھی سے اس کی کیا مراد ہے؟ تاہم اسے ایک اور خیال آیا۔

''آپ کہیں تو میں گاؤں سے اپنی اماں اور بہن کو لے آؤں؟ انہیں تو آپ جانتی بھی ہیں۔'' اس نے بے حد خلوص سے کہا۔

نہ جانے کیوں بیگم صاحبہ گڑبڑا گئیں۔

''ارے نہیں بھئی..... ! میں انہیں تکلیف کیسے دے سکتی ہوں؟''

''تکلیف کیسی بیگم صاحبہ..... ! یہ تو ہمارے لئے عزت اور فخر کی بات ہوگی۔''

''نہیں بھئی..... ! ہمیں تو بہت لمبے عرصے کے لئے ملازمہ چاہئے۔'' بیگم صاحبہ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

اب نوریز کیا کہہ سکتا تھا؟ وہ خاموشی سے کھانا لے کر سرونٹ کوارٹر کی طرف چل دیا۔

اگلے روز بیگم صاحبہ کو ایک عورت پسند آ ہی گئی۔ لیکن اسے دیکھ کر نوریز کو صدمہ ہوا۔ دیکھنے میں ہی چالاک اور مکار لگتی تھی، اور لالچی پن اس کی نگاہوں سے صاف عیاں تھا۔

پھر وہ اپنی بیٹی کو بھی لے آئی۔ بیٹی جوان تھی۔ اٹھارہ انیس سال کی ہوگی۔ ماں کے برعکس دیکھنے میں وہ سادہ لوح لگتی تھی۔

بیگم صاحبہ کی پسند اچھی نہیں ہے۔ نوریز نے دل میں سوچا۔ اللہ رحم کرے، یہ عورت کوئی چوٹ ضرور دے گی۔ اس نے سوچا، چوکیدار سے کہے گا کہ آتے جاتے اس عورت پر خاص طور پر نظر رکھے۔

❁ ❁ ❁

جو کھیل نور بانو کھیل رہی تھی، اس میں ملازمہ کی بڑی اہمیت تھی۔ پہلے دن جو عورتیں آئیں، انہوں نے اسے بڑا مایوس کیا۔ ان میں سے کوئی بھی اس کی ضرورت کے مطابق نہیں تھی۔

نور بانو نے ہر عورت سے اپنے طے شدہ معیار کے مطابق دو ہی سوال کئے تھے..... اور وہ بھی یہ بتانے کے بعد کہ انہیں مستقل طور پر سال بھر یہیں رہنا ہوگا۔ چھٹی ایک دن کی بھی نہیں ملے گی۔ بہت ضروری ہوا تو گھنٹے دو گھنٹے کی چھٹی مل سکتی ہے۔

دو ایک عورتوں کے سوا کسی کو اس پر اعتراض نہیں تھا۔ انہیں تو کام چاہئے تھا، اور وہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار تھیں۔

پھر نور بانو اپنا پہلا سوال کرتی۔

''تنخواہ کیا لوگی.....؟''

سب کے پاس اس کا ایک ہی جواب تھا۔

''جو چاہے، دے دینا بیگم صاب..... !'' لفظ اور پیرایہ مختلف تھا، لیکن جواب سب کا یہی تھا۔

نور بانو کو بڑی مایوسی ہوئی۔ یہ کیسے لوگ ہیں؟ اس نے دل میں سوچا۔ اتنا سخت کام، اپنے گھر سے دوری، اور اس پر بھی تنخواہ مانگنے کی ہمت نہیں۔ جو مل جائے، قبول ہے۔ ایسے لوگ اس کی مطلب کے ہو نہیں سکتے۔

پھر بھی اس نے دوسرا سوال بھی سب سے کیا۔

''اللہ اگر تم سے کہے کہ جو چاہو مانگو، تمہیں ملے گا تو تم کیا مانگو گی.....؟''

بیشتر عورتیں تو اس کی بات سمجھ ہی نہیں سکیں۔ اسے وضاحت کرنی پڑی۔

لیکن یہاں بھی جواب تقریباً ایک ہی تھا۔ گھر والوں کے لئے اور اپنے

لئے عزت کے ساتھ تین وقت کی روٹی اور تن ڈھانپنے کو کپڑا...... اور بس۔

''اللہ جی کا شکر ہے بی بی صاب! کہ سر چھپانے کو ٹھکانا دے رکھا ہے اس نے۔ بس جی یہاں روزگار نہیں ہے۔'' ایک نے ذرا تفصیل سے بات کی۔

نوربانو کی جھنجلاہٹ کی کوئی حد نہیں تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہاں اسے اپنے مطلب کی ملازمہ نہیں ملے گی۔

رات کو وہ سونے کے لئے لیٹیں تو ارجمند نے دھیرے سے کہا۔

''میری تو سمجھ میں نہیں آیا آپی...... ! کہ آپ نے سب کو رد کیوں کر دیا؟ وہ سبھی اچھی تھیں۔''

''یہی تو خرابی تھی ان میں۔'' نوربانو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ارجمند نے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں سمجھی نہیں آپی...... ! قناعت پسند لوگ ایماندار بھی ہوتے ہیں اور وفادار بھی۔''

''تم نہیں سمجھو گی ارجی...... ! ہماری ضرورت برعکس ہے۔''

''یعنی ہمیں بے ایمان اور دغاباز ملازمہ چاہئے۔'' ارجمند کے لہجے میں حیرت تھی۔

''یہ الفاظ ذرا زیادہ سخت ہیں۔ لیکن بہرحال ہمیں ایسی ہی ملازمہ چاہئے۔'' نوربانو نے بے حد سکون سے کہا۔

''لیکن کیوں آپی......!''

''دیکھو، یہاں معاملہ بڑی رازداری کا ہے۔'' نوربانو نے اسے سمجھایا۔

''ہمیں نہ وفاداری چاہئے نہ ایمان داری۔ ایسے لوگ تو سچے ہوتے ہیں۔ ہمارا راز نہیں چھپا سکیں گے۔ ہاں، کوئی لالچی عورت ہو تو ہمارا راز چھپانے کی قیمت مانگے گی، جو ہم ادا کر سکتے ہیں۔ اور پھر وہ ہمارے راز کو راز رکھے گی بھی۔''

یہ بات ایک لمحے میں ارجمند کو سمجھ میں آ گئی۔ آپی کتنی ذہین اور سمجھ دار ہیں۔ اس نے دل میں سوچا۔

''ذرا سوچو! ہماری ملازمہ اندر کی بات سے واقف ہو گی۔ مگر اسے حقیقت

چھپانی ہو گی، جھوٹ بولنا ہو گا۔''

''میں سمجھ گئی۔'' ارجمند نے کہا۔

''لیکن آپی...... ! ایسے لوگ خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ انہیں کسی کی کمزوری پتا چل جائے تو......''

''ہم اسے موقع ہی نہیں دیں گے۔ اور پھر ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ تم فکر نہ کرو، سب مجھ پر چھوڑ دو۔''

ارجمند کے خیال میں بھی بہتر یہی تھا۔ آپی جانیں، آپی سنبھالیں۔

اگلا دن بھی مایوس کن انداز میں شروع ہوا۔ وہی قناعت پسندی۔ مگر پھر جو عورت اندر آئی، اسے دیکھ کر نوربانو کے دل میں امید جاگی۔ وہ اسے غور سے دیکھتی رہی...... خاموشی سے۔

اس عورت کی نظروں کو قرار نہیں تھا۔ ایک نظر اس نے نوربانو کو دیکھا، پھر گرد و پیش کا جائزہ لینے لگی۔

''کیا دیکھ رہی ہو......؟'' نوربانو نے اس سے پوچھا۔

عورت نے چونک کر اسے دیکھا۔

''بڑا خوب صورت بنگلا ہے۔'' اس نے بلا جھجک کہا۔ پھر پوچھا۔

''آپ کا اپنا ہے......؟''

نوربانو نے جواب دینے کے بجائے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہارا کیا اندازہ ہے......؟''

''میرے خیال میں تو آپ نے کرائے پر لیا ہے۔'' عورت نے اس بار بھی بلا توقف کہا۔

''یہ تم نے کیسے سمجھا......؟''

''بنگلہ بہت بڑا اور خوب صورت ہے۔ لیکن سامان اس حساب سے نہیں ہے۔'' عورت نے کہا۔

نوربانو خوش ہو گئی۔ یہ عورت ذہین اور متجسس بھی تھی اور جرات مند بھی۔ یہ اسے اپنے مطلب کی لگ رہی تھی۔

"بنگلہ ہمارا اپنا ہے۔ لیکن میں یہاں رہنے کے لئے پہلی بار آئی ہوں۔ سامان تو اب خریدا جائے گا۔"

"میرے لئے کیا حکم ہے بی بی صاب......!" عورت کا انداز اور لہجہ ایک دم بدل گیا۔

"نام کیا ہے تمہارا......؟" نوربانو نے اپنا لہجہ سخت کر لیا۔

"رشیدہ......!"

"تمہاری کوئی بیٹی بھی ہے......؟"

"تین ہیں بی بی صاب......! پر ایک ابھی بہت چھوٹی ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے......"

"مجھ سب معلوم ہے بی بی صاحبہ......! مجھے اپنی ایک بیٹی کے ساتھ یہیں رہنا ہوگا......اپنے گھر کو بھول کر......"

"اور تم ایسا کر سکتی ہو......؟"

رشیدہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"بالکل کر سکتی ہوں۔ گھر میری بڑی بیٹی سنبھال لے گی۔ کام کے حساب سے پیسے ملیں تو میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔"

اس "کچھ بھی کر سکتی ہوں" میں بہت کچھ تھا۔ نوربانو خوش ہوگئی۔

"پیسے کام سے زیادہ ہی ملیں گے۔" اس نے کہا۔

"اچھا......! تم خود بتاؤ، کیا لوگی......؟"

رشیدہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا آپ مجھے رکھ رہی ہیں......؟"

"ابھی فیصلہ تو نہیں کیا ہے۔ لیکن تم مجھے اچھی لگی ہو۔ بولو......! کیا لو گی......؟"

رشیدہ چند لمحے سوچتی رہی۔

"آپ کو تو زیادہ لگے گا بی بی صاب......! لیکن گھر چھوڑ کر یہاں رہنا آسان نہیں، اور وہ بھی دو آدمیوں کا......آپ مجھے سو روپے مہینہ دے دیں۔"

نوربانو کو پیسوں کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ تاثر دینا مناسب نہیں ہوگا۔ اس کے سامنے ایک بہت تیز وطرار عورت تھی۔

"یہ تو واقعی بہت زیادہ ہے۔" اس نے کہا۔

"پچاس روپے تو ہم اپنے ڈرائیو کو دیتے ہیں۔"

رشیدہ مایوس نظر آنے لگی۔

"لیکن چلو...... میں تمہیں منہ مانگی تنخواہ دیتی ہوں۔" نوربانو نے جلدی سے کہا۔

"تو آپ نے مجھے رکھ لیا......؟"

"ابھی نہیں ......! دراصل میرے شوہر سی آئی ڈی میں بہت بڑے افسر ہیں۔ بہت شکی مزاج ہیں۔ پہلے تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ تو میں سوچوں گی کہ تمہیں رکھنا مناسب بھی ہے یا نہیں......؟" نوربانو نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

"تم یہاں کی تو نہیں لگتیں......؟"

"آپ نے کیسے پہچانا بی بی صاب......!" رشیدہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"سی آئی ڈی افسر کی بیوی ہوں۔ میرے شوہر تو تمہیں ایک نظر دیکھ کر تمہارے پورے خاندان کے بارے میں بتا دیں۔ اور وہ سخت بھی بہت ہیں۔"

رشیدہ بہت مرعوب نظر آ رہی تھی۔

"ہم بغہ کے رہنے والے ہیں بی بی صاب......! یہ آگے مانسہرہ میں ہے......بغہ......"

"تو یہاں کیوں آ گئے تم لوگ......؟"

"قسمت کی خرابی بی بی صاب......! بغہ میں ہماری اپنی زمین تھی۔ میرا آدمی بیمار ہوا تو ہم پر قرضہ چڑھ گیا۔ زمین ہاتھ سے نکل گئی۔ ہم یہاں آ گئے کہ یہاں صاب لوگوں کی چاکری کر کے پیسہ جمع کریں گے، پھر جا کر زمین چھوڑائیں گے۔ پر اب تک تو کچھ ہوا نہیں......"

"کتنا قرضہ ہے تمہارا......؟" نوربانو نے پوچھا۔ اس کے نکتہ نظر سے تو یہ

مثالی صورتِ حال بن رہی تھی۔

''پہاڑ جیسا ہے بی بی صاب...... !''

''پھر بھی، کچھ بتاؤ تو......''

''چھ سو روپے ادا کرنے ہیں زمین چھوڑانے کے لئے۔'' رشیدہ نے آہ بھر کے کہا۔

نور بانو کچھ سوچ رہی تھی۔

''میں تمہیں اچھی تنخواہ دوں، اور یہاں ایک سال رکوں تو تم اتنی رقم بچا سکتی ہو۔لیکن اگر تم نے میری مرضی کے مطابق کام کیا تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ یہاں سے جاتے ہوئے تمہیں چھ سو روپے الگ سے دوں گی۔''

رشیدہ نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ پیروں میں بیٹھ گئی۔

''میں آپ کے لئے جان بھی دے سکتی ہوں بی بی صاب......!''

''مجھے جان نہیں، وفاداری چاہئے۔ صرف ایک بات، کہ یہاں کی کوئی بات کبھی گھر سے باہر نہ نکلے۔''

''آپ سمجھ لیں بی بی صاب......! کہ میرے منہ میں زبان ہے ہی نہیں۔''

''دو مہینے دیکھوں گی تمہیں۔'' نور بانو نے بڑی شان سے کہا۔

''پھر تنخواہ بھی بڑھا دوں گی اور جاتے وقت وعدہ بھی پورا کروں گی۔''

''تو میں کام پر آ جاؤں......؟''

یوں یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

اس کے بعد گھر سجانے اور سنوارنے کا مسئلہ تھا۔ فرنیچر تو وہاں موجود تھا۔ نور بانو نے خوابگاہ کی آرائش پر خاص توجہ دی۔ وہ اور ارجمند دونوں اسی کمرے میں سوتی تھیں۔

وہ ارجمند کے ساتھ گئی اور دل کھول کر خریداری کی۔ پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ عبدالحق نے دونوں کے اکاؤنٹ کھلوا دیئے تھے۔

رشیدہ اپنی بیٹی کو لے کر آ گئی تھی۔ وہ سولہ سترہ سال کی لڑکی تھی۔ اس کا نام آبیہ تھا۔ وہ اپنی ماں سے بالکل مختلف تھی۔ بغیر ضرورت کے وہ بولتی ہی نہیں تھی۔

اس میں تیز طراری بھی نہیں تھی۔

نور بانو کو اس طرف سے بھی اطمینان ہو گیا۔

لیکن ایک بہت بڑی فکر ابھی اسے لاحق تھی۔ اسے احساس تھا کہ اس نے قبل از وقت اعلان کر کے غلطی کی ہے۔ تاریخوں میں کبھی کبھی گڑبڑ بھی ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو پورا ایک مہینہ بھی نکل جاتا ہے۔

اب وہ ایک ایک دن گن رہی تھی۔

پھر ارجمند کا ایام کا عرصہ شروع ہو گیا۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔ اب ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ مطمئن ہو رہی تھی۔ دس دن اوپر ہو گئے تو گویا پوری طرح تصدیق ہو گئی۔

اس شام نور بانو نے رشیدہ سے علیحدگی میں بات کی۔

''یہاں کسی دائی کو بھی جانتی ہو تم......؟''

''میں خود بہت اچھی دائی ہوں۔'' رشیدہ نے کہا۔

''کتنی اچھی......؟'' نور بانو نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے پوچھا۔ سارے مرحلے آسان ہوتے جا رہے تھے۔

''چال دیکھ کر پہچان لیتی ہوں بی بی صاب......!''

''تو پہچانا......؟''

''جی بی بی صاب......! بیٹا ہو گا اللہ نے چاہا تو......!''

''اب تک بتایا کیوں نہیں تھا......؟''

''آپ کے حکم کے بغیر زبان کھل سکتی ہے بھلا......؟'' رشیدہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''اچھی بات ہے۔ تم بہت سمجھدار ہو۔'' نور بانو بھی مسکرائی۔

''اچھا......! ذرا یہ تو بتاؤ کہ بات کس کی کر رہی ہو......؟ کس کے ہاں بیٹا ہو گا......؟''

''آپ کے ہاں......! اور کس کے ہاں ہو سکتا ہے......؟'' رشیدہ نے بغیر جھجکے کہا۔

''کیسی پہچان ہے تمہاری.....؟''

''وہ کہہ رہی ہوں بی بی صاب .....! جو سب کو بتانا ہے۔'' رشیدہ پھر مسکرائی۔

''میں راز داری کا مطلب سمجھ گئی ہوں، اور اس پر عمل کر کے مجھے انعام بھی لینا ہے۔ اب آپ سمجھ لیں کہ میری زبان پر اس وقت سچ نہیں آیا تو کبھی نہیں آئے گا۔ باہر کیا؟ میں تو گھر کی بات گھر میں بھی کرنے والی نہیں۔ ثبوت آپ کو دے دیا ہے۔''

''تو انعام بھی پکا سمجھو۔ لیکن غلطی نہ کرنا۔ میرا شوہر بڑا جلاد ہے، اور یہ سب کچھ اس کے کہنے پر ہو رہا ہے۔'' نوربانو نے دھمکی دینا بھی ضروری سمجھا۔

''مجھے اس سے کیا بی بی صاب.....! میں تو بس آپ کی وفادار ہوں۔''

''اچھا، یہ بتاؤ.....!'' نوربانو کہتے کہتے رک گئی۔

''کیا یہ سچ ہے.....؟ تم سے چُوک بھی تو ہو سکتی ہے۔''

''نہیں بی بی صاب.....! مجھ سے چُوک نہیں ہوتی۔ یہ دوسرا مہینہ ہے آپ کا۔''

عورت پکی ہے، نوربانو نے دل میں سوچا۔ اس نے پچاس کا نوٹ نکال کر اسے دیا۔

''یہ خوش خبری کا انعام ہے۔''

''شکریہ بی بی صاب.....!''

''اور سنو.....! اسپتال تو ہم جا نہیں سکتے۔''

''یہ میں بھی سمجھتی ہوں بی بی صاب.....!''

''تو تم سنبھال سکو گی نا.....؟''

رشیدہ نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیئے۔

''ان ہاتھوں میں سو بچے تو نکلے ہیں بی بی صاب.....! آپ فکر ہی نہ کریں۔'' اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''اس کا محتانہ الگ سے دوں گی میں۔''

''مجھے معلوم ہے، مجھے مانگنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''بس.....! اب ہر طرح سے خیال رکھنا ہے اس کا۔'' نوربانو نے کہا۔

''اور ہاں.....! اپنی بیٹی کو سمجھا دینا۔''

''وہ تو کچھ بولتی ہی نہیں بی بی صاب.....! اللہ میاں کی گائے ہے۔ پھر بھی میں نے اسے سمجھا دیا ہے بہت اچھی طرح۔''

اب نوربانو پوری طرح مطمئن تھی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی اسے عربی زبان میں گفتگو کرنے کا موقع ملے گا۔

سعودی حکومت کے بھارت سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ بلکہ وہ پاکستان پر عموماً بھارت کو ترجیح دیتی تھی۔ لیکن پھر سوچ میں تبدیلی آنی شروع ہوئی اور سعودی حکومت نے پاکستان سے قریبی تعلق قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ بنیادی تعلق تو دین کے حوالے سے تھا ہی، مسلمان آپس میں بھائی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے دونوں برادر ملک تھے۔

اس کے پیش نظر پاکستان میں سعودی سفیر کی اہمیت کو سمجھا گیا۔ چنانچہ پاکستان کے لئے جس نئے سفیر کا تقرر کیا گیا، وہ ایک سعودی شہزادہ تھا۔ شاید اس کا مقصد پاکستان کو یہ احساس دلانا تھا کہ اسے اہمیت دی جا رہی ہے۔

نئے سفیر کے لئے قیمتی گاڑیاں اور دیگر ساز و سامان پاکستان آیا تو کسٹم کلیرنس کا مرحلہ سامنے آیا۔ کلکٹر صاحب کو اتفاق سے علم تھا کہ عبدالحق عربی سے واقف ہے۔ انہوں نے یہ تمام معاملات عبدالحق کو سونپ دیئے۔

پہلی ملاقات میں عبدالحق نے شہزادہ محمد بن عثمان سے عربی میں گفتگو کی تو وہ بہت خوش ہوئے۔

''آپ تو بہت اچھی عربی بولتے ہیں۔'' ان کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور خوشی بھی۔

''یہ تو مجھے علم نہیں۔'' عبدالحق نے اپنی فطری عاجزی سے کام لیا۔

"البتہ میرے استاد بہت قابل تھے۔ پھر مجھے عربی بولنے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ میں قرآن تک ہی محدود رہا۔"

"تب تو یہ بات اور حیرت انگیز ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ آپ یقیناً میری حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔"

"یہ بات نہیں ... بس ذرا لہجے میں اجنبیت سی ہے۔ ورنہ ذخیرۂ الفاظ تو تمہارا وسیع ہے۔" شہزادے نے کہا۔

"اور لہجے کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔ یہ کمی بولنے کی مشق نہ ہونے سے ہے۔"

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، شکریہ ....!"

"لیکن یہ کمی دور ہو جائے گی۔ میں تم سے بات کیا کروں گا؟"

"مگر آپ تو اسلام آباد میں ہوں گے۔"

"تو کیا ہوا ...؟ فون پر بھی تو بات ہو سکتی ہے۔"

"جی ... یقیناً ...!"

شہزادہ کچھ سوچ رہا تھا۔

"تم مجھے بہت اچھے لگے ہو۔ تم سے دوستی پکی ...!" اس نے کہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔

"لیکن تمہارا تبادلہ اسلام آباد بھی تو ہو سکتا ہے۔"

عبدالحق گڑبڑا گیا۔ اس تعلق کی رفتار بہت تیز معلوم ہو رہی تھی۔

"تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس سلسلے میں بات کروں ....؟"

عبدالحق کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ لاہور کراچی کی نسبت اسلام آباد سے زیادہ قریب تھا۔

سارے معاملات خوش اسلوبی کے ساتھ نمٹ گئے۔ شہزادہ جتنے دن کراچی میں رہا، اس نے زیادہ وقت عبدالحق کے ساتھ ہی گزارا۔ وہ اسلام آباد کے لئے روانہ ہونے لگا تو اس نے کہا۔

"بس چند روز کی بات ہے۔ اب اسلام آباد میں ملاقات ہوگی۔"

"انشاء اللہ ....!"

ایک ہفتے بعد کلکٹر کی طرف سے عبدالحق کا بلاوا آ گیا۔

"کیا حکم ہے جناب ....!" عبدالحق نے ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"حکم میرا نہیں ... اوپر والوں کا ہے۔" کلکٹر صاحب بولے۔

"میں سمجھا نہیں جناب ....!"

"میں نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری۔"

"میں آپ کی یہ بات بھی نہیں سمجھا۔"

"تمہارا تبادلہ وزارتِ خارجہ میں کر دیا گیا ہے۔" کلکٹر صاحب نے تاسف سے کہا۔

عبدالحق کو اب بھی یقین نہیں تھا کہ اس کا تبادلہ ہو سکے گا۔ وہ جانتا تھا کہ کلکٹر صاحب بہت بارسوخ آدمی ہیں۔ وہ وفاقی وزیر خزانہ کے داماد تھے۔

"میں نے بہت اوپر تک بات کی۔ لیکن تمہارا تبادلہ نہیں رکوا سکا۔ یہ سب شہزادے کی فرمائش پر ہو رہا ہے۔ میں نے تمہیں اس کے کام پر مامور کر کے بڑی غلطی کی۔ تمہیں کھو دیا میں نے۔"

"مجھے افسوس ہے جناب ....!"

کلکٹر صاحب نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

"ایک بات بتاؤ......! تم اس تبادلے پر خوش ہو نا ...؟"

"میں جھوٹ نہیں بولوں گا سر ....! میرے لئے اس میں بہتری ہے۔"

"کیا یہ تبادلہ تمہاری خواہش یا فرمائش پر ہوا ہے ....؟"

"مجھے افسوس ہے جناب ....! کہ آپ نے ایسا گمان کیا۔" عبدالحق نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں سفارش کا قائل نہیں ہوں۔ اور اپنا کام خوش دلی اور ایمانداری سے کرتا ہوں۔ یہ تبادلہ نہ ہوتا تو بھی مجھے کوئی فرق نہ پڑتا۔"

"سوری عبدالحق......! مجھے یہ بات نہیں کہنی چاہئے تھی۔"

"اس میں آپ کا قصور نہیں۔ صورتِ حال ہی ایسی تھی۔"

"اور تم دیانتدار اور کام والے نہ ہوتے تو میں تمہارے تبادلے کی پرواہ کیوں کرتا؟" کلکٹر صاحب نے گویا اپنی صفائی پیش کی۔

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"میں نے سعودی شہزادے سے اپنا تبادلہ کرانے کے لئے تو نہیں کہا، لیکن آپ چاہیں تو اپنا تبادلہ رکوانے کے لئے ان سے بات کر سکتا ہوں۔"

"نہیں بھئی.....! تمہارے لئے یہ مناسب نہیں۔"

"کیوں.....؟"

"حیرت ہے کہ تم اتنا عرصہ یہاں کام کر کے بھی یہ بات نہیں سمجھے۔" کلکٹر صاحب نے کہا۔

"تم اپنا تبادلہ رکوانے کی کوشش کرو گے تو یہ سمجھا جائے گا کہ تم رشوت خور ہو۔ یہ محکمہ ہی ایسا ہے عبدالحق.....!"

"میں یہ بات سمجھتا ہوں جناب.....! لیکن اسے اہمیت نہیں دیتا۔" عبدالحق کے لہجے میں بے پرواہی تھی۔

"مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ کون مجھے کیا سمجھتا ہے؟ میں تو بس اللہ کو جواب دہ ہوں اور میرا ضمیر میرا محتسب ہے۔"

"بہرحال! اس کی ضرورت نہیں۔" کلکٹر صاحب نے کہا۔

"لیکن میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ کبھی کوئی مسئلہ ہو تو بلا جھجک مجھ سے رابطہ کرنا۔ میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔"

"شکریہ جناب.....!" عبدالحق نے تبادلے کا حکم نامہ لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

یوں اس کا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا۔

❁ ❁ ❁

جنگ بغیر اعلان کے شروع ہوئی تھی۔ بھارتی جنرلوں کو یقین تھا کہ رات کو وہ لاہور جم خانہ میں جامِ فتح بلند کریں گے۔

اکبر اس روز وقت سے پہلے ہی گھر آ گیا۔ وہ بہت متوحش نظر آ رہا تھا۔

"خیر تو ہے.....؟ کیا بات ہے پتر.....؟" حمیدہ نے اس سے پوچھا۔

"بھارت نے حملہ کر دیا ہے اماں.....!"

"کوئی بات نہیں۔ انشاء اللہ منہ کی کھائے گا۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو.....؟"

"ہم سرحد کے بہت قریب ہیں اماں.....! قریب کے کچھ گاؤں گولہ باری کی زد میں آئے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں پتر.....! رب خیر کرے گا۔"

"مجھے بات تو پوری کرنے دیں۔ ادھر ادھر کے گاؤں کے لوگ نقل مکانی کر رہے ہیں۔"

"بے وقوفی ہے۔ اپنے گھر چھوڑ کر کوئی جاتا ہے؟"

اکبر کی آواز سن کر صفیہ بھی وہاں آ گئی۔ تاہم اس نے مداخلت نہیں کی۔ شوہر کی موت کے بعد اسے دنیا میں کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی۔ اس وقت بھی اسے تجسس نہیں ہوا۔ خاموشی سے سنتی رہی۔

"جان ہے تو جہان ہے اماں.....!" اکبر نے قدرے جھنجلا کر کہا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا اور نرم لہجے میں بولا۔

"اس تمام علاقے میں پاکستان کے فوجی آ گئے ہیں اور مورچے قائم کر رہے ہیں۔ ان کا عام لوگوں سے یہی کہنا ہے کہ وہ نقل مکانی کر جائیں۔ جو علاقہ میدانِ جنگ بن جائے، وہ رہائشی نہیں رہتا۔"

اس وقت زرینہ بھی آ گئی۔

"مطلب کیا ہے ان سب باتوں کا.....؟" حمیدہ نے کہا۔

"مطلب یہ ہے اماں.....! کہ ہمیں وقتی طور پر علاقہ چھوڑ دینا چاہئے۔"

"تم جانتے ہو کہ میں عدت میں ہوں۔" صفیہ نے پہلی بار زبان کھولی۔

"امی.....! مجبوری میں اللہ نے آدمی کو ہر معاملے میں رعایت دی ہے۔"

"لیکن اس کا فیصلہ بندے پر چھوڑ دیا ہے۔" صفیہ نے کہا۔

"رعایت فائدہ اٹھانے کے لئے نہیں ہے۔ اپنے نفس کے لئے نہیں ہونی چاہئے۔"

"جی ہاں..... ! لیکن زندگی کو خطرہ ہو تو اللہ نے حرام کو حلال قرار دیا ہے۔"

"وہ بھی مشروط ہے۔ اجازت پیٹ بھرنے کی نہیں ..."

"تو میں بھی جان بچانے کی بات کر رہا ہوں۔"

زرینہ سحر زدہ سی یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ اب حمیدہ بھی خاموش تھی۔ بحث ماں اور بیٹے کے درمیان تھی۔

"ہاں ..... ! یہ تو ہے۔" صفیہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

اکبر خوش ہو گیا کہ اس نے ماں کو قائل کر لیا۔

"لیکن ہم گھر چھوڑ کر جائیں گے کہاں ..... ؟" اچانک زرینہ بولی۔

"اور چاہے جنگ میں سب کچھ ختم ہو جائے، ایک دن لوٹ کر تو یہیں آنا ہے۔"

یہ سن کر حمیدہ کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ مچلی۔

"دوسرے لوگ بھی تو جا رہے ہیں۔" اکبر زرینہ کی طرف پلٹا۔ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

"ان کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں۔ ہم کون سا ان سے مختلف ہیں۔ آدمی کو وقت اور حالات کے مطابق سوچنا اور فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔"

"تمہارے لئے یہ پریشانی نہیں۔" حمیدہ نے جلدی سے کہا۔

"لاہور میں تمہارا اپنا گھر موجود ہے۔"

اکبر نے سکون کی سانس لی۔ مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ پہلے امی قائل ہوئیں، اور اب اماں۔

"شکریہ اماں..... !" اس نے آہستہ سے کہا۔

"تو تم کب جا رہے ہو..... ؟" صفیہ نے اسے چونکا دیا۔

"ہم سب جائیں گے امی ..... !"

"نہیں..... ! میں کہیں نہیں جا رہی ہوں۔ میں عدت پوری ہونے سے

پہلے یہاں سے ہلوں گی بھی نہیں۔ تم زرینہ کو لے کر چلے جاؤ۔"

"لیکن آپ تو قائل ہو گئی تھیں۔ ابھی ذرا پہلے آپ نے میری بات مان لی تھی۔"

"تمہارے لئے، اپنے لئے نہیں۔ ایسے فیصلے اپنے اپنے ہوتے ہیں۔ تم اپنے فیصلے پر عمل کرو، میں اپنے فیصلے پر عمل کروں گی۔" صفیہ کے لہجے میں قطعیت تھی۔

اکبر نے بے بسی سے حمیدہ کی طرف دیکھا۔

"آپ ہی انہیں سمجھائیں اماں..... !"

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں پتر..... ! ہر آدمی کا اپنا فیصلہ ہوتا ہے۔"

"میں امی کو یہاں اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتا۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ میں ان کے ساتھ رہوں گی۔"

"اور میں بھی..... !" زرینہ نے جلدی سے کہا۔

اکبر حیرت اور بے بسی سے بار باران کے چہرے دیکھتا رہا۔

"ان بوڑھی آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے پتر اکبر..... ! اللہ کی بڑی قدرت دیکھی ہے۔" حمیدہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ وہ اس وقت ماضی میں پہنچ گئی تھی۔

"یہ جگہ جو اب حق نگر کہلاتی ہے، شہر کا شہر بس گیا ہے، یہاں کبھی کئی چھوٹے بڑے گاؤں ہوا کرتے تھے۔ پھر ایک دن جنگ سے بڑی ... بہت ہی بڑی آفت آئی اس علاقے پر، لال آندھی..... !

میں نے بڑی منتیں کر کے عبدالحق کو یہاں سے بھگا دیا۔ وہ جا ہی نہیں رہا تھا کسی طرح۔ اور میں خود یہیں رکی رہی اللہ کے بھروسے پر..."

"تو آپ بھی چلی جاتیں عبدالحق بھائی کے ساتھ..... !" اکبر نے کہا۔

"یہی تو وہ بھی کہہ رہا تھا۔" حمیدہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

"پر میں جانتی تھی کہ وہ دوڑ سکتا ہے، میں نہیں دوڑ سکتی۔ میں اس کا بوجھ بن جاؤں گی۔ میری وجہ سے وہ بھی مارا جائے گا۔ وہ کبھی نہ جاتا میرے بغیر ... پر

میں نے اپنی قسم دی تو وہ ہار گیا۔''

''آپ کیسے بچیں......؟'' اکبر نے پوچھا۔

''پتا نہیں......! رب ہی جانتا ہے۔تم اس آندھی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ریت کی دیواریں تھیں جو اُڑ رہی تھیں۔ مجھے کچھ نہیں پتا تھا کہ میں کہاں جا رہی ہوں؟ ریت نے مجھے سچ مچ اندھا کر دیا تھا۔ وہ تمام گاؤں ریت کے نیچے دفن ہوگئے۔ مجھے اللہ نے کہیں پہنچا دیا۔ میں اندھی ہو چکی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں؟ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایک بار کسی انسان کی آواز سنی تھی ......بس ایک بار...... اس سے پتا چل گیا تھا کہ وہاں کھجور کا ایک درخت ہے اور پانی کی ایک چاٹی...... برسوں میں وہاں اکیلی رہی۔ کھجوریں اور پانی مجھے ملتا رہا۔ چاٹی میں پانی کہاں سے آتا تھا، مجھے نہیں پتا۔ وہاں تو ہوا چلنے کی بھی چاپ نہیں تھی۔ میں اندھی، اندازے سے نماز پڑھتی تھی۔ مجھے دن کا پتا تھا نہ رات کا...''

اکبر سحرزدہ سانس لے رہا تھا۔

''پھر ایک دن میرا پتر عبدالحق وہاں آ گیا۔ اس کے ساتھ زبیر اور رابعہ کے علاوہ نور بانو بھی تھی۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آتا تھا۔ اللہ نے کیسے مجھے زندہ رکھا؟ اور کیسے عبدالحق کو مجھ تک لایا؟ میں سمجھ نہیں سکتی تھی۔ بس اس کی قدرت، اس کا کرم، پھر مجھے آنکھیں بھی واپس مل گئیں۔ اللہ کی مہربانی سے عبدالحق نے مٹی ہٹوائی، اپنی حویلی برآمد کرائی۔ یہ کام ایسا تھا، جیسے کوئی پہاڑ ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دے۔''

''کچھ تھوڑا سا تو میں نے بھی دیکھا ہے اماں......!''

''تم نے کچھ نہیں دیکھا پتر......! صرف حویلی اوپر آنے تک مٹی کا بہت بڑا پہاڑ کھڑا ہوگیا تھا۔تم نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں۔''

''میں نے جو دیکھا، اس سے اندازہ لگا سکتا ہوں۔''

''یہ بھی سمجھے کہ میں نے تمہیں یہ سب کیوں سنایا......؟''

''اللہ کی قدرت بتانے کے لئے......!''

''وہ تو ہے۔ پر مجھے یہ بتانا تھا کہ اللہ نے دفن ہوئے مردہ گاؤں پر سے

مٹی ہٹوا کر اس زمین پر یہ حق نگر آباد کرایا

یہاں کبھی ٹھاکروں کی گڑھی اور ہندوؤں کے دیگر گاؤں ہوتے تھے۔ اگر اس آندھی میں یہ سب دفن نہ ہوتے تو آج یہ زمین ہندوستان میں ہوتی۔ لیکن اب یہ حق نگر ہے اور پاکستان میں ہے۔ یہ حق نگر پاکستان کی طرح اللہ کا معجزہ ہے، اس کا کرم ہے۔'' وہ رکی اور اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنی بات جاری رکھی۔

''کون جانے، وقت کہانی دہرا رہا ہو۔ ممکن ہے، کافروں کے گاؤں سے یہاں تباہی ہو۔ پر میرا ایمان ہے کہ حق نگر ختم بھی ہوگیا تو دوبارہ آباد ہوگا۔ برسوں پہلے میں نے عبدالحق کو یہاں سے جانے پر مجبور کیا تھا، آج تم سے کہہ رہی ہوں کہ تم زرینہ کو لے کر چلے جاؤ۔ ہم دو بوڑھی عورتوں کو یہاں چھوڑ جاؤ۔ انشاء اللہ تم واپس آؤ گے تو ہم تمہیں یہیں ملیں گی۔ تم چلے جاؤ بیٹے......!''

اکبر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''آپ نے میری آنکھیں کھول دیں اماں......!'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

''اب ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ یہ زمین کتنی قیمتی ہے۔''

''شکر ہے کہ تم نے اللہ کے اس انعام کو سمجھ لیا۔ یہ حق نگر اللہ کا تحفہ ہے۔ اس آندھی سے پہلے اس زمین پر میرے شوہر، میرے بیٹے اور میرے علاوہ نماز پڑھنے والا کوئی نہیں تھا۔''

''میں سمجھ گیا اماں......!''

''کاش! یہ بھی سمجھ لو کہ پاکستان کتنی بڑی نعمت ہے۔'' صفیہ نے کہا۔

''اور اس کی قیمت مسلمانوں نے اپنے خون اور مال اور آبرو سے چکائی ہے۔''

اکبر نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

''اب میں یہ کبھی نہیں بھولوں گا امی......!''

❁ ❁ ❁

عبدالحق کو یہ اطلاع عام لوگوں سے پہلے مل گئی تھی۔ عوام کو تو خبروں میں پتا چلا تھا۔

وہ محکمہ خارجہ کے لئے ایک مصروف ترین دن تھا۔ احتجاجی مراسلہ تیار کر کے بھارت کے سفیر کے حوالے کر دیا گیا۔ بھارت نے بغیر کسی جواز اور بغیر اعلان کے فوج کشی کر کے عالمی قوانین کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔

تمام دوست ممالک سے رابطے کئے گئے۔ ان پر صورتِ حال واضح کر کے ان سے ہر ممکنہ مدد کی درخواست کی گئی۔

لیکن ریڈیو پر عوام سے صدرِ پاکستان کا خطاب اہم ترین سنگِ میل قرار پایا۔ جوش، ولولے اور عزم سے بھرپور اس خطاب نے عوام میں نئی روح پھونک دی۔ اٹھارہ سالہ قوم نے ایک انگڑائی لی اور چودہ سو سالہ اُمت بھی تبدیل ہوگئی۔ ہر شخص اپنے مقام پر جیسے اپنے محاذ پر تھا، اور جنگ لڑ رہا تھا۔

جنگ کے لئے تیار نہ ہونے کے باوجود پاکستانی افواج نے بزدل دشمن کو حیران کر دیا، جس نے رات کی تاریکی میں اچانک حملہ کیا تھا اور سوچا تھا کہ محض چند گھنٹوں میں وہ لاہور پر قابض ہوگا۔ افواجِ پاکستان نے نہ صرف موثر دفاع کیا، بلکہ جارحانہ حکمت عملی تیار کر کے اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔

وزارتِ خارجہ میں مصروفیت ایسی تھی کہ دن اور رات برابر ہوگئے تھے۔

عبدالحق کا تبادلہ سعودی سفیر شہزادہ محمد بن عثمان کی فرمائش پر ہوا تھا۔ اس لئے اسے ذاتی طور پر بھی سعودی سفیر سے رابطے کے لئے کہا گیا۔ کیونکہ سعودی حکومت کا ردعمل کچھ حوصلہ افزا نہیں تھا۔

انڈونیشیا اور چین دو ایسے ممالک تھے، جنہوں نے اس موقع پر پاکستان کی کھل کر مدد کی۔

عبدالحق نے سعودی سفارت خارجہ جا کر شہزادہ محمد بن عثمان سے ملاقات کی۔ شہزادے نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''مجھے شرمندگی ہے برادر عبدالحق! کہ میری محبت نے تمہیں مصیبت میں

پھنسا دیا۔''

''یہ میرے لئے مصیبت نہیں ..... ایک اعزاز ہے یور ہائی نس۔'' عبدالحق نے بے حد خلوص سے کہا۔

''اور میں اس کے لئے آپ کا شکرگزار ہوں۔''

وہ ان کے درمیان پہلی ملاقات تھی۔ کیونکہ عبدالحق کو اسلام آباد میں وزارتِ خارجہ جوائن کئے چند ہی دن ہوئے تھے۔

''تم مجھ سے تکلف نہ کیا کرو برادر عبدالحق.....!'' شہزادے نے بڑی محبت سے کہا۔

''یہ تکلف نہیں، آپ کے مقام کا تقاضا ہے۔ اس عمارت میں تو میں آپ کے یور ہائی نس کے سوا کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔''

''لیکن یہ ملاقات سرکاری تو نہیں۔ وزارتِ خارجہ سے مجھے سرکاری طور پر جو پیغام ملا تھا، وہ میں نے اپنی حکومت کو پہنچا دیا ہے۔''

''یہ غیر رسمی، نیم سرکاری ملاقات ہے یور ہائی نس۔ ہمیں اس وقت برادر ملک کی امداد کی اشد ضرورت ہے۔''

محمد بن عثمان نے ایک گہری سانس لی۔

''میں اس وقت تم سے جو گفتگو کروں گا، وہ ذاتی حیثیت میں ہوگی۔''

''میں اس کا مطلب سمجھتا ہوں یور ہائی نس۔''

''بدقسمتی سے ہماری حکومت کا جھکاؤ بھارت کی طرف رہا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ تجارتی مجبوریاں ہیں۔ لیکن مجھ سمیت حکومت میں بعض اہم افراد اس میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ پاکستان ایک مسلم ملک ہے، اور ہمیں بھارت پر اسے فوقیت دینی چاہئے۔ میری سفیر کی حیثیت سے یہاں تقرری اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ لیکن یہ تبدیلی بتدریج ہوگی۔ پالیسیوں پر یوٹرن لینا کسی بھی طرح اچھا نہیں ہوتا۔''

''لیکن یور ہائی نس .....''

''مجھے بات پوری کرنے دو برادر.....!'' محمد بن عثمان نے نرم لہجے میں

کہا۔

''اس وقت ہم کھل کر پاکستان کی مدد نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم مدد ضرور کریں گے۔ البتہ راز داری کے ساتھ۔ اور تمہاری حکومت کو بھی اس راز داری کا پاس رکھنا ہوگا۔ مجھے اس کی ضمانت درکار ہے۔''

''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں......'' عبدالحق نے جوش سے کہا۔

محمد بن عثمان نے اس کی بات کاٹ دی۔'' تم میرے لئے قابل احترام ہو برادر......! لیکن یقین دہانی سرکاری ہونی چاہئے۔''

''یہ کام انشاء اللہ آج ہی ہو جائے گا۔''

''ہمارے پاس حربی وسائل تو ہیں نہیں، ہم مالی مدد کے علاوہ صرف تیل فراہم کر سکتے ہیں۔''

''جزاک اللہ......! یور ہائی نس۔ یہ ہمارے لئے بہت ہے۔''

''اور مجھے تمہاری افواج کی کارکردگی پر خوشی بھی ہے اور فخر بھی۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ مسلمان موت سے نہیں ڈرتا، بلکہ شوقِ شہادت سے مالا مال ہوتا ہے۔ کاش پوری اُمت ایسی ہو جائے۔''

''آمین......!'' عبدالحق نے دل کی گہرائی سے کہا۔

''میں آپ کا شکر گزار ہوں یور ہائی نس......! اب میں......''

محمد بن عثمان نے اس کی بات کاٹ دی۔

''بقول تمہارے غیر رسمی، نیم سرکاری ملاقات ہو چکی۔ اب یہ ذاتی ملاقات ہے۔''

''جی...... بہت بہتر......!''

محمد بن عثمان اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

''بہت تھکے تھکے لگ رہے ہو برادر......!''

''گزشتہ تین روز مصروفیت ہی ایسی رہی ہے۔ گھنٹے دو گھنٹے سے زیادہ نیند نہیں مل سکی ہے۔''

''ارے ہاں......! تمہارے گھر والے تو لاہور میں ہیں نا......؟''

اس سوال نے عبدالحق کو چونکا دیا۔ ان تین دنوں میں اسے کچھ سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔

''اس وقت تو ہم بکھرے ہوئے ہیں یور ہائی نس۔'' اس نے جواب دیا۔

''میرے بھائی بھابی اور بھتیجا تو لاہور میں ہیں۔ دونوں بیویاں ایبٹ آباد میں ہیں، اور......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

محمد بن عثمان اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت سپید پڑ گئی تھی۔ آنکھوں میں خالی پن تھا، جیسے وہ شاک میں ہو۔

''کیا ہوا برادر عبدالحق......! خیریت تو ہے......؟''

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کا خالی پن دور ہو چکا تھا، اور اب ان میں سراسیمگی تھی۔

''کیا ہوا برادر......؟'' شہزادے کے لہجے میں شفقت تھی۔

''میری اماں......'' عبدالحق کے لئے بولنا دشوار ہو رہا تھا۔

''......وہ سرحد کے قریب میرے آبائی قصبے حق نگر میں ہیں...... میری بہن کے ساتھ۔''

''اوہ......!'' محمد بن عثمان نے بے ساختہ کہا۔ پھر حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر وہ بولا تو اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اور تمہیں اب تک اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ پہلی بار تمہیں خیال آیا ہے ان کا؟ تین دن بعد......؟''

''جی......! فرصت ہی نہیں ملی۔'' عبدالحق نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

''تو اب تم کیا کرو گے......؟''

''دعا ہی کر سکتا ہوں ان کے لئے۔''

''جا کر انہیں واپس لاہور کیوں نہیں لے آتے......؟''

''ایسے وقت میں ذاتی معاملات پیچھے چلے جاتے ہیں یور ہائی نس۔ میں ایک دن کی چھٹی بھی نہیں لے سکتا۔ ویسے بھی حفاظت کرنے والا تو اللہ ہے۔''

محمد بن عثمان اب اسے ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تمہاری عربی بولنے کی صلاحت نے مجھے تمہارا دوست بنایا برادر عبدالحق......!'' اس کے لہجے میں محبت تھی۔

''لیکن اب میں تمہیں گہرائی میں دیکھ رہا ہوں تو مجھے تم سے تعلق پر فخر محسوس ہو رہا ہے۔''

عبدالحق نے کچھ نہیں کہا۔ اب وہ اماں اور حق نگر کے بارے میں فکر مند تھا۔

''ایک بات بتاؤ......! جہاں تمہاری ماں ہیں، وہاں فون ہے......؟''

''جی ہاں......! ہے۔''

''نمبر بتاؤ......!''

عبدالحق نے نمبر بتایا۔ محمد بن عثمان نے نمبر ملایا۔ کئی بار کی کوشش ناکام ہوئی تو اس نے اپنے سیکرٹری سے کہا کہ اس سلسلے میں ایکسچینج سے معلومات کرے۔

سیکرٹری نے بتایا کہ تقریباً تمام سرحدی علاقوں کا مواصلاتی رابطہ باقی ملک سے منقطع ہو چکا ہے۔

''اب تو بس یہی ایک صورت ہے کہ تم خود وہاں جاؤ۔'' محمد بن عثمان نے عبدالحق سے کہا۔

''اور یہ ممکن نہیں......!''

''خیر......! یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ اب سرکاری بات ہو جائے۔''

عبدالحق کو محمد بن عثمان کے اس اچانک رویے پر حیرت ہوئی۔ لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

''جیسا کہ میں نے کہا کہ ان معاملات میں راز داری کی ضرورت ہے۔ قوموں کے معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تم میری بات غور سے سنو......! میں نے پہلے ہی بتا دیا کہ ہماری حکومت کھل کر تمہاری مدد نہیں کر سکتی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ بات خبروں میں نہیں آئے گی اور میں تمہارے صدر یا وزیر خارجہ سے ملوں تو یہ خبر بنے گی۔ اور ان میں سے کوئی مجھ سے ملنے آئے تو یہ بھی خبر ہوگی۔ مجھے قومی سطح پر اس یقین دہانی کی ضرورت ہے کہ ہم پاکستان کے لئے جو کچھ بھی کریں گے۔ اس

ے بارے میں مکمل راز داری سے کام لیا جائے گا۔ اب یہ کام آسان تو نہیں۔''

عبدالحق سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ایک ہی راستہ ہے۔''

''ٹیلی فون......!'' محمد بن عثمان نے اس کی بات پوری کر دی۔

''جی ہاں......!''

''ٹیلی فون بھی ہاٹ لائن......صدر صاحب خود مجھ سے بات کریں گے۔''

''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں......!''

''مسئلہ ہے۔'' محمد بن عثمان نے اس کی بات کاٹ دی۔

''یہ بات صدر صاحب تک کون پہنچائے گا......؟''

عبدالحق چکرا گیا۔ بات درست تھی۔ مسئلہ پروٹوکول کا تھا۔ وہ براہ راست صدر صاحب سے تو بات نہیں کر سکتا۔ اصولاً تو اسے یہ بات سیکرٹری خارجہ سے کرنا تھی۔ سیکرٹری خارجہ وزیر خارجہ سے اور پھر وزیر خارجہ صدر سے بات کرتا۔

محمد بن عثمان جیسے اس کی سوچیں پڑھ رہا تھا۔

''تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔ لیکن ہمیں کوئی اور صوت نکالنی ہوگی۔''

''مجھے تو یہ ممکن نظر نہیں آتا۔''

''سوچا جائے تو کوئی صورت نکل ہی آتی ہے۔''

ذرا دیر بعد محمد بن عثمان نے ایک خاکہ عبدالحق کے سامنے رکھ دیا۔ تفصیل اس نے زبانی بتائی۔

✿ ✿ ✿

''تو وہ ہماری امداد نہیں کریں گے......؟'' سیکرٹری نے کہا۔

''جی جناب......! انہوں نے صاف انکار کر دیا۔''

''یہ تو حال ہے مسلمانوں کا۔ مسلمانوں کے بجائے کفار کی مدد کرتے ...'' سیکرٹری جذباتی ہو گیا۔

''اور جناب......! انہوں نے مجھے ایک شکایت نامہ اس ہدایت کے ساتھ ... کہ یہ مجھے خود صدر صاحب کو پہنچانا ہے۔''

''وہ کون ہوتا ہے یہ حکم صادر کرنے والا.....؟'' سیکرٹری کو غصہ آ گیا۔

''لاؤ.....! مجھے دکھاؤ وہ شکایت نامہ۔''

''انہوں نے کہا تھا کہ یہ میں صرف صدر صاحب کے ہاتھ میں دوں۔''

''تم حکومت پاکستان کے ملازم ہو عبدالحق صاحب.....! کسی اور کے حکم کے پابند نہیں ہو۔''

''یہ درست ہے جناب.....!'' عبدالحق نے وہ سرکاری خط سیکرٹری کے حوالے کر دیا۔

خط کھلے ہوئے لفافے میں تھا۔ سیکرٹری کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ تاہم اس نے خط نکالا اور پڑھنے لگا۔ پڑھنے کے دوران اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اس کا غصہ بڑھ رہا ہے۔

''یہ بکواس ہے.....؟'' اس نے خط کو دوبارہ لفافے میں رکھتے ہوئے کہا۔

''انہیں شبہ ہے کہ ان کی کالیں ٹیپ کی جا رہی ہیں۔ انہیں شبہ ہے کہ انٹیلی جنس والے ان کی نگرانی کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے سفارتی حقوق پامال کئے جا رہے ہیں۔ نری بکواس ہے۔''

''مجھے تو معلوم نہیں جناب.....! میں نے تو پڑھا بھی نہیں۔''

سیکرٹری نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

''اور حال یہ ہے کہ وہ خود سفارتی آداب سے بے بہرہ ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہمارے ہی افسر کے ہاتھ یہ شکایت نامہ بھیجنا..... اس کا اسے کوئی حق نہیں تھا۔ وہ فرسٹ سیکرٹری کے ہاتھ یہ خط ہمیں بھجواتا۔ صدر صاحب سے براہ راست.....''

''اس وقت صورتِ حال کچھ ایسی ہے جناب.....! کہ میرے خیال میں صدر صاحب.....''

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ سیکرٹری نے فون اٹھایا۔

عبدالحق جانتا تھا کہ یہ کس کا فون ہے۔ وہ پروگرام کے عین مطابق تھا۔

''ٹھیک ہے۔ بات کراؤ.....!'' سیکرٹری نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر عبدالحق سے بولا۔

''ہز ہائی نس پرنس محمد بن عثمان کا فون ہے۔'' اس کے لہجے میں تحقیر تھی۔

عبدالحق نے بے پروائی سے سر جھٹک دیا۔

''جی.....! آپ کیسے ہیں یور ہائنس۔'' سیکرٹری فون پر بھی تقریباً کورنش بجا لایا۔

''میرا شکایت نامہ صدر صاحب تک پہنچا دیا گیا.....؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''نہیں یور ہائی نس۔ ابھی تو عبدالحق صاحب یہاں پہنچے ہیں۔''

''آپ نے پڑھ لیا اسے.....؟''

''میں کیسے پڑھ سکتا ہوں یور ہائی نس۔ جبکہ وہ صدر صاحب کے لئے ہے۔'' سیکرٹری نے عبدالحق کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''بس.....! تو آپ عبدالحق کے ہاتھ اسے صدر صاحب کو بھجوا دیں۔''

''سوری یور ہائی نس، لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔'' سیکرٹری نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''کیوں.....؟'' دوسری طرف سے سخت لہجے میں پوچھا گیا۔

''یہ پروٹوکول کے خلاف ہے یور ہائی نس۔ قاعدے کے مطابق ہم تو قاصد کے ذریعے اسے صدر صاحب کے سیکرٹریٹ تک بھجوا سکتے ہیں۔''

''آپ یہ نہ بھولیں مسٹر سیکرٹری کہ آپ اس وقت حالت جنگ میں ہیں۔ میری شکایات بڑی سنگین نوعیت کی ہیں، جن کا فوری طور پر ازالہ کیا جانا چاہئے۔ میں یہ بھی بتا دوں کہ مجھے یہ علم ہے کہ آپ کے دفاتر میں فائلیں کس رفتار سے چلتی ہیں۔ اسی لئے اس خط کو ڈائریکٹ صدر صاحب تک پہنچانا چاہتا ہوں۔''

''لیکن یور ہائنس، یہ عبدالحق کا..... بلکہ میرا بھی منصب نہیں کہ ہم براہ راست صدر صاحب.....''

''آپ بس اپنی ذمہ داری پوری کریں۔ طریقہ میں بتاتا ہوں۔'' دوسری

طرف سے خشک لہجے میں کہا گیا۔

سکریٹری سنتا رہا۔ پھر اس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

''لیس یور ہائی نس۔'' اور فون رکھ دیا۔

فون رکھنے کے بعد اس نے رومال سے پیشانی کا پسینہ خشک کیا اور عبدالحق کو پرُ خیال نظروں سے دیکھتا رہا۔

''تمہاری تو سفیر صاحب سے خاصی گہری دوستی ہے۔''

''دوستی تو لیول کے مطابق ہوتی ہے جناب ...!'' عبدالحق نے بے تامل کہا۔

''میں عربی بول اور سمجھ لیتا ہوں، کسٹمز میں اس بنیاد پر ہز ہائی نس کا کنسائنمنٹ میرے سپرد کیا تھا۔ دوستی کیسی جناب ...!''

''لیکن تمہارا یہاں تبادلہ بھی انہی کی فرمائش پر ہوا ہے۔'' سکریٹری کا انداز معترفانہ تھا۔

''مجھے ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔ میں کسٹمز میں بہت خوش تھا۔''

سیکریٹری مسکرایا۔

''یہی تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔ کسٹمز چھوڑ کر وزارتِ خارجہ میں کون آتا ہے ...؟''

عبدالحق کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''میں تو ہر جگہ اور ہر حال میں خوش رہنے والا آدمی ہوں جناب ...!''

سکریٹری نے جیسے سنا ہی نہیں۔

''یعنی یک طرفہ محبت ہے یہ۔ ہز ہائی نس نے تمہیں بلوا لیا ... تمہاری مرضی کے خلاف۔''

عبدالحق کو غصہ تو بہت آیا۔ لیکن سامنے جو بڑے معاملات تھے، ان کے پیش نظر اسے پی لینا ہی مناسب تھا۔ تاہم اس نے کہا۔

''کیسی محبت، کہاں کی دوستی جناب ...! دیکھیں، اسی خیال سے تو مجھے ان کے پاس بھیجا گیا تھا۔ ورنہ میری اتنی حیثیت تو نہیں تھی۔ اور اب نتیجہ دیکھیں۔

میں خالی ہاتھ واپس آیا ... لیکن نہیں، ساتھ میں الٹا ایک شکایت نامہ لے آیا۔''

''ڈپلومیسی درحقیقت منافقت اور بے غیرتی کا نام ہے۔'' سکریٹری نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''اب مجھے دیکھو، جی تو میرا چاہ رہا تھا کہ بے بھاؤ کی سناؤں اسے۔ لیکن سب کچھ بھول کر مجھے اس کی ہدایت پر عمل کرنا ہے۔''

''میں جا سکتا ہوں ...؟'' عبدالحق نے معصومیت سے پوچھا۔

''ابھی نہیں ...!'' سکریٹری نے کہا۔

''میں صدر صاحب کے پی اے سے بات کر لوں۔ پھر بتاتا ہوں۔''

❁ ❁ ❁

صدر کی شخصیت ایسی تھی کہ ان کے سامنے آدمی کو اپنا وجود بے معنی لگنے لگتا تھا۔ عبدالحق تو ویسے ہی ان سے بہت متاثر تھا۔ وہ نہ معیشت داں تھے نہ ماہر اقتصادیات۔ لیکن انہوں نے نہایت قابل اور لائق لوگوں کی ایک ٹیم بنائی تھی، جس نے ملکی معیشت کو مستقبل کے لئے ایک نہایت ٹھوس بنیاد فراہم کر دی تھی۔ اس کے نتیجے میں ملک میں خوش حالی آ رہی تھی۔ اچھے حکمران ایسے ہی ہوتے ہیں۔

''سنا ہے کہ سعودی سفیر نے اپنا کوئی شکایت نامہ مجھے بھیجنے پر اصرار کیا ہے ... اور وہ بھی صرف تمہارے ذریعے۔'' صدر صاحب نے گونج دار آواز میں کہا۔

''لاؤ وہ شکایت نامہ دیکھا تو جائے۔''

لفافہ عبدالحق کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے صدر صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ محض دکھاوا ہے جناب صدر ...! اسے پھاڑ کر پھینک دیجئے گا۔ اصل پیغام تو زبانی ہے۔ یہ کہ آپ سعودی سفیر سے ہاٹ لائن پر بات کر لیں۔''

صدر صاحب کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے۔

''اوہ ...! تمہارا سعودی سفیر سے ایسا کیا تعلق ہے کہ اس نے اس کام کے لئے تمہیں منتخب کیا ...؟''

''یہ ان کی عنایت ہے جناب صدر ...! کہ وہ مجھے دوست سمجھتے ہیں۔

حالانکہ میں اس کا اہل ہرگز نہیں ہوں۔‘‘

صدر صاحب نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

’’کوئی اہلیت تو ہوگی۔ سعودی سفیر کا تعلق شاہی خاندان سے ہے۔ یہ لوگ ایسے ہی دوستیاں نہیں کرتے۔‘‘

’’معمولی سی بات ہے جناب.....!‘‘ عبدالحق نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔

’’عربی زبان کی کچھ شُد بُد ہے مجھے۔ بول اور سمجھ لیتا ہوں۔‘‘

صدر صاحب مسکرائے۔

’’تو یہ تو بڑی خوبی ہوئی نا.....!‘‘ پھر ان کا انداز بدل گیا۔

’’ٹھیک ہے.....! اب تم جا سکتے ہو۔‘‘

❁❁❁

عبدالحق آفس پہنچا تو جیسے دنیا ہی بدل چکی تھی۔ فوراً ہی سکریٹری کے سامنے اس کی پیشی ہوگئی۔ سکریٹری کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔

’’تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا عبدالحق.....!‘‘ اس نے بلا تمہید، سخت لہجے میں کہا۔

’’میں سمجھا نہیں جناب.....!‘‘

’’ہم نے تمہیں سعودی سفیر کے پاس ایک قومی کام کے سلسلے میں بھیجا تھا۔ وہ تو ہوا نہیں، لیکن تم نے اپنا ذاتی کام کرا لیا۔‘‘

’’آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب.....!‘‘ عبدالحق نے احتجاج کیا۔

’’کیسا ذاتی کام.....؟‘‘

’’بنومت.....! خیر، اسے چھوڑو۔ اب تم سات دن کی چھٹی کی درخواست لکھ دو۔ میں ابھی وقت اسے منظور کروں گا، اور اسی وقت سے تمہاری چھٹی شروع۔‘‘

عبدالحق ہکا بکا رہ گیا۔

’’مگر میں چھٹی پر جانا ہی نہیں چاہتا۔ یہ تو ہنگامی صورتِ حال ہے۔ ایسے میں چھٹی.....‘‘

’’یہی تو بات ہے۔‘‘ سکریٹری نے جھنجلا کر کہا۔

’’چھٹی ملنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ یہاں تو چھٹیاں منسوخ کر کے لوگوں کو ڈیوٹی پر بلا لیا گیا۔ ہم نے تمہیں سفیر کے پاس بھیجا تو تم نے اس سے چھٹی کی بات کر لی۔‘‘

عبدالحق کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

’’میرے حلق سے یہ بات نہیں اتر رہی تھی کہ شکایت نامہ صدر صاحب کو بھجوانے کی کیا تُک ہے..... اور وہ بھی صرف تمہارے ہاتھ.....! اب سمجھ میں آئی کہ یہ تمہاری چھٹی کا معاملہ تھا۔‘‘

عبدالحق کی کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

’’ہوا کیا ہے جناب.....! کچھ بتائیں تو.....‘‘ اس نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔

’’صدر صاحب کے پی اے کا فون آیا کہ تم سے ایک ہفتے کی چھٹی کی درخواست لے کر، چھٹی منظور کر کے تمہیں فوری طور پر ریلیو کر دیا جائے۔‘‘

’’آپ کے خیال میں میں نے سفیر صاحب سے اپنی چھوٹی کے لئے بات کی ہوگی.....؟‘‘ عبدالحق کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

’’سامنے کی بات ہے..... کھلی بات ہے۔‘‘ سکریٹری نے بے حد خراب لہجے میں کہا۔

’’اس کے لئے تو سفیر صاحب آپ کو بھی فون کر سکتے تھے۔ چڑیا کے شکار کے لئے توپ استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی.....؟‘‘ عبدالحق نے دلیل دی۔

’’تم جانتے تھے کہ ملک میں ایمرجنسی نافذ ہے۔ میں انکار کر دیتا، اور میرا خیال ہے کہ منسٹر صاحب بھی انکار کر دیتے۔ اسی لئے تم نے سفیر صاحب کو صدر صاحب کا راستہ دکھایا ہوگا۔ سفیر صاحب تو یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکتے۔‘‘

اب عبدالحق بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔

صدر صاحب نے ہاٹ لائن پر سعودی سفیر سے رابطہ کیا ہوگا۔ سفیر نے صدر صاحب پر سفارتی نزاکتوں اور رازداری کی اہمیت واضح کرنے کے بعد سعودی

عرب کی طرف سے دی جانے والی امداد کی تفصیل بتائی ہوگی۔ یہ بھی طے تھا کہ اس کے سفارت خانے سے نکلتے ہی سفیر نے سعودی حکومت سے رابطہ کر کے امداد کے بارے میں معاملات طے کئے ہوں گے۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ یہ باتیں پہلے ہی طے ہو چکی ہوں۔

بہرحال صدر صاحب سے فون پر گفتگو کے آخر میں سفیر نے اس کی چھٹی کا معاملہ سامنے رکھا ہوگا۔ صدر صاحب کے نزدیک وہ ایک چھوٹی سی فرمائش ہوگی۔ انہوں نے اس سلسلے میں اپنے پی اے کو ہدایت کر دی ہوگی۔

سعودی سفیر یقینی طور پر بہت ذہین آدمی تھا۔ وہ ایک عمل سے کئی مقاصد حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ بات اس نے ثابت کر دی تھی۔

عبدالحق سمجھ سکتا تھا کہ سفیر نے اس کی ضرورت کو محض اصل معاملے کو کیمو فلاج کرنے کے لئے استعمال نہیں کیا۔ بلکہ اس نے ایک سچے دوست کی حیثیت سے بڑے خلوص سے اس کی مدد کی۔ صورت حال ایسی تھی کہ وہ مدد از خود اصل معاملے کے لئے پردہ بن گئی۔

عبدالحق نے درخواست سکریٹری کی طرف بڑھائی۔ اس نے فوری طور پر منظوری کا نوٹ لکھ کر اس پر دستخط کئے اور درخواست پر پیپر ویٹ رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

''اب تم جا سکتے ہو۔''

عبدالحق دروازے کی طرف بڑھا۔ سکریٹری کے پکارنے پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

''میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی اپنے کسی کام کے لئے مجھ پر سفارش کے ذریعے دباؤ ڈلوائے۔ یہ بات ذہن میں رکھنا عبدالحق......!''

عبدالحق اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اس نے تو یہاں سفارش یا رشوت کے بغیر کام ہوتے ہی نہیں دیکھے۔ لیکن یہ مناسب نہیں تھا۔ وہ جواب دیئے بغیر پلٹا اور کمرے سے نکل آیا۔

❋ ❋ ❋

نور بانو کو عبدالحق کے اسلام آباد تبادلے کی خبر نے پریشان کر دیا تھا۔ اسلام آباد اور ایبٹ آباد کے درمیان بہت تھوڑا فاصلہ تھا۔ عبدالحق کے لئے یہ بہت آسان تھا کہ دفتر سے چھٹی کے بعد اپنی گاڑی میں بیٹھے اور ایبٹ آباد چلا جائے۔ وہ سحر خیز تھا۔ یہ اس کے لئے کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ رات ایبٹ آباد میں گزارے اور صبح یہاں سے سیدھا اپنے دفتر چلا جائے۔ جبکہ یہاں کی صورت حال کے مطابق نور بانو اس کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

یہاں صورتِ حال چاند چڑھے گا تو دنیا دیکھے گی ..... والی ہوگئی تھی۔ اب چھپانے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ یہاں تو سب خیر تھی۔ رشیدہ اور آبیہ کے سوا کسی کو حقیقت کا علم نہیں تھا۔ لیکن عبدالحق آ جاتا تو ..

یہ خیال آتا تو نور بانو کو پسینے چھوٹنے لگتے۔

اطمینان کی بات صرف اتنی تھی کہ عبدالحق وعدے کا پاس رکھنے والا تھا۔ لیکن صرف اس بات سے نور بانو کی تسلی نہیں ہو سکتی تھی۔ کچھ بھی ہو، وہ بہرحال انسان تھا..... اور مرد۔ فطری تقاضے تو اسے بھی ستاتے ہوں گے۔ پھر وہ اس سے محبت بھی کرتا تھا۔ اتنا کم فاصلہ..... تو کیا عجب ہے کہ وہ کسی دن ایبٹ آباد چلا آئے، چاہے بعد میں اس پر شرمندہ ہو یا پچھتائے۔ انسان کا تو اسی طرح کا معاملہ ہوتا ہے۔ ایک کمزور لمحے میں سب کچھ ہار جاتا ہے۔ جبکہ یہاں تو تحریک بھی بہت بڑی تھی۔

اسی لئے عبدالحق نے فون کر کے تبادلے کی اطلاع دی تو نور بانو نے احتیاطاً اپنی کھڑی ہوئی دیوار کو دو اور ردے لگا کر مزید اونچا کر دیا۔

''واہ.....! اس کا مطلب ہے کہ اب آپ بہت قریب آ رہے ہیں۔'' اس نے چہک کر کہا۔

''ہاں.....! بہت قریب، لاہور سے بھی اور ایبٹ آباد سے بھی۔''

''اسلام آباد سے ایبٹ آباد کا سفر کتنی دیر کا ہے.....؟'' اس نے پوچھا۔

''زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے کا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ دفتر سے چھٹی کر کے یہاں

آئیں، رات گزاریں اور صبح یہاں سے دفتر چلے جائیں۔‘‘

’’بالکل ممکن ہے۔لیکن یہ تم کہہ رہی ہو......؟‘‘ عبدالحق کے لہجے میں حیرانی در آئی۔

’’تو اور کون کہہ سکتا ہے......؟‘‘ نوربانو نے لہجے میں بے خودی سموتے ہوئے کہا۔

’’آپ کو کیا پتا کہ میں آپ کو کتنا یاد کرتی ہوں، کتنی کمی محسوس کرتی ہوں آپ کی۔ شاید اس عرصے میں بیویوں کو شوہر کے سہارے کی کچھ زیادہ ہی ضرورت ہوتی ہے۔‘‘

دوسری طرف خاموشی رہی۔ عبدالحق نے کچھ نہیں کہا۔

’’تو آپ آئیں گے نا......؟‘‘

’’میں کیسے آسکتا ہوں......؟‘‘

’’کیوں نہیں آسکتے ......؟ میں اسلام آباد تبادلے کے بعد کی بات کر رہی ہوں۔‘‘

عبدالحق نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

’’تم کچھ بھول رہی ہو۔‘‘

’’مجھے تو اس وقت آپ کے سوا کچھ یاد ہی نہیں۔‘‘

’’حالانکہ یہ بات تمہیں کبھی بھولنی ہی نہیں چاہئے۔‘‘

نوربانو کو ڈھارس بندھی، تقویت کا احساس ہوا۔ گویا عبدالحق کو اپنا وعدہ یاد ہے۔ تاہم اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

’’آپ کس بات کی بات کر رہے ہیں ......؟‘‘

’’حیرت ہے......! تمہیں یاد نہیں۔‘‘

’’آپ یاد دلا دیں نا......!‘‘

’’تم نے مجھ سے ایک وعدہ لیا، مجھے پابند کیا تھا، تم نے ایک منت مانی تھی، تمہیں یاد نہیں......؟‘‘

نوربانو نے اپنی آواز سے یہ تاثر دیا کہ جیسے اسے زبردست جھٹکا لگا ہے۔

’’ارے......! وہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔‘‘ اس نے لہجے میں تاسف سموتے ہوئے کہا۔

’’اب سوچتی ہوں کہ کتنی بڑی حماقت کر بیٹھی ہوں۔‘‘

’’اس میں تو کوئی شک ہی نہیں۔‘‘

’’آدمی حماقت کا ازالہ بھی تو کر سکتا ہے۔‘‘

’’کیسے......؟‘‘

’’میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھ سے آپ کے بغیر نہیں رہا جاتا۔‘‘

’’یہ کیسے ممکن ہے......؟‘‘

’’بس آپ آجائیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔‘‘

’’تم وعدے کی اہمیت نہیں سمجھتیں۔‘‘ عبدالحق نے تمہیدی لہجے میں کہا۔

’’اللہ تو انسانوں سے کئے گئے وعدوں کی خلاف ورزی بھی پسند نہیں کرتا۔ جبکہ منت تو اللہ سے کیا ہوا عہد ہوتا ہے۔ جو بندے نے مانگا ہوتا ہے، اس کی قیمت ہوتی ہے ایک طرح سے۔ اس سے پھرنا تو اللہ کو صریحاً ناراض کرنا ہے۔‘‘

’’میں کچھ نہیں جانتی۔ بس آپ......‘‘ نوربانو رونے لگی۔

’’شاید میں تم سے زیادہ تڑپ رہا ہوں تمہارے پاس آنے کے لئے۔‘‘ عبدالحق نے کہا۔

’’لیکن کیا کروں......؟ تم ہی نے مجھے پابند کیا، مجھ سے وعدہ لیا اور میں وعدہ شکنی کا قائل نہیں ہوں۔‘‘

’’تو کیا میں یوں ہی ترستی رہوں گی آپ کے لئے......!‘‘

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر عبدالحق نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

’’ایک صورت ہے۔ اللہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ اس نے ہر طرح سے بندوں کے لئے آسانیاں عطا فرمائی ہیں۔ قسموں اور وعدوں سے نکلنے کے لئے کفارے کا راستہ ہے۔ لیکن یہاں ہمیں دہرا کنارہ ادا کرنا ہوگا...... تمہیں الگ اور مجھے الگ۔ میں قرآن پاک میں دیکھوں گا، اور کسی صاحب علم سے راہنمائی بھی

طلب کروں گا اس سلسلے میں۔''

نور بانو بری طرح دہل گئی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ عبدالحق کو پکا کرنے کے اس کھیل میں مناسب حدود سے آگے نکل گئی تھی۔

''نہیں عبدالحق صاحب ......! اس کی ضرورت نہیں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''یہ معاملہ بہت بڑا اور اہم ہے میرے لئے۔ بات آپ کے بچے کی ہے۔ خدانخواستہ اسے کسی بھی طرح کا نقصان پہنچ جائے تو اس کا کوئی ازالہ نہیں ہوگا۔ نہیں..... ہرگز نہیں، ہم دونوں کو ہی اپنے عہد کی پابندی کرنی ہوگی۔ بھول جائیں اس بات کو۔''

دوسری طرف عبدالحق نے سکون کا سانس لیا۔ یہ اس کی آواز سے ظاہر تھا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو تم.....! صبر کرنا ہی مناسب ہے۔ اللہ بھی اسے پسند کرتا ہے۔ ہمیں انشاء اللہ اس کا صلہ بھی ملے گا۔''

لیکن شاید عبدالحق کے اندر کا مرد جاگ چکا تھا۔ اس کی اگلی بات سن کر تو نور بانو پر لرزہ طاری ہوگیا۔

''مگر خوش قسمتی سے میری ایک بیوی اور بھی ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''میں اس سے ملنے کے لئے تو آسکتا ہوں۔ اس کے لئے تو کوئی پابندی نہیں ہے مجھ پر۔''

نور بانو چند لمحوں کے لئے گنگ ہوکر رہ گئی۔ پھر اس نے جلدی سے دلیل دی۔

''لیکن میں بھی تو یہیں ہوں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے.....؟ اتنا بڑا گھر ہے۔ بات مشکل سہی، مگر میں دل پر پتھر رکھ لوں گا۔ نہیں ملوں گا تم سے۔''

نور بانو کی حاسدانہ فطرت اس طرح ابھری کہ وہ خود پر قابو ہی نہ رکھ سکی۔

''تو یوں کہیں نا..... اس سے ملنے کے لئے تڑپ رہے ہیں آپ.....!''

اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''میں تو تم سے ملنے کے لئے تڑپ رہا ہوں۔ لیکن وہ بھی بہرحال میری بیوی ہے۔ اور تم نے خود اصرار کر کے اس سے میری شادی کرائی تھی۔ ورنہ خدا گواہ ہے کہ میں تو یہ چاہتا ہی نہیں تھا۔ اب تم تنگ دلی اور روایتی جہالت کا مظاہرہ کرو تو یہ میں قبول نہیں کروں گا۔ تمہیں تو اپنی فطرت کا پتا تھا۔ تمہیں یہ شادی کرانی ہی نہیں چاہئے تھی۔ اب اس کے بھی تو کچھ حقوق ہیں۔ تمہاری منت کی خاطر میں انہیں نظر انداز کر کے گناہ گار نہیں ہوسکتا۔''

''یہ فلسفہ مجھے نہ پڑھائیں۔ وہ کم عمر بھی ہے اور حسین بھی، اس لئے ....''

''تمہاری سوچ کبھی نہیں بدلے گی۔'' عبدالحق نے سخت لہجے میں کہا۔

''تم اسے اپنی بہن سمجھتی تھیں، مگر اب تمہارے لئے وہ محض سوکن ہے۔''

نور بانو نے بہت تیزی سے خود کو سنبھالا۔ عبدالحق کی ہر بات درست تھی۔ اسے غلط ثابت کرنے کے لئے وہ اسے یہاں آنے اور ارجمند سے ملنے کی اجازت بھی دے دیتی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ عبدالحق اس سے ملے یا ارجمند سے، دونوں صورتوں میں اس کا پول کھل جاتا۔

اس نے جلدی سے پینترا بدلا۔

''وہ اب بھی میرے لئے بہن ہی ہے۔ اور میں جانتی ہوں کہ میں اصرار نہ کرتی تو آپ کبھی اس سے شادی نہ کرتے۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں، زچگی کے عرصے میں عورتوں کے مزاج میں تبدیلی آتی ہے۔ میں شاید چڑچڑی ہوگئی ہوں۔ کچھ اس کی وجہ آپ سے دوری بھی ہے۔ میں کب دور رہی ہوں آپ سے۔ یہ پہلا موقع ہے، اور اس کا سبب بھی میں خود ہوں۔ اس لئے اور زیادہ جھنجلاتی ہوں۔ آنے والے کی فکر نہ ہوتی تو خود اصرار کر کے آپ کو بلواتی۔ لیکن اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔''

''لیکن میں تو.....''

وہ جانتی تھی کہ وہ کیا کہے گا۔ اس نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

''مجھے بات پوری کرنے دیں۔ آپ یہاں آئیں، سر آنکھوں پر، میرا کوئی حق نہیں ہے اعتراض کرنے کا۔ لیکن یہ جانتی ہوں کہ اس طرح آپ بھی آزمائش میں پڑیں گے اور میں بھی۔ اتنے قریب آکر آپ مجھ سے ملے بغیر رہ سکیں گے.....؟''

اس نے چند لمحے انتظار کیا۔ لیکن دوسری طرف سے حسب توقع جواب نہیں ملا۔

''خیر.....آپ تو رہ لیں گے۔ لیکن اپنا مجھے معلوم ہے کہ میں نہیں رہ سکوں گی۔'' اس نے دوسرے زاویے سے وار کیا۔

''خیر.....آپ آجائیں۔''

''نہیں.....! میں نہیں آرہا ہوں۔ میں نہ تمہیں آزمائش میں ڈالنا چاہتا ہوں نہ خود کو۔''

ادھر ادھ کی چند باتوں کے بعد عبدالحق نے ریسیور رکھا تو نور بانو نے سکون کا سانس لیا۔ اس وقت وہ بال بال بچی تھی۔ اور حماقت اس کی اپنی تھی۔ بات کو اتنی دور نہیں لے جانا چاہئے، جہاں واپسی ممکن ہی نہ رہے۔

عبدالحق کے اسلام آباد تبادلے کو چند روز ہی ہوئے تھے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس بات کو اب تین دن ہوگئے تھے، اور عبدالحق کا فون نہیں آیا تھا۔ وہ پریشان ہو رہی تھی۔

مگر اسے احساس تھا کہ ارجمند اس سے کہیں زیادہ پریشان ہے عبدالحق کے لئے۔ رشیدہ کا کہنا تھا کہ پریشانی نہ ارجمند کے لئے اچھی ہے اور نہ ہی بچے کے لئے۔

نور بانو نے ارجمند کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''تم پریشان نہ ہو۔ جنگ کی وجہ سے مصروفیت بڑھ گئی ہوگی۔''

''میں پریشان نہیں ہوں آپی.....!'' ارجمند نے کہا۔

''البتہ مجھے دادی اماں کی فکر ہے۔ حق نگر تو بالکل سرحد پر ہے۔''

''مجھ سے چھپاتی ہو۔ میں بہن ہوں تمہاری۔ کیا جانتی نہیں ہوں تمہیں۔''

خوش قسمتی سے اس وقت فون کی گھنٹی بجی۔

''لو.....فون آگیا ان کا۔'' نور بانو نے بہت یقین سے کہا۔

''اب پہلے تم ہی بات کرلو۔ تاکہ تسلی ہو جائے تمہاری۔''

ارجمند نے حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔ آپی اسے عبدالحق سے بات کرنے کا موقع ہی کب دیتی تھیں۔

نور بانو کے سامنے اس وقت دو مقاصد تھے۔ ایک تو عبدالحق کا یہ تاثر زائل کرنا کہ وہ ارجمند کو سوکن سمجھتی ہے۔ دوسری ارجمند کی پریشانی دور کرنا، جو بچے کے لئے نقصان دہ ہو سکتی تھی۔ آخر وہ بچہ اسی کو تو ملنا تھا۔ وہ اسی کا بچہ تو کہلاتا۔

''اٹھاؤ نا فون.....!'' اس نے ذرا ڈپٹ کر کہا۔

''ارے ارجمند.....!'' عبدالحق کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور خوشی بھی۔

''تمہاری آواز تو کب سے نہیں سنی میں نے۔ بہت مصروف رہتی ہو۔''

''جی.....اتفاق ہے کہ آپ کا فون جب بھی آیا، میں مصروف تھی۔''

''کیسی ہو تم.....!''

''الحمد للہ.....! میں ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں۔ آپ نے سو پریشان کر دیا ہمیں۔''

''ہمیں.....تم تو نہیں ہوئیں نا پریشان۔'' عبدالحق نے ذرا شوخ لہجے میں کہا۔

''جی.....میں بھی۔'' ارجمند نے کن انکھیوں سے نور بانو کو دیکھتے ہوئے دبی آواز میں کہا۔

''فون کیوں نہیں کیا اتنے دن سے.....؟''

''تمہیں نہیں پتا۔ ملک میں ایمرجنسی نافذ ہے۔ اتنی مصروفیت رہی کہ دن رات برابر ہوگئے۔''

ارجمند نے نور بانو کی بے چینی محسوس کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔

''لیجئے.....آپی سے بات کیجئے۔ یہ بہت پریشان ہو رہی تھیں۔''

نور بانو نے ریسیور لیتے ہی شکایات کا دفتر کھول دیا۔

عبدالحق نے اسے مصروفیت کے بارے میں بتانے کے بعد کہا۔

''فون میں نے اس لئے کیا ہے کہ مجھے اماں سے ملنے جانے کے لئے خاص طور پر ایک ہفتے کی چھٹی دی گئی ہے۔ میں صبح حق نگر جا رہا ہوں۔ وہاں سارے رابطے منقطع ہیں۔ میں فون نہیں کر سکوں گا وہاں سے۔ پریشان نہ ہونا۔''

لیکن نور بانو تو یہ سن کر ہی پریشان ہوگئی۔

''کمال کرتے ہیں آپ....! کوئی ضرورت نہیں آپ کو وہاں جانے کی۔ وہ تو بالکل سرحد ہے، جہاں جنگ ہو رہی ہے۔''

''وہاں میری اماں موجود ہیں۔'' عبدالحق نے خشک لہجے میں کہا۔

''موجودہ صورتِ حال میں تو یہ بہت ضروری ہے کہ میں وہاں جاؤں۔''

''میں نے کہا نا....!''

''تم مجھ سے اس طرح بات نہ کرو۔ میں جانتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

عبدالحق کے لہجے نے نور بانو کو دہلا دیا۔

''آپ کو میری پریشانی کا بالکل خیال نہیں۔''

''خیال نہ ہوتا تو فون کر کے تمہیں کیوں بتاتا؟ بتائے بغیر ہی نہ چلا جاتا۔''

''اچھا.... اپنا خیال رکھئے گا۔ اور واپس آتے ہی فون کیجئے گا۔''

''یہ کہنے کی ضرورت نہیں.... خدا حافظ....!''

❁ ❁ ❁

حمیدہ عبدالحق کو دیکھ کر خوش ہوگئی۔

''تو یہاں کیوں آ گیا بیٹے....؟''

''تمہارے لئے، زرینہ کے لئے، اکبر اور چچی کے لئے، اپنے سب لوگوں کے لئے۔''

''لیکن ایسے حالات میں سفر کرنا....''

''میں نے تو سفر کیا ہے۔ آپ سب لوگ تو یہاں رہ رہے ہیں۔''

''میں نے تو کہا تھا کہ لاہور چلے جائیں۔'' اکبر نے کہا۔

''لیکن اماں آمادہ ہی نہیں ہوئیں۔ پھر خالد نے بھی مجھے سمجھایا۔''

''مجھے تو نہیں لگتا کہ یہاں سے لوگوں نے نقل مکانی کی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں عبدالحق بھائی....! یہاں سے کوئی نہیں گیا۔ سب لوگ جوش سے بھرے ہوئے ہیں۔ محاذ پر جا کر لڑنا چاہتے ہیں۔ فوجیوں نے بڑی مشکل سے روک رکھا ہے انہیں۔''

''اور صورتِ حال کیا ہے یہاں کی....؟''

''حق نگر سے متصل جو گاؤں حق نگر کی حدود میں ہے، وہ فوج نے خالی کرا لئے ہیں۔ وہ لوگ اس وقت یہاں حق نگر میں ہی ہیں۔'' اکبر نے بتایا۔

''بھارتی گولہ باری سے دیہاتوں میں کافی نقصان ہوا ہے۔''

''اور یہاں....؟''

''شروع میں تو اس طرف کے کچھ علاقے میں گولے آ کر گرے۔ لیکن کوئی نقصان نہیں ہوا۔ پھر جب فوج آ گئی، مورچے بن گئے تو اب تک سکون ہے۔''

''مورچے کہاں لگے ہیں....؟''

''وہ جو گاؤں خالی کرائے گئے تھے نا.... وہاں۔''

''تو اب کچھ دیر آرام کر لے پتر....! تھک گیا ہوگا۔'' حمیدہ نے مداخلت کی۔

''تھکن کیسی اماں....! آرام سے آیا ہوں۔''

مگر حمیدہ کے اصرار پر اسے لیٹنا ہی پڑا۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد حق نگر کے لوگ آنے لگے۔ آرام کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اکبر نے ٹالنا چاہا لیکن عبدالحق نے منع کر دیا۔ عبدالحق کے کہنے پر اکبر نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔

اب عبدالحق کا یہاں آنا کم ہی ہوتا تھا۔ لیکن ہر بار اسے حیرت ہوتی تھی۔ ہر بار اسے احساس ہوتا تھا کہ اللہ کے کرم سے یہاں اس کی عزت، اس کا مرتبہ پہلے سے بڑھ گیا ہے۔ یہی نہیں، عزت کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی۔

بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ پاکستان میں پیدا ہونے والوں کی ایک نسل جوانی میں قدم رکھ چکی تھی۔ ہر بار پرانے چہروں کے درمیان اجنبی چہروں کی کثرت دکھائی دیتی تھی۔ لیکن ان چہروں پر بھی اور ان آنکھوں میں بھی اس کے لئے وہی محبت اور احترام تھا، جو انہیں ان کے بڑوں نے دیا تھا۔ وہ لڑکے اس کے لئے اجنبی تھے۔ لیکن وہ ان لڑکوں کے لئے اجنبی نہیں تھا۔

وہ جو ہجرت کر کے آئے، کیسے احسان شناس لوگ تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں کو قصے کہانیوں کے بجائے تحریک پاکستان کے بارے میں بتایا تھا۔ انہوں نے انہیں ہجرت کے سفر کی سچی داستانیں سنائی تھیں۔ انہوں نے انہیں ہندوؤں اور سکھوں کے مظالم کے بارے میں بتایا تھا۔ انہوں نے اپنے بچوں کو بتایا تھا کہ پاکستان کی کیا قیمت ادا کی گئی ہے، اور یہ ملک کتنا مبارک اور اہم ہے۔ اور انہوں نے انہیں بتایا تھا کہ وہ کس حال میں یہاں پہنچے تھے اور عبدالحق نے کس طرح ان کا ساتھ دیا، ان کے لئے سب کچھ کیا۔ آج وہ جو کچھ بھی ہیں، اللہ کے فضل اور عبدالحق کے ایثار و محبت کی وجہ سے ہیں۔ ان کی ماؤں نے ہمیشہ انہیں تلقین کی تھی کہ عبدالحق کا ان کی آنے والی نسلوں تک پر احسان ہے۔ یہ انہیں کبھی نہیں بھولنا ہے۔

پرانے لوگوں میں سے کچھ کم ہو گئے تھے۔ اللہ کے ہاں چلے گئے تھے۔ عبدالحق ان میں سے ایک ایک کے گھر دعا اور تعزیت کے لئے گیا۔

اس رات وہ سونے کے لئے لیٹا تو اسے خود پر افسوس ہوا۔ بچے بڑے ہو گئے تھے، اور بڑے ہو رہے تھے۔ وہ پاکستان کا مستقبل تھے، اور وہ ان سے، ان کی ضرورتوں اور ان کی تربیت سے بے خبر تھا۔ اس رات اس نے بہت کچھ سوچا۔

اگلی صبح اس نے تمام لڑکوں کو بلا لیا۔ وہ ان سے بات کرنا، ان کی ضرورتوں کو سمجھنا چاہتا تھا۔

شاید قدرت نے اسے وہاں اس کام کے لئے ہی بھیجا تھا۔

وہاں وہ بڑی ضرورتیں سامنے آئیں۔ ایک تو یہ کہ وہاں آبادی کے لحاظ سے اسکول نہیں تھے۔ اور میٹرک کے بعد کالج کی تعلیم کے لئے انہیں بڑے شہروں

کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ صاحب حیثیت لوگ تو اپنے بچوں کو شہر بھجوا دیتے تھے۔ لیکن باقی لوگ یوں ہی رہ جاتے تھے۔

اس نے مختلف علاقوں میں چار اسکول اور دو کالج قائم کرنے کا وعدہ کر لیا۔ ایک گرلز کالج تھا۔ سرکاری اسکولوں میں اساتذہ کی کمی کا مسئلہ بھی تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں بھی کوشش کرے گا۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ وہاں عورتیں بڑی ہنر مند تھیں۔ سلائی، کڑھائی اور دست کاری کے ایسے نمونے اس نے دیکھے کہ وہ دنگ رہ گیا۔ اور ان ہنر مندوں کا استحصال ہو رہا تھا، ان میں مرد بھی تھے۔ شہر سے دکان دار آتے اور ان کی چیزوں کو کوڑیوں کے مول خرید کر لے جاتے۔ جبکہ شہروں میں وہ چیزیں مہنگے داموں فروخت ہوتی تھیں۔

عبدالحق نے فیصلہ کیا کہ ایک تو یہاں کاٹیج انڈسٹری قائم کرنے کے سلسلے میں کام کرے گا، اور دوسرے زبیر سے مل کر ایک ایسا منصوبہ بنائے گا، جس میں ہنر مندوں کو ان کی محنت کا بہترین صلہ مل سکے۔ اس کے ذہن میں ایکسپورٹ کا خیال بھی تھا۔

اس شام کو میجر منیر اس سے ملنے کے لئے آ گئے۔

اسے حیرت ہوئی کہ میجر اسے کیسے جانتا ہے۔ گفتگو پر پتا چلا کہ یہ بھی حق نگر کے لوگوں کی مہربانی ہے۔

میجر نے اپنا مسئلہ اس کے سامنے رکھا۔

''یہاں کے نوجوان بہت پر جوش ہیں اور پاکستان سے محبت بھی کرتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ دونوں باتیں قابل قدر ہیں۔ لیکن ہمارے لئے مسئلہ بھی بن گئی ہیں۔''

''کیسے....؟''

''حق نگر کے باہر ہماری چوکی ہے۔ یہ نوجوان ڈنڈے اور لاٹھیاں اٹھائے وہاں چلے آتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ انہیں محاذ پر جانے دیا جائے۔ بہت ہوا تو کسی کے پاس بہت پرانے طرز کی بندوق ہوتی ہے اور بس، ہم انہیں سمجھا سمجھا کر

تھک گئے ہیں کہ یہ جنگ ہے، جو اندھا دھند نہیں، بلکہ منصوبہ بندی اور جنگی حکمت عملی کے تحت لڑی جا رہی ہے۔ یہ کوئی جذباتی معاملہ نہیں۔ لیکن ہر روز تین چار بار ہمیں ان کو بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ ہمارے لئے ایک اضافی بوجھ بن گیا ہے۔''

''لیکن اس سے آپ کے جوانوں کا جذبہ اور حوصلہ بھی تو بڑھتا ہوگا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں، اور میں اس پر ان کا شکر گزار بھی ہوں۔'' میجر منیر نے بڑے تحمل سے کہا۔

''لیکن آپ سوچیں تو، ہم حالت جنگ میں ہیں، اور دشمن نے بغیر اعلان کے اچانک حملہ کیا ہے۔ یوں صورت حال کی سنگینی اور بڑھ گئی ہے۔ ایسے میں ان لوگوں کا خلوص ہمارے لئے مسئلہ بن جاتا ہے۔''

''یہ بتائیں کہ میں کیا کر سکتا ہوں اس سلسلے میں ...؟''

میجر منیر مسکرایا۔

''یہ مسئلہ نہ ہوتا تو بھی میں آپ سے ملنے کے لئے آتا۔ مجھے اشتیاق تھا آپ سے ملنے کا۔ شاید آپ کو نہیں معلوم کہ آپ یہاں کیسے چاہے جاتے ہیں۔ میں جب یہاں آیا تو بہت حیران ہوا۔ یہاں آپ کا نام ایسے لیا جاتا ہے، جیسے کسی محبوب بادشاہ کا۔ ایسا بادشاہ جو یہاں موجود بھی نہیں۔ پھر مجھے اس کی وجہ بھی معلوم ہوگئی۔ درحقیقت آپ اس سے زیادہ محبت کے مستحق ہیں۔ خیر ... میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ ایک آپ ہی ہیں، جو انہیں سمجھا سکتے ہیں اور ہمیں اس پریشانی سے نجات دلا سکتے ہیں۔ دیکھیں، میں نے ان سے یہاں تک کہا کہ خدانخواستہ ... اللہ نہ کرے، اگر ہمیں ضرورت پڑی تو ہم خود انہیں آواز دے کر مطلب کرلیں گے۔ مگر یہ نہیں مانتے۔''

''ٹھیک ہے میجر صاحب! میں کوشش کروں گا کہ یہ مسئلہ حل ہو جائے۔''

''شکریہ عبدالحق صاحب ...! میرے لائق کبھی بھی کوئی خدمت ہو تو بتایئے گا۔''

عبدالحق نے اسی روز تمام لڑکوں کو بلایا اور انہیں سمجھایا۔ بات ان کی سمجھ

میں آگئی۔

''فوج کی اپنی ایک حکمت عملی، اپنا ایک طریق کار ہوتا ہے۔'' اس نے انہیں سمجھایا۔

''بے شک ... ! کبھی ضرورت پڑے تو عام لوگوں سے بھی کام لیتے ہیں، مگر اندھا دھند نہیں۔ وہ بھی ایک حکمت عملی کے تحت ہوتا ہے۔ تمہارا جذبہ اپنی جگہ سچا اور قابل احترام ہے۔ لیکن تمہارا روز انہیں پریشان کرنا ان کے ارتکاز میں خلل انداز ہوتا ہے، جو ملک و قوم کے لئے نقصان دہ ہے۔''

لڑکوں نے تفہیمی انداز میں سر ہلائے۔ بات ان کی سمجھ میں آگئی تھی۔

''اور وطن سے محبت کے اظہار کا ایک طریقہ یہ ہے کہ تم فوج میں بھرتی کے لئے کوشش کرو۔''

ان کے ردعمل نے عبدالحق کو مطمئن کر دیا۔

لیکن عورتیں فوجیوں کے لئے کھانا لے کر بہرحال جاتی رہیں۔

عبدالحق حیران بھی تھا اور خوش بھی کہ اس جنگ نے قوم میں ایسا یک جہتی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ سیسہ پلائی دیوار بن گئی تھی۔ وہ جذبے ہی تھے، جنہوں نے ہمیشہ کی طرح کفار کی عددی اور عسکری برتری کے بت کو مسمار کر دیا تھا۔

عجیب بات یہ ہوئی کہ اگلے روز زبیر بھی آگیا۔ اس کے ساتھ رابعہ اور ساجد بھی تھے۔

''زبیر بھائی ... ! آپ یہاں کیسے ...؟'' عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

''بہت ضروری کام میں نہ پھنسا ہوتا تو ہم سات تاریخ کو ہی یہاں آجاتے۔ اماں کو ایسے میں یہاں اکیلا چھوڑ سکتے ہیں ہم، میں تو شرمندہ ہوں کہ پانچ دن بعد آیا ہوں۔''

''چلو اچھا ہوا، میں آپ کو یاد کر رہا تھا۔''

''کیا یاد کر رہے تھے کاکا ... ! مجھے تو فون بھی نہیں کیا آپ نے۔'' زبیر نے شکایت کی۔

عبدالحق نے مصروفیت اور پھر اچانک چھٹی ملنے کے بارے میں بتایا۔ پھر

معذرت کی۔

''اس افراتفری میں خیال ہی نہیں رہا۔ معافی چاہتا ہوں۔''

''کیوں شرمندہ کرتے ہیں کاکا.....! غلطی تو میری ہے کہ میں نے شکایت کی۔'' زبیر بری طرح کھسیا گیا۔

رات کو عبدالحق نے زبیر سے حق نگر کے بارے میں اپنے منصوبوں پر بات کی۔

''یہ خیال میرے ذہن میں بھی تھا کاکا.....!'' زبیر نے کہا۔

''خاص طور سے دست کاری کی مصنوعات برآمد کرنے کا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ جنگ ختم ہوتے ہی اس سلسلے میں کام شروع ہو جائے گا۔''

''اور اسکول اور کالج.....؟''

''وہ بھی..... آپ کسی سے وعدہ کریں کاکا.....! تو وہ میرے لئے حکم ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی آپ کو خوش خبری سناؤں گا۔''

''بہت شکریہ زبیر بھائی.....! مجھ پر تو آپ نے کوئی بوجھ ہی نہیں رہنے دیا کبھی۔''

''شرمندہ نہ کریں کاکا.....!''

موقع غنیمت جان کر زبیر اسے کاروباری معاملات کی تفصیل بتانے لگا۔

عبدالحق پہلے ہی سے اس بات کا قائل تھا کہ تعلیم سے محرومی کے باوجود زبیر فہم و فراست اور کاروباری سوجھ بوجھ سے مالا مال ہے۔ اس نے اپنے طور پر وہی فیصلہ کیا تھا، جو اقتصادیات کے ماہرین کا تھا۔ اس نے زراعت کو سمیٹ کر پوری توجہ صنعت پر مرکوز کر دی تھی۔

''مجھے یہ بتائیں زبیر بھائی.....! کہ ہم آدھے آدھے کے حصہ دار ہیں نا.....!''

زبیر نے نظریں جھکا لیں۔ چند لمحے بعد وہ بولا تو اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

''نہیں کاکا.....! منافع کا صرف بیس فیصد میں آپ کے اکاؤنٹ میں جمع

کراتا ہوں۔ باقی اپنے اکاؤنٹ میں۔''

عبدالحق کو ذرا حیرت تو ہوئی۔ لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔

''آپ نے کچھ کہا نہیں کاکا.....!''

''کہنے کی کوئی بات ہی نہیں۔'' عبدالحق نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں نے شروع میں ہی کہا تھا کہ سب کچھ آپ کے اختیار میں ہے۔ اور سچی بات یہ کہ میرے خیال میں آپ اس سے بھی زیادہ کے مستحق ہیں۔ نہ میں کچھ کرتا ہوں اور نہ مجھے پتا ہے کسی چیز کا۔''

''یہ میں نے ایک وجہ کے تحت کیا ہے کاکا.....! لیکن میں ابھی آپ کو اس کی وجہ نہیں بتاؤں گا۔''

''میں پوچھوں گا بھی نہیں زبیر بھائی.....!''

چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ عبدالحق حق نگر سے رخصت ہوا تو زبیر اپنی فیملی کے ساتھ وہیں مقیم تھا۔

''میں تو جنگ ختم ہونے کے بعد ہی یہاں سے جاؤں گا کاکا.....! اور وہ بھی یہاں کے کام شروع کرانے کے بعد۔'' اس نے کہا۔

''شکریہ بھائی.....! اب مجھے اطمینان رہے گا۔'' عبدالحق نے کہا۔

❁ ❁ ❁

نور بانو اپنا کھیل بڑی احتیاط کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ باریک بینی اس کے منصوبے کا لازمہ تھی۔ تفصیلات اور چھوٹی چھوٹی جزئیات کا خیال رکھنے کی بڑی اہمیت تھی۔

اب کی طرف ارجمند کو چھپا کر رکھنا ضروری ہو گیا تھا تو دوسری طرف اسے خود بھی محتاط رہنا تھا۔ ارجمند تو اب اس کے لئے ایک ایسے ہیرے کی طرح تھی، جسے ہر اپنے پرائے کی نظر سے چھپانا تھا۔ چنانچہ ارجمند تو بس اپنے کمرے تک محدود ہو گئی۔ ویسے بھی باہر وہ کہاں آتی جاتی تھی؟ لیکن سب سے بڑھ کر اسے نوریز کی نظر سے بچانا تھا۔ وہ مستقل ملازم تھا۔ وہ ایک بار بھانپ لیتا تو گڑبڑ ہو جاتی۔ اس وجہ سے ارجمند کو اور سختی سے محدود کرنا پڑا۔ ورنہ ابتداء میں تو وہ بازار جاتی

رہی تھی۔

اس کا اپنا معاملہ اور تھا۔ جیسے ارجمند کو چھپانا تھا، ویسے اسے خود کو دکھانا تھا۔ اپنی زچگی کے لئے جو گواہ اسے درکار تھے، ان میں نوریز کی اہمیت سب سے زیادہ تھی۔

اس نے انٹرکام پر نوریز سے کہا۔

''گاڑی تیار رکھو۔ مجھے اسپتال جانا ہے۔''

نوریز گھبرا گیا۔

''خیریت تو ہے بیگم صاحبہ...!''

''ہاں! خیریت ہے۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔'' نوربانو نے خشک لہجے میں کہا۔

اس نے اس مرحلے کے لئے ہر تیاری رشیدہ کے مشورے سے کی تھی، اور یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ ورنہ اس نے خود جو طریقہ سوچا تھا، وہ اس کے لئے مشکل تھا۔ وہ تو فلمی سی ترکیب تھی۔

لیکن رشیدہ نے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں بی بی صاب...! بس ڈھیلی سی ایک قمیض پہن لیں۔ اور خود کو اچھی طرح چادر میں لپیٹ لیں۔''

''تو نوریز کو کیسے پتا چلے گا...؟''

''میں بتاؤں گی نا اسے۔ پھر اس حلیے میں آپ کو دیکھے گا تو اسے یقین ہو جائے گا۔''

''لیکن اس نے کہیں دیکھ لیا تو...؟'' نوربانو مطمئن نہیں ہو رہی تھی۔

''ایسا نہیں ہوگا بی بی صاب...! نوکر لوگ اپنی مالکن کو ایسے نہیں دیکھتے۔ خاص کر اچھے نوکر۔ اور آپ کا یہ نوکر بہت شریف ہے۔ پھر پیٹ تو آپ کا اچھا خاصا ہے۔'' نوربانو کے چہرے پر خفگی دیکھ کر اس نے جلدی سے بات بدلی۔

''میرا مطلب ہے، اب لڑکیوں جیسی تو آپ کی کمر نہیں ہے نا...!''

''سوچ لو...!''

''میں سوچ سمجھ کر ہی کہہ رہی ہوں بی بی صاب! جو آپ نے سوچا ہے، اسے نبھانا مشکل ہو جائے گا۔ آپ سوچیں نا۔ اسپتال میں تو آپ نقلی پیٹ لے کر نہیں جا سکتیں۔ باہر نوریز کو تو دکھا دیں گی، پر اندر اسپتال میں کیا کریں گی...؟''

بات معقول تھی۔ نوربانو کی سمجھ میں آ گئی۔ رشیدہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ڈھونگ گلے پڑ جاتا۔ لیکن اس بات پر اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ نوریز پر یہ تاثر چھوڑا جا سکے گا۔

''بس آپ کو ذرا اپنی چال بدلنی ہوگی۔''

''کیا مطلب...؟''

''حاملہ عورتوں کی طرح چلنا ہوگا آپ کو۔''

''مجھے کیا پتا...؟ کیسے چلتی ہیں حاملہ عورتیں؟'' نوربانو نے بھنا کر کہا۔

''میں بتاتی ہوں۔'' رشیدہ نے کہا اور چل کر دکھایا۔

نوربانو کو ذرا مشکل تو لگا۔ لیکن اس کے اپنے طریق کار کے مقابلے میں تو وہ بہت آسان تھا۔ وہ روز اس کی مشق کرنے لگی۔

''تو اب چلیں...؟'' نوربانو نے انٹرکام رکھنے کے بعد رشیدہ سے کہا۔

''آپ پانچ منٹ بعد آیئے گا۔'' رشیدہ بولی۔

''میں جا کر اس کے ذہن میں بات تو بٹھا دوں۔''

''ٹھیک ہے...!''

رشیدہ باہر آئی۔ نوریز گاڑی کی صفائی کر رہا تھا۔

''گاڑی بالکل دروازے کے ساتھ کھڑی کر دو۔'' رشیدہ نے اس سے کہا۔

نوریز پھر پریشان ہوگیا۔

''خیر تو ہے...؟'' اس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''تم نے یہ بی بی صاب سے بھی پوچھا تھا۔ ایسی باتیں پوچھی نہیں

جاتیں۔'' رشیدہ نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ پھر بولی۔

''وفادار ہو، اس لئے پریشان ہوتے ہو۔ یہ پریشانی کی نہیں، خوشی کی بات ہے۔ بی بی صاب ماں بننے والی ہیں۔ اب ہر مہینے اسپتال جایا کریں گی۔''

نوریز نے منہ پھیر لیا۔ دل میں سوچا، عجیب بے حیال عورت ہے۔ مگر بہرحال اسے اطمینان ہوگیا۔

وہ انہیں سی ایم ایچ لے گیا۔ بیگم صاحبہ رشیدہ کے ساتھ اندر گئیں۔ کوئی بیس منٹ بعد وہ واپس آگئیں۔ نوریز اب انہیں نظر اٹھا کر دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

اس معمول کو اب دو ماہ ہوگئے تھے۔ نوربانو نے بڑی کامیابی سے اپنے حق میں فضا تیار کر لی تھی۔ گواہ بھی موجود تھے۔ حالانکہ ایسا کوئی امکان نہیں تھا کہ کبھی ان کی ضرورت پڑے گی۔

❁ ❁ ❁

جب سے عبدالحق چھٹی گزار کے واپس آیا تھا، اسے دفتر کی فضا بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ ویسے تو ابھی اسے محکمے میں آئے اسے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، اور ابھی اتنے تعلقات بھی نہیں بنے تھے۔ پھر بھی کم وقت میں اس کی ایک عزت بن گئی تھی۔

لیکن چھٹی سے واپس آنے کے بعد اسے ایسا لگ رہا تھا، جیسے لوگ اس سے کچھ کھنچے کھنچے ہیں۔ بہرحال اسے اس بات کی کوئی پرواہ بھی نہیں تھی۔ وہ تو اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی تھا۔

سکریٹری صاحب نے کا پی اے، مبین اس سے کچھ زیادہ ہی متاثر تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ بھی پنج وقتہ نمازی تھا۔ اس نے ایک دن بڑی رازداری سے عبدالحق سے کہا۔

''سر......! آپ دفتری معاملات میں ذرا محتاط رہئے گا۔''

''میں دفتری معاملات میں ہمیشہ محتاط ہی رہتا ہوں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''لیکن بات کیا ہے......؟''

''آپ کو اپنے لئے فضا کچھ ناسازگار نہیں لگ رہی ہے......؟'' مبین نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

''وہ تو شروع سے ہی محسوس ہوئی تھی۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''لیکن اب اور بڑھ گئی ہے۔''

''ہاں......! لگتا تو ہے مجھے بھی۔ لیکن وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔''

''آپ کو جس طرح سے چھٹی دلوائی گئی ہے، وہ ہمارے صاحب کو اچھا نہیں لگا۔ ان کا خیال ہے کہ آپ اپنے اثر و رسوخ کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں۔''

''حالانکہ میں اسے گناہ سمجھتا ہوں۔''

''آپ خود سوچیں، ظاہری طور پر تو یہی نظر آتا ہے سر......!''

''اس میں میری کوئی غلطی نہیں ہے۔'' عبدالحق نے خشک لہجے میں کہا۔

''اور اگر میں نے اثر و رسوخ استعمال کیا بھی ہے، جو کہ میں نے ہرگز نہیں کیا، تو بھی تمہارے صاحب کو اس میں کیا پریشانی ہے؟ کیا سفارش یہاں کوئی نئی چیز ہے؟ کیا وہ سفارش کے تحت پہلے بھی پسندیدہ کام نہیں کرتے رہے؟''

''آپ کی بات درست ہے۔ بس یہ سمجھ لیں کہ انہیں آپ سے اللہ واسطے کا بیر ہوگیا ہے۔''

''مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ لیکن تم نے محتاط رہنے کا کیوں کہا مجھ سے......؟''

''صاحب نے بات منسٹر صاحب تک پہنچا دی ہے۔ منسٹر صاحب بھی بڑے انا والے آدمی ہیں سر......! آپ ان کی بیڈ بک میں آگئے ہیں۔ اور شاید آپ نہیں جانتے، اس کی منتقم مزاجی مشہور ہے۔''

میں صرف اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں اور صرف اللہ سے ہی ڈرتا ہوں۔''

عبدالحق سرکاری ملازم تھا۔ اس لئے سیاست پر کوئی تبصرہ نہیں کرتا تھا۔ لیکن منسٹر صاحب کے بارے میں اس کی کوئی اچھی رائے نہیں تھی۔ جاننے والے جانتے تھے کہ وہ صدر صاحب کو ڈیڈی کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ عبدالحق کے نزدیک

کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ بات ثابت کرتی تھی کہ وہ حد درجہ خوشامدی انسان ہیں۔ اور جو آدمی خوشامدی ہو، وہ خوشامد پسند بھی بہت ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ خوشامدی لوگ ناقابلِ اعتبار ہوتے ہیں۔ اسے یقین تھا کہ صدر صاحب کو سب سے زیادہ نقصان اپنے اسی وزیر سے پہنچے گا، جسے وہ بیٹے کا درجہ دیتے ہیں۔

جنگ ختم ہو چکی تھی۔ اعلانِ تاشقند پر دستخط ہو چکے تھے۔ فوجوں کی واپسی ہو رہی تھی۔

عبدالحق کے نزدیک بڑی بات یہ تھی کہ سترہ روز جنگ نے ملکی معیشت پر نہ کوئی برا اثر چھوڑا تھا، اور نہ ہی اسے پیچھے دھکیلا تھا۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے پر عمل شروع ہو چکا تھا۔ پاکستانی روپیہ بھارتی روپے کے مقابلے میں زیادہ مستحکم تھا۔ پاکستان میں روزگار کی فراوانی تھی، اشیائے ضرورت سستی تھیں۔ جبکہ بھارتی میں بے روزگاری اور غربت بڑے مسائل تھے۔

یہ اللہ کا فضل تھا کہ صرف اٹھارہ برس کے عرصے میں نوزائیدہ پاکستان، جسے دانستہ طور پر کمزوریاں سونپی گئی تھیں، ہر اعتبار سے پہلے سے مستحکم بھارت سے آگے نکل گیا تھا۔ اس کی ٹیکسٹائل انڈسٹری بین الاقوامی مارکیٹ میں اپنی برتری ثابت کر رہی تھی۔ پھر جنگ نے پوری دنیا میں پاکستان کا امیج بہتر بنایا تھا۔ ثابت ہو گیا تھا کہ پاکستانی قوم غیور اور خودداری بھی ہے اور بہادر بھی۔ اور وہ کسی بھی جارحیت کے خلاف اپنا دفاع کر سکتی ہے۔

❁ ❁ ❁

نور بانو دکھاوے کے لئے اسپتال جاتی رہی تھی۔ لیکن ایک دن اس کے پیٹ میں اتنا خوف ناک درد اٹھا کہ سچ مچ اسپتال جانے کی نوبت آ گئی۔

درد اتنا شدید تھا کہ وہ پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔

ارجمند نے پہلی بار اسے اس حال میں دیکھا تھا۔ اس کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

''میں کیا کروں آپی......!'' اس نے گھبرا کر کہا۔

''آغا جی کو فون کروں......؟''

نور بانو کو تو ایسا کرنٹ لگا کہ وہ اپنے درد کو بھی بھول گئی۔

''یہ تو کبھی بھول کر بھی نہ کرنا'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔ لیکن آخر میں اس کی چیخ نکل گئی۔

''مگر آپ اتنی تکلیف میں ہیں۔''

''یہ تکلیف بہت پرانی ہے۔ اسی کی وجہ سے تو کراچی سے بھاگنا پڑا تھا'' نور بانو نے کراہتے ہوئے کہا۔

رشیدہ بھی آ گئی تھی۔

''کیا ہوا بی بی صاب......!''

''مجھے فوراً اسپتال لے چلو۔''

رشیدہ کی سمجھ میں معاملہ تو نہیں آیا۔ لیکن اس نے یہ سمجھ لیا کہ اسپتال جانا ہے۔ وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکی، تاکہ نوریز سے گاڑی کے لئے کہے۔

ارجمند نور بانو کے پاؤں سہلا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

نور بانو شدید تکلیف میں تھی۔ لیکن ارجمند نے عبدالحق کو فون کرنے کی تجویز پیش کر کے اسے یہ احساس دلا دیا تھا کہ کیسی ہی تکلیف ہو، اسے ہوش میں رہنا ہے۔ اور وہ بڑی طاقت ور قوتِ ارادی کی مالک تھی۔ ورنہ جیسی تکلیف میں وہ تھی، اس میں تکلیف اور خدا کے سوا کچھ بھی یاد نہیں رہتا آدمی کو۔

''میرا بیگ اٹھاؤ۔ اس میں دوا ہے......'' اس نے ارجمند سے کہا۔

ارجمند نے بیگ میں سے دوا نکال کر اسے دی، اس کے لئے پانی لائی۔

ٹیبلٹ لینے کے بعد تکلیف میں معمولی سی کمی ہوئی۔ یعنی اسپتال جانا اب بھی ضروری تھا۔ تاہم وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

ارجمند نے جلدی سے چادر اوڑھ لی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''یہ...... یہ تم کیا کر رہی ہو......؟''

''آپ کے ساتھ چلنا ہے مجھے۔''

''پاگل ہو گئی ہو۔'' نور بانو نے چیختے ہوئے کہا۔

اسی دوران رشیدہ آگئی۔

"چلیں بی بی صاب......! میں نے گاڑی دروازے پر لگوادی ہے۔"

ارجمند حیرت اور صدمے سے نور بانو کو دیکھ رہی تھی۔

"تو کیا میں اس حال میں آپ کو اکیلے اسپتال جانے دوں......؟"

"ہاں......! تم صرف ایک بات یاد رکھو۔" نور بانو نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی ہو جائے، تمہیں کبھی کسی کے سامنے نہیں آنا ہے۔" اس کے لئے بولنا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ بات بہت اہم ہے...... زندگی سے بھی زیادہ اہم...... اور خاص طور پر نوریز اور چوکیدار کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔"

اتنا کہتے کہتے وہ ہانپ گئی۔ اس کے کٹے ہوئے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا۔

ارجمند نے حیرت اور دکھ سے اسے دیکھا۔

"لیکن آپی......! آپ......"

"تمہیں میری قسم......! میں مر بھی رہی ہوں تو اس کے خلاف نہ کرنا۔"

ارجمند نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ......!" اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

رشیدہ کے سہارے سے وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی، لیکن لڑکھڑا گئی۔ رشیدہ چوکنی نہ ہوتی، سہارا نہ دیتی تو وہ گر گئی ہوتی۔ درد کی شدت سے اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔

"آپ کا چلنا تو مشکل ہے بی بی صاب......! میں آبیہ کو بلاتی ہوں۔ ہم اٹھا کر آپ کو لے چلیں گے۔"

"نہیں......! تم بس سہارا دے دو۔ میں چل سکتی ہوں۔ آبیہ کو یہیں چھوڑنا ہے...... ارجمند کے پاس۔"

اور ہمت اور طاقت نہ ہونے کے باوجود وہ صرف قوتِ ارادی کے زور پر دروازے تک چلی گئی۔

✿ ✿ ✿

ان کے جانے کے بعد ارجمند گھر میں اکیلی رہ گئی۔ آبیہ کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ وہ کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی تھی۔

اس تنہائی میں پہلی بار اسے اس صورتِ حال پر غور کرنے کا موقع ملا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی کی محض قیمت ادا نہیں کر رہی ہے۔ وہ تو ایک بہت بڑے جھوٹ...... بلکہ ایک فریب میں نور بانو کی شریک ہے۔

اس پر لرزہ چڑھ گیا۔

اب تک وہ صرف یہ سوچتی رہی تھی کہ عبدالحق اسی کے لئے زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھا، اور اس خوشی کے ملنے کا ظاہری طور پر کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن اللہ سے اسے امید تھی، بلکہ یقین تھا کہ وہ کوئی راستہ نکال دے گی۔

پھر جب آپی نے اس سے بات کی تو اس نے اسے اللہ کی رحمت پر محمول کیا۔ جو اسے چاہئے تھا، وہ اسے بغیر مانگے مل رہا تھا۔ اسے اللہ کی رحمت کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ اور اس کے لئے تو وہ کوئی بھی قیمت ادا کر سکتی تھی۔ آپی نے جو مانگا تھا، وہ تو کوئی بڑی بات تھی ہی نہیں۔

وہ ایسی سرشار ہوئی کہ اسے سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ وہ تو جیسے کسی خوب صورت خواب میں جی رہی تھی۔

درحقیقت وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ نظریاتی طور پر تو وہ بہت مضبوط تھی، اور بہت کچھ جانتی اور سمجھتی تھی۔ لیکن عملی زندگی کے بارے میں اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ صرف یہ جانتی تھی کہ زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزارنا عبادت ہے۔

لیکن جب وہ ماں بننے کے مرحلے میں داخل ہوئی تو اس پر آگہی کے دروازے کھلنے لگے۔

پہلے تو اسے جسمانی تبدیلیوں کا احساس ہوا۔ جی متلانے کی کیفیت اسے بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔ یہ احساس ہونے لگتا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ اُلٹی ہونے سے تو وہ بہت گھبراتی تھی۔ مگر اب اُلٹیاں معمول بن گئی تھیں۔ اور ہر اُلٹی کے بعد وہ دیر تک نڈھال رہتی تھی۔

پھر مزاج میں تبدیلی آنے لگی۔ جو خوشبو بہت اچھی لگتی تھی، وہ اب اتنی بری لگنے لگی۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟ اس نے گھبرا کر سوچا۔ لیکن اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ بس اس کی سمجھ میں یہی آتا تھا کہ وہ نارمل نہیں رہی۔ اور اب وہ کبھی پہلے کی طرح نارمل ہو بھی سکے گی۔ اس کے بارے میں بھی وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

پھر ایک رات وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ اس کی آنکھ کیوں کھلی ہے؟ مگر اگلے ہی لمحے پیٹ میں متحرک اس وجود نے اسے احساس دلا دیا۔

ارے.....! یہ میرے وجود میں ایک اور وجود اپنی مرضی سے..... پوری خود مختاری کے ساتھ حرکت کر رہا ہے۔ ایک لمحے کو وہ خوف زدہ ہوئی۔ اگلے لمحے وہاں مداخلت بے جا پر جھنجلائی، جیسے اندر متحرک وہ وجود اس کے وجود کی آزادی کو چیلنج کر رہا ہے۔ مملکت کے اندر ایک اور مملکت!

مگر وہ بس دو ہی لمحے تھے۔

پھر اچانک اسے اس متحرک وجود پر، جو اب اچانک ساکت ہو گیا تھا، ایسا پیار آیا کہ پہلے کبھی کسی پر بھی نہیں آیا تھا۔ ارے! یہ تو میری ہڈیوں، میرے خون اور میرے گوشت سے نمو پانے والا میرا بچہ ہے..... میرا اور آغا جی کا بچہ!

اور اچانک وہ گھبرا گئی۔ اے..... تم ساکت کیوں ہو گئے؟ بلو نا.....! کیا ہو گیا تمہیں.....؟ اس نے زبانِ خامشی میں اسے پکارا۔

اور بچے نے جیسے اس کی بات سن لی۔ وہ پھر ہلا۔

اور ارجمند کو اس پر ایسی محبت آئی کہ وہ اس کی دسترس میں ہوتا تو وہ اسے چوم چوم کر بے حال کر دیتی۔ شکر یہ میرے بچے..... !اس نے کہا۔

اندر سے ابھرنے والی ایک آواز نے سختی سے اسے ٹوکا۔ تم کچھ بھول رہی ہو۔ یہ تمہارا نہیں، نور بانو کا بچہ ہے۔

ارے نہیں.....! اور اچانک اسے نور بنو سے کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا۔ ایک ننھے سے پل میں ہی وہ احساسِ زیاں سے نڈھال ہو گئی۔ اور وہ احساسِ زیاں ایسا

شدید تھا کہ اسے لگا کہ وہ دنیا کی ہر نعمت سے محروم ہو گئی ہے۔

لیکن اس کے نزدیک وعدے کی بڑی اہمیت تھی، کیونکہ اللہ نے وعدے کو اہمیت دی ہے۔ وہ احساسِ زیاں کو جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے بڑبڑائی۔ بے شک، یہ آپی کا بچہ ہے۔ میرے پاس تو یہ ان کی امانت ہے۔

مگر اس کا دل اس کے ساتھ ہم آواز نہیں تھا۔ اس کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔

وہ اس کے لئے بچے کی موجودگی کا پہلا شعوری احساس تھا۔ لیکن غیر شعوری طور پر وہ اسے کچھ پہلے ہی محسوس کر چکی تھی۔ جب اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ اس کے اندر دل دھڑکنے کی ایک نہیں، دو آوازیں ابھرتی ہیں۔ شاید وہ غیر شعوری طور پر سمجھ گئی ہوگی۔ لیکن شعور کی سطح پر وہ الجھتی تھی کہ یہ دو آوازیں کیوں؟ اور وہ ڈرتی تھی کہ کہیں یہ کوئی بیماری تو نہیں۔

مگر اس تحرک سے روشناس ہونے کے بعد اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کے اندر اب دو دل دھڑکتے ہیں۔

ایبٹ آباد میں اسے بڑی شدت سے تنہائی کا احساس ہوتا تھا۔ بات صرف عبدالحق کی نہیں تھی۔ وہ تو اس کے لئے ہوا کے ایک خوش گوار جھونکے کی طرح تھا۔ لیکن دادی اماں، ساجد، چاچا اور چاچی..... ان سب لوگوں کی اسے کمی محسوس ہوتی تھی۔ یہاں اس کے پاس آپی کے سوا کوئی نہیں تھا اور آپی یہاں آ کر بالکل بدل گئی تھیں۔ وہ تو بس ہر وقت اس کھیل کے بارے میں سوچتی رہتی تھیں، جو وہ کھیل رہی تھیں، اور اس کھیل میں وہ بھی ان کی شریک تھی۔

اس تنہائی نے اسے اللہ کے اور قریب کر دیا۔ وہ بڑی کثرت سے قرآن پڑھنے لگی۔

لیکن آج جو کچھ ہوا، اس نے پہلی بار اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اور جب سوچا تو اس کی سمجھ میں آیا کہ جسے وہ اب تک اپنی دانست میں ایثار سمجھ رہی تھی، وہ تو ایک بہت بڑا فریب ہے، جو وہ اپنے بہت محبوب لوگوں کو دے رہی ہے۔

اس نے اس پر سوچنا شروع کیا تو جیسے دروازے کھلتے چلے گئے۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ اس کے لئے اللہ کی طرف سے امداد ہے کہ اس طرح عبدالحق اسے

مل رہا ہے۔ لیکن اب اس نے دوسرے زاویے سے سوچا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ شیطان کی طرف سے فتنہ ہو۔

اس خیال سے اس نے صورتِ حال کا تجزیہ کیا تو اسے ڈر لگنے لگا۔

جب آپی نے اس سے یہ بات کی تھی تو اس نے کہا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ اس پر آپی نے کہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ اس پر چھوڑ دے۔ اور اس نے یہ سوچ کر آپی کی بات مان لی تھی کہ اسے آم سے غرض ہونی چاہئے، پیڑ گننے سے نہیں۔ درحقیقت اسے تو ان معاملات کی سمجھ ہی نہیں تھی۔ کیا ہوتا ہے، کیسے ہوتا ہے، کیا کیا فرق پڑتا ہے، اسے تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ اس نے تو بس معاملات کی باگ دوڑ آپی کو سونپ دی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آپی نے ایبٹ آباد آنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ مگر جب اس نے اپنے اندر آنے والی جسمانی تبدیلیوں کو دیکھا تو بات اس کی سمجھ میں آنے لگی۔ آپی جو کھیل کھیل رہی تھیں، اس میں انہیں بہت کچھ چھپانا تھا۔ اور انہیں ایک نہیں، دو افراد کو چھپانا تھا۔ ایک طرف انہیں اس کی جسمانی تبدیلیوں کو چھپانا تھا تو دوسری طرف خود کو بھی چھپانا تھا کہ ان کے اعلان کے مطابق وہ جسمانی تبدیلیاں ان میں آنی چاہئے تھیں، جبکہ وہ ان میں آ ہی نہیں سکتی تھیں۔ خرابی یہ تھی کہ یہ فریب دو رخ سے بے نقاب ہو سکتا تھا۔

چنانچہ آپی اسے لے کر یہاں آ گئیں۔ یہاں وہ دونوں محفوظ تھیں۔

ارجمند نے مزید سوچا تو اسے خوف آنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آپی نے اس ناممکن کام کا بیڑہ کیوں اٹھایا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ قدرت نے آپی کی مدد کی۔ اگر ڈاکٹر صاحب کا انتقال نہ ہوا ہوتا تو دادی اماں، جنہیں پوتے کی آرزو تھی، انہیں اکیلا کیسے چھوڑتیں؟ وہ تو انہیں اپنے ہاتھ کا چھالا بنا لیتیں۔ انہیں کیسے دور رکھ پاتیں آپی۔

پھر ایک اور خیال نے اسے خوف زدہ کر دیا۔ عدت ختم ہو گی تو دادی اماں یہاں آئے بغیر رہیں گی بھلا......؟ اور آئیں گی اور دیکھیں گی تو پول نہیں کھل جائے گا بھلا......؟ اللہ......! وہ بھی دادی اماں کی نظروں میں حقیر ہو جائے گی۔

لیکن نہیں......! آپی بہت ذہین ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا انتقال نہ ہوا ہوتا تو بھی آپی نے دادی اماں کو دور رکھنے کی کوئی نہ کوئی تدبیر نکال لی ہوتی۔ آخر انہوں نے آغا جی کو بھی تو یہاں آنے سے روک دیا ہے۔ اور اب بھی، جیسے انہوں نے آغا جی کو روک رکھا ہے، ویسے ہی دادی اماں کو بھی روک دیں گی۔

آپی کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ وہ ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہیں۔ انہوں نے اس کے لئے ایک ناممکن کو...... آغا جی کے ملنے کو ممکن بنا دیا تو اپنے لئے تو وہ اس سے بھی زیادہ کر سکتی ہیں۔

لیکن یہ سب غلط ہے۔ اس نے شرمندگی سے سوچا۔ دادی اماں کے لئے یہ بہت بڑی خوشی ہے۔ وہ ہر لمحہ اپنی بہو کے قریب رہنا چاہتی ہوں گی، جو کہ ان کے خواب کو تعبیر دینے والی ہے۔ یوں وہ ایک بڑی خوشی سے محروم رہیں گی۔

اور آغا جی کے ساتھ تو یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ بلکہ شاید یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ دو بیویوں کے ہوتے ہوئے آدمی اتنا طویل عرصہ تنہا گزارے۔ یہ تو بہت بڑا ظلم ہے۔ وہ انسان ہیں اور انسان کے ساتھ نفس لگا ہے، جو کہ ایک لمحے میں بہت بڑا فتنہ، بہت بڑی آزمائش بن جاتا ہے۔ کبھی آغا جی کا دل چاہتا ہوگا......

یہ سوچتے ہوئے تنہائی کے باوجود اس کا چہرہ دہک اٹھا۔

ایک شخص کو اس کے اللہ کے عطا کئے ہوئے حق سے سازش، جھوٹ اور فریب کے تحت محروم کرنا...... یہ تو گناہ ہی ہے۔ اس نے سوچا اور لرز گئی۔ اسے عبدالحق پر ترس آنے لگا۔ آپی نے انہیں کیسے دور کیا ہے۔ لیکن وہ خود بھی تو اس جرم میں برابر کی شریک ہے۔

مگر اب وہ کچھ کر نہیں سکتی، پیچھے ہٹ نہیں سکتی۔ اب یہ جھوٹ ہو، فریب ہو، گناہ، اسے تو آخر تک نبھانا ہے۔ عہد شکنی تو نہیں کی جا سکتی۔ اور سوال صرف اس کے ذلیل اور حقیر ہونے کا ہوتا تو وہ پرواہ نہ کرتی، اعتراف کر لیتی۔ لیکن یہاں تو معاملہ آپی کا بھی ہے۔

اس نے سمجھ لیا کہ وہ کثرت سے استغفار اور توبہ کرنے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتی۔

کیوں بیٹے..... ٹھیک ہے نا.....؟ اس نے اپنے بچے سے پوچھا۔ نہ جانے کیوں، کیسے، لیکن اسے یقین تھا کہ وہ بیٹا ہی ہے۔

بچے نے خفیف سے جنبش کی، جسے اس نے بچے کی تائید پر محمول کیا۔

اس کا بچہ اس کی تنہائی کا ساتھی بن گیا تھا۔ زور سے بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ دل میں جو کچھ کہے گی، بچہ اسے سن بھی لے گا اور سمجھ بھی لے گا۔ اور اس نے اپنے طور پر بچے کی تربیت بھی شروع کر دی تھی۔

میں چاہتی ہوں کہ تم سر سے پاؤں تک صرف اور صرف محبت ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ میری تمام باتیں تمہارے اندر اتر جائیں، کیونکہ اندر اتری ہوئی باتیں ہی تو سب سے طاقت ور ہوتی ہیں۔ وہ بچے سے کہتی۔ میں تمہیں چار محبتیں سونپنا چاہتی ہوں۔ سب سے پہلے اللہ کی محبت، جو میرے بطن کے گہرے اندھیرے میں تین مرحلوں میں تمہاری تخلیق مکمل فرمانے کا انشاء اللہ! یہ اس کا احسان ہے تم پر بھی اور دوسروں پر بھی..... مجھ پر بھی، تمہارے باپ پر بھی اور دادی پر بھی۔ وہ پوری کائنات کا مالک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ ہر عبادت اور ہر محبت کا صرف وہی سزاوار ہے۔ اس کا حکم ماننا، اس کی اطاعت کرنا بشر کی پہلی ترجیح ہونا چاہئے۔ میں تمہیں اس کے بارے میں بتاتی رہوں گی۔ میں تمہیں اس کے بارے میں بتاتی رہوں، یہاں تک کہ تم جوان ہو جاؤ، تب بھی اس کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔ حالانکہ میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ صرف اتنا جانتی ہوں، جتنا خود اس نے بتایا ہے۔ اور جتنا کچھ اس نے بتایا ہے، وہ بہت ہی کم ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی توصیف اور اس کی عظمت ازل سے ابد تک مسلسل بیان کی جائے تو بھی اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

پھر قرآن ہے میرے بچے..... ! اس سے عشق کرنا کہ یہ اللہ کا کلام ہے، ہم پر اس کا ایک اور بہت بڑا احسان ہے۔ قرآن جو ضابطہ حیات ہے، راہنما ہے، نور ہدایت ہے، ہمارے لئے راستہ بھی ہے اور منزل بھی۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جاتے جاتے فرمایا کہ اسے مضبوطی سے تھامے رکھنا۔

پھر ہمارے پیارے نبی ہیں..... محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم..... اللہ کو سب

سے بڑھ کر محبوب، آخری پیغمبر، جن کے ذریعے اللہ نے قرآن ہم تک پہنچایا، جنہوں نے ہمیں قرآن کو سمجھنا اور اس کی ایک ایک آیت پر عمل کرنا سکھایا۔ جن کی وجہ سے ہم ایمان سے روشناس ہوئے۔ جن کی عطا کی ہوئی روشنی میں ہی ہم ہر گمراہی، ہر خرابی اور دنیا اور آخرت کے ہر عذاب سے محفوظ ہو سکتے ہیں۔ اپنے ماں باپ سے، دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر ان سے محبت کرنا میرے بچے..... ! ان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا، ان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہر عمل کی اتباع کرنا کہ اسی میں فلاح ہے۔

اور چوتھی محبت میرے بچے..... ! یہ کہتے ہوئے اس احساس ہوا کہ بچے کا کوئی نام بھی ہونا چاہئے۔ اسی ثانیے اس کے ذہن میں ایک نام آیا اور جو اس نے دل، دماغ اور روح کی گہرائی سے قبول کر لیا۔

غور سے سنو میرے بچے..... ! تمہارا نام نور الحق ہے۔

اسے ایک دھچکا سا لگا۔ وہ کون ہوتی ہے اس بچے کا نام رکھنے والی؟ یہ تو آپی کا بچہ ہے۔ اس بچے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ وہ تو بس اسے نو ماہ پیٹ میں رکھنے اور جنم دینے کی حد تک ماں ہے اور یہ بات بھی کسی اور کو معلوم نہیں ہوگی۔

تو کیا.....؟ میں اسے اپنے طور پر خاموشی سے اس نام سے پکار لیا کروں گی۔ اس نے سوچا۔

ہاں تو نور الحق..... ! میں آپ کو چوتھی بڑی محبت کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس نے بچے سے اپنا سلسلہ کلام جوڑا۔ پہلی تینوں بڑی محبتیں آخرت کے لئے ہیں، اگرچہ ان سے دنیا بھی سنورتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دنیا کی محبت بھی سونپی ہے۔ وہی تو آزمائش بنتی ہے۔ اللہ نے دنیا کی محبت دے کر دنیا میں بھیجا ہے..... جنت کمانے کے لئے۔ تو ہوتا یہی ہے۔ دنیا کی محبتیں بڑھ کر ہوس بن جاتی ہیں اور آدمی آخرت کو بھول جاتا ہے۔ آخرت میں عزت، سعادت اور انعام دلوانے والی محبتوں کو بھول جاتا ہے۔

میں تم سے دنیا میں سب سے بڑی محبت کے لئے کہتی ہوں کہ تم سب

سے بڑھ کر اپنے باپ سے محبت کرنا۔ اتنی محبت کرنا ..... اتنی محبت کرنا ان سے کہ میں سرخ رو ہو جاؤں۔ لیکن یاد رہے، اللہ، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کی محبت کے سامنے ان کی محبت کی کوئی حیثیت نہیں۔

یہ ساری باتیں وہ اس سے کرتی رہتی تھی۔ وہ اسے عبدالحق کے بارے میں بتاتی، جیسے اسے متعارف کرا رہی ہو۔

لیکن آج نماز پڑھ کر آپی کی شفا اور صحت کے لئے دعا کرنے کے بعد وہ دیر تک استغفار کرتی رہی۔ پھر وہ قرآن پڑھنے کے لئے بیٹھ گئی۔

قرآن پڑھتے ہوئے کوئی آیت سمجھ میں آتی تو وہ اس پر بچے سے یک طرفہ تبادلہ خیال کرتی۔ عبدالحق کے بعد وہ دوسری ہستی تھی، جس سے وہ قرآن کی روشنی بانٹتی تھی۔

❁ ❁ ❁

اسپتال میں نور بانو کو پہلے تو او پی ڈی میں لے جایا گیا۔ مگر پھر اس کی حالت کے پیش نظر اسے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔

کچھ دوائیں دی گئی تھیں، جن سے تکلیف کچھ کم ہوگئی تھی۔ پھر بھی نور بانو کی حالت اچھی نہیں تھی۔ لیکن ایسے میں بھی اسے اپنے کھیل کے خراب ہونے کی فکر لاحق تھی۔ اس نے سرگوشی میں رشیدہ سے کہا۔

''نوریز کو گھر واپس بھیج دو۔''

''لیکن بی بی صاب .....! یہاں بھی تو .....''

''جیسا میں کہتی ہوں، ویسا ہی کرو۔'' نور بانو نے چڑ کر کہا۔

رشیدہ نے نوریز کو نور بانو کا پیغام پہنچا دیا۔ نوریز بہت فکر مند تھا۔

''بیگم صاحبہ کب تک یہاں رہیں گی .....؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا پتا.....؟ تم بس اپنا کام کرو۔''

''میرے خیال میں تو صاحب کو بتا دینا چاہئے۔''

یہاں رشیدہ کو اپنی سمجھ بوجھ سے کام لینا پڑا۔ نور بانو نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن اس نے اپنے طور پر سمجھ لیا تھا کہ یہ کھیل اس کی مالکن اپنے شوہر کو بے

خبری میں رکھ کر کھیل رہی ہے۔

''یہ تمہارا کام نہیں نوریز.....! ہم تو نوکر لوگ ہیں۔'' اس نے نوریز کو سمجھایا۔

''صاحب نے کبھی مجھے نوکر نہیں سمجھا۔ میں گھر کے فرد کی طرح ہوں۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نوکر تو نوکر ہی رہتا ہے۔'' رشیدہ نے سرد لہجے میں کہا۔

''ویسے تمہارے صاحب کرتے کیا ہیں.....؟'' اس نے بے حد سرسری انداز میں پوچھا۔ اپنے انداز کے تصدیق کا یہ اچھا موقع اسے ملا تھا۔

''بہت بڑے افسر ہیں۔'' نوریز نے فخر سے کہا۔

''پولیس افسر.....؟'' رشیدہ نے تصدیق چاہی۔

''نہیں.....!'' نوریز نے جواب دیا۔ پھر چونک کر بولا۔

''یہ تم سے کس نے کہا.....؟''

''کسی نے بھی نہیں.....! ہم لوگ تو پولیس افسر کو ہی بڑا افسر سمجھتے ہیں۔''

''میرے صاحب پولیس افسر سے بھی بڑے افسر ہیں۔''

اس وقت رشیدہ کو ایک اور خیال آ گیا۔ اگر صاحب کا فون آ گیا اور چھوٹی بی بی نے انہیں بی بی صاب کے بارے میں بتا دیا تو.....؟ بی بی صاب کی یہ بات تو جھوٹی ثابت ہوگئی تھی کہ صاحب بہت بڑے پولیس افسر ہیں۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا اندازہ درست ہے۔ ایسے میں اگر صاحب یہاں آ گئے تو.....؟ کوئی گڑبڑ ہوگئی تو انعام تو دور کی بات، نوکری بھی چلی جائے گی۔ زمین واپس لینے کا آسرا بھی ختم.....

''تم ذرا رکو۔ میں بی بی صاب سے مل لوں۔ ہو سکتا ہے۔ مجھے بھی تمہارے ساتھ چلنا پڑے۔'' اس نے نوریز سے کہا۔

وہ وارڈ میں آئی۔ لیکن نور بانو مسکن دواؤں کے زیر اثر تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے اپنی بہتری کی خاطر اپنے طور پر ہی کچھ فیصلے کرنے ہوں گے۔ ایک تو اس نے یہ سوچ لیا کہ بی بی صاب کو ایک الگ کمرہ دلوانا ہوگا۔ دوسرے چھوٹی بی بی سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔

اس نے نرس کو دس کا ایک نوٹ دیا۔

”بی بی صاب کا خاص خیال رکھنا ابھی میں آؤں گی تو انہیں الگ کمرے میں لے جائیں گے۔“

✿ ✿ ✿

”آپی نہیں آئیں ....؟“ ارجمند نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے....؟ خیریت تو ہے نا.... !“

”تو پھر آپی کہاں ہیں ....؟“ ارجمند کے لہجے میں وحشت تھی۔

”وہ ابھی اسپتال میں ہیں۔“ رشیدہ نے کہا۔ پھر اس کی پریشانی بڑھتے دیکھ کر جلدی سے وضاحت کی۔

”پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ طبیعت اب بہت ٹھیک ہے ان کی۔ پر شاید دو ایک دن اسپتال میں رہنا پڑے گا۔“

”تو تم انہیں اکیلا چھوڑ کر یہاں کیوں آ گئیں؟“ ارجمند نے برہمی سے کہا۔

”میں تو کام سے آئی ہوں۔ ایک تو بی بی صاب کو الگ کمرہ دلانا ہے، اس کے لئے پیسے چاہئیں۔“

ارجمند اس کی پوری بات سنے بغیر الماری کی طرف بڑھ گئی۔ الماری کے سیف نے نور بانو ہمیشہ اچھی بڑی رقم رکھتی تھی کہ ممکن ہے، کبھی اچانک ضرورت پڑ جائے۔ اس کی چابی اس کے پاس ہی رہتی تھی۔

اس نے سیف میں سے سو سو کے دس نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

”یہ لو .... اور اب آپی کے پاس سے نہ ہٹنا، بلکہ سنو.... میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ ایک نظر دیکھ کر آ جاؤں گی آپی کو۔“

رشیدہ نے گہری سانس لی۔

”یہ ہونا ہوتا تو وہ آپ کو اپنے ساتھ ہی نہ لے جاتیں۔“

ارجمند ٹھٹک گئی۔

اب رشیدہ کے لئے بات کرنے کا موقع تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے جو کچھ بھی کہنا ہے، بی بی صاب سے منسوب کر کے کہنا ہے۔ اس نے گہری سانس لے کر خود کو اس کے لئے تیار کیا۔

”مجھے بی بی صاب نے خاص طور پر بھیجا ہے.... آپ کو سمجھانے کے لئے۔“

ارجمند متوقع نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

”انہوں نے کہا ہے کہ صاحب کا فون آئے تو انہیں ٹال دیجئے گا۔ یہ نہ بتایئے گا کہ وہ اسپتال میں ہیں۔“

”یہ ان سے چھپانے والی بات نہیں .... یہ تو انہیں بتانے والی بات ہے۔“ ارجمند نے سخت لہجے میں کہا۔

”یہ میں ان سے کیوں چھپاؤں ؟“

”تاکہ وہ پریشان نہ ہوں۔“

”بات ایسی ہے کہ وہ پریشان تو ہوں گے۔ لیکن ان سے چھپائی نہیں جا سکتی۔ آپی کی صحت ان کی پریشانی سے زیادہ اہم ہے۔“

”لیکن وہ پریشان ہوں گے تو یہاں چلے آئیں گے۔“

”اور انہیں آنا بھی چاہئے۔“ ارجمند نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

”آپ نہیں سمجھتیں کہ وہ یہاں آئیں گے تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ وہ آپ کو دیکھیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے رشیدہ کی معنی خیز نظریں ارجمند کے پیٹ کی طرف جھکیں۔

”اور پھر بی بی صاب کو دیکھیں گے۔“

ارجمند کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اسے رشیدہ کی بے حجابی پر پہلے تو غصہ آیا۔ مگر پھر وہ بات کی اہمیت کو سمجھ گئی۔ واقعی.... اسی لئے تو آپی نے آغا جی کو یہاں آنے سے روک رکھا ہے۔

”لیکن وہ آپی سے بات کرنے کو کہیں گے تو میں انہیں کیسے ٹالوں

گی..... ؟'' اب اس کا انداز مدافعانہ تھا۔
''کہہ دیجئے گا کہ وہ بازار گئی ہوئی ہیں۔'' رشیدہ نے بے پرواہی سے کہا۔
''اور انہوں نے دو چار گھنٹے کے بعد پھر فون کر لیا تو.....؟''
''تو کہئے گا، ابھی واپس نہیں آئی ہیں۔''
''یہ کیسے ممکن.....''
''کہہ دیجئے گا کہ انہیں معمول کے معائنے کے لئے اسپتال بھی جانا تھا۔''
''یہ بھی نہیں پتا کہ آپی کو کتنے دن اسپتال میں رہنا پڑے گا۔'' ارجمند نے پریشانی سے کہا۔
''کچھ بھی ہو، آپ کو انہیں یہاں آنے سے روکنا ہے۔''
یہ بات تو ارجمند نے بھی سمجھ لی تھی۔ لیکن یہ بھی جان لیا تھا کہ یہ بڑا مشکل کام ہے۔
''تو اس کے لئے مجھے جھوٹ بولنا پڑے گا۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔
اتنا بڑا جھوٹ بولنے کے بعد آپ جھوٹ بولنے سے ڈرتی ہیں۔'' رشیدہ نے اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''تم اپنے کام سے کام رکھو۔'' ارجمند نے بہت سخت لہجے میں کہا۔ یہ بات اس کے لئے ناقابل برداشت تھی کہ ایک نوکرانی اس کو اس کے منہ پر اس بدتمیزی سے جھوٹا کہے۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا تھا۔
''آئندہ کبھی مجھ سے اس طرح بات نہ کرنا۔''
''آپ کو مجھ سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہئے۔'' رشیدہ نے ترکی بہ ترکی کہا۔
''میں بظاہر آپ کی نوکرانی سہی، اصل میں آپ کی راز دار ہوں۔''
مگر اب ارجمند کو جلال آ گیا تھا۔
''راز دار تم آپی کی ہو، میری نہیں۔ میرے لئے تمہاری وہی حیثیت ہے، جس میں تمہیں رکھا گیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اسے احساس ہو رہا تھا کہ رشیدہ کی

پوزیشن بہت مضبوط ہے اور وہ اس کی توقع کے عین مطابق اسے بلیک میل کر رہی ہے۔ لیکن بلیک میل ہونا اس کی اپنی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ایک بار بلیک میلنگ قبول کر لی تو بھی چھٹکارا نہیں مل سکے گا۔ اسے اسی لمحے رشیدہ کو زیر کرنا ہے۔
''لیکن راز تو آپ کا بھی ہے۔ صاحب کو معلوم ہو گیا تو.....؟'' رشیدہ بھی بہت پکی تھی۔ وہ ایسے ہار ماننے والی نہیں تھی۔
''میرے لئے جھوٹ بولنا جتنا مشکل ہے، سچ بولنا اتنا ہی آسان ہے۔'' ارجمند نے پوری سچائی سے کہا۔
''اور سچ بولتے ہوئے میں نتائج کی پرواہ بھی نہیں کرتی۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو۔''
رشیدہ کے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس جھوٹ سے تو اس کی زمین واگزار ہونے کی امید بندھی تھی۔ اور ارجمند کا لہجہ ایسا تھا، جیسے وہ ابھی فون کر کے صاحب کو حقیقت بتا دے گی۔ اس نے جلدی سے ارجمند کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔
''میں آپ کے سامنے ہاتھ باندھ کر معافی مانگتی ہوں چھوٹی بی بی.....! اگر میں نے آپ سے بدتمیزی سے بات کی تو صرف بی بی صاب کی خاطر.....''
''غلط.....!'' ارجمند نے اس کی بات کاٹ دی۔
''آپی سے تمہیں کیا دلچسپی، تم اپنی غرض کی فکر کرتی ہو۔ کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو.....؟''
''یہ بھید کھل گیا تو بی بی صاب مر جائیں گی۔''
''میں نے کہا نا.....! تم بس اپنی غرض کی فکر کرو۔ باقی معاملات مجھ پر چھوڑ دو۔ آئندہ مجھ سے یا آپی سے کبھی اس طرح بات نہ کرنا۔ ورنہ میں تمہیں فوری طور پر نکال دوں گی۔ بس اب تم جاؤ۔'' ارجمند نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔
رشیدہ نے عافیت اسی میں جانی کہ وہاں سے نکل بھاگے۔ کچھ بھی ہو، کمزور ہمیشہ کمزور ہی رہتا ہے۔ اس نے تلخی سے سوچا۔

اس کے جانے کے بعد ارجمند دیر تک اس صورتِ حال کے بارے میں سوچتی رہی۔ ایک بڑی اہم حقیقت یہ تھی کہ اب تک اس نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اس نے بس اتنا کیا تھا کہ ایک سچائی کا اعلان نہیں کیا تھا۔ لیکن اب ایسا لگتا تھا کہ اسے جھوٹ بولنا پڑے گا۔ اور یہ وہ جانتی تھی کہ ایک جھوٹ بولنے کے نتیجے میں آدمی کو ہزار جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔

یہ اس کے لئے بہت آسان تھا کہ وہ جھوٹ بولنے کے بجائے سچ کہہ دے۔ لیکن اس میں عہد شکنی ہوتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان دو برائیوں میں زیادہ بڑی برائی کون سی ہے۔

وہ دیر تک اس پر سر کھپاتی رہی۔ پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ محض وقت ضائع کر رہی ہے۔ اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ ہی کہاں ہے۔ اگر کوئی مفتی فتویٰ بھی دے دے کہ جھوٹ بولنے کے مقابلے میں عہد شکنی بہتر ہے، تب بھی وہ عہد شکنی نہیں کر سکے گی۔ کیونکہ اس صورت میں آپی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔ رشیدہ نے کہا تھا کہ یہ جھوٹ کھل گیا تو بی بی صاب مر جائیں گی۔ ایسا نہ بھی ہو تو یہ طے تھا کہ وہ آغا جی، دادی اماں اور سب لوگوں کی نظروں میں بے توقیر ہو جائیں گی۔ بلکہ وہ خود اپنی نظروں میں بھی گر جائیں گی۔ اور یہ وہ کیسے گوارہ کر سکتی ہے۔ آپی نے اسے اپنی سگی بہن کی طرح چاہا ہے۔ یعنی بات عہد شکنی سے بڑھ کر احسان فراموشی تک پہنچے گی۔

جس وقت نوربانو نے اس سے یہ وعدہ لیا تھا، اسے نہیں معلوم تھا کہ کس طرح کے معاملات درپیش ہوں گے۔ ذرا بھی اندازہ ہوتا تو وہ عبدالحق سے محرومی گوارہ کر لیتی، لیکن یہ وعدہ نہ کرتی۔

مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تن بہ تقدیر ہو گئی۔

اسی وقت فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق سفارش کا قائل ہی نہیں تھا۔ وہ کسی بھی صورت میں سعودی سفیر سے اپنے کسی ذاتی مسئلے کے سلسلے میں رابطہ نہ کرتا۔ لیکن خوش قسمتی سے یہ بات

دوسروں کو معلوم نہیں تھی۔ اس لئے وہ محتاط تھے۔

اس کے باوجود محکمے میں اسے عضوِ معطل بنا دیا گیا تھا۔ درحقیقت اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ اس نے سکریٹری صاحب سے اس سلسلے میں بات کی۔

''آپ کو کیا پریشانی ہے، عیش کرتے رہئے۔'' سکریٹری نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''مفت کی تنخواہ مجھے اچھی نہیں لگتی۔ میں یہاں کام کرنے کے لئے آتا ہوں۔'' عبدالحق نے سادگی سے کہا۔

''جب کام کا وقت تھا تو آپ چھٹی پر چلے گئے۔'' سکریٹری نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''میں چھٹی پر گیا نہیں، زبردستی بھیجا گیا تھا۔''

سکریٹری کو اچانک خیال آ گیا کہ وہ خواہ مخواہ اپنی پوزیشن خراب کر رہا ہے۔ ہاتھیوں کی اس لڑائی میں اسے خواہ مخواہ نقصان پہنچ جائے گا۔ چنانچہ اس نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔

''مجھے آپ سے ہمدردی ہے عبدالحق صاحب......! لیکن یہاں سب کچھ منسٹر صاحب کے حکم سے ہوتا ہے۔ اور ہو رہا ہے۔ کاش میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا۔''

''آپ اتنا کریں کہ میں جہاں سے آیا تھا، مجھے وہیں بھیج دیں۔''

''یہ میرے اختیار میں کہاں......؟'' سکریٹری نے ٹھنڈی سانس لی۔

''آپ منسٹر صاحب سے بات تو کر سکتے ہیں۔''

''میری کیا مجال کہ آپ کے سلسلے میں ان سے بات کروں۔ وہ تو آپ کا نام سن کر ہی بھڑک جاتے ہیں۔'' سکریٹری بولا۔ پھر چند لمحے کے توقف کے بعد اس نے تجویز پیش کی۔

''جب آپ ایمرجنسی کے دوران چھٹی لے سکتے ہیں تو اپنا تبادلہ بھی کرا سکتے ہیں۔ ویسے بھی کہاں کسٹم اور کہاں وزارت خارجہ؟'' اس کے لہجے میں دبی دبی شرارت تھی۔

عبدالحق نے سمجھ لیا کہ بات کرنا لا حاصل ہے۔ وہ خاموشی سے اٹھ گیا۔

اس نے بہت سے ناپسندیدہ افسروں کا حشر دیکھا تھا۔ انہیں او ایس ڈی بنا دیا جاتا اور پھر بھاری پتھروں کی طرح اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر لڑھکایا جاتا۔ اس کے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہوا تو وہ اس کی وجہ بھی جانتا تھا۔ محض سفیر صاحب کی مداخلت کے خیال سے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ حالانکہ سفیر صاحب کو تو صورتِ حال کا علم ہی نہیں تھا۔

بہر حال وہ اس صورتِ حال سے بہت ناخوش تھا۔

دشواری یہ تھی کہ گھر میں بھی اس کے لئے خوشی نہیں تھی۔ اوّل تو وہ گھر ہی نہیں تھا۔ وہ تو چار دیواری تھی، مکان تھا، اور مکان مکینوں کے بغیر گھر کہاں ہوتے ہیں؟ یہ بات بہت عجیب اور دل شکن تھی کہ وہ بیویوں کے ہوتے ہوئے بھی تنہا تھا۔

وہ اس کی زندگی میں پہلا موقع تھا کہ تنہائی اسے بری لگ رہی تھی۔ ورنہ اسے تو تنہائی بہت پسند تھی۔ تنہائی میں نماز پڑھنا، قرآن پڑھنا اور اس پر غور کرنا اس کے لئے بہت بڑی نعمت اور بہت بڑی خوشی تھی۔

لیکن یہ تنہائی تو نہیں تھی۔ یہ مہیب، مسلسل اور اتھاہ تنہائی، جس کا کوئی اختتام نہیں تھا، یہ تو کچھ اور تھا۔ تنہائی تو وہ ہوتی ہے، جسے آدمی اپنی خوشی سے اپنی مرضی کے مطابق اپنائے۔ یہ تنہائی تو اس پر مسلط کر دی گئی تھی۔

ظلم یہ تھا کہ نوربانو نے اسے اپنا عادی بنا دیا تھا۔ اور پھر اب تو ارجمند بھی تھی۔ کبھی کبھی ارجمند بھی اسے یاد آتی۔ لیکن وہ اپنی گفتگو اور خاص طور پر قرآن کے بارے میں گفتگو کے حوالے سے یاد آتی تھی۔ جبکہ نوربانو کی یاد کا حوالہ صرف اور صرف نفسانی تھا۔

اللہ کا کرم تھا کہ وہ قرآن سے جڑا ہوا تھا۔ اس صورتِ حال میں قرآن کی ہدایت کے مطابق وہ ہفتے میں دو تین دن روزہ رکھ لیتا تھا۔ ورنہ شاید جسمانی تقاضے اسے پاگل کر دیتے۔ اس کے باوجود کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر، سب کچھ بھول کر ایبٹ آباد چلا جائے۔

ایسے میں اسے نوربانو پر جھنجلاہٹ ہونے لگی، غصہ آنے لگا۔ وہ سوچتا، یہ

کیسی بے تکی عورت ہے۔ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ اللہ نے خوشی دی تو منت مان کر خود کو اور اسے نعمتوں سے محروم کر دیا۔ اور ظلم پر ظلم یہ کہ ارجمند کو اپنے ساتھ لے گئی۔

سوچوں کے اس عرصے میں اس پر یہ بات واضح ہوگئی کہ ارجمند کو ساتھ لے جانے میں نوربانو کا بنیادی مقصد اپنی دوسراہٹ نہیں ہے، بلکہ وہ ارجمند کو اس سے دور رکھنا چاہتی تھی، اس ڈر سے کہ کہیں ارجمند اسے اس سے بڑھ کر عزیز نہ ہو جائے۔ وہ جانتا تھا کہ نوربانو سدا کی حاسد اور تنگ دل ہے۔ جو ساجد جیسے چھوٹے سے بچے کو رقیب سمجھ سکتی ہے، وہ سوکن کو کیا سمجھے گی؟ یہ جو اس نے اصرار کر کے ارجمند سے اس کی شادی کرائی، یہ تو ایک معجزہ ہے، اور اللہ نے ایک تنگ دل عورت کے اس ایثار کے صلے میں ہی اسے نواز دیا ہے۔ لیکن اس کی تنگ دلی تو جانے سے رہی۔

اس کی یہ سوچ بے سبب، بے دلیل نہیں تھی۔ نوربانو نے خود یہ بات ثابت کر دی تھی۔ تمام عرصے میں صرف ایک بار اس کی ارجمند سے بات ہو سکی تھی، وہ بھی بمشکل ایک منٹ۔ اس کے علاوہ اس نے جب بھی ارجمند سے بات کرنی چاہی، نوربانو نے کوئی بہانہ بنا دیا۔

نوربانو پر اس کی جھنجلاہٹ بڑھتی گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں اس نے اسے فون کرنا بھی کم کر دیا۔ جھنجلاہٹ کے علاوہ بھی اس کی وجوہات تھیں۔ ایک تو اسے یہ بات بہت بری لگی تھی کہ اس کے یقین کے برعکس تمام آداب اور طور طریقے بالائے طاق رکھ کر وہ حمیدہ کی اجازت لئے بغیر ایبٹ آباد چلی گئی تھی۔ یہی نہیں، پانچ ماہ کے اس عرصے میں اس نے ایک بار بھی حمیدہ کو فون نہیں کیا تھا۔ اور یہ بات اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اس کی ماں کے ساتھ ایسا سلوک!

اور دوسری وجہ ذاتی تھی۔ نوربانو سے فون پر بات کرتا تو اس کا نفس بے لگام ہو جاتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ ایبٹ آباد چلا جائے۔ روزے کا اثر بھی زائل ہو جاتا تھا۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ اسے ارجمند کی حق تلفی کا احساس ستاتا تھا۔ وہ جانتا تھا

کہ ارجمند کے ساتھ بہت بڑی زیادتی، بلکہ ظلم ہو رہا ہے۔ اور وہ اس سلسلے میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ یہ اس کے ضمیر پر بہت بڑا بوجھ تھا۔ اور اس بوجھ کی ذمہ دار نور بانو تھی۔

ارجمند نے کبھی یہ بات نہیں چھپائی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ بلکہ اس کی محبت تو ہر اعتبار سے غیر معمولی تھی۔ پہلی بار اس بارے میں اسے نادرہ نے بتایا تھا۔ اور نادرہ خود اسے غیر معمولی سمجھتی تھی، اس کے بقول ارجمند کو یہ محبت جس عمر میں ہوئی تھی، اس میں بچوں کو محبت کا مطلب بھی معلوم نہیں ہوتا۔

پھر وہ محبت اپنے وجود میں بھی غیر معمولی تھی۔ اور عبدالحق کو اس سے بھی انکار نہیں تھا کہ خود ارجمند ہر اعتبار سے غیر معمولی لڑکی ہے۔ وہ ایک بار اپنی محبت کا اعلان کرنے کے بعد سکون سے بیٹھ گئی تھی۔ اس کی محبت میں اضطراب، خلفشار، بے چینی اور تڑپ نہیں تھی، جبکہ کم عمری کی محبت تو طوفان کی طرح ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اس کی محبت میں سکون، قناعت اور یقین تھا۔ شاید اس کی وجہ اللہ سے اس کا تعلق تھا۔ اسے یقین تھا کہ اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو وہ چاہتی ہے، اللہ اسے دے دے گا۔

اور ہوا بھی یہی تھا...... اور حد درجہ ناقابل یقین تھا۔ کوئی بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ نور بانو جیسی تنگ دل اور حاسد عورت، خوشامد کر کے اس کی شادی ارجمند سے کرائے گی۔ لیکن یہ ان ہونی ہوگئی تھی۔

ارجمند سے شادی کے بعد عبدالحق نے کئی بار خود کو ٹٹولا تھا۔ اسے ارجمند سے محبت نہیں تھی۔ لیکن وہ اس میں بہت کشش محسوس کرتا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ کشش جسمانی نہیں، ذہنی اور روحانی تھی۔ اللہ سے تعلق اور قرآن کی محبت ان کے درمیان قدرِ مشترک تھی۔ بلکہ یہاں وہ ارجمند سے مرعوب تھا۔ ارجمند کم عمر ہونے کے باوجود اس سے آگے تھی۔

تاہم وہ ارجمند کی خوب صورتی سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت حسین تھی...... اتنی حسین کہ حقیقت نہیں، خواب لگتی تھی۔ مگر اس کے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ خوب صورتی اس کی نظر میں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایسا نہیں ہے، لیکن جب وہ نور بانو کو

دیکھتا تو پوری سچائی کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ نور بانو ارجمند سے زیادہ حسین ہے۔ ایسے میں وہ جلدی سے اپنی سوچ میں تین لفظ ٹانک لیتا میری نظر میں۔

دونوں کی قربت کا معاملہ بالکل برعکس تھا۔ نور بانو کی قربت میں وحشت تھی، طوفان تھا، سب کچھ بل جاتا تھا۔ جبکہ ارجمند کی قربت میں سکون تھا، کچھ پانے کا احساس تھا۔ ارجمند سے وہ گھنٹوں باتیں کرتا اور وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوتا۔ ہر بار وہ اس سے کچھ نہ کچھ سیکھتا۔

تو اسے ارجمند سے کم از کم روایتی محبت ہرگز نہیں تھی، لیکن اب وہ اس کی بیوی تھی، اس کی ذمہ داری تھی۔ اور نور بانو کی وجہ سے اس کی حق تلفی ہو رہی تھی۔ لیکن ذمہ دار تو وہ تھا۔ اسے احساس جرم ستاتا تھا۔ وہ اللہ سے ڈرنے والا آدمی تھا۔ جانتا تھا کہ اللہ کے سامنے اس زیادتی اور بے انصافی کی جواب دہی کون ہوگی، جو کہ ممکن ہی نہیں۔ لیکن نور بانو کے وجود کا صندوق نت نئی ترکیبوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنی ہر بات منوانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اب منت کو ہی دیکھ لو۔ اس سے ایک طرف تو وہ محروم ہوا۔ لیکن نور بانو نے ارجمند کے لئے بھی کوئی موقع نہیں چھوڑا۔ اور عبدالحق کو یقین تھا کہ نور بانو نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا ہے۔

اس نے سر جھٹک کر گویا اپنی سوچوں کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ ان دنوں تو وہ چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہا تھا۔ کہیں بھی سکون نہیں تھا، نہ گھر میں، نہ دفتر میں۔ بس ایک خوش کن خیال اسے سہارا دیتا تھا۔ وہ باپ بننے والا ہے اور اگر اللہ نے بیٹا عطا فرمایا تو انشاء اللہ اس کی نسل ایمان کے راستے پر آگے بڑھے گی۔

یہ اس کے لئے بہت بڑی خوشی تھی۔ اس کے بارے سوچتا تو ہر پریشانی غیر اہم اور بے معنی لگنے لگتی۔

اس نے سوچا کہ آج ایبٹ آباد فون کر ہی لے۔ لیکن جب بھی ایسا ہوتا تو پہلے وہ حمیدہ کو فون کرتا۔ اس وقت بھی اس نے ایسا ہی کیا۔

عدت ختم ہونے کے بعد حمیدہ صفیہ کو اپنے ساتھ لاہور لے آئی تھی۔ اور اب اس نے سوچا تھا کہ صفیہ کو اپنے ساتھ ایبٹ آباد لے جائے گی۔ نور بانو کے ہاں ولادت تک وہ دونوں یہیں رہیں گی۔

حمیدہ سے فون پر خیر خیریت معلوم کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔

''اماں..... !ایبٹ آباد کا کب کا ارادہ ہے.....؟''

''اگلے ہفتے انشاء اللہ چلیں گے۔ میں نے زبیر سے بات کر لی ہے۔''

''ٹھیک ہے..... ! میں نور بانو کو بتا دوں گا۔''

''اسے نہ بتانا پتر..... ! اچانک کہیں دیکھے گی تو کتنی حیران ہوگی وہ۔''

حمیدہ بچوں کی سی ہیجانی خوشی میں مبتلا تھی۔

''ٹھیک ہے اماں..... !'' عبدالحق نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔ دل میں اس نے سوچ لیا تھا کہ نور بانو کو بتانا ضروری ہے۔ اماں جسے نور بانو کے لئے خوش گوار حیرت سمجھ رہی ہیں، ممکن ہے، وہ نور بانو کے لئے نہایت ناخوش گوار ہو۔ پہلے سے بتا کر وہ اسے کم از کم اس کے لئے تیار کر سکتا ہے۔ یوں نور بانو کے منفی ردِعمل کا سامنا تو وہ کرے گا۔ اماں محفوظ ہو جائیں گی۔

اس نے ایبٹ آباد کا نمبر ملایا۔ خلاف توقع اسے دوسری طرف سے ارجمند کی السلام علیکم کی آواز سنائی دی۔ اس کا دل خوش ہو گیا۔

''شکر ہے ارجمند..... ! تم سے بات تو ہوئی۔'' اس نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔

''کیسی ہو تم..... !''

''جی..... الحمد للہ..... !'' ارجمند کے لہجے میں ہلکی سی حیرت تھی۔

''بہت مصروف رہتی ہو.....؟''

''جی..... جی نہیں تو..... !'' ارجمند گڑبڑا گئی۔

''میں جب بھی فون کرتا ہوں، تم کہیں مصروف رہتی ہو۔''

''اتفاق ہے..... !'' ارجمند نے کہا۔ پھر جلدی سے بات بدلی۔

''آپ کیسے ہیں.....؟''

''الحمد للہ..... ! خیریت سے ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم سے بات کا موقع ملا۔''

ارجمند کا دل ایک پل کو جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

''ایسی کیا بات ہے.....؟''

''بہت جی چاہتا تھا تم سے بات کرنے کو۔ کبھی تم خود ہی فون کر لیا کرو۔ میرا نمبر تو ہے تمہارے پاس.....؟''

''جی..... جی..... لیکن.....'' ارجمند کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے؟

''یہ کہنے والی باتیں نہیں ہوتیں آغا جی..... ! یہ تو بغیر کہے ہی محسوس کر لی اور سمجھ لی جاتی ہیں۔ اور میں نہیں سمجھتی کہ آپ نے یہ سوال سنجیدگی سے کیا ہے، کیونکہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتی ہوں۔ دل ٹیلی فون کا اور لفظوں کا محتاج تو نہیں ہوتا۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن مجھے معذرت کرنی ہے تم سے۔ معافی مانگنی ہے۔''

''کیسی بات کر رہے ہیں آغا جی..... ! کیوں مجھے گناہ گار.....''

''مجھے بات کرنے دو پلیز..... !'' عبدالحق نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے، اور اس کا ذمہ دار میں ہوں۔''

''ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ نہ جانے کس زیادتی کی بات کر رہے ہیں۔''

''تمہیں نور بانو کے ساتھ یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ مجھے روک دینا چاہئے تھا۔ لیکن میں وقت پر فیصلہ نہیں کر سکا۔ یہ تمہاری حق تلفی ہے۔ مجھے اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے ہر حال میں اللہ کے ساتھ شرمندہ ہونا ہے۔ لیکن میں اس بات سے بہت ڈرتا ہوں۔ تم مجھے اس زیادتی پر معاف کر کے مجھے جواب دہی سے بچا سکتی ہو۔''

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں آغا جی..... !'' ارجمند نے بڑی محبت سے کہا۔

''میں اپنی خوشی سے یہاں آئی ہوں۔ اس لئے آپ کو کوئی جواب دہی نہیں کرنی۔''

''میں اتنے بڑے معاملے میں یوں مطمئن نہیں ہو سکتا۔ ایک بات بتاؤ، میں اگر تمہیں منع کر دیتا تو کیا تم پھر بھی یہاں آتیں.....؟''

ارجمند بری طرح گڑبڑا گئی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''آپ کی حکم عدولی تو میں نہیں کر سکتی تھی۔''

''تو سچ یہ ہے کہ مجھے اپنے اس حق کو فرض سمجھ کر استعمال کرنا چاہئے تھا۔ میں نے ایسا نہیں کیا۔ اب تمہارے معاف کرنے سے ہی میں بچ سکتا ہوں۔''

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر ارجمند نے کہا۔

''آج ایک اہم بات بتا دوں آپ کو۔ ہمیشہ یاد رکھئے گا۔ میں نے اللہ کی بارگاہ میں ہمیشہ ایک عرض کی ہے۔ آپ کی طرف سے مجھ پر کوئی زیادتی یا میری کوئی حق تلفی ہو، دانستہ ہو یا نادانستہ، میں زندگی بھر کے لئے آپ کو اس پر معاف کرتی ہوں۔ میرا کوئی دعویٰ نہیں ہوگا آپ پر۔ تو آپ بےفکر ہو جائیں۔ انشاء اللہ قیامت کے دن میرے بارے میں آپ سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔''

عبدالحق کو اس کی محبت نے ہلا کر رکھ دیا۔

''تم بہت اچھی ہو ارجی ..... میں تمہارا.....''

''آگے کچھ نہ کہئے گا۔ یہ تو محبت کا حق ہوتا ہے۔ اور میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔''

''کاش میں بھی .....''

''یہ بھی نہ کہیں۔ جو محبت کرتا ہے، اسے محبت کرنا اچھا لگتا ہے، محبوب بننا نہیں۔''

''ارے ہاں ..... ! ایک اہم بات بتانی ہے۔ اگلے ہفتے اماں تغیہ چچی کے ساتھ آ رہی ہیں۔''

چند لمحوں کے لئے تو ارجمند سن ہو کر رہ گئی۔ پیچیدگی اور بہت بڑی پیچیدگی! مگر وہ انہیں روک تو نہیں سکتی۔

''جی بہت بہتر ..... !'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''نور بانو سے بات ہو سکتی ہے .....؟'' عبدالحق نے سرسری انداز میں کہا۔ ویسے اس نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ یہ ممکن نہیں۔ نور بانو اگر گھر میں ہوتی تو ارجمند سے اتنی طویل گفتگو وہ کبھی نہ کر پاتا۔

''اس وقت تو یہ ممکن نہیں آغا جی .....!''

''کیوں.....؟''

''آپی اسپتال گئی ہیں۔'' ارجمند نے بے ساختہ کہا۔

''خیریت تو ہے .....؟''

ارجمند اگر سوچتی تو شاید اس سوال کا جواب کبھی نہ دے پاتی۔ لیکن جواب تو جیسے اس کی نوکِ زباں پر دھرا تھا۔

''وہ چیک اپ کے لئے جاتی ہیں نا .....!''

''اوہ ..... ٹھیک ہے۔ ارجمند ..... ! اپنی آپی کا خیال رکھنا۔''

''آپ بےفکر رہیں آغا جی ..... ! آپ کی ہر امانت کا میں زندگی سے بڑھ کر خیال رکھتی ہوں، اور خیال رکھوں گی۔ چاہے مجھے خیال رکھنا آتا ہو یا نہیں آتا ہو۔ نہیں آتا تو میں سیکھ لوں گی۔''

عبدالحق نے سوچا کہ اتنی کم عمری میں ایک زچہ کا خیال رکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ لڑکی واقعی مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔

اس نے خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

❁ ❁ ❁

نوریز رشیدہ کے ساتھ اسپتال جانا چاہتا تھا۔ لیکن رشیدہ نے اسے سختی سے روک دیا۔

''یہ بی بی صاب کا حکم ہے۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''تمہیں یہیں رہنا ہے۔ بی بی صاب کے پاس میں رہوں گی۔''

نوریز کو وہ شروع سے ہی اچھی نہیں لگی تھی۔ مگر بیگم صاحب نے اسے خود رکھا تھا۔ اور وہ نہ ان سے اختلاف کر سکتا تھا، نہ ہی ان کے حکم سے سرتابی۔ وہ بے بس تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس معاملے میں اسے کسی بہت بڑی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ گڑبڑ کیا ہے؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ صاحب سے رابطے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

رشیدہ اسپتال پہنچی تو نور بانو کی وہی کیفیت تھی۔ وہ مسکن دواؤں کے زیر

اثر تھی۔ رشیدہ نے ڈاکٹر سے بات کی اور یوں نور بانو کو پرائیویٹ روم میں منتقل کر دیا گیا۔ ضرورت کی تمام چیزیں رشیدہ اپنے ساتھ لائی تھی۔

نور بانو کو ہوش آیا تو درد کا احساس تو بالکل نہیں تھا۔ لیکن نقاہت حد درجہ کی تھی۔

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ اجنبی کمرہ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔ ذہن پر زور دینے پر یاد آیا کہ اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی، اور وہ اسپتال آئی تھی۔

اس نے سر گھما کر دیکھا۔ رشیدہ اس کے پاس ہی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اسے جاگتے دیکھا تو وہ اس پر جھک گئی۔

''آپ کی طبیعت اب کیسی ہے بی بی صاب ...؟'' اس نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں ...!'' نور بانو نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔ پھر پوچھا۔

''یہ اسپتال ہے ...؟''

''جی ہاں ...! میں نے آپ کے لئے الگ کمرے کی بات کر لی تھی۔''

''مگر ہم گھر کیوں نہیں گئے ...؟''

''ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ آپ کو تین چار دن رُکنا ہوگا یہاں۔''

''کیوں ...؟'' نور بانو کے لہجے میں وحشت تھی۔

''یہاں تو میرا دم گھٹ جائے گا۔''

''آپ کی طبیعت بہت خراب ہے بی بی صاب ...! کل کے بعد اب تو آپ کو ہوش آیا ہے۔''

''کل ...؟'' نور بانو کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی، لیکن نقاہت کی وجہ سے ڈھ گئی۔ اسی لمحے درد نے بھی احساس دلا دیا کہ وہ ابھی موجود ہے۔ اور اس درد سے وہ بہت ڈرتی تھی۔

وہ لیٹی بے بسی سے رشیدہ کو تکتی رہی۔ اٹھنے کی وہ کوشش اس کے لئے اتنی بڑی مشقت ثابت ہوئی تھی کہ اب وہ ہانپ رہی تھی۔ بات کرنے کے قابل بھی نہیں تھی۔

''آپ آرام کریں بی بی صاب ...! کمزوری بہت ہوگئی ہے آپ کو۔''

یہ بات نور بانو نے بھی سمجھ لی تھی۔ درد اب جاگا تھا۔ اگرچہ ہلکا تھا۔ مگر اسے یہ ڈر لگ رہا تھا کہ بڑھ نہ جائے۔ کچھ دیر وہ خاموش رہی۔ یہاں تک کہ درد کا احساس معدوم ہوگیا۔

پھر اس نے آہستہ سے رشیدہ سے پوچھا۔

''تو میں کل سے یہاں ہوں ...؟''

''جی بی بی صاب ...!''

اچانک نور بانو کا ذہن جیسے جاگ اٹھا... بلکہ اندیشوں سے بھر گیا۔ اگر اس دوران عبدالحق نے فون کیا ہو، اور ارجمند نے اسے اس کے بارے میں بتا دیا ہو تو کیا ہوگا ...؟ وہ یہاں آجائے گا۔ اور وہ یہاں آگیا تو سب کچھ ختم۔ شاید کچھ بھی نہیں بچے گا ... اس کی ازدواجی زندگی بھی نہیں بچے گی۔ عبدالحق جھوٹ سے کتنی نفرت کرتا ہے۔ جبکہ یہاں تو بات جھوٹ سے بہت آگے کی ہے۔ یہ تو بہت بڑا فریب ہے، مجرمانہ دھوکا ہے اسے وہ کیسے معاف کر سکے گا، چاہے وہ اس سے کتنی ہی محبت کرتا ہے۔ اور اب تو ارجمند جیسی حسین لڑکی اس کی بیوی ہے، اور ایسی بیوی جو ماں بن کر اس کا سب سے بڑا ارمان پورا کرنے والی ہے۔

اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ چہرے سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ آنکھیں دھندلانے لگیں۔

رشیدہ اس کے چہرے پر پل پل بدلتے رنگ دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی گھبرا گئی۔

''کیا ہوگیا بی بی صاب ...؟''

مگر نور بانو جواب دینے کے قابل نہیں تھی۔

''میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتی ہوں۔'' رشیدہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

نور بانو نے بمشکل اشارے سے اسے روکا اور بیٹھنے کو کہا۔ پھر وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

رشیدہ نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گئی۔ حالانکہ اس کے خیال میں ڈاکٹر کی

ضرورت تھی۔

نور بانو کی حاللت کچھ سنبھلی تو اس نے آہستہ سے کہا۔

''بہت بڑی گڑ بڑ ہو جائے گی رشیدہ ...! اور کون جانے، ہو بھی گئی ہو۔''

''کچھ نہیں ہوا بی بی صاب ...! کچھ نہیں ہوگا۔ سب ٹھیک ہے۔''

نور بانو ہذیانی انداز میں نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

''تمہیں اسی وقت گھر جانا ہوگا۔ ارجمند کو سمجھنا ہوگا۔''

رشیدہ سمجھ گئی کہ بات کیا ہے؟ اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''آپ بےفکر رہیں بی بی صاب ...! یہ کام تو میں کل ہی کر چکی ہوں۔''

''تم سمجھ ہی نہیں رہی ہو میری بات ...!'' نور بانو کے لہجے میں احتجاج تھا۔

''آپ صاحب کے فون کے خیال سے پریشان ہو رہی ہیں نا ...؟''

نور بانو نے اثبات میں سر ہلایا۔ اب اس کے لئے بولنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ایک تو نقاہت، اس پر کچھ چھن جانے، زندگی اجڑ جانے کے خوف نے اسے شل کر کے رکھ دیا تھا۔

رشیدہ نے اسے اپنی گزشتہ روز کی کارگزاری کی تفصیل سنا دی۔

نور بانو سنتی رہی اور تشکر سے سر ہلاتی رہی۔ اس کا وجود پرسکون ہوتا جا رہا تھا۔

سب کچھ سننے کے بعد نور بانو نے دھیمے لہجے میں اسے داد دی۔

''یہ تم نے بہت اچھا کیا رشیدہ.....! تم بڑے انعام کی حق دار ہو۔''

''میں تو بس اپنا فرض پورا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں... بی بی صاب.....!''

''مجھے خوشی ہے کہ میں نے تمہیں منتخب کیا۔''

''مگر ایک بات ہے بی بی صاب .....! مجھے ڈر ہے کہ چھوٹی بی بی بھانڈا نہ پھوڑ دیں۔''

نور بانو پھر متوحش ہوگئی۔ وہ یہ بھی بھول گئی کہ اس نے رشیدہ کو بتایا تھا کہ

یہ سب کچھ اس کے شوہر کی مرضی سے ہی ہو رہا ہے۔ اس نے کہا۔

''یہ بات تم نے کیسی کہی ...؟''

''میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو وہ مجھ پر بگڑ گئیں۔ کہنے لگیں، اپنے کام سے کام رکھو۔ نوکرانی ہو، نوکرانی ہی رہو۔''

''ایسے کہا ارجمند نے ...؟'' نور بانو نے حیرت سے کہا۔ ویسے وہ جانتی تھی کہ ارجمند رشیدہ کو پسند نہیں کرتی۔ بلکہ اس نے کہا تھا کہ آپی! یہ عورت ہماری کمزوری سے فائدہ اٹھائے گی، اور اس نے جواب دیا تھا کہ تم اسے مجھ پر چھوڑ دو۔

''انہوں نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ ان کے لئے جھوٹ بولنا جتنا مشکل ہے، سچ بولنا اتنا ہی آسان ہے۔''

ایک لمحے کو تو نور بانو یہ سن کر گھبرا گئی۔ وہ بیمار تھی، تکلیف میں تھی، ناطاقتی کا شکار تھی۔ ایسے میں ذہن ٹھیک سے کام کہاں کرتا ہے؟ لیکن یہ اس کے لئے زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ اس نے تیزی سے خود کو سنبھالا اور ذہن کو مرکوز کر کے سوچنے کی کوشش کی۔ یہ تو وہ اب بھی نہیں سمجھ سکی کہ رشیدہ نے اس کا جھوٹ پکڑ لیا ہے۔ یہ بات سمجھ لی ہے کہ یہ سارا کھیل وہ اپنے شوہر کی بےخبری میں کھیل رہی ہے۔ شاید اس لئے نہ سمجھ سکی کہ اس کے سامنے اس سے بڑا مسئلہ تھا۔

کیا ارجمند واقعی بھانڈا پھوڑ دے گی.....؟

اس نے ارجمند کو دیکھا تھا۔ وہ اسے جانتی تھی۔ اور وہ کوئی نادان عورت نہیں تھی۔ ارجمند سے عبدالحق کی شادی اس نے یوں ہی تو نہیں کرا دی تھی۔ بہت سوچ سمجھ کر اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا اس نے۔ وہ جانتی تھی کہ ارجمند اس کی خاطر جان بھی دے سکتی ہے۔

اور رشیدہ؟ رشیدہ کو بھی اس نے جان لیا تھا، سمجھ لیا تھا۔ تبھی تو اسے منتخب کیا تھا کہ اس کے پاس اخلاق کا کوئی معیار نہیں، وہ صرف اپنے مفاد کی فکر کرنے والی ہے۔ وہ کمزوری دیکھے گی تو اس کو چھپانے کی قیمت مانگے گی۔ اور قیمت بغیر مانگے مل رہی ہو تو وہ وفادار بن کر اس کمزوری کا پردہ رکھے گی۔ اور نور بانو اسے قیمت ادا کر سکتی تھی۔ اسی لئے اس نے اسے رکھ لیا تھا۔

ایک لمحے میں نور بانو نے سمجھ لیا کہ اسے ارجمند کی طرف سے خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ البتہ رشیدہ ضرورت سے زیادہ چپل سکتی ہے۔ اسے دیکھنا ہوگا کہ اس میں رشیدہ کی کوئی چال تو نہیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ رشیدہ نے اس وقت وہ سب کچھ کیا جو نہایت ضروری تھا، جبکہ خود نور بانو کچھ سوچنے کے قابل بھی نہیں تھی۔ اور ارجمند بھی بے دھیانی میں غلطی کر سکتی تھی۔ مگر اب وہ محتاط رہے گی۔

''پھر تم نے کیا کہا...؟'' بالآخر نور بانو رشیدہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''میں کیا کہتی بی بی صاحب... نوکرانی تو میں ہوں نا... رازدار تو بس آپ کی ہوں۔'' رشیدہ نے آخری پر خاص طور پر زور دیا۔

اس بار نور بانو کی سمجھ میں بات آگئی۔ اس نے رشیدہ سے کہا تھا کہ یہ سب کچھ اس کے شوہر کے علم میں ہے۔ اور اب وہ جتا رہی تھی کہ وہ جانتی ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

تو اب رشیدہ اس اضافی کمزوری سے بڑھ چڑھ کر فائدہ اٹھانے کی کوشش کر سکتی ہے۔ ارجمند نے سچ ہی کہا تھا۔

مگر خود اس نے بھی غلط نہیں کہا تھا۔ وہ اسے سنبھالنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ اس بار، اس عالم میں راستہ اسے رشیدہ کے ساتھ ارجمند کے رویے نے دکھایا تھا۔

''یہ سچ ہے۔'' اس نے رشیدہ سے کہا۔

''اس کے لئے سچ بولنا آسان ہے اور جھوٹ بولنا مشکل۔ تم اس سے کبھی نہ الجھنا۔ تمہارا معاملہ بس میرے ساتھ ہے۔ تم اس سے الجھو گی تو میرا اور تمہارا دونوں کا کام خراب ہوگا۔''

''توبہ کریں بی بی صاحب...!'' رشیدہ نے دونوں کان پکڑتے ہوئے کہا۔

''میں کیوں اُلجھوں گی ان سے۔ یہ تو میں نے آپ کی بھلائی کی خاطر سمجھایا تھا انہیں۔''

''اس میں تمہاری بھی بھلائی تھی۔'' نور بانو نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

رشیدہ کھسیا گئی۔ مگر اس نے بالادستی کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔

''تو آپ کے شوہر یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ بچہ آپ کو ہونے والا ہے...؟'' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''آپ نے تو کہا تھا کہ.....''

''میں نے جو مناسب سمجھا، تمہیں بتا دیا۔'' نور بانو نے خشک لہجے میں کہا۔

''اگر مجھے وقت پر خیال نہ آتا تو بڑی گڑبڑ ہو جاتی۔''

''ایسی بات نہیں۔ ارجمند ہر طرح کی صورتِ حال سے نمٹ سکتی ہے۔''

''لیکن انہیں میرے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔''

اب نور بانو نے سمجھ لیا کہ ارجمند کو رشیدہ کے لئے ہوا نانا ضروری ہے۔

''میں نے کہا نا...! اس کو بھول جاؤ تم... ورنہ وہ تمہیں نکال بھی سکتی ہے۔''

''تو اس کے بعد یہ راز ساری دنیا کو معلوم ہو جائے گا۔''

نور بانو نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو رشیدہ...! میں تمہیں جو کچھ بھی دوں گی، اپنی خوشی سے دوں گی۔ لیکن تم میری مجبوری نہیں ہو۔ تم نے کبھی غور نہیں کیا ہوگا۔ ہمارے گھر کے باہر تم پر نظر رکھی جاتی ہے۔ جو اتنا بڑا راز رکھتے ہیں، وہ راز کو راز رکھنا ہی جانتے ہیں۔ وہ کسی پر بھی بھروسہ نہیں کرتے۔ میں دل کی نرم ہوں۔ لیکن ارجمند اور طرح کی لڑکی ہے۔ اس کے سامنے میں بھی بے بس ہوں۔ اس کے باپ کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ راز فاش کرنے سے پہلے ہی تمہارا پتا بھی نہیں چلے گا کسی کو۔ بہت بڑے فائدے کے کام میں اپنے لئے بہت بڑا نقصان تلاش نہ کرو تم...!''

نور بانو نے ایسے لہجے میں بات کی تھی کہ رشیدہ خوف زدہ ہوگئی۔ تیز و طرار عورت تھی۔ نور بانو کی بات پر اسے پورا یقین تو نہیں آیا تھا۔ لیکن یہ ضرور سمجھ میں آگیا کہ زیادہ الجھنے کے بجائے بس اپنے فائدے کی فکر کی جائے۔

''میں تو آپ کی خیر خواہ ہوں بی بی صاحب.....!''

''میرے دل میں بھی تمہاری بڑی قدر ہے۔'' نور بانو نے بڑے خلوص

سے کہا۔ اتنی دیر میں وہ نڈھال ہوگئی تھی۔ اس نے آنکھیں موندھ لیں۔

❁ ❁ ❁

رشیدہ کی سمجھ میں بھی بہت کچھ آ گیا تھا۔ بہت زیادہ تو نہیں، البتہ وہ ڈر ضرور گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ جو لوگ یہ کھیل کھیل رہے ہیں، وہ کچھ بھی کرا سکتے ہیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ کون لوگ ہیں؟ لیکن ان کا رہن سہن اور ان کا کھلا ہاتھ دیکھ کر یہ تو پتا چلتا تھا کہ وہ بہت بڑے لوگ ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

اس کی سمجھ میں یہ بات بھی آ گئی کہ اس کے لئے اہمیت صرف نور بانو کی ہے۔ ارجمند کو نہ اس کی ضرورت ہے اور نہ ہی پرواہ۔ اگر نور بانو کو کچھ ہوگیا تو اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا، اور اس کے سب خواب بکھر جائیں گے۔

اس نے یہ بات گرہ میں باندھ لی کہ تیزی اور طراری دکھانے میں اس کا نقصان ہے۔ اس کھیل میں اسے وفاداری ہی کامیابی دلا سکتی ہے۔ وفاداری اور رازداری۔

❁ ❁ ❁

تین دن اسپتال میں رہنے کے بعد نور بانو کی حالت بہتر ہوگئی۔ اسپتال سے ڈس چارج ہوتے وقت ڈاکٹر نے اس سے بڑی تفصیل سے بات کی۔

''سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کو ڈس چارج نہیں کرنا چاہتا۔'' اس نے کہا۔

''لیکن اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''آپ کو یہ تکلیف کب سے ہے.....؟'' ڈاکٹر نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''کئی برس سے ہے۔ میں مستقل طور پر دوائیں استعمال کرتی ہوں۔''

''آپ کو کبھی کسی ڈاکٹر نے آپریشن کے لئے نہیں کہا.....؟''

نور بانو کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

''جی..... کہا تو تھا لیکن.....''

''آپ ڈرتی ہیں آپریشن سے.....؟''

''جی..... جی..... جی ہاں.....!''

''اور وہ بہت ضروری ہے۔ بہت پہلے ہو جانا چاہئے تھا آپریشن۔ آپ کو اس تکلیف سے نجات مل جاتی۔ اب آپ کا مرض بہت بڑھ گیا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ پھر اچانک بات بدلی۔

''آپ کو یہاں کوئی دیکھنے بھی نہیں آیا.....؟''

''جی..... میں یہاں اکیلی ہوں۔ بس یہ ملازمہ ہے میرے ساتھ.....!''

''اور آپ کے شوہر.....؟''

''وہ سرکاری افسر ہیں۔ کراچی میں ہوتے ہیں۔'' نور بانو نے دانستہ جھوٹ بولا۔

''یہ اور خراب بات ہے۔ آپ انہیں یہاں بلوا لیجئے۔ آپ کے لئے ضروری یہ ہے کہ ایک ماہ کے اندر آپریشن ہو جائے آپ کا۔ ورنہ آپ کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔''

''جی.....! میں ان سے بات کروں گی۔'' نور بانو نے بے دلی سے کہا۔

''آپ اس مسئلے کی سنگینی کو سمجھنے کی کوشش کریں۔''

یہ گفتگو سن کر رشیدہ پریشان ہوگئی۔ اگر خدانخواستہ بی بی صاب کو کچھ ہوگیا تو اس کا کیا ہوگا؟ اس نے جلدی سے نور بانو سے کہا۔

''آپ ابھی آپریشن کرا لیجئے نا بی بی صاب.....!''

نور بانو کے جواب دینے سے پہلے ہی ڈاکٹر بول اٹھا۔

''یہ ممکن نہیں ہے..... ہم اپنی ذمہ داری پر یہ آپریشن نہیں کر سکتے۔''

''کیا مطلب.....؟'' نور بانو نے چونک کر پوچھا۔

''آپ کے شوہر یا کسی ذمہ دار رشتہ دار کو تحریری طور پر آپریشن کے لئے اجازت دینی ہوگی۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ جلد از جلد اپنے شوہر کو یہاں بلوا لیجئے۔''

''جی بہتر.....!''

''اور اس وقت تک یہ دوائیں باقاعدگی سے استعمال کریں۔ پرانی دوائیں چھوڑ دیں۔''

نور بانو نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ عبدالحق یہاں موجود نہیں، ورنہ آپریشن کی نوبت آ جاتی۔ اور وہ آپریشن سے اتنا ڈرتی تھی کہ اس کے مقابلے میں مر جانا اس کے نزدیک بہتر تھا۔ زندگی میں آدمی کی چیر پھاڑ... کانٹ چھانٹ... توبہ توبہ...!

❁ ❁ ❁

نور بانو اسپتال سے گھر واپس آئی تو ارجمند نے سکون کی سانس لی۔ دیکھنے میں وہ بہت کمزور لگ رہی تھی۔ لیکن ارجمند کے لئے تو یہ بہت بڑی بات تھی کہ وہ اپنے پیروں پر چل کر گھر میں آئی ہے۔

وہ بس اس کی دیکھ بھال، اس کے کھانے پینے کی فکر میں لگ گئی۔

ایک بار موقع ملا تو نور بانو نے اس سے کہا۔

''تم میرے پاس کیوں نہیں بیٹھتیں...؟''

''بس... یخنی بنا کر لے آؤں آپ کے لئے۔ پھر آپ کے پاس ہی بیٹھوں گی۔''

''یخنی آیا بنا لے گی۔ تم کیوں فکر کرتی ہو...؟''

''وہ اتنی اچھی نہیں بنا سکتی۔'' ارجمند نے کہا اور کچن میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اس کے لئے یخنی لے کر آ گئی۔

''یہ لیجئے...!'' اس نے پیالہ نور بانو کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''ذرا گرم گرم ہی پی لیں۔ انشاء اللہ طاقت آ جائے گی۔ بہت کمزور ہو گئی ہیں آپ۔''

''ہاں...! کمزوری کا احساس تو مجھے بھی ہو رہا ہے۔''

''فکر نہ کریں۔ چار دن میں آپ کی طاقت بحال ہو جائے گی۔''

نور بانو چمچے سے یخنی پینے لگی۔ درمیان میں اسے احساس ہوا کہ ارجمند اسے بہت غور سے دیکھ رہی ہے۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ ارجمند بڑی محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو...؟'' اس نے ارجمند سے پوچھا۔

''آپ کی صورت دیکھنے کو ترس گئی تھی میں تو...'' یہ لڑکی درحقیقت اسے کتنا چاہتی ہے، اس کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہے... اور کر رہی ہے۔ کوئی عورت کسی کے لئے ایسی قربانی نہیں دے سکتی، جیسی یہ دے رہی ہے۔ اسے شرم آنے لگی کہ وہ اسے اپنی غرض کے لئے استعمال کر رہی ہے۔

پھر اس نے دھیرے سے سر ہلا کر گویا اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اس وقت اتنی پریشانیاں تھیں۔ یہ شرمندگی پالنے کا وقت نہیں تھا۔

''یہ بتاؤ! تمہارے آغا جی نے فون کیا تھا...؟'' اس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''جی آپی...! پہلے ہی دن ان کا فون آ گیا تھا۔''

''میرے بارے میں پوچھا ہوگا انہوں نے...؟''

''انہوں نے تو فون ہی آپ کو کیا تھا۔'' ارجمند نے سادگی سے کہا۔

''پھر...؟''

''میں نے کہہ دیا کہ آپ چیک اپ کے لئے اسپتال گئی ہیں۔''

نور بانو نے سکون کی سانس لی۔

''شکر ہے...! تم طبیعت خراب ہونے کا کہتیں تو وہ آ ہی جاتے۔''

''لیکن آپی...! یہ بات غلط ہے۔ میں جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتی۔''

ارجمند کا لہجہ غیر معمولی حد تک نرم تھا۔

نور بانو نے چونک کر اسے دیکھا، پھر مسکرائی۔

''میں جانتی ہوں۔ اسی لئے یہ نوبت ہی کبھی نہیں آنے دی تھی۔ اب یہ درد تو ناگہانی تھا۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔''

''آپی...! میں نے آپ کی محبت میں آپ کی ہر بات مان لی۔ میں اس وقت بہت کچھ جانتی اور سمجھتی نہیں تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس معاملے میں اتنی سنگینیاں ہوں گی۔''

''تم کیوں فکر کرتی ہو۔ میں سب سنبھال لوں گی۔''

''نہیں آپی...! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ جھوٹ اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ اور

یہ ہمارا جھوٹ تو بہت بڑا ہے۔ مجھے تو شرم بھی آتی ہے آپی ! ابھی یہ کھل گیا تو میں کسی کا سامنا بھی نہیں کرسکوں گی۔ ذرا سوچیں تو، اس کی وجہ سے آغا جی بھی تکلیف میں ہیں۔"

"انہیں کیا تکلیف ہے....؟" نور بانو کو جلال آگیا۔

"آپ سے دور، آپ سے محروم ہیں۔ یہ ان کے لئے معمولی بات تو نہیں۔ آپ مجھ سے ویسے ہی کہتیں تو بھی یہ سب کچھ ہو جاتا۔ میں تو آپ کے لئے کچھ بھی کرسکتی ہوں۔"

"جانتی ہوں۔" نور بانو نے نرم لہجے میں کہا۔

"مگر اس طرح مجھے وہ عزت اور مان تو نہ ملتا ...."

"یہ تو سوچیں کہ اس میں ہم دونوں کو بدترین ذلت بھی مل سکتی ہے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم نے میرے لئے وہ کچھ کیا ہے، جو دنیا میں کوئی نہیں کرسکتا۔ تمہارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں آپی..... ! لیکن اب مجھے اس صورتِ حال سے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔"

نور بانو نے غور سے اسے دیکھا۔

"تو تم کیا چاہتی ہو....؟"

"میں چاہتی ہوں کہ ہم اس جھوٹ سے نجات پالیں۔ سچ بولیں ....."

"ٹھیک ہے.... ! لیکن اس سے پہلے میں جان دے دوں گی۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔"

ارجمند نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر جو کچھ اسے نظر آیا، اسے دیکھ کر وہ تھرا گئی۔

"یہ کیسی بات....؟"

نور بانو کے چہرے پر اب نرمی تھی۔

"سچ تو یہ ہے کہ ارجی .... ! کہ اب مجھے غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ لیکن تیر اب کمان سے نکل چکا ہے۔ اب پیچھے ہٹنے میں جو ذلت ہے، وہ مجھے گوارہ نہیں۔

اس کے مقابلے میں موت مجھے قبول ہے۔"

"یہ میں کیسے گوارہ کرسکتی ہوں۔" ارجمند نے احتجاج کیا۔

"سوچ لو.....! فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہے۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔ ابھی فون کر کے انہیں سچ بتا دو۔ مگر اس کے ساتھ ہی انہیں میری موت کی خبر بھی دے ...."

ارجمند نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ایسا آپ سوچئے بھی نہیں ...."

"میں نے کہا نا.... ! فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہے۔"

ارجمند چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر اس کے کندھے جھک گئے، جیسے اس نے شکست قبول کر لی ہو۔

"ٹھیک ہے آپی ! اب جو ہو سو ہو۔ اللہ ہم پر رحم کرے۔ ہمیں معاف فرمائے۔"

"میں تم سے معافی مانگتی ہوں میری بہن .... ! غلطی میری ہے۔ مگر اب پیچھے ہٹنا ممکن نہیں۔" نور بانو نے کہا۔

"اللہ سب جانتا ہے، تم نا سمجھ تھیں، جو کچھ ہوا میری ذمہ داری ہے۔"

ارجمند نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

"اب بس کریں آپی ....!" اور دل میں اس نے سوچا، قصوروار میں بھی ہوں۔ میری ناسمجھی اپنی جگہ، لیکن میں نے اپنے لالچ میں آپ کی بات مانی۔

"بس! آپ جلدی سے اچھی ہو جائیں۔"

❁ ❁ ❁

ارجمند خود کو بہت بوجھل محسوس کر رہی تھی۔ وہ بہت کثرت سے استغفار کرتی تھی۔ دوسری طرف وہ فکرمند بھی تھی اور خوفزدہ بھی۔ عبدالحق نے اسے بتایا تھا کہ ایک ہفتے بعد حمیدہ صفیہ کے ساتھ ایبٹ آباد آنے والی ہے۔ اب یہ بات وہ نور بانو کو کیسے بتائے؟ ابھی تو وہ بیماری سے سنبھلی بھی نہیں ہے۔ اور یہ تو اتنا بڑا دھماکا ہوگا کہ خدانخواستہ کچھ بھی ہو جائے۔

جس بھید کے کھلنے کے حوالے سے اس نے نور بانو کو سچ پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی، نور بانو نے تو اس کے بدلے موت کو گوارہ قرار دیا تھا۔ اب وہ اسے کیسے سمجھاتی کہ وہ بھید کھلنے ہی والا ہے، اور اسے روکنے کی کوئی صورت نہیں۔

ایک دن اور گزر گیا۔ زندگی ارجمند کو بوجھ لگنے لگی۔ وہ کیا کرے؟

پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ نور بانو پر کچھ بھی گزرے، لیکن اسے اس بارے میں بتانا ضروری ہے۔ اس نے پہلے بھی یہی سوچا تھا کہ نور بانو کچھ نہ کچھ کر لے گی۔ دادی اماں کو آنے سے روکنے کی کوئی ترکیب سوچ لے گی۔

یہ سوچ کر اس نے نور بانو کو یہ بات بتا ہی دی۔

نور بانو کا تو منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم ....؟"

"جی آپی ....! آغا جی نے مجھے بتایا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ بس دو تین دن میں ہی ....." نور بانو سے بات پوری نہیں کی گئی۔ وہ تو بری طرح بوکھلا گئی تھی۔ اس افتاد کو روکنے کی کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اور وہ جانتی تھی کہ حمیدہ کے آتے ہی کھیل ختم۔ عمر بھر کی ذلت اور رسوائی الگ۔

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

اسے دیکھ کر ارجمند کو بھی ہول اٹھنے لگے۔ اگر آپی کا یہ حال ہے تو پھر بچت کی کوئی صورت نہیں۔ اللہ ..... وہ آغا جی کو، دادی اماں کو ..... کیا منہ دکھائے گی؟ کیسا اس پر مان کرتی تھیں دادی اماں۔

نور بانو نے بھی سوچ لیا کہ اب تو زندگی یا موت۔ آفت سر پر کھڑی ہے۔ جو کیا جا سکتا ہے، کر لیا جائے۔ ذہن میں ایک ہی تدبیر آتی تھی۔ منت والی بات کو دہرایا جائے۔ بات اگرچہ بچکانہ لگے گی۔ لیکن اور کوئی چارہ ہے بھی نہیں۔

اور اس پر غور کیا تو اسے کامیابی کا خاصا امکان نظر آنے لگا۔ وہ جانتی تھی کہ حمیدہ کو پوتے کی کیسی آرزو ہے۔ اس کے لئے تو وہ پیروں فقیروں کے در پر حاضری دیتی پھری تھی۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ منت کی بات کو ضرور

اہمیت دے گی۔ بلکہ قوی امکان یہ ہے کہ یہ سننے کے بعد وہ کبھی بھی یہاں نہیں آئے گی۔

اس نے مزید غور کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ بات عبدالحق سے کرنے کی نہیں۔ بات براہِ راست حمیدہ سے کی جائے، اور اسے رازداری کا بھی کہا جائے۔ یوں عین ممکن ہے کہ عبدالحق کو اس بات کا پتا بھی نہ چلے۔

اس کا دل کہہ رہا تھا کہ بچت کی صورت نکل آئی ہے۔ اگر عبدالحق منت کی بات کے سامنے ہار سکتا ہے تو توہم پرست حمیدہ تو اس کے سامنے دم بھی نہیں مار سکے گی۔ اس نے مزید سوچا کہ وہ فون نہ کرنے کا حیلہ بھی اسی بات کو بنا لے گی۔ پرانی شکایت بھی رفع، نیا فساد بھی ختم!

اس کے چہرے پر سکون اور آنکھوں میں امید کی پھیلتی چمک دیکھ کر ارجمند کی بھی جان میں جان آئی۔

"کچھ سمجھ میں آ گیا آپی......!" اس نے پُرامید لہجے میں پوچھا۔

"ہاں گڑیا......! تم ذرا لاہور کا فون نمبر ملاؤ۔" نور بانو کے لہجے میں اعتماد تھا۔

"براہِ راست دادی اماں کو روکیں گی آپ .....؟"

"تم بس دیکھتی جاؤ......!"

ارجمند کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ نور بانو کیا کہے گی؟ اس نے نمبر ملاتے ہوئے سوچا، دیکھتے ہیں۔

لیکن کچھ دیکھنے اور سننے کا موقع نہیں ملا۔ لاہور میں فون پر نسیمہ سے بات ہوئی۔ اس نے کہا۔

"گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

"خیریت......؟"

"اماں کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ سب انہیں لے کر اسپتال گئے ہیں۔"

ارجمند نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر نور بانو کو یہ بات بتائی۔

نور بانو بڑے ظالمانہ انداز میں مسکرائی۔ ارجمند کو وہ مسکراہٹ ذرا بھی اچھی نہیں لگی۔ وہ خود دادی اماں کی بیماری کا سن کر دہل گئی تھی۔ جبکہ نور بانو کے لئے جیسے وہ کوئی خوش خبری تھی۔

''میری بات کراؤ نسیمہ سے......!'' نور بانو نے کہا۔

نور بانو نے نسیمہ سے کہا کہ وہ اس کے فون کے بارے میں سب کو بتا دے۔

''اور ہاں......! ایک بات دھیان سے سن نسیمہ......!'' پھر اس نے اچانک کہا۔

''اماں اگر یہاں ایبٹ آباد آنے کا ارادہ کریں تو ان سے کہنا کہ پہلے فون پر مجھ سے بات کر لیں۔''

''جی بہتر......!''

''یہ بات بھولنی نہیں ہے۔'' نور بانو نے تاکید کرتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔ پھر وہ ارجمند کی طرف مڑی۔

''لو......خواہ مخواہ گھبرا رہی تھیں تم......!'' اس نے کہا۔

ارجمند نے کچھ نہیں کہا۔ وہ حمیدہ کی طرف سے پریشان ہو رہی تھی۔ لیکن بات اس کے سامنے ہی ہوئی تھی۔ نور بانو نے نسیمہ سے حمیدہ کی بیماری کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

اس کا دل گھبرانے لگا۔ اس نے سوچا، کچھ دیر بعد وہ خود ہی فون کر لے گی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق کو وہ فون ریسیو کر کے حیرت ہوئی۔ زبیر نے اس سے پہلے خود اسے فون کبھی نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ تو فون پر بات کرتے ہوئے گھبرا جاتا تھا۔ اسے احساس ہو گیا کہ ضرور کوئی غیر معمولی بات ہے۔

''خیریت تو ہے بھائی......!''

''کوئی بڑی پریشانی کی بات نہیں ہے کاکا......!'' زبیر نے اسے تسلی دینے

کی کوشش کی۔ لیکن اس کی آواز سے گھبراہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔

''بس اماں کی طبیعت ذرا خراب ہو گئی ہے۔''

''کیا ہوا......؟'' عبدالحق نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''دو تین دن سے کچھ کھایا نہیں جا رہا تھا۔ پھر آج الٹیاں شروع ہو گئیں۔''

''ڈاکٹر کو دکھایا......؟''

''جی کاکا......! اس نے کہا کہ یرقان ہے۔ ہم انہیں اسپتال لے گئے۔ اب وہ وہیں ہیں۔''

''تم فکر نہ کرو بھائی......! میں کل پہنچ جاؤں گا۔''

''میں نے آپ کو پریشان کر دیا کاکا......!'' زبیر کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''ارے نہیں......! ایسی کوئی بات نہیں۔ بس اب آپ پریشان نہ ہوں۔''

ریسیور رکھنے کے بعد عبدالحق کو بے چینی ہونے لگی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسی وقت لاہور کے لئے روانہ ہو جائے۔ لیکن دفتر کے معاملات ویسے ہی پیچیدہ چل رہے تھے۔

وہ سوچتا اور الجھتا رہا۔ ملازمت کی اسے کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن وہ چچا جان کے خلوص کی توہین نہیں کر سکتا تھا۔ اور وہ ملازمت کی ذمہ داریوں کو بھی سمجھتا تھا۔ نہ سمجھتا ہوتا تو اسی وقت لاہور چلا جاتا۔ لیکن چھٹی لینا بھی ضروری تھا اور اسٹیشن چھوڑنے کی اجازت بھی ضروری تھی۔

دوسری طرف وہ یہ بھی جانتا تھا کہ چھٹی اسے نہیں ملے گی۔ اب ایسے میں وہ کیا کرے؟ یہ تو ممکن نہیں کہ اماں اتنی بیمار ہوں کہ اسپتال میں داخل ہونے کی نوبت آ جائے اور وہ بیٹھا نوکری کی فکر کرتا رہے۔ ایمرجنسی میں چھٹی اس کا حق ہے۔ نہیں دیا جاتا تو اس کے پاس فوری طور پر استعفیٰ دینے کا راستہ موجود ہے۔

یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو گیا۔ اس کے باوجود بہت دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔

اگلی صبح جو کچھ ہوا، وہ اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ چیف سکریٹری نے

اس کی درخواست پڑھنے کے بعد کہا۔

''میں تو منظوری نہیں دے سکتا عبدالحق صاحب......! مجھے منسٹر صاحب سے بات کرنی ہوگی۔''

''میں دفتری ضابطوں سے بخوبی آگاہ ہوں جناب......!'' عبدالحق نے نرم لہجے میں کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں ......! میری چھٹی منظور کرنا آپ ہی کی ذمہ داری ہے۔''

''وہ تو ہے۔ لیکن منسٹر صاحب نے آپ کے معاملے میں خاص طور پر......''

''آپ ان سے رابطہ کرلیں۔ میں ایک گھنٹے بعد آپ سے بات کروں گا۔''

بڑی مشکل سے عبدالحق نے وہ ایک گھنٹہ گزارا، اور پھر چیف سکریٹری کے کمرے میں پہنچ گیا۔

''ابھی تک تو میرا ان سے رابطہ نہیں ہو سکا ہے۔'' چیف سکریٹری نے اسے بتایا۔

''بس تو آپ خود میری چھٹی کی منظوری دے دیں۔''

''سوری عبدالحق صاحب......! یہ ممکن نہیں ہے۔''

''تو ٹھیک ہے......! میری درخواست مجھے واپس دے دیں۔''

چیف سکریٹری نے سکون کی سانس لی اور اس کی درخواست اس کی طرف بڑھا دی۔

عبدالحق نے درخواست پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دی۔ اور ایک اور کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔

چیف سکریٹری اس کے ردِعمل پر پہلے ہی پریشان تھا، گڑبڑا کر بولا۔

''یہ کیا ہے......؟''

''پڑھ لیں......!''

چیف سکریٹری نے پڑھا اور برا سا منہ بنا کر بولا۔

''استعفیٰ سے پہلے آپ کو پندرہ دن کا نوٹس دینا چاہئے۔''

''جی نہیں......! فوری استعفیٰ کا حق بھی مجھے حاصل ہے، اور میں اسے استعمال کر رہا ہوں۔''

''لیکن استعفیٰ کی منظوری......''

''یہ میرا دردِ سر نہیں......!'' عبدالحق نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''اب آپ جو چاہیں کریں، میں لاہور جا رہا ہوں۔''

''عجیب آدمی ہیں آپ......!''

''یہ ملازمت میری ضرورت نہیں ہے جناب......! میں تو کسی اور جذبے کے ساتھ اس طرف آیا تھا۔ یہ بات منسٹر صاحب کو بھی بتا دیجئے گا۔''

عبدالحق نے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔

✿ ✿ ✿

وہ لاہور پہنچا تو منظر بدل چکا تھا۔

حمیدہ اس کی توقع کے برعکس اسپتال میں نہیں تھی، بلکہ گھر پر ہی تھی۔ چچا جان اپنے گھر والوں سمیت وہاں موجود تھے۔ گھر کی رونق دیکھ کر چند لمحوں کے لئے تو وہ اپنی پریشانی بھول ہی گیا۔

لیکن حمیدہ کو دیکھ کر وہ پریشان ہوگیا۔ وہ بہت کمزور ہوگئی تھی۔ وہ بے بسی سے بستر پر لیٹی اسے دیکھتی رہی، پھر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔

عبدالحق اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''یہ کیا حال بنالیا ہے اماں ......!''

''ٹھیک ہوں ......! بس کمزوری بہت زیادہ ہے۔''

''انشاء اللہ ......! دور ہو جائے گی اماں......! غم نہ کرو۔''

''سوچا تھا، ایبٹ آباد جاؤں گی۔ پر اللہ کی مرضی نہیں تھی۔''

''چلی جانا اماں......! دل کیوں چھوٹا کرتی ہو......؟''

"مجھے تو لگتا ہے پتر.....! کہ اب کبھی اٹھ ہی نہیں سکوں گی۔" حمیدہ کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔

"کروٹ بدلنا بھی مشکل ہوگیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ میرا پوتے کا ارمان پورا کر رہا ہے۔ پر اس کی مرضی نہیں کہ میں وہاں بہو کے پاس جاؤں۔ میں نے تو تیاری کر لی تھی جانے کی....." اتنا کہہ کر وہ ہانپنے لگی۔

عبدالحق اس کا ہاتھ سہلاتا رہا۔

"کچھ مت بولو اماں.....! اتنی کمزوری ہے۔"

"کیسے چپ رہوں.....؟ اتنی شکایتیں ہیں تجھ سے....." حمیدہ سے بولا نہیں گیا۔

"مجھ سے شکایتیں.....؟" اس کے لہجے کی سنگینی نے عبدالحق کو دہلا دیا۔ پھر اس نے خود کو سنبھال کر خوش دلی سے کہا۔

"فکر نہ کرو اماں.....! میں یہیں ہوں تمہارے پاس.....! تمہاری طبیعت ٹھیک ہونے سے پہلے میں یہاں سے نہیں جانے والا۔ جی بھر کر شکایتیں کر لینا مجھ سے، جلدی کیا ہے.....؟"

حمیدہ کی آنکھیں مند گئیں۔ وہ غشی کی سی کیفیت تھی۔

عبدالحق تھوڑی دیر بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔

ان برسوں میں بڑی تبدیلیاں آئی تھیں۔ رضوانہ اور شابانہ کی شادی ہوگئی تھی۔ ماجد مسعود صاحب کا اکلوتا بیٹا تھا، اب اس کی بھی شادی ہوگئی تھی۔ مسعود صاحب نانا بھی بن گئے تھے اور دادا بھی۔

انہوں نے عبدالحق کو اپنی بہو سے ملوایا۔ بہت سادہ سی لڑکی تھی۔ وہ عبدالحق کو بہت اچھی لگی۔

تھوڑی دیر بعد وہاں عبدالحق کے ساتھ بس مسعود صاحب اور زبیر رہ گئے۔

"اماں کو اسپتال سے کیوں لے آئے بھائی.....!" عبدالحق نے پُرتشویش لہجے میں زبیر سے پوچھا۔

"اس کا مشورہ میں نے دیا تھا۔" مسعود صاحب نے جلدی سے کہا۔

"کیوں.....؟ تم پریشان کیوں ہو رہے ہو.....؟"

عبدالحق نے سکون کی گہری سانس لی۔

"اب میں مطمئن ہوگیا چچا جان.....!"

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم سے پوچھے بغیر....."

عبدالحق نے تیزی سے ان کی بات کاٹ دی۔

"یہ آپ کا حق اور اختیار ہے چچا جان.....!" پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے وضاحت کی۔

"اماں اتنی کمزور ہوگئی ہیں۔ مجھے ان کی حالت اچھی نہیں لگی۔ اور انہیں گھر میں دیکھ کر مجھے ڈر لگا کہ کہیں اسپتال والوں نے جواب دے کر انہیں ڈس چارج تو نہیں کر دیا۔"

"ایسی بات نہیں ہے میاں.....! یرقان میں تو کمزوری ہو ہی جاتی ہے۔" مسعود صاحب نے کہا۔

"مجھے اس کا تجربہ ہے کہ اسپتال میں ڈرپ لگانے کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ رضوانہ کو یرقان ہوا تھا تو میں نے حکیم یاسین صاحب سے علاج کروایا تھا اس کا۔ اور ایک صاحب ہیں یہاں گڑھی شاہو میں، وہ دم کرتے ہیں۔ کسی کا بخشا ہوا ہے۔ وہی میں نے اماں کے لئے سوچا۔"

"میں مطمئن ہوں چچا جان.....! بس مجھے ڈر بہت لگا ہے اماں کو دیکھ کر۔"

"انشاء اللہ! انہیں کچھ نہیں ہوگا میاں.....! دم کرنے والے صاحب روز یہاں آئیں گے۔ ایک ہفتے میں انشاء اللہ یرقان اتر جائے گا۔ اثرات رہ جائیں گے۔ وہ انشاء اللہ دواؤں سے زائل ہو جائیں گے۔ لیکن اس بیماری میں سب سے بڑی دوا مکمل آرام ہے میاں.....! یرقان کے مریض کے لئے تو ہلنا بھی مشقت ہوتا ہے۔"

یہ سب سن کر زبیر کی جان میں جان آئی۔ وہ تو اپنی جواب دہی سے ڈر رہا

تھا۔

''اور دفتر کی صورتِ حال کیا ہے......؟''

عبدالحق نے انہیں پوری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

''اوہ......! تم نے مجھے بتایا بھی نہیں......!''

''اب کیا ساری عمر آپ کی انگلی تھام کر چلتا رہوں؟ کوئی مسئلہ ہو تو ننھے بچوں کی طرح آپ کی طرف دیکھوں؟'' عبدالحق نے شرمندگی سے کہا۔

''یہ تو بڑی غیرت والی بات کی ہے تم نے......!'' مسعود صاحب نے شکایت کی۔

''آپ جانتے ہیں کہ یہ بات نہیں ہے۔''

مسعود صاحب مسکرا دیئے۔

''جانتا ہوں۔ ورنہ ناراض ہو جاتا تم سے۔ مگر استعفیٰ دیتے وقت تمہیں میرا خیال نہیں آیا......؟''

''میرے سامنے کوئی اور راستہ نہیں تھا چچا جان......!''

''خیر......! استعفیٰ تو تمہارا منظور نہیں ہوگا۔ البتہ وہ تمہیں فٹ بال بنا دیں گے۔''

''کیا مطلب......؟''

''او ایس ڈی......!'' مسعود صاحب نے مختصراً کہا۔ پھر بولے۔

''خیر......اب تم یہ مجھ پر چھوڑ دو۔''

عبدالحق کو کوئی ایسی پرواہ بھی نہیں تھی۔ اسے تو بس حمیدہ کی فکر تھی۔

✿ ✿ ✿

نور بانو کی طبیعت خاصی بہتر ہوگئی تھی۔ ارجمند لاہور فون کرنا چاہتی تھی مگر جھجک رہی تھی۔ خود اسے تو بہت شرمندگی تھی۔ پانچ مہینے ہوگئے، اور اس نے حمیدہ کو فون بھی نہیں کیا۔ نور بانو نے دانستہ فون نہیں کیا تھا۔ وہ ڈرتی تھی کہ رابطہ ہوگا تو پول کھل جانے کا کوئی خطرہ ضرور سر اٹھائے گا۔

ارجمند سوچتی کہ آپی کی آپی جانیں۔ لیکن اس سے کسی نے اس سلسلے میں

سوال کر لیا تو شرمندگی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ اور یہ بھی سچ تھا کہ وہ دادی اماں کی کمی بڑی شدت سے محسوس کرتی تھی۔

اور اب تو دادی اماں بیمار ہیں......ایسی بیمار کہ اسپتال میں ہیں۔ تو کیا وہ ان کی خیریت معلوم کرنے کے لئے بھی فون نہیں کر سکتی۔

تیسرے دن اس کی برداشت جواب دے گئی۔

''آپی......! مجھے لاہور فون کرنا ہے۔'' اس نے کہا۔

''کوئی ضرورت نہیں......!'' نور بانو نے صاف جواب دے دیا۔

''دادی اماں بیمار ہیں آپی......!''

''اور یہ ہمارے حق میں بہتر ہی ہے۔''

میرے حق میں تو ہرگز بہتر نہیں ہے۔ ارجمند نے دل میں کہا۔

''سوئے ہوئے شیر کو جگانا حماقت ہوتی ہے۔'' نور بانو نے بات مکمل کی۔

ارجمند کو احساس ہوگیا تھا کہ اب تک نور بانو کی ہر بات مان کر اس نے غلطی کی ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اسے ایسا نہیں کرنا۔

''آپ بات کو صرف ایک رخ سے دیکھ رہی ہیں آپی......!'' اس کے لہجے میں نرمی بھی تھی اور قطعیت بھی۔

''ذرا دوسرے رخ سے بھی تو دیکھیں، پانچ مہینے ہوگئے، ہم نے دادی اماں سے ایک بار بھی بات نہیں کی۔ یہ تو غیر فطری ہے۔ ہم نے ایبٹ آباد آنے سے پہلے انہیں رسماً اطلاع بھی نہیں دی۔ حالانکہ ہمیں ان سے اجازت لینی چاہئے تھی۔ ہم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ایسے غیر فطری روّیے پر غور کیا جائے تو شبہات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔''

اس پر نور بانو کے کان کھڑے ہوئے۔

''یہ کیسی بات کر رہی ہو تم......!''

''آپ خود سوچیں، اگر آپ دادی اماں سے یہاں آنے کی اجازت مانگتیں تو منع تو نہیں کرتیں آپ کو......''

''مجھے تو یقین ہے کہ وہ منع کر دیتیں۔''

"چلیں...... مان لیا۔ مگر پانچ مہینے میں ایک بار بھی فون نہ کرنا...... آپ خو سوچیں۔"

اس بات کا نور بانو کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"اوراب وہ بیمار ہیں۔ ایسے میں فون نہ کرنا......"

"ٹھیک ہے......! لیکن سوچ لو، کوئی بات بگڑی تو سنبھال سکو گی......؟"

"آپ فکر نہ کریں۔ یہ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

مگر لاہور میں رابطہ ملتے ہی عبدالحق کی آواز سنائی دی تو ارجمند حیران رہ گئی۔ وہ حیرانی ایک لمحے کی تھی۔ پھر اس نے سوچا کہ عبدالحق کی وہاں موجودگی تو فطری ہے۔

"آپ کیسے ہیں آغا جی......!" اس نے سلام کے بعد کہا۔

یہ سن کر نور بانو چونکی۔ ارجمند نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا کہا۔

"ٹھیک ہوں، الحمد للہ......!" دوسری طرف سے عبدالحق نے کہا۔

"تم کیسی ہو......؟ نور بانو کا کیا حال ہے......؟"

"اللہ کا شکر ہے۔ بس آج کل آپی کی طبیعت ذرا گری گری رہتی ہے۔ لیکن اس وقت تو میں نے دادی اماں کے لئے فون کیا ہے۔ ان کی طبیعت کیسی ہے آغا جی......!"

عبدالحق کو حیرت ہوئی کہ اسے اماں کی بیماری کا کیسے پتا چلا......؟ اور خود اسے شرمندگی ہوئی کہ اماں کی پریشانی میں اسے ایبٹ آباد فون کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ اماں بیمار ہیں......؟" اس نے پوچھا۔

"آپی نے تین چار دن پہلے فون کیا تھا نا......! تو سب لوگ اماں کو لے کر اسپتال گئے ہوئے تھے۔ نسیمہ سے بات ہوئی تھی آپی کی۔ اب نسیمہ تفصیل سے تو بتا نہیں سکی۔ بس یہ اندازہ ہوگیا کہ دادی اماں کی طبیعت زیادہ ہی خراب ہے، تب سے پریشانی ہے ہمیں۔ آپی کی طبیعت بھی اور خراب ہوگئی۔"

"اور تب سے تمہیں آج خیال ہے اماں کا......؟" عبدالحق کے لہجے میں طنز بھی تھا اور شکایت بھی۔

جواب دیتی تو جھوٹ بولنا پڑتا۔ ادھر نور بانو اسے گھور رہی تھی۔ ارجمند نے دوسری ترکیب نکالی۔

"بدگمانی نہیں کرتے آغا جی......! بہت بری بات ہے۔" اس نے بہت شیریں لہجے میں کہا۔

لیکن عبدالحق مطمئن نہیں ہوا۔

"میں معذرت کرلوں گا۔ مگر پہلے مجھے وجہ تو بتا دو۔"

"میں نے آپ کو بتایا نا کہ آپی کی طبیعت خراب ہے۔ آج ذرا بہتر ہوئی ہے۔ دوسرے ہمیں یہ خیال بھی تھا کہ بات دادی اماں سے ہی ہو تو بہتر ہے۔ چاچا اور چاچی تو فون پر بات کرتے ہوئے عجیب سے ہو جاتے ہیں۔"

یہ بات عبدالحق کو معقول لگی۔ اس کا تجربہ تو اسے بھی تھا۔

"اب دادی اماں کے بارے میں تو بتا دیں......!"

"اماں کو یرقان ہوگیا ہے۔ اتنی کمزور ہوگئی ہیں کہ خود سے اٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتیں۔"

"اللہ......!" ارجمند وحشت زدہ ہوگئی۔

"علاج ہو رہا ہے...... روحانی بھی اور حکیم کا بھی۔ اب پہلے سے کافی بہتر ہیں۔ یرقان سمجھو، آدھا اتر چکا ہے۔ لیکن حکیم صاحب کا کہنا ہے کہ کمزوری دور ہونے میں بہت وقت لگے گا۔ اس بیماری میں دوا سے زیادہ آرام کام کرتا ہے۔"

ارجمند سچ مچ تڑپ گئی تھی حمیدہ کے لئے۔ اس نے کہا۔

"اب تشویش کی تو کوئی بات نہیں ہے نا آغا جی......!"

"الحمد للہ......! حکیم صاحب مطمئن ہیں۔ وہ کہتے ہیں، دوا، پرہیز اور آرام...... تینوں کا خیال رکھا جائے تو انشاء اللہ بہت جلد اماں اٹھ کھڑی ہوں گی۔"

"بات تو نہیں ہوسکتی اماں سے......؟" ارجمند کے لہجے میں تڑپ تھی۔

"نہیں ارجی......!"

''بہرحال آپ نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اب میں آپ کو اس پر انعام دوں گی۔'' ارجمند کو احساس تھا کہ نور بانو اسے گھور رہی ہے۔

''اتنی دور سے انعام......؟'' عبدالحق نے شوخ لہجے میں کہا۔

ارجمند نے اپنے فطری ردِعمل پر قابو پانے کی کوشش کی۔ لیکن چہرہ پھر بھی گلابی ہو گیا۔

''جی......! آپ کا انعام یہ ہے کہ اب آپ آپی سے بات کر سکیں گے۔ ورنہ میں ہرگز نہ کراتی بات......!'' یہ کہہ کر اس نے ریسیور نور بانو کی طرف بڑھا دیا۔

نور بانو کے چہرے پر کھنچاؤ تھا۔ تاہم اس نے ریسیور لے لیا۔

''کیسے ہیں آپ......؟'' اس نے لہجے میں نقاہت سموتے ہوئے کہا۔

''میں تو ٹھیک ہوں۔ لیکن تمہاری آواز سے تو بہت کمزوری ظاہر ہو رہی ہے۔'' عبدالحق کے لہجے میں تشویش تھی۔

''اب تو بہت بہتر ہو گئی ہوں۔ ایک ہفتہ پہلے تو بولنا بھی ممکن نہیں تھا میرے لئے۔''

ارجمند حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اگر نسیمہ سے فون پر نور بانو کی آواز میں پوچھا جاتا تو وہ بتاتی کہ اس کی آواز میں کیسی سختی اور لہجے میں کیسا تحکم تھا۔

''مجھے تو یہ آواز سن کر بھی پریشانی ہو گئی ہے تمہاری طرف سے۔''

''اب آنے کا ارادہ نہ کر لیجئے گا، خدا کے لئے......!'' نور بانو کی آواز اور کمزور ہو گئی۔

دوسری طرف سے عبدالحق کی سرد آہ سنائی دی۔ پھر اس نے پوچھا۔

''ہوا کیا تھا......؟''

''وہی جو ہوتا ہے ایسے میں...... پر آپ کہاں سمجھ سکتے ہیں......؟''

پانچ منٹ ہو گئے، اور صرف نور بانو کے بارے میں بات ہوتی رہی۔

ارجمند سوچ رہی تھی، کچھ ہنر تو ہے آپی کے پاس۔ دادی اماں کی عیادت تو رکھی رہ گئی۔

نور بانو کو حمیدہ کے بارے میں جاننے کی ضرورت نہ ہوتی تو شاید اس کا تذکرہ ہی نہ آتا۔ لیکن بالآخر نور بانو نے خود ہی پوچھ لیا۔

''اماں کا کیا حال ہے......؟''

''بہتر ہے......! البتہ کمزور بہت ہو گئی ہیں۔''

''اور وہ یہاں جو آنے والی تھیں......؟''

''اسے تو بھول ہی جاؤ۔ حکیم صاحب نے مسلسل چھ ماہ آرام کے لئے کہا ہے...... سختی سے۔''

''خدا کا شکر ہے......!'' نور بانو کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''کیا مطلب......؟''

''وہ آرام کہاں کرتی ہیں......؟''

''مگر اب تو آرام کرنا پڑے گا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ خود بھی ڈر گئی ہیں۔''

''وہ نہیں ڈرنے والی۔ کچھ عجب نہیں کہ اگلے مہینے ہی یہاں کے لئے نکل کھڑی ہوں۔'' نور بانو نے عبدالحق کو چڑھانے کے لئے کہا۔

''نہیں بھئی......! سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ان کے لئے اپنے کمرے میں چلنا پھرنا ممکن نہیں، اتنے طویل سفر کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے......؟''

''بہرحال سختی سے خیال رکھئے گا اس بات کا۔ یرقان بگڑ جائے تو......''

''اللہ نہ کرے......! کیسی بات کرتی ہو......؟''

''اماں کی بھلائی کے لئے کہہ رہی ہوں۔ میں وہاں ہوتی تو خود خیال رکھتی۔ اور آپ بھی کون سا وہاں رہیں گے تمام وقت۔ کچھ الٹا سیدھا سوچیں تو کون روکنے والا ہے انہیں......؟''

''تم فکر نہ کرو۔ میں سب بندوبست کر کے جاؤں گا یہاں سے۔''

نور بانو نے ریسیور رکھا تو وہ پوری طرح مطمئن تھی۔ ریسیور رکھ کر وہ ارجمند کی طرف پلٹی۔

''چلو...... بلا ٹلی......!'' اس نے خوش ہو کر کہا۔

ارجمند کو حمیدہ کے بارے میں ایسی سخت باتیں سن کر بہت تکلیف ہوتی تھی۔ وہ نوربانو سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن اس وقت اس سے رہا نہیں گیا۔

''آپ دادی اماں کے بارے میں ایسی باتیں نہ کیا کریں آپی......!'' اس نے کہا۔

''آپ جانتی ہی نہیں کہ وہ آپ سے کتنی محبت کرتی ہیں۔''

''مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے......؟'' نوربانو نے طنزاً کہا۔

''وہ آپ کے لئے ساس نہیں، ماں ہیں۔''

''رہنے دو یہ باتیں......!'' نوربانو نے چڑ کر کہا۔

''اگر میں نے خود عبدالحق صاحب سے تمہاری شادی نہ کرائی ہوتی تو یہ بھرم بھی کھل جاتا۔''

ارجمند بھوں چکی رہ گئی۔

''کیا مطلب آپی......!'' اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

''وہ تو پہلے ہی سے ان کی دوسری شادی کرانے کے چکر میں تھیں اولاد کی خاطر......!''

''تو دوسری شادی کوئی گناہ تو نہیں ہے آپی......! بلکہ تیسری اور چوتھی بھی...... اللہ نے اجازت دی ہے اس کی۔''

''بے شک دی ہے۔ لیکن میں نے علم دین رکھنے والی عورتوں کو بھی شوہر کی دوسری شادی پر طوفان اٹھاتے دیکھا ہے۔ یہ عورت کی کمزوری ہے۔ بڑی بڑی باتیں کروالو دین کی، قرآن حدیث سناڈالیں گی فرفر...... لیکن شوہر کی دوسری شادی کی بات آجائے تو سب کچھ بھول جاتی ہیں۔ اللہ بھی یاد نہیں رہتا۔''

''بدبختی اور جہالت ہے ان کی۔'' ارجمند نے نیچی آواز میں کہا۔

''اللہ کے حکم کے سامنے کیا چون و چرا......؟ یہ سب کچھ ہندوؤں کے ساتھ میل جول کا نتیجہ ہے۔ انہی سے یہ سب کچھ سیکھا ہے ہم نے...... اور یہ بہت برا ہے آپی......!''

نوربانو اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

''یہ بتاؤ......! وہ اگر تم سے ایک اور شادی کی اجازت مانگیں تو تم کیا کرو گی......؟''

''میں بہت سخت برا مانوں گی۔'' ارجمند نے بے ساختہ کہا۔

''دیکھا......! آخر ہونا عورت......!'' نوربانو نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں اس بات پر برا مانوں گی کہ جس چیز کی انہیں اللہ نے اجازت دی ہے، وہ اس کے لئے مجھ سے اجازت کیوں مانگ رہے ہیں......؟ یہ تو بہت بری بات ہوگی۔''

''کچھ بھی ہو بھئی......! میں تو ایسی ہی ہوں، عام سی عورت...... میں تو کبھی اجازت نہ دوں۔ اسی لئے تو کراچی جا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ تو اس منحوس پیٹ کے درد نے مجھے مجبور کر دیا، ورنہ......''

اب ارجمند اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ شاید عقدے کھلنے کا دن تھا۔

''تو اس درد کی وجہ سے آپ لاہور واپس آئیں......؟''

''تو اور کیا......؟ لیکن مجھے معلوم تھا کہ بڑی بی فوراً ہی ان کی دوسری شادی کے چکر میں پڑ جائیں گی۔ میں نے سوچا، موقع ہی کیوں دوں......؟ سارے معاملات اپنے ہاتھ میں ہی نہ لے لوں۔''

''تو آپ کو میرا خیال کیسے آیا......؟''

''تو اور کس کا خیال آتا......؟ اور تھا کون تمہارے سوا......؟ تم میرے لئے بہن تھیں۔ اگر مجھے عبدالحق صاحب میں کسی کا حصہ لگانا ہی تھا تو میں تمہارے سوا کسی اور کو تو ان کا سایہ بھی نہیں دے سکتی تھی۔ ایک تم ہی تو تھیں ارجی......! سو میں نے اپنی سب سے قیمتی چیز میں تمہیں حصہ دار بنا لیا۔''

ارجمند کئی لمحوں تک خاموش رہی۔ لگتا تھا، اب کچھ نہیں بولے گی۔

نوربانو نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کا بے حد واضح تاثر تھا۔

"تم چپ کیوں ہوگئیں ارجی......؟"

"کبھی چپ رہنا ہی بہتر ہوتا ہے آپی......!" ارجمند نے آہستہ سے کہا۔

"میری کوئی بات بری لگی ہے تمہیں......؟"

"رہنے دیں آپی......!"

"نہیں......! مجھے بتاؤ......! تمہیں میری قسم......!"

"آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔ اور یہ بات مجھے اچھی نہیں لگے گی۔"

"مجھے برا نہیں لگے گا...... وعدہ رہا...... اور دیکھو، میں نے تمہیں اپنی قسم دی ہے۔"

ارجمند اس کے اصرار کے باوجود جھجک رہی تھی۔ پھر بالآخر اس نے گہری سانس لی۔

"ٹھیک ہے آپی......! میں بتاتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"چیزوں اور انسانوں میں بہت فرق ہوتا ہے آپی......! کوئی انسان کسی انسان کی ملکیت نہیں ہوتا۔ بلکہ میں تو سمجھتی ہوں کہ کوئی جاندار بھی کسی کی ملکیت نہیں ہوتا۔ پالتو جانور بھی نہیں۔ بلی صرف اپنے مالک تک محدود نہیں رہتی۔ جو کوئی بھی ذرا سا التفات دکھائے، اس کے سامنے خرخراتی ہے، اس سے پیار کرانے کی کوشش کرتی ہے۔ کتا سب سے بڑھ کر اپنے مالک کا وفادار ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے لوگوں کو بھی دوست بناتا ہے۔ اپنے مالک کے دوستوں سے بھی محبت کرتا ہے۔ جبکہ انسان کو تو اللہ نے اپنا خلیفہ بنایا ہے، تو کوئی بات تو ہے اس میں۔ اس میں ہمہ گیری ہے، وسعت ہے۔ اللہ نے اسے محدود ہونے کے لئے نہیں بنایا۔ صرف اپنی متعین کی ہوئی حدود کا پابند ہونے کا حکم دیا ہے اسے۔ پوری کائنات مسخر کر دی ہے اس کے لئے۔ یہ ایک غلام کا منصب تو نہیں۔ ایک غلام کیا کسی کو مسخر کرے گا۔ انسان کوئی رومال تو نہیں کہ کوئی کہے، یہ میرا رومال ہے، میں یہ کسی کو نہیں دوں گا۔ اور مرد تو آزاد طبع ہی اچھا لگتا ہے آپی......! بس وہ اللہ کا غلام ہو۔ اور سوچیں، اللہ نے اسے کتنے رشتے، کتنے تعلق عطا فرمائیں ہیں...... بیک وقت......! وہ والدین کا بیٹا ہے، بہن بھائیوں کا بھائی ہے، بیوی کا شوہر ہے، پھر ماں باپ کی طرف سے ملنے

والے رشتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوست احباب ہیں، دنیاوی تعلقات ہیں۔ کئی کئی دوست ہوتے ہیں اس کے۔ سب سے تعلق مختلف ہوتا ہے اس کا۔ ساری محبتیں الگ الگ ہوتی ہیں، برابر نہیں ہوتیں، ایک جیسی نہیں ہوتیں، اور اللہ کی شان دیکھیں کہ اتنے تعلقات، محبتوں اور رشتوں میں بھی وہ تقسیم نہیں ہوتا۔ ایک سالم اکائی ہی رہتا ہے۔ وہ کوئی بتاشوں کا ڈھیر نہیں ہوتا کہ کسی کی ملکیت ہو، اور جس کی ملکیت ہو، وہ جہاں جی چاہے، اسے مٹھی مٹھی بھر بانٹ دے اور جہاں چاہے، کہہ دے کہ نہیں اسے تو میں ایک بتاشہ بھی نہ دوں۔"

نور بانو حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کبھی ارجمند کو اتنا بولتے نہیں سنا تھا۔

ارجمند نے اپنی بات جاری رکھی۔

"تو آپی......! مرد کو بانٹا نہیں جاتا۔ وہ تو خود بانٹنے والا ہوتا ہے۔ اللہ نے اسے صرف چار شادیوں کی اجازت نہیں دی، ایک وقت میں چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی ہے۔ اسے انصاف کے ساتھ ان کے حقوق ادا کرنے کا، ان کے ساتھ برابری کا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ آپ سوچیں تو یہ اس کی آزمائش ہے، اور اس کے لئے وہ اللہ کے سامنے جواب دہ ہے۔ ہم جسے عیش سمجھتے ہیں، وہ دراصل اس کے لئے بہت بڑی آزمائش ہے۔"

"تو وہ اس میں پورا کب اترتا ہے؟ پورا اتر ہی نہیں سکتا۔" نور بانو نے پرخیال لہجے میں کہا۔

"ماں اپنی اولاد تک کو برابر کی محبت نہیں دے سکتی۔ مرد بیویوں کے درمیان کیا انصاف کرے گا؟"

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں آپی......! یہ انصاف ظاہر ہے۔ دنیاوی چیزوں اور آسائشات میں اس کا خیال رکھنا ہے۔ مکان ہے، کپڑے ہیں، کھانا پینا ہے، وقت کی تقسیم ہے۔ کسی سے یہ ظاہر نہ ہو کہ ایک کو دوسری پر فوقیت دی جا رہی ہے۔ اس محبت تو دل میں ہوتی ہے۔ ہاں......! یہ ضروری ہے کہ آدمی حتی الامکان اسے ظاہر نہ ہونے دے۔ کسی کو شکایت نہ ہو۔ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ ایسی حکمت سے کام

لے کہ ہر بیوی یہی سمجھے کہ وہ سب سے بڑھ کر اس سے محبت کرتا ہے۔ یوں کوئی بیوی خواہ یہ سمجھتی رہے، لیکن کبھی اسے ظاہر نہیں کرے گی۔ یوں سب خوش اور مطمئن رہیں گی، اور ہر طرف امن رہے گا۔''

''تمہیں اتنا بولنا آتا ہے ارجی ...!'' نور بانو نے حیرت سے کہا۔

''اور تم اتنا کچھ جانتی اور سمجھتی ہو، کیسے ...؟''

''میں قرآن پڑھتی ہوں اور اس پر غور کرتی ہوں آپی ! اور میں ہر بات پر سوچتی ہوں۔ آدمی تو سوچنے والا جانور ہے نا آپی !''

''مگر ارجی ...! محبت چھپائی کہاں جاتی ہے؟ وہ تو ظاہر ہو کر رہتی ہے اور ظاہر ہوگی تو شکایت بھی ہوگی۔''

ارجمند نے ایک گہری سانس لی۔

''دیکھیں آپی ...! مجھے معلو ہے کہ آغا جی آپ سے بہت محبت کرتے ہیں بہت زیادہ...... اور مجھ سے تو وہ محبت ہی نہیں کرتے۔ لیکن مجھے کوئی شکایت نہیں ان سے۔''

نور بانو نے بہت غور سے اسے دیکھا۔

''شاید اس لئے کہ تم ان سے محبت نہیں کرتیں۔''

''نہیں آپی ! شوہر سے محبت کرنا بیوی کا فرض ہوتا ہے۔ اور میں بھی آغا جی سے محبت کرتی ہوں۔'' یہ کہتے کہتے ارجمند کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''شوہروں سے محبت وہ عورتیں شاید نہیں کر پاتی ہوں گی، جن کی شادی ان کی مرضی کے خلاف زبردستی کی گئی ہو۔ اللہ معاف کرنے والا ہے۔''

''تو تم نے بھی تو محض میری وجہ سے ان سے شادی کی ہے۔'' نور بانو نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

ارجمند جانتی تھی کہ اس گفتگو میں یہ مرحلہ بھی آئے گا اور وہ اس کے لئے تیار تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''مجھے جھوٹ بولنا بہت ناپسند ہے آپی .....! یہ سچ ہے کہ اس شادی کا سبب آپ ہیں۔ لیکن بات صرف اتنی سی نہیں۔ اگر آغا جی اچھے انسان نہ ہوتے،

اگر میں انہیں ناپسند کرتی ہوتی تو میں اس شادی سے صاف انکار کر دیتی۔ ازدواجی زندگی کی بنیاد جھوٹ پر نہیں رکھی جاتی۔ آپ اپنے اوپر یہ بوجھ کبھی نہیں رکھئے گا کہ میرا آپ پر کوئی احسان ہے۔'' یہ کہہ کر جیسے وہ ہلکی ہوگئی۔

نور بانو کی رنگت ایک لمحے کو متغیر ہوگئی۔ کیا یہ اظہارِ محبت ہے؟ اس نے سوچا۔ لیکن فوراً ہی اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ بے شک ارجمند اعلیٰ ظرف ہے۔ کس خوب صورتی سے اس نے مجھے اپنے احسان سے آزاد کر دیا ہے۔

اب وہ ارجمند کو نئی روشنی میں دیکھ رہی تھی۔ یہ کم عمر لڑکی کتنی سمجھدار اور نیک ہے۔ اس کے سامنے اسے اپنا وجود بہت چھوٹا، بہت حقیر لگنے لگا۔ یہ زندگی کے، ہر چیز کے بارے میں سوچتی ہے، غور کرتی ہے، اس کے اپنے نظریات ہیں۔ یہ بولتی کم ہے، اور جب بولتی ہے تو بہت سوچ سمجھ کر، تول کر بولتی ہے، ایسے کہ اس کی بات رد کرنا آسان نہیں ہوتا۔

اپنی غلطیوں، اپنی خامیوں، اپنی کمزوریوں سے وہ ناواقف نہیں تھی۔ لیکن ارجمند کی باتوں نے اس کے دل پر اثر کیا تھا۔ پہلی بار... زندگی میں پہلی بار وہ ان کا دفاع کرنے، ان کے لئے جواز گھڑنے کے بجائے ان پر شرمندہ ہو رہی تھی۔ اس نے دینی تعلیم حاصل کی تھی۔ قرآن کے علاوہ حدیث بھی پڑھتی رہی تھی۔ یہ سب باتیں وہ جانتی تھی۔ لیکن اس کا عمل عام، جاہل عورتوں کا سا تھا۔ عملی زندگی میں وہ سارا دین بھول گئی تھی اور کیوں نہ بھولتی؟ وہ قرآن سے دور ہوگئی تھی۔ نماز بھی بھول بیٹھی تھی۔ جبکہ ارجمند نے وہ سب کچھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اس کے نتیجے میں اس کے برعکس وہ کتنی خوش، پرسکون اور مطمئن تھی۔ محبت میں وہ صرف دینے کی قائل تھی۔ مانگتی کچھ تھی ہی نہیں۔ بے طلبی بڑی چیز ہے۔ آدمی بے طلب ہو تو بے چینی اور اضطراب، دکھ اور پریشانی اور کوئی خوف اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ یہ بات اب اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

وہ سوچتی رہی۔ ارجمند نے اس کے کہنے پر شادی کی۔ اسے وہ کچھ دینے کا وعدہ کیا، جو کوئی عورت کسی کو نہیں دے سکتی۔ اور اس نے عبدالحق کو اس سے دور کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ حالانکہ وہ کم عمر بھی ہے اور بہت حسین بھی، چاہتی تو

ایسا کر سکتی تھی، اور اس میں کامیاب بھی ہو سکتی تھی۔

اور خود اس کا عمل کیا ہے؟ اس نے اپنی غرض کے لئے اسے استعمال کیا اور تنگ نظری کا اس کی یہ عالم ہے کہ اس کا بس چلے تو وہ اسے عبدالحق سے فون پر بات بھی نہ کرنے دے۔

اس نے نظر اٹھا کر ارجمند کو دیکھا۔

''تم بہت اچھی ہو ارجی ...! تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں سچ مچ بہت بری ہوں۔''

''ایسا نہ کہیں آپی ...!'' ارجمند نے تڑپ کر کہا۔

''خدا گواہ کہ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔''

''میں جانتی ہوں۔تم نے یہ نہیں کہا، مگر یہ سچ ہے۔ میں اب خود کو بدلوں گی۔تم اور بتاؤ مجھے۔ مجھ سے باتیں کرو۔ مجھے فائدہ ہوگا اس سے۔''

''میں کیا کہوں ...؟ اتنا تو میں کبھی بولتی بھی نہیں۔''

نور بانو سمجھ گئی کہ تسلسل ٹوٹ چکا ہے۔ ارجمند بے ساختہ بول رہی تھی ..... ارادے سے، سوچ سمجھ کر نہیں۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کہے؟ لیکن وہ اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے ذہن میں بہت سی ایسی باتیں تھیں، جو وہ کسی سے بھی نہیں کر سکتی تھی۔ خود سوچ کر اسے احساسِ گناہ ہوتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ ایسے سوچ کر وہ خود کو اللہ کی رحمت سے دور کر رہی ہے۔ لیکن سوچوں پر بھلا کس کا اختیار ہے؟

اب اس نے سوچا کہ وہ ارجمند سے یہ باتیں کر سکتی ہے۔

''کچھ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں ارجی ...!'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''تو ان پر کسی سے بات کرنی چاہئے۔''

''کسی سے وہ باتیں کروں تو وہ مجھے بہت برا سمجھے گا۔''

''میں آپ کو کبھی برا نہیں سمجھوں گی آپی.....!'' ارجمند نے بے حد خلوص سے کہا۔

''ایسے یقین سے نہ کہو ارجی ...! ان باتوں پر تو مجھ پر کفر کا حکم بھی لگ سکتا ہے۔''

ارجمند جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔

''کیسی باتیں کرتی ہیں آپی ...!''

''ڈر گئیں نا ...!''

''نہیں آپی ...! یہ بات نہیں .....! ایسی باتیں ہیں تو آپ کو اللہ سے رجوع کرنا چاہئے۔''

نور بانو نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔

''یعنی تم یہی کہہ رہی ہو نا کہ تم ایسی باتیں نہیں سننا چاہو گی۔''

''آپ نے مجھے بات پوری نہیں کرنے دی۔ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ اس کے بعد آپ کو اپنے کسی خیر خواہ سے وہ باتیں کرنی چاہئیں۔ اللہ بندے کے رجوع کرنے پر خوش ہوتا ہے۔ وہ اس خیر خواہ کے ذریعے وہ خرابی دور کر دے گا۔''

''مگر مجھے یہ ڈر ہے کہ وہ باتیں سن کر تم ہی مجھ سے دور ہو جاؤ گی۔''

''انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔ آپ مجھ سے بات کریں۔''

نور بانو کچھ دیر سوچتی رہی۔

''یہ بہت پہلے سے ہے۔'' بالآخر اس نے کہا۔

''تم نے میری بہنوں کو نہیں دیکھا۔ وہ اتنی خوب صورت تھیں کہ میں بتا نہیں سکتی۔ اور وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ لیکن میں ان سے جلتی تھی، حسد کرتی تھی۔''

''یہ تو فطری بات ہے آپی ...! لیکن آدمی ایسی سوچوں سے لڑتا ہے اور اللہ کی مدد سے جیت بھی جاتا ہے۔ مگر ایک بات بڑی سچائی کے ساتھ بتاؤں ...! آپ مجھے بہت خوب صورت لگتی ہیں۔''

''لگنے اور ہونے میں بڑا فرق ہے ارجی ...! میں جانتی تھی اور جانتی ہوں کہ میری بہت واجبی سی شکل وصورت ہے۔ بہنوں کی غیر معمولی خوب صورتی نے اس احساس کو بڑھا دیا تھا۔ کچھ لوگوں کی باتیں بھی اثر دکھاتی تھیں۔ لوگ اکثر

امی سے کہتے..... آپ کی یہ بیٹی کس پر پڑ گئی؟ اور امی مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ لیکن میں نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ وہ مجھ پر ترس کھاتی ہیں۔''

''یہ تو بدگمانی ہے آپی.....! اور آپ اب بھی بدگمانی بہت کرتی ہیں۔''

''جانتی ہوں، پر فطرت کا کیا کروں.....؟'' نوربانو نے کہا۔

''اب آگے بات کرتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔''

''آپ بالکل نہ ڈریں آپی.....! میں آپ سے محبت کرتی ہوں، بہن ہی ہوں آپ کی۔''

نوربانو اب بھی جھجک رہی تھی۔

''بے فکر ہو کر بات کریں..... اللہ کی طرف سے بہتری آئے گی انشاء اللہ.....!''

نوربانو نے ایک گہری سانس لی اور پھر جیسے پھٹ پڑی۔

''مجھے اللہ سے بھی گلہ تھا۔ اللہ نے اگر مجھے کسی ایسے گھر میں پیدا کیا ہوتا، جہاں بہنیں مجھ جیسی ہی ہوتیں تو شاید میں ایسی نہ ہوتی۔ مجھے اللہ سے ہمیشہ گلہ رہا کہ اس نے میرے ساتھ بے انصافی کی ہے۔'' وہ کہتے کہتے رکی اور اس نے ارجمند کو بہت غور سے دیکھا۔

''اتنی خوب صورت بہنوں کے ہوتے ہوئے یہ بے انصافی کا احساس تو فطری تھا نا.....!'' پھر اس نے جلدی سے کہا۔

''نہیں آپی.....! اللہ کے حکم کے خلاف کوئی بات فطری نہیں ہو سکتی، خواہ وہ انسان کی فطرت میں ہی کیوں نہ ہو.....؟ جو آپ سوچتی رہیں، وہ بہت بری بات تھی۔ اللہ سے کسی بری چیز کو نسبت دینا..... توبہ توبہ.....! دیکھیں نا.....! اللہ کے ناموں میں سے العدل ہے۔ اللہ نے پوری کائنات کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا ہے، میزان قائم فرمائی ہے۔ یہ تو آپی.....! ایمان کے خلاف ہے۔''

''اب دیکھو نا.....! تم ناراض ہو رہی ہو نا.....! دور بھی ہو جاؤ گی۔'' نوربانو نے فریاد کی۔ وہ اس وقت جیسے چھوٹی سی بچی بن گئی تھی۔

''نہ میں ناراض ہو رہی ہوں نہ دور.....!'' ارجمند نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔

''میں تو آپ کو سمجھا رہی ہوں کہ اس پر آپ کو توبہ کرنی چاہئے۔ اور اللہ سے رجوع کرنا چاہئے۔''

''اب بے اختیار سوچ کا آدمی کیا کر سکتا ہے.....؟''

''سوچ کی جانچ پڑتال ضروری ہے۔ سوچ ہی تو عمل کی راہ ہموار کرتی ہے۔ سوچ غلط ہوگی تو آدمی کو برے عمل کی طرف لے جائے گی۔ آدمی کو اپنے ہر خیال کی طرف سے چوکنا رہنا چاہئے۔ جب آپ سمجھ جائیں گی کہ سوچ غلط ہے تو آپ اسے مسترد کریں گی اور گمراہی سے بچ جائیں گی۔''

''مگر میں تو اپنی سوچ کو درست سمجھ رہی تھی۔''

''آدمی کو گمراہ کرنے کے لئے شیطان دل میں وسوسے ڈالتا ہے آپی.....! اور اسے باور کراتا ہے کہ اس کی سوچ درست ہے۔ اب اللہ کا اور ایمان کا معاملہ تو بہت نازک ہوتا ہے۔ معمولی سی لغزش بھی سب کچھ تباہ کر دیتی ہے۔ اور آپی.....! ہمیں تو اللہ نے ایمان پر پیدا فرمایا ہے۔ ہم اللہ کے خلاف سوچ بھی کیسے سکتے ہیں؟ شیطان سوچ ذہن میں ڈالتا ہے۔ لیکن ایسی سوچ کو تو مسلمان ابھرتے ہی رد کر دیتا ہے۔''

''اچھا.....! تم بتاؤ.....! تم میری جگہ ہوتیں تو کیا ہوتا.....؟''

''میں تو فوراً ہی اسماء الحسنٰی کے ورد کو معمول بنا لیتی۔''

''اور خیال پھر بھی نہ مٹتا تو.....؟''

''ذکر ہر برائی کو بنا دیتا ہے آپی.....! نماز آدمی کو ہر برائی سے روکتی ہے۔''

میں نے تو نماز ہی چھوڑ دی تھی۔ نوربانو نے شرمندگی سے سوچا۔

''اور خیال پھر بھی نہ مٹتا تو.....؟'' اس نے اصرار کیا۔

ارجمند نے ایک گہری سانس لے کر اپنی جھنجلاہٹ کو دبایا۔

''دیکھیں آپی.....! میں تو اللہ کی پناہ مانگتی ہوں شیطان کے شر سے اور

ایسی سوچوں اور وسوسوں سے۔ لیکن آپ سوچیں، سب کچھ تو اللہ نے کسی کو بھی نہیں دیا۔ بڑے بڑے بادشاہ بھی بڑی بڑی نعمتوں سے محروم ہوتے ہیں اور کسی بھی طرح انہیں حاصل نہیں کر سکتے۔ کوئی بھی شخص محرومی سے مبرا نہیں۔ اب اللہ کی حکمت دیکھیں۔ ایک طرف تو ان محرومیوں سے آدمی کے ایمان کی آزمائش ہوتی ہے، جس میں کامیابی کا صلہ بہت عظیم ہے۔ اور دوسری طرف یہ محرومیاں، بن دیکھے اسے اللہ کے قادرِ مطلق ہونے کا یقین بھی دلاتی ہیں۔''

نور بانو بڑی توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی۔

''اب میں آپ کی سوچ کی بات کرتی ہوں۔ اب تک تو آپ کو سمجھ لینا چاہئے کہ اچھا نصیب سب سے بڑی نعمت ہے۔ آپ کی بہنیں بہت حسین تھیں۔ لیکن ان کے نصیب اچھے نہیں تھے۔ مجھے یاد ہے، آپ نے مجھے ان کی موت کے بارے میں بتایا تھا تو میں کانپ گئی تھی۔ اور آپ کے بقول آپ کی صورت اچھی نہیں۔ لیکن آپ کتنی خوش نصیب ہیں، یہ آپ نے کبھی نہیں سوچا۔ ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے آغا جی جیسے نہایت خوب صورت آپ پر جان چھڑکتے ہیں۔ دنیا کی ہر نعمت آپ کو حاصل ہے۔ کون سی چیز ایسی ہے، جو آپ چاہیں اور آپ کو بغیر کسی دشواری کے نہ ملے؟ اب آپ ساری نعمتوں کو بھول کر اپنی شکل وصورت کے لئے اللہ سے گلہ کرتے رہیں، جبکہ اس کی وجہ سے آپ کو کوئی محرومی بھی نہیں ملی تو یہ تو ناشکرا پن ہے۔

اب عملی زندگی میں دیکھیں تو ثابت ہوتا ہے کہ شکل وصورت کی اتنی اہمیت ہے بھی نہیں۔''

''کیسے......؟''

''دنیا میں بدصورت سے بدصورت شخص کو بھی پسند کرنے والے بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔ یوں نہیں ان میں بھی بہت سے لوگ بے پناہ کشش محسوس کرتے ہیں۔ اور بہت سے نہیں تو کم از کم ایک شخص تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو جن لوگوں کو بدصورت قرار دیا جاتا ہے، ان سے کبھی کوئی محبت ہی نہ کرتا۔ وہ محبت سے بھی محروم رہتے اور ازدواجی زندگی سے بھی۔''

نور بانو نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔

''واقعی......! تمہاری بات میری سمجھ میں آ رہی ہے۔''

''تو خوب صورتی سے زیادہ اہمیت کشش کی ہے۔ اللہ نے ہر کسی کے لئے ہر کسی میں کشش نہیں رکھی۔ جو لوگ معیارِ حسن پر پورا اترتے ہیں، دنیا میں بے شمار لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو انہیں خوب صورت نہیں سمجھتے۔ کہتے ہیں نا کہ خوب صورتی تو دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ آپ کسی کو خوش ذوق کہیں یا بدذوق، لیکن ہر شخص کا اپنا الگ ذوق ہوتا ہے۔''

''لیکن خوب صورتی کی اہمیت تو اپنی جگہ ہے۔'' نور بانو نے اعتراض کیا۔

''اور میں آپ کو یہ بتا رہی ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔''

''یہ تو محض کتابی بات ہے۔''

''جی نہیں......! یہ عملی زندگی کی حقیقت ہے۔ آپ کی کوئی بہن موجود ہوتی تو اس کی خوب صورتی کے باوجود آغا جی آپ ہی سے شادی کرتے۔''

''یہی تو کتابی بات ہے۔''

''نہیں آپی......! اللہ نے اس کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے اپنی رحمت سے۔ اپنے گھر میں ہی دیکھ لیں۔ آغا جی، دادی اماں اور میں...... ہم سب آپ سے محبت کرتے ہیں۔ اور یقیناً آپ ہم سب کو اچھی لگتی ہیں، ورنہ محبت کیوں کرتے......؟''

''اچھا لگنا اور بات ہے اور خوب صورت ہونا اور بات ہے۔ تم سب کی محبت کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں خوب صورت ہوں۔''

''تو آپ خود ہی بتا دیں......! خوب صورتی بڑی چیز ہے یا محبت......؟''

''دونوں کی اہمیت اپنی جگہ......!'' نور بانو کو احساس تھا کہ وہ کٹ حجتی کر رہی ہے۔

''اللہ سب کچھ تو نہیں دیتا کسی کو۔ آپ بتائیں، دونوں میں سے کوئی ایک چیز آپ کو مل رہی ہو تو آپ کس کا انتخاب کریں گی۔''

''خوب صورتی کا......!'' نور بانو نے بے جھجک کہا۔

''کیوں......؟''

"کیونکہ خوب صورتی مل گئی تو محبت خود بخود مل جائے گی۔"

"مجھے افسوس ہے آپی......! کہ آپ غلطی پر ہیں۔"

"ثابت کرو......!" نور بانو اپنے اندر کے جالے ایک ہی بار میں صاف کر دینا چاہتی تھی۔

"دو زاویے ہیں۔ ایک کو آپ کتابی قرار دیں گی۔ لیکن پھر بھی میں بتاؤں گی ضرور! دیکھیں، جو محبت صرف خوب صورتی کی وجہ سے ملے گی، وہ ممکنہ طور پر سچی اور پائیدار نہیں ہوگی۔ ہر مادی چیز کی طرح جسمانی خوب صورتی بھی فانی اور غیر پائیدار ہوتی ہے۔ تو جب خوب صورتی نہیں رہے گی تو محبت بھی ختم ہو جائے گی۔ ایسی محبت کا کیا فائدہ؟ وہ تو آخر میں، جب آدمی بوڑھا ہو جائے گا تو اسے دکھ ہی دے گی۔ جبکہ آدمی کو بڑھاپے میں زیادہ ضرورت ہوتی ہے محبت کی۔"

"تم نے ٹھیک کہا......! یہ تو کتابی بات ہے۔ مجھ سے تو عملی بات کرو۔" نور بانو بولی۔

"تو اب میں جو بات بھی کروں گی، آپ کے جواب کی روشنی میں کروں گی۔ میں خود سے کچھ نہیں کہوں گی۔ ہر بات سامنے کی، عملی زندگی کی، ہمارے اپنے گھر کی بات ہوگی۔" ارجمند نے کہا۔

"اب آپ یہ بتائیں کہ خوب صورتی کے اعتبار سے آپ خود کو کیسا سمجھتی ہیں؟"

"میں سرے سے خوب صورت ہوں ہی نہیں۔"

"تو آپ خود کو کیسا سمجھتی ہیں؟"

"واجبی قبول صورتی سے بھی نیچے۔"

"اور میں کیسی ہوں......؟"

"تم ایسی حسین ہو کہ تمہاری مثال دی جا سکتی ہے۔ میری بہنیں بھی بہت حسین تھیں، لیکن تم ان سے کہیں زیادہ حسین ہو۔"

"خود سے میرا موازنہ نہ کریں۔"

"کتنی تعریف کروانا چاہتی ہو اپنی......؟" نور بانو نے جھنجلا کر کہا۔

"مجھے آپ پر کچھ ثابت کرنا ہے۔" ارجمند نے برا مانے بغیر کہا۔

"اور یہ ہرگز ضروری نہیں کہ میں آپ کی رائے سے متفق ہوں۔ آپ بس میری بات کا جواب دیں۔"

"میرا اور تمہارا موازنہ ممکن ہی نہیں۔ تم لاکھوں، بلکہ کروڑوں گنا خوب صورت ہو مجھ سے۔"

"لیکن آغا جی آپ سے بہت...... بہت زیادہ محبت کرتے ہیں، جبکہ مجھ سے وہ ذرا بھی محبت نہیں کرتے۔ میں ان کی آپ سے محبت اور مجھ سے محبت کا موازنہ کرتے ہوئے آپ کی ہی بات دہراؤں گی کہ ان دونوں محبتوں کا موازنہ ممکن ہی نہیں۔ وہ میرے مقابلے میں بلاشبہ کروڑوں گنا محبت کرتے ہیں آپ سے۔"

نور بانو آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ اس نے بے پرواہی سے کہا۔

"دل کا حال کون جانے......؟ آدمی دکھاوا تو کرتا ہے۔"

"یہ اور بری بات ہے...... آپ بدگمانی کر رہی ہیں یا بے کار کی محبت...... اتنے قریبی تعلق میں دکھاوا نہیں چلتا۔ آدمی کی محبت صاف نظر آتی ہے۔ اس کی نظروں سے، اس کے عمل سے، ہر بات سے، ہر انداز سے پتا چلتا ہے۔"

نور بانو چند لمحے سوچتی رہی، پھر اس نے محبت سے ارجمند کا ہاتھ تھام لیا۔

"واقعی......! میں زیادتی کر رہی ہوں۔ میں نے تمہاری بات سمجھ بھی لی اور مان بھی لی۔" اس کے لہجے میں بھی محبت تھی۔ اس نے غور سے ارجمند کو دیکھا۔

"تم میری وجہ سے کتنے دکھ اٹھا رہی ہو۔ میں نے بڑی زیادتی کی ہے تمہارے ساتھ......!"

ارجمند نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ایسا نہ کہیں آپی......! میں جھوٹ نہیں بولتی۔ میں بہت خوش ہوں۔ اتنی خوش میں اس سے پہلے کبھی نہیں رہی۔ آپ نے تو مجھے خوشی اور عزت دی ہے، مرتبہ دیا ہے۔ دکھ کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"تمہیں توہین کا احساس نہیں ہوتا۔" نور بانو کے لہجے میں حیرت تھی۔

"توہین کیسی......؟ میں اسے عزت اور مرتبہ قرار دے رہی ہوں۔"

اب نور بانو کو یقین ہو گیا کہ ارجمند عبدالحق سے محبت کرتی ہے۔ اس کا ذہن تو اس بات کو تسلیم نہیں کر رہا تھا، کیونکہ اس نے ایسی کوئی بات دیکھی نہیں تھی۔ لیکن اس کے اندر اس بات کا گہرا یقین ابھر رہا تھا۔

''تم اتنی خوب صورت ہو، اس کے باوجود عبدالحق صاحب تمہیں نظر انداز کرتے ہیں، اور میری معمولی شکل و صورت کے باوجود مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں، اس پر توہین کا احساس نہ ہونا تو غیر فطری ہے۔'' بالآخر اس نے کہا۔

''نہیں آپی......! یہ غیر فطری نہیں۔ دیکھیں، یہ میرا نصیب ہے، اور مجھے اس پر یقین ہے کہ جو کچھ اللہ نے میرے نصیب میں لکھا ہے، وہ سب میرے لئے بہت اچھا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ کی طرف سے مسلسل میری بہتری ہو رہی ہے۔ میرا ہر آج میرے گزرے ہوئے کل سے بہتر ہوتا ہے۔''

یہ بات نور بانو کے دل کو لگی۔ اسے یاد آیا کہ یہ بچی کیسے اور کس حال میں اس کے گھر آئی تھی، اور اب......! یہ بات بھی اس کی سمجھ میں آ گئی کہ باہمی محبت کے باوجود وہ اور ارجمند ایک دوسرے کی ضد ہیں، برعکس ہیں۔ بات صرف شکل و صورت تک محدود نہیں تھی، بلکہ وہ مزاج اور فطرت کے لحاظ سے بھی برعکس تھیں۔ وہ جتنی ناشکری تھی، ارجمند اتنی ہی شکر گزار تھی۔ وہ بدگمان تھی اور ارجمند ہر ایک کے بارے میں صرف اچھا گمان رکھتی تھی۔

''اب بتائیں، میں آپ کو قائل کر پائی یا نہیں......؟'' ارجمند نے اسے چونکا دیا۔

''ہاں بھئی......! میں پوری طرح قائل ہو گئی۔ بات سمجھ میں آ گئی۔''

''اب اللہ سے تو آپ کو کوئی گلہ نہیں رہا......؟''

''نہیں......!''

''الحمد للہ......! یہ اللہ کا کرم ہوا ہے آپ پر......!''

''مگر ایک بات اور ہے۔''

''وہ بھی کر لیں۔''

''وہ اس سے بھی بڑی بات ہے۔ تم ایسے ہی سمجھا سکو گی مجھے......؟''

نور بانو کے لہجے میں دبا دبا سا خوف تھا۔

''کوشش کروں گی اور اللہ سے مدد چاہوں گی۔''

''مجھ سے ناراض، مجھ سے دور تو نہیں ہو جاؤ گی......؟''

''انشاء اللہ......! ایسا نہیں ہوگا۔''

''اللہ نے تمام انسانوں کو برابر کے حقوق دیئے۔ مرد اور عورت کو زندگی کی گاڑی کے دو پہیوں کی طرح بنایا۔ عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں حقیر نہیں کیا۔''

''بلکہ زیادہ عزت اور مرتبہ دیا۔'' ارجمند بیچ میں بول پڑی۔

نور بانو نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''جو ماں کا مرتبہ ہے، کسی اور کا نہیں، نسلوں کی امین ہوتی ہے۔ اس کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔''

''لیکن مرد اسے پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔'' اس بار نور بانو نے اس کی بات کاٹ دی۔

''مسلم معاشرے میں ایسا نہیں ہوتا آپی......!'' ارجمند نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

''آپ ہندو معاشرے کی بات کر رہی ہیں، جس میں عورت مرد کا کھلونا ہے، جہاں اس کی حیثیت محض ایک داسی کی ہے۔ پتی ورتا کے نام پر سارے حقوق چھین لئے ہیں اس سے۔ اسلام نے تو مرد سے زیادہ عزت دی ہے اسے۔''

''کیا عزت دی ہے؟ جب جی چاہے، شوہر روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا ہے۔''

''بدقسمتی سے برصغیر میں جہاں مسلمانوں نے ہندو معاشرے پر اَن مٹ اثرات مرتب کئے، وہاں ساتھ رہنے کے نتیجے میں انہوں نے کچھ ہندوؤں کے اثرات بھی قبول کر لئے۔ یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔''

''تم کیسی بات کر رہی ہو......؟'' نور بانو نے تنک کر کہا۔

''مسلمان بھلا بت پرستوں سے متاثر ہو سکتا ہے......؟''

''بات شرمندگی کی ہے۔ مگر ایسا ہوا ہے۔ اور غیر فطری بھی نہیں، ساتھ رہیں گے تو میل جول بڑھے گا۔ اسلام رواداری سکھاتا ہے۔ دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ رواداری میں بے اعتدالی ہونے لگی تو تہواروں میں بھی شریک ہونے لگے۔ اسلامی تہذیب اور ثقافت میں ہندوستانی تہذیب اور ثقافت گھلنے ملنے لگی۔ یہ شب برأت میں آتش بازی کہاں سے آئی؟ دیوالی سے...... یہ محرم میں تعزیے اور اکھاڑے کہاں سے آئے؟ دسہرے سے...... اور جہیز کے نام پر جو زیادتیاں ہوتی ہیں، وہ ہم نے کینا دان سے سیکھی ہیں۔ آپ مانیں نہ مانیں، متاثر تو ہم ہوئے ہیں۔ ہم سجدہ کرتے ہی اور ہندو ماتھا ٹیکتے ہیں۔ سجدہ صرف اللہ کے لئے ہوتا ہے۔ اور ماتھا درخت، پتھر اور اپنے جیسے انسان ...... کسی کے سامنے بھی ٹیکا جا سکتا ہے، جس سے بھی آپ مرعوب ہوں۔ تو اب دیکھیں کہ سجدہ کرنے والے بھی ماتھا ٹیکنے لگے۔ یہ اثرات خانگی زندگی پر بھی پڑے۔ کہیں مردوں نے تو کہیں عورتیں نے ہندوؤں کی سوچ اور ان کے طور طریقے اپنا لئے۔''

''بات کسی اور رخ پر نکل گئی۔'' نور بانو نے کہا۔

''میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اللہ نے مردوں کو چار شادیوں تک کی اجازت دی۔ لیکن عورت کو نہیں دی۔ یہ تو مرد کو برتری دی نا...... !''

ایک لمحے کو ارجمند کا چہرہ متغیر ہوا۔ نور بانو اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

''میں وضاحت کر دوں ...... !''

ارجمند نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔

''نہیں آپی...... ! آپ نے کہا، میں نے سن اور سمجھ لیا۔ اتنا ہی کافی ہے۔ مزید وضاحت کریں گی تو میں اور آپ دونوں گناہ گار ہوں گی۔''

''میں نے تو دل میں جو خیال آتا ہے، اس میں تمہیں شریک کر لیا۔ اب تم ناراض نہ ہو جانا۔''

اس وقت ارجمند درحقیقت جھنجلا گئی تھی، بلکہ مشتعل ہو گئی تھی۔ یہ آپی کیسی باتیں سوچتی ہیں، کیسی باتیں کرتی ہیں۔ اس کا پہلا ردِعمل تو یہ تھا کہ وہ نور بانو سے کنارہ کش ہو جائے۔ یہ وہ باتیں تھیں، جو اس نے کبھی سوچی بھی نہیں تھیں۔ اور اس

کے نزدیک یہ سب کچھ سوچنا خود کو تباہ کر لینے کے مترادف تھا۔ تو اس نے سوچا کہ نور بانو کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔

لیکن وہ نور بانو سے محبت کرتی تھی۔ وہ اسے تباہی کے گہرے گڑھے میں گرتے دیکھے اور اسے بچانے کے لئے کچھ نہ کرے، یہ اس کے نزدیک احسان فراموشی تھی۔ اسے کوشش تو کرنی ہوگی۔ لیکن کیا...... ؟ یہ موضوع تو وہ تھا، جس پر اللہ کی رحمت سے اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

''تم اس سلسلے میں کیا کہو گی...... ؟'' نور بانو نے اسے چونکا دیا۔

''بنیادی بات یہ ہے آپی...... ! کہ میں سورۃ الحشر کی ایک آیت مبارکہ کا حوالہ دوں گی، جس میں اللہ نے ایمان والوں سے فرمایا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کچھ تمہیں دیں، وہ لے لو، اور جس چیز سے منع کریں، اس سے رُک جاؤ۔ اور اس کے آگے تنبیہ فرمائی کہ اللہ سے ڈرو۔ وہ بہت شدید سزا دینے والا ہے۔ اب یہ ذہن میں رکھیں آپی...... ! کہ یہ خطاب ان لوگوں سے ہے، جو ایمان لائے، اور اللہ کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ اللہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ماننے کو کہہ رہا ہے اور نہ ماننے کے نتیجے میں بدترین سزا کی وعید دے رہا ہے تو اللہ کا حکم!'' یہ کہتے ہوئے اسے جھرجھری سی آئی۔ اس کے لہجے میں خوف در آیا۔

''اللہ کے حکم میں کیا چون و چرا...... اللہ کے حکم سے اختلاف و انحراف کہاں لے جائے گا...... ؟ سب کچھ تباہ ہو جائے گا آپی...... !''

ایک لمحے کو تو نور بانو بھی تھرا کر رہ گئی۔

''اللہ کے حکم کے معاملے میں ایک ہی روّیہ ہونا چاہئے۔ کسی دوسرے روّیے کی اس میں گنجائش نہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ سنیں اور ایمان لے آئیں۔ اللہ نے فرمایا، میں واحد اور احد ہوں۔ میرا کوئی شریک نہیں۔ نہ میں کسی سے ہوں، نہ کوئی مجھ سے ہے۔ اور ہم نے مان لیا۔ اللہ نے جو کچھ حلال قرار دیا، ہم نے اسے اپنا لیا۔ اور جسے حرام قرار دیا، اس سے منہ پھیر لیا۔ اس طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا۔ یہ ہے بندگی...... !''

''لیکن اللہ نے آدمی کو عقل دی، سوچنے والا بنایا۔ اب اس کے اندر

اختلافی سوچ ابھرے۔ مخالف دلیلیں سر اٹھائیں تو.....؟''

''بے شک اللہ نے عقل دی۔ دنیا کا نفع نقصان سمجھنے کے لئے۔ دین کو سمجھنے کے لئے نہیں۔ ایمان تو دل سے لانے کو کہا، دلیلوں کی روشنی میں نہیں۔ ایمان بالغیب۔ اگر اللہ سامنے آجائے تو کس کی مجال ہو اس کا انکار کرنے کی۔ یہ بالغیب ہی تو آزمائش ہے۔ کون جانے، عقل بھی ہمیں ایک اعتبار سے آزمائش کے لئے ملی ہو..... ہمیں بھٹکانے، بہکانے کے لئے۔ سنیں آپی.....! کتاب تو مجھے یاد نہیں، لیکن میں نے کہیں پڑھا تھا کہ پہلے تسلیم پھر تفہیم۔ یہ اللہ کے حکم کے لئے ہے کہ سنو اور اسی لمحے تسلیم کرلو۔ تفہیم کے چکر میں مت پڑو۔ یہ ایمان کا حصہ ہے کہ اللہ کا حکم سچا، برحق۔ اس کو کسی دلیل کی حاجت نہیں۔''

نور بانو نے دیکھا کہ ارجمند عجیب سی کیفیت میں بول رہی ہے، جیسے وہ ارجمند نہیں، کوئی اور ہو۔

''لیکن تسلیم کرنے میں عقل رکاوٹ ہو تو.....؟'' اس نے کہا۔

''تو یہ بدترین بدبختی ہوگی۔'' ارجمند کے لہجے میں جلال تھا۔

''تسلیم کرلیا اور تفہیم نہ ہوئی تو.....؟''

ارجمند کو خود بھی لگ رہا تھا، جیسے اس کے اندر کوئی اور چھپا بیٹھا ہے۔ آواز تو اس کی تھی، لیکن شاید الفاظ اس کے نہیں تھے۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ جو باتیں وہ کر رہی ہے، وہ اس کی اپنی فہم سے بھی ماورا ہیں۔

''اہمیت صرف تسلیم کی ہے آپی.....! تسلیم کافی ہے، تسلیم شافی ہے۔ تسلیم میں خیر و برکت ہے۔ بندہ تسلیم کرے گا، عمل کرے گا تو اللہ اسے تفہیم سے نوازے گا..... مرحلہ وار۔ کیونکہ تفہیم دراصل ایمان ہے۔'' ارجمند نے پُرخیال لہجے میں کہا اور پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''کیسے.....؟''

ارجمند جیسے کھل اٹھی۔ اس کے اندر جیسے روشنی ہوگئی تھی..... بلکہ وہ جگمگا رہی تھی۔

''اب جو کچھ بھی میں کہوں گی، وہ اس کا ثبوت ہے۔ کیونکہ آپ نے جو

سوال اٹھائے، وہ میرے ذہن میں کبھی ابھرے نہیں تھے۔ اس لئے کہ خواہ میں اللہ کے حکم پر عمل نہ کر پاؤں، لیکن اسے بلاچون و چرا تسلیم ضرور کرتی ہوں۔ آج ضرورت محسوس ہوئی تو اللہ نے تفہیم بھی عطا فرما دی۔''

نور بانو نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ ننھے بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔

''اللہ کا شکر ہے.....!'' ارجمند نے کہا۔

''مجھے سمجھاؤ بھی تو.....!'' نور بانو بولی۔

''آپی.....! سورۂ ملک میں اللہ نے فرمایا..... اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ..... کیا وہی نہ جانے، جس نے پیدا کیا؟ یہ کتنی بڑی بات ہے آپی.....! محض چار لفظوں میں۔ اللہ خالق ہے۔ اپنی مخلوق کو خوب جانتا ہے۔ اسی لئے تو کریم بھی ہے۔ بغیر مانگے ہماری ضرورتیں پوری فرماتا ہے۔ بلکہ ہمیں تو اپنی ضرورتوں کا علم ہی نہیں ہوتا۔ تو وہ ہمیں جانتا ہے..... ہمارا مزاج، ہماری فطرت، تو اس نے جو حکم دیا، اس میں ہماری بہتری ہے۔ وہ ہماری ہی بھلائی کے لئے ہے۔ ہم اپنے باطن کے نہاں خانوں سے بے خبر ہیں، لیکن وہ ہمارا ہر بھید جانتا ہے۔ صرف ہمیں ہی نہیں، ہماری فطرت بھی اس نے بنائی ہے۔ مرد اور عورت گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ دونوں کی فطرت اور مزاج مختلف ہیں۔ اسی کے حساب سے اللہ نے ان کے لئے دائرہ کار بنایا ہے۔ ان کا الگ الگ میدان ہے۔ مرد میں وسعت ہے۔ اس کی فطرت میں تجسس ہے۔ اسے باہر کے معاملات سے نمٹنا ہے۔ اس کے سامنے کائنات کی وسعت ہے۔ وہ کھوجی ہے۔ وہ اپنے گھر اور خاندان کا رکھوالا ہے۔ اسے اپنے خاندان کے لئے سامانِ زیست فراہم کرنا ہے۔ اللہ نے جو رزق اس کے لئے رکھا ہے، اس کی جستجو کرنی ہے، اس کے لئے سعی کرنی ہے۔ اس لئے اللہ نے اسے جسمانی طاقت عطا فرمائی ہے۔ وہ صنفِ قوی ہے۔ بوقتِ ضرورت اسے لڑنا بھی ہے، دفاع بھی کرنا ہے۔''

''تو برابری کہاں رہی.....؟'' نور بانو نے جھنجھلا کر کہا۔

''یہ دنیا تو پھر مرد کی ہی ہے نا.....!''

''آپ پوری بات سنیں گی تو سمجھیں گی۔'' ارجمند نے نرم لہجے میں کہا۔

"اور بات ویسے بھی آسان نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اللہ نے مرد اور عورت کی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے ان کا دائرہ کار بنایا۔ مگر یوں بھی تو ہے کہ اللہ کو جس سے جو کام لینا تھا، اسے اس کے مطابق بنایا ۔ جسمانی اعتبار سے بھی اور فطرت اور مزاج کے اعتبار سے بھی۔" اب اس کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ خود سے بات کر رہی ہو۔ پھر وہ جیسے چونکی۔ اس نے نور بانو کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ برابر کی بات کرتی ہیں تو وہ برابری ہر طرح سے، تو نہیں ہو سکتی۔ ہر چیز کا اپنا ایک مقام ہے، اور ہر چیز اپنے مقام پر ہی اہمیت رکھتی ہے۔ مقام سے ہٹ کر ہر چیز اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہے۔"

"بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔" نور بانو نے اعتراض کیا۔

"اللہ نے آدمی کو سمجھانے کے لئے اس کی نگاہوں کے سامنے مثالیں چھوڑی ہیں۔ بس اسے ادھر ادھر دیکھنا اور غور کرنا ہے۔ آپ ذرا پھول کے بارے میں سوچیں۔ اس کا مقام کیا ہے؟ شاخ پر! کلی کھلتی ہے، پھول بنتی ہے، پھول خوشبو بکھیرتا ہے، اور کیونکہ ہر چیز کی طرح فانی ہے، اور اس کا وقت بھی مقرر ہے، سو اپنے وقت پر وہ بکھر جاتا ہے۔ لیکن ہم اسے شاخ سے توڑیں تو اس کی وہ وقعت نہیں رہتی۔ چند لمحے ہم اسے سونگھتے ہیں، پھر بے پرواہی سے پھینک دیتے ہیں، اور وہ خاک میں مل جاتا ہے۔ شاخ پر رہے تو اس کی عزت بھی ہوتی ہے، اور اس میں کشش بھی محسوس ہوتی ہے۔ شاخ سے ٹوٹ کر کچھ بھی نہیں۔"

نور بانو نے بڑے رشک سے اسے دیکھا۔ یہ اتنی کم عمر لڑکی اتنا کچھ کیسے سوچ اور سمجھ لیتی ہے۔

"ہر چیز کا یہی حال ہے آپی.....! اللہ نے جسے جو مقام دیا ہے، وہیں پر اس کی عزت اور مرتبہ ہے۔ اس مقام سے ہٹ کر کچھ بھی نہیں۔ یہی حال مرد اور عورت کا ہے۔ ان کا اپنا اپنا مقام ہے۔ آپ ذرا سوچیں، مرد اور عورت جسمانی اعتبار سے ایک جیسے ہوتے تو ان میں ایک دوسرے کے لئے کشش ہوتی بھلا.....؟"

یہ کہتے کہتے ارجمند شرما گئی۔

"پھر دنیا کا نظام کیسے چلتا ؟ کشش تو مختلف ہونے ہی کی وجہ سے ہے۔ میں مردوں کا دائرہ کار بیان کر رہی تھی تو آپ نے یہ سمجھ لیا کہ یہ اس کی برتری ہے۔ نہیں آپی.....! ایسا نہیں ہے۔ مرد اپنے خاندان کا محافظ ہے۔ لیکن عورت کو تو اللہ نے نسلوں کا امین اور محافظ بنایا ہے۔ کہیں مرد کو فوقیت حاصل ہے تو کہیں عورت کو۔ اور اسے تسلیم کرنا ہی زندگی کی کامیابی ہے۔

مرد کا تعلق باہر کی دنیا سے ہے، سو اسے اس کے لئے اللہ نے وسائل عطا فرمائے۔ اور عورت کی حکمرانی گھر کی چار دیواری میں ہے، اور اسے اس کے لئے وسائل عطا ہوئے ہیں۔ مرد جسمانی طور پر طاقتور ہے۔ وہ جو بوجھ اٹھا سکتا ہے، عورت نہیں اٹھا سکتی۔ لیکن جو بوجھ عورت اٹھا سکتی ہے، وہ مرد نہیں اٹھا سکتا۔ وہ بچوں کو نہیں پال سکتا، ان کی تربیت نہیں کر سکتا۔ یہاں عورت برتر ہے۔ شوہر مر جائے تو بیوی رزق کی جستجو بھی کرتی ہے اور بچوں کی تربیت بھی کر لیتی ہے۔ لیکن بیوی مر جائے تو شوہر کے لئے یہ آسان نہیں ہوتا۔ میری بات سمجھ رہی ہیں نا آپ.....! اللہ نے دونوں کو ان کی ضرورت کے مطابق جسم اور صلاحیتیں عطا فرمائیں ہیں۔"

"کچھ کچھ سمجھ رہی ہوں۔ لیکن یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں ہے۔"

"یہ اس کی تمہید ہے آپی.....! مرد میں برداشت، صبر اور تحمل عورت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ جس تکلیف میں مرد تڑپ جاتا ہے، عورت اسے اُف کئے بغیر سہہ لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بچوں کی تربیت کر سکتی ہے۔ بیٹوں کے روپ میں وہ مردوں کو برداشت، صبر اور تحمل سکھاتی ہے۔ بنیادی بات یہ ہے آپی.....! کہ مرد اور عورت ایک دوسرے سے یکسر مختلف، بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مرد میں وسعت ہے تو عورت میں ارتکاز ہے۔ مرد میں شجاعت ہے تو عورت میں حکمت ہے۔ مرد کے پاس طاقت ہے تو عورت کے پاس دانائی ہے، اور دانائی بڑی سے بڑی طاقت کو زیر کر لیتی ہے۔ مرد تنوع پسند ہے تو عورت یکسو۔ عورت ایک ہدف رکھتی ہے، اور اس کے لئے بڑے ارتکاز کے ساتھ اس کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔ جبکہ مرد کے سامنے بہت سے اہداف ہوتے ہیں اور وہ بیک وقت ان کے لئے

جدوجہد کرتا ہے۔ عورت کی توجہ کا مرکز اس کا گھر ہے، اور مرد زندگی کی ہر لڑائی لڑنے کے بعد گھر کا رخ کرتا ہے۔ گھر کا آرام، وہاں ملنے والی محبتیں اور آسائشیں اسے اگلے روز پھر جنگ لڑنے کے لئے تازہ دم کرتی ہیں۔ یعنی عورت کی مدد کے بغیر مرد کوئی جنگ نہیں لڑ سکتا، اور عورت کے لئے اس کا محافظ مرد ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہیں، ورنہ زندگی کی گاڑی ٹھپ ہو جائے گی۔

اب مزاج اور فطرت کا فرق دیکھیں۔ مرد تنوع پسند ہے اور عورت یکسو۔ مرد میں وسعت اور توسیع پسندی ہے، اور عورت میں مرکزیت اور ارتکاز۔ مرد ایک وقت میں کئی عورتوں سے محبت کر سکتا ہے، جبکہ عورت ایک وقت میں دو مردوں سے محبت کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

نوربانو کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن ارجمند نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"نہیں آپی.....! یہ نہیں کہئے گا کہ یہی تو خرابی ہے کیونکہ یہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت ہے۔ اور اسی کو سامنے رکھتے ہوئے اللہ نے قانون بنائے ہیں۔ عام طور پر عورت کی پہلی محبت آخری ہوتی ہے، اس کی پسند نہیں بدلتی۔ جبکہ مرد کی پسند بدلتی رہتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ متضاد چیزیں پسند کرتا ہے۔ اور ہاتھ بڑھا لینا اور حاصل کر لینا بھی اس کی فطرت ہے۔" ارجمند نے ایک گہری سانس لی اور پھر سلسلہ کلام جوڑا۔

"اللہ کے ہر حکم میں اور اس کے ایک ایک لفظ میں بے شمار حکمتیں ہیں۔ ہم انہیں سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اس کی مرضی ہو تو اس کی کوئی حکمت سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اس چار شادیوں کی اجازت میں بھی بے شمار مصلحتیں ہوں گی۔ لیکن ان میں سے ایک اللہ کے فضل سے میری سمجھ میں آ گئی۔ اس میں مردوں کے لئے گناہ سے بچنے کا سامان ہے۔"

"تو عورتوں کے لئے کیوں نہیں.....؟" نوربانو نے پھر اعتراض داغا۔

"عورت کے لئے یہ غیر فطری ہوتا۔" ارجمند نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"عورت ایک وقت میں دو مردوں سے محبت بھی نہیں کر سکتی، ایک سے

زیادہ شوہر رکھنا تو بہت دور کی بات ہے۔"

"لیکن ارجی.....! ایسی بھی عورتیں ہوتی ہیں جو"

ارجمند نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔

"وہ شیطان کے زیر اثر خلاف فطرت زندگی گزار رہی ہوتی ہیں۔"

"یہ فطری اور غیر فطری کا یقین کیسے کیا جا سکتا ہے؟"

"میں تو گناہ کو غیر فطری سمجھتی ہوں آپی.....! اگرچہ ہوتا وہ آدمی کی فطرت میں ہی ہے۔ لیکن شاید آزمائش کے لئے رکھا گیا ہوتا ہے۔ میرے نزدیک زیادہ آسان ہوتا ہے۔ پھر آدمی گناہ کا عادی ہو جائے تو وہ غیر فطری گناہ کرتے ہوئے بھی نہیں ہچکچاتا۔ اب اس کی تشریح کے لئے مجھ سے نہ کہئے گا آپی.....! میں کر سکتی ہوں، لیکن کروں گی نہیں۔ بہت سی باتیں زبان پر لانا بھی مناسب نہیں ہوتا۔ اس پر آپ خود سوچ سکتی ہیں۔"

نوربانو نہ چاہتے ہوئے بھی قائل ہو گئی۔

"یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

"ہاں.....! میرے پاس ایک دلیل ہے۔ دنیا کے کسی مذہب نے، خواہ وہ مشرکوں کا ہو، عورت کا ایک وقت میں دو شوہر رکھنے کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ کسی سیکولر معاشرے میں بھی، جو مہذب ہو، ایسا نہیں ہوتا۔"

"لیکن مرد کو دو بیویاں رکھنے کی اجازت بھی نہیں دی۔" نوربانو نے تیز لہجے میں کہا۔

"تو وہ معاشرے مردوں کو گناہوں سے دور بھی نہیں رکھ سکے۔ لادینی معاشروں میں مرد اور عورت شادی کے بغیر بھی ساتھ رہتے ہیں، لیکن انداز ان کا شوہر اور بیوی والا ہی ہوتا ہے۔ یہ الگ بات کہ اس میں خیر اور برکت نہیں ہوتی۔ شادی مہذب مذہبی معاشروں کا سب سے اہم ادارہ ہوتا ہے۔ معاشرے اس پر قائم ہوتے ہیں۔ یہ حرام اور حلال کی بنیاد ہے۔ اب میں آپ سے ایک بات پوچھوں آپی.....! اگر اللہ عورت کو بیک وقت ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دے دے تو کیا آپ دوسری شادی کر لیں گی.....؟"

نور بانو نے جھرجھری سی لی۔

''کیا بیہودہ بات کی ہے تم نے ... ہرگز نہیں ... ! یہ تو ممکن ہی نہیں ... !''

''دیکھ لیں ... ! یہ ہے فطرت ... !'' ارجمند نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

''ہر عورت کا یہی جواب ہوگا۔ آپ نے یہی کہا تھا نا کہ اللہ نے عورتوں کو چار شادیوں کی اجازت کیوں نہیں دی ... ؟ یہ کیسی برابری ہے۔ اب آپ نے خود ہی اپنے اعتراض کو مسترد کر دیا۔''

نور بانو کھسیا گئی۔

''وہ تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا۔''

ارجمند کے دماغ میں روشنی کا ایک اور جھماکا سا ہوا۔

''ابھی ابھی ایک اور بات میری سمجھ میں آئی ہے آپی ... !''

''نہیں ... ! اس بات کو بھول جاؤ ارجی ... !'' نور بانو نے اس کی بات کاٹ دی۔

''یہ بات میں نے جہالت میں کہہ دی تھی۔ میں توبہ کرتی ہوں اس پر۔ دراصل میں اس پر جھنجلاتی ہوں کہ مردوں کو چار شادیوں کی اجازت ملی تو عورت کو اس سلسلے میں حسد کیوں ملا؟ میں اپنے شوہر کو کیوں کسی دوسری عورت کے ساتھ نہیں بانٹ سکتی۔''

''اپنی بات کیوں کرتی ہیں ... ؟'' ارجمند نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ نے تو خود آغا جی کی دوسری شادی کرائی ہے۔''

اب نور بانو یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ یہ مجبوری تھی، ورنہ وہ حسد تو اس سے بھی کرتی ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''تمہاری بات اور ہے۔ ورنہ میں تو عبدالحق صاحب پر کسی دوسری عورت کا سایہ بھی برداشت نہ کرتی۔ اب یہ حسد تو فطری ہے نا ... !''

''حسد کبھی فطری نہیں ہوتا آپی ... ! یہ تو ایک دوسرے سے لگنے والی بیماری ہے۔ اسلامی معاشرے میں بیوی اس پر کبھی اعتراض نہیں کر سکتی کہ اس کا

شوہر دوسری، تیسری یا چوتھی شادی کرے۔ ہم نے تو یہ سب کچھ ہندو عورتوں سے سیکھا ہے۔''

''یہ بتاؤ ... ! ایسا اسلامی معاشرہ ہے کہاں ... ؟'' نور بانو کے لہجے میں طنز تھا۔

''میرے خیال میں تمام عرب ممالک میں ایسا ہی ہے۔ اور سعودی عرب میں تو ہے ہی۔ وہاں لفظ سوکن استعمال ہی نہیں ہوتا۔ ہر بیوی اپنے شوہر پر اس کی دوسری بیویوں کے حق کو تسلیم کرتی ہے۔ کتنے ہی گھر ایسے ہیں، جہاں ایک سے زیادہ بیویاں ساتھ ہی رہتی ہیں۔ بچے بھی اپنے باپ کی ہر بیوی کو ماں کا درجہ دیتے ہیں۔ وہاں سوتیلی ماں بھی نہیں ہوتی۔''

''یہ تمہیں کیسے معلوم ... ؟''

''عربی لٹریچر پڑھتی رہی ہوں میں۔ اسلامی معاشرے میں اللہ کے حکم سے اختلاف کون کر سکتا ہے ... ؟ یہ تو بغاوت ہے آپی ... !''

نور بانو نے پھر جھرجھری لی۔

''ٹھیک ہے ارجی ... ! شکریہ ... ! بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اب میں اللہ سے توبہ کروں گی اس پر۔''

''اللہ کا شکر ہے آپی ... !'' ارجمند کھل کے مسکرائی۔ وہ بہت خوش تھی۔

''میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ تم نے بہت اچھی طرح سمجھایا ہے مجھے۔ ورنہ یہ باتیں تو میں کسی سے کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتی تھی۔''

''میرا کوئی کمال نہیں آپی ... ! یہ اللہ نے رحمت کی ہے آپ پر ... !'' ارجمند نے عاجزی سے کہا۔

''تم بہت اچھی ہو ارجی ... !''

''اگر یہ سچ ہے تو یہ بھی اللہ کا فضل ہے، الحمدللہ ... !'' ارجمند نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اب میں آپ کے لئے پھل لاتی ہوں۔ کچھ کھا لیں، کتنی کمزور ہو گئی ہیں آپ ... !''

وہ چلی گئی اور نور بانو اس کی باتوں پر غور کرتی رہی۔

❁ ❁ ❁

رشیدہ اس گفتگو کے مکمل ہونے پر بہت پہلے ہی دروازے کے پاس سے ہٹ چلی تھی۔

یہ محض اتفاق تھا کہ دروازے کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک بات اس کے کان میں پڑی، اور وہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر ان کی باتیں سننے لگی۔

ات وقت نور بانو اپنے شوہر سے فون پر بات کر رہی تھی۔

اس گفتگو کو سنتے ہوئے رشیدہ پر سب کچھ عیاں ہو گیا۔ ہر عقدہ کھل گیا۔

کچھ کچھ تو وہ پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔ مگر اب تو پوری کہانی سامنے آ گئی۔

اور وہ سنتے ہوئے اسے حیرت ہوئی۔ وہ کیسا شخص ہوگا جو واجبی شکل و صورت کی اس عام سی عورت سے اتنی محبت کرتا ہوگا کہ اولاد سے محروم ہونے کے باوجود دوسری شادی کے لئے تیار نہیں تھا۔ اور پھر اس کی بیوی نے اصرار کر کے اس کی شادی اس لڑکی سے کرا دی جو کم عمر بھی ہے اور بے حد حسین بھی۔ لیکن وہ شادی کے بعد بھی اس لڑکی کو نظر انداز کرتا ہے، اسے وہ محبت نہیں دیتا، جس کی یہ حقدار ہے۔

رشیدہ کوئی نادان عورت نہیں تھی۔ وہ بہت سمجھدار، بلکہ چالاک تھی۔ چند منٹ کی گفتگو میں سب کچھ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ خود کو بہت تیز وطرار سمجھتی تھی۔ لیکن اسے تسلیم کرنا پڑا کہ نور بانو کے سامنے وہ طفل مکتب ہے۔ اپنی مقصد برآری کے لئے نور بانو نے جو کچھ سوچا، وہ سوچنا بھی آسان نہیں تھا۔ کجا یہ کہ اس پر عمل کرنا۔

اور اس نے مان لیا کہ خود غرضی میں بھی نور بانو اس سے بہت آگے ہے۔

جو نہیں کہا گیا تھا، رشیدہ نے وہ بھی سمجھ لیا تھا۔ اس عورت نور بانو نے کیسا کھیل کھیلا تھا۔ جب اس نے سمجھ لیا کہ اب اس کے شوہر کی دوسری شادی ہو کر رہے گی تو اس نے اس معصوم لڑکی کو آلہ کار بنا لیا، جو اس سے بہت محبت کرتی ہے۔ ایک اجنبی عورت کے مقابلے میں تو یہ بہت بہتر تھا، کیونکہ یہ لڑکی اس کی کوئی بات

ٹال ہی نہیں سکتی۔

اور پھر فائدے کا یہ اک رخ ہی نہیں تھا۔ لڑکی اس کے لئے وہ ایثار کر رہی تھی، جو دنیا میں کوئی کسی کے لئے نہیں کرتا۔ یعنی بچہ اس کا ہوگا اور ماں نور بانو بنے گی۔

رشیدہ سمجھ سکتی تھی کہ کم عمر اور معصوم لڑکی ہامی بھرتے ہوئے یہ سمجھ ہی نہیں سکی ہوگی کہ اس کھیل میں کتنی دشواریاں ہیں۔ یہ کھیل کھیلنا تقریباً ناممکن ہے۔ ہاں! اب اس کی سمجھ میں یہ بات آ رہی ہوگی۔

رشیدہ کے لئے یہ سمجھنا ناممکن تھا کہ نور بانو نے یہ کھیل کیسے ترتیب دیا ہوگا۔ یہ اس نے کیسے ممکن بنایا کہ ساس اور شوہر کو چھوڑ کر، اور ارجمند کو ساتھ لے کر وہ یہاں اتنی دور آ گئی، جہاں بچے کے معاملے میں رازداری کا اہتمام کرنا اس کے لئے ممکن ہو گیا۔ کیسے اس نے شوہر کو اور اپنی ساس کو یہاں آنے سے روک رکھا ہے۔ یہ سب کیسے کیا اس نے؟

رشیدہ دروازے کے پاس اس وقت آئی، جب نور بانو اپنے شوہر سے بات کر رہی تھی، اور اس نے کہا تھا... اب آنے کا ارادہ نہ کر لیجئے گا... اور یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں کیسا خوف تھا۔ اس کی یہ بات سن کر ہی رشیدہ وہاں رک گئی تھی۔

بات تھی بھی خوف کی۔ شوہر یہاں آ جائے تو پول کھل جائے گی۔ بے عزتی الگ، محبت سے محرومی الگ۔ کتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے اس عورت نے صرف ایک بچے کے لئے۔

لیکن رشیدہ کو ماننا پڑا کہ قسمت بھی نور بانو کا ساتھ دے رہی ہے۔ فون پر گفتگو سے پتا چلا کہ اس کی ساس آنے والی تھی۔ لیکن اچانک وہ بہت بیمار ہو گئی ہے، اور نہیں آ سکے گی۔

قسمت ساتھ نہ دے تو یہ کھیل دھرا رہ جائے۔ رشیدہ نے سوچا تھا۔

پھر نور بانو اور ارجمند کے درمیان جو گفتگو ہوئی، رشیدہ نے وہ بھی سنی۔

جب چار شادیوں والی بات چلی، تبھی وہ وہاں سے ٹلی۔

اور اس گفتگو نے اس پر سب کچھ کھول دیا۔

جو کچھ اس نے سنا، اس نے رشیدہ جیسی عورت کو بھی خوفزدہ کر دیا۔ سچ یہ ہے کہ اب وہ نور بانو سے خوفزدہ تھی۔ اس نے سوچا، یہ عورت کچھ بھی کر سکتی ہے۔ یہ جس کی دشمن ہو جائے، اسے مٹا ڈالے گی۔ اور دوست یہ کسی کی بھی نہیں۔ جو عورت محض خوب صورتی کی بنا پر اپنی سگی بہنوں سے حسد کر سکتی ہے، وہ کسی کو نہیں بخشے گی۔ بظاہر تو وہ ارجمند کو اپنی سگی بہن جیسا سمجھتی تھی اور اسے اتنا چاہتی تھی کہ اپنے شوہر میں اسے شریک کر لیا۔ لیکن رشیدہ کو یقین تھا کہ سب صرف دکھاوا ہے۔ وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ نور بانو کسی سے بھی محبت کرنے والی نہیں۔ محبت اس کی فطرت میں تھی ہی نہیں۔ ارجمند کو وہ بس استعمال کر رہی ہے...... اور کس بری طرح استعمال کر رہی ہے۔

اتنی سی دیر میں رشیدہ کو لگتا تھا کہ اس نے نور بانو کو پوری طرح جان اور سمجھ لیا ہے۔ یہ عورت اپنے شوہر میں کسی کو شریک کرنے والی نہیں۔ ارجمند کو بظاہر شریک کیا تو اپنی غرض کے لئے...... اور وہ بھی ایک غرض نہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک بات میں کئی فائدے حاصل کرنا جانتی ہے۔

ارجمند کی اپنے شوہر سے شادی کرا کے ایک طرف تو اس نے خود کو صحیح معنوں میں سوکن سے محفوظ کر لیا۔ اگر دوسری شادی اس کی ساس کراتی تو بھی آنے والی یقیناً نور بانو سے کم عمر اور زیادہ حسین ہوتی۔ اور وہ اس کے اختیار میں نہ ہوتی۔ وہ اس سے دبتی نہیں۔ بلکہ ذرا بھی تیز ہوتی تو اس کے شوہر کو بآسانی اس سے چھین لیتی۔ جبکہ ارجمند بہت کم عمر اور بہت زیادہ حسین ہونے کے باوجود پوری طرح اس کی مطیع تھی۔ اس سے اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اور دوسرا فائدہ اور بڑا تھا، جو اسے حاصل ہونے والا تھا۔ بچہ، جو اس کا نہیں تھا، لیکن اس کا کہلاتا، اسے عزت دلاتا۔

رشیدہ کو یقین ہو گیا کہ بچہ مل جانے کے بعد نور بانو چند روز کے لئے بھی اپنے شوہر میں ارجمند کی شراکت برداشت نہیں کرے گی۔ تب ارجمند اسے محض ایک کانٹا لگے گی، اور وہ اس کانٹے کو جلد از جلد اپنے شوہر کی زندگی سے نکال دے گی۔

رشیدہ کو جھرجھری سی آ گئی۔ اس نے اتنی متضاد شخصیتوں کو پہلے کبھی یکجا نہیں دیکھا تھا۔ نور بانو چالاک اور مطلبی تھی، اتنی پست کہ رشیدہ نے ایسی پستی پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اور ارجمند بے غرض، مخلص اور معصوم، اور اتنی بلند کہ رشیدہ کو وہ بلندی ناقابل یقین اور افسانوی لگتی تھی۔ رشیدہ جہاں دیدہ عورت تھی۔ لیکن وہ کہہ سکتی تھی کہ نہ ایسی بلندی اس نے پہلے کبھی دیکھی اور نہ ہی ایسی پستی۔ اور لطف یہ کہ یہ دونوں انتہائیں ایک شوہر کے گھر میں یکجا تھیں۔ اور ان کے درمیان یکطرفہ ہی سہی، بہرحال محبت کا رشتہ بھی تھا۔

رشیدہ جتنی نور بانو سے خوفزدہ ہوئی، اتنا ہی اسے ارجمند پر ترس آیا۔ اس نے پہلے کبھی ارجمند کو اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کے لئے وہ محض ایک کیس تھی۔ اور اسے شروع ہی سے احساس تھا کہ ارجمند اسے ناپسند کرتی ہے۔ مگر اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اس کا تو واسطہ نور بانو سے تھا۔ لیکن جس دن ارجمند نے اسے جھڑکا اور اس کی حیثیت اسے یاد دلائی تو اسے احساس ہوا کہ یہ سیدھی سادی، کم عمر لڑکی روحانی طور پر بہت مضبوط ہے۔ وہ نہ جھوٹ بولتی ہے اور نہ کسی سے دبتی ہے۔ اس دن اس کی ڈانٹ کھا کر اس نے اسے اپنے لئے خطرناک سمجھ لیا اور اس کی اہمیت بھی سمجھ لی۔ یہ بات البتہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ نور بانو کے لئے اتنی بڑی قربانی کیوں دے رہی ہے؟ اس نے اس بات کو اپنی ہی روشنی میں دیکھا۔ اس نے یہی سمجھا کہ اس کی طرح نور بانو نے ارجمند کو بھی کوئی بڑا لالچ دیا ہوگا۔ ہر شخص کی اپنی ایک قیمت ہوتی ہے۔ اس کی کم تھی، ارجمند کی زیادہ ہوگی، اور بس۔

مگر اب سب کچھ جاننے کے بعد اسے اس پر ترس آ رہا تھا۔ بے چاری لڑکی......! اسے کچھ بھی تو نہیں ملے گا محرومی کے سوا۔ اپنے بچے سے بھی محروم، اور اس کے بعد شوہر سے بھی محروم۔

اسے اس میں ذرا بھی شک نہیں تھا کہ ارجمند کے ساتھ یہی ہوگا۔ جو عورت اتنی بڑی ان ہونی کو ممکن بنا سکتی ہے، اس کے لئے اپنی راہ کی رکاوٹ دور کرنا تو بہت معمولی سی بات ہوگی۔ بچہ کوئی چاند تو نہیں ہوتا کہ ہر آنگن میں نظر آ جائے۔ وہ تو جہاں ہوتا ہے، وہیں نظر آتا ہے اور جہاں نہیں ہوتا، وہ کوئی اس کا

گمان بھی نہیں کر سکتا۔ مگر اس عیار عورت نے تو کمال کر دکھایا ہے۔ اس نے تو چڑھتے چاند کو ساری دنیا کی نظروں سے اوجھل کر کے اپنے آنگن میں دکھا دیا۔

رشیدہ کو نور بانو سے صرف خوف نہیں آیا، اسے بہت شدید کراہت بھی محسوس ہوئی۔ اسے لگا کہ وہ ایک بہت بڑے گناہ میں شریک ہوگئی ہے۔ ارجمند کو وہ سمجھا نہیں سکتی تھی۔ وہاں سے سوائے ڈانٹ کے کچھ نہیں ملتا اسے۔ پھر وہ ضرورت مند تھی، اور اس کی ضرورت بہت بڑی تھی۔ ورنہ وہ اسی وقت وہاں سے رخصت ہو جاتی۔ ایک لمحے کو تو اس کا دل یہی چاہا تھا۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ یہاں اتنا وقت وہ لگا چکی ہے، وہ ضائع ہوگا۔ اور اب محض تین مہینوں ہی کی تو بات ہے۔ اور جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں اس کا کیا قصور؟ یہ تو یوں ہی ہونا تھا۔ وہ نہ ہوتی تو اس کی جگہ کوئی اور ہوتا۔ یہ معاملہ تو نہیں رکتا۔ اب کم از کم وہ اپنی زمین تو واگزار کرا سکے گی۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ، لیکن ایک عجیب بات ہوئی۔ رشیدہ کو نور بانو مکروہ لگنے لگی، لیکن ارجمند سے اسے محبت ہوگئی ...... بے غرض محبت ......! اگرچہ وہ اس کے لئے کر کچھ بھی نہیں سکتی تھی۔ مگر محبت کا کیا، وہ تو بس ہو جاتی ہے۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق کو کراچی واپس آئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔

اماں کی حالت کافی بہتر ہونے پر وہ اسلام آباد واپس گیا تو اس کے ذہن میں کچھ اور ہی نقشہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اماں کے صحت یاب ہونے تک ان کے پاس ہی رہنا چاہتا تھا۔ لیکن ملازمت کے سلسلے میں وہ اپنے سر کوئی الزام لے کر مسعود صاحب کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ویسے بھی اسے یقین تھا کہ جس طرح چھٹی منظور کرائے بغیر وہ لاہور آیا ہے، اس کے خلاف ڈسپلنری ایکشن ضرور لیا جائے گا۔ اس کے بعد اس کے سامنے استعفیٰ کا راستہ کھلا تھا۔ ویسے بھی منسٹر صاحب کے مخاصمانہ رویے کے بعد وہ ملازمت چھوڑ دینے کو ہی بہتر سمجھتا تھا۔

لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

وہ اسلام آباد پہنچا تو دوبارہ کسٹمز میں تبادلے کا لیٹر اس کا منتظر تھا۔

اس نے مسعود صاحب کو فون کیا۔

''آپ نے زبردستی معاملات کو جاری رکھنے کی کوشش کی ہے چچا جان ...... !'' اس نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

''نہیں بیٹے ...... ! تم معاملات کو زبردستی ختم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو مناسب نہیں تھا۔''

''مگر یہ سب کچھ ہوا کیسے ...... ؟''

''کلکٹر آف کسٹمز کا تو بس چلتا تو وہ پہلے ہی تمہارا ٹرانسفر نہ ہونے دیتے۔ میں نے بس اتنا کیا کہ انہیں صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ وہ تو بے تاب ہو رہے تھے تمہیں دوبارہ پانے کے لئے۔''

''چلیں ...... ! ٹھیک ہے ...... !''

''تم فوراً ہی کراچی چلے جاؤ ...... !''

''جی چچا جان ...... !''

اور کراچی پہنچ کر مسعود صاحب کی بات کی تصدیق ہوئی۔ کلکٹر صاحب نے اس کا ایسا پرتپاک خیر مقدم کیا، جیسے وہ ان کا برسوں کا بچھڑا ہوا بھائی ہو۔

''تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں تمہیں کتنا مس کر رہا تھا عبدالحق ...... !'' انہوں نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''مس تو میں بھی آپ کو کرتا رہا ہوں جناب ...... !''

''مگر دیکھ لو ...... میں نے تمہیں کھینچ کر بلایا ہی لیا نا ...... !''

''میں شکر گزار ہوں جناب ...... !'' عبدالحق نے کہا۔

کلکٹر صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''مجھے یقین نہیں آتا۔''

''کیوں جناب ...... !''

''تم نے مجھے فون پر کچھ بتانے کی زحمت نہیں کی۔ میں مسعود صاحب کا شکر گزار ہوں۔ وہ مجھے فون نہ کرتے تو ......'' کلکٹر صاحب کہتے کہتے رک گئے۔ چند لمحے وہ اسے بغور دیکھتے رہے، پھر بولے۔

"سچ بتاؤ.....! اگر میں نے مداخلت نہ کی ہوتی تو تم کیا کرتے.....؟"

"میرے کچھ کرنے نہ کرنے کا انحصار تو میرے خلاف محکمے کی کارروائی پر ہوتا جناب.....!"

"وہ تمہارے خلاف کارروائی کرتے تو تم کیا کرتے.....؟"

"میں استعفیٰ دے دیتا۔"

"مجھے بھی یہی یقین تھا۔" کلکٹر صاحب نے کہا۔ پھر پوچھا۔

"اور تم اس میں خوش رہے.....؟"

"جی ہاں جناب.....! دراصل میں اماں کو اس حالت میں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو لاہور سے ہی استعفیٰ ارسال کر دیتا۔ لیکن مسعود صاحب کی وجہ سے ایسا نہیں کیا۔"

"وہ بھی تمہیں بہت چاہتے ہیں۔ اور میں بھی تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا۔ خیر..... یہ بتاؤ.....! اب تمہاری اماں کا کیا حال ہے.....؟"

"بہتر ہیں۔ لیکن پوری سرح سنبھلنے میں بہت وقت لگے گا۔"

"میرے پاس تمہارے لئے ایک آفر ہے۔" کلکٹر صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہر ہفتے تم لاہور چلے جایا کرو اور منگل کو آفس آ جایا کرو۔ میری طرف سے پیر کی چھٹی۔ اس طرح تمہیں اپنی اماں سے دور ہونے کا احساس نہیں ہوگا۔ وہ بھی خوش رہیں گی۔ میرا خیال ہے کہ پلین سے آنا جانا تم افورڈ کر سکتے ہو۔"

"یہ تو مسئلہ نہیں..... لیکن ہر پیر کو چھٹی.....؟"

"ویسے تو یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ لیکن میں تمہیں جانتا ہوں کہ تم رعایت لینے والے نہیں۔ اس لئے تم مجھے ایک درخواست لکھ دو۔ میں اس کی منظوری دے دوں گا۔ تم پر کوئی بوجھ بھی نہیں ہوگا۔"

"بہت شکریہ جناب.....!"

"بس تو پہلی فرصت میں یہ درخواست مجھے بھجوا دو۔"

عبدالحق اٹھ کھڑا ہوا۔

تب سے اب تک وہ تین بار لاہور جا چکا تھا۔ وہ شکر گزار تھا کہ کلکٹر صاحب نے اتنی بڑی رعایت اسے دی۔ یہ حقیقت تھی کہ اس طرح سے اسے بھی اور اماں کو بھی، ایک دوسرے سے دور ہونے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

پچھلی بار جو تبادلہ ہوا تو وہ یعقوب کو یہیں چھوڑ گیا تھا۔ فائدہ تو ساتھ لے جانے میں ہی تھا۔ لیکن یعقوب کی بیوی اور اس کے بچوں کی وجہ سے اسے یہ اچھا نہیں لگا۔ مگر اب وہ فیصلہ اس کے لئے فائدہ مند ثابت ہوا تھا۔ گھر صاف ستھری حالت میں موجود تھا۔

عبدالحق نے اسے دیکھا تو بولا۔

"تم موٹے ہو گئے ہو مسٹر جیکب.....!"

"کرنے کو کچھ ڈیوٹی نہیں سر.....! بس بیٹھتا ہوں، کھاتا ہوں اور آرام کرتا ہوں۔ فیٹ تو ہونا ہی تھا۔"

"تو خالی بیٹھنے کے بجائے کوئی کام دھندا شروع کر دیتے۔"

"کیسے کر سکتا ہوں سر.....!" اس کے جواب نے عبدالحق کو حیران کر دیا۔

"کیوں بھئی.....!"

"آپ کا سرونٹ ہوں، سیلری آپ سے لیتا ہوں، تو کوئی دوسرا کام کیسے کر سکتا ہوں.....؟"

عبدالحق کو حیرت ہوئی۔ اس نے یعقوب کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ لیکن اس ایماندار جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔

"بالکل درست سوچا آپ نے مسٹر جیکب.....!" اس نے کہا۔

"لیکن یہ بتائیں کہ یہ بات آپ نے سیکھی کہاں سے.....؟"

"ہر اچھی بات کی طرح انگریز سے ہی سیکھی ہے یور ہائی نس.....!"

نہ جانے کیوں اس بار عبدالحق کو غصہ آ گیا۔

"بہت بری بات ہے یعقوب.....! یہ بات تو ہمیں ہمارا دین سکھاتا ہے۔ تمہاری بدنصیبی کہ تمہیں یہ بات انگریزوں سے سیکھنا نصیب ہوا۔"

یعقوب کچھ سہم گیا۔ عبدالحق نے پہلے کبھی اس سے ایسے لہجے میں بات

نہیں کی تھی۔

''سوری سر..... ! میں نے آپ کو اینگری کر دیا۔'' اس نے کہا۔

''لیکن سر..... ! آپ اپنے کلرکوں کو دیکھیں، سرکار سے سیلری لیتے ہیں تو پھر شام کو پارٹی والوں کے دفتر جا کر منتھلی کیوں لیتے ہیں؟ صرف اس لئے کہ ان کا کام جلدی کر دیتے ہیں۔ وہ تو ایک وقت میں تھرڈ فورتھ نوکریاں کرتے ہیں۔ انہیں دین یہ اچھی بات کیوں نہیں سکھاتا.....؟''

عبدالحق جانتا تھا کہ پارٹی والوں سے مراد کلیئرنگ ایجنٹ ہیں، اور کچھ کلیئرنگ ایجنسیاں ہر کام پر رشوت دینے کے بجائے ماہانہ رشوت مقرر کر دیتے ہیں، جو منتھلی کہلاتی ہے۔

''یہ دین کا نہیں، ان کا اپنا قصور ہے۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔

''اور یہ بھی سن لیں کہ یہ سب کچھ بھی انہیں آپ کا انگریز ہی سکھا کر گیا ہے۔''

''کیسے سر..... !''

''جب کسی سرزمین پر مختلف طبقوں کے لئے مختلف قانون نافذ ہوتے ہیں، یا کسی طبقے کو قانون سے بالاتر قرار دے دیا جاتا ہے تو وہاں لوگ اپنے فائدے کے لئے خلاف قانون رعایت دینے کے عادی ہو جاتے ہیں، اور رشوت فروغ پاتی ہے۔ مجھے یاد ہے، جب تم شروع میں میرے پاس آئے، اور پہلی بار پولیس والے نے چالان کے لئے گاڑی روکی تو تم کس طرح بھڑک کے تھے۔ تمہارے خیال میں چالان تو بہت دور کی بات، اسے ہماری گاڑی کو روکنے کا حق بھی نہیں تھا۔ کیا یہ بے اصولی اور بے ایمانی نہیں؟ اور یہ تم نے سیکھی کہاں سے؟ اپنے اس انگریز سے، جس پر عام لوگوں کا قانون لاگو نہیں تو یہ ڈھل مل قانون چھوڑ کر گیا ہے، جس سے برائی پر مائل لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔'' عبدالحق نے ایک گہری سانس لی، پھر سلسلہ کلام جوڑا۔

''اور میں نے تمہاری اس اچھائی پر تمہیں داد دی، جو بدقسمتی سے تم نے انگریزوں سے سیکھی۔ اب میں اس برائی پر تمہیں داد دیتا ہوں، جو تم نے انگریز سے

نہیں سیکھی۔ تم کسی انگریز کے سامنے اتنی جرح کر سکتے تھے؟''

یعقوب کا چہرہ سپید پڑ گیا۔

''اب آپ مجھے نکال دیں گے.....؟'' اس کے لہجے میں خوف تھا۔

عبدالحق کا غصہ ہوا ہو گیا۔ وہ مسکرایا۔

''میں انگریز ہوتا تو تمہیں شوٹ بھی کر سکتا تھا۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''لیکن میں مسلمان ہوں۔ تم میرے ملازم ضرور ہو۔ لیکن مجھے غلطی کرتے دیکھو تو مجھے ٹوکنے کا حق رکھتے ہو۔ یہ ہمارا دین سکھاتا ہے۔ ہمارے دین کے ایسے بڑے لوگ تھے، جو حاکمِ وقت تھے، مگر ان سے ایک عام آدمی بھرے مجمع میں یہ پوچھ لیتا تھا کہ آپ نے یہ کرتا کیسے بنا لیا، اتنا کپڑا تو نہیں ملا تھا آپ کو۔ تو انہوں نے برا مانے بغیر عاجزی کے ساتھ اس کی وضاحت کی، ایک عام آدمی کے سامنے صفائی پیش کی۔ اب اس سے ہم کچھ نہ سیکھیں تو یہ ہمارا قصور ہے یا انگریزوں کا کمال۔''

یعقوب دم بخود تھا۔ چند لمحے تو خاموشی رہی۔ پھر اس نے حیرت سے کہا۔

''سر جی..... ! واقعی ایسے لوگ تھے ہمارے ہاں.....؟'' پھر اس کے لہجے میں ندامت در آئی۔

''یہ تو سچ ہے سر جی..... ! ہم کالے لوگ تو انگریز کو غلط بات پر بھی نہیں ٹوک سکتے تھے۔ پر یہ بات اب تک میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی؟''

''بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگ نہیں سمجھ پائے، تمہارا کیا قصور ہے.....؟'' عبدالحق نے کہا۔

''یہ وہ لوگ ہیں، جو انگریزوں سے مرعوب ہو گئے تھے۔ ان کے سامنے احساسِ کم تری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں، جنہیں اپنے دین کی کچھ خبر نہیں۔ انہیں نہیں معلوم کہ وہ اللہ کے احکامات پر عمل کریں تو دنیا میں ان سے اچھا کوئی نہیں ہو سکتا۔''

''سر جی..... ! آپ نے پہلے کیوں نہیں ٹوکا مجھے.....؟'' یعقوب کی آواز

رندھ گئی۔

''میں تو اب بھی شرمندہ ہوں تمہیں ٹوک کر۔ میں تو تم سے معذرت کر رہا ہوں کہ میں نے تم سے اتنے سخت لہجے میں بات کیوں کی ...؟''

یعقوب نے ایک دم جھک کر عبدالحق کے پاؤں پکڑ لئے۔

''ایسے نہ کہیں صاب جی ...! آج تو مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں اب تک اندھیرے میں رہا ہوں۔''

''یہ اللہ کی مہربانی ہے تم پر ...!''

''پر صاب جی ...! آپ نے پہلے کیوں نہیں سمجھایا مجھے ...؟''

''میں سمجھاتا تو تمہاری سمجھ میں کچھ نہ آتا۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''دیکھو نا ...! تم میرے ملازمہ ہو۔ اور آدھی زندگی تم نے انگریزوں کی ملازمت کی ہے۔ ان سے تم نے یہ سیکھا کہ جو وہ کہیں، مان لو، خواہ غلط ہو۔ اس میں تمہارا فائدہ ہے۔ تم مجھ سے بحث نہ کرتے۔ لیکن میری بات کو دل سے قبول بھی نہ کرتے۔ تو فائدے کے بجائے نقصان ہی ہوتا تمہیں۔''

''تو سر جی ...! اب مجھے بتائیں، دین کیا ہے ...؟''

''اللہ کو ماننا، اس کے ہر حکم پر عمل کرنا، اور اسے جاننا۔''

''ماں نے بچپن میں کلمہ سکھایا تھا سر جی ...! مجھے تو بس وہی آتا ہے۔''

''وہی تو بنیاد ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''لیکن پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یوں تو طوطا بھی کلمہ رٹ لیتا ہے۔ مطلب بھی معلوم ہے اس کا ...؟''

''نہیں سر جی ...!'' یعقوب نے شرمندگی سے کہا اور سر جھکا لیا۔

''اچھا ...! تو کلمہ سناؤ مجھے۔''

یعقوب نے کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت سنا دیا۔

''یہ جو دوسرا کلمہ سنایا ہے نا تم نے، یہ کلمہ شہادت ہے، اور شہادت کا مطلب ہے، گواہی ....''

یعقوب بہت غور سے اس کی بات سن رہا تھا۔

''اب سوچو ...! گواہی دیکھے اور جانے بغیر تو نہیں دی جا سکتی۔ آدمی کو معلوم تو ہو کہ وہ کس بات کی گواہی دے رہا ہے؟ جھوٹی گواہی تو دنیا میں بھی جرم ہے اور اللہ کے ہاں بھی۔''

یعقوب کے جسم میں واضح طور پر تھرتھراہٹ نظر آئی۔

''تو غور سے سنو ...! اب میں تمہیں کلمہ شہادت کا مطلب بتا رہا ہوں۔ اس کا مطلب ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ واحد ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔''

یعقوب کے ہونٹ ہل رہے تھے، جیسے وہ عبدالحق کے الفاظ دہرا رہا ہو۔ پھر اس نے کہا۔

''اب سر جی ....! مجھے نہیں پتا کہ اللہ نے کیا کیا حکم دیا ہے تو میں مانوں گا کیسے ....؟''

''اس کے لئے اللہ نے کتاب نازل فرمائی۔ قرآن پڑھو گے تو سب معلوم ہو جائے گا۔ قرآن پڑھا ہے تم نے ....؟''

''میں نے بتایا نا سر جی ....! کہ کلمے کے سوا کچھ بھی نہیں آتا مجھے۔''

یعقوب نے بے بسی سے کہا۔ پھر بڑی عاجزی سے بولا۔

''آپ مجھے قرآن پڑھا دیں گے سر جی ...!''

''اس سے کیسے انکار کر سکتا ہوں میں ....؟ تم نے کہا تو یہ فرض ہو گیا مجھ پر۔ کل صبح سے انشاء اللہ اس پر عمل کریں گے۔''

''ٹھیک ہے سر جی ....!''

''تو اب میرے کھانے کی فکر کرو مسٹر جیکب ....!''

''نہیں سر ....! اب مجھے ایسے نہ پکاریں۔ میرے ماں باپ کا دیا ہوا اچھا نام انگریزوں نے بگاڑا، اور میں نے ان کو خوش کرنے کے لئے اسے قبول کر لیا۔ وہ میری جہالت تھی سر ....! اب میں یعقوب ہوں۔''

عبدالحق کو حیرت ہوئی۔ یعقوب برسوں سے اس کے ساتھ تھا، اور یہ بگاڑ اس سے بھی بہت پہلے کا تھا۔ ایک لمحے میں ...... صرف ایک لمحے میں وہ سب کچھ کیسے بدل گیا ...... ؟ یہ کیسے ممکن ہوا ...... ؟ شاید صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے پر ...... !

پھر اس نے سر جھٹکا۔ سب بہانے ہیں۔ اصل بات تو اللہ کی طرف سے ملنے والی ہدایت کی ہے۔ وہ جب، جسے چاہے، ہدایت دے دے۔ وہ ہدایت نہ دے تو آدمی سمجھانے پر بھی ضد پکڑ لے، اور گمراہ ہو جائے۔ اسی خوف سے تو اس نے آج تک یعقوب کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اس کی کراچی آمد سے عارف بھی بہت خوش تھا۔ اس نے عبدالحق سے گھر کے سب لوگوں کی خیریت دریافت کی۔

''اماں کو یرقان ہو گیا ہے۔ طبیعت تو اب بہت بہتر ہے۔ لیکن کمزور بہت ہو گئی ہیں۔'' عبدالحق نے بتایا۔

''ارجمند کیسی ہے ......؟'' عارف نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے یہ سوچ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ اب وہ میری بھابی بن گئی ہے۔''

''ٹھیک ہی ہو گی۔'' عبدالحق کے لہجے میں پژمردگی تھی۔

''فون پر بات ہوئی تھی اس سے۔''

''فون پر ......؟'' عارف بری طرح چونکا۔

''کیوں بھئی ...... ! تم لاہور رہ کر آئے ہو اتنے دن۔''

پچھلی بار عبدالحق نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن اب بات منہ سے نکل گئی تھی، اور جھوٹ وہ بولتا نہیں تھا۔

''دراصل وہ ایبٹ آباد میں ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''وہ کیوں بھئی ...... ! خیریت تو ہے ......؟''

اب اسے پوری بات بتانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

عارف نے درمیان میں اسے نہیں ٹوکا، لیکن اس کے چہرے پر گمبھیرتا چھا گئی تھی۔ عبدالحق کی بات مکمل ہونے کے بعد اس نے کہا۔

''میں ایسا کوئی حق تو نہیں رکھتا۔ لیکن میں نے ہمیشہ تمہیں چھوٹے بھائی کا درجہ دیا ہے۔ اجازت دو تو کچھ کہوں ......؟''

''کیسی بات کرتے ہیں عارف بھائی ...... ! میں بھی آپ کو بڑا بھائی ہی سمجھتا ہوں۔''

''تو پھر مجھے سمجھاؤ ...... ! یہ ایبٹ آباد کی منطق میرے حلق سے تو نہیں اتری۔ تم ایسے ضعیف الاعتقاد تو نہیں ہو۔''

''میں تو صرف نور بانو کی وجہ سے مجبور ہو گیا۔ ورنہ میں منت کا نہیں، شکر کا قائل ہوں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟ بھابی کی دل جوئی کے لئے کیا تمہیں دوسروں کے ساتھ اور اپنے ساتھ زیادتی کا حق مل گیا ہے۔''

عبدالحق نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''میں سمجھا نہیں عارف بھائی ......!''

''دیکھو نا ...... ! بھابی نے ایک منت مانی، تم نے ان کی خاطر اسے مان لیا۔ چلو ...... یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ تم نے بھابی کو ایبٹ آباد بھیج دیا۔ کوئی حرج نہیں۔ لیکن ارجمند کو ان کے ساتھ بھجوانے کیا تک تھی ......؟''

''اب نور بانو کو اکیلے تو نہیں بھیج سکتا تھا میں۔'' عبدالحق نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

''تم تو ایسے کہہ رہے ہو، جیسے تم نے بھابی کی دوسراہٹ کے لئے ارجمند کو ساتھ کر دیا۔ لیکن میں دعوی سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ بھابی کی فرمائش ہو گی۔ تمہیں یہ خیال ہرگز نہیں آیا ہو گا۔ تم نے تو بس بھابی کی بات مان لی۔''

''آپ درست کہہ رہے ہیں۔ لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے ......؟''

''بچوں کی سی بات کرتے ہو۔'' عارف کے لہجے میں ہلکی سی خفگی تھی۔

''زندگی کو سمجھتے ہی نہیں ہو کیا ......؟''

''آپ سمجھائیں نا ......!''

''بھئی ......! تمہاری ارجمند سے شادی کو مشکل سے تین ہفتے ہوئے ہوں

گے کہ تم کراچی واپس آ گئے، اور اب تم بتا رہے ہو کہ تمہارے یہاں آتے ہی بھابی ارجمند کو لے کر ایبٹ آباد چلی گئیں۔ اب تم ایبٹ آباد جا نہیں سکتے کہ بھابی کی منت کا سوال ہے۔ تمہیں یہ احساس نہیں ہوا کہ یہ ارجمند کے ساتھ زیادتی ہے، بلکہ تمہارے ساتھ بھی۔''

''زیادتی کی کیا بات ہے عارف بھائی.....! مجھے بھی اعتراض نہیں تھا اور ارجمند بھی اپنی خوشی سے گئی ہے۔''

''ارجمند تو تمہاری اور بھابی کی خوشی کے لئے گئی ہے۔ تمہاری خاطر وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اس صورت میں وہ تمہاری ذمہ داری ہے عبدالحق.....! وہ تو بس تمہاری خوشی کا خیال رکھے گی، اپنا نہیں، اس کا خیال تو تمہیں ہی رکھنا ہوگا۔''

''میں کیا کر سکتا تھا عارف بھائی.....! میں مجبور ہو گیا۔'' عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔

''تم اپنے حق سے دست بردار ہو سکتے ہو۔ لیکن بھابی کی خوش نودی کے لئے ارجمند کو اس کے حق سے محروم کرنے کا تمہیں حق نہیں۔ تمہیں احساس نہیں کہ تم نے ارجمند کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔''

عبدالحق کا چہرہ فق ہو گیا۔

''میں نے تو اس انداز میں سوچا ہی نہیں تھا۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں عارف بھائی.....!''

''اور غور تو کرو، چھ ماہ سے تم غیر فطری زندگی گزار رہے ہو۔''

''اس سے تو میں اختلاف کروں گا عارف بھائی.....! یہ تو بہت بڑی بات کہہ رہے ہیں آپ.....!''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں خود ایسی زندگی گزار رہا ہوں، اس لئے یہ بات جانتا ہوں۔'' عارف نے اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''دو بیویاں ہیں تمہاری.....! اور تم پھر بھی محروم ہو۔''

''یہ تو ایثار ہے عارف بھائی.....!''

''نہیں.....! یہ ایثار نہیں۔ یہ بے سبب خود کو فتنے میں ڈالنا ہے۔'' عارف

نے تیز لہجے میں کہا۔

''تم انسان ہو، فرشتہ تو نہیں ہو۔ سچائی کے ساتھ کہو کہ یہ دوریاں تمہارے لئے اذیت کا سبب نہیں بنیں۔''

عبدالحق نے اثبات میں سر ہلایا۔ منہ سے کچھ نہیں کہا۔

''اذیت کے بعد آزمائش اور پھر فتنے کا مرحلہ آتا ہے۔ تم جانتے ہو عبدالحق! کہ اس کے نتیجے میں میں گناہ کی دلدل میں جا پھنسا تھا۔ اللہ نادرہ کی مغفرت فرمائے کہ اس کی وجہ سے میں اس دلدل سے نکل آیا۔ اللہ کی رحمت ہوئی مجھ پر۔'' عارف نے کہا۔ پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

''چلو..... اپنے لئے تم نے محرومی منتخب کر لی، تمہاری مرضی.....! لیکن ارجمند تو نئی نویلی دلہن تھی۔ اسے محروم کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں تھا۔ کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس کے لئے تمہیں اللہ کو جواب دینا ہوگا۔''

عبدالحق کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو جسم میں خون نہیں۔

''اور ارجمند کا کون ہے اس دنیا میں.....؟ تم لوگ تو بعد میں ملے ہو اسے۔ اس سے پہلے نادرہ کے علاوہ بس اچھو میاں تھے، اور میں تھا۔ اب اچھو میاں تو یہاں نہیں ہیں۔ لیکن میں تو ہوں۔ تم نہیں سمجھ سکتے، وہ میرے لئے بہن بھی ہے اور بیٹی بھی۔ میں اسے اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ تم اس کے ساتھ زیادتی کرو گے تو میں تم سے ضرور باز پرس کروں گا۔''

''میں بہت شرمندہ ہوں عارف بھائی.....! مجھے معاف کر دیں۔''

''تم بھی تو میرے لئے بھائی ہو۔'' عارف نے محبت سے کہا۔

''تم عقل مند بھی ہو اور اللہ سے ڈرنے والے بھی۔ پھر بھی تم اس غیر فطری پن کو نہیں سمجھ سکے۔ دیکھو نا، فطری تو یہ ہوتا کہ تم ارجمند کو کراچی ساتھ لاتے۔ بھابی اپنی منت پوری کرنے کے لئے بے شک ایبٹ آباد چلی جاتیں۔ وہ ان کا اپنا معاملہ تھا۔ انہوں نے خود تو غلط کیا ہی، لیکن تمہیں بھی گمراہ کر دیا۔ اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے دانستہ ایسا کیا۔''

عبدالحق نے سر اٹھا کر حیرت سے عارف کو دیکھا۔ پھر اس کی نگاہوں میں

شکایت سی مچلی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''اس بات کا بہت قوی امکان ہے عارف بھائی.....! کہ یہ آپ کی بدگمانی ہو۔ اور بدگمانی ہے۔تو بہت بڑی ہے۔''

''تم برا نہ ماننے کا، میری بات پر غور کرنے کا وعدہ کرو تو کچھ کہوں...؟''

عبدالحق ہچکچایا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ بات بہت ناپسندیدگی ہوگی۔ اسے سننے سے بہتر ہے کہ بات یہیں روک دی جائے۔لیکن اسے یہ احساس ہوگیا تھا کہ عارف کی کہی ہوئی ہر بات اب تک درست ہے۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ اس نے ارجمند کے ساتھ بہت سنگین زیادتی کی ہے۔ وہ واقعی اس کے لئے اللہ کو جواب دہ ہے۔ اندر ہی اندر اس پر لرزہ طاری تھا۔

سو اس نے بہ تکلیف وہ فیصلہ کیا کہ سب کچھ سن لینا ہی بہتر ہے۔ اس سے کچھ راہنمائی ہی ملے گی۔

''کہیں عارف بھائی.... ! برا ماننے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ میں ہر بات پر غور کرتا ہوں۔''

عارف نے ایک گہری سانس لی۔اور چند لمحے سوچتا رہا۔ جیسے کسی پیچیدہ بات کو ذہن میں مرتب کر رہا ہو۔ پھر اس نے کہا۔

''تم سادہ آدمی ہو عبدالحق.....! محبت کرنے والے اور اچھا گمان رکھنے والے ہو۔مگر میں نے زندگی کے اور عورتوں کے اتنے روپ دیکھے ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ میں بھابی نور بانو کے بارے میں جو کچھ کہوں گا، اس کا مقصد تمہارے اور ان کے درمیان تفرقہ ڈالنا نہیں ہے۔ میں تمہاری راہنمائی کے لئے یہ سب کہہ رہا ہوں۔ دو بیویوں کے درمیان انصاف کرنا آسان نہیں، اور اللہ معاف کرنے والا ہے۔لیکن بے انصافی سرزد ہوگئی تو سمجھ کر بڑا نقصان ہے۔ اور خاص طور پر اس لئے بھی کہ ارجمند کے ساتھ بے انصافی ہوگی تو وہ شکایت بھی نہیں کرے گی۔ اور جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں، بھابی نور بانو تمہارے لئے اس سلسلے میں قدم قدم پر مشکل کھڑی کرتی رہیں گی۔''

عبدالحق کو یہ سننا بہت برا لگا۔لیکن اسیر محبت ہونے کے باوجود بات پر غور کر کے، تجزیہ کر کے اس کے بارے میں فیصلہ کرنا اس کی فطرت میں تھا۔ چنانچہ اس نے بہت حلیمی سے کہا۔

''اس آخری بات کی وضاحت کریں گے آپ...؟''

''ضرور.....! عارف نے کہا اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''عورت کو اللہ نے بڑی حیثیت اور مرتبہ عطا فرمایا ہے۔لیکن وہ بھی انسان ہیں۔ کچھ منفی چیزیں بھی ان کے مزاج میں ہوتی ہیں۔ سب عورتیں تو ایسی نہیں ہوتیں۔لیکن کچھ عورتیں مکار بھی ہوتی ہیں۔ میں نے اپنی بیوی کو دیکھ کر یہ بات سمجھی ہے۔ وہ اپنی مرضی چلاتی ہے۔لیکن ایسے کہ کوئی پکڑ نہیں سکتا۔ وہ جو ارادہ کر لے، اس پر بغیر کہے مجھ سے ہی عمل کراتی ہے۔ میں یہ بات جانتے ہوئے بھی اس کی مرضی پر چلتا ہوں۔ کیونکہ میرے سامنے کوئی اور راستہ نہیں ہوتا۔ وہ میری فطرت، میرے مزاج کو سمجھتی ہے، اور اس سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اس کا کھلونا ہوں، لیکن میں کچھ کر نہیں سکتا۔''

''لیکن نور بانو ایسی نہیں ہے عارف بھائی....!''

''یہ سچ ہے کہ میں انہیں نہیں جانتا۔ میں نے انہیں دیکھا بھی نہیں۔لیکن جو کچھ تم نے مجھے بتایا، اس کی روشنی میں تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے تمہیں بھی استعمال کیا اور ارجمند کو بھی۔''

''کیسے.....؟''

''دیکھو نا.....! یہ بہت بڑی خوش خبری ہے کہ وہ ماں بننے والی ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے تم سے دور رہنے کی منت مانی، یہ بات تو میری سمجھ میں آتی ہے۔لیکن وہ ارجمند کو اپنے ساتھ لے گئیں، یہ بات عجیب سی ہے۔ انہیں تو ارجمند کو تمہارے ساتھ بھیج دینا چاہئے تھا، تاکہ تمہیں گھر کا آرام میسر رہے۔ تمہیں احساسِ تنہائی نہ ہو۔''

''آپ کے خیال میں نور بانو نے ایسا کیوں کیا.....؟''

''اس پر تو تمہیں غور کرنا چاہئے۔''

"مجھے تو یہ بات اہم نہیں لگی۔ آپ مجھے بتائیے کہ آپ کیا سمجھتے ہیں؟ پھر میں اس پر غور کروں گا۔"

"میں تو حیران ہوں کہ تمہیں یہ بات غیر اہم لگی۔ بہرحال میرے خیال میں تو بات بالکل واضح ہے۔ بھابی نے یہ خطرہ مول نہیں لیا کہ وہ نو ماہ تم سے دور رہیں، اور ارجمند تمہارے ساتھ رہے۔ اس ڈر سے کہ تمہارا جھکاؤ اس کی طرف زیادہ نہ ہو جائے۔ اس خوف سے کہ کہیں تم ان سے دور نہ ہو جاؤ۔"

"مجھے اس سے اختلاف ہے عارف بھائی......! نور بانو جانتی ہے کہ میں اس کے سوا کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔"

"اس یقین کے باوجود شک کرنا اور شوہر کو کھونے سے ڈرنا عورت کی فطرت ہوتی ہے۔"

"عارف بھائی......! میں تو دوسری شادی کبھی نہیں کرتا۔ نور بانو نے مجبور کر دیا، اور کچھ مجھے اماں کا بھی خیال تھا۔ مگر آپ خود سوچیں، یہی سب کچھ کرنا ہوتا تو نور بانو ارجمند سے خود میری شادی کیوں کراتی......؟ اور وہ نہ کراتی تو یہ شادی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔"

"تم سادہ آدمی ہو۔" عارف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خود کو بھابی کی جگہ رکھ کر سوچو تو بات سمجھ میں آنے میں ذرا دیر بھی نہیں لگے گی۔"

عبدالحق نے چند لمحے غور کرنے کے بعد بے بسی سے کہا۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا عارف بھائی......!"

"اور تم سے بہتر اس بات کو کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ کیونکہ تم بھابی کو جانتے ہو۔ میں نہیں جانتا۔" لیکن کوشش کر سکتا ہوں۔ مگر تمہاری مدد کے بغیر میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔"

"میں حاضر ہوں......!"

"میرے سوالوں کے بے لاگ جواب دینے ہوں گے۔"

"آپ جانتے ہیں......"

"جانتا ہوں کہ جھوٹ تم نہیں بولتے۔" عارف نے اس کی بات کاٹ دی۔

"لیکن محبت میں آدمی کے لئے غیر جانبداری بہت مشکل ہو جاتی ہے۔"

"الحمدللہ......! مجھ پر اللہ کا کرم ہے۔ اس سے ڈرتا ہوں نا...... تو ہمیشہ حق بات کہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ انسان ہوں، غلطی تو ہو جاتا ہے۔ لیکن دانستہ بے انصافی نہیں کر سکتا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ......! بھابی کی فطرت میں حسد ہے...... خاص طور پر تمہارے معاملے میں......؟"

"جی ہاں......! بہت زیادہ ہے۔" عبدالحق نے بے جھجک کہا۔

"قابضانہ فطرت بھی ہے......؟ تمہیں کسی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کرنا چاہتی ہوں گی......؟"

عبدالحق کی آنکھوں میں شیر خوار ساجد کی صورت پھر گئی۔

"جی ہاں......! وہ ایسی ہی ہے۔"

"تو پھر وہ تمہاری دوسری شادی کیسے گوارہ کر سکتی تھیں......؟ اس پر یہ کہ انہوں نے خود تمہاری دوسری شادی کرائی۔ چلو...... کرا بھی دی تو کسی معمولی سی لڑکی سے کراتیں، جو ان سے کم تر ہوتی۔ مگر انہوں نے تو ارجمند سے تمہاری شادی کرائی، جو غیر معمولی طور پر حسین ہے۔"

"یہ بات تو میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔"

"ایک بات اور بتاؤ......! تم اپنی اماں کے تو بہت فرمانبردار ہو گے......؟"

"الحمدللہ......! وہ تو میں ہوں۔"

"اور اماں کو پوتے کی آرزو بھی ہوگی......؟"

"بہت زیادہ ہے۔"

"تو انہوں نے کبھی تم سے دوسری شادی کے لئے نہیں کہا......؟"

"اصرار نہیں کیا کبھی، حکم نہیں دیا۔" عبدالحق نے کہا۔

"دراصل وہ نور بانو سے بہت محبت کرتی ہے۔ بیٹی کی طرح چاہتی ہے

اسے۔''

''اگر وہ حکم دیتیں تو تم انکار کر سکتے تھے ....؟''

''یہ کیسے ممکن ہے عارف بھائی ....!''

''اور یہ بات بھابی کو بھی معلوم ہے ....؟''

''ہاں .... ! ایک بار بات ہوئی تھی اس سے۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''ان دنوں اماں پیروں فقیروں اور درگاہوں کے چکر کاٹ رہی تھیں پوتے کے لئے۔ نور بانو اس بات سے بہت چڑتی تھی۔ وہ ایک بار ان سے الجھی بھی، مجھ سے بھی شکایت کی تو میں نے یہ بات کہہ دی کہ اماں کی طلب تو فطری ہے۔ اور وہ مجھے دوسری شادی کا حکم دیں تو میں چاہتے ہوئے بھی ان کا حکم نہیں ٹال سکتا۔ تو اس سے بہتر ہے کہ ان کا لایا ہوا پڑھا ہوا پانی پی لیا کرو۔''

''پھر کیا ہوا ....؟''

''پھر میرا ٹرانسفر ہو گیا۔ ہم کراچی آ گئے، اور نور بانو کو پیروں فقیروں کی عنایات سے نجات مل گئی۔''

''حیرت ہے ....! ایک طرف تو اولاد کی طلب ہونے کے باوجود بھابی کو پیروں فقیروں سے چڑ تھی۔ اور دوسری طرف انہوں نے اولاد کے لئے اتنی سخت اور احمقانہ منت مان لی۔'' عارف نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''اور میں حیران ہوں عبدالحق ....! کہ اتنا کچھ جاننے کے بعد بھی تم یہ بات نہیں سمجھ سکے کہ بھابی نے ارجمند سے تمہاری شادی کیوں کرائی ....؟''

''آپ سمجھا دیں نا ....!''

''ہاں ....! اب میں سمجھا سکتا ہوں۔'' عارف معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

''تمہاری شادی کو پندرہ سال ہو گئے۔ اماں پوتے کی آرزو میں بوڑھی ہو گئیں۔ بھابی یہاں کراچی میں محفوظ تھیں۔ لیکن بیماری نے انہیں لاہور جانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن وہ جانتی تھیں کہ اب اماں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہوگا۔ وہ تمہاری دوسری شادی کرا دیں گی، اور یقیناً تمہارے لئے بہت خوب صورت اور اچھی لڑکی

تلاش کریں گی۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ یوں معاملات ان کے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ اس سے بہتر ہے کہ معاملات اپنے ہی ہاتھ میں رکھے جائیں، اور خود ہی ہنسی خوشی، اصرار کر کے تمہاری دوسری شادی کرا دی جائے۔ اب اگر وہ کسی عام سی لڑکی سے تمہاری شادی کراتیں تو اماں کو اعتراض ہوتا۔ بھابی کے سامنے ارجمند کی صورت میں بہت اچھا آپشن موجود تھا۔ وہ خوب صورت بھی ہے، خوب سیرت بھی اور کم عمر بھی۔ اس سے اسے کیا فائدہ ....؟''

''میں جواب دے رہا ہوں۔ تم خود غور کرو تو جواب تمہیں بھی مل جائے گا۔ دیکھو، کہیں باہر تمہاری دوسری شادی ہوتی تو بھابی کا اس پر کوئی زور نہ ہوتا۔ اس سے مقابلہ رہتا ان کا۔ اور وہ تیز طرار ہوتی تو ان کے لئے خطرہ بن جاتی۔ ارجمند کی بات اور تھی۔ وہ ان کی فرمانبردار تھی، اور اب بھی ہے۔ اس سے انہیں کوئی خطرہ نہیں۔ اور یہ بات ثابت بھی ہو گئی۔ ارجمند کی جگہ کوئی اور ہوتی تو وہ بھابی کے ساتھ ایبٹ آباد چلی جاتی بھلا ....؟ کبھی نہیں جاتی۔ وہ تو اس موقع کو غنیمت جان کر تمہیں جکڑ لیتی۔ اور دوسرے زاویے سے دیکھو تو بھابی نے تم پر بھی اور اماں پر بھی اپنی کشادہ دلی اور ایثار ثابت کر دیا۔ کہو، اب سمجھ میں آئی بات ....!''

''مگر یہ تو آپ کا گمان ہے عارف بھائی ....!'' عبدالحق نے احتجاج کیا۔

''نہیں ....! تمام معلومات، صورتِ حال اور پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے یہ ایک غیر جانبدارانہ تجزیہ ہے۔ تم تو خود تجزیہ کرنے والے ہو عبدالحق ....! خود غور کر کے دیکھو۔''

عبدالحق کو ماننا پڑا کہ عارف کی بات سچی ہے۔

''میرا خیال ہے، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں عارف بھائی ....!''

''صرف یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا عبدالحق ....!'' عارف نے کہا۔

''تمہاری ذمہ داری اس وجہ سے اور بڑھ گئی ہے کہ ارجمند شکایت کرنے والی نہیں ہے۔ وہ منہ سے کچھ مانگے گی بھی نہیں۔ تمہیں خود ہی اس کا خیال رکھنا ہوگا۔ تمہیں اس کو ہر زیادتی سے بچانا ہوگا۔ تمہیں بھابی کی طرف سے، اور ان کی چالوں کی طرف سے محتاط رہنا ہوگا۔ یہ نہ کیا تو بڑے نقصان میں رہو گے تم ....!

اللہ کے سامنے جواب دینا ہوگا۔''

''میں سمجھ گیا، عارف بھائی.....! اور پوری طرح سمجھ گیا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اب اس وقت تو کچھ کرنے کا فائدہ نہیں۔ ویسے بھی تھوڑے ہی دن کی بات ہے۔ البتہ مستقبل میں میں خیال رکھوں گا۔''

''یہ بات تمہاری ٹھیک ہے۔ بھابی کو یہ احساس نہ ہونے دینا، ورنہ وہ ارجمند کی دشمن بن جائیں گی۔'' عارف نے کہا۔ پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

''اور عبدالحق.....! ایک بات بتا دوں، ارجمند ایک غیر معمولی لڑکی ہے..... خاص طور پر تمہارے حوالے سے۔''

''وہ کیسے عارف بھائی.....!''

''اس نے کبھی تمہیں جتایا کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے.....؟''

عبدالحق کا چہرہ تمتما اٹھا، جیسے وہ اس تذکرے پر شرمندہ ہوا ہو۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں عارف بھائی.....! البتہ جب نادرہ نے اسے میرے سپرد کیا تو اس نے یہ بات مجھے بتائی ضرور تھی، اور وہ اتنی کم عمر تھی کہ میں نے اسے اہمیت نہیں دی۔ لیکن اس سے بھی پہلے نادرہ نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔ اس وقت میں نے ارجمند کو دیکھا ہی نہیں تھا، اس لئے میں پریشان ہوگیا۔ نور بانو کے مزاج سے میں واقف تھا۔ مجھے لگا کہ یہ میرے لئے سنگین مسائل کھڑے کرسکتا ہے۔ میں نے یہ بات نادرہ سے کہی بھی۔ لیکن اس نے کہا کہ ایسا نہیں ہوگا۔'' عبدالحق کھو سا گیا۔

''اور ایسا کبھی ہوا بھی نہیں۔''

''نہیں.....! کبھی نہیں.....! نور بانو تو ارجمند کو دیکھتے ہی اس پر فدا ہوگئی۔ اس میں اسے اپنی چھوٹی بہن نظر آتی تھی۔ اور میں بڑی سچائی سے کہہ رہا ہوں کہ نور بانو نے اس کا ہمیشہ ایسے ہی خیال بھی رکھا، جیسے وہ اس کی چھوٹی بہن ہو۔ اس نے مجھے مجبور کیا کہ میں ارجمند کو پڑھاؤں۔ اور حیرت انگیز بات یہ کہ پڑھائی کے

دوران ہم ہمیشہ تنہا رہے۔ نور بانو نے کبھی وہاں گھسنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ وہ تو بہت شکی ہے۔''

''لیکن ارجمند نے اس تنہائی میں تم سے کبھی اپنے دل کی بات نہیں کی ہوگی۔''

''جی عارف بھائی.....! کبھی نہیں.....!''

''جانتے ہو، کیوں.....؟''

عبدالحق نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہی تو غیر معمولی پن ہے اس کا۔'' عارف نے کہا۔

''تم نے کہا کہ اس کی کم عمری کی وجہ سے تم نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی۔ جبکہ اسے تم سے محبت اس عمر میں ہوئی تھی، جس میں بچوں کے پاس محبت کا تصور بھی نہیں ہوگا۔''

''جی.....! نادرہ نے مجھے بتایا تھا۔''

''ارجمند اس محبت کے ساتھ بڑی ہوئی، یا یوں کہہ لو کہ وہ محبت اس کے ساتھ بڑی ہوئی۔ اب اس میں کون شک کرسکتا ہے کہ وہ محبت اللہ کی دی ہوئی تھی۔ نادرہ نے مجھے اس کے بارے میں بتایا۔ ارجمند کہتی تھی کہ اللہ میاں اس سے بات کرتے ہیں۔ نادرہ خوف زدہ تھی کہ یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔ لیکن جب ارجمند نے کچھ ایسی باتیں بتائیں، جو اسے کسی طرح معلوم ہو ہی نہیں سکتی تھیں تو نادرہ اس کا احترام کرنے لگی۔ پھر جب ارجمند کو تمہیں سونپنے کا مرحلہ آیا تو نادرہ نے ارجمند کو بہت سمجھایا، اسے بتایا کہ تمہاری بیوی بہت شکی ہے۔ تو ارجمند نے اس سے کہا کہ وہ پریشان نہ ہو۔ اللہ میاں نے اسے بتا دیا ہے کہ اسے اس سلسلے میں کچھ نہیں کرنا۔ جب اللہ کا حکم ہوگا تو تم اسے خود بخود مل جاؤ گے..... بغیر کچھ کہے، بغیر کچھ کئے۔ یہ وجہ تھی کہ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنے یقین کے سائے میں سکون سے بیٹھی رہی۔

اب تم خود سوچو کہ یہ غیر معمولی بات ہے یا نہیں.....؟ محبت میں تو بڑے بڑے بردبار لوگ بے صبرے ہو جاتے ہیں، وہ تو کم عمر لڑکی تھی، اور کم عمری کی محبت

تو پہاڑی دریا کی طرح منہ زور ہوتی ہے۔ تم کراچی آ گئے۔ برسوں اس سے دور رہے۔ اس نے کبھی تمہیں خط بھی نہیں لکھا۔ فون پر بھی بس رسمی گفتگو ہی کی۔ کیسا صبر تھا اس بچی میں......؟

اور غیر معمولی بات دیکھو کہ اس کا یقین سچا ثابت ہوا۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا، کسی سے کچھ نہیں مانگا سوائے اللہ کے۔ اور جو اس نے چاہا، وہ اسے ملا اور کس شان سے ملا۔ تم جانتے تھے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ لیکن تم ہرگز اس سے شادی نہ کرتے۔ لیکن بھابی نے تمہیں مجبور کر دیا۔ اور سوچو .....! بھابی نے ارجمند سے کیسے خوشامد کی ہوگی......؟ اس سے کہا ہوگا کہ وہ تم سے شادی کے لئے ہاں کرے گی تو یہ اس کا ان پر احسان ہوگا۔ کتنے وقار کے ساتھ اس نے تمہیں پالیا۔ کیونکہ اس نے بڑے صبر کے ساتھ اللہ پر بھروسہ کیا تھا۔ محبت میں کسی نوعمر لڑکی سے ایسی امید رکھی جا سکتی ہے......؟

اور اب اتنی مضبوطی کے ساتھ تمہیں پانے کے باوجود اس کے انکسار کا یہ عالم ہے کہ بھابی کے کہنے پر وہ ان کے ساتھ اتنے طویل عرصے کے لئے ایبٹ آباد چلی گئی۔ حالانکہ اپنے احسان کے حوالے سے وہ ان پر زور بھی رکھتی تھی، اور انکار کرنے کا حق بھی تھا اسے۔ اس نے اس سلسلے میں تم سے بھی کچھ نہیں کہا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اسے تم سے کوئی شکایت بھی نہیں ہوگی۔ وہ ایسی ہی ہے، سب کچھ اللہ پر چھوڑ دینے والی۔ اور عبدالحق......! ایک بات کہوں، میں تو مذہبی آدمی بھی نہیں ہوں۔ عام سا گناہ گار آدمی ہوں۔ لیکن میں سمجھ سکتا ہوں کہ ایسی لڑکی بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس کا خیال اللہ رکھے گا، اور کوئی اس کی حق تلفی کرے گا تو وہ اللہ کو خفا کرے گا۔ اسی لئے میں نے تم سے تمہارے ذاتی معاملے میں تم سے اتنی بات کی ہے۔ میں تمہیں خسارے میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ تم میرے بھائی ہو، اور تم تو دیندار بھی ہو۔''

عبدالحق سر جھکائے خاموشی سے یہ سب کچھ سنتا رہا تھا۔ عارف کی بات ختم ہوئی تو اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھر اس نے جھک کر عارف کا ہاتھ تھاما، اسے ہونٹوں سے اور پھر اپنی نم آنکھوں سے

لگایا۔

''جزاک اللہ......! عارف بھائی......! اس وقت آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ آپ نے بھائی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ مجھے جو کچھ سمجھنا چاہئے تھا، اور میں نہیں سمجھ سکا تھا، آپ نے بہت اچھی طرح مجھے سمجھا دیا۔ بے شک......! ارجمند میرے لئے بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ میں نے غفلت کی، اب نہیں کروں گا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے ہر طرح سے ارجمند کا خیال رکھنا ہوگا، ورنہ میں بڑے خسارے میں پڑ جاؤں گا۔ اب انشاء اللہ کوتاہی نہیں ہوگی عارف بھائی......!''

عارف نے بڑی محبت سے اسے دیکھا۔

''مجھے ارجمند کی طرح تم بھی نادرہ کے ذریعے ہی ملے ہو۔ مجھے ارجمند ہی کی طرح عزیز ہو تم......!''

''اب تک جو ہوا سو ہوا...... آئندہ میں بہت محتاط رہوں گا۔''

بات ختم ہو گئی۔ لیکن عبدالحق کو احساس تھا کہ عارف نے بہت بڑی بات اس پر کھول دی ہے۔

عارف کے سامنے تو وہ اعتراف نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لئے خاموش رہا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ نور بانو کی فطرت کیسی ہے۔ محبت تو آدمی دل سے کرتا ہے۔ لیکن عبدالحق محبت میں اندھا ہو جانے والا نہیں تھا۔ وہ خوبیوں، خامیوں اور کمزوریوں پر نظر رکھنے والا تھا۔ وہ اپنے محبوب کو اس کی خامیوں اور کمزوریوں سمیت قبول کرنے کا قائل تھا۔ اس نے اس سلسلے میں پہلے بھی بہت کچھ سوچا تھا۔ محبت تو اس کا خاص موضوع تھا...... اس وقت سے، جب اسے محبت ہوئی بھی نہیں تھی۔'' اور بعد میں تو اس نے اس پر بہت زیادہ سوچا تھا۔

اسے یاد تھا، نور بانو سے شادی سے پہلے حمیدہ نے اسے سمجھایا تھا۔ حمیدہ نور بانو کو بہت چاہتی تھی، بیٹیوں کی طرح، اور شادی کی تجویز بھی اسی نے پیش کی تھی۔ لیکن شادی سے پہلے دو باتیں ایسی ہوئیں کہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ یہ رشتہ مناسب بھی ہے یا نہیں، اور یہ کہ یہ شادی چل بھی سکے گی یا نہیں۔ سب سے

پہلے تو نور بانو نے ننھے ساجد کے معاملے میں جس تنگ نظری، بلکہ حسد کا مظاہرہ کیا۔ اس نے حمیدہ کو چونکا دیا۔ پھر جب اعتکاف کے بعد نور بانو کے اصرار پر اس نے داڑھی رکھنے کا ارادہ موخر کیا تو وہ بھی حمیدہ کو بہت برا لگا۔ ان دونوں موقعوں پر خود عبدالحق کو بھی شرمندگی ہوئی۔ تب حمیدہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ شادی عمر بھر کی بات ہے، وہ خوب سوچ لے۔

اور اس نے خوب سوچ سمجھ کر ہی شادی کا فیصلہ کیا تھا۔ حمیدہ نے اسے احساس دلایا تھا کہ نور بانو کوئی حسین لڑکی نہیں ہے۔ مگر اس نے بہت سوچ سمجھ کر کہا تھا کہ وہ اسے دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی لگتی ہے۔ اور یہ بات آج تک سچی ثابت ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ارجمند بہت حسین ہے۔ لیکن اسے نور بانو اس سے زیادہ خوب صورت لگتی تھی۔

تو عبدالحق جانتا تھا کہ نور بانو حاسد اور تنگ نظر ہے۔ اس کی فطرت قابضانہ ہے۔ اس نے کوشش کی تھی کہ نور بانو کو ان کمزوریوں کا احساس دلائے، تاکہ وہ انہیں دور کرنے کی کوشش کرے۔ ایسا نہیں ہو سکا۔ لیکن حمیدہ کے معاملے میں عبدالحق نے اسے یہ احساس دلا دیا کہ وہ ماں ہے، اور اس کے معاملے میں وہ کوئی لحاظ، کوئی مروت نہیں کرے گا۔ اس نے نور بانو کو جتا دیا کہ حمیدہ کا حکم وہ کبھی نہیں ٹال سکے گا۔ اور اس میں اس نے بڑی سختی دکھائی۔

لیکن بدقسمتی سے نور بانو کے معاملے میں وہ ایسا نہیں کر سکا۔ اس نے اس بات کی اہمیت سمجھی ہی نہیں۔

محبت اپنی جگہ، لیکن وہ حقیقت پسند تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ارجمند ہر طرح سے نور بانو سے برتر ہے۔ درحقیقت ان کے درمیان موازنہ کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ارجمند اس سے کتنی محبت کرتی ہے، اور اس محبت میں کتنی گہرائی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی محبت بے طلب تھی۔ وہ محبت کے جواب میں کچھ مانگتی بھی نہیں تھی۔ اور وہ محبت صرف دنیاوی نہیں تھی، وہ اللہ کے تعلق کے ساتھ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایسی محبت کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ مگر اس کا کیا کرتا کہ وہ پہلے ہی سے نور بانو کو اسیر تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ وہ اس

محبت کی ناقدری کرے، ارجمند کے ساتھ بے انصافی ..... بلکہ زیادتی کرے۔ زیادتی ہونے دے، یہ بھی زیادتی ہی ہے۔

اس نے عارف کے سامنے یہ بات قبول تو نہیں کی۔ لیکن دل میں مان لیا کہ نور بانو نے مکاری سے کام لیا ہے۔ اس نے دانستہ اسے ارجمند سے دور کیا ہے۔ اور یہ سچ تھا کہ وہ ارجمند سے سگی بہن جیسی محبت کرتی تھی۔ اگر وہ اس کے ساتھ ایسا کر سکتی ہے تو اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو نہ جانے اس کے ساتھ کیا کرتی۔ عارف نے نور بانو کے سلسلے میں جو یہ توجیہہ کی تھی کہ اس نے ارجمند سے کیوں اس کی شادی کرائی، تو عبدالحق اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اس روز پہلی بار اسے نور بانو پر غصہ آیا۔ وہ محبت کیا، جو آدمی کو اللہ سے غافل کر دے، اسے اللہ کا مجرم بنا دے۔ وہ یہ یاد کرنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس محبت نے ابتداء میں تو اسے نماز اور قرآن سے بھی دور کر دیا تھا۔ مگر اسے یہ یاد تھا کہ ارجمند کی آمد نے دوبارہ اسے اللہ کی راہ پر لگایا تھا۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ بڑے خسارے سے بچنے کے لئے اسے بہت محتاط رہنا ہوگا۔

❁ ❁ ❁

شدید بیماری بھی حمیدہ کی اس خواہش کو کمزور نہیں کر سکی تھی کہ عبدالحق کے ہاں اولاد ہو تو اس کی نگاہوں کے سامنے ہو۔ یہ تو اس کا بہت بڑا ارمان تھا۔ اس سے وہ دست بردار ہونا نہیں چاہتی تھی۔

اس نے حساب لگایا۔ ابھی دو ماہ باقی تھے۔ یہ بھی اچھی بات تھی کہ صفیہ بیگم اس کے ساتھ ہی آئی تھیں۔ وہ اب بھی ان کے ساتھ ایبٹ آباد جا سکتی تھی۔ اکیلے پن کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

حق نگر سے آتے ہی وہ بیمار پڑ گئی تھی۔ اب اس بات کو ڈیڑھ ماہ ہو چکا تھا۔ ابتداء میں تو وہ اتنی کمزور تھی کہ ہلنا بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ لیکن اب آہستہ آہستہ کمزوری دور ہو رہی تھی۔ حکیم صاحب کا تو کہنا تھا کہ کم از کم چار ماہ اسے آرام کرنا چاہئے۔ لیکن طبیبوں کا کیا ہے، وہ تو بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔

اسپتال کے ڈاکٹر نے تو کہا تھا کہ چھ ماہ تک وہ بستر سے اترنے کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ بلکہ اس کے چہرے تاثر سے تو اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دل ہی دل میں اس کے لئے فاتحہ پڑھ رہا ہے۔

یہ سوچتے ہوئے وہ مسکرا دی۔ اب وہ ڈاکٹر اسے دیکھے تو شاید مایوس ہو کر اس کے اندازے کے برعکس وہ صرف ڈیڑھ مہینے میں اس حد تک سنبھل گئی ہے کہ خود سے اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔

اس میں عبدالحق کا بھی بڑا دخل تھا۔ دفتر جانے کے ایک ہفتہ بعد ہی وہ خلافِ توقع آ گیا تھا۔ وہ تو اسے دیکھ کر کھل گئی تھی۔

''میں تو سمجھی تھی کہ اب تیرا آنا مشکل ہے پتر.....!'' اس نے کہا تھا۔

''میرا تبادلہ پھر کراچی ہو گیا ہے اماں.....!''

''لے..... اسلام آباد تو پھر قریب تھا۔ کراچی تو بہت دور ہے۔'' وہ بولی۔

''فاصلوں سے کچھ نہیں ہوتا اماں.....! اللہ کی عطا کی ہوئی آسانی سب سے بڑی نعمت ہے۔'' عبدالحق نے کہا تھا۔

''میری کچھ شرطیں مان لو گی تو میں ہر ہفتے یہاں آؤں گا اور اتوار تک تمہارے ساتھ رہوں گا۔''

''ماں سے شرطیں لگاتا ہے۔'' اس نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔

''مجبوری ہے اماں.....! اب دیکھو نا..... اتنی دور سے ہر ہفتے آنا اور ایک دن بعد واپس جانا کوئی آسان تو نہیں.....!''

حمیدہ نے سوچا، بات تو سچی ہے۔ اس نے کہا۔

''بول! کیا شرط ہے تیری.....؟ اس کے لئے تو میں ہر شرط مان لوں گی۔''

''حکیم صاحب کی ہر بات ماننی ہوگی۔ پرہیز کرنا ہوگا۔ مکمل آرام کرنا ہوگا۔''

''یہ سب کچھ تو میں کرتی ہوں۔ پر اب میری طبیعت بہتر ہے۔ اور حکیم جی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔''

''حکیم وہ ہیں اماں.....! تم نہیں ہو۔''

''ٹھیک ہے.....! پھر تو ہر ہفتے آئے گا نا.....!''

''جھوٹا وعدہ میں نہیں کرتا اماں.....! یہ یہاں خالہ کو جج بنا کر چھوڑ جاؤں گا۔'' عبدالحق نے صفیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آؤں گا تو ان سے پوچھوں گا کہ تم نے کوئی گڑبڑ تو نہیں کی۔ کی ہو گی تو فوراً واپس چلا جاؤں گا۔ اور اگلے ہفتے بھی.....''

''تو ہر ہفتے آئے، اس کے لئے تو میں کچھ بھی کر سکتی ہوں پتر.....!''

حمیدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

اور عبدالحق نے اپنا وعدہ نبھایا۔ وہ ہفتے کی سہ پہر آ جاتا تھا، اور اتوار کی رات واپس جاتا۔ بلکہ کبھی تو پیر کی صبح واپس جاتا۔

''تو کتنا تھک جاتا ہو گا پتر.....!'' دوسری بار وہ آیا تو حمیدہ نے اس سے کہا۔

''اتنا لمبا سفر ہے.....!''

عبدالحق ہنسنے لگا۔

''ہوائی جہاز میں نہ تو سفر لمبا ہوتا ہے اماں.....! اور نہ ہی تھکن ہوتی ہے۔ بس تین گھنٹے لگتے ہیں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے.....؟''

''اُڑ کر جاتے ہیں نا اماں.....!''

حمیدہ کو یقین نہیں آیا۔

''تم جلدی سے اچھی ہو جاؤ تو تمہیں بھی اپنے ساتھ اُڑا کر لے جاؤں گا اماں.....! پھر خود دیکھ لینا۔''

اور عبدالحق جب بھی آتا، صفیہ کے لئے خاص طور پر کچھ نہ کچھ لے کر آتا۔ حمیدہ کو اس سے یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ صفیہ دل میں تو خوش ہوتیں، لیکن زبان سے کہتیں۔

''تم اتنا تکلف کیوں کرتے ہو بیٹے.....!''

"واہ ...! بیٹا بھی کہتی ہیں اور محبت کو تکلف بھی کہتی ہیں۔" عبدالحق نے کہا۔

"جیسے اماں ہیں، ویسے ہی آپ ہیں میرے لئے۔"

صفیہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

یہ دیکھ کر عبدالحق نے بات کو مزاحیہ رخ دے دیا۔

"اور یہ تو آپ کی فیس ہے خالہ......! آپ اماں کی جاسوسی کرتی ہیں نا میرے لئے ...!"

اور آنکھوں میں آنسو ہونے کے باوجود صفیہ مسکرا دیں۔

عبدالحق کے باقاعدگی سے آنے سے حمیدہ کو بہت فائدہ ہوا۔ تقویت تو اپنی جگہ تھی۔ وہ آتا تو اس کا خاص طور پر خیال رکھتا۔ اس کے سارے کام خود کرتا، دوا پلاتا۔ پھر بیٹھ کر اس سے باتیں کرتا۔ تمام وقت وہ اس کے ساتھ ہی گزارتا شاید اسی لئے وہ اتنی تیزی سے سنبھلی تھی۔ وہ آتا تو جیسے اس کی طاقت بڑھ جاتی۔ دن گن گن کر وہ ہفتے کا انتظار کرتی۔

اب ذرا طبیعت سنبھلی تو حمیدہ کو پھر ایبٹ آباد یاد آ گیا۔

"اب تو مجھے لگتا ہے آپا...... ! کہ میں سفر کر سکتی ہوں۔" اس روز اس نے صفیہ سے کہا۔

"یہ تو حکیم صاحب سے پوچھنا ہوگا۔" صفیہ نے کہا۔

"اپنی طاقت کا مجھے پتا ہوگا یا حکیم صاحب کو......؟" حمیدہ نے چڑ کر کہا۔

"ضرورت سے جاتی ہو تو رابعہ سہارا دیتی ہے تمہیں۔ باتیں ایبٹ آباد جانے کی کر رہی ہو۔"

"یہ تو عبدالحق کی زبردستی ہے۔ اللہ رابعہ کو خوش رکھے۔ مگر مجھے تو اپنا آپ بوجھ لگنے لگا ہے اس پر۔"

"خدا کا شکر ادا کرو باجی ......!" صفیہ نے کہا۔

"اتنے دن اٹھنے کے قابل نہیں تھیں تو بستر پر ہی سب کچھ کرتی تھیں نا مجبوری میں۔ اور رابعہ تو بڑی جانثار ہے۔ اللہ بہت اجر دے گا اسے۔"

"تو آج میں بغیر سہارے کے خود ہی جا کر دیکھتی ہوں۔ سچ کہتی ہوں، مجھے نہیں لگتا کہ اب مجھے سہارے کی ضرورت ہے۔"

"نہیں باجی ...! یہ سب تم عبدالحق کے سامنے ہی کرنا۔ ورنہ وہ پوچھے گا تو جھوٹ تو نہیں بولوں گی میں۔ اور پھر وہ ہر ہفتے جانا چھوڑ دے گا۔"

حمیدہ کو یہ بات ماننی پڑی۔ وہ عبدالحق کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔

عبدالحق آیا تو اس نے یہ بات اس سے کی۔ عبدالحق نے صاف انکار کر دیا۔

"پہلے میں حکیم صاحب سے پوچھوں گا۔" اس نے کہا۔

حمیدہ کو جلال آ گیا۔

"ماں ہوں تیری ......! کیا تیرے حکم پر چلوں گی ...؟"

"نہیں اماں ......! کیوں گناہ گار کرتی ہو مجھے ... مگر ابھی اتنی طاقت نہیں ہے تم میں۔ دیکھنے سے نظر آتا ہے۔"

"یہ تو ایبٹ آباد جانے کے چکر میں ہیں۔" صفیہ نے بھید کھول دیا۔

عبدالحق پریشان ہو گیا۔

"ایبٹ آباد کو بھول جاؤ اماں ......! بہت لمبا سفر ہے۔"

حمیدہ مسکرائی۔

"تو کیا ہوا......؟ ہم اُڑ کر چلے جائیں گے ... ہوائی جہاز میں۔"

"وہاں ہوائی جہاز نہیں جا سکتا اماں ......!"

"بے وقوف بنا رہا ہے مجھے......!" حمیدہ نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

"نہیں اماں ......! یہ سچ ہے۔ مری یاد ہے نا اماں......؟"

حمیدہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یہ ایبٹ آباد بھی ویسا ہی پہاڑی مقام ہے۔ وہاں جہاز سے نہیں جایا جا سکتا۔"

"ٹھیک ہے......! پر میں اٹھ کر یہ تو دیکھ لوں کہ میں سہارے کے بغیر چل بھی سکتی ہوں یا نہیں......!"

عبدالحق مجبور ہو گیا۔

"ٹھیک ہے اماں.....! کوشش کر لو..... اس وقت تو میں بھی موجود ہوں نا.....!"

اس روز حمیدہ پہلی بار خود اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اب تک وہ سہارے سے اٹھتی رہی تھی۔ اب اپنی ٹانگوں پر زور دیا تو ایک لمحے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ اس کی ٹانگوں میں ابھی دم نہیں ہے۔ پھر بھی اس نے جیسے تیسے ایک قدم اٹھا لیا۔ مگر دوسرا قدم اٹھاتے ہی اسے چکر آ گئے اور وہ بری طرح ڈگمگا گئی۔ عبدالحق چوکنا تھا۔ اس نے تیزی سے اسے سنبھالا اور گود میں اٹھا کر اسے بستر پر لٹا دیا۔

"دیکھا اماں.....! حکیم صاحب غلط تو نہیں کہتے۔" عبدالحق نے کہا۔

حمیدہ سے بولا نہیں گیا۔ اس کی سانس بے ترتیب ہو گئی تھی۔

اس کے چہرے پر یاس دیکھ کر عبدالحق تڑپ گیا۔

"وقت لگے گا اماں.....! پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" اس نے انہیں دلاسہ دیا۔

"طاقت آئے گی تو پہلے تھوڑا تھوڑا کر کے چلو گی۔ حکیم صاحب کا اندازہ درست ہے اماں.....!"

"ٹھیک ہے.....!" حمیدہ نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"تو ایک مہربانی کر دے۔ نور بانو کو یہاں لے آ.....!"

"اب یہ اس کے لئے بھی ممکن نہیں رہا اماں.....!" عبدالحق نے کہا۔

"پر تو نے اسے جانے ہی کیوں دیا پتر.....؟" حمیدہ کے لہجے میں شکایت تھی۔

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"بس.....! غلطی ہو گئی اماں.....!"

حمیدہ سرد آہ بھر کے رہ گئی۔ صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اللہ کی مرضی.....!

❁ ❁ ❁

نور بانو ارجمند کی باتوں پر غور کرتی رہی تھی۔ سچ یہ ہے کہ ارجمند نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اپنی تمام غلطیاں اسے نظر آ گئی تھیں۔ اسے احساس ہوتا تھا کہ اس نے بڑے ظلم کئے ہیں۔ کسی کو بھی نہیں چھوڑا اس نے۔ ان سب لوگوں کو اس نے تکلیف پہنچائی، جو اس سے محبت کرتے تھے۔ حمیدہ، عبدالحق، ارجمند..... اور ساجد۔

سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے اپنی جان پر بڑا ظلم کیا تھا۔ دوسروں کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ اسی کا نتیجہ تھا۔ وہ نماز کی پابند تھی، باقاعدگی سے قرآن پڑھنے والی تھی، اور مکمل نہ سہی، اس نے حدیث کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ مگر عبدالحق پر قابض ہونے کے، اور اپنے حسد اور احساسِ کم تری کے چکر میں اس نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔

غضب خدا کا، میں نے تو اللہ کو بھی چھوڑ دیا۔ سوچتے ہوئے وہ بلند آواز میں بڑبڑائی۔ پھر اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ لیکن کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔

اسے سب کچھ یاد آیا۔ نہ صرف یاد آیا، بلکہ اسے دکھائی دیا۔ وہ گزرے ہوئے لمحے کو دیکھ سکتی تھی۔ اللہ نے کتنے کرم کئے اس پر۔ کیسے کیسے نوازا اسے۔ دہلی میں اسے موت سے بھی بچایا اور بے عزتی سے بھی۔ بے یار و مددگار ہونے کے باوجود اسے پناہ دی، عزت دی، مقام دیا۔ وہ ہندو سمجھ کر عبدالحق کو حقیر سمجھتی تھی۔ پھر اس نے دیکھا کہ اللہ نے عبدالحق کو کتنی بلندی عطا فرمائی۔ اللہ نے ہی اس کی دلی خواہش پوری کرنے کا اہتمام فرمایا۔ ورنہ عبدالحق کے ساتھ اس کا کیا جوڑ تھا.....؟ نہ ظاہری طور پر، نہ باطنی طور پر۔ مگر عبدالحق کے دل میں اللہ نے اس کی محبت ڈال دی تھی۔ اللہ نے انہیں ملا دیا۔

اللہ نے تو اپنی رحمت سے عبدالحق اسے پکا پکا دے دیا تھا۔ مگر خود اس کے اندر بڑی کھوٹ تھی۔ احساسِ کمتری کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اس کی وجہ سے کیسی کیسی خرابیاں پیدا ہوئیں اس میں۔ حسد، بدگمانی، احسان فراموشی، تنگ نظری، سب اس احساسِ کمتری کے ہی تحفے تھے۔ مگر اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ بنیادی خرابی اس کا ناشکرا پن تھا۔ وہ شکرگزار ہوتی تو کوئی فساد نہ ہوتا۔ احساسِ کمتری بھی نہ ہوتا، بلکہ

خود اعتمادی ملتی اسے۔ کیا اسے نہیں معلوم تھا کہ سب کچھ اللہ ہی دیتا ہے، اور وہ جب چاہتا ہے، جو چیز چاہے، واپس لے لیتا ہے۔ بندہ اس میں کچھ نہیں کر سکتا۔ تو آدمی ڈرے تو بس اللہ سے ڈرے، اور کچھ چاہیے تو بس اللہ سے مانگے۔

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہ کب اللہ سے، قرآن سے، نماز سے دور ہوئی۔ اور اسے یاد آ گیا۔ یاد آیا تو اس پر تھرتھری چڑھ گئی۔

وہ رمضان المبارک کا آخری عشرہ تھا، اور اس کے فوراً بعد اس کی عبدالحق سے شادی ہونا تھی۔ وہیں سے اس کی تباہی کا آغاز ہوا تھا۔ شیرخوار ساجد کو اس نے اپنا رقیب بنا لیا تھا۔ اور اس جہالت میں اس نے غضب کر دیا۔ طاق راتوں میں اس نے اپنے لئے دعا کی...... اس بات سے بے خبر کہ وہ بددعا ہے۔ اس نے اپنے لئے اولاد سے محرومی کی دعا کی، اسے یہ بھی خیال نہیں آیا کہ یہ محرومی عبدالحق کی بھی ہوگی، اور کم از کم اس کی محرومی کے لئے دعا کرنے کا تو اسے کوئی حق نہیں۔

یہ سوچتے ہوئے وہ پھر کانپ گئی۔ یہ تو بہت بڑا جرم تھا۔ اس پر اللہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ پہلے عبدالحق سے معافی مانگنی ہوگی۔ اور یہ سننے کے بعد معاف کرنا تو دور کی بات، شاید عبدالحق کبھی اس کی صورت دیکھنا بھی گوارہ نہ کرے۔

اس وقت اس نے سوچا کیا تھا؟ یہ کہ اس کے اور عبدالحق کے درمیان کوئی کبھی حائل نہ ہو۔ اس نے نہیں سمجھا کہ اولاد میاں بیوی کے درمیان حائل نہیں، شامل ہوتی ہے۔ وہ تو ان کے تعلق کو، رشتے کو، ان کی محبت کو مضبوط کرتی ہے۔ وہ تو یہ بھی نہیں سمجھی کہ اولاد کے بغیر عورت اس درخت کی طرح ہوتی ہے، جو پھل سے بھی محروم ہو اور پھول سے بھی، اور اس کی چھاؤں بھی نہ ہو۔ اولاد تو عورت کی تکمیل کرتی ہے۔ بانجھ عورت تو عورت ہی نہیں ہوتی۔ اور وہ ایسی بدنصیب عورت تھی، جس نے رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں اپنے لئے بانجھ پن کی دعا کی تھی۔

اور وہ دعا قبول ہوگئی......!

اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ اس نے عبدالحق پر قابض ہونے، اسے صرف اپنا بنائے رکھنے کے لئے اپنی جہالت میں جو دعا کی تھی، وہ تو درحقیقت اسے کھونے کی

دعا تھی۔ ایک نومسلم کے لئے جو بڑی محبت اور سچائی سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لایا ہو، اپنی اولاد کی ... بلکہ اولادِ نرینہ کی کتنی اہمیت ہوتی ہوگی، کیونکہ اسے تو اپنی نسل بہت عزیز ہوتی ہوگی۔ عبدالحق کی جگہ کوئی اور ہوتا تو نہایت درجے کی محبت کے باوجود زیادہ سے زیادہ دو تین سال انتظار کرتا، اور پھر دوسری شادی کر لیتا۔ اور اس بیوی سے اولاد ملتی تو وہ بیوی اسے عزیز تر ہو جاتی، اور اس کی اپنی حیثیت گھر کے آنگن میں لگے بے برگ و بار شجر کی سی ہو کر رہ جاتی، جو موجود ہوتا ہے، لیکن کسی کو نظر نہیں آتا۔ اور ایسا اس کی اپنی دعا کی قبولیت کی وجہ سے ہوتا۔

اب اس کی سمجھ میں آیا۔ شادی کی رات عبدالحق نے اس سے شکر کے نفل پڑھنے کو کہا تھا، اور اس نے گریز کیا تھا۔ یہ شاید اس کی بددعا کی وجہ سے تھا۔ اور شکر ادا نہ کر کے وہ اور نحوست میں گرفتار ہوگئی۔ شکر ادا کرتی تو اسے خوشی اور خود اعتمادی ملتی، احساسِ کمتری دور ہو جاتا۔ لیکن اس نحوست نے اسے نیک اعمال سے دور کر دیا، اس کا احساسِ کمتری الگ بڑھ گیا۔ عبدالحق کو جکڑ کر رکھنے کا شوق ایک منحوس مرض کی صورت اختیار کر گیا۔ اس کے لئے اس نے جسم کا سہارا لیا۔ دیر سے سونا دیر سے اٹھنا معمول بن گیا۔ پاکی کا احساس ختم ہوگیا اور وہ ناپاکی میں مبتلا ہوگئی...... یعنی نحوست در نحوست۔

اس کا جسم پھر بری طرح لرزا۔ اس کے اعمال کی پاداش میں کیا اس پر لعنت کر دی گئی۔ ورنہ وہ تو نماز کی پابند تھی۔ قرآن باقاعدگی سے پڑھتی تھی۔ پھر وہ کیسے ایک دم محروم ہوگئی۔

تمہاری اوقات ہی کیا ہے......؟ اس کے اندر سے کسی نے للکارا۔ شیطان تو معلم الملکوت تھا۔ اللہ کے ایک حکم سے منہ موڑا تو ابد تک کے لئے راندۂ درگاہ ہوگیا۔

اس سب کے باوجود اللہ نے اس پر کتنی رحمت فرمائی۔ اس کا پردہ رکھا۔ عبدالحق کی محبت کم نہیں ہونے دی۔ بلکہ اس کی محبت کی گہرائی تو ایسی ہے کہ ارجمند جیسی حسین اور خوبیوں سے مالا مال لڑکی کو بھی اس نے اس کے مقابلے میں اہمیت

نہیں دی۔

پھر اس نے ارجمند کے بارے میں سوچا۔ ایک بات سچی تھی کہ وہ ارجمند کو اپنی سگی بہن کی طرح چاہتی تھی۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اس نے ارجمند کو بڑی بے دردی سے اپنی مطلب برآری کے لئے استعمال کیا تھا۔ ارجمند نے اسے کے کہنے پر عبدالحق سے شادی کی۔ اسے ایک ایسی سوکن کے عذاب سے بچایا، جس پر اس کا کوئی اختیار نہ ہوتا۔ یہی نہیں، وہاں کے لئے وہ ایثار کر رہی تھی، جو کوئی کسی کے لئے نہیں کرتا۔ وہ اپنا بچہ اسے دے رہی تھی۔ وہ اسے ماں بنا رہی تھی، وہ نعمت اسے دے رہی تھی، جس سے محرومی کے لئے خود اس نے رمضان کی مبارک راتوں میں دعا کی تھی۔ ارجمند اس کے لئے سراپا ایثار تھی۔ لیکن وہ اس کے لئے بھی خودغرض ہی رہی۔ اس کی تنگ نظری اور حسد میں کوئی کمی نہیں آئی۔ عبدالحق پر اپنا مکمل تصرف رکھنے کے اس کے شوق میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس نے ارجمند کو عبدالحق سے ملنے دیا تو صرف اپنی غرض کے لئے۔ اور جب غرض پوری ہوگئی تو اسے ارجمند کا فون پر عبدالحق سے بات کرنا بھی گوارہ نہیں رہا۔

برسوں کا سویا ہوا ضمیر جاگ گیا تھا، اور اسے آئینہ دکھانے پر تلا ہوا تھا۔

ارجمند کو سگی بہن کی طرح چاہنے کے باوجود اس نے کیسا کھیل کھیلا؟ اور اس کھیل میں آگے کا نقشہ کیا تھا؟

اس نے گھبرا کر آئینے سے نظریں چرانے کی کوشش کی، لیکن آنکھیں بھی ضمیر کا ساتھ دے رہی تھیں۔

وہ عبدالحق کو کسی کے ساتھ بھی بانٹنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اس نے جان لیا کہ یہ ناگزیر ہے۔ اور بانٹنے سے زیادہ اسے اس بات کی فکر ہوئی کہ وہ تو اپنی دعا کی قبولیت کے بعد اب ماں بن ہی نہیں سکتی۔ اور آنے والی ضرور ماں بنے گی۔ اور وہ حقیر ہو جائے گی۔ کسی کی نظروں میں بھی اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ دنیا میں ارجمند کے سوا کوئی ایسا نہیں ہو سکتا تھا، جو اس کی یہ بات مان لے، اپنا بچہ اسے دے دے کہ سب یہی سمجھیں کہ نور بانو ماں بنی ہے۔ اور اس میں جہاں اس کا فائدہ تھا، وہاں ارجمند کا سراسر نقصان تھا۔ عبدالحق کو تو ویسے ہی ارجمند سے محبت نہیں

تھی۔ اس کے ماں بننے کے بعد تو وہ ارجمند سے بالکل ہی بے نیاز ہو جاتا۔ اور اگر اللہ کے سامنے جواب دہی سے بچنے کے لئے وہ انصاف کی کوشش کرتا تو وہ اس کوشش کو ناکام بنا دیتی۔ یعنی ارجمند کا مستقبل وہ ہوتا، جو عبدالحق کی کہیں اور شادی ہونے کے نتیجے میں اس کا ہونا تھا۔ وہ شوہر سے بھی محروم رہتی۔

نور بانو کی روح پر جیسے کوڑا سا لگا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

نہیں ....! میں ایسی تو نہیں ہوں۔ ارجمند کے احسان کے بدلے میں میں اسے محرومی اور دکھ تو کبھی نہ دیتی۔

تم جانتی ہو کہ تم کیا ہو۔ ضمیر نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ اب تم خود سے بھی جھوٹ بول رہی ہو۔ تم بے رحم شاطر ہو۔ بازی جیتنا ہی تمہارا اصل مقصد ہے۔

''نہیں، یہ سچ نہیں ....! نور بانو نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لئے۔ وہ یہ سب کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔

لیکن ضمیر کی آواز کانوں میں نہیں، اس کے وجود میں گونج رہی تھی۔

یہ سچ ہے، اور تم جانتی ہو۔ تمہارا عمل اس کا ثبوت ہے۔ ضمیر نے کہا۔ ابھی ارجمند سے تمہاری غرض پوری نہیں ہوئی ہے۔ ابھی ارجمند پوزیشن کے اعتبار سے تم پر بھاری ہے۔ مگر تم تو اب بھی اس کا لحاظ نہیں کرتیں۔ وہ ایک منٹ عبدالحق سے بات کرے تو یہ بھی تم سے برداشت نہیں ہوتا۔ اب خود بتاؤ......! اس کا بچہ ملنے کے بعد تم اس کے ساتھ کیا کرو گی......؟

وہ سچ کی جیت کا لمحہ تھا، وہ اعتراف کا لمحہ تھا۔ اب آنکھیں اور کان بند کرنے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اب وہ خود سے منہ نہیں چھپا سکتی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

نہ جانے کتنی دیر تک وہ روتی رہی۔ لیکن دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوا۔ اس کے لئے ماننا ضروری تھا، اور اس نے مان لیا۔ ٹھیک ہے......! میں اعتراض کرتی ہوں کہ میں بہت بری ہوں، اتنی بری کہ شاید کوئی اتنا برا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں خودغرض ہوں، تنگ نظر ہوں، حاسد ہوں، ظالم ہوں۔ اس نے دل میں کہا۔ پتا نہیں ...!

کیسے میں ایسی ہوگئی، لیکن اللہ تو بہت بخشنے والا ہے، وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔ وہ رحیم و کریم ہے۔ گناہ گاروں کی توبہ اسے بہت پسند ہے۔

لیکن تم تو برسوں سے اسے بھی چھوڑے بیٹھی ہو۔ ضمیر نے اعتراض کیا۔

میں رجوع کروں گی تو وہ اس پر بھی مجھے معاف کر دے گا۔ یہ اس کا وعدہ ہے۔

بے شک......! لیکن رجوع کرنے کے ساتھ ساتھ پچھلی غلاظتیں بھی تو دھونی ہوں گی۔ تمام معاملات کو صاف کرنا ہوگا۔

اس پر وہ گھبرا گئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟ اس میں تو بڑی پیچیدگیاں ہیں۔

سب تمہارا ہی کیا دھرا تو ہے۔ ضمیر نے ملامت کی۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ جھوٹ جو بظاہر بہت چھوٹی سی، معمولی سی بات لگتا ہے، اسے اللہ نے گناہ کبیرہ کیوں قرار دیا؟ تم نے ایک جھوٹ بولا، اور تمہاری پوری زندگی جھوٹ بن گئی۔ چلو، تم تو اس کی مستحق ہو۔ لیکن ارجمند بے چاری کا کیا قصور؟ تم نے اس کی زندگی کو بھی جھوٹ بنا کر رکھ دیا۔ تمہیں تو اس کا حساب بھی دینا ہوگا۔

نور بانو تھرا گئی۔

دیکھا......! بگاڑ کتنا آسان ہے، اور اصلاح کتنی مشکل......!

وہ بڑے فیصلوں کے لمحے تھے۔ نور بانو نے عہد کر لیا کہ اب وہ ارجمند کے ساتھ نہ کوئی زیادتی کرے گی، نہ ہونے دے گی۔ وہ ہنسی خوشی اسے عبدالحق سے ملائے گی۔ اسے اس کے حق سے بھی زیادہ دے گی۔ اس سے اتنی محبت کرے گی کہ پچھلی تمام زیادتیوں کی تلافی کر دے گی۔

اور......؟ ضمیر نے زہر خند کیا۔

اور میں نماز قائم کروں گی، اور قرآن سے دوبارہ جڑوں گی۔ اس کی ہی وجہ سے تو عبدالحق صاحب کو مجھ سے محبت ہوئی تھی۔

اور......؟

اور میں توبہ کروں گی...... سچی توبہ......! اور زندگی بھر مسلسل استغفار کروں

گی۔ اللہ کی رحمت اور مغفرت سے امید ہے کہ وہ مجھے بخش دے گا۔

سچی توبہ تو عملی ہوتی ہے۔ عمل کے بغیر نہیں۔

تو میں تلافی کروں گی نا......!

اور یہ جو جھوٹ کی اتنی بڑی عمارت کھڑی کر دی ہے تم نے...... اسے کون گرائے گا......؟ تم نہیں گراؤ گی اسے......؟

نور بانو چکرا گئی۔ یہ تو بہت بڑا فضیحتہ ہے۔ یہ کیسے ٹھیک ہو سکتا ہے......؟ ابھی تو ممکن نہیں۔ ابھی سب کچھ کھول دوں، سچ بول دوں تو کیسی جگ ہنسائی ہوگی۔ اور عبدالحق صاحب کو تو شاید میں کھو ہی بیٹھوں۔ انہیں جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔ اس سے ارجمند کو تو بہت فائدہ ہوگا۔ اس کا ایثار تو مثالی قرار پائے گا۔ وہ سب کی نظروں میں اچھی ہے، اور بلند ہو جائے گی۔ مگر مجھے تو سب لعنت ملامت کریں گے، زبان سے نہیں کریں گے تو آنکھیں بولیں گی۔ پھر تو ہر طرف ارجمند ہی ارجمند ہوگی۔

آ گئیں نا اپنی اوقات پر......! ضمیر نے ملامت کی۔ پھر شروع ہو گیا حسد......! ابھی تو ارجمند کے لئے بڑے بڑے دعوے کر رہی تھیں۔

نور بانو نے بے ساختہ اپنے کان پکڑے اور دونوں رخساروں پر طمانچے مارے۔ توبہ میرے اللہ......! اب نہیں کروں گی۔

تو جھوٹ کی یہ ناؤ چلتی رہے گی...... اور یہ چلتی رہے گی تو توبہ کیسے قبول ہوگی......؟''

نور بانو سوچتی رہی...... گہری سوچ۔ اتنا بڑا جھوٹ......! ایک دم سے تو پردہ نہیں ہٹایا جا سکتا۔ ساری دیواریں، پورا ملبہ مجھ پر آ گرے گا دھڑام سے۔ اس میں دب کر جیتے جی مر جاؤں گی میں۔

تو پھر......؟

ہاں......! ایک صورت ہے۔ ابھی تو اس جھوٹ کو چلنے دیا جائے۔ بعد میں مناسب موقع دیکھ کر میں عبدالحق صاحب کو سچ بتا دوں گی، اس طرح کہ مجھ سے ان کا دل برا بھی نہ ہو۔

صرف عبدالحق کو.....؟

اماں کو بھی بتا دوں گی۔ نور بانو نے تمام حوصلہ خرچ کرتے ہوئے سوچا۔ اور کسی کو بتانا ایسا ضروری نہیں۔

اور اس سے پہلے ہی تم مر گئیں تو.....؟

نور بانو ہکا بکا رہ گئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے.....؟

کیوں.....؟ اللہ نے کوئی وعدہ کر رکھا ہے تم سے.....؟ تمہیں بتا دیا ہے کہ کب مرنا ہے تمہیں.....؟ زندگی کا تو ایک پل کا بھی بھروسہ نہیں۔

تب تو یہ سب لاحاصل ہو جائے گا۔ نور بانو مایوس ہوگئی۔ جی میں تو آیا کہ ابھی عبدالحق کو فون کر کے اسے حقیقت بتا دے۔ لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ اس نے سوچا، یہ کام تو بعد میں ہی کیا جا سکتا ہے۔

تاہم اس نے تلافی کی طرف قدم بڑھا دیا۔

اس نے وضو کیا۔ نماز کے لئے کھڑے ہونے سے پہلے اس نے ارجمند سے کہا۔

''اتنے دن ہوگئے، ان کا فون نہیں آیا۔ تم انہیں فون کیوں نہیں کرتیں.....؟''

''آپ کر لیں نا آپی.....!''

''میں تو نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔ پھر قرآن پڑھوں گی۔ تم فون کرو انہیں، اور اچھی طرح بات کرو ان سے۔ دیر تک بات کرو، خوب ساری باتیں کرو۔ وہ بھی کیا سوچتے ہوں گے کہ نئی نویلی دلہن کو فکر ہی نہیں ہے ہماری۔''

ارجمند نے حیرت سے اسے دیکھا۔ نماز، قرآن اور یہ فون کی فرمائش.....! دنیا ہی بدل گئی ہے کیا.....؟

''بس تم فون کرو انہیں جلدی سے..... اور ہاں.....! میرا سلام کہہ دینا انہیں۔'' یہ کہہ کر نور بانو دوسرے کمرے کی طرف چلی گئی۔

ارجمند نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

نور بانو کے شب و روز بدل گئے۔ نماز، قرآن توبہ اور استغفار۔ مگر اس

کے دل میں موت کا خوف بیٹھ گیا تھا۔ زندگی کا تو واقعی کوئی بھروسہ نہیں۔ اور وہ تو ویسے ہی ایک موذی درد کا شکار ہے۔ اسے یہ خیال بھی ہوا کہ اسے آپریشن سے بچنا ہوگا۔ نہ جانے کیوں، اسے لگتا تھا کہ آپریشن کا انجام اس کی موت ہی ہوگا۔

درد ہر تیسرے چوتھے دن ہوتا تھا، مگر شدید نہیں۔ اور دوا سے آرام آ جاتا تھا۔ لیکن نور بانو اس بات سے ڈرتی تھی کہ دوا سے درد کم نہ ہوا تو اسپتال جانا پڑے گا۔ اور وہاں ڈاکٹر آپریشن پر تلا بیٹھا ہے۔

اس نے ایک دن رشیدہ سے کہا۔

''یہاں پرائیویٹ ڈاکٹر بھی تو ہوں گے.....؟''

''بہت ہیں.....! بڑے بڑے ڈاکٹر ہیں۔''

''ضرورت کے وقت گھر پر بھی آتے ہیں مریض کو دیکھنے.....؟''

''جی ہاں.....! بس فیس زیادہ لیتے ہیں۔''

''اس کی کوئی بات نہیں.....! دیکھ رشیدہ.....! میں اب اسپتال نہیں جانا چاہتی۔ ضرورت پڑنے پر ڈاکٹر یہاں آ جاتے تو بہتر ہے۔''

''میں اس مرض کے خاص ڈاکٹر کے بارے میں معلوم کرتی ہوں۔'' رشیدہ نے کہا۔

''پھر ایک بار آپ اپنے ایکس رے اور رپورٹیں لے کر اس کے مطب چلئے گا۔ اس کے بعد ضرورت پڑنے پر اسے گھر بلا لیں گے۔''

''خدانخواستہ تو کہہ دیا کر.....!'' نور بانو نے اسے جھڑک دیا۔

❀❀❀

عبدالحق عارف کی باتوں پر بعد میں بھی غور کرتا رہا۔ لیکن ان سوچوں کے دوران بھی وہ بنیادی طور پر نور بانو سے محبت کرنے والا شوہر ہی رہتا تھا۔ البتہ ارجمند کے معاملے میں وہ اللہ کے سامنے جواب دہی سے بھی خوف زدہ تھا۔

غور کرنے کے لئے وہ خود کو ماضی میں لے گیا۔ نور بانو نے لاہور پہنچتے ہی اماں سے اس کی اور ارجمند کی شادی کی بات کی تھی، اور اس کے بعد اس سے اس شادی کی فرمائش کی تھی۔ پھر شادی کے ہر مرحلے میں وہ پیش پیش رہی تھی۔ اس

کے خلوص سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس معاملے میں تبھی اس کی محبت اور خلوص کے معترف تھے۔ وہ تو مثال بن گئی تھی۔

عبدالحق کو اپنی سہاگ رات یاد تھی۔ جو کچھ چاہتا تھا اور نور بانو نے نہیں کیا تھا، ارجمند نے اپنی سہاگ رات میں اس سے بڑھ کر کیا۔ اس کا اسے فجر سے پہلے غسل کے لئے اصرار کے ساتھ جگانا یاد تھا۔ اس کے سخت لہجے کے باوجود اس نے اسے جگایا تھا، اور کہا تھا کہ نہیں جاگا تو وہ نماز کے خسارے میں پڑ جائے گا، اور یہ اسے گوارہ نہیں۔

اور اگلی رات نور بانو کی تھی۔ اس صبح جو نور بانو نے کہا، وہ بھی اسے یاد تھا۔ وہ صبح غسل کے لئے اٹھا، اور نماز کے لئے گیا۔ نور بانو کی نیند اچٹ ہوگی۔ اس نے اسے موجود نہ پایا تو شک میں مبتلا ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اور ارجمند ساتھ ہوں گے۔ وہ ان دونوں کو ڈھونڈتی پھری۔ گیسٹ روم کے بارے میں اسے یقین ہوگیا کہ وہاں اسے وہ دونوں یکجا نظر آئیں گے۔ لیکن وہاں اسے ارجمند نماز پڑھتی ملی، اور پھر وہ خود بھی مسجد سے واپس آ گیا۔ نور بانو کیسی کھسیائی تھی۔

یہ نور بانو کی فطرت تھی۔ شادی اس نے خود کرائی تھی۔ ارجمند کو وہ بہنوں کی طرح چاہتی تھی۔ لیکن اس کے معاملے میں نور بانو کے حسد سے ارجمند بھی محفوظ نہیں تھی۔ یعنی عارف بھائی نے غلط نہیں کہا تھا۔ ارجمند کو اپنے ساتھ ایبٹ آباد نور بانو دانستہ لے کر گئی تھی۔ مقصد ان دونوں کو ملنے سے روکنا تھا۔

مگر پھر عبدالحق کو ایک ایسی بات یاد آئی، جو نور بانو کے حق میں جاتی تھی۔

ارجمند سے اس کی شادی کے بمشکل دو ہفتے بعد ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہوا تھا۔ وہ سب لوگ گاؤں گئے تھے۔ وہاں اماں نے تو رکنے کا فیصلہ کر لیا کہ صفیہ خالہ کو عدت کے دوران وہ اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔ نور بانو نے بھی ایک ہفتے وہاں رکنے کا فیصلہ کیا...... زرینہ کی خاطر۔ عبدالحق نے کہا کہ پھر وہ اور ارجمند بھی رک جاتے ہیں۔ مگر نور بانو نے منع کر دیا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ ارجمند کے ساتھ زیادتی ہوگی، جو نئی نویلی دلہن ہے۔ اس لئے وہ ارجمند کو لے کر لاہور چلا جائے۔ وہ ایک ہفتے بعد آئے گی۔

یہ تو نور بانو کے خلوص کا ثبوت ہے۔ عبدالحق نے سوچا۔ ارجمند سے وہ سچ مچ بہت محبت کرتی ہے۔

ایک ہفتے کے لئے تو دل بڑا کر لیا۔ اس کے اندر تردیدی سوچ ابھری۔ اور ارجمند پر نو مہینے کی محرومی تھوپ دی۔

اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اور اس دوری کے دوران بھی کچھ باتیں تھیں، جو ذہن میں کھٹکتی تھیں۔ فون پر جب بھی گفتگو ہوئی تھی تو نور بانو سے طویل ہی ہوئی تھی۔ لیکن ارجمند سے بات کم ہی ہوتی تھی۔ کبھی اس نے پوچھا بھی تو نور بانو نے یا تو یہ بتایا کہ وہ مصروف ہے، یا وہ بازار گئی ہوئی ہے۔ اور کبھی ارجمند سے بات ہوئی تو بہت مختصر۔ اسے یاد نہیں آتا تھا کہ کبھی ارجمند سے ایک منٹ بھی اس کی بات ہوئی ہو۔ دو ایک بار فون ریسیو ہی ارجمند نے کیا، لیکن مختصر سی بات کر کے نور بانو کی طرف بڑھا دیا۔ یعنی نور بانو وہیں موجود تھی۔ ارجمند نے اس کے انداز میں ناپسندیدگی دیکھی ہوگی، اور ریسیور اس کی طرف بڑھا دیا ہوگا۔

اور آخری بار تو فون ہی ارجمند نے کیا تھا۔ مگر مختصر سی بات کر کے ریسیور نور بانو کو دے دیا تھا۔

بس ایک بار ارجمند نے اس سے تفصیلی بات کی تھی۔ صرف ایک بار...... اور اس موقع پر نور بانو گھر میں موجود نہیں تھی۔ ارجمند نے کہا تھا کہ وہ چیک اپ کے لئے اسپتال گئی ہوئی ہے۔ وہ واحد موقع تھا، جب ارجمند نے اس سے کھل کر بات کی تھی، اور طویل بات کی تھی۔

یہ بھی اس بات کا ثبوت تھا کہ نور بانو ہی فون پر گفتگو میں بھی رکاوٹ تھی۔

عبدالحق کو نور بانو پر شدید غصہ آیا۔ اس نے خود ارجمند سے اس کی شادی کرائی، اسے آزمائش میں پھنسایا، اور خود ہی اس کے لئے مشکل کھڑی کر رہی ہے۔ جواب دہی تو اسے کرنی ہوگی اللہ کے سامنے۔

غصہ اتنا بڑھا کہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب نور بانو کو فون نہیں کرے گا۔

اتنا وقت گزر چکا تھا، اور اب اتنے تھوڑے دن رہ گئے تھے، ورنہ وہ جا کر ارجمند کو اپنے ساتھ لے آتا۔ اب ایسے عرصے میں نور بانو کو کوئی ٹھیس پہنچانا عقل مندی نہ ہوتی۔

ایک بات اس نے ضرور سوچی ..... کہ کچھ بھی ہو، اللہ نے نور بانو کو اس کے ایثار کے صلے میں بہت نوازا۔ کیسی عجیب، کہانیوں سی بات ہے کہ نور بانو نے اولاد کی خاطر، اسے خوش کرنے کے لئے ارجمند سے اس کی شادی کرائی، اور صرف پندرہ دن بعد اللہ نے اسے ہی اولاد کی خوشخبری عطا کر دی۔

وہ واقعی فون نہ کرتا۔ مگر ایبٹ آباد سے ہی فون آ گیا۔ اور وہ بھی ارجمند کا۔

❁ ❁ ❁

حمیدہ کو بڑی مایوسی ہوئی کہ وہ اس درجہ کمزور ہو چکی ہے کہ گھر میں بھی بغیر کسی سہارے کے نہیں چل سکتی۔ جبکہ وہ ایبٹ آباد جانا چاہتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اُڑ کر ایبٹ آباد پہنچ جاتی۔

کیسا ارمان تھا اسے عبدالحق کی اولاد کا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ہر لمحے نور بانو کو اپنے سامنے رکھتی۔ ایک لمحے کے لئے بھی اسے نظر سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔ لیکن قسمت کو کیا کیجئے۔ پہلے تو ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہوا، اور اسے حق نگر جانا پڑا۔ اس دوران نور بانو ایبٹ آباد چلی گئی۔ اب صفیہ آپا کی عدت پوری ہونے کے بعد وہ ایبٹ آباد جانے کے ارادے سے لاہور واپس آئی تو بیمار پڑ گئی۔

یہ تو سیدھی سی بات ہے۔ اللہ کو یہ منظور ہی نہیں کہ یہ سب کچھ میرے سامنے ہو۔ کون جانے، میں عبدالحق کے بچے کو دیکھنے کے لئے زندہ ہی نہ رہوں .....

اس نے اس خیال کو تیزی سے اپنے ذہن سے جھٹکا۔ بابا نے کہا تھا کہ وہ دیکھے گی..... عبدالحق کے بچے کو گود میں کھلائے گی۔

بابا کا خیال آیا تو ایک اور سوچ ابھری.....

جب نور بانو نے اصرار کر کے ارجمند سے عبدالحق کی شادی کرائی تو اس کا

خواب پورا کیا۔ تب اس نے سوچا کہ ارجمند سے عبدالحق کو اولاد ملے گی، اور بہت اچھی اور نیک اولاد ملے گی۔ لیکن پندرہ دن کے بعد خوش خبری آئی تو نور بانو کی طرف سے۔ نہ جانے کیوں؟ حمیدہ کو اس پر یقین نہیں آیا۔ اور مایوسی الگ ہوئی۔ مگر اس مایوسی پر اس نے توبہ کی اللہ سے کہ وہ کفرانِ نعمت کی مرتکب ہو رہی ہے۔ بچہ نور بانو سے ہو یا ارجمند سے، ہوگا تو عبدالحق کا ہی۔ اور مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ بے اولاد تو انشاء اللہ ارجمند بھی نہیں رہے گی۔

یہ سب اپنی جگہ، لیکن کہیں اپنے اندر گہرائی میں اسے احساس تھا کہ اس معاملے میں کہیں کوئی گڑبڑ ہے..... بہت بڑی گڑبڑ۔ لیکن وہ اسے سمجھ نہیں سکتی تھی۔

پھر وہ مٹھائی لے کر بابا کے پاس گئی تو وہاں بابا کی گفتگو نے اس کے اس بے نام اور موہوم احساس کی تائید کر دی۔ بابا اشاروں میں گفتگو کرتے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ کھیل کھیلنے والوں کو ان کے حال پر چھوڑ دے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ کی ناؤ پار لگ جائے گی۔ لیکن اللہ سب دیکھ رہا ہے۔ انہوں نے کہا، تجھے کیا ضرورت ہے سمجھنے کی؟ اللہ کی مرضی ہے تو وہ ان کی مدد بھی کر رہا ہے، اور پردہ بھی رکھ رہا ہے۔ لیکن جھوٹ سچ سے کبھی جیت نہیں سکتا۔ تو پریشان نہ ہو، آم کھا، پیڑ گننے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔

بابا کی بات میں جو اشارہ تھا، وہ سمجھ میں آ رہا تھا۔ اسے پہلے ہی خیال تھا کہ نور بانو نے جھوٹ بولا ہے کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ لیکن کیوں بولا؟ اور وہ اتنے بڑے جھوٹ کو کیسے نبھا سکے گی؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ یہ معاملہ تو چاند کی طرح کا ہوتا ہے۔ چاند چڑھتا ہے تو ساری دنیا دیکھتی ہے۔ بلکہ یہ تو وہ چاند ہوتا ہے، جسے کالی گھٹا بھی نہیں چھپا سکتی۔

اسے یقین تھا کہ عبدالحق کے ہاں اللہ کے فضل و کرم سے بیٹا ہوگا۔ بابا نے یہی کہا تھا۔ بلکہ اس نے تو کہا تھا کہ اسے دو پوتے ملیں گے، لیکن دس برس کے وقفے سے۔ اب یہ اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ ارجمند کو اللہ دس سال کے بعد اولاد دے گا؟

پھر اس نے سوچا کہ نور بانو اس معاملے میں کوئی چالاکی نہیں کر سکتی۔ وہ

اس کی نظروں کے سامنے ہی تو ہوگی۔ مگر پھر ڈاکٹر صاحب کے انتقال کی خبر آ گئی۔ وہ سب حق نگر گئے، اور وہاں اس نے صفیہ آپا کے ساتھ عدت تک رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ قدرتی بات تھی۔ بعد میں اسے خیال آیا کہ اس نے نور بانو کو اپنی نگاہوں سے دور رہنے کا موقع دے دیا۔ پھر اس نے سوچا، کوئی بات نہیں، چار ساڑھے چار مہینے کی تو بات ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے؟

مگر جب اسے عبدالحق سے پتا چلا کہ نور بانو ایبٹ آباد چلی گئی ہے، اور بچے کی ولادت وہیں ہوگی، تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ یہ کون سی تک ہے؟ اس نے سوچا۔ بات صاف تھی۔ نور بانو نے اس کے دور ہونے کا فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ ہوتی تو اسے کسی قیمت پر گھر سے دور نہیں جانے دیتی۔ پر عبدالحق سے تو وہ کچھ بھی منوا سکتی تھی۔ اور اس نے رسماً بھی اس سے اجازت نہیں لی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اجازت اسے نہیں ملے گی، اور اسے رکنا پڑ جائے گا۔ وہ نہیں جا سکے گی۔ ظاہر ہے، وہ منع کر دیتی تو عبدالحق اس کے حکم کے سامنے چوں بھی نہ کرتا، اور نور بانو بے بس ہو جاتی۔

اور سب سے زیادہ شبہ پیدا کرنے والی بات یہ تھی کہ نور بانو اپنے ساتھ ارجمند کو بھی لے گئی تھی۔ یہ تو بہت بری بات ہے۔ اس نے سوچا تھا۔ نور بانو نے عبدالحق کو اکیلا چھوڑ دیا۔ دو بیویوں کے ہوتے ہوئے آدمی اکیلا رہے؟ یہ تو کوئی بات ہی نہیں۔

اب اس کی سمجھ میں آیا کہ نور بانو نے اسے فون کیوں نہیں کیا ...؟ ایبٹ آباد جانے پر تو شاید وہ صبر کر لیتی۔ لیکن عبدالحق پر یہ ظلم تو وہ کسی قیمت پر نہ ہونے دیتی۔ نور بانو کے لئے ارجمند اور عبدالحق پر اپنی بات تھوپنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

پھر کراچی سے عبدالحق کا فون آیا تو وہ اور پریشان ہوگئی۔ کراچی پہنچتے ہی عبدالحق کی طبیعت خراب ہوئی۔ آپریشن کی نوبت آ گئی۔ کم از کم اس موقع پر ارجمند کو تو اس کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔

اس پریشانی میں وہ عبدالحق سے نور بانو اور ارجمند کے ایبٹ آباد جانے کے بارے میں کچھ پوچھ نہیں سکی۔ اگلی بار اس نے پوچھا تو ملنے والا جواب کم از کم اس کے لئے تو تسلی بخش نہیں تھا۔ اور ارجمند کو ساتھ لے جانے کی وجہ یہ کہ نور بانو

اسے بہنوں کی طرح چاہتی ہے، اس سے دور نہیں رہ سکتی۔

عبدالحق نے اس سے معافی مانگی۔ کچھ کہنے کا فائدہ نہیں تھا۔ تیر تو کمان سے نکل چکا تھا۔ حمیدہ نے زیادہ بات نہیں کی کہ عبدالحق اور شرمندہ ہوگا۔ پھر بابا کی بات بھی اسے یاد آئی کہ خاموشی سے تماشا دیکھنا، دخل نہ دینا۔

اسے یقین ہوگیا کہ نور بانو کوئی بہت بڑا کھیل کھیل رہی ہے۔ اس کی نگاہوں سے دور بھاگنا اس کا ثبوت تھا۔ مگر کیا نور بانو کو اس کا ڈر نہیں کہ لاہور واپسی کے بعد وہ ایبٹ آباد کا رخ ضرور کرے گی۔ تب وہ کیسے اسے روکے گی؟ یا خود بھاگ کر کہاں جائے گی؟

مگر لاہور واپس آنے کے بعد اس نے ایبٹ آباد جانے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ اتنی بری طرح بیمار پڑ گئی۔ اب کمزوری کا یہ عالم ہے کہ گھر میں چلنا پھرنا ممکن نہیں۔ ایبٹ آباد جانے کا کیا سوال ہے؟

بابا نے کہا تھا، اللہ کی مرضی ہے تو وہ ان کی مدد بھی کر رہا ہے، پردہ بھی رکھ رہا ہے۔

واقعی ...! اس نے دل میں سوچا۔ اب میں ایبٹ آباد نہیں جا سکتی۔ یہاں رہنے پر مجبور ہوں تو یہ نور بانو کے لئے آسانی ہی تو ہے۔ اس کا پردہ چاک نہیں ہو رہا ہے۔

نہ جانے کیوں، اسے یقین ہوگیا تھا کہ درحقیقت ارجمند ماں بننے والی ہے، اور نور بانو اس کا بچہ ہتھیا لے گی۔ اسی لئے تو وہ اسے لے کر دور چلی گئی ہے کہ کسی کو پتا ہی نہ چلے۔

اس خیال کو اس بات سے اور تقویت ہوتی تھی کہ وہ صرف نوریز اور ارجمند کو ساتھ لے کر گئی۔ نوریز کو تو باہر رہنا تھا۔ اسے کچھ پتا نہ چلتا۔ اب پہلا پہلا بچہ ہے۔ کسی عورت کو تو ساتھ رکھنا تھا۔ وہ رابعہ کو بھی ساتھ لے جاتی۔ لیکن اس صورت میں بات کھل نہ جاتی۔

یہی بات ہے۔ یہی معاملہ ہے۔

حمیدہ کا دل گھبرانے لگا۔ اس نے نسیمہ کو بلایا۔

''دیکھو ... میں تو چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوں ... تو بابا کے پاس چلی جا......!''

''ٹھیک ہے اماں ...! کہنا کیا ہے ...؟''

حمیدہ نے بہت محتاط انداز میں اپنا مدعا بیان کیا کہ بات نسیمہ پر نہ کھلے۔ گھر کی بات نوکروں تک تو نہیں پہنچنی چاہئے۔

لیکن نسیمہ واپس آئی تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''کیا ہوا نسیمہ ...! خیر تو ہے......؟''

''اماں ...! بابا کا تو وصال ہوگیا۔''

پہلے تو بات حمیدہ کی سمجھ میں ہی نہیں آئی۔ پھر سمجھ میں آئی تو اس نے گھبرا کر پوچھا۔

''کب ...؟''

''دو مہینے ہوگئے اماں ...!''

تب حمیدہ کو یاد آیا۔ پچھلی ملاقات میں بابا نے یہ بھی تو کہا تھا کہ اگلی بار یہاں نہ آنا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اب وہ اس سے کبھی نہیں ملیں گے۔

حمیدہ وحشت زدہ ہوگئی۔ اب تو کوئی راہنمائی کرنے والا بھی نہیں رہا۔ اب وہ کیا کرے؟ کچھ نہیں کیا تو نور بانو کامیاب ہو جائے گی۔ اور کہیں اس معاملے میں خدانخواستہ ارجمند کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

اس ہفتے عبدالحق آیا تو اس نے عبدالحق سے بات کی۔

''مجھے یہ بتا پتر ...! کہ نور بانو اور ارجمند کا کیا حال ہے ...؟ میں ان کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔''

''پریشانی کی کوئی بات نہیں اماں ...!'' عبدالحق نے اسے دلاسہ دیا۔

''دونوں الحمدللہ خیریت سے ہیں۔''

''دیکھنے میں کیسی لگتی ہے نور بانو ...؟'' حمیدہ نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

عبدالحق ہکا بکا رہ گیا۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا اماں ...!''

''کہتے ہیں، عورت ماں بننے والی ہو تو اس پر نور اتر آتا ہے۔''

''ایبٹ آباد جانے کے بعد میں نے اسے دیکھا ہی کب ہے اماں ...!''

حمیدہ کے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ اسے یقین تھا کہ عبدالحق ایبٹ آباد نہیں جاتا ہے۔ اگر جاتا ہوتا تو پردہ نہ اٹھ جاتا۔

''یہ تو بڑی زیادتی ہے پتر ...! عورت کو اس حال میں شوہر کا ساتھ چاہئے ہوتا ہے۔''

''پچھلے عرصے میں اتنی مصروفیت رہی ہے اماں......! دوبارہ تبادلہ ہوگیا۔ جنگ ہوگئی۔ مجھے موقع ہی نہیں ملا۔''

''پر مجھ سے ملنے تو تو حق نگر بھی آ گیا تھا جنگ کے دنوں میں۔ پھر طبیعت خراب ہوئی تو کئی دن میرے پاس رہا۔ اور اب بھی ہفتے میں ایک بار مجھ سے ملنے آتا ہے۔ وہ تیری بیویاں ہیں۔'' حمیدہ نے ''بیویاں'' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ان کا بھی حق ہے تجھ پر......!''

''وہ تو ٹھیک ہے اماں......! پر ...''

حمیدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''بس اگلی بار تو میرے پاس آنے کے بجائے ایبٹ آباد جانا۔ اور انہیں دیکھ کر آنا۔ مجھے بتانا کہ وہ دونوں کیسی ہیں؟ مجھے بہت فکر ہے ان کی۔ اب میں خود تو جا نہیں سکتی۔''

''لیکن اماں......! مجھے کلکٹر صاحب نے ہر ہفتے کی یہ رعایت صرف تمہارے لئے دی ہے۔''

''اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ تو ان سے کہے کہ اپنی بیوی کے پاس جا رہا ہے، تو وہ منع تو نہیں کریں گے نا......؟''

''وہ تو ٹھیک ہے اماں......! لیکن ...''

''لیکن ویکن کچھ نہیں......! یہ میرا حکم ہے۔''

''میں نہیں جا سکتا اماں ...!''

''تو میرا حکم نہیں مانے گا.....؟''

''مجبوری ہے اماں.....!''

''مجبوری ہے تو مجھے بھی بتا.....!''

عبدالحق چند لمحے ہچکچاتا رہا۔ پھر اس نے حمیدہ کو نور بانو کی منت کے بارے میں بتا دیا۔

حمیدہ حیرت سے منہ کھولے سنتی رہی۔ پھر غصے سے بولی۔

''اور تو نے مان لی یہ جاہلانہ بات.....؟''

''اور کیا کرتا اماں.....! منت اس نے مجھ سے پوچھ کر تو نہیں مانی تھی۔''

حمیدہ اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ بات منت کی نہیں، مکاری کے کھیل کی ہے۔ مگر ایک بات اس کو سوجھ گئی۔

''چل..... یہی سہی۔ پر ارجمند کے لئے تو پابندی نہیں ہے تجھ پر..... تو اس سے مل کر آ..... اور اس کے بارے میں مجھے بتا۔'' یہ کہہ کر وہ خوش ہوئی کہ کھیل اگر وہی ہے، جو وہ سمجھ رہی ہے تو ارجمند کو دیکھ کر ہی کھل جائے گا۔

''یہ خطرہ میں مول نہیں لے سکتا اماں.....!'' عبدالحق کے جواب نے اسے مایوس کر دیا۔

''وہاں جاؤں.....! اور نور بانو سے نہ ملوں، یہ کیسے ممکن ہے.....؟''

''بچہ تو نہیں ہے تو.....! اور تجھے نور بانو کی منت کا پاس بھی ہے۔''

''اور نور بانو ہی ضبط نہ کر پائی تو.....''

''ایسا نہیں ہوگا۔ بس تو اگلی بار یہاں آنے کے بجائے ایبٹ آباد جانا۔''

''لیکن اماں.....!''

''یہ میرا حکم ہے پتر عبدالحق.....!'' حمیدہ نے سخت لہجے میں کہا۔ پھر وہ مطمئن ہوگئی، کیونکہ عبدالحق نے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔

لیکن جمعرات کو عبدالحق کا فون آیا۔ اس کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ ٹخنے کی ہڈی پر ہلکی ضرب لگی تھی۔ لیکن ڈاکٹر نے اسے چھ ہفتے کے لئے چلنے پھرنے سے منع کر دیا تھا۔ اب تو وہ اس سے ملنے بھی نہیں آ سکتا تھا۔

حمیدہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ جب اللہ کسی کا پردہ رکھ رہا ہو تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟ بابا نے بھی کہا تھا..... کچھ مت کرنا۔ تماشا دیکھتی رہنا۔

اس کے دل میں مایوسی تھی۔ مگر پھر اچانک اسے یاد آیا۔ بابا نے آخر میں یہ بھی تو کہا تھا کہ جھوٹ سچ سے کبھی جیت نہیں سکتا۔

❁ ❁ ❁

نور بانو میں اتنی واضح تبدیلی آئی تھی کہ اسے سب نے ہی محسوس کر لیا تھا۔ نماز وہ باقاعدگی سے پڑھنے لگی تھی، بلکہ کوشش کرتی تھی کہ وقت پر ہی نماز ادا کرے۔ پھر قرآن کی تلاوت اور تسبیح پڑھنا معمول بن گیا تھا۔

ارجمند اس تبدیلی پر بہت خوش تھی۔ اس نے تو کبھی نور بانو کو ایسا دیکھا ہی نہیں تھا۔ ہاں.....! وہ اس کے لئے دعا بہت کرتی تھی۔ منہ سے کہنا تو اسے اچھا نہ لگتا۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات والا معاملہ تھا۔

رشیدہ نے اس تبدیلی پر دل میں یہ تبصرہ کیا کہ ظالموں کو بھی خدا یاد آنے لگا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ بیگم صاب اپنی بیماری سے بری طرح خوف زدہ ہوگئی ہیں۔ آپریشن سے گھبراتی ہیں، اس لئے خدا کو پکار رہی ہیں۔

مگر ارجمند نے اس تبدیلی کو بھی محسوس کر لیا، جو نور بانو کے باطن میں رونما ہوئی تھی۔ شاید یہ اس کی گفتگو کا نتیجہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ نور بانو کو اپنی تمام کوتاہیوں، تمام برائیوں کا احساس ہو گیا ہے۔

اس روز نور بانو نے نماز کے لئے جاتے ہوئے اس سے عبدالحق کو فون کرنے کو کہا تو ارجمند حیران رہ گئی۔ نور بانو نے جتا دیا تھا کہ وہ فون اسی کو کرنا ہے، خود وہ بات نہیں کر سکے گی۔ کیونکہ نماز کے بعد اسے قرآن بھی پڑھنا ہے۔

ارجمند جانتی تھی کہ اس کا عبدالحق سے فون پر بات کرنا نور بانو کو پسند نہیں۔ اسی لئے اس نے کبھی خود سے عبدالحق کو فون نہیں کیا تھا۔ اور عبدالحق کا فون آتا تو بھی وہ مختصر بات کر کے نور بانو کی طرف بڑھا دیتی۔

لیکن اب نور بانو اسے عبدالحق کو فون کرنے کی کھلی اجازت دے رہی تھی۔

ارجمند انسان تھی، فرشتہ نہیں اور وہ عبدالحق سے محبت کرتی تھی، اور بیوی ہونے کے ناطے اس کا عبدالحق پر حق بھی تھا۔ اور وہ ناسمجھ بھی نہیں تھی۔ جانتی تھی کہ نور بانو نے اپنی غرض سے اس کی اور عبدالحق کی شادی کرائی ہے۔ وہ غرض کتنی بڑی اور کتنی مشکل تھی، یہ ابتداء میں تو وہ سمجھ ہی نہیں سکی۔ لیکن اب اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ اس کے علاوہ شاید کوئی بھی نور بانو کی وہ غرض پوری نہیں کر سکتا تھا۔

پھر اس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ نور بانو جو اسے فون پر بھی عبدالحق سے بات نہیں کرنے دینا چاہتی، تو آگے جا کر وہ عبدالحق سے اس کا ملنا کیسے گوارہ کرے گی؟ اور وہ اتنی تیز اور اور عبدالحق پر ایسے حاوی ہے کہ اس سے کچھ بھی کروا دے۔ بچہ ملنے کے بعد تو اسے اس کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ اور عبدالحق کو تو ویسے بھی اس کی کچھ پرواہ نہیں۔ سو کچھ عجیب نہیں کہ بعد میں وہ کوئی متروک مکان بن کر رہ جائے۔

یہ سب کچھ سوچنا تو فطری تھا۔ لیکن وہ ان سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیتی۔ وہ اسے اپنی بدگمانی قرار دے کر شرمندہ ہوتی۔ مگر جب سوچیں پیچھا نہ چھوڑتیں تو اس کے پاس اس کا دوسرا علاج بھی تھا۔ یہ سچ تھا کہ اس نے نور بانو کی خودغرضانہ پیش کش کو صدقِ دل سے اللہ کی بہت بڑی نعمت سمجھ کر قبول کیا تھا۔ شکایت کا کیا سوال، کہ وہ تو اس کے لئے مقامِ شکر تھا۔ وہ اس پر اللہ کا شکر بھی ادا کرتی، اور وہ اس پر نور بانو کی بھی شکرگزار تھی۔ اس نے عبدالحق کو پانے کے لئے کبھی کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ تو یہ جانتی تھی کہ جب وقت آئے گا تو اللہ میاں ہی اسے عبدالحق سے ملوائیں گے۔ کس طرح؟ اس سے اسے کوئی غرض نہیں تھی۔

اور جب وہ ملے تو اس نے سمجھ لیا کہ اللہ نے ایسا ہی چاہا ہے۔ اور جو اس نے چاہا ہے، اس پر گلہ کیسا؟ اس پر تو بس شکر ادا کرنا ہے۔ اور یہ بھی اسے یقین تھا کہ اللہ جب چاہے گا، یہ خوشی واپس لے لے گا۔ اور اسے اس صورت میں بھی اللہ کا شکر ادا کرنا ہے۔

ایسے میں نور بانو سے شکایت کی گنجائش ہی کہاں تھی۔

اب، جب نور بانو کا رویہ بدلا تو یہ اس کے لئے خلافِ توقع اور بہت خوش

کن تھا۔ یہ اللہ کی طرف سے بہت بڑا فضل تھا۔ اس کی شکرگزاری اور بڑھ گئی۔

اس نے عبدالحق کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف سے اس کی آواز پہچان کر یعقوب نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''صاب تو انجرڈ ہوگئے ہیں چھوٹی میم صاب.....!''

وہ متوحش ہوگئی۔

''کیا ہوا.....؟ خیر تو ہے.....؟''

''ایسکی ڈینٹ ہوگیا تھا.....''

''مسٹر جیکب.....! ریسیور میری طرف بڑھائیے۔'' اسے عبدالحق کی آواز سنائی دی۔

''نو سر.....! مجھے جیکب نہیں، یعقوب بلائیں۔'' یعقوب نے احتجاج کیا۔

''تو پھر آپ بھی انگریزی کی ٹانگ توڑنا چھوڑ دیں۔''

''انہیں ریسیور دو نا یعقوب.....!'' ارجمند نے پریشان ہو کر کہا۔

''دیتا ہوں.....!''

''خیریت تو ہے.....؟'' ارجمند نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''حادثہ ہوگیا تھا۔ ٹخنے پر معمولی سی چوٹ آئی ہے۔ لیکن ڈاکٹر نے چھ ہفتے کے بیڈ ریسٹ کی پخ لگا دی ہے۔''

''ہوا کیسے.....؟''

''میں تو یہی کہوں گا کہ تمہاری وجہ سے ہوا۔'' عبدالحق کے لہجے میں شوخی تھی۔

''کیا مطلب.....؟''

''تم سے ملنے کے لئے ایبٹ آباد آنے کا ارادہ کیا تھا کہ یہ حادثہ ہوگیا۔''

''مجھ سے ملنے کے لئے.....!'' ارجمند کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ظاہر ہے.....! نور بانو سے تو میں ملنے سے رہا۔ تم ہی سے ملنے کے لئے آسکتا ہوں۔''

ارجمند کو نہیں معلوم تھا کہ آپی نے عبدالحق کو یہاں آنے سے کیسے روک

رکھا ہے۔ اس نے تو سب کچھ ان پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ اور یہ بات ثابت بھی ہوگئی تھی کہ آپی جس سے جو چاہیں، کرا سکتی ہیں۔

اس وقت نہ جانے کیسے اس پر تجسس غالب آ گیا۔ اس نے پوچھا۔

''آپ آپی سے کیوں نہیں مل سکتے ...؟''

''تمہیں نہیں معلوم ...؟''

''جی نہیں ...!''

''اس نے ایک جاہلانہ منت مان لی تھی کہ بچے کی ولادت تک میں اور وہ نہیں ملیں گے۔'' عبدالحق کے لہجے میں جھنجلاہٹ آ گئی۔

ارجمند حیران رہ گئی۔ واقعی، آپی کا کوئی جواب نہیں۔ کیا ترکیب ہے؟ لیکن فوراً ہی اسے خیال آیا کہ آغا جی کا ایکسیڈنٹ نہ ہوا ہوتا تو آپی کیا کر لیتیں ...؟ آغا جی اسے دیکھتے تو پول نہ کھل جاتی۔

اس لمحے ایک اور بات اس کی سمجھ میں آئی۔ اللہ میاں ساتھ دے رہے ہیں، پردہ رکھ رہے ہیں، ورنہ دھری رہ جاتی آپی کی عقل مندی۔ دادی اماں آنے والی تھیں تو وہ بیمار ہوگئیں۔ اب آغا جی آنے والے تھے تو حادثے نے انہیں روک دیا۔ سچ ہے، اللہ کے حکم سے ہی سب کچھ ہوتا ہے۔

''کہاں کھو گئیں تم ...؟'' عبدالحق کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''کچھ سوچ رہی تھی۔''

''کیا سوچ رہی تھیں ...؟''

''یہ کہ آپ کا ایکسیڈنٹ ہوا، اور آپ نے فون کر کے ہمیں بتانے کی بھی زحمت نہیں کی ...؟''

''دراصل میں بہت زیادہ ناراض تھا، اور میں نے سوچ لیا تھا کہ اب فون نہیں کروں گا۔''

ارجمند حیران رہ گئی۔

''ناراض تھے آپ ...؟ کوئی غلطی ہوگئی مجھ سے ...؟''

''نہیں ...! تم سے نہیں، تم ناراض ہونے کا موقع ہی کہاں دیتی ہو ...؟

میں نور بانو سے ناراض تھا۔''

''تو میں کیوں لپیٹ میں آئی ...؟ آپ مجھے تو فون کر سکتے تھے۔''

''تم سے فون پر کب بات ہوتی ہے ...؟'' عبدالحق کے لہجے میں شکایت تھی۔

''بات ہو تو مشکل سے آدھے منٹ کے بعد تم ریسیور نور بانو کو تھما دیتی ہو۔''

''آپ نے کبھی اصرار ہی نہیں کیا کہ آپ اور بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''تمہارا اپنا دل نہیں چاہا کبھی ...؟''

یہ نازک مرحلہ تھا۔ ارجمند نے بہت محتاط انداز میں جواب دیا۔

''میں دل کی باتیں کم ہی مانتی ہوں آغا جی ...! اور اپنی عادتیں خراب بھی نہیں کرنا چاہتی۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ پھر بات کا رخ بدلا۔

''یہ بہت تشویش ناک بات ہے کہ آپ آپی سے ناراض ہیں۔ اب یہ آپ دونوں کی آپس کی بات ہے۔ مجھے پوچھنے کا حق نہیں۔''

''حالانکہ ناراضی کا سبب ہی تم ہو۔''

اس پر تو ارجمند بھونچکی رہ گئی۔ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہیں سکی۔

''کیا ہوا...؟ تم فون پر موجود تو ہو نا ...؟''

''جی ... جی ہاں ...! اصل میں مجھے شاک لگا ہے یہ سن کر۔ ایسی کون سی بات ہے کہ میری وجہ سے آپ آپی سے ناراض ہوگئے ...؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''میں تم سے فون پر بات کرنا چاہتا تھا... تفصیل سے، لیکن جانتا تھا کہ نور بانو موقع ہی نہیں دے گی۔''

''آپی کے بارے میں یہ گمان کیسے کر لیا آپ نے ...؟'' ارجمند نے خفگی سے کہا۔

''میں اسے جانتا ہوں اچھی طرح۔ وہ ایسی حاسد ہے کہ کسی کو بھی نہیں بخشتی۔ اپنا ساجد ہے نا ...! یہ مشکل سے چند ماہ کا تھا، اس سے بھی حسد کرتی تھی

نور بانو۔ میں تم سے بات کر رہا ہوتا ہوں، اور تم اچانک نور بانو کو ریسیور دے دیتی ہو، تو کیا میں اس کی وجہ نہیں سمجھ سکتا؟ اس کا منہ بن جاتا ہوگا، اور تم اس سے محبت بہت کرتی ہو۔''

''اور آپ بدگمان بہت کرتے ہیں، جو کہ بہت بری بات ہے۔ آپ نے غلط سوچا۔''

''تو پھر اصل وجہ تم بتا دو.....!''

اتنی دیر میں ارجمند سوچ بھی چکی تھی۔

''کچھ لوگ فون پر لمبی بات نہیں کر سکتے۔ اپنے گھر میں اور بھی لوگ ہیں ایسے۔''

''زبیر بھائی اور بھابی.....!''

''میں بھی انہی میں سے ہوں۔''

''اوہ.....!'' عبدالحق کا لہجہ قدرے پرسکون ہوگیا۔

''اب تو آپ آپی سے ناراض نہیں ہے نا.....؟''

''میں اب بھی ناراض ہوں اس سے۔''

''کیوں.....؟''

''ایک تو میں تمہارے جواب سے مطمئن نہیں ہوں۔''

''آپ کے خیال میں میں جھوٹ بول رہی ہوں.....؟'' ارجمند نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

اس کے لہجے کے یقین نے ارجمند کو ہلا ڈالا۔ اس کا چہرہ خفت سے تمتما اٹھا۔ جھوٹ تو اس نے بولا تھا، لیکن میاں بیوی کے درمیان ناراضی ختم کرانے کے لئے۔ لیکن جو وہ ایک عملی جھوٹ میں شامل تھی، وہ تو بہت بڑا تھا.....زندگی سے بھی بڑا۔ وہ نور بانو کی خوشی کے لئے ایثار کر رہی تھی، لیکن تھا تو وہ بھی جھوٹ ہی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اللہ کے ہاں اس کا اجر ملے گا کہ اس پر سزا ملے گی۔ اس نے سوچا، عبدالحق کو اس پر اتنا یقین ہے، اگر وہ آجاتا اور اسے دیکھ لیتا تو وہ اس کی

نظروں میں کتنی حقیر ہو جاتی۔ شاید عبدالحق بھی اس کی صورت دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتا۔

''لیکن اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ تم چاہتیں تو بھی نور بانو تمہیں موقع نہیں دیتی۔'' عبدالحق نے بات پوری کی۔

''یہ تو زیادتی ہے آغا جی.....! یہ تو محض گمان ہے آپ کا۔''

''بات تو اور بھی ہے، اور وہ محض بدگمانی نہیں ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''وہ تمہیں اپنے ساتھ یہاں لے کر آئی، جبکہ اس کا جواز نہیں تھا کوئی۔ وہ اپنی منت پوری کرتی۔ تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔''

''مجھے اس میں کوئی زیادتی نہیں نظر آتی۔ میں اپنی خوشی سے یہاں آئی ہوں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ کام آپ کی اجازت سے ہی ہوا ہے۔ اس پر آپ خفا کیسے ہو سکتے ہیں.....؟''

عبدالحق چند لمحے خاموش رہا۔ قصور وار تو وہ تھا۔ اور اب تو یہ بات ارجمند نے بھی کہہ دی تھی۔ اگرچہ اس کا انداز الزام لگانے والا نہیں تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''یہی تو بات ہے۔ نور بانو نے کہا، اور میں نے اس کی محبت میں مان لیا۔ لیکن یہ میں نے تمہارے ساتھ بے انصافی کی۔ تم میری بیوی ہو۔ تمہیں میرے ساتھ رہنے کا حق تھا۔ اب اس پر اللہ کے سامنے جواب دہ میں ہوں، نور بانو تو نہیں۔''

''غلطی آپ اپنی مان رہے ہیں اور خفا آپی سے ہو رہے ہیں۔ عجیب سی بات ہے نا.....!''

''تمہیں یہ بات عجیب لگتی ہے تو شاید تم محبت کو سمجھتی نہیں ہو۔ میں نور بانو سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ اس کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا، اور وہ یہ بات جانتی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔''

''خیال نہیں، یہ حقیقت ہے۔'' ارجمند اس کی بات کاٹ دی۔

''تو ایسے میں کیا میں نور بانو کی ذمہ داری نہیں۔'' عبدالحق نے تیز لہجے میں کہا۔

"اسے مجھ سے کوئی ایسا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے، جس پر مجھے اللہ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے، اس کی محبت نے مجھے کوئی کمزوری دی ہے تو اسے اس کے سلسلے میں مجھے آزمائش سے بچانا چاہئے، نہ کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے۔ اب دیکھو نا.....! میں دوسری شادی سے اسی لئے تو گھبراتا تھا کہ انصاف کرنا بہت مشکلات ہے۔ اس نے ضد کر کے مجھے مجبور کیا، اور پھر خود ہی مجھ سے بے انصافی کروائی۔"

"آپ بات کا بتنگڑ بنا رہے ہیں۔" ارجمند نے بے پرواہی سے کہا۔

"چلو..... ٹھیک ہے.....! میں جانتا ہوں کہ تم جھوٹ نہیں بولتیں۔ تو میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں، اس کا جواب دو۔ بولو، دو گی.....؟"

"جی ضرور.....!"

"تم مجھ سے محبت کرتی ہو نا.....؟"

"جو بات آپ یقینی طور پر جانتے ہیں، اسے بار بار پوچھنا تو مناسب نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں شرمندہ ہوتی ہوں۔"

"مجبوراً پوچھا ہے۔ اب ذرا خود کو نور بانو کی جگہ اور نور بانو کو اپنی جگہ رکھ کر سوچو، اور مجھے بتاؤ کہ کیا تم مجھ سے وہ سب کچھ کروا سکتی تھیں، جو نور بانو نے کروایا۔"

ارجمند خاموش رہ گئی۔ اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس۔ اور جو جواب تھا، وہ نور بانو کے خلاف جاتا تھا۔

"نہیں دینا چاہتیں نا اس کا جواب.....!"

"پتا نہیں.....! آپ کیا کروانے کی بات کر رہے ہیں.....؟" ارجمند نے بات گھمانے کی کوشش کی۔

"تم نور بانو کی جگہ ہوتیں تو کیا اس سے میری شادی کرانے کے لئے اصرار کرتیں.....؟"

"یقیناً کرتی.....!" ارجمند کے لئے یہ جواب نہایت آسان تھا۔

"پھر تم منت مانتیں، اور اسے اپنے ساتھ ایبٹ آباد بھی لے جاتیں۔

اور وہ بھی مجھ سے اجازت لے کر۔"

ارجمند خاموش رہی۔

"جواب دو نا.....! مجھے معلوم ہے کہ کہو گی تم سچ ہی۔"

"نہیں.....! میں ایسا نہیں کرتی۔"

"صرف اس لئے نا کہ تم مجھے خسارے میں نہیں دیکھ سکتیں۔ یہ تم نے مجھے پہلی رات ہی بتا دیا تھا۔ تم مجھے کوئی ایسا کام کرتے ہوئے دیکھ کر خاموش بھی نہیں رہ سکتیں، جس کی مجھے اللہ کے سامنے جواب دہی کرنی پڑے۔ لیکن نور بانو کو اس کی پرواہ نہیں۔ اس نے تو دانستہ مجھے خسارے میں ڈال دیا۔ تو میں اس سے ناراض بھی نہ ہوں.....؟"

"اللہ نہ کرے کہ آپ کو کبھی خسارہ ہو..... اور وہ بھی میری وجہ سے۔ انشاء اللہ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔"

"کیسے.....؟"

"شاید آپ بھول گئے۔ جب ہماری شادی کی بات چلی تھی، اور آپ مجھ سے پوچھنے، بلکہ مجھے سمجھانے کے لئے آئے تھے کہ میں خسارے کا سودا کر رہی ہوں۔ کیونکہ آپ صرف آپی سے محبت کرتے ہیں۔ مجھے آپ کی محبت نہیں مل سکے گی۔"

"شرمندہ کر رہی ہو مجھے.....!"

"ہرگز نہیں.....! یہ بھی میرے جیتے جی انشاء اللہ کبھی نہیں ہوگا۔ میں صرف آپ کو ایک بات یاد دلا رہی ہوں۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں آپ سے کبھی کچھ طلب نہیں کروں گی۔ اور میں نے اللہ کو گواہ بناتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ آپ کے ساتھ رہتے ہوئے آپ کی کسی بات پر کبھی دکھ نہیں کروں گی۔ اور دکھ ہوا تو بھی میں ابھی سے اللہ کے سامنے آپ کو اس سے بری قرار دیتی ہوں۔ میں پھر دہراؤں آغا جی.....! اللہ مجھے اس سے محفوظ رکھے کہ میں زندگی کی سب سے بڑی نعمت پر شکر ادا کرنے کے بجائے اس کی شکایت کروں۔ یہ میں صرف اس لئے دہرا رہی ہوں آغا جی.....! کہ میں نے اللہ کو گواہ بنا کر آپ کو اپنے معاملے میں ہر

جواب دہی سے محفوظ کر دیا ہے۔ اس لئے آپ کو آپی سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں۔''

دوسری طرف خاصی دیر خاموشی رہی۔ پھر عبدالحق نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''جزاک اللہ ... ! ارجی..... ! اللہ نے تمہیں بڑائی دی ہے، اور مجھے تمہارے روپ میں بہت بڑی نعمت، جس کی میں کبھی قدر نہیں کر پایا۔''

''بس..... ! میری تعریف نہ کریں بلاوجہ.....''

''لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم نے خود اللہ کے سامنے اپنی جواب دہی کی فکر نہیں کی۔''

ارجمند دہل گئی۔

''کیا کہہ رہے ہیں آغا جی..... !''

''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''

''کس معاملے میں..... ؟''

''یہاں..... ایبٹ آباد آنے کے معاملے میں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''تم نے مجھے اجازت لینے کی زحمت بھی نہیں کی۔''

''لیکن آپ نے اجازت دی تو تھی۔ آپی نے کہا تھا.....''

''اللہ کی طرف سے تم پر میری اطاعت فرض ہے، نور بانو کی نہیں۔ تم اگر مجھ سے پوچھتیں تو شاید مجھے خیال آجاتا کہ یہ تمہارے ساتھ زیادتی ہے۔ میں تم پر اپنے حق سے دست بردار ہونے کا حق رکھتا ہوں، لیکن تمہارا حق سلب کرنے کا تو مجھے اختیار نہیں تھا۔'' عبدالحق کے لہجے میں تاسف تھا۔

''یہ تو ٹھیک کہا آپ نے ... ! مجھ سے واقعی بڑی بھول ہوئی۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔''

''ایسے نہ کہو... ! معاف تو تمہیں کرنا ہوگا مجھے۔''

''بس..... ! اس بات کو چھوڑیں۔ آپی سے اپنی ناراضی ختم کر دیں۔''

''کر دوں گا۔ لیکن اب ہمیشہ چوکنا رہوں گا اس کی طرف سے۔''

ارجمند نے اس لمحے سوچا کہ اگر اس نے نور بانو کے ساتھ ایبٹ آباد آنے کے سلسلے میں عبدالحق سے اجازت طلب کی ہوتی، اور عبدالحق کو اس حق تلفی کا خیال آجاتا اور وہ اسے روک دیتا تو کیا ہوتا..... ؟

ایک لمحے کو وہ خوش ہوگئی۔ یوں وہ اور نور بانو اس جھوٹ سے بچ جاتے..... اس بہت بڑے عملی جھوٹ سے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی سمجھ میں آیا کہ نور بانو اس سے خفا ہو جاتی۔ اور یہی نہیں، خود وہ بھی نور بانو سے وعدہ خلافی کی مرتکب ہوتی۔ کیونکہ ناسمجھی میں ہی سہی، لیکن اس نے نور بانو سے وعدہ کیا تھا کہ اپنا بچہ اسے دے گی۔

''کیا ہوا..... ؟ بری لگی میری یہ بات..... ؟'' عبدالحق نے اسے چونکا دیا۔

''اتنی محبت کرتی ہو نور بانو سے..... !''

''جو جانتے ہیں، وہ پوچھتے کیوں ہیں... ؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''مجھ سے بھی زیادہ..... !''

''یہ بھی آپ جانتے ہیں۔ خود سے ہی پوچھ لیں..... !'' ارجمند کچھ خفا سی ہوگئی۔

''چلو..... نہیں پوچھتا۔ پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں..... !''

''اور اب اپنی بدگمانی پر بھی غور کر لیں۔ یہ اتنی طویل گفتگو جو ہمارے درمیان ہوئی ہے، اس کا سبب آپی ہیں۔ وضو کر کے نماز کے لئے جاتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا تھا آپ کو فون کرنے کو، اتنے دن سے آپ کا فون نہیں آیا تھا۔''

عبدالحق کے لئے تو وہ دہری خوش خبری تھی۔ ایک طرف نور بانو کا دل کشادہ ہوا تھا دوسری طرف وہ نماز پڑھ رہی تھی۔

''تو اب تک تو وہ نماز پڑھ چکی ہوگی۔ میری بات کرا دو اس سے۔'' اس نے کہا۔

''جی نہیں..... ! میں نہیں کراؤں گی بات..... !'' ارجمند نے شوخ لہجے میں کہا۔

''میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔''

عبدالحق ہنسنے لگا۔

''تمہارے منہ سے کتنی اوپری اور غیر حقیقی لگ رہی ہے یہ بات......! بات کراؤ نا نور بانو سے۔''

''سوری آغا جی...... ناممکن نہیں ہے۔'' ارجمند سنجیدہ ہوگئی۔

''آپی کہہ کر گئی ہیں کہ نماز کے بعد وہ قرآن پڑھیں گی۔ اس لئے آج آپ سے ان کی بات نہیں ہو سکے گی۔ اور ابھی تک تو انہوں نے نماز بھی نہیں پڑھی ہوگی۔''

عبدالحق کو لگا کہ دنیا ہی بدل گئی ہے۔

''اس کا مطلب ہے کہ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے......!''

''جی آغا جی......! الحمد للہ......!''

''چلو...... اسے میرا سلام کہہ دینا۔ میں پھر کسی دن فون کروں گا۔''

''آپ اپنا خیال رکھئے گا......!''

''وہ تو مجھے آتا ہی نہیں......!''

''میں آپ کے لئے بہت دعا کرتی ہوں۔ اب اور زیادہ کروں گی۔''

''جزاک اللہ ارجی......!'' عبدالحق کے لہجے میں محبت تھی۔

''اللہ حافظ......!''

''فی امان اللہ آغا جی......!'' ارجمند نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

❁❁❁

نور بانو کسی سے یہ بات کہہ نہیں سکتی تھی۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ درد اب ہر روز ہوتا تھا۔ دوا سے وقتی طور پر آرام آ جاتا تھا۔ مگر دوا کی دوسری خوراک کا وقت آنے سے پہلے ہی پھر جاگ اٹھتا تھا۔ ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا تھا کہ وقت سے پہلے دوا ہرگز نہ لی جائے۔ سو اسے وہ وقت گزارنا ہوتا تھا۔ ہر لمحہ اسے محسوس ہوتا کہ وہ اندر سے کٹ رہی ہے۔

ستم یہ تھا کہ وہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔

پھر دوا کھانے کے بعد آرام کے وہ دورانیے سکڑنے لگے۔ درد ناقابل برداشت ہوتا تو وہ وقت سے پہلے ہی دوا لے لیتی۔ اور جب بہت مجبور ہو جاتی تو ڈاکٹر باسط کو بلانا پڑ جاتا۔ ویسے اس سے وہ بچنے کی کوشش کرتی تھی۔ کیونکہ ڈاکٹر باسط کے چہرے پر ہر بار پہلے سے گہری تشویش ہوتی اور اس سے آپریشن کے لئے کہتے ہوئے ہر بار ان کے لہجے میں پہلے سے زیادہ اصرار ہوتا۔

''آپ اپنے ساتھ بہت بڑا ظلم کر رہی ہیں مسز عبدالحق......!'' وہ کہتے۔

''آپ صورت حال کی سنگینی کو نہیں سمجھ رہی ہیں۔ معاملہ بہت بڑھ چکا ہے۔ آپ کو فوری طور پر آپریشن کرا لینا چاہئے۔''

''درد اتنا زیادہ بھی نہیں۔''

''اہمیت درد کی نہیں، اصل بیماری کی ہے۔ درد تو محض اطلاعی گھنٹی کی ہے۔''

ڈاکٹر باسط نے دوا تبدیل کی، پھر اس کی مقدار بڑھا دی۔

نور بانو اب ذہنی طور پر آپریشن کے لئے تیار تھی۔ صورتِ حال کی سنگینی کا اسے بھی احساس ہو گیا تھا۔ مگر ارجمند کی فراغت سے پہلے یہ آپریشن اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ ڈر تھا کہ پول کھل جائے گا۔ جھوٹ پکڑا جائے گا۔ اس نے بہت سوچا تھا کہ خود ہی اس جھوٹ کو کھول دے۔ لیکن دل آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ اس میں نقصان ہی نقصان تھا۔ یہ خدشہ الگ کہ وہ کہیں عبدالحق کو ہی نہ کھو بیٹھے۔

وہ باقاعدگی سے استغفار کرتی، ہر نماز کے بعد گڑگڑا کر توبہ کرتی۔ دل سے عملی توبہ کے لئے اصرار ابھرتا تو وہ منہ پھیر لیتی۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ ہاں، بعد میں وہ سچ کھول دے گی۔

وہ اللہ سے دعا کرتی کہ ارجمند کی فراغت تک اس کی بیماری کو روکے رکھے۔ پھر وہ آپریشن بھی کرا لے گی، اور عبدالحق آئے گا تو اسے حقیقت بھی بتا دے گی۔

لیکن درد کے دورانیے بڑھ رہے تھے، اور آرام کے دورانیے سکڑ رہے تھے۔

وہ اب ایک ایک دن گن رہی تھی۔ تقریباً ہر روز ہی وہ رشیدہ سے اس بارے میں بات کرتی۔

''اب کتنے دن رہ گئے ہیں......؟''

رشیدہ کی زبان پر جواب تیار ہوتا تھا۔

''کچھ جلدی نہیں ہوسکتا۔''

''اس پر کس کا اختیار ہے بیگم صاب...... ! سوائے اللہ کے۔''

''اور دیر بھی تو ہوسکتی ہے......؟'' وہ گھبرا کر پوچھتی۔

''دو چار دن ادھر ادھر تو ہو ہی جاتے ہیں بیگم صاب......!''

ڈاکٹر باسط آخری بار آئے تو جاتے ہوئے بے حد خفا تھے۔

''اب خدانخواستہ طبیعت خراب ہو تو مجھے نہیں بلوایئے گا۔'' انہوں نے کہا۔

''ناراض نہ ہوں ڈاکٹر صاحب...... ! بس چند دن......''

''میں ناراض نہیں ہوں۔'' ڈاکٹر نے بے رخی سے کہا۔

''تو پھر یہ کیوں کہا آپ نے......؟''

''میرے آنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا آپ کو۔ اب آپریشن کے سوا کوئی راستہ نہیں۔''

''بس چند دن کی بات ہے ڈاکٹر صاحب...... !''

''یہ تو آپ کئی ہفتوں سے کہہ رہی ہیں۔ بہرحال آپ جانیں۔ میں اب آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکوں گا۔''

اور اب واقعی دن تھوڑے ہی رہ گئے تھے۔ عبدالحق کی طرف سے وہ مطمئن ہوگئی تھی۔ حادثے کے نتیجے میں وہ چھ ہفتوں کے لئے معذور ہوا تھا۔ یہ عرصہ تقریباً اتنا ہی تھا۔ گویا عبدالحق کو خوش خبری پہنچے گی تو وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو چکا ہوگا۔

اس روز اس نے رشیدہ سے پوچھا۔

''اب کتنے دن رہ گئے ہیں......؟''

''اللہ کی رحمت ہوئی تو بس سات دن......!''

نور بانو خوش ہوگئی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا۔

جس روز اس نے ڈیوٹی جوائن کی، ذرا دیر بعد ہی کلکٹر صاحب کا بلاوا آگیا۔

وہ ان سے ملنے چلا گیا۔

''آؤ بیٹھو عبدالحق...... ! اب کیسے ہو......؟'' کلکٹر صاحب نے کہا۔

''اللہ کا شکر ہے جناب......!''

''اب تکلیف تو نہیں ہے نا......؟''

''جی نہیں...... ! الحمد للہ......!''

''تم بہت خوش نصیب ہو عبدالحق......!''

عبدالحق نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''بہت بڑا اعزاز ملا ہے تمہیں......!'' کلکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سعودی حکومت نے تمہارے محکمے سے چار افراد کے نام مانگے ہیں۔ اور یہ تمام لوگ اس سال سعودی حکومت کے سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے حج کی سعادت حاصل کریں گے۔ یہ وہاں شاہی مہمان کی حیثیت سے قیام کریں گے۔''

عبدالحق خوش ہوگیا۔

''سبحان اللہ...... ! الحمد للہ...... ! بے شک یہ اللہ کا فضل عظیم ہے۔''

کلکٹر صاحب نے ایک فائل اس کی طرف بڑھائی۔

''تم نے جو سعودی شہزادے کے ساتھ تعاون کیا تھا، یہ اس کا صلہ ہے۔ اور کتنا اچھا صلہ ہے۔ اب ان چار میں ایک تو تم ہی ہو۔ دیگر تین تمہیں منتخب کرنے ہیں، پھر یہ فارم بھر کر بھجوانے ہیں۔'' وہ کہتے کہتے رکے۔

''اگر تم اسے دخل در معقولات نہ سمجھو تو میرا ایک مشورہ ہے۔''

"کیسی بات کرتے ہیں جناب .....! آپ کا مشورہ تو میرے لئے مشعلِ راہ ہوگا۔ حکم کیجئے.....!"

"ایسے لوگ منتخب کرنا، جو صاحب استطاعت نہ ہوں، جو اپنے طور پر حج کرنے کی سکت نہ رکھتے ہوں۔ اس کا تمہیں بڑا اجر ملے گا۔"

"جزاک اللہ جناب .....!" عبدالحق نے خوش ہو کر کہا۔

"کتنا اچھا اور درست مشورہ دیا ہے آپ نے۔ اور اب میں سب سے پہلے اسلام آباد فون کر شہزادے کا شکریہ ادا کروں گا۔"

"وہ اب یہاں نہیں ہیں۔ وطن واپس جا چکے ہیں۔"

عبدالحق حیران رہ گیا۔

"اتنی جلدی .....!"

"ہاں..... ! انہیں سعودی کابینہ میں وزارتِ داخلہ کا قلم دان سونپا گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے جناب .....!" عبدالحق اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمام فارم پر کر کے، تصویروں کے ساتھ جلد از جلد مجھے بھجوادو۔ تین دن بعد یہ فائل سفارت خانے بھجوانی ہے۔"

"بہت بہتر جناب.....!"

عبدالحق واپس آیا تو اس کے جسم میں ہیجان سا بپا تھا۔ کتنی بڑی آرزو پوری ہو رہی تھی اس کی، اور کیسے اعزاز کے ساتھ۔ وہ اور بیت اللہ شریف، اور روضہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم .....! کہاں میں، کہاں یہ مقام.....؟ اللہ .....!

وہ سرشار ہو گیا۔ جاگتے میں جیسے خواب دیکھنے لگا۔

پہلی بار اسے احساس ہوا کہ جس حیثیت میں اسے اس مقدس سرزمین پر قدم رکھنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے، وہ بہت بڑی ہے۔ اس کے بہت فائدے ہیں۔ اس میں اس کے ہر خواب کو تعبیر مل جائے گی۔

برسوں سے وہ سوچتا تھا کہ اسے یہ سعادت ملی تو وہ ہر اس جگہ جائے گا،

جہاں بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قدم رکھے۔ وہ اس پاک ریت کے ہر ذرّے کو چومے گا، آنکھوں سے لگائے گا جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک قدم پڑے ہوں گے۔ اور وہ ادب کا ہر تقاضا پورا کرے گا۔ وہ وہاں پاؤں رکھنے کی جسارت نہیں کرے گا۔ وہ وہاں ہتھیلیوں اور گھٹنوں کے بل چلے گا۔ صدیوں سے پھیلی ہوئی وہ ریت، جس کا ہر ذرہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقشِ کفِ پا کی پاک اور مقدس امانت لئے ہوئے ہے۔ وہ اپنا وجود وہیں قربان کر دے گا۔ وہ وہاں سے واپس ہی نہیں آئے گا۔

لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ اگر اسے جانے کی سعادت نصیب ہوئی تو وہ وہاں بس مناسک حج ادا کر سکے گا۔ اس کے علاوہ چند خاص مقامات کی زیارت کر سکے گا، اور بس ..... اس سے زیادہ تو کسی کو بھی نہیں ملتا۔

اور وہ ایسا پیاسا تھا، جو قطرے سے تو کیا دریا سے، سمندر سے بھی نہ بہلے۔ وہ تو ساتوں سمندر پی جانا چاہتا تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ چند قطروں سے زیادہ کی اس کی اوقات نہیں۔

مگر وہ دینے والا کیسا کریم تھا۔ اس نے اوقات کے مطابق تو کبھی کسی کو دیا ہی نہیں۔ وہ تو ہر ایک کو بغیر مانگے ہی اوقات سے سوا دیتا ہے۔ کوئی ایک جام کا طلب گار ہو، اور اس کی رحمت جوش میں ہو تو مے خانے کا مے خانہ دے دے۔ ایک وہی تو ہے، جس سے اپنی اوقات سے بہت ..... بہت ..... بہت زیادہ بڑھ کر مانگا جا سکتا ہے، اور مل بھی جاتا ہے۔

اور اسے مل گیا تھا۔

اپنے دفتر کی تنہائی میں بیٹھے عبدالحق کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ جس اعزاز کے ساتھ اسے اذنِ باریابی عطا کیا گیا تھا، اس میں سب کچھ ممکن تھا۔ اس کے ہر خواب کو تعبیر مل جانی تھی۔ وہ ہر جگہ جا سکتا تھا ..... سرکاری مہمان، شاہی مہمان، بادشاہوں کے بادشاہ کا مہمان!

دیر تک وہ سن بیٹھا رہا۔ فائل اس کے سامنے رکھی تھی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی نہ بجتی تو شاید وہ اس کیفیت سے نکل ہی نہ پاتا۔

فون پر بات کرنے کے بعد اس نے فائل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ فائل کھولی تو اسے پہلی بار احساس ہوا کہ یہ صرف خواب کی تعبیر کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ اس پر بہت بھاری ذمہ داری بھی ہے..... بھاری ذمہ داری ... !

اسے تین افراد کا انتخاب بھی کرنا ہے، ایسے افراد کا جو اس اعزاز کے مستحق ہوں۔

اس نے اپنے پی اے کو طلب کیا۔

''یس سر ...!''

''اکاؤنٹس میں کام کرنے والے تمام اسٹاف کی پرسنل فائلیں درکار ہیں مجھے۔''

''بہت بہتر سر...!''

''یہ ارجنٹ ہے ...!''

''یس سر...!''

پی اے چلا گیا۔

ایک گھنٹے بعد تمام فائلیں اس کی میز پر تھیں۔

وہ ہر کام بھول کر ان کی چھان بین میں مصروف ہوگیا۔ اپنے تقریباً تمام اسٹاف کو وہ جانتا تھا۔ فائلوں کا اہتمام اس لئے کیا کہ ذہن سے کوئی نام محو نہ ہو جائے، اس سے بے انصافی سرزد نہ ہو جائے۔

جو کھلے راشی تھے، انہیں تو اس نے فوراً ہی ایک طرف کر دیا۔ پھر کچھ لوگ مشتبہ تھے، انہیں بھی اس نے اپنی فہرست سے خارج کر دیا۔ یہ امر بھی اسے بہت حوصلہ افزا معلوم ہوا کہ ایک 113 میں سے 11 افراد ایسے ہیں، جن کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ رشوت نہیں لیتے۔

اب مرحلہ سخت تھا۔ ان گیارہ افراد میں سے اسے تین کو منتخب کرنا تھا۔ یہ خیال رکھنا بھی ضروری تھا کہ فیصلہ وہ اپنی پسند ناپسند کی بنیاد پر نہ کرے۔ ان میں سے ہر شخص کو ڈراپ کرنا اس کے لئے بہت بڑی ذمہ داری تھی۔

شام تک اس نے اس کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ اس حد تک وہ کامیاب

ہوگیا کہ فہرست میں صرف چار نام رہ گئے۔ لیکن اب اس کے سامنے جو مرحلہ تھا، وہ بہت دشوار تھا۔ یہ چار افراد ایسے تھے کہ ان میں سے کسی کا نام قلم زد کرنے میں اسے زیادتی کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اس فہرست میں سے کسی کو نکالنا کیسے ممکن ہے؟

یہ فیصلہ آج ہی ہو جانا چاہئے۔ اس نے سوچا۔ اگلے دن فارم بھروا لئے جائیں، اور اس سے اگلے دن فائل مکمل کر کے کلکٹر صاحب کو دے دی جائے۔ لیکن ایک نام کو قلم زد کرنے کے اس مرحلے سے کیسے گزرا جائے۔ بہت بڑی ذمہ داری ہے یہ، بہت بڑا بوجھ ہے۔

❁ ❁ ❁

حمیدہ کی کمزوری بڑی حد تک رفع ہو چکی تھی۔ اب وہ سہارے کے بغیر باتھ روم چلی جاتی تھی۔ البتہ واپس آتے آتے وہ ہانپ جاتی تھی، اور خاصی دیر تک اسے آرام کرنا پڑتا تھا۔

اس عرصے میں وہ عبدالحق کو بہت یاد کرتی رہی تھی۔ بہت کمی محسوس ہوتی تھی اس کی۔ کبھی اسے خیال آتا کہ یہ سب اس کی اپنی وجہ سے ہے، اس کا اپنا کیا دھرا ہے۔ اس نے عبدالحق کو ایبٹ آباد جانے کا حکم دیا۔ عبدالحق اس کا حکم ٹال نہیں سکتا تھا، اور اللہ کی یہ مرضی نہیں تھی، سو عبدالحق کو حادثہ پیش آ گیا۔ یوں وہ اس کے حکم کی تعمیل سے بچ گیا۔ اور اسے اس کی سزا ایسے ملی کہ ہر ہفتے عبدالحق کے آنے سے جو خوشی اور راحت اسے ملتی تھی، وہ اس سے محروم ہوگئی۔

اسے پھر بابا کی یاد آ گئی۔ جب تک اللہ پردہ رکھ رہا ہے، کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اور اس نے تو کوشش کر کے نتیجہ بھی دیکھ لیا تھا۔ اب تو یہی امید تھی کہ جھوٹ کو ہار جانا ہے۔ فتح سچ کی ہی ہوگی۔ اور یہ امید نہیں تھی، یقین تھا۔

اچانک اسے خیال آیا کہ خوشخبری کا وقت تو تقریباً آ پہنچا ہے۔ اس کے وجود میں خوشی ہیجان بن کر دوڑنے لگی۔ ارے واقعی .....! مجھے تو یہ خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اب تو کسی بھی دن......

اس نے رابعہ کو پکارا، اور پکارتی ہی چلی گئی۔

رابعہ دوسرے کمرے میں تھی۔ وہ یہ پکار سن کر گھبرا گئی۔ اماں نے کبھی ایسے پکارا نہیں تھا۔ وہ تو ایک آواز دے کر چپ ہو جاتی تھیں۔ پھر ضرورت پڑے تو دوسری آواز.....

وہ گھبرا کر اس کے کمرے میں آئی۔

''کیا بات ہے اماں.....! خیر تو ہے.....؟''

''ہاں.....! خیر ہی خیر ہے۔ مجھے عبدالحق سے بات کرنی ہے..... ابھی، اسی وقت.....!''

''مجھے تو آتا نہیں اماں.....! آپ کو تو پتا ہی ہے۔ میں ابھی ساجد کو بھیجتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی۔

حمیدہ تو ایسی بے صبری ہو رہی تھی کہ ایک پل بھی گھنٹہ بھر کا لگ رہا تھا۔ وہ بستر پر لیٹی پہلو بدلتی رہی۔

کوئی پانچ منٹ بعد ساجد کمرے میں آیا تو وہ ہلکان ہو چکی تھی۔

''کہاں رہ گیا تھا رے تو.....؟'' وہ اس پر برس پڑی۔

''پڑھ رہا تھا دادی.....!''

''جلدی سے نمبر ملا اپنے چاچا کا.....!''

ساجد نے نمبر ملایا۔ تین چار گھنٹیوں کے بعد فون عبدالحق نے ہی اٹھایا۔ ساجد نے اسے سلام کیا۔

''کیسے ہو ساجد.....؟'' عبدالحق نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔

''پڑھائی کیسی چل رہی ہے.....؟''

''امتحان کی تیاری ہو رہی ہے چاچا.....!''

''میری بات کرانا.....تو تو خود ہی شروع ہو گیا۔'' حمیدہ نے اسے ڈانٹا۔

''دادی سے بات کریں چاچا.....!'' ساجد نے جلدی سے کہا اور ریسیور حمیدہ کی طرف بڑھا دیا۔

ریسیور ہاتھ میں آتے ہی حمیدہ پُرسکون ہو گئی۔ سارا اضطراب ختم ہو گیا۔

''تو اب کیسا ہے پتر.....!'' اس نے پوچھا۔ اسے اچانک اس کا حادثہ یاد آ گیا تھا۔

''تکلیف تو نہیں ہے زیادہ.....؟''

''نہیں اماں.....! اللہ کا شکر ہے۔ اب میں چل پھر سکتا ہوں۔ آج تو میں دفتر بھی گیا تھا۔''

حمیدہ اسے فوری طور پر ایبٹ آباد جانے کا حکم دینا چاہتی تھی، مگر فوراً ہی اسے پچھلے حکم کے نتائج کا خیال آ گیا۔ اس نے اس حکم کو اپنی نوک زبان پر روک لیا۔

''اور تم کیسی ہو اماں.....؟''

''اب تو بہت بہتر ہوں۔ چل پھر بھی لیتی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے.....!''

''الحمدللہ.....!''

''میں تیری بہت کمی محسوس کرتی ہوں پتر.....! بہت یاد کرتی ہوں تجھے۔ عادت ہو گئی تھی نا تیرے آنے کی۔''

''اس ہفتے انشاء اللہ آؤں گا تمہارے پاس.....!''

اسے تو اندازہ بھی نہیں کہ میرے پاس آنے کے بجائے اسے ایبٹ آباد جانا ہو گا، عجیب بے وقوف لڑکا ہے۔ حمیدہ نے جھنجلا کر سوچا۔ پھر بولی۔

''تو ایبٹ آباد فون کر کے خیریت تو معلوم کر لے پتر.....!''

''ٹھیک ہے اماں.....! ابھی کر لوں گا فون.....!''

''میرے حساب سے تو اب تجھے خوش خبری ہی ملے گی۔''

''انشاء اللہ اماں.....! بس دعا کرو، سب کچھ خیر و عافیت سے ہو۔''

''اس دعا کے سوا اور کرتی کیا ہوں میں.....؟'' حمیدہ نے کہا۔

''بس دو ہی تمنائیں ہیں میری۔ ایک تیرے پتر کو گود میں لے لوں اور اس کے بعد تیرے ساتھ حج پر چلی جاؤں۔ ایک تو ہی تو ہے، جس کے ساتھ میں جا سکتی ہوں۔''

''انشاء اللہ.....! تمہاری ہر خواہش پوری ہو گی اماں.....! اللہ تمہیں بہت

لمبی عمر دے گا، اور تم انشاء اللہ خواہشیں کرتی رہوگی، اور اللہ پوری کرتا رہے گا۔"

"خوش رہ پتر...! تو فون ضرور کر لینا۔ پھر مجھے بھی بتا دینا۔"

"ضرور اماں...! خدا حافظ...!"

"خدا حافظ پتر...!" حمیدہ نے ریسیور ساجد کی طرف بڑھا دیا۔ ساجد نے ریسیور کان سے لگا لیا۔ رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس نے ریسیور کو کریڈل پر رکھا اور کمرے سے نکل گیا۔

حمیدہ بستر پر دراز ہو گئی۔ اس کے دل میں اور ہونٹوں پر دعائیں تھیں۔

❁ ❁ ❁

نور بانو کا دل اب گھبرا رہا تھا۔ درد اب ایک طرح سے معمول بنتا جا رہا تھا۔ اس کا حوصلہ جواب دینے لگا تھا۔ برداشت اب جیسے اس کے جسم کو چاٹ رہی تھی۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔

اس رات اس نے رشیدہ سے بات کی۔

"تمہارا اندازہ تو درست ثابت نہیں ہوا۔" اس کا انداز الزام دینے والا تھا۔

"اندازہ تو اندازہ ہی ہوتا ہے بیگم صاب...! ہوتا سب کچھ اللہ کے مقرر کیے ہوئے وقت پر ہے۔"

"مگر تم نے کہا تھا کہ تم بڑی تجربہ کار ہو۔"

"دو چار دن ادھر یا ادھر ہو جانا معمولی بات ہے بیگم صاب...!" رشیدہ نے عاجزی سے کہا۔

"میری جان پر بنی ہوئی ہے۔" نور بانو نے چڑچڑے پن سے کہا۔ پھر بولی۔

"ارجمند کیا کر رہی ہے...؟"

"سو رہی ہیں۔"

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ نور بانو کو یقین تھا کہ یہ عبدالحق کا فون ہے۔ اس نے رشیدہ سے کہا۔

"تم ارجمند کے پاس جاؤ۔ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ہٹنا اس کے پاس سے۔ کون جانے، آج ہی..." اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"جی بیگم صاب...!" رشیدہ نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ ارجمند کے ساتھ ہی سو رہی تھی۔ نور بانو دوسرے کمرے میں منتقل ہو گئی تھی۔

اس کے جانے کے بعد نور بانو نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف عبدالحق ہی تھا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے نور...!" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"جی... میں ٹھیک ہوں۔"

"میں تو خوش خبری کا انتظار کر رہا تھا۔ اب تک تو آ جانی چاہئے تھی۔"

نور بانو کے لئے عبدالحق سے یہ بات سننا باعث تشویش تھا۔ اس نے اس کی بات کو غیر موثر بنانے کے لئے جارحانہ انداز میں کہا۔

"ارے...! یہ آپ عورتوں کا حساب کب سے رکھنے لگے...؟ یہ تجربہ کہاں سے مل گیا آپ کو...؟"

عبدالحق شاید کچھ کھسیا گیا۔

"نہیں بھئی...! میں کیا جانوں یہ سب...؟"

"تو پھر...؟" نور بانو کی تشویش اور بڑھ گئی۔

"ابھی اماں سے فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھیں..."

"اماں کو کیا پتا...؟ پھر ان کی طبیعت خراب ہے۔ ابھی تو کچھ دن ہیں۔" نور بانو نے کہا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے صحیح بات بتا دی تو عجیب نہیں کہ عبدالحق سب کچھ بھول کر دوڑا چلا آئے۔ عین وقت پر گڑبڑ ہو جائے۔

"ویسے سب کچھ ٹھیک ہے نا...! مجھے تمہاری طرف سے بڑی فکر ہے۔" عبدالحق کے لہجے میں اسے پریشانی محسوس ہوئی۔

"یہاں سب کچھ ٹھیک ہے۔ آپ اس طرف سے..." اچانک درد کی ایک تند لہر اٹھی۔ اس کی آواز بدل گئی۔

''بے فکر رہیں۔'' اس نے بات پوری کی۔

'''آپ پریشان نہ ہوں۔''

''یہ تمہاری آواز کیا ہو گیا......؟'' عبدالحق سچ مچ پریشان ہو گیے۔

''مجھے تو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔''

''کچھ بھی نہیں، وہم ہے آپ کا۔'' نور بانو نے اسے تسلی دی۔ درد اب موج در موج ہو گیا تھا۔ وہ آواز پر قابو رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''آپ کا کیا حال ہے......؟ بڑی جڑ گئی آپ کی......؟'' اس نے بات کا رخ بدلا۔

''میں ٹھیک ہوں...... اللہ کا شکر ہے...... ! آج سے دفتر جانا شروع کیا ہے میں نے۔''

تو یہاں بھی آسکتے ہیں۔ نور بانو نے دل میں سوچا۔ درد اب شدت پکڑ رہا تھا۔

''اب میں خود ہی آپ کو خوش خبری سناؤں گی۔'' اس نے دانتوں سے نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

''آپ اب فون مت کیجئے گا......!''

''مجھے تمہاری آواز نارمل نہیں لگ رہی ہے۔ لرز رہی ہے تمہاری آواز۔ طبیعت خراب ہو رہی ہے نا تمہاری......؟''

''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ایسے میں بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ اب میں بات نہیں کر سکتی۔''

''اچھا......! ارجمند سے بات کرا دو۔'' عبدالحق کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''وہ سو گئی ہے۔''

''اتنی جلدی......! تمہاری طبیعت خراب ہو رہی ہے، اور وہ سو رہی ہے۔'' عبدالحق نے غصے سے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ طبیعت اس کی خراب ہے۔'' اب درد کی وجہ سے بات

کرنا نور بانو کے لئے دوبھر ہو رہا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ ایک لفظ کہے بغیر ریسیور رکھ دیتی۔ لیکن یوں عبدالحق کی پریشانی بڑھ جاتی، اور اس کے یہاں چلے آنے کا خطرہ بڑھ جاتا۔ اس امکان کے مقابلے میں تو مر جانا اس کے نزدیک زیادہ بہتر تھا۔

''اسے کیا ہوا......؟''

''پیٹ میں بہت شدید درد اٹھا تھا اس کے۔ نڈھال ہو گئی تھی۔'' نور بانو نے اپنی کیفیت بیان کر دی۔

''آرام آیا تو سو گئی۔''

''کوئی پریشانی کی بات تو نہیں......؟''

''آپ تو بس پریشان ہونے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔'' نور بانو نے چڑ کر کہا۔

''اچھا......! اب میں فون رکھ رہی ہوں، خدا حافظ......!''

ریسیور رکھ کر اس نے گہری سانس لی۔ اسے احساس نہیں تھا کہ درد کی برداشت کرنے کی کوشش میں اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو اس بری طرح چبایا ہے کہ وہ لہولہان ہو گیا ہے۔

اس بار درد کی ایسی لہر اٹھی کہ ضبط ممکن ہی نہیں رہا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ اب ضبط کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کے حلق سے ایسی خوف ناک چیخ نکلی، جس نے پورے گھر کو ہلا کر رکھ دیا۔ پھر وہ صوفے پر ڈھے گئی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق نور بانو کی گفتگو سے غیر مطمئن تھا، لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ دل تو اس کا یہی چاہا تھا کہ ابھی اٹھے اور ایبٹ آباد کے لئے روانہ ہو جائے۔ لیکن یہ سوچ کر رہ گیا کہ جہاں اتنے مہینے گزار لئے، ایک ہفتہ اور سہی۔

دل بہرحال پریشان ہو گیا تھا۔ نور بانو کا معاملہ تو سمجھ میں آنے والا تھا، اس کی کیفیت تو فطری تھی۔ لیکن ارجمند کی طرف سے وہ زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔ اس کے پیٹ میں درد! اس کے معاملے میں ضمیر پہلے ہی سے بوجھل تھا کہ اس کے

ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اس نے معاف کرنے کا کہہ دیا ..... اللہ کو گواہ بنا کر، تو یہ اس کا ظرف۔ مگر اسے تو اس کا احساس کرنا ہوگا۔

بہرحال یہ تو ہوا نا کہ اس نے اماں کے حکم کی تعمیل کر دی۔ اب وہ دعا ہی کر سکتا ہے۔

دل کی پریشانی کا اس کے پاس ایک ہی علاج تھا، اور وہ ہمیشہ کارگر ہوتا تھا۔ وہ اٹھا، اس نے وضو کیا اور قرآن پڑھنے بیٹھ گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ دنیا و مافیا سے بے خبر ہو گیا۔

قرآن پڑھنے کے بعد اس نے نوربانو اور ارجمند کے لئے صحت اور عافیت کی دعا کی۔ پھر وہ اٹھا تو پرسکون تھا۔ دل کو قرار آ گیا تھا۔

اس کی نظر فائل پر پڑی، جو وہ دفتر سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اسے دیکھ کر یاد آیا کہ بڑی ذمہ داری اور انصاف کے ساتھ اسے ایک بہت بڑے فیصلہ کرنا ہے۔ یہ فیصلہ کئے بغیر اسے نیند نہیں آ سکتی تھی۔

اس نے فائل کھولی۔ اوپر ہی وہ کاغذ رکھا تھا، جس پر اس نے چار نام لکھے تھے اور اوپر تین کا ہندسہ بنایا تھا۔

وہ ذہن کو اس مسئلے پر مرکوز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی نظر فائل میں لگے لیٹر پر پڑی۔ وہاں اسے چار کا ہندسہ نظر آیا۔ تو پھر میں نے یہ تین کا ہندسہ کیوں بنایا .....؟ اس نے سوچا۔ سعودی عرب سے تو چار افراد کا بلاوا آیا ہے۔ اور یہ جو نام میں نے منتخب کر کے اس کاغذ پر لکھے ہیں، یہ بھی چار ہی ہیں۔

چند لمحے تو وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکا۔ پھر اسے اچانک خیال آیا.....

ارے .....! میں بھی تو ہوں۔

اب ذہن نے کام کرنا شروع کیا۔ تو اصل صورتِ حال یہ ہے کہ چار افراد کو مدعو کیا گیا ہے، اور امیدوار پانچ ہیں۔ تو پہلے اس معاملے کو درست کر لیا جائے۔

اس نے چار ناموں کے آگے اپنا نام بھی لکھ دیا، اور اوپر لکھے تین کے ہندسے کو کاٹ کر چار کا ہندسہ لکھ دیا۔

اب ان پانچ میں سے چار افراد کو سعودی حکومت کے مہمان کی حیثیت سے حج پر جانا ہے۔ یہ بڑی سعادت ہے۔ اور ان میں سے ایک کا نام قلم زد ہونا ہے، اور اس کا مطلب ایک عظیم سعادت سے محرومی ہے۔

اتنی بڑی محرومی .....!

اور فیصلہ اسے کرنا ہے .....!

ابھی تک اس بات کی معنویت اس کے شعور تک نہیں پہنچی تھی۔ لیکن اپنے ہاتھ سے لکھا اپنا نام دیکھ کر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

میں نے یہاں اپنا نام کیوں لکھا ہے .....؟ اس کے اندر احتجاج ابھرا۔ میں تو اس عنایت کا مرکز اور سبب ہوں۔

خبردار .....! یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اس کے دل نے اسے ڈپٹا۔ تمہاری حیثیت اس معاملے میں منصف کی ہے۔ کسی کو اتنی بڑی سعادت سے محروم کر دینا کوئی آسان اور معمولی بات نہیں۔ اور یہ طنطنہ، یہ غرور کیسا .....؟ کیا تمہیں اللہ نے بتایا کہ اس عنایت کا مرکز اور سبب تم ہی ہو۔

وہ دل کا آدمی تھا، دل کی ایک ڈانٹ نے اسے دہلا دیا۔

کیا تم یہ دعویٰ کر سکتے ہو کہ تم ان چاروں سے بہتر ہو.....؟ دل نے چیلنج کیا۔ انصاف بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ منصف کا ایک غلط فیصلہ اسے جہنم رسید کرا سکتا ہے۔

اس پر تھرتھری چڑھ گئی۔ اس نے عاجزی سے سر جھکا لیا۔ پھر میں کیا کروں؟ میں خود کو اس ذمہ داری کا اہل نہیں سمجھتا۔ میں یہ فیصلہ کلکٹر صاحب پر نہ چھوڑ دوں۔

ہاں! کیوں نہیں .....؟ دل نے طنز کیا۔ جانتے ہو کہ وہ سب سے پہلے تمہیں ہی منتخب کریں گے، تمہیں سعادت بھی مل جائے گی، اور ذمہ داری کلکٹر صاحب پر ہوگی۔ بھول رہے ہو کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ اس کے ساتھ چالاکی ممکن نہیں۔

میں نے تو ایسا نہیں سوچا۔ اس نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

اپنے باطن کے نہاں خانوں کو کون جانتا ہے......؟ ہاں......! جس نے پیدا کیا، اسے سب معلوم ہے۔ وہی تو سب جانتا ہے۔

اب کے وہ ڈھیر ہوگیا۔ تو ٹھیک ہے۔ میں اپنا نام قلم زد کر دیتا ہوں۔

نہیں......! تولے بغیر یہ بھی مناسب نہیں۔ میزان پر رکھو سب کو۔ دل نے حکم لگایا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ یہ تو بہت مشکل ہے۔ وہ بڑبڑایا۔

پل صراط پر چلنے سے زیادہ مشکل تو نہیں۔

اس نے حواس مجتمع کئے اور دل کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا۔ لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ راہنمائی کس سمت سے ہوگی۔ اس نے ابتداء سے یاد کرنے کی کوشش کی۔ شاید کہیں سے اشارہ مل جائے۔

کلکٹر صاحب نے فائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا...... اب ان چار میں ایک تو تم ہی ہو۔

دل نے سچ کہا تھا، اس نے سوچا۔ کلکٹر صاحب پر چھوڑ دوں تو وہ سب سے پہلے مجھے ہی منتخب کریں گے، چاہے میں سب سے کم مستحق ہوں۔

پھر اسے یاد آیا کلکٹر صاحب نے اسے ایک مشورہ بھی دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا، ایسے لوگ منتخب کرنا، جو صاحب استطاعت نہ ہوں، اپنے طور پر حج کرنے کی سکت نہ رکھتے ہوں۔ اس کا تمہیں بڑا اجر ملے گا۔

اور اسے وہ مشورہ بہت اچھا لگا تھا۔ اس نے اس پر عمل بھی کیا تھا۔ رشوت لینے والے صاحب استطاعت تھے۔ انہیں اس نے امیدواروں کی فہرست سے باہر نکال دیا تھا۔ جو لوگ بچے، وہ تھے جو اکل حلال کے قائل تھے۔ اور وہ صرف گیارہ افراد تھے۔

ان گیارہ افراد میں بھی دو ایسے تھے، جو صاحب استطاعت تھے۔ زمین دار گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ زرعی زمینیں تھیں ان کے پاس۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں ملازمت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس نے امیدواروں کی فہرست میں سے ان کے نام بھی کاٹ دیئے۔

باقی بچے نو افراد میں تین ایسے تھے، جو باعمل نہیں تھے۔ مطلب یہ کہ وہ نماز سے پوری طرح دور تھے۔ اس نے ان کے نام بھی کاٹ دیئے۔

پھر اس کے بعد دو افراد ایسے تھے، جو صرف جمعہ کی نماز پڑھتے تھے۔ اور آخر میں جو چار افراد بچے، ان کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ پنج وقتہ نمازی ہیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ اسے ان میں سے تین کو منتخب کرنا تھا۔

اب اسے خیال آیا کہ کلکٹر صاحب سے چوک ہوگئی۔ انہوں نے اسے یہ باور کرا دیا تھا کہ وہ خود بخود منتخب ہوگیا ہے۔ لیکن نہیں، یہ چوک تو خود اس سے ہوئی۔

تو اصل صورت حال یہ تھی کہ 114 افراد میں سے 5 کو منتخب کرنا تھا۔ ان میں 102 رشوت لینے والے تھے۔ باقی بارہ بچے۔ ان میں سے دو صاحب استطاعت......

اسے اچانک جھٹکا سا لگا۔ وہ خود بھی تو صاحب استطاعت ہے۔ اس فہرست میں اس کے نام کی موجودگی کا کوئی جواز نہیں۔ نماز کے مرحلے تک تو بات پہنچ ہی نہیں رہی تھی۔ اس فہرست میں صاحب استطاعت افراد دو نہیں، تین تھے۔

اس نے اپنا نام کاٹ دیا۔

اب بچے نو...... ان میں پنج وقتہ نمازی صرف چار تھے۔ اور چار ہی افراد کو حج پر جانا تھا۔ مسئلہ حل ہوگیا تھا۔

اس نے چاروں نام نیچے لکھ دیئے۔

مگر اگلے ہی لمحے جیسے وہ اندر سے ڈھیر ہوگیا۔ ذہن میں خیال ابھر رہے تھے۔ یہ اتنی بڑی سعادت...... کیا یہ مجھے نہیں مل سکے گی......؟ کیا میں حج پر نہیں جا سکوں گا......؟

انصاف کی بات تو یہ ہے کہ میں اس سعادت کا حقدار نہیں ہوں۔ اس نے فیصلہ کیا۔ اور یہ فیصلہ بھی مجھے ہی کرنا تھا، اور انصاف سے کرنا تھا۔ تو انصاف یہی ہے۔

اس لمحے اسے اپنی دولت بہت بری لگی۔ بلکہ اسے اس سے نفرت کا احساس ہوا۔ یہ سرکاری مہمان کی حیثیت سے حج کرنے کی سعادت بہت بڑی تھی۔ یہ اس کے لئے تھی۔ لیکن اس کی دولت نے اسے اس سعادت سے محروم کر دیا تھا۔

وہ شاک میں تھا۔ وہ افسوس میں گھرا ہوا تھا۔ بس ایک ہی خیال اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا ۔۔۔ کیا میں حج نہیں کر سکوں گا ۔۔۔؟

پھر اچانک اس کے اندر روشنی سی پھوٹی۔ کیوں نہیں ۔۔۔؟ اس کے اندر سے کسی نے کہا۔ صاحب استطاعت ہو تو حج بھی کر سکتے ہو۔ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ تمہارے لئے کیا مشکل ہے۔ البتہ ان چاروں میں سے جو محروم ہوگا، وہ شاید کبھی حج نہیں کر سکے گا۔

وہ کچھ مطمئن ہوگیا۔ البتہ ہلکی سی خلش اب بھی تھی۔

پھر اچانک اسے حمیدہ کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا، ایک تو ہی تو ہے پتر ۔۔۔! جس کے ساتھ میں حج پر جا سکتی ہوں۔

اس نے سوچا، اشارہ تو پہلے ہی مل گیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔ راہنمائی تو کر دی گئی تھی۔ واقعی ۔۔۔! اسے تو اماں کے بغیر حج پر جانے کا سوچنا ہی نہیں چاہئے۔ بس ٹھیک ہے۔ وہ اماں، بلکہ نور بانو اور ارجمند کو بھی ساتھ لے کر حج پر جائے گا۔

اس کا دل ہلکا ہوگیا۔ اس نے وہ چاروں نام فائنل کر دیے۔

❁ ❁ ❁

رشیدہ تو جاگ ہی رہی تھی، نور بانو کی لرزہ خیز چیخ نے سوتی ہوئی ارجمند کو بھی جگا دیا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی کچھ نہیں آیا۔ مگر اگلے ہی لمحے کرب میں ڈوبی ہوئی نور بانو کی دوسری چیخ ابھری تو وہ تڑپ گئی۔

''یہ ۔۔۔ یہ کیا ہوا ۔۔۔؟ یہ تو آپی کی چیخ ہے، دیکھو تو ۔۔۔'' اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

رشیدہ جو اس وقت تک سن سی بیٹھی تھی، اچانک حرکت میں آگئی۔ اس نے ارجمند کو روک دیا۔

''یہ کیا کر رہی ہیں ۔۔۔؟ میں نے آپ کو بتایا نا کہ جھٹکے سے اٹھنا یا بیٹھنا آپ کے لئے اچھا نہیں ہے۔ پہلا پہلا معاملہ ہے ۔۔۔''

''مگر آپی ۔۔۔''

''آپ فکر نہ کریں، میں دیکھتی ہوں۔'' رشیدہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسی لمحے نور بانو کی تیسری چیخ سنائی دی۔ رشیدہ تقریباً بھاگتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

ارجمند کا بس چلتا تو وہ اُڑ کر دوسرے کمرے میں پہنچ جاتی، جہاں نور بانو درد سے تڑپ رہی تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ رشیدہ کی نصیحت بے معنی ہے، نہ غیر اہم۔ وہ آہستہ آہستہ بستر سے اٹھی۔ اسے نور بانو کی فکر بھی تھی، اور یہ خیال بھی کہ اس کے بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

وہ کھڑی ہوئی اور اس نے دروازے کی طرف پہلا قدم بڑھایا۔ اسی لمحے ایک طرف تو اسے اپنے جسم کا تمام خون اچھل کر سر کی طرف جھپٹتا محسوس ہوا، اور دوسری طرف پیٹ میں جیسے کسی نے ٹھوکر ماری۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑی نہ رہ سکی، اور فرش پر گر گئی۔

اسے اپنے سر میں اندھیرا سا پھیلتا محسوس ہوا، پھر وہ اندھیرا اس کی آنکھوں میں اترنے لگا۔ وہ کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھی۔ مگر اس کے ذہن میں ایک واضح خیال تھا ۔۔۔ آپی تکلیف میں ہیں، اور مجھے ان تک پہنچنا ہے۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس سے اٹھا نہیں گیا۔ وہ فرش پر گھسٹتی ہوئی آگے بڑھی۔ دروازے تک پہنچتے پہنچتے وہ نڈھال ہوگئی۔ لیکن وہ رکی نہیں۔ اسی دوران نور بانو کی چیخیں تواتر سے سنائی دیتی رہیں۔

اب وہ راہ داری میں تھی۔ دوسرا دروازہ زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ رکی اور دیوار سے ٹک کر بیٹھ گئی۔ سانس پھول گئی تھی۔ وہ سانس درست کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

اس کا بایاں ہاتھ فرش پر اس طرف رکھا تھا، جس طرف سے وہ گھسٹتی ہوئی آئی تھی۔ اس ہاتھ پر اسے چپ چپے سے لمس کا احساس ہوا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر

آنکھوں کے سامنے لا کر دیکھا۔ وہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔

یہ خون کہاں سے آ گیا......؟ اس نے گھبرا کر سوچا۔

راہ داری میں روشنی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا اور دہل گئی۔ جہاں سے وہ گھسٹ کر آ رہی تھی، وہاں سے یہاں تک خون کی چوڑی سی لکیر تھی۔

اسے چکر سے آ گئے۔ دل ڈوبنے لگا۔ لیکن یہ خیال بہت مستحکم تھا کہ آپی کی طبیعت بہت خراب ہے، اور اسے ان تک پہنچنا ہے۔ وہ دیوار سے ٹکے ٹکے دوسرے دروازے کی طرف کھسکنے لگی۔ قوتِ ارادی کے سوا اس وقت اس کے پاس کوئی طاقت نہیں تھی۔

دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر قوتِ ارادی بھی جواب دے گئی۔

اس نے گھٹی گھٹی آواز میں پکارا۔

''آپی......! آپی......!'' پھر اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا۔

❁ ❁ ❁

رشیدہ نور بانو کے کمرے میں پہنچی تو اسے صوفے پر تڑپتا پایا۔ آبیہ اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھی، اور نور بانو کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

نور بانو ایک بار پھر درد کی شدت سے چلائی۔ لیکن رشیدہ کو دیکھ کر کچھ پرسکون ہو گئی۔

''میری...... دو...... دوا......'' اس نے ٹوٹتے بکھرتے لہجے میں رشیدہ سے کہا۔

رشیدہ نے آبیہ سے کہا۔

''جلدی سے پانی لے کر آ......!'' پھر وہ بیڈ کے سرہانے رکھی دوا کی طرف لپکی۔ وہاں سے دوا لے کر وہ نور بانو کی طرف آئی۔ اتنی دیر میں آبیہ پانی لے آئی تھی۔

رشیدہ نے گولی نکال کر نور بانو کے منہ میں رکھی، پھر پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔

نور بانو نے پانی کی مدد سے گولی حلق سے اتار لی۔

رشیدہ اس کے ہاتھ سہلا رہی تھی۔

''ابھی آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔ پریشان نہ ہوں۔''

نور بانو کا چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ دوا لینے کے دو منٹ کے اندر اندر درد کم ہو جاتا تھا۔ لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا۔ درد کی لہر اٹھی تو وہ پھر چلائی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا پیٹ دبا لیا تھا۔

''کچھ آرام آیا......؟'' رشیدہ نے پوچھا۔

''ذرا بھی نہیں......! ڈاکٹر باسط کو بلاؤ فوراً......!''

''وہ تو کہہ کر گئے تھے کہ اب نہیں بلانا۔ ہرگز نہیں آؤں گا۔''

''اچھا......! مجھے ایک اور گولی دو......!'' نور بانو نے کہا، اور پھر اس کی چیخ نکل گئی۔

''ابھی تو لی ہے آپ نے گولی......!''

''کچھ نہیں ہوا اس سے...... دوسری دو......!''

''ڈاکٹر صاحب نے بہت سختی سے منع کیا تھا۔''

''بحث مت کر رشیدہ......!''

رشیدہ نے دوسری گولی دی اور آبیہ کو پانی دینے کا اشارہ کرتے ہوئے فون کی طرف جھپٹی۔

نور بانو نے دوسری گولی حلق سے اتاری۔ دو منٹ کے بعد درد میں کچھ کمی کا احساس ہوا۔ اس کے باوجود درد خوف زدہ کر دینے کی حد تک شدید تھا۔ وہ دل میں دعا کرتی رہی کہ ڈاکٹر باسط آنے پر رضامند ہو جائیں۔

رشیدہ فون پر بات کر کے اس کے پاس آئی تو مایوسی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

''کیا ہوا......؟ آ رہے ہیں وہ......؟'' نور بانو نے بے تابی سے پوچھا۔

حالانکہ جواب رشیدہ کے چہرے پر لکھا تھا۔

''نہیں بیگم صاحبہ......! وہ کہتے ہیں کہ آپ کو فوری طور پر اسپتال جانا

ہوگا۔ ورنہ خدانخواستہ ...." رشیدہ کہتے کہتے رک گئی۔

نور بانو کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

اسی لمحے باہر سے گھٹی گھٹی چیخ سنائی دی۔

"آپی ..... آپی .....!"

"ارے ..... ! یہ تو ارجی کی آواز ہے۔" نور بانو نے گھبرا کر کہا۔

"تم تو کہہ رہی تھیں کہ وہ سو رہی ہے۔"

"جی ..... لیکن آپ کی چیخ سن کر وہ اٹھ گئی تھیں۔"

"جلدی سے دیکھو ..... ! آواز تو قریب سے آئی ہے۔" نور بانو نے کہا، اور صوفے پر ڈھے گئی۔

رشیدہ دروازے کی طرف لپکی۔ دروازے سے نکلتے ہی اسے کچھ فاصلے پر ارجمند گری ہوئی نظر آئی۔ اس کے کمرے کے دروازے سے خون کی لکیر بہت واضح تھی۔ ایک نظر میں اس نے سب دیکھ لیا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی لفظ گونجا ..... ایمرجنسی ..... لیکن سچ یہ ہے کہ اپنی تجربہ کاری کے باوجود اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ یہاں ایک نہیں، دہری ایمرجنسی تھی۔ ارجمند کے بارے میں تو اسے پورا یقین تھا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ اور نور بانو کے بارے میں ڈاکٹر باسط نے یہی بات کہی تھی۔ گویا وہ دونوں ہی خطرے میں تھیں۔

اس نے جھک کر دیکھا۔ ارجمند بے ہوش تھی، اور خون جاری تھا۔

رشیدہ اپنے کام میں ماہر تھی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب یہ کیس گھر پر نہیں نمٹایا جا سکتا۔ ارجمند کو اسپتال لے جانا ہوگا۔ اور وہ بھی فوری طور پر۔ ہر لمحہ قیمتی ہے۔ ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا ہے۔

اس نے دروازے کی طرف رخ کر کے آبیہ کو پکارا۔ آبیہ آئی تو اس نے کہا۔

"جا کر نوریز کو بول کہ گاڑی نکالے۔ بی بی صاب کی طبیعت بہت خراب

ہے۔ اسپتال جانا ہے۔"

آبیہ اس کی ہدایت کی تعمیل کے لئے دوڑی۔

اسی لمحے نور بانو لڑکھڑاتی ہوئی باہر آئی۔ فون دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔

"یہ ..... یہ کیا ہوا رشیدہ ..... ؟"

"معاملہ بہت بگڑ گیا ہے بیگم صاب ..... ! انہیں فوری طور پر اسپتال لے جانا پڑے گا۔"

نور بانو درد کی شدت سے دہری ہوگئی۔ ارجمند کو اس حال میں دیکھ کر جو گھبراہٹ ہوئی تھی، شاید اس نے درد کے احساس کو اور بڑھا دیا تھا۔

"تم تو کہہ رہی تھیں کہ تم بڑی ماہر دائی ہو۔" اس نے ٹوٹتی آواز میں کہا۔ اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

"جب خون جاری ہو جائے تو کیس دائی کا نہیں رہتا بیگم صاب ..... ! انہیں خون کی ضرورت ہوگی، جو یہاں نہیں دیا جا سکتا۔"

"ایسا ہوا کیوں ..... ؟"

"خون کا دباؤ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے بیگم صاب ..... ! یہ اور بچہ دونوں خطرے میں ہیں۔"

"اور مجھے لگتا ہے کہ میرا اسپتال جانا بھی ضروری ہے۔"

"جی ..... ڈاکٹر صاحب نے یہی کہا تھا۔ مگر بی بی صاب کے لئے تو ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔"

"تو پھر ..... ؟"

اتنی دیر میں آبیہ آ گئی۔ "گاڑی تیار ہے اماں ..... !"

"مگر ارجمند کا رجسٹریشن تو ہے نہیں اسپتال میں۔"

"وہ میں سنبھال لوں گی بیگم صاب ..... !"

"کیسے ..... ؟" اب نور بانو کے لئے بولنا دشوار ہو رہا تھا۔

"میں کہہ دوں گی کہ یہ دو دن پہلے ہی مانسہرے سے آئی تھیں کہ یہاں طبیعت بگڑ گئی۔" رشیدہ نے کہا اور آبیہ کی طرف مڑی۔

"چل آبیہ......! بی بی صاب کو اٹھا کر گاڑی میں پہنچاتا ہے۔"

"اور میرا کیا ہوگا......؟" نور بانو نے گھبرا کر کہا۔

"یہ تو ہے بیگم صاحب......! کیا کریں......؟" رشیدہ سوچ میں پڑ گئی۔ چند لمحے وہ سوچتی رہی، پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"آپ دونوں کو ایک ساتھ تو لے جا نہیں سکتے۔ اور بی بی صاحب کے ساتھ میرا جانا ضروری ہے۔" اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

نور بانو کو ایسے میں بھی رازداری کا خیال آ گیا۔

"ارجمند کو نوریز کے ساتھ تو ویسے بھی نہیں جانا چاہئے۔"

"آپ سمجھ نہیں رہی ہیں بیگم صاحب......!" رشیدہ کا لہجہ تیز اور سخت ہو گیا۔

"ایک منٹ کی دیر بھی بی بی صاحب اور بچے، دونوں کے لئے خطرناک ہو جائے گی۔ بلکہ اب بھی خدانخواستہ......"

نور بانو نے سوچا، ان دونوں کو کچھ ہو گیا تو رازداری تو ویسے ہی ختم ہو جائے گی۔

"تو پھر کیا کرنا ہے......؟" اس نے بے بسی سے کہا۔

رشیدہ اس دوران فیصلہ کر چکی تھی۔

"میں نوریز کے ساتھ بی بی صاحب کو لے کر جاتی ہوں۔ اور آبیہ......" وہ آبیہ کی طرف مڑی۔

"بی بی صاحب کو گاڑی میں پہنچانے کے بعد تو گاڑی کرنا اور بیگم صاحب کو سی ایم ایچ لے جانا۔ ہم بھی وہیں جا رہے ہیں۔"

آبیہ نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

"اسے کیا معلوم اسپتال کا......؟" نور بانو نے گھبرا کر کہا۔

"سب معلوم ہے۔ ویسے بھی جانا تو ایمرجنسی میں ہی ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔"

کوئی چارہ نہیں تھا۔ نور بانو وہیں دیوار سے ٹک کر بیٹھ گئی۔ درد اسے اپنے پیٹ میں بہت تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔

رشیدہ موٹی چادر لے کر آئی۔ اس نے آبیہ کے ساتھ مل کر ارجمند کو چادر میں لپیٹا۔ پھر وہ اسے اٹھا کر باہر لے گئیں، جہاں نوریز نے گاڑی دروازے کے ساتھ لا کر کھڑی کر دی تھی۔

انہوں نے بے ہوش ارجمند کو پچھلی نشست پر لٹایا۔ خود رشیدہ بھی ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔ ارجمند کا سر اس نے اپنی گود میں رکھ لیا۔

"میری بات سمجھ گئی ہے نا آبیہ......!" رشیدہ نے بیٹی سے کہا۔

"اور ہاں......! بیگم صاحب سے کہنا کہ اپنی فائل اور تمام چیزیں ضرور لے لیں۔ بس تو انہیں لے کر اسپتال پہنچ۔ میں وہاں موجود ملوں گی۔"

آبیہ پلٹ کر گھر میں گئی۔ نوریز یہ گفتگو سن کر گھبرا گیا تھا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے......؟ بی بی صاحب کو کیا ہوا......؟ اور کیا بیگم صاحبہ کی طبیعت بھی خراب ہے......؟"

"تم گاڑی چلاؤ......! وقت بہت قیمتی ہے۔" رشیدہ نے چڑ کر کہا۔

نوریز نے گاڑی باہر نکال لی۔

رشیدہ دل ہی دل میں ارجمند کے لئے دعا کرتی رہی۔ جریانِ خون اتنا تیز تھا کہ خون کوئی چادر سے بھی رسنے لگا تھا۔ یہ مقامِ شکر تھا کہ اسپتال تک ڈرائیو پانچ منٹ کی بھی نہیں تھی۔

اسپتال پہنچ کر رشیدہ نیچے اتری اور اس نے اسٹریچر کے لئے اشارہ کیا۔

نوریز بھی اتر آیا تھا۔ لیکن رشیدہ نے اسے روک دیا۔

"یہ میں سنبھال لوں گی۔" اس نے کہا۔

"تم یہاں بیگم صاحبہ کا انتظار کرو۔ آبیہ بچی ہے۔ وہ آ جائیں تو انہیں ایمرجنسی میں لے جانا۔"

نوریز اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

رشیدہ اسٹریچر کے ساتھ اسپتال کی طرف لپکی۔

"زچہ وارڈ میں لے چلو......!" اس نے اسٹریچر دھکیلنے والے سے کہا۔

گاڑی کے پاس کھڑے نوریز نے گاڑی کی پچھلی نشست کو دیکھا تو وہاں

خون نظر آیا۔ وہ دہل گئی۔ یا اللہ..... ! خیر کرنا۔ یہ کیا ہوگا بی بی صاحبہ کو اور بیگم صاحبہ بھی..... ! کیا ہو رہا ہے یہ سب.....؟

اس نے ڈیش بورڈ میں سے کپڑا نکالا اور پچھلی سیٹ صاف کرنے لگا۔

❁❁❁

نور بانو مشکل سے پانچ منٹ اکیلی رہی ہوگی۔ لیکن اسے وہ بہت طویل عرصہ لگا۔ اور اسے ڈر لگا کر پردیس میں، اتنے بڑے گھر میں وہ اکیلی ہے۔ لیکن پھر درد نے ہر خوف کو مٹا ڈالا۔

کوشش کے باوجود وہ اس درد سے نظریں نہیں چرا سکی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے اندر..... اپنے وجود میں دیکھ سکتی ہے۔ وہ درد نہیں، آگ کا ایک دہکتا ہوا گولا تھا..... بہت بڑا! گولا، اور وہ دل کی طرح دھڑک رہا تھا۔ ٹیس تو اس کے لئے بہت چھوٹا لفظ تھا۔ اور درد سے قطع نظر سب سے زیادہ ڈراؤنی بات یہ یقین تھا کہ وہ گولا درحقیقت ایک بہتا بڑا پٹاخہ ہے، جو کسی بھی لمحے پھٹ سکتا ہے۔ اور وہ پھٹے گا تو اس کے پورے جسم کے اندر آگ لگ جائے گی، جو بجھائی بھی نہیں جا سکے گی۔

وہ جھٹکنے کی کوشش کے باوجود ان خوف ناک سوچوں کو ذہن سے نہیں جھٹک سکی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ ہر لمحے اندر موجود وہ پٹاخہ، وہ آگ کا گولا بڑھتا، پھیلتا جا رہا ہے..... کسی غبارے کی طرح۔ اور غبارے ہی کی طرح پھٹ بھی جائے گا۔

اس پر لرزہ چڑھ گیا۔ وہ اپنے اندر جھانکتی رہی۔

باہر گاڑی رکنے کی آواز نے اسے چونکایا۔ پھر آبیہ آ گئی۔

''چلئے بیگم صاحب.....!'' اس نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔

ایک قدم اٹھانا بھی دوبھر تھا۔ لیکن اسے دروازے تک جانا تھا۔ پھر یہ بھی سوچنا تھا کہ کیا کچھ کرنا ضروری ہے۔ اس پر اسے خیال آیا کہ گھر میں موجود رقم لینا ضروری ہے۔ ارجمند اس سے پہلے ہی اسپتال لے جائی جا چکی تھی، اور وہ بے ہوش بھی تھی۔ نہ جانے وہاں کیا ضرورت پڑے..... اسے بھی اور ارجمند کو بھی۔

اس نے آبیہ کو الماری میں رکھی رقم کے بارے میں بتایا۔ آبیہ نے رقم

نکالی۔

''میرے بیگ میں رکھ دو.....!'' اس نے کہا۔

پھر اسے خیال آیا کہ پہلی بار ایسا ہوگا کہ گھر میں کوئی بھی نہیں ہوگا۔ یعنی تالا لگانا ہوگا۔ لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ تالا چابی کہاں ہوگا؟ اور یہ آبیہ کو بھی معلوم نہیں تھا۔

آخر انہوں نے گھر کو ایسے ہی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ تالا ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا ان کے پاس۔

جیسے تیسے بڑی مشکل سے وہ گاڑی تک پہنچی۔ آبیہ نے سہارا دے کر اسے گاڑی میں بٹھایا۔ وہ درد سے بے حال ہو رہی تھی۔

''کتنی دیر لگے گی اسپتال پہنچنے میں.....؟'' وہ بڑبڑائی۔

''پانچ منٹ بھی نہیں لگیں گے جی.....!'' ڈرائیور نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

جھٹکا لگا، جو نور بانو کے لئے بڑا اذیت ناک تھا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔

''ذرا آہستہ چلاؤ.....!'' آبیہ نے ڈرائیور سے کہا۔

''جی اچھا.....!''

نور بانو کے لئے سانس لینا بھی دشوار ہوا جا رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبائے بیٹھی تھی۔ ہر طرف، ہر چیز اسے سرخ رنگ میں نہائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

سڑک بھی پختہ اور ہموار تھی، اور ڈرائیور گاڑی بھی کم رفتار سے چلا رہا تھا۔ پھر بھی نور بانو کو جھٹکوں کا احساس ہو رہا تھا۔ پیٹ کے اندر موجود سرخ غبارہ پھر پھیلتا جا رہا تھا۔

پھر اچانک دھاکا سا ہوا، اور وہ غبارہ..... لیکن نہیں، وہ غبارہ نہیں، بہت بڑا پٹاخہ ہی تھا..... اور وہ پھٹ گیا۔ ایسا لگا کہ اس کے وجود میں آگ دہک اٹھی ہے، اور پھیلتی جا رہی ہے۔

وہ ایک طرف ڈھے گئی۔ اس کی چیخیں مسلسل تھیں۔ لیکن اس کے ہوش و

حواس بتدریج اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے، اور اسی حساب سے اس کی آواز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

اسپتال پہنچنے سے پہلے وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

❁ ❁ ❁

آبیہ بری طرح گھبرا گئی تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ فوراً ہی وہ اسپتال پہنچ گئے۔ وہاں اسے اپنی گاڑی، اور گاڑی کے پاس کھڑا نوریز نظر آ گیا۔ وہ اسپتال کے گیٹ پر نظر جمائے ہر اندر آنے والی گاڑی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

آبیہ نے ڈرائیور کو گاڑی اسی طرف لینے کو کہا۔ گاڑی رکی تو وہ اتری۔

''بیگم صاحب کی حالت بہت خراب ہے۔'' اس نے نوریز سے کہا۔

نوریز جلدی سے اسٹریچر لانے کے لئے دوڑ گیا۔

اٹینڈنٹ نے نور بانو کو اسٹریچر پر منتقل کیا۔ آبیہ نے نور بانو کا بیگ سنبھالا اور اسے کھولنے لگی۔

''کیا کر رہی ہو؟ بیگم صاحبہ کے ساتھ جاؤ نا.....!'' نوریز نے جھنجلا کر کہا۔

''گاڑی والے کو کرایہ دینا ہے۔''

''تم چلو..... میں کرایہ دے کر آتا ہوں۔'' نوریز نے کہا۔

آبیہ تیز قدموں سے اسٹریچر کے پیچھے چل دی۔

❁ ❁ ❁

رشیدہ دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اللہ نے ہر مرحلہ آسان کر دیا۔ ڈاکٹر نے کوئی بحث نہیں کی، اور ارجمند کے معائنے میں مصروف ہو گئی۔

''بلڈنگ کب شروع ہوئی.....؟'' اس نے پوچھا۔

''دس منٹ ہوئے ہوں گے۔'' رشیدہ نے بتایا۔

ڈاکٹر نے غور سے ارجمند کے چہرے کو دیکھا۔

''یہ ان کا پہلا بچہ ہے نا.....؟''

''جی.....!''

''بہت ہیوی بلڈنگ ہے۔'' ڈاکٹر بڑبڑائی۔ اس نے ارجمند کو آکسیجن لگوائی، اور اس کے بعد ڈراپ۔

''یہ بہت کمزور ہو گئی ہیں اس وقت تو بچہ اور یہ دونوں ہی خطرے میں ہیں۔''

رشیدہ سر ہلا کر رہ گئی۔

ڈاکٹر ارجمند کو آبزرو کر رہی تھی۔

''کوئی صدمہ پہنچا تھا انہیں.....؟''

''ان کی بہن کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ اور یہ ان سے بہت محبت کرتی ہیں۔''

''تمہارا ان سے کیا تعلق ہے.....؟'' ڈاکٹر نے رشیدہ کو غور سے دیکھا۔

''جی..... ! میں نوکر ہوں ان کی۔''

''کوئی ذمہ دار آدمی ہے ان کے ساتھ.....؟''

''جی نہیں..... ! ان کے شوہر کراچی میں ہیں۔ ہم تو یہاں ان کی بہن کو دیکھنے آئے تھے۔''

''اس حال میں.....؟'' ڈاکٹر نے بھنویں اچکائیں۔

''کہاں سے آئے تھے.....؟''

''مانسہرہ سے.....!''

''یہ اس علاقے کی تو نہیں لگتیں.....؟''

''ان کی اپنی کوٹھی ہے وہاں.....!''

''تو یہاں بہن کے گھر میں بھی تو لوگ ہوں گے۔''

''وہ اکیلی رہتی ہیں۔'' رشیدہ جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہی تھی۔

''ان کی کمزوری کی وجہ سے مجھے لگتا ہے کہ آپریشن کے بغیر ڈلیوری نہیں ہو گی۔'' ڈاکٹر نے وضاحت کی۔

''اور آپریشن میں بہرحال خطرہ ہوتا ہے۔ کسی رشتہ دار کو پیپر سائن کرنا

پڑے گا۔''

''میں کر دوں گی۔''

''یہ ممکن نہیں۔ شوہر ہو، باپ یا بھائی...... !''

رشیدہ کو نوریز کا خیال آ گیا۔

''جی...... ٹھیک ہے...... ! ویسے آپریشن میں کتنا خطرہ ہوگا......؟''

''جان کا خطرہ ہو تو پیپر سائن کرایا جاتا ہے۔ ویسے تو ہم زچہ اور بچہ، دونوں کو بچانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن خطرے کی صورت میں ہماری پہلی ترجیح ان کا بچانا ہوگا۔''

''آپریشن کب ہوگا......؟''

''پہلے ہمیں بلڈنگ کو کنٹرول کرنا ہے۔ پھر انہیں خون دینا ہوگا۔''

''میں ذرا ان کی بہن کو دیکھ لوں۔'' رشیدہ ڈاکٹر سے اجازت لے کر باہر نکل آئی۔

❁ ❁ ❁

ایمرجنسی میں اسے نوریز اور آبیہ نظر آئے۔ دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آبیہ نے اسے دیکھا تو تیزی سے اس کی طرف لپکی۔

''کیا ہوا......؟ بیگم صاحب کہاں ہیں......؟'' رشیدہ نے اس سے پوچھا۔

''ان کا آپریشن ہو رہا ہے اماں...... !'' ڈاکٹر بول رہا تھا کہ ان کی حالت اچھی نہیں ہے۔''

رشیدہ کی نظر آبیہ کے ہاتھ میں موجود بیگ پر پڑی۔

''یہ بیگم صاحبہ کا......''

آبیہ نے بیگ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''چلتے وقت انہوں نے الماری سے پیسے نکلوا کر اس میں رکھوائے تھے۔''

رشیدہ نے بیگ کھول کر دیکھا تو سکون کی سانس لی۔ سو کے نوٹوں کی اچھی خاصی موٹی گڈی تھی۔ اس کا اندازہ تھا کہ تیس سے کچھ زیادہ ہی نوٹ ہوں گے اس میں۔

ویسے پیسوں کی اتنی زیادہ اہمیت بھی نہیں تھی۔ اب تک تنخواہ جو وہ جمع کرتی رہی تھی، وہ بھی کم نہیں تھی۔ اور خرچہ تو کوئی تھا نہیں۔ ابھی آتے ہوئے وہ اپنے ساتھ احتیاطاً وہ رقم بھی لے آئی تھی۔

وہ نوریز کی طرف بڑھی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ ہلا ہوا ہے۔

''انہوں نے مجھ سے دستخط کرائے ہیں ایک کاغذ پر۔''

اس نے کہا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''وہ کہہ رہے تھے، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''تم نے کیا کہہ کر دستخط کئے......؟''

''میں نے کہا کہ یہاں تو میں ہی سب کچھ ہوں۔ کوئی اور نہیں ہے۔'' نوریز نے جواب دیا۔ پھر پوچھا۔

''چھوٹی بی بی کا کیا حال ہے......؟''

''اب بہتر ہے...... ! لیکن آپریشن ہوگا ان کا بھی۔ اور تمہیں ان کے لئے بھی دستخط کرنے ہوں گے۔ پر ایسے نہیں چلے گا۔ کہنا کہ تم بھائی ہو چھوٹی بی بی کے۔''

''ٹھیک ہے جی...... ! کہہ دوں گا۔ پر مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

''مرد ہو کر ڈرتے ہو......؟''

''اس کا مردانگی سے کیا تعلق......؟'' نوریز نے چڑ کر کہا۔

''یہاں مالکوں میں سے کسی کو ہونا چاہئے تھا۔ مجھے تو یہ بہت بڑی ذمہ داری لگ رہی ہے۔''

''یہ ٹھیک کہا تم نے۔ پر اب کیا کریں......؟ کچھ ہو نہیں سکتا۔''

''میرے پاس کسی کا فون نمبر بھی نہیں ہے۔'' نوریز بڑبڑایا۔ اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''اچھا تم یہیں رکو...... آبیہ کو میں اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔'' رشیدہ بولی۔

''کیوں...؟'' نوریز نے گھبرا کر کہا۔

''اسے دکھا دوں گی بی بی صاحبہ کا وارڈ۔ یہ دونوں جگہ کی خبر رکھ سکے گی۔''

رشیدہ نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا، پھر اسے دلاسہ دیا۔

''گھبراؤ مت...! سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تم اس کو وہاں چھوڑ دو چھوٹی بی بی کے پاس۔'' نوریز نے آبیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم یہاں آجاؤ......!''

رشیدہ نے چند لمحے سوچا، پھر بولی۔

''وہاں میرا ہونا زیادہ ضروری ہے۔''

''بیگم صاحبہ کی حالت اچھی نہیں ہے۔''

''تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔''

''ہوا کیا ہے چھوٹی بی بی کو...؟ اب خون تو رک گیا ہے نا...؟'' نوریز نے اچانک پوچھا۔

رشیدہ نے چونک کر غور سے اسے دیکھا۔ خون اس نے بھی دیکھ لیا......؟

''وہ اب ٹھیک ہیں، تم فکر نہ کرو۔'' اس نے کہا۔

''تو پھر تم آبیہ کو ان کے پاس کیوں نہیں چھوڑتیں......؟''

''اب اتنی ٹھیک بھی نہیں ہیں وہ......!''

نوریز چپ ہو گیا۔

رشیدہ آبیہ کو اپنے ساتھ لے کر چل دی۔ اب اسے ارجمند کے لئے پرائیویٹ روم کا بندوبست کرنا تھا۔

❁ ❁ ❁

وہ سبھی کے لئے قیامت کی رات تھی۔

ارجمند کو پرائیویٹ روم میں منتقل کر دیا گیا تھا، اور اب اسے خون دیا جا رہا تھا۔ رشیدہ کو پریشانی یہ تھی کہ اب تک ارجمند کو ہوش نہیں آیا تھا۔ بہر حال یہ بات تسلی بخش تھی کہ جریانِ خون رک گیا تھا۔

رشیدہ نے ڈاکٹر سے اس سلسلے میں بات کی۔

''بلڈ پریشر بہت بڑھا ہوا ہے، اور قابو میں نہیں آ رہا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

رشیدہ خاموش رہی۔ کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔

''جس صدمے سے شروعات ہوئی ہیں، ان کا دماغ ابھی تک اس صدمے کے زیر اثر ہے۔''

''تو آپریشن......؟''

''اتنے بڑھے ہوئے بلڈ پریشر میں تو ممکن نہیں۔ پہلا مسئلہ بلڈ پریشر ہے۔ تم بس دعا کرو بی بی...!''

رشیدہ کا تو رواں رواں دعا کر رہا تھا... ارجمند کے لئے بھی، اور نور بانو کے لئے بھی۔

آبیہ بہر حال بچی تھی، وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ رشیدہ وقتاً فوقتاً جاتی اور گھبرائے ہوئے نوریز کو دلاسہ دے آتی۔

رات بہت آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔

❁ ❁ ❁

نوریز بہت پریشان اور متوحش تھا۔ یہاں کی پریشانی ہی کچھ کم نہیں تھی۔ اس پر ستم، اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ صاحب کو کیسے اطلاع دے۔ اگر یہاں خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو وہ صاحب کو کیا منہ دکھائے گا؟

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنا اچانک یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ اور کیا ہو گیا؟ یہ تو اسے معلوم تھا کہ بیگم صاحبہ ماں بننے والی ہیں۔ مگر اب ان کی طبیعت اتنی خراب ہو گئی کہ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے! اور ڈاکٹر نے اس سے ذمہ داری کے کاغذ پر دستخط کرا لئے تھے۔ تو اب خدانخواستہ ان کو کچھ ہو گیا تو یہ اس کی ذمہ داری ہو گی۔ اتنی بڑی ذمہ داری!

وہ دل ہی دل میں بڑی شدت سے بیگم صاحبہ کی زندگی کے لئے دعا کر رہا تھا۔ لیکن وہ یکسو نہیں تھا۔ دھیان دوسری طرف بھی چلا جاتا تھا۔

دوسری طرف ..... !

اس نے یاد کیا، اور دہل کر رہ گیا۔

دوسری طرف چھوٹی بی بی تھیں۔ انہیں اچانک کیا ہوگیا؟ اتنا خون بہہ گیا ان کا کہ موٹی چادر میں لپٹے ہونے کے باوجود گاڑی کی سیٹ خراب ہوگئی۔ ہوا کیا انہیں؟ اور رشیدہ بیگم صاحبہ کی اتنی خراب حالت ہونے کے باوجود چھوٹی بی بی کو اہمیت دے رہی ہے، جبکہ وہ جانتا ہے کہ وہ وفادار بیگم صاحبہ کی ہے، کیونکہ بیگم صاحبہ نے ہی اسے پسند کر کے ملازمت دی۔ تو اس کا مطلب تو یہی ہے کہ ان کی حالت بیگم صاحبہ سے بھی زیادہ خراب ہے۔

اتنا پریشان وہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ بیگم صاحبہ سے اس کا تعلق وفاداری کا تھا، اور حوالہ صاحب کا بھی تھا۔ وفاداری اس کے لئے بہت اہم تھی۔ بیگم صاحبہ نے ہمیشہ اسے محض نوکر ہی سمجھا تھا، اور وہ نوکر تھا بھی۔ وفاداری کے تحت اس کا ان کے لئے پریشان ہونا فطری تھا۔ لیکن چھوٹی بی بی سے تو اسے دلی انسیت تھی۔ وہ بڑی نرم دل تھیں۔ اس سے بہت اچھی طرح بات کرتی تھیں۔ اس کا خیال رکھتی تھیں۔ ان کے لئے تو وہ جان بھی دے سکتا تھا۔

وہ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ دعا کرنا چاہتا تھا، لیکن دل پر ایسی گھبراہٹ تھی کہ اس سے دعا بھی نہیں کی جا رہی تھی۔ یہاں کی صورتِ حال کی پریشانی اپنی جگہ، مگر اس سے زیادہ اسے یہ فکر تھی کہ صاحب کو کس طرح اطلاع دے .....؟

سچ تو یہ ہے کہ نہ یہ پریشانی اس کی تھی، اور نہ وہ اسے اٹھانے کی اہلیت رکھتا تھا۔ لیکن اسے ٹالنا بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ ایک لمحے کو...... بس ایک لمحے کو اس نے سوچا کہ کاش وہ یہاں نہ ہوتا...... کم از کم اس صورتِ حال میں تو ہرگز بھی نہ ہوتا۔

لیکن اگلے ہی لمحے وہ اپنی اس سوچ پر شرمندہ ہوگیا۔ اس نے سوچا، وہ نہیں ہوتا تو اس کی جگہ کوئی اور ہوتا، اور وہ جو بھی ہوتا، ہوش و حواس میں رہ کر خوش دلی اور محبت سے اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتا۔ اتنے پیارے، اتنی محبت والے،

اتنی عزت کرنے والے لوگ تو نصیب سے ملتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو نوکر کو نوکر نہیں سمجھتے تھے، گھر کے فرد کا درجہ دیتے تھے۔ یہ آزمائش تو بہت چھوٹی چیز ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے تو جان بھی دی جا سکتی ہے۔

اس خیال نے اسے کچھ مضبوطی دے دی۔ وہ پرسکون تو نہیں ہوا۔ لیکن اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوگئی۔

وہ بند دروازے کو دیکھتا رہا، جس کے پیچھے بیگم صاحبہ کا آپریشن ہو رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

رات بہت سست روی سے صبح کی طرف بڑھ رہی تھی۔ آبیہ کرسی پر بیٹھی بدستور سو رہی تھی۔ رشیدہ ایک کرسی پر بیٹھی ارجمند کے چہرے کو تک رہی تھی، جو بے ہوش تھی۔

اس وقت رشیدہ کی بڑی عجیب کیفیت تھی۔ وہ ارجمند کے لئے سراپا دعا تھی۔ اور وہ اپنے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پچھلے تھوڑے سے دنوں میں وہ کتنا بدل گئی تھی، اور اسے بدلنے والی ارجمند تھی، وہ ارجمند جو اس سے بہت نخوت سے بات کرتی تھی، جو سچ بولنے کی قائل تھی، جو سچ سے، اور بڑے سے بڑا راز فاش ہونے سے بالکل نہیں ڈرتی تھی۔ لیکن اندر سے وہ بہت نرم تھی۔ وہ اللہ سے ڈرتی تھی۔ احسان کئے بغیر، بڑی عاجزی سے اتنا بڑا ایثار کرتی تھی، جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہ سکے۔ وہ بے غرض دینے والی تھی۔

اور اس ارجمند نے اسے کیسا بدل ڈالا تھا!

رشیدہ خود سے ناواقف نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ نہایت خودغرض اور مطلبی ہے۔ اس کے نزدیک یہ کوئی بری بات تھی بھی نہیں۔ اس نے دنیا کو ایسا ہی دیکھا تھا۔ کوئی بھی بغیر کسی غرض کے کسی کی ضرورت پوری نہیں کرتا، بلکہ بدلے میں اس سے زیادہ ہی لیتا ہے۔ اس کی ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے ایک پیسے والے نے اس کی زمین ہتھیا لی تھی۔ وہ اسے واپس لینی تھی، اور اس کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔

لیکن وہ مایوس تھی۔ اس بات کی کوئی امید نہیں تھی کہ وہ کبھی اپنا قرض اتارنے اور زمین چھڑانے کے لئے مطلوبہ رقم جمع کر سکے گی۔ ہزارہ میں کام ہی کہاں تھا؟ ایک موہوم سی امید پر وہ ایبٹ آباد چلی آئی۔ یہاں سیزن کے چار مہینوں میں اچھا کام مل جاتا تھا۔ مگر باقی کے خشک مہینوں میں جمع پونجی خرچ ہو جاتی تھی۔ اور اگلے سیزن میں وہ پھر خالی ہاتھ ہوتی تھی۔

خوش قسمتی سے وہ نور بانو کو پسند آ گئی۔ یہ یقینی ہو گیا کہ صرف اس کام میں اسے اتنا مل جائے گا کہ زمین چھڑانے کے بعد بھی اس کے پاس اچھی خاصی رقم بچ رہے گی۔ زمین اس کی تھی بھی بہت اچھی۔

کام کیا، وہ تو غرض کا سودا تھا۔ اور رشیدہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی کہ مول تو غرض کا ہی ملتا ہے۔ سودے بازی کے بغیر، دوسرے کی مجبوری سے فائدہ اٹھائے بغیر دنیا میں کبھی کچھ نہیں ملتا۔

وہ تیز وطرار بھی تھی اور چالاک بھی۔ نور بانو اور ارجمند کے معاملے کو اس نے ابتداء ہی میں بھانپ لیا۔ یہاں جو سودا ہو رہا تھا، وہ تو اس نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے اپنے اتنے بچے تھے۔ ایک اور بھی ہونے والا ہوتا تو بھی ضرورت مند ہونے کے باوجود وہ کسی قیمت پر اسے کسی اور کو نہ دیتی۔ اس کے نزدیک تو وہ اَن ہونی تھی۔ لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ دنیا میں سب کچھ بکتا ہے۔ ہر چیز کا سودا ہوتا ہے۔

پہلے تاثر میں ارجمند اسے خود سے بھی پست لگی۔ کوئی بھلا اپنے پہلے بچے کو بھی بیچتا ہے۔ اور وہ بھی ماں...... اس نے یہ بھی سوچا کہ جو کچھ اسے مل رہا ہے، ارجمند کو یقیناً اس سے بہت زیادہ مل رہا ہوگا۔ اور شاید اس کی وجہ ارجمند کی کم عمری بھی تھی۔ وہ پہلے بچے کی اہمیت سمجھتی ہی نہیں ہوگی۔ ماں بننے کے مرحلے سے پہلے کبھی گزری جو نہیں تھی۔ پھر اس کے سامنے نور بانو تھی، جو اپنا مقصد ہر حال میں حاصل کرنا جانتی تھی۔ رشیدہ نے ایسی شاطر عورت زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ جو کھیل وہ کھیل رہی تھی، چالاک رشیدہ بھی اسے کھیلنے کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ اتنی رکاوٹوں کے باوجود اس نے جس طرح بازی جمائی تھی، وہ بے مثال تھی۔ اس کی

تفصیل تو رشیدہ کو ساتھ رہ کر بعد میں معلوم ہوئی، اور وہ دانتوں میں انگلی دبا کر رہ گئی۔ وہ اکیلے شوہر کا معاملہ نہیں تھا، حالانکہ اس صورت میں بھی یہ آسان نہیں تھا۔ شوہروں سے یہ باتیں کہاں چھپ سکتی ہیں۔ لیکن یہاں تو بھرا پرا گھر تھا، جسے نور بانو بے وقوف بنا رہی تھی۔

سو رشیدہ نور بانو سے بری طرح مرعوب ہو گئی۔ لیکن ارجمند اس کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی۔ اس کے نزدیک وہ بھی اس کی طرح نور بانو کی ایک طرح سے ملازمت کر رہی تھی۔ بلکہ رشیدہ نے ایک طرح سے اسے خود سے بھی کم تر سمجھا۔ کیونکہ وہ اس کے راز کی امین تھی۔ وہ اس کا بھانڈا پھوڑ سکتی تھی۔ اس لئے اس کے خیال میں ارجمند کو اس سے دب کر رہنا تھا۔

اسی تاثر کے تحت ایک دن اس نے ارجمند سے تحکمانہ لہجے میں بات کر لی۔ اس وقت نور بانو اسپتال میں تھی۔ لیکن ارجمند نے جس درشتی سے اسے جھڑکا، اس نے رشیدہ کو اس کی اوقات یاد دلا دی۔ ارجمند نے اسے جتا دیا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتی۔ اور اسے اس کے کسی مشورے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

اس واقعے نے رشیدہ کو احساس دلا دیا کہ ارجمند نہ بے وقوف اور سادہ لوح ہے، نہ کمزور اور نہ ہی لالچی۔ وہ جانتی تھی کہ اس راز کے زیر پردہ نور بانو سے تو کچھ بھی منوا سکتی ہے۔ لیکن ارجمند دینے والی نہیں یعنی نور بانو کمزور ہے اور ارجمند مضبوط۔

لیکن ارجمند کی مضبوطی کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

پھر ایک دن اتفاق سے اس نے کچھ فون پر کی جانے والی اور کچھ دونوں سوکنوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی تو سب کچھ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ چاہے نور بانو ارجمند کی سوکن ہو، لیکن ارجمند نور بانو کی سوکن ہرگز نہیں۔ وہ تو نور بانو کو سگی بہن سے بڑھ کر چاہتی ہے، اور اس کی خوشی کے لئے بغیر کسی لالچ اور غرض کے، اتنا بڑا ایثار کر رہی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نور بانو نے خود اپنے شوہر سے ارجمند کی شادی کرائی ہے، اور اسی غرض کے تحت کرائی ہے کہ وہ

اسے اپنا بچہ اور ماں کا مرتبہ اور مقام دے گی۔

اس دن سے اس کی سوچ بدل گئی۔ ارجمند کا مرتبہ اس کی نظروں میں بلند ہوگیا، اور اس حقیقت کے باوجود کہ اس کی غرض نور بانو سے وابستہ تھی، نور بانو اس کی نظروں میں گر گئی۔ وہ ایک شاطر، بے رحم اور سفاک عورت تھی، جو جھوٹی محبت کے زور پر ایک معصوم لڑکی سے وہ کچھ خرید رہی تھی، جو دنیا بھر کے تمام خزانوں کے عوض بھی نہیں مل سکتا۔

لیکن رشیدہ کو ارجمند پر ترس بھی آنے لگا۔ وہ بچی تھی...... اللہ والی تھی ...... مضبوط تھی ...... لیکن کم عمر اور ناتجربہ کار بھی تھی...... اپنی اچھائی میں اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس ایثار کے بعد اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ لیکن رشیدہ سمجھ سکتی تھی۔

اسے معلوم ہوگیا تھا کہ شوہر کو ارجمند میں کوئی دلچسپی نہیں ..... اور وہ نور بانو سے دیوانہ وار محبت کرتا ہے...... بچے سے محرومی پر یہ حال تھا کہ نور بانو کی ضد سے مجبور ہو کر اس نے ارجمند سے شادی کی تھی...... رشیدہ سمجھ سکتی تھی کہ دنیا کی نظروں میں نور بانو ماں بن گئی تو کیا ہوگا......؟ اس میں اسے ذرا بھی شک نہیں تھا کہ ارجمند بے حیثیت ہو کر رہ جائے گی...... بلکہ عجب نہیں کہ نور بانو اسے کانٹا سمجھ کر نکال پھینکے۔

کئی بار اس کا جی چاہا کہ بے خبر ارجمند کو اس سلسلے میں خبردار کرے۔ لیکن ایک بار ڈانٹ کھانے کے بعد اس نے اپنی اوقات سمجھ لی تھی۔ دوبارہ ڈانٹ کھانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

اصولاً تو اسے پرواہ نہیں ہونی چاہئے تھی۔ اس کا اُلو تو سیدھا ہو رہا تھا۔ لیکن تبدیلی یہی تو آئی تھی۔ وہ ارجمند کے انجام کے بارے میں سوچ کر کڑھتی تھی، اور اسے نور بانو پر غصہ آتا تھا، جس سے اس کا مفاد وابستہ تھا۔ اس روز نور بانو سے ارجمند کی گفتگو سن کر اس نے اللہ کو سمجھا تھا۔ ورنہ پہلے وہ بس ایک نام تھا، جو عادتاً وہ لیتی تھی۔

اسے ارجمند سے محبت ہوگئی...... وہ زندگی میں اس کی پہلی بے غرض محبت

تھی...... وہ اس کے لئے کچھ کر نہیں سکتی تھی...... لیکن باقاعدگی سے اس کے لئے دعا ضرور کرنے لگی...... ورنہ دعا کا خیال تو اسے کبھی اپنے لئے بھی نہیں آیا تھا۔

وہ اتنی بدل گئی کہ یہ تک سوچنے لگی کہ کسی نہ کسی طرح وہ بے خبر شوہر پر یہ راز کھول دے گی۔ اسے بتا دے گی کہ درحقیقت ارجمند ماں بنی ہے، نور بانو نہیں۔ لیکن یہ کام اسے اپنا حق وصول کرنے کے بعد کرنا تھا۔ کیسے...... ؟ یہ وہ بعد میں سوچ لے گی۔

لیکن آج تو حد ہی ہوگئی۔

جب اس کے سامنے نور بانو کی حالت بگڑی تو اسے خوف آنے لگا۔ نور بانو کی صورت دیکھ کر اندازہ ہوگیا تھا کہ اس بار معاملہ سنگین ہے۔ پھر ڈاکٹر نے بھی کہہ دیا کہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اس نے سوچا، اگر نور بانو کو کچھ ہوگیا تو اسے انعام کون دے گا؟ ارجمند سے تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اور ارجمند کو کیا پڑی تھی کہ وہ اسے کچھ دیتی؟ بلکہ نور بانو کو کچھ ہو جاتا تو وہ جھوٹ کا کھیل آپ ہی ختم ہو جاتا۔

اسے اب بھی یاد تھا کہ یہ خیال آتے ہی وہ پرسکون ہوگئی تھی۔ اس نے سوچا تھا، یہ ہوگیا تو یہ اللہ کا انصاف ہوگا، اور اس کا نقصان اپنی جگہ، لیکن اسے خوشی ہوگی کہ جھوٹ ختم ہوگیا اور حق حقدار کو مل گیا۔

اس لمحے بھی اسے اپنی اس سوچ پر حیرت ہوئی تھی ..... ابھی وہ اتنی رقم جمع نہیں کر سکتی تھی کہ اپنی زمین واگزار کرا پاتی...... اور نور بانو کو کچھ ہو جاتا تو اس کا خواب خواب ہی رہ جاتا...... اس کی بہتری تو اسی میں تھی کہ معاملات خوش اسلوبی سے نمٹ جائیں اور نور بانو اسے انعام و اکرام کے ساتھ رخصت کر دے۔

مگر اگلے ہی لمحے اس کے دل میں کراہت سی ابھری...... نہیں چاہئے مجھے ایسا پیسہ...... اس نے دل میں سوچا...... جو ایک معصوم اور نیک لڑکی کی زندگی تباہ کرنے کے صلے میں مل رہا ہے...... اللہ چاہے گا تو کہیں سے بھی مجھے دے دے گا۔

پھر وہ باہر سے ارجمند کی چیخ سن کر لپکی۔ ارجمند کو اس نے جس حال میں دیکھا، اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اب یہ کیس گھر پر نہیں نمٹایا جا سکتا۔ بلکہ یہاں تو ارجمند کی زندگی ہی خطرے میں ہے۔ ایک لمحے کی تاخیر بھی مہلک ثابت ہوسکتی تھی۔

دونوں عورتوں کی زندگی خطرے میں تھی۔ مگر اس نے ارجمند کے تحفظ کو اولیت دی۔ گھر کی گاڑی میں وہ اسے ساتھ لے کر آئی اور نور بانو کو آبیہ پر چھوڑ آئی۔ یہی نہیں، وہ اپنی تمام جمع پونجی بھی بہت خلوص سے ساتھ لے آئی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ گھر میں کوئی رقم ہے یا نہیں۔ اور نور بانو کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اس سے یہ بات پوچھی جاتی۔ اور وہ یہ جانتے ہوئے بھی وہ رقم خرچ کرنے کو تیار تھی کہ شاید یہ اسے واپس بھی نہ ملے۔ اپنا یہ عمل خود اس کے لئے بھی حیران کن تھا۔

لیکن سخت جان نور بانو نے اتنے برے حال میں بھی اس کا خیال رکھا تھا۔ وہ رقم اپنے بیگ میں لے کر آئی تھی۔

وہ اپنے خیالوں میں اتنی گم تھی کہ اسے ڈاکٹر کی آمد کا پتا بھی نہیں چلا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ ارجمند کی کیفیت بدل رہی ہے۔ بے ہوش تو وہ اب بھی تھی۔ لیکن اس کا جسم مرتعش تھا۔

ڈاکٹر نے بلڈ پریشر چیک کیا اور نفی میں سر ہلایا۔

''کم تو ہوا ہے بلڈ پریشر..... لیکن اب بھی کنٹرول میں نہیں ہے۔''

اسی وقت ارجمند کے جسم میں تشنج کی سی کیفیت پیدا ہوئی، جو جھٹکوں میں تبدیل ہوگئی۔ ڈاکٹر نے جلدی سے ڈرپ علیحدہ کر دی۔ پھر اس نے اسٹیتھسکوپ پیٹ پر لگایا، اور اچانک ہی پریشان ہوگئی۔

''بچہ خطرے میں ہے۔ اب مزید انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں اسی حالت میں آپریشن کرنا ہوگا۔''

''لیکن آپ نے کہا تھا کہ آپ زچہ کو بچانے کو ترجیح دیں گی۔''

ڈاکٹر نے نرس کو اشارہ کیا۔ وہ باہر کی طرف لپکی۔ پھر ڈاکٹر نے جھنجلا کر رشیدہ کو دیکھا۔

''تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ بچے کے بچنے کا امکان تو اب بھی بہت کم ہے۔ لیکن بچہ مر گیا تو خود ان کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

بات رشیدہ کی سمجھ میں آگئی۔

''تو پھر.....؟''

''فوری آپریشن کرنا ہوگا..... تم ان کے بھائی کی بات کر رہی تھیں... انہیں بلاؤ.....! اجازت نامے پر ان کے دستخط کے بغیر ہم آپریشن نہیں کریں گے۔''

متوحش رشیدہ نے آبیہ کو جھنجھوڑ کر جگایا اور خود دروازے کی طرف لپکی۔

❁ ❁ ❁

صبح بہت قریب تھی۔ لیکن اندر بیٹھ کر اس بات کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ البتہ دیوار پر لگا کلاک بتا رہا تھا کہ ساڑھے چار بجے ہیں۔

کہتے ہیں نیند تو کانٹوں پر بھی آجاتی ہے..... نوریز کو بھی ایک جھپکی آگئی۔ لیکن وہ بہت کچی نیند تھی۔ اسے جیسے گردو پیش کا ادراک بھی تھا۔ جس دروازے پر وہ آس بھری نظریں لگائے بیٹھا تھا، وہ دروازہ کھلا تو اس کی نیند اچٹ گئی۔

لیکن آنکھیں کھولنا اب بھی اس کے لئے آسان نہیں تھا۔ آپریشن تھیٹر کے کھلے دروازے سے اسے سفید کوٹ پہنے ایک ہیولا اپنی طرف بڑھتا نظر آیا۔

ڈاکٹر نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تھکے تھکے لہجے میں بولا۔

''مجھے افسوس ہے.....!''

''کوئی بات نہیں صاحب.....!'' اس نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔

''میں سو تو نہیں رہا تھا۔ بس یوں ہی.....''

ڈاکٹر نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ہم نے پوری کوشش کی۔ لیکن اللہ کی مرضی کے سامنے سب بے بس ہیں۔ ویسے بھی یہاں انہیں لاتے ہوئے دیر ہوگئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ معمولی سا امکان تھا ان کے بچنے کا۔ مگر ہمارا کام تو کوشش کرنا ہے۔''

نوریز کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ کچھ احساس سا ہو رہا تھا۔ لیکن وہ اب بھی سمجھا نہیں تھا۔

''میں سمجھا نہیں صاحب.....!''

''ہم انہیں نہیں بچا سکے۔''

نوریز کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

❁ ❁ ❁

علیم الحق حقی کا شہرۂ آفاق ناول

"عشق کا شین"

(حصہ پنجم)

جلد آ رہا ہے